DUE DATE

Cl. No. ________________ *Acc. No.* ________________

Late Fine **Rs. 1.00** per day for first 15 days.
Rs. 2.00 per day after 15 days of the due date.



اِدارۂ ادبیاتِ اُردو، ایوانِ اُردو، پنجہ گٹہ، حیدر آباد

سن اجراء : ۱۹۳۸ء

فون : 3310469

[redacted]

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

12

جلد : ۶۰ — جنوری ۱۹۹۸ء — شمارہ : ۱

فی پرچہ	:	۱۲ روپے
زرِ سالانہ	:	۱۲۵ روپے
کتب خانوں سے	:	۱۵۰ روپے

مشرقِ وسطیٰ اور امریکہ	:	۲۵ ڈالر
پاکستان ، برما ، سری لنکا و بنگلہ دیش	:	۱۰ ڈالر
انگلستان	:	۱۵ پونڈ

ناشر : ادارہ ادبیاتِ اردو ، پنجہ گٹہ روڈ ، حیدرآباد ـ ۵۰۰۰۸۲ (اے ـ پی) انڈیا۔

کمپیوٹر کتابت : جے ـ جے ـ کمپیوٹرس ، منڈی پلٹم ، حیدرآباد ۔ / شاپ کمپیوٹرز ، چادر گھاٹ ، حیدرآباد۔

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر ، پرنٹر ، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے ایس ایس گرافکس دارالحکومت میں طبع کرواکے ادارہ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

اِس شمارے میں

○●○ ● ○●○

علی سردار جعفری

علی سردار جعفری جن کی خدمت میں حال ہی میں ملک کا باوقار اعزاز گیان پیٹھ ایوارڈ پیش کیا گیا ہے اردو کے ایک منفرد معتبر اور اہم شاعر اور نقاد ہونے کے علاوہ اس عہد کے بڑے دانش ور بھی ہیں ۔

جعفری صاحب کے خاندان کا تعلق آگرہ اور بھرت پور سے تھا ان کے اسلاف بلرام پور منتقل ہوگئے تھے اور وہاں بڑے عہدوں پر فائز رہے ۔ ان کے والد ریاست بلرام پور کے اسلحہ خانے اور توشہ خانے کے آفیسر تھے اور انھیں کتب بینی کا شوق تھا ۔ اس طرح جعفری صاحب کی ابتدائی نشو و نما کتابوں اور بندوقوں کے درمیان ہوئی ۔

سردار جعفری ۲۹ نومبر ۱۹۱۳ ء کو بلرام پور میں پیدا ہوئے ۔ وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی اس کے بعد لکھنو الہ آباد اور علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم کا سلسلہ جاری رہا ۔ ام ۔ اے فائنل تک پہنچے تھے کہ سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے انھیں گرفتار کرلیا گیا ۔ اس کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا ۔ بعد ازاں وہ عملی سیاست میں حصہ لینے لگے ۔ انھوں نے کہیں ملازمت نہیں کی ۔ کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ رہے ۔ ترقی پسند تحریک کے ہمیشہ روحِ رواں رہے ۔ نیا ادب لکھنو کی ادارت کی ۔ قومی جنگ کی مجلسِ ادارت کے رکن رہے ۔ بمبئی سے ادبی جریدہ گفتگو جاری کیا ۔

سیاست اور ادبی صحافت کے ساتھ ساتھ مختلف فلموں کے لیے کہانیاں اور مکالمے لکھے ۔ ٹی وی سیریلس بنائے ۔ لال قلعہ دہلی ، شالیمار باغ سری نگر ، سابرمتی آشرم احمدآباد اور تین مورتی نواس (پنڈت نہرو کی قیام گاہ) کے لیے " روشنی اور آواز " کے اسکرپٹ تیار کیے ۔

علی سردار جعفری کم عمری ہی سے شعر کہنے اور افسانے لکھنے لگے تھے ۔ ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ پرواز ۱۹۴۳ ء میں شائع ہوا ۔ اس کے بعد شاعری کے کئی اور مجموعے شائع ہوے جن میں چند قابلِ ذکر مجموعے یہ ہیں : نئی دنیا کو سلام ، خون کی لکیر ، امن کا ستارہ ، ایشیا جاگ اٹھا ، پتھر کی دیوار ، ایک خواب اور ، لہو پکارتا ہے ۔ افسانوں کا ایک مجموعہ منزل ۱۹۳۸ ء میں شائع ہوا ۔

سردار جعفری محض شاعر اور ادیب ہی نہیں ، ایک مفکر ، دانش ور اور بلند پایہ نقاد بھی ہیں ۔ ادبی ، تہذیبی اور سیاسی موضوعات پر اردو اور انگریزی میں ان کے کئی مضامین شائع ہوچکے ہیں ۔ ان کے علاوہ انھوں نے ترقی پسند ادب کی ایک مبسوط تاریخ لکھی جو ۱۹۵۳ ء میں شائع ہوئی ۔ اقبال شناسی ، پیغمبرانِ سخن (کبیر ، میر ، غالب) لکھنو کی پانچ راتیں دیگر نثری تصانیف ہیں ۔ سردار جعفری کی کئی نظموں کے ہندستانی اور بیرونی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں ۔

گیان پیٹھ ایوارڈ سے قبل جعفری صاحب کو متعدد قومی و بین الاقوامی ایوارڈ اور اعزازات حاصل ہوچکے ہیں جن میں سے

چند قابلِ ذکر حسبِ ذیل ہیں ؛ سوویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ ، پدم شری کا اعزاز ، جواہر لال نہرو فیلوشپ ، اقبال میڈل پاکستان وغیرہ ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انھیں ڈی ۔ لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی ۔

علی سردار جعفری کئی ادبی ، علمی اور تہذیبی اداروں سے وابستہ رہے ۔ وہ بمبئی یونیورسٹی کی سینٹ کے رکن ، جموں یونیورسٹی کے ویزیٹنگ پروفیسر ، انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) کے صدر ، آل انڈیا ریڈیو اور ٹی وی کے اعزازی پروڈیوسر ، مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی کے نائب صدر ، گجرال کمیٹی کے صدر اور فلم رائٹرز ایسوسی ایشن بمبئی کے صدر رہے ۔

علی سردار جعفری آج اردو دنیا کی سب سے بلند قامت شخصیت ہیں ۔ ادارہ ، سب رس گیان پیٹھ ایوارڈ کے لیے انھیں دلی مبارک باد دیتا ہے ۔ اگلے صفحات پر علی سردار جعفری کی چند منتخب نظمیں پیش کی جارہی ہیں ۔

(ادارہ)

○●○ ● ○●○

علی سردار جعفری

پتھر کی دیوار

کیا کہوں بھیانک ہے
یا حسیں ہے یہ منظر
خواب ہے کہ بیداری
کچھ پتہ نہیں چلتا
آدمی محبت بھی
گیت بھی ہیں آنسو بھی
پھر بھی ایک خاموشی
روح و دل کی تنہائی
اک طویل سناٹا
جیسے سانپ لہرائے

○

ماہ و سال آتے ہیں
اور دن نکلتے ہیں
جیسے دل کی بستی سے
اجنبی گزر جائے

○

چیختی ہوئی گھڑیاں
زخم خوردہ طائر ہیں
نرم رو سبک لمحے
منجمد ستارے ہیں
رینگتی ہیں تاریکیں
روز و شب کی راہوں پر
ڈھونڈتے ہیں چشم و دل
نقشِ پا نہیں ملتے
زندگی کے گل دستے
زیبِ طاقِ نسیاں ہیں
پتیوں کی پلکوں پر
اوس جگمگاتی ہے
املیوں کے پیڑوں پر
دھوپ پر سکھاتی ہے
آفتاب ہنستا ہے
مسکراتے ہیں تارے
چاند کے کٹورے سے
چاندنی چھلکتی ہے
جیل کی فضاؤں میں
پھر بھی اک اندھیرا ہے
جیسے ریت میں گر کر
دودھ جذب ہو جائے
روشنی کے گالوں پر
تیرگی کے ناخن کی
سیکڑوں خراشیں ہیں

○

پتھروں کی دیواریں
بارکوں کی تعمیریں
اژدہوں کے پیکر ہیں
جو نئے اسیروں کو
رات دن نگلتے ہیں
ان کے پیٹ کی دوزخ
کوئی بھر نہیں سکتا

○

پتھروں کی دیواریں
بھوک کا بھیانک روپ
چکیوں کے بھدے راگ
روٹیوں کے دانتوں میں
ریت اور کنکر ہیں
دال کے پیالوں میں
زرد زرد پانی ہے
چاولوں کی صورت پر
سبزیوں کے زخموں سے
پیپ سی ٹپکتی ہے

○

پتھروں کی دیواریں

○

درد و غم کے پیروں میں
آنسوؤں کی دیواریں
بے بسی کی محفل میں
حسرتوں کی تقریریں
رسیوں کی گانٹھوں میں
بازوؤں کی گولائی
نیم جان قدموں میں
بیڑیوں کی شنوائی
ہتھکڑی کے حلقوں میں
ہاتھ کسمساتے ہیں
پھانسیوں کے پھندوں میں
گردنیں تڑپتی ہیں

○

پتھروں کی دیواریں

○

جو کبھی نہیں روتیں
جو کبھی نہیں ہنستیں
ان کے سخت چہروں پر
رنگ ہے نہ غازہ ہے
کھردرے لبوں پر صرف
بے حسی کی مہریں ہیں

○

پتھروں کی دیواریں

○

پتھروں کے فرش اور چھت
پتھروں کی محرابیں
پتھروں کی پیشانی
پتھروں کی آنکھیں ہیں
پتھروں کے دروازے
پتھروں کی انگڑائی
پتھروں کے پنجوں میں
آہنی سلاخیں ہیں

○

اور ان سلاخوں میں
حسرتیں ، تمنائیں
آرزوئیں ، امیدیں
اشک ، پھول اور شبنم
چاند کی جواں نظریں
دھوپ کی سنہری زلف
بادلوں کی پرچھائیں
صبح و شام کی پریاں
موسموں کی لیلائیں
سولیوں پہ چڑھتی ہیں
اور اس اندھیرے میں
سولیوں کے سائے میں
انقلاب پلتا ہے
تیرگی کے کانٹوں پر
آفتاب چلتا ہے
پتھروں کے سینے میں
سرخ ہاتھ اگتے ہیں
ہاتھ ہیں کہ تلواریں
رات کے اندھیرے میں
جیسے شمع جلتی ہے
انگلیاں فروزاں ہیں
بارکوں کے کونوں سے
سازشیں نکلتی ہیں
گھنٹیاں سی بجتی ہیں

○

جانے کیسے قیدی ہیں
کس جہاں سے آتے ہیں
ناخنوں میں کیلیں ہیں
ہڈیاں شکستہ ہیں
نوجواں جسموں پر
پیرہن ہیں زخموں کے
جگمگاتے ہاتھوں پر
خون کی لکیریں ہیں
اشک ، آگ کے قطرے
سانس تند آندھی ہے
بات ہے کہ طوفاں ہے
ابروؤں کی جنبش میں
عزم مسکراتے ہیں
اور نگہ کی لرزش میں
حوصلے مچلتے ہیں
تیوریوں کی شکنوں میں
نقشِ پا بغاوت کے
جتنا ظلم سہتے ہیں
اور مسکراتے ہیں
جتنا دکھ اٹھاتے ہیں
اور گیت گاتے ہیں
جبر اور بڑھتا ہے
ظالموں کی شدت پر
ظلم چیخ اٹھتا ہے
ان کے لب نہیں ہلتے
ان کے سر نہیں جھکتے
دل سے آہ کے بدلے
اک صدا نکلتی ہے
انقلاب زندہ باد

○

خاکِ پاک کے بیٹے
کھیتیوں کے رکھوالے
ہاتھ کارخانوں کے
انقلاب کے شہہ پر
کوہ سار کے شاہیں
پتھروں کی کوروں پر
آندھیوں کی راہوں پر
بجلیوں کی بارش میں
گولیوں کے طوفاں میں
سر اٹھائے بیٹھے ہیں

○

انقلاب ساماں ہے
ہند کی فضا ساری
نزع کے ہے عالم میں
یہ نظام زر داری
وقت کے محل میں ہے
جشنِ نو کی تیاری
جشنِ عامِ جمہوری
اقتدارِ مزدوری
غرقِ آتش و آہن
بے کسی و مجبوری
مفلسی و ناداری
تیرگی کے بادل سے
جگنوؤں کی بارش ہے
رقص میں شرارے ہیں
ہر طرف اندھیرا ہے
اور اس اندھیرے میں
ہر طرف شرارے ہیں
کوئی کہہ نہیں سکتا
کون سا شرارہ کب
بے قرار ہو جائے
شعلہ بار ہوجائے
انقلاب آجائے

(سنٹرل جیل ناسک)

علی سردار جعفری

فریب

(۱۵ / اگست اور اس کے بعد)

(۱)

ناگہانی شور ہوا
لو شبِ تارِ غلامی کی سحر آپہنچی
انگلیاں جاگ اٹھیں
بربط و طاؤس نے انگڑائی لی
اور مطرب کی ہتھیلی سے شعاعیں پھوٹیں
کھل گئے ساز میں نغموں کے مہکتے ہوئے پھول
لوگ چلائے کہ فریاد کے دن بیت گئے
راہ زن ہار گئے
راہ رو جیت گئے

قافلے دور تھے منزل سے ، بہت دور ، مگر
خود فریبی کی گھنی چھاؤں میں دم لینے لگے
چن لیا راہ کے روڑوں کو خذف ریزوں کو
اور سمجھ بیٹھے کہ بس لعل و جواہر ہیں یہی
راہ زن ہنسنے لگے چھپ کے کمیں گاہوں میں

ہم نفسیں یہ تھا فرنگی کی فراست کا طلسم
رہبرِ قوم کی ناکارہ قیادت کا فریب
ہم نے آزردگیِ شوق کو منزل جانا
گردشِ حلقہ ٔ گرداب کو ساحل جانا

اب جدھر دیکھو ادھر موت ہی منڈلاتی ہے
درو دیوار سے رونے کی صدا آتی ہے
خواب زخمی ہیں ، امنگوں کے کلیجے چھلنی
میرے دامن میں ہیں زخموں کے مہکتے ہوئے پھول
خوں میں لتھڑے ہوئے پھول
میں جنھیں کوچہ و بازار سے چن لایا ہوں
قوم کے راہ بر و راہ زنو
اپنے ایوانِ حکومت میں سجالو ان کو
اپنے گل دانِ سیاست میں لگا لو ان کو
اپنی صدسالہ تمناؤں کا حاصل ہے یہی
موجِ پایاب کا ساحل ہے یہی
تم نے فردوس کے بدلے میں جہنم لے کر
کہہ دیا ہم سے گلستاں میں بہار آئی ہے
چند سکوں کے عوض چند ملوں کی خاطر
تم نے ناموسِ شہیدانِ وطن بیچ دیا
باغ باں بن کے لٹیرے اور چمن بیچ دیا

(۲)

کون آزاد ہوا ؟
کس کے ماتھے سے غلامی کی سیاہی چھوٹی
میرے سینے میں ابھی درد ہے محکومی کا
[illegible]

چور بازاروں میں بدشکل چڑیلوں کی طرح
قیمتیں کالی دکانوں پہ کھڑی رہتی ہیں
ہر خریدار کی جیبوں کو کترنے کے لیے
کارخانوں پہ لگا رہتا ہے
سانس لیتی ہوی لاشوں کا ہجوم
بیچ میں ان کے پھرا کرتی ہے بےکاری بھی
اپنا خون خوار دہن کھولے ہوے

اور سونے کے چمکتے سکّے
ڈنک اٹھائے ہوے پھن پھیلائے
روح اور دل پہ چلا کرتے ہیں
ملک اور قوم کو دن رات ڈسا کرتے ہیں

روٹیاں چکلوں کی قبائیں ہیں
جن کو سرمائے کے دلالوں نے
نفع خوری کے جھروکوں میں سجا رکھا ہے

ہم کہاں جائیں کہیں کس سے کہ نادار ہیں ہم
کس کو سمجھائیں غلامی کے گنہ گار ہیں ہم

طوق خود ہم نے پہنا رکھا ہے ارمانوں کو
اپنے سینے میں جکڑ رکھا ہے طوفانوں کو

(۳)

آج پھر ہوتی ہیں زخموں سے زبانیں پیدا
تیرہ و تار فضاؤں سے برستا ہے لہو
راہ کی گرد کے نیچے سے ابھرتے ہیں قدم

تارے آکاش پہ کم زور حبابوں کی طرح
شب کے سیلابِ سیاہی میں بہے جاتے ہیں
پھوٹنے والی ہے مزدوروں کے ماتھے سے کرن
سرخ پرچم افقِ صبح پہ لہراتے ہیں

○●○

علی سردار جعفری

ایک خواب اور

خواب اب حسنِ تصور کے افق سے ہیں پرے
دل کے اک جذبۂ معصوم نے دیکھے تھے جو خواب
اور تعبیروں کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
تشنگی آبلہ پا، شعلہ بہ کف موجِ سراب
یا پلٹ آتے کوئی ساعتِ نایاب شباب
پھوٹ نکلے کسی افسردہ تبسم سے کرن
یا دمک اٹھے کسی دستِ بریدہ میں گلاب
آہ پتھر کی لکیریں ہیں کہ یادوں کے نقوش
کون لکھ سکتا ہے پھر عمرِ گزشتہ کی کتاب
بہتے لمحات کے سوتے ہوئے طوفانوں میں
تیرتے پھرتے ہیں پھوٹی ہوئی آنکھوں کے حباب
تابشِ رنگِ شفق، آتشِ روئے خورشید
مل کے چہرے پہ سحر آئی ہے خونِ احباب
جانے کس موڑ پہ کس راہ میں کیا بیتی ہے
کس سے ممکن ہے تمناؤں کے زخموں کا حساب
آستینوں کو پکاریں گے کہاں تک آنسو
اب تو دامن کو پکڑتے ہیں لہو کے گرداب
دیکھتی پھرتی ہے ایک ایک کا منہ خاموشی
جانے کیا بات ہے شرمندہ ہے اندازِ خطاب
در بہ در ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال
اور مجرم کی طرح ان سے گریزاں ہے جواب
سرکشی، پھر میں تجھے آج صدا دیتا ہوں
میں ترا شاعرِ آوارہ و بے باک و خراب
پھینک پھر جذبۂ بے تاب کی عالم پہ کمند
ایک خواب اور بھی اے ہمتِ دشوار پسند

علی سردار جعفری

آبلہ پا

سائے میں درختوں کے
بیٹھے ہوئے انسانو
اے وقت کے مہمانو
کس دیس سے آئے ہو
کس دیس کو جانا ہے
اے سوختہ سامانو
یہ وسعتِ میداں ہے
یا درد کا صحرا ہے
اک دھوپ کا جنگل ہے یا پیاس کا دریا ہے
دریا کے پرے کیا ہے
پتھر ہے کہ چشمہ ہے
نغمہ ہے کہ نالہ ہے
شبنم ہے کہ شعلہ ہے
شاید کوئی ساحر ہے
جو ڈوبتے سورج کے دروازے پہ بیٹھا ہے
افسونِ تماشا ہے
ہے رات کی راہوں میں تاروں کا سفر جاری
اور بادِ بیابانی
سرمست و غزل خواں ہے
ہر ذرے کے سینے میں اک شمع فروزاں ہے
ہر خار کے نیزے پر خوابوں کا گلستاں ہے
اے عشقِ جنوں پیشہ
اس سمت ہی چلنا ہے
ڈوبا ہے جہاں سورج
نکلا ہے جہاں سورج
واں ریت کے ٹیلے پر
یا ناقۂ لیلیٰ ہے یا محملِ سلمیٰ ہے
صد قافلہ پنہاں ہے
صد قافلہ پیدا ہے
آوازِ جرس لیکن اس دشت میں تنہا ہے
صدیوں سے اسی صورت
ہے حکمِ سفر جاری
فرمانِ ستم جاری
اعلانِ کرم جاری
پھولوں کے کٹوروں میں
شبنم کی گلابی ہے
اور بادِ سحر گاہی
بدمست شرابی ہے
کل صبح کے دامن میں تم ہوگے نہ ہم ہوں گے
بس ریت کے سینے پر کچھ نقشِ قدم ہوں گے
سائے میں درختوں کے
پھر لوگ بہم ہوں گے
کس دیس سے آئے ہو کس دیس کو جانا ہے
اے وقت کے مہمانو
اے سوختہ سامانو
اے شمعِ تمنا پر جلتے ہوئے پروانو

○●○

اختر حسن

یادوں کی سیر گاہ

(چھٹی قسط)

متحدہ جمہوری محاذ

جے سوریا اپنے ساتھیوں کی حرکت اور مسٹر ڈھگے کی چال بازیوں کو جان کر بے حد نادم تھا کچھ لوگوں نے بیچ میں پڑ کر میرے اور جے سوریا کے درمیان صلح صفائی کرادی اور سیاسی مصروفیات میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہوگئے ۔ ڈاکٹر جے سوریا کا مکان گولڈن تھرش ہولڈ (سنہری آستانہ) پھر ہماری سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا ۔ جے سوریا اپنے کیے پر اتنا شرمندہ تھے کہ اب ہر وقت ہماری دل داری میں لگے رہتے چناں چہ اب ہمارے ملنے جلنے میں پہلے سے زیادہ گرمی پید ہوگئی تھی ۔

آپ کو وہ میمورینڈم کی بات تو یاد ہوگی جو علی یاور جنگ کے ساتھ مل کر تیار کیا گیا تھا اور سیول لبرٹیز یونین کے قیام میں جو اڑچن پیدا ہوگئی تھی اس وقت سے جے سوریا اس فکر میں تھے کہ کوئی متبادل پلیٹ فارم بنایا جائے چناں چہ اب ایک دن جے سوریا نے اپنے گھر پر ایک میٹنگ بلائی اور اپنی تقریر میں کہا کہ محض سیول لبرٹیز سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا ۔ ہم کو اگر مسلمانوں میں جاگرتی پیدا کرنا ہے تو اس کے لیے ایک باقاعدہ تنظیم کی ضرورت ہے چناں چہ اس ضمن میں کئی بیٹھکیں ہوئیں ، کچھ نئے لوگوں کو بھی شامل کیا گیا ۔ مثلاً ایک خورشید حسن تھے موٹر یونین کے سکریٹری ۔ نوجوان آدمی تھے ۔ بڑی فعال شخصیت تھی ان کی ، ہر الکشن ضرور لڑتے ، اپنی موٹر یونین کے بل بوتے پر ، ہمیشہ ہارتے ۔ ایک اور ہمارے ملنے والوں میں تھے غلام پنجتن ، بہت بڑے Democrate عابد حسن انھی کے بیٹے ہیں ، جو کئی اعلیٰ عہدوں پر سرفراز رہے ، امریکہ میں سفیر بھی رہے ۔ تو یہ غلام پنجتن صاحب بہت خوش باش دل چسپ آدمی تھے ۔ تقریباً روز ہی پیام کے دفتر آتے تھے اور گپ شپ کرتے تھے اور ایک تھا ستیہ نارائن ریڈی جو بہت ہی ذہین نوجوان تھا ، اردو بہت اچھی جانتا تھا ، ٹریڈ یونینسٹ تھا ۔ ایک دن وہ پیام کے دفتر آیا کہ آپ کے اداریے پڑھ کر میں نے کانگریس پارٹی سے استعفیٰ دے دیا ہے اور آپ لوگوں کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں ۔ شروع شروع میں اس پر کچھ شبہ ہوا کہ کہیں وہ C I D کا آدمی نہ ہو مگر وہ پکا ڈیموکریٹ ثابت ہوا ۔ کوکب دری اور عالم خوند میری تو پہلے ہی سے ہمارے ساتھ تھے ۔ کئی روز کے بحث مباحثہ کے بعد ایک چھوٹی سی سیاسی جماعت تشکیل دی گئی " جمہوری عوامی پارٹی " کے نام سے ، جس کے صدر ڈاکٹر جے سوریا منتخب ہوئے اور میں نائب صدر ۔ سکریٹری ستیہ نرائن ریڈی کو بنایا گیا اور خازن خورشید حسن معتمد موٹر یونین اور مشیر قانونی غلام پنجتن صاحب مقرر ہوئے ۔ عالم اور کوکب دری وغیرہ عاملہ کے رکن بنے ۔

پہلے عام انتخابات

پھر جب کچھ ہی عرصے بعد پہلے الکشن کی بات شروع ہوئی تو ہماری نئی پارٹی کے سامنے بہت اہم سوالات یہی تھے کہ ہماری کیا پالیسی ہو ؟ تیز رفتار تبدیلیوں کا کس طرح مقابلہ کیا جائے ۔ بہت سوچ بچار کے بعد ہم نے اپنا مینی فسٹو تیار کیا اور اپنی ڈیماکریٹک پارٹی کی تحریک پر بائیں بازو کی طرف رجحان رکھنے والی جماعتوں پر مشتمل ایک متحدہ محاذ بنانے کی بات سوچی گئی ۔ اسی زمانے میں اورنگ آباد (مرہٹواڑہ) کی دو اہم شخصیتیں وشن پائن اور گوبند راؤ شراف نے کچھ نظریاتی اختلافات کی بنا پر کانگریس پارٹی سے استعفیٰ دے دیا تھا اور لیگ آف سوشلسٹ ورکرز کے نام سے اپنا ایک علاحدہ گروہ بنالیا تھا۔اس کے علاوہ مہاراشٹرا میں ایک اور بہت اہم پارٹی کسان مزدور پارٹی تھی ۔ جب چناؤ لڑنے کے لیے ہم نے سوچا کہ ایک متحدہ محاذ ہونا چاہیے تو اس ضمن میں گوبندراؤ شراف اور وشن پائن سے بھی بات چیت ہوئی ۔ انھوں نے ہماری رائے سے اتفاق کیا ۔ اس طرح ایک متحدہ محاذ تشکیل دینے کی کوشش کی گئی ۔
ہماری ڈیماکریٹک اسوسی ایشن نے initiative لیا چناں چہ گوبند راؤ شراف کی " لیگ آف سوشلسٹ ورکرز " ، " کسان مزدور پارٹی " اور کچھ ایمان دار افراد کے ساتھ مل کر ایک جمہوری محاذ (.P.D.F) بنا ۔ کمیونسٹ پارٹی اس وقت ممنوع تھی اور اس کے لیڈر سب جیلوں میں تھے تو اس کے ساتھ بہ راہِ راست ربط قائم کرنے کا کوئی سوال نہ تھا ۔ البتہ پارٹی کے کچھ افراد کو .P.D.F کی طرف سے الکشن میں کھڑا کیا گیا مثلاً مخدوم محی الدین کو پرانے شہر سے اور روی ناراین ریڈی کو پارلیمنٹ کے لیے نلگنڈے سے ۔ اسی طرح بدم یلا ریڈی اور چودھری کو بھی متحدہ محاذ کی طرف سے کھڑا کیا گیا ... الکشن سے کوئی تین ہفتہ پہلے ان چاروں کو جیل سے چھوڑا گیا ۔
الکشن لڑنے کے لیے مجھے جن گاؤں سے کھڑا کیا گیا تھا جہاں میرے مقابل ایک کانگریسی بہت بڑے نیتا امرت لعل تھے اور ایک آزاد امیدوار بھی تھا لیکن ان دونوں کی ضمانتیں ضبط ہوگئیں ۔ میں الکشن جیت گیا ۔ دارالشفا سے بیرسٹر اکبر علی خاں کے مقابل سید حسن ہمارا ایک نوجوان تھاوہ جیتا۔اس طرح پہلے جنرل الکشن میں حیدرآباد شہر سے .P.D.F کو دو سیٹیں ملیں ۔
مخدوم محی الدین بےحد ہردل عزیز شاعر تھے ۔ جب وہ جیل سے الکشن لڑنے کے لیے رہا کیے گئے تو جلوس نکلا ۔ اتنا بڑا جلوس حیدرآباد کی تاریخ میں کبھی نہیں نکلا تھا ۔ اور بڑا زبردست جلسہ ہوا تھا پرانے شہر میں ۔ اس میں ارونا آصف علی بھی آئی تھیں اور بڑی عمدہ تقریر کی تھی انھوں نے ۔ جے سوریا نے بھی مخاطب کیا تھا اور پرانے شہر کی ہر دیوار پر " کامریڈ مخدوم گھر گھر دھوم " لکھا ہوا تھا مگر مخدوم یہ الکشن ہار گئے ۔ چند ماہ بعد بائی الکشن میں جیتے ۔
پہلے الکشن کے بعد جب اسمبلی بنی تو بی ۔ رام کشن راؤ چیف منسٹر ہوئے جو حیدرآباد کے بہت مشہور وکیل تھے ۔ کاچیگوڑہ میں رہتے تھے ۔ " امروز " انھیں کا اخبار تھا جس کی مدیر شعیب اللہ خاں تھے جو رضا کار دور میں قتل ہوئے ۔
بی ۔ رام کشن راؤ کی قیادت میں جو اسمبلی تشکیل پائی اس کا میں بھی ایک رکن تھا ۔ شروع شروع میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ایک .M.L.A کو کیا کرنا ہوتا ہے مگر جلد ہی میں نے بہت کچھ سیکھ لیا ۔ سینیر لوگوں سے مشورہ کرتا تھا اور PDF کی ہر میٹنگ میں پابندی سے شریک رہتا ۔ آمدورفت کی سہولت کے پیش نظر پرانے MLA کوارٹرز میں فیملی کے ساتھ منتقل ہوگیا تھا۔ وہاں اکثر اسمبلی کے دوسرے ارکان سے بھی ملاقات اور بات چیت رہتی ۔ غرض بہت جلد میں اسمبلی کا ایک کامیاب ممبر سمجھا جانے لگا اور مجھے بہت ساری ذمہ داریاں سونپ دی گئیں ۔ تقریر کرنے کی بھی خوب مشق ہوگئی ۔

اس زمانے میں اسمبلی میں اردو ہی کا چلن تھا ۔ سب ہی بہت شستہ اردو بولتے تھے انگریزی ۔ تلگو کوئی ایک آدھ ہی بولتا تھا۔اس پہلی اسمبلی میں Oppositon بہت مضبوط تھا ۴۲ تو صرف P D F کے ممبر تھے ۔ کچھ سوشلسٹ پارٹی کے کچھ آزاد رکن ۔ سب ملا کر کانگریس سے صرف ۱۳ ممبرز کم تھے یعنی Treasury اور Opposition میں صرف تیرہ ممبرز کا فرق تھا ۔

اسمبلی کے پانچ برسوں میں ۔ میں نے جو ذمہ داریاں پوری کیں وہ کافی اہم ہیں ۔ ایک تو مجھے یہ تجربہ حاصل ہوا کہ اسمبلی کیا ہوتی ہے ۔ Adjurn motion کیا ہوتا ہے ؟ سوالات کس طرح کیے جاتے ہیں ۔ Adjurn کا کیا مطلب ہوتا ہے وغیرہ ۔ یہ ساری معلومات مجھے انھی پانچ سالوں میں حاصل ہوئیں اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اپوزیشن کے رکن کی حیثیت سے مجھے کئی کمیٹیوں میں کام کرنے کا موقع ملا ۔ جن میں " پبلک اکاؤنٹ کمیٹی " سب سے اہم تھی ۔ اس کا بھی میں ممبر تھا ۔ ظہیرالدین صاحب اکونٹنٹ جنرل تھے ۔ بڑے شریف آدمی تھے ۔ بہت مشہور تھے ۔ مجھے بہت پسند کرنے لگے تھے کیوں کہ میں کمیٹی کی میٹنگ میں بہت تیاری کرکے جاتا تھا ۔ مجھے اپنی ذمہ داریوں کا بہت احساس تھا ۔ پبلک کمیٹی کے معاملات کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کرتا تھا ۔ مناسب تجاویز پیش کرتا تھا ۔ اس کے علاوہ عثمانیہ یونیورسٹی کی سنیٹ کا ممبر بھی منتخب ہوا تھا اور چھے سال تک اس کا ممبر رہا ۔ یونیورسٹی کی فینانس کمیٹی میں بھی باہر کے ایک رکن کی حیثیت سے مجھے لیا گیا تھا ۔ یہ کمیٹی صرف تین آدمیوں پر مشتمل ہوتی تھی وائس چانسلر ۔ رجسٹرار اور ایک باہر کا رکن ۔ اس وقت غالباً بھگونتم صاحب وائس چانسلر تھے ۔ انھوں نے باہر کے ایک رکن کی حیثیت سے میرا انتخاب کیا تھا ۔ یونیورسٹی کی یہ ایک بہت اہم کمیٹی ہے ۔ وہاں میں نے ایک کارنامہ یہ انجام دیا کہ زور صاحب کا کوئی معاملہ تھا ۔ ان کو کچھ بقایا ملنا تھا جو کئی برس سے نہیں ملا تھا ۔ زور صاحب نے مجھے بلا کر کہا ۔ تم کمیٹی ممبر ہو ہمارا یہ Case ہے ۔ اتنے پیسے نکلتے ہیں ۔ کمیٹی اس کا تصفیہ کرسکتی ہے ۔ تو تم کو یہ کام کرنا ہوگا کہ ہمارا بقایا دلوادو ۔ میں نے ان کے معاملے کی تفصیلات کا بہت غور سے مطالعہ کیا ۔ ان کا مطالبہ بالکل جائز تھا اور میں اس کے لیے کمیٹی میں بہت لڑا بالآخر ان کا بقایا منظور ہوگیا ۔ زور صاحب بہت خوش ہوئے اور میرے ساتھ ان کے روابط اور مستحکم ہوگئے ۔ بورڈ آف جرنلزم کا بھی ممبر رہا مگر ایک پارلیمنٹری کی حیثیت سے ۔ میں سمجھتا ہوں ۔ اسمبلی کی رکنیت کے دوران میرا سب سے بڑا Contribution یہ رہا کہ جب نظام آباد میں ہندو مسلم فساد ہوا ۔ اس وقت کی خبر اتفاقاً ایم ۔ ایل ۔ اے کوارٹرز کی کسی تقریب میں مجھ تک پہنچی ۔ میں اسی وقت اروٹلا رام چندر ریڈی پاس چلا گیا جو میرے قریب ہی کے کوارٹر میں رہتے تھے اور ان سے کہا کہ ان کی پارٹی کے لوگ فسادات کی خبروں کو سنجیدگی سے نہیں لے رہے ہیں مگر فسادات کی جو خبریں ملی ہیں وہ بہت خطرناک ہیں ۔ اسمبلی کا اجلاس چل رہا ہے ہم کو فوری کچھ کرنا چاہیے ۔ انھوں نے کہا کہ بے شک ہم کو فی الفور وہاں جانا چاہیے تو میں اور وہ اسی وقت رات کی ٹرین سے وہاں پہنچے اور چوک کے قریب جہاں فساد ہوا تھا ایک ہوٹل میں ٹھیرے اور صبح ہوتے ہی تحقیقات شروع کی اور تین چار گھنٹے میں پوری رپورٹ مکمل کر کے فساد کیسے ہوا ؟ کیوں ہوا ؟ گاندھی جی کے پتلے کو وہاں جو نقصان پہنچایا گیا وہ کن لوگوں نے پہنچایا ؟ کون لوگ اس کے اصل ذمہ دار ہیں ؟ کس طرح دکانیں لوٹی گئیں ؟ کتنا نقصان ہوا ؟ بیرونی عناصر کا اس میں کہاں تک دخل تھا وغیرہ وغیرہ ۔ یہ سب تفصیلات معلوم کر کے ہم لوٹے اور آتے ہی سب سے پہلے میں نے اسمبلی میں تحریکِ التوا پیش کی جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی اتنا اہم واقعہ ہو کہ اسمبلی کی دوسری اہم کارروائیوں کو روک کر پہلے اس پر گفتگو کی جائے ۔ تو یہ بہت اہم واقعہ تھا ۔ پہلی بار نظام آباد میں ہندو مسلم فساد ہوا تھا جس میں کئی جانیں گئیں اور مال و اسباب کا بہت

نقصان ہوا تھا ۔ تو میری تحریکِ التوا منظور ہوگئی ۔ دوسرے دن اس پر بحث رکھی گئی ۔ یہ دوسرا دن میری زندگی کا عجیب و غریب دن تھا کہ اسی دن میں نے محسوس کیا کہ اسمبلی میں میرا واقعی کچھ Contribution ہے ۔ چوں کہ میں نے تحریکِ التوا پیش کی تھی بحث کا آغاز کرتے ہوئے پہلے مجھ ہی کو تقریر کرنی تھی ۔ میں نے بہت مدلل تقریر کی ۔ پورے اعداد و شمار کے ساتھ پوری تفصیل بتاتے ہوئے۔ کافی طویل تقریر تھی ادبی انداز میں ، شعر بھی برجستہ کوٹ کیے ، کوئی ایک گھنٹہ تک مسلسل بولتا رہا ۔ بی رام کشن راؤ نے اس کا جواب اردو میں ہی دیا اور انھوں نے بھی اردو فارسی کے کئی شعر پڑھے ۔ بہت اہم اجلاس رہا یہ ۔ Visitors Gallery کھچا کھچ بھری ہوئی تھی جس میں پارٹی کے لیڈر بھی موجود تھے ۔ راجیشور راؤ جو اب پارٹی کے سکریٹری ہیں وہ بھی تھے ۔ انھوں نے بہت مبارک باد دی مجھے ۔ تو یہ میں سمجھتا ہوں میرا بہت بڑا کارنامہ رہا اسمبلی میں ۔ جلی سرخیوں کے ساتھ سب ہی اخباروں نے اس کا ذکر کیا اور پوری رپورٹ چھاپی ۔ اس فساد میں کئی لوگ مرے ، میرے ایک استاد بھی مارے گئے ۔ یہ کوئی ۵۲ / ۵۳ ء کی بات ہے ۔ اس کے بعد گلبرگہ میں فساد ہوئے ۔ گورنمنٹ نے ایک امن کمیٹی بنائی جس میں مجھے بھی رکھا ۔ اس کمیٹی نے اضلاع کا دورہ کیا ۔ ہر ضلع میں گئے اورنگ آباد بھی گئے اور ہر جگہ ایک مقامی امن کمیٹی بنائی ۔ کچھ اور لوگوں نے بھی امن کمیٹیاں بنائیں ، دورے کیے ۔ اس طرح اس وقت متحدہ کوششوں سے ہم فسادات کو پھیلنے سے روک سکے لیکن بعد میں آر ۔ ایس ۔ ایس کی اور ایسی ہی دوسری فرقہ پرست تحریکوں کا زور بڑھا تو انھیں روکنا مشکل ہوگیا ۔ نظام آباد کے فسادات کے ضمن میں ہی کچھ دنوں بعد ۱۲ ستمبر ۱۹۵۲ ء کو مجھے پھر گرفتار کیا گیا مگر دو مہینے کے اندر ہی یکم نومبر ۱۹۵۲ ء کو رہا کردیا گیا ۔

آپ کو بھی یاد ہوگا ، یہ ہمارا شہر حیدرآباد ، بیسویں صدی کے پہلے دہوں میں کتنا پر امن پرسکون شہر تھا ، کیسا میل ملاپ ، رواداری اور کتنی ارزانی ۔ ہمارے والدین ، دادی ، نانی اس زمانے کے جو قصے سناتے تھے یقین کرنا مشکل لگتا تھا ۔ خود ہم کو یاد ہے جب ہم کالج میں تھے ۔ روپے کا چار سیر دودھ ملتا تھا بارہ آنے سیر خالص گھی ، ۴ روپے پلہ گیہوں ، روپیے کا چار کیلو گوشت اور سب ہی چیزیں اتنی ہی ارزاں تھیں ۔ غالب کا وہ خط پڑھا ہوگا آپ نے کہ اس زمانے میں قحط پڑا تو انھوں نے لکھا روپیہ کو اٹھارہ سیر چنا مل رہا ہے اور ہماری دادی کہتی تھیں قحط کے زمانے میں جوار روپیہ کی ۹ سیر ہوگئی تھی تو مائیں بچوں کو ایک ایک دو دو روٹی کے لیے بیچ دیتی تھیں ۔ اس وقت حالی سکہ چلتا تھا جو سرکارِ عالی کا اپنا سکہ تھا ، ٹپہ ، ریلوے ، وغیرہ بھی ان کی اپنی تھی ، بالکل خود مختار ریاست تھی یہ اور یہ تو ہے ، کہ واقعی بڑا امن و امان تھا ۔ اعلیٰ حضرت کا یہ قول مشہور ہے کہ ہندو مسلم میری دو آنکھیں ہیں ۔ دراصل ہمارے شہر میں ایسا ہی اتحاد تھا ۔ ایک دوسرے کے تیوہاروں میں شرکت ، ساتھ اٹھنا بیٹھنا ۔ کبھی ہندو مسلم کا سوال ہی درمیان میں نہیں آتا تھا ۔ مہاراجہ کشن پرشاد عید کا بڑا شان دار ڈنر دیتے تھے اور جانکی پرشاد ، ڈاکٹر رام پرشاد کے والد جو ہمارے ہی محلے ملاپلی میں رہتے تھے ، ہر نیاز فاتحہ اسی طرح کرتے تھے جیسے ہم لوگ کرتے ہیں ۔ مجھے یاد ہے دسہرہ دیوالی تیوہار میں والد صاحب پتھر گٹی بازار تاجروں سے ملنے ضرور جاتے تھے تو وہ خوب مٹھائی کھلاتے تھے اور جب وہ ملازم تھے اجنتہ اور باؤڑہ میں تو ہم بچوں کے لیے ٹوکریاں بھر بھر کر آتش بازی اور مٹھائی آتی تھی اور ہمارے گھر سے بھی ہر نیاز فاتحہ پر ہندو دوستوں کو تبرک بھیجا جاتا تھا ۔ میرے ہاسٹل کے ایک ساتھی ہریش چندر استھانہ جو بچارے نوجوان مر گئے ، ان کے ایک قریبی عزیز کنج بہاری لال تھے جو بعد میں حیدرآباد کے چیف سکریٹری رہے ، وہ ہریش سے کافی چھوٹے تھے ۔ ہم ہریش چندر کے گھر جاتے تو ان کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے مگر ہاسٹل کے

قیام کے زمانے سے ہی یہ دستور بن گیا تھا کہ دیوالی میں ہم پوری رات اس کے گھر گزارتے اور عید بقرعید پر وہ لوگ ہمارے گھر آتے ۔۔ اس گھرانے سے ابھی حال تک بھی ہمارے گہرے روابط تھے ۔ میں اور میرے بہنوئی لطیف الحسن برنی دیوالی میں اب بھی ضرور ان کے گھر جاتے ہیں ۔ تو یہ ہماری تہذیب تھی ، روایتوں کی پاس داری تھی ۔۔ اور ہم کو یاد نہیں کہ ہم نے گھر کا دروازہ راتوں کو بند کیا ہو ۔ اتنا امن و امان تھا شہر میں ۔ آزادی سے کچھ پہلے تک بھی حیدرآباد کی یہ پرُ امن فضا بنی رہی ۔۔ مگر اب یہ وہی ہمارا شہر ہے جو آئے دن فسادات اور بدامنی کا شکار رہتا ہے اور پھر جب وشال آندھرا بن گیا تو اس کی صورت اور بھی بدل گئی ۔

وشال آندھرا

آپ کو یاد ہوگا تحریکِ آزادی کے زمانے میں ہی کانگریس نے بار بار یہ اعلان کیا تھا کہ جب بھی ہندستان آزاد ہوگا اور ہماری حکومت برسرِ اقتدار آئے گی تو انگریزوں نے ہندستان کی جو غیر فطری تقسیم کر رکھی تھی، جو سرحدیں مقرر کی تھیں ان کو ختم کردیا جائے گا اور لسانی بنیادوں پر صوبوں کی تقسیم عمل میں آئے گی ۔

آندھرا بننے سے پہے ہماری ریاست حیدرآباد کا نقشہ اس طرح تھا۔اس میں پربھنی سے لےکر اورنگ آباد کا بڑا حصہ جو اب مہاراشٹرا میں ہے ، حیدرآباد ریاست میں تھا ، گلبرگہ ، بیدر ، رائچور وغیرہ جو اب کرناٹک میں ہیں حیدرآباد اسٹیٹ میں تھے مگر لسانی بنیادوں پر تقسیم کے بعد یہ نقشہ بدل گیا ۔

پہلے الکشن کے بعد ہی فضل علی کمیشن کے نام سے ایک کمیشن قائم ہوا تھا جس کے صدر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس تھے اور ایک ممبر ڈاکٹر کنزرو تھے ۔ یہ کمیشن مختلف صوبوں کا دورہ کرتا ہوا حیدرآباد بھی آیا تھا مختلف جماعتوں اور لوگوں سے بات چیت کی تھی ۔ ہم سے بھی ملا تھا اور ہم نے کافی Cross Questioning بھی کی تھی ۔ اس کے بعد اس کی رپورٹ چھپی لیکن اس سے پہلے میں آپ کو یہ بتادوں کہ یہاں یعنی حیدرآباد اسٹیٹ میں لسانی بنیاد پر تقسیم کا مطالبہ پہلے ہی سے اتنا زور پکڑ گیا تھا اور اس تحریک کے جو نیتا پٹی سری رالمو تھے وہ آندھرا کے مطالبہ کو منوانے کے لیے مرن برت میں فوت ہوگئے تھے تو ان کا مطالبہ مان لیا گیا تھا اور اس طرح کمیشن کی رپورٹ سے پہلے ہی ایک آندھرا بن گیا تھا ، وہ اس طرح کہ جو علاقہ مدراس پریسیڈنسی میں تھا وہ تلگو بولنے والے علاقے سے الگ کردیا گیا تھا اور اسے آندھرا کا نام دیا گیا اور تلنگانہ ایک الگ ریاست بن گئی تھی جس کا صدر مقام کرنول تھا ۔ مگر جب فضل علی کمیشن کی رپورٹ آگئی تو اس کی سفارشات کے پیشِ نظر ہندستان کی نئی جغرافیائی حد بندی ہوئی اور ۱۹۵۶ء میں " وشال آندھرا " بنا جس کا صدر مقام حیدرآباد کو قرار دیا گیا ۔ تلنگانہ کا جو الگ اسٹیٹ بن گیا تھا وہ بھی اس میں شامل کرلیا گیا ۔ مدراس Constituency الگ ہوگئی ۔ یہاں ایک دل چسپ بات یہ قابلِ لحاظ ہے کہ اب جو ہمارا آندھرا ہے اس کی ۹۹ فیصد سرحدیں وہی ہیں جو ابراہیم قطب شاہ اور محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں تھیں ۔ محمد قلی قطب شاہ کے زمانے کا نقشہ دیکھیں تو تقریباً وہی نقشہ دکھائی دے گا جو اب آندھرا پردیش کا ہے ۔

بہمنی سلطنت کا صدر مقام بیدر تھا جو محمد ۔۔۔ شاہ کو گویا ورثتاً ملا تھا ۔ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد صوبوں کے گورنروں نے اپنی اپنی آزادی کا اعلان کردیا تھا مگر جب ابراہیم قطب شاہ نے سلطنت کا دائرہ پھیلایا تو قطب شاہیوں کو ان کی سرحدیں واپس مل گئیں ۔۔ حیدرآباد بنا اور صدر مقام قرار پایا جیسا اب آندھرا کا صدر مقام ہے ۔

آندھرا گورنمنٹ کے پہلے چیف منسٹر نیلم سنجیوا ریڈی تھے ۔ آندھرا کے " ماما " سنجیوا ریڈی پر سرور ڈنڈا کی نظم " سنجیوا ریڈی " آج تک لوگوں کی زبان پر ہے ۔ گوپال ریڈی اس وقت گورنر تھے ۔ یہ بڑی تبدیلی جنوبی ہند میں ہوئی ، ادھر شمالی ہند میں ہندی تقریباً وہی رہا جو پہلے تھا ۔ بنگال میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا ۔ البتہ راجستھان اور گجرات کے علاقے میں جو پرانی ریاستیں تھیں کے خاتمے کے بعد انگریزوں نے ان کی تقسیم کچھ اس طرح کی تھی کہ مختلف زبانوں کے علاقے اس میں شامل ہوگئے تھے ۔ ان کو یسے ہی برقرار رکھا گیا ، غالباً سیاسی مصلحت کی بنا پر ۔۔۔ غرض ۱۹۵۶ء سے کہنا چاہیے ہندستان کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے ، کے جغرافیائی نقشے میں بھی تبدیلی آتی ہے ۔

سرے عام انتخابات

پھر ۵۶ء میں ہی دوسرے عام الکشن آگئے ۔۔۔ میں اس دوسرے الکشن میں کھڑا ہونا نہیں چاہتا تھا ، میری اپنی کچھ وجوہات بنا پر مگر پھر وہی اپنے کامریڈ بھائیوں کی عنایت ۔۔۔ بہرحال ما ۔۔۔ راج بہادر گوڑ بھولے نہیں ہوں گے کہ میں نے کن وجوہات کی بنا انکار کیا تھا اور جس حلقے سے مجھے کھڑا کیا جارہا تھا ، وہاں سے میں جانتا تھا میری کامیابی بالکل غیر یقینی تھی ۔ مگر راج بہادر گوڑ کا صرار اور یہ کہ .P. D. F کا فیصلہ ہے آپ کو اس فلاں Constituency سے کھڑا ہونا ہے تو آخر مجبوراً مجھے کھڑا ہونا پڑا ۔ کے ۔ یل ۔ مہندرا میرے الکشن کے انچارج تھے ۔ پتھر گٹی کا پورا علاقہ ہماری Constituency تھا اور لوگوں نے ووٹ بھی ہم کو بہت دیے ، صرف تین سو ووٹوں کی کمی سے شکست ہوئی ۔ دراصل پارٹی نے بہت غلطیاں کیں ، غلط اندازے لگائے ، ہماری بات کبھی نہیں مانی ۔ مخالفِ مذہب نعرے لگائے جس کا وہ موقع نہیں تھا ۔ ہم نے بہت روکا مگر وہ نہیں مانے ۔ پارٹی سیاست اور مذہب کو گڈمڈ کرتے رہے جس سے بہت نقصان ہوا ۔ اب وہ اپنی غلطیاں تسلیم کرتے ہیں مگر فائدہ ۔۔۔ " جب چڑیاں چگ گئیں کھیت " ۔

الکشن مہم کے لیے مسلم علاقوں میں مخدوم اور میں بھیجے جاتے تھے اور ہمارے ساتھ انٹرپریٹر کی حیثیت سے ایک اعظم صاحب نامی رہتے تھے ۔ تو ایک مہینے کے دورے میں ہم نے جگہ جگہ بہت سے جلسے کیے تقریریں کیں اور جلسوں میں لوگ جس طرح جوق در جوق آتے تھے ، ہزاروں کا مجمع ہوجاتا تھا ۔ اس سے بہ ظاہر ایسا ہی لگتا تھا کہ ۹۹٪ ووٹ پارٹی کو ملیں گے جیسا کہ ایک بار مخدوم نے کہا بھی تھا ۔ مگر یہ ہماری خوش فہمی تھی ہم نے یہ غور نہیں کیا کہ کانگریس کے جلسوں میں بھی لوگ اتنی ہی کثرت سے شریک ہوتے ہیں ۔ دوسری چیز یہ کہ انفرادی طور پر بات چیت میں ، لوگوں نے پارٹی سے جو کچھ شکایات کیں اور اس کو ہم نے پارٹی تک پہنچایا تو پارٹی نے اس پر کوئی دھیان نہیں دیا ۔۔ میرا اپنا اندازہ اور تجزیہ شروع سے یہ تھا کہ پارٹی نہیں جیتے گی اور اس کا میں نے کئی بار اظہار بھی کیا تھا ۔۔ مجھے یاد ہے ایک بار جب میں نے جب کچھ ایسی بات کہی کہ صرف جلسوں میں لوگوں کی کثیر تعداد میں شرکت کی بنا پر ہم یہ طے نہیں کرسکتے کہ کون جیتے گا اور مجھے یہ اندیشہ ہے کہ پارٹی نہیں جیتے گی تو ہمارے کامریڈز ہم سے ناراض ہوگئے ۔ غرض دوسرے الکشن میں مخدوم بھی ہارے اور میں بھی ۔ اس طرح جب دوسرے الکشن میں میں ہار گیا اور ۱۹۵۷ء میں " پیام " بند ہوگیا تو ایک طرح سے سیاسی اور صحافتی زندگی سے عملاً میرا رشتہ باقی نہیں رہا ۔ میں نے صحافت کو چھوڑ دیا مگر صحافت کسی نہ کسی صورت میرا پیچھا کرتی رہی " عوام " بلٹز اردو " اور " ہم راہی " کی صورت میں ، بہ ہرحال میں " پیام " کے بعد اپنے مختلف کاموں کے ساتھ صحافت سے بھی وابستہ رہا ۔

تو آئیے اب میں آپ کو بتاؤں کہ ۱۹۵۰ء کے بعد سے میری زندگی کا جو دور شروع ہوا اس میں میں نے کیا کیا مختلف قسم کے کام کیے اور نئے تجربے حاصل کیے ۔

سوشیل کالج

یہ کام مختلف نوعیت کے تھے مثلاً لڑکیوں کے ایک کالج " ونیتا مہا ودیالیہ " (جس کا نام اس وقت سوشیل کالج تھا) میں اردو کی کچھ کلاسیں لیں اور وہاں کی کلچرل ایکٹی وٹیز میں بھی اپنے مشوروں سے لڑکیوں کی رہنمائی کی ۔ معصومہ ہمارے ورنگل کے ایک پرانے ساتھی کی لڑکی تھی وہ اس وقت کالج میں پڑھ رہی تھی اسے ڈراما وغیرہ کا بہت شوق تھا ۔ ایک دن جب اس نے یہ بات چھیڑی کہ ہم کو کالج میں ڈراما وغیرہ جیسی کلچرل ایکٹی وٹیز کی طرف بھی توجہ دینا ضروری ہے تو میں نے اس کی بہت ہمت افزائی کی ۔ بزم کا سالانہ جلسہ ہونے والا تھا ۔ لڑکیاں چاہتی تھیں کسی بڑی ادبی شخصیت کی صدارت میں جلسہ ہو چناں چہ میں نے آغا حیدر حسن (۱) کو اس کے لیے ہموار کیا اور لڑکیوں کی طرف سے خود ان تک دعوت نامہ پہنچایا ۔ وہ اپنے مخصوص مغل دور کے لباس میں آئے اور مغل دور کی زنانی زبان میں بڑی دل چسپ صدارتی تقریر کی ۔ لڑکیاں بہت محظوظ ہوئیں اور ڈراما بھی کھیلا گیا ۔ کالج کے پرنسپل نے بھی ان ایکٹی ویٹیز کو بہت پسند کیا اور میرا بے حد شکریہ ادا کیا کہ میری وجہ سے کالج میں اتنا اچھا جلسہ ہوا ۔

سالار جنگ لائبریری

اسی زمانے میں سالار جنگ لائبریری میں اردو فارسی کی توضیحی فہرست بنانے کا کام بھی کیا ۔ اردو کا کام نصیرالدین ہاشمی صاحب کرچکے تھے مگر اس میں بہت غلطیاں تھیں اس کو Revise کرنا تھا تو میرے مشورہ پر اس کے Revision کے لیے شاہد صدیقی کو مقرر کیا گیا ۔ عربی پر ایک اور صاحب کام کررہے تھے ۔ فارسی کا کام میں نے اپنے ہاتھ میں لیا ۔ وہاں فارسی کے تقریباً کوئی تیس ہزار قلمی نسخے تھے ۔ ایک پرانے بوڑھے آدمی تھے وہاں ۔ قدرت اللہ نامی ۔ ستر اسی سال کی عمر ہوگی ان کی ۔ ہر مخطوطے کے بارے میں ان کو اچھا علم تھا ۔ ہر قسم کا خط پہچانتے تھے ۔ کاغذ کی بھی جان کاری تھی اور جتنے بڑے بڑے کاتب گزرے ہیں ان سب کے نام ان کو یاد تھے ۔ ان سے مجھے بہت مدد ملی تو میں نے وہاں دوسال کام کیا اور اس عرصے میں کوئی ۱۵ ہزار کتابوں کا کیٹلاگ بنایا ۔ میرے بعد ایک ڈاکٹر اشرف صاحب نے اس کام کی تکمیل کی اور جب کیٹلاگ چھپا تو اس پر صرف ان ہی کا نام آیا ۔ مجھے بالکلیہ نظر انداز کردیا گیا ۔ شاید یہی رسم دنیا ہے ۔ خیر تو مخطوطات پر کام کرنے کے تجربے کے ساتھ قطب شاہی دور میں جو فارسی شاعر گزرے ہیں ان کے کئی نادر نسخے میری نظر سے گزرے اور ان میں سے دو ایک پر میں نے تحقیقی مقالے بھی لکھے مثلاً روح الامین اور وجہی کے مخطوطے کو سب سے پہلے میں نے ہی ادبی حلقے میں روشناس کرایا جس پر بعد میں لوگوں نے تفصیلی کام کیا ۔ وجہی ۔ قطب شاہی دور کا ملک الشعرا تھا۔ اس کی اردو (دکھنی) کی دو کتابیں بہت مشہور ہیں ۔ ایک تو مثنوی " قطب مشتری " دوسری ایک نثر کی کتاب " سب رس " ۔ عبداللہ قطب شاہ کے دور کی ۔ وجہی نے چار بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا۔اس کا ایک فارسی کلیات بھی ہے جس پر آج تک کام نہیں ہوا ہے ۔ اسی کلیات کو پڑھتے ہوئے ایک شعر سے مجھے وجہی کے نام کا پتہ چلا کہ اسد اللہ نام تھا اور وجہی تخلص ۔ ایک اور نادر کتاب جو میری نظر سے گزری وہ " لغت برہان تبریزی " ہے یہ برہان تبریزی عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں تھا ۔ محمد حسین نام تھا اس کا ۔ یہ لغت فارسی کا بہت قیمتی سرمایہ ہے اور اس پر کئی مستشرقین نے کام کیا ہے اور وہ یہ فارسی مخطوطات پر کام کرنے کا ہی فیض کہیے کہ میں

نے بعد میں قطب شاہی دور کے فارسی ادب پر کام کیا اور میرا تحقیقی مقالہ کتابی صورت میں ۱۹۷۳ء میں چھپا اور اتنا مقبول ہوا کہ اس کا ایک نسخہ بھی دستیاب نہیں ہوتا مگر دوبارہ چھاپنے کی کسی نے کوشش نہیں کی حالاں کہ وہ کتاب غالباً ایم ۔ اے کے اردو نصاب میں بھی شامل ہے ۔

سالارجنگ لائبریری میں میرے جو دو سال گزرے اس میں مجھے فارسی زبان و ادب سے از سرِ نو دل چسپی پیدا ہوئی اور یہ زمانہ میرے لیے بہت فائدہ بخش رہا جس کے لیے مجھے مہدی نواز جنگ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ان ہی کی توجہ اور عنایت سے میں سالارجنگ لائبریری میں کام پر مامور ہوا ۔

" پیام " بند ہوچکا تھا اور میرے سامنے اب کوئی ذریعہ ، معاش نہیں تھا ۔ میں مایوس و ناامید تو نہیں تھا البتہ کسی قدر پریشان ضرور تھا کہ ایک روز صبح میں گھر سے نکل ہی رہا تھا کہ اچانک ایک کار میرے دروازے پر آکر رکی ۔ دیکھا تو اس میں مہدی نواز جنگ بیٹھے ہیں ۔ میں نے بڑھ کر انھیں سلام کیا تو کہا " تمھارے پاس ہی آیا ہوں " میں نے بہ صد ادب انھیں لے جاکر ڈرائنگ روم میں بٹھایا ۔ انھوں نے کہا میں دراصل تمھارے پاس دو باتوں کے لیے آیا ہوں ۔ ایک تو تمھاری بیٹی کی مزاج پرسی کے لیے ، دوسرے تمھارے لیے ایک کام ہے اگر تم کرنا چاہو ۔

میری بڑی لڑکی شاہینہ چار سال کی تھی تو اسی زمانے میں پولیو کی وبا پھیلی تھی اور وہ اس کا شکار ہوگئی تھی ۔ مہدی نواز جنگ نے اس کو بلا کر پیار کیا ، اپنے پاس بٹھایا اور پھر کاغذ منگوا کر ایک چٹھی لکھ کر دی کہ بمبئی میں ایک مسز اسماعیل ہیں فوراً انھیں جاکر بچی کو دکھاؤ ، وہاں انھوں نے صرف اس مرض کے علاج کے لیے ایک بڑا ہسپتال کھول رکھا ہے ۔ یہ ہم کو بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی بچی کو پولیو ہوگیا تھا اور وہ اس مرض سے جاں بر نہ ہوسکی تھی ۔۔۔ چناں چہ ہم بمبئی گئے ۔ مسز اسماعیل نے مہدی نواز جنگ کی چٹھی دیکھ کر بہت توجہ سے دیر تک معائنہ کیا اور کہا فی الحال تو کچھ نہیں ہوسکتا ۱۴ ، ۱۵ سال کی عمر میں آپریشن کرنا ہوگا ۔ جب شاہینہ ۱۴ برس کی ہوئی تو ہم نے اس ہسپتال میں اس کا آپریشن کروایا اور وہ بالکل ٹھیک ہوگئی ۔ ، مہینے دواخانے میں رہنا پڑا تو مہدی نواز جنگ کے مشورے اور چٹھی نے یہ کام کیا اور دوسری بات انھوں نے یہ کہی کہ آج کل بے کار ہو ، سالارجنگ لائبریری میں فارسی کتابوں کی کیٹلاگنگ کا کام ہے تم وہاں آجاؤ ۔ سالارجنگ کی وفات کے بعد مہدی نواز جنگ سالارجنگ میوزیم کے انچارج تھے ۔ اس طرح مہدی نواز جنگ کی نوازش سے ہی میں سالارجنگ لائبریری میں کام کرسکا ۔

مہدی نواز جنگ سے اسمبلی کے زمانہ سے ہی میرے گہرے روابط ہوگئے تھے اور اکثر ان کے پاس آنا جانا رہتا تھا ۔ بنجارا ہلز پر ان کا واحد مکان تھا اس وقت اور بنجارا آباد کرنے میں ان ہی کی کوششوں کا بہت دخل ہے ۔ بڑے ہم درد انسان دوست آدمی تھے ۔

انوار العلوم کالج

سالارجنگ لائبریری میں کام کے دوران ہی ایک دن مجھے علی اکبر صاحب نے بلا بھیجا جو اس وقت انوار العلوم کالج کے پرنسپل تھے اور مجھ سے کہا تم پارٹ ٹائم کے طور پر یہاں اردو کی کچھ کلاسس لے لیا کرو ۔ میں اس پر تیار ہوگیا پھر بعد میں جب یہ کام فل ٹائم ہوگیا تو مجھے سالارجنگ لائبریری کا کام چھوڑنا پڑا اور میں انوارالعلوم کالج میں اردو کا باقاعدہ لکچرر بن گیا ۔

ٹیوشن

اس کے ساتھ اسی زمانہ میں میں نے کچھ ٹیوشن بھی کیے ۔ دو تین بیرونی حضرات نے مجھ سے اردو فارسی پڑھنا چاہی ۔ ایک تو کوئی مختلف زبانوں کی Organization کا نوجوان ڈائرکٹر تھا ۔ وہ انجینئرنگ کالج کے پاس رہتا تھا ۔ ہفتے میں تین دن میں اسے اردو فارسی پڑھانے جاتا تھا ۔ اچھا معاوضہ ملتا تھا ۔

ایک اور کراشنی نکوف روسی پروفیسر تھا ، وہ اپنی فیملی کے ساتھ یہاں آیا ہوا تھا ، اس کے ساتھ ایک نوجوان انیسوف نامی بھی تھا ، وہ دونوں مجھ سے اردو پڑھتے تھے ۔ نوجوان بہت تیز تھا ، بےحد ذہین ، جلد ہی اپنا سبق یاد کرلیتا تھا تو پروفیسر کہتا تھا اس کا دماغ ابھی خالی ہے نا اس لیے جلدی یاد کرلیتا ہے ، ہمارے دماغ میں اور بھی بہت سی چیزیں رہتی ہیں ۔ ان لوگوں سے بہت دوستی ہوگئی تھی ۔ جاتے وقت انھوں نے ہماری زور دار دعوت بھی کی تھی اور ووڈ کا پلائی تھی ۔

ایک ٹیوشن میں نے ایک خاتون کو پڑھانے کا کیا ۔ وہ بھی روس سے آئی تھی ، بڑی پراسرار شخصیت تھی اس کی، تیس بتیس برس کی عمر ہوگی مگر سر کے پورے بال برف کی طرح سفید تھے جس کے بارے میں بےتکلفی ہونے پر بعد میں اس نے بتایا کہ جب دوسری جنگ کے زمانے میں ماسکو کا تخلیہ ہورہا تھا تو ہمارا خاندان ، میرے بوڑھے ماں باپ ، بھائی ، بہن سب دخانی کشتیوں میں جارہے تھے والگا کے راستے ۔ تو ایک روز شدید بمباری ہوئی ۔ ہمارے سامنے کئی جہاز اور کشتیاں سیکڑوں لوگوں کے ساتھ آنا فانا تباہ ہوگئیں ۔ ہماری کشتی جانے کیسے بچ گئی ۔ صبح ساحل پر پہنچے تو ماں نے مجھے بتایا کہ میرے سر کے سارے بال اس صدمے سے سفید ہوگئے تھے ۔ تو یہ خاتون لڈ میلا ماسکو یونیورسٹی میں تاریخ کی پروفیسر تھی اور یہاں کچھ ریسرچ کرنے آئی تھی اور صرف بول چال کی حد تک اردو جاننا چاہتی تھی ۔ اس کا ہمارے گھر بہت آنا جانا ہوگیا تھا ۔ ہمارے سب ہی گھر والوں سے اس کی دوستی ہوگئی تھی ۔ تقریباً روز ہی شام میں آجاتی تھی ، بڑی تگڑی خاتون تھی اور بےحد پڑھاکو بھی ، فنِ تعمیر سے بھی لگاؤ تھا ، یہاں کی پرانی عمارتوں ، مسجدوں ہر جگہ کی میں نے سیر کرائی ۔ اسے حیدرآباد بےحد پسند آیا ۔ دوبارہ آنے کی بےحد خواہش مند تھی ، ہم نے کہا کہ مسجد میں سیاہ پتھر کی جو بینچ ہے اس پر کوئی بیٹھے تو ضرور دوبارہ یہاں آتا ہے تو وہ خاص طور سے جاکر اس پر بیٹھی اور واقعی وہ دوبارہ یہاں آئی ، مختصر عرصے کے لیے سہی ۔ میں نے اسے بھی اردو پڑھائی ۔ حافظ کے دیوان سے اسے فال نکلوانے کا بھی بڑا شوق تھا اور اس پر یقین بھی کرتی تھی ۔ یہاں سے جاتے وقت اس نے میرا اور مخدوم کا انٹرویو بھی لیا تھا اور ایک کانگریسی ایم ۔ اے ۔ ہاشم صاحب کا بھی جو ماسکو کے روسی میگزین میں چھپے ۔ اس کی کاپیاں بھجوائی تھیں اس نے ، اور خط بھی لکھا تھا کہ آپ کا انٹرویو یہاں بہت پسند کیا گیا اور اس کا اتنا معاوضہ ہے جو آپ یہاں آئیں تب ہی مل سکتا ہے ۔ بھجوایا نہیں جاسکتا ۔

پھر تیسری بار وہ ہندستان آئی تو میں بمبئی میں تھا ، وہاں اس سے ملاقات ہوئی ۔ اس کے ساتھ ایک مسٹر غفوروف تاجکستان یونیورسٹی کے ایک مشہور اردو داں بھی آئے تھے تو کرشن چندر کے گھر ادیبوں کی محفل جمی ، کھانا بھی تھا ، میں اتفاق سے ان دنوں کچھ بیمار تھا ۔ اسے پتہ چلا تو بغیر کھانا کھائے مجھے دیکھنے آئی اور دیر تک بیٹھی باتیں کرتی رہی ۔ پھر کہا کھانا کھلواؤ بہت بھوک لگی ہے ۔ ذکیہ اور عادل بھی کہیں دعوت میں گئے ہوئے تھے ، گھر پر کوئی اور نہیں تھا ۔ سوچا کیسے اسے کھانا کھلاؤں ، شوکت کے گھر فون کیا کہ شاید شبانہ گھر پر ہو ۔ وہ اس زمانے میں طالبِ علم تھی ۔ وہ گھر پر تھی اسے صورتِ حال بتائی تو وہ جلد ہی کچھ بنوا کر لے آئی اس طرح کوئی

بارہ بجے رات کو ہم نے کھانا کھایا پھر وہ واپس اس محفل میں گئی ۔ یہ لڈمیلا سے آخری ملاقات تھی ۔ اس کے بعد اس کا کچھ پتہ نہ چلا حالاں کہ دو سال بعد ہی تاجکستان کے ایشیائی زبانوں کے ڈائرکٹر کوئی علی سوف نامی یہاں آئے ۔ میں ان سے ملنے گیا لڈمیلا کے بارے میں پوچھا انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا ۔ وہ اردو جانتے تھے انھوں نے بتایا کہ ہمارے ادارے سے مخدوم اور فیض کی شاعری کے ترجمے چھپ رہے ہیں ۔ اب میں یہاں خاص طور سے اس لیے آیا ہوں کہ کچھ افسانہ نگاروں کی تلاش کروں اور حیدرآباد کے تعلق سے میرے پاس دو نام ہیں ۔ ایک جیلانی بانو کا اور دوسرا اقبال متین کا ان سے ملوا دیجیے ۔ میں نے انھیں جیلانی بانو سے ملوا دیا ۔ اقبال متین اس زمانے میں یہاں نہیں تھے ۔ یہ دبی انیسوف تھے جنھوں نے کچھ دنوں مجھ سے فارسی پڑھی تھی ۔۔۔ تو یہ تین چار ہمارے روسی شاگرد تھے جو مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے ۔ یہ مختلف کام تو مجھے آمدنی کا ذریعہ تھے ۔ اصل کام جو میرا اس زمانے کا ہے وہ دراصل قطب شاہی دور کے فارسی ادب پر ہے ۔

ابوالکلام اورینٹل انسٹی ٹیوٹ

غالباً ۵۸ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کا انتقال ہوا ۔ اس کے بعد زور صاحب نے یہاں حیدرآباد میں ابوالکلام اورینٹل انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گورنمنٹ کی مدد سے اور ۱۵ فلوشپس کا اعلان کیا ۔ زور صاحب سے اس وقت تک ہمارے بہت گہرے روابط ہوگئے تھے ۔ میں ان کی بہت عزت کرتا تھا اور وہ مجھے بہت چاہتے تھے ۔ جب یہ انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا تو انھوں نے مجھے خاص طور پر بلا بھیجا اور کہا بلکہ ایک طرح سے حکم دیا کہ قطب شاہی دور کے فارسی ادب پر بالکل کام نہیں ہوا ہے اور اب تم کو کام کرنا ہے ۔ ہر ماہ دو سو روپے ملیں گے اور کچھ عام شرائط کہ مہینے میں ایک بار کام کی رپورٹ دینا ہوگی اور قاری کلیم اللہ صاحب کی نگرانی میں کام کرنا ہوگا ۔ یہ بڑی مصیبت تھی مگر خیر میں نے ان کی سب شرائط مان لیں اور کام شروع کردیا ۔ یہ میری دل چسپی کا کام تھا ۔

اس زمانے میں ڈاکٹر عبداللطیف صاحب نے ابوالکلام آزاد کے سورہ ء فاتحہ کے اپنے انگریزی ترجمہ کا اردو میں ترجمہ کا کام میرے سپرد کیا اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ طرزِ نگارش مولانا ابوالکلام کے طرزِ نگارش جیسا ہو ۔۔۔ یہ میرا ترجمہ " بنیادی تصوراتِ قرآن " کے نام سے چھپا کتابی صورت میں مگر اس کی نکاسی نہیں ہوئی اب تک اس کی کئی جلدیں میرے پاس پڑی ہیں ۔ البتہ " قطب شاہی دور کے فارسی ادب " پر میرا تحقیقی مقالہ آزاد انسٹی ٹیوٹ سے ہی چھپا اور اس کی ساری جلدیں ہاتھوں ہاتھ بک گئیں مگر دوسرا ایڈیشن چھاپنے کی طرف اب تک کسی نے توجہ نہیں کی ہے ۔

نئے احباب

تو ان مختلف کاموں کے ساتھ کچھ نئے دوست بھی بنے جیسے سعید بن محمد نقش سے اسی زمانے میں رابطہ پیدا ہوا ۔ اریب سے بھی زیادہ روابط اسی زمانے میں استوار ہوئے ۔ وہ " صبا " ماہ نامہ نکالتے تھے ۔ اس کا دفتر بیچلرس کوارٹر میں تھا ۔ معظم جاہی مارکٹ پر ۔ شام میں اکثر احباب وہاں جمع ہوجاتے جن میں اکثر میں بھی شامل رہتا اور اکثر میں اور اریب ساتھ ہی گھر لوٹتے ۔ میں ملے پلی میں رہتا تھا اور وہ تھوڑی دور آگے وجے نگر کالونی میں تو ہمارا حلقہ ء احباب کافی بڑھ گیا تھا اور بالعموم شامیں اچھی گزرتی تھیں ۔

رائٹرز کیمپ

اسی زمانہ میں ایک حسنِ اتفاق کیسے یہ ہوا کہ اچانک ایک دن کلچرل منسٹر دلی کی طرف سے ہمایوں کبیر کا خط ملا کہ " رائٹرز

" میں اردو کے نمائندے کی حیثیت سے آپ کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے ۔ یہ ہمایوں کبیر کی ایک Brain wave تھی کہ
میں منظورہ ہندستان کی جتنی زبانیں ہیں ان سب کے دو دو ادیبوں کو کسی ایک مقام پر یک جا کیا جائے کہ ان کے درمیان ایک
پیدا ہوسکے ۔ ایک دوسرے کے ادب سے واقف ہوں آپس میں تبادلہ ، خیالات کریں ۔ تو اس تعلق سے پہلی بار انھوں نے میسور
یری فالس کے قریب ہوٹل کرشنا میں ادیبوں کے کیمپ کا انتظام کیا تھا ۔ مجھے تعجب ہوا کہ اردو کے اور کئی بڑے ادیبوں کے
ہوتے مجھے کیوں چنا گیا ۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ ہمارے کرم فرما بیرسٹر اکبر علی خاں صاحب نے وہاں میرا نام تجویز کردیا تھا ۔ اردو
سرے ادیب آلِ احمد سرور چنے گئے تھے مگر اس زمانے میں وہ بیمار تھے اس لیے نہیں آسکے تو میں تنہا اردو ادب کے نمائندے کی
سے اس کیمپ میں شریک ہوا ـــ یہ پندرہ دن کا کیمپ تھا ۔ انتظام بہت اچھا تھا ۔ زیادہ تر کو ایک ایک علاحدہ کمرہ میں ٹھہرایا گیا
کچھ کمرے جو بڑے تھے ان میں دو دو کو ۔ میرا کمرہ بہت بڑا تھا مگر شروع میں میں ہی تنہا اس میں تھا ۔ بعد میں آندھرا کے ایک ۔
کے ادیب آگئے تھے ۔

پہلے دن ایک مشترکہ میٹنگ کر کے ہم نے متفقہ طور پر پندرہ دن کا پروگرام اس طرح بنالیا تھا کہ ہر روز دن میں ہر زبان کے
یا دو نمائندے مقالے پڑھیں گے ۔ اپنی زبان و ادب کے موضوع پر جس زبان میں وہ چاہیں ۔ زیادہ تر مقالے انگریزی میں پڑھے
ر شام میں صرف مل بیٹھ کر باتیں کریں گے کہ ایک دوسرے سے شناسائی بڑھے اور ان کے ادب سے جان کاری حاصل ہو ۔
رح صبح دس بجے سے اجلاس شروع ہوتا ۔ دو تین مقالے پڑھے جاتے ۔ ان پر کچھ سوالات ہوتے بحث ہوتی جو ایک بجے تک چلتی ۔
کے بعد لنچ ہوتا ۔ ہر کوئی اپنی پسند کا آرڈر دے سکتا تھا جو چاہے ۔ اس طرح پندرہ دن یہاں بہت اچھے گزرے ۔

ہمارے کیمپ میں ایک منوج واسو دیو بڑے دل چسپ آدمی تھے ۔ باتیں بہت اچھی کرتے تھے اور ایک تھے مہاراشٹرا کے
صاحب وہ بھی بڑے دل چسپ آدمی تھے بے حد پُر مذاق اور ایکٹنگ بھی بہت اچھی کرتے تھے اور ایک کشمیر سے آئے تھے میرے
اختر صاحب ۔ تو خوب ہماہمی رہتی تھی ۔ کئی لوگوں سے اچھی دوستی ہوگئی تھی ۔ کیمپ اور اس میں شریک ہونے والوں پر میں
یک مضمون بھی لکھا تھا جو سیاست میں شائع ہوا تھا ۔ میسور کیمپ سے واپسی پر میں بنگلور ہوتا ہوا آیا ۔ وہاں اس زمانہ میں ہمارے
پرانے دوست رحمان صاحب تھے ۔ بہت خاطر تواضع کی انھوں نے پھر بعد میں جب وہ دلی چلے گئے تو اردو کے تعلق سے کوئی انٹرویو
انھوں نے ۔ اس میں مجھے ہوائی جہاز کا کرایہ دے کر بلوایا تھا اور ہمارے اعزاز میں گھر پر بہت شان دار دعوت بھی کی تھی ۔

اہد صدیقی

میسور کیمپ سے حیدرآباد واپس آنے پر شاہد صدیقی کے انتقال کی افسوس ناک خبر سنی ۔ شاہد صدیقی سے ہمارا بہت یارانہ
لار جنگ لائبریری کے زمانہ سے ان کا ساتھ تھا ۔ ہماری شام کی بیٹھکوں میں وہ اکثر شریک رہتے تھے ۔ بہت پرمذاق لطیفہ سنج آدمی
ر شاعر بھی اچھے تھے ۔ عمر بھی زیادہ نہیں تھی ۔ بہت دکھ ہوا مجھے یہ خبر سن کر ـــ میں ان کی بیوی کو پرسہ دینے ان کے گھر
معلوم کرنے جگر صاحب کے پاس گیا تو انھوں نے یہ واقعہ سنایا کہ تمھارے جانے کے بعد ایک دن جمیل یوسف زئی آئے ۔
بی بیٹھے تھے انھوں نے کہا لاؤ تمھارا ہاتھ دیکھوں ۔ ہاتھ دیکھا اور زائچہ کھینچ کر ان کو تو کچھ اچھی باتیں بتادیں مگر شاہد کے جانے
عد مجھے بتایا کہ اس کی زندگی چند دن سے زیادہ نہیں ۔ اس کے چار پانچ روز بعد ہی یکایک حرکتِ قلب بند ہوجانے سے ان کا

(باقی ص ۴۴ پر)

اعجاز احمد

ترجمہ : اسامہ فاروقی

اردو کے تعلق سے چند افکار

شاذ و نادر کسی ادب اور اس کی تخلیق کے بلاواسطہ احوال کا ربطِ باہمی اتنا واضح رہا ہوگا جتنا کہ آزاد ہندستان میں اردو ادب کے معاملے میں ۔ ان احوال میں تقسیمِ ہند کے نتیجے میں من جملہ دیگر امور کے قلم کار طبقے اور ماحولِ نشر واشاعت اور نیز عام طبقہ ، قارئین کی مکمل تشکیلِ نو بھی شامل ہے ۔ وہ فرقہ وارانہ صورتِ حال بھی شامل ہے جس کے پس منظر میں تقسیمِ ہند سے قبل اور اس کے بعد بھی زبانِ اردو کی تاریخی ابتدا اور سماجی وجود کے بارے میں مباحث جاری رہے ہیں ۔ اردو زبان کے تعلق سے طرزِ عمل اور حکومت کی سرپرستی اور اس سماج میں جو بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ بن چکا ہے ایک زبان کی ترقی کے انجماد اور روزگار کی منڈی کا پیچیدہ ربطِ باہمی بھی شامل ہے ۔

یہ ایسے پیچیدہ امور ہیں جن کی ایک مختصر مضمون کی حدود میں مفصل صراحت ممکن نہیں ہے ۔ تاہم اس کا مطلب یہ ضرور ہے کہ رسمی جائزے کی شکل میں یعنی وقیع تحریروں کی طولانی فردِ حساب اور ان کی صنفی درجہ بندی کے ذریعے کوئی مفید بحث ممکن نہیں ہے ، خاص طور پر اس لیے کہ حصولِ آزادی کے بعد ہندستان میں کسی وقیع تحریر کا معرضِ وجود میں آنا ہمیشہ ایک استثنائی واقعہ رہا ہے ، ایک استثنا فتح اس صورتِ حال پر جو ایسی تحریروں کی تخلیق اور اشاعت میں بنیادی طو پر مزاحم ہے ۔ لہٰذا یہاں مخصوص تحریروں اور ان کے مصنفین کا ذکر محض بہ طورِ مثال کیا جائے گا ۔ اس کے بجائے میری یہ کوشش رہے گی کہ چند خیالات کو اس وسیع تر سیاق و سباق میں پیش کروں جس میں اردو زبان میں ادبی تخلیق روبہ عمل آرہی ہے ۔

تقسیمِ ہند کے نتیجے میں اردو قلم کار طبقے اور عام طبقہ ، قارئین کی مختلف بنیادی طریقوں سے تشکیلِ نو عمل میں آئی ۔ یہاں لائقِ توجہ پہلی بات یہ ہے کہ غیر منقسم ہندستان کے سبھی صوبوں اور ریاستوں میں ، جیسے کہ شمال میں یو ۔ پی اور بہار میں اور جنوب میں دکن کے علاقے ہیں جہاں اردو نے ایک اہم مقام بنالیا تھا ، اس کو یہ مقام بنیادی طور پر شہری مراکز میں حاصل ہوا تھا لیکن ہمیشہ دوسری زبانوں کی شراکت کے ساتھ ۔ اردو ہمیشہ ان علاقوں کی دوسری زبانوں ، ہندی ، پنجابی ، کشمیری وغیرہ کے دوش بہ دوش پروان چڑھی ۔ ان میں سے کوئی بھی علاقہ ایک زبان بولنے اور لکھنے والوں پر مشتمل نہیں تھا اور محض اس ہندستان میں بورژوا ریاست کے روز افزوں اہتمام کے ضمنی نتیجے کے طور پر ، جس نے خود کو سرمایہ دارانہ قومی ریاست کے یورپی یک لسانی نمونوں پر ڈھالنا اپنا مطمحِ نظر بنایا ہے ، جدید دانش ور طبقے کے فیصلہ کن گروہ اس خیال کے حامی بن گئے ہیں کہ بہ حیثیتِ مجموعی انڈین یونین کی ایک ، دیگر زبانوں پر فائق ، قومی زبان ہونی چاہیے ۔ یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ انڈین یونین کے اندر ہر ریاست کی ، دوسری زبانوں کی شرکت کے بغیر ، ایک زبان ہونی چاہیے ، جس سے دوسری زبانوں کا درجہ واضح طور پر فروتر ہو ۔

ایک صریحاً فرقہ پرستانہ خیال یہ بھی ہے کہ زبان کی شناخت کسی نہ کسی طرح مختلف مذہبی گروہوں کے حوالے سے ہونی

چاہیے ، مثلاً پنجابی کی سکھوں سے ، ہندی کی پنجاب اور ہریانہ کے ہندوؤں سے ، اردو کی بالعموم مسلمانوں سے ۔ متعدد دیگر خصوصیات کے ساتھ ساتھ اردو ہندی میں یہ بات بھی مشترک ہے کہ ہندی کی طرح یہ زبان نہ تو مخصوص صوبوں اور ریاستوں تک محدود تھی اور نہ ہی یہ کسی صوبے یا ریاست کی بلاشرکت غیرے واحد زبان اور نہ ہی اکثریتی زبان تھی ۔ ان علاقوں میں بھی جہاں اس کا ایک اہم مقام تھا ، اردو بولنے والی آبادی کے پھیلاؤ کے لحاظ سے بھی اور ادبی تخلیق کے لحاظ سے بھی ، اس کی ترقی میں یکسانیت کا فقدان تھا ۔ اس وجہ سے اس زبان پر تقسیمِ ہند کا اثر مختلف علاقوں میں یکساں نہیں رہا ۔ مثال کے طور پر پنجاب ہی کی صورتِ حال اس طریقِ عمل کی پیچیدگی پر عمدگی سے روشنی ڈالتی ہے ۔

نثر کی بنیادی کتاب " آبِ حیات " کے مصنف مولوی محمد حسین آزاد ، سرسید اور حالی جیسے افراد کا انیسویں صدی عیسوی کے اواخر کے اردو ادب میں نمایاں اور باثر مقام حاصل کرنا اور ان کا اردو میں مباحثۂ عمرانی کے لیے جدید نثر کے موجدین کی حیثیت سے منظرِ عام پر آنا اس بات کی علامت تھا کہ زبان میں بروئے کار آنے والی زبردست پیش رفت کا مرکزِ ثقل دلی اور اودھ کے دربار سے متعلق طبقوں سے ہٹ کر تیزی سے ظہور پذیر ہونے والے درمیانی طبقے کی طرف منتقل ہورہا تھا ۔ اسی عمل کے دوران یہ مرکزِ ثقل مزید مغرب کی جانب ان علاقوں کی طرف منتقل ہورہا تھا ۔ جنھیں آج کل ہم مغربی اتر پردیش ، ہریانہ اور پاکستانی پنجاب کہیں گے ۔

اس صدی کے آغاز میں " پیسہ اخبار " اور " زمین دار " جیسے اخباروں کا اجرا اور اردو صحافت میں (مولانا آزاد کے ساتھ ساتھ جو کلکتے سے اپنے اخبار شائع کررہے تھے) ظفر علی خاں کا ایک غیر معمولی شخصیت کی حیثیت سے ظہور پذیر ہونا پنجاب کے درمیانی طبقوں میں اردو کی متواتر توسیع کی ایک اور شہادت تھی ۔ یہ امرِ واقعہ کہ اس صدی کی اردو شاعری کی دو نہایت سربر آوردہ شخصیتیں اقبال اور فیض دونوں مغربی پنجاب کے شہر سیال کوٹ کے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے ۔ اردو ادبی تخلیق کے اجزائے ترکیبی کی ، علاقے اور سماجی طبقے کے حوالے سے اسی تشکیلِ نو کی ایک اور شہادت ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے ، کیوں کہ اردو ادبی تخلیق کے اس صدی کے دوران مسلسل وسیع تر ہوتے ہوئے حلقوں کی تشکیل ، پانی پت اور لدھیانہ سے لے کر جالندھر اور امرتسر تک نیز راول پنڈی اور سیال کوٹ سے لے کر لائل پور اور ملتان تک ، غیر منقسم پنجاب کے سبھی شہری مراکز میں عمل میں آئی ۔ دلی اور لاہور کی حیثیت ان عظیم مراکز کی تھی جہاں ان ادبی تخلیقات کو چھان پھٹک ، اصلاح و تالیف کے عمل سے گزار کر دیگر مقامات پر معرضِ وجود میں آنے والے اردو تخلیقات ، یہاں تک کہ علاقے اور بہ حیثیت مجموعی ملک میں معرضِ وجود میں آنے والی مماثل تخلیقات سے ان کے معنی خیز رشتوں کی نشان دہی کی جاتی تھی ۔

اس عمل کے دوران پنجاب کے ادبی دانش وروں میں دو متوازی رجحانات بہ روئے کار آئے ۔ ایک طرف تو یہ کم و بیش مستحکم لسانی گروہوں میں تقسیم ہوگئے ، جب کہ ہر قلم کار نے طے کرلیا کہ وہ مختص طور پر یا کم از کم بیش تر کسی ایک زبان میں لکھے گا ۔ دوسری طرف یہی قلم کار جنھوں نے اپنی ادبی تخلیقات میں ایک ہی زبان کو اپنا لیا تھا سماجی تعلقات میں یا تو پہلے کی طرح دو لسانی یا سہ لسانی ہی رہے یا پھر جلد ہی اس غرض سے ان دیگر زبانوں کو بھی برتنا سیکھ لیا ۔ مثال کے طور پر فیض اور امرتا پریتم مختلف زبانوں میں لکھتے تھے ، لیکن ایک ہی مشترکہ ادبی ثقافت کے پروردہ تھے ۔ نہ ہی قلم کار کی لسانی شناخت کسی فرقہ وارانہ حدِ فاصل کی نشان دہی کرتی تھی ۔

ترقی پسند ادیبوں میں راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کی طرح کے لوگوں کو غیر معمولی شہرت ملی ، اس لیے اکثر ان کا شمار مستثنیات میں کیا جاتا ہے ۔ لیکن ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے دہوں میں لاہور اور پنجاب کے دیگر مقامات سے شائع ہونے والے ادبی

رسالوں کا سرسری مطالعہ بھی ہندو اور سکھ فرقوں سے تعلق رکھنے والے درجنوں قلم کاروں کے ناموں کا انکشاف کرے گا ۔ ان قابلِ ذکر دہوں کے دوران اس قبیل کے ادیبوں کی تعداد میں کمی نہیں بلکہ قابلِ لحاظ اضافہ ہوا تھا جس سے بلا لحاظ مذہب و ملہ پنجاب کے شہری متوسط طبقے کے سبھی گروہوں میں اردو ادبی تخلیقی عمل کی مسلسل توسیع کی نشان دہی ہوتی ہے ۔ مسلمانوں میں بیش تر ان کے ملازمت پیشہ طبقوں میں اردو شہری رابطے کی عام طور پر مروج زبان تھی لیکن سکھوں اور ہندوؤں میں بھی مما طبقات اور گروہ تھے جن کے لیے اردو درسی نوشت و خواند اور ادبی تخلیق کا ذریعہ تھی ۔

اس آخری دور میں رفتہ رفتہ لاہور اردو نوشت و خواند اور اشاعت کا اہم ترین اور جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے ۔ سے زیادہ فعال مرکز بن چکا تھا ۔ اس شہر کے اپنے ، امتیازی حیثیت رکھنے والے " ادبِ لطیف " اور " ادبی دنیا " جیسے ادبی رسالہ مکتبہ ، جدید جیسے اشاعت گھر ، اورینٹل کالج جیسے تعلیمی ادارے نیز اس کے اپنے اخبار ، ادیبوں کے حلقے ، چائے خانے اور کافی ہاؤ وغیرہ تھے ۔ لاہور نہ صرف ہر طرح کے ادیبوں کی ایک بڑی تعداد کا مستقر تھا بلکہ مخصوص گروہوں اور رجحانات کا بھی ۔ مثال کے طور پر دیاں میرا جی ، ن ۔ م ۔ راشد ، قیوم نظر ، یوسف ظفر اور قدرے بعد میں مجید امجد جیسے نام نہاد جدید شاعر اور ادیب بھی تھے جنھوں نے ترقی پسندوں سے علاحدگی اختیار کرلی تھی اور جن کی ذہنی تشکیل کلیتہً لاہور میں ہوئی تھی ۔ بٹوارے کے بعد ہندستان کی اردو ثقافتی زندگی کے لیے سرزمینِ پنجاب کی تقسیم اور وہاں کی آبادی کی تشکیلِ نو بہ ذاتِ خود ایک نقصانِ عظیم تھا ۔

یہاں میں نے پنجاب کی صورت حال کا خلاصہ ، کافی اختصار کے ساتھ سہی ، نہ صرف اس کی علامتی نوعیت کے مد پیش کیا ہے بلکہ اس لیے بھی کہ اس پر گفتگو بھی شاذ و نادر ہی ہوتی ہے اور اس کو ٹھیک سے سمجھا بھی نہیں گیا ہے ۔ اپنے بھ اور سماج کے لیے اپنے نتائج کے اعتبار سے اتنی ہی دل دہلا دینے والی اتھل پتھل دوسرے مقامات پر بھی وقوع پذیر ہوئی ۔ ہمیں ا اتھل پتھل اور سماج کے لیے اس کے نتائج کی مفصل عمرانی تاریخ کی ضرورت ہے اور افسوس کی بات ہے کہ ثقافتی مطالعات ۔ اس پیچیدہ شعبے میں معقول روندادیں ابھی تک ہمیں میسر نہیں ہیں ۔ یہاں بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ تقسیمِ ہند کا نتیجہ اردو کاروں اور ان کے ساتھ عام قارئین کی ہندستان کے مختلف علاقوں سے پاکستان کو بڑے پیمانے پر ہجرت کی شکل میں برآمد ہوا ، جبکہ پاکستان سے ہندستان کو منتقل ہونے والے قلم کاروں کی تعداد نسبتاً کم تھی ۔ بہت سے رسالے اور اشاعت گھر جن کا مستقر دہلی ، لکھنو ، الہ آباد ، پٹنہ تھا قطعی طور پر ناپید ہوگئے ۔ ان میں سے بعض کا ، مثال کے طور " ساقی " کا ، کراچی میں احیاءِ نو میں آیا ، گو کہ ان کی سابقہ جڑوں اور خوبیوں کا یہاں فقدان تھا ۔

ادبی طبقوں کی اس شکست و ریخت کا عمل اس فرقہ وارانہ سیاق و سباق کی وجہ سے بےحد پیچیدہ ہوگیا تھا جس میں ار کے مقام کے بارے میں بحث کی جارہی تھی ۔ اس میں شک نہیں کہ شمالی ہند ، بالخصوص اتر پردیش میں انیسویں صدی عیسوی کے اواخر سے اردو ہندی مناقشے کی ساخت ہی فرقہ وارانہ مباحث کے اہتمام میں بنیادی طور سے ایک کلیدی میکانزم کی حیثیت رکھتی تھی اس باب میں سنہ ۱۹۴۷ ، ایک خطِ فاصل ثابت ہوا کیوں کہ اس اہم سال کی دو معنویت اس میں ہے کہ یہ نہ صرف مخالف نوآبادیاتی قوم پرستی بلکہ فرقہ پرستی کی فتح کا بھی سال تھا ۔ چناں چہ اپنے نتائج کے اعتبار سے یہ سال نئی نئی مقررہ سرحد کی دونو طرف یعنی پاکستان اور ہندستان دونوں ملکوں میں ظہور پذیر ہونے والی سیاست کو مزید فرقہ پرستانہ رنگ دینے کا باعث بنا ۔

جب ہم اس تاریخ اور ان واقعات کی تشکیلِ جدید کرتے ہیں تو ہم بیش تر قوم پرستی اور فرقہ پرستی کے ان دو رجحانات میں فرق کرتے ہیں ، انھیں کلیتہً جداگانہ اور بالکل متناقض ملتے ہیں ۔ ہم بیش تر فرقہ پرستی کو محض قیامِ پاکستان سے مربوط کرتے ہیں

گویا کہ ہندستانی قوم پرستی بہ ذاتِ خود کوئی منزہ اور مختلف مواقع پر ہندو اور مسلم دونوں طرح کی فرقہ پرستی سے کی ہوئی متعدد مصالحتوں اور جوڑ توڑ سے بے داغ شے تھی ۔ درحقیقت ہوا یہ تھا کہ مسلم فرقہ پرستی کے اہم رجحانات کے ، ہندستان کی مابعد نوآبادیاتی سرحدوں کے باہر ایک اقتدار اعلیٰ کی حامل ریاست کی شکل میں آئینی حیثیت اختیار کرلینے کے ساتھ اور ملک کی تقسیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے پایاں تلخیوں کی بنیاد پر ہندو فرقہ پرستی نے اپنے لیے ایک نیا قابلِ احترام مقام حاصل کرلیا تھا ۔ اس کے بہت سے اصول عام عقلِ سلیم کا ایک جزو بن گئے اور اس کے بعض نظریات کو مختلف پُراسرار شکلوں میں ہی کیوں نہ سہی ، رفتہ رفتہ آزاد خیال غیر مذہبی دانش ور طبقے کے مختلف گروہوں نے بھی اپنا لیا ۔

فرقہ پرستی کے اس بڑھتے ہوئے اثر کے نتائج اردو زبان کے لیے کافی دور رس تھے ۔ ملک کی آبادی کے صرف سات فی صد افراد کی زبانِ اول ہوتے ہوئے اردو پاکستان کی واحد قومی زبان قرار دے دی گئی ۔ اس وقت کے مشرقی پاکستان کے صدر مقام ڈھاکہ میں مظاہرین کے اس مطالبے پر کہ بنگالی کو بھی جو پاکستان کے پچاس فی صد سے زائد شہریوں کی زبان تھی برابری کا درجہ دیا جائے ،گولیاں چلیں اور کئی جانیں ضائع ہوئیں ۔ جیسے ہی میتیں دفنادی گئیں اور ہنگامہ فرو ہوا ، انگریزی کو حقیقی حکومت کی زبان کی حیثیت سے برقرار رکھتے ہوئے نوکر شاہی فوراً حرکت میں آئی اور اردو کو مفرس بنانے ممکنہ حد تک اسے اس کی فطری سادگی اور ہندی کے ساتھ مشترکہ ذخیرہ ، الفاظ سے محروم کرنے اور نیز اردو کو عام اور اندرونِ صوبہ رابطے کی زبان اور ابتدائی اور ثانوی تعلیم نیز نچلی سطح پر ہوئے نظم و نسق کی زبان کی حیثیت سے مروج کرنے کے لیے اس نے ضروری کارروائی کی ۔

اس امرِ واقعہ نے کہ پنجابی ، پشتو اور نہ ہی بلوچی کبھی بھی درس و تدریس اور نظم و نسق کی زبانیں رہی تھیں نیز اس امرِ واقعہ نے کہ اقتدار کے ایوانوں میں سندھیوں کو کوئی حقیقی نمائندگی حاصل نہیں تھی پاکستان میں جبریہ ثقافتی ہم رنگی اور یکسانیت کے حصول میں اردو کے رول کو آسان بنادیا ۔ اوپر سے تھوپی جانے والی ہم رنگی اور یکسانیت کے حصول کی اس کوشش کا منفی اور فطری نتیجہ یہ رہا ہے کہ پاکستان کی ہر لسانی قوم ، بالخصوص سندھیوں اور پنجابیوں میں خود اردو کے خلاف اب بڑے پیمانے پر ناراضگی کا احساس پایا جاتا ہے اور ملکی شناخت کا ادعا کرنے والی ہر تحریک کا لازمی مقصد ثقافتی اقتدار کی غیر مساوی تقسیم کو موقوف کرنا ہوتا ہے ۔

باوجود اس کے اس اثنا میں اردو جس حد تک پاکستان میں اندرونِ صوبہ رابطے کی زبان اور عوامی ذرائع ابلاغ کی زبان بن چکی ہے ہندستان میں ہندی کو وہ موقف نہیں حاصل ہوا ہے اور شاید ہو بھی نہیں سکتا ۔ دوسرے الفاظ میں اردو وہ زبان ہے جس میں نہ صرف تمام حرف شناس پاکستانی بلکہ وہ سب جو کسی حد تک شہری تجربہ رکھتے ہیں ایک دوسرے سے رابطہ قائم رکھتے ہیں ۔ مزید برآں پاکستان کے علمی اداروں میں علومِ عمرانی ، فلسفہ اور دوسرے تمام متعلقہ شعبہ ہائے تعلیم میں نئی تصانیف کو بڑھاوا دینے کی کافی کوششیں کی گئی ہیں جو بول چال ، خواندگی اور ادبی تخلیق کی زبانوں کی ترقی اور بار آوری کے لیے اشد ضروری ہیں اور جس کے بغیر ادبی تخلیق کا جمود لازمی ہوجاتا ہے ۔

ہندستان میں صورتِ حال اس کے بالکل برعکس رہی ہے ۔ تقسیم سے پہلے ہندستان میں اہم مقام کی حامل زبانوں میں اردو شاید وہ واحد زبان ہے جو (بمبئی کی فلمی صنعت کے بعض محدود شعبوں کو چھوڑ کر !) کسی واضح جغرافیائی علاقے کو اپنا نہیں کہہ سکتی ۔ پہلے کبھی ہندستانی ، اردو اور ہندی کو جوڑنے والے ایک رشتہ ، اتحاد اور پل کا کام دیتی تھی ۔ ہندستانی کے تعلیم اور نظم و نسق کی زبان کے رتبے سے ساقط ہوجانے ، سرکاری سرپرستی میں کام کرنے والے ذرائع ابلاغ میں اس کے کلیتہً نظر انداز کیے جانے اور ادبی ہندی کے تیزی سے سنسکرت آمیز ہوجانے کے لازمی نتیجے میں یہ پل منہدم ہوگیا ۔ یہ دو زبانیں اردو اور ہندی بڑی تیز رفتاری سے

دو ایسے ہی متناقض اضداد میں تبدیل ہوتی جارہی ہیں ، بلکہ فی الواقع تبدیل ہوچکی ہیں ، جیسا کہ ہمیشہ ہی سے فرقہ پرستوں اور لسانی بنیاد پرستوں کا ان زبانوں کے تعلق سے ادعا رہا ہے ۔ انسانوں کے درمیان روز مرہ کے رابطے کے شعبے میں اس صورتِ حال کی وجہ سے پیدا ہونے والے انتشار سے نبٹنا آسان نہیں ہے ۔

اپنی سبھی جنم بھومیوں میں ہندستانی ، عوامی بول چال کی زبان رہی ہے اور چوں کہ ہندستان میں اردو حتی الامکان فارسی آمیز نہیں ہوئی ہے اور اپنی ہندستانی جڑوں سے نسبتاً قریب رہی ہے ، ہندی کے ادیبوں کے لیے (یہ نہ بھولیں کہ ہندی ابھی تک ایک کتابی زبان ہے) محض روز مرہ کی زبان کی بنیاد پر اردو بولنے والے کو سمجھنا بالکل ممکن ہے لیکن ایک اردو ادیب شدھ ہندی صرف اسی حالت میں سمجھ سکتا ہے اگر اس نے ضروری کتابی علم حاصل کیا ہو ۔ دیسی زبانوں کے ادب کے مشترک ذخیرے اور زبانی روایات کے لیے ، جن کے بغیر ادبی تخلیق کی اعلیٰ و ارفع اصناف پر ہمیشہ گوشہ نشینی اور رہبانیت کا رنگ چڑھ جاتا ہے ، ان بڑھتے ہوئے فاصلوں کے طویل مدتی نتائج و عواقب کافی تشویش ناک ہیں ۔

متضاد دباؤ کے ردِ عمل کے طور پر حکومت نے ایک دو دھاری حکمتِ عملی اختیار کی ہے ۔ اردو بولنے شہری متوسط طبقے کے ان گروہوں کی تشفی کے لیے جو پیشہ ورانہ حیثیت سے اردو ادب کی نشرو اشاعت میں دل چسپی رکھتے ہیں ہر طرح کے سرکاری مالی ذرائع سے چلنے والے ادارے اور عطیات کے نظام قائم کیے گئے نیز مختلف انعامات کا انتظام کیا گیا تاکہ اس طرح ان کی ادبی تخلیقات کی اشاعت ہوسکے ، مالی وسائل کی تقسیم عمل میں آئے اور مستحق افراد کو اعزاز مل سکے ۔ دوسری طرف ، کہیں زیادہ اہمیت کا حامل یہ امر واقعہ ہے کہ اب اردو یہاں نہ ہی درس و تدریس کی اور نہ ہی نظم و نسق یا ذرائع ابلاغ کی زبان ہے ۔ اس کی بجائے اسے اب خاندان کے خانگی شعبے میں ڈھکیل دیا گیا ہے یا پھر ادبی تخلیق کے حد درجہ محدود سرکاری شعبے میں تھوڑی سی جگہ دی گئی ہے ۔

بنیادی طور سے شہری متوسط طبقے کے ماحول میں جب کہ فرد کے سماجی اور تہذیبی وجود کے تعین میں اسکول اور کام کی جگہ کی اہمیت میں اضافے کے ساتھ سماجی اور تہذیبی کارکنوں کی تشکیل میں خاندان کا رول خود روبہ تنزل ہے بڑی حد تک صرف خاندان اور قریب ترین ادبی حلقے پر مبنی ادبی تخلیق کا غیر ترقی پذیر ہوکر رہ جانا اور ماحول سے دن بہ دن غیر متعلق ہوجانا ناگزیر ہے ۔

اس صورتِ حال نے اردو بولنے والے گھرانے کے لوگوں کو ایک ناقابلِ برداشت ، تہذیبی شیز و فرینیا ، بد دلی ، مغالطے ، ذہنی اور جذباتی انحطاط کی صورتِ حال سے دوچار کردیا ہے ۔ اپنی پشت در پشت تہذیبی بقا کے لیے اس خاندان کے بزرگ شدت سے خواہش کرتے ہیں کہ ان کے بچے اردو سیکھیں ۔ لیکن تعلیم اور تلاشِ روزگار کی حد درجہ زیادہ مسابقتی دنیا میں اردو سے واقفیت اتنی بے مصرف ہوگئی ہے کہ بچے کے پاس اسے سیکھنے کا کوئی محرک ہی نہیں رہ گیا ہے ۔ بچے کے لیے صورتِ حال غالب ثقافت کے دباؤ کی وجہ سے مزید سنگین ہوگئی ہے جس میں اردو سیکھنا نام نہاد ہندستانی مکھیہ دھارا یعنی ہندستانی تشخص کی مخصوص برہمنی ، سنسکرت زدہ ، بیش تر فرقہ پرستی کے رنگ میں رنگی ہوئی روایت سے انحراف کی کوشش کے مماثل سمجھا جاتاہے ۔ اس ماحول میں کسی بچے کی اردو سیکھنے کی خواہش بالفعل اپنی صرف انگشت نمائی کی دعوت دینے اور دوسروں سے خود کو الگ تھلگ کرلینے کے برابر ہے ۔

مابعد تقسیم ، ہندستان میں اردو کا بدترین المیہ یہ رہا ہے کہ فرقہ پرستوں کے اذہان میں تو بلاشک و شبہ لیکن بے تعصب افراد کی اکثریت کے اذہان میں بھی اندر ہی اندر یہ زبان تقریباً کلیتہً مسلم فرقہ ورانہ مفاد سے جوڑ دی گئی ہے ۔ یہ صورتِ حال مسلم فرقہ پرست کے لیے بھی بہت باعثِ سہولت ہے کیوں کہ اس صورت میں وہ اردو کے مسئلے کا سرکاری اداروں سے سودے بازی کے لیے اور خود کو " مسلمانوں " کے رہ نما کی حیثیت سے منوانے کے لیے اپنے سیاسی پیش نامے کے ایک اشتعال انگیز جزو کی

حیثیت سے استحصال کرسکتا ہے ۔

اردو کو کلیتہً مسلمانوں کے ساتھ جوڑ دیے جانے کا یہ عمل ہندو فرقہ پرستی کے فریقِ دیگر کو آسیب اور بھوت پریت کا درجہ دینے کے رجحان کے لیے بھی اتنا ہی سہولت بخش ہے ۔ ہندو فرقہ پرستی کے صریحاً متعصبانہ نظریات سے لامحالہ سبھی واقف ہیں ۔ لیکن یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ بڑی حد تک فرقہ پرستانہ رنگ لیے ہوئے مباحث کی حدود میں غیر متعصبانہ نظریہ بھی یہی ہے کہ اردو کو " تحفظ " کی اتنی شدید ضرورت اس لیے ہے کہ خود دستورِ ہند اور ہندستانی لا مذہبیت کا تقاضا ہے کہ ہر مذہبی اقلیت کے حقوق کی حفاظت کی جانی چاہیے اور بہ ہر حال اردو مسلم اقلیت کی مخصوص زبان ہے اور چناں چہ اگر اردو کے سماجی اور سرکاری موقف کے مسئلے پر بالفرضِ محال اگر غور کیا بھی جاتے تو وہ مسلم اقلیت کے حقوق کے مسئلے کی حیثیت سے کیا جاتا ہے ۔

بہ حیثیتِ مجموعی کریم النفس اور بے تعصب اندازِ خیال کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ اپنی لا مذہبی پارسائی کے جوش میں اس اندازِ خیال کے حامل ، اردو کی حقیقی تاریخ کو نظر انداز کردیتے ہیں ۔ اس وجہ سے مسلم فرقہ وارانہ مفاد سے عظیم تر وہ شئے جو درحقیقت یہاں جوکھوں میں ہے ان کی گرفت میں نہیں آتی ۔ کیوں کہ بات یہ ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہ کبھی تھی اور نہ اب ہے ۔ طبقے ، ذات ، علاقے ، پیشے ، شہری ، دیہاتی تفریق جیسے مختلف ، پیچیدہ اور پُر اسرار حقائق ، یہاں تک کہ شہروں کے اندر آبادی کی محلوں اور بستیوں میں تقسیم ، جو کسی بھی دوسری ہندستانی زبان کی تشکیل کے عوامل رہے ہیں ، اردو کی تشکیل میں بھی بہ روے کار ہے ہیں ۔ یو ۔ پی کا کسان ، چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان ، اپنے گاؤں کی زبان بولتا تھا اور وہ زبان جدید شہری روز مرہ میں ہندی اور اردو کہلانے والی زبان نہ کبھی تھی اور نہ اب ہے ۔

طبقہ واری تفریق کے دوسرے سرے پر اودھ کے تعلق دار ، چاہے مسلمان ہوں کہ ہندو ، کسانوں کی بولی کے نام نہاد بازاری پن سے یکساں طور پر کراہت محسوس کرتے تھے اور شاید معدودے چند الفاظ کے فرق کے ساتھ ایک بالکل یکساں زبان بولتے تھے جو ان کے لیے مخصوص تھی ۔ کشمیری برہمنوں یا یو ۔ پی کے کائستھوں کی طرح مخصوص ذاتوں کے پورے علاقائی گروہ ہیں جن کی تہذیبی تاریخ میں اردو کا ایک اہم اور مخصوص مقام ہے ۔ چناں چہ جب ہم شمالی ہندستان میں ہندوؤں اور سکھوں کی سماجی زندگی میں اردو کے تاریخی مقام کی بات کرتے ہیں تو یہ نہ صرف افراد کی بلکہ پورے علاقوں ، ذاتوں اور پورے ماحول کی بات ہوتی ہے اور یہ محض اتفاق یا انفرادی بوالعجبی کے باعث نہیں اور نہ ہی نام نہاد " مسلم تہذیب " میں شمولیت کی علامت کے طور پر بلکہ برادریوں کے مذکورہ ، صدر بڑے اور پائدار گروہوں کی یہ دولت ہے کہ ماضی اور نیز حال کے اردو ادب کی تاریخ میں لاتعداد ہندو اور سکھ نژاد افراد کو ممتاز مقام حاصل رہا ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ اردو کی مطبوعہ کتابوں کا پہلا عظیم محافظ خانہ پنڈت نول کشور نے اکٹھا کیا تھا ۔ اردو کا پہلا عظیم ناول پنڈت رتن ناتھ سرشار نے لکھا تھا اور یہی وجہ ہے کہ گذشتہ نصف صدی کا شاید (بلکہ میری شخصی راے میں یقیناً) بہترین غزل گو شاعر فراق گورکھ پوری ہے اور اردو میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک کا کوئی بھی تذکرہ ، اس میں کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کے ممتاز مقام کے اعتراف کے بغیر ممکن نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ گذشتہ چوتھائی صدی کے اردو افسانے پر بلونت سنگھ ، سریندر پرکاش ، بلراج مینرا ، جوگیندر پال اور ظفر پیامی مساویانہ بلکہ شاید دوسروں سے کچھ زیادہ ہی چھائے ہوئے ہیں ۔ ماضی اور حال کے ان قلم کاروں کو کسی بھی معنی خیز مفہوم میں " ہندو " قلم کار قرار دینا اتنا ہی نامناسب ہوگا جتنا کہ فیض یا منٹو کو " مسلم " قلم کار گرداننا ۔ زمانہ ، گذشتہ و حال کے ان ادیبوں اور شاعروں کو محض اردو ادیب اور شاعر سمجھنا چاہیے جو جداگانہ ہندو ، مسلم اور سکھ گھرانوں میں پیدا ہوئے ۔

اور میں اس امر سے بہ خوبی آگاہ ہوں کہ اس مختصر فہرست کو مرتب کرتے ہوئے ، ان طریقوں سے جو شخصی طور پر ۔
ناگوار ہیں ، میں اس فرقہ پرستانہ دباؤ سے متاثر ہوا ہوں جو غیر مذہبیت کے خلاف ہے ۔ تشخص کی بات صرف مذہب کی بنیاد یا مذہب
سے تعلق کی اصطلاح میں کرتا ہے ۔ اردو کو خصوصیت سے مسلمانوں کے فرقہ وارانہ مفاد سے جوڑتا ہے اور ہم کو ان کے ناموں
صراحت کرنے پر مجبور کرتا ہے جنھوں نے کبھی بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ان کے گھرانوں کے مذہبی تعلق کا کسی خاص زبان کے
استعمال سے کوئی بھی سروکار ہوسکتا ہے ۔

باوجود اس کے یہ بات مسلمہ ہے کہ اردو شمالی ہند کے متعدد علاقوں اور فرقوں پر محیط ایک بہت وسیع تہذیبی مجموعے
ایک جزو رہی ہے ، اب بھی ہے اور اگر اسے جمود سے بچنا اور بالکل معدوم نہیں ہونا ہے تو اسے اس حیثیت سے برقرار بھی رہ
ہوگا ۔ یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ اردو کو مسلم مفاد سے جوڑنے کا موجودہ ، تقریباً عالم گیر رجحان ، خواہ اس کی وکالت کینہ پرور
پرستانہ نقطہ ، نظر سے کی جاتی ہو یا روشن خیال بے تعصبانہ نقطہ ، نظر سے ، نہ صرف اس زبان کو بلکہ اس تہذیب کو بھی نقصا
پہنچاتا ہے جس میں یہ زبان ناقابلِ تنسیخ طور پر بہ شمول دیگر ایک ذریعہ ، اظہار رہی ہے ۔

اس اثنا میں اس امر واقعہ کا کہ اردو کا درس و تدریس ، پیشہ ورانہ تربیت ، نظم و نسق کے وسیع تر عمل میں اور شہر
پیشوں کی تنظیم میں کوئی اہم رول باقی نہیں رہا مطلب یہ ہے کہ گھرانے کے لوگوں اور دوستوں کے درمیان رابطے کے کام آنے کے
علاوہ یہ تقریباً کلیتہً ایک ادبی زبان بن کر رہ گئی ہے جس کا تصور ہی غور و فکر اور تاریخ ، فلسفہ جیسے علوم اور عمرانی علوم سے (طب
علوم تو دور کی بات ہے) تعلق تقریباً بالکل ختم ہوچکا ہے ۔ اردو بولنے والے دانش ور جو اردو میں لکھتے ہیں پھر بھی دنیا کے بارے
میں معلومات کسی دوسری زبان ، بیش تر انگریزی ، کے ذریعے حاصل کرتے ہیں اور شاذ و نادر ہی ان معلومات کو اردو میں منتق
کرتے ہیں اور اگر کرتے بھی ہیں تو نہایت شاعرانہ اور افسانوی رنگ میں ۔ ادبی تحریروں کے سوا باقی تمام اغراض کے لیے یہ دانش
ور انگریزی سے کام چلاتے ہیں ۔

اس صورتِ حال کے بھی اپنے نتائج رہے ہیں ۔ یعنی یہ کہ انگریزی کی استعداد نہ رکھنے والے اردو قلم کاروں کی اکثریت کو لاز
طور سے خیالات اور الفاظ کے افسوس ناک حد تک محدود ذخیرے سے کام چلانا پڑتا ہے اس لیے کہ وہ ادب کی نہایت محدود قلم رو کے
اندر ہی کام کرتے ہیں ، ادب بھی وہ جو غور و فکر کے وسیع تر سرچشموں سے بڑی حد تک کٹ کر رہ گیا ہے ۔ اس سے بھی خراب بات
ہے کہ اس ادب کو جو تاریخ ، علومِ عمرانی وغیرہ جیسے متعلقہ علوم سے اور عمرانی باز تخلیق کی جدوجہد اور عمل سے اتنا دور ہوچکا ہو ایک
طرف روبہ تنزل ہوکر نہایت فرسودہ قسم کی جمالیات اور دوسری طرف محض ایک ذریعہ ، تفریح میں متبدل ہونے کا خطرہ درپیش رہتا ہے ۔

عہدِ حاضر کی صنعتِ تفریح میں غزل سرائی کی نسبتاً زوال پذیر انواع کے موجودہ فروغ اور تشویش ناک مقبولیت کا فنی انحـ
اور سماجی نتائج و عواقب کے حوالے سے لکھنو کے تہذیبی انحطاط کے دور میں لکھے جانے والے گھٹیا غزلوں کے بےشمار دفتروں ۔
مقابلہ کیا جاسکتا ہے ۔ کیوں کہ صنعتِ تفریح کا یہ غیر معمولی انحطاط محض اس امر واقعہ کا بہ یک وقت اصل سے بڑا اور مسخ
عکس ہے کہ عہدِ حاضر کے ہندستان میں سماجی باز تخلیق کے اہم ترین عمل سے اردو کی علاحدگی خود اردو ادب کے تانے بانے
انحطاط کے عناصر کے استحکام کا باعث ہوئی ہے ۔ ان دنوں کسی بھی مثالی اردو رسالے میں شائع شدہ مثالی نظم میں اس صورتِ
کا عکس بہ آسانی دیکھا جاسکتا ہے ۔

آزادی کے بعد کے ہندستان میں اردو ادبی تخلیق کے سماجی وسیاسی سیاق و سباق کے تعین میں ملک کی تقسیم کو نہ صر

ایک مرکزی اور فیصلہ کن واقعے کی حیثیت حاصل ہے ۔ اس ادب میں ، خاص طور سے آزادی کے بعد کے کم و بیش پہلے دہے کے دوران ، اسے ایک اہم موضوع کی حیثیت بھی حاصل ہے ۔ تقسیم کی موضوعی برتری پاکستان میں اردو تحریروں کے پورے سلسلے میں خاص طور سے نمایاں ہے ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فی الواقع اس پیڑھی کا ادیب خواہ وہ ملکی ہو یا مہاجر اس تجربے کا گہرا صدمہ برداشت کرچکا تھا اور ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انفرادی اور اجتماعی تشخص کے ان مسائل کی نوعیت ، جو تقسیم نے پاکستانی ادیب کے سامنے رکھے تھے بالکل جداگانہ نوعیت کے تھے ۔

ہندستانی برقرار رہنے کا مطلب تھا تقسیم وطن سے قدیم ترکسی شے سے رشتہ برقرار رکھنا ، کسی اس شے سے جو زیادہ مخلوط و بوقلموں ، پائدار اور شناخت پذیر تھی ۔ راتوں رات پاکستانی بن جانا ، سماجی اور نیز نفسیاتی تجربے کی حیثیت سے ، ایک بالکل انوکھی بات تھی ۔ نسبتاً غیر واضح اور ناپائدار ، جس سے اپنی ذات اور سماج کے بارے میں ایسے سوال جڑے ہوئے تھے جن کو ماضی میں تقسیم ہی سے منسوب کیا جاسکتا تھا ، اس کے قبل کے کسی واقعے سے نہیں ۔ ہندستان میں ایک اردو ادیب ہونے کا ذہنی کرب اور اسی طرح پاکستان میں ایک اردو ادیب ہونے کی ثقافتی خود اعتمادی رفتہ رفتہ ہی پیدا ہوئی اور پروان چڑھی ۔

ہندستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں افسانے نے تقسیمِ وطن کی فی الواقعی سرگذشت کا کام دیا (افسانہ بہ ہرحال جدید اردو ادب کی سب سے زیادہ جان دار صنف رہا ہے) ۔ تاہم اس موضوع پر متعدد ناول بھی لکھے گئے ۔ ان میں سے اولین تصانیف مثلاً راماتند ساگر کا ناول " اور انسان مرگیا " اور کرشن چندر کا ناول " غدار " کسی قدر فطرت پسندانہ انداز میں لکھی ہوئی اس مصیبت کی کم و بیش ناتراشیدہ داستانیں تھیں ، جن کا مقصد بہیمانہ حقائق اور ان کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار کی شکست و ریخت کی یاد کو تازہ رکھنا تھا ۔

قدرے بعد میں منظرِ عام پر آنے والے ناولوں کا میلان زیادہ مفکرانہ تھا ، جن میں بعض وسیع تر ثقافتی ، سماجی یا سیاسی مسائل کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی تھی ۔ اس طرح کے ناولوں میں بہ درجہ ہا تاثیر انگیز قرۃ العین حیدر کا " آگ کا دریا " تھا ۔ یہ رومانی طرز کی نیم تاریخی داستان ہے جس میں تقسیم پر منتج ہونے والی ہندستان کی زمانہ ، ماقبل تاریخ سے چلی آرہی گنگا جمنی تہذیب کی کہانی بیان کی گئی ہے اور مسلم مہاجر ، خصوصاً خوش حال طبقے کی منقسم وفاداریوں سے پیدا ہونے والی بیزاری (ennui) کی تصویر کھینچی گئی ہے ۔ حیات اللہ انصاری کا " لہو کے پھول " گو کہ اس کا کینوس نسبتاً محدود ہے اور نہ ہی اسے اتنی شہرت نصیب ہوئی ، بنیادی طور پر انھیں ناولوں کے زمرے میں شامل ہے ، جن میں تقسیمِ ہند کا احاطہ کرنے والی کسی وسیع تر ہیئت کو (اس ناول میں خود تحریکِ آزادی کو) نیم رومانی ، نیم فطرت پسندانہ نثر میں بیان کیا گیا ہے ۔

نسبتاً حالیہ ، ظفر پیامی کا ناول " فرار " (سنہ اشاعت ۱۹۸۶ ء) اس ذیلی صنفِ ادب سے انحراف بھی ہے اور اس کا اختتام بھی اس پر ہوتا ہے ، اس مفہوم میں کہ اس میں ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۷۱ء تک کی مدت کا یعنی تقسیمِ ہند سے لے کر بنگلہ دیش کے معرضِ وجود میں آنے تک کی مدت کا احاطہ کیا گیا ہے ۔ اس میں تقسیم پر منتج ہونے والے واقعات کو نہیں بلکہ تقسیم کے نتیجے میں پیش آنے والے واقعات کو بیان کیا گیا ہے ، جن کی جڑیں تو تقسیمِ ہند کی اساسی منطق میں پیوست تھیں لیکن جو بالآخر اس منطق سے کافی متجاوز ہوگئے ۔ سارے بیانیہ میں مضمر شعور کی تشکیل تقسیمِ ہند سے ہوئی ہے ، لیکن صرف شعور کی ۔ کردار کی قسمت کے فی الواقع بننے اور بگڑنے میں زیادہ تر برِ صغیر کے بعد نوآبادیاتی حقائق کو دخل ہے ۔

تو یہ ناول اس امر کا اشارہ تھا کہ اردو میں " بٹوارے کا ادب " اپنی خالص صنفی شکل میں ، مرورِ زمانہ کی بہ دولت اپنی مسافت طے کرچکا ہے ۔ مستقبل میں کسی بھی داستان کو جس کا نقطہ ، آغاز تقسیمِ ہند ہو لازمی طور پر ان بہت سے واقعات کا احاطہ

کرنا ہوگا جو بٹوارے کے بعد نہ صرف افراد کی زندگی میں بلکہ سارے برِ صغیر پر اثر انداز ہونے والے اجتماعی زندگی کے نازک موقعوں پر وقوع پذیر ہوتے ۔

بٹوارے کے بعد کے کم و بیش پہلے دہے کے دوران مختلف اردو ادیبوں کی خصوصیت سے بہ حیثیت ہندستانی یا پاکستانی ادیب درجہ بندی مشکل تھی ۔ ایک حد تک اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی اکثریت نے اپنا مقام تقسیمِ ہند سے قبل بنالیا تھا اور اسے محض نئی علاقائی تقسیم کے مطابق اتنی آسانی سے الگ الگ خانوں میں باٹنا نہیں جاسکتا تھا ۔ اس کے علاوہ نئی قائم شدہ سرحدوں کے دونوں طرف ادبی رسالے علاقائی سرحدوں کا لحاظ کیے بغیر مصنفین کی تخلیقات اسی طرح چھاپتے رہے جیسے پہلے چھاپتے آتے تھے ۔ اس طرح سے انھوں نے کم از کم بہ ظاہر گنگا جمنی تہذیب کو زندہ اور اس سماجی ادبی رشتے کو قائم رکھا جو ویسے تو ٹوٹ ہی چکا تھا ۔

میرے خیال میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بٹوارے کی وجہ سے پیدا ہونے والی تلخیوں اور سرحد کے دونوں طرف سرکاری اداروں کی طرف سے عائد کی گئی بندشوں کے باوجود اردو رسالے اور اس سے کم تر درجے میں اردو اشاعت گھر کی حیثیت ہندستان اور اب جس کو ہم پاکستان کے نام سے جانتے ہیں (یعنی اس وقت کے مغربی پاکستان) کے دانش وروں کے کم و بیش بڑے گروہوں کے درمیان بچے کچھے شاید واحد استوار ثقافتی رشتے اور یقیناً مضبوط ترین ادبی رشتے کی تھی ۔ سرحد کے دونوں طرف سندھی اور پنجابی میں لکھنے والے دانش وروں اور ان زبانوں کے قارئین کے درمیان کسی مماثل باہم دگر تبادلے اور لین دین کا عمل بہت بعد میں شروع ہوا اور ایک عرصے تک بہت محدود رہا ۔

بٹوارے کے فوری بعد کے برسوں سے تقریباً سنہ ۱۹۶۵ء کی جنگ تک اردو ادبی رسالے کی شکل میں اس ثقافتی رشتے کو استحکام اگر حاصل تھا تو ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے ۔ اس تحریک کے اثرات سے اور اس کے پیدا کیے ہوئے ادبی ذوق اور اس کی قائم کی ہوئی روایتوں کی پائداری سے اور ساتھ ہی ساتھ بٹوارے سے پہلے اور بعد اس تحریک سے منسلک مصنفین کی تخلیقی صلاحیتوں ، اثر اور نام وری سے ۔

بٹوارے سے قبل کے کم و بیش دس سال کے عرصے کے دوران انجمن ترقی پسند مصنفین کا جوش اتنا زیادہ تھا ، حصولِ آزادی کے عین قبل مخالف نوآبادیاتی تحریک اور کمیونسٹ تحریک ، دونوں سے اس نے اتنا کسبِ فیض کیا تھا اور پھر یہ تحریک بہ حیثیت تحریک آزادی کے بعد اتنی سرعت کے ساتھ زوال پذیر ہوگئی کہ ہم اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ اہم ترقی پسند مصنفین کی بیش تر بہترین تحریریں ، کم از کم اردو میں ، آزادی کے بعد ہی معرضِ وجود میں آئیں ۔ یہ تحریریں ٹھیک اسی عرصے میں معرضِ وجود میں آئیں جب اردو ادب میں ترقی پسند تحریک زوال سے دوچار ہوئی اور بالفعل مفقود ہوگئی ۔

۱۹۴۷ء میں فیض دراصل ایک معمولی درجے کے شاعر تھے ، جن کی شہرت صرف " نقشِ فریادی " یا بہ الفاظِ دیگر محض معدودے چند اہم نظموں پر قائم تھی ۔ ان کی بہترین تخلیقات جو " دستِ صبا " اور " زندان نامہ " میں شامل ہیں بعد میں ، بٹوارے اور ۱۹۶۵ء کی جنگ کے درمیان ، معرضِ وجود میں آئیں اور وہ جیسا کہ سب جانتے ہیں ، اپنی زندگی کے آخری دنوں تک اہمیت کا حامل کلام لکھتے اور شائع کرواتے رہے ۔ اسی طرح راجندر سنگھ بیدی نے بھی ، جو تقسیم کے پہلے ہی ایک قارئین کے پسندیدہ نوعمر ادیب تھے ، اپنی اہم ترین تصنیفات آگے چل کر لکھیں ، جن میں سے بہترین تخلیقات مثلاً مختصر ناول " ایک چادر میلی سی " اور " اپنے دکھ مجھے دے دو " کی کہانیاں سال با سال بعد معرضِ وجود میں آئیں ۔ یہاں تک کہ منٹو بھی ، جو فیض یا بیدی دونوں سے ۱۹۴۷ء میں زیادہ مشہور تھے ، آخر کار انھیں شہرت اور بدنامی دونوں دلانے والی " بو " اور " ٹھنڈا گوشت " جیسی بٹوارے سے پہلے

لکھی گئی کہانیوں کی وجہ سے نہیں بلکہ بٹوارے کے بعد فی الحقیقت اس کے ردِ عمل کے طور پر اور اس کی مخالفت میں تحریر شدہ " ٹوبا ٹیک سنگھ " جیسی کہانیوں کے پورے سلسلے کی وجہ سے یاد رکھے جائیں گے ۔

گذشتہ دو دہوں کے دوران ہندستان میں اردو شاعری کی دو نہایت سربر آوردہ ہستیاں علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی کا مقام ۱۹۴۷ء میں ایسا نہیں تھا کہ اسے بہ ہرحال یادرکھا جاتے ۔ ان میں ، بالخصوص کیفی میں ، پختگی بہت بعد میں آئی ۔ اس فہرست میں خاصا اضافہ کیا جاسکتا ہے ۔ یہ بات البتہ اپنی جگہ پر ہے کہ بلالحاظ اس امر کے کہ کسی مخصوص ادیب کی سکونت اتفاقیہ طور پر دونوں میں سے کسی ملک میں تھی ، بہ حیثیت مجموعی ترقی پسند مصنفین بٹوارے کے بعد کم و بیش دس سال تک ہندستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے اردو ادبی رسالوں میں نمایاں طور پر شائع ہوتے رہے ، درآں حالے کہ رسالوں کے درمیان اختلاف کی بنیاد علاقائی سے زیادہ نظریاتی تھی ۔

لیکن پھر متعدد دوسرے واقعات بھی پیش آنے لگے ۔ ایک بڑی عجیب بات یہ تھی کہ درآں حالے کہ انفرادی حیثیت سے بہت سے ترقی پسند ادیبوں کی نام وری برقرار رہی اور بہت سی صورتوں میں اس میں اضافہ بھی ہوا ، ترقی پسند تحریک بہ ذاتِ خود کم زور ہوگئی اور کافی نمایاں طور پر سرعت کے ساتھ زوال پذیر ہوگئی ۔ واقعی ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ اس کے پاس بہ مشکل کوئی اپنا واضح نقطہ ، نظر یا پیش نامہ رہ گیا تھا اور شاید ہی اس کے کوئی اپنے رسالے رہے ہوں ۔ وہ کم و بیش رہ نمایانہ حیثیت جو ۱۹۳۰ء کے دہے کے اواخر سے بیش تر اردو ادبی تخلیقات کے نظریاتی رویے کے تعلق سے اسے حاصل تھی رفتہ رفتہ اس نے کھودی ۔ نظریاتی نقطہ ، نظر کے اس فیصلہ کن بگاڑ کے ساتھ کئی طرح کے تغیرات رفتہ رفتہ مجتمع ہوکر ایک کلیتہً نئی وضع کی تنظیم میں ظاہر ہوتے ۔ اس تنظیم کو بھی ابتداءً سرحد کے دونوں طرف ایک مشترکہ وجود کی حیثیت سے مجتمع کیا گیا لیکن اس کے بعد سے ہر دو ملکوں میں اس کا ارتقا مختلف النوع رہا ہے ۔

مثال کے طور پر اس رجحان کے احیا اور تفوق کی حد تک فروغ پانے کا واقعہ پیش آیا جسے آخر کار اردو ادب میں جدیدیت کا نام دیا گیا ۔ پہلی بات جو اس ادبی جدیدیت کے بارے میں قابلِ ذکر ہے وہ یہ کہ جدیدیت ہونے کی وجہ سے ہی وہ لازمی طور پر ایک حد تک منطبق لیکن نہایت منفرد اور متضاد نقاطِ نظر کا مجموعہ تھی ، جن کا رشتہ اتحاد محض ترقی پسند تحریک کے تعلق سے ان نقاطِ نظر کے حامیوں کی مشترکہ اور اکثر کینہ ورانہ مخالفت تھی ۔ ورنہ ان کے پاس نہ تو کوئی اشتراکیت جیسا مشترک سماجی نظریہ اور نہ ہی ادبی اظہار کا کوئی مشترک نظریہ تھا (مثلاً حقیقت نگاری یا اس کے متبادل کا مسئلہ جس کو ترقی پسندی کی شعریات میں اتنی مرکزی اہمیت حاصل رہی ہے) ۔ بہ الفاظِ دیگر جدیدیت مروجہ مفہوم میں ترقی پسندی کی طرح کوئی متحدہ تحریک نہیں تھی بلکہ مختلف رجحانات کا ایک طیف یا مختلف النوع مجموعہ تھی ۔

ثانیاً جیسے جیسے " جدیدیت " پھیلی اس کا مرکز ثقل پاکستان کی طرف منتقل ہوتا گیا ۔ وہاں ترقی پسندی کی تحریک کا خاتمہ نسبتاً تیزی سے بھی ہوا اور فیصلہ کن طریقے سے بھی ۔ مخالف ادبی رجحانات کو اکٹھا کرنے میں سرکاری سرپرستی نے کہیں زیادہ اہم کردار ادا کیا ۔ اور جدیدیت کے اہم نقاطِ نظر کی وضاحت کرنے والے بہت سے دانش ور — عسکری ، ممتاز شیریں ، جمیل جالبی مدیرانِ جرائد اور نقادوں کی حیثیت سے ، ن ۔ م ۔ راشد اور انتظار حسین (نیز قدرے بعد میں انور سجاد) بہ حیثیت شاعر و افسانہ نگار — بالآخر سرحد کے اس پار ہی تھے ۔

اس صورتِ حال کا معاشری و زمانی توافق تاریخ کے اس مرحلے سے بھی تھا جہاں پہنچ کر ہندستان کے مثلی نوخیز ادیب کو ہندستان میں اپنے تہذیبی موقف کے بارے میں یک گونہ تشویش لاحق ہوچلی تھی ۔ اس وجہ سے وہ اپنے پاکستانی ہم پیشہ مقابل کو یک

گونہ رشک و تحسین کی نظر سے دیکھتا تھا ۔ بعض نقاطِ نظر صرف اس لیے باوقار بن گئے کہ وہ کراچی اور لاہور سے آتے تھے ۔ ہندستان میں ۱۹۶۲ ء کے لگ بھگ اور اس کے بعد پختگی کو پہنچنے والی پیڑھی کے بعض سربر آوردہ قلم کار مثلاً بل راج منرا اور کمار پاشی افسانے کے شعبے میں اور شہر یار غزل کے میدان میں خود کو کسی شرمندگی یا خجالت کے احساس کے بغیر انتظار حسین ، انور سجاد ، ناصر کاظمی وغیرہ جیسے مخصوص پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کے مقلدین میں شمار کرتے تھے ۔

اس طرح سرحد کے دونوں طرف سے اردو ادیبوں کے درمیان اب بھی مشترک ادبی تخلیقی عمل جاری تھا ، گو کہ ایسا لگتا ہے کہ ایک معینہ نسبت مقلوب ہوگئی تھی ۔ درآں حالے کہ پاکستان کے ترقی پسند مصنفین ، ہندستان کے بعض تہذیبی مراکز ۔لکھنو ، علی گڑھ ، دلی ، بمبئی کو اپنی تحریک کے نقطہ ہائے آغاز سمجھتے تھے اور درآں حالے کہ ترقی پسند مصنفین کی تحریک واقعی ہندستان میں نسبتاً بہترین حالت میں رہی ، پاکستان ۱۹۶۰ ء کے دہے میں نمایاں مقام حاصل کرنے والی " جدیدیت " کا بلاشبہ مقامِ وقوع بھی تھا اور تخلیقی تحریک کا سرچشمہ بھی ۔

تاہم اس دہے کے دوران بہت سے تغیرات آئے ۔ ۱۹۶۵ ء کی جنگ پاکستان کے بہت سے ادبی حلقوں میں ایک نفسیاتی مرض کا باعث ہوئی جس کے نتیجے میں ہندستانی ادیب کو ، بالخصوص اگر وہ ہندو ہو ، مدِ مقابل اور تہذیبی اعتبار سے کم تر سمجھا جانے لگا ۔ سمجھا جاتا تھا کہ محدود ادبی سیاق و سباق میں بھی اس سے بس برائے نام ہی دل چسپی لی جاسکتی ہے ۔ اس جنگ کے نتیجے میں ان دو ممالک کے درمیان نجی سفر اور کتابوں کی نشرو اشاعت میں بھی بےحد تخفیف کردی گئی ۔ سرحد پار سے مطبوعات نیز غیر مطبوعہ مسودوں کا حصول دشوار ہوگیا ۔ پاکستان کے بہت سے مدیرانِ جرائد اور بزرگ ادیبوں میں اس طرح کی کسی کوشش کی خواہش تک کم ہوگئی ۔

بٹوارے کے کم و بیش دو دہوں کے بعد پہلی بار ان دو ملکوں کے اردو ادیبوں نے ایک دوسرے سے نسبتاً لاعلم رہتے ہوئے لکھنا شروع کیا اور اردو ادبی رسائل نے بڑی حد تک " ہندستانی " یا " پاکستانی " رسائل کی شکل اختیار کرلی ، جن میں دوسرے ملک کے ادیبوں کی نمائندگی برائے نام ہی رہتی تھی ۔ اس میں شک نہیں کہ ایک حد تک فاصلوں میں یہ اضافہ محض مرورِ زمانہ کا اور موجود علاقائی حقائق کا لازمی نتیجہ تھا ۔ ۱۹۶۰ ء کے دہے کے اواخر میں اردو کے نسبتاً کم عمر ادیبوں اور قارئین کا سچ پوچھیے تو ایسا کوئی شخصی ماضی نہیں تھا جو ان کی نظر میں ان دو ملکوں کو پرُ معنی انداز سے باہم مربوط کرتا ۔

اس اثنا میں پاکستانی " جدیدیت " کی بعض اہم ہستیوں کا میلان اسلامیت ، تحریکِ احیاءِ مذہب اور اس مکتبِ خیال کی جانب ہوگیا جسے " نظریہ ، پاکستان " کے نام سے جانا جاتا ہے ۔ نقطہ ،نظر کی یہ تبدیلی محمد حسن عسکری کی رہ نمائی میں عمل میں آئی جو اس سے قبل جدیدیت کے نہایت بلند بانگ اور باثر ترجمان تھے اور اب پختہ کار حامیِ احیاءِ مذہب بن گئے اور مرورِ زمانہ کے ساتھ اسلامی بنیاد پرست ۔ ان کے پیروؤں میں سے چند ہی نے اتنا فاصلہ طے کیا لیکن ان میں سے بیش تر نے نئے باہیئے نظر کی وکالت شروع کردی جو مختلف طریقوں سے عسکری کے نئے اصولوں سے اخذ کیے گئے تھے ۔ ان کی ایک خاصی تعداد رائٹرس گلڈ جیسی تنظیموں کے وسیلے سے سرکاری سرپرستی کے نظام میں شامل ہوگئی ۔ چوں کہ ہندستانی اردو ادیب بلا لحاظ مذہب و ملت جبلی طور پر زیادہ سیکولر تھا ان ہندستانی اور پاکستانی ادبی حلقوں کے درمیان بھی جو اور باتوں کے لحاظ سے بالکل مماثل تھے ، فاصلہ بڑھتا گیا ۔

اس طرح کے بے شمار تغیرات کی بہ دولت ۱۹۶۰ ء کے دہے کے وسط سے ہندستان میں قابلِ لحاظ مقدار میں اردو ادب کی ایسی تخلیقات معرضِ وجود میں آنے لگیں جو نہ صرف موضوع کے مقامی رنگ کے لحاظ سے بلکہ اپنے احساسات ، ذخیرہ ، الفاظ اور

سالیبِ بیان کے لحاظ سے بھی پاکستان میں معرضِ وجود میں آنے والی تخلیقات سے بالکل مختلف تھیں ۔ جہاں تک ادبی اسلوبِ بیان کے ارتقا کا سوال ہے یہاں آزادی کے کچھ سال بعد پختگی کو پہنچنے والے ادیبوں کا عام رجحان ، خاص طور سے نئی فکشن اور نیز بیش تر یر روایتی نظم میں ، پاکستان میں نشو و نما پانے والے قدرے فارسی آمیز محاورے کی بجائے روز مرہ کی ہندستانی سے قریب تر محاورے کے استعمال کی طرف رہا ہے ۔

اصنافِ ادب کی تقسیم کے لحاظ سے ارتقا کافی ناہموار رہا ہے ۔ گو کہ تحتانی اور فوقانی مدارس کی سطح پر عام ذریعہ تعلیم کی یثیت سے اردو کا استعمال تیزی سے زوال پذیر ہوا ہے بعض یونی ورسٹیوں میں اردو زبان و ادب کے شعبے علمی تحقیق کی تربیت کے معاملے میں بلاشبہ زیادہ سخت گیر ہوگئے ہیں ۔ نقاد کو اس طرح مزید پیشہ ور بنادینے کے نتیجے میں منظرِ عام پر آنے والی ادبی تنقید کا یش تر حصہ پہلے سے زیادہ اونچے معیار کا ہے گو کہ ساتھ ہی ساتھ وہ زیادہ رسمی طور پر تجریدی ، زیادہ محدود معنوں میں " ادبی " اور لسانی " بھی ہوگیا ہے ۔

شاعری میں سربرآوردہ شخصیتیں وہی ہیں جو آزادی سے عین قبل یا فوراً بعد منظرِ عام پر آئیں مثلاً سردار جعفری ، کیفی اعظمی ، ختر الایمان ، جاں نثار اختر وغیرہ ۔ شاعری میں بھی انتہائی دل چسپ تجربے اختر الایمان جیسے لوگوں کے پاس زیادہ ملتے ہیں جن کے حاورے کی تشکیل کہیں زیادہ کامل طور سے روز مرہ اور روایتی اردو شعریات کے سنگم پر ہوئی ہے بہ نسبت بل راج کومل جیسے لوگوں کے جو " جدیدیوں " کے زیادہ غیر مصالحت پسندانہ حلقوں میں کہیں زیادہ مقبول ہیں ۔ تاہم فکشن وہ شعبہ ہے جس میں آزادی کے بعد ؛ اردو ادب بےحد بارآور رہا ہے اور اس کی ترقی بھی ہر لحاظ سے یک ساں رہی ہے ، افسانے ، ناولٹ اور بڑے پیمانے کے ناول یں تقسیم کے اعتبار سے ۱۹۴۰ ء کے دہے سے ۱۹۷۰ ء کے دہے تک کی پیڑھیوں کے تسلسل کے اعتبار سے اور روایتی حقیقت نگاری ؛ ریدی جدیدیت اور نوجدیدیت کے حامیوں کے درمیان تعامل اور نمایاں فرق کے اعتبار سے بھی ۔

عہدِ حاضر کے مصنفین اور آزادی کے بعد کے جدید اردو ادب کی مختلف اصناف کے متون پر کوئی تحقیقی بحث یا اس دور ں اردو فکشن کی تعداد کے اعتبار سے کافی قابلِ لحاظ تصنیفات کی زیادہ تفصیلی فہرست پیش کرنا اس مضمون کی حدود کے باہر ہے ۔ یہ نا کافی ہوگا کہ بہ ظاہر فکشن میں بھی تمام امکانات کے ختم ہوجانے اور اپنے آپ کو دہرانے کے آثار نمایاں ہیں ، خصوصاً اس لیے ہ نوجدیدیت کے رنگ میں لکھا جانے والا افسانہ بھی اپنی پہلے کی اختراعی قوت سے محروم ہوکر محض ایک مصنوعی طرزِ بیان کی شکل ختیار کرتا جارہا ہے ۔

اب جب کہ فکشن کے شعبے میں امکانات کا روز افزوں فقدان ہے ، عہدِ حاضر کی نظم میں انوکھی اور مستقل قدر و قیمت کھنے والی تخلیقات کی قلت ہے اور ادبی تنقید روز بہ روز پیشہ ورانہ ہوتی جارہی ہے اور اس کا دائرہ ، کار تنگ ہوتا جارہا ہے ۔ جدید ندستان میں اردو ادب ایک نازک موڑ پر پہنچ گیا ہے ۔ امکانات کا یہ فقدان اتفاقی بھی نہیں ہے ۔ یہ نتیجہ ہے مختلف بالواسطہ اور است طریقوں سے اثر انداز ہونے والی اس انتہائی مزاحم سماجی اور تہذیبی صورتِ حال کا جس میں فی الحال اردو ادبی تخلیقی عمل میں ارہی ہے اور جس کی اس مضمون کے ابتدائی حصے میں مختصراً نشان دہی کی گئی ہے ۔

(جولائی ۱۹۸۹ ء)

○○○ ● ○○○

زہرہ نگاہ

چلو اس کوہ پر ۔ ۔ ۔

چلو اس کوہ پر اب ہم بھی چڑھ جائیں
جہاں پر جاکے پھر کوئی کبھی واپس نہیں آتا
سنا ہے اک ندائے اجنبی باہوں کو پھیلائے
جو آئے اس کا استقبال کرتی ہے
اسے تاریکیوں میں لے کے آخر ڈوب جاتی ہے
یہی وہ راستہ ہے جس جگہ سایہ نہیں جاتا
جہاں پر جاکے پھر کوئی کبھی واپس نہیں آتا
چلو اس کوہ پر ۔ ۔ ۔

○

جو سچ پوچھو تو ہم تم زندگی بھر ہارتے آئے
ہمیشہ بے یقینی کے خطر سے کانپتے آئے
ہمیشہ خوف کے پیراہنوں سے اپنے پیکر ڈھانپتے آئے
ہمیشہ دوسروں کے سامنے میں اک دوسرے کو چاہتے آئے
برا کیا ہے اگر اس کوہ کے دامن میں چھپ جائیں
جہاں سے لوٹ کے کوئی کبھی واپس نہیں آتا
چلو اس کوہ پر اب ہم بھی چڑھ جائیں
چلو اس کوہ پر ۔ ۔ ۔

○●○

راشد آزر

مداوا

میں کل رات
اک چادر لے کر
گھر سے نکلا

○

یہ سوچا تھا
آپ کے غم
اور اپنے غم
اور اِن کے غم
اور اُن کے غم کو
اپنی اس
چادر میں سمیٹ کے
اک دریا میں
پھینک آؤں گا

○

لیکن اس چادر میں اتنے
چھید پڑے تھے
سارے غم میری چادر سے
چھن چھن کر گلیوں کی پکی
سڑکوں پر پھر بکھر گئے ہیں
آپ کے غم میں میرا غم
اور اِن کے غم میں اُن کا غم
سب ملا پڑا ہے

○

جس کے غم کو جو پہچانے
آگے بڑھ کر اس کو اٹھالے
یا اس چادر کو سینے میں
آ کر میرا ہاتھ بٹالے

○○○

ایک حادثہ

ابھی کل کی خبر تھی
ایک بس پر
رات کو حملہ ہوا تھا
اور مسافر سب کے سب
مارے گئے تھے

○

میں اکثر ایسی باتیں
ہر خبرنامے میں پڑھتا تھا
ہزاروں قتل کے قصے
مرے احباب مجھ سے
کہتے رہتے تھے
مگر قصے تو قصے ہیں
مجھے کیا اس سے لینا ہے
یہی میرا رویہ تھا

○

مگر کل بس میں جب اس نے
مری بانہوں میں دم توڑا
تو اس کا تو کوئی قاتل نہیں
پھر بھی میری سانس
کیوں رک سی گئی تھی
ایک لمحے کو ؟ !

○○○

وزلا واشم بورسکا

ترجمہ : کاوش عباسی

میں اس سے بے حد قریب ہوں

○

میں اس سے اتنی زیادہ قریب ہوں کہ اس کا خواب نہیں بن سکتی ۔
میں اس کے اوپر سے اڑتی ہوئی نہیں گزرتی ۔ اس سے بھاگ نہیں جاتی ہوں
ایک درخت کی جڑوں کے نیچے۔ میں اس سے بے حد قریب ہوں ۔
میری آواز میں جال کی مچھلی کا گیت نہیں ہے ۔
میری انگلی میں سے انگوٹھی نکل نکل نہیں جاتی ۔
میں اس سے بے حد قریب ہوں ۔ ایک بڑے گھر میں آگ لگی ہے
میرے بغیر ۔ (اور) وہ مدد کے لیے پکارتا ہے ۔ حد سے زیادہ قریب ہوں
اتنی کہ میرے بالوں میں لٹکتی ہوئی گھنٹیوں کے بجنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا
حد سے زیادہ قریب ہوں اتنی کہ ایک مہمان کی طرح داخل نہیں ہوسکتی ۔
جس کے آنے سے دیواریں آپ ہی آپ دور سرکتی جاتی ہیں ۔
دوبارہ کبھی میں
اتنی بے خود و بے پرواہ سی ۔ گوشت پوست سے اتنی ماورا سی ۔
اتنی سبک سی ۔ نہیں مروں گی
جیسے کبھی ایک بار اس کے خواب میں ـــ حد سے زیادہ قریب ہوں ۔
میں (اس لفظ کی) آواز کا ذائقہ چکھتی ہوں ۔ میں اس لفظ کا چمکتا ہوا چھلکا دیکھتی ہوں
اب کہ میں اس کی آغوش میں بے حس و حرکت لیٹی ہوں ۔ وہ سوتا ہے ۔
زیادہ قابل حصول اب اس (عورت) کے لیے جسے صرف ایک بار دیکھا ہے ۔
جو ایک خانہ بہ دوش سرکس میں جس میں ایک شیر تھا ۔ ایک کشیئر تھی ۔
بہ مقابلہ میرے لیے ۔ جو اس کے پہلو میں ہوں ۔
اس (عورت) کے لیے اب اس کے اندر ایک وادی پنپتی ہے ۔

بیلے پتوں سے لدی ، گہری نیلی ہوا میں
برف پوش پہاڑوں سے بند ہوتی ہوئی ۔ میں اس سے اتنی زیادہ قریب ہوں
کہ اس پر آسمان سے گر نہیں سکتی ۔ میری چیخ
اسے جگا دے سکتی ہے ۔ حقیر ، بد نصیب
ہوں میں ، اپنی ہیئت میں محدود ،
میں جو ایک صنوبر کا پیڑ تھی ، ایک چھپکلی تھی ،
میرے کویوں سے نمودار ہونے والی ،
میری جلد کے رنگوں میں جھلملانے والی ۔
ششدر آنکھوں کے سامنے سے جلوہ دکھا کر گم ہوجانے کی ادا کی ملک ،
جو ایک دولتوں کی دولت ہے ۔ میں قریب ہوں ،
اس سے اتنی زیادہ قریب ہوں کہ وہ میرے خواب نہیں بن سکتا ۔
میں سونے والے کے سر کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھسکاتی ہوں
اور وہ سُن ہے ، رقص کرتی ہوئی ٹیسوں کی سوئیوں سے معمور
جن میں ہر ایک کی نوک پر ، گنے جانے کے انتظار میں ،
راندہ ، درگاہ فرشتے بیٹھے ہیں

○●○ ● ○●○

شاعرہ : POETESS : Wislawa Szymborska (b - 1923) - (Polish)
(Noble Prize winner - 1997)

انگریزی ترجمہ : Translation in English by Czeslaw Milosz

○○○

مصحف اقبال توصیفی

O

ہم تھے ۔ کسی کا دھیان تھا ۔ وہ بھی نہیں رہا
اک ربطِ جسم و جان تھا ۔ وہ بھی نہیں رہا

جھگڑا تھا میرا جس سے وہ دنیا کہاں گئی
اک شخص درمیان تھا وہ بھی نہیں رہا

مثلِ چراغ ۔ تیرگیِ دشتِ جاں میں دل
اک شہرِ بے نشان تھا وہ بھی نہیں رہا

اینٹیں بچی تھیں جس میں وہ اک تنگ سی گلی
اس میں مرا مکان تھا وہ بھی نہیں رہا

دنیا مری نہیں ۔ نہ سہی ۔ تم تو ساتھ ہو
کیا کیا ہمیں گمان تھا وہ بھی نہیں رہا

نقطہ بنی ۔ نگاہ سے اوجھل ہوئی زمیں
سر پر اک آسمان تھا ۔ وہ بھی نہیں رہا

مصحف تمہارا نام یہیں تھا ـــ اور اس پہ ہاں ـــ
اک سرخ سا نشان تھا وہ بھی نہیں رہا

OOO

سید انور سعید

•

فلک پر جگمگاتا اک ستارا دیکھتا ہوں
کہ میں اپنے سفر کا استعارا دیکھتا ہوں

لکھا ہے نام میرے سب خسارا دیکھتا ہوں
میں اپنے دوست کا جب گوشوارا دیکھتا ہوں

ابھی طے کی ہے تھوڑی سی مسافت میں نے لیکن
سمٹ آیا جہاں قدموں میں سارا دیکھتا ہوں

مرے ہمراہ چلتے ہیں سب الفاظ و معانی
میں شاعر ہوں کسی کا کب سہارا دیکھتا ہوں

جو محفل ہو تو بن جاتا ہے وہ انجان اکثر
ہو تنہا تو محبت کا اشارا دیکھتا ہوں

وہ دشمن ہے یا میرا دوست پھر سوچوں گا انور
یہ خنجر کس نے سینے میں اتارا دیکھتا ہوں

☆

رئیس الدین رئیس

•

سروں سے گردِ سفر ہم جو صاف کرتے ہیں
تو اپنی ہار کا ہم اعتراف کرتے ہیں

کبھی جو بحرِ تخیل میں ڈوبتا ہوں میں
ابھر کے لفظ قلم کا طواف کرتے ہیں

عجیب خوف شکستوں کا ہے ابھی طاری
ہم اپنے فیصلے اپنے خلاف کرتے ہیں

رئیس پار اترنا کہاں نصیب ان کا
جو اپنی ناؤ میں خود ہی شگاف کرتے ہیں

☆

●

ہیں حجابات حسنِ کامل کے
اختلافات حق و باطل کے

چند قطرے تھے خونِ بسمل کے
باغ میں پھول بن گئے کھل کے

کیا انھیں شرم گیں نگاہوں سے
آپ پرزے اڑائیں گے دل کے

دل میں رہ کر بھی ہیں نظر سے دور
دل میں ارمان رہ گئے دل کے

بحر و بر کو الٹ بھی دیتے ہیں
چند نالے دکھے ہوئے دل کے

ان کو پامال یوں نہ کر ظالم
یہ ورق ہیں صحیفہ دل کے

سن کے مسعودؔ کا فسانہ عشق
اڑ گئے ہوش اہلِ محفل کے

مصطفیٰ شہاب

●

کوئی آنسو بھی کاغذی نہ ہو،
سوچ کے غم کو میں دکھی نہ ہوا

مجھ سے مدت ہوئی مرا ہم زاد
ایسا ٹوٹا کہ پھر کڑی نہ ہوا

آسماں کے ہزار رنگ ہوئے
تیرے آنچل سا ابرئی نہ ہوا

اب رکا ہوں تو اک سمندر ہوں
پہلے بہہ کر بھی اک ندی نہ ہوا

جب گھڑی بھر کو ہم ملے تھے شہاب
وقت اتنا بھی اس گھڑی نہ ہوا

رفیعہ منظور الامین

تیسری دنیا کی تلاش

" تم بورژوائی ہو یا پرولتاری ؟ " فریدہ بی بی نے پوچھا ۔

" دلاری ہوں میں " ۔ ۔ ۔ دلاری نے جھاڑو سے اپنی کھنڈر بتیسی چھپاتے ہوئے جواب دیا ۔

" یہ آخر فریدہ بی بی کو کیا ہوگیا تھا جو اوٹ پٹانگ سوال کر رہی تھیں اور تو اور اس کا نام بھی بھول گئی تھیں ۔ روز آنے والی بھنگی جس کی جھاڑو گھر کی صفائی کی ضامن تھی ۔

فریدہ بی بی نے سوال دراصل دلاری سے نہیں اپنے بھائی جاوید میاں سے پوچھا تھا جنھیں داڑھی بنانے کا نیا نیا شوق چرایا تھا ۔ اور گال زخمی کر کے وہ بی اماں کے پاس دوڑے آئے تھے کہ پاؤڈر لگا دو ۔ اور دلاری اسی وقت اپنی جھاڑو لیے داخل ہوئی تھی ۔

فریدہ بی بی بھی ہبکی نہیں تھیں ۔ وہ تو اپنے امتحان کی تیاری میں مصروف تھیں ۔ ۔ ۔ ہبکی تو خود دلاری کی نوخیز بیٹی چمکی تھی ۔

چمکی اپنی ماں کے ساتھ اس وقت سے آئی تھی جب وہ اتنی سی تھی ۔ آم کے موسم میں اس کی ناک پر مکھیاں بھنبھناتی رہتی تھیں ۔ جن گھروں میں دلاری کام کرتی تھی ، کتوں کے لیے تو خیر الگ برتن ہوتے ہی تھے ، وہاں چمکی کے لیے بھی ایک برتن چھوڑ رکھا تھا ۔ ۔ دلاری جب اپنا کام کرتی تو بچا کچھا جھوٹن اس برتن میں چمکی کے آگے رکھ دیا جاتا جو تن من دھن سے برتن کے ساتھ جٹ جاتی لیکن جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی اس کے سماجی رتبے میں فرق آتا گیا ۔ ۔ ۔ اسے اجازت مل گئی کہ گھر کی پرانی جھاڑو جو بس ایک ٹھونٹھ ہی رہ گئی تھی ، لے کر فرش پر لٹے سیدھے ہاتھ ماریا کرے پھر بھی وہ دادا ابا کے کمرے میں نہیں جاسکتی تھی ۔ ان کی گھرکی سے اس کی روح فنا ہوتی تھی ۔ جاوید میاں بھی کبھی کبھی آتے جاتے اسے ایک چپت رسید کردیا کرتے تھے ۔ اور تو باقی سب ٹھیک تھا ۔

پہلے چمکی کی دنیا اس کٹورے تک محدود تھی جس میں کچھ نہ کچھ کھانے کو مل ہی جاتا تھا لیکن اب وہ کٹورہ پھیلتے پھیلتے نصف کرہ ارض بن گیا تھا جو چمکی کی دنیا تھی ۔ ۔ ۔ اب اس نے وہ چھوٹا کٹورہ ہی کوڑے دان میں پھینک دیا تھا جو اس کی حقیر شخصیت کی یادگار تھا ۔

جوتے اس پاؤں کا جغرافیہ اختیار کرلیتے ہیں جو انھیں مسلسل پہنتا ہے فریدہ بی بی کی اترن میں بھی ۔ ۔ ۔ ان کی کچھ شخصیت سموئی ہوتی ۔ ان کی مہک ہوتی ۔ بھینی بھینی سی ۔ اور یہ کپڑے راست چمکی کو مل جاتے جو اسے ایسے فٹ ہوجاتے جیسے اس کے لیے ہی بنائے گئے ہوں ۔ فریدہ بی بی نئے نئے کپڑوں کی دیوانگی کی حد تک دل دادہ تھیں اس لیے آئے دن رد کیے ہوئے کپڑے چمکی کو دان کر دیے جاتے ۔ ساتھ ہی تھوڑی سی فریدہ بی بی بھی ان کپڑوں میں لپٹی چمکی میں سرایت کرجاتی ۔ ان کی چال ڈھال ، ان کے ہنسنے کا انداز ان کا گردن کو ایک طرف جھٹکا دے کر بال پھینکنے کی ادا حتیٰ کہ کھانا کھاتے ہوئے نوالہ اٹھانے کی نقل تک چمکی کی شخصیت میں شامل ہوتی گئی ۔ اس پر طرہ یہ کہ فریدہ بی بی نے اسے تعلیم دینے کا بیڑہ اٹھایا ۔ اس کے لیے کتاب کاپی پنسل دی ۔ اور یہیں چمکی کا باپو ٹھٹک گیا ۔ جھوٹن ، اترن تک تو بات ٹھیک تھی ۔ یہ تو جمعداروں کا شیوہ ہی تھا لیکن یہ پڑھائی لکھائی اسے بالکل نہیں جچی ۔ اس کے

خیال میں لکھنا پڑھنا سو روگوں کا ایک روگ تھا جو انسان کو نتے نتے رستے دکھاتا ہے۔ خاص کر اسے اپنی لڑکی کو پڑھا لکھا کر میم نہیں بنانا تھا۔۔۔ ایک بھنگن کے ہاتھ میں قلم نہیں جھاڑو ہی بھلی لگتی ہے۔ یہ تعلیم وعلیم تو امیروں کے چونچلے ہیں۔۔۔ چناں چہ اس نے کتاب کاپی پھاڑ کر پنسل [redacted] چولہے میں جلتے اپلوں میں جھونک دی۔۔۔ لیکن فریدہ بی بی کا جادو چمکی پر چل چکا تھا۔ انھیں کی راتے سے دوبارہ اس کی تعلیم کا در پردہ سلسلہ چلنے لگا جس کے ساتھ ہی چمکی کی شخصیت اور بھی جلا پانے لگی۔

ادھر فریدہ بی بی کا ارمان تھا کہ وہ تعلیمی میدان میں کچھ کر گزریں اور کچھ نہیں تو ڈاکٹر ہی بن جائیں۔۔۔ لیکن ان کا یہ خواب پورا نہ ہوسکا۔ کیوں کہ رفاقت میاں کا رشتہ ہی ایسا آیا تھا کہ اسے ٹھکرانا کفرانِ نعمت ہوتا چناں چہ ان کی چٹ منگنی پٹ بیاہ کردیا گیا۔

شادی میں دلاری اور چمکی کے بھی کپڑے بنے۔۔۔ انعام و اکرام بھی دیا گیا۔۔۔ فریدہ بی بی کی خواہش پر چمکی کو ایسا جوڑ بنایا گیا جسے پہن کر وہ کہیں سے بھی بھنگن نظر نہیں آتی تھی۔۔۔ فریدہ بی بی کے پھینکے ہوئے لپ اسٹک نے اور بھی قیامت ڈھادی بغیر زیور گہنے کے اس کا بانکپن فریدہ بی بی کی ہر سہیلی سے زیادہ قاتل تھا۔۔۔ شائد اسی لیے رفاقت میاں کے دوست ارشاد اس پر مٹے۔ مہندی کی رسم میں سہیلیوں کے گروہ میں وہ اسی کو تکتے رہے لیکن صبر کیا کہ فریدہ کا رشتہ بھابی والا بن جائے تو اسی کے توسط سے اپنی بات چلائیں۔

"ہوگی کوئی بھابی کی کزن وزن مگر ہے قیامت" انھوں نے سوچا شادی کی رسومات کے دوران ان کی نظریں بس چمکی ہی کا تعاقب کرتی رہیں۔

چمکی بھی ارشاد میاں کی توجہ سے بے خبر نہیں تھی۔۔۔ لیکن وہ اپنی اوقات سے بھی بے خبر نہیں تھی۔۔۔ اسے ارشاد کا مردانہ حسن و وجاہت بہت اچھا لگا۔۔۔ لیکن اسے تو چاند بھی اچھا لگتا تھا تو کیا وہ چاند پر کمند پھینک سکتی تھی؟ پھر بھی جوان دلوا کے خواب بہت بے ساختہ ہوتے ہیں۔ اس نے سوچا خواب ہی سہی جو ایک دن ٹوٹ جائے گا۔ لیکن جب تک ہے۔۔۔ ہے سہی! کیا حرج ہے جو بادِ صبا کے ایک دو جھونکے صحرا میں بھی چل جائیں! لیکن اس کے خواب کو جھٹکا اس وقت لگا جب ارشاد خود اس نے بتایا کہ وہ کون ہے تب بھی وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے اور شادی پر مصر رہے۔۔۔ انھوں نے اسے یقین دلایا کہ اپنی والدہ کو ضرور راضی کرلیں گے کیوں کہ وہ خود ایک سوشیل ورکر تھیں اور سماجی درجہ بندی کے خلاف بڑی زہریلی تقریریں کرتی تھیں۔۔۔ لیکن یہ ارشاد کا خیالِ خام تھا کیوں کہ ان کی والدہ نے دو چار صلواتیں سنا کر صاف کہہ دیا کہ وہ تقریریں دوسروں کے لیے کرتی ہیں بلکہ تقریر کرنا ان کا پیشہ ہی تھا۔۔۔ اور جب سارا ملک ان کی تقریر کی پرواہ نہیں کرتا تو ارشاد ہی کیوں انھیں عملی جامہ پہنانے پر مصر تھا۔!

گھی جب سیدھی انگلیوں نہیں نکلا تو ارشاد نے چمکی کو ایک ٹیڑھی ترکیب سجھائی۔

"تم میرے ساتھ بھاگ چلو۔۔۔ لیکن چمکی نے صاف انکار کردیا بھلا وہ فریدہ بی بی کے جاسے میں ایسی ذلیل حرکت کیسے کرسکتی تھی۔ اس نے ارشاد سے کہا کہ ہمت ہو تو کھلے عام مجھے اپناؤ۔ میں تمھارے ساتھ بھاگوں گی ہرگز نہیں"۔۔۔

ارشاد کی والدہ بھی اپنی تقریروں کے درمیان چونک چکی تھیں۔ انھوں نے فریدہ بی بی کی والدہ کو اپنا احوال سنایا اور نتیجے کے طور پر دلاری چمکی کی چوٹی پکڑ کر گھسیٹ لے گئی۔

"موئی کمند لگائی بھی تو کہاں۔۔۔!

مچھی کو تو ایسی چپ لگی تھی کہ اس کا علاج باپو کے گھونسوں لاتوں میں بھی نہیں تھا۔۔۔ یہ چپ دراصل باپو کے گھونسوں نے ہی لگائی تھی۔ وہ جب دلاری کو پیٹتا تھا تو وہ بھی پنجے جھاڑ کر بھوکی شیرنی کی طرح اس سے چمٹ جاتی اور اس کے بدن میں اپنے دانت گڑو دیتی۔ یہاں مچھی کی چپ نے اسے ہرا دیا۔۔۔ اور وہ ہانپتا کانپتا کھٹیا پر پڑرہا۔

دو چار ہی دن میں مچھی کو کالو کے حوالے کردیا گیا۔

کالو بھنگی کہاں خوش تھا اس مدھر ملن سے۔ وہ پہلے ہی مچھی کی میم ایسی حرکتوں سے مرعوب تھا۔ اب شادی کے بعد تو اس کی کم عصری اور بھی بڑھ گئی۔ وہ خود تو سدا کوڑے دان بنا رہتا تھا۔ اور بیوی جو ملی تو نفاست پسند، روز نہا دھو کر صاف ستھری رہنے والی۔ جو ہمیشہ اس کی خود کی گندگی کا احساس دلاتی۔

ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ کالو بھنگی بھی آخر عاجز آگیا۔ وہ جب بھی مارپیٹ کے ارادے سے مچھی کے پاس پہنچتا اس کی ہمت ٹوٹ جاتی۔ مچھی کا رکھ رکھاؤ اور ہاتھ میں تھامی ہوئی کتاب اس پر ایک طلسم سا کردیتی اور وہ سر جھکائے وہاں سے ٹل جاتا۔ بھنگی کمیونٹی اس کی مرعوبیت پر انگلیاں اٹھارہی تھی۔۔۔

آخر ایک دن اس نے گڑ گڑا کر پنچوں سے کہا کہ اسے تو ایک عورت چاہیے تھی جو اس کے ساتھ جھاڑو اور ٹوکرا تھامے کمائی کرسکے۔ یہ کتاب والی میم اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔

پنچوں نے فیصلہ سنایا کہ۔یا تو مچھی اپنے کنٹم کے طور طریقے اپنائے یا اسے برادری سے خارج کردیا جائے گا۔

مچھی نے یہ فیصلہ جھگی میں بیٹھے بیٹھے ہی سن لیا تھا۔

اسی رات وہ بھنگی بستی سے غائب ہوگئی۔ دونوں دنیاؤں نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔۔۔ وہ شاید تیسری دنیا کی تلاش میں نکل گئی تھی۔

تیسری دنیا کہاں ہے۔کوئی بتا سکتا ہے اسے اس کا پتہ؟

○●○ ● ○●○

(سلسلہ ص ۲۱)

انتقال ہوگیا، افسوس! بڑا پیارا مخلص دوست تھا!

(۲) رائیٹرز کیمپ

دوسرے سال ادیبوں کا کیمپ حیدرآباد میں ہوا۔میں اس میں شامل نہیں تھا مگر دوستوں سے ملنے اکثر شام وہاں جاتا، کچھ نئے لوگ بھی آئے تھے۔ان سے بھی ملاقات رہی مگر یہاں جو کیمپ ہوا اس کا انتظام سنا بہت خراب تھا۔ میسور کا کیمپ بہت منظم تھا اور اس کے افتتاحی اجلاس میں رادھا کرشنن آئے تھے صدر جمہوریہ ، ہند اور ساہتیہ اکیڈمی کے سکریٹری بھی اور ان کے ساتھ گروپ فوٹوز بھی لیے گئے تھے اور تیسرے سال آخری بار یہ کیمپ کشمیر میں ہوا پھر اس کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

○●○ ● ○●○

شبیہہ عباس جارچوی

اک بات جو کہنا تھی۔۔۔!

سیٹی بجنے کے بعد کوئلے کے انجن کی چھک چھک کی آواز آنے لگی تھی اور ریل گاڑی آنے والے مسافروں کو اتار کر اور جانے والوں کو لے کر آہستہ آہستہ اسٹیشن چھوڑ رہی تھی۔ زینب کو بچپن ہی سے ان آوازوں اور ماحول سے واسطہ تھا۔ پیدا ہوئی تو ریلوے ملازم کے گھر، شادی ہوئی تو ریلوے ملازم سے، ساری زندگی ہی مختلف ریلوے اسٹیشنوں کے قریب ریلوے کوارٹروں میں بیت گئی۔ اب تو شوہر کی ریٹائرمنٹ قریب ہے۔ دو تین سال کی بات اور ہے، پھر شوہر ملازمت سے ریٹائر ہوجائے گا۔ بس دو میاں بیوی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد گریجویٹی وغیرہ اتنی مل جائے گی کہ اس کا شوہر کوئی چھوٹی موٹی دکان کرے گا جس کے متعلق وہ اکثر کہتا رہتا ہے۔ دو آدمیوں کا خرچہ ہی کیا بس بری بھلی گزرتی رہے گی۔ ہاں اس عمر میں کبھی کبھی ایسی بیماری آگھیرتی ہے کہ اخراجات ایک دم بڑھ جاتے ہیں اور مالی پریشانی ہوجاتی ہے اور اس کا شوہر تو یوں بھی سانس کا مریض ہے۔ خیر خدا نہ کرے ایسا وقت آئے۔ اگر آیا تو دیکھا جائے گا۔ دن کے دو بج رہے ہیں۔ زینب کا شوہر محی الدین کچھ دیر پہلے ہی کھانا کھاکر اسٹیشن گیا ہے وہ بھی کھانا کھاچکنے کے بعد سونے کی کوشش کررہی ہے مگر نیند جیسے آنکھوں سے کوسوں دور ہے۔ شام کا وقت ہوتا تو وہ پڑوس کے چند گھروں میں سے کسی گھر میں چلی جاتی اور کچھ وقت کٹ جاتا مگر دوسرے گھروں کی عورتیں تو بچوں والی ہیں اور اسی حساب سے ان کی مصروفیات اور مسائل ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ بچوں کو دوپہر کو کھلا پلا کر کچھ دیر سلادیں اور خود بھی آرام کرلیں۔ اسٹیشن ماسٹر ارشاد حسین صاحب کے یہاں ٹیلی ویژن ہے اور ان کی بیوی اصرار کرکے زینب کو ٹی وی دیکھنے کے لیے بلاتی ہے اور جب کبھی جاؤ تو خوب آؤ بھگت بھی کرتی ہے مگر ٹی وی دیکھنے کا اسے کچھ زیادہ شوق نہیں۔ بھلا اس کے بچپن اور جوانی میں، یہ ٹی وی کب تھا۔ یہ تو ابھی کچھ دنوں سے آیا ہے اور وہ بھی کسی کسی پیسے والے کے پاس مگر پھر بھی وہ ارشاد صاحب کے یہاں کبھی کسی پروگرام کی وجہ سے یا کبھی محفل میں موجود ہونے کی وجہ سے ٹی وی دیکھ لیتی ہے لیکن بھری دوپہر کا وقت تو ٹی وی کا بھی نہیں۔

اسٹیشن کے پاس یوں تو خاص آبادی ہے لیکن ریلوے ملازمین کل سترہ ہیں سب ملاکر۔ ریلوے کے دس کوارٹر اور فیملی والے ریلوے ملازمین کے بس سات گھر ہیں۔ اسٹیشن ماسٹر کی بیوی زینب اکثر کہتی ہیں کہ رحیم پورہ کے زیادہ باشندے ہمیشہ سے یہیں کے رہنے والے ہیں اور یہیں رہیں گے اور زیادہ تر ایک جیسے اور ایک جیسے ماحول میں زندگی گزارنے والے لوگ یہیں مر کھپ جائیں گے۔ بچے لڑکے، لڑکے جوان، جوان ادھیڑ اور ادھیڑ بوڑھے ہوجائیں گے اور پھر مرکر اپنی اپنی قبروں میں جا سوئیں گے وقت کا پہیہ یوں ہی چلتا رہا ہے اور یوں ہی چلتا رہے۔ ہم ریلوے ملازمین مختلف مذاہب، عقیدوں، رنگ و نسل اور بولیاں بولنے والے ہیں اور ملازمت کے سبب اس اسٹیشن پر ہمارا قیام عارضی ہے۔ نہ جانے کب کسی کے تبادلے کے احکامات آجائیں اور پھر شاید ساری زندگی ہماری ایک دوسرے سے ملاقات نہ ہوسکے تو کیوں نہ ہم آپس میں میل محبت سے رہیں۔ سچ سچ وہ اخلاق اور میل جول کی بہت اچھی ہے، دکھاوا، بڑا پن اور غرور نام کو نہیں۔ کم از کم زینب کو تو اس سے آج تک ایک بھی شکایت نہیں ہوئی۔ ماسٹرنی عید تہوار اور کبھی کسی بہانے اور کبھی کسی بہانے دعوتوں کا سلسلہ جاری رکھتی ہے اور کبھی

بھی دوسرے خوش حال ملازمین کو بھی دعوتِ منعقد کرنے کے لیے خود کہتی ہے یا اپنے شوہر کے ذریعے ان سے کہلواتی ہے اور یوں ریلوے والوں کا یہ "خاندان" اپنی ملازمت کے فرائض ادا کرنے کے ساتھ ایک دوسرے کے دکھ درد خوشی غمی میں شرکت کے علاوہ ساتھ مل بیٹھنے کا نہ صرف کوئی موقع نہیں جانے دیتا بلکہ خواہ مخواہ کے مواقع پیدا کرتا رہتا ہے ۔ زینب کی شادی کے ایک سال بعد ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام انھوں نے زرینہ رکھا تھا ۔ بڑی پیاری سی بچی تھی مگر چار سال کی عمر میں نمونیہ کا شکار ہوکر مر گئی پھر زینب کے کوئی بچہ نہ ہوا ۔ بڑے علاج اور ٹونے ٹوٹکے کیے مگر اولاد قسمت ہی میں نہ تھی ۔ پھر جب بڑھاپا آگیا تو دونوں میاں بیوی نے صبر کرلیا ۔ سردیوں کے موسم کی آمد آمد تھی ۔ دن میں اب بھی خاصی گرمی ہوتی تھی رات میں البتہ کچھ خنکی ہوجاتی ۔ ابھی لوگ لحاف ، سوئٹر ، مفلر وغیرہ صندوقوں میں سے نکالنے کے متعلق سوچ رہے تھے ۔ زینب بھی کئی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ گرم کپڑے صندوق میں سے نکالے مگر صبح کے بعد جب تھوڑا سا دن چڑھتا تو اچھی خاصی گرمی ہوجاتی اور وہ اس کام کو پھر آئندہ کے لیے ملتوی کردیتی ۔ زینب ایک چادر اوڑھے لیٹی تھی کہ دروازے پر شوہر نے دستک دی اور اندر آکر بتایا کہ ارشاد صاحب کے کوئی رشتے دار آئے ہوئے ہیں ، وہ کسی دوسرے شہر جارہے ہیں اور چند گھنٹوں کے لیے یہاں ٹھہر گئے ہیں ۔ ارشاد صاحب نے اس خوشی میں ریلوے ملازمین کی دعوت کی ہے اور تمھیں بلا رہے ہیں ۔ جب دونوں میاں بیوی اسٹیشن ماسٹر کے نسبتاً بڑے کوارٹر پہنچے تو سبھی متعلقہ افراد آچکے تھے ، سوائے ان کے جو کسی مجبوری کے سبب نہ آسکے ۔ وہاں جاکر پتہ چلا کہ ارشاد صاحب کے دور کے رشتے کے ایک چچا جن کا نام ظہور الحق ہے وہ دورانِ سفر چند گھنٹوں کے لیے اپنے بھتیجے کے ہاں رک گئے ہیں اور اب وہ اگلی ٹرین سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہوجائیں گے ۔ یہاں ریلوے ملازمین کے کوارٹر اسٹیشن سے تقریباً متصل تھے ۔ ایک میل ٹرین آنے کا وقت ہورہا تھا جسے اس اسٹیشن پر رکے بغیر گزر جانا تھا ۔ کچھ دیر بعد ریل کی مخصوص آواز سے اس کی آمد کا اور چند لمحوں میں آواز ختم ہوجانے سے اس کے گزر جانے کا گویا اعلان ہوگیا ۔ ارشاد صاحب نے کھانا اور ناشتہ دونوں کا انتظام کرلیا تھا ۔ ظہور صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ آئے تھے ۔

زینب بھی اور عورتوں کے ساتھ ظہور صاحب کی اہلیہ عائشہ سے باتوں میں مصروف ہوگئی ۔ دورانِ گفتگو زینب کو پتہ چلا کہ عائشہ اور ان کے شوہر لاہور سے کراچی جارہے ہیں اور راستے میں یہاں رک گئے ہیں اور محکمہ ریلوے کی طرف سے طویل سفر کے دوران راستے میں چند گھنٹوں کے قیام کی اجازت کا فائدہ اٹھا رہے ہیں ۔ باتوں باتوں میں زینب نے انھیں بتایا کہ میری پیدائش بھی لاہور کی ہے اور میرا بچپن اور لڑکپن وہیں گزرا ہے ۔ کچھ دیر کی گفتگو سے زینب نے اندازہ لگایا کہ یہ تو عبدالحق صاحب کا بیٹا ظہور ہے ۔ ظہورالحق کے بارے میں تو اسے اب پتہ چلا ورنہ بچپن اور لڑکپن میں تو وہ یا تو بھولا تھا یا پھر اگر کسی نے اسے بہت عزت بخشی تو اس کا نام ظہور لے کر اسے پکارا مگر اب تقریباً چالیس سال پرانا بھلا یا ظہور اب ظہور الحق کی شکل میں اس کے سامنے تھا ۔ وہ اب وکیل تھا اور لاہور میں وکالت کرتا تھا ۔ کراچی اپنے رشتے داروں میں کسی شادی میں شرکت کی غرض سے جارہا تھا ۔ زینب نے عائشہ سے کہہ کر ظہور الحق کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ بھائیا تم نے مجھے پہچانا؟

اس نے جواب میں خاموشی اختیار کی تو اس نے بتایا کہ لاہور واشنگ لائن کا سلیم یاد ہے ۔ ظہور نے چند لمحے سوچ کر کہا ، ہاں جی یاد ہے ۔ بھائی ظہور میں اس کی بہن زینب ہوں ۔ ظہور نے یہ سن کر زینب کے سر پر ہاتھ رکھا اور سلیم کا حال پوچھا اور زینب کے شوہر محی الدین سے معانقہ کیا ۔ کچھ دیر کی رسمی گفتگو کے بعد دونوں میاں بیوی اپنے گھر واپس ہوئے ۔ راستے میں محی الدین نے زینب سے پوچھا کہ تم ظہورالحق صاحب کو جانتی ہو تو اس نے بتایا کہ ہاں لاہور میں یہ ہمارے محلے ہی میں رہتے تھے اور بھائی سلیم کے گہرے دوست تھے ۔ شوہر کو تو زینب نے اتنا بتاکر چپ کرادیا لیکن خود اس کے ذہن پر چالیس سال پرانی فلم چلنے لگی ۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اس کی عمر تین سال تھی اس کی بڑی بہن

بعد چھ سال کی اور اکلوتا بھائی سلیم دس سال کا تھا۔ لاہور کے ریلوے ملازمین کی رہائشی آبادی واشنگ لائن کا ایک کوارٹر ان کے والد کو الاٹ ہوا تھا جہاں وہ اپنی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ زینب کے دونوں بہن بھائی اسکول جاتے تھے۔ وہ ابھی چھوٹی تھی۔ کبھی ایک کچا اور آتا پہنے اڑوس پڑوس کے دو تین کوارٹروں کے پھیرے لگاتی پھرتی۔ پڑوس کے گھروں میں اس کے جتنا چھوٹا اور پیارا بچہ کوئی نہ تھا، لہذا اس کی مانگ بہت تھی۔ جو بھی اسے دیکھتا اپنے پاس بلاتا مگر وہ ذرا کم ہی کسی کی بات پر توجہ دیتی ورنہ ادھر آئی اور ادھر گئی کا سلسلہ جاری رہتا۔ ظہور ان کے برابر کے کوارٹر میں رہتا تھا وہ اس کے بھائی کا ہم عمر اور ہم جماعت تھا۔ ظہور اور سلیم ان دنوں چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے۔ اس کی بھی بہن رابعہ دوسری جماعت میں تھی۔ ظہور کے ابا زینب کو اکثر گود میں لے کر پیار کرتے اور پوچھتے زیبو تم کب تک بڑی ہوجاؤ گی۔ زیبو جواب یوں کہتی "تین چار گھنٹے میں" اچھا یہ بتاؤ تم بڑی ہو کر کیا بنوگی "؟ " دلہن " زینب جواب دیتی۔ ایک دن یوں ہی ظہور کے ابا زینب سے باتوں میں اپنا اور اس کا دل بہلا رہے تھے کہ پاس بیٹھے ہوئے ایک چھوٹے بچے نے سوال داغ دیا " زیبو تم بڑی ہوکر کس کی دلہن بنوگی ؟ جواب میں زینب نے قریب بیٹھے ہوئے ظہور کی طرف اشارہ کردیا اور پھر سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

کچھ عرصے کے بعد ظہور کے ابا نے واشنگ لائن کی رہائش ترک کردی اور محلہ تیزاب احاطہ میں رہائش اختیار کرلی۔ ظہور اور سلیم کی ساتھ ساتھ تعلیم جاری رہی۔ ظہور اکثر سلیم کے پاس آتا۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ امتحانوں کے زمانوں میں کبھی ظہور سلیم کے پاس آتا اور کبھی دن میں اور کبھی رات گئے تک ان کے ہاں سلیم کے ساتھ پڑھائی میں مصروف رہتا۔ ظہور شروع ہی سے اسے اپنا اپنا سا لگتا۔ زینب کو وہ سارے لمحات یاد آگئے۔ جب وہ اسے تکا کرتی تھی اور اگر کبھی نظر مل بھی گئی تو فوراً نظروں کو جھکا لیا کرتی تھی۔ پہلے تو اپنی نظروں کا مقصد خود اسے بھی معلوم نہ تھا۔ جب اس کے تصورات اور احساسات نے کچھ شکلیں اور معنی اختیار کئے تو بڑے بھائی کے دوست سے جو اسے اپنے دوست کی چھوٹی بہن ہونے کے ناطے چھوٹی بہن ہی کہہ کر پکارتا تھا اور ایسا ہی سمجھتا تھا، مارے شرم کے اپنے خوابوں اور دل کا حال نہ کہہ سکی اور اپنے خوابوں کو چپ چاپ اپنی نگاہوں میں چھپائے رہی۔ مدتوں تک آمنا سامنا ہونے کے باوجود نہ تو ان کی نظریں ہی ملیں اور نہ ہی اس کے دل کا حال ظہور پر واضح ہوا۔ زینب کو عمر بھر ایک خلش سی رہی۔ زینب کو یاد آیا ابا کہتے تھے کہ کچھ چیزیں ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملتیں جیسے ریل کی دو پٹریاں جو چاہے کتنی ہی طویل ہوں لیکن آپس میں کبھی نہیں ملیں گی بس ایسا ہی اس کا اور ظہور کا معاملہ رہا کہ ان کی تو آپس میں کبھی نظریں ہی نہ مل سکیں اور ظہور پر اس کے دل کا حال ہی نہ کھلا تو وہ آگے کا کیا سوچتی۔ بس زندگی کسی نہ کسی طرح گزرنی تھی سو گزر گئی۔ شوہر کے گھر وہ آباد تو ہوگئی مگر ایک کمی کا احساس ساری عمر رہا۔ محی الدین اسے آدھے راستے ہی میں چھوڑ کر اسٹیشن اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا تھا۔ زینب نے مرغیوں کے ڈربے کو صاف کیا کہ کئی دنوں سے صاف نہیں کیا تھا اور مرغیوں کو اس میں بند کرکے کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گئی۔

سامنے غلام نبی کے کوارٹر سے ریڈیو بجنے کی آواز آرہی تھی جس پر کوئی لہک لہک کر پڑھ رہا تھا؛

بھلا موئے تے وچھڑے کون میلے   ایویں جیوڑا لوک ولاندائی
دکھاں والیاں نوں گلاں سکھ دیاں وے   قصے جوڑ جہاں سناؤ ندائی

سہ پہر کو آنے والی پسنجر ٹرین کے آنے کا وقت ہوگیا تھا۔ اس کی سیٹی کی آواز سے پتہ چل رہا تھا کہ گاڑی اسٹیشن کے قریب آچکی ہے۔ زینب نے چادر سر سے پاؤں تک کھینچی اور آنکھیں موندلیں۔

● ○ ●

رپورٹ

شہزاد انجم

آزادی کے بعد اردو فکشن

(ساہتیہ اکادمی کا فکر انگیز سہ روزہ قومی سمینار)

" آزادی کے بعد اردو فکشن " کے موضوع پر ایک قومی سمینار ساہتیہ اکادمی دہلی کی جانب سے رابندر بھون نئی دہلی میں منعقد ہوا جس میں دہلی کے علاوہ علی گڑھ ، لکھنو ، بمبئی ، پٹنہ ، سری نگر ، حیدرآباد ، رامپور اور کئی دوسرے شہروں کے ممتاز ناقدین اور تخلیق کاروں نے شرکت کی ۔

سمینار کا افتتاحی اجلاس ۱۲ دسمبر ۱۹۹۷ء کو ساہتیہ اکادمی کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی جب کہ مہمانِ خصوصی محترمہ قرۃ العین حیدر صاحبہ تھیں ۔ مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے پروفیسر سچدانندن سکریٹری ساہتیہ اکادمی نے فرمایا کہ اردو ہندستان کی اہم تخلیقی زبانوں میں سے ہے ۔ اس زبان کی نثری اور شعری کئی اہم تخلیقات منظرِ عام پر آچکی ہیں ۔ ڈاکٹر سچدانندن نے اردو فکشن کے بتدریج ارتقا اور اس کی اہمیت و معنویت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا کہ ادب میں نئی تحریکیں اور نئے رجحانات ابھرتے رہتے ہیں ۔ اردو فکشن کو نئے نظریات کی نئی روشنی میں دیکھا جانا ضروری ہے ۔

محترمہ قرۃ العین حیدر نے فرمایا کہ میں نے جب لکھنا شروع کیا تو میں اپنی رو میں راستے طے کررہی تھی ۔ مجھے پہلی بار ممتاز شیریں کے مضمون " قرۃ العین حیدر ۔ ایک منفرد فن کار " سے اندازہ ہوا کہ میں باصلاحیت ہوں ۔ ناول " آگ کا دریا " کے بارے میں مجھے بعد میں پتہ چلا کہ یہ شعور کی رو میں لکھا گیا ہے ۔ میں نے ہمیشہ اپنی سوچ اور فکر کو اولیت دی اور اسی کے سہارے ناول و افسانے لکھے ۔ مجھے افسوس ہوتا ہے جب لوگ صرف " آگ کا دریا " کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں ۔ ایسا لگتا ہے گردشِ رنگِ چمن اور چاندنی بیگم لوگوں نے پڑھے ہی نہیں ۔ تخلیق کار اور نقاد میں ہمیشہ ایک بعد رہا ہے اور وہ رہے گا ۔ یہ بے حد افسوس کی بات ہے کہ ہم لوگ قدیم ادبی سرمایے کو محفوظ نہیں کر پارہے ہیں جب کہ اس کی اہم ضرورت ہے ۔ میں نے جب مطبع نول کشور کی پرانی کتابیں محفوظ کرنے کے لیے اتر پردیش اردو اکادمی سے بات کی تو انھوں نے جگہ کی تنگی کی وجہ سے معذرت کرلی جب کہ وہاں کئی کمرے خالی تھے ۔ بعد میں ان میں سے بہت ساری کتابیں جاپان کے ایک اردو ادیب اپنے ساتھ ٹوکیو لے گئے ۔ بعد میں کلیدی خطبہ پروفیسر وہاب اشرفی نے پیش کیا ۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے اس سمینار کو وقت کی ایک ضرورت تسلیم کیا اور مشاورتی بورڈ کے کنوینر ڈاکٹر عبدالصمد اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کو مبارک باد کا مستحق قرار دیا ۔ اپنے کلیدی خطبے " اردو فکشن ۔ چند مسائل " میں انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اردو فکشن کے سرمایے میں بنیادی حیثیت مختصر افسانے اور ناول ہی کی رہی ہے ۔ ترقی پسندی سے جدیدیت تک اور اس کے بعد اردو افسانے نے کئی منزلیں طے کی ہیں لیکن راستے ہموار نہیں رہے ہیں ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد اور آزادی سے پہلے کے افسانوں میں مختلف تحریکوں کی کارفرمائی الگ الگ طریقوں سے اثر قائم کرتی رہی ہے ۔ ترقی پسندی کو افسانے

کے ارتقا کا سنہری دور کہا جاسکتا ہے لیکن جب ترقی پسندی کے زیرِ اثر افسانہ ، تکرار کے سبب نئی تخلیقی جہت سے محروم ہونے لگا تو جدیدیت کے لیے راہ ہموار ہوگئی ۔ جدیدیت کے زیرِ اثر کچھ خاص نوع کے افسانوں کا چلن عام ہوا جنھیں علامتی اور تجریدی افسانوں کا نام دیا گیا ۔ ۱۹۸۰ء کے بعد کے افسانوں میں علامتوں کی طرف اندھا دھند بھاگ دوڑ کا سلسلہ کچھ تھما ہے اور مختصر افسانہ نگاروں نے بیانیہ سے اپنا رشتہ جوڑا ہے ، واقعہ سازی کی طرف دوبارہ توجہ ہوئی ہے اور کہانی پن یوں واپس آیا ہے کہ نئے افسانہ نگاروں نے زیادہ تر انتظار حسین کی راہ اختیار کرلی ہے ۔

پروفیسر وہاب اشرفی نے ناول کے سلسلے میں کہا کہ ناول میں بھی تنوع کا فقدان ہے ۔ ساہتیہ اکادمی سے انعام یافتہ ناولوں کا ایک سرسری جائزہ لیجیے تو اندازہ ہوگا کہ وہی ذات کی شناخت یا تقسیم کے مسئلے اور کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے استحصال سے بات آگے نہیں بڑھتی ۔ " آگ کا دریا " ایک ایسا استثنا ہے جو اردو ناولوں کی تاریخ میں اپنے کینوس اور فنی برتاؤ کے سبب حرفِ اول بھی ہے اور حرفِ آخر بھی ۔

افتتاحی اجلاس کے آخر میں پروفیسر گوپی چند نارنگ اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ ادھر ہندستانی فکشن کی دنیا میں ایک سے ایک دھماکا ہوا ہے ۔ وکرم سیٹھ کے بعد اروندھتی رائے کی آمد ہندستانی ادبیات بالخصوص فکشن میں کوئی معمولی واقعہ نہیں ۔ اس ناول کا انتخاب بوکر ایوارڈ کے لیے بھی ہوا ہے ۔ بات ایک یا دو ناموں کی نہیں ، فضا بنانے میں بہت سے نئے لکھنے والوں کا ہاتھ ہے روہنٹن مستری ، امت چودھری ، اردشیر وکیل ، امیتا گھوش ، ششی تھارر ، کرن ڈیسائی ، وکرم چندر وغیرہ ۔ ان میں زیادہ تر وہ ہندستانی ہیں جو باہر بس گئے ہیں ۔ اس کو نوآبادیت کا ردِ عمل کہیے یا اپنے ثقافتی تشخص کا اثبات کہ نئے لکھنے والے ، انگریز اہلِ زبان سے بہتر انگریزی لکھ رہے ہیں اور اپنی تخلیقی قوت سے سب کو ششدر بھی کر رہے ہیں ۔ ایسا نہ ہوتا تو " نیویارکر " جیسا نک چڑھا رسالہ ہندستان کی آزادی کی پچاسویں سالگرہ پر ہندستانیوں کے نئے فکشن کو خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور نہ ہوتا ۔ نیویارکر کے خصوصی نمبر میں گیارہ سرکردہ ناول نگاروں کی یادگار تصویر چھاپی گئی ہے جس کے لیے ان سب کو لندن کے ایک اسٹوڈیو میں مدعو کیا گیا اور اڈیٹوریل میں ہندستان کے نئے فکشن نگاروں کی ادبی و فنی صلاحیتوں کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے ۔ (ملاحظہ ہو نیو یارکر شمارہ ۳۰ جون ۱۹۹۷ء) ان نئے ناولوں میں زیادہ تر ہندستانی یا جنوب ایشیائی زندگی اور ثقافت کی تخلیقی ترجمانی ہے ۔ معاصر فکشن نگار جو ہندستانی علاقائی زبانوں میں لکھ رہے ہیں ، ان کا بھی ذکر ہے ۔ سعادت حسن منٹو کو یہ کہہ کر خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے کہ زندگی کی بے لاگ ترجمانی میں آج بھی منٹو ایک روشن مثال ہے ۔ البتہ رشدی کے اس بیان سے بجاطور پر اختلاف کیا گیا کہ اعلیٰ فکشن فقط وہی نہیں جو انگریزی میں لکھا جارہا ہے ۔ پروفیسر نارنگ نے اصرار کیا کہ سچا ہندستانی ادب آج بھی عملاً ہندستانی زبانوں میں تخلیق ہورہا ہے ۔ اچھے تراجم کی عدم موجودگی کا یہ مطلب نہیں کہ اعلیٰ ناول فقط انگریزی میں لکھے جارہے ہیں ۔ ترجمانی کے لیے آج بھی بشمول قرۃ العین حیدر کے شورام کارنتھ ، تکژی شوشنکر پلے ، آننت مورتی ، مہاشویتا دیوی ، کرشنا سوبتی ، وجے تندولکر ، اوپی وجے ین ، نرل ورما ، امرتا پریتم اور کئی دوسرے صفِ اول کے ہندستانی زبانوں کے مصنفین زیادہ معتبر حیثیت رکھتے ہیں ۔ اردو فکشن کو بھی آج اس بڑے پے نوراما میں دیکھنے کی ضرورت ہے ۔ سوچنے کی بات ہے کہ شکست و ریخت کے اس دور میں قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین موجودہ عہد کا معتبر حوالہ اپنی کن ادبی خوبیوں کی وجہ سے بن گئے ہیں ؟ اور یہ کہ دوسری زبان کے لوگ آج بھی منٹو اور بیدی کا نام احترام سے

لینے پر کیوں مجبور ہیں ؟ افسانے میں تجربے برحق ، نیز ذات اور دروں بینی کی اہمیت سے بھی انکار نہیں لیکن سماج اور ثقافت سے یکسر بے تعلقی بھی فکشن کو راس نہیں آتی ۔ اصل معنویت تو زندگی ہی سے آتی ہے اور زندگی کے گہرے مسائل سے ۔ ان سب کی آگہی ضروری ہے ۔ غیر مشروطیت سے مراد یہی ہے کہ فن کار پروگرام یا دی ہوئی لیک کا پابند نہیں ، لیکن لکھنے والا مادر پدر آزاد بھی نہیں ۔ ہر بڑا ناول اس کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ ہر جینوین تخلیق کار کسی نہ کسی نظریہ ، اقدار کی پاس داری کرتا ہے یعنی انسانی اقدار اور ثقافتی اقدار کی ۔ اور یہی آئیڈیولوجی ہے ۔ فقط کمیونزم ہی آئیڈیولوجی نہیں ۔ اقدار کا ہر نظام ایک نوع کی آئیڈیولوجی ہوتا ہے ، اس فرق کو سمجھنا بہت ضروری ہے ۔ موجودہ سمینار پچاس سالہ روایت کا محاسبہ کرے گا اور امید ہے کہ فن کے نئے مطالبات بھی زیرِ بحث آئیں گے ۔ آخر میں ڈاکٹر عبدالصمد ، ساہتیہ اکادمی اردو مشاورتی بورڈ نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا ۔

دوسرے اجلاس کا آغاز لنچ کے بعد ڈھائی بجے ہوا ، جس کی صدارت کی ذمہ داری داری جوگندر پال کو دی گئی ۔ بلراج کومل نے اپنے مقالے " آزادی کے بعد اردو ناول " انسانی اور سماجی سروکار میں اس پر زور دیا کہ آزادی کے بعد وجود میں آنے والے عصری ناول کا ایک قابلِ ذکر پہلو روایتی ، مذہبی ، اخلاقی رویوں سے انحراف ہے ۔ اقدار کے زوال و انہدام کا منظر نامہ کم و بیش تمام عصری ناولوں کا حصہ ہے ۔ عصری اردو ناول میں نجی انفرادی احتجاج تو کہیں کہیں موجود ہے لیکن الیاس احمد گدی کا ناول فائر ایریا اجتماعی احتجاج کی جانب واضح اشارہ کرتا ہے ۔ حال کے برسوں میں کچھ ایسے ناول بھی سامنے آتے ہیں جو اقلیتوں ، استحصال کی زد میں آئے ہوئے لوگوں ، نیز عورت مرد کے مسائل کو مشروط حوالوں اور خوش گوار امکانات کا سہارا لیے بغیر پیش کرتے ہیں ۔ عبدالصمد کے ناول " دوگز زمین " اور " خوابوں کا سویرا " مشرف عالم ذوقی کا " بیان " اس سلسلے کی قابلِ ذکر کوششیں ہیں ۔ اقدار کے زوال و انہدام کا منظر نامہ کم و بیش تمام عصری ناولوں کا حصہ ہے ۔ بلراج کومل نے آخر میں کہا کہ وہ اردو ناول جو رزمیہ انداز میں عصر کے سارے منظر نامے کو اس کے تمام تر تضادات اور امکانات کے ساتھ پیش کر سکے اور دوستو وسکی یا کزنتزا کی کے زور بادی گریک جیسا کوئی کوہ قامت اور ہمہ جہت کردار تخلیق کر سکے فی الحال معرضِ امکاں میں ہے ۔

بلراج کومل کے اس مقالے کے بعد لکھنو سے تشریف لائے ممتاز و منفرد افسانہ نگار پروفیسر نیر مسعود کو مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی ۔ نیر مسعود نے اپنا مقالہ " آزادی کے بعد اردو افسانہ : رجحانات اور مسائل " کے موضوع پر پیش کیا ۔ انھوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد سے دورِ حاضر تک کے افسانوں پر فن ، تکنیک اور موضوع کے اعتبار سے روشنی ڈالی ۔ انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ترقی پسندوں کی خارجی شناخت جس رویے سے قائم ہوئی تھی شروع میں وہی رویہ ادب کا معیار قائم پایا تھا اور جو ادب اس رویے کے تحت نہیں لکھا جارہا تھا وہ غیر معیاری اور پس ماندہ قرار ٹھہرا تھا ۔ یہی صورت جدیدیت کے ساتھ پیش آئی کہ جو بھی افسانے اس رویے کے تحت لکھے گئے وہ جدید یعنی معیاری ٹھہرے لیکن خود ان افسانوں کے مابین خوب و زشت ، پست و بلند کی پہچان طے نہیں پا رہی تھی ۔ نیر مسعود نے عصرِ حاضر کے افسانوں پر ان خیالات کا اظہار کیا کہ اب افسانے کا وہ موجودہ دور شروع ہوا جسے کہانی کی واپسی کا دور کہا گیا ہے ۔ بیانیہ افسانے لکھنے کا رجحان بڑھنے لگا ہے ۔ آج کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع بڑھ رہا ہے ۔ سماجی مسائل اور خارجی حقائق کی تصویریں بھی نظر آرہی ہیں اور ابہام و تجرید کا رجحان کم ہو رہا ہے ۔ اس طرح کا افسانہ نگار ابلاغ کے مسئلے سے دوچار نہیں ہے لیکن اب اس کے سامنے ذرائع ابلاغ کا مسئلہ ہے جس کا تعلق مابعد جدید دور کی نئی پیچیدہ صورتِ حال سے ہے ۔

ان مقالوں پر پروفیسر ابوالکلام قاسمی ، جوگیندرپال ، بلراج کومل ، انیس اشفاق ، ارتضیٰ کریم ، شموئل احمد اور مشرف عالم ذوقی نے بحثیں اٹھائیں اور مسائل کی گرہیں کھولیں ۔

۱۳ دسمبر ۱۹۹۷ ، دوسرا اجلاس پروفیسر حامدی کاشمیری کی صدارت میں شروع ہوا ۔ سب سے پہلے پروفیسر ابوالکلام قاسمی کو مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی ۔ پروفیسر قاسمی نے اپنا مقالہ " آزادی کے بعد کے اردو ناول کے سیاسی حوالے " پیش کرنے سے پہلے یہ وضاحت کی کہ کسی سیاسی تحریک یا رویے کو ناول کے فارم میں کس طرح تبدیل کیا جاسکتا ہے ۔ آزادی سے پہلے اور بعد میں بہت سے ایسے ناول لکھے گئے جس میں سیاسی موضوعات ہیں لیکن صرف ان ہی ناولوں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جو ادبی معیار پر پورے اترتے ہیں ۔ ابوالکلام قاسمی نے اپنے مقالے میں آزادی کے بعد لکھے گئے اہم سیاسی ناولوں کا تفصیل سے ذکر کیا اور اس خیال کا اظہار کیا کہ اردو میں بعض ایسے ناول لکھے گئے ہیں جن میں سیاست براہِ راست زیرِ بحث آتی ہے اور ایسے ناول تو کثیر تعداد میں ملتے ہیں جن میں ضمنی اور ذیلی حوالے کے طور پر بعض سیاسی واقعات یا تاریخ کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں ۔ اگر ان دونوں طرح کے ناولوں میں سیاسی موضوعات ناول نگاری کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں تو ایسے ناول سنجیدہ مطالعہ کے دائرہ ، کار میں نہیں آتے ۔ قاسمی صاحب نے اپنے مقالے کے اختتام پر کہا کہ آج معاصرِ زندگی کے بیش تر معاملات جس قدر سیاست یا سیاسی محرکات کے تابع ہوچکے ہیں ، اس کے پس منظر میں اردو ناولوں کے سیاسی حوالے اس بات کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہیں کہ ہمارے ناول نگاروں نے زندگی کے روز بہ روز اہم ہوتے ہوئے محرک کو اپنے ناولوں میں نظر انداز نہیں کیا ہے اور نئی نسل کے ناول نگاروں نے معمولی سیاسی ارتعاشات کو بھی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے ۔ اس کے باعث یہ امکان پیدا ہوچلا ہے کہ سیاسی شعور اور ناول نگاری کی فنی تدابیر کی آمیزش سے کسی بڑے سیاسی ناول کے ظہور کا مژدہ مستقبل قریب میں سن پائیں گے ۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے یہ بھی کہا کہ " آخرِ شب کے ہم سفر " سیاسی اعتبار سے " آگ کا دریا " سے آگے ہے ۔ " دوگز زمین " اور کسی حد تک " خوابوں کا سویرا " اردو ناول میں ایک اہم اضافہ ہے ۔ ثقافتی نظریہ بہت معنی خیز اور فن کارانہ ہے ۔ عبداللہ حسین کا ناول " نادار لوگ " بھی موضوعاتی اعتبار سے بے حد اہم ناول ہے ۔ اس مقالہ کے بعد بحث میں حصہ لیتے ہوئے محترمہ قرۃ العین حیدر نے کہا کہ سیاسی اور سماجی ناول کو الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹ سکتے جب کہ زیڈ ۔ ایم ۔ قریشی کسی ناول میں صرف ایک زاویہ ، فکر کا ذکر کرنے کی مخالفت کرتے ہیں ۔ بلراج کومل ، فیاض رفعت اور اسلم خاں بھی مباحثے میں شامل ہوتے ہیں اور سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا سیاسی عنصر یا سیاسی حوالے کی بنا پر کسی ناول کو سیاسی قرار دیا جاسکتا ہے ۔

دوسرا مقالہ انور خاں نے " اردو ناول ـــ رویے اور اسالیب " کے موضوع پر پیش کیا ۔ انھوں نے مختلف اہم ناولوں کے رویے اور اسالیب کا جائزہ لیتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا کہ گزشتہ پچاس سال کے بیشتر قابلِ ذکر ناولوں کا بنیادی حوالہ سیاست ہے ۔ چاہے وہ تقسیم کے پہلے کی سیاست ہو یا بعد سے آج تک کی ۔ اس سیشن میں تیسرا مقالہ انیس اشفاق نے " آزادی کے بعد اردو ناول میں تکنیک اور اسلوب کا جائزہ " پیش کیا ۔ سوال و جواب کے انداز میں لکھا گیا یہ مقالہ خاص طور پر موضوع بحث بنا اور اس بات سے بالعموم اختلاف کیا گیا کہ تکنیک اسلوب ہے اور اسلوب موضوع ہے ۔ البتہ جب ہم ناول پڑھتے ہیں تو ان سب کی ملی جلی تخلیقی وحدت جمالیاتی اثر پیدا کرتی ہے ۔ چوتھا پرچہ ڈاکٹر خورشید احمد کا تھا ۔ انھوں نے اپنے مقالے " معاصر ناول ، ہیئت و اسلوب کے چند

پہلو " میں نئی نسل کی کاوشوں پر گفتگو کی اور بتایا کہ ہیئت اور اسلوب کے لحاظ سے نئے ناولوں کو دو خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔ ایسے ناول جو حقیقت پسند روایت کو نیا تناظر عطا کرتے ہیں ۔ مثلاً دو گز زمین ، مکان ، فرات ، فائر ایریا وغیرہ ۔ دوسرے ایسے ناول جن میں حقیقت نگاری کی رسومیات سے گریز کا میلان ہے اور ساتھ ہی زبان کے تئیں خاص رویہ ملتا ہے ۔ مثلاً پانی ، نمبر دار کا نیلا ، گیان سنگھ شاطر اور آخری داستان گو وغیرہ ۔ ڈاکٹر خورشید نے ان ناولوں کا جائزہ پیش کیا اور ان کے ہیئت و اسلوب پر روشنی ڈالی ۔ جوگیندر پال نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ ہر ناول ایک جگہ بناتا ہے اور اس ناول سے یہ طریقہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے کس طرح برتا جائے ۔ عینی آپا نے کہا کہ اردو افسانے کا صرف ایک مسئلہ ہے وہ یہ کہ اس میں قاری کی کمی ہورہی ہے ۔ گوپی چند نارنگ ، شمس الحق عثمانی ، شموئل احمد ، اوما شنکر ستیش ، پیغام آفاقی ، اسلم خاں ، رتن سنگھ اور عزیز پریہار نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔

۱۳ دسمبر ۱۹۹۷ء دوپہر کے بعد کے اجلاس کی صدارت رتن سنگھ نے کی جو اس سمینار کا تیسرا اجلاس تھا ۔ پہلا مقالہ پروفیسر حامدی کاشمیری نے " اردو افسانے میں موضوعیت کا مسئلہ " کے موضوع پر پیش کیا ۔ جس میں انھوں نے وضاحت کی کہ آزادی کے بعد برِ صغیر کو تاریخ کے ایک ایسے بحرانی دور سے گزرنا پڑا جس نے سماجی اور سیاسی اور نت نئے مسائل کو جنم دیا اور افسانہ نگاروں نے موضوعی روایت کی پاس داری کرتے ہوئے متعدد موضوعی افسانے لکھے ۔ ان افسانوں میں بظاہر فنِ افسانہ کے عناصرِ ترکیبی یعنی پلاٹ ، کردار ، نظریہ ، مصنف اور منظر کا التزام کیا گیا ہے مگر یہ عمل بیش تر صورتوں میں میکانکیت اور فارمولیت پر منتج ہوا ۔ نتیجتاً افسانے کی روح سکڑ کر رہ گئی ۔ حامدی کاشمیری نے اس نکتے پر توجہ دلائی کہ جدیدیت کے دور میں ایسے افسانے بھی لکھے گئے جو فنی لوازم سے محروم ہوگئے ، علامت نگاری کے نام پر معمہ سازی کی گئی ۔ قصے کو تجریدیت کی بھینٹ چڑھا دیا گیا ، افسانے اور انشائیے کی حدِ امتیاز کو مٹا دیا گیا ، پلاٹ کا یکسر اخراج کیا گیا اور نثری اسلوب کو طول کلامی اور لفاظی کے مرادف سمجھا گیا اور قاری افسانہ کی یہ درگت دیکھ کر اپنا سر پکڑ کر رہ گیا ۔ تاہم ۱۹۸۰ء سے نئی نسلوں کے افسانہ نگاروں نے صنفِ افسانہ کی گم شدہ حرمت کی بحالی کا احترام کیا اور اس پر کی گئی زیادتیوں کے خلاف اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا ۔ پروفیسر حامدی کاشمیری نے اس رویے کو خوش آئند بتایا کہ اردو میں افسانہ کئی نشیب و فراز سے گزر کر اب زیادہ سے زیادہ اپنے تخلیقی وجود کی آگہی پیدا کرنے میں کوشاں ہے ۔ اس اجلاس میں دوسرا مقالہ پروفیسر سیدہ جعفر نے " اردو افسانہ آزادی کے بعد " پیش کیا ۔ جس میں انھوں نے اردو افسانے کا جائزہ لیتے ہوئے موجودہ افسانے پر اظہارِ خیال کیا کہ آج کا افسانہ نئی معنویت کا متلاشی ہے اور انسانی تجربات کی تہہ دار تہہ پرتیں کھولنے کا متمنی ہے ۔ آج کے افسانہ نگاروں کو حیات کی تلوّن مزاجی اور اس کی تیز رفتاری دونوں کا ادراک حاصل ہے ۔ بدلتے ہوئے رشتوں کے عرفان نے نئے افسانے کو زندگی کا مزاج شناس بنادیا ہے ۔ اس اجلاس کا اگلا مقالہ شافع قدوائی نے " آزادی کے بعد اردو افسانہ ۔ شناخت کا ایک نیا حوالہ " کے موضوع پر پیش کیا شافع قدوائی نے اپنے مقالے کا آغاز ان جملوں سے کیا کہ تقسیمِ وطن کے بعد اردو افسانہ میں اسلوب اور مواد دونوں سطحوں پر انقلاب آفریں اور دور رس نوعی تبدیلیاں رونما ہوئیں ۔ غیر ادبی مقصدیت ، اخلاقی نقطہ ، نظر اور نصب العین اساس کے سیدھے سادے اور اکہرے بیانیہ افسانے نے حقیقت نگاری کے پیش پا افتادہ اور روایتی نقطہ ، نظر سے نہ صرف انحراف کیا بلکہ منطقی تنظیم ، آغاز ، وسط ، انجام اور معنی وحدت کے تصور کی بھی یک سر تقلیب کردی ۔ ڈاکٹر شافع قدوائی نے مقالے کے آخری حصے میں نیر مسعود کے افسانوں کا جائزہ پیش کیا اور ان کے افسانوں کے امتیازات کی اجمالاً نشان دہی کے بعد یہ رائے دی کہ نیر مسعود کے

افسانے نہ صرف واقعیت اور زمان و مکاں کی مروجہ تقدیر پر سوالیہ نشان قائم کرتے ہیں بلکہ ان کے افسانے اردو میں مابعد جدید افسانے کا ڈسکورس بھی قائم کرتے ہیں ۔

ان مقالوں پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ حامدی کاشمیری نے موضوعات کے ساتھ ساتھ فنی لوازم کے فرق کو محسوس کرایا ۔ نارنگ صاحب نے اسلوب اور تکنیک کے حوالے سے بہت اچھی بات کہی تھی کہ فنی وسائل یا تدابیر مقصود بالذات نہیں ، ان کا کام اثر پیدا کرنا ہے ۔ شمس الحق عثمانی نے کہا کہ موضوعیت کے مسئلے سے نصف اول مقالہ میں حامدی کاشمیری نے نہایت اہم نکتے اٹھائے ۔ انیس اشفاق نے کہا کہ کیا شافع قدوائی کا " اپروچ " دس برس پہلے وہی ہوتا جو آج ہے ؟۔ نیر مسعود کا ایک افسانہ ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا دوسرا ۱۹۸۶ء میں ، آج مابعد جدید کیسے ؟ نارنگ صاحب نے وضاحت کی کہ ہر پیڑھی اپنی توقعات کے افق پر فن کاروں کو پڑھتی ہے ۔ آج جب ہم غالب اور جدید ذہن میں ربط دیکھتے ہیں تو " جدید " معنی میں تب کہاں تھا۔ اسی طرح جب میراجی اور راشد نے شاعری شروع کی تو جدیدیت کہاں تھی ؟ سچی بات تو یہ ہے کہ مابعد جدید فکشن کی نشانیاں تو قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں ۔ اگر شافع قدوائی نیر مسعود کے فکشن میں بعض مابعد جدید رویوں کی نشان دہی مدلل کرتے ہیں تو سنجیدہ توجہ کی ضرورت ہے ۔ ان مقالوں پر جوگیندر پال اور اسلم خاں نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔

سمینار کا چوتھا اجلاس ۱۴ دسمبر ۱۹۹۷ء صبح دس بجے ڈاکٹر صغرا مہدی کی صدارت میں منعقد ہوا ۔ پہلا مقالہ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے پیش کیا ۔ اپنے مقالے " نئی کہانیوں میں کردار کا زوال " میں انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہمارے نئے افسانہ نگار اپنی کہانیوں میں بڑے مثالی اور یادگار یا ایسے کردار نہیں پیش کر پا رہے ہیں جو ہمارے ذہن اور دماغ پر اپنا دیرپا اثر چھوڑ سکیں ۔ انھوں نے اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ کردار کا زوال بہ طور آرٹ بھی ہوا ہے ۔ ہمارے نئے افسانہ نگار فنی اعتبار سے بھی اپنی کہانیوں میں کامیاب کردار نہیں پیش کرپا رہے ہیں ۔ اس مقالہ پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر صادق نے کہاکہ ارتضیٰ کریم کا یہ مفروضہ ہے کہ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء تک لازوال کردار نہیں آئے جب کہ قرۃ العین حیدر ، جوگیندر پال ، انتظار حسین اور غیاث احمد گدی کے افسانوں میں کئی لازوال کردار ہیں ۔ اس اجلاس کا دوسرا مقالہ ڈاکٹر صادق نے " قدیم فنی ہیئتیں نئے قالب میں " پیش کیا اور اس خیال کا اظہار کیا کہ آزادیِ وطن کے بعد ہمارے افسانہ نگاروں نے جہاں نت نئے فنی تجربوں اور تکنیکوں سے مختصر افسانے کے فن کو بہرہ مند کیا وہیں افسانے کی قدیم روایتی ہیئتوں کو بھی نئے اسلوب و فکر و انداز میں فن کارانہ طور پر برتنے کی سعیِ مسلسل کی اور اس طرح اردو افسانے کی قوت واثر اور اس کی وسعتوں میں اضافہ ہوتا گیا ۔ ڈاکٹر صادق نے مزید کہا کہ آج کے افسانے میں تمثیل ، اسطور ، حکایت اور فیبل بلکہ ملفوظات جیسی قدیم ہیئتیں پھر راہ پا رہی ہیں جو متن پر متن کا مابعد جدید رویہ ہے جس میں حقیقت اور فنتیسی کا تال میل ہے ۔ ڈاکٹر صادق کے بعد شموئل احمد کا مقالہ " آزادی کے بعد اردو افسانہ " کافی بحث انگیز رہا ۔ اس مقالہ میں شموئل احمد نے گزشتہ ۵۰ برس کے افسانوں کے رویوں ، رجحانات ، موضوعات اور تکنیک پر کھل کر گفتگو کی اور آزادانہ اپنی آرا پیش کیں ۔ شموئل احمد نے مضمون کے آخر میں اس خیال کا اظہار کیا کہ آج تخلیق تنقید پر حاوی ہے ، جدیدیت کے دور میں افسانے نے قاری کو رد کیا اور ناقد کو گلے لگایا ۔ آج کا افسانہ قاری کو گلے لگاتا ہے اور ناقد کو رد کرتا ہے ۔

ان مقالوں کے بعد بحث کا آغاز ہوا تو ساجد رشید نے کہا کہ شموئل احمد لائق مبارک باد ہیں ۔ ۱۹۸۵ء میں ہاتھ باندھ باندھ

ر نقاد سے اجازت طلب کی جارہی تھی اور ہم لوگوں نے احتجاج کیا تھا ۔ ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ ہم نے حال اور مستقبل کے امکانات پر غور نہیں کیا ۔ یہ ہونا چاہیے ۔ نئی نسل کے افسانہ نگار لتے اہم افسانے کیوں نہیں لکھ رہے ہیں جو ماضی میں لکھے گئے ؟ ہم لوگ بار بار انتظار حسین ، سریندر پرکاش اور نیر مسعود کی طرف کیوں دیکھتے ہیں ۔ مجھے عینی آپا سے بھی شکایت ہے انھوں نے پچھلے دس سال سے افسانہ نہیں لکھا ۔ ذرائع ابلاغ اور صارفیت کی یلغار نے چیلنجز پیش کیے ہیں ۔ شموئل احمد نے ان پر غور نہیں کیا ۔ افسانے کے بنیادی مسائل پر ضرور گفتگو ہونا چاہیے ۔ ارتضیٰ کریم کے مقالے سے مجھے امید تھی لیکن انھوں نے بہت سے نکات نہیں اٹھائے ۔ اخلاقیات سے آپ ناول یا افسانے کے کردار کو بڑا نہیں بناسکتے ، بڑے کردار شریف نہیں ہوتے' کردار ہمیشہ تضادات سے پیدا ہوتے ہیں ۔ ابوالکلام قاسمی کے بعد حامدی کاشمیری نے کہا کہ قاسمی صاحب کی پرجوش گفتگو کے بعد میں آہستگی سے اپنی بات رکھنا چاہتا ہوں ۔ شموئل صاحب کے مقالے میں عمومی بیانات عجلت میں دیے گئے ہیں ان کا جواز پیش نہیں کیا گیا ہے ۔ یہاں عام تاثر یہ ابھرا ہے کہ افسانہ نگار اور نقاد میں زبردست کشمکش ہے ۔ تخلیق کار نقاد کو Dictate نہیں کرتا ۔ تخلیق کار آزاد ہوتا ہے ۔ عینی آپا نے Inner Urge کے مطابق آگ کا دریا لکھا بعد میں لوگوں نے شعور کی رو دریافت کی ۔ شمس الحق عثمانی نے کہا کہ ہم لکھتے تبھی ہیں جب سمینار سے بلاوا آتا ہے یا جب کسی رسالہ میں گوشہ نکلتا ہے ۔ ادیبوں کا مسئلہ محض ترقی پانا رہ گیا ہے ۔ اگر ایسا ہے تو فلیپ پر ناقدوں سے لکھانا چھوڑ دیں ۔ آخر میں پروفیسر گوپی چند نارنگ سے درخواست کی گئی کہ تمام نکات کو سمیٹیں اور اپنی رائے سے مباحث کو اختتام تک پہنچائیں ۔ نارنگ صاحب نے کہا کہ آپ ضرور دل کی بھڑاس نکالیں لیکن اپنی اصلاح بھی کریں ۔ اگر ہم ہر چیز میں کیڑے ڈالیں گے تو ئی بھی کام نہیں کرپائیں گے ۔ شموئل احمد صاحب کی بعض باتوں سے آپ اختلاف کرسکتے ہیں لیکن اگر ان کی پیڑھی کے لوگ اس طرح کے مضامین زیادہ سے زیادہ لکھیں ، طرفوں کو کھولیں ، نیا ڈسکورس قائم کریں ، اپنی رائے بنائیں ، تو اس سے تخلیق کار کو فائدہ ہی ہوگا ۔ اگر ان کی بہت سی باتوں کا ردِ عمل ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے پرچے میں بعض اہم باتیں تھیں ۔ انھوں نے منٹو ، بیدی ، سریندر پرکاش ، نیر مسعود اور جدید لکھنے والوں پر خاصی تفصیل سے آزادانہ رائے دی ہے ۔ منٹو کا تخلیقی منظر نامہ میرے نزدیک جنسی ہے ہی نہیں وہ تو عورت کے داخلی وجود کے سنسان پن اور اس کی روح کی کراہ کی آواز ہے ۔ سریندر پرکاش بے شک ایک ہوشیار تخلیق کار ہیں ، انھوں نے جدید افسانے لکھ کر اپنی تخلیقیت کا لوہا منوایا اور پھر بیانیہ انداز میں بھی کہانیاں لکھیں ، خود کو بدلنا گناہ نہیں ، ادب میں سب سے بڑا گناہ ضد ، اپنے جہل پر اصرار اور دانش دشمنی ہے ۔ آج کل دانش دشمنی عام ہے ۔ فن کے لیے محنت ، تربیت اور غور شرط ہے ۔ زبان کا شعور ، صنف کا شعور اور روایت کا شعور یہ سب بہت ضروری ہیں اور ان کا گہرا تعلق آگہی اور بیدار ذہن سے ہے ۔ پروفیسر نارنگ نے مزید کہا کہ مابعد جدیدیت ، نیز مشرقیت کے نام پر پھیلائی جانے والی گمراہی اور کیا تخلیق واقعی تنقید سے بے نیاز ہوسکتی ہے ، ان نکات پر مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے ۔ اردو اکادمی کے مابعد جدیدیت سمینار کا ذکر آیا ، ہم جب جذباتی ہوجاتے ہیں تو پوری سچائی سے آنکھیں بند کرلیتے ہیں ، حالاں کہ وہ سمینار فقط مابعد جدیدیت پر نہیں تھا " ادب کا بدلتا منظر نامہ " پر تھا ۔ اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ منظر نامہ بدل نہیں رہا ۔ یہ بات تو سامنے کی ہے کہ جس دور میں ہم داخل ہوچکے ہیں وہ جدیدیت کے بعد کا دور ہے ، جدیدیت سے پہلے کا نہیں اور جس صورتِ حال سے آج کا انسان دوچار ہے وہ مابعد جدید صورتِ حال ہے ۔ مابعد جدیدیت کا مطلب یہی ہے بعد جدیدیت یا جدیدیت کے بعد ۔ یہ کسی کی ذاتی اصطلاح نہیں ، اردو میں بھی اس

کا چلن کئی برسوں سے ہے ۔ یہ ہر نظریئے اور فارمولے کے خلاف ہے ۔ اس میں کئی رویوں کا چلن ہے ۔ اردو میں اس کی تعریف کر
ہوگی ، اس کا فیصلہ اردو تخلیق سے ہوگا ۔ اس کی تعریف ہماری اپنی ضرورت ، ہماری اپنی روایت اور ہماری اپنی ثقافت کی رو سے
ہوگی ۔ میں اس کی محدود تعریف کرنا اس لیے بھی مناسب نہیں سمجھتا کہ خود مابعد جدیدیت اوپر سے لادی ہوئی تمام تعریفوں کے خلاف
ہے ، البتہ یہ ایک مختلف صورتِ حال ہے جس کے سروکار اور مسائل مختلف ہیں اور یہ دور تاریخی طور پر جدیدیت کے بعد کا دوا
ہے ۔ لطف کی بات یہ ہے کہ تیس پینتیس برس پہلے جب ترقی پسند پسپائی محسوس کرتے تھے اور جدیدیت کو رد کرتے تھے ، تو اسی
سانس میں وہ جدیدیت کو ترقی پسند کی توسیع بھی قرار دیتے تھے ۔ ایسا کچھ اب بھی ہورہا ہے ۔ ایک طرف تو مابعد جدیدیت کو رد کیا جا
ہے لیکن اسی سانس میں مابعد جدیدیت کو جدیدیت کی توسیع بھی کہا جارہا ہے ۔ ایسے لوگ مابعد جدیدیت تو کیا جدیدیت کو بھی نہیں
سمجھتے کہ کس طرح تین دہائیوں تک سماجی ثقافتی ڈسکورس کی جڑ کاٹ کر ادب کو یرقان زدہ بنادیا گیا ۔ فن اور فارم کی اہمیت کا احساس
برحق ، لیکن فن فقط رعایتِ لفظی یا ابہام بھی تو نہیں ۔ اس سے تو فقط ناتخیت (یا فرسودہ ادب) پیدا ہوسکتی ہے جس سے اردو اپنے
تاریخی ارتقا میں بہت آگے بڑھ آئی ہے ۔ مشرقیت کو بھی اسی تناظر میں دکھایا جارہا ہے اور مشرق کی محدود تعریف کی جارہی ہے
مغرب سے مرعوب ہونا غلط ہے لیکن بسم اللہ کے گنبد میں بند ہوجانا بھی اتنا ہی غلط ہے ۔ مشرقیت کی روح کو پانا ہے تو اسی طر
پلئیے جس طرح قرۃ العین حیدر یا انتظار حسین نے پایا ہے ۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ قرۃ العین حیدر اپنے ناولوں کے لیے کتنا
ریسرچ اور کتنا مطالعہ کرتی ہیں ۔ کتنا سفر کرتی ہیں ۔ فلسفہ کس طرح فکشن بنتا ہے ؟ ان کو دیکھیے کہ ان لوگوں کا مطالعہ کس قدر زبردست
ہے اور پھر تخلیقی قوت ، زمینوں اور زمانوں کا شعور ، آریائی ، بودھی و اسلامی ثقافت کی صدیوں پر پھیلی ہوئی روایت کی حیرت انگ
آگہی ۔ کیا یہ آگہی مشرق اور مغرب کے منفی خانے بنانے سے پیدا ہوتی ہے یا کھلے ڈلے آزادانہ تخلیقی سلیقے سے ؟ منٹو کی محنت کا
آپ کو اندازہ ہے کہ اس نے جو کچھ سیکھا فرانسیسی اور روسی شاہ کاروں کے ترجموں سے سیکھا ۔ پریم چند بہت ہندوستانی تھے لیکن ا
کے ماڈل فقط بنگالی نہیں ، ٹالسٹائی سے بھی وہ متاثر تھے ۔ بیدی نے چیخوف سے بہت کچھ سیکھا ۔ مشرقیت کا ہرگز یہ مطلب نہیں
آگہی و شعور کی دوسری تمام راہیں بند کردی جائیں ۔ اس طرح کی کوششیں فقط اپنی دوکان کو چمکانے کے لیے ہوتی ہیں اور ان ۔
خبردار رہنا بہت ضروری ہے ۔ ایک غیر ملکی خاتون نے حالی کی یک طرفہ تنقید کی تو ہمارے ایک فاضل نقاد نے بھی ان کی دیکھا دیکھ
کولونیل راگنی الاپنا شروع کردی ، یہ نہ سوچا کہ حالی کا مشرقی روایت کا شعور کس قدر بالیدہ اور رچا ہوا تھا اور حالی ہی کیا سرسید ا
آزاد بھی اردو میں نشاۃ ثانیہ کی کتنی بڑی کڑی ہیں بالکل جیسے بنگالی ادب کے لیے راجا رام موہن رائے ، ان کے بغیر تو جدید تاریخ
تصور ہی ممکن نہیں ۔ حالی اور آزاد نے جہاں فرسودگی کے خلاف آواز اٹھائی روایت کے صالح اور بامعنی حصے کی بازیافت بھی کی ا
نئے شعور کا دروازہ وا کیا ۔ رہی بات تنقید اور تخلیق کی تو ان دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ نیر مسعود نے کہا کہ آج تخلیق
نقاد کو Reject کرتا ہے ۔ دراصل " نقاد " سے مراد پوری تنقید ہرگز نہیں ۔ اگر کوئی نقاد حکم نامہ نافذ کرتا ہے اور تحکمانہ گفتگو کرتا ۔
اور اس کے ہدایت ناموں اور مکالموں سے افسانے کو نقصان پہنچتا ہے تو تخلیق کار کا غم و غصہ بجا ہے ۔ لیکن نئے لکھنے والوں
پوری تنقید کو کوسنا صحت مند رویہ نہیں ۔ یہ تو بالکل ایسا ہے کہ آپ ہاتھ ٹب کے پانی کے ساتھ بچے کو بھی پھینکنا چاہتے ہیں ۔ ج
افسانے نے قاری کو Reject کرنے کی غلطی کی تھی آج افسانہ قاری کی بحالی چاہتا ہے ۔ یہ نہ ہو کہ اب افسانہ تنقید کو Reject کر

اور دس بیس برس بعد اسے اپنی نادانی پر پچھتانا پڑے ۔ تخلیق ، تنقید اور قاری ایک مثلیث ہے ۔ ادب کا تصور ان تینوں کے بغیر ممکن نہیں ۔ اگر آپ ادب کا ادھورا تصور قائم کریں گے تو بعد میں پچھتاوا ہوگا ہی ۔ ہماری ایک بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم تبصروں اور تبصرہ نما مضامین ہی کو کل تنقید سمجھتے ہیں ۔ تنقید کی اساس نظریہ ، ادب یعنی تھیوری پر ہوتی ہے یعنی ادب کیا ہے ، شعر کیا ہے ، ناول افسانہ کیا ہے ، ادنیٰ اور اعلیٰ ادب کیا ہے ، معنیٰ آفرینی یا اثر آفرینی یا شعریت کیا ہے ؟ وغیرہ ، یہ تنقید کا جوہر ہے (دوسرے لفظوں میں ام التنقید) اس سے کسی تخلیق کار کو مفر نہیں ، ادب کے اس نوع کے تصورات لکھتے وقت ہر تخلیق کار کے ذہن میں مضمر ہوتے ہیں تبھی تو ہر تخلیق کا پہلا قاری خود تخلیق کار ہوتا ہے جس کے لیے آگہی شرط ہے ۔ گاندھی جی کی یہ بات جتنی ثقافتی امور کے لیے صحیح ہے اتنی ادبی امور کے لیے بھی کہ میں چاہوں گا کہ میرے قدم اپنی زمین پر مضبوطی سے جمے رہیں لیکن میں اپنے گھر کے دروازے اور کھڑکیاں کھلی رکھنا چاہوں گا تاکہ تازہ ہوائیں آتی رہیں ۔ ویسے علامہ اقبال نے بھی اس کشمکش کو محسوس کیا ہوگا اور کیا صحیح کہا ہے :

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر　　　قدرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

یہ سب باتیں روایت میں ہیں لیکن ہم پھر بھی غور نہیں کرتے ۔ غالباً اسی لیے نہج البلاغہ میں آیا ہے کہ " علما دنیا میں اکیلے ہیں اس لیے کہ اکثریت جہلا کی ہے " ۔ اشارہ کرتے اور بتاتے رہنا ہمارا فرض ہے ، مانیں نہ مانیں اس کا آپ کو اختیار ہے ۔

اس سمینار کا پانچواں اور آخری اجلاس لنچ کے وقفے کے بعد شروع ہوا ۔ اجلاس کی کاروائی ڈاکٹر عبدالصمد نے چلائی ۔ انور عظیم صاحب نے کہا کہ I and My Times کی بڑی اہمیت ہے ۔ ہر تخلیق کار جمالیات کی دنیا میں طرح طرح کے تجربے کرتا ہے ، تگ و دو کرتا ہے ۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنے عہد سے رشتہ بھی جوڑتا ہے اور متصادم بھی ہوتا ہے ۔ اس سمینار کے بعد ہم لوگ یہاں سے نکلیں تو ہمیں محسوس ہو کہ ہم لوگوں نے یہاں سے کچھ پایا ہے ۔ عظیم کی اس مختصر گفتگو کے بعد انور خاں ، محسن خاں ، عزیز پریہار ، نرنجن سنگھ تسنیم ، ساجد رشید ، رتن سنگھ ، گیان سنگھ شاطر ، ترنم ریاض ، پیغام آفاقی ، فیاض رفعت ، م ۔ م ۔ راجندر اور انجم عثمانی نے اس موضوع پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔ ساجد رشید نے کہا کہ یہ عہد ہمارے پیش روؤں سے زیادہ پیچیدہ ہے ۔ یہ عہد زیادہ سفاک اور ریاکار ہے ۔ رتن سنگھ نے کہا کہ ملک کی تقسیم کے بعد ادب کی تقسیم اور پھر ادب کے اندر جو گروہ بندی ہوئی وہ قابلِ مذمت ہے ۔ ادیبوں ، شاعروں ، افسانہ نگاروں کے درمیان فاصلہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ، اس نے بہت نقصان پہنچایا ۔ نئی نسل نقاد سے انکار نہیں کرتی بلکہ اس نقاد سے انکار کرتی ہے جو گروہ بندی کرتا ہے اور ادب کو بانٹتا ہے ۔

آخر میں رمیش کھشین اور ڈاکٹر عبدالصمد نے سب کا شکریہ ادا کیا اور امید دلائی کہ اگر منظوری مل گئی تو مقالات اور مباحث پر مبنی کتاب جلد شائع کی جائے گی ۔

○●○ ● ○●○

سب رس کتاب گھر

فہرستِ کتب

مطبوعاتِ ادارہ ادبیاتِ اردو • حیدرآباد ۔

شاعری

صبر و شکر	تہنیت النسا بیگم	10=00
تنویرِ تخیل	الہیٰ حیدرآبادی	20=00
دیوانِ داؤد اورنگ آبادی	مرتبہ : خالدہ بیگم	15=00
[illegible]	عزیز احمد	15=00
ورق در ورق	سید مظفر الدین صاحب	25=00
انوار	علی اختر	20=00
سخنِ حمید	مرتبہ : احمد پاشاہ قادری	15=00
سلسلہ در سلسلہ	مظفر الدین صاحب حیدرآبادی	8=00
آبگینۂ شعر	بشیر النساء بیگم بشیر	30=00
آتشِ بے نام	صاحب حیدرآبادی	20=00
طالب و موہنی	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	15=00
تسلیم و رضا	تہنیت النسا بیگم	10=00
ترجمانِ زندگی	سید علی منظور	20=00
گلستانِ حمد ، نعت ، منقبت	صاحب حیدرآبادی	25=00
نمودِ زندگی	سید علی منظور	20=00
سخن در سخن	صاحب حیدرآبادی	25=00
رمزِ سخن	محی الدین قادری زور	20=00
دیوانِ عشق	مرزا جلال اللہ عشق	25 =00
انجمن در انجمن	صاحب حیدرآبادی	20=00
زبانِ شمع	صاحب حیدرآبادی	20=00
مہکتے ویرانے	بانو طاہرہ سعید	20=00
فیضِ سخن	شمس الدین فیض	
	/ مرتبہ : ڈاکٹر زور	25=00
سلکِ گوہرین	محمد جلال الدین اشک	15=00
کلامِ معظم بیجاپوری	مرتبہ : ابوالنصر محمد خالدی	20=00
ارمغانِ جذب	راگھویندر راؤ	25=00

تاریخ

تاریخِ گولکنڈہ (انگریزی)	عبدالمجید صدیقی	50=00
مسلمان شاہی خاندان	محمد عبدالرحمن خاں	40=00
قطب شاہی سلاطین (انگریزی)	ڈاکٹر زور	10=00
مال والوں کی سیر	مراد علی طالع	10=00

بہ یادگار سید محی الدین قادری زورؔ

سن اجراء : ۱۹۳۸ء

فون : 3310469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد : ۶۰ — فروری ۱۹۹۸ء — شمارہ : ۲

○ مدیر : مغنی تبسم

○ معاونین : غلام جیلانی ، بیگ احساس

سعودی عرب میں ہمارے نمائندے

○ غوث ارسلان : P. O. Box. No. 71, Riyadh - 11411.

○ سلیم فاروقی : اردو اکیڈمی جدہ فون : 6855698

○ شریف اسلم : بزم اردو جدہ۔

فی پرچہ	:	۱۲ روپے
زرسالانہ	:	۱۲۵ روپے
کتب خانوں سے	:	۱۵۰ روپے

مشرق وسطیٰ اور امریکہ	:	۲۵ ڈالر
پاکستان ، برما ، سری لنکا و بنگلہ دیش	:	۱۰ ڈالر
انگلستان	:	۱۵ پونڈ

ناشر : ادارہ ادبیات اردو ، پنجہ گٹہ روڈ ، حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۸۲ (اے ۔ پی) انڈیا۔

کمپیوٹر کتابت ، جی ۔ جی ۔ کمپیوٹرس، صدی پنجم ، حیدرآباد۔

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر ، پرنٹر ، پبلیشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے ایس ایس گرافکس نارائن گوڑہ میں طبع کرواکے ادارہ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

آپ بیتی

خاکہ

مضامین

دو افریقی نظمیں

غزلیں

افسانہ

اختر حسن

یادوں کی سیرگاہ

(ساتویں قسط)

کشمیر کی سیر :۔ کشمیر کا ذکر آگیا تو آئیے میں آپ کو اپنی کشمیر کی سیر کا بھی واقعہ سناتا چلوں کہ وہ بھی ایک حسنِ اتفاق ہی تھا۔ جب زور صاحب کشمیر میں اردو کے پروفیسر ہوکر گئے تو ایک بار چھٹیوں میں یہاں آئے ہوئے تھے۔ مجھے پتہ چلا تو میں ان سے ملنے ان کے گھر گیا۔ باتوں باتوں میں کشمیر کا ذکر آگیا تو میں نے یہ شعر پڑھا :

اگر فردوس بر روئے زمین است ہمین است و ہمین است و ہمین است

اور بڑی حسرت سے کہا آپ تو اس فردوس میں ہیں، ہم شاید کبھی اس فردوس کی سیر نہ کرسکیں۔ تو وہ کچھ کہے بنا اٹھ کر اندر گئے اور انگریزی کا ایک اخبار لاکر مجھے دیا کہ دیکھو یہ کشمیر یونیورسٹی میں ایک اردو لکچرر کی خالی جائیداد کا اشتہار ہے۔ تم چاہو تو درخواست دے دو۔ تمھارا اس جائداد پر تقرر نہیں ہوگا۔ مجھے معلوم ہے مگر میں تم کو انٹرویو کے لیے بلواؤں گا۔ سکنڈ کلاس آمد و رفت کا کرایہ ملے گا، تم آجانا اس طرح کشمیر کی سیر ہوجائے گی۔ چناں چہ یوں ہم کشمیر جا پہنچے۔ غالباً ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔ جموں سے سری نگر تک بس کا سفر الاماں! خطرناک چکر دار راستہ، ایک طرف سربلند پہاڑ دوسری طرف گہری کھائی اور سردارجی اس تنگ چکر دار راستے پر اتنی تیز رفتاری سے بس چلاتے ہیں کہ نہ پوچھیے۔ بس جان ہتھیلی پر لیے بیٹھے رہے۔ ہر دم یہ لگتا تھا کہ بس گری اب کھڈ میں، اقبال کا مصرعہ زبان پر تھا :

" اگر خواہی حیات اندر خطرزی " راستہ خطرناک ضرور تھا مگر ساتھ ہی بے حد حسین بھی۔ کافی رات گئے سری نگر پہنچے۔ موسم خوش گوار تھا۔ غالباً ستمبر کا مہینہ تھا۔ راستے میں ایک صاحب سے شناسائی ہوگئی تھی۔ وہ تفریح کے لیے کشمیر جارہے تھے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ کس ہوٹل میں جائیں کہ پتہ چلا بس ڈپو پر ویٹنگ رومس بھی ہیں تو ہم کو ایک کمرہ خالی مل گیا۔ رات ہم دونوں نے وہیں گزاری، دوسری صبح ایک چھوٹی ہوٹل میں منتقل ہوگئے۔

معلوم ہوا علی جواد زیدی PIB کے ڈائرکٹر ہیں۔ ان سے میری پرانی ملاقات تھی اور اس دن کوئی کام نہ تھا تو میں ان سے ملنے چلا گیا۔ بڑے خلوص سے ملے، گلے لگایا، پوچھا کہاں ٹھہرے ہو؟ میں نے کہا فلاں ہوٹل میں تو بہت خفا ہوئے کہ میرے یہاں ہوتے ہوٹل میں کیوں ٹھہرے۔ اسی وقت اپنی گاڑی میں بٹھا کر ہوٹل لے گئے اور سامان اٹھوا کر اپنے گھر لے آئے۔ وہ شام ان کی صحبت میں بہت اچھی گزری۔ کشمیر میں، میں پانچ چھ دن رہا۔ انٹرویو دینے کے بعد میں بے فکری سے کشمیر کی سیر کو نکل گیا۔ ویسے ساتھ چلنے والے تو بہت تھے مگر میں نے اکیلے گھومنا پسند کیا کہ اپنی مرضی سے آزادانہ گھوم سکوں اور جو چاہے دیکھوں۔ تو ڈل لیک میں شکارے پر گھوما، شالیمار باغ دیکھا، گلمرگ گیا، پہلگام گیا۔ قدم قدم پر نیا حسن، آبشار، چشمے، جھرنے، ندیاں، دیودار کے گھنے جنگل اور سر بہ فلک بوس پہاڑ۔ برف سے ڈھکے قدرتی مناظر کے بے پناہ حسن کے ساتھ انسانی حسن کی بھی فراوانی، دل ربا حسین چہرے، گورا رنگ، نیلی آنکھیں، بچے،

بوڑھے ، عورتیں ، لڑکیاں مرد سب حسین ۔ کشمیر واقعی جنت لگتا ہے ۔ سیر و تفریح کے ساتھ دعوتیں بھی خوب کھائیں ۔ ایک دن زیدی صاحب نے ہمارے اعزاز میں ڈنر دیا ۔ ہفتے کی شام کو زور صاحب نے چائے پر بلایا ۔ یونیورسٹی کے کچھ اور پروفیسر بھی تھے ان سے ملایا ۔ ان میں مجھے میسور کیمپ کے اپنے ہم نام پرانے دوست بھی مل گئے ۔ وہ کشمیری زبان کے ادیب ہیں ۔ کئی ایوارڈ حاصل کرچکے ہیں اور بھی کئی کشمیری ادیبوں سے ملاقات ہوئی ۔ وہ بخشی غلام محمد کا زمانہ تھا اور میں نے محسوس کیا کہ کشمیری مسلمانوں کی اکثریت مخالف بخشی ہے ۔ شیخ عبداللہ کی وہ پرستش کرتے ہیں ۔ آپ نے شیخ عبداللہ کی سوانح " آتشِ چنار " تو پڑھی ہوگی اسے ساہتیہ اکیڈمی کا ایوارڈ بھی ملا ہے ۔ بڑی عمدہ کتاب ہے ۔ کشمیر کے عوام اپنے " شیرِ کشمیر " شیخ عبداللہ کے شیدائی ہیں اور بخشی غلام محمد سے نالاں ۔ ان کی آوارہ مزاجی اور رعونت کے بہت قصے سنے ۔ کسی نے بتایا کہ ایک بار سری نگر جاتے ہوئے راستے میں بس رک گئی ایک بڑا ٹرک حائل تھا ۔ ادھر سے بخشی غلام محمد آرہے تھے ۔ حکم ہوا ٹرک کو کھائی میں ڈھکیل دیا جائے کہ راستہ کھل جائے اور ٹرک میں جتنا مال تھا اس کا تخمینہ لگا کر خزانے سے یہ رقم مالکِ ٹرک کو ادا کر دی جائے ۔ ایسی ہی اور بہت سی باتیں ان کے بارے میں سننے میں آئیں پتہ نہیں کہاں تک صحیح ہیں ۔

کشمیر کے حسنِ فراواں نے جتنا متاثر کیا ، دل و دماغ کو فرحت بخشی اتنا ہی دکھ وہاں کی غربت کو دیکھ کر ہوا ۔ صنعتی ترقی نام کو نہیں ۔ سیاحت کا محکمہ جو آمدنی کا بڑا ذریعہ ہے وہ بھی Develop نہیں ہوا ۔ انڈین یونین Subsidise کرتی ہے مگر اس سے کیا ہوتا ہے ۔ اسی فی صد لوگ تقریباً فاقے کرتے ہیں بےحد افلاس ہے ۔ وادیِ کشمیر تو مجھے اس لیے بچی ہوئی ہے کہ وہاں باہر کے آدمی کو جائداد (Property) خریدنے کی اجازت نہیں ورنہ پنجابیوں نے جاکر اب تک اس کو تباہ کردیا ہوتا ۔

کشمیر سے میری واپسی اتوار کو تھی ایک مسئلہ یہ درپیش ہوا کہ کرائے کا جو چک ملا تھا وہ Cash کیسے ہو ؟ سب بینک بند ۔ علی جواد زیدی نے بینک کے مینیجر کو گھر فون کیا کہ حیدرآباد سے میرے ایک دوست آئے ہوئے ہیں آج ان کا جانا ضروری ہے ، بینک بند ہوگا مگر آپ کو ان کا چک Cash کرنا ہے تو آپ کچھ کیجیے ۔ ۔ ۔ اور مجھے ان کے پاس بھیج دیا ۔ انھوں نے یہ کیا کہ باقاعدہ بینک کھلوا کر میرا چک کیش کروایا اور چائے وائے سے خاطر بھی کی اور ایک گھنٹے تک مجھ سے حیدرآباد کے مسلمانوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے ۔ بہت سوال کیے انھوں نے اور میں نے بھی تفصیل سے ان کو سب بتایا ۔

گجرات کی سیر :- کشمیر کی سیر کی طرح ہمارے ایک اور کرم فرما مہدی نواز جنگ کی عنایت سے میں نے گجرات کی سیر بھی کی ۔ مہدی نواز جنگ جو وہاں کے گورنر تھے انھوں نے بہ طورِ خاص کچھ تحقیقی کام کے لیے مجھے گجرات بلایا ، سلیمان اریب اور صفیہ کو بھی بلایا تھا ۔ یہ صرف ایک ہفتے کا پروگرام تھا ۔ راج بھون میں ٹھیرایا گیا تھا اور پورا پروگرام مرتب تھا کہ کس کس سے ملنا ہے کون کون سی لائبریریز دیکھنا ہے ، کلب جانا ہے وغیرہ ۔ ایک رات قوالی کا بھی پروگرام تھا ۔ حیدرآباد سے عزیز قوال کو بلایا گیا تھا ۔ ۔ ۔ نواب صاحب نے خود مجھے انفارمیشن ڈپارٹمنٹ کے ڈائرکٹر اور کچھ خاص لوگوں سے ملایا کہ یہ فارسی کے اسکالر ہیں ۔ میں نے انھیں یہاں بلایا ہے ۔ یہ گجرات کی تہذیبی تاریخ پر کام کریں گے ۔ گجرات فارسی ادب کا بہت بڑا مرکز رہ چکا ہے ۔ آپ لوگ ہر طرح ان کی مدد کریں ۔ ڈائرکٹر نے ہم کو لائبریریز دکھائیں اور ۲۵ / ۳۰ ، انگریزی کی کتابوں کی فہرست فراہم کردی کہ میں ان سے استفادہ کرسکتا ہوں ۔ اور ایک صاحب نے نئی پرانی عمارتوں کے کوتی ،، بلاکس ہم کو تحفتاً دیے کہ آپ انھیں استعمال کریں ۔ اس طرح کام کی باتیں بھی ہوئیں اور سیر و تفریح بھی ۔ اب ایک اور اتفاق دیکھیے ۔ میں نے آپ کو بتایا کہ پیام بند ہوگیا تو میں نے صحافت کو چھوڑ دیا مگر صحافت نے مجھے نہیں چھوڑا ۔ چناں چہ جب میں انوارالعلوم کالج میں لکچرر تھا ، اردو پڑھا رہا تھا ایک دن بمبئی سے خواجہ احمد عباس کا فون آیا کہ ہم یہاں سے اردو بلٹز نکال رہے ہیں اور اس کے لیے مدیر کی ضرورت ہے ۔ میرے ذہن میں تمہارا نام آیا ہے اگر تم آنا چاہو ۔ میں پس و پیش میں تھا ۔ اس لیے کہ وہاں مشاہرہ

بہت کم تھا ۔ یہاں کالج کے علاوہ دوسرے کاموں کے ذریعے میں زیادہ کمالیتا تھا ۔ اس لیے سوچ بچار کے بعد اس وقت میں نے اس پیش کش کو قبول نہیں کیا ۔ خواجہ احمد عباس کے ایک قریبی رشتہ دار انور صاحب اس زمانے میں ماسکو سے آئے تھے ۔ اردو بلٹز نے ان کی خدمات حاصل کرلیں ۔ ینش سکسینہ ہندی بلٹز کے مدیر تھے ۔ اور جب تک اردو بلٹز کے لیے انور صاحب آئیں وہی اردو بلٹز کا بھی کام دیکھ رہے تھے ۔ ان سے ہماری بڑی پرانی دوستی تھی ۔ انھوں نے میرے ذمے بھی یہ کام لگا دیا کہ ہر ہفتہ اردو بلٹز کا ایک کالم لکھا کروں ۔ اسلامی ممالک کے کسی اہم موضوع پر ۔ اس طرح میں پہلے اردو بلٹز کا کالم نگار بنا ۔ جب انور صاحب نے اردو کا پورا کام لے لیا تب بھی مجھے ایک کالم نگار کی حیثیت سے برقرار رکھا ۔ اس کالم کا عنوان تھا : " انڈونیشیا سے الجیریا تک " جس میں اسلامی ممالک بھی آجاتے ہیں اور عرب ممالک بھی ۔ میں بڑی محنت سے ہر ہفتہ یہ کالم لکھ کر بھیجتا تھا ۔ فی کالم پچیس روپے معاوضہ ملتا تھا ۔ ۱۹۶۲ ء سے ۱۹۶۵ ء تک میں بلٹز کا کالم نگار رہا ۔ اس ضمن میں انور صاحب سے خطو وکتابت کا سلسلہ بھی شروع ہوا وہ سوشلسٹ خیالات کے ادیب اور ناول نگار بھی تھے ۔ کچھ عرصے بعد مجھے ان کا ایک خط ملا کہ مجھے دہلی سوویت انفارمیشن میں کام مل گیا ہے ، میں وہاں جارہا ہوں ۔ بلٹز کی جگہ خالی ہورہی ہے ، میرا مشورہ ہے کہ اب آپ انکار نہ کریں ۔ میں نے مینیجر سے بات کرلی ہے کہ اس وقت مجھے جو تنخواہ مل رہی ہے وہیں سے آپ کو Start دیا جائے گا اور انھوں نے اس سے اتفاق کرلیا ہے لہٰذا آپ فوراً آجایئے ۔ میں نے اب اس پیش کش کو قبول کرلیا اور ۱۹۶۵ ء کے آخر میں بمبئی جاکر اخبار کا چارج لے لیا ۔ انور صاحب کو اس وقت گیارہ سو روپے مل رہے تھے وہیں سے مجھے Start مل گیا ۔

بلٹز میں یہ روایت چلی آرہی تھی کہ سال میں دو مرتبہ مشاہرے کے برابر بونس دیا جاتا تھا اور ہر جمعرات کو سو روپے ٹیکسی کرایہ تو اس طرح مجھے ماہانہ پندرہ سولہ سو روپے پڑ جاتے تھے ۔ اس طرح جنوری ۱۹۶۶ ء سے میں نے باقاعدہ اردو بلٹز کا کام شروع کیا ۔ ابھی ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ حیدرآباد سے مجھے اپنے والدِ بزرگوار کی وفات کی الم ناک خبر ملی ۔ میری چھوٹی بہن مسز عادل (ذکیہ) بھی بمبئی میں تھی ۔ ہم دونوں پرواز کر کے حیدرآباد پہنچے ۔ ۔ ۔ حیدرآباد سے بمبئی آتے ہوئے جب میں اور ریاست ان کو خداحافظ کہنے گئے ۔ (وہ اپنی چہیتی بیٹی رضیہ کے ساتھ رہتے تھے) تو انھوں نے کہا تھا " شاید اب ہم پھر تم کو اور ریاست کو نہ دیکھ سکیں گے ۔ ان کو جیسے پہلے سے الہام ہوگیا تھا ۔ ایک ہفتہ حیدرآباد رہ کر میں سوگ وار دل لیے پھر بمبئی لوٹ آیا ۔ ۲ فروری ۱۹۶۶ ء کو میرے والد نے اس دنیائے فانی سے کوچ کیا ۔

ہم راہی کی ادارت :- بلٹز سے پہلے حیدرآباد سے ہی ایک اخبار " ہم راہی " کا بھی میں مدیر رہا تھا ۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ جب میں بلٹز کا کالم نگار تھا غالباً ۱۹۶۲ ء میں کہ ایک دن صبح ہی صبح عالم ، رضیہ کے کمرہ میں بدری وشال صاحب کو لے کر آئے ۔ میں اتفاق سے وہیں تھا ۔ انھوں نے تعارف کرایا ۔ ویسے میں پہلے سے بھی ان کو جانتا تھا ۔ عالم نے کہا بدری وشال صاحب اردو کا ایک ہفتہ وار نکالنا چاہتے ہیں ۔ بدری وشال صاحب کا تعلق رام منوہر لوہیا سوشلسٹ گروپ سے تھا ۔ اس وقت کچھ ابتدائی باتیں ہوئیں ۔ کیوں نکالنا چاہتے ہیں ؟ کیا پالیسی ہوگی ؟ اڈیٹر کے کیا اختیارات ہوں گے ؟ وغیرہ وغیرہ ۔ پھر دوچار بیٹھکیں اور ہوئیں ۔ بدری وشال صاحب ایک ہندی ماہ نامہ " کلپنا " ہندی میں نکالتے تھے ۔ عالم اور رضیہ کے مضامین بھی اس میں چھپتے تھے اور اب وہ اردو میں ایک ہفتہ وار نکالنا چاہتے تھے ۔ بہرحال بات چیت کے بعد معاملہ طے ہوگیا ۔ نام کے بارے میں سوچا گیا میں نے ہم راہی تجویز کیا ۔ سب کو پسند آگیا تو اس نام سے بدری وشال صاحب کی کوٹھی میں نچلی منزل کے دو کمرے اڈیٹوریل اسٹاف کے لیے دیے گئے تھے ۔ " ہم راہی " کا بورڈ لگا دیا گیا ۔ اس کی خاطر خواہ تشہیر کی گئی اور یہ ہفتہ وار سال بھر بڑی پابندی سے نکلتا رہا ۔ اس میں عالم کے ، رضیہ کے اور میرے مضامین ترجمے وغیرہ بھی چھپتے تھے ۔ بہت معیاری ہفتہ وار تھا ۔ اتفاق سے محمود علی خاں اختر جنھوں نے پیام میں کام کیا تھا ، اس زمانے میں حیدرآباد ہی میں تھے اور مینیجر

کی حیثیت سے ان کی خدمات حاصل ہوگئی تھیں ۔

" ہم راہی " کے اخراجات پورے بدری وشال اٹھاتے تھے ۔ ایک سال کے اندر ہی اس کا آٹھ نو ہزار سرکولیشن ہوگیا تھا یہ سوشلسٹ اخبار تو نہیں تھا مگر جھکاؤ اس طرف ضرور تھا اور اس میں سوشلسٹ نظریات پر مضامین بہت چھپتے تھے ۔ ۔ ۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کچھ اختلافات پیدا ہوگئے ۔ اور یہ ہفتہ وار بند ہوگیا ۔ بدری وشال اخبار کے مالک تھے مگر نہ انھوں نے اس کی کوئی فائل رکھی اور نہ ہم نے ۔ نتیجہ یہ کہ آج اس کا کوئی نام بھی نہیں جانتا ۔

کچھ یادگار ملاقاتیں

داغ دہلوی :۔ میری بڑی بہن باجی جمال النسا کی شادی عزیزالدین صاحب سے ہوئی تھی ان کے بڑے بھائی نصیرالدین صاحب ریوینیو ڈپارٹمنٹ میں کام کرتے تھے ۔ یہ میرٹھ کی فیملی تھی ۔ داغ سے نصیرالدین صاحب کی بہت دوستی تھی ۔ جب داغ یہاں ملک الشعرا بن کر آئے تو انھوں نے داغ کی دعوت کی ۔ نصیرالدین صاحب کا گھر افضل گنج میں تھا ۔ داغ بھی وہیں قریب میں رہتے تھے ۔ ۔ ۔ اس دعوت میں باجی نے مجھے بھی بلایا تھا ۔ داغ کے علاوہ اور بھی شعرا تھے ۔ مجھے یاد ہے کھانے کے لیے ہاتھ دھوتے ہوئے داغ صاحب نے یہ مطلع کہا : ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں ناز والے نیاز کیا جانیں

پھر کھانے کے دوران ہی غزل مکمل ہوگئی اس کا مقطع تھا : جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے آپ بندہ نواز کیا جانیں

یہاں میں چند حرف اپنی باجی کے بارے میں کہنا چاہوں گا جن کا ہم سب بھائی بہنوں کی تعلیم میں بالواسطہ طور پر بہت حصہ رہا ہے ۔ انھوں نے کالج کی ڈگریاں حاصل نہیں کیں مگر بچپن سے ان کو پڑھنے کا شوق تھا اور گھر پر ہی اردو فارسی پڑھی اور پھر خود ہی جانے کیسے انگریزی پڑھنا سیکھ لی اور شروع سے ہر قسم کی کتابیں پڑھنا ان کی عادت تھی جو اب تک برقرار ہے ۔ ہمارے گھر کے ہر فرد کو شعرو شاعری سے دل چسپی تھی ۔ میرے والد موسیقی کے دل دادہ تھے ۔ والدہ بھی گو بہت پڑھی لکھی نہیں تھیں ۔ مگر بڑی اچھی سیاسی سوجھ بوجھ اور ادبی ذوق رکھتی تھیں اور یہ ذوق باجی کو سب سے زیادہ ورثے میں ملا تھا ۔ مگر گھر کی بڑی لڑکی ہونے کے ناتے ان کی شادی جلدی ہوگئی اور جیسی اس زمانہ میں ہوتی تھیں ، رشتہ طے کردیا گیا ۔ ان کے شوہر حیدرآباد میں اپنے بڑے بھائی اور ان کے گھر والوں کے ساتھ رہتے تھے ۔ وہ بھی محکمہ ، مال گزاری میں ملازم تھے اور بہت محتاط قسم کے پرانی وضع کے آدمی تھے ۔ باجی اپنے گھر کے یعنی سسرال کے ماحول سے بہت خوش نہیں تھیں ۔ وہ کچھ کرنا چاہتی تھیں ، مجہول قسم کی زندگی ان کو بالکل پسند نہیں تھی ۔ تاہم کافی عرصے تک انھوں نے سسرال کی پرانی گھریلو قسم کی زندگی کو برداشت کرلیا اور پھر جب وہ اپنے شوہر کے ساتھ الگ گھر کر کے رہیں اور عزیز بھائی نے ان کی بہنوں کو تعلیم کی خاطر اپنے گھر رکھنے پر آمادگی ظاہر کی تو ان کی زندگی میں نیا موڑ آیا ۔ ہم سب بھائی بہن ان کے ساتھ رہتے تھے اور ہماری ادبی سرگرمیوں میں وہ بھی شریک رہتی تھیں ۔ ہمارے عزیز بھائی پرانے خیالات کے تھے مگر اتنا ضرور کہنا پڑتا ہے کہ وہ ہماری علمی سرگرمیوں میں کبھی حارج نہیں ہوتے ، باجی کو بھی نہیں روکا ۔ ۔ ۔ تو غرض بہت بعد میں جب مخدوم محی الدین سے ملاقات ہوئی تو باجی ان کو بہت پسند کرنے لگیں ۔ وہ اکثر ہمارے گھر آتے تھے ، ملنا جلنا ، بے تکلفی ۔ ۔ ۔ ویسے ہم سب بھائی بہن ذہنی طور پر سوشلسٹ تھے مگر باجی شروع سے کمیونسٹ پارٹی کی رکن رہیں اور سوشل ورک کرتی رہیں ۔ وہ آج تک بھی پارٹی کارڈ ہولڈر ہیں مگر دل چسپ بات دیکھیے پارٹی پر کئی بار حملے ہوئے ہم لوگ سب ہی جیل گئے ۔ رضیہ ، انور ، مظہر ، مظفر سب ۔ مگر باجی کے خلاف آج تک کوئی وارنٹ نہیں آیا ۔ ۔ ۔ بہت کام کیا انھوں نے پارٹی کا مگر ان کی سوجھ بوجھ بہت سے پارٹی والوں سے اچھی تھی اور ہے اور انھوں نے کبھی ان کی اندھی پیروی نہیں کی ۔ مجھے یاد ہے جب میرے بہنوئی عزیز بھائی کا انتقال ہوا تو میں اور رضیہ جیل میں تھے ۔ ایک دوست کی بڑی کوشش سے تین چار

ان کے لیے پیرول پر ان کی تجہیز و تکفین میں شرکت کے لیے گھر آئے ۔ جب ہم واپس جانے لگے تو کمیونسٹ پارٹی کے بڑے بڑے لوگوں نے جیسے راج بہادر گوڑ وغیرہ کہنے لگے کوئی ضرورت نہیں واپس جانے کی انڈر گراؤنڈ ہوجایئے ۔ یہ غیر اصولی بات مجھے پسند نہیں آئی اور باجی نے بھی اس کی مخالفت کی کہ یہ لوگ ایک دوست کی ذمہ داری پر پیرول پر آئے ہیں اور یہ بہت غلط بات ہوگی کہ اس طرح اس سے فائدہ اٹھایا جائے ۔ یہ غیر اخلاقی حرکت ہم گوارا نہیں کرسکتے ۔ راج بہادر گوڑ کو یہ بات ذرا ناگوار گزری اور شاید مخدوم کو بھی مگر باجی نے ان کا ساتھ نہیں دیا ۔ ۔ ۔ بہت بڑا ظرف ہے میری بہن کا اور خاموشی سے انھوں نے جتنا کام کیا ہے شاید ہی کسی پارٹی ممبر نے کیا ہو ۔ سیکڑوں عورتوں کو ان کی وجہ سے روزگار ملا اور کتنے ہی ذہنوں کو انھوں نے جہالت کے اندھیروں سے نکالا ۔ خدا ان کی زندگی دراز کرے اور ان کی صحت برقرار رکھے ۔

خالدہ ادیب خانم :- یہ ترکی کی وہ مشہور خاتون ہیں جو حیدرآباد بھی آئی تھیں اور مجھے ان سے ملنے کا موقع ملا تھا ۔ خلافت تحریک سے تو آپ واقف ہیں ۔ ترکی میں عبدالمجید آخری خلیفہ معزول کیے گئے تو عالم اسلام میں بڑا شور مچا یہاں تو مسلمان بھائیوں کے چھکے چھوٹ گئے ۔ علی برادران وغیرہ تحریکِ خلافت کے علم بردار تھے اور جامع مسجد دلی میں دھواں دھار تقریریں ہوتی تھیں ۔

پہلی جنگِ عظیم میں ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا ۔ جرمنی کے ہارنے کے بعد برطانوی سامراج نے ترکی کے خلاف مہم چلائی اور اسکے حصے بخرے کردیے گئے وہاں " انجمنِ اتحادِ ترکی " کے نام سے ایک انجمن قائم ہوئی جس کے کئی لیڈر تھے ان میں ایک مصطفیٰ کمال سب سے پرجوش جری نوجوان تھے ۔ ان کی رہ نمائی میں بہت تھوڑی سی فوج اور طاقت نے متحد ہوکر انگریزوں کا مقابلہ کیا ، انھیں شکست دی ، قسطنطنیہ پر قبضہ کرلیا اور بادشاہ کو معزول کیا ۔ ۔ ۔ تو مسلمان بھائیوں میں ہنگامہ ہوگیا ۔ ۔ ۔ اپنی صحیح صورتِ حال کو سمجھانے کے لیے ترکی سے ایک وفد ہندستان آیا ۔ خالدہ ادیب اس وفد کی ایک خاتون رکن تھیں ۔ وہ بہت اچھی ادیبہ تھیں ۔ حیدرآباد بھی آئی تھیں ۔ اور مجھے یاد ہے یہ جو دل کشا گیسٹ ہاوس ہے اس میں ٹھہری تھیں ۔ میں اس وقت ان سے جا کر ملا اور ان کی اجازت سے میں نے ان کا فوٹو بھی لیا ۔ وہ بہت اچھی طرح ملیں اور دیر تک میرے سوالات کا جواب دیتی رہیں ۔ یہاں ایک بہت بڑا جلسہ بھی ہوا تھا اور اس میں انھوں نے بڑی اچھی تقریر کی تھی اور یہاں سے واپس جاکر انھوں نے ایک کتاب لکھی " Inside India "مولوی عبدالحق صاحب نے اس کا " اندرونِ ہند " کے نام سے ترجمہ کروایا جو انجمن ترقی اردو سے چھپا ہے اور جو تصویر میں نے لی تھی عبدالحق صاحب نے مجھ سے لے کر کتاب کے سرِ ورق پر چھاپی ۔ ۔ ۔ خالدہ ادیب خانم کی شخصیت سے میں بہت متاثر ہوا ۔ وہ بڑی جری (Bold) خاتون تھیں انھوں نے جو باتیں کیں وہ بہت دانش مندانہ اور صحت مند تصور کی حامل تھیں ۔ انھوں نے کہا " ہم نے مذہب کو نہیں بدلا ہے روایات کو بدلا ہے رومن رسم الخط اختیار کرنے کے فوائد بتاتے ہوئے انھوں نے واضح کیا کہ یہ کیوں ضروری تھا ۔ غرض ہمارے ہر سوال کا انھوں نے بہت معقول جواب دیا ۔

شخصیتیں

اسی طرح کچھ اور اہم اور بڑی شخصیتیں جو میری زندگی میں آئیں اور جنھوں نے مجھے بےحد متاثر کیا یہاں میں ان میں سے صرف چند ایک کے ذکر پر اکتفا کروں گا ۔ ۔ ۔

جوش ملیح آبادی :- سب سے بڑی ادبی شخصیت جس سے آخری دم تک میرے روابط رہے ، صرف نیاز مندانہ روابط ، وہ جوش ملیح آبادی کی شخصیت ہے ۔

جوش سے میری شناسائی اختر شیرانی کے ایک خط کی بنا پر ہوئی ۔ ہندستان کے کم و بیش سب ہی مشہور ادیبوں ، شاعروں سے

میری ہمیشہ خط و کتابت رہی ہے خاص طور سے اختر شیرانی کے بہت خط تھے میرے پاس ۔ ان کی ہینڈ رائٹنگ بہت خوب صورت تھی ۔ جانے کہاں گم ہوگئے ان کے لتنے سارے خطوط ۔ ۔ ۔ تو اختر شیرانی نے ہی ایک خط میں مجھے لکھا تھا : " اتنا بڑا شاعر آپ کے شہر میں رہتا ہے ۔ ہم خط لکھتے ہیں تو جواب تک نہیں دیتا ۔ آپ ان سے ہمارے " خیالستان " کے لیے کچھ چیزیں بھجوائیے ۔" تو اس بہانے میں جوش سے ملنے گیا ۔ وہ اس زمانے میں یہاں ناظم دارالترجمہ تھے اور اب جو رائل ہوٹل ہے ، اس کی جو پرانی عمارت ہے زینہ چڑھ کر جائیے تو سیدھے ہاتھ پر پہلے کمرے میں اس کا دفتر تھا ۔ یہ دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی سے ایک سال قبل ۱۹۱۸ ء میں قائم ہوا تھا ۔ عنایت اللہ نے اس کے پہلے ڈائرکٹر تھے اور عبداللہ عمادی اور یہ آپ کے ابولا علیٰ مودودی کے چھوٹے بھائی ابوالخیر مودودی ، جوش ملیح آبادی ، محمد ہادی رسوا ، عبدالحلیم شرر وغیرہ سب اس سے وابستہ رہے ہیں ۔ میں اس وقت غالباً میٹرک میں تھا ، تو سیدھا جوش صاحب کے کمرے میں چلاگیا ۔ وہاں ابوالخیر مودودی بیٹھے ہوئے تھے ۔گپ شپ چل رہی تھی ۔ میں ایک طرف کو خاموش بیٹھ گیا اور ان لوگوں کی گپ شپ سن کر پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ یہ " بڑے لوگ " کیسے ہوتے ہیں !! چھوٹی چھوٹی معمولی باتیں بھی کرتے ہیں ، بہت ہی Vulgar بھی اور اس کے بیچ ایک دم سے کچھ ایسی بڑی بات کرجاتے ہیں کہ ہم حیران رہ جاتے ہیں ۔

جب ان کی باتیں ختم ہوئیں تو میں نے عرضِ مدعا کیا کہ اس لیے آیا ہوں اور اختر شیرانی کا خط دکھایا ۔ جوش اس وقت جوان تھے یہی کوئی ۳۵ ، ۳۶ سال کے ہوں گے اور یہاں حیدرآباد میں وہ دس سال رہے ان کی پہلی کتاب " روحِ ادب " جس میں نظم و نثر دونوں ہیں یہیں سے چھپی ۔ وہ بہت مشہور ہوگئی تھی اور جوش کا نام بھی بہت عام ہوگیا تھا ۔ وہ بڑے خاندانی آدمی تھے ۔ فقیر محمد خاں گویا ان کے دادا تھے ۔ بڑی پُر رعب شخصیت تھی ان کی ۔ تو پہلی بار میں ان سے ملا اور عرضِ مدعا کیا تو انھوں نے اپنی بیاض میری طرف بڑھادی کہ جو چاہیے نقل کرلو ۔ میں نے بیاض کھولی تو بہت پریشان ہوا ۔ ہر مصرعے میں کئی کئی اصلاحات ، کٹا پھٹا کچھ ادھر کچھ ادھر لکھا ہوا ۔ یہ جوش صاحب کی عادت ہمیشہ رہی ۔ میں نے ایک بار ان سے پوچھا بھی تھا کہ آپ اتنی کاٹ چھانٹ کیوں کرتے ہیں ؟ تو کہنے لگے بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ پہلے تو خیال لکھ دیتے ہیں ، زبان کے لحاظ سے پھر اس میں اصلاح کرتے رہتے ہیں میں نے ایک نظم بڑی مشکل سے نقل کی اور جوش صاحب کو دکھائی کہ اس میں کوئی غلطی تو نہیں ۔ یہ نظم حیدرآباد کی کہی ہوئی تھی حسین ساگر کے کٹے پر ۔

وہ یار پری چہرہ جو کل شب کو سدھارا	طوفاں تھا ، تلاطم تھا ، چھلاوا تھا ، شرارا
جو اس کے ہی ہونٹوں کی طرف کثرتِ آرا	پھولوں کی نمائش میں ہوا گر متبسم

یہ نظم بھیجی تھی میں نے اختر شیرانی کو ۔ جب میں نے شکریے کے ساتھ رخصت کی اجازت چاہی تو جوش صاحب نے کہا " آیا کرو " کہاں رہتے ہو ؟ کیا کرتے ہو ؟ کیا پڑھ رہے ہو " تو پھر اس کے بعد میں کئی بار ان کے دفتر گیا اور ان کی بیاض سے نظمیں نقل کرکے " ایوان " " خیالستان وغیرہ کے لیے بھجواتا رہا ۔ پھر ایک دن جوش صاحب نے کہا تم میرے گھر آیا کرو دفتر میں بڑی گڑبڑ رہتی ہے ۔ وہ لال ٹیکری میں رہتے تھے اس طرح میں ان کے گھر جانے لگا ۔ وہاں وہ مجھے اپنی شام کی محفلوں میں بلانے لگے۔ان محفلوں میں صبح دکن کے ایڈیٹر احمد عارف حیدرآبادی اور معین الدین قریشی اور کئی لوگ اکثر شریک رہتے تھے بڑی دل چسپ محفلیں ہوتی تھیں وہ ۔ شعر شاعری ، مذاق ، لطیفے ، چھیڑ چھاڑ اور مشورے بھی۔اس طرح جوش کے ساتھ چار پانچ سال تک میں ان کی محفلوں میں اکثر و بیش تر شریک رہا ۔

جوش جیسا بھولا معصوم شاعر میں نے نہیں دیکھا ۔ وہ دنیا دار بھی تھے مگر ان کی دنیاداری اور بھول پن ان میں اس طرح گھلی ملی دو چیزیں تھیں کہ ان کو الگ الگ کرنا مشکل ہے ۔ پھر وہ حیدرآباد سے چلے گئے پونا میں ، جب ان کی خدمات لی گئیں تو میں اس وقت

ن کالج میں لکچرر تھا ۔ جوش نے مجھے خط لکھا کہ ہم یہاں ہیں تمھارے شہر سے قریب ۔ آؤ ۔ ساغر صاحب سے بھی اس وقت تک ری بڑی دوستی ہوگئی تھی اور ابھی میری شادی نہیں ہوئی تھی تو چھٹیوں میں میں ان کے پاس گیا ۔ ساغر اور جوش مشترکہ طور پر ہی گھر میں رہتے تھے ۔ ان کو معلوم تو تھا کہ ہم نے تھوڑی فارسی پڑھی ہے تو شاید ہمارا امتحان لینے کے لیے وہ فارسی کے ت شعر سناتے تھے ۔ یہ جوش صاحب کی عادت رہی ہے کہ ان سے کم درجے کا شاعر ہو ، ادیب ہو یا طالب علم وہ اس کا امتحان ور لیتے تھے ۔ میں دو ہفتے ان کے پاس رہا ۔ اس دوران مجاز بھی وہاں آئے ۔ غالباً " من کی جیت " کوئی فلم بن رہی تھی اور وہ کے لیے " میرا میکہ کہ سسرال ، مجھے دونوں طرف کا خیال " قسم کے گیت لکھ رہے تھے ۔ پھر جوش حیدرآباد سے نکالے گئے ۔ وہ ۔ تو سب جانتے ہیں ۔ شاہد دہلوی نے ان کے بارے میں بہت لکھا ہے مگر جو بڑا فن کار ہوتا ہے اس قسم کی تنقید اس کا کچھ نہیں بگاڑ ق ، یہ میرا ایقان ہے ۔ وہ اپنی جگہ رہتا ہے اور تنقید کرنے والوں کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے اور خود بہت آگے نکل جاتا ہے ۔

پولیس ایکشن کے بعد جب پہلی بار جوش یہاں مشاعرے میں بلائے گئے تو میں اس مشاعرے کا کنوینر تھا اور میرے ہی اصرار پر آئے ۔ یہ مشاعرہ کانگریسیوں کا تھا ، الکشن کا ٹمپو چل رہا تھا ۔ اس کو بڑھانے کے لیے جوش صاحب کو بلایا گیا تھا ۔ ہم بھی PDF کی ب سے الکشن میں حصہ لینے والے تھے ۔ بہ طورِ خاص مجھے اس کا کنوینر اس لیے بنایا گیا تھا کہ لوگوں کو معلوم تھا کہ جوش صاحب سے ے ذاتی تعلقات ہیں اور وہ ہماری بات ٹالیں گے نہیں ۔

جوش مشاعرے میں آئے تو مجھ سے پوچھا کیا سنائیں ؟ میں نے کہا جس نظم کی نہرو جی نے سنانے کی اجازت دی تھی ۔ ان کی ب نظم کے بارے میں نہرو جی نے کہا تھا تم اس نظم کو سناتے رہو مگر چھپوانا مت ، وہ نظم تھی " فریبِ آزادی " ۔ تو ہم نے ان سے ی نظم کی فرمائش کی ۔ کہنے لگے ہم بمبئی سے آرہے ہیں وہاں مرارجی بیٹھا ہوا ہے جو آزادی کے بعد چیف منسٹر بن گیا ہے وہاں اس Prohibition کردیا ہے ہم نے اس کو بھی سنائی یہ نظم کہ :

انسان کے لہو کو پیو اذنِ عام ہے انگور کی شراب کا پینا حرام ہے

رس کی شکل میں یہ بڑی خوب صورت نظم ہے ۔ عام لوگوں نے شروع میں تو خوب داد دی مگر کچھ کھدر والے بیٹھے تھے ان کے چہرے کہ کیا کہہ رہا ہے یہ شاعر !

جوش تنہا شاعر تھے جو نہرو اور ابوالکلام آزاد کے پاس وقت لیے بغیر جب بھی چاہتے چلے جاتے اور کسی میں ہمت نہیں تھی کہ کو روکتا ۔ ایک دن ابوالکلام آزاد مصروف تھے نہیں مل سکے تو آپ چٹھی چھوڑ آئے :

امناسب ہے خون کھولانا اب کسی اور وقت مولانا " تو جب مولانا کو معلوم ہوا تو بھاگے بھاگے ان کے گھر پہنچے ۔ غرض جوش ، میرے تعلقات ان کے حیدرآباد سے جانے کے بعد بھی برقرار رہے اور وقتاً فوقتاً ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں ۔ ایک بار جب میں بلٹز میں جوش بمبئی آئے ہوئے تھے اور کسی بڑے ساہو کار کے پاس ٹھہرے تھے ۔ رات گئے فون آیا " بھئی تمھارے بال بچے ہیں " کہا " کیسے ور کیا کہنا ہے " بولے " بھئی ہم کو اس نو دولتیے کے پاس سے لے چلو ۔ ۔ ۔ " تو میں اسی وقت جاکر ان کو لے آیا ۔ پانچ دن کیفی ب کے گھر رہے اور ہم ان کی خدمت میں ۔ وہ صبح چار بجے اٹھنے کے عادی تھے اور چہل قدمی پابندی سے کرتے ۔ ہم کو بھی اٹھنا پڑتا ان کے ساتھ جوہو بیچ چہل قدمی کرنا پڑتی ۔ ۔ ۔ پھر وہ پاکستان چلے گئے وہاں ۱۹۷۷ء میں آخری مرتبہ میری ان سے ملاقات ہوئی ۔ کراچی پورٹ پر پہنچتے ہی خورشید علی خاں (میرے سالے) نے یہ خوش خبری سنائی کہ آج کل جوش اسلام آباد سے کراچی آئے ہوئے ہیں چار ن یہیں رہیں گے ۔ دوسرے ہی دن صبح ہم جوش صاحب کے پاس پہنچ گئے ۔ بہت خوش ہوئے ، کہنے لگے جب تک ہم ہیں تم یہیں

رہو ۔ تو روز ہم ان کے پاس چلے جاتے اور شام میں ان کی محفلوں میں شریک رہتے ۔ خورشید علی خاں بھی میرے ساتھ ہوتے وہ بھی جوش کے شیدائیوں میں سے تھے ۔ جس دن ۔انے والے تھے کسی ہوٹل کے بڑے Management کے لوگ جمع تھے ۔ انھوں نے کہا لاہور کی فلائٹ بہت سویرے جاتی ہے بہتر ہوگا آپ ایرپورٹ کے قریب جو ہوٹل ہے وہاں چلے جائیں ۔ ہم انتظام کردیں گے ، سہولت رہے گی انھوں نے کہا " ہاں بھئی ہم وہیں چلے جائیں گے بہ شرطیکہ یہ دونوں ہمارے ساتھ رہیں یعنی میں اور خورشید علی خاں تو ہم ان کے ساتھ گئے ۔ وہ ہوٹل کوئی دس میل دور تھا ۔ رات کے ایک بجے تک محفل جمی رہی ۔ میزبان ٹیپ ریکارڈر پر ان کی باتیں ٹیپ کررہے تھے اور ان سے بہت ہی breaking سوالات کر رہے تھے ۔ جب وہسکی کے تین چار پیگ پی چکے تو جوش نے اپنے مخصوص انداز میں پاکستان کے بارے میں ، ضیاء الحق کے بارے میں ، مسلمانوں کے بارے میں ، کھل کر صاف جواب دیے یہ پورا ریکارڈ چند روز بعد اخباروں میں چھپا جس پر بڑا ہنگامہ ہوا ۔ دہلی میں بھی اس کی رپورٹ ہوئی ۔ یہ میری جوش سے آخری ملاقات تھی ۔

○●○ ● ○●○

(سلسلہ ص : ۴۳)

اس کو پانا اتنا نا ممکن تو نہیں شرط وہی ہے خود کو کھونا پڑتا ہے
قتل کرنا ہو تو کب زہر دیا جاتا ہے ان دنوں بس نظر انداز کیا جاتا ہے
یہ تو ظاہر ہے کہیں ہے کوئی ہے مگر کون ، کدھر ہے ، کیا ہے
ایک دروازہ کھلا آخرِ عمر موت ہے یا مرا گھر ہے ، کیا ہے
کیوں دکھائی نہیں دیتا ، جو ہے جو نہیں ہے ، نظر آتا کیوں ہے
سارے اندھیروں پر بھاری ہے دل میں جو چنگاری سی ہے
اُف زمیں کے تنازعے یا رب آسمانوں سے قولِ فیصل بھیج
دیدہ ور اب نہ بھیج کوئی مگر کسی اندھے کے ہاتھ مشعل بھیج (مناجات)

آخر میں ہم انھی کا شعر ان کے نذر کرتے ہیں ۔

نئی نسل کے حق میں ہے یہ دعا تمھیں ہم سے بہتر زمانہ ملے

یہ مجموعہ نہایت خوب صورتی اور اہتمام سے چھپا ہے ۔

○ سائز ۔ ڈیمائی (مجلد مع گرد پوش) ○ صفحات ۔ ۱۹۲ ○ اشاعت ۔ اکتوبر ۱۹۹۷ء ○ قیمت ۔ ۱۵۰ روپے ○ ترتیب و تدوین عبدالرحیم نشتر ○ ملنے کا پتہ : پروفیسر سید یونس ۸ ۔ احباب کالونی ، عقب پولیس لائین ، ٹاکلی ، ناگپور ۴۴۰۰۱۳ (مہاراشٹرا)

○●○ ● ○●○

خاکہ

نریندر لوتھر

... صاحب نظر بنے ہے (۱)

حیدرآباد میں مجھے دو غیر معمولی شخصیتوں کی دوستی کی سعادت نصیب ہوئی ۔ ایک عابد علی خاں جنھیں مرحوم کہنے کو دل نہیں مانتا اور دوسرے ہاشم علی اختر جو حال ہی میں امریکہ ہجرت کر گئے ہیں ۔ اس مضمون میں ہاشم بھائی کا ذکرِ خیر ہے ۔

۱۹۵۸ ء میں جب میں حیدرآباد سیکریٹریٹ میں انڈر سکریٹری بن کر آیا تو اس وقت ہاشم بھائی ڈپٹی سکریٹری تھے ۔ بہت ہی وضع دار اور خوش مزاج شخصیت ۔ ایک ہی ملاقات میں دوستی ہوگئی ۔ ان دنوں سکریٹریٹ میں افسروں کی دو لنچ کلب تھیں ۔ ایک میں سابق آندھرا یا مدراس کے افسر مدراس کی روایت کے مطابق جمع ہوتے تھے ۔ دوسری میں تلنگانہ کے افسر مل کر کھانا کھاتے اور گپ شپ کرتے ۔ یہ دونوں کلبیں انفارمل تھیں اور ان میں داخلہ کی کوئی ممانعت نہیں تھی ۔ مجھے دونوں کلبوں میں مدعو کیا جاتا اور میں موڈ کے مطابق کبھی ادھر کبھی ادھر چلے جاتا ۔ آندھرا کلب میں بہ طورِ حق (میرا تعلق آندھرا ریاست کے افسروں میں سے تھا) اور تلنگانہ کلب میں از راہِ خوش سگالی ۔ موخر الذکر کلب میں مجھے کچھ لے کے جانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی کیوں کہ ہر افسر اپنی ضرورت سے زیادہ کھانے کو لاتا تھا ۔ جب پہلی بار میں اپنا لنچ بنوا کے لے کے گیا تو میری بیوی نے حیرت سے پوچھا ۔ "کیا سارے سکریٹریٹ کو کھانا کھلانا ہے ؟ "

اس کے علاوہ ہاشم بھائی اور میں اکثر چائے بھی اکٹھے پی لیتے کیوں کہ وہ تواضع محکمے کے ان چارج بھی تھے اس لیے ان کی چائے بہت اچھی ہوتی تھی اور بڑے اہتمام سے " سرو " کی جاتی تھی ۔ پھر ہمارا ایک دوسرے کے گھر بھی آنا جانا شروع ہوگیا اور اس طرح ہمارے کنبوں میں بھی دوستی ہوگئی ۔

۱۹۵۶ ء کی ریاستی تنظیم نو کے بعد جب ریاست حیدرآباد کا وجود ختم ہوگیا تو حیدرآباد شہر پر مدراس سے آتے ہوئے افسروں کی یلغار ہوئی ۔ حیدرآباد کے افسروں اور اسٹاف میں رکھ رکھاؤ ، وضع داری اور " پالش " زیادہ تھی ۔ اس کے برخلاف یہ رائے بھی عام تھی کہ آندھرا کا اسٹاف کام بہتر کرتا ہے ۔ اس رائے کا اظہار اکثر کھلم کھلا بھی کیا جاتا ۔ تلنگانہ کے عملے پر یہ بات بہت گراں گزرتی ۔ ہاشم بھائی آخر اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کرتے اور آندھرا کے افسروں کو بتاتے کہ کس طرح کئی لحاظ سے حیدرآباد کا نظم و نسق آندھرا سے زیادہ " پروگریسو " تھا ۔ خود ان کو کام کرتے دیکھ کر کبھی یہ خیال بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ تلنگانہ کے افسر کم اہل ہوتے ہیں ۔

خود ہاشم بھائی غیر معمولی قابلیت کے افسر رہے ہیں ۔ سکریٹریٹ میں ایک پوسٹ تھی جو خاص طور پر قابل اور قابلِ اعتماد افسر کو دی جاتی تھی ۔ ڈپٹی سکریٹری پولیٹکل (جس کا رتبہ اب بڑھا کر سکریٹری کر دیا گیا ہے) یہ پوسٹ راست چیف سکریٹری کے تحت تھی اور تمام خفیہ اور راز کے امور اسی کے تحت رہتے تھے ۔ چیف سکریٹری نے اعتراض کیا کہ اس پوسٹ پر کسی مسلم افسر کو

---

(۱) برسوں لگی رہی ہیں ان مہر و ماہ کی آنکھیں تب ہم سا کوئی صاحب صاحب نظر بنے ہے (میر تقی میر)

نا دانش مندی نہیں ہوگی ۔ اس وقت کے چیف منسٹر سنجیوا ریڈی نے اس اعتراض کو ٹھکرا دیا اور خاص طور پر ہاشم بھائی کے تعلق سے کہا کہ اگر وہ بھروسے کے قابل نہیں تو ریاست میں کوئی افسر بھی بھروسے کے قابل نہیں ہوسکتا ۔ ہاشم بھائی اس پوسٹ پر پانچ سال تک فائز رہے اور جب وہاں سے ان کا تبادلہ ہوا تب چیف منسٹر برہمانند ریڈی نے ان کو یہ بات بتائی ۔ ۔ ۔ اور ساتھ ہی ان کا شکریہ ادا کیا کہ وہ ان کے اعتماد پر پورے اترے ۔

ہاشم بھائی کی ہر صفت غیر معمولی ہے ۔ غیر معمولی ذہانت ، غیر معمولی یادداشت ، غیر معمولی خیرسگالی کا جذبہ اور غیر معمولی قصوں اور حکایتوں کا ذخیرہ اور اس کے اوپر شکایت نگاری اور محاضرہ نگاری کی غیر معمولی قابلیت ۔ پھر ان سے متاثر ہوئے بغیر کون رہ سکتا ہے ؟ اس کے ساتھ ہی وہ غیر معمولی حد تک صاف گو ہیں ۔ ۔ ۔ خود اپنے آپ کو " منھ پھٹ " کہتے ہیں ۔ اگر کوئی نامناسب کاروائی ہورہی ہو یا غلط تجویز ہو تو وہ چپ نہیں رہتے ۔ ریاست کی نوکر شاہی کے ایک طبقے سے انھوں نے بارہا ٹکرلی ہے ۔ یہ طبقہ یہاں حاوی ہے اور صرف اپنوں میں ہی گڑ بانٹنے کا عادی ہے ۔ خود ان کے ساتھ بھی ایک بار گھور ناانصافی ہوئی تھی جب ریاستوں کی تنظیم نو کے وقت ان کی سینارٹی کے سات آٹھ سال مارلیے گئے ۔ یہ خلش ان کو ہمیشہ رہی ہے ۔

پھر ایک وقت آیا جب ان کو ایک ایسی پوسٹ دی گئی ۔ جو نئی نوعیت کی تھی اور جس کے خدوخال ابھی واضح نہیں تھے ۔ کمانڈ ایریا ڈیولپمنٹ ۔ وہ دس سال تک اس محکمہ کے پرنسپل سکریٹری اور بعد میں Agricultural Production Commission کے چیرمین بن کر ریٹائر ہوئے ۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے میں انھوں نے اس کو اتنا اہم بنادیا کہ سب حیران ہوگئے ۔ وہاں انھوں نے اس موضوع پر دو جلدوں میں کتاب لکھی ۔ اسی پوسٹ سے وہ دوبار غیر ملکوں میں گئے اور عالمی بنک کے اکسپرٹ کی حیثیت سے اتنا نام کمایا کہ انھیں اکثر غیر ممالک سے دعوت نامے آتے ۔ لیکن اگر وہیں ان کا کیریر ختم ہوجاتا تو وہ شاید Consultant بن جاتے اور ان کی شخصیت پورے طور پر ابھرنے نہ پاتی ۔ اس کے لیے ابھی ایک اور موڑ مڑنا تھا ۔

انسان کی زندگی ، اس کے مقدر کا انحصار کس قدر اتفاقی واقعات اور حادثات پر ہوتا ہے ۔ سنہ ۱۹۸۳ ء کے الکشن سے پہلے ایک مانگ جو آندھرا پردیش میں بڑے زوروں پر تھی وہ یونیورسٹی اور ہائی کورٹ میں مسلمانوں کے تقرر کی تھی ۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی جگہ خالی تھی ۔ چیف سکریٹری رامن نے صلاح دی کیوں نہ ہاشم کو اس جگہ لگا دیا جائے ۔ تقرر ہوگیا ۔ یہ اعزاز ہاشم بھائی کے لیے ایک جذباتی اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ انھوں نے نہ صرف وہاں تعلیم پائی تھی بلکہ وہاں پڑھایا بھی تھا ۔ لیکن یونیورسٹی کے حالات دگرگوں تھے اور خاص طور پر ایک یونین نے تو وہاں ہڑبونگ مچا رکھی تھی ۔ اس تقرر کے خلاف احتجاج بھی ہوا ۔ اس کے علاوہ تقریباً ہر شعبہ میں لاقانونیت تھی ۔ لا کالج میں نہ تو طلبا آتے تھے نہ پڑھانے والے ۔ ہاشم نے دھمکی دی کہ اگر طلبا کی حاضری پوری نہ ہوئی تو وہ UGC کو اس شعبے کو Derecognize کرنے کے لیے لکھیں گے ۔ پھر ایک ایک کر کے سب مسئلوں کو گرفت میں لیا ۔ یہاں ہاشم کی انتظامی صلاحیتوں کا کڑا امتحان ہوا ۔ بالآخر یونیورسٹی راہِ راست پر آگئی ۔ اس ضمن میں بےشمار چھوٹے اور بڑے واقعات ہیں جن کا ذکر کرنا یہاں ممکن نہیں ۔

ابھی عثمانیہ یونیورسٹی میں ہاشم کی میعاد پوری نہیں ہوئی تھی کہ پنت نے جو اس وقت مرکز میں وزیرِ تعلیم تھے ، ہاشم کو علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر شپ کی آفر دی ۔ یہ پوسٹ کسی بھی مسلمان کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز ہے ۔ لیکن ساتھ ہی یہ کانٹوں کی سیج بھی ہے ۔ وہاں بڑے بڑے شیخوں کی پگڑیاں اچھل چکی تھیں ۔ لیکن عثمانیہ میں کامیابی پانے کے بعد ہاشم کا حوصلہ بلند ہوگیا تھا اور پھر فطرتاً وہ چیلنجوں سے ڈرنے والے نہیں ۔

علی گڑھ یونیورسٹی کی تاریخ میں اتنی اصلاحات کبھی نہیں ہوئیں جتنی ہاشم کے دور میں ہوئیں - وہاں ہر چیز ، ہر امر ، فیصلے ، ہر تجویز ایک خاص نقطہ ، نگاہ سے دیکھی جاتی تھی - ہاشم کا کہنا ہے کہ اگر وہ علی گڑھ نہ جاتے تو انھیں مسلم فرقہ پرستی تجربہ نہ ہوتا (ہندو فرقہ پرستی کا تجربہ انھیں عثمانیہ میں ہوچکا تھا) انھوں نے اپنے مخصوص اسٹائیل میں طلبا کی یونین کے لیڈروں ے راست اور دوٹوک بات چیت کی ان کے واجب مطالبوں کی یکسوئی کی اور ناواجب مانگوں کو رد کردیا - اسی طرح کئی اساتذہ کے تھ ناانصافیاں ہوئی تھیں - ان کا بھی ازالہ کیا - جب ایک موقع سے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو مدعو کیا تو چند طلبا نے منھ نیچے کرکے تمامی طور پر " سی سی " کرنا شروع کردیا - ہاشم بڑے سکون سے اٹھے اور طلبا کو خطاب کرتے ہوئے کہا جو اعتماد سرسید نے سلمانوں میں پیدا کیا تھا وہ آج پنکچر ہو رہا ہے - سب لوگ ہنس پڑے اور طلبہ بھی کھسیانے ہوکر چپ ہوگئے - کچھ مسلمان لیڈروں ر خاص طور پر یو - پی سے اور یو - پی کے چند وزرا نے اس یونیورسٹی کو اپنی ذاتی ملکیت بنا رکھا تھا - ہاشم نے کہا سب کام قاعدہ ، رو سے ہوں گے - جب چانسلر نے وائس چانسلر کی سفارش کے خلاف سینیٹ کی میٹنگ بلائی تو ہاشم نے اسے چیلنج کیا اور کہا کہ دستور کے خلاف ہے - کافی تگ و دو ہوئی - گڑبڑ کرنے کی کوشش کی گئی لیکن ہاشم نے کسی کی نہ چلنے دی - انھوں نے وہاں کے ملاؤں کو بھی للکارا - جب ان کی کاوشوں کی وجہ سے میڈیکل کالج کی سیٹوں میں ۱۰۰ فی صد اضافہ ہوا تو اس کی مخالفت کی گئی کہ س کا فائدہ زیادہ ہندوؤں کو ہوگا -

ہاشم نے سمجھوتہ کرنے کی بجائے قدم آگے بڑھائے - انھوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو تجویز دی کہ ماری دو یونیورسٹیوں کو باہمی تال میل بڑھانا چاہیے - ڈاکٹر رستوگی نے اس آفر پر لبیک کہا - جب کھلاڑیوں کی ٹیموں کا Exchange Programme بنایا گیا تو اس کی مخالفت ہوئی - لیکن جب اس کے باوجود ہاشم نے اسے عملی جامہ پہنایا تو علی گڑھ کے طلبہ نے پنے وائس چانسلر سے حیرانگی سے کہا - " سر - وہ تو بالکل ہمارے جیسے ہیں ! " تعلیم کے میدان میں بھی ایک Exchange Programme تیار کیا گیا - ہاشم نے کہا بنارس یونیورسٹی Classical Studies میں مضبوط ہے جب کہ علی گڑھ یونیورسٹی Medieval Studies پر کافی زور دیتی ہے - کیوں نہ ایک دوسرے کے اساتذہ سے فائدہ اٹھایا جائے - اس طرح جو نفرت اور شک کا آہنی پردہ ونوں یونیورسٹیوں کے درمیان تھا اس کو اٹھا دیا گیا اور غالباً پہلی بار دونوں یونیورسٹیوں کے طلبہ اور اساتذہ نے دیکھا کہ " وہ تو بالکل ہمارے جیسے ہیں " مینیجمنٹ میں اس رویے کو Synergic Approach کہا جاتا ہے - ہاشم نے اس کو Integration Through Inter Action کا نام دیا -

واقعات بیسیوں ہیں - ہر واقعے سے ان کی جدت پسندی اور تخلیقی اپروچ ظاہر ہوتی ہے - مختلف قومی مسائل کا حل نھوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے دائرہ ، عمل میں کرنے کی کوشش کی - ان کی نہ صرف اپروچ نرالی ہوتی ہے بلکہ ان میں غیر معمولی دلیری اور ہٹ دھری بھی پائی جاتی ہے -

ہر مسئلے کا حل تجویز کرنے یا ہر موضوع پر رائے دینے سے پہلے وہ اپنا " ہوم ورک " بہ خوبی کرتے تھے - آج تک تابیں ، اخبار اور مضامین اسی انہماک سے پڑھتے ہیں جیسے وہ اسکول اور کالج میں اپنا کورس پڑھتے تھے - پڑھے ہوئے مواد کے نوٹس بناتے ہیں - ہر نئی کتاب پر نیا مضمون گویا اس عمارت پر جو انھوں نے برسوں کے مطالعے سے استوار کی ہے ، ایک نئی اینٹ ہوتی ہے - اس طرح آج تک ان کی تعلقی عمارت بڑھتی جاتی ہے - انھوں نے نہ صرف قرآن شریف بلکہ دوسرے مذاہب کی مقدس تابوں کا بھی بڑے غور سے مطالعہ کیا ہے - میں جب حیدرآباد کی تاریخ پر کتاب لکھ رہا تھا تو پولیس ایکشن سے پہلے اور بعد کے دور

کے بارے میں مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ کے متعلق میں نے متعدد مسلمانوں سے بات چیت کی ۔ ان سے بھی مشورہ لیا ۔ انھوں
مجھے سید عبداللطیف کی کتاب Bases of Islamic Culture پڑھنے کو دی جس میں مختلف موضوعات پر قرآن کی آیات اور حدیث
رو سے تشریح کی گئی ہے ۔ اس سے مجھے متعلقہ باب لکھنے میں کافی مدد ملی ۔ اس کے علاوہ انھوں نے مجھے چند ایسے لوگوں سے ملا
جو اس دور سے گزر چکے تھے ۔ اور جن کو اس بارے میں ذاتی تجربہ تھا اور اس کی بنا پر چند واقعات پر روشنی ڈال سکتے تھے ۔ کی
کہ ان کا مطالعہ وسیع ہے اس لیے وہ کٹر پنتھیوں سے کبھی دبے نہیں ۔

ذہانت کا ایک روپ بذلہ سنجی ہے ۔ طنز و مزاح بھی اسی قبیل سے ہے ۔ ہاشم بھائی کی گفتگو اور تقریر میں بڑا ستھرا م
ملتا ہے ۔ انھیں مسلسل اکسانے کے بعد صرف ایک بار ہم ان کو زندہ دلان کے جلسے میں لانے میں کامیاب ہوسکے ۔ انھوں نے
" اہلِ غرض " پر مضمون پڑھا تھا ۔ جو بہت سراہا گیا ۔ اس کے بعد وہ اسٹیج پر نہیں آئے حالاں کہ خود ان کو بھی اپنے اس جوہ
اعتراف ہے ۔ شاید یہ فیصلہ دور اندیشی پر مبنی تھا ۔ کیوں کہ ایک افسر کے لیے اس سے زیادہ اور کوئی شہرت نقصان دہ نہیں ؟
کہ وہ مزاح نگار ہے ۔ پھر اسے ہر سنجیدہ کام کے لیے نااہل سمجھا جاتا ہے ۔ کتنے افسر اور کتنے سیاست داں اپنی حسِ مزاح کو چور
کی طرح دبائے رہتے ہیں ۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب ہم نے عالمی جشنِ مزاح کا اہتمام کیا ۔ ہاشم بھائی میری موجودگی
جب بھی کسی سے ملتے ہیں تو اس سے کہتے ہیں " میں صرف گفتگو میں مزاح نگاری کرتا ہوں ۔ یہ تحریر اور تقریر دونوں میں " اور
شاید دل ہی دل میں کہتے ہیں ۔ " اس لیے یہ اکثر پکڑا جاتا ہے ۔" وہ نہ صرف مزاحیہ جملے اور Snippets اکٹھے کرتے ہیں بلکہ
اپنے مزاحیہ قول بھی نوٹ کرتے رہتے ہیں ۔ ایک بار ایک ایسی لسٹ انھوں نے مجھے ازراہِ سیمپل دی تھی ۔ کبھی بلیک میل کر
کا موقع آیا تو استعمال کروں گا ۔ وہ دانش مندی اسی میں سمجھتے ہیں کہ حسِ مزاح چھپی رہے اور مزاح نگاری چوری چھپے کی جائے
میں سمجھتا ہوں کہ بارہا ان کی کامیابی کی وجہ ان کی بذلہ سنجی اور حسِ مزاح ہی تھی ۔ ہم مزاح نگاروں کی حوصلہ افزائی کے لیے
وقت آگیا ہے کہ ہاشم بھائی جیسا کامیاب شخص مزاح کی سود مندی کا علانیہ اعتراف کریں ۔

جب وہ عثمانیہ کے وائس چانسلر تھے تو اپنی شادی کی (غالباً) ۳۰ ویں سالگرہ پر انھوں نے اپنے چند دوستوں کو ڈنر پر
کیا ۔ کھانے کے بعد سب چلے گئے ۔ میں اور میری بیوی ان سے باتیں کرتے رہے ۔ کار کے پاس پہنچنے کے بعد ہاشم بھائی تھو
جذباتی ہوگئے ۔ میرا بازو پکڑ کر کہنے لگے " آج ہماری شادی کو ۳۰ برس ہوگئے ۔ اس دوران ایک بار بھی ہمارا آپس میں کبھی
نہیں ہوا ۔ اور اس کا سارا کریڈٹ وحید کو ملتا ہے ۔ نہ جانے یہ کیسے مجھ جیسے بگڑ شخص کے ساتھ نباہ کرتی رہی ۔" میں نے کہا ۔ "
بڑے افسوس کی بات ۔ جھگڑا تو ہونا ہی چاہیے ۔ اس کا مطلب ہے آپ نے ابھی تک گرہست کا مزا نہیں چکھا ۔ چلیے میں آپ کو
ہوں جھگڑا کیسے کرتے ہیں ۔" میری بیوی نے یہ سنا تو وہ بول اٹھیں ۔ " آپ کیا سکھائیں گے ؟ میں سکھاتی ہوں ۔" اسی بات
ہماری تکرار شروع ہوگئی اور وہ جوڑا کھڑا مسکراتا رہا ۔

وحید بھابی کی شخصیت میں روایت اور جدیدیت کا بڑا حسین امتزاج تھا ۔ مجھے ہمیشہ پہلے نام سے بلاتیں ۔ ہمیشہ بڑے
سے ملتیں ۔ " تم بہت دبلے ہوگئے ہو ۔ کیا بات ہے ؟ " اور پھر میری بیوی سے مخاطب ہوتیں ۔ " اپنے میاں کا خیال رکھو بھابی
ہاشم بھائی کا فون آتا ۔ " وحید کہہ رہی تھی کہ بہت دن سے آپ کی خبر نہیں آئی " ہم جاکے خبر دے دیتے ۔ رمضان میں ایک
بار افطار کے لیے جاتے اور عید کے دن تو وہ گھر ہمارا لازمی اسٹاپ ہوتا ۔ جب ۱۹۸۹ء میں ، میں شدید بیمار ہوا اور مجھے دہلی
آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ میں داخل کرایا گیا تو ہاشم بھائی اور وحید بھابی سب سے زیادہ بار مزاج پرسی کرنے آنے والوں میں سے

بارہا ہسپتال میں آئے اور جب میں اپنے بھائی کے گھر منتقل ہوگیا تو وہاں بھی آئے ۔ ساتھ کبھی پھل ۔ کبھی مٹھائی ۔ کبھی کیک وغیرہ لے لے آتے ۔ ساتھ ہی ساتھ کوئی نہ کوئی دل لگی کی بات کردیتے اور وہ بھی خالص دکنی میں جس سے بات کو اور بھی چاشنی لگ جاتی ۔ وہ تکلف کو اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتیں ۔ ہمیں علی گڑھ آنے کی دعوت دیتی رہیں لیکن ہم جا نہ سکے ۔

حالاں کہ دیکھنے میں وہ چھوٹے قد کی اور نازک اندام لگتی تھیں لیکن وحید بھابی بڑے مضبوط کیرکٹر اور ارادے کی عورت تھیں ۔ ہاشم کے لیے گویا ایک چٹان کا سہارا تھیں ۔ کہا جاتا ہے کہ ہر کامیاب اور بڑے شخص کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے ۔۔۔ اور اس عورت کے پیچھے اس کی بیوی ! ۔ یہاں اس سلسلے کی بیچ کی کڑی غائب تھی ۔ ابھی عثمانیہ کا وائس چانسلر بنے ایک دو مہینے ہی ہوئے تھے کہ ہاشم وہاں کی روز کی ہڑ بونگ سے تنگ آگئے اور ایک دن انھوں نے وحید بھابی کو بتایا کہ وہ استعفیٰ دینے جارہے ہیں ۔ بھابی نے کہا ۔ " دیکھو ۔ یا تو آپ کو یہ آفر منظور نہیں کرنی چاہیے تھی یا پھر اب اس سے منہ مت موڑو ۔ حوصلہ قائم رکھو ۔ اللہ سب ٹھیک کردے گا ۔" ہاشم نے اسی نصیحت پر عمل کیا ۔ ۔ ۔ اور کامیابی نے ان کے قدم چومے ۔

انھیں ہاشم بھائی کی صحت کے بارے میں بڑی تشویش رہتی ۔ دو بار آنکھوں کا آپریشن ہوا تھا ۔ دو بار بائی پاس سرجری ۔ ان کی مصروفیات کو راشن کرنے کی کوشش کرتیں ۔ لوگ اور تنظیمیں ان پر انتہائی دباؤ ڈالتے ۔ ہم سب کو بھی ہاشم بھائی کی صحت کے بارے میں خدشہ رہتا ۔ ان کے تینوں بچے امریکہ میں ہیں ۔ علی گڑھ سے آنے کے بعد ہر سال ایک چکر امریکہ کا لگ جاتا ۔ ہمیں بڑے شوق سے وہاں کی تصویریں دکھاتے اور پھر جب ہم اٹھنے لگتے تو کوئی چھوٹا سا پیکٹ میری بیوی کے ہاتھ تھما دیتے ۔ پچھلی بار اپنی نواسی کی شادی کر کے آئے تو ہم نے کھانے پر بلایا ۔ کسی دوسری مصروفیت کی وجہ سے اس دن وہ کھانے پر نہ آسکے ۔ بھابی نے کہا ۔ " کیا ہمارا پروگرام چیک کر کے ہمیں بلایا تاکہ ہم آ نہ سکیں ؟ "

۱۲ نومبر ۱۹۹۳ء کی رات کو جب وہ The World This Week پروگرام دیکھ رہے تھے تو اچانک وحید بھابی کی طبیعت خراب ہوگئی اور پیش تر اس کے کہ کوئی طبی امداد دی جاسکتی وہ اس دنیا سے چلی گئیں ۔ ہاشم بھائی لاش کو لے ہسپتال پہنچے کہ شاید بے ہوش ہو ۔ لیکن ڈاکٹروں نے کہا کہ یہ ابدی نیند ہے ۔ قدرت کی بات بھی عجیب ہے ۔ دل کس کا کم زور تھا بائی پاس کس کی ہوئی تھی اور دورہ کس کو پڑا ؟

اس صدمے سے ہاشم بھائی بالکل ٹوٹ گئے ۔ دیوالی کی شام ہم بھابی کو دفنانے لے گئے ۔ شہر میں پٹاخے چل رہے تھے ۔ ہر طرف چراغاں تھا ۔ میں سوچ رہا تھا کیا یہ چراغاں بند نہیں ہوسکتا ؟ پھر خیال آیا کہ ایسی نیک روح کے آخری سفر پر شاید چراغاں ہی مناسب ہے ۔ ایسا لگتا تھا کہ سارا شہر انھیں الوداع کہہ رہا تھا ۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ انسان فانی ہے ، موت پر دکھ ہوتا ہے خاص طور پر اگر وہ ایسے عزیز کی ہو ۔ لیکن قدرت کا نظام ایسے ہی چلتا ہے ۔ ایسے نیک لوگوں کے مٹی میں مل جانے سے ہی مٹی میں زرخیزی پیدا ہوتی ہے ، ان سے فصلیں پیدا ہوتی ہیں ، پھول کھلتے ہیں ، زندگی بنتی ہے ۔

عموماً عورتیں خاوند کی موت پر بے سہارا ہوجاتی ہیں ۔ لیکن ہاشم بھائی کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی میں ان کے لیے صرف ایک ہی سہارا تھا ۔ مجھے ہاشم بھائی کا وہ قول یاد آیا کہ " ایک بار بھی ہمارا جھگڑا نہیں ہوا ۔" ہاشم بھائی کی بھابی سے متعلق یادوں میں صرف پیار ہی پیار ، صرف خوش بو ہی خوش بو ہے ۔ ان کا ایسے ٹوٹ جانا قدرتی تھا ۔

پھر ایک بار ہاشم بھائی کی زندگی نے ایک اتفاقی واقعے ، ایک ناگہانی حادثے کی بنا پر موڑ لیا ۔ اس بار وہ موڑ کرب ناک تھا ۔ وہ جو اس شہر کے دانش وروں میں شمار ہوتا تھا ، وہ جو ہر محفل کی زینت تھا ، وہ جو کہتا تھا کہ ہم یہیں رہیں گے ، یہیں

ہریں گے ۔ اچانک بے سہارا ، اجنبی بن گیا ؟ مشورہ کس سے کرے ؟ فیصلے کی ڈور پھسل کر بچوں کے ہاتھ میں چلی گئی ۔ انھوں نے کہا ۔ " بابا آپ کی دیکھ بھال وہیں ہمارے پاس ہوسکتی ہے ۔ یہاں نہیں ۔ آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا ۔" ہاشم بھائی کو صلاح دینے والا تو اب یہاں نہیں تھا ۔ انھوں نے پچھلے ۴۰ سال کی جڑوں کو کاٹ پھینکا ۔ وہ جو اتنا بکھیڑا پھیلا ہوا تھا وہ سب سنبھالا گیا ۔ گھر بیچ دیا گیا ۔ اثاثہ ادھر ادھر دے دیا گیا ، کتابوں کو لائبریریوں کو دے دیا گیا ۔ رختِ سفر باندھا گیا ۔ محض ایک موت نے ان کی زندگی کا رخ ایسا موڑا کہ وہ سات سمندر پار چلے گئے ۔ مجھے ہاشم بھائی کے الفاظ یاد آتے جن کا میں نے کہیں استعمال بھی کیا ہے ۔ " میں یہاں ایک انسان ہوں ۔ میری اپنی شناخت ہے ۔ وہاں امریکہ میں ۔ ۔ ۔ ایک گھر میں محض ایک بڈھا ہوں ، دوسرے میں صوفہ سیٹ کی ایک سیٹ اور تیسرے میں ایک ٹیلیفون ۔" ہاشم بھائی اپنے بچوں کی انگلی پکڑ کر بچے کی طرح چل پڑے ۔ ایک نئے سفر پر ۔ انسان کو اپنی زندگی پر ، اپنے مقدر پر کتنا اختیار ہے ؟

ع ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی

لیکن ہاشم کے سینے میں دل ہے جس میں انسانیت کے لیے تشویش ہے ، قوم اور ملک کے لیے تڑپ ہے ۔ وہ دل وہ تڑپ وہاں بھی زندہ رہیں گے ۔ اور وہ ان کو زندہ بھی رکھیں گے ۔ یہاں بھی وہ صرف ایک ریٹائرڈ افسر ، ایک وظیفہ یاب وائس چانسلر ہی نہیں تھے ۔ وہ یہاں کے دانش ور تھے ۔ اور رہیں گے ۔ کافی عرصے سے ان کی یہ کوشش رہی ہے کہ ہندستانیوں اور خاص طور پر مسلمانوں میں خود احتسابی کا جذبہ پیدا ہو ۔ انھوں نے ۱۹۹۱ء میں شکاگو میں اپنی تقریر میں ، اپنے بعد کے مضمونوں میں اور ہمیشہ اپنی تقریر اور تحریر میں اس بات پر زور دیا ہے کہ ہمیں ۔ ہر شخص ہر فرقے کو ۔ ۔ ۔ اپنے گریبان کے اندر منھ ڈال کر جھانکنا چاہیے نہ کہ دوسروں کی خامیاں ڈھونڈنی چاہئیں ۔ وہ مسلمانوں کو تعلیم کی تلقین دیتے ہیں کہ اسی میں ان کی ترقی کا راز ہے ۔ ایسے مثبت مشورے بعض حلقوں میں پسند نہیں کیے گئے ۔ ان کی وجہ سے انھیں دھمکیاں بھی وصول ہوئیں ۔ خاموش ہوجاؤ ۔ اپنا قلم روک لو ۔ ہم صرف وہی سنتے ہیں جو ہم سننا پسند کرتے ہیں وہ نہیں جو ہمیں سننا چاہیے ۔ جو ہمارے لیے مفید ہو ۔ یہی ہمارا المیہ ہے ۔ لیکن طوطی کو نقار خانے میں خاموش نہیں ہونا چاہیے ۔

نہ جانے مستقبل کے بارے میں ہاشم کے کیا پلان ہیں ۔ لیکن میں اگر انھیں مشورہ دے سکوں تو یہ کہوں گا کہ آپ اپنی آپ بیتی لکھیے ۔ (یہ بات میں بار بار وحید بھائی سے بھی کہتا رہا بالآخر انھوں نے لکھنا شروع کیا اور ابتدائی حصے مجھے سنائے بھی لیکن وقت سے پہلے ان کو بلاوا آگیا) ہر غیر معمولی کامیاب شخص کا یہ فرض بنتا ہے ۔ اس کے علاوہ انھیں اب طنز و مزاح کی طرف مائل ہونا چاہیے کیوں کہ اب ان کو اپنی نیک نامی متاثر ہونے کا کوئی ڈر نہیں ہونا چاہیے ۔ امریکہ میں مزاح نگاروں کی بجا طور پر بڑی پذیرائی ہوتی ہے اور گلہ ہے یہ گلہ ہے وہ کچھ پند و نصائح بھی کرتے رہیں ۔ آپ کا ہندستان سے چلے جانا ایک بہت بڑا Brain Drain ہے ۔ لیکن آج کے زمانے میں Drain یک طرفہ نہیں ہوتے ۔ ہم اتنی دوری سے بھی آپ کے ذہن سے استفادہ کرسکتے ہیں ۔ جیسا کہ اسٹار ۔ ٹی ۔ وی کے اشتہار میں کیا جاتا ہے ۔ " آخر ہم ایک دوسرے سے ایک فیکس Fax کی دوری پر ہی تو ہیں ۔" یقین کیجیے ہمیں آپ کی صاف گوئی ، دانش مندانہ صاف گوئی کی ابھی بہت ضرورت ہے اور وہاں بھی تو آپ بہت کچھ کرسکتے ہیں ۔ کتنے ہندستانی کتنے حیدرآبادی نوجوان اور ان کے بچے وہاں ہیں ۔ جتنا ہمارا نقصان ان کا فائدہ ہے ۔

اور ہمارے دل میں آپ سے ملنے کی آرزو ہمیشہ جوان رہے گی ۔

ooo ● ooo

ڈاکٹر اختر سلطانہ

غاروں کی تصویریں ۔۔۔ ایک معمہ

نودریافت شدہ آلتامیرا (ALTAMIRA) غار سان تلانا ویل مار (SANTILLANADEL MAR) اسپین کے شمالی ساحل پر واقع ہے ۔ ۱۸۶۹ء کی ایک گرمائی شام کو آثارِ قدیمہ کے ایک شائق فن مارسیلی نودے ساؤتواولا (MARCELINO - DE SAUTUOLA) ۔ اس غار کے دہانے پر رہل کے ایک ڈھیر کے قریب کرید کرید کر کچھ تلاش کرنے میں مصروف تھے دفعتہً غار کی گہرائی سے انھیں اپنی نوسالہ لڑکی ماریا کی چیخ سنائی دی ۔

"پپا ۔ ۔ ۔ جلدی آئیے ۔ بیل ۔ بیل"

اور وہ مضطر بانہ اپنی لڑکی کی طرف لپکے جو متحیرانہ انداز میں چھت کی ایک جانب اشارہ کر رہی تھی ۔ انھوں نے اپنی لالٹین بلند کی اور محسوس کیا جیسے ان کے جسم کے تمام رونگھٹے کھڑے ہوگئے ہوں ۔ جو کچھ انھوں نے دیکھا وہ بیل نہیں بلکہ ماقبلِ تاریخ زمانے کا ایک شان دار مصوری کا شاہ کار جنگلی بھینسہ (BISON) تھا ۔ جو سرخ ، زرد ، چاکلیٹی اور سیاہ رنگوں میں پینٹ کیا گیا تھا ۔



یہی نہیں ۹ x ۱۸ میٹر کی چھت فی الحقیقت پینٹ کیے ہوئے کئی FUR والے مہیب وحشی جانوروں سے بھری پڑی تھی ان میں سے سترا تو حیرت انگیز طور پر ہو بہو زندہ جیتی جاگتی شکل میں تھے ۔ کچھ کھڑے ہوئے ۔ چند ایک بیٹھے ہوئے ۔ کچھ لیٹے ہوئے یا نیند میں زمین پر لڑھکی ہوئی حالت میں ۔ چند پنجوں کے بل کھڑے پچھلے پیروں کو پھیلائے ہوئے ۔ کوئی نیزے کا زخم لگنے کے بعد کراہتے ہوئے ۔ بعض مجروح ہونے کے بعد جاں کنی کے عالم میں گرد آلود زمین پر لوٹتے ہوئے ۔ بھیڑیوں کے خوف سے کانپتی ہوئی ایک دہشت زدہ سی ہرنی کے علاوہ درمیان میں ایک غضب ناک جنگلی سور اور گھوڑا بھی ۔

پر پیچ بھول بھلیاں نما غار میں ہاتھوں کی مدد سے راستہ ٹٹول کر آگے بڑھتے ہوئے ساؤ تو اولا (SOUTUOLA) کو وہاں کی چٹانوں پر منقش درجنوں جانوروں کی دیواری تصویریں ملیں جن میں عظیم الشان بارہ سنگھے ۔ بڑی سینگوں والے ہرن ۔ شاخ دار سینگوں والے چوپایوں کے علاوہ عظیم الجثہ ارنا بھینسے وغیرہ بھی (جن کی نسل اب معدوم ہوچکی ہے) ۔

اس نہایت اہم غیر متوقع دریافت نے ماقبلِ تاریخ کے انسانوں کے بارے میں انکشاف کے وسیع دروازے کھول دیے ۔ دون مرسیلی نو (DON MERCELINO) (ایک اور ماہر آثارِ قدیمہ) نے جب اس بارے میں سنا تو اس نے آلتا میرا (ALTAMIRA) غار کی پینٹنگس اور وہاں موجود نقش ونگار کو خارج از قیاس کہنہ اور پچھلے وقتوں کی یادگاریں تسلیم کرلیا ۔ کیوں کہ یہ ثبوت کافی تھا کہ وہاں موجود جن جانوروں کی شبیہیں ملی تھیں وہ زبانِ حال سے کہہ رہی تھیں کہ وہ قدیم ترین ہیں کیوں کہ ان کی نسلیں صدیوں پہلے مغربی یورپ کی سرزمینوں سے ناپید ہوچکی تھیں ۔ جب وہ اس غار کے دہانے پر پہلی بار آئے تو تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ مصوری کے یہ شاہ کار یقیناً PALAEOLITHIC ERA یا قدیم حجری دور کے ہیں جو ۱۰۰۰۰ قبلِ مسیح میں گریٹ گلیشیرس کے پگھلنے کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے ۔ ساؤتواولا (SOUTUOLA) نے آلتامیرا (ALTAMIRA) غار میں دیواری مصوری کے جو نمونے ملے تھے ان کو جدید پمفلٹس کی شکل میں شائع کروایا ۔ اور ان پمفلٹس کو ماقبل تاریخ آرکیالوجی ریکارڈ کی اس میٹنگ میں بھجوایا جو ۱۸۸۰ ء میں لزبن میں منعقد ہوئی تھی ۔ اس تنظیم نے ان تصویروں پر فوراً جعلی ہونے کا لیبل چسپاں کردیا اور کہا کہ یہ تو کسی ماہر فن مصور کی تخلیقات ہیں جو حساس ذہن کا مالک ہے ۔ صناعی کے یہ شاہ کار ان وحشی انسانوں کے ہرگز نہیں ہوسکتے جو بندروں سے مشابہہ تھے ۔ اس تنظیم نے ساؤتوالا پر یہ الزام بھی لگایا کہ ان تصویروں کو اس نے خود پینٹ کیا ہے اور اس کا مقصد مقدس مذہبی تصورات کو جھٹلانے کے سوا اور کچھ نہیں ۔ وہ مایہ ، ناز شائق فن ہسپانوی باشندہ جس نے اس غار کو دریافت کیا تھا ۔ اپنے دعوے کو اپنی زندگی میں صحیح ثابت کرنے میں ناکام رہا اور ۱۸۸۸ ء میں موت کی آغوش میں چلا گیا ۔

اس بات کو مشہور ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ۱۹۰۲ ء میں نوجوان ایبے ہنری برئی (ABBE HENRI BREUIL) یہ نام فرنچ معلوم ہوتا ہے ۔ تلفظ یہ ہوگا ۔ ایبے برئی (بشرطے کہ ہجا صحیح ہو) جو پینٹیڈ غاروں کے پادری کی حیثیت سے شہرت حاصل کرنے کا خواہاں تھا ۔ کوشش کی کہ اس نظریے کو صحیح ثابت کیا جائے کہ وہ تصاویر قدیم مذہبی معبد ہی کی ہیں ۔ وہ مصور غاروں کے پادری (PRIEST OF PAINTED CAVES) کی حیثیت سے آلتا میرا کو دیکھنے کے لیے گیا ۔ اسے وہاں ایسے جانوروں کے ڈھانچے ملے ۔ جن کی ہڈیاں تک پتھر بن چکی تھیں اور بعض پتھروں پر ان جانوروں کے نقوش بھی مرتسم ہوچکے تھے ۔ جو ہزاروں سال سے وہاں موجود تھے ۔ انھیں صدیوں سے چھیڑا یا چھوا نہیں گیا تھا ۔ ان کے ڈھانچے جسمانی حیثیت سے بالکل ان

پینٹنگس کے مماثل تھے جن کے نقوش وہاں کی چھتوں اور چٹانوں پر موجود تھے ۔ اس کے بعد ان دیواری نقاشی کے نمونوں اور تصویروں کو ماقبلِ تاریخ زمانے کی مستند اور قابلِ اعتبار مصوری کے نمونے تسلیم کرنے میں کوئی شک یا شبہ باقی نہیں رہا ۔ اس کے بعد ہی آلٹا میرا کو ماقبل تاریخ کے آرٹ کے SISTINE CHAPIEL سے موسوم کیا گیا ۔ آلٹا میرا غار کے شاہ کاروں کو مستند تسلیم کیے جانے کے دس برس بعد یورپ میں سو سے زیادہ ایسے ہی خوب صورت دیواری تصویروں سے آراستہ کئی غار دریافت ہوئے جن میں ماقبل تاریخ زمانہ کی تصویریں اور نقاشی کے نادر نمونے موجود تھے ۔ شمالی اسپین میں فرانسیسی پیرینیز (FRENCH PYRENEES) اور دوردون یے (DORDOGNE) کی شمالی زمینوں میں ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ، کچھ جنوبی اٹلی میں اور ارلاس (URLAS) میں کہیں کہیں جو تصاویر اور سنگ تراشی کے نمونے ملے ، ان میں سے کسی مقام کی تخلیقات بھی اتنی تازہ ، جدید اور جاہ و جلال کو ظاہر کرنے والی نہیں تھیں جن سے آلٹا میرا میں موجود شاہ کاروں کا تقابل کیا جاسکے ۔

۱۹۴۰ء میں اسکول کے لڑکوں کا ایک گروپ تقریباً لاس کاؤزے (LAS CAUSE) گیا تھا جو فرانس کے نزدیک واقع ہے اتفاقاً ایک پالتو کتا سنگلاخ چٹانوں میں موجود غار کے ایک کھوہ میں گر پڑا ۔ اس کی تلاش میں بچے اس غار میں اتر پڑے ۔ اس غار میں موجود زندہ جانوروں سے مشابہہ تصویریں اشکال ، سنگ تراشی کے نمونوں وغیرہ کی خاصی تعداد ایسی تھی جو شاندار ماقبلِ تاریخ کے وحشی جانوروں سے ملتے جلتے تھے (PALAEOLITHIC) لُوور (LOVIRE) صناعی کے ان نمونوں میں حیرت انگیز سانڈ ، چار پانچ میٹر لمبے سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے ۔ ایک عظیم الشان دیو پیکر بارہ سنگھا جس کی سینگیں سرریلسٹک (SURREALISTIC) انداز کی تھیں ۔ ایک اور عجیب الخلقت دیو پیکر جانور جس کی دو لانبی سینگیں اس کے مربع نما سر سے جڑی ہوئی تھیں ۔

یہاں موجود جانوروں کی یہ تصویریں جو اعلیٰ درجے کی اور جاذبِ نظر تھیں ان کے مقابلے میں انسانی پیکروں کی تصویر کشی انتہائی بھونڈے انداز کی تھی ۔ کسی نے اس کی توضیح یوں کی کہ انسانوں کی تصویر کشی یا ان کے نقش و نگار کی عکاسی شاید اس وقت مذہباً ممنوع ہوگی یا یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت کے طاقت ور مذہبی پروہتوں اور کاہنوں نے عقیدتاً انسانی تصویریں بنانے پر امتناع عائد کیا ہو ۔

۰، سال کی جدوجہد ، مطالعے و تحقیق اور ہر وہ سائنسی طریقہ ، کار کے استعمال کے باوجود ماہرینِ آثار قدیمہ نے یہ اعتراف کیا کہ وہ تعجب خیز (CAVE ART) کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل کرسکتے ہیں اور ان کے تخلیق کاروں کے بارے میں بھی کم ہی جانتے ہیں جنھوں نے ان تصاویر کو خلق کیا ۔

آرٹ کے یہ قدیم ترین نمونے کتنے ہی کہنہ کیوں نہ ہوں لیکن طرز اور اسٹائیل میں ایک دوسرے سے قریب و مماثل محسوس ہوتے ہیں جیسے کہ یہ ایک ہی اسکول سے تعلق رکھتے ہوں ۔ ریڈیو کاربن (RADIO CARBON) کی مدد سے کیے جانے والے تجربے سے جس کے ذریعے وقت کا تعین کیا جاتا ہے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ یہ دیواری پینٹنگس ۱۰۰۰۰ سے ۳۰۰۰۰ قبلِ مسیح کے درمیان بنائی گئی ہیں ۔ قیاس کیاگیا ہے کہ تاریخی حیثیت سے مندرجہ وقت ریکارڈ شدہ اس وقتی وقفے سے ۳ گناہ زیادہ بھی ہوسکتا ہے ۔

بالکل ابتدائی تاریخی زمانے میں بنائے گئے بہت سے مصورانہ نقوش خاصے بھونڈے محسوس ہوتے ہیں لیکن بعد میں جب زیادہ تفصیلی جائزہ لیاگیا تو یہ ایسے محسوس ہوئے جیسے کہ ماہر حیاتیات یا کبھی کبھی اشکال کے خاکے بنانے کے لیے (ANATONICAL CHARTS)

اتار تے ہیں ۔ اس طرح کے فن کارانہ نمونوں کو اس وقت کے کیوبسٹ (CUBIST) آرٹ کے دور سے موسوم کرسکتے ہیں ۔ اس دوران بنائے گئے مصوری کے نمونوں میں سینگیں سامنے سے اتاری گئی ہیں اگرچہ سر ایک رخی انداز کے ہیں اور گردن آرٹسٹ نے جہاں مناسب تصور کی ہے وہاں تک بنادی ہے ۔

یہ فن کار کون تھے ۔ ۔ ۔ ؟ بعد کی تحقیقات سے اس نتیجے پر پہنچا گیا کہ یہ مغربی یورپ کے باشندے تھے جو ماقبلِ تاریخ (CROMAGNON - MEN) کے دور میں موجود تھے بہ لحاظِ قدوقامت یہ اونچے چوڑے لوگ تھے ۔ ان کے ہاتھ اور پیر سیدھے اور پیشانی اونچی تھی ۔ وہ جانوروں کی کھالیں لباس کی طرح زیب تن کرتے تھے اور شکاری ، مچھیرے یا پھل جمع کرنے والے تھے ۔ ان کی غذا بیرز اور SHELL FISH وغیرہ پر مشتمل ہوگی ۔ تب تک انھوں نے فصل اگانا نہیں سیکھا تھا ۔ مویشیوں کو سدھانے اور گلہ بانی سے بھی وہ واقف نہیں تھے ۔ غالباً گھوڑے سواری سے بھی وہ نابلد ہی تھے اور یہ نہیں جانتے تھے کہ گھوڑے اور دوسرے جانور باربرداری کے کام آسکتے ہیں ۔

گو جس مقام پر وہ رہتے تھے ، وہاں کی آب و ہوا سرد تھی اور اس قسم کے ماحول میں زندگی بسر کرنا اکثر تکلیف دہ بھی ہوجاتا ہوگا ۔ ان کی جو باقیات دستیاب ہوئی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی عمریں کم ہوتی تھیں ۔ مرد زیادہ سے زیادہ پچاس سال کی عمر تک زندہ رہتے تھے اور عورتیں ۲۵ سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے فوت ہوجاتی تھیں ۔ ماقبلِ تاریخ کے یہ باشندے یقیناً نہایت عقل مند اور حساس لوگ تھے ۔ ان کی تہذیب ، رقص اور گانے بھی ایسے ہی ترقی یافتہ ہوں گے جیسا کہ ان کا آرٹ نظر آتا ہے ۔ موت کے بعد پھر زندگی ہوگی انھیں اس کا یقین تھا ۔ اس لیے وہ مرنے والوں کی قبروں میں غذا اور ہتھیار رکھ دیتے تھے کہ عدم کے سفر پر روانہ ہونے والے مسافروں کو جب وہ پھر نئی زندگی پائیں گے تو انھیں ان چیزوں کی ضرورت ہوگی ۔ ان کا ایقان تھا کہ جانوروں کی بھی ارواح ہوتی ہیں ۔ ایک غار میں ایک گھوڑے کی تصویر اس طرح اتاری گئی ہے کہ برچھے کے زخم سے گھائل قریب المرگ بڑے گھوڑے کے جسم سے ایک چھوٹے سے گھوڑے کو جست لگا کر آگے کو نکلتا ہوا دکھایا گیا ہے ۔

آرٹ کے یہ نمونے کیوں بنائے گئے اس تعلق سے ماہرینِ آثار قدیمہ نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ مذہبی عقیدے کے سوا ان کو بنانے کی کوئی اور وجہ نظر نہیں آتی ۔ بعض اس بات پر متفق ہیں کہ ماقبلِ تاریخ کے یہ باشندے شکار کے لیے جن ہتھیاروں کا استعمال کرتے تھے ان کے ذریعے عظیم الجثہ جانوروں کا شکار یقیناً مشکل اور خطرناک ترین عمل رہا ہوگا ۔ اس زمانے کے ان قدیم انسانوں نے قوی وحشی جانوروں کو سحر زدہ کرنے یا ان پر جادوئی اثر کرنے کے عمل کی انجام دہی کی خاطر یہ خاکے یا تصویریں بنائی ہوں گی ۔ قیاساً یہ بھی کہا گیا ہے کہ زیادہ سحر انگیزی یہ تصور کی گئی ہوگی کہ اگر وہ ایک مرتبہ کسی وحشی جانور کے مشابہ کوئی تصویر یا خاکہ غار میں یا دیوار پر بنانے میں کامیاب ہوجاتے تو اس کے بعد اس کو مارنے یا اس کے شکار کی مہم کو سر کرنے میں وہ اپنے آپ میں غیر معمولی طاقت کا احساس کرتے ہوں گے ۔ ان کا یہ بھی خیال ہوگا کہ تصویر کشی کے بعد وہ جانور بھی انسانی طاقت کے آگے مزاحم نہیں ہوسکتا ۔

سوچتے ہوں گے کہ اس طرح تصویر میں اس دیو ہیکر جانور کو مقید کرنے سے اس جانور کی روح اس مصور یا فن کار کے قبضے میں آجاتی ہوگی جس نے وہ تصویر بنائی ۔ اپنی تصویروں میں وہ مخصوص جانوروں کی مابہ الامتیاز جسمانی خصوصیات کو بھی واضح

راز میں پیش کرتے تھے ۔ جیسے اگر جانور کوئی گھوڑا یا ہرن ہوتا تو اس کی تیز رفتاری کے لیے پیروں کی وضاحت پر زیادہ توجہ صرف
جاتی تھی ۔ اگر کوئی جانور قوی الجثہ ہوتا جیسے ارنا بھینسہ یا بڑا ہاتھی تو آرٹسٹ یہ کرتا تھا کہ اسے خوف و دہشت میں مبتلا کرنے
لے لیے اس کی پینٹنگ میں برچھے سے زخم کی طرح کا ایک نشان بنا کر اسے پینٹ کردیتا تھا ۔ تاکہ اس کے شکار کو یقینی بنایا جاسکے ۔
ں طرح کی بنائی گئی تصاویر کو بہ طورِ ہدایتی چارٹ کے بھی استعمال میں لاتے ہوں گے تاکہ نوجوان شکاریوں کو یہ سکھا سکیں کہ کس
ام پر نشانہ لگانے سے جانور کو بہ آسانی زخمی کیا جاسکتا ہے ۔

یہ محسوس کیا گیا ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ماقبلِ تاریخ کا انسان جانوروں کی قلت سے خوف زدہ ہوتا گیا کیوں کہ
نوروں کے شکار سے ان کی تعداد میں کمی واقع ہورہی تھی ۔ اس سے غذا کی فراہمی میں کمی کا بھی امکان تھا ۔ بہت سے ماہرینِ آثارِ
یمہ نے یہ نظریہ بھی پیش کیا ہے کہ اس زمانے کے انسانوں کا یہ عقیدہ رہا ہوگا کہ اگر جانوروں کی تصویریں بنائی جائیں تو ان کی
اد بڑھ سکتی ہے ، اس لیے وہ بہ طورِ علامت (SYMBOL) ان جانوروں کی تصویر کشی کرتے تھے جو کم ہورہے تھے ۔

یہ آرٹسٹ تصویریں کس طرح بناتے تھے اس بارے میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ پینٹنگ سے قبل وہ غار کی سنگی دیوار پر
نور کے جسم کے بیرونی خطوط کا خاکہ کسی نوکیلے پتھر کی مدد سے کھود لیتے تھے ۔ ماقبلِ تاریخ کے ان مصوروں کے پاس ہرا یا نیلا
ں نہیں تھا ۔ البتہ یہ آرٹسٹ سیاہی مائل جامنی اور ناسی رنگ NAGNISE OXIDE سے اور کالا رنگ دھویں کے ذریعے
پارکول سے حاصل کر کے اس میں چربی ملا کر استعمال میں لاتے تھے ۔ چاکلیٹی ، لال ، نارنجی اور زرد رنگ وغیرہ IRON ORE
ے بناتے تھے جس کو وہ پتھروں کے بیچ میں رکھ کر پیس لیتے تھے ۔ اس کے بعد اس پاؤڈر کو ، چربی ، درختوں کے رس یا جانوروں
لے خون میں ملا لیتے تھے ۔ تصویروں کو پینٹ کرنے کے لیے جو رنگ استعمال کرتے تھے وہ عموماً گاڑھا ہوتا تھا ۔ ان کو لگانے کے
یقے بھی مختلف تھے ۔ انگلیوں کی مدد سے ، برش سے جو FUR سے بنائے جاتے تھے یا پروں سے یا کسی درخت کی ٹہنی کے
ری حصے کو دانتوں سے چبا کر یا کائی کو تہہ کر کے اس کے ذریعے تصویروں میں رنگ بھرتے تھے ۔ یا پھر کسی سوراخ دار یا سرکنڈے ،
س کی سی لکڑی میں کلر لیکر پھونک کے ذریعے سے اسے اڑا کر بھی دیواری تصویروں کو رنگا جاتا تھا OCHRE کلر کو چربی سے چکنا
کے اسے CRAYON کی طرح بنا لیا جاتا تھا ۔ ایسے CRAYONS آلٹا میرا غار میں پائے گئے ہیں ۔ (THREE
DIMENSIONAL EFFECT بھی ان تصویروں میں ملتا ہے اکثر اوقات خدوخال کو ابھارنے کے لیے غاروں میں پتھریلی سطحوں سے
ں فائدہ اٹھایا گیا ہے جیسے ایک چھوٹے سے قدرتی سوراخ کو جو چٹان کی سطح پر موجود ہوگا اسے چمکتی ہوئی آنکھ میں تبدیل کردیا گیا
ہے یا کوئی بڑا نشان غار کی کسی چٹان پر ہوتا تو اسے لال رنگ کردیا جاتا تاکہ زخم کو پیش کیا جاسکے ۔ بعض عجیب و غریب نا ہموار ،
بے ڈول قسم کے ابھار جانوروں کے سر ، کوہان ، ران یا پٹھے کے گوشت کو ظاہر کرنے کے لیے بھی استعمال میں لائے گئے ہیں ۔
بونیٹ اور چونے کا تہہ نشین مادہ جو عموماً غاروں کے فرش پر موجود رہتا ہے اسے چوپایوں کے پیر بنانے کے لیے استعمال میں
لایا گیا ہے لیکن ان کا مقصد ہر صورت میں تصویر کے نقوش کو ابھارنا ہی رہا ہے ۔



جو اشکال وہاں ملی ہیں ان کے خطوط واضح اور پراعتماد انداز سے بنائے گئے ہیں جن میں مشکل ہی سے تصحیح کیے جانے کی علامات ملتی ہیں ۔ یقیناً ماقبلِ تاریخ کے یہ مصور تصویر کشی کی تربیت اور اس فن کو سیکھنے کے لیے آرٹ اسکولس کو ضرور جاتے ہوں گے ۔ اس کا ثبوت لینے ویل (LENEVILLE) جو جنوب مغربی فرانس میں واقع ہے وہاں ملا ہے جہاں ۱۳۰ پتھروں کے لیے شیٹس ملے ہیں جن پر اسکیچس بنے ہوئے تھے لیکن ان میں سے اکثر خراب حالت میں تھے اور ان سے اس بات کا اظہار ہوتا تھا کہ کسی ماہر استاد نے ان کی تصحیح کی ہو ۔

تعجب خیز بات یہ ہے کہ آرٹ کے یہ نمونے اتنا طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی کس طرح باقی بچ رہے! خیال یہ ہے کہ تصاویر کا بڑا حصہ فنا ہوچکا ہے ۔ اور جو کچھ باقی بچ رہا ہے وہ ایسے غاروں میں تھا جہاں کا درجہ ، حرارت اور رطوبت یا نم مسلسل ایک سی تھی ۔ ہوا کے آنے کا انتظام بھی معقول تھا ۔ نہ بہت زیادہ نمی تھی نہ سیلن کہ رنگ سوکھ جائیں یا پپڑت بن کر نکل سکیں ۔ روغنی رنگ جو ہزاروں سال قبل تصویروں کو پینٹ کرنے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں ۔ آج بھی اگر انہیں انگلی سے

ذراسا بھی چھوا یا رگڑا جائے تو وہ ایک دوسرے میں گھل مل جاتے یا دھندلے ہوجاتے ہیں۔

سب سے اہم چیز جو ان غاروں میں موجود پینٹنگس کے باقی بچے رہنے کا سبب ہوئی وہ یہ تھی کہ ان غاروں میں داخلے کے جو راستے تھے ان کے دہانے بہت زمانہ پہلے چٹانوں کے گرنے سے بند ہوچکے تھے۔ اس طرح لوگ ان میں داخل نہیں ہوسکے۔

خوردبینی مطالعے کے بعد یہ محسوس کیا گیا کہ لاسکو (LASCAUX) کے غاروں کو دیکھنے آنے والے ہزاروں آدمیوں کا پسینہ اور جسمانی حرارت نیز وہاں روشنی کے لیے لگائی گئی لالٹین ان تصویروں کے لیے بہت زیادہ نقصان دہ ثابت ہوئیں۔ جو نقصان ان پینٹنگس کو گزشتہ ۱۵۰۰۰ سالوں میں نہیں پہنچا تھا عوام کے لیے کھول دینے کے صرف ۱۵ سال ان کی تباہی کا موجب بنے نتیجے میں ۱۹۶۳ء میں لاسکو کے غار عوام کے لیے بند کردیے گئے۔

حقیقت میں ان تصاویر کو محفوظ رکھنے کا سہرا ان کے آرٹسٹوں کے سر بندھتا ہے۔ ماقبلِ تاریخ کے زمانے میں بھی ان کے مصور یہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ تصویریں عام لوگوں کی نظروں میں آئیں۔ ان غاروں کے متعلق یہ خیال ہے کہ انھیں اس وقت کی مذہبی عبادت گاہوں یا محفوظ مقدس مقامات کی حیثیت حاصل تھی۔ جہاں یہ تصاویر بنائی گئی ہیں اکثر ان مقامات تک پہنچنا نہ صرف خطرناک بلکہ انتہائی مشکل اور دشوار گزار بھی تھا۔ ان کے بنانے والے آرٹسٹ خود ایسی جگہ کا انتخاب کرتے تھے کہ ان دیواری تصاویر و نقش و نگار کو بنانے کے لیے اس مقام تک پہنچنے میں ممکنہ مشکلات کا سامنا ہو اور وہاں تک پہنچنے کے بعد بھی بے حد طویل فاصلہ طے کرنا پڑے۔ ایک قابلِ دید گینڈے اور عظیم الشان ہاتھی کی تصویر اور روغن یاک کی نقاشی کے جو نمونے فرانس میں ملتے ہیں وہ غار کے دہانے سے تقریباً دو کیلو میٹر کے فاصلے پر بنائے گئے ہیں جہاں تک پہنچنا کچھ آسان نہیں۔

اگر آخری گلیشرس کے بارے میں اوراق الٹیں جو ۱۰۰۰۰ قبل مسیح میں واقع ہوئے تھے تو ماقبلِ تاریخ کے ان غاروں کے آرٹ کو دیکھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کا یکایک اختتام عمل آیا ہے۔ وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ جب درجہ حرارت گرگیا تو یہ لوگ ان مقامات کو چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے اور گرم غاروں اور درختوں کی زیرِ سایہ اپنے مسکن بنالیے یا ندیوں اور جھیلوں کے قرب و جوار میں بس گئے۔ وہ کھیت بونا اور جوتنا بھی سیکھ گئے تھے اور بہ تدریج جانوروں کو سدھانے بھی لگے تھے اور جنگلی جانوروں کے شکار سے حاصل شدہ غذا پر ان کی زندگی کا دارو مدار وانحصار باقی نہیں رہا تھا اس لیے اب ان کے لیے ضروری نہیں تھا کہ وہ غاروں کے جنگلی جانوروں کی ارواح کی حفاظت کرتے۔

۸۰۰ سے ۱۵۰۰ قبلِ مسیح میں سب سے پہلے جو تاجر مشرقی MEDITERRANEAN (بحرِ محیط) سے وہاں پہنچے اس وقت آخری غار کی پینٹنگس بھی ۸۰۰۰ سال پرانی ہوچکی تھیں۔ نقاشی اور مصوری کے وہ قدیم آلات جن کی مدد سے وہ تصویریں بناتے تھے دستبردِ زمانہ کے ہاتھوں نیست و نابود ہوچکے۔ ان مصوروں کے وجدانی جذبات جو ان تصویروں کو بنانے کا موجب ہوئے ان کے بارے میں بھی معلومات حاصل نہیں ہوئی ہیں اور اس طرح ان عظیم وغیر معمولی آرٹسٹوں کا وہ قدیم دور جس میں انھوں نے اپنی تخلیقات کے شاہ کار پیش کیے وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ یہ تجاویز بھی پیش کی گئیں کہ ان غاروں میں جو تصاویر ہیں ان کو دوبارہ بنایا جائے۔ لیکن اس طرح کا عمل ان کے ساتھ قطعاً غیر منصفانہ فعل کے مترادف محسوس کیا گیا۔ کیوں کہ اس طرح نہ تو ان کی صحیح عکاسی ہوسکتی ہے نہ ان کی اصلی خوبیاں ہی اجاگر ہوسکتی ہیں۔ ان تصویروں کی مسحور کن دل کش بناوٹ۔ قدیم صناعی جس

کے سبب وہ اتنا طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی جوں کی توں کیوں کر موجود رہیں ، یہ راز ابھی تک پردہ خفا میں ہے ۔ جب تک ہم بہ ذاتِ خود ان مصورانہ تخلیقات کو نہ دیکھیں ان کی خوبیاں ہم پر واضح نہیں ہوسکتیں ۔ ان کی تخلیقی خوبیوں کا اندازہ ہم غاروں کی اس دھندلی روشنی ہی میں لگا سکتے ہیں جہاں آرٹسٹوں نے انھیں بنایا ہے ۔

مثلاً جب میں پہلے پہل آلتامیرا غار میں گیا تو ایک چٹان کے مسطح پلیٹ فارم کے گوشے میں THREE DIMENSIONAL انداز میں بنائی گئی ایک BISON (جنگلی بھینسے) کی تصویر کو مبہوت سا کھڑا دیکھتا رہا ۔ میرے گائیڈ نے مجھ سے پوچھا ۔ "کیا آپ اس کو اب تک دیکھ رہے ہیں ؟ " ۔ پھر اس نے کہا ۔ "یوں ہی دیکھتے رہیے " ۔ ۔ ۔

میں کچھ لمحے اور اسی طرح ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا ۔ یکایک یوں محسوس ہوا ۔ جیسے وہ سانس لے رہا ہو ۔ اور اس کے جسمانی اعضا بھی متحرک ہوگئے ہوں ۔ یہی نہیں یہ بھی کہ وہ کسی آن مجھ سے آٹکرائے گا ۔ میں نے اپنے حواس مجتمع کئے ۔ یہ حقیقت تھی کہ نہ صرف میں نے اسے بہ ذاتِ خود دیکھا بلکہ یہ سب کچھ محسوس بھی کیا ۔ ۱۵۰۰۰ سال یا شاید اس سے بھی زیادہ قدیم لیکن پھر بھی یہ قیدِ حیات اور یہ ایک ناقابلِ فراموش ، متعجب کن و حیرت انگیز نادر نمونہ تھا ALTAMIRA غار کے اس شاہ کار کا ۔ ۔ ۔

○●○ ● ○●○

حوالے :

1 Ronald Schiller, " Riddle of Europe's Painted Caves " READERS DIGEST
2 F. Clark Howell & The Editor of Life " EARLY MAN " Life Nature Library
3 The Dawn of Modern Man, Geographical Magazine.

(مسلسل ص : ۴۰)

" نہیں ۔ ہم اپنی کار کی سیٹیں ابھی بدلی ہیں ، خراب ہوجائیں گی ۔"

پھر تانگے میں لے جاتے ہوئے اس کے منھ سے اور ناک سے جھاگ سا بہنے لگا اور اس نے تانگے ہی میں میرے بازوؤں میں دم توڑ دیا ۔"

کچھ عرصہ بعد جب میں کالج میں داخل ہوا تو میرے ایک دوست خالد نے بتایا کہ اس کا ایک چچا امریکہ سے آنکھوں کا ڈاکٹر بن کر آیا ہے ۔ وہ چاہتا ہے کہ میرے دوست تابی کی آنکھوں کا آپریشن کر کے نئی آنکھیں لگا دے ۔ کامیابی یقینی نہیں ، بس تجربہ ہے ۔

میرے دوست خالد کو معلوم نہ تھا کہ تابی اب اس دنیا میں نہیں ہے ۔ میں اسے کیا جواب دیتا ، سوائے اس کے :

" اپنے چچا سے کہو ، وہ آنکھیں ہمارے اس اندھے معاشرے کو لگادیں ۔"

کافی ٹھنڈی ہوچکی تھی ۔

○●○ ● ○●○

پروفیسر اکبر رحمانی

اشاریہ مکاتیبِ اقبال اور لمعہ حیدرآبادی

علامہ اقبال کی شخصیت کے مطالعے، ان کے شعر و فلسفہ کی تفہیم، ان کے شب و روز کی مصروفیات، ان کی تصانیف، ان کے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک کے سفروں، ان کی صحت اور علالت، علاج اور معالجے نیز قومی و ملی مسائل کے افکار و نظریات کو سمجھنے کے لیے مکاتیبِ اقبال، بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر جو تحقیقی کام پاکستان میں ہورہا ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ پھر یہ تحقیقی کام (بالاستثنائے چند) خاصا معیاری ہے اور ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔ پروفیسر صابر کلوروی کی مرتبہ "اشاریہ مکاتیبِ اقبال" (1)۔ ایک ایسی ہی حوالہ جاتی کتاب ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں پروفیسر صابر کلوروی نے کافی محنت کی ہے۔ انھوں نے وہ بنیادی کام کیا ہے کہ مکاتیبِ اقبال پر تحقیقی کام کرنے والوں کو مختلف مجموعہ ہائے مکاتیبِ اقبال کی بار بار ورق گردانی سے بے نیاز کرکے Ready Reckoner فراہم کردیا ہے۔

اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ مکاتیبِ اقبال کے مختلف مجموعوں میں کسی خاص شخصیت، موضوع، کتب و رسائل، اخبارات اور ادارے، شہر اور نظم کا ذکر کہاں مل سکتا ہے تو یہ اشاریہ، آپ کی رہ نمائی کے لیے ہمیشہ تیار ہے۔ یہ اشاریہ اردو انگریزی مکاتیبِ اقبال کے تیرہ مجموعوں میں شامل ۱۱۸۳ خطوط پر مبنی ہے۔ اپنے پیش لفظ میں فاضل مرتب نے اشاریہ کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ حقیقت ہے کہ علامہ کی زندگی کے بعض گوشے پہلی بار مکاتیب کے ذریعے ہی منظرِ عام پر آئے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ مکاتیبِ اقبال کے اس ذخیرے سے بھرپور فائدہ حاصل کرنے کے لیے ایک جامع اشاریہ ترتیب دیا جائے تاکہ علامہ کے افکار و شخصیت اور ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں مدد مل سکے اور ان اغلاط کی بھی نشان دہی ہوسکے جو مرتبین کی کوتاہی کی وجہ سے مکاتیب میں در آئی ہیں" (2)۔

"اشاریہ مکاتیبِ اقبال" کل گیارہ حصوں پر مشتمل ہے جس کی تفصیل اس طرح ہے:

اشاریہ (۱) موضوعات کا ہے۔ (۲) میں ان اشخاص کا ذکر کیا گیا ہے جن کا ذکر مکاتیب میں آیا ہے۔ (۳) ان کتب اور اخبارات کے تذکرے پر مبنی ہے جن کا ذکر علامہ کے خطوط میں ہوا ہے۔ (۴) میں انجمنوں، اداروں اور مقامات کا ذکر ہے۔ (۵) میں علامہ کی شائع شدہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کی تفصیل درج ہے نیز ان کتابوں اور موضوعات کا ذکر ہے جن پر علامہ مختلف اوقات میں لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ (۶) میں ایسے تمام اشعار اور نظموں / غزلوں کی نشان دہی کی گئی ہے جو علامہ کے مکاتیب میں موجود ہیں۔ اشاریہ (۷) میں مختلف مجموعوں میں مشترک خطوط کی نشان دہی کردی گئی ہے۔ (۸) میں ایسے خطوط کی نشان دہی کی گئی ہے جن پر تاریخ یا سنہ کا اندراج سرے سے نہیں ہے اور اگر ہے تو غلط۔ (۹) میں ہر سال میں لکھے جانے والے خطوط کی تفصیل اور تعداد کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کی بھی نشان دہی کردی گئی کہ یہ خطوط کس کس مجموعے میں شائع ہوئے ہیں۔ اشاریہ (۱۰) میں ان افراد کا ذکر الفبائی ترتیب سے کیا گیا ہے جن کو علامہ نے خطوط لکھے۔ نیز خطوط کی تعداد کا بھی ذکر ہے۔ (۱۱) میں علامہ کے خطوط کا سنہ وار اشاریہ ہے۔ خطوط سے متعلق جملہ تفصیلات اس اشاریے میں شامل ہیں۔

اس کتاب کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ فاضل مرتب نے بعض خطوط میں پائی جانے والی تاریخ و سنین کی غلطیوں کی بھی نشان دہی

کی ہے ۔ پروفیسر صابر کلوری نے مکاتیبِ اقبال بہ نام لمعہ (جو اقبال نامہ اول میں شامل ہیں) کی تاریخوں کی تصحیح کی ہے اور مختلف اشاریوں میں بھی مکتوبات کا ذکر ہے ۔ یہاں اسی کا جائزہ لیا گیا ہے ۔

(۱) اشاریہ (۳) کے تحت صفحہ ۴۴ پر " ارمغاق عزیز " نامی کتاب کا ذکر ہے جو " اقبال نامہ اول ص ۲۸۹ سے ماخوذ ہے ۔ کتاب کا نام غلط تحریر کیا گیا ہے ۔ یہ کتاب نواب عزیز یار جنگ عزیز کا شعری مجموعہ ہے ۔ کتاب کا اصل نام " ارمغانِ عزیز " ہے جس کی جلد دوم لمعہ نے بھیجی تھی۔ اسی طرح صفحہ ۴۸ پر " عالم گیر انسانی برادری " نامی کتاب کا ذکر ہے ۔ (اقبال نامہ اول ص ۲۷۹)۔ اصل میں یہ انگریزی کتاب Brotherbood کا ترجمہ ہے ۔ اس کتاب کے مصنف کلیفورڈ منشرلٹ ہیں۔ اس انگریزی کتاب کا نام فہرست میں نہیں دیا گیا ہے ۔ جب کہ مکتوبِ اقبال بنام لمعہ (اقبال نامہ ۔ اول ص ۲۷۹) میں کتاب Brotherhood کا ذکر ہے ۔ یہ نام انگریزی کتابوں کی فہرست میں دیا جانا چاہیے ۔ اردو فہرست سے " عالم گیر انسانی برادری " کا نام خارج ہونا چاہیے ۔

(۲) اشاریہ (۱) دوسروں کے کلام پر اصلاح کے موضوع کے تحت لمعہ کی نظم پر دی گئی اصلاح (اقبال نامہ ص ۲۹۲) کا ذکر نہیں کیا گیا ہے ۔

(۳) لمعہ نے علامہ اقبال کو مفید طبی مشورے بھی دیے تھے ۔ ان کا بھی ذکر " اشاریے " میں نہیں ہے ۔ (اقبال نامہ جلد اول ص ۲۷۴ ، ۲۸۲ ، ۲۸۵ ، ۲۸۹ ، ۲۹۱)

(۴) علامہ اقبال کی گلے کی آواز بیٹھ گئی تھی ۔ حکیم نابینا سے علاج کیا گیا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ لمعہ نے اس کے لیے برقی علاج کا مشورہ دیا مگر اس " اشاریے " میں اس کا ذکر نہ ہوسکا۔ بھوپال کے سفر کا ذکر ہے مگر " برقی علاج " کا نہیں۔ (اقبال نامہ ص ۲۸۲ ، ۲۸۷)

(۵) اسی طرح " تعزیت کے موضوع کے تحت لمعہ کے والد بزرگوار کے انتقال پر جو تعزیتی خط لکھا تھا اس کا تذکرہ ہونے سے رہ گیا ہے ۔ (اقبال نامہ ص ۲۶۷)

(۶) مکاتیب اقبال بہ نام لمعہ (اقبال نامہ ص ۲۶۵ ، ۲۶۶ ، ۲۶۹ ، ۲۷۴ ، ۲۷۶ ، ۲۸۲ ، ۲۸۳ ، ۲۸۸ ، ۲۹۳ اور ۲۹۶) میں لمعہ کے کلام پر درستی و اصلاح کا ذکر کیا گیا ہے اور تعریف کی گئی ہے لیکن ان خطوط کو موضوع " تلامذہ اقبال " کے ذیل میں جگہ دی گئی جس سے غلط فہمی کا اندیشہ ہے ۔

(۷) موضوع " عید " کے تحت لمعہ کو دی گئی عیدالفطر کی مبارکباد کا ذکر نہیں کیا گیا۔ علامہ کا یہ خط اقبال نامہ ص ۲۷۶ پر ہے ۔

(۸) اشاریہ (۲) میں شخصیات کے تحت " نظام حیدرآباد " کا ذکر ہے ۔ لمعہ کے نام ایک خط (اقبال نامہ ص ۲۸۶) میں " اعلیٰ حضرت کا اشارہ " نظام " ہی کی طرف ہے ۔ اس لیے اس مکتوب کا حوالہ دیا جانا ضروری تھا۔

(۹) اشاریہ (۵) میں اقبال کی تصانیف کا ذکر ہے ۔ ان کے انگریزی خطبات Reconstruction of Religious Thought in Islam کے نام سے شائع ہوچکے تھے ۔ لمعہ کے نام اک خط میں (اقبال نامہ اول ص ۲۶۷) اس کا ذکر ہے ۔ لیکن فاضل مرتب نے اس کا حوالہ نہیں دیا۔

(۱۰) اشاریہ (۳) میں مقامات اور اداروں کی تفصیل ہے ۔ علامہ کے انگریزی خطبات کو مبارک علی تاجر کتب۔ لاہور نے شائع کیا تھا۔ لمعہ کے نام ایک خط (اقبال نامہ ص ۲۶۷) میں ذکر ہے اس کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے ۔ اسی طرح ایک خط میں لندن کا سفر ملتوی کرنے کا تذکرہ ہے وہ صفحہ نمبر (۲۸۷) بھی اشاریے سے غائب ہے ۔

اس طرح " لاہور " کے ذیل میں " اقبال نامہ اول " ص ۲۸۷ شامل ہونے سے رہ گیا۔ لمعہ کے نام اقبال کے اس خط میں ٹیگور کے

ر جانے کا ذکر ہے ۔

ا تاریخ و سنین میں تصحیح

پروفیسر صابر کلوروی نے لمعہ حیدرآبادی کے دو خطوں کی تاریخوں کو درست کیا ہے مگر ایک خط کی تاریخ کی تصحیح نہ کرسکے (3)۔
ال نامہ اول، ص ۲۸۶ میں لمعہ کے نام اقبال کا ایک خط ہے جس کی تاریخ تحریر ۱۱ مئی ۱۹۳۵ء ہے ۔ صابر کلوروی نے اسے غلط قرار دیا ہے اور
ہ تاریخ ۱۱ مئی ۱۹۳۴ء متعین کی ہے ۔ دلیل یہ دی ہے کہ "اس خط میں لکھا ہے " میں انشاء اللہ آپ کے حسبِ خواہش ضرور بھوپال جاکر بجلی
ہ ذریعے علاج کراؤں گا ۔ " علامہ مئی ۱۹۳۵ء میں بھوپال کے پہلے سفر سے واپس آگئے تھے ۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ رہوڈز لیکچرز کے سلسلے
ں علامہ نے ۱۹۳۵ء میں نہیں بلکہ دسمبر ۱۹۳۴ء میں (زیادہ سے زیادہ) انگلستان جانے کا ارادہ بدل دیا تھا۔ زیرِ بحث خط میں صرف سفر ملتوی کرنے
امکان ظاہر کیا ہے ۔ لہٰذا یہ خط ۲ اگست ۱۹۳۴ء سے پہلے لکھا گیا ہوگا ۔ اس لیے زیادہ قرینِ قیاس تاریخ ۱۱ مئی ۱۹۳۴ء ہے " (3)۔
اقم الحروف کو اصل خط دست یاب ہوا ہے ۔ اسے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس خط کی صحیح تاریخ ۱۱ مارچ ۳۴ء ہے ۔

(۲) لمعہ کے نام دوسرے خط کی تاریخ ۲۱ جون ۱۹۰۴ء درج ہے (4)۔ صابر کلوروی نے اس کی درست تاریخ ۲۱ جون ۱۹۳۴ء لکھی ہے (5)۔
محمد عبداللہ قریشی نے اس کی صحیح تاریخ ۲۱ جون ۱۹۳۵ء تحریر کی ہے (6) اور میری تحقیق کے مطابق یہی تاریخ قرینِ قیاس ہے ۔

(۳) اقبال نامہ اول میں لمعہ کے نام ایک خط (محررہ ۱ / اگست ۱۹۳۴ء) غلط مقام پر درج ہونے سے صابر کلوروی کو اس کے سنہ پر
ہے ۔ اس لیے انھوں نے مذکورہ تاریخ پر سوالیہ (7) نشان لگا دیا ہے ۔ اس خط میں لمعہ کے نارو کے مرض میں مبتلا ہونے کا ذکر ہے اور نظم
د بھی درج ہے ۔ لمعہ کی چھوٹی بہن احمدی خاتون (جو اس وقت بہ قیدِ حیات ہیں ۔ (مقیم حیدرآباد دکن) نے راقم کو بتایا کہ لمعہ بھائی اپریل ۱۹۳۴
کے اواخر میں نارو کے مرض میں مبتلا ہوئے تھے ۔ قریب چار پانچ مہینے وہ بیمار رہے ۔ لمعہ کا ایک مجموعہ " نوائے سروش " (قلمی مخطوطہ) راقم
ے پاس ہے ۔ اس میں ہر نظم اور غزل کے نیچے لمعہ کے دست خط اور تاریخ ملتی ہے ۔ نظم " نارو " بھی اس میں موجود ہے اور اس کے نیچے
مئی ۱۹۳۴ء کی تاریخ اور مقام جالنہ ریلوے اسٹیشن ویٹنگ روم، درج ہے ۔ " نوائے سروش " میں ایک غزل درج ہے جس کا مقطع ہے :

درد نارو کے لطف سے لمعہ   حال کیسا نڈھال ہے اپنا

س غزل کے نیچے ۸ جون ۱۹۳۴ء کی تاریخ تحریر ہے ۔

لمعہ کے ٹیگور سے بھی تعلقات تھے ۔ لمعہ کی علالت کی خبر سن کر ٹیگور نے بھی ایک خط (محررہ ۱۰ / اگست ۱۹۳۴ء) کے ذریعے دکھ کا
ہار کیا ہے اور جلد صحت یابی کی امید کی ہے ۔ (8) ٹیگور کے خط کا متن درج ذیل ہے ۔

VISVA BHARATI

Founder President
RABINDRANATH TAGORE

SANTINIKETAN
BENGAL, INDIA
10TH AUGUST, 1934

Dear Sir,

Rabindranath Tagore has received your letter and wishes me to tell you that he is very sorry to know of your protracted illness. He sends his blessings to you and hopes that you will soon recover.

M. Abbas Ali Khan Esq
192 Nam palli
Hyderabad (Deccan).

Yours faithfully
Anil K. Chanda
Secretary to Rabindranath Tagore.

ان شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ اس خط کی صحیح تاریخ ۱/ اگست ۱۹۳۴ء زیادہ قرینِ قیاس ہے ۔

(۱۲) صفحہ ۱۳۴ پر لمعہ کے نام اقبال کے خط محررہ ۱۵/ اپریل ۱۹۲۹ء کے بارے میں کوئی صراحت نہ ہونے کی وجہ سے فاضل مرتب اور دیگر تمام محققینِ اقبالیات نے اسے اردو کا خط سمجھ لیا ہے ۔ اصل خط انگریزی میں ہے اور راقم کے پاس محفوظ ہے ۔ اسی طرح صفحہ ۱۳۵ کے خط محررہ ۲۰ مئی ۱۹۳۰ء کو اردو کا خط شمار کیا گیا ہے جب کہ شیخ عطاء اللہ نے اس کے انگریزی ہونے کی صراحت کردی ہے اور واقعی یہ خط انگریزی ہی میں ہے ۔ مکتوب اقبال بہ نام لمعہ (محررہ یکم فروری ۱۹۳۱ء) کے بارے میں "اقبال نامہ اول" اور "اشاریہ" (9) میں کوئی صراحت نہیں ہے لیکن پچھلے خط کے القاب مائی ڈیر عباس علی خاں" کے پیشِ نظر اس خط کا انگریزی میں ہونا قرینِ قیاس ہے ۔ صابر کلوروی نے اس کے بعد والے خط کے انگریزی میں ہونے کی صراحت کی ہے جو درست ہے (۱۰) لیکن اقبال نامہ اول" میں صراحت نہیں ہے ۔

(۱۳) اشاریہ (۱۱) میں فاضل مرتب نے لمعہ کے نام اقبال کے خطوط کی تعداد ۲ بتلائی ہے جو ایک فاش غلطی ہے ۔ یہ قطعی سہو کاتب ہے ۔ کتابت کی اسی طرح کی غلطیاں ص ۴۸ (صحیح لفظ شعر العجم) ص ۹۳ (صحیح لفظ ینگ ٹرک پارٹی) اور ص ۸۳ (صحیح لفظ انوارِ اقبال) پر ہیں۔

حوالے و حواشی:

(1) شائع کردہ اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۔ طبع اول ۔ جنوری ۱۹۸۴ء
(2) پیش لفظ ۔ ص ۔ ر
(3) اقبال ریویو لاہور ۔ جولائی ۱۹۸۲ء ص ۵۰
(4) اقبال نامہ اول ۔ ص ۲۸۰
(5) اشاریہ مکاتیبِ اقبال ۔ ص ۸۰ صابر کلوروی نے کن دلائل کی بنیاد پر یہ تاریخ متعین کی ہے ۔ اس وقت میرے سامنے نہیں ہیں۔
(6) روحِ مکاتیبِ اقبال ۔ ص ۵۹۳
(7) اشاریہ مکاتیب ۔ اقبال ص ۱۴۹
(8) یہ اصل خط راقم کے پاس ہے
(9) اشاریہ مکاتیبِ اقبال ۔ ص ۱۳۰
(10) ایضاً ص ۱۳۸

● ○ ●

سید نصرت عالم

اردو ـــــ انگریزی کی ایک جامع لغت

(یعقوب میراں مجتہدی کی پُرعظمت و حوصلہ مند مساعی)

لغت کی بات کیجیے تو کہنا پڑتا ہے کہ لفظوں کا بھی ایک خاندان ہوتا ہے اور یہ اپنے تکوینی اسلوب میں پوری لسانیاتی تہذیب کی آئینہ داری کرتے ہیں اور اپنی نہاد میں ان کی پوری ایک نسل ہوتی ہے جس میں خورد و کلاں ، جواں سال و سال خوردہ سب ہی قسم کے الفاظ شامل ہوتے ہیں ۔ زمانی یا مکانی طور پر ان کی بھی ایک حدِ عمر ہوتی ہے اور یہ ایک رشتہ و پیوند سے جڑے رہتے ہیں اور یہ بھی غلط نہیں کہ ہر لفظ کا ایک مزاج ہوتا ہے اور اس کا ایک کردار بھی جو آب و ہوائے عصر میں پرورش پاکر اپنے تہذیبی ، اخلاقی اور قانونی وجود کا اظہار کرتا ہے ۔ لفظوں کی نفسیات سے یہ بھی کھلے گا کہ ہر لفظ گنجینہ ، معنی کا طلسم بھی نہیں ہے خواہ وہ نظم میں آئے کہ نثر میں ۔

معروضی طور پر ہمارے جذبات و احساسات کے اظہار و ابلاغ کا ذریعہ "حرف و صوت" ہی تو ہے ۔ مختصر یہ کہ الفاظ کی بھی ایک دنیا ہے ۔ ان کی بھی ایک کائنات ہے ۔ خارجی طور پر ان کا وجود جو اور جیسا کچھ ہوگا ، ہوگا مگر داخلی سطح پر اپنے اندر وہ جہانِ معنی رکھتے ہیں ۔ ان ہی الفاظ کی شیرازہ بندی کا نام لغت ہے ۔

جہاں تک یعقوب میراں مجتہدی کا تعلق ہے ، وہ ایک نہایت مرتب و سلیقہ مند ذہن رکھتے ہیں ۔ انھوں نے بذاتہ ایک مہم سر کرنے کی کوشش کی ہے ۔ آج سے تقریباً بیس سال پہلے موصوف نے ایک منصوبے کی داغ بیل ڈالی تھی اور وہ منصوبہ تھا اردو سے انگریزی لغت کا ، کیوں کہ ایک مدت سے اس بات کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ ایک معتبر ، جامع اور کثیر الفوائد ڈکشنری ہو جو ہماری ادبی ، علمی ، مذہبی ، قانونی اور ترجمے کی ضرورتوں کا احاطہ کرسکے اور جس سے داعیاتِ وقت کی تکمیل ہو ۔ یعقوب میراں مجتہدی کی یہ محنت اب بار آور ہورہی ہے کیوں کہ ان کا یہ ذوالجہات کام تکمیل کے بالکل آخری مرحلوں سے گزر رہا ہے ۔ بہت اغلب ہے کہ آئندہ سال اس کا کمپیوٹرائزیشن شروع ہوجائے ۔

یہ کہنا کچھ بے محل سی بات نہ ہوگی کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی "اسٹانڈرڈ انگلش ـــ اردو ڈکشنری" (مطبوعہ ۱۹۳۷ء ـــ اورنگ آباد دکن) عرصہ ، دراز سے اہلِ علم اور مترجمین کی ضرورتیں پوری کررہی تھی اور اب بھی کررہی ہے ۔ مگر بات یہ ہے کہ وہ تھی "انگریزی ۔ اردو لغت" لیکن اردو سے انگریزی میں ترجمے میں مدد دینے کے لیے اردو سے انگریزی کی کوئی جامع ، مستند ، وقیع و معتبر "اردو ـــ انگریزی لغت" جب دستیاب تھی نہ اب ہے ۔

ہرچند رام نرائن لال (پبلشر) نے الہ آباد سے ایک "پریکٹیکل اردو ـــ انگلش ڈکشنری" برسوں پہلے چھپوائی تھی ۔ بعد میں اس کے ترمیم شدہ ایڈیشن وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں ۔ فیروز اینڈ سنز لاہور (پاکستان) نے ایک اور اردو سے انگریزی کی لغت (۸۳۱ صفحات) ۱۹۹۰ء میں لاہور سے چھاپی تھی اور اس کے بعد اس کے بھی کئی ایڈیشن شائع ہوئے ۔ رام نرائن لال کی ڈکشنری ہو یا

فیروز لینڈ سنز کی ، یہ دونوں بھی اس معیار پر پوری اتر نہ سکیں جس کی اہلِ علم توقع رکھتے تھے ۔ لیکن یہ بات ہر شبہہ سے بالاتر ہے کہ ان دونوں لغات نے طالبانِ علم کی رفاقت کی ، وقت کا ساتھ دیا اور بڑی حد تک فائدہ بھی پہنچایا ۔ بعد میں ۱۹۸۰ ء میں پاکستان سے پروفیسر بشیر احمد قریشی نے بھی ایک اردو ۔ انگریزی لغت (۹۸۸ صفحات) شائع کی ۔ اس سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے ۔

جس حد تک تاریخ کا ذکر ہے ، میں یہاں جان شیکسپیر (JOHN SHAKESPEAR) ، ڈنکن فاربس DUNCAN FORBES) ، ایس ۔ ڈبلیو ۔ فیلن (S. W. FALLON) اور جان ۔ ٹی ۔ پلاٹس (JOHN T. PLATTS) کی ڈکشنریوں کا ذکر نہیں کروں گا کیوں کہ یہ انیسویں صدی کی پیداوار ہیں اور ۱۸۳۳ ، ۱۸۶۶ ، ۱۸۷۹ ، ۱۸۸۴ ء میں شائع ہوئی تھیں اور ان کا ایک پس منظر ہے اور تاریخ بھی ۔ اب یہ زیادہ کارآمد نہیں رہیں ۔

ایک مرتبہ میں نے مجتبیٰ صاحب کے مکان پر ان سے ملاقات کی تھی ۔ انھوں نے لفظوں اور اس کام کی تفصیلات بتلائیں یہ کام نہایت سائنٹفک انداز میں ، سلیقہ مندی اور نفاست اور نظم و ترتیب کے ساتھ جاری تھا ۔ حروفِ تہجی کے لحاظ سے کارڈ بنائے گئے تھے جن کی تعداد کم و بیش تین لاکھ ہے ۔ یہ لغت کوئی تین ہزار صفحات پر مشتمل ہوگی جس میں اندراجات (ENTRIES) کی تعداد لگ بھگ ایک لاکھ ہوگی (کئی اندراجات ایک سے زائد کارڈ پر ہیں) ۔ اس ڈکشنری کے چند نمایاں اور روشن پہلو یوں سمجھ میں آئے ۔

(الف) ہر اردو اندراج کے بالمقابل رومن رسم الخط میں اس کا تلفظ بتایا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ تمام اردو جملوں فقروں ، محاوروں وغیرہ کو بھی رومن رسم الخط میں لکھا گیا ہے ۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ وہ تمام لوگ جو اردو جانتے ، بولتے اور سمجھتے ہیں لیکن پڑھ نہیں سکتے ، اس رومن رسم الخط کی مدد سے اردو پڑھ سکیں گے ۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے استفادہ کر سکیں گے ۔

(ب) اس لغت میں لفظ کی حیثیت کو بھی سمجھایا گیا ہے کہ آیا یہ مذکر ہے یا مؤنث ، واحد ہے یا جمع اور پھر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ لفظ کا ماخذ اور منبع کیا ہے ۔

(ج) الفاظ کے برتاؤ اور محلِ استعمال کی صحت کے لیے اردو فقروں اور جملوں کی مالا میں انگریزی ترجمے کے پھول گوندھے گئے ہیں اور ان پر خوب کھل کر روشنی ڈالی گئی ہے اور ایک ایک لفظ پر کئی زاویوں سے گفتگو کی ہے اور اس تناظر میں اساتذہ کے کلام سے بھی ضرورتاً استفادہ کیا گیا ہے جیسے رخشندہ کا منظر کھلا ۔

(د) الفاظ کی اسلوبیاتی قدر بھی دی گئی ہے مثلاً متروک ، شعری ، سائنسی وغیرہ ۔

(ہ) اردو ضرب الامثال اور محاورات وغیرہ کے جہاں تک ممکن ہو ہم معنی ضرب الامثال وغیرہ دیے گئے ہیں ۔

(و) اس میں جا بجا (Collocations) اور حروفِ ربط (Prepositions) کا استعمال بتلایا گیا ہے تاکہ صحیح انگریزی لکھنے میں مدد ملے ۔

(ز) اس لغت میں قانونی ، صحافتی ، محکمہ جاتی اصطلاحات اور دیگر اصطلاحات کا قابلِ لحاظ ذخیرہ شامل ہے جس سے خصوصاً مترجمین اور محققین کو بڑی سہولت ملے گی ۔

(ح) اس لغت میں جناب رشید حسن خاں کی کتاب " اردو املا " اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی کتاب " املا نامہ " کی سفارشات کو ملحوظ رکھا گیا ہے ۔

زبان کی تازگی اور شادابی کا بھی ایک ارتقائی عمل ہے ۔ تہذیبی تغیرات اور ان کے نوامیس سے زمانے کو مفر نہیں ۔ حیاتِ انسانی کا ہر گوشہ ان تغیرات و رجحانات کی گرفت میں ہے ، ان سے آزاد نہیں ہے ۔ زبان بھی اس قلم رو کے زیرِ اثر ہوتی ۔

ے کے بطن سے معنی کا ایک نیا افق نمودار ہوتا ہے ۔ ہوتا یہ ہے کہ پرانے الفاظ کا جب پیرہن چاک ہوتا ہے تو یہی الفاظ متروک
ہوجاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے الفاظ سے پُر ہوجاتی ہے ۔

الفاظ کے معنی کی تلاش و توسیع کا عمل ایک تخلیقی عمل ہے جو اپنی صلاحیت اظہار کی تخلیق میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا
۔ توانا اور جان دار زبانوں کی شناخت کا یہی ایک وسیلہ ہے ۔ ان سب اکتسابات کا ذکر مجتہدی صاحب نے اپنی ڈکشنری میں کیا ہے ۔

جناب یعقوب میراں کی نظر بڑی دھلی چھنی ہے ۔ ترجمہ ان کا فن ہے ۔ ترجمے سے ترجمانی کے اس فن میں وہ ایک خاص
مہارت رکھتے ہیں ۔ وہ انگریزی سے اردو اور اردو سے انگریزی کے ایک دست آگاہ مترجم رہ چکے ہیں اور " نظامتِ ترجمہ " حکومتِ
آندھرا پردیش میں نائب ناظم ترجمہ (اردو) (Dy. Director of Translations (Urdu)) کے عہدے سے جولائی ۱۹۸۹ ء میں
وظیفہ ۔ حسنِ خدمت پر سبک دوش ہوچکے ہیں ۔ انھوں نے اس محکمے میں اپنی عمر کے ۲۹ سال (۱۹۶۰ ء تا ۱۹۸۹ ء) گزارے ہیں ۔

مجتہدی صاحب اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں ۔ حیرت اس بات پر ہے کہ " تنہا " ایک شخص ، جس کے پس منظر میں
اس کی اپنی مسائلی زندگی کا ریگ زار ہو ، اتنی بڑی مہم کیسے سر کرسکا ۔ یہ کام تو اداروں اور انجمنوں کے کرنے کا ہے ۔

سب پہ جس بار نے گرانی کی ۔ اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا ۔

یعقوب میراں صاحب نے اپنی جہد اور ستیز اور گرمیِ لہو سے اردو سے انگریزی کی لغت کا جو چراغ روشن کیا ہے ، یہ ان کے
دماغ کے عطرِ پیراہن ہونے کی دلیل بھی ہے اور ان کے خوابوں کی تعبیر بھی ۔

مجتہدی صاحب کے اس کام کے تعلق سے نام ور اساتذہ اور دانش ور جیسے ڈاکٹر یوسف حسین خاں ، ڈاکٹر عابد حسین ، پروفیسر
خوند میری ، پروفیسر عبدالقادر سروری ، ڈاکٹر مسعود حسین ، پروفیسر رفیعہ سلطانہ ، پروفیسر سید سراج الدین ، پروفیسر ظہیر صدیقی ،
کرسٹوفر شیکل (لندن یونیورسٹی) جناب ہیروشی ہاگیتا اردو پروفیسر (ٹوکیو یونیورسٹی) اور دوسرے بہت ساروں نے اپنے جن گراں قدر
وقیع احساسات کا اظہار اپنی آراء کے ذریعے کیا ہے ، اس سے مجتہدی صاحب کی شخصیت اور ان کے کام کی وقعت کا اندازہ ہوتا ہے ۔

یہ بات دل چسپی سے خالی نہیں کہ برِ صغیر ہند کے علاوہ پاکستان ، لندن ، امریکہ اور سعودی عرب کے مختلف اخبارات و
رسائل میں متذکرہ لغت کے تعلق سے اردو ، انگریزی ، ہندی اور تلگو میں مضامین و تبصرے چھپے ہیں ۔ حیدرآباد دوردرشن کے اردو
پروگرام " انجمن " میں اور آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے بھی مجتہدی صاحب کے انٹرویو پیش کیے جاچکے ہیں ۔ نیز ریڈیو کشمیر سری نگر
سے بھی اس ڈکشنری سے متعلق ایک مضمون نشر کیا گیا ۔

ترجیحاً یہ بات درخورِ تشکر ہے کہ ایچ ۔ ای ۔ ایچ ۔ دی نظامس ٹرسٹ نے اس کام کی تدوین و تالیف میں جناب میراں
مجتہدی کا ہاتھ نہ بٹایا ہوتا تو یہ کہنا بہت مشکل ہوتا کہ یہ کام اور کتنے قدم پیچھے رہ جاتا ۔ اس کے صدر نشین پرنس مفخم جاہ کے " دستِ کار
آفریں " و " کار کشا " نے اس کام کو سہل بنا دیا ۔ نسیم سحر ہی چمن میں پھول کھلانے کا باعث ہوتی ہے ۔ اردو سے انگریزی کی یہ ڈکشنری
۔ از جلد منظرِ عام پر آجائے تو ان کی زندگی کا یہ ناقابلِ فراموش ، تابناک اور روشن پہلو ہوگا ۔ جب کبھی محفلِ ارباب و دانش میں
تدوینِ لغت (اردو سے انگریزی) کا ذکر چلے گا تو حیدرآباد کے اس فرزند کا نام بھی نہایت محبت و احترام سے لیا جائے گا ۔ اللہ تعالیٰ
صاحب یعقوب میراں کی صحت قائم رکھے اور ان کی عمر دراز کرے ۔

ooo ● ooo

دو افریقی نظمیں

پنیزی نیپل جاری

ترجمہ : خالد سہیل

کنگرو

پہاڑیوں کے دامن میں
ایک ندی کا پانی
دھیرے دھیرے بہہ رہا ہے
شاخوں پر بیٹھے پرندے
سرخ پھولوں کی خوش بو سے
محظوظ ہو رہے ہیں
ایک کنگرو
تھکن سے چور
درخت کے سائے میں لیٹا ہے
وہ ندی کے پانی کی آواز سے لطف اندوز ہورہا ہے
وہ کنگرو خوش ہے
جانتا ہے کہ اس کے اردگرد
کوئی ایسا شخص نہیں
جو اسے تیر مار کر شکار کرے
وہ پھولوں کی خوش بو سونگھتا ہے
اور تھکن سے نڈھال
نیند کی آغوش میں چلا جاتا ہے

○●○

میری ڈورو

ترجمہ خالد سہیل

میں اپنی زبان "ڈاٹرنگن" سے محروم ہوگئی ہوں
میں افسردہ ہوں
اس تباہی پر میری آنکھیں پُرنم ہیں
میری مادری زبان کے نرم و گداز الفاظ
چکنا چور ہوکر ماضی میں بکھر گئے ہیں
ہم پر جب انگریزی مسلط کی گئی
تو ہم اپنی مادری زبان ڈاٹرنگن بھلا بیٹھے
اور اسے تہذیب و ثقافت کی بھینٹ چڑھا دیا
اے میری مادری زبان
تمھیں کھونے پر
ہم بہت شرمندہ ہیں

○●○

وزیر آغا

○

چلو مانا ہمیں بے کارواں ہیں
جو جزو کارواں تھے وہ کہاں ہیں

نہ جانے کون پیچھے رہ گیا ہے
مناظر الٹی جانب کو رواں ہیں

ابھی خواہش کے پر نکلے نہیں ہیں
ابھی کچھ خواب ہم پر مہرباں ہیں

چھتیں آباد اور چھتنار سونے
پرندے آسماں در آسماں ہیں

سنا ہے تشنگی بھی اک دعا ہے
لبوں پر لفظ جس کے پر فشاں ہیں

کھلے صحرا میں مت ڈھونڈو ہمیں تم
سدا سے ہم تمہارے درمیاں ہیں

○●○

مہتاب حیدر نقوی

○

اگر کوئی خلشِ جاوداں سلامت ہے
تو پھر جہاں میں یہ طرزِ فغاں سلامت ہے

ابھی تو بچھڑے ہوئے لوگ یاد آئیں گے
ابھی تو دردِ دلِ رائگاں سلامت ہے

سبھی کو شوقِ شہادت تو ہوگیا ہے مگر
کسی کے دوش پہ سر ہی کہاں سلامت ہے

جہاں میں رنجِ سفر ہم بھی کھینچتے ہیں مگر
جو گم ہوا ہے وہی کارواں سلامت ہے

اگر چہ اس کے نہ ہونے سے کچھ نہیں ہوتا
ہمارے سر پہ ابھی آسماں سلامت ہے

ہمارے سینے کا یہ زخم بھر گیا ہے تو کیا
عدو کے تیر، عدو کی کماں سلامت ہے

○●○

○

جو کرتے آئے ہیں احباب ہمت کون کرتا ہے
ہماری وحشتوں کی یوں حمایت کون کرتا ہے

سرِ بامِ خیال آتا ہے اب بھی کون راتوں کو
دل و جاں کے لیے پیدا مصیبت کون کرتا ہے

ہمارے زخم تو دل میں ہمارے کھلتے رہتے ہیں
انھیں باہر کی دنیا سے عبارت کون کرتا ۔ہے

اسے اپنے جنوں کے واسطے ہم نے بنایا تھا
مگر دل دشت میں برپا قیامت کون کرتا ہے

○●○

مہتاب حیدر نقوی

○

دشت کا ، دریا کا بستی کا فسوں کیا چیز ہے
عالمِ بے رنگ میں میرا جنوں کیا چیز ہے

وحشتیں کیا چیز ہیں منظر عجب لگتے ہیں کیوں
یہ فصیلِ جسم کیا ہے خاک و خوں کیا چیز ہے

آ رہی ہے صاف اب دل کے دھڑکنے کی صدا
خاک و خوں کے اس گھرانے میں سکوں کیا چیز ہے

اپنے گھر کے سارے دروازے مقفل ہیں مگر
اس خرابے میں بھلا سوزِ دروں کیا چیز ہے

کارِ دنیا سے کبھی مہلت نہیں ملتی مجھے
ورنہ بتلاتا کہ یہ کارِ جنوں کیا چیز ہے

○●○

○

سب یہ دستور ہے کس بات کا ہم ذکر کریں
آؤ پھر لمحہ ، آئندہ کو تھوڑا چھیڑیں

دشت میں کیوں سگِ آوارہ بڑھاتے ہیں بھیڑ
ان سے کہہ دو کہ کسی شہر کی جانب جائیں

سوچتے رہتے ہیں دنیا تہہ و بالا ہوجائے
بیٹھ کر پھر اسی نظارے کا نوحہ لکھیں

دل کہ سینے میں سماتا ہی نہیں ہے اب کے
سو تقاضا ہے درِ بابِ تمنا کھولیں

○●○

مہتاب حیدر نقوی

○

بس کہ اتنا بھی نہ دنیادار ہونا چاہیے
کچھ نہ کچھ کارِ جنوں سرکار ہونا چاہیے

بے سبب ہی اس کو غم کھانے کی عادت پڑ گئی
درد ، دل میں ہے تو کچھ آزار ہونا چاہیے

ہم نہیں کہتے کہ غم کی اتنی شدت ہو مگر
دیدہ ، تر ، دیدہ ، خوں بار ہونا چاہیے

دل فروغِ جلوہ ، دانش سے ڈرتا ہے بہت
کوئی ہنگامہ بہ پائے یار ہونا چاہیے

بیچ دریا میں کھڑے ہیں یہ کبھی سوچا نہیں
گر نہیں اس پار تو اس پار ہونا چاہیے

○●○

○

دل ہی نہیں یہ دیدہ ، تر بھی اٹھاتے ہیں
کیا بوجھ ہے جو تارِ نظر بھی اٹھاتے ہیں

یہ اضطراب کم نہیں ہوتا کسی طرح
گھر میں ہیں اور رنجِ سفر بھی اٹھاتے ہیں

ایسا نہیں کہ ہم یوں ہی مصروفِ خواب ہیں
پلکوں پہ بارِ شام و سحر بھی اٹھاتے ہیں

یہ سب برائے عزت سادات ہی تو ہے
جو ہم نحیف شانوں پہ سر بھی اٹھاتے ہیں

اہلِ جنوں کے ساتھ ہے دنیا لگی ہوئی
ہم اس لیے یہ بارِ ہنر بھی اٹھاتے ہیں

○●○

شاداب رضی

○

آپ نے سب کو ایک طرف سے اپنے غضب میں رکھا
ہم نے بڑی مشکل سے خود کو حدِ ادب میں رکھا

فیاضی کا ایک انوکھا ڈھنگ اس نے اپنایا
وہ ندا میں چھپ کے سب کو دشتِ طلب میں رکھا

خواب جگاتی اس دنیا میں یاد رہا کب کس کو
کیا ٹپکایا پلکوں سے کیا خشکیِ لب میں رکھا

چاند بنانے والے میری یہ گتھی سلجھا دے
چاند بنایا ہے اس کو تو کیوں عقرب میں رکھا

بھیڑ میں گم ہونے کا اکثر اندیشہ رہتا ہے
دل کی ایک الجھن کیوں اس کو وہمِ عجب میں رکھا

تم شاداب نرے شاعر ہو خود کو منوانے کو
تھوڑا ہنر بھی یاروں نے اپنے منصب میں رکھا

●

مشیر صدیقی

اشعار

یہ جھوٹ ہے اک وقت بھی ایسا نہیں آیا
پیاسوں کے لیے چل کے تو دریا نہیں آیا
سوچا ہی نہیں صبر کی دولت جو ملی تھی
دیکھا ہی نہیں میرے لیے کیا نہیں آیا
کس عکس کی امید رہی میری نظر کو
کس چہرے کو آئینے میں دیکھا نہیں آیا
جب مجھ کو ضرورت ہی نہیں تھی کسی شے کی
اس وقت مرے واسطے کیا کیا نہیں آیا

○ ● ○

کل تیرگیِ شب میں کوئی خواب تھا روشن
یا ان کا تصور کسی احساس کی طرح تھا
بکھرے ہوئے پتے یہی دیتے تھے گواہی
جو وقت بھی گزرا کسی طوفاں کی طرح تھا
لے دے کے یہی چیز تھی سرمایۂ ہستی
کیا اس سے جدا ہوتا ۔ مری جاں کی طرح تھا
اک بوجھ بھی لگتا رہا ماضی کا تصور
اور حال بھی کچھ حالِ پریشاں کی طرح تھا

○ ● ○

افتخار نسیم

تابی

" لیٹ ہونا سکسٹی اور سونٹی کا فیشن تھا اور ہم ویسے ابھی تک اسی میں پھنسے ہوتے ہیں ۔ "
میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے جھنجلا کر سوچا ۔ کھڑکی سے جھانکا ، دور دور تک کوئی رولز رائس نظر نہیں آرہی تھی ۔ ناصر نے نئی رولز رائس خریدی تھی اور مجھے اس پر سیر کے لیے لے کر جارہا تھا ۔
" یہ میری ڈریم کار ہے ۔" ناصر جذباتی ہورہا تھا ۔
" اور مجھے پکا یقین ہے یہ وائٹ کلر کی ہوگی ۔" میں نے اس کا راز فاش کردیا ۔
فون پر خاموشی تھی ۔
" اور سیٹوں کا رنگ کریم کلر ہے ۔"
" او مائی گاڈ ۔ تم نے میری گاڑی کو دیکھا ہوا ہے ۔ " ناصر نے مدھم آواز میں کہا ۔
" نہیں ، میں نے تمھیں دیکھا ہوا ہے ۔"
فون پر ایک قہقہہ سنائی دیا ۔
" گورا رنگ تمھاری کمزوری ہے ۔" میں نے تھوڑا سا اور دبایا ۔
" بکواس نہ کرو تم ہر چیز میں پالیٹکس لے آتے ہو ۔ میں آدھے گھنٹے میں تمھارے پاس آرہا ہوں ۔ پھر " اسٹار بک " کافی پینے چلیں گے ۔

یہ فون پر اتوار کی صبح کو شہر لائل پور پاکستان کے دو مڈل کلاس لڑکوں کی گفتگو تھی جو اب اپنی مڈل ایج میں داخل ہوچکے تھے اور امریکہ کے شہر شکاگو میں اپنی اپنی فینانشل کامیابی پر نازاں ، اپنے اپنے " نیسٹ میں گولڈن ریگ پر بیٹھے ہوئے تھے ۔

ناصر اور میں ایک ساتھ امریکہ آئے تھے اس نے ایم ۔ اے کیا تھا اور میں نے لا ۔ دونوں اپنے اپنے پروفیشن سے سخت نالاں ۔ وہ اکنامکس کا پروفیسر نہیں بننا چاہتا تھا اور میں وکیل ۔ کون سارا دن کچہریوں کی خاک چھانے اور کون لڑکوں کو پڑھاتے چناں چہ ہم دونوں نے دنیا کی خاک چھاننے کی سوچی ۔ امریکہ کو مزدوروں کی ضرورت تھی ، ہم دونوں بھی ورکنگ کلاس ویزا لے کر آگئے ۔

ناصر میں شروع ہی سے ایک شعلہ تھا جو اسے ہمیشہ آگے بڑھنے پر مجبور کرتا رہتا تھا ۔ لیکن ہر ترقی کرنے والے کی طرح اس میں بھی ایک Ruthlessness تھی ۔ اس لیے وہ کبھی انسانوں کو پتھر کی سیڑھیوں کی طرح استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتا تھا ۔

" میں امریکہ میں اپنی غربت مٹانے کے لیے آیا ہوں ۔ اس کے لیے مجھے جو بھی طریقے استعمال کرنا پڑے وہ کروں گا ۔ اپنا وعظ ، اپنی پالیٹکس اور اپنے اصول تم اپنے پاس ہی رکھو ۔" ناصر مجھے کہا کرتا ۔ لیکن پیسے کے معاملے میں کسی اور کی مدد کرے نہ کرے

میری مدد ضرور کرتا تھا ۔ اپنی بہنوں اور بھائیوں کی شادی سے لے کر میری اپنی ضروریات ، سب پر اس کی نظر تھی ۔

" ٹھیک ہے آدمی کا ایک نہ ایک دوست تو ہونا چاہیے تم اپنی شاعری کرو ، لکھو ۔ اس میں تمھیں سکون ملتا ہے اور مجھے محنت کرکے پیسے کماکر ۔" ناصر کا فلسفہ وہ تھا جس سے میں کبھی اتفاق نہ کرتا ، اگر میں اس کے حالات نہ جانتا ۔

میرے اباجی ریلوے میں تھے ۔ جب ان کا لائل پور ٹرانسفر ہوا تو میں فرسٹ ائیر میں تھا ۔ گورنمنٹ کالج لائل پور میں داخلے کے لیے گیا تو سب سے پہلے جس لڑکے سے ملاقات ہوئی وہ ناصر ہی تھا ۔ ہم دونوں فوراً دوست بن گئے ۔ دفتر میں کاغذات جمع کروا کے وہ مجھے کینٹین چائے کے پے اور شامی کھلانے کے لیے لے گیا ۔ ایک میز پر کچھ سینیئر بحث کر رہے تھے ۔

" یہ ٹٹ پونجیے شاعر ہیں ، سارا دن یہاں بیٹھ کر اپنا وقت ضائع کرتے ہیں اور ہوائی قلعے بناتے ہیں ۔ ان لوگوں سے دور ہی رہنا چاہیے ۔"

یہ ریاض مجید سے میرا پہلا تعارف تھا ۔ شاعروں کے نام پر میرے کان کھڑے ہوئے تھے ۔ " کون کہتا ہے کہ شاعر بنائے جاتے ہیں ، مجھ میں تو یہ جراثیم پیدائش سے ہی تھے ۔" میں نے سوچا ۔

کالج کے بعد وہ مجھے اپنے گھر لے گیا ۔ لوئر مڈل کلاس گھر ، جس میں ایک بڑی بہن " متبادل ماں " کا رول ادا کر رہی تھی ۔ جس کی کبھی شادی نہیں ہوگی ۔ در و دیوار سے غربت ، نمایاں تھی ۔ میں نے گھر واپس آکر سانس لیا ۔

" دیکھتے رہنا میں ایک نہ ایک دن غربت اپنے گھر سے ضرور بھگا دوں گا ۔ میرے ابا کو کلرکی کرنے اور بچے پیدا کرنے ہی سے فرصت نہیں ہے ۔" ناصر ہمیشہ کہا کرتا ۔ لیکن اس کا ایم ۔ اے کرنا اور پھر کالج میں لکچرر بننے کی خواہش مجھے اس کی غربت دور کرنے کے ارادے سے بالکل مختلف نظر آرہی تھی ۔ امریکہ آنے کے بعد ناصر نے اپنے وقت کو بہت صحیح استعمال کیا ۔ اسے علم تھا کہ Time is money چناں چہ اس نے ایک ایک منٹ سے ڈالر نچوڑ نے شروع کردیے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لائل پور میں اس کے گھر کا نقشہ ہی بدل گیا ۔ سب بہن بھائی اچھی جگہ تعلیم حاصل کرنے لگے ۔ شادیاں ہونے لگیں اور ناصر بھی خوش رہنے لگا ۔ امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس میں ہاتھ ڈالا تو شکاگو کا Tycoon بن گیا ۔ بزنس ورلڈ میں ناصر کی سنگ دلی کے قصے مشہور تھے ، کوئی اس کے سامنے ٹک نہیں سکتا تھا ۔ اور وہ اسی طرح لوگوں کے سروں پر پاؤں رکھتا ہوا دن بہ دن ترقی اور دولت کی منزلیں طے کرتا گیا ۔ وقت گزر رہا تھا ۔

آج وہ مجھے اپنی رولز رائس میں سیر کرانے کے لیے لینے آرہا تھا ۔ باہر سے گنگناتے ہوئے کار کے ہارن کی آواز آئی ۔ ناصر کار کا دروازہ کھولے کھڑا تھا ۔

سفید رنگ کے کپڑے اور سلک کی سفید جیکٹ میں بہت خوب صورت لگ رہا تھا ۔ " دولت انسان کو خوب صورت بنادیتی ہے " میرے اندر کے جیلس انسان نے کہا ۔ باہر نکل کر میں نے اسے مبارک باد دی ۔ " یاد ہے ہم سائیکل بھی کرائے پر نہیں لے سکتے تھے ۔" ناصر نے رولز رائس کو چلاتے ہوئے کہا ۔

" جوتے اور سوئیٹر بھی ۔" میں نے اسے یاد دلایا ۔ ناصر نے قہقہہ لگایا ۔

رولز رائس امریکنوں کی کمزوری ہے ۔ جولائی کی صبح چلتے ہوئے لوگ ہمیں مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے ۔ ناصر ان کے اس طرح دیکھنے کا خوب مزہ لے رہا تھا ۔

" گورے ، ہمارے رنگ کی وجہ سے یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ یا تو ہم ٹیکسی ڈرائیور ہیں یا چور ۔"

میرے اندر کے جیلس انسان سے ناصر کی خوشی دیکھی نہیں جارہی تھی ۔ اس لیے میں نے فقرہ کسا ۔ لیکن لگتا تھا کہ آج کوئی چیز بھی اس کی خوشی میں حائل نہیں ہوسکتی ۔

ایک موڑ پر تھوڑی سی بھیڑ جمع تھی ۔ ناصر نے گاڑی روکی ۔ جب لوگ ایک طرف ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ ایک کتا گاڑی کے نیچے آگیا تھا ۔ کتا زمین پر پڑا ہوا تھا اور اس کی ٹانگ اور کمر سے خون بہہ رہا تھا ۔

امریکہ میں تو کوئی اپنے کتے کو اس طرح باہر نہیں نکلنے دیتا ۔ ضرور یہ کسی گھر سے بھاگ کر آیا ہوگا ۔

کتا کسی کو ہاتھ لگانے نہیں دے رہا تھا ۔

ناصر اچانک چھلانگ لگا کر اپنی رولز رائس سے باہر نکلا ۔ کتے کے منھ پر اپنی سلک کی جیکٹ کو ڈالا اور اسے گود میں اٹھا کر کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا ۔

" چلو ، قریب ہی انیمل کلینک ہے ۔" اس نے کہا ۔

جب ہم نے کتے کو کار سے باہر نکالا تو دیکھا کار کی پوری سیٹ خون سے بھری ہوئی تھی ۔ ڈاکٹر نے کتے کے گلے کا ٹیگ دیکھ کر اس کے مالک کو اطلاع دی ۔ تھوڑی دیر بعد ایک گوری عورت اور اس کا چھوٹا سا بیٹا روتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور دونوں " شیڈو شیڈو " کہتے ہوئے کتے سے لپٹ گئے ۔ ناصر سے تفصیل سن کر وہ اس کے بہت ممنون ہوئے ۔

" ہمارے گھر ضرور آیئے ۔"

" مجھے شیڈو کے بارے میں باخبر رکھیے ۔" ناصر نے انھیں اپنا کارڈ دیتے ہوئے کہا ۔

ناصر کپڑے بدل کر ڈرائینگ روم میں آیا تو اس کے نوکر نے کافی میز پر لگا دی ۔

" ناصر میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ایک کتے کے لیے یہ سب کچھ کرو گے ۔"

" اس کے پیچھے ایک واقعہ ہے ۔ میرے بچپن کا ایک دوست تھا آفتاب ۔ جسے ہم تابی کہتے تھے ۔ ایک دن اس کی آنکھیں آگئیں ۔ اس کی والدہ نے نہ جانے اس کی آنکھوں میں کیا دوائی ڈالی کہ تابی کی آنکھیں سفید سفید سی ہوگئیں ۔ اسے ہر چیز دھندلی دکھائی دینے لگی ، بس سائے سائے کی طرح ۔ جب انسان کی آنکھیں روشنی کھو دیتی ہیں تو وہ ڈریمر ہوجاتا ہے ۔ ہم دونوں اکٹھے کھیلتے تھے اور اکٹھے خواب دیکھتے تھے ۔ لیکن جب اسکول جانے کا وقت آیا تو اسے کہیں داخلہ نہ ملا ۔ اندھوں کو کون اسکول میں داخلہ دیتا ہے ۔ اس کے والدین نے اسے حافظِ قرآن بنانے کا ارادہ کیا اور اسے ایک جگہ بھیج دیا جہاں تابی سے بجائے حفظِ قرآن کے کرسیاں بنوائی جاتیں اور مونڈھے بنانے کے لیے اسے استعمال کیا جاتا رہا ۔ وہ روز مجھے اپنے ہاتھوں کے زخم دکھاتا تھا اور جب میں اسے اپنے اسکول کی باتیں بتاتا تو وہ حسرت سے سنا کرتا تھا ۔ جب اپنے میٹرک میں پاس ہونے کی خبر میں اسے دینے گیا تو معلوم ہوا وہ اپنے نانا کے گھر گیا ہے ۔ اس کے نانا پکے افیمی مشہور تھے ۔ جب میں وہاں پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ تابی نے اپنے نانا کے گھر جاکر افیون کافی مقدار میں کھالی ہے ۔ وہ خودکشی کرنا چاہتا تھا ۔ میں نے اس کے پاس پہنچ کر زور زور سے آوازیں دیں " تابی ۔ تابی " ۔ اس نے مشکل سے آنکھیں کھولیں ۔ کسی نے چیخ کر کہا " اسے ہسپتال لے جائیں ۔" پھر ایک آواز آئی " لیکن ہسپتال تو بہت دور ہے ، وہاں جاتے جاتے تو یہ مرجائے گا ۔"

میں فوراً ہی پڑوس کے ایک گھر کی طرف بھاگا جن کے پاس کار تھی ۔ " شاہ جی ، شاہ جی ۔ پلیز تابی کو اپنی کار میں ہسپتال لے چلیں ۔" میں نے التجا کی ۔

(باقی ص ۴۴ پر)

نقد و نظر

[تبصرے کے لیے کتاب کی دو جلدیں روانہ کی جائیں ۔ ادارے کا تبصرہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے ۔]

تبصرہ نگار : وقار خلیل

○ نام کتاب : " اردو مدارس کے معیارِ تعلیم کا مسئلہ " ○ مصنف : ڈاکٹر اکبر رحمانی

ڈاکٹر اکبر رحمانی ، ماہرِ تعلیم ، استادِ اردو اور ماہنامہ " آموز گار " (جلگاؤں مہاراشٹرا) کے مدیر اور بچوں کے ادب کے رمز شناس قلم کار اور اقبال شناس دانش ور بھی ہیں ۔ تقریباً (۹) کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے وہ علمی ، ادبی اور تعلیمی و تدریسی اردو دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں ۔

زیرِ نظر مختصر سے کتاب چے میں ڈاکٹر رحمانی کے دو فکر انگیز مقالے " اردو مدارس کے معیارِ تعلیم کا مسئلہ " اور " موجودہ نظامِ تعلیم کی ناکامی کے اسباب اور ان کا علاج " شامل ہیں ۔ موضوع کی اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے ان مقالوں کا دھیان سے مطالعہ اساتذہ ، اردو کے لیے ضروری قرار پاتا ہے ۔

مشہور ماہرِ تعلیم محمد حسن فاروقی کی اس رائے سے ہم اتفاق کرتے ہیں کہ " اکبر رحمانی نے تعلیم کا صحیح مفہوم ، بچوں کی تعلیم اور ان کی تربیت پر اثر انداز ہونے والے عوامل ، موجودہ نظامِ تعلیم کی خرابیوں اور اس کے اسباب و علل کا باریک بینی سے جائزہ لیا ہے ۔ آج ملک میں تعلیم کو عام کرنے کے باب میں سرکاری طور پر وافر دست یاب سہولتوں کے باوجود معیارِ تعلیم کا گراف گرتا ہی جارہا ہے ۔ ضرورت ہے کہ اساتذہ صاحبان ماہرینِ تعلیم کے رہنمایانہ افکار و خیالات کو نصب العین بنائیں اور سرپرست صاحبان بھی اپنے بچوں کو اردو تعلیم و تدریس کے باب میں ذمہ داری کو فرض سمجھ کر انجام دیں ۔

○ سائز : ڈیمائی ○ صفحات : ۳۲ ○ اشاعت : ۱۹۹۶ء ○ قیمت : ۱۵ روپے

ملنے کا پتہ : ایجوکیشنل اکیڈمی ، مکتبہ ، آموزگار ، ۳۷ بھوانی پیٹھ ، اسلام پورہ جلگاؤں ۔ ۴۲۵۰۰۱)

○ نام کتاب : چڑیا گھر ○ مصنف : محمد شاہد عظیم

حیدرآباد میں بچوں کے ادب کی دنیا شاہد عظیم سے نہ صرف واقف ہے بلکہ ان کے بعض معلوماتی مضامین نصابی کتابوں میں شامل رہے ہیں ۔ ان کی ایک دلچسپ کتاب " پرندوں سے جانوروں تک " شائع ہوکر مقبولیت حاصل کرچکی ہے ۔ ادب اطفال کے سلسلے میں شاہد عظیم کی تخلیقی سرگرمیاں ۱۹۵۰ء سے جاری ہیں ۔ انھوں نے بچوں کے لیے سینکڑوں مضامین اور کہانیاں لکھیں ۔ بچوں کی نفسیات اور ان کے ارتقائی ذہن و فکر کو ملحوظ رکھتے ہوئے آسان زبان میں شاہد عظیم نے " چڑیا گھر " کتاب تیار کی ہے ۔ اس میں ۱۳ مضامین اور ۸ تصاویر شامل ہیں ، جن کی تفصیل یوں ہے ، ہاتھی ، گدھا ، بلی ، طوطا ، شارک مچھلی ، وھیل مچھلی ، گوریلا ، گینڈا ، نیولا ، مور ، مکا اور بچھو ۔ تیز رفتار پرندوں اور جانوروں پر اہم اور دل چسپ معلوماتی تفصیلات درج کی گئی ہیں ۔

شاہد عظیم کا اسلوب تحریر اور موضوع سے مربوط افہام و تفہیم کا انداز ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا غماز ہے ۔ جن موضوعات پر

اختصار کے ساتھ شاہد عظیم نے مضامین لکھے ہیں کاش وہ مزید تفصیل کو بروئے کار لاتے ہوئے انھیں مکمل کرتے ۔ اردو صحافت کی ہمہ وقتی مصروفیت نے شاید انھیں مزید فرصت اور مہلت نہ دی ہو ۔ اس کتاب کے مطالعے کے دوران بار بار ایسے ہی موضوعات پر لکھنے والے ایک معروف قلم کار حمید آرموری کا نام ذہن میں ابھرتا ہے ۔ عبارت مختصر ، چڑیا گھر بچوں کے لیے معلوماتی ، مختصر اور مفید کتاب ہے ۔ جو چھپی بھی عمدہ ہے ۔

○ سائز : کراون ○ صفحات : ۶۴ ○ قیمت : ۳۵ روپے

ملنے کا پتہ : اتحاد پبلی کیشنز ۳ / ۱۱۲ - ۲ - ۸ ریلوے اسٹیشن روڈ ، فلک نما ، حیدرآباد ۔ ۵۰۰۲۵۳

○ نام کتاب : اقبال اور تحریکِ آزادیِ ہند ○ مصنف : سید یعقوب شمیم

دکنیات ، غالبیات اور پھر اقبالیات کو اصنافِ ادب کی " اصنافیات " کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا ۔ ان موضوعات پر مقتدر اصحابِ قلم نے بہت کچھ لکھا ہے اور سینکڑوں کتابیں شائع ہوچکی ہیں پھر بھی یہ سلسلہ ، تحقیق ، تالیف اور تحریر و تنقید کا موضوع بنا ہوا ہے ۔

زیرِ نظر کتاب آزادیِ ہند کی ۵۰ سالہ تقاریب کا ایک حصہ قرار پاتی ہے اور اقبالیات شناسی کے باب میں خوش گوار تحفہ اور عصری اضطراب و کشاکش کے دور میں قاری کو اقبال کی فکر اور زاویہ ، نظر کو سمجھنے میں بہتر اور کہتر سوغات قرار دی جاسکتی ہے ۔

سید یعقوب شمیم نے اقبال کی قومی اور وطنی شاعری کے سیاق و سباق میں تحریکِ آزادیِ ہند کا اجمالی جائزہ لینے کی مستحسن کاوش کی ہے ۔ پانچ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں " تحریکِ آزادی کے تاریخی پس منظر کو معتبر حوالہ جاتی تاریخی کتابوں کے تناظر میں واضح کیا ہے ۔ دوسرے باب کے مقالے " اقبال کی ذہنی نشوونما کے اولین دور " کی کھوج کے سلسلے میں یعقوب شمیم نے نام ور ماہرینِ اقبالیات کے مقالوں اور کتابوں سے استفادہ کرتے ہوئے ذہنِ اقبال تک رسائی کا فریضہ انجام دیا ہے ۔

دیگر تین مقالوں میں اقبال کی قومی شاعری ، قومی یک جہتی کے تصور اور وطن پرستی نیز حب الوطنی پر اقبال کی نظموں کے تناظر میں جائزہ لیا ہے اور تاریخ آزادیِ ہند میں اقبال کے مقام و مرتبے کا تعین کرنے کی سعیِ مشکور انجام دی ہے ۔

سید یعقوب شمیم نے ۷۳ - ۱۹۷۲ ء کے دوران امتحان ایم ۔ اے عثمانیہ یونیورسٹی کے لیے پروفیسر غلام عمر خاں کی نگرانی میں یہ مقالہ لکھا تھا ، جسے بعد نظرِ ثانی شائع کیا ہے ۔ پروفیسر غلام عمر خاں نے کتاب کے فلیپ پر بالکل درست اظہارِ خیال کیا ہے کہ " تحریکِ آزادی میں اقبال کے رول کو انھوں نے شرح و بسط کے ساتھ تاریخی پس منظر میں اجاگر کیا ہے ۔ علم اور بصیرت کی نشوونما نے ان کے ذوق و ذہن میں پختگی پیدا کردی ہے اور ان کی تحریروں میں علمی وقار پایا جاتا ہے ۔ "

○ سائز : ڈیمائی کارڈ بورڈ خوب صورت سرِ ورق ○ صفحات : ۸۰ ○ قیمت : ۵۰ روپے

○ اشاعت : ۱۹۹۸ ء ○ سرِ ورق : طالب خوند میری ○ ناشر : نہال اکیڈمی ، حیدرآباد ۔

ملنے کا پتہ : سید یعقوب شمیم ۴ / ۶۵۳ - ۹ - ۱۶ وہاب منزل ، سرعلی نگر ، اولڈ ملک پیٹھ ، حیدرآباد ۔ ۳۶

نام کتاب " ارمغان " (مجلہ جامعہ گلبرگہ کرناٹک) ○ سرپرست : پروفیسر لئیق صلاح

جامعاتی مجلوں کی اشاعت اردو صحافت کی تاریخ میں اہم باب رہا ہے ۔ علی گڑھ یونیورسٹی میگزین ، مجلہ جامعہ ، عثمانیہ حیدرآباد

کو جامعاتی رسائل میں زبان و ادب کے فروغ میں جامعاتی طالبِ علموں کی تخلیقی سرگرمیوں کا نقطہ ، آغاز کا نام دیا گیا ہے ۔ رسائل و جرائد ادیبوں ، شاعروں کی تربیت اور ان کے فکر و فن کی پیدا پنہاں صلاحیتوں کو روشن کرتے رہے ہیں ۔

گلبرگہ یونیورسٹی کرناٹک کے مجلہ " ارمغان " کا زیرِ نظر خصوصی شمارہ اسی جامعہ کے اردو ریفریشر کورس منعقدہ ۱۹۹۶ ء کا آئینہ دار ہے ۔ اس مجلے میں اساتذہ اور طلبہ کے مضامین اور مقالوں کو شامل کیا گیا ہے ۔ اس باب میں پروفیسر لئیق صلاح صدر شعبۂ اردو نے لکھا ہے کہ جامعہ ، گلبرگہ میں پہلی مرتبہ تعلیمی سال ۹۶ ۔ ۱۹۹۵ ء کے دوران ڈائرکٹر آف کالیجیٹ ایجوکیشن کے تعاون سے ریفریشر کورس کا اہتمام کیا گیا ۔ جامعہ عثمانیہ ، سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد کے علاوہ بمبئی میسور اور ... ن جامعات کے اساتذہ نے شرکت کی اور اپنے مقالے پیش کیے ۔ تقریباً تین ہفتوں تک اس کورس کی کاروائی جاری رہی اور طالبِ علموں نے استفادہ کیا ۔

ارمغان کی اہم مشمولات میں ہندی کے مسلم ادیب (پروفیسر سیتاپتی کھنکے ترجمہ حمید سہروردی) معلوماتی ٹکنالوجی کے فروغ میں کمپیوٹر کا استعمال (ڈاکٹر آر ۔ بی ۔ گنڈگی مٹھ ترجمہ ڈاکٹر شبیر احمد) فنِ مخطوطہ شناسی تعارف و مسائل (ڈاکٹر محمد انورالدین) متنی تنقید : تعریف و توضیح (معین الدین جینا بڑے) ترقی پسند تحریک (ڈاکٹر اکرام باگ) اردو ادب میں طنز و مزاح (ڈاکٹر شمیم ثریا) تہذیبی ورثہ (سید مجیب الرحمن) اردو صحافت (زینب بیگم) اور اردو ناول و افسانے پر سیدہ عصمت ، محمدی بیگم ، زرینہ ناہید کے مضامین کے دوش بدوش مشتاق احمد یوسفی کی مزاح نگاری (پیر زادہ فہیم الدین) اور الطاف حسین حالی کی ادبی خدمات (عبدالرب استاد) اچھے مضامین ہیں ۔ جامعہ گلبرگہ کی طالبات اور طالبِ علموں نے جامعہ کی ادبی اور تعلیمی سرگرمیوں کے منظر نامے کو بھی رپورٹ کی شکل میں تحریر کیا ہے ۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جامعہ ، گلبرگہ اپنے تدریسی فرائض کو خلوص سے ارتقائی منازل سے ہم کنار کر رہا ہے ۔

○ سائز : ڈیمائی (جلد : کارڈ بورڈ) ○ سرِ ورق کتابت و طباعت مناسب ○ صفحات : ۱۳۶

○ اشاعت : ڈسمبر ۱۹۹۶ ء ○ قیمت : ۶۰ روپے ... : شگوفہ پبلی کیشن ، معظم جاہی مارکٹ ، حیدرآباد ۔

○ نام کتاب : انکشافات (شاعری) ○ شاعر : سید ۔ یونس

مہاراشٹرا کے علاقہ ودربھ کے معروف سخن ور سید یونس کی (۱۲۶) غزلوں اور ایک ایک حمد ، نعت و مناجات پر مشتمل مجموعہ ، کلام کا نام " انکشافات " ہے ۔ لفظ انکشافات کی پُر اسراریت تو ان کے کلام میں نہیں ملتی ۔ ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر کے تعارفی مضمون سے علم ہوتا ہے کہ یونس جدید شعرا مدحت الاختر ، شاہد کبیر ، نشتر اور صفدر کے بعد ابھرنے والے شعرا میں حرفِ معتبر کی حیثیت رکھتے ہیں ، وہ اپنے آپ کو روایت کے خواب زار میں بھٹکنے نہیں دیتے بلکہ کھردرے حقائق کا سامنا کرکے نتائج اخذ کرتے ہیں اس لحاظ سے ان کی غزلیں حسیت اور زندگی کی سچائیوں کا بڑی حد تک عہد نامہ قرار پاتی ہیں ۔

ابتدائی کلام میں غزلیہ شاعری کی روایتی پاس داری اور قافیہ پیمائی ملتی ہے ۔ جیسے جیسے " انکشافات " کی ہم نے ورق گردانی کی ، چھوٹی بحر میں لکھی غزلیں اپنے مزاج اور تیور کے باعث پسند آئیں ۔

یونس نے اپنی غزلیہ شاعری کو زندگی کی ٹوٹتی اور جڑتی نئی اور پرانی قدروں سے رشتہ دوز کرتے ہوئے روشنی ، حرکت ، حسن اور خیر کو داخلی فکر کا اٹوٹ حصہ بنا کر اپنی شناخت کی تشکیل کے لیے راہ ہموار کی ہے ۔

چند منتخب شعر :

سب کو اک دن تنہا ہونا پڑتا ہے ۔۔۔۔ اپنے بوجھ کو خود ہی ڈھونا

(باقی ص : ۱۰ پر)

سب رس کتاب گھر

ادارہ ادبیات اردو ۔ حیدرآباد ۔

ایجنسی کی کتابیں

شاعری

مٹی مٹی میرا دل	پروفیسر مغنی تبسم	50=00
لگے موسم کا انتظار	اسلم عمادی	16=00
سخن	وقار خلیل	30=00
تنہائی	صدیقہ شبنم	55=00
خاکِ انا	راشد آزر	10=00
آب دیدہ	راشد آزر	10=00
منزلِ شوق	" "	25=00
کفِ گل فروش	سعید شہیدی	50=00
خود رو	بشارت علی بشارت	80=00
صباحتِ زہرہ	صبیحہ نسرین	70=00
دھنواں دھنواں چراغِ جاں	علی الدین نوید	60=00
رقصِ تنہائی	علی اصغر	50=00
گمان کا صحرا	مصحف اقبال توصیفی	80=00
قریہ ، فکر	اسلم عمادی	60=00
شام ڈھلے سویرا	مصطفیٰ شہاب	65=00
جمع و خرچ وفا	راشد آزر	16=00
نا تمام	حسن داد خاں	60=00
کمالِ سخن	کمال حیدرآبادی	20=00
ذکر و فکر	ساجدہ خاتون	200=00
غزال	خورشید حسین مضطر	60=00
ارض بے پیغمبر	مظہر مہدی	60=00

تاریخ

تاریخ یورپ عہدِ جدید	سید علی محسن	150=00
حیدرآباد کے بنسی راجہ	بھاسکر راج سکسینہ	100=00
برطانیہ کی سیاسی جماعتیں اور پارلیمنٹ	حبیب حیدرآبادی	75=00
یادوں کی رہ گزر	کے ۔ ایس ۔ شفیق	125=00

افسانے اور ناولٹ

تیسرا مجسمہ	عوض سعید	15=00
بے نام موسموں کا نوحہ	" "	30=00
میں کتھا سناتا ہوں	عاتق شاہ	35=00

اجرا : ۱۹۳۸ء　　　　به یادگار سید محی الدین قادری زورؔ　　　　فون : 3310469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد : ۶۰　　　　**محبوب حسین جگر نمبر**　　　　شمارہ : ۳

مـارچ ۱۹۹۸ء

ناشر : ادارۂ ادبیاتِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدر آباد۔ ۵۰۰۰۸۲۔(اے۔پی)۔انڈیا

.اج سکسینہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے اسپیڈ پرنٹس، سعید آباد میں طبع کرواکر ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

مضامین اور تاثرات

منظوم خراج عقیدت

محبوب حسین جگر مرحوم کے رشحاتِ قلم

رپورتاژ

پہلی بات

جناب محبوب حسین جگر مرحوم کی برسی کے موقع پر "سب رس" کی یہ خصوصی اشاعت عمل میں آرہی ہے۔ جگر صاحب کے ڈاکٹر زور سے دیرینہ مراسم تھے۔ ادارۂ ادبیات اردو کے قیام کے بعد وہ مختلف حیثیتوں سے اس کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ زور صاحب کی وفات کے بعد بھی جگر صاحب اور عابد علی خاں صاحب ہمیشہ ادارے کے بہی خواہ رہے اور مختلف طریقوں سے اس کی اعانت کرتے رہے۔ محبوب حسین جگر صاحب کی ادارے سے وابستگی اور ادب و صحافت میں ان کے کارہائے نمایاں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھیں ادارے کا رفیق نام زد کیا گیا تھا۔ جگر صاحب کی وفات سے ادارے کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ادارہ ان کے عملی تعاون کے علاوہ پُرشفقت مشوروں اور حوصلہ افزائیوں سے محروم ہوگیا ہے۔

"سب رس" کا محبوب حسین جگر نمبر ادارے کی جانب سے بہ طور نذرانۂ عقیدت شائع کیا جارہا ہے۔ اس نمبر میں چند مضامین افراد خاندان کے تاثرات پر مبنی ہیں (عابد علی خاں مرحوم کے خاندان سے ان کا رشتہ خونی رشتے سے بھی زیادہ تھا) دیگر مضامین جگر مرحوم کے احباب، رفقائے کار، صحافیوں اور دانشوروں کے تحریر کردہ ہیں۔ مضامین کے علاوہ شعرا کے منظوم خراجِ عقیدت بھی اس شمارے میں شامل ہیں۔

جگر صاحب صحافت سے وابستہ ہونے سے قبل ایک افسانہ نگار اور شاعر کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ حیدرآباد میں ترقی پسند ادبی تحریک کو پروان چڑھانے میں ان کا نمایاں حصہ رہا جس کا کچھ اندازہ کرشن چندر کے رپورتاژ "پودے" کے مطالعے سے ہوگا جو اس نمبر میں شامل کیا گیا ہے۔ "سیاست" اخبار کے اجرا کے بعد وہ ادب سے کنارہ کش ہوگئے تھے۔ جگر صاحب نے اپنی ادبی تحریریں محفوظ نہیں رکھیں ان کے چند افسانے جو جرائد میں شائع ہوئے تھے اس نمبر کی زینت ہیں۔ ان کے علاوہ جگر صاحب کی ایک غزل بخواہش معین الدین صاحب نے عنایت کی شریکِ اشاعت ہے۔

جگر صاحب نے جو آخری اداریہ بسترِ علالت پر تحریر کیا تھا اسے بھی شائع کیا جارہا ہے۔ کسی اخبار کے اداریئے ایڈیٹر، جوائنٹ ایڈیٹر کے علاوہ سب ایڈیٹرز بھی لکھا کرتے ہیں۔ "سیاست" اخبار میں جو اداریے جگر صاحب نے تحریر کیے تھے ان کی نشان دہی کے انھیں مرتب کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک اہم کام ہے۔

ادارہ "سب رس" جناب زاہد علی خاں صاحب، جناب ظہیر الدین علی خاں صاحب کا ممنون ہے کہ ان کی اعانت کے بغیر یہ ترتیب نہیں دیا جاسکتا تھا۔

مغنی تبسم

جگر صاحب کی وفات پر روزنامہ سیاست کا اداریہ

جناب محبوب حسین جگر کے سوگ و احترام میں

جنہوں نے اس اداریٔ کالم کے ذریعہ ہمیشہ اعلیٰ و ارفع اقدار و روایات کی پاسداری اور انسانی حقوق کے تحفظ اور سربلندی کیلئے جدوجہد کی اور اس نیک مقصد کے حصول کیلئے خونِ دل میں اپنی انگلیاں ڈبولیں اور اردو زبان و صحافت کے فروغ اور اس کے استحکام کیلئے اپنی زندگی کی آخری شام تک خود کو وقف کئے رکھا۔

زاہد علی خاں

جگ چاچا

یوں تو دنیا میں ایسی بہت ساری شخصیتیں مل جائیں گی جنھیں جگ ماموں کہا جاتا رہا ہے ۔ لیکن حیدرآباد میں ایک ایسی بلند پایہ شخصیت محترم محبوب حسین جگر کی بھی گزری ہے جنھیں جگ چاچا ہی کہا جاسکتا ہے ۔

میری پیدائش سے شادی تک اور پھر سیدہ عنبرین اور عامر کی پیدائش سے میری بڑی لڑکی سیدہ کی لڑکیوں رمشا فاطمہ اور رشا فاطمہ کے تولد ہونے تک ان تینوں پیڑھیوں کے لیے محبوب حسین جگر صرف ایک "چاچا" ہی رہے کیوں کہ مجھے اور میرے بچوں کو بلکہ میرے بچوں کے بچوں کو بھی انھیں چاچا پکارنے کا شرف حاصل رہا ہے ۔

میرے علاوہ شاہد ، عرشیہ ، ظہیر ، یاسمین اور صابر کی زندگیوں کو نکھارنے اور پروان چڑھانے میں میرے والد محترم کے ساتھ ساتھ خود جگر صاحب کی محبت اور شفقت کا بڑا دخل رہا ۔ نہ صرف یہ بلکہ سیدہ اور عامر کو اخبار کے کام سے واقف کرانے اور خود اپنی نگرانی میں کام کروانے سے انھیں بڑی دل چسپی تھی ۔

عابد علی خاں صاحب نے اپنی زندگی میں جو بھی اصحاب دفترِ سیاست آتے بڑی خوشی اور فخر کے ساتھ مجھ کو ان سے ملانے سے پہلے سیدہ کو یہ کہہ کر ملاتے کہ یہ سیاست خاندان کی Third Generation ہے ۔ جگر صاحب بھی اس پر عمل کرتے تھے اور بڑی خوشی محسوس کرتے ۔ جب بھی دفتر پر راج بہادر گوڑ چلے آتے سیدہ کو یہ کہہ کر ستاتے کہ Third Generation کیا کررہی ہے اور پھر سیدہ ان سے یہ کہتی "محمد حسین" (راج بہادر) آپ کو لکھنا آتا ہے نہ پڑھنا پھر یہ جو مضمون جگر چاچا کی فرمائش پر لے کر دفتر پر نازل ہوجاتے ہیں یہ کس سے لکھواتے ہیں ۔

سیدہ ، راج بہادر گوڑ کو "محمد حسین" پکارتی ہے کیوں کہ کبھی راج صاحب نے دفترِ سیاست میں ایک لطیفہ سنایا تھا جس میں کسی محمد حسین کا ذکر تھا ۔ بس تب ہی سے راج بہادر گوڑ سیدہ کے لیے محمد حسین ہوگئے ہیں ۔

ڈسپلن کا یہ عالم تھا کہ دفتر کے علاوہ خود آنے جانے والے بھی ان سے ملنے میں جھجک محسوس کرتے تھے ۔ ان کی نظر نہ صرف دفتر کے فرسٹ فلور پر رہتی تھی بلکہ وہ اپنی چوکھی آنکھوں سے گراؤنڈ فلور کے ساتھ ساتھ چھت پر ہونے والی سرگرمیوں پر تک نظر رکھتے تھے ۔ صرف یہی نہیں بلکہ کام کی رفتار کا جائزہ لینے میں بھی انھیں مہارت حاصل تھی ۔ سب ایڈیٹر صاحبان کے صفحوں کے پلٹنے کے وقفے سے انھیں ان کے ترجمہ کرنے کی رفتار کا اندازہ ہو جاتا تھا ۔ کمپیوٹر کے رکنے پر وہ کسی بھی آپریٹر کی کارکردگی کو محسوس کرلیتے تھے اور بھی اہم بات یہ ہے کہ دفتر میں صفائی کے انتظام کی بھی خود ہی نگرانی کرتے ۔ پتہ نہیں کونسی

خداداد صلاحیت تھی کہ جہاں کچھ کچرا پڑا ہوتا وہیں ان کی نظر پڑجاتی اور عملے کو چوکس رہ کر ان کے خوف سے صفائی پر زیادہ توجہ دینی پڑتی۔

کسی نے ان کے بارے میں کیا خوب کہا ہے کہ " جگر صاحب سیاست کے جگر ہیں " لیکن چاچا کو صرف جگر ہی تک محدود کردینے کے لیے میں تیار نہیں ہوں۔ وہ تو سیاست کی " جان " تھے ۔ زندگی اور موت کی کش مکش کے دوران انھیں ہروقت سیاست اخبار ہی کا خیال رہتا۔ میں جب بھی میڈی سٹی ہاسپٹل جاتا جہاں وہ زیرِ علاج تھے میرے پہنچتے ہی ان کا پہلا سوال یہ ہوتا کہ کتنے کالم اشتہار ہیں، کل کتنے صفحات کا اخبار ہے ۔ میں بھی دن بھر کا تھکا ہارا ۸ بجے دفتر سے نکل کر ۳۱ کیلو میٹر کا سفر طے کرکے میڈی سٹی جاتا۔ ۹ بجے ہاسپٹل پہنچنے پر انھیں میرے انتظار میں جاگتا ہوا پاتا۔ سب کی خیر خیریت معلوم کرنے کے بعد کچھ دیر دفتر کے بارے میں بات چیت ہوتی۔ پھر کہتے دیر ہو رہی ہے تم بھی تھک گئے ہوں گے، راستہ طویل ہے گھر واپس جاؤ۔ میڈی سٹی کو پہنچنے کے لیے مجھے ۴۵ منٹ لگ جاتے تھے ۔ میں راستے میں صرف یہی سوچتا ہوا چلا جاتا کہ چاچا کا سامنا ہونے پر وہ کیا پوچھ سکتے ہیں۔ پھر میں سوچ سمجھ کر ذہن میں ان کے جواب کے بارے میں تیاری کرلیتا کیوں کہ کسی بھی غلط بیانی کو وہ خوب پکڑ لیتے تھے ۔

جگر چاچا کی کن کن خوبیوں کو بیان کروں۔ سوتے بھی رہتے تو سوچتے کہ کب اور کس سے کیا کام لیا جانا چاہیے ۔ کوئی سامنے نظر آتا تو مضمون کی خواہش کردیتے ۔ عنوانات کا اسٹاک تو ان کے ذہن میں محفوظ ہی رہتا تھا۔ ہاسپٹل میں عیادت کے لیے آنے والے قلم کاروں کی تعداد خاصی رہتی تھی جو بھی ملاقات کے لیے آتا مضمون کا عنوان اس کے ہاتھ میں ضرور تھمادیتے بلکہ مضمون دینے کی تاریخ کا بھی پابند کردیا کرتے تھے ۔ مزاج پرسی کے لیے مولانا حمید الدین شرفی صاحب پہنچے ۔ اس وقت میں بھی وہاں پر موجود تھا۔ کہنے لگے کہ شرفی صاحب بہت مناسب ہیں ان سے دکن کے اولیا پر ایک کتاب لکھوائی جائے ۔ اسی طرح جب حمایت اللہ صاحب کی طرف ان کی نظر پلٹی تو کہنے لگے کہ حمایت تم سیاست کا ہفتہ واری شیشہ و تیشہ کا کالم مرتب کرو۔ طنز و مزاح کے لکھنے والے سبھی اصحاب کا تعاون و اشتراک اس میں شامل رہے ۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ بیماری کے دوران میں نے مولانا رضوان القاسمی صاحب کا کوئی مضمون نہیں دیکھا انھیں فون کرو اور کہو کہ وہ سیاست کے لیے جلد از جلد کوئی مضمون روانہ کریں ۔ آئندہ ہفتہ واری اشاعت میں میں ان کا مضمون دیکھنا چاہوں گا ۔ ایک بار کہنے لگے کہ ڈاکٹر انور معظم کو مصروف رکھو۔ نریندر لوتھر کی مصروفیات معلوم کرو اور کہو کہ وہ سیاست سے سلسلہ باندھے رکھیں ۔ وی۔ کے ۔ باوا سے شہر کے حالات پر مضمون لکھواتے رہو۔ بہر حال ایسی کوئی شخصیت نہیں تھی جن کے بارے میں وہ معلومات نہیں رکھتے تھے ۔

گھر پر دعوت کا معاملہ بہت کٹھن ہوتا تھا۔ جب بھی کوئی دعوت کی بات ہوتی ایک الگ سی فہرست جیب میں تیار رکھتے اور فہرست کا یہ سلسلہ لمحۂ آخر تک جاری رہتا۔ حتیٰ کہ دعوت کے وقت کوئی غیر حاضر ہوجاتا تو فوری کہہ دیتے کہ ان کی جگہ فلاں فلاں صاحب کو فوری فون کرکے بلوالو۔ محفل کے حساب سے شخصیت کو چن لینے کا فن صرف انھیں کو آتا تھا۔ کس محفل میں کون غزل سنائے گا، کس آرٹسٹ کو بلوایا جائے، کن شعرا حضرات کو مدعو کیا جائے، یہ سب ان ہی کی مرضی پر منحصر تھا۔

انتقال سے دودن قبل انھوں نے یہ کہنا شروع کردیا تھا کہ اب زندگی سے میرا سمجھوتہ ختم ہو رہا ہے ۔کہنے لگے دفتر سیاست ۔ متصل فرمان واڑی قبرستان میں میرے لیے جگہ حاصل کی جائے ۔ میں نے بتلایا کہ ابا مرحوم کی یہ وصیت تھی کہ آپ کے ۔ ہمارے آبائی قبرستان آخرت منزل میں جگہ رکھی جائے ۔ تو کہنے لگے کہ خاندانی قبرستان ہے کہیں کسی رشتہ دار کو اعتراض نہ ہو۔ میں نے انھیں بتا یا کہ میں اگر چاہوں تو کوئی اعتراض نہیں کرے گا ۔ چاچا کہنے لگے کہ میں تم کو مرنے کے بعد کسی قسم کی پریشانی میں نہیں ڈالنا چاہتا ۔ پھر بھی اکبر (مولانا اکبر نظام الدین سجادہ نشین درگاہ شاہ خاموشؒ) سے بات کرلو ۔ درگاہ شریف میں جگہ مل جائے تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھوں گا ۔ بس اس کے بعد بات بند ہو گئی اور وہ ڈاکٹروں کی محنت اور دواخانے کی سہولتوں کے باوجود اس دنیا سے کوچ کر گئے ۔

——— 000 ———

اعلان بہ حکم پریس رجسٹرار حکومتِ ہند

(فارم ۴ رول نمبر : ۸)

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر کا نام	:	رمن راج سکسینہ
قومیت	:	ہندوستانی
پتہ	:	ادارۂ ادبیاتِ اردو، ایوانِ اردو
نام و پتہ مالک	:	ادارۂ ادبیاتِ اردو، ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ ، حیدر آباد۔ ۲

میں رمن راج سکسینہ تصدیق کر تا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں، وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

دستخط

رمن راج



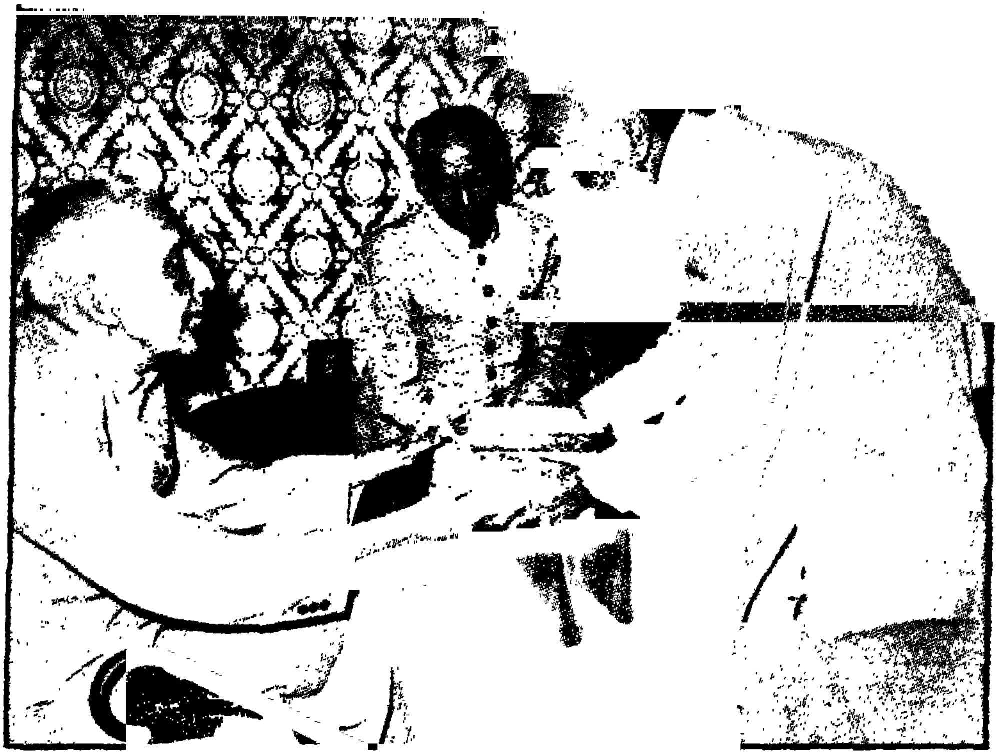
بانیانِ "سیاست" عابد علی خاں اور محبوب حسین جگر دفتر "سیاست" میں (۱۹۸۶)



عابد علی خاں اور محبوب حسین جگر



۱۹۸۰ میں عابد علی خاں، کیفی اعظمی اور محبوب حسین جگر۔



پرنس معظم جاہ، محبوب حسین جگر اور عابد علی خاں عابد منزل کی ایک تقریب میں۔

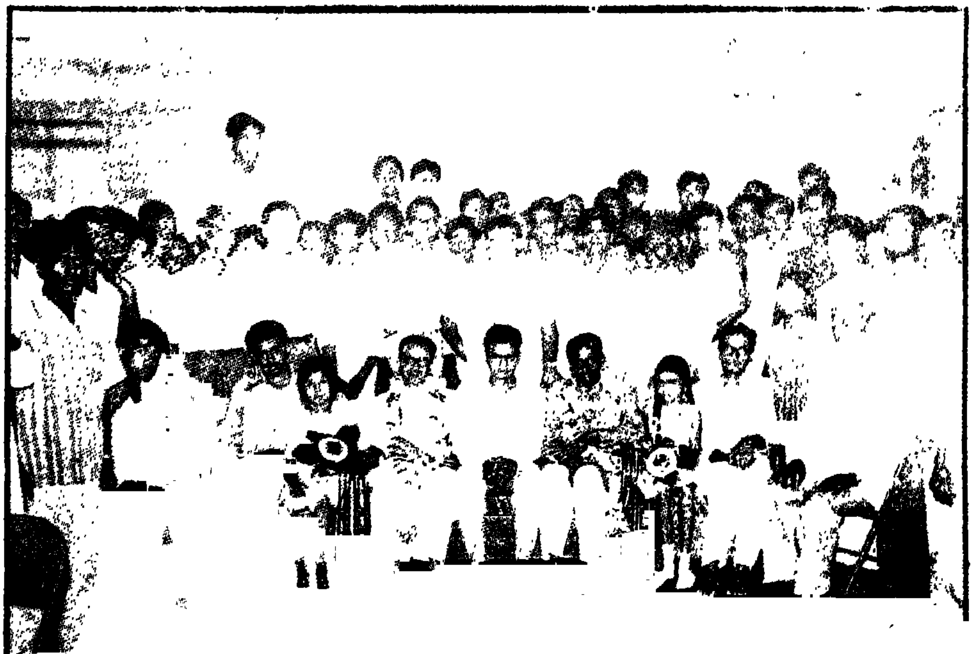


پاکستان کے مشہور آرٹسٹ اور خطاط صادقین، کے ساتھ اردو گھر میں ۔ تصویر میں زاہد علی خاں، حامد قادری، عابد علی خاں، صادقین، محبوب

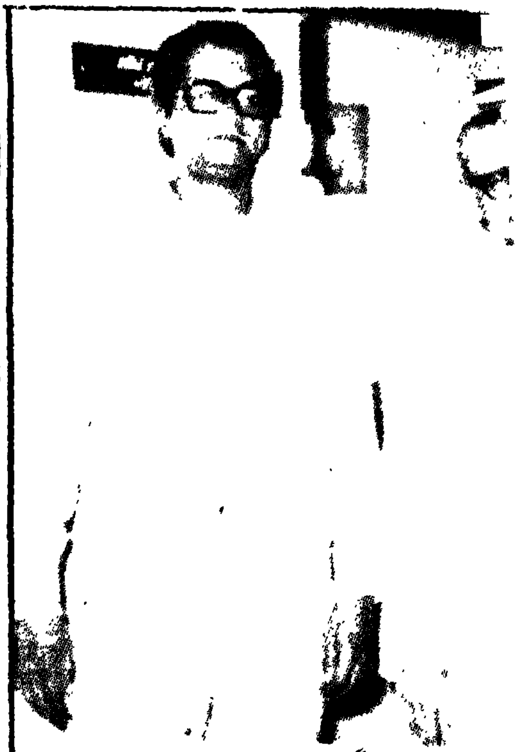




روزنامہ "سیاست" کے دفتر کے عملہ کا ایک قدیم فوٹو



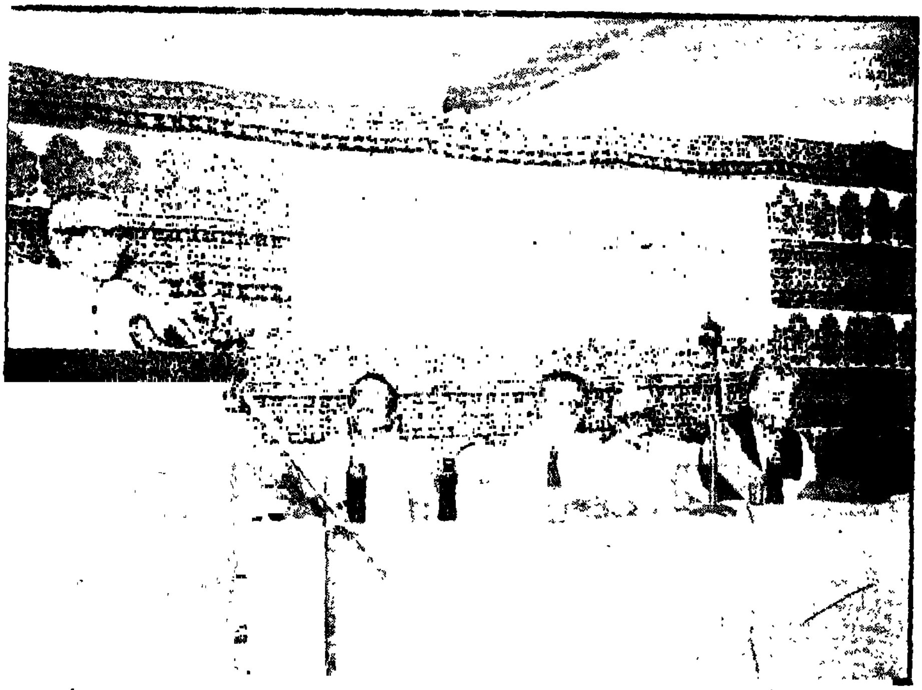
روزنامہ "سیاست" کے ابتدائی دور کی ایک یادگار تصویر۔ تصویر میں عابد علی خاں، محبوب حسین جگر، ڈاکٹر شاہد علی خاں، زاہد علی
عرشیہ عابد علی خاں، مصطفے علی بیگ، ج رشاد، احمد رضا قادری، ہاشم سعد [illegible]



محبوب حسین جگر اور مجتبیٰ حسین ۱۹۸۶



محبوب حسین جگر، عابد علی خاں، زاہد علی خاں۔



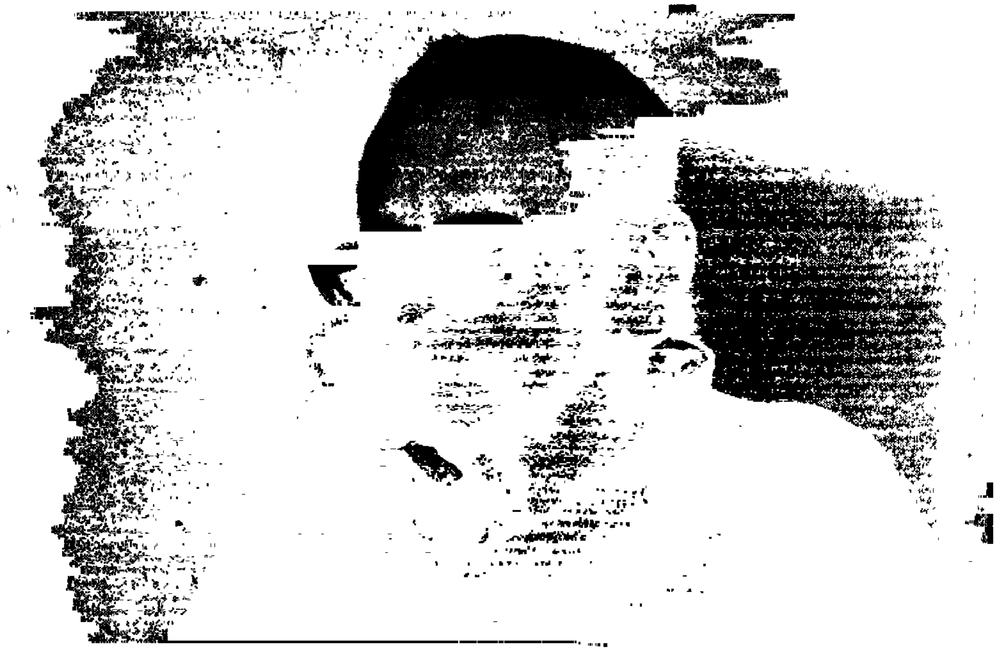
[illegible] کیشنام ٹوسرد کے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے۔ تصویر میں زاہد علی خاں، منوہر راج سکسینہ، ڈاکٹر



مسٹر پی وی نرسمہا راؤ وزیر اعظم ہند کے ہاتھوں "یکجہتی انعام" برائے اردو صحافت حاصل کرتے ہوئے۔



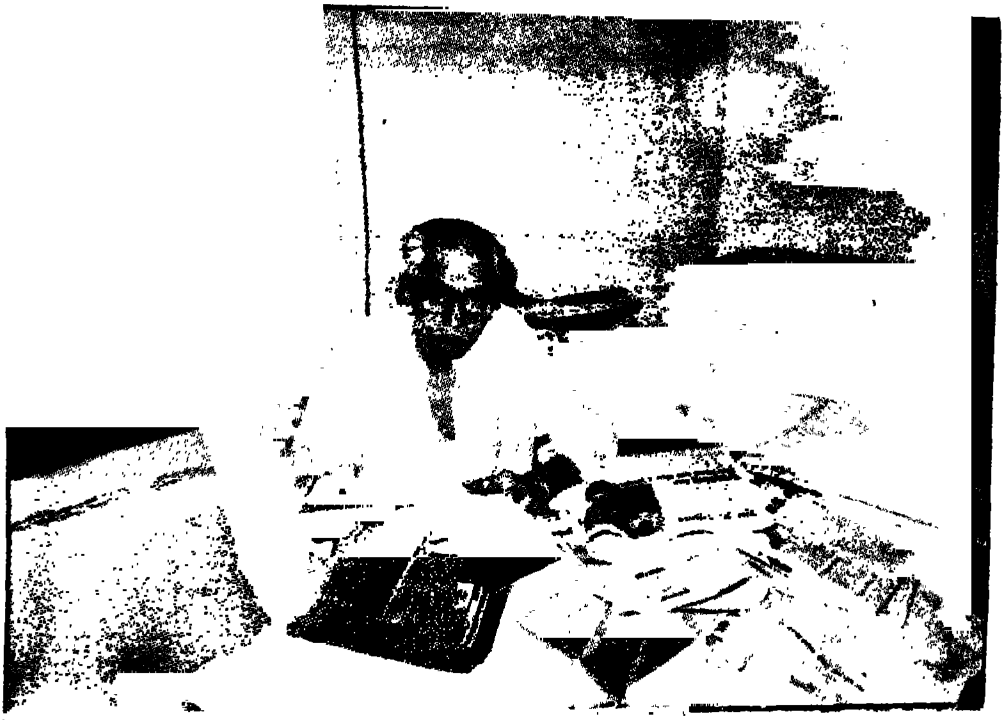
سیاست توسیعی لکچر کے موقع پر مشہور صحافی این رام کے ساتھ۔



آخری ایام کی ایک تصویر۔



۱۱مارچ ۱۹۹۰ء کو جگر صاحب کا آخری دیدار کرتے ہوئے گورنر آندھرا پردیش مسٹر کرشن کانت۔ جناب یونس سلیم۔ جناب مجتبیٰ حسین اور زاہد علی خاں۔



دفتر میں مصروفِ کار



حضرت فراق گورکھپوری کے ساتھ دفترِ "سیاست" میں۔ محبوب حسین جگر، شاہد صدیقی، احمد معظم اور اسد جعفری۔

مجتبیٰ حسین

میرے بھائی جگر صاحب کے بغیر

۱۹۵۶ء سے میری تحریریں روزنامہ "سیاست" میں شائع ہوتی رہی ہیں اور زیرِ نظر میری تحریر میری پہلی تحریر ہے جو جگر صاحب کی ظر سے گزرے بغیر شائع ہو رہی ہے اور مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتے اور یہ تحریر ان کی نظر سے گزرتی تو کبھی شائع نہ ہوتی۔ وئی ان کا ذکر کرتے تو خوش ہونا تو بہت دور کی بات ہے وہ اس سے ناراض ہوجاتے تھے۔ اب جب کہ وہ ہمارے درمیان نہیں رہے تو حساس ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا کی اور بالخصوص آج کی دنیا کی مخلوق بالکل نہیں تھے۔

جگر صاحب میرے بڑے بھائی تھے۔ وہ ابراہیم جلیس مرحوم سے پانچ سال اور مجھ سے سترہ برس بڑے تھے۔ ہم دونوں بھائیوں ی ذہنی تربیت میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ ابراہیم جلیس تو خیر ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلے گئے تھے لیکن میری ذہنی تربیت تو سراسر ان ہی کی مرہونِ منت تھی۔ آزادی سے پہلے جب میں تیسری یا چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا تو گلبرگہ میں میرے نام سے میرے پتے پر "پھول"، "غنچہ" ور بچوں کے کئی رسالے آیا کرتے تھے۔ یہ سارے رسالے جگر صاحب نے میرے نام جاری کروا رکھے تھے۔ اس عمر میں اپنے نام سے وئی رسالہ آتا تھا تو فطری طور پر مجھے بہت خوشی ہوتی تھی اور میں اس کے ایک ایک لفظ کو پڑھنا نہ صرف ضروری سمجھتا تھا بلکہ اپنے نام ئے ہوئے ان رسالوں کو میں کسی اور کو پڑھنے کے لیے بھی نہیں دیتا تھا۔ ادب کو اپنی میراث اور اپنی ذاتی زندگی کا لازمی جز سمجھنے کا پہلا حساس مجھے ان ہی رسالوں کے ذریعے ہوا۔ حیدرآباد پر پولیس ایکشن کے بعد جو افراتفری پھیلی تو ۱۹۴۹ء میں کچھ عرصے کے لیے علی گڑھ یٹرک کا امتحان دینے کی خاطر میں گلبرگہ سے حیدرآباد چلا آیا اور حیدرگوڑہ میں جگر صاحب کے ساتھ رہنے لگا۔

۱۵/ اگست ۱۹۴۹ء کو جب جناب عابد علی خاں صاحب اور جگر صاحب نے مل کر "سیاست" کا اجرا کیا تو میں حیدرآباد میں ہی موجود تھا۔ سیاست کا پہلا شمارہ لے کر وہ اس دن صبح کو کچھ دیر کے لیے گھر آئے تھے۔ نہادھو کر پھر دفتر چلے گئے۔ اس کے بعد ان کے گھر آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں رہا۔ وہ دو تین دن میں اچانک گھر چلے آتے تھے۔ گھر کے اخراجات کے لیے ضروری رقم دیتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ گھر میں ایک نوکر تھا وہ کام کرے یا نہ کرے پہلی تاریخ کو اسے پابندی سے تنخواہ ادا کردیتے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں میں پھر گلبرگہ چلا گیا اور ۱۹۵۳ء میں بی۔اے کرنے کے لیے دوبارہ حیدرآباد آیا تو اس وقت تک جگر صاحب نے وہ گھر چھوڑدیا تھا کیوں کہ سیاست ہی ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا تھا۔ ایک عرصے تک وہ دفترِ سیاست کے ایک گوشے میں ہی رہتے تھے۔ مشینوں کے شور شرابے میں رات دیر گئے سوجانے کی عادت انھوں نے ڈال لی تھی۔ ان دنوں روزنامہ سیاست جیسے متوازن، معتدل اور غیر جانب دار اخبار کو جاری رکھنے کے لیے عابد علی خاں صاحب اور جگر صاحب کو کن مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا اسے بیان کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے اور حیدرآباد میں

بہت سے لوگ اس دور سے واقف ہیں۔بی۔اے کرنے کے بعد میں ۱۹۵۷ء میں روزنامہ سیاست سے بہ طور صحافی باضابطہ طور پر وابستہ ہوگیا۔
عابد علی خاں صاحب اور جگر صاحب میں ایک ایسی مفاہمت اور ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھنے کی ایک ایسی زبردست صلاحیت تھی کہ دونوں کو کسی بھی مسئلے پر ایک دوسرے کو کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی، حالاں کہ بہ ظاہر دونوں کے مزاج بالکل مختلف دکھائی دیتے تھے۔عابد علی خاں صاحب میں ایک طرح کا دھیما پن، ٹھہراؤ اور استقلال نظر آتا تھا اور جگر صاحب کے مزاج میں عجلت پسندی، تلون، شدت اور بلا کا جلال تھا۔البتہ بہت دنوں بعد مجھے ادراک ہوا کہ دونوں کے مزاجوں میں بڑی گہری مماثلت تھی۔یہ اور بات ہے کہ دونوں کے مزاجوں کی مندرجہ بالا کیفیات کے ظاہر ہونے کے درجات بالکل مختلف تھے۔دونوں میں ایک دوسرے کے لیے احترام کا یہ عالم تھا کہ اگر جگر صاحب کوئی بات کہہ دیتے تھے تو عابد علی خاں صاحب ان سے کبھی اختلاف نہیں کرتے تھے اور عابد علی خاں صاحب نے کوئی بات کہہ دی تو جگر صاحب اس پر قائم رہتے تھے۔اس صدی میں اس طرح کی دوستی کی شاید ہی کوئی اور مثال مل سکے۔جگر صاحب ڈسپلن کے معاملے میں بے حد سخت گیر تھے لیکن اندر سے اتنا ہی دردمند دل رکھتے تھے۔چھوٹا بھائی ہونے کے ناتے ان سے راست بات چیت کرتے ہوئے گریز کرتا تھا، یا تحریری طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا، یا عابد علی خاں صاحب سے بات چیت کرلیتا تھا۔جگر صاحب کے ظاہری مزاج کی وجہ سے عابد علی خاں صاحب مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔آخری دنوں میں جب وہ دفتر جانے کے قابل نہیں رہ گئے تھے تو وہ ہر دوسرے دن مجھے گھر سے دہلی فون کیا کرتے تھے اور جگر صاحب کو اس کی اطلاع نہیں دیتے تھے۔عابد علی خاں صاحب اور جگر صاحب کے کہنے پر میں نے اگست ۱۹۶۲ء میں شاہد صدیقی کے انتقال کے بعد سیاست کا طنزیہ کالم "شیشہ و تیشہ" لکھنا شروع کیا تھا۔اردو مزاح نگاری کے میدان میں آج میں نے جو کچھ بھی حقیر سی کوشش کی ہے وہ ان ہی دونوں بزرگوں کی رہنمائی اور تربیت کا نتیجہ ہے۔اگرچہ جگر صاحب میرے سب سے بڑے محتسب بھی تھے لیکن میری تحریروں سے سب سے زیادہ وہی لطف اندوز بھی ہوتے تھے۔ان کے اظہارِ ستائش کا انداز مختلف تھا۔انھوں نے میری ہی نہیں حیدرآباد کے سینکڑوں نوجوان صحافیوں کی ذہنی تربیت کی۔وہ ایک بے لوث، بے غرض، بے نیاز اور قلندر صفت انسان تھے۔ان کے بس میں جو کچھ بھی تھا اسے دنیا کو دے دینا چاہتے تھے اور دنیا سے کچھ لینا جانتے ہی نہ تھے۔وہ کسی بھی معاملے میں کسی کو زحمت دینے کے قائل نہیں تھے۔

۹ فبروری کو عید الفطر کے دن ان کی طبیعت اچانک خراب ہوئی اور ۱۰ فبروری کو انھیں حیدرآباد کے میڈی سٹی اسپتال میں شریک کرا دیا گیا۔اسی دن زاہد علی خاں صاحب نے مجھے دہلی فون کیا اور میں اسی شام حیدرآباد آگیا۔اسپتال پہنچا تو غنودگی کے عالم میں تھے۔ان کے دماغ کی ایک شریان میں خون منجمد ہوگیا تھا جس کی وجہ سے نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی۔لیکن اس عالم میں بھی وہ اخبار کے کاموں کے بارے میں ہی باتیں کررہے تھے اور ان کا سیدھا ہاتھ لگاتار کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔وقفے وقفے سے وہ دفتر کے ملازمین کو بھی پکارتے جارہے تھے یہ کیفیت دو دنوں تک برقرار رہی۔پھر خون کا انجماد خود بہ خود ختم ہوگیا تو وہ پوری طرح ہوش میں آگئے اور یوں باتیں کرنے لگے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔مجھ سے کہا کہ میں دہلی میں اپنے کام چھوڑ کر حیدرآباد کیوں آگیا۔وہ اپنے مرض کی کیفیت کسی سے بیان نہیں کرتے تھے۔ڈاکٹر سدھیر نائک واحد شخص تھے جن سے وہ اپنے مرض کے بارے میں کہتے تھے۔ان کی علالت کے پورے ایک مہینے میں ڈاکٹر سدھیر نائک نے ان کے علاج پر بھرپور توجہ دی۔گھنٹوں وہ جگر صاحب کے پاس رہتے تھے اور دن میں کئ

بار اسپتال آجاتے تھے ۔ انھیں "پیس میکر" لگانے کا منصوبہ بنایا گیا تو جگر صاحب کو تین مرتبہ میڈی سٹی اسپتال کے میڈیکل سنٹر میں جانا پڑا ۔ وہ ہر مرحلے سے گزرے لیکن کبھی اپنی تکلیف کا کسی سے اظہار نہیں کیا ۔ سب کچھ خاموشی سے برداشت کرلیتے تھے ۔ ان میں صبر و تحمل کا ایک عجیب و غریب مادہ تھا اور ان کی قوتِ ارادی کتنی مضبوط تھی اس کا اندازہ ان کی علالت کے زمانے میں بھی ہوا ۔ جب بھی ذراسی طبیعت سنبھلتی تو اس طرح باتیں کرتے جیسے پوری طرح صحت یاب ہوگئے ہوں ۔ ان کی علالت کا علم بھی بہت کم لوگوں کو تھا ۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگوں کو زحمت ہو ۔ وقفے وقفے سے وہ دفتر کے لیے ضروری ہدایتیں بھی جاری کرتے رہتے تھے ۔ پورے ایک مہینے میں ان کی صحت میں کئی اتار چڑھاؤ آئے لیکن وہ اپنی علالت سے بے نیاز، سماج، سیاست، ادب اور حالاتِ حاضرہ پر باتیں کرتے رہتے تھے ۔ زاہد علی خاں اور ظہیر الدین علی خاں آتے تو ان کا اصرار ہوتا کہ وہ اخبار کے کام پر زیادہ توجہ دیں اور بار بار اسپتال نہ آیا کریں ۔ ڈاکٹر شاہد علی خاں سے البتہ اپنے مرض کی کیفیت ضرور بتاتے تھے ۔ انھیں اچانک یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ ان کے علاج پر بے دریغ رقم خرچ کی جارہی ہے ۔ آنے جانے والے اصحاب سے روم کا کرایہ پوچھتے تھے ۔ پیس میکر کی قیمت جاننے کی کوشش کرتے تھے ۔ کہتے تھے "میں بھرپور زندگی جی چکا ہوں، کب تک زندہ رہوں گا آخر یہ ساری کوششیں کیوں کی جارہی ہیں" ۔ ایک مرحلے پر تو انھوں نے پیس میکر لگوانے سے بالکل انکار کردیا تھا ۔ ڈاکٹر سدھیر نائک نے بالآخر بہ وقتِ تمام انھیں راضی کرلیا ۔ درمیان میں تین مرتبہ ایسے مواقع آئے جب انھیں اسپتال سے ڈسچارج کیا جانے والا تھا ۔ مجھ سے بار بار کہتے تھے کہ میں دہلی واپس چلا جاؤں ۔

۹ مارچ کو شام میں وہ پوری طرح ہشاش بشاش تھے ۔ پیس میکر بھی پوری طرح کام کر رہا تھا ۔ زاہد علی خاں اور مجھ سے ادبی ٹرسٹ کے سالانہ مشاعرے کے انعقاد کے بارے میں بات کی ۔ دفتر کے بارے میں زاہد علی خاں سے ضروری صلاح و مشورہ بھی کرتے رہے ۔ ڈاکٹر سدھیر نائک نے ان کا معائنہ کرنے کے بعد یہ خوش خبری سنائی کہ انھیں اگلے دن ۱۰ مارچ کو ڈسچارج کردیا جائے گا ۔ میں نے بھی اس حساب سے دہلی واپس جانے کا ریزرویشن کروالیا ۔ صبح صبح میں اسپتال گیا تو اس وقت تک ڈاکٹر پی گوپال ریڈی کے بارے میں ڈیلی اداریہ لکھ چکے تھے ۔ اداریہ مجھے دے کر کہنے لگے "دفتر جاکر اسے زاہد کو دے دو اور کہو کہ کسی کو بھیج کر اسپتال کا بل ادا کردیں" ۔ پھر مجھ سے کہا "تم چوں کہ شام میں دہلی واپس جارہے ہو اس لیے دوبارہ اسپتال نہ آؤ، میں اب ٹھیک ہوچکا ہوں" ۔ میں سیاست آیا تو زاہد علی خاں نے فوراً اپنے منیجر کو اسپتال روانہ کیا ۔ میں ابھی گھنٹہ بھر بھی سیاست میں نہیں بیٹھا تھا کہ منیجر سیاست واپس آگئے اور اطلاع دی کہ "جگر صاحب کے پیٹ میں درد شروع ہوگیا ہے اس لیے ڈاکٹروں نے انھیں آج ڈسچارج نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے ۔" میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے اپنی روانگی منسوخ کردی ۔ مجھے ڈر تھا کہ میں شام میں اسپتال جاؤں گا تو وہ ضرور ناراض ہوں گے کہ میں دہلی کیوں نہیں گیا ۔ اس لیے میں اور ظہیر الدین علی خاں مل کر اسپتال گئے ۔ مجھے دیکھتے ہی حسبِ معمول ناراض ہوگئے کہ میں کیوں رک گیا ۔ اتنے میں زاہد علی خاں اور عامر علی خاں بھی آگئے ۔ ان کے چہرے سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ تکلیف سے گزر رہے ہیں لیکن تکلیف کا ذکر کرنے سے گریز کر رہے ہیں ۔ رات میں دس بجے ہم سب سے کہا کہ ہم گھر چلے جائیں ۔ اگرچہ ہم کمرے سے باہر نکل آئے لیکن ہم سب تشویش میں مبتلا تھے ۔

اسپتال کی انتظار گاہ میں میرے دوست عباس زیدی اور محمد تقی میرا انتظار کر رہے تھے ۔ عباس نے اصرار کیا کہ ہم لوگ کہیں چل کر رات کا کھانا کھالیں ۔ پچھلے ایک مہینے میں میری عادت سی ہوگئی کہ رات کو دیر سے ایک بار اسپتال ضرور چلا جاتا تھا اور چپکے سے ان

کے ملازم سے جگر صاحب کی خیریت پوچھ لیتا تھا۔ میں حسب معمول گیارہ بجے اسپتال واپس ہوا تو جگر صاحب کا ملازم نرسنگ اوپر سے دوڑتا ہوا آتا نظر آیا۔ کہنے لگا " جگر صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں اور آپ کو فوراً اوپر بلارہے ہیں "۔ میں کمرے میں گیا تو بائیں طرف اپنے پیٹ کو تھامے ہوئے تھے۔ سخت تکلیف میں مبتلا تھے لیکن پورے سکون کے ساتھ بولے " آج میری طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب لگ رہی ہے۔ آج کی رات بڑی بھاری نظر آتی ہے۔ میں تمھیں رات میں روکنا نہیں چاہتا تھا لیکن پھر بھی تم رک سکو تو اچھا ہے "۔ اس جملے نے میرے سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ میں نے ڈاکٹر کو بلایا تو خفا ہوگئے کہ کیوں ڈاکٹروں کو پریشان کرتے ہو۔ اتنے میں ڈاکٹر سلمان وہاں آگئے، نیند کا انجکشن دیا۔ تکلیف اتنی زیادہ تھی کہ بڑی مشکل سے آدھا پون گھنٹہ سوگئے۔ بے چینی بڑھی تو میں نے پھر ڈاکٹر کو بلایا۔ کہنے لگے " صبح میں ڈاکٹر سدھیر نائک آئیں گے تو وہ دیکھ لیں گے کیوں ڈاکٹروں کو پریشان کر رہے ہو "۔ رات کے چار بجے کے بعد سے تکلیف ناقابلِ برداشت ہوتی چلی گئی۔ پونے چھ بجے جب ان کی حالت غیر ہونے لگی اور نرسیں انھیں گلوکوز دینے کے لیے شریانیں ڈھونڈنے لگیں تو انھوں نے پورے اعتماد کے ساتھ مسکراتے ہوئے نرسوں سے کہا:

Thank you very much sisters, now please stop this.

پھر میرا ہاتھ تھامے ہوئے بڑے اعتماد کے ساتھ بولے " ظہیر اور زاہد کو فون کر کے بلالو اور کہو کہ مجھے گھر لے چلیں۔ زندگی سے میرا معاہدہ اب ختم ہو چکا ہے "۔ اس کے بعد انھوں نے چھت کی طرف دیکھا اور بہ آواز بلند کہا " اللہ پاک میری مشکل کو آسان فرمادے اور مجھے اس عذاب سے نجات دلا دے۔ " اللہ پاک، اللہ پاک " اس کے بعد ان کی زبان بند ہو گئی۔ اللہ کو پکارنے کے بعد پھر انھوں نے کسی بشر سے بات نہیں کی۔ ان کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ اس حالت میں انھیں Intensive Care Unit لے جایا گیا۔ ڈاکٹر شاہد علی خاں، ظہیر الدین علی خاں، زاہد علی خاں، عامر علی خاں اور ڈاکٹر سدھیر نائک بھی آگئے۔ تنفس کو دوبارہ بحال کرنے کے لیے ڈاکٹروں کی ٹیم نے کوششیں شروع کردیں اور کچھ دیر بعد تنفس کا عمل بحال بھی ہو گیا۔ مجھ سے یہ دیکھا نہیں گیا، میں چپ چاپ ICU سے باہر چلا آیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ کسی انسان سے پھر بات نہیں کریں گے کیوں کہ وہ خدا سے رجوع ہو چکے تھے۔ اگرچہ وہ صبح میں ہی دنیا سے اپنا ناتا توڑ چکے تھے اور زندگی سے اپنا معاہدہ فسخ کر چکے تھے لیکن ڈاکٹروں نے انھیں بچانے کی سہ پہر میں ڈھائی بجے تک پوری کوشش کی اور یوں حیدر آبادی تہذیب کا ایک سچا علم بردار، ایک قلندر صفت صحافی اور ایک عظیم انسان ہم سب سے رخصت ہو گیا۔

———— 000 ————

سیدہ فاطمہ

جگر چاچا

(سیاست کی تھرڈ جنریشن کا تاثر)

جیسے جواہر لال نہرو بچوں کے لیے چاچا نہرو تھے ویسے ہی جگر صاحب ہم سب کے لیے ۔ وہ میرے والد کے چاچا تھے پھر میرے اور میری بیٹیوں کے بھی چاچا تھے ۔ جگر صاحب کی شفقت اور محبت نے میرے والد اور چچاؤں کو بچپن ہی سے ان کا گرویدہ بنادیا تھا ۔ ان سب کو شفقت اور محبت کے ساتھ ساتھ پڑھائی پر نگرانی اور سختی بھی کی گئی لیکن ہمارے لیے یہ بات نہیں تھی ۔ لڑکیوں کے لیے وہ نرم گوشہ رکھتے اور لڑکوں کی بہ نسبت زیادہ شفقت سے پیش آتے ۔ ہماری شرارتوں پر وہ بہت خوش ہوتے تھے ۔

ہماری خواہشوں اور فرمائشوں کا ذخیرہ ہم اتوار کے لیے جمع کرتے اور یہ سب فرمائشیں اتوار ہی کو پوری ہوجاتیں ۔ اتوار کی صبح ہم دفتر سیاست آتے دوپہر تک کھیلتے اور من پسند چیزیں کھاتے اور گھر واپس چلے جاتے ۔ شام کو جب دادا (عابد علی خاں صاحب) دوبارہ دفتر آتے تو ان کے ساتھ آجاتے ۔ آتے ہی چاچا کے ساتھ باغِ عامہ جاتے ۔ وہاں پر کھیل کود کے بعد گھر واپس ہوجاتے ۔ یہ تھا ہمارا اتوار کا معمول جس میں ساری فرمائشیں مکمل ہو جاتی تھیں ۔

سیر و تفریح اور ایسی فرمائشیں جن کی تکمیل دوسروں کے لیے مشکل تھی وہ سب ہم چاچا کے لیے رکھ دیتے ۔ سرکس شہر میں آئے اور ہم نہ جائیں ، یہ ناممکن تھا ۔ چاچا خود ہی ہمارے لیے انتظام کرتے ، ہمیں کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی ۔ کم سے کم دو مرتبہ سرکس جاتے ۔ ہم بچوں کے ساتھ خواجہ صاحب کا رہنا ضروری تھا ۔ ہم انھیں ستاتے اور چاچا بہت خوش ہوتے ۔ نمائش آتی تو جنوری کا پورا مہینہ باغِ عامہ سے چھٹی اتوار کی تفریح کا رخ نمائش کی جانب ہوتا ۔ اتوار کی شام چاچا کے ساتھ نمائش جاتے ، جھولوں پر بیٹھتے Giant Wheel پر بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی لیکن شوق بہت تھا ۔ گھوڑے اور اونٹ کی سواری ، Pop Corn اور Sugar Candy کے علاوہ گول گپے ۔ شاید ہی کبھی ایسا لطف آیا ہوگا جیسے ان دنوں آتا تھا ، ہر خواہش پوری ہوتی تھی ۔ ۱۵ / گست اور ۲۶ / جنوری کے دن اسکول نہیں جاتے بلکہ دفترِ سیاست پر جھنڈا لہرانے آجاتے ۔ واپسی میں حمایت ساگر ، عثمان ساگر جاتے ۔ گرما کی چھٹیاں بھی بہت ہی مزے دار گزرتی تھیں ۔ روزانہ شام دفتر سے آتے ہی ہم سب کے ساتھ چہل قدمی کے لیے جاتے در گھر کے قریب ایک بیکری تھی وہاں سے چاکلٹ خرید کر دیتے یہ ہماری شام کی مصروفیت کے کچھ منٹ ان کے ساتھ بہت اہمیت رکھتے تھے ۔ کبھی کبھی دادا بھی ہمارے ساتھ ہو جاتے ۔ جگر صاحب کے ان معمولات سے شاید ہی کوئی واقف ہوگا کہ وہ بچوں کے ساتھ اس قدر وقت گزارتے تھے ۔ ورنہ چاچا کے بارے میں عام طور پر یہ مشہور تھا کہ وہ کسی کے ساتھ چند منٹ گزارنے کے بعد

چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے بے چین ہوتے ۔ گرما کی چھٹیوں میں بورڈ کے امتحانات کے نتائج فون پر بتانے کے لیے ہمیں بلوایا جاتا ۔ خوشی خوشی آتے ۔ میں نے جب ایس ۔ ایس ۔ سی کامیاب کیا تو انھوں نے مجھے ایک قلم PEN بطور تحفہ دیا تھا ۔

چوں کہ میں کسی نہ کسی وجہ سے دفتر سیاست آتی تھی اس لیے اخبار میں میری دلچسپی بڑھتی گئی ۔ گریجویشن کے بعد میں نے سیاست join کرنے کا فیصلہ کیا ۔ یہ سال ۱۹۸۹ء بات ہے ۔ پہلے ایک دو ہفتے دادا اور چاچا ناراض رہے کیوں کہ یہ ان کی مرضی نہیں تھی لیکن پپا نے مجھے اجازت دی تھی ۔ میں دادا کے ساتھ کمرے میں بیٹھتی تھی ۔ پھر ایک دن چاچا نے خود مجھے اپنے ساتھ اوپر آنے کے لیے کہا ۔ بس اسی دن سے سلسلہ شروع ہوگیا ۔ ناراضگی ختم ہو گئی ۔ وہ مجھے کام کا طریقہ بتاتے ۔ مجھے کام سیکھنے میں دشواری اس لیے نہیں ہوئی کیوں کہ ان کے کام سکھانے کا انداز ہی نرالا تھا ۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوتی تو وہ قلم اٹھا کر کہتے " دوبارہ یہ غلطی کی تو مار پڑے گی " (یہ محض ایک تنبیہ ہی ہوتی زندگی میں چاچا نے ہم بچوں پر تو کیا کسی پر بھی ہاتھ نہیں اٹھایا) غلطی کی اصلاح کرواتے اور دوبارہ لکھواتے تھے ۔

ناراضگی تو چند دنوں کی تھی سو ختم ہو گئی لیکن اس کے بعد یہ ہوا کہ جب بھی کسی سے ملواتے تو دادا بڑے فخریہ انداز میں کہتے " سیاست کی Third Generation ہے جو اب تیار ہو رہی ہے ۔ مجھے ان کی اس بات سے اتنی خوشی اور فخر محسوس ہوتا تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتی ۔

چاچا ، پپا اور میں صبح آتے ہی اوپر جاتے ، رجسٹرس دیکھنے کے بعد رات کی چھوڑی ہوئی خبروں کو Edit کرتے اور پھر کام ختم ہو جانے کے بعد دادا کے کمرے میں چائے پینے کے لیے آجاتے ۔ یہ وقت اخبار کے اس دن کے تجزیہ اور دوسرے دن کے اخبار کی حکمت عملی پر غور کرنے کا ہوتا ۔ چاچا کا وقت مقرر تھا ۔ آدھے گھنٹے کے بعد مجھ سے کہتے چلو کام بہت ہے اور اوپر چلے جاتے ۔ کوئی غیر معمولی بات ہوتو فوراً Intercom پر دادا کو اطلاع کرتے ۔ اخبار کے کام میں کوئی Interruption ہوتو برداشت نہیں کرتے ۔ سنا ہے کہ ان کو غصہ بہت جلد آتا تھا لیکن میں نے کبھی دیکھا نہیں صرف سنا ہے ۔

میرے بعد عامر (میرے چھوٹے بھائی) کو کام سکھانے کی باری آئی ۔ عامر کو انھوں نے اپنی نگرانی میں کام سکھایا ۔ ان کی آرزو تھی کہ عامر ، عابد علی خاں صاحب کا حقیقی جانشین بن جائے اور دادا کی طرح صلاحیتوں اور قابلیت کا حامل بن جائے ۔ اکثر و بیشتر وہ اہل خاندان سے اپنی اس آرزو کا تذکرہ کرتے اور بڑے فخریہ انداز میں کہتے عامر یقیناً میری وصیت کی تکمیل کرے گا ۔

رمضان کی آخری تاریخ تک میں نے ان کے ساتھ کام کیا ۔ عید کے دن ہی ان کی طبعیت خراب ہوگئی ۔ کس نے سوچا تھا کہ رمضان کا آخری دن ان کے دفتر آنے کا بھی آخری دن ہو سکتا تھا ۔

ان کے گزر جانے کے بعد بھی ہم کام کرتے وقت ان کی موجودگی محسوس کرتے ہیں ۔ جب بھی چاچا کی عدم موجودگی کا احساس ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہی ان کے مشن اور ان کی آرزوؤں اور امنگوں کا خیال اس خلا کو پر کرتا ہے اور ان کا دیا ہوا حوصلہ کام میں منہمک ہوجانے پر مجبور کرتا ہے ۔

چاچا کو میں تو کیا میری ننھی رمشا بھی بھلا نہیں سکی ۔ وہ آج بھی گھر میں اور دفتر میں اپنی عادت کے مطابق زور زور سے چاچا چاچا کی آوازیں بلند کرتی ہے ۔

——— 000 ———

ہاشم علی اختر

محترم بھائی جگر

۱۴ / مارچ کی شام شکاگو سے حسن چشتی صاحب اور زین الدین صدیقی صاحب نے ٹیلیفون پر یہ اطلاع دی کہ میرے کالج اور
ٹل کے ساتھی محترم بھائی محبوب حسین جگر کا منگل کے دن انتقال ہوگیا ہے ۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون ۔ ۹ / مارچ کی شام مجھے بھائی
کا ایک فیکس ملا تھا جس میں انھوں نے اپنی خرابیِ صحت کا ذکر کیا تھا اور Pace Maker لگائے جانے کی اطلاع دی تھی اور یہ
یہ ظاہر کی تھی کہ وہ دوچار دن میں گھر واپس چلے جائیں گے ۔ میں نے فوراً فیکس کے ذریعے انھیں لکھا تھا کہ میرے پیس میکر کو لگے
ے پانچ سال ہوچکے ہیں اور دعا کی تھی کہ وہ جلد صحت یاب ہوجائیں ۔ آج مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ
وں نے اپنی تکلیف کے وقت اور شاید زندگی سے ناامیدی کے کٹھن لمحے میں مجھے نہ صرف یاد کیا بلکہ اس کی اطلاع بھی دی ۔ میں
کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکوں گا ۔ اس غمگین خبر سے جو صدمہ ہوا وہ کسی قریبی عزیز کی موت کے صدمے سے کم نہیں تھا اور
گھنٹے تک خاموشی کے دوران مجھے وہ ساری باتیں یاد آتی گئیں جو ۱۹۴۰ء سے ان سے پہلی ملاقات کے بعد سے شروع ہوئی تھیں ۔

۱۹۴ ۔کے تعلیمی سال میں وہ گلبرگہ سے انٹرمیڈیٹ کرکے جامعہ عثمانیہ میں بی ۔ اے میں شریک ہوئے اور اقامت خانہ عارضی یا سی
C) ہاسٹل میں ایک اور محترم دوست عابد علی خاں مرحوم کے روم میٹ بنے ۔ میں بھی اس وقت سائنس کے تھرڈ ایئر میں تھا اور
ٹل میں ان کے قریب ہی کے کمرے میں رہتا تھا ۔ یہ دونوں ہاسٹل کے نفیس اور مہذب لڑکوں میں شمار ہوتے تھے اور ترقی پسند
پ سے ان کا تعلق تھا ۔ ہاسٹل کے ساتھیوں سے ان کے بڑے اچھے تعلقات تھے اور ان دونوں کی دوستی اس وقت بھی مثالی سمجھی
ی تھی ۔ ۴۴ ۔ میں گریجویشن کے بعد ان دونوں نے تعلیم ختم کردی اور ۴۹ ء میں جب عابد علی خاں نے اخبارِ سیاست شروع کیا تو بھائی
شریک مدیر کی حیثیت سے کام کرنے لگے اور عابد ہی کے ساتھ رہنے لگے ۔ انھوں نے اخبار کے لیے ساری زندگی وقف کردی تھی
ہندوستان کے مایۂ ناز صحافیوں میں شمار ہونے لگے تھے لیکن نام و نمود اور شہرت سے بہت دور رہنا چاہتے تھے ۔ انکساری کا یہ حال
کہ اگر عابد ان کی تعریف بھی کرتے تو ان کو شرمندگی محسوس ہوتی تھی اور ہمیشہ پس منظر میں رہنے کو ترجیح دیتے تھے ۔ ان دونوں کی
، مثال دوستی شاید ہی کہیں دیکھنے کو ملتی ہے ۔ ایسے دوست جو ایک دوسرے کے ہم راز ہوں جو بے خوف مشورہ دے سکیں اور
انس پوری طرح ساتھ دیں ، پریشانی کے وقت ہمت افزائی کریں ، طبیعتوں کے اونچ نیچ کو سہہ لیں ، ایک دوسرے کی باہمت مدافعت
ں اور مروت اور محبت میں کبھی فرق نہ آنے دیں ، ایسی دوستی قدرت کا ایک شاہ کار ہوتی ہے اور اس کی خوش بو دیر تک باقی رہتی
ہے ۔ خدا ان دونوں کو جنت نصیب کرے اور ان کی یہ بے مثال دوستی عالمِ بالا میں بھی قائم رہے ۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

محبوب حسین جگر

ایک عزیز دوست اور ممتاز صحافی

۱۹۴۵ء بڑی ہماہمی کا سال تھا ۔ اردو کانفرنس اور پھر ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ، شہر حیدرآباد میں جشنِ اردو کا منظر تھا ۔ اس میں شرکت کے لیے ملک بھر سے دانش ور آئے تھے ۔ حسرت موہانی تھے ، فراق گورکھپوری تھے ، احتشام حسین تھے ، عبدالعلیم تھے ، قاضی عبدالغفار تھے ، سجاد ظہیر تھے ، مخدوم محی الدین تھے ۔ ان سب کے لیے قیام و طعام کا انتظام ، کانفرنس کے مختلف اجلاسوں کا اہتمام ، یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی ۔ یوں تو بہت سے نوجوان ان کاموں میں لگے ہوئے تھے لیکن کرشن چندر نے اس کانفرنس کا جو رپورتاژ " پودے " لکھا اس میں ایک نوجوان انتظامیہ کا ہیرو بن کر ابھرتا ہے ۔ ریلوے اسٹیشن پر وہ موجود کہ آنے والوں کا استقبال کرے ۔ ایک متحرک شخصیت بلکہ بے چین جسد اور " پودے " کا یہی ہیرو محبوب حسین جگر تھے ۔ عابد علی خان استقبالیہ کے معتمد تھے اور جگر ان کے معاون و مدد گار ۔

محبوب حسین جگر سے کانفرنس کے دوران ملاقاتیں کیا ہوتیں جھلک نظر آتی اور پھر غائب ۔

پھر محبوب حسین جگر سے ملاقات راتوں کے اندھیرے میں حیدر گوڑہ کے گھر میں جہاں وہ اور عابد رہتے تھے بہت نازک حالات میں ہوتی ۔ میں روپوش تھا اور اچانک ان کے گھر پر آدھمکا جگر نے دروازہ کھولا اور مجھے اندر کھینچ لیا اور پھر دروازہ بند ۔ یہ مخالف نظام جدوجہد کا زمانہ تھا ابھی پولیس ایکشن نہیں ہوا تھا ۔ ۴۶ ۔ ۴۷ء کے دن تھے میں ان کی میزبانی میں رہتا اور ان کی نیندیں حرام کرتا۔ منزل ایک تھی اور بس اسی قدرِ مشترک نے ہمیں ایک کر دیا تھا ۔ یہ جگر کی دوسری تصویر تھی ۔

پھر پولیس ایکشن کے بعد روزنامہ سیاست جاری ہوا تو عابد علی خان اس کا دل اور محبوب حسین اس کا جگر تھے ۔ سیاست حیدرآباد کے مسلمانوں کے لیے خاص طور پر زخم پر مرہم ثابت ہوا ۔ انھوں نے غوغائی سیاست میں غوطہ لگایا تھا اور اب حالات دگرگوں ہورہے تھے ۔ ایسے میں سیاست نے نہ صرف ان کی ہمت بندھائی بلکہ نئے حالات کے مطابق انھیں ڈھالنے کی کوشش کی ۔ سیکولرازم ، جمہوریت ، سماجی انصاف کے نئے راستوں سے انھیں روشناس کرایا اور اس طرح ان کی ہمتیں باندھیں ۔

سیاست کے اس تاریخی رول میں عابد علی خاں کا ساتھ محبوب حسین جگر نے جس خوش اسلوبی سے دیا وہ وہی جانتے ہیں جو ان

ور کی سیاست کی اونچ نیچ اور کھابڑ سے واقف ہیں اور سیاست کے تاریخی رول کو دیکھ چکے ہیں۔

لیکن سوچتا ہوں کہ میں پہلے محبوب حسین جگر سے ملا یا ان کے بھائی ابراہیم جلیس سے میرا دوستانہ ہوا۔ ابراہیم جلیس جگر کا چھوٹا بھائی تھا۔ ادیب تھا۔ اس کا ایک ناول (اس وقت نام نہیں یاد آرہا ہے) میں نے اسی زمانے میں پڑھا تھا۔

پولیس ایکشن کے بعد وہ پاکستان چلا گیا لیکن جو سیاسی چلبلا پن اسے ہماری صحبت میں حاصل ہوا تھا وہ اس کے ساتھ رہا۔ وہ وہاں بھی اپنے ادبی (اور سیاسی) کارنامے انجام دیتا رہا۔ لکھا بھی اور حکمرانوں کا عتاب بھی اس پر نازل ہوا۔ بڑے استبداد کا مقابلہ کرتے ہوئے اس نے موت کو لبیک کہا۔ حیدرآباد میں اس کے ساتھیوں نے سوگ منایا۔ جگر کو پرسہ دیا۔

محبوب حسین جگر کی ایک بہن اور ۶ بھائی تھے اور چھوٹے بھائیوں میں ایک ذات شریف مجتبیٰ حسین ہیں۔ پس محبوب حسین ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین ہی نے ادب اور ادب کی خدمت میں اپنا مقام بنایا۔ ابراہیم تو سیاست کے سنگلاخ دروازوں کو بھی کھٹکھٹا چکا تھا اور مجتبیٰ حسین سیاست دانوں کا مذاق اڑانے ہی کو بہترین سیاست سمجھتا ہے۔

محبوب حسین نے سیاست دانوں کو اپنے اخبار میں جگہ دی اور اپنے اداریوں میں ان کی خبر بھی لی۔

محبوب حسین جگر کی صحافتی قینچی بہت مشہور اور ممتاز ہے۔ ہر مضمون نگار کو اس بات کا خطرہ لگا رہتا کہ اس کے مضمون میں جانے کون سا حصہ قینچی کے سپرد ہو جائے۔ کبھی موضوع کی "ناموزونیت" کی وجہ سے اور کبھی اخبار میں "جگہ کی قلت" کی وجہ سے چھپنے تک وہ جگر کو تھامے رکھتا اور دعا کرتا رہتا کہ جگر کی قینچی نہ چلے۔

مجھے بھی اس سے سابقہ پڑ چکا ہے۔ لیکن خیر اس میں تھی کہ کوئی معنی خیز حصہ کٹا نہیں۔ ایک بار میں نے اشفاق کی ایک کتاب پر تبصرہ کیا تھا۔ مجھے اس کا ہر پیراگراف عزیز تھا۔ میر حسن نے جگر کے کہنے پر اس کی "چھٹنی" کردی۔ مجھے بتایا۔ میں نے جگر سے کہا کہ مت کرو میرا مضمون پورا چھاپ دو۔ تب انھوں نے کہا ہفتہ وار ایڈیشن میں آئے گا۔ میں نے کہا منظور!

جگر کے ساتھ کتنی ہی محفلوں میں شریک ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ وہ مہمانِ خصوصی ہوتے اور میں "مقررِ خصوصی" لیکن مہمانِ خصوصی کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ بہت کم بولتے۔ ان کے حصے کی تقریر بھی مجھے ہی کرنی پڑتی۔

غرض میرے احباب کو ایک جسد فرض کرلیا جائے تو جگر کی حیثیت اس جسد کے جگر کی سی تھی۔

ان کی بیماری کی خبر ملی۔ زاہد سے کیفیت ملتی رہتی لیکن مجھے تو محسوس ہونے لگا تھا کہ جگر اس سے بچ نہیں سکیں گے۔ مجتبیٰ سے کیفیت لی تو وہ تو پیدائشی خوش فہم ہے کہتا تھا "اب مائل بہ صحت" ہیں۔ میں سر نیوڑھائے سنتا رہتا بالآخر وہی خبر ملی۔

عابد کا مکان، احباب کا جمگھٹ، گورنر کرشن کانت اور بہت سے ممتاز لوگ جمع تھے۔

سب نے خدا حافظ کہا۔ وہ اصل میں خدا سے اپنی حفاظت کے طلب گار تھے۔

——000——

سید حامد

دنیا کا کارخانہ چلتا ان ہی لوگوں سے ہے

کن لوگوں کا تذکرہ ہے یہ؟ سنیے۔ دنیا کی نگاہوں میں کھب جاتے ہیں وہ لوگ جو منظرِ عام کے طالب ہوتے ہیں۔ جن کی ذہانت خاص و عام کو مرعوب کرتی ہے۔ اور جن کی گفتگو مسحور۔ جو اپنے کارہائے نمایاں کے لیے خراج وصول کرنا نہیں بھولتے۔ جو ترقی اور اعتراف کی تمنا میں بے تاب رہتے ہیں، بے خواب رہتے ہیں، مقام اور مشغلہ بدلنے میں جنھیں تکلف نہیں ہوتا۔ ہمارے دور کا سیمابی مزاج ان حضرات کو راس آتا ہے۔ فربہی کانوں کے ذریعے ان کے دل و دماغ پر چھاجاتی ہے۔ کامیابی کی مثال ان ہی لوگوں سے دی جاتی ہے۔

لیکن دنیا کا کارخانہ یہ پرصدا، سیماب تمثال، برخود غلط، شہرت پسند لوگ نہیں چلاتے۔ یہ کارخانہ تو چلاتے ہیں وہ بے صدا، استقامت پیشہ، بے نفس لوگ جو نام و نمود میں دل چسپی نہیں رکھتے، جنھیں اپنے کام سے کام ہے، جو محنت کے بعد شام کو اجرت وصول کرنے کے لیے کھڑے نہیں ہوتے، اجرت، اعترافات، مقبولیت اور شہرت کی شکل میں۔ جنھیں نہ ستائش کی تمنا ہوتی ہے، نہ صلے کی پروا۔ جو پس پردہ رہ کر کام کرتے ہیں۔ اور ایک روز پردے کے پیچھے سے اس طرح ہٹ جاتے ہیں کہ کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔

مرحوم محبوب حسین جگر صاحب کا تعلق اسی کم گو اور بسیار کن اور ریاضت خو طبقے سے تھا۔ راقمِ سطور کو ان سے شرفِ نیاز دو مرتبہ حاصل ہوا۔ اور دونوں بار وہ دل ہی دل میں ان کی بے صدا ریاضت ولیاقت کو داد دیتا ہوا لوٹا اور ان کی استقامت پر آفریں کرتا ہوا۔ جناب عابد علی خان صاحب، روزنامہ سیاست اور جناب محبوب حسین جگر صاحب ایک دل نواز اور بار آور تکون (مثلث) کے تین زاویے تھے۔ محبوب حسین جگر صاحب کی جناب عابد علی خان صاحب کے ساتھ رفاقت ضرب المثل بن گئی تھی۔ بے ساختہ غالب کا وہ شعر زبان پر آجاتا ہے:

وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

یہ اہل وفادھن کے کتنے پکے ہوتے ہیں۔ ضمناً یہ "ملحدانہ" بات بھی کہہ دی جائے کہ پہلے مصرع میں "بہ شرطِ استواری" زاید اور بے مصرف ہے۔ غالب جیسے قادر الکلام شاعر کے یہاں زوائد ڈھونڈے نہ ملیں گے۔ حشو کا اس مصرع میں اشتباہ ہوا تو کم سواد بغلیں بجانے لگے۔ یہاں وزن کے تقاضے معنی کے مطالبات پر غالب آگئے۔ واقعہ یہ ہے کہ وفاداری مطلق وصف ہے، وہ کوئی شرط یا تحدید قبول نہیں کرتا۔ وفاداری کا تصور ہی بغیر استواری کے ممکن نہیں۔ لہٰذا یہ قید لگانے کی ضرورت کیا؟

ہم سب اردو والوں کی ہم دردیاں گرامی قدر زاہد علی خاں اور ان کے شرکاءِ کار کے ساتھ ہیں ۔ ہمیں احساس ہے کہ سیاست نے سنجیدہ صحافت کا ایک معیار قائم کیا ہے ۔ ہماری دعا ہے کہ مرحوم و مغفور کو پروردگار اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے ۔ اور " سیاست " سنجیدہ ، باوقار اور معنی خیز صحافت کی شاہ راہ پر گرمِ سفر رہے ۔

—— 000 ——

منوہر راج سکینہ ایڈوکیٹ

جناب محبوب حسین جگر

جناب محبوب حسین جگر نے انتقال سے قبل آخری کلمات میں یہ کہا کہ اب زندگی سے ان کا معاہدہ ختم ہو چکا ہے مگر اردو والوں کا کنبہ جو اس معاہدے کا فریق نہ تھا اس کو ایک شدید دھکا پہنچا۔ جگر صاحب سے میری ملاقات اور وابستگی اتنی ہی دیرینہ اور پرانی ہے جتنی میری عابد علی خاں (مرحوم) کے ساتھ دوستی رہی ہے۔ جگر صاحب اردو زبان کی ترقی و ترویج میں زندگی بھر جٹے رہے۔ اردو زبان کو زندہ رکھنے میں ہمہ تن مصروف رہا کرتے تھے۔ نت نئے منصوبوں کے ساتھ اس مہم کو آگے بڑھاتے رہے۔ اردو زبان کی بقا کے لیے عابد علی خاں اور محبوب حسین جگر کی شراکت Participation ایک مثالی شراکت ثابت ہوئی۔ اردو انجمنوں اور اداروں کا استحکام، ادیبوں اور شاعروں کی امداد کے لیے ایک سے زیادہ ٹرسٹ کی تشکیل اور گوشۂ عثمانین کے قیام میں عابد علی خاں کے ساتھ آپ کا بھرپور تعاون شامل رہا ہے۔ ادبی ٹرسٹ کے مشاعرے نہ صرف دکن کی تہذیب و تمدن کی یادگار محفلیں سمجھی جاتی رہیں بلکہ ان مشاعروں سے ہونے والی آمدنی اردو اداروں اور اردو زبان سے ذوق رکھنے والے حضرات ادباء و شعراء کی امداد میں بطور عطیہ تقسیم کردی جاتی تھی۔ نمائش مصنوعات ملکی میں اردو بک اسٹال اردو زبان سے ذوق رکھنے والے حضرات کے لیے نہ صرف ایک مرکز بنا رہتا تھا بلکہ کتب کی فروختگی کے بعد جو آمدنی ہوتی تھی وہ بھی بالترتیب اردو اداروں میں تقسیم کردی جاتی تھی۔ یہ وہ کارنامے ہیں جو اردو والوں کو خود اپنے طور پر اردو زبان کو زندہ رکھنے کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لیے گھر گھر اردو تعلیم کو عام کرنے عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ قائم کیا گیا اور اس ٹرسٹ کے تحت گلی گلی بستی بستی اردو دانی کے مراکز قائم کیے گئے۔ اس ٹرسٹ کے تحت ایک ایسی لہر چلی کہ آج شہر کے کونے کونے میں بچے، بوڑھے سب ہی اردو پڑھ رہے ہیں۔ اپنے طور پر اردو پڑھنے اور سیکھنے کا جذبہ پیدا ہوا اور یہ لہر اردو والوں میں ایک حد تک جو بے حسی تھی اس کو دور کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔ کیا اردو والے ان تحریکوں، اسکیموں اور منصوبوں کو بھول سکتے ہیں جن کی پشت پناہی محبوب حسین جگر کرتے رہے۔ جگر صاحب اردو کاز کے لیے پرخلوص کام کرنے والوں کو اپنا دوست سمجھتے تھے۔ ایسے تمام حضرات کی فہرست ان کے ذہن میں رہا کرتی تھی اور جب بھی اردو زبان کی خدمت کی ضرورت ہوتی ایک ایک کو یاد کرتے اور تعاون کے طالب رہتے تھے۔ اردو زبان سے متعلق میری دستوری معلومات اور مختلف تجاویز کو وہ پسند کرتے اور کبھی کبھار روزنامہ سیاست کے اداریوں میں ذکر بھی فرماتے تھے۔ ۲۶ جنوری ہو یا ۱۵ اگست وہ میرے مضمون کے لیے جگہ چھوڑ دیتے اور مسلسل یاد

دہانی کراتے تھے ۔ جناب محبوب حسین جگر ایک بلند پایہ صحافی تھے ۔وہ سماجی اصلاح کے ایک خاموش رہبر تھے ۔ قلم کے دھنی تھے
اخبار سیاست کو اپنے خونِ جگر سے ایک بلند و باوقار مقام پر پہنچایا ۔روزنامہ سیاست کو انھوں نے سیاسی ریشہ دوانیوں سے ہمیشہ دور رکا
روزنامہ سیاست کا مطالعہ کرنے والوں کو معلوم ہوگا کہ وہ جس عنوان یا مضمون یا سیاسی مسئلہ پر اداریہ لکھتے اولاً تاریخی پس منظر کو پیٗ
کرتے پھر سرکاری اعلانات اور وعدوں کا سلسلہ وار حوالے دیا کرتے تھے اور آخر میں نتیجہ اخذ کرتے ہوئے اپنی تجاویز پیش کرتے یہ سـ
محبوب حسین جگر کی بلند سوچ اور فکر کا نتیجہ ہی تو تھا ۔ بہ ہرحال محبوب حسین جگر سیاست کے لیے ہی زندہ رہے اور سیاست اخبار ۔
لیے بسترِ مرگ سے بھی آخری اداریہ ڈاکٹر بھواڑہ گوپال ریڈی کے انتقال پر تحریر فرمایا اور اس اداریے میں بھی ان کے اردو زبان ۔
فروغ کے لیے جو نمایاں حصہ انھوں نے ادا کیا اس کو آپ نے سراہا پھر ان کے دور میں اردو تلگو اکیڈیمی کے تعاون سے حیدر آباد ۔
شاعر و ادیب کی دو جلدیں شائع ہوئیں ،اس کا ذکر بھی آپ نے فرمایا ۔ محبوب حسین جگر ایک قد آور صحافی تھے ۔ محبوب حسین جگر کے انتقا
ے اردو صحافت کا ایک یادگار دور ختم ہوا ۔ جناب محبوب حسین جگر نے Simple Living and High Thinking ۔
اصول پر اپنی ساری زندگی بتادی ۔ کم زور وہ جسمانی طور پر ضرور تھے مگر قوی الدماغ اور بلند فکر انسان تھے نہایت سادگی پسند اور شان
شوکت سے کوسوں دور تھے ۔ جناب محبوب حسین جگر نے غضب کا حافظہ پایا تھا ۔ عزم و عقیدے میں پختگی ،لگن و دھن کے پکے تھے
ایک سچے عثمانین تھے ۔ شکاگو میں مقیم عثمانین نے حال ہی میں آپ کو بابائے صحافت کا لقب عطا کیا ۔ فرقہ وارانہ فسادات میں بڑے
بے چین ہوجاتے تھے ۔ دوست احباب کی خیریت کسی نہ کسی طرح لیتے رہتے ۔ آپ کی انسان دوستی و خلوص کے سب ہی قایل تھے
جناب محبوب حسین جگر عرصہ تک بھولنے پر بھی بھلائے نہیں جائیں گے ۔ جگر صاحب اپنے نام سے زیادہ اپنے کام اور عزم سے مشہور تھے ۔

----000----

یوسف ناظم

حیدر آباد کی محبوب شخصیت کو الوداع

آج ۱۱ مارچ ۱۹۹۱ء کو حیدر آباد میں دن کے ۳ بجے وہ کہانی ختم ہو گئی جو آج سے ٹھیک ۵۸ سال پہلے جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے اے ہاسٹل میں اس وقت شروع ہوئی تھی جب جامعہ عثمانیہ کے آرٹس کالج کے افتتاح کی تاریخی تقریب منعقد ہوئی تھی۔ میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع نے ہندوستان کی واحد اردو یونیورسٹی قائم کی تھی اور خود آصف جاہ سابع ہی کے ہاتھوں یہ تقریب پایۂ تکمیل کو پہنچنے والی تھی۔ حیدر آباد کے چار ضلعوں اورنگ آباد، ورنگل، گلبرگہ اور رائچور کے انٹر میڈیٹ کالجوں کے نمائندوں کو بھی اس تقریب میں مدعو کیا گیا تھا۔ اضلاع کے نو عمر طالب علموں کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ اورنگ آباد انٹر میڈیٹ کے پہلے سال کے طالب علم یوسف ناظم کو یہ اعزاز عطا ہوا اور جب یوسف ناظم نے اورنگ آباد سے حیدر آباد پہنچ کر اے ہاسٹل میں ایک حیران، پریشان بلکہ سراسیمہ مسافر کی طرح قدم رکھا تو اسے خوش آمدید کہا محبوب حسین جگر نے جو بی ہاسٹل میں مقیم طالب علم کی حیثیت میں اضلاع سے آنے والے نمائندوں کی دیکھ ریکھ کے لیے مامور کیے گئے تھے۔ ۵۸ سال پہلے کی وہ پہلی ملاقات آج بھی دل پر نقش ہے۔ ماہ و سال خوش رنگ تتلیوں کی طرح ہوا میں اڑتے اور رنگ بدلتے رہے۔ جگر صاحب نے تقریری مقابلے سے ایک دن پہلے ہاسٹل ہی میں مدعو طلبہ کا فی البدیہہ تقریری مقابلہ رکھا اور مجھے اتنی شاباشی دی کہ میرا جی چاہا کہ کاش یہی اصلی مقابلہ ہوتا۔ مقابلے کے دن میں نے یہ حسن و خوبی ان کی خوش فہمی دور کردی۔ تقریر کے دوران ہی ہوٹنگ کے ذریعے سامعینِ کرام نے مجھے مسترد کردیا لیکن میرا خیال ہے انتظامیہ کی طرف سے جو مراسلہ اورنگ آباد کالج کے نام بھیجا گیا اس میں میری تقریر کی تعریف ہی کی گئی تھی۔ یہ مراسلہ محبوب حسین جگر کے مسودے کا بعینہٖ تھا۔ مجھے اس وقت ان کی محبت اور ان کی جگری کیفیت کا اندازہ نہیں ہوا تھا لیکن بعد میں ان سے اتنا ربط ضبط رہا کہ ان کی قلبی کیفیات ایک شاداب پھول کھلنے کے انداز سے مجھ پر منکشف ہوتی رہیں۔ ان کی خاموشی ان کی گویائی تھی۔ وہ سننے کی نہیں سمجھنے کی چیز تھے۔ کام کی لگن نے ان کے جذبات کو یخ بستہ کردیا تھا۔ کام کے سوا شاید ہی انھوں نے کبھی کوئی اور بات سوچی ہو۔ کسی سے ہنس کر اگر بول بھی لیتے تو شاید بعد میں انھیں اس کا افسوس بھی ہوتا ہو، کوئی تعجب نہیں۔ دل کے نرم لیکن مزاج کے سخت۔ وہ اندرونی طور پر اتنے سنجیدہ نہیں تھے جتنے بہ ظاہر نظر آتے تھے۔ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر اخبارِ سیاست نہ ہوتا تو ان کا دل کاہے میں لگتا۔ وہ رفتار اور گفتار سے کبھی سرگرم نظر نہیں آئے لیکن سرگرمی، ان کے خاموش عمل میں تھی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس جب حیدر آباد میں منعقد ہوئی شاید

۱۹۴۴ یا ۴۵ میں تو کرشن چندر سب سے زیادہ جس شخصیت سے متاثر ہوئے وہ محبوب حسین جگر کی شخصیت تھی۔ ان کی تصنیف "پودے" کے ہیرو نہیں محرک ہی جگر تھے۔ سیاست کے اب تک کوئی ۲۵ مشاعرے تو ہو ہی چکے ہوں گے۔ ان مشاعروں کے سربراہ عابد علی خاں تھے لیکن روحِ رواں محبوب حسین جگر تھے۔ حد یہ ہوگئی کہ اس سال اپریل کے دوسرے ہفتے میں سیاست کے جس مشاعرے کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں ان میں بھی خونِ جگر شامل تھا۔ مجتبیٰ کے ذریعے انھوں نے مجھے بمبئی سے تین شاعروں کو بھیجنے کی ذمہ داری سونپی تھی۔ مجتبیٰ نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ جگر صاحب ۱۰ مارچ کو اسپتال سے گھر واپس آجائیں گے۔ زاہد علی خاں نے ۱۸ فبروری کو مجھے ان کی خیریت کی اطلاع دی تھی اور لکھا تھا کہ پیس میکر کے لگائے جانے میں کھانسی کے غلبے کی وجہ سے ایک آدھ دن کی دیر ہو جائے گی۔ پیس میکر بھی لگ گیا لیکن جگر صاحب نے عابد علی خاں کی وفات کے بعد سیاست میں تو اپنی دل چسپی کو برقرار رکھا لیکن زندگی سے دل چسپی کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ مایوسی اگر انھیں چھوڑنا بھی چاہتی تو یہ اسے جدا کرنے پر رضامند نہیں تھے۔ دل کے مریض تھے۔ ان کے علاج میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔ دوائیں، دعائیں سب ہوئیں لیکن میں سمجھتا ہوں محبوب حسین جگر نے آخری سفر کے لیے اسی دن اپنا بوریہ بستر باندھ لیا تھا جس دن عابد علی خاں نے دنیا کو خیر باد کہا۔ وہ صرف سیاست کی یعنی اخبارِ سیاست کی زندگی گزار رہے تھے۔ وہ عابد علی خاں کے صرف دوست نہیں رکنِ خاندان تھے۔ محبت، مروت، دوستی اور استقامت کی چلتی پھرتی مثال۔ سیاست کی نئی عمارت تو ابھی حال میں بنی لیکن پہلی عمارت جو اس صدی کے پانچویں دہے میں بننی شروع ہوئی تھی اس کی تعمیر کے دوران جگر کی مصروفیت سب کی دیکھی ہوئی ہے۔ وہ اس عمارت کی چھت پر چھتری لگائے ہوئے اس وقت تک کھڑے رہتے جب تک سورج تھک کر غروب نہ ہو جاتا۔

میری ان سے مستقل طور پر خط و کتابت ہوتی تھی۔ خط کا جواب پابندی سے دیتے اور خود اگر نہ لکھ سکتے تو کسی سے لکھوا کر بھیجتے ضرور۔ کبھی کبھی پہل بھی کرتے۔ ان کا خط بے حد شکستہ تھا اور آخر آخر میں تو خط میں صرف مدھم سطریں ہوتی تھیں۔ الفاظ میں اپنی طرف سے گھڑ لیتا تھا۔ خط کے جواب میں وہ کیا لکھیں گے میں اس سے پوری طرح باخبر تھا۔ محبت کے لیے الفاظ ضروری بھی کب ہیں۔

محبوب حسین جگر کا نام نہ صرف اخبارِ سیاست کی تاریخ میں بلکہ حیدرآباد کی تاریخ میں بھی روشن رہے گا۔ ایک ایسے شخص کا نام جس نے صرف کام سے کام رکھا۔ سلیقے سے زندگی گزاری۔ ان کے پسماندگان میں اخبارِ سیاست کے سارے قارئین ہیں جو دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ کیا عجیب و غریب داستان ہے کہ حجرِ ضمیر میں رہنے والا شخص زندگی بھر تنہا رہا لیکن انجمنیں سجاتا رہا۔ اسم بامسمیٰ، شخص محبوب۔ سیاست کے دفتر کے سامنے سے جو شخص بھی گزرے گا گزر جانے والے کو ضرور یاد کرے گا۔ اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت کرے۔

—— 0000 ——

اقبال متین

میرے جگر بھائی

مٹا مٹا کے خودی کو نفس نفس دیکھوں
میں سیم وزر میں رہوں بھی تو خار و خس دیکھوں

(ا۔م)

اپنی انفرادیت کو اپنی شخصیت کی پہچان بننے سے بچالینا اور اپنا سب کچھ کسی انیسِ جاں کو اس طرح تج دینا کہ باہر سے صرف صورت پہچانی جائے اور اندر سے سات پردوں میں چھپی شخصیت خود اپنی صورت کو ترسنے کا جذبہ بھی بھول جائے تو یہ بھول ایک ایسی انفرادیت کا پتہ دیتی ہے جس کے وجود کا کہیں اور ملنا محال ہے۔

کرشن چندر نے اپنے رپور تاژ "پودے" میں جس محبوب حسین جگر کی دریافت کی تھی وہ اپنا آپا دوسروں کے لیے وقف کردینے والی ایسی جواں سال شخصیت تھی جس نے ترقی پسندوں کے لیے اپنا آرام کھویا، مسکراہٹ کھوئی، آنسو کھوئے اور ان آنسوؤں کو اپنے دامن میں چھپالینے والی ایسی بہن کھودی جس کا دوپٹہ جگر بھائی کی بھیگی پلکوں تک بھی نہ پہنچ سکا۔

میں نے جگر بھائی سے باتیں کیں کہ انھیں کھوج کھوج کر ڈھونڈ نکالوں لیکن وہ ہر بات میں عابد علی خاں صاحب کے پیچھے چھپتے رہے۔ کبھی وہ ابراہیم جلیس کے پیچھے بھی چھپ گئے تھے جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ جتنی اچھائیاں ان کے تعلق سے سنی تھیں ،ساری برائیاں ڈھانک ڈھانپ کر اپنے پاس رکھ لیں اور ساری اچھائیاں عابد صاحب کو سونپ کر اپنے آپ سے دست بردار ہوگئے۔

جگر صاحب پر لکھنا اتنا آسان نہیں ہے۔ جو شخص ہاتھ ہی نہ آئے وہ قلم کی زد سے یوں بچ نکلتا ہے کہ نام لیا اور روشنائی ختم ہوئی۔ جگر بھائی کچھ اسی طرح سے جیتے تھے۔ سوچتا ہوں جب ان کی سانسیں بھی ان کی نہ رہیں گی ان کے دل کی دھڑکن خود انھیں ڈھونڈنے لگے گی اس وقت جگر صاحب کچھ اس طرح ذہنوں میں یا دبن بن کر مسکرائیں گے کہ دیکھو دوسروں کے لیے اس طرح جیتے تھے، دوسروں کے لیے اس طرح مرتے ہیں۔

میرے ،ان سے مراسم کچھ نہیں رہے۔ بس رہے تو یوں رہے کہ ہر قسم کی دوریاں ان میں مجھ میں حائل رہیں۔ ابراہیم جلیس جیسے منفرد طنز نگار سے میں بس قریب ہوتے ہوتے رہ گیا کہ سیاسی نظریات نے دیواریں کھڑی کردیں۔ ان دیواروں کے پیچھے نفرتوں کی آگ شعلہ بن بن کر ایک رخ کو اس طرح چاٹتی رہ گئی۔ نظر حیدرآبادی جیسا مخلص دوست منہ پھیر کر گزر جانے لگا۔ قاسم رضوی کی ہذیان گوئی الل

قلعے پر آصفی پرچم لہراتی رہی اور دلوں کے چراغ بجھتے رہے ۔ دوست جب دوست نہیں رہے تو جاننے پہچاننے کا کیا سوال ۔ لطیف ساجد ابراہیم جلیس کو روتا رہا ، میں اور سلیمان اریب نظر حیدرآبادی کو ۔ میرے لیے تو "الو کمیت" والا خواجہ معین الدین بھی تھا جو سٹی کالج میں آٹھویں اور نویں جماعت میں میرا دوست تھا اور ہم دونوں مخدوم کے شاگرد بھی تھے ۔ لیکن ذہنی بُعد نے اُنسیت لوٹ لی تھی ۔ اُنھیں دنوں یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کا کوئی بڑا بھائی ہے جو اپنے بہت چہیتے چھوٹے بھائی کے لیے اندر ہی اندر سسکتا رہتا ہے اور پاس کے لوگوں کو بھی اس کی سسکیاں سنائی نہیں دیتیں ۔ یہ نہ سنائی دینے والی سسکیاں ابراہیم جلیس کے لیے محبوب حسین جگر کی تھیں جن کی جدائیاں آخری دم تک سسکتی رہیں ۔

جگر بھائی سے میں اُن دنوں بھی بہت دور تھا کہ ایک نک سک سے درست کم رنگ لڑکا ہماری محفلوں میں یکایک رنگینیاں بکھیرنے لگا ۔ دراتا ہوا آیا اور ہر دل میں گھس گیا ۔ پہلی بار محسوس ہوا کہ نسبت دبا کی طرح بھی آتی ہے ۔ چہرے پر چمک نہیں لیکن آنکھوں میں پھلجھڑیاں جلائے اس شخص نے دوستوں کے غموں میں مسکان پھینکنی شروع کی ۔ ابراہیم جلیس کے طنز میں مزاح کی چاشنی ملا کر اس نے زندگی کی صعوبتوں کو سہل کر دینے کے جتن کیے ۔ اب گھپ اندھیروں میں یہ جگنو بھٹکتا پھرتا تھا تو اچھا لگتا تھا ۔ معلوم ہوا کہ یہ مجتبیٰ حسین ہے ۔ محبوب حسین جگر کا سب سے چھوٹا بھائی اور ان کا جگر گوشہ ۔ یہاں سے میں جگر صاحب سے ذہنی طور پر قریب ہونے لگا ۔

ابراہیم جلیس کو پڑھ کر میں ان کا ہو گیا تھا ۔ "اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی" پڑھنے کے بعد یوں لگا کہ صحرا سے بھٹک کر شہر میں بے نکیل پھرنے والا یہ اونٹ محفلوں کی وسعتیں ناپنے لگا تھا کہ میں جلیس کو رو بیٹھا ۔

"دو ملک ایک کہانی" پڑھنے کے بعد رہی سہی کسر پوری ہو گئی ۔

اپنی کمزوریوں ، اپنی گراوٹوں ، اپنی تنگ نظر خود بینیوں ، اپنی جاں گیر ہزیمتوں ، اپنی نشیب نواز بلندیوں کا ذکر ابراہیم جلیس نے اس درد سے "دو ملک ایک کہانی" میں کیا ہے کہ اس کے اعترافات کا ایک ایک لفظ اس کی دوریوں کو قریب کی جاں گسل حرارت بخشتا ہے ۔ وہ لکھتا ہے :

> چھ روز تک کراچی میں شدید بخار اور مفلسی میں مبتلا رہا ۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں میری یہ دونوں کمزوریاں میرے قدموں کو نہ ڈگمگا دیں اور میں پھر اندھیرے جنگل میں راستہ بھٹک جاؤں ۔ اس لیے میں نے ساتویں روز اپنے دوست وزیر محمد خاں سے تیس روپے قرض لیے اور میرے دوست سجاد نے مجھے سندھ اکسپریس کے تیسرے درجے میں سوار کرا دیا ۔
>
> حیدرآباد سندھ تک میں اپنی سیٹ پر بیٹھا اور بیٹھنے کی کوشش کرتا رہا ۔ مگر مجھے بخار تیزی سے چڑھنے لگا تھا ۔ میرے سامنے کی سیٹ پر گوجرانوالہ ضلع کا ایک بوڑھا کسان اور اس کی بیوی بیٹھے تھے ۔ انھوں نے میری حالت کو بہ غور دیکھا ۔ کسان نے میری نبض اور میرا ماتھا چھو کر دیکھا اس کے بعد مجھ سے بغیر کچھ کہے اس نے میرا بستر کھول کر سیٹ پر بچھا دیا اور بولا :
>
> "بیٹا جی ۔ تینوں تپ چڑھی دی اے توں لمّے سوں جا" ۔

اس کی بیوی نے اپنی میلی کثیف تھیلی سے ملغی قسم کی کوئی چیز نکالی اور مجھے دیتے ہوئے کہا:

"پتر..... لیئوں کھالے۔ آرام آجاؤ گا"۔

میں نے اس کسان اور اس کی بیوی کی طرف شکر گزار نظروں سے ممنون نظروں سے نہیں بلکہ مجرم نظروں سے دیکھا۔ کیوں کہ آج سے ایک سال پہلے تلنگانہ کے کھیتوں میں میں اسی کسان کا ساتھ چھوڑ کر عالی شان محلوں کی طرف چلا گیا تھا۔ اس پر ظلم کے پہاڑ توڑنے میں، میں نے اُس کے دشمنوں کا غیر شعوری طور پر ہی سی مگر ساتھ ضرور دیا تھا۔ آج وہی کسان سندھ اور پنجاب کے اجنبی میدانوں میں یکا و تنہا بخار میں مبتلا، دشمن کو موت کے منہ میں جانے سے بچارہا تھا۔ اپنے طاقت ور بازوؤں سے اپنے دشمن کو موت کے منہ سے چھین کر زندگی کی طرف لے جارہا تھا۔

(دو ملک ایک کہانی ص ۳۸۔ ۱۳۷)

محبوب حسین جگر کو ابراہیم جلیس سے جدا ہونے کے بعد نہ اس کی نبض کے ڈوبنے کی خبر تھی نہ رک رک کر دل کے دھڑ کی۔ بہن کو کھو کر اس نے پہلے ہی اپنے جسم کا ایک حصہ گنوادیا تھا۔ بھائی کو کھو کر اُس نے پہلے ہی اپنے ذہن کا ایک حصہ گنوادیا۔ کو رو دھو کر خاموش رہا جاسکتا تھا کہ زندگی، موت کے لگائے ہوئے زخموں کے اندمال کا گُر جانتی ہے۔ لیکن دل میں لگائے ہوئے گھاؤ جو خود زندگی نے لگائے تھے اس کا اندمال کون کرے۔ جلیس حیدرآباد میں تھے لیکن محبوب حسین جگر سے دور تھے۔ یہ جغ دوریاں سہن کی جاسکتی تھیں گو صبر آزما تھیں۔ لیکن جلیس سے اس ذہنی تفاوت نے محبوب حسین جگر کو کاٹ کر رکھ دیا تھا جس، زخموں کا اندمال اس لیے مشکل تھا کہ یہ زخم جلیس نے اپنی سیاسی بصیرت کھو کر، اپنے شعور و احساس کی منزل اپنے ہاتھوں ہی نیلام کر جگر صاحب کو لگائے تھے۔ بقول تمکین سرمست:

غم نہ کر میری خشک آنکھوں کا
یوں بھی آنسو بہائے جاتے ہیں

جگر بھائی لگتا ہے کہ خشک آنکھوں کا بھرم رکھنے میں اس حد تک کمال حاصل کر چکے تھے کہ عابد صاحب کا غم بھی جوان کے سب سے بڑا غم تھا اُن کے مشت استخواں ڈھانچے کو تسخیر نہ کر سکا اور وہ اپنی ہڈیوں کو لوہے کی لچکتی پٹیوں سے کس کر عابد صاحب چھوڑے ہوئے کاموں کی تکمیل میں جٹ گئے۔ یہی ان کا ذہنی یگانگت و رفاقت کا چمن زار تھا۔ یہی ان کا آدرش و ادھیکار تھا ورنہ میں کبھی یوں بھی ہوا تھا کہ وہ جلیس کے پیچھے چھپ کر اپنی محبتوں کا جنازہ اپنے ہی کندھے پر اٹھا لینے کے لیے آمادہ ہوگئے تھے اور دکھ سے پڑھا تھا کہ:

"میں نے بہت سے بڑے لوگ کتابوں میں پڑھے ہیں۔ چند ایک زندگی میں دیکھے ہیں لیکن ایسا کوئی بڑا آدمی نہیں دیکھا جو اپنی عظمتوں کا اپنے ہی ہاتھوں گلا گھونٹتا ہے اور دوسروں کے سینوں پر تمغے لگاتا پھرتا ہے۔ اپنے ہونے پر اس لیے خوش ہے کہ وہی اس کا نہ ہونا بن گیا ہے"۔

ں سوچتا ہوں اقبال متین تم قلم سے اپنی رفاقتوں پر نازاں ہو، کوئی تمھیں پہچانتا ہے کوئی نہیں پہچانتا۔ تمھیں کسی کے نہ پہچاننے کا دکھ
ہے اور کسی کے پہچاننے کی خوشی۔ تمھارے پاس جینے کے لیے شناخت کا یہی مسئلہ سہارا بن گیا ہے۔ لیکن وہ دیکھو وہ اخبارِ سیاست
کے دفتر کے شیشوں میں گھرا ہوا، اپنے ہی تنفس سے کھیلتا ہوا ریڑھ کی ہڈی کے درد کو نرم توشکوں، گدیوں سے بچاکر گرم سلاخوں سے
ٹکا ہوا ایک شخص اس طرح بیٹھا ہے جو شیشوں کے باہر سے دکھائی نہیں دیتا۔ قریب پہنچو تو خود باہر ہی باہر سے دکھائی دیتا ہے، اندر
ے ہرگز دکھائی نہیں دیتا۔ اور کام کیے جاتا ہے۔ کام کیے جاتا ہے۔ کیوں؟ کس کے لیے؟ اس شخص کی شناخت کیا ہے؟ روزنامہ سیاست
انی جگری دوست عابد صاحب لیکن یہ خود کیا ہے، کون ہے، کیوں ہے۔ ایک بھٹکتی ہوئی نیکی جس کو خود اپنا پتا نہیں ہے۔ ایک نامی
امی جس کو خود اپنا نام معلوم نہیں ہے۔ میں اس جذبے کے آگے سر جھکاتا ہوں جو ہر جذبے سے عاری ہے۔ میں اس گم نامی کو سلام کرتا
ں جو اپنا نام ہی جاننا نہیں چاہتی۔

جگر بھائی میں تو دور دور کا آدمی ہوں۔ نہ آپ کی خوش نودی کا خواہاں نہ خوشامد میرا شعار۔ آپ مجھے کیا دیں گے۔ میں آپ سے
الوں گا۔ میں جب بھی ملتا ہوں تو آپ مجھے محبت دیتے ہیں۔ آپ سے ہر طرح چھوٹا ہونے کے باوجود اپنی اس مشفقانہ محبت کو بعض
ت تعظیم تک لے جاتے ہیں تو میں لپک کر آپ سے بیٹھنے کی درخواست کرتا ہوں۔ یہ سرمایہ میرے لیے بہت ہے لیکن آج آپ سے
ب چیز مانگوں گا اور بہ ضد ہو کر مانگوں گا۔ مجھے بس اتنا بتا دیجیے کہ خود کو مٹا مٹا کر جینے کا عرفان آدمی کو کہاں ملتا ہے۔ موت سے پہلے
ت کے ساتھ گھرے اڑانے کی ادا آپ کو کس نے سکھلا دی۔ میں نے تو بہت غم اٹھائے لیکن آپ کی طرح زندہ نہ رہ سکا۔

جگر بھائی سے کیسے ملوں، کس طرح اوروں سے ملواؤں۔ میں نے کہا نا وہ ہاتھ ہی نہیں آتے ہیں۔ ان کی سخت گیری زباں زد ہے
ت کوشی سات پردوں میں چھپی ہوئی۔ اس لوہے کے ڈھانچے میں کتنا موم پگھلتا رہتا ہے دکھائی نہیں دیتا۔

صلاح الدین نیر سے جگر بھائی کے سامنے ملتا ہوں تو وہ پہچانے ہی نہیں جاتے۔ کوئی مٹی کا پتلا لکڑی کا بھی نہیں، جگر صاحب
لے اشاروں پر کبھی تھرکتا رہتا ہے کبھی فرش پر نصب ہو جاتا ہے۔ وہ لن ترانی وہ نزت جو محفل میں نیر کا خاصہ ہے جانے کہاں غائب
جاتی ہے۔ اس کی یہ بے بسی جس کے بارے میں لوگ ترس کھا کر باتیں کرتے ہیں نیر کی منزلت میرے دل میں اور بڑھا دیتی ہے۔
ی شخصیت اگر سامنے ہو جس نے ہمیں صحافت کی وسیع و عریض دنیا میں بات کرنے کا اعتماد دیا۔ قلم ہاتھ میں تھما کر یہ گربتا دیا کہ سادہ
غذ سے اس طرح سلوک کرتے ہیں۔ اس کے آگے اپنی ذات کو اس کا راستہ بنا کر پاؤں میں بچھا دینا شرافت ہے۔ چناں چہ میں بھی
ر بھائی کے سامنے نیر سے اس طرح ملتا ہوں جیسے سلام و پیام نہیں صرف سلام و السلام ہے۔ نہ میں قریب جاتا ہوں نہ وہ قریب آتے ہیں
یہ بات "سیاست" کے آداب کے خلاف ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس اُپنی تلوار کو جو سمجھتا ہوں کہ کارپردازانِ سیاست کی گردنوں پر جب چاہے گر سکتی ہے۔ لوگ دہل دہل کر بھی
ا ہی دل میں اس کے لیے احترام و محبت کا جذبہ کیوں کر پرورش کرتے ہیں۔ دنیا بھر کی تاریخ میں کسی ظلم کے خلاف کوئی آواز محبت
ا ڈوب کر نہیں اٹھی تو پھر جگر بھائی کے لیے یہ کیسے ممکن ہوا کہ وہ تاریخ کی اس کھلی حقیقت کو بدل کر رکھ دیں۔

سیڑھیاں چڑھ کر جگر بھائی تک پہنچنے سے پہلے ان کا عکس روزنامہ سیاست کے احاطے کے ایک گوشے میں مل جاتا ہے۔ اس

عکس کا نام ہے مرزا مصطفےٰ علی بیگ۔ یہ شخص جگر بھائی کا دیوانہ ہے اور اس حد تک دیوانہ ہے کہ اس نے نہ صرف ہیئت کذائی میں ان کا تتبع کیا ہے بلکہ زندگی کرنے کے ڈھنگ بھی اپنا لینے کی سعی کیے جاتا ہے۔ جگر بھائی سے زیادہ بھتے کی طرح سینے میں ہانپتا ہوا دل کہ جانے کب اچھل کر باہر نکل پڑے اور پوچھے جگر صاحب کیا کر رہے ہیں۔ لیکن اس عالم میں بھی دھان پان، بج دھج کر صاف ستھری پوشاک میں خود کو سمیٹے جگر صاحب ہی کی تمکنت سے بیٹھا ہوا ملتا ہے۔ آپ کے سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے ہی وہ لب کشائی کی زحمت اٹھائے بغیر جگر بھائی کی منفرد شخصیت کی پہچان کے سامان آپ کے ساتھ کر دیتا ہے اوپر چڑھ کر جب آپ جگر بھائی سے ملتے ہیں تو ننگے کے صاف و شفاف چمکتے ہوئے فرش پر ایک ایسی خاک نشینی سے سامنا ہوتا ہے جو مٹی سے اپنی تجسیم کر کے شاہی کرنے میں مگن ہے۔ نہ کپڑوں کی سد بدھ نہ اپنی اہمیت و فضیلت کا احساس۔ یہ ہیں میرے جگر بھائی۔ ہائے ہائے۔ ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے۔ یہ خاک نشینی نہ بھائی مصطفےٰ کے مقدر میں ہے نہ انھیں کے چھوٹے بھائی مجتبےٰ حسین میں کیوں کہ جگر بھائی اس کو جن بلندیوں پر لے گئے ہیں وہ اب انھیں کے ساتھ جائے گی۔ مجھ جیسا گناہ گار، عصیاں آشنا، مبتلائے فسق و فجور شخص کو بھی میرے سرکار صلعم نے اتنی اجازت تو اپنے کرم بے حساب سے دے دی ہوگی کہ میں یہ لکھتے ہوئے کوئی عار نہ کروں کہ جگر بھائی سرکار صلعم کے قدموں کی خاک بن کر رہنے کو اوجِ ثریا سے بلند تر سمجھتے ہیں۔

اپنا پسندیدہ نیا ڈبل کیسٹ ٹیپ ریکارڈر جس کی اقساط بھی ابھی ادا نہیں ہوئی تھیں لے کر میں حیدرآباد پہنچا کہ جگر صاحب سے پہلے ہی وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ ایک ڈیڑھ گھنٹہ اپنی معروف زندگی سے نکال کر میرے حوالے کر دیں۔ وہ راضی ہو گئے تھے اور کہا تھا کہ تم آنے سے پہلے فون کر لینا ہفتے کے دن کو چھوڑ کر۔

حیدرآباد چھوڑ کر میں نے سیاست کے دفتر کو فون کیا۔ خاطر خواہ جواب نہیں ملا۔

"جگر صاحب دفتر نہیں آئے۔"

"جگر صاحب آج نہیں ہیں۔"

"ہاں ہاں صحت اچھی ہے شاید دیر سے آئیں گے"

"سیاست" کے جتنے نمبر تھے گھما لیے۔ وہی آموختہ۔

کچھ عجیب وسوسوں سے دل گزرنے لگا۔ کہیں بیمار تو نہیں ہیں اور یہ بات پردۂ اخفا میں رکھی جارہی ہے۔

میں سیدھے مصطفےٰ علی بیگ کے پاس پہنچا کہ صحیح بات معلوم کروں کہ من در پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ام۔ اور مصطفےٰ علی بیگ کا پیالہ شیشے کا نہیں کوری مٹی سے محبت، رفاقت و احترام سے، خمیر اٹھا کر خود اپنے ہاتھوں مصطفےٰ نے جگر بھائی کے لیے بنا رکھا ہے۔

مصطفےٰ نے کہا وہ حج کی سعادت حاصل کرنے گئے ہیں۔

میرا ماتھا ٹھنکا۔ یقین نہیں آتا۔ یقیناً کوئی بات ہم دور کے لوگوں سے چھپائی جارہی ہے۔

میں نے کہا۔ مصطفےٰ میرے ان کا پیچھا کر کے اور زحمت دینے کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔ اس لیے مجھے تو صاف صاف بتلا دو۔ وہ صحت مند تو ہیں نا؟ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے اور میں کس طرح مان لوں کہ وہ حج کے لیے گئے ہیں اور "سیاست" میں دو سطر کی خبر تک نہیں۔"

مصطفےٰ حسبِ دستور مسکرائے اور سانس برابر کر کے مسکرائے کہ اس شخص کے تحمل کو میں اس سے مل کر اکثر متاثر ہوا ہوں۔ بیساکھو کے سہارے روزانہ وقت پر دفتر آنا، وقت پورا ہونے تک اپنی سیٹ سے نہ ہلنا، سانس اس طرح کسی کی آمد پر درست کرنا جیسے سینے کے بخیے ادھڑ گئے ہوں۔ نہ پیشانی پر بل نہ پوشاک میں شکن بس جگر صاحب کی بات چھیڑیے اور پھر اس کی گل افشانیِ گفتار دیکھیے۔

کہا، سختی سے منع کیا تھا کہ ان کے تعلق سے کوئی خبر نہ چھپے۔ اللہ رسول کی بارگاہ کی غلامی کو تشہیر سے کیا نسبت۔ اس سعادت کا نصیب ہو جانا ہی میرے لیے اس سر کی فرازی بھی ہے، میری سرافرازی بھی۔

مصطفےٰ بتاتے ہیں کہ ۱۹۴۴ء میں جب انھیں دق ہو گئی تھی تو عابد علی خاں، مخدوم اور راج بہادر گوڑ کی کاوشوں اور اثر و رسوخ سے سینی ٹوریم میں انھیں بروقت بستر مل سکا تھا ورنہ مریض کے نام کا اندراج رجسٹر میں ہونے کے بعد بستر ملنے ملنے تک مریض کا نام رجسٹر سے کاٹ دیا جانا ضروری ہو جاتا کہ ان دنوں دق زندگی کو اتنی مہلت نہیں دیتی تھی اور زندگی میں بھی اپنے پرائے مدقوق سے دور دور رہتے تھے کیوں کہ طب نے اس کی غارت گری پر فتح نہیں پائی تھی۔ اختر اورینوی نے سینی ٹوریم پر جو کہانی لکھی تھی وہ اس خون تھوکتے ماحول میں بھی اتنی بے پناہ تھی کہ موت کو گلے میں باندھے ہوئے بھی زندگی اپنی راہیں نکال لیتی تھی اور محبت تھی کہ یہاں بھی ہر ویرانی میں گل کھلاتی۔

میں کبھی کبھی اریب کی بہن اور اکثر سردار سلیم کی بیٹی کی عیادت کے لیے سینی ٹوریم جایا کرتا تھا تو اختر اورینوی کی یہ کہانی بری انگلی پکڑ کر مجھے سینی ٹوریم سے باہر نکال لاتی۔ نہ اریب کی بہن گھر آئی نہ سردار سلیم کی بیٹی۔ ایسے جان لیوا حالات میں مصطفےٰ نے انھی میں ادھر ادھر خود کو کھوجتے ہوئے کچھ کہنا چاہا پھر اس کی نم آنکھوں کو لبوں کی مسکراہٹ نے چھپا دیا تو وہ کہنے لگا۔

> "میں کیسے بھول جاؤں متین بھائی کہ جگر صاحب ہفتے میں ایک بار میری مزاج پرسی کو سینی ٹوریم آتے رہے۔ میں وہاں دس مہینے فریش رہا۔ جگر صاحب کی اس طرح میری بار بار عیادت کرنے کا ڈاکٹر کنول چندر مہتم سینی ٹوریم پر یہ اثر ہوا کہ وہ میرا زیادہ ہی خیال رکھنے لگے۔ ویسے وہ کایستھ گھرانے کے ہم درد آدمی تھے لیکن میں نے تو جگر صاحب کے وسیلے سے ان کی ہمدردی کو شفقت میں تبدیل کر لیا تھا۔"

مجھے تو جگر بھائی نے اپنے تعلق سے کچھ دیا ہی نہیں۔ گھنٹے بھر کے انٹرویو میں وہ صرف عابد علی خاں کی باتیں کرتے رہے۔ ان کی اصول پسندی اور وضع داری کے گن گاتے رہے۔

کہیں کبھی سیاست کے نظم و نسق کے اختلاف کے بارے میں میرے راست سوال پر بس اتنا بتایا کہ ہاں اختلاف ہو جاتا تھا تو عابد اپنی اصول پسندی پر قائم رہتے تھے۔ مخالف کی بات میں وزن ہوتا تو وہ مان بھی جاتے چناں چہ انھوں نے ایک دن مجھ سے کہا کہ "سیاست" میں فلمی اشتہاروں کو بند کر دینا چاہیے میں نے بزنس کے پیشِ نظر مخالفت کی اور وہ فوری مان گئے۔ بہ ہر حال وہ سوجھن سے عابد علی خاں کے پیچھے خود کو چھپائے چھپائے رکھتے۔ میں بے نیل و مرام واپس ہوا۔ اب نہ احسن علی مرزا تھے نہ س الف عشرت۔ منور علی سے وہ پہلی قربتیں نہیں رہی تھیں۔ سارے راستے جگر بھائی تک پہنچنے کے مسدود تھے۔ ہر پھر کر مصطفےٰ پر وار کرتا اور وہ اپنے نیم وحشی سینے پر

لر بھائی کی ڈھال چادر کی طرح تان لیتے۔

مصطفےٰ کہہ رہے تھے کہ ایک بار وہ دفتر میں کام کرتے بیٹھے تھے کہ یکایک انھیں ابکائیاں آئیں اور الٹیاں شروع ہو گئیں۔ ڈھالی نے اوسان خطا کر دیے۔ جگر صاحب کو اطلاع ملی تو شتابی سے آئے موٹر منگوا کر انھیں سہارے سے سوار کروایا۔ بڑا سا اگال دان یادستاوا ساتھ لے کر موٹر میں ان کے برابر بیٹھ جانے کی کسی ملازم کو ہدایت کی اور دوسری موٹر میں خود سوار ہو گئے۔ الگنی پر سے اپنی شیروانی اتار کر جسم پر ڈال لینا بھول گئے۔ ڈاکٹر کے پاس پہنچے تو وہ مجھے بار بار تسلی دے رہے تھے۔ ان کی آواز کہ مصطفےٰ گھبراؤ نہیں.... میں ہوں نا..... میں تمھارے پاس ہوں، کبھی پچھائی جاتی کبھی کہیں ڈوب جاتی ..... ہوش ٹھکانے ہوئے تو جی بھر آیا اور مجھے احساس ہوا کہ کوئی میرا بھی ہے۔

مصیبت میں مصطفےٰ کو یہ احساس ہوا تھا کہ کوئی اس کا بھی ہے یہ اپنی جگہ بڑی بات ہوتے ہوئے بھی سوال یہ نہیں ہے کہ کون کس کا ہے اور کس کا نہیں ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ وہ شخص جو اپنے کسی کے ہونے کا یقین، کسی کو جاں کنی کے عالم میں دلارہا ہے، اس کے پاس یہ اعتماد کہاں سے آگیا کہ ایسے میں بھی اس کا کسی کا ہو جانا اس کو زندگی کا حوصلہ دے سکتا ہے۔ جگر بھائی آپ نے کبھی اپنے بارے میں بھی تو سوچا ہوتا۔

مصطفےٰ، جگر بھائی کی باتیں کرتے کرتے محتاط ہو جاتے ہیں۔ کہتے کہتے رک جاتے ہیں پھر گریز کر جاتے ہیں۔ میں ٹٹولنے کا عادی ہوں۔ افسانے نے یہ عادت ڈال دی ہے۔ لوگ بعض وقت رنگے ہاتھوں مجھے گتھ جاتے ہیں۔ کچھ ہی دن پہلے ایک ناول نگار نے اپنے دوستوں کی یادوں کا سہارا لے کر اپنے ناول کے کرداروں کی باتیں مجھے سنائیں۔ میں ہونق بنا سنتا رہا اور دل چسپی لی۔ بعض وقت دانا بینا معصومیت اللہ کی دین بن جاتی ہے۔

روزنامہ سیاست کے نظم و نسق سے لے کر کئی ادبی اور ثقافتی اسکیموں میں جیسے اردو گھر کا قیام، ادبی ٹرسٹ اور اس کے کل ہند مشاعرے سب میں جگر صاحب بھی عابد صاحب کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں لیکن کسی سے یہ بات سننا انھیں گوارا نہیں ہے۔

میں نے مصطفےٰ کو تقویت دینے کے لیے اس حقیقت کے انکشاف میں پس و پیش کرنا گوارا نہیں کیا کہ ایک زمانہ ایسی باتیں کرتا ہے احسن علی مرزا نہیں رہے جو تم سے زیادہ بولڈ Bold اور صاف گو تھے تو اب تم کن کن کے منہ پر ہاتھ رکھتے پھرو گے تم اکیلے نہیں ہو۔ لیکن مصطفےٰ حد درجہ محتاط تھے بات بدل کر کہا، جگر صاحب کا طفیل ہے کہ میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ان کی خوش نودی مجھے ہر پہلو سے مقدم ہے۔ ایک بار کسی نے انھیں "سیاست" کا اڈیٹر کہہ دیا اور وہ برہم ہو گئے۔ کہنے والے سے کہا کہ آپ کو اتنا شعور بھی نہیں ہے کہ کس سے کیا بات کریں۔ اڈیٹر عابد علی خاں صاحب ہیں آپ کون ہوتے ہیں مجھ پر نوازش کرنے والے۔ وہ اتنے سخت گیر نہ ہوتے تو دفتر سیاست کی مشنری کا پرزہ پرزہ اپنی جگہ فٹ نہ رہتا۔

میں نے محسوس کر لیا اور اپنے اس احساس کو زبان نہ دی کہ عابد علی خاں صاحب کی نرم مزاجی کو جگر صاحب کی گرمی گفتار کی ضرورت تھی۔ یہ دونوں لازم و ملزوم تھے۔

۱۳ ستمبر ۱۹۹۶ء کو میں مصطفےٰ علی بیگ سے مل کر جگر بھائی سے نیاز حاصل کرنے کے لیے اٹھا تو انھوں نے اپنی سانسوں کو سینے

کے بیٹھنے میں درست کرتے ہوئے کہا دیکھیے ناستین، میری نشست کا جگر صاحب نے اپنی نگرانی میں انتظام کروایا ہے۔ آٹو میں یہاں تک پہنچتا ہوں اور اترتے ہی اپنے کمرے میں داخل ہو جاتا ہوں۔ واپسی میں پھر آٹو یہاں تک منگوا لیتا ہوں۔

میں اوپر پہنچا تو جگر بھائی کھلے شیشوں میں سامنے ہی بیٹھے صلاح الدین نیر کو کچھ لکھوا رہے تھے۔ برابر کی کرسی پر میں جا بیٹھا۔ بات کر رہے تھے تو علانیہ سانس پھول رہی تھی۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ مصطفےٰ میرے کانوں میں چلا رہا تھا۔

"یہاں آٹو سے اترتا ہوں اور واپسی میں آٹو یہیں منگوا لیتا ہوں یہ انتظام میرے لیے جگر صاحب نے کیا ہے"۔

میں کچھ دل برداشتہ سا ہو گیا تھا کہ یہ ایذا پسندی اپنے لیے انھیں کیوں گوارا ہے۔ مجھے مٹ مٹ دیکھتا ہوا دیکھا تو کہا، جو کچھ باتیں ہو چکی ہیں ان پر اکتفا کروں۔ میرے بیٹھتے ہی نیر جا چکے تھے۔ میں نے گزارش کی کہ آٹھ دس دن بعد آجاؤں گا جب بھی آپ کی صحت سنبھل جائے۔ کہا کیا ضروری ہے۔ میں نے مزید اصرار مناسب نہ سمجھا۔ یہ سوچ کر چلا آیا کہ جو بات میں جگر بھائی سے پوچھنا چاہتا تھا وہ اتنی آسان بھی تو نہ تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ان کے جذبات کو میرا سوال الفاظ کی ان حسیات سے گزارتا جہاں لفظ اپنا مفہوم چھپا کر ایک جہانِ معانی سے گزر جاتا ہے۔ کتنے ہی مقام آتے ہیں جہاں نطق بے آواز ہو جاتا ہے اور خاموشی چیخ چیخ کر بولنے لگتی ہے۔ زندگی بھر کا تجرد سناٹا بن کر سانسوں کا حساب کتاب چکا رہا ہو تو پھر پوچھنے کے لیے رہ ہی کیا جاتا ہے۔

میں نے لوٹتے وقت مصطفےٰ سے مرزا ظفر الحسن کی کتاب مستعار لی جو دکن کا سفر نامہ ہے۔ "وہ قربتیں سی وہ فاصلے سے" سوچا جگر صاحب کو اس کتاب میں بھی ڈھونڈ لوں۔ مرزا صاحب نے دوستوں کا حق اپنے اخلاص کیش ماضی سے قربتوں کو سمیٹ سمیٹ کر ادا کر دیا ہے لیکن فاصلوں تک ان کی نظر نہیں پہنچ سکی ہے۔ ان کی تحریر کو پڑھ کر یوں لگا کہ ان کے پاس وہ عینک ہی نہیں ہے جو فاصلوں کی دھند کو ہٹا کر چہرے کے صحیح خدوخال دیکھ سکے۔ انھوں نے جگر صاحب کو سرے سے پہچانا ہی نہیں۔ کسی کی توصیف میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ممدوح ہی کے عزیز دوست کی اہانت کے مرتکب ہونا اور سمجھنا کہ کسی کی دوست داری کا حق ادا کر دیا، معیوب بات ہے۔

وہ زاہد علی خاں فرزندِ دل بند عابد صاحب کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں

محبوب حسین جگر کی اخبار میں جو اور جتنی حکمرانی ہے اس میں رمق برابر دخل نہیں دیتا۔ یہ زاہد کی سعادت مندی ہے۔
(وہ قربتیں سی وہ فاصلے سے ص ۵۴)

اس جملۂ معطوفہ کے بعد کہنے کو کیا رہ جاتا ہے۔ یا دفتر کھلتے ہیں یا بوسیدہ پوسٹ کا منھ بند رہ جاتا ہے۔ اس پر مستزاد مرزا صاحب نے آگے چل کر جگر صاحب اور عابد صاحب کے پچھلے دنوں کی محنت و محبت کا ذکر بھی کیا ہے۔

"جس یک دلی نے صعوبتوں کو راحتوں سے بدل کر من و تو کا فرق مٹا دیا اور اخبار سیاست کے روپ میں حیدرآباد کے بے شمار عوام کے دل جیت لیے جس یک دلی نے سایہ بن کر ایک دوسرے کا پیچھا کیا۔ جس یک دلی نے ایک دوسرے کے زخم پر مرہم رکھ کر اپنے اپنے دامن کی ہوا دی۔ جس یک دلی نے زمانے بھر کی ناسازگاری سے پنجہ کشی کی

اور اسے زیر کیا ہے تب کہیں جا کر روزنامہ سیاست ایک ہزار سے پندرہ ہزار تک ۱۹۸۸ء میں پہنچ گیا تھا۔"

مرزا صاحب حیدر آباد کی ایک بارش کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

"سیاست کا دفتر جواہر لال روڈ کی ایک چھوٹی سی گلی کے نشیبی حصے میں واقع تھا۔ پانی نشیب ہی میں مرتا ہے ..... عابد اور جگر بڑے دل والے ہیں دونوں نے ایک ایک بالٹی اور جھاڑو سنبھالی اور بالٹی بھر بھر کر نہرو روڈ کی طغیانی میں اضافہ کرنے لگے۔

پہنچا وہیں پہ آب جہاں کا خمیر تھا۔

ذرا تصور کیجیے دونوں کے پاجامے گھٹنوں تک، آستینیں کہنیوں تک، سر جھاڑ، منہ پہاڑ، ایک ہاتھ میں بالٹی دوسرے میں جھاڑو، کام میں اس طرح جٹے ہوئے جیسے اس کے سوا انھیں کوئی اور کام کرنا ہی نہیں ہے ..... یہ اس وقت کی بات ہے جب سیاست ایک ہزار چھپتا تھا"

(وہ قربتیں سی وہ فاصلے سے۔ ص ۵۴۔ ۵۵)

مرزا ظفر الحسن نے ان سطور کے بعد یک دلی کی اس فقید المثال داستان سے جو "دل و جگر" کے عنوان سے محسوس کی جاسکتی تھی، "جگر" کو الگ کر کے رکھ دیا ہے۔ جگر بھائی کا ظرف یہ ہے کہ وہ ان پر کیا ہوا وار سہہ جاتے ہیں لیکن عابد صاحب تو عابد صاحب تھے۔ اخبار سیاست کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتے تھے جو عابد صاحب کی یادگار ہے اور اس یادگار میں ان کی اپنی یادوں کی ایک دنیا بھی مخفی ہے جس کی طرف نظر اٹھا کر بھی انھوں نے کبھی نہیں دیکھا۔

اس عتاب کا میں بھی شکار ہوا ہوں جس کا ذکر آگے آئے گا۔ اس مرحلے پر تو مجھے زاہد علی خاں کی اس بڑائی کا ذکر کرنا ہے جس کو مرزا صاحب کی کوتاہ بینی نے نہیں پہچانا۔

زاہد علی خاں کے دل میں جگر صاحب کی عزت و محبت کچھ اس طرح پروان چڑھی ہے کہ جس ماحول میں انھوں نے آنکھیں کھولیں وہاں اپنے والد محترم عابد صاحب اور ان کے جانی دوست جگر صاحب کو ایک روح دو قالب کی حیثیت سے دیکھا۔ یہ بھی دیکھا کہ ہر دکھ درد میں دونوں کے چہروں پر زندگی کی متابعت میں تردد کی پرچھائیاں تھیں تو ہر خوشی میں دونوں ہی کے لب تبسم ریز تھے۔ زاہد علی خاں کی بڑائی یہی ہے کہ انھوں نے اس قیمتی اثاثے کو دل میں جگہ دی اور عابد صاحب کے بعد بھی جگر صاحب کے احترام میں کوئی فرق آنے نہیں دیا۔ "ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"۔

اب رہ گیا وہ عتاب جس کی میں بات کرتے کرتے رہ گیا تھا کچھ اس طرح ہے کہ میں نے پروانہ ہال میں شاذ کی یاد میں ایک مضمون عابد علی خاں صاحب کی صدارت میں پڑھا تھا۔ جس فقرے کو سیاست کے حواریوں نے ہوا دی وہ کوئی جملۂ معترضہ تو تھا نہیں ایک حقیقت تھی کہ آج تک نہ سید سجاد حسین کے "اودھ پنچ" نے نہ ابوالکلام آزاد کے "الہلال" نے نہ حسرت موہانی کے "اردوئے معلی" نے

ہ قاضی عبدالغفار کے "پیام" نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ شاعر گر ہیں۔ میں اس قضیے کا اقتباس اس وضاحت کے ساتھ جو "سوندھی مٹی کے بت" میں کی گئی ہے پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

"شاذ کا مرض الموت ٹوکب کا شروع ہو چکا تھا۔ اب جو اضطراب تھا وہ تو بس بھڑک بھڑک کر بجھنے کی پیش بندی تھی۔ اپنے بچے فواد تمکنت سے بیاض منگوائی۔ کسی غزل کے بارے میں کہا۔ پھر مجھ سے کہا متین بھائی فیر کردیجیے سیاست کو بھجوادوں۔ فواد کو غزل نہیں ملی۔ میں نے بھی دیکھا، نہیں ملی۔ اس بیاض میں نا مکمل چیزیں ادھر ادھر تھیں۔ شاذ جس کی نظمیں اور غزلیں ہند و پاک کے موقر و معیاری جریدوں میں نمایاں طور پر آئے دن چھپتی تھیں، روزنامہ سیاست میں چھپنا اس کے لیے باعثِ توقیر نہیں تھا۔ لیکن آج صحت کی اس منزل میں سیاست میں غزل بھجوانے کے لیے وہ مصر تھا۔

درونِ خانہ ہنگامے تھے کیا کیا
چراغِ رہ گزر کو کیا خبر تھی

(اس شعر میں ضرورتاً میں نے ہلکا سا تصرف زباں کی حد تک کیا ہے) بسترِ مرگ پر شاذ کے اس اصرار کے پیچھے خدانہ کرے کہ وہ سب کچھ ہو جو میں سمجھ رہا تھا۔ لیکن اس کی طویل بیماری، سیاست میں اس کے کلام کا مسلسل چھپنا مجھے یہی سمجھا رہا تھا کہ:

وہی سب کچھ ہے جسے میں جھٹلا رہا ہوں

عابد علی خاں مدیر اعلیٰ روزنامہ سیاست کا شاعروں سے تعلقِ خاطر یہاں حیدرآبادیوں کے لیے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ انھوں نے اس قبیلۂ دارو گیر کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد جانا۔ میں ان سے دور دور رہ کر بھی شاہد صدیقی، ابنِ احمد تاب، سلیمان اریب اور شاذ تمکنت کی وساطت سے ان کی دل فگاری سے آگاہ بھی تھا، قدرداں بھی۔

بعض مصلحت پسند اور جی حضوری کرنے والوں نے اس بات کو اور ہی رنگ دیے تھے کہ "سیاست میں چھپنا شاذ کے لیے باعث توقیر نہ تھا"

ان خوشامدیوں نے اس بات کا ایک ایسا مفہوم متعین کیا تھا کہ سیاست میں اشاعت مخدومؔ اور شاذؔ کی شاعرانہ بڑائی کی ان کی دانست میں ضامن تھی اور بہ زعمِ خود یہ بھول گئے تھے کہ ان کے خود ساختہ طریقۂ احتساب سے ان کی اپنی عظمتِ سخن، روزنامہ سیاست سے ان کی وابستگی کی بنیاد پر ہند و پاک میں کس مقام پر رکھی جاسکتی ہے"۔

(سوندھی مٹی کے بت ص ۸۲ - ۸۳)

اس کھلی حقیقت کے انکشاف سے میرا مقصد ہرگز کسی کی دل شکنی نہیں تھا بلکہ عابد صاحب کی اس انسان دوستی کا اعتراف محض تھا جو ادیبوں اور شاعروں کے لیے انھیں بے چین و بے آرام رکھتا تھا۔

ایک بات اور بتاتا ہوں ۱۴ مئی ۱۹۵۹ء کو شہریار نے شاذ کو علی گڑھ سے لکھا تھا۔

"شاذ پچھلے مہینے سے پہلے میرے پاس کافی روپیہ تھا جو میں نے ادھر ادھر اڑادیا۔ خیر قسمت میں یہ دن بھی لکھے تھے کہ تم کچھ مانگو اور ہم لوگ نہ دے سکیں۔ اگلے مہینے کے پہلے ہفتے میں کسی طرح تم کو سو روپے بھجوادیے جائیں گے اس عرصے کو کسی طرح گزاردو۔ شاذ اس مرتبہ تمھارے خط سے مجھے بہت صدمہ پہنچا۔ آخر اس قنوطیت کی وجہ۔ کیا روپیہ پیسہ سب کچھ ہے؟ شاذ تم سے یہ امید نہ تھی۔ پریشانیاں اور ناکامیاں کس نے نہیں اٹھائیں۔ کیا سب اسی طرح زندگی سے بیزار ہوگئے۔ شاذ تم اور خلیل اگر کسی وقت بھی شاعری سے پھرے تو میں تم لوگوں سے پھر جاؤں گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے اس کو مذاق نہ سمجھنا۔ اعظمی اب تک میری باتوں کو ٹالتے رہے۔ لیکن اب وہ ان باتوں کو اسی شدت کے ساتھ محسوس کررہے ہیں جس طرح میں نے ان کو محسوس کیا"۔

(تکمیل سہ ماہی شاذ تمکنت نمبر ص ۳۰)

یہ باتیں اس وقت کی ہیں جب شاذ کی نئی نویلی شادی ہوئی تھی۔ وہ تنگ دستی سے عاجز آکر سر ڈال دیتا تھا۔ لطیف ساجد کی طرح نکبت و افلاس کو شاعری کی قوت بنا لینا اسے نہ آیا۔ دونوں شاعروں کا زندگی کو سمجھنے اور برتنے کا انداز بالکل جدا تھا۔ افسوس ہے کہ لطیف ساجد بھی بھری جوانی میں ہم سے جدا ہوگیا ورنہ اس کی شاعری اس بات کو ثابت کردیتی کہ زندگی خود مجبور ہو کر غم و آلام کے آگے کس طرح سر جھکا لیتی ہے اور شعر کی صلابت کس بلندی سے اس کو دیکھ سکتی ہے اور میں نے جو باتیں اپنے مضمون میں شاذ کے تعلق سے کی ہیں اس وقت کی ہیں جب شاذ اپنی بیوی اور چہیتے بیٹوں سے منھ موڑ کر دنیا نہ چھوڑنے کے لیے موت سے برسرِ پیکار تھا۔ ایسے میں اس نے اگر روزنامہ سیاست کے نام پر عابد صاحب کی محبتوں سے غزل کو درمیان میں رکھ کر کچھ مطالبہ کیا ہے تو اس لیے کہ عابد علی خاں دلوں کی وہ زبان سمجھتے تھے جو ضرورت مندی کا لبادہ اوڑھ کر ان سے بات کرتی تھی۔ جب کہ ان کے "جی حضوریے" اپنے خوشامد اور چاپلوسی کے فن کو صحیح طور پر برتنے کے بھی اہل نہیں تھے کہ شعر و ادب خوشامد کا آج تک بار نہیں پاسکی ہے۔ ہاں ذاتی منفعت کا سامان فراہم کر بھی دیا تو شعر و ادب کا منصب اس سے بلند تر رہا۔

ایک اور بات مرزا ظفر الحسن لکھتے ہیں:

ایک دن عابد کے کمرے میں بیٹھا تھا کہ ایک شاعر صاحب تشریف لائے۔ جیب سے ایک غزل نکالی اور سنانے کے بجائے عابد کے سامنے رکھ دی اور کہا بچی بیمار ہے۔ عابد نے مسودے پر کچھ لکھا اور ایک صاحب کا نام لکھ کر کہا ان سے مل لیجیے۔ ان کے جانے کے بعد کہا یہ سب فراڈ ہے۔ کوئی بیمار نہیں ہے۔ شاعر محترم کو شراب کے لیے پیسے درکار تھے اس لیے دھمک گئے۔ اب انھیں

پسینہ سے پہلے اور ابھی معاوضہ مل جائے اور یہ آج اور ابھی شراب خانے جائیں گے۔ عابد اس طرح کے لوگوں کی بھی مالی امداد کرتا ہے۔
(وہ قربتیں سی وہ فاصلے سے۔ ص ۵۶)

جانے وہ شاعر صاحب کون تھے۔ شاذ نہ ان ضمیر فروش شاعروں میں تھا جو پینے کے لیے اولاد کی بیماری کے نام پر پیسہ حاصل
ں نہ اس گراوٹ تک وہ کبھی پہنچ سکتا تھا۔ عابد صاحب جب ایسے شاعروں کی بھی مدد کرتے تھے تو شاذ نے بھی بستر مرگ پر
دکیا تھا۔ کاش ان کے حواری کچھ تو سمجھ سکتے ہیں۔ پھر ایسے نتھو خیروں کو وہی شعر نذر کرتا ہوں جو شاعر ہو کر بھی شعر فہم نہیں ہیں:

درونِ خانہ ہنگامے تھے کیا کیا
چراغِ رہ گزر کو کیا خبر تھی

روزنامہ سیاست نے سیاست و صحافت میں اپنا شایانِ شان رول ادا کیا ہے۔ فرقہ واریت کو ختم کرنے اور قومی یک جہتی کو فروغ
، اس نے عوام کے ذہنوں کو بلا تخصیصِ مذہب و ملت متاثر کیا ہے۔ چاپلوسی کرنے والوں کو اس سے کیا لینا دینا کہ انھوں نے
تہ ہو کر کتنی دست درازیاں کیں اور اپنا دامن بھر لینا چاہا جب کہ دینے والے ہاتھ اصلیت کو جان گئے تھے۔

دروغ بر گردن راوی۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہ باتیں جگر صاحب کے سامنے بھی بڑھا چڑھا کر پیش کی گئیں اور وہ مجھ سے ناخوش
ہ ان کے ظرف کی بڑائی ہے کہ کبھی مجھے اس بات کا اندازہ بھی نہیں ہونے دیا۔ ہمیشہ شفقت سے ملے۔

مجھے یہ لکھنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ عابد صاحب کی قابلِ فخر امانت بانیِ سیاست کی سرخی کی روشنی کے ساتھ جگر بھائی نے زاہد
کے صحیح اور توانا ہاتھوں میں سونپ دی ہے۔ جب اس سرخی کا سلولائیڈ تیار ہو رہا تھا میں جگر بھائی کے پاس دفترِ سیاست میں
۔ شاید وہ محسوس کر رہے تھے کہ انھوں نے اپنا رول ادا کر دیا ہے۔ ہر بڑے کاز کے پیچھے کاسہ برداروں کا ہجوم سا ہو جاتا ہے۔ یہ
ی صاف گوئی کے خلاف اگر کچھ کر سکتے ہیں تو صرف یہی کہ میں مر جاؤں تو سیاست میں میری موت کی خبر نہ چھپے۔ مجھے اس کی پروا
۔

میں جانتا ہوں ایسی کھری باتیں میرے جگر بھائی سیاست کے بارے میں نہیں سن سکتے۔ ان کی قربانیاں ان کے ہر چہیتے
سب کچھ چاہتی ہیں۔ لیکن اس کو کیا کروں کہ جب نہ وہ رہیں گے نہ میں رہوں گا اس وقت اخبار سیاست کا مستقبل ان کی باتیں
رداستان بیان کرے گا۔ ان کا ماضی مدھم مدھم آئینوں کو صیقل کرے گا جس میں ایک دنیا جگر بھائی کا اصلی روپ دیکھ سکے گی۔

مجھے جگر بھائی کی بڑائی سے نہ انکار ہے نہ کچھ لینا دینا۔ لیکن جادو اگر سر چڑھ کر بولے تو میں مجبور محض ہوں ہی۔ میں نے ان کی
کو جہاں جا کر محسوس کیا ہے شاید اب دوسروں کی نظریں بھی وہاں تک پہنچیں گی۔ میں حقیر فقیر آج بھی ان لوگوں میں ہوں یا شاید
جو سیاست کے ادبی گوشے کے لیے ۱۹۶۴ء سے آج تک اپنا ایک شعر بھی نذر کرنا گوارا نہیں کرتا۔

میں بہت دیر میں کسی سے ٹوٹتا ہوں۔ قدموں میں بچھے راستے کی طرح روندا جانے کے بعد لیکن جب معدوم ہو جاتا ہوں تو محبت
مق بھی ان کو دینے کے لیے میرے پاس نہیں رہتی جنھوں نے کبھی اپنی رعونت سے میرے دل کو چھید کر رکھ دیا تھا۔ ایسی
ود میرے خاندان میں یکے بعد دیگرے سرافراز ہوتی رہیں جنھیں نہ زندگی کی کھائیوں کا پتہ تھا نہ فراز دار کا اور میرے پاس کیا تھا

صرف اپنا "میں "۔ جگر بھائی نے تو کبھی میری دل شکنی نہیں کی صرف ایک بار اپنا حق استعمال کیا تھا اور بس۔

زندگی کی محرومیاں جب اس طرح مقدر بن جاتی ہیں کہ صبر و شکر کے سارے امکانات نہ ہیولے بن کر ساتھ رہتے ہیں نہ پرچھائیاں تو آدمی موت وزیست کے درمیان کوئی خط کھینچے بغیر سانسوں کی آمد وشد پر انحصار کیے جاتا ہے اور اس کو پتہ بھی نہیں ہو تا کہ اس کا مختصر کیا ہے، منحرف کیا اور اسی انحصار و انحراف سے زندگی کا کوئی شائبہ ابھر تا ہے۔ کوئی گمان مسلسل گزر تا ہے۔ بھائی نہیں دیتا کہ اجالا کتنا ہے، اندھیرا کتنا لیکن ایسے میں بھی "میں" اپنا سر اٹھا تا ہے۔ خود کو زندہ رکھنے کے جتن کرتا ہے۔ یہ "میں" ہی شاید کسی ادیب اور شاعر کی زندگی کی ضمانت ہے بہ شرطیکہ وہ اپنا محتسب بھی ہو ورنہ ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گر جانا یقینی ہے۔ ایسے میں بھی کیا وہ آدمی ہم سے بڑا نہیں ہے جس کے پاس اپنا "میں" سرے سے ہے ہی نہیں، سب دوسروں کا ہے، یہ میرے جگر بھائی ہیں لیکن میں تو فرید کو کھو چکا تھا اور اس کے بعد بھی زندہ تھا۔ میری کہانی گریویارڈ، ادب لطیف میں مرزا ادیب کے اداریے کا احاطہ کرتے ہوئے شائع ہو چکی تھی۔ یہ غزل:

رستے سے الگ کوئی کھڑا تھا
مرقد کا دیا بجھا ہوا تھا

ہوا یوں تھا کہ سلیمان اریب اور عزیز قیسی نے اپنی اپنی غزل سیاست میں اشاعت کے لیے بھیج کر ایک ہی ہفتے کی دو راتیں رنگین بنالی تھیں۔ میں بھی ان رنگینیوں میں ان کے ساتھ شامل تھا۔ میں نے روزنامہ سیاست سے ایسے رنگ کبھی نہیں مانگے تھے۔ دونوں نے مل کر مجھے باڑھ پر چڑھایا۔ میں نے کہا بھی کہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ مجھے اپنی جگہ رہنے دو۔ میں ان کی کسوٹی پر کھرا اترنے سے رہا۔ دونوں نے یہ کہتے ہوئے اصرار کیا کہ تیرا اس میں کیا جائے گا۔ شام رنگین ہو جائے گی تو اللہ میاں کا شکر کریں گے۔ مایوسی ہو تو صبر کریں گے۔ جو اس کی رضا سو ہماری رضا۔ میں نے کمرہ نمبر ۱، امجد گاہ سے جہاں صبا کا دفتر تھا سیاست کے لیے غزل بھجوادی۔ جگر بھائی نے یہ کہلاتے ہوئے غزل واپس کردی کہ میں تم کو افسانہ نگار مانتا ہوں شاعر نہیں۔ کچھ ہی دیر میں سردار سلیم آپہنچا۔ روداد سنی تو قہقہے مار کر ہنسا۔ لگتا تھا کہ اپنے والد ماجد حیدر علی خاں کی جیب سے مجتبیٰ اڑالایا ہے۔ اس نے ہماری شام رنگین بنادی۔ بات آئی گئی ہوئی۔ میں نے یہ غزل پاکستان کے سہ ماہی فنون کو بھجوادی۔ احمد ندیم قاسمی جس کے مدیر و مالک تھے فنون کے خاص نمبر ٦-٧، میں میری یہ غزل ۱۹۶۳ء میں چھپ کر آئی اور قاسمی صاحب نے ایسا ضخیم رسالہ اعزازی طور پر بھجوایا تو پھر یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن قیسی اور اریب نے ہمیشہ مجھے یہی کہتے ہوئے سنایا کہ تمھاری تخلیقات ہند و پاک میں کہیں بھی شائع ہو سکتی ہیں لیکن "سیاست" کے معیار پر کب اترو گے۔

اب نہ وہ وقت رہا، نہ وہ احباب رہے۔ نہ وہ چھوٹی چھوٹی ضرورتیں، نہ وہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں، لیکن "وہ وقت" جس کا میں نے شاذ— کے بارے میں ذکر کیا ہے اس وقت تو شاذ— کی مایوسیاں ساری تمکنت کو بھول کر موت وزیست کی سرحد پر کھڑی تھیں۔ ہائے:

آہو تھا دیارِ دل میں مہماں
جنگل آنکھوں میں بس گیا تھا

ہم جگر بھائی کی عیادت کو گئے تھے ۔ جو کچھ ہوا وہ محض اتفاق تھا تو شاید اتفاقات بھی کسی شخصیت سے میل کھا کر سوچ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ گویا یوں بھی ہو جاتا ہے جس کا نہ کوئی جواز نہ تاویل۔

وحید اختر بیمار تھے ۔ ڈیالسس پر تھے ۔ ان کا چھوٹا بیٹا چھوٹم جس نے زندگی بھر ان کی خدمت کی آج بھی ان کی موت اور زندگی کے کھیل میں حائل تھا اور موت مسلسل پسپا ہو رہی تھی۔

چھوٹم اللہ رکھے بہت خوب نوجواں ہے ۔ میں نے علی گڑھ میں بھی وحید اختر کو سنبھال سنبھال کر رکھتے ہوئے اسے دیکھا تھا ۔ ان دنوں وحید اختر کے مرض الموت کی شروعات تھیں۔

کچھ دیر کے بعد وحید اختر نے سر اٹھایا ۔ بہت مضمحل تھے ۔ دیکھا نہ جاتا تھا کہا "ہم سوگئے تھے ۔ آپ کب آئے ۔ جگایا کیوں نہیں"

میں کیا کہتا نہ دل جوئی کرنا آئے نہ خود کو جھٹلانا ۔ وہ بے زباں آواز جو لیسے میں ضرور باتیں کرتا ہے غیر مرئی سا کہیں کھڑا تھا اور کہے جارہا تھا ۔ بس اسی کو آخری ملاقات سمجھو۔

میں اسی بولتی ہوئی خاموشی سے خود کو بچارہا تھا کہ مجتبیٰ حسین اور حمایت اللہ آدھمکے ۔ مجتبیٰ کے آنے کے بعد آدمی ہنسی ضبط کرسکتا ہے ۔ ہنسی سے ہاتھ اٹھا نہیں سکتا ۔ جب وہ جانے لگے تو کمرے سے باہر مجھ سے کہا جگر صاحب سے ضرور مل لیجئے ان کی صحت اچھی نہیں ہے ۔ اور پیروں پر ورم بھی آگیا ہے ۔

اس کی دوسری شام ، میں ، مغنی تبسم اور راشد آزر عیادت کو پہنچے ۔ کیور ول (CURE WELL) ہاسپٹل کے سامنے ایک ہی احاطے میں مرحوم عابد علی خاں کا گھر ہے ۔ جگر بھائی وہیں قیام کرتے ہیں ۔ راشد کے موٹر سے میں نے نیچے قدم رکھا اور اس بلا کا چکر مجھے آیا کہ پیر زمین سے اکھڑ گئے ۔ راشد اور مغنی نے بڑھ کر سنبھال نہ لیا ہوتا تو اچھا خاصا تماشا ہو جاتا ۔ جب دونوں نے گھر کی بلند کرسی کی سیڑھیاں چڑھا دیں اور ڈرائنگ روم میں لے جا کر ابھی بٹھایا بھی نہ تھا کہ جگر بھائی نکل آئے ۔ ہم نے ان کی نہیں انھوں نے ہماری خیر خیریت پوچھی ۔ ماجرا سن کر کسی سے کہا فوری کسی ڈاکٹر کو کیور ویل سے بلا لائے ۔ ایک ہنس مکھ نوجوان اسٹیتھسکوپ گلے میں لٹکائے ہاتھ میں بیگ لیے آیا اور مجھے جگر بھائی کے کمرے میں لٹا کر میرا معائنہ کیا ۔ کوئی تشویش ظاہر نہیں کی ۔ ذرا سا اہمیت ضرور دی ۔ کہا اس وقت لو بلڈ پریشر (LOW BLOOD PRESSURE) زیادہ ہے اور میں فوری خون کا معائنہ کراؤں ۔ خون میں شکر ضرور ہوگی ۔ اور اس وقت جو گولی ATENOVA میں نے نگل لی ہے وہ استعمال نہ کی جائے تو اچھا تھا ۔ لیکن کچھ دیر میں میری طبیعت سنبھل گئی ۔ میں سنبھل گیا تو جگر بھائی بھی ہشاش بشاش لگے ۔ یا شاید میں اپنے اندرونی کرب سے باہر آکر ہر منظر کو سہانا سمجھ رہا تھا ۔ مغنی اور راشد نے بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیے اور اپنا اپنا بلڈ پریشر چیک کروالیا تو سب ٹھیک ٹھاک تھے ۔ اب جگر بھائی کی عیادت کا فرض پورا کرنا تھا ۔ سو ہم نے کیا کیوں کہ ہم اب یہاں اپنے معائینے کے لیے تو نہیں آئے تھے ۔

میں کچھ عجیب احساس سے ۔ رہا تھا کہ یہ شخص یہاں بھی خود کو بچا کر نکلا۔

ہم رخصت ہونے لگے تو جگر بھائی نے ہم کو سیڑھیوں تک چھوڑا۔

میں نے نظام آباد پہنچ کر شکریے کا خط لکھا اور اس نوجوان ڈاکٹر کی تعریف کی جس کی تشخیص میرے تعلق سے بالکل صحیح نکلی تھی۔ بلڈ میں شکر زیادہ تھی۔ جگر بھائی کی خوشی کا عالم دیدنی رہا ہوگا جب انھوں نے میرا خط پڑھا ہوگا۔ عابد علی خاں صاحب کے خاندان کا کوئی فرد ہو اس کی تعریف سن کر جگر صاحب جیسے ہر قسم کی دولت سے مالا مال ہوجاتے تھے۔ مجھے بڑی شفقت سے خط لکھا۔ کاش وہ خط میرے سامنے ہوتا اور میں اس کی نقل کرسکتا۔ میں نے کھودیا کہیں۔ شاید جگر بھائی یہ چاہتے تھے کہ ان کی اس خوشی پر بھی وقت کا پردہ پڑجائے۔ لکھا تھا۔ تمھارا خط شاہد علی خاں کو بلا کر حیدر کے پاس بھجوادیا ہے۔ حیدر، شاہد علی خاں کا بیٹا ہے۔ بہت ہونہار ڈاکٹر ہے کلکتے میں ہاؤز سرجن شپ کر رہا ہے۔ اس کو لکھا ہے کہ یہ خط تمھارے لیے سند ہے۔ تم نے جو توقعات اس سے وابستہ کی ہیں صحیح کی ہیں۔

اس کے بعد میں ایک آدھ بار جگر بھائی سے سیاست کے دفتر پر ان کے نامکمل انٹرویو کے سلسلے میں مل سکا ان کا تنفس بہت تیز تھا اس کی تفصیل میں پہلے کہیں بیان کرچکا ہوں۔ پھر ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ سنا کہ وہ ایک مہینہ میڈی سٹی (MEDI CITY) ہاسپٹل میں فریش رہے۔ کسی کو کانوں کان خبر بھی ہونے نہیں دی۔ روزنامہ سیاست جس کے پرزے پرزے پر جس کا نام لکھا جاسکتا تھا ایک مہینہ وہ موت و زیست کی کش مکش میں رہا تو دو لفظ اخبار میں نہیں چھپے۔ یہ تھے جگر بھائی۔ اس خبر کو راز رکھنے میں انھوں نے زاہد علی خاں کو بے بس کردیا ہوگا اور وہ بے آرام رہے ہوں گے۔ آخرش اس بندۂ خدا نے جس خاموشی سے حج بیت اللہ کے فرائض انجام دیے تھے اسی خاموشی سے اپنے اللہ سے جا ملا۔

اب جب کہ نہ عابد صاحب ہیں نہ جگر صاحب۔ سیاست کی پیشانی پر نظریں اس حقیقت کے اعتراف کو ترس جاتی ہیں کہ

بانیاں:۔

جناب عابد علی خاں مرحوم

جناب محبوب حسین جگر مرحوم

——000——

ڈاکٹر صفی الدین صدیقی

محبوب حسین جگر کی یاد میں

جامعہ عثمانیہ میں جب میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان سے فارغ ہوا تھا تو جگر صاحب گریجویشن کی تکمیل کے بعد جامعہ چھوڑ چکے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کبھی میں نے ان کو طعام خانے (ان دنوں اقامت خانہ ب اور ج کے لیے ایک مشترک طعام خانہ تھا) یا پھر یونیورسٹی کے آرٹس کالج میں دیکھا تھا۔

گلبرگہ سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد جگر صاحب نے بی۔اے میں داخلہ لیا تھا اور C ہوسٹل میں مقیم تھے۔ (انٹرمیڈیٹ کے دوسال میں نے ہوسٹل B میں گزارے اس کے بعد ہوسٹل C میں منتقل ہوگیا تھا) عابد علی خاں صاحب ان کے روم میٹ تھے۔ ہوسٹل کی یہ رفاقت آگے چل کر مثالی دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ مرزا ظفر الحسن نے ایک جگہ لکھا ہے "جب سے عابد کو دیکھا ہے جگر کے ساتھ اور جگر کو دیکھا ہے عابد کے ساتھ جس طرح ریاست حیدرآباد میں فضل الرحمن اور عطاء الرحمن جیسے سگے بھائیوں کی طرح دو دو ستوں کی جوڑی نہیں ملی۔ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس دوست داری میں کس کا کتنا حصہ ہے"۔

جگر صاحب کے والد محترم جناب احمد حسین صاحب کا تعلق عثمان آباد کے ایک معزز گھرانے سے تھا۔ (مہاراشٹرا کی شیوسینا بی جے پی حکومت نے حال ہی میں عثمان آباد کا نام بدل کر دھاراشیور کھا ہے)۔ احمد حسین صاحب اپنی ملازمت کے دوران ریاست حیدرآباد کے کئی مقامات پر کار گزار رہے اور آخری دنوں میں گلبرگہ میں سکونت اختیار کرلی تھی جہاں سے جگر صاحب نے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کیا تھا۔ جگر صاحب کا مقامِ پیدائش ایک مضمون نگار نے رائچور بتلایا ہے۔ جب کہ ماہنامہ سب رس کے ایک تعارفی نوٹ (جنوری ۱۹۹۶ء) کی رو سے جگر صاحب ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو عثمان آباد میں پیدا ہوئے تھے۔

جگر صاحب بی۔اے کے بعد بھی اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھ سکتے تھے لیکن گھریلو ذمہ داریوں کے باعث انھیں ملازمت کرنی پڑی۔ پہلے تو محکمہ کروڑگیری میں سب انسپکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے بعد محکمۂ نشر و اشاعت سے منسلک ہوئے۔ جگر صاحب سے میری باقاعدہ ملاقات ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس (اکتوبر ۱۹۴۵ء) کے دوران ہوئی تھی۔ اس یادگار کانفرنس کو آرگنائز کرنے میں عابد علی خان کے ساتھ جگر صاحب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ مجھے ایک والنٹیر کی حیثیت میں مہمانوں کی دیکھ بھال کے لیے متعین کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں حیدرآباد سے باہر کے جن ادبا نے شرکت کی تھی وہ حیدرآباد کی روایتی مہمان نوازی سے بہت خوش ہوئے تھے۔ کانفرنس

کا اختتام ایک شان دار مشاعرے پر ہوا تھا جو ساگر ٹاکیز میں منعقد ہوا تھا ۔ اور جس کی صدارت استادی ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم نے کی تھی ۔ جناب کرشن چندر نے اس ادبی کانفرنس کی روداد افسانوی انداز میں تحریر کی تھی جو بعد میں "پودے" کے نام سے شائع ہوئی تھی جسے میں ایک اہم ادبی دستاویز سمجھتا ہوں ۔ رپورتاژ میں مصنف نے جگر صاحب کو ایک مرکزی کردار کی حیثیت میں پیش کیا تھا ۔

جب جگر صاحب کے چھوٹے بھائی ابراہیم جلیس علی گڑھ کی تعلیم سے فارغ ہوکر آئے تھے تو ان کی افسانہ نگاری عروج پر تھی ۔ میرے ایک بزرگ دوست مسلم ضیائی نے پہلی بار مجھے ابراہیم جلیس سے ملایا تھا اس وقت وہ غالباً ملک پیٹ اسٹیشن کے قریب واقع ایک مکان زینت فضا میں منتقل ہوئے تھے ۔ ہم ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے تھے ۔ بیچلرز کوارٹر (مسلم ضیائی کے کمرے) میں اور عابد روڈ پر واقع نظامیہ ہوٹل میں روز ہماری ملاقات ہوتی تھی ۔ بعد ازاں ابراہیم جلیس حیدرگوڑہ منتقل ہوگئے تھے ۔ اس زمانے میں جگر صاحب سے "علیک سلیک" ہو جاتی تھی ۔

ریاست حیدرآباد کی سیاست ان دنوں ایک نازک دور سے گزر رہی تھی ۔ ہندوستان کی آزادی کا پس منظر برِ صغیر کی تقسیم کا المیہ ، گاندھی جی کا قتل ، ان تمام حالات کو ضبطِ تحریر میں لانے کی یہاں گنجائش نہیں ہے ۔ جب حیدرآباد پر فوجی کارروائی ہوئی تو اس وقت میں انٹر میڈیٹ کالج اورنگ آباد میں لکچرر کی حیثیت سے کام کررہا تھا ۔ پولیس ایکشن کے نام پر حیدرآباد اور اس کے بعض اضلاع میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا جو بازار گرم ہوا اس کی خونیں روداد بیان کرنے کے لیے کئی صفحات درکار ہوں گے ۔ جگر صاحب کا آبائی وطن عثمان آباد سب سے زیادہ متاثر ہونے والا ضلع تھا ۔ عثمان آباد میں ان کا مکان لوٹ لیا گیا اور ان کے افرادِ خاندان کو کئی ناگفتہ بہہ حالات سے گزرنا پڑا تھا ۔

ریاست حیدرآباد کے سقوط کے تقریباً ایک سال بعد جب کہ اقلیتوں اور اردو زبان کے لیے حالات سازگار نہیں تھے عابد علی خاں صاحب نے جگر صاحب کو ساتھ لے کر اردو روزنامہ سیاست کا اجرا کیا ۔ یقیناً یہ ایک جراءت مندانہ اقدام تھا ۔ ایک محفوظ و مامون سرکاری ملازمت کو تج کر جگر صاحب اس نوزائیدہ اخبار سے منسلک ہوئے ۔ روزنامہ سیاست کا پہلا شمارہ ۱۵ اگست ۱۹۴۹ء کو شائع ہوکر منظر عام پر آیا تھا ۔

سیاست کے اجرا کو آج ۴۸ سال ہوچکے ہیں ۔ میں اس اخبار کو اردو کا ٹائمز آف انڈیا سمجھتا ہوں ۔ سیاست ہندوستان سے باہر خلیجی ملکوں کے علاوہ انگلستان ، امریکہ اور کینیڈا میں بھی پڑھا جاتا ہے ۔ ان ملکوں میں رہنے والے اردوداں تارکانِ وطن اپنی ادبی سرگرمیوں کی روداد باقاعدہ طور پر سیاست میں اشاعت کی غرض سے بھیجتے ہیں ۔ اس کی شہرت اور مقبولیت کی ان بلندیوں تک پہنچانے میں عابد علی خان مرحوم اور جگر صاحب کی مساعی کا دخل ہے ۔ سیاست کے قارئین اچھی طرح جانتے ہیں کہ جگر صاحب کے لکھے ہوئے اداریے کس قدر فکر انگیز ہوا کرتے تھے ۔

میں ۱۹۵۸ ہی سے مختلف موضوعات پر سیاست کے لیے لکھتا آرہا ہوں ۔ اب تک میرے کتنے مضامین اور مراسلے سیاست میں شائع ہوچکے ہیں ان کا شمار مجھے یاد نہیں ہے اور نہ ہی ان کا ریکارڈ میرے پاس محفوظ ہے ۔ بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ اپنی دوسری مصروفیات کے باعث ہفتوں بلکہ مہینوں تک کوئی مضمون نہیں بھیج پاتا تھا تب جگر صاحب اپنے خط میں خیر خیریت دریافت کرنے کے

بعد اس بات کی یاد دہانی کرتے تھے کہ میں نے کافی عرصے سے سیاست کے لیے کوئی مضمون نہیں بھیجا ہے ۔ بہت عرصہ پہلے ، ادارے کی طرف سے انھوں نے سنڈے ایڈیشن میرے نام جاری کروایا تھا جو تاخیر سے سہی مجھے مل جاتا ہے ۔ جب کوئی مضمون پسند آجاتا تو خط لکھ کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے تھے ۔ سویٹ کتابیں ، کے عنوان سے میں نے جو مضمون لکھا تھا اس کی انھوں نے تعریف کی تھی ۔ ان کی خواہش تھی کہ میں قدیم جامعہ عثمانیہ کے ماہ وسال اور اقامت خانے کی زندگی کے بارے میں لکھوں ۔ میرے اپنے شعبہ فلسفہ کے اساتذہ (ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ، ڈاکٹر میرولی الدین ، پروفیسر شیو موہن لال ماتھر ، پروفیسر عبدالہادی ندوی ، پروفیسر صلاح الدین ، ڈاکٹر سید وحید الدین) کے بارے میں خاکے لکھ کر بھیجوں ۔ اب تک صرف وحید الدین صاحب پر سیاست میں میرا مضمون شائع ہوا ہے ۔

جگر صاحب شروع ہی سے ترقی پسند رجحانات کے حامل تھے ۔ اس کے باوجود کہ آزادی سے پہلے اور آزادی کے کچھ عرصہ بعد تک انجمن ترقی پسند مصنفین کے بعض اراکین کا جھکاؤ کمیونزم کی طرف تھا ۔ اور چند اراکین تو پارٹی کے کارڈ ہولڈر بھی تھے ۔ جگر صاحب نے اپنی زندگی میں کمیونسٹ آئیڈیالوجی کو کبھی نہیں اپنایا ۔ انسان کی زندگی میں مذہب کی اہمیت و ضرورت کے وہ قائل تھے ۔ لیکن کٹر پن Fanaticism سے انھیں کد تھی ۔ سبھی مذاہب کا احترام کرتے تھے ۔ اور ہر مذہب کے ماننے والے انھیں اپنا عزیز سمجھتے تھے ۔

انتقال سے ایک سال قبل جب کہ ان کی صحت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی جگر صاحب کو حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی تھی ۔ جب میں نے مبارک باد کا خط لکھا تو انھوں نے جواب میں لکھا کہ اللہ کا شکر ہے کہ ان کی یہ دیرینہ آرزو بھی پوری ہوگئی ۔

آخری خط انھوں نے مجھے Medi City Hospital سے لکھا تھا ۔

" برادرم ۔ اسلام علیکم ۔ جناب محمد بن علی باوہاب میرے کلاس میٹ تھے ۔ پاکستان میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ۔ انھوں نے ول ڈیورنٹ کی کتاب تبصرے کے لیے روانہ کی ہے ۔ یہ کتاب فلسفے سے تعلق رکھتی ہے ۔ جلد سے جلد تبصرہ روانہ کیجیے ۔ میں پندرہ دن سے دل کے عارضے سے ہسپتال میں ہوں ۔ کتاب کی اہمیت اور دوستی کے باعث دواخانہ سے یہ خط لکھ رہا ہوں ۔ (۲۷ فروری ۹۰ء)

ول ڈیورنٹ کی لکھی ہوئی کتاب The Lessons of History دوسری جنگ کے دوران شائع ہوئی تھی ۔ جگر صاحب کے دوست اور کلاس میٹ باوہاب صاحب نے اس کا ترجمہ تاریخ کا سبق ، کے نام سے کیا تھا مجھے اس کتاب کے پڑھنے میں ڈیڑھ دو ہفتے کا عرصہ لگ گیا تھا لیکن میں نے جگر صاحب کو خط لکھ کر ترجمے کی تعریف کی تھی ۔ میرا یہ خط ان کے انتقال کے بعد حیدرآباد پہنچا ۔ زاہد علی خان صاحب نے میرے اس خط کے جواب میں لکھا تھا

" جگر چاچا کے نام آپ کا گرامی نامہ ملا ۔ افسوس کہ آپ کا خط آنے تک وہ ہم میں نہیں رہے ۔ وہ ہمیشہ آپ کا بڑی محبت سے ذکر کرتے تھے ۔ کاش یہ تبصرہ ان کی زندگی میں چھپ جاتا " ۔ (۱۷ مارچ ۹۰ء)

اب جب کہ جگر صاحب ہمارے درمیان نہیں رہے تو ان کی اک اک بات یاد آتی رہتی ہے ۔ وہ میرے مخلص اور غم گسار دوست تھے

تمام رات چلی ہے تمام رات چلے
الٰہی ختم نہ ہو یارِ غم گسار کی بات

——000——

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

جگر صاحب

بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں حیدرآباد، حیدرآباد ہی نہیں، ہندوستان، ہندوستان ہی نہیں برِ صغیر کی اردو صحافت کے افق پر جو دو تین نام جگمگاتے ہیں ان میں ایک نام محبوب حسین جگر کا ہے۔ جگر صاحب کیا تھے اور کیا نہیں تھے میں سمجھتا ہوں وہ لوگ جو جگر صاحب سے بے حد قریب تھے وہ بھی اس کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ کیا عجب، خود جگر صاحب کو بھی اس کا اندازہ نہ ہو۔ اور اس کا اندازہ ہو بھی تو کیسے؟ وہ ان افراد میں تھے جن کی اپنی ذات کے نزدیک اپنی ذات اور شخصیت کا تصور تھا ہی کہاں؟ انہوں نے اپنے لیے زیست ہی کب کی؟ وہ تو جیے بھی "سیاست" کی خاطر اور مرے بھی "سیاست" کی خاطر! گرا نجویشن کے بعد انہوں نے ایک مختصر سے عرصے کے لیے غالباً محکمۂ کسٹم میں ملازمت کی لیکن یہ ملازمت ان کے مزاج سے ہم آہنگ کہاں تھی، انہیں راس کیوں آتی؟ اسی زمانے میں انہوں نے ہاسٹل اور کمرے کے رفیق عابد علی خاں صاحب کے ساتھ اخبار کی اجرائی کا پروگرام بنایا۔ ملازمت کو خیرباد کہا اور ۱۵/ اگست ۱۹۴۹ء سے "سیاست" کی اجرائی عمل میں آئی۔ "سیاست" آخری سانس تک ان کی شخصیت اور ان کی ذات رہا۔ "سیاست" کے بغیر جگر صاحب کا اور جگر صاحب کے بغیر "سیاست" کا تصور میں نہیں سمجھتا کوئی کر سکتا ہے۔ میں نے تو انھیں، ز سر تا بہ قدم "سیاست" پایا۔ "سیاست" اور جگر صاحب "من تو شدم تو من شدی" کی تفسیر ہو چکے تھے۔ "سیاست" کا وہ پہلا دفتر ہو یا اب اسی کے مقابلہ تعمیر کردہ پروقار اور پر کشش عمارت، جگر صاحب اپنی ایک مخصوص کرسی پر اور وہ کرسی بھی جو ایک خاص زاویے سے ترچھی رکھی ہوئی ہے بیٹھے ملیں گے۔ سیدھے ہاتھ میں قلم اور بائیں ہاتھ میں ڈوری میں لگے کاغذات پر لکھتے ہوئے یا کبھی کچھ پڑھتے ہوئے، کبھی کتابت شدہ صفحات کی تصحیح کرتے ہوئے یا کبھی ڈاک دیکھتے ہوئے۔ دایاں ہاتھ ایک فاصلہ تک آگے بڑھے گا۔ مصافحہ کر لیجیے۔ آپ سے چند ثانیے گفتگو اور پھر کام میں مصروف۔ یا پھر کام کرتے ہوئے گفتگو۔ بہت کم لوگ ہوں گے جو ان سے پانچ سات منٹ سے زیادہ گفتگو کر سکتے ہوں۔ وہ اتنی گنجائش رکھتے ہی نہیں تھے۔ ہفتے کو تو اور مصروف، اتوار کے ایڈیشن کی تیاری جو ہوتی اور اس وقت وہ ٹوک کہہ دیتے کہ آج ہفتہ ہے مصروف ہوں۔ ہاں اب انتقال سے چند ماہ قبل جب بھی میں جاتا (ہفتے سے قطعِ نظر) پتہ نہیں کیا بات تھی (تعجب مجھے بھی ہوتا) ادھر ادھر کی تھوڑی بہت گفتگو کر لیتے۔ ایسے ہی کسی موقع پر بعض شاعروں کا تذکرہ نکلا میں نے ان شاعروں کے بارے میں کوئی اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا بلکہ الفاظ ذرا سخت استعمال کیے۔ کہنے لگے تم بہت SHARP ہو گئے ہو۔ ویسے انہیں میرے خیالات سے اتفاق تھا۔ وہ بھی اپنی رائے کا اظہار مناسب انداز میں لیکن کسی رو رعایت کے بغیر کیا کرتے تھے جس کا مظاہرہ ان تقریبات سے ہوتا جن کی وہ صدارت کرتے یا کسی کتاب کی رسمِ اجرا کے لیے تشریف لاتے۔ جگر صاحب کا مطالعہ گہرائی اور گیرائی کا حامل تھا اور ان کی فکر نہایت دور رس

تھی۔ وہ نہ جانے کیا کچھ پڑھ لیتے اور اپنی مصروفیات کے باوجود کیسے پڑھ لیتے۔ جب کبھی کسی ادبی موضوع پر گفتگو ہوتی، ان کے خیالات سے روشنی ملتی، ان کی رائے نہایت صائب ہوتی۔ ان کے وسیع اور گہرے مطالعے کا ثبوت یہ بھی تھا کہ کون کیا لکھ پڑھ رہا ہے۔ وہ جانتے تھے چناں چہ وہ "سیاست" کے لیے مضامین وغیرہ کی فرمائش کرتے وقت اس امر کو ضرور ملحوظ رکھتے کہ کس کا موضوع کیا ہے اور کس سے کس موضوع پر لکھنے کے لیے کہا جائے۔ تبصرے کے لیے کتابیں دیتے وقت بھی وہ اس نکتے کو نظر انداز نہیں کرتے۔ میری کتاب "عزیز احمد کے افسانے" شائع ہوئی اور ان کی نظر سے گزری اس کا ذکر نہایت ذوق و شوق سے کیا اور پھر خاص طور پر افسانوں کے مجموعے تبصرے کے لیے دینے لگے۔ آلِ احمد سرور کی مرتبہ "رشید احمد صدیقی کے خطوط" تبصرے کے لیے آئی۔ میں اس دوران چند ایک ہفتے "سیاست" نہیں گیا۔ جگر صاحب چاہتے تو کسی اور کو بھی کتاب تبصرے کے لیے دے سکتے تھے لیکن انھوں نے مجھے دینے کے لیے یہ کتاب صلاح الدین نیر صاحب کے حوالے کی۔ میں ان دنوں نیر صاحب کی رہائش گاہ کے قریب رہتا تھا۔ نیر صاحب سے مجھے یہ کتاب ملی اور میں نے تبصرہ کیا۔ کہنا یہ ہے کہ جگر صاحب کی نظر میں بالخصوص حیدرآباد کا ادبی منظر نامہ تھا۔ ان کے انتقال سے کچھ پہلے کی بات ہے۔ دکھائی کم دے رہا تھا۔ کوئی لڑکا ان کے بازو بیٹھا رہتا۔ وہ کاغذات اس کو دیتے وہ ایک آدھ سطر پڑھتا اور پھر یہ اس کاغذ کی قسمت کا فیصلہ کردیتے یا تو وہ ردی کی ٹوکری کے حوالے ہوجاتا یا نیوز یا مضمون قابلِ اشاعت ہوتے تو دفتر میں متعلقہ اصحاب کو روانہ کردیتے۔ یہ لڑکا کچھ واجبی واجبی سا تھا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "آپ فرمائیں تو میں یہ خدمت انجام دوں" مجھے غور سے دیکھا اور کہنے لگے "تم یہ کام کروگے؟" .... اس روز جگر صاحب کو دیکھ کر دل بیٹھ سا گیا۔ وہ کیا تھے اور آج کیا ہوگئے تاہم ان کے مزاج میں بانک پن اور شخصیت میں خود اعتمادی تھی۔ یہ جگر صاحب سے آخری ملاقات تھی۔ جگر صاحب سے پہلی ملاقات کب ہوئی یہ یاد ہی نہیں آتا۔ غالباً بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا۔ "سیاست" میں آنا جانا بھی ہوا۔ جگر صاحب حوصلہ افزائی کرتے اور فراخ دلی کے ساتھ۔ اسی زمانے میں "سیاست" میں بچوں کا صفحہ ترتیب دینے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی۔ چند ایک ہفتوں تک یہ سلسلہ جاری رہا اور پھر مسدود ہوگیا۔ پھر آج تک "سیاست" میں بچوں کا صفحہ شروع نہیں کیا گیا۔ جگر صاحب کے حافظے میں یہ ساری باتیں تازہ تھیں۔ دو ایک مرتبہ تو ایسا ہوا زاہد علی خاں صاحب کے لڑکے عامر سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ تمھاری (عامر کی) عمر کے تھے جب سے "سیاست" میں لکھتے رہے ہیں اور ہمارے ہاں "بچوں کا صفحہ" ترتیب دیتے تھے۔

جگر صاحب حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین سے ابتدا سے وابستہ تھے۔ انجمن کے معتمدِ عمومی عابد علی خاں صاحب تھے اور جگر صاحب روحِ رواں۔ ۱۹۴۶ء میں حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی جو یادگار کانفرنس ہوئی جگر صاحب نے اس میں کلیدی حصہ ادا کیا تھا بیش تر انتظامی امور کے وہی ذمہ دار تھے۔ انھوں نے یہ اننگ شان دار طریقے پر کھیلی۔ آگے چل کر انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین سے خود کو ایسا وابستہ نہ رکھا ہو لیکن ترقی پسند احباب سے وہ ہمیشہ قریب رہے۔ مخدوم محی الدین، راج بہادر گوڑ، اختر حسن، سلیمان اریب اور دیگر کئی اصحاب۔ بیرونِ حیدرآباد ترقی پسند فن کاروں سے بھی ان کے گہرے دوستانہ مراسم تھے خواہ سردار جعفری ہوں، کرشن چندر ہوں، کیفی اعظمی یا ساحر لدھیانوی یا کوئی اور۔ یہ اصحاب جب بھی حیدرآباد آتے جگر صاحب سے ملاقات کے بغیر اپنے سفرِ حیدرآباد کو نامکمل تصور کرتے۔

جگر صاحب کی ذاتی زندگی سے بہت کم واقف ہوں۔ یہاں وہاں جو سنا بس وہی۔ لیکن اس میں بھی ان کے ایثار و قربانی کی داستان ملی انھوں نے اپنے ذاتی معاملات کو کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا (ویسے ان کی ذاتی زندگی کبھی رہی ہوگی "سیاست" کے اجرا کے بعد تو "سیاست" ہی ان کی ذات و صفات بن چکا تھا) کہا جاتا ہے ۱۹۴۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کے دوران انھیں اپنی بہن کے انتقال کی اطلاع ملی وہ کانفرنس کے انتظامات میں مصروف رہے اور غالباً کسی سے کچھ کہا نہیں۔ کانفرنس کے اختتام پر انھوں نے گلبرگہ شریف کا رخ کیا۔ بہن کے آخری دیدار یا اس کے جنازے میں شرکت کرنے کے لیے نہیں، اس کی قبر پر پھول چڑھانے کے لیے، چند آنسو بہانے کے لیے۔ کرشن چندر نے مذکورہ کانفرنس کے تعلق سے اپنے رپورتاژ "پودے" میں جگر صاحب کو یوں ہی خراجِ تحسین پیش نہیں کیا ہے۔ جگر صاحب یوں ہی "پودے" کے ہیرو نہیں بنے۔ اقبال نے کہا ہے:

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسین، ابتدا ہے اسماعیل

جگر صاحب کی حیات ابتدا سے ایثار و قربانی سے عبارت رہی۔ و نیز انھوں نے اپنے طور پر جس قدر سادہ زندگی گزاری اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ انھیں جب بھی دیکھا، کسی جلسے یا تقریب میں ہو تو شیروانی ورنہ انتہائی صاف ستھرا لیکن سادہ کرتا پائجامہ، غذا بھی ہلکی، سادہ اور نہایت کم بلکہ بقول ان کے ایک چاہنے والے کے جگر صاحب کھاتے ہی کیا تھے بس غذا سونگھتے تھے۔ اور ان کا کمرہ بھی سیدھا سادہ .... جی ہاں! عابد منزل میں ایک بار ان کا کمرہ بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جگر صاحب علیل تھے۔ غالباً پروفیسر مغنی تبسم صاحب کے ہم راہ ان کی عیادت کو پہنچا۔ صاف ستھرا اور کشادہ کمرہ، عام سا پلنگ اور کمرے میں ضرورت کی مناسب اشیا۔ جگر صاحب نے ایک بے نیازانہ اور قناعت پسند زندگی گزاری۔ وہ ایک درویش کی طرح اپنے حال میں مست رہے لیکن "سیاست" کی ترقی اور اس کو بہتر سے بہتر بنانے کے سلسلے میں کسی سے سمجھوتہ نہیں کیا، کسی کی پروا نہیں کی، کسی سے سودے بازی نہیں کی۔ "سیاست" کے موقف کو بنانے اور اس کی اشاعت کی توسیع میں ان کا کردار ایک زمانے میں یادگار رہے گا۔

اور اصحاب کے "سیاست" میں جو بھی اوقات کار ہوں، جگر صاحب "سیاست" کے ہمہ وقتی کارکن تھے۔ صبح ۹ بجے کے لگ بھگ جائیے وہ دفتر میں موجود اور شام میں کسی وقت جائیے وہ ملیں گے۔ کسی نے بتایا "سیاست" کے اجرا کے ابتدائی برسوں میں وہ صبح ساتھ بجے سے رات گیارہ بارہ بجے تک دفتر میں ہوتے۔ کبھی کبھی رات یہیں گزار لیتے۔ پھر وہ صبح آٹھ بجے سے رات دس گیارہ بجے تک دفتر میں رہنے لگے۔ بعد میں صبح سات بجے تا شام سات بجے ان کا معمول تھا۔ ممکن ہے اس سے زیادہ بھی رہتے ہوں ہاں دوپہر میں دفتر ہی میں گھنٹہ، آدھ گھنٹہ آرام ضرور کر لیتے۔ شام میں گھر جانے کے بعد کئی مرتبہ فون کرتے۔ کبھی کبھار وقت بے وقت دفتر بھی آجاتے عابد علی خاں صاحب کے انتقال کے دوسرے روز تو وہ اپنے معمول سے اور پہلے دفتر آچکے تھے۔ "سیاست" جگر صاحب کا اوڑھنا بچھونا ہی نہیں تھا ان کی فکر، ان کی سوچ، ان کا خیال، ان کے حوصلہ و ہوس کی دنیا، ان کے خوابوں کی تعبیر، ان کے ارمانوں اور آرزوؤں کی منزل، ان کے جہدِ مسلسل کا حاصل، ان کی کوششوں اور کاوشوں کا ثمر، ان کے تگ و دو کا نتیجہ، ان کی محبت، ان کا عشق، غرض سب کچھ۔ "سیاست" سے ان کو جو عشق تھا اس کی روشنی میں کوئی عجب نہیں آج بھی ان کی روح دفتر کے کسی گوشے میں محو نظارہ ہو۔

موودعا کہ "سیاست" کچھ اور نکھرے، کچھ اور بامِ مروج پر پہنچے۔ وہ آج ہم کو دکھائی نہ دیتے ہوں یہ اور بات ہے!

"سیاست" کے رگ و پے میں ہر چند کہ وہ خون بن کر سمائے ہوئے تھے لیکن انہوں نے اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ دفتر میں انہوں نے اپنی نشست بھی ایسی جگہ بنا رکھی تھی کہ کوئی شخص جو ان کو نہیں جانتا ہو اور پہلی بار دفتر میں آئے تو ان کی طرف توجہ بھی نہ دے لیکن وہ ان ساری باتوں سے بے نیاز تھے۔ انہوں نے پایا بھی تھا کچھ ایسا صوفیانہ مزاج۔ جلسوں اور دیگر تقریبات میں خیالِ خاطرِ احباب کے لیے کبھی کبھار شرکت کرلیتے کہ آبگینوں کو ٹھیس نہ لگ جائے ورنہ وہ تو گوشہ نشین آدمی تھے۔ "سیاست" نشین! یوں کہیے "سیاست" کے عشق (بلکہ جنون) میں وہ دنیا گریز ہو چکے تھے۔ انہوں نے کبھی شہرت یا اعزاز و ایوارڈ کی کوئی پروا نہیں کی (تمنا تو دور کی بات ہے) آج جب کہ لوگ اعزاز و ایوارڈ کے لیے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلتے کیا کچھ جوڑ توڑ نہیں کرتے۔ دنیا داری کی نیچی نیچی سطحوں پر اتر آتے ہیں ان لوگوں کو جگر صاحب کی حیات سے سبق لینا چاہیے۔ اس کے باوجود جگر صاحب کو اعزاز و ایوارڈ ملے اور شاید انھوں نے اس لیے قبول کیا کہ چاہنے والے دل شکستہ نہ ہوں۔ تاہم ان اعزازات وغیرہ سے جگر صاحب کی مرتبت میں کیا اضافہ ہوا کیا اضافہ ہوتا، یہ اعزازات کچھ اور معتبر، معزز اور موقر ہوگئے۔

گلے برگوشۂ دستار داری
خوشا بختِ بلندِ باغباناں

۱۹۹۳ء میں بار منی ایوارڈ اور ۱۹۹۴ء میں آل انڈیا اردو ایڈیٹرس ایوارڈ کو قبول کرتے ہوئے جگر صاحب نے ان کی منزلت کو کچھ اور فزوں کردیا۔

جگر صاحب نے کبھی شاعری بھی کی اور افسانے بھی لکھے۔ ان کے افسانوں کا کوئی مجموعہ غالباً کبھی شائع ہوا بھی لیکن سیاست سے وابستگی کے بعد بقول کسے، انہوں نے صرف ایک افسانہ لکھا۔ ممکن ہے وہ شاعری کرتے رہتے یا افسانہ نگاری جاری رہتی تو دنیائے ادب میں اپنا کوئی مقام بنالیتے لیکن ان میں ایک صحافی بننے کی صلاحیتیں زیادہ تھیں اور وقت اور حالات نے ثابت کردیا کہ ایک صحافی کی حیثیت سے انہوں نے بلند ترین مقام تک رسائی حاصل کی اور خود اردو صحافت کو بھی ایک بلند ترین مقام تک پہنچادیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اردو صحافت کا گوہرِ تابدار تھے۔ انہیں عہد جدید میں اردو صحافت کی رجحان ساز شخصیت کہنا چاہیے۔

عابد علی خاں صاحب کے انتقال کے بعد جگر صاحب بجھ سے گئے تھے۔ یوں بھی وہ خاصے لیے دیے اور رکھ رکھاؤ سے رہتے لیکن اب لگتا تھا کہ ان کے سراپا میں، ان کی گفتگو میں ان کے رویے میں کسی چیز کی کمی سی ہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہے، کچھ کم ہے۔ دراصل وہ اور عابد علی خاں صاحب ایک ہی تصویر کے دو رخ تھے بلکہ ایک ہی تصویر کے دو حصے جن سے "سیاست" کی تصویر مکمل بھرپور اور رنگین ہوئی۔ دراصل عابد علی خاں کے انتقال کے بعد ہی وہ جذباتی طور پر اس دنیا میں نہیں رہے، وہ اس دنیا کے نہیں تھے۔ انہوں نے اسی وقت اپنا رختِ سفر باندھ لیا تھا اور بس طبعی موت کا انتظار تھا۔ ۱۱ مارچ کو یہ وقت بھی آپہنچا وہ اپنے مالکِ حقیقی سے جاملے اور اپنے محبِ حقیقی عابد علی خاں صاحب سے بھی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ہم الفاظ کے اسراف اور ان کے بے جا استعمال کے کچھ اس حد تک عادی ہوچکے ہیں کہ ہر کہ و مہ کی وفات پر سوچے سمجھے بغیر

کہہ دیتے ہیں کہ فلاں کے انتقال سے ناقابلِ تلافی نقصان ہوگیا، فلاں کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی پر نہیں ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ ایسے بہتوں سے جگر صاحب کا کیا مقابلہ، کیا موازنہ ..... ان کا قد تو ان کئی ایک سے بہت بڑا تھا۔ بے حد بڑا۔ لیکن پھر بھی جگر صاحب کے بارے میں میں یہ عرض نہیں کروں گا کہ ان کی وفات سے پیدا شدہ خلا پُر نہیں ہوگا۔ جگر صاحب رجحان ساز ہی نہیں شخصیت ساز بھی تھے۔ انھوں نے "سیاست" کے دفتر میں کام کرنے والوں ہی کی تربیت نہیں کی، شہر حیدرآباد بلکہ اس کے باہر کی نئی نسل نے بھی ان سے اکتساب کیا، فیض اٹھایا، جگر صاحب نے کسی سے لیا نہیں، اپنا سب کچھ صحافت کو دے دیا۔ وہ اپنے ساتھ کچھ لے کر نہیں گئے، جسد خاکی کے سوا۔ جگر صاحب صرف ایک فرد نہیں، ایک شخصیت نہیں، ایک مشن کا نام ہے، ایک تحریک کا نام ہے ایک جذبہ، ایک کیفیت کا نام ہے۔ انھوں نے جو اقدار چھوڑی ہیں وہ ضائع نہیں ہوں گی۔ آئندہ نسلوں کو منتقل ہوتی رہیں گی۔ نئے لکھنے والے، نئے صحافی اس مشن، اس تحریک، اس جذبے، اس کیفیت اور ان اقدار کو مشعلِ راہ بنائیں گے۔ یہ سفر جاری رہے گا، یہ سفر زندہ رہے گا۔ جگر صاحب بھی زندہ رہیں گے۔

—— 000 ——

رفعت سروش

محبوب حسین جگر کی یاد میں

اپنے خونِ جگر سے سیاست (حیدرآباد) کے لفظ لفظ کو روشن کرنے والے اور اردو صحافت کا معیار بلند سے بلند کرنے والے محبوب حسین جگر کا دل آخر کار ان سے بے وفائی کر گیا اور وہ ۱۱/ مارچ کو راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

اپنے عزم واستقلال کے اعتبار سے وہ شخص آج بھی جوان تھا۔ شاید ۹، برس کا ایک لمحہ بھی جگر صاحب نے دانستہ طور پر ضائع نہیں کیا۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ ایک پر وقار فعال صحافی کی حیثیت سے گزارا اور نہ جانے کتنے نوجوانوں کی بہ شمول مجتبیٰ حسین، تربیت کی۔ تین پسلی کے آدمی مگر علم و فضل و دانش کے پیکر۔

آج سے تقریباً ۵۲ سال پہلے ۱۹۴۵ء میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ انھوں نے مخدوم محی الدین اور راج بہادر گوڑ کے ساتھ جس طرح انجمنِ ترقی پسند مصنفین کی ہفت روز کانفرنس کا بار اپنے نوجوان کاندھوں پر اٹھایا تھا اس کی یاد آتے ہی عقیدت کے جذبات ابل پڑتے ہیں۔ ہائے ان کا وہ انہماک اور کانفرنس کو کامیاب کرنے کی اتنی لگن کہ ان کی بہن کا انتقال ٹھیک انھیں دنوں ہوا مگر انھوں نے اپنے فرائض منصبی سے ذرا سی بے پرواہی نہ کی۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے پچاس سے زیادہ دانش ور، ادیب، شاعر، افسانہ نگار اس کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے حیدرآباد پہنچے تھے۔ فراق گورکھپوری، ڈاکٹر ملک راج آنند، سجاد ظہیر اور حسرت موہانی سے لے کر ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی اور رفعت سروش جیسے نوجوان ادیب تک اس کانفرنس میں شامل تھے۔ جگر صاحب کی مصروفیت، انہماک اور جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ وہ ہمہ وقت موجود رہتے تھے اور ان کی کارکردگی کے باعث حسنِ انتظام کے اعتبار سے بھی یہ کانفرنس بے مثال تھی اور لطف کی بات یہ تھی کہ اس وقت کی نظام سرکار کو اس کانفرنس سے کوئی ہمدردی نہ تھا۔ بس ایک والہانہ پن تھا جس نے اردو کے تمام ادیبوں اور شاعروں کو گویا کانفرنس کا رکن بنا دیا تھا۔ انتظام کرنے والوں کا ایک اچھا خاصا قافلہ تھا جو جگر صاحب کے اشاروں پر کام کر رہا تھا۔ جگر صاحب بلاشبہ اس کانفرنس کے ہیرو تھے۔ کرشن چندر نے کانفرنس کا رپورتاژ "پودے" کے نام سے لکھا تھا اس میں انھوں نے جگر صاحب کے خلوص کے اعتراف میں قلم توڑ دیا تھا۔ اگرچہ محبوب حسین جگر کے بھائی ابراہیم جلیس بھی حیدرآبادی ادیبوں کی بڑی تعداد میں شامل تھے مگر کامیابی کا سہرا تھا محبوب حسین جگر کے سر جن کو مرحوم لکھتے ہوئے قلم رکتا ہے۔

ملک تقسیم ہوا، پھر حیدرآباد مقامی انقلاب سے گزرا، پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد کے زمین و آسمان بدل گئے ۔ ابراہیم جلیس رضا کار تحریک کے سرگرم رکن رہنے کے بعد کراچی چلے گئے ۔ مگر "سیاست" اخبار، عابد علی خاں (مالک و مدیر سیاست) اور محبوب حسین جگر کا اتحاد کسی کے توڑنے سے نہ ٹوٹا ۔ سوائے موت کے بے رحم ہاتھوں کے ۔ پہلے عابد علی خاں گئے ۔ ان کے اٹھ جانے سے جگر صاحب کے شانوں پر اور زیادہ بارِ ادارت پڑا ۔ مگر وہ مردِ میدانِ قلم تھے ۔ صحافت کی دنیا میں جو کامیابی روزنامہ سیاست کو حاصل ہوئی اور ہے ۔ وہ بہت کم اخباروں کو نصیب ہوئی ہے ۔ سیاست اردو کا بین الاقوامی اخبار ہے اور اس کامیابی میں محبوب حسین جگر کی جگر سوزی کو بہت بڑا دخل ہے ۔ جگر صاحب بیرونی سفر سے بہت گھبراتے تھے ۔ بس وہ اور حیدرآباد اور سیاست ۔

تقریباً ۴۸ سال بعد ۱۹۹۳ء میں ان سے ملاقات ہوئی ۔ میں اپنے ضیق النفس کے علاج کے سلسلے میں حیدرآباد گیا تھا ۔ دس بارہ روز قیام رہا ۔ جگر صاحب سے ملنے گیا تو کیا خلوص سے گلے لگایا ہے کہ گویا وقت کے سب فاصلے سمٹ گئے ۔ ان کا وہی جثہ، وہی نرم نرم لہجے میں مختصر مختصر باتیں کرنے کا انداز، وہی سادہ مزاجی، وہی سراپا خلوص بے تکلفی ۔ ان کے اشارے پر دفتر کا ہر آدمی حرکت میں آجاتا تھا ۔ میں نے فون پر پہلے سے بات کرلی تھی اور حیدرآباد سے متعلق اپنے تاثرات قلم بند کر کے لے گیا تھا ۔ مضمون دیکھ کر بہت خوش ہوئے دفتر کے ایک کارکن کو اشارہ کیا اور وہ منٹوں میں ہی چند سو روپے ایک لفافے میں رکھ کر لے آیا ۔ "جگر صاحب! یہ کیا" مسکرا کر بولے "یہ ہمارا اصول ہے کہ قلم کاروں کو پیشگی معاوضہ دے دیتے ہیں" ۔ اول تو اردو اخبار والے معاوضہ دیتے ہی کہاں ہیں ۔ اور دیں گے تو جھنکا کر ۔ مگر سیاست کی روش دیکھ کر میں حیران رہ گیا ۔ اس سفر میں انھوں نے بہت خاموش انداز سے میری ہمت افزائی کی اور نظمیں اور مضامین فرمائش کر کے لکھائے اور مجھے غریب الوطنی کا احساس نہیں ہونے دیا ۔ میرے علاج کا سلسلہ مسلسل تین سال چلا ۔ ۹۳، ۹۴، ۹۵ء جون کے پہلے ہفتہ میں ضیق النفس کے لیے مچھلی کھلائی جاتی ہے ۔ یہی "ذوقِ ماہی" مجھے حیدرآباد لے جاتا رہا اور ہر بار میں جگر صاحب کی صحبتوں سے فیض یاب ہوتا رہا ۔

جگر صاحب قلم کاروں اور صحافیوں کی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جن کے لیے کام "مشن" کی حیثیت رکھتا تھا ۔ ایسے صحافی جن کی عمریں صحافت کی زلفیں سنوارتے گزر گئیں، جنھوں نے اخبار نویسوں کی کئی نسلوں کی تربیت کی مگر خود نام و نمود سے بے پروا رہے ۔ ایسے ایسے اداریے سپردِ قلم کیے جن سے تحریکیں پروان چڑھیں، جن سے ذہنوں کی تربیت ہوئی مگر شاذ ہی ان کے وقیع اداریوں کو کتابی شکل میں شائع کیا گیا ۔ بیش قیمت تحریریں اخبارات کے فائلوں میں گم ہیں ۔ روزنامہ اجمل (بمبئی) کے ایڈیٹر معین الدین حارث جامعی ایک ایسے ہی قلم کار تھے ۔ ان کے اداریے اپنے وقت کی سیاسی اور سماجی زندگی کے عکاس ہوتے تھے ۔ مولانا ظفر علی خاں کے "زمین دار" کے اداریوں کا بھی یہی حال تھا ۔ مدینہ (بجنور) میں علامہ بدر جلالی اور حامد الانصاری ...... کے اداریوں میں ایک دور سانس لیتا تھا ۔ خود حیدرآباد کے اخبار "پیام" کے اداریوں اور ادھر نیا زمانہ (بمبئی) میں سبطِ حسن، ظ ۔ انصاری اور سجاد ظہیر کے اداریے اپنے دور کی منھ بولتی تحریریں تھیں ۔

آج اگر جمع کیا جائے تو معتبر اخبارات کے ذمہ دار ایڈیٹروں کی صحافیانہ تحریروں کا انتخاب جہاں اپنے اپنے دور کی تاریخ بیان کرسکتا ہے وہیں کوچۂ صحافت میں نیا قدم رکھنے والوں کے لیے مشعلِ راہ بھی بن سکتا ہے ۔ محبوب حسین جگر کا شمار بلاشبہ اردو کے ایسے ہی بلند مرتبہ صحافیوں میں ہے جن کی تحریروں میں ایک دور سانس لیتا ہے اور جن کے لفظ لفظ سے شائستگی اور ذہانت ٹپکتی ہے ۔ مجھے علم

ہے کہ ایسے لوگوں کی بہت سی تحریریں بے نام ہی چھپتی ہیں۔ اخبار نویسی کی ضرورت انسان کو اتنا زود نویس بنا دیتی ہے کہ اسے اخبار کا پیٹ بھرنے کی فکر رہتی ہے ۔ میرا تجربہ ہے کہ یہی حال ریڈیو کا ہے ۔میں نے اپنی ریڈیو کی چالیس سالہ ملازمت کے دور میں بیس سال اردو کے ایک روزانہ پروگرام کی پروڈکشن میں گزارے ہیں اور پروگرام کا پیٹ بھرنے کے لیے کیا کیا کچھ کرنا پڑتا ہے اسے وہی سمجھ سکتے ہیں جو اس بھنور میں آ پھنسے ہوں۔

اس وقت یہ محسوس کرکے افسوس ہو رہا ہے ، شدید افسوس کہ اس آپادھاپی کے دور نے محبوب حسین جگر جیسے لائق اور بے لوث صحافی کو وہ مقام نہیں دیا جس کے وہ ایک زمانے سے مستحق تھے ۔ آج کل "کا تا اور لے دوڑے" قسم کے قلم کاروں اور صحافت کے پیشے سے تعلق رکھنے والوں کو "تعلقاتِ عامہ" کی بنا پر طرح طرح کے انعامات و اعزازات سے نوازا جاتا ہے ۔ کئی اردو اکادمیوں نے صحافت کے انعامات ایسے ایسے لوگوں کو عطا کیے ہیں جن پر صحافت کا محض الزام ہے ۔ (نام گنانے سے فسادِ خلق کا اندیشہ ہے) اکادمیوں کی بات تو چھوڑیے کچھ سرمایہ داروں نے شاید اپنی عاقبت درست کرنے کے لیے ادیبوں ، شاعروں اور صحافیوں کو انعامات کے احسانات کے بوجھ میں دبانے کا سلسلہ شروع کیا ہے ۔ ان کے انعامات کی فہرست دیکھ کر محسوس ہوتا ہے ۔

خرد کا نام جنوں پڑگیا ، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

محبوب حسین جگر اس پائے کے صحافی تھے کہ ان کی خدمات پر تحقیقی مقالے سپردِ قلم ہونے چاہئیں ۔ ان کی تحریروں کو یکجا کر کے محفوظ کرنا چاہیے اور اگر کسی اور جگہ نہیں تو کم سے کم حیدرآباد میں ان کے نام منسوب کرکے کوئی صحافت کا تربیتی مرکز قائم ہونا چاہیے ۔

جگر صاحب کا ترقی پسند تحریک سے چولی دامن کا ساتھ تھا ۔ نصف صدی بعد ۱۹۹۵ء میں حیدرآباد میں جب اردو ادیبوں کی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ہوئی تھی تو کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں وہ مسند نشین تھے ۔ وہ تقریر کے نہیں تحریر کے آدمی تھے ۔ ان کی موجودگی سے کانفرنس کے وقار میں اضافہ ہوا ۔ مگر ۴۵ء میں بھی انھوں نے کوئی تقریر نہیں کی ۔ ہاں سیاست کا اداریہ ان کے جذبات کا ترجمان تھا ۔

اس وقت ذہن میں خیالات و تصورات کا ایک طوفان موج زن ہے ۔ ابھی چند ماہ بعد پھر حیدرآباد جانا ہے ۔ سوچتا ہوں جب عابد روڈ سے گزر ہوگا اور ایک گلی میں بہت ہی سادہ اور روایتی اردو اخبارات کا سا روزنامہ "سیاست" کا دفتر نظر آئے گا اور وہ چھوٹی سی کرسی خالی ملے گی جس پر میز سے ذرا الگ ہٹ کر شیروانی میں ملبوس ، محبوب حسین جگر بیٹھتے تھے تو کیسا محسوس ہوگا ۔ ان کا سراپا وہاں نہ ہو مگر ان کی روح تو ضرور وہاں ہوگی ۔

اخبار نکلتے رہیں گے ، ایڈیٹر اور صحافی پیدا ہوتے رہیں گے مگر اردو صحافت شاید محبوب حسین جگر کا جواب نہ پیدا کرسکے ۔ کیوں کہ اب وہ زمین و آسمان ہی بدل گئے جن کی فضا میں ایسے بے ریا ، بے لوث اور مخلص انسان سانس لیتے تھے ۔ آج میر تقی میر کی بات پہلے سے زیادہ سچ محسوس ہوئی ہے ۔

مت سہل ہمیں جانو ، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ممممم

نسیمہ تراب الحسن

انسان دوست محبوب حسین جگر

جگر صاحب کے انتقال سے شاید تین دن پہلے کی بات ہے کہ مجتبیٰ بھائی نے فون کیا اور کہا کہ جگر صاحب نے آپ سے مضمون منگوانے کے لیے کہا ہے ۔ یقین کیجیے کتنی خوشی ہوئی اس خیال سے کہ ایسی بیماری کی حالت میں بھی انھوں نے مجھ جیسی ناچیز ہستی کو یاد رکھا ۔ دراصل ان کا یہی وہ خلوص تھا جس نے اتنے لوگوں کو اپنا گرویدہ کرلیا تھا ۔ جگر صاحب اردو صحافت کے لیے کیا تھے ، انھوں نے اپنی زندگی اس کے لیے وقف کردی تھی ۔ اردو صحافت میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں وغیرہ وغیرہ ایسی باتیں ہیں جو سچائی پر مبنی اور روزِ روشن کی طرح تابناک ہیں لیکن جگر صاحب سے ملنے والوں سے ان کی ذاتی صفات کے بارے میں پوچھا جائے تو ہم کو پتہ چلتا ہے کہ وہ انتہائی سادگی پسند ، اصولوں کے پابند اور کام کے دھنی تھے ۔ خندہ پیشانی سے ملنا اور رواداری کا برتاؤ ہی ان کا مسلک زندگی تھا ۔ انھیں دیکھ کر حیرت ہوتی کہ اتنے دبلے پتلے جسم میں اتنی طاقت کہاں سے آتی ہے جو صبح سے لے کر رات تک اتنی مستعدی سے کام میں جٹے رہتے ہیں ۔ ان کی نظر اپنے سامنے پھیلے کاغذوں پر ہی نہیں پورے دفتر میں مصروف لوگوں کے کام پر رہتی ۔ غالباً انھیں ہردم یہ احساس رہتا کہ غلطی کسی کی بھی ہو اس کو درست نہ کرنا میری بھول ہے اور یہ سب وہ اتنی خاموشی سے کرتے رہتے کہ ان کے ساتھیوں پر ذرا بھی بار نہ گزرتا ۔

جیسا کہ بہت لوگ جانتے ہیں وہ طالب علمی کے دور سے افسانہ نویس تھے لیکن عابد علی خاں صاحب کے ساتھ سیاست اخبار نکالنے کے فیصلے کے بعد وہ صرف صحافت سے جڑکر رہ گئے ۔ ان کی مجرد زندگی کا محور روزنامہ سیاست ہی بن گیا اور جو راستہ اپنی خوشی سے چنا آخری دم تک اس پر گام زن رہے ۔ یہی مشورہ وہ دوسروں کو بھی دیتے رہے کہ انسان کو مستقل مزاجی سے اپنے مقصد زندگی کے لیے کام کرنا چاہیے ۔ مجھے ان سے بہت مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا مگر کبھی انھوں نے اپنے کام کی تشہیر نہیں کی ۔ یہ بھی انسانی خودداری کا ایک فن ہے جو بڑا دشوار ہوتا ہے ۔ ان کی باتیں سن کر ان کی سنجیدگی ، متانت ، وسعتِ نظر اور ان کے وقار کا پتہ چلتا تھا ۔ ساتھ ہی ان کے متوازن احساسات ذمہ داری کے جذبے اور انصاف پسندی کی گہرائی کا اندازہ ہو جاتا ۔ ان کی باتوں میں تصنع اور بناوٹ نام کو نہ تھی ۔ اخلاق و خلوص کا مجسمہ ۔ بھلا سوچیے میری ان کے سامنے کیا ہستی تھی لیکن میں جب بھی ان کے پاس گئی اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ، محبت سے بٹھاتے اور پھر کہتے بہت دن سے آپ نے کچھ لکھ کر بھیجا نہیں ۔ ان کے ایسا کہنے سے خود کتنا اعتماد آجاتا تھا بیان سے باہر ہے ۔ کہاں ملیں گے ایسے باوقار لوگ جو تہذیب و اخلاق کا ورثہ سنبھالے ہوئے تھے ۔ ہماری نظریں متلاشی رہیں گی دل ڈھونڈے گا مگر بس ان کی باتیں یاد آتی رہیں گی ۔ اگر واقعی ہم ان کے قدردان ہیں ، مداح ہیں تو تادمِ زیست

ان کے اصولوں، ان کی نصیحتوں اور ان کی قدروں کا صرف ذکر ہی نہیں کریں گے بلکہ حتی الامکان اس پر عمل پیرا رہیں گے ۔ ویسے انسانی فطرت بھی ہے اور دنیا کا طریقہ بھی کہ مرنے کے بعد خوبیوں کا ذکر کرتے رہتے ہیں، پھر وقت کا غبار ان پر دبیز چادر ڈال دیتا ہے اور سب اپنی مصروفیات میں کھوجاتے ہیں پھر ہمیں خیال آتا ہے تو سالانہ جلسوں میں، جب ہم ان ہستیوں پر عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں چاہے وہ مذہبی پیشوا ہوں، قومی رہنما ہوں یا انسانیت کے پیکر ۔ ان بے غرض محسنوں کے علمی اور عملی کردار کو سرے سے فراموش کردیتے ہیں ۔ جگر صاحب کی علم دوستی، خلوص، رواداری، وضع داری، اردو ادب سے سچی لگن، ان کی نرم گفتاری، ان کے عزم کی پختگی، عابد علی خاں صاحب کی رفاقت میں اپنی زندگی کا رخ صحافت کی طرف ایسا موڑا کہ اس کے سوا سب کچھ تج دیا ۔ اپنی ہمت و استقلال سے روزنامہ سیاست کے لیے خونِ جگر دے کر اس کو شہرت کی بلندی پر پہنچانے کے قصے ہر اہلِ ادب کی زبان اور قلم سے مختلف جلسوں اخباروں میں آشکار ہوچکے ہیں ۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو انھیں طالب علمی کے زمانے سے جانتے ہیں ۔ وہ بھی ہیں جنھیں ۱۹۴۸ء کے حیدرآباد کے سیاسی حالات میں بدحواس عوام کو ڈھارس بندھانے اور ہمت دلانے کے لیے عابد علی خاں اور جگر صاحب کے اخبار نکالنے اور اس کے لیے انھوں نے کیا کیا جتن کیے اور اس کا علم بھی ہے ۔ وہ لوگ بھی ہیں جو ان کے قریب رہے ۔ وہ بھی ہیں جو سرسری ملاقات میں عقیدت مند بن گئے اور وہ بھی ہیں جن سے ان کا خون کا رشتہ تھا ۔ ہم ان سب کی باتیں سن کر اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جگر صاحب کے لیے اپنے پرائے یکساں تھے ۔ میں نہ تو جگر صاحب کے قریب رہی نہ ہی ادیب ہوں کہ ان کی شخصیت کی عکاسی کر سکوں لیکن خوش قسمت ضرور ہوں کہ ان کی شفقت سے فیض یاب ہوسکی ۔ یہ انھی کی ہمت افزائی ہے جو اپنے الٹے سیدھے خیالات قلم بند کرنے کے قابل بنی ۔ میں کئی ایسے اشخاص سے واقف ہوں جنھیں جگر صاحب کی سرپرستی میں اردو لکھنے کا سلیقہ آگیا اور اس طرح اردو کی خدمت کا جذبہ پیدا ہوا ۔ ان میں مختلف طبقے اور مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں جیسے پروفیسر، ڈاکٹر، آئی ۔ اے ۔ ایس عہدہ دار، گھریلو خانہ دار خواتین، اسکول کے ٹیچر غرض کہ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد صحافت کا سہارا لے کر اپنے خیالات عوام تک پہنچانے کی کوشش کرنے لگے ۔ مگر سب سے زیادہ اہم کام جس کے لیے اردو جاننے والے عابد علی خاں صاحب اور جگر صاحب کو یاد کریں گے وہ اردو سیکھنے کی کتابیں ہیں جن کے سبب آج کمسن بچے اور عمر رسیدہ لوگ اردو پڑھنا لکھنا سیکھ رہے ہیں ۔ اس کے باعث اردو زبان میں نئی زندگی پیدا ہوئی، ایک ولولہ جاگا ۔

جگر صاحب ایک شفیق بزرگ تھے ۔ پرانی تہذیب و اخلاق کی مکمل تصویر، صحافت کی دنیا میں مگن ۔ روزنامہ سیاست ان کی کمزوری بن گیا تھا ۔ یہ ان کی اور عابد علی خاں صاحب کی جاں فشانی کا اثر ہے کہ سیاست اخبار صرف عوام ہی نہیں بلکہ حکومت کے لیے اہمیت بھی رکھتا ہے ۔ اس کے پڑھنے والے اور اس کے لیے لکھنے والے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں ۔ بڑے بڑے دانش وروں، ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات اس میں دکھائی دیتی ہیں ۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ روزنامہ سیاست کی ابتدا اور لگتے سالوں تک شان دار اشاعت کے لیے عابد علی خاں اور محبوب حسین جگر دونوں برابر کے شریک تھے ۔ انھوں نے دنیا پر ثابت کردیا کہ سچے رفیق کیسے ہوتے ہیں ۔ خدا کرے کہ روزنامہ سیاست ہمیشہ اسی نیک نامی اور کامیابی کے ساتھ باقی رہے تاکہ اس کے بانی اور اس کو اس ترقی کی منزل پر چھوڑ کر جانے والوں کی روح شاد رہے ۔ آمین

—000—

ڈاکٹر لئیق صلاح

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

ہم نے پڑھا تھا کہ IDES OF MARCH ایک بہت بڑی شخصیت کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی تھی اور اس کی پا گوئی کرنے والے کی بات ("قیصر روم" Julius Ceaser) نے سنی ان سنی کردی تھی۔ لیکن جس کا وہم و گمان بھی جولیس سیز نہیں تھا۔ وہ ایک الم ناک حقیقت کے روپ میں بالآخر ۱۰ مارچ کو ظاہر ہوئی۔ یعنی سیزر کو اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کرنا پ
مارچ کا مہینہ یوں بھی خزاں رسیدہ محسوس ہوتا ہے۔ تمام انسانوں کی زندگی میں نہ سہی لیکن کئی افراد، اسی ماہ میں زندگی کے حقائق سے دوچار ہوتے ہیں۔ ۱۱ مارچ میرے لیے بھی ایک یادگار تاریخ ہے۔ اسی دن میرے والد کی تدفین ہوئی تھی۔ برس ہا برس گزر کے باوجود وہ تاریخ ذہن سے محو نہیں ہوتی۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ محبوب حسین جگر کی وفات کی تاریخ بھی وہی ہے۔ اب اس دن ایک نہیں دو یادیں وابستہ ہو گئیں۔ مجھے ۱۲ مارچ کی صبح وہاب عندلیب صاحب نے فون پر اس سانحے کی اطلاع دی۔

جگر صاحب سے ملاقات کا شرف ۸۰ء میں ہوا جب مرزا ظفر الحسن حیدرآباد آئے تھے۔ انہوں نے "دفترِ سیاست" پر ملنے خواہش کی تھی۔ (میرے بڑے بھائی کو جگر صاحب پہلے ہی سے جانتے تھے اور مجھ سے غائبانہ تعارف تھا۔) اس روز مرزا صاحب گفتگو کے علاوہ جگر صاحب سے رسمی بات چیت ہوئی، جو متاثر کن نہیں تھی۔

۱۹۷۹ء میں بچوں کا بین الاقوامی سال منایا جارہا تھا۔ وقار خلیل صاحب نے کہا کہ "سیاست" کے لیے جگر ب نے کچھ آ کے لیے کہا ہے۔ ان دنوں میرا ایم۔ فل کا مقالہ زیورِ طبع سے آراستہ ہو رہا تھا اس لیے وقت نکالنا دشوار تھا لیکن وقار صاحب کے مسل اصرار نے بالآخر لکھنے پر مجبور کردیا اور میں نے تھک ہار کر ایک انگریزی کتاب Child Care سے بچوں کی تربیت کے تعلق ایک ترجمہ روانہ کیا۔ جگر صاحب کے تعلق سے ایک بات عام طور پر مشہور تھی کہ وہ ہر کس و ناکس کی تحریر کو من و عن شائع نہیں کر بلکہ اس میں کاٹ چھانٹ ضرور ہوتی ہے۔ جب وہ مضمون "سیاست" میں شائع ہوا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کیوں کہ جگر صاحب اسے جوں کا توں شائع کیا تھا۔ (ممکن ہے یہ حوصلہ افزائی ہی ہو)

آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے "تاریخ کے محور" کے عنوان سے نظام کی سلطنت میں شامل چند تاریخی شہروں کو پیش کیا جار راقمۃ الحروف گلبرگہ میں مقیم ہونے کی وجہ سے یہ موضوع میرے سپرد ہوا۔ ماضی اور حال کے واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تا جائزے کے ساتھ میں نے قلم فرسائی کی اور وہ مضمون نشر ہوا۔ دوسرے ہی روز جگر صاحب کا فون آیا کہ وہ مضمون "سیاست" کے

نہ کروں۔ حسبِ ارشاد میں نے بھیج دیا۔ جگر صاحب نے اپنی اگلی اشاعت میں اسے شامل کر لیا اور معاوضہ بھی ارسال کیا۔ ہر چند میں لینے سے انکار کیا اور کہا کہ مجھے آل انڈیا ریڈیو سے معاوضہ مل چکا ہے لیکن وہ مصرر ہے کہ یہ "سیاست" کی جانب سے ہے قبول کریں۔

رشید صاحب کو جو نسبت علی گڑھ سے تھی، جگر صاحب کا تعلق بھی اسی طرح گلبرگہ سے رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا ئی وطن عثمان آباد تھا لیکن جو لگاؤ رشید صاحب کو اپنے وطن جون پور کی بجائے "علی گڑھ" سے تھا بالکل اسی طرح جگر صاحب کا حال ۔بہت کم لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہوں گے کہ ان کا اصلی وطن کیا تھا؟ جگر صاحب کو جن مقامات سے نسبت رہی وہ حیدر آباد ہے پھر گلبرگہ۔ عموماً لوگ "گلبرگہ" کو ان کی کمزوری کہا کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے بھی، بعض مشاہدات سے ہوا۔

پچھلے چند سالوں سے، ہمارے پوسٹ گریجویشن کے نصاب میں "صحافت" کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ روایتی نصاب میں تبدیلی، ری تقاضوں کی ضرورت کے پیشِ نظر ناگزیر ہو جاتی ہے۔ ہم نے اسی نکتے کو ملحوظ رکھ کر "صحافت" کو شامل نصاب کیا۔ امتحان صرف ی نصاب تک محدود ہے مگر عملی طریقۂ کار سے واقفیت بھی ضروری ہوتی ہے جس کے لیے صحافی، مدیر وغیرہ سے ملاقات اور پریس کی ر بھی توجہ دینا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں جب بھی طالب علم حیدر آباد جاتے تو دفترِ "سیاست" کی زیارت ضروری ہوتی۔ صحافت کے لعے کے بعد طالب علم اس امر سے بخوبی واقف ہو جاتے ہیں کہ مدیر اور نائب مدیر کی ذمہ داریاں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ لوگوں سے ملنے ، لیے ان کے یہاں وقت نہیں ہوتا لیکن جب دفتر سیاست پہنچتے تو مشاہدہ کچھ اور ہی ہوتا۔ مرحوم عابد علی خاں صاحب اپنا قیمتی وقت کی نذر کرتے۔ گھنٹہ، دیڑھ گھنٹہ طویل انٹرویو دینے سے گریز نہ کرتے۔ (زاہد علی خاں صاحب بھی اس روایت کے پاس دار ہیں، وہ بھی طرح تعاون کرتے ہیں۔)

جگر صاحب مرحوم جن کے بارے میں یہ خیال عام تھا کہ وہ کم گو ہیں اور مجلسی آدمی نہیں مگر جب انھیں اطلاع ملتی کہ گلبرگہ ان ، اپنے شہر سے طلبہ و طالبات آئے ہیں تو جگر صاحب، کام کو خیر باد کہہ کر پذیرائی کے لیے آتے۔ نہایت خندہ پیشانی اور انکساری کے دفترِ سیاست کے چپے چپے کے تعلق سے گھوم پھر کر معلومات فراہم کرتے۔ تمام شعبہ جات میں لے جاتے اور بتلاتے کہ یہ کتابت کا ہے۔ یہاں ٹیلی پرنٹر ہے۔ اس طرف فوٹو گرافی کا کام ہو رہا ہے۔ جتنے سوال طالب علم کرتے، ان سب کا تشفی بخش جواب، جگر حب دینے میں ذرا بھی تامل نہ کرتے۔ کبھی ہم کو یہ احساس تک ہونے نہ دیا کہ ہم ان کے بارِ خاطر ثابت ہو رہے ہیں۔ سادگی کا یہ عالم جیسے ہمارے طالب علموں نے ان کے ادارے کو اعزاز بخشا ہے۔ تصویر کھنچوانے کی خواہش کی جاتی تو فوری آمادہ ہو جاتے۔ حالی نے ب کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے جو شعر کہا تھا وہ جگر صاحب پر بھی صادق آتا ہے:

عاجزوں سے تو انکساری تھی
سر بلندوں سے انکسار نہ تھا

میری نگرانی میں ۱۹۹۴ء میں، کوثر فاطمہ ریسرچ اسکالر نے ایم۔ فل کا مقالہ ضلع گلبرگہ کی ادبی و تہذیبی انجمنوں کے موضوع پر سپردِ کیا تھا۔ اس اسکالر نے ۱۹۴۷ء کے بعد کی تمام انجمنوں کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کیں۔ میں نے خیال کیا کہ اس کے سچے روان، جگر صاحب کو بتلانا چاہیے۔ چناں چہ یہ مقالہ میں نے ان کے حوالے کیا۔ انھوں نے بالاستیعاب اسے پڑھا، اور اپنی بیش قیمت

مخلصانہ رائے تحریر کی۔ اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے لکھا:

"عزیزی ڈاکٹر صاحب ــ السلام علیکم
آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے گلبرگہ کی ادبی و تہذیبی انجمنوں پر تحقیقی مقالے کے مطالعے کا موقع عنایت فرمایا۔ میں اپنے تاثرات علاحدہ قلم بند کیے ہیں"

جگر صاحب نے بہمنی دور سے عہدِ عثمانی تک کی ادبی سرگرمیوں کی ایک مختصر سی تاریخ اپنے اس تبصرے میں بیان کردی میں بہ طور خاص ان کے عہد کے گلبرگہ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے: "محترمہ ڈاکٹر لئیق صلاح شعبۂ اردو گلبرگہ یونیورسٹی نگرانی اور رہنمائی میں ضلع گلبرگہ کی ادبی تہذیبی انجمنوں پر عزیزی کوثر فاطمہ کے تحقیقی مقالے برائے ایم۔ فل کے مطالعے کا موقع ملا۔ خوشی کی بات ہے کہ ایک بہت مشکل ادبی کام کو بڑے حوصلے اور محنت سے انجام دیا گیا۔ یہ رسمی بات نہیں۔

گلبرگہ کو حضرت خواجہ بندہ نواز کی اردو سے نسبت ہے اور گلبرگہ بہمنی خاندان کے خاتمے کے بعد دکن میں مسلم حکمرانوں حکمرانی اور اردو کا مرکز رہا ہے۔ مگر اس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔

آزادی سے قبل میں نے بھی گلبرگہ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اس وقت گلبرگہ میں کوئی انجمن یا تنظیم نہیں تھی۔ حتیٰ کہ کتب خانہ بھی نہیں تھا۔ کچھ نوجوان تھے جو علمی و ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیا کرتے تھے اور کتابوں اور رسائل کے مطالعہ کا انھیں شوق ان میں ایک عثمان صحرائی صاحب تھے جو گلبرگہ کے پہلے کتب خانہ (قریب بہمنی تالاب) کے پہلے سکریٹری بنائے گئے تھے۔ گلبرگہ یہ پہلا کتب خانہ تھا جو غالباً بلدیہ کے تحت تھا۔ اس نئی عمارت میں ایک ہال بھی تھا، جہاں اکثر علمی جلسے ہوا کرتے تھے۔ عثمان صاحب نے ایک رسالہ "بہمنی" نکالا تھا، جو غالباً گلبرگہ کا پہلا معتبر علمی معیاری رسالہ تھا۔ جس میں زیادہ تر گلبرگہ پر مضامین ہوتے۔ ایک دو شماروں کے بعد یہ رسالہ بند ہو گیا۔

گلبرگہ میں انٹرمیڈیٹ کالج کے قیام کے بعد کچھ علمی سرگرمیاں شروع ہوئی تھیں۔ اسے مزید تقویت اس وقت ملی جب فرحت اللہ بیگ، مرزا حسین احمد بیگ، امین الحسن بسمل اعلیٰ عہدوں پر عدالت گلبرگہ میں فائز ہوئے۔ نواب غوث یار جنگ صاحب گلبرگہ بھی تعاون کیا کرتے تھے۔ چناں چہ ابراہیم جلیس نے گلبرگہ میں پہلا اہم ادبی جلسہ پیام برادری (رسالہ پیام تعلیم) کے زیرِ اہتمام تھا جس میں مخدوم اور میکش پہلی مرتبہ گلبرگہ آئے تھے۔ یہ جلسہ لکشمی ٹاکیز میں ہوا تھا۔ اسی رات محبوب گلشن میں ایک بڑا مشاعرہ اس کی صدارت نواب غوث یار جنگ نے کی تھی۔ مخدوم اور میکش نے پہلی مرتبہ گلبرگہ کے اس مشاعرے میں اپنا کلام سنایا تھا مشاعرے میں بہ مشکل دس بارہ مقامی شعرا تھے"۔

جگر صاحب کی وفات کے بعد جتنے مضامین میری نظر سے گزرے، وہ قابلِ قدر ضرور ہیں کیوں کہ ان میں جگر صاحب تعلقات مختلف شخصیات سے، اور ان کے تاثرات جگر صاحب کے بارے میں، پر روشنی پڑتی ہے لیکن جگر صاحب کی ایسی کوئی تحریر سے نہیں گزری جو خود موصوف کی ہو۔ مجھے یہاں ان چند سطور کو سپردِ قلم کرتے ہوئے اس بات کی خوشی ہے کہ ان کا بیان "جو

فرمایا ہوا" کو پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ علاوہ ازیں جگر صاحب نے اس دور کے اہم شعرا میکش، مخدوم، اعلیٰ عہدوں پر فائز
ہتیوں اور گلبرگہ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ بیانات ہماری معلومات میں اضافے کا باعث ہیں۔

جگر صاحب نے اس تبصرے میں آگے، جو باتیں بیان کی ہیں ان میں بہ طورِ خاص گلبرگہ کی اہم شخصیتوں کے کارناموں کو محفوظ
نے کی خواہش کی ہے۔ جن شخصیات پر مقالے لکھے گئے ہیں، غالباً وہ ان کی نظر سے نہیں گزرے۔ انھوں نے ابراہیم جلیس، سلیمان
ٍطیب، نیاز گلبرگوی اور مرزا فرحت اللہ بیگ پر تحقیقی کام کروانے کا مشورہ دیا اور میرے تعلق سے انھوں نے جو تاثرات پیش کیے ہیں
حسنِ ظن یا مخلصانہ اور مشفقانہ جذبات کہوں تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ یہاں اس کی پیش کشی، خود ستائی کے لیے نہیں ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

"میں نے جن امور کا اوپر ذکر کیا ہے، وہ حافظے کی بنیاد پر ہیں، گلبرگہ کی ادبی تاریخ کی ترتیب کے لیے، کوئی تحریری مواد نہیں تھا۔ محض تحقیق اور انٹرویو کی بنیاد پر گلبرگہ میں ادبی انجمنوں کی تاریخ مرتب کی گئی ہے، جس کے لیے میں ریسرچ اسکالر کو مبارک باد دوں گا۔ سب سے زیادہ تعریف کی مستحق محترمہ لئیق صلاح ہیں، جو اردو کا دوسرا نام اور کرناٹک میں اردو کی شناخت ہیں۔ انھوں نے ایک اہم بلکہ مشکل ترین کام کو عملی شکل دینے میں ریسرچ اسکالر کی رہنمائی کی۔" گلبرگہ کی ادبی اور تہذیبی انجمنیں" یقیناً ایک اہم دستاویز ہے۔ مگر بعض اہم ادبی شخصیتوں نے گلبرگہ کا نام روشن کیا ہے جیسے ابراہیم جلیس، محمد علی، سلیمان خطیب اور نیاز گلبرگوی۔

گزشتہ ہفتہ پشاور یونیورسٹی سے ایک خط میرے نام آیا ہے۔ جس کی زیراکس کاپی مرسل ہے۔ (افسوس یہ نقل ملی نہیں غالباً منسلک کرنا بھول گئے) ابراہیم جلیس پر ایک صاحب نے ایم۔ فل کیا اور پی ایچ۔ ڈی کر رہے ہیں۔ انھیں ابراہیم جلیس کی ابتدائی زندگی اور خدمات کے بارے میں مواد درکار ہے لیکن یہ مواد گلبرگہ اور حیدرآباد میں بھی نہیں مل سکتا۔ اس لیے اب آپ گلبرگہ کی اہم شخصیتوں پر تحقیق کروائیں"۔

جگر صاحب نے سلیمان خطیب، فرحت اللہ بیگ، فضل گلبرگوی اور نیاز گلبرگوی کے فن کا تجزیہ کرتے ہوئے، مقالہ نگار کی
ششوں کو سراہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"سلیمان خطیب کے اشعار کا اب بھی حوالہ دیا جاتا ہے۔ فضل گلبرگوی کی شاعری ہجرت کے کرب سے دوچار ہے۔ نیاز
برگوی سے میں واقف نہیں لیکن ان کا کلام انھیں ایک مقام دلاتا ہے۔ سلیمان خطیب کا انتقال ہوئے دو دہے گزر چکے ہیں۔ ان کا کلام
مسائل تھا، کئی لوگوں کو یاد ہے۔ اب خطیب کا مجموعۂ کلام دستیاب نہیں۔ یوں بھی خطیب کو ان کی زندگی میں جو اعتراف اور مقام ملنا
یے تھا، ان کی دکنی شاعری کی وجہ سے نہیں ملا۔ حالاں کہ دکنی شاعری کو سلیمان خطیب نے رتبہ اور مقام دلایا۔ اسی طرح گلبرگہ کی علمی
وادبی ترقی میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔ ان کی وجہ سے وہاں بڑے بڑے مشاعروں کی ابتدا ہوئی۔ یہ نکات کوثر فاطمہ

کے مطالعے سے سامنے آئے ہیں۔ وہی تحریر موثر اور معنی خیز ہوتی ہے جو مسائل کی نشان دہی پر غور کی دعوت دیتی ہو۔ مقالہ نگار نے ڈاکٹریٹ کے لیے ایک موضوع کا علمی و تحقیقی احاطہ کیا ہے اور گلبرگہ پر علمی کام کی ایک اہم بنیاد رکھی"۔

جگر صاحب کے تاثرات اپنے بارے میں اور مقالے کے تعلق سے پڑھ کر یقین جانیے ، یوں محسوس ہوا کہ مجھے اپنی محنت کا صلہ مل گیا۔

شعروں کا انتخاب جس طرح کسی شخص کی نیک نامی اور بدنامی کا ضامن ہوتا ہے ، اسی طرح ایک اچھے اور معیاری اخبار کے لیے خبروں کا انتخاب بھی ہوتا ہے۔ سستی شہرت کی خاطر بعض جرائد ، اس شرط کو ملحوظ نہیں رکھتے اور بلا کسی تحقیق کے سنی سنائی پر یقین کرکے ، جھوٹی خبریں چھاپ دیتے ہیں اور "خبروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے "کی بدنامی کا ٹیکا اپنے موقر جریدے پر لگادیتے ہیں۔

"روزنامہ سیاست" اس معاملے میں بہت محتاط ہے۔ اس میں بلا کسی تصدیق کے کوئی اطلاع شائع نہیں ہوتی۔ اس وقار کو ملحوظ رکھنے میں ، عابد علی خاں مرحوم اور جگر صاحب مرحوم دونوں کی کاوشوں کا دخل رہا ہے۔ دونوں کا اس طرح اخبار کے قواعد و ضوابط پر متفق ہونا بھی ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔ "سیاست" کا گویا جسم عابد علی خاں صاحب تھے تو روح جگر صاحب تھے۔ دونوں کا وجود ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھا۔

من تو شدم ، تو من شدی ، من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں ، من دیگرم تو دیگری

عابد علی خاں صاحب کا حلقۂ احباب وسیع تھا۔ ان کی پہنچ مختلف رسائل تک تھی تو جگر صاحب اپنے خونِ جگر سے اس کی آب یاری کررہے تھے۔ جگر صاحب نے جب صحافت سے اپنا رشتہ استوار کیا تھا اس وقت حالات سازگار نہیں تھے۔ عموماً لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تمام وسائل تک بہ آسانی رسائی ہو تب ہی انسان کامیابی کی منزلوں سے ہم کنار ہوتا ہے لیکن کچھ لوگ اپنے عزم ، استقلال اور استقامت سے ، ناموافق حالات میں بھی اپنی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ ان ہی گنی چنی ہستیوں میں ایک ہستی جگر صاحب کی تھی۔ راہیں مسدود تھیں لیکن انھوں نے نامساعد حالات کا مقابلہ ، ایک "مردِ آہن" کی طرح کیا اور مردانہ وار آگے بڑھتے گئے اور یہ ثابت کر دکھایا کہ:

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

جگر صاحب کی تحریریں خواہ وہ خطوط کی شکل میں ہوں یا افسانوں ، انشائیوں اور اداریوں کی شکل میں ، انھیں اکٹھا کرکے شائع کرنا چاہیے تاکہ ان کے نقطۂ نظر سے واقفیت ہو اور قابل تقلید امور پر توجہ دے سکیں۔

مجھے دو باتوں کا افسوس ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ شعبۂ اردو کی جانب سے صحافت کے موضوع پر ایک سمینار رکھوں اور جگر صاحب کو مدعو کروں لیکن اس کا موقع نہیں ملا۔ مجھ سے جگر صاحب نے خواہش کی تھی کہ ایک مضمون "سیاست" کے لیے روانہ کروں۔ ان کی اس خواہش کی تکمیل نہ کرسکی۔ آج یہ مضمون سپردِ قلم کرتے ہوئے یہ احساس ہو رہا ہے کہ ممکن ہے ان پر قلم فرسائی سے میں اس فرض کی تکمیل کرکے اپنا فرض ادا کر رہی ہوں۔

——000——

محمد طیب انصاری

محبوب حسین جگر کی یاد میں

پچھلے چھ سات مہینوں سے پتہ نہیں کیوں لگ رہا تھا کہ اب جگر صاحب ہم میں نہیں رہیں گے ۔ سوچ سوچ کر آب دیدہ بھی ہو جاتا اور اکثر آنسو ڈھلک بھی جاتے ۔ جب بھی ملتا انھیں حسرت دیاس کی نظروں سے دیکھتا ۔ سوچتا تھا کہ ان کے ساتھ مل بیٹھوں اور کہوں "مجھ پر آپ کے احسانات بہت ہیں "۔ اظہار تشکر کروں اور کچھ گفتگو بھی ہو، ان کے دل کی بات پوچھوں ۔ لیکن ہمت کہاں تھی یہ سب کرنے اور کہنے کے لیے ۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ پل بھر کوئی ان کے ساتھ بیٹھ جائے اور وہ ان سے بات کریں تو وہ اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہوتا کہ جگر صاحب نے آج اس سے بات کی ہے ۔ بھلا ایسے میں گھنٹوں ان کے ساتھ بیٹھنے اور وقت گزارنے کا تصور ہی حماقت ہے ۔ دو ماہ قبل دفتر روزنامہ "سیاست" گیا تھا، معلوم ہوا کہ جگر صاحب خرابیِ صحت کی وجہ سے گھر پر ہیں ۔ گھر پر عام ملاقات کی اجازت نہیں تھی چوں کہ وہ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے اس لیے بعض اوقات ہمت کر بیٹھتا ۔ عابد منزل پہنچ گیا ۔ بہت خوش ہوئے ۔ دیر تک باتیں ہوئیں ۔ میری ہمت نہیں ہوئی کہ دل کی باتیں پوچھوں، ویسے ہی اٹھ آیا ۔ پچھلے ماہ دفتر سیاست پہنچا، کام میں مصروف تھے، سلام عرض کیا، بیٹھنے کو کہا، بازو میں کرسی پر بیٹھ گیا ۔ ہمت کی اور دوران گفتگو ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا "مجھ پر آپ کے بڑے احسانات ہیں" وہ چونک پڑے ۔ میری اس حرکت کی ان کو توقع نہیں تھی ۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہا "میں آپ کا شکر گزار ہوں ۔ آپ نے ابتدا ہی سے میری ہمت افزائی کی ہے "۔ وہ کہنے لگے "نہیں نہیں ایسا نہیں بولتے "۔ میری آنکھوں سے آنسو ڈھلک گئے ۔ وہ ایسے موقعوں پر اپنی جگہ سے اٹھ جایا کرتے تھے ۔ وہ اٹھے اور اپنے کام میں لگ گئے ۔ پھر مجھ سے انھوں نے کہا "تم کام کرو، کوئی تمھارے لیے رکاوٹ نہیں بنے گا "۔ وہ بھی بول نہیں پارہے تھے جگر صاحب کا دل بھی بھر آیا تھا ۔ لیکن وہ زندگی میں ہمت ہارنی تو بڑی بات ہے اپنے غم کا اظہار کرنا بھی بزدلی سمجھتے تھے ۔ یہ تو کوئی ایسا موقع بھی نہیں تھا شاید وہ میرے احساسات کو جان چکے تھے ۔ ان کو اپنی موت کا احساس ہو چکا تھا شاید وہ بھی یہ جانتے تھے کہ وہ چند ماہ کے مہمان ہیں ۔ انھوں نے اس بات کا احساس کسی پہلو سے بھی ہونے نہیں دیا ۔ میں مطمئن تھا کہ بالآخر میں نے ان پر اپنے احساسات کو ظاہر کر دیا ۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا ہے میں بھلا ان کو دے بھی کیا سکتا تھا سوائے ان اظہار تشکر کے چند الفاظ کے ۔ اب جب وہ ہم میں نہیں ہیں، میں مطمئن ہوں ۔ عجیب بات یہ کہ میری یہ ان سے آخری ملاقات تھی ۔ عید الفطر کے موقع پر آیا تھا ۔ معلوم ہوا کہ جگر صاحب بیمار ہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے ۔ دواخانہ میں شریک ہیں ۔ ملنے نہیں دیا جارہا ہے ۔ میں مجبور تھا میرا قیام بھی مختصر تھا ۔ دواخانہ نہیں جاسکا ۔ میرا ماتھا ٹھنکا تھا اسی وقت اور ہوا بھی وہی ۔ ایک ماہ کی کش مکش کے بعد زمانے کے ظلم

م کے خلاف آواز اٹھانے والے مجاہد قلم کے دھنی، بلند حوصلہ اور اولوالعزم انسان نے باآلآخر موت کے سامنے سپر ڈال دی۔ سچ ہے انسان ہر ز پر فتح پاسکتا ہے سوائے موت کے۔ اور موت نے جگر صاحب پر فتح پالی۔

جگر صاحب کی ذات مجموعۂ اضداد تھی۔ بشریت کے تقاضے کے طور پر ان کی چند کمزوریاں تھیں۔ ان کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی کمزوری تو روزنامہ "سیاست" تھی۔ سیاست کے بغیر جگر صاحب ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتے تھے کیوں کہ سیاست ہی ان کی زندگی تھی۔ بھرپور زندگی!! ان کی دوسری کمزوری ان کا وطن گلبرگہ تھا۔ گلبرگہ میں انٹرمیڈیٹ تک تعلیم پائی۔ گلبرگہ ہی کے دحانی اور ادبی ماحول میں ان کی پرورش ہوئی۔ حصولِ تعلیم کے لیے وہ حیدرآباد گئے اور بس وہیں کے ہوکر رہ گئے۔ وہ برسوں میں کبھی بھی گلبرگہ آتے لیکن گلبرگہ تو ان کے قلب و ذہن میں بسا تھا۔ وہ گلبرگہ سے دور رہ کر بھی گلبرگہ کے خیال سے ایک پل کے لیے بھی غافل نہ تھے۔ اہلِ گلبرگہ تو ان کے لیے اہلِ خاندان سے بڑھ کر تھے۔ جگر صاحب کے مزاج اور رویے سے جو لوگ واقف ہیں وہ میری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ دفتر میں جو لوگ ان سے ملنے آتے بس چلتے چلتے یا پھر ٹیبل پر جھک کر لکھتے لکھتے ایک دو سکنڈ کے لیے کچھ کہہ دیتے اور پھر اپنے کام میں مصروف ہوجاتے برخلاف اس کے گلبرگہ سے کوئی آجائے تو چہرے پر مسکراہٹ کھل سی جاتی۔ پوچھتے، کب آئے! اور بیٹھنے کا اشارہ کرتے۔ گلبرگہ کے لوگوں کے بارے میں، وہاں کی سیاسی، ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کے بارے میں اور حد تو یہ کہ موسم کے بارے میں دریافت کرتے۔ وطن تو سب کے لیے عزیز ہوتا ہے لیکن جگر صاحب کے لیے عزیز ترین تھا۔ گلبرگہ بڑا مردم خیز خطہ ہے۔ قلعہ حشام کھنڈر بن گیا لیکن عظمت رفتہ کی یاد تازہ کرتا ہے۔ علاء الدین حسن نے سلطنت بہمنیہ کی بنیاد یہیں رکھی تھی۔ دکنی زبان و ادب کا فروغ یہیں ہوا تھا۔ ہندلسانی تہذیب کی بنیاد کا پہلا پتھر یہیں رکھا گیا۔ عصرِ حاضر میں کئی دیدہ وروں نے یہیں آنکھیں کھولیں۔ محبوب حسین جگر، ابراہیم جلیس اور اب مجتبیٰ حسین اسی سرزمین سے رشتۂ پیوند رکھتے ہیں۔ ارضِ گلبرگہ ان فرزندانِ دل بند پر نازاں و فرحاں ہے۔ محبوب حسین جگر صاحب اپنے وطن آخری بار ۱۹۹۳ء میں میری دعوت پر آئے تھے۔ مزاج ناساز تھا ویسے بھی وہ سیاست کے دفتر سے ایک منٹ کے لیے بھی علاحدہ رہنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر معاملہ میرا تھا۔ کہتے تھے طیب کا جلسہ ہے مجھے جانا ہوگا۔ کششِ سرزمینِ وطن اپنے محبوب کو کھینچ لائی۔ داستانِ ادبِ گلبرگہ کی رسمِ اجرا تھی۔ رسم انجام دی۔ یادوں کی برات آئی۔ جگر صاحب کھوسے گئے، بہکنے لگے۔ "گلبرگہ کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں، گلبرگہ نے مجھے اور میرے بھائیوں کو بہت نوازا ہے گلبرگہ کے احسانات کو میں بھول نہیں سکتا" اور جذبات سے مغلوب ہاتھ بلند کیا اور کہا "گلبرگہ کو میرا سلام" کسے معلوم تھا جگر صاحب کا گلبرگہ اور اہلِ گلبرگہ کو یہ آخری سلام ثابت ہوگا۔ گلبرگہ اپنے فرزندِ دل بند کے لیے آٹھوں پہر آنسو بہارہا ہے۔ وہ یوں ہی مدتوں روتا رہے گا۔

جگر صاحب کی تیسری اور اہم کمزوری اردو زبان ہے۔ اردو زبان پر افتاد آپڑی تھی۔ آزادی کے بعد ملک میں اردو زبان کے لیے حالات ناسازگار رہے۔ حیدرآباد میں بھی یہی ہوا۔ یہاں تو یہ ہوا کہ اردو زبان کی سرکاری حیثیت ختم کردی گئی اور جامعہ عثمانیہ کا ذریعۂ تعلیم انگریزی سے بدل دیا گیا۔ ان نامساعد حالات میں عابد علی خاں صاحب اور محبوب حسین جگر صاحب نے روزنامہ سیاست کے ذریعے اردو تحریک کو فروغ دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے عوامی سطح پر اردو زبان کے کالج اور ادارے قائم ہوتے۔ اردو زبان عوامی تائید حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ مایوسی کے بادل چھٹ گئے۔ روزنامہ سیاست نے ملک کے حدود پار کرکے بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ یہ

اردو زبان کی بڑی خوش بختی رہی ہے کہ جب افتاد آپڑی تو خود اس شہر سے اس زبان کے تحفظ اور ترقی کے لیے کئی سرکردہ شخصیتیں ا
کھڑی ہوئیں ۔ ڈاکٹر زور نے ادارۂ ادبیاتِ اردو کے زیرِ اہتمام " ایوانِ اردو " تعمیر کیا ۔ مولوی حبیب الرحمٰن نے انجمن ترقی اردو (ہند
حیدرآباد کے بینر تلے اردو ہال بنایا ۔ اور اردو ذریعۂ تعلیم کے کالج قائم کیے ۔ حد یہ کہ انھوں نے اپنی قیمتی جائیداد اردو کے لیے وقف کردٗ
یہ کارنامے ان لوگوں کے لیے جنھوں نے اردو زبان کو اپنی شہرت اور منفعت کے حصول کا ذریعہ بنایا ہے ، مثالی حیثیت رکھتے ہیں
عابد علی خاں صاحب اور جگر صاحب نے ادبی ٹرسٹ ، تعلیمی ٹرسٹ ، اردو گھر اور اب اردو امتحانات کے انعقاد کے ذریعے اردو زبانَ
فروغ دیا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کی ایک شخصیت بھی ملک کی ہر ریاست میں پیدا ہوتی تو آج ملک میں اردو زبان کی صورتِ حا
مختلف ہوتی ۔

عابد صاحب اور جگر صاحب نے اردو کا جو ماحول بنایا اس کے پیچھے محض زبان کا فروغ ہی نہیں تھا بلکہ اس سے بھی زیا
مقدس مقصد قومی یک جہتی کا ماحول بنائے رکھنا ہے ۔

جگر صاحب نے کام چھوڑا ہے نام نہیں چھوڑا ۔ یہ بات یوں بھی صحیح ہے کہ روزنامہ سیاست کے سارے ہی صفحات انَ
نظروں سے گزرتے تھے ۔ وہ اداریہ لکھتے تھے اور فکر و نظر کے کالم بھی تیار کرواتے تھے ۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سیاست کے اوراق
ان کا نام کہیں بھی پکی سیاہی میں لکھا نہیں ملتا ۔ حد تو یہ ہے کہ یہ روزنامہ سیاست کے جوائنٹ اڈیٹر تھے ۔ اس حیثیت کا اظہار بھی کبھ
نہیں ہوا ۔ یہ تو ان کا صوفیانہ رنگ تھا اور قلندرانہ مزاج کہ انھوں نے اپنے نام کو چھپایا اور ہر وقت ہر لمحہ خود کو کام میں لگائے رکھا گ
تصوف کی زبان میں وہ " فنافی السیاست " تھے ۔ اپنے وجود کو انھوں نے کچھ اس طرح مٹادیا تھا کہ اس کی مثال سوائے خانقاہوں کے کہیں
اور نہیں ملتی ۔ شاید ان کے قلب و ذہن کے کسی گوشے میں حضرت بندہ نواز کا یہ قول رہ گیا تھا کہ جس طرح نمک پانی میں گھل جاتا ۔
اسی طرح اپنی ذات کو اللہ کی ذات میں فنا کردو ۔ فنائیت کا یہ فلسفہ جگر صاحب نے اپنے لیے مشعلِ راہ بنا لیا تھا اور حق تو یہ ہے کہ
حضرت بندہ نواز سے غیر معمولی عقیدت بھی رکھتے تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ تمام عمر ترقی پسند رہنے کے باوجود قلندری کو انھوں ۔
سینے سے لگائے رکھا ۔ انتقال سے ایک برس قبل انھوں نے فریضۂ حج بھی انجام دیا تھا اور مرتے وقت بھی بہ قول مجتبیٰ حسین ان کی زبٗ
پر جو آخری لفظ تھا وہ " اللہ " تھا ۔ مجتبیٰ حسین کی درجِ ذیل سطریں پڑھتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" پھر میرا ہاتھ تھامے ہوئے بڑے اعتماد کے ساتھ بولے ظہیر اور زاہد کو فون کر کے بلالو اور کہو کہ مجھے گھر لے چلیں زندگی ۔
میرا معاہدہ اب ختم ہوچکا ہے ۔ اس کے بعد انھوں نے چھت کی طرف دیکھا اور بہ آواز بلند کہا اللہ پاک میری مشکل آسان کردے :
مجھے اس عذاب سے نجات دلادے ۔ اللہ پاک ، اللہ پاک ! ! " ۔

اللہ پاک نے اپنے اس نیک بندے کی بات سن لی اور اللہ کا یہ نیک بندہ اللہ پاک کو پیارا ہوگیا ۔

جگر صاحب تمام عمر مجرد رہے ۔ بھائی مجتبیٰ حسین اور دوسرے بھائیوں اور بہنوں کی اولاد ہی ان کے پس ماندگان میں سے ہیں
لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اردو زبان کا سارا کنبہ ان کے پس ماندگان میں شامل ہے ۔ وہ تنہا تھے اور وہ تنہا نہیں بھی تھے ۔ بے ہمہ و باہمہ
کیفیت ہے ۔ یوسف ناظم نے صحیح لکھا ہے :

(آگے ص ۱۹۸ پڑھیں)

مشتاق جلیلی

روشنی رہ گئی

ابھی کچھ دن ہوئے، کہیں کسی نیوز پیپر یا کسی میگزین پر نظروں نے کچھ ایسی سطریں پڑھی ہیں کہ پھر ان سطروں پر پڑی ہی رہ گئیں۔ اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہوتا ہے۔ پھر سے پڑھنا شروع کرتا ہوں تو خبر جھوٹی لگتی ہے۔ خبر پر یقین آتا ہے تو آنکھوں سے ایک چنگاری اڑتی ہوئی دل کو جلا بیٹھتی ہے۔

محبوب حسین جگر کا نام رہ گیا۔ جگر صاحب نہیں رہے۔

وہ کتنی عجیب پر کشش شخصیت ہوگی کہ جس سے نہ کوئی خاص دوستی تھی، نہ میل ملاپ، نہ کوئی ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔ ان کی صبح و شام، رات دن سے بے خبر، ان کی ذات سے بالکل جڑا ہوا نہیں ہوں۔ نہ وہ کبھی میرے گھر آئے نہ کبھی میں ان کے گھر گیا ہوں۔ اور میرا گھر بھی کہاں ہے حیدرآباد میں، وہ تو مہمان خانہ ہے۔ چند دنوں کے لیے آتا ہوں، چلا جاتا ہوں۔ مدتوں سے فلمی زندگی گزار رہا ہوں اور ممبئی میں رہ رہا ہوں۔ کوئی خط و کتابت کا سلسلہ بھی نہیں، ہاں اتنا ضرور ہے برسوں کی جان پہچان ہے۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔

لیکن آج پتہ چلا۔ اندر ہی اندر خلوص، احترام اور پیار کا رشتہ دل کی گہرائیوں میں جیسے بڑی دور تک چلا گیا ہے کہ یہ الم ناک خبر سننے کے ساتھ ہی قلم ہاتھ میں آجاتا ہے اور لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔

حیدرآبادی ہوں ؛ جہاں کہیں بھی رہوں، حیدرآباد کی یاد آجاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ روزنامہ سیاست کے صفحے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی عابد علی خاں صاحب اور اس کے ساتھ ہی محبوب حسین جگر صاحب کی یادوں کا سلسلہ۔ حیدرآباد۔ سیاست۔ عابد علی خاں صاحب۔ محبوب حسین جگر۔ ان چاروں کی الگ الگ تاریخی حیثیت ہے۔ مگر نام ایک ہے۔

ادھر کئی دنوں سے حیدرآباد آنا ہی نہیں ہوا لیکن جب بھی آتا ہوں، اپنے بھائی علی احمد جلیلی صاحب کے ساتھ سیاست کے دفتر میں حاضری ضرور دیتا ہوں۔ عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب سے ملاقات نہ ہو تو میرا یہ سفر ادھورا رہ جاتا ہے۔ کوئی کام ہو نہ ہو، یہ نیازمندی اپنی وضع داری بن گئی ہے۔

یہ میں پرانے آفس کی بات کر رہا ہوں۔ سیڑھیوں سے اوپر چڑھتے ہی ایک بڑا سا ہال ہے اور ہال کے آخری سرے پر ایک بڑی سی میز لگی ہے۔ سیدھی طرف جگر صاحب اپنے مخصوص انداز میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں جتنی بار گیا ہوں، وہ اسی طرح بیٹھے ہوئے ملے ہیں اور ان کے ساتھ ہی زاہد علی خاں۔ کچھ لکھتے ہوئے، کام کرتے ہوئے۔ جگر صاحب کے وجود سے تجربات کے جھڑتے ہوئے موتیوں کو

چلتے جارہے ہیں۔

چھریرا بدن، دراز قد، چہرے پر مٹے مٹے سے نشانات کے اندر زمانوں کی تہہ جمی ہوئی۔ آنکھیں تجربات کی روشنی سے روشن روشن، پیشانی کی سلوٹوں سے ذہانت ٹپکتی ہوئی۔ باتوں میں اک عجیب جھنجلاہٹ سی۔ خاموشی ہے کہ بولتی جارہی ہے۔ چال ایسی کہ قدموں کے نیچے آکر مشکلیں دم توڑتی ہوئی۔ چہرے پر عینک اور عینک پر مقناطیسی شیشے جڑے ہوئے۔

قاعدہ، قانون، ڈسپلن مینیجمنٹ، انتظامی امور میں سلیقہ، قرینہ، یہ دبلا پتلا آدمی اپنے اندر اک کائنات لیے بیٹھا ہے۔

جگر صاحب کی شخصیت کو پہچاننے کے لیے ان کے قریب رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ چارمینار کے منجمد ارادوں کی طرح اپنی جگہ اٹل ہے۔ میری ان سے ہمیشہ بڑی چھوٹی سی ملاقات رہی ہے۔ لیکن میری نظر بھی رائیٹر کی نظر ہے۔ ان چند لمحوں میں انھیں تھوڑا بہت میں نے پڑھا ہے۔ ان کی نظریں جدھر اٹھ جاتیں، دیواروں کو چیرتی ہوئی نکل جاتی ہیں۔ آفس میں اِدھر اُدھر کیا ہورہا ہے، انھیں سب معلوم ہو جاتا ہے۔

ایک بات اور بھی ہے۔ جگر صاحب کی طرح ان کی جھڑکیاں بھی مشہور ہیں۔ جس پر برس پڑیں، وہ بہت کچھ سیکھ جاتا ہے۔ اس روکھے سوکھے پن میں بھی اپنا پن ہے۔

"سیاست" کی زندگی اتنی پیاری تھی انھیں کہ اپنی زندگی بھول بیٹھے۔ اس اخبار کی عمر بڑھانے میں کبھی اپنی طرف مڑکر نہیں دیکھا۔ چلتے ہی رہے ہیں۔

پھر عابد علی خاں صاحب اور جگر صاحب کی پاس داری اور وفاداری کی جو بھی کہانیاں مشہور ہیں، وہ آج کے دور میں سنی سنائی لگتی ہیں۔ برے وقت کا ساتھی اور اچھے وقت کا دوست آج کہاں ملتا ہے۔ ان دونوں کے دلوں کا ایسا میل جول، نہ سنا ہے نہ دیکھا ہے۔ وہ کچھ بھول جاتے تو ان کو یاد آجاتا ہے۔ یہ کچھ کھودیتے ہیں تو انھیں مل جاتا ہے۔ یہ عشق و محبت کا جذبہ، اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ ہر فرق مٹا دیتا ہے۔ نہ کوئی مالک ہے نہ نوکر۔ نہ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا۔ نہ کوئی کم ہے نہ زیادہ۔ لالچ اور غرض سے بے نیاز، ایک ہی شے دونوں کے بیچ میں رہ گئی ہے، دوستی۔ ایسا دوست، ایسا ساتھی، ایسا مالک، ایسا ہم سفر، راستے سے بچھڑ جانے کے بعد، جگر صاحب کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ اس درد کا احساس کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔ صرف جگر صاحب کا دل ہی محسوس کرسکتا ہے۔

دوستی کی دولت تولٹ گئی اور مرنا جینا بس میں نہیں ہے۔ خالی ہاتھ کسی طرح گزارہ ہوگیا۔ جہاں تک "سیاست" کی محبت کے سہارے چلنا تھا چل لیا۔ وہ بہت دن سے اکیلے پن سے گھبرا کر فرار ہونا چاہتے تھے۔ آخر انھیں راستہ مل ہی گیا۔

عابد علی خاں انھیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ انھیں ڈھونڈنے کے لیے جگر صاحب بھی پیچھے پیچھے چلے گئے ہیں۔

اب نہ عابد علی خاں آئیں گے۔ نہ جگر صاحب آئیں گے۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

00000

سید محمد حمید الدین شرفی

محترم محبوب حسین جگر مرحوم

زندگی کے ہر شعبے میں اعتدال اور توازن لازمی ہے۔ صحافت کا زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ اس میں شدت اور انتہا پسندی مقاہ کو متاثر کر دیتی ہے۔ محترم محبوب حسین جگر صاحب مرحوم جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ سیاست حیدرآباد، ان ساری خوبیوں سے متصف تھے گذشتہ ۴۸ سال سے وہ اردو صحافت میں اپنے معتدل رویّے، متوازن مزاج اور معتبر لب و لہجہ کے ذریعے اعلیٰ صحافتی اقدار کی پاس داری رہے تھے۔

جگر صاحب روزنامہ سیاست کی اجرائی کے پہلے دن سے اس اخبار سے وابستہ رہے۔ وہ محترم عابد علی خاں مرحوم موسسہ روزنامہ سیاست، حیدرآباد کے گہرے دوست اور یونیورسٹی کے ساتھی تھے۔ اس اخبار کی ترقی، وسعت اور کامیابی میں جگر صاحب کی۔ لوث اور مخلصانہ محنتوں کا بڑا دخل ہے، جس کا اعتراف عابد علی خاں مرحوم برابر کیا کرتے تھے بلکہ ایک مرتبہ موسسِ مرحوم نے یہا تک کہہ دیا تھا کہ "روزنامہ سیاست کے رگ و پے میں جگر کا خونِ جگر دوڑ رہا ہے۔" جگر صاحب کی اردو صحافت کے لیے عظیم الشا خدمات لائقِ صد ہزار تحسین اور یقیناً ناقابلِ فراموش ہیں۔ جگر صاحب کے والد حضرت احمد حسین مرحوم، عثمان آباد کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنے پاک و صاف خیالات، نیک نفسی اور اچھے اخلاق کی بنا پر احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے انھوں نے سرکاری ملازمت کے سلسلے میں مختلف شہروں میں قیام کیا۔ وہ رائچور، تلجاپور اور گلبرگہ شریف میں عرصۂ دراز تک مقیم رہے۔

محبوب حسین جگر بہ مقام رائچور (کرناٹک) ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم تلجاپور میں ہوئی۔ گلبرگہ سے میٹرک کامیاب کیا اور یہیں پر انٹرمیڈیٹ کی تکمیل کی۔ بعد ازاں جامعۂ عثمانیہ میں داخلہ لیا۔ ۱۹۴۲ء میں بی۔ اے پاس کیا۔ تاریخ اور سماجیا ان کے مضامین تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر مجید صدیقی، پروفیسر ہارون خاں شروانی، پروفیسر ایشور ناتھ ٹوپا، ڈاکٹر جعفر حسن پروفیسر حسین علی خاں ان کے اساتذہ تھے۔ سری کشن سنہا، جناب رشید قریشی، ڈاکٹر علی احمد جلیلی، جناب شاہد علی خاں اور جناب مز عالم ان کے جامعہ کے ساتھی تھے۔ انھیں دورانِ تعلیم جسمانی کھیل کود سے زیادہ مضامین، افسانے اور کہانیاں لکھنے کا شوق تھا طالب علمی کے زمانہ ہی میں ان کے اکثر مضامین ملک کے معیاری رسالوں میں چھپنے لگے تھے۔ ایک حیدرآبادی قلم کار کی حیثیت۔ نیاز فتح پوری کے شہرۂ آفاق رسالے نگار میں وہ زیادہ چھپتے تھے۔ مخدوم محی الدین پر ان کا ایک مضمون بہت مقبول ہوا۔ نیاز فتح پوری۔ اس کو بے حد سراہا تھا، جس کا مخدوم مرحوم اکثر ذکر کیا کرتے تھے۔ جگر صاحب کے والد تحصیل دار تھے۔ ملازمت سے سبک دوشی۔

خانہ نشین ہوگئے تھے ۔ بعد میں ان کے انتقال اور پولیس ایکشن کے ہنگاموں کے سبب جگر صاحب کے خاندان پر بڑی مصیبتیں ں۔ عثمان آباد میں ان کا گھر لٹ گیا ۔ بے پناہ تباہی و بربادی ہوئی ۔ سارے خاندان کی ذمہ داریاں بڑے بھائی ہونے کے ناتے جگر ب نے سنبھال لیں ۔ جگر صاحب کے آٹھ بھائی ہیں جن کے منجملہ دو بھائی صحافت و ادب میں مہرو ماہ کی طرح تابناک ہیں ۔ ابراہیم) مرحوم اور جناب مجتبیٰ حسین صاحب، جنھیں برصغیر میں بے پناہ شہرت حاصل ہے ۔ جگر صاحب نے گریجویشن کی تکمیل کے بعد اور خاندانی ذمہ داریوں کے باعث سرکاری ملازمت کو ترجیح دی ۔ محکمۂ کروڑ گیری میں سب انسپکٹر مقرر ہوئے ۔ بعد میں محکمۂ نشر ت سے منسلک ہوئے ۔ ۱۹۴۸ء میں ملازمت سے علاحدگی اختیار کی ۔

جگر صاحب ابتدا ہی سے ترقی پسند رجحانات رکھتے تھے ۔ حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا دفتر ان کے گھر پر قائم کیا گیا ابد علی خاں مرحوم سے عثمانیہ یونیورسٹی کے دور سے گہرے مراسم تھے ۔ خیالات کی ہم آہنگی نے دوستی کے رشتوں کو مضبوط کر دیا ۔ دن کے ساتھ نے مستقبل کے بارے میں مشترکہ غور و خوض اور منصوبہ بندی پر متوجہ کیا ۔ یہ لوگ پاکستان جانا نہیں چاہتے تھے ہیں رہ کر کوئی ذاتی کام کرنا پسند کرتے تھے ۔ ترقی پسند مصنفین سے رابطے کے باعث قاضی عبدالغفار مدیر "پیام" سے بے حد قربت زیادہ تر وقت دفترِ پیام میں گزر تا ۔ ان عوامل نے اردو صحافت سے دلچسپی کو گہرا کر دیا ۔ قاضی صاحب کی صحبت نے گویا سونے پر ا کا کام کیا ۔ عابد علی خاں مرحوم اور جگر صاحب مرحوم آخر کار یہ طے کرچکے کہ حیدرآباد سے اردو اخبار جاری کریں ۔ اس وقت آباد کا مقبول ترین اخبار "رہبرِ دکن" بند ہو چکا تھا ۔ اس کی جگہ "رہنمائے دکن" نے لے لی تھی ۔ دیگر اخبارات میں آواز ، میزان ، زٹ ، جناح اور صبحِ دکن جاری تھے ۔ اشاعت اور مقبولیت کے لحاظ سے رہنمائے دکن آگے تھا ۔ البتہ صحافتی معیار کے لحاظ سے بے مثال اخبار تھا ۔ مشیرِ دکن قدیم ترین اخبار تھا ۔ روزنامہ ملاپ بعد میں جاری ہوا ۔ شعیب زیادہ دنوں تک نہ چل سکا ۔ ان حالات کے نظر محترم عابد علی خاں مرحوم نے ایک اردو روزنامے کے اجرا کا مصمم ارادہ کر لیا اور جگر صاحب کو اپنے ساتھ اشتراک پر آمادہ کیا ۔ رح جگر صاحب مرحوم کی اردو صحافت اور روزنامہ سیاست سے دائمی وابستگی ہوئی ۔

عابد علی خاں مرحوم اور جگر صاحب مرحوم نے مل کر اخبار کا خاکہ تیار کیا ۔ عابد علی خاں صاحب نے سرمایہ فراہم کر کے ایک لیتھو اخرید لیا اور اخبار کا نام حضرت سید شاہ صابر حسینی صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے جو نواب میر عابد علی خاں صاحب کے خسرِ محترم تھے ست" تجویز کیا ۔ پہلے سے تیار کردہ ڈھانچے کے مطابق روزنامہ سیاست کی اجرائی عمل میں آئی ۔ اخبار کی نوعیت ، ترتیب ، تزئین اور بند و غیر جانبداریوں کے متعلق طے شدہ اساس پر ۱۵ / اگست ۱۹۴۹ء کو روزنامہ سیاست کا پہلا شمارہ شائع ہوا ۔ جگر صاحب اس دن اپنی وفات تک یعنی ۱۱ / مارچ ۱۹۹۰ء تک اس موقر اخبار سے بہ حیثیت شریک مدیر وابستہ رہے اور گزشتہ ۴۸ سال سیاست اخبار کی توسیع اور کامیابی کے لیے پوری سرگرمی ، توجہ اور انہماک کے ساتھ اپنے آپ کو وقف کیے ہوئے رہے ۔

روزنامہ سیاست کی بالالتزام پابندی سے اشاعت اردو صحافت میں بجائے خود ایک شاندار ریکارڈ ہے ۔ اس اخبار میں جگر ب کے ذمے خبروں کا انتخاب ، ترجمہ ، تدوین ، مواد کا جائزہ ، اخبار کی تزئین و تہذیب کے علاوہ شعبہ جات کتابت ، طباعت وغیرہ کی انگرانی تھی ۔ اب چوں کہ کمپیوٹر کتابت اور روٹری مشین پر طباعت کی سہولتیں مہیا ہیں اس کے باوجود پوری توجہ سے ہر کام دیکھا

...تے تھے ۔ جگر صاحب گذشتہ پانچ دہوں سے لکھ رہے تھے ۔ ان کے کئی مضامین مختلف موضوعات پر روزنامہ سیاست کی زینت بن چکے ہیں ۔ انھوں نے مضامین، افسانوں اور کہانیوں کے ساتھ ساتھ دیگر اصناف نثر میں بھی ایک بڑا تحریری سرمایہ چھوڑا ہے ۔ اخبار سیاست کے ان قدر اداریوں کا ایک بڑا حصہ جگر صاحب کے فکر و نظر کا ترجمان ہے ۔ حضرت محبوب حسین جگر بیدار مغز صحافی، دوراندیش صاحب ر، کہنہ مشق قلم کار، تجربہ کار اخبار نویس، تنظیمی مزاج، عظیم دانش ور، ترقی پسند مصنف، دردمند، حساس، بامروت اور نہایت صاف ستھرے خیالات کے انسان تھے ۔ ترقی پسندی کے باوصف مذہب و اخلاق سے گہرا تعلق رکھتے تھے ۔ ایک راسخ العقیدہ مومن، نیک خو مسلمان اور ملت کے بہی خواہ کی حیثیت سے انھیں بھلایا نہ جائے گا ۔ ایک مرتبہ عمرہ اور سالِ گذشتہ فریضۂ حج کی سعادتوں سے بہرہ مند ہو چکے تھے ۔ وہ انسانی تعمیر کے لیے مذہبی تعلیمات کی اہمیت کا احساس رکھتے تھے ۔ وہ رواداری چلن کو مختلف مذہب والوں کے درمیان بھائی چارہ اور خیر سگالی کے لیے ضروری سمجھتے تھے ۔ جناب محبوب حسین جگر صاحب کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ نہایت گہرا تھا ۔ وہ اجتماعی حیات کی نفسیات پر گہری نظر رکھتے تھے ۔ ان کے مزاج میں اعتدال اور توازن پایا جاتا تھا ۔ وہ عصرِ حاضر میں، قوت کا پورا احساس رکھتے تھے ۔ اخبار کو قارئین کی ذہنی و عملی تربیت کا موثر وسیلہ مانتے تھے ۔ اس میدان میں ان کا تجربہ بہت پختہ تھا ۔ وہ کہتے تھے قارئین تک اخبار کئی مرحلوں سے گزر کر پہنچتا ہے ۔ سب سے پہلا مرحلہ مواد یعنی خبریں، مضامین اور اداریے اکٹھا کرنا پھر انھیں مدون کرنا، کتابت، تصحیح، ترتیب، طباعت ان سب کاموں کے بعد بروقت قاری تک پہنچانا سب سے اہم مرحلہ ہے ۔

جگر صاحب ترجمے کے مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے ۔ اردو اخبارات کے لیے " ترجمہ " سب سے اہم مسئلہ ہوتا ہے ۔ جب " اردو نیوز " کی سربراہی کا پراجکٹ ایک قومی نیوز ایجنسی نے ملک گیر پیمانے پر شروع کیا تو کہا تھا کہ اور بہت سارے گوشے ہیں جنھیں بغیر اس وسیلے کے اردو اخبارات میں پیش نہیں کیا جا سکتا ۔ ایک دفعہ اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے چند اہم نکات کی وضاحت کی تھی :

" آج سے تین چار دہے قبل خبروں کے حصول کے ذرائع محدود تھے ۔ آج حالات بدلے ہوئے ہیں ۔ ہر شعبے میں ترقی ہوئی ہے ۔ اردو اور دیگر علاقائی زبانوں کے اخبارات کے لیے " ترجمہ " ایک اہم مرحلہ ہوا کرتا ہے ۔ عام ترجموں اور صحافتی ترجمے میں بڑا فرق ہوتا ہے ۔ صرف صحافیوں کو یہ کام انجام دینا ہوتا ہے ۔ اگرچہ ریڈیو، اطلاعات اور دیگر ذرائع سے ایسا ترجمہ شدہ مواد مل جاتا ہے تاہم اس کی ضرورت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا " ۔

اخباری ترجمے میں لفظی ترجمے کے بجائے بامحاورہ ترجمہ سود مند ہوتا ہے ۔ ترجمے کو عام فہم اور سہل بنانا ضروری ہے ۔ مشکل اور خالص علمی اصطلاحات کو رواج دینا اردو کے ساتھ زیادتی اور اردو صحافت سے دشمنی ہوگی ۔ جگر صاحب کے نزدیک اردو زبان و ادب کے فروغ میں اردو اخبارات کا اہم لیکن خاموش کردار ہے ۔ اخبارات میں گنجائش کی مجبوری کے سبب مضامین کو مختصر طور پر شائع کرنا پڑتا ہے ۔ مختصر مضامین میں قاری کو تشنگی اور بے ربطی کا احساس نہ ہونے دینا فنِ تدوین میں کمال اور مہارت کا خاصہ ہے ۔ محبوب حسین جگر بلاشبہ اس فن میں یکتا تھے ۔ جگر صاحب کے نزدیک اخبار کا معاشرتی زندگی میں اہم رول ہوتا ہے ۔ لہٰذا مسائل کو جذبات سے نہیں بلکہ ذہنی سکون، تحمل اور تدبر کے ساتھ پیش کرنا ہی ایک ذمہ دار صحافی کا فریضہ ہونا چاہیے ۔ جگر صاحب گذشتہ ۴۸ برس سے اخبار سیاست

اور اس کے وسیع حلقۂ قارئین کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھنے میں جناب عابد علی خاں مرحوم کے دست و بازو بنے رہے اور آخر وقت تک اس رشتے کو گہرائی اور گیرائی عطا کرنے میں شب و روز منہمک نظر آتے ۔ خبر کی صحت کی تحقیق کے بعد ہی وہ اسے قابلِ اشاعت قرار دیتے تھے ۔ خبروں میں ذاتی آرا اور تبصروں کی نشان دہی اور انھیں الگ کرکے خبر کو پروپگنڈہ نہ بننے دینا ، زبان و بیان ، اعداد و شمار کو قابلِ فہم بنانا جگر صاحب کے ذمے تھا ۔ محبوب حسین جگر روزانہ ۱۲ گھنٹے اخبار کا کام کرتے ۔ کام ختم کرکے گھر پہنچنے کے باوجود ٹیلی فون برابر نائب ایڈیٹر ، شعبۂ ادارت ، شعبۂ کتابت اور شعبۂ طباعت سے وقفے وقفے سے ربط ٹیلی فون کے ذریعے پیدا کرتے اور ہدایات دیتے رہتے تھے ۔ جگر صاحب کو تین مرتبہ قلب پر حملہ ہوچکا تھا ۔ اس کے باوجود ان کے کام کرنے کی لگن میں بال برابر فرق نہیں آیا ۔ انھوں نے خاندانی ذمہ داریوں کے سبب شادی نہیں کی ۔ اتنی بڑی ذاتی قربانی دے کر بھی وہ اپنے افرادِ خاندان یا احباب سے اپنے احسانات کا ذکر بھی نہیں کرتے تھے ۔ کئی برسوں سے وہ اپنے جگری دوست جناب عابد علی خاں کے ساتھ ان کی قیام گاہ "عابد منزل" لکڑی کا پل ، حیدرآباد میں رہائش پذیر تھے ۔ وہ جناب عابد علی خاں اور ان کے اہلِ خاندان کے محبت و خلوص آمیز برتاؤ سے بے حد متاثر بلکہ عابد علی خاں صاحب کے حسنِ اخلاق ، طرزِ عمل اور سلوک و محبت کے گرویدہ تھے ۔ ان کی اولاد کو عزیز از جان رکھتے تھے ۔

جگر صاحب لباس اور غذا کے بارے میں قلندرانہ سادگی رکھتے تھے ۔ البتہ " پان " سے والہانہ لگاؤ تھا ۔ دن بھر میں ۵۰ تا ۶۰ پان کے بیڑے نوش کرتے تھے جو عابد منزل سے بہ طورِ خاص ان کے لیے بھیجے جاتے تھے ۔ جگر صاحب ترقی پسند رجحانات رکھنے کے باوجود مذہبی اقدار کو بے حد اہمیت دیتے تھے ۔ وہ راسخ العقیدہ مسلمان اور کسی حد تک صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے ۔ قرآن مجید کی بلاناغہ تلاوت ان کے ہر روز صبح کے معمولات میں شامل تھی ۔ انھیں بزرگانِ دین سے خاص لگاؤ تھا ۔ جگر صاحب مدینۂ منورہ میں زیارتِ روضۂ اقدس سے شرف یاب ہوچکے تھے ۔ جگر صاحب کی شخصیت سچائی ، محنت ، لگن ، عملِ پیہم ، خلوص و محبت سے عبارت تھی ۔ انھوں نے اخلاصِ عمل بے غرض دوستی اور انسانیت کے احترام کے جو نشان قائم کیے ہیں وہ عرصۂ دراز تک صحافیوں کی نوجوان نسل کو راستہ دکھاتے رہیں گے اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے ۔ اب ایسے مخلص بندے کہاں دیکھنے کو ملیں گے ۔ یہ چار مصرعے حضرت جگر صاحب مرحوم پر صادق آتے ہیں ۔

اگر ہم خود میں تابندہ نہ ہوتے
تو اپنے عہد میں زندہ نہ ہوتے
اندھیرے اور بڑھ جاتے اگر ہم
نویدِ صبحِ آئندہ نہ ہوتے

000000

محسن علی

برگِ گل ساوزن اور وجود آہنی

(محترم بھائی جگر صاحب مرحوم کی یاد میں)

"جانے کیوں ایسے آدمی بہت ہی کم ملتے ہیں جو کہتے ہیں کہ دیکھو اس دنیا کے لیے جس آدمی کی ضرورت ہے اور جس آدمی کے لیے یہ دنیا بنی ہے وہ "ہم نہیں ہیں" یہی جان کر دیکھو کہ اب ہم اس جہان سے جارہے ہیں اور ہمارے جانے کے بعد سوچو کہ واقعی اس دنیا کو کس آدمی کی ضرورت ہے "یقیناً اُس آدمی کی جو ہم سے یہ سب کچھ کہہ کر چلا گیا:

Nothing of him that doth fade

But doth suffer a sea change

into something rich and strange

پتہ نہیں کس نے کبھی یہ بات شاعر شیلی کے لیے کہی تھی جو مجھے آج بھی بڑی بلیغ لگتی ہے اور حسبِ مقدور آج جب میں محترم بھائی جگر صاحب کی زندۂ جاوید شخصیت کے تعلق سے اپنے کچھ خیالات کا اظہار کرنے کی جرات کررہا ہوں تو یہی بات میرے ذہن میں بار بار اپنے آپ کو دہرارہی ہے۔

یہ بات آج بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ بھائی جگر صاحب اپنی جگہ دراصل ایک سچائی تھے۔ ویسے کوئی سچائی الفاظ میں جب بیان ہوتو وہ پُر اثر ضرور ہوتی ہے لیکن وہ سچائی جب ایک عمل بنتی ہے تو ایک بہت بڑا سچ بن جاتی ہے۔ اس لیے کہ علم و عمل کے امتزاج کے خول میں زندگی کی صداقتیں بڑی محفوظ رہتی ہیں۔

A man truly treat is a great truth

ہر وہ شخص جو بھائی جگر صاحب کی شخصیت سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتا تھا وہ یہ بات آج بہ ہر طور کہہ دیتا ہے کہ جگر صاحب ایک بے لوث اور بے غرض آدمی تھے اور صحیح معنوں میں خوددار بھی لیکن ان کی خودداری ہر نوع کی خودپسندی سے محفوظ تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کی یہی بے غرضی اس کی فطرت کی سنگلاخ زمین میں بنی ہوئی ایک چٹان ہوتی ہے جو بنیاد ہوتی ہے خودداری کی۔ اس کے بنا وصفِ خودداری ایک بے بنیاد تصور ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ بے لوث اور بے غرض ہونا دراصل سچے جذبۂ انسانیت کو ایک حشمت و افتخار بخشتا ہے۔ ایسا جذبۂ انسانیت جس میں کسی منفعت کی امید کی آمیزش ہوتی ہے وہ کسی تہذیب کی کوئی اعلیٰ قدر نہیں بنتا۔ پتہ

نہیں کیسے ہر صبح اور ہر شام، سیاہ و سفید رنگوں میں آگے بڑھنے والے وقت کے کسی پہلو میں محفوظ یہ صفت بھائی جگر صاحب کے ساتھ ساتھ اس دور تک چلی آئی تھی ورنہ ایسی ہر وہ انسانی صفت جس کی بنیاد پر ہمارے سارے عالی وقار علوم و تصوراتِ حیات کی بلند و بالا عمارتیں کھڑی ہیں ان کا انسانی وجود سے آج شاید ہی کوئی تعلق خاطر قائم رہا ہو کیوں کہ ایسی ساری صفات اب نایاب ہو چکی ہیں اور وہ اب ہر نایاب و نادر شے کی طرح ملکیت ہو گئی ہیں معاشرے کے اونچے طبقات کی اور آج وہ بہ زور کردار و عمل نہیں بلکہ اقتدار و اثر اور دولت سے خریدی جاسکتی ہیں۔ شہرت و شرافت اور نام و مقام چاہیں یا عزت و ناموس اور جاہ و حشم چاہیں، یہ سب بازاری اشیاءِ خرید و فروخت بنی ہوئی ہیں۔ اور آج وہ سچا انسان جس کی فطرت کا وصفِ اول بے غرضی تھا، ایک داستان بن گیا ہے۔ اسی لیے آج کا بڑا آدمی ایک Mistaken Identity لگتا ہے۔ ورنہ تاریخ نے دیکھا ہے، ریکارڈ کیا ہے کہ بے لوث و بے غرض ہونا پتہ نہیں کیسی کیسی قربانیوں، کیسے کیسے ایثار اور کیسی بے پناہ قوت برداشت اور ایک محنت شاقہ کی سی بردباری کا طلب گار ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ ہم جیسے عام انسان اس لیے نہیں لگا پاتے کہ ہم تو ایسے شخص کی فرض شناسی، کارکردگی اور کام کی شکل میں اس کی تعمیرِ حیات کی دھن سے فیض یاب ہونے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔

کہتے ہیں Tolerance is the pace of geratness بھائی جگر صاحب ہر لحاظ سے ایک بڑے آدمی تھے۔ بڑی ہی پروقار شائستگی اور سخت جان جذبۂ حلم و صبر کے ساتھ وہ وقعت تہذیب و تمدن کی پاس داری کرتے تھے۔ ان کی فکر اور ان کے جذبہ و احساس کی وسعتوں کے افق نمایاں طور پر روشن کیے ہوئے نظر نہیں آتے تھے۔ اس لیے کہ ان کی فکر و فطرت کی بلندیاں زمینی تھیں، ارضی تھیں اور ان کی زندگی کی عام روش کام سے کام کا کٹھن انداز لیے ہوئے ہوتی تھی۔ ان کا کام کرنے کا انداز تو ایسا تھا کہ لگتا ان کے کام پر وقت کوئی قید نہیں لگا سکتا بلکہ ان کا کام وقت پر قید لگا دیتا ہے کہ "اے وقت میں مصروف ہوں، ابھی نہ گزر" کچھ ایسا ہی دبدبہ تھا ان کے کام کے انداز میں۔ تفریح و تفننِ طبع کا تصور تو پتہ نہیں کس طرح مغرب یا مشرق کی تہذیبوں کی مزاج پرسی کرنے والی طبی سائنسوں نے پیدا کیا تھا جس کے لزوم اور احساس کے ساتھ جینے والا تو ساٹھ انسٹھ سال کی عمر میں یوں ہی تھک سا جاتا لیکن یہاں تو کام اور صرف کام کی لگن نے اپنی پوری اہمیت کے ساتھ ۹۰ سال کی عمر میں بھی تھکن محسوس نہیں کی بلکہ کام جاری رکھا۔ بنا کسی تفریح و تفنن کے وقفے کے اور زندگی کے ساتھ کیے گئے معاہدے کے حرفِ آخر تک آکر کام کی تکمیل کی۔

شہرت و ناموری کے وسائل و مواقع تو ان کے علم و فن کے میدان میں ان کی صلاحیتوں اور صحافت و سیاست کے اعلیٰ شعور کے حکم کے منتظر رہے۔ لیکن دن مہینے بن گئے مہینے سال اور سال ایک عمر بن گئے۔ پھر بھی کبھی اس بڑے پن کو جو شہرت اور نام وری کا مرہونِ منت ہوتا ہے انھوں نے اپنی ملکیت بن جانے کا حکم نہیں دیا گو کہ وہ سب کچھ ان کے دست رس میں تھا۔ لگتا کہیں تو ان کی ذات کی صاف پاک پرتوں میں محفوظ نازک سا ایک احساسِ درد تھا جو شاید فنِ شیشہ گراں کی دین ہوتا ہے اور جس کا مداوا اس کو آشکار کرنے میں نہیں ہوتا۔ انھوں نے اپنے لیے ایک راہ ضرور متعین کرلی تھی۔ دشوار گزار سہی اس راہ سے چل کر اپنی منزل تک پہنچ جانا ہی ان کے مقصدِ حیات کو موقر و معتبر بناتا تھا۔ لیکن ہر راہِ آسان پر گام زن ہو جانا اور چھوٹے چھوٹے فاصلوں پر ملنے والے کسی مقام کو منزل جان لینا ان کے پاس بے راہ روی کے مماثل تھا۔ وہ ایک بلند حوصلہ اور بلند مقام انسان تھے۔

The heights by greatness reached and kept were not
attained by sudden flight. But they , while their
companions . slept , were toiling upward in the night

(Longfellow)

طویل سے طویل فاصلے ان کی منزل کو ان کی نظروں سے اوجھل نہیں کر سکتے تھے ۔ طے شدہ منزل تو ان کے سفر ہی میں ان کے ساتھ رہی اور ان کو صد رہی تو اپنے سفر ہی سے کہ نہ میں تھکوں نہ تو ختم ہو۔ زندگی کے آخری لمحات شاید ثبوت بن سکیں کہ سانس پہلے رکی اور بعد کو قلم چھوٹا

Deserts have worn out but man continued his quest for oasis-
-oasis of Love and success for humanity

یہی عظمت و بلندی تو وہی ہوتی ہے جہاں پہنچنے والا اپنی جگہ اکیلا ہوتا ہے اور زمین کے لمس کو کھو کر اس بلندی کا درد سہتا رہتا ہے ۔ یکا و تنہا......!

—— 000 ——

(سلسلہ ص ۵۹)

" کیا عجیب و غریب داستان ہے کہ جمِ غفیر میں رہنے والا شخص زندگی بھر تنہا رہا لیکن انجمنیں سجاتا رہا ۔ اسم باسمیٰ شخص محبوب سیاست کے دفتر کے سامنے سے جو شخص بھی گزرے گا گزر جانے والے کو ضرور یاد کرے گا "۔

شکاگو سے محمد زین الدین صدیقی نے کہا ، مختصراً کہا لیکن بہت خوب کہا :

" اب تو حیدر آباد خالی ہو گیا "

جگر صاحب کے انتقال پر ہر شخص کچھ نہ کچھ کہہ رہا ہے لیکن یہ بات جو زین الدین صدیقی صاحب نے کہی ہے خوب کہی ہے ۔ جگر صاحب کے بعد اب حیدر آباد میں بچا کیا ہے ۔ وہ آدمی تھا جو اپنی ذات میں محشرِ خیال تھا ۔ وہ اپنے وقت کا چار مینار تھا ۔ مکہ مسجد تھا ، وہ لاڈ بازار تھا ، پتھر گٹی تھا وہ عابد شاپ تھا ، باغِ عامہ تھا حد تو یہ کہ وہ شیروانی اور بریانی بھی تھا ۔ سر پر رومی ٹوپی اوڑھے ، شیروانی زیب تن کیے ایسے شخص کو جو منہ میں پان چبائے اردو زبان میں سوچتا ، اردو زبان میں لکھتا اور اردو زبان میں ہی پڑھتا ، ہمیں اب کہاں نظر آئے گا ۔

جگر مراد آبادی نے شاید محبوب حسین جگر جیسی شخصیت کی موت پر ہی کہا تھا :

جان کر من جملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

—— 000 ——

اثر فاروقی

جگر صاحب
بے لوث خدمات کی عظیم روایت

جنوری کے دوسرے ہفتے میں میں نے مجتبیٰ حسین سے ٹیلی فون پر ربط قائم کیا اور ان سے خواہش کی کہ وہ ابراہیم جلیس اور محبوب حسین جگر پر خاکے تحریر کرکے مارچ کے اختتام تک روانہ کریں کہ قومی محاذ کا ایک دستاویزی و تاریخی شمارہ شائع کیا جارہا ہے جس میں مرہٹواڑہ کے سب ہی نامور شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کی نمائندہ تخلیقات کے ساتھ ساتھ ان کا مکمل تعارف بھی شاملِ اشاعت ہوگا۔

محبوب حسین جگر کی ابتدائی تعلیم تلجاپور (ضلع عثمان آباد) میں ہوئی تھی اور ان کے والدِ محترم اسی ضلع میں تحصیل دار کی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ قاضی شفیع الدین (بیڑ) سے ابراہیم جلیس کی خط و کتابت تھی کہ یہ دونوں ہم جماعت تھے۔ ان خطوط کو بھی شاملِ اشاعت کیا جانے والا ہے۔ جواب میں مجتبیٰ حسین نے بتایا کہ ان دونوں بھائیوں پر ان کے خاکے دو الگ الگ ماہناموں میں شائع ہوچکے ہیں۔ انہی کو اگر شاملِ اشاعت کرلیا جائے تو بہتر ہوگا۔ میں نے مجتبیٰ حسین سے سوال کیا کہ کیوں بھائی نئے خاکے یا مضمون لکھنے کا ارادہ نہیں ہے، غالباً یہ میرا اپنائیت سے بھرا اصرار ہی تھا کہ انھوں نے نئی تخلیقات روانہ کرنے کا وعدہ کرلیا۔ دہلی کی اس گفتگو کے بعد میں اپنی جگہ مطمئن ہوگیا کہ اب مجتبیٰ حسین کے مضامین یقینی ہوگئے ہیں۔

کسے پتہ تھا کہ مارچ میں ایک ایسے شخص پر مضامین و خراجِ عقیدت پر ہی خبروں کا انبار لگ جائے گا جو اپنی ساری عمر نام و نمود اور شہرت کے سائے سے بھی کوسوں دور رہا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب آل جہانی جے۔ پی۔ مولے نمائندہ پی۔ ٹی۔ آئی روزنامہ سیاست کو بھی خبریں روانہ کیا کرتے تھے۔ وہ انگریزی میں خبریں روانہ کرتے تھے جن کا ترجمہ کرلیا جاتا تھا۔ اردو ادبی مجلس (موجودہ کل ہند اردو پریشد) کے اکثر جلسوں میں جے۔ پی مولے شریک ہوا کرتے تھے اور ان اجتماعات کی روداد بڑے اہتمام سے روانہ کیا کرتے تھے۔ شاید وہ میری تحریر و تقریر سے کسی حد تک متاثر تھے۔ ایک بار انھوں نے سیاست کے لیے خبرنامہ لکھوایا۔ یہ سلسلہ کئی دنوں تک جاری رہا اور آخر کار محبوب حسین جگر صاحب کی دل چسپی کے باعث میں راست سیاست کو خبریں اور اس علاقے کے احوال روانہ کرنے لگا۔ مکتوبِ مرہٹواڑہ اور مہاراشٹرا ڈائری کا سلسلہ متعدد سالوں تک متواتر و لگاتار جاری رہا۔ "مکتوبِ مرہٹواڑہ" ہفتے میں دو بار شائع ہوا کرتا تھا۔ ایک بدھ کے روز اور دوسرا سنیچر کو۔ یہی وہ دور تھا جب میں ذاتی طور پر جگر صاحب سے نہ صرف متعارف ہوا بلکہ مجھے ان کی قربت بھی حاصل ہوئی۔ جب بھی اورنگ آباد میں کوئی کام ہوتا جگر صاحب مجھ سے ربط پیدا کرتے۔ ان دنوں سکندر علی وجد بھی اورنگ آباد آچکے تھے۔ ۲۶ / جنوری اور ۱۵ / اگست

کے لیے ان کا خصوصی کلام حاصل کر کے جگر صاحب کو روانہ کرنا میرے ہی ذمے تھا۔ ان کی اورنگ آباد آمد پر اردو ادبی مجلس کی جانب سے رنگل سینما گھر میں ایک زبردست مشاعرہ رکھا گیا تھا۔ نظامت کے فرائض خود وجد ہی انجام دے رہے تھے۔ فقرے چست کرنے میں وجد صاحب کا جواب نہیں تھا اس مشاعرے میں بھی انھوں نے اپنی فقرہ بازی کے ذریعے سامعین کو خوب محظوظ کیا۔ میں نے ان میں سے منتخب لطیفے لکھ کر جگر صاحب کی خدمت میں روانہ کر دیے جو بعد ازاں شیشہ و تیشہ کے کالم میں شائع ہوئے۔

جگر صاحب کو مرہٹواڑہ کے مسائل سے بے پناہ اور غیر معمولی دل چسپی تھی۔ خاص طور پر تعلیمی و معاشی مسائل کے تجزیے کے مسئلے میں وہ ہمیشہ مجھے متوجہ کیا کرتے تھے۔ غالباً یہ ان کے اس علاقے سے جذباتی لگاؤ کا نتیجہ تھا کہ ان کے بچپن اور تعلیم کے چند نہایت اہم اور یادگار لمحات کا تعلق اسی علاقے سے ہے۔ ایک بار شعرا کی بہتات اور انحطاطِ شاعری کے تدارک کے لیے میں نے فری اسٹائل، مشاعرہ منعقد کیا تھا کہ اس زمانے میں بمبئی میں فری اسٹائل کشتیوں کا زبردست رواج تھا۔ اس منفرد مشاعرے کی روداد بھی انھوں نے سیاست میں نمایاں شائع کی تھی اور اس خبر پر شاہد صدیقی نے شیشہ و تیشہ میں ان شعرا کی خوب خبر لی تھی۔

میں جب بھی حیدر آباد آتا جگر صاحب سے ضرور ملتا۔ ایک بار میں نے دیکھا کہ وہ ایک انگریزی اشتہار کی تصحیح خود ہی کر رہے ہیں، اس حد تک کام سے لگاؤ اور انکساری کی مثال میں نے آج تک کسی دوسرے اخبار کے دفتر میں نہیں دیکھی۔ ایک بار ملند کامرس کالج ہاکی ٹیم مقابلوں میں شرکت کے لیے حیدر آباد آئی۔ میں بھی اس ٹیم کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ مقابلوں سے فرصت ملنے کے بعد میں جگر صاحب سے ملاقات کرنے دفتر سیاست پہنچا اور ٹیم کے کپتان سے کہا کہ وہ اپنی فوج کو باہر ہی رکھے کہ اتنے لوگوں کا دفتر میں جانا مناسب نہیں۔

جگر صاحب سے بات چیت کے دوران حیدر آباد آمد کا سبب بھی زیرِ بحث آگیا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا ٹیم کہاں ہے میں نے جواب میں کہا کہ دفتر کے باہر، جگر صاحب نے فوری سارے کھلاڑیوں کو اندر بلایا۔ ان کی زبردست ضیافت کی اور پھر ایک تصویر بھی لینے کا حکم عملے کے کسی فرد کو دیا۔ دوسرے روز کے سیاست میں یہ تصویر تفصیلی خبر کے ساتھ شائع ہوئی۔ شاید ان کی یہی اپنائیت تھی کہ لوگ ان کے گرویدہ ہو جایا کرتے تھے۔

ایک بار میں نے انھیں تفصیلی خط لکھا کہ مترجم حضرات تن آسانی سے کام لیتے ہوئے انگریزی الفاظ جوں کا توں استعمال کر رہے ہیں۔ اتنا ہی نہیں سرخیوں میں انگریزی الفاظ شائع ہو رہے ہیں۔ مثلاً انفراسٹرکچر، کارپوریٹر، ڈائرکٹر کی جمع کارپوریٹرس، ڈائرکٹرس، سیکورٹی فورسز اور لیجسلیچر پارٹی وغیرہ یہ الفاظ نہ صرف بولنے میں بلکہ لکھنے میں بھی مشکل ہیں اور اردو کا قاری جب ساری خبر اردو میں سمجھ لیتا ہے تو یہ الفاظ کیوں استعمال کیے جائیں۔ انھوں نے اپنے جواب میں بڑی حد تک میری بعض باتوں سے اتفاق کر لیا اور لکھا کہ روزنامہ "جنگ" پاکستان میں اس سے زیادہ انگریزی الفاظ ہوتے ہیں۔

جس طرح سعادت حسن منٹو کی افسانوی تحریر کی کوئی نقل نہیں کر سکا بالکل اسی طرح جگر صاحب کے اداریوں کی تحریر کی نقل صرف مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ ان کی تحریروں سے ان کے عمیق مطالعے اور حالات کے صحیح ادراک کا ثبوت فراہم ہوتا ہے اختلافِ رائے کا وہ بہت احترام کرتے تھے کہ اختلافِ رائے ہی آزادی تحریر و تقریر کی بنیاد ہے۔ جس طرح ہندوستان کی قومی تاریخ میں

(آگے ص ۷۳ پر)

ہاشم سعید

محبوب حسین جگر

فروغِ شمع تو باقی رہے گا صبح محشر تک
مگر محفل سے پروانے تو رخصت ہوتے جاتے ہیں

عابد علی خاں ۱۲ نومبر ۱۹۹۲ء کو اس دنیا سے چلے گئے اور آج ۱۱ مارچ کو محبوب حسین جگر نے آخری سانس لی۔ لیکن وہ دونوں جاتے جاتے ایک ادارہ چھوڑ گئے ہیں جس کا فروغ صبح محشر تک جاری رہے گا۔ ۱۹۴۸ء کی بات ہے، حیدرآباد کے مسلمان پریشان ہو کر نقلِ وطن کر رہے تھے اور جنھوں نے یہیں قیام کرنا مناسب سمجھا وہ سہمے ہوئے تھے۔ سیاسی تبدیلیوں نے لوگوں کی زندگیاں تبدیل کر دی تھیں۔ ایسے وقت عوام کی ہمت بڑھانے اور انھیں ڈھارس دینے کی ضرورت تھی۔ لیکن اس کے لیے ذریعہ کیا ہو کسی کو پتہ نہیں تھا۔ عابد علی خاں اور محبوب حسین جگر نے مناسب یہ سمجھا کہ ایک اخبار نکالا جائے اور مسلمانوں کو سمجھایا جائے کہ اسی ملک سے ان کی تقدیر وابستہ ہے۔ چناں چہ اخبار نکالنے کی اجازت حکومت وقت سے مانگی گئی اور اجازت تقریباً ۸ ماہ بعد ملی۔ سیاست کی موجودہ جگہ کرائے پر حاصل کی گئی اور ٹین کا شیڈ ڈالا گیا۔ مالیے کی قلت نے کام میں رکاوٹ پیدا کی۔ مگر عابد علی خاں اور محبوب حسین جگر نے ہمت نہیں ہاری۔ ٹین کا شیڈ تیار ہو گیا اور وہیں ایک پرانا پریس اقساط پر خرید کر نصب کیا گیا۔ سیاست کا پہلا شمارہ ۱۵ اگست ۱۹۴۹ء کو منظر عام پر آیا۔ ۱۴ اگست کی رات محبوب حسین جگر کے لیے ایک یادگار رات تھی۔ دوسرے دن کام کرنے والے لوگ آنے والے تھے۔ انھوں نے "فکر و نظر" کا کالم تیار کیا۔ ایک مضمون لکھا پھر اخبار سیاست نکالنے کی ضرورت اور اسباب پر اداریہ لکھا اور پھر چند خبروں کا ترجمہ کیا۔ رات میں ۲ بجے آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے ان کی آنکھ لگ گئی۔ لیکن جس طرح بچے عید کی رات سے قبل سرہانے اپنے نئے کپڑے رکھ کر سوجاتے ہیں اسی طرح انھوں نے بھی شیروانی کے ایک جیب میں فکر و نظر دوسرے جیب میں مضمون، نیچے کی ایک جیب میں اداریہ اور چوتھی جیب میں ترجمہ کی ہوئی خبریں رکھ لیں۔ لیکن ان کی نیند بھی پل دو پل کی تھی۔ اٹھ بیٹھے اور اخبار نکالنے کا انتظام کرنے لگے۔

محبوب حسین کے لیے کام ہی عبادت کا دوسرا نام تھا۔ وہ کام کرنے سے کبھی نہیں تھکتے تھے۔ اگر کوئی کسی کام کو ناممکن بتاتا تو وہ اس کام کو کر دکھاتے۔ ان کے قریبی دوست احباب کا خیال تھا کہ وہ اپنے آخری وقت میں بھی سیاست ہی کا کام کرتے رہیں گے۔ چناں چہ انتقال سے ایک دن قبل انھوں نے بی گوپال ریڈی کے انتقال پر ایک ڈیلی اداریہ لکھا۔ بیماری کی وجہ سے ان میں نقاہت بے حد

پیدا ہوگئی تھی۔ قلم پکڑا نہیں جارہا تھا۔ دماغ ساتھ نہیں دے رہا تھا پھر بھی انھوں نے ایک مختصر اداریہ لکھا۔ جب رفیع احمد قدوائی کا انتقال ہوا تھا تو پنڈت نہرو نے کہا تھا HE DIED IN HARNESS یہی بات محبوب حسین جگر پر بھی صادق آتی ہے۔ دل بیٹھا جارہا تھا لیکن کام کی لگن بیمار دل پر قابو پانے کی کوشش کررہی تھی۔ عید الفطر کے دن بھی دفتر سیاست میں بیٹھے بیٹھے ان کی طبیعت خراب ہوگئی، فوری کئی ڈاکٹر چلے آئے۔ انھیں میڈی سٹی میں شریک کرایا گیا ڈاکٹروں نے انھیں PACE MAKER لگانے کا فیصلہ کیا۔ چناں چہ پیس میکر بھی لگا دیا گیا لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ محبوب حسین جگر زندگی سے ہر وقت لڑتے رہے اور آخری وقت میں بھی موت سے لڑتے رہے۔ لیکن موت ہمیشہ غالب رہتی ہے اور زندگی کو ہار ماننی پڑتی ہے۔ محبوب حسین ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کا ایقان تھا کہ کام کرتے رہنے سے مصیبتیں قریب نہیں آتی ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری مرحلے میں بھی انھوں نے دوسرے شخص کی موت پر اظہار تعزیت کیا۔ یہ ان کی آخری تحریر تھی اور زندگی کی ترجمان بھی تھی۔

عابد علی خاں اور محبوب حسین جگر کی ملاقات جامعہ عثمانیہ میں بی۔ اے سالِ اول کی جماعت میں ہوئی۔ عابد علی خاں فلسفے کے طالب علم تھے اور محبوب حسین جگر تاریخ کے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حضرت جگر مراد آبادی کا پورے ہندوستان میں طوطی بول رہا تھا۔ جامعہ کے طالب علموں نے سمجھا کہ محبوب حسین جگر بھی ان ہی کے شاگرد ہیں اور استاد کے تخلص کی مناسبت سے اپنا بھی وہی تخلص رکھا ہے۔ لیکن محبوب حسین جگر شاعر نہیں تھے۔ انھیں افسانے لکھنے کا شوق تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا تھا۔ لیکن جب جگر صاحب صحیفہ نگار بن گئے اور سیاست ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا تو انھوں نے افسانے بھی لکھنا چھوڑ دیا۔ سیاست سے وابستگی کے ۴۸ سال کے دوران انھوں نے صرف ایک افسانہ لکھا تھا۔ روز کی طرح صبح میں وہ شیو کررہے تھے کہ انھیں اپنی کنپٹی میں سفید بال نظر آیا اور وہ سوچنے لگے کہ زندگی کی دوڑ دوسری جانب شروع ہوگئی ہے یا شروع ہونے والی ہے۔ شیو کرکے انھوں نے افسانہ لکھنا شروع کیا اور ایک ہی نشست میں اس کو ختم کردیا۔ عنوان تھا "کنپٹی"۔ سیاست سے اپنی وابستگی کو انھوں نے اتنا پختہ کرلیا تھا کہ ان کے بعض دوست احباب اپنا نام تبدیل کرکے محبوب حسین سیاست رکھنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ جگر صاحب نے زمانے کے گرم و سرد کو چکھا تھا۔ انھوں نے اپنے اور سیاست کے لیے جو راستہ اختیار کیا تھا اس کو کبھی نہیں بدلا۔ وہ اپنے ساتھی جرنلسٹوں کو یہی مشورہ دیا کرتے تھے کہ انسان کو اپنا راستہ نہیں بدلنا چاہیے۔ جس راستے کو اپنایا ہے اسی راستے پر آخری وقت تک چلتے رہنا چاہیے۔ ۱۹۴۶ء میں انجمن ترقی مصنفین کی کانفرنس ساگر ٹاکیز میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کے جنرل سکریٹری عابد علی خاں تھے اور محبوب حسین جگر کبھی کرسیوں پر گرد صاف کرتے تھے، کہیں پینٹنگس لگاتے ہوئے نظر آتے۔ کانفرنس سے ایک دن قبل کئی ادیب اور شاعر حیدرآباد چلے آئے۔ ان میں کرشن چندر بھی شامل تھے۔ کانفرنس کے رپورتاژ "پودے" میں انھوں نے لکھا ہے کہ جب محبوب حسین جگر سے ان کا تعارف کرایا گیا تو وہ سوچنے لگے کہ جگر ہر جگہ جلا بھنا کیوں ملتا ہے۔ کانفرنس ختم ہوگئی اور تمام مندوبین جانے لگے۔ بمبئی جانے والی ٹرین میں محبوب حسین بھی سوار ہوگئے۔ کرشن چندر نے پوچھا کدھر جانے کا ارادہ ہے۔ جواب دیا گلبرگہ سے تار آیا تھا کہ بہن کا انتقال ہوگیا ہے۔ کانفرنس کی وجہ سے جانہ سکا۔ اب جارہا ہوں تاکہ اس کی قبر پر کم از کم فاتحہ پڑھ سکوں۔ کرشن چندر نے محبوب حسین جگر زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ انھوں نے "پودے" میں لکھا ہے کہ ایک ایسا بھی نوجوان ہے جس کی بہن مرگئی وہ اس کے

ازے میں شریک نہ ہوسکا ۔ چوں کہ وہ چاہتا تھا کہ غالب زندہ رہے ۔ اقبال زندہ رہے اردو زندہ رہے اور ہماری تہذیب زندہ رہے ۔ یہ محبوب حسین جگر جن کے کردار کے اس پہلو کو کرشن چندر نے دوچار جملوں میں پیش کرکے اس کو جاودانی حیثیت دے دی ہے ۔ ۱۹۵۹ء میں محبوب حسین جگر نے ایک مشاعرہ منعقد کیا تھا ۔ جس میں بعض لوگ مفت داخل ہونے کی کوشش کررہے تھے ۔ ان حیدرآباد کا ایک شاعر بھی شامل تھا ۔ محبوب حسین جگر نے ان سب کو پیچھے ڈھکیل دیا لیکن دوسرے دن سوچنے لگے کہ انھوں نے جو بھی کیا وہ انھیں نہیں کرنا چاہیے تھا ۔ اس سے بامقصدی مشاعروں کا دور شروع ہوگیا اور ادیبوں و شاعروں کی مدد کی جانے لگی ۔ کئی یبوں اور شاعروں کی تخلیقات کو وہ شائع نہیں کرسکے لیکن انھوں نے محنت کا معاوضہ پہلے ہی ادا کیا ۔ جگر صاحب ایک مخصوص کردار حامل تھے ۔ کسی زمانے میں پان بہت چباتے تھے اور چار مینار سگریٹ کے مرغولے چھوڑتے رہتے تھے ۔ ایسے وقت کوئی ناخوش ر بات پیش آتی تو وہ ہر چیز کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ۔ پان پر پان چباتے ۔ دونوں پیر اوپر کرلیتے اور ایک کے بعد دوسرا ریٹ سلگانا شروع کردیتے ۔ اخبارِ سیاست کے معاملے میں وہ بڑے بے مروت تھے ۔ کبھی کسی غلطی کو برداشت نہیں کرسکتے تھے ۔ اس لئے پر اپنے ساتھی کارکنوں سے ان کی کئی مرتبہ بحث بھی ہوئی ۔ عابد علی خاں کے بعد محبوب حسین جگر کی موت سے ایک قدیم دور ختم گیا ۔ اس بارے میں کہا ہی کیا جاسکتا ہے

اٹھ گئے دنیا سے فانی اہلِ ذوق
ایک ہم مرنے کو زندہ رہ گئے

—— 000 ——

سلسلہ ص ۷۰)

سٹر عنایت اللہ مشرقی (خاکسار تحریک کے بانی) محدث شاہ ولی اللہ و اسماعیل دہلوی اور صحافی عثمان فارقلیط کی ساری کی ساری زندگی کی پرواہ کیے بغیر مقاصد کے حصول میں گزری اسی طرح جگر صاحب کی طرزِ روش بھی ان حضرات کے مماثل ہے کہ جگر صاحب عمر بھر دلِ مقصد کی خاطر نتائج کی قطعی پرواہ کیے بغیر اپنا کام انجام دیتے رہے ۔

—— 000 ——

محمد منور علی
(سب ایڈیٹر سیاست۔ ریٹائرڈ)

جناب محبوب حسین جگر
(سیاست خاندان کے آئیڈیل)

سیاست خاندان کے لیے عابد علی خاں صاحب مرحوم God Father کا مقام رکھتے تھے اور جناب محبوب حسین جگر ایک IDEAL ثابت ہوئے جنھوں نے بے لوث خدمت، ایثار، قربانی اور مقصد کی تکمیل کے لیے زندگی کا ہر لمحہ وقف کردینے کا ایسا عملی نمونہ قائم کیا جو سیاست سے وابستہ ہر شخص کے لیے ہمیشہ ایک زندہ مثال ثابت ہوتا رہا۔ جگر صاحب پہلے خود عمل کرتے اور دوسروں سے اسی طرح کی خدمات کی توقع کرتے اور جو ان کے مزاج میں ڈھل جائے وہ ہمیشہ کے لیے ان کا ہوجاتا۔ جگر صاحب کا اعتماد حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اور ان کا اعتماد حاصل کرنے والے نہ صرف مخلص کارکن ثابت ہوتے بلکہ اپنی نجی زندگی میں ایسے ڈسپلن کے پابند ہوجاتے جو کردار ساز ثابت ہوتا۔ جگر صاحب کی رہ نمائی میں کام کرنے والوں کو تضیعِ اوقات کی مہلت ہی نہیں مل سکتی تھی۔ مکر و فریب کی دنیا سے وہ ہمیشہ دور رہتے۔ قناعت ان کی معیشت کا محور ہوتا۔

آج بھی کئی افراد جو ترقی یافتہ ممالک میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں یا اندرونِ ملک اعلیٰ عہدوں پر خدمات انجام دے رہے ہیں اس بات کا برملا اعتراف کرتے ہیں کہ چند برس جگر صاحب کی رہ نمائی میں کام کرنے کا جو موقع ملا وہ ترقی کے مختلف مدارج طے کرنے میں معاون ثابت ہوا۔

جگر صاحب نے کہنہ مشق صحیفہ نگاروں کی خدمات سے استفادہ ضرور کیا۔ سیاست کے ابتدائی دور میں جناب احسن علی مرزا جناب ہاشم سعید اور کچھ عرصہ بعد غلام حیدر کی خدمات بھی انہوں نے حاصل کیں جو روزنامہ پیام میں قاضی عبدالغفار صاحب کی رہ نمائی میں خدمات کا تجربہ رکھتے تھے لیکن جگر صاحب کو نوجوانوں کو صحیفہ نگار بنانے کی ہمیشہ جستجو رہی۔ وہ ایسے نوجوانوں کی تلاش میں ہوتے جنھیں اخبارات میں کام کرنے سے دل چسپی ہو اور جو پر خلوص طریقے سے کام کرنے کا جذبہ رکھتے ہوں۔ چناں چہ ۱۹۵۰ء کے دہوں میں انہوں نے کئی نوجوانوں کو صحیفہ نگار بنادیا جن میں اسد جعفری کا نام قابل ذکر ہے۔ اس زمانے میں جگر صاحب نے نوجوان صحیفہ نگاروں کی ایک فوج کھڑی کردی تھی۔ ان میں سے بعض سیاست سے وابستہ رہے اور بیش تر حیدرآباد کے دیگر اخبارات، خبر رساں ایجنسیوں، آل انڈیا ریڈیو، پریس انفارمیشن بیورو، مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے دفاتر میں تعلقاتِ عامہ کے شعبوں سے وابستہ ہوئے۔ بعض نے قومی اخبارات اور نیوز ایجنسیوں کا رخ کیا۔ بعض بیرونِ ملک بھی ذرائع ابلاغ سے وابستہ ہوئے۔ بعض اضلاع کے نامہ نگاروں کو جن میں کام

کرنے کا مخلصانہ جذبہ تھا انھیں حیدرآباد طلب کرکے صحیفہ نگار بنادیا۔ شکر نگر کے نامہ نگار اور ضلع نلگنڈہ کے ایک پس ماندہ تعلقے کے نوجوان نے جو بہ حیثیت نامہ نگار ہفتہ دو ہفتے میں خبریں روانہ کیا کرتے تھے بہ حیثیت مترجم خدمات انجام دینے کی خواہش کا اظہار کیا تو جگر صاحب نے ان کا حوصلہ بڑھایا اور یہ نامہ نگار چند سال کے اندر سیاست کے ایڈیٹوریل ڈیسک پر کام کرنے کے قابل بن گئے اور انھیں باقاعدہ طور پر سب ایڈیٹر کا مقام حاصل ہوا۔ ۱۹۷۰ء کے دہے میں سیاست کے ادارتی اسٹاف میں اکثریت ایسے نوجوانوں کی تھی جو جگر صاحب کی حوصلہ افزائی کی بدولت اس پیشے سے وابستہ ہوئے۔ مسٹر محمود انصاری جو بچوں کے صفحے کے لیے مضامین لکھا کرتے تھے اور بچوں کا ایک رسالہ ایڈٹ کیا کرتے تھے اکثر و بیش تر جگر صاحب کی خدمت میں اپنا پرچہ پیش کرنے یا بچوں کے لیے اپنا لکھا ہوا کوئی مضمون اشاعت کے لیے دینے حاضر ہوتے۔ ایک دن جگر صاحب نے انھیں مضامین اور خبروں کے ترجمے کا کام شروع کرنے کا مشورہ دیا اور چند ماہ کے اندر انھیں صحیفہ نگار بنادیا وہ ایک عرصے تک سیاست سے بہ حیثیت سب ایڈیٹر وابستہ رہے اور بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر سیاست سے سبک دوشی کے بعد اخبار منصف جاری کیا۔ اسی طرح ذہانت علی بیگ کو انتہائی کم عمری میں ایک صحیفہ نگار بنادیا۔ اعجاز قریشی ایڈیٹر بھارت نیوز، مصطفےٰ علی اکبر نیوز ریڈر آل انڈیا ریڈیو دہلی، احمد معظم، چندر سریواستو اور مصطفےٰ کمال بھی اسی دور کے وہ نوجوان ہیں جنھیں جگر صاحب نے اپنی حوصلہ افزائی کے ذریعے صحیفہ نگار بنادیا۔

ایک کشمیری پنڈت ٹی این دھار کشمیر سے حیدرآباد منتقل ہوئے تھے۔ وہ رپورٹنگ کا بڑا ذوق رکھتے تھے اور اردو زبان سے بھی واقف تھے۔ کسی نے انھیں جگر صاحب کی سرپرستی حاصل کرلینے کا مشورہ دیا۔ چناں چہ وہ روزانہ جگر صاحب کی خدمت میں حاضری دیتے۔ ایک دن جگر صاحب نے انھیں کسی جلسے کی رپورٹنگ کے لیے روانہ کیا پھر کانفرنسوں میں انھیں سیاست کی نمائندگی کے لیے بھیجتے رہے۔ چند ہی ماہ میں انھوں نے رپورٹر کا مقام حاصل کرلیا۔ سیاست سے وابستگی کے ساتھ ساتھ اپنی ایک نیوز ایجنسی بھی چلائی۔ پھر قومی اخبار انڈین اکسپریس سے بہ حیثیت اسٹاف رپورٹر وابستہ ہوئے۔ ٹی این دھار دنیا میں اگر کسی کا احترام کرتے اور کسی سے ڈرتے تو وہ جناب عابد علی خاں اور جناب محبوب حسین جگر تھے۔ انڈین اکسپریس کے علاوہ ہندو اخبار اور ملک کی نیشنل نیوز ایجنسی پریس ٹرسٹ آف انڈیا کو بھی جگر صاحب کی رہ نمائی اور حوصلہ افزائی کے نتیجے میں مقام بنانے والے صحیفہ نگار حاصل ہوئے۔ جناب جمال الدین علی خاں اس وقت پی۔ ٹی۔ آئی حیدرآباد بیورو کے سربراہ کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں جنھوں نے بہ حیثیت صحیفہ نگار اعلیٰ صلاحیتوں کے علاوہ سنجیدگی، بردباری اور راست بازی کی وجہ سے معتبر شخصیتوں کی صف میں نمایاں مقام بنالیا ہے۔ سیاست کے ایڈیٹوریل ڈیسک کے لیے کسی کو تیار کرنے کے لیے جگر صاحب کا یہ طریقہ کار تھا کہ ابتدائی مرحلے میں ہی کوئی ذمہ دارانہ کام سپرد کردیتے اور عموماً ابتدا اضلاع کی خبروں کی ترتیب و ترجمہ سے کی جاتی۔ ان خبروں میں کوئی غلطی ہوجاتی تو عام طور پر دوسرے ہی دن یا تیسرے دن شکایت کا خط آجاتا تھا اور جگر صاحب متعلقہ شخص کی خبر لیا کرتے تھے۔ اس لیے اضلاع کی خبروں کی ترتیب کے مرحلے پر ہی ذمہ داری کا احساس تقویت اختیار کرجاتا پھر رفتہ رفتہ مقامی خبروں کی ذمہ داری سونپ دی جاتی۔ خبریں مرتب کرنے پر قدرے عبور حاصل ہوجانے پر ہی بیرونی خبروں کا ترجمہ کرنے کا موقع دیا جاتا اور رفتہ رفتہ فیچرس، انٹرویوز اور کالم نگاری کے مواقع عطا کیے جاتے۔

جگر صاحب کسی بھی شخص کو اس کی تمام تر صلاحیتوں کو بہ روئے کار لانے کا عادی بنادیا کرتے تھے انھیں اس بات کا پورا پورا

اندازہ ہوتا کہ کس شخص میں کس کام کی کس قدر صلاحیتیں موجود ہیں ۔ وہ اس مناسبت سے ذمہ داری سپرد کردیتے اور یہ توقع کرتے کہ ان ذمہ داریوں کی پوری تن دہی سے تکمیل ہو ۔ اس سلسلے میں کسی بھی تساہل کو ہرگز برداشت نہیں کرسکتے تھے ۔ اس لیے ہر شخص جگر صاحب کی دی ہوئی ذمہ داری کی تکمیل کے لیے اپنی ساری توانائیوں کو صرف کرنے اور حتی المقدور جگر صاحب کی توقعات کو پورا کرنے کے لیے اپنے آپ کو پابند اور مجبور محسوس کرتا ۔ اس طرح سیاست سے وابستہ ہر فرد میں چاہے وہ کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتا ہو ، پرخلوص انداز میں جاں فشانی کے ساتھ کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ۔

جگر صاحب کم از کم "سیاست خاندان" کے تمام افراد کے لیے کردار ساز ثابت ہوئے ۔ وہ ہر شخص کو اپنے ایک مخصوص ڈسپلن کا پابند بنادیتے جس میں کام کو ہی تمام امور پر ترجیح دینا لازمی ہوتا ۔ وقت کی پابندی کو غیر معمولی اہمیت دیا کرتے ۔ کسی کے دفتر پہنچنے کے مقررہ وقت کے گزرجانے کے ۵ منٹ بعد ہی وہ اس شخص کے انتظار میں بے چین ہوتے اور تاخیر کی صورت میں اس کے اسباب کے بارے میں ان کا پہلا سوال ہوتا ۔ اسی طرح وہ مقررہ کام کی تکمیل کے بعد کسی کو بے کار دفتر میں بیٹھے رہنے کی ہرگز اجازت نہ دیتے ۔ وہ چاہتے کہ دفتر سے گھر جاکر آرام کیا جائے اور جو بھی وقت مل جائے مطالعے میں گزارنا چاہیے ۔ تضیع اوقات ان کے نزدیک جرم تھا ۔ وہ خود چوں کہ ہمیشہ مصروف رہتے اس لیے ان کے سامنے ہر ایک ہمہ تن مصروف ہی ہوتا ۔ سب ایڈیٹرس کو وہ روزانہ "ہوم ورک" کے طور پر ملک کے مختلف ریاستوں سے تبادلے میں آنے والے اردو اخبارات اور بعض انگریزی اخبارات اور اخبارات کے تراشے دیا کرتے ۔

اردو اخبارات اگرچہ زیادہ معیاری نہیں ہوتے تھے اس کے باوجود جگر صاحب ان کے مطالعے کے لیے زور دیا کرتے اور کہا کرتے تھے کہ کسی بھی اخبار یا تحریر کو ہیچ تصور نہیں کرنا چاہیے ۔ ان کے مطالعے سے کچھ نہ کچھ معلومات ضرور حاصل ہوتی ہیں ، کم از کم ان علاقوں کے صحیح ناموں سے تو واقفیت حاصل ہوتی ہے جو ہمارے لیے نئے ہوتے ہیں ۔ جگر صاحب کے دیے ہوئے اخبارات کے مطالعے سے گریز ممکن نہیں ہوتا کیوں کہ اکثر و بیشتر ان کا امتحان لیا کرتے تھے ۔ وہ اخبارات حوالے کرتے وقت کسی مضمون پر خود نظر ڈال لیتے اور اسے نشان زد کرتے ۔ دو دن بعد اس کے بارے میں استفسار کرتے کہ یہ مضمون کیسا تھا ۔ اس لیے اس سلسلے میں جگر صاحب کی ہدایات کی تعمیل سے مفر ممکن نہیں ہوتا ۔ شعبۂ ادارت سے وابستہ ہر کارکن کو وہ اکثر و بیشتر "ہر فن مولا" بنانے کی کوشش کرتے اور ان سے ایسے کام کرواتے جن کے لیے وہ نہ تو تیار رہتے اور نہ اپنے آپ کو اس لائق تصور کرتے تھے لیکن اچانک ذمہ داری عائد کرتے ہوئے یہ کام کرواتے اور معمولی فروگذاشت کو درگزر کرتے ہوئے اس کام کی تعریف کے ذریعے حوصلہ بڑھاتے ۔ اس طرح ایک سب ایڈیٹر کو وہ نہ صرف خبروں کے انتخاب ، ترجمہ ، ایڈیٹنگ کی تربیت دیتے اور اس میدان میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرنے دیتے بلکہ اخبار کے بعض مستقل کالم لکھنے کی ذمہ داری بھی سونپتے ۔ اس لیے گھر سے نکل کر دفتر پہنچنے تک کسی سب ایڈیٹر کے سامنے ایسی کوئی واضح تصویر نہیں ہوتی کہ آج جگر صاحب کس قسم کا کام لیں گے ۔ وہ اخبار کی ضرورت کے علاوہ سب ایڈیٹر کو مختلف انداز کا کام کرنے کے قابل بنانے سے دل چسپی رکھتے تھے ۔ دفتر پہنچنے پر اچانک فکر و نظر کا کالم تیار کرنے کی ہدایت دیتے یا کسی دن مضمون لکھنے کی ذمہ داری سونپ دی جاتی کسی دن رپورٹنگ کی یا کسی شخصیت کا انٹرویو لینے کی ذمہ داری عائد ہوتی ۔ اس طرح ایک سب ایڈیٹر کو ان کی رہ نمائی میں اخبار کے ہر کام کے قابل بنانے کی کوشش کیا کرتے ۔ اور یہ طریقۂ عمل سیاست کے کارکنوں کو ہر میدان میں اپنے جوہر دکھانے کے قابل

نادیتا تھا۔ جس طرح کہا جاتا ہے کہ پرانے شہر کی سڑکوں پر موٹر کار یا اسکوٹر چلانے والا دنیا کے کسی شہر کی ٹریفک میں ڈرائیونگ کے ابل بن جاتا ہے اسی طرح سیاست میں چند سال گزارنے والا سب ایڈیٹر کم از کم اردو اخبار یا ٹی وی/ ریڈیو یا میگزین میں کامیاب کارکن بت ہوسکتا ہے۔

راقم الحروف پر جگر صاحب کا احسان ہے کہ انھوں نے سیاست کے لیے اپنانے کے بعد اپنی شفقت سے حوصلہ بڑھایا اور اس ظیم اخبار کے جو ایک دیوہیکل مشین کی طرح ہے ایک معمولی پرزے کی طرح کام کرنے کے قابل بنایا۔ ورنہ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے دہے ں جب کہ اردو صحافت کا مستقبل تاریک محسوس ہوتا تھا۔ میں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھنے کی کوشش کی تو بعض مخلصین نے جو اس میدان میں برسوں سے سرگرم عمل تھے بڑے خلوص کے ساتھ یہ مشورہ دیا تھا کہ میاں ابھی تمھاری عملی زندگی کے آغاز کا رحلہ ہے۔ ہماری مانو تو کوئی ایسا کیریر تلاش کرو جو تمھیں معاشی خوش حالی عطا کرسکے۔ لیکن یہی بزرگ حضرات آج میرے اس پیشے سے ، دستور وابستگی پر انتہائی مسرور ہیں اور مجھے داد دیتے ہیں کہ میں نے شبانہ روز کی محنت و مشقت کے ساتھ اپنے آپ کو جگر صاحب کے قررہ معیار پر پورا اترنے کی کوشش کی اور کامیاب ثابت ہوا ورنہ اس طویل عرصے کے دوران کئی حضرات نے پیشۂ صحافت سے منھ وڑلیا۔ میری اس ثابت قدمی میں بڑا دخل جناب عابد علی خاں اور جناب محبوب حسین جگر کی مشفقانہ رہ نمائی اور جناب ہاشم سعید کی زبیت کا رہا۔ ہاشم صاحب نے ایک چیلینج کے طور پر مجھے سب ایڈیٹر بنایا اور جگر صاحب کے مقررہ معیار اور اخبار سیاست کے تقاضوں ی تکمیل کی صلاحیتیں پیدا کیں۔

ادارۂ سیاست نے جرنلزم کی ایک یونیورسٹی کا کردار بھی ادا کیا۔ ایسے وقت جب کہ ملک کی کسی یونیورسٹی میں جرنلزم کی باقاعدہ لور پر کوئی تعلیم نہیں دی جاتی تھی اور عثمانیہ یونیورسٹی میں جرنلزم کورس کے ۱۹۷۰ء کے دہے میں آغاز کے بعد صرف امریکن جرنلزم کے صاب کی تعلیم دی جاتی تھی، ادارۂ سیاست میں کئی گریجویٹس نے عملی تربیت کے ذریعے اپنی قابلیتوں میں جرنلزم کا اضافہ کرتے ہوئے عوامی اور خانگی شعبے کے اداروں میں نمایاں عہدے حاصل کیے۔ کئی ادیبوں اور شاعروں کو ان کی حوصلہ افزائی کے ذریعے جناب محبوب سین جگر نے عوامی مقبولیت حاصل کرنے کے قابل بنایا۔ ایسے ادیبوں اور شاعروں کی تعداد کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ جگر صاحب نے ردو صحافت میں پہلی مرتبہ مضمون نگاروں، شاعروں کو معاوضہ ادا کرنے کی روایت قائم کی۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ بعض سرکردہ ادیب و شاعر اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ ایک اردو اخبار ان کی تخلیقات کا معاوضہ ادا کرتا ہے۔ جگر صاحب کا بنیادی نصب العین سیاست" کی ترقی، اس کی عوامی مقبولیت میں اضافہ، اردو زبان کی بقا و فروغ اور اردو سے وابستہ گنگا جمنی تہذیب کا ارتقا۔ وہ اپنی ساری عملی زندگی میں بس اس نصب العین کے تحت شبانہ روز مصروف رہے۔

جگر صاحب کا یہ وصف بھی قابلِ ذکر ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں مقاصد کے حصول کے لیے کسی "نشانہ" کی تکمیل پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک سنگِ میل پر پہنچنے کے بعد وہ دوسرے سنگِ میل کی جانب آگے بڑھنے کی جستجو میں مصروف ہوجاتے۔ کسی کامیابی پر فخر کرنا انھیں ہرگز گوارا نہیں تھا بلکہ اپنی کمزوریوں کا محاسبہ کرنے سے انھیں دل چسپی ہوتی۔ آخری دنوں میں جب کہ وہ بسترِ مرگ پر تھے جب جگر صاحب کو فخریہ انداز میں یہ مژدہ سنایا گیا کہ سیاست کی اشاعت کے ۵۰ ہزار تک پہنچ جانے کا ABC سرٹیفکیٹ مل گیا ہے

(آگے ص ۸۱ پر)

فیروز بخت احمد

محبوب حسین جگر

قلم سے تلوار کا کام لینے والا صحافی

اللہ پاک محبوب حسین جگر کی مٹی خوش بودار کرے ۔ میرے لیے کافی عرصے سے ایک جانی پہچانی شخصیت تھے ۔ انھیں میں نے ایک سچے، کھرے اور بے باک صحافی کے طور پر جانا ۔ ہردل عزیز و کثیرالاشاعت حیدرآبادی روزنامہ سیاست کے جگر صاحب روحِ رواں تھے ۔ انھوں نے اپنی کاوشوں سے اردو کی خدمت کے جذبے اور لگن سے روزنامہ سیاست کو ہندوستان کا ایک معتبر موقر اور خوش نما روزنامہ بنا دیا تھا ۔

جگر صاحب (اللہ ان کی مغفرت کرے) کا تعلق اس نسل سے تھا جو مذہب کی اعلیٰ روحانی اور اخلاقی قدروں سے قومیت کا تصور اخذ کرتی تھیں اور جس کو ہندوستان کی وطنیت اور قومیت پر فخر تھا ۔ دلی میں جناب شاہد صدیقی کے دفتر میں اکثر ان کی تعریف سنا کرتا تھا ۔ حالاں کہ پیشے کے اعتبار سے شاہد صدیقی ان کو اپنا Competitor سمجھتے تھے مگر ذاتی اعتبار سے ان کے مداح تھے ۔ شروع شروع میں میرے مضامین کی اصلاح جگر صاحب نے ہی کی اور یہ میرے لیے سعادت کا مقام تھا کہ ان مضامین کو انھوں نے اپنے اخبار میں شائع ہی نہیں کیا بلکہ ہمت افزائی بھی کی ۔

حقیقت تو یہ ہے کہ محبوب حسین جگر صاحب ایک جید صحافی اور وسیع التجربہ اخبار نویس تھے ۔ انھوں نے مرحوم عابد علی خاں، بانی سیاست کے ساتھ اس زمانے میں کام کیا جب مقبولِ عام روزنامہ نکالنا بڑے دل گردے کی بات تھی ۔ ابتدا میں جگر صاحب اور عابد صاحب اخبار کے لیے ہر قسم کا کام کرتے تھے چاہے وہ قلم سنبھالنا ہو کتابت کرنی ہو یا اخبارات کے بنڈل سر پر ڈھو کر پاس کے ڈسٹری بیوٹر یا ہاکرز کے پاس لے جانا ہو ۔ پریس میں جانے والی پلیٹیں بھی یہ حضرات دھو کر ہاتھ کالے کیا کرتے تھے ۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ سیاست آج اس مقام پر پہنچا ہے ۔ جگر صاحب نے ایک ننھے سے پودے کو اپنے ہاتھوں سے سینچ سینچ کر بڑھا کے ایک تناور درخت کی شکل دے دی تھی جس کے کئی حصے نئی جڑیں پکڑ چکے تھے اور نئی پتیاں اور نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں ۔ موجودہ مدیر جناب زاہد علی خاں بھی اسی کا ایک حصہ ہیں، مجتبیٰ حسین بھی اسی کا ایک حصہ ہیں ۔ اردو صحافت میں روزنامہ سیاست کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے آزادی کے بعد کے بیش تر صحافیوں کی تربیت کی تھی ۔ یہ جگر صاحب کا ہی فیضان ہے کہ اردو صحافت میں آج زاہد علی خاں کا نام عزت سے لیا جاتا ہے ۔ زاہد علی خاں صاحب کامیاب مدیر اس لیے بھی ہیں کہ ان کی تربیت عابد علی خاں مرحوم کے علاوہ جگر صاحب

نے بھی بڑی شفقت کے ساتھ کی۔

عام طور پر دنیا میں ہوتا یہ ہے کہ لوگ پیدا ہوتے ہیں، زندہ رہتے ہیں اور مرجاتے ہیں ان کی موت پر ان کے اعزا آنسو بہاتے ہیں، احباب کف افسوس ملتے ہیں لیکن کچھ دن بعد لوگ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ کون کب پیدا ہوا، جیا اور کب مرگیا لیکن اس کے برعکس کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی پیدائش ان کے اردگرد کے ماحول کے لیے ذاتی اہمیت کے واقعہ سے زیادہ معنی نہیں رکھتی لیکن ان کی زندگی کچھ اس طرح سے گزرتی ہے کہ ان کے وجود کی معنویت اور ان کے فکر و عمل کی افادیت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ ہمارے بیچ سے اٹھ جاتے ہیں۔ ایسی ہی ایک یگانۂ روزگار اور اہم ترین شخصیت حضرت محبوب حسین جگر کی تھی۔

انھوں نے تمام عمر مصلحت سے زیادہ مسائل میں دلچسپی دکھائی اور اکثر و بیشتر اس کے لیے انھوں نے تمام عمر کے رفیقوں اور ساتھیوں کو چھوڑنا بھی گوارا کیا۔ "سیاست" کی پرانی فائلیں پڑھ کر اس بات کی گواہی دی جاسکتی ہے کہ جگر صاحب نے نوکِ قلم سے نشتر اور اس کی روشنائی سے مرہم کا کام لیا۔ ایک ایسے ماحول میں جب شکوے اور شکایت کی تہذیب کے بجائے شکریے کی تہذیب کو پروان چڑھایا جارہا تھا تو محبوب حسین جگر صاحب نے ضربِ کلیم، کی سنت پر عمل کیا۔ انھوں نے آندھرا کے ہی نہیں تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ مسلمانوں کو میدانِ عمل میں حب الوطنی کے جذبہ کے ساتھ ایک نئی جدوجہد کے لیے تیار کیا۔ خدا کی اس بستی میں وہ خدا کے ایسے بندوں میں تھے جو نہ صرف باہمت اور عزمِ محکم والے تھے بلکہ جو اپنی راہ خود بناتے ہیں۔ اپنی تحریروں کے ذریعے وہ انگاروں پر چلنے اور چٹانوں کو توڑنے کا سبق دیتے تھے۔ حالاں کہ کامیابی سے جگر صاحب اکثر ہم کنار رہے مگر ناکامیوں سے بھی نہ گھبرائے۔ ہر ناکامی کے بعد مردانہ وار حوصلے کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے۔ ایسوں کی زندگی نسلوں کے لیے نشانِ راہ ہوتی ہے اور قومیں ان کو اپنا کر اپنی تعمیر کرتی ہیں۔ مرے لیے وہ ایک شفیق اور دل سے قریب بزرگ و مشیر رہے۔ اکثر ان کے خطوط میرے پاس آیا کرتے تھے۔ ایک خط میں انھوں نے ذکر کیا کہ زاہد علی خاں صاحب امریکہ گئے ہوئے ہیں اور ان کے سامنے چاہیے اتنی نہیں مگر ان کے پیچھے ذمہ داری بے تحاشا بڑھ جاتی ہے اور یہ کہ اولاد سے بھی بڑھ کر انھوں نے "سیاست" کو چاہا اور اس کا کام کیا۔ ایسے زمانے میں جب کہ قلم آزاد ہوتے ہوئے بھی زنگ آلود تھے جگر صاحب نے قلم سے تلوار کا کام لیا۔ انھوں نے سماج کے کم زور طبقات بالخصوص اقلیتوں اور پسماندہ برادریوں کو دیے گیے آئینی تحفظات کو عمل کی کسوٹی پر رکھنے کا دلیرانہ اقدام کیا جس کے لیے حیدرآباد کے مسلم و پچھڑے ہوئے طبقوں میں ان کا نام عزت سے لیا جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ اگر نیت نیک ہے تو ہر مشکل آسان ہوجاتی ہے۔ جگر صاحب کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

کچھ عرصہ قبل فروری میں اردو یونیورسٹی کی ایک تقریب میں حصہ لینے آیا تو دوسرے دن یعنی ۱۵ فروری کو "سیاست" کے دفتر گیا کہ زاہد صاحب کے ساتھ ساتھ جگر صاحب کی ملاقات کا فیض بھی حاصل ہوجائے گا۔ مگر دفتر میں جاتے ہی زاہد صاحب سے جگر صاحب کی طبیعت کی ناسازی کی خبر سنی۔ دل بہت اداس ہوا۔ یہ سن کر کہ وہ اسپتال میں ہیں، حیدرآباد آنے کی خوشی کوفت میں تبدیل ہوگئی۔ وہیں قریب میں ہی مجتبیٰ حسین صاحب تشریف فرما تھے۔ محبوب حسین جگر صاحب کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ بھائی بستر پر لیٹے لیٹے بھی اس قدر کام کرلیتے تھے کہ ایک نوجوان اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس قدر کام انجام نہیں دے سکتا۔ اخبار کے لیے لکھنا پھر اپنی ڈاک

کا جواب تحریر کرنا اور کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا تمام کام بھی وہ بیماری کی حالت میں بڑی مستعدی سے کرتے تھے ۔

محبوب حسین جگر صاحب کے انتقال کی دل خراش خبر مجھے فون پر حیدرآباد کے میرے ایک عزیز دوست جناب محمود بن محمد (سعودی عرب میں ہند کے سابق سفارت کار) نے دی "جگر صاحب کا انتقال ہوگیا ہے ۔ وہ کافی دن سے علیل تھے " دھیمے اور افسردہ لہجے میں کہے گیے یہ الفاظ پگھلے ہوئے شیشے کی طرح میرے کانوں میں اتر تے چلے گئے ۔ میں کھویا سا بیٹھ گیا ۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھ سے کیا کہا گیا اور میں نے کیا سنا ۔ ایسا محسوس ہوا جیسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب ہو چکی ہے ۔ لیکن جلد ہی کُلّ من علیہا فان کی حقیقت ذہن کے پردوں پر روشن ہو گئی اور میں انا للہ وانا الیہ راجعون کہتا ہوا کھڑا ہو گیا ۔ میرا ذہن اس اندوہناک اور جاں فرسا حقیقت کو تسلیم کر چکا تھا کہ جگر صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے ۔ محمود صاحب نے کچھ اس طرح کا خیال بھی ظاہر کیا کہ شاید اب " سیاست " کا وہ معیار نہ رہے ۔ اس بات پر میں نے محمود صاحب سے اتفاق نہیں کیا کیوں کہ اپنی زندگی میں وہ ادارۂ سیاست میں ایسی ٹیم بنا گئے ہیں اور اس طرح سے اس ٹیم کو تربیت دے گئے ہیں کہ اخبار کا معیار گر نہیں سکتا ہاں بلند ضرور ہو سکتا ہے ۔

جگر صاحب سے قریب رہنے والا کوئی شخص بھی ان کے متعلق یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ جیسا سنا اس سے بڑھ کر پایا ۔ اچھے لوگوں کے متعلق اظہارِ حقیقت بھی تعریف و خوشامد معلوم ہونے لگتی ہے لیکن میں اس خوف کی وجہ سے حقائق بیانی سے روگردانی ہرگز نہ کروں گا ۔ جگر صاحب انتہائی خلیق اور سنجیدہ انسان تھے ۔ وہ ہلکی شخصیت والے لوگوں میں نہیں تھے جو بات بات پر کھلکھلا کر ہنستے اور قہقہے لگاتے ہیں بلکہ نرم و دل آویز تبسم کے خلوص کے پھول برسا دیتے تھے ۔ ان کا چہرہ تاثرات کا آئنہ تھا ۔ جب جوش و خروش کے ساتھ عزم و حوصلہ کی بات کرتے تو ان کے چہرے پر تناؤ صاف نظر آتا تھا ۔ جب وہ صبر و تحمل کی تلقین کرتے تو چہرے پر نرمی و ملائمت عیاں ہو جاتی ۔ قدم قدم پر ان کے اوصاف حمیدہ کے مشاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ فارسی کی مثل شنیدہ کے بود مانند دیدہ ان پر پوری اترتی ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کے قول و فعل میں یکسانیت کی دلیل تھی ۔ قلبی لگاؤ، خلوص اور ہمدردی کا یہ عالم تھا کہ نہ صرف دفتری و کاروباری امور میں ہر طرح معاونت اور ہمت افزائی کرتے تھے بلکہ کسی کی دل شکنی نہ ہو اس بات کا خاص خیال رکھتے ۔ " سیاست " کے رپورٹرز کے لیے وہ چلتی پھرتی ڈکشنری تھے ۔ جنگ وہ بندوق سے نہیں قلم سے لڑنے کے قائل تھے ۔

صحافی بہت پیدا ہوتے ہیں اور پیدا ہوتے رہیں گے لیکن جو مقام جگر صاحب نے ہندستان میں اردو اخبار نویسی میں پایا ہے وہ کم ہی خوش نصیبوں کو حاصل ہوتا ہے ۔ جگر صاحب کے بارے میں یہ بات اچھی طرح ثابت ہو گئی کہ وہ جذبۂ ملی میں جماعتوں اور افرادِ حکومت اور اقتدار کی کبھی پرواہ نہیں کرتے تھے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے مسلم قارئین کے لیے انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ انھیں جیسا صحافی دے سکتا تھا ۔ وہ سیاست میں جا سکتے تھے ، الیکشن لڑ سکتے تھے مگر نہیں ، خدمت انھوں نے کی اور صحیح معنوں میں قلم سے کی ۔ روزنامہ " سیاست " سے ان کا جگری رشتہ تھا ۔ انھوں نے اپنی ذاتی آمدنی " دنیاوی منفعت " منصب اور شخصیت پر حملے کی بھی پرواہ نہیں کی اور نہایت ہی نڈر ، بے باک اور بے خوف صحافی کی حیثیت سے ملک ، قوم اور ملت کی خدمت و ترجمانی کرتے رہے ۔ ان کی مقبولیت صرف ہندوستان میں ہی نہیں تھی بلکہ پاکستان اور لندن کے اردو اخبارات میں بھی اکثر ان کا ذکر رہتا تھا ۔ اکثر ان کے مضامین " سیاست " سے اخذ ہو کر " جنگ " اور " نوائے وقت " میں شائع ہو چکے ہیں ۔ یہ بات شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو ۔ چوں کہ یہ دونوں

اخبارات پابندی سے میرے پاس آتے ہیں تو اس بات کا اندازہ ہوا ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کالم ان دونوں اخبارات کو بھی روانہ کیا جارہا ہے۔

جگر صاحب کی خاص خوبی تھی مسلم طبقے کے لیے تعلیم سے دلچسپی ۔ نوجوانی کے دور میں تعلیم کے میدان میں انھوں نے نام و نمود و شہرت کی پرواہ کیے بغیر بہت کام کیا ۔ شروع سے ہی جگہ جگہ تعلیمی انجمن بنوادیتے ۔ اپنی تحریروں میں نہ صرف انھوں نے تعلیم کی افادیت پر زور دیا بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کو احساسِ کم تری کی کھائیوں سے باہر نکالا۔ حیدرآباد ہی نہیں بلکہ تمام ہندوستان کی اردو تہذیب ان کی قرض دار ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ان جیسا عزم وارادہ و قوت عمل شاید ہی ان کے ہم عصروں میں سے کسی کو حاصل ہو۔ لیکن سچ ہے :

"زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے"

انا للہ وانا الیہ راجعون

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں ۔ دست بہ دعا ہوں کہ حضرتِ حق جل مجدہ ان کو اپنی رحمتوں سے نواز تا رہے اور مراتب بلند ہوتے رہیں ۔

بس ان کے واسطے یہی حسرت دعا رہے
مرقد پر ان کی لالہ و ریحاں بچھا رہے

00000

ملسلہ ص ۷۷)

تو دل ہی دل میں وہ بے حد مسرور ہوئے لیکن مژدہ سنانے والوں کو یہ کہتے ہوئے اس کامیابی پر فخر کرنے سے ٹوک دیا کہ تعداد اشاعت تو بڑھ گئی لیکن اخبار کے معیار کو بہتر بنانے اور غلطیوں کی اصلاح پر توجہ دینے کی ضرورت ہے ۔

جگر صاحب کے انتقال سے یقیناً ایسا خلاہم محسوس کرتے ہیں جس کا پر ہونا کئی اعتبار سے ناممکن ہے لیکن مرحوم نے اپنی زندگی میں اپنی متاعِ عزیز " سیاست " کی سربلندی کے لیے سارے جتن کیے اور جناب زاہد علی خاں، جناب ظہیر الدین علی خاں کے علاوہ مسٹر عامر علی خاں کی تربیت پر خاص توجہ دی ۔ جناب عابد علی خاں صاحب کے انتقال کے بعد تو جگر صاحب نے عامر علی خاں کو سیاست کے شعبۂ ادارت کے لیے تیار کرنے پر ساری توجہ مرکوز کردی تھی ۔

جگر صاحب نے اپنے زندگی میں بعض ایسے کارکنوں کو بھی تیار کیا جو مختلف شعبوں میں مخلصانہ خدمات کا جذبہ رکھتے ہیں ۔ یہ مخلص کارکنانِ سیاست کا اثاثہ ہیں جن کی وفاداری کو بعض حاسدین نے " فلاں " کا نام دینے کی کوشش کی لیکن وہ " سیاست " کے لیے مقدور بھر خدمات انجام دینے کا ایسا جذبہ رکھتے ہیں جو عابد علی خاں اور محبوب حسین جگر کے مشن کو جاری رکھنے میں معاون ہو ۔ یہ کارکن سیاست کا قیمتی اثاثہ ہیں ۔

000

منیر احمد صدیقی

یمین الصحافت، جناب جگر مرحوم
چند دل نواز یادیں

صحافت کو چوتھی مملکت کہا جاتا ہے ۔ اس مملکت کے جنابِ جگر ایک عظیم ستون تھے ۔ دنیا میں صحافی تو بہت ہیں مگر ایسے صحافیوں کا ہمیشہ قحط رہا ہے جو صحافت کے رموز میں درک رکھتے ہوئے دیانت کے حامل بھی پائے جاتے ہوں لیکن جگر صاحب کی طبیعت کی سادگی، سنجیدگی، متانت، احساسِ انسانیت، دردمندی کی کیفیت ایسی تھی جو ہر جاننے والے کو ان کا گرویدہ و معتقد بنادیتی۔ حیدرآبادی اور خاص طور پر عثمانین تہذیب کے یہ بڑے ہی دل دادہ بلکہ عاشقِ زار تھے ۔ آنے والی نسلوں کو اپنے قدیم روشن تہذیبی اقدار سے واقف کرانا ان کا مطمحِ نظر تھا ۔ اس کے ہر پہلو کو ضبطِ تحریر میں لاکر وہ محفوظ کردینا چاہتے تھے ۔ ان کی نظرِ انتخاب بڑی ماہرانہ تھی وہ ہر موضوع کے لیے موزوں شخصیتوں کا انتخاب کرکے ان موضوعات پر ان سے ضرور کچھ نہ کچھ لکھواتے ۔ اپنے چھوٹوں سے بڑے خلوص و اپنائیت سے ملتے ۔ ان کے خاندانی پسِ منظر سے واقف ہوتے تو ان سے بڑی التفات آمیز شفقت سے پیش آتے اور خاندان کے ہر فرد کا حال دریافت فرماتے ۔ میرے بزرگوں سے ، مجھ سے زیادہ واقف تھے ۔ مجھے ملاقات کے لیے زیادہ ہی وقت دیا کرتے ۔ اکثر گفتگو میں کبھی مسکراتے اور کبھی میری باتوں پر کھلکھلا کر ہنس دیا کرتے ۔ یہ گفتگو اکثر تہذیبی و صحافتی اور تاریخی موضوع پر ہوتی ۔ کبھی یاد فرمالیا کرتے اور کسی خاص موضوع پر فوری لکھنے کی تاکید فرماتے ۔ اثناءِ گفتگو خاموش ہو جاتے اور کسی سوچ میں غرق ہو جاتے ۔ انتقال سے چند ماہ قبل "حیدرآباد کی خفیہ پولیس کے کارنامے" اچانک گفتگو کا موضوع بن گیا تھا ۔ ارشاد فرمایا فضلِ رسول خاں اور تمہارے بہنوئی خواجہ الطاف احمد کے کارناموں پر ضرور تم کچھ لکھو ۔ میں نے عرض کیا مواد اکٹھا کرنے میں بہت دیر لگ جائے گی اس کے بعد ہر ملاقات میں ضرور یاددہانی فرماتے اور کہتے "کیا ابھی مواد اکٹھا نہیں ہوا" میں بڑا جزبز ہوتا ۔ ان کی دل چسپی اور اصرار پر میں نے بہ عجلتِ ممکنہ مضمون کو مرتب کر ہی دیا ۔ یہ میرے بخت کی یاوری کہ وہ ان کی وفات سے ایک روز قبل ہی چھپا اور ان کے ملاحظے سے گزرا ۔ اکثر مضامین لکھنے میں جناب عابد علی خاں مرحوم کی طرح یہ بھی میری استادانہ رہنمائی فرماتے جو میرے لیے باعثِ فخر ہے ۔

ان کے ادبی اور صحافتی کارناموں پر تو محققین و سیرت نگار یقیناً بڑے تحقیقی و تفصیلی انداز میں روشنی ڈالیں گے ہی مگر میں یہاں قارئین کی دل چسپی کے لیے بعض ایسے واقعات پیش کرتا ہوں جو ذاتی مشاہدات پر مبنی ہیں اور جس کا شاید ہی کسی کو علم ہو۔

جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کے بعد اپنے معاشرے کے بعض افراد اور خاندانوں کی معاشی زبوں حالی کا اوروں کی طرح انھیں بھی

پرملال احساس تھا۔ اسی تباہی سے متاثر ایک نامی گرامی خاندان کے لڑکے کو جس کے والد سے میرے دوستانہ مراسم تھے میں جناب جگر صاحب کے پاس لے کر پہنچا اور اس کی ساری بپتا کہہ سنائی۔ انھوں نے خاموش دردمندانہ احساس سے ساری کہانی سنی اور اپنی زیر نگرانی اس کو پریس میں ملازم رکھ لیا اور اس طرح ان کے نان شبینہ کا ذریعہ مہیا کردیا۔ انھیں نوجوانوں کی فنی تعلیم سے بڑی دل چسپی تھی۔ چناں چہ حیدرآباد کے ایک قدیم پریس کے مالک کے خاندان کے ایک لڑکے کو میری سفارش پر اپنے یہاں آفسٹ کی ٹریننگ دلائی جواب کئی برس سے بیرونِ ملک معقول مشاہرے پر ملازم ہے اور وہاں پریس ہی سے وابستہ ہے۔ جب بھی آتا ہے بڑے ہی احسان مندانہ جذباتِ ممنونیت و تشکر سے سرشار قدم بوسی کے لیے حاضر ہو جاتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ عثمانین تہذیب کے یہ دو کوہِ نور عابد علی خاں اور محبوب حسین جگر اپنے کردار و عمل کی تاب ناکی کے ساتھ اپنی قوم کے لیے یک جہتی و آشتی، مروت و انسانیت دوستی کا ایک روشن مینار بنے ہوئے تھے۔ حمایت نگر میں جناب مکرم الدین سابق ایم ایل۔ اے کی قیام گاہ کے احاطے میں مین روڈ پر شری راجیا کا ٹی اسٹال قائم تھا جہاں صبح صبح سب ہی اخبارات دست یاب رہتے۔ یہ میرے گھر سے چند ہی قدم کے فاصلے پر تھا۔ صبح کی چہل قدمی سے واپس ہوتے ہوئے محلے کی سب ہی سر کردہ و سر برآوردہ شخصیتیں اس سے اپنی اپنی پسند کا اخبار خریدا کرتیں۔ راجیا کا قیام دول گوڑے میں تھا اس کی شریک کار اس کی بیوی ہی تھی اور کوئی نہ تھا۔ چہرے پر موٹے موٹے شیشوں کی ڈوری سے بندھی عینک لگی رہتی۔ ایک روز اخبار کو کافی دیر ہوگئی۔ پتہ چلا کہ راجیا گھر کے قریب اندھیرے میں سیکل پر سے گر پڑا۔ راجیا جس کی پرورش مشہور ڈاکٹر جبار نے کی تھی ماقبل پولیس ایکشن کے سیاسی اتھل پتھل کا ایک عوامی مبصر تھا۔ کامریڈ مخدوم، کامریڈ روی نارائن ریڈی کی خفیہ سرگرمیوں اور رضاکار لیڈر قاسم رضوی کی تقریروں پر بڑے مزے لے لے کر تبصرے کیا کرتا۔ یہ اس دور کی گویا ایک چلتی پھرتی تاریخ تھا۔ عینک ٹوٹ جانے سے بڑا اداس ہوکر مجھ سے کہنے لگا صاحب اب کیا ہوگا؟ میں نے کہا گھبراؤ نہیں گیارہ بجے دفتر سیاست جانا تمھارا سب انتظام ہو جائے گا۔ کہنے لگا مجھے کون پہچانے گا۔ میں نے ایک تعارفی خط جناب عابد علی خاں مرحوم کو اس استدعا کے ساتھ لکھا کہ "آپ کی نگاہِ کرم اس کی نظروں کا نور بڑھادے گی" خط لے کر یہ دفتر پر پہنچ گیا جہاں نواب عابد علی خاں نے اس کی پذیرائی کی۔ آنے جانے کا کرایہ بھی دیا اور فیضِ عام ٹرسٹ سے اس کے لیے عینک کی فراہمی کا انتظام بھی کردیا۔ راجیا نے بڑی معقول قیمت کا خوب صورت فریم پسند کیا اور ہر صبح اپنے گاہکوں کو خاص طور پر کہتا کہ دیکھو سیاست کے نواب صاحب نے مجھے یہ عینک دلائی ہے۔ میں جب اظہارِ تشکر کے لیے پہنچا تو جگر صاحب مجھ سے فرمانے لگے تم نے ایک جملے میں مدعا پیش کردیا۔ اب اس کا ایک انٹرویو ضرور لو۔ انسانیت دوستی اور قومی یک جہتی کی یہ ایک بے نظیر مثال ہے۔ مرحوم جگر صاحب بے کس و بے آسرا بیواؤں اور یتیموں کی ایسی بروقت خاموش مالی امداد کردیا کرتے کہ کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ ایسی ہی ایک بیوہ خاتون ان کے انتقال کی خبر سن کر ہمارے گھر پہنچی جس کی یتیم لڑکی کی شادی کے موقع پر انھوں نے معقول رقمی امداد کی تھی اور یہ یاد کرکے زار و قطار رونے لگی۔ انسانیت سے سچی ہم دردی اور دردمندی کی یہ ایک عملی مثال ہے ان لوگوں کے لیے جو زبانی ہم دردیوں کا راگ الاپتے ہیں۔ رسول اللہؐ کو بے کس عورتوں کی دست گیری سے دل چسپی تھی۔ جب بھی رسول اللہؐ کی سیرت کا ذکر آتا ان کی آنکھیں نمناک ہو جاتیں۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی مجلسِ نظماء کے معزز رکن تھے۔ مجھے بھی اس کی رکنیت کا اعزاز حاصل ہے۔ چند سال پہلے

(آگے ص ۸۷ پر)

شریف اسلم

کیا خوب آدمی تھا
(حضرت محبوب حسین جگر کی یاد میں)

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام ، لاساقی

شہرِ مہر و محبت ، گہوارہ علم و دانش ، حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں پچھلے دنوں بہ روز شنبہ بتاریخ ۱۱ مارچ ۱۹۹۷ ، ایک ایسے ہی بادہ کش نے بساطِ زندگی لپیٹ کر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی لیکن اس سے قبل اپنے عزمِ محکم اور سعیِ پیہم سے ایک ننھے منے پودے کو تناور درخت میں تبدیل ہوتا ہوا بہ چشم خود دیکھا ، مطمئن اور مسرور ہوئے اور پھر یہ امانت نئی نسل کے ہاتھوں میں سونپ کر اپنے حقیقی سے جاملے ۔

یہ تھے محبوب حسین جگر ۔۔۔۔ شاعر ، ادیب ، کہنہ مشق و نام ور صحافی ، اور مادر علمی جامعہ عثمانیہ کے مایۂ ناز سپوت تہذیب دکن ، بانی شریک مدیر روزنامہ سیاست ۔ نصف صدی قبل اپنے جگری دوست عابد علی خاں کی رفاقت میں حیدرآباد دکن میں روزنامہ " سیاست " کی بنیاد رکھی۔ اس وقت کے آزمائشی دور میں جب کہ دکن کی شہرہ آفاق تہذیب و ثقافت کو نیست و نابود کرنے کے تمام جتن کیے جارہے تھے ایک اردو روزنامہ جاری کرنا ، یقیناً جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا ۔ کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ یہ شجر برگ و بار لائے گا ۔ لیکن عابد علی خاں اور محبوب حسین جگر نے مجروح کے اس قول کو اپنے دل و دماغ میں جاگزیں کرلیا تھا :

سنگ تو کوئی بڑھ کے اٹھاؤ ، شاخِ ثمر کچھ دور نہیں
جس کو بلندی سمجھے ہو ، ان ہاتھوں کی کوتاہی ہے

" سیاست " کے ان بانیوں نے ایک جان دو قالب بن کر شبانہ روز محنت کے ذریعے سچی لگن اور سچی دھن کے ساتھ روزنامے کو برِ صغیر کا ایک معتبر بااثر اور باوقار روزنامہ بنا کر چھوڑا اور اس طرح اردو صحافت کی بہترین روایات کو پروان چڑھانے میں اپنی جان کھپادی ۔

سیاست کے ابتدائی دور میں راقم الحروف کو بھی اس سے وابستگی کا اعزاز حاصل رہا ہے اور وہ اپنے ذاتی مشاہدے کی بنا پر بلاخوف تردید کہہ سکتا ہے کہ جگر صاحب مرحوم نے فی الواقعی چمنستانِ سیاست کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری کی ۔ خود عابد علی خاں نے اپنے رفیقِ صادق کے جذبۂ صادق کا اعتراف کرتے ہوئے ایک دفعہ کہا تھا " سیاست کی رگوں میں " جگر " کا خون دوڑ رہا ہے

راج بہادر گوڑ کے الفاظ میں "عابد علی خاں اگر سیاست کا "دل" تھے تو محبوب حسین اس کا جگر تھے"۔

ایڈیٹوریل اسٹاف اور ایڈمنسٹریشن ڈپارٹمنٹ ہر دو سے پورا پورا کام لینے میں انھیں زبردست ملکہ حاصل تھا۔ نظم و ضبط کی پابندی کے معاملے میں وہ بڑے سخت گیر تھے۔ ان کی اس سخت گیری میں خیر کا پہلو یہ نکلا کہ جو کوئی سیاست سے وابستہ رہا وہ گویا تپ کے کندن بن گیا۔ ان کے نزدیک اخبار کا مفاد دوسری تمام باتوں پر مقدم تھا۔ رات ہو یا دن ہر وقت وہ اس فکر میں رہتے کہ اخبار کا کام ٹھیک وقت پر ہو اور اس میں کسی بھی وجہ سے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ وہ رات دیر گئے بستر سے اٹھ کر سیدھے پریس پہنچ جاتے اور تمام شعبوں پر کڑی نظر رکھتے۔

سیاست کے اکثر معاملات میں ان کا کہا "حرفِ آخر" ہوتا۔ انھیں وسیع تر عاملانہ اختیارات حاصل تھے۔ جہاں تک نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کا تعلق ہے وہ اس معاملے میں بے حد فراخ دل اور وسیع النظر واقع ہوئے تھے۔ جس کسی میں انھیں کوئی جوہر کامل نظر آتا وہ ان کی آنکھ کا تارہ بن جاتا۔ جناب عابد علی خاں کے ساتھ جگر صاحب کی زندگی بھر کی رفاقت کا یہ بندھن چند سال قبل عابد علی خاں کی رحلت سے ٹوٹ گیا۔ اس دن سے جگر صاحب بھی کچھ اس طرح ٹوٹ گئے کہ آخرِ کار خود اپنی بساطِ زندگی بھی لپیٹ لی۔

باہمی اعتماد، ذہنی ہم آہنگی، واضح نصب العین اور اس کے حصول کے لیے اپنے آپ کو وقف کردینے کا جذبۂ صادق یہ چار عناصر تھے جو زندگی کے آخری ایام تک ان دونوں کو اپنے بندھن سے باندھے رہے۔ اسی قدرِ مشترک کے باعث وہ ایک جان دو قالب کہلائے۔ جگر صاحب زندگی بھر مجرد رہے لیکن سیاست سے ایسا رشتہ جوڑا کہ ایک ننھے منے پودے کو تناور درخت اور شجر سایہ دار بنا کر چھوڑا۔ نام و نمود سے بے نیاز شب و روز سیاست کو خوب سے خوب تر بنانے کی جستجو، روزانہ اٹھارہ تا بیس گھنٹے کام، یہی ان کا معمول تھا۔

جگر صاحب نے یوں تو ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا لیکن نواب عابد علی خاں کی رفاقت میں وہ صحافت کی طرف اس طرح مائل ہوئے کہ اسی کے ہو کے رہ گئے۔ ۱۹۴۰۔۴۱ء کے تعلیمی سال میں وہ گلبرگہ سے انٹرمیڈیٹ کرکے جامعۂ عثمانیہ میں بی اے میں شریک ہوئے۔ سابق وائس چانسلر جناب ہاشم علی اختر کے مطابق جگر صاحب یونیورسٹی کے (C) ہاسٹل میں عابد علی خاں مرحوم کے روم میٹ بنے۔ اس زمانے سے یہ دونوں دوستی کے اٹوٹ بندھن میں بندھ گئے۔ ۱۹۴۳ء میں گریجویشن کی تکمیل کے بعد ان دونوں نے تعلیم ختم کردی اور ۱۹۴۹ء میں سیاست کی داغ بیل ڈالی۔ اس وقت سے تادمِ آخر جگر صاحب بہ حیثیت بانی شریک مدیر سیاست سے وابستہ رہے۔ جگر صاحب نقلِ مکانی کرکے جب گلبرگہ سے حیدرآباد آئے تو عابد علی خاں سے پہلا رابطہ زندگی بھر کا ساتھ ہوگیا۔ دونوں نے یہ رفاقت اس شان اور اس آن سے نبھائی کہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم اور ایک جان دو قالب کہلائے۔ حتیٰ کہ عارضۂ قلب ہی دونوں کے لیے مرض الموت ثابت ہوا۔ شاد عظیم آبادی کا یہ شعر اپنی بھرپور معنویت کے ساتھ ان پر منطبق ہوتا ہے:

ڈھونڈوگے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
اے اہلِ زمانہ قدر کرو، نایاب نہ ہوں کمیاب ہیں ہم

جگر صاحب اور عابد علی خان کا شمار حیدرآباد دکن میں ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں انھوں نے ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس منعقد کی اور جواں سال و جواں فکر قلم کاروں کا ایک قافلہ تیار کیا۔ سیاست کے اجرا کے بعد اس کی پالیسی کا

تعین ان دونوں دانش وروں نے اس طرح کیا کہ اس کی اہمیت اور افادیت کے ان کے معترضین بھی قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست میں جو کچھ شائع ہوتا ہے وہ ہر زمانے میں اربابِ مقتدر کی توجہ اپنی طرف منعطف کراتا ہے ۔ سیاست کو ابتدا ہی سے قارئین کی امانت سمجھا گیا۔ عابد علی خاں اور جگر صاحب کے کسی نہ کسی وجہ سے جو کٹر مخالف تھے ان کے بیان اور ان کے مضامین بھی سیاست میں اسی طرح شائع کیے جاتے ہیں جس طرح دوسروں کے ۔ ہندوستان میں کسی اردو روزنامے کا اپنی عمر کے پچاس سال مکمل کرنا اور وہ بھی پوری آن بان اور شان کے ساتھ بلاشبہ ایک قابلِ فخر کارنامہ ہے ۔

سیاست اب محض ایک روزنامہ ہی نہیں بلکہ ایک ادارہ اور ایک تحریک ہے ۔ اس کی شروع کی ہوئی ہر تحریک پر نہ صرف اس کے قارئین لبیک کہتے ہیں بلکہ اربابِ مقتدر بھی بھرپور تعاون کی پیش کش کرتے ہیں۔ ریاستی حکومت ہو یا مرکزی حکومت، سرکاری محکمے ہوں یا غیر سرکاری ادارے ، سیاست میں شائع ہونے والی شکایات کا سنجیدگی سے نوٹ لیتے ہیں اور اس کو متوازن اور معتدل انداز فکر رکھنے والے جریدے اور اقلیتوں کے ترجمان کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ آج سیاست صرف حیدرآباد ہی میں نہیں، صرف آندھرا پردیش میں نہیں بلکہ ملک اور بیرونِ ملک بھی اپنے قارئین کا ایک وسیع حلقہ رکھتا ہے ۔

جناب محبوب حسین جگر کے والدِ گرامی، مولوی احمد حسین صاحب اگرچہ عثمان آباد کے رہنے والے تھے لیکن ان کی ملازمت کا زیادہ عرصہ ضلع گلبرگہ میں گزرا ۔ (ہندوستان میں لسانی ریاستوں کی تشکیل سے قبل گلبرگہ بھی مملکتِ آصفیہ، ممالک محروسہ سرکارِ عالی حیدرآباد کا ایک ضلع تھا جو حیدرآباد کرناٹک کہلاتا تھا) مولوی احمد حسین صاحب تحصیل داری کے منصب پر فائز تھے ۔ انھیں اردو شعر و ادب سے گہرا شغف تھا۔ کلاسیکی شعرا کے بے شمار اشعار انھیں یاد تھے ۔ ان کے تین لائق سپوتوں نے برِ صغیر ہندو پاک میں اردو ادب و صحافت کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔

محبوب حسین جگر سے چھوٹے ابراہیم جلیس اور ابراہیم جلیس سے چھوٹے مجتبیٰ حسین۔ جلیس ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد دکن سے ہجرت کرکے پاکستان جابسے اور انتقال سے کچھ عرصہ قبل تک پیپلز پارٹی کے اخبار "مساوات" کے ایڈیٹر رہے ۔ راقم الحروف نے ۱۹۴۸ء کے اوائل میں حیدرآباد دکن کے معروف روزنامے "نظام گزٹ" میں جلیس صاحب کو دیکھا جہاں وہ نظر حیدرآبادی کے ہم راہ اکثر و بیش تر آیا کرتے ۔ مجتبیٰ حسین کا شمار اس وقت برِ صغیر کے صفِ اول کے مزاح نگاروں میں ہوتا ہے ۔ روزنامہ سیاست میں ان کی نگارشات "میرا کالم" میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

جگر صاحب مرحوم پہلی مرتبہ نواب عابد علی خاں کے ہم راہ اس وقت جدہ تشریف لائے جب جدہ میں ۱۹۹۰ میں جشنِ حیدرآباد کی چار سو سالہ تقاریب منعقد ہوئی تھیں۔ پچھلے سال اذنِ حضوری پر حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ بہ فضلِ تعالیٰ اس وقت صحت مند و تن درست تھے ۔ مرحوم سے آخری مرتبہ دفتر سیاست پر اس وقت ملاقات اور گفتگو ہوئی جب گزشتہ اکتوبر میں راقم الحروف کا حیدرآباد جانا ہوا تھا۔ اس ملاقات میں حسبِ معمول ستائشی کلمات سے نوازا ، نئی عمارت میں سیاست دفتر کے مختلف شعبے دکھلائے اور بارگاہ ربُّ العزّت میں شکر بجالایا کہ نصف صدی قبل جس اخبار نے ٹین کے ڈھابے میں اپنے سفر کا آغاز کیا تھا وہ آج ایک عالی شان عمارت میں سربلند و سرافراز ہے ۔

جگر صاحب کے راہی عدم ہونے سے شہرۂ آفاق حیدرآبادی تہذیب کا پیکر، زبانِ شیریں اردو کا بے تکان مجاہد، اقلیتوں کے حقوق کے نقیب، شریف النفس اور قلندر صفت انسان اٹھ گیا۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

ویراں ہے مے کدہ، خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

—— 000 ——

(سلسلہ ص ۸۳)

کانفرنس کی ایک تقریب کے یہ صدر اور میر قدرت علی ناصری (بنگلور) مہمانِ خصوصی تھے۔ معتمد صاحب نے خیر مقدمی کلمات کہنے کے لیے مجھ سے کہا۔ میں نے انھیں "یمین الصحافت" جناب جگر سے مخاطب کیا اوپر سے نیچے تک دیکھنے لگے۔ جب میں بیٹھ گیا تو فرمانے لگے فی البدیہہ اصطلاح خوب وضع کی۔ انکساری کا یہ عالم! فرمانے لگے مجھے اتنا نہ بڑھا دو۔ میں نے کہا مستقبل کا مورخ اور زیادہ بڑھائے گا۔ کانفرنس کی سرگرمیوں سے دل چسپی رکھتے اور مجھ سے ضروری معلومات حاصل کرتے اور فرماتے کانفرنس کی تحریک پر ہی جامعہ عثمانیہ قائم ہوئی۔ اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا کرتے تھے۔

علالت کی اطلاع پر عیادت کے لیے میں اور میری اہلیہ ڈاکٹر حبیبہ ہسپتال پہنچے۔ درود شریف کے ختم کا دم کیا، پانی کا شیشہ میری اہلیہ نے پیش کیا بڑے عقیدت و احترام سے اپنے چھوٹے بھائی اور میرے عزیز کلاس فیلو جناب مجتبیٰ حسین سے کہا اس کو حفاظت سے رکھو۔ میری اہلیہ سے کہا شکریہ آپ نے بڑی زحمت کی۔ کہنے لگے میرا نام لے کر مریض پہنچتے ہیں۔ آپ معائنہ بھی کرتی ہیں اور دوا بھی مفت دے دیتی ہیں شکریہ۔ آپ ہمارے بزرگ ہیں آپ کے نام کے بعد معاوضے کا کیا سوال۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوکر بعض لوگوں کا حال پوچھا۔ میرے جواب پر مسکرائے اور پھر خوب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ہم صحت یابی کی دعا کر کے باہر آگئے۔ مجتبیٰ حسین نے کہا ڈاکٹروں نے تو بات کرنے سے منع کیا تھا تم نے ہنسا دیا۔ کسے خبر تھی کہ اردو ادب و صحافت کی اس گراں مایہ شخصیت سے یہ آخری ملاقات ہوگی۔ اخلاق و مروت کا یہ بحر رواں، جدید اردو صحافت کا عظیم ستون ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نظروں سے او جھل ہو جائے گا۔

—— 000 ——

ایس۔ زیڈ۔ اعجاز
(ترجمہ: اسامہ فاروقی)

ایک گم شدہ قبیلے کا آخری فرد

محبوب حسین جگر کا شمار جنگ آزمودہ سپاہیوں میں تھا۔ انہوں نے نظامِ کہن کی رخصت اور نظامِ نو کی آمد کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس وقت کے اقتدار کے ڈھانچے کی شکست و ریخت کے عمل سے براہ راست متاثر ہونے کے باوجود جگر نے اس قلب ماہیت کے تعلق سے ویسے ردِ عمل کا مظاہرہ نہیں کیا جیسا کہ ان کی پیڑھی نے کیا تھا۔ وہ پیڑھی جو معاشرے کے رسوم و رواج اور روایات کی پوری عمارت کے دفعتہً گر جانے سے بد حواس تھی۔

جگر جو ایک متوسط طبقے کے خاندان میں پیدا ہوئے اپنی زندگی کے کافی ابتدائی مرحلے ہی میں مارکسی نظریۂ حیات سے متاثر ہوئے۔ بعد میں جب وہ گلبرگہ سے حیدرآباد جامعہ عثمانیہ میں حصولِ تعلیم کی غرض سے منتقل ہوئے جگر کو اس وقت کے سربر آوردہ مارکسی دانش وروں سے استفادے کا موقع ملا۔ جامعہ عثمانیہ کے کیمپس میں طالبِ علموں کو منظم کرتے ہوئے انہوں نے اشتراکی طرزِ فکر سے اپنا رشتہ مزید استوار کیا اور اسے عمر بھر عزیز رکھا۔ جامعہ عثمانیہ کے اقامت خانہ "الف" کے ایک کمرے میں قیام کے دوران جگر کی ملاقات عابد علی خاں سے ہوئی اور انہوں نے آپس میں عمر بھر کی دوستی اور رفاقت کا رشتہ قائم کر لیا۔ ترقی پسند طالب علموں کو کیمپس میں منظم کرنے کا کام ان ہی دونوں کے ذریعے انجام پایا۔ بعد میں ۱۹۴۵ء میں جگر اور عابد علی خاں نے حیدرآباد میں ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس کے انعقاد میں کلیدی رول انجام دیا۔ کانفرنس میں پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، ملک راج آنند وغیرہ جیسی تحریک کی قابل اور ذی اثر شخصیتوں نے شرکت کی۔ کہا جاتا ہے جگر کی کانفرنس میں پرجوش شرکت سے عظیم ناول نگار کرشن چندر کو مشہور رپورتاژ "پودے" لکھنے کی تحریک ملی۔ پھر "سیاست" معرض وجود میں آیا۔ محبوب حسین جگر اور عابد علی خاں نے اس روزنامہ کو ۱۵/اگست ۱۹۴۹ء کو جاری کیا۔ اس تاریخی دن کی یاد تازہ کرتے ہوئے جگر کے چھوٹے بھائی اور مشہور کالم نویس مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں۔

> "سیاست کا پہلا شمارہ لے کر وہ اس دن صبح کو کچھ دیر کے لیے گھر آئے تھے،
> نہادھو کر وہ پھر دفتر چلے گئے۔ اس کے بعد ان کے گھر آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں رہا۔
> دو تین دن میں اچانک وہ گھر چلے آتے تھے "سیاست" ہی ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا تھا۔
> ایک عرصے تک وہ دفترِ "سیاست" کے ایک گوشے ہی میں رہتے تھے۔ مشینوں کے شور شرابے میں رات دیر گئے سوجانے کی عادت انہوں نے ڈال لی تھی۔"

ایسے اخبار سے لگاؤ، جس کو کسی نے جاری کیا ہو اور پھر اسے ایک بچے کی طرح چار سو کی تعدادِ اشاعت والے اخبار سے بڑھ کر ملک بھر میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والا اردو اخبار بنتے ہوئے دیکھا ہو یقیناً سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ لیکن جگر کا اس روزنامے سے تعلقِ خاطر محض لگاؤ کی سطح سے کہیں اونچا تھا اور اس نے ایک طرح سے والہانہ محبت کی شکل اختیار کرلی تھی۔ جب "سیاست" کا اجرا ہوا نظام کی سابقہ مملکت پولیس ایکشن کے صدمے سے ابھی پوری طرح سنبھل نہیں پائی تھی۔ حیدرآبادیوں کو دکھ پہنچا تھا اور وہ برافروختہ تھے۔ عوام کی اس وقت کی کیفیتِ مزاج کا استحصال کرتے ہوئے، حیدرآباد کے زیادہ تر اردو اخبار انتہاپسندی کی وکالت کررہے تھے۔ جگر اور خان نے "سیاست" کو حیدرآبادیوں کے قلبِ مجروح میں اعتماد، میانہ روی اور ہوش مندی کی اہمیت کو جاگزین کرنے کے لیے استعمال کیا۔ ان دونوں نے اس مفروضے کو غلط ثابت کردکھایا کہ سنسنی خیز خبروں ہی سے تعدادِ اشاعت بڑھائی جاسکتی ہے۔ مناقشوں اور انتہا پسندانہ انداز سے واسطہ نہ رکھنے کے باوجود جگر نے "سیاست" کو تجارتی نقطۂ نظر سے ایک نہایت کامیاب اخبار بنا دیا۔

مختلف فرقوں اور معاشرے کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے قارئین کے گوناگوں حلقوں کی ضیافتِ طبع کا سامان کرتے ہوئے، جگر کے طرزِ عمل کی بہ دولت "سیاست" نے حیدرآباد کی وسیع المشرب تہذیب کے ترجمان کی حیثیت سے اپنی شناخت بنالی۔ اس کی اتوار کی خصوصی اشاعت اور دوشنبے کے ادبی ضمیمے کا ان کے خصوصی مضامین اور دل چسپ مباحثوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے قارئین بے صبری سے انتظار کیا کرتے تھے۔ بالخصوص حیدرآباد اور بالعموم آندھراپردیش کی تہذیبی سرگرمیوں اور سماجی زندگی سے متعلق خبروں کی بڑے پیمانے پر پیش کشی نے اس اخبار کو سارے کرۂ ارض کے غیر ممالک میں مقیم ہندوستانیوں میں بھی بے حد مقبول بنا دیا۔ جگر نے جو خود بھی شاعر اور ادیب تھے سیاست کے ادبی ضمیمے کو مختلف تحریکوں اور رجحانات پر مباحثے اور اظہارِ خیال کے ایک نہایت معتبر وسیلے کی شکل دی۔ ہمت افزائی اور رہ نمائی کے ذریعے اس کہنہ مشق صاحبِ قلم نے بے شمار ادیبوں اور شاعروں کی تربیت کی۔ تاہم انھوں نے دوسرے درجے کی نگارشات کو کبھی برداشت نہیں کیا۔ قدرتی طور پر نہایت سنجیدہ ادیب بھی اپنی تحریروں کی "سیاست" میں اشاعت کو اپنے لیے باعث اعزاز سمجھتے تھے۔

فطرتاً بہت کم سخن ہونے کے باعث "سیاست" کے رسوخ اور مقبولیت کے باوجود، جگر نے خود نمائی سے ساری عمر پرہیز کیا۔ اپنی زندگی کے بارے میں کسی کام کی انھوں نے کبھی ہمت افزائی نہیں کی اور نتیجتہً محققین کو ان کے کارناموں پر کام کرنا بہت دشوار ہوگیا۔ اردو صحافت کو ان کی دین کی اہمیت بے پایاں ہے اور بلاخوفِ تردید ہم ان کو باباۓ جدید اردو صحافت کے نام سے متصف کرسکتے ہیں۔ ملک میں اردو صحافت کے ایک معمار کی حیثیت سے ان کو جو بلند مقام حاصل تھا اس کی وجہ سے ان کے وجود کا دوسرا پہلو یعنی ان کا ساتھ ہی ساتھ ایک کام یاب شاعر، افسانہ نگار اور نقاد ہونا، نگاہوں سے بڑی حد تک اوجھل رہا۔ انھوں نے ہی سب سے پہلے حیدرآباد کی نمائندگی کرنے والے عظیم شاعر مخدوم محی الدین کو ملک کے اور علاقوں میں متعارف کروایا۔ مخدوم کی انقلابی شاعری کے بارے میں سب سے پہلے ان کی تحریر نیاز فتح پوری کے موقر مجلے "نگار" میں شائع ہوئی۔ اپنے دو چھوٹے بھائیوں ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین کی طرح برِّصغیر کے دو مقبول ترین ادیبوں کی حیثیت سے تربیت میں بھی ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ اول الذکر جو بعد میں پاکستان کو منتقل ہوگئے، کئی کتابوں کے مصنف تھے اور ایک معروف اردو روزنامہ ان کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔

جگر کے عابد علی خاں سے مراسم عام ڈگر سے بالکل ہٹے ہوئے تھے۔ جب ان دونوں نے روزنامہ جاری کیا تو دونوں نوجوان تھے۔

جلد ہی خان کی شادی ہو گئی لیکن جگر اپنے پسندیدہ منصوبے کو روبہ عمل لانے میں اتنے منہمک رہے کہ انھیں ازدواج کی ء بارے میں سوچنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ ابتدا اپنے بھائی مجتبیٰ حسین کے ساتھ کچھ دنوں حیدر گوڑہ میں قیام کے بعد وہ خان صاحب رہائش عابد منزل کو منتقل ہو گئے۔ انھوں نے خود کو اپنے دوست اور ان کے افراد خاندان کے ساتھ ایک جان دو قالب بنا لیا۔

تقریباً پانچ دہوں کے دوران وہ "سیاست" کی روح رواں رہے۔ ہر شعبہ پر کڑی نگاہ رکھتے ہوئے اور اس کی سیکولر پا داری کرتے ہوئے انھوں نے روزنامے کی اپنی اولاد کی طرح نگہہ داشت کی۔ جب بھی ان کے پاس ملاقات کے لیے جائیے وہ (Ticker) کے ذریعے موصول ہونے والی خبروں کے مطالعے میں محو، پہلے صفحے پر شائع کی جانے کے لائق خبروں کی نشان ہوئے اور معاون مدیروں کو ہدایات دیتے ہوئے ملتے۔

اپنی روزمرہ کی ان تھکا دینے والی مصروفیات کے باوجود وہ ملاقات کی غرض سے آنے والے شاعروں اور ادیبوں۔ شہر کی ادبی سرگرمیوں میں شرکت کے لیے کچھ نہ کچھ وقت نکال ہی لیتے۔ روزنامے کے مقررہ معمول کے فرائض کے علاوہ وہ اور اس کی مطبوعات پر بھی توجہ دیتے۔ ٹرسٹ اردو کے کاز کو آگے بڑھانے کے لیے قائم کیا گیا تھا اور اس کے مشاعروں انصرام میں جگر کی شمولیت کی بہ دولت، مقبولیت کے لحاظ سے سارے ملک میں ایک امتیازی حیثیت حاصل کرلی تھی۔ عابد انتقال کے بعد انھوں نے اپنے عزیز دوست کی یاد میں ایک ٹرسٹ قائم کیا اور ان افراد کے لیے جن کا ذریعۂ تعلیم اردو کی بجا زبان ہے لیکن جو اردو کے جادو کے دل دادہ ہیں اردو دانی، اردو زبان دانی اور انشاء کے مختصر مدتی کورس کا انتظام کیا۔ تقریباً افراد نے جن میں کم عمر اور معمر دونوں شامل ہیں اردو لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔

میں ان کو اپنے یونی ورسٹی کے دنوں سے جانتا تھا۔ میں "سیاست" کے ادبی ضمیمے کے لیے اس وقت سے لکھتا رہا میری عمر چودہ یا پندرہ سال رہی ہو گی لیکن کبھی ان سے ملاقات کی ہمت نہیں جٹا سکا۔ جب "سیاست" میں سال ہا سال کی سے خطاطی کی جگہ کمپیوٹر کتابت رائج ہوئی تو اس سے اردو صحافت میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ میرے نگران کار پروفیسر نے میں اس کے بارے میں کچھ لکھوں۔ میں جگر سے اپنی پہلی ملاقات کو اب بھی نہیں بھول سکتا۔ وہ آلۂ وقیہ نگار (Ticker) کھڑے، خبروں کو تیز رفتاری کے ساتھ ٹیپ پر چھپ کر آتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ ان کا بے پناہ گرم جوشانہ ردّ عمل بائیس سال نوجوان کے لیے باعث ندامت تھا۔ وہ مجھے دفتر میں لے گئے اور مجھے عملے کے تمام اراکین سے یوں متعارف کروایا گویا کہ شخص ہوں۔ قدرے جھجک کے ساتھ ان سے اپنی اس مدبھیڑ کے بعد بھی اکثر ان کے پاس حاضر ہوتا اور اپنی گوناگوں مصروفیا ادنچے رہتے کے باوجود وہ میرے نامعقول سوالات کا گرم جوشی سے جواب دیتے۔ جامعہ عثمانیہ کے اولین طلبہ میں سے ایک وجہ سے وہ اپنی مادر جامعہ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ وہ جامعہ کے معاملات سے خود کو بالعموم باخبر رکھتے اور اس کا انھیں بہت عظیم ادارہ نچلی سطح کی سیاست کی چپیٹ میں آ گیا ہے۔

اردو صحافت کی تاریخ میں جگر کا نام سرفہرست رہے گا۔ اس عظیم صحافی اور عظیم تر انسان اور ان کے انتہا کارناموں کا شاید مستقبل میں آنے والی نسلیں ہی صحیح اندازہ کر سکتی ہیں۔

محبوب حسین جگر

(۱۹۱۸ء)

محبوب حسین جگر ان دنوں صحیفہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن چند سال پہلے تک ان کا شمار حیدرآباد کے ممتاز ترقی پسند فسانہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ وہ ایک سرگرم تہذیبی کارکن بھی رہے ہیں۔ جن لوگوں نے کرشن چندر کا رپورتاژ "پودے" پڑھا ہے ان کے ہنوں میں جس جگر کی تصویر محفوظ ہے وہ کبھی دھندلا نہیں سکتی۔

جگر گلبرگہ شریف کے رہنے والے ہیں۔ یہیں ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی جس کے بعد وہ حیدرآباد چلے آئے اور جامعہ عثمانیہ سے ۱۹۴۲ء میں بی۔ اے کی ڈگری لی۔ تعلیم سے فراغت پاتے ہی وہ سرکاری ملازمت کے دائرے میں داخل ہوگئے لیکن یہ سلسلہ چار سال سے زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکا۔ ۱۹۴۸ء میں ان کے دوست عابد علی خاں نے روزنامہ سیاست جاری کیا تو انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے کر اپنے آپ کو سیاست کے لیے وقف کردیا۔ سیاست آج ہندوستان کے صفِ اول کے اردو روزناموں میں شمار کیا جاتا ہ اور اپنی سلامت روی، سنجیدگی، متوازن لب و لہجہ اور ذوقِ ترتیب کی وجہ سے صحافتی دنیا میں اپنے لیے ممتاز مقام پیدا کرچکا ہے۔ سیاست کی اس کامیابی میں جگر کی غیر معمولی صلاحیتوں کو بڑا دخل ہے۔

جگر طالب علمی کے زمانے ہی سے افسانے لکھا کرتے ہیں۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین حیدرآباد کے بانیوں اور سرگرم کارکنوں مں سے ہیں۔ اس تحریک نے ان کے دل و دماغ کو بہت متاثر کیا اور وہ اپنے عہد کی نمائندہ حقیقتوں کو بنیاد بناکر کہانیاں لکھنے لگے جو اس زمانے میں بہت مقبول ہوئیں لیکن جب سے انھوں نے صحافت سے رشتہ جوڑلیا ہے افسانہ نگاری کو بھلا بیٹھے ہیں۔ ادھر کئی سال سے انھوں نے کوئی کہانی نہیں لکھی تاہم انھوں نے جو کہانیاں لکھی ہیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اب وہ اپنی افسانہ نگاری کو افسانۂ پارینہ مجھنے لگے ہیں اس لیے توقع نہیں کہ ان کی کہانیاں کتابی صورت میں شائع ہوسکیں۔

حیدرآباد کے ادیب (حصہ دوم)

مرتبہ:۔ زینت ساجدہ

——— 000 ———

مجیدہ موسوی

آہ!! جگر مرحوم

دل خون ہوگیا ہے جگر چاک ہوگیا
پھر اشک بار دیدۂ نمناک ہوگیا

پھر تیرگی فضاءِ گلستاں پہ چھا گئی
ہر اہلِ درد ، مضطر و غمناک ہوگیا

روحِ ادب ، کمالِ صحافت کدھر گیا
کیوں کر نہاں وہ صاحبِ ادراک ہوگیا

عالی دماغ وسعتِ قلب و نظر لیے
شاید رواں وہ جانبِ افلاک ہوگیا

وہ تھا سخن شناس ، سخن فہم بالیقیں
بعد اس کے اپنا ذوقِ سخن خاک ہوگیا

--------0000--------

وہ نیک نفس ، نرم طبیعت وہ نیک دل
ہمدم ، شفیق ، قابلِ صد احترام تھا

منصف مزاج ، حق کا پرستار ، صاف گو
وہ نرم خو وہ صاحبِ عالی مقام تھا

ہر دل عزیز ، پیکر اخلاص ، دردمند
وہ مرکزِ قلوبِ ہر اک خاص و عام تھا

ہر ہر قدم پہ شمعیں جلاتا چلا گیا
"اس کے بغیر نقش ہر اک ناتمام تھا"

—ooo—

سید امتیاز الدین

نذرِ محبوب حسین جگر

وہ پیکرِ خلوص تھا ، خدمت شعار تھا
تھی کام کی لگن ، اسے شہرت سے عار تھا
جو کچھ تھا اس کے پاس صحافت کو دے دیا
خونِ جگر بھی اپنا سیاست کو دے دیا
عابدؔ کی اور جگرؔ کی رفاقت مثال تھی
اس دورِ امتحاں میں صداقت کی ڈھال تھی
دونوں نے مل کے کارِ نمایاں کیے بہت
دامانِ چاک دونوں نے مل کر سیے بہت
شعر و ادب کی محفلیں سونی پڑی ہیں آج
جیسے فضاءِ شہر بھی حرماں بدوش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ عابدؔ لیے ہوئے
شمعِ جگرؔ تھی بزم میں وہ بھی خموش ہے

—ooo—

اسلم عمادی

محبوب حسین جگر مرحوم کی یاد میں

(مجتبیٰ حسین اور زاہد علی خاں کے لیے)

عظیم سانحہ ہے یہ تو اے مرے بھائی
وہ ہستی جو تھی نگہہ دار اب وہی نہ رہی
ہے کون اس کی طرح جو خبر کشید کرے
بکھرتے ذہنوں سے فکر و نظر کشید کرے
نئی زباں، نئے انداز میں کلام کرے
نئی ادا، نئے اسلوب کا قیام کرے
خزاں میں حوصلے کے جس نے تازہ پھول کھلائے
دعا یہ ہے کہ خدا اس کی مغفرت فرمائے

—ooo—

وقار خلیل

بہ یاد محبوب حسین جگر

حبیبِ شہرِ دل کہیے کہ محبوبِ دکن اس کو
وہ ہر اک زاویے سے شہر دانش میں سویرا تھا
جو اپنی ذات میں اک انجمن سے بھی سِوا تھا
رفاقت کے تسلسل کا سجل پیکر
جسے چاہت ملی سب کی
وہ دانش ور صحافی ، احترامِ آدمیت کا پیامی
دکن کی عظمتِ رفتہ کے اک اک باب کا عاشق
نئے منظر کا راہی ، ہم قدم بھی
ترقی ، جستجو ، تقدیسِ فکر و فن کا گل دستہ
وفا تھا ، روشنی تھا ، نظمِ تہذیبِ جنوں میں فکرِ دانش تھا
" سیاست " سے ثقافت تک ، وہ برگد پیڑ ایسا تھا
ادب ، تہذیب اور کلچر کا دیوانہ
شام سے پہلے سفر پر جاچکا ہے !
ہر نظر افسردہ ، ہر دل سوگوار
خدا بخشے جگر مرحوم کو ، " آمین " کہیے

—ooo—

جامی وجودی

دکن کی شان تھے حضرت جگر صاحب

صحافت کی ہمیشہ جان تھے حضرت جگر صاحب
نہایت ہی شریف انسان تھے حضرت جگر صاحب
قلم لے کر قلم کی آبرو رکھی ہے مرنے تک
حقیقت میں دکن کی شان تھے حضرت جگر صاحب
اخوت ، پیار ، الفت ، دوستی ، اخلاص یک جہتی
ہراک موضوع کا عنوان تھے حضرت جگر صاحب
قلم کی روشنی آئینہ تھی ان کے تعارف کا
خود اپنی ذات کی پہچان تھے حضرت جگر صاحب
حقائق سامنے رکھتے تھے کھل کر بات کرتے تھے
دلاور تھے نڈر انسان تھے حضرت جگر صاحب
یقیناً ان کی شخصیت معمہ تھی مگر جامیؔ
سمجھنے میں بہت آسان تھے حضرت جگر صاحب

000

ڈاکٹر گلزار زتشی دہلوی

صحافت کا جگر

اے سیاست کے جسد کے جانِ جاں ، قلب و جگر
بزمِ اردو کے ممیز کج کلاہِ مفتخر
اک صدی کی لیلیٰ تحریر کا آئینہ تھا
ارتقاءِ علم کا گنجینہ تیرا سینہ تھا
تیس برسوں سے زیادہ مجھ کو حاصل تھا شرف
فخر تھا تیری رفاقت پر تکلف بر طرف
اہلِ علم و فن کا تو تھا مرتبہ دانِ عظیم
ناز تیری ذات پر کرتے تھے اربابِ فہیم
صحتِ روحِ دکن کا تو بڑا نباض تھا
شاعروں کی قدر افزائی میں بھی فیاض تھا
کردیا تو نے سیاست کو بھی انٹرنیشنل
تو کہ گلزارِ صحافت میں ہوا ضرب المثل

000

خلیل الزماں خاں

قطعات سلسلۂ رحلت

جناب محبوب حسین جگر جائنٹ ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" حیدرآباد۔ انڈیا

مصروفِ صحافت تھے کچھ ایسے دن رات
تھا دن کو سکوں اور نہ تھا رات کو چین
کہتی تھی جنہیں ساری صحافت "محبوب"
"محبوب صحافت" تھے وہ محبوب حسین

—000—

اللہ پاک، کہتا رہا جو نزع کے وقت
بندہ وہ خاص تھا، وہ بڑا خوش نصیب تھا
سب خامشی سے سہہ گیا، برداشت کر گیا
وہ شخص جس میں صبر و تحمل عجیب تھا

—000—

محبوب حسین، نام ہے جن کا ان کو
حاصل ہو، رسولؐ اور خدا کی قربت!
بس اتنی دعا ہے مرے ہونٹوں پہ خلیلؔ
اللہ کرے ان کو غریقِ رحمت

—000—

دنیا ہے آج جس کی صحافت کی معترف !
کرتے ہیں آج ہم بھی اسی باہنر کی بات
لائیں گے لانے والے بہت کچھ ہنر مگر
کوئی نہ لاسکے گا جنابِ جگر کی بات

—000—

وہ جنھیں سب راستوں کے پیچ وخم معلوم تھے
زندگی بھر وہ شعورِ رہ گزر دیتے رہے
جن کے دم سے ہو گیا تاباں ، صحافت کا چراغ
وہ سیاست کو سدا خونِ جگر دیتے رہے

—000—

قمر ساحری

محبوب حسین جگر

(تعزیتی نظم۔ رباعی کی بحر میں)

ہر بات کا کرتے رہے اظہار جگر ہرگز نہ بنے بندۂ سرکار جگر
گردن نہ جھکی ان کی کسی کے آگے زندہ رہے جب تک ، رہے خوددار جگر
تھے بزمِ محبت میں ، محبت والے میدانِ سیاست میں ، جگر دار جگر
ہنستے ہوئے دیکھا ہے ، انھیں جب دیکھا ہر دور میں ، ہر حال میں سرشار جگر
وہ فرقہ پرستی سے بہت دور رہے ہر ایک سے کرتے ہی رہے پیار جگر
دل جوئی بھی کرتے تھے سبھی کی لیکن تھے حسنِ ذہانت کے پرستار جگر
غافل نہ ہوئے اپنے فرائض سے کبھی تھے اپنے مقاصد کے طرف دار جگر
تھے عابد[1] و زاہد[2] کے بھی خواہوں میں اخبارِ سیاست کے نگہ دار جگر
ہمت نہیں ہوتی ہے کہ مرحوم لکھوں اے صاحبِ کردار ، مرے یار جگر

۱۔ عابد علی خان مرحوم بانی سیاست
۲۔ زاہد علی خان مدیر سیاست

آخری اداریہ

[جگر صاحب نے اپنی وفات سے ایک دن پہلے یہ اداریہ تحریر کیا تھا جو روزنامہ سیاست میں ۱۱ مارچ، ۹۰ء کو ان کے انتقال کے دن شائع ہوا۔]

ڈاکٹر بجواڑہ گوپال ریڈی

ڈاکٹر بجواڑہ گوپال ریڈی کا انتقال آندھرا پردیش کے اردوداں طبقے کا بھی نقصانِ عظیم ہے۔ جب ملک میں پہلی لسانی آندھرا کا وجود عمل میں آیا، اس ریاست کے پہلے چیف منسٹر کی حیثیت سے انھوں نے اردو کی اہمیت کا اعتراف کیا اور نواب میر احمد علی خاں اور عابد علی خاں کو کرنول بلواکر نئی ریاست آندھرا کے لیے ایک معیاری اردو اخبار کی ضرورت ظاہر کی۔ ان دنوں حیدرآباد میں اردو ہال زیرِ تعمیر تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے حکومت آندھرا سے عمارت فنڈ میں گراں قدر عطیہ بھی دیا۔ جب یکم نومبر ۱۹۵۶ء کو بڑی تلگو ریاست آندھرا پردیش کا قیام عمل میں آیا، ڈاکٹر صاحب وزیرِ فینانس تھے۔ آپ نے آندھرا پردیش اردو، تلگو اکیڈیمی کے قیام میں تعاون کیا۔ حیدرآباد کے شاعر اور ادیب کی جو دو جلدیں شائع ہوئیں وہ محض آپ ہی کی دل چسپی کا نتیجہ تھیں آپ نے آندھرا سرسوت پریشد میں بھی اردو ادیبوں کو جگہ دلائی اور مشاعروں کی صدارت سے مشاعروں کو ایک نئی شان بخشی۔ آپ جب کسی عہدے پر نہ تھے اردو کاز کے لیے ممکنہ تعاون کیا۔

محبوب حسین جگر

عابد علی خاں
نصف صدی کی مسلسل خدمات

جناب عابد علی خاں نے تقریباً نصف صدی تک حیدرآباد میں اردو زبان و ادب اور ترقی پسند افکار کی بڑی خاموش خدمت کی ہے۔ ۱۹۴۱ء میں عثمانیہ یونی ورسٹی سے گریجویشن سے قبل، عابد علی خاں نے مضمون نگاری کا آغاز کیا تھا۔ وہ فلسفے کے طالبِ علم تھے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور پروفیسر شیوموہن لال کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کا پہلا مضمون سگمنڈ فرائیڈ ۱۹۴۰ء میں نگار، لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم جاری تھی۔ اخبارات "پیام" اور "رعیت" میں اہم سیاسی مضامین پر ان کے ترجمے شائع ہوا کرتے تھے۔ گریجویشن کے بعد کافی ہاؤس میں شام میں تمام ادیب و شاعر جمع ہوا کرتے تھے۔ یہیں مخدوم محی الدین سے ملاقات ہوئی   غالباً ۱۹۴۴ء میں جب کمیونسٹ پارٹی پر سے پابندی برخاست ہوئی اور پارٹی کا پہلا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا، مخدوم صاحب کے اصرار پر عابد علی خاں نے کمیونسٹ پارٹی کانگریس میں شرکت کی۔ وہ جناب سجاد ظہیر کے گھر پر ٹھہرائے گئے جہاں نورالحسن صاحب (گورنر مغربی بنگال) بھی انھی دنوں لندن سے حصولِ تعلیم کے بعد واپس لوٹے تھے اور یہیں مقیم تھے۔ سجاد ظہیر صاحب نے عابد علی خاں صاحب کو کارل مارکس کی کتاب (WAGE LABOUR AND CAPITAL) ترجمے کے لیے دی جو ماڈرن بک ڈپو حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ ان ہی دنوں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے ادارۂ ادبیات اردو کے زیرِ اہتمام ایک کل ہند کانفرنس منعقد کی جس میں غیر منقسم ہندستان کے کئی شہروں بہ شمول ڈھاکہ اور لاہور کے کئی ادیب و شاعر و مشاہیر شریک تھے۔ مجھے سر محمد یعقوب، حضرت خواجہ حسن نظامی، حفیظ جالندھری اور جگر مرادآبادی کے نام یاد ہیں۔ زور صاحب نے عابد علی خاں صاحب کو اس کانفرنس میں ترقی پسند ادب کے شعبے کا کنوینر مقرر کیا۔ اس اجلاس کے لیے سجاد ظہیر صاحب مدعو کیے گئے۔ سجاد ظہیر صاحب کا یہ پہلا دورۂ حیدرآباد تھا۔ محترمہ سروجنی نائیڈو نے سجاد ظہیر صاحب کی ایک علاحدہ تقریر کے انتظام کے لیے عابد علی خاں صاحب سے خواہش کی چناں چہ ریڈی ہاسٹل میں سجاد ظہیر صاحب کی تقریر کا انتظام کیا گیا جس میں سروجنی نائیڈو ان کی دونوں صاحبزادیاں، مسز پدمجا نائیڈو اور لیلا منی نائیڈو کے علاوہ عثمانیہ یونی ورسٹی گرلز کالج کی بعض اساتذہ اور طالبات نے بھی شرکت کی تھی۔ یہ اپنی نوعیت کا حیدرآباد میں پہلا جلسہ تھا۔

جنگ کے دوران جب ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہوئی، عابد علی خاں صاحب انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری بنائے گئے۔ انھوں نے عوام کی اس غلط فہمی کو کہ یہ تحریک کمیونسٹوں سے تعلق رکھتی ہے، دور کیا۔ یادِ حالی کا پروگرام منعقد کیا جس میں ایک طرف مسز سروجنی نائیڈو اور ابوالحسن سید علی صاحب صدر مجلس اتحادالمسلمین شریک تھے تو دوسری طرف قاضی عبدالغفار اور مولوی عبدالحق جو ان دنوں ایک دوسرے کے حریف تھے۔ عابد علی خاں صاحب کا یہ پہلا اہم کارنامہ تھا کہ انھوں نے مختلف مکاتبِ خیال کو

ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔

عابد علی خاں صاحب کا تعلق حیدر آباد کے ایک ممتاز جاگیر دار گھرانے سے تھا۔ ۱۹۴۳ء میں ان کی شادی میں حضور نظام نے شرکت کی تھی جو ان دنوں ایک غیر معمولی بلکہ اہم واقعہ تھا۔ نظام صرف امرائے عظام کے گھرانوں کی شادیوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ انھیں اچھی ملازمت مل سکتی تھی۔ لیکن انھیں ملازمت سے دل چسپی نہیں رہی اور وہ ادبی تحریکات سے وابستہ رہے۔

۱۹۴۹ء میں جب کہ ریاستِ حیدر آباد کا ہند یونین میں انضمام عمل میں آیا، عابد علی خاں صاحب نے اپنی گزیٹڈ پوسٹ سے استعفیٰ دے دیا۔ وہ سوچتے رہے کہ اب کیا قدم اٹھایا جائے۔ ان دنوں تلنگانہ جدوجہد کے باعث کمیونسٹ پارٹی پر پابندی تھی۔ کئی اہم اخبارات رہبرِ دکن، میزان وغیرہ بند تھے۔ پیام اور رعیت جو بائیں بازو کے اخبارات تھے، مشکلات سے دوچار تھے۔ عابد علی خاں صاحب نے ایک اخبار کی ضرورت محسوس کی تاکہ عوام کے نئے مسائل سامنے آئیں۔ نئی سیاسی تبدیلیوں نے جو مسائل پیدا کیے ہیں وہ حل ہوں، آصفی حکومت کے خاتمے سے مسلمانوں اور اردو کے جو مسائل پیدا ہوگئے ہیں ان کی ترجمانی اور رہبری ہو چناں چہ ۱۵/ اگست ۱۹۴۹ء کو اخبار سیاست کی اجرائی عمل میں آئی۔ ایک اچھا اخبار سامنے آیا۔ مگر اسے جلد اور آسان پذیرائی نہیں ہوئی چوں کہ پرانے سماج پر جو کاری ضرب پڑی تھی اس دور میں ایک نئی آواز، نئی فکر اور نئی پہل کو عوام قبول کرنے میں پس و پیش اور تامل کرتے رہے۔ عابد علی خاں صاحب کے افکار اور سیاست میں قاضی عبدالغفار کے پیام کی جھلک نے کانگریس اور کمیونسٹ قائدین دونوں کو یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ اب سیاست کو مسلم عوام اور سیاسی جماعتوں کے قریب کرنے کے لیے اہمیت دی جانی ضروری ہے چناں چہ ۱۹۵۰ء میں چیف منسٹر مسٹر بی رام کرشنا راؤ نے عابد علی خاں صاحب سے خواہش کی کہ ریاست کے ہند یونین میں انضمام کے بعد مسلمان جس سیاسی علاحدگی اور پس و پیش سے دوچار ہیں انھیں قریب تر کرنا چاہیے۔ انھوں نے ممتاز مسلمانوں کے ایک اجتماع کی خواہش کی۔ عابد علی خاں صاحب نے اپنے گھر پر اس وقت کے تمام ممتاز علما، مشائخین، قائدین اور اعلا عہدہ داروں کا جن کی کچھ آواز تھی اپنے گھر پر جلسہ منعقد کیا جس میں ڈاکٹر سید عبداللطیف، نواب سعید جنگ (چیف جسٹس) نواب مقصود جنگ، نواب محمود یار جنگ، نواب ناظر یار جنگ، بیرسٹر اکبر علی خاں، پدما بھوشن غلام یزدانی اور پروفیسر حبیب الرحمٰن کے نام یاد آرہے ہیں۔ اس جلسے میں مسلمانوں کے عملی سیاست میں حصہ لینے کے مسائل پر گفتگو ہوئی۔ کئی قائدین نے مسلمانوں کی گرفتاریوں، املاک و جائیدادوں کی تباہی اور ملازمتوں سے علاحدگی، بے روزگاری، جاگیردارانہ نظام کی برخاستگی کے مسائل پر توجہ دلائی۔ چیف منسٹر کے علاوہ مسٹر دگمبر راؤ بندو، گوپال راؤ اکبوٹے اور پنڈت نریندر جی نے جو اس جلسے میں موجود تھے کہا کہ جو کچھ ہوا اب اس کی تلافی کا کام شروع کیا جانا چاہیے۔ اس کے بعد بلدی الکشن میں کانگریس نے ممتاز مسلمانوں کو کانگریس پارٹی کے لیبل کے بغیر انتخابات میں حصہ لینے کی ترغیب دی اور انھیں کامیاب بنایا۔

عابد علی خاں نے سیاست کے آغاز ہی سے اردو کے مسائل پر توجہ کی۔ حبیب الرحمٰن صاحب کو انجمن ترقی اردو کی سکریٹری شپ حوالہ کی گئی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب کہ سرکاری دفاتر سے اردو برخاست کردی گئی تھی۔ عثمانیہ یونی ورسٹی میں ذریعۂ تعلیم اردو سے انگریزی کردیا گیا تھا۔ مدارس میں اردو تعلیم کا انتظام بدل چکا تھا۔ حبیب الرحمٰن صاحب نے انجمن ترقی اردو کے دفتر کے لیے اپنے بنگلے میں سے کچھ حصہ اراضی کا عطیہ دیا۔ جناب سجاد مرزا ناظمِ تعلیمات نے بارہ پندرہ ہزار روپے کا عطیہ دیا۔ یہ طے کیا گیا کہ سر چھپانے کے

لیے ہال بنالیا جائے ۔ عابد علی خاں صاحب نے اردو ہال کی تجویز پیش کی۔ پروفیسر شروانی اور پدما بھوشن غلام یزدانی نے پوچھا کہ رقم کہاں سے آئے گی۔ جاگیریں برخاست ہوگئیں، نوکریوں سے نکالا جارہا ہے، مسلمانوں کی مالی حالت خراب ہے ۔ عابد علی خاں صاحب نے فنڈز کی فراہمی اپنے ذمے لی۔ حیدرآباد میونسپل کارپوریشن سے ایک گراں قدر عطیہ حاصل کیا، حکومتِ حیدرآباد سے بھی مدد لی اور اس طرح اردو ہال کی تعمیر عمل میں آئی جس کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا۔ انجمن نے اردو تعلیم اور سرکاری دفاتر میں اردو کے استعمال کے لیے عہد ساز خدمات انجام دیں۔

فضل علی کمیشن کی سفارشات کے بہ موجب جب سابق ریاست حیدرآباد کے تلگو، مرہٹی اور کنڑا علاقہ کی آندھرا، بمبئی اور کرناٹک کی ریاستوں میں انضمام کی تجویز پیش ہوئی تو فضل علی کمیشن نے پانچ سال کے لیے علاحدہ تلنگانہ کی سفارش کی تھی۔ روزنامہ سیاست نے سب سے پہلے اس سفارش پر اداریے کے ذریعے آندھرا پردیش کی تشکیل کا مطالبہ کیا۔اس کے ایک ہفتہ بعد چیف منسٹر ڈاکٹر بی رام کرشن راؤ نے ریاست کی لسانی تقسیم کے لیے ریاستی کابینہ کے فیصلے کا اعلان کیا۔ دہلی میں ایک طاقتور گروپ اردو کے تحفظ کے لیے علاحدہ ریاست تلنگانہ کی تشکیل چاہتا تھا اور اردو کا مسئلہ کسی فیصلے و اعلان میں حائل تھا۔ چیف منسٹر مسٹر بی رام کرشنا راؤ کی طلبی پر عابد علی خاں صاحب، حبیب الرحمٰن صاحب اور محمد یونس صاحب چیف انجینئر (ریٹائرڈ) دہلی گئے۔ پنڈت نہرو اور مولانا آزاد سے ملاقاتیں کیں اور پانچ سال تک علاحدہ تلنگانہ کے بجائے نئی ریاست آندھراپردیش میں اردو کے لیے تحفظات و تیقنات حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ شاید اسی لیے رام کرشنا راؤ صاحب نے پہلے عام انتخابات میں اسمبلی کے لیے عابد علی خاں صاحب کو حلقۂ آلیر کے لیے ٹکٹ دیا جسے انھوں نے مسترد کردیا۔

انجمن ترقی اردو کے استحکام کے ساتھ عابد علی خاں صاحب نے ۱۹۶۶ء میں ادبی ٹرسٹ قائم کیا۔ ان دنوں حیدرآباد میں کوئی علمی کتاب نہیں ملتی تھی۔ حیدرآباد جو اردو کا اہم مرکز رہا ہے، یہاں کے تمام اردو کتب گھر برخاست ہوگئے تھے۔ کسی ادیب و شاعر کی تصنیف و تالیف کی اشاعت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ادیبوں کی مدد اور علاج کے لیے سابق میں جو شاہانہ اور حکومت کی سرپرستی حاصل تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔ عابد علی خاں صاحب نے نواب مہدی نواز جنگ کی ہدایت اور تعاون سے مقصدی مشاعروں کا آغاز کیا۔ مشاعرے میں شرکت کے لیے اگر ٹکٹ رکھا گیا تو اس موقعہ پر ایک سوونیر بھی شائع کیا جانے لگا جس کے اشتہارات سے پچاس ساٹھ ہزار کی سالانہ آمدنی شروع ہوئی۔ گذشتہ ۲۷ سال میں ان مشاعروں سے عابد علی خاں صاحب نے تیس لاکھ روپے سے زائد رقم جمع کی۔ سب سے پہلے حیدرآباد کے کے اردو آرٹس کالج کے لیے تین چار لاکھ روپے فراہم کیے۔ خود ادبی ٹرسٹ کے کارپس کو مستحکم کیا جو ادیبوں کی علالت، انتقال کے علاوہ نئی کتابوں کی اشاعت میں مدد دیتا تھا۔ عابد علی خاں صاحب نے شہر کے مشہور شاپنگ سنٹر عابد روڈ پر کنارا بینک کا ایک شوروم حاصل کیا اور وہاں بک اسٹال قائم کیا۔ عابد علی خاں صاحب نے اردو اکیڈیمی کے پہلے صدر مجلسِ عاملہ کی حیثیت سے کتابوں کی اشاعت، سمینار، ادیبوں کی مدد اور انھیں اعزاز دینے کا جو پروگرام شروع کیا تھا وہ اب بھی اردو اکیڈیمی کے لیے لائقِ تقلید ہے۔ آندھراپردیش کی تشکیل کے بعد حکومت نے ایک نیا عصری اردو کتب خانہ قائم کیا تھا، رائے جانکی پرشاد اور جناب علی اکبر صاحب سابق ناظم تعلیمات اس کے ذمہ دار تھے۔ عابد علی خاں صاحب نے اسے اردو اکیڈیمی کے لیے حاصل کرلیا اور اسے ضائع ہونے سے بچالیا۔

ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں کے ذریعے پرانے شہر میں ایک اردو گھر تعمیر کیا جہاں دارالمطالعے کے علاوہ اردو تعلیمِ بالغان کا مرکز، ایک نن اسکول اور انجینئرنگ و میڈیسن کے طلبہ کے لیے بک بینک قائم کیا گیا۔ ادارۂ ادبیات اردو کو ڈاکٹر زور صاحب کے بعد بڑی مشکلات سامنا تھا۔ حکومت سے سالانہ صرف پانچ ہزار روپے کی امداد ملتی تھی۔ عابد علی خاں صاحب نے مشاعروں اور عطیوں سے ڈھائی لاکھ دپے سے ادارۂ ادبیات اردو کے لیے ایک ٹرسٹ قائم کیا جس سے اب سالانہ پچاس ہزار روپے کی آمدنی ہوتی ہے اور چھے ماہ قبل ومت ہند نے ادارۂ ادبیات اردو کے میوزیم کے لیے پچاس ہزار روپے کی امداد منظور کی ہے۔

عابد علی خاں صاحب نے حیدرآباد کی سب سے بڑی صنعتی نمائش میں جو جنوری میں منعقد ہوتی ہے اور ۱۵ فبروری تک جاری ہتی ہے، دس سال قبل اردو کتابوں کا اسٹال قائم کیا جسے ملک کے تمام ممتاز پبلشروں کا تعاون حاصل ہے۔ اس اسٹال پر ہر سال تقریباً یک لاکھ روپے سے زائد کی اردو کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ حیدرآباد میں سال میں ایک موقع ایسا آتا ہے جبکہ ہندوستان اور پاکستان کی ریباً تمام اہم اردو مطبوعات ایک اسٹال پر مل جاتی ہیں۔

عابد علی خاں صاحب نے انجمن ترقی اردو کے پلیٹ فارم سے نظم و نسق میں اردو کے سرکاری استعمال اور انجمن ترقی اردو کی الی امداد کے لیے پچاس ہزار کی سالانہ گرانٹ منظور کرائی جو اب تک جاری ہے۔

حیدرآباد میں اقبال صدی تقاریب اور غالب صدی تقاریب کی عابد علی خاں صاحب کو ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ واقف کاروں کا کہنا ہے کہ غالب صدی تقاریب حیدرآباد میں بہت شاندار پیمانے پر منائی گئیں۔ گجرال کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے عابد علی خاں صاحب نے تین زبانی فارمولے اور صحافت کے لیے اہم تجاویز کو شریک رپورٹ کروایا۔ عابد علی خاں صاحب ایک دہا قبل انجمن ترقی اردو سے علاحدہ ہوگئے تھے۔ انجمن ترقی اردو کی ۱۹۸۴ء میں سالانہ کانفرنس میں تعلیم کے لیے چار زبانی قرارداد کے فارمولے کی سطور سے انھیں اختلاف تھا مگر انھوں نے انجمن کے باہر رہ کر اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی وہ حیدرآباد کی اردو تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔

ادبی ٹرسٹ نے کئی ادیبوں کی مدد کی، ان کی تصانیف کی اشاعت میں تعاون کیا۔ خود سیاست کے مضامین پر مشتمل کتابوں کی اشاعت ایک صحافتی کارنامہ ہے۔ اب روزنامہ جنگ پاکستان نے بھی اپنے صفحات پر شائع شدہ مضامین کے مجموعوں کی اشاعت کا آغاز کیا ہے۔

عابد علی خاں صاحب نے اردو زبان کو صرف اپنی مادری زبان ہی نہیں سمجھا بلکہ وہ اس زبان کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ تہذیب اور علامت تصور کرتے ہوئے اردو کا تحفظ اور ارتقا چاہتے تھے۔ ان کے کام کی وجہ سے ان کی آواز معتبر اور قابلِ لحاظ بن گئی۔ جب ۱۹۹۰ء میں حیدرآباد کے چارسو سال پورے ہورہے تھے، انھوں نے جدہ، کویت اور لندن میں جشنِ حیدرآباد میں شرکت کی اور ریاستی حکومت کے بجائے اپنی پہل سے چارمینار پر مہاراجا کشن پرشاد شاد کا تمثیلی مشاعرہ پیش کیا۔ شاید ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہوکہ شہر کی ایک مصروف شاہراہ پر چار گھنٹوں تک مشاعرہ ہوتا رہا۔ ہزاروں لوگ شریک مشاعرہ تھے۔ چارمینار کے چاروں طرف ٹریفک بند رہی۔ چارمینار کے چارسو سال کی تاریخ میں یقیناً کبھی کہیں اتنا بڑا مجمع نہیں ہوا ہوگا۔ حکومتِ آندھراپردیش نے مارچ ۱۹۹۱ء میں حیدرآباد کے چارسو سال کے جشن کی تقاریب کا اعلان کیا مگر اسے ملتوی کیا گیا۔ عابد علی خاں صاحب نے اعلان کیا کہ اسی ملتویہ تاریخ کو قلعہ گولکنڈہ میں بانی شہر محمد قلی قطب کے گنبد پر جلسہ ہوگا، مشاعرہ ہوگا، قطب شاہوں کی تاریخ کی جھلک دکھائی جائے گی۔ محمد قلی اور

بھاگ متی کو کردار کے طور پر پیش کیا جائے گا۔ جلسے میں مرکزی وزیر فروغ انسانی وسائل مسٹر ارجن سنگھ کے علاوہ گورنر، وزراء کے علاوہ ہزاروں عوام اور سینکڑوں بیرونی شہری شریکِ جلسے تھے۔ گولکنڈہ میں اس صدی میں یہ سب سے بڑا اجتماع تھا۔ عابد علی خاں صاحب نے کئی تہذیبی محفلیں منعقد کیں۔ ادبی اجلاس، سمینار اور سمپوزیم، نمائش میں ان کی خاص دل چسپی تھی اور پھر سیاست توسیعی تقریر کا تجربہ اب بھی سارے ملک میں منفرد ہے۔

عابد علی خاں صاحب کو کئی اعزاز ملے ہیں۔ پدماشری، غالب ایوارڈ اور الامین سوسائٹی بنگلور کے کمیونٹی ایوارڈ کے علاوہ انھیں کئی اعزازات حاصل ہوئے، اوپن یونی ورسٹی نے ڈاکٹریٹ کا اعزاز دیا۔ ان کے نام مشاہیر کے خطوط، ایک بہت بڑا اثاثہ ہیں۔ سیاست پر اور عابد علی خاں صاحب پر طلبہ نے ڈاکٹریٹ کیا ہے۔ سیاست آج ملک کا دوسرا کثیر الاشاعت اخبار ہے اور واحد اخبار ہے جس کی خلیجی ممالک کے علاوہ امریکہ کے مختلف شہروں میں ایجنسیاں ہیں۔

عابد علی خاں صاحب کو اگست میں انجینا کا عارضہ لاحق ہوا۔ وہ دل کے پرانے مریض تھے۔ دو مرتبہ دل پر سخت حملوں کا انھوں نے مقابلہ کیا۔ دو ماہ سے گھر پر آرام کی ہدایت کے باوجود وہ آخری دن تک کام کرتے رہے۔ انھوں نے علالت کے باوجود حیدرآباد پر لکھی جانے والی دو ضخیم انگریزی کتابوں کے مسودوں پر نظرِ ثانی کی۔ ۱۲ نومبر کی رات دو بجے سانس لینے میں تکلیف محسوس کی۔ انھوں نے تمام اہلِ خاندان کو بلایا، باتیں کیں اور ۳۰۔۴ بجے اپنے خالق حقیقی کے پاس چلے گئے۔ ان کے انتقال کی خبر صبح کی ریڈیو اور ٹی وی نشریات سے جوں ہی عام ہوئی، حیدرآباد میں ان کے جاننے والوں میں گہرے رنج و الم کا اظہار کیا گیا۔ حیدرآباد کی گذشتہ پچاس سالہ تاریخ میں شاید ایسا ماتم کسی شخص کا ہوا ہو۔ گورنر اور چیف منسٹر سے لے کر تمام سیاسی جماعتوں کے قائدین، تمام مذاہب کے پیشواؤں، تمام زبانوں کے صحیفہ نگاروں اور عوام نے شرکت کی۔ انگریزی اور تلگو اخبارات کی جانب سے ان کی میت پر پھول چڑھائے گئے۔ صبح سے شام تک ہزاروں افراد نے عابد علی خاں صاحب کا آخری دیدار کیا۔ ان کی تدفین کے موقع پر گورنر شری کرشن کانت آخر تک موجود تھے اور قبر میں مٹی ڈالی۔ ان کے انتقال پر سکھوں اور ہندوؤں نے دعائیہ اجتماعات منعقد کیے۔ ان کے انتقال پر پیامات و تعزیت کا طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان کے انتقال کے دوسرے دن ان کا وصیت نامہ کھولا گیا۔ ان کی ہدایت کے باعث دوسرے دن سے ان کے بارے میں سیاست میں کچھ شائع نہیں ہوا۔ ان کا کوئی تعزیتی جلسہ نہیں ہوا۔ ان کی قبر پر کتبہ بھی نہیں ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ مجھے صرف دعائے مغفرت چاہیے۔

عابد علی خاں صاحب اب ہم میں نہیں ہیں لیکن انھوں نے سیاست کے معیار کے لیے، اردو زبان و تہذیب کے لیے، حیدرآباد کے اعلیٰ اقدار کے لیے جو کام چھوڑے ہیں وہ اہلِ حیدرآباد اور اہلِ اردو کی ذمہ داری بن گئے ہیں۔

مجھے عابد علی خاں صاحب کے ساتھ ابتدا سے کام کرنے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ نیک نفسی، آہنی عزم اور مسلسل کام ان کا اہم وصف تھا۔ ان کے انتقال پر دکن کرانیکل نے ان پر اپنے مضمون کی سرخی لگائی تھی HYDERABAD WILL MISS HIM ان کے انتقال پر ملک کے مختلف شہروں سے جو خطوط آئے ہیں ان سب کا مشترکہ جملہ یہ ہے کہ "ہم اب حیدرآباد میں کس سے ملیں" دکن کرانیکل نے ان کے بارے میں ایک جملہ لکھا ہے اور خوب لکھا ہے کہ (A FRIEND OF ALL ENEMY OF NONE)

بدعلی خاں صاحب نے نصف صدی تک اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی اور اقلیتوں کے مفاد کے لیے جو کام کیا ہے وہ صرف خدا کا فضل تھا۔ لتنے بڑے کام ایک آدمی کے بس کی بات نہیں ہوسکتے ۔ عوام کو ان پر اعتماد تھا۔ کسی بھی نیک کام کے لیے ان پر عطیوں کی بوچھار ہوتی تھی۔ کالجس کے طلبہ کی امداد، ادیبوں کا علاج، تجہیز و تکفین اور ضرورت مندوں کی مدد غریب لڑکیوں کی شادیاں، ان کاموں کے لیے ان کے پاس پیسے کی کبھی کمی نہیں رہی۔ عابد علی خاں صاحب نے جو کام شروع کیے، وہ پایۂ تکمیل کو بھی پہنچتے رہے ۔ انھوں نے ایک کامیاب زندگی گزاری اور زندگی کا آخری سفر بھی عزت و محبت و خلوص اور کلماتِ خیر سے طے کیا۔ انھوں نے جو کام چھوڑا ہے اس کی تکمیل کے لیے خدا کا فضل اور ان کے مخلصین کی دعائیں درکار ہیں۔

—— ooo ——

محبوب حسین جگر

ربع صدی کی دوستی

گلبرگہ سے انٹرمیڈیٹ کامیاب کرنے کے بعد جب میں گریجویشن کی تکمیل کے لیے عثمانیہ یونیورسٹی میں داخل ہوا تو مجھے بڑی آرزو تھی کہ میں ممتاز شاعروں، ادیبوں اور صحیفہ نگاروں سے ملاقات کروں۔ ڈاکٹر زور اور قاضی عبدالغفار سے شرفِ نیاز حاصل کرنے کی خواہش نے مجھے ایک عرصۂ دراز سے بے تاب کیے رکھا تھا۔ اس زمانے میں کئی ممتاز ادیبوں، شاعروں اور پروفیسروں سے ملنے کی تمنا پوری ہوئی۔ مخدوم، میکش اور وجد سے بھی میں ملنا چاہتا تھا۔ بچپن میں میکش مرحوم کے ساتھ چنچولی میں چند دن گزارنے کا موقع مل چکا تھا جب کہ ان کے اور میرے والدین وہاں سرکاری عہدیدار تھے۔

ریڈیو سے تقاریر اور اخبارات میں مضامین کی اشاعت کے ساتھ ساتھ ایک نئی خواہش نے جنم لیا اور وہ مخدوم محی الدین سے ملاقات کے بعد بڑھتی گئی۔ یہ خواہش تھی نئی فکر و دانش سے ہم آہنگی اور مطابقت' مخدوم سے میں بہ حیثیتِ شاعر ملاقات کا متمنی تھا۔ لیکن مخدوم سے دوستانہ روابط کے قیام کے بعد شاعری سے زیادہ وہ تحریک اور فلسفہ متاثر کرتا گیا جو ان کی شاعری میں نئی دنیا اور نیا آدم سے متعلق تھا۔

میں ہاسٹل میں رہتا تھا۔ مخدوم ان دنوں حیدرآباد میں توپ کے سانچے میں رہتے تھے۔ ان سے ملنے جب کبھی ہاسٹل سے شہر آتا تو ہمیشہ یہی جواب ملتا کہ کافی ہاؤس میں دیکھیے۔ گھر سے کافی ہاؤس دور نہیں تھا لیکن ان دنوں کافی ہاؤس میں سینئر عثمانین جمع رہتے اور مجھے جونیئر ہونے کی بنا پر کافی ہاؤس میں مخدوم کی میز پر بیٹھنے کی ہمت نہ ہوتی۔ چوں کہ وہاں مارکسزم اور سوشلزم پر بحثیں ہوا کرتیں۔ مخدوم مجھے دیکھتے ہی بلاتے، اپنے حلقے میں بٹھاتے۔ ایک دن میں نے کہا کہ مجھے آپ کی نظمیں درکار ہیں، میں آپ کی شاعری پر مضمون لکھ رہا ہوں۔ مخدوم نے کہا میرے پاس دس بارہ نظموں کے سوا کیا ہے۔ اس وقت مخدوم نے نئی نظم "ہندوستان" لکھی تھی اور اس اعتبار سے وہ اپنی نظموں کی تعداد گنانے میں حق بجانب تھے۔ انھوں نے اسی وقت کچھ نظمیں لکھوائیں اور کچھ نظمیں مجھے زبانی یاد تھیں۔ ان کی مدد سے میں نے مضمون لکھا اور رسالہ نگار کو بھجوایا۔ حضرت نیاز نے لکھا کہ تمہارا مضمون بہت اچھا ہے آئندہ مہینے شائع ہوگا۔ اس مضمون میں میں نے مخدوم کی شاعری کے انقلابی آہنگ کا تجزیہ کیا تھا۔ نیاز صاحب نے یہ بھی لکھا کہ تم نے مخدوم کی شاعری کے ایک اہم پہلو کو پیش کیا ہے۔ یہ مضمون جب شائع ہوا۔ کئی لوگوں نے پسند کیا۔ اس کے کچھ دنوں بعد "نیا ادب" نے بھی مجھ سے مضمون کی خواہش کی۔ ان دنوں "نیا ادب" لکھنؤ سے سبطِ حسن اور علی سردار جعفری نکالا کرتے تھے۔ مجھے اپنے مضمون نگار ہونے کا احساس تو نہیں ہوا لیکن میں نے مخدوم کے فکر و فن کو سمجھنے کی کوشش ضرور کی اور سوشلزم کے مطالعے کی خواہش بڑھنے لگی۔

کافی ہاؤس میں مخدوم صاحب کے ساتھ تبادلۂ خیالات کے مواقع میں اضافہ ہوتا گیا۔ پھر انجمن ترقی پسند مصنفین کے محاذ پر مخدوم کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اخبار "سیاست" سے وابستگی کے بعد اکثر یہ مواقع حاصل ہوئے ہیں کہ مخدوم صاحب اپنی نئی نظم سنانے آتے۔ وہ اپنی نئی غزل یا نظم سنانے کے لیے بے چین رہا کرتے، اور اس کے بارے میں دوسروں کی رائے معلوم کرنے کی کوشش کرتے۔ ں جب کوئی تبصرہ کرتا، یا رائے دیتا تو بڑے انہماک سے سنتے اور اس پر بحث کرتے۔ میں بڑے فخر سے کہوں گا کہ مخدوم صاحب سے مضامین لکھوانے میں میری ترغیب کو بڑا دخل حاصل ہے۔ غالباً ۵۵۔ ۱۹۵۰ء کی بات ہے جب کہ مخدوم صاحب کو یہ شکایت پیدا ہوگئی تھی کہ ان سے شاعری نہیں ہورہی ہے۔ میں اصرار کرتا کہ وہ سیاست کے لیے مضمون ہی لکھیں۔ چناں چہ میری خواہش کی تکمیل میں انھوں نے سیاست کے لیے چار پانچ مضامین لکھے جن میں "بگھی کے پیچھے چھوکرا" جیسا مزاحیہ اور مقبولِ عام مضمون بھی شامل ہے۔

میں بتا رہا تھا کہ گلبرگہ سے حیدرآباد آنے کے بعد سب سے زیادہ مخدوم سے متاثر ہوا۔ پہلے یہ خواہش تھی کہ مخدوم سے ضرور ملوں لیکن مخدوم کے ساتھ، مخدوم کے فکر و فلسفہ سے بھی قریب ہونے کا موقع ملا۔ شاید میری طرح اور کئی لوگ ہوں گے جو مخدوم کے اندازِ فکر اور نئی تحریکات سے بے حد متاثر ہوئے۔ ہاسٹل میں قیام کے دوران ہم مخدوم صاحب کو اکثر سٹی کالج، ان کے گھر، یا پھر کافی ہاؤس سے ہاسٹل لے آتے۔ مخدوم صاحب کو ہاسٹل کے میدانوں میں گھومنے سے بڑی دل چسپی تھی۔ اکثر اشفاق، عابد علی خاں، احمد سبزواری اور بعض احباب چاندنی راتوں میں دور تک نکل جاتے۔ اس وقت مخدوم لطیفے سناتے اور شیطانوں وغیرہ کے قصے بھی گھڑتے۔ کچھ دنوں بعد جب ان سے شیطان کے ان قصوں کے بارے میں کچھ پوچھا جاتا تو انھیں خود کچھ یاد نہ رہتا۔ وہ رات میں ڈر اور خوف کی کہانیاں سنا کر ایک خاص منظر پیدا کرتے اور ایک خاص احساس کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے اور اپنی زندہ دلی سے ان کہانیوں کو ڈر اور لطف کا امتزاج بنا دیتے تھے۔ مخدوم صاحب لطیفے سنانے میں بھی بڑے ماہر تھے۔ پتہ نہیں ان میں سے کتنے سچے اور کتنے فرضی ہوتے۔ لیکن ان کی قدرِ مشترک یہ ہوتی کہ ان کا تعلق کسی نہ کسی ادیب یا شاعر سے ضرور رہتا۔ مجھے ابھی تک ایک قصہ یاد ہے جو مخدوم نے سنایا تھا۔ ان کے بیان کے مطابق وہ مجاز اور کرشن چندر لکھنؤ کی ایک سڑک پر جا رہے تھے کہ مخالف سمت سے کچھ لڑکیاں آتی دکھائی دیں۔ مجاز نے کہا کوئی فقرہ سوچو اور فقرہ سوچا ہی جا رہا تھا کہ لڑکیاں قریب آئیں۔ اور ایک نے کہا "واہ واہ کیا پہلوان آرہے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک" غرض کہ مخدوم جہاں اس قسم کے واقعات سنا کر ہنساتے وہیں وہ کسی نئی نظم، نئی کتاب اور نئے سیاسی واقعات پر تبصرے کے ذریعے اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو حالاتِ حاضرہ سے آگاہ و واقف بھی کراتے۔

پچھلے تیس ۳۰ سال میں مخدوم صاحب سے کئی اہم مسائل پر تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ بعض مرتبہ وہ سیاست کے اداریوں اور سرخیوں پر اعتراض کرتے لیکن بحث میں جب اپنا استدلال پیش کرتے، وہ کہتے آپ اپنی پالیسی میں آزاد ہیں لیکن مسائل کے تجزیے میں جدید اندازِ فکر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مخدوم سے تقریباً ۳۰ سال کی ملاقات اور دوستی میں جو اہم ربط رہا وہ ذہنی اور فکری زنجیر کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ مخدوم صاحب اکثر کہا کرتے تھے تم لکھا کرو اور میں جواب دیتا، اب لکھنا مشکل ہے۔ انھوں نے "صبا" کے مخدوم نمبر میں میرے مضمون کو بہ طور خاص شریک کروایا کہ ان پر جو مضامین لکھے گئے ہیں وہ اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ پچھلے دنوں کئی مرتبہ مخدوم پر کچھ لکھنے کی خواہش مختلف حلقوں سے کی گئی لیکن مجھ سے بن نہیں پڑا لیکن آج ان کی پہلی برسی کے موقعہ پر مضمون کی

(آگے ص ۱۱۱ پر)

محبوب حسین جگر

مخدوم کی شاعری

[محبوب حسین جگر کے ذیل کے مضمون کو اس لحاظ سے تاریخی اہمیت حاصل ہے کہ یہ مخدوم پر پہلا مضمون ہے جس میں پہلی بار مخدوم کے فکر و فن کے امکانات پر روشنی ڈالی گئی تھی۔
یہ مضمون "نگار" لکھنو کے فروری ۴۰ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا (اریب۔ صبا۔ مخدوم نمبر)

جب کسی قوم کی حالت تباہی اور بربادی کے عبرت انگیز انجام کو پہنچ جاتی ہے ۔ پستی اور تنزل کے احساسات اس کا مقدر بن جاتے ہیں اس وقت نظامِ طبعی کو برقرار رکھنے کے لیے زمانہ کروٹیں بدلتا ہوا ایسے ایسے پیغمبرانِ سخن اٹھاتا ہے جن کا پیام احساسات کو جگاتا اور ذہنی انقلاب برپا کرتا ہے ۔ ہمیشہ سے یہی ہوتا چلا آیا ہے اور آئندہ بھی یوں ہی رہے گا ۔

ادبِ جدید کے پیغمبر میکسم گورکی نے ادب کے دھارے کو انسان کی بے چارگی اور زندگی کی نوحہ خوانیوں سے روک کر یہ کہنے کے لیے مجبور کیا کہ :

"زندگی ابدالآباد تک رہے گی ہم اس کے کارسازِ حقیقی ہیں قیامت یہی ہوگی کہ روح الاجتماع داورِ محشر بن کر استبداد کو ہمیشہ کے لیے جہنم رسید کردے "

گورکی سماج اور انسانیت کی تباہ کاریوں سے نفرت کرتا ہوا ایک پیام دے گیا کہ ستم رسیدہ انسانیت کے حقوق پر غاصبانہ قبضہ اور ایسی تمام پابندیوں کو فنا کردیا جائے اور ایسا نظام بنایا جائے جو انسانیت کے مقاصد کی ترجمانی کرے ۔ نہ صرف ترجمانی بلکہ اپنے جہدِ عمل کے لیے راہیں بھی تلاش کرے ۔ اس کا یہ پیام زمانے کے معاشرتی حالات، سیاسی عقائد اور اخلاقی رجحانات کا آئینہ دار تھا ۔ اسی لیے اس کے پیام میں زندگی ہے ۔ اس کے تاثرات میں نہ صرف اس کا وطن بلکہ ساری دنیا بھی گردشیں لگارہی ہے ۔ اس پیام کو سمجھنے والوں نے تنزل و انحطاط کو فنا کی گود میں سلانے کے لیے انقلاب کے ساتھ پیمانِ وفا باندھا ۔ احساسات کی ان بیداریوں نے ہندوستان میں قاضی نذرالاسلام کو پیدا کیا جو برائیوں کے اندھیرے ، خوفناک انتشار اور آتش کدہ استبداد کے جہنم کو سرد کرنے کے لیے آہنی عزم سے میدان میں چلے آئے ۔ قاضی کے آتشیں گیتوں نے ادب کے دھارے کا رخ بدل دیا ۔ ملک کے سنجیدہ ادیبوں اور شاعروں نے قاضی کے دبستان میں اپنے لیے جگہ کرلی اور اپنی استعداد سے جدید ادب کو عبادت بنالیا ۔ مخدوم بھی ان کے مقلدین میں سے ایک ہیں اور اپنے لیے

ایک رفیع مقام رکھتے ہیں۔

مخدوم حیدرآباد کے باشندے اور جامعہ عثمانیہ کے ایم۔اے ہیں اور جدید ادب کے علم برادروں یا ترقی پسند شعرا میں حیدرآباد کی واحد نمائندگی کررہے ہیں۔ ان کی شاعری کا آغاز ۱۹۳۲ء میں ہوا جب کہ بی۔اے میں تھے۔ کالج کی آزاد اور رنگین زندگی میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ اس بات کی تصدیق کردیتا ہے کہ ادیب یا شاعر جو کچھ لکھتا ہے وہ زمانے کے رجحان سے متاثر ہوکر لکھتا ہے۔ مخدوم پر بھی یہی بیتی۔ مزاحیہ نظموں اور رومانی شاعری سے اس عرصے میں مشق ہوتی رہی۔ "پیلادوشالہ" مخدوم کی پہلی شاہ کار طنزیہ نظم ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ ادبی لطافتوں سے مملو یہ ایک بہترین طنزیہ نظم ہے اور ادب میں اپنے لیے ایک رفیع مقام رکھتی ہے۔ اس کے بعد مخدوم رومانی شاعری کے میدان میں گھومتے رہے۔ مخدوم بہت کم کہنے والوں میں سے ایک ہیں اور اسی وقت کہتے ہیں جب کہ زندگی ان سے تقاضا کرتی ہے اور حیات انھیں اکساتی ہے۔ وہ اسی وقت کہتے ہیں جب کہنے کے عالم میں ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مخدوم کی شاعری میں ایک خاص اثر اور خاص جوش ہے۔ ان کے رومان کا آغاز کھیتوں میں پانی کے کنارے ہوتا ہے ..... یہیں اظہارِ حرفِ مدعا کی جرأت کرتے ہیں..... سرورِ سرمدی سے معمور زندگی میں مئے دو آتشہ کے مزے لیتے ہوئے خلوتِ معصوم کو رشکِ طور بناتے ہیں۔ وہ اسی پریم سنسار میں،

بہے جاتے تھے بیٹھے عشق کے زریں سفینے میں　　تمناؤں کا طوفاں کروٹیں لیتا تھا سینے میں
جو چھو لیتا میں اس کو وہ نہا جاتا پسینے میں　　مئے دوآتشہ کے سے مزے آتے تھے جینے میں
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

شاعر کو رنگینیوں میں رنگنے وہ رنگیں سحاب جب آتا تو کہہ دیتے کہ

وہ کیا آتا کہ گویا دور میں جامِ شراب آتا
وہ کیا آتا رنگیلی راگنی، رنگیں سحاب آتا
لبوں کی مے پلانے جھومتا مستِ شباب آتا

جب وہ آتا اور حیا کے بوجھ سے ہر قدم پر لغزشیں ہوتیں تو فضا میں اس رنگین بدن کی لرزشیں منتشر ہوجاتیں جس سے شاعر کے ربابِ دل کے تاروں میں مسلسل جنبشوں کا آغاز ہو جاتا۔ مخدوم اسی پریم سنسار میں کبھی کسی کے انتظار میں وہ گداز بھری تانیں الاپتے ہیں کہ سارا ماحول بھی انتظار میں محو ایک بے کلی سی محسوس کرتا ہے۔ جاگے ہوئے تارے بھی نیند کی مستی میں غرق ہوجاتے ہیں لیکن مخدوم چشم براہ اور نقشِ حیرت بنے ہوئے گداز کے عالم میں کہہ دیتے ہیں کہ:

صبح نے سیج سے اٹھتے ہوئے لی انگڑائی　　او صبا! تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی
میرے محبوب! مری نیند اڑانے والے　　میرے مسجود مری روح پہ چھانے والے

آ بھی جا ۰ تا کہ مرے سجدوں کا ارماں نکلے
آ بھی جا، تا ترے قدموں پہ مری جاں نکلے

ان کی اس رومانی شاعری میں، میں نے ایسا محسوس کیا ہے کہ ہر شخص کے دل کی دھڑکنیں پنہاں ہیں۔

کالج کی زندگی بھر یہ اسی ماحول میں رہے۔ کالج کے آخری ایام میں جب مستقبل سے قریب ہو رہے تھے اور جدید ادب انھیں متاثر کر رہا تھا، ان کے تصور حیات میں ایک تبدیلی پیدا ہوئی۔ انسانیت کا اندرونی اضطراب، مسلسل غلامی، ذہنی بربادی، بھوک، غریبی بے روزگاری، ظلم و استبداد، زندگی کی قدامت اور بجھا ہوا پن یہ سب اپنی بپتا سنانے لگے۔ سارے ہندوستان میں ہر طرف یہی بربادیاں نظر آنے لگیں۔ مخدوم نے دیکھا کہ ان کا وطن جہل، فاقہ، بھوک، بیماری اور نجاست کا مکان ہے، عقل و فراست کا مسان ہے، روایت کا غلام ہے اور جس میں صدیوں کا جذام پرورش پاتا ہے۔ مخدوم کی بصیرت نے دیکھا کہ ایک بے گور و کفن ٹھٹھری ہوئی نعش ہے، ایک خون میں لتھڑا ہوا لقمہ ہے۔

"ایک قبرستان جس میں ہوں نہ ہاں، کچھ بھی نہیں۔ ایک بھٹکی روح ہے جس کا مکاں کوئی نہیں۔" یہاں ایک ایسی مسلسل رات ہے جس کی صبح ہی نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ:

اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا

وہ اس دنیا کو ڈھا دینا چاہتے ہیں، وہ یہاں کی فرسودہ زندگی کے نظام سے باغی ہو جاتے ہیں۔ ان کا وطن جس کی بے کاریوں سے وہ کبھی نہیں تھکے، وہی وطن جہاں کبھی:

عشرت و عیش کی جس جا کہ فراوانی تھی
جس جگہ جلوہ فگن روحِ جہاں بانی تھی

ہاں اسی جگہ مخدوم کے دلِ زار نے یہ دیکھا کہ

خونِ دہقاں میں امارت کے سفینے تھے رواں
ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میّت کا دھواں

یہ وہ بدنصیب واقعہ تھا جس نے مخدوم کو للکار کر کہا کہ وہ اس نظام کی دھجیاں اڑا دے۔ اصلاح مرض کا صحیح علاج نہیں بلکہ انقلاب ہی درد کا صحیح درماں ہے۔

مخدوم نے محسوس کر لیا کہ ظلمتِ کفر کو ایمان.... سگِ خوں خوار کو انسان اور دشمنِ جاں کو نگہبان نہیں کہا جا سکتا وہ کہہ اٹھے کہ

عرش کی آڑ میں انسان بہت کھیل چکا
خونِ انسان سے حیوان بہت کھیل چکا
مورِ بے جاں سے سلیمان بہت کھیل چکا

اب یہ کھیل نہیں ہو سکیں گے کیوں کہ یہ بہت کھیلے جا چکے ہیں

وقت ہے آؤ دو عالم کو دگرگوں کردیں
قلبِ گیتی میں تباہی کے شرارے بھر دیں

مخدوم ایسے سماج کے فرد ہیں جو نزع کے عالم میں ہے جس کے مکیں، مہاجن، امیر، کاشی کے برہمن اور کعبہ کے فقیر ہیں۔ ج
کے ناخن کی خلش سے اقوامِ عالم واقف ہیں۔ انگلی رکھنے کا کیا ذکر.... یہی خندہ و تبسم۔ ہیں ان کی حویلیاں:

رہزنوں کا قصرِ شوریٰ، قاتلوں کی خواب گاہ
کھلکھلاتے ہیں جرائم، جگمگاتے ہیں گناہ

انھیں حویلیوں میں روز و شب انسانیت کا نیلام ہوتا ہوا دیکھتے ہیں اور بے نان و بے پوشش گداؤں کا ایسا گروہ نظر میں آتا ہے

جن کے دل کچلے ہوئے جن کی تمنا پائمال
جھانکتا ہے جن کی آنکھوں سے جہنم کا جلال

ان کی خانماں برباد اور المناک زندگی سے شاعر کو یقین کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا کہ:

کوڑھ کے دھبے چھپا سکتا نہیں ملبوسِ دیں
بھوک کے شعلے بجھا سکتا نہیں روح الامیں

اس بربادی پر وہ کڑھ کر نہیں رہ جاتے، وہ انقلابی ہیں وہ ایمان کے قائل نہیں وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ بنی نوع انسا
کے ہر مسئلے کو تاریخ نے استبداد سے طے کرایا ہے اس لیے ان کی حیات کا مدعا یہ ہے کہ:

وقت ہے آؤ دو عالم کو دگرگوں کردیں
قلبِ گیتی میں تباہی کے شرارے بھردیں

وہ کاسۂ دہر کو معمورِ کرم کرکے اور قلبِ گیتی میں تباہی کے شرارے بھر کے ختم ہونا نہیں چاہتے وہ رجائی ہیں تباہیوں ا
بربادیوں میں بھی مسکراتے ہیں۔ ثباتِ قدمی سے دلیرانہ میدان میں آکر اپنا مدعا سناتے ہیں کہ:

دورِ ناشاد کو اب شاد کیا جائے گا
روحِ انساں کو آزاد کیا جائے گا

وہ اس نئی دنیا اور نئے آدم کے لیے اور ان کھنڈروں پر آزادی کے پرچم کھولنے کے لیے علم بردارانِ آزادی یعنی ہندی نوجوا
سے عقیدت رکھتے ہیں چوں کہ ان کی نظر اور ذوقِ یقیں سے زنداں کی زنجیریں کٹ جائیں گی۔ ان کا نوجوان آندھیوں میں پلا اور طوفا
میں پروان چڑھا۔ وہ مردِ مجاہد ہے۔ اس کی ٹھوکر سے گیتی لرزہ براندام ہوتی ہے۔ ان کا نوجوان اس سارے فرسودہ نظام کی دھجیاں اڑا د
گا اور ناپاکیوں کا جنازہ نکال دے گا۔

مخدوم نشاۃ ثانیہ کے لیے سرمایہ داری کو ام الخبائث اور گرسنگی کو ایک بدترین لعنت سمجھتے ہیں۔ وہ غدارانِ وطن اور ان کی نعشو
کے جہنم کو سرد کرنے کے لیے قیامت کا جوش لیے ہوئے آتے ہیں۔

خدانے فرشتوں کے نام کہیں فرمان دیا ہے کہ:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو

داورِ محشر اس کھیت کے خوشۂ گندم ہی کو جلائے گا۔ حکم کیوں نہیں دیتا کہ کھیت کے اس مالک کو فنا کردیا جائے جس نے دہقاں کو روزی میسر ہونے نہیں دی۔ شاید وہ اپنی شیریں سخنی سے ایک دوردراز عرصہ تک ہمیں فریب دیتا رہے گا۔ لیکن اب ہمارا فریب کھانا مشکل ہے۔ دنیا کی عمر کافی دراز ہوچکی۔ ہمارے تجربے پختہ ہوچکے اور سچ پوچھیے تو اب جبر و استبداد کی انتہا ہوچکی۔ اب یہ وعدے اور سارے فرمان طاقِ نسیاں ہوجائیں گے۔ اب وہیں جہاں:

قصرِ شداد کے دربند ہیں بھوکوں کے لیے

وہیں اس دنیا میں احساسات کی بیداریاں جہدِ عمل کے لیے آئیں گی اور کہیں گی کہ:

پھونک دو قصر کو گر کن کا تماشا ہے یہی
زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی

اب نہ بانس رہے گا نہ بنسیا بجے گی.... استبداد کا وہ دیوتا خوشۂ گندم کے ساتھ فنا ہوجائے گا اور نئی دنیا اور نئے آدم پیدا ہوں گے جو دنیا کو حیات افروز حالت میں رکھیں گے۔

مخدوم اس بربادی اور فنائیت میں اس نظام کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں زلزلوں، آندھیوں، گرج دار گھٹاؤں اور جہنم کی ہواؤں کے شورِ محشر سے مدد لے کر سرمایہ اور استبداد کے ناپاک جنازے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کردینا چاہتے ہیں تاکہ یہ پھر کبھی نہ ابھر سکے۔ ان کا انقلاب ایک قیامتِ صغریٰ کا نمونہ ہوگا جس کا نتیجہ کائنات کے لیے ایک متوازن نظام ہوگا۔

یہ کہتے ہوئے میں ذرا بھر بھی نہیں ڈرتا کہ مخدوم اپنے Theme (مرکزی تخیل) کے جوش اور اثر کی وجہ سے اپنے ہم عصروں سے بہت آگے بڑھ جاتے ہیں۔ چوں کہ وہ خود ایک ایسے شعرِ مجسم ہیں جن میں اجل کے قہقہے اور زلزلوں کی گڑگڑاہٹ ہے۔ وہ زندگی کی آگ میں تپتے ہیں۔ وہ ساحل پر ٹھہر کر دریا کی گہرائیوں کا اندازہ نہیں لگاتے بلکہ تہ کی ساری ترکیبوں سے بہ طورِ خود واقف ہیں۔ اس لیے ان کے کلام میں بلا کا جوش ہے۔ مخدوم کے راسخ عقیدے اور اعجاز بیانی نے قوم کے جذبۂ عمل کو متحرک کردیا ہے۔ ان کے پیام میں عظمت ہے، چوں کہ وہ زندگی کے عمیق مسائل بیان کرتے ہیں۔ تخیلات کے اسی اعجاز میں انسانیت اپنے لیے راہِ عمل ڈھونڈ لیتی ہے۔

مخدوم نے کہنے کی باتیں صاف صاف کہی ہیں۔ ان کے پاس ادب اور زندگی دونوں میں ہم آہنگی ہے۔ وہ ابھی نوخیز ہیں۔ ان کی اس انقلابی شاعری کو جنم لیے ہوئے تین چار سال ہوئے ہوں گے۔ مخدوم کے پاس ان ہیجانی و انقلابی احساسات کے باوجود فن کارانہ ضبط ہے۔ ان کی کامیابی کا ایک بڑا سبب ہے۔ اسی وجہ سے ان کا کلام اوروں کے لیے اثر پذیر بھی ہے۔ وہ انقلاب کے بہت بڑے نقیب ہیں۔ مخدوم کی پختہ مشقی انھیں بہت بلند بنادے گی..... وہ دن دور نہیں جب کہ مخدوم اپنے اس پیام میں اس مہم میں رہبری کے لیے سب سے ممتاز رہیں گے۔

—ooo—

محبوب حسین جگر

اکیلی عورت

نیلا تم پوچھتی ہو کہ میں تمھارے خطوط کے جواب میں ایسی پراسرار خاموشی کیوں اختیار کیے ہوئے ہوں کہ تمھیں اپنی نئی ازدواجی زندگی کا ایک لفظ بھی سنانا نہیں چاہتی ۔ تم یہ کیسے سمجھ بیٹھی ہو کہ میں شیام کے ساتھ رنگ رلیوں میں ایسی محو ہوں کہ نہ صرف تم بلکہ کالج کی تمام ساتھی سہیلیاں بھی فراموش ہو گئیں ۔ تم تو رہ گزار کی رفیق نہیں نیلا بلکہ میری روح اور میری زندگی ہو ۔ تمھارا ہی تو سہارا لے کر میں نے کالج کی زندگی کے تمام منازل طے کیے ہیں ۔ میرے حواس نے ابھی جواب نہیں دیا ہے کہ میں نیلا کو بھول جاؤں اور اسے پہچان بھی نہ سکوں ۔ میری طویل اور پراسرار خاموشی ایک دردناک حقیقت ہے ۔ ان ہی خاموش دنوں میں میری زندگی کا جنازہ نکل چکا ہے ۔ نصیب کی لکھی ساری خوشیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فنا کی گود میں سو چکیں ۔ نیلا بہن اب میں ایک ٹوٹا ہوا رباب ہوں جس سے کوئی نغمہ نہیں نکل سکتا ۔ تم مجھ سے کالج کی چہلیں بیان کرتی ہو اور مجھ سے چاہتی ہو کہ شیام کا حال سناؤں ! اگر تم میری بدنصیبیوں اور محرومیوں کی دردناک داستان سننے کی سکت رکھتی ہو تو میرے پتی شیام کی داستان بھی سن لو اور میری زندہ موت کا ماتم کرتی رہو ۔ یہ نہ سمجھو نیلا کہ شیام کا مزاج نصیبِ دشمناں ہو گیا ہے بلکہ میری تقدیر تقدیرِ دشمناں بن چکی ہے ۔ یہ جان کر درد و غم میں ڈوب نہ جاؤ کہ شادی کے تین چار مہینے بعد ہی میری تقدیر کیوں پھوٹی ۔

شیام کچھ عجیب سا جوان ہے ۔ بہکا بہکا ، الجھے خیالوں میں گرفتار ، نگاہوں میں معمے ، حرکتوں میں چھپی داستانیں ، گفتگو میں خامشی ، خاموشی میں پہیلیاں ۔ اس کو بوجھنے جو چلی تو اپنا پتہ بھی بھولی ۔ اس رات جب میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تو ایک اچنبھے میں پڑ گئی کہ پرماتما نے مجھے کس وحشی کے پلے باندھا ہے ۔ لیکن نیلا میری زندگی اس کی زندگی سے وابستہ ہے ۔ میں نے پوری کوشش کی کہ اس کی اس انوکھی طبیعت میں قرار پیدا کردوں لیکن وہ گذشتہ مہینے یعنی ہمارے بیاہ کے دوسرے ہی مہینے گھوش کے آشرم میں چلا گیا ۔ اس نے دنیا چھوڑ دی ، سب کو تیاگ دیا ، شریر اور آتما کے پھندوں میں گرفتار ہو کر چلا گیا ۔ بھائی ، بہن ، ماں ، باپ اور میں بلکہ تمام رشتوں ناتوں کو محروم و مایوس بنا کر آشرم میں جا بیٹھا ۔ آشرم میں جیسے اس کی آتما کو تجلی نصیب ہونے والی ہے ۔ نیلا وہ آشرم چلا گیا ہے اور اب کون جانے کہ وہ کبھی لوٹے گا بھی یا نہیں ۔ میں اس کے بغیر یہاں رہ کر کیا کرتی تھی ۔ عورت کا آشرم ، اس کی دنیا ، اس کی کائنات بھی تو اس کا پتی ہے ۔ میں بھی انھی قدموں پر چل نکلی ۔ میرے آشرم پہنچنے سے وہ بگڑ بیٹھا ۔ قہر و غضب کا دیوتا بنا ہوا مجھ پر برس پڑا ۔ میری ساری کوششوں کے باوجود وہ رام نہ ہو سکا ۔ آشرم والوں کو بھی میرا قیام گراں گزر رہا تھا ۔ گرودیو سے ان کے چیلوں نے کہا کہ آشرم میں ایک سندری آئی ہے جو بی ۔ اے پاس ہے اور اسکول میں لڑکیوں کو پڑھاتی بھی ہے ۔ شاید شیام کی بیوی ہے لیکن اس کا قیام آشرم پر کلنک کا

یک ٹیکا بن جائے گا۔ مہاراج نے مالا جپتے ہوئے آنکھیں بند کیے شیام سے کہا کہ وہ مجھے آشرم سے چلے جانے کو کہے ورنہ اس کو بھی اشرم میں جگہ نہ مل سکے گی۔ شیام سراپا قہر بنا ہوا میرے تارو پود بکھیر نے چلا آیا۔ میں سوائے اس کے اور کیا کر سکتی تھی کہ آشرم سے گھر واپس ملی آؤں۔

نیلا میں درد و غم کی اسی دنیا میں سانس لیتی ہوئی ماتم کناں تھی کہ ایک اور پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ شیام کی ماں نے کہا کہ وہ میری وجہ سے اشرم چلا گیا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک میم بیاہ لائے جو نہ گھر کی لاج ہو سکتی ہے اور نہ ایک بیوی بن سکتی ہے۔ اسکول اور کالج کی پڑھی لڑکی کی آنکھوں کا پانی مرجاتا ہے۔ شرم و حیا انھیں مس بھی نہیں کرتی اور پھر اس پر طرفہ یہ کہ اب بھی یہ لڑکیوں کو پڑھاتی ہے۔ سکول کی لڑکیاں جو آج اپنا فیصلہ آپ خود کررہی ہیں، ہے رام۔ اس نئے زمانے کو دیکھ کر ہی شیام ڈرا ہے۔ اسی میم سے خوف زدہ ہو کر ماگ کھڑا ہوا ہے۔ نیلا میں نے تعلیم پاکر رہنے سہنے کے آداب تہذیب عطا کی ہے لیکن ان آداب کو بھی فراموش نہیں کیا جو ایک بیوی کا زیور ہیں۔ شیام کی دماغی اور خیالی الجھنوں کو رفع کرنے کی میں نے پوری کوشش کی ہے لیکن اس پر گرودیو، گوسائیں جی اور آشرم کے بھوت سوار تھے، ان بھوتوں کا مقابلہ ایک مجبور عورت کیا کر سکتی ہے جس کی مخالفت میں گھر کی بوڑھیاں بھی ایک پلٹن بن کر نکلی وں۔ شیام کے چلے جانے کے بعد ماں کے طعنے کوسنے اور مجھ ہی پر سارا الزام، مجھے دیوانہ بنا رہے تھے لیکن نیلا پھر بھی میں خاموش رہی۔ ں کو خوش کرنے کی خاطر میں نے اسکول کی ملازمت بھی چھوڑدی لیکن ان کی نظروں میں میں ایک خار ہی رہی۔ مجھ اسکول کی استانی سے نھیں شکایت ہی رہی کہ میرے رکھ رکھاؤ ہی کو دیکھ کر وہ ڈرا ہے۔

نیلا اس دیس میں استانی اور نرس کبھی تقدیس و عفت کا احترام حاصل نہیں کرسکتے۔ استانی اور نرس، سماج کی تمام عورتوں نے نھیں اپنے مقام سے بے دخل کردیا ہے چوں کہ یہ مخلوق مردوں سے آنکھیں ملاتی ہے اور ہر ایک کے درد و غم میں بے محابانہ شریک وتی ہے۔ استانی اور نرس کو دیکھ کر دیویاں اپنا دامن بچالیتی ہیں۔ استریاں سائے سے بھاگ کھڑی ہوتی ہیں اور کھسر پھسر شروع ہوجاتی ہے کہ یہ پڑھی لکھی عورتیں جو بھی قیامت ڈھائیں کم ہے۔ طعن و طنز کے انھی نشتروں سے زخمی، درد و کرب کے مارے آہیں بھرتی ہی لیکن یہ زخم اور بڑھتے گئے، گہرے ہوگئے۔ کسی نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ میں نے شیام کو آشرم کیسے بھجوایا۔ کیا میں پنے پتی کو چھوڑ کر اپنی جوانی کی بربادی گوارا کرسکتی ہوں؟ ہمارے ملک کا دھرم یہی ہے کہ اپنی بربادیوں اور ناکامیوں کا ذمہ دار انھیں نایا جائے جو یہ سب سن سکتے ہیں۔ اس کے جواب میں کچھ کہہ نہیں سکتے۔

نیلا، میں اسی درد و غم کے اتاہ سمندر میں ہچکولے کھا رہی تھی، نہ کوئی لنگر اور نہ کہیں بادبان کہ اس کے سہارے آگے بڑھ سکوں۔ ان دنوں تمھارے اور دوسری سہیلیوں کے خطوط آتے رہے جنھیں پڑھ کر مجھ میں ایک بھونچال آجاتا تھا۔ روز لکھتی تھی ساری رات میں نارمن کے ساتھ سمندر کی سیر کرتی رہی۔ نجمہ شفیق نے کشمیر سے خط بھیجا تھا کہ وہ جھیل ڈل کی رنگینیوں میں غرق ہیں۔ پاروتی اپنے شوہر کی شرارتوں کا ذکر کرتی تھی۔ ارمیلا کہتی ہے کہ اس کا شوہر دھوئیں کے مرغولے یوں چھوڑتا ہے کہ وہ اس کے گلے کا ہار ہو جاتے ہیں جس پر وہ کہتا ہے چاندہالے میں گرفتار ہے۔ نیلا یہ سب پڑھ کر میرا قرار بے قراریوں کا روپ دھارے مجھ سے سرگوشیاں کرتا ہے۔ مجھ میں ایسی حرکت بیدار ہوتی ہے کہ میں دوجہاں پر چھا جانا چاہتی ہوں۔ چاند، ستارے، بادلوں کے جزیرے، غرض کائنات کے

سارے حسن سے کھیلنا چاہتی ہوں۔ نیلا، میرے ٹوٹے ہوئے رباب سے بھی نغمہ تڑپ اٹھتا ہے۔ لیکن نیلا، میں وہ چنگاری ہو گئی ہ
راکھ میں بجھی جا رہی ہے۔

ماں کے نشتروں سے زخمی اور نڈھال ہو کر میں پھر آشرم پہنچی کہ شیام کو واپس لا سکوں لیکن وہ اب کبھی نہیں لوٹ سکتا۔ ا
جٹائیں اور سینے تک لہراتی ہوئی ڈاڑھی اس بات کا ثبوت بن چکی ہے کہ وہ آشرم ہی میں اپنی سمادھی بنا لے گا۔ مجبور ہو کر میں نے
سے کہہ بھی دیا کہ مجھے شرعاً چھوڑ دو اور دوسری نئی زندگی کی اجازت دو۔ میں نے کون سا قصور کیا ہے کہ تمھارے لیے میں بھی زن
طعن و طنز کی آگ میں جھلسنے دوں۔ لیکن خدا کا بندہ، صاف انکار کر گیا۔ وہ مجھے تو صرف تڑپانا اور جھلسانا چاہتا ہے۔ اب میرے ل
رہا کہ زندگی کے حسن تصور کو اپنے دماغ میں آنے دوں۔

نیلا، تم ہی کہو کہ شیام کے آشرم چلے جانے کی مجھ پر کون سی ذمہ داری ہے۔ وہ تارک الدنیا ہو جانا چاہتا ہے تو اپنے ساتھ
دنیا کو کیوں خراب کرتا ہے۔ وہ مجھے کیوں فنا کر رہا ہے۔ اس دیس کی یہی ریت ہے۔ لڑکیاں قربانی کے جانور ہیں جو مردوں کی خوش
لیے بھینٹ چڑھتی ہیں۔ اسلم پاگل تھا جب اس پر دورے پڑتے تھے وہ نیک اور بد کا کوئی امتیاز نہیں کر سکتا تھا لیکن پھول سی نازک
گلاب کی پنکھڑی شاہدہ اس کے ساتھ بیاہی گئی۔ جانتی ہو تم پھر کیا ہوا۔ اسلم پاگل خانہ گیا اور شاہدہ مدن پلی کے سینے ٹوریم میں شر بک
گئی۔ مندرا قلب کا مریض تھا لیکن ڈاکٹروں نے اسے رائے دی تھی کہ اگر وہ بیاہا جائے تو اس کا مرض جاتا رہے گا۔ کملا اس کی بیو
کر آئی مگر کچھ ہی دنوں بعد قلب کے مریض نے کملا کو مفارقت کا دائمی مرض عطا کر دیا اور میں شیام کے آشرم کے جنون پر بھینٹ
رہی ہوں۔ اس دنیا میں بیویاں اپنے شوہروں کی باندیاں ہی بن کر نہیں رہتی ہیں بلکہ بھینٹ چڑھنے کے لیے بھی پیدا کی جاتی ہیں۔ ـ
کی تقدیر ہی میں لکھا ہے کہ وہ اپنی بربادیوں پر اف نہ کرے۔ ان ناانصافیوں کے خلاف اگر کوئی جہاد کرنے کا ارادہ کرے تو وہ مسمار
جائے گا یا ستی کی رسم دوبارہ شروع کر دی جائے گی کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بنسری۔ شیام کے باپ کہہ رہے تھے کہ اس نئے ز
نے دھرم کو بھی بگاڑ دیا۔ ان کے خیال میں وہ بڑے اچھے دن تھے جب کہ شوہر کے مرنے پر اس کی بیوی بھی چتا میں جل کر اپنے
شوہر کے ساتھ چلی جاتی تھی۔ اب جو یہ طریقہ اٹھ گیا ہے، زمانہ میں کیسی کیسی برائیاں پھیل رہی ہیں۔ بیوہ لڑکیاں مردوں سے ٹھٹول
ہیں۔ تم نے اس گفتگو کا مطلب نہیں سمجھا، نیلا وہ ستی پر اس لیے غور کر رہے تھے کہ بیوہ عورتوں کے لیے یہ طریقہ مفید تھا لیک
عورتوں کے لیے یہ طریقہ مفید ہو سکتا ہے جن کے شوہر زندہ ہوں لیکن آشرم میں پناہ گزیں ہوں۔ وہ یا تو مجھے جلا دینا چاہتے ہیں یا قید
چاہتے ہیں تاکہ ان پر کلنک کا کوئی ٹیکہ نہ لگنے پائے۔ مجبوریوں اور لاچاریوں کے اس پشتارے کو لے کر میں نہ جانے کدھر چلی جا رہی
کالج میں شکسپیر کا انطونی اور قلوپطرہ اور رومیو و جولیٹ جب پڑھتی تھی تو مجھے زندگی پیاری لگتی تھی۔ جب کالج چھوڑ کر زندگی میں چلی
کالج کے وہ دن ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں جس میں دور کے ڈھول ہی سہانے تھے۔ اس دنیا میں شیام بھی بستا ہے جس کو آشرم کی پر
جو زندگی کی حقیقت کو پہچانتا چاہتا ہے۔ روح اور جسم کے تعلقات سے پردے ہٹا رہا ہے لیکن ایک عورت کے دل کو نہیں پڑھ
اس کی نگاہوں کو پہچان نہیں سکتا، اس کی دھڑکنوں کو سن نہیں سکتا، ایک عورت کی بربادی پر وہ اپنے عرفان کا محل تعمیر کر رہا ہے۔

نیلا شیام کی ماں صبح سے مجھ پر طعن و طنز کر رہی ہے کہ میرے قدموں کی برکت سے اس کا چاند سا بیٹا ہاتھوں سے جاتا رہا۔

سے ممکن ہوتا تو میں شیام کی جٹائیں پکڑ کر آشرم سے کھینچ لاتی اور محبت کی ماری ماں سے کہتی کہ اپنے لاڈلے سے پوچھو، وہ آشرم کیوں گیا؟ اپنی ماں کے محبت بھرے دل کو کیوں دکھ پہنچایا اور ساتھ ہی ساتھ اگر مناسب سمجھو تو پوچھو کہ ایک جوان لڑکی کی زندگی بھی کیوں تباہ کر گیا؟

نیلا میں یہی سوچتی رہتی ہوں کہ کیا ہمارے ملک میں کوئی ایسا شخص بھی پیدا ہوگا جو آشرم جانے والوں سے نوجوان لڑکیوں کو بچا کر انھیں زندگی عطا کر سکے۔ میں بھی یہ طاقت رکھتی ہوں کہ آشرم جانے والوں کو آشرم جانے دوں لیکن ان کے ساتھ ایک دوسری زندگی بھی تباہ ہونے سے بچالوں۔ لیکن نیلا میں اکیلی ہوں، کام بہت دشوار ہے اور راستے میں بڑی مشکلات ہیں۔ اگر کوئی ساتھی مل جائے تو میں ناانصافیوں سے لڑنے نکلوں لیکن ابھی میں اکیلی ہوں تنہا۔ اکیلی۔ وقت اور ساتھی دونوں کا انتظار کر رہی ہوں۔

—— 000 ——

(مسلسل ص ۱۰۲)

خواہش کی گئی تو مجھ سے اس لیے انکار بن نہیں پڑا کہ میں صاف صاف اعتراف کرنا چاہتا تھا کہ میں گلبرگہ سے حیدرآباد آیا تو تھا بی۔ اے کی ڈگری کے حصول کے لیے اور ڈگری مل بھی گئی لیکن اس سے زیادہ مخدوم محی الدین کی فکر، فن، اور ان کی پسندیدہ تحریک سے بھی متاثر ہونے کا موقع ملا۔ مخدوم تو نہیں ہیں لیکن فکر اور ذہن کے جو نئے سانچے بنے وہ موجود ہیں۔ مخدوم نے جس نئے خیال سے مجھے آشنا کیا وہ عصر حاضر کی آواز بن گیا ہے۔ مجھ جیسے کئی لوگ اس آواز سے آشنا ہیں۔ مخدوم ایک مکتبِ خیال ہے، مخدوم آج نہیں ہے لیکن مکتبِ خیال تو موجود ہے اور میں اسی مکتبِ خیال کے دریچے اور جھروکے سے مخدوم کو دیکھ رہا ہوں۔ مخدوم صاف نظر آرہے ہیں۔ اپنی پہلی نظم "مشرق" کے شعروں کے درمیان۔۔۔۔ ہندوستان، قمر، اندھیرا، سپاہی، جنگ آزادی اور پھر قید آپ بیتی جیسی نظم میں بھی اور غزلوں میں بھی دکھائی دے رہے ہیں۔

ربع صدی کی ہماری دوستی اور ان کی شاعری میں کتنی مشترک قدریں ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری دوستی اس عہد کی کہانی ہے جو اور کئی انسانی قدریں ساتھ لیے چل رہی ہے۔

—— 000 ——

مت اشک بہاؤ

محبوب حسین جگر

میں کہتا ہوں سعیدہ اس لمحہ تمھاری آنکھ میں آنسو ایک بہت بڑے نظام کی شکست ہیں ۔ آج تم ریشم و کم خواب میں ملبوس ہو۔ نیلم کی انگشتری تمھاری مخروطی حنائی انگلیوں میں جگمگا رہی ہے ۔ تمھارے کان کی لو میں زمرد کا بُندا ستاروں کی تابندگی کو شرمارہا ہے ۔ تمھارے بازوؤں پر مرصع زیور، تمھاری گردن میں الماس کا گلوبند، تمھارے ماتھے پر یاقوت کا جھومر، تمھیں ملکہ بنا چکا ہے ۔ گلستان کی خوشبو میں تم بسائی گئی ہو۔ جانتی ہو یہ سب تمھیں کبھی میسر نہ ہوتا اگر آج تم بیاہی نہ گئی ہوتیں۔ ایسے لمحے میں تمھاری غزالی آنکھوں میں آنسو، اطلس و دیبا کی نیلم و پکھراج کی شکست ہے ، اس لیے تم آنسو نہ بہاؤ۔

اگر تم میرے گھر کی ملکہ بن کر آتیں تو تمھیں کچھ بھی نہ ملتا ۔ اپنا خونِ جگر پینا ہوتا ۔ تمھاری جبیں پر طلائی جھومر جھومتا نہ تمھاری زلف کی چھاؤں میں کان کی لو میں زمرد کا بُندا کہکشاں کی طرح جگمگاتا ہوتا ۔ میں نے تمھیں اپنے افسانے سنا کر ادھ موا کردیا ہوتا ۔ عشق و محبت کی داستانیں سنا کر تمھیں بیزار کردیا ہوتا ۔ خیالی باتوں سے تمھیں بہلاتا رہتا ۔ بریلی کے جھمکے ، بنارس کی ساری ، لاہور کی شلوار ، لکھنو کی انگیا، حیدرآباد کی چوڑیاں ، آگرہ کی جوتی سب کی امید ہی امید دلاتا رہتا ۔ اچھا ہوا کہ تم ان بہلاوؤں میں نہ آئیں لیکن اس لمحہ تم اشک نہ بہاؤ ۔ جانتی ہو یہ نفیریاں ، شہنائیاں ، ڈھول اور کئی ساز تمھیں مبارکبادی کا ترانہ سنا رہے ہیں ۔ دیکھتی نہیں ہو سارا قصر قمقموں سے روشن ہوگیا ہے ۔ ہر لب پر تبسم ہے ۔ ہر نگاہ میں خوشی رقصاں ہے ، ہر لفظِ گفتگو سے مسرت چھلک رہی ہے ۔ شمعیں جل رہی ہیں ، پروانے مر رہے ہیں، دیے سلگ اٹھے ہیں۔ تمھاری آنکھوں سے پھر آنسو کیوں رواں ہیں۔

سعیدہ، وہ دن اب یاد نہ کرو جب تمھیں مجھ سے محبت تھی۔ تم ایک ہنگامے میں بھی ، قیامت کے شور میں بھی ، میری آواز سن کر مست ابر کی طرح جھوم جاتی تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ تمھارے لیے وجہِ نشاط صرف میں ہوں ۔ میں آیا اور تمھارا جی لہرایا ۔ تم کہا کرتی تھیں کہ رزاق ، تم ایک گریجویٹ کلرک ہی سہی لیکن تم ایک بلند پایہ افسانہ نگار بھی ہو ، تمھارے افسانے کی غنائیت ، جس میں کسی گلوئے زہرہ کا لوچ ہے ۔ اس غنائیت میں ایسی اداسی بھی ہے جیسے کسی سلونی شام میں دفعتہً آندھی آگئی ہو ۔ ہمیشہ تمھارے افسانے کی ہیروئن مجھ جیسی لڑکیاں ہی رہی ہیں ، جو آدھی عمر کو پہنچ گئی ہیں ، آنکھوں میں آنسو لبوں پر مناجات لیے سحر کا انتظار کررہی ہوں لیکن بھیانک اندھیری رات کا خونیں چنگل انھیں دبوچ رہا ہو ۔ زرد ، پیلی ، بیمار کنواریاں ۔ وہ دوشیزہ جوانیاں جنھیں تنہائی کا غم کھا رہا ہو ۔ کالج کی کئی لڑکیاں جن کے پاس صرف بی اے ، ایم ، اے کی ڈگریاں ہیں لیکن قارون کا خزانہ نہیں ۔ اسلاف کی جاگیر نہیں ۔ پھر اثر نہیں ، رسوخ بھی نہیں ، جو امید و انتظار کے سہارے جی رہی ہیں ۔ صرف سہانے سپنے ہی دیکھتی ہیں ۔ تم کہتی تھیں تمھارے افسانے پڑھ کر عذرا کہتی

۔ جانے میری حالت کو اس نے کیسے تاڑ لیا۔ میمونہ بتلاتی تھی عین میری کہانی ہے۔ مس مزدار گلوگیر آواز میں کہنے لگی۔ "سعیدہ پڑھ ا نے میری ٹریجڈی، میری زندگی کا محزون افسانہ۔ نہ جانے رزاق بھی کیا انھیں لڑکیوں میں سے کسی پر فریفتہ ہے جو ہمیشہ ان کی یوں کی نقش گیری کرتا رہتا ہے۔" مس مزدار کے اس جملے پر میرے پسینے بہہ گئے۔ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور میں ن گئی۔ پھر نہ جانے کیوں لجانے لگی۔ اچھا ہوا کہ مس مزدار نے مجھے نہیں دیکھا۔

تمھاری ماں بھی تمھارے لیے کتنی بے چین تھی کہ تمھارا بیاہ ایسے شخص سے ہو جائے کہ اس بیاہ کے طفیل میں ان کی گزر بسر ،و جائے۔ سعیدہ وہ یوں خیال کرنے میں شاید حق بجانب بھی تھیں ورنہ تم جانتی ہو کہ وہ اب تمھاری مدد کے بغیر فاقوں سے مرجاتیں۔ حقیر پونجی انھوں نے تمھاری تعلیم پر خرچ کردی۔ مجھ سے بھی انھوں نے کہا تھا کہ سعیدہ کا بیاہ جلد ہو جائے تو میری پریشانیاں دور ئیں گی۔ یقین کرو کہ تم اب قصر وایوان میں جا رہی ہو۔ جاتے جاتے یوں اشک بہاتے نہ جاؤ۔ میں جانتا ہوں کہ تمھاری زندگی کا ہم سفر یافتہ نہیں، وہ تمھاری طرح ارسطو اور افلاطون کے فلسفے سے واقف نہیں لیکن وہ داغ کی غزلیں خوب یاد رکھتا ہے۔ ہجر و فراق کے ،وصال و پیار کے اشعار، عشوہ وناز کے اشعار یہ تمام اسے ازبر ہیں۔ تم اسے ان اشعار کا انسائیکلو پیڈیا سمجھ سکتی ہو۔ اس نے یہ اشعار ،کی کئی کیفیتوں سے متاثر ہو کر یاد کیے ہیں۔ اس نے یہ اشعار اپنی خواب گاہ میں گنگنائے ہیں۔ پائین باغ میں، بالائی منزلوں پر، ،میں اور کبھی لب جوئبار یہ اشعار گونجے ہیں۔ اس نے یہ اشعار دولت لٹا کر سیکھے ہیں اور شاید بعض اشعار کے ساتھ کچھ اداؤں کی یاد سے پر مستی و مدہوشی کا ایک عالم گزر جاتا ہو۔ وہ تمھاری خوب قدر کرے گا۔ کہ قدر دانی میں اس کی ایک عمر گزر گئی۔ ایسے لمحے تمھاری پرنم مجھے ڈرا رہی ہے، سہما رہی ہے۔ چوں کہ اس کے قصر میں آج تک کوئی اشک آلود نہیں آیا۔ تم یوں جو اشک بہانے لگو تو تمھاری ن نگاہوں، کھوئی ہوئی باتوں اور الجھے ہوئے خیالوں سے وہ تمھیں پہچان نہ لے۔ اس لیے تم اشک نہ بہاؤ۔ آنکھوں سے ان نظاروں کو ردو جن کی یاد تمھیں رلا رہی ہے۔ ان خیالوں کو دفن کردو جو تمھارے اضطراب کو بڑھا رہے ہیں۔ اس لیے مسکرا دو، مسکراتی رہو۔

میں مانتا ہوں کہ تم نے پیمان نہیں توڑے، وفا کے بعد جفا نہ کی، محبت کے گہرے نقش کو مٹانا نہ چاہا لیکن تم مجبور و بے بس ،۔ تمھاری ماں پر بڑائی کا جنون تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ سعیدہ جس گھر میں جائے وہاں سے رتبہ و اعزاز کی کرنوں کی چھوٹ ان پر بھی ے، وہ بھی پوجی جائیں۔ بس ان کی آرزو پوری ہو گئی۔ تم سے زیادہ انھیں اپنی فکر تھی۔ زندگی کے دن گزارنے اور کھانے کپڑے کی فکر۔ ،لیے وہ یہ نہیں چاہتی تھیں کہ تم ایک بے یار و مددگار گریجویٹ کلرک اور پھر افسانہ نگار سے شادی کرلو۔ الفاظ اور خیالی پلاؤ کے ادو سحر میں گرفتار ہو کر اپنا اور ان کا مستقبل تباہ کرلو۔ کتنی بڑی خلیج پیدا کردی تمھاری ماں نے۔

اس لمحے جب کہ شہنائیوں کا شور اور بلند ہو رہا ہے، برات نکل رہی ہے، مہتابیاں چھوٹ رہی ہیں، آتش بازی نے راستوں اور ،ل کو بقعۂ نور بنا رکھا ہے، ایک خیال ایک لمحے کے لیے میری روح کو کچل گیا۔ تمھاری غزالی آنکھوں سے تمھارے گلنار رخساروں پر ،ا یہ خوشی کے آنسو نہیں بہہ رہے ہیں۔

اگر تم مجھ سے بیاہی جاتیں تو میں تمھاری جناب میں کیا نذر دے سکتا تھا۔ سعیدہ؟

پچھلی راتوں میں تمھاری یاد میں بہائے ہوئے چاندی کی طرح چمکتے آنسو، محبت کا انمول خزانہ، ارمانوں اور آرزوؤں کی دولت،

الفت کے سنہرے خواب ، یہی نیلم و پکھراج تمھیں ملتے ، پھر تمھارے پاس بھی تمھارے سنہرے گیسوؤں ، یاقوتی لب ، موتی سے دانت نیلی رگوں اور جسم کے سونے کے سوا اور کیا تھا ۔ لیکن آج تمھیں سچ مچ دولت مل گئی ، قصر وایواں مل گیا ، حریری پردے مل گئے ، تمھارا شبستان ، اپنی سج دھج اور تمھارے حسن سے جگمگا اٹھا ۔ اب تم کسی ایرانی ملکہ کی طرح خواب گاہ کی جانب جاتی دکھائی دوگی ۔ کسی مغل شہزادی کی طرح یاسمین و گلاب کی بو میں بسی ہوئی رہوگی ۔ کسی یونانی حسینہ کی طرح تمھارے جسم کی رعنائی لباس کے حدوں کو توڑ کر باہر نکل آئے گی ۔ کسی مصری ناگن کی طرح تمھاری زلف لہراتی رہے گی پھر جب تم خواب گاہ میں داخل ہو جاؤ تو سعیدہ کبھی تم میرا خیال نہ کرنا ورنہ تم انگاروں پر لوٹوگی ، جہنم میں ڈھکیل دی جاؤ گی ۔ روح کو کچوکے لگ جائیں گے ۔ میں کہتا ہوں سعیدہ یہاں سے وہاں پہنچنے سے پیشتر ہی تم مجھے بھول جاؤ ورنہ شبستان میں پہنچنے تک یہ ڈراؤنے گھناؤنے خیال ، تمھیں پاگل نہ بنادیں ۔ میں تباہی کے جس بھنور میں گرفتار ہوں تم اس کی طرف نہ آؤ ۔ اب ہمارا ماضی دفن ہو گیا ۔ محبت دفن کردی گئی ۔ میرا نشاط مر گیا ۔ تم انھیں فراموش کر جاؤ ۔ بھول جاؤ مسکراتی چلی جاؤ مت اشک بہاؤ ۔

000

محبوب حسین جگر

مہر و مہ و انجم

کچھ دنوں پیش تر میں عابد روڈ کی ایک دو کان پر قطار میں کھڑا ہوا تھا ۔ ابھی میری باری آنے بھی نہ پائی تھی کہ بارش شروع ہو گئی اور قطار میں کھلبلی مچ گئی ۔ پناہ کے لیے سب دو کانوں کے سائبانوں میں ٹوٹ پڑے ۔ میں بھی ایک کتب فروش کی دو کان کے برآمدے میں پناہ کے لیے دوڑا جب میں قطار سے نکل کر دوڑ رہا تھا وہیں بجلی کے کھمبے سے قریب ایک لفافہ پڑا ہوا ملا ، جو نہ معلوم ڈاک میں حوالے کیے جانے کے بجائے وہاں کیسے گر گیا تھا ۔ میں نے اسے اٹھالیا تاکہ ڈاک خانے میں ڈال سکوں ۔ سائبان میں جب میں نے لفافے پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ سوائے لفظ بمبئی کے باقی تمام حروف بارش سے دھل گئے ہیں ، اور ڈاک میں ڈالنے سے یہ خط صرف لاوارثی خطوط کے دفتر میں پہنچ کر ضائع ہو جائے گا ۔ جب تک بارش ہوتی رہی ، میں بھی سوچتا رہا کہ اس خط کو کیا کیا جائے ۔ معاً یہ خیال آیا کہ خط کو کھول کر کاتب کے پتے پر واپس کر دیا جائے ۔ گو ، اس خیال پر ضمیر نے ملامت بھی کی کہ اوروں کا راز کیوں جان رہے ہو ؟ جانے کسی محبوب کا خط ہو ۔ کسی بیوی نے اپنے شوہر کو خط لکھا ہو یا یہ ہو سکتا ہے کہ کسی مہاجن نے اپنے قرض دار کو نوٹس دیا ہو ! ان لمحوں میں مجھے ان شاعروں کی یاد بہت ستا گئی جو لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیتے تھے ۔ جب میں گھر لوٹا تو یہ خط پھر یاد آگیا اور مجھے سند باد جہازی والے پیر تسمہ پا کی یاد آ گئی ۔ چوں کہ یہ خط صبح سے میرے خیالوں پر چھایا ہوا تھا ، میں نے لفافہ چاک کیا ۔ اندازِ تحریر سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ کسی لڑکی نے لکھا ہے ۔ کسی لڑکی کا خط پاکر جیسے میں ہواؤں میں اڑنے لگا ۔ آج میں بھی ایک لڑکی کے دل کی دھڑکنوں کو سن رہا ہوں ۔ اس خط میں پیار کی باتیں ہوں گی ، راز کی ملاقاتوں کا ذکر ہو گا ، اندھیرے سے اجالے میں آنے کے احوال ہوں گے ۔ میں نے جب القاب پڑھے میری یہ خیال آفرینیاں دفعتاً رفو چکر ہو گئیں ۔ ایک بھتیجی نے چچا کو یہ خط لکھا تھا ۔ اس خط میں مہر و مہ و انجم ہی کا ذکر تھا ۔ مہ نے یہ خط لکھا تھا ۔

"چچا جان ! قدم بوسی اور ہزار احترام !

بہت دنوں سے آپ نے کوئی خط نہیں لکھا ، اور نہ ہماری خیریت معلوم کی ۔ اماں کہتی ہیں کہ ہم تینوں یتیم بہنوں کا آپ کے سوا اور کون سہارا ہے ۔ وہ یہ فرماتی ہیں کہ اس بیوہ کے صرف آپ ہی پرسانِ حال ہیں ۔ لیکن آپ نے بمبئی جانے کے بعد سے کوئی خط ہمیں نہ لکھا ۔ ہم سایہ گھر والی آمنہ خالہ نے بتلایا کہ ان کے بھائی کے ہاں آپ کا خط آیا ہے کہ آپ کو بمبئی میں اچھی ملازمت مل گئی ہے ۔ کیا اس خوش خبری کے سننے کے

ہم حق دار نہیں ہیں ۔؟

اچھے چچا! آپ کو یہ سن کو بے حد تکلیف ہوگی کہ مہر کا رسم ٹوٹ گیا ۔ اماں اس واقعہ سے اتنی دل گیر ہو گئی ہیں کہ رہ رہ کر انھیں پسینہ آجاتا ہے اور وہ گھبرائی ہوئی دیوانوں کی سی باتیں کرتی ہیں ۔ گھڑی میں روتی ہیں ۔ گھڑی میں دیوانوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر فضا میں ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہتی ہیں ۔ بہت درد بھرے لہجے میں کہتی ہیں کہ تقدیر نے مجھے یہی دن دکھانے کے لیے زندہ رکھا ہے ۔ کل جب وہ کہہ رہی تھیں کہ یہ تین لڑکیاں میرے سینے پر تین پہاڑ ہیں ۔ ان تین پہاڑوں تلے میرا دم نکلا جارہا ہے تو انجم برا مان گئی اور کہنے لگی کہ " اماں اگر آپ کو ہمارا وجود اس قدر برا معلوم ہوتا ہے تو ہمیں زہر دے دو! " انجم بچپن ہی سے الٹی باتیں کرنے کی عادی ہے ۔ وہ اماں کی باتیں سمجھ نہ سکی ۔ اس کے اس جملہ پر اماں زار و قطار رونے لگیں اور انجم کو اپنے سینے سے لگا لیا ۔ کہنے لگیں کہ " میری لختِ جگر تو نے کچھ سمجھا نہیں ، میری بھولی بچی ، میری کلی جیسی نازک بچی ، تجھے کیا معلوم! " پھر انجم بھی رونے لگی ۔ چچا جان! اماں کو اس رسم کے ٹوٹ جانے کا سخت ملال ہے ۔ کہتی ہیں کہ اس انتظار اور آس بھری نگاہوں میں روشنی کی ایک کرن آرہی تھی وہ بھی جاتی رہی ۔ مہر آپا کے منگیتر نے پرسوں کہلا بھجوایا کہ مہر آپا کی عمر بہت زیادہ ہے اس لیے وہ بیاہ نہیں کرسکتے البتہ انجم سے بیاہ کرنے تیار ہیں ۔ اماں نے بہت دیر سوچنے کے بعد کہلا بھیجا کہ یہ ممکن نہیں ۔ پھر انھوں نے ہم سب کو اپنے کلیجے سے لگا لیا ۔ ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر ہمارے رخسار اور پیشانی پر بہنے لگے ۔ اماں نے کہا کہ انجم کو اگر بیاہ دوں تو پھر میری دونوں بچیوں مہر و مہہ کو کون بیاہے گا ۔ تم دونوں کے متعلق یہ دنیا کتنے اعتراضات نہیں اٹھائے گی ۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ یہ جو رسم ٹوٹ گیا اچھا ہی ہوا ۔ آپ نے منگیتر صاحب کو دیکھا ہے نا! سر پر بگلوں کی طرح سفید بال ہوگئے ہیں ، شملہ سے سر ڈھانک کر سپیدی چھپانا چاہتے ہیں ۔ حنائی رنگ کی مونچھیں ، خضاب کی مدد کا صاف پتہ دیتی ہیں لیکن اس کے باوجود چاہتے ہیں کہ انجم سے بیاہ کریں ۔ مہر آپا کو بھی اس رسم کے ٹوٹنے کا افسوس سا معلوم ہوتا ہے ۔ وہ بھی کچھ بجھی بجھی سی اداس اور خاموش معلوم ہوتی ہیں ۔ جب سے شادی کی بات پکی ہوئی تھی ان کا رنگ جیسے نکھر رہا تھا اور وہ خوش خوش دکھائی دے رہی تھیں لیکن دفعتہً جیسے انھیں اب کچھ ہو گیا ہے ۔ اماں مہر آپا کو سمجھاتے سمجھاتے تنگ آچکی ہیں کہ اتنی دل گیر نہ ہو لیکن لڑکی اور شادی کا تصور ۔ اس

افسوں کو اماں کی باتیں کیسے دور کر سکتی ہیں، آپ ہی بتلائیے نا؟

انجم اس سال میٹرک میں کامیاب نہ ہو سکی، وہ دو پرچوں میں ناکام ہو گئی۔ اس سال وہ اسکول نہیں جائے گی۔ گھر ہی میں وہ امتحان کی تیاری کر کے خانگی امیدوار کی حیثیت سے شریک ہونا چاہتی ہے۔ بے چاری کامیاب ہو جاتی لیکن اس کے پاس پڑھنے کے لیے کتابیں بھی نہ تھیں۔ اماں کہتی تھیں کہ امتحان کے قریب کتابیں دلوائیں گی لیکن مشیت کو ہمارا امتحان لینا مقصود تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہماری گزر بسر صرف ایک مکان پر ہے جسے ہم نے کرائے پر دے رکھا ہے اور اس چھوٹے سے مکان میں معمولی کرایہ پر ہیں۔ ہمارے مکان کا چالیس روپے جو کرایہ آتا ہے وہی ہماری زیست کا آسرا ہے۔ اس مکان میں بیمہ کمپنی کا جو مینیجر تھا وہ ایک ہی رات میں مکان خالی کر کے بلا کسی علم و اطلاع کے معلوم نہیں کہاں چلا گیا۔ ایک مہینہ کا کرایہ کیا ڈوبا ہم سب کی دنیا ڈوبی۔ اماں کے ہاتھ میں چاندی کا جو آخری کڑا تھا وہ بیچ کر ہم نے ایک مہینہ کاٹا۔ اگر یہ حادثہ پیش نہ آتا تو انجم کو کتابیں دلوائی جاتیں اور شاید وہ رب العالمین کے صدقے کامیاب بھی ہو جاتی لیکن میں نے آپ سے ابھی جو کہا کہ مشیت ہمارا امتحان لینا چاہتی ہے۔ اماں انجم سے کہہ رہی ہیں کہ ابھی امتحان کو ایک سال باقی ہے، جب تک کسی اسکول میں نوکری کر لے لیکن انجم اماں کی بات نہیں مانتی۔ وہ کہتی ہے کہ بغیر سند والوں کو نوکری کے لیے سفارش کی ضرورت ہے اور ہم غریب سفارش کہاں سے لائیں۔ پھر جب وہ ایک مرتبہ ملازم ہو جائے گی تو اس چکر میں وہ میٹرک بھی کامیاب نہ کر سکے گی۔

آپ کو آخر میں میں خوش خبری سنانا چاہتی ہوں کہ میں نے انٹر میڈیٹ کا امتحان کامیاب کر لیا ہے اور اب بی۔ اے میں داخلہ بھی لے لیا ہے لیکن مجھے کالج جانے سے ڈر سا لگتا ہے۔ مجھ سے کوئی لڑکی نہیں ملتی، مجھ سے کوئی دوستی نہیں کرتی، سب مجھ سے کترا کر بھاگتی ہیں۔ آیائیں بھی مجھے نہیں چاہتی ہیں۔ چوں کہ میں تیلیا رومال پہنے کالج جاتی ہوں، میرے پاس اچھے کپڑے کہاں؟

چچا جان! میں نے سنا ہے کہ بمبئی میں جمعرات کے بازار میں سپید ساڑیاں وغیرہ سستی ملتی ہیں، اگر آپ سے ہو سکے تو میرے لیے مستعملہ سستی ساڑیاں اور قمیصوں کے لیے سستا ریشمی کپڑا بھجوائیے اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہاں پرانے سینڈل اور زنانی جوتے بھی فروخت ہوتے ہیں، اگر کوئی سستا جوتا مل جائے تو میرے

لیے ضرور خریدیے۔ پرسوں جب میں تنگے پیر کالج گئی تھی تو میری جماعت کی لڑکیوں نے بہت بری نظروں سے مجھے دیکھا۔ اگر وہ مجھے اسی طرح دیکھتی رہیں گی تو میں کالج جانا چھوڑدوں گی۔ جب میں کالج جاتی ہوں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ احساسِ کمتری میرا گلا دبوچ رہا ہے۔ میری غربت میری روح کو سلب کررہی ہے۔ میری بے چارگی میری شرافت کا خاتمہ کررہی ہے لیکن یہ غریبی بھی عجیب ہے کہ پھر بھی ہم جیتے جاتے ہیں۔

میں نے اتنا طویل خط آپ کو لکھ دیا لیکن اصل بات لکھنا ہی بھول گئی۔ اماں کہتی ہیں کہ آپ بمبئی جاتے وقت ان سے جو پاؤ تولے کی طلائی انگوٹھی لیکر رہن رکھائے تھے اب ان کو اس انگھوٹھی کی سخت ضرورت ہے۔ چوں کہ ہم سب کے کپڑے تار تار ہو چکے ہیں۔ ابا کے انتقال کے بعد سے کوئی کپڑے ہم بنوانہ سکے اور چار سال تک وہی پرانے کپڑے استعمال کرتے رہے۔ براہِ کرم آپ توجہ فرمایئے، ہم پر احسان ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ میرے اچھے چچا خط کا جلد جواب دیں گے۔ مہرآپا اور انجم آپ کو قدمبوسی کہتی ہیں۔ اماں آپ کو دعا فرماتی ہیں۔

آپ کی

مہہ

یہ خط اس لیے میں نے چاک کیا تھا کہ کاتب کے پاس واپس کردوں لیکن واپس کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ کتنے ارا کتنی امیدیں، کتنی آرزوئیں اس خط میں ہیں جو یہ خط واپس پہنچ جائے تو تین لڑکیوں اور ایک ضعیف ماں پر ایک اور بجلی گرے گی۔ مہرومہ و انجم کے چچا تک بھی پہنچ نہیں سکتا۔ چوں کہ بارش کے قطروں سے پتہ دھل چکا ہے، شاید قدرت کو ان لڑکیوں کا ادا مقصود ہے لیکن اس امتحان میں میں بھی شریک کرلیا گیا ہوں۔ بے چاری ستم نصیب لڑکیوں نے نام بھی کتنے انلٹے رکھ لیے ہیں، مہر وانجم۔ تینوں کے پاس اندھیرا ہے۔ اس اندھیرے میں وہ اس خط سے نور کی کرن کی کتنی امید باندھی ہوئی ہیں اور یہ خط میرے پاس۔ گذشتہ چار روز سے یہ خط میرے پاس ہے اور میری عقل گم ہوگئی ہے۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا کہ اس خط کو کیا کروں۔

000

محبوب حسین جگر مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ غزل

یڈیٹر صاحب روزنامہ "سیاست" حیدر آباد۔

، مودبانہ

المقام میرے محسن و دیرینہ رفیق جناب محبوب حسین صاحب جگر مرحوم جائنٹ ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" ب غزل تقریباً ۵۵ سال قبل لکھی گئی مرحوم کے آٹوگراف کے ساتھ میرے پاس محفوظ ہے۔ اس کی ایک کاپی بہ پیش ہے۔ بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہوگا کہ جب جگر صاحب انٹرمیڈیٹ کالج گلبرگہ میں زیرِ تعلیم تھے محبوب ا۔ لیکن جناب رحیم الدین صاحب مرحوم جب وہ کالج کے پرنسپل تھے ان کی خواہش پر جگر تخلص فرمانے لگے۔

م صحافی، افسانہ نگار اور شاعر کو ہم سب کا سلام

خواجہ معین الدین
پرسنل اسسٹنٹ برائے وزیر داخلہ
اڈمنسٹریٹیو آفیسر (ریٹائیرڈ) حیدر آباد

محبوب حسین جگر

ھے وہ دیکھتے ہی مسکرائے
ی قسمت کہاں سے کوئی لائے
ـ سے پھر کہو بجلی گرائے
ی مدت ہوئی نظریں ملائے
یں تو کیا فلک بھی گونج جائے
. وہ ہولے ہولے گنگنائے
ے کہتے ہیں تاثیرِ محبت
ں پر نام آیا تھا، کہ آئے
ں گزری ہوئی باتیں نہ چھیڑو
اں تک کوئی دل اتنا دکھائے
. ان کی نظر ہے مرنا جینا
ں مشکل سے دونوں ہاتھ آئے

——ooo——

کرشن چندر

پودے

(رپورتاژ)

بوری بندر

جب کرشن چندر بوری بندر کے اسٹیشن پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ سید سجاد ظہیر جو کمیونسٹ ہونے کے باوجود اپنے نام کے پہلے سید لکھتے ہیں، کچھ اداس، کچھ پریشان سے کھڑے گیارہ نمبر کے پلیٹ فارم کے باہر اس کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ پستہ قد مصنف نے جس کے فراغ ماتھے سے بال بڑی تیزی سے غائب ہو رہے تھے اور جس نے اپنی بے چین آنکھوں کو عینک کے دبیز شیشوں سے ڈھانپ رکھا تھا، سید سجاد ظہیر کے قریب جاکر ملتجیانہ انداز میں معذرت پیش کرنے کی جرأت کی۔

بھئی ـــــ سید سجاد ظہیر نے شروع کیا۔ لیکن ـــ کرشن چندر اسی لمحے بول اٹھا۔ بھئی معاف کرنا، دیر ہوگئی اس نے اپنے لبوں پر ایک جھوٹی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ یہ تو دیکھو، ملاڈ سے آرہا ہوں۔ یہاں سے اٹھارہ میل کا فاصلہ ہے۔ پھر بیوی بچوں سے بھی رخصت ہونا تھا اور کم بخت یہ سامان ساتھ تھا اور نوکر عین وقت پر کہیں بھاگ گیا۔ اور ـــــ"

بس کرشن چندر اسی طرح بے ربط جملے کہتا جارہا تھا بہ ظاہر بے ربط لیکن بہ باطن بہ درجۂ غایت مرتب جملے۔ یہ بے ربطی اس کے افسانوں میں ہے، اس کی زندگی میں بھی نظر آتی ہے۔ لوگ بہ ہر صورت دھوکا کھاتے ہیں، بے چارے۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ سید سجاد ظہیر کے لبوں تک بھی اک مسکراہٹ آئی۔

کس قدر لطیف پاکیزہ، نورانی مسکراہٹ تھی۔ سید سجاد ظہیر اطوار و گفتار میں بالکل چمڑے کے سوداگر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی متین اور خاموش صورت دیکھ کر کوئی ان کی جودتِ طبع کا اندازہ نہیں کرسکتا لیکن جب وہ مسکراتے ہیں تو ذہانت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ تبسم ہے کہ ہنستا ہوا کنول ہے، شوخ ہے، خوب صورت ہے، دل کش ہے، نور کا فوارہ ہے۔ تخیل کا کوندا ہے۔ ذہانت کی لہر ہے اڈتی ہوئی، بل کھاتی ہوئی، آگے بڑھتی ہوئی ہیجانی، سیلابی، طوفانی، چشم زدن میں ایک سیدھے سادے، موٹے موٹے، روکھے روکھے چہرے کو سرسبز و شاداب بنا دیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید سجاد ظہیر کے پاس اس تبسم کے سوا اور کچھ ہئ نہیں۔ (شاید اب وہ روز آئینے میں دیکھ کر مسکرایا کریں گے ایں واللہ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ تبسم سچ مچ ـــــ بہ خدا)

سید سجاد ظہیر نے مسکرا کر صاف کہہ دیا۔ "چلو بھئی بس اب ـــ یہ لو اپنا ٹکٹ۔ گاڑی چھوٹنے میں چند منٹ باقی ہیں۔" اتنا کہہ کر انھوں نے گھبرا کر پلیٹ فارم کی گھڑی کی طرف دیکھا۔

دفعتہً علی سردار جعفری سر پر آن کھڑے ہوئے ۔ ان کی بے کریز پتلون، بڑھے ہوئے بال اور گھونسا مار کہ چہرہ بڑے بڑے جغادری ادیبوں پر رعشہ طاری کردیتا ہے ۔ کرشن چندر نے انھیں آتے دیکھ کر اپنی پلکیں جھپکائیں اور ادھر ادھر دیکھنا شروع کردیا لیکن حرکتوں سے کیا دتا تھا ۔ سردار نے بڑے زور سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔ "کیوں بھائی، یہ کیا حرکت ہے ۔ اس وقت چلے آرہے ہو۔ گیارہ بجے کا وقت نہیں دیا تھا ؟ اب دیکھو ایک بج رہا ہے ۔ خیر اب جلدی سے سامان" ..... یکایک سید سجاد ظہیر نے چونک کر کہا ۔ "ہاں بھئی چلو" ا جانے اب تک وہ وہاں کھڑے کیا سوچ رہے تھے ۔

گاڑی میں

تھرڈ کے ڈبے پر "سکندر آباد" لکھا تھا ۔ سکندر آباد جو حیدر آباد دکن میں واقع ہے ۔ تھرڈ کا ڈبہ جو نظام اسٹیٹ ریلوے کی ملکیت اُس وقت بوری بندر کے سٹیشن پر کھڑا تھا اور مسافر اس میں گڑکی بھیلیوں کی طرح لدے ہوئے تھے ۔ نظام اسٹیٹ ریلوے کے یسرے درجے کے ڈبوں میں بھی بجلی کے پنکھے لگے ہوتے ہیں ۔ چناں چہ جہاں ترقی پسند ادیبوں کا گروہ بیٹھا تھا وہاں اتنی گھٹن نہ تھی ۔ اصل ان لوگوں نے اپنے بیٹھنے کے لیے اچھی جگہ حاصل کرلی تھی، پورے ڈبے میں صرف دو پنکھے تھے اور جہاں یہ پنکھے تھے، وہیں تی پسند ادیب بھی تھے ۔ دونوں پنکھوں کے نیچے آمنے سامنے ٹولیاں بنا کے بیٹھ گئے تھے ۔ گاڑی میں اس لیے بیٹھے تھے کیوں کہ یدر آباد دکن جارہے تھے اور حیدر آباد دکن اس لیے جارہے تھے کہ وہاں اردو کے ترقی پسند ادیبوں کی کل ہند کانفرنس تھی ۔

ایک ٹولی میں سید سجاد ظہیر، ڈاکٹر ملک راج آنند، مدن گوپال، سبطِ حسن، اوپندر ناتھ شامل تھے ۔ دوسری ٹولی میں علی سردار جعفری فعت سروش، قدوس صہبائی، عادل رشید، کرشن چندر اور کیفی اعظمی تھے ۔ کیفی اعظمی نے اپنی ہیئت ایک چرس پینے والے فقیر کی سی ار کھی تھی ۔ وہ ایک بوسیدہ کمبل اوڑھے ہوئے، کھڑکی سے پیٹھ لگائے آنکھیں بند کیے اونگھ رہے تھے اور دورانِ سفر میں کبھی کبھی نکھیں کھول کر کمالِ حیرت و استعجاب سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ لیتے ۔ ان کی نگاہ گویا کہہ رہی تھی ۔ ہائیں ! تم لوگ ابھی تک اس بے میں ہو، کچھ کھا کے سو کیوں نہیں گئے ۔ ان کی شکایت آمیز نگاہوں کا نوحہ ادیبوں کے لیے اک مسلسل مرثیہ تھا ۔ عادل رشید اپنی یٹ پر اس طرح بیٹھے تھے گویا فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے ہوں ۔ سبطِ حسن اور مہندر ناتھ نے دنیا کی بے ثباتی اور موجودہ دور کی رجعت ندی پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد شطرنج بچھائی تھی اور مہروں کو پیٹنے میں مصروف ہوگئے کیوں کہ امیر لوگوں کو پیٹنے سے تو یہ لوگ ہے ۔ رفعت سروش کا سنولا چہرہ اپنی معصومیت اور خطرناک سادگی کی مکمل رعنائیاں لیے ہوئے ایک سرمئی کبوتر کی طرح نظر آرہا تھا جو ن چھتری پر بیٹھا ہوا بڑی بے صبری سے دانے کا انتظار کررہا ہو ۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی اس کے کان میں چپکے سے کہہ دے "غٹر غوں ۔ ل کبوتر بول ! ۔"

گاڑی کے چھوٹنے میں ابھی دو منٹ باقی تھے ۔ کرشن چندر نے جو حال ہی میں کسی فلم کمپنی میں ملازم ہوا تھا اپنی نئی امارت تانے کے لیے چار روپے کے سنگترے پھل والے سے خرید کیے اور انھیں اپنے ساتھیوں میں بانٹنے لگا ۔ ازل کا بھوکا اور کمینہ، ساتھ ساتھ کہتا جارہا تھا ۔ "لو بھئی کھاؤ نا ۔ ارے یار ۔ بہت میٹھے ہیں یہ سنگترے اور چہرے پر دبی جھوٹی مسکراہٹ تھی ۔ خوب ہیں یہ سنگترے ۔

رنگترے۔ رس بھرے۔ ارے بھائی اس میں وٹامن بھی ہے، اماں یار ایک تو چکھو" پلکیں جھپکا جھپکا کر وہ سنگترے تقسیم کر رہا تھا۔ راک فیلر کا سالا!

ادیبوں کے کاہن ملک راج آنند اور سید سجاد ظہیر آمنے سامنے بیٹھے تھے، دونوں براق کھدر میں ملبوس تھے۔ سجاد ظہیر کے کھدر کا رنگ سپید تھا تو ملک راج آنند کا رنگ جوگیا تھا لیکن لباس دونوں کا وہی تھا، وہی ٹوپی، وہی جواہر جیکٹ، وہی پائجامہ۔ ملک راج آنند کے منہ میں پائپ تھا تو سید سجاد ظہیر کے لبوں پر تبسم۔ ملک راج آنند کے گداز اور سرخ گلے اور اس کے بھرے بھرے فربہ ہونٹ انگلستان کی آسودگی کے مظہر تھے۔ اس کے پائپ کا دھواں اڑ کر چھت کی طرف جاتا تھا اور پھر یکایک پنکھے کی ہوا سے فضا میں منتشر ہو جاتا تھا۔ آنند اور سجاد ظہیر دونوں ادبی کانفرنس کے پروگرام طے کر رہے تھے اور مدن گوپال جنھوں نے منشی پریم چند کے آرٹ پر ایک کتاب انگریزی میں لکھی ہے ان کے قریب بیٹھے ہوئے ان دونوں ادیبوں کی گفتگو اس انہماک سے سن رہے تھے گویا کسی الہامی تفسیر سے روشناس ہو رہے ہوں۔ مدن گوپال کا خاصہ یہ ہے کہ وہ محض اپنی خاموشی ہی سے لوگوں کو پریشانی میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ مہندر ناتھ اور سبط حسن کبھی کبھی بساط سے گردن اٹھا کر نگاہ پھیر کر ڈبے میں چاروں طرف دیکھ لیتے اور کہیں آسودگی نہ پاکر پھر مہروں کو بیٹنے میں مصروف ہو جاتے۔ قدوس صہبائی مدیر "نظام" تکیہ کا سہارا لیے منہ میں یوکلپٹس کی گولی ڈالے، دونوں ٹانگیں سکیڑے اس طرح بیٹھے تھے گویا پرانی بواسیر کے شکار ہیں۔ کرشن چندر نے از راہِ ہمدردی ان سے کہا۔ "لیجیے۔ آپ بھی کھائیے نا!"

"شکریہ۔" وہ بولے۔ "مجھے تو نزلہ ہے۔" اس کے بعد انھوں نے خود سگریٹ پیش کیا۔ "لیجیے۔"

"شکریہ" کرشن چندر نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو پیچش ہے، اور پیچش میں تمباکو۔ آپ خود جانتے ہیں"؟ "میں خوب جانتا ہوں"۔ قدوس صہبائی نے شہیدوں کا سا تبسم اپنے چہرے پر لا کر کہا۔ "مجھے دس سال سے پیچش ہے"۔

"مجھے پندرہ سال سے ہے۔" کرشن چندر نے عاجزی سے کہا۔

"اور میرے نرخرے کے اعصاب میں ورم بھی ہے۔" قدوس صہبائی نے نہایت انکسار سے جواب دیا۔

"میری آنتوں میں سوزش ہے اور دل میں اختلاج ہے اور جگر میں پتھری ہے۔" کرشن چندر نے نہایت ہی مسکین بیٹھے بجے پر کہا۔ "ڈاکٹر کہتے ہیں میں صرف تین سال تک زندہ رہوں گا۔ خدا خیر کرے، میرا وہ ناول مکمل ہو جائے۔"

"کون سا ناول؟" قدوس صہبائی نے پوچھا۔ "کوئی نیا ناول آپ لکھ رہے ہیں، بھئی ذرا جی لگا کے لکھیے گا وہ آپ کا ناول۔ "شکست"۔ تو بالکل۔ معاف کیجیے گا۔ بھئی فلاپ ہے۔ بالکل۔۔۔"

کرشن چندر سنگترے کی پھانک کھاتے کھاتے اس کے کڑوے بیج بھی نگل گیا۔ کہنے لگا۔ "ذرا یہ۔ اس پنکھے کا رخ اس طرف موڑ دیجیے۔ اف کس قدر گرمی ہے دم گھٹا جا رہا ہے۔"

قدوس صہبائی نے مسکرا کر کہا۔ "یہ یوکلپٹس کی گولی لیجیے مفرح ہے۔"

"وہ مارا۔ وہ مارا۔ دوستو۔ وہ مارا۔" یکایک مہندر ناتھ دھاڑا۔

"کیا بات ہے، کیا بات ہے۔" یکایک کیفی اعظمی نے گھبرا کر اور آنکھیں کھول کر پوچھا۔

دوستو۔ میں کچھ نہیں کہتا۔ بس اسی سبطِ حسن سے پوچھو۔ مات دے دی اسے کہ نہیں؟ وزیر اور فیل اور سب پیادے دھرے کے دھرے رہ گئے دوستو!"

سبطے نے اپنے گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اک نستعلیق انداز میں کہا۔ "اماں۔ ہٹاؤ بھی۔ کیوں شور مچاتے ہو بے کار۔ آخر پنجابی ہونا۔ تو آؤ۔ اب کے تمھیں مات نہ دے دیں تو ۔۔۔"

گارڈ نے یا خدا جانے کس نے سیٹی بجائی اور گاڑی چلنے لگی۔ ادیب گاڑی سے باہر جھانکنے لگے لیکن ان بے چاروں کو الوداع کہنے والا وہاں کون تھا۔ ایک خوب صورت ایرانی عورت اپنے خاوند کو الوداع کہہ رہی تھی۔ ایک پارسی لڑکی قوس قزحی ساڑھی پہنے دوسرے درجے میں کھڑی رومال ہلا رہی تھی اور اس کا محبوب پیار بھری نگاہوں سے اسے تکتا گیا اور گاڑی آہستہ آہستہ چلتی گئی۔ ایک بوڑھے نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ شولاپور پر بھائی صاحب تجھے گاڑی سے اتاریں گے۔ گھبرائیو نہیں۔" لیکن ان ادیبوں کے لیے وہاں کوئی نہ تھا۔ نہ باپ، نہ محبوب، نہ مداح۔ بے چارے خود ہی ہاتھ ہلا ہلا کے رہ گئے اور جب گاڑی پلیٹ فارم سے باہر نکل گئی تو پھر اپنی سیٹوں پر آن بیٹھے اور بے بسی کے عالم میں اونگھنے لگے۔

کرشن چندر جب اداس ہوتا ہے تو سگریٹ پیتا ہے لیکن خود خرید کے کبھی نہیں پیتا ہے، ہمیشہ دوسروں سے مانگ کر پیتا ہے۔ اس کی اس عادت سے اس کے دوست اچھی طرح واقف ہیں اور اسے اکثر پریشان بھی کیا کرتے ہیں۔ اس وقت بھی کرشن چندر کو سگریٹ کی طلب محسوس ہوئی لیکن اسے کسی نے سگریٹ نہیں دیا۔ نہ جانے ان لوگوں کے پاس سگریٹ نہیں تھا یا ان لوگوں نے اسے پریشان کرنا ہی مناسب سمجھا۔ بہر حال اسے اپنے ساتھیوں سے سگریٹ نہیں ملا اور وہ مایوس ہوکر اور گردن جھکا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور اس کے دل کی ویرانی اور بڑھ گئی۔ یکایک اس کے قریب بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے کہنی مار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ کرشن چندر نے دیکھا۔ ایک کالا بھجنگ بدصورت نوجوان ہے جس کے دانت بے حد سپید ہیں اور اپنی جلا سے موتیوں کو بھی شرماتے ہیں اور وہ اسے سگریٹ پیش کر رہا ہے۔ کرشن چندر نے شکریے کے ساتھ اس سگریٹ کو قبول کیا۔ باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ وہ نوجوان نظام اسٹیٹ ریلوے میں مزدور ہے اور حیدرآباد دکن جا رہا ہے۔ کرشن چندر کو یاد آیا کہ سنگترے تقسیم کرتے وقت اس نے اپنے ہمسائے کو سنگترہ نہیں پیش کیا تھا کیوں کہ اس کے کپڑے نیلے رنگ کے تھے اور میلے کچیلے تھے اور اس کا رنگ کالا تھا اور وہ بد صورت، بے ڈول اور کریہہ منظر تھا اور مزدور تھا۔ کرشن چندر نے سگریٹ پیتے پیتے سوچا کہ وہ ابھی تک بورژوائی اخلاق کے تضاد میں گرفتار ہے۔ سردار نے اس کی ذہنی کشمکش کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ "دیکھا تم نے ایک پرولتاری کا اخلاق؟" اور پھر فوراً چپ ہو گیا۔ رفعت سروش نے عادل رشید سے کہا۔ "بھئی، ہمیں تو بھوک لگی ہے"۔ سیٹ کے نیچے ایک ٹوکری میں کچھ سامان خورد نوش بھی تھا۔ عادل رشید نے وہ ٹوکری اٹھا کر اپنی ران پر رکھ لی۔ اور اب وہ دونوں انڈے اور روٹی نکال نکال کر کھانے لگے۔ مکھن ٹین ڈبے میں بند تھا اور چاقو کسی کے پاس نہ تھا۔ اس وقت وہی مزدور اپنے کام آیا اور سب لوگ کھانے میں مصروف ہو گئے۔ اس مرتبہ بھی کرشن چندر اپنے ہمسائے کو کھانے کے لیے پوچھنا بھول گیا۔ سب لوگ جلدی جلدی انڈے، توس، مکھن اور پھل ڈکار گئے۔ بہت عرصے کے بعد یکایک کرشن چندر کو خیال آیا اور اس نے چونک کر کہا۔ "ارے بھئی، کچھ اسے بھی دے دیا ہوتا اپنے ساتھی کو۔"

مزدور مسکرایا۔ وہ ان کا ساتھی تھا لیکن انڈے توس مکھن پھل کھانے والا ساتھی نہیں۔ وہ تو فرش خاک پر بیٹھ کر تقریریں سننے والا ساتھی تھا۔ اس نے آہستہ سے اپنے چاقو سے مکھن کو الگ کیا اور اسے بند کر کے اپنی جیب میں ڈال کر چار مینار کا سگریٹ پینے لگا۔

ترقی پسند ادیبوں کے علاوہ اس ڈبے میں کوئی سو ڈیڑھ سو آدمی اور ہوں گے۔ دو مولوی تھے، چار سود خوار پٹھان تھے، آٹھ دس بنیے تھے جو دوسرے درجے میں سفر کر سکتے تھے لیکن روپیہ بچانے کی خاطر تھرڈ میں آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے، کوئی پندرہ بیس ریلوے کے مزدور تھے، ایک چنا جور گرم بیچنے والا تھا۔ ایک دیسی عیسائی اپنی بیوی کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ بیوی نے اپنے تین بچے سیٹوں پر سلا رکھے تھے اور خود بھی نیلا سایہ پہن کر پھکڑا مارے بیٹھی تھی۔ اس کی سیاہ اور مضبوط ٹانگیں گھٹنوں تک ننگی نظر آتی تھیں اور بالوں سے پر تھیں۔ ٹخنوں پر اونچی ایڑی کے سپید سینڈل کا تسمہ بندھا تھا۔ اس ڈبے کے چار دروازے تھے۔ ہر دروازے پر مفلوک الحال کسان بوسیدہ چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے کھڑے تھے اور بلند آواز میں باتیں کرتے جاتے تھے۔ کتنی عجیب باتیں تھیں وہ۔ زمین کی باتیں، پٹواری کی باتیں، جریب اور کھتونی کی باتیں، ہل کی باتیں، بیل کی باتیں، قحط کی باتیں، بیاہ کے لیے بنیے سے سود پر رقم حاصل کرنے کی باتیں، گھر کو گروی اور زمین کو رہن کرنے کی باتیں، عجیب و غریب باتیں، نہ عشق و محبت کی باتیں، نہ حسنِ جہاں سوز کی باتیں، ساقی کی باتیں نہ شرابِ ناب کی باتیں، مذہب کی باتیں نہ جنت کی باتیں، اک بے پناہ شور تھا، اک مسلسل ہنگامہ، ایک مستقل دوزخ، اک آگ، اک بو، اک سڑاند، جیسے وہ تھرڈ کا پورا ڈبہ انسانیت کا سنڈاس تھا اور جس میں ترقی پسند ادیب اس طرح دھرے تھے جس طرح کوئی کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر سیب کی سرخ و سپید قاش پھینک دے۔

ڈاکٹر ملک راج آنند نے کہا "ادب کی دوامی قدریں بھی ہوتی ہیں۔"

"بے شک بے شک"۔ مدن گوپال نے طوطے کی طرح رٹتے ہوئے کہا۔

"کون سی دوامی قدریں ہوتی ہیں جناب؟" علی سردار نے گویا گھونسا دکھاتے ہوئے کہا۔ سردار کے چہرے پر سیاسی مجرموں کی صعوبتوں کے تمام نشانات موجود ہیں۔ اس کی پیشانی پر مستقبل کے نئے عزائم کی بڑ ہے۔ وہ جب بات کرتا ہے دانت پیس کر، قہر میں ڈوب کر، اک جلالی مجذوب کے انداز میں۔ جو بات چہرے میں ہے، وہی چال ڈھال میں، وہی گفتار میں، ایک تنا ہوا ٹھوس گھونسا، اک جامد ہتھوڑا، اور ہنسیا سرخ جھنڈا گویا اس کے چہرے پر گڑا ہوا ہے۔ سردار کی ذاتی شخصیت اب گھٹتے گھٹتے صفر ہو کے رہ گئی ہے۔ اس سے بات کیجیے۔ معلوم ہوتا ہے آپ ایک کتاب پڑھ رہے ہیں، ایک تحریک کا سامنا کر رہے ہیں، فلسفے کی اک مشق کا مطالعہ کر رہے ہیں، اک نئے اندازِ فکر سے دوچار ہو رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کس نے اس کے دل کو شاعر بنا دیا ہے۔ پھول سے کھل گئے تصور میں۔ دامنِ شوق بھر گیا کوئی......

ملک راج آنند نے پائپ کی راکھ جھاڑ کر اک مخصوص مدبرانہ انداز میں کہا۔ "یہی خوب صورتی یہ ترتیبِ بہترین جمال ہے مجھے یہ جان کر افسوس ہوتا ہے کہ جہاں ہندوستانی ادیبوں نے سماجی مواد کی فراہمی میں اتنی مستعدی سے کام لیا ہے وہاں وہ اسے پیش کرنے میں کمالِ فن کا ثبوت نہیں دے سکتے۔ ...... میری مراد ہئیت سے ہے۔ سماجی مواد خوب صورتی سے پیش کرنا ہی صحیح حسن کاری ہے۔ جنگ کے دوران میں ہندوستان کے ترقی پسند ادیبوں نے کون سا ایسا قابلِ فخر کارنامہ ......" کرشن چندر نے جھلا کر کہا۔ "اور آپ کے

انگریزی ادیبوں نے کون سا ایسا کمال کرکے دکھا دیا ہے۔ آپ کے آڈن نے ـــــ"

"آڈن بہت بڑا شاعر ہے جناب"۔ آنند نے جواب دیا۔ "اس کی شاعری میں شیکسپیئر کے کلام کی عظمت ہے" کرشن چندر نے سی ان سی کرکے کہا۔ "آپ کے آڈن نے، اسپنڈر نے، لیک میکس نے، ہکسلے نے، بریٹلے نے، کوئی یوگا میں الجھ کے رہ گیا تو کوئی سٹنٹ فلموں کے مکالمے لکھنے لگا۔ بریٹلے سیدھا سادا پروپیگنڈا کرتے ہیں، انگریزی استعماریت کے حق میں۔ نیورے نکلس ہندوستانیوں کو صلواتیں سناتے ہیں۔ کچھ لوگ اے۔ آر۔ پی۔ پر کتابیں لکھ رہے ہیں۔ واہ رے حسن کاری ـــــ"

"یہ میں مانتا ہوں کہ ابھی تک بیشتر امریکی اور انگریزی مصنف اس نیم جمہوری استعماریت کے دل دادہ نظر آتے ہیں، اس لیے ان کا خیال ہے کہ ان کی تہذیب اور ان کا سماج اور ان کا اقتصادی نظام ابھی بیس پچیس برس اور چلے گا۔ اس لیے وہ کیوں خواہ مخواہ اس سے لڑائی مول لیں اور اپنی روزی خطرے میں ڈالیں۔ وہ اتنے بے وقوف نہیں ہیں۔ اب یورپی مصنفوں کو لیجیے جدید یورپی شاعری کو جو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔"

"کہاں ہو رہا ہے؟" سردار نے جل کر کہا۔ "ایک آراگان کو چھوڑ دیجیے اور دو ایک اور کو۔ باقی شاعروں نے کیا اپنے آپ کو اور اپنے فن کو نازیوں کے حوالے نہیں کر دیا تھا۔ خاص طور پر فرانسیسی زوال پسندوں نے۔ کہیے تو ایک نہیں، درجنوں مثالیں پیش کردوں۔ ابن الوقتی پر آدرش کو قربان کر دینے سے کبھی آرٹ یا آرٹسٹ عظیم نہیں ہو سکتا۔"

"APOEALYPTIES" آنند نے شروع کیا۔ لیکن اب اس پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے تھے۔ "کنی نے جھنجھلا کے کہا۔ "اس گروپ کا کیا کہتے ہو۔ ایک ہی مجموعہ چھاپ کے رہ گئے، لغویات کا پلندہ۔ چلے تھے رییش دیو مالا کے بل قوم کی حالت سدھارنے، رییش دیو مالا جس میں انسانی بھیڑیوں کے قصے ہیں اور جہاں دوست کی بیوی کو بہکانا بھی دیوتائی میں شامل ہے۔ کیا یہی ادب کی دوامی قدریں ہیں۔ کیا انھیں قدروں کی بنا پر ایک نئے، بہتر اور بھرپور سماج کی داغ بیل ڈالی جائے گی؟"

"ارے کن لوگوں کا ذکر کر رہے ہو، سردار نے کہا۔ "وہ بے چارے تو کب کے ختم ہو گئے۔ اب تو شاعری چھوڑ چھاڑ کے اپنے پیٹ کا دھندا کر رہے ہیں۔"

"بے شک، بے شک" مدن گوپال نے دریں چہ شک کی گردان دہرائی اور عادل رشید بے ساختہ ہنس پڑے۔ جس پر انھیں غصہ آگیا اور وہ عادل رشید کو گھورنے لگے۔ آنند نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "بھئی ہم نے بھی بہت پڑھا ہے۔ ہم نے بھی اقبال اور جوش کا مطالعہ کیا ہے۔ لندن میں بیٹھ کے جھک نہیں مارتا رہا ہوں۔ مجھے تو معاف کیجیے۔ ان میں کوئی عظیم بات نظر نہیں آتی۔ اقبال بہت اچھے ہیں لیکن ان کا فلسفہ متضاد خیالات کا مجموعہ ہے اور جوش اردو میں تو بہت شور و غل مچاتے ہیں لیکن جب بھی انگریزی میں ترجمہ کرو گھاس معلوم ہوتے ہیں۔ بالکل گھاس"

"آپ خود گھاس کھا گئے ہیں۔" سردار نے غصے میں آکر کہا۔ "آنند صاحب پہلے آپ اس ملک کی حالت کا اندازہ کیجیے، اس کی ادبی تحریکات کا مطالعہ کیجیے، اس کے سیاسی رجحانات کا تجزیہ ـــــ"

"دوستو!" سمندر ناتھ نے چیخ کر کہا۔ "دوستو۔ مار ڈالا۔ کچل کے رکھ دیا۔ دوستو میدان جنگ سے بھگا دیا"

"کیا ہوا بھئی؟" سجاد ظہیر نے سخت پریشان ہو کے پوچھا۔ "کچھ بھی تو نہیں" سبطے نے چیں بہ جبیں ہو کے کہا۔ "بس ایک دفعہ اور مات کھلا دیویں۔ جب سے گلا پھاڑ پھاڑ کے چلا رہے ہیں میرے یار۔ پنجابی ڈھگے ہیں نا آخر، تہذیب چھو تک نہیں گئی ہے۔ ہٹاؤ یہ بساط ہم نہیں کھیلتے۔"

"لاؤ ہم تمھاری مدد کرتے ہیں"۔ علی سردار جعفری نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب۔ آپ میری مدد کریں گے۔ آپ؟" سبطے نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"کیوں مجھے کیا ہوا ہے؟" سردار نے چونک کر پوچھا۔ "آپ؟" سبطے ہنسا۔

"ہاں میں!"

"آپ!"

"ہاں! ہاں میں!" اب سردار کو واقعی غصہ آ گیا

"تم!"

"تم!!!"

"بے شک بے شک۔" مدن گوپال نے سرہلا کے کہا، اور سب ہنس پڑے۔

گفتگو ایک لمبے عرصے کے لیے خود بہ خود بند ہو گئی۔ سجاد ظہیر، رفعت سروش، عادل رشید اور مہندر ناتھ کسی نہ کسی طرح سو گئے۔ جب یہ سب سو گئے تو چرس پینے والا فقیر کیفی اعظمی، اک گونہ بے خودی سے سرشار ہو کر گنگنا نے لگا۔ قدوس صہبائی چسکی لے کر یوکلپٹس کی میٹھی گولی چوسنے لگے۔ آنند الکسی ٹالسٹائی کی ROAD TO CALYENY پڑھنے لگے۔ مدن گوپال نے پریم چند کے متعلق اپنا انگریزی شاہکار پھر سے پڑھنا شروع کر دیا اور اس پر پنسل سے نشان لگاتا گیا گویا دوسرے ایڈیشن کے لیے اسے نئی نئی باتیں ابھی سے سوجھ رہی تھیں۔ کرشن چندر کا جی پان کھانے کو چاہتا تھا لیکن گاڑی کہیں رکتی نظر نہ آتی تھی۔ اس نے سبطِ حسن سے کہا۔ "دم گھٹا جا رہا ہے"۔

اگلے سٹیشن پر اتر کر ڈائننگ کار میں چلیں گے۔" سبطے نے تجویز پیش کی۔

"میں بھی چلوں گا۔" سردار نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ یعنی ڈبے کے بیچ میں خاموشی تھی ورنہ چاروں طرف شور تھا اور کسان اور مزدور اور غریب بدصورت مفلوک الحال لوگ چلا چلا کے باتیں کر رہے تھے۔ اس قدر اکیلے، کمینے اور بھوکے لوگ وہ تھے۔ کہ اگر نہ چلاتے تو شاید پاگل ہو جاتے۔ اس خاموش کائنات کی اندھی بسیط گناہ گار خاموشی میں دب کر رہ جاتے۔ اسی لیے تو ان کی روحیں چیخ چیخ کر اپنی زندگی کا نوحہ بیان کر رہی تھیں۔ وہ ہنستے تھے، بات کرتے تھے، مسکراتے تھے، خوش ہوتے تھے، غصے میں آکر چیختے تھے لیکن بات ایک تھی۔ نوحہ، مرثیہ، دفنائی ہوئی، کفنائی ہوئی آرزوؤں کے ننگے مزار۔ ہر ہنسی کے پیچھے، ہر تبسم کے پیچھے، ہر انداز گفتگو کے مرکز میں گویا اپنا سینہ کھولے ہوئے کہہ رہے تھے، ہمیں دیکھو لو جاہل وحشی ظالم درندو، ہمیں بھنبوڑ کر کھا جانے والو دیوتا

تماشیطانو۔ آہا آہا۔ ہمیں قریب سے دیکھ لو۔۔۔۔

کرشن چندر نے منھ پھیر لیا۔ باہر شفق کھل گئی تھی۔

سیطے کے ذہین چہرے پر کرب کی لہر آئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "وہ دیکھا تم نے"۔

سیطے کے چہرے پر کرب کی بے شمار لکیریں ہیں، جیسے سمندر کا جھاگ ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر پختہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ذہنی احساسات کا تموج سالہا سال سے اس کے نازک چہرے پر یخ بستہ ہوتا چلا گیا ہے۔ اس کا چہرہ خفیف سے خفیف انسانی جذبات کا بھی عکاس ہے اور اکثر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سیطے نے زندگی سے کرب ہی اخذ کیا ہے۔ زندگی کی بے پناہ صعوبتوں اور گہری سے گہری مسرتوں سے بھی اس نے کرب ہی حاصل کیا ہے۔ غالباً اس کے اندازِ فکر میں ایک ایسی نازکی ہے اور اس کے احساسات اور جذبات پر اک ایسی شدت کی کیفیت ہے جو اسے ہر غم سے اور ہر مسرت سے اک خاص قسم کا درد محسوس کراتی ہے۔ اک حسین کلی کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایسی ہی کیفیت پیدا ہوئی ہے جیسے ایک نکبت زدہ بھکاری کو دیکھ کے۔ اس کا چہرہ شدتِ احساس کا وہ مرکزِ اتصال ہے جہاں حسن اور غربت، دونوں ایک درد کی تفسیر بن جاتے ہیں۔ اپنی جواں سالی کے باوجود یہ چہرہ، بوڑھا ہو چلا ہے۔ اس میں صدیوں کی پختگی آچکی ہے۔ کرب کی ننھی ننھی لاکھوں لکیریں اس چہرے کے ہر روزن سے شب و روز جھانکتی نظر آتی ہیں جیسے انھوں نے دنیا کے سارے غم کا احاطہ کر لیا ہو۔

شفق کے نازک رنگوں سے سیطے کے چہرے پر وہی مخصوص کربناک کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "وہ دیکھو۔ وہ دیکھو۔۔۔۔

کرشن چندر نے شفق کی طرف دیکھا۔ افق پر پھولی ہوئی سرسوں کی کیاریاں، کشمیر کی کشت ہائے زعفران۔ اسے بھی شفق بے حد پسند ہے۔ شفق جو اس کے دل میں نہ تھی۔ یہ پیلا پیلا سنہرا جادو جو اس کی روح میں نہ تھا۔ یہ شادابی، یہ رنگینی، یہ حسن کاری جس کے نہ ہونے سے اس کا رواں رواں بھوکا تھا۔۔۔۔ یہ شفق جو اب زعفرانی بھی نہ تھی جو اب گل مہر کے پھولوں کی طرح شعلہ بہ داماں تھی۔ سورج نیچے ڈھل گیا تھا۔ بادلوں کا ہر غرفہ پھول پھول تھا۔

سیطے نے کہا۔ "وہ دیکھو۔۔۔۔ وہ دیکھو۔۔۔۔" سیاہ بادلوں کے پیچھے سونا ابل رہا تھا۔ سیاہ بادلوں کے مرکز میں آسمان نیلا تھا۔ سمندر پر کھڑکی سی کھل گئی تھی اور سورج غروب ہو رہا تھا۔ اور وہ کھڑکی میں بیٹھ کر ڈوبتے ہوئے سورج کو تک رہا تھا اور لہریں ریت کو چوم کر واپس چلی جا رہی تھیں۔ یہ نور کی لہریں یہ سورج کا سمندر یہ خدائی کا مرکز۔

"وہ دیکھو۔۔۔۔ وہ دیکھو۔۔۔۔"

شام بڑھنے لگی۔ شفق ڈوبنے لگی۔ تاریکی پھیلنے لگی۔ ہر چیز ڈوب جاتی ہے اس تاریکی کے سمندر میں، وہ سنہرے رنگ میں کھو گیا۔ وہ گلابی تاج محل شہابی ہو گئے۔ مرمریں سے گلابی، گلابی سے شہابی، شہابی سے قرمزی، محل ہاتھی بن گئے اور پھر تاریکی۔ نور کی آخری لہر افق سے ٹکرا کر ڈوب گئی اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ اب کچھ نظر نہیں آتا۔ سیطے نے افسردگی سے کہا، "اور اسے ڈائننگ کار یاد آئی۔ "اگلے اسٹیشن پر وہاں چلیں گے۔"

اب کچھ نظر نہیں آتا۔" کرشن چندر نے کہا۔ بجلی کے کھمبے اور ہرے بھرے کھیت اور پھونس کے جھونپڑے اور دھرتی کے بیٹے اور بیٹیاں......

"عورت کا ذکر تم ضرور کرو گے" سردار نے چڑکر کہا۔ "میاں کسی ڈاکٹر سے علاج کراؤ اپنا، شفق کو دیکھ کر تمھیں عورت ہی یاد آتی ہے۔ اس خونیں منظر کو دیکھ کے بھلا تمھیں میدانِ جنگ کیوں یاد نہیں آتا......

گاڑی دھیمی ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ چلنے لگی، چلتی چلتی رک گئی۔ سردار، سبطے اور کرشن چندر اتر کر ڈائننگ کار میں بیٹھ گئے۔

ڈائننگ کار میں خوب صورت فانوس تھے، شفاف بلوری میزیں تھیں، انگریزی شراب تھی، ہنستے ہوئے چہرے تھے اور عورتیں جن کے چہرے گلاب تھے، قد بوٹا، ہنسی نقرئی اور جسم برفاب، خون کے لباس کا سرسراتا ہوا ریشم اپنے رنگ و نور سے نگاہوں کو خیرہ کیے دیتا تھا اور وہ بیٹھی ہوئیں اور مسکراتی ہوئیں اور چلتی ہوئیں اس طرح دکھائی دیتی تھیں گویا کسی شیشے کی صراحی میں رنگین مچھلیاں تیر رہی ہوں۔ یہ ڈائننگ کار کی مچھلیاں تھیں، یہ وہ مچھلیاں نہ تھیں جو ساحل سمندر پر گھومنے والی ماہی گیروں کی میراث ہوتی ہیں۔

سبطے، سردار اور کرشن چندر کو معلوم ہوا گویا وہ کسی نئی دنیا میں آگئے ہیں۔ بیرے سپید مکلف لباس پہنے با ادب کھڑے تھے۔ تین کورس کا انگریزی کھانا اس کے بعد کافی، پھر وہ لوگ اخروٹ کھانے لگے۔ صاحب لوگ اخروٹ توڑنے والا ہتھوڑا استعمال کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے دانتوں سے وہی کام لیا۔ مقابل کے میز پر تین انگریز فوجی بیٹھے تھے۔ ایک دوسرے سے شناسا نہ تھے۔ اس لیے بات نہ کرسکتے تھے۔ ہاں وہ ان قہقہہ مار کر ہنسنے والے ادیبوں کی بد تمیزیوں کو بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ان تین انگریز فوجیوں کے ساتھ چوتھی کرسی پر ایک موٹا پارسی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بار بار کہہ اٹھتا "میں پریشان ہوں میں بے حد پریشان ہوں جیلانی"

ٹھیک ہے۔ ایک انگریز فوجی افسر نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں تم نہیں جانتے۔ میں زندگی سے عاجز آگیا ہوں۔ بیرا ایک لارج برانڈی لاؤ۔ آپ پئیں گے؟"

"نو تھینکس" دوسرے فوجی نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"تمھاری مرضی۔ لیکن میں بہت پریشان۔ میں بیان نہیں کرسکتا۔ میں کس قدر پریشان ہوں۔"

فوجی افسر اٹھ گئے۔ موٹے پارسی نے سبطے کی طرف نگاہ دوڑائی اور کہا۔ "بھائی میں بہت پریشان ہوں۔"

"آپ پریشان نہ ہوں" سبطے نے مشورہ دیا۔

"کیسے پریشان نہ ہوں، میں تو پریشان ہوں۔ میں اس زندگی سے، اس دنیا سے پریشان ہو چکا۔ یہ سب دھوکا ہے، سراب ہے۔" اس نے گلاس ختم کرتے ہوئے کہا۔

"بیرا ایک لارج برانڈی اور لاؤ، آپ پئیں گے؟"

"نہیں، شکریہ!" کرشن چندر نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"آپ کی مرضی۔ مگر میں بہت پریشان ہوں!"

رستے میں ایک موٹا پارسی آخری میز سے اٹھ کر ادھر آیا۔ دونوں پارسیوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ بڑے ٹھاٹ سے "صاحب جی" ہوا۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔

"کیا حال ہے؟" نووارد نے پوچھا۔

"کیا پوچھتے ہو دوست۔ یہ دنیا ایک دھوکا ہے، سراب ہے، مایا ہے۔ میں تو بے حد پریشان ہوں۔"

"آخر ہوا کیا ہے؟"

"ارے بھئی۔ امسال ایک کروڑ انکم ٹیکس میں جا رہا ہے۔ اس سال کے بزنس پر۔ بتاؤ ہم لوگ کیا کھائیں گے۔ جب اسی فی صدی تو سرکار ہی منافع میں سے لے جائے گی I tell you it is a scandle میں بہت پریشان ہوں۔ کہیں بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ بوائے دو لارج برانڈی لاؤ" اتنا کہہ کر وہ موٹا پارسی میز پر سر پٹک کر رونے لگا۔

حیدر آباد سٹیشن

دوسرے روز صبح جو آنکھ کھلی تو گاڑی نظام اسٹیٹ کی حدود میں داخل ہو چکی تھی اور ایک اندھا لڑکا ہاتھ میں کھجری لیے دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ اپنی دل دوز آواز میں گا کر بیان کر رہا تھا۔ باہر میلوں تک مکا کے کھیت تھے ـــ یا میلوں تک چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کا جنگل تھا۔ خرگوش اور تیتر گاڑی کی آواز سے چونک کر جھاڑیوں سے نکل بھاگتے تھے۔ پگڈنڈی پر چرواہا ریوڑ لیے جا رہا تھا۔ اور بیلوں کے پاؤں سے اڑتی ہوئی گرد میں سورج کی کرنیں ایک زریں دھندلکے میں کھوئی گئی تھیں۔ یہی دھندلکا افق پر بھی تھا۔ جہاں سورج سرخ لحاف سے سر نکال کر نئے دن کو دیکھ رہا تھا۔ چلتی ہوئی گاڑی کو دیکھ رہا تھا۔ ترقی پسند ادیبوں کے تھکے ہوئے چہرے دیکھ رہا تھا۔ کھجری کا نغمہ سن رہا تھا۔ جو مچلتی ہوئی زندگی کو برفیلی موت کا پیغام دے رہی تھی۔ مسافر آنے والی موت سے مرعوب ہو کر اندھے کو خیرات بانٹ رہے تھے۔ ہزاروں سالوں سے یہی آسا کی دھن اور یہی موت کا نغمہ صبح سویرے سارے ہندوستان میں گونج اٹھتا ہے۔ چھوڑ دو دنیا۔ چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے۔ مایا کا جنجال ہے۔ مسافر کس بھول میں پڑا ہے۔ ان گیتوں میں سراب ہے، اندھیرا ہے، تاریکی ہے، موت ہے۔ زندگی نہیں، حرکت نہیں، خوشی نہیں، خود اعتمادی کی وہ جگمگاتی ہوئی کرن نہیں جو انسان کو صبح سے شام تک دنیا کے تکلیف دہ کاموں میں یہ مسرت و شادمانی مصروف رکھتی ہے، اسی لیے تو یہاں ہر فرد فاقہ مست ہے۔ ہر شخص کا چہرہ ستا ہے۔ جیسے ابھی ابھی اس نے اپنے والد کے انتقال کی خبر سنی ہو۔ اسی لیے یہاں ہنسی ہونٹوں سے غائب ہے۔ کرۂ ارض پر شاید ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں ہنسنا بد تمیزی میں شمار کیا جاتا ہے اور رونا عین ثواب ہے۔ رونا ہمارے نغمے میں ہے، ہمارے فلسفے میں ہے، ہمارے سماج میں ہے، ہمارے فن میں ہمارے مذہب میں ہے۔ رونا ہمارے تمدن کی معراجِ کامل ہے، سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا ـــ کھجری والے اندھے نے دوسرا رونا شروع کر دیا اور سردار نے جھلا کر اسے دوانی دی اور کہا ـــ بس کرو، اور اگر ضروری کچھ گانا چاہتے ہو تو کوئی کام کی چیز گاؤ ـــ اندھا بے چارہ چند لمحے چپ رہا۔ اس کے ساتھی نے ادھر ادھر دیکھا۔ اندازہ لگایا کہ ڈبے میں مسلمان مسافروں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس نے اندھے کے کان میں کچھ کہا اور اندھے نے کھجری کی تھاپ سے ایک نعت شروع کی اور جب وہ نعت گا چکا اور

صرف مسلمان مسافروں سے پیسے وصول کر چکا تو اس نے اب دوسری چیز شروع کی "مرلی والے گھنشام" ...... اب کے صرف ہندو مسافروں نے اسے پیسے دیئے۔ اس وقت گاڑی میں بیٹھا ہوا ہر ہندو اور مسلمان مسافر ایک دوسرے کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، جیسے اسے کچا کھا جائے گا اور کرشن چندر کو ایسا محسوس ہوا گویا گاڑی کے ڈبے میں اک گہری خلیج حائل ہوتی جا رہی ہے۔ دو قوموں کے درمیان، دو نظریوں کے درمیان، دو زندگیوں کے درمیان، جیسے کوئی سویا ہوا احساسِ نفرت یکایک پیدا ہو گیا تھا اور سانپ کے پھن کی طرح سر اٹھا کر لوگوں کے دلوں میں لہرا رہا تھا۔ ہر چہرہ زہریلا تھا اور کمینہ اور بھوکا۔ جیسے وہ لوگ اپنی زندگی کی تمام تر صعوبتوں۔ ناکامیوں اور نامرادیوں کے ذمہ دار مخالف فریق کو ٹھہرانا چاہتے تھے اور اپنی بھوک اور پستی اور کمزوری اور نامرادی کا انتقام اس سے لینا چاہتے تھے۔ یکایک گاڑی رک گئی اور اندھا اتر کر دوسرے ڈبے میں چلا گیا۔ وہاں سے پھر وہی صدا آنے لگی۔ سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا ...... کملی والے ...... مرلی والے گھنشیام ...... اور کیفی اعظمی نے اس طرح برا سا منہ بنایا، جیسے کسی نے زبردستی اس کے گلے میں زہر انڈیل دیا ہو۔

مدن گوپال نے سہلا کے کہا۔ "ظالم نے کیسا اچھا گلا پایا ہے؟"

"ہائیں! یکایک سب ترقی پسند ادیب جھلا کے اس کے پیچھے پڑ گئے۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ اسے اسی وقت گاڑی سے نیچے اتار دیتے۔ لیکن پھر یہ سوچ کے چپ ہو رہے کہ اس آدمی نے منشی پریم چند پر ایک کتاب لکھی ہے۔

ہر طرف بیزار سے چہرے تھے۔ عادل رشید کھٹے ڈکار لے رہے تھے۔ ملک راج آنند منہ پر ہاتھ رکھے شریفانہ انداز میں جمائیاں لے رہے تھے۔ رفعت سروش بے وجہ مسکرا رہے تھے۔ کرشن چندر پائنچوں میں دونوں ہاتھ ڈالے سیٹ پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ قدوس اپنے حلق میں یوکلپٹس کی گولی رکھ رہے تھے۔ سبطے آنکھیں مل رہے تھے۔ اور سجاد اونگھ رہے تھے۔ اور علی سردار جعفری لوٹا لیے باتھ روم کی طرف اس طرح بڑھ رہے تھے گویا کسی انقلابی مہم پر روانہ ہو رہے ہوں۔

"مسلم چائے۔ مسلم چائے۔" کسی نے پکارا یہاں بہت سے لوگوں نے ایک ساتھ کہا۔ "لاؤ" کتنی چائے؟

"پندرہ، بیس، پچیس، چالیس، جتنی بھی ہو سکے لے آؤ" عادل رشید نے حکم دیا۔

"چائے والے نے کہا۔ "اگلے سٹیشن پر ملے گی" اور یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

اگلا سٹیشن بیگم پیٹ تھا۔ اور جب تک یہ لوگ چائے ختم کرتے، حیدرآباد کا سٹیشن آ گیا۔ یہاں استقبالیہ کمیٹی کے دس پندرہ ارکان حاضر تھے اور صبح سویرے یوں چلے آنے پر برافروختہ سے دکھائی دیتے تھے۔ ان کے چہرے خوش آمدید کہنے کی کوشش میں مصروف تھے مگر بشرے سے عیاں ہوتا تھا، میاں اگر انسان ہو تو ابھی واپس لوٹ جاؤ۔ صبح سویرے ہمیں جگایا۔ یہ کوئی شرافت نہیں ہے بھاڑ میں جائے تمھاری ترقی پسندیاں۔ حیدرآباد میں ہم لوگ دس بجے سے پہلے نہیں اٹھتے۔ دکانوں کے دروازے گیارہ بجے کھلتے ہیں اور بارہ بجے کے قریب کوئی اکا دکا خریدار سردی میں ٹھٹھرتا ہوا شیروانی کے بٹن کالر تک بند کیے اک معذرتی انداز میں گھومتا ہوا نظر آتا ہے اور ایک آپ ڈھیٹ ہیں کہ نو بجے ہی سٹیشن پر آ دھمکے ہیں۔ لعنت!

چند لمحوں تک مہمانوں نے میزبانوں اور میزبانوں نے مہمانوں کو دیکھا۔ ہونٹوں پر تبسم آتے گئے۔ یہ تبسم بھی خوب ہے

کاروباری، تجارتی، معذرتی، احمقانہ ہر طرح کا تبسم ہوتا ہے۔ مایوس تبسم، عیار تبسم، محبوب تبسم، منفعل تبسم، جاہل تبسم، عالم تبسم، جیسے ہم سب کچھ جانتے ہیں اور آپ نرے چغد ہیں۔ کامراں تبسم، جیسے میاں بتاؤ اب کیا کرو گے تمہاری لونڈیا تو ہم لے اڑے اور تبسم جس میں حسرتوں کی خاک بھری ہوتی ہے۔ ابراہیم جلیس کے چہرے پر یہی تبسم تھا۔ کچھ عجیب قسم کا ملتجیانہ، مٹیالا مایوس تبسم۔ گویا کہہ رہا ہے۔ دیکھو مجھے جو دیدہ، عبرت نگاہ ہو۔ قد چھ فٹ سے کچھ نکلتا ہوا اس پر ایک فٹ کی اونچی رومی ٹوپی پہن کر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ابھی ابھی کسی سرکس سے نکل بھاگے ہیں۔ یہ شباب، پستہ قد، گندمی رنگ، گول چہرہ۔ سیدھا سادا لیکن آنکھیں بے حد ذہین، گویا کہہ رہی ہوں، ہم تمھیں پہچان گئے، ایک ہی لمحے میں۔ یہ نظر حیدر آبادی ہیں۔ چوڑا سیاہ چہرہ، چوڑا ماتھا، چوڑا دہانہ، بڑے بڑے الجھے ہوئے بال، ہر چیز میں وسعت کا احساس، دکن کا مثالی باشندہ، جیسے دکن نے خود اپنی وسیع و عریض چٹانوں سے تراشا ہو۔ بے باک قہقہہ، بے جھجک تبسم جو خود بخود لبوں پر آیا جاتا ہے۔ نظر شاعر ہو کر بھی زمین کے اس قدر قریب کیسے ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ اسے دیکھ کے ہی ہو سکتا ہے۔ یہ مسلم ضیائی ——— پستہ قد، سنولا رنگ، گنجا سر، آنکھوں پر دبیز شیشے، ہونٹوں پر شرمیلی کنواریوں کی سی مسکراہٹ، مسکراہٹ جو کم ہو جاتی تھی اور آجاتی تھی۔ پیچھے ہٹ جاتی تھی اور سامنے آجاتی تھی۔ اس قدر حساس مسکراہٹ تھی وہ کہ فیصلہ ہی نہ کر سکتی تھی، یہ باہر کے لوگ میرے دوست ہیں یا دشمن، اجنبی ہیں یا عزیز، مسکراہٹ، جو کہہ رہی تھی میں اکیلی ہوں، میں تنہا ہوں، میں نے بہت کچھ کھو دیا ہے۔ سب کچھ کھو دیا ہے۔ پھر بھی میں معصوم ہوں اکیلی ہوں مجھے نہ چھوڑو۔ میں تمھیں اپنا بنانا چاہتی ہوں لیکن مجھے تم پر اعتبار نہیں۔ اپنے آپ اعتبار نہیں۔ اس ذلیل ماحول پر اعتبار نہیں جو آدمی کو آدمی نہیں رہنے دیتا۔ تم میرے رفیق ہو سکتے ہو۔ ہاں ہاں ——— نہیں نہیں ——— مجھے چھوڑ نہیں۔ میرے پاس اب اپنا کچھ نہیں ——— ایک نام تھا وہ بھی اپنا نہیں رہا۔ ضیائی میرا ایک دوست تھا وہ مر گیا۔ اس کا نام میں نے اپنا لیا۔ اب وہ مجھ میں زندہ ہے۔ تم میری ہنسی اڑانا چاہتے ہو۔ اے لو میں چلی، نہیں تم مجھے نہیں جانتے۔ اس دوست نے مرتے وقت مجھ سے کہا تھا کہ میں شراب نہ پیوں۔ اس دن سے میں نے کبھی شراب نہیں ——— تم پھر ہنسنے لگے۔ اے لو میں ہونٹوں سے غائب ہوتی جا رہی ہوں ——— تم مجھے نہیں سمجھو گے۔ میں جو معصومیت کی میراث ہوں۔ میں جو محبت کے آنسو سے پیدا ہوتی ہوں اور ناکامی کی گود میں موتی بن کر چھپی رہتی ہوں ———

مسلم ضیائی اور مہندر ناتھ گلے ملنے لگے۔

"آپ سے ملیے۔" کسی نے کرشن چندر سے کہا۔ اور کرشن چندر نے مڑ کر دیکھا۔ معمولی قد و قامت کا بے ڈول سا انسان، چہرے پر اک لایعنی، بے مطلب تبسم۔ پر اسرار تبسم نہیں کہ جسے آدمی نہ سمجھ سکے بلکہ ایسا تبسم جو اپنی تفسیر میں کسی طرح اسمِ مہمل نہ پڑھ سکے۔ بے حد روکھا پھیکا چہرہ۔ نہ لبوں پر چمک، نہ آنکھوں میں ذہانت، نہ پیشانی پر نور، چپ چاپ، گم سم۔ مٹی کا مادھو، چہرے کا رنگ پیلا نہیں مٹیالا، نہیں خاکستری، نہیں کچھ خاکستری کچھ سبز سا۔ بالکل مینڈک ایسا۔ لاحول ولا کرشن چندر نے دل ہی دل میں کہا۔ اسے دیکھ دیکھ کر متلی سی ہو رہی تھی ——— کس کا منہ دیکھنا پڑا صبح سویرے ——— "آپ جگر حیدر آبادی ہیں، ابراہیم جلیس کے بڑے بھائی ہیں۔"

"اوہ جگر حیدر آبادی ہیں؟ بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔" کرشن چندر نے مصافحہ کرتے ہوئے اپنے غلیظ کثیف دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا اور پھر مڑ کر سیٹھے کے کان میں۔ "جگر جہاں بھی دیکھو۔ جلا بھنا ہی ملتا ہے کم بخت!"

سبطے نے ہنس کر کہا۔ "ہاں حیدر آباد میں ہو یا مراد آباد میں یا اردو شاعری میں، اس کا ایک ہی رنگ ہے۔"

سردار نے سبطے اور کرشن چندر دونوں کو ڈانٹا۔ "آئینے میں اپنی صورتیں ملاحظہ فرمایئے ذرا، پھر دوسرے پر انگلی اٹھایئے گا۔"

"کچھ بھی ہو مجھے تو اس شخص سے نفرت ہو گئی ہے۔" کرشن چندر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"یہ آپ کی بد قسمتی ہے کیوں کہ قیام و طعام کے تمام انتظامات جگر صاحب کے ذمے ہیں۔" سردار نے ہر لفظ پر زور دے کر کہا۔

"ہاپ رے" کرشن چندر چونک کر اچھل پڑا۔

حیدر گوڑہ

جس مکان میں مہمان ادیبوں کو ٹھہرایا گیا وہ حیدر گوڑے میں واقع تھا۔ علی سردار جعفری نے کرشن چندر کو حیدر گوڑہ جاتے ہوئے راستے میں ایک محل کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔ گذشتہ مرتبہ اردو کانفرنس کے موقعہ پر ہم لوگ اسی محل میں ٹھہرائے گئے تھے۔ قیام و طعام کا اس قدر اچھا انتظام، بلکہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی اچھا تھا۔ ہر مہمان کے لیے دو نوکر وقف کیے گئے تھے جو ہر وقت اس کے کمرے کے باہر بیٹھے رہتے تھے۔ اس وقت کے نظم و نسق میں جاگیرداری کا مکمل شکوہ موجود تھا۔ اور کرشن چندر نے سوچا۔ اب پرولتاریت کی حد ہو گئی ہے۔ دراصل اسے جگر سے بغض للّہی ہو گیا تھا اس لیے اسے یہ مکان بھی پسند نہ آیا در حالیکہ مکان نیا نیا تعمیر کیا گیا تھا اور پورا مکان ان لوگوں کے قبضے میں تھا۔ کرشن چندر نے دل ہی دل میں مہتمم کو گالیاں دیتے ہوئے سب سے اچھا کمرہ اپنے قبضے میں کر لیا۔ باقی تین کمروں میں چھ چھ سات سات آدمی گولیاں بنا کے بس گئے اور بستر فرش پر بچھ گئے۔ اودھر چار پائی تک تو میسر نہیں اور یہ باتھ روم کی کنڈی بھی غائب ہے اور نہانے کے لیے برتن بھی موجود نہیں۔ جگر اس کے ساتھ ساتھ چلے آرہے تھے اور اس کے دل کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ یکایک اس نے رک کر جگر صاحب کو مخاطب کیا۔ "بہت اچھا مکان لیا ہے آپ نے"

"اجی صاحب ابھی ابھی بنا ہے۔ جگر معصومیت سے فرمانے لگے۔ "وہ دیتا نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے اسے حاصل کیا۔ آپ لوگوں کے لیے۔ بالکل نیا ہے ڈپٹی جلال الدین جو ہیں نا......"

کرشن چندر نے دل میں کہا۔ "اب آپ اس مکان کی کہانی سنائیں گے، اس کا شجرۂ نسب بیان کریں گے، ٹھیک ہے صاحب" آپ کہیے۔ ہم سنیں گے۔ آپ کے مہمان جو ٹھہرے۔"

اتنے میں ایک آدمی دوڑتا ہوا۔ "جگر صاحب سجاد ظہیر صاحب پلنگ مانگ رہے ہیں۔ ان کے کمرے میں پلنگ ڈلوا دیجیے۔"

جگر صاحب نے کہا۔ "پلنگ تو یہاں نہیں ہیں۔ مگر ٹھہریے میں انتظام کرتا ہوں" اتنا کہہ کے وہ اپنی کہانی ادھوری چھوڑ کے چل دیے اور کرشن چندر نے سوچا۔ کس قدر عجیب آدمی ہے یہ۔ بھئی تم اپنی کہانی تو پوری کرتے جاؤ۔ یہ کیا بد تمیزی ہے کہ عین گفتگو کے بیچ میں اٹھ کے چل دیے۔ کس قدر بری بات ہے یہ۔ اچھی تہذیب ہے یہ۔ واہ۔ پھر اسے سجاد ظہیر کے پلنگ کا خیال آیا۔ بنّے پلنگ ہی پر سو سکتے ہیں، فرش پر نہیں۔ آخر ان کے لیے پلنگ کیوں منگایا جائے۔ وہ کیوں پلنگ پر سوئیں اور ہم کیوں نہ پلنگ پر سوئیں۔ واہ۔ یہ اچھی رہی۔ کرشن چندر نے سوچا۔ بنّے (سجاد) پلنگ پر سوئیں گے تو میں بھی پلنگ پر سوؤں گا۔ بنّے کے لیے پلنگ آئے گا تو میرے لیے بھی

آئے گا۔ میں کسی سے کم نہیں ہوں اور یہ جگر صاحب کس صفائی سے مجھے یہاں اکیلا چھوڑ کے بنّے کے لیے پلنگ کا انتظام کرنے کے لیے چلے گئے۔ میں بھی تو ان کا مہمان ہوں۔ مہمان ہوں، خاک مہمان ہوں، گھنٹوں سے یہاں اس خالی کمرے میں کھڑا ہوں۔ کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے اور بنّے کے لیے پلنگ منگایا جارہا ہے اور میں یہاں فرش پر سوؤں گا۔ میرا ماتھا تو اسی وقت ٹھنکا تھا، جب میں نے جگر کو سٹیشن پر دیکھا تھا۔ خباثت اس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ پلنگ لائے گئے ہیں۔ سجاد ظہیر کے رشتہ دار ہوتے ہیں۔ کیا میں یہاں فرش پر سوؤں گا۔ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں لیکن۔ لیکن میں جب سے یہاں کھڑا ہوں، کوئی نوکر بھی تو اس کمرے میں جھاڑو دینے نہیں آیا اور دوسرے کمروں میں پلنگ بچھائے جارہے ہیں۔ کون پوچھتا ہے مجھے میں کون ہوں جو مجھے کوئی پوچھے گا۔ دراصل یہ سب سازش ہے۔ مجھے ذلیل کرنے کے لیے یہاں بلایا ہے۔ وہ بے چارہ احمد علی ٹھیک کہتا تھا۔ کرشن چندر کو اپنے آپ پر رحم آنے لگا۔ اور اس کی آنکھیں غم و غصے کے آنسوؤں سے نمناک ہو گئیں۔ اتنے میں مجلس استقبالیہ کے ایک رکن تشریف لائے۔

"چلیے چائے پی لیجیے۔"

"نہیں۔ میں چائے نہیں پیوں گا۔" کرشن چندر نے کہا۔

"آپ چائے نہیں پیتے۔"

"پیتا ہوں، مگر اس وقت نہیں پیوں گا۔"

"کیوں کوئی خاص بات ہے۔"

"جی نہیں، مجھے ذرا پیچش ہے۔"

"تو پیچش میں تو چائے مفید ہوتی ہے۔"

"ہوتی ہوگی، مگر میرے لیے نہیں۔"

"اچھا تو چلیے، تھوڑا سا ناشتہ ہی کر لیجیے۔"

"ناشتہ؟ میں ناشتہ بھی نہیں کروں گا۔"

"چلیے بھائی، تکلف نہ کیجیے آپ ناشتہ نہیں کریں گے تو جگر صاحب مجھ پر خفا ہوں گے۔"

"جگر صاحب کہاں ہیں۔ انھیں میرے پاس بھیج دیجیے۔"

"وہ ابھی آتے ہوں گے۔ سجاد ظہیر کے لیے پلنگ کا انتظام کرنے گئے ہیں۔"

"نہیں صاحب۔" یکایک کرشن چندر نے چلا کر کہا۔

"مجھے پیچش ہے، سر میں درد ہے، ہلکی ہلکی حرارت بھی ہے۔"

"بخار ہے، پیچش ہے، سر میں درد ہے، تو ٹھہریے میں ڈاکٹر کو بلا کے لاتا ہوں۔"

کرشن چندر نے کہا۔ "ٹھہریے، ٹھہریے۔" مگر وہ رکا نہیں اور ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا۔

اتنے میں سردار قریب سے گزرا۔ "یہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو کرشن، چلو ناشتے پر لوگ تمھارا انتظار کر رہے ہیں" اور وہ

دونوں بازو میں بازو ڈال کر چل دیے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر جب وہ اپنے کمرے کو گیا۔ تو دیکھا کہ باہر دہلیز پر جگر کھڑے ہیں۔ اور اس کے کمرے میں ـــ پلنگ بچھوایا جارہا ہے۔

جگر نے کہا۔"ڈاکٹر ابھی آتا ہو گا، میں ابھی بستر کیے دیتا ہوں، آپ اس پر آرام کیجیے۔"

اجلاس

کانفرنس کا پہلا اجلاس۔ افتتاح کے موقعہ پر سروجنی نائیڈو صاحبہ کی شعلہ بیانی، کیا عورت ہے۔ معمر ہونے پر بھی آنکھوں کی جواں سالی نہیں کھوئی، تبسم کی حیرانی نہیں کھوئی، روح کی جستجو اور پیہم کاوش نہیں کھوئی۔ بدلتا ہوا زمانہ ہر بار اک نیا مرحلہ سامنے لے آتا ہے اور یہ شاعرہ اس مرحلے کا یوں استقبال کرتی ہے، گویا وہ مدت سے اس کی منتظر تھی۔ اٹھتی ہوئی لہریں بار بار ساحل سے ٹکراتی ہیں اور ان رواں دواں بلند و بالا موجوں کے تخت پر آپ اس عورت کو دیکھیں گے جس نے ہندوستانی سیاست اور ادب کے سارے رنگ دیکھے ہیں۔ فن سے زندگی تک اور ہوم رول سے اشتراکیت تک، وہ کبھی پیچھے نہیں رہی۔ اس کے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے۔ وہ زمانے سے ہمیشہ دو قدم آگے رہی ہے۔ ممکن ہے اپنے باغیانہ خیالات کی بنا پر اب کے اسے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں بھی جگہ نہ ملے۔ سردار نے سبطے سے کہا "ہش" سبطے نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے کہا۔"سنو کرشن اپنا مقالہ پڑھنے جارہا ہے"۔ہال میں خاموشی تھی، پانچ ہزار آدمی چپ چاپ بیٹھے ہوئے ایک ادبی مقالہ سن رہے تھے۔ اس سے پہلے ایسا نہ ہوا تھا۔ یہاں مشاعرہ نہ تھا، خطیبانہ انداز تکلم نہ تھا، کوئی گہری فلسفہ طرازی نہ تھی لیکن لوگ خاموشی سے سن رہے تھے۔ پانچ ہزار آدمی، کالج کے طالب علم، سکول کی لڑکیاں، سرکاری ملازم، دکاندار، ریلوے کے مزدور، بے کار، ہر طبقے کے لوگ شامل تھے اور خاموشی سے سن رہے تھے اور جب مقالہ نگار نے مراکو سے لے کر جاوا تک کے آزادی پسندوں کی تحریک کا ذکر کیا تو ہال نعروں سے گونج اٹھا اور جب ادب میں اشتراکیت کا ذکر آیا، انسانیت کا ذکر آیا، ایک بہترین نظامِ زندگی کا ذکر آیا، عشق کی انقلابی ماہیت کا ذکر آیا اور ان طبقوں کا ذکر آیا جن پر ہمارے ادب کے دروازے ابھی تک بند ہیں، تو سامعین کے دلوں کے تار جھنجنا اٹھے۔ جیسے مقالہ نگار کی زبان اور ان کے دل ڈھل گئے تھے۔ جیسے اس مقالے میں وہ لوگ خود بول رہے تھے۔ پہلے روز بھی یہ ہوا دوسرے روز بھی اسی طرح ہوا۔ تیسرے اور چوتھے روز بھی یہی ہوا۔ یہ مکمل انہماک، یہ سچائی کو پالینے کی پاکیزہ جستجو، ہر چہرے سے عیاں نظر آئی۔ گذشتہ دس سال سے لوگ، تہذیبی اور ادبی کاوشوں کی طرف توجہ دینے لگے ہیں۔ انھیں اپنی قومی زندگی کا عنصر سمجھنے لگے ہیں اور گو تعمیری تنقید نے اتنی ترقی نہ کی تھی پھر بھی باشعور پڑھے لکھے طبقے میں ان ہی باتوں کا چرچا تھا۔ نئی تحریروں پر بحثیں ہوتی تھیں۔ یہ تعمقِ نگاہ ہر مضمون کے حسن و قبح پر اس کے افادی یا غیر افادی پہلوؤں پر، اس کے ترقی پسند یا نا ترقی پسند رجحانات پر، بڑی تفصیل سے گفتگو ہوتی تھی۔ مختلف نظریے تھے، مختلف اذہان تھے، مختلف زاویہ ہائے نگاہ۔ لیکن ایک چیز ان سب میں وجہِ اشتراک تھی۔ ادب اور کلچر اور تمدن سے دل چسپی، حقیقی دل چسپی اور قومی اور ملکی ادب کو اس راہ پر گامزن کرنے کی آرزو، جہاں وہ اس کی بڑھتی اٹھتی، مچلتی ہوئی زندگی کا ترجمان بن جائے۔ ہندوستان کے نوجوان کا دل جاگ اٹھا تھا۔ اور ادب کی ہر تفسیر میں اپنی تمناؤں کے فانوسِ خیال روشن کر رہا تھا۔ یہ روشنی جو بڑھتی جا رہی تھی۔ جو اندھیرے پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ گیت

ﺲ کے ہر مصرعے میں اک نئی لے کی چمک تھی اور جس کی ہر لے میں کروڑوں انسانوں کی آرزؤں کی گونج تھی۔ اس نئے نغمے نے ہر
دیب کے دل کو بہجت اور مسرت سے لبریز کر دیا اور ان ہزاروں دلوں کی دھڑکنوں میں کھوئی گئیں جو اس وقت ہال میں موجود تھے۔
وشن چہرے، ذہین آنکھیں، تالیوں کا شور اور نئی زندگی، نیا ادب، نئے انقلاب کے نعرے۔ یکایک کئی ادیبوں نے حیران ہو کر ایک
وسرے کی طرف دیکھا۔ گویا سب کے دل معانی شدت سے محسوس کرنے لگے کہ ادب صرف تخیل کی چار دیواری میں محبوس رہ کر
س قدر مجبور ہو جاتا ہے اور اس بڑھتی ہوئی زندگی، کشمکشِ حیات کی آویزشوں سے ٹکراتی ہوئی زندگی کے بحرانی لمحوں میں گھل مل کے
دب اور ادیب کیسے اک نئی وسعت، اک نئے رخ، اک نئے کیف و کم سے سرشار ہو جاتا ہے۔ پہلے اجلاس کے ختم ہونے کے بعد
ہت رات گئے اجلاس کی کامیابی پر گفتگو ہوتی رہی۔ کالجوں کے لڑکے بڑے انہماک سے ادیبوں کی گفتگو سنتے رہے اور آٹو گراف لیتے
ہے۔ یہ آٹو گراف کی بدعت بھی خوب ہے۔ ادیب جلدی میں یوں دست خط کرتے تھے گویا کہہ رہے ہوں ارے بھئی ان لوگوں نے تو
پریشان کر دیا۔ اب کوئی کہاں تک دست خط کرے۔ کبھی کبھی کسی لڑکی کی آٹو گراف بک آجاتی تو قلم لے کے بیٹھ جاتے اور سوچتے کہ کس
رح ایک فقرے میں لیلےٰ و مجنوں کی پوری داستان بیان کر دیں۔ بعض لوگ بہت ہی کلبی بننے کی کوشش کرتے۔ ایں اس میں ہے کیا
خر۔ آخر تو عورت ہی تو ہے۔ شوپن ہار والی عورت، جا معاف کر دیا تجھے۔ مدن گوپال سے کسی نے آٹو گراف نہیں مانگا تو آپ بتیسی
کالے ہر ایک سے پوچھ رہے ہیں۔ "بھئی، اس خوب صورت لڑکی کی بے حد بد صورت آٹو گراف بک پر تم نے کیا لکھا ہی ہی۔" اب
دئی پوچھے اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی"۔ آٹو گراف بک جو مسلم ضیائی کے پاس تھی، کئی اعتبار سے بہت دل چسپ تھی۔ سجاد ظہیر
نے لکھا تھا۔ "اشتراکیت زندہ باد۔" کرشن چندر نے لکھا تھا۔ "انسانیت زندہ باد۔" جوش نے لکھا تھا۔ "ابھی تم دونوں بچے ہو۔" آگے
ساغر نے لکھا تھا "تو بڑا چار سو بیس ہے" یہاں آکے تسلسل ٹوٹ گیا تھا۔ اور جوش اور ساغر کے مناقشات پر گفتگو ہونے لگی۔ جوش کی
باعیوں کا ذکر آیا۔ فراق نے بھی رباعیاں کہنا شروع کی تھیں۔ موازنہ ہوا۔ اسی جھگڑے میں رات کے دو بج گئے۔ صبح ہی سردار کو نظام
کالج میں ایک تقریر کرنا تھی۔ اس نے سوچا۔ لاؤ ابھی شیو کر ڈالو۔ کرشن تمہارا شیو کا سامان کہاں ہے؟ کرشن کا سامان غائب تھا۔ اس نے
بہت ڈھونڈا مگر نہیں ملا۔ اس نے گھور کر جگر صاحب کی طرف دیکھا۔ جگر نے کوئی توجہ نہ کی۔ کرشن چندر کے دل میں نفرت اور بڑھ گئی۔
خوب۔ اب یہ پوچھتے تک بھی نہیں کہ بھئی آپ کا شیو کا سامان کہاں ہے، کیسے گم ہوا، یہیں کہیں ہوگا، میں ڈھونڈ دیتا ہوں۔ جگر نے
جمائی لے کے کہا۔ "میں تو چلتا ہوں، صبح فراق اور احتشام اور ڈاکٹر عبدالعلیم تشریف لائیں گے اور ہمیں تو نظام کالج جانا ہے۔" کرشن
چندر نے کہا۔ "گاڑی کا انتظام کر دیجیے میں دیکھتا ہوں" جگر نے سرسری طور پر کہا اور کرشن چندر کا جی جل کے کباب ہو گیا اور وہ
اسی لمحے اپنے کمرے میں جا کے بستر پر دراز ہو گیا اور اس نے سوچا۔ میں کل صبح نظام کالج نہیں جاؤں گا، چاہے مجھے کوئی کچھ ہی کہے۔
میری بلا سے۔ وہ صبح اٹھا تو شیو کا سامان غائب ہی تھا۔ دوبارہ ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملا۔ سردار بے چارہ ایک کمرے سے دوسرے
کمرے گھوم رہا تھا لیکن کسی کا شیو کا سامان خالی نہ تھا۔ آنند داڑھی مونڈ رہے تھے۔ سبطے نیند میں کراہ رہا تھا۔ سجاد ظہیر اپنے شیو کا سامان
کسی کو مستعار نہ دیتے تھے۔ قدوس صہبائی نے جب دونوں کو نظام کالج کا عزم کرتے دیکھا، تو بولے۔ "آپ شیو بنا لیتے تو اچھا تھا۔ سنا ہے
نظام کالج میں لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں۔" سردار کا چہرہ ایک تنا ہوا گھونسا تھا اور کرشن چندر کا چہرہ ایک بھوکی بھیڑ کا تھا۔ رستے میں جگر گاڑی

لے آئے۔ چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری۔ نہ غم، نہ حسرت، نہ حیرانی، نہ دل چسپی، نہ وہ ادیبوں سے مرعوب تھے، نہ ان سے بیزار نظر آتے تھے۔ جیسے کوئی خاص دل چسپی انھیں ان لوگوں سے نہ تھی اور پھر کوئی اجنبیت بھی نہ تھی۔ کچھ عجب قسم کی لاتعلقی چہرے پر حیاں تھی جسے دیکھ کر کرشن چندر اور بھی جھنجلا گیا اور اپنے چہرے کے بڑھے ہوئے بالوں پر یوں ہاتھ پھیرنے لگا گویا جگر ہی نے اس کے شو کا سامان گم کیا تھا۔

جب سردار اور کرشن چندر نظام کالج سے لوٹے تو فراق اور احتشام اور ڈاکٹر عبدالعلیم لکھنؤ سے تشریف لے آئے تھے۔ یہ سب لوگ کھانے پر بیٹھے عریانی پر بحث کر رہے تھے۔ سردار نے آتے ہی قلم ہاتھ میں لے کر ایک تجویز اس امر کے متعلق لکھنا شروع کی اور بحث طویل ہوتی گئی۔ فراق حسن کار ہیں اس لیے انھیں عریانی سے اتنی نفرت نہیں۔ احتشام کی طبیعت میں نوجوانی کے باوجود اتنا ٹھہراؤ ہے کہ وہ عریانی کو دیکھ کر بدکتے نہیں، برافروختہ نہیں ہو جاتے، صلواتیں سنانے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کا انداز یہ تھا۔ میاں ابھی تم بچے ہو۔ کیا طفلانہ باتیں کر رہے ہو۔ ان کے ہشاش بشاش چہرے پر مسکراہٹ کی لہر دوڑ دوڑ کے گم ہو جاتی تھی۔ وہ اپنی داڑھی اور وضع قطع سے فرانسیسی معلوم ہوتے ہیں اور اپنے درشت اندازِ تکلم سے ہیڈ ماسٹر اور آگ بگولا ہوتے وقت سو فیصدی کمیونسٹ نظر آتے ہیں۔ اکثر لوگ غلط بات غلط موقع پر کہتے ہیں یا غلط بات صحیح موقع پر کہتے ہیں لیکن ڈاکٹر عبدالعلیم کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہمیشہ صحیح بات کہتے ہیں اور ہمیشہ غلط موقع پر کہتے ہیں۔ چادر گھاٹ کالج میں انھوں نے تقریر کرتے ہوئے طلبہ کے مجمع میں کالج کے استادوں کو وہ ڈانٹ بتائی کہ بے چارے اب تک یاد کرتے ہوں گے۔ اسی طرح P.E.N. کانفرنس کے موقع پر جب ڈاکٹر ملک راج آنند نے تجویز پیش کی کہ ہندوستان میں بھی فرانسیسی انسائیکلو پیڈیسٹ کی طرح ایک تحریک جاری کی جائے تو بہت سے لوگوں نے اس انقلابی تجویز کی حمایت کی۔ ان میں ریاست بیکانیر کے وزیر سردار پانیکر بھی شامل تھے لیکن صرف ایک آدمی کی پر زور مخالفت سے یہ تحریک رہ گئی۔ یہ مخالفت کرنے والا جانتے ہو، کون تھا۔ یہی اپنے ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب۔ آپ نے اٹھ کر کہا۔ "تجویز تو بہت معقول ہے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ فرانس میں اس تحریک کے چلانے والوں میں بڑے بڑے لوگ تھے۔ روسو اور والٹیر۔ یہاں اب کون ادیب ہے۔ کون ایسا مفکر ہے "؟ آپ نے پورے مجمع پر نظر ڈال کر کہا۔ "مجھے تو آپ لوگوں میں سے ایک آدمی بھی اس پائے کا نظر نہیں آتا"۔ اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ پھر مجمع میں سے کسی من چلے نے کہا۔ "اور کیا ڈائس پر بھی کوئی ایسا آدمی آپ کو نظر نہیں آتا۔"

ڈائس پر سروجنی نائیڈو تشریف فرما تھیں۔ جواہر لال نہرو تھے..... فلسفہ داں رادھا کرشن، ہرمن اولڈ اور..... فارسٹر اور ملک راج آنند، احمد شاہ بخاری پطرس اور دوسرے لوگ۔ ڈاکٹر صاحب نے ڈائس پر نگاہ ڈالی۔ سب کی طرف دیکھا اور پھر مجمع کی طرف مڑ کر کہنے لگے "نہیں۔ ان میں بھی کوئی نہیں.....!"

تحریک گر گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب سچائی کو اس شدت احساس کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور اس پر اس سختی سے کاربند ہوتے ہیں کہ اکثر اوقات ہم درد بھی مخالف ہو جاتے ہیں لیکن اس کی انھیں کوئی پروا نہیں۔ وہ ادیبوں کے مہاتما گاندھی ہیں لیکن ذرا عدم تشدد کے قائل نہیں اور اگر کبھی ہندوستان میں ایسا قانون نافذ ہوا کہ ادیبوں کو ان کی فکری، ذہنی یا خارجی غلطیوں کی سزا ملنے لگی تو اس

ساب کا محکمہ ڈاکٹر صاحب کے ہی سپرد ہو گا۔ ان کی صاف گوئی سے بہت سے لوگ ان سے گھبراتے ہیں لیکن اس میں ان کی ست ہے اور اگر اس صنف میں کوئی ان سے ٹکر لے سکتا ہے تو وہ حسرت موہانی ہیں جو خوش قسمتی سے اس کانفرنس میں تشریف رکھتے ، اور بلاناغہ اس کے ہر جلسے میں شرکت کرتے رہے۔ چناں چہ جب ترقی پسند ادیبوں کی طرف سے عریانی کے خلاف قرار داد پیش کی ا تو اس کی مخالفت کرنے والے مولانا حسرت موہانی تھے اور قاضی عبدالغفار۔ مزے کی بات یہ تھی کہ نوجوان عریانی کے خلاف تحریک ں کر رہے تھے اور بزرگ اس تحریک کی مخالفت کر رہے تھے کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ اس طرح نوجوان اذہان کی قوتیں مسلوب پائیں گی اور ان کی تخیلی نمو رک جائے گی۔ مولانا حسرت موہانی کی پر زور تقریر سے قرارداد مسترد کر دی گئی۔ سبطے بے حد ناخوش تھا۔ ہنے لگا۔ "اماں، مولانا کا ہمیشہ یہی رول رہا ہے۔ وہ جہاں گئے لوگوں کو مصیبت میں ڈالتے گئے۔ جب کانگریس میں تھے تو ہوم رول کے ں میں آزادی کا ذکر کر کے کانگریس ہائی کمانڈ کو خائف کیا کرتے تھے اور جب کانگریس نے لاہور کانفرنس کے موقع پر مکمل آزادی کی رداد منظور کر لی تو آپ نے اشتراکیت کی بیخ لگا دی اور کانگریس سے ایسے ناخوش ہوئے کہ مسلم لیگ میں چلے گئے۔ وہاں پہنچے ہیں تو ۔ بے چارے شریف خان بہادروں کو بغاوت پر اکسا رہے ہیں اور مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس کیے دے رہے ہیں۔ ہر جگہ مصیبت ڈالتے ہیں یہ لوگوں کو۔ بھئی اب اچھا بھلا یہ ریزولیوشن پاس ہو رہا تھا...... خیر...... ہٹاؤ اب اس قصے کو۔" یہ کہہ کر وہ رک گیا اور اس ، چہرے پر ہزاروں درد کی لکیریں یکایک معدوم ہو گئیں اور پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ مگر بھئی، یہ خوب ہیں، مولانا چٹان ہیں۔ بس کسی کی ں سنیں گے۔ اپنی جگہ سے کبھی نہیں ہٹیں گے۔

دوپہر کو پریم چند سوسائٹی کا افتتاح تھا۔ حسین ساگر میں جو کلب ہے وہاں دعوت بھی تھی۔ ادیبوں کو کشتیوں میں سوار کر کے ب میں پہنچایا گیا درحالیکہ ایک راستہ خشکی سے بھی جاتا تھا۔ غالباً موٹر بوٹ کی نمائش مقصود تھی۔ کلب کی عمارت جھیل میں تعمیر کی گئی ہ۔ کوئی پچاس کے قریب ملازم ہوں گے۔ آٹھ کورس کا کھانا۔ اس دعوت پر اتنا صرف کیا گیا تھا کہ غالباً پریم چند کو اپنی زندگی میں اتنی نیلٹی نہ ملی ہوگی۔ یورپ میں جب ادیب زندہ ہوتا ہے تو اس کی قدر ہوتی ہے۔ ہندوستان میں مرنے کے بعد اسے پوچھا جاتا ہے۔ اں چہ آج پریم چند سوسائٹی کا افتتاح تھا۔ قاضی عبدالغفار خاں تقریر کر رہے تھے اور مرغن کھانے دعوت میں شامل تھے۔ اور جھیل کے رے ادیب لطف اندوز ہو رہے تھے۔ قاضی عبدالغفار کی شخصیت پر متانت کا ایک دبیز پردہ پڑا ہوا ہے۔ لیکن اتنا دبیز بھی نہیں کہ ان جبلّی خوش طبعی اس متانت کے اندر سے جھلک نہ اٹھے۔ متانت ہے لیکن بوجھل نہیں ہے، خوش طبعی ہے لیکن کھل کر نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی چیز نے، کسی خاص واقعے نے، یا کسی خاص ماحول نے ان کے ذہن کے، ان کے فکر کے، ان کی فطری صلاحیت کے دو ٹکڑے کر دیے ہیں۔ وہ اس پر بھی مجبور ہیں۔ اس پر بھی دونوں رنگ ایک ہی شخصیت میں جھلکتے نظر آتے ہیں۔ پیرس کی رنگینی نا ہے۔ عالمانہ زہد بھی ہے، شگفتہ انشاپردازی بھی ہے اور فکری ٹھہراؤ بھی۔ لباس میں امارت کی جھلک ہے اور گفتگو میں علم کی چاشنی۔ یہ جاگیردارانہ ہیں اور ذہن باغیانہ۔ قاضی صاحب اک ایسے نوجوان ہیں جسے مدت سے کسی نے گدگدایا نہ ہو لیکن خود اس کے دل میں وخیاں چٹکیاں لے رہی ہوں۔ کاش، کوئی مصنف لیلے کے خطوط کو گدگدا دے اس طرح کہ وہ بھری محفل میں، یاروں کی محفل میں نہیں، زاروں لاکھوں معمولی آدمیوں کی محفل میں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ یہ گدگدی ایک بہت بڑے شاہ کار کا پیش خیمہ ہوگی۔

پرانا محل

کرشن چندر نے مسلم ضیائی سے پوچھا۔

"بھئی تم شادی کیوں نہیں کرتے ہو۔ اب تو تمہاری آنکھوں پر عینک بھی آچکی ہے۔"

مسلم ضیائی نے اپنی عینک کے شیشوں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ "تم نہیں جانتے۔ آہ!"

"کون ہے وہ ظالم!" کرشن چندر نے پوچھا۔

"وہ ہر روز کانفرنس میں آتی ہے۔ آہ:"

گاڑی چار مینار کے گرد گھوم کر ایک گل فروش کی دوکان پر کھڑی ہو گئی۔ مسلم ضیائی اتر کر گجرے خریدنے لگے۔

"یہ گجرے کیا کرو گے؟"

"میں اسے بھیج دوں گا۔ اسے یہ گجرے بہت پسند ہیں"

"آہ!" کرشن چندر نے کہا۔ مجھے اپنی بیوی کے لیے چوڑیاں خریدنا ہیں اور تھوڑا سا ہمرو اور ایک مرادآبادی پان دان۔"

"واہ! یہ سب چیزیں تو قریب ہی کے بازار سے مل سکتی ہیں۔" مسلم ضیائی نے جواب دیا۔

"آہ!" کرشن چندر نے کہا۔

قریب کے بازار سے یہ سب چیزیں مول لے کر وہ لوگ واپس ہوئے تو چار مینار کے قریب گاڑی روک کر ایک طرف کھڑی کردی گئی۔ مینار پر گھڑی میں ابھی پانچ نہ بجے تھے۔ چاروں طرف سیٹیاں بج رہی تھیں۔ سائیکل والے سائیکلوں سے اتر کر، گھوڑا گاڑی والے گاڑی ٹھہرا کر، کاروالے، کار ایک طرف کرکے اور پیدل چلنے والے جہاں تھے وہیں رک کر جامد و ساکت ہوگئے۔ چاروں طرف جدھر نگاہ جاتی تھی خاموشی تھی، گہرا سناٹا، اور مخلوق کے سر جھکے ہوئے تھے اور شیروانیوں کے بٹن گلے تک بند تھے اور آنکھیں آسمان کی پہنائیوں کو چھوڑ کر زمین کی پتھریلی سطح پر جھکی ہوئی تھیں اور پسینے میں عرق عرق پیشانیاں کسی نظر نہ آنے والے خدا کے آستانے کی جبہ سائی کر رہی تھیں۔ یکایک کہیں سے اک سیاہ موٹر گزر گئی۔ مینار کے سامنے کھڑے ہوئے سپاہیوں نے سلامی اتاری اور گاڑی بہت دور چلی گئی اور یکایک مینار کے گھڑیال نے پانچ بجائے اور یکایک جیسے ساری فضا کی خاموشی جھن سے ٹوٹ گئی اور جھکی ہوئی گردنیں اوپر اٹھ گئیں اور موٹر اور سائیکل اور گھوڑا گاڑیاں چلنے لگیں اور دکان دار گاہکوں کو سودا دینے لگے۔ اب پھر وہی شور و غل تھا۔ وہی ہاؤ ہو۔ وہی زندگی۔

"کیا ہوا تھا بھئی" کرشن چندر نے ایک چاؤش سے پوچھا۔ جو اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔

چاؤش نے اسے گھور کر دیکھا، اور اپنی تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ابھی سرکار کی سواری ادھر سے گزر کر گئی ہے۔ اندھے ہو کیا تمھیں اتنا بھی معلوم نہیں۔"

"چلو۔ چلو۔ گاڑی بڑھاؤ۔" مسلم ضیائی نے ٹیکسی والے سے کہا۔ اور پھر مڑکر کرشن چندر سے کہنے لگا۔

"یہ چاؤش آزاد عرب کے لوگ ہیں۔ ان سے "یا چاؤش" کہہ کے گفتگو کرنا چاہیے۔ "بھئی" کہہ کے نہیں، وہ تو یوں کہو۔ شریف

اؤش تھا۔ لڑا کا ہوتا تو ابھی اس بات پر تمہارے پیٹ میں چھری بھونک دیتا۔

"یا چاؤش!" کرشن چندر نے گھبرا کر کہا۔ "اب کہاں چلو گے۔"

"راجہ شامراج جی کے ہاں دعوت ہے چھ بجے!"

راجہ شامراج کا محل پرانا محل۔ شہر میں واقع ہے۔ اونچی فصیل کے اندر ایک خوش نما باغیچہ ہے۔ باغیچے میں ایک مور ناچ رہا ما۔ جب ادیب لوگ وہاں پہنچے تو دس بارہ موٹریں ایک طرف استقبال کے لیے کھڑی تھیں۔ راجہ صاحب غائب تھے۔ ادیبوں کو موٹر رائیوروں، سپاہیوں اور راجہ صاحب کے مصاحبوں نے جھک کر سلام کیا اور یہ بے چارے کچھ حیران، کچھ پریشان، کچھ پشیمان سے محل کی یڑھیوں پر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ اتنے میں کسی نے کہا۔ "اوپر تشریف لائیے۔ ادھر لائبریری کی طرف"۔ یہاں راجہ صاحب سے عارف ہوا۔ بہ ظاہر صدق و صفا کی مورت، دبلے پتلے، پیشانی پر تلک، اتنی بڑی لائبریری اتنی اچھی لائبریری، ہر موضوع پر کتابیں جنھیں الباً آج تک کسی نے کھول کر پڑھا نہ تھا۔ بہت سی کتابوں کے ورق بھی کاٹے نہیں گئے تھے۔ پوری لائبریری میں صرف دو بچے پڑھ ہے تھے۔ یہ سنگ مرمر کے مجسمے تھے اور ایک سنگ مرمر کی کتاب کھولے ہوئے اس پر جھکے ہوئے تھے اور نہ جانے کتنے سال سے س طرح جھکے ہوئے اسی کتاب کے اسی صفحے کو پڑھ رہے تھے۔ یہ سنگِ مرمر کی کتاب، یہ سنگِ مرمر کے محل لیکن ہم لوگ یہاں کیا کر ہے تھے۔ کیوں اس دیارِ غیر میں اجنبیوں کی طرح گھوم رہے تھے۔ وہ گھر جو اپنا نہ تھا جس کے ہر سنگِ مرمر کی رگ کا خون سفید ہو چکا ما۔ سامنے مور ناچ رہا تھا۔ ایک کمرہ اشتراکیت کے موضوع سے متعلق تھا۔ یہاں ہزاروں کتابیں جمع تھیں۔ مصاحب ہمیں اس طرح یکھ رہے تھے۔ گویا ہم تماشا ہوں، اور وہ تماشائی۔ ان کی نظریں گویا کہہ رہی تھیں تمہارے ایسے سینکڑوں لوگ یہاں آتے ہیں اور دعوت کھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہم ادیبوں کو بلاتے ہیں اور سرکس والوں کو بھی اور مداریوں کو اور مسخروں کو۔ یہاں سیاح آتے ہیں اور بھک منگے بھی اور سیاست داں بھی۔ ہمارے راجہ صاحب بہت اچھے ہیں لیکن ان کے اچھا ہونے سے آپ لوگ اچھے نہیں ہو سکے۔ سردار صاحب آپ کی قمیص پھٹی ہوئی ہے۔ آپ کی شیروانی کا بٹن غائب ہے سبطے میاں۔ قدوس صاحب آپ نے یہ جھولا کیسے لٹکا رکھا ہے۔ مہندر بھائی آپ نے سر پر یہ جنگل سا کیا لگا رکھا ہے۔ کرشن صاحب، آپ کی پتلون پر دس پیوند ہیں، آپ لوگ یہاں کیا کھا کر ترقی پسندی کا دعویٰ کریں گے ——

سامنے مور ناچ رہا تھا۔

ایک صاحب جو غالباً راجہ صاحب کے وزیر معلوم ہوتے تھے بولے۔ "سرکار کا عجائب گھر بھی دیکھیے گا۔"

سرکار کا عجائب گھر! اس وقت تو یہ سارا محل عجائب گھر معلوم ہو رہا تھا جس میں نمونے کے طور پر ترقی پسند ادیب مختلف کمروں میں رکھ دیے گئے تھے۔ اس بالکونی میں سجاد ظہیر، ڈاکٹر تاراچند اور ملک راج آنند قید تھے۔ اس کمرے میں سردار اور عادل رشید سبطِ حسن اور رفعت سروش محبوس تھے۔ اس شیشے کی الماری کے قریب کرشن چندر، مدن گوپال، اور فراق گورکھپوری استادہ تھے۔ فراق صاحب کے چہرے پر غیظ و غضب کے آثار نمایاں تھے اور ان کی گول گول پتلیاں حیرت و استعجاب میں ڈوب کر ادھر ادھر مجذوبانہ انداز میں تک رہی تھیں۔ ایں۔ ہم لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ ہم دعوت کھانے آئے ہیں، یا اپنا خون پینے آئے ہیں۔

فراق بولے بلند آواز میں۔

"بھئی میں تو چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ چلے۔

"ٹھہریے۔ ٹھہریے" وزیر نے کہا۔

"وہ راجہ صاحب کا عجائب گھر!"

"اچھا صاحب۔" فراق صاحب نے ہار مان کر کہا۔ "وہ بھی ہو جائے۔"

ایک کمرے میں پتھر کے بت، ایک کمرے میں دیوتاؤں کے بت، پتھر کے نہیں دھات کے، ایک کمرے میں آصفیہ خاندان کے خطوط جو راجہ صاحب کے بزرگوں کو لکھے گئے تھے۔ راجہ صاحب کے بچوں کے خط جو انھوں نے اردو میں لکھے تھے۔ یہ خط شاید اردو سے محبت کے ثبوت میں تھے۔

وزیر نے کہا۔ "مجھے وہ تصویر بہت پسند ہے" کوئی خاص بات اس تصویر میں نہ تھی۔ ایک خوب صورت عورت کی تصویر تھی جس نے ایک سپید ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس طرح کہ ساڑھی کے اندر عورت تقریباً ننگی نظر آتی تھی۔ کمر کے خم میں گاگر لیے کھڑی تھی۔

بے حد پسند ہے۔ وزیر کے ہونٹ کھلے تھے۔ ہائے وہ موٹے موٹے کھلے کھلے بدصورت ہونٹ!

سامنے مور ناچ رہا تھا۔

"میں جا رہا ہوں بھئی کرشن" فراق نے جھلا کے کہا۔

"ٹھہریے۔ ٹھہریے" وزیر نے گھبرا کے کہا۔ "چائے پی کے جائیے"۔

"ہوں" فراق صاحب نے کھرج میں کہا۔ اور باغیچے میں جا کے چائے پینے لگے۔

چائے پینے کے بعد راجہ صاحب کے ساتھ ترقی پسند ادیبوں کا فوٹو کھینچا گیا۔ دائیں طرف سجاد ظہیر، بائیں طرف کرشن چندر اور کرسیوں پر دوسرے ادیب اور بہت سے ادیب مصاحبوں کی طرح پیچھے کھڑے تھے، سردار اور سبطے اور دوسرے انقلابی ادیب۔

"میں حاضر ہوں سرکار۔" فوٹو گرافر نے کہا۔

راجہ صاحب نے اشارہ کیا اور فوٹو لے لیا گیا۔

فراق کے بدن میں کانٹے چبھ رہے تھے لیکن اب فوٹو لے لیا گیا تھا۔ فوٹو جو بے حد ضروری تھا۔ فوٹو سے راجہ صاحب کی ترقی پسندی تو کیا ظاہر ہوتی تھی، اپنی ذلت پسندی کی انتہا ہو گئی تھی۔ سردار نے کہا۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا۔ سبطے بولا، "انقلاب کے دوران میں جاگیر دار ایسے ایسے کئی فوٹو پیش کر کے اپنے آپ کو اشتراکیت کا علم بردار ثابت کریں گے اونھ، ان باتوں سے کیا ہوتا ہے"۔ قدوس صہبائی بولے۔ "فوراً گردن ناپ دی جائے گی۔ مگر ایسا ہوا کیوں"؟ مدن گوپال چیخے۔ "ہم یہاں آئے کیوں"؟ فراق بولے۔ "اگر کوئی میرے ساتھ چلتا ہے تو چلے۔ ورنہ میں تو ابھی چلا"۔

"ٹھہریے۔ ٹھہریے" وزیر نے چلا کر کہا۔

"پان اور عطر حاضر ہے۔"

ونے کا عطر دان اور چاندی کا پان دان اور پان کھلا کے اور عطر لگا کے اور ہاتھ میں ایک گلدستہ تھما کے ادیبوں کو رخصت کر دیا گیا۔ ئے وقت یہ محسوس ہو رہا تھا گویا کسی نے منہ پر تھوک دیا ہے۔ پیشانی پر کیچڑ مل دی ہے اور روح میں غلاظت کے انبار لگا دیے ہیں۔ ہر نس الو کا پٹھا معلوم ہو رہا تھا۔

سامنے مور ناچ رہا تھا۔

واپس قیام گاہ پہنچ گئے تو دیکھا سامنے صحن میں جگر حیدر آبادی کھڑے کھڑے، مسکرا رہے ہیں۔ "کہیے صاحب، راجہ صاحب کی عوت سے فارغ ہو گئے"۔

اس کے بعد ہنسے۔ ہونٹ لال، مسوڑھے لال، دانت لال، زعفران رنگ چہرے پر رستا ہوا سرخ زخم، جی میں آیا گلا گھونٹ دیا اے۔ سردار نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں اور اپنے آپ پر بے حد جبر کر کے بولے۔ "بندہ، خدا بتا تو دیا ہوتا، کہاں دعوت ہے۔ ہمیں کیا معلوم یہ شام راج کون ہیں..... ؟ ہم تو سمجھے تھے کوئی ادب نواز صاحب ہوں گے"۔

"ادب نواز تو وہ ہیں۔ ورنہ آپ کو بلاتے کیوں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر۔ مگر یہ راجہ یہ نواب، یہ یار جنگ بہادر، تم کچھ سمجھو گے بھی کہ نہیں۔"

جگر گھوم گئے۔ مطبخ کی طرف جاتے ہوئے بولے۔ "آپ کے لیے شام کے کھانے کا انتظام کرنے جا رہا ہوں۔ شام کے کھانے ے پہلے اردو مجلس کے ہاں سے تمام مندوبین کو بلاوا آیا ہے۔ جانا ہو گا۔"

وہ مڑ کر گھوم گئے۔ فراق نے انھیں معاف نہیں کیا تھا۔ اپنی آنکھوں کی پتلیاں گھماتے ہوئے بولے "یارو عجب آدمی ہے۔ چوبیس گھنٹے سر پر سوار رہتا ہے۔ جب دیکھو قیام گاہ میں حاضر ہے۔ یہ شخص سوتا نہیں، کھاتا نہیں، پیتا نہیں جب دیکھو، ادھر سے ادھر، دھر سے ادھر گھومتا رہتا ہے اسے کیا ہوا ہے"۔

اس کے بعد خود ہی سر جھکا کے حیران و ششدر کھڑے رہ گئے۔ دیر کے بعد سبطے سے مخاطب ہوئے۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا ۔ آؤ بھئی تمھیں کچھ رباعیاں سنائیں"۔

"آپ چلیے۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

سبطے نے کرشن کو بھی گھسیٹنا چاہا، چلو، رباعیاں سنو تم بھی، کم بخت رباعی بہت اچھی کہتا ہے"۔

عادل رشید پتلون کی کریز درست کرتے ہوئے بولے۔ "بہت بڑا شاعر ہے"۔

سبطے نے کہا۔ "ان کی شاعری ہندستانی کلچر کی معراج ہے"۔

کرشن چندر نے کہا۔ "میں نہیں جاؤں گا رباعیاں سننے اس وقت"۔

لہجے میں ضرورت سے زیادہ تلخی تھی۔ حسد اور رشک اور اک مجبور، گراں بار حریفانہ رقابت کہ ہائے میں شاعر کیوں نہیں! یہ ہر محفل میں شاعر کیوں چھا جاتا ہے اور کیوں افسانہ سنتے ہی لوگوں کو جماہیاں آنے لگتی ہیں۔ کاش میرا ہر افسانہ فراق کی رباعی کی طرح خوب صورت ہوتا......

لطیفوں کے ساتھ ایک شام

شام اور رات کے بیچ کے وقفے کی دھندلی دھندلی اداسی، ادیبوں کی پھیکی پھیکی اکتائی ہوئی، تھکی ہوئی صورتیں، مرزا فرحت اللہ بیگ کے وسیع و عریض برآمدے کے باہر لطیفوں کا بے ہنگم خرام، اردو مجلس میں چائے اور مشاعرے کا بندوبست، شاعروں کی آوازیں اور چینی کے پیالوں میں چلتے ہوئے چمچے اور سرکیوں کے پیچھے پردہ پوش خواتین کی کڑی تنقید۔

"ائیں۔ یہ کرشن چندر ہیں"۔

"کون، وہ ٹھگنے سے ـــ اری وہ ـــ کرشن چندر نہیں چغد چندر معلوم ہوتے ہیں"۔ قہقہہ۔

کرشن چندر کا کھانسنا۔ وہ کھانسی گویا کہہ رہی ہو، دیکھیے ہم بھی سن رہے ہیں۔

عادل رشید اس طرح بیٹھے ہوئے تھے گویا میرِ مشاعرہ وہی تھے۔

قدوس صہبائی ـــ گویا ابھی چوتھے درویش کی سرگذشت سنا کے سستا رہے ہوں۔

فضا میں اجلے پن کے باوجود تیرگی، عرصۂ زماں میں حال کے باوجود ماضی کا دھندلکا، تکلف محبت کے باوجود اک کھنچاؤ، جیسے رگیں ٹوٹ رہی ہوں، جیسے دو زمانے، دو نسلیں، اور دو زاویہ ہائے نظر ایک دوسرے کے قریب آنے کی ناکام کوشش کر رہے ہوں جیسے اندھیرا اجالے میں، اور ماضی مستقبل میں اور موت زندگی میں اپنا عکس ڈھونڈ رہی ہو۔

کیفی نے اپنی نظم مرثیہ خوانوں کے انداز میں سنائی۔ خاموشی گہرا سناٹا۔

ایک پیر و مرشد نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "آپ شاعر ہیں۔"

پھر خاموشی۔ لوگ اس جملے کی اہمیت پر غور کر رہے ہیں۔

سب مودب بیٹھے ہوئے ہیں۔ گویا کسی ایٹم بم کا انتظار کر رہے ہیں۔ پھر کسی نے کہا۔ "مرزا صاحب۔ آپ کچھ سنائیے"۔

مرزا صاحب سنانے لگے۔ "جمنا کا کِنارہ" حریری پردوں کے پیچھے کسی نے کہا۔ "کنارہ نہیں، کَنارا کہیے"۔

تہذیب اور کلچر موت کے زہر آب میں گرفتار ہوں لیکن گرامر نہیں بدل سکتی۔ زندگی بدل جائے لیکن زبان کی ہئیت نہیں بدل سکتی۔ زمان و مکان میں تغیر کی نمو ہو سکتی ہے، ملک و ملت اور افراد و کردار کی ہئیت میں، اطوار و گفتار میں، ان کی سماجی، سیاسی شعور، زندگی میں انقلاب آسکتا ہے لیکن زبان میں کوئی تغیر ممکن نہیں۔ وہ موت کی طرح اور خدا کے آخری حکم کی طرح قطعی ہے۔

اے لسانی مقابر کو پوجنے والی مخلوق! سر جھکائے مودب بیٹھی رہ۔ اس کی فکر نہ کر کہ سر سے طوفان گزرا جا رہا ہے۔ فائبر کی بیش قیمت چائے دانیوں میں ابلتی ہوئی چائے انڈیل، صحن میں آہستہ خرام، کڑکڑاتی ہوئی بدصورت لطیفوں کو دیکھ اور حسن جمنا کا کنارہ۔ نہیں نہیں جمنا کا کنارا! معاف کیجیے گا ـــ

کرشن چندر نے جھک کر نظر کے کان میں کہا۔ "خودکشی کے لیے کون سی جگہ بہتر رہے گی"۔

نظر نے بہت سوچ بچار کے بعد کہا۔ "دیکاہی کا ہوٹل تو چلو پھر وہیں"۔

آخر کانفرنس ختم ہو گئی۔ سبطے نے فنِ صحافت پر اپنا مقالہ بھی پڑھ لیا۔ کسی شخص نے ٹوکا نہیں۔ سردار نے اقبال کے

ت پسند نقادوں کو آٹے ہاتھوں لیا۔ کسی نے اس کے پیٹ میں چھرا نہیں بھونکا۔ ڈاکٹر تارا چند نے اردو کا شجرہء نسب دو ہزار سال پرانے ہندوستان کی تہذیب سے جا ملایا۔ کسی ہندو مہا سبھائی نے اف تک نہ کی۔ لیکن جب کانفرنس ختم ہونے کے بعد مخدوم نے یہ سے کہا بھئی! وہ ریلوے کے مزدور تم لوگوں کو اپنے جلسے میں بلانا چاہتے ہیں تو بہت سے لوگ زکام اور پیچش اور بخار سے بیمار پڑ ۔ جگر صاحب نے بڑی مستعدی سے لوگوں کے بستر باندھنا شروع کردیے۔ کچھ لوگ بازار میں خرید و فروخت کرنے چلے گئے۔ کچھ ۔ P.E.N. کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے اسٹیشن سے جے پور کا ٹکٹ لانے کے لیے چلے گئے۔ کچھ لوگ بیمار ہوکر بستر پر دراز لئے۔ مزدوروں کے جلسے کے لیے صرف کیفی، سردار اور ساحر بچے۔

مخدوم نے تعارف کرایا .... یہ کیفی ہیں۔

.... انقلاب زندہ باد!

یہ سردار ہیں .... انقلاب زندہ باد!

یہ ساحر لدھیانوی ہیں .... انقلاب زندہ باد!

مشینوں پر کام کرنے والے لوگ، سانولے کالے لوگ، موٹے موٹے جبڑوں، کھردرے ہاتھ پاؤں والے لوگ، بد صورت ، غلیظ لباس پہننے والے لوگ، برا کھانا کھانے والے لوگ، لوگ جو نہ "واللہ" کہہ سکتے تھے نہ "مکرر ارشاد" نہ "ہے کیا شعر ہوا " ۔ لوگ جن کے آداب ان کی زندگیوں کی طرح کھردرے تھے۔ ان کے لباس کی طرح وحشی تھے اور ان کے اعتقاد کی طرح مضبوط ۔ یہ لوگ خوب صورت الفاظ میں شاعروں کی تعریف نہیں کرسکتے تھے۔ جو خاموش تھے اور سن رہے تھے اور مکرر ارشاد نہ کہنے کے جود ان کے چہروں کی آب اور ان کی آنکھوں کی چمک، اور ان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گویا کہہ رہی تھی، ہم خوش ہیں کیوں کہ تم ے ہو، ہم میں سے ایک ہو، ہماری خوشیوں اور غموں کے گیت گاتے ہو اور اپنے الفاظ کی حسین تصویروں میں ہمارے دکھ کا مداوا ڈتے ہو۔ تم ہماری برادری میں سے ہو، ان انسانوں کی عظیم برادری میں سے جہاں کسی انسان کا حق دوسرے انسان کے حق پر فائق ں سمجھا جاتا۔ آؤ۔ آؤ، ہم تمہارا استقبال کرتے ہیں۔ چمکتی ہوئی آنکھوں سے، خاموش کانپتے ہوئے ہونٹوں سے، اور بھنچی ہوئی مضبوط یوں سے۔ خوش آمدید ساتھیو۔ اب تک تم ویرانے میں گھومتے رہے۔ آج تم گھر میں آئے ہو۔ ہمارے پاس حریری پردے نہیں، تنگی اریں ہیں۔ سونے کے پلنگ نہیں، پتھر کا فرش ہے۔ ہماری جیبیں خالی ہیں لیکن دل آنسوؤں سے معمور ہیں۔ محبت کے آنسو، رفاقت ، آنسو! ..... آؤ ..... آؤ ..... ساتھیو!

ساحر لدھیانوی کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور وہ شعر کہتے کہتے رک گیا اور اس کی نمناک آنکھوں میں جیسے سارا مجمع ناچ گیا اور اسے ساس ہوا، جیسے وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا اپنے عزیزوں سے گلے مل رہا ہو۔ یہ اس کی ماں تھی۔ یہ بھائی۔ یہ بہن۔ یہ بچپن کا محبوب تھی۔

آؤ ..... آؤ ..... ساتھیو!

واپسی

اب وہ لوگ فارغ ہو کر حیدرآباد کے اسٹیشن پر پہنچ گئے تھے۔ ریلوے مزدوروں نے تھرڈ کا ایک چھوٹا سا ڈبہ ان کے لیے وقف کر دیا تھا تاکہ انھیں دورانِ سفر میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ اب اس کمرے میں ان کا سامان رکھا ہوا تھا۔ اسٹیشن کا پلیٹ فارم تھرڈ کلاس کی مخلوق سے اٹا ہوا تھا اور غلیظ بستروں اور زنگ آلود سیاہ ٹرنکوں، بدبودار ٹوکروں اور کھانچیوں سے ایک غلیظ مال گودام کی صورت میں مبدل ہو چکا تھا۔ جالی والی ٹوکریوں میں مرغیاں کڑکڑا رہی تھیں اور ان کے قریب سیاہ فام گھاٹنیں اپنی کمر کے گرد لپٹی ہوئی مرہٹی ساڑھی کے پلو سے جوئیں چننے میں مصروف تھیں۔ اتنے میں زور سے ایک موٹر کے ہارن کی آواز کانوں میں آئی اور ایک سیاہ رنگ کی سیڈان اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر جہاں موٹر گاڑیوں کا آنا ممنوع ہے چلتی ہوئی دکھائی دی۔ پوں پوں، آگے سے ہٹ جاؤ۔ پوں پوں — پولیس کے آدمی ہنٹر لیے ہوئے لوگوں کو پرے ہٹانے لگے۔ قلی اسباب راستے سے اٹھانے لگے۔ راستہ صاف ہوتا گیا۔ پوں پوں۔ موٹر پلیٹ فارم پر چلتی گئی اور آخر اک ایسے ڈبے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی جو کسی بڑے آدمی کا سپیشل سیلون معلوم ہوتا تھا۔ کار میں سے پہلے سنہری وردی میں ملبوس ایک اردلی اترا، پھر اس نے کار کے دروازے کا پٹ کھولا اور جب تک پولیس کے لوگوں نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال لیا اور پھر کوئی کچھ نہ دیکھ سکا کہ کیا ہے۔

"کیا ہے"؟ ایک نے پوچھا۔

"سر سلطان بالقابہ کا سپیشل سیلون ہے۔"

"سر سلطان احمد جو وائسرائے کی کونسل کے ممبر ہیں؟"

"جی ہاں وہی۔"

"یہاں حیدرآباد میں کیا کرنے آئے ہیں؟"

"اپنے کسی عزیز کی شادی یہاں کرنے آئے تھے۔ وہ دلھن کے لیے کمپارٹمنٹ ہے۔ اور یہ باہر کیا رکھا ہوا ہے، دیکھتے نہیں ہو، یہ جہیز کا سامان ہی تو ہے۔"

مرغی کے بدبودار ٹوکروں اور غلیظ جام سے بھری ہوئی کھانچیوں اور زنگ آلود ٹرنکوں سے نظریں پھسلتی ہوئیں اس سازو سامان پر پڑیں، جہاں چاندی کے برتن پڑے تھے اور اخروٹ کی بیش قیمت چیزیں اور روپہلے پایوں والے پلنگ اور صراحیاں جن پر طلائی آب و رنگ تھا اور پھر وہاں سے نظریں پھسلتی ہوئیں جوئیں چنتی ہوئی مٹیالی کالی سلونی، غلیظ گھاٹنوں کے جسموں کو بہ انداز تنفر دیکھتی ہوئیں اس کھڑکی کے باہر جا کر رک گئیں۔ یہاں ریشمی پردہ لہرا رہا تھا۔ آگے مت جاؤ ریشمی پردہ کہہ رہا تھا۔ آگے مت جاؤ، یہ ریشم کی دیوار ہے۔ اس دیوار کے ادھر تمھاری دنیا ہے، غریبی کے متعفن کیچڑ میں کلبلاتی ہوئی مخلوق۔ ریشم کی دیوار کے اس طرف دوسری دنیا ہے جس کی ہر سانس میں آسودہ تعیش کی تعطر ہے۔ ہر تبسم میں کامراں امنگوں کی شراب ہے۔ ہر لے میں فتح کا مغرور نغمہ ہے اور ان دونوں دنیاؤں کے بیچ میں ایک پتلی شفاف سی ریشم کی دیوار ہے۔ اتنی پتلی اور ایسی شفاف کہ لوگ آر پار دیکھ سکتے ہیں۔ اس دنیا کے لوگ، اس دنیا کے

وگوں کو اجنبی نگاہوں سے ، دشمن نگاہوں سے ، نفرت کی نگاہوں سے تک رہے ہیں۔ تک رہے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں ۔ ڈر رہے ہیں لیکن وئی ادھر یا ادھر سے ادھر نہیں آتا۔ کوئی اس پتلے شفاف سے پردے کو ہاتھ کے ایک ہی جھٹکے سے چاک کرنے کی ہمت نہیں کرتا۔

آؤ، آؤ، ساتھیو۔ دیکھو یہ سر سلطان احمد کا سپیشل سیلون ہے۔ تمہارا تھرڈ کلاس کا ڈبہ ہے۔ یہ ان کا سبز وردی میں ملبوس بیرا ہے۔ یہ پھٹے ہوئے کالروں والا علی سردار جعفری ہے۔ یہ اخروٹ کا میز ہے جس پر کشمیر کے کاریگروں نے حسین چپکی کاری کی ہے۔ وہ رفعت سروش کا بھورا بستر ہے جس میں درجنوں پیوند لگے ہیں۔ یہ طلائی صراحی ہے۔ وہ تلنبے کا لوٹا ہے۔ یہ کم خواب کی رضائی ہے۔ وہ لدر کی اوڑھنی ہے۔ یہ موت ہے، وہ زندگی ہے۔

یہ ماضی ہے۔ وہ مستقبل ہے۔

یہ اندھیرا ہے۔ وہ اجالا ہے

دیکھو۔ دیکھو، وہ دیوار ٹوٹ گئی۔ موت زندگی سے، ماضی مستقبل سے اور رات سحر سے گلے مل رہی ہے۔

لیکن ہٹیں! دیوار کہاں ٹوٹی ہے۔ یہ تو گاڑی چل رہی ہے، آہستہ آہستہ۔ لوگ الوداع کہہ رہے ہیں۔ مسلم ضیائی کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ ابراہیم جلیس کے رخساروں کے گڑھے اور گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ نظر کے بال اور بکھر گئے ہیں اور شبر حاتمی کی محجوب نگاہیں کہہ رہی ہیں۔ ہم شرمندہ ہیں بے حد شرمندہ ہیں۔ نہ جانے کیوں۔

گاڑی چل رہی ہے۔

جگر صاحب ہاتھ ہلا کر جلیس سے کہہ رہے ہیں۔ میں بہت جلد گاؤں سے لوٹ آؤں گا۔ اور چھوٹی بہن کو ساتھ لیتا آؤں گا۔ فکر نہ کرنا۔ اچھا ہے، اپنے مہمانوں کے ساتھ جا رہا ہوں، تھوڑی دور ساتھ رہے گا ـــــ میرا خیال ہے اب وہ اچھی ہو گئی ہو گی چھوٹی بہن ـــــ

گاڑی چل رہی ہے

سورج ڈوبتا جا رہا ہے۔

سورج ڈوب گیا۔

حیدر آباد غائب ہو گیا۔

گاڑی پھر بھی آہستہ آہستہ چل رہی تھی، گویا ان بھک منگوں کا منہ چڑا رہی تھی، جو پلیٹ فارم کے کنارے کنارے اور بعد میں ریل کی پٹری کے کنارے کنارے بھاگ رہے تھے۔ سگنل مینوں کے کیبن سور کے چھوٹے چھوٹے ڈربوں کی طرح سطحِ زمین سے اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ گاڑی آگے چلی جا رہی تھی لیکن انجن نے ابھی اپنی رفتار تیز نہیں کی تھی کیوں کہ وہ ابھی ابھی گودام سے کوئلہ اور نل سے پانی لے کر فارغ ہوا تھا اور تازہ دم حقے کی طرح گڑگڑا رہا تھا۔ بھکاری چلا رہے تھے۔ بابو صاحب، پیسہ۔ بابو صاحب، پیسہ۔ گاڑی شہر سے باہر میدان میں آ گئی تھی۔ سٹیشن کی عمارت، بہت دور پیچھے رہ گئی تھی اور اب یہاں سطح مرتفع پر گارے کی بنی ہوئی ـــ جھونپڑیاں نظر آتی تھیں۔ ان پر کھپریل کی چھت تھی۔ سوکھیا کی ماری ہوئی بھینسیں میدان میں کھڑی جگالی کر رہی تھیں اور سورنیاں اور سور آس پاس چر رہے تھے اور اتنی دور سے وہ بھی بھینس کے بچے معلوم ہوتے تھے۔ جو ہٹروں میں بدبودار غلیظ گہرا سبز پانی ٹھہرا ہوا تھا اور کہیں کہیں

کھائیوں میں لوگ رفعِ حاجت کے لیے گاڑی کی طرف پیٹھ کیے بیٹھے تھے ۔ بھک منگوں کی آواز بار بار کانوں میں آرہی تھی ۔ بابو صاحب پیسہ ۔ بدھ کے وقت میں یہی ہندوستان تھا ۔ یہی غلیظ جوہڑ، یہی گارے کی جھونپڑیاں، یہی بھک منگے ۔ اشوک کے عہد میں بھی یہی ہندوستان تھا، اکبر کے عہد میں بھی یہی، اور آج دو سو سال کی انگریزی حکومت کے بعد بھی لوگ اسی طرح گاڑی کی طرف پیٹھ کیے بیٹھے تھے ۔ آئے ۔ آئے ۔ کہیں سے آئے ۔ وہ زندگی کی بیدار افق اس ساکن منجمد بے حس دنیا میں، اس گہری اتھاہ تیرگی میں آئے ۔ کہیں سے آئے ۔ وہ نور کی کرن، وہ صبح کی سرخ لکیر، محبوب کے پایل کی ناچتی ہوئی آواز ۔ آئے، کہیں سے آئے اور تاروں بھری افشاں کی طرح چمک کر ہندوستان کے ماتھے پر جگمگائے ــــــ

پھر گاڑی تیز چلنے لگی ۔ اندھیرا بڑھتا گیا ۔ تاریکیاں شبنمی لبادے اوڑھ کر چاروں طرف چھا گئیں ۔ دل کسی نامعلوم خوف اور اداسی سے معمور ہو گئے ۔ سب چپ تھے، صرف جگر اک ملتجیانہ تبسم سے ادیبوں کی طرف دیکھ کر کہہ رہا تھا، "میں اپنے گاؤں جا رہا ہوں"

سب خاموش تھے ۔

"میری بہن بیمار ہے"۔

کوئی نہیں بولا ۔

"مجھے اپنی بہن سے بڑی محبت ہے ۔ مجھے گھر میں سب سے چھوٹی بہن ہی پیاری ہے ۔ ہماری ایک ہی بہن ہے اور ایک عرصے سے بیمار ہے ۔ لیکن یہی، اسے چند وجوہات سے اب تک حیدرآباد نہ لاسکا"۔

چپ چاپ ـــــ گاڑی چلتی رہی

میں اسے حیدرآباد لے آؤں گا ۔ ڈاکٹر اجنکیاسے اس کا علاج کراؤں گا ۔ ڈاکٹر نائیڈو کو بھی دکھاؤں گا ۔ میں نے دو سو روپیہ ــــــ اس کی بیماری کے علاج کے لیے بچا کے رکھا ہے ۔

ہم دونوں کیسے امرود توڑ کر کھایا کرتے تھے ۔ میں اس کے لیے پچھمن کے گھر سے املی چرا کے لایا کرتا تھا ۔ اسے میٹھے بیر بہت پسند ہیں ــــ

وہ اپنی یادوں میں کھویا گیا ۔ سب لوگ چپ رہے ۔

ہولے ہولے کچھ گنگنانے لگا ۔ اپنی غزلیں، محبت کا گیت، وہ گیت جس میں اس نے اپنے کھانستے ہوئے سینے کی آرزوئیں اپنی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں کا نور اور اپنے زرد چہرے کی راکھ کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی ۔ وہ ہولے ہولے گا رہا تھا جیسے اپنے دل کے بچے کو لوری دے رہا ہو ۔ وہ خود اپنے لیے گا رہا تھا، صرف اپنے لیے ـــ لیکن اس ڈبے میں کون تھا جس نے اس گیت کو اپنے لیے نہیں سمجھا ۔ جیسے اس کے ہر شعر میں، ہر مصرعے میں، ہر لفظ میں اپنے عشق کی جھلک، اپنی ناکامی کی تصویر اور اپنے محبوب کی تنویر نظر نہیں آئی ۔ جیسے تصور میں کوئی مسکرا اٹھا، کسی نے انگڑائی لی، کہیں سے پایل بج اٹھی اور نغمہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا ـــ اک گراں بار افسردگی بوجھل غبار بن کر سانس روکنے لگی اور پھر ساحر اپنے چیچک زدہ چہرے کے داغوں کو سہلاتا ہوا اپنی سیٹ پر جھک گیا اور اپنے ہاتھ ٹھوڑی پر رکھے ان نظموں کا ذکر کرنے لگا جو اس نے اپنے محبوب کے پیار کی خاطر لکھے تھے ۔ وہ نغمے جن کی پہنائیوں میں اس کی زندگی کی بہاریں

کے سرچشمے ابلتے تھے اور جس کے زعفران رنگ کھیتوں میں اس کی سرمست آرزؤوں کی مہک تھی۔ ہولے ہولے آہستہ آہستہ، شرماتے ہوئے، مجرمانہ انداز میں وہ گا رہا تھا۔ گاڑی جتنی تیز تھی، گیت اتنا ہی ہولے تھا۔ کہیں کوئی سن نہ لے۔ اس کے پیار کا گیت، اس کی محبت کی شکست، اس کی زندگی کی موت لیکن کون اس وقت ساحر نہ تھا۔ یہ نغمے کس نے بازار میں نہ بیچے تھے۔ کس نے کینچی کی طرح اپنے لیے ہر غم کی بھاری سل نہ باندھی تھی جس کے بوجھ سے سینہ یوں چور چور ہو گیا تھا۔ کس نے غمِ جاناں کی منزل سے گزر کر غمِ دوراں کو اپنایا نہ تھا، کون تھا جو زخمی نہ رہ چکا تھا، محزوں نہ رہ چکا تھا، شکستہ دل نہ رہ چکا تھا ـــــ

یکایک ساحر نے آہستہ سے کہا۔ آہستہ سے، جیسے اپنے الفاظ کو چوم رہا ہو۔ "وہ، ہر روز سٹیشن پر ملنے کے لیے آتی تھی ـــــ "
پھر چپ ہو گیا۔

سب یادوں میں کھو گئے۔ کسی نے کچھ نہیں کہا مگر شاید سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں کروڑوں آدمی ایک خاموش گویائی کے طلسم سے مجبور ہو کر وہاں بیان کر رہے تھے۔ اپنا نوحہ، اپنی حسرتیں، اپنی آرزوئیں، اپنی مسرتیں، جو وہ تھے جو وہ بننا چاہتے تھے۔ سپنے جو ادھورے رہ گئے۔ خوب صورتی جسے ہونٹ چوم نہ سکے۔ کسی گم شدہ ماضی کی حسرت، کسی نامعلوم مستقبل کی آرزو، آرزو اور پھر کشمکشِ حیات کا لپکتا ہوا شعلہ۔ تھا، اب نہیں ہے، اب ہوگا، ضرور ہوگا ـــــ ضرور ـــــ

سب یادوں میں کھو گئے اور پھر آنکھیں بند کر کے سپنے دیکھنے لگے۔

منزل

یکایک کرشن چندر کی آنکھ کھلی۔ گاڑی ایک چھوٹے سے سٹیشن پر کھڑی تھی۔ جگر صاحب بستر لپیٹ رہے تھے اور سٹیشن پر جانے والے تھے۔ بستر لپیٹ کر انھوں نے سوئے ہوئے ادیبوں کی طرف دیکھا اور یکایک کرشن چندر پر ان کی نظر پڑ گئی اور جگر نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ کرشن چندر نے دیکھا کہ جگر رو رہے ہیں۔

جگر!

کرشن چندر اسے خدا حافظ نہ کہہ سکا۔ گاڑی چلنے لگی۔

ساحر لدھیانوی کرشن چندر کے قریب سیٹ پر لیٹے تھے۔ کرشن چندر نے آہستہ سے کہا ساحر ـــــ ساحر، ساحر نے اسی طرح لیٹے لیٹے کہا۔ "میں خوب جانتا ہوں اس شخص کو۔ یہ ابراہیم جلیس کا بھائی ہے "۔

کرشن چندر نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "تم جانتے ہو اس کی چھوٹی بہن مر گئی ہے "۔

"ہاں، میں سن رہا تھا "۔ ساحر نے نپے تلے لہجے میں جو ہر قسم کے جذبات سے عاری معلوم ہوتا تھا کہا۔ "میں جانتا ہوں اس کی بہن مر گئی ہے۔ اس کی ایک ہی بہن تھی۔ سارے گھر میں اسے وہی سب سے پیاری تھی لیکن اتنی محبت کے باوجود وہ اس کا علاج اب تک حیدر آباد میں نہ کرا سکا کیوں کہ اب تک وہ دو سو روپے اکٹھے نہ کر سکا تھا "۔

"مگر"۔ کرشن چندر کہنا چاہا۔ لیکن ساحر نے اسے بولنے نہیں دیا۔

اور جب اس نے دو سو روپے اکٹھے کر لیے تو یہ کانفرنس آ گئی اور اس نے یہ روپے کانفرنس کے لیے دے دیے اور اس نے گاؤں گاؤں گھوم کر مخدوم کے ساتھ ہر جگہ جا کر چندہ اکٹھا کیا۔ کسانوں سے، مزدوروں سے، طلبہ سے، غریب لوگوں سے چندہ جمع کیا تا کہ کلچر زندہ رہے۔ اس کی بہن مرجائے، لیکن تہذیب زندہ رہے، تمدن زندہ رہے، فن کار کا خیال زندہ رہے۔ اس کی بہن اچھی خوراک اور مناسب دوا نہ ملنے سے سسک سسک کر جان دے دی لیکن کتاب زندہ رہے، زبان زندہ رہے، قوم کی روح زندہ رہے۔ اس کی پیاری پیاری، املی کھانے والی، امرود توڑ کر چرا کر کھانے والی اس کے بچپن کی ساتھی بہن مرجائے لیکن کالیداس زندہ رہے، غالب زندہ رہے، اقبال زندہ رہے، پریم چند زندہ رہے۔ موت اس کی بہن کے ہونٹوں کو یخ بستہ کر دے اور اس کی آنکھوں کو بے نور کر دے لیکن زندگی اور اس کا زندہ ادب اپنے نور سے اور اپنی حرارت سے اور اپنے ایمان سے لاکھوں دلوں کو روشن کر دے۔

"مگر" ـــ کرشن نے کچھ کہنا چاہا لیکن ساحر اب بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ بہت سے ادیب جاگ اٹھے تھے۔

"کانفرنس کامیاب رہی، مگر اس کی بہن مر گئی۔ کانفرنس کے دوران میں جگر کو اپنی بہن کی شدید علالت کے تین تار آئے لیکن وہ اسے لانے نہیں گیا۔ چپ چاپ کانفرنس کا کام کرتا رہا۔ جب پہلا تار آیا، اس روز تم اپنا مقالہ پڑھ رہے تھے۔ جب دوسرا تار آیا، اس روز تم پریم چند سوسائٹی کے مہمان ہو کر ڈنر کھا رہے تھے۔ جب تیسرا تار پہنچا، تم لوگ راجہ شام راج کے ہاں مدعو تھے ـــ"

ساحر ـــ کرشن چندر زور سے چلایا جیسے کسی نے اس کے دل میں آہنی کیل گاڑ دی ہو اور پھر جیسے اس کیل سے لہو کی سرخ دھار پھوٹ نکلی۔ کسی نے اپنی جان سے پیاری ہمشیرہ کی زندگی کا لہو دے کر ادب کو زندہ کر دیا تھا۔ لہو چاروں طرف بہہ رہا تھا اور اس میں طلائی صراحیاں اور اخروٹ کے میز اور نقرئی پلنگ ڈوب رہے تھے۔ حریری پردے سرک گئے تھے اور دیوار ٹوٹ گئی تھی۔ جس نے انسان اور انسان کے مابین امتیاز پیدا کر دیا تھا۔ چاروں مینار سرنگوں تھے اور تیز دوڑتی ہوئی سیاہ سیڈان سیاہ فام گھاٹنوں کے آگے سربہ سجود تھی۔ وہ لوگ اکیلے تھے، کمینے تھے، احساسِ کمتری اور خود غرضی کے شکار تھے لیکن سب مل کے وہ جیسے کچھ اور ہو گئے تھے۔ کسی نئی ہمت، کسی نئی قوت، کسی نئی عظمت سے سرشار ہو گئے تھے جیسے مل کے ان کی برائیاں دب گئی تھیں اور اچھائیاں ابھر آئی تھیں۔
ساحر اب چپ تھا۔ لیکن اس کا سینہ کسی ان جانے طوفان سے رستاخیز تھا۔ اس نے کنکھیوں سے اپنے رفیقوں کی طرف دیکھا۔ کوئی ایسا نہ تھا جس کی آنکھیں پرنم نہ ہوں، پرنم اور دور، بہت دور، جیسے وہ ماضی اور حال اور مستقبل کے پرے جا کر بھی کچھ تلاش کر رہی ہوں، کچھ ڈھونڈ رہی ہوں، کچھ پا رہی ہوں ـــ

وامق آہستہ سے گانے لگا۔

پورب دیس میں ڈگی باجے بھوکا ہے بنگال رے ساتھی
بھوکا ہے بنگال
رے ساتھی

یہ بھوکے بنگال کا گیت تھا۔ اداس دلوں کا گیت تھا مرتی ہوئی روحوں کا گیت تھا لیکن اس وقت نہ جانے اس گیت میں کون سی طاقت آ گئی تھی کہ یہ گیت موت کا گیت نہیں زندگی کا نغمہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی لے میں اداسی کی جھلک نہیں، اک کامران تبسم کی

مزلگن معلوم ہوتی تھی۔ اس کی پہنائی میں یاس وحسرت نہیں، اک پر امید للکار کی گونج سنائی دیتی تھی، جیسے اس گیت کا سویا سویا مدھم نوحہ کسی کے خون سے جاگ اٹھا تھا اور اک بے خطر بغاوتی طوفانی انداز میں کہہ رہا تھا

پورب دیس میں ڈگی باجے

ڈگ ۔۔۔ ڈگ ۔۔۔ ڈگ ۔۔۔ ڈگی باج رہی تھی۔ پورب دیس ہی میں نہیں، پورب، اتر، دکھن، پچھم، ہندوستان کی چاروں کھونٹوں میں یہ ڈگی باج رہی تھی۔ ہندوستان کا وہ کون سا گوشہ ہے جو بنگال نہیں!

وامق کے گاتے گاتے یکایک وہ سب ایک دم اکٹھے پوری قوت سے گانے لگے۔

پورب دیس میں ڈگی باجے بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال

رے ساتھی!

ساتھی! یہ ڈگی سن لے۔ یہ خطرے کی ڈگی، اک غیر مختتم للکار، اک پیہم پیکار۔

آؤ۔ آؤ ساتھی

ساتھی جو بھوکے تھے، ساتھی جو مدقوق تھے، ساتھی جو جیل کی سختیوں کے آثار لیے ہوئے تھے، ساتھی جو لتھڑی ہوئی ناکام آرزوؤں کے مزار تھے، ساتھی جو درد کی تفسیر تھے، اب یکایک اٹھ کر اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے اور اپنی روح کی پوری قوت سے گانے لگے۔ خود ہی گا رہے تھے اور خود ہی سن رہے تھے۔ اک نیا گیت، اک نیا خیال، اک نئی آواز، اک نیا تبسم، جیسے ادھ کھلی کلی یکایک کچھ سوچ کے مسکرا اٹھے۔۔۔

باہر گاڑی بھاگی جارہی تھی لیکن اندر سکون۔ باہر چاروں طرف اندھیرا تھا لیکن گاڑی کے اندر روشنی تھی۔ باہر راستہ تاریک اور دشوار گزار تھا لیکن منزل معلوم ہو چکی تھی۔

—— ooo ——

بیرونی مُمالِک میں ہمارے نُمائندے

- امریکہ : جناب حسن چشتی۔ لنکن وڈ۔ شکاگو۔ یوایس اے
- کناڈا : جناب شاہد صدیقی۔ اوٹاوا۔ اونٹاریو۔ کناڈا۔ فون نمبر : 613-738-7712
- انگلستان : محترمہ صدیقہ شبنم۔ سڈکپ۔ کینٹ۔ یوکے۔ فون :081-302-9504
- ریاض (سعودی عربیہ) : جناب غوث ارسلان، پوسٹ باکس نمبر : 71، ریاض 11411
- جدہ (سعودی عربیہ) : جناب سلیم فاروقی۔ اردو اکیڈیمی۔ جدہ۔ فون نمبر :6859698
- جدہ (سعودی عربیہ) : جناب شریف اسلم۔ بزمِ اردو جدہ

سب رس کتاب گھر

فہرستِ کتب

مطبوعاتِ ادارۂ ادبیاتِ اردو ۔ حیدرآباد ۔

شاعری

صبر و شکر	تہنیت النسا بیگم	10=00
تنویرِ تخیل	المغنی حیدرآبادی	20=00
دیوانِ داؤد اورنگ آبادی	مرتبہ : خالدہ بیگم	15=00
ماہ لقا	عزیز احمد	15=00
ورق در ورق	سید مظفرالدین	25=00
انوار	علی اختر	20=00
سخنِ حمید	مرتبہ : احمد پاشاہ قادری	15=00
سلسلہ در سلسلہ	مظفرالدین حیدرآبادی	8=00
آبگینۂ شعر	بشیر النساء بیگم	30=00
آتشِ بے نام	صاحب حیدرآبادی	20=00
طالب و موہنی	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	15=00
تسلیم و رضا	تہنیت النسا بیگم	10=00
ترجمانِ زندگی	سید علی منظور	20=00
گلستانِ حمد ، نعت ، منقبت	صاحب حیدرآبادی	25=00
نمودِ زندگی	سید علی منظور	20=00
سخن در سخن	صاحب حیدرآبادی	25=00
رمزِ سخن	محی الدین قادری زور	20=00
دیوانِ عشق	مرزا جمال اللہ عشق	25=00
انجمن در انجمن	صاحب حیدرآبادی	20=00
زبانِ شمع	صاحب حیدرآبادی	20=00
مہکتے ویرانے	بانو طاہرہ سعید	20=00
فیضِ سخن	شمس الدین فیض / مرتبہ : ڈاکٹر زور	25=00
مسلکِ گوہرین	محمد جلال الدین اشک	15=00
کلام معظم بیجاپوری	مرتبہ : ابوالنصر محمد خالدی	20=00
ارمغانِ جذب	راگھویندر راؤ	25=00

تاریخ

تاریخ گول کنڈہ (انگریزی)	عبدالمجید صدیقی	30=00
مسلمان شاہی خاندان	محمد عبدالرحمن خاں	40=00
قطب شاہی سلاطین (انگریزی)	ڈاکٹر زور	10=00
مال والوں کی سیر تاریخ	مراد علی طالع	10=00

O

آصف سابع میر عثمان علی خان اور ان کا دور	طیبہ بیگم	125=00
مقدمہ ، تاریخ دکن	عبدالمجید صدیقی	20=00
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	میر حسن	25=00
محمد قلی قطب شاہ	ادارہ ، ادبیاتِ اردو	5=00
تذکرہ ، مخطوطات جلد اول (مرمہ ایڈیشن)	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	200=00
" " جلد دوم	" " " "	30=00
" " جلد سوم	" " " "	45=00
" " جلد ششم	اکبر الدین صدیقی ، / محمد علی اثر	45=00
تذکرہ ، نوادر ایوانِ اردو	ڈاکٹر زور	40=00
دارالعلوم کے سپوت	حافظ محمد مظہر	20=00
مرقع سخن (شعرائے عثمانیہ)	ادارہ ، ادبیاتِ اردو	40=00
سرگذشتِ حاتم	محی الدین قادری زور	20=00
جنوبی ہند میں رباعی گوئی	صاحب حیدرآبادی	45=00
رسائلِ طیبہ	سکینہ بیگم	45=00
دکنی ہندو اور اردو	نصیر الدین ہاشمی	30=00
سرگذشتِ ادارہ ، ادبیاتِ اردو	حمید الدین شاہد	35=00
تحفۃ الشعرا	مرزا افضل بیگ قاقشال	25=00
داستانِ ادبِ حیدرآباد	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	40=00

ooo

سوانح

جلال الدین اکبر	محمد نصیر الدین	15=00
سر سالار جنگ اعظم	فیض محمد	7=00
نواب عماد الملک	فیض محمد	7=00
سر سید احمد خاں	ظہیر الدین احمد	5=00
دادا بھائی نوروزجی	ظہیر الدین احمد	5=00
نظام الملک اول	مراد علی طالع	6=00
نواب سکندر جاہ ثالث	" "	6=00
نواب ناصر الدولہ رابع	" "	6=00
نواب افضل الدولہ پنجم	" "	6=00
نواب میر محبوب علی خاں سادس	" "	6=00
ملکہ حیات بخشی بیگم	نصیر الدین ہاشمی	10=00
سرگذشتِ غالب	سید محی الدین قادری زور	20=00
مرزا غالب	ڈاکٹر تاتیانا پری گارینا / ترجمہ : اسامہ فاروقی	140=00

ڈرامے

ہیلینا	فضل الرحمان	15=00
وہی	وزیر حسن دہلوی	15=00
تماشائے اہلِ ہنر	سید رشید الحسن	10=00
کاغذ کی ناؤ	محمد علی میکش	15=00
سانولی	اظہر افسر	20=00

ooo

افسانے اور ناولٹ

رم جھم	سری کشن سنہا	12=00
برف میں آگ	حامدی کاشمیری	20=00
رادھا اور رنگ محل	وزیر حسن دہلوی	15=00
سر سٹرگل	طیبہ بیگم	25=00
لیلیٰ	عظیم النساء بیگم	15=00
فکر مت کرو	زین العابدین	15=00

ادبِ اطفال

باتیں	شجاع احمد قاید	10=00
جب میں طالبِ علم تھا	شاہ غیاث	4=00
عرب اور عربستان	جہاں بانو نقوی	15=00
مولانا ابوالکلام آزاد	وقار خلیل	6=00
اشوکِ اعظم	سیدہ مہدی جعفر	6=00

سائنس

ہمارے ماحول	محمد سعید الدین	8=00
سائنس کے کرشمے	میر حسن	8=00
سمندری عجائبات	احمد حسن نقوی	8=00
زہریلے پودے	محمد عبدالسلام	8=00
آب دوز اور سرنگ	ادارہ ء ادبیاتِ اردو	6=00

تعلیم اور مکاتیب

تعلیم کا مسئلہ	رضی الدین صدیقی	15=00
علم خانہ داری	محمودہ صدیقی	15=00
معلم بالغان	سیدہ زاہدہ حسین	10=00
مکتوبات شاد عظیم آبادی	محی الدین قادری زور	20=00
خطوطِ عبدالحق	اکبرالدین صدیقی	40=00
مکتوباتِ سلاطینِ قطب شاہی	قاضی عبدالعلی طالقانی	35=00

متفرق

خطابیات	ڈاکٹر رحیم الدین کمال	10=00
ہندستانی قومیت کا تمدنی پہلو	پروفیسر اشور ناتھ ٹوپا	10=00
مخزنِ علوم و فنون	ادارہ ء ادبیاتِ اردو	25=00
دفتری معلومات	ظہیرالدین احمد	10=00
ٹھنڈی بجلیاں (مزاح)	بھارت چند کھنہ	15=00
حرفِ شیریں	قاضی غلام محمد	15=00
یارانِ شہر (خاکے)	طیب انصاری	20=00
تاریخ سیاسیات (سیاسیات)	عبدالمجید صدیقی	25=00
سفر نامہ یورپ اور امریکہ (سفر نامہ)	لیاقت جنگ	30=00

●○●○●○○●

ماہنامہ **سب رس** حیدرآباد

جلد : ۶۰ — اپریل ۱۹۹۸ء — شمارہ : ۴

خصوصی اشاعت

○ مدیر : مغنی تبسم
○ معاونین : غلام جیلانی ، بیگ احساس

سوونیر کمیٹی

ولی قادری — ڈاکٹر موہن لال نگم
مخدوم محی الدین

فی پرچہ : ۱۲ روپے
زر سالانہ : ۱۲۵ روپے
کتب خانوں سے : ۱۵۰ روپے

مشرق وسطی اور امریکہ : ۲۵ ڈالر
پاکستان، نیپال، سری لنکا، بنگلہ دیش : ۱۰ ڈالر
انگلستان : ۱۵ پونڈ

اس شمارے میں

قطب شاہی دور اور محمد قلی قطب شاہ

ادارہ ادبیاتِ اردو کے نوادر

تصویریں

○○○

پہلی بات

اس سال ادارہ ، ادبیاتِ اردو کے زیرِ اہتمام یومِ محمد قلی قطب شاہ تقاریب ۲۵ ۔ ۲۶ / اپریل ۱۹۹۸ء کو منائی جارہی ہیں ۔ افتتاحی جلاس ہمیشہ کی طرح گنبدانِ قطب شاہی میں منعقد ہوگا ۔ اس بار ہم نے افتتاحی اجلاس کی صدارت کے لیے پروفیسر شمیم جے راج پوری انس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو دعوت دی ہے اور پروفیسر گوپی چند نارنگ نائب صدر ساہتیہ اکیڈمی دہلی تقاریب کا تتاح کریں گے ۔ ۲۶ / اپریل ۱۹۹۸ء کو " دکنی زبان پر جنوبی ہند کی زبانوں کے اثرات " کے موضوع پر ایک قومی سمینار ، قومی نسل برائے فروغِ اردو زبان کے تعاون سے منعقد کیا جارہا ہے جس کے لیے ہم قومی کونسل کے نائب صدر نشین ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ر ڈائرکٹر ڈاکٹر حمیداللہ بھٹ کے شکرگزار ہیں ۔ اس سمینار کا افتتاح ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کریں گے اور پروفیسر گوپی چند نارنگ صدارت یں گے ۔ پروفیسر عبدالستار دلوی (بمبئی) ، پروفیسر مسعود سراج (میسور) ، پروفیسر عابد صفی (مدراس) ، پروفیسر سجاد حسین (مدراس) ، لٹر محمد علی اثر اور پروفیسر مغنی تبسم مقالے پڑھیں گے ۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا سمینار ہوگا جس میں دکنی زبان پر جنوبی ہند کی زبانوں راتی ، مرہٹی ، تلگو ، کنڑ ، ٹامل اور ملیالم کے اثرات کا جائزہ لیا جائے گا ۔

یومِ محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے انعقاد کے لیے قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے علاوہ حسبِ ذیل اداروں نے رقمی نت کی ہے جس کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں ؛

۱ ادبی ٹرسٹ ، حیدرآباد ۔
۲ خان لطیف خان فاؤنڈیشن ، حیدرآباد ۔
۳ آندھرا پردیش اردو اکیڈمی ، حیدرآباد ۔
۴ ایچ ۔ ای ۔ ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ ، حیدرآباد ۔
۵ حیدرآباد دکن سگریٹ فیکٹری ۔
۶ جناب سید عابد حسین خان صاحب ۔
۷ جناب سید سعید بھائی صاحب ۔
۸ جناب عباس زیدی صاحب ۔
۹ جناب سید علی نقوی صاحب ۔

ہم مشتہرین حضرات کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جن کے تعاون سے یہ سووینیر اشاعت پذیر ہوا ۔

اس شمارے کے لیے قطب شاہی دور سے متعلق جناب محمد عبدالقیوم صاحب ، جناب عابد حسین خاں صاحب اور محترمہ نت علی خلیل صاحبہ نے بہ طور خاص مضامین تحریر کیے ہیں ۔ ان کے علاوہ وہ مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں جو یومِ زور کے سلے میں نوادراتِ ادارہ ، ادبیاتِ اردو کے موضوع پر منعقدہ سمینار میں پڑھے گئے تھے ۔

(ادارہ)

ooo

سید عابد حسین خاں

محمد قلی قطب شاہ

سلطنتِ قطب شاہی کا بانی سلطان قلی قطب شاہ ترکستان ماوراء النہر کے ایک بڑے قبیلے قراقونیلو (جس کا نشان کالا بکرا تھا) سے تعلق رکھتا تھا (۱) ۔ اس خاندان کے مشہور شخصیت اغز خان نے ترکستان کے بڑے حصے کو اپنے قبضے میں لیا اور ستر برس حکومت کی ۔ یہ قبیلے کے دوسرے نامور جیسے قارا یوسف ، سکندر شاہ ثانی ، جہاں شاہ حکمراں کی طرح ایران و ترکستان کی سلطنت کو عظیم الشان درجہ پر پہنچایا اور ایسا کردار وسط ایشائی سیاست میں ادا کیا کہ اسے تیمورِ ثانی کہا جاسکتا ہے ۔ اغز خاں کے فرزند تورا بیگ کے زمانے میں چنگیز خاں کے حملوں کی وجہ سے اس قبیلے کو ایران کے مغربی حصہ میں منتقل ہونا پڑا اور انھوں نے ہمدان کو اپنا دارالحکومت بنایا اور ابوسعید مرزا کے عہد تک اپنی حکومت کو مستحکم رکھا ۔

اس قبیلے کو بہت بڑا دھکا حق قونیلو سے پہنچا جس کا نشان سفید بکرا تھا ۔ حزن حسن نے جہاں شاہ کو قتل کیا اور تمام اولادِ نرینہ قبیلہ ، قرا قونیلو کو بھی قتل کردیا ۔

سلطان قلی کے والد اویس قلی نے اپنے گوشہ ، جگر کو اپنے بھائی اللہ قلی کے ہم راہ ہندستان روانہ کیا ۔ یہ دونوں ممکن ہے شمالی ہند سے واردِ دکن ہوئے ہوں ۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان قلی اور اللہ قلی دو مرتبہ ہندستان آئے اور بیدر پہنچے ۔ عبدالمجید صدیقی نے " تاریخ قطب شاہی " ، " تذکرات الملوک قانی " ، " ظفرہ " اور " قطبیہ " کے حوالے سے اللہ قلی اور سلطان قلی کی آمد بہ مقام بیدر بہ عہدِ محمد شاہ ۸۹۲ ھ م ۱۴۸۶ ، بتائی ہے (۲) ۔

سلطان قلی کو ۸۹۹ ھ م ۱۴۹۳ ، قطب الملک کا خطاب عطا ہوا اور ان کے زیرِ کمان بہادر جیلانی کی سرکوبی کے لیے متعین کیے گئے اور انھوں نے کامیابی حاصل کی اور ۹۰۱ ھ م ۱۴۹۶ ، (۳) طرف دارِ تلنگانہ کے عہدے پر تقرر ہوا اور امیر الامرا کا خطاب عطا ہوا ۔

محمود شاہ نے ۲۴ ذی الحجہ ۹۲۳ ھ م ۲۷ دسمبر ۱۵۱۸ ، کو اس جہانِ فانی سے کوچ کیا اور سلطان قلی نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور ایرانی طرزِ عمل کے مطابق خطبے میں اپنا نام " قطب شاہ " رائج کیا اور دن میں پانچ بار نوبت و نقارہ بجانے کا حکم دیا (۴) ۔

سب سے پہلے سلطان قلی نے قلعہ ، گول کنڈہ اور شہر کی تعمیر کی ۔ قلعہ کو بے حد مضبوط بنایا گیا ۔ سلطان محمود کے انتقال کے بعد سلطان قلی نے اس کا نام " محمد نگر " رکھا اور اسے دارالخلافہ قرار دیا ۔

سلطان قلی نے یہاں باغات و محلات ، سرائے ، مکانات ، مساجد ، اور دو غسل خانے تعمیر کروائے ۔ محلاتِ شاہی جیسے " زنانہ محل " اپنی ابتر حالت میں بھی عہدِ ماضی کی شان نمایاں کرتا ہے ۔ کئی چمن و باغات بھی لگائے گئے تھے ۔ اب جو عماراتِ نادامتی اور بینا متی ہیں وہاں ابراہیم باغ تھا ۔ نگینہ باغ قلعہ میں ہے باب الداخلہ کی داہنی جانب اور " باغِ فیض اثر " جہاں گنبدانِ شاہی واقع

۔ آج بھی موجود ہیں ۔ دیگر باغات کو زمانے کے طویل ہاتھوں نے برباد کردیا ۔ سلطان قلی کو فنِ تعمیر سے بےحد دل چسپی تھی
نے ایک نیا طرزِ تعمیر اپنایا جسے قطب شاہی طرزِ تعمیر کے نام سے دنیا جانتی ہے (۵) ۔

سلطان قلی نے اپنے دورِ حکمرانی میں مختلف جنگیں لڑیں جس کی وجہ سے سلطنت کا رقبہ ورنگل سے لے کر ساحلِ مچھلی بندر
پھیل گیا تھا (۶) ۔ سلطان قلی نے فارسی کو درباری زبان بنایا ۔ اس دور میں علما ، مشائخین اور سادات بیرونی ممالک سے گول
آتے (۷) ۔ ادیب و شاعر دربار میں مقام پاتے ۔

عبدالمجید صدیقی اور جناب سید علی اصغر بلگرامی کے بہ موجب ۲ جمادی الثانی ۹۵۰ ھ م ۲ دسمبر ۱۵۴۳ ء سلطان قلی قطب شاہ
قتل مسجدِ صفا میں حالتِ سجدہ میں[9] یار قلی جمشید کے اشارے سے گول کنڈے کے قلعہ دار میر محمد ہمدانی کے ہاتھوں ہوا ۔ جب وہ
سر کی نماز پڑھ رہا تھا ۔ انتقال کے وقت سلطان کی عمر ۹۹ برس کی تھی اور " لنگر فیض اثر " میں جس کو آج کل گنبدانِ قطب
ہی کہاجاتا ہے دفن کیا گیا ۔

میں نے سلطان قلی کے متعلق تفصیلی مقالہ " قطب الملک سلطان قلی قطب شاہ " میں قلم بند کیا ہے (۱۰) ۔ یہ چند کلمات
نے بہ طورِ تمہید تحریر کیے ہیں ۔

خاندان قطب شاہیہ کے حسبِ ذیل ، فرماں روا گزرے ہیں ۔

سلطان قلی		۹۲۴ ھ م ۱۵۱۸ ء	تا	۹۵۰ ھ م ۱۵۴۳ ء
جمشید قلی		۹۵۰ ھ م ۱۵۴۳ ء	تا	۹۵۷ ھ م ۱۵۵۰ ء
ابراہیم قلی	۱۲ رجب	۹۵۷ ھ م ۱۵۵۰ ء	تا	۹۸۸ ھ م ۱۵۸۰ ء
محمد قلی		۹۸۸ ھ م ۱۵۸۰ ء	تا	۱۰۲۰ ھ م ۱۶۱۲ ء
سلطان محمد		۱۰۲۰ ھ م ۱۶۱۲ ء	تا	۱۰۳۵ ھ م ۱۶۲۶ ء
عبداللہ		۱۰۳۵ ھ م ۱۶۲۶ ء	تا	۱۰۸۳ ھ م ۱۶۷۲ ء
ابوالحسن		۱۰۸۳ ھ م ۱۶۷۲ ء	تا	۱۰۹۸ ھ م ۱۶۸۶ ء

سلطنت کو مستحکم کرنے میں ابراہیم قلی قطب شاہ نے نمایاں حصہ لیا اور کئی محلات تعمیر کروائے اور قلعہ کے حصار کو مضبوط
اور کئی امرا نے اپنے محلات بھی اندرونِ قلعہ بنائے ۔ اس کے علاوہ کئی مساجد و مدرسے لنگر خانے اور دو تالاب بھی بنائے گئے ۔
ایک تو ابراہیم پٹن میں اور دوسرا ۱۵۶۲ء میں شہر حیدرآباد میں حسین شاہ ولی کے نام سے حسین ساگر بنایا گیا ایک تالاب بدویل میں
بنایا گیا (۱۱) ۔ ابراہیم کے عہد میں تجار ترکستان ، عرب و ایران سے آتے ۔ اسی کے دور میں تلگو کو شاہی سرپرستی ملی اور وہ
اد اس زبان میں شعر کہتا تھا ۔ کئی شاعر اندکی گنگا دھر کوی ، پنگلی تلنگانارہ اور کندا کوری زودا کوی دربار میں تھے اس بادشاہ کو
" ملک بھرام " کہتے تھے ۔ ابراہیم قلی ، جمشید قلی کے دورِ حکومت میں سات برس وجیانگر میں پناہ گزین تھا (۱۲) ۔ ابراہیم کا
رایا کی چہیتی سے ہوگیا تھا جو برہمن تھی یا گانے والی تھی جس کی وجہ سے دونوں میں نااتفاقی ہوگئی تھی ۔ ممکن ہے یہ خاتون
رنی ہو ۔ ابراہیم کی شادی بھاگ رتی کے اسلام قبول کرنے کے بعد ہوئی (۱۳) ۔ ابراہیم کی دوسری شادی بی بی جمال دختر
حسین نظام شاہ سے ہوئی ۔ شادی کی تقریب بیرونِ شہر کلیان ۱۵۴۳ ء م ۹۸۱ ھ میں عمل میں آئی (۱۴) ۔ اسی بادشاہ کی دور اندیشی کی
ابہ سے بیجاپور ، احمد نگر اور گول کنڈہ نے یک جا ہوکر وجیہ نگر کے خلاف بہ مقام بنی ہٹی (جو رکساسی تانگاڈی کہلاتی اور تلی کوٹہ کے

درمیان واقع ہے جنگ کی جو تاریخ میں ، جنگ تالی کوٹ " (۱۵) کے نام سے مشہور ہے ۔

۲۳ جنوری ۱۵۶۵ ء م ۹۷۲ ھ میدانِ کارزار گرم ہوا اور رام راج تمیہ کیا گیا اور متحدہ افواج کی جیت ہوئی ۔

ابراہیم کو کل تیس اولادیں تھیں ، چھے لڑکے اور ۱۲ لڑکیاں تھیں جو سنِ بلوغ کو پہنچیں[۱۶]۔ بھاگ رتی کے بطن سے ۴ لڑکے محمد قلی ، محمد امین ، عبدالقادر اور ایک لڑکا تھا جس کا نام معلوم نہیں (۱۷) ۔ ابراہیم قلی قطب شاہ نے ۲۱ ربیع الثانی ۹۸۸ ھ م ۵ / جون ۱۵۸۰ ء کو انتقال کیا (۱۵) ۔ اس کی عمر ۵۰ برس کی تھی[۱۸]

محمد قلی قطب شاہ ۱۴ رمضان ۹۷۳ ھ م ۱۴ اپریل ۱۵۶۶ ء کو پیدا ہوا ۔ پیدائش کی تاریخ " باعثِ روزیِ اہلِ عالم " ہے کئی شاعروں نے اس خوشی کے موقع پر نظمیں کہیں نمونہ کے طور پر ذیل میں چند اشعار لکھے جاتے ہیں ۔

شاہ را داد خدا فرزندے کہ شد از دیدن او دل خرم
پئے شکرانہ شہِ دریا دل کرد باخلق بہ صد لطف و کرم
سال مولودش را یافت فلک " باعث روزیِ اہلِ عالم " (۱۹)

محمد قلی ۲۱ ربیع الثانی ۹۸۸ ھ م ۵ جون ۱۵۸۰ کو تخت نشین ہوا جب کہ اس کی عمر ۱۵ سال تھی ۔ محمد قلی فرزندِ اکبر نہیں تھا ۔ قطب شاہیہ ص ؛ ۲۲۹ پر درج ہے کہ محمد قلی تیسرا لڑکا تھا (۲۰) ۔ بڑا لڑکا عبدالقادر المخاطب شاہ صاحب ، ابراہیم کی زندگی میں مرچکا تھا ۔ دوسرا لڑکا حسین قلی اور پھر محمد قلی ۔ لیکن تاریخِ قطب شاہی ص ۱۲۰ پر لکھا ہے کہ محمد قلی فرزندِ اکبر تھا (۲۱) ۔ عبدالفتح ، خدابندہ اور محمد امین چھوٹے تھے ۔ محمد قلی اپنی ایک غزل میں اپنے آپ کو " ای " کہتا ہے (۲۲) ۔

میں ای کر گنتے ہیں سب امیاں تو علم میں   موز بانی کا قلم تج وصف لکو ناسک بھاگیا
مجھے   قرار دیتے ہیں   تیرے   میرے   بھاگ گیا

محمد قلی کے تخت نشین ہونے میں درباری سازش تھی جو رائے راؤ اور دکنی حلقے نے کی تھی ۔ اس خیال سے کہ محمد قلی رحم دل شخص تھا وہ ایک اچھا بادشاہ ثابت ہوگا تمام امرا اور عہدہ داروں نے مشورہ کر کے محمد قلی کو تخت نشین کیا قبل اس کے کہ میر شاہ میر جو تسخیر قلعہ نلدرگ میں تھا آجائے اور اپنے ہونے والے داماد حسین قلی کی تائید کرے (۲۳) ۔

محمد قلی نے میر شاہ میر کو نلدرگ سے طلب کیا اور جب وہ آیا تو اس کو میر جملہ بنایا (۲۴) ۔ سلطنت بیجاپور سے نلدرگ کے قلعہ پر کافی عرصے سے جنگ ہورہی تھی ۔ میر شاہ میر نے محمد قلی کو یہ رائے دی کہ اگر محمد قلی خود جنگ میں چلے تو افواج کی ہمت افزائی ہوگی ۔ چناں چہ محمد قلی جنگ کے لیے رمضان ۹۸۹ ھ م ستمبر ۱۵۸۱ ء کو روانہ ہوا (بہ حوالہ قطب شاہی ۲۲۳ ۔ ۲۲۴ ، برہان مآثر ص ص ؛ ۵۴۰ ۔ ۵۲۰) (۲۵) ۔ لیکن اس قلعہ کا محاصرہ کیے ہوئے قریب ایک سال ہو رہا تھا ۔ احمد نگر کی افواج نے یہ طے کیا کہ اپنے وطن چلے جائیں ادھر محمد قلی نے اس طول عرصے کی جنگ سے تنگ آکر میر زین الاستر آبادی کو مصطفیٰ خاں کا خطاب عطا کر کے مع ۔۔۔۔ فوج اور کئی ہاتھی دیئے چند بیجاپوری مقامات فتح کرنے کے لیے چھوڑا اور خود گول کنڈہ کی راہ لی ۔ گول کنڈہ واپس ہونے کے بعد محمد قلی قطب شاہ نے میر شاہ میر کی لڑکی سے جو اس کے بڑے بھائی حسین قلی سے منسوب تھی ۹۹۱ ھ میں بڑی دھوم دھام سے شادی رچائی ۔ ایک ماہ تک جشن منائے گئے اور اعیان و ارکان اور چند خدم و حشم کو انعام و اکرام سے سرفراز کیا گیا اور خلعتیں اور مناصب دیے گئے ۔ لیکن SHA ROCCO اپنی کتاب GOLCONDA AND THE QUTUB SHAHS PAGE : 13 میں لکھتا ہے (بہ حوالہ فرشتہ) کہ محمد قلی قطب شاہ نے شاہ نظام اصفہانی کو جو ابراہیم قلی کے زمانے سے میر جملہ تھا ای

ذمت پر بحال رکھا اور اس کی دختر سے شادی کی اور اس کی رائے سے نلدرگ کی جنگ میں بہ ذاتِ خود حصہ لینے پر آمادہ ہوا ۔

محمد قلی قطب شاہ ایک دور اندیش اور اچھے اطوار کا شخص تھا ۔ اس کے دورِ حکومت میں سلطنت گول کنڈہ کا ستارہ بلند تھا اور یہ دور تاریخ میں سنہرے الفاظ میں لکھا جاتا ہے ۔ محمد قلی نے اپنی سلطنت کو مستحکم بنایا ۔ اس کا عظیم کارنامہ شہر حیدرآباد کی بنیاد ہے جو ۹۹۹ ھ م ۱۵۹۱ء رکھی گئی ۔ اس شہر کا خاکہ ایک تکون کی شکل میں ڈالا گیا جس کے تینوں حصے تقریباً مساوی تھے ۔ شہر کی تعمیر کے لیے جو حصہ پسند کیا گیا وہ موسیٰ ندی کے کنارے ایک زرخیز علاقہ تھا ۔ اس کی وجہ سے شہر کی خوب صورتی میں چار چاند لگ گئے ۔ پیشوائے سلطنت میر محمد مومن کو اس شہر کی نقشہ سازی ، آرائش و زیبائش میں بہت بڑا دخل تھا اور محمد قلی قطب شاہ نے بھی خاص دل چسپی لی ۔ یہ شہر محمد قلی کی شادی کے پانچ سات سال بعد بسایا گیا ۔

اس شہر کے عمارتوں میں چار مینار ۱۵۹۱ء م ۱۰۰۰ ھ میں تکمیل پایا ۔ بادشاہی عاشور خانے کا سنگ بنیاد ۱۵۹۴ء میں اور جامع مسجد کا سنگ بنیاد ۱۵۹۸ میں رکھا گیا اور اس مسجد کے قریب ترکی حمام خانہ بھی بنایا گیا ۔

سب سے پہلے چار مینار کے جانب شمال مغرب دولت خانہ عالی بنایا گیا جس کے جلو خانے کے وسط میں " چارسو کا حوض " کی تعمیر عمل میں آئی ۔ جلو خانہ کے چار کمانیں تھیں ۔ کمان جو شاہی محلات کا باب الداخلہ تھی کمان شیر علی کہلاتی اور جب میر محمد مومن نے ایک طلسمی پتھر اس میں نصب کیا تاکہ بادشاہ کی حفاظت ہو اور بری نظر سے بچے تو لوگ اس کو کمان سحرِ باطل کہنے لگے اور آج کل اس کا نام بگاڑ کر مٹی کے شیر کی کمان کہتے ہیں ۔ دورِ قطب شاہی میں باقی کے تین کمانیں " ترپولیا " کہلاتی تھیں " محلات شاہی کے نام خدا داد محل ، سجن محل اور اعلیٰ محل تھے ۔ خدا داد محل سات منزلہ عمارت تھی اور ہر منزل کے محل کا ایک نام تھا ۔ موسیٰ محل ، جعفری محل ، حسینی محل ، حسنی محل ، حیدری محل ، محمدی محل اور الٰہی محل وغیرہ ان کے علاوہ ایک اور محل جس کا نام داد محل تھا ، موجودہ چوک کی طرف واقع تھا ۔ ان کے علاوہ کوہ طور تعمیر ہوا جہاں اب فلک نما واقع ہے ۔ رفاہِ عام اور بیماروں کے علاج کے لیے ایک ہسپتال بنایا گیا جو دارالشفا کہلاتا ہے میں نے شہر حیدرآباد کے متعلق ایک تفصیلی مضمون سالارجنگ میوزیم جرنل شمارہ ۳۳ ۔ ۳۴ ، ۱۹۹۶ ، ۱۹۹۷ء میں بہ عنوان HYDERABAD OLD ARCHITECTURAL GLORY لکھا یہاں مزید اس کا دوبارہ ذکر کرنا ضروری نہیں ۔

کہاجاتا ہے کہ محمد قلی کی ایک محبوبہ تھی جس کا نام بھاگ متی تھا جو چھوٹے سے گاؤں چچلم میں قیام پذیر تھی اس کا ذکر زبانی روایتوں اور بعض تاریخوں میں ملتا ہے مگر قطب شاہی تاریخیں اس بارے میں خاموش ہیں ۔

محمد قلی کے کوئی اولا نرینہ نہ ہوئی سوائے ایک دختر حیات بخش بیگم کے جو ۱۰۰۱ ھ میں پیدا ہوئی ۔ حیات بخش بیگم شہزادہ مرزا سلطان کے ساتھ ۱۰۱۶ ھ میں بیاہ دی گئی ۔ محبوب الزمن جلد دوم صفحہ ۱۰۴۸ اور تاریخ قطب شاہی ورق ۲۱۴ ب میں لکھا ہے کہ نظام شاہ ، عادل شاہ اور عماد شاہ اس تقریب میں شریک تھے (۲۶) ۔

یہ عظیم الشان فرماں روا اپنی صحت کی طرف سے ہمیشہ لاپروا رہا اور بہت کمزور ہوگیا تھا جس کا ذکر اس نے اپنے کلام میں بھی کیا ہے اور اپنی صحتِ کامل کی دعا مانگی ہے ۔ وہ ماہِ رمضان ۱۰۲۰ ھ میں سخت بیمار پڑا اور ڈھائی مہینے بخار کا سلسلہ جاری رہا چنانچہ کی صبح بہ تاریخ ۱۷ ذیقعدہ ۱۰۲۰ ھ م ۱۶۱۱ء محمد قلی قطب شاہ نے وفات پائی ۔ انتقال کے وقت اس کی عمر ۴۷ برس کی تھی ۔

محمد قلی نے اپنے لیے ایک گنبد تیار کروایا تھا ۔ جو مقابرِ قطب شاہیہ میں سب سے زیادہ عظیم الشان ہے ۔

محمد قلی قطب شاہ کے کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے ۔ اس کے دور میں تجارت کو فروغ ہوا اور رعایا عام طور پر خوش

جال تھی ۔ اس کے عہد میں سکہ جو پہلی بار ڈھالا گیا اس پر صرف تاریخ " ۸۹ " کندہ ہے اور دوسرے سکے کی تاریخ ۹۹۱ ھ م ۱۵۸۳ ہے جس پر دارالسلطنت گل کندہ لکھا ہے تیسرے سکے پر بہ تاریخ ۱۰۱۲ ھ دارالسلطنت حیدرآباد کندہ ہے ۔ ان دو مقامات کے عا کہیں اور بھی سکے ڈھالے جاتے تھے اس کا پتہ نہیں چلتا ۔ آدھا فلس " ۸۹ " بہ تاریخ ۹۸۹ ھ م ۱۵۸۱ ، جو تخت نشینی کے ایک سال ڈھالا گیا تھا اس پر علم کندہ ہے جو امام حسین علیہ السلام سے منسوب ہے ۔ اس امر سے پتہ چلتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کا مسلک جعفریہ تھا (۲۷) ۔

دکن کی ریاستوں میں صرف بیجاپور اور گول کنڈہ ایسی ریاستیں تھیں جہاں مرقعے ایک خاص انداز میں کھینچے جاتے تھے ؛ دکنی قلم کہا جاتا ہے ۔ جب مغل واردِ دکن ہوے تو یورپین انداز کا اثر پڑا ۔ دکنی قلم میں چیزیں چھوٹی اتاری جاتی تھیں اور سنہرا رنگ زیادہ تر استعمال کیا جاتا تھا جو دلی قلم سے زیادہ خوب صورت تھا ۔

محمد قلی کے جو تصویر (داہنی جانب دیکھتے ہوئے) اور دو مرقعے (بائیں جانب دیکھتے ہوئے ہیں) جو " رجکس میوز؛ امسٹرڈم میں ہیں روایتی دکنی قلم میں اتری ہوئی ہیں (۲۸) ۔ مچھلی بندر کے قلم کاری کے کپڑے بیرونی ممالک مشہور تھے یہ کام پالک اور پٹا پولی میں ہوتا تھا (۲۹) ۔

محمد قلی قطب شاہ نے دکنی (قدیم اردو) کی سرپرستی کی ۔ وہ خود بھی اس زبان کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر تھا ۔ محمد قلی دیوان غزل ، قصیدہ ، رباعی ، مرثیہ اور مثنوی وغیرہ پر مشتمل ہے ۔ اس نے اپنے کلام میں عیدین ، رواج و رسومات ، تہوار ، بسنت موسم سردی ، بارش ، حسینوں اور مذہب و ملت کا تفصیلی ذکر کیا ہے ۔ محمد قلی نے حافظ کے کلام کو بھی دکنی میں نظم کا جامہ پہنا؛ محمد قلی کی نظم " فتنہ ، دکن " (۳۰) میں اعلیٰ درجے کی تصویر کشی ملتی ہے ۔ محمد قلی کہتا ہے ؛

پھاندے ... بل جائے جیواں کوں سکی اپ چوٹی کیرے تاب میں ... بل
پتلی سن لرکاتے ہے دل اپ نین محراب میں
کیا چلبلی سو دھن ہے توں ، ہرفن منے پر فن ہے توں
ہور فتنہ ، دکھن ہے توں سرزور ہر یک باب میں

اس دور میں ملا وجہی نے مثنوی " قطب مشتری " ۱۰۱۸ ھ م ۱۶۰۹ ، لکھی ۔ وجہی کا دوسرا کارنامہ " سب رس " ہے جو ادبی نثر کا ا نمونہ ہے ۔ غواصی بھی محمد قلی قطب شاہ کا ہم عصر تھا وہ عبداللہ قطب شاہ کے دربار کا ملک الشعرا تھا ۔ اس کی مثنوی " سیـ الملوک و بدیع الجمال " ، " طوطی نامہ " محتاجِ تعارف نہیں ۔ اس کی غزلیں ، مثنوی اور قصیدے دبستانِ گول کنڈہ کی شاعری کے بہـ نمونے ہیں ۔ مرزا محمد مقیم مقیمی کی " چندر بدن مہیار " بھی بے مثال مثنوی ہے مقیمی ایرانی ہونے کے باوجود دکنی پر کامل عبور ا تھا ۔ ایک اور شاعر امین " چندر بدن مہیار کے جواب میں " بہرام و حسن بانو " لکھ رہا تھا کہ اس کا انتقال ہوگیا ۔ اس مثنوی مرزا دولت شاہ نے ۱۶۳۸ ، میں مکمل کیا ۔

حسن شوقی عادل شاہی درباری شاعر تھا ۔ ابنِ نشاطی نے " پھول بن " میں حسن شوقی کی مدح کی جو ۱۰۶۶ ھ م ۱۶۵۵ ، لکھی گئی (۳۱) ۔

محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں کئی فارسی شاعر اور علما تھے ۔ مرزا محمد امین شہرستانی ، میر مومن ، رکنئے مسیح ، سراج الد عارف ، غیاث الدین اصفہانی ، میر حسن عسکری ، میر مجدالدین ، محسن ہمدانی ، وحشی کاشانی ، شریف کاشی ، وجہی اور اشرف وغیرہ ۔

اس عہد کی تاریخ نظم میں " نسب نامہ ، قطب شاہی " حسین بن علی الفری نے لکھی جو اٹھارہ ہزار چھے سو اشعار پر مشتمل ہے (۳۲) ۔

" تاریخ قطب شاہی " کہا جاتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کی لکھی ہوئی ہے جو دس سال میں لکھی گئی ۔ گو اس پر مصنف کا نام لکھا نہیں ہے ۔ ۱۳۰ صفحات پر مشتمل ہے اور خط نستعلیق ہے ۔ اس میں محمد قلی کے تخت نشین ہونے تک کے حالات درج ہیں ۔ " مآثر قطب شاہی " کے مصنف محمد بن عبداللہ نیشاپوری نے محمد قلی قطب شاہ کے انتقال تک کے حالات قلم بند کیے ہیں (۳۳) ۔

محمد قلی قطب شاہ کے دور میں تلگو شاعروں کی ہمت افزائی ہوتی تھی ۔ سارنگو تمیا بادشاہ سے بہت قریب تھا اور محمد قلی اس پر اعتماد کرتا تھا ۔ اس شاعر نے " وجینتی ولاسو " لکھی جو وشنوی بزرگ وپرا نارائنا کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے (۳۴) ۔

محمد قلی نے پلمٹا سوما یاجو کوی کو درباری شاعر کا درجہ عطا کیا تھا ۔ دوسرا شاعر گنٹیا پنڈت تھا جو قطب شاہی سلطنت کے پنڈتوں کا سردار تھا ۔ کالی ریڈی کو جواہر ، پالکی ، مورچھل و چھتر عطا ہوا تھا ۔ یہ شخص ملا ریڈی کا رشتہ دار تھا ۔ اس کی یادگار " سوادھرمو تارمو " اور " پدما پورا نامو " ہیں ۔ سنگارو تمیا متنڈو نے " وبجایانتی ولاسو " لکھی (۳۵) ۔

محمد قلی قطب شاہ کے دورِ حکومت میں شاہ عباس صفوری بادشاہ ایران نے ۱۶۰۳ء میں اغزلو سلطان کو اپنا سفیر بنا کر گول کنڈہ بھیجا ۔ اس کے ساتھ کئی تحفے محمد قلی قطب شاہ کے لیے روانہ کیے تھے ۔ یہ سفیر چھے سال حیدرآباد میں مقیم رہا ۔ اس سفارتی مہم کا مقصد یہ تھا کہ حیات بخش بیگم کی شادی شاہِ ایران کے کسی بھی فرزند سے ہو لیکن وہ ناکام ایران لوٹا ۔

۱۶۱۱ء میں محمد قلی قطب شاہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بہ مقام مچھلی بندر فیکٹری کھولنے کی اجازت دی (۳۶) ۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کا دورِ حکومت اس کے گوناگوں علمی ، تہذیبی اور ادبی کارناموں کی وجہ سے تاریخ میں سنہری الفاظ میں لکھا جاتا ہے ۔

○●○

حوالے :

(۱) مقدمہ تاریخ دکن از عبدالمجید صدیقی ص : ۵۰

History of Medieval Deccan, Vol : I , P : 413 , History of Golgonda, P : 3 , Golconda and qutb Shahs, Sha Rocco , P 4 .

(۲) تاریخ دکن ، سلسلہ ، یوسفیہ ص : ۲۳۹ ۔

History of Golconda, P - 10 . History of Golconda, P - 19 .

(۴) Land Marks of the Deccan By S. Ali Asgar Bilgrami

(۵) History of Medeival Deccan Vol . II . Page : 230 .

(۶) History of Medeival Deccan Vol . I . Page : 417 - 422 .

History of Golconda . Page 27 .

. Qutb Shah and Golconda. Page : 6

History of medeival Deccan Vol - II. Page : 10 (۷)
Land Marks of the Deccan - Page 115, History of Golconda - Page : 27. (۸)
Land Marks of the Deccan - Page : 115.. (۹)
(۱۰) سب رس یوم محمد قلی قطب شاہ، خصوصی اشاعت مئی جون ۱۹۹۶ء

The Mughal Empire, Muslim insistance to Mughal Imperialism - Page : 471 (۱۱)
R.C. Majumdar, J.N. Chaudhri & S. Choudhri.
History of Golconda, "The new era". Page-50. Abdul Majid Siddiqui (۱۲)
History of the Qutb Shahi Dynasty, H.K. Sherwani, Page : 244. Note : 130. (۱۳)
History of Golconda, Page : 77 (Cross Ref : Abu Turab Page : 126, (۱۴)
Basatin us Salatin : Page : 86)
History of Golconda Page : 83. (۱۵)
Golconda and the Qutb Shah, Page : 13. (۱۶)
History of Qutb Shahi Dynasty, Page : 144 Note : 130. (۱۷)
Mohammed Quli Qutb Shah, Page : 11, The Mughal Empire, Page : 472. (۱۸)
History of Golconda, Page : 88. Mohammed Quli Qutb Shah, Page : 12. (۱۹)
History of Golconda, Page : 87. (۲۰)
Mohammed Quli Qutb Shah, Sherwani - Page : 12. (۲۱)
History of the Qutb Shahi dynasty, Page : 349. Note No.3. (۲۲)
History of the Qutb Shahi Dynasty Page : 257. (۲۳)
(۲۴) کلیات محمد قلی قطب شاہ - ڈاکٹر زور - ص ۳۰۲

History of Medieval Deccan Vol - I, Page : 447. (۲۵)
(۲۶) کلیات محمد قلی قطب شاہ - ص - ۳۱۳

History of the Qutb Shahi Dynasty, Page : 258. (۲۷)
Mohammed Quli Qutb Shah, Page : 40. (۲۸)
History of Medieval Deccan, Page : 218. (۲۹)
History of Medieval Deccan Vol - II, Page : 22, 23. (۳۰)
History of Medieval Deccan Vol - II, Page : 26. (۳۱)
History of Medieval Deccan Vol - II, Page 106. (۳۲)
History of Medieval Deccan Vol - II, Page : 163. (۳۴)
Mohammed Quli Qutb Shah, H.K. Sherwani Page : 44, 45. (۳۵)
The Mughal Empire, R.C. Majumdar, J.N. Chaudhri & S. Chaudhri Page : 473., (۳۶)
olconda and Qutb Shahs, Sha Rocco, Page : 15.

ooo

پروفیسر دھریندر پرشاد

قطب شاہی دور کی تقاریب اور میلے

محمد قلی قطب شاہ ، قطب شاہی سلطنت کا پانچواں فرماں روا تھا ۔ اس کا عہدِ حکومت قطب شاہی سلطنت کا زریں دور تھا ۔ ں کے زمانے میں سلطنتِ گول کنڈہ کو زبردست تاریخی اور سیاسی اہمیت حاصل ہوگئی تھی اور شہر حیدرآباد ، قطب شاہی مملکت کا نیا لسلطنت ہوگیا تھا ۔ اس بادشاہ کی سب سے اچھی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے دکن کی مقامی روایات اور ایک ملی جلی تہذیب کو غ دینے میں بڑی دل چسپی لی تھی ۔ وہ مقامی اور موسمی تہواروں کو بڑی دھوم دھام سے مناتا تھا اور اپنے آپ کو اس مشترکہ کلچر عملی نمونہ بنا کر اپنی رعایا کے سامنے پیش کرتا تھا ۔ اس میں شک نہیں کہ وہ نسلی طور پر ایرانی تھا لیکن اس نے ایرانی لباس اور طریقوں کو ترک کر کے دکن کا مقامی لباس اختیار کیا تھا اور مقامی روایتوں کو اپنا لیا تھا ۔ اپنے والد ابراہیم قطب شاہ کی طرح ، جو و رعایا میں ملکِ ابھارام اور دوبگھورام کے لقب سے مشہور تھا اور جس نے تلگو شعرا کو ہر طرح سے نوازا تھا ، محمد قلی نے بھی ، ممتاز تلگو شاعر پٹا پٹا کوی کو اپنی سلطنت کا ملک الشعرا بنایا تھا ۔

اس طرح محمد قلی کے نواسے عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ، ہندو اور مسلمان رعایا میں پہلے سے بھی زیادہ میل جول بڑھ گیا ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندو رسوم و رواج مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں داخل ہوگئے تھے ، تو ہندوؤں نے مسلمانوں کے بات کو اپنی زندگی میں داخل کرلیا تھا ۔

میرے محترم استاد پروفیسر ہارون خاں شیروانی کے مطابق ،

" امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی شہادت ، کربلا کے واقعات ، خدا کے حضور میں ان دونوں کے رتبے ، جنت کے مناظر ، یہ سب اور ایسے ہی دوسرے قصے ، مقامی اثرات اور مقامی جذبات کے تحت اضافے اور ترمیمات کے ساتھ تلگو گیتوں میں پرو دیے گئے اور انھیں آج بھی رائل سیما اور آندھرا پردیش کے دوسرے علاقوں میں کسان اپنا ہل چلاتے ہوے ، کمہار اپنا چاک پھراتے ہوتے ، جولاہے اپنا کپڑا بنتے ہوتے گاتے ہیں ۔ یہ گیت چوں کہ سانچوں میں ڈھالے گئے ہیں ۔ اس لیے واقعات کی اجنبیت ختم ہوجاتی ہے اور کسان ہو یا جولاہا یا کمہار ، اسے یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ ان گیتوں کے ہیرو باہر کے کسی دیس کے رہنے والے تھے ۔"

زمانے کا ایک مشہور تلگو شاعر رمنا ، جو تعلقہ رائے درگ کے فولاپور گاؤں کا رہنے والا تھا ۔ محرم کے آغاز پر لکھتا ہے ،

" پیرالا پنڈوگا رادے
پیرالا پنڈوگا رادے "

(آؤ ! عظیم شخصیتوں کی تعریف آگئی ہے !
آؤ ! پیروں کی تقریب آگئی ہے ۔)

اس طرح تلگو زبان میں محرم ۔ کو پیرلا پنڈوگا ۔ کی تعریف سے موسوم کیا گیا تھا اور امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو " آشنا و اوشا " کے نام سے تعظیماً یاد کیا جاتا تھا اور محرم ایک بین قومی تہوار ہوگیا تھا ۔

ڈاکٹر زور اپنی تصنیف " سلطان محمد قلی قطب شاہ " میں یوں رقم طراز ہیں کہ محمد قلی قطب شاہ ۔ سال میں چودہ (۱۴) تقاریب بڑی شان و شوکت سے مناتا تھا ۔ تاکہ اس کی سلطنت کے لوگ دل کھول کر ان میں اپنے جذبات کا اظہار کرسکیں ۔

ان تقریبوں کو کس طرح منایا جاتا تھا ان کی ایک بڑی اچھی تصویر محمد قلی نے اپنی شاعری میں کھینچی ہے ۔ یہ تقاریب حسب ذیل ہے :

(۱) محرم (۲) عید میلادالنبیؐ (۳) عید بعثتِ نبیؐ (۴) عید سوری (۵) عیدِ مولودِ نبیؐ
(۶) عیدِ غدیر (۷) شبِ برات (۸) عیدِ رمضان (۹) بقر عید (۱۰) نوروز
(۱۱) بسنت (۱۲) سال گرہ ۔ بادشاہ (۱۳) مرگ سال (۱۴) شبِ معراج ۔

ان میں سے چار سرکاری تقریبوں کے طور پر منائی جاتی تھیں جو حسبِ ذیل تھیں :

(۱) محرم (۲) نوروز (۳) آغازِ برسات (۴) سال گرہ ۔ بادشاہ ۔

ان تقریبوں کے علاوہ ۔ بعض دوسری تقریبوں کو یہاں مختصر طور پر بیان کرنا خالی از دل چسپی نہ ہوگا کیوں کہ ان کو لوگ بڑے جوش و خروش کے ساتھ مناتے تھے ۔

۱ ۔ محرم : حیدرآباد میں محرم کی تقریب کا آغاز خود سلطان محمد قلی نے کیا تھا ۔ تعزیہ داری اور مجلسیں اسی کی ابتدا کی ہیں ۔ جو آج تک جاری ہیں ۔ حیدرآباد میں سب سے پہلا علم جو ہر سال گول کنڈے کے قدیم عاشور خانے میں ایستاد کیا جاتا ہے حسینی علمؑ کے نام سے مشہور ہے اسی کا بٹھایا ہوا ہے ۔

محرم کی تقریب کو سلطان نے اس خوبی سے رائج کیا تھا کہ شیعہ قوم کے علاوہ سنی اور ہندو ۔ دونوں بھی قومیں ۔ ان مراسم خاص اہتمام سے مناتی تھیں ۔ خاص کر محرم کے ابتدائی دس بارہ روز تک ایسی مصروفیتیں رہتی تھیں کہ ہر فرد اس میں حصہ لیتا تھا ۔

محرم کے زمانے میں بادشاہ کی دریا دلی بڑھ جاتی تھی ۔ وہ بارہ اماموں کے لنگر میں ساٹھ ہزار ہون اور مجاوروں ۔ خادم کے وظیفوں اور دیگر امور میں بے دریغ خرچ کرتا ۔ اس کے علاوہ مقدس مقامات جیسے نجفِ اشرف ۔ کربلائے معلیٰ وغیرہ کو ایک ہون تقسیم کے لیے روانہ کرتا ۔ عزاداری کو شایانِ شان طریقے پر منانے کے لیے محل کے عاشور خانے کے علاوہ بادشاہی عاشور خانہ میں ساٹھ ہزار ہون صرف کرتا اور اسی عاشور خانہ میں محرم کی نو تاریخ تک ہر روز ایک ایک ہزار اور دس تاریخ کو دس ہزار چراغ روشن کیے جاتے جس سے عاشور خانہ بقعہ ۔ نور بن جاتا ۔

عاشور خانہ میں سیاہ پوش عزاداروں کا صبح و شام اژدہام رہتا اور خوش آواز ذاکر ۔ دل سوز مرثیے اور غم اندوز اشعار ایسے درد بھرے لہجے میں پڑھتے کہ سننے والوں پر بے اختیار رقت طاری ہوجاتی ۔ جب بادشاہ عاشور خانے کے دروازے میں داخل ہوتا تو سواری سے اتر کر برہنہ پا آتا اور اپنے ہاتھ سے علموں پر پھول چڑھاتا اور شام کے وقت تمام شمعوں اور چراغوں کو اپنے ہاتھ سے روشن کرتا اسی وقت مرثیہ خوانی ہوتی ۔ جس کے بعد بادشاہ دولت خانہ ۔ عالی کی جانب روانہ ہوتا ۔

یہ ساری تقریبیں چوں کہ اس کے نواسے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دور میں بھی رائج تھیں اس لیے مؤرخوں اور شاعروں نے اس کو " محمد قلی کا سچا جانشین " کہا ہے ۔

۲ ۔ **عید میلاد** : عید میلاد کی آمد سے بہت قبل داد محل اور اس کے جانب جنوب واقع وسیع میدان کو ہر طرح سے آراستہ و پیراستہ کیا جاتا اور جب ۱۱ ربیع الاول کی تاریخ آجاتی تو کوسوں ، دماموں ، قفاروں ، فقیروں اور قوالوں کی آوازوں سے میدان داد محل گونج اٹھتا ۔ تمام شہر اور اطراف و اکناف کے رہنے والے یہاں جمع ہوجاتے اور صنعت و حرفت کا تماشا دیکھتے ۔ اسی طرح ملک کے مسخرے ، بھانڈ ، شعبدہ باز وغیرہ بھی جمع ہوتے اور داد محل اور اس کے ملحقہ میدان میں اپنا فن اور کرتب پیش کرتے ۔ جوں ہی لوگوں کی نظریں بادشاہ پر پڑتیں تو وہ بے اختیار اپنے مالک کو دعائیں دینے لگتے ۔

جشن میلاد کا پروگرام بارہ روز تک ، دن رات جاری رہتا ۔ اس موقع پر بازاروں ، دکانوں کی سجاوٹ قابل دید ہوتی اور مکانوں کی چھتوں اور ان کے نزدیک سوائے انسانی مخلوق کے کوئی اور چیز نظر نہیں آتی ۔ میدان داد محل میں گروہ در گروہ لوگ دسترخوانوں پر کھانے کھاتے اور دولت خانہ ، شاہی کے اندر اور باہر آتش بازی کا سلسلہ جاری رہتا اور صبح تک گانے بجانے اور تماش بینوں کا ایک جمگھٹا رہتا ۔

محمد قلی نے حیدرآباد میں ایک بین قومی فضا پیدا کرنے کے لیے اسلامی عیدوں کے علاوہ دوسری تقریبیں بھی رائج کی تھیں ۔ جیسے جشن نوروز ، بسنت ، دسہرہ ، دیوالی ، آمد برسات وغیرہ ۔

۳ ۔ **نوروز** : کہا جاتا ہے کہ جب آفتاب برجوں کی گردش کرتا ہوا خط استوا پر آجاتے تو ایک پورا سال ختم ہوجاتا ہے اور جب یہ دور ختم ہوکر ایک نیا دور شروع ہوجاتا ہے تو اس کو " نوروز " کہتے ہیں ۔ نوروز کے ساتھ ہی دنیا کی ہر چیز ترو تازہ ہوجاتی ہے اور لوگوں کے دلوں میں ایک امنگ پیدا ہوجاتی ہے ۔ محمد قلی اس تقریب کو بڑے شان دار طریقے پر مناتا تھا ۔ نوروز کی تفصیلات اس نے اپنی نظموں میں بڑی خوبی سے بیان کی ہیں ۔

۴ ۔ **بسنت** : بسنت دراصل ہندوؤں کا تہوار ہے ۔ اس کی رعایا میں ہندوؤں کی کثرت تھی اور اس کے محل میں ہندو عورتوں اور ملازموں کی کمی نہ تھی ۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض ان کی خاطر بسنت نہیں مناتا تھا بلکہ خود بھی دل و جان سے اس تقریب کو پسند کرتا تھا ۔ بسنت کا تہوار موسم بہار کی آمد پر منایا جاتا ہے ۔ ہندستان میں بہار کا موسم وسط مارچ سے مئی تک سمجھا جاتا ہے ، جب کہ پھولوں کی کثرت رہتی ہے اور ہر طرف ان کی خوشبو سے دل و دماغ معطر ہوجاتے ہیں ۔ ہندو عورتیں پھول جمع کر کے ، مندروں اور تالابوں کو لے جاتی ہیں ، جہاں ایک میلہ سا لگ جاتا ہے ۔

محمد قلی نے گولکنڈے میں اس تقریب کو خاص اہتمام اور شان دار پیمانے پر جاری کیا تھا ، کیوں کہ اس نے ایک رنگین طبیعت پائی تھی ، جو عیش و عشرت کی طرف زیادہ مائل تھی ۔ اس لیے اس تہوار میں اس کے دل کی امنگیں جس خوبی سے ظاہر ہوئیں کسی اور تقریب میں نہیں ہوتی تھیں ۔ اس تہوار کے موقع پر اس نے اپنے جذبات کو اس طرح ظاہر کیا ہے :

بسنت کھیلیں عشق کی ، آپیارا   تمھیں ہیں چاند ، میں ہوں جوں ستارا
بسنت کھیلیں ہم ہور ساجناں یوں   کہ اسماں رنگ شفق پایا ہے سارا
نبی صدقے بسنت کھیلیا قطب شاہ   رنگیلا ہور ہوا ، تر لوک سارا

قلعہ گولکنڈہ سے متصل نئے قلعہ میں جو تالاب اور وسیع مرغ زار ہے اس میں آج بھی بسنت کے زمانے میں میلہ لگا رہتا

ہے اور ہندو عورتیں ، بناؤ سنگار کر کے اور پھولوں کی ٹوکریاں لیے ہوئے گاتی اور اٹھلاتی نکلتی ہیں ۔
وزیر حسن مصنف " چاند بی بی سلطان " دسہرے کے موقعے پر بتکما کی بڑی اچھی پیش کش کی ہے جناں چہ وہ لکھتے ہیں

" ایک دن بانو نے حصار گول کنڈہ کی ایک پوجا کو ایسا بیان کیا کہ نقشہ آنکھوں میں پھر گیا ۔ کہا کہ بالا حصار سے لنگر حوض تک عورتوں کا بس ایک سمندر تھا کہ ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیتا تھا ۔ بھلا اس سمندر میں تھا کون ! تلنگنیں ۔ ان کی دس دس ، بیس بیس ، کی ٹکڑیاں ہوتیں ۔ جوڑوں میں پھول ، پیروں میں ہلدی ، پتمبری ساڑیاں ، ہاتھوں میں تھالیاں ، جن میں پوجا کی گیندئی پھول اور گئی گئی دیے تھے ۔ انھیں لے لے کر کچھ تو لنگر حوض آرہی تھیں ، کچھ ان تھالیوں کو زمین پر رکھے بتکما منا رہی تھیں ۔ اس وقت دس پندرہ نے مل کر ایک ہالا بنایا تھا ۔ ان کے بیچوں بیچ دیے روشن تھے ، جیسے دل میں ارمان چراغاں ہوں ۔ ایسے میں بڑی ادا سے وہ سب جھونک لیتیں اور چکر میں سب ایک ساتھ بڑھتیں اور پھر ایک ہی ساتھ تالیاں بھی بجاتیں ، گویا ساری قطب شاہی آج خوشیوں کی ایک تالی بن گئی ہو اور کہتی بھی جاتیں :

بتکما ، بتکما ، اوتیا لو
بتکما ، بتکما ، اوتیا لو

مرگ سال یا آمدِ برسات : اپریل اور مئی (خورداد اور تیر) کی چلچلاتی دھوپ اور گرمیوں کے بعد جب باران ر کی شروعات ہوتی ہے تو زمین کے ذرے ذرے میں جان پڑ جاتی ہے ۔ دکن میں تو یہ موسم ، موسمِ بہار کی طرح ہے ۔ جس مرگ لگتا ہے اس روز محمد قلی قطب شاہ بہت خوشیاں مناتا اور شراب کے جام چلتے ، رقص و سرود کی محفلیں جمتیں ، باغوں جھولے ڈالے جاتے ۔ جوان لڑکیاں اپنے خوب صورت جسموں کو مشک وغیرہ سے معطر کرتیں اور بیر بہوٹی کے[1] سرخ رنگ کے سرخ کپڑے پہنتیں ۔ تمام محلاتِ شاہی میں زمردی رنگ کی مسندیں بچھائی جاتیں اور ہر طرف خوشی اور امنگ کی لہر دوڑ جاتی ۔

سال گرہ ، سلطان : محمد قلی اپنی سال گرہ کی تقریب بڑی دھوم دھام و تزک و احتشام سے مناتا تھا ۔ اگر چہ خانگی تقریب تھی لیکن ریاست کا ہر کس و ناکس اس تقریب کو بڑی مسرت کے ساتھ مناتا ۔ چناں چہ اس کے دور میں یہ ایک مشترکہ قومی تقریب بن گئی اور سرکاری تقریب کے طور پر جاری ہوگئی ۔ یوں تو محمد قلی قطب شاہ ۱۴ رمضان ۹۷۳ ھ م کو جمعہ کے دن پیدا ہوا تھا لیکن اس کی سال گرہ نجومیوں کے مشورہ کے مطابق کسی اور مبارک دن اور ساعت کو منائی جا اس خوشی کے موقعے پر ہر طرف شادمانی پھیل جاتی ، محلاتِ شاہی کو سجایا جاتا ، خوشی کے باجے بجنے لگتے تارا منڈل چھوٹتے ہر روشنی ہی روشنی رہتی اور خوشی کی مٹھائیاں بٹتیں ۔

ملا وجہی نے قطب مشتری کے نام سے ۹۷۳ ھ میں جو مثنوی لکھی تھی ، اس میں محمد قلی کی پیدائش کے بارے میں لکھتا ہے :

اجالا پڑا آج یوں نور کا | کہ حاجت نہیں چاند اور سور کا
دو جگ آج نورٌ علی نور ہے | زمیں چاند اور آسماں سور ہے
یوں نادان بالک تمنا لاڈ کا | نواں پھول ہے شاہ کے جھاڑ کا

مشہور حیدرآبادی شاعر سرور ڈنڈا نے قلی قطب شاہ کے درخشاں دور کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

امیداں کے دن تھے ، مراداں کے راتاں
ہندو مسلمن کے ہاتاں میں ہاتاں !
دن ان کے بیتے سنہرے روپیلے
قلی قطب پاشا تھے رنگ رنگیلے
رنگ رنگیلے بڑے چھیل چھبیلے

عیداں ، تیواراں و لنگر ، نیازاں
نوے نوے کاماں و رسماں رواجاں
گیتاں کے میلے اسگاں کے میلے
قلی قطب پاشا تھے رنگ رنگیلے
رنگ رنگیلے بڑے چھیل چھبیلے

ادارہ ادبیاتِ اردو کا رکن بن کر

دکنی ادب اور دکنی کلچر کے تحفظ اور اردو زبان و ادب کو فروغ دینے کے سلسلے میں ادارے کی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے میں تعاون کیجیے ۔

فیس رکنیتِ عام	فیس دوامی رکنیت
سالانہ : ایک سو پچاس روپے	اندرونِ ہند : دو ہزار روپے
	بیرونِ ہند : سو ڈالر

تمام اراکین کے نام ادارے کا ترجمان رسالہ " سب رس " جاری کیا جائے گا اور ادارے کی تمام مطبوعات چالیس فی صد کمی پر دی جائیں گی ۔

محمد عبدالقیوم

حیدرآباد کے قطب شاہی باغات

دکن کے تمام حکم رانوں میں قطب شاہی فرماں روا اپنی سخاوت، شرافتِ نفس اور علوِ خیال کے لیے ممتاز تھے۔ یہ بادشاہ جنھوں نے آندھرا پردیش پر سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی کے دوران حکم رانی کی، دکن کے باشندوں کے لیے ثقافت کا ایک بیش بہا ورثہ چھوڑ گئے ہیں۔

نفیس خاکے کے مطابق تعمیر کیے ہوئے شہر حیدرآباد اور اس کی آرائش و زیبائش کو بجا طور سے قطب شاہی بادشاہوں کی یادگار سمجھنا چاہیے۔

محرکات کچھ بھی رہے ہوں شہر حیدرآباد کی بنیاد ۱۵۹۱ء۔ ۱۵۹۲ء میں پڑی۔ یہاں نئی زندگی اور سماجی سرگرمیوں کو پروان چڑھنے میں کئی سال لگے۔ اس کا خاکہ اور اس کی آرائش و زیبائش اس کے بانی کے عمدہ ذوق اور ذہانت و بصیرت کی آئینہ دار ہیں۔ ولیم میتھولڈ کہتا ہے:

"اس کی صحت بخش آب و ہوا اور پانی کی افراط کو دیکھتے ہوئے شہر حیدرآباد سارے ہندستان کا بہترین شہر ہے۔"

حیدرآباد کوئی خود رو شہر نہیں بلکہ ایک منصوبہ بند شہر ہے جس کا خاکہ نہایت خوش اسلوبی اور ہندسی صحت و تناسب کے ساتھ بنایا گیا ہے۔ اس کا خاکہ عالمانہ انداز سے بنایا گیا تھا، جس میں سے سیدھی سڑکیں گزرتی تھیں اور جہاں ہر سمت میں جا بہ جا محلات، حویلیوں، کمانوں اور باغات کی گنجائش رکھی گئی تھی۔

قطب شاہی عہد کے پہلے باغ کا ذکر سلطان قلی اول کے ترتیب دیئے ہوئے باغِ فیض آثار (گول کنڈہ کے موجودہ قطب شاہی باغات) کے نام سے ملتا ہے۔

باوجود ے کہ شہر کی منصوبہ بند تعمیر اور فنِ عمارت کے شعبے میں ابراہیم قطب شاہ کے بیٹے محمد قلی قطب شاہ ہی نے اپنا نام آیندہ نسلوں کے لیے چھوڑا، درحقیقت اپنے بیٹے کی رہ نمائی ابراہیم قطب شاہ نے کی تھی۔

گول کنڈہ مختلف تہذیبوں کا، خاص طور پر جنوبی ہند کی اور ایرانی عربی تہذیبوں کا سنگم بن گیا اور ابراہیم ان سبھی لوگوں کا جو اس کی سلطنت کو اخلاقی یا مادی طور سے مالا مال کرنے کی غرض سے آتے تھے خوشی سے استقبال کرتا تھا۔ تحائف و وظائف کے علاوہ جو "طالب علموں، شاعروں اور دیگر مستحقین" کو اس کی طرف سے عطا کیے جاتے تھے اس کے مستقل احکام تھے کہ ان سبھی لوگوں کو جو اس کے بنا کیے ہوئے متعدد میوہ باغوں اور گلشنوں کی سیر کو آئیں "انار، سیب، انجیر، اور آم" موسم کے لحاظ سے تحفے میں دیے جائیں۔

لندن کے باشندے رالف فچ کو جس نے ۱۵۸۳ء سے لے کر ۱۵۹۱ء تک کی مدت ہندستان میں گزاری ابراہیم قطب شاہ کی

راج دھانی کی خوب صورتی اور وسعت نے بہت متاثر کیا، چناں چہ وہ کہتا ہے کہ گول کنڈہ "اینٹ اور لکڑی سے تعمیر شدہ خوش نما مکانات والا خوش نما شہر ہے جہاں میووں اور میٹھے پانی کی افراط ہے۔"

ابراہیم قطب شاہ نے متعدد میوہ باغ لگائے، جن میں سے بعض قلعہ گول کنڈہ کے جنوب مغرب میں وسیع و عریض باغ ابراہیم شاہی یا ابراہیم باغ کے چھوٹے سے حصے کے بہ شمول اب بھی موجود ہیں۔ اس نے انھیں عوام کے لیے کھول دیا تھا۔ اصل ابراہیم باغ ان جڑواں پہاڑوں سے لے کر جو موجودہ عثمان ساگر کو جانے والی سڑک کے کنارے واقع ہیں اور جن پر بارہ دری اور پیماتی سے منسوب مسجد واقع ہے، مسجد کے مغرب میں واقع محلات کے کھنڈروں تک پھیلا ہوا تھا۔

محمد قلی قطب شاہ نے نئے دارالسلطنت کو موسیٰ ندی کے جنوب کے میدان میں بڑے پیمانے پر آباد کرنے کا منصوبہ بنایا جس میں طرح طرح کی سہولتیں مہیا ہوں۔ چناں چہ "جب چاند برج اسد میں اور مشتری خود اپنے قصر میں تھا" سلطان نے فن عمارت کے ماہرین اور معماروں کو ایک ایسے شہر کا نقشہ تجویز کرنے کا حکم دیا جس کا ساری دنیا میں کوئی ثانی نہ ہو اور جو خود فردوسِ بریں کا نمونہ ہو۔"

اصل محلات کے علاوہ محمد قلی نے تین وسیع و عریض شہ نشین بنوائے دو پہاڑیوں کی چوٹیوں پر اور ایک نادی محل کے نام سے موسوم جہاں سے موسیٰ ندی کے جنوبی کنارے کا منظر سامنے پڑتا تھا اور جہاں وہ آرام کی غرض سے خانہ نشین ہوا کرتا تھا۔

سلطان نے پہاڑی کی چوٹی پر ایک وسیع و عریض شہ نشین بڑے حوضوں اور چہار سمت، شمال، جنوب، مشرق و مغرب، پھاٹکوں کی تعمیر کا حکم دیا۔ جب عمارتیں پایہ، تکمیل کو پہنچ گئیں تو اس نے ایک باغ لگوایا جس کا نام نبات گھاٹ یعنی دامنِ کوہ (گھاٹ) میں واقع باغِ نباتات، رکھا۔ یہ وہی پہاڑی تھی جسے بعد میں لوگ نوبت پہاڑ کے نام سے جانتے تھے۔ بعد میں نبات گھاٹ کو باغِ دل کش کے نام سے ندی تک توسیع دی گئی جو اس سارے نو مربع میل کے علاقے پر مشتمل تھا جہاں اب بشیر باغ، باغِ عام، فتح میدان اور ریزیڈنسی واقع ہیں۔ پانی حسین ساگر سے فراہم کیا جاتا تھا۔

چار مینار کے تقریباً دو میل جنوب میں ایک اور پہاڑی تھی جو چاروں طرف سے سبزہ پوش تھی اور جس کی آب و ہوا بے حد خوش گوار تھی۔ چناں چہ وہاں چار وسیع و عریض کمروں تیس گز طویل اور بیس گز عریض چبوترے اور عقب میں پینتالیس گز طویل اور تیس گز عریض حوض پر مشتمل ایک شہ نشین تعمیر کیا گیا۔ بادشاہ نے اس کا نام کوہِ طور رکھا۔ یہ شہر کے جنوبی حصے پر ٹھیک اسی طرح سے چھایا ہوا تھا جیسا کہ نبات گھاٹ شمالی حصوں پر۔ حیدرآباد کے نواح میں اس پہاڑی کو اب بھی امتیازی خصوصیت حاصل ہے کیوں کہ مشہورِ عالم فلک نما محل اسی پر تعمیر کیا گیا ہے۔ نبات گھاٹ سے لے کر کوہِ طور تک کا سارا علاقہ گلشنوں، میوہ باغوں اور سبزہ زاروں سے بھرا ہوا تھا اور اس میں شک نہیں ہر طرف لہلہاتے ہوئے سبزے کے درمیان محمد قلی قطب شاہ کے نئے دارالسلطنت کی عمارتیں جواہرات کی طرح جگمگاتی رہی ہوں گی۔ نہ صرف یہ کہ محلات گلشنوں کے درمیان تعمیر کیے گئے تھے، سبزہ زار دوسرے مقامات پر بھی لگائے گئے تھے۔ بعض گلشن محلات کی چھتوں پر بھی لگائے گئے تھے اور تھیوونیر انتہائی تعجب کا اظہار کرتا ہے کہ حنا محل کے سقفی باغات میں "اتنے اونچے درخت کیسے ٹک گئے، بڑا تعجب ہے کہ یہ چھتیں اتنے زیادہ وزن کو کیسے سہار لیتی ہیں۔"

ان باغات کے اندرونی نقشے کو سمجھنے کے لیے، ان میں سے ایک، غالباً باغ لنگم پلی کی اس توصیف کا مطالعہ ضروری ہے جو تھیونوٹ نے ہمارے لیے چھوڑی ہے:

"اس شہر میں متعدد خوش نما باغ ہیں۔ ان کی عجب صنعتی دل کشی میوہ دار درختوں اور ان طویل روشوں میں ہے جنھیں

... صاف ستھرا رکھا جاتا ہے ۔ شہر کے باہر کے باغات نہایت دل کش ہیں اور میں ان میں سے صرف ایک کا ذکر کروں گا ۔ پہلے ہم ایک وسیع علاقے میں داخل ہوتے ہیں ۔ اس میں کھجور کی قسم کے درخت ایک دوسرے سے اتنے قریب لگائے گئے ہیں کہ سورج کی روشنی ان میں سے بہ مشکل گزر پاتی ہے ۔ اس کی روشیں سیدھی اور صاف ستھری ہیں جن کے دونوں طرف جنگلی پھولوں کی گوٹ ہے جسے یہاں گل ڈنڈی کہتے ہیں ۔ اس باغ کے سرے پر مکان کی اصل عمارت سے متصل دو طویل و عریض پہلو ہیں ۔"

• باغ میں پھول اور میوہ دار درخت لگائے گئے ہیں سبھی بہت خوب صورتی سے ترتیب دیے گئے ہیں اور پہلے باغ کی طرح اس میں بھی دل کش روشیں ہیں جن پر عمدگی سے بجری بچھائی گئی ہے اور روشوں کے دونوں طرف مختلف پھولوں کی گوٹ ہے۔ بڑی روش کے درمیان میں چار فیٹ چوڑی ایک نہر ہے جو ان چھوٹے چھوٹے فواروں کا پانی بھی بہا کر لے جاتی ہے جو جا بہ جا روش کے درمیان بنائے گئے ہیں ۔ باغ بہت وسیع و عریض ہے جس کی حد بندی ایک دیوار سے کی گئی ہے جس کے بیچ میں ایک بڑا پھاٹک ہے جو ایک وسیع و عریض احاطے میں کھلتا ہے ، جہاں میوہ دار درخت لگائے گئے ہیں اور جسے باغ ہی کی طرح صاف ستھرا رکھا گیا ہے ۔"

ولیم میتھولڈ جو برٹش کمپنی کا ملازم تھا کہتا ہے کہ قطب شاہی عمارتوں (بہ شمول باغات) کی شان و شوکت اور خوب صورتی کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں ۔

• محلات میں نہایت عمدگی سے سنہرا رنگ کیا گیا تھا اور ان کو خوب صورت مشجر اور زربفت و ریشم کے دیواری پردوں سے سجایا گیا تھا ۔ کمروں اور ڈیوڑھیوں کو پر تکلف فرنیچر چینی کے برتنوں ، سونے چاندی کے اسباب آرائش سے آراستہ کیا گیا تھا ۔"

ان عمارتوں کے تعلق سے ایک عجیب و غریب امر واقعہ یہ تھا کہ ان سب میں پانی کی فراہمی کا پُر اسرار طریقے پر انتظام کیا گیا تھا ۔ تقریباً سبھی محلات میں پانی کے نلوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا اور دیواروں اور چھت گیریوں تک پر پانی رواں رہتا تھا ۔ اس کے علاوہ سدا بہار باغوں کا سبزہ اور ان کی شان و شوکت آنکھوں کو تراوٹ پہنچاتی تھی ۔ نہریں جا بہ جا بل کھاتی ہوئی بہتی تھیں اور گرد و پیش میں فواروں اور حوضوں کی افراط تھی ۔ محلات بلند ہموار زمین پر تعمیر کیے جاتے تھے اور ان کے نقشے میں تناسب کا خاص خیال رکھا جاتا تھا اور چشمے اور آبشار اصل عمارت کے متوازی بہتے تھے ۔ فوارے ہر طرف دل کش مقامات پر بنائے جاتے تھے ۔

موسیٰ ندی کے کنارے امین باغ میں واقع حنا محل کسی زمانے میں ابراہیم قطب شاہ کے عہد کے امیر امین خاں کا باغ تھا ۔ یہ مقام اب بھی امین باغ کہلاتا ہے اور موجودہ وکٹوریہ زنانہ دواخانہ یہیں واقع ہے ۔

حال حال تک باغ لنگم پلی کا محض قالب موجود تھا لیکن قطب شاہی شہ نشین اب باقی نہیں ہے ۔

• عالی شان محلات والے ایک بڑے شہر کی تعمیر شروع کی گئی ، جس کے ہر محل سے متصل ایک باغ تھا ۔ بازار اور مکانات دونوں درختوں سے اس قدر بھرے ہوئے ہیں کہ سارا شہر ایک باغ کی مانند دکھائی دیتا ہے اور خراسان و پرتگال سے لاکر لگائے ہوئے مختلف قسم کے میوہ دار درختوں کے پھلوں کی ایسی افراط ہے کہ ان کی کوئی قدر ہی نہیں رہ گئی ہے ۔"

اب بھی شہر کے متعدد حصے ہیں جن میں کسی زمانے میں سبزہ زار گرد و پیش کی اہم ترین خصوصیت کی حیثیت رکھتے تھے لیکن جہاں اب نہ ہی میوہ باغ پائے جاتے ہیں اور نہ ہی سبزہ زار ۔ مثال کے طور پر جام باغ ، مرلی دھر باغ ، بشیر باغ ، سیتارام باغ ، موسیٰ رام باغ ، باغ عنبر پیٹھ ، امین باغ اور متعدد دوسرے ۔ ان پر اب بستیاں بس گئی ہیں ۔

محمد قلی کے دل کی دنیا محض اس کے معشوقوں ہی سے آباد نہیں تھی ۔ وہ جب مظاہر قدرت کا بیان شروع کرتا ہے تو موسمات ، موسم سرما و گرما ، گلشنوں ، میوہ باغوں ، سبزہ زاروں ، پھلوں اور ترکاریوں پر بھی نظمیں لکھتا ہے ، ان خالص ہندستانی اشیا

سے متاثر ہوکر جو اس کے مشاہدے میں آتی تھیں ۔ وہ سال کی پہلی بارش کو خوش آمدید کہتا ہے جب کہ ہر شئے پھر سے جوان ہوجاتی ہے اور ہرے ہرے گھاس کے تختوں اور بھینی خوش بو والے میوے کے درختوں کے پہلے پھول کی امید بندھ جاتی ہے ۔ اپنی ایک نظم "برسات" میں وہ لکھتا ہے :

گرجا ہے میگھ سو تھے ، تازہ ہوا ہے بستاں (پھر سے)
پھولاں کی باس پایا بلبل ہزار دستاں
اے خوش خبر صبا توں لے جا جواں قداں کوں (سے)
چمناں کی آرزو میں بیٹھے ہیں سے پرستاں
وہ نونہال پھولاں ہے جام خوے سو بادہ (پسینہ)
نرگس اپس پلک سوں جھاڑو کرے شبستاں

اپنے لگائے ہوئے باغ ، موسوم بہ باغِ محمد شاہی ، کی تعریف میں محمد قلی کہتا ہے :

محمد ناؤں تھے بستا محمد کا اسے بن سارا   سو طوباں سوں سہانا ہے جنت نمنے چمن سارا
نام سے   مانند
سڑک تھے باغ کو دیکھت کھلے مج باغ کے منجے   سو اس منجے کے باساں تھے لگیا جگ مگمگن سارا
یہ

سو خوشے دلکھ لاکھاں کے ثریا سنبلا ہے جوں   ہے اس دلکھ منڈوا سو جیا انبر گگن سارا
انگور   آسماں
کھجوراں کے دسیں جھونکے کہ جوں مرجان کے بنجے   سپاریاں لعل خوشے جوں دسیں دن ہور رین سارا

دسیں جامون کے پھل بن میں نیلم کے نمن سالم   نظر لاگے نہ تیوں میویاں کوں راکھیا ہے جتن سارا

محمد قطب شاہ کے عہد میں مسجد خیریت آباد کی اراضی پر ایک باغ لگایا گیا تھا ۔

"خاص باغ" موقوعہ حیات نگر :

مسجدِ حیات نگر کے احاطے سے عین متصل اس کے شمال مشرقی کونے پر ہاتھی باولی نام کا ایک مربع شکل کا کنواں ہے جس کی دیواروں پر مختلف انواع کی چڑیوں کی بڑی خوب صورت مورتیاں گچ سے بنائی گئی ہیں ۔ اس میں پانی نکالنے کے لیے چڑسے کے ڈولوں سے بندھی رسی کے لیے چرخیاں تھیں ، تین نچلی چرخیاں بیلوں کے لیے اور اوپر کی بڑی چرخی ہاتھی کے لیے ۔ پانی نیچے ذخائرِ آب تک پہنچایا جاتا تھا ، جہاں سے مٹی کے پائپوں کے ذریعے اس علاقے میں اور نیز خاص باغ میں تقسیم کیا جاتا تھا ۔

حدیقتہ السلاطین :

حدیقتہ السلاطین کا مصنف اس شہر کا نام حیدرآباد بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ فردوس بریں ہی کے ایک ٹکڑے کی مانند ہے ۔ اس کی تعمیر سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہدِ حکم رانی کے پہلے سال میں ، بہترین اسلوب سے ، شروع کی گئی اور اسے تمام قسم

کے لوگوں ، بیوپاریوں ، دست کاروں وغیرہ سے آباد کیا گیا ۔ اس میں کثیر التعداد مکانات اور بلند بالا عمارتیں بہت سے میوہ باغ اور گلشن ، چوڑی سڑکیں اور چوک اور ایک داد محل یعنی انصاف محل ہے ۔

باغِ نبی اور باغِ لنگم پلی سلطان عبداللہ قطب شاہ نے لگوائے تھے لیکن باغِ نبی کا اب کوئی نشان نہیں ملتا ۔ وسیع و عریض باغِ لنگم پلی کسی زمانے میں اپنے تازہ پھلوں کے لیے مشہور تھا ۔ بعد ازاں یہ سلطان عبداللہ کی دل پسند تفریح گاہ کے کام آتا تھا جس نے اس کی تعمیرِ نو اور آرائش پر تین لاکھ روپے صرف کیے ۔ یہ باغات قطار در قطار درختوں اور پودوں سے بھرے ہوئے تھے اور انھیں بہ افراط پانی کی سہولت میسر تھی ۔

میر جملہ سید مظفر کے لگائے ہوئے وسیع و عریض سبزہ زار کے مماثل باغ میں عبداللہ قطب شاہ نے دو اور محل تعمیر کروائے ۔ کہا جاتا ہے کہ جب سید مظفر سخت بیمار ہوئے تو سلطان بہ نفسِ نفیس ان کی مزاج پرسی کے لیے گیا اور سید مظفر نے بہ طور شکر گزاری یہ شہ نشین اور باغات بادشاہ کی نذر کیے ۔ بعد ازاں بادشاہ نے حکم دیا کہ وہاں دو بلند و بالا محل بنائے جائیں جن کے گرد و پیش میوہ باغ ہو اور متعدد تالاب ، پانی کے فوارے اور آب شار ہوں ۔ ان کی تکمیل پر عبداللہ قطب شاہ نے خوش نودی کا اظہار کیا اور حکم دیا کہ اس سارے مجموعے کا نام سلطان شاہی باغ رکھا جائے ۔ ان محلات کا اب کوئی نشان نہیں ملتا لیکن شہر کے ایک محلے کا نام " سلطان شاہی " اب تک برقرار ہے ۔

عبداللہ قطب شاہ نے نئے قلعے میں باغِ نیا قلعہ کے نام سے ایک باغ لگوایا جس کا نقشہ بہ شکلِ مستطیل تھا ۔ غالباً یہ اس خوب صورت نہر کے دونوں جانب پھیلا ہوا تھا جو باغ کے شمال میں واقع دل بادل نامی کھلے چبوترے والے نسبتاً چھوٹے حوض کے جنوب میں واقع بڑے حوض سے پانی لاتی ہے ۔ نہر اور باغ کا نقشہ روایتی مغل نمونے کے مطابق ہے ، اس طرح کہ بڑے حوض کے وسط میں ایک چھوٹا شہ نشین اور مزید ایک شہ نشین نہر کے عین وسط میں تعمیر کیا گیا ہے ۔

عطاپور میں میاں مشک نے باغ والے شہ نشین کے مماثل ایک مکان تعمیر کروایا تھا ۔ یہ گاؤں پرانے پل سے تقریباً چار میل کے فاصلے پر واقع ہے ۔ اس محل میں ہم متاخر قطب شاہی عہد کے خوش حال امرا کی تفریح گاہ کی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں ۔ مشک محل تقریباً دس ایکڑ رقبے کے وسیع و عریض علاقے کے وسط میں تعمیر کیا گیا ہے جس کا دو پھاٹکوں والی ایک اونچی دیوار چاروں طرف سے احاطہ کیے ہوئے ہے ۔ ان میں سے ایک پھاٹک کا رخ شمال کی طرف ہے اور دوسرے کا جنوب کی طرف ۔ اس وسیع و عریض احاطے میں بے شمار پانی کی نہریں اور میوہ دار درخت تھے ۔

مشرق کی دیگر اقوام کی طرح . . . قطب شاہی فرماں روا بھی فنونِ لطیفہ میں دل چسپی لیتے تھے اور حسن کے قدردان تھے ۔ زمانہ ، قدیم ہی سے ہندستان میں پھولوں پودوں کو لگانے اور ان کو بہ نظرِ استحسان دیکھنے کا رواج رہا ہے ۔ قدیم بدھ مت کے ادب اور سنسکرت ڈراموں میں باغوں کا ذکر بارہا آیا ہے ۔ بدھ مت کے مندروں کے گرد و پیش لگائے جانے والے مقدس کنج بلاشبہ باغ بانی کی قدیم ترین اشکال میں شمار کیے جاسکتے ہیں ۔

وسیع و عریض شہروں میں مندر و مسجد ، گرجا یہاں تک کہ محل بھی لوگوں کی مختلف گروہوں میں شناخت اور مسلک و مذہب کی بنیاد پر ان کی تقسیم کے کام آتے تھے لیکن باغ ہی وہ مقام تھا جہاں سب اکٹھا ہوسکتے تھے ۔

ooo

(فاضل ماہرِ آثارِ قدیمہ جناب محمد عبدالقیوم کے مقالے " حیدرآباد کے قطب شاہی باغات اور مغل باغات " کا اقتباس ۔ ترجمہ : اسامہ فاروقی)

سیدہ فرحت علی خلیل

قطب شاہی نظم و نسق کی ایک جھلک

(فرامین کی روشنی میں)

بہمنی سلطنت کے آخری فرماں روا سلطان محمد شاہ بہمنی کے انتقال کے بعد سلطان قلی قطب شاہ اول جو صوبہ ، تلنگانہ کا صوبہ دار تھا ۹۲۴ ھ م ۱۵۱۸ء میں ایک خود مختار قطب شاہی سلطنت قائم کی ۔ اس سلطنت کے تمام بادشاہ قابل صاحبِ علم و ادب تھے ۔ ان کی بیدار مغزی اور اعلیٰ صلاحیت و بلند کرداری کی یہ دولت علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے جو آثار انھوں نے چھوڑے ہیں اہلِ دکن ان پر بجا طور پر فخر کرتے ہیں ۔ لیکن یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ اس سلطنت کے طویل دورِ حکومت کے آئین و قوانین اور نظم و نسق سے متعلق کاغذات کا کہیں پتا نہیں چلا ۔ یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ جیسا کہ عام طور پر ہوتا آیا ہے ، مفتوح نے اپنی شکست کے بعد انھیں مصلحتاً نذرِ آتش کردیئے ہوں یا پھر مغل فوج نے گول کنڈہ کے متعلقہ دفاتر وغیرہ تباہ کر ڈالے ۔

اب صرف چند قطب شاہی فرامین باقی ہیں جو اس عہد کی یاد دلاتے ہیں ۔ ان فرامین کا تعلق زیادہ تر عطیات ، اوقاف وغیرہ سے ہے ۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ ، عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن قطب شاہ کے فرمان ملتے ہیں ۔ یہ فرامین موجودہ سنٹرل ریکارڈ آفس STATE ARCHIVES ، تلنگانہ ، حیدرآباد اور ادارہ ادبیاتِ اردو ، پنجہ گٹہ ، حیدرآباد میں موجود ہیں ۔ یہ فرامین وہ ہیں جو قدیم خاندانوں کے مورثِ اعلیٰ کے نام جاری ہوئے تھے ۔

یہاں اسٹیٹ آرکائیوز کے چند فرامین کے بارے میں مختصر تحریر پیش ہے ۔

فرمان FARMAN یہ فارسی زبان کا لفظ ہے اور اس کی جمع فرامین ہے عام معنوں میں حکمِ شاہی اور مجازاً کتابتِ شاہی کے لیے مستعمل ہے (صاحب فرہنگ آصفیہ) ۔

فرمان سلطان محمد قطب شاہ مورخہ ۵ جمادی الثانی ۱۰۳۱ ھ ۔ مہر کے اوپر " یا محمدؐ یا علیؓ " درج ہے ۔ فرمان کے اختتام پر کاغذ کے سیدھے جانب کے گوشے میں پروانگی خواجہ افضل ترک سرخیل شاہی ۔ اس فرمان کا تعلق عدل و انصاف سے ہے اس لیے اس فرمان پر دفتری کاروائی کی گئی ہے اس کا طریقہ ، کار راست ہے ۔

بہ موجب فرمان مدعی شاہ محمد سید نے بادشاہ کی خدمت میں معروضہ پیش کیا کہ موضع بنیا پوری پرگنہ کرنگل میں ان کا موروثی باغ اور حوض واقع ہے جہاں کی رعایا ظلم و زیادتی سے ان کو پریشان کر رہی ہے ۔ اس معروضے کی پیش کشی کے بعد بادشاہ نے سرخیل کو حکم دیا کہ اس شکایت کا سد باب کیا جائے ۔ چناں چہ سرخیل شاہی خواجہ افضل ترک نے دوسرے مرحلے کی کاروائی بہ ذریعہ پروانگی متعلقہ افسران ، عمال اور رعایا کے نام تاکید جاری کی کہ باغ امرائی اور حوض کے بارے میں جس طرح شکایت کی گئی

ہے وہ دور کی جائے لہذا اس پروانگی کی اجرائی کے بعد مذکورہ پرگنہ کے عہدہ دار ، عمال وغیرہ نے تیسرے مرحلے کی کاروائی کے ذریعے مشار الیہ کی درخواست اور احکام کی بجا آوری پر عمل کیا اس طرح اس فرمان کے مطالعے سے یہ پتا چلتا ہے کہ عدل و انصاف سے متعلق کوئی کاروائی کی جاتی تو دفتری امور درجہ بہ درجہ انجام دیے جاتے ۔ بادشاہ خود جج کے فرائض انجام دیتا تھا ۔

فرمان سلطان محمد قطب شاہ مورخہ ۹ شوال ۱۰۳۶ ھ ۔ اس فرمان میں ناصیہ کے تقریباً درمیانی حصے میں مہرِ شاہی ثبت ہے ۔ مہر کے اوپر "یا محمدؐ یا علیؑ" اور اس کے ساتھ اوپر "ھوالسلطان" کے الفاظ لکھے گئے ہیں ۔

مذکورہ فرمان کا تعلق خاص نظم و نسق سے ہے ۔ اس میں درج شدہ عہدہ داروں کے نام اور ان کے فرائض کی تفصیل پیشِ خدمت ہیں جن کے بارے میں جانتا دل چسپی سے خالی نہیں ۔

پہلا مرحلہ معروضہ مدعی ایا کونڈوول تھا جو ایک عہدے کی خدمت حاصل کرنا چاہتا ہے ۔ اس عہدے کا نام دیسایاں یا دیس پانڈیہ گری ہے ۔ مدعی سرخیلِ شاہی کی خدمت میں عرضی پیش کرتا ہے لہذا ایک ہزار روپے نذرانہ ادا کرتا ہے ۔

دوسرا مرحلہ کاروائی سرخیلِ شاہی نے بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوکر اطلاع دی کہ ایا کونڈوول تھا نے خدمت دیس پانڈیہ گری کے لیے ایک ہزار روپے بہ طور نذرانہ داخل کیے ہیں کہ ان کو خدمتِ دیس پانڈیہ گری سے متعلق فرمان صادر فرمایا جائے ۔

معروضہ پیش ہونے پر اعمال نایک واڑیاں و دیسایانِ قلعہ گول کنڈہ کے نام فرمان جاری ہوا کہ پرگنہ کویل کنڈہ (موجودہ ضلع محبوب نگر) کونڈ مال و مرکل کے متعلقہ دیہات کی نصف دیس پانڈیہ گیری ، پرگنہ میں انعام اور ڈھائی فی صد رسوم دیس پانڈیہ گیری اور ایک ویران موضع کتائی پلی جس کا بالمقطعہ سرکاری پن سات ہن ہے مشار الیہ اور ان کی اولاد و احفاد کو عطا کیا جاتا ہے ، جو بحال و جاری رکھا جائے ۔ اس فرمان میں بعض اصلاحیں عہدوں کے نام وغیرہ ہیں ان کی وضاحت حسبِ ذیل ہے :

سرخیل ۔ فوج کے چھوٹے افسر کو سرخیل کہا جاتا تھا اور جو سرخیلِ خاص بادشاہ کی حفاظت کے لیے مقرر ہوتے تھے وہ سرخیل شاہی کہلاتے تھے ۔

دیس پانڈیہ گیری ۔ ہندی زبان کا لفظ ہے دیس کے معنی ملک ، ولایت ، صوبہ ، وطن ، جائے ولادت کے ہیں (فرہنگِ آصفیہ) پانڈے یعنی پنڈت بہ معنی عالم ، فاضل ، استاد ، معلم ۔

دیس پانڈیہ گیری کے فرائض یہ پرگنہ کا حاکم مال ہوتا تھا ۔ حسابات دیکھنا ، اس کا ریکارڈ وغیرہ رکھنا اس کی ذمہ داری تھی ۔ یہ عہدہ موروثی ہوتا تھا ۔ دیس پانڈیہ کو اس کی خدمات کے صلے میں زمینات وغیرہ بہ طور معاوضہ دی جاتی تھیں ۔ کئی پرگنوں پر ایک دیس پانڈیہ مقرر کیا جاتا تھا ۔

نائک واڑی ۔ عہدے کا نام ہے ۔ ہندی زبان کا لفظ ہے ۔ قطب شاہی عہد میں کاشت کاری ، غلے کی نگرانی اور پولیس کے فرائض کی انجام دہی اس عہدہ دار کے ذمے تھی ۔

اس فرمان کی روشنی میں اس بات کا پتا چلتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی قسم کی خدمات حاصل کرنا چاہتا تھا تو وہ سرخیلِ شاہی کے ذریعے معروضہ و نذرانہ پیش کرکے اس خدمات کو حاصل کرنے کا اجازت نامہ بادشاہ سے حاصل کر سکتا تھا ۔

فرمان عبداللہ قطب شاہ مورخہ ۲۹ جمادی الثانی ۱۰۳۸ ھ

ناصیہ کے تقریباً درمیانی حصہ میں مہرِ شاہی ثبت ہے ۔ مہر کے اوپر یا محمدؐ یا علیؑ کے الفاظ سرخی سے لکھے گئے ہیں ۔ فرمان کے اختتام پر کاغذ کے سیدھے جانب کے گوشے میں پروانگی حرمت و فضائل پناہ "شیخ محمد خاتون" درج ہے ۔ فرمان کا خلاصہ یہ ہے :

عبدالکریم امین خاں کے فرزندوں نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کی خدمت میں اس مضمون کا شکایتی معروضہ پیش کیا کہ موضع کاچی ریڈی پلی کی سیواد میں ان کی ایک چاور انعامی زمین واقع ہے۔ سالِ حال سیدبابو نے اس گاؤں کا اجارہ حاصل کیا اور اس انعامی زمین میں جدید مزرعہ قائم کیا ہے۔ نیز اس کے علاقے کے حوض سے جبریہ پانی حاصل کررہا ہے۔

اس شکایت کی بنیاد پر بادشاہ نے سمت نق باد عرف پٹن چرو کے کارکنوں اور دیسائیوں کے نام احکام جاری کیے کہ اگر یہ واقعات صداقت پر مبنی ہیں تو مذکورہ انعامی زمین پر جدید مزرعہ آئندہ قائم نہ کرنے دیا جائے۔ تاکید سخت کی جائے۔

چاور CHAWAR :- چاور ایک ملکی اور سطحی پیمانہ ہے جو ۱۲۰ بیگہ مساوی ہوتا ہے۔ متعدد اسناد میں اراضی کا حساب چاور کے نام سے ہوتا ہے۔ یہ ہندی زبان کا لفظ ہے۔ تلنگانہ میں عام طور پر اس کو ساورمو کہاجاتا ہے۔ اس فرمان میں متعلقہ افسر کو تحقیق کر کے شکایت کی صداقت معلوم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ گذشتہ فرامین میں تحقیق کا طریقہ نہ تھا۔

فرمان سلطان ابوالحسن قطب شاہ مورخہ ۱۷ جمادی الاول ۱۰۹۷ھ

ناصیہ کے تقریباً درمیانی حصے میں مہرِ شاہی ثبت ہے جس میں "ختم بالخیر و السعادۃ" درج ہے۔

ابوالحسن قطب شاہ نے یہ فرمان کارکنان، دیسایان، دیس پانڈیاں، مقدمان، گلکرنیاں و تھلکرنیاں پرگنہ چرکنڈہ سرکار دیور کنڈہ کے نام جاری کیا۔ فرمان کا خلاصہ یہ ہے کہ رام چندر راؤ، نرسا راؤ، رگھو نایک راؤ اور سیتاپت راؤ فرزندان منکنا کے نام پرگنہ مذکور کے (۹۲) مواضعات دیس مکھی، مجموعہ داری و نار گوڑی بہ شمول بارہ ویہات پالم پٹ، دہمکمان، محرقہ متعلقہ جات وغیرہ اور حق ساٹر، راہ داری، کلالی محرقہ و معمول دسہرہ اور مان پان جو سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانے سے جاری ہے اب مذکورہ اشخاص اور ان کی اولاد میں نسل بعد نسل برقرار رکھا جائے اور ان کی متوجہ خدمات کی ادائی میں کسی قسم کی مزاحمت نہ کی جائے۔

فرمان میں فرزندان منکنا کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ اس آمدنی کو اپنی زندگی کی ضروریات پر صرف کریں اور ہمیشہ سرکار کی اطاعت میں سرگرم عمل رہیں۔ اس فرمان میں چند خاص اصطلاحات، عہدوں اور محصولات وغیرہ کے نام آئے ہیں ان کی وضاحت پیش ہے:

مجموعہ داری :- عہدے کا نام ہے۔ اس عہدہ دار کے ذمے مال گزاری جمع کرنا اور پرگنہ کی جملہ مال گزاری کی رقم کا حساب رکھنا اور حسابات کی تنقیح کرتا تھا۔

نارگوڑ :- عہدے کا نام ہے۔ مقدم کو نار گوڑ بھی کہا جاتا تھا اس کے ذمے گاؤں کے حفاظتی کام، پولیس اور مال کا انتظام ہوتا تھا۔

گلکرنی :- عہدے کا نام ہے۔ زمین دار کو تلنگانے کے بعض اضلاع میں پٹواری اور گلکرنی کہا جاتا ہے۔

تھلکرنی :- عہدے کا نام ہے۔ زمین دار کو تھلکرنی بھی کہا جاتا تھا خواہ وہ بہ ذاتِ خود کاشت کرتا ہو یا زمین قول پر دیتا ہو۔

پالم پٹ :- زمین داروں کو جو زمین بہ طور متعلقہ عطا کی جاتی تھی اس کو پالم پٹ کہا جاتا تھا۔ پالم، گتہ (بالمقطعہ) پٹ، پٹہ کا مخفف ہے یعنی پالم پٹ سے مراد وہ زمین ہے جس کے محاصل کا پٹہ دیا گیا ہو۔

گھر گاؤں :- کسی زمین دار کو جو زمین عطا کی جاتی تھی اور زمین دار کا گھر بھی اس زمین پر ہوتا اس کو گھر گاؤں کہا جاتا تھا یعنی ہمارا گاؤں جس میں ہم رہتے ہیں۔

اگرہار :- اگرہار ایک مرکب لفظ ہے۔ دونوں ہندی زبان کے الفاظ ہیں جو سنسکرت سے لیے گئے ہیں۔ اگرہار ایک طرح کا مددِ معاش ہے جو اہلِ ہنود کی معاش یا مذہبی کے لیے دی جاتی تھی۔ مندر کی روشنی، عود و گل وغیرہ کے اخراجات کے لیے

معاش عطا کی جاتی تھی ۔ اس کے علاوہ سادھیوں کے لیے بھی اس سے استفادہ کیا جاتا تھا ۔ یہ زمینات صرف برہمنوں کے قبضہ میں رہتی تھیں ۔ ان کا پن دوامی طور پر مقرر رہتا تھا ۔ پن ہندی لفظ ہے ۔ معنی توجہ ۔ بعض اعتبارات سے اس کو معاش جاگیر سمجھا جاسکتا ہے ۔

سیری :- سیری ۔ غیاث اللغات ، سیری بہ فتح سین ۔ نام دیہہ ۔ بہارِ عجم : بہ کسرِ اول و سکون یائے مجہول و رائے مہملہ مستغنی و بے نیاز اور کثیر کے معنوں میں بیان کیا ہے ۔ سیری وہ انعامی زمین ہے جو مالک میا موروثی اسامی کے زیرِ کاشت ہو اور وہ اراضی زمین دار کے نام ہو (ہندی زبان کا لفظ ہے) ۔

سیری زمین اعلیٰ ترین زمین ہوتی ہے کثیر الحاصل ، سیر حاصل ۔ اس کی پیداوار بہ نسبت دوسری زمینات کے زیادہ حاصل ہوتی ہیں ۔ یہ زمین بہ معاوضہ مال گزاری انعام دی جاتی تھی ۔

مان پان :- مان پان یہ ایک طرح کا اعزاز ہے جس کا رواج عبداللہ قطب شاہ کے زمانے سے ہے پھول پان تقسیم کرنے کا ایک دیہی طریقہ تھا ۔ وطن داروں کو عام طور پر یہ اعزاز عطا کیا جاتا تھا ۔

رسوم :- رسوم دس فیصدی ۔ رسوم اسم مونث عربی زبان کا لفظ ہے ۔ رسم کی جمع اردو میں بہ معنی نقوش ، نشان ، تنخواہ ، مشاہرہ ، آئین ، قوانین ، فیس اجرت مختلفہ مستعمل تھا ۔ (فرہنگِ آصفیہ)

رسوم سے مراد نقدی رقم ہے جو ملازمین کو ان کی خدمات کے فی صدی محاصل ملک کے حساب سے دی جاتی تھی جس کو رسوم فی صدی بھی کہا جاتا تھا ۔

سائر :- سائر اس محصول کروڑگری کو کہتے تھے جو درآمدِ مال پر مقرر تھا ۔ یہ وہ محصول ہے جو تجارتی مال کے حمل و نقل پر لگایا جاتا ۔ اس کے علاوہ محصولِ مکان ، بازار وغیرہ بھی سائر کے تحت شمار کیے جاتے تھے ۔

محترفہ :- یہ ایک قسم کا سیل ٹیکس تھا جو صرف دوکان داروں اور ہنر پیشہ لوگوں سے لیا جاتا تھا ۔ اس کا تعلق صنعت و حرفت سے تھا ۔

کلالی :- یہ ٹیکس تاڑی سیندھی تلسنے والوں سے لیا جاتا تھا ۔ یہ پیشہ صرف کلال قوم کا تھا ۔

ادارہ ، ادبیاتِ اردو کے میوزیم کے چند فرامین کا مختصر جائزہ پیشِ خدمت ہے ۔ اس میوزیم میں یوں تو تقریباً مغل ، عادل شاہی ، قطب شاہی اور آصف جاہی عہد کے فرامین ہیں ۔ میں صرف چند قطب شاہی فرامین کے بارے میں یہاں درج کر رہی ہوں ۔

فرمانِ ابو الحسن قطب شاہ (۱۶۷۷ء ۔ ۱۶۸۲) مورخہ صفر ۱۰۸۷ھ (کیٹلاگ نمبر ۵ بہ موجب فہرست نوادرات و فرامین) :-

مہرِ شاہی "خاتمہ بالخیر و السعادۃ" درج ہے اس فرمان کا تعلق نظم و نسق سے ہے ۔ یہ فرمان حوالہ دار جل پلی بالاجی کے نام جاری کیا گیا تھا ۔ بادشاہ نے احکام دیئے تھے کہ ملہاراؤ حوالہ دار پرگنہ کندی کنڈہ کو اطلاع دیتے ہیں کہ یرہ سال ملیا نے ویرا ریڈی وینکٹ کشنو دیسائی کو قتل کردیا ہے یرہ سال ملیا کو فوراً گرفتار کیا جائے ۔

فرمان ابوالحسن قطب شاہ مورخہ ربیع الاول (۱۰۸۳ھ کیٹلاگ نمبر ۲۱۱) :- اس فرمان کا تعلق وقف برائے درگاہ سے ہے اوارے میں دو فرمان ہیں وقف قصبہ مصطفیٰ نگر برائے اخراجات روضہ علی ابنِ موسیٰ رضا بہ مقام مشہد ۔ پر ابوالحسن قطب شاہ کی بارہ برجی مہر اس کی پیشانی پر ثبت ہے جس کے اطراف سرخ اور سبز اور طلائی نقش و نگار بنائے گئے یہ فرمان ابوالحسن قطب شاہ کی تخت نشنی کے بعد میں جاری کیا گیا ہے ۔

پروانہ ابوالحسن قطب شاہ (کیٹلاگ نمبر ۳۶) :- سید مظفر سرِ خیل شاہی کی مہر ہے ۔ پروانہ فارسی لفظ ہے ۔ بہار عجم : "

کاغذ جو بادشاہوں اور امیروں کی جانب سے عمال کے نام لکھا جاتا ہے جیسے پروانہ ، تنخواہ اور پروانہ ، جاگیر وغیرہ ۔ اصطلاحاتِ دفتری میں اس کو پروانچہ بھی کہا جاتا تھا ۔

پروانہ وہ کاغذ ہے جو بادشاہانِ سلف کے دفتر اور مہرِ شاہی سے جاری ہوتا تھا ۔ بعض جاگیرات اور دیگر اقسام عطیات کی عطا کی نسبت ابتدائی پروانے بھی جاری کیے جاتے تھے ۔

اعمال ۔ منتظم اجرائی فرمان اور سند کے بعد ہر سال معاش داروں سے فرمائش کرتے تھے کہ سالِ حال کے لیے بحالی کا حکم پہنچائیں اور معاش دار دارالسلطنت میں حاضر ہوکر سعی کرتا تھا اور پروانہ ، شاہی اجرا کرواتا تھا ۔ یہ فرمان دو لسانی ہے فارسی کی چند سطور باقی ہیں اور نیچے موڑی رسم الخط میں تقریباً ۲۰ سطور باقی ہیں یہ ناقص الاول فرمان ہے ۔

چک نامہ یک بندی مورخہ ۱۱۹ ھ ۱۱۱۴ فصلی (کیٹلاگ نمبر ۲۱۲) ۔ چک فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی برات کے ہیں اور اصطلاحِ دفتری میں چک بندی اس کاغذ کو کہتے ہیں جس میں اراضی کا تفصیلی داخلہ صراحت کے ساتھ رقبہ مع حدود و سمت اور قابض کا نام وغیرہ درج ہوتا تھا ۔ چک نامہ موضع واری مرتب کیے جاتے تھے ۔

مذکورہ چک نامہ عبداللہ قطب الملک کی سند اور اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ کا فرمان مورخہ ۲۱ رمضان ۳۱ جلوس اور فاضل خاں کا پروانہ مورخہ ۱۴ شعبان ۱ جلوس کا ہے ۔ یہ چک نامہ لسانی اہمیت کا حامل ہے ۔ یہ دو لسانی تحریر ہے ابتدا میں فارسی مضمون اس کے نیچے فارسی میں چک بندی کی گئی ہے اور اس کے نیچے تلگو مضمون ہے اور تلگو زبان میں چک بندی درج ہے ۔ یہ چک نامہ بہترین حالت میں ہے ۔ تحریر بالکل صاف اور خوش خط ہے اور ایک اہم لسانی ماخذ بھی کہا جاسکتا ہے ۔
چک نامہ کا خلاصہ پیش ہے :

موضع میراں پود المعروف نماپلی پرگنہ چرکنڈہ سرکار دیور کنڈہ صوبہ حیدرآباد ۔ سید حسن علی شاہ کے نام عبداللہ قطب شاہ کی سند اور عالم گیر بادشاہ کا فرمان بہ موجب ناصیہ عبداللہ قطب الملک نے مددِ معاش کے لیے سید حسن شاہ کے نام سے چاور زمین برائے کاشت اور محاصل برائے اخراجات خود و گل روضہ سید شاہ جان اللہ قدس سرہ العزیز کے لیے اور ان کی اولاد میں اس کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے سند عطا کی تھی ۔

ان قطب شاہی فرامین کے مطالعے سے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ بادشاہ عوام کی فلاح و بہبود کا کس طرح خیال رکھتے تھے ہر شعبہ ، حیات میں رعایا پروری کی مثال ملتی ہے ۔ نظم و نسق ، عدل و انصاف ، مذہبی رواداری ، علوم و فنون کی ترویج ، غربا پروری وغیرہ کی منہ بولتی تاریخی دستاویزات ہیں ۔

○●○

نوٹ : اس مضمون کی تیاری میں حسبِ ذیل مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے :
فرامین اسٹیٹ آرکائیوز آندھرا ○ ادارہ ادبیاتِ اردو میوزیم ذخیرہ ، فرامین ○ اس کے علاوہ ○ ماہ نامہ "سب رس" مرکزی نمبر جنوری فروری ۱۹۷۷ ، مضمون " چند قطب شاہی فرامین " از میر سراج الدین علی خاں ○ جامع العطیات مرتبہ ضیاالدین احمد شکیب و حسن الدین احمد (فرہنگ آصفیہ) ۔

○●○

کلامِ محمد قلی قطب شاہ

جلوہ

پرم پیاری کا جلوہ گاؤ سارے — اسے چند سور سوں پریاں سنگارے
چاند سورج سے
سہاگن بھاگ پھل مستک کھلے ہیں — سہیلیاں آرتی تارے توارے
پھول پیشانی
دچاؤ تخت جلوے کا خوشی سوں — کہ چوندھر چوک موتیاں سوں سنوارے
چڑاؤ تیل اب ساتو سہاگن — مشاطہ ہو کے زہرہ ہت نگارے
ساتوں — ہاتھوں کو
پلا شربت دیوو ہاتاں میں بیڑے — بنداؤ ساریاں موتیاں کنارے
بندھاؤ
محمد قطب شہ ہور اس پری کوں
خدایا رکھ جداں لگ ہیں ستارے
جب تک

برسات

گرجا ہے میگھ سرتے تازہ ہوا ہے بستاں — پھولاں کی باس پایا بلبل بجراں دستاں
پھرے بوستاں — داستاں
اے خوش خبر صبا توں لے جا جواں قداں کن — چھناں کی آنند میں بیٹھے ہیں سب پرستاں
چمنوں
مکھ نور پر دسے یوں نج خطِ عنبری او — جیوں سور ابر ہے پاول مسکان سوں گلستاں
نظر آئے مجھے وہ

تج عشق کے گدا کوں اورنگ شاہی دیا — سب عاشقاں تج لگے ہیں طفل جیوں داستاں
آگے

روزی ہوا معانی تج عشق کا پیالا

بھرے ہیں ہر طرف توجے شوق کے گلستاں
تب ہی

پریم کہانی

سنو لوگ میری پرِم کی کہانی — کہ پیلا ہے رنگ عاشقی کی نشانی
پریم

تمن عشق بھیدیا ہے منج بالے بالا — کہ ہوئی ہوں تمن پیم میں میں دوانی
تمہارے چھپا ہے میرے بال بال میں

محبت کی لذت فرشتیاں کوں نیتں ہے — بہت سی سوں میں سو لذت پچھانی

جکوئی عمر کھویا ہے ساجن ہوس میں — جیون پھل وہی پائیا کر میں جانی
جو کوئی ساجن کی ہوس — زندگی کا پھل

نبی صدقے قطبا جگت مول پایا
دنیا کی قیمت

سو لو عشق ہے اس تجے نیں خوش کہانی
وہ — سے بڑھ کر نہیں

غزلیں

یوسفِ گم سو پھر آئیگا اب پہ کنعاں غم نہ کھا — گھر ترا امید کا ہوگا گلستاں غم نہ کھا
آئے گا

سنے پیا تیرہ دکھ دکھیا سو خوب ہوگا حال تج — من کا چنتا ہوئے گا پھر آکے جاناں غم نہ کھا

وہ عشق کا دکھ

ہاں تو ناامید نا ہو کوے نہ جانے سرّ غیب — کیا لکھے کا پردے اوجھل کھیل ہلتیاں غم نہ کھا

کوئی

لسے پیا موجاں تھے نا ڈر من کا بھاتا ہوئے گا — تو تجے ہے نوح کشتی بان طوفاں غم نہ کھا

بات تیرا دور اگر ہے عشق پنتھ دکھلائے گا — شاہ رایاں تو ہے رایاں میں ز رایاں غم نہ کھا

راستہ

قطب شہ اس کنجِ فکر و خلوتِ دین منے

میں

تا لکھے وردت دعا و درسِ قرآں غم نہ کھا

جب تک تیرا رہے وردت

○●○

خبر لیا یا ہے بد بد میرے تئیں اس یارِ جانی کا — خوشی کا وقت ہے ظاہر کروں رازِ نہانی کا

مرے جیو آرسی میں خیال تج مکھ کا سو دستا ہے — کرے اوخیال منج دل میں نشانی زرفشانی کا

دل کے آئینے میں — نظر آتا ہے

خدا کا شکر ہے تج سلطنت تھے کام پایا ہوں — دندے دشمن کے مکھ پر پھوتلے ارغوانی کا

مقصد — مخالف — سامنے

چھبیلے مست ساقی کے پچھیں دوڑیں سو مخموراں — پلادو مئے ہوا اب تو ہوا ہے گل فشانی کا

پیچھے

دوتن انسوں کے بارے تھے ہمن کوں کچ نہیں ڈر ہے — ہمارے دیوے کوں ہے روشنی صاحب قرآنی کا

غیر — چراغ

ہمیں ہیں عشق کے پنتھ میں دونو عالم تھے بے پروا — لگیا ہے داغ منج دل پر سو اس ہندوستانی کا

سے

پڑے دنبال ہیں میرے سو اس نیناں کے دنبالے

خدایا عشق مشکل ہے بجرم دکھ تھوں معافی کا

○●○

ڈاکٹر حبیب نثار

ڈاکٹر زور اور ادارہ ادبیات اردو کے نوادر

ادارہ ادبیات اردو بابائے دکنی اردو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے خوابوں کی تعبیر ہے جسے ڈاکٹر زور نے ۲۵ جنوری ۱۹۳۱ء دکن کی ادبی خدمات، دکن کی تاریخ و تمدن کی تحقیق و ترتیب کے مقصد سے اپنے مخلص احباب کی اعانت سے قائم کیا۔ ۱۹۳۲ء میں کتب خانے کا آغاز ہوا (۶)۔ جنوری ۱۹۳۸ء میں ادارہ ادبیات اردو کا ترجمان "سب رس" کا اجرا عمل میں آیا۔ ۱۹۴۳ء میں ڈاکٹر زور نے تذکرہ اردو مخطوطات کی جلد اول مرتب و شائع کی جس میں ادارے کے ۷۲۵ مخطوطات کا وضاحتی تذکرہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے ۱۹۴۳ء میں ادارے کے تحت تاریخ دکن کانفرنس کی بنیاد رکھی اور ۱۹۴۳ء ہی میں کل ہند اردو کانگریس منعقد کی۔

ڈاکٹر زور اور ادارہ ادبیات اردو کی سرگرمیاں روز بہ روز تیز سے تیز تر ہونے لگیں۔ ہندستان بھر میں ادارہ ادبیات اردو معروف ہوگیا۔ ادارے کی مطبوعات کو ہاتھوں ہاتھ لیا جانے لگا۔ ۱۹۴۹ء میں خواجہ حسن نظامی نے ڈاکٹر زور کو ادارے کی اپنی عمارت بنانے کی جانب توجہ دینے پر مائل کیا اور عمارت کا نام " ایوان اردو " تجویز کیا۔

۲۷ جنوری ۱۹۵۵ء کو ادارہ ادبیات اردو کی سلور جوبلی تقاریب اعلیٰ پیمانے پر منعقد کی گئیں۔ ۱۲ / اکتوبر ۱۹۵۵ء کو بیگم زور نے ادارے کے لیے زمین کا عطیہ دیا۔ ۶ نومبر ۱۹۵۵ء کو حکیم الشعرا حضرت امجد حیدرآبادی کی دعاؤں کے ساتھ ایوانِ اردو کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا گیا اور پانچ برس کی ان تھک محنت کے بعد یہ عمارت پایہ تکمیل کو پہنچی۔ ۲۲ مارچ ۱۹۶۰ء کو جناب بخشی غلام محمد صاحب وزیر اعظم جموں و کشمیر نے اس ایوان کا افتتاح کیا۔

ایوانِ اردو اور سرزمینِ دکن کی نسبت مشاہیر شعرا نے جو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اسے ایوانِ اردو کے آڈی ٹوریم کی بالکنی پر تینوں طرف اور بابِ داخلہ کے اندر لکڑی پر ابھری ہوئی نیلگوں زمین پر سنہرے حروف میں کندہ کرا کے نواب عنایت جنگ بہادر نے خود اپنی نگرانی میں نصب کروایا ہے۔"

ایوانِ اردو کی عمارت کے اوپری حصے میں کئی تاریخی پتھر اور کتبات دیواروں میں نصب کیے گئے ہیں جو ۹۰۰ھ اور ۱۲۲۲ھ کے درمیانی زمانے سے متعلق ہیں۔ ان میں مختلف خطاطی کے نمونے محفوظ ہیں۔ یہ نسخ، نستعلیق اور ثلث خطوں کو ظاہر کرتے ہیں جو ہندستان میں پانچ سو سال سے مستعمل ہیں۔

۱۹۵۵ - ۵۶ء میں جب ایوانِ اردو کی عمارت تیار ہونے لگی تب نواب عنایت جنگ بہادر نے تجویز پیش کی کہ اس کا ایک حصہ دکن کے تاریخی نوادر کے لیے مختص کیا جانا چاہیے۔ ڈاکٹر زور نے اس تجویز کو لبیک کہا اور بہ قول ڈاکٹر زور:

"ایوانِ اردو کی افتتاحی تقریب سے قبل ہی نواب صاحب نے متعدد قدیم تاریخی کاغذات اور فرامین و قطعاتِ خوش نویسانِ دکن و دکنی قلمی تصاویر اور نادر اشیا عطا کر کے افتتاح کے وقت ان کو نمائش کی شکل میں مرتب فرما دیا(۲)۔"

ایوانِ اردو کے نوادرات کا ذکر کرتے ہوئے محمد اکبرالدین صدیقی، نواب عنایت جنگ کے عطیات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"نواب صاحب نے قطب شاہی اور آصف جاہی دور کے کئی فرامین، احکام، اسناد، نشان وغیرہ ادارے کو عنایت فرمائے۔ اس کے علاوہ مشہور کاتبوں، خوش نویسوں اور خطاطوں کے طغرے اور وصلیاں عنایت کیں۔ نواب صاحب خود بھی اچھے خوش نویس اور مصور تھے۔ اپنی خوش نویسی کے نمونے اور متعدد مصوروں کی تصویریں بھی عنایت فرمائی ہیں۔ یہ تصویریں صرف دکن اسکول ہی سے متعلق نہیں بلکہ بعض اور اسکولوں سے بھی تعلق رکھتی ہیں۔ ایک نہایت نفیس مصوری کا شاہکار شاہانِ قلی قطب شاہیہ کی رنگین تصاویر ہیں جو عاج پر کندہ ہیں۔ یہ ایک نایاب سیٹ ہے۔(۳)"

ایوانِ اردو کو جن ۲۲ اصحاب نے نایاب نوادر بہ طور عطیہ دیے ہیں ان تمام کے نام ڈاکٹر زور نے تذکرہ، نوادر کے ص درج کیے ہیں(۴)۔ ان میں مولوی احمد اللہ خاں صاحب، نواب میر سعادت علی رضوی، ڈاکٹر مسندر راج سکسینہ، نواب سراج الدین صاحب، نواب سالار جنگ، نواب دین یار جنگ، رائے ست گرو پرشاد ایڈوکیٹ، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، بیگم زور کے نام ذکر ہیں لیکن ان نوادر کا بیش تر ذخیرہ نواب عنایت جنگ کا عطیہ ہے۔ محمد اکبرالدین صدیقی لکھتے ہیں:

"نواب صاحب نے سماجی اور تمدنی تاریخ کو محفوظ کرنے کے لیے میوزیم کے قیام میں بیش بہا امداد فرمائی اگر نواب صاحب کی عطایا کو نکال لیں تو ادارے کا میوزیم جسدِ بے جان بن جائے گا۔(۵)"

ایوانِ اردو کے نوادرات میں مخطوطات، قطعاتِ خوش نویسانِ دکن، پتھر کے اصلی کتبے، قدیم تاریخی کتبوں کے نقول یا چربے، دنیا کے مشہور خطاطوں کے لکھے ہوئے خطاطی کے نمونے، شجرے اور دیواری نقشے، مطبوعہ رقعے، اسلحہ، سکے، تمغے وغیرہ شامل ہیں۔

قطعاتِ خوش نویسانِ دکن: ادارے کے نوادر میں تقریباً ۱۱۰ قطعاتِ خوش نویسانِ دکن محفوظ ہیں۔ ان قطعات میں سے ایسے ہیں جو ۱۰۲۰ھ سے ۱۳۰۲ھ کے درمیان لکھے گئے اور جن پر خطاط کا نام اور سنہ کتابت درج ہے۔ چالیس قطعات ایسے ہیں جن خطاط کے صرف لقب درج ہیں اصل نام نہیں۔ ان تمام خطاطوں کے نام ڈاکٹر زور نے اپنے مرتبہ تذکرہ، نوادرِ ایوانِ اردو کے ص درج کیے ہیں۔ ذیل میں صرف چند قطعات کا سنہ کتابت اور خطاط کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ میر خلیل۔ سنہ کتابت ۱۰۲۰ھ

۲۔ جواہر رقم خاں عالمگیری۔ سنہ کتابت ۱۱۴۰ھ سے قبل۔ یہ شہزادگان آصف جاہ اول کے استاد تھے۔

۳۔ عبدالحسین۔ سنہ کتابت ۱۱۴۴ھ۔

۴۔ خواجہ حسین علی۔ سنہ کتابت ۱۱۸۲ھ۔

- منشی رام گوبند اورنگ آباد کتابت عہدِ نظام علی خاں آصف جاہ ثانی۔
- سید جمشید علی خاں ابنِ قیصر جنگ۔ سنہ کتابت ۱۲۱۲ھ۔
- حسین علی خاں ابنِ علی یاور خاں حیدرآبادی۔ سنہ کتابت ۱۲۲۰ھ۔
- یاورالدولہ نواب علی نقی خاں یاور جنگ۔ سنہ کتابت ۱۲۲۹ھ۔ یہ دربارِ آصفی کے پہلے سفیر ہیں جن کو ہندستان کے انگریزی پایہ تخت کلکتہ میں متعین کیا گیا تھا۔
- نواب میر عباس علی خاں احتشام الدولہ۔ سنہ کتابت ۱۲۵۲ھ۔
- نواب عنایت جنگ۔ سنہ کتابت ۱۳۳۰ھ۔

ان قطعاتِ خوش نویسانِ دکن کے بارے میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں: "یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ جملہ قطعات خطاطانِ دکن کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس طرح اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ دکن کے خوش نویسوں کے جتنے شاہ کار ادارے میں محفوظ ہیں اتنے کسی ایک ہی کتب خانے میں (خواہ وہ سالار جنگ میوزیم ہو یا کتب خانہ آصفیہ یا ریکارڈ آفس موجود نہیں ہیں" (۶)۔

...ے کی نمائش گاہِ نوادر میں دنیا کے مشہور اساتذہ، خطاطی مثلاً میر علی، میر عماد، عبدالرشید۔ سلطان علی مشہدی، میر خلیل، محمد قاسم، رضا عباسی، محمود بن اسحاق اور معزالدین محمود کے ساتھ اصلی شاہ کاروں کی تصاویر کا مرقع محفوظ ہے جو تقریباً اسی (۸۰) برس قبل غالباً یورپ ... کتب خانوں سے حاصل کیے گئے ہیں یہ نوادر ۹۳۹ھ اور ۱۰۲۵ھ کے درمیانی زمانے میں لکھے گئے تھے اور بخارا، اصفہان اور شیراز ... کتابت کی گئی تھی۔

یہ مرقع ادارے کے لیے جنوری ۱۹۵۹ء میں خریدا گیا تھا۔ مرقع کے صفحہ آخر پر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا ایک مختصر نوٹ ... ہے۔ لکھتے ہیں:

"یہ مرقع نواب میر سعادت علی صاحب رضوی ولد نواب سرتاج جنگ ولد نواب محبوب یار جنگ ناظم الدولہ ناظم الملک سے بہ قیمت ایک سو پچیس روپے خریدا گیا۔ جنوری ۱۹۵۹ء" (۷)۔

قبر کے اصلی کتبے : ادارے کے نوادر میں قدیم تاریخ سے متعلق پتھر میں کندہ اصلی کتبے بھی شامل ہیں جن کی تعداد پانچ ہے۔ ... کتبہ عہدِ محمد قلی قطب شاہ سے متعلق ہے جو خطِ نستعلیق میں ۱۰۰۰ھ کا مکتوبہ ہے۔ اس کتبے میں محمد قلی قطب شاہ کے ایک فرمان کی ... عبارت کندہ ہے۔ جس کا مضمون یہ ہے کہ "بادشاہ نے باغ ہائے شہر محمد نگر کے جملہ محاصل اپنے شہر کے عوام کے لیے وقف ... تھے" (۸)۔ یہ کتبہ ادارے کے میوزیم میں کرہ مخطوطات میں جانے کے راستے پر بطور ستون دیوار میں نصب ہے۔

دوسرا کتبہ عہدِ محمد قطب شاہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ سنگِ سرخ پر نقش و نگار کے درمیان ۱۰۳۳ھ میں خطِ طغریٰ میں لکھا گیا ہے

ماہنامہ سب رس، حیدرآباد۔

جسے لطف اللہ حسینی تبریزی نے لکھا ہے ۔ یہ کتبہ مسجد شیخ پیٹ کے محراب سے نکالا گیا ہے اور ادارے کے مینار کی سیڑھیوں پ
جنوالے کے قریب دیوار میں نصب ہے جس سے میوزیم میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ کتبہ اس لیے اہم ہے کہ گولکنڈہ کے تمام سنگ
سنگ موسیٰ پر کندہ کیے گئے ہیں اور یہ کتبہ سنگِ سرخ پر کندہ ہے ۔

ادارے کے نوادرات میں اصلی سنگی کتبوں کے علاوہ ۲۶ تاریخی کتبوں کے نقول یا چربے بھی محفوظ ہیں۔ ان میں ۲۴ سا
قطب شاہیہ کے ہیں۔ ایک بہمنی عہد سے تعلق رکھتا ہے اور ایک آصف جاہی عہد سے متعلق ہے ۔

بہمنی عہد کا کتبہ ۹۱۹ھ م ۱۵۱۳ء یعنی سلطنتِ قطب شاہیہ کی بنیاد رکھنے سے صرف پانچ برس قبل خود سلطان قلی قطب ال
بہمنی سلطنت کے صوبے تلنگانہ کے صوبہ دار نے قصبہ حسن آباد کے لنگر کے لیے وقف کے ضمن میں کندہ کروایا تھا ۔ اس
تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

"اس کتبے کی بابت اب تک کسی کتاب یا رسالے میں معلومات شائع نہیں ہوئی ہیں اس لحاظ سے اس کا یہ چربہ
خاص اہمیت رکھتا ہے "(۹)۔

ادارے کے نوادر میں موجود تاریخی کتبوں کے ان نقول میں ایک اور کتبہ بہت اہم ہے جو ۱۰۳۳ھ میں کندہ کروایا گیا ہے ۔
تالاب ماں صاحب کے بارے میں ہے ۔

تالاب ماں صاحبہ کے سلسلے میں عموماً مشہور ہے کہ اسے حیات بخش بیگم بنت سلطان محمد قلی قطب شاہ والدہ عبداللہ قط
نے بنایا تھا۔ ڈاکٹر زور تذکرہ، نوادرِ ایوانِ اردو (جلد اول) کے ص ۸۴ پر ۱۰۳۳ھ کے اس کتبہ کا مضمون درج کرنے کے بعد تا
ہٹ یافت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ کتبہ تالاب محلہ سیف آباد (واقع موجودہ اے سی گارڈز) کے ایک جانب برج کے اندر موجود ہے ۔ اس
تالاب کو بعض لوگ غلطی سے حیات بخش بیگم والدہ عبداللہ قطب شاہ سے منسوب کرتے ہیں حالاں کہ یہ تالاب سلطان
قطب شاہ کی والدہ خانم آغا کا بنوایا ہوا ہے "(۱۰)۔

قلمی تصاویر: ادارے کے نوادرات میں قدیم رنگین قلمی تصاویر بھی مخزون ہیں۔ ان میں سلاطین عادل شاہی، سلاطین و امرائے آ
مشاہیرِ دکن کے علاوہ بزرگانِ دین کی تصاویر بھی موجود ہیں۔ ہاتھی دانت پر بنایا ہوا قطب شاہی سلاطین کی تصویروں کا ایک البم بھی اد
کے میوزیم کی زینت ہے ۔

ان قدیم قلمی تصویروں کے علاوہ جدید رنگین تصویروں کا قابلِ قدر ذخیرہ بھی ادارے میں محفوظ ہے جس میں مشاہیرِ قطب
مشاہیرِ اردو، اربابِ ادارہ کی رنگین تصاویر کے ساتھ ساتھ ۹۰ سادہ تصویروں کا ذخیرہ بھی محفوظ ہے ۔ معمارانِ اردو کی ۱۰۰ تصویریں بھ
ہیں۔ ان کے علاوہ عکسی تصویروں کے ۱۲ مرقع یا البم بھی ادارے میں محفوظ ہیں جن میں تقریباً ۱۰۰ تصاویر ہیں۔

قدیم تاریخی کاغذات

ادارے میں قدیم شاہی احکام، فرامین، اسناد پروانہ جات بھی موجود ہیں جو تقریباً ۲۵۰ ہیں۔ بیش تر اسناد و فرامین دکن سے متعلق ہیں ان میں مغل حکمران (شاہ جہاں، اورنگ زیب بہ حیثیت صوبہ دارِ دکن، اورنگ زیب بہ حیثیت شاہنشاہِ ہند، فرخ سیر، محمد شاہ شاہ جہاں ثانی، عالم گیر ثانی، شاہ عالم، اکبر شاہ ثانی، اور بہادر شاہ ظفر) عادل شاہی سلاطین (محمد عادل شاہ اور سکندر عادل شاہ) قطب شاہی سلاطین (ابراہیم قطب شاہ، ابوالحسن قطب شاہ) آصف جاہی سلاطین امرا (آصف جاہ اول، ناصر جنگ شہید) صلابت جنگ، سکندر جاہ، آصف جاہِ ثالث، ناصرالدولہ آصف جاہِ رابع، افضل الدولہ آصف جاہِ خامس میر نظام علی خاں) پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے متعلق ۳۰ نومبر ۱۸۶۰ء کی لکھی ہوئی ملکہ وکٹوریہ کی ایک سندِ خوش نودی کی نقل بھی ادارہ کے ان کاغذات کی زینت ہے۔

اپنی قدیم تاریخی کاغذات میں ایک مکتوب میر اولاد محمد خاں ذکا بلگرامی کا موجود ہے جو ادبی و تاریخی اعتبار سے بہت اہم ماخذ ہے۔

ڈاکٹر زور چاہے مورخ ہوں کہ نہ ہوں لیکن ان کو قدیم فرامین، اسناد اور احکام حاصل کرنے اور انھیں محفوظ کرنے کا "جنون" تھا ۲۵۰ اسناد، احکام اور فرامین ادارے کے لیے حاصل کرنے کے بعد انھوں نے ایسے فرامین اسناد اور احکام کے فوٹو حاصل کیے جسے ان کے مالکین سے کسی بھی طرح حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔ اور یہ تمام عکسی فوٹو جو تعداد میں ۲۱ ہیں ادارے کے نوادرات میں شامل کیے۔ تاریخی نقطہ نظر سے یہ تمام عکسی فوٹو اہم ہیں لیکن ان میں تین نہایت اہم ہیں۔

اورنگ زیب عالم گیر کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے شیعہ دشمنی میں گولکنڈہ کی سلطنت کا خاتمہ کیا۔ ادارے کے نوادرات میں ۴ رجب ۱۱۰۰ھ کو لکھی گئی ایک سند کی عکسی فوٹو محفوظ ہے جس میں لکھا ہے کہ عالم گیر نے بعد فتح گولکنڈہ "بیمارِ کربلا" کا تبرک دارالشفا میں رکھنے کا حکم دیا کہ:

"بیمارِ کربلا کا یہ تبرک دارالشفا کی بیماروں کو شفا سے کلی بخشے" (۱۱)

سند میں بہ صراحت یہ بھی درج ہے کہ اورنگ زیب نے:

"روزانہ دو من عود و گل عاشور خانے کے نام جاری کرنے کا حکم دیا تھا" (۱۲)۔

سند کی یہ نقل ادارے کے البم نمبر (۲) کے ورق ۲۵ پر محفوظ ہے۔ ڈاکٹر زور کا خیال ہے کہ یہ کوئی سند نہیں ہے کہ بلکہ عبارت بہ طور کیفیت لکھی گئی ہے اور اس پر کسی کی مہر بھی موجود نہیں ہے لیکن یہ کاغذ آج بھی متولی عاشور خانے کے پاس موجود ہے (۱۳)۔

قطب شاہی عہد کے دارالشفا کا اللہ سر طوق مبارک میں بدل جانے کا غالباً ایک سبب اورنگ زیب عالم گیر کا مندرجہ بالا حکم ہوسکتا ہے اس سند سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ دارالشفا مملکتِ قطب شاہی کے زوال کے بعد بھی قائم تھا۔ حالاں کہ تاریخ کی کتابوں میں عہدِ عبداللہ قطب شاہ کے زمانے ہی میں اس کے ختم ہوجانے کی جانب اشارہ ملتا ہے۔

ادارے میں موجود ان عکسی فرامین میں دو فرامین تلگو میں ہیں جو ابوالحسن تاناشاہ کی مہر کے ساتھ ہیں اور تاریخی اعتبار سے اہم ہیں۔

ان ۲۱ عکسی تصویروں کے بارے میں تفصیلی اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے فرمانِ ابوالحسن قطب شاہ بابت ۶ رجب ۱۰۹۹ھ اور اقرار نامہ خواجہ یوسف بابت ۲۳ رجب ۱۰۶۲ھ کو "قطعی جعلی" (۱۴) قرار دیا ہے۔ یہ فیصلہ ڈاکٹر زور کے تحقیقی حزم و احتیاط کا اچھا ثبوت ہے۔

ایوانِ اردو میں مشاہیر کے خطوط اور حیدرآبادی تقاریب کے تقریباً دو ہزار رقعات بھی موجود ہیں۔ مشاہیر کے خطوط ادبی اعتبار سے اہم ہیں۔ حیدرآباد میں منعقد ہونے والی تقاریب کے رقعے جمع کرتے ہوئے ڈاکٹر زور نے نہ صرف تاریخ کو محفوظ کردیا ہے بلکہ حیدرآباد کی تہذیبی تاریخ بھی ایوانِ اردو میں مخزون ہوگئی ہے۔ دو ہزار رقعات میں سے صرف چند کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

راشد الخیری کی لڑکی راشدہ بیگم کے عقد کا رقعہ بابت ۱۹ محرم ۱۳۲۰ھ (عطیہ صغرا ہمایوں مرزا) نیم چند آصف جاہی کی دعوتِ افطار کا رقعہ بابت ۲۴ رمضان ۱۳۲۹ھ (عطیہ عنایت جنگ) ہمایوں مرزا کے جلسہ، امداد پسماندگانِ جنگِ روم و بلقان بابت، دے ۱۳۳۲ف (عطیہ صغرا ہمایوں مرزا) اساتذہ، نظام کالج کا رقعہ محفلِ ذکرِ میلاد بابت ۱۸ ربیع الثانی ۱۳۴۲ھ (عطیہ ڈاکٹر زور) محمد مظفر الدین کا رقعہ، عقد ڈاکٹر رضی الدین صدیقی بابت ۶ ربیع الاول ۱۳۴۴ھ (مظفر الدین صاحب ہی کا ایک رقعہ، عقد ڈاکٹر رضی الدین صدیقی بابت ۲۴ رجب ۱۳۵۲ھ بھی موجود ہے جس سے ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کے دو شادیوں کا پتہ چلتا ہے۔) بشیشور ناتھ واگھرے کا رقعہ، زنار بندی جتیندر ناتھ واگھرے (عطیہ عنایت جنگ)، سید غلام محمد قادری زخم کا رقعہ، عقد ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور بابت ۱۹ رجب ۱۳۵۱ھ (عطیہ ڈاکٹر زور) ہری پرشاد گوڑ کا رقعہ، عقد رائے محبوب نرائن گوڑ بابت ۱۹ / امرداد ۱۳۵۱ف منتظمین اقامت خانہ مسرت منزل کا رقعہ، عصرانہ کامیابی کرکٹ بابت ۲۳ / آبان ۱۳۵۱ (عطیہ محترمہ تہنیت النساء بیگم) مدرسہ، عالیہ کا رقعہ مشاعرہ و سالگرہ، ہمایونی بابت ۴ شعبان ۱۳۵۲ھ محمد مظفر الدین کا رقعہ ولیمہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی بابت ۲۶ شعبان ۱۳۵۲ھ (عطیہ ڈاکٹر زور) صدور و اساتذہ، جامعہ عثمانیہ کا رقعہ جامعہ عثمانیہ عصرانہ بہ اعزاز مفتیِ فلسطین بابت ۲۲ شہریور (عطیہ محترمہ تہنیت النسا بیگم) محمد عبدالرؤف کا رقعہ طیلسانین عثمانیہ کی پہلی سالانہ کانفرنس بابت ۱۱ دے ۱۳۵۴ف (عطیہ ڈاکٹر زور) مخدوم محی الدین رقعہ مشاعرہ جامعہ عثمانیہ بابت ۱۰ ڈسمبر (عطیہ ڈاکٹر زور) اہلیہ محمد عبدالرؤف رقعہ، سالگرہ اقبال عارف بابت ۵ دے ۱۳۵۴ف (عطیہ ڈاکٹر زور) گروچرن داس سکسینہ رقعہ، مشاعرہ خیر طرحی بہ صدارت کشن پرشاد بابت ۲۹ جولائی، حلیمہ بیگم رقعہ، عقد عوض سعید بابت ۲۳ ستمبر ۱۳۸۰ھ (عطیہ محترمہ تہنیت النساء بیگم) ڈاکٹر زور افتتاحِ ایوانِ اردو بابت ۲۲ مارچ ۱۹۶۰، ایوان کے نوادر میں تقریباً اسی (۸۰) میڈلس بھی محفوظ ہیں جس میں کل ہند اردو کانفرنس حیدرآباد دکن بابت ۱۹۴۴، بہ یادگار جشن جی شنن میڈل برائے اردو عالم ۱۹۴۳، (امۃ الرؤف) ادارہ ادبیات اردو ۱۳۴۵ف، مفید الانام ہائی اسکول، نظام کالج، مڈل اسکول اردو شریف "علم و عمل صالح"

نظام کالج ڈائمنڈ جوبلی ۱۹۴۷، عطیہ نواب ظہیر یار جنگ بہادر امیر پائیگاہ آسمان جاہی) نویں نمائش مصنوعات مملکتِ آصفیہ گورنمنٹ سٹی پرائمری اسکول دارالشفا حیدرآباد دکن۔ Walee & Awaken Western India Truf گورنمنٹ ہائی اسکو

...رگھاٹ، گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول ہنمکنڈہ ۱۹۵۲ء وغیرہ وغیرہ۔

ادارہ ادبیاتِ اردو کے نوادر میں سکہ جات کا بہت اہم ذخیرہ موجود ہے۔ سلطنت آندھرا قدیم کے سکے، کشان خاندان کے ...، پرتھوی راج، سکہ عہد چالوکیہ (نادر) اور عہد بہمنی کے سکے۔ جملہ نو بہمنی حکمرانوں کے سکے محفوظ ہیں جن میں احمد شاہ اول بہمنی ... دو عدد سکے اس لیے اہم قرار دیے جائیں گے کہ اسی بادشاہ کے عہد میں اردو کی پہلی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" لکھی گئی یہ سکے ۸۳۰ھ ... متعلق ہیں۔ غیاث الدین بلبن اور علاؤ الدین خلجی کے نایاب و کم یاب سکے بھی ادارے میں موجود ہیں۔ غیاث الدین تغلق اور محمد ... تغلق کے سکے بھی ہیں۔ محمد بن تغلق کا سکہ جو دولت آباد میں ضرب کیا گیا ادارے میں مخزون ہے جو بہت ہی نادر ہے۔ سلطنت ... کا ایک نایاب سکہ ہے۔ قطب شاہی سلطنت کے تین سلاطین کے سکے ہیں۔ مغل شاہنشاہوں میں اکبر اور اورنگ زیب کے سکے ... محفوظ ہیں۔ اورنگ زیب کا ایک سکہ حیدرآباد میں ضرب کیا گیا ہے۔ برہان نظام شاہ اور مرتضیٰ نظام شاہ کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی، وکٹوریہ، جارج پنجم، اور ایڈورڈ ہفتم کے سکے بھی ایوانِ اردو میں موجود ہیں۔ یہ تمام سکے نواب عنایت جنگ، فیاض الدین نظامی، محمد ...ف صاحب انجینیر، ڈاکٹر زور، ڈاکٹر غیاث صدیقی، اقبال کرشن اور حاجی محمد صلاح الدین قریشی کے عطا کردہ ہیں۔

ایوانِ اردو میں موجود اسلحہ میں شہنشاہ اکبر کی طلائی دستے والی ذوالفقار، تلوار عباسی، منقش ترکش جس میں ۴۰ عدد تیر ہیں، دو عدد ...ئی فولادی توپیں میوزیم کے شعبہ اسلحہ میں محفوظ ہیں۔ یہ اسلحہ نواب عنایت جنگ کا عطیہ ہیں۔ ڈاکٹر زور نے تذکرہ نوادرِ ایوانِ اردو ...۱۰ میں جلد اول کی شکل میں مرتب کیا تھا۔ وہ جلد دوم مرتب کرنا چاہتے تھے لیکن زندگی نے انھیں اس کی فرصت نہ دی۔ "سفینہ چاہیے ...بحر بیکراں کے لیے"

حوالے

زور، ڈاکٹر سید محی الدین قادری "دیباچہ طبع ثانی" تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول

۔ زور، ڈاکٹر محی الدین قادری "تذکرہ نوادر ایوان اردو" (جلد اول) حیدرآباد ۱۹۶۰، ص ۱۲

۔ محمد اکبر الدین صدیقی "نواب عنایت جنگ اور ادارہ" ماہنامہ سب رس حیدرآباد۔ اپریل ۱۹۷۱، ص ۳۱

۔ تذکرہ نوادرِ ایوانِ اردو۔ ص ۱۵

۔ نواب عنایت جنگ اور ادارہ۔ ص ۳۹

۔ تذکرہ نوادرِ ایوانِ اردو۔ ص ۱۰

۔ ایضاً۔ ص ۳۸۔ (۸)۔ ایضاً ص ۸۰۔ (۹) ایضاً ص ۸۲

ایضاً ص ۸۳۔ (۱۱) ... (۱۲) ایضاً ص ۹۳۔ (۱۳)۔ ایضاً (۱۴)۔ ایضاً ص ۷۹

ڈاکٹر موہن لال نگم

دکن کے اسلحہ اور اسلحہ سازی

ادارہ ادبیاتِ اردو کے خصوصی حوالے کے ساتھ

(تقریر کا اقتباس)

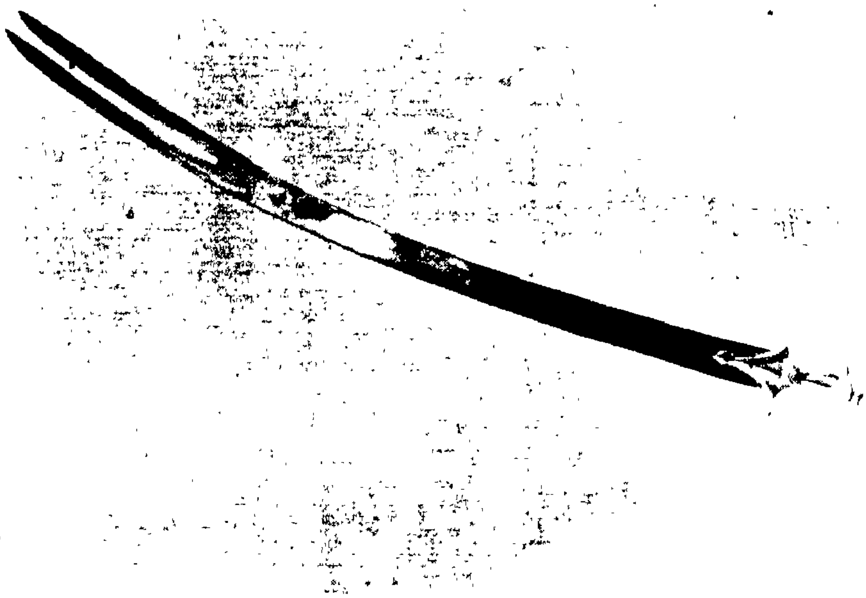
صدر جلسہ ، خواتین و حضرات :

سب سے پہلے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ میں ڈاکٹر مغنی تبسم کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کروں کہ انھوں نے مجھے یہاں دعوت دے کر اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا اور ساتھ ہی ساتھ ایک اہم موقع دیا کہ میں اس بڑی شخصیت کو جس نے نہ صرف حیدرآباد کی تاریخ پر کام کیا بلکہ یہاں کی تہذیب کو اجاگر کرنے کے لیے اپنی تمام زندگی کام کیا ، اپنا خراجِ عقیدت پیش کرسکوں ۔

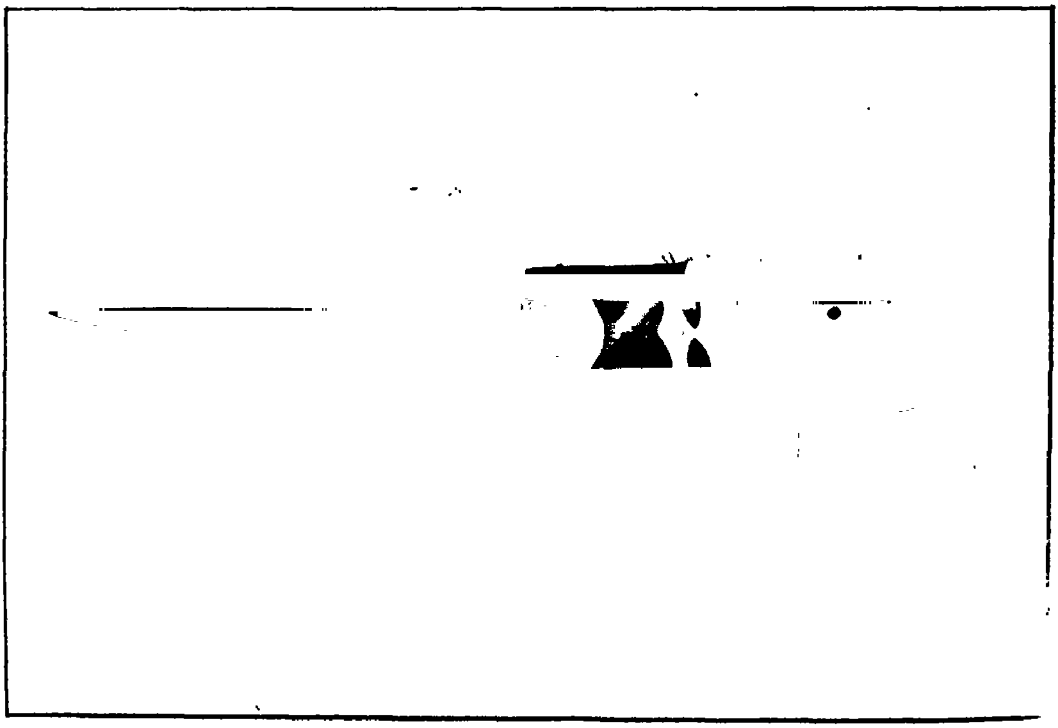
زور صاحب ان چند شخصیتوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی تمام زندگی یہاں کی پرانی تاریخ جاننے اور لکھنے ، نوادرات اکٹھا کرنے اور یہاں کی تہذیب کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے کی کوشش میں بسر کی ۔ میں سمجھتا ہوں کہ سب سے بڑا خراجِ عقیدت زور صاحب کو یہ ہوگا کہ اپنی زندگی میں جس کام کا انھوں نے آغاز کیا تھا (میری مراد ادارے کے میوزیم سے ہے) اسے ترقی دی جائے اور ایسا میوزیم بنائیں کہ جسے حیدرآباد میوزیم کہہ سکیں تاکہ باہر کا کوئی بھی آدمی یہاں آئے تو وہ اس میوزیم میں جاکر ایک نظر میں حیدرآباد کی تہذیب کو سمجھ سکے ۔ ڈاکٹر زور مرحوم کو یہ سب سے بڑا خراجِ عقیدت ہوگا ۔ میں اسٹیٹ گورنمنٹ سے درخواست کرتا ہوں کہ یہاں کے جتنے بھی بڑے لوگ ہیں چاہے وہ سیاسی ہوں ، چاہے وہ اڈمنسٹریٹرز ہوں سب مل کر کے ایک ایسا میوزیم قائم کرسکیں تو یہ زور صاحب کی ایک یادگار رہے گا ۔

مجھے حکم ہوا ہے کہ میں یہاں کے اسلحات پر اظہارِ خیال کروں ۔ حضرات ! یہاں جو ہتھیار ہیں وہ ایک تہذیب کی اور ایک دور کی چند چیزیں ہیں ۔ انھیں جاننے کے لیے اس زمانے کو اور اس عہد کی تاریخ کو سامنے رکھنا ہوگا ۔

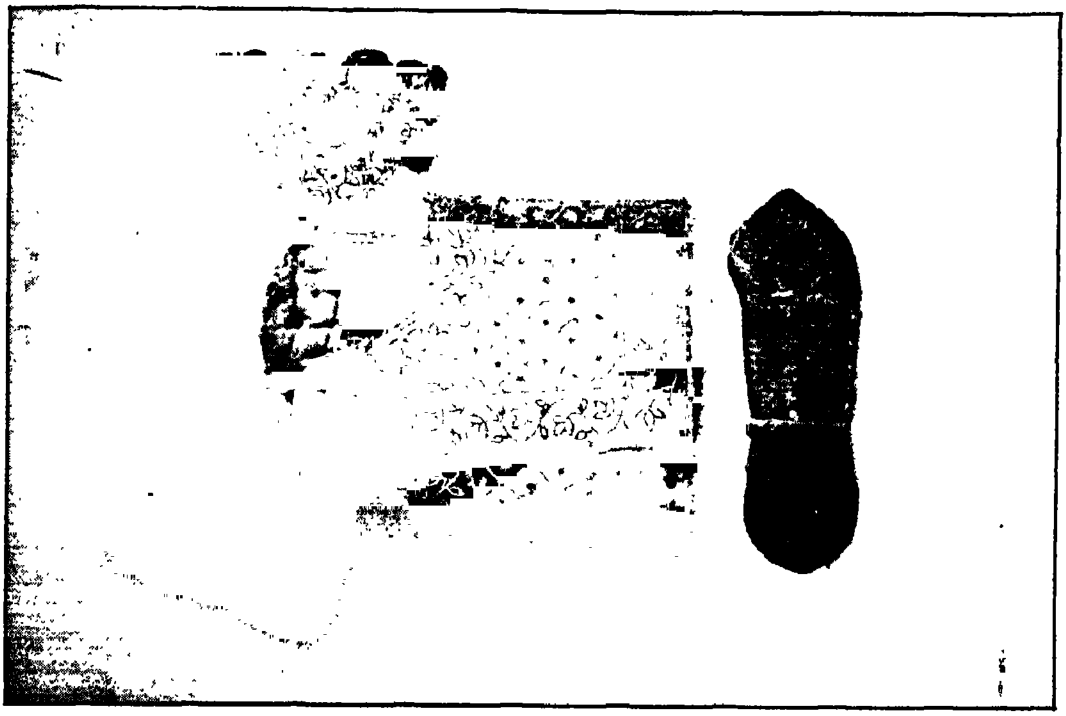
حیدرآباد شہر ، جب سے کہ یہ قائم ہوا اپنی تین اہم چیزوں کے لیے تمام دنیا میں مشہور تھا ۔ ایک تو تھی یہاں کی ٹکسٹائلز کپڑے کی صنعت ، دوسری تھی یہاں کی اسٹیل اور تیسرے تھے یہاں کے ہیرے ۔ یہ تینوں چیزیں حیدرآباد سے تمام دنیا کو جاتی تھیں اور حیدرآباد اس کے لیے مشہور تھا ۔ میرا موضوع اسٹیل سے تعلق رکھتا ہے ۔ حیدرآباد میں جو اسٹیل بنتی تھی وہ شاید دنیا کی سب سے پہلی اسٹیل تھی ۔ حیدرآباد میں جو آئرن اور (IRON ORE) نرمل سے قریب ایک گاؤں اندور میں ملتا تھا اس میں لوہا ملاکر اسٹیل بنائی جاتی تھی ۔ دنیا میں ایسی کوئی دوسری اسٹیل آج تک نہیں بنائی گئی ۔ صرف اسی اسٹیل میں جوہر پیدا ہوتا تھا اور یہی



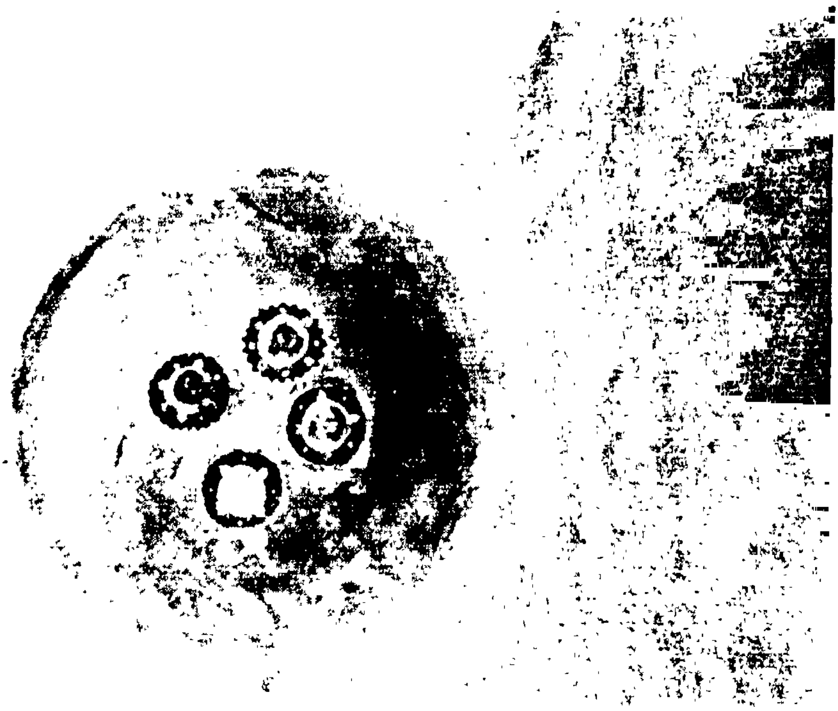
○ ذوالفقار اکبر بادشاہ



○ کٹار سنہری تحریر کردہ



○ زرہ کے نیچے پہننے کی وردی



○ چھوٹی ڈھال

ں ایران کو جاتی تھی ۔ دمشق میں اس اسٹیل کی تلواریں بنائی جاتی تھیں اور پھر لوٹ کر ہندستان میں آتی تھیں ۔ اس
ہتھیار یہاں پر رکھے ہوئے ہیں وہ اسی اسٹیل کے بنے ہوئے ہیں ۔ یہاں دو طرح کی اسٹیل کے ہتھیار بھی بنائے جاتے
۔ ہم کھیری کہتے ہیں ، دوسری کو فولاد ۔ یہ علاقہ دکنی ہتھیاروں کے لیے آج سے قریب پانچ ہزار سال پہلے سے بلکہ اس
سے جانا جاتا تھا ۔ آپ میں سے جو حضرات اسٹیٹ میوزیم گئے ہوں گے وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ وہاں جو
رکھی ہوئی ہیں ، تانبے کے دور (COPPER AGE) کی ہیں کہ جب لوہا ایجاد نہیں ہوا تھا اور انسان کو لوہے کا پتہ
نبے سے جو ہتھیار بنائے جاتے تھے ان میں سے تین تلواریں وہاں موجود ہیں اور ان تلواروں کو آج ANTENEE)
کہتے ہیں ۔ ANTENEE ایک طرح کا دستہ ہوتا ہے جیسے کہ چیونٹی کے دو ٹھنے ۔ ایک ادھر اور ایک ادھر ۔ یہ
سے پہلے دکن میں کلور مقام پر دستیاب ہوئی ہیں ۔ اس کے پہلے بھی ایسی تلواریں اتر پردیش کے مقام فتح پور میں ملی
ر آرکیالوجسٹ بی ۔ بی لال کا کہنا ہے کہ ان طرح کی تلواریں کم سے کم پندرہ سو قبل مسیح یا اس کے پہلے بنائی جاتی
ہا ایجاد نہیں ہوا تھا اور ان کو بنانے والے ASTROLOIDS قبیلے کے لوگ تھے جو سنٹرل ایشیا سے اتر بھارت میں
ھشن میں آئے اور اسی طرح سے یہ تلواریں اس دور کی یادگار ہیں ۔

نرات ! میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ علاقہ اپنے ہتھیاروں کی اسٹیل کے لیے تمام دنیا میں بہت عرصے سے مشہور
ز میں جو کھدائیاں ہوئیں ان میں قدیم زمانے کے خنجر اور تلواریں ملی ہیں ۔ اسٹیٹ میوزیم جائیں تو وہاں ان کھدائیوں کا
ملا ہوا ملے گا ۔ اس میں کچھ ایسے خنجر ہم کو ملے ہیں جن میں آدھا لوہا اور آدھا تانبا لگا ہوا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ
کے ہیں جب لوہا ایجاد تو ہوگیا تھا لیکن وہ اتنا کم تھا کہ ہتھیاروں میں پورا لوہا لگانا ان کے لیے مشکل تھا ۔ اس لیے اس
ز اشیا ملی ہیں ان میں کچھ سامان تانبے کا بنا ہوا ہے اور کچھ لوہے کا اور ان کی تاریخ کو ہم حضرت عیسیٰ سے بارہ سو سال
ں ۔ یہ تو ہوئیں چیزیں جو یہاں موجود ہیں ۔ اس کے بعد اور بھی بہت سی چیزیں ملی ہیں ۔ میں ان کی تفصیل میں نہیں
ب حیدرآباد کے ہتھیاروں کے بارے میں جاننے کے لیے ہم کو یہاں کی تہذیب اور یہاں کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنی ہوگی ۔
کہ مختلف زمانوں میں کن کن علاقوں کے اثرات یہاں کی تہذیب پر پڑے ۔ پہلا اثر تو ایران کا تھا ۔ قطب شاہی سلاطین
ہ بڑے دل دادہ تھے اور جب وہ سنٹرل ایشیا سے آئے تو ایران سے ہوتے ہوئے آئے ۔ اس لیے ان کو ایرانی کلچر سے
؟ تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے ہم کو جو ہتھیار یہاں ملتے ہیں وہ ایرانی تلواریں ہیں جن کو ہم عباسی کہتے ہیں اور ہمارے
ت ہے کہ یہاں ادارے میں عباسی تلواریں رکھی ہوئی ہیں اور اسے ہم سترھویں صدی کی مان سکتے ہیں ۔ ایرانی تلواریں
تیں ۔ ایک تو عباسی ہوتی تھی اور دوسری تلوار جو ہوتی تھی اس میں سامنے کی طرف سے خم ہوتا تھا ۔ دوسری طرح کی
کے میوزیم میں نہیں ہے جب قطب شاہی دور کا آغاز ہوا تو یہاں دکن میں ایک بہت بڑی تہذیبی ریاست تھی جس کو
کے نام سے جانتے ہیں ۔ ان کے اپنے ہتھیار ہوا کرتے تھے ۔ ان ہتھیاروں میں دو طرح کی تلواریں تھیں ۔ ایک تو خم
ں جو آگے کی طرف مڑی ہوئی ہوتی تھی ۔ آج کی تلوار کا جو خم ہوتا ہے وہ پیچھے کی طرف ہوتا ہے اور دوسری جو تلوار
ا بلیے کی طرح نوک پر مڑتی تھی ۔ قطب شاہوں نے یہاں کی تہذیب کے اثرات قبول کیے ۔ اس دور میں جو نئی تلوار
ں سے ہٹ کر تھی ۔ اس میں بلیڈ ہوتا تھا لیکن شروع میں جو بلیڈ بنے وہ سامنے کی طرف تھوڑا جھکے ہوئے تھے کیوں کہ

اس پر ایران کا قبضہ تھا۔ جب مغلوں نے ۱۶۸۷ء میں گول کنڈے کو فتح کیا۔ ان کی بہت بڑی فوج یہاں آگئی اور انھوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کی۔

مغل دور کے جتنے ہتھیار تھے وہ مغل فوج کے ساتھ آگئے اور اسی طرح کے ہتھیار بننے لگے۔ ان میں دو تین چیزیں تھیں۔ اگر آپ آئینِ اکبری پڑھیں تو اس میں مغلوں کے ہتھیاروں کے بارے میں بہت تفصیل دی گئی ہے۔ میوزیم میں جو ہتھیار رکھے ہوئے ہیں ان میں مغلوں کے عہد کی تلواریں بھی ہیں۔ یہاں ایک بڑی اہم تلوار رکھی ہوئی ہے۔ اگر ہم اس کو مستند مان لیں تو اس میں ایک INSCRIPTON بھی ہے۔ وہ بادشاہ اکبر کی ہے۔ اس پر جو عبارت لکھی ہوئی ہے اس میں بادشاہ کا لفظ نہیں ہے۔ اسی لیے میں اس کو تھوڑا سا مشکوک سمجھتا ہوں حالاں کہ ان کا نام جلال الدین غازی کندہ ہے۔ لیکن بادشاہ کا لفظ اس میں نہیں ہے۔ دوسری اس کی عبارت کا خط نسخ ہونا چاہیے تھا جو اس زمانے میں رائج تھا۔ یہ بہر حال ایک تلوار یہاں پر اکبر کے نام کی بھی رکھی ہوئی ہے جسے آپ میوزیم میں دیکھ سکتے ہیں اور اس کی صورت شکل بھی ان تلواروں سے ملتی جلتی ہے جو مغلیہ دور کے شروع میں بنتی تھیں۔ اس طرح سے اور بھی یہاں بہت سی تلواریں ہیں لیکن ان کی تفصیل میں نہ جاؤں گا۔ ان میں جو زیادہ تر عبارت کندہ ہے ان میں قرآن شریف سے ایسی آیتیں لی گئی ہیں جن میں کہ فتح کے لیے اللہ کی مدد کا ذکر ہے جیسے "نصر من اللہ و فتح قریب"۔ لیکن ایسی تلواریں نہیں ہیں جن پر کسی بادشاہ کا نام ہو یا کسی تاریخی چیز کا ذکر ہو۔ یہاں سترھویں صدی کا ایک زرہ بکتر بھی رکھا ہوا ہے جو بہت نایاب ہے۔

مغلوں کے عہدِ حکومت میں یہاں پر ڈچ آئے، پرتگیز آئے، فرانسیسی آئے اور انگریز آئے۔ ان کو یہاں کی تلواریں راس نہیں آئیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ یہاں کا جو بلیڈ ہوتا تھا وہ لچک دار نہیں ہوتا تھا۔ دکن کی صرف ایک ہی تلوار ایسی تھی جس کا بلیڈ بہت لچک دار ہوتا تھا۔ اس کو اصل کہتے تھے۔ بادشاہ جہانگیر تزکِ جہانگیری میں لکھتا ہے کہ ہندستان میں سب سے اچھی تلوار دکن میں حیدرآباد میں بنتی ہے اور اس تلوار کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو اگر جھکایا جائے تو یہ دھنش کی طرح جھک جاتی ہے اور ٹوٹتی نہیں۔ وہ تو نہیں ٹوٹتی تھی مگر دیگر تلواروں کے بلیڈ جو بڑے سخت اور بے لچک ہوتے تھے لڑائی میں ٹوٹ جاتے تھے۔ دوسری کم زوری یہاں کی تلواروں میں یہ تھی کہ یہ صرف کاٹنے کے کام آتی تھی۔ ان کو گھونپ نہیں سکتے تھے۔انگریزوں نے وہ تلواریں پسند کی تھیں جو گھڑ سوار فوجوں کے کام آئیں۔ اس لیے مرہٹوں اور انگریزوں نے ایسی ہی تلواروں کو پسند کیا۔ گھڑ سوار یا گھڑ سواروں کی سینا جب آگے بڑھتی تھی تو اس میں ان کو ایسی تلواروں کی ضرورت پڑتی تھی جو ادھر بھی کاٹ سکیں اور ادھر بھی کاٹ سکیں۔ یعنی وہ دو دھاری تلوار ہونی چاہیے جب کہ دکن کی تلواروں میں ایک ہی طرف دھار ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ تلوار کو نوکیلا بھی ہونا چاہیے تاکہ سامنے سے اگر دشمن آتا ہے تو اس کے جسم میں اسے گھونپ سکیں۔ ایسی تلواروں کے جو بلیڈز ہوتے تھے وہ یورپ میں بنتے تھے۔ ہمارے اس کلکشن میں ایسی بھی تلواریں ہیں جن میں جرمنی ہسپانوی اور اطالوی بلیڈز ہیں اور ان کے قبضے ہندستانی ہیں۔ اس طرح کی تلواریں مرہٹوں نے زیادہ پسند کیں کیوں کہ مرہٹوں کے سپاہی گوریلا جنگ لڑتے تھے۔ وہ جنگلوں میں رہتے تھے اور رات کو گھوڑوں پر سوار ہوکر اچانک حملے کرتے تھے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ مرہٹوں کی فوج میں زیادہ تر گھوڑیاں ہوتی تھیں، گھوڑے نہیں ہوتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گھوڑیاں رات کو زیادہ آواز نہیں کرتی تھیں جب کہ گھوڑا زیادہ ہنہناتا رہتا ہے۔ اس لیے گوریلا جنگ کے لیے ضروری ہوتا تھا کہ جب وہ حملہ کریں ان کے گھوڑوں کی آواز دشمن کی فوج تک نہ پہنچ سکے۔

اس لیے زیادہ تر وہ گھوڑیاں رکھتے تھے اور گھونپنے والی تلوار رکھتے تھے جس میں دونوں طرف دھار ہوتی تھی ۔

میوزیم میں سترھویں اور اٹھارویں صدی عیسوی کی جو جرمنی اور اسپینی تلواریں رکھی ہیں ان کے دستے ہندستان اور دکن کے بنے ہوئے ہیں ۔ ان پر جو صراحی نما قبضہ ہے وہ ہندستان کا بنا ہوا ہے ۔ ان میں جو تحریر کندہ ہے وہ بھی ہندستان کی ہے لیکن ان کے بلیڈز باہر کے ہیں اور زیادہ تر ان کو آصف جاہی دور میں لایا گیا ۔ جو جوہر دار تلواریں ہیں وہ زیادہ تر مختلف تقاریب کے لیے ہوتی تھیں ۔ ان کے دستوں میں ہیرے جواہرات جڑے ہوتے تھے اور اس میں خاص عبارتیں کندہ ہوتی تھی لیکن وہ صرف نمائش کے لیے بلٹ میں ڈالے جاتے تھے ۔ ان سے لڑائی میں کام نہیں لیا جاتا تھا ۔ تیز دھار والے ہتھیاروں سے حفاظت کے لیے خاص زرہ بکتر تیار کیے جاتے تھے جو سر کے لیے الگ اور سینے کے لیے الگ ہوتے تھے ۔ ہاتھوں کے لیے الگ دستانے ہوتے تھے کہ کہیں پر وار کیا جائے تو جسم پر نہ لگ سکے ۔ یہاں پر ایک بہت عمدہ زرہ بکتر بھی ہے اس میں کاٹن ہیڈنگ دی ہوتی ہے تاکہ جب کوئی پہنے تو جسم کو کسی طرح کی چوٹ نہ پہنچے اور وہ لڑائی میں باقاعدہ حفاظت کے ساتھ اپنی لڑائی لڑ سکے ۔ ایسے بہت سے ہتھیار یہاں پر رکھے ہوئے ہیں ۔

انگریزوں کے آنے کے بعد بلکہ مغلوں کے دور سے ہی آتشیں اسلحہ کا دور شروع ہوچکا تھا ۔ لڑائی توپ اور بندوق سے لڑی جاتی تھی تیر اور تلوار سے نہیں ۔ اس لیے یہ ہتھیار اب میوزیم کی زینت بن گئے ہیں لیکن پھر بھی یہ جو ہتھیار یہاں رکھے ہوئے ہیں ہمارے اس دور کی تہذیب اور تاریخ کو اجاگر کرنے کے لیے جو کام کیا ہے وہ بہت اہم ہے ایسے کام ہونے چاہئیں ، کیوں کہ حیدرآباد کی پہچان ختم ہوتی جاتی ہے اور پہچان اس وقت ختم ہوتی ہے جب تہذیب ختم ہوتی ہے ۔ تہذیب ہی ہماری پہچان ہے اور جب پہچان مٹ جاتی ہے تو ہم لاوارث ہوجاتے ہیں ۔ نہ ہمارا کوئی وارث رہ جاتا ہے نہ ہماری کوئی سکونت رہ جاتی ہے ۔

دوستو ! اگر ہم کو لاوارث نہیں بننا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اپنی تہذیب کو زندہ رکھیں ۔ انگریزوں نے اس دور کی تاریخ کو ختم کیا ۔ آزادی کے بعد ہمارا پہلا فرض ہوجاتا ہے کہ ہم اپنی تاریخ اور اپنی تہذیب کو زندہ کریں ۔

میں ایک شعر پر اپنی اس بات کو ختم کروں گا جو انگریزوں کے دور سے تعلق رکھتی ہے ۔

ان اجالوں نے تو تاریخ جلا کر رکھ دی
اس سے بہتر تھا کہ ہر سمت اندھیرا ہوتا

(سلسلہ ص ۴۵)

(بیربہوٹی جیسی) گہری سرخ روشنائی میں تحریر کئے گئے ہیں۔ ان کی تفصیل فہرست نوادر (جلد اول) مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور میں دیکھی جاسکتی ہے۔

خط اطلی کے نمونوں کی ایک وضاحتی فہرست مرتب کی جانی چاہیئے جس سے محققین استفادہ کرسکیں۔

محمد عبد القیوم

ادارہ ادبیاتِ اردو کے میوزیم میں مخزونہ تصویریں

ہاتھی دانت پر سلاطینِ قطب شاہیہ کی رنگین تصاویر

ہاتھی دانت پر نازک موئے قلم سے چھوٹی چھوٹی عمدہ تصویریں اتارنے کا کام شمالی ہند میں آگرہ اور دلی میں اور جنوبی ہند میں میسور اور بنگلور میں تقریباً تین صدیوں سے ہوتا رہا ہے۔ گول کنڈہ اور حیدرآباد میں بنائے گئے ایسے نمونے شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ یہ تمام ہاتھی دانت پر بنی رنگین تصاویر بیسویں صدی میں بنائی گئی ہیں۔ یہ نفیس نقاشی کا ایک نمونہ ہیں۔ ہر تصویر پر سنہرے رنگ میں بادشاہوں کے نام بھی لکھے گئے ہیں اور جملہ تصویریں ایک ہی سائز میں تیار کی گئی ہیں۔

۱۔ سلطان قلی قطب شاہ اول
۲۔ جمشید قطب شاہ
۳۔ ابراہیم قطب شاہ
۴۔ محمد قلی قطب شاہ
۵۔ سلطان محمد قطب شاہ
۶۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ
۷۔ ابوالحسن تانا شاہ

غالباً یہ تصاویر مشہور دکنی مصور وینکٹ رامیا کے ہاتھوں کی بنی ہوئی ہیں۔ ان سلاطین کی تصاویر میں جمشید قلی اور ابراہیم قلی قطب شاہ کو مغلیہ طرز کے لباس میں بتایا گیا ہے۔ اس طرز کا لباس اورنگ زیب عالم گیر اور آصف جاہ اول کے دور میں مروج رہا ہے۔ عام طور پر قطب شاہی سلاطین کی تصویریں محمد قلی قطب شاہ کے آخری دور میں بنائی گئی ہیں۔ جس میں سلطان قلی قطب شاہ اول، جمشید قطب شاہ اور ابراہیم قطب شاہ شامل ہیں۔ ان تینوں بادشاہوں کے دور میں بنی تصویریں ابھی تک دستیاب نہیں ہوئی ہیں۔ اس کے بعد سلطان محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ کے دور میں بہترین اور عمدہ تصویریں بنائی گئی ہیں۔

آصفی سلاطین و امرا کی تصویریں

۱۔ میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی: اس تصویر میں نیگوں رنگ کی زمین پر میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کو بتایا گیا ہے۔ ایک ہاتھ میں دستنبو ہے اور بایاں ہاتھ تلوار پر ٹکا ہوا ہے۔ اس تصویر کے اطراف سرخ رنگ کا حاشیہ ہے اور یہ تصویر دکنی قلم کا نمونہ ہے۔ اس کا سائز "۱۴" × "۱۰" ہے۔



○ آصف جاہ ثانی



○ ملکہ چاند بی بی



۱۔ لیلیٰ مجنوں



۲۔ آصف جاہ ثانی اور رکن الدولہ

۲ ۔ نظام علی خاں آصف جاہ ثانی اور رکن الدولہ دیوانِ دکن : یہ بھی عمدہ رنگین تصویر ہے ۔ آصف جاہ ثانی ایک منقش زرکار شامیانے کے نیچے زرین مسند پہ شاہی خلعت میں تشریف فرما ہیں ۔ اور بائیں ہاتھ کے قریب مسند پر تلوار شاہی رکھی ہوتی ہے ۔ پس منظر میں پھول دار پودے اور سرو کے درخت خوش گوار ماحول کی عکاسی کر رہے ہیں اور سامنے حوض میں فوارہ اور چمن بندی دیکھی جاسکتی ہے ۔ آصف جاہ ثانی کے سامنے چاندنی کے فرش پر نواب رکن الدولہ ہاتھ جوڑے بیٹھے ہیں ۔ نظام علی خاں چہرے مہرے سے جوان آدمی معلوم ہوتے ہیں ۔ چناں چہ ان کی مونچھیں بھی سیاہ ہیں ۔ ان کی استادہ تصویر میں مونچھیں سفید ہیں اور وہ ارسطو جاہ کی دیوانی کے زمانے کی تصویر ہے ۔ سائز ۸" × ۶" ہے ۔

۳ ۔ ارسطو جاہ : یہ تصویر بھی نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کا جوڑ معلوم ہوتی ہے مشیر الملک اعظم الامرا ارسطو جاہ ، آصف جاہ ثانی کے آخری دیوان تھے ۔ اس تصویر میں وہ دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے کھڑے ہیں ۔ پگڑی پر طرہ ، جیغہ اور کلغی موجود ہے ۔ ان کے پاجامہ کا رنگ گہرا نیلگوں ہے اس کے برخلاف آصف جاہ ثانی کا پاجامہ ہلکے سرخ رنگ کا ہے ۔ سائز ۱۳" × ۱۰" ہے ۔

۴ ۔ نواب رکن الدولہ : میر موسیٰ خاں رکن الدولہ شرف الملک ، میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے اس وقت دیوان تھے جب کہ حیدرآباد پایہ ، تخت نہیں بنا تھا (۱۷۶۵ء سے قبل) اور سلطنتِ آصفی کا مستقر اورنگ آباد ہی تھا ۔ ان سے پہلے یہ خطاب (رکن الدولہ) دوسرے امراءِ آصفی کو بھی مل چکا تھا ۔ چناں چہ نصیر جنگ رکن الدولہ بھی ان سے قبل دیوان دکن رہ چکے ہیں ۔ میر موسیٰ خاں رکن الدولہ کی تحریک پر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی نے اپنا پایہ ، تخت اورنگ آباد کے بہ جائے حیدرآباد کو پایہ ، تخت قرار دیا تھا ۔

اس تصویر میں رکن الدولہ ایک نہایت خوب صورت قالین پر بیٹھے ہوئے ہیں ۔ بائیں ہاتھ میں پتے کی شکل کا دستنبو ہے سیدھا ہاتھ خالی ہے ۔ سامنے ایک خوب صورت حقہ دھرا ہوا ہے ۔ ان کی پگڑی سرپیچ ، جیغہ اور سیاہ کلغی سے آراستہ ہے ۔ تصویر میں بہت ہی نازک نقش و نگار کا رنگین کام ہے اور یہ تصویر دکن اسکول کی بہت عمدہ تصویروں میں سے ہے ۔ (سائز : ۸" × ۶")

۵ ۔ نواب تہور الملک شرف الدولہ شرف الامرا : نواب شرف الامرا نواب رکن الدولہ کے بھائی تھے ۔ یہ تصویر اعلیٰ کام سے آراستہ ہے ۔ سبز رنگ کی مسند پر نشستہ ہیں اور ہاتھ میں حقہ کی نے ہے ۔ حقے پر بیدری کام دیکھا جاسکتا ہے ۔ پگڑی پر سنہری سرپیچ اور جیغہ ہے اور اس پر سیاہ کلغی ہے ۔ گلے میں موتیوں کے دو خوب صورت ہار ہیں ۔

۶ ۔ نواب داور الدولہ : یہ نواب رکن الدولہ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ۔ یہ تصویر سید قاسم مصور نے ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء میں بنائی تھی ۔ چناں چہ اس کی پیشانی پر سنہرے حروف میں اپنا اور صاحبِ تصویر کا نام اور تاریخ بھی لکھ دی ہے ۔

داور الدولہ ایک بیدری کام کے سیاہ تخت پر سبز مسند پر نشستہ ہیں ۔ ان کے ہاتھ میں سرخ پھولوں کی وضع کا دستنبو ہے ۔ سامنے سیدھی طرف بیدری کام کا سیاہ اگال دان اور بائیں طرف سنہری کام کا چنگیر ہے ۔ گلے میں زمرد کا کنٹھا ہے ۔ (سائز ۵" × ۶")

۷ ۔ میر موسیٰ خاں خلفِ شرف الامرا : یہ ایک بڑی تصویر ہے ۔ جس میں میر موسیٰ خاں شکار کے لیے گھوڑے پر سوار جارہے ہیں ۔ ہاتھ میں باز ہے اور آگے پیچھے ملازمین بندوقیں ، چیتے ، باز ، شکار کیے ہوئے پرندے اور دوسرا سامانِ شکار لیے ہوئے چل رہے ہیں ۔ پیچھے ایک ملازم آفتاب گیری تھامے ہوئے اور دوسرا رومال ۔ پس منظر میں مرغابیاں اور سارس دکھائے گئے ہیں اور دونوں جانب عمارتیں جیسے محلات اور مسجد کے گنبد اور مینار دیکھے جاسکتے ہیں ۔ سواری کا گھوڑا ، زیور اور کلغی سے آراستہ ہے ۔ یہ تصویر اپنے عہد کی دکنی تصویروں کی اچھی نمائندہ ہے ۔

۸۔ **میر اکبر علی خاں سکندر جاہ آصف جاہِ ثالث اور راجہ چندو لال :** اس تصویر میں آصف جاہِ ثالث ہاتھ میں دستنبو لیے سرخ مسند پر بیٹھے ہیں ۔ اور ان کے دیوان راجہ چندو لال سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے ہیں ۔ سکندر جاہ کے چہرہ پر آب زدگی کی وجہ سے دھبے آگئے ہیں ۔ دوسری تصویر میں سکندر جاہ ایک نازک کرسی پر ہاتھ میں دستنبو لیے ہوئے نشست ہیں اور سامنے راجہ چندو لال دست بستہ کھڑے ہیں ۔ دکھنی اسکول کی یہ اچھی تصاویر ہیں ۔ (سائز : "۱۱ × "۸ اور "۶ × "۵) ۔

۹۔ **نواب سکندر جاہ آصف جاہِ ثالث :** یہ سکندر جاہ کی بہت ہی عمدہ تصویر ہے اور اس میں طلائی کام اب تک روشن ہے ۔ اس تصویر میں سکندر جاہ طلائی کام کی کرسی پر سیدھے ہاتھ میں دستنبو لیے بیٹھے ہوئے ہیں ۔ اور بائیں ہاتھ میں تلوار ہے جس کی میان زرین ہے ۔ (سائز : "۱۰ × "۶) ۔

۱۰۔ **چاند سلطانہ :** ملکہ چاند بی بی کی یہ تصویر عمدہ نقاشی کا نمونہ ہے اس تصویر میں وہ دوڑتے ہوئے گھوڑے پر سوار ہے ہاتھ میں باز ہے اور آسمان میں مرغابیاں اڑ رہی ہیں ۔ ساتھ ساتھ دو شکاری کتے بھی دوڑ رہے ہیں ۔ گھوڑا بہت ہی خوب صورت ہے ۔ زرین لگام اور زیور سے آراستہ ہے ۔ سائز ("۱۰ × "۶) ۔

۱۱۔ **حیات بخش بیگم :** اس تصویر میں ایک سرخ مسند پر حقہ پیتی ہوئی بیٹھی ہوئی ہیں ۔ سامنے تلوار ، اگال دان اور دیگر اشیا دھری ہیں ۔ سر پر مغلیہ وضع کی پگڑی اور کلغی ہے ۔ صورت میں چاند بی بی سے مشابہ دکھائی گئی ہے ۔ (سائز : "۶ × "۴)

آج تک حیات بخش بیگم کی تصویر دستیاب نہیں ہوئی اور نہ کہیں شائع کی گئی ہے اس لیے صحیح طور پر اس تصویر کو حیات بخش بیگم کی تصویر تسلیم کرنا درست نہ ہوگا ۔ غالباً دونوں تصاویر اٹھارویں صدی میں تیار کی گئی ہیں ۔ ہم جانتے ہیں کہ حیات بخش بیگم دختر محمد قلی قطب شاہ سال ہا سال تک گول کنڈہ کی ملکہ تھیں ۔

اس کے علاوہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ ، میر محمود اولیاؒ ، حکیم الملک گیلانی اور شاہ خلیل اللہ بت شکن کی تصاویر بھی ادارہ ، ہذا میں ہیں ۔

دوسری قدیم تصویروں میں : حضرت امام حسن علیہ السلام ، حضرت امام حسین علیہ السلام ، حضرت محبوب سبحانی عبدالقادر جیلانیؒ ۔

لیلیٰ مجنوں : اس تصویر میں مجنوں کو بہت ہی لاغر حالت میں ایک ٹیلے پر بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے ۔ ٹیلے کے نیچے لیلیٰ میں کوئی نذرانہ لیے شاہی لباس میں بیٹھی ہے۔اس کے پیچھے ایک خادمہ مور چھل جھلتی کھڑی ہے ۔ پس منظر میں ایک اونٹ بیٹھا ہے جس پر محمل لدا ہے ۔ غالباً یہ تصاویر حیدرآباد کے کسی آرٹسٹ کی بنائی ہوئی ہیں ۔ اطراف سرخ حاشیہ ہے ۔ لیلیٰ کا لباس ، شکل و صورت قطب شاہی شہزادیوں جیسی ہے ۔ (سائز : "۸ × "۵) ۔

اس کے علاوہ مشاہیرِ اردو کی قدیم قلمی تصویریں ہیں اور اربابِ ادارہ ، ہذا کی رنگین تصویریں میر احمد علی آرٹسٹ نے ۱۹۲۸ میں اور بعد میں بنوائیں ۔

○●○

محمد ضمیر الدین خدری نظامی محفوظ رقم

اِدارۂ ادبیاتِ اُردو اور گوشۂ خطّاطی

★ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ہ "تحریر حروف کے نقوش اور شکلیں ہیں، جو سُنی ہوئی ایسی باتوں کی جانب رہنمائی کرتی ہیں، جو کہ ارادہ کی گئی ہوں" (مقدمہ ابنِ خلدون)

★ ابو دلف کا قول ہے کہ "تحریر مختلف علوم کا باغ ہے، اور قلم کلام کا بنانے والا اور ذخیرہ کیے ہوئے علم کو سانچے میں ڈھالنے والا ہے۔

قُطب شاہی عہد کے ادبی مورّخ، دکنی زبان و ادب کے محقق، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ صاحب، بانیِ ادارۂ ادبیات اُردو نے دکنی ادب کی اِرتقا کے لیے علمی خزینہ جمع کرنے کے سلسلے میں اپنے ذوقِ علمی کا ثبوت اس طرح دیا کہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو میں قلمی نسخوں (مخطوطات۔ خطّاطی) کا ایک نادر و عظیم گوشہ قائم کیا، جو بیش بہا خزانہ ہی نہیں بلکہ محققین کے لئے ایک اہم تاریخی ورثہ بھی ہے۔ قطب شاہی، آصف جاہی شاہوں، اُمرا، بزرگوں اور دکنی نوابوں اور اہلِ قلم حضرات کے رشحاتِ قلم کی خطّاطی میں اُستاذانہ نزاکتِ فن کے کارنامے اس گوشے میں محفوظ ہیں۔ خطّاطی کے چند نمونوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

خانخاناں نے ۱۳۱۶ ہجری میں فارسی شعر

★ خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر
توجہ دانے کہ دریں گرد سوارے باشد

عمدہ وصلی پر فن کی باریکی، نوک و پلک اور کشش کے ساتھ جلے چاول اور مازو کی بنی سیاہی سے انتہائی روشن کتابت کی، جو اپنی مثال آپ ہے (۱۰۲) سال قدیم اس روشن کتابت کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آج ہی لکھی گئی وصلی ہے۔

★ 123 سال قبل یعنی ۱۲۹۰ ہجری میں سید اسد علی خاں نظام یار جنگ بہادر نے ایک مرصع قطعہ تحریر کیا ہے جو فنِ نستعلیق کا ایک عمدہ شاہکار ہے۔ سات دائروں میں یکسانیت، کشش کی خوبی، نوک و پلک کے بانکپن کے ساتھ کاجل کی سیاہی جس میں مازو شامل ہے، انتہائی روشن چمک دار کتابت کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تازہ کتابت ہے۔

چمن از عیدِ فطر جلوہ فروش
گل کند عندلیب خروش

دم افطار روزۂ مستان
شیشہ در رقص گشت و جام بجوش

★ عماد الدین احمد خوش نویس نے خطِ نستعلیق میں کٹے کی سیاہی سے ایک ہی سطر میں بقلم جلی

اَنَا مَدِینَۃُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ بَابُهَا

نہایت ہی خوبی سے لکھا لیکن اس میں گردشِ قلم کی نزاکت یہ ہے کہ (علی) کے ل لام کو قلم میں سیاہی کی کمی کے باعث چھوٹا کر کے خوب نبھایا ہے۔ یہ نسخہ ۱۲۸ سال قبل یعنی ۱۲۹۰ ہجری میں لکھا گیا۔

★ محمد باقر زرّین قلم نستعلیق کے بلند پایہ خطّاط گذرے ہیں۔ خاص میر عماد الحسنی کی طرز پر لکھتے تھے۔ ۱۲۹۳ھ میں ایک رباعی رقم کی جس میں پندرہ دائرے ہیں، دائروں میں یکسانیت پیدا کی گئی، ان میں تیرہ دائرے بیضوی لکھے، دو دائروں میں سانس کے ٹوٹ جانے سے فرق آگیا، تب انھوں نے بہت ہی نزاکت سے اس کو آفتابی شکل دے دی۔ یہ فرق تو جانکاری رکھنے والا ہی جانتا ہے۔

اس نمونے میں مصوّر نے مہین گل کاری کی ہے اس پر طلائی کام اور فیروزہ بانڈر ہے۔ اسی طرح ۱۲۹۳ھ کا ایک شعر بھی خطاطی کی شان نوک پلک کے ساتھ تحریر کیا ہے۔

صد ہزاراں صورت اندر قالبِ حسن و جمال
ریختند اما تو مطبوع تر کم ریختند

اس شعر کی کتابت میں تین سید ھے دائرے ہیں جو یکسانیت کے ساتھ ہیں۔ دوسرے مصرعے میں ریختند دو مرتبہ اول و آخر آیا ہے اور مطبوع میں طا اور ب کو ملانے والی کشش اور درمیان میں (ع) نہایت خوب صورتی کے ساتھ اصولی طور پر تحریر ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ آن کا کمالِ فن ہے۔

★ ۱۴۶ سال قبل ۹۵ سال کی عمر میں محمد امیر رضوی نے ۱۲۷۴ء میں بہ خطِ نستعلیق نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ اس خوب صورتی سے کتابت کی کہ ف۔ ت۔ ق کے نقاط ایک میزانیہ میں ہیں۔ مقسام سے پیمائش کریں تو کسی قسم فرق نہ پائیں گے۔

▬ اسی طرح موصوف کا ۱۲۷۳ھ میں کتھے کی سیاہی سے لکھا دوسرا نسخہ کلمۂ طیبہ کا ہے جس میں فنی نزاکت موجود ہے اور سبحان تری قدرت بھی نوک پلک کی خوبی سے تحریر کیا ہے۔

★ محمد مظفر الدین ماہر خطاط اور امراء و روساء اور شاہ وقت کے اُستاذ رہے۔ فارسی زبان میں دُعائیہ کلام نہایت ہی خوب صورت اور نوک پلک کے ساتھ تحریر کیا ہے اور حاشیہ پر مختلف انداز میں مضمون بھی درج ہے۔ فیروزہ، شنگرف، شجرکاری کے ساتھ مصوّر نے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسی طرح دوسرا نسخہ بھی موجود ہے۔ یہ نسخے ۱۲۹۹ھ کے تحریر کردہ ہیں۔ انہی کا ۱۳۲۷ھ میں لکھا ایک قطعہ خطاطی کے بانکپن کے ساتھ طلائی سبز رنگ کے کام میں ہے۔ ان کے ہاتھ کے لکھی تحریروں سے خطاطی کے کمالِ فن کا اندازہ ہوتا ہے۔

▬ اس دَور کے ایک اور خوش نویس نے جن کا نام اننت کشن راؤ ہے۔ کاجل اور بادام کی بنی سیاہی سے ایک دُعائیہ رباعی تحریر کی ہے جس میں تین دائرے ہیں۔ مصوّر نے طلائی گل کاری سے مُزیّن کیا ہے۔ رباعی یہ ہے،

خداوندِ دولت وحیدِ زمن	پناہِ ریاست وزیرِ دکن
بصد حشمت وجاہ مختارِ ملک	بماناد در سایۂ پنجتن

اننت کشن راؤ نے دورانِ ملازمت مختار الملک کی شان میں یہ دُعائیہ رباعی تحریر کر کے قُرب حاصل کیا۔

★ ایک قطعہ بہ عنوان مسجع بہ اسم گرامی یوسف علی صاحب دام ظلہٗ عالی جناب نواب میر ریاضت علی خان محبوب یار جنگ بہادر دام اقبالہٗ وصلی انتہائی خوبصورتی سے کتابت کی ہوئی ہے۔ اس میں گل کاری۔ آبِ زر، شنگرف، یاقوت و زمرد کے کام میں جو دیدہ زیب ہے۔

▬ قطعہ ۱۳۰۳ھ کا نسخہ ہے۔ راقم جانکی پرشاد سیاہ نویس تھے جنھیں نے محبوب یار جنگ ذی جاہ کو یہ قطعہ پیش کیا تھا۔

★ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے گوشۂ خطاطی میں مزید قلمی نسخے ہیں۔ جن میں محمد باقر زرّین قلم کے قلمی نسخوں میں بعض مقامات پر نہایت نزاکت و ندرت سے تحریر کردہ ایک شعر ہے۔ جس میں دس کشش اور ساتھ دائرے ہیں۔

مست باش و خموش و شکستہ باش و خاموش کہ سبوی
درست را بدست برند و شکستہ را بدوس از حسین منصور پرسند

اس پر سنہرا کام ہے۔

ایک اور شعر میں "ق" کی ترکیب کو فنی یکسانیت کے ساتھ تحریر کیا ہے مقسام سے اگر ناپا جائے تو دوائر میں فرق نہ پائیں گے۔

نرزم قصۂ دوستی دانی چرا درازست از آنکہ دوست نیازست
ہر کہ دانست کہ خالق در حق خلق بذنگرو از غیب برات

اسی طرح مندرجہ ذیل شعر میں بارہ دائرے سیدھے ہیں اور کشش چار قسم سے لکھی گئی ہے اور ایک خاص جوڑ نہایت عمدہ و نادر ہے جس کو آج کا خطاط یا خوش نویس ماننے یا لکھنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔

شعر اس طرح ہے،

خود را نمی پسند اگر حاضری بانگی و اگر غافلی ہزار سخن بدانکے
دوستی گزیں کہ ہیچ ملول نشود سلطانی گزیں کہ ہرگز معزول نشود

اس شعر میں "پسند" والی جوڑ نادر ہے۔ دائروں میں یکسانیت ہے سیاہی دُھندلی پڑتی جا رہی ہے۔

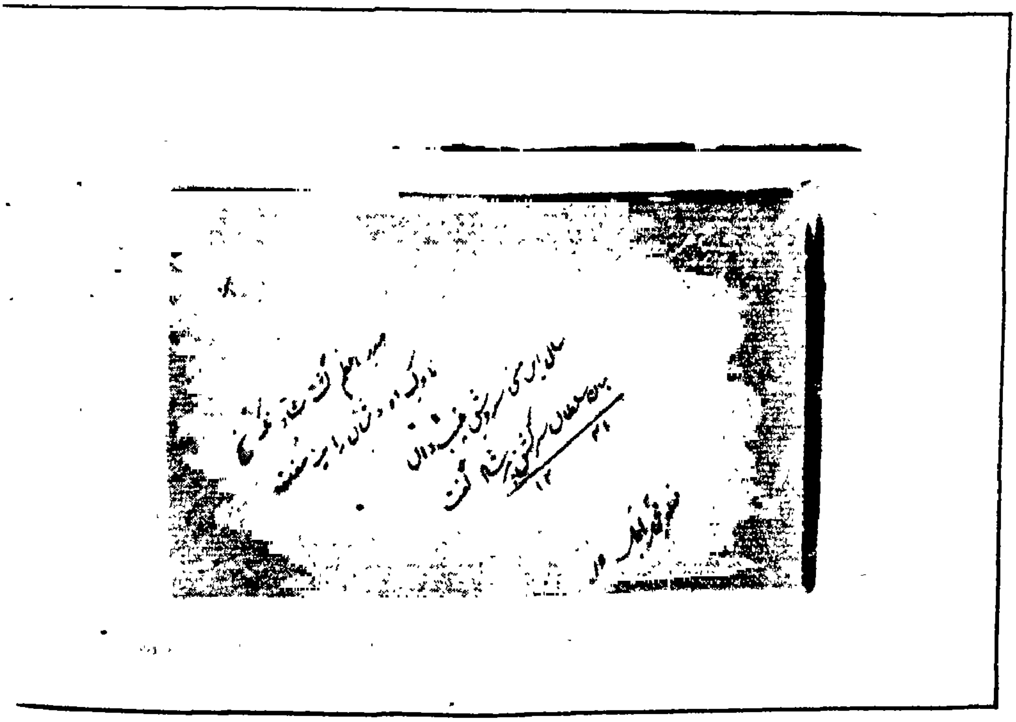
اسی میوزیم میں ایک کانچ کا گولہ ہے جس پر بلغ العلی بکمالہٖ کے چاروں مصرعوں کے ساتھ پنجتن کے نام اُبھرے حروف میں تحریر ہیں۔ یہ فن پارہ قابلِ دید ہے۔



○ میوزیم ادارہ ادبیاتِ اردو میں مخزونہ خطاطی کے نمونے







○ مہاراجہ کشن پرشاد کے صدر اعظم مقرر ہونے پر علامہ اقبال کا قطعہ تہنیت

معروف زمانہ اُستادانِ شاہی میں شمار کیے جانے والے عمدہ خوش نویس محترم محمد مظفر الدین نے ۱۳۰۹ھ میں مُطلّا و پچی کاری کے ساتھ ایک شعر کی نہایت ہی خوب صورتی سے کتابت کی ہے۔ کشش، نوک و پلک کے ساتھ ایک نُدرت فن رکھتا ہے۔

شعر یہ ہے: زہی بحر بخشایشں و کانِ جود
کہ مستظہر انداز وجودت وجود

ہادی علی خان بہادر کے شاگرد مُحبّی لعل نے ایک قطعہ پیلے رنگ کے کاغذ پر روشن سیاہی سے رقم کیا ہے۔ عنوان اس طرح "برائے ملاحظہ سرکار تحریر یافت" ہے۔

مولوی حشمت علی قادر رقم نے ۱۳۶۶ھ میں ایک رباعی میر عمادالحسینی کی طرز پر عمدہ تحریر کیا ہے۔

۱۲۵۷ھ محمد امام الدین خوشنویس نے کاجل کی روشنائی سے طلائی گل کاری اور پچی کاری کے ساتھ عمدہ رباعی لکھی۔

۱۳۷۴ھ میں محترم استاد جابر بن عبداللہ نے بخطِ ثلث قرآنی آیت تحریر کی جو جلے چاول کی سیاہی سے لکھی گئی ہے۔

۱۳۷۶ھ میں محمد جابر خطّاط نے ایک طغرا پنجتن پاک اور اسماء بارہ امام اس عنوان سے نواب عنایت جنگ بہادر کو پیش کیا "بجہت نواب عنایت جنگ بہادر" اور ۱۳۷۹ھ میں سورۂ اخلاص بہ خطِ کوفی "برائے عنایت جنگ بہادر" پیش کر کے اپنے اس نسخے کو محفوظ کر دیا ہے جو خطّاطی کا شاہ کار ہے۔

عہدِ عثمان علی خان آصف جاہ سابع کے نواب عنایت جنگ بہادر کے ملاحظے میں سردار علی یمانی ستار رقم (خطّاط) نے ۱۳۷۹ھ میں بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم اور قل ھو اللہ احد کا مکمل سورہ بہ خطِ کوفی عمدگی کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ جو اپنی مثال آپ ہے۔ اور اسی طرح ۱۳۶۹ھ میں سیاہ کاغذ پر سفید روشنائی سے نادِ علی کی لکھائی ہے۔

ادارہ کے میوزیم میں مباہی مجلد پہ خطِ کوفی میں نادِ علیاً مظہر العجائب کی مکمل تحریر ہے۔ دستے میں گرفت پہ ذو الفقار قاسم (یا اللہ) یا اللہ یا رحیم نہایت شاندار طریقے پر دھلی ہوئی عبارت ہے۔

اکبر بادشاہ کی تلوار پر خطِ نستعلیق ذیل کی تحریر قلع ہے۔ جو کتابت اور کندہ کرنے کے فن کا شاہ کار ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم ٭ نادِ علیاً مظہر العجائب تجدہٗ عوناً لک فی النوائب کل ھم و غم سینجلی بنبوتیک یا محمد بولایتک یا علی یا علی یا علی

مٹھ پر یا رحیم اور دستے پر یہ شعر کندہ ہے:

بوقت بیکے اللہ یار است
سری دشمن بزیر ذوالفقار است

اسلحہ کے ذخیرے میں ایک کٹار ہے جس پر نادِ علی خطِ ثلث میں بہت ہی عمدہ طریقے سے تحریر و کندہ کیا گیا ہے۔

کٹار پر ٹھپّہ یعنی کالی مٹی کی تہہ (چادر) پر جا کر پھر اس پر عبارت کاغذ یا لکڑی پر لکھ کر مٹی کی چادر میں دبا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد لوہے، پیتل کے قسم کی دھات کو پگھلا کر اس میں ڈال دیا جاتا ہے، تب حروف اُس سانچے میں گڑھ جاتے ہیں۔ یا ان حروف کو کھودا جاتا ہے (جس کو آج مولڈنگ یا انگریونگ کہا جاتا ہے) اس پر سونے کا پتر چڑھایا جاتا ہے۔

میوزیم میں ایک عباسی دستہ، بیدری پر سونے کا کام ہے۔ اس پر یہ تحریر یا اللہ دونوں جانب، اور مٹھ پر یَا نَاصِرُ یَا فَتَّاحُ یَا نَصِیۡرُ یَا مُعِیۡنُ یَا ظَہِیۡرُ کندہ ہے۔ یہ ایک نادر ہتھیار ہے۔

میوزیم کے نوادر میں ایک عصا ہے، لکڑی پر خطِ نستعلیق میں بے حد خوب صورتی سے اشعار کندہ ہیں، گل کاری دیدہ زیب ہے۔ یہ لکڑی کرم خوردہ ہو گئی ہے۔ جس کی حفاظت نہیں ہو سکی۔

میوزیم میں ایک رومال رکھا ہوا ہے رومال پر عربی میں اشعار لکڑی پر اُلٹا کندہ کر کے چھاپے ہوئے ہیں یہ قدیم طریقہ تھا۔

قدیم خوش نویسوں نے اپنے فن کا مظاہرہ نہ صرف وصلیوں (کاغذ) پر بلکہ تلواروں اور کٹار اور لکڑی پر خوب صورت انداز میں تحریر کیے ہیں۔

تزئینی خطوط، خطّاطی اور مصوّری کا ایک دلچسپ امتزاج ان نمونوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ گو اب اس تزئین کاری سے لوگ واقف بھی نہیں ہیں۔

ادارۂ ادبیات اُردو میں جو قطعات محفوظ ہیں، ان میں انواع و اقسام کے کاغذ سے آب زر کے علاوہ لعل لاجوردی اور

(باقی ص ۳۹ پر)

ڈاکٹر زیب حیدر

ادارۂ ادبیاتِ اردو کے چند اہم فارسی مخطوطات

اس ادارے کے کتب خانے میں بہت سے نایاب اور کم یاب مخطوطات موجود ہیں جو مختلف موضوعات پر لکھے گئے ہیں. جیسے مذہب، تصوف، تاریخ، طب، حکمت، لغت، تجوید نظم و نثر وغیرہ۔ ان تمام مخطوطات کا یہاں احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔ ان میں سے چند کا میں یہاں تعارف کرواؤں گی۔

یہاں ایک اہم لغت فارسی سراج اللغت ہے جس کے مصنف سراج الدین علی خاں آرزو ہیں۔ یہ نسخہ ۱۱۶۵ھ سے قبل لکھا گیا ہے اور یہ حافظ میر شمس الدین فیض کے حکم پر لکھا گیا تھا۔ اس کے حاشیے پر علی نقی خاں انصاف ابن نقد علی خاں ایجاد نے تصحیح و تنقید کی ہے۔ اس لغت کے دو حصے ہیں۔

پہلے حصے میں ایسے الفاظ ہیں جن کے معنی ہندستانیوں کو نہیں معلوم۔ دوسرے ایسے الفاظ ہیں جو مشہور ہیں لیکن فصحا کا کہنا ہے کہ عام آدمی ان کو نہیں جانتا۔ خود خان آرزو نے اس نسخے کے مقدمے میں یوں لکھا ہے:

این نسخہ مفید است برائے فارسی گویانِ ہند نہ زبان دانانِ ایران و توران "

یہ نسخہ خطِ روشن میں اچھے کاغذ پر لکھا ہوا ہے۔ سب الفاظ اور علامات سرخ رنگ میں لکھے ہوئے ہیں اور یہ نسخہ کرم خوردہ ہے۔
اس نسخہ کا ترقیمہ یہ ہے:

" الحمد اللہ رب العالمین۔ بہ حسب الحکم سیدی و مولائی و مرشدی و مکرمی حضرت حافظ سید شمس الدین محمد المتخلص بہ فیض صاحب مدظلہ العالی بہ تاریخ دواز دہم شہر جمادی الاول ۱۲۰۴ھ بہ روز جمعہ بہ وقت چاشت بہ دست سید احمد در بلدہ حیدرآباد دکن محلہ علی آباد بہ قلم آمدہ "۔

اس نسخے میں ۱۸۴ ورق ہیں۔

تصوف سے متعلق ایک مخطوطہ " عروسِ عرفان " ہے جو بہت اہم ہے۔ اس کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ یہ ایک مشہور صوفی بزرگ خوش نویس شاہ محمد حسین قبلہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور اس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

کسے کشید بہ این عروسِ عرفان را   کہ دید در در عرفانِ خویش عیاں را

اس کتاب کا ترقیمہ اس طرح لکھا ہوا ہے:

" این رسالہ معنی مقالہ مسمی بہ عروسِ عرفان من کلام وحشت انتظام سر خیل خلل داغان قاضی محمود بحری ولد قاضی بحرالدین المعروف بہ قاضی دریا متوطن گوگی متصل قلعہ نصرت آباد المشہور سگر مضاف بہ صوبہ دارالظفر بیجاپور درزمانِ دین پرور دیانت گستر ابوالغازی سلطان اورنگ زیب غازی خلد اللہ ملکہ از ممکن غیب بہ مشہد شہادت نزول نمود "

اس نسخے میں ۱۵۰ ورق ہیں۔ آخری صفحہ پر کاتب نے اپنی مہر کے نیچے کا نقش اس طرح بنایا ہے کہ بیچ میں م لکھا ہے اور اس کے اطراف لکیریں کھینچی ہیں اور ان میں اس طرح سے الفاظ لکھے ہیں کہ اگر ان کو جوڑا جائے تو حسب ذیل شعر برآمد ہوتا ہے۔

من مائل محبوب مسلسل مویم مفتونِ میان مہ وش مہر اویم

من می خورم میانہ مے خانہ مدام مسلکِ ملک مالک املاک گویم

علوم دین میں ایک اہم مخطوطہ جامع عباسی ہے جو ۱۰۳۱ھ کا لکھا ہوا ہے اور یہ کتاب بہاء الدین محمد عاملی نے فقہ امامیہ پر لکھی ہے۔ یہ مخطوطہ ۸۰ ورق پر مشتمل ہے۔ یہ مخطوطہ کسی شاہی کتب خانے کے لیے لکھا گیا تھا۔ پہلا صفحہ مطلا و مذہب ہے اور خط نہایت روشن نستعلیق ہے۔ کاغذ دبیز اور بہت عمدہ ہے۔ عربی عبارتیں خطِ نسخ میں لکھی ہوئی ہیں۔ ہر ورق پر سنہرے جدول بنے ہوئے ہیں۔ اس مخطوطے کا شمار بہترین مخطوطوں میں ہوتا ہے۔ اس کی ایک شرح بھی جس کو علامہ ابن خاتون عاملی نے لکھی ہے۔ کتب خانے میں موجود ہے۔ ان دونوں کتابوں کی نقل سالار جنگ لائبریری میں بھی موجود ہے۔

شرح جامع عباسی ۱۰۵۰ھ میں علامہ ابن خاتون نے لکھی ہے۔ یہ نسخہ بہت ہی نایاب اور کم یاب ہے۔ اس کا خط نہایت خوب صورت نستعلیق ہے۔ حاشیے پر شاہانِ اودھ کی مہر ثبت ہے جو امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کی ہیں۔ اس میں عقاید فقہ اثناء عشری سے بحث کی گئی ہے۔ نسخے ۱۳۳ ورق ہیں۔

اساس المصلی: یہ مخطوطہ فقہ حنفی سے متعلق ہے جس کو شیخ یعقوب علی فاروقی الحنفی نے ۱۲۱۰ھ میں نقل کیا ہے۔ خط نستعلیق ہے۔ عنوان سرخی میں لکھے ہوئے ہیں۔ یہ نسخہ کرم خوردہ ہے۔ تصوف کا ایک اور مخطوطہ "مرغوب القلوب" ہے۔ حضرت شمس تبریز نے اپنے مریدوں کے لیے ۷۰۵ھ میں یہ کتاب لکھی تھی۔ یہ کتاب اس ادارے کی سب سے قدیم فارسی کتاب ہے۔ اس مثنوی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

بگویم حمد رب العالمیں را عطا می کرد ہما عقل و دیں را

اس رسالے میں ۱۲۰ شعر ہیں اور نو باب ہیں۔ ان ابواب کے عنوان یہ ہیں:

توبہ۔ شناختنِ روح۔ نماز و وضو۔ ترک دنیا۔ تجرید و تفرید۔ سخنِ معرفت۔ عشق و محبت۔ معشوق۔ فنا و بقا وغیرہ۔ ہندو مذہب سے متعلق ایک مخطوطہ "مراۃ الحقایق" ہے جو ان کی مقدس کتاب گیتا کا ترجمہ ہے۔ اس کا مترجم عبدالرحمن بن عبدالرسول چشتی غیاثی العلوی ہے۔ اس نسخے کا آغاز عربی زبان میں حمد و نعت سے ہوتا ہے اور فارسی میں اس طرح شروع ہوتا ہے:

در ہرچہ بہ دیدم ندیدم بجز دوست معلوم چناں شد کہ کسے نیست مگر اوست

پس ازاین جا معلوم شد کہ بقائے عالم و فنائے عالم و ظہورِ عالم و بطونِ عالم ہمہ یک نفسہ ہو۔ لہٰل تحقیق ہمہ نفرہ را صداتے کن قرارداد ند۔

یہ نسخہ کرم خوردہ ہے۔ روشن نستعلیق میں سرخ رنگ سے لکھا ہوا ہے۔

فن تاریخ میں ادارہ کی سب سے قدیم اور نادر و نایاب کتاب "تاریخ تیمور" ہے جس کے کاتب کا نام معلوم نہ ہوسکا۔ اس کا

ط بہت ہی خوب صورت اور روشن نستعلیق ہے ۔ اس میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ ۷۳۲ھ سے شروع ہوتے ہیں ۔ ابتدائی دو صفحے مطلا و مذہب اور گل ریز ہیں ۔ حاشیے پر سیاہ اور سنہری رنگ سے جدول ہے ۔ یہ کافی ضخیم مخطوطہ ہے جو ۴۵۹ اوراق پر مشتمل ہے ۔ اس کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے ہوتا ہے :

به نام خدائی که از نام اوست   که مارا توانائی گفتگو ست

اور اختتام :

> حضرت صاحب قران سعادت و اقبال از آں جا روانہ شد و کس بہ خراسان پیشِ امیر مضراب فرستاد کہ با لشکر آن جا ساری و وایل متوجہ قہر و انتقام سکندر تکو ہید فرجام بروند و در جمعہ ہشتم شوال تذکیر امیر زادہ خلیل سلطان از جانب ماوراء النہر بہ رسید و اخبار امن و استقامت آں طرف بہ عرض ہمایوں رسانید و الحمد اللہ رب العالمین ۔

تحت میں لکھا ہے : " داستانِ امیر زادہ رستم و امیر سلیمان شاہ کہ بہ جانب ری رفتہ بودند ۔

اس میں بعض جگہ الفاظ کی تشریح بہ رنگِ سرخ کی گئی ہے کہیں بین السطور اور کہیں حاشیوں پر ترتیبِ کتاب اس طرح ہے ۔ اول تو اس میں خدائے تعالیٰ کی تعریف بہ صورتِ نظم و نثر کی گئی ہے ۔ اس کے بعد خود بادشاہ کی تعریف کی گئی ہے اور پھر یہ بتایا گیا ہے کہ اس کتاب میں جو بھی واقعات اور حالات جمع کیے گئے ہیں وہ مختلف جگہوں کے علما ، فقہا ، اہلِ فضل عمایم ، بخشی و دبیر وغیرہ سے بچے واقعات و اخبار جو صاحبِ قران تیمور کو سفر و حضر میں پیش آئے جمع کیے گئے ہیں جو ملک و ملت اور بادشاہ کے احوال ، اقوال اور حالات پر مشتمل ہیں اور بعد میں جس کی تحقیق ارکانِ دولت سے کی گئی اور اس کو بڑے اہتمام کے ساتھ تذرِ قلم کیا گیا اور تاکید بھی کی گئی کہ اس میں چرب زبانی سے کام نہ لیا جائے اور اس شرط پر یہ لکھا جاتا تھا کہ بادشاہ کی مجلسِ عالی میں اس کو پڑھ کر پہلے سنایا جائے اور پورے وثوق کے ساتھ اس کی صحت کی جائے جو فارسی اور ترکی میں نظم و نثر کی صورت میں بادشاہ کے بارے میں لکھے گئے تھے اور بعض چیزیں خود بادشاہ کے دربار کے مقصدیوں نے بہ لحاظِ تاریخ تدوین کی تھیں اس کی تحقیق اور تدوین میں سعیِ بلیغ کی گئی تھی ۔ اس کتاب کی تدوین کی علت یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے بادشاہ کو عروج اور مدارج عالی پر پہنچایا تو اس کو یہ خیال ہوا کہ اپنی تمام تاریخ کو لکھوائے تاکہ اس کے بعد اس کے مخالفوں کے سلسلے سے محفوظ رہے اور اقبال اور دولت مندی کی جو نسیم بہار خداوند تعالیٰ نے اس کو بخشی ہے وہ حاسدوں کے حسد سے نقصان نہ اٹھائے ۔ اس کا اقبال و دولت خدا تعالیٰ کے فضل سے ہے جس کو بادِ حوادثِ نقصان نہیں پہنچا سکتی ۔ تمام ممالک کی فتوحات کے واقعات تیمور نے منثور و منظوم جمع کئے اور یہ تاریخ خود اپنے سامنے لکھوائی اس وجہ سے اس نسخے کی اہمیت بہت زیادہ ہے ۔

تاریخ کی دوسری اہم کتاب " نامہ فیاض عالم " ہے جس کو روزنامچہ نادر شاہ کا نام دیا گیا ہے ۔ یہ اصل میں نادر شاہ کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً سید مرتضیٰ خان قلعہ دار دولت آباد نے جمع کر کے ایک مخطوطے کی شکل دی ہے ۔ اس کا اور ایک نام فرامین قضا تمکین ہے ۔ یہ کتاب ۱۰۹۸ھ میں تالیف ہوئی ۔ یہ پانچ ابواب یا فصلوں پر مشتمل ہے ۔

فصل اول : نقول فرامین قضا تمکین
حسب الحکم اشرف والاعلیٰ

فصل دوم : عرائض بہ درگاہ گیتی پناہ و مراسلات و پروانہ جات بہ نواب مدارالمہام اسد خاں بہ نام نواب خانِ جہاں بہادر ظفر جنگ کو کلتاش و بخشیان

فصل سوم : مکاتیب و مراسلات کہ اکابر و علماء و فضلاء و امرء دربار معلی وغیرہ نے نواب معزالیہ کے نام لکھے ۔

فصل چہارم : القاب و رقعاتِ متفرقات ۔ بہ حسب روز مرہ و حال

فصل پنجم : فرہنگ و مکاتبات شیخ ابوالفضل وقصائد و رباعیات و منتخب اشعار تاریخ وار جمع کیے گئے ہیں ۔

یہ نسخہ ۲۸۵ اوراق پر مشتمل ہے ۔ کرم خوردہ ہے ۔ خط نہایت شکستہ اور خراب ہے ۔ اس کو پڑھنا بہت دشوار ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں کئی کاتبوں کے خطوط ہیں ۔ اس کے پہلے صفحے پر ایک مہر دھن سنگھ بہادر ۱۱۳۱ھ کی ثبت ہے ۔ تاریخی اعتبار سے یہ کتاب بہت اہم ہے ۔

فرامین کا موضوع مددِ معاش ۔ حکم قصاصِ قاتلان بہ اتفاقِ قاضی و قید بہادر سنگھ بجزاری بہ علتِ اغواد حمایتِ قاتلان ۔ بنائے جبتِ مساجد فقرا ۔ عطائے زمین ۔ گرفتاریاں متعلق اتباعِ شریعت ۔ بندوبست ۔ اخراج دزدان و استیصالِ فتنہ ۔ متعلق مصالح توپ خانہ قلعہ وغیرہ اور اجرائی سند ہیں ۔ بعض فرامین برائی چراگاہ اشتران شاہی ۔ معروضہ شاہ بیگ داروغہ اشتیر خانہ ۔ یہ بہرحال یہ نسخہ نادر و نایاب ہے ۔

فن تاریخ میں آصف جاہی دور کی ایک اور تصنیف " ماہ نامہ " ہے جو غلام حسین خاں جوہر نے ماہ لقابائی چندا کے حکم پر لکھی تھی ۔ اس کتاب میں حمد و نعت باری تعالیٰ کے بعد مصنف نے سکندر جاہ کی مدح کی ہے اور اس کتاب کا سبب تالیف بھی بتلایا ہے اور اپنی زندگی کے حالات کے علاوہ ماہ لقابائی چندا کے خاندان کے حالات بھی لکھے ہیں ۔ اس کے کتاب کے اصل موضوع کو شریک کیا ہے ۔ اس میں چودہ ابواب ہیں اور ایک خاتمہ اور ہر باب کو لمعہ کہا ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے :

پہلے سات ابواب میں نواب آصف جاہ اول سے نواب سکندر جاہ تک خاندانِ آصف جاہی کے حالات لکھے ہیں ۔ اس کے بعد امراء نامدار کا حال لکھا ہے ۔ نویں باب میں صوبہ جاتِ ہند و دکن اور ہر صوبے کے سلاطین کا حال ہے ۔ دسویں باب میں شرح مسافت و منازلِ ہندستان اور وہاں کے بادشاہوں کا حال ۔ گیارہویں باب میں قلعہ جات ہند و دکن کے حالات جو عہدِ شاہ جہاں میں تھے

۱۲: مخلوقات و عرش و کرسی و افلاکِ سبعہ

۱۳: عجائبات روئے زمین ۔

۱۴: پیدائش انہار وجبال و عجائبات

خاتمے میں ماہ لقا کا اردو اشعار کا دیوان ہے اور اس کے بعد مؤلف نے اپنے ماخذ کتابوں کے نام لکھے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ سب کتابیں ماہ لقا بائی چندا کے کتب خانے میں موجود ہیں ۔ یہ نسخہ بہت ہی خوب صورت نستعلیق میں لکھا ہوا ۔ ۱۳۲ اوراق پر مشتمل ہے اس میں ہر زمرے کے لوگوں کا حال الگ الگ اور تفصیل کے ساتھ لکھا ہوا ہے ۔ جیسے وزیر ، ادیب ، انشا پرداز ، منشی ، ہنرمند وغیرہ ۔ گویا کہ یہ کتاب اپنے طور پر ایک انسائیکلو پیڈیا ہے ۔ اس کا ترقیمہ یہ ہے : " تمام شد تاریخ دکن موسوم بہ ماہ نامہ "

اس کے علاوہ ادارے میں تاریخ کے فن پر ایک اور کتاب سوال و جواب کی صورت میں " سوال و جواب جمنا لال و موہن لال ۔ یہ کتاب

۱۱۶۰ھ سے قبل کی لکھی ہوئی ہے ۔ اس کا مصنف منشی چمن لال ہے ۔ دکن کی تاریخ و ثقافت سے متعلق اس مختصر سے رسالے میں بہت سی مفید معلومات درج ہیں ۔ جمنا لال اور چمن لال دونوں عہدِ نواب ناصر جنگ شہید کے منشی تھے ۔ اس کتاب میں پہلے تو آتشِ ایرانی پر بحث کی گئی ہے جو ایرانیوں کی ایک سوپ نما غذا ہے ۔ اس کے بعد جمنا لال نے اس کتاب میں اپنے ہم عصر امیروں کے خانگی حالات اور ملک کے سیاسی اور سماجی واقعات محفوظ کردیے ہیں ۔ یہ باتیں تاریخوں میں نہیں ملتیں اور نہ درج ہوسکتی ہیں ۔ اس لیے تاریخ دکن پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے اس رسالے میں اکثر و بیشتر اصحاب مثلاً شاہ نواز خاں صمصام جنگ ، رکن الدولہ ، نصیر جنگ ، بالاجی راؤ صف شکن شاہ ، سداشیو راؤ ، رگھوجی ، میر قوام الدین خاں ، میر محمد حسین خاں ، معز الدولہ ، قوت جنگ ، تہور جنگ ، عبدالغفور ، شمشیر بہادر محمد معانی خاں ، شیخ شکر اللہ ، شیخ محمد ، حسین سعید سے متعلق دلچسپ باتیں لکھی ہیں ۔ یہ سخن طرازی و انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے ۔ مخطوطہ ۱۱۷۰ھ میں لکھا گیا ہے ۔ املا بعض جگہ غلط ہے اور درگا داس کاتب نے یہ خطِ شکستہ لکھا ہے ۔ عنوانات سرخ روشنائی میں ہیں او حاشیے پر جگہ جگہ اصلاح اور اضافہ نسخ کی عبارتیں درج ہیں ۔ یہ کتاب نواب عنایت جنگ مرحوم کا عطیہ ہے ۔ پہلے ورق پر ان کی بیضوی مہر اور آخر پر مستطیل مہر درج ہے ۔

ان کے علاوہ ادارۂ ادبیات اردو میں بہت سے اہم فارسی مخطوطات ہیں جن کا اس مختصر مضمون میں ذکر کرنا مشکل ہے مثلاً "تزکِ قطب شاہیہ" "طورِ معرفت" "رقعاتِ بیدل" اور مرزا بیدل ۔ "قوتِ لایموت" از سید فضل علی شفائی خاں ، "شجرۂ چشتیہ" از مسکین شاہ "علوم انسانی" از مرزا مہدی خاں کوکب ۔ "حسنات العارفین" "حق نما" اور "سفینۃ الاولیا از دارالشکوہ ۔ "منہاج العابدین" رقعاتِ لالہ تلسی رام "مجمع الانشا از فضل اللہ خاں "نشاط العشق" عبداللہ بن حسن بن علی ۔ "قانونچہ مہر و بخش" از امر سنگھ ۔ انشاء دل کشا از سید نثار علی "گل زارِ شفیق" از حکومت رائے "مخزنِ طبِ قطب شاہی" "تزکِ آصفیہ" از شاہ تجلی علی "زادالمومنین" المعروف بہ زاد الموحدین" یہ ملفوظات شاہ راجو قتال کے ہیں اور ان کا مؤلف حسین ابن حسن ہے ۔ "دیوانِ اسیر" از جلال الدین اسیر ۔ "تکملہ جامع عباسی" از نظام بن حسین ساوی "تنبیہ الغافلین" از بہاء الدین محمد ابراہیم ترمذی ۔ "سوانحِ دکن" از منعم خاں ہمدانی ۔ وغیرہ یہ سب بڑے اہم مخطوطات ہیں ۔ ●○○

بیرونی ممالک میں ادارہ ادبیاتِ اردو کے نمائندے

○ کناڈا ☆ جناب شاہد صدیقی صاحب
بینک اسٹریٹ اوٹاوا (کناڈا)
فون نمبر 613 - 738 - 7712

○ امریکہ ☆ جناب حسن چشتی صاحب
7130 N. KEDVALE LINCOLN WOOD
IL 60046. U S A.

○ برطانیہ ☆ محترمہ صدیقہ شبنم صاحبہ
2, LYMINGE CLOSE, SIDCUP
KENT DA 14 6RE U K.
Phone : 081 - 302 - 5904.

○ سعودی عرب

جدہ ☆ جناب شریف اسلم صاحب
بزم اردو جدہ ۔

جدہ ☆ سلیم فاروقی صاحب
اردو اکیڈمی ۔ جدہ فون نمبر 6855698

ریاض ☆ جناب خورشید ارسلان صاحب
P.O. BOX. NO. 71 RYADH - 11411.

○●○

سب رس کتاب گھر

فہرست کتب

مطبوعاتِ ادارہ ، ادبیاتِ اردو ، حیدرآباد ۔

شاعری

صبر و شکر	تہنیت النسا بیگم	10=00
تنویرِ تخیل	الحق حیدرآبادی	20=00
دیوانِ داؤد اورنگ آبادی	مرتبہ : خالدہ بیگم	15=00
ماہ لقا	عزیز احمد	15=00
ورق در ورق	سید مظفر الدین صاحب	25=00
انوار	علی اختر	20=00
سخنِ حیدر	مرتبہ : احمد پاشاہ قادری	15=00
سلسلہ در سلسلہ	مظفرالدین صاحب حیدرآبادی	8=00
آبگینہ ، شعر	بشیر النساء بیگم بشیر	30=00
آتشِ بے نام	صاحب حیدرآبادی	20=00
طالب و موہنی	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	15=00
تسلیم و رضا	تہنیت النسا بیگم	10=00
ترجمانِ زندگی	سید علی منظور	20=00
گلستانِ حمد ، نعت ، منقبت	صاحب حیدرآبادی	25=00
نمودِ زندگی	سید علی منظور	20=00
انجمن در سخن	صاحب حیدرآبادی	25=00
رمزِ سخن	محی الدین قادری زور	20=00
دیوانِ عشق	میرزا جمال اللہ عشق	25=00
انجمن در انجمن	صاحب حیدرآبادی	20=00
زبانِ شمع	صاحب حیدرآبادی	20=00
مہکتے ویرانے	بانو طاہرہ سعید	20=00
فیضِ سخن	شمس الدین فیض / مرتبہ : ڈاکٹر زور	25=00
سلکِ گوہرین	محمد جلال الدین اشک	15=00
کلامِ معظم بیجاپوری	مرتبہ : ابوالنصر محمد خالدی	20=00
ارمغانِ جذب	راگھویندر راؤ	25=00

تاریخ

تاریخ گولکنڈہ (انگریزی)	عبدالمجید صدیقی	50=00
مسلمان شاہی خاندان	محمد عبدالرحمٰن خاں	40=00
قطب شاہی سلاطین (انگریزی)	ڈاکٹر زور	10=00
مال والوں کی سیر	مراد علی طالع	10=00

○

آصف سابع میر عثمان علی خان اور ان کا دور	طیبہ بیگم	125=00
مقدمہ ۔ تاریخ دکن	عبدالمجید صدیقی	20=00
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	میر حسن	25=00
محمد قلی قطب شاہ	ادارہ ۔ ادبیاتِ اردو	5=00
تذکرہ ۔ مخطوطات جلد اول (مرمہ ایڈیشن)	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	200=00
" " جلد دوم	" " " "	30=00
" " جلد سوم	" " " "	45=00
" " جلد ششم	اکبر الدین صدیقی ۔ / محمد علی اثر	45=00
تذکرہ ۔ نوادر ایوانِ اردو	ڈاکٹر زور	40=00
دار العلوم کے سپوت	حافظ محمد مظہر	20=00
مرقع سخن (شعرائے عثمانیہ)	ادارہ ۔ ادبیاتِ اردو	40=00
سرگذشتِ حاتم	محی الدین قادری زور	20=00
جنوبی ہند میں رباعی گوئی	صاحب حیدرآبادی	45=00
رسائلِ طیبہ	سکینہ بیگم	45=00
دکنی ہندو اور اردو	نصیر الدین ہاشمی	30=00
سرگذشتِ ادارہ ۔ ادبیاتِ اردو	حمید الدین شاہد	35=00
تحفۃ الشعرا	مرزا افضل بیگ قاقشال	25=00
داستانِ ادبِ حیدرآباد	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	40=00

○●○

سوانح

جلال الدین اکبر	محمد نصیر الدین	15=00
سر سالار جنگ اعظم	فیض محمد	7=00
نواب عماد الملک	فیض محمد	7=00
سر سید احمد خاں	ظہیر الدین احمد	5=00
دادا بھائی نوروزجی	ظہیر الدین احمد	5=00
نظام الملک اول	مراد علی طالع	6=00
نواب سکندر جاہ ثالث	" "	6=00
نواب ناصر الدولہ رابع	" "	6=00
نواب افضل الدولہ پنجم	" "	6=00
نواب میر محبوب علی خاں سادس	" "	6=00
ملکہ حیات بخشی بیگم	نصیر الدین ہاشمی	10=00
سرگذشتِ غالب	سید محی الدین قادری زور	20=00
مرزا غالب	ڈاکٹر نتالیا پری گارینا / ترجمہ ۔ اسامہ فاروقی	140=00

ڈرامے

ہیلینا	فضل الرحمانؒ	15=00
وہی	وزیر حسن دہلوی	15=00
تماشائے اہلِ ہنر	سید رشید الحسن	10=00
کاغذ کی ناؤ	محمد علی میکش	15=00
سانولی	اظہر افسر	20=00

○●○

افسانے اور ناولٹ

رم جھم	سری کشن سنہا	12=00
برف میں آگ	حامدی کاشمیری	20=00
رادھا اور رنگ محل	وزیر حسن دہلوی	15=00
سرِ مو گل	طیبہ بیگم	25=00
لیلیٰ	عظیم النساء بیگم	15=00
فکر مت کرو	زین العابدین	15=00

ادبِ اطفال

باتیں	شجاع احمد قاید	10=00
جب میں طالبِ علم تھا	شاہ غیاث	4=00
عرب اور عربستان	جہاں بانو نقوی	15=00
مولانا ابوالکلام آزاد	وقار خلیل	6=00
اشوکِ اعظم	سیدہ مہدی جعفر	6=00

سائنس

ہمارے پھول	محمد سعید الدین	8=00
سائنس کے کرشمے	میر حسن	8=00
سمندری عجائبات	احمد حسن نقوی	8=00
زہریلے پودے	محمد عبدالسلام	8=00
آب دوز اور سرنگ	ادارہ ، ادبیاتِ اردو	6=00

تعلیم اور مکاتیب

تعلیم کا مسئلہ	رضی الدین صدیقی	15=00
علم خانہ داری	محمودہ صدیقی	15=00
معلم بالغان	سیدہ زاہدہ حسین	10=00
مکتوبات شاد عظیم آبادی	محی الدین قادری زور	20=00
خطوطِ عبدالحق	اکبرالدین صدیقی	40=00
مکتوباتِ سلاطینِ قطب شاہی	قاضی عبدالعلی طالقانی	35=00

متفرق

خطابیات	ڈاکٹر رحیم الدین کمال	10=00
ہندستانی قومیت کا تمدنی پہلو	پروفیسر لکشور ناتھ ٹوپا	10=00
مخزنِ علوم و فنون	ادارہ ، ادبیاتِ اردو	25=00
دفتری معلومات	ظہیرالدین احمد	10=00
ٹھنڈی بجلیاں (مزاح)	بھارت چند کھنہ	15=00
حرفِ شیریں	قاضی غلام محمد	15=00
یارانِ شہر (خاکے)	طیب انصاری	20=00
تاریخِ سیاسیات (سیاسیات)	عبدالمجید صدیقی	25=00
سفر نامہ یورپ اور امریکہ (سفر نامہ)	لیاقت جنگ	30=00

●○●○●○●

انجمنِ خواتین آندھرا پردیش کی زیرِ سرپرستی

اجتماعی شادیوں کی اہمیت

موجودہ مسلم معاشرہ جو فرسودہ رسومات کی جکڑ بندیوں میں گھرا ہوا ہے اس کی وجہ سے شادیوں کا مسئلہ کٹھن بنتا جارہا ہے ۔
ہمارا غریب گھرانوں کی بااخلاق سلیقہ مند اور دینی تربیت یافتہ لڑکیاں جوڑے کی رقم ۔ لین دین اور جہیز کے گراں بار اخراجات کی
ں نہیں ہوسکتیں اس لیے وہ اپنے ماں باپ اور معاشرے پر لعک بوجھ بنتی جارہی ہیں ۔ یہ صورتِ حال عبرت ناک ہے اور
بل میں اس بات کا خطرہ ہے کہ کہیں مسلم قوم کے اخلاقی کردار نہ متاثر ہوجائیں ۔ اسلام نے تو شادی کو آسان اور قابلِ تقلید
ر پیش کیا تھا مگر ہندستان میں دیگر اقوام کے رسم و رواج سے متاثر ہوکر متمول گھرانوں میں بےجا نمائش اور نام و نمود کا جو
ن پرورش پارہا ہے وہ آہستہ آہستہ پورے مسلم معاشرے پر اثر انداز ہوتا جارہا ہے ۔

انجمنِ خواتین آندھرا پردیش نے عورتوں میں تعلیمی بیداری ، خود بسری کی صلاحیت اور دینی شعور پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ
ی شادیوں کے انصرام کا بھی بیڑا اٹھایا ہے ۔ چناں چہ الصمد دینی اسکول کے قیام کا مقصد یہی ہے کہ اردو ذریعہ ، تعلیم سے
ں کو سرکاری امتحانات میں شرکت کا موقع دیں تاکہ وہ بھی لگن سے اعلیٰ تعلیم تک رسائی حاصل کریں ۔ نیز ٹیلرنگ اور
بیڈری سکھاکر انھیں فنی تعلیم سے آراستہ کریں اور انھیں خود مکتفی بناکر معاشرے میں ایک ذمہ دار شہری کی حیثیت سے زندگی بسر
ے کے لیے اجتماعی شادیوں کا بھی اہتمام کریں ۔

الحمد لِلّٰہ کہ یہ تمام امور الصمد دینی اسکول ، ٹیلرنگ سنٹر اور ہر سال دس شادیوں کی ذمہ داری لےکر پایہ ، تکمیل کو پہنچلے
ہے ہیں ۔ خدا سے دعا ہے کہ انجمنِ خواتین آندھرا پردیش کی سرپرستی میں اراکینِ انجمن اور قوم کے درد مند اصحاب اور دور اندیش
ین کا اخلاقی اور مالیاتی تعاون حاصل ۔ہے تو انشاء اللّٰہ یہ کام آسانی سے انجام پاتے رہیں گے ۔ .ما علینا الا البلاغ ()



یومِ قلی قطب شاہ کے موقع پر

نیک تمنّاوں کے ساتھ

منجانب

کارخانہ زندہ طلسمات (عنبر پیٹھ ۔ حیدر آباد)

تیار کنندہ:

(یونانی دوائیں ○ زندہ طلسمات ○ فاروقی پوڈر ○ زندہ بام)

بلاسودی کاروبار کے لیے منفرد نام

AL FALAH COMPANY (Regd.)

POLICE COMISSIONER OFFICE ROAD,
PURANI HAVELI, HYDERABAD - 500002.

PHONE:
45658
45727

آپ کے روپیوں کا صحیح استعمال ۔ بلاسودی کاروبار ار منافع جائز اور بھرپور اعتماد کے ساتھ تشریف لایئے اور اطمینان کے ساتھ گھر بیٹھے کمیشن حاصل کیجیے ۔
(صبح ۱۰ تا ۷ شام مستعد اور بااخلاق اسٹاف آپ کی خدمت میں موجود رہے گا ۔)



اپنے کاروبار کو وسعت دیتے ہوئے ممبران کے لیے
اور زیادہ منافع کی راہیں کھول دی ہیں ۔
الفلاح کمپنی ، رقم مشغول کرنے کے لیے اعتماد اور فائدے کا عنوان بن گئی ہے ۔
صداقت اور بہتر معاملت الفلاح کمپنی کی تسلیم شدہ خصوصیات ہیں ۔
دکن سے جدہ تک الفلاح کمپنی کا شہرہ ہے ۔

آندھرا رتن ، سفیر تہذیبِ دکن
لائن M J F سید سعید بھائی
(منیجنگ پارٹنر الفلاح کمپنی)

الفلاح کمپنی (رجسٹرڈ)

پولیس کمشنر آفس روڈ ، پرانی حویلی ، حیدرآباد ۔

بہ یادگار سید محی الدین قادری زورؔ

سن اجراء : ۱۹۳۸ء   فون : 3310469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد : ۶۰   مئی، جون ۱۹۹۸ء   شمارہ : ۶،۵

فی پرچہ	:	۱۲ روپے
زر سالانہ	:	۱۲۵ روپے
کتب خانوں سے	:	۱۵۰ روپے

مشرق وسطیٰ اور امریکہ	:	۲۵ ڈالر
پاکستان، برما، سری لنکا و بنگلہ دیش	:	۱۰ ڈالر
انگلستان	:	۱۵ پونڈ

ناشر : ادارۂ ادبیاتِ اردو ، پنجہ گٹہ روڈ ، حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۸۲ (اے ۔ پی) انڈیا ۔

کمپیوٹر کتابت : جے ۔ جے ۔ کمپیوٹرس صدی ہشتم ، حیدرآباد ۔ / شارپ کمپیوٹرز چادرگھاٹ ، حیدرآباد ۔

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر ، پرنٹر ، پبلیشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے دو ایس گرافکس نارائن گوڑہ میں طبع کرواکے ادارہ ، ادبیات اردو سے شائع کیا ۔

بیرونی ممالک میں
ادارہ ادبیات اردو کے نمائندے

کینیڈا ☆ جناب شاہد صدیقی صاحب
SIDDIQI SIDDIQI & CO,
1719 BANK STREET,
SUITE 204,
OTTAWA, ONTARIO,
KIV 724 (KANADA).
فون نمبر 613 - 738 - 7712.

امریکہ ☆ جناب حسن چشتی صاحب
7130 N. KEDVALE,
LINCOLN WOOD,
IL 60046. U.S.A.

برطانیہ ☆ محترمہ صدیقہ شبنم صاحبہ
2. LYMINGE CLOSE,
SIDCUP KENT,
DA 14 6RE U.K.
Phone : 081 - 302 - 5904.

سعودی عرب

جدہ ☆ جناب شریف اسلم صاحب
بزم اردو ، جدہ ۔

جدہ ☆ جناب سلیم فاروقی صاحب
اردو اکیڈمی ، جدہ ۔
فون نمبر 6855698

ریاض ☆ جناب غوث ارسلان صاحب
P.O. BOX. NO. 71.
RIYADH- 11411.

ادارہ ادبیات اردو کے دوامی اراکین

۱	جناب محمد عبدالرحمن صدیقی صاحب	امریکہ
۲	جناب غلام نورالدین صاحب	امریکہ
۳	جناب سید فرید محی الدین صاحب	امریکہ
۴	ڈاکٹر وحید رومی صاحب	امریکہ
۵	جناب عزیز احمد صاحب	کینیڈا
۶	محترمہ مسعودہ صدیقی صاحبہ	کینیڈا
۷	جناب جوش مندو زئی صاحب	کینیڈا
۸	جناب محمد قاسم الدین صاحب	کینیڈا
۹	ڈاکٹر بدر الدین خاں صاحب	کینیڈا
۱۰	جناب محمد عبداللہ شاہ صدیقی صاحب	برطانیہ
۱۱	جناب محمد عابد صدیقی صاحب	برطانیہ
۱۲	جناب مرزا مظفر بیگ صاحب	برطانیہ
۱۳	جناب خواجہ قمر الدین صاحب	برطانیہ
۱۴	ڈاکٹر عابد معز صاحب	سعودی عرب
۱۵	جناب شریف اسلم صاحب	سعودی عرب
۱۶	جناب سلیم فاروقی صاحب	سعودی عرب
۱۷	جناب سید عبدالقدوس صاحب	حیدرآباد
۱۸	محترمہ شاہدہ صمد صاحبہ	حیدرآباد
۱۹	جناب خان محمد عمر خاں صاحب	حیدرآباد
۲۰	محترمہ اختر سلطانہ صاحبہ	حیدرآباد

اس شمارے میں

○○○

پہلی بات

۵ / جون ۱۹۹۸ء کو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے داماد سید عزیز احمد صاحب کا کراچی میں انتقال ہوگیا ۔ وہ ڈاکٹر زور کی منجھلی صاحب زادی محترمہ توفیق النسا بیگم صاحبہ کے شوہر تھے ۔ سید عزیز احمد مرحوم ، عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر اور ممتاز ادیب جناب محشر عابدی مرحوم کے چھوٹے بھائی تھے ۔ سید عزیز احمد صاحب حیدرآباد میں پیدا ہوئے ۔ یہاں سے انجینیرنگ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد پاکستان منتقل ہوگئے وہاں پر وہ تعمیراتی پراجکٹ میں مصروف رہے ۔ بابا کنسٹرکشن کمپنی کے ڈائرکٹر رہے پھر امریکہ میں بھی اپنا ذاتی کاروبار شروع کیا بعدازاں پاکستان لوٹ آئے ۔ شعر و شاعری کا بہت عمدہ ذوق رکھتے تھے گو کہ خود شاعر نہیں تھے لیکن شعرا ، اردو کا بہت سا عمدہ کلام جمع کیا تھا ۔ جو ان کے زیرِ مطالعہ رہتا تھا ۔ سینکڑوں اشعار ازبر تھے ۔ طبیعت میں سادگی تھی تنہائی پسند تھے مگر جس سے بے تکلف ہوتے اس سے گھنٹوں باتیں کرتے ۔ اس ہر دل عزیز شخصیت کے اٹھ جانے سے ان کے بیگم کے علاوہ اعزا اور احباب کو شدید دلی صدمہ پہنچا ۔ ہم ان کے غم میں شریک ہیں اور دعا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائیں ۔

○●○

گذشتہ برسوں میں ادارہ ، ادبیاتِ اردو کی سرگرمیوں میں قابلِ لحاظ اضافہ ہوا ۔ اس میں قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان ، نیشنل میوزیم حکومت ہند اور نیشنل آرکائیوز حکومتِ ہند آندھرا پردیش کی مالی اعانت کا بڑا دخل ہے ۔ اس کے علاوہ بعض محبانِ اردو بھی ادارے کی ترقی میں کوشاں رہے ہیں ۔

جناب شاہد صدیقی صاحب جو کینیڈا میں ہمارے نمائندہ ہیں مسعود صدیقی ٹرسٹ کی جانب سے گذشتہ سال ادارے کے اسٹاف اور ادارے کے امتحانات میں اول آنے والے طلبہ کے لیے عطیہ دیا تھا ۔ اس سال بھی مسعود صدیقی ٹرسٹ کی جانب سے اسٹاف کے لیے ۱۹۸۰۰ روپے اور امتحانات میں اول آنے والے طلبہ کے لیے ۱۶۰۰ روپے کا عطیہ ارسال کیا ہے جس کے لیے ہم ان کے تہہ دل سے ممنون ہیں ۔ سعودی عرب ، برطانیہ اور امریکہ میں مقیم ہمارے نمائندے جناب خوش ارسلان ، جناب شریف اسلم ، جناب سلیم فاروقی ، محترمہ صدیقہ شبنم صاحبہ اور جناب حسن چشتی صاحب بھی ادارے کے ترقیاتی کاموں میں ہاتھ بٹا رہے ہیں ۔ ہم ان کے بھی شکر گذار ہیں ۔

ہم اپنے قارئین سے التماس کرتے ہیں کہ سب رس کے خریداروں کا حلقہ بڑھائیں اس کے علاوہ اپنے احباب کو دوامی رکن بنا کر ادارے کو مالی استحکام بخشیں ۔

○●○

(ادارہ)

اختر حسن

یادوں کی سیر گاہ

(آٹھویں قسط)

۲ ۔ ڈاکٹر حسین ظہیر :۔ ایک اور بہت بڑی شخصیت جس سے میں بہت متاثر رہا اور جن کا میری زندگی میں بہت اہم ں رہا ہے وہ ڈاکٹر حسین ظہیر کی ہے وہ سجاد ظہیر کہ جن کو ہم ننے بھائی کہتے تھے بھائی تھے ۔ یہ لکھنؤ کا بہت مشہور خاندان تھا ۔

ڈاکٹر حسین ظہیر یہاں سٹی کالج کے پرنسپل ہوکر آئے تھے پھر یونیورسٹی چلے گئے اور وہاں سے R . R . Lab کے ڈائرکٹر بن نمایاں کام انجام دیے ۔

عالم خوند میری اس وقت اسٹیٹ بینک میں کام کررہے تھے جو ظاہر ہے ان کے مزاج کے مطابق نہیں تھا ۔ ڈاکٹر حسین ظہیر ، ہی ان کو وہاں سے نکال کر سٹی کالج میں لیا تھا ۔ شاید اسی بنا پر وہ حسین ظہیر صاحب سے زیادہ قریب تھے اور میں پہلی بار انھیں ، ساتھ ڈاکٹر حسین ظہیر سے ملا تھا ۔ پھر رفتہ رفتہ کچھ ایسے حالات پیدا ہوتے گئے کہ ان سے ہمارے روابط بہت بڑھ گئے ۔ میں اور اکثر ان سے ملنے جایا کرتے تھے ۔ وہ اس وقت پنجہ گٹہ میں کرایے کے مکان میں رہتے تھے ۔ بعد میں ہمارے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ل ہوگئے جیسے رشید الدین خاں ، کوکب دری ، مہدی علی خاں وغیرہ اور ہمارا ایک حلقہ بن گیا اکثر شاموں کو ہم سب ڈاکٹر صاحب ، مکان پر جمع ہوتے اور مختلف مسائل پر گفتگو رہتی ۔ زیادہ تر یونیورسٹی کے اور تعلیمی مسائل زیرِ بحث رہتے ۔ بعض وقت شعر ری بھی ہوتی ان کو شعر و ادب کا بھی اچھا ذوق تھا اگرچہ سائنس کے آدمی تھے مجھے یاد ہے پہلی مرتبہ ڈاکٹر حسین ظہیر کے گھر ایک لک میں میں نے پہلا جامِ شراب نوش کیا تھا ۔ اس وقت تک بنجارا ہلز پر ان کا اپنا مکان بن گیا تھا ۔ وہ شام بہت خوش گوار اور ں اچھی محفل تھی ۔ اتفاق سے اس دن میری بیوی بھی ساتھ تھیں سب فرش پر بیٹھے تھے جب بیرا جام و مینا کی کشتی لے کر آیا اور کچھ ڈ ڈرنکس تو اپنی بیوی کے ساتھ میں نے بھی کولڈ ڈرنکس کا گلاس اٹھالیا ۔ ڈاکٹر علیم جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز کے فیسر تھے وہ بھی اس دن شریکِ محفل تھے اور میرے بازو ہی بیٹھے تھے انھوں نے وہسکی کا گلاس لیا تو میری بیوی ریاست بے اختیار ہ اٹھیں ، " ڈاکٹر صاحب ، آپ ۔ ۔ ۔ " بہت اطمینان سے مسکراکر انھوں نے کہا ، " جی ، میں " اس پر ڈاکٹر صاحب نے ہنستے ہوئے ی بیوی کی طرف دیکھ کر کہا " آج ہم ان کو بھی تھوڑی سی مزےدار شراب پلائیں گے چناں چہ جب انھوں نے خود جن کا گلاس ی طرف بڑھایا تو میں نے انکار کرنا خلافِ آداب سمجھا ۔

بڑی خوبیوں کے آدمی تھے ہمارے ڈاکٹر حسین ظہیر ۔ باہر سے سائنس میں ڈاکٹریٹ کر کے آئے تھے نہرو گھرانے سے ان کے دان کے پرانے روابط تھے ۔ جواہر لال نہرو ڈاکٹر صاحب کو بہت چاہتے تھے ۔ جب حیدرآباد میں R . R . LAB کے قیام کا تصفیہ لا تو ڈاکٹر حسین ظہیر کو اس کا انچارج یا ڈائرکٹر بنا دیا گیا ۔ وہ ڈائرکٹر تو بنادیئے گئے مگر " ڈائرکٹری " نہیں تھی یعنی ابھی لیبارٹری کی

عمارت تک نہیں بنی تھی ۔ ۔ ۔ ڈاکٹر حسین ظہیر نے خود کو اس کے لیے وقف کردیا ۔ اپنی نگرانی میں اس کی تعمیر کروائی ۔ ایک ایک چیز پر ان کی نظر رہتی تھی ۔ جدید وضع کی بڑی خوب صورت لیباریٹری تعمیر کروائی انھوں نے بہت خوب صورت باغ لگوایا اور عمارت کی تزئین و آرائش بھی اپنے ذوق کے مطابق بہت عمدہ کروائی اور پھر اس کی رسمِ افتتاح کے لیے جواہر لعل نہرو کو بلوایا اور وہ بہ صد شوق آئے ۔

وہ شامِ افتتاح مجھے اچھی طرح یاد ہے ہمارا پورا گھر اس میں شریک تھا ۔ ڈائس بہت سلیقے سے سجایا گیا تھا ۔ جواہر لعل نہرو تقریر کرنے والے تھے اس لیے قاعدے کے مطابق کئی مائک رکھے گئے تھے ۔ جب وہ تقریر کرنے اٹھے تو سامنے کئی ایک مائکس دیکھ کر جھنجھلا کر کہا ۔ " یہ اتنے سارے آلاتِ حرب کیوں میرے سامنے رکھے ہیں " بہت جلد غصے میں آجاتے تھے نہرو ۔ منتظمین نے جلدی سے سب کو ہٹایا صرف ایک رہنے دیا جواہر لعل نے بہت اچھی تقریر کی ۔

گو آر آر لیب کے قیام کے بعد ڈاکٹر صاحب بہت مصروف ہوگئے تھے پھر بھی ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں ۔ کچھ کم سہی ۔ کام کے وہ اتنے دھنی تھے کہ سارا سارا دن ان کا لیب میں ہی گزرتا ۔ اکثر تو رات گئے دیر تک وہیں بیٹھے کام کرتے رہتے حتیٰ کہ جس دن ان کے لڑکے کی شادی تھی غالباً اس دن بھی وہ دیر تک لیب میں بیٹھے کام کرتے رہے۔جب تقریب ختم ہو رہی تھی تب آئے اور ان کی موت بھی وہیں لیب میں ہوئی ۔ ان کو وہاں سے سبک دوش ہوئے تین سال ہوگئے تھے اور وہ اس دوران میں دہلی چلے گئے تھے اور یہاں ان کی جگہ سدھو ڈائرکٹر ہوگئے تھے ۔ تین سال بعد جب وہ حیدرآباد واپس آئے تو بےکار بیٹھنا ان کے لیے ممکن نہ تھا تو وہ اپنے R.R.LAB پہنچے اور سدھو سے کہا : " کسی کونے میں ہمارے لیے ایک میز کرسی ڈلوادو ہم یہاں بیٹھ کر کام کرنا چاہتے ہیں ۔ سدھو ان کے عقیدت مندوں میں سے تھے فوراً انھوں نے ایک کمرے میں میز کرسی ڈلوادی اور ایک چپراسی بھی مقرر کردیا اور وہ روز جیسے پہلے آتے تھے پابندی سے صبح آتے اور شام کے ۵ بجے تک وہاں بیٹھ کر کام کرتے تھے ۔ بلامعاوضہ اور وہیں میز پر سر رکھ کر انھوں نے جان دی ۔ بڑا دل گداز سانحہ ہے ۔ ان کے دو بیٹے تھے ایک بیٹے کی تو جوانی میں ہی لندن میں دورانِ تعلیم ایک پکنک کے موقع پر پیراکی میں موت ہوگئی تھی ۔ بہت خوب صورت لڑکا تھا وہ ہم نے دیکھا تھا اسے ۔ اس کا انھیں بےحد صدمہ تھا ۔ دوسرا لڑکا ٹی گارڈن میں تھا۔وہ آیا ہوا تھا حیدرآباد باپ سے ملنے ۔ معلوم ہوا وہ لیب میں ہیں تو وہیں پہنچ گیا۔باتیں کرتے کرتے پتہ نہیں کیا بات ہوئی کچھ بہت جذباتی ہوگئے وہ اور ایک دم سے سر میز پر ٹیک دیا ۔ ۔ ۔ اور ختم ہوگئے ۔ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔بےحد خوش اخلاق ۔ انسان دوست۔جس کسی میں صلاحیت دیکھتے ہر طرح اس کی مدد کرتے ۔ میرا چھوٹا بھائی انور جب گریجویٹ ہوگیا تو اسے کام کی تلاش تھی میں اسے ڈاکٹر حسین ظہیر سے ملانے لے گئی ۔ وہ ریاضی میں بہت اچھا تھا ۔ چند باتیں کیں ڈاکٹر صاحب نے اس سے اور پھر فوراً اپنی لائبریری میں لے لیا اور چند ہی مہینے بعد چھ ماہ کی رخصت دے کر بمبئی ٹریننگ کے لیے بھیجا اور جب وہ ٹریننگ لے کر آیا تو اسے چیف لائبریرین بنادیا۔ان میں آدمی کو اس کی ذہانت اور کارکردگی کو سمجھنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی ۔ حسرت موہانی کی بھانجی سلمیٰ کو بھی انھوں نے ہی LAB میں نوکری دلائی تھی اور جب انور کی بےوقت موت ہوگئی تو اس کی اکلوتی بیٹی صبوحی کو جس کی ابھی ۵ ، ۶ سال پہلے شادی ہوئی اور اس وقت صرف پانچ برس کی تھی بی ۔ اے تک کے لیے تعلیمی وظیفہ مقرر کردیا تھا ۔ ڈاکٹر ظہیر کا اور ہمارا بہت ساتھ رہا ۔ ہمارا چھوٹا سا گروپ تھا ۔ دنیا کا کوئی مسئلہ ہوتا ڈاکٹر حسین ظہیر صاحب سے مشورہ اور بحث کیے بغیر طے نہ پاتا ۔ کوئی کام ہوتا کوئی مشکل درپیش ہوتی تو ہم سب سے پہلے ان کے پاس بھاگتے اور وہ بھی کوئی کام ہوتا تو بےتکلف ہم سے لے لیتے ۔ بڑے سچے سائنس داں تھے ۔ انھوں نے کولسا نیٹ پر ریسرچ بھی کیا تھا کہ پانی سے بجلی لینے کے بجائے کوئلے سے بجلی لی جاسکتی ہے

جو ہمارے پاس بہت ہے اور جے پور کی کسی کانفرنس کے لیے انھوں نے اس پر انگریزی میں ایک طویل مقالہ بھی لکھا تھا اور مجھ سے خواہش کی کہ اسے تین دن میں چھپوا دو تو بڑا اچھا ہوا اس وقت تک پیام بند ہوچکا تھا مگر اخبار والوں سے اور پریس سے اچھے تعلقات تھے میں نے ان کا مقالہ دو دن میں چھپوا کر دے دیا تو بہت خوش ہوئے اور کہا ہم نہیں سمجھتے تھے کہ ہندستان میں خاص طور سے حیدرآباد میں اتنی جلدی بھی کام ہوسکتا ہے ۔ پیام کے تعلق سے ڈاکٹر حسین ظہیر نے ہماری کتنی مدد کی میں کہہ نہیں سکتا ۔ اس زمانے میں تقسیم کنندہ کے ذریعے اخبار گھروں پر پہنچایا جاتا تھا جس کو ماہانہ مشاہرہ دیا جاتا تھا ۔ ہر علاقہ یا حلقہ کا ایک تقسیم کنندہ ہوتا تھا ۔ ہمارا بنجارہ ہلز کا جو تقسیم کنندہ تھا وہ بہت اچھا تھا ۔ پابندی سے صبح سویرے وہاں کے خریداروں کو اخبار پہنچادیتا تھا ۔ چناں چہ ڈاکٹر حسین ظہیر اور ایل ۔ این گپتا کہتے تھے کہ بھئی سب سے پہلے تمہارا اخبار آتا ہے اور ہم پہلے وہی پڑھتے ہیں ۔ اخبار میں ڈاکٹر صاحب کو بڑے بڑے سیاسی مسائل سے زیادہ چھوٹے چھوٹے سماجی مسائل پڑھنا پسند تھا ۔ ایک دفعہ میں نے یہ ڈرینج سے جو گندہ پانی آتا ہے اس پر اداریہ لکھا تھا وہ انھیں بہت پسند آیا اور مجھ سے کہا تھا کہ بڑے بڑے بین قومی مسائل پر لکھنے سے کیا فائدہ کون سمجھتا ہے ان کو ۔ چھوٹے چھوٹے جو عوام کے مسائل ہوتے ہیں ان پر لکھا کرو ۔ پیام کی مشکلات پر جس طرح انھوں نے ہر موقع پر میری مدد کی ، میرا حوصلہ بندھایا اسے میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا ۔

WEDNES DAY گروپ بھی ہم نے ڈاکٹر حسین ظہیر کے مشورے پر ہی قائم کیا تھا ۔ جس کی میٹنگ ہر اتوار کو ہوتی تھی ۔ کوکب دری اس کے انچارج تھے اور اس گروپ میں وہی کچھ لوگ تھے جو ہم خیال تھے اور عوام میں قومی شعور جگانا چاہتے تھے ۔ اس کے جلسے زیادہ تر حسین ظہیر صاحب کے گھر پر ہوتے تھے یا کوکب دری کے اور ان میں سیاسی ادبی ، سماجی ہر قسم کے مسائل پر بحث ہوتی تھی ۔

۳ ۔ **ڈاکٹر عبداللطیف** ۔ ایک اور بڑی شخصیت جس سے میں بہت متاثر رہا ڈاکٹر عبداللطیف کی ہے وہ میرے استاد بھی تھے اور دوست بھی ۔ جب یونیورسٹی اڈکمیٹ کی عمارتوں میں منتقل ہوئی تو ان دنوں وہ عثمانیہ یونیورسٹی اسٹیشن سے چند گز کے فاصلے پر رہتے تھے اور ہم یعنی میں اور یونس سلیم تقریباً روز ہی ان کے گھر جاتے اور ان سے ملتے بے تکلف ہوگئے تھے کہ بے جھجک بہت کھل کر ان سے باتیں کرتے تھے بالخصوص غالب پر اور ان کی تشریح پر کبھی تنقید بھی کر بیٹھتے اور ان کے ساتھ ہماری بے تکلفانہ راہ و رسم آخری وقت تک رہی ۔ انگریزی ان کی بہت اچھی تھی اور اردو فارسی میں بھی مہارت حاصل تھی مولانا ابوالکلام کی تفسیر القرآن کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا ۔ ان کا اندازِ گفتگو بہت خاص تھا جب عثمانیہ میں اردو کی جگہ انگریزی کو میڈیم بنایا گیا تو ایک دن ہم ان کے پاس بیٹھے تھے یوں ہی کچھ باتیں ہورہی تھیں کہنے لگے ، اردو ، یونیورسٹی سے اتر کر اردو ہال گئی اب وہاں سے اتر کر محبوب کی مہندی چلی جائے گی ۔ وہیں ہے گھر اس کا ، اس طرح باتیں کرتے تھے ۔ بہت سادہ مزاج اسکالر آدمی تھے ۔ مصر ، ترکی وغیرہ کے بڑے بڑے عالم ان کی تلاش میں رہتے تھے ۔ جتنے باہر کے نمائندے آتے تھے میرے ذمے انھوں نے یہ کام کر رکھا تھا کہ ان میں جو عالم ہوں ان سب کی ان کے گھر پر میٹنگ ترتیب دوں اور صرف چائے بسکٹ سے سادگی کے ساتھ ان کی تواضع کی جائے اور وہ سب باہر سے آنے والوں سے بہت ادب سے ملتے تھے ۔ بہت احترام کرتے تھے ان کا ۔

ڈاکٹر عبداللطیف کے آخری ایام زندگی بڑی کس مپرسی میں گزرے ۔ اس وقت تک وہ یہاں آغا پورہ میں آگئے تھے ۔ کرایہ کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے ۔ لیکن آخری دم تک باوجود بینائی نہ رہنے کے وہ ترجمے کراتے رہے ۔ قرآن شریف کا انگریزی ترجمہ بھی انھوں نے اسی طرح کروایا ۔ صبح دس بجے سے ۱۲ بجے تک روز یہ کام ہوتا تھا ۔ چند اسکالر ان کے اردگرد رہتے جو مختلف ترجمے اور

تفاسیر پڑھ کر سناتے تھے ۔ یہ کام دوسال تک چلا اور جب وہ ترجمہ چھپ کر کتابی صورت میں آیا تو ڈاکٹر صاحب نے اپنے دست خط کے ساتھ ایک نسخہ مجھے عنایت فرمایا ۔ یہ ان کا ایسا عظیم ہدیہ ہے جو میرے لیے حرز جاں کی حیثیت رکھتا ہے اس کام کے ختم ہونے کے ایک ہفتہ بعد ہی ۔ یہ عظیم شخصیت ایک رات خاموشی سے ابدی نیند سو گئی ۔

میری بہن رضیہ پر وہ بہت مہربان تھے جب وہ لے پلی سے قریب آغاپورہ میں تھے تو ہر دوسرے تیسرے روز میں اور رضیہ ان کی خدمت میں حاضری دیتے ۔ رضیہ کے فردوسی پر اردو میں ایک مضمون کا انگریزی میں ترجمہ کروانے میں انھوں نے بہت مدد کی تھی اور وہ مضمون اسلامک کلچر میں چھپا بھی ۔

۴ ۔ صدق جائسی :۔ میرے ایک اور استاد تھے صدق جائسی جو بعد میں میرے بہت اچھے دوست ہوگئے ۔ تصدق حسین نام تھا ان کا ۔ صدق تخلص کرتے تھے ۔ لکھنؤ کے قریب یو ۔ پی کے قصبے جائس میں پیدا ہوئے اور عین عالم شباب میں تلاش روزگار کے سلسلے میں حیدرآباد آئے ۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے نام اکابرین ہند کے کئی سفارشی رقعے لے کر آئے تھے مگر صرف شاعری کے بھرسے پر ۔ کوئی ڈگری وغیرہ نہیں تھی تو یونیورسٹی میں ملازمت کا ملنا محال تھا اور صدق صاحب کو جامعہ عثمانیہ شعبہ ۔ اردو کی صدارت کا عہدہ جلیلہ حاصل کرنے کی تمنا تھی ۔ مگر اسی زمانہ میں اس خدمت پر مولانا وحیدالدین سلیم کا تقرر ہوچکا تھا ۔ بہت جزبز ہوئے کچھ اور نہ بنا تو اپنی شعری صلاحیتوں کا سہارا لے کر مولانا وحیدالدین سلیم صاحب کی ایک ہجو لکھ ڈالی جس کی زمین یوں تھی :

جس گھر سے ملی دعوت کی خبر جس قلب میں دیکھا لقمہ تر   بل ڈاگ کی صورت پھاڑسا منہ پھیلادیا تمیں والے نے

پرانے انداز کی غزل اچھی کہتے تھے ان سے ملنے کے بعد پتہ چلا کہ یہ شعر انھی کا ہے :

ان کے لطفِ عام کو غیرت نہیں کرتی قبول   اور میں کم بخت لطفِ خاص کے قابل نہیں

وحیدالدین سلیم کے بعد سید سجاد حیدر اور مولوی عبدالحق یونیورسٹی میں اردو کے سب سے سربرآوردہ اشخاص تھے ۔ صدق جائسی نے ان دونوں محترم حضرات کی ہجو میں خوب خوب گل افشانی کی ۔ سجاد صاحب پر ان کی طویل ہجویہ نظم تو اتنی مشہور ہوئی کہ حیدرآباد کے اہل تمول صرف اس نظم کو سننے کے لیے ان کی پُر تکلف دعوتیں کرتے تھے اور صدق صاحب جھوم جھوم کر ہر شعر کی تلمیح طلب اشعار کی تلمیح پر روشنی ڈالتے ہوئے خاص انداز سے اسے سناتے مثلاً اس شعر کو سنانے سے پہلے وہ بتاتے کہ سجاد صاحب نے حیدرآباد دکن میں ایک شادی کی تھی دو بچے ہوئے تھے بیوی کا انتقال ہوگیا تو یہ شعر سنیے :

سرہلا کے دو چوزے مرغی تو ہوئی چمپت   اب ڈربے میں ٹٹرول ٹوں مرغا نظر آتا ہے

پھر سجاد صاحب اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت گئے ۔ جرمنی سے بڑی بڑی ڈگریاں لے کر اور ایک میم کر کے لوٹے ۔ میم کے ساتھ ان کی بڑی بہن بھی تھیں جو اپنی نازک اندام چھوٹی بہن سے عمر اور جسامت میں بھی بہت زیادہ تھیں اور خود سجاد صاحب ایک حادثہ کا شکار ہوئے تھے اور ان کے پاؤں میں لنگ آگیا تھا تو ان تینوں باتوں کو آموں کے مختلف ناموں سے تشبیہ دیتے ہوئے اس طرح شعر میں مقید کیا ہے :

ایک غیرت فجری ہے ایک رشکِ دسہری ہے   اور بیچ میں دونوں کے لنگڑا نظر آتا ہے

ایک روز نیاز فتح پوری میرے غریب خانہ پر تشریف لائے ۔ وہ حیدرآباد آئے ہوئے تھے اور حسبِ دستور ہوش بلگرامی کے ہاں فروکش تھے ۔ میں ان سے ملنے گیا تھا دوسرے روز گویا ملاقات باز دید کے لیے وہ مجھ سے ملنے آئے تھے ۔ اتفاق سے اس وقت صدق صاحب بھی تشریف لے آئے ۔ میں نے صدق کا نیاز سے تعارف کراتے ہوئے ان کی شاعری خصوصاً " ہجویہ " کا ذکر بھی کردیا تو صدق فوراً

ہی کچھ تمہید کے بعد وحیدالدین سلیم اور پھر سجاد صاحب کی ہجویں سنائیں ۔ نیاز نے نہ صرف یہ کہ داد نہیں دی بلکہ بعد میں مجھ سے اپنی ناگواری کا اظہار کیا اور فرمایا کہ اس زمانے میں یہ شاعری شاعری نہیں ہے بلکہ اپنی کم ظرفی کا مظاہرہ ہے ۔ یہ نہ تو سودا کی ہجویہ شاعری سے کوئی تعلق رکھتی ہے نہ کسی صاحبِ شعور شاعر کی زبان سے ایسے اشعار سننے کے لیے کوئی صاحبِ ذوق انسان تیار ہوسکتا ہے ۔

ویسے صدق صاحب بہت نفاست پسند انسان تھے ۔ چوڑی دار پاجامہ اس پر ململ کا کڑھا ہوا کرتہ سلیم شاہی اعلیٰ درجہ کے ٹوئیڈ کی شیروانی اور اس سب کا ایک انبار تھا کہ ان کی الماری میں لٹکتا رہتا تھا ۔ اچھے کھانے اور مٹھائی کے بہت شوقین تھے ۔ باتیں بہت اچھی کرتے تھے ۔ ٹکسالی اردو میں بے تکلف محاوروں اور روز مرہ کے استعمال کے پہلو بہ پہلو دل چسپ تمثیلیں اور کہاوتیں بھی باتوں میں جوڑتے جاتے میں صرف ان کی زبان اور ان کی دل چسپ باتوں کو سننے کے لیے ان کا گرویدہ تھا ۔ بار بار گھر بدلتے ایک گھر سے طبیعت اوب جاتی تو جلد ہی اس سے بہتر دوسرے گھر میں اٹھ جاتے ۔ کچھ عرصے کے لیے میرا ان کا تو یہ معاملہ ہوگیا تھا کہ مجھے ان سے ملے بغیر چین نہ آتا اور یہی حال ان کا تھا ۔ آخری مکان جو ٹلے پلی کے قریب اے ۔ سی ۔ گارڈ میں انھوں نے لیا تھا بہت روشن اور ہوا دار تھا ۔ جب اس گھر میں وہ منتقل ہوئے تو میں ان سے ملنے گیا نئے گھر کی مبارک باد دی ۔ بہت خوش ہوئے ۔ کہنے لگے بھئی یہاں تو ہر وقت ایسی اچھی ہوائیں چلتی ہیں کہ آپ کے ہاں کیا عید ، بقرعید پر چلتی ہوں گی پھر ملازم کو آواز دی ۔ اس کے کان میں کچھ کہا اور جب وہ جانے لگا تو پکار کر بولے ارے یار دیکھو بلی کی چال جانا اور کتے کی چال واپس آنا ۔ میں نے بعد میں پوچھا اس کا کیا مطلب ہوا تو فرمایا کہ جاتے وقت کسی سے کچھ کہے بغیر دبے پاؤں چلے جاؤ اور آتے وقت جس کام کے لیے گئے تھے وہ پورا ہوجائے تو تیزی سے اور نازاں و فرحاں واپس آؤ ۔ دراصل انھوں نے اسے مٹھائی لانے کے لیے بھیجا تھا ..... اس کے بعد میں ورنگل کی ملازمت پر چلا گیا ۔ بہت دنوں تک ان کی کوئی خبر نہیں معلوم ہوئی پھر معلوم ہوا کہ اپنے وطن جائس گئے ہوئے ہیں ... محکمہ ، تعلیمات میں ملازم ہوگئے تھے اور آخر تک ٹیچر ہی رہے ۔ یونیورسٹی کا ان کا خواب کبھی پورا نہیں ہوا اور اپنی شاعری سے ان کو صرف یہ فیض پہنچا کہ بلدہ حیدرآباد سے باہر کسی ضلع پر کبھی تبادلہ نہیں ہوا ۔ عمر بھر غالباً مجرد رہے ۔ آخری زمانہ ان کا کہاں گزرا مجھے علم نہیں ۔ آصف جاہ سابع کے منجھلے بیٹے پرنس معظم جاہ سے کچھ مدت تک ان کا کافی خلا ملا رہا ۔ چند سال قبل ایک کتاب کا اشتہار نظر سے گزرا " دربارِ دربار " از صدق جائسی ۔ میں نے وہ کتاب منگوائی ۔ پرنس معظم جاہ کے دربار کے جو واقعات اور داستانیں شاہد صدیقی اور دوسرے اصحاب سے سن چکا تھا اور ان کی محافل شبینہ کے جو قصے مشہور تھے ان کو بہت خوب صورتی کے ساتھ اپنی اس کتاب میں صدق جائسی نے محفوظ کردیا ہے ۔

ایک بار صدق کے دولت خانے پر ہی یاس یگانہ چنگیزی سے بھی نیاز حاصل ہوا ۔ مقامی اخبارات میں یہ خبر چھپ چکی تھی کہ یاس یگانہ اپنی خدمت سے سبک دوش ہوکر لکھنؤ جانے والے ہیں ۔ میں مغرب کے بعد صدق صاحب کے گھر پہنچا تو معلوم ہوا مغرب کی نماز پڑھ رہے ہیں ۔ کچھ دیر بعد صدق صاحب کے ساتھ آئے ۔ صدق نے میرا تعارف کرایا اور یہ تو میرے محترم دوست صدق نے مجھے پہلے ہی متنبہ کردیا تھا کہ ان سے ملو ضرور مگر کچھ سنانے کی فرمائش ہرگز نہ کرنا ۔ میں بہت نیاز مندانہ انداز سے ان سے مل کر ایک کونے کی کرسی پر گم صم بیٹھ گیا ۔ صدق ہی باتیں کرتے رہے پھر نہ جانے کیوں اور کب یگانہ نے اپنا کلام سنانا شروع کردیا ۔ میں چونکا اور ہمہ تن گوش ہوگیا ۔ میں ان کی گہری فکر انگیز اور معنی خیز غزل کی شاعری کا قائل تھا اور ان کے کئی شعر میری نوکِ زبان پر تھے :

کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا ۔۔۔۔ امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر

غرض ان کے ساتھ میری مختصر سی صحبت بہت دل چسپ اور طرب افزا رہی ۔ اس کے دوسرے دن وہ اپنے وطن لکھنؤ روانہ ہوگئے ۔

اسٹیشن پر ان کو خدا حافظ کہنے کے لیے کافی حیدرآبادی احباب جمع ہوگئے تھے ۔ اس کے چند روز بعد صدق جائسی سے بھی ان کے دولت خانہ پر ان سے آخری ملاقات ہوئی وہ اس وقت اس کوچے میں رہ رہے تھے جہاں اب ایمرالڈ ہوٹل ہے یہ غالباً ۳۹ ء کی بات ہے ۔ اس کے چند ماہ بعد میں ورنگل چلاگیا ۔ بیچ میں کئی بار حیدرآباد آیا مگر ہر بار یہ پتہ چلا کہ موصوف جائس گئے ہوئے ہیں ۔ پھر میں کچھ اتنا مصروف ہوگیا کہ ان سے ملاقات کا وقت نہ نکال سکا ۔ اب اتنا زمانہ گزر نے کے بعد خبر نہیں۔ وہ اس دنیا میں ہیں یا دوسری دنیا کو سدھار چکے ہیں جسے اب خود اپنی خبر نہیں اور اب " دیر سے انتظار ہے اپنا " اپنی پرانے یادوں کی خبر تک کیسے پہنچے ۔

۵ ۔ ڈاکٹر سید سجاد :۔ اردو کے پروفیسر سید سجاد میرے ان مہربان استادوں میں سے تھے جن کو میں کبھی بھلا نہیں سکتا ۔ ڈاکٹر سید سجاد دہلی کے رہنے والے تھے وہاں کوچہ ، چیلان میں ان کا آبائی مکان تھا اور وہیں کچھ جائداد بھی تھی ۔ بی ۔ اے کے بعد اسلامیہ ہائی اسکول میں ملازم ہوگئے ۔ پھر ۱۹۱۸ ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے ایم ۔ اے کیا اس کے کچھ عرصے بعد ہی بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب ان کو انجمن ترقی اردو میں لے گئے جس کا دفتر ان دنوں اورنگ آباد میں تھا ۔ دو تین سال تک وہ انجمن سے وابستہ رہے اسی دوران انھوں نے براؤن کی " لٹریری ہسٹری آف پرشیا " اور سائکی کی " تاریخ ایران " کو انگریزی سے اردو میں منتقل کیا اور دارالترجمہ کی اور بھی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا ۔ اس کے علاوہ کوئی ایک سو پیشوں کی اصطلاحات جمع کر کے انجمن کو دیں ۔ مولوی عبدالحق صاحب ان کو اس قدر چاہتے تھے کہ پیار سے سجاد علیہ السلام کہا کرتے تھے اور خط و کتابت میں بھی اسی طرح مخاطب کرتے تھے ۔ بابائے اردو کے سبک دوش ہونے کے بعد جامعہ ، عثمانیہ میں صدر شعبہ ، اردو کی حیثیت سے ڈاکٹر سجاد کا ہی تقرر ہوا ریاست حیدرآباد کے چیف جسٹس علیا یار جنگ کی دختر سے ان کی شادی ہوئی جو ۱۹۲۵ ء میں کچھ عرصہ بیمار رہ کر داغ مفارقت دے گئیں ۔ خود ڈاکٹر صاحب بتاتے تھے کہ ان کی یہ ازدواجی زندگی بہت پُر مسرت تھی ۔ پھر ۱۹۳۳ ء میں وہ پی ایچ ۔ ڈی کے لیے جرمنی گئے ۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا " ہندی اور آریائی فلسفہ " اور ساتھ ہی دوسرے تحقیقی کام بھی کرتے رہے ۔ انگریزی میں " تاریخ نثر اردو " لکھی جس میں ابتدا سے لے کر ۱۸۵۰ ء تک کی تصانیف زیرِ گفتگو آئی ہیں ۔ انھوں نے میر محمد حسین کی مشہور و معروف کتاب کو بھی ایڈٹ کیا ۔ دنیا کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ قلمی نسخوں کے تقابل کے بعد اس کا متن تیار کیا ۔ اتفاق سے جرمنی میں انھیں ایک ایسی کتاب مل گئی جس میں ایسی کہانی تھی جو کسی اور نسخے میں نہیں تھی ۔ ڈاکٹر صاب کی رائے میں " نوطرز مرصع " دبستانِ لکھنو کی پہلی نثری تصنیف تھی ۔ جامعہ عثمانیہ میں انھوں نے پوسٹ اسٹڈیز ریسرچ سنٹر قائم کیا اور طلبہ اور طالبات سے کوئی تیس (۳۰) بہت عمدہ تحقیقی مقالے لکھوائے جس میں حسرت موہانی پر میری بہن رابعہ برنی کا مقالہ بھی شامل ہے ۔

یورپ کے دورانِ قیام میں انھوں نے کولون کی رہنے والی ایک شریف جرمن خاتون مس ہیلن شنایدر سے دوسری شادی کرلی ۔ تقسیم کے بعد وہ کراچی چلے گئے لیکن وہاں ان کی جیسی قدر ہونی چاہیے تھی نہیں ہوئی ۔ ۲۳ فروری ۱۹۵۵ ء کو کراچی میں ہی وفات پائی ۔ وہ ایک بہت شریف النفس انسان تھے بہت نرم لہجہ میں آہستہ آہستہ بات کرتے ۔ اپنے سے چھوٹوں اور شاگردوں کو بھی جناب سے مخاطب کرتے ۔ ان کو فلسفے سے بھی خاص لگاؤ تھا ۔ آخری زمانے میں انھوں نے " اقبال اور مغرب " کے زیرِ عنوان ایک بہت عمدہ اور جامع مقالہ لکھا تھا ۔ ورنگل انٹرمیڈیٹ کالج میں جب اردو فارسی کے لکچرر کے لیے تقرر طلب جائیداد کا اعلان ہوا تو انھی کے ارشاد کی بنا پر میں نے بھی اس پوسٹ کے لیے درخواست دی تھی اور کوئی ۴۵ ۰ امیدواروں میں سے میرا انتخاب ہوا تھا ۔ سید سجاد کی اس دلیل نے جو سلکشن کمیٹی کے رکن تھے وائس چانسلر اور دوسرے ممبرز کو میرا انتخاب کرنے مائل کیا ۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ ایک فارسی کا ایم ۔ اے انٹر کے طالبِ علموں کو اردو کے علاوہ فارسی بھی بہ خوبی پڑھالے گا اور چوں کہ فارسی ایم ۔ اے ۴۵ ۰ امیدواروں میں

میں اکیلا تھا اس لیے سلکشن کمیٹی نے ان کی دلیل قبول کرلی اور میرا انتخاب ہوگیا ۔ ۱۹۴۰ء سے ۴۶ء تک چھ سال میں نے لکچراری کی خدمت انجام دی پھر پیام کا مالک بنا ۔ مختصر یہ کہ ڈاکٹر سجاد کی شخصیت ان کی صحبت اور علم سے میں بہت متاثر رہا اور استفادہ بھی بہت کیا ۔

۶ ۔ **حسرت موہانی** ۔ آیئے اب میں آپ کو ایک ایسی شخصیت سے ملاؤں جس سے گو میں کبھی اتنا قریب نہیں رہا جتنا اپنے کچھ دوسرے استادوں اور دوستوں سے ، پھر بھی ادبی ، سیاسی سطح پر اس شخصیت کا مجھ پر جتنا گہرا اثر رہا شاید ہی کسی اور کا رہا ہو ۔ حسرت موہانی اور میرے والد سید اکبر حسن چچازاد بھائی تھے اور ہم ان کو حسرت چچا کہتے تھے ۔ نام ان کا فضل الحسن تھا حسرت تخلص مگر بہ قول خود ان کے :

عشق نے جب سے کہا حسرت مجھے کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن

موہان ضلع اناؤ میں ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے آپ کے والد کا نام اظہر حسن تھا ۔ والدہ کا سیدہ شہر بانو جو سید نیاز حسن کی دختر تھیں ۔ حسرت کی تاریخ وفات ۱۹۵۱ء ہے لپنے پیر کے پائنتی لکھنو کے " باغ انوار " میں دفن ہیں یہ علمائے فرنگی محل کی سکونت گاہ ہے اور اس کے ایک حصہ میں انہی علما کا خاندانی قبرستان بھی ہے ۔

قرآن شریف اور عربی ، فارسی اردو کی ابتدائی کتابیں میاں جی غلام علی اور میاں جیلانی سے موہان میں پڑھیں پھر موہان ہی کے مڈل اسکول میں داخلہ لیا جس کے ہیڈ ماسٹر لچھمی نرائن تھے جو اس نٹ کھٹ ذہین لڑکے کو دل و جان سے چاہتے تھے ۔ ۱۸۹۴ء میں مڈل اسکول کا امتحان امتیاز سے پاس کیا ۔ پورے صوبہ میں فرسٹ آئے ۔ پھر ۱۸۹۸ء میں فتح پور گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان بھی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور وظیفہ پایا ۔ وہاں سے علی گڑھ چلے گئے ۔ ۱۹۰۳ء میں بی ۔ اے کی ڈگری حاصل کی ۔ بی ۔ اے میں آپ کے اختیاری مضامین ریاضی اور عربی تھے ۔ یہاں آپ کے قابلِ ذکر اساتذہ مولانا ظہور الاسلام ، نیاز فتح پوری ، محمد امیر خاں ، پروفیسر جے ۔ سی ۔ چکرورتی ، صاحب زادہ آفتاب احمد اور ڈاکٹر ضیاء الدین تھے ۔

آپ نے پہلی غزل ۱۸۹۳ء میں لکھی جو کلیات میں شامل ہے ۔ آپ کی شادی ۱۹۰۲ء میں محترمہ نشاط النساء بنتِ شبیر حسن سے ہوئی ۔ آپ کی اکلوتی بیٹی نعیمہ ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئیں ۔ جو جناب عبدالسمیع سے بیاہی گئیں ۔ نعیمہ اور ان کے شوہر تقسیم ہند کے بعد کراچی چلے گئے اور وہیں ۱۹۸۰ ۔ ۸۶ کے دوران دونوں کا انتقال ہوگیا ۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی ۔ آپ کی بیوی نشاط النساء کا انتقال ۱۹۳۶ء میں ہوا ۔ اس کے دس سال بعد انھوں نے لپنے خاندان کی ایک بیوہ خاتون سے ان کی اولاد کی خاطر دوسرا عقد کیا ان کا نام حبیبہ بیگم تھا وہ حسرت کی وفات کے بعد بھی مرتے تک حیات رہیں ۔ ان سے ایک بیٹی بھی تھی اس کی شادی بھی ہوگئی مگر پہلی زچگی میں وہ ختم ہوگئی بچی حیات ہے اور لپنے والد کے ساتھ ہے ۔

حسرت نے پہلے اپنا کلام سید ظہور الحسن موہانی کو دکھایا پھر تسلیم شاگرد نسیم شاگرد مومن کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا ۔ عجیب مرنجاں مرنج شخصیت تھی ہمارے حسرت چچا کی ۔ کم رو ، کم قد ، چہرے پر چیچک کے داغ ، منحنی سی باریک آواز مگر آنکھیں بہت روشن چمکتی ہوئی ، عینک لگاتے تھے ، داڑھی بھی تھی پھر بھی بلا کا جادو تھا ان کی شخصیت میں ۔ بڑی معصومیت تھی ان کے مزاج میں ، بےحد سادگی کوئی نمود و نمائش نہیں ۔ کسی کام میں ان کو عار نہیں تھا ۔ گھر کا سودا سلف بھی خود لاتے تھے ، کبھی کسی کی برائی نہ کرتے ، ہمیشہ دوٹوک بات کرتے ہر کام کے ان کے بندھے ہوئے اوقات تھے ۔ ایک روزنامہ نکالتے تھے چھوٹے سائز کا ، بےحد پابندی سے ۔ جب کانپور آکر رہے تو وہاں انھوں نے ایک سودیشی اسٹور بھی قائم کیا جیسا اس سے پہلے علی گڑھ میں بھی کیا تھا اور خود ہر روز دو گھنٹے بلاناغہ اسٹور پر بیٹھتے تھے ۔ ہمیشہ سودیشی کپڑے پہنتے تھے ۔ کھادی کے سخت مخالف تھے ۔ شام میں اخبار کا کام کرتے تھے اور ۴ سے مغرب کی نماز تک پابندی سے شطرنج کھیلتے تھے ۔ ان کے تین چار مخصوص دوست تھے ۔ وہ وقت پر

آجاتے اور شطرنج کی بازی جمتی ۔ اکثر مولانا ہی ہارتے ۔ بہت تیز کھیلتے تھے چال چلنے میں بہت سوچتے نہیں تھے ۔ مغرب کی نماز پڑھ کر اپنے کچھ سیاسی دوستوں سے ملنے جاتے اور سونے سے پہلے بلاناغہ ڈائری ضرور لکھتے تھے ۔۔ ایک بار جب وہ حیدرآباد آئے میں نے ان سے کہا " میں آپ کے بارے میں لکھنا چاہتا ہوں ، تو کہا ہم اپنی ڈائری تم کو دے دیں گے اس سے بہت مواد مل جائے گا تم کو " افسوس وہ ڈائریز ہم کو نہیں مل سکیں ۔ ان کی وفات کے بعد ان کے داماد عبدالسمیع صاحب نے سب اپنے قبضہ میں لے لیں اور پاکستان چلے گئے ۔ ان کی ایک ہی بیٹی تھی نعیمہ ۔ پتنگ اڑانے میں ماہر ۔ بہت پتنگ اڑائے لڑکپن میں میں نے ان کی ساتھ ۔۔ اب تو دونوں ہی اس دنیا میں نہیں اور پتہ نہیں ان ڈائریز کا کیا ہوا ؟

۱۹۲۸ ء میں کمیونسٹ پارٹی کی کل ہند کانفرنس کانپور ہوئی ۔ مولانا حسرت اس کے صدر تھے ۔ کمیونزم کے مفہوم اور اس کی نوعیت کو سب سے پہلے حسرت نے ہی تفصیل سے اپنے خطبہ ، صدارت میں بیان کیا ۔ بہت ہی استدلالی انداز میں ، وہ پہلے آدمی تھے جو کمیونسٹ لٹریچر باہر سے لے کر آئے جو اس وقت یہاں ممنوع تھا ۔ مولانا تقریبا ہر سال لندن جاتے تھے ۔ اس وقت فیروز خاں نون یہاں کے کمشنر تھے ۔ ان سے مولانا کی بہت دوستی تھی انھوں نے پوچھا " مولانا کوئی خدمت ؟ " تو کہا " کچھ کتابیں ہماری یہاں پہنچ جائیں ۔۔ " تو وہ ساری مارکسزم کی کتابیں تھیں ۔ انھوں نے مارکسزم کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا ۔ کہتے تھے اسلام اور مارکسزم میں کوئی فرق نہیں ۔ عجیب تصور تھا ان کا بلکہ ایقان کہ کمیونزم کے بعد " درویشزم " آئے گا ۔

دستورساز اسمبلی کے وہ واحد ممبر تھے جس نے دستور پر دستخط نہیں کیے ۔ نہرو نے بہت کہا کہ تم دست خط نہ کروگے تو بھی وہ منظور ہوجائے گا مگر انھوں نے دست خط نہیں کیے ۔

جیل میں بڑی اذیت اٹھائی انھوں نے روزانہ ایک من یعنی چالیس سیر آٹا پیسنا پڑتا تھا ۔ رمضان میں روزے بھی رکھتے تھے اس حالت میں بھی چکی چلاتے تھے ۔

گیارہ حج کیے انھوں نے ۔ مغل لائن جہاز والے ان کے بڑے عقیدت مند تھے ۔ ہر سال ان کو چار ٹکٹ آنے جانے کے فری دیتے تھے مگر وہ خود اس فری ٹکٹ پر کبھی نہیں جاتے تھے ۔ کہتے تھے اس طرح ہمارا حج نہیں ہوگا ۔ اپنے پیسے سے ٹکٹ خرید کر جاتے تھے ۔ البتہ دوسروں کو ان فری ٹکٹوں میں ساتھ لے جاتے تھے ۔ اس طرح اپنے رشتے داروں کو انھوں نے حج کروایا ۔ میری پھوپھی ، چھوٹے چچا ، والد صاحب وغیرہ بھی اسی طرح حج کرکے آئے ۔ وہاں وہ اور ان کے ساتھی ابن سعود کے مہمان ہوتے تھے ان کی ایک کتاب " نکاتِ سخن " لاہور سے چھپی تھی جو لاہور کالج کے کورس میں تھی ۔ اس کی کافی رائلٹی آتی تھی ۔ اپنا ٹکٹ وہ اس سے خریدتے تھے ۔ ہر عرس میں شریک ہوتے تھے ۔ گلبرگہ کا عرس انھوں نے کبھی ناغہ نہیں کیا اور ہمیشہ تھرڈ کلاس میں سفر کرتے تھے اور ان کا کل سامان ایک تھیلے میں دو جوڑے ایک لنگی اور ایک سرمہ دانی سلائی بس اور کچھ نہیں ۔ بہت حسن دوست بھی تھے ۔ سفر میں حسین خواتین ملتیں تو ان سے عشق و دوستی میں بھی مضائقہ نہ کرتے اور شعر میں بھی اس کا ذکر کرتے :

دوپہر کی دھوپ میں مجھ کو بلانے کے لیے وہ تیرا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

یہ معشوق اردو شاعری کے معشوق سے بالکل الگ ہے ۔ حقیقی معشوق ہے جو بعد میں ان کی بیوی بنا ۔ نشاط النساء ان کا نام تھا نشاطا کہلاتی تھیں اور زندگی بھر ان کی آپسی محبت برقرار رہی ۔ یہاں حیدرآباد میں ان کی دو سگی بہنیں رہتی تھیں نسیمہ اور منیبہ ، نسیمہ بیگم کو ہم نسو پھوپھی کہتے تھے ان کے شوہر حاتم صاحب یہاں کے مشہور وکیل تھے ۔ بڑے عجیب آدمی تھے وہ ، بس ہر وقت اپنی فائلوں میں گھرے رہتے ۔ بہت کم کسی سے ملتے جلتے تھے ۔ ان کی ایک ہی لڑکی تھی وسیمہ بیگم ۔ میری بڑی بہن باجی کی ہم عمر ۔ ان کی شادی یہیں حیدرآباد میں ہوئی ۔ ان کی دو لڑکیاں دو لڑکے ہیں ، شمیمہ ، سلمٰی ، معین اور حبیب اور سب نے اعلیٰ تعلیم پائی شمیمہ ڈاکٹر ہیں اور لندن میں مقیم ہیں سلمٰی نے کسسٹری میں ڈاکٹریٹ کیا اور سنٹرل لیب میں ڈاکٹر حسین ظہیر کے ساتھ کام کرتی تھیں اب ریٹائرڈ زندگی میں سوشیل ورک کر رہی ہیں ۔ معین انجنیر تھے ۔ کچھ عرصہ پہلے بیوی بچوں کے ساتھ امریکہ چلے گئے تھے وہیں ا؟

بینے ہوئے ان کا انتقال ہوگیا ۔ حبیب نظام کالج میں میری بہن رابعہ برنی کی بڑی لڑکی شہلا برنی کا کلاس میٹ رہا ہے ۔ بے حد ذہین ہے ۔ ں کناڈا میں رہا ۔ اب علی گڑھ یونیورسٹی میں ریسرچ پروفیسر ہے ۔۔ بس حسرت کے خاندان کے یہی چند لوگ یہاں رہ گئے ہیں ۔

ہمارے حسرت چچا واقعی فقیر منش تھے ۔ سر اکبر حیدری کے ذریعے نظام نے انھیں دکن بلایا تو کہا : " میں فقیر آدمی درباری نہیں جانتا ان کے حضور تو نہیں آسکتا ۔ ایک جھونپڑی کہیں دلوادیں تو اس میں پڑا رہوں ۔ تو ملے پلی میں ایم ۔ ایم ۔ ہاشم کا جو ہے اس کے سامنے C - CLASS کا ایک مکان سرکار نے ان کو الاٹ کردیا ۔ جب بھی حیدرآباد آتے وہیں ٹھہرتے بعد میں وہ انھوں نے میرے تایا کی لڑکی حلیمہ خانم کے نام کردیا ۔ ان کے شوہر نے اسے بیچ دیا ۔ مگر اس سے پہلے مجھے یاد ہے وہ جب آئے تو اس مکان میں فیملی کے ساتھ ٹھہرے تھے ۔ کہتے تھے وہ یہاں روپوشی کی زندگی گزارنے آئے ہیں ۔ کیوں کہ سوبھاش س نے کہا ہے گرفتار مت ہونا کسی ایسی جگہ جاکر روپوش ہوجاو کہ جب ہند آزاد ہو اور تمھاری ضرورت ہو تو تم ہم سے آکر لو ۔ اس لیے ہم یہاں آئے ہیں اور پھر مجھ سے کہا ایک پریس کانفرنس کروادو ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں ۔ چوں کہ میرا صحافت سے تا یہاں کے اخبار نویسوں اور اڈیٹروں کو جانتا تھا ۔ میں نے پریس والوں کو اطلاع دے دی ۔ مغرب کا وقت مقرر ہوا ۔ اتھی ن کے قریب ایک چھوٹے سے میدان میں کچھ کرسیاں ڈال دیں لوگ جمع ہوگئے میں بھی پہنچ گیا مگر حسرت صاحب غائب ۔ کچھ ر دیکھا مولانا ایک تھیلا لیے چلے آرہے ہیں ۔ مسکراتے ہوئے کہا " آٹا پسوا کر لارہے ہیں ۔ ابھی آتے ہیں نماز پڑھ کر ۔ اندر ھر میں اور دو منٹ میں واپس آگئے ۔ میں نے پوچھا مولانا آپ نے دو منٹ میں نماز کیسے پڑھ لی ۔ کہنے لگے آپ لوگوں نے سم اللہ کے اعداد نکال لیے ہیں میں نے سورتوں کے اعداد نکال لیے ہیں ۔ وہی پڑھ دیتا ہوں نماز ہوجاتی ہے ۔ اس کے بعد وہ والوں سے مخاطب ہوئے ۔ کوئی ایک گھنٹہ بات چیت رہی ۔ پریس والوں نے ان سے سوالات کیے اور وہ ہر سوال کا جواب گئے ۔ وہ بہت مختصر بات کرتے تھے اور بڑے سے بڑے مسئلے کا ایک چھوٹے سے جملے میں جواب دے دیتے تھے ۔ کسی نے کیا جاپان فاشسٹ ملک ہے سوبھاش چندر بوس اس کے بل بوتے پر انگریزوں کی جگہ آجائیں گے تو جاپان ہم پر چھا نہ جائے گا ۔ یک بھوت سر پر بیٹھا ہے ۔ ایک درخت پر ۔ تو سر کے بھوت سے نمٹ لیں پھر دیکھا جائے گا ۔

ان کا سیاسی تجزیہ اکثر غلط ہوتا تھا لیکن وہ بات ہمیشہ کھری کہتے تھے ۔ یہ ہماری ان سے آخری ملاقات تھی ۔

○●○

پروفیسر جعفر نظام

نواب سالار جنگ سوم

(شخصیت اور کارنامے)

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ نہ میں کوئی مورخ ہوں اور نہ ہی ماہرِ فنونِ لطیفہ ۔ شان و شوکت کے اس شریف النفس انسان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنا چاہوں گا ۔ سالارجنگ نہ صرف ریاستِ حیدرآباد کے ذمہ دار شہری تھے بلکہ انھیں حیدرآباد دل سے عزیز تھا ۔ میں ڈاکٹر صادق نقوی کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ حیدرآباد صرف ایک شہر کا نام نہیں ہے بلکہ اپنے وسیع تر معنوں میں ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کی علامت بھی ہے جو سارے ہندستان میں اپنی مثال آپ ہے ۔ نواب صاحب بھی حیدرآبادی تہذیب اور سکیولرازم کا نمونہ تھے ۔

نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ سوم کے بیان کے مطابق ان کا خاندانی سلسلہ مدینہ شریف کے اوقاف کے محکمے کے سربراہ حضرت شیخ اویس قرنی دوم سے ملتا ہے ۔ علی عادل شاہ کے دورِ حکومت میں شیخ اویس ترکِ وطن کر کے اپنے فرزند شیخ محمد علی کے ہم راہ بیجاپور تشریف لائے ۔ بعد میں محمد علی کی شادی سلطنتِ بیجاپور کے وزیرِ اعظم ملا احمد نوبتی کی دختر سے ہوئی ۔ حضرت شیخ اویس قرنی دوم کے خانوادوں نے بیجاپور، مغل اور آصف جاہی سلاطین کے ہاں مختلف خدمات انجام دیں ۔ وزرائے اعظم کی حیثیت سے اویس قرنی دوم کے خانوادے کی خدمات سے لوگ کماحقہ، واقف ہیں اور ان خدمات کے بیان کے لیے ایک عرصہ درکار ہے ۔

تاریخِ دکن کی ان شخصیات کی یادیں ۱۵۰ سال سے عوام کے ذہنوں میں تازہ ہیں ۔ اس زمانے میں تین سالارجنگ پیدا ہوئے ۔ میر تراب علی خاں مختارالملک، ان کے صاحب زادے میر لائق علی خاں سالارجنگ دوم جنھیں عمادالملک کا خطاب بھی عطا ہوا تھا اور ان کے پوتے میر یوسف علی خاں سالارجنگ سوم ۔ یہ تینوں حضرات ریاستِ محروسہ سرکارِ عالی کے وزیرِ اعظم گزرے ہیں ۔ نواب لائق علی خاں نے وزارتِ عظمیٰ سے استعفیٰ دے کر پونا میں رہائش اختیار کرلی تھی ۔ وہاں ان کا انتقال بڑی شکستہ دلی کے عالم میں ہوا جب کہ سالارجنگ اول "جدید حیدرآباد" کے بانی کی حیثیت سے یاد رکھے جانے کے مستحق ہیں ۔ ان کے پوتے میر یوسف علی خاں جو سالارجنگ سلسلے کے آخری خطاب یافتہ نواب تھے انھوں نے سالارجنگ میوزیم کے قیام کی وجہ سے ہندستان اور بیرونِ ہند ساری دنیا میں نام کمایا ۔ سالارجنگ حیدرآبادی امرا کے سب سے اعلیٰ درجے کے حامل ہم مرتبہ و مشہور تین نوابی خاندان، سالارجنگ، خان خاناں اور فخرالملک کی نمائندگی کرتے تھے ۔ ان خاندانوں کی آپس میں قرابت داری بھی تھی ۔

نواب میر یوسف علی خاں سالارجنگ سوم کی پیدائش پونا میں ۱۳ / جون ۱۸۸۹ء کو ہوئی اور ان کا انتقال ۶۰ سال کی عمر میں ۲ / مارچ ۱۹۴۹ء کو ہوا ۔ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں دور رس نتائج کے حامل اہم عالمی واقعات کا مشاہدہ کیا تھا جن میں پہلی جنگِ عظیم، دوسری جنگِ عظیم، تقسیمِ ہند، آزادیِ ہند اور سقوطِ حیدرآباد کے واقعات شامل ہیں ۔

سالار جنگ سوم کے والد نواب میر لائق علی خاں کا انتقال اس وقت ہوگیا جب وہ صرف ۲۴ دن کے نومولود تھے ۔ بعد ازا
جنگ سوم کا خطاب انھیں عطا کیا گیا ۔ اپنے والد کی موت کے بعد انھوں نے اپنی ماں زینب بیگم کے سایہ ، عاطفت میں پرور
۔ نظام دکن میر محبوب علی خاں نے ان کی تعلیم و تربیت میں غیر معمولی دل چسپی لی ۔ مدرسہ ، عالیہ میں انھوں نے ابتدائی تع
ل کی ۔ بعد میں مشہور علما اور اساتذہ کی رہ نمائی میں انھوں نے عربی ، فارسی ، اردو اور انگریزی میں اعلیٰ درجے کی دست رس
نی اور علوم کی دیگر اصناف میں بھی کمال پیدا کرلیا ۔

۱۹۱۲ ء میں وزیر اعظم کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا اور ۱۹۱۴ ء میں انھوں نے اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا ۔ ا
ء میں محکمہ ، آثار قدیمہ کا قیام عمل میں آچکا تھا ۔ اس محکمے نے ان کے آرٹ اور کلچر سے متعلق نادر نمونوں کو محفوظ کرلینے
ی کی تصدیق کی ۔ نواب صاحب کے مختلف شوق تھے جن میں وہ ہمہ وقت مشغول رہتے تھے ۔ وہ اکثر اوقات اپنے آپ کو تعلیمی ا
ی سرگرمیوں میں مصروف رکھتے تھے اور انھوں نے ہمیشہ تعلیم و ثقافت کے فروغ کی کوششوں میں اپنا دستِ تعاون دراز کیا ۔ انھو
بغیر نام و نمود کے ضرورت مندوں کی مدد کی ۔ انھوں نے انجمن ترقیِ اردو کی ترویج کے لیے فراخ دلانہ امداد دی ۔ انھوں نے شم
ی مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے متوازی حیدرآباد ایجوکیشن کانفرنس کے قیام میں اہم رول ادا کیا ۔ ۱۹۲۷ ء میں انھوں نے ولی دکنی
ش کے ۲۰۰ سالہ جشن کی تقریبات کی صدارت بھی کی ۔ اس موقع پر ان کے ذہن میں سلسلہ ، یوسفیہ کے پرچم تلے دکنی اد
موں کو شائع کرنے کا خیال آیا ۔ چناں چہ سلسلہ ، یوسفیہ کے تحت حسبِ ذیل کتابیں شائع کی گئیں ۔

○ کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ ، مرتبہ ڈاکٹر زور ○ کلیاتِ سراج ○ قصہ ، بے نظیر ○ پھول بن
ثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال ○ طوطی نامہ ○ کلام الملوک ○ کلیاتِ عبداللہ قطب شاہ ○ گلشنِ عشق ، نصر
کے علاوہ بے شمار کتابیں سالار جنگ کے خاندان پر لکھی اور چھاپی گئیں ۔ جن میں سے چند یہ ہیں ؛ شیر جنگ ، میر عالم ، ریاضِ مختار
ب دکن ، مرقع دہلی ۔ سالار جنگ سوم نے ۱۹۴۱ ء میں تاریخ پر منعقدہ کانگریس کے لیے بھی خطیر مالی امداد دی ۔ ۱۹۳۴ ء میں کل ہند ا
نس کے لیے مالی امداد دینے کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ترقی کے لیے بھی وہ پابندی کے ساتھ کثیر رقم کا عطیہ دیا کرتے تھے ۔

سالار جنگ سوم کھیل کود کو بھی بہت پسند کرتے تھے ۔ چناں چہ انھوں نے فٹ بال ، کرکٹ ، پولو ، ٹینس اور بلیرڈس
ستی بھی کی ۔ سالار جنگ کپ اور معین الدولہ کپ کے کھیل کے مقابلے اس دور کی یادگاریں ہیں ۔ وہ فٹ بال کے بہترین کھلاڑی تھے
ں نشانہ بازی کا بھی بہت شوق تھا ۔ ان کے پاس ایک عمدہ اسلحہ خانہ بھی تھا ۔

شومیِ قسمت ، سالار جنگ سوم رشتہ ، ازدواج میں بندھے نہ جاسکے ۔ ایک مرتبہ ان کی شادی ان کی ماموں زاد بہن سے ۔
ی تھی لیکن ان کی ماموں زاد بہن عنفوانِ شباب ہی میں گزر گئیں ۔ اس کے بعد انھوں نے لیلاویلنکر میں دل چسپی لینا شروع کی
ان کی منگنی بھی ہوچکی تھی مگر نہ جانے کیوں یہ رشتہ بھی شادی پر منتج نہ ہوسکا اور سالار جنگ سوم تمام عمر کنوارے رہ گئے ۔ ان
ل کا مقصد ہی ادب اور فنونِ لطیفہ کی سرپرستی بن گیا تھا اور وہ مصوروں ، شاعروں ، انشا پردازوں ، کھلاڑیوں ، فن کاروں اور
ں کے لیے معاش فراہم کیا کرتے تھے ۔

وہ دو بار ہندستان سے باہر بھی گئے ۔ ۱۹۲۰ ء میں انھوں نے یورپی ممالک پہلا دورہ کیا اور ۱۹۲۷ ء میں انھوں نے انگلینڈ ، مصر
ن ، ایران ، شام اور سعودی عرب کا سفر کیا ۔ اس سفر کے دوران انھوں نے بیش قیمت اشیا کے ذخائر اپنے میوزیم کے لیے اکٹھا کیے

ان کے اس ذوق سے واقف ہوکر دنیا کے کونے کونے سے تاجر نایاب اشیا کا ذخیرہ لیے اپنے مقدر آزمانے ان کے محل کے اطراف چکر لگاتے رہتے تھے ۔ انھوں نے بیرونی سفر کے دوران مختلف براج خانوں سے اشیا خریدیں لیکن ہمیشہ اس کے لیے اپنے معتمد سید ہادی علی ہی کا نام استعمال کیا ۔ ان کے میوزیم کے ذخائر میں یورپ اور ہندستان کی پینٹنگس ، چین کے ظروف ، کانچ کا سامان ، قالین ، لکڑی کی اشیا ، بت گری کے نمونے ، ہاتھی دانت کی عمدہ منقش چیزیں ، زیورات اور گھڑیاں وغیرہ شامل ہیں ۔ ان سب سے زیادہ پرکشش اور خیالات پر چھا جانے والا ریبکا کا نقاب پوش مجسمہ ہے ۔ چوبی دہرا مجسمہ ، مشہور دیوار کی گھڑی اور ان کے علاوہ چند لاقیمت اشیا ہیں جو قیمتی پتھروں کے حجرے میں رکھے ہیں ۔ روزانہ مہمانوں کے ساتھ کھلے ہوئے حصے میں پسندیدہ اور مرغن غذاؤں سے مزین دوپہر کا کھانے کے بعد آئینہ خانے میں سالارجنگ سوم ان کے ملاحظے کے لیے رکھی گئیں چیزوں کا معائنہ کیا کرتے تھے ۔ ان کی آنکھیں پارکھ کی آنکھیں تھیں ۔ ایک بار سالارجنگ نے ایک نادر چیز خریدی ۔ چند دنوں کے بعد ویسی ہی چیز دوبارہ نظر آئی وہ بھی انھوں نے خرید لی ۔ تیسری بار پھر ایسا ہی ہوا ۔ چوتھی بار جب وہ نادر چیز بازار میں آئی تو نواب صاحب نے اس چیز کے مالک سے نہایت ہی خوش اخلاقی سے کہہ دیا کہ وہ مزید دھوکا دہی سے باز رہے ۔ اس سے ان کی خوش اخلاقی اور پریشان کن حالات کو قابو میں کرنے کے صلاحیت کا اظہار ہوتا ہے ۔ انھوں نے مصور مسٹر دیوسکر کو پینٹنگس کے نادر نمونوں کی جانچ اور اپنے تصوراتی خاکوں کی تصویر کشی کے لیے ملازم رکھا تھا ۔ ان کی زندگی میں ان کے نایاب ذخائر سرور نگر میں سات عمارتوں میں رکھے جاتے تھے ۔ ان کے علاوہ دیوان دیوڑھی میں بھی اشیا رکھی جاتی تھیں ۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے میرعالم کے تالاب کے کنارے ایک عمارت بھی بنانا چاہی تھی ۔ مگر یہ منصوبہ پایہ ، تکمیل کو نہ پہنچ سکا ۔

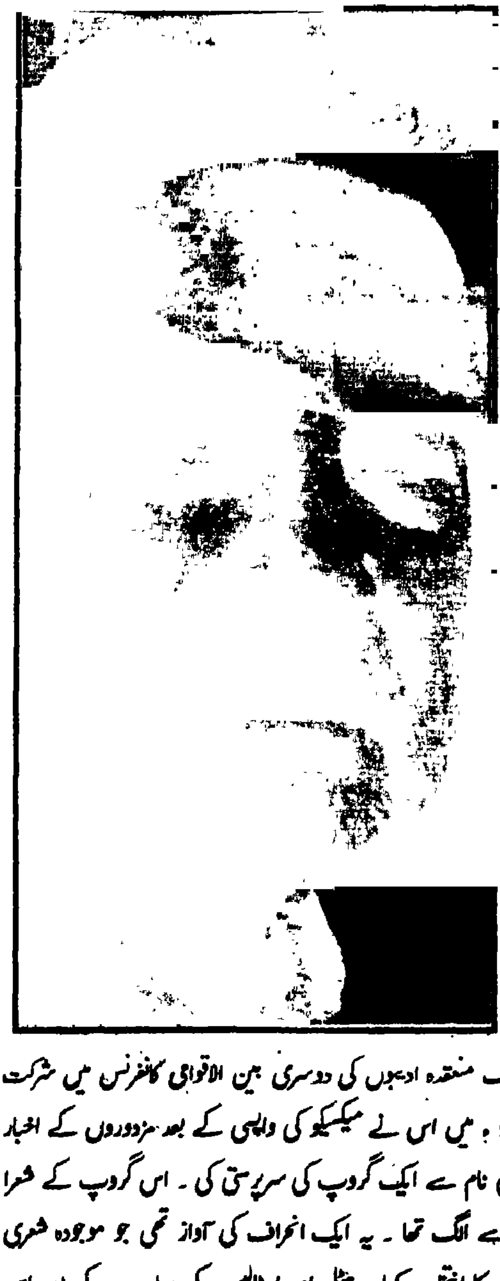
پولیس ایکشن کے بعد ۱۹۴۸ء میں ملٹری گورنر جے ۔ ین ۔ چودھری نے عدالت سے ان کی نادر اشیا کو اپنے قبضے میں کرنے کی گزارش کی تھی ۔ ۱۴ / دسمبر ۱۹۵۱ء کو پنڈت نہرو نے ان کے میوزیم کو عوام کے لیے کھول دیا ۔ ۱۹۶۱ء میں اسے مرکزی حکومت نے قومیا کر اپنی تحویل میں لے لیا ۔ ۱۹۶۸ء میں اسے موجودہ عمارت میں منتقل کردیا گیا ۔

سالارجنگ لائبریری میں بھی نادر نمونوں کے ذخائر موجود ہیں ۔ جن میں ۱۵ صفحوں پر تحریر کردہ قرآن پاک ، قرآن پاک کا ایک اور نسخہ جس کا ہر صفحہ "الف" سے شروع ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ دیوانِ محمد قلی قطب شاہ اور ہاتھ سے لکھی ہوئی نایاب تحریریں اور خطاطی کے عمدہ شہ پارے شامل ہیں ۔

سالارجنگ نہایت ہی شکیل ، پرکشش اور خوش لباس آدمی تھے ۔ وہ مسلمانوں کی عیدوں کے علاوہ دسہرہ تیوہار کی تقاریب کے بڑے پیمانے پر انعقاد میں بھی دل چسپی لیتے تھے ۔ ان کا انتقال ۲ / مارچ ۱۹۴۹ء میں ہوا ۔ ان کے انتقال کے ساتھ ہی خوش شکل ، نہایت ہی وضع دار ، مہذب شخصیت ہمیشہ کے لیے نگاہوں سے اوجھل ہوگئی ۔ چوں کہ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے سالارجنگ اول اور سالارجنگ دوم کی ہم شیرزادیاں ان کے خاندان کی نمائندگی کرتی ہیں ۔

○●○

اوکتا ویو پاز



۱۹ / اپریل ۱۹۹۸ء مو عظیم شاعر اوکتا ویو پاز کا انتقال ہوگیا ۔
پاز میکسیکو میں ۳۱ مارچ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوا ۔ وہ اپنے والد کی
ـ سے میکسیکن تھا ، پاز کے دادا اپنے وقت کے مشہور صحافی اور قلم
تھے ۔ انھوں نے فرانسیسیوں کو میکسیکو سے بےدخل کرنے کی جنگ
بھی حصہ لیا تھا ۔ اس کی ماں اسپین کی رہنے والی تھیں جو
ANDOLLS سے ہجرت کر کے یہاں بس گئی تھیں ۔ پاز کا بچپن
ـ دیہات میں گزرا جو اب METROPIRS میں ضم ہوگیا ہے ۔ پاز
اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا " ہم ایک بڑے مکان میں رہتے تھے
ـ میں ایک باغ تھا ۔ ہمارا خاندان انقلاب اور خانہ جنگی میں بری طرح
ہوچکا تھا ۔ ہمارے گھر میں نایاب فرنیچر تھا ، بےشمار کتابیں اور
ری اشیا جو دھیرے دھیرے بوسیدہ ہوچکی تھیں ۔ مجھے اب بھی یاد ہے
ایک عرصے تک ہم ایک نادر گوشے میں رہتے تھے جس کی دیواریں
ـ تھیں اور جس کو ایک اسکرین کے ذریعے کمرہ بنایا گیا تھا جو مجھے
می اور بارش سے بچایا کرتا تھا ۔ اس کمرے کو جھینگروں نے فتح کرلیا
ـ" اس نے سترہ برس کی عمر میں ۱۹۳۱ء میں شاعری شروع کی ۔ اپنے
پ کے دوسرے نوجوان شعرا کے ساتھ اس نے ایک رسالہ
BARANDA جاری کیا ۔ دو برس بعد اپنا پہلا شعری مجموعہ SAVAGE
MOO شائع کیا ۔ ایک لٹل میگزین " وادی میکسیکو کی نوٹ بک "
ـے نام سے شروع کیا ۔ ۱۹۳۷ء میں اس نے اسپین میں فاشزم کے خلاف منعقدہ ادیبوں کی دوسری بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت
جہاں اس کی ملاقات البراتی ، پبلو نرودا ، آڈن ، اسپنڈر سے ہوئی ۔ ۱۹۳۸ء میں اس نے میکسیکو کی واپسی کے بعد مزدوروں کے اخبار
ـ کالم لکھنا شروع کیا ۔ ایک رسالہ " ورک شاپ " بھی جاری کیا اور اسی نام سے ایک گروپ کی سرپرستی کی ۔ اس گروپ کے شعرا
طرہ ، امتیاز یہ تھا کہ ان کا شعری رویہ مروجہ ادبی اسلوب اور روایت سے الگ تھا ۔ یہ ایک انحراف کی آواز تھی جو موجودہ شعری
ـار اور موجودہ تنقیدی اصولوں کی نفی کرتا تھا ۔ اس نے اسپین کی شاعری کا انتخاب کیا ۔ ہٹلر اور اسٹالین کے معاہدے کے بعد اس
ـے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کی ۔ ۱۹۴۳ء میں بین الاقوامی میگزین PRODIGAL SAN کے نام سے شروع کیا جس کی وجہ سے ٹی ۔
ایس ۔ ایلیٹ اور جان ڈن اسپین میں روشناس ہوئے ۔ اس دوران وہ معمولی قسم کے کام کرتا رہا جیسے سنٹرل بنک میں پھٹے پرانے نوٹوں

کو جلانے سے پہلے گننے کا کام وغیرہ ۔

۱۹۴۴ ء میں وہ امریکہ گیا جہاں - شمالی امریکہ کی شاعری کا اثر میکسیکو میں " کے عنوان سے اس کی پہلی تنقیدی کتاب ۱۹۵۰ ء میں شائع ہوئی ۔ اس کی دوسری تنقیدی کتاب "THE LABYRINTH OF SOLITUDE" " تنہائی کی بھول بھلیاں " ایک بلند پایہ کتاب ہے ۔ جو اس کے تخلیقی افکار کا خزانہ ہے ۔ یہ کتاب اس کے شعری رویوں اور اس کے نقطہ ۔ نظر کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے ۔ ۱۹۴۵ ء میں اس نے فرانس کا دورہ کیا ، ماورائیت کی تحریک کا ہم نو ابن کر تحریک کے رکن کی حیثیت سے نمائش اور طباعت کے لیے اپنی خدمات پیش کیں ۔ میکسیکو کی وزارتِ خارجہ سے وابستہ ہوکر ابتدائی دو برس اس نے پیرس ، نیویارک ، سان فرانسیسکو ، جنیوا میں کام کیا ۔ ۱۹۵۰ ء میں اس نے میکسیکو کی شاعری کا انتخاب شائع کیا جس کا ترجمہ مشہور ڈرامہ نگار سمویل بکٹ نے انگریزی میں کیا ۔ ۱۹۶۲ ء میں میکسیکو کے سفیر کی حیثیت سے وہ ہندستان آیا ۔ ہندستانی تہذیب اور ثقافتی اقدار سے وہ بےحد متاثر تھا ۔ اس نے ہندو دیومالا بدھ مت اور اسلامی تہذیبی روایتوں کو شاعری میں بڑی خوب صورتی سے اپنایا ۔ یہیں اس کی ملاقات فرانسیسی خاتون MARE JOSE TRAAMINI سے ہوئی جس سے اس نے شادی کرلی ۔ اس نے اس واقع کو اپنی پیدائش کے بعد دوسرا اہم واقعہ قرار دیا ۔ ۱۹۶۸ ء میں اس نے محکمہ ، خارجہ سے استعفیٰ دیا اور ایک سال بعد کیمبرج ، ٹکساس اور ہارورڈ یونیورسٹیوں میں تدریس کا کام کرتا رہا ۱۹۷۱ ء میں میکسیکو واپس ہوکر PLUREL نامی جریدہ نکالا ۔ اس اخبار کو حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا ۔ اس نے " واپسی " کے نام سے ایک اور ادبی رسالے کی بنیاد ڈالی اور اس سے ایک مرحلے تک وابستہ رہا ۔ اسے ادب کے ساتھ ساتھ بصری آرٹ سے بھی دل چسپی تھی ۔ ۱۹۶۰ ء میں اس نے تانترک آرٹ کی پہلی نمائش امریکہ میں کی تھی ۔ اس کی منتخب نظموں کا مجموعہ حرّیت اور لفظ "FREEDOM AND THE WORD" کا دوسرا ایڈیشن مناسب ردوبدل کے بعد ۱۹۶۰ ء میں شائع ہوا جو اس کی نمائندہ نظموں پر مشتمل ہے ۔ THE BROKEN JAR اور SUN STONE اس کی دو طویل نظمیں ہیں جو اس کی شاعری میں سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں ۔

مشہور افسانہ نگار ناصر بغدادی (کراچی) نے اپنے ایک مضمون میں پاز کی شاعری کے تین بنیادی لوازمات کا ذکر کیا ہے :

(۱) شاعری جو انسانیت اور بنی نوعِ انسان کے حوالے سے وحدانیت اور ہم آہنگی کا بلند آہنگ پیغام ہے ۔

(۲) محبت جو انسانی انا کی تسکین - تم " کے ذریعے کراتی ہے " تم " کا حصول فی الاصل " میں " کی تکمیل ہے اور جب " میں " کی اکائی مکمل ہوجاتی ہے تو انسانی طمانیتِ نفس اور تکمیل پذیری کے نقطہ ، عروج پر پہنچ جاتی ہے ۔

(۳) تقدس جو انسان کو زندگی کے دوسرے کنارے پر پہنچاتا ہے ۔ انسانی زندگی کے حوالے سے پاز کے یہ رہ نما اصول مابعد الطبیعاتی اہمیت کے حامل ہیں ۔

پاز کی شاعری ماورائیت کی ایک اچھی مثال ہے جس کی وجہ سے اس کی شاعری منطقی طور پر بے محل اور غیر قدرتی بھی محسوس ہوتی ہے پاز کو ۱۹۹۴ ء میں نوبل انعام ملا ۔

○●○

(مظہر مہدی)

اوکتا ویو پاز

ترجمہ : مظہر مہدی

بھوت کا سایہ

اگر آدمی خاک ہے
تو کیا میدان سے اٹھتے بگولے
آدمی ہیں ؟

○●○

سحر

مشاق سرد ہاتھ
کھول رہے ہیں یکے بعد دیگرے
تاریکی کے زخم سے پٹیاں
میں اپنی آنکھیں کھولتا ہوں
ابھی تک ـــ میں زندہ ہوں
زخم کے اندرون
جو ابھی تک تازہ ہے

○●○

مطلع الفجر

ریت پر
پرندوں کے پر
ہوا کی یادداشت لکھ رہے ہیں

○●○

مشابہت

میرے جسم میں تم کھوجتے ہو کہسار
اس سورج کے لیے جو مدفون ہے اپنے ہی صحرا میں
تمھارے جسم میں کھوجتا ہوں
رات کے سمندر میں
ڈولتی ہوئی ناؤ

○●○

وہ دوسرا تھا

اس نے اپنے لیے ایک چہرہ بنایا
اس کے پیچھے
جیا ۔ مرا اور قبر سے اٹھا
کئی دفعہ
اب اس کے چہرے پر
اس چہرے کی جھریاں ہیں
اور جھریوں کا کوئی چہرہ نہیں

○●○

اوکتا ویو پاز

ترجمہ : تبسم کاشمیری

جھنڈ

○

بکثرت وسیع اور ٹھوس
مگر جھولتے ہوئے
ہوا کے ہاتھوں تھکے ہارے
مگر زنجیروں میں بند
ایک لاکھ پتوں کی سرسراہٹ
مری کھڑکی کے بالمقابل
درختوں کا ہنگامہ
گہری سبز آوازوں کا تموج
جھنڈ یک بہ یک ساکت ہو ہو جاتے ہیں
وہ ٹہنیوں اور پتوں کا جالا ہیں
مگر کچھ مقامات شعلہ آگیں بھی ہیں
اور ان پھندوں میں پھنستے ہوئے
..... بے چین
سانس لیتی ہوئی
کوئی شے ہے جو تند و تیز اور درخشاں ہے
ایک تیز رو اور غضب ناک جانور
پتوں کے بیچ روشنی کا ایک بدن
اور وہ دن ہے
بائیں جانب ۰ دیوار کے اوپر

رنگوں سے زیادہ خیال نظر آتے ہیں
بادل ہی بادل ۰ آسماں کم دکھائی دیتا ہے
ایک طاس کی نیلاہٹ
ریزہ ریزہ ہوتی چٹانوں کے حصار
اور جھنڈ کی قیف کے اندر
تہہ میں بیٹھتی ہوئی ریت
بیچ میں
مغرب کی برافروختہ روشنائی کے دبیز چھینٹے
کاغذ کے ایک ورق پر
اب رات تقریباً اچھی طرح پھیل چکی ہے
جنوب مشرق کے بُعد میں
جہاں افق تھک کر ہمت ہار جاتا ہے
برگ پوش سائبان
تانبا بن کر چمکنے لگتا ہے
تین گلہریاں
اس شعلے سے گزرتی ہیں
اور کسی بھی ضرر کے بغیر
دوبارہ ظاہر ہوتی ہیں
ویران خلا میں روشنی ہے نہ سایا

بادل تحلیل ہونے والے ہیں
گھر روشنیوں سے جگمگاتے ہیں
آسمان دریچے میں سمٹ رہا ہے
اور صحن
اپنی چار دیواری میں بند
بہت الگ تھلگ ہو رہا ہے
اس طرح یہ اپنی حقیقت تک پہنچتا ہے
اور اب ردی کے ڈبے
اور خالی گل دان کے صرف سائے ہی
بے نور سیمنٹ کی دیوار پر باقی ہیں
خلا سکڑ رہا ہے
خود اپنے اوپر
آہستہ آہستہ نام متحیر ہوتے جاتے ہیں

○●○

اوکتا ویو پاز

ترجمہ : تبسم کاشمیری

پرار تھنا

۱

شیو اور پاربتی
ہم تمھیں پوجتے ہیں
کسی دیوتا کی طرح نہیں
بلکہ آدمی کی ایشورتا کی
تمثالوں کی طرح
تم اس کے سوا اور کچھ نہیں جو آدمی بناتا ہے
محنت کی کٹھن سزا سے گزر کر
آدمی بھلا کیا بنے گا
شیو جی !
تمھارے چار بازو چار دریا ہیں
پانی کے چار فوارے
تمھارا پورا وجود ایک فوارہ ہے
جہاں سندر پاربتی اشنان کرتی ہے
اور جہاں وہ ایک سجیلے بجرے کی طرح ڈولتی ہے
سورج کے نیچے ساگر دھڑکتا ہے
شیو کی ہنسی کے عظیم ہونٹ
ساگر شعلہ کناں ہے
یہ پانیوں پہ پاربتی کے قدم ہیں

شیو اور پاربتی
وہ عورت جو میری بیوی ہے
اور میں تم سے
بالکل بے معنی طور پر اس کے بارے میں پوچھتا ہوں
وہ جو کہ ایک اور ہی دنیا سے ظاہر ہوتا ہے ؛
وہ جو ہے
سمندر پر روشنی
خوابیدہ زمین اور سمندر پر ننگے پاؤں روشنی

○○○

اوکتاویو پاز

ترجمہ : تبسم کاشمیری

شام

وہ کیا ہے جو سنبھالے رکھتا ہے
شام کے نیم وا نور
اور ہاتھوں میں آزاد کردہ روشنی کو ؟

تمام شاخیں
پرندوں کے بوجھ سے مغلوب ۔
اندھیرے کی سمت جھکتی ہیں

محوِ ذات رزل لمحے
ابھی تک تاباں ہیں
حصاروں پر

رات کا استقبال کرتے ہوئے
پیڑوں کے جھنڈ
سکوت کے فوارے بن جاتے ہیں

ایک پنچھی گرتا ہے
گھاس بھورا ہے
دھندلے کنارے ، لاسا سیاہ ہے
دنیا ذرا کم ہی قابلِ اعتبار ہے ؛

٭٭٭

شجرِ ذات

ایک پیڑ مرے سر کے اندر اگا
ایک پیڑ اگا
رگیں اس کی جڑیں ہیں
شاخیں اعصابی ریشے ہیں
اور خیالات اس کے ژولیدہ گل بوٹے
تمہاری ایک جھلک اس کو آگ لگادیتی ہے
لہو رنگ نارنگیاں
اور شعلوں کے انار
اس کے اثمار کے عکس ہیں

رات کے بدن میں
دن طلوع ہوتا ہے
اس جگہ ، مرے باطن میں ، مرے سر کے اندر
پیڑ بولتا ہے
ذرا قریب آجاؤ ـــــ کیا تم سن سکتے ہو ؟

٭٭٭

اوکتا ویو پاز

ترجمہ : تبسم کاشمیری

ہرات میں انبساط

○

اس مقام پر مری آمد
اور میرے یہ مصرعے
کسی باقاعدہ خیال و موضوع کے پابند نہیں
ایک نیلی اور سبز مسجد ،
چھ تراشے ہوئے مینار ،
دو یا تین مقبرے
ایک صوفی شاعر کی یادیں
تیمور اور اس کا شجرہ نسب
ایک کہنہ ہوا سے میری ملاقات
جس نے سب راتوں پر ریگ افشانی کی
اس نے مری پیشانی کی تعذیب کی اور
پپوٹے جھلس دیے
طلوع سحر پنچھیوں کی اڑانیں
ور پتھروں پر پانی کی وہ سرسراہٹ
سانوں کے نقوشِ پا
مگر پانی کا ذائقہ مٹیالا تھا)
میدانوں میں سرگوشیاں
صورتوں کا ظہور
ور خیاب
بڑے بگولے
سے خیالات کی طرح غیر حقیقی
ہوں کے کمرے یا پہاڑوں پر

چکر پہ چکر
یہ زمین جو اونٹوں کا قبرستان ہے
اور مری نکتہ چینیوں میں
ہمیشہ کی طرح ریزہ ریزہ ہوتے چہرے
کیا تباہیوں کی آقا ہوا
مری واحد مالک ہے ؟
زمین بردگی
کثرتِ ضیاع
صوفی کے مقبرے پر
ایک خشک پیڑ کے اندر
میں نے ایک کیل گاڑھی
دیگر لوگوں کی طرح
نظرِ بد کے خلاف نہیں
بلکہ خود اپنے خلاف
(میں نے کچھ کہا ،
لفظ جو ہوا اڑا لے گئی)

ایک سہ پہر کو چوٹیوں کی مشاورت ہوتی
چناروں نے کھڑے کھڑے چہل قدمی کی
چمک دار اینٹوں پر دھوپ چمکی
یک بہ یک آمدِ بہار
خواتین کے باغ میں

میں فیروزی برجی کی طرف چڑھا
حروف سے منقش مینار
کوئی رسم الخط اپنے معنی سے ماورا ہوکر
روشن ہوا
میں تمثالوں کے بغیر نہیں دیکھ سکتا تھا
اور میں غائب ہوتی شکلوں کے چکر نہ دیکھ سکا
جب تک وہ صوفی کے بے جوہر وجود کی
غیر متحرک روشنی میں گم نہ ہوگئے
میں کثرت کو خلا میں نوش نہ کیا
اور نہ ہی بدھی ستوا کے جواہری بدن پر
تیس نشان دیکھ سکا
میں نے ایک نیلا آسمان
اور تمام تر نیلاہٹیں دیکھیں
سفید سے سبز ہوتے
پنکھا نما تبریزی پیڑ
اور چیڑ کے ایک درخت پر
پرندے سے زیادہ ہوا تھی
ایک سبز اور سفید مینار
میں نے دیکھا دنیا اپنے وجود پر استراحت کر رہی تھی
میں نے دیکھا کہ پیکر ظاہر ہو رہے تھے
اور میں نے اس نصف ساعت کو
متناہیت کے کمال کا نام دیا

○●○

گوشۂ روحی قادری



پیر زادہ سید محی الدین علی روحی قادری صاحب کا شمار حیدرآباد کے اساتذۂ غزل میں ہوتا ہے ۔ وہ ایک صوفی گھرانے میں پیدا ہوئے ۔ علومِ مشرقیہ کی تعلیم گھر پر ہوئی ۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے ۔ ان کا کلام روحانی تجربات ، مشاہدہ ، کائنات اور مسائلِ حیات کے بارے میں فکرِ عمیق کا حامل ہے ۔ غزل گوئی میں ان کا منفرد اسلوب ہے ۔

روحی قادری صاحب کے کلام کا ایک انتخاب " کیفِ اضطراب " کے نام سے شائع ہوا تھا ۔ ۱۹۹۴ ء میں دوسرے مجموعۂ کلام " حرفِ روشن " کی اشاعت عمل میں آئی ۔ اس مجموعے پر ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے مبسوط پیش لفظ تحریر کیا ہے ۔

(ادارہ)

پروفیسر سید سراج الدین

روحی صاحب اور ان کی شاعری

روحی قادری کے کلام پر کچھ لکھنا چاہیں تو جی چاہتا ہے کہ تنقید کی جدید لفظیات کو الگ رکھ دیا جائے ۔ پیکر تراشی ، علامتی طرز اظہار ، جدید حسیت ، ترسیل و ابلاغ کے مسائل ، جدیدیت ، روایت ، جدید لب و لہجہ اور کیا کیا کچھ ۔ جی چاہتا ہے یہ سب باتیں ایک طرف رکھ دی جائیں ۔ کیوں کہ روحی قادری کی شاعری ایک اندرونی تقاضا ہے اور بس ۔ انھوں نے خود کہا ہے کہ ان کی شاعری واردات قلبی کی داستان ہے ۔ جہاں یہ واردات گہری ہے وہاں شعر بھی گہرا ہے ۔ جہاں نہیں ہے وہاں بس کلام موزوں بن کر رہ گیا ہے ۔

بہت عرصہ ہوا ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے ایک دفعہ گفتگو میں روحی صاحب کا ایک شعر سنایا جو اتنا بے ساختہ تھا کہ میں نے طے کرلیا کہ جس کسی کا یہ شعر ہے وہ ، طبعی شاعر ہے ۔ پھر غالباً ۹۰ یا ۱۹۹۱ ء کی بات ہے جب ڈاکٹر شکیب نے ایک شعری نشست صرف پرانے شہر کے شعراء کی ، اردو گھر مغل پورہ میں منعقد کی ۔ مجھے بھی ازراہ دوستی اس میں بلایا اور صدارت کا اعزاز بخشا ۔ اپنی کرسی پر بیٹھا ، جہاں میں یہ سوچتا رہا کہ یہ صدارت مجھے کتنی زیب دیتی ہے ، وہیں میں ان شاعروں کو دیکھتا رہا جو اس ہال میں جمع تھے ۔ یہ ایک خاص تجربہ تھا کیوں کہ جو لوگ وہاں جمع تھے ان میں بے حد دل چسپ نسلی خد و خال دکھائی دیتے تھے ۔ ان میں سے اکثر معمر تھے اور ان کی آنکھوں میں غم دنیا کی گرد سی تھی ۔ ان کے لباس بعض صورتوں میں روایتی تھے ۔ سب میں ایک رکھ رکھاؤ تھا ۔ سب پر ایک تہذیب کی چھاپ تھی ، بات چیت میں ، حرکات و سکنات ، چال ڈھال میں ، اس مجمع میں ایک شخص نے میری توجہ کھینچ لی ۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ خالص دکھنی خد و خال اور شخصیت بھی کوئی چیز ہے تو یہ شخص مجھے خالص دکھنی آدمی لگا ۔ گہرا سانولا دکن کی دھوپ میں تپا ہوا رنگ ، چھریرا بدن ، دبے ہوئے گال ، تھوڑی سی اندر دھنسی ہوئی آنکھیں ، ابروؤں کے سائے میں ان کی چمک ، غم جہاں کی گرد سے کسی قدر دھندلی ، پتلے لب تمباکو کی نیلاہٹ سے کپاسی ، شخصیت کے اطراف جو فضاء ہوتی ہے اس میں کسی کوچے میں کوئی قدیم مکان اور دیوان خانہ بھی ہو جہاں اچھے کھانے کا بھی لطف ملے اور شعر و سخن کا بھی اور پرانی تہذیب اور خلوص و محبت کی وہ میگنیٹک فیلڈ جو جوبلی ہل کی سفید مرمریں سلوں کی سرد مہری میں ڈھونڈتے رہ جاتیے ۔ یہ وہ چیز ہے جس کی کشش آنا مری شمل کو لاڈ بازار کھینچ لاتی ہے ۔ یہ تاثری خاکہ میں نے کیوں سپرد قلم کیا ؟ ایک تو اس شام کی یاد جب میں نے روحی صاحب کو پہلی دفعہ سنا ، دوسرے اس فضاء کو گرفت میں لانا جو ایک حد تک روحی صاحب کی غزلوں میں بھی فلطاں ہے ۔ لیکن اس مضمون کو تو روحی قادری کی شاعری پر تنقیدی مضمون ہونا ہے لہذا آگے چلتے ہیں ۔

روحی قادری غزل کے شاعر ہیں ۔ انھوں نے رعایتاً بھی کوئی نظم نہیں لکھی ، دور جدید کی رعایت سے بھی نہیں ۔ یہ بھی ایک بے نیازی ہے ۔ غزل بڑی مشکل اور بڑی آسان صنف ہے ۔ آسان اس بناء پر کہ قافیے اور ردیف کی وجہ اس میں خود بہ خود ایک موزونیت آجاتی ہے اور ہماری پرانی تنقید کے مطابق شاعری کے معنی ہی کلام موزوں کے ہیں ۔ غزل کی مشکل وہ ہے جسے

ہم تک ہندی کہتے ہیں۔ ہماری قدیم شاعری میں جا بہ جا ایسی تک بندی مل جاتی ہے ۔ بڑے شاعروں کے ہاں بھی۔ اس تک بندی نے متشاعروں کا ایک پورا گروہ پیدا کردیا تھا جس کے نمائندے آج بھی مل جاتے ہیں۔ محض تک بندی کرنی ہو تو غزل سے زیادہ آسان صنف نہیں۔ بس تھوڑی سی موزوں طبیعت چاہیئے ۔ لیکن اسی آسانی نے غزل کو مشکل ترین صنف بنادیا ہے ۔

شعر غزل کے کہنا کوئی کھیل نہیں ہے بچوں کا   سیدھی سادی بات تو یہ ہے ٹیڑھی ہے یہ کھیر میاں

غزل کے شاعر کے لیے اپنی انفرادیت جتانا جوئے شیر لانا ہے ۔ غزل کا شاعر نہ صرف ردیف و قافیہ بلکہ لفظیات اور استعاروں کو ایک دبیز روایت کے بوجھ تلے کام کرتا ہے ۔ اس کو تکرار سے بھی بچنا ہے اور محض روایتی انداز سے بھی۔ اس طرح وہ رد و قبول کی ایک کڑی آزمائش سے گزرتا ہے ۔ غزل کے موضوعات بھی بندھے ٹکے ہیں یا رہ چکے ہیں۔ عشق و عاشقی، تصوف، عرفان حمد و ثنا، اخلاق وغیرہ (ویسے آج کل غزل کا دائرہ بہت پھیل چکا ہے)۔ حال حال تک غزل کا شاعر ایک محدود دائرے میں اس طرح کام کرتا تھا کہ اس کے شعر (یعنی واقعی اہم شعر) کی شعاعیں اس دائرے سے پھوٹ کر بہت آگے نکل جاتی تھیں ۔ یہ غزل کی کور پوئٹری (Core Poetry) ہے ۔ یہ ایسی شاعری ہے جس میں ایک ایک شعر یعنی محض دو مصرعے زندگی اور کائنات کے محیط تک پھیل جاتے ہیں۔ غالب اس کی بہت اعلی مثال ہے یا میر کی بظاہر سادہ پر کاری جیسے ۔

مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میر   کیا دوانے نے موت پائی ہے !

غزل کے لیے شعر جو ایک دفتر کو دو مصرعوں میں ہی سمیٹ لیتے ہیں یا سننے یا پڑھنے کے بعد ذہن میں ان کے مفاہیم کی سرحدیں پھیلنے لگتی ہیں۔ شاعری کے اعلی نمونے ہیں۔ کیا روحی صاحب کے ہاں ایسے شعر موجود ہیں۔ اس کا ذکر آگے آئے گا ۔ پھر بھی جی چاہے تو محض مثلاً آپ حرفِ روشن کی صفحات ۲۳، ۲۹، ۶۵، ۸۰، ۸۳ والی غزلیں دیکھ لیں۔ کچھ نہ کچھ ایسے شعر مل جائیں گے ۔ جو میری اوپر کہی ہوئی بات پر پورے اتریں۔

اس سے پہلے کہ فنِ غزل اس اونچائی پر پہونچے کئی شرائط ہیں۔ شرط اول ایک طرح کی تیز حس ہے جس میں قلب و حواس سب شریک ہوں، احساس شاعر پر فطرت کی وہ خوبصورتیاں کھولتا ہے جو عام اچٹتی نظر سے اوجھل رہتی ہیں۔ روحی کا شعر ہے ۔

کچھ وہی سمجھتے ہیں راز رنگ و بو کیا ہے   لو سے آتش گل کی جو دماغ جلتے ہیں

یا

یہ دیکھ سکتے تو بادل زمیں پہ بچھ جاتے   جو نرم دھوپ چمکنے لگی پھوار کے بعد

یا

دلہنیں موسم کی ہیں پھولوں کی روحی ڈالیاں   سرخ رو سبزہ ہے ان کے آنچلوں کی چھاؤں میں

وغیرہ ۔ لیکن محض تیز حسی کافی نہیں۔ شعر کا ایک پورا کاروبار ہے جس کے کئی سوراق کہتے ہیں۔ یہی احساس کا تیکھاپن شعر میں نثر کی طرح راست ظاہر نہیں ہوتا۔ اس میں شاعر ایک نزاکت یا باریکی پیدا کرتا ہے ۔ اسی کو ہمارے اگلے تذکرہ نگار ندرت بیان یا نزاکتِ خیال لکھتے تھے ۔ ندرت اگر برائے ندرت ہو تو سطحی سی ہو کر رہ جاتی ہے لیکن اگر اس میں خیال کا کوئی پہلو پوشیدہ ہو یا زبان کا لطف ہو کہ دیر تک کسی لذت دہن کی طرح زبان پر رہے تو پھر یہ نزاکت ایک لطف پیدا کر دیتی ہے ۔ روحی قادری کی شاعری میں

ایسی ہی ایک نزاکت ہے جو غزل کے عام مجموعوں میں کم دکھائی دیتی ہے ۔ اسی نزاکت کو صاحبِ ذوق قاری اپنی پسند اور داد کے ضمن میں محسوب کر سکتا ہے ۔ یہاں ایک جملہ معترضہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بات یا ریمارک ایسا نہیں ہوتا جو ہمیشہ اور ہر بات پر صادق آئے ۔ گو صداقت کا ایک پرتو اس کا جزو ضرور ہوتا ہے ۔ روحی قادری کو سنتے ہوئے ، اور یہ اسی محفل کی بات ہے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے ، اور بعد میں ان کے کلام کو دیکھ کر مجھے اسی نزاکت اور باریکی کا احساس ہوا ۔ میں نے چند مثالیں نوٹ کی ہیں کیوں کہ بغیر مثالوں کے بات ادھوری رہ جاتی ہے ۔ ان اشعار کو دیکھیے :

رونے کو کیا رو بھی لیں گے لیکن ہم کو فکر یہ ہے — آنسو اپنی آنکھ سے گر کر مٹی میں مل جائے تو
بہت آساں سہی تیری گلی جان دے دینا — مگر مشکل یہ ہے تیری گلی مشکل سے ملتی ہے
ہم اہلِ عشق ہیں صرفِ سوال ہو جاتے — وہ ہم سے پوچھ تو لیتے کہ آرزو کیا ہے
یہ دیکھ سکتے تو بادل زمیں پہ بچھ جاتے — جو نرم دھوپ چمکنے لگی پھوار کے بعد

ادائے خیال میں اس نزاکت کے لئے ضرور ہے کہ آدمی زبان پر حاوی ہو ، لفظ و محاورے کا گہرا ادراک رکھتا ہو ۔ لفظوں کی تاریخ اور ان کی نبض سے واقف ہو ۔ زبان کا یہی گہرا شعور ہے جو روحی قادری کی شاعری کو اعتبار بخشتا ہے ۔ آج کل زبان سے گہری واقفیت رکھنے ، اس کی روایت میں ڈوبنے کا رواج کم ہوگیا ہے ۔ ہمارے بہت سے نئے شاعر بڑی تخلیقی صلاحیت کے باوجود زبان پر زیادہ قدرت نہیں رکھتے اور ستم یہ کہ اس کو ضروری بھی نہیں سمجھتے ۔ روحی قادری پرانی طرز کے آدمی ہیں ، زبان کو اہمیت دیتے ہیں اور جانتے ہیں کہ شعر اور لطفِ زبان کا کیا رشتہ ہے ۔ انھوں نے خود کہا ہے کہ ۔

ہم نے جس لفظ کو بھی برتا ہے — پہلے اس کا حسب نسب دیکھا

لفظ کا حسب نسب دیکھنا اسی کے بس میں ہے جس نے اس باب میں تامل کیا ہو ۔ جس کی لسانی تربیت ہوئی ہو ۔ روحی قادری کو یہ وصف شعرائے سلف کے گہرے مطالعے سے ملا ہے ۔ ان کی زبان صیقل ہوگئی ہے ۔ اور یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ انھوں نے فصاحت بیان میں دکن کی روایت کو راہ دی ہے ۔

انفاس سے ہے اشرف و کیفی و صفی کے — گل زار سخن میں جو نسیم دکنی ہے

روحی قادری کا کلام زبان کی سلاست ، اردو پن اور پختگی کے سبب منفرد بن گیا ہے ۔ انھوں نے اردو کو ممکنہ حد تک اردو رکھا ہے ۔ عربی فارسی ترکیبوں کو زیادہ داخل نہیں کیا ہے (اس بات کا یہ) مطلب نہیں کہ یہ ترکیبیں منع ہیں) ۔ ان کے شعر پڑھتے ہوئے پڑھنے والے کو اکثر ضرور یہ احساس ہوگا ۔ بہت مثالیں دی جا سکتی ہیں ۔ مثلاً ۔

ایک اک پتہ ہے کیوں بکھرا ہوا — کیا ہوا ہے پھر کوئی جھگڑا ہوا

یا

غزل تو خیر کیا کہتا ہے روحی — غزل کا نام لے کر جی رہا ہے
عمر چودہ صدی طے کرچکی ہے — مگر دنیا ابھی تک سو رہی ہے
دلدار غم کی عیش کا در بیلے کے کیا کروں — میں گرد رہ گزار ہوں گھر لے کے کیا کروں

وغیرہ

سب کچھ وہ بخش دیں گے مگر لے کے کیا کروں　　مانا کہ اپنے قرب کی دولت کے ماسوا

آخری شعر میں زبان کی چاشنی کے علاوہ جو بے ساختگی ہے اس نے اس میں ایک ایسی کیفیت پیدا کردی ہے کہ وہ بار بار یاد آئے

حسن تیز اور لطفِ زبان کے علاوہ غزل کی ایک خاص صفت وہ ہے جسے درد کہا گیا ہے ۔ اردو ، فارسی شاعری میں ایک بہت ہی تہہ دار لفظ ہے جس کے سارے مفاہیم کو گرفت میں لانا مشکل کام ہے ۔ مختصر یہ کہ ہماری شاعری میں درد ا احساس ہی نہیں ایک قدر کی حیثیت رکھتا ہے ۔ دکھ سے لے کر اس کی کیفیت اس نقطے تک پہنچتی ہے جہاں ایک خاص طر انبساط بھی اس میں شامل ہوجاتا ہے ۔ یہی چیز ہے جس نے غالباً فانی سے یہ کہلوایا تھا کہ :

میری ہوس کو عیشِ دو عالم بھی تھا قبول　　تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

روحی قادری کی غزل اس درد سے بہرہ ور ہے :

گونجتی پھرتی ہیں بے صوت و صدا نغموں میں　　داستانیں جو غم دل کی کہی ہیں میں نے

فانی کی طرح روحی نے بھی یہ کہا ہے کہ " روحی متاع دونوں جہاں کی ہے یہ تپش " تپش اور تڑپ دل کی زندگی ۔ اور شعر کی تاثیر ۔ روحی صاحب کی غزلوں میں ایسے شعر تو مل جائیں گے ۔ جہاں درد یا غم کا ذکر اور ذکر خیر ہو لیکن محض انھیں میں نہیں بلکہ درد کا گزر وہاں بھی ہے جہاں اس کا ذکر نہیں ۔ روحی کے نرم لہجے اور ان کے شعر کی فضا میں درد ایک شفقت آمیز طرح مل جائے گا ۔ جیسے اس شعر میں جہاں درد بھی ہے اور تنہائی بھی :

اک سناٹا شور میں ڈھل کر　　بستی بستی گھوم رہا ہے

پھر اسی نہج میں یہ شعر کہ :

کیا حال ہے اب کوچہ و بازار وفا کا　　لوگو کبھی آباد تھے اس شہر میں ہم بھی

روحی صاحب ایک معزز صوفی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ پیرزادے ہیں ۔ تصوف کی روایت ان کو ورثے میں ملی اور ان کے مزاج کا جزو بن گئی ہے ۔ اس روایت نے ان کو متاع درد کے علاوہ وہ شرافت اور تہذیب بخشی ہے جو ان کی میں نمایاں ہے ۔ یہ وہ تہذیب ہے جس میں قدامت کے ساتھ اقدار و آداب کا ایک ذخیرہ اب تک محفوظ ہے ۔ مسابقت اور عجلت کے اس دور میں یہ تہذیب اپنے آپ میں سمٹ گئی ہے لیکن اس کی دل کشی اب بھی باقی ہے ۔ روحی کی شاعری اسی دیر کی پروردہ ہے ، نرم رو ہے ، مہذب ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں کوئی چونکانے والی جدتیں نہیں ہیں لیکن اگر اس طر جدت پر اصرار نہ کیا جائے تو روحی صاحب کی دھیمی طرز اور ایسے شعر جو دل کو چھولیتے اور حافظے میں اتر جاتے ہیں ان کے حرف روشن کو ایک دل کشی اور مستقل قدر بخشتے ہیں ۔ میں یہ کہوں گا کہ روحی کی شاعری میں ایک طرح گھلی ہوئی روحانیت ہے کی صوفی منشی اور قلندری سے آئی ہے ۔ مجھے علم نہیں کہ روحی قادری کس مرحلے کے صوفی طریق کے راہ رو ہیں ۔ یقیناً مراقبے کے حصے میں آیا ہے لیکن ان کے شعر پڑھ کر ان کی قلندری اور صوفی منشی پر یقین آجاتا ہے ۔ میں ایک باقاعدہ صوفی اور صوفی آدمی میں فرق کرتا ہوں ۔ صوفی منشی تصوف کی باقاعدہ مشق کی متقاضی نہیں ۔ وہ ایسے آدمی میں ملتی ہے جس کے مزاج میں رد

نے جگہ پائی ہو ۔ صوفی مشی کی خاص علامت ایک طرح کی بے نیازی عافیت طلبی ہے جو روحی قادری کے ہاں جابجا مل جاتی ۔
جیسے ان اشعار میں :

روحی ازل سے ہے مرا مسلک قلندری — کچھ شاعری ذریعہ ، عزت نہیں مجھے
ہے مملکتِ فقر کا عالم ہی نرالا — یہ جاہ و حشم اور ہے یہ طبل و علم اور
دھوم سنتے تھے بزم ہستی کی — چلتے چلتے نگاہ ڈال آئے
ماورائے جہانِ ناز و نیاز — کون محمود اور کون ایاز ؟

انتہا بے نیازی کی

گھوم پھر کر اپنے در پر آئی ہے دنیا تو خیر — رہنے دو دہلیز پر یہ بھی پڑی رہ جائے گی

اور عافیت طلبی کی :

- فاصلہ ، قرب ، سفر ، سب ہے دکھاوا روحی — سچ تو یہ ہے کہیں آنا ہے نہ جانا ہے مجھے
فرصت ملے تو بزم سخن کی طرف چلوں — میں ہوں خود اپنے آپ سے محوِ سخن ابھی

خود کلامی ، جو پروین شاکر کے ایک مجموعے کا عنوان بھی ہے غزل کی ایک اہم صفت رہی ہے ۔ روحی قادری کی شا میں خود کلامی جا بہ جا مل جاتی ہے ۔ روحی صاحب نے ظاہر ہے کوئی آسائشی شاعری نہیں کی ہے زندگی کو دیکھا ہے ، سہا ہے لطف بھی اٹھائے ہیں ۔ رنج بھی ، عذاب و ثواب دونوں سے گزرے ہیں ۔ یہ باتیں میں اس وجہ سے نہیں کہہ رہا ہوں کہ میں ا زندگی سے واقف ہوں بلکہ اس وجہ سے کہ ان کو پڑھ کر جو تصویر بنتی ہے وہ کچھ ایسی ہی ہے ۔ چناں چہ ان کی شاعری میں تفکر گزر ہے ، اک سوچ کی کیفیت ہے ۔ اس سوچ میں یقین بھی ہے بے یقینی بھی ۔ یقین کا لمحہ آتا ہے تو شاعر بول اٹھتا ہے :

میں انفس و آفاق کا آئینہ ہوں روحی — کی ہے مری روح مرا دل مدنی ہے

لیکن ہر سوچنے والے ذہن کا ایک بے یقینی ، ایک تذبذب بھی پیچھا کرتا ہے ۔ تب یہ خیال آتا ہے کہ :

سمجھ میں آ نہ سکا راز زندگی روحی — تمام عمر کسی اجنبی کے ساتھ چلے

اور جب اس تذبذب کے ساتھ ایک گہری خاک ساری شریک ہوجاتی ہے تو اس شعر کی منزل آتی ہے ۔

نقشِ اوراق پہ جذبے ۔ میرے ہوجائیں گے — اور کتاب اوڑھ کے پھر طاق میں سوجائیں گے

لیکن راقم کے خیال میں حرف روشن ایسی کتاب نہیں جسے طاق میں رکھ دیا جائے ۔

oooooo

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین احمد شکیب

روحی قادری کی شاعری کا متصوفانہ پہلو

روحی قادری کا کلام بڑا پہلودار ہے۔ ان کے یہاں قدیم و جدید فنی روایات کا ایک لطیف امتزاج ہے۔ ان کے یہاں حیات و کائنات خدا، مذہب، تاریخ، معاشرت، فن اور ادب کے تعلق سے واضح اور اہم نقاط نظر موجود ہیں جو نہایت مثبت ہیں۔ پھر ان سب کے تعلق سے ان کا اپنا تنقیدی رویہ بھی ہے۔ ان کی فکر و فن کا پھیلاؤ کچھ ایسا ہے کہ کسی ایک مضمون میں اس کا سمیٹنا مشکل ہے۔ اس لیے اس وقت ان سطور میں ان کے متصوفانہ کلام کا مختصر سا جائزہ لیا جائے گا اور اسی کے حوالے سے ان کے فن کے بعض اوصاف کا۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ان کے کلام میں صرف یہی کچھ ہے اور کچھ نہیں۔ اور بھی بہت کچھ ہے۔ یقین ہے کہ "سب رس" کے اس شمارے میں دوسرے اہل قلم اور باتوں کا جائزہ لیں گے۔

میں نے متصوفانہ پہلو کا جائزہ اس لیے منتخب کیا کہ مغربی دنیا کو مشرقی شاعری کے جس پہلو سے گہری دلچسپی ہے وہ یہی ہے۔ یہ وہ عنصر ہے جو جدید اردو شاعری سے ہوا ہونے لگا ہے۔ روحی کی شاعری کا یہ جوہرِ اصلی مرکزی عنصر ہے۔ اسی حیثیت سے مغربی دنیا میں روحی کو متعارف کرواتے ہوئے مجھے خوشی اور فخر محسوس ہوتا ہے۔

غزل گزشتہ نصف صدی میں کہاں سے کہاں آگئی۔ مگر یہ نہ سمجھیے کہ غزل نے جو نئے اسالیب اختیار کیے ہیں وہ گزشتہ اسالیب کے حامل نہیں۔ بات صرف علائم، الفاظ اور اسالیب کی نہیں ہے۔ غزل کا راز اس میں ہے کہ اس میں زندگی کے لحہ بہ لحہ ہونے والے نئے تجربوں کو اس طرح پیش کیا جائے کہ ان تجربوں کی انفرادیت اور تیکھاپن، ندرت و تازگی بے خلل معرضِ اظہار میں آجائے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ اظہار کبھی روایتی اسالیب کو چھوڑ اور کبھی توڑ کر اپنی راہ پاتا ہے اور کبھی کبھی روایات کی گپھاؤں میں چھپ کر۔ اگر شاعر خاصا توانا ہو تو حالی کی طرح سادگی بھی اختیار کر سکتا ہے۔ اردو غزل گوئی پر بھی صدیاں بیت چکی ہیں۔ صدیوں کے اس تسلسل میں غزل گویوں کے دو کارواں آگے بڑھے۔ ایک ان لوگوں کا جو زبان کے وسیلے سے حقیقت شعر تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ان کا ایمان سخن ایک سودائے سر ہے۔ یہ لوگ اہل دل کے پیش کردہ تجربات پر خیال آرائی اور مضمون آفرینی کا ہنگامہ برپا کرتے ہیں۔ دوسرا کارواں ان لوگوں کا ہے جو بہ قول عرفی قبیلۂ عشق سے تعلق رکھتے ہیں اور غزل ان کا وظیفہ ہوتی ہے۔ عشق ان کا مسلک حیات ہوتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کے تجربات سے غزل کو حقیقی وسعت عطا کی۔

روحی قادری کا تعلق غزل گویوں کے اس دوسرے زمرے سے ہے۔ ان کے عشق نے ان کی شاعری کو ایک شجرِ طیبہ بنا دیا ہے جس کی جڑیں زمین میں ہیں اور اس کی شاخیں سماوی بیکرانیوں میں گم ہیں۔ روحی اس دور کے صوفی شاعر ہیں۔ جہاں تک میں نے ان کو برسوں دیکھا ہے اور جہاں تک ان کا کلام پڑھا ہے، رموزِ معرفت میں انھیں کہیں بھی کھوتا نہیں پایا۔ روحی ایک صاحبِ حال شاعر ہیں۔ وہ جب بات کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ کس مقام پر ہیں۔ ان کے یہاں عشق امرِ الٰہی کا فطری تقاضا ہے جو کائنات میں جاری و ساری ہے اور انسان اس

مرکز ہے۔ اس حقیقت کا اوراک مختلف استعداد والوں نے مختلف انداز میں حاصل کیا ہے۔ رومی نے اس راز سربستہ کو کس پر اسرار انداز میں بیان کیا ہے کہ بات مکمل بھی ہو گئی اور راز بھی رہی:

یہ خبر لوح و قلم کو بھی نہ تھی روز ازل میری تقدیر میں وہ خود اپنا ہی غم رکھ دیں گے

یہ عشق تکمیل ذات کے لیے جذب حسن کا ایک لامتناہی عمل ہے جس میں شاعر سرتاپا طلب بن جاتا ہے:

نظر نظر میں ہو ارمان دید اے رومی نفس نفس میں حضوری کا التماس رہے

اس عاشقانہ طلب اور التماس کا مقصود ذات واجب ہے۔ اگر اس کا قرب میسر نہ آسکا تو پھر شاعر کے لیے کسی اور شئے میں کوئی دل کشی نہیں۔ ملاحظہ ہو یہ شعر:

مانا کہ اپنے قرب کی دولت کے ماسوا سب کچھ وہ بخش دیں گے مگر لے کے کیا کروں

جاننے والے جانتے ہیں کہ حسن مطلق سے قرب کی تمنا کس قدر طلسمی اسرار کی حامل ہوتی ہے۔ تعینات کس قدر حائل ہوتے ہیں:

اے ذوق نظر ڈھونڈھ اسے خود کو بچا کر چھپ جائے نہ وہ قرب کی دیوار اٹھا کر

یقین کیا ہے گماں بھی نہ ہوسکا کوئی اس احتیاط سے میرے قریب تھا کوئی

حیات آنکھ مچولی تھی حسن والفت کی چھپا ہوا تھا کوئی اور ڈھونڈھتا تھا کوئی

اس آنکھ مچولی میں شاعر ہر تجلی سے استفادہ کرتا ہے لیکن اس کا دل اُن تجلیوں سے سیر نہیں ہوتا:

کوئی ادائے تجلی نظر سے غیر نہیں مگر دل اپنا اس انداز پر بھی سیر نہیں

تمنائے نظر کا اس وقت تک پورا ہونا ممکن نہیں جب تک شاعر اپنی ہستی کے تعینات کو نہ ڈھادے:

اس کو ڈھادوں تو تمنائے نظر پوری ہو میری ہستی نہیں دیوار حرم ہے اے دوست

جمال مطلق کو دیکھنے کی تمنائیں وجود کے بھید بتاتی ہیں۔ یہ صوفی شاعر جب ان مقامات سے گذرتا ہے تو عجیب انکشافات ہوتے ہیں:

جب التباس تعین کے ساتھ گذرا ہوں تو آئینہ بھی نہ بتلا سکا کہ میں کیا ہوں

شاعر اب جب تجلیات کی روشنی میں اپنی حقیقت کا عرفان حاصل کرنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے یہ احساس ہوتا ہے کہ وجود واجب کے بغیر خود اس کا وجود نہیں:

میں ہوں تو ایسا ہے احساس اپنے ہونے کا مرا وجود ہی جیسے ترے بغیر نہیں

بالآخر اس پر یہ راز کھل جاتا ہے کہ وہ نہیں دیکھ رہا ہے بلکہ حق دیکھ رہا ہے:

کمال عشق کا انداز ہوں میں تمنائے نگاہ ناز ہوں میں

ہم حسن نظر تاب کا ایک عکس ہیں رومی جو اپنی حقیقت ہے وہ افسانہ ہے اس کا

رومی کا کلام ان معاملات و مکاشفات کا ایک آئینہ خانہ ہے۔

رومی کی شعری [illegible] حقیقت انسان کا احساس ہے۔ وہ [illegible] کی [illegible] ہر جگہ انسان ان کے یہاں

ایک مرکزی قوت کی حیثیت رکھتا ہے۔ "میں" "ہم" کی ضمیر ان کے یہاں انسان کی طرف اشارہ کرتی ہے:

آئینہ خانہ، حقیقت میں — جس طرف آنکھ اٹھی ہمیں ہم تھے
اپنی حال زبوں میں ہم روحیؔ — ناز بردار نظم عالم تھے
کیا کیا نہیں ہیں پیکر تخلیق کردگار — لیکن کہاں سے لائے کوئی آدمی کی بات

انسان خواہ کسی حالت میں ہو وہ کارگہ ارض و سما میں صاحب قرآنی کرتا ہے:

ہم ہیں صاحب قرآنی ارض و سما — بوریا اپنا شہ نشین حیات

کائنات میں انسان کی بے بسی یہ ہے کہ وہ تنہا ہے اور اس کے حسن کی شان یکتائی بھی اسی میں ہے:

ازل کے روز سے میں ڈھونڈھتا ہوں — جواب اپنا زمین و آسماں میں

انسان کی عظمت اور اس کے حسن کے احساس سے سرشار ہو کر روحی ناز آفریں مضامین باندھنے لگتے ہیں:

اپنا مقام کم نہ تھا عالم ہست و بود میں — پھر بھی کسی خیال سے رہنا پڑا حدود میں

زمان و مکاں کے اضافی تصور کو کس لطف سے کہہ گئے ہیں:

جلوؤں کی سیر میں یہ خبر بھی نہ ہو سکی — کس گوشہ نگاہ میں کون و مکاں رہے

جہاں تک مسلک و مذہب کا تعلق ہے روحی کسی پٹی ہوئی ڈگر کے راہی نہیں ہیں۔ دراصل مذاہب کی تنظیموں نے انسانوں کو اعلیٰ منزلوں تک پہنچانے کی بجائے ان کو اپنے اندر مقید کر لیا ہے۔ یہی حال بہت ساری جدید تحریکوں کا بھی ہے۔ اس انداز فکر کی وجہ سے راستے بجائے خود منزل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ لہذا راستوں کی قید سے بچ کر چلنا منزل اعلیٰ کے مسافر کے لیے ضروری ہے:

چھوٹ نہ جائے ہاتھ سے دامن عظمت سفر — لوٹ نہ لیں کہیں مجھے اپنا بنا کے راستے

راستوں کی پابندی سے گریزاں رہنے کے باوجود وہ بیہڑ زمینوں میں بھٹکنے والے نہیں۔ جو چیز منزل کی طرف ان کی رہنمائی کرتی ہے وہ ہے نقش پائے ناز:

راہوں کا کوئی خوف نہ منزل کی کوئی فکر — ہو زیر پردہ پائے ناز اگر نقش بند ہے
کرتی رہی حیات کی منزل مرا طواف — جب تک ترے قدم کے نشاں دیکھتا رہا

ظاہر ہے کہ یہ طرز عمل اسوہ حسنہ کی اتباع معنوی سے عبارت ہے۔ اس مسلک نے مذاہب کے تعلق سے ان میں ایک خاص نظر پیدا کی جو حقائق تک پہنچتی ہے:

کعبے میں بھی زاہد کی نگاہیں رہیں محروم — بت خانے میں ہم شان خدا دیکھ کے آئے

ان کی فکر کا ہر پہلو ان کے فن کو ایک نیا زاویہ عطا کرتا ہے۔ چناں چہ اسی بات کو اس شعر میں وہ خود بہت خوب کہہ گئے ہیں:

جو عشق کی تنویر ہے روحی مرے فن میں — وہ دیر کی بجلی بھی ہے قندیل حرم بھی

اعلیٰ درجے کا فن وہ ہے جو تخلیقی فکر کے قالب میں ڈھل جائے اور فکر و فن میں دوئی باقی نہ رہے۔ اگر ایسا ہو سکے تو مشکل مضامین

ن کو بھی آسان پیرایہ، اظہار مل جاتا ہے ۔ وہی بات اگر تخلیقی فکر کی اس منزل سے نیچے اتر کر کہی جائے تو تقریروں اور دفتروں میں ان کو نامشکل ہو جاتا ہے ۔ روحی کے کلام سے صاف ظاہر ہے کہ وہ جب تک حال سے نہیں گذرتے قال کی زحمت نہیں کرتے ۔ تجربے کی آنچ سے بے بغیر انھوں نے کچھ نہیں کہا ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا فن ان کی زبان بن گیا ہے:

دل نغمہ ہوں جان ساز ہوں میں — درون پردہء آواز ہوں میں
عروس فکر کی رعنائیاں جس سے نکھر آئیں — زبانِ شعر کو وہ سادگی مشکل سے ملتی ہے
پلکوں پہ چمکنے لگے سوزدل شاعر — احساس کو موتی کی طرح رول کے لکھے

روحی قادری کی شاعری کا حسن تہہ نشین ہے ۔ ان کے یہاں چونکا دینے والے انداز بیان سے زیادہ زندگی کے چونکا دینے والے حقائق و ب کا اظہار ہے ۔ ان کا کلام بار بار پڑھیے، ہر دفعہ فکر و فن کے نئے نئے گوشے سامنے آئیں گے ۔ یہ کیفیت صرف ایک سچے اور بڑے شاعر کلام میں پیدا ہو سکتی ہے ۔ "حرفِ روشن" کے پیش لفظ میں میں نے لکھا تھا "روحی کے پاس سچائیوں کا ایک ایسا خزانہ ہے کہ جس کی وجہ انھیں کبھی لفظی بکھیڑوں میں جانے اور صنعت طرازی کی نہ تو ضرورت ہوئی نہ ہی توفیق" ۔ لیکن جب میں نے پروفیسر مغنی تبسم کا ون سنا تو مجھے احساس ہوا کہ ان کے یہاں کثرت سے صنائع ہیں ۔ لیکن ان کے موجود ہونے کا احساس اس وجہ سے جلد نہیں ہوتا کہ ان کے ، صنعتیں تو ہیں لیکن صنعت طرازی کی خاطر نہیں ۔ اساتذہ کے کلام کے گہرے مطالعے کے نتیجے میں لفظوں کی معنوی گہرائیاں اور پہنائیاں اس کے ساتھ صنائع سے استفادے کا رجحان ان کی تخلیقی فکر کے خمیر میں پڑا ہوا ہے ۔ شاذ ہی کوئی صنعت، صنعت کی خاطر ہو ۔ ان کے یہاں ت آرائش گفتار کے لیے نہیں ہے بلکہ صنعتوں سے انھوں نے حسن ابلاغ کا وہ کام لیا ہے جو خود صنعتوں کی غایت ہے ۔

(علمی مجلس لندن کے ایک اجلاس میں پڑھا گیا)

پروفیسر اشرف رفیع

حرفِ روشن

ادبی روایات کی تشکیل و تعمیر میں صرف لکھنے والوں کا حصہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے پڑھنے اور سننے والے بھی ادبی روایات کی سمت و رفتار کے تعین میں بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زبان میں، ہر زمانے میں کچھ ہیئتیں، کچھ الفاظ اور اظہار کے کچھ اسالیب اور وسائل غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لیتے ہیں۔

موسیقار اور شاعر دو ایسے خوش نصیب اہلِ فن ہیں جنھیں راست سننے والے مل جاتے ہیں۔ اسی ربط باہم وسیلہ کے نتیجے میں شاعر اور موسیقار کو اپنی راہ متعین کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

مشاعروں کو جہاں تہذیبی اہمیت حاصل ہے وہیں اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مشاعرے شعر و سخن کی پرورش بھی کرتے ہیں اور شاعر کو اس کی قدر و منزلت کا پتہ بھی دیتے ہیں بشرطیکہ سامعین کی ایک بڑی تعداد سخن فہم و جوہر شناس بھی ہو۔

اپنی انا کی تسکین اور ادبی وقار و اعتبار حاصل کرنے کے لیے شاعر کیا کچھ نہیں کرتے، بقول روحی قادری:

لٹ گیا کاغذ ، قلم رسوا ہوا   شاعری کے نام پر کیا کیا ہوا

مگر روحی صاحب کا معاملہ بالکلیہ جدا ہے۔ نہ وہ مشاعروں کے قائل نہ عوامی مشاعروں میں ملنے والی داد کے طلب گار۔ "نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا" وہ ان شاعروں میں ایک ہیں جو چشمِ امتیاز کی ایک جنبش کو متاعِ گراں مایہ اور عطائے بیش بہا شمار کرتے ہیں۔

آج کی یہ محفل، "حرفِ روشن" کی تابانی سے اس لیے جگمگا رہی ہے کہ اس کی طباعت میں نہ روحی صاحب کا دخل، نہ بزم آرائی سے انھیں کوئی مطلب۔ ان کے دو دیرینہ قدرداں جن کی لیاقت اور فکر و نظر کا سکہ مشرق و مغرب، دیس بہ دیس میں یکساں بیٹھا ہوا ہے، بس ان ہی کے جبرِ محبت میں بات یہاں تک پہنچی ہے۔ ورنہ پیرزادہ سید محی الدین قادری روحی کو اور پچاس سال بھی دیے جائیں تب بھی وہ اپنے شاعرانہ کمالات کو منظرِ عام پر لانے کی فکر نہ کریں۔

صفی کے یہاں بہت سے شاعر، شاگردی کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے خود چل کر آئے مگر روحی قادری ان شاگردوں میں سے ہیں جنھیں صفی نے خود اپنا لیا۔ ابتدا میں روحی صاحب مفتی اشرف علی صاحب کے آستانِ سخن سے وابستہ تھے۔ ان کے فیض کی پرچھائیاں آج بھی روحی صاحب کی شاعرانہ شخصیت پر چھائی ہوئی سی ہیں۔ ان کے لب و لہجے کے وقار، علمی شان، ان کی آواز کے اس اعتبار میں ان کے خاندانی پس منظر کا بھی بہت بڑا دخل ہے کہ جہاں تصوف ہی طرزِ زندگی تھا۔ روحی صاحب کو اس کا احساس ہے:

مجھ میں ہی نہیں آتا یہ راز روحی کا   یہ شخص اصل میں شاعر ہے یا قلندر ہے

"ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی" تو ان کی شاعری میں انفس و آفاق کے گوناں گوں جلوے نظر آتے ہیں۔ تصوف کی گرہ کشائی، فکر و نظر کی توانائی، جذبے کی پاکیزگی ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ وہ نسبتاً مشکل زمینوں میں غزل کہتے ہیں مگر ردیف اور قافیہ کی ہم آہنگی ان زمینوں کی سختی و کرختگی کو نغمگی سے بدل دیتی ہے۔ مشکل زمینوں میں سے ایک غزل کے دو شعر نمونتاً ملاحظہ فرمایئے:

فکرِ نمود کیا کریں عالم ہست و بود میں ہم تو فقیر ہیں میاں، اپنا زیاں ہے سود میں
ذوقِ نگاہ، قید ہے، آئینہ شہود میں ہستی ہے میری مبتلا، عارضہ وجود میں

یہ اشعار نہ صرف مشکل زمینوں پر ان کی گرفت کا پتہ دیتے ہیں بلکہ ذکر و فکر اور جذب و سرور کے ایک جہانِ تازہ کی بھی نشان دہی
تے ہیں:

کرتے ہو تم بھی سن کے خدا جانے کیا خیال میں ایک کائنات، سمندر مرا خیال

روحی صاحب کی شاعری میں نغمہ بیداریِ جمہور بھی ہے اور شبستانِ محبت کی حریر و پرنیاں بھی۔ وہ نگاہِ عام سے یک سر نہاں بھی
ے لیکن عصر کے سیاسی اور سماجی مسائل سے باخبر بھی رہے:

ہمارے شعر تو لمحوں کی دین ہیں لیکن ہمارے شعروں میں صدیوں کا اقتباس بھی ہے

انھوں نے تاریخ کے صفحات پر خوں ریزیاں بھی دیکھیں، زمینوں کو بٹتے، رشتوں کو ٹوٹتے، زندگیوں کو بکھرتے اور گھروں کو سمٹتے دیکھا۔ زندگی کے پرپیچ سفر میں جن مشاہدات و تجربات سے گزرے ہیں اس سے اس کا دامِ تخیل آفاق گیر ہو گیا۔ اپنے وسیع تر تجربات کے
ار میں وہ کبھی ناصح بن کر سامنے آتے ہیں، کبھی چارہ گر، کبھی غم گسار کبھی مبصرِ حیات اور کبھی صوفی صافی:

وقت کی طبیعت کے جو خلاف کرتا ہے وقت ایسے مجرم کو کب معاف کرتا ہے
رنگ لائیں گے یہ بے راہ روی کے انداز ہم نہیں کہتے، ترے نقشِ قدم کہتے ہیں
مٹتے جاتے ہیں نشانِ آدمیت دہر سے عکس لیتے جائیے اڑتی ہوئی تحریر کا
سوئے ہجومِ دل آزاراں، دیکھا تو دل بیٹھ گیا سب جانے پہچانے چہرے، سب جانے پہچانے لوگ
جھلکی ہے تو موسوم وہ اشکوں سے ہوئی ہے جو مئے غمِ ایام کی بھٹی میں کھنچی ہے
اچھا ہوا لباسِ تعین اتر گیا بے ننگ و نام ہوں تو ندامت نہیں مجھے

روحی صاحب کے شعور و فکر میں روایت رچی بسی ہے۔ وہ تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو موضوعات کو بھی کلاسیکی رکھ رکھاؤ کے ساتھ برتنے
درت رکھتے ہیں۔ اقتضاءِ حال کی مناسبت سے الفاظ کے انتخاب اور ترتیب میں کلاسیکیت کا حسن پوشیدہ ہے یعنی:

مزاجِ عصر کا دینا ہے ساتھ بھی روحی بھرم غزل کا بھی رکھنا ہے کیا کیا جائے

روحی صاحب نے الفاظ کے انتخاب سے لب و لہجہ کو نیا پن دیا ہے:

حیات پھر انھیں دینی ہے لاؤ میرے پاس جو لفظ مر چکے معنی کے خلفشار کے بعد

وہ لفظ کو مسلمہ اور رسمی تلازموں سے آزاد، ان کے وسیع تر معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ یعنی صنعت انھیں آتی ہے پرانی بھی نئی

خود اپنے آئینے سجا کر اکثر میری تنہائی ڈھال رہی ہے کیسے کیسے پیکر میری تنہائی
ملے تو دل کے کھنڈر ہی میں کچھ ملے گا میاں پتہ چلاؤ کہیں پر کسی دفینے کا

وہ شخص دشتِ تمنا میں کتنا پیاسا تھا — کہ سنگ ریزوں سے منھ بھر کے خوش مزا سا تھا

کیا حال ہے اب کوچہ و بازار وفا کا — لوگو کبھی آباد تھے، اس شہر میں ہم بھی

لطفِ کلام کیا جو نہ ہو دل میں دردِ عشق، عشق کے موضوع کو شاعروں نے جتنا ارزاں کر دیا ہے وہ اتنا کم عیار بھی نہیں۔ عشق کی دنیا ذرے سے آفتاب تک، بندے سے خدا تک، جس کو شاعر نے چاہا وہی محبوب ہو گیا جو کچھ محبوب نے دیا وہی سرمایہ، افتخار بن گیا۔ پیرزادہ روحی قادری کے یہاں حسن و عشق کے مضامین نقل در نقل نہیں بلکہ حیات کا ایک اٹوٹ جذبہ بن کر آتے ہیں۔ جن سے ان کے دل کا آئینہ خانہ ہمیشہ منور رہتا ہے:

مانا کہ اپنے قرب کی دولت کے ماسوا — سب کچھ وہ بخش دیں گے مگر لے کے کیا کروں

دریا تھا اپنی آنکھ میں کب سے رکا ہوا — پوچھا کسی نے حال تو مت پوچھ کیا ہوا

امیدیں دل کو بہلاتی ہیں روحی — میری شہ زادیاں ہیں اور میں ہوں

یاد اس کی ہے تو کس طرح بھلا دی جائے — یہ کوئی شمع نہیں ہے کہ بجھا دی جائے

جب اندھیرے ہی اندھیرے ہوں نظر میں ہر سو — تیرے جلوے کے سوا کس کو صدا دی جائے

روحی قادری نہ اپنی ذات میں ڈوبے ہوئے ہیں نہ باہر کی دنیا میں گم ہیں۔ ان کے یہاں حدیثِ دل اور حدیثِ دیگراں میں ایک توازن ہے۔ یہی توازن اور موضوع و اظہار کی ہم آہنگی ان کی غزل کو دو آتشہ بنا دیتی ہے

"حرف روشن" کی رسم اجرا کی تقریب میں پڑھا گیا۔

سید نصرت عالم

کچھ حرفِ روشن سے آگے

گذشتہ دنوں میں جب ابوظبی جارہا تھا تو میرے ساتھ ایک شعری مجموعہ "حرفِ روشن" تھا۔ اس کے خالق منفرد لب و لہجہ کے شاعر روحی قادری تھے۔ اس مجموعے کو مکتبہ شعر و حکمت نے شائع کیا تھا۔ اس شعری مجموعہ میں روحی قادری صاحب کی کوئی ایک سو چالیس غزلیں شامل تھیں اور یہ ساری غزلیں نہایت نفاست اور سلیقے سے انتخاب کی گئی تھیں۔ شعر کا انتخاب بھی شعر کے انتخاب کرنے والے کی پرکھ اور اس کی دقتِ نظر اور اس کے ذہنی رویے کی آئینہ داری کرتا ہے اور یہ انتخاب اتنا اچھوتا، اتنا جچا تلا تھا کہ غزل کے ہر شعر سے شاعر کی روشنیٔ طبع اور اس کی جگمگاہٹ کا اظہار ہوتا تھا اور محسوس یوں ہوتا تھا کہ کچھ شمعیں قطار اندر قطار فروزاں ہیں۔ اس مجموعے میں مجھے ایک نئے حسن اور ایک نئی آواز کا احساس ہوا۔ اس مجموعۂ کلام "حرفِ روشن" کو نامور محقق و ادیب جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب نے مجھے عنایت فرمایا تھا۔ میں ڈاکٹر صاحب کی اس عنایتِ لانہایت کا شکر گزار ہوں۔ فرصت کے رات دن اگر ہوں تو ممکن ہے کہ بگڑے دل کے لوگ تصورِ جاناں کیے بیٹھے رہیں مگر میں فرصت کے لمحات میں اس شعری مجموعے کو پڑھنا چاہتا تھا۔ ابوظبی پہنچا تو مجھے حرفِ روشن" کی "قراءت" کا موقع حاصل تھا۔ میں نے فرصت کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ پڑھنا ایک باطنی عمل بھی ہے اور مراقبانہ اسلوب بھی جس کے زیرِ اثر شاعر کے فکری ابعاد، ذہنی رویوں اور اس کے فنی و فکری اکتسابات پر غور کرنے کے امکانات رہتے ہیں اور یہ بھی کہ شاعر نے لفظوں پر کس حد تک فتح پائی ہے اور جذبے کی ترسیل میں وہ کس حد تک کامیاب رہا ہے؟

صاحب عقدالفرید کے حوالہ سے زہیر ابن ابی سلمہ کی یہ بات مجھے پسند آتی ہے کہ

وان احسن بیتی انت قائله بیت یقال اذاانشدته صدقا۔ شاعر نے کہا یہ ہے کہ جب شعر پڑھا جائے تو لوگ اس کی صداقتوں کے مسرت خیز پہلو کا اعتراف کرلیں۔ یہی عقدہ "حرفِ روشن" کے مطالعہ کے بعد کھلا۔

روحی قادری کی قادرالکلامی، ان کی پختہ کاریاں اور فکری طرح داری، ایک قاری یا سامع کو بہت جلد اپنی گرفت میں لے لیتی ہے سوال یہ ہے کہ ہم روحی کو کہاں ڈھونڈیں؟ اس کا جواب خود ان ہی سے سنیے۔

حدودِ معنی و الفاظ میں نہ ڈھونڈ مجھے — کہ ماورائے فروعاتِ لفظ و معنی ہوں

اس کی ماورائیت میں اک طرح کی طرفگی ہے (ہم اوجِ طالع و لعل و گوہر کو دیکھتے ہیں) شکیب نے "حرفِ روشن" کے پیش لفظ میں روحی کے فکر و فن کا بڑی گہرائیوں سے جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے "واقعہ یہ ہے کہ ان کے کلام پر تبصرہ کرتے وقت طویل تمہیدات و توضیحات کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان کی فکر تہہ در تہہ اور ان کا طرزِ اظہار کی سادگی کے باوجود پہلو دار ہے۔" خود ڈاکٹر شکیب کی یہ رائے سادہ ہونے کے باوجود کتنی پہلودار ہے اور کتنی وقیع اور جامع ہے۔

ایں رشتہ با انگشت مپیچی کہ دراز است۔ روحی کی نگاہ میں ہمیشہ قدروں کا احترام رہا، وہ سخن فہمی کی جستجو میں غالب کے طرفدار نہیں بنتے۔ وہ اصول پسند ہیں، ان کا شیوۂ گفتار سردل مری سے خالی نہیں۔ روحی ایک جگہ یوں گویا ہیں:

جو کچھ بھی ، جسے لکھنا ہے جی کھول کے لکھے   یہ شرط ہے لیکن کہ قلم تول کے لکھے

لکھنے کے لیے وہ کچھ شرائط طے کرتے ہیں ، شرائط کا طے کرنا ایک طرح کی محدودیت کو قبول کرنا ہے ۔ شرائط ایک طرح سے زنجیرِ اسیری بھی ہیں اور نظامِ زندگی کو باقاعدہ بنانے کی کوشش بھی ، یوں بھی ہر اسیری بری نہیں ہوتی ۔ صیاد بننے اور قلب و نظر شکار کرنے کی تمنا اگر فن کار کے دل میں ہو تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسی دل میں کسی کے صیدِ زبوں بننے کی بھی آرزو ہو ۔ یہ آرزو مندی ایک شاعر کو "حرفِ روشن" تک یا اس سے اور آگے لے جاتی ہے ۔ اور شاید یہی وہ افق ہے کہ جہاں روحی کے پاس ماورائیت کا احساس ہوتا ہے اور فکر و فن کے چراغوں کا ہر حرف "حرفِ روشن" نظر آتا ہے ورنہ اذافات الشرط فات المشروط ، حرف کو آفتاب بنانے کا فن کوئی روحی سے سیکھے :

جب قلم اپنا بے نقاب ہوا   ایک ایک حرف آفتاب ہوا

روحی کی شاعری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری میں تپش و دردمندی کی وہ لے نمایاں ہے جو عبادت سے توانائی و رعنائی سے اور ہاں یہ تپش و دردمندی روحی کے پاس "بہ طرحِ دیگر" ہے ۔ میں نے دیکھا ہے روحی بڑے سلیقے سے بات کرتے ہیں کیوں کہ انھیں بات کرنے کا سلیقہ آتا ہے ۔ ان کے نظامِ فکر میں ایک تہذیب و ترتیب ہے اور لہجے کی آگ بھی دھیمی دھیمی ہے ۔ تاثراتی طور پر ، غزلوں کو سن کر یا پڑھ کر گمان گزرتا ہے کہ جو بات پھولوں کے ہونٹوں سے چلی تھی وہ اب سمٹ کر لبِ شاعر تک آگئی :

شمع کے سر پہ ٹھہر جاتی ہے شعلہ بن کر   بات جو پھولوں کے ہونٹوں پہ چلی ہوتی ہے

یا : پھیرلوں آنکھ تو ملتی ہے سزا غفلت کی   اس کو تکتا ہوں تو سوئے ادبی ہوتی ہے

روحی نے زمانے کے تیور دیکھے ہیں اس کی دھوپ چھاؤں دیکھی ہے وقت کے نشیب و فراز دیکھے ہیں اور کیا کچھ نہیں دیکھا؟ سب ہی کچھ دیکھا ہے مگر حیرت ہے کہ ان کی شاعری میں ان کا ذاتی کرب یعنی ذکرِ غمِ جاناں کچھ کم ہی نظر آتا ہے ۔ ان کا غمِ عشق بڑا معتبر ہے ۔ اس میں ابتذال اور سستے جذبات کے سائے دور دور تک نہیں ملتے ۔ وہ گردشِ دوراں اور حیات و کائنات کے مسائل پر تو اظہارِ خیال کرتے ہیں مگر جب خود ان کا ذکر آتا ہے تو وہ اپنے بارے میں خاموش ہوجاتے ہیں اور چپ سادھ لیتے ہیں ۔ ان کی خاموشی میں سخن گسترانہ معنویت ہے ۔ ان کے ہاں ان کے نفسی مطالبات اور تہیجاتِ شباب کا ذکر بھی بہت محدود ہے ۔ زلف و گیسو ، کف و آستیں ، ساعد و سیمیں وغیرہ کے ذکر سے ، جن سے عبارتیں رنگین و سحر آگیں ہوجاتی ہیں ، ان کے پاس بہت کم ہی بار پاتی ہیں ۔ کیوں کہ میرا طریق امیری نہیں ، فقیری ہے :

حرفِ مطلب کو ہم جو ٹال آئے   بات ایک اس کے دل میں ڈال آئے

روحی کی قوتِ برداشت ، ان کی خودداریاں ، ان کا ضبط و تحمل بھی بڑی ٹھاٹ کا ہے ۔ ان کے ذہنی پس منظر میں اگر کوئی بتِ ہزار شیوہ ، جلوہ ساماں بھی ہو تو کیا مجال کہ وہ اس کے روبہ رو "حرفِ مطلب" ادا کریں ۔ وارداتی یا حسی سطح پر ویسے ان کا "محبوب" ان کا حرفِ مطلب سن لے تو شاید وہ بھی پگھل جائے ۔ مگر یہ بات بھی ظنیات کے وسیلے سے ہے :

اس طرح ٹوٹ کے ہم آپ کے ہوجائیں گے   اتنا تڑپیں گے کہ آرام سے سوجائیں گے

رستے کی گرد کہتی ہے لپٹ کر پاؤں سے رستے ملتے ہیں جاکر سب اس کے گاؤں سے

حمامِ بادگر کی خبر کسی اور دوست نے سنائی تھی لیکن مجھے روحی کی آواز پر کوہِ ندا کی آواز کا گماں گزرتا ہے (تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ) روحی کو ایک بار سنا ہے اور دوسری بار سننے کی آرزو ہے ۔ یہ آرزو شعور کے بعض خوابیدہ گوشوں کو بیدار کرتی ہے چناں چہ یں :

کیا کہیے شرف کس کے نصیبوں میں نہیں تھا خضر آئے تھے اک وقت ، میں گھر میں نہیں تھا

روحی نے بڑی بے ساختگی کے ساتھ کیسا خوب صورت شعر کہہ دیا ہے ۔ طبیعت کھل اٹھی اور ذہن جگمگا گیا ۔ طبعِ نازک پہ بات نہ گزرے تو بہ طور لطفِ طبع مجھے یہ بات بھاتی دیتی ہے کہ شاعر سے ملنے یا اسے دیکھنے کے لیے کہ وہ کس حال میں ہے ؟ خضر آئے تھے لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ اس وقت شاعر (ہمیشہ کی طرح) گھر پر نہیں تھا ۔ آخر کہاں گیا تھا ؟ تعجب ہے کہ خضر آگہی بھی دھری کی دھری رہ گئی ، کچھ کام نہ آئی ۔ مجھے بھی اس کا علم نہیں تھا کہ خضر شاعر کے گھر آرہے ہیں ورنہ میں بھی اس عر کے گھر پہنچ جاتا مگر کیا کہیے میری یہ محرومی تھی کہ میں اس وقت خود بھی گھر میں نہیں تھا ۔ یہ تو خیر اک لطیفے کے طور پر میں نے لہ دی ۔ روحی شعری سطح پر لمحوں اور صدیوں میں بہت کم فرق کرنا جانتے ہیں یا یوں کیوں نہ کہیے کہ لمحے ان کے پاس صدیوں سے ہیں یا پھر صدیاں لمحوں سے ، بات ایک ہی ہے چناں چہ وہ کہتے ہیں :

ایک لمحے کی ملاقات کا احساس نہ پوچھ کوئی صدیوں سے مرے ساتھ رہا ہو جیسے

ذکر یہاں " ایک لمحہ " کی ملاقات کا نہیں ۔ ایک " اور صرف ایک لمحہ " میں ہوتا ہی کیا ہے ۔ لمحہ تو صرف ایک علامتی اظہارِ بیان شعر میں فلسفیانہ جہت بھی در آئی ہے ۔ زیست کی سطح پر " آرزوئے ملاقاتِ دوست " صرف ایک مناجاتی طرزِ فکر نہیں ہے بلکہ تقاضا بھی ہے اور نفسی کشاکش اور فطری میلانات کا اشاریہ بھی ۔ کیوں کہ قوت ، روشنی اور نمو اسی بقائے دوست یا جمالِ ہم نشیں ہے ۔ روحی کے پاس جیسا کہ میں نے اس سے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ اس کے ذاتی کرب کے اظہار کے لیے جامہ حرف اور واماندگی شوق کے ہاتھوں غمِ ذات کے بہاؤ نے اظہار و ابلاغ کی دوسری سطحیں اور عبارتیں ڈھونڈلی ہیں :

حال لکھنا تھا اسے پر یہ خبر تھی کس کو بھیڑ میں اشکوں کے الفاظ بھی کھوجائیں گے

یہاں چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں جن سے شاعر کے میلانات اور ان کی فکری تقویم اور ان کی نہادِ طبع کا اندازہ کیا جاسکتا ہے :

گئے وہ دن کہ سودا اک کرن کا غیر ممکن تھا کرن کیا اب تو سورج بھی سرِ بازار بکتے ہیں
تجارت میں بھی اپنے دیس کا سر کتنا اونچا ہے ہمارے دیس کے پردیس میں اسرار بکتے ہیں
ناکامیِ ارمان سبک سار ہے روحی کیا اس سے بھی بڑھ کر ہے کوئی بارِ گراں اور
احساس کے چمن میں جب اترے تو دیکھنا تخئیل کی حدوں میں ہے دل کی جلن ابھی

آپ نے غور کیا ہوگا کہ ذہن میں غیب سے آئے ہوئے ان مضامین نے ایک طلسماتی اور خواب آلود فضا پیدا کر رکھی ہے ۔ نے قاری کو [illegible]ت میں لیے رکھتے ہیں اور قاری ان کے " حلقہ تاثیر " سے بیرونِ در نہیں رہتا ۔ ابنِ رشیق کی ایک بامعنی بات یہاں

مجھے یاد آتی ہے :

فلذ اقیل اصم الناس طرا واذا رمیٰ اعجز المعجزین

شعر پڑھا جائے تو سامع کو خیال گزرے کہ میں بھی ایسا کہہ سکتا ہوں اور قلم و قرطاس سامنے آئیں تو اس کی پیچ مدانیاں کھل جائیں روحی قادری کے پاس ایک اور بھی آواز ہے جس کا سررشتہ ایک ایسی آہلانہ طرزِ فکر سے جا ملتا ہے جو عبارت ہے تصوف سے۔ خیال یہ ہے کہ اس فکر یا روشنی کی لو، روحی کے فکر و فن کو دیر تک قائم رکھے گی۔ روحی حقیقتوں کو بے نقاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ بے نہ کے سلسلے بہت دور تک جا پہنچے ہیں۔ ہر حقیقت کی کچھ حدیں ہوتی ہیں، ان کو بے نقاب دیکھنا ایک آرزومندانہ حسی عمل ہے۔ اس میں کچھ ابعاد بھی آجاتے ہیں اور امکانیت بھی۔ محدود و نا محدود، نہایت ولانہایت، مطلق و مقید کی کچھ پیچیدہ اور تہہ دارا اصطلاحوں سے ممکن نہیں۔ یہ ایک علاحدہ ہی اقلیم ہے۔ حقیقت و مجاز اور ان کی تعبیرات بھی اسی اقلیم کا ایک حصہ اور اسی زمین کا پودا ہیں۔ مستیِ الست کی بات آگے کی ہے مگر پہلے زندگی (روحانیت) کے مرحلے سہل تو ہولیں:

ہے شہ رگ سے بھی روحی کے قریں تو مری خاطر کہاں تک آگیا تو

ذاتِ مطلق سے بے پناہ لگاؤ، وہ مقام ہے جہاں اسرارِ وجود کھلتے ہیں اور خدا شناسی کے ایک جز کے طور پر جہاں آدمی کو ذات کا عرفان یا اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کے امکانات روشن نظر آتے ہیں۔ "حرفِ روشن" میں مجھے کہیں بھی روحی کی صبح، دوپہر یا نظر نہیں آتی۔ روحی کے کلام کا سارا یہ انتخاب "حرفِ روشن" ایک تجریدی عمل سے گزارا گیا ہے کیوں کہ یہاں وقت کا وقوف ہے وقت پر ٹھہرے ہونے کا گمان گزرتا ہے اور شاعری کے وہ پہلو کھل کر سامنے نہیں آتے جو ان کی شعری صلاحیتوں کے تدریجی ار پتہ دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ اس میں ایک زمانی تواتر و تسلسل ہے جو وقت کے ایک محدود حصے کا آفریدہ ہے۔

وزیر آغا نے کسی شاعر کے تعلق سے کہا تھا کہ "دبے پاؤں وہ اپنے باطن میں اتر گئے ہیں"

یہی بات روحی قادری پر بھی صادق آتی ہے۔

روحی قادری

انتخابِ کلام

غزلیں

سورج تھے ، چاند تھے نہ چراغِ سخن تھے ہم
پھر بھی نہ پوچھ کتنے دلوں کی جلن تھے ہم
چلتے رہے تو گردشِ دوراں تھی گردِ پا
اور رک گئے تو سارے جہاں کی تھکن تھے ہم
اپنا طواف کرتے تھے سب کے خیال و خواب
تیرے خیال و خواب میں جب تک مگن تھے ہم
کب چھو سکی تھی تیرے بدن کو یہ گردِ غم
جب تک نگارِ زیست ترا پیرہن تھے ہم
اک اک ادا تھی آئینہ ، حسنِ آرزو
تنہائی مل گئی تو تری انجمن تھے ہم

○●○

قسمت کے ہیں مارے لوگ
کیسے کیسے پیارے لوگ
پتھر ہم پر مارتے ہیں
کیا کرتے بےچارے لوگ
کیسا ہے یہ گاؤں ترا
پانی میٹھا ، کھارے لوگ
برسیں جس پر وہ جانے
پھول ہیں یا انگارے لوگ
چلتے رہتے ہیں روحی
ہم گردن ہیں ، آرے لوگ

○●○

روحیں پیاسی ہیں ذہن بھوکے ہیں
یہ کرم قحطِ آرزو کے ہیں
اپنے قلب و نظر کے سناٹے
منتظر اذنِ گفتگو کے ہیں
قحط سا قحط ہے محبت کا
شہر کے شہر آج بھوکے ہیں
اب جو آتے ہیں باغ میں جھونکے
یہ ہوا کے نہیں ہیں ، لو کے ہیں

○●○

پیڑ ہوں میں ، مجھ کو کیا لے جائے گی
" خشک پتوں کو ہوا لے جائے گی "
جاتی ہے تو جائے منزل کی امید
کیا اٹھا کر راستہ لے جائے گی
پھر ہنسی میں کھو گئے گلشن کے پھول
پھر ہوا خوش بو اڑا لے جائے گی
دیکھنا اک دن یہ سانسوں کی ہوا
کر کے مٹی کے حوالے ؛ جائے گی

○●○

کس کے حصے میں آئی ہے ایسی بڑی تقصیر میاں
کون ہے ایسا قیدی جس کے پاؤں پڑے زنجیر میاں
دل جلتا ہے ، جاں جلتی ہے تب جاکر کچھ ہوتا ہے
ایسے ہی کیا آجاتی ہے آہوں میں تاثیر میاں
اپنی ہر اک سانس میں ہم اک پردہ نشیں پر مرتے ہیں
ہم نے بھی کیا خوب نکالی جینے کی تدبیر میاں
دیکھیں گے ہم بھی کہ کہاں تک زور ہوا کا چلتا ہے
کب تک جکڑے رکھتی ہے یہ سانسوں کی زنجیر میاں
روحی صاحب ، سب میں اسی اک ساز کے نغمے بجتے ہیں
سب ہیں اسی آواز کے شعلے کیا مرزا ، کیا میر میاں

○●○

باتیں واتیں سب بے معنی کہنا وہنا سب بے کار
جام کا بوسہ لے نہ سکیں تو گویا اپنے لب بے کار
لو سے ہی جب نور نہ نکلے ، سونے کی ہو شمع تو کیا
بات میں کوئی بات نہ ہو تو لہجہ وہجہ سب بے کار
دھرتی چومے پاؤں تو سر پر چھت کی صورت ہو آکاش
جس کا جینا ایسا ہو تو کیوں ہوگا صاحب بے کار
دل کی طاقت ہی لفظوں کو رنگِ کرامت دیتی ہے
دل کی طاقت ساتھ نہ ہو تو ذہن کے سب کرتب بے کار

○●○

جنوں اور میرے سر میں ؟ پھر محبت کا جنوں وہ بھی !
تمھاری یاد تھی دل میں سو کیا دیتی سکوں وہ بھی
بچا رکھا تھا نورِ آگہی کو ایک مدت سے
ارادہ ہے جہانِ بےخبر کو بخش دوں وہ بھی
انھیں کافر اداؤں نے ، انھیں نیچی نگاہوں نے
کیا تھا کیا ؟ سنیں گے آپ ؟ اجازت ہے ؟ کہوں وہ بھی
تقاضا ہے یہ بے تابی کا اور کیسا تقاضا ۔
میں اپنے درد کی روداد دنیا سے کہوں ، وہ
اب اس منزل میں لے آیا کرم ضبطِ محبت
میں اس کا نام لیتا تھا سو شاید اب نہ لوں و
مٹا سکتا نہیں کوئی فریبِ زندگی
رہِ ہستی میں ہوں اور نقشِ پائے ناز ہوں وہ

○●○

اس طرح آج مجھ سے نظریں ملا رہے
میری طرف وہ جیسے ساغر بڑھا رہے
جو عکس لے رہے تھے اپنی ادا ا
وہ آئینے بھی ہم سے اب منھ چھپا رہے
دیکھا نہیں کہ کتنی حسرت ہے میرے دا
سوچا نہیں کہ کس سے دامن بچا رہے
یہ آگہی بھی اپنی کچھ کم نہیں ہی
ہم کم سے کم فریبِ ہستی تو کھا رہے

○●○

دل کی آہوں سے داغ جلتے ہیں
آندھیوں میں چراغ جلتے ہیں
شعلہ ، عشق ہے خوشی اپنی
ہو کے ہم باغ باغ جلتے ہیں
موج در موج گرمیِ تخلیق
قطرہ قطرہ چراغ جلتے ہیں
قطرے قطرے میں آتشِ گل ہے
مینھ برستا ہے باغ جلتے ہیں
کتنے دل ہیں دھواں دھواں روحی
کتنے دل بے چراغ جلتے ہیں

○●○

اشعار

یہ آنکھ ہے تو اس میں سفید و سیاہ ہے
دل ہے تو دل میں آتا ہے اچھا برا خیال

خود اپنا خیال آئے تو ہوتی ہے مکدر
صدقے میں ترے غم کے طبیعت یہ غنی ہے

دریا تھا اپنی آنکھوں میں کب سے رکا ہوا
پوچھا کسی نے حال تو مت پوچھو کیا ہوا

نقش اوراق پہ جذبے مرے ہوجائیں گے
اور کتاب اوڑھ کے پھر طاق میں سوجائیں گے

تقاضا ہے مرے ذوقِ طلب کا
اسے پاؤں جسے سوچا نہ جائے

مجھ کو ملا کے خاک میں پہنچا دیا کہاں
تیرے قدم کے ساتھ ترے راستوں میں ہوں

عالمِ وہم وہ گماں ہے تری دنیا لیکن
کیسے کیسے یہاں اربابِ یقیں رہتے ہیں

غیرتِ دل کا نہ جانے کون سا ہے یہ مقام
بے وفا بنتی ہے دنیا اور شرماتا ہوں میں

خشک پتوں کی کھڑ کھڑاہٹ میں
سن رہا ہوں بہار کی آواز

گم ہوں لطفِ سوال میں اب تک
اس نے پوچھا تھا مدعا کیا ہے

لیتا نہیں ہوں سانس ترے نام کے بغیر
تیرے بغیر جینے کی عادت نہیں مجھے

دیکھی ہے میں نے دوست کی بدلی ہوئی نظر
دنیا بدل رہی ہے تو حیرت نہیں مجھے

قتل کرتے ہیں وہ ہنسی سے بھی
موت ملتی ہے زندگی سے بھی

سارے اسبابِ تباہی جمع ہیں اب دہر میں
بس کمی اک رہ گئی ہے صورِ اسرافیلؑ کی

خود بہ خود کبھی دل سے اک سوال اٹھتا ہے
اپنی کیا ضرورت ہے اس جہانِ فانی میں

کیوں لوٹ کے گلشن میں آجائیں نہ بن والے
پھولوں میں ابھر آئے انداز چبھن والے

پھولوں سے تمھیں رغبت ، زخموں سے ہمیں راحت
تم اور چمن والے ، ہم اور چبھن والے

○●○ ● ○●○

یوسف ناظم

تخاطب ـــ خامہ بگوش سے

کبھی کبھی سوچتا ہوں یعنی ظریفانہ ادب کے بارے میں سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ اگر مشفق خواجہ (خامہ بگوش) اس کی طرف توجہ نہ کرتے تو اردو ظرافت نگاری کی گود اتنی ہری نہ ہوتی جتنی ان کی توجہ کی وجہ سے ہوئی ہے ۔ مشفق خواجہ نے ظرافت نگاری میں ایک علاحدہ ہی شاخ پیدا کی اور وہ ہے ظریفانہ تبصرہ نگاری ۔ پاکستان میں حقیقت یہ ہے کہ ظرافت کے باغوں میں سال کے بارہ مہینے بہار ہی بہار رہی ۔ ایک سے ایک جید ظرافت نگار وہاں موجود ہے ۔ مشتاق احمد یوسفی ، ابنِ انشاء ، شفیق الرحمن اور وہ بہ جنگ آمد والے کرنل صاحب جن کا نام ہی ڈر کے مارے بالعموم بھول جاتا ہوں ۔ ویسے تو شفیق الرحمن کا تعلق بھی فوج سے رہا ہے لیکن بندوق ان کے ہاتھ میں نہیں تھی ۔ اور وہ ہندستان میں بےحد مقبول رہے ہیں ۔ میرے اس بیان کا ثبوت ان کا وہ گوشہ ہے جو سوغات (بنگلور) کے تازہ شمارے مطبوعہ نومبر ۱۹۹۷ء میں شامل ہے ۔ یہ گوشہ کوئی ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے ۔ یہی صورتِ حال ابنِ انشاء اور مشتاق احمد یوسفی کی مزاح نگاری کی رہی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس معاملے میں کراچی ، لاہور سے ذرا آگے ہے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا اور اب تو مشفق خواجہ کی شمولیت نے اس طرزِ نگارش کو بنات النعشِ گردوں بنادیا ہے ۔ کیا کہکشانی تحریر وہ لکھتے ہیں اور جو میدان انھوں نے اپنے لیے منتخب کیا ہے یعنی ظریفانہ تبصرہ نگاری اس میں تنگیِ چشم حسود ، اتنی شدید ہے کہ دور دور تک ان کا کوئی حریف بہ روئے کار ، نظر نہیں آتا ۔ (آئندہ بھی اس کا امکان نہیں ہے) ۔ مشفق خواجہ غالباً سبز رنگ کی روشنائی استعمال کرتے ہیں ۔ جبھی تو یہ کشت ظرافت اتنی سرسبز ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی تحریر میں یہ غضب کی شادابی ، سبز رنگ کی روشنائی کی دین ہے ۔ ایسا سوچنا بھی ظرافت نہیں ستم ظریفی ہوگا ۔ غالب نے تو اپنے چاہنے والوں کو مطلع کردیا تھا کہ ان کے خیال میں جو مضامین آتے ہیں وہ غیب سے آتے ہیں ۔ مشفق خواجہ نے اس بارے میں اب تک کوئی اطلاع نہیں دی ہے اور ان کے قاری ، جو ان کی بےساختہ تحریروں کو بے تحاشہ پڑھتے ہیں حیران و پریشان ہیں کہ یہ مضامین ان کے خیال میں پتہ نہیں کہاں کہاں سے آتے ہیں ۔ غالب کا ذکر یہاں اس لیے غلط نہیں ہے کہ موصوف اعلیٰ درجے کے شاعر تو تھے ہی علاوہ اس کے ظریف النفس بھی تھے ۔ ان کی ظرافت بھی نثری تھی لیکن مکتوباتی اور ایک مخصوص حلقے کی حد تک محدود ۔ مشفق خواجہ میرے حساب سے شکر ، قندونبات اور مصری کے ایسے تاجر ہیں کہ ان کی تحریروں کی وجہ سے ان کے پڑھنے والوں کے دلوں میں بتاشے ہی نہیں لڈو پھوٹنے لگتے ہیں ۔ مشفق خواجہ کا ایک تو میدان ان کا اپنا جس کے تنہا یہی سپاہی دوسرے یہ کہ ان کا دم پھولتا نہیں ہے ۔ مسلسل نبرد آزمائی نے ان میں تکان یا تھکن نام کی چیز پیدا نہیں ہونے دی غالب کے یہاں جو اہلِ قلم ، پایا جاتا ہے وہ کان پر قلم رکھ کر صبح سویرے گھر سے نکل جاتا تھا جسے بھی محبت نامہ لکھوانا ہو اس سے لکھوالے ۔ مشفق خواجہ کا معاملہ بالکل برعکس ہے ۔ جس کسی کی بھی کتاب چھپتی ہے (بلکہ بعض لوگ تو کتاب چھپواتے ہی اس لیے ہیں

مشفق خواجہ سے اس پر تبصرہ کروائیں گے) وہ صبح سویرے کتاب ہاتھ میں لیے خواجہ صاحب کے مکان کا رخ کرتا ہے کہ ناشتے سے انھیں اپنی کتاب پہنچادے ۔ آپ سمجھیں گے کہ میرے اس بیان میں مبالغہ ہے لیکن یہ آپ کا مغالطہ ہے ۔ مشفق خواجہ کے ساتھ کئی مرتبہ ہوچکا ہے ۔

مشفق خواجہ کے تبصروں میں ان کا مطالعہ ان کا مشاہدہ دونوں بولتے ہیں اور وہ بھی ایک ساتھ ۔ مطالعے کی کثرت اور مشاہدے سعت نے ان کی وہبی استعداد کو ایک عجیب وضع کی پوشش عطا کی ہے جو مخمل و سنجاب کی ہوتے ہوتے بھی ڈھاکے کی مشہور و ف ململ کی ملائمت رکھتی ہے اور اس ملائمت کا رشتہ اس ظرافت سے ہے جس میں طنز کی مقدار مزاح سے ، مزاح کی مقدار طنز سے زیادہ ۔ علمیت مستزاد ۔ علمی مزاج کا وقار الگ اور شان علاحدہ ہوتی ہے ۔ مشفق خواجہ کی ظرافت میں علم اس لیے لازمی مضمون ہے کہ ں کتابوں پر تبصرہ کرنا ہوتا ہے ۔ ہر کتاب کے بارے میں انھیں پہلے پہلے شبہ ہوتا ہے کہ یہ علمی ہوگی ۔ چند صفحے پڑھنے کے بعد ان بدگمانی دور ہوجاتی ہے اور وہ حقیقت کے بالکل قریب پہنچ جاتے ہیں ۔ ان کا یہی قرب ، بعد میں مہلک ثابت ہوتا ہے ۔ یہ اپنی وضع تنہا قاتل ہیں جو انشاء (یا شاید مصحفی) کے شعر کے مطابق ذبح بھی کرتے ہیں اور ثواب بھی الٹا خود ہی اپنے نام لکھواتے ہیں ۔

اب تبصراتی ادب کی بات چھڑ گئی ہے تو مجھے اجازت دیجیے کہ مزاح نگاری میں مشفق خواجہ کا سلسلہ غالب تک پہنچتا ہے تو ہ نگاری میں غالب کے ہم عصر ، سرسید احمد خاں سے جاکر جڑتا ہے ۔ وہ اس لیے کہ اردو میں تبصرہ نگاری کا آغاز سر موصوف ہی سے ورنہ اس سے پہلے تو اردو میں صرف تقریظیں لکھی جاتی تھیں ۔ تقریظ اور تنقید کے بیچ میں کوئی دوسری چیز تھی ہی نہیں ۔ سرسید خاں اور ان کے رفقا نے تبصراتی ادب کی رسم افتتاح انجام دی اور نثری مدح سرائی کی بجائے ایک معتدل اور متوازن مزاج کی طرز ن کی پیدائش کا انتظام کیا اور رفتہ رفتہ یہ طرزِ نگارش اصنافِ ادب کی ذیلی فہرست میں شامل ہوگئی اور آج صورتِ حال یہ ہے کہ ر اور تبصرہ نگار حضرات کا ایک قبیلہ سرگرمِ عمل ہے ۔ اخبارات اور رسائل میں ایک مخصوص نشست ان کے لیے محفوظ رہتی ہے ۔ ق خواجہ اسی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن جیسا کہ سب جانتے ہیں انھوں نے جو راستہ اپنے لیے چنا ہے وہ اتنا سنگلاخ ہے کہ یہ ہ عشق پر پہنچیں گے تو تنہا ہی پہنچیں گے ۔ کچھ لوگ کاروانِ ادب میں شامل ہوئے ہیں تو سرخیل کی طرح ۔ مشفق خواجہ اس لیے یل کے عہدے پر فائز ہیں کہ اس شق میں ان کے آگے کوئی تھا بھی نہیں اور پیچھے کوئی ہے نہیں ۔ انھوں نے راستہ ہی ایسا ڈھونڈا کہ شاہ راہ ہونے کے باوجود کوئی دوسرا راہی اب تک نمودار نہیں ہوا ۔

مشفق خواجہ بہت دنوں تک پردہ ، خفا میں رہے ۔ ان کا مزاج غیر تشہیری ہے لیکن غیر تشہیری مزاج کے ادیبوں کا استحکام بھی ے مضبوط ہوتا ہے ۔ کچھ دن پہلے لندن کے تمکین کاظمی کی ایک تحریر پڑھنے کو ملی تھی جو صرف لندن کے کسی بڑے اخبار میں مطالعہ تے رہنے کی خدمت پر مامور ہیں اور سال میں کوئی ہزار ڈیڑھ ہزار ناولیں انھیں پڑھنی پڑتی ہیں یہ ذخیرہ بہ غرض تبصرہ (اخبار) کے دفتر جمع ہوتا ہے اور انہی ناولوں میں سے کوئی نہ کوئی کتاب نوبل انعام کے لیے منتخب ہوتی ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ صرف دس بارہ ں کو قابلِ ذکر کہا جاسکتا ہے ۔ اپنے مضمون کے آخر میں انھوں نے قرۃ العین حیدر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ موصوفہ نے کبھی تشہیر کی فکر نہیں کی جو آج کل ادب میں تقریبا لازمی ہوکر رہ گئی ہے (یہ بہت شریفانہ طرز کا خراجِ تحسین ہے) میرا یہ بیان شاید ا بے جوڑ معلوم ہوتا ہے لیکن ان سطروں میں صرف سطریں ہی نہیں ہیں ۔ سطروں کے بیچ میں بھی کچھ ہے ۔

میں نے اب تک مشفق خواجہ کی تحریر کا کوئی نمونہ پیش نہیں کیا ہے ۔ وجہ آپ جانتے ہیں ۔ ان کا اقتباس پہلے ہی درج

کردیتا تو آپ وہ سب کچھ کیوں پڑھتے جو میں نے لکھا ہے ۔ (اب افسوس کرنے سے کیا فائدہ حاصل ہوگا) ۔ ان کے طنز و مزاحیہ کالموں کا انتخاب " سخن در سخن " کے نام سے یہاں ہندستان میں ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا اور مکتبہ ، جامعہ دلی سے شائع ہونے والی کتابوں میں شاید یہ پہلی کتاب ہے جو ۱۹۹۵ء کے ختم ہونے سے پہلے ختم ہوگئی (ختم ہوگئی سے مراد فروخت ہوگئی) ۔ مظفر علی سید جو اس انتخاب کے مرتب ہیں ، اسی کتاب کی وجہ سے ہندستان میں مشہور ہوئے (میں مانتا ہوں یہ بیان ان کے ساتھ زیادتی ہے لیکن اظہارِ واقعہ بھی کوئی چیز ہوتی ہے ۔ فاضل مرتب کے بارے میں اگر کبھی عرض کرنے کی توفیق ہوئی تو اس زیادتی کی " تلافی " پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا) فی الحال مشفق خواجہ کی بات سن لیجیے ۔ کہتے ہیں :

" سید صاحب (مظفر علی سید) نے نہایت توجہ اور محنت سے اور سب سے بڑی بات یہ کہ بڑی محبت سے ہمارے کالموں کو پڑھا ۔ ان تمام کالموں کو مسترد کردیا جن میں ان کی پسندیدہ شخصیات کو ہم نے مسترد کیا تھا ۔ یہاں تک کہ ان کے نزدیک وہ کالم بھی بےاعتبار ٹھہرا جو خود ان کے اعزاز میں لکھا گیا تھا اور جس میں ان کے وزیٹنگ کارڈ کو ان کی واحد تصنیف قرار دیا گیا تھا "۔ یہ جملہ مشفق خواجہ کے حسنِ سلوک کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے ۔ انتخاب کے دیباچے میں انھوں نے فرمایا ۔ ان سب مرحلوں سے گزرنے کے بعد نظرِ ثانی کا مرحلہ آیا ۔ دوچار کالم پڑھ کر ہی یہ فیصلہ مشکل ہوگیا کہ کتابت کی غلطیاں زیادہ ہیں یا معنوی اغلاط ۔ بہرحال ہم نے بڑی محنت سے کتابت کی غلطیاں دور کردیں اور باقی ہر طرح کی اغلاط کو اصل کے مطابق باقی رہنے دیا تاکہ ہم پر اصل میں تحریف کا الزام نہ آئے ۔ کتاب کے آخر میں " غلط نامہ " شامل کرنے کا ارادہ تھا ۔ پھر خیال آیا کہ اردو کی کتابوں میں غلط نامہ شامل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کیوں کہ یہ تو خود غلط نامے کا نعم البدل ہوتی ہیں ۔" اب ایسے قاتل تبصرہ نگار کی کون سی تحریر بہ طور اقتباس پیش کی جائے ۔ مشفق خواجہ بنیادی طور پر محقق ہیں اور وہ بھی بڑے محقق یعنی اتنے بڑے کہ اکثر محققین جنھوں نے دشتِ تحقیق کی سیاحی میں عمر گزاری ہے ان سے تبادلہ ، خیال کرتے وقت آواز دھیمی اور آنکھیں نیچی رکھتے ہیں اور بعد میں کفِ افسوس ملتے ہیں کہ ہم نے تبادلہ ، خیال کیا ہی کیوں تھا لیکن کہاں تحقیق اور کہاں ظرافت ۔ تحقیق نہایت غیر دل چسپ اور ٹاٹ کی طرح خشک مضمون اور کہاں کشتِ زعفران ۔ دونوں کے بیچ قطبین کا فاصلہ لیکن قدرت کے کارخانے میں صرف اتفاقات ہی نہیں ہوتے حسنِ اتفاق کے واقعات بھی ہوتے ہیں ۔ " خامہ بگوش " کا محقق ہوتے اور رہتے ہوئے ظرافت نگار بہ معہ تنقید نگار بن جانا بھی حسنِ اتفاق ہے ۔ یہ یا تو صنفی تبدیلی ہے یا ماہرانہ کلوننگ ۔ بہ ہرحال اردو کے ظریفانہ ادب کی پیٹھ پر کہیے یا سر پر کہیے ایک محقق کے دستِ شفقت کا فائدہ یہ ہوا کہ ظریفانہ تبصرہ نگاری ایک مثبت ، مستحکم اور مہذب طرزِ نگارش بن گئی ۔ آئندہ چل کر اگر کسی ادیب نے اس طرزِ نگارش کو اپنایا (جس کا امکان کم ہے) تو کہا یہی جائے گا ۔ ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو بیٹے . . .

مظفر علی سید نے کتنی محنت اور دیدہ ریزی سے ایک انتخاب مرتب کیا ، اب میں کیا اس انتخاب میں سے کوئی کالم منتخب کرکے آپ سے فرمائش کروں کہ اسے پڑھ لیجیے ۔ یہ دونوں پر ظلم ہوگا اور میری حماقت ۔ یوں بھی ۔ انتخاب تو اب سرکار کے پنج سالہ منصوبے کی طرح اپنی مدت ختم کرچکا اور اس دوران خامہ بگوش نے کتنے ہی قبلہ نما مرغ آشیانے میں تڑپنے کے لیے زندہ چھوڑ دیئے ۔ ان کے خامے کی زد میں جو آیا پھر کہیں جانہ سکا . . . صرف یہ بتانے کے لیے کہ خامہ بگوش تڑپنے کے لیے زندہ چھوڑ دیے ۔ ان کے خامے کی زد میں جو آیا پھر کہیں جا نہ سکا . . . صرف یہ بتانے کے لیے کہ " خامہ بگوش " کے کالم پابندی سے چھپتے ہی نہیں پڑھے بھی جاتے ہیں ایک اقتباس پیش کر رہا ہوں ۔ عنوان ہے طوافِ کوئے ملامت

(باقی سلسلہ ص ۵۳ پر)

خامہ بگوش

ادب اور ازدواجی مسائل

کسی ادیب سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے اگر اس کے صاحبِ نظر ہونے کی گواہی دیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ کوئی معمولی ادیب نہیں ہے ۔ زاہدہ حنا جو کچھ لکھتی ہیں ، وہ افسانہ ہو یا اخباری کالم ، ان کی بہت سی باتوں سے اتفاق کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہوتا ، اس کے باوجود ہماری رائے یہ ہے کہ وہ جب لکھتی ہیں تو لکھنے کا حق ادا کرتی دیتی ہیں ۔ وہ جدید افسانے کا ایک معتبر نام ہیں ۔ افسانہ نگاری کے لیے زندگی کا یہ راہِ راست مشاہدہ پہلی اور بنیادی شرط ہے ۔ اگر اس کے ساتھ لکھنے والے کا مطالعہ خصوصاً اس معاشرے کی تاریخ کا مطالعہ جس میں وہ سانس لے رہا ہے ، وسیع ہے تو اس کی نظر ساحل پر کھڑے ہوئے تماشائی کی نظر کی طرح سطح بیں نہ ہوگی بلکہ اس غواص کی نظر بن جائے گی جو دریا کی تہہ کی خبر لاتا ہے ۔ مشاہدے اور مطالعے کی وسعت کے ساتھ اگر کوئی افسانہ نگار زبان و بیان پر بھی قدرت رکھتا ہو تو اسے قرۃ العین حیدر کے سوا اور نام نہیں دیا جاسکتا ۔ زاہدہ حنا بھی قرۃ العین حیدر کے آس پاس کہیں موجود نظر آتی ہیں ۔

یہاں تک لکھنے کے بعد ہم نے اپنے لکھنے پر نظر ڈالی تو محسوس ہوا یہ ہمارے کالم کا عام انداز نہیں ہے ۔ ہم کسی کی تعریف میں اتنی دریا دلی کا مظاہرہ اس وقت تک نہیں کرتے جب تک کہ موضوع خود ہماری ذات نہ ہو ۔ مندرجہ بالا پیراگراف تو کسی ایسے مقالے کا حصہ نظر آتا ہے جیسا نظیر صدیقی نے پروین شاکر کی شاعری پر یا علی سردار جعفری نے عشرت آفرین کی کتاب پر لکھا تھا ۔ خیر ، اب تیر کمان سے نکل چکا ہے ، ہم اپنے الفاظ واپس نہیں لے سکتے کہ ایسے " آلودہ ۔ توصیفِ غیر " الفاظ ہمارے کس کام آئیں گے ، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ہم محترمہ قرۃ العین حیدر سے معذرت کرلیں کہ ان کے آس پاس زاہدہ حنا کو نہیں بھیجا ، وہ خود اپنی مرضی سے وہاں موجود ہیں ۔

زاہدہ حنا پر لکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ لاہور کے روزنامہ " پاکستان " میں ان کا ایک دل چسپ انٹرویو شائع ہوا ہے ۔ یہ انٹرویو ڈاکٹر اجمل نیازی نے لیا ہے جو فکر انگیز سوالات اٹھانے میں مہارت رکھتے ہیں اور حال ہی میں اکادمی ادبیات کے جلسے میں احمد فراز پر کرسی اٹھانے میں بھی وہ خاصی مہارت کا مظاہرہ کرچکے ہیں ۔

زاہدہ حنا نے پاکستان کی موجودہ ادبی صورتِ حال سے بےزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہماری " علمی و ادبی تقریبات کی مسند نشینی جاہل وزیروں اور اجہل مشیروں کے حصے میں آئی ہے ۔ ایسی تقریبات کی اگلی صفوں میں کمشنر اور ڈپٹی کمشنر بٹھائے جاتے ہیں ۔ انکم ٹیکس افسر اور اسمگلر بار پاتے ہیں ۔ ہم نے اپنی نوکر شاہی کے معمولی اہل کاروں کو علم و دانش کا ہمالیہ پہاڑ ٹھہرایا ۔ کوئی افسر غالب کے بیس شعر یاد کرکے آجائے تو ہم اس سے اپنی ادبی محفلوں کی صدارت کراتے ہیں ۔

محترمہ نے واقعی بڑی دردناک تصویر کھینچی ہے ۔ ایسی ہی دردناک تصویریں کھینچنے پر علامہ راشدالخیری کو " مصورِ غم " کا

خطاب دیا گیا تھا ۔ زاہدہ حنا بھی مصوّرِ غم کہلانے کی مستحق ہیں ۔ انھوں نے جو کچھ فرمایا ہے وہ صد فی صد درست ہے لیکن اس میں جاہل وزیروں اور اجہل مشیروں وغیرہ کا کوئی قصور نہیں ۔ انھیں بلایا جاتا ہے تو وہ ادبی تقریبوں میں آتے ہیں ۔ ان سے درخواست کی جاتی ہے تو وہ مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہوجاتے ہیں ۔ ہم نے تو آج تک یہ نہیں سنا کہ کسی وزیر یا کمشنر نے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی مدد سے زبردستی علمی و ادبی تقاریب کی صدارت کی ہو یا کسی تھانےدار نے سپاہی بھیج کر شاعروں کو تھانے بلایا ہو اور اپنی صدارت میں مشاعرہ منعقد کیا ہو ۔ اس صورتِ حال کی ساری ذمےداری ان ادیبوں پر عائد ہوتی ہے جنھوں نے ادب کو کاسہ ٔ گدائی بنا رکھا ہے ۔ وزیر اور کمشنر بڑی چیز ہیں ۔ ہمارے ادیب تو ٹی وی اسٹیشن کے دروازے پر کھڑے ہوئے چوکیدار سے بھی اسی عقیدت سے ملتے ہیں جس عقیدت سے غالب اپنے محبوب کے پاسبان کے قدم لیتا تھا ۔

محترمہ نے اس سرکاری افسر کا ذکر بھی بڑی حقارت سے کیا ہے جو غالب کے بیس شعر یاد کرکے آجاتا ہے اور ادبی تقاریب کی صدارت کرتا ہے ۔ ہماری رائے میں یہ سرکاری افسر ستائش کا مستحق ہے کہ اس نے غالب کے بیس شعر تو یاد کرلیے ۔ اس کے برعکس ہمارے مشاعروں کا یہ حال ہے کہ انھیں سوائے اپنے شعروں کے کسی دوسرے کا کوئی شعر یاد نہیں ہوتا ۔ یقین نہ آئے تو کسی بھی شاعر سے غالب کے صرف پانچ شعر سنانے کی فرمائش کرکے دیکھ لیجیے ۔ وہ اپنے ہی پانچ شعر غالب کے نام سے سنادے گا ۔ سرکاری افسر غالب کو بےآبرو نہیں کرتا ۔ اس کے نام سے اسی کے شعر سناتا ہے ۔

ایک سوال کے جواب میں محترمہ نے یہ فرمایا کہ ہمارے شاعروں کو شادی نہیں کرنی چاہیے کیوں کہ ان کے پاس اس رشتے کو نبھانے کی فرصت ہوتی ہے نہ حوصلہ اور اگر غلطی سے یہ لوگ شادی کر ہی لیں تو انھیں اس رشتے کو نبھانے کا سلیقہ عوام سے سیکھنا چاہیے ۔

پہلے تو ہم یہ سمجھے کہ اس بیان میں کتابت کی غلطی کی وجہ سے " شاعری " کی جگہ " شادی " کا لفظ چھپ گیا ہے ۔ یعنی محترمہ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ ہمارے شاعروں کو شاعری نہیں کرنی چاہیے ۔ بات معقول ہے کہ ہمارے شاعر آج کل جس طرح کی شاعری کر رہے ہیں ۔ اس سے نہ خود ان کی عزت میں کوئی اضافہ ہو رہا ہے بلکہ شاعری کی آبرو بھی خطرے میں پڑچکی ہے ۔ ۔ ۔ لیکن جب بیان کو غور سے پڑھا تو معلوم ہوا کہ محترمہ شاعروں کو شاعری سے نہیں ، شادی ہی سے اجتناب کا مشورہ دے رہی ہیں ۔

ہم شاعر نہیں ہیں لیکن شاعروں کے ہم درد ضرور ہیں اس لیے ہم محترمہ کے مشورے کو ناقابلِ قبول ہی نہیں ، ادب کے لیے نقصان دہ بھی سمجھتے ہیں ۔ اگر شعرا حضرات شادی نہ کرتے تو ہمارے بہت سے بڑے شاعر پیدا ہی نہ ہوتے کیوں کہ وہ خود شاعروں کی اولاد میں سے ہیں ۔ مثلاً ماضی میں میرانیس کے خاندان میں سات پشتوں تک شاعری کا سلسلہ جاری رہا ۔ اگر میرانیس کے جدِ امجد ، زاہدہ حنا کے مشورے پر عمل کرتے تو اردو شاعری میرانیس جیسے بڑے شاعر سے محروم رہ جاتی ۔ اسی طرح موجودہ زمانے میں جون ایلیا کے خاندان میں بھی چار پشتوں سے شاعری ہو رہی ہے ۔ خدا کا شکر ہے کہ محترمہ زاہدہ حنا کے مشورے پر عمل نہیں ہوا ورنہ آج جون ایلیا جیسا طرح دار شاعر ہمارے درمیان موجود نہ ہوتا ۔

محترمہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ شعرا حضرات اگر غلطی سے شادی کرلیں تو انھیں اس رشتے کو نبھانے کا سلیقہ عوام سے سیکھنا چاہیے ۔ محترمہ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ شادی کوئی شاعری نہیں ہے جو کسی غلطی کے نتیجے میں وجود میں آئے ۔ آدمی خوب سوچ کر اور خاصی رقم صرف کرکے شادی کرتا ہے اور پھر شادی مزاحمتی ادب جیسی کوئی چیز بھی نہیں ہے جو عوام کے مفاد میں اور عوام کے مشورے سے کی جائے ۔ شعرا تو ہر معاملے میں عوام کی رہ نمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں شادی کے مسئلے میں وہ

عوام کی رہنمائی کیوں کر قبول کرسکتے ہیں ۔ محترمہ سے گذارش ہے کہ وہ اپنی افسانہ نگاری اور کالم نویسی کی حدود میں رہیں اور شاعروں کے ازدواجی معاملات کو انھیں پر چھوڑ دیں ۔

جون ایلیا کا ذکر آیا ہے تو یہ بتا دینا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ زاہدہ حنا کے انٹرویو سے کچھ دن پہلے روزنامہ " پاکستان " میں موصوف کا بھی ایک انٹرویو چھپا تھا جس میں انھوں نے اپنی شادی کے حوالے سے بعض ایسی باتیں کہی ہیں جنھیں ازراہِ شائستگی نقل نہیں کیا جاسکتا ۔ شاید ایسی ہی باتوں کی وجہ سے زاہدہ حنا نے شاعروں کو شادی نہ کرنے کا مشورہ دیا ہے ۔ جون ایلیا کے انٹرویو میں کئی اور دل چسپ باتیں ہیں ۔ لہذا اگر ہم کچھ وقت اس سریر آرائے اقلیمِ سخن کے ساتھ بھی گزارلیں تو کوئی مضائقہ نہیں ۔

جون ایلیا کی عادت ہے کہ اپنے ہر انٹرویو میں اپنے جدِّ امجد کے بارے میں کوئی نہ کوئی چونکا دینے والی بات ضرور کہتے ہیں ۔ چند ماہ پہلے انھوں نے ایک انٹرویو میں اپنے جدِّ امجد کے لیے " اوباش " کا لفظ استعمال کیا تھا ۔ اس پر ہم نے ٹوکا تو اخبار میں وضاحت کی کہ انھوں نے " عشق باز " کا لفظ استعمال کیا تھا جسے انٹرویو لینے والے نے " اوباش " سمجھا ۔ اس وضاحت سے معاملہ اور سنگین ہوگیا ۔ کیوں کہ نوراللغات جیسی مستند لغت میں " عشق باز " کے معنی ، حسن پرست ، عاشق مزاج ، عیاش " لکھے ہیں ۔

جون ایلیا نے یہ بھی بتایا ہے کہ اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو فلسفی ہوتے اور اگر فلسفی نہ ہوتے تو پہلوان ہوتے ۔ پہلوانی سے موصوف کو بچپن سے دل چسپی ہے ۔ انھوں نے امروہے کے نامی گرامی پہلوانوں سے یہ فن سیکھا ہے ۔ فرماتے ہیں " ایک زمانے میں میں دودھ کا ایک گلاس پیتا تھا ، ڈنڈ لگاتا تھا اور دیوار پر مکا مارتا تھا کہ اب تو یہ دیوار گر ہی جائے گی کیوں کہ میں سمجھتا تھا کہ بہت بڑا پہلوان بن گیا ہوں ۔"

جون ایلیا پر ہمیں رشک آیا کہ انھوں نے وہ اچھا زمانہ دیکھا ہے جب آدمی دودھ کا ایک گلاس پی کر پہلوان بن جاتا تھا ۔ اب تو کوئی بالٹی بھر دودھ بھی پی ڈالے تو کوئی فائدہ نہیں ہوتا ۔ اول تو دودھ خالص نہیں ملتا ، دوسرے دودھ کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ اس کا صحت پر منفی اثر ہوتا ہے ۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آدمی پہلوان بننے کی بجائے جون ایلیا بن جاتا ہے ۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں ، اچھا ہوا کہ جون ایلیا پہلوان نہیں بنے ورنہ مُکّے مار مار کر شہر کی ساری دیواریں گرادیتے ۔ ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں ہے ۔ موصوف پہلوان نہیں بنے تو کیا ہوا پہلوانِ سخن تو وہ ہیں ۔ اگر چاہیں تو اپنے زورِ سخن سے سارے عالم کو تہہ و بالا کرسکتے ہیں لیکن آرام پسندی کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کرتے ۔ آرام پسندی کا تو یہ عالم ہے کہ انھوں نے بہ قول خود ایک عرصے سے کنگھا نہیں کیا ۔ استاد لاغر مرادآبادی کا بھی یہ حال ہے ۔ ایک مدت سے ان کی زلفیں بےنیازِ شانہ ہیں ایک مرتبہ ہم نے اس کا سبب پوچھا تو انھوں نے فرمایا " آدمی کنگھا اس وقت کرتا ہے جب وہ منہ دھوتا ہے ۔ ہم کبھی پہلے مرحلے ہی سے نہیں گزرے تو دوسرے مرحلے تک کیسے پہنچ سکتے ہیں ۔ ۔ ۔"

○●○

خامہ بگوش

ادبی خرکار

وہ دن گئے جب اردو ادب پر برِ صغیر کے چند بڑے شہروں کی اجارہ داری تھی ۔ اب تو یہ زبان اور اس کے ادیب دنیا کے ہر خطے میں موجود ہیں اور بعض مقامات پر تو لاہور ، کراچی ، دلی اور لکھنو جیسی ادبی چہل پہل نظر آتی ہے ۔ اردو کے بین الاقوامی مشاعرے تو منعقد ہوتے ہی تھے ، اب بین الاقوامی رسالے بھی شائع ہونے لگے جن میں برِ صغیر سے باہر کے ادیبوں کو خاص اہمیت دی جاتی ہے ۔ تارکینِ وطن معاشی دباؤ کے تحت رزق کی تلاش میں غیر ملکوں میں جاتے ہیں تو ادب کے ذریعے ان کا تعلق اپنے وطن سے قائم رہتا ہے ۔ ادبی رسالے بھی معاشی دباؤ کے تحت اس تعلق کو برقرار رکھنے میں مدد دیتے ہیں ۔ کس طرح ؟ اس کا اندازہ ذیل کی خط وکتابت سے ہوگا جو ایک کرم فرما کی عنایت سے ہمیں پڑھنے کے لیے ملی تھی ۔ جی نہ چاہا کہ ایسی بصیرت افروز خط وکتابت سے ہم اکیلے محظوظ ہوں ۔ لہذا ہم اس کا کچھ حصہ اپنے قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے شائع کر رہے ہیں ۔

(۱)

کراچی ۔ ۲ / فروری ۱۹۹۳ ء

مکرمی خلیل بےخود صاحب ۔ آداب ۔۔۔ آپ نے ماہ نامہ " خرکار " کا سالانہ تعاون عنایت کر کے ادب نوازی کا جو ثبوت دیا ہے اس کی وجہ سے تاریخِ ادب میں آپ کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگیا ہے ۔ اگر آپ اس تاریخ میں اپنا نام آبِ زر سے لکھوانا چاہتے ہیں تو رسالے کی تاحیات سرپرستی قبول فرمائیے ۔ اس کے نرخ منسلکہ ریٹ کارڈ پر درج ہیں ۔ آپ نے سالانہ زرِ تعاون کے ڈرافٹ کے ساتھ جو خط بھیجا ہے ، اس کی خوب صورت نثر سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ شاعر ہیں ۔ نیز آپ کے شاعرانہ نام سے اس کی تصدیق ہوتی ہے ۔ ازراہِ کرم اپنا کلام مع تصویر عنایت فرمائیے تاکہ دنیائے ادب کے سامنے مستقبل کے ایک بڑے شاعر کو فخر کے ساتھ پیش کیا جاسکے ۔ واضح رہے کہ ہمارے ادارے کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے سعودی عرب ، خلیج کی ریاستوں ، یورپ اور امریکہ میں آباد برِ صغیر کے بےشمار باشندوں کے اندر چھپے ہوئے شاعروں کو برآمد کیا ہے ۔ یہ تمام شاعر آج اردو دنیا پر چھائے ہوئے ہیں ۔ آپ کے اندر کے خوب صورت شاعر کو باہر آنا ہوگا ۔

خرکار نوازی کا ایک مرتبہ پھر شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ آپ ہی جیسے صاحبانِ عزم و ہمت کی وجہ سے اردو عالمی سطح پر مقبول ہورہی ہے ۔ آپ کے جواب کا بےتابی سے انتظار کروں گا ۔

آپ کا خیر اندیش مینا لکھنوی

(۲)

دوبئی ۔ ۱۵ / فروری ۱۹۹۳ء

محترمی ۔ ۔ ۔ تسلیمات ۔ گرامی نامہ موصول ہوا ۔ یاد فرمائی کے لیے شکرگزار ہوں ۔ آپ نے میرے بارے میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں ، مگر جناب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں شاعر نہیں ہوں ۔ میرا نام آپ کو شاعرانہ اس لیے نظر آیا کہ میں حضرت بےخود گڑھ مکیشتری کا فرزند ہوں میرا اصل نام خلیل اللہ خاں ہے اسے میں نے مختصر کر کے والد مرحوم کے تخلص سے جوڑ دیا ہے ۔ میں پیشے کے اعتبار سے انجینیر ہوں ۔ افسوس کہ ایک شاعر کا بیٹا ہونے کے باوجود شعر کہنے کی صلاحیت سے محروم ہوں ۔ البتہ اردو زبان سے بےپناہ محبت ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ کے ایک دوست نے آپ کے رسالے کا سالانہ چندہ بھیجنے کے لیے کہا تو میں نے فوراً تعمیلِ ارشاد کی ۔ آپ مجھے رسالے کا سرپرست بنانا چاہتے ہیں تو مجھے اس میں کیا اعتراض ہوسکتا ہے ۔ اس کا ہدیہ بھی پیش کررہا ہوں ۔ غزل میں نے کبھی نہیں لکھی ، اس لیے بھیجنے سے معذور ہوں ۔ البتہ آپ کی خواہش کے احترام میں اپنی تصویر بھیج رہا ہوں ۔ فی الحال اپنے رسالے میں اسی کی اشاعت پر اکتفا کیجیے ۔

مخلص خلیل بےخود

(۳)

کراچی ۔ ۸ / مارچ ۱۹۹۳ء

عزیزی خلیل بےخود صاحب ۔ سلام و رحمت ۔ سرپرستی کی رقم کا ڈرافٹ ملا اور تصویر بھی ۔ دونوں کے دیدار سے آنکھیں روشن ہوئیں ۔ غلط فہمی مجھے نہیں آپ کو ہوئی ہے ۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت بےخود گڑھ مکیشتری کا فرزندِ ارجمند شاعر نہ ہو ۔ میں نے آپ کی تصویر کو بہ غور دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کے اندر ایک طرح دار شاعر موجود ہے ۔ آپ اس شاعر کو باہر نکالیے ۔ اگر کسی وجہ سے اس کے باہر نکلنے میں کچھ دیر ہے تو میں آپ کے لیے غزلوں کا انتظام کرسکتا ہوں ۔ بلکہ کرلیا ہے ۔ میرے عزیز دوست فرصت بریلوی میرے ساتھ ہی کام کرتے ہیں ۔ ان سے آپ کے لیے چند غزلیں لکھوائی ہیں جو بھیج رہا ہوں ایک ایک کر کے انھیں " غزلکار " میں شائع کرتا رہوں گا ۔ آپ اس دوران میں مقامی مشاعروں اور شعری نشستوں میں شرکت شروع کردیجیے ۔ انشاء اللہ بہت جلد آپ بہ طور شاعر مشہور ہوجائیں گے ۔ فرصت بریلوی صاحب کو غزلوں کا کچھ معاوضہ ادا کرنا ہوگا ۔ ان کے لیے آپ جو رقم بھیجیں اس کا ڈرافٹ میرے نام ہونا چاہیے ۔ میں ایک دم ساری رقم ان کے حوالے نہیں کروں گا کیوں کہ آئندہ بھی غزلیں لکھوانی ہوں گی ۔

یہ جان کر بےحد خوشی ہوئی آپ حضرت بےخود مکیشتری کے فرزندِ دل بند ہیں ۔ میں نے قیامِ پاکستان سے چند ماہ پہلے انھیں سندیلہ کے سالانہ مشاعرے میں دیکھا تھا ۔ سبحان اللہ کیا کلام تھا اور پڑھنے کا انداز بھی کیسا دل نشین تھا ۔ ان کا نورانی چہرہ اور خوب صورت آواز اب بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے وہ میرے حال پر بہت مہربان تھے ۔ اسی رشتے سے میں نے آپ کو " محترمی " کی بجائے " عزیزی " لکھا ہے ۔ انشاء اللہ آپ ہمیشہ عزیزی ہی رہیں گے ۔ اچھا اب اجازت دیجیے ۔ اس وقت زیادہ نہیں لکھا جارہا ہے کیوں کہ میرا قلم خاصا پرانا ہوگیا ہے اور لکھنے میں دقت ہوتی ہے ۔

دعاگو منا لکھنوی

(۴)

دوحہ ۔ ۲۳ / مارچ ۱۹۹۳ ء

بزرگوارِ محترم ۔ سلام مسنون ـــ آپ کا محبت نامہ ملا اور غزلیں بھی ۔ والد مرحوم سے تعلق خاطر کا آپ نے خوب خ رکھا ۔ نہایت عمدہ غزلیں ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فرصت بریلوی نے میرے ہی خیالات و جذبات کو منظوم کردیا ہے غزلیں پڑھ کر میرے اندر چھپا ہوا شاعر باہر آگیا ہے ۔ اس کی طرف سے بھی سلام قبول کیجیے ۔ حضرت فرصت بریلوی کی خدمت آداب عرض کرتا ہوں ۔ امید ہے کہ وہ آئندہ بھی میرے حال پر کرم فرماتے رہیں گے ۔ مجھ سے جو خدمت ہوسکے گی اس سے ، نہیں کروں گا ۔ منسلکہ ڈرافٹ انھیں کے حساب میں بھیج رہا ہوں ، میرے ایک دوست کے دوست یہاں سے مشاعروں کا کاربار کر ہیں ۔ ہر سال کسی شاعر کا جشن مناتے ہیں اور پاک و ہند کے بہت سے شاعروں کو بلاکر مشاعرہ بازی کرتے ہیں ۔ عنقریب مشاعرہ ہونے والا ہے ۔ کوشش کروں گا کہ اس میں غزلیں سنانے کا موقع مل جائے ۔

" خرکار " کے جس شمارے میں میری غزلیں شائع ہوں ، اس کی دس کاپیاں قیمتاً بھجوادیا کیجیے ۔ اپنا پرانا قلم پھینک دیجئے میرے ایک دوست کراچی جانے والے ہیں ان کے ہاتھ نیا قلم بھجواؤں گا ۔ کسی اور چیز کی ضرورت ہوتو بلا تکلف لکھیے ۔

نیاز مند خلیل بےخود

(۵)

کراچی ۔ ۳ / نومبر ۱۹۹۳ ء

عزیزی گرامی قدر ۔ خوش رہیے ۔ گذشتہ چند مہینوں میں آپ نے اردو دنیا میں نام پیدا کیا ہے اس پر میں جتنا فخر کروں ہے ۔ آپ کی غزلوں کی تعریف میں " خرکار " کے دفتر میں روزانہ آٹھ دس خط موصول ہوتے ہیں ۔ فرصت بریلوی نہایت توجہ آپ کے لیے فکر سخن کر رہے ہیں ۔ انھوں نے یہ معمول بنالیا ہے کہ ہفتے میں دو دن صرف آپ ہی کا کام کرتے ہیں ۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ وہاں کے مشاعروں اور شعری نشستوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے ہیں اور بہ طور آپ کو بہت مقبولیت حاصل ہو رہی ہے ۔ آپ کے اس خیال سے مجھے صد فی صد اتفاق ہے کہ آپ کا مجموعہ ء کلام اب ہوجانا چاہیے ۔ ڈاکٹر منیف ذوق کی بھی یہی رائے ہے ۔ وہ فرماتے ہیں جب تک آپ کا مجموعہ شائع نہیں ہوگا اس وقت تک ادب کو اندازہ نہیں ہوسکتا کہ آپ کس درجے کے شاعر ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ فیض کے بعد آپ ہی وہ شاعر ہیں کے ہاں عصری حسیت مروج پر نظر آتی ہے ۔ آپ کا دیوان میں مکتبہ ء خرکار سے چھاپوں گا ۔ اگر کچھ رقم پیشگی مل جائے تو کتابت شروع کرادی جائے گی ۔ انشاء اللہ دیوان کی رونمائی بڑے پیمانے پر ہوگی ۔

آپ نے رسالے کے خریدار بنانے میں خرکار نوازی کا جو ثبوت دیا ہے ، اس کا شکریہ ادا کرکے میں آپ کے خلوص آلودہ ، رسمیات نہیں کرنا چاہتا ۔ میری دعا ہے کہ خدا آپ کو ایسی نیکیوں کی مزید توفیق دے ۔ آمین ۔

دعا گو مینا لکھنوی

(۶)

ی ۔ ۲۲ / دسمبر ۱۹۹۳ء

بزرگوارِ محترم ۔۔ آپ کا ہر خط سیروں خون بڑھا دیتا ہے ۔ بےحد ممنون ہوں کہ آپ نے میرے دیوان کی اشاعت کی ے داری قبول فرمالی ہے ۔ اخراجات کی آپ بالکل پرواہ نہ کریں بس اس کا خیال رکھیں کہ گیٹ اپ ایسا ہو کہ جو بھی دیکھے متا ہی رہ جائے ۔

میری خوش قسمتی ہے کہ ڈاکٹر منیف ذوق میری شاعری کے بارے میں اتنی عمدہ رائے رکھتے ہیں ۔ مجھے فیض کے برابر جگہ ۔ ان کے صاحبِ علم و نظر ہونے کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے ۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ڈاکٹر صاحب میرے دیوان کا دیباچہ لکھ دیں ۔ ، سلسلے میں جو خدمت میرے لائق ہو تحریر فرمائیے ۔ فلیپ آپ کس سے لکھوائیں گے ؟ میری حقیر رائے یہ ہے کہ دائیں طرف فلیپ آپ خود لکھیں اور بائیں طرف کا فلیپ حضرت فرصت بریلوی سے لکھوائیں ۔ آپ دونوں بزرگ میرے دائیں بائیں ہوں ۔ تو میرے ادبی قدوقامت میں اضافہ ہوگا ۔ عقبی سرورق پر میری تصویر ہونی چاہیے اور تصویر کے نیچے میرے حسبِ حال میرا ہی ، شعر ہو ۔ شعر کا انتخاب حضرت فرصت بریلوی پر چھوڑتا ہوں کہ وہ میرے شعری مزاج کو خوب سمجھتے ہیں ۔

دیوان کے مصارفِ طباعت کا تخمینہ معلوم ہوجائے تو پوری رقم یک مشت ارسال کردوں گا ۔ فی الحال کام شروع کرنے کے ۔ کچھ رقم بھیج رہا ہوں اور ہاں دیوان کی رونمائی کس انداز سے ہوگی ؟ اس کی کچھ تفصیل لکھیے تاکہ میں اس جہت میں کوئی عملی قدم ا سکوں ۔

آپ کا خادم خلیل بےخود

(۷)

ی ۔ ۱۵ / جنوری ۱۹۹۴ء

عزیز مکرم ۔۔ دعائیں ۔ خط کا جواب لکھنے میں تاخیر ہوئی ۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں ۔ دراصل میں اس دوران میں ے ہی کے کام میں مصروف رہا ۔ دس بارہ کاتبوں سے کتابت کے نمونے حاصل کیے اور ماہرین کی ایک کمیٹی کے سامنے پیش کیے ۔ وئی نمونہ پسند نہ آیا تو طے پایا کہ آپ کا دیوان نوری نستعلیق میں کمپوز کرایا جائے ۔ کام شروع ہوگیا ہے ۔ انشاء اللہ اگلے ایک میں کمپوزنگ کا کام مکمل ہوجائے گا ۔ توقع ہے کہ مارچ کے آخر تک کتاب چھپ جائے گی ۔ اخراجات کا تخمینہ الگ کاغذ پر لکھ ہے ۔ اسے آپ ملاحظہ کرلیجیے ۔

ڈاکٹر منیف نے دیباچہ لکھ لیا ہے اور اب وہ اس پر نظرِ ثانی کررہے ہیں ۔ انھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے آپ کی ری میں ترقی پسند عناصر کی نشان دہی کی ہے ۔ میں نے سوچا ہے کہ اتنی اہم کتاب میں ایک دیباچہ کم پڑے گا ۔ کم از کم ایک اچہ اور ہونا چاہیے ۔ خوش قسمتی سے اس کا انتظام ہوگیا ہے ۔ اسلام آباد سے نظیر صدیقی نے محبوب خزاں کی شاعری پر ایک مون " خرکار " میں اشاعت کے لیے بھیجا ہے جو خزاں کی شاعری سے زیادہ آپ کی شاعری کی خصوصیات کا احاطہ کرتا ہے ۔ مون میں جہاں خزاں کا نام آیا ہے وہاں ہر جگہ میں نے آپ کا نام لکھ دیا ہے خزاں کے جو اشعار نمونتہً پیش کیے گئے تھے ان جگہ آپ کے اشعار درج کردیے ہیں ۔ نظیر صدیقی سے میرے مراسم بہت گہرے ہیں ۔ اس لیے انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا بلکہ

جب میں انھیں اس دیباچے کا معاوضہ بھیجوں گا تو وہ بہت خوش ہوں گے اور ممکن ہے کہ وہ یہ پیش کش کریں کہ انھ فیض پر جو مضمون لکھا تھا اسے بھی مناسب قطع و برید کے بعد آپ کے حسب حال بنالیا جائے ۔

دیوان کی رونمائی بڑے پیمانے پر ہوگی ۔ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں پہلے جلسہ ہوگا اور پھر عشائیہ ۔ آج کل لوگ تقریبات میں عشائیے ہی کی وجہ سے شرکت ہوتے ہیں ۔ اس کا تخمینہ بھیج رہا ہوں ۔

اگلے سال " فرکار " کی اشاعت کے پچاس سال پورے ہوجائیں گے ۔ اس لیے اس کی گولڈن جوبلی منانے کا پروگ جائے ۔ آپ کے دیوان کی رونمائی کے موقع پر ایک بروشیر شائع کیا جائے گا جس میں صنعتی و تجارتی اداروں اور بنک اشتہارات ہوں گے ۔ اشتہارات کی ساری آمدنی آپ کی طرف سے گولڈن جوبلی فنڈ میں بہ طورِ عطیہ دے دی جائے گی ۔ ملک کے ادبی حلقوں میں آپ کی عزت اور وقار میں اضافہ ہوگا ۔ یہاں کے اداروں کے اشتہار تو میں حاصل کرلوں گا ۔ البتہ ریاستوں سے اشتہارات آپ ہی کو حاصل کرنے ہوں گے وہاں کے کئی ادارے یہاں کے اخباروں میں اشتہارات شائع کرا اگر ایسے آٹھ دس اداروں کے اشتہار بھی مل جائیں تو گولڈن جوبلی شان دار پیمانے پر منائی جاسکتی ہے ۔

ظاہر ہے کہ دیوان کی رونمائی میں آپ کی شرکت لازمی ہوگی ۔ آپ یہاں تشریف لائیں گے تو آپ کے اعزاز میں بھی ہوں گی ۔ ان دعوتوں کے اخراجات تخمینے میں شامل نہیں کیے گئے یہ بات اس لیے آپ کے کان میں ڈال دی اخراجات کی یہ مد بھی آپ کے پیشِ نظر رہے ۔

دعا گو مینا لکھنوی

○●○

(باقی ص ۴۵ سے)

" انجم صاحب کا خیال ہے (کوئے ملامت کے شاعر) کہ ناصر کاظمی زندہ رہتا تو بڑا شاعر بنتا ۔ فیض کے بڑا شاعر بننے کی بتائی ہے کہ اس کے پاس اپنا لہو بہت تھوڑا ہے ۔ ان دونوں آراء پر غور کیا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ناصر کاظمی اس لیے بڑا بن سکا کہ وہ وقت سے پہلے مرگیا اور فیض اس لیے بڑا شاعر نہیں کہ وہ بعد بعد ازوقت بھی زندہ رہا ۔ گویا زندگی اور موت تو ا ہاتھ میں ہے لیکن کسی کا بڑا شاعر بننا انجم صاحب کی صواب دید پر منحصر ہے " ۔ ۔ ۔ خاکسار کو انجم صاحب کا یہ انٹرویو (بہ بہت پسند آیا اور خوشی اس بات کی ہوئی کہ وہاں بھی انٹرویو بے ساختہ ہی نہیں بے محابا دیے جاتے ہیں ۔

" خامہ بگوش " کو روا روی میں نہیں پڑھا جاسکتا ۔ موصوف فرصت سے اور دل جمعی کے ساتھ پڑھے جانے کے لائق شخص فرصت آپ کو پیدا کرنی ہوگی دل جمعی خود بہ خود پیدا ہوجائے گی ابتدا کی دو سطریں ہی کافی ہوں گی اس کے بعد آپ کچے دھاگ بندھے چلے جائیں گے ۔ آخر تک اور افسوس کریں گے کہ مضمون اتنی جلدی ختم ہوگیا ۔ ان کی تحریر سے پیاس بجھتی نہیں بڑھتی ہے کراچی میں مشفق خواجہ اور مشتاق احمد یوسفی کی موجودگی میں اور کسی دو آتشہ کی ضرورت نہیں ۔ ہوا خود کہتی ہے باد نوشِ بادہ پیمائی ۔

یہ نہ تبصرہ ہے نہ تاثر ۔ صرف یاد ہے جس میں فریاد کا عنصر غالب ہے وہ اس طرح کہ

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی   اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

مضطر مجاز

غالب کی چند غزلوں کے منظوم تراجم

گر نہ نوابا سرودے چہ غم استی
من کہ نیم گر نبودے چہ غم استی

نہیں ہوتا نوا کا مجھ کو سودا تو برا کیا تھا
یہ میں ناچیز پیدا ہی نہ ہوتا تو برا کیا تھا

زنگ زدودن نبرد زآئینہ ، کلفت
گر ہمہ صورت زدودے چہ غم استی

کھرچنا زنگ کا آئینہ ، کلفت سے لاحاصل
میں آئینے سے صورت ہی کھرچتا تو برا کیا ہے

بختِ خود اربودے کہ تابہ قیامت
بے خبر از خود غنودے چہ غم استی

اگر میرا مقدر اس طرح ہی تاقیامت ہے
تو میں بھی بےخبر مخمور رہتا تو برا کیا تھا

نے بہ سخن مزد " نے ستائش " اگر من
کشتِ کدیور درودے چہ غم استی

صلہ کوئی سخن کا ہے نہ توفیقِ ستائش ہے
میں دہقاں کی طرح ہل ہی چلاتا تو برا کیا ہے

نیست مشامِ شمیم جوئے ، اگر من
غالیہ چندیں نہ سودے چہ غم استی

مشام افسوس جویائے شمیمِ گل نہیں ، مجھ کو
یہ شوقِ عنبر افشانی نہ ہوتا تو برا کیا تھا

چوں درِ دعویٰ تواں بہ لغو کشودن
من بہ ہنر گر کشودے چہ غم استی

اگر یاں لغو گوئی ہی سے کھلتا ہے درِ دعویٰ
ہنر سے اپنے میں نے اس کو کھولا تو برا کیا تھا

چوں دلِ یاراں تواں بہ ہزل ربودن
من بہ سخن گر ربودمے چہ غم استی

گر بہ مثلِ لال گشتمے کہ سخن ہا
گفتمے و خود شنودمے چہ غم استی

قافیہ غالب چو نیست پرس زعرفی
گرمن فرہنگ بودمے چہ غم استی

○●○

ہزل گوئی سے یاروں کا بہلتا ہے اگر دل تو
میں اس ذوقِ سخن سے ہاتھ اٹھاتا تو برا کیا تھا

اگر گونگے کی صورت مجھ کو مرنا تھا تو ہوکر مست
سخن پر اپنے ، اپنا سر میں دھنتا تو برا کیا تھا

نہیں ہے قافیہ غالب کوئی تو پوچھ عرفی سے
اسے ، میں بھی کوئی فرہنگ ہوتا تو برا کیا تھا

○●○

○

در پردہ شکایت زتو داریم و بیاں ہیچ
زخمِ دلِ ما جملہ دہان است و زباں ہیچ

اے حسن ! گراز راست نہ رنجی ، سخنے ہست
ناز ایں ہمہ ! یعنی چہ کمر ہیچ و دہاں ہیچ

ہر گریہ بیفزود زدل ، ہرچہ فرو ریخت
در عشق بود تفرقہ ، سود و زیاں ہیچ

تن پروریِ خلق فزوں شد زِ ریاضت
جز گرمیِ افطار نہ دارد رمضاں ہیچ

دنیا طلباں ! حریدہ مفت است ، بجو شید
آزادیِ ما ہیچ و گرفتاری تاں ہیچ

○

در پردہ گلہ تجھ سے ہے مجھ کو ، یہ بیاں ہیچ
دل کا مرے ہر زخم دہاں ہے ، یہ زباں ہیچ

اے حسن ! خفا سچ سے نہ ہوتو ، تو کہوں گا
کس بات پہ نازاں ہے ، کمر ہیچ ، دہاں ہیچ

جو دل نے گنوایا وہ مرے اشک نے پایا
ہے عشق میں یہ تفرقہ ، سود و زیاں ہیچ

تن پروریِ خلق ریاضت سے فزوں ہے
سرگرمیِ افطار ہے ، ورنہ رمضاں ہیچ

دنیا طلبو ، مفت کی ہے جنگ ، لڑے جاؤ
ہو قید کہ آزادی سبھی کچھ ہے یہاں ہیچ

پیمانہ ، رنگیست دریں بزم بہ گردش
ہستی ہمہ طوفانِ بہار است و خزاں ہیچ

عالم ہمہ مرآتِ وجود است عدم چیست
تا کار کند چشم محیطست و گراں ہیچ

درپردہ ، رسوائیِ منصور نوائیست
رازت نشنودیم ازیں خلوتیاں ہیچ

غالب زگرفتاریِ اوہام بروں آی
باللہ جہاں ہیچ و بدونیکِ جہاں ہیچ

○●○

اس بزم میں گردش میں ہے پیمانہ ، رنگیں
ہستی ہمہ طوفانِ بہار اور خزاں ہیچ

عالم ہے یہ مرآتِ وجود اور عدم کیا
ہر شے ہے محیط ، آنکھ کھلی ہو تو ؟ گراں ہیچ

ہے پردہ ، رسوائیِ منصور میں اک راز
وہ رازِ نہاں تیرا ، نہیں ہوتا عیاں ہیچ

باہر نکل آقید سے اوہام کی غالب
واللہ جہاں ہیچ و بدونیکِ جہاں ہیچ

○●○

○

چوں زبان با قفل و جاں با پر ز غوغا کردہ ای
بایدت از خویش پرسید آں چہ با ما کردہ ای

گر نہ ای مشتاقِ عرضِ دست گاہِ حسنِ خویش
جاں فدایت دیدہ را بہر چہ بینا کردہ ای

ہفت دوزخ در نہادِ شرم ساری مضمر است
انتقام است ایں کہ با مجرم مدارا کردہ ای

صد کشاد آں را کہ ہم امروز رخ بنمودہ ای
مژدہ باد آں را کہ محوِ ذوقِ فردا کردہ ای

○

گنگ کر ڈالی زباں ، جاں میں بپا غوغا کیا
پوچھ اپنے آپ سے یہ تونے مجھ سے کیا کیا

گر نہیں مشتاق اپنی جلوہ سامانی کا تو
جاں ترے صدقے ! پھر ان آنکھوں کو کیوں بینا کیا

سات دوزخ ہیں نہادِ شرم ساری میں نہاں
کر کے خاطر بدلہ مجرم سے لیا ، اچھا کیا

آج جن کو اپنی چھب دکھلائی بھاگ ان کے کھلے
مژدہ ان کو ، جن کو محوِ جلوہ ، فردا کیا

خوب رویاں چوں مذاقِ خستے ترکاں داشتند
آفرینش را برایشاں خوانِ یغما کردہ ای

خستگاں را دل بہ پرسش ہائے پنہاں بردہ ای
با درستاں گرنوازش ہائے پیدا کردہ ای

ذرہ ای را • روشناسِ صدبیاباں گفتہ ای
قطرہ ای را • آشنائے ہفت دریا کردہ ای

دجلہ می جو شد ہماناں • دیدہ ہاجویائے تست
شعلہ می بالد مگر در سینہ ہا جاکردہ ای

جلوہ و نظارہ پنداری کہ ازیک گوہر است
خویش را در پردہ ۔ خلقے تماشا کردہ ای

چارہ درسنگ وگیاہ و رنج با جاں دار بود
پیش ازاں کایں در رسد آں را مہیا کردہ ای

دیدہ می گرید • زباں نالد و دل می تپد
عقدہ از کارِ غالب سر بہ سر وا کردہ ای

○●○

خوب رویوں کو عطا کی خوئے ترکانہ جہاں
خوانِ یغما بھی پھر ان کے واسطے پیدا کیا

دل • تھکے ہاروں کا • پرسش ہائے پنہاں سے لیا
در • بھلے چنگوں پہ وا لطف و نوازش کا کیا

روشناسِ صد بیاباں کردیا اک ذرے کو
آشنائے ہفت دریا تونے اک قطرہ کیا

دجلہ جیسے جوش میں آنکھوں کو تیری جستجو
شعلہ اٹھے جیسے یوں • سینے میں ہنگامہ کیا

جلوہ و نظارہ گویا ایک ہی جوہر سے ہیں
خلق کے پردے میں خود اپنا ہی نظارہ کیا

چارہ ۔ سنگ وگیاہ و رنج جاں داروں میں تھا
اس سے پہلے یہ جنم لیں • تونے وہ پیدا کیا

آنکھ گریاں ہے • زباں نالاں ہے • دل ہے مضطرب
کارِ غالب کا تو اک اک عقدہ تونے وا کیا

○●○

مصحف اقبال توصیفی

☆

نعت

نقشِ پائے رسول آنکھوں میں
پھول سینے میں ۔ پھول آنکھوں میں

جیسے خوش بو کلی کے تکیے میں
یوں ہے نامِ رسول آنکھوں میں

ان کی الفت کا داغ سینے میں
باغِ عالم کے پھول آنکھوں میں

ان کے دامن کو تھام کر رولوں
اگ رہی ہے ببول آنکھوں میں

عمر بڑھ جائے گی اسیروں کی
شوق کھینچے گا طول آنکھوں میں

آسماں پر دماغ مصحف کا
پائے اقدس کی دھول آنکھوں میں

○●○

مصحف اقبال توصیفی

○

آسمانوں میں سدا گھوما کریں
اک ستارہ دور سے دیکھا کریں

لاکھ رنگیں ہوں کھلونے ہی تو ہیں
دیکھیے لفظوں سے کم کھیلا کریں

بےوفا ہے وہ تو اس در پر نہ جائیں
آپ ادھر آئیں ۔ یہاں بیٹھا کریں

ہم نے پوچھا ان دکھوں کا کیا علاج
ہنس کے بولے ۔ خواب کم دیکھا کریں

دوش پر سر ۔ پاؤں کے نیچے زمیں
آئینے کو طاق پر رکھا کریں

ہاں وہ پتھر ہی سہی ۔ تم کون ہو ؟
ہم جسے چاہیں ـــ جسے سجدہ کریں

یاد بولی تم کہو تو رات کو
پائنتی ہم آ کے سوجایا کریں

مصحف اس کا دل دکھاکر کیا ملا
آپ سچ بولیں ـــ مگر سوچا کریں ـــ

○●○

مصطفیٰ شہاب

○

چھو کے گزرا مجھے زمانہ سا
پیرہن ہوگیا پرانا سا

بوند ، اتری کوئی کہ سیپی میں
کھل گیا اک کارخانہ سا

اک پرانا سا ربط ہے اس سے
اک تعلق ہے غائبانہ سا

اس شکستہ فصیل کے اندر
ایک در بھی ہے بے ٹھکانہ سا

اب بھی اس کی گلی میں مڑتا ہے
دل میں رستہ جو ہے پرانا سا

بار ہے دل پہ خامشی گھر کی
دور اک شور ہے سہانا سا

○○○

○

دکھ زمیں کا ہو بیاں جیسے کسی طائر کنے
دردِ دل ہم نے سنایا قلب کے ماہر کنے

ہم نے دیکھا اس کی دنیا بھی الگ ، دیں بھی الگ
مفت میں دکھڑوں کو رونے بیٹھ کے صابر کنے

ہم فریبِ سحر سے آزاد ہوتے کس طرح
جب کہ لطفِ خاص کا اک دم بھی تھا ساحر کنے

آسماں سے جو برستا ہے وہ زہر آشام ہے
سچا پانی بک رہا ہے شہر میں تاجر کنے

اک حقیقت کو کئی میزان میں تولا شہاب
میں بھی شاید ایک کافر ہوں کسی کافر کنے

○○○

شاداب رضی

○

آپ نے سب کو ایک طرف سے اپنے غضب میں رکھا
ہم نے بڑی مشکل سے خود کو حدِ ادب میں رکھا

خواب جگاتی اس دنیا میں یاد رہا کب کس کو
کیا ٹپکایا پلکوں سے کیا خشکیِ لب میں رکھا

فیاضی کا ایک انوکھا ڈھنگ اس نے اپنایا
کوہِ ندا میں چھپ کے سب کو دشتِ طلب میں رکھا

چاند بنانے والے میری یہ گتھی سلجھا دے
چاند بنایا ہے اس کو تو کیوں عقرب میں رکھا

گہرا گہرا رنگ وہی ہے تیرہ شبی کا اب تک
ہم نے اگرچہ اک جگنو بھی خیمہ ، شب میں رکھا

بھیڑ میں گم ہونے کا اکثر اندیشہ رہتا ہے
دل کی ایک انجمن کیوں اس کو وہمِ عجب میں رکھا

تم شاداب ! نرے شاعر ہو خود کو منوانے کو
تھوڑا ہنر بھی یاروں نے اپنے منصب میں رکھا

○●○

م۔ اخلاق

○

کیا جلتے کیوں چھوڑ کے صحرا نہیں آ
دل پیاسا تو تھا جانبِ دریا نہیں آ

اب تک ترا غم باعثِ راحت نہیں مجھ ک
اب تک مجھے جینے کا سلیقہ نہیں آ

ہر حال میں مجھ پر تھا وہی کرب کا عا
دنیا کو نظر کیوں مرا چہرہ نہیں آ

دنیا کے یہ الطاف میں اس سوچ میں گم ہو
کیا آیا ہے حصے میں مرے کیا نہیں آ

چہرے کا ترے رنگ بدن کی ترے خوش ب
حصے میں گل و لالہ کے کیا کیا نہیں آ

سانسوں میں مری کب تری خوش بو نہ سما
آنکھوں میں مری کب ترا چہرہ نہیں آ

اخلاق کہے کیا کہ کبھی اس کی سمجھ م
خود اپنی ہی تقدیر کا عقدہ نہیں آ

○●○

جمال اویسی

○

زندگی دور تک ایسی جائے
جیسے آئینہ دکھاتی جائے

شاعرو ! تم تو نظریہ داں ہو
کس طرح تم کو نظر دی جائے

زندہ رہنے کے لیے دل بدلیں
ہو یہ بیمار دوا دی جائے

امتیاز اپنا ہے انساں ہونا
یہ بڑی بات نہ بھولی جائے

بھول کر ساری حکایاتِ قدیم
اک نئی داستاں لکھی جائے

جینے کے واسطے پیدا ہو غرور
ورنہ یہ رسم اٹھادی جائے

○●○

○

دور تک آنکھ بچھائی میں نے
کوئی منزل نہیں پائی میں نے

راہ ہی راہ تھی تاحدِ نظر
بیٹھ کر عمر بتائی میں نے

خواب ہی خواب ہیں آنکھوں میں نہاں
ان کی تعبیر نہ پائی میں نے

دیکھتے دیکھتے جب اوب گیا
آنکھ روزن سے ہٹائی میں نے

کوئی محرم نہ مسیحا ہے ترا
دل کو یہ بات بتائی میں نے

○●○

○

زندگی سے مرا رشتہ کیا ہے
آرزو مرچکی جینا کیا ہے

دیکھتا رہتا ہوں دیکھا بھالا
فلک و ارض میں رکھا کیا ہے

موت سے پہلے مجھے مرنے دے
جی لیا ۔ جی کے بھی کرنا کیا ہے

کون سنتا ہے یہاں کڑوا سچ
شعر کہنے سے بھی ہوتا کیا ہے

جب نظر سوئے فلک جاتی ہے
سوچتا ہوں کہ کرشمہ کیا ہے

کون دیتا ہے مجھے آوازیں
دل میں رہ رہ کے ہمکتا کیا ہے

○●○

مسعود صدیقی مسعود

○

نگاہِ ناز میں نیرنگِ مرگِ ناگہانی ہے
لبِ اعجاز میں پنہاں حیاتِ جاودانی ہے

نہ تیرا کوئی ہم سر ہے نہ تیرا کوئی ثانی ہے
مری آنکھوں نے بھی سارے جہاں کی خاک چھانی ہے

محبت میں مرا سارا زمانہ ہوگیا دشمن
مجھے دنیا سے اور دنیا کو مجھ سے بدگمانی ہے

زمیں کے ذرے ذرے کی چمک سے خیرہ ہیں آنکھیں
یہ کس کی جلوہ ریزی ہے یہ کس کی ضوفشانی ہے

حصولِ مدعائے زندگی ہے تجھ پہ مر مٹنا
محبت میں فنا ہونا حیاتِ جاودانی ہے

وہ شاید پھر کوئی تازہ قیامت ڈھانے والے ہیں
کہ مجھ پر بے سبب پھر آج ان کی مہربانی ہے

گلوں کی چاک دامانی ۔ عنادل کی غزل خوانی
گلستاں میں مرے جذباتِ دل کی ترجمانی ہے

○●○

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید

○

زندگی مایا جال ہے اے دوست
دنیا داری وبال ہے اے دوست
آہیں بھرتے تھے تم کسی کے لیے
اب وہ پہلا سا حال ہے اے دوست ؟
چار سو پہرے توپیں سنگینیں
تم سے ملنا محال ہے اے دوست !
دوست سے دوست کو جدا کرنا
دشمنوں کی یہ چال ہے اے دوست
آفتِ جاں ، بھیانک ایجادیں
آدمی کا زوال ہے اے دوست !
شہرِ آلودہ کی گھٹن ، توبہ
سانس لینا کمال ہے اے دوست !
خواب میں آئے بعد مدت کے
کیا یہ فرخندہ فال ہے اے دوست ؟
میری نظروں میں کربلا کی زمیں
آج تک لال لال ہے اے دوست !
تیرے بن چاندنی میں کچھ بھی نہیں
تیرے بن دل نڈھال ہے اے دوست !
یادِ ماضی کبھی ستاتی ہے ؟
طاہرہ کا سوال ہے اے دوست !

○○○

مغل فاروق پرواز

○

زندگی تجھ سے تو اپنا رابطہ ایسا نہ تھا
میں کبھی اک موڑ پر تا دیر یوں ٹھہرا نہ تھا

دیکھتے ہی دیکھتے ہالہ بنا اک نور کا
پھر وہ سب کچھ ہوگیا جس کو ابھی ہونا نہ تھا

یا تو وہ ساعت بہ ساعت خیر کا ہوتا گیا
یا تو میں نے ہی اسے جی جان سے چاہا نہ تھا

یا تو میری آنکھ کا مرکز تھی کوئی اور شئے
یا تو میں نے جان کر ہی اس طرف دیکھا نہ تھا

یا حدودِ وقت سے گزرے زمانہ ہوگیا
یا مکانِ خواب کا مجھ پر کوئی در وا نہ تھا

جس کے ہونے سے مری رگ رگ میں روشن تھے دیئے
اس کا ہونا ، اب یہ لگتا ہے ، بہت اچھا نہ تھا

○○○

ڈاکٹر شہپر رسول

○

واقعوں کو "بھول دامن" سے ہوا کرتے رہے
داستاں بننے کی سب رسمیں ادا کرتے رہے

وہ کہ جو درخواست لکھنے تک پہ بھی مائل نہ تھے
جانے کن مجبوریوں میں التجا کرتے رہے

لوٹ کر روندے ہوئے رستے نہیں آنا ہمیں
ہر روایت کو ہم اپنی خود فنا کرتے رہے

ہم نئی انجان خوش بو کے سفر پر تھے تو کیا
لوگ خود کو حامیِ دستِ صبا کرتے رہے

موسموں کے کچھ اشارے تھے تمہارے نام بھی
تم مگر اپنے فرائض ہی ادا کرتے رہے

آج کی تبدیلیوں سے بدگماں ہیں سب کے سب
عمر بھر شہپرؔ یہ ناقد جانے کیا کرتے رہے

○●○

زبیر شفائی

○

کیسے کیسے ان دیکھے منظر گم اپنی ذات میں ہیں
یہاں تو سارے روشن سیارے ذروں کے ہات میں ہیں

خوش بو ، قوسِ قزح ، موسیقی ، چاند ، شفق ، آئینہ ، شراب
اس کا بدن کچھ اور ہی شئے ہے یہ سب مشمولات میں ہیں

رنگوں کی رو گردش میں ہے پانی سے انگارے تک
لیکن وہ تصویریں جو نازک دل کے جذبات میں ہیں

دریا ، صحرا ، جنگل ، بستی ، دھند ، اجالا ، کانٹے ، پھول
سب آگے آگے ہیں لیکن ہم پیچھے کس بات میں ہیں

آئینے پر ہاتھ اٹھانا پرچھائیں سے لڑجانا
یہ اور ایسی کتنی ہی باتیں سب اس کی عادات میں ہیں

ایک ان جانا خوف برابر میرے تعاقب میں ہے زبیرؔ
شعلے جیسی دو سرخ آنکھیں پل پل میری گھات میں ہیں

○●○

عبدالرحیم نشتر

○

نیند آنکھوں سے چراتی ہے ۔ گزر جاتی ہے
رات آتی ہے تو بےخواب ہی کر جاتی ہے

پتی پتی پہ چمک اٹھتے ہیں آنسو میرے
آپ کی یاد بھی شبنم سی نکھر جاتی ہے

لوٹ آتا ہوں تھکے ہارے پرندے کی طرح
شفقِ شام ہر اک سمت بکھر جاتی ہے

شام کے وقت درختوں سے نہ مل کے رونا
سارے جنگل میں ہواؤں سے خبر جاتی ہے

دیکھتا ہوں میں اسے رودِ افق میں ہر روز
ایک دوشیزہ ۔ ستاروں سے ادھر جاتی ہے

زندگی شمع کی مانند ہوئی تیرے بغیر
جل گئی ۔ شعلہ بہ لب ۔ خاک بسر جاتی ہے

ہجر کی شاخ پہ کھلتے ہیں اگر درد کے پھول
ایک خوش بو سی فضاؤں میں بکھر جاتی ہے

کون ہے دھیان کے زینوں پہ یہ آہستہ قدم
جو کرن بن کے مرے دل میں اتر جاتی ہے

○●○

عبدالرحیم نشتر

○

اپنے سینوں پہ لیجے وار کھلا
چلیے میدانِ کارزار کھلا

کوئی اندر بلا رہا ہے مجھے
بند دروازہ بار بار کھلا

کم سے کم جاں سے ہی گزر جاؤں
کچھ تو حاصل ہو اختیار کھلا

کس طرح اس کا روپ پہچانوں
غیر ۔ مخفی ہے اور یار کھلا

چشم و دل فرشِ راہ کرتا ہوں
اب کہیں جا کے اعتبار کھلا

○●○

کاوش عباسی

ستم بھی سنے

ستم بولتا ہے
ستم ہر طرف گونجتا ہے
روزِ ستم مرگیا ہے
(مگر کیا کبھی زندہ بھی تھا؟)
روزِ ستم منجمد خطروں کا جہاں بن گیا ہے
ستم کے لیے بازگشتوں کا کوہِ گراں بن گیا ہے

لیکن کہیں منجمد خطروں کے پہاڑوں کے نیچے
میدانوں کی مٹی میں گم
دریاؤں کے پانیوں میں رواں ڈولتی تیرتی
سڑکوں پہ، بازاروں میں لڑکھاتی، لٹرتی ہوئی
ایک اور آواز بھی ہے
جس کو ستم بھی سنے
(اور روزِ ستم بھی اگر جی اٹھے تو سنے)

یہ آواز
جب اپنی کایا پلٹ میں نیا روپ دھارے گی
آتش بہ جاں ہوگی، ویکار ویکار ہر سو پکارے گی
برفاب و جامد پہاڑوں کو دھن دے گی
دھرتی اکھاڑے گی
زندگی کا لہو پینے والے ستم کا ہر اک نقش بکھرائے گی
زندگی
زندگی کی حکومت کو بحال کرے گی
یہ آواز میں ہوں!
یہ آواز میں ہوں! ○○○

سلاخیں

ہمیں آگیا ہے
تمھیں دیکھنے کی بہ جائے تمھیں اپنی یادوں میں رکھنا
تمھاری فضاؤں میں رہنے
تمھاری ہواؤں کا رس جسم میں گھولنے کی بہ جائے
تمھاری جھلستی کسک تپتی جاں، جلتی آنکھوں میں رکھنا
ہر اک پل تمھارے ملن کے تصور میں رہنا
مگر ملنے کا کچھ نہ سامان کرنا

ہماری سدا ہجر میں روتی راتیں
اجنبی بعد اور جبر کی کوفت میں جاگتی ان کہی اور جھلائی صبحیں
جدائی کے زخموں کو چاٹتی، درد میں لوٹتی، بین کرتی سہ پہریں
خالی ویران شاموں کے سینے میں گڑتی سلاخیں
کہ جیسے ہوں ہم جھیلتے، ہم پہ واجب کئی پیڑھیوں کی سزائیں

یہ سارے عذاب اور
اک ان سنے زاویے میں بڑھی
کچھ مراد اور کچھ نامرادی کی محتاج اور لجلجی زندگی

یار کی باہیں، رخسار اور بارشِ وصل
دھرتی کی صاف اور اصیل اور کھلی
اور کھری اور گھمسان کی زندگی تو کسی نیند کا خواب لگتا ہے؟
○○○

مظہر مہدی

آخری نظم

تم اگر کہتی ہو
آج شام نہیں جاؤں گا
تمہاری خواہش ہے ۔ ہم باتیں کریں گے
کسی اچھے ہوٹل جائیں گے

○

میری لڑکی نے امتحان میں
اول درجے کامیابی حاصل کی
اور اس بہانے
اس کا محبوب بھی موجود ہے

○

نہیں ایسا نہیں ہوسکتا
ادب میں کوئی صنف جامد نہیں
ادب ارتقا کا نام ہے

○

نہیں ایسا نہیں ہوسکتا
تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتیں

○

میری ناسازی
دیوار کی مانند گھیرے جارہی ہے
پنکھا ہوا کا جھول رہا ہے
گلاس میرا ہم پیالہ ہے

○

تنہائی کی دیوی سے
باتیں کرتے کرتے تھک گیا ہوں
نیند بھی بے رخی برتی ہے
کچھ لوگ آجائیں تو
بول سکتا ہوں

○

ہر چیز اجنبی بنتی جارہی ہے
دیواریں ڈھل ڈھل
ڈھلتی جارہی ہیں
میں خود کو آسمانوں میں
محسوس کررہا ہوں

○○○

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید

سانٹ

(شکتی)

o

وقت کے زخم گرچہ گہرے ہیں !
کسی مرہم کا احتیاج نہیں
ناامیدی کا مجھ پہ راج نہیں
خواب اب بھی میرے سنہرے ہیں !
تیر کھا کھا کے مسکرانا پڑا
غمِ دوراں مجھے ہرا نہ سکا
تند طوفان بھی ڈرا نہ سکا
تلخ یادوں سے بھی نبھانا پڑا
زندگی کیا تھی ایک نوکِ سناں
لب پہ لیکن کبھی نہ آئی فغاں
جو بھی بپتا پڑی ہوئی آساں
کشتی گرداب میں رہی ہے رواں
مجھ میں شکتی ہے دیوتاؤں کی
میری فطرت ہے سورماؤں کی

ooo

وقار خلیل

تین یخ بستہ نظمیں

o

عافیت کوش لمحات زیر و زبر
پھر وہی کھیل دہرا رہے ہیں سبھی
خوف و دہشت کی بازی گری
یہ جو موسم نیا بن رہا ہے
اس کو کیا نام دیں !

o

ہر طرف جزر و مد ۰ انتشار
رہ گزر بے یقینی کی کالی لکیر
منزلیں دھند میں جیسے لپٹی ہوئیں
چلنے والوں کو کچھ بھی پتا ہی نہیں
کس طرف جا رہے ہیں ! !

o

چلتے چلتے قدم رک گئے ہیں
حوصلے برف سے بن گئے ہیں
زندگی کی حرارت نہ جوشِ جنوں
جلتے ، جگمگاتے ہوئے قافلے
حیف ! منظر کے بت بن گئے ہیں

ooo

غلام جیلانی

فریب زار

(ناول : قسط : ۱)

[غلام جیلانی صاحب کا یہ دلچسپ اور منفرد انداز کا ناول ہم قسط وار شائع کررہے ہیں ۔
مکمل ہونے پر اسے کتاب کی صورت دی جائے گی ۔]

دھیرج گھوش نے کارنس پر رکھے آئس کیف سے برف کا ایک کیوب شراب کے گلاس میں ڈالا اور پلٹ کر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا ۔ ۔ ۔ " میں پھر کہتا ہوں ۔ آرٹ از اے وے آف لائف ۔ جینے کی ادا کا نام ہے آرٹ ۔ وہ ہمارے دل اور دماغ پر ایک فضا قائم کردیتا ہے ۔ یہ فضا کبھی ایک راز بن کر ذہن کو بےچین کردیتی ہے اور کبھی بادلوں کی اوٹ سے سورج کی طرف نکل کر اجالا بکھیر دیتی ہے ۔ ۔ ۔ "

" بیوٹی فل مسٹر گھوش ! " میورل آرٹسٹ ناگ راج بول پڑا ۔ " آپ جتنے اچھے ناولسٹ ہیں ، اتنے ہی اچھے اسپیکر بھی ہیں ۔ "

دھیرج گھوش نے اپنی گدے دار کرسی پر واپس آتے ہوئے " تھینک یو " کہا ۔ منوج نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور آہستہ سے بولا ۔ ۔ ۔ " مسٹر گھوش ، ابھی آپ نے جو کچھ کہا ، وہ شاید میں نے کہیں پڑھا تھا ۔ "

" اس وقت تو میں نے کہا ہے ۔ " گھوش نے منوج کی طرف دیکھے بغیر کہا ۔

آٹھ دس لوگوں کی اس محفل میں منی راج نے اس دن جن لوگوں کو مدعو کیا تھا ، ان میں سب ہی کا شمار کبھی نہ کسی عنوان سے تخلیقی فن کاروں میں ہوتا تھا ۔ رات کا کھانا ختم کرکے سب لوگ منی راج کے شان دار فرنیچر سے سجے ڈرائنگ روم میں آبیٹھے تھے ۔ فروری کے گلابی جاڑوں میں کمرے کے اندر گردانی ہوئی خوش گوار گرمی نے فضا کو دل آویز بنادیا تھا ۔ بوتلوں کے کاگ اچھلے دیر ہوچکی تھی اور اب ڈنر کے بعد گلاسوں میں شراب انڈیلنے کی آوازیں نہیں آرہی تھیں ۔

منی راج ان لوگوں میں تھا جو خود تو آرٹسٹ یا شاعر نہیں ہوتے ، مگر انٹلکچوئلس کے ساتھ اپنی رفاقت کی تشہیر میں فخر محسوس کرتے ہیں اور اس کے لیے اپنا وقت اور دولت بڑی فراخ دلی سے خرچ کرتے ہیں ۔

اندرانی گھوش کی فرمائش پر آرتی دیوی نے اپنی نظم سنائی ۔ نظم ہمیشہ کی طرح معمولی تھی ۔ شراب میں بھیگے ہوئے ماحول میں اسے زیادہ تعریف نہ مل سکی ۔ نظم کے دوران اندرانی گھوش نے دو ایک بار منوج کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ اس سے نظم کے بارے میں کوئی ریمارک سننا چاہتی ہو ۔ منوج کا شمار ان دنوں ملک کے چوٹی کے آرٹ کریٹکس میں ہوتا تھا اور ایک دفعہ اس نے آرتی کی ایک نظم سن کر کہا تھا ۔

" آرتی جی ، آپ جتنی محنت اور لگن سے اپنی سجاوٹ کرتی ہیں ، اتنی ہی اپنی نظم کو سنوارنے میں کرتیں تو یہ کتنی دل نشین

ہوجاتی!"

مگر اس دن منوج چپ بیٹھا رہا۔ نظم ختم ہوتی تو گلاس سے ایک سپ لے کر اندرانی کے شوہر دھیرج گھوش سے آرٹ کے کسی مسئلے پر کوئی سوال کر بیٹھا۔ دھیرج گھوش نے جواب میں کوئی اور سوال اٹھا دیا اور پھر دیر تک بحث ہوتی رہی جس میں رما دیوی کے سوا وہاں موجود سب ہی نے حصہ لیا۔

خوب رو نوجوان روپیش، جو اسٹیج ایکٹر تھا اور اب ٹی۔وی سیریلس میں آرہا تھا، کہنے لگا... "میں مسٹر منی راج کی بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ہر تخلیق فنکار کے ذہن میں تحرک پیدا کرے، جس سے وہ لطف اندوز ہو؟ اور پھر وہ فنکار اس تحرک کو دوسروں تک پہنچائے؟... کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی تخلیق نے راست عام آدمی کے دل و دماغ میں ہل چل مچادی، جب کہ ہمارا فنکار ذہن کے آگے ہمیلس بنا بیٹھا رہا..."

آرتی نے خوش ہوکر جوشیلے انداز میں منوج کی طرف یوں دیکھا جیسے یہ بات روپیش نے نہیں خود اس نے کی ہے... "مسٹر منوج۔ آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں؟... آپ تو اپنے ریویوز میں روایتی پیمانوں کا دامن کبھی چھوڑتے ہی نہیں..."

منوج نے بہت ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا... "یہ ماڈرنٹی آپ کا اوبسیشن بنتی جارہی ہے، آرتی جی۔"

"آئی آبجکٹ منوج صاحب" آرتی کی آواز تلوار کی دھار تک رہی تھی... "آج کی دنیا میں تو کل کی بات پرانی ہوجاتی ہے۔ کیا ماڈرنیٹی کا ساتھ دینا اوبسیشن ہے؟... رما جی کی ہی مثال لیجیے۔ تین چار سال سے انھوں نے کچھ نہیں لکھا۔ اس سے پہلے ان کے لکھے ہوئے ناولز اور ان کے پروڈکشنز کی آپ اتنی تعریف کیا کرتے تھے۔ کیا وہ باتیں آج بھی کسوٹی پر پوری اتریں گی؟"

سب لوگ چپ ہوگئے۔ رما دیوی منوج کے پاس شروع سے چپ بیٹھی تھی۔ وہ اسی طرح خاموش بیٹھی رہی جیسے آرتی کی بات کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ دھیرج گھوش نے اس بوجھل خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا... "مسز رما آنند نے چار سال پہلے جو کچھ لکھا، وہ اس وقت کے لیے ماڈرن تھا۔ اگر آج وہ کچھ لکھیں گی تو وہ اس وقت کے لیے ماڈرن ہوگا۔"

"یہ دنیا بڑی ظالم ہوتی ہے، مائی ڈیر"... اندرانی کہنے لگی... "چند دن آپ کا نام نظروں سے اوجھل ہوا اور لوگ بھول جاتے ہیں۔"

میزبان منی راج جو زیادہ تر چپ ہی رہا کرتا تھا اور جس نے بہ طورِ خاص آج کی محفل میں رما کو بلایا تھا، بول پڑا... "آپ ٹھیک کہتی ہیں مسز گھوش۔ مگر جس ٹریجیڈی سے رما دیوی گزری ہیں، اس کے بعد ان کے قلم کا رک جانا نیچرل تھا۔"

"کہتے ہیں کہ غم کی آنچ آرٹ کو اور دہکاتی ہے"... آرتی بولی۔

"یہ بات وہی لوگ کہتے ہیں جنھوں نے غم کو کبھی چکھا نہیں"... اس پر روپیش بول پڑا۔

"روپیش؟... ڈونٹ بی سِلی۔" آرتی کی تلوار پھر لہرائی... "میں سمجھ سکتی ہوں کہ شوہر کا غم معمولی غم نہیں ہوتا"... پھر رک کر رما دیوی سے بولی "آئی ایم ساری رما جی،... میں بھی تھی اتنے دنوں میں آپ کا غم..."

منی راج آرتی کی بات کاٹ کر بول پڑا... "رما جی۔ آپ جب سے چپ بیٹھی ہیں،... کوئی بات نہیں کی آپ نے!"

"مجھے کچھ کہنا نہیں ہے مسٹر منی راج" رما نے کہا "میں آج آپ لوگوں کی باتیں سننے آئی تھی اور اس کے لیے احسان مند ہوں... کتنی کام کی باتیں معلوم ہوئیں آج... اور آرتی، میں جانتی ہوں تم نے جو کچھ کہا، میری ہمدردی میں کہا۔ مگر تم نہیں جانتیں، میں اداس بالکل نہیں ہوں۔ ہونی کو کس نے روکا ہے!... میں تو خوش قسمت ہوں کہ آنند نے اتنے دن میرے ساتھ

اسے ۔ ۔ ۔ وہ دن جو بھی خوشیوں سے بھرپور تھے ۔ ورنہ کتنے لوگ ہیں جو ساتھ رہتے ہوئے بھی بھی خوشی کے تجربے سے کبھی ہم کنار میں ہوتے ، اور زندگی گزار دیتے ہیں ! ہم دردی تو ان سے کرنی چاہیے ۔ ۔ ۔"

رما نے رک کر اپنا پرس اور شال سنبھالی ۔ ۔ ۔ " تھینک یو مسٹر منی راج ، جو آپ نے آج کی گیدرنگ میں مجھے ان وائٹ کیا ۔ ۔ مسٹر منوج ، کیا آپ مجھے گھر چھوڑ دیں گے ؟"

کرسی سے اٹھتے ہوئے منوج کہنے لگا " ۔ ۔ ۔ مارسل پروست نے کہا ہے ، دنیا ایک بار بن کر ختم نہیں ہوگئی ۔ ۔ ۔ جب بھی نئی بڑا فن کار قلم اٹھاتا ہے ، دنیا پھر سے بنتی ہے ۔ ایکس کیوز می جنٹلمن ۔ ۔ ۔ چلیے رما جی ۔"

یکایک آرتی رما سے بولی " ۔ ۔ ۔ رما جی ۔ میں نے سنا تھا ، آپ نے نئی کار لی ہے ۔ ۔ ۔ ؟"

" تو یہ بھی سنا ہوگا ، میں رات کو کار نہیں چلاتی ۔ ۔ ۔" ۔ ۔ ۔ رما کی آواز میں اتار چڑھاؤ نہیں تھا ۔ دو تین قدم چل کر وہ ۔ دم رک گئی ۔ پلٹ کر سب کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ۔ ۔ ۔ " شما کیجیے ۔ جانے سے پہلے میں نے آپ کو نمستے نہیں کہا ۔"

اکثر دکانیں بند ہوچکی تھیں اور خالی خالی سڑکوں پر لطیف نیلگوں کہرا اترنے لگا تھا کار کے شیشے چڑھے ہوئے تھے ۔ رما شال لپیٹے اموش بیٹھی کار کے پہیوں سے نکلنے والی وہ آواز سن رہی تھی جو جاڑوں کی راتوں میں خالی سڑکوں کی رگڑ سے ایک مسلسل پر اسرار یٹی سی بن کر کار کا تعاقب کرتی ہے ۔

" مجھے بےحد خوشی ہے کہ آج اس گیدرنگ میں آپ آئیں ۔" منوج نے کہا ۔

" آپ اتنا اصرار نہ کرتے تو شاید نہیں آتی ۔" رما نے جواب دیا ۔

" آرتی کی باتوں کا برا تو نہیں مانا آپ نے ؟ ۔ ۔ ۔ باتوں باتوں میں ایک آدھ ڈنک ضرور مارتی ہے وہ ۔ ۔ ۔" منوج بولا ۔

" میں ان کی باتوں کا کبھی نوٹس نہیں لیتی ۔ ۔ ۔ ہاں انجوائے ضرور کرتی ہوں ۔" رما بولی " منوج صاحب ۔ آج شاید تین سال ۔ ان لوگوں سے ملی تھی ۔ حیرت ہے ، یہ آج بھی اسی جگہ ہیں ، جہاں میں نے انھیں چھوڑا تھا !"

گرین ویو ہوٹل سے کچھ لوگ نکل رہے تھے ۔ منوج نے کار آہستہ کرکے رما کے گھر کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ لی ۔ ۔

" یہ اندرانی جی مسز گھوش کب بن گئیں ؟" رما نے پوچھا ۔

" کوئی ایک سال ہوا ۔"

" ان کے پچھلے شوہر تو مشہور آرکیالوجسٹ تھے !" رما کی حیرت ابھی کم نہیں ہوئی تھی ۔

" شاید انھیں آرکیالوجی سے اب کوئی دل چسپی نہیں رہی ۔" منوج بولا ۔

" اور دھیرج گھوش کی پہلی بیوی ۔ ۔ ۔ ؟"

منوج نے مڑ کر رما کی طرف دیکھا ۔ ۔ ۔ " وہ ان کی دوسری بیوی تھی ۔ ۔ ۔ چھوڑ دیا اسے THEY HAVE SEPARATED

" کچھ لوگ کتنی آسانی سے اپنی زندگی کا چولا بدل لیتے ہیں !" رما نے ایک دو سکنڈ چپ رہ کر کہا ۔

منوج بولا ۔ ۔ ۔ " مجھے تو لگتا ہے دھیرج گھوش دوسروں کی زندگیوں سے بے مقصد نہیں کھیلتا ہے ۔ اسے اپنے ناولوں کے لیے [illegible] تلاش کرتا ہوتا ہے ۔"

اس کے بعد دونوں چپ ہوگئے ۔ تھوڑی دیر میں رما کا گھر آگیا ۔ موٹر سے اترتے ہوئے رما بولی ۔ ۔ ۔ " تھینک یو منوج صاحب

۔۔۔ ویسے آج کا تجربہ برا نہیں رہا ۔۔۔ گڈ نائٹ ۔"

منی راج کے یہاں ابھی سب لوگ موجود تھے ۔ آرتی گلاس کی تہہ میں دیر سے پڑی چند بوندوں کو ایک چسکی میں ختم کرتے ہوئے بولی ۔۔۔ "آپ نے دیکھا مسز گھوش ، رما کتنی لیے دیے بیٹھی رہی ؟ جیسے یہاں آکر ہم پر احسان کیا ہے ۔"

"یہ بات نہیں آرتی ۔" اندرانی گھوش بولی ۔ "آج اتنے دن بعد ایسے رائیٹرز اور آرٹسٹوں کی کمپنی میں وہ شاید نروس ہوگئی تھیں ۔"

"نروس وروس کچھ نہیں ۔۔۔ وہ سدا کی گھمنڈی رہی ہے ۔۔۔ اور وہ منوج ! " آرتی پتہ نہیں کیا کہنا چاہتی تھی ۔ رک کر آہستہ سے بولی "بڑا کریٹک بنا پھرتا ہے ! ۔۔۔ فین ہے اس کا ۔ مارسل پروسٹ کو کوٹ کرنے سے کیا مقصد تھا اس کا ؟"

منی راج جو عام طور پر چپ بیٹھا دوسروں کی گفتگو سنتا رہتا تھا ، کہنے لگا ۔۔۔ "وہ کسی کا فین نہیں ہے مسز آرتی ورما ۔۔۔ سوائے آرٹ کے ۔"

روپیش یکبارگی کھڑا ہوگیا ۔۔۔ "منی راج صاحب میں بھی اب جانے کی اجازت چاہتا ہوں ۔ رات کافی ہوگئی ہے اور کل لوکیشن شوٹنگ پر جانا ہے ۔"

"ایسے آپ جارہے ہیں روپیش ؟ " آرتی بولی ۔ "آپ نے وعدہ کیا تھا ، مجھے گھر پر ڈراپ کریں گے ؟ "

"تو چلیے ۔۔۔ مجھے وعدہ یاد ہے ۔"

آرتی کھڑے ہونے میں ذرا سا لڑکھڑا گئی ۔ روپیش کا سہارا لیتے ہوئے بولی ۔۔۔ "ایکسکیوز می جنٹلمن ۔۔۔ آئی ہیو ٹو لیو ۔۔۔ تھینکس مسٹر منی راج ۔ بڑا اچھا وقت گزرا ۔"

روپیش کے سہارے جاتی ہوئی آرتی کو اندرانی گھوش دیر تک دیکھتی رہی ۔

سڑکیں ویران ہوچلی تھیں ۔ ہوا کے سرد جھونکوں میں درختوں سے اکا دکا زرد پتے ٹوٹ کر گر رہے تھے ۔ کہرے کی مہین چادر میں لپٹی اسٹریٹ لائٹس ابھی سے اونگھنے لگی تھیں ۔ روپیش کار کو دھیمی رفتار سے چلا رہا تھا کیوں کہ برابر کی سیٹ پر بیٹھی آرتی کا سر اس کے کاندھے پر ڈھلک گیا تھا ۔ آرتی آنکھیں بند کیے کسی گیت کے بول گنگنا رہی تھی ۔ جو کوشش کے باوجود روپیش کی سمجھ میں نہیں آرہے تھے ۔

کار دھیرے سے یوں رکی جیسے پانی پر پھسلتے پھسلتے رک گئی ہو ۔ آرتی کو پتہ بھی نہ چلا ۔

"آرتی جی ۔۔۔ گھر آگیا ۔"

"گھر آگیا ؟ ۔۔۔ کس کا گھر ؟ " آرتی نے چونک کر پوچھا ۔

"تمہارا ۔۔۔ اور کس کا ؟ " روپیش نے اسی طرح دھیمے لہجے میں کہا ۔

"اوہ ۔۔۔ آگیا گھر ! ۔۔۔ اتنی جلدی ! ۔۔۔ میں نے کہا تھا دھیرے دھیرے چلو روپیش " ۔۔۔ آرتی نے بدن سمیٹتے ہوئے کہا ۔ "تو اب مجھے جانا ہے ۔ پھر اپنی اسی تنہائی میں " آرتی پلٹ کر روپیش کی آنکھوں میں دیکھنے لگی ۔ "۔۔۔ روپیش کیا تم اترو گے نہیں ؟ " ۔۔۔ کیا کچھ دیر اور ۔۔۔ میرے ساتھ نہیں گزار سکتے ؟ ۔۔۔ آئی ایم سو لونلی ۔۔۔ "

"تم امریکہ کیوں نہیں چلی جاتیں آرتی ۔۔۔ اپنے اس ہسبنڈ کے پاس ؟ "

وائپر کی چنگاری پر چھن سے پانی کا قطرہ ٹپکا ۔۔۔ "تم مجھے اسی لیے ساتھ لائے تھے کہ بچوں کی طرح نصیحتیں کرو ؟ مجھ سے

ہوش کی باتیں کرو ؟" آرتی نے رک کر سانس درست کیا ۔ ۔ ۔ "جب کہ میں اپنے ہوش و حواس رات کے پُر اسرار رنگوں میں بکھیر چکی ہوں ۔ میں مدہوش رہنا چاہتی ہوں روپیش ۔"

روپیش نے آرتی کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "۔ ۔ ۔ اتنی زیادہ مت پیا کرو آرتی ۔ ۔ ۔ جاؤ اب آرام کرو ۔"

آرتی نے جھلا کر روپیش کا ہاتھ جھٹک دیا ۔ ۔ ۔ " یو بروٹ ۔ تمھیں میری ذرا بھی پرواہ نہیں ہے ! " اور جلدی سے کار کا پٹ کھول کر نیچے اتر گئی ۔ ۔ ۔ " آج تم نے وہاں میری نظم کی ذرا بھی تعریف نہیں کی ۔ میں نظم سنا رہی تھی اور تم رما کی طرف دیکھ رہے تھے ۔"

" رما آنند کے ڈراموں میں میں نے کام کیا ہے مسز آرتی ورما " روپیش نے سمجھانے کی کوشش کی ۔ ۔ ۔ " میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے ۔"

" تو پھر جاؤ ۔ اور سیکھو اسی سے ۔ ۔ ۔ " اور باہر کا دروازہ زور سے دھکیل کر آرتی گھر کی سیڑھیوں کی طرف تیز تیز قدموں سے چلی گئی ۔ سیڑھیوں پر پھر ایک بار لڑکھڑا گئی ۔ رک کر اپنے کو سنبھالا اور جاکر کال بیل کا بٹن دبانے کے لیے ہاتھ بڑھایا ۔ مگر پیچھے کھڑے ہوئے روپیش نے اس کا ہاتھ تھام لیا ، اور خود بٹن دبا دیا ۔

آرتی بپھری شیرنی کی طرح پلٹی اور دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں کس کر روپیش کے سینے پر مارنے لگی اور پھر بے دم ہوکر اسی سینے پر گر پڑی ۔

آرتی کی نوکرانی دروازہ بند کر کے پلٹی تو دیکھا کہ اس کی مالکن اسی طرح روپیش سے چپکی لڑکھڑاتے قدموں سے بیڈ روم کی طرف جارہی ہے ۔ آرتی کی نوکرانی کو کوئی حیرت نہیں ہوتی ۔

مس راج والی پارٹی کے تیسرے دن رما ناشتہ کر کے چائے پی رہی تھی کہ منوج آگیا تھا ۔ ناشتے کی میز پر ہی دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے ۔ رما کے سامنے ایک ایر لیٹر پڑا تھا ۔ منوج نے دیکھا تو رما بولی ۔ ۔ ۔ " کمل کا ہے ۔ ہارورڈ یونیورسٹی سے ایم ۔ بی ۔ اے کا امتحان دے دیا ہے ۔"

" پھر اب کیا کررہی ہے ؟ " منوج نے پوچھا ۔

" عشق ۔"

" عشق ؟ "

" ہاں ۔ عشق ۔ " اور میز پر سے لیٹر اٹھاکر منوج کو دے دیا ۔

۔ ۔ ۔ پیاری ممی ۔ اس عجیب کیفیت سے پہلی بار گزر رہی ہوں ۔ اب میں نے جانا ہے محبت کیا ہے ! اس سے پہلے جو دو ایک تجربوں سے گزری تھی ، اور جس کے بارے میں تمھیں لکھا بھی تھا ، وہ تو بس ایسے تھے جیسے تیز بارش سے پہلے ہوائیں چلیں اور بوندا باندی کے چھینٹے آئیں اور گزر جائیں ۔ ۔ ۔ رسک بھی ہندستانی ہے ۔ کلکتے کا ۔ مائکرو ویو ٹکنالوجی کا اکسپرٹ مانا جاتا ہے ۔ یہاں امریکہ میں پانچ سال سے ہے ۔ ممی ۔ ۔ ۔ وہ بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرتا ہے ۔ اس کی آواز میں بنگال کا جادو ہے ۔ لگتا ہے تو دل کی دھڑکنیں تیز ہوجاتی ہیں ۔ ۔ ۔ میں اس کی تصویر نہیں بھیج رہی ہوں ۔ تین مہینے بعد آؤں گی تو ساتھ لاکر سامنے کھڑا کردوں گی اک دم ۔ تمھاری پسند کے بعد ہی آگے قدم اٹھایا جائے گا ۔ ۔ ۔ یاد رکھو ممی ، تم سے زیادہ میرے لیے دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے اور تمھیں مجھ سے کتنی محبت ہے وہ بھی جانتی ہوں ۔ ۔ ۔

تمھاری ۔ ۔ ۔ نیل کمل

P.S. رسک سے ملنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ تم میں اور ڈیڈی میں کتنی عظیم محبت تھی !

خط کو واپس رکھتے ہوئے منوج نے رما کی طرف دیکھا جو آنکھیں بند کیے چپ چاپ بیٹھی تھی ۔

"کیا سوچ رہی ہیں ؟"

"کچھ نہیں ۔ بڑا عجیب سا لگ رہا ہے ۔" رما نے جواب دیا ۔

"ایسا ہی ہوتا ہے رما دیوی ۔ گڑیوں سے کھیلنے والی ننھی منی بچیاں کب بڑی ہوجاتی ہیں ، ماؤں کو پتہ بھی نہیں چلتا اور جب محبت کا پہلا جھونکا ان کی دنیا میں داخل ہوتا ہے تو ماؤں کے دل دھک سے رہ جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ مگر کمل بڑی سمجھ دار بچی ہے ۔ ایسی بیٹی ہر کسی ماں کو نصیب نہیں ہوتی رما دیوی جی ۔ ۔ ۔ " منوج نے کہا ۔ ۔ ۔ " خوشی کی بات ہے کہ کمل محبت جیسی عظیم نعمت سے ہم کنار ہورہی ہے ۔"

" محبت جتنی عظیم نعمت ہے ، اتنی ہی سفاک بھی ہوتی ہے ، منوج صاحب ۔" رما بولی ۔

" سفاک تو ہر سچائی ہوتی ہے اسی طرح جیسے وہ عظیم بھی ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ " منوج بولا ۔

" ۔ ۔ ۔ چھوڑیے ان باتوں کو اور اندیشوں کو اور اس خط کو احتیاط سے رکھیے ، جو کمل کی نئی زندگی کی سہانی یادوں کی البم میں پہلی تصویر ہوگا ۔"

رما کے ہونٹوں پر ہلکی سے مسکراہٹ جھلکی ۔ ۔ ۔ " آپ جب آئے تو محض اتفاقاً یہ خط نکال کر پڑھ رہی تھی ۔ ۔ ۔ کل سے تیسری بار ۔ مگر اچھا ہی ہوا جو آپ نے بھی دیکھ لیا ورنہ اب آپ کے اور اسوانی صاحب کے سوا اور کون ہیں جن سے کمل کی باتیں کرسکوں ؟ ۔ ۔ ۔ بس وہی دکھاوے کی نپی تلی باتیں ، جھوٹی شان ، جلن ، حسد اور کھوکھلے قہقہے ۔ ۔ ۔"

رما نے ابھی جملہ ختم نہیں کیا تھا کہ منوج آگے کہتا چلا گیا ۔ ۔ ۔ " ان کی محرومیاں ان کے مزاج کا کڑواپن بن جاتی ہیں ۔ دوسرے کی آنکھ کا تنکا بھی دیکھ لیتے ہیں ، مگر اپنی آنکھ کے آگے شہتیر بھی دکھائی نہیں دیتا ۔"

رما نے چونک کر منوج کی طرف دیکھا ۔ وہ مسکراکر بولا ۔ ۔ ۔ " جی ہاں ، کچھ اسی طرح کے ڈائیلاگ تھے جو آپ کے کسی ڈرامے میں ایک کیرکٹر ادا کرتا ہے ۔"

" آپ کو یاد ہے !" رما نے حیرت سے پوچھا

" رما جی ۔ میں نے آپ کے ہر ہر ڈرامے کو پڑھ کر اور اسٹیج پر دیکھ کر ریویو لکھے تھے ۔ ۔ ۔ یوں ہی نہیں لکھے تھے ۔" منوج بولا ۔ ۔ ۔ " ایک مرتبہ آنند نے مجھ سے ہنستے ہوئے کہا تھا ۔ ۔ ۔ بھئی منوج میں آج تک رما کا کوئی ڈراما شروع سے آخر تک نہیں دیکھ سکا ، تم کیسے دیکھ لیتے ہو ؟"

منوج نے چونک کر رما کی طرف دیکھا ۔ مگر رما کے چہرے پر مسکراہٹ تھی ۔ ۔ ۔ ہلکی ہلکی دل آویز چاندنی جیسی مسکراہٹ ۔ جیسے کسی بات پر کوئی اور بات یاد آجائے اور کئی خوش گوار یادیں سمٹ آئیں ۔

" زندہ دلی میں آنند کی مثال نہیں تھی ۔ ۔ ۔ " بہت آہستہ سے منوج بولا ۔ جیسے یہ بات اپنے آپ سے کہی ہو ۔

" ہنستے اور ہنساتے وقت وہ بالکل بچہ بن جاتے تھے ۔ ۔ ۔ " رما بولی ۔

" اور یہ بچہ آنند کے اندر کبھی بڑا نہیں ہوا ۔" منوج نے کہا ۔ یادوں کی لطیف لہروں سے دونوں ہی لطف اندوز ہورہے تھے ۔ ۔ ۔

" ایک دفعہ کلکتہ جاتے ہوئے ٹرین میں آنند کا ساتھ ہوگیا " ۔ ۔ ۔ یکایک منوج بولا " ہم دونوں ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرے ۔ اپنے اپنے کام کرکے دونوں موہن بگان اور ایسٹ بنگال کا میچ دیکھنے چلے گئے ۔ آپ جانتی ہی ہیں آنند فٹ بال کا اچھا کھلاڑی تھا ۔ ۔ ۔ " رما دل چسپی سے سن رہی تھی ۔ میچ پورے جوش و خروش پر تھا ۔ ایک موقع پر موہن بگان کا ایک کھلاڑی ایسٹ بنگال کی پوری ڈیفنس کو ڈریبل کر کے عین گول کے سامنے پہنچ گیا ۔ مگر بال کو کِک لگا کر گول کرنے میں دیر کر رہا تھا ۔ ۔ ۔ دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوگئی تھیں ۔ تماشائیوں کے ٹینشن کا لاوا پھٹ پڑنے کو تھا ۔ ۔ ۔ آخر اس نے گول کردیا ۔ خوشی سے لوگوں کے شور نے اسٹیڈیم کو سر پر اٹھالیا ۔ اسی شور میں ہمارے سامنے کھڑے ہوئے ایک موٹے بنگالی نے پلٹ کر جلدی سے آنند سے کہا ۔ ۔ ۔ تھینک یو ۔ ورنہ ہم تو چارپیہ اب تک گول نہ مارتا ! " ۔ ۔ ۔ اور قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا ۔

مجھے حیران دیکھ کر آنند میرا ہاتھ پکڑ کر الگ لے گیا ۔ اور بولا ۔ ۔ ۔ اس کم بخت نے گول مارنے میں اتنی دیر لگادی کہ میرا پیپر اٹھ گیا ، سیدھا اس بنگالی کے بکس پر ۔ تم نے کبھی فٹ بال کھیلا ہے ؟ " اور منوج ہنستا چلا گیا ۔ ۔ ۔ اسے اس طرح ہنستے ہوئے شاید ہی کسی نے دیکھا ہوگا ۔ ورنہ ہمیشہ چپ رہنے والا منوج تو ہنسی جانتا ہی نہ تھا ۔

رما کی ملازمہ چائے کے خالی برتن لے جانے آئی کھڑی تھی اور حیرانی سے دیکھ رہی تھی کہ کتنے عرصے بعد رما ایسے ہنس رہی ہے ! خوش ہوکر بولی " چائے اور لاؤں بی بی جی ؟ "

رما نے منوج کی طرف دیکھا ۔

" نہیں اب اور نہیں ۔" منوج نے چونک کر کہا ۔ ۔ ۔ " ارے اصل کام تو میں بھول ہی گیا جس کے لیے آیا تھا ! " رما جی ۔ ہماری سوسائٹی ایک سیمینار آرگنائز کر رہی ہے ۔ ۔ ۔ لٹریری ٹرینڈز ۔ ۔ ۔ ٹوڈے اینڈ ٹومارو ۔ اس میں آپ کو پیپر پڑھنا ہے ۔

رما نے اک دم منوج کی طرف دیکھا ۔ بے چین سی ہوکر کچھ کہنا چاہتی تھی ۔ مگر منوج جلدی سے بولا ۔ ۔ ۔ " نہیں ۔ آپ انکار نہیں کریں گی ۔ میں نے خاص طور پر آپ کا نام دیا ہے ۔

" مگر آپ نے مجھ سے پوچھا تو ہوتا ۔"

" وقت نہیں تھا ۔ الٰہ آباد سے ڈاکٹر سوراں نے یہاں آنے کا پروگرام بدل دیا ۔ ان کی وجہ سے ہم کو بھی سیمینار جلدی رکھنا پڑا ۔ مگر ٹاپک آپ کے لیے نیا نہیں ہے ۔ مجھے یاد ہے کوئی چار پانچ سال پہلے آپ نے ماڈرن لٹریری ٹرینڈز پر ایک آرٹیکل لکھا تھا ۔

" جب کی بات اور تھی منوج صاحب ۔ ۔ ۔ اب مجھ سے کچھ نہ ہوگا ۔"

" ہوگا رما جی ۔ یقین رکھیے ۔"

" کیوں ۔ ۔ ۔ آخر کیوں آپ اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ ۔ ۔ ۔ " کہتے کہتے رما رک گئی ۔ جیسے الفاظ تلاش کر رہی ہو ۔ ۔ ۔ " میں وہ حوصلہ کہاں سے ڈھونڈھ لاؤں جو آنند کے ساتھ گم ہوچکا ہے ۔"

" وہ گم نہیں ہوا ہے " ۔ ۔ ۔ منوج بولا ۔ " ڈوب گیا ہے ۔ اندھیرے میں اور رات کے اندھیرے میں پربت گم نہیں ہوجاتے ۔ رات کا سینہ چیر کر روشنی کی کرن ضرور پھوٹتی ہے اور سارے منظر واپس رہتے ہیں ۔ رما دیوی ۔ ۔ ۔ کریٹیو ٹیلنٹ کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے ۔ اس سے یوں منھ موڑلینا اللہ کی نافرمانی ہے ۔ ۔ ۔ "

رما اٹھ کر ٹہلنے لگی ۔ ۔ ۔ " آنند کے جانے کے بعد میں کبھی اپنی کتابوں کی گرد بھی صاف نہیں کر سکی اور اب آپ چاہتے ہیں ۔ ۔ ۔ " وہ پھر رک گئی ۔ پلٹ کر آہستہ سے بولی " اس راستے پر مجھے واپس لانے پر آپ کو اتنا اصرار کیوں ہے ؟ "

"اس کی وجہ میں بھی نہیں جانتا رما دیوی ۔ ۔ ۔ " چند لمحے خاموش رہ کر منوج بولا ۔ ۔ ۔ "یا شاید اس کی تہہ میں چھپی ہوئی میری خود غرضی ہے ۔ وہ بھروسا ہے، جو مجھے اپنے آپ پر ہے اور جسے میں کھونا نہیں چاہتا ۔ ۔ ۔ "

(۲)

گیارہ بجے اسوانی سے اپائنٹمنٹ تھا ۔ گیریج سے کار نکال کر اسٹارٹ کرنے لگی تو ہمیشہ کی طرح رما نے دیکھا کہ سڑک کے دوسری جانب مقابل کے گھر میں سے کچھ آنکھیں اس کی طرف دیکھ رہی ہیں ۔ مگر اب وہ ان چیزوں کی عادی ہوگئی تھی ۔ لوگوں کی نظروں کی یا ان کی سرگوشیوں میں باتوں کی ۔ لڑکی امریکہ میں پڑھ رہی تھی اور گھر میں وہ اکیلی رہتی تھی ۔ اس گھر کو آنند نے بڑے چاؤ سے بنایا تھا ۔ رما کی نفاست پسند طبیعت کا خیال رکھتے ہوئے بڑی خوش ذوقی سے آراستہ کیا تھا ۔ طوفان آئے اور گزر گئے مگر رما نے اپنے رہن سہن کی ڈگر نہیں چھوڑی ۔ ۔ ۔ اپنے دکھوں کی ٹیس کو چہرے کی مسکراہٹ میں چھپائے رکھا ۔ سادہ مگر سلیقے کے لباس وہ اب بھی زیب تن کرتی تھی جو آنند کو پسند تھے اور جن میں اس کی عمر کی بڑھتے ہوئے ماہ و سال بے اثر سے لگتے تھے ۔ آنند کے وہ چند دوست جو ان دونوں کے بہت قریب تھے اب بھی رما سے ملنے آتے تھے اور اسی ذہنی ہم آہنگی کے بل پر رما نے کبھی دنیا کی اوچھی باتوں کی پرواہ نہیں کی ۔

مانٹو کامپلکس میں اسونی کا آفس ساتویں فلور پر تھا ۔ رما نے دروازہ کھولا تو اسوانی جیسے انتظار کر رہا تھا ۔ مسکرا کر بولا ۔

"نمستے ۔ آئیے بھابی ۔ مجھے معلوم تھا آپ مقررہ وقت سے ایک منٹ بھی دیر نہیں کرتیں ۔"

"تھینک یو ۔ اسوانی صاحب ۔ رما نے بیٹھتے ہوئے کہا ۔ چپراسی چائے لے آیا اور ایک ایک پیالی دونوں کے سامنے رکھ کر چلا گیا ۔

"مجھے یقین ہے، اس روز آپ نے آرتی دیوی کی باتوں کا برا نہیں مانا ہوگا ۔ ۔ ۔ " چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے اسوانی بولا ۔

"نہیں ۔ مجھے ان کی باتوں پر نہ دکھ ہوتا ہے نہ تعجب ۔" رما بولی " ۔ ۔ ۔ بتلائیے آج کیا کام ہے ؟ " ۔ ۔ ۔ اور چائے پینے لگی ۔

قدرے توقف سے اسوانی بولا ۔ ۔ ۔ "آپ کی دلی والی پراپرٹی کا ڈیل ہوگیا ہے اس سے اچھا آفر ممکن نہیں تھا ۔ یوں بھی وہ مکان کتنے عرصے سے بے کار خالی پڑا تھا ۔ ۔ ۔ اگر آپ ایگری کریں تو ۔ ۔ ۔ "

"مسٹر اسوانی ۔ آپ اسے ٹھیک سمجھتے ہیں تو پھر مجھے کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے ؟ " ۔ ۔ ۔ رما بول پڑی ۔

میز پر سے ٹائپ شدہ اسٹامپ پیپرز کا فائل اٹھاکر رما کو دیتے ہوئے اسوانی کہنے لگا ۔ ۔ ۔ "میں نے سارے ڈاکیومنٹس تیار کر رکھے ہیں ۔ ان پر آپ کے دست خط چاہئیں ۔"

رما پرس سے قلم نکالنے لگی تو جلدی سے اسوانی بولا ۔ ۔ ۔ "نہیں رما بھابی ۔ ۔ ۔ پہلے آپ انھیں ایک نظر دیکھ لیجیے ۔ پڑھنے کے بعد ۔ ۔ ۔

رما بات کاٹ کر بولی ۔ ۔ ۔ "اسوانی صاحب ۔ آپ آنند کے بزنس پارٹنر ہی نہیں سچے دوست کی طرح رہے ہیں ۔ ۔ ۔ پہلے بھی، اور اب بھی ۔ آپ نے جو بھی کیا، ہمارے فائدے کے لیے کیا ۔ ۔ ۔ اور اب بھی کر رہے ہیں ۔ ان پیپرز کو پڑھ کر میں اس یقین کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتی جو مجھے آپ پر ہے ۔ ۔ ۔ بتلائیے ۔ کہاں کہاں کرنی ہیں دست خط ۔"

"شکریہ، رما بھابی ۔ ۔ ۔ " اسوانی دھیرے سے بولا ۔ "آپ لوگوں کی پارٹنرشپ پر مجھے فخر ہے ۔ ۔ ۔ لیجیے ۔ یہاں ۔ ۔ ۔ اور یہاں سگنیچر کردیجیے ۔"

دستخط کرنے کے بعد چند سکنڈ چپ چاپ بیٹھی رہی ۔ پھر آہستہ سے بولی ۔ ۔ ۔ " بس ایک بات کہنی ہے آپ سے ۔ اس مکان کے ڈسپوزل سے پہلے ۔ ۔ ۔ ایک بار میں وہاں جانا چاہتی ہوں ۔ کیا یہ ممکن ہوسکے گا ؟ "

اسوانی چپ ہوگیا ۔ تھوڑی دیر بعد بولا ۔ ۔ ۔ " کیوں نہیں ؟ ۔ ۔ ۔ اس میں کیا مشکل ہے ! ۔ ۔ ۔ مگر رما بھابی ، اب آپ وہاں نہ جائیں تو اچھا ہے ۔" ۔ ۔ ۔ رما کو چپ دیکھ کر اسوانی نے اپنی بات جاری رکھی ۔ " ۔ ۔ ۔ اتنے برس بعد ، آپ کا وہاں جانا کیا ٹھیک ہوگا ؟ "

" مجھے نہیں معلوم ۔ ۔ ۔" رما آہستہ سے بولی " مگر سوچ رہی ہوں ، کہیں خلش نہ رہ جائے دل میں ۔"

اچھی بات ہے ۔ جیسے آپ کی مرضی ۔" اسوانی اک دم کچھ سوچ کر بولا ۔ ۔ ۔ " مگر آپ اکیلی مت جائیے میں اپنی وائف سے کہوں گا ۔ ہم دونوں آپ کے ساتھ جائیں گے ۔"

" نہیں اسوانی صاحب ۔ وہاں میں اکیلی ہی جاؤں گی ۔"

اسوانی خاموشی سے رما کو دیکھنے لگا ۔ جو نہ جانے کن خیالوں میں گم ہوگئی تھی ۔ آہستہ سے بولا ۔ ۔ ۔ " ٹھیک ہے ۔ میں سب سمجھ سکتا ہوں ۔ آپ جب بھی جانا چاہیں مجھے بتا دیجیے ۔ میں وہاں چوکیدار کو اطلاع کردوں گا ۔"

(۳)

پہاڑ کے دامن میں ، درختوں کے نیچے فلم کی شوٹنگ میں مار دھاڑ کے کسی سین کا ٹیک چل رہا تھا ۔ روپیش سکنڈ ہیرو کے رول میں ہیرو کے شانہ بہ شانہ غنڈوں میں گھرا ہوا ان سے لڑ رہا تھا ۔ گھونسے اور لاتیں ہوا میں چل رہی تھیں ، اور غنڈے ڈھیر ہوتے جارہے تھے ۔ یکایک ڈائرکٹر چلایا ۔ ۔ ۔ " کٹ ۔" اس کی آواز میں جھلاہٹ تھی ۔ ۔ ۔ " کافی بریک ۔"

تماشا رک گیا ۔ ہیرو اور روپیش پنیڑ کے سائے میں کرسیوں پر آبیٹھے جہاں آرتی دیوی پہلے سے بیٹھی تھی ۔ وہ اکثر روپیش کے ساتھ اس کی شوٹنگ دیکھنے آجایا کرتی تھی ۔ ایسے وقت وہ بڑی بن سنور کر آتی ، اس امید پر کہ روپیش ڈائرکٹر سے کہہ کر کسی فلم میں اسے کوئی بریک دلا دے ۔

ڈائرکٹر اور کیمرا مین آپس میں زور زور سے باتیں کرتے ہوئے آکر کرسیوں پر بیٹھ گئے ۔ ڈائرکٹر ابھی تک خفگی کے موڈ میں تھا ۔ ۔ ۔ کافی کا ایک گھونٹ لے کر کیمرہ مین سے بولا ۔ ۔ ۔ " یس مسٹر نرسنگ ۔ اٹ از لیف فار می ۔ میں چاہتا ہوں ، اب کی بار جو فلم ڈائرکٹ کروں ، اس میں ایسے فائٹنگ وائٹنگ کے اسلنٹ سین بالکل نہ ہوں ، ۔ ۔ ۔ دکھاوے کے ! کوئی ایسی اسٹوری ہو جو زندگی کی سچائیوں پر BASED ہو ، ۔ ۔ ۔ سیریس ، ریئل !

روپیش بول پڑا ۔ ۔ ۔ " مسز رما آنند اسی قسم کے پلاٹ لکھتی رہی ہیں ۔ میں نے ان کے کئی اسکرپٹس میں کام کیا ہے ۔"

" کون مسز رما ؟ ۔ ۔ ۔ انڈین آرٹ تھیٹر والی ؟ " ڈائرکٹر نے پوچھا ۔

" جی ہاں ۔ ۔ ۔ ان کے ہس بینڈ کی اچانک موت ہوگئی تھی ۔ آپ کو یاد ہوگا ، تین برس پہلے شملے کے پاس ایک پلین کریش ہوا تھا ۔ ۔ ۔ اس کے بعد سے انھوں نے کچھ نہیں لکھا ۔"

" اور اب شاید کچھ بھی نہ سکیں ۔" یکایک درمیان میں آرتی بول اٹھی ۔

" نہیں ۔ یہ کوئی ضروری نہیں ۔ ۔ ۔" روپیش کے لہجے میں حق کی جھلک آگئی ۔ ۔ ۔ سنبھل کر ڈائرکٹر سے بولا ۔ ۔ ۔ " کچھ ہی دن پہلے وہ ایک لٹریری قسم کے گٹ ٹوگیدر میں آئی تھیں ۔ کون جانے کب رکے ہوئے سوتے پھر سے ٹوٹ کر پھوٹ نکلیں ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ اور جب ایسا ہو تو کیا میں ان سے کہوں آپ کے لیے کوئی اسکرپٹ ۔ ۔ ۔ ؟ "

" ہاں ۔ کیوں نہیں ؟ ۔ ۔ ۔ ضرور کہیے ۔ ۔ ۔ " ڈائرکٹر نے کہا ۔

آرتی غصے میں بھری روپیش کو دیکھتی رہی ۔

(۴)

منوج نے اپنے آرٹیکل کا آخری جملہ لکھ کر قلم میز پر رکھ دیا ۔ ہونٹوں سے جلتا ہوا سگریٹ نکال کر ایش ٹرے میں رگڑ دیا اور گردن پیچھے کی طرف کرتے ہوئے دونوں ہاتھ انگڑائی کے انداز میں پھیلادیے ۔ ۔ ۔ لی نا کی طرف دیکھا ، جو پاس ہی اپنی کرسی پر بیٹھی مسلسل ٹائپ کیے جارہی تھی ۔ منوج کے آفس کے اس چھوٹے سے کمرے میں ٹائپ کی مسلسل کھٹ کھٹ کی آواز اب اس کے کام میں مخل ہونے کی بجائے ردھم کا کام کرنے لگی تھی ۔ ۔ ۔ وہ بولا

" لی نا ۔ یہ آرٹیکل بھی کمپلیٹ ہوگیا ۔ ۔ ۔ IN - ROADS IN INDIAN CULTURE چھپنے کے بعد ، مجھے یقین ہے ایک ہلچل مچادے گا ۔ ۔ ۔ اس وقت کیا ٹائپ کر رہی ہو ؟ "

" ویکلی ریویو ۔ سن رائز والوں کے لیے " لی نا نے جواب دیا ۔

" ٹھیک ہے ۔ اس کے بعد اسے بھی ٹائپ کردینا " ۔ ۔ ۔ پھر رک کر بولا " نہیں " کل کردینا ۔ آج تم جلدی گھر چلی جاؤ ۔ تم نے بتایا تھا ، کل گریش کو واپس جانا ہے ، اپنی ٹریننگ پر ؟ "

لی نا منوج کو دیکھنے لگی ۔ ۔ ۔ " جی ہاں ۔"

" تو جاؤ ۔ آج شام اس کے ساتھ گزارو ۔ خوب گھومو ، پھرو ۔ ۔ ۔ خوشیوں کا ایک پل بڑا قیمتی ہوتا ہے ۔ یہ وقت پھر نہیں آتا لی نا ! اسے اپنے دامن میں باندھ کر امر کرلو ۔"

" تھینک یو سر ۔"

اس دن کی پوسٹ لے کر لی نا منوج کے پاس آگئی ۔ منوج جلدی جلدی لیٹرز دیکھ کر ایک طرف ڈالنے لگا ۔

" سر ۔ یہ لیٹر کشوری سیٹھ کا آدمی آکر پرسنلی دے گیا ہے ۔" ۔ ۔ ۔ منوج کے ہاتھ میں ایک لفافہ دیکھ کر لی نا نے جلدی سے کہا ۔ منوج نے لفافہ کھولا ۔

" یس ۔ اسپیشل انوی ٹیشن ! " وہ مسکرانے لگا " اس کی لڑکی کا ڈانس پرفارمنس ہے ۔ ۔ ۔ سلیکٹ آڈینس میں ۔ اور آخر میں ڈنر ۔"

" نوٹ کرنے کی ضرورت نہیں ، میں نہیں جاؤں گا ۔ ۔ ۔ اس کی لڑکی کو ڈانس وانس آتا نہیں ہے اور چاہتا ہے میں اس کی تعریف میں ایک بڑھیا سا رائٹ اپ چھپوادوں ، ۔ ۔ ۔ جو مجھ سے نہیں ہوسکتا ۔ پچھلی دفعہ ایک ہینڈسم اماؤنٹ کا لالچ بھی دیا تھا ۔ ۔ ۔ ایڈیٹ ! "

منوج نے نیا سگریٹ سلگا لیا ۔ کش لے کر لی نا کی طرف دیکھا تو وہ بے چین سی کھڑی تھی ۔ ۔ ۔ " ڈاکٹر نے آپ کو زیادہ اسموکنگ سے منع کیا ہے سر ۔"

منوج لی نا کی طرف دیکھنے لگا ۔ چند سکنڈ بعد ایک کش لے کر سگریٹ کو ایش ٹرے میں بجھادیا اور پوسٹ سے آئے ہوئے لیٹر اٹھا کر جلدی جلدی دیکھنے لگا ۔ ایک لیٹر لی نا کی طرف بڑھا دیا ۔ ۔ ۔ " تاریخ اور مقام نوٹ کرلو ۔"

لی نا اپنی میز پر چلی گئی اور ڈائرکٹری میں نوٹ کرنے لگی ۔ منوج نے ٹیلی فون اٹھاکر رما کا نمبر ڈائل کیا ۔ ۔ ۔ " ہلو ۔ ۔ ۔
: رما جی ۔ پندرہ تاریخ کو آرٹ گیلری میں بھوشن کمار کی پینٹنگس کی اگزی بیشن شروع ہورہی ہے ۔ میں چاہتا ہوں آپ کمار کی
ٹس ضرور دیکھیں ۔"

" تھینکس مسٹر منوج ۔ دھیرج گھوش نے بھی فون کیا تھا ۔ ۔ ۔ اسی بارے میں ۔" رما نے جواب دیا ۔

منوج کے چہرے پر ہلکی سے مسکراہٹ آگئی ۔ ۔ ۔ " اوہ ۔ تب تو ضرور جائیے ۔ ۔ ۔ مجھے کمار کے ورکس پر آرٹیکل لکھنا ہے
آپ کے امپریشنس بھی سننا چاہتا ہوں ۔"

لی نا ڈائری بند کرکے منوج کی گفتگو سننے میں محو تھی ۔ ۔ ۔ " میں شاید نہ آسکوں گا ۔ ۔ ۔ جی ہاں ۔ ہماری سوسائیٹی کی
لب ہے ۔ ۔ ۔ جی اچھا ۔ اور شکریہ ۔"

فون رکھ کر منوج جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ۔ " اچھا لی نا میں چلتا ہوں ۔ تم بھی وہ ریویو ختم کر کے چلی جانا ۔" ۔ ۔ ۔ پھر
، دم رک کر آہستہ سے پوچھا " کیا بات ہے ، کچھ کہنا چاہتی ہو ؟ "

" کچھ نہیں سر ۔" لی نا رکتے رکتے بولی ۔ جیسے سٹ پٹاسی ہوگئی ۔ ۔ ۔ " میں سوچ رہی تھی ، ۔ ۔ ۔ مسز رما آنند کے
پشنس ، ۔ ۔ کیا سچ مچ اتنے قیمتی ہوں گے ۔ ۔ ۔ ! "

کچھ کہنے سے پہلے منوج واپس کرسی پر بیٹھ گیا ۔ ۔ ۔ " ہاں ۔ تم شاید واقف نہیں ہو SHE IS AN INTELLECTUAL
AND A GIFTED WRITER ; چند سکنڈ خاموش رہ کر منوج کہتا چلاگیا ۔ ۔ ۔ " میں انھیں بڑے زمانے سے جانتا ہوں ۔
ب آنند سے ان کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی ، تب سے ۔ انھوں نے کئی ریمارکیبل پلیز لکھے ۔ بالکل نئے ڈھنگ سے خود ہی ڈائرکٹ
ہ کرتی تھیں ۔ میں ان پر ریویو لکھتا تھا ۔ ۔ ۔ آنند کی بےوقت موت نے انھیں اک دم چپ کردیا ہے ۔ قدرت نے یہ ظلم رما آنند
نہیں ، پورے کریٹیو آرٹ پر کیا ہے ۔ ۔ ۔"

منوج کی آواز میں ہلکی سی کاٹ آگئی تھی ۔ لی نا کو لگا جیسے وہ کہیں دور سے بول رہا ہے ۔ ۔ ۔" مگر مجھے یقین ہے وقت
راکھ تلے چنگاری بجھی نہیں ہے ۔ کسی بہانے ، کہیں سے بھی ، کوئی تازہ جھونکا اڑ کر آئے گا اور راکھ کے اس ڈھیر کو اڑا لے جائے
۔ چنگاری پھر سے دہک اٹھے گی ۔"

لی نا بت بنی بیٹھی تھی ۔

○●○

ڈاکٹر یامین اختر فاروقی

(رپورٹ)

مالیگاؤں میں اردو اکیڈمی کا ادبِ اطفال پر سمینار

مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکیڈمی کے زیرِ اہتمام مالیگاؤں میں پہلی بار ریاستی سطح پر ادبِ اطفال سمینار کامیابی سے منعقد کیا گیا ۔ اس سہ روزہ سمینار کا افتتاح جناب یوسف ناظم نے کیا ۔ اس سلسلے کا آغاز ۲۲ / مئی کی صبح ۱۱ بجے صابر ستار ٹاؤن ہال (مالیگاؤں) میں بچوں کے مختلف ثقافتی مقابلوں سے ہوا ۔ اسکولوں میں تعطیلات کے باوجود اس پروگرام میں سینکڑوں طلبہ و اساتذہ کے علاوہ خواتین او عمائدینِ شہر نے شرکت کی اور بچوں کے نظم خوانی ، حرکاتی گیت اور لطیفہ گوئی کے مقابلوں سے محظوظ ہوتے رہے ۔ ان مقابلوں میں ز کے فرائض ظہیر قدسی ، صالح ابنِ تابش اور حسین عاجز نے انجام دیے ۔ مہمان کی حیثیت سے جناب قاسم باغلا (رکن اکیڈمی جالنہ) شریک ہوئے ۔ جناب ابراہیم سیٹھ (نیشنل ٹراویلس) نے اس پروگرام کی صدارت فرمائی اور حامد اقبال صدیقی نے نظامت کے فرائض انجام دیے ابتدا میں ڈاکٹر یامین اختر فاروقی (ممبر سکریٹری اردو اکیڈمی) نے اساتذہ اور بچوں کا خیرمقدم کیا اور پروگرام میں ان کی غیر معمولی دل چسپ اور سرگرمی پر مسرت کا اظہار کیا ۔ اس ثقافتی پروگرام میں سارا دن ہال کھچا کھچ بھرا رہا اور مختلف اسکولوں کے طلبہ اپنی صلاحیتوں کا مظاہ کرتے رہے ۔

۲۳ / مئی کی صبح ساڑھے دس بجے سمینار کا باقاعدہ آغاز ہوا ۔ اے ٹی ٹی ہائی اسکول کے گراؤنڈ میں مدرسوں کے طلبہ نے بین باجے کے ساتھ ، سلامی دیتے ہوئے مہمانوں کا خیرمقدم کیا ۔ اس موقع کے لیے خصوصی طور پر تیار کردہ اردو کا پرچم جناب یوسف ناظم نے لہرایا ۔ پس منظر میں ترانہ ، اردو اور ترانہ ، ہندی بجتا رہا ۔ سمینار میں شرکت کے لیے ملک گیر سطح کی نام ور شخصیات اور بچوں کے ادب کے مستند ادبا و شعرا کے ساتھ سب مقامی و بیرونی مہمانان نے امن کی علامت کبوتر اڑائے اور رنگین غبارے بھی فضا میں چھوڑے ا اس طرح تالیوں کی گونج میں سمینار کا افتتاح ہوا ۔ دوسرا مرحلہ تھا بچوں کے کتب و رسائل کی نمائش کا ۔ جناب شمیم طارق نے ایک دن نمائش کا افتتاح کیا ۔ ادبِ اطفال سے متعلق نادر و نایاب کتابوں ، رسائل اور تصاویر کی نمائش نے اس سمینار کی آب و تاب میں اضا کیا ۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت جناب یوسف ناظم نے کی ، عثمان غنی انصاری نے مہمانوں کا تعارف کروایا اور ڈاکٹر یامین اختر فاروقی نے مہمانوں کا خیرمقدم کیا ، گل پوشی کی اور سمینار کی غرض و غایت بیان کی ۔ جناب ہارون بی ۔ اے (مدیر بےباک) نے شمع روشن کرا کی رسم ادا کی ۔ افتتاحی اجلاس میں سلام بن رزاق ، ساجد رشید شمیم طارق ، اقبال نیازی ، وکیل نجیب ، حیدر بیابانی ، مسرت بانو شیخ ، حا اقبال صدیقی ، معین الدین عثمانی ، رشید قاسمی ، صغیر احمد ، خیال انصاری ، ایم یوسف انصاری ، سلیم شہزاد ، اسحق خضر ، رفیع احمد ، مجر انجد ، عبدالحفیظ انصاری ، حاجی ابراہیم سیٹھ وغیرہ نے شرکت کی ۔ جناب شمیم طارق نے بچوں کا ادب کا جائزہ لیتے ہوئے پُر اثر تقریر کی انھوں نے کہا کہ اردو میں ناصحانہ اندازِ تحریر کے ساتھ تو بچوں کا ادب ہے لیکن بچوں کی نفسیات کے پیشِ نظر ادب تخلیق نہیں ہو رہا ہے

نیا ورق کے ایڈیٹر اور مشہور صحافی جناب ساجد رشید نے بچوں کے ادبی ذخائر کے اضافے میں مالیگاؤں کے ادبا و شعرا کی کاوشوں کا ذکر خصوصی طور پر کیا اور ان کی خدمات کا اعتراف بھی کیا ۔ ساجد رشید نے کہا کہ ہم میں سے کتنے والدین ایسے ہیں جو اپنے بچوں کے لیے رسائل خریدتے ہیں ؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے گھریلو اخراجات میں بچوں کے ادب کے لیے بھی بجٹ مختص کریں تاکہ ہمارے بچوں کا بچپن صحیح سمت میں سفر کرسکے بہ صورت دیگر موجودہ میڈیا ہمارے بچوں کو گم راہ کرکے رکھ دے گا ۔ جناب ہارون بی ۔ اے نے انگریزی زبان میں بچوں کے ادب کے سرمائے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو میں کم داموں پر خوب صورت جاذبِ نظر کتابیں اور رسائل بچوں کو مہیا نہیں ۔ ہارون صاحب نے اردو اکیڈمی سے اپیل کی کہ بچوں کے ادب کے لیے سالانہ کم از کم ۵ لاکھ روپے مختص کیے جائیں صدرِ جلسہ جناب یوسف ناظم نے اپنی طنز و مزاح سے پُر تقریر سے محفل کو زعفران زار بنادیا ۔ انھوں نے کہا بچوں کے ادب پر کام کم ہوا ہے اس کا اظہار بار بار کیا جاتا ہے اور ہم صرف افسوس جتاتے رہتے ہیں جب کہ بچوں کے ادب پر بہت کام ہوا ہے لیکن نہ جانے کیوں ہم احتجاجی لہجے میں ہربار کمی کا اظہار کرتے رہتے ہیں ۔ جناب یوسف ناظم نے خصوصی طور پر اس بات پر زور دے کر کہا کہ اردو میں بچوں کے ادب پر جس قدر سرمایہ مہیا ہے پہلے ہم ٹھیک سے اسے تو پڑھ لیں اور شکر ادا کریں ۔ بار بار شکوہ ہمیں زیب نہیں دیتا ۔ افتتاحی اجلاس نہایت کامیابی سے اختتام کو پہنچا ۔ دوپہر میں وقفہ ۔ طعام کے بعد شام ۳ بجے سمینار کے پہلے اجلاس کا آغاز ہوا ۔ صدر جناب سلام بن رزاق نے صدارت کی ۔ وکیل نجیب نے " بچوں کی کہانیاں " ۔ اسحٰق خضر نے " ادبِ اطفال میں نظم کا حصہ " ۔ حیدر بیابانی نے " بچوں کی نظمیں " ۔ مسرت بانو شیخ کے " اردو مدارس میں بچوں کی علمی ادبی سرگرمیاں " موضوع پر مقالے پڑھے ۔ سبھی مقالوں پر حاضرین نے مباحث میں حصہ لیا ۔ جناب سید عارف ۔ ساجد رشید ۔ شمیم طارق ۔ احمد عثمانی ۔ اقبال نیازی ۔ حامد اقبال ۔ ایم یوسف انصاری ۔ اقبال برکی ۔ ابراہیم شیخ وغیرہ نے بحث میں حصہ لیا ۔ نظامت کے فرائض صغیر احمد نے انجام دیے ۔ جناب سلام بن رزاق نے اپنی صدارتی تقریر میں پیش کردہ سبھی مقالات کا بھرپور جائزہ لیا اور مقالہ نگاروں کو مبارک باد پیش کی کہ انھوں نے متعدد سوالات اٹھائے ۔ سلام بن رزاق نے خصوصی طور پر اس بات کا اظہار کیا کہ ہمیں ان سوالات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ ادب کیا ہے ؟ ہم ادب کس کے لیے تخلیق کررہے ہیں ؟ ادب کی ضرورت آج کیوں ہے ؟ اور الکٹرانک میڈیا ہمارے بچوں کے ذہنوں پر کس طرح اثر انداز ہورہا ہے ؟ اس ضمن میں انھوں نے چند دل چسپ واقعات کی مدد سے بچوں کے نفسیاتی عمل کا جائزہ بھی لیا ۔

۲۴ / مئی کی صبح ۱۱ بجے اس سمینار کا دوسرا اجلاس پرنسپل پروفیسر عبدالحفیظ انصاری کی صدارت میں منعقد ہوا ۔ اس سیشن میں ۶ مقالے پڑھے گئے ۔ ایم ۔ یوسف انصاری " داستانِ ادبِ اطفال الف تا ی " خیال انصاری " مالیگاؤں میں ادبِ اطفال کی سرگرمیاں " معین الدین عثمانی " اردو مدارس میں علمی و ادبی سرگرمیاں " رشید قاسمی " بچوں کے اخبارات و رسائل " آفتاب حسنین " بچوں کا ادب اور ادیبوں کے مسائل " اور اقبال نیازی " بچوں کے ڈرامے " اس اجلاس میں بھی پیش کردہ مقالات پر بحث ہوئی اور بحث میں جناب سلام بن رزاق ۔ ساجد رشید ۔ شمیم طارق ۔ احمد عثمانی ۔ سراج دلاور ۔ اقبال برکی ۔ حامد اقبال ۔ شکیل کیفی ۔ عبدالرشید صدیقی وغیرہ نے حصہ لیا ۔ صدرِ جلسہ پروفیسر عبدالحفیظ انصاری نے پیش کردہ مقالات کا جائزہ لیا اور مقالہ نگاروں کو مفید مشوروں سے نوازا ۔ اس اجلاس کی نظامت حامد اقبال صدیقی نے کی ۔ شام میں ۶ بجے اس سمینار کا اختتامی اجلاس منعقد ہوا ۔ جناب یوسف ناظم نے صدارت کی مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے جناب مشتاق انتولے نے شرکت کی ۔ ڈاکٹر یاسین فاروقی نے مہمانِ خصوصی اور دیگر مہمانوں کا خیرمقدم کیا اور گل پوشی کی ۔ اس اختتامی تقریب میں ایک بار پھر ہال سامعین سے کھچا کھچ بھر گیا تھا جن میں نوجوانوں اور بچوں کی تعداد بھی خاصی تھی ۔ آغاز میں مختلف ثقافتی مقابلوں میں انعام یافتہ بچوں کو جناب مشتاق انتولے کے ہاتھوں انعامات اور اسناد تقسیم کیے گئے ۔ بچوں نے اپنی اعلیٰ

صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے نمونۃً اپنے آئٹمس پیش کیے ۔ بعد ازاں ادبِ اطفال کی تخلیقی سرگرمیوں کے لیے گراں قدر خدمات عوض مالیگاؤں کے چار اہم اور مستند ادیب اور شاعر کو خوب صورت یادگار تمغے و اسناد دے کر انھیں اعزاز بخشا گیا ۔ جناب مہ انتولے کے ہاتھوں یہ اعزاز جناب بختیار سعید ، جناب خیال انصاری ، جناب ندیم یوسف انصاری اور جناب رفیع احمد کو تفویض کیا گیا ۔ سے قبل جناب سلیم شہزاد نے سمینار کے ان اجلاسوں میں پڑھے گئے مقالات کا بھر پور جائزہ پیش کیا ۔ جناب مشتاق انتولے نے تقریر میں اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا کہ مالیگاؤں کی خواتین بھی تعلیم اور ادب کے معاملے میں بیدار ہیں ۔ آپ نے خاص حضرت ادیب مالیگانوی کا ذکر کرتے ہوئے مالیگاؤں کے شعرا و ادبا سے بچپن سے اپنی وابستگی کا ذکر کیا اور کہا کہ بمبئی کے بعد مالیگاؤں میں اردو زبان و ادب کی بہت خدمت ہو رہی ہے ۔ ایم ایل سی جناب مشتاق انتولے جو اردو اکیڈمی کے رکن بھی ہیں نے ممبر سکریٹری ڈاکٹر یامین اختر فاروقی کی سرگرمیوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے اہم ترین پروگرام پہلے صرف بمبئی میں ہوا کرتے تھے لیکن فاروقی نے اسے ریاست کے مختلف اضلاع تک پہنچانے کا اہم کام کیا اور مستقبل میں بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا ۔ صدرِ جلسہ ڈاکٹر یوسف ناظم نے بھی اردو زبان و ادب کے لیے مالیگاؤں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اس سہ روزہ ادبِ اطفال سمینار کو ایک کامیاب قرار دیا ۔ سمینار میں ہر طرح کی معاونت کے لیے جناب ابراہیم سیٹھ کو توصیفی سند اور بشیر سر اور دیگر اساتذہ کے ساتھ مالیگاؤں آرٹس اینڈ کلچرل کے صدر جناب سراج دلار کو بھی توصیفی اسناد پیش کی گئیں ۔ ڈاکٹر یامین فاروقی نے نام بہ نام ہر ایک کا شکریہ ادا کیا ۔ اہلیانِ مالیگاؤں کی جانب سے ڈاکٹر یامین اختر فاروقی کی کاوشوں کا اعتراف پروفیسر اسماء شیخ نے کیا اور انھیں تہنیتی گل پیش کیے ۔ اس موقع پر رسالہ " پاسبانِ تعلیم " نے سمینار پر ایک مخصوص شمارہ شائع کیا جسے مہمانوں میں تقسیم کیا گیا اور ۲۴ / مئی کی شب ۸ بجے عظیم الشان سہ روزہ ادبِ اطفال سمینار کا باوقار اختتام ہوا ۔

○●○

(سلسلہ ص : (۹۴) سے)

نتائجِ امتحانات

ادارہ	۱ ۔ نتائجِ امتحانات ادارہ ، ادبیاتِ اردو ، حیدرآباد ۔ منعقدہ جون ۱۹۹۷ ء	جون	ص :
"	۲ ۔ نتائجِ امتحانات ادارہ ، ادبیاتِ اردو ، حیدرآباد ۔ منعقدہ اکتوبر ۱۹۹۷ ء	اکتوبر تا دسمبر	ص

○●○

سید جلیل الدین

اشاریہ ماہ نامہ "سب رس" حیدرآباد
جنوری تا دسمبر ۱۹۹۷ء

مقالے

تعارف

آپ بیتی

تجزیہ

افسانے

؛رہ احمد	۱۔ میں، آئینہ اور وہ	اکتوبر تا دسمبر	ص: ۴۹
" "	۲۔ کانچ کا کھلونا	" "	ص: ۶۱
" "	۳۔ ہرجائی	" "	ص: ۸۴
لت عثمان / ترجمہ: قاسم ندیم	پاسبان	" "	ص: ۱۱۱
نیل او ستھی ۔ ڈاکٹر جمہ: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	اجگر	جون	ص: ۳۹
ام جیلانی	چھوٹی سی بات	جولائی تا ستمبر	ص: ۹۲
انز کافکا / ترجمہ: محمود ایاز	فیصلہ	مئی	ص: ۹
ی کھلانی / ترجمہ: حیدر جعفری سید	کاکاتوا (سندھی کہانی)	جولائی تا ستمبر	ص: ۹۹
ھوی کٹی / ترجمہ: حیدر جعفری سید	بنجر زمین (ملیالم افسانہ)	اکتوبر تا دسمبر	ص: ۱۰۵
ملفیٰ شہاب	ہم جنس	جنوری تا مارچ	ص: ۹۱
سود الٰہی شیخ	۱۔ دل نہ دریا، سمندر خالی	جنوری تا مارچ	ص: ۸۱
"	۲۔ چوتھی شرمندگی	مئی	ص: ۵۱

ریڈیائی تمثیل

؛اق حسین	گولکنڈہ	اپریل	ص: ۳۶

خطوط

؛دیقی ۔ صفی الدین ۔ ڈاکٹر	خطوط بنام ڈاکٹر رضی الدین صدیقی	جون	ص: ۲۱

نظمیں

ثار نسیم	۱۔ قابیل کی موت	اکتوبر تا دسمبر	ص: ۴۱
" "	۲۔ ایک مختصر سہرا	" "	"
سم کاشمیری	۱۔ ایک یاد کی دستک چھوڑ گئے	جنوری تا مارچ	ص: ۴۶
" "	۲۔ چپ کا سناٹا	" "	ص: ۴۷
" "	۳۔ بھاری بھرکم لڑھکتے دن	" "	ص: ۴۸
" "	۴۔ حیرت خاں ڈوب گیا حیرت میں	" "	ص: ۴۹
" "	۵۔ مسٹر جی ۔ ایس شاہ اور ان کی قبر	" "	ص: ۵۰

چارلس بودلیر / ترجمہ، مظہر مہدی	۱۔ بارگاہِ حسن میں	اکتوبر تا دسمبر	ص
" " "	۲۔ بالکنی	" "	ص
" " "	۳۔ البا ٹروس	" "	ص
" " "	۴۔ قہر	" "	صر
" " "	۵۔ شاعری کے ضمیر فروش	" "	صر
" " "	۶۔ سمندر اور آدمی	" "	صر
" " "	۷۔ نقشِ تصور	" "	صر
" " "	۸۔ اجنبی	" "	م
راشد آذر	تم سے یہ بھی نہ ہوا	جون	م
ساحل احمد	یہ آنسو روشنی کے ہیں	جون	م
شیندر کمار / ترجمہ، فردوس گیاوی	تلافی	جنوری تا مارچ	م
سیدہ حنا	ماہیے	اکتوبر تا دسمبر	م
شاہین	میری پلکوں سے لپٹی ہے جو خاکِ افلاکیاں	" "	
"	موت بھی رحم کے قابل ہے	" "	
"	بابری مسجد	" "	
"	وہ گلی ہر شہر میں موجود ہے	" "	
"	نیا سال	" "	
شہاب اختر	۱۔ معدوم شناسائی	" "	
" "	۲۔ برسات	جنوری تا مارچ	
ضیا جالندھری	زوال	جولائی تا ستمبر	
عطیہ فاطمہ	۱۔ ضرورت	" "	
" "	۲۔ سایہ	" "	
" "	۳۔ فتیلہ	جنوری تا مارچ	
علی ظہیر	نذرِ حافظ شیرازی	" "	
فاطمہ تاج	اشکوں کی دیوار	اکتوبر تا دسمبر	
فصیح اکمل	غزلیہ	جولائی تا ستمبر	
قاسم ندیم	۱۔ ویرانیِ دل	جنوری تا مارچ	
" "	۲۔ بے قراری	" "	

قاسم ندیم	۲۔ بت	جولائی تا ستمبر	ص: ۶۸
ان بہادر سنگھ / ترجمہ قاسم ندیم	ماں جانتی ہے	جنوری تا مارچ	ص: ۶۲
محسن جلگانوی	امربیل	مئی	ص: ۴۴
محمود ایاز	۱۔ نوحہ	مئی	ص: ۱۳
" "	۲۔ شبِ چراغ	مئی	ص: ۱۴
" "	۳۔ ایں نکتہ کہ ہستم من	مئی	ص: ۱۵
" "	۴۔ ایک نظم	"	ص: ۱۵
" "	۵۔ کفارہ	"	ص: ۱۶
محمود درویش (فلسطین)	ایک نظم	"	ص: ۴۲
ترجمہ: سید خالد قادری			
مصحف اقبال توصیفی	ایک نظم ۔۔ تمھارے نام	جنوری تا مارچ	ص: ۵۴
مظہر مہدی	۱۔ زمین کا المیہ	" "	ص: ۵۴
" "	۲۔ ایک نظم	" "	ص: ۵۶
منیر نیازی	میرے آس پاس خواب کی کیفیت ہے	جون	ص: ۴۲
میر ہاشم	۱۔ تمھاری مرضی	جنوری تا مارچ	ص: ۵۲
"	۲۔ معجزہ	" "	ص: ۵۳
نثار ۔ نثار احمد	روز و شب کی ارزانی	جولائی تا ستمبر	ص: ۶۶

غزلیں

اثر ۔ محمد علی ۔ ڈاکٹر	۱۔ وقت ہی جب درپئے آزار ہے	جنوری تا مارچ	ص: ۴۰
"	۲۔ جانے کب اک موڑ پہ آئے	" "	ص: ۴۰
"	۳۔ مرا "میں" ہم سفر ہے اور میں ہوں	جولائی تا ستمبر	ص: ۸۵
احسن سلیم	۱۔ ساتھ رہ کر بھی رفاقت نہیں ہوتی	" "	ص: ۵۳
" "	۲۔ مٹی میں نہاں زبان بھی ہے	اکتوبر تا دسمبر	ص: ۷۹
احسن عزیز	قیام و رفت کی تمثیل روز و شب مسلسل دیکھتے ہیں	جولائی تا ستمبر	ص: ۷۹
احمد فراز	غم تمھارا تھا زندگی گویا	جون	ص: ۳۱
اختر نظمی ۔ ڈاکٹر	تنگ ہر رہ گزر ، نہ کردینا	جولائی تا ستمبر	ص: ۸۳
اسعد بدایونی	۱۔ نہ مہر و ماہ نہ ہیاد گل سے روشن ہے	" "	"

اسد بدایونی	۲۔ فصیلِ قصرِ انا عشق نے گرادی ہے	جون	ص: ۲۳
اعجاز ۔ بھگوان داس	ایک تو دکھ پہچان کا گھیرے ہے دن رات	اکتوبر تا دسمبر	ص: ۹۴
افتخار نسیم	۱۔ غم سے آزاد بھی نہیں کرتا	جون	ص: ۲۹
" "	۲۔ ملنے والے بچھڑ بھی جاتے ہیں	"	"
" "	۳۔ غم سے پاگل جو ہونے لگتے ہیں	"	"
" "	۴۔ آر سے پار سے نہیں نکلا	"	ص: ۳۰
اقبال متین	ہوا ہے تیز تو بے آب و گل ہی جائے گا	جنوری تا مارچ	ص: ۶۴
اکبر حیدرآبادی	میری محبت زندہ ، میرا درد مثالی تھا	جون	ص: ۳۱
اکمل حیدرآباد	کس کو غزل سنائیں غزل آشنا ہے کون	جنوری تا مارچ	ص: ۶۸
اوشا بھدوریا	روشنی کے خواب پلکوں پر کھلاتا کون ہے	جولائی تا ستمبر	ص: ۸۴
بے حس الٰہ آبادی	ہر ستے گام پہ منت کشِ آزار ہیں ہم	مئی	ص: ۴۸
جمال اویسی	۱۔ چراغِ دیر جلا گم ہوئی مری ہستی	"	"
" "	۲۔ یہ جو سادہ ورق ہے اسے جاناں	اکتوبر تا دسمبر	ص: ۵۷
" "	۳۔ ہر لحہ مری جان کو ہے خطرہ ، عدم	" "	"
" "	۴۔ ہم رفتگاں جانے کہاں گم ہوگئے	" "	ص: ۵۸
حامدی کاشمیری	دل کہ خوگر دہ ، غم ہے کب سے	جولائی تا ستمبر	ص: ۶۹
حسن داد خاں	۱۔ افشائے راز کس نے کیا ، آئینہ کہ میں	" "	ص: ۸۴
" "	۲۔ کچھ جانے پہچانے چہرے ، کچھ بھولی بسری باتیں	اکتوبر تا دسمبر	ص: ۴۹
حمید الماس	نشیدِ صبح سے منسوب زندگی ہوگی	جنوری تا مارچ	ص: ۶۸
خواجہ رضی حیدر	۱۔ ختم کر مجھ پہ شب و روز کی یکسانی کو	" "	"
" "	۲۔ کبھی مکاں میں کبھی رہ گزر میں رہتے ہیں	اکتوبر تا دسمبر	ص: ۲۰
ذکی بلگرامی	۱۔ بس ایک دھیان تمھارا ہے اور کچھ بھی نہیں	" "	"
" "	۲۔ یارانِ گم شدہ کی نہ یادوں کی آہٹیں	جون	ص: ۱۷
راز الٰہ آبادی ۔ شفیع اللہ خاں	زمانہ جس کو ٹھکراتا رہا ہے	اکتوبر تا دسمبر	ص: ۱۳
راہی ۔ غلام مرتضیٰ	جہاں والا وہی ایک اپنی ذات سے تھا	" "	ص: ۴
رئیس ۔ رئیس الدین	۱۔ مرے قدموں تلے افلاک کر دے	جنوری تا مارچ	ص: ۱۴
" " "	۲۔ زباں شناس بھی لب آشنا نہیں ہوتے	" "	"
" " "	۳۔ زندگی سر بسر اک دیدہ ، حیراں ہے تو کیا	مئی	ص: ۵

رئیس ۔ رئیس الدین	۴ ۔ مجھ سے کب ترکِ انا ممکن ہوا	مئی	ص: ۳۵
" " "	۵ ۔ زمیں سے لے کے سرآسماں بناؤں میں	اکتوبر تا ستمبر	ص: ۵۹
زبیر شفائی	۱ ۔ لو، چراغ اپنی نگلنا چاہتا ہے	" "	ص: ۵۵
" "	۲ ۔ اب اپنے فکرِ سخن کون مجھے اکسائے	" "	"
" "	۳ ۔ نہ صرف موجہ، خوں پیچ و تاب دیتا ہے	اکتوبر تا دسمبر	ص: ۵۶
" "	۴ ۔ نفس مزوک ٹھہرا دوں کہ خال و خد بدل دوں میں	" "	"
ساحل احمد	گھر میں رہنے کیوں نہیں دیتی ہوا	جولائی تا ستمبر	ص: ۸۲
سلمان عباسی ۔ ڈاکٹر	۱ ۔ دل گرفتارِ جفائے صنمِ چند رہا	مئی	ص: ۳۹
" " "	۲ ۔ دل کہتا ہے بھولی بسری میری کہانی لکھتے جاؤ	"	"
" " "	۳ ۔ اپنوں سے دوستی نہ سہی ڈر کبھی نہ تھا	اکتوبر تا دسمبر	ص: ۴۰
سلیم محی الدین	زندگی جب اڑان بھر دینا	" "	ص: ۹۳
شاذ تمکنت	۱ ۔ جانے والے تجھے کب دیکھ سکوں بارِ دگر	" "	"
" "	۲ ۔ یہ مری زخم نصیبی یہ تری حیرانی	جولائی تا ستمبر	ص: ۸۰
شاہین	۱ ۔ کیا کیا رہی نہ گرمیِ بازار شب بخیر	" "	"
"	۲ ۔ کٹ ہی جائے گا سفر آہستہ چل	اکتوبر تا دسمبر	ص: ۴۸
"	۳ ۔ بے تعلقی چاہوں پھر بھی بات آجائے	" "	ص: ۴۹
شکیل اعظمی	۱ ۔ برہنہ سر ہوں ایک دستار دے دے		
" "	۲ ۔ ندی کو آب دیا ہے تو کچھ بہاؤ بھی دے		
" "	۳ ۔ غلط تھا، پر ہمارے نام تھا کچھ	جنوری تا مارچ	ص: ۹۴
" "	۴ ۔ شام کے دھندلکے سے اک خیال آتا ہے	" "	"
" "	۵ ۔ گر گئی چھت دراڑ ہونے سے	مئی	ص: ۳۶
صابر، فخرالدین	ہم کو آیا نہ کبھی خوف و خطر میں رہنا	"	ص: ۵۰
ظفر مرادآبادی ۔ ڈاکٹر	ہر چند جستجو نے ندی تک سفر کیا	جولائی تا ستمبر	ص: ۸۲
عرفان پربھنوی	دلوں میں پیار نگاہوں میں دوستی نہ رہی	اکتوبر تا دسمبر	ص: ۹۱
عزم بہزاد	۱ ۔ قسمت کو جو لوگ رو رہے ہیں	" "	"
" "	۲ ۔ مرے خدا نے مجھے کتنا سرفراز کیا	" "	ص: ۵۱
عشرت ظفر	۱ ۔ قطرہ قطرہ ہو چکے ہیں جذب ہر پیکر میں ہم	" "	"
" "	۲ ۔ یہ کس نے کہہ دیا تجھ سے کہ ساحل چاہتا ہوں میں	" "	ص: ۵۰

غیاث صدیقی ۔ ڈاکٹر	میں تیری ہر صفت ہوں ، ترا آفریدہ ہوں	مئی	ص: ۳۹
فاطمہ تاج	۱۔ میں ہوں دلِ معتطر ہے ترے غم کی گھڑی ہے	جنوری تا مارچ	ص: ۶۰
" "	۲۔ حدودِ شام و سحر توڑ کر نکلتے ہیں	اکتوبر تا دسمبر	ص: ۹۲
قمر ۔ قمر حیدر ، سید	سدا کسی نہ کسی چیز کی کمی ہی رہی	مئی	ص: ۵۰
کاوش عباسی	۱۔ شب و روز اک جدائی مرے دل میں جو بسی ہے	"	"
" "	۲۔ کہنے کو میرے تن پہ جو ٹانکے رفو کے ہیں	جنوری تا مارچ	ص: ۶۹
" "	۳۔ آ پہنچا انتظار بھی گھٹ کر دنوں تلک	" "	"
" "	۴۔ رہ میں یہ خفتِ سخن پوچھے نہ کوئی حال بھی	جولائی تا ستمبر	ص: ۸۱
کرامت ۔ کرامت علی ۔ ڈاکٹر	تو جو گل ہے تو چاہوں تنہ نابایا ہو	جنوری تا مارچ	ص: ۶۶
محسن جلگانوی	۱۔ کیا شہر ہے یہ کوئی کسی سے نہیں ملتا	" "	"
" "	۲۔ سب اثاثہ متاعِ آب ہوا	مئی	ص: ۳۷
" "	۳۔ یقیں کے ہاتھ عطا کر گمان تھوڑا سا	جولائی تا ستمبر	ص: ۸۳
محمود ایاز	۱۔ حیرتِ جلوہ مقدر ہے تو جلوہ کیا ہے	" "	"
" "	۲۔ ہوائے یاس چلی لے کے کن زمانوں میں	مئی	ص: ۱۷
" "	۳۔ کروڑوں سال کا دیکھا ہوا تماشا ہے	"	"
" "	۴۔ کون سا وہ لمحہ ، محشر ہے جو گزرا نہیں	"	ص: ۱۸
" "	۵۔ نہ کوئی برقِ تجلی نہ کوئی عرشِ بریں	"	"
" "	۶۔ آہ بھی نارسا نہ تھی ، درد بھی لادوا نہ تھا	"	ص: ۱۹
" "	۷۔ اشعار	"	ص: ۲۰
مصطفیٰ شہاب	۱۔ جنگ پھر اس سے ٹل گئی ٹھن کر	جنوری تا مارچ	ص: ۹۵
"	۲۔ گواہی دل کی ہم تسلیم کرتے	" "	"
" "	۳۔ کوئی آنسو بھی کاغذی نہ ہوا	اکتوبر تا دسمبر	ص: ۵۳
میر ہاشم	۱۔ ویسے کہنے کو تو یہ سارا جہاں ہے میرا	" "	"
"	۲۔ میں آگہی کے سفر میں ہوں ، جزر و مد میں ہوں	جنوری تا مارچ	ص: ۹۳
نادر اسلوبی	آپ اپنے کو جو بے دار نہیں کر سکتا	مئی	ص: ۴۸
نثار ۔ نثار احمد	ہوا کے جھونکے غبارِ اب کے کم اٹھاتے ہیں	جولائی تا ستمبر	ص: ۸۶
نعمت انور حوری	۱۔ اک شورِ محشر تھا بپا تم چپ رہے ہم چپ رہے	" "	"
" " "	۲۔ عمرِ رفتہ کی ہمیں کیا کیا نہ یاد آنے لگی	اکتوبر تا دسمبر	ص: ۹۱

اشاریہ

جلیل الدین ۔ سید	اشاریہ ماہ نامہ "سب رس" حیدرآباد جنوری تا دسمبر ۱۹۹۷ء	جنوری تا مارچ	ص: ۱۰۸

اداریے

ادارہ	۱۔ پہلی بات	جنوری تا مارچ	ص: ۳
"	۲۔ پہلی بات	جولائی تا ستمبر	ص: ۳
مغنی تبسم ، پروفیسر	پہلی بات	مئی	ص: ۳

مطالعے

اعجاز حسین بٹالوی	دست سوس	جنوری تا مارچ	ص: ۳۳
عباس علی ۔ محمد ، پروفیسر	ہندستان ،اسلام اور مغربی ایشیا "مصنف، پروفیسر محمد شفیع آگوانی	جون	ص: ۴۳
غلام جیلانی	دھواں (گلزار کے افسانوں کا مجموعہ)	اکتوبر تا دسمبر	ص: ۱۱۵
مغنی تبسم ، پروفیسر	حیدرآباد کی سیر	جولائی تا ستمبر	ص: ۷۱
نثار احمد ۔ ڈاکٹر	"حنظل " مصنف ، بیگ احساس	جنوری تا مارچ	ص: ۳۷
یوسف ناظم	۱۔ مت سہل ہمیں جانو	جون	ص: ۴۶
" "	۲۔ ندا فاضلی "کھویا ہوا کچھ " کے پردے میں	جولائی تا ستمبر	ص: ۹۸

تبصرے

اثر ۔ محمد علی ، ڈاکٹر	۱۔ "ٹیچر کے بغیر" (محمد خالد عابدی)	جنوری تا مارچ	ص: ۹۹
" " "	۲۔ "مضامینِ خالد" (محمد خالد عابدی)	" "	ص: ۹۹
" " "	۳۔ "دبستانِ گولکنڈہ کی شاعری میں ہندستانی عناصر" (ڈاکٹر عبدالستار ساحر)	جون	ص: ۵۱
اسلم عمادی	۱۔ "صحرا" (حنیف ترین)	جنوری تا مارچ	ص: ۹۴
" "	۲۔ "حق تو یہ ہے کہ (شبیب احمد کاف) مرتبہ، آمنہ تحسین	" "	ص: ۹۵
" "	۳۔ شام ڈھلے سویرا (مصطفیٰ شہاب)	" "	ص: ۹۵
" "	۴۔ بوستانی (تسنیم کوثر)	" "	ص: ۹۶
" "	۵۔ "تال ناڈو کے صاحبِ تصنیف علماء" (علیم صبا نویدی)	" "	ص: ۹۷

اسلم عمادی	۶ ۔ " متاعِ ہنر " (محمود سروش)	جنوری تا مارچ	ص : ۹۸
" "	۷ ۔ " علامہ عبدالحق احقر بنگوری ـــ حیات اور کارنامے " (ڈاکٹر قدرت اللہ باقوی)	"	" "
بیگ احساس ۔ ڈاکٹر	۱ ۔ " بے منظری کا سفر نامہ " (حمید سہروردی)	جولائی تا ستمبر	ص : ۱۱۸
" " "	۲ ۔ ایک نیزہ اونچا آسمان (اکبر زاہد)	" "	ص : ۱۱۹
رخسانہ سلطانہ	" روپیوں کا پیڑ " (رشید انور)	اکتوبر تا دسمبر	ص : ۱۲۰
رفعت النساء بیگم ۔ ڈاکٹر	۱ ۔ " قصائدِ جذب " (جذب گوپال پوری)	" "	ص : ۱۲۵
" " "	۲ ۔ " پرچھائیوں کے درمیاں " (اوشا بھدوریہ)	" "	ص : ۱۲۶
سلیمان اطہر جاوید ۔ پروفیسر	" مرزا غالب " (نتالیا پری گارینا / ترجمہ : اسامہ فاروقی)	جولائی تا ستمبر	ص : ۱۱۳
سعود ادیبی	" نگارستانِ تاریخ " (کلیم سرونجی)	اکتوبر تا دسمبر	ص : ۱۲۱
قدیر زماں	" موسمی پرندے " (انل ٹھکر)	" "	ص : ۱۱۸
مصنظر مجاز	" ارضِ بے پیغمبر " (مظہر مہدی)	جنوری تا مارچ	ص : ۱۰۰
مغنی تبسم ۔ پروفیسر	۱ ۔ تاریخ کا سبق (THE LESSONS OF HISTORY) (ول ریوراں ، ایریل ریوراں / ترجمہ : محمد بن علی با وہاب)	جون	ص : ۳۸
" " "	۲ ۔ " یادوں کی رہ گزر " (کے ۔ یس ۔ شفیق)	"	ص : ۵۰
" " "	۳ ۔ " شیخ العالم ـــ حیات اور شاعری " (پروفیسر حامدی کاشمیری)	جولائی تا ستمبر	ص : ۱۱۳
" " "	۴ ۔ " شہر آشوب ایک تجزیہ " (ڈاکٹر امیر عارفی)	" "	ص : ۱۱۷
وقار خلیل	۱ ۔ " لہو کی آنچ " (علی احمد جلیلی)	جون	ص : ۵۲
" "	۲ ۔ بہار میں اردو طنز و ظرافت (سلطانہ آزاد)	"	ص : ۵۲
" "	۳ ۔ " اردو بک ریویو " دہلی	"	ص : ۵۳
" "	۴ ۔ " تجلیاں " (مدنا منظر)	"	ص : ۵۳
" "	۵ ۔ " الماس ربا " (ساغر جنیدی)	"	ص : ۵۳
وہاب عندلیب	" مصباحِ تصوف " (ڈاکٹر عقیل ہاشمی)	اکتوبر تا دسمبر	ص : ۱۲۳

خبریں

ادارہ	۱ ۔ ادارے کی خبریں	جولائی تا ستمبر	ص : ۱۰۶
	۲ ۔ ادارے کی خبریں	اکتوبر تا دسمبر	ص : ۱۳۲

وقار خلیل	ادارے کی خبریں	جنوری تا مارچ	ص: ۱۰۲

تقاریر

جعفر نظام ۔ پروفیسر	خطبۂ استقبالیہ (یوم محمد قلی قطب شاہ ۱۹۹۷ء)	اپریل	ص: ۸
شاہ عالم خاں ۔ نواب	خطبۂ افتتاحیہ (اڑتیسویں یوم محمد قلی قطب شاہ کے موقع پر)	"	ص: ۱۰
مغنی تبسم ۔ پروفیسر	تقریر — یوم محمد قلی قطب شاہ کی معنویت	"	ص: ۱۱

رپورٹ

اردو اکادمی ۔ دلی	ادب کا بدلتا ہوا منظر نامہ — مابعد جدیدیت اردو کے تناظر میں (سہ روزہ قومی سمینار)	جنوری تا مارچ	ص: ۴۰
قادری ۔ صفی الدین ، سید	رپورٹ — یوم محمد قلی قطب شاہ ۱۹۹۷ء	اپریل	ص: ۱۲
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ، نئی دلی	نوآبادیاتی فکر کے منفی اثرات اردو زبان اور ادبی نظریات پر (سہ روزہ قومی سمینار)	اکتوبر تا دسمبر	ص: ۱۲۸
وقار خلیل	یوم محمد قلی قطب شاہ کا منظر نامہ	اپریل	ص: ۳

وفیات

وقار خلیل	۱۔ ڈاکٹر وحید اختر	جنوری تا مارچ	ص: ۱۰۵
" "	۲۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	" "	"
" "	۳۔ حضرت راز الہ آبادی	" "	"
" "	۴۔ جلیس عابدی	" "	"
" "	۵۔ ڈاکٹر عنایت اللہ منظر اعظمی	" "	"
" "	۶۔ بیگم ممتاز مرزا	" "	"
" "	۷۔ شمیم نصرتی	" "	"
" "	۸۔ محبوب حسین جگر	مئی	ص: ۵۶
" "	۹۔ قلی عباس عباسی	"	"
" "	۱۰۔ حسینی جاوید	"	"
" "	۱۱۔ فکری بدایونی	"	"

(سلسلہ ص ۱۳۸ پر)

سب رس کتاب گھر

فہرست کتب

مطبوعاتِ ادارہ ، ادبیاتِ اردو ، حیدرآباد ۔

شاعری

صبر و شکر	تہنیت النسا بیگم	10=00
تنویرِ تخیل	المعی حیدرآبادی	20=00
دیوانِ داؤد اورنگ آبادی	مرتبہ : خالدہ بیگم	15=00
ماہ لقا	عزیز احمد	15=00
ورق در ورق	سید مظفر الدین صاحب	25=00
انوار	علی اختر	20=00
سخنِ حیدر	مرتبہ : احمد پاشاہ قادری	15=00
سلسلہ در سلسلہ	مظفرالدین صاحب حیدرآبادی	8=00
آبگینہ ، شعر	بشیر النساء بیگم بشیر	30=00
آتشِ بے نام	صاحب حیدرآبادی	20=00
طالب و موہنی	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	15=00
تسلیم و رضا	تہنیت النسا بیگم	10=00
ترجمانِ زندگی	سید علی منظور	20=00
گلستانِ حمد ، نعت ، منقبت	صاحب حیدرآبادی	25=00
نمودِ زندگی	سید علی منظور	20=00
سخن در سخن	صاحب حیدرآبادی	25=00
رمزِ سخن	محی لدین قادری زور	0=00
دیوانِ عشق	مرزا جلال اللہ عشق	5=00
انجمن در انجمن	صاحب حیدرآبادی	0=00
زبانِ شمع	صاحب حیدرآبادی	0=00
مہکتے ویرانے	بانو طاہرہ سعید	0=00
فیضِ سخن	شمس الدین فیض	
	/ مرتبہ : ڈاکٹر زور	5=00
سلکِ گوہرین	محمد جلال الدین اشک	5=00
کلام معظم بیجاپوری	مرتبہ : ابوالنصر محمد خالدی	0=00
ارمغانِ جذب	راگھویندر راؤ	5=00

تاریخ

تاریخ گول کنڈہ (انگریزی)	عبدالمجید صدیقی	0=00
مسلمان شاہی خاندان	محمد عبدالرحمن خاں	0=00
قطب شاہی سلاطین (انگریزی)	ڈاکٹر زور	0=00
مال والوں کی سیر	مراد علی طالع	0=00

بہ یادگار سید محی الدین قادری زورؔ

سن اجراء : ۱۹۳۸ء — فون , 3310469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد : ۶۰ — جولائی ۱۹۹۸ء — شمارہ : ۷

فی پرچہ	:	۱۲	روپے
زرسالانہ	:	۱۲۵	روپے
کتب خانوں سے	:	۱۵۰	روپے

مشرق وسطیٰ اور امریکہ	:	۲۵ ڈالر
پاکستان ، برما ، سری لنکا و بنگلہ دیش	:	۱۸ ڈالر
انگلستان	:	۱۵ پونڈ

ناشر : ادارہ ادبیاتِ اردو ، پنجہ گٹہ روڈ ، حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۸۲ (اے ۔ پی) انڈیا ۔

کمپیوٹر کتابت ، جی ۔ جی ۔ کمپیوٹرس ، مہدی پٹنم ، حیدرآباد ۔ / شارپ کمپیوٹرز چادرگھاٹ ، حیدرآباد ۔

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر ، پرنٹر ، پبلیشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے سنے او ایس گرافکس عدان گوڑہ میں طبع کرواکے ادارہ ادبیاتِ اردو سے شائع کیا ۔

اس شمارے میں

○●○

اختر حسن

یادوں کی سیر گاہ

(نویں اور آخری قسط)

چند اور احباب میں بہت یار باش نہیں تھا پھر بھی میرے دوستوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ یہاں میں ان میں سے اپنے چند یک مخصوص دوستوں کا ذکر کروں گا۔

۔ **سبطِ حسن** ان کا تعلق مدھیہ پردیش سے تھا مگر رہتے بمبئی میں تھے۔ قاضی صاحب غالباً ان کو مرادآباد سے جانتے تھے اور نھیں کے بلانے پر وہ حیدرآباد آئے تھے اور کافی عرصے تک قاضی صاحب کے ساتھ پیام میں کام کرتے رہے تھے۔

سبطِ حسن بےحد ذہین نوجوان تھے اور ترقی دوست۔ یہاں کے ترقی پسند ادیبوں سے ان کا بہت جلد میل جول ہوگیا۔ اس من میں میرا بھی ان سے تعارف ہوا اور دوستی ہوگئی۔ وہ بہت ACTIVE آدمی تھے اور اچھے ادیب بھی۔ حیدرآباد کے بارے میں ی انھوں نے ایک کتاب لکھی ہے "شہرِ نگاراں" کے نام سے، جس پر میں نے اس زمانے میں بہت سخت تبصرہ کیا تھا کہ سبطِ حسن یے سیاسی شعور رکھنے والے افراد بھی جب حیدرآباد کی باتیں کرتے ہیں تو اسے صرف "شہرِ نگاراں" سمجھ کر مخدوم کا اور یہاں کے سرے شاعروں کا ذکر کرتے ہیں۔ ادبی اور شعری محفلوں کی روئیداد سناتے ہیں لیکن یہاں کے سیاسی سماجی شعور اور یہاں کی ایسی ریکوں کو نظر انداز کردیتے ہیں جن کا حیدرآباد کی تاریخ و تہذیب پر گہرا اثر رہا ہے، سبطِ حسن سے ہماری یہ توقعات تھیں کہ وہ کم از کم ں طرف توجہ کریں گے۔

بہت دنوں بعد جب وہ ایک بار پھر چند روز کے لیے حیدرآباد آئے تو میری ان سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ انھیں میرا تبصرہ یاد ما اور انھوں نے اعتراف کیا کہ آپ نے بعض باتیں صحیح لکھی تھیں مگر اس وقت میں ان باتوں کا ذکر کرتا تو آپ کے ہاں کتاب BAN ہوجاتی اس لیے میں نے قلم روک کر باتیں کیں۔ وہ دراصل بہت سلجھے ذہن کے آدمی تھے۔ پاکستان چلے گئے تھے اور وہاں جانے کے بعد انھوں نے بہت لکھا۔ میرے بہت اچھے دوست تھے افسوس اب وہ اس دنیا میں نہیں۔

۔ **ساغر نظامی** اردو کا یہ ایک خوش گو اور حسین و جمیل شاعر، میں اس سے کب اور کیسے ملا؟

میرے روم میٹ ہریش چندر استھانہ کے ایک رشتہ دار تھے للیتا پرشاد۔ بہت دل چسپ آدمی تھے۔ نظام شوگر فیکٹری سے ان تعلق تھا اور فیکٹری کے قریب کچھ اراضی بھی ان کی ملکیت تھی جس پر وہ گنے کی کاشت کرتے تھے۔ یہ للیتا پرشاد صاحب شاعر دوست ے اور خود بھی شعر کہتے تھے۔ زیادہ تر لمبی لمبی تاریخی نظمیں لکھتے تھے اور سنانے پر آتے تو ایک ہی سانس میں پوری نظم سنادیتے۔ ایک ز دوپہر کے قریب ہمارے ہاسٹل آئے اور نظم کی طرح ایک ہی سانس میں یہ داستان سنائی کہ آج ہی میں دلی سے لوٹا ہوں اور میرے اتھ ایک مشہور شاعر بھی آئے ہیں جو دلی سے میرے ہم سفر ہوگئے تھے۔ انھیں کسی نہ کسی طرح ایک دن کے لیے قطعِ سفر کرنے اور

حیدرآباد میں غریب خانے پر ٹھہرنے کے لیے آمادہ کرلیا ہے ۔ وہ مدراس کے کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے جارہے ہیں ۔ کل ان کو وہاں پہنچنا ہے اور وہ ہیں ساغر نظامی ۔ غائبانہ میں نے اختر ، تمھارا تعارف ان سے کرادیا ہے اور وہ تم سے ملنے کے مشتاق ہیں اور بے چینی سے منتظر ۔ ۔ ۔ ظاہر ہے ان کی اتنی لمبی " تقریر " کے بعد انکار کا کوئی سوال نہ تھا ۔ میں اسی وقت ہریش چندر کو ساتھ لے کر ان کے گھر چلا گیا ۔ ان کا گھر ہریش چندر کے گھر سے ملا ہوا تھا دراصل وہ ایک ہی بہت بڑا مکان تھا جس کے مختلف حصے تھے ۔ خیریت آباد کے موڑ پر واقع تھا لیکن آج اس کی ہیئت بالکل بدل گئی ہے ۔ کنج بہاری لعل بھی اسی مکان کے ایک حصہ میں رہتے تھے وہ بھی ہریش چندر کے رشتہ دار تھے اور ان کی شادی کی برات میں جو حیدرآباد سے گئی تھی ہریش چندر کے ساتھ میں اور میرے بہنوئی لطیف الحسن برنی بھی شامل تھے ۔ ۔ ۔ وہ سیول سرویس میں کامیابی کے بعد حیدرآباد کے یا سرکارِ عالی کے مختلف اہم عہدوں پر فائز رہے اور بعد میں ہماری گہری دوستی بھی ہوگئی ۔ ۔ ۔ ابھی چند ماہ قبل وہ اس دنیا سے کوچ کر گئے ۔ وہ اپنے گھر میں بھیا کے نام سے مشہور تھے اور ہم بھی ان کو بھیا کہتے تھے ۔ وہ مکان دراصل انھی کا آبائی مکان تھا اور ساغر نظامی وہیں ٹھہرے تھے اور اسی مکان کے ورانڈے میں پہلی بار مجھے ساغر سے نیاز حاصل ہوا ۔

میں نے ساغر کا نام سنا تھا ۔ ان کی دو ایک نظمیں بھی پڑھی تھیں مگر ان کی شاعری کچھ زیادہ بھائی نہیں تھی ۔ اور یہ بھی معلوم تھا کہ وہ " ایشیا " کے نام سے ایک ماہ نامہ نکالتے ہیں تو اس پہلی ملاقات میں جب میں نے یہ ذکر کیا کہ میں ان کو جانتا ہوں انھیں پڑھ بھی چکا ہوں تو بہت خوش ہوئے اور اس طرح سے ملے جیسے وہ مجھے برسوں سے جانتے ہوں ۔

صمد یار خاں نام تھا ساغر تخلص ۔ خواجہ حسن نظامی سے بیعت تھی اس لیے اپنے آپ کو ساغر نظامی مشہور کر رکھا تھا ۔ استاد غزل سیماب اکبر آبادی سے مشورہ ، سخن کرتے تھے ۔ ان کی شخصیت میں بڑا بانکپن تھا ۔ مزاج میں بے انتہا نفاست تھی ۔ گندمی رنگ ، دراز قامت ، چوڑی دار پاجامہ ، علی گڑھی شیروانی سر پر اونچی باڑہ کی قراقلی ٹوپی ، پیر میں خوب صورت سیاہ شوز ، بڑی سرخ غلافی آنکھیں جس میں ریشم جیسے سرخ ڈور ، جھلملاتے رہتے گھنگریالے بال ، کہتے ہیں ان کی سج دھج آخر تک باقی رہی ۔ بوڑھاپے میں بھی جوانی کی طرح دلآویز لگتے تھے ۔ آواز میں بلا کا لوچ اور ترنم تھا ۔ ۔ ۔ پہلی ہی ملاقات میں انھوں نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا ۔ چائے کے بعد میزبانوں کی فرمائش پر اپنے خاص ترنم میں اپنا کلام سنایا شام کی گاڑی سے مدراس جانے والے تھے مگر ہمارے بےحد اصرار پر وعدہ کرلیا کہ تین دن بعد واپسی میں پھر ایک دو دن کے لیے حیدرآباد میں ٹھہریں گے چناں چہ تین دن بعد جب وہ حسبِ وعدہ دوبارہ آئے تو ان کے سواگت میں ایک مقامی مشاعرے کا انتظام کرلیا گیا ۔ امجد حیدرآبادی کی صدارت میں مشاعرے کی یہ محفل گرامر اسکول کے ایک بڑے ہال میں منعقد ہوئی ۔ سات آٹھ مقامی شعرا بھی مدعو تھے ۔ اس رات ساغر نے اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ کئی نظمیں سنائیں تاہم مشاعرہ امجد کی رباعیوں نے لوٹ لیا ۔ ساغر نے جو نظمیں سنائی تھیں ان میں پہلی نظم یہ تھی :

وہی کہو تو پھر ذرا کہ تم بہت حسین ہو حسین ہو ، جمیل ہو ، شکیل ہو ، متین ہو
حسین کہہ کے دیوتا بنا رہی ہو تم مجھے ۔ ۔ ۔ وغیرہ وغیرہ

دوسرے دن جناب للیتا پرشاد صاحب نے علی ساگر کے ڈاک بنگلے میں شعر و سخن کی محفل سجائی اور اپنے سفر کے ہم راہی شاعر کے اعزاز میں ساغر اور کچھ دوسرے شاعروں کو لے کر وہ تو صبح سویرے ہی نکل گئے اور ہمارے لیے ایک دوسری گاڑی کا انتظام کر گئے کہ مقامی شعرا کے ساتھ میں شام تک علی ساگر پہنچ جاؤں ۔ میں چھے مقامی شاعروں کو ساتھ لے کر شام میں وہاں پہنچا یہ مقامی شاعر تھے : شاہد صدیقی ، کنول پرشاد کنول ، ماہر القادری ، عبدالوہاب مسلم وغیرہ ۔ بہت خوب صورت رات تھی وہ ۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی ۔ علی ساگر بجائے خود

دل کش سحر انگیز مقام ہے لیکن اس رات تو وہ غضب ڈھا رہا تھا ۔ ڈنر کے بعد محفلِ سخن کا آغاز ہوا اور رات کے دو بجے تک یہ محفل گرم رہی اس کے بعد بھی صبح تک کوئی نہیں سویا ۔ علی ساگر کے پُر فضا ماحول میں ہر شخص اپنے اپنے طور پر ڈوبتے ہوئے چاند اور ارد گرد کے جادو اثر مناظر کا لطف اٹھاتا رہا ۔ ۔ ۔ ساحر اس کے دوسرے دن میرٹھ چلے گئے ، وہاں جاکر انھوں نے اپنا "ایشیا" میرے نام بھیجا اور پھر خط وکتابت کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا ۔ حیدرآباد ان کو اتنا پسند آیا کہ وہ یہاں بار بار آئے اور ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ برقرار رہا ۔ ۔ ۔ بعد میں بمبئی میں بھی کئی بار ان کی صحبت رہی اور ان کی بیگم ذکیہ صاحبہ سے بھی نیاز حاصل ہوا ۔ آخر میں وہ دلی میں سکونت پذیر ہوگئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا ۔

۳ ۔ **کرشن چندر** کرشن چندر سے ہماری بہت ملاقاتیں رہیں ۔ یہاں جو بھی کانفرنس ہوتی تھی جیسے پریم چند کانفرنس ، ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس وغیرہ ، سب میں ان کو بلایا جاتا تھا اور وہ جب بھی یہاں آتے ہمارے گھر ان کی دعوت ضرور ہوتی تھی ۔ کھانے کے بے حد شوقین تھے اور بے حد نرم دل ۔ ایک دفعہ آئے ادیب ہسپتال میں تھے کینسر کے مریض ۔ وہ ان کو دیکھنے گئے ان کی مزاج پرسی کی ، ہنس ہنس کر ان سے باتیں کرتے رہے مگر کمرے سے باہر نکلتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے ۔

ان سے پہلی بار میری ملاقات ۱۹۴۵ء کی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں ہوئی تھی اور پہلی ہی ملاقات میں ان سے اتنی بے تکلفی ہوگئی تھی کہ جاتے ہوئے انھوں نے مجھے اور ریاست خانم کو بمبئی آنے کی دعوت دی تھی اور کہا تھا بمبئی آئیے اور ہمارے گھر ٹھہریے اور اگر آپ نہیں آئیں گے تو ہم ناراض ہوجائیں گے ۔ ۔ ۔ تو جب ہم بمبئی گئے تو ۱۵ دن ان کے گھر مہمان رہے ۔ اس وقت وہ اندھیری میں " چار بنگلہ " میں رہتے تھے ، اپنی پہلی بیوی کے ساتھ ۔ ایک لڑکی ان کی پاگل تھی ۔ کرشن چندر جتنے مہمان نواز اور خراچ تھے ان کی بیوی اتنی ہی کنجوس اور غیر ملنسار ۔ ۔ ۔ اس زمانے میں عادل بھی وہیں رہتے تھے ۔ وہ ریڈیو میں کام کرتے تھے ۔ ریڈیو پر احمد شاہ بخاری صاحب نے سب سے اچھے ادیبوں کو جمع کر رکھا تھا ، کرشن چندر ، بیدی ، منٹو ، عادل ۔ ۔ ۔ وشوامتر عادل جو اب میرے بہنوئی ہیں ، میری چھوٹی بہن ذکیہ کے شوہر ۔ وہ ڈرامے لکھتے تھے ۔ بمبئی کے اس قیام کے دوران ہی میں عادل کے ساتھ میراجی سے ملا ، سعادت حسن منٹو سے بھی ملاقات ہوئی ۔ ۔ ۔ مجھے یاد ہے وہ ٹائپ رائٹر پر بیٹھے کہانی لکھ رہے تھے ۔ بڑا نفاست پسند انسان تھا منٹو اور پائے کا کہانی نگار ۔ ۔ ۔ اور بھی کئی ادیبوں سے ملاقات ہوئی اور کرشن چندر سے تو اس کے بعد دوستی کا رشتہ اور مضبوط ہوگیا ۔ حیدرآباد میں بمبئی میں اکثر ان سے ملاقات رہی جب رشید احمد صدیقی کی لڑکی سلمٰی سے ان کی شادی ہوگئی ۔ (پہلی بیوی سے طلاق کے بعد) تو کئی بار ان کے گھر دعوتیں بھی کھائیں ۔ سلمٰی کے ساتھ ان کی زندگی بہت خوش گوار گزری ۔ ۔ ۔ بڑا پیارا دوست تھا کرشن چندر میرا ۔ افسوس اب وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہوگئے ۔

اور وہ کتنے سارے شناسا چہرے ۔ ۔ ۔ ابوالحسن سید علی ، عالم خوند میری کے خسر ۔ میرے ایک دوست یونس سلیم طالبِ علمی کے زمانے میں ان کے گھر رہتے تھے تو میرا وہاں روز ہی آنا جانا رہتا تھا ۔ ان کا مکان اس وقت معظم جاہی مارکٹ سے ذرا پہلے لٹے ہاتھ کی گلی میں تھا ان سے میرے خاص تعلقات ہوگئے تھے ۔

اور وہ بہادر یار جنگ بڑے غیر معمولی آتش بیان مقرر تھے ۔ طالبِ علمی کے زمانے میں ہی میں ایک بار ان سے ملا تھا معلوم نہیں ان میں کیا چیز تھی جو مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں اکثر ان کے پاس جایا کرتا تھا ۔ وہ بہت محبت اور پیار سے ملتے تھے ۔ جب میں ورنگل میں تھا وہ کسی جلسے میں آئے تھے ۔ میرے گھر کا پتہ معلوم کر کے خود ملنے آئے ۔ قاضی عبدالغفار صاحب سے ان کے بہت مراسم تھے ۔ قاضی میں اور ان میں نظریاتی اختلافات تھے مگر دونوں جب ملتے تو ایسے جیسے صدیوں کے دوست ہوں ۔ یہ ہمارے بزرگوں کی

وضع داری تھی ۔ نظریاتی اختلاف شخصی سطح پر حائل نہیں ہوتا تھا آج کی طرح ۔
اور وہ مانک لعل گپتا ایل ۔ این ۔ گپتا کے کزن ۔ بے حد پروگریسیو ۔ عالم کے خاص دوستوں میں سے تھے ۔ میرے بھی دوست تھے ۔ شعیب اللہ کے قتل کے بعد وہی آکر مجھے اپنے گھر لے گئے تھے اور آٹھ دن تک مجھے وہاں چھپائے رکھا تھا ۔ مانک لعل کی بیوی ویمنس کالج میں پڑھاتی تھیں ۔ میری بیوی اور بہنوں سے ان کا بہت ملنا جلنا تھا ۔
اور وہ ایک جی ۔ ایم خاں تھے ۔ بڑا خاص کردار تھا ان کا ۔ ایک گردہ ان کا ناکارہ ہوچکا تھا ۔ ایک ہی گردے پر جی رہے تھے ۔ وہ " ہندستانی ادب " ایک پرچہ نکالتے تھے اور اردو کو آسان بنانے کے خبط میں انھوں نے جو " املا " ایجاد کیا تھا پورا پرچہ اس میں لکھواتے تھے ۔ پھر اتفاق سے آبائی ورثے میں ان کو کچھ پیسہ مل گیا تو ایک روز نامہ بھی نکالا جو معظم جاہی مارکٹ پر ان کے کسی دوست کا پریس تھا اس میں چھپتا تھا ۔ اخبار بھی وہ اپنے خاص املا میں نکالتے تھے ۔ وہ اخبار بس دو چار مہینے چلا ۔ پہلا پرچہ تو لوگوں نے یہ کہہ کر واپس کردیا کہ اس کا املا غلط ہے ۔ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے ۔

آج ۱۹۹۱ ء میں یہ سب چہرے ، میرے مہربان اساتذہ ، دوست احباب ، خدا جانے سب کہاں چلے گئے کوئی بھی نہیں رہا
" وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں "

○●○

میرا ۷۵ واں جنم دن ... شہلا کی ایک خوب صورت سازش

میری چھوٹی بہن رابعہ برنی کی بڑی لڑکی شہلا[۱] ۱۹۸۰ ء کے اوائل میں کینڈا سے حیدرآباد آئی ہوئی تھی ۔ جب اتفاق سے اسے یہ معلوم ہوا کہ ۲۵ جون کو میں ۷۵ برس کا ہوجاؤں گا تو اس نے اپنی آپی اور میرے چند قریبی دوستوں کے ساتھ مل کر جس میں قدیر زماں سرِ فہرست تھے ایک خوب صورت سازش رچائی ۔ ایک چھوٹی سی کمیٹی بنائی گئی جس نے میرے جنم دن کو اس مرتبہ بڑے پیمانے پر ایک عوامی تقریب کا روپ دینے کے لیے ضروری انتظامات شروع کردیے ۔ کچھ دنوں بعد مجھے اس بات سے باخبر کردیا گیا کہ ۲۵ جون کو پریس کلب میں ایک تہنیتی جلسہ ، عام منعقد کیا جائے گا اور اس تقریب میں مجھے بھی لازماً تقریر کرنی ہوگی ۔
شہلا نے بہت خوب صورت دعوت نامے چھپوائے جو بڑی تعداد میں تقسیم کیے گئے ۔ میری تحریک پر گوپال راؤ اکبوٹے[۲] سابق

---

[۱] شہلا جب پیدا ہوئی تھی تو اس کا یہ نام میں نے ہی تجویز کیا تھا ۔ اس کا پورا تعلیمی کیریر بہت شان دار رہا ہمیشہ فرسٹ کلاس آتی رہی ۔ ایم ۔ اے میں انگریزی لٹریچر میں پوری یونیورسٹی میں ٹاپ کیا ۔ گولڈ مڈل لیا ۔ پھر جرنلزم کیا اس میں بھی فرسٹ آئی ۔ کچھ عرصہ انوار العلوم کالج میں انگریزی کی لکچرار بھی رہی پھر کینیڈا چلی گئی ۔ وہاں جاکر کام کے ساتھ مزید تعلیم بھی حاصل کرتی رہی ۔ بی ۔ ایڈ کیا اور وہاں بھی اس میں فرسٹ آئی ۔ پھر کئی سال کی محنت و کاوش سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی اور اب وہاں یونیورسٹی کے ہسٹری ڈپارٹمنٹ میں کینیڈا کے مختلف ETHNIC گروپس پر تحقیقی کام کر رہی ہے ۔ پانچ چھے کتابیں اب تک لکھ چکی ہے جس میں سے دو تین چھپ بھی گئی ہیں ، ساتھ ہی یونیورسٹی میں کچھ لکچرز بھی دے رہی ہے ۔ اس کا پی ایچ ۔ ڈی کا مقالہ " بدبخت " بھی زیرِ طبع ہے ۔ کلاسیکی رقص کچی پوڑی میں بھی یہاں کالج کی تعلیم کے زمانے میں اس نے مہارت حاصل کی اور کئی انعامات جیتے ہر دوسرے تیسرے سال انڈیا آتی رہتی ہے ۔ بے حد ذہین ہے ۔

[۲] پہلے چناؤ میں گوپال راؤ اکبوٹے بھی کانگریس کے ٹکٹ پر منتخب ہوتے تھے اور اسمبلی کے زمانے سے میرے ان کے بہت گہرے مراسم قائم ہوگئے تھے ۔

چیف جسٹس ہائیکورٹ کو پہلے اجلاس کی صدارت کے لیے نامزد کیا گیا اور ان کو دعوت دینے قدیر زماں مجھے ان کے پاس لے گئے ۔ ان سے نیاز حاصل ہوا ۔ مرض مدعا کیا ، انھوں نے بہ خوشی صدارت قبول فرمائی اور بڑی اچھی تقریر کی ۔ جلسے کی کارروائی شہلا برنی نے چلائی ۔ دوسرے اجلاس کی صدارت جناب فضل الرحمان سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کی اور اسی شام کے اجلاس میں انھیں کے ہاتھوں میرے شعری مجموعے " حرفِ ناتمام " کی رسم اجرا بھی انجام پائی ۔ ۔ ۔ کئی تہنیتی پیامات بھی وصول ہوئے جنھیں قدیر زماں نے پڑھ کر سنایا ۔ غرض شہلا کی کوششوں سے یہ جلسہ بہت کامیاب رہا ۔ پریس کلب کا بڑا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا ۔ قدیر زماں نے شکریہ ادا کیا ۔

جلسے سے ایک روز قبل نظام کلب میں ڈنر کا بھی انتظام کیا گیا جس میں کمیٹی کے ارکان اور تمام ارکانِ خاندان کے علاوہ کچھ دوسرے لوگ بھی جیسے گیان سنگھ شاطر ، ان کی بیگم صاحبہ ، جیلانی پیپاک ، رام ناتھ (ڈاکٹر) اور عبدالرب صاحب بھی شریک تھے ۔ والدہ صاحبہ نے میری گل پوشی کی ۔ بہنوں[1] نے تحفے دیے ۔ رضیہ نے بہت خوب صورت دستی گھڑی دی ۔ میری اس ۷۵ ویں جنم دن کی جو روئیداد سیاست اخبار میں چھپی ہے پہلے میں یہاں اس کا خلاصہ نقل کرتا ہوں تاکہ سب باتیں معلوم ہوجائیں پھر اپنا کلیدی خطبہ پیش کروں گا ۔

سیاست ۲۸ جون ۱۹۸۷ء ۔ ممتاز دانش ور ، ادیب ، شاعر اور صحافی مسٹر اختر حسن کی ۷۵ ویں سالگرہ کے موقع پر آج یہاں پریس کلب میں ایک تہنیتی تقریب منعقد ہوئی ۔ اس تقریب کے پہلے اجلاس کی صدارت مسٹر جسٹس گوپال راؤ ایکبوٹے نے کی دوسرے اجلاس کی صدارت مسٹر فضل الرحمان سابق پرو وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی نے کی اور اس اجلاس کا آغاز اختر حسن کے مجموعہ ، کلام " حرفِ ناتمام " کی رسم اجرا سے ہوا ۔ رسم اجرا انجام دیتے ہوئے اپنی تقریر میں فضل الرحمان صاحب نے حیدرآباد کی تاریخ کے قریبی ماضی پر روشنی ڈالی اور اظہارِ حیرت کیا کہ آج پہلی بار ان کو یہ پتہ چلا کہ اختر حسن ایک اچھے شاعر بھی ہیں ۔

---

[1] میری چار بہنیں ہیں ۔ میری بڑی بہن جمال النسا جو باجی مشہور ہیں وہ مجھ سے سوا سال کی بڑی ہیں ۔ ۲۰ برس کی عمر میں ان کی شادی جناب عزیز الدین احمد بی ۔ اے ۔ ایل ایل ۔ بی سے ہوئی ۔ ان کا پہلا لڑکا جاتا رہا اور دوسرا لڑکا جاوید ہے جو ٹیچر ہے اور مدرسے کی ذمہ داریوں کے ساتھ اس نے پرائیویٹ طور پر فارسی کا ایم ۔ اے کیا ہے اور گولڈ میڈل لیا ہے ۔ باجی شروع سے ہی کمیونسٹ پارٹی کی کارڈ ہولڈر ہیں اور برسوں سے سوشیل ورک کر رہی ہیں ۔ دوسری بہن رضیہ نے عثمانیہ سے فارسی میں ایم ۔ اے کیا اور تہران یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ لی اور پروفیسر جامعہ عثمانیہ کی حیثیت سے ۱۹۸۲ء میں حسنِ خدمت پر سبک دوش ہوئیں ۔ ڈاکٹر رضیہ اکبر فارسی ، اردو میں کئی کتابوں کی مصنف ہیں ۔ ان سے چھوٹی رابعہ کی شادی میرے دوست لطیف الحسن برنی سے ہوئی ۔ شادی کے بعد اس نے اردو سے ایم ۔ اے کا پھر بی ۔ ایڈ اور جونیر کالج میں اردو کی لکچرر رہ کر حسنِ خدمت پر ریٹائر ہوئیں ۔ رابعہ کو بچپن سے شاعری کا شوق تھا اچھے شعر کہتی ہیں مگر چھپواتی نہیں ۔ ہم لوگوں کے اصرار پر " پروازِ شوق " کے نام سے کچھ عرصہ قبل ایک چھوٹا سا مجموعہ چھپوایا ہے جس کا پیش لفظ مغنی تبسم نے لکھا ہے اور سرورق عزیز آرٹسٹ کا بنایا ہوا ہے ۔ چوتھی سب سے چھوٹی بہن بھی گریجویٹ ہے اس کی ہندی بہت اچھی ہے ۔ اس کی شادی وشوامتر عادل سے ہوئی ہے جو فلموں کے مشہور ڈائلاگ رائٹر ہیں اور " انسپکٹر ایگل " کے خالق ۔

بھائی بھی میرے چار تھے ، انور ، ظفر ، مظہر اور قمر مگر افسوس اب میرا صرف ایک بھائی مظہر حیات ہے اور میرے جنم دن کے انتظامات میں اس نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا ۔ (اب وہ بھی نہیں رہے ۲۰ جنوری ۱۹۹۲ء کو کینسر کے مرض میں وہ بھی چل بسے ۔ مرتب) ۔

اس موقع پر " حیدرآباد کی جھلکیاں ۱۹۳۶ ء سے ۵۶ ء تک " کے عنوان سے اختر حسن نے کلیدی مضمون سناتے ہوئے کہا کہ وقت کی خوبی ہے کہ گزر جاتا ہے ۔ ایک کروڑ باسٹھ لاکھ نفوس پر مشتمل ریاستِ محروسہ سرکارِ عالی ہندستان میں رہتے ہوئے بھی ہندستان سے دور تھی ۔ یہی دور رہنے کی پالیسی اس کے لیے مضر ثابت ہوئی ۔ انھوں نے مزید کہا کہ تلنگانہ تحریک کے نتیجے میں سب سے پہلے حیدرآباد میں زرعی اصلاحات کا نفاذ عمل میں آیا ۔ قاسم علی رضوی اور لائق علی وزیر اعظم مملکتِ حیدرآباد کا تجزیہ کرتے ہوئے اختر حسن نے کہا کہ قاسم رضوی بھولے بھالے تھے تو ایسے لوگوں کے دماغ میں کبھی کبھی کوئی لہر آجاتی ہے تو مشکل سے نکلتی ہے ۔ لیکن لائق علی بہت شروڈ ڈپلومیٹ اور بڑے سرمایہ دار تھے ۔ مسٹر کے ۔ راما راؤ ایڈوکیٹ نے اختر حسن کی صحافتی خدمات کا جائزہ لیا ۔ ۔ ۔ جناب جواد رضوی نے کہا کہ آزادی سے پہلے نگار اور پیام نے قومی جذبات کو ابھارنے میں بہت اہم حصہ لیا ۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے کہا کہ اختر حسن کو اخبار پیام نکالنے کے سلسلے میں کافی مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ۔ انھوں نے کہا کہ کاش اخبار پڑھنے والوں کو اردو اخبار کے ایڈیٹر کی مشکلات اور کرب کا احساس ہوتا ۔ انھوں نے اختر حسن کے ایک جملے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ تلنگانہ کمیونسٹ تحریک کے قائدین اور کارکن خیر سگالی سے کام لیتے ہوئے ہتیار ڈال کر روپوشی سے باہر آنے تھے لیکن پولیس ایکشن کے بعد فوج نے جو مظالم ڈھائے اور سردار پٹیل کی " فتح میدان " کی وہ تقریر جس میں انھوں نے کہا تھا کہ کمیونسٹوں کو زندہ نہ چھوڑو ، پھر سے ہمیں روپوشی اور ہتیار بند ہونے پر مجبور کیا ۔ ۔ ۔ جناب محبوب حسین جگر نے جو سیاست کے مددگار ایڈیٹر تھے ، حیدرآباد کے ممتاز دانش ور صحافی اور شاعر اختر حسن کی علمی ، ادبی اور تہذیبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہاکہ اختر حسن کی زندگی حیدرآباد کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے ان کی اپنی شخصیت ہے اور ان کا اندازِ بیان اور طرزِ نگارش منفرد خصوصیات کا حامل ہے ۔

مسٹر منوہر راج سکسینہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ اختر حسن نے پیام اخبار کے ذریعے عوام میں شعور پیدا کیا ۔ ایک غیر جمہوری دور میں جمہوری اقدار کی پاس داری بہت مشکل اور کٹھن کام ہوتا ہے لیکن اختر حسن صاحب نے بڑی عمدگی کے ساتھ اس کام کو انجام دیا اور خندہ پیشانی سے تمام مشکلات کا سامنا کیا ۔ سری نواس لاہوٹی نے بھی اختر حسن کی تعریف کرتے ہوئے تقریر کی اور کہا کہ پیام کو ہاتھ میں لینے کے بعد اختر حسن نے اپنے قلم کے زور سے ترقی پسند تحریکات کو آگے بڑھانے میں زبردست حصہ لیا ۔ ایس ۔ اے ۔ قدوس جیلانی پیراک اور پروفیسر سراج الدین نے بھی جلسے کو مخاطب کیا ۔ دلی سے بھیجا ہوا مجتبیٰ حسین کا مضمون " اختر بھائی " جناب مسیح انجم نے پڑھ کر سنایا ۔ مسٹر بی ۔ نرسنگ راؤ نے اپنی تقریر میں ماضی کی حیدرآباد کی تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ پولیس ایکشن سے پہلے حکومت کے خلاف کسی قسم کا اظہارِ خیال بےحد مشکل کام تھا مگر اس پُر آشوب زمانے میں بھی اختر حسن نے اپنی جدوجہد جاری رکھی ۔ گیان سنگھ شاطر نے ایک غزلیہ قصیدہ پیش کیا ۔

محترمہ شہلا برنی نے جلسے کی کاروائی چلائی اور قدیر زماں کے شکریے پر جلسہ کا اختتام ہوا ۔

دوسرے دن ڈاک سے ۲۰ ، ۲۵ تہنیتی خطوط بھی وصول ہوئے جن میں میرے محترم دوست مغنی تبسم کا بھی ایک مبارک باد کا مکتوب تھا مغنی صاحب ان دنوں لندن گئے ہوئے تھے ۔

عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست کا پیام

برادرم اختر حسن

آپ کی ۷۵ سالہ سال گرہ اور نصف صدی کی ادبی خدمات پر میں خود شخصی طور پر آپ کو مبارک باد دینا چاہتا تھا لیکن جلسہ گاہ کی سیڑھیاں بہت زیادہ ہیں اور میں قلب کا مریض ہوں ۔

آپ نے لکچرر ، اڈیٹر ، لیجسلیٹر ، ریسرچ اسکالر اور ادیب و مصنف کی حیثیت سے جو نقش بنائے ہیں وہ حیدرآباد کی علمی ادبی زندگی کے لیے ایک دین ہیں ۔ میرا خیال ہے کہ ایڈیٹر پیام کی حیثیت سے آپ کی خدمات زیادہ اہم اور قابلِ ذکر ہیں ۔ حیدرآباد کی اردو صحافت کے ایک اہم نمائندے قاضی عبدالغفار نے جب نظامتِ اطلاعات کا جائزہ لیا انھوں نے پیام کو ایک نازک دور میں آپ کے حوالے کیا ۔ ان دنوں کے حالات میں پیام نے ذہنی بےداری کا اہم مشن انجام دیا ۔ دوسرے اخبارات کے مقابلے میں پیام کا سرکولیشن بہت معمولی تھا مگر پیام کی آواز نئے حیدرآباد کے دلوں کی دھڑکن تھی ۔ پیام سے پہلے بھی حیدرآباد میں جمہوریت پسند صحافت ، رعیت اور مشیرِ دکن کی شکل میں موجود تھی مگر پیام نے سابق ریاست حیدرآباد میں پہلی مرتبہ بائیں بازو کی صحافت کا پیام دیا تھا ۔ قاضی صاحب نے مولانا آزاد کے مشن کو پیام کے روپ میں ڈھالا ۔ ان کے بعد ادارتی ذمہ داری جب آپ کے کندھوں پر آئی بائیں ، بازو کی تحریکات کا آغاز ہوچکا تھا ۔ ریاست ، حیدرآباد کے انضمام کے بعد کئی سیاسی ، سماجی مسائل سے دوچار تھی ۔ اب رعیت اور مشیرِ دکن کے بعد پیام نے ہمارے شہر کی تہذیب اور اردو زبان کی ترقی کے لیے جو کام کیے وہ حیدرآباد کی بہت بڑی خدمت تھی ۔

آج آپ کی سال گرہ تقریب حیدرآباد کی صد سالہ صحافت کے ارتقا کو بھی پیش کرتی ہے ۔ آپ خوش نصیب ہیں کہ حیدرآباد کی صحافت کے تاریخی تذکرے میں آپ کو ایک اہم مقام حاصل ہے ۔

آپ کی سال گرہ نے ایک شخص کی تقریب سے زیادہ حیدرآباد کی اردو صحافت کے جائزے کا موقع فراہم کیا ہے ۔ میں آپ کو اس پُر مسرت موقع پر دلی مبارک باد دیتا ہوں ۔

عابد علی خاں

۲۷ جون ۱۹۸۷ء

۷۵ ویں سال گرہ کے موقعے پر اختر حسن کا کلیدی خطبہ

حیدرآباد کی جھلکیاں ۱۹۳۲ء تا ۱۹۵۶ء

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے — بول زباں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں — تند ہیں شعلے سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے — پھیلا ہے زنجیر کا دامن
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے — جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک — بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

اہلِ محفل ! ۔ ۔ ۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں ۲۰ ویں صدی کی ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۶ء تک کے حیدرآباد کی سیاسی، ثقافتی، م اور معاشرتی زندگی کے بارے میں اپنے تجربوں اور مشاہدوں کی روشنی میں اپنے تاثرات و افکار کو منظرِ عام پر لاؤں جو میرے حافظے کے خانے میں محفوظ ہیں ۔

بے شک حیدرآباد کی تقریباً چار سو سالہ تاریخ کا یہ دور جو صرف ۲۰ برسوں پر مشتمل تھا بہت ہی اہم اور برق رفتار ترقیوا دور رہا ہے ۔ ان ساری تبدیلیوں کے محرکات اور ان کے اجزائے ترکیبی کا تذکرہ اور محاسبہ ایک مختصر سی فرصت میں ممکن نہیں اس دور کے ایسے گوشوں کو جو اب تک ان کہے اور ان جانے سے ہیں، معلوم تاریخی حقیقتوں کی روشنی میں بہت اختصار کے ساتھ کچھ کہ علامتوں اور اشاروں کی شکل میں آپ کے آگے پیش کرنے کی کوشش کروں گا ۔

یہ بیس برس صرف بیس برس نہیں، ان بیس برسوں کے مختصر سے عرصے میں ماضی، حال اور مستقبل کی کئی صدیاں رہی ہیں ۔ ان کے دل کی دھڑکنوں اور قدموں کی چاپ سننے کے لیے وقت اور دوران کا شعورِ صادق ہمارا ہم نفس اور رہنما بن جا۔ شاید پورا مطلع ہماری نظروں کے سامنے آ سکے ۔

کہتے ہیں وقت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ گزر جاتا ہے مگر گزرا ہوا وقت بہ ہرحال آنے والے وقت سے الگ تھ نہیں رہتا ۔ مشرقی فکر میں وقت اور دوران کے اس تسلسل اور اس کے پا بہ جولاں اور امٹ نقوش کو ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا رہا ہے وقت سے فرار اور زماں سے تغافل کوشی کے کارن انسانی زندگی کی تشکیل و تعمیر کے سفرِ مسلسل میں ایک ایسا خلا پیدا ہو جاتا ہے کہ طلسمات کی دنیا میں کھو کر رہ جاتے ہیں اور ہماری تاریخ بے خبری کی بھول بھلیاں میں گم ہو کر رہ جاتی ہے ۔ ایسی صورت میں صرف " وہم " ہمارا آئیڈیل اور محور بن جاتا ہے کہ " ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں " ۔ زمانی بصیرت سے بے تعلقی بے نیازی نے ہماری زندگی کے تسلسل کے کتنے ہی گوشوں کو ہماری نظروں سے اوجھل کر کے رکھ دیا ہے لیکن عصرِ حاضر کی عقلی بصیر کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی تمدنی زندگی اور تہذیبی اقدار کی شیرازہ بندی کو اپنا مقصودِ نظر اور اپنا نصب العین بنا کر آگے بڑھیں تاکہ ماضی، اور مستقبل میں ایک با معنی رشتہ پیدا ہو سکے ۔ ایسی صورت میں یہ چند تجربات اور مشاہدات شاید آنے والے مورخ کے لیے کچھ آ سکیں بشرطیکہ وہ تاریخ نگاری کی گھسی پٹی روش سے ہٹ کر صرف اہلِ حکم اور جنگ و جدال کی کہانیاں لکھنے کے بجائے انسانوں انسانی ذہنوں کی تاریخ لکھے اور ارتقاءِ حیات کی نو بہ نو داستان رقم کرنے پر اپنا زورِ قلم صرف کرے ۔

ہماری صدی کے وہ شب و روز جو ۱۹۳۶ء سے ۵۶ء تک کی مسافت طے کرتے ہیں اور جس کے ذہن و فکر و مزاج کردار پر ہم آج ایک نظر بازگشت ڈالنا چاہتے ہیں ہر آئینہ بہت زیادہ مصروف ہنگامہ خیز اور عہد آفریں شب و روز تھے ۔

○●○

اختر حسن اپنے کلیدی مضمون کا یہی تمہیدی حصہ لکھ سکے تھے کہ اس کے آگے لکھنے کی فرصت انھیں نہ مل سکی اور اس جلسے میں اس کا اگلا حصہ تقریر کی صورت میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا چوں کہ یہ تقریری حصہ بہت طول ہوگیا تھا اور اس میں حیدرآباد مقامی حالات کے پہلو بہ پہلو متعدد قومی اور بین قومی امور بھی زیرِ گفتگو آگئے تھے اس لیے یہاں ہم اس کو چند اہم عنوانوں اور م واقعات کی سرخیوں کے روپ میں پیش کرنے پر ہی اکتفا کریں گے کہ " عقل منداں را اشارہ کافی است "

۱ ۔ ریاستِ حیدرآباد ہندستان کی سب سے بڑی دیسی ریاست ہے جو سطح مرتفع دکن کے ۸۲ ہزار ۶۹۸ مربع میل پر محیط ہے اور کے طول و عرض میں ایک کروڑ ۲۰ لاکھ نفوس بستے ہیں ۔

۲ ۔ حیدرآباد اپنے ایک طویل اور خواب ناک معاشرے کے بند قلعے اور " ظل اللہ " کے سائے سے نکل کر ان دو دہوں میں عوام کی سانسوں اور ان کے قدوم میمنت لزوم سے برکت اور طاقت حاصل کرتا ہے ۔

۳ ۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد حیدرآباد میں ایک ہندستانی زبان اردو کو ذریعہ ، تعلیم قرار دے کر ایک عظیم علمی ادارے یعنی جامعہ ، عثمانیہ اور اس کے ساتھ دارالترجمہ کی طرح پڑتی ہے ۔

اسی زمانے میں روس کے بالشویک انقلاب کے اثرات پوری دنیا میں پھیلتے ہیں اور پرانے نقشے بدلنے لگتے ہیں ۔ ایشیا اور افریقہ کے تمام محکوم اور نوآبادیاتی ملکوں میں جمہوریت اور آزادی کی لڑائیاں تیز سے تیز تر ہوتی ہیں اور بالآخر ہندستان بھی سامراجی جوئے سے نجات حاصل کرلیتا ہے ۔ ملک کا بٹوارا ہوتا ہے اور ۱۴ ، ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ایک کے بجائے دو ملک پاکستان اور ہندستان آزادی کا پرچم بلند کرتے ہیں ۔

۴ ۔ حیدرآباد " انڈیا بل " کے بہانے اور سہارے اپنی اپنی خود مختاری کا اعلان کرتا ہے ۔ ہزاکسیلنسی آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں راتوں رات ہز مجسٹی ہزاگزالٹڈ ہائی نس بن جاتے ہیں لیکن پھلجھڑی ۱۴ مہینوں کے اندر بجھ کر راکھ ہوجاتی ہے لیکن اس مختصر سے عرصے میں جس طرح اس خطہ ، ارض کی دیرینہ تہذیبی اقدار و روایات کو بھی جلا کر خاکستر کردیتی ہے ، اس کی روئیداد دل سوز بھی ہے اور عبرت انگیز بھی ۔

۵ ۔ قاضی عبدالغفار صاحب ۱۹۳۳ء میں حیدرآباد سے " پیام " کے نام سے ایک نیا اخبار نکالتے ہیں جو حیدرآباد کے پچھڑے ہوئے عوام میں زندگی اور بیداری کی ایک نئی لہر پیدا کرتا ہے اور ۱۹۳۶ء میں اس اخبار کا سارا ادارتی بوجھ مجھ راقم الحروف کے ناتواں کاندھوں پر آپڑتا ہے ۔

۶ ۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہوتا ہے اور ۴۱ء میں سوویٹ روس پر ہٹلر کا حملہ ۔ سوویٹ روس اتحادیوں کی صف میں آکر ہٹلر مسولینی اور جاپان کی محوری طاقتوں کے خلاف صف آرا ہوتا ہے ۔

۷ ۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۴۸ء کو حیدرآباد کے خلاف پولیس ایکشن ہوتا ہے اور ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء سقوط حیدرآباد کی تاریخ ہے ۔ رضاکار تحریک و تنظیم ممنوع قرار پاتی ہے ۔ لائق علی اور کچھ دوسرے سرگرم رضاکار رہ نما راہِ فرار اختیار کرتے ہیں ۔ قاسم رضوی گرفتار ہوتے ہیں ان پر مقدمہ چلتا ہے اور ۹ سال کی قید سے رہائی پاکر وہ پاکستان کا رخ کرتے ہیں ۔

۸ ۔ کمیونسٹ پارٹی ، کانگریس اور اتحاد المسلمین کے مثلث میں حیدرآباد کی سیاست ، صحافت ، معاشرت اور ثقافت نے جن متضاد راستوں پر اپنا سفر شروع کیا تھا ، تضادات کے باوجود حرکت و انقلاب اس کی قدر مشترک تھی ۔ ۔ ۔ اس سفر کی پہلی منزل ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کو تمام ہوتی ہے اور پھر ۱۸ ستمبر ۴۸ء کی صبح سے حیدرآباد کی زندگی کا نیا سفر شروع ہوتا ہے ۔

۹ ۔ لسانی اساس پر ریاستوں کی از سرِ نو حد بندی یکم نومبر ۱۹۵۶ء تک جاری رہتی ہے ۔ غرض یہ کہ پچھلے دو دہوں کا زمانہ حیدرآباد میں کلیدی تبدیلیوں کا زمانہ رہا ہے ۔ (مرتب)

○●○

محمد حسن عسکری

داخلیت پسندی

پچھلے دس پندرہ سال سے اردو کے اکثر تنقیدی مضامین میں داخلیت کا ذکر اس طرح ہوتا رہا ہے جیسے یہ کسی بیماری کا نام ہے جیسے بخار کا نام سن کے ہم یہ فرض کرلیتے ہیں کہ مریض کا بدن جلتا ہوگا ، آنکھیں لال ہوں گی وغیرہ وغیرہ ۔ اسی طرح ہمارے بہت سے نقاد اس لفظ داخلیت کے ساتھ چند باتیں یوں منسوب کرتے ہیں گویا یہ سب داخلیت کے انڈے بچے ہیں ۔ مثلاً (۱) آدمی اپنی ذات میں کھو کے رہ گیا (۲) حقیقت سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا اور وہ اپنے تصورات میں الجھ کے رہ گیا (۳) دوسرے آدمیوں سے اس کوئی علاقہ نہیں رہا اور اس نے اپنی ایک خیالی دنیا الگ بسالی (۴) وہ ایسا انفرادیت پسند بلکہ خودپرست بنا کہ سماجی شعور اسے حاصل نہ ہوسکا (۵) لہٰذا وہ انسانیت کا دشمن قرار پایا ۔ یعنی ہمارے نقادوں کے نزدیک داخلیت صرف مرض ہی نہیں ، جرم بھی ہے بلکہ ا کی دینیات میں تو اس کا درجہ ازلی گناہ کاسا ہے ۔ اگر داخلیت اور خارجیت واقعی انسانی ذہن کے دو مستقل رجحانات ہیں تو ہمار نقادوں کے اس رویے کی مثال بالکل ایسی ہوگی جیسے کسی آدمی کو لمبے قد یا چھوٹے قد کی وجہ سے مجرم سمجھنے لگیں ۔ اگر داخلیت انسا ذہن کا ایک مستقل رجحان بھی ہے اور ساتھ ہی ایک مرض بھی تو کیا جو لوگ اس خلقی لعنت میں گرفتار ہیں وہ خودکشی کرلیں ؟ آخر ا کے نقادوں نے اس فطری رجحان کے لیے نظام زندگی میں کون سی جگہ متعین کی ہے ؟ قصہ شاید یہ ہے کہ ہمارے نقاد سوچنے صلاحیت کو داخلیت کہتے ہیں اور سوچنا ان کے نظام اقدار میں جرم کے برابر ہے ۔ جس طرح ایک مہذب ریاضی داں نے اپنی بد خادمہ کو مثلث متساوی الساقین کی گالی دی تھی ، اسی طرح ہمارے شریف نقاد سوچنے والوں کو داخلیت پسندی کی گالی دیتے ہیں ۔ گالی حیثیت سے تو یہ لفظ بہت کار آمد ہے ، لیکن جو نقاد اپنی تحریروں کی متانت سنجیدگی ، علمیت اور سب سے زیادہ "محنت" پر فخر کر ہیں اگر وہ کبھی کبھار اپنے استعمال کردہ الفاظ کے معنی بھی ڈھونڈلیا کریں تو انھیں پتہ چلے کہ بات اتنی سیدھی سادی نہیں ہے ۔

غالباً ہمارے نقادوں کو خارجیت یا خارج بینی اس لیے پسند آتی ہے کہ اس کے ذریعے آدمی سماجی حقیقت سے قریب رہتا ہے ۔ سے کم مجھے یہ خیال سو فی صدی قبول ہے کہ جو رویہ آدمی کو سماجی حقیقت سے قریب لائے وہ اس رویے سے بہتر ہے جو اسے د لے جائے ۔ لیکن خارج بینی میں بھی وہی خطرات لاحق ہوتے ہیں جو داخل بینی میں ۔ اگر آدمی خارجی حقیقت سے ہم آہنگ ہونے اس پر اثر انداز ہونے یا اسے بدلنے کے لیے اپنے آپ کو کسی خاص نقطہ ، نظر سے منسلک کرلے یا اپنا ایک خاص کردار بنالے خارج بینی بھی اس آدمی اور حقیقت کے درمیان دیوار کی طرح آ کھڑی ہوتی ہے ۔ رائج کے خیال میں تو آدمی اپنا ایک کردار بناتا اس لیے ہے کہ حقیقت کا بہت ہی تھوڑا حصہ اس کے تجربے میں آئے اور جب جز کل سے الگ ہوجاتا ہے تو اس کی معنویت مسخ ہوجاتی ہے ۔ خارجی عمل کے ذریعے خارجی حقیقت کو بدلنے کے مقصد سے خارج بینی اختیار کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حقیقہ کے جو عناصر ہمارے عمل سے نہیں بدل سکتے ہم انھیں اپنے دائرہ ، احساس میں آنے ہی نہ دیں ، بلکہ اپنے کردار اور اس پر اپنے

قرار رکھنے کے لیے یہ فرض کرلیں کہ ہم ساری حقیقت کو سمجھ رہے ہیں اور اسے بدل بھی سکتے ہیں ۔ یعنی خارج بینی کے ذریعے بھی ـ خیالی جنت تعمیر ہوسکتی ہے اور داخل بینوں کی جنت سے بھی زیادہ ناپائدار ۔ ایک اوسط درجے کا داخل بین تو بےچارہ پھر بھی جانتا ہے کہ میری جنت صرف خیالی ہے لیکن خارج بیں اپنی جنت اور اصلی دنیا کو بڑی آسانی سے ایک سمجھ بیٹھتا ہے ۔ جب خارج ں اس خود فریبی میں مبتلا ہوجاتے کہ مجھے حقیقت پر پورا اختیار حاصل ہے تو اس کی نیند بعض دفعہ سخت حادثوں سے بھی نہیں ٹوٹتی ، ں کہ اس کا کردار ان باتوں سے اثر ہی نہیں لیتا ۔ بہت سے حاکم ، معلم ، واعظ اصلاح پسند ، انقلابی اسی زمرے میں آتے ہیں ۔

بے میل خارج بینی آدمی کو حقیقت سے اتنا ہی غافل کرسکتی ہے جتنا داخل بینی ۔ نمونے کے طور پر ایک طرف تو وہ سیاسی ں لیجیے جو انقلابی نقطہ ، نظر سے لکھے گئے ہیں ۔ مثلاً شولو خوف کے ناول اور دوسری طرف ادب برائے ادب کے پرستار فلوبیئر کا ل " جذباتی تعلیم " ، یا استاں دال کا " سرخ و سیاہ " یا جوئس کے پہلے ناول کے وہ حصے جو آئرلینڈ کی سیاسیات سے متعلق ہیں اور بتلائیے کہ سماجی حقیقت کو کون سمجھتا ہے ۔ اگر آپ کے نزدیک آدمی کے اندرونی تجربے اور اس کے خارجی عمل میں کوئی علاقہ ں تب تو بات ہی ختم ہوجاتی ہے لیکن اگر ان دونوں کے درمیان کوئی ربط ہے تو داخلی تجربات پر غور کیے بغیر آپ خارجی عمل سماجی حقیقت پر اس کے اثر کا ادراک حاصل کر ہی نہیں سکتے ۔ اس ادراک کے بغیر آپ کے عمل کے مقصد اور اس کے نتیجے ں اتنا فرق پیدا ہوگا کہ آپ خود نہیں سمجھ سکیں گے کہاں سے چلے تھے اور کہاں آگئے ۔

اگر آدمی داخلیت اور خارجیت کو گڈمڈ کر دے ، یا جو عمل اندرونی رجحانات کے ذریعے ظہور پذیر ہوا ہے اسے اپنی خارج بینی مظہر سمجھ بیٹھے تو اسے خود پتہ نہیں چلتا کہ میرے عمل کا مطلب اور اس کی نوعیت کیا ہے ، نہ وہ اس کی صحیح قدروقیمت متعین سکتا ہے ۔ ایسی صورت میں عمل آدمی کے قبضے میں نہیں رہتا ، بلکہ آدمی اپنے عمل کا غلام بن جاتا ہے اور عمل جدھر چاہتا ہے ے کھینچے پھرتا ہے ۔ اس قسم کی خارج بینی انفرادی اور سماجی زندگی کے لیے کیسی تباہ کن ہے اس کا نقشہ فلوبیئر نے اپنے ناول میں چا ہے ۔ مثلاً اس ناول کا ایک کردار اشتراکی اور انقلابی ہے ۔ تھوڑے دن بعد جب انقلاب پسندوں پر مصیبت آتی ہے تو وہی شخص یس کی وردی پہنے ڈنڈے سے انقلابیوں کی پٹائی کرتا نظر آتا ہے ۔ سیاسی لوگوں میں اس قسم کی تبدیلیاں سماجی حقیقت کا حصہ ہیں یا ں ؟ یہ سماجی حقیقت داخل بیں فلوبیئر نے سمجھی یا نہیں سمجھی ؟ کیا یہ حقیقت داخل بینی کے بغیر سمجھ میں آسکتی تھی ؟ کیا اس قسم داخل بینی کے بغیر حقیقی معنوں میں نتیجہ خیز سیاسی عمل ممکن ہے ؟

اس تمام بحث سے میرا مطلب یہ نہیں کہ خالی داخلیت پسندی سے کام چل سکتا ہے یا داخلیت پسندی ہر حالت میں خارجیت دی سے بہتر ہے ۔ البتہ اس پر مجھے واقعی اصرار ہے کہ " میں کیا دیکھ رہا ہوں ؟ " والے سوال کا جواب ڈھونڈنے سے پہلے آدمی کو معلوم کرلینا چاہیے کہ " میں کس طرح دیکھ رہا ہوں ؟ " کیوں کہ جس طرح خارج بینی خارجی حقیقت کو پردے میں چھپاسکتی ہے اسی ح داخل بینی کے ذریعے بھی یہ لازمی نہیں کہ آدمی دنیا کی حقیقت تو الگ رہی ، اپنی حقیقت ہی سمجھ لے ۔ جس طرح آدمی کا خارجی دار اس کے شعور اور بیرونی حقیقت کے درمیان حائل ہوسکتا ہے ، اسی طرح اس اس کا " داخلی کردار " اسے اپنے آپ کو دیکھنے سے ک سکتا ہے ۔ یونگ نے بتایا ہے کہ داخل بینی کی اس شکل میں آدمی اپنے آپ کو کسی اندرونی تصویر سے وابستہ کرلیتا ہے اور پھر رچیز کو اسی کی نظروں سے دیکھتا ہے ۔ یعنی آدمی اپنے دو کردار بناتا ہے ، ایک تو دوسروں کے لیے اور ایک اپنے لیے ۔ اگر یہ اندرونی دار ضرورت سے زیادہ استوار ہوجاتے تو آدمی اپنے اندرونی عوامل کو دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت کھودیتا ہے ۔ اپنے بجائے صرف اپنی ں خیالی تصویر کو دیکھتا ہے ۔ یہ جھوٹی داخلیت پسندی ہے ، جو خارجی حقیقت سے بھاگنے کے لیے اختیار کی جاتی ہے اور جس کا نتیجہ

اپنے آپ سے فرار ہوتا ہے ۔ ہمارے یہاں اداسی ، شام اور بھیڑیوں کے متعلق جو نظمیں لکھی جاتی ہیں وہ اسی قسم کی داخلیت پسندی کا نمونہ ہیں ۔ اس کا تو کسی قسم کی حقیقت بینی سے علاقہ ہی نہیں ، اس لیے ہم اس پر غور نہیں کریں گے ۔

لیکن سوال یہ ہے کہ جس داخل بینی کے ذریعے ہم اور کچھ نہیں تو کم سے کم اپنے اندرونی عوامل اور محرکات کو سمجھ سکتے ہیں وہ ہمیں خارجی حقیقت سے دور لے جاتی ہے یا اس کے قریب لاتی ہے ؟ چلیے ، ہم اپنی بحث یہ بات مان کر شروع کریں گے کہ داخل بیں شخص خارجی حقیقت کو دیکھتا ہی نہیں ، اس کی نظریں بس اپنے ذہنی عوامل پر ہوتی ہے ۔ اب سوال یہ آتا ہے کہ ذہنی عوامل کیا چیز ہوتے ہیں ؟

فرائڈ کے نزدیک ذہنی عوامل چار عناصر کے ذریعے وجود میں آتے ہیں :

(۱) انا (۲) فوق الانا (۳) لاشعور (۴) حقیقت کا اصول

ان چار عناصر کا ترکیبی تناسب مختلف افراد میں یا ایک ہی فرد کے مختلف ذہنی عوامل میں مختلف ہوسکتا ہے ، مگر یہ بہرحال ان میں سے تین تو کسی نہ کسی حد تک غیر شخصی چیزیں ہیں ۔ لاشعور میں جو جبلتیں کام کرتی ہیں وہ کسی ایک آدمی کی ذاتی ملکیت نہیں ۔ بنیادی جبلتیں سب میں وہی ہیں ۔ اگر ایک آدمی اپنے اندر کام کرنے والی جبلتوں کا ادراک رکھتا ہے تو وہ کم سے کم اپنے معاشرے میں رہنے والوں کی جبلتوں کو بھی تھوڑا بہت سمجھتا ہے ۔ وہ اپنے اندر جذب ہوکے نہیں رہ جاتا بلکہ دوسروں کے ذہنی محرکات کا اندازہ لگانا سیکھتا ہے ۔ "حقیقت کے اصول " کا جو مروجہ تصور ہے اس میں بہت سی باتیں ابھی صاف نہیں ہوتیں ۔ یہ بہرحال جو داخل بیں یہ جانتا ہے کہ اگر میں سڑک کے بیچ میں چلوں گا تو موٹر سے ٹکرا جاؤں گا تو وہ بھی اسی حقیقت کو تسلیم کرتا ہے جسے خارج بیں ۔ تیسری چیز ہے فوق الانا ۔ اس کی تشکیل کیسے ہوتی ہے اور اس کی تہیں کتنی ہیں ، ان تفصیلات میں پڑے بغیر اتنی بات کہی جاسکتی ہے کہ اس کے بنانے میں معاشرے کی مروجہ اخلاقی اقدار کا ہاتھ بھی ہوتا ہے ۔ اپنے ذہنی عوامل میں جو قوتیں کارفرما ہیں انھیں دیکھنے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی سماجی حقیقت یا اپنے معاشرے کے سیاسی ، معاشی اور اخلاقی عوامل سے بھی غافل نہیں رہ سکتا ۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ داخل بینی کے ذریعے آدمی سماجی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا وہ اپنے اس عقیدے کو جھٹلاتے ہیں کہ فرد کی تشکیل معاشرہ کرتا ہے ۔

اب اس بحث کا ایک اور پہلو دیکھیے ۔ ہمارے ذہن میں داخل بینی یا اپنا مشاہدہ کرنے کی عادت کا آغاز کیسے ہوتا ہے ؟ تھیوڈور رانک نے بتایا ہے کہ بچہ اٹھتے بیٹھتے ، کھیلتے کودتے یہ محسوس کرتا ہے کہ دوسرے لوگ مجھے پسند یا ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہے ہیں ۔ چوں کہ وہ چاہتا ہے کہ لوگ مجھے پسند کریں ، اس لیے وہ اپنا مشاہدہ شروع کردیتا ہے یہ دیکھنے کے لیے کہ میری کون سی بات انھیں پسند آتی ہے اور کونسی ناپسند ۔ چوں کہ سوال دوسروں کے ردِ عمل کا ہوتا ہے ، اس لیے وہ اپنے آپ کو انھیں کی نظروں سے دیکھتا ہے ۔ یعنی دوسروں کو اپنی شخصیت کا حصہ بنالیتا ہے ۔ خارجی حرکات کے مشاہدے کے بعد عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اندرونی محرکا کے مشاہدے کا نمبر آتا ہے ۔ انھیں بھی وہ ماں باپ کی نظروں سے ، آس پاس کے لوگوں کی نظروں سے اور آخر سماج کی نظروں سے دیکھتا ہے ۔ یہ مشاہدہ ہی نہیں محاسبہ بھی ہے ۔ داخل بینی دوسروں سے فرار کا وسیلہ نہیں بلکہ دوسروں کو اپنی زندگی میں مداخلت کا اختیار دینے کا نام ہے ۔ اپنی انا کے استوار ہونے کے بعد ہم ان لوگوں کے نقطہ نظر پر تنقید تو کرتے ہیں جن کی نظروں سے ہم اپنے آپ کو دیکھ رہے ہیں لیکن اگر ہم سچے معنوں میں داخل بیں ہیں تو ان کی نظروں سے اپنے آپ کو چھپا نہیں سکتے ۔ سماجی اقدار کو سمجھنے اور انھیں تنقیدی طور سے جانچنے کا اگر کوئی مناسب طریقہ ہے تو داخل بینی ۔

اگر یونگ کی بات مانیں تو داخل بینی کے سوا انسانی حقیقت تک پہنچنے کا اور کوئی طریقہ ہی نہیں ۔ اس کے نزدیک ذہن

کے چار حصے یا اوپر نیچے چار تہیں ہیں ـــــ (۱) انا (۲) شعور (۳) ذاتی لاشعور (۴) اجتماعی لاشعور ۔ یہ چوتھی چیز بالکل غیر شخصی ہے ۔ یونگ اسے ایک ذہنی کیفیت نہیں بلکہ ایک " شئے " کا درجہ دیتا ہے ۔ اس کا ادراک حاصل کرنے کا مطلب ہے اپنی ہستی کے محدود دائرے سے باہر نکل کے پوری انسانی تاریخ کے تجربے میں شریک ہونا ۔ یعنی داخل بینی کی آخری منزل میں ہم صرف اپنے آپ سے نہیں بلکہ نسلِ انسانی سے دوچار ہوتے ہیں ۔

اگر یہ بات آپ کو متصوفانہ معلوم ہوتی ہے تو رائخ کا نقطہ ء نظر دیکھیے جن کے نظریے کی بنیاد طبعیات پر ہے ۔ ان کے نزدیک خود آگاہی کا مطلب بنیادی طور سے یہ ہے کہ اپنے جسمانی اور ذہنی نظام کے اندر " اور گون" کی لہروں کے بہاؤ کی کیفیت کو محسوس کیا جائے ۔ ان لہروں کے دو رخ ہیں ۔ ایک تو جسم کے اندر سے باہر کی طرف ۔ دوسرے باہر فضا میں سے جسم کی طرف ۔ ان لہروں کے دوطرفہ بہاؤ کے ذریعے ہی ہمیں اپنا اور خارجی اشیا کا ادراک حاصل ہوتا ہے ۔ یعنی رائخ نے تو خارجیت اور داخلیت کا فرق ہی مٹا دیا ہے ۔ یہ دونوں ایک ہی عمل کے دو رخ ہیں ۔ اگر آدمی میں اپنے آپ کو دیکھنے کی ہمت ہے تو وہ اسی مناسبت سے خارجی حقیقت کو بھی زیادہ دیکھ سکتا ہے ۔ بلکہ رائخ تو کہے گا کہ باہر کی چیزوں کو بھی صرف وہی دیکھ سکتا ہے جو پہلے اپنے آپ کو دیکھ سکے ۔ ان باہر کی چیزوں میں سماجی حقیقت بھی شامل ہے اور کائنات بھی ۔ خود آگاہی کے ہر عمل میں ان دونوں چیزوں کا ادراک کسی نہ کسی حد تک ضرور شامل ہوتا ہے ۔ یعنی جس چیز کو ہمارے نقاد اپنے آپ میں کھو جانا کہتے ہیں ۔ خارجی حقیقت سے رشتہ قائم کرنے کا یہی ایک ذریعہ ہے ۔ بہ شرطیکہ آدمی سچ مچ اپنے آپ میں کھو سکے ۔

○●○

(سلسلہ ص : ۱۸ سے)

اشاعت کے سبب اردو کا شاہ کار سمجھی جاتی ہے۔ یہاں کے مسلمانوں میں قرآن مجید کے بعد اس کتاب کا سب سے زیادہ استعمال رہا ہے۔ گھروں میں عورتیں بڑے ادب اور اہتمام سے پڑھتی ہیں۔ مسجدوں میں ہر سال اس کا ختم کرتے ہیں۔ اس کی قدرو منزلت کا یہ عالم ہے کہ لڑکیوں کے جہیز میں قرآن مجید کے ساتھ شامل رہتی ہے۔ سارے جنوبی ہندوستان میں اس کی عام مقبولیت کا کم و بیش یہی حال ہے۔ اسی طرح مصباح الحیات کو بھی کافی اہمیت حاصل ہے۔ یہ بھی سیر شریف کی طرح ہر گھر میں پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ زین المجالس، شہادت نامہ، رکن دین، مجلس خاتون جنت وغیرہ کتابوں کا بھی کثرت سے استعمال ہوتا رہا ہے مذہبی معلومات کے فروغ کی حد تک یہ تحریک رہی جو ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۰ء تک پچاس سالوں میں پھیلی ہوئی ہے۔

ملناڈ میں خالص شعروادب کے ظہور پانے کے لیے ابھی وقت درکار تھا جس کی ابتدا اس علاقے میں نواب نسیم میسوری کی ۱۸۶۰ء میں تریکرہ میں آمد سے ہوئی یہاں نسیم کا چند سالوں تک سکونت پذیر رہنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کے شاعرانہ مذاق نے ملناڈی علاقے کے ماحول کو اثر انداز کیا ہے۔ پھر محمد باقر حسنی برق ایک ایسی شخصیت ہمیں تاریخ دیتی ہے جنھیں ملناڈی علاقے میں اردو ادب کا رہنما کہا جا سکتا ہے حضرت برق کا رشتہ تلمذ حضرت داغ دہلوی سے ملتا ہے پھر اس علاقے میں حضرت داغ کے ایک اور شاگرد محمد کبیر تحصیل کا تذکرہ آتا اور دو زبان کو زندگی بخشنے میں سب سے اہم رول رہا ہے اگرچہ کہ ان کا طرز کلام کلاسکی اور روایت پسندی کا بہترین نمونہ ہے جو حضرت داغ دہلوی کی پیروی کا حق ادا کرتا ہے لیکن تاریخی اعتبار سے اردو کی ترویج میں اس وقت کے ماحول کے مطابق جو کردار برق اور تحصیل صاحب نے ادا کیا ہے اس کی مثال ملناڈی علاقوں میں کوئی دوسرا شاعر یا ادیب نہیں دے سکا۔

سید خلیل احمد

ملناڈ میں اردو کے ابتدائی آثار

ریاست کرناٹک کے باہر لفظ ملناڈ غیر مانوس لفظ ہوگا اس لیے اس کی تشریح ضروری ہے۔ یہ کنڑی زبان کے دو لفظوں ملے یعنی بارش، ناڈو یعنی مقام، جس کا اردو میں آسان ترجمہ بارش کی سرزمین ہے، ملناڈ نہایت ہی سرسبز پہاڑیوں اور جنگلات سے بھرا قدرتی مناظر کا ایک بے مثال خطہ ہے، یہ زمین جتنی زرخیز ہے اتنی ہی مردم خیز بھی ہے اس میں ہمارے صوبے کے اضلاع شموگہ، چکمگلور اور ہاسن بھی شامل ہیں جو کہ کرناٹک ریاست کے جنوب مغرب میں واقع ہیں۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ سرزمین دکن کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں کے صوفیاء کرام اور سلاطین نے اردو کے فروغ میں سب سے نمایاں حصہ لیا اور شہر بیدر سے اردو کا سب سے پہلا شاعر اٹھا جس کا نام فخر دین نظامی بیدری ہے جس کی لکھی ہوئی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، اولیت کا درجہ رکھتی ہے خواجہ بندہ نواز اور ان کے سلسلے کے بزرگان دین نے صرف زبان میں دین کی تبلیغ نہیں بلکہ اس زبان میں بہت ساری تصانیف ان کے نام سے منسوب ہیں اسی طرح یہاں کے سلاطین میں محمد قلی قطب شاہ اردو کا سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر گزرا ہے پھر عادل شاہی دور میں اس زبان کو خوب ترقی حاصل ہوئی اور بیجاپور قدیم اردو کا مرکز بنا رہا۔

جب کرناٹک کے ان شمالی حصوں میں اردو کا طوطی بول رہا تھا تو اس کے برعکس ملناڈ میں ابھی اس زبان کی شروعات بھی نہیں ہوئی تھی گو ملناڈ میں مسلمانوں کی آمد برسوں پہلے ہوئی تھی، کہا جاتا ہے کہ ۳۹۶ھ میں قرون اولی کے ایک اللہ والے بزرگ حضرت میر دادا حیات قلندر تبلیغ اسلام کے لیے جب سرزمین ملناڈ میں تشریف لائے تو ساحل ملیبار سے ان علاقوں میں مسلمانوں کی آمد آمد ہوئی، پھر ملک کافور نے جب ۱۳۲۶ء میں ہوسیلا سلطنت پر حملہ کیا تو اس وقت یہاں کا راجہ بلالا کی فوج میں ہزاروں مسلمان سپاہی موجود تھے لیکن ان میں سے کسی کی زبان اردو نہیں تھی۔

ملناڈ میں اردو کے ابتدائی آثار ۱۶۳۶ء کے بعد ملتے ہیں جب کہ بیجاپور کے سلطان محمد عادل شاہ نے تریکرے اور بسواپٹن کے سردار کنگے ہنوما کی تحریک پر اپنے فوجی افسر دن دولہ خان کو ویر بھدرا نائک سے اکھیری اور پورے ملناڈ پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا۔ دن دولہ خاں نے اکھیری پر فتح حاصل کی اور اس نے خان جان کو یہاں کا حوالدار مقرر کیا پھر آگے بڑ کر شموگہ پر قبضہ کرلیا اس کے بعد بیجاپوری مسلمانوں کے چند قافلے ملناڈی علاقوں میں داخل ہوئے۔ ظاہر ہے یہ لوگ اپنی تہذیب و تمدن کے علاوہ زبان بھی ساتھ لائے تھے اس وقت بیجاپوری مسلمانوں کی زبان قدیم اردو تھی۔

محمد عادل شاہ کے درباری شاعر مرزا محمد مقیم نے اپنی مثنوی "فتح نامہ بکھیری" میں اس جنگ کا پورا واقعہ بیان کیا ہے۔ ویر بھدرا نائک نے اپنا تخت بکھیری سے بدنور بدل دیا اور بدنور ۱۷۶۳ء تک ایک علاحدہ ریاست رہی جب کہ حیدر علی نے اس خاندان کا خاتمہ کر دیا۔ بشیر الدین احمد نے اپنی تصنیف " واقعات مملکت بیجاپور" میں اس کا ذکر کیا ہے۔ پھ ملا نصرتی کی رزمیہ مثنوی "علی نامہ" میں ایک قصیدہ ملناڈ ملتا ہے جس میں ملناڈی علاقوں پر عادل شاہی حکومت کے قبضے اور ان کی شمولیت وغیرہ کا بیان ہے۔

بیجاپوری مسلمانوں کی ان فتوحات نے اردو زبان کو ملناڈ میں آہستہ آہستہ داخل کیا یہاں کی مقامی دراوڈی زبانوا

جیسے کنڑی، تلگو وغیرہ کے ساحل میں قدیم اردو کی یہ ابتدائی شکل محض بول چال کی حیثیت رکھتی تھی ان علاقوں میں کچھ عادل شاہی دور کے چار کتبے ملتے ہیں جن میں ایک شکاری پور، ایک سنتے ہنور اور دو جنگری کے قریب نصب کیے گئے ہیں یہ تینوں مقامات ضلع شموگہ میں واقع ہیں یہ چاروں کتبے فارسی اور کنڑی آمیز عبارت میں کندہ ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ سرکاری سطح پر ابھی فارسی زبان تھی اور اردو بول چال کی زبان رہی۔ B.L.Rice کی Epigraphy of Mysore اور پھر میر محمود حسین صاحب کی ریاست میسور میں فارسی اور اردو کتبے" نامی کتابوں میں ان کا ذکر ہے۔

بیجاپور سلطنت جو کہ ۱۶۳۲ء میں مغلیہ کی باج گزار بن گئی تھی اس کے ٹھیک پچاس سال بعد یعنی ۱۶۸۲ء میں اورنگ زیب کی فوج جنوب پر حملہ آور ہوئی اور ۱۶۸۶ء میں سلطنت بیجاپور کا خاتمہ کر کے اس پر اپنا تسلط جمالیا اور یہاں دو صوبہ داریاں اک سرا اور دوسری ارکاٹ کی قائم کیں۔ سرا کی صوبہ داری میں ملناڈ کے علاقے بسواپٹن تریرہ وغیرہ شامل تھے سرا کا پہلا گورنر قاسم خان مقرر ہوا اس کے عہد میں مسلمان کرناٹک کے تمام حصوں میں پھیل گئے اس سیاسی انقلاب کے اثرات زبان و ادب پر بھی پڑے چناں چہ بیجاپور اور گلبرگے کی ادبی فضا مکدر ہوئی، شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کرنے والے سلاطین نہ رہے تو یہاں کے شعرا نے دوسرے مقامات پر پہنچ کر اپنے روزگار کا سامان کیا، ادبی فن پاروں کو پڑھنے، سمجھنے اور سراہنے والوں میں بتدریج کمی آتی گئی، اورنگ زیب کی فتح دکن کے بعد اورنگ آباد ایک نئے ادبی مرکز کی حیثیت سے ابھرنے لگا۔ یہاں شمالی ہند کے اکثر امرا، روسا، علما اور کچھ شعرا دکن آکر سکونت پذیر ہونے، شمال اور دکن کے اس سیاسی اتحاد نے اورنگ آباد کی اردو اور وہاں کے ادب پر گہرا اثر ڈالا۔ دکن کے علاقوں میں جن میں کرناٹک بھی شامل ہے اردو کی قدیم چھاپ تھی۔

بیجاپور کی تباہی کے بعد مسلمان اور مرہٹی خاندان ہجرت کر کے ملناڈ میں آکر بسنے لگے جن میں مذہبی پیشوا، علما، ادبا سبھی تھے۔ ویسے ملناڈ میں بیجاپوری خاندان فتح بکھیری کے بعد سے آنے شروع ہونے تھے لیکن اب کی بار ان کا سیلاب امڈ آیا اور یہ لوگ ملناڈ کے دور دور علاقوں میں پھیل گئے جن میں ضلع چکمگلور اور ہاسن کے قصبے آلدور، ادرے ہلی، بس ہلی، ہالے ہنور، بیلگوڈ وغیرہ مقامات میں جاکر بس گئے۔

ان ملناڈی مقامات میں ہر جگہ سرسبز گھنے جنگلات جو اپنے دامن میں قیمتی لکڑیوں کی دولت رکھتے ہیں یہاں کے پہاڑی دامن میں دور دور تک پھیلے ہوئے کافی، الائچی اور سپاری کے ہرے بھرے باغات میں بیجاپوری مہاجرین کو روزگار کے مواقع فراہم ہوئے۔ ان لوگوں میں ہر قسم کے پیشہ ور حضرات تھے جن میں ایک حریری قوم بھی تھی جس کو ہنرگر کہا جاتا ہے۔ یہ ابریشم کا کام کیا کرتے تھے، گھوڑوں کی زین وغیرہ بنانا ان کے ذمے تھا پھر لوہار، کمہار اور زراعت پیشہ لوگ بھی شامل تھے۔ انھوں نے قدیم اردو ہی کو اپنے خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ دوسری جانب مذہبی پیشواؤں میں مختلف عقائد کے ماننے والے جیسے سنی، شیعہ، مہدوی سبھی نے اپنے دین کی تبلیغ اسی زبان میں کی۔

بیجاپوری لوگوں کا کلچر ہندو مسلم اتحاد کا ایک بہترین نمونہ تھا ان کی ملی جلی گنگا جمنی تہذیب دراصل مسلمانوں کا رہنوں اور دیگر اقوام سے میل ملاپ کا نتیجہ تھا پھر ایک عید اور تہوار جیسے محرم ہو کہ شب برات، دیوالی ہو کہ ہولی دونوں زمیں مل کر منائے جاتے چناں چہ بیجاپور کے سلاطین ان دونوں کی رسم و رواج میں برابر شریک ہوتے تھے اس لیے رعایا میں بھی یہ بات رواج پاگئی تھی آج بھی ملناڈ کے چند علاقوں میں محرم اور شب برات کے موقعوں پر دونوں کا سنگم دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہر بڑے گاؤں میں ایک [illegible] خانہ کے سامنے آگ جلائی جاتی ہے۔ ان موقعوں پر [illegible] پڑھے جاتے ہیں۔ [illegible] کنڑی کے [illegible] آگ کے گیت کے ہیں اور پھر مختلف گروہ بندیاں ہوا کرتی ہیں جن میں مرثیے پڑھے جاتے [illegible] پھر دوسرے [illegible] زبان بولی جاتی [illegible] کنڑی لفظ ہے جس کے معنی ایک قسم کی نظم ہے جس میں سوال و جواب ہوا کرتا ہے [illegible] کیا جاتا ہے اس کا [illegible] ان تمام اصناف میں اردو کے ساتھ

کنڑی اور مرہٹی آمیز الفاظ کا استعمال ہوا ہے ان علاقوں میں اردو کی ابتدائی شکل وہاں کی لوک گیتوں میں ملتی ہے۔

دکن میں اردو ادب بہت زمانے تک مردوں کے حصے میں رہا چند مخصوص خواتین کے سوا کسی نے ادبی سرگرمیوں میں زیادہ حصہ نہیں لیا تاہم گیت ایک ایسی ادبی ـــ ہے جس نے معاشرتی اور ادبی نقطہ نظر سے زبان کو پائیدار بنانے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ کی تصنیف "نورس" میں مختلف راگوں کے لیے مختلف گیت ملتے ہیں اسے موسیقی میں مہارت کے سبب جگت گرو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ گیت صرف خوشیوں کے حصہ نہیں بلکہ ہر موقع و محل کے گیت موجود ہیں خصوصا ہجر و فراق کی دل دوز داستانیں انہیں گیتوں میں ملیں گی۔ ساون کا موسم اور سسرال میں رہنے والی بیٹی کی دل سے نکلے یاد میں نکلنے والی آہیں، بھائی کی یاد میں، بہن کی تڑپ، بیدر کھلارت، سہیلیوں کی یاد کے موقع پر عورتیں گیت گایا کرتی تھیں۔ مولود نامہ، چکی نامہ کے گیت، جھولے کے گیت، چکی نامہ وغیرہ۔ یہاں کی عورتیں آج بھی اپنی یادداشت کی مدد سے گایا کرتی ہیں۔ فصیح و بلیغ کلام اگر شان و شوکت کا آئینہ دار ہے تو گیت شیریں زبان کا لعل آویزہ مرقع ہیں اور قدیم اردو کا ایک قیمتی سرمایہ بھی اور یہ زیادہ تر خواتین کی زبان پر ـــ اور ان گیتوں کے ذریعے یہاں اردو زبان کا فروغ ہو رہا تھا۔

سرزمین ملناڈ میں اردو کی خوش بو ہمیں سلطنت خداداد کے زمانے تک گیتوں، مرثیوں اور لوک گیتوں کی صورت میں ملتی ہے۔ اس سے پہلے کوئی تحریری نمونہ یہاں نہیں ملتا ۱۷۶۱ء میں سلطنت خداداد کا قیام عمل میں آیا اور اس کے دو سال بعد یعنی ۱۷۶۳ء میں حیدر علی خان نے شموگہ کے قریب بدنور ریاست جہاں پالیگاروں کی حکومت تھی حملہ کیا اور فتح حاصل کی اور بدنور کا نام حیدر نگر رکھا اور یہ سلطنت سرکار خداداد میں شامل ہو گئی بعد میں انگریز جنرل میتھو نے اس پر قبضہ کر لیا جب ۱۷۸۳ء میں ٹیپو سلطان شہید نے حکومت سنبھالی تو انھوں نے دوبارہ حیدر نگر کو انگریزوں سے چھین لیا اور ۱۷۹۹ء تک ریاست بدنور سلطنت خداداد کا حصہ رہی اور سرکار خداداد کی ادبی سرگرمیوں سے فیض یاب ہوتی رہی۔

سلطنت خداداد کے فرمانروا ابوالفتح حضرت ٹیپو سلطان شہید نے ملناڈ کی ترقی میں باوجود جنگی مصروفیات کے نمایاں حصہ لیا۔ حیدر علی خان اور ٹیپو سلطان دونوں کے درباروں میں ملک الشعرا کا تقرر ہوتا تھا اور دوسرے شاعر بھی موجود رہتے تھے ان دونوں کے دور حکومت میں ایرانیوں کی آمد کا سلسلہ بھی جاری رہا جس طرح دلی، لکھنؤ، بیجاپور وغیرہ اسلامی سلطنتوں میں جاری رہا، فارسی زبان کے نمونے ادب میں ملتے ہیں اور اسے سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا اور اردو اس وقت بھی بول چال کی زبان ہی رہی لیکن ان سلاطین نے اردو کے فروغ میں دل چسپی دکھائی چناں چہ ان کے درباری شاعر حسن علی عزت نے جہاں فتح نامہ لکھا ہیں سلطان کے کہنے پر علم موسیقی میں ایک کتاب "مفرح القلوب" لکھی جس کی بنیاد ابراہیم عادل شاہ کی نورس پر رکھی گئی مفرح القلوب کی اہمیت کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ عہد سلطنت خداداد کی دکھنی شاعری اور زبان کا ضخیم ترین اور نمائندہ مجموعہ ہے یہ وہ قدیم اردو ہے جو ٹیپو سلطان کے دربار میں رائج تھی۔

جب سلطان نے دیکھا کہ یہاں کے مسلمانوں نے شادی کے اکثر رسوم کو ہندؤں سے اپنالیا ہے اور ان رسموں کی ادائیگی میں بے شمار وقت اور پیسہ ضائع ہونے لگا ہے تو انھوں نے مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور ایک رسالہ "احکام النکاح" لکھوایا۔ حضرت ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد تھوڑے عرصے تک زبان کی طرف توجہ نہیں کی گئی اور جب وڈیار خاندان نے حکومت سنبھالی تو زبان کی ترقی پر آہستہ آہستہ زور دیا جانے لگا اور یہی وہ زمانہ ہے جب اردو میں مذہبی اور دیگر ادبی کتابیں لکھی جانے لگیں اور گھر گھر ان کی رسائی ہونے لگی۔ انیسویں صدی کے اوائل میں لکھے گئے رسائل اور کتابیں ملناڈ کے کم و بیش ہر ایک گھر میں ملتی ہیں جن میں عبدالحی صاحب کی "جان السیر" اور میر حیات مسعودی کی "مصباح الحیات" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جان السیر اردو کی سب سے بڑی اور سب سے مشہور اور مقبول کتاب ہے اور عرف عام میں اسے سیر شریف کہتے ہیں اس گراں مایہ تصنیف پر ریاست کرناٹک جتنا فخر کرے کم ہے یہ کتاب قبول عام و مقبول منزلت اور کثرت

(باقی ص: ۱۵ پر)

عزیز بھگروی

نعت

☆

قومِ انساں کی ہدایت کے لیے آئے رسولؐ
زندگی کا اک مکمل ضابطہ لائے رسولؐ

کھل گئے آنکھوں پہ اسرارِ حیات و کائنات
ذہن و دل کو کر گئے روشن تھی جلائے رسولؐ

بن گئی گہوارہ ، امن و اماں یہ زندگی
آپؐ کے انداز جب دنیا نے اپنائے رسولؐ

موسموں کے ساتھ ان کے پھول بھی مرجھا گئے
انقلابِ وقت پر ہنستے ہیں گل بلائے رسولؐ

منتشر پھر ہوگیا انسانیت کا قافلہ
ڈھونڈ کر پھر لائیے نقشِ کفِ پائے رسولؐ

اس سے بڑھ کر کون ہوگا کامیابِ زندگی
جس سے خوش ہوجائے آقا جس کو مل جائے رسولؐ

ہم میں پھر تفریق کیسی اجنبیت کس لیے
میں بھی شیدا ہے محمدؐ تو بھی شیدائے رسولؐ

○●○

نعت

☆

راستی ان کی ، حیا ان کی ، قناعت ان کی
آدمیت کی ہے معراج شرافت ان کی
ان کا پیغام محبت ہو کہ سیرت ان کی
آج دنیا کو ہے شدت سے ضرورت ان کی
شہریاروں کو ہمارے بھی عطا ہو یارب
جذبہ ، خیر سے بھرپور سیاست ان کی
شہر میں کوئی تہی دست نہ آتا تھا نظر
کیا خوش انجام قیادت تھی قیادت ان کی
دیدہ ور گرد کو اس کی بھی نہ پہنچا کوئی
مل گئی جس کو مقدر سے بصیرت ان کی
مضطرب سارے زمانے کے لیے تھے آقاؐ
سارے عالم پہ تھی چھائی ہوئی رحمت ان کی
ہر نفس ان کا تھا اک خوفِ خدا کی تصویر
زندگی یعنی مکمل تھی عبادت ان کی
ایسا تو نامہ ، اعمال نہیں تھا میرا
وہ تو کام آگئی محشر میں شفاعت ان کی
خود بہ خود ذہن میں آجائیں گے اشعار عزیزؔ
آپ ارادہ تو کریں لکھیے گا مدحت ان کی

○●○

تہنیت النساء بیگم تہنیت

نعت

☆

حضور ! پھر ہمیں ایماں کی پختگی مل جائے
عمل کا شوق ملے ، ذوقِ آگہی مل جائے

نصیب پھر سے ہو سرمایہ ، یقیں ہم کو
نظر کو نور ملے ، دل کو روشنی مل جائے

ملے وہ روح کو بالیدگی ، شگفتہ دلی
علاجِ پستی و احساسِ کم تری مل جائے

خدا کرے کہ یہ غفلت ، یہ بے بسی نہ رہے
خدا کرے کہ دل و جاں کو تازگی مل جائے

پھنسیں نہ کشمکشِ دولت و سیاست میں
بہ قولِ شاعرِ مشرق ، قلندری مل جائے

بھٹک رہے ہیں جو ہر سو تلاشِ منزل میں
انھیں پھر اسوہ ، حسنہ سے رہبری مل جائے

ملی تھی جس سے غلاموں کی رفعتِ کونین
ذرا سا ہم کو بھی وہ جذبہ ، خودی مل جائے

بلالؓ کا سا اگر سوزِ دل میسر ہو
عجب نہیں کہ دو عالم کی سروری مل جائے

دماغ صبحِ بہاراں کی تازگی پائیں
دلوں کو پھر سے گلوں کی شگفتگی مل جائے

اگر یہ سب کسی صورت نہ مل سکیں نہ سہی
بس اک نگاہِ کرم ہم کو آپؐ کی مل جائے

اسی کے در سے محتاج ہیں مسلماں سب
ملے جو یہ تو ہمیں تہنیت سبھی مل جائے

○●○

صفدر حسین صدیقی

نعت

☆

مجھ کو مرا مسلک تو وراثت سے ملا ہے
ایمان مگر تیری محبت سے ملا ہے

یہ تجھ سے محبت کا ہے فیضان کہ مجھ سے
جو شخص ملا ہے وہ محبت سے ملا ہے

میں روشنی لکھتا ہوں جو پڑھتا ہوں تو خوش
اعجاز یہ مجھ کو تری مدحت سے ملا ہے

دنیا میں بہت ہے تو حقوبت میں سوا ہے
اتنا مجھے تیرے درِ دولت سے ملا ہے

امت کا مقدر تھے ، جو دکھ تو نے سہے ہے
اسلام ہمیں کتنی سہولت سے ملا ہے

اس نسل کو اعزاز مبارک ہو کہ جس نے
آبا میں کوئی شاہِ رسالتؐ سے ملا ہے

گھر چھوڑ کے نکلا ہوں مدینے کے سفر
یہ راستہ ایسا ہے کہ جنت سے ملا ہے

اللہ کو تعمیر دو عالم کا تھ
تخلیق محمدؐ کی وساطت سے ملا ہے

○●○

جعفر جری

نعت

☆

روضے پہ اپنے مجھ کو بلا لیجیے حضورؐ
بے آسرا ہوں اپنا بنا لیجیے حضورؐ

حسرت میں زندگی نہ کبھی ختم ہو کہیں
ہوں دور اپنے پاس بلا لیجیے حضورؐ

شمعِ ہدایت آپؐ ہیں نورِ جہاں ہیں آپؐ
دنیا کی ظلمتوں سے بچا لیجیے حضورؐ

شیطان کے وسوسوں سے بچا لیجیے مجھے
دامن میں رحمتوں کی چھپا لیجیے حضورؐ

پستی میں ہوں گرا ہوا عیش و نشاط کی
مجھ کو بڑھا کے ہاتھ اٹھا لیجیے حضورؐ

طیبہ میں ہو بسر مری باقی تمام عمر
خدمت میں اب جری کو لگا لیجیے حضورؐ

○●○

توصیف تبسم

نعت

☆

مولا ! غمِ دنیا کی خلش دل سے نکل جائے
یہ موجِ سبک ، وسعتِ ساحل سے نکل جائے

خوش بو سا بکھر جاؤں میں طیبہ کی ہوا میں
پیکر یہ مرا ، دست رسِ گِل سے نکل جائے

ہشیار کہ یہ بارگہہ مصطفویؐ ہے
محفل کے جو لائق نہیں ، محفل سے نکل جائے

وہ خالق و مخلوق میں اک ربطِ جلی ہے
دھیان اس کا بھلا کیسے کسی دل سے نکل جائے

امید ہے دیکھیں انھیں حشر میں توصیف
مرجائیں ، نہ ہم یہ بھی اگر دل سے نکل جائے

○●○

اسعد بدایونی

○

جلے چراغ ہوا کیسے تا سحر کوئی
ہوا کے پاس نہیں دوسرا ہنر کوئی

ابھرتی ڈوبتی گزرے ہوئے وصال کی ناؤ
بدن کے بحر میں پڑتا ہوا بھنور کوئی

یہ دل جزیرہ کسی دھند کے غلاف میں ہے
سو اب جہاز نہیں آئے گا ادھر کوئی

اداس چاند نے دریا کے در پہ دستک دی
خوش آمدید کو بڑھنے لگا بھنور کوئی

کسی سوال کا چہرہ ، کسی خیال کا پھول
نواحِ جاں میں کہاں حرفِ معتبر کوئی

○●○

○

تھی کبھی اپنی جگہ حدِ شاہی کے قریب
دوسرے لوگ ہیں اب ظلِ الٰہی کے قریب

اب زمانے سے تعلق مرا یوں ہے جیسے
تیغ ٹوٹی ہوئی مجروح سپاہی کے قریب

یہ تو ہر دور میں ہوتا ہے سو اب بھی ہوگا
ملک حاکم سے خفا ، شہر تباہی کے قریب

میں تو سچ کہنے عدالت میں چلا آیا تھا
لرزہ ، مرگ سا طاری ہے گواہی کے قریب

یہ فقط رسم ہے یا اور کوئی قصہ ہے
خار کیوں رکھتے ہیں سب آبلہ پائی کے قریب

○●○

اسعد بدایونی

○

جب آسمان اندھیرے میں ڈوب جاتا ہے
فضائے یاد میں اک نام جھلملاتا ہے

کبھی ملال چمکتا ہے میری راتوں میں
کبھی زوال مجھے آئینہ دکھاتا ہے

یہی ہوا مرے سینے سے لگ کے روتی ہے
اسی کا ہاتھ دیے بھی مرے بجھاتا ہے

تمام رات دریچے کے پاس اک چہرہ
طلسمِ تیرہ شبی کے فریب کھلتا ہے

وہ رنگ کیوں مری آنکھیں بجھائے دیتا ہے
وہ لمس کیوں مری دیوارِ جاں گراتا ہے

مجھے بھی لوح ملے کوئی برکتوں والی
مقامِ ہول مرے راستے میں آتا ہے

○○○

○

چمک رہا ہے مرا سر بھی، میں بھی، دنیا بھی
اک آئینہ ہے سمندر بھی، میں بھی، دنیا بھی

کھلا کہ ایک ہی رشتے میں منسلک ہیں تمام
یہ میرا سر بھی، یہ پتھر بھی، میں بھی، دنیا بھی

کسی گناہ کی پاداش میں ہیں سب زندہ
مرے شجر، مرے منظر بھی، میں بھی، دنیا بھی

اتر رہے ہیں سبھی اک نشیب کی جانب
بلندیوں سے یہ پتھر بھی، میں بھی، دنیا بھی

خبر کسی کو کسی کی یہاں نہیں لیکن
ہوا کی زد پہ گلِ تر بھی، میں بھی، دنیا بھی

○○○

جمشید مسرور

○

تنہا ہر ایک رہ سے گزر جانا چاہیے
جیسے جیے ہیں ویسے ہی مرجانا چاہیے

جانے یہ دل کا درد کہاں تک ستائے گا
دریا چڑھے تو اس کو اتر جانا چاہیے

بجھ کر وجودِ شعلہ سلگتا ہے کس لیے
میں راکھ ہوں تو مجھ کو بکھر جانا چاہیے

آوارگی میں کب سے گزرتی ہے رات بھی
آخر کبھی تو شام کو گھر جانا چاہیے

اے دوستو کھڑے ہو مرے گرد کس لیے
کوئی بتاؤ مجھ کو کدھر جانا چاہیے

ہر جلوہ ، جہاں سے تنگ آچکا ہے جی
اک روز زندگی سے بھی بھرجانا چاہیے

جمشید سن رہے ہو سفر کی پکار کیا
طوفاں کو یوں نہ رہ میں ٹھہرجانا چاہیے

○●○

مقبول احمد مقبول

○

خود اپنے آپ ہی کو ڈھونڈتا ہوں
نہ جانے میں کہاں پر کھو گیا ہوں

کوئی تو مجھ پہ کردے آشکارا
حقیقت ہوں کہ عکسِ آئینہ ہوں

وہ جس کا ملنا تسکینِ دل و جاں
تصور میں اسی کے کھو گیا ہوں

وہ نغمہ ہوں ، ہے جس کو حاجتِ ساز
کوئی سنتا نہیں ہے ، وہ صدا ہوں

سبھی چہرے یہاں پر اجنبی ہیں
نہ جانے میں کہاں پر آگیا ہوں

مری دیوانگی کیا رنگ لائے
یہی مقبول ہر دم سوچتا ہوں

○●○

مسعود صدیقی مسعود

○

ن کو جفا پہ ہم کو وفا پہ غرور تھا
ن کا قصور تھا نہ ہمارا قصور تھا
ں پی گیا یہ جرم تو میرا ضرور تھا
ن یقینِ رحمتِ ربِ غفور تھا
ت بھی ایک جلوہ ۔ تجلی بھی اک حجاب
ے میں تیرے پردہ تھا پردے میں نور تھا
ں سے نیاز و نازِ نظر سے الگ الگ
ہ کو پاس پاس مگر دور دور تھا
بِ طوافِ بُت کدہ ، مہ و شاں ہے آج
قدم جو سجدہ گہہِ اہلِ نور تھا
خزاں کے ایک ہی جھونکے میں اڑ گئی
، گل اسی بہار پہ اتنا غرور تھا
پیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
ہی دی اسے جسے جتنا شعور تھا
، کوئی کس جگر سے تری آرزو کرے
نے کو چشمِ شوق ۔ تجلی کو طور تھا
ہوا کہ ان کی ادا پر ہی مر مٹے
د ایک روز تو مرنا ضرور تھا

○●○

نعمت انور غوری

○

وہ نقوش جو تھے متاعِ جاں شبِ ہجر ۔ صبحِ وصال کے
کوئی لوحِ دل سے مٹا دیا کوئی رکھ لیا ہے سنبھال کے

ترا ساتھ ۔ تیری عنایتیں ۔ وہ سرور و کیف کی ساعتیں
تری چاہتوں کی حکایتیں ہوئیں قصے خواب و خیال کے

میں جواب دوں بھی تو کس طرح یہی سوچ سوچ کے رہ گیا
اک عذابِ جاں تھے وہ مرحلے ترے ایک ایک سوال کے

وہ فراز ہو کہ نشیب ہو یہ ہیں زندگی کے لوازمے
نہ عروج پر یوں غرور کر کبھی دن بھی ہوں گے زوال کے

ہمیں ان سے پیار ہے کس قدر یہ بتا دو انورِ خستہ جاں
انھیں کاش ہم یہ دکھا سکیں دلِ بےقرار نکال کے

○●○

حبیب اجملی

○

دل خدا کا گھر بھی ہے اصنام کا مندر بھی ہے
بابری مسجد کے اندر صنعتِ آزر بھی ہے

ظلم سہتا ہوں مگر لیتا نہیں ظالم کا نام
حق نہ کہنا جرم لیکن بولنے میں ڈر بھی ہے

چشمِ ساقی ہی جو گردش میں نہیں تو کچھ نہیں
دور میں یوں جام ہے ، مینا بھی ہے ، ساغر بھی ہے

زیست کے دریا کا لمبا پاٹ اور میں ناتواں
پار بھی جانا ہے اور تن سے بندھا پتھر بھی ہے

ڈھونڈ کر بحرِ سخن سے تم جو لائے ہو حبیب
یہ صدف خالی ہیں یا ان میں کوئی گوہر بھی ہے

○●○

ایس ۔ اے ۔ فہیم

○

سرِ مژگاں نہ اگر جلتے ستاروں کے چراغ
پھر کہاں ملتا شبِ غم مجھے منزل کا سراغ
جن سے روشن ہیں تری بزمِ محبت کے چراغ
کیا قیامت ہے اٹھاتے ہیں وہی داغ پہ داغ
سرد ، آہوں سے ہوئے ہیں نہ لپکتے شعلے
گرم سانسوں نے جلائے نہ کبھی کوئی چراغ
جن کو ہمت کی ہے توفیق وہ پی سکتے ہیں
دستِ امروز سے لے کر مئے فردا کا ایاغ
اپنے دامن کی ہواؤں کو ذرا روک تو ، لو
آندھیوں نے تو جلائے ، یہ بجھادیں گے چراغ
زلفِ جاناں کو سنواروں گا بہ عنوانِ دگر
اک ذرا تلخیِ حالات سے مل جائے فراغ
وہ بھی شاید کسی منزل کا پتہ دیتے ہیں
جو سرِ شام جل اٹھتے ہیں امیدوں کا چراغ

○●○

اے ۔ ایم ۔ احمد خواہ مخواہ

○

خبر دلوں کو دکھا گئی ۔ وہ یہاں کی تھی نہ وہاں کی تھی
ی بات سب پہ عیاں ہوئی ۔ جو کسی کے رازِ نہاں کی تھی
پڑھی ہوس کی صلیب پر ۔ وہ غریب جانے کہاں کی تھی
ی دھوم جس کی تھی شہر میں ۔ وہ برات پیرِ جواں کی تھی
حرم ہو یا کوئی مےکدہ ۔ وہاں بات زورِ بیاں کی تھی
یں ذکرِ خلد و بہشت تھا ۔ کہیں بات کوئے بتاں کی تھی
ئی جب فساد کی ابتدا تو میں دور تھا نہ سمجھ سکا
دھواں جو ہے یہ کہاں کا ہے ۔ وہ جو آگ تھی وہ کہاں کی تھی
لو تھوڑی دیر سی مگر ۔ ہوئی ساری بستی میں روشنی
ی بات باعثِ فخر ہے کہ وہ آگ میرے مکاں کی تھی
ں وفا پہ اپنی ہوں مطمئن ۔ تو جفا پہ اپنی تھا منفعل
مرے یقین کی جیت ہے وہ شکست تیرے گماں کی تھی
ل در و دریچے کھلے ہوئے ۔ وہ بہت وسیع و عریض ہو
رے دل میں کیوں چلے آئے تم ۔ جو تلاش ایسے مکاں کی تھی
وا جس کی چاہ میں در بہ در ۔ اسے کیا پتہ اسے کیا خبر
رہا مجھی سے وہ بےخبر ۔ جسے فکر سارے جہاں کی تھی
یں مئے کا جس پہ کوئی اثر یہ شبابِ رندِ خراب ہے
ہی تشنگی سے جو جاں بہ لب وہ جوانی پیرِ مغاں کی تھی
وئے ہم بھی عشق میں مبتلا ۔ مگر ان میں مجھ میں یہ فرق تھا
مجھے ان کی جان کا خوف تھا انھیں فکر سود و زیاں کی تھی
ے میں نے دل میں چھپالیا ۔ اسے تونے سب کو بتا دیا
یا یہی دوا مرے چارہ گر ۔ ترے پاس دردِ نہاں کی تھی
تھا ایک سائے کی جستجو میں ۔ جلا ہوں دھوپ میں عمر بھر
تو سر پہ چھت کی تھی آرزو ۔ نہ طلب ہی کون و مکاں کی تھی

ہوا ناقدوں میں مباحثہ تو ہنسی کی بھی نہ تھی انتہا
جو چھڑی تھی دونوں کے درمیاں وہ تو بحث آہ و فغاں کی تھی
ہوئے نیم جاں تری اک نظر سے ۔ تو جاں نثاروں کے درمیاں
مجھے یاد تو نہیں ٹھیک سے ۔ کوئی بات تیر و کماں کی تھی
میں جتیدِ زیست تھا جب تلک ۔ مجھے صرف فکرِ معاش تھی
نہ تو اپنے بختِ سیاہ کی نہ نصیبِ دشمنِ جاں کی تھی
مری شعر گوئی پہ محتسب ۔ ہوئی ناقدوں میں جو گفتگو
مری فکر کی تو نہ تھی مگر ۔ میرے منہ میں تیری زباں کی تھی
یہ غلط ہے دعوائے ناخدا ۔ مجھے ڈوبنے سے بچالیا
جو مجھے کنارے پہ لے گئی وہ روانی موجِ رواں کی تھی
تمھیں مانگتے ہی جفاؤں کا ملا اختیار ۔ مگر مجھے
بڑی دیر بعد عطا ہوئی ۔ مری ضد ہی تاب و تواں کی تھی
جو غموں کا بوجھ نہ سہہ سکا وہ مرا ۔ تو لوحِ مزار بھی
ذرا اتفاق تو دیکھیے کہ سیاہ سنگِ گراں کی تھی
اسے کیسے بزمِ سخن کہوں کہ جہاں کسی کی زبان پر
نہ کوئی ستائشِ فکر و فن ۔ نہ تو دادِ حسنِ بیاں کی تھی
کئی وعظ میں نے سنے مگر ۔ نہ ہوا کسی کا بھی کچھ اثر
مجھے لے گئی جو خدا کے گھر وہ کشش تو سوزِ اذاں کی تھی
وہ حیات و موت کے جال میں جو مجھے پھنسا کے چلی گئی
مجھے ایسا لگتا ہے خواہ مخواہ کہ یہ چال عمرِ رواں کی تھی

○○○

غلام جیلانی

فریب زار

(دوسری : قسط)

(۶)

بھوشن کمار کے آرٹ کی اگزبی بیشن میں رما دیر سے پہنچی ۔ افتتاحی تقریریں وغیرہ ختم ہوچکی تھیں اور لوگ آہستہ آہستہ گھو کر پینٹنگس دیکھ رہے تھے ۔ شاید وہ دیر سے اسی لیے آئی تھی کہ بیٹھ کر تقریریں سننے سے بچ جائے ۔

ہال کو سلیقے سے سجایا گیا تھا ۔ ایک طرف مہمانوں کے لیے چائے اور ڈرنکس کا انتظام تھا ۔ اپنے بہترین لباسوں اور فیشنوا میں بجی سنوری عورتیں چھوٹے چھوٹے گروپس میں کھڑی بہ ظاہر باتوں میں مشغول تھیں مگر ان کی چبھتی ہوئی نظریں دوسری عورتوا کے فیشنوں پر پڑ رہی تھیں ۔ طرح طرح کے غیر ملکی پرفیومس سے فضا بوجھل ہوگئی تھی ۔

کالج کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بڑی سنجیدگی سے تصویریں دیکھنے اور ان میں پوشیدہ خوبیوں کی تلاش میں منہمک تھے ایک پورٹریٹ کے سامنے رما رکی ہوئی اسے غور سے دیکھ رہی تھی ۔ پورٹریٹ کسی درمیانی عمر کے عام آدمی کا تھا جو بے چین ، غم آلو نظروں سے کہیں دیکھ رہا ہے ۔ چہرہ فکروں کے جال میں قید ہے ۔ ۔ ۔ یکایک پیچھے سے ایک آواز نے رما کو چونکا دیا ۔

" بڑی عجیب بات ہے رما جی ۔ جس پورٹریٹ نے آپ کے قدم جکڑ لیے ہیں اسے میں بھی اپنے ماسٹر پی سس میں شما کرتا ہوں ۔" پیچھے بھوشن کمار کھڑا تھا ۔

" اوہ ۔ آپ ! " رما نے پلٹ کر کہا " مگر یہ ہے بھی ماسٹر پیس ! ۔ ۔ ۔ SO EXPRESSIVE "

" تھینکس ۔ ۔ ۔ تھینک یو مسز رما آنند ۔" بھوشن کمار ایسے خوش ہوکر بولا جیسے رما نے اسے کوئی ایوارڈ دے دیا ۔ ۔ ۔ " ایک بات بتلائیے ۔ اس تصویر کی کس چیز نے آپ کو اسٹرائک کیا ؟ "

" ایکسپریشن ، مسٹر بھوشن کمار ۔ ۔ ۔ " رما نے جواب دیا ۔ ۔ ۔ " ایک عام آدمی کے چہرے پر آپ نے وہ اندرونی دکھ دکھا ہے جو آج کی دنیا میں جینے کی سزا ہے ۔ اور ان دور دیکھتی ہوئی آنکھوں میں ان دکھوں کا عکس اتر آیا ہے جو باہر کی دنیا میں پھیلا ہوئے ہیں ۔ ۔ ۔ MISERY IN AND MISERY OUT ! اور اس کے لیے ہلکے بھورے رنگوں کا استعمال آپ نے بہت خوب کیا ہے ! "

دھیرج گھوش جو اس دوران میں چپ چاپ وہاں آ کھڑا ہوا تھا ، اک دم بول پڑا ۔ ۔ ۔ " مارولس ، رما دیوی ۔ آپ کی نظر میں کتنی گہرائی ہے ، ۔ ۔ ۔ اور کس خوبی سے ڈسکرائب کیا ہے آپ نے WHAT AN INSPIRING COMPLIMENT TO BHUSHAN KUMAR ! "

بھوشن کمار بولا " آپ کی تعریف سچ مچ میرے لیے بڑی قیمتی ہے ، رما دیوی جی ۔ ۔ ۔ اس لیے بھی کہ پورٹریٹ آرٹ اتنا پاپولر سبجکٹ نہیں ہے ۔"

" مگر ناولسٹ ہنری جیمس کے خیال میں سب سے بڑا آرٹ بھی یہی ہے اور اس میں رنگوں کا سلیکشن میرے خیال میں اور شکل ۔" رما نے جواب دیا ۔

دھیرج گھوش رما کو تعجب سے دیکھ رہا تھا ۔ کتنے عرصے بعد اس نے اتنی باتیں کہہ ڈالیں ! بھوشن کمار اس کے ساتھ تھے ۔ ...ں عورتوں کا ایک گروپ کھڑا تھا ۔ جن کی باتیں رما کے کانوں تک آرہی تھیں ۔ ۔ ۔ ایک عورت کہہ رہی تھی " او ۔ گاڈ ۔ ۔ ۔ ...ب صورت ساڑی آپ نے کہاں سے خریدی ؟ "

دوسری عورت بولی ۔ ۔ ۔ " میرا سارا ویرنگ میٹیریل تو سنگاپور سے آجاتا ہے ، ۔ ۔ ۔ جب بھی میرے ہس بینڈ جاتے ہیں ، ٹرپ پر ۔ ساڑیاں ، پرفیومز ، ۔ ۔ ۔ شوز ۔ ۔ ۔ ۔ "

رما آگے نہیں سن سکی ۔ وہ آگے بڑھ گئی تھی اور اب ایک دوسرے گروپ کی باتیں اس کے کان تک پہنچ رہی تھیں ۔ ...روپ میں آرتی اور اندرانی گھوش بھی شامل تھیں ۔

کوئی عورت کہہ رہی تھی ۔ ۔ ۔ " یہ مسز رما آنند نے فنکشنس میں آنا کب سے شروع کردیا ؟ "

ایک اور آواز آئی " پتی نہیں رہا ، مگر ٹھسا وہی ہے ! ۔ ۔ ۔ اسے ڈریسنگ کرنے کا آرٹ خوب آتا ہے ۔"

" اور مردوں کو اپنے اطراف اٹریکٹ کرنے کا آرٹ بھی ۔" یہ آرتی کی آواز تھی ۔ اگلی تصویر تک پہنچنے سے پہلے ہی رما کو ...ی گھوش کی آواز سنائی دی ۔

" منوج کہاں ہے ؟ وہ نظر نہیں آرہا ہے ؟ " اندرانی نے زور سے کہا ، اس ڈر سے کہ شاید کہیں اس کی آواز رما کے ... تک نہ پہنچ سکے ۔

ایک عجیب تشفی کا سا احساس لیے رما آگے بڑھ گئی ۔

آرٹ گیلری میں اب لوگوں کی تعداد کم ہونے لگی تھی ۔ بھوشن کمار کے اصرار پر رما کچھ دیر کے لیے رک گئی تھی ۔ اس ... میں روپیش بھی وہاں آگیا تھا ۔ ایک چھوٹی سی میز کے گرد وہ سب بیٹھے آرٹ پر دھیرج گھوش کے " عالمانہ " خیالات کو ...ے کی چسکیوں میں گھول رہے تھے ۔ گھوش کہہ رہا تھا ۔ ۔ ۔

" آرٹ کوئی بڑا یا چھوٹا نہیں ہوتا ۔ صرف آرٹ ہوتا ہے ۔ اسے بڑا یا چھوٹا بنانے والا ہوتا ہے آرٹسٹ ۔ مصور اپنے ...ے کینوس پر رنگوں کی زبان میں ان کہی باتیں کہہ ڈالتا ہے ۔ شاعر یا ناولسٹ قلم سے نکلے ہوئے لفظوں کے جادو سے یہی کام لیتا ... ور ڈراماٹسٹ ان باتوں کو جذبات کی زبان دے دیتا ہے ۔ ۔ ۔ "

" گڈ ۔ ۔ ۔ ویری گڈ ۔ ۔ ۔ " اک دم برابر کی میز سے ایک شخص اٹھ کر دھیرج گھوش کی طرف بڑھا ۔ ۔ ۔ " ویری بیوٹی فلی سیڈ ، مسٹر ۔ ۔ ۔ ؟ "

کسی نے ابھی دھیرج گھوش کا نام بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ شخص رما کو دیکھ کر رک گیا ۔ اور اک دم چونک کر بولا ۔ ۔ ۔ ...ے ، رما ؟ ! " ۔ ۔ ۔ اور رما کی طرف بڑھ گیا ۔ " وہاٹ لک ! کتنے دن سے تمھیں تلاش کر رہا تھا ! "

رما نروس سی ہوکر کھڑی ہوگئی ۔ ۔ ۔ " اوہ ! ۔ ۔ ۔ پروفیسر صاحب ! ۔ ۔ ۔ نمستے ۔"

رما کا ہاتھ لے کر پروفیسر نے بڑی گرم جوشی سے شیک ہینڈ کیا ۔ ۔ ۔ " کیسی ہو رما ؟ "
" آپ کیسے ہیں ؟ " اور رما پلٹ کر سب سے پروفیسر کا تعارف کرانے لگی ۔ ۔ ۔ " ڈاکٹر راجن ، پروفیسر آف انگلش لٹریچر ۔ اور یہ ہیں مسٹر دھیرج گھوش ۔ مشہور ناولسٹ ۔"
راجن نے ہاتھ ملاتے ہوئے دھیرج گھوش سے کہا ۔ ۔ ۔ " میں نے سنا ہے آپ کا نام ۔" ۔ ۔ ۔ اور پھر پلٹ کر بھوشن کمار سے مخاطب ہوا ۔ " اور آپ کی پینٹنگس دیکھنے تو آیا ہی ہوں ۔"
رما نے روپیش کا تعارف کرایا ۔ ۔ ۔ " فلم اور اسٹیج کے TALENTED آرٹسٹ مسٹر روپیش ۔"
" ایکس کیوز می ۔ ۔ ۔" کہتے ہوئے بھوشن کمار اٹھ کر کھڑا ہوگیا ۔ ۔ ۔ " میرے کچھ گیسٹ میرے انتظار میں کھڑے ہیں ۔ شاید واپس جانا چاہتے ہیں ۔ ۔ ۔"
بھوشن کے جانے کے بعد پروفیسر راجن گھوش سے بولا ۔ ۔ ۔ " آپ جانتے ہیں مسٹر گھوش ، رما دیوی میری سب سے بری لینٹ اسٹوڈنٹ رہی ہیں ؟ "
گھوش کے کچھ کہنے سے پہلے رما بول پڑی ۔ ۔ ۔ " پروفیسر صاحب ۔ آپ تو امریکہ میں سیٹل ہوگئے تھے ؟ "
" ہاں ۔ مگر سات آٹھ سال گزار کر اب واپس آگیا ہوں ، یہاں کی یونیورسٹی میں ۔"
" امریکہ پسند نہیں آیا ۔ ۔ ۔ یا کوئی اور وجہ ہوئی ؟ " گھوش نے پوچھا ۔
" WELL, THATS ANOTHER STORY " کہتے ہوئے راجن کی نگاہیں گھوش سے ہٹ کر رما پر ٹک گئیں ۔ " کبھی فرصت سے سناؤں گا ۔ ۔ ۔ کہو کب ملوگی ؟ " اور پھر اک دم پلٹ کر دیکھتے ہوئے اونچی آواز میں بولا " انیتا ۔ ۔ ۔ یہاں آؤ ۔ تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے ۔"
رما چونک پڑی ۔ " انیتا ! ! " مڑ کر دیکھا تو برابر کی میز پر شراب کی بوتل اور گلاسوں کو سامنے دھرے ایک عورت بیٹھی تھی ، نشے میں ڈوبی ہوئی ، بے سدھ سی ۔ چہرے پر بالوں کی ایک لٹ بکھر کر گر پڑی تھی ۔ جس میں سے اس کی چڑھی ہوئی آنکھوں کی سرخی جھلک رہی تھی ۔ راجن اس کے پاس پہنچا تو ایک دم چیخ کر بولی ۔ I HATE , I HATE ... I HATE EVERY THING ! " پھر جیسے نڈھال ہوکر دونوں ہاتھ زور سے میز پر پٹک کر ان میں سر چھپالیا ۔ ایک گلاس میز پر لڑھک گیا جس میں بچی ہوئی تھوڑی سی شراب میز پر پھیلنے لگی ۔
پروفیسر کا چہرہ پُر سکون تھا ۔ اس نے جھک کر ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ عورت کو کرسی پر سیدھا بٹھاتے ہوئے پلٹ کر رما ، گھوش اور روپیش سے کہا ۔ ۔ ۔ " ڈونٹ بادر ۔ شی از آل رائیٹ ۔" اور پھر عورت کے کان میں آہستہ سے کچھ کہنے لگا ۔
عورت کا چہرہ اب صاف نظر آرہا تھا ۔ انیتا ؟ ! ۔ ۔ ۔ رما کے منہ سے نکلا ۔ اس کی آواز حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی ۔
" رما جی ۔ اب چلئیے یہاں سے ۔" ۔ ۔ ۔ روپیش جو اب تک خاموش بیٹھا تھا ۔ اچانک بولا ۔ اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا ۔
دھیرج گھوش اور روپیش رما کے ساتھ آرٹ گیلری کے انٹرینس تک آئے ۔ اس دوران میں تینوں خاموش رہے ۔ ہال میں کھڑی آرتی اور اندرانی کی نگاہیں ان کا تعاقب کر رہی تھیں ۔ باالآخر گھوش نے رما سے پوچھا ۔ ۔ ۔ " کیا بات ہے ، رما جی ۔ آپ اچانک کچھ ڈسٹرب سی ہوگئی تھیں ۔ ۔ ۔ ؟ "
" میں بالکل ٹھیک ہوں مسٹر گھوش ۔" رما نے جواب دیا ۔

" اس انیتا کو آپ جانتی ہیں ؟ "

" وہ میری کلاس میٹ تھی ۔ ایم ۔ اے میں ۔"

" آئی سی ۔ یعنی راجن کی اسٹوڈنٹ " ۔ ۔ ۔ گھوش اپنی کرید میں لگا رہا ۔

" گھوش صاحب ۔ باقی باتیں پھر کبھی پوچھ لیجیے ۔ رما دیوی کو جانے میں دیر ہورہی ہے " ۔ ۔ ۔ روپیش جو عام طور پر خاموش تھا ، بیچ میں بول پڑا ۔ گھوش کھسیانا سا ہوگیا ۔ جلدی سے بولا ۔

" او ۔ یس ۔ ۔ ۔ آئی ایم ساری ۔ چلیے رما دیوی ۔ میں آپ کو گھر چھوڑ آتا ہوں ۔"

" شکریہ ۔ ۔ ۔ مگر اس کی ضرورت نہیں ۔ میں چلی جاؤں گی ۔" رما نے جواب دیا ۔

" کیسے ؟ ۔ ۔ ۔ رات کے وقت آپ کار نہیں چلاتیں ۔ اور پھر آپ اکیلی ہیں ! " ۔ ۔ ۔ گھوش نے اصرار کیا ۔

رما چند لمحے خاموش رہی ۔ " میں اکیلی کبھی نہیں رہتی گھوش صاحب ۔ ۔ ۔ " میں چلی جاؤں گی ۔ آپ کوئی فکر نہ کریں ۔ ۔ ۔ اور ۔ آپ کا بے حد شکریہ ۔ ۔ ۔"

رما نے جانے کے لیے قدم بڑھایا ہی تھا کہ پیچھے سے پروفیسر کی آواز سنائی دی ۔ ۔ ۔ " رما ۔ ۔ ۔ ذرا ٹھہرو ۔ ۔ ۔" رما رک پروفیسر جلدی سے پاس آکر بولا ۔ ۔ ۔ " تم جارہی ہو ؟ ۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی تھیں ۔ ۔ ۔ بتاؤ کیسے ہوگا ؟ " ۔ ۔ ۔ ۔ بل کرو ۔ ۔ ۔ کل مجھ سے فون پر کال ٹیکٹ کرو ۔" اور جیب سے کارڈ نکال کر دیتے ہوئے بولا " کارڈ امریکہ کا ہے ۔ مگر اس پر کا نمبر لکھ دیا ہے میں نے ۔"

کارڈ لے کر رما بولی ۔ ۔ ۔ " میں کچھ دنوں کے لیے باہر جارہی ہوں ۔ ۔ ۔ شاید کل ہی چلی جاؤں ۔ اس لیے ۔ ۔ ۔ "

" کوئی بات نہیں ۔ جب آجاؤ تب ہی سہی ۔ ۔ ۔ مگر بھولنا نہیں ۔"

رما نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ آہستہ سے مڑ کر جانے لگی تو پروفیسر کی آواز پھر ایک بار آئی ۔ ۔ ۔ " اور ہاں ۔ آنند کو میری سے وِش کرنا ۔"

رما جاتے جاتے رک گئی ۔ چند سکنڈ ویسے ہی کھڑی رہی ۔ پھر بہت دھیرے سے گھوم کر پروفیسر کو دیکھا اور ہولے سے گردن ل کیا ۔ اس کی نظریں پُر سکون تھیں ۔

روپیش نے ایک دم بے چین ہوکر گھوش کی طرف دیکھا ۔ اندرانی اور آرتی بھی اتنی دیر میں وہیں آکر چپ چاپ کھڑے تھے ۔ ے کچھ کہے بغیر روپیش تیز قدموں سے رما کی طرف چل دیا ، جو کمپاؤنڈ میں پارک کی ہوئی موٹروں کی طرف جارہی تھی ۔ ۔ ۔ " رما ۔ ۔ ۔ ؟ "

رما نے پلٹ کر روپیش کو دیکھا تو رک گئی ۔ روپیش نے پاس جاکر کچھ کہا ، اور دونوں ایک گاڑی کی طرف بڑھ گئے ۔

ہال کے انٹرینس میں سب لوگ چپ چاپ کھڑے تھے ۔ اندرانی نے نظریں گھما کر دیکھا تو آرتی بپھری ہوئی ناگن کی طرح پیچ ، کھا رہی تھی ۔ خاموشی کو توڑتے ہوئے گھوش نے راجن سے کہا ۔ ۔ ۔ " پروفیسر راجن ۔ آپ امریکہ میں تھے ۔ شاید آپ کو نہیں ہوا ۔ آنند اب اس دنیا میں نہیں رہا ۔" ۔ ۔ ۔ راجن کی نگاہیں گھوش کے چہرے پر گڑ گئیں ۔ ۔ ۔ " تین سال ہوگئے ۔"

(۷)

رما راستے میں چپ رہی ۔ روپیش بھی خاموشی میں کار چلاتا رہا ۔ گھر آگیا تو رما بولی ۔ ۔ ۔ " شکریہ روپیش ، تمھیں بڑی تکلیف ہوئی میری وجہ سے ۔"

" آپ ایسی باتیں مجھ سے نہ کہیں رما جی ۔ ۔ ۔ آپ کسی کو تکلیف دیتی ہی کہاں ہیں ! " روپیش نے جواب دیا ۔

" تمھاری کار تو وہیں رہ گئی ۔ کیسے کرو گے ؟ " رما نے پوچھا ۔ ۔ ۔ " گھر جارہے ہو تو یہی کار لے جاؤ ۔ کل بھجوادینا ۔"

" نہیں رما جی میں کسی طرح چلا جاؤں گا ۔ کار وہاں چھوڑنا نہیں چاہتا ۔ ۔ ۔ اور پھر آرتی نے کہا تھا ، اسے گھر پر چھوڑ نے کے لیے ۔ ۔ ۔" روپیش نے کار سے اترتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔ " ویسے مجھے معلوم ہے ، اب میرے جانے تک وہ وہاں نہیں رکے گی ۔ چلی جائے گی اندرانی اور گھوش صاحب کے ساتھ ۔"

رما بھی کار سے اتر گئی ۔ ۔ ۔ " روپیش ۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ فلموں کی مصروفیت کے باوجود تم نے آرٹ کی دنیا سے ناتا نہیں توڑا ۔"

مجھے بھی خوشی ہو رہی ہے کہ آپ نے اس دنیا میں پھر دل چسپی لینی شروع کردی ہے ۔ ۔ ۔ بہت اچھا کیا ۔ ورنہ گھر میں رہتے ہوئے تنہائی اور بڑھ جاتی ہے ، رما جی ۔" روپیش بولا ۔

" نہیں روپیش ۔ تنہائی تو گھر کے باہر بڑھ جاتی ہے ۔"

" روپیش چونک کر رما کی طرف دیکھنے لگا ۔ ۔ ۔ " آپ کے ایک ڈرامے کا ڈائیلاگ یاد آرہا ہے ۔ ۔ ۔ سزا مرنے والے کو نہیں ملتی ، جنھیں وہ پیچھے چھوڑ جاتا ہے ، ان کو ملتی ہے ۔"

(۸)

آرتی کو اس رات نیند کے لیے دو گولیاں کھانی پڑی تھیں ۔ صبح دیر تک سوتی رہی ۔ اٹھی تو سر میں درد اور بھاری پن تھا ۔ دل اور ذہن پر چھایا ہوا غبار الگ ۔ سیدھی اندرانی کے یہاں چلی گئی ۔ خود اندرانی پچھلی رات آرٹ گیلری سے لوٹی تو شوہر کی حرکتوں اور باتوں سے دل ہی دل میں سخت برہم ہو رہی تھی ۔ جلے پھپھولے پھوڑتے دونوں کو دیر نہیں لگی ۔

" ہاں ۔ مجھے یاد ہے ۔ پروفیسر راجن ، رما کو بہت (LIKE) لائک کرتا تھا ۔ ۔ ۔" اندرانی کہہ رہی تھی ۔ ۔ ۔ " جب وہ لوگ دلی میں تھے ۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ اسی کی کوششوں سے رما کو ایم ۔ اے میں گولڈ میڈل ملا تھا ! " ۔ ۔ ۔ پھر ذرا سے توقف کے بعد بولی ۔ ۔ ۔ " مگر کل روپیش کو یہ کیا سوجھی ؟ ۔ ۔ ۔ تمھیں چھوڑ کر رما کو ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت تھی اسے ؟ "

آرتی کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا ۔ کسی بھی قسم کے جذبے کو قابو میں رکھنا اس کے لیے مشکل تھا ۔ ۔ ۔ " بروٹ ، اس نے میری ان سلٹ کی ہے ۔ ۔ ۔ سب کے سامنے ۔" آرتی کے منہ سے نکلا ۔ ۔ ۔ " اور اپنی حرکت پر مجھ سے معافی بھی نہیں مانگی اب تک ؟ ۔ ۔ ۔ بد تمیز ! ۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کرسکتی ۔"

غصے میں آرتی کو محسوس بھی نہیں ہوا کہ اندرانی اس کی باتوں سے لطف اندوز ہورہی ہے ۔

" کسے معاف نہیں کرسکتی ؟ روپیش کو یا ۔ ۔ ۔ رما کو ؟ " اندرانی آہستہ سے بولی ۔

"ہاں ۔ سامنے بھی ان سلٹ کی ہے ۔ وہ سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو ؟ "
اندرانی نے تیل کا ایک اور چھینٹا چھڑکا ۔ ۔ ۔ "کل ہم سب تھے وہاں ۔ ۔ ۔ مگر ایک بات تک نہیں کی اس نے ! "
"کس بات کا غرور ہے اسے ؟ ۔ ۔ ۔ دولت کا ؟ " آرتی کی آواز میں تلوار کی کاٹ آگئی تھی ۔
"منوج کا ۔ جس نے اسے شہرت دی ۔" اندرانی کی آواز میں جاڑوں کی سرد ہوا کا نشتر تھا ۔
یکایک برابر کے دروازے سے گھوش داخل ہوا ۔ جو کہیں باہر جانے کے لیے تیار ہوکر آیا تھا ۔ بریف کیس تپائی پر رکھتے ہوئے بولا ۔ ۔ ۔ "ہلو آرتی ۔ ۔ ۔ کب آئیں تم ؟ ۔ ۔ ۔ کیا باتیں ہورہی ہیں ؟ "
"ہماری باتیں چھوڑیئے ۔ ۔ ۔" جواب اندرانی نے دیا "آپ کہیے کیا باتیں ہوتی رہیں کل آپ کی رما سے ، اتنی دیر تک ۔ ۔ ۔ ؟ "
گھوش چند سکنڈ تک بیوی کو دیکھتا رہا ۔ پھر کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے جواب دیا ۔ ۔ ۔ "آرٹ پر ۔ آرٹ کے مختلف پہلوؤں پر ۔"
"ہوں ۔ تو آپ نے خوب لکچر پلائے ہوں گے ، اسے امپرس کرنے ! "
"نہیں اندرانی ۔ ۔ ۔" گھوش کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی ۔ "کل پورٹریٹ پینٹنگ پر رما دیوی نے ایسے پوائنٹس اجاگر کیے کہ بھوشن کمار بھی حیران رہ گیا ! "
اندرانی کا کھسیانا پن غصے میں بدلنے لگا تو اب آرتی کو لطف آنے لگا ۔ اندرانی بولی ۔ ۔ ۔
"تو اب اگلا فنکشن کب ہے ، آرٹ یا کلچر پر ؟ ۔ ۔ ۔ جہاں آپ کی ملاقات اس سے ہوگی ، ۔ ۔ ۔ اور وہ لوگوں کو حیران کردے گی ؟ "
"یہ آپ لوگوں کے ذہنوں پر رما کیوں سوار رہتی ہے ، اتنی ؟ " گھوش کے لہجے میں کسی قدر جھلاہٹ آگئی تھی ۔ رک کر آرتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا ۔ ۔ ۔ "اور آرتی تم نے اندرانی کو یہ نہیں بتایا کہ اب کئی دن تک رما شہر میں نہیں رہے گی وہ کہیں باہر جارہی ہے ؟ "
آرتی اور اندرانی دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا ۔ ان کے چہروں پر چھایا ہوا تعجب بناوٹی نہیں تھا ۔ اندرانی نے سنبھل کر اپنے شوہر سے کہا ۔ ۔ ۔ "اچھا ؟ ۔ ۔ ۔ تو یہ اس نے آپ کو بتایا ؟ ۔ ۔ ۔ ہمیں تو معلوم نہیں ۔"
آرتی بولی ۔ ۔ ۔ "تو پھر یہ بھی بتایا ہوگا کہ کہاں جارہی ہے ۔ ۔ ۔ اور کیوں ؟ "
گھوش نے جواب دیا ۔ ۔ ۔ "اتنی کھوج کیوں ہے آخر ؟ مجھے کچھ نہیں معلوم ۔ ۔ ۔ نہ میں نے پوچھا ، نہ اس نے بتایا ۔"
"منوج کو معلوم ہوگا " ۔ ۔ ۔ اندرانی بولی ۔
آرتی نے جلدی سے کہا ۔ ۔ ۔ "یو آر رائٹ ۔ بلکہ کسے معلوم ، وہ بھی ساتھ جارہا ہوگا ! "
گھوش نے بگڑ کر آرتی کو دیکھا ۔ ۔ ۔ "وہ کیوں جانے لگا ؟ ۔ ۔ ۔ اسے اتنی فرصت ہی کہاں ؟ ۔ ۔ ۔ اور پھر یہ کیسے سمجھ لیا ، وہ رما کے ساتھ ہر جگہ جائے گا ؟ تم لوگ منوج کے پیچھے مت پڑا کرو ۔ پہلے ہی اس کا دل دکھی ہے ۔"
"بےچارہ منوج ! " اندرانی طنز بھرے تھیٹریکل انداز میں بولی ۔ ۔ ۔ اور پھر گھوش کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا ۔ ۔ ۔ "اور کیا آپ کو یقین ہے ، وہ دکھی دل لیے پھرتا ہے ؟ "
گھوش تھوڑی دیر کڑواہٹ بھری خاموشی میں اپنی بیوی کو دیکھتا رہا ۔ کڑواہٹ اس کی نگاہوں میں بھی جھلک رہی تھی ۔ ۔ ۔

"جس آدمی کی بیوی، جس سے وہ پیار کرتا تھا، اس کے سب سے اچھے دوست کے ساتھ چلی جائے۔۔۔ وہ کس طرح کا دل لیے ہوگا، کبھی سوچا ہے تم لوگوں نے؟"

(۹)

اس دن اسوانی سے منوج کی ڈبھیڑ محض اتفاقاً ہوگئی تھی کنگسوے پر ایک بزنس فرم کی افتتاحی تقریب تھی۔ فرم کا مالک منوج کا پرانا دوست تھا۔ تقریب میں شرکت کے بعد منوج لوٹ رہا تھا کہ کار کے پاس اسوانی سے ملاقات ہوگئی۔ دونوں کئی دن بعد ملے تھے۔ جاکر ایک ریسٹوراں میں بیٹھ گئے۔ باتوں کے موضوع کو گھوم پھر کر رما پر آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اور جب اسوانی سے پتہ چلا کہ رما نے اپنے دلی جانے کے خیال کا منوج سے کوئی ذکر نہیں کیا ہے، تو اسے ہلکاسا تعجب ضرور ہوا۔

"اس سے پہلے کہ اس مکان کا ڈیل ہو جائے، وہ ایک دفعہ وہاں جاکر اس میں رہنا چاہتی ہیں۔۔۔ ایک دو دن کے لیے" اسوانی نے منوج کو بتایا جو کسی قدر تعجب سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تو وہ دلی والا مکان۔۔۔ میرا مطلب ہے چھتری والی کوٹھی رما دیوی کی موسی کی نہیں تھی؟"۔۔۔ منوج نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ مسز رما کے ڈیڈی کی تھی۔۔۔ رما دیوی کی ماتاجی بہت پہلے چل بسی تھیں اور ڈیڈی کو آرمی سروس میں زیادہ تر باہر رہنا پڑتا تھا۔ اس لیے دلی کے اس مکان میں رما دیوی کے ساتھ رہنے کے لیے ان کی موسی کا پورا خاندان آکر بس گیا تھا۔" اسوانی نے جواب دیا۔

منوج بولا "اور میں سمجھتا تھا رما دیوی اپنی پڑھائی کی خاطر موسی کے یہاں ٹھہری ہوئی ہیں۔"

"دراصل رما دیوی کے ڈیڈی بہت محبت والے آدمی تھے۔ ان کو سبھی سے پیار تھا۔ بیٹی پر تو وہ جان چھڑکتے تھے۔ نہیں چاہتے تھے کہ وہ ہاسٹل میں رہے، یا اتنے بڑے مکان میں اکیلی رہے۔۔۔" ذرا سے توقف کے بعد اسوانی نے کہا "اس کوٹھی سے رما دیوی کی بڑی یادیں جڑی ہوئی ہیں۔۔۔ اب اتنے دن بعد وہ وہاں کس لیے جارہی ہیں!"

"۔۔۔ انھیں جانے دیجیے اسوانی صاحب۔۔۔ وہی یادیں انھیں بلا رہی ہیں!"

"مگر وہاں جاکر وہ اور دکھی ہوجائیں گی۔"

"ہونے دیجیے۔ غم کی آگ میں دہک کر مٹی بھی سونا ہوجاتی ہے۔۔۔ اور رما دیوی مٹی کی بنی نہیں ہیں۔۔۔" منوج نے کہا۔۔۔ "یہی وجہ ہے وہ وہاں چپ چاپ اکیلی جانا چاہتی ہیں۔ اور میرے خیال میں یہی اچھا بھی ہے۔ کون جانے کوئی ذراسی ہلچل لہروں کی رکی ہوئی روانی لوٹا دے!"

(۱۰)

دلی کی چھتری والی کوٹھی کا سودا ہو جانے کی خبر نے رما کو بے چین سا کردیا تھا۔ حالاں کہ اس کے لیے خود اس نے اسوانی سے کہہ رکھا تھا، پھر بھی دن بھر یہ خیال پھانس بن کر چبھتا رہا کہ جس جگہ اس کی زندگی کے سب سے اچھے دن گزرے تھے، اب پرائی ہوجائے گی۔۔۔ وہیں آنند پہلی بار اس کی زندگی میں داخل ہوا تھا۔ اور وہیں کے در و دیوار اس کے ڈیڈی کی آواز سے گونجتے تھے جب وہ اچانک وقت نکال کر دلی آجاتے اور دروازے سے ہی اسے پکار اٹھتے تھے۔۔۔ "رما بیٹی؟"

رات آئی تو یادوں کی ایک انجمن ساتھ لے آئی ۔ ۔ ۔ جانے کب تک بستر پر لیٹے لیٹے وہ دریچے کے باہر دیکھتی رہی ، جہاں اسمان پر پھیلی تاریکی سے یادوں کی ننھی ننھی روشنیاں نبرد آزما تھیں ۔ کبھی جھل ملانے لگتیں اور کبھی روپوش ہوجاتیں ۔ ۔ ۔

اس دن بھی روز کی طرح اسے کالج کے لیے دیر ہوگئی تھی اور ناشتے کی میز پر پہنچی تو سب لوگ ناشتہ ختم کر کے چائے پی رہے تھے ۔ آنٹی ، منورما ، رنجنا اور جگدیش انکل جو ایک دن پہلے امریکہ سے آئے تھے اور پچھری والی کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے اور جنھیں رما نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا ۔ آنٹی نے بتایا تھا کہ رشتے میں ان کے بھائی ہوتے ہیں ۔ ویسے کوٹھی میں سدا ہی کوئی نہ کوئی مہمان ضرور براجمان رہتا تھا ۔ موسی کے دور اور نزدیک کے رشتے داروں کی فہرست بڑی لمبی چوڑی تھی ۔

رما کو معلوم ہوگیا تھا کہ جگدیش انکل دراصل اپنے بیٹے کے رشتے کے لیے جو امریکہ میں رہتا ہے ۔کسی موزوں لڑکی کی تلاش میں ہندستان آئے تھے ۔ آنٹی ان کی آؤ بھگت میں لگی ہوئی تھیں اور ان کی بیٹیوں منورما اور رنجنا کے دل میں امید کے لڈو پھوٹ رہے تھے ۔

رما کو آتا دیکھ کر منورما نے آہستہ سے رنجنا کے کان میں کہا ۔ ۔ ۔ " انٹلکچول " ۔ مگر آواز رما کے کانوں تک پہنچ گئی اور اس میں چھپا ہوا طنز بھی ۔ اپنی کتابیں اور بیگ میز پر رکھ کر رما خاموشی سے چائے پیالی میں ڈالنے لگی ۔ آنٹی نے سینڈوچس کا پلیٹ اس کی طرف بڑھایا بھی ، مگر وہ بس چائے پی کر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی ۔

آنٹی نے خاموشی کو توڑا ۔ ۔ ۔ " کیا آج بھی جلدی میں ہو ؟ "

" جی آنٹی ۔ کالج کا وقت ہوگیا ۔" رما نے جواب دیا اور جانے لگی ۔ دروازے سے نکلی ہی تھی کہ پیچھے سے منورما کی آواز آئی ۔ ۔ ۔ " وہ پروفیسر راجن کا لکچر ذرا سا بھی مس کرنا نہیں چاہتی ۔ ۔ ۔ آپ کو پتہ نہیں ممی ؟ "

" کیا کالج میں پڑھاتی ہیں ؟ " ۔ ۔ ۔ جگدیش انکل نے عجیب بھونڈا سا سوال کیا ۔

" نہیں ۔ ایم ۔ اے کر رہی ہے ، انگلش لٹریچر میں ۔" آنٹی نے جلدی سے جواب دیا ۔ رما نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ پھر رک گئی ۔ اس بار رنجنا کہہ رہی تھی ۔

" مگر اپنی ساتھیوں کو پڑھاتی بھی ہے ۔ موسٹ بری لینٹ اسٹوڈنٹ ! "

" گڈ ۔ ۔ ۔ ویری گڈ ۔ ۔ ۔" جگدیش انکل بولے ۔ ۔ ۔ " لٹریچر ؟ ۔ ۔ ۔ اس سبجکٹ کی بڑی قدر ہے امریکہ میں ۔"

" مگر جگدیش انکل ۔ وہ ایم ۔ اے کے بعد پی ایچ ۔ ڈی کرے گی ۔ ۔ ۔ آپ جو سوچ رہے ہیں ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔"

" تم دونوں کو کالج جانا نہیں ہے کیا ؟ " آنٹی بات کاٹ کر بولیں ۔ لہجے میں کسی قدر غصے کو بھی شامل کرلیا تھا ۔ اس پر منورما نے شاید جانے کے لیے اٹھتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔ " ہے ممی ، جانا ہے ۔ یہ ہمارا کالج بھی بڑا منحوس کالج ہے ۔ لتنے دن سے ایک اسٹرائک نہیں ہوئی ! ۔ ۔ ۔ چلو رنجنی ۔"

رات کے ساتھ ستاروں کا کارواں آگے بڑھ چکا تھا ۔ دریچے میں سے نظر آنے والے آسمان کی تاریکی میں جھل ملاتے ستارے بھی اب وہ نہیں تھے ؛ ان کی جگہ دوسروں نے لے لی تھی ۔ ۔ ۔ یادوں کے دریچے میں بھی اب دوسرا منظر تھا ۔ ۔ ۔

پروفیسر راجن کی کلاس ختم ہوچکی تھی ۔ کسی لڑکے نے کوئی سوال کردیا تھا ۔ ۔ ۔ سوال رما کو اس وقت یاد نہیں آیا تھا ۔ ۔ ۔ جواب میں پروفیسر کہہ رہے تھے ۔ ۔ ۔

" ۔ ۔ ۔ میں یہ عذر نہیں سننا چاہتا کہ ہمارے پاس ٹائم نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ زمانہ فاسٹ ہوگیا ہے ۔ زندگی کی تیز دوڑ " کلاسیکل چیزوں کے لیے وقت کہاں ؟ ۔ ۔ ۔ غلط ۔ سب غلط ! ہر دور میں زمانہ اپنے پچھلے زمانے سے فاسٹ ہی رہا ہے ۔ پھر بھی جو کے ساتھ قدیم علم کا مطالعہ سب ہی کرتے رہے ۔

یہ بھی غلط کہ ہم اور آپ دو الگ الگ دنیاؤں میں جیتے ہیں ۔ میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ کلاس میں کوئی سوال کروں تو اد سے سر جھکائے جواب دو ۔ بلکہ یہ کہا ہے کہ نظریں ملاکر جواب دو ۔ میں غلطی کروں تو ٹوک دو ۔ لڑکیاں پتلون پہن لیں یا لڑکے تیتری رنگ کے کپڑے پہن لیں ، تو مجھے ۔ ۔ ۔ اچھا لگتا ہے ۔ یہ جنریشن گیپ کوئی چیز نہیں ۔ مریض دماغوں کی پیداوار ہے ۔ ۔ ۔

SO, TO SUM UP.... ۔ ۔ ۔ اپنے کلاسیکل لٹریچر کو بھی پڑھو ، اور جدید ٹرینڈز سے بھی واقف رہو ۔ ایکسپریشن یہ اظہار کی جڑ ہے ، لفظ ۔ لفظ کو بگاڑو نہیں ۔ اس کے استعمال اور معنی کے پہلو شوق سے نت نئے تلاش کرو ۔ ۔ ۔ "

پروفیسر راجن اور سارے لڑکے لڑکیاں چلے گئے تھے ۔ خالی کلاس میں وہ اکیلی بیٹھی رہ گئی تھی ۔ اچانک رضیہ کی آواز چونک پڑی ۔ ۔ ۔ " رما ؟ ۔ ۔ ۔ لکچر ختم ہوگیا ۔ کیا اس کے اثر میں سارا دن اسی طرح بیٹھی رہے گی ؟ ۔ ۔ ۔ چل کینٹین چلتے ہیں ۔ کچھ باتیں کرنی ہیں ۔"

کینٹین میں ابھی زیادہ بھیڑ نہیں تھی ۔ بیرا آیا تو رضیہ نے آرڈر دیا ۔ ۔ ۔ " دو کافی ۔ ۔ ۔ اور ہاں ، کچھ سینڈوچس اور بسکٹ بھی ساتھ لے آؤ ۔" اور پلٹ کر رما سے بولی ۔ ۔ ۔ " مجھے پتہ ہے ، تو آج بھی جلدی میں صبح کو صرف چائے کی ایک پیالی پی کر سے نکل پڑی ہوگی ۔ ۔ ۔ پہلا پیریڈ پروفیسر راجن کا تھا نا ؟ " ۔ ۔ ۔

" یہ بات نہیں رضیہ ۔ ۔ ۔"

" یہی بات ہے ۔ ۔ ۔" رضیہ بات کاٹ کر بولی ۔ " اور یہ بات سب جان گئے ہیں کہ پروفیسر صاحب تجھ میں کچھ زیادہ INTERESTED ہوگئے ہیں ۔"

" تو مجھ سے اپنی کوئی بات کہنے والی تھی ! " رما نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا ۔ جس پر رضیہ تھوڑی سی دیر کے ۔ خاموش ہوگئی ۔ پھر سنجیدگی سے بولی ۔ ۔ ۔ " رما ۔ میں ان دنوں بڑی کنفیوزڈ ہوں ۔ ہمارے بزرگ میری شادی کر دینا چاہتے ہیں ! "

" تو کر لے ۔"

" تو کر لے ، بس کہہ دیا ! " رضیہ طنز سے نقل کرتے ہوئے بولی ۔ ۔ ۔ " مجھے نہیں کرنی ہے شادی اس چڑی کے غلام سے ۔"

رما نے چھیڑتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔ " چڑی کا نہیں ، وہ تو تیرا غلام ہے ۔ تو نے ہی بتایا تھا ، مرتا ہے تجھ پر ۔ اور پھر اتنا بھی نہیں کر تو نام دھرے اس کا ! ۔ ۔ ۔ بنگلہ ہے ، موٹر ہے ، چمڑے کا کاروبار کرتا ہے ۔ ۔ ۔ سوچتا کس بات کا ہے ؟ "

" عقل ! ۔ ۔ ۔ عقل کا کورا ہے ۔" رضیہ بولی ۔ ۔ ۔ " معصوم بچے کی طرح میری ہر بات مان لیتا ہے ۔ کبھی کسی بات پر کاٹتا ہی نہیں کرتا میری ! ۔ ۔ ۔ نہ کبھی غصے میں آتا ہے ، نہ روٹھتا ہے ! ۔ ۔ ۔ کاٹھ کے الو عاشق ، وہاں جان بن جاتے ہیں رما ۔ ۔ ۔"

" تو پھر کیسے عاشق چاہئیں آپ کو ؟ " یکایک قریب سے ایک آواز آئی ۔ ۔ ۔ " اگر برا نہ مانیں تو ٹرائیل کے لیے بندہ حاضر ہے ۔"

دونوں نے چونک کر دیکھا تو ایک خوب رو نوجوان چپ چاپ کھڑا جانے کب سے ان کی باتیں سن رہا تھا ۔ چہرے

رارت جھلک رہی تھی ۔ رضیہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا ۔ ۔ ۔ " آپ کس کھیت کی مولی ہیں ، معلوم تو ہو ، ۔ ۔ ۔ جو اس طرح ، بلائی بلا کی طرح آ دھمکے ؟ "

" ارے آپ تو خفا ہوئی جارہی ہیں ! ۔ ۔ ۔ خیر ، دیکھا گیا ہے کہ اکثر ۔ ۔ ۔ ابتداء اسی طرح ہوتی ہے " ۔ ۔ ۔ کہتے ہوئے ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا ۔

" ابتدا ؟ ۔ ۔ ۔ کس چیز کی ؟ " رضیہ کی آواز میں غصہ جھلک رہا تھا ۔

" جی ؟ ۔ ۔ ۔ میرا مطلب ہے ۔ ۔ ۔ التفات کی ۔" ذرا سے تامل کے بعد اس نے اسی پرسکون انداز میں جواب دیا ۔

" آپ یہاں سے جانے کا کیا لیں گے ؟ " جلدی سے رما بول پڑی ۔

نوجوان نے گھوم کر رما کو دیکھا ، ۔ ۔ ۔ ایسے جیسے پہلی بار اس کی موجودگی کا احساس ہوا ہو ۔ ۔ ۔ " اوہ ، ۔ ۔ ۔ آپ کو تو ما ہی نہیں تھا میں نے ! " ۔ ۔ ۔ اور نظریں ہٹائے بغیر کہتا گیا ۔ ۔ ۔ " کون بد ذوق ہوگا جو آپ کی محفل سے اٹھ کر جائے گا ! "

رضیہ نے غصے سے پیر پٹکتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔ " نان سنس ۔ بہت ہوچکا ۔ اب آپ فوراً یہاں سے دفع ہوجائیے ۔ ۔ ۔ ہم ، کچھ پرسنل باتیں کر رہے تھے ۔ ۔ ۔ "

" لڑکیاں جب بھی مل بیٹھتی ہیں ، پرسنل باتیں ہی کرتی ہیں ۔ ۔ ۔" اس نے رضیہ کی طرف پلٹتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔ " اور سنیے ، ۔ میں دراصل آپ ہی سے ملنے آیا تھا ۔"

رضیہ اسے غور سے دیکھنے لگی ۔ ۔ ۔ " میں نے آپ کو پہلے کبھی دیکھا تک نہیں ۔ ۔ ۔"

" اب روز دیکھنا پڑے گا ۔ کیوں کہ میں اب آپ ہی کے ساتھ رہوں گا ۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا ۔ جیسے ہم دردی کا کر رہا ہو ۔

رما جو چپ بیٹھی تھی ، بول پڑی ۔ ۔ ۔ " رضیہ یہ کوئی پاگل لگتا ہے ! "

" رضیہ ؟ ! " ۔ ۔ ۔ وہ ایک دم چونک پڑا ۔ ۔ ۔ " آپ رضیہ ہیں ؟ ۔ ۔ ۔ تو پھر رما کون ہیں ؟ " ۔ ۔ ۔ اور جلدی سے کر رما کو دیکھا ۔ ۔ ۔ " آپ ہیں رما ؟ " چہرے پر گھبراہٹ چھا گئی تھی ۔

" کوئی اعتراض ہے آپ کو ؟ " رما نے سکون بھرے انداز میں پوچھا ۔

" اعتراض ؟ ۔ ۔ ۔ نہیں ۔ ۔ ۔ نہیں کوئی اعتراض نہیں " وہ بوکھلا گیا تھا ۔ ۔ ۔ " میں تو ۔ ۔ ۔ دیکھیے نا " سخت شرمندہ ہو ں اپنی حماقت پر ، ۔ ۔ ۔ اور نروس بھی ۔ اس طرح بن بلائی بلا کی طرح آ دھمکا ! ۔ ۔ ۔ میں سچ معافی چاہتا ہوں اپنی غلطی پر " اور یکایک جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ۔

" کون سی غلطی پر ؟ ۔ ۔ ۔ جانے سے پہلے بتاتے تو جائیے ؟ " رضیہ اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہورہی تھی ۔

" کوئی فائدہ نہیں ۔ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا ۔ ۔ ۔ میں تو مذاق کر رہا تھا ، اس ذرا سی غلطی نے اسے بد ذوقی میں بدل ، دیا ۔ ۔ ۔ "

اور وہ فوراً وہاں سے چل دیا ۔ رضیہ اور رما حیران سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے ۔ پھر ہنس پڑے ۔ ان کی ہنسی قہقہوں نے لگی ۔ رما نے اپنی انگلی سر کے پاس لے جاکر ہوا میں گھماتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔ " پاگل ! "

ooo

اے ۔ ام ۔ احمد خواہ مخواہ

افسانہ

دل کے رشتے

ہوٹل اوبرائے شیرٹن کے کانفرنس ہال میں "آل انڈیا میڈیکل کونسل کی جانب سے منعقد کردہ سہ روزہ سمینار کا آخری دن تھا۔ بحث کا موضوع تھا "امراض قلب کے محرکات اور ان کا انسداد" مختلف ممالک سے آئے ہوئے ماہرین امراض قلب اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کر چکے تھے۔ چائے کے وقفے کے بعد کئی مندوبین، چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹے ایک دوسرے سے متعارف ہو کر تبادلہ، خیالات کر رہے تھے کہ اناونسر کی آواز گونجی ... "لیڈیز اینڈ جنٹلمین! آپ اپنی نشستوں پر تشریف رکھیں۔ اس سے پہلے کہ چائے کے بعد کا اجلاس باضابطہ شروع ہو، مہاراشٹر کے ضلع اورنگ آباد سے آئے ہوئے مشہور و معروف کارڈیالوجسٹ ڈاکٹر ڈی سوزا "دیہات و قصبات میں امراض قلب کی کمی" کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کریں گے ..."

ڈاکٹر ڈی سوزا نے مائک سنبھالا اور اپنی نپی تلی تقریر میں پہلے اس موذی مرض کے محرکات پر مختصر سی روشنی ڈالی پھر دیہاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے بتایا کہ "تمباکو، سگریٹ اور شراب نوشی کے علاوہ شہر کی مسموم آب و ہوا اور اشیاء خور و نوش میں آمیزشں بھی امراض قلب کی معقول وجوہات ہیں۔ اسی لیے ہندستان کے دیہات میں رہنے والے سیدھے سادے کسان اور مزدور جو کھلی اور صاف ستھری ہوا میں سانس لیتے، سادہ لیکن ملاوٹ سے پاک غذا استعمال کرتے ہیں ان جان لیوا امراض سے محفوظ او مامون رہتے ہیں ..."

سمینار میں شریک دیگر ڈاکٹروں کے ساتھ پہلی صف میں بیٹھے ڈاکٹر حامد ایم۔ ڈی، کارڈیالوجسٹ کو، ڈاکٹر ڈی سوزا کی تقریر کا ایک ایک لفظ دل میں اترتا محسوس ہوا۔ ڈاکٹر حامد کو پوسٹ گریجویشن کیے دو سال ہوچکے تھے۔ وہ دل کے کئی مریضوں کو ٹھیک کرچکے تھے جس کی وجہ سے دو برس کی قلیل مدت میں انھیں کافی شہرت حاصل ہوگئی تھی۔ شہر اور مضافات میں ان کے دو کلینک تھے۔ کئی دواخانوں میں آنریری فزیشین کی حیثیت سے وزٹ بھی کرتے تھے۔ — ڈاکٹر ڈی سوزا کی تقریر سن کر انھیں یوں لگا کہ اس موضوع پر اگر انھیں تقریر کرنے کے لیے کہا جاتا تو وہ بھی یہی کچھ کہتے جو ڈاکٹر ڈی سوزا مختلف دلائل اور ثبوت کے ساتھ کہہ رہے تھے۔

تقریر کے اختتام پر ڈاکٹر ڈی سوزا اسٹیج سے نیچے اترے تو ڈاکٹر حامد نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھام لیا اور اپنے بازو والی نشست انھیں پیش کی۔ ڈاکٹر ڈی سوزا کی عمر ستر برس کے لگ بھگ تھی۔ کندھے ڈھلے ہوئے، چال میں سستی لیکن چہرے پر بلا کی متانت اور پُر وقار سنجیدگی اور سادگی تھی۔ سمینار کے اختتام پر ڈاکٹر ڈی سوزا نے بتایا کہ وہ رات کی ٹرین سے اورنگ آباد واپس جارہے ہیں۔ ڈاکٹر حامد ان کی سادگی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ رات ان سے اسٹیشن پر ملنے کا وعدہ کرکے گھر لوٹے۔ کلینک سے فارغ ہوکر حسب وعدہ جب وہ اسٹیشن پہنچے تو ٹرین چھوٹنے میں صرف دس منٹ رہ گئے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر ڈی سوزا کو ڈھونڈا اور عین اس وقت جب

نے بری جی دکھائی انھوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر ڈی سوزا ایک ہاتھ میں سوٹ کیس لیے پلیٹ فارم پر دوڑے چلے آرہے ہیں ۔ جب تک مٹر حامد دوڑ کر انھیں سنبھالتے چھوٹتی ہوئی ٹرین کو دیکھ کر ان کے قدم لڑکھڑا گئے اور وہ پلیٹ فارم پر ڈھیر ہوگئے ۔ ڈاکٹر حامد نے کی مدد سے انھیں بینچ پر لٹایا ۔ سفاری سوٹ کے بٹن کھول دیے اور نبض دیکھی ۔ ان کا چہرہ پسینے سے تر بہ تر اور سفید ہو رہا تھا یں پتھرانے لگی تھیں ۔ ہارٹ اٹیک کے آثار تھے ۔ انھوں نے فوراً اپنے بیگ سے سار بی ٹریٹ گولی نکالی اور ڈاکٹر ڈی سوزا کی زبان نیچے رکھ دی ۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر ڈی سوزا نے آنکھیں کھولیں ۔ ڈاکٹر حامد نے فوراً ایمبولینس منگوائی اور بمبئی ہاسپٹل کے انٹنسیو کیر ، میں داخل کرادیا ۔ اسی ہاسپٹل سے وہ خود بھی منسلک تھے ۔ جہاں وہ ہر روز اپنے مریضوں کو دیکھنے جایا کرتے تھے ۔

ہفتے بھر کی مناسب دیکھ بھال اور معقول علاج کے بعد ڈاکٹر ڈی سوزا اس حد تک صحت یاب ہوئے کہ انھیں بات کرنے اور پھرنے کی اجازت دے دی گئی ۔ ایک صبح وہ ناشتے سے فارغ ہوئے تھے کہ ڈاکٹر حامد اپنے وقتِ مقررہ پر وزٹ کے لیے آگئے ۔

" گڈ مارننگ ڈاکٹر ، ہاؤ آر یو ۔"

ڈاکٹر ڈی سوزا نے جواب دینا چاہا لیکن ڈاکٹر حامد نے کہا " ۔ ۔ ۔ آپ ابھی بات نہ کریں ۔ ناؤ یو آر لکنگ فائن ۔ ۔ ۔"

ڈاکٹر ڈی سوزا کی آنکھیں بھر آئیں وہ بہ مشکل اتنا ہی کہہ سکے ۔ ۔ ۔ " تھینکس اے لاٹ ڈاکٹر ۔ ۔ ۔"

" نیور مائنڈ ڈاکٹر ، اٹ از مائی ڈیوٹی ۔ ۔ ۔ ڈاکٹر حامد نے مسکرا کر کہا ۔ ۔ ۔ " اب آپ خطرے سے باہر ہیں ۔ ایک اور کارڈیو دیکھ لوں گا پھر آپ اورنگ آباد جا سکتے ہیں مگر سفر فرسٹ کلاس میں کرنا ہوگا ۔ نو تھرڈ کلاس ، سوری آئی مین ، سکنڈ کلاس ۔ ۔ ۔ ہ ہنسنے لگے ۔

ڈاکٹر ڈی سوزا نے کہا ۔ ۔ ۔ " میں ایک یا دو روز بعد چلا جاؤں گا ۔ جانے کیوں تم سے ڈھیر ساری باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے ۔"

ڈاکٹر حامد نے جواب دیا ۔ " جی چاہتا ہے تو ضرور کہیے ، ویسے میں آج فری بھی ہوں مگر آپ کم ہی بولیں تو اچھا ہے ۔ ۔ ۔"

ڈاکٹر ڈی سوزا گمبھیر آواز میں بولے ۔ ۔ ۔ " بیٹا ! میں ایک مرحلے سے اکیلا جی رہا ہوں ۔ میری وائف بے اولاد ہی چل بسی ۔ ری لڑکا ہوتا تو اس وقت وہ تمھاری عمر کا ہوتا اور شاید ہو بھی جاتا ۔ ۔ ۔ لیکن ۔ ۔ ۔"

" ۔ ۔ ۔ کیا ہوا تھا ۔ ۔ ۔" ڈاکٹر حامد نے ہم دردانہ لہجے میں پوچھا ۔ ۔ ۔ " کوئی ایکسیڈنٹ ؟ ۔ ۔ ۔"

" نہیں " ڈاکٹر ڈی سوزا نے دھیمے لہجے میں کہا ۔ ۔ ۔ " ایکسیڈنٹ تو نہیں لیکن ایکسیڈنٹ ہی سمجھو ۔ میری وائف کو جب یہ یقین کہ اس کے کوئی اولاد نہیں ہوگی تو اس نے چاہا تھا کہ ہم کسی کرسچن لڑکے کو گود لے لیں ۔ میں نے اسے سمجھایا کہ گود لینے کے اگر وہ کرسچن لڑکے ہی کو ڈھونڈتی رہے گی تو جنم بھر بے اولاد ہی رہے گی ۔ بچوں کا کوئی دھرم نہیں ہوتا ۔ ۔ ۔ ہم ذات پات دیکھے ں کے بھی بچے کو لے کر اس کی پرورش کریں گے ۔ جب وہ بڑا ہوگا تو اس کی مرضی پر چھوڑ دیں گے ۔ وہ جو مذہب چاہے اختیار ۔ وہ راضی ہوگئی ۔ ہم نے کئی برس انتظار کیا جب ہم بالکل مایوس ہوچکے تھے تو ایک حاملہ عورت میری کلینک میں ابورشن کے لیے اس کا پہلا لڑکا ایک برس کا بھی نہ تھا اس لیے وہ اس بچے کو ابورٹ کرنا چاہتی تھی ۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اس بچے کو نہ کرے ۔ میں اس کی صحت اور ڈیلیوری کی ضمانت دوں گا اور کفالت بھی کروں گا ۔ ڈیلیوری کے بعد چاہے لڑکا ہو یا لڑکی وہ بچہ لے لوں گا ۔ ۔ ۔ عورت راضی ہوگئی ۔ تب سے میری وائف اس ہونے والے بچے کو گود لینے کی خوشی میں آٹھوں پہر مسرور رہنے لگی ۔ ، بے چاری کیسے کیسے خواب دیکھنے لگی تھی ۔ کبھی بچے کے لیے سویٹر بنتی کبھی موزے اور نیپکن تیار کرتی ۔ ڈھیر سارے کھلونے خرید جیسے جیسے اس عورت کی ڈیلیوری کے دن قریب آتے گئے وہ دیوانگی کی حد تک مصروف رہنے لگی ۔ ۔ ۔" اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگئے ۔

" آپ چپ کیوں ہوگئے ڈاکٹر ؟ " ڈاکٹر حامد نے پوچھا ۔ ۔ ۔ " پھر کیا ہوا ؟ ۔ ۔ ۔ "

" ہونا کیا تھا ۔ ۔ ۔ " ڈاکٹر ڈی سوزا نے مایوسی سے کہا ۔ ۔ ۔ " ہم نے پورے نو مہینے اس عورت کی خاطر خواہ دیکھ بھال کی ڈیلیوری ہوئی ۔ لڑکا تھا ۔ ۔ ۔ خوب صورت گول مٹول اور صحت مند ۔ ۔ ۔ میری وائف کی خوشیوں کا ٹھکانا ہی نہ تھا ۔ صبح سے شام تک اس عورت اور بچے کی خدمت کرنے میں یوں مصروف رہتی ۔ لگتا تھا کہ اس بچے نے اسی کی کوکھ سے جنم لیا ہے ۔ ایک ہفتہ بعد ، عورت ڈسچارج ہوکر جانے لگی تو میں نے وعدہ یاد دلایا ۔

اس نے جواب دیا ۔ ۔ ۔ " بچہ ابھی بہت چھوٹا ہے ایک ماہ بعد وہ اپنے شوہر اور سسرالی عزیزوں سے مشورہ کرنے کے بعد جواب دے گی ۔ ڈاکٹر ! وہ ایک ماہ کا عرصہ بڑا ہی صبر آزما تھا ۔ لیکن ماں آخر ماں ہوتی ہے ۔ اس کی ممتا وعدے پر غالب آگئی ۔ ایک ماہ بعد میرے اصرار کرنے پر اس نے اپنا بچہ دینے سے انکار کردیا اور پھر وہ لوگ اورنگ آباد چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے ۔ ۔ ۔ میری وائف برداشت نہ کرسکی ۔ مہینوں اس بچے کے لیے تیار کیے ہوئے کپڑوں اور خریدے گئے کھلونوں کو تکتی رہی ۔ کبھی سویٹر پر محبت سے ہاتھ پھیرتی کبھی موزے چومتی ۔ اسی حالت میں وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی ۔ ۔ ۔ "

پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہنے لگے ۔ ۔ ۔ " ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے ۔ انسان کو ہر حال میں خوش رہنا چاہیے ۔ ہے نا ڈاکٹر ؟ ۔ ۔ ۔ "

ڈاکٹر حامد کے دل میں ڈاکٹر ڈی سوزا کی عظمت اور بڑھ گئی انھوں نے بس اتنا ہی کہا ۔ ۔ ۔ " یو آر ریئلی گریٹ ڈاکٹر ۔ ۔ ۔ "

ڈاکٹر ڈی سوزا نے موضوع بدلتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔ " تم مجھے اپنی کلینک نہیں دکھاؤ گے ۔ یہیں سے واپس بھیج دو گے ۔ ۔ ۔ ؟ ۔ ۔ ۔ "

" آج ہی شام کو چلیں گے ۔ ۔ ۔ " ڈاکٹر حامد نے جواب دیا ۔

اسی شام ڈاکٹر حامد کے کنسلٹنگ روم میں میز پر رکھی ایک گروپ فوٹو کو ڈاکٹر ڈی سوزا نے اٹھا لیا اور اپنے چہرے کے قریب لاکر بہ غور دیکھنے لگے ۔

ڈاکٹر حامد نے بتایا ۔ ۔ ۔ ڈاکٹر ۔ یہ میری فیملی کا گروپ فوٹو ہے ۔ میرے ڈیڈی میرے بڑے بھائی کو گود میں لیے کھڑے ہیں اور جو ننھا سا بچہ میری ممی کی گود میں ہے وہ میں ہوں ۔ ۔ ۔ "

ڈاکٹر ڈی سوزا نے وہ تصویر اچانک میز پر رکھ دی اور پوچھا ۔ ۔ ۔ " تمھارے والدین کبھی اورنگ آباد میں بھی رہ چکے تھے ؟ "

" جی ہاں ! " ڈاکٹر حامد نے کہا ۔ ۔ ۔ " میں وہیں پیدا ہوا ۔ ابھی دو ماہ کا بھی نہ تھا کہ ہم سب بمبئی آگئے ۔ یہیں ڈیڈی کا انتقال ہوگیا ۔ تب سے میری ممی نے ہی مجھے پالا پوسا اور ڈیڈی کا پیار دیا کبھی ان کی کمی محسوس ہونے نہیں دی لیکن ڈاکٹر ! کبھی کبھی ڈیڈی کی کمی بری طرح محسوس ہوتی ہے ۔ ان کی آرزو تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں ۔ آج میں ڈاکٹر ہوں لیکن وہ نہیں ہیں ۔ ۔ ۔ " اتنا کہتے کہتے ڈاکٹر حامد کی آنکھیں بھر آئیں ۔ ۔ ۔ ڈاکٹر ڈی سوزا فوراً اٹھے اور انھیں گلے لگا کر کہا ۔ ۔ ۔ " ڈونٹ بی سو اموشنل مائی سن ۔ گاڈ از گریٹ ۔ "

ڈاکٹر حامد نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا ۔ ۔ ۔ " آپ ایک دن اور رک جاتے تو میں آپ کو اپنی ممی سے ملاتا وہ آپ سے مل کر بے حد خوش ہوتیں ۔ ۔ ۔ "

ڈاکٹر ڈی سوزا نے کچھ سوچ کر جواب دیا ۔ ۔ ۔ " نو مائی سن ۔ مجھے جلد واپس جانا ہے میرے مریض میرا انتظار کر رہے ہوں گے ۔ ۔ ۔ تمھاری ممی واقعی گریٹ لیڈی ہیں جنھوں نے نہ صرف یہ کہ تم جیسے ہونہار ڈاکٹر کو جنم دیا بلکہ ۔ ۔ ۔ خیر انھیں میری طرف سے پوچھنا اور ان کا خیال رکھنا ۔ او کے ! "

انھیں اسٹیشن پر وداع کرتے ہوئے ڈاکٹر حامد کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے کسی عزیز سے بچھڑ رہے ہیں ۔ ادھر ڈاکٹر ڈی سوزا بھی بہ ظاہر ہشاش بشاش نظر آرہے تھے ۔ ٹرین چھوٹنے سے قبل انھوں نے ڈاکٹر حامد کی پیشانی چوم لی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا ۔ ۔ ۔ "تھینک یو ویری مچ مائی سن فار ایوری تھنگ یو ہیو ڈن فار می ۔ مے گاڈ بلیس یو ۔ ۔ ۔" تبھی ڈاکٹر حامد نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے ۔

رات کے کھانے پر دیر سے آنے کا سبب پوچھنے پر انھوں نے اپنی ماں کو بتایا کہ وہ اورنگ آباد سے آئے ہوئے ڈاکٹر ڈی سوزا کو وداع کرنے اسٹیشن گئے تھے ۔ ۔ ۔ "ممی ! وہ بے چارے بہت دکھی تھے ۔ کسی عورت نے ان کی لا ولد بیوی کو اپنا ہونے والا بچہ گود دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن ڈیلیوری کے بعد وہ مکر گئی ۔ پور اولڈ لیڈی ۔ ۔ ۔ وہ اس غم کو برداشت نہ کرسکی اور مرگئی ۔ تب سے بے چارے دوہرا غم اپنے سینے میں چھپائے جی رہے ہیں ۔ ۔ ۔"

ماں نے کھانے سے ہاتھ روک کر پوچھا ۔ ۔ ۔ "کیا نام بتایا تم نے ؟ ڈاکٹر ڈی سوزا ! ! ۔ ۔ ۔"

"ہاں ماں ! " ڈاکٹر حامد نے جواب دیا ۔ ۔ ۔ "اورنگ آباد سے سمینار میں شریک ہونے بمبئی آئے تھے ۔ ہارٹ اٹیک ہونے پر ایک ہفتہ میرے زیر علاج رہے ۔ ابھی ابھی میں انھیں اسٹیشن چھوڑ آیا ہوں ۔ ۔ ۔"

ڈاکٹر حامد کی ماں کا چہرہ یکایک سفید پڑگیا ۔ ۔ ۔ "تم کھا لو ۔ ۔ ۔ مجھے بھوک نہیں ۔ ۔ ۔" یہ کہہ کر وہ ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ گئیں ۔

○●○

یوسف ناظم

مطالعہ

اردو ادب میں طنز و مزاح ۔۔۔ آزادی کے بعد ۔

(مصنف : ڈاکٹر ایس ۔ جے ۔ صادق)

ڈیمائی سائز کے سات سو صفحات پر مشتمل ، نہ صرف ضخیم بلکہ مجسم تحقیق ، یہ کتاب ۱۹۹۴ء میں حیدرآباد سے شائع ہوئی ۔ دو چار سال اور یوں ہی گزر جاتے تو شاید مخطوطہ بن جاتی ۔ اس کے مصنف ڈاکٹر ایس ۔ جے ۔ صادق حیدرآباد ہی کے رہنے والے ہیں لیکن نہ تو اج تک ان کا دیدار نصیب ہوا نہ ان کی گن سن کہیں ملی ۔ کتاب کے نظر آنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔ اس غضب کی بے تعلقی ، نہ لاگ نہ لگاؤ ۔ گوشہ نشینی اور خفیہ رہائش کم سے کم حیدرآباد میں ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا ۔

مصنف نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے " مجھے اس کا احساس ہے کہ بعض جائزے بہت طویل ہوگئے ہیں ، تنقیدی تبصروں میں مزاح نگاروں کی نگارشات سے حوالے بہت زیادہ ہوگئے ہیں مگر قاری کو محسوس ہوگا کہ اس سے پیش تر کسی نے بھی اس طرح کا گہرا اور تفصیلی جائزہ نہیں لیا تھا ۔" (ص ص ، ۸ و) ۔۔۔ یہ تعلّی اور خودستائی نہیں حقیقت ہے ۔ زیرِ نظر کتاب " اردو ادب میں طنز و مزاح ۔۔۔ آزادی کے بعد (۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۰ء) " دراصل فاضل مصنف کا پی ایچ ۔ ڈی کا مقالہ ہے جس کی داغ بیل ۱۹۶۹ء میں پڑی ۔ مرحوم ڈاکٹر حنیف قتیل ، مقالہ نگار کے گائیڈ تھے ۔ یہ نام بجائے خود اعلیٰ درجے کی تحقیق کا ضامن ہے ۔ ڈاکٹر صادق نے پیش لفظ میں جو کچھ لکھا ہے وہ صرف سچ ہے ۔ اس کتاب سے مصنف کو کوئی فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو ، یہ بات بہ ہرحال کھل کر سامنے آگئی کہ ڈاکٹریٹ جیسی ڈگری کے مقالہ لکھنے کے لیے اتنی ہی محنت اور مطالعہ ضروری ہے جتنا کہ ڈاکٹر صادق نے کیا ہے ۔ تحقیق کا اعلیٰ معیار قائم کرنے میں پہل تو شاید انھوں نے نہ کی ہو لیکن اس معیار کو برقرار رکھنے کا کارنامہ انھوں نے ضرور انجام دیا ہے ۔ مرحبا کہنے کو جی چاہتا ہے لیکن تبصروں کی لفظیات میں یہ لفظ ملتا نہیں ہے ۔

کتاب چھے ابواب پر پھیلی ہوئی ہے ۔ پہلا باب نظریات سے متعلق ہے اور خود یہ باب اس لیے حیرت ناک ہے کہ ۸۸ صفحات پر مشتمل ہے یعنی بجائے خود ایک مکمل کتاب ۔ رشید احمد صدیقی کی طنزیات مضحکات ، جو مکتبہ ، جامعہ دلی نے از سرِ نو ۱۹۷۷ء میں چھاپی دو سو صفحات پر مشتمل ہے ۔ رشید احمد صاحب کی تصنیف ایک استاد کی تصنیف ہے اور مصنف کی تنقیدی بصیرت کی آئینہ دار ڈاکٹر صادق کی کتاب ایک طالبِ علم کا مقالہ ہے لیکن خوشی کی بات ہے کہ اس پر طالبِ علمانہ مقالہ ہونے کا شبہ نہیں ہوتا ۔ (جائے استاد خالی است کا نکتہ ذہن میں رکھیے) ۔ ڈاکٹر صادق نے اپنے پیش لفظ میں ایک دل چسپ لیکن اہم سوال یہ اٹھایا ہے کہ نظری حصے میں طنز و مزاح کے مشرقی تصورات کا جائزہ کیوں نہیں لیا جاتا اور یہ کہ ہم کو اپنے ادب کے جانچنے کے لیے پیمانے بھی اپنی ہی تہذیب سے لینے چاہئیں ۔ اس ضمن میں میری عرض یہ ہے کہ گو ہمارے محققین نے ظرافت کے اصول اور نظریات پر بحث کرتے وقت صرف

انگریزی ادب (تحقیقی) کو پیشِ نظر رکھا ہے (بوجہ مجبوری) لیکن ہمارے یہاں صرف ظرافت کے لیے بلکہ دیگر اصنافِ ادب (خاص طور پر تنقید) کے تعلق سے بھی یہی ، " بدعت " بہ طور نعمت جاری رہی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم نے ان سارے نظریات کو من و عن قبول کرلیا ہے ۔ یہ صرف اکیڈیمک بحثیں ہیں ۔ نشستند و گفتند کی خاطر ۔ ظرافت کے سلسلے میں ہم نے اپنے معیارات قائم کیے ہیں اور خود ڈاکٹر صادق نے بھی خالص ہندستانی معیارات اپنے پیشِ نظر رکھے ہیں اور بہت ہی سنبھلے ہوئے انداز میں اپنی مبصرانہ اور تنقیدی راہوں کا اظہار کیا ہے ۔

پہلے باب کے علمی مباحث ، ڈاکٹر صادق کے وسیع مطالعے اور دیدہ ریزی کا ثبوت ہیں اور اصولِ ظرافت سے آگاہی حاصل کرنے والوں کے لیے " رہنمائے طنز و مزاح " کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ میں نے یہ باب (سرسری طور پر) پڑھنے کے بعد " کتابیات " کی طویل و عریض فہرست پڑھی تو یہ گمان گزرا کہ اتنا پڑھنے کے بعد ڈاکٹر صادق کی بینائی یقیناً متاثر ہوئی ہوگی ۔

اس کتاب کا اصل باب ، بابِ دوم ہے گو کہ صرف ۲۶ صفحات پر مشتمل ہے ۔ فاضل مصنف نے اس باب میں آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد لکھی جانے والی تحریرات کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے اور ہر دو ادوار کے رونوں پر روشنی ڈالی ہے ۔ رجحان موضوعات ، اور ماحول کے فرق کو ظاہر کرتے ہوئے فاضل مصنف نے جراءت مندانہ رائے بھی دی ہے ۔ یہ بڑے حوصلے کا کام ہے ۔

کتاب کا تیسرا باب طویل ترین باب ہے اور کوئی چھ سو سے زائد صفحوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے ۔ اس باب میں فاضل مصنف نے ۳۶ مزاح نگاروں کا یوں سمجھیے کچا چٹھا کھول کے رکھ دیا ہے ۔ ۳۶ کے ۳۶ مزاح نگاروں کی ہر تحریر بار بار پڑھی ہے (شاید نہیں کچھ مضامین حفظ بھی ہوگئے ہوں گے) ۔ اتنا شدید ، مطالعہ ـــ اس پر تو ان کے راہ نما ڈاکٹر حفیظ قتیل کو سرزنش کرنی چاہیے تھی ۔
ں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صادق نے تو " ظریفانہ ادب " کی ایک لائبریری قائم کرلی ہوگی (اور ساری کتابیں خود ہی خریدی ہوں گی کہیں سے نت حاصل نہیں کی ہوں گی) ۔ مطالعے کا شوق دراصل ایک بانی ہے لیکن ڈاکٹر صادق مطالعے کے شوقین نہیں اس کے مریض ہیں ۔
۱۹۷ ، کے بعد اگر فاضل مصنف نے اپنے اس " یک سمتی " مطالعے کو برقرار رکھا ہے تو انھیں اپنے مزید ۲۲ سال کے مطالعے کا " نچوڑ " ی پیش کرنا چاہیے ۔ (سعید شہیدی نے جب وہ نوجوان تھے لیکن لستے ہی دبلے جتنے کہ اب ہیں کہا تھا نشیمن پر نشیمن بنتا چلا جا) اس ب میں جو بات سب سے زیادہ دل کو بھاتی بلکہ لبھاتی ہے وہ مصنف کا آزادانہ اظہارِ خیال ہے ۔ نہ کسی کی مروت نہ رعایت ، نہ کسی ہ خصومت نہ کسی سے والہانہ عشق ، ڈاکٹر صادق کے الگ تھلگ رہنے کا فائدہ اب سمجھ میں آیا ـــ بے لاگ تبصرہ کرنے میں آسانی تی ہے ۔ ان کے کثیر المطالعہ ہونے کا اس لیے بھی قائل ہوں کہ باوجود اس کے کہ میں خود اس موضوع سے کسی نہ کسی طرح وابستہ بلکہ ملوث) رہا ہوں میں نے اتنا " زبردست " مطالعہ نہیں کیا ہے بلکہ مجھے اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنے میں تامل نہیں کرنا چاہیے ان ۳۶ مزاح نگاروں میں سے کم سے کم ایک درجن مزاح نگار میری دست برد سے محفوظ رہے ۔ ڈاکٹر صادق کو تو حیدرآباد میں وہ کام ا چاہیے جو ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نہیں کر سکے یعنی طنزیہ و مزاحیہ ادب کی مکمل لائبریری قائم کرنا چاہیے ۔ میرا عقیدہ ہے کہ اچھی لائبریری کے رایک اچھی تنقیدی کتاب کا لکھاجانا ممکن نہیں ہے اور خاص طور پر ظرافت سے متعلق تحقیق کم تنقید (یہ کم Cum انگریزی لفظ ہے) ے بزم و اختیاط کی دشت نوردی ہے ۔ ظرافت نگاری ، صنفِ ادب نہ ہوتے ہوتے بھی نیم صنفِ ادب ہے اور مرصع سازی نہ ہوتے ئے بھی طباعی اور صناعی ہے اس لیے اس کی پرکھ اور تخلیقی تنقید کے مطالبات کچھ زیادہ ہی ہیں ۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے ا جگہ رشید احمد صدیقی کے بارے میں رائے دی ہے کہ ان کا فن مائل بہ انحطاط ہے ۔ " یہ رائے اس لحاظ سے تاخیری ہے کہ رشید ب نے مزاح نگاری کب سے ترک کردی تھی اور جہاں تک مجھے یاد ہے نیاز فتح پوری نے ان کے بارے میں لکھا تھا کہ رشید صاحب

کا قلم تھک گیا ہے اور خود رشید صاحب نے اس جملہ ، معترضہ کی تائید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ صرف قلم ہی نہیں تھکا دل
تھک گیا ہے ۔" (دیکھیے تنقید نگار حضرات کی گرفت اور ظرف) ۔ اور کلیم الدین احمد نے تو بڑے بڑے مزاح نگاروں میں سے
" اشد گریجویٹ تک کا لقب دے دیا تھا ۔ آپ کو تو یاد ہی ہوگا کہ ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے تنقیدی مقالے میں " پانچ قد آور "
نگاروں کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ تنقید میں یہ رکھاؤ ، اتار چڑھاؤ ، تنقیدی بصیرت اور زاویہ ، نگاہ کی دین ہوتا ہے ۔ گو میں لکھ چکا ہو
زیرِ نظر مقالے میں طالبِ علمانہ جھلک نہیں ہے لیکن جہاں تک رشید صاحب کی مزاح نگاری کا تعلق ہے فاضل مقالہ نگار کا قلم لڑ
ہے (قلم بھی اور قدم بھی) رشید صاحب اور پطرس ہمارے دو ایسے جید مقالہ نگار ہیں جنھیں مزاح نگاری کی آبرو کہنا چاہیے ۔ میں
چاہتا کہ اس تبصرے میں غیر ضروری طور پر اپنی رائے پیش کروں لیکن میری مشکل یہ ہے کہ زیرِ نظر کتاب ہے ہی ایسے موضوع
زیبِ داستان کی غرض سے یا خودنمائی کی خاطر مجھے کچھ عرض کرنا ہی چاہیے ۔ اس لیے عرض یہ ہے کہ رشید صاحب اور پطرس ہمارے
ایسے جید مزاح نگار ہیں جن کا فن ان دونوں کی ایک ایک کتاب میں مقید ہے اور یہ دونوں کتابیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے تقریباً
آخر ہیں ۔ (تقریباً کا لفظ میں نے اس لیے لکھا ہے کہ ہمارے حروف تہجی میں حرف " ی " کی بھی دو قسمیں ہیں ایک چھوٹی " ی
ایک بڑی " ے " ۔ میں اپنی حد تک ان دونوں ظریف النفس اور ظریف الطبع حضرات کو دیارِ ظرافت کا مستقل باشندہ نہیں سمجھتا ۔
سیاح تھے جو موسم گرما کی چھٹیاں گزارنے ظرافت کے ہل اسٹیشن آتے ہوتے تھے ۔ یہاں سے واپس ہوتے تو پوری طرح لٹ چکے
ہل اسٹیشن کی رونق اور شہرت انھیں دونوں کے بے محابا اسراف کی بنا پر ہے ۔ (میری اس رائے کو جملہ معترضہ نہیں بلکہ معترضہ
جانئے) ۔

مزاح نگاروں کی فہرست میں کرشن چندر کا نام برسبیلِ تذکرہ بھی آیا ہے ۔ ڈاکٹر صادق نے کرشن جی کی مزاحیہ نگارشا
تفصیلی مطالعہ کیا ہے اور ایک سوال یہ اٹھایا ہے کہ " مزاحیہ مضامین اور انشائیے لکھنے کے باوجود آخر کیوں کرشن چندر اس میدان م
کوئی مقام نہ بنا سکے ۔ اور ۸ صفحات پر مشتمل خود کلامی کے بعد وہ خود اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ " کرشن چندر کی ظرافت کے بار
کوئی لکھنے بیٹھتا ہے تو اسے بڑی مشکل کا سامنا ہوتا ہے کیوں کہ کرشن چندر کے قلم سے نکلی ہوئی ہر تحریر میں مزاح کی چاشنی موجو
ہے ۔ ان کی نگارشات خاص مزاحیہ کارنامے نہ ہوتے ہوتے بھی اردو طنز و مزاح کا ایک اہم باب بن گئے ہیں " صفحہ ۲۶۲ ۔ یہ ا
میں نے صرف اس لیے نقل کیا تا کہ آپ کو بتا سکوں کہ فاضل مصنف نے ۲۶ کے ۳۶ ادیبوں کا کتنی تفصیل سے جائزہ لیا ۔
" تگ و دو " کے بعد اپنی رائے قائم کی ہے ۔ فاضل مصنف کو سماجی علم سے رغبت نہیں رہی ہے ۔ دیے سے دیا جلنے کی رسم
میں بھی رائج ہے اور ضروری بھی ہے لیکن ڈاکٹر صادق نے حتی الامکان اپنے ہی جگنوؤں کی روشنی سے گھر میں چراغاں کیا ہے ۔ یہ
وادرانہ رویہ ہے ۔ فکر تونسوی اور کنھیا لال کپور کی نگارشات کا جائزہ ڈاکٹر صادق نے بڑے خلوص اور محنت سے لیا ہے اور لغوی
میں انھوں نے نفسِ مضمون پر روشنی ڈالی ہے ورنہ وہ چاہتے تو نفسِ مضمون اندھیرے میں رہنے دیتے اور خود کو روشنی میں پیش
رکھتے ۔ ظرافت نگاروں کی کتابی صحبت میں کئی سال گزارنے کے بعد فاضل مصنف نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ " اردو ادب میں مزاح
کی بہتات ہے ۔ سوائے کپور اور فکر تونسوی کے کوئی تیسرا قد آور طنز نگار ہمیں نہیں ملتا " ۔ زیرِ نظر کتاب ۱۹۸۴ ء میں چھپی اور
مصنف نے اپنا پیش لفظ اس دہائی کے اوائل میں لکھا ہوگا اس ۸ سال کی مدت میں کیا ان کی رائے میں کوئی تبدیلی ظہور پذیر ہوئی
۔ موصوف کو یہ سلسلہ برقرار رکھنا چاہیے ۔

چوتھے باب میں پیروڈی اور پانچویں باب میں مزاحیہ رسائل کے بارے میں تفصیلات شامل ہیں ۔ پیروڈی سے متعلق

مصنف کی تحقیق خاصی دل چسپ، استفہامی اور استعجابی ہے لکھتے ہیں ۔ ایک زمانے میں یونان میں پیروڈی* کے فروغ کا یہ حال تھا کہ ایک جانب ایسے لکھے جاتے تو دوسری جانب ان المیوں کی تحریف باضابطہ منظم طریقے پر کی جاتی ۔ رزمیے لکھے جاتے اور ان رزمیوں کا قبول عام ہونے پر ان رزمیوں کی توڑ Mock Epic شائع ہوجاتیں ۔" اس باب میں ڈاکٹر قمر رئیس اور احتشام حسین کی رائیں بھی دی گئی ہیں ۔ آپ یہ باب نہیں پڑھیں گے تو آپ کا مطالعہ ادھورا رہ جائے گا ۔

مزاحیہ رسائل کے باب میں مجھے یہ جملہ بہت پسند آیا ۔ شگوفہ نے بڑی سمجھوتے والی پالیسی اختیار کی ہے اس میں سخت تنقید شائع نہیں ہوتی ۔" اس کے آگے دو جملے اور بھی ہیں اور وہ بھی اچھے ہیں ۔

باب ہشتم مزاحیہ کالموں سے متعلق ہے ۔ مختصر ہے لیکن بھرپور ۔

وہ کتابیں جو سات سو صفحات پر مشتمل ہوتی ہیں عام طور پر تفصیل سے (لفظ بہ لفظ) پڑھی نہیں جاتیں ۔ زیر نظر کتاب (اگر آپ کو موضوع سے دل چسپی ہے) پڑھیے تو آپ پڑھتے ہی چلے جائیں گے ۔ یہی اس کتاب کی خوبی ہے اور خرابی یہ ہے کہ اس کی اشاعت پر کسی اکادمی یا سوسائٹی نے جزوی امداد نہیں دی ہے ۔ جزوی امداد شاید اس لیے نہیں دی گئی کہ پوری کتاب تو شائع ہی اکادمی جانب سے ہونی چاہیے تھی ۔ مصنف یہ بہرحال اس لیے قابلِ مبارک باد ہیں کہ مالی امداد کے لیے انھیں تگ و دو نہیں کرنی پڑی انھیں اس بات پر بھی خوش ہونا چاہیے کہ یہ ضخیم اور وقیع کتاب قبر درویش نہیں بہرِ درویش ہے اور ملائے عام ۔

○ پس نوشت کتاب کی قیمت ۲۰۰ روپے ہے ۔ ○ پلاٹ نمبر ۴۴ ، نزد بالاجی رسٹوران سرنواس کالونی ، راما پور ، حیدرآباد سے حاصل کی جاسکتی ہے ۔

○●○

فاطمہ عالم علی خاں

مطالعہ

حیدرآباد کی سیر

(تصنیف : آغا حیدر حسن مرزا) مرتب : مہرالنسا معظم حسین

کتاب کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے صاحبِ کتاب کا تعارف ضروری ہوتا ہے تو آئیے پہلے یہ بتاؤں کہ میں نے آغا صاحب کو کب دیکھا تھا ۔ میں نے پہلی بار ۱۹۳۳ ۔ میں دیکھا تھا اور دیکھتی رہ گئی تھی ۔ درمیانے سے کچھ نکلتا ہوا قد ، چوڑے شانے ، سنہری لمبے بال ، بڑی بڑی سبزی مائل شربتی سی آنکھیں جن میں شوخی اور ذہانت کے ساتھ انسان کو پرکھنے اور سمجھنے کا سلیقہ بھی ۔ نازک خط و خال ، چہرہ ڈاڑھی مونچھ سے بے نیاز ۔ شہابی رنگت ، لباس میں ریشمی کرتا ، ریشم ہی کا چوڑی دار پاجامہ ، پیر میں سلیم شاہی ، غرض سرتا پا جیتے جاگتے مغل ـــ اب ایسے بانکے اور چھبیلے انسان کا نظروں میں کھب جانا کونسی تعجب کی بات ہے ۔ ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد داڑھی رکھ لی تھی اس نے تو اور غضب ڈھایا چہرہ ایسا نورانی کہ بے اختیار ہاتھ چوم لینے کو جی چاہے ۔

آغا حیدر حسن مرزا مرحوم نے قلعہ ، معلیٰ میں آنکھیں کھولیں اور شعور نے علی گڑھ میں ہوش سنبھالا ۔ انگریز سرکار کی مخالفت کی پاداش میں اکثر کو علی گڑھ چھوڑنا پڑا چناں چہ آغا صاحب نے بھی بستر لپیٹا اور حیدرآباد کا رخ کیا اور جب آئے تو ایسے بسے کہ یہیں کے ہورہے اور یوں حیدرآباد دکن ان کا وطنِ ثانی بن گیا ۔ یقین نہیں آتا کہ آغا صاحب نے کچھ دن پولیس کی ملازمت بھی کی تھی لیکن وہ ماحول انھیں راس نہیں آ سکتا تھا اور نہیں آیا ۔ وہ ان کے بس کا روگ ہی نہ تھا ، کچھ ہی دن میں استعفیٰ دے دیا ۔

اس وقت تک بیگماتی لب و لہجہ ، دل کش اندازِ تحریر و تقریر اور وضع قطع کے انوکھے پن کی وجہ حیدرآباد میں وہ اپنا ایک مقام بنا چکے تھے اس لیے نظام کالج کی ملازمت بغیر کسی رکاوٹ کے انھیں مل گئی بلکہ آغا صاحب کا انتخاب کالج کے لیے فالِ نیک سمجھا گیا اور یہیں سے وظیفہ ، حسنِ خدمت پر سبک دوش ہوئے ۔

دلی کی ٹکسالی زبان و معاشرت پر جن دلی والوں نے قلم اٹھایا ان میں ڈپٹی نذیر احمد ، خواجہ ناصر نذیر فراق ، خواجہ حسن نظامی ، فرحت اللہ بیگ ، خواجہ محمد شفیع ، راشد الخیری ، ملا واحدی اور وزیر حسن کے نام قابلِ ذکر ہیں لیکن بیگماتی زبان ، لباس ، زیبائش و آرائش اور خالص عورتوں کے محاورے اور روزمرہ پر آغا صحب کو جتنا عبور تھا وہ صرف ان کی اپنی چیز تھی ۔ اس میں ان کا کوئی حریف نظر نہیں آتا ۔

مغلوں کے مزاج میں جمال و جلال کا ایسا نرالا امتزاج ہے جو کہیں اور مشکل ہی سے دیکھنے کو ملے گا ۔ ان کے یہاں تلوار ، کتاب ، مصوری ، موسیقی اور کبوتر بازی لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ گویا یہ نہ ہوں تو زندگی کا مزہ ہی کیا ۔ ۔ ! چوں کہ آغا صاحب آخری مغلیہ دور کی پیداوار تھے اس لیے تلوار کی جھنکار تو نہ سن سکے البتہ سامانِ آرائش میں شامل کرلیا ۔ ہاں ! کتابیں ان کا اوڑھنا بچھونا تھیں ۔ کتابوں سے ان کی چاہت کا ثبوت ان کا وہ کتب خانہ ہے جس میں قلمی اور نایاب کتابوں کا بیش بہا ذخیرہ محفوظ

۔ باغ بانی ان کا محبوب مشغلہ تھا ۔ پیڑ پودوں اور پھول پھل کے مزاج سے اس طرح واقف تھے کہ کیا کوئی نباتات کا ماہر واقف ۔ کبوتروں کا نہ پوچھیے ۔ ہمہ اقسام کے کبوتر ان کے یہاں دیکھنے کو ملے ۔ مصوری اور موسیقی کے رموز سے آگاہ تھے بلکہ یوں کہنا کہ الفاظ کے ذریعے مصوری کرتے تھے اور ظاہر ہے لب و لہجے میں موسیقی کا آہنگ صاف محسوس ہوتا تھا ۔

بیگماتی زبان میں لکھے گئے مضامین کا ایک مجموعہ "پس پردہ" کے نام سے شائع ہوچکا ہے ۔ آغا صاحب چوں کہ فطرتاً ں آدمی تھے اس کتاب کے بعد کم کم ہی لکھا اور جو لکھا اس کو دوبارہ چھپوانے پر دھیان ہی نہیں دیا ۔ خدا کا شکر ہے کہ حال ہی میں کے مضامین کے دو مجموعے "ندرتِ زبان" اور "حیدرآباد کی سیر" ان کی چہیتی بیٹی مہرالنسا اور داماد نواب میر معظم حسین صاحب بڑی محنت اور لگن سے مرتب کر کے چھپوائے ہیں ۔

مرحوم دکن ریڈیو نے ان کی بے پناہ صلاحیتوں سے خوب کام لیا ہے حیدرآباد پر ان سے کئی مضامین لکھوائے جو دل چسپی کے بار بار سنے اور سنائے گئے اور ان کے انفرادی اسلوب کو بہت سراہا گیا ۔ ایسے ہی تمام مضامین کو یک جا کر کے "حیدرآباد کی سیر" (دیا گیا ہے ۔ اس کتاب میں دونوں زاویہ ، نظر موجود ہیں ۔ ایک وہ جو صرف حیدرآباد والوں کا ہے اور دوسرا وہ جو ایک نو وارد کا ہونا چاہیے ۔ اس طرح حیدرآباد کو موضوعی اور معروضی دونوں طرح سے سمجھنے ، دیکھنے ، پرکھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں ۔

اس کتاب میں جملہ ۲۷ مضامین شامل ہیں جن میں چار پانچ ایسے مضامین بھی ہیں جن کا راست تعلق حیدرآباد سے نہیں مثلاً ، غالب ، ڈرامہ بہادر شاہ ظفر وغیرہ وغیرہ ۔ زیادہ تر مضامین حیدرآباد کے محلوں ، روز مرہ زندگی ، جاتراؤں ، تہواروں اور چند خاص ت کے بارے میں ہیں ۔ آغا صاحب کا حیدرآباد پر یہ بڑا احسان ہے کہ انھوں نے دستیاب معلومات اور غیر معمولی مشاہدے اور کی عادت سے کام لے کر بیسویں صدی کے نصف اول والے حیدرآباد کو قلمی تصویروں میں محفوظ کر دیا کہ سند رہے ۔

حیدرآباد کے محلوں کے بارے میں نصیرالدین ہاشمی ، تمکین کاظمی اور رائے محبوب نرائن گوڑ نے بھی لکھا ہے اور کچھ سال پہلے عثمانیہ کے لکچرار دھرمیندر پرشاد بھی کتاب مرتب کر رہے تھے ۔ اور وہ غالباً مکمل بھی ہو گئی تھی لیکن معلوم نہیں کہ ان کی نا وقت ۔ کے بعد وہ چھپی یا نہیں ۔ حیدرآباد اور حیدرآباد کے محلوں کے بارے میں موہن پرشاد صاحب کے مضامین اخبار سیاست اور دیگر ں میں شائع ہوچکے ہیں ۔ حال میں اخبار سیاست کے صفحات میں ملک محمد علی خاں مختلف محلوں کا جائزہ لیکے بعد دیگرے شائع کروا ہیں ۔ رہنمائے دکن کے فاضل حسین بھی اپنے ڈھنگ سے کام کر رہے ہیں لیکن آغا حیدر حسن مرزا کا رنگ چیزے دیگر است !!

آغا صاحب سیر و سیاحت کے رسیا مناظرِ قدرت کے شیدائی تو تھے ہی ، قدرت نے قوتِ مشاہدہ اور حافظہ ایسا عطا کیا تھا کہ م پر ان کی نظر تھی ۔ دنیا بھر کی معلومات آپ کو ان مضامین میں ملیں گی اسی لیے ان کی تحریر میں بڑی تہہ داری ہے ۔ دنیا کو ہم ملتے ہیں اور سرسری گزر جاتے ہیں بہ قول میر

"سرسری ہم جہان سے گزرے ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا"

آغا صاحب سرسری گزر جانے کے قائل ہی نہ تھے ۔ ان کی نظر تو کیمرہ نہیں ایکسرے کی مشین تھی جس گہرائی تک دیکھتے ہو کاغذ پر منتقل کردیتے ۔ زبان ان کی اپنی ہوتی کیوں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعوری طور انھوں نے اپنی زبان کی قلعہ بندی ں عدت عام طور پر جب نقلِ مقام کرتے ہیں تو رہن سہن کے ساتھ ساتھ زبان بھی متاثر ہوتی ہے ، لہجہ بدلتا ہے ، نئے الفاظ کا اضافہ ہے ۔ غرض کچھ کھوتے ہیں کچھ پاتے ہیں لیکن آغا صاحب جو زبان و تہذیب لے کر آئے تھے آخری دم تک اس کا ساتھ نہ چھوڑا ۔

میں نے کہیں لکھا تھا کہ آغا حیدر جب کوئی قصہ سناتے تو لگتا ہمارے سامنے کتاب کھلی رکھی ہے اور جب ان کی تحریر سامنے ہوتی تو جیسے ان کی زبان بن جاتی ۔ یہی اسلوب ان کی انفرادیت کا ضامن ہے ۔ تاریخی اور زبانی روایات کا با موقع اور برمحل استعمال مضامین کو با مقصد بناتا ہے ۔ بعض ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جن سے مضامین کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے مثلاً ان کے پہلے ہی مضمون " نام پلی " میں حمال کا لفظ ان کی توجہ کا مرکز بنا ۔ حیدرآبادیوں کے لیے یہ ایک عام سا لفظ ہے لیکن باہر سے آنے والوں کے لیے قلی کی جگہ حمال تھوڑا سا چونکا دینے والا ہے جس کی طرف انھوں نے اشارہ بھی کیا ہے ۔ کہتے ہیں : " عربی فارسی کے بہ کثرت مغلق الفاظ یہاں کے عام روز مرہ میں داخل ہیں ثمرہ بھی بہ معنی باغ ، پھلوں کا ٹھیکہ ، افزود بہ معنی زیادہ اور اسی قبیل کے سیکڑوں لفظ رستہ چلتے سن لیجیے ۔ اسی طرح ریل گاڑی کو بنڈی ، کروڑگیری بہ معنی چنگی سپاہی کے لیے جوان اور جو عالم نہ بھی ہو وہ بھی مولوی صاحب وغیرہ وغیرہ ۔

آغا صاحب کی سیر و سیاحت ملکوں ملکوں گھومنے پر منحصر نہیں تھی ۔ انھوں نے تو گھر بیٹھے بھی سیاحی کی ہے اور غیر اہم چیزوں میں بھی اپنی جوہر شناسی کا ثبوت دیا ہے " حیدرآباد کی سیر " شروع ہی ہوتی ہے " نام پلی " اسٹیشن سے جہاں مرزا صاحب ریل سے اترتے ہیں اور آغا صاحب ان کو حیدرآباد کے چپے چپے سے واقف کرانے کا ذمہ لیتے ہیں ۔

کروڑگیری سے مسافر خانے پھر وہاں سے طعام خانے ہوتے ہوتے کوہستان جوبلی پہنچتے ہیں ۔ جی ہاں یہ نام انھوں نے جوبلی ہلز کو دیا ہے آج کل وہ بنجارہ ہلز کے نام سے جانا جاتا ہے ۔ لیجیے میں ہی بہک گئی ابھی کوہستان جوبلی کہاں پہنچے ، ابھی تو نوبت پہاڑ سے حیدرآباد کا منظر دکھا رہے ہیں اور جوبلی ہلز نظروں کے سامنے ہے ، رات کا وقت ہے ، منظر کی دل آویزی انھیں کے الفاظ میں سنیے ، کہتے ہیں :

" قمقموں کی روشنی کو دیکھو کیسے جھلمل جھلمل کر رہے ہیں ۔ کسی البیلی کاکا مدانی دوپٹہ معلوم ہو رہے ہیں یا کسی الھڑ نے اوڑھنی میں پھٹ بیجنے جمع کر لیے تھے اور آنچل گیا چھوٹ پٹ بیجنے گئے بکھر اور لگے جھم جھم کرنے ۔"

تاروں بھرا آسمان اور جگنوؤں سے بھرے آنچل کا کھل جانا گویا الفاظ سے ایک تصویر بنادی ۔"

غرض ایک دفعہ قدم باہر نکالے تو اب قرار کہاں ۔ نوبت پہاڑ کی لفظوں میں وہ منظر کشی کی کہ صاحب ، آغا صاحب کی زبان نے سیاح کو بے دام غلام بنالیا اور اب بھلا وہ کاہے کو پیچھا چھوڑتا ۔ نوبت پہاڑ سے اترے تو افضل گنج کی خبر لائے ۔ لکڑ کوٹ میں کیا قدم رکھا کہ ماضی میں کھو گئے ۔ مرزا کو بھی کچھ ایسا ہی مشورہ دے رہے ہیں کہتے ہیں :

" لکڑ کوٹ کو صبح اور شام کو مختلف زاویوں پر کھڑے ہوکر دیکھو تو ایک سوچ کی دنیا میں چلے جاؤ ۔ میر عالم کا زمانہ میسور کی فتح یابی کی خوشی میں باغ میں جلسے ۔ ایران کی مہ جبین ، دکن کی سانولی سلونیاں ، رنگ برنگی پشوازیں پہنیں ، لمبی لمبی چوٹیاں لٹکائے ، کاجل سے بھویں جنی بنائے ، کانوں میں ہیرے کے جگمگاتے جھمکے کرن پھول ماتھے پر ٹیکے ، موتیوں سے مانگ بھرے گلے میں بدھیا اور موتی بالائیں پڑیں ، زریں جھکوں سے چھاتی کرن کسی پاؤں میں جڑاؤ پازیبیں ، کارچوبی جھم جھم کرتے کفشیں پہنے ، لہر لہر کرتی ، کمروں میں تین تین بل ڈالتی چوٹیاں ہلاتی جھم جھم کرتی پھرتی ہوں گی ۔"

دیکھا آپ نے پلک جھپکتے میر عالم کے جلسے میں پہنچ گئے اور ہمیں بھی ساتھ لے لیا ۔ یہاں آغا صاحب نے سر سے پیر تک جن زیورات کا ذکر کیا ہے یہ تو کچھ بھی نہیں ہیں ۔ خواتین کے لباس و آرائش پر جو مضامین انھوں نے لکھے ہیں آج وہ ستگھردان نظر آتے

ہیں نہ زیورات کے ناموں سے لوگ واقف ہیں ۔ صرف آغا صاحب کی تحریریں وہ واحد ذریعہ ہیں جو گزرے ہوئے زمانے کی سیر کراسکتی ہیں ۔

افضل گنج سے چلے تو دیوان دیوڑھی میں ذرا کی ذرا دم لینے رکے تو محل سرا اور دیوڑھی کی بحث میں الجھ گئے ۔ جی نہیں اسے الجھنا نہیں کہتے وہ تو دونوں کے فرق کو قاری کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں ۔ ان کی تحریریں تفریح طبع کے ساتھ ساتھ معلومات بھی فراہم کرتی ہیں ۔ دیوان دیوڑھی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

" ڈیوڑھی کسی مکان یا محل سرائے کے مسقف دروازے کو کہتے ہیں حویلی یا محل کو ڈیوڑھی نہیں کہتے ۔ دلی میں تو بڑی محل سرائے کی سات سات ڈیوڑھیاں ہوتی تھیں اور ہر ڈیوڑھی پر ڈیوڑھی بان مامور تھے جو آنے جانے والوں کو نظر میں رکھتے تھے ۔"

ابھی ہم محل اور ڈیوڑھی کے فرق کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ آغا صاحب کی نظر تمباکو والوں پر جا لگی پتہ سمجھاتے ہوئے آغا صاحب خود بھی وہیں پہنچ گئے ۔ سنیے ہاتھ کے اشارے سے کچھ بتا رہے ہیں :

" سیدھے ہاتھ کی طرف نیچے بندوں کی دکانیں ہیں ۔ ان کے سنکیں اور نیچے لکھنو والے دیکھیں تو چیں چیں کرنے لگیں ۔ چلمیں دیکھو کہاں کہاں سے آئی ہیں ۔ پشاور تک کی روغنی موجود ہیں اور یہاں کی بنی ہوئی تو خیر ۔ بھونگیر کی بنی ہوئی دیکھو خوب ہیں ۔ چنبر پیچ رس کے یہاں خوب ہوتے ہیں ۔ حرارت سے رنگ بدلتے رہتے ہیں ۔ بدری شہنائیاں ، فرشی گڑگڑیاں ،گولے کلیاں ، بھنڈے ، اب بھی مل جاتے ہیں پیچ رس کے بھی تیار ہوتے ہیں ۔"

یقیناً حقہ پینے کو آپ کا جی مچل اٹھا ہوگا ۔

اب تو یہ پرانی حویلی پہنچ گئے ۔ کمال یار جنگ محل سرائے کو باہر ہی سے دیکھا کیوں کہ پہلے سے اجازت نہیں لی تھی ۔ خیر تھوڑی دور پر خانِ دوراں کی حویلی ہے آغا صاحب بتاتے ہیں :

" آج کل نواب عنایت جنگ بہادر رہتے ہیں جو نواب خانِ دوراں کے چھوٹے فرزند ہیں ۔ ملنے کے قابل انسان ہیں ۔ حیدرآباد کی بولتی تاریخ ہیں ۔ باتیں ایسے مزے دار کرتے ہیں کہ تم آغا حیدرحسن کو بھول جاؤ ۔ نہ بھئی ان سے نہ ملو ، کون تمھیں اپنے سے کھوئے ۔ صورت میں تو ہیں ہی یہ آغا صاحب سے اچھے ، اس عمر میں بھی دیکھنے دکھانے جو لگے ہیں ۔"

آغا چچا ہم خوب سمجھتے ہیں یہ خانِ دوراں کی حویلی کا تو بہانہ ہے آپ اپنی تعریف کروانا چاہتے ہیں ۔ آپ اطمینان رکھیے اور یقین کیجیے کہ آپ سے ایک دفعہ ملنے کے بعد چراغوں میں روشنی ہی کہاں رہی ۔ ۔ ۔ !

عقل حیران ہے کہ آغا صاحب کو یہ دنیا بھر کی معلومات کہاں سے ملیں ۔ اب بھلا بتائیے بھاجی یا ساگ ہم تو دیکھتے ہوئے گزر جاتے ہیں اور یہ مرزا کو یوں سمجھا رہے ہیں جیسے کوئی بڑی عنقا چیز ہو ۔ سنیے :

" یہ امبوتھے کی بھاجی ہے ، یہ چکے کی بھاجی ہے ۔ بھاجی یہاں ساگ کو کہتے ہیں ۔ یہ چگر ہے ! خوب رہی آغا صاحب ! ایسے بھی ہم کیا اندھے ہیں ۔ کیا پیچ آپ نے گشنا نگر سمجھ لیا ؟ یہ تو املی کی کونپلیں ہیں ۔ تو جناب خفا کیوں ہو رہے ہیں ، میں نے کب کہا کہ یاقوت کی کرچیں اور زمرد کے ریزے ہیں ۔ چگر ایک لفظ اچھا ہے یا املی کی کونپلیں ؟ کونپلیں نیم کی بھی ہوتی ہیں اور پیپل کی بھی لیکن چگر املی کی ہی کونپل کو کہتے ہیں ۔ اگر آپ کی اردوئے

معلیٰ اور لکھنؤ کی اردوئے معلا میں کوئی لفظ اس کا مترادف ہو تو بتادیجیے ۔"

جگر کے لیے یاقوت کی کرچیں اور زمرد کے ریزے سوائے آغا صاحب کے کون سوچ سکتا ہے ! ! جگر کی لال ہری پتیاں آنکھوں میں گھوم جاتی ہیں ۔

یہ تو آغا صاحب کا ہوتا ہے کہ محلے محلے بےتکان گھوم رہے ہیں ۔ چلیے ان کے ساتھ سلطان شاہی چلے چلیں ۔ عمارتوں کی باتیں تو سن لیں یہاں کچھ مصوری کے بارے میں معلومات میں اضافہ کرنا چاہیے ۔ کہتے ہیں :

"آصف جاہ ثانی کے زمانے میں جو چھتریوں کا گھرانا شولاپور سے یہاں آکر آباد ہوگیا تھا ، اواخر اٹھارویں اور انیسویں صدی کے حیدرآبادی امرا اور مشاہیر کی قلمی تصویریں اسی گھرانے کے لوگوں کی بنائی ہوئی ہیں ۔ اب بھی اس گھرانے کے دو ایک افراد باقی ہیں جن کو نواب سالار جنگ بہادر اور نواب معین الدولہ مرحوم کی پائیگہ سے تنخواہیں ملتی ہیں ۔ ابیا اور ونکٹیا اس زمانے کے اچھے دکنی دبستان کی تصویریں بنانے والے ہیں ۔ ونکٹیا کو ایرانی سیاہ قلم کی تصویروں کی نقل کرنے میں کمال ہے ۔ اصل اور نقل میں تمیز کرلینا بڑے مبصر کا کام ہے ۔ افسوس اس شخص پر دکن کا دبستان ختم ہوجائے گا ۔"

تالاب میر جملہ دوسرے راستے سے لوٹے تو لاڑ بازار میں نکلے ۔ یہ آغا صاحب کا پسندیدہ بازار ہے اسی لیے اس کو "سہاگ بازار" کہتے ہیں ۔ پھول والوں کی دکانوں سے ذرا آگے بڑھے تو گندھیوں کی دکانیں ہیں جو یہاں مصالحہ فروش اور عطر فروش کہلاتے ہیں ۔ مصالحوں کی تفصیل کچھ یوں ہے :

"اگر ، برکی ، کوڑیا لوبان جس کو اس شہر میں عود کہتے ہیں ۔ صندل سفید و سرخ دونوں طرح کا ہوتا ہے اس کا چورا اور برادہ بھی فروخت ہوتا ہے ۔ پڑیوں پر چوکور ڈبوں میں چھیل چھبیلا ، ناگرموتھا ، بال چھڑ ، کپور کچری ، دونگر کچری ، پان کی جڑیں ، خس ، بابو نہ ، مروا ، باونچی ، مولسری کے سوکھے پھول بھرے رکھے ہیں ۔"

آج کتنے لوگ ان ناموں اور ان کے استعمال سے واقف ہیں ۔

حیدرآباد کے نگینوں اور مصالحے والی لاکھ کی چوڑیاں سارے ہندستان میں مشہور ہیں ۔ اب ان کی قیمتیں بھی آسمان سے باتیں کر رہی ہیں ۔ آغا صاحب کے زمانے میں بہترین جوڑا ۲۵۰ روپے میں تیار ہوجاتا تھا آج ہزار سے اوپر ہے ۔ اس زمانے میں چوڑیوں اور پھولوں کے گہنے پر خرچ کرتے وقت مول تول نہ ہوتا تھا کیوں کہ یہ سہاگ اور مسرتوں کی علامتیں ہیں ۔ اس موضوع پر عظمت عبدالقیوم مرحومہ نے بھی بہت دل چسپ مضمون لکھا تھا اور عظمت آپا بڑے فخر سے ذکر کرتی تھیں کہ آغا صاحب نے اس مضمون کی تعریف کی تھی ۔ آئیے دیکھیں آغا صاحب کیا کہتے ہیں انھوں نے بھی مختصراً اور ضمنی طور پر چوڑیوں کی اہمیت کے ساتھ ساتھ چوڑیوں کے اقسام کا ذکر خوب چٹخارے لے کر کیا ہے ۔ فی الحال تو چوڑیوں کے نام انھیں کی زبانی :

"ان جوڑوں کی وضاحوں کے مختلف نام ہیں جیسے کندن ، کنگن ، برج پھنس ، سپولیا ، نیل پتی ، بھٹے کا جوڑا ، مولسری ، کٹوری ، ناخن ، چاند تارا ، چمکی ، کبوتر آنکھ ، گردہ ، توڑہ ، کھیرے ، پھول پان ، جالی ، نور ، تارا منڈل ، خربوزے کا جال ، مخمل ، کیری ، ست پھلا ، کوڑلا ، چندن ہار ، منڈوا لپیٹا ، مرغ سینہ ، کنول ، نورتن ، تعویذ خنجر ، سنگھاڑا ، پتنگ کی لوٹ ، بانک ۔ بچے بھی مختلف وضع کے ہوتے ہیں ۔ جیسے کوڑلے کے بچے ، جوابوں کی وضع بھی مختلف ہوتی ہے ۔ کٹوری کے جواب ، گردے کے جواب ، چمکی کے جواب وغیرہ ۔"

غرض آغا صاحب نے اس بازار کا چپہ چپہ چھان مارا ۔ پڑھنے کے قابل مضمون ہے ۔

لیجیے وہ رہا سامنے چار مینار اور آغا صاحب فنِ تعمیر کی باریکیوں سے مرزا صاحب کو واقف کرا رہے ہیں ۔ طوالت کے خیال سے صرف اوپر کی چھت کا حال مختصراً سن لیجیے کہ آپ کو اندازہ ہو کہ کون سا ایسا فن ہے جہاں آغا صاحب کی رسائی نہ ہوئی ہو ۔ کہتے ہیں :

" اوپر کی چھت پر پردے کی منڈیر ہے ۔ منڈیر میں جالیاں ہیں ۔ چار خانے کی جالی ، لوزاتی جالی ماہی پشت کی جالی ، بند روم کی جالی ، دیکھت بھولی جالی ، تارے کی جالی ، چنبیلی کی جالی ، کم از کم ساری عمارت میں سو سے بھی زیادہ جالیاں ہوں گی ۔"

اسی طرح نواب کلیانی کی محل سرا اور اس میں بنی قبر کی تفصیل بھی ان کی عمارت سازی سے دل چسپی کا ثبوت ہے ۔ کبرا بانو عرف کالی بیگم ، آصف جاہ اول کی صاحب زادی نواب کلیانی سے بیاہی گئی تھیں ان کی محل سرا کا حال ملاحظہ کیجیے :

" اس محل سرائے میں ایسے خوش قطع صحن ، دالان ، صحنچیاں ، شہ نشین ، مرغولیں ، غلام گردشیں ، حوض ، فوارے اور کیاریاں ہیں کہ ہندستان میں کم جگہ ہوں گے ۔ خصوصاً گچ کاری سے جو کیاریوں کے گل دستے حوضوں کے لب گردانوں پر بنائے ہیں جب یہ پھولوں سے بھرے ہوتے ہوں گے تو معلوم ہوتا ہوگا ساسانی قالین بچھا ہے ۔ مقبرہ ایک چبوترے پر ہے جس پر اونچی سطح چھت بلیوشہ تیروں کی ہے اور چاروں طرف بیچ کی چھت کے کڑیوں کی ڈھلوان چھتیں ہیں ۔ بیچ میں چھت کے نیچے زردی مائل سنگِ مرمر کا حجرہ ہے ۔"

کوہستان جوبلی یعنی موجودہ بنجارہ ہلز کے وجود میں آنے کی پوری تاریخ اور بسنے والوں کی زندگیوں پر روشنی ڈالی ہے ۔ حیدرآباد کے عاشور خانوں پر عقیدت کے پھول چڑھائے ہیں اور احترام اور اہتمام کے ساتھ کب اور کیسے وجود میں آئے ذکر کیا ہے ۔

" عظیم تر حیدرآباد " کے بارے میں سوچا تھا سرسری نکل جاؤں گی لیکن مضمون کی ابتدا ہی ایسی ہے کہ میں اپنے کو روک نہ سکی مجھے یقین ہے کہ آپ کو سن کر لطف آئے گا ۔

" بھئی بچپنے میں سنا ہوگا بیر بہوٹی ، بیر بہوٹی اپنے لنجے بنجے کھول تیرا ماموں آیا ہے ۔ بیر بہوٹی جو اپنے پاؤں سمیٹے گول مٹول ہوئی پڑی تھی یہ سن کر اپنے پاؤں آہستہ سے کھول دیتی ہے ۔ بچے خوش کہ ہم نے بیر بہوٹی کو بہکا دیا وہ چلنے لگی ۔ یہی حالت پرانے شہروں کی ہے حیدرآباد بھی اور محمد نگر گول کنڈہ ، سینکڑوں برس پرانے شہر ہیں ۔ جب بنے ہوں گے تو ان کے خاکے ڈالے گئے ہوں گے ، چوپڑ کے بازار ہوں گے ، چوک ہوں گے ، واڑے ہوں گے ، بازار گنج ہوں گے ، کٹہرے ہوں گے ، سرائیں ہوں گی ، محل ہوں گے ، حویلیاں ہوں گی ، باغ ہوں گے جیسی ہماری شاعری ہے کہ ردیف بھی ہے قافیہ بھی اور وزن بھی بحر بھی ۔ ہم نے صرف ادب میں شاعری نہیں کی ۔ اینٹ چونے پتھر میں بھی شاعری کی ہے ۔ اپنے مکانوں میں ، ایوانوں میں ، کوشکوں میں ، چمنوں میں ، محلوں میں بھی سوال کا جواب کیا اور مکانوں اور محلوں کو وزن سے نہ گرنے دیا ۔ اگر عقاب کے پَر یا اڑن کھٹولے سیلانیوں کو مل جاتے اور اڑ کر اپنے شہروں کو دیکھتے تو ہر چیز سلیقے سے بنی اور موقع کا لحاظ رکھتے ہوئے موزونیت سے دھری نظر آتی ۔ اس زمانے کے لوگ ایسے نازک دماغ ہوتے تھے کہ اگر رستہ چلتے کسی غریب کی چار پائی ٹیڑھی پڑی دکھائی دیتی تو سر میں درد ہونے لگتا اور جب تک اس کو ٹھیک کر کے نہ بچھا لیتے سر پکڑے رہتے ۔ ایک نواب صاحب ایک شاعر کے پاس آئے ، پانی پیا کٹورا ٹیڑھا سا رکھ دیا ۔ شاعر نے سر پکڑ لیا اور بگڑ کر بولے واہ جناب آپ کو نواب کس نے بنایا آپ تو اس قابل بھی نہیں کہ کٹورا سیدھا رکھ سکیں ۔ ۔ ! ! "

(باقی ص : ۶۰ پر)

نقد و نظر

{تبصرے کے لیے کتاب کی دو جلدیں روانہ کی جائیں ۔ ادارے کا تبصرہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے ۔ }

نام کتاب : میرے حصے کا زہر (افسانے) مصنف : فیاض رفعت تبصرہ نگار : ڈاکٹر بیگ احساس

" میرے حصے کا زہر " فیاض رفعت کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے ۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ " نئے عہد کی سوغات " ۱۹۷۵ء میں شائع ہوچکا ہے ۔ اس مجموعے میں ۲۲ افسانے اور ایک زیرِ تحریر ناول " بنارس والی گلی " کا ناتمام حصہ شامل ہے ۔

اس مجموعے میں دو طرح کے افسانے ہیں ۔ کچھ ایسے افسانے ہیں جو ساتویں دہائی تک بےحد مقبول رہے جن میں باضابطہ نقطہ ، آغاز ، کردار نگاری اور کلائمکس ہوتا ہے ۔ قاری کو کہیں الجھن نہیں ہوتی افسانہ ایک روانی کے ساتھ اختتام تک پہنچتا ہے ۔ دوسرے افسانے وہ ہیں جو جدید رجحان سے متاثر ہوکر لکھے گئے ۔ جن میں پلاٹ ، کردار ، مکالموں اور واقعات کی جگہ فلسفیانہ رنگ ، اساطیر ، علامتیں ، نفسیاتی و تاریخی شعور سے کام لیا جاتا ہے ۔ یہ افسانے رک رک کر اور سوچ سوچ کر پڑھنے کا مطالبہ کرتے ہیں ۔ فیاض رفعت کے لیے افسانے نئے عہد کی سوغات ، میرے حصے کا زہر ، بستر پر اگی کانٹوں کی فصل ، کہرے میں لپٹا ہوا شہر کیچڑ میں لت پت چہرہ ، المیہ داستاں کا آخری ورق ، نئے لمحے کی آواز اور بکھرے ہوئے چہروں کی تلاش ہیں ۔

فیاض رفعت نے اس عہد کے منظر نامے کی تخلیق میں فنتاسی اور حقیقت کے درمیان ایک نئی دنیا تخلیق کی ہے ۔ یہاں وقت ماضی ، حال اور مستقبل کے خانوں میں تقسیم نہیں ہے بلکہ ایک بہاؤ ہے جہاں وقت کے آتش فشاں سمندر بہہ رہے ہیں ، سبز دلدل ہے ۔ پاتال میں آگ لگی ہوئی ہے ۔ دیوتا کانپ رہے ہیں ۔ آسمان پر اندر کا سنگھاسن ڈول رہا ہے ۔ شنکر کو نیند کی دیوی نے بےہوش کردیا ہے ۔ مصر کے بازار سجے ہیں بغداد کی گلیاں ہیں ۔ مینکا اور اروشی فرینچ وھسکی پی رہی ہیں ۔ کسانوں نے اپنی درانتیاں بیچ دی ہیں ۔ راہ سخت دشوار ہے ، نوکیلے پتھروں پر چلتے چلتے پاؤں سے گیلا بے رنگ خون رسنے لگا ہے ۔ دھوئیں کے طلسماتی جنگل ہیں ، ست رنگی پریوں کا ڈیرا ہے جو ہاتھ لگاتے ہی غائب ہوجاتی ہیں جہاں کھائیوں اور کنوؤں سے بھی گہرے غار ہیں ۔ لفظوں کی آنکھیں بینائی کھوچکی ہیں اور آدھے جسموں کے لوگ کیڑے کوڑوں کی طرح رینگ رہے ہیں ۔ تاریخی پس منظر جبر کا شکار ہے ۔ بارود میں بسی ہوئی لاشوں کی بساندہ قوتِ شامہ کا امتحان لے رہی ہے ۔ لاشوں کے ڈھیر گوداموں میں سڑ رہے ہیں ۔ بےجان اور ٹوٹے ہوئے خوابوں جیسی فضا میں لوگ اپنے وجود کے حقیر تراشیدہ پتھروں کو اٹھائے دھوئیں کی مٹتی ابھرتی زنجیروں میں قید ایک دوسرے کو اجنبیوں کی طرح گھور رہے ہیں ۔

ایسے ریستوران ہیں جہاں ٹھرے کی بدبو سپاٹ ماحول کے سینے میں اترتی جارہی ہے اور جوگیوں کی طرح لبادے اور لمبے گیسوؤں والا بوڑھا سڑے ہوئے گوشت کو سیخ پر چڑھا رہا ہے اور ہاتھ خالی ہونے پر زیرِ ناف کھیلے ہوئے لاعلاج داد کو اپنے کنس کی طرح بڑھے ہوئے ناخنوں سے زخمی کر رہا ہے ۔ اس کے منھ سے لذت اور کرب کی ملی جلی سسکیاں نکل رہی ہیں ۔ دیمک زدہ میزوں اور

کھردری کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ اسپرٹ ملی ہوئی شراب پی رہے ہیں ۔ کڑوی کسیلی شراب سے بوجھل ان کی دکھتی ہوئی لمھیں رن چنڈی کا منظر پیش کررہی ہیں جیسے یہ ابھی شعلے اگلنا شروع کردیں گی اور کائنات کے مشینی نظام کی کڑیاں ٹوٹ کر جائیں گی ۔ ان کے چہروں پر الجھن کے آثار ہیں ۔ ایک عجیب سا کرب جسے وہ معنی و مفہوم کی زنجیریں نہیں پہنا سکتے ۔ ان غ کی ہڈیوں میں چبھن پیدا کررہا ہے ۔ وہ اضطراب کے بے نام جزیروں میں بھٹک رہے ہیں ۔

یہ دنیا ہماری دنیا بھی ہے جہاں کھیتوں میں ایل ایس ڈی کی فصلیں بو دی گئی ہیں ۔ لوگ وٹامنز کی گولیاں کھا کر زندہ رہتے ئ نسل کی کھیپیں لیباریٹریوں میں تیار ہورہی ہیں ۔ میکس فیکٹر والوں نے چہرے کے میک اپ سے زیادہ اب اندرونی اعضا کی کے لیے کاسمیٹکس کے ترقیاتی پلانٹ لگا دیے ہیں ۔ چائے خانے اور کافی ہاؤسوں نے اب ڈس کوتھیک کا روپ اختیار کرلیا ہے سٹ باسکٹس ایف ایل سے بھری ہوئی کوڑے کرکٹ کی میونسپل گاڑیوں میں الٹ دی جاتی ہیں ۔ فیشن ہاؤسوں کی بجی ہوئی مچی برینڈ کی تلاش میں اپنے پرسوں کو نوٹوں سے بھر کر نکلتی ہیں اور مایوسی و ناکامی کی جھلاہٹ لیے کسی لکڑی کے شہزادے کو ہیں جو اسٹروک لگانے کے فن سے ناشائستگی کی حد تک ناواقف ہوتا ہے ۔ ہارٹ ٹرانس پلانٹیشن عام ہوگیا ہے ۔ مصنوعی دل ڑکنے کی صدا آتی ہے نہ کھلتے شگوفوں کے چٹکنے کی آواز سنائی دیتی ہے ۔

یہ دنیا مستقبل کی دنیا بھی ہے ۔ اس دنیا کی مخلوق زمین کا سینہ شق کر کے پاتال سے باہر آگئی ہے پاتال کی مخلوق جشن ہے آتش فشاں لاوے کی طرح سڑکوں پر بہہ رہا ہے ۔ شنکر ۔ تیسری آنکھ وا کیے دیوانہ وار رقص کررہا ہے ۔ سب کچھ ختم ہورہا ہے ۔ چھوتی ہوئی سیون اسٹار بلڈنگیں ریت کے تودوں کی طرح زمین بوس ہو رہی ہیں ۔ آتش کدوں ، شوالوں ، مندروں اور مسجدوں دوسرے سے بغل گیر ہوکر صدیوں پرانے فاصلوں کو مٹا دیا ہے ۔ سراسیمہ اور وحشت زدہ لوگ اپنی جان بچانے کے لیے پر نکل آئے ہیں اور اپنا سارا اثاثہ اپنے گھروں میں چھوڑ آئے ہیں ۔ سڑکوں پر سرخ لاوے کے دریا بہہ رہے ہیں جن میں تیر رہی ہیں مگر نوح آرام سے بیٹھا سگار پی رہا ہے اور لوگوں کو انتظار ہے کہ اس کا جلتا ہوا سگار جلد راکھ ہوکر اس کی مرضی رنہ کوئی کشتی میں سوار ہوسکتا ہے ۔ نہ بادبان کھل سکتے ہیں ۔

اس دنیا میں خوب صورت عورتیں ہیں جو مرد کو رجھانے کے لیے اپنے سارے کپڑے اتار کر صرف برا اور پینٹی میں کوچ پر وتِ گناہ دے رہی ہیں ۔ ان کی جالی دار پینٹی اور ٹرانسپیرنٹ برا سے جھانکتے ہوئے بدن پر سرمئی ، نیلی اور گلابی رگوں کا جال ا ہے ۔ عورت راغب کر رہی ہے لیکن مرد اس مشینی عمل سے اوب گیا ہے ۔ اسے زیرِ ناف حصے گندگی کا جوہڑ نظر آتے ہیں دنیا بھر کی غلاظتیں گندے کیڑوں کی طرح بدبدا رہی ہیں ۔ عورت اپنے مقصد میں کامیاب احساسِ فتح سے سرشار ہے اور مرد خوردہ (نئے عہد کی سوغات) ۔ کہیں بدلتی قدروں کا کرب ہے ۔ بدلتے ذوق پر ماتم ہے کہ لوگ آواز سے زیادہ گداز جسم سے دل ل لے رہے ہیں ۔ ساتھ ہی محبوبہ کی بےوفائی کا دور ہے جس نے گجراتی سیٹھ کی داشتہ بننے کو ترجیح دی اور اس کے بچوں کی بن سکی (میرے حصے کا زہر) ۔ کہیں اس بات کا غم ہے کہ جس جدائی پر ایک آنسو بھی نہیں بہایا ۔ (بستر پر آگی کانٹوں کی ۔ " کیچڑ میں لت پت چہرہ " میں بھی محبوبہ کی جدائی کا غم ہے جو کوٹھے پر رقص کر رہی ہے اور بغیر شوہر کے ایک بچی کی ماں ہے ۔ بےروزگار نا کام ادیبوں کا فرسٹریشن ہے جن کے گھر کھو گئے ہیں ۔ وہ اپنا فرسٹریشن کیرول بیکر کی نیم عریاں تصویر کی ے دور کرنا چاہتے ہیں ۔ " نئے لمحے کی آواز " میں ایک انقلابی ادیب کا المناک انجام ہے ۔ اپنے دوست کی موت تینوں دوستوں ے آنسو بھی نکلتے لیکن ایک کتے کو اپنے مردہ ساتھی کی لاش پر روتے دیکھ کر وہ بھی رونے لگتے ہیں یہ غم پگھل کر انھیں ایک

نیا حوصلہ دیتا ہے ۔ " المیہ داستاں کا آخری ورق " ایک خوب صورت افسانہ ہے جس میں ماضی اور حال کی لغزشوں اور گناہوں کا بیان اور اس کی پاداش میں زوال کے کرب سے گزرنے کی داستان ہے ۔ وہ ایک ایسی رہ گزر پر ہیں جہاں دعائیں آسمان کا سینہ فگار نہیں کرتیں ، کوئی فلسفہ ، کوئی نظام انسانوں کو بدل نہیں سکتا ۔ انسان نفسیاتی خواہشوں کا اسیر ہوکر آواز دینے والوں کا تمسخر اڑانے لگتا ہے پھر ان پر قہر نازل ہونے لگتا ہے اور سر پر تاریکیوں کا سمندر سائبان کی طرح چھاتا جاتا ہے ۔ نجات کا ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے کہ لوگوں کی نفرتیں اور حقارتیں سہہ کر گناہوں کا کفارہ ادا کیا جائے ۔

ان افسانوں میں مصنف نے ہندو دیو مالا ، عیسائی مِتھ اور اسلامی اساطیر کا خوب صورت امتزاج پیش کیا ہے لیکن بعض علامتیں جیسے " کوڑیلا سانپ " اروشی منیکا اور شنکر اور مصر کے بازار کے بار بار تذکرے سے اساطیر کے محدود ہونے کا احساس ہوتا ہے ۔ بعض تشبیہات اتنی کھلی ہیں کہ ایک باریک سا پردہ بھی باقی نہیں رہتا ۔ جیسے " انٹرنیشنل اسٹار کیوچن نے ایک ایک کر کے اپنے سب کپڑے اتار دیے ہیں اور جاپ لیس بکنی کی میراث کو اپنی شرمگاہ پر اس طرح بچھا لیا ہے کہ اس کے سوا کسی اور شخص میں اتنی جرات نہیں کہ بے باکانہ در آئے اور ریشمی کینچلی کو ہٹا کر سیپ میں بند موتی نکال سکے ۔ تکونے شیشے میں بھری جن کا ڈھکن اندر کے ابال کی تاب نہ لاسکنے کی بنا پر کارک کی مانند اچھل کر مستطیل نما کمرے کی چھت سے ٹکرا جاتا ہے ۔"

فیاض رفعت کے یہاں جنس موضوع نہیں ہے ۔ ایک لہر کی طرح آتا ہے ۔ اکثر سراپا کا بیان جب لذت سے ہم کنار کرنے لگتا ہے کہیں سے تلخ سچائی اس لذت میں کڑواہٹ گھول دیتی ہے ۔

" تیسرے آدمی کا فلسفہ " ، " مرنے والا سپاہی " ، دانائی کا راز " ، " بیگم رضیہ " ، " سگ اور صنم " ، " خوابوں کا شہر " ، " شرمیلا " ، " سرد خانے کا آدمی " ، " الف لیلہ " ، " انتہائے غم " ، " ٹوٹتی محرابیں " ، " ایک رات کی جنت " ، " نئی راہ " ترقی پسند افسانے کی یاد دلاتے ہیں ۔ " بیگم رضیہ " اور ٹوٹتی محرابیں " جاگیر دارانہ معاشرے کے دو رنگ ہیں ۔ بیگم رضیہ اپنے جنسی تعلقات کو چھپائے رکھتی ہیں اور " ٹوٹتی محرابیں " میں جاگیر دار صاحب مندر کی تعمیر کے لیے چندہ کی خاطر اپنے دو سونے کے دانت اکھاڑ دیتے ہیں اور چندے میں دیتے ہیں ۔ " ایک رات کی جنت " نئے عہد کا " کفن " کہلاتی اگر اس کا انجام اخلاقی حکایتوں کی طرح نہ ہوتا ۔ " شرمیلا " ایک مزاحیہ افسانہ ہے ۔ " خوابوں کا شہر " میں مرد عورت سے صرف فلرٹ کرنا چاہتا ہے اور عورت کے خواب ٹوٹ جاتے ہیں ۔ " نئی راہ " جیسے افسانے " بیسویں صدی " میں بہت زیادہ شائع ہوتے رہے جن کی پسندیدگی کے بارے میں مصنفین کو سینکڑوں خطوط وصول ہوتے تھے ۔ ان میں سب سے دل چسپ افسانہ " سگ اور صنم " ہے ۔ اس میں ایک لمحے کے لیے بھی دلچسپی ختم نہیں ہوتی ۔ اسے اسٹیج پر بڑی خوب صورتی سے پیش کیا جاسکتا ہے ۔ اسی طرح " تیسرے آدمی کا فلسفہ " بھی ایک خوب صورت ایک ایکٹ کا ڈراما بن سکتا ہے ۔ یہ افسانہ بھی دل چسپ ہے ۔ ایک ہلکے پھلکے پس منظر میں زندگی کے مختلف فلسفے پیش کیے گئے ہیں ۔

" بنارس والی گلی " طوائف کے موضوع پر لکھا گیا ناول ہے ۔ پتہ نہیں فیاض رفعت نے اپنے ناول کے لیے یہ موضوع کیوں چنا ۔ طوائفیں ہمارے عہد کا حصہ نہیں ہیں ۔ اب تو صرف جسم فروشی کے اڈے باقی رہ گئے ہیں ۔ جتنا بھی ناول شامل کیا گیا اس میں کوئی نئی بات نظر نہیں آئی ۔ پھر ادھورے ناول کے بارے میں کچھ لکھنا بھی قبل از وقت ہوگا ۔ موضوع کی قدامت کی بنا پر ہی فاروقی صاحب نے غالباً قاری سرفراز حسین عزمی کے ناولوں اور حیات اللہ انصاری کے ناول گھروندہ سے اس کا تقابل کیا ہے ۔

فیاض رفعت شاعر بھی ہیں لیکن انھوں نے نثر کو شاعری نہیں بننے دیا ۔ یہی ان کا سب سے بڑا وصف ہے کہ انھوں نے نثر کا اسٹرکچر برقرار رکھا ۔ ذرائع ابلاغ سے وابستگی نے ان کے ویژن کو وسیع بنایا ہے ۔ ذرائع ابلاغ سے وابستہ ہمارے بے شمار فن کاروں

نے اردو ادب کو نئی جہتوں سے روشناس کروایا جن میں فیاض رفعت بھی شامل ہیں ۔ فاروقی صاحب کے اس بیان سے صد فی صد اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ فیاض رفعت موضوع اور طرزِ بیان کے اعتبار سے آج کے افسانہ نگاروں میں منفرد ہیں ۔ فاروقی صاحب نے ان کی نثر کے بارے میں لکھا ہے کہ " ان کی نثر کچھ شاعرانہ اور کچھ زیرِ لب ، داخلی مناظر کو بیان کرنے کا آہنگ رکھتی ہے اور یہی رنگ ان افسانوں کو باطنی طور پر وحدت عطا کرتا ہے ۔" اس صفت کی بنیاد پر فاروقی صاحب نے انھیں جدید افسانے کے منظر نامے کے بالکل وسط میں قائم کیا ہے ۔ فاروقی صاحب سے اختلاف کی جراءت نہیں کی جاسکتی ۔ فیاض رفعت خوش قسمت ہیں کہ فاروقی صاحب نے انھیں بالکل وسط میں قائم کیا ورنہ کتنے ہی افسانہ نگار فاروقی صاحب کی نگاہِ کرم کے منتظر ہیں کہ وہ جدید افسانے کے منظر نامے میں انھیں کہیں کسی کونے میں تھوڑی سی جگہ دلادیں ۔

فیاض رفعت نے اس افسانوی مجموعے کو احمد ہمیش کے نام معنون کیا ہے ۔ کتاب کمپیوٹر پر کمپوز کی گئی ہے جس میں پروف ریڈنگ کی کوئی غلطی ڈھونڈنے سے نہیں ملتی ۔ کاغذ عمدہ ہے ۔ چھپوائی روشن ہے ۔ ٹائٹل ملٹی کلر اور جاذبِ نظر ہے ۔ قیمت ایک سو روپے واجبی ہے ۔ یہ کتاب معیار پبلی کیشنز دہلی سے حاصل کی جاسکتی ہے ۔ ○●○

نام کتاب : نوادراتِ تحقیق • مصنف : ڈاکٹر محمد علی اثر • تبصرہ نگار : ڈاکٹر راہی فدائی

" نوادراتِ تحقیق " ڈاکٹر محمد علی اثر کے پندرہ مختلف النوع تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً علمی و ادبی تقاضوں کے تحت ان کے نوکِ قلم سے ظہور پذیر ہوتے ہیں ۔ ان مضامین کی شروعات " خوشی ارکاٹی ــ قدیم اردو کا ایک قادرالکلام شاعر " سے ہوتی ہے ۔ ڈاکٹر اثر نے خوشی کے صحیح نام ، ولدیت ، وطن وغیرہ احوال کا پتہ چلایا ہے اور آپ ہی نے خوشی ارکاٹی اور خوشی جنگل پیٹی کے تعلق سے اپنے پیش رو محققین کے علی الرغم یہ انکشاف کیا ہے کہ یہ دونوں الگ الگ معاصر شخصیتیں ہیں ۔ خوشی جنگل پیٹی پر جناب اکرام کاوش نے بھی کام کیا ہے اور اس کی تاریخی مثنوی " شہادت جنگ سلطانی " کا نایاب مطبوعہ نسخہ جس کو ڈاکٹر آمنہ خاتون اور مولوی محمد خاں میسوری نے شائع کیا تھا کھوج نکالا جس کا عکس اکرام کاوش نے راقم الحروف کے توسط سے ڈاکٹر محمد علی اثر کو پہنچایا بھی ہے ۔

" نوادراتِ تحقیق " کا دوسرا مضمون " باقر آگاہ ویلوری ، جدید تحقیق کی روشنی میں " ہے ۔ باقر آگاہ اور خوشی ارکاٹی نہ صرف معاصر تھے بلکہ ایک دوسرے کے قدردان بھی تھے ۔ علامہ باقر آگاہ کی معرکۃ آرا پانچ مثنویوں کے مجموعے " خمسہ متحیرہ ، اوج آگاہی " میں ہر مثنوی کے اختتام پر خوشی ارکاٹی نے تاریخی نظمیں بھی لکھی ہیں ۔ خمسہ متحیرہ ، اوجِ آگاہی کا ایک نایاب مخطوطہ کتب خانہ دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور کی زینت ہے ۔ مگر کتاب پر خوشی ارکاٹی تحریر ہونے کی وجہ سے محققین کی نظروں سے پوشیدہ تھا راقم الحروف اور ڈاکٹر اثر نے مل کر اس نسخے کو ڈھونڈ نکالا اور عنوان کی تصحیح بھی کی تھی ۔ علامہ باقر آگاہ کے فکر و فن پر تحقیقات کا سلسلہ شروع ہوچکا ہے ۔ راقم الحروف کے علاوہ جناب علیم صبا نویدی اور ڈاکٹر ذاکرہ خوشی نے بھی مولوی باقر آگاہ کی حیات و خدمات پر سیر حاصل بحث کی ہے ۔ زیرِ نظر مضمون اس سلسلے کی ایک کڑی ہے ۔ ڈاکٹر اثر نے علامہ باقر آگاہ کی اردو تخلیقات کو بالخصوص موضوعِ بحث بنایا ہے اور ان کے تمام معلوم نسخوں کا تعارف بڑی عمدگی سے کراتے ہوئے ڈاکٹر محی الدین قادری زور ، پروفیسر یوسف کوکن اور ڈاکٹر افضل اقبال کے زلات و لغزشات کی نشان دہی بھی ہے ۔ علامہ باقر آگاہ ہی نے اردو ادب میں نقد و انتقاد کی اولاً داغ

بیل ڈالی تھی ۔ تقریباً ایک صدی بعد مولانا حالی نے تنقید کی شجرکاری کی تھی ۔ ان حقائق کو ہمارے نقاد اب تسلیم کرنے لگے ہیں ۔

نوادراتِ تحقیق کا تیسرا مضمون " دکنی شاعری میں غمریات " ہے ڈاکٹر اثر کا یہ ادعا صحیح ہے کہ دکنی شاعری کی غمریات پر کسی بھی محقق یا نقاد نے نظر نہیں ڈالی ۔ انھوں نے اس لذیذ ترین موضوع پر اپنے شحاتِ قلم سے قارئین کی فکر و نظر کو سیراب کردیا ہے ۔

اس کتاب کا چوتھا مضمون " عہدِ عبداللہ قطب شاہ کے علمی ، ادبی اور تہذیبی کارنامے " اور پانچواں " عادل شاہی سلاطین کے ادبی اور تہذیبی کارنامے " اپنے موضوع کا بڑی خوب صورتی سے احاطہ کیے ہوئے ہے ۔ اول الذکر مضمون میں انھوں نے عبداللہ قطب شاہ کی ایک غزل کے حوالے سے اس کے بنواتے ہوئے ایک عالی شان محل " عشرت محل " کے بارے میں تحقیق کی ہے جس کا ذکر تا حال کسی محقق نے نہیں کیا تھا ۔

چھٹا مضمون " ادبی تحقیق کے مسائل ۔۔ دکنی ادب کے حوالے سے " بڑا ہی وقیع اور فنِ تحقیق پر گراں قدر مضمون ہے ۔ اصحابِ نقد و نظر کے برخلاف اہلِ تحقیق کو بڑے ہی عزم و احتیاط سے ہر حرف و ہر نقطے پر نکتہ سنجی و نکتہ رسی سے کام لیتے ہوئے اپنے نقطہ نظر کی مدلل وضاحت کرنی پڑتی ہے ۔ ڈاکٹر اثر نے میدانِ تحقیق کے بہت سارے شہ سواروں مثلاً ڈاکٹر زور ، پروفیسر سروری ، پروفیسر یوسف کوکن ، پروفیسر سیدہ جعفر ، ڈاکٹر اعجاز حسین اور ڈاکٹر انور سدید وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے ان کی لغزشوں اور فروگذاشتوں کے نمونے اپنی تصحیح کے ساتھ پیش کیے ہیں ۔

" نوادراتِ تحقیق " کا ساتواں مضمون " دیوانِ ولی کا ایک نادر مخطوطہ " اور پندرہ مضمون " ولی اورنگ آبادی (کتابیات) ولی محمد ولی اورنگ آبادی جو محمد فیاض ولی ویلوری کا ہم عصر اور اردو کا مشہور ترین شاعر تھا ۔ دکن کے اس عظیم سپوت کی کیا جنوب کیا شمال ۔۔۔ سبھی نے بغیر کسی تعصب کے قدر افزائی کی ۔

" راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں تا قیامت کھلا ہے بابِ سخن "

کہنے والا یہ شاعر قدیم شعرا ہی کا پیشوا نہ تھا بلکہ جدید شاعروں کے لیے بھی رہنما سے کم نہیں ہے ۔ ڈاکٹر اثر نے بڑے ہی ایجاز و اختصار کے ساتھ ولی کی شخصیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے موضوع کی مناسبت سے دیوانِ ولی کے نادر مخطوطہ کا تعارف بڑی جامعیت اور تقابلِ نسخ کی روشنی میں کروایا ہے ۔ ولی کے متعلق تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مواد کی نشان دہی کی ہے ۔ زیرِ نظر مجموعے کا آٹھواں مضمون " دکنی کے چند نایاب مراثی " اور نواں مضمون " شغلی بیجاپوری کا غیر مطبوعہ کلام " ڈاکٹر اثر کی مسلسل تلاش و جستجو کا ثمرہ ہیں جو نایاب مراثی ڈاکٹر اثر کے ہاتھ لگے ہیں ان میں سے اکثر کا تعلق شمالی ارکاٹ سے ہے اور ان میں سے بعض مثلاً علی رضا وغیرہ نوابانِ آرکاٹ کے رشتہ دار بھی ہیں ۔ شاہ عالم شغلی ترچنا پلوی اور ان کے مرشد شاہ سلطان ثانی کے کلام و تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنوب کا یہ علاقہ جس کو آج ٹمل ناڈو کہا جاتا ہے چہار صد سالہ اردو روایات کو اپنے سینے میں محفوظ کیے ہوئے ہے اور ان علاقوں میں اس کی قدامت و مقبولیت کا بھی آئینہ دار ہے ۔

دسواں مضمون ڈاکٹر زور کے مرتبہ تذکرہ ، مخطوطات اور بارھواں مضمون " فرہنگِ اصطلاحات جامعہ ، عثمانیہ " پر ایک نظر تحقیقاتِ زبان و ادب کی دو عظیم المرتبت شخصیتوں کے کارناموں کا احاطہ کرتے ہیں ۔ ڈاکٹر زور اور ڈاکٹر جمیل جالبی رہ روانِ علم و ادب کے لیے مینارہ ، نور کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ مذکورۃ الصدر دونوں مضامین سے مبحوث عنہ کتابوں کے بھرپور تعارف کے علاوہ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حیدرآباد فرخندہ بنیاد کا احسان و امتنان زبانِ اردو پر کتنا وقیع اور کس قدر ہمہ گیر ہے ۔

" صفی اورنگ آبادی بہ حیثیت استادِ سخن " اس مجموعے کا گیارھواں مضمون ہے جس میں ڈاکٹر اثر نے صفی کے مختلف

عوں کا ذکر کرتے ہوئے حضرت صفی کے کمالِ فن پر اجمالی مگر عمدہ بحث کی ہے اور تلامذہ کے کلام پر استادِ سخن کی اصلاحوں کا
ۂ اور وجہ اصلاح پیش کرتے ہوئے آپ نے اس مقالے میں جان ڈال دی ہے ۔

" نوادراتِ تحقیق " کا تیرھواں اور چودھواں مضمون بالترتیب " جنوبی ہند کا ایک کثیر التصانیف شاعر " اور عکس در عکس "
ـ مطالعہ اردو دنیا کے جانے مانے مایہ ۔ ناز شاعر و محقق جناب علیم صبانویدی کی فکر و فن اور حیات و شخصیت کے مطالعے کی
مانہ کوشش ہی نہیں بلکہ اس جاں نثارِ اردو کی خدماتِ جلیلہ کے لیے خراجِ تحسین بھی ہے ۔

" نوادراتِ تحقیق " مشہور نقاد ، محقق و شاعر پروفیسر مغنی تبسم کے پیش لفظ سے آراستہ ہے ۔ جس میں انھوں نے محققین
ت سے خواہش کی ہے کہ وہ دکنی تلفظ و املا کے تعین اور عہد بہ عہد اس کی تبدیلی پر بھی تحقیقی کام کریں کتاب کے آخر میں
ر عباس متقی کا خوب صورت قطعہ تاریخ بھی مرقوم ہے ۔

○ ۸/۱ ڈیمائی سائز ○ ضخامت : ۱۷۶ صفحات ○ قیمت : ایک سو روپے ○ ناشر ادارہ ، شعر و حکمت
2 / 659 - 3 - 6 سوماجی گوڑہ ، حیدرآباد ۔ 500082

نامِ کتاب : خود رو (شعری مجموعہ) ، مصنف : سید بشارت علی ، تبصرہ نگار : زبیر شاداب خاں

اردو میں شعری مجموعوں کی نبہتات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مبالغہ ہوگا کہ فلاں شاعر کی شاعری ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے ۔
، یہ بھی ایک قطعی صداقت ہے کہ ہر اچھے شاعر کی کچھ ذاتی یا انفرادی خوبیاں ہوتی ہیں ۔ یہ خوبیاں احساس و افکار ، جمالیاتی حس ،
ز بیان ، لسانی تشکیل ، سماجی حسیت ، اجتماعی اور انفرادی لوازمات غرض کہ زندگی کے سفر میں آنے والے مثبت و منفی سنگِ میل
ان سے پیدا ہونے والے موافق و غیر موافق سمت بلکہ اس سفر میں حائل ہونے والے نشیب و فراز کو کاغذ اور قلم کے حسین رشتے
ظاہر کرنا ہے ۔

" خود رو " میں سید بشارت علی یہ ثابت کرنے میں بہت حد تک کامیاب نظر آتے ہیں ۔ بشارت کی شاعری میں استعمال کیے
بیش تر الفاظ یہ ظاہر کردے ہیں ۔ اس لیے چبھتے ہیں لیکن یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ داخلی طور پر ان اچھوت لفظوں میں کس
رحق اور کتنا کرب ہے ۔ بشارت نے ان لفظوں کی جمالیاتی غربت کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کی متنوع حیثیت ، معنویت اور ایک
دمی تہذیبی روایت کا پاس رکھا ہے ۔ مثال کے طور پر ایک نظم کا ٹکڑا دیکھیے :

انھیں غاروں ، گھنیری جھاڑیوں میں
ہم کو ڈھونڈو
ہم وہیں ہوں گے
وہی مسکن جسے ہم چھوڑ آئے
آ بسے پھر بستیوں ، شہروں ، دیہاتوں میں
ہم اونچے اونچے میناروں کے سائے میں کھڑے ہوکر
بہت شرمائے اپنے آپ سے ۔ ۔ ۔ ! (ہم وہیں ہوں گے)

بشارت اپنی شاعری میں دھرتی سے چمٹ کر کبھی خود کو اور کہیں اپنی پرانی تصویر کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں اور کہیں صدائے بازگشت بن کر ہمیں بھی اپنے اصلی چہرے کو تلاش کرنے کی دعوتِ فکر دیتے ہیں تو کہیں انسانیت کی غبار آلود صورت صاف کرنے کی تدبیریں بھی جتاتے ہیں۔ کہیں وجود سے لاتعلقی کا احساس دلاتے ہیں تو کہیں اس کا سبب جاننا چاہتے ہیں۔

میں صدیوں کے سمندر سے گزر کر
تم میں گونجوں
تو سمجھ لینا
کہ میں آواز کا رنگین کفن پہنے ہوئے ہوں
اور تمہارے ساتھ زندہ ہوں (میرے بعد)

اس شعری مجموعے کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس کے زیادہ تر صفحات مختصر نظموں سے مزیّن ہیں اور جہاں اختصار اپنے شباب پہ ہے وہاں فکر اور فن کا حسین و بلیغ امتزاج اپنی معراج پر:

رات کی منڈیروں سے
فل ضیاءِ سورج کا
چھپ کے دیکھ لیتا ہوں (عرفان)

کسی واقعے یا حادثے سے دوچار ہو کر تجربے حاصل کرنا اور پھر سوچنے کے عمل سے کاغذی پیرہن اور پیکرِ تصویر کے تعلق کو بشارتؔ شاعری کا BACK BONE کہہ سکتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ کہ جب وہ خود کے بارے میں سوچتے ہیں تو ان کے افکار میں بصیرت نہیں پیدا ہوپاتی جو دوسروں ، بالخصوص اس کردار کے بارے میں سوچتے وقت پیدا ہوتی ہے جسے آدم و حوا کی کھیتی کی فصل کہتے ہیں۔ بشارت کی شاعری میں مسرت و بصیرت کے ساتھ لمس و لذت سے محظوظ ہونا قاری کی مجبوری ہوجاتی ہے۔ انھوں نے جہاں بھی پیکریہ یا خطیبانہ انداز اپنایا ہے وہاں مصوروں اور خطیبوں کے رقیب بن بیٹھے ہیں:

وہ لمبی داستاں میں ایک چھوٹی سی حکایت تھی
ہوئی ہوگی کہیں پر ابتدا
ہم تک بھی آ پہنچی
اور ہم سے بھی گزر جائے گی
اس کو تو گزرنا ہے
کچھ الجھے الجھے جملوں میں رقم ہم بھی ہوئے
گرچہ علٰحدہ فاصلے تھیں
لیکن اک انجام ہونا تھا (چھوٹی سی حکایت)

اب "خود رو" کی غزلوں سے چند اشعار:

ندی تھا جا کے سمندر کی تہہ میں جذب ہوا | مٹا جو میں تو نئے روپ میں ابھر آیا
بدلتے سانچوں میں ڈھلتا ہوا گزرتا ہوں | مرا وجود مرے اختیار میں کب ہے

ہوا ہوں آج تمنا کی مفلسی کا شکار
وہ مجھ پہ پیار کی دولت لٹا گیا ہے بہت

بھٹک بھٹک کے پھر آنا پڑا وہیں پہ ہمیں
جو ساتھ ساتھ چلا راستہ کچھ ایسا تھا

تھے بت تو ان کی نگاہیں تھیں پتھروں جیسی
تھی چشم قہر و غضب کی ، خدا کچھ ایسا تھا

بچی ہوئی ہے ابھی مجھ میں تابِ گویائی
میں ٹکڑے ٹکڑے ہوا ہوں کہاں کہاں سن لو

اس کی لہرانے والی نظروں پر
کیسے کیسے گمان سے گزرے

اونچائی کا عذاب تو سینے سے بچ گئے
کیا کم یہ عافیت ہے کہ بے بال و پر ہوئے

امید ہے " خود رو " سنجیدہ قارئین کو چونکانے کا سامان فراہم کرے گا ۔ اس مجموعے میں ایک سو پانچ نظمیں ، تیرہ غزلیں اور ن مراثی شامل ہیں ۔ تینوں مراثی شخصی ہیں ۔ بشارت نے پہلا مرثیہ ایک شاعر کی موت پر دوسرا ایک مرحوم نوجوان عورت کی تصویر ، متاثر ہوکر اور تیسرا مرثیہ اپنے پہلے بچے کی یاد میں لکھا ہے ۔ تینوں مراثی زندگی کے معنی تلاش کرتے نظر آتے ہیں اور آزاد نظم کی ںرت میں ہیں ۔

○ ۱/۸ ڈیمائی سائز ○ ضخامت : ۱۹۲ صفحات ○ قیمت : ۸۰ روپے ○ ناشر ادارہ ، شعر و حکمت
2 / 659 - 3 - 6 سوماجی گوڑہ ، حیدرآباد ۔ 500082

نام کتاب : صدائے شکستِ دل (شاعری) ، مصنف : نثار جے راج پوری ، تبصرہ نگار : وقار خلیل

اعظم گڑھ (یو پی) کو اسلامیات اور اردو شعر و ادب کا مرکز ہونے کا اعزاز حاصل ہے ۔ اسی خطہ ، دانش کے سخن ورنثار ، راج پوری کا یہ مجموعہ ، کلام " صدائے شکستِ دل " ان کے اپنے فکر و احساس کا آئینہ خانہ ہے ۔ بہ قول شاعر " اس میں زندگی ں تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ نظر آئے گی ۔

نثار صاحب خاصے پڑھے لکھے فرد ہیں ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دلی اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے فرد فرید بھی ، ان دنوں وہ شبلی ئل پوسٹ گراجویٹ کالج اعظم گڑھ میں ریڈر شعبہ ، کامرس کے عہدے پر فائز ہیں ۔ اس مجموعے میں ایک حمد اور (۱۰۱) غزلیں شامل ، ۔ کیفی اعظمی نے ان کے فکر سخن پر اپنے " تاثر " کا اظہار کرتے ہوئے بڑی حد تک درست ہی اظہارِ خیال کیا ہے اور لکھا ہے کہ نثار نے اپنے مشاہدات اور تجربات کو فن کارانہ انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے ۔"

شمیم حنفی نے بھی اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے مجموعے میں اچھے اشعار کا تناسب عام شاعروں کی بہ نسبت ہا زیادہ ہے ۔

تقریباً دو دہوں کی ریاضِ سخن کا یہ مجموعہ مشاہدے ، تجربے اور نظرِ عمیق کا عطرِ مجموعہ ہے ، کلاسیک اور نئی فرد مندی کا ں گوار امتزاج نثار کی غزلیہ شاعری میں تاثر چھوڑتا ہے ۔ کہیں کہیں روایتی اسلوب بھی ملتا ہے ۔ مجموعی طور پر " صدائے شکستِ دل " ن و عشق کے سبک اور خوش گوار جذبات کی صدائے بازگشت بھی ہے اور نئی منزلوں ، نئے مثبت نظریات کی عکاسی کے ساتھ زندگی ، تلخ و ترش احساسات و مسائل کا آئینہ ، خانہ بھی ہے ۔

یہ چند شعر پڑھیے اور نثار کی فکرِ سخن کو مرحبا کہیے :

سائباں بن کے کھڑی ہے تیری رحمت ہر سو | مجھ پہ جو سایہ فگن ہیں وہ شجر تیرے ہیں
جلے گا اگر امن کا یہ شجر | تو سب کے گھروں میں دھواں جائے گا
نثار اس کو نہ تم منزل سمجھنا | یہ دنیا تو فقط اک رہ گزر ہے
وہاں دونوں طرف ہی کھائیاں ہیں | جہاں سے سوچ کا رستہ گیا ہے
جس نے سینچا تھا لہو دے کے چمن | اب اسی کا خون بے معنی ہوا
چھوڑ کے جائیے نہ یہ دہلیز | اپنے اجداد کی نشانی ہے
ماں کے آنچل سے چھن کے آتی ہے | آج دونوں جہان کی خوش بو
سبھی کو روشنی بخشی گئی ہے | ہماری بستیاں نچھوٹی ہوی ہیں

مجلد خوب صورت سرورق ○ ۱/۸ ڈیمائی سائز ○ آفسیٹ طباعت ○ عمدہ کاغذ ○ صفحات : ۱۴۴ ○ اشاعت ۱۹۹۰ء
○ قیمت : ۸۰ روپے ○ ملنے کا پتہ : مکتبہ ، جامعہ لمیٹڈ ، اردو بازار جامع مسجد دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۶

○●○

(باقی سلسلہ ص : ۵۱ سے)

آخری حصے میں خاکے ، مرثیہ گوئی اور ادبی جلسوں ، بچوں سے باتیں قسم کے مضامین شامل ہیں جو اپنی انفرادیت یہاں بھی رہے ہیں ۔ غرض کن کن باتوں کا ذکر کیا جائے اس سیر کی داستان دل چسپ بھی ہے اور دل کش بھی اسی لیے اس سے دل سیر نہیں ہوتا ۔ بہتر ہے کہ آپ اس کتاب کو خود پڑھیں اور لطف اٹھائیں ۔

کتاب میں کہیں کہیں املا کی غلطیاں رہ گئی ہیں اس کتاب کی اہمیت حوالے کی کتاب کی ہوگئی ہے ۔ آغا حیدر حسن مرزا نے الفاظ اپنی یاد داشت کی زنبیل سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے اور اپنی تحریروں میں نگوں کی طرح جڑے ہیں ان کی صحت املا کا پورا اہتمام کرنے کے باوجود کہیں کہیں چوک ہو ہی گئی ۔ لیکن میں سوچتی ہوں کہ اگر یہ خامیاں نہ ہوتیں تو ان کی تحریروں کو نظر لگ جاتی ۔ انھیں تو آپ پڑھتے وقت نظر ہٹو سمجھ کر نظر انداز کیجیے اور جناب معظم حسین صاحب اور بیگم مہر النسا صاحبہ کا شکریہ ادا کیجیے جنھوں نے نایاب تحریروں کو مرتب کر کے ہم تک پہنچایا ۔ فرض کیجیے اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ہم ان کا کیا بگاڑ لیتے !

○●○

(باقی سلسلہ ص : ۶۳ سے)

ہے کہ اسے معاصر علوم و فنون سے مربوط کر کے بازار میں ان کی اہمیت میں اضافہ کیا جائے ۔ ڈاکٹر امینہ آہوجہ نے خطاطی اور اس متعلقہ آرٹ کے لیے مزید گنجائشوں پر روشنی ڈالی ۔ میٹنگ میں یہ بھی طے پایا کہ فن خطاطی اور گرافکس کے لیے دو سالہ ڈپلوما کورس نصاب کی تیاری کے لیے فائن آرٹ کے اساتذہ اور فن کاروں پر مشتمل نصابی کمیٹی تشکیل دی جائے ۔

قومی اردو کونسل نے مالی سال ۹۸ ۔ ۱۹۹۷ء میں بیس لاکھ سے زیادہ کی کتابیں فروخت کیں ۹۸ ۔ ۱۹۹۷ء مالی سال میں ۳۹ کتابیں شائع ہوئیں اس کے بعد اپریل تا دمِ تحریر ۱۰ کتابیں شائع ہوتی ہیں ۔

○●○

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

قومی اردو کونسل ، اردو کے فروغ کے لیے مسلسل کوشاں ہے اور اس سلسلے میں گذشتہ چند مہینوں میں اردو کونسل کی سرگرمیوں کا دائرہ ، کار مزید وسیع ہوا ہے ۔

۱۷ فروری کو تاریخ اور پولیٹیکل سائنس پینل کی میٹنگیں قومی اردو کونسل کے دفتر میں کی گئیں ۔ میٹنگ کی صدارت پروفیسر محمد امین نے کی ۔ پروفیسر اے ۔ بیج بلگرامی ، پروفیسر مظفر عالم ، پروفیسر اندوبانگو ، پروفیسر اسحاق احمد خاں ، پروفیسر تسنیم احمد ارکانِ پینل کی حیثیت سے شریک تھے ۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر حمیداللہ بھٹ کنوینر تھے ۔ ڈائرکٹر قومی اردو کونسل نے مولانا آزاد قومی اردو یونیورسٹی کے قیام کے تناظر میں معیاری اردو نصابی کتابوں کی تیاری اور فراہمی پر روشنی ڈالی اور کہا کہ تمام موضوعات پر کونسل کتابیں شائع کرے گی ۔

کمیٹی کا خیال تھا کہ نصابی کتابوں کے ساتھ ساتھ معاون اکیڈمک مواد چاہے طبع زاد یا ترجمہ کی صورت میں فراہم کیا جائے ۔ علاوہ ازیں جو کتابیں مبدا (SOURCE) کتب کی حیثیت رکھتی ہیں انھیں بھی فوراً شائع کیا جائے ۔

کمیٹی نے قومی اردو کونسل کی مطبوعہ کتابوں پر بھی نظر ڈالی اور تاریخ کی چار کتابوں کو فوراً شائع کرنے پر زور دیا ۔ یہ بھی تجویز رکھی گئی کہ تاریخ کی ان کتابوں کی ایک مکمل BIBLIOGRAPHY تیار کی جائے جو نول کشور کے کتب خانے میں موجود ہیں اور ان میں سے منتخب کتابوں کو شائع کیا جائے ۔

شرکاءِ کمیٹی کی رائے تھی کہ برطانوی راج میں صوبائی تاریخیں لکھی گئی تھیں اور ان سے مواد لے کر سرکاری گزیٹیر تیار کیے گئے تھے ۔ اس سلسلے میں ایک پراجیکٹ ترتیب دیا جائے جو قابلِ قدر مواد کا انتخاب کرے اور اسے شائع کیا جائے ۔ کمیٹی نے سفارش کی کہ تزکِ جہانگیری ، تزکِ بابری ، تزکِ اکبری اور اکبر نامہ کا ترجمہ کرایا جائے اور اسے اردو میں شائع کیا جائے ۔ اس سلسلے میں نامور مصنفین کو ضروری امداد موادی مثلاً ڈکٹافون وغیرہ بھی فراہم کرایا جائے اور اس کے لیے معقول اعزازیہ مقرر کیا جائے ۔

۲۳ فروری کو عربی و فارسی زبانوں کے فروغ کے لیے مالی معاونت مہیا کرنے کے سلسلے میں ایک مربوط منصوبہ بنانے کی تجویز پر غور کیا گیا ۔ ملک میں ہزاروں ایسے مدرسے قائم ہیں جن میں عربی و فارسی کی تعلیم دی جاتی ہے لیکن کوئی باقاعدہ تنظیم نہ ہونے اور مالی مشکلات کے باعث یہ مدرسے زیادہ مفید ثابت نہیں ہو پاتے ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مدرسوں کو منظم کر کے ان کو مالی تعاون دیا جائے اور ان کی تعلیم کا باقاعدہ پروگرام بنایا جائے ۔ کمیٹی کے شرکا میں جناب سید حامد ، پروفیسر شمیم حنفی ، پروفیسر ریاض الرحمن شیروانی ، پروفیسر محمد ہاشم ، پروفیسر اے رحیم ، جناب فہیم الدین ، ڈاکٹر قمر الدین ، پروفیسر این ۔ ایس گوریکر ، پروفیسر گنگا دھر پانڈے ، جناب سمتے سنگھ اور جناب ٹی ۔ آر پرشاد شامل تھے ۔ جناب سید حامد نے مدرسوں کی تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور پورے ملک میں مدرسہ ایجوکیشن کو مربوط اور منظم کرنے کی ضرورت پر زور دیا ۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ نے کہا کہ کلاسیکی زبانوں (عربی و فارسی) کے فروغ کے لیے حکومتِ ہند کی

مالی معاونت کی اسکیم سے شمال مشرقی اور جنوبی ریاستوں نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے لیکن شمالی ہند کے مدرسوں نے اُس سے فائدہ نہیں اٹھایا ۔ ڈاکٹر بھٹ نے فرمایا ۔ ان مدرسوں میں دینی تعلیم کی مرکزیت کو برقرار رکھتے ہوئے دنیوی علوم کی گنجائش بھی پیدا جاسکتی ہے ۔

شرکاءِ مجلس اس بات پر متفق تھے کہ ان مدرسوں کے لیے قومی سطح پر نصابِ تعلیم تیار کیا جائے جس میں بنیادی مذہبی کے ساتھ جنرل سائنس ، سوشل اسٹڈیز اور ریاضیات کی تعلیم کا بھی بندوبست ہو ۔ اسی کے ساتھ مدرسوں کے اساتذہ کی تربیت کا خیال رکھا جائے اور تدریس کا معیار بڑھایا جائے ۔ میٹنگ میں یہ بھی کہا گیا کہ SSOCIATION OF INDIAN UNIVERSITIES سے مدرسہ تعلیم کو قومی تعلیمی نظام سے دیے جانے والے ڈپلوما اور ڈگری کو مساوی سمجھا جائے ۔

۲۹ فروری کو قومی اردو کونسل کے دفتر میں کمپیوٹر کاری کے پروگرام کو فروغ دینے کے سلسلے میں میٹنگ کا انعقاد کیا گیا جس کونسل کی دعوت پر ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تیس کتابت مرکزوں کے منتظمین نے شرکت کی ۔ اس کے علاوہ کمپیوٹر کاری تجربہ رکھنے والے ماہرین کو بھی قومی اردو کونسل نے مشورے کے لیے بلایا ۔ علی گڑھ سے پروفیسر ابوالکلام قاسمی اور رانچی یونیورسٹی صدر شعبہ ، اردو پروفیسر انور سجاد دہلی سے پروفیسر نثار احمد فاروقی اور پروفیسر حامد حسن (ڈائرکٹر کمپیوٹر سنٹر ، جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے شر کی اور کتابت مرکزوں میں کمپیوٹر کاری کی اہمیت پر زور دیا ۔

شرکاءِ جلسہ کا خیرمقدم کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ نے پروگرام کی وضاحت کرتے ہوئے کہ کمپیوٹر نے علم اور تکنیک کے میدان میں بہت سی سہولتیں مہیا کردی ہیں لیکن کتابت اور فنِ خطاطی کو موجودہ جدید دور میں بھی انداز نہیں کیا جاسکتا ۔ ڈاکٹر بھٹ نے کمپیوٹر کاری کے ساتھ خطاطی کے فن کو بھی برقرار رکھنے اور فروغ دینے کی ضرورت پر زور دیا اور اگر کتابت سکھانے کے بعد طلبہ کو کمپیوٹر کی تربیت بھی دی جائے گی تو ان کے لیے روزگار حاصل کرنے کے مواقع وسیع تر ہوجائیں اور وہ زندگی کی دوڑ میں کامیاب ہوسکیں گے لیکن ساتھ ہی قومی کونسل نے یہ بات واضح کردی کہ کمپیوٹر کی فراہمی قومی اردو کونسل کرے گی لیکن اس سے متعلقہ اخراجات کا ۲۵ ٪ سے ۵۰ ٪ خرچ خود رضاکار اداروں کو برداشت کرنا ہوگا ۔

۲ مارچ کو اردو اکادمیوں کی رابطہ کمیٹی کی میٹنگ کونسل کے دفتر میں منعقد ہوئی ۔ جس میں جناب کشمیری لال ذاکر (چیرمین) پروفیسر عبدالغفار شکیل (ممبر) پروفیسر آفاق احمد (ممبر) جناب محمود سعیدی (ممبر) جناب رضوان احمد (ممبر) ڈاکٹر شمیم رضوی (م ڈائرکٹر قومی اردو کونسل محمد حمیداللہ بھٹ (کنوینر) شریک تھے ۔ میٹنگ میں چندی گڑھ سالانہ کانفرنس کی سفارشات پر عمل آوری صورتِ حال کا جائزہ لیا گیا اور ان امور پر خصوصی توجہ دی گئی کہ قومی اردو کونسل ریاستی اردو اکادمیوں اور رضاکار اداروں کے تعا سے اردو تعلیم کو فروغ دینے کے اقدامات کرے ۔ اس کے لیے اردو نصاب اور اردو میڈیم سے تمام علمی مضامین کی تدریس کے لیے نص کتابوں کے معیار کو بہتر بنایا جائے ۔

میٹنگ میں یہ بھی طے پایا کہ گذشتہ پچاس برسوں میں اردو کے فروغ کے لیے جو اقدامات ہوئے ہیں ان کو یک جا اور مرتب کرنے کے لیے مختلف پراجیکٹس کے تحت کونسل ریاستی اکادمیوں کو مالی تعاون فراہم کرے گی ۔

۲۷ مارچ کو قومی اردو کونسل نے رابطہ ، عامہ کے لیے مراسلہ بھی جاری کیا جس میں بتایا گیا کہ قومی اردو کونسل ماہرین تجربات کی روشنی اور ان کے مشوروں سے اردو کی ہمہ جہت ترقی اور اردو تعلیم و تدریس کی معیار بندی کے لیے اقدامات کر رہی ہے بھی کہا گیا کہ کتابت مرکز کے دوش بہ دوش اردو کونسل کے متعدد خطاطی مراکز بھی ہیں جن میں کمپیوٹر کا دخل نہیں ہوگا ۔ خطاطی ة

رٹ کا ایک عظیم ورثہ ہے جس کا تحفظ کونسل کا اہم فریضہ ہے ۔ انھوں نے واضح کیا کہ فنِ خطاطی سے فارغ طلبہ کو اردو و ر عربی کی خطاطی پر قادر ہونے کے ساتھ طغرا نگاری میں بھی مہارت حاصل ہوگی ۔ کونسل کی کوشش ہے کہ اس آرٹ کا ربط ج پروگراموں سے پیدا کرے تاکہ خطاطی اور طغرا نگاری ایک آرٹ کی حیثیت سے ملک کے برآمدات میں اپنا کردار ادا کرسکے ۔

۲۱ / اپریل کو پٹنہ میں ہوئی ایک کانفرنس میں ڈائرکٹر قومی اردو کونسل نے شرکت کی اور اس بات پر زور دیا کہ مادری ں تعلیم دینے سے بچوں کی ذہنی نشو و نما بہتر ہوتی ہے ۔ اردو زبان کو جب تک ذریعہ ، تعلیم سے نہیں جوڑا جائے گا تب و کے فروغ کی تمام کوششیں بےکار ثابت ہوتی رہیں گی ۔ انھوں نے کونسل کے کاموں کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ نے کونسل کو ایک نوڈل ایجنسی کا درجہ دیا ہے جس سے کونسل آزادانہ اقدامات کرنے کی اہل ہوگئی ہے ۔ ریاستی اردو ، کے سلسلے میں ڈائرکٹر قومی اردو کونسل نے کہا کہ یہ اردو اکادمیاں اردو کے سلسلے میں اپنے دائرہ ، کار میں رہتے ہوئے اچھے ہی ہیں ۔ ان کا ارادہ ہے کہ وہ ہر ریاست میں وہاں کی اکیڈمی کو کونسل کے کاموں کا اسٹیٹ چیاپٹر مقرر کر کے مانیٹرنگ کی ی ان کو سونپ دے ۔

۲۸ / اپریل کو کونسل کے دفتر میں اردو میڈیم اسکولوں میں نئے رابطوں کے سلسلے میں ایک اجلاس منعقد کیا گیا جس میں ڈیم اسکولوں کے پرنسپل صاحبان اور نمائندوں نے شرکت کی ۔ اردو میڈیم سیکنڈری اسکولوں کے پرنسپل اور انتظامیہ کے ، پر مبنی اپنی نوعیت کی یہ پہلی میٹنگ تھی ۔ ڈائرکٹر اردو کونسل جناب حمیداللہ بھٹ نے استقبالیہ تقریر میں اردو میڈیم اسکولوں ، کی مشکلات و مسائل ، درسی کتابوں کے معیار ، تقسیم کاری ، اساتذہ کی ٹریننگ وغیرہ پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اردو میڈیم کا نصاب قومی نصاب اور قومی ضروریات کو مدِ نظر رکھ کر بنایا گیا ہے ۔ یہاں بھی NCERT کی درسی کتابیں مروج ہیں اور NC کا معیار متعین ہے ۔ اسی معیار اور نصاب کو برقرار رکھنا ہوگا تاکہ اردو طلبہ ملک کے مرکزی دھارے کا حصہ بنے رہیں ۔ لیے انھوں نے کہا کہ نصابی کتابوں کی بروقت فراہمی کے علاوہ ان اسکولوں میں تعلیمی ماحول کی بہتری کے لیے کمپیوٹر سیکھنے قع فراہم کرنا ضروری ہیں ۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو میڈیم کا بچہ محدود وسائل کے باوجود دوسرے میڈیم کے بچے سے ضبوط ہوتا ہے ۔ ہمیں تعلیم کے میدان میں انھیں آگے بڑھانا ہے ۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اردو ٹیچرز کو ٹریننگ دی کہ وہ نصاب سے صحیح طور پر انصاف کرسکیں ۔ اس کے علاوہ قومی کونسل وقتاً فوقتاً اردو میڈیم اسکولوں کا سروے بھی کراتی ، اردو میڈیم طلبہ اور اساتذہ کے مسائل سے باخبر رہے اور حتی الوسع ان مسائل کو حل کرنے کے بارے میں غور و فکر کرسکے ۔

۱۴ مئی کو کونسل کے دفتر میں فنِ خطاطی کے ماہرینِ فن کو مدعو کیا گیا ۔ کمیٹی کے شرکا میں ڈاکٹر زرگر ظہوز ، ڈاکٹر صدرِ عالم ، کے ۔ ایم چودھری اور جناب جاوید اشرف نے شرکت کی ۔ میٹنگ کی صدارت ڈاکٹر امینہ آہوجہ نے فرمائی ۔

شرکاءِ جلسہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے قومی اردو کونسل جناب حمیداللہ بھٹ نے کہا کہ فنِ خطاطی کا قدیم زمانے سے فنونِ لطیفہ ز مقام رہا ہے مگر اب رفتہ رفتہ اس فن کے طلبہ اور ماہرین کا دائرہ ، روزگار کم ہوتا جارہا ہے ۔ زمانے کی تبدیلی کا تقاضہ ہے کہ کے فن کو برقرار رکھتے ہوئے فن کے دیگر اسلوب مثلاً جدید آرٹ ، کمرشل آرٹ اور گرافکس سے اسے مربوط کیا جائے ۔

شرکاءِ مجلس کے مشوروں پر غور و فکر کے بعد طے پایا کہ خطاطی کے آرٹ کو آرٹ کے دیگر اسلوبوں سے مربوط کرنے کے لی کے طلبہ کو نہ صرف عملی تربیت دی جائے بلکہ نظری معلومات سے بھی آگاہ کیا جائے ۔ چوں کہ قومی اردو کونسل اردو کتابت ن کے شعبوں کے فروغ کے لیے کام کر رہی ہے اس لیے کتابت اور خطاطی سنٹر قائم کیے گئے ہیں ۔ اب ضرورت اس بات کی

سب رس کتاب گھر

فہرستِ کتب

مطبوعاتِ ادارہ ، ادبیاتِ اردو ، حیدرآباد ۔

شاعری

بر و شکر	تہنیت النسا بیگم	10=00
بو تخیل	الطی حیدرآبادی	20=00
ان داؤد اورنگ آبادی	مرتبہ : خالدہ بیگم	15=00
لقا	عزیز احمد	15=00
ن در ورق	سید مظفر الدین صاحب	25=00
.	علی اختر	20=00
، حیدر	مرتبہ ، احمد پاشاہ قادری	15=00
ہ در سلسلہ	مظفر الدین صاحب حیدرآبادی	8=00
ۂ ، شعر	بشیر النساء بیگم بشیر	30=00
، بے نام	صاحب حیدرآبادی	20=00
، و موہنی	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	15=00
و رعنا	تہنیت النسا بیگم	10=00
، زندگی	سید علی منظور	20=00
حمد ، نعت ، منقبت	صاحب حیدرآبادی	25=00
مگی	سید علی منظور	20=00
سخن	صاحب حیدرآبادی	25=00
رمز سخن	محی الدین قادری زور	20=00
دیوانِ عشق	مرزا جمال اللہ عشق	25=00
انجمن در انجمن	صاحب حیدرآبادی	20=00
زبانِ شمع	صاحب حیدرآبادی	20=00
مہکتے ویرانے	بانو طاہرہ سعید	20=00
فیضِ سخن	شمس الدین فیض / مرتبہ : ڈاکٹر زور	25=00
سلکِ گوہرین	محمد جلال الدین اشک	15=00
کلام معظم بیجاپوری	مرتبہ : ابوالنصر محمد خالدی	20=00
ارمغانِ جذب	راگھویندر راؤ	25=00

تاریخ

تاریخ گولکنڈہ (انگریزی)	عبدالمجید صدیقی	50=00
مسلمان شاہی خاندان	محمد عبدالرحمن خاں	40=00
قطب شاہی سلاطین (انگریزی)	ڈاکٹر زور	10=00
مال والوں کی سیر	مراد علی طالع	10=00

به یادگار سید محی الدین قادری زورؔ

سن اجراء : ۱۹۳۸ء — فون : 3310469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد : ۶۰ — اگسٹ ۱۹۹۸ء — شمارہ : ۸

مدیر

مغنی تبسم

معاونین

غلام جیلانی ، بیگ احساس

فی پرچہ	:	۱۲ روپے
زرِ سالانہ	:	۱۲۵ روپے
کتب خانوں سے	:	۱۵۰ روپے

مشرق وسطیٰ اور امریکہ	:	۲۵ ڈالر
پاکستان ، برما ، سری لنکا و بنگلہ دیش	:	۱۸ ڈالر
انگلستان	:	۱۵ پونڈ

ناشر : ادارۂ ادبیاتِ اردو ، پنجہ گٹہ روڈ ، حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۸۲ (اے ۔ پی) انڈیا ۔

کمپیوٹر کتابت : جی ۔ جی ۔ کمپیوٹرس: مدی پٹنم ، حیدرآباد ۔ / شاہ کمپیوٹرز چادرگھاٹ ، حیدرآباد ۔

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر ، پرنٹر ، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے [illegible] گرافکس نارائن گوڑہ میں طبع کرواکے ادارہ ادبیات اردو سے شائع کیا ۔

اس شمارے میں

○●○

پہلی بات

۳۱ / اگست ۱۹۹۷ ، کو ادا
ادبیاتِ اردو کے زیرِ اہتمام آزادی
کی پچاس سالہ تقاریب کے سلسلے
" جدوجہدِ آزادی میں اردو ادب
صحافت کا حصہ " کے زیرِ عنوان
سمینار منعقد کیا گیا تھا ۔ اگست ۸
میں ان تقاریب کے اختتام کے موق
اس سمینار میں پڑھے گئے مقالے ز
شمارے میں شائع کیے جارہے ہیں ۔
اس ماہ سے ہریا زبان اور اس
لوک کہانیوں کی بارے میں ایک
سلسلہ شروع کیا جارہا ہے ۔ لسانیاتی
سماجیاتی نقطہ ، نظر سے یہ مطالعہ ا
کا حامل اور معلومات آفریں ہے ۔
کہ اسے قارئین پسند کریں گے ۔

(ادا

پروفیسر یوسف سرمست

اردو ناول اور جدوجہدِ آزادی

اردو کی کوئی بھی صنفِ ادب ایسی نہیں جس میں جدوجہدِ آزادی کے تعلق سے نہ لکھا گیا ہو ۔ ناول میں تو اس بات کی سب سے زیادہ گنجائش تھی ۔ اس وجہ سے ناول کی ابتدا ہی سے سیاسی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ۔ نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں ۔ بہ ظاہر انھوں نے انگریزی حکومت کے خلاف کوئی بات نہیں لکھی لیکن انگریزی تسلط کی وجہ سے جو بے چینی اور بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی اس کی تفصیل اپنے ناول "ابن الوقت" میں پیش کی ہے ۔ اس میں نہ صرف انگریزی تہذیب اور مغربی طرز زندگی کو اپنانے کی شدید مخالفت کی گئی ہے بلکہ سیاسی اور اقتصادی حالات کی آگہی کا بہترین ثبوت دیاگیا ہے ۔ اس ناول میں بتایاگیا ہے کہ انگریزی تسلط کی وجہ سے ہندستان کا صدہا سال کا دیہی نظام کس طرح تباہ ہوا اور اس تباہی کے کیا نتائج برآمد ہوئے ۔ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ سیاسی نظام کی تبدیلی سے ہندستان کا اقتصادی نظام تباہ و برباد ہوکر رہ گیا ۔ ان تمام باتوں کا جائزہ نذیر احمد نے نہایت بصیرت افروز انداز میں لیا ہے ۔ حیرت ناک بات یہ ہے کہ انھوں نے بھی وہی نتائج اخذ کیے جو بہت بعد میں رجنی پام دت اور جواہر لال نہرو نے اخذ کیے ہیں ۔

انگریزوں اور اس وقت کے سیاسی حالات کو جس نے سب سے پہلے اپنے طنز کا نشانہ بنایا وہ اردو کا ایک مشہور صحافی لیکن کمتر معروف ناول نگار منشی سجاد حسین ایڈیٹر "اودھ پنچ" ہے ۔ منشی سجاد حسین کے ناولوں میں برطانوی حکومت اور انگریزوں کی ہر چیز سے ایک بے زاری ملتی ہے ۔ اس لحاظ سے انکا ناول "کایا پلٹ" سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے ۔ اس ناول میں اس وقت کی سیاسی فضا سانس لیتی نظر آتی ہے ۔ سجاد حسین نے اپنے پختہ سیاسی شعور سے کام لے کر ان تمام عناصر کا احاطہ کرلیا ہے ، جو اس زمانے کی سیاسی فضا کی تعمیر میں حصہ لے رہے تھے ۔ منشی سجاد حسین ہندستان کی پہلی سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگریس کے لیڈر پر بھی طنز کرتے ہیں جن کہ وہ انگریز تھا ۔ وہ لکھتے ہیں انگریز لیڈر تو بن بیٹھے ہیں لیکن ان کی باتوں میں خلوص ہے نہ سچائی ۔ ہندستانیوں کے حقیقی مسائل سے بھی واقف نہیں ہیں ۔ ایک طرف تو سیاسی ہل چل پیدا کرنے والے انگریز تھے جو ہندستانی عوام سے خلوص نہ رکھتے تھے ۔ دوسری طرف سادہ لوح ہندستانی عوام تھے جو صرف صاحب کی آواز پر سردھنا جانتے تھے ۔ انھیں اس بات سے کوئی مطلب نہ تھا کہ صاحب کی باتیں کس حد تک مفید اور پر مغز ہیں ۔ انگریزی حکومت اور انگریزوں کے خلاف طنز کے حربے اپنا کر منشی سجاد حسین نے ہندستانیوں کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ۔

منشی سجاد حسین کے برخلاف حال کی بجائے ماضی کے سہارے بعض دوسرے ناول نگار الگ قسم کی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کررہے تھے جیسے عبدالحلیم شرر ، محمد علی طبیب ، راشد الخیری وغیرہ جو تاریخی ناولوں کے ذریعہ ہندستانیوں میں خودداری پیدا کر رہے تھے ۔ اس زمانے میں بے شمار معروف اور غیر معروف ادیب تاریخی ناول لکھ رہے تھے جیسے برج موہن دتاتریہ کیفی نے ایک تاریخی ناول "ہنستا رانا" کے نام سے لکھا ۔ صرف اردو ہی نہیں ہندستانی کی دوسری تمام زبانوں میں بیسویں صدی کے ربع اول میں ان

گنت تاریخی ناول لکھے گئے ۔ ماضی پرستی کا یہ رجحان اس وقت کے سیاسی اور سماجی حالات کا تقاضا تھا ۔ اپنی خودی اور خودداری کو بیدا کرنے کے لیے ماضی کو یاد کیاجارہا تھا ۔ ماضی کی طرف لوٹنے کی یہ خواہش اور اس کی پرستش اپنی وقعت اور اہمیت کے جذبے کو ابھارنے کے لیے ضروری بلکہ ناگزیر تھی ۔ ماضی پرستی کا یہ رجحان اس لیے بھی تھا کہ روحانیت اور مذہب ہندستان کے لیے ہمیشہ ایک سہارا رہا اور چوں کہ مذہب اور روحانیت کا ماضی میں بول بالا تھا ، اس لیے بھی ماضی پرستی ضروری تھی ۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" میں لکھا ہے :

" اس میں روحانی اور مذہبی عنصر تھا ، اس کے علاوہ اس کا ایک قومی اور سیاسی پس منظر بھی تھا ۔ ابھرتے ہوئے درمیانی طبقے کا یہ رجحان مذہبی سے زیادہ سیاسی تھا وہ یہ چاہتے تھے کہ انھیں ایسی تہذیبی بنیادیں مل جائیں جو انھیں اپنی اہمیت اور قدر کا یقین دلائیں ۔ ایسی کوئی بات جو ان کے احساس ذلت اور مایوسی کو کم کرسکے جو کہ بیرونی اقتدار نے ان میں پیدا کردی تھی ۔ ماضی کی تلاش اور اس کی طرف لوٹنے کا یہ رجحان مذ ہبیت کے علاوہ قومیت کی ترقی کی وجہ سے بھی رواج پارہا تھا ۔ "

بیسویں صدی کے ربع اول میں جس ناول نگار نے مسلسل طور اپنے ناولوں میں جدوجہد آزادی کو پیش کیا وہ پریم چند ہیں ۔ پریم چند کے ناول تو گویا ہندستان کی جدوجہد آزادی کی مکمل تاریخ ہیں ۔ جوں جوں جدوجہد آزادی تیز ہوتی گئی اسی رفتار سے اس کی عکاسی انھوں نے اپنے ناولوں میں کی ۔ پریم کی ناول نگاری کا مقصد ہی حصولِ آزادی تھا وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

" ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دوچار بلند پایہ تصنیفیں چھوڑ جاؤں لیکن ان کا مقصد بھی حصولِ آزادی ہی ہو ۔ "

حصولِ آزادی کی اس جدوجہد کو پریم چند نے سماجی حیثیت سے بھی پیش کیا ہے ۔ معاشی حیثیت سے بھی اور سیاسی حیثیت سے بھی ۔ انھوں نے اپنے ناولوں کا مواد تمام تر اپنے زمانے کے ہندستان اور اس دور کی تاریخ سے حاصل کیا ہے ۔ ان کے ناولوں میں ہندستان کے سارے مسائل اور پیچ دپیچ حالات بڑی تفصیل کے ساتھ ملتے ہیں جس سے ہندستان ۱۹۰۱ء سے ۱۹۳۶ء تک دوچار ہوتا رہا ہے ۔

"گوشہ عافیت" ، "چوگانِ ہستی" اور "میدانِ عمل" ایسے ناول ہیں جو ہندستان کی جدوجہد آزادی کی مکمل طور پر عکاسی کرتے ہیں ۔ "گوشہ عافیت" میں کسانوں کے مسائل اور ان کی جدوجہد مرکزی حیثیت رکھتی ہے ۔ اصل میں اس وقت کے حالات اس بات پر مجبور کررہے تھے کہ کسانوں کی زندگی کی طرف توجہ کی جائے ۔ اسی وجہ سے اس زمانے میں سارے ہندستان میں سیاسی جدوجہد معاشی مسائل سے وابستہ ہوگئی تھی اور کسانوں کے مسائل سیاسی جدوجہد میں زیادہ اہمیت حاصل کرچکے تھے ۔ کسانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی تھی گاندھی جی نے انھیں مشورہ دیا تھا :

" مال گزاری مت ادا کرو ، سزائیں بھگتو ، سچائی پر قائم رہو اور ستیہ گرہ کی بادشاہت میں داخل ہوجاؤ " کسانوں نے گاندھی جی کی اس بات پر حرف بہ حرف عمل کیا تھا ۔ وہ اب ہندستان کی سیاسی اور معاشی جدوجہد میں بھرپور طریقے پر حصہ لے رہے تھے ۔ "

پنڈت جی نے لکھا ہے :

" اس دورے سے ہماری آنکھیں کھل گئیں ۔ ہم نے دیکھا کہ سارے دیہات جوش و خروش سے بھرے

ہوتے ہیں اور ان میں عجیب ہیجان برپا ہے "

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "گوشۂ عافیت" کے واقعات کو مختصر طور پر پنڈت جی نے اپنے الفاظ میں بیان کردیا ہے۔

جدوجہدِ آزادی کی حقیقت شعارانہ پیش کشی میں "چوگانِ ہستی" بھی امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں ہندستانی زندگی کے ہر رخ ہندستان کی سیاسی جدوجہد کے اہم ترین دور کو اس کی پوری وسعت کے ساتھ سمیٹ لیگیا ہے۔ "چوگانِ ہستی" ہندستان کی سیاسی کی مکمل تصویر ہے اور گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد کی بہترین تفسیر۔ "عدم تشدد" کی وہ جنگ جو مہاتما گاندھی کی سرکردگی میں ے لے کر اس ناول کے لکھے جانے تک لڑی گئی تھی، اس کی مکمل عکاسی اس ناول میں ملتی ہے۔

آزادی سے پہلے ہندستان جن سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل سے دوچار تھا، ان سب کی عکاسی اس ناول میں کی گئی ہے۔ اس اکینوس بہت وسیع ہے۔ گاندھی جی کی زیرِ قیادت جو جنگ مختلف محاذوں پر لڑی جارہی تھی، اس کو ناول میں بڑی ہی تکمیل کے ش کیگیاہے۔

"میدانِ عمل" میں بھی ہندستان کی سیاسی اور قومی جدوجہد کو پیش کیگیاہے۔ اس زمانے میں سیاسی کشمکش زیادہ شدید صورت رچکی تھی۔ اس کے متعلق جواہرلال نہرو لکھتے ہیں:

> "ہندستان تازہ دم، مستعد اور دبے ہوئے جوش سے بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ہر جگہ اس کے آثار نظر آتے تھے۔ مزدوروں میں، کاشت کاروں میں متوسط طبقے کے نوجوانوں میں اور عموماً تعلیم یافتہ لوگوں میں "

"میدانِ عمل" اس رجحان کی تفصیل ہے اس میں متوسط طبقے کے نوجوانوں، کاشت کاروں، مزدوروں اور دوسرے تمام افراد کی وجہد کو پورے فن کارانہ طریقے سے پیش کردیگیا ہے۔ کانگریس نے "کامل آزادی" کی تحریک شروع کردی تھی۔ گاندھی جی نے ہ اور اہنسا پر کاربند ہوکر سول نافرمانی کا اعلان کردیا تھا۔ وہ نمک کا قانون توڑ رہے تھے۔ پنڈت جی کو گرفتار کرلیگیا تھا۔ یوں آزادی کی تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ حکومت نے ناقابلِ بیان ظلم و ستم ڈھائے لیکن ستیہ گرہ اور سول نافرمانی کی یہ جنگ حیرت ناک عدم تشدد اتھ برابر شدت اختیار کرتی گئی۔ اس سیاسی ہیجان کے بارے میں پنڈت جی لکھتے ہیں:

> " ان دنوں ہر طرف مذہبی ہیجان انگیز خبریں آیا کرتی تھیں، جلوس نکلتے تھے، لاٹھیاں اور گولیاں برسائی جاتی تھیں، مشہور لیڈروں کی گرفتاری کی وجہ سے ہڑتال ہوتی رہتی تھی "

ں حالات کے اس پس منظر کو سامنے رکھ کر "میدانِ عمل" کا مطالعہ کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم ہندستان کی افسانوی تاریخ کا مطالعہ ہیں۔ اس میں ہندستانی زندگی کے ہر پہلو کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ پریم چند کا شاہ کار ہے۔ جدوجہدِ آزادی کے مختلف ں کو پریم چند نے جس فن کارانہ خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے وہ انھیں اردو ناول نگاری میں ایک بہت ممتاز اور منفرد مقام عطا کرتا ہے۔

۱۹۳۶ء سے ہندستان میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی۔ مارکسی نظریے کے زیرِ اثر معاشی حالات اور دولت کی غیر مساوی تقسیم، کشمکش اردو ناول میں زیادہ اہمیت اختیار کرتے گئے لیکن سیاسی زندگی اور ہندستان کی آزادی کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ ضرور مل ہے۔ سجاد ظہیر کا ناول "لندن کی ایک رات" اگرچہ لندن میں رہنے والے ہندستانی نوجوانوں کی شعور کی رو کو پیش کرتا ہے لیکن یہ ں ہندستان کی سیاسی جدوجہد پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔

سیاسی تبدیلی کی شدید خواہش ان میں ملتی ہے ۔ ہندستان کی اس زمانے کی حالت اور خاص طور پر سیاسی حالات کی عکاسی صرف اپنے جملے سے یوں کرتا ہے :

"ہندستان میں قید ہونے کے لیے مجرم ہونا ضروری نہیں ۔ آزادی کی خواہش اس کے لیے کافی ہے ۔"

ابراہیم جلیس کا ناول "چور بازار" غلام ہندستان کے حالات کو بڑی عمدگی سے پیش کرتا ہے اور اس زمانے کے واقعات پر بڑا گہرا طنز ہے ۔ خاص طور پر انگریزی اقتدار اور تسلط پر اس میں ہر جگہ طنز کیا گیا ہے ۔ اس ناول کا ایک کردار کہتا ہے :

"زندگی کا اصلی لطف تو ادھر سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے آنے لگا ہے ۔ لوگ بات بے بات خوش ہونے لگے ہیں ۔ کلرکی مل گئی تو نوح خوش ہوگیا۔ دو دفعہ کے بجائے تین دفعہ کھانے کو مل گیا تو اچھل پڑا ۔ زندہ رہو تو یوں ہنستے کھیلتے زندہ رہو ۔ ناراض ہوکر برگد کے پیڑ کے تلے زندگی گزار دینے میں رجائیت کہاں !"

انگریزوں نے ہندستان کو جس حالت کو پہنچا دیا تھا ، اس کی تصویر کشی جلیس نے استعاراتی انداز میں یوں کی ہے :

"بیرے نے کٹلس اور مٹن چاپس سامنے رکھ دیے اور ہم نے بھیڑوں کے گوشت سے بنائے ہوئے ان گرم گرم سوندھے کٹلس اور مٹن چاپس میں ولایتی کانٹے دار چھریاں چلا چلا کر پلیٹوں میں خالی ہڈیاں چھوڑ دیں "

نوح مسکراتے ہوئے کہنے لگا ۔ "یہ پلیٹ ہندستان ہے " اس طرح اس ناول میں انگریزوں کی غلامی اور ان کے تسلط نے زندگی میں گھول دیا تھا اور جو تلخی پیدا کردی تھی ، اس کا اظہار پوری شدت سے کیا ہے ۔

عزیز احمد نے اپنے ناول "آگ" میں کشمیری زندگی کو پیش کرتے ہوئے بے شمار سیاسی ، سماجی ، تاریخی اور معاشی حقائق کیا ہے ۔ اس ناول میں ہندستان کی تہہ در تہہ غلامی سے بیزارگی کا اظہار کیا گیا ہے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :

"برطانوی حکومت ، برطانوی سرمایہ داروں کی غلام ہے ۔ گورنمنٹ آف انڈیا ، برطانوی حکومت کی ، ریاست گورنمنٹ آف انڈیا کے سیاسی محکمے کی ، کشمیر کے شرفا ریاست کے غلام ہیں اور شرفا کی بیویاں شرفا کی غلام ہیں "

ترقی پسند تحریک سے وابستہ ایک اور ناول نگار خواجہ احمد عباس اپنے ناول "انقلاب" میں ہندستان کی جدوجہدِ آزادی کے مختلف کو پیش کرتے ہیں ۔ انھوں نے اس زمانے کے مختلف بڑے بڑے اور اہم لیڈروں کو بھی پیش کیا ہے ۔ ان کا نقطہ نظر چوں کہ ہے اس لیے انھوں نے اسی انداز سے اس زمانے کی حالات کو دیکھا اور دکھایا ہے ۔ ایک اور ناول جس میں ہندستان کی جدوجہدِ آ تصویر کشی کی گئی ہے ، وہ حیات اللہ انصاری کا "لہو کے پھول" ہے ۔ خواجہ احمد عباس کے برخلاف ان کا نقطہ نظر کانگریسی ہے نے اپنے کئی جلدوں پر مشتمل ناول میں ہندستانی زندگی کے ہر رخ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ ان دونوں ناولوں میں ایک کہ معروضی نقطہ نظر کی شدید کمی محسوس ہوتی ہے ، دوسرے ناول کے فن پر بھی اتنی گرفت محسوس نہیں ہوتی کہ وہ ہر قسم کے موثر انداز میں بیان کرسکیں ۔ اس سلسلے میں جو ناول سب سے اہم اور ممتاز مقام رکھتا ہے وہ خدیجہ مستور کا "آنگن" ہے ۔ اس بہت چھوٹا ہے لیکن اس میں ایک دنیا سمودی گئی ہے ۔ تقسیم سے پہلے تک ناول صرف گھر آنگن ہی تک محدود رہتا ہے ۔ لیکن کے آنگن میں جدوجہدِ آزادی کی گونج صاف اور واضح طور پر سنائی دیتی ہے ۔ کانگریس اور لیگ کی کشمکش اور ان دونوں پارٹیوں سے اشخاص کی وفاداریاں سب کچھ بہت ہی موثر انداز میں پیش کیے گئے ہیں ۔

ڈاکٹر بیگ احساس

جذبۂ حب الوطنی اور اردو افسانہ

۱۸۵۷ء کے انقلاب نے ملک کے حالات بدل کر رکھ دیے ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے کے استحکام اور مغلیہ حکومت زوال سے فیصلہ کن اثرات مرتب ہوئے ۔ ملک کا اقتصادی ، سماجی ، ثقافتی اور اخلاقی ڈھانچہ تباہ ہوکر رہ گیا ۔ ملک کے مختلف گوشوں تعدد تحریکیں جنم لینے لگیں ۔ علی گڑھ تحریک کے بانی سرسید اور ان کے رفقا نے بھی مفاہمت کا رویہ اختیار کیا ۔ ایک ایسی قوم جس ماجی پستی ، مفلسی ، جہالت ، اوہام پرستی ، رسوم پرستی ، تن آسانی اور مذہبی سختی جیسی لعنتیں جڑ پکڑ چکی تھیں ، اس کی اصلاح کرنا اس میں کے حصول کا جذبہ بیدار کرنا اور ساتھ ساتھ حبِ وطن کا جذبہ جگانا آسان بات نہ تھی ۔

۱۸۵۷ء سے لے کر انیسویں صدی تک جو ادب پیدا ہوا وہ سماجی ، معاشی اور سیاسی تقاضوں کا مرہونِ منت نظر آتا ہے ۔ گئے تو قصیدہ نگاری نے دم توڑا ، فرصت کی کمی نے داستانوں کا گلا گھونٹ دیا ۔ انگریزی کے زیرِ اثر نئی اصناف ان کی جگہ لینے لگیں ۔ افسانے کی ابتدا انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں ہوئی ۔ اس صنف کی خوش قسمتی کہ اسے شروع ہی میں پریم سجاد حیدر یلدرم اور سلطان حیدر جوش جیسے قلم کار مل گئے ۔ افسانے کے ابتدائی دور میں جو رجحانات کارفرما تھے ، ان میں عینیت یت ، حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ قومی اور وطنی میلانات کے اثرات بھی نمایاں تھے ۔

پریم چند نے اپنی افسانہ نگاری کی ابتدا حب الوطنی کے جذبے کے تحت کی ۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ " سوزِ وطن " ہے ۔ بہ اکٹر صادق " پریم چند نے پہلا قدم ہی کانچ کی کرچیوں پر رکھا تھا " سوزِ وطن کی کہانیوں میں وطن اور قوم کے ساتھ اس بے لوث جذبے قمیے کا اظہار ملتا ہے جس میں حصولِ آزادی کے جذبے سے زیادہ غلامی کا شدید احساس پایا جاتا ہے ۔ سوزِ وطن کی اشاعت کے لریز سرکار نے اس کی کاپیاں نذرِ آتش کردیں اور پریم چند پر پابندی عاید کردی گئی کہ وہ کلکٹر صاحب کو دکھائے بغیر کوئی چیز نہ ئیں ۔ پریم چند نے یہ ساری کہانیاں نواب رائے کے نام سے لکھی تھیں ۔ اس واقعے کے بعد منشی دیا نرائن نگم کے مشورے سے م بدل کر پریم چند رکھ لیا ۔ اس طرح انگریزوں کے خوف سے پریم چند کا جنم ہوا ۔

" سوزِ وطن " میں انھوں نے ایک مختصر سا دیباچہ بھی لکھا جس سے ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

> " ہر ایک قوم کا علم و ادب اپنے زمانے کی سچی تصویر ہوتا ہے ۔ جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے اور جو جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں وہ نظم و نثر کے صفحوں میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینے میں صورت ! ۔۔۔ اب ہندستان کے قومی خیال نے بلوغت کے زینے پر ایک قدم اور بڑھایا ہے اور

حبِ وطن کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر ابھارنے لگے ہیں کیوں کر ممکن تھا کہ اس کا اثر ادب پر نہ پڑتا۔ یہ چند کہانیاں اس اثر کا آغاز ہیں اور یقین ہے کہ جیوں جیوں ہمارے خیال وسیع ہوتے جائیں گے اس رنگ کے لٹریچر کو روز افزوں فروغ ہوتا جائے گا۔ ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حبِ وطن کی عظمت کا نقشہ جمائیں۔ (نواب رائے)

اس مجموعے کا پہلا افسانہ "دنیا کا سب سے ان مول رتن" ہے۔ اس افسانے کے کرداروں کے نام، ماحول، واقعات، ہیرو کے حصولِ مقصد کے راستے میں دشواریاں، ہیرو کی مایوسی، روحانی قوت کی تائید غیبی، آخر میں ہیرو کی کامرانی۔ سب کچھ داستانوں جیسا ہے۔ افسانے کا ہیرو دل فگار، ہیروئن ملکہ دل فریب سے بے پناہ عشق کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ملکہ یہ شرط رکھتی ہے کہ وہ پہلے اسے دنیا کا سب سے ان مول رتن لا کر دے۔ ہیرو ان مول رتن کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔ کافی تلاش کے بعد وہ ایک ایسی جگہ پہنچتا ہے جہاں پھانسی کے تختے پر چڑھا ہوا چور اپنی آخری خواہش پوری کرنے کے لیے پاس ہی کھیلتے ہوئے ایک بچے کو پیار کرتا ہے۔ اس وقت اس کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ ٹپکتا ہے۔ دل فگار لپک کر اس در یکتا کو محفوظ کر لیتا ہے اور اپنی محبوبہ کو پیش کرتا ہے لیکن وہ اسے نامنظور کرتی ہے، پھر وہ ایک ستی ہوئی عورت کی راکھ پیش کرتا ہے، ملکہ اسے بھی منظور نہیں کرتی۔ آخر میں خضرِ راہ کی رہ بری سے وہ سرزمینِ ہند پہنچتا ہے۔ وہ ایک ایسے میدانِ جنگ میں جاتا ہے جہاں سارا میدان خون سے سرخ ہے۔ سینکڑوں نوجوانوں کی لاشیں پڑی ہیں۔ وہ ایک دم توڑتے سپاہی کے قریب جاتا ہے۔ زخمی اسے بتاتا ہے کہ وہ بھارت کا لختِ جگر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمارے باپ دادا کا دیس ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اور اس وقت ہم بے وطن ہیں مگر ہم نے حملہ آور غنیم کو بتادیا کہ راج پوت اپنے دیس کے لیے کیسی بے جگری سے جان دیتا ہے۔ پھر وہ سپاہی آہستہ سے بھارت ماتا کی جئے کہتا ہے اور اس کے سینے سے آخری قطرہ خون نکل پڑتا ہے۔ دل فگار وہ آخری قطرہ خون لے کر ملکہ کے پاس پہنچتا ہے۔ ملکہ اس ان مول نذرانے کو قبول کرتی ہے اور کہتی ہے آج سے تو میرا آقا اور میں تیری کنیز۔ یہ کہہ کر وہ ایک مرصع صندوقچے سے ایک لوح نکالتی ہے جس پر آبِ زر سے لکھا ہوا تھا۔

"وہ آخری قطرہ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے۔ دنیا کی سب سے بیش قیمت شئے ہے"

وقار عظیم لکھتے ہیں "یہ کہانی ضخامت میں ۱۷ صفحے سے کچھ کم ہے لیکن یہ بارہ صفحے پریم چند نے خونِ دل کے قطروں سے لکھے ہیں (منشی پریم چند شخصیت اور کارنامے۔ ص ۳۲۹)

دوسرا افسانہ "شیخ مخمور" بھی مختصر افسانے اور داستان کے فن کا امتزاج ہے۔ اس میں شہزادہ مسعود، شیخ مخمور کے بھیس میں دشمن کے بھیدوں کا پتہ چلاتا ہے اور فوجوں کی رہ نمائی کرتا ہے۔ وہ جو تقریریں کرتا ہے اس میں حب الوطنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ زیبِ داستاں کے لیے شہزادہ مسعود اور ملکہ شیر افگن کی محبت کی کہانی بھی ہے۔ اس میں جو جوشیلی تقریریں ہیں وہ پریم چند کے خیالات کی ترجمان ہیں جیسے :

"نہیں ہم قلعہ بند نہیں ہوں گے ۔ ہم میدان میں رہیں گے اور دست بہ دست دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ ہمارے سینوں میں ہڈیاں ایسی کمزور نہیں ہیں کہ تیر و تفنگ کے نشانے نہ برداشت کر سکیں۔

یا

"ہم نے یہ جنگ توسیع سلطنت کے کینے ارادے سے نہیں چھیڑی۔ تم حق اور انصاف کی لڑائی لڑ رہے ہو ۔کیا تمہارا جوش اتنی جلدی ٹھنڈا ہوگیا۔ کیا تمہاری تیغ انصاف کی پیاس اتنی جلدی بجھ گئی ؟ تم جانتے ہو کہ انصاف اور حق کی فتح ضرور ہوگی ۔"

"یہی میرا وطن ہے " اس مجموعے کا تیسرا اور سب سے چھوٹا افسانہ ہے ۔ یہ ایک ایسے انسان کی کہانی ہے جو ساٹھ برس امریکہ میں رہنے کے بعد زندگی کے آخری دن اپنے وطن بھارت میں گزارنا چاہتا ہے۔ اسے امریکہ میں دولت ،شہرت ،حسین بیوی اور خوب صورت بچے میسر ہیں لیکن اس کی شدید خواہش ہے کہ وہ وطن کی خاکِ پاک میں دفن ہوسکے ۔ وہ بمبئی میں اترتا ہے اور یہاں کی زندگی کا مغربی انداز دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے اور کہتا ہے " یہ میرا پیارا دیس نہیں ۔ یہ میرا پیارا بھارت نہیں " اپنے گاؤں میں شکستہ جھونپڑے کو جلتے دیکھ کر ، انگریزوں کا تشدد دیکھ کر کہتا ہے نہیں یہ میرا پیارا دیس نہیں ۔ پھر لال پگڑی والوں کا ظلم دیکھ کر ، وہ دل شکستہ ہوجاتا ہے اور چوپال کی طرف جاتا ہے ۔ وہاں کوئی اسے رات بھر رہنے کی جگہ نہیں دیتا۔ کوئی اسے فقیر سمجھ کر اس کے ہاتھ پر مٹھی بھر چنے رکھ دیتا ہے ۔ "نہیں یہ میرا مہمان نواز، مسافر نواز دیس نہیں " وہ امریکہ لوٹ جانے کا فیصلہ کرلیتا ہے تو اس کے کانوں میں وطن کا یہ نغمہ گونجتا ہے " پربھو میرے اوگن چت نہ دھرو۔ "کچھ لوگ شیو شیو ہر ہر نارائن نارائن کے بول گن گناتے جارہے ہیں وہ ان کے پیچھے ہوجاتا ہے اور گنگا کنارے پہنچ کر چیخ اٹھتا ہے : " ہاں ہاں یہی میرا دیس ہے ، یہی میرا پیارا وطن ہے ، یہی میرا بھارت ہے اور اسی کے دیدار کی اسی کی خاک میں پیوند ہونے کی حسرت میرے دل میں تھی ۔ اس مجموعے کی آخری کہانی "عشقِ دنیا و حبِ وطن " ہے اس میں پریم چند نے اٹلی کے عظیم کردار میزینی کو پیش کیا ہے جس نے ملک کی آزادی کے لیے تمام خوشیوں کو قربان کرکے ظلم و جبر کو برداشت کیا اور زندگی کے آخری لمحوں تک سرفروشی اور جاں بازی کا ثبوت دیتا ہے ۔

پریم چند چاہتے تھے کہ ان کہانیوں کو پڑھ کر ملک کے مختلف طبقوں کو اپنے ماضی کی عظمت کا احساس اور اپنے وطن سے محبت کا جذبہ پیدا ہو ۔ یہ ایک ایسی ضرب تھی جس سے انگریز حکام تلملا گئے اور اس مجموعے کی ساری کاپیاں نذرِ آتش کردیں۔

اس مجموعے کے علاوہ پریم چند کے بیش تر افسانوں میں کسی نہ کسی صورت میں جذبہ حب الوطنی ملتا ہے ۔ افسانہ "لال فیتہ " (خواب و خیال) اس کی بہترین مثال ہے ۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ہری بلاس ڈپٹی مجسٹریٹ ہے ۔ دورانِ جنگ یورپ میں ہری بلاس نے ہر ممکنہ طریقے سے اپنی وفاداری کا ثبوت دیا اور رائے بہادر کے اعزاز سے سرفراز ہوا ۔ وہ افسروں کو خوش ضرور رکھتا لیکن کبھی قانون کا دائرہ توڑتا نہ تھا۔ اسے ایک سرکاری مراسلہ دیا جاتا ہے جو سرخ فیتے سے بندھا ہے جس میں قوم اور ملک کے خلاف کارروائی کرنے کی

ہدایت ہے ۔ مراسلہ پڑھنے کے بعد بڑی بلاس خوب سوچتا ہے اس کے سینے میں حب الوطنی کا جذبہ جاگتا ہے اور کافی سوچ بچار کے بعد وہ اپنے ذاتی مفادات پر وطن پرستی کو ترجیح دیتا ہے اور مراسلے کا جواب لکھتا ہے ۔

مراسلہ ـــ نمبر ـــ مورخہ ـــ میں جو احکام نافذ کیے گئے ہیں وہ میرے ضمیر اور اصول کے خلاف ہیں ـــ لہٰذا میں ہندستانی ہونے کے اعتبار سے یہ خدمت انجام دینے سے معذور ہوں اور استدعا کرتا ہوں کہ مجھے بلاتاخیر اس عہدے سے سبک دوش کیا جائے ۔" (ص ۲۰۸)

استعفیٰ کے بعد وہ کافی مصیبتیں جھیلتا ہے لیکن ثابت قدم رہتا ہے ۔ پریم چند یہ شعور پیدا کرنا چاہتے تھے کہ انگریزوں کے ساتھ تعاون قوم سے ایک طرح کی غداری ہے ۔ چناں چہ خود انھوں نے ۱۵ فروری ۱۹۲۱ء کو سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔

آزادی کی جنگ نے شدت اختیار کی تو پریم چند کے قلم میں بھی تیزی آگئی اور وہ بھی شدت اختیار کرنے لگے ۔ افسانہ "قاتل" (آخری تحفہ) کا ہیرو دھرم ویر اپنی ماں سے کہتا ہے ۔

" تم نے مجھے یہ زندگی عطا کی ہے اسے تمھارے قدموں میں نثار کرسکتا ہوں لیکن مادرِ وطن نے تمھیں اور مجھے دونوں ہی کو زندگی عطا کی ہے اور اس کا حق افضل ہے ۔ اگر کوئی ایسا موقع ہاتھ آجائے کہ مجھے مادرِ وطن کی حمایت کے لیے تمھیں قتل کرنا پڑے تو میں اس ناگوار فرض سے بھی منھ نہ موڑ سکوں گا ۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوں گے لیکن تلوار گردن پر ہوگی ۔" (ص ۴۲)

اور اس کے برعکس "قاتل کی ماں" (واردات) میں رامیشوری اپنے قاتل بیٹے ونو سے کہتی ہے ۔

" میں اسے بچا نہیں کہتی کہ جرم تو منھ چھپا کر بھاگ جائے اور بے گناہوں کو سزا ملے ـــ لیڈر وہ ہوتے ہیں جو دوسروں کے لیے مرتے ہیں ۔ جو دوسروں کی حفاظت کریں وہی بہادر اور سورما ہیں ۔ انھیں کا جنم مبارک ہے انھیں کی مائیں خوش نصیب ہیں ۔ تجھے شرم نہیں آتی کہ خون کرکے اپنی بڑائی کررہا ہے ۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری کوکھ سے ایسا سپوت پیدا ہوگا ورنہ پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دیتی ۔ اگر مرد ہے تو جاکر عدالت میں اپنا قصور تسلیم کرلے ورنہ ان بے گناہوں کا خون تیرے سر پر ہوگا ۔" (ص ۲۰۷)

وطن کے آگے پریم چند رشتے ناتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ۔ پریم چند جنگِ آزادی میں سرفروشی کا صحت مند تصور رکھتے تھے ۔ ان کو یہ گوارا نہیں تھا کہ انقلابی ، انگریزوں کو قتل کرکے راہ فرار اختیار کریں اور بے گناہ سزا پائیں ۔ قتل کرکے فرار ہوجانے والا ان کی نظر میں مجاہد نہیں محض قاتل ہے ۔

افسانہ "جیل" (آخری تحفہ) میں ہیرو دشمبر اپنی محبوبہ روپ متی سے کہتا ہے ؛

" ذرا سوچو ، میری جان کی قیمت کیا ہے ۔ ایم ۔ اے پاس کرنے کے بعد بھی سو روپے کی ملازمت ، بہت بڑھا تو تین چار سو تک پہنچ جاؤں گا ۔ اس کے بدلے یہاں کیا ملے گا ؟ جانتی ہو سارے ملک کے لیے سوراج ۔ لیے عظیم مقصد کے لیے مرجانا بھی اس زندگی سے کہیں اچھا ہے ۔"

چند کے ابتدائی افسانوں میں جذبہ حب الوطنی نمایاں ہے ۔ شروع میں انھوں نے مثالی کرداروں کے ذریعے قوم کی غیرت اور کو جھنجوڑا ۔ وہ گاندھی جی کے اہنسا کے رویے اور تحریکِ عدم تعاون سے بھی متاثر رہے اور تشدد کے بھی قائل رہے ۔

"رانی سارندھا" میں وہ ایک نیم تاریخی واقعے کے سہارے ملک کی آزادی ، عزتِ نفس اور جذبہ خودداری کا درس دیتے ہیں "ستی" میں وہ بندیل کھنڈ کی ایک بہادر خاتون چنتا دیوی کا کردار پیش کرتے ہیں ۔ چنتا دیوی کا باپ جنگ میں مارا گیا ہے۔ اس وقت دیوی کی عمر تیرہ برس ہے ۔ جب چنتا دیوی سے پوچھا جاتا ہے کہ اب وہ کیا کرے گی تو وہ جواب دیتی ہے "جو کچھ انھوں نے کیا میں بھی کروں گی۔ اپنے وطن کی سرزمین دشمنوں کے پنجے سے چھڑانے میں انھوں نے جان دے دی میرے سامنے بھی وہی معیار ہے" رتن سنگھ اس سے محبت کرتا ہے وہ رتن سنگھ سے شادی کرلیتی ہے کیوں کہ رتن سنگھ نے دلیری سے اس کی جان بچائی تھی ۔ کی شبِ اولین اسے خبر ملتی ہے کہ مرانٹھے قلعے کی طرف بڑھ رہے ہیں تو وہ اپنے شوہر رتن سنگھ کو مقابلے کے لیے بھیجتی ہے ۔ سنگھ اپنے وفادار ساتھیوں کو دشمنوں سے لڑتا چھوڑ کر خود بزدلوں کی طرح بھاگ آتا ہے ۔ چنتا دیوی چتا تیار کرنے کا حکم دیتی ہے ۔ رتن سنگھ اس سے ملتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ زندہ ہے تو وہ کہتی ہے :

"تمھارا نام رتن سنگھ ہے مگر تم رتن سنگھ نہیں ہو"

"میری طرف دیکھو تو ، میں ہی تمھارا خادم ، تمھارا عقیدت مند ، تمھارا شوہر ہوں"

"میرا شوہر بہادروں کی موت مرچکا ہے ۔ تم میرے رتن سنگھ نہیں۔ میرا رتن سنگھ سچا سورما تھا ۔ وہ اپنی حفاظت کے لیے اپنے لے جسم کو بچانے کے لیے اپنے چھتری دھرم کو ترک نہ کرسکتا تھا...... رتن سنگھ کو بدنام نہ کرو وہ بہادر راجپوت تھا، میدان جنگ بھاگنے والا بزدل نہیں ۔" (ص ۳۴) یہ کہہ کر وہ چتا میں کود جاتی ہے ۔

وکرمادتیہ کا تیغہ ، راجہ ہردول ، سرِ پرغرور اور مریادا کی قربان گاہ میں پریم چند قوم میں غیرت ، شجاعت ، بہادری کے اوصاف چاہتے ہیں۔ سرِ پرغرور کا کنور مگن سنگھ آن کی خاطر سب کچھ قربان کردیتا ہے ۔ "مریادا کی قربان گاہ" میں پربھا چتوڑ کے رانا کی قید میں ہوتے کہتی ہے :

> "وہ دن نہ آئے کہ میں چھتری ونش کا کلنک ہوں ۔ راج پوت قوم نے حرمت پر اپنا خون پانی کی طرح بہایا ہے اس کی ہزاروں دیویاں سوکھی لکڑی کی طرح جل مری ہیں ۔ ایشور! وہ گھڑی نہ آئے کہ میرے کارن کسی راج پوت کی آنکھیں شرم سے زمین کی طرف جھکیں"

پریم چند اپنے مثالی کرداروں کے ذریعے قوم میں اعلیٰ قدروں کی روح پھونکنا چاہتے تھے ۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ پریم چند کے وطن پرست ، بہادر اور دلیر کردار اکثر راج پوت ہیں جبکہ وہ مراٹھوں کو دشمن بتاتے بعد میں پریم چند کے افسانوں کا موضوع بدل گیا ۔

پریم چند اسکول کے سدرشن، اعظم کریوی اور عباس حسینی کے افسانوں میں حب الوطنی کا موضوع نہیں ملتا۔ علی عباس حسینی گاندھی جی کی تعلیمات سے متاثر تھے۔ قوم پرستوں اور مجاہدین آزادی سے انھیں ہمدردی تھی لیکن انھوں نے اپنے افسانوں میں کبھی کوئی ایسی بات نہیں لکھی جو حکومت کی نظر میں قابلِ اعتراض ہو۔ البتہ ہندو مسلم اتحاد اور قومی یک جہتی پر انھوں نے کامیاب افسانے لکھے اس موضوع پر ان کا ایک اہم افسانہ "ماں کے دو بچے" ہے اس افسانے میں انھوں نے انسانی بے حسی اور درندگی کی عبرت ناک تصویر کھینچی اور ضمیر کو جھنجھوڑا۔ کلکتے کے فساد کا غیر جانب داری سے تجزیہ کیا۔

"دیکھو یہ بھارت ماتا کی گود میں دو بچے ہیں، ایک ہندو اور ایک مسلمان۔ یہ میری داہنی اور بائیں آنکھیں ہیں۔ جب ان میں سے ایک پھوٹی تو میں کانی ٹھہری اور جب دونوں تو بالکل اندھی" (زمانہ مارچ ۱۹۲۸، ص ۳۰۹)

مجنوں گورکھپوری (جن کا تعلق رومانوی دبستان سے تھا) کا ایک افسانہ "محبت کی قربانیاں" پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ترقی پسند تحریک سے بہت پہلے انھوں نے ترقی پسند تحریک کا مقصد اس افسانے میں پیش کردیا۔ اس افسانے کی فضا اور لب و لہجہ رومانی ہے لیکن اس کے کردار جذبہ، حب الوطنی سے سرشار ہیں، ان میں سرفروشی کی تمنا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار شمیم اپنی محبوبہ کملاوتی کو سمجھاتا ہے:

"کملاوتی کم از کم مجھ میں اتنی ہٹ دھرمی نہیں ہے کہ جہاں لوگ بھوک کی مار کا رونا رو رہے ہیں، جہاں غلامی پر ماتم کیا جارہا ہو، جہاں آزادی کی ایک سانس بھی لینے کو لوگ ترستے ہوں وہاں میں محبت کے ایک دکھ کو دکھ سمجھوں اور اس پر آنسو بہاؤں؟"

پورا اقتباس فیض کے اس شعر کی تفسیر بن جاتا ہے:

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا ــــ راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

بعد میں پوری ترقی پسند شاعری کا موضوع یہی بنا۔ وہ اپنی محبوبہ سے کہتا ہے کہ اس کی محبت کو بھلانے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ وہ زمانے کے درد کو اپنے دل میں سمیٹ لے۔ ایک تفصیلی خط میں شادی سے انکار کرتے ہوئے اپنی محبوبہ کو نئی زندگی شروع کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ اس طرح مجنوں کا ہیرو ترقی پسند تحریک سے قبل غمِ جاناں پر غمِ دوراں کو ترجیح دیتا ہے۔ جیل جاتے ہوئے وہ اپنے دوستوں سے کہتا ہے:

"میں چلا لیکن تم لوگ ہو۔ یہ حریت اور غلامی کی جنگ، یہ فاقہ کشی اور شکم سیری کی لڑائی رکنے نہ پائے۔ جب تک تمھارے جسم میں ایک قطرہ لہو باقی ہے اس وقت تک پیچھے نہ ہٹو۔ تمھاری زندگی یہی ہے۔ تمھاری نجات اسی میں ہے۔"

خواجہ حسن نظامی کے افسانوں کا موضوع غدرِ دہلی، اسلام کی تباہی اور دہلی کے جاہ و جلال کی تباہی رہا۔ خواجہ حسن نظامی کو مغلیہ سلطنت کی تباہی کا بے حد افسوس تھا۔ انھوں نے "غدرِ دہلی کے افسانے" اور "بیگمات کے آنسو" جیسے افسانے لکھے۔

انگارے (۱۹۳۲ء) اور کفن (۱۹۳۵ء) کی اشاعت کے بعد اردو افسانے میں ایک انقلاب آیا۔ افسانے کے موضوعات اور تکنیک میں وسعت آئی ۔ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر لکھنے والوں میں ذہین اور جنونی فن کاروں کی ایک بڑی تعداد شامل تھی ۔ سماجی و سیاسی حالات اور بدلتے ہوئے افکار اردو افسانے کو نئے نئے موضوعات کی طرف راغب کر رہے تھے ۔ نئی نسل مارکس سے ہی نہیں فرائیڈ سے بھی متاثر تھی ۔ شعور و لاشعور کی کشمکش اور جنسی مسائل کو افسانے کا موضوع بنایا جارہا تھا ۔ افسانہ قومی اور ملکی حدود سے نکل کر بین الاقوامی مسائل سے جڑ گیا تھا ۔ افسانہ نگاروں میں عالمی مسائل کو سمجھنے کا شعور جاگ رہا تھا ۔ اس کے باوجود قومی مسائل کو نظر انداز نہیں کیا گیا ۔

کرشن چندر کے افسانے "دو فرلانگ لمبی سڑک" میں سڑک ہندستانی معاشرے کی علامت بن جاتی ہے ۔ اس سڑک پر ایک گورا صرف دو آنے کی خاطر چمڑے کے ہنٹر سے تانگے والے کو پیٹ رہا ہے اور ضمیر فروش غلامانہ ذہنیت کا سپاہی اس گورے کو اس طرح ظلم کرنے سے روکنے کی بجائے تانگے والے سے کہتا ہے : "حرام زادے، صاحب بہادر سے معافی مانگو"۔ تانگے والا اپنی میلی پگڑی سے آنسو پونچھ رہا ہے ۔ وہ ظلم کے خلاف احتجاج نہیں کرسکتا ۔ سب خاموش تماشائی ہیں ۔

ایسے مناظر انگریزوں کے خلاف نفرت جگانے میں کامیاب رول ادا کرتے ہیں ۔

ترقی پسندوں نے قحطِ بنگال پر بہترین کہانیاں تخلیق کیں ۔ قحطِ بنگال کا تعلق جدوجہدِ آزادی سے نہیں لیکن انگریزوں کی گھناؤنی سازشوں کا پردہ فاش کرکے ان سے نفرت پیدا کرنے میں یہ افسانے کامیاب ہیں ۔ بنگال کا یہ قحط قدرتی نہیں تھا ۔ سرمایہ داروں اور سیاست دانوں کی گھناؤنی سازش کا پیدا کردہ تھا ۔ یہ ہندستان کی تاریخ کا بدترین قحط تھا ۔ کرشن چندر نے اس موضوع پر غیر معمولی افسانہ ان داتا لکھا ۔ ان کے علاوہ خواجہ احمد عباس (ایک پائلی چاول) اختر اورینوی (جنگل) دیویندر ستیارتھی (قبروں کے بیچوں بیچ) صدیقہ بیگم (چاول کے دانے) سردار جعفری (چہرہ ماجھی) میرزا ادیب (بنگال دیس میں) نے موثر افسانے لکھے ۔ کرشن چندر نے قحط کو تین زاویوں سے پیش کیا اور تین طبقوں کی عکاسی کی ہے ۔ پہلا طبقہ کچلا ہوا غریب ہے ۔ دوسرا اونچا متوسط طبقہ ہے جو مصیبت زدوں کے ساتھ جھوٹی ہمدردی کرتا ہے ۔ تیسرا اونچا طبقہ ہے جو خوشامد پسند اور ریاکار ہے جو صرف اپنے آقا کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے ۔ اسے قحط سے زیادہ اپنے عشق کی فکر ہے ۔ آخر میں وہ "وہ آدمی جو ابھی زندہ ہے" کی زبانی اپنا مطمحِ نظر بیان کرتے ہیں ۔

"میں سیاست داں نہیں ہوں ستار بجانے والا ہوں ۔ حاکم نہیں ہوں حکم بجالانے والا ہوں لیکن شاید ایک نادار مغنی کو بھی یہ پوچھنے کا حق ہے کہ اس نئی دنیا کی تعمیر میں ان لاکھوں کروڑوں ننگے بھوکے آدمیوں کا بھی ہاتھ ہوگا جو اس دنیا میں بستے ہیں ۔ میں یہ سوال اس لیے کر رہا ہوں کہ میں بھی ان تین بڑے رہنماؤں کی دنیا میں رہنا چاہتا ہوں ۔ مجھے بھی فسطائیت، جنگ اور ظلم سے نفرت ہے اور گو میں سیاست داں نہیں ہوں لیکن مغنی ہو کر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اداس نغمے سے اداسی ہی پیدا ہوتی ہے جو آدمی خود غلام ہے دوسروں کو بھی غلام بنادیتا ہے ۔ دنیا کا ہر چھٹا آدمی ہندستانی ہے ۔ یہ غیر ممکن ہے کہ باقی پانچ آدمی کرب کی اس زنجیر کو محسوس نہ کرتے ہوں جو ان

کی روحوں کو چیر کو نکل رہی ہے۔"

ملک راج آنند نے اس افسانے کو "حقیقت کا مینی فیسٹو" قرار دیا تھا۔ خواجہ احمد عباس نے "ایک پاؤلی چاول" میں مصائب کو حقیقی رنگ میں پیش کیا۔ اختر اورنیوی "جنگل" میں غیر جذباتی انداز میں قحط سے پیدا شدہ صورتِ حال کی چند تصویر کیں جو قاری کے ذہن کو جھنجھوڑ دیتی ہیں۔ صدیقہ بیگم نے انسان کی بھوک اور بے بسی کے المیے کو پیش کیا۔ میرزا ادیب نے ر اختیار کیا۔ اس موضوع پر ۱۹۴۲ء کی تحریک میں کمیونسٹ پارٹی نے بالکل حصہ نہیں لیا۔ ترقی پسند مصنفین نے بھی اس موضوع پ لکھا۔ لیکن انگریزوں سے نفرت کے اظہار سے وہ خود کو بچا نہ سکے۔ کرشن چندر نے "تین غنڈے" لکھی۔ جہازیوں کی مسلح بغا اور ان انقلابیوں کو غنڈہ قرار دیگیا۔ یہ عبدالصمد، رحمان اور سکھ کسان کی کہانی ہے۔ عبدالصمد چوبیس برس کا راج پوت مسلمان ہے چھوٹی اینگلو انڈین لڑکی کو بچاتے ہوئے خود گولی کا نشان بن جاتا ہے۔ اس کے دوسرے کردار شانتا اور بدصورت گجراتی لڑکی شکار ہوجاتی ہے۔ دونوں جئے ہند کا نعرہ لگا کر مرجاتے ہیں۔ کرشن چندر اشتراکیت کے حامی تھے تین غنڈے کا ایک سین ملاحظہ فر

"اس کے ہاتھ میں کانگریس اور لیگ دونوں کے جھنڈے تھے اور جب وہ گولیاں کھاکر مرجاتا ہے تو اس کے خون سے لیگ جھنڈا اور کانگریس کا سبز سفید زعفرانی جھنڈا دونوں اس کے خون سے ایسے سرخ ہوگئے تھے کہ کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ کون جھنڈا کس

بعد میں کرشن چندر نے کوریا کی جنگ پر "ایک گرجا ایک خندق" میں انتظار کروں گا" جیسے افسانے لکھے۔ "تین غنڈے" "ا ایک خندق" "ماہر فن" اور "بھوت" میں وہ جنگ سے شدید نفرت کا اظہار کرتے ہیں:

"بت جاگتے ہیں" کا محرک تحریر و تقریر کی آزادی پر بمبئی گورنمنٹ کی پابندی ہے۔ کرشن چندر کو یہ شکایت ہے کہ آ تلک، گوکھلے اور گاندھی جیسے لیڈروں کے بت نصب کرتے ہیں لیکن وہ عام آدمی جو جنگِ آزادی میں ان سے زیادہ قربانیاں دے اسے فراموش کردیا جاتا ہے"

"بھوت" میں دوسری جنگ ختم ہوجانے کا جشن منایا جارہا ہے۔ شدید بارش ہے۔ یہ بارش عجیب و غریب شکلیں بنا۔ یہ منظر دیکھیے:

"چھاتے کی دراز کمانیوں سے پانی ٹپ ٹپ کرکے بہہ رہا تھا اور فرش پر بہتا ہوا کچھ لکھتا جارہا تھا۔ ناگری حروف، اردو کے گیدڑ کا منہ، شیر کے بال، جناح کا چہرہ، گاندھی کا چہرہ، چرچل کا سگار، مندر کی تکونی عورت جو دیکھتے دیکھتے مسجد کے گنبد میں تبد اور پھر کاٹھک گرجا کی صورت میں نمودار ہوگئی۔ پھر ایک عالی شان محل کا کھنڈر بن گئی۔ قطرہ قطرہ کرکے پانی بہہ رہا تھا اور ایک نوک سے مختلف زبانیں تہذیبیں، شخصیتیں مذاہب ایجاد کرتا چلا جارہا تھا (ص ۱۰۲)

"آدھے گھنٹے کا خدا" میں وطن کے سچے سپاہی کا جذبہ، انتقام ہے۔ کاشرو ایک فوجی جوان ہے جو موگری سے پیار کرتا ہے۔ مخبری پر اس کے علاقے کا پل ڈائنامیٹ سے اڑا دیا جاتا ہے۔ کاشرو کو سخت دھکا پہنچتا ہے۔ موگری نے نہ صرف اس کے ملا

داری کی بلکہ اس سے بھی بے وفائی کی۔ وہ موگری کا قتل کر دیتا ہے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ملک کے مختلف مقامات پر فسادات ہوئے۔ کلکتہ، نواکھالی، بہار، امرتسر، لاہور، بمبئی، دہلی، میوات اور پورا پنجاب اس آگ میں جلنے لگا۔ ۱۹۴۸ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آزادی اور تقسیم وطن کے بعد ملک میں فرقہ پرستی اور قتل و خون کا ایک طوفان اٹھا۔ بے شمار جانیں تلف ہوئیں۔ ترقی پسند ادیبوں نے اس موقع پر بڑے ضبط اور توازن سے کام لیا۔ انھوں نے مذہبی یا فرقہ وارانہ تعصب کی سطح سے اونچا اٹھ کر فسادات کو ایک انسانی مسئلے کی حیثیت سے پیش کیا۔

کرشن چندر نے دوسری موت، برہمن، جانور، لال باغ، جیکسن، پشاور ایکسپریس، ایک طوائف کا خط، جیسے افسانے لکھے اور "ہم وحشی ہیں" جیسا افسانوی مجموعہ شائع کیا۔ ان میں پشاور ایکسپریس سب سے موثر افسانہ ہے۔ بہ قول ڈاکٹر صادق جب آدمی مذہب کے نام پر وحشی درندہ بن کر انسانیت کو یک سر فراموش کر بیٹھا تھا اور اس نے مجرمانہ جانب داری اور بے حسی اختیار کر لی تھی ایسے وقت کرشن چندر نے ایک بے جان اور بے حس ٹرین کو زبان دے کر انسان کی وحشیانہ درندگی اور بے حسی پر کاری طنز کیا۔" کرشن چندر لکھتے ہیں:

"وہ برہمنیت جو بدھ کے عروج کا باعث بنی جس نے اسلام کو فروغ دیا جس نے اچھوت پیدا کیے آج پاکستان کو جنم دے رہی ہے۔" ...... قومیت کا سیلاب آزادی لایا، برہمنیت کے رد عمل نے پاکستان کی تشکیل کی" (دوسری موت۔ ص ۱۸)

"ظالمو تم نے مسلمان نہیں مارا

ظالمو تم نے ہندستان کو مارا

تم نے تاج محل، فتح پور سیکری اور شالامار کا قتل کیا ہے۔ یہ اشوک کی لاش ہے۔ یہ اکبر کی لاش ہے۔ یہ پانچ ہزار سال پرانی تہذیب کا مردہ ہے" (لال باغ ص ۴۰)

"ایک طوائف کا خط" میں انھوں نے مہاتما گاندھی اور محمد علی جناح کے نام لکھے گئے خط میں دو معصوم لڑکیوں کی درد انگیز کہانی بیان کی ہے۔

منٹو نے ٹوبہ ٹیک سنگھ، کھول دو اور گورکھ سنگھ کی وصیت کے علاوہ افسانچوں پر مشتمل ایک مجموعہ "سیاہ حاشیے" شائع کیا۔ یہ چھوٹے چھوٹے افسانے رائفل کی گولی کا کام کرتے ہیں۔ ایک چھوٹا افسانہ "مشٹیک" ہے۔

چھری پیٹ چاک کرتی ہوئی ناف کے نیچے تک چلی گئی۔ ازار بند کٹ گیا۔ چھری مارنے والے کے منہ سے دفعتاً کلمہ تاسف نکلا "چ چ چ چ" مشٹیک ہو گیا۔"

افسانہ "کھول دو" میں سکینہ جسے بلوائی اٹھا کر لے گئے ہیں اپنے باپ سراج الدین سے بچھڑ جاتی ہے۔ سراج الدین اسے تلاش کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو رضا کاروں سے ملتا ہے جو بچھڑے ہوئے لوگوں کو تلاش کرنے میں مدد کر رہے تھے۔ یہ آٹھ رضا کار سکینہ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن اپنی ہوس پر قابو نہیں رکھتے چناں چہ وہ اپنے ہی فرقے سے تعلق رکھنے والی لڑکی سکینہ کو ہوس کا نشانہ

بناتے ہیں۔ ایک روز سکینہ ریلوے لائن کے پاس بے ہوش پڑی ملتی ہے۔ اسے ہسپتال لاتے ہیں۔ افسانے کا اختتام بے حد موثر ہے۔

"ڈاکٹر جس نے کمرے میں روشنی کی تھی سراج الدین سے پوچھا "کیا ہے؟" سراج الدین کے حلق سے صرف اس قدر نکل سکا۔

" جی میں ۔۔۔۔ جی میں ۔۔۔۔ اس کا باپ ہوں "

ڈاکٹر نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا۔ اس کی نبض ٹٹولی اور سراج الدین سے کہا "کھڑکی کھول دو"

سکینہ کے مردہ جسم میں جنبش ہوئی۔ بے جان ہاتھوں سے اس نے ازاربند کھولا اور شلوار نیچے سرکادی۔ بوڑھا سراج الدین خوشی سے چلایا "زندہ ہے۔ میری بیٹی زندہ ہے ۔۔۔۔" ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینے میں غرق ہوگیا۔"

پڑھنے والے کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا اختتام بھی فن کارانہ ہے۔ بہ قول حسن عسکری "فسادات کے متعلق جتنا بھی لکھا گیا ہے اس میں اگر کوئی چیز انسانی دستاویز کہلانے کے مستحق ہے تو وہ منٹو کے یہ افسانے ہیں"

حیات اللہ انصاری (ماں بیٹا) احمد ندیم قاسمی (پرمیشر سنگھ) عصمت چغتائی (جڑیں) راجندر سنگھ بیدی (لاجونتی) خواجہ احمد عباس (سردار جی، میں کون ہوں، انتقام) عزیز احمد (کالی رات) خدیجہ مستور (ٹلک ٹوپے، مینو لے چلا بابلا) ہاجرہ مسرور (امت مرحوم، بڑے انسان بنے بیٹھے ہو) صدیقہ بیگم (گوتم کی سرزمین) فسادات پر لکھے گئے اچھے افسانے ہیں۔ تقسیم وطن نے اردو ادیبوں کو مایوس کردیا تھا۔ یہ آزادی وہ آزادی نہیں تھی جس کا انھوں نے خواب دیکھا تھا۔ ابراہیم جلیس نے آزادی کے بعد ہندستان میں پھیلے ہوئے غم و غصے کو پوری دیانت داری سے پیش کیا۔ "آزاد غلام" میں وہ لکھتے ہیں:

" بیوگی، آتش، اجڑی گودیوں، سربریدہ بچوں، پستان دریدہ ماؤں، بے حیا بہنوں، بے غیرت شوہروں، بے شرم باپوں اور جلے ہوئے مسمار مکانوں کو اپنی اپنی پیٹھ پر ڈھو کر یہ ہندستان اور پاکستان آزاد ہوچکے تھے۔"

اپنی ابتدا سے لے کر تقسیم ملک تک یہ اردو افسانے کا سفر ہے۔ اردو افسانے نے حب الوطنی کے جذبے کو جگانے اور جدوجہد آزادی کی لے تیز کرنے میں موثر رول ادا کیا۔ افسانہ ہی وہ واحد صنف ہے جس میں ہنگامی موضوعات اور وقتی جذبات کو لئے خلوص اور خوب صورت تکنیک کے ساتھ برتا گیا کہ پروپگنڈے کے الزامات کے باوجود یہ ادب عالیہ کا حصہ بن کر رہ گئے۔ یہ افسانے عوام کے ذہن کو جھنجھوڑنے میں شاعری سے بھی کہیں زیادہ کامیاب ثابت ہوئے۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ انگریزوں کی گھناؤنی سازشوں کو طشت از بام کرنے، حب الوطنی کا جذبہ جگانے، جنگ سے نفرت پیدا کرنے، جدوجہد آزادی میں حصہ لینے اور فسادات کے بھیانک روپ دکھانے میں جو اردو افسانے لکھے گئے وہ تعداد اور معیار کے اعتبار سے ہندستان کی ساری زبانوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔

● ○ ●

پروفیسر اشرف رفیع

ہندستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری

اردو شاعری کے بارے میں یہ خیال عام ہے کہ وہ گل و بلبل کی داستان ہے، جھوما فسانہ ہے، حقیقت سے بعید، عصر سے بیگانہ اور لذت نظر سے عبارت ہے۔ لیکن اردو شاعری کے سرسری مطالعے سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس زبان کا کوئی شاعر ایسا نہیں جس نے اپنے عہد کے نشیب و فراز کی عکاسی اپنی شاعری میں نہ کی ہو۔ میر جیسا صاحب دل جو اپنی شاعری کے بارے میں کہتا ہے:

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے   درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

اس کے درد و غم میں دلی کی تباہی و بربادی بھی شامل ہے۔ ان کی آپ بیتی میں جگ بیتی بھی جھلکتی نظر آتی ہے:

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں   تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا
جن کے ملک تھا زیر نگیں صاف مٹ گئے   تم اس خیال میں ہو کہ نام و نشاں رہے

سودا، درد اور میر کے "شہر آشوب" انقلاب دوراں کی پستی اور زوال کے اچھے مرقعے پیش کرتے ہیں۔ یہ ایسی تصویریں ہیں جو سماج اور سیاسی تاریخوں میں نظر نہیں آتیں، جن کو شاعر نے بہ حیثیت ایک فرد دیکھا اور بھگتا ہے۔ لکھنؤ کے پر سکون ماحول میں سانس لینے والے شاعر، اس بات سے اچھی طرح باخبر تھے کہ انگریز ہندستان میں کیوں آئے اور یہاں کس طرح اپنے قدم جمائے۔ آتش بڑے ہی لطیف انداز میں اس طرف اشارہ کرتے ہیں:

مبارک کشتیاں مئے کی بتان ہند کو ہوویں   جہازوں میں فرنگستاں سے آب آتشیں آیا

اس آب آتشیں کے ساتھ ساتھ غلامی کی زنجیروں کی جھنکار بھی صاف سنائی دینے لگی۔ انگریزوں نے جب سے ہندستان کی سرزمین پر قدم رکھا ان کی اہل قلم کی طرف سے باضابطہ مخالفت ہوتی رہی اور سرد جنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ شیخ قلندر بخش جرات لکھتے ہیں:

کہیے نہ انھیں امیر اب اور نہ وزیر   انگریزوں کے ہاتھ یہ قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ وہ پڑھائیں سو یہ منھ سے بولیں   بنگالے کی مینا ہیں یہ پورب کے امیر

غالب کے خطوط اور ان کا کلام پہلی جنگ آزادی کے بعض اہم اور دردناک پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے:

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم   گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو   آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا میرے آگے
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی   اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے
روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے   کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ رہی سہی مغلیہ سلطنت کا خاتمہ کر گیا۔ بہادر شاہ ظفر بالراست اس کا نشانہ بنے۔ نشانہ کیا بنے ایسے تباہ ہوئے کہ "دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں۔" غالب کے علاوہ ظہیر دہلوی، سالک دہلوی اور داغ کے شہر آشوب دلی کی تباہی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس دور کی شاعری نے سب کچھ کہا لیکن گلزار و چمن، دانہ و دام، قفس و آشیاں، بہار و خزاں، شمع و پروانہ، طوق و زنجیر، آہ و فغاں، جبر و قہر، اور ...

وغیرہ وغیرہ کے پردے میں کیا۔

پہلی جنگِ آزادی کے بعد جہاں سیاسی اعتبار سے ہماری غلامی مستند ہو گئی اور ایک حکومت کا جو بھرم تھا سو وہ بھی ٹوٹ گیا تو اس کے ساتھ ہی علمی، ادبی اور تہذیبی سطح پر ہماری قوم زوال خوردہ اور احساسِ پستی میں مبتلا ہو گئی۔ سرسید اور ان کے رفقا نے بڑی دور اندیشی او احتیاط سے اردو شعرا کو نسبتاً واضح انداز میں قوم پرستی کے اظہار کی طرف مائل کیا، حب الوطنی کے جذبات کو بیدار کیا۔ اس وقت ہمارے ذہن اس قدر مضمحل اور شکست خوردہ ہو چکے تھے کہ وہ رمز و اشارے کی زبان سمجھنے سے قاصر تھے۔ ایسے ذہنوں کو جھنجھوڑنے اور جگانے کے لیے علی گڑھ تحریک نے بڑا کام کیا۔ الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کی طرف سے مشاعروں کو مقصدی بنایا اور شاعروں کو قومی شاعری کی طرف آنے کی دعوت دی۔ حالی نے اس تغیر کے لیے ایک ترکیب "مقتضائے فطرت" بار بار اپنی تحریروں میں استعمال کی ہے۔ یہ ترکیب خود دعوتِ فکر رکھتی ہے۔ اس وقت فطرت کا تقاضا تھا کہ "ہر شب کی سحر کر۔" انجمن کے دیے ہوئے عنوانات سے ہٹ کر اردو شاعروں نے ایسے موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی جن کا تعلق براہِ راست قومی اور وطنی جذبات سے تھا۔ ان شاعروں نے سب سے پہلے محسوس کیا کہ آزادی کی جنگ میں فرنگیوں کے خلاف اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں کر سکتے جب تک ہم میں حب الوطنی، یک جہتی ا آپسی محبت نہ پیدا ہو جائے۔ حالی نے دوستی کے لیے پکارا:

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو! — اٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو

حالی اور ان کے ہم عصروں نے اس خلیج کو پاٹنے کی بڑی کوششیں کیں۔ شبلی کہتے ہیں:

نوجوانو یہ زمانے کو دکھا دینا ہے — اپنی قوت کو کیا قوم نے یکجا کیسا
قوم کے تازہ نہالانِ چمن ہو تم لوگ — دیکھیں پھل لاتا ہے یہ نخلِ تمنا کیسا

شبلی کا سیاسی شعور اپنے ہم عصروں سے کچھ مختلف ہے۔ انھوں نے سیاسی مسائل پر علمی انداز میں غور و فکر کیا ہے۔ اپنے عہد کے لوگوں رہنمائی کی۔ اپنی نظموں کے ذریعے ایک طرف بالعموم ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں میں انگریز دشمنی کے جذبے کو ہوا دی تو دوسر طرف مسلم لیگ کی مخالفت میں نظمیں لکھ کر کانگریس کے شانہ بہ شانہ چلنے کی طرف آمادہ کیا۔ شبلی کو ڈر تھا کہ مسلم لیگ کہیں مسلمانوں علاحدگی کا رجحان نہ پیدا کر دے اس لیے وہ کانگریس کے حامی تھے۔ "کفرانِ نعمت" میں انھوں نے اپنے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے:

معترض ہیں آج مجھ پہ مہربانانِ قدیم — جرم یہ ہے میں نے کیوں چھوڑا وہ آئینِ کہن
میں نے کیوں لکھے مضامینِ سیاست پے بہ پے — کیوں نہ کی تقلیدِ طرزِ رہنمایانِ زمن
کانگریس سے مجھ کو اظہارِ برأت کیوں نہیں — کیوں حقوقِ ملک میں ہوں ہندوؤں کا ہم سخن

شبلی پکے مسلمان تھے ان کے علمی کارنامے زیادہ تر اسلامیات پر مشتمل ہیں لیکن سیاسی امور میں اور آزادیِ ملک میں انھوں نے کبھی مذہب بیچ میں آنے نہ دیا۔ ان کی نظموں میں سامراج دشمنی، سامراجی نظام سے ٹکر لینے کا حوصلہ اور ولولہ ملتا ہے۔ سامراجی حکمرانوں سے ان مخاطبت کا یہ انداز قابلِ غور ہے:

کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو — یہ ظلم آرائیاں کب تک، یہ حشر انگیزیاں کب تک
یہ جوشِ انگیزیِ طوفانِ بیدادِ بلا تا کے — یہ لطف اندوزیِ ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے — ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک

یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک کی خشک سالی کا ہم اپنے خوں سے سینچیں گے تمھاری کھیتیاں کب تک

سی لے کو اونچے سروں میں سرور جہاں آبادی، اکبر الٰہ آبادی، چکبست، ظفر علی خاں اور اقبال نے بھی پیش کیا۔ چکبست کی شاعری اپنے زمانے کے اہم سیاسی واقعات کی آئینہ دار ہے۔ حالی اور شبلی کی طرح چکبست بھی یہ محسوس کر رہے تھے کہ حب وطن کی کمی ہی ہماری غلامی کا بنیادی سبب ہے۔

گل شمع انجمن ہے ، گو انجمن وہی ہے حب وطن نہیں ہے خاکِ وطن وہی ہے

سرور جہاں آبادی نے بیسویں صدی کے شروع ہی سے انقلاب و آزادی اور حب الوطنی کے گیت، وطن کی محبت میں سرشار ہو کر لکھے۔ قوم کو اس کی عظمتِ رفتہ کا احساس دلا کر حال کی مجبوریوں کا شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ تاہم وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ی صرف اسلاف کے کارناموں کے تذکروں سے قوم میں نئی زندگی، حرکت اور حرارت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس لیے انھوں نے قوم کو بالراست بھی ان کی ذمے داریوں سے آگاہ کیا اور نویدِ آزادی دی:

دنیا کی رزم گاہ ہے شہرت کا کارزار افسانۂ اکابر عالم ہے یادگار
ہمت کرو بلند کہ ہو عزت و وقار کوشش کرو کہ کل کا ہے کیا خاک اعتبار
اونچا ہوا میں سب سے پھریرا اڑا کرے طاؤس بن کے قوم کا جھنڈا اڑا کرے

سرور کا نغمۂ وطن سیاسی داؤ پیچ سے آزاد اور آزادیٔ وطن کے سیدھے سادے مگر دل کش تصور سے معمور ہے۔ ظفر علی خاں کے ہاتھ میں ایک بے باک قلم تھا، عجیب جوشیلا اور بے خوف شاعر، جس کی نوکِ قلم نوکِ سناں سے تیز تر تھی اس نے جنگِ آزادی کے ہر مرحلے پر نظمیں لکھیں۔ انگریزوں کے ظلم و استبداد کے پردے چاک کیے:

یہ کیسا دیس ہے جس دیس کے ہم رہنے والے ہیں گرفتارِ بلا ہیں اور خطا یہ ہے کہ کالے ہیں
یہ نو بر نو تغافل اور یہ پیہم سختیاں کب تک یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک

اقبال کی علمیت، قوتِ فکر، مشاہدے و تجربات اور دور بینی نے شاعری کے سست رفتار قافلے کو "تیز ترک گام زن، منزلِ ما دور نیست" کا حدی خواں بنایا، بانگِ درا اور ضربِ کلیم سے قوم کو بیدار کیا۔ اقبال نے قومی حالات کا مطالعہ تاریخی، سیاسی، معاشی، تہذیبی اور مذہبی زندگی کے پس منظر میں کیا اور اپنی شاعری کو ایک واضح، بلند، وسیع اور ہمہ گیر مقصد کا ذریعہ بنایا، ہندوستان میں سیاسی اور قومی شعور کو بیدار کیا، مردہ دلوں میں بجلیاں بھر دیں۔ ان کی نظموں ہمالہ، بچے کی دعا، صدائے درد، ایک آرزو، تصویرِ درد، ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت اور نیا شوالہ وغیرہ میں قوم اور ملت کی زبوں حالی کو دور کرنے کی نفسیاتی کوشش ملتی ہے۔ اقبال یہ اچھی طرح محسوس کرتے تھے کہ جو برائیاں ہماری قوم میں آگئی ہیں یہ سب مسکرات ہیں جنھیں غلامی نے چن چن کر ہمیں دے دیے ہیں۔ اقبال قوم کو خودی اور عمل پیہم کی طرف بار بار متوجہ کرتے ہیں، آزادی کے لیے خود بھی تڑپتے اور دوسروں کو بھی تڑپاتے ہیں۔ انھوں نے انقلاب کا نعرہ دیا کہ جیتے جاگتے فرنگی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے قوم کو تڑپاتا اور گرماتا رہے:

بندیاں با یک دگر آویختند فتنہ ہائے کہنہ را انگیختند
کس نداند جلوۂ آب از سراب انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

اکبر الٰہ آبادی کو یہ غم تھا کہ وہ "مد خولہ گورنمنٹ" ہیں ورنہ وہ بھی آزادی کی تحریکوں میں شامل رہتے:

مدخولہ گورنمنٹ ہوتا اگر نہ اکبر   اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں تھے کہ مشرق، مغرب کے ہاتھوں کس طرح سرنگوں ہو رہا ہے۔ انھیں یہ بھی افسوس تھا کہ ہم پر اور ہمارے ملک پر مغرب کو برتری اور بالادستی حاصل ہو گئی ہے۔ مغرب کے رحم و کرم پر ہماری گزر ہو رہی ہے۔ بہ ظاہر ہم زندہ ہیں مگر "مردہ بہ دست زندہ":

گو سانس چل رہی ہے خوں اب نہیں جہندہ   مشرق بہ دستِ مغرب، مردہ بہ دستِ زندہ

آزادیِ وطن کے لیے سیاسی رہ بر و رہ نما اپنے اپنے طور پر برسرِ پیکار تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں سودیشی تحریک شروع ہوئی تو اردو شاعری نے اس تحریک کو عوام کے سامنے اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی کہ عوام اس طرف مائل ہو جائیں۔ تلوک چند محروم نے ایک نظم میں اس تحریک کی اہمیت یوں واضح کی:

وطن کے دردِ نہاں کی دوا سودیشی ہے   غریب قوم کی حاجت روا سودیشی ہے
فنا کے ہاتھوں میں ہے جانِ ناتوانِ وطن   بقا جو چاہو تو رازِ بقا سودیشی ہے
ہو اپنے ملک کی چیزوں سے کیوں ہمیں نفرت   ہر ایک قوم کا جب مدعا سودیشی ہے

حسرت موہانی زمانہ طالب علمی ہی سے سیاست میں سرگرم حصہ لیتے رہے۔ فرنگی اور اس کے نظامِ حکومت کی مخالفت کی تو زنداں کی مصیبتیں جھیلنی پڑیں مگر وہ کہتے ہیں:

وہ جرمِ آرزو پر، جس قدر چاہیں سزا دے لیں   مجھے خود خواہشِ تعزیر ہے، ملزم ہوں اقراری
بے کار ڈراتے ہیں مجھے قیدِ ستم سے   واں روحِ وفا اور بھی بے کار رہے گی

۱۹۲۰ء میں جب تحریکِ ترکِ موالات شروع ہوئی تو اس تحریک کو کامیاب اور بااثر بنانے میں ہندو مسلم سبھوں نے برابر کا حصہ لیا۔ وقت کے تقاضوں کو محسوس کر کے اس دور کے تقریباً ہر شاعر نے قومی اور ملی شاعری میں اضافے کیے۔ جوش، اختر شیرانی، علی اختر حیدرآبادی، حفیظ جالندھری، علی منظور، محب حسین اور دیگر شاعروں نے قومی شاعری کی روایت کو آگے بڑھایا، قومی مسائل کی ترجمانی کی اور اپنے رہ نماؤں کے بتائے ہوئے راستوں کو روشن تر کر کے ان راستوں پر قوم کو گامزن کرنے کی کوشش کی۔ جوش اس راہ میں اتنے تیز رفتار ثابت ہوئے کہ انھیں شاعرِ انقلاب ہی کہا جانے لگا۔ جوش کی نظموں میں لیلائے آزادی، وقت کی آرزو، غلاموں سے خطاب، اللہ کرے، وطن، رعبِ حکومت، پیمانِ محکم، آثارِ انقلاب، صدائے بیداری اسی قبیل کی نظمیں ہیں ۱۹۲۸ء میں نظم ہندوستان لکھی جس میں بڑے ہی جلے کٹے انداز میں غلامی کا نقشہ کھینچا ہے:

نہنگوں کا سمندر ہوں، درندوں کا بیاباں ہوں   عدو سے کیا غرض اپنوں سے ہی دست و گریباں ہوں
خدا کے فضل سے بدبخت ہوں، بزدل ہوں، ناداں ہوں   مری گردن میں ہے طوقِ غلامی، پابہ جولاں ہوں
درِ آقا پہ سر ہے، کلشِ بردباری پہ نازاں ہوں

وہ اس لہجے کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ:

خواب کو جذبۂ بیدار دیے دیتا ہوں   قوم کے ہاتھ میں تلوار دیے دیتا ہوں

جوش چاہتے تھے کہ میدانِ سیاست میں نوجوان آگے آئیں تاکہ انقلاب کی راہیں تیزی سے ہموار ہو سکیں ۱۹۲۷ء میں نعرۂ شباب لکھا اور جسے

آخر میں نعرۂ انقلاب میں بدل کر نوجوانوں کو ان کی ذمہ داری کا احساس دلایا:

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

جوش تقسیم ہند کے قائل نہیں تھے، آزادی وطن کی کتاب پر زرین حروف میں "ہندوستان" لکھنے کے آرزومند تھے:

ہو جو غیرت ڈوب مر، یہ عمر، یہ درس جنوں دشمنوں کی خواہش تقسیم کی صید زبوں
یہ ستم کیا اے کنیز کفر و ایماں کردیا بھائیوں کو گائے اور باجے پہ قرباں کردیا
تیرے جھوٹے کفر و ایماں کو مٹاڈالوں گا میں ہڈیاں اس کفر و ایماں کی چباڈالوں گا میں
ایک دین نو کی لکھوں گا کتاب زرفشاں ثبت ہوگا جس کی زریں جلد پر ہندوستاں

وطن کی غلامی، بے چارگی اور مغربی زنجیروں کی جھنکار نے اختر شیرانی جیسے رومانی شاعر کو بھی خوابوں کی دنیا سے جگادیا۔ اسی رومانی اور جذباتی لہجے میں بھی انھوں نے آزادی کے حصول کی آرزو کا اظہار کیا ہے:

عشق و آزادی، بہار زیست کا سامان ہے عشق میری جان، آزادی مرا ایمان ہے
عشق پر کردوں فدا میں اپنی ساری زندگی لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

قومی شاعری کے اس قافلے نے نوجوان شاعروں کو متاثر کر کے ایک ایسی کھیپ تیار کی جس نے موجودہ زمانے میں قومی و ملی شاعری کا رجحان عام کیا اور قوم کے نوجوانوں کو انقلاب برپا کرنے پر مائل کیا۔ ان میں مخدوم محی الدین، فیض، مجروح سلطان پوری، سردار جعفری، کیفی اعظمی، ساحر، جاں نثار اختر اور مجاز کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

مخدوم کی انقلابی شاعری کی دو جہتیں تھیں ایک تو ریاست حیدرآباد کی شاہی کے خلاف پڑتی تھی اور دوسری سامراجی شہنشاہیت کا راستہ کاٹنے والی تھی۔ مخدوم کی سامراج دشمنی اور انقلابی رہنمائی نے خاص طور پر حیدرآباد کے جاگیردار طبقے کو خواب غفلت سے جگایا۔ کئی روشن دماغ "نواب زادے" مخدوم کے ساتھ ہولیے۔ مخدوم چاہتے بھی یہی تھے کہ "چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو"

مخدوم کی سیاسی اور انقلابی نظمیں اس زمانے میں زبان زد عام و خاص تھیں۔ ان نظموں میں وقت کی پکار کے ساتھ شعری لطافت اور جذبات کی اُبی تھی۔ ملک کی غلامی، پستی، بدحالی، مغربی چیلوں کی ستم رانی اور ظلم و استبداد کے مختلف پہلو ان کے شعری سانچوں میں ڈھلتے رہے۔ مخدوم کی نظمیں موت کا گیت، زلف چلیپا، سپاہی، انقلاب، جنگ، مشرق اور قید ان کے سیاسی تفکر کی نشان دہی کراتی ہیں۔ مشرق میں مظلومی اور مغربی ظلم کا موازنہ کس عبرت ناک طریقے سے کیا ہے ملاحظہ ہو:

ایک ننگی نعش، بے گور و کفن، ٹھٹھری ہوئی مغربی چیلوں کا لقمہ خون میں لتھڑی ہوئی

اور پھر ایک نئے عزم کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

اس زمین موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا اک نئی دنیا، نیا آدم بنایا جائے گا

اس طرح موت کا گیت، میں مخدوم بڑے ہی جارحانہ لہجے میں دعوت انقلاب دیتے ہیں:

عرش کی آڑ میں انسان بہت کھیل چکا خون انسان سے حیوان بہت کھیل چکا
موور ہے جہاں سے سلیمان بہت کھیل چکا
وقت ہے آؤ دو عالم کو دگرگوں کردیں قلب گیتی میں تباہی کے شرارے بھردیں

"زلفِ چلیپا" میں وہ سرخ پرچم کے ساتھ ساتھ ملک کی آزادی کے لیے پرچم بغاوت بھی بلند کرتے نظر آتے ہیں:

اب کسی سینے میں روحِ شادماں گاتی نہیں زندگی کی اب کہیں بلبل نظر آتی نہیں
برہمی زلفِ چلیپا میں کبھی دیکھی نہ تھی برہمی دیکھی تھی ، ایسی برہمی دیکھی نہ تھی
پی اور اپنے ہاتھ سے پی لے کے سرمائے کا نام موت کا لبریز ساغر، عصرِ حاضر کے غلام
عزمِ آزادی سلامت ، زندگی پائندہ باد سرخ پرچم اور اونچا ہو بغاوت زندہ باد

فیض، محبت کے اور فیض محبت کے شاعر تھے۔ تاہم ملک جو آزادی کی جنگ کے دہانے پر کھڑا تھا اس لمحہ نازک سے وہ بھی بے خبر نہ ان کی نظموں: چند روز اور مری جان، اے دلِ بے تاب ٹھہر، لوح و قلم، ترانہ، نثار میں تری گلیوں کے، مجھ سے پہلی سی محبت مرے نہ مانگ اور سیاسی لیڈر کے نام، میں ملک کے چاروں طرف بکھری ہوئی شب و روز کی جنگ اور قوم کی طرزِ فغاں سنائی دیتی ہے۔ ان میں فیض کا لہجہ تیکھا اور نرا مجاہدِ آزادی کا نہیں بلکہ غم دوراں کو غمِ جاناں میں مدغم کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ نظموں کے علاوہ ان کی میں بھی ایسے استعارے مل جاتے ہیں جن سے ہندستان اور فرنگیوں کے ربط کی زنجیریں ٹوٹتی محسوس ہوتی ہیں۔

ترقی پسند شاعروں میں اس موضوع پر سب سے زیادہ کھل کر اور بے باکی سے علی سردار جعفری نے اپنے جذبات و خیالات کا کیا ہے۔ سردار جعفری نے سیاست کو اپنی شاعری میں اس قدر سمو لیا ہے کہ ان کی شاعری بیسویں صدی میں جد و جہد آزادی کی عصری تار: ہندستانی سیاست کا دستاویز بن گئی ہے۔ یہاں نمونتاً صرف چند نظموں سے اقتباسات پیش ہیں جن میں آزادی کے خوش آئند خواب ہیں، بیداری ہے، دعوتِ انقلاب ہے اور سامراجی تسلط کی شدت سے مذمت بھی ہے:

دیدنی اہلِ شہر کا ہے شکوہ گولیاں روکتے ہیں سینوں پر
لب پہ نعرہ ، نگہہ میں عزمِ جہاد حریت ضوفگن جبینوں پر
اٹھو ہند کے باغ بانو اٹھو اٹھو انقلابی جوانو اٹھو
اٹھو کھل گیا پرچمِ انقلاب نکلتا ہے جس طرح سے آفتاب
غلامی کی زنجیر کو توڑ دو زمانے کی رفتار کو موڑ دو

سردار جعفری جب بھی اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں ان کا لہجہ شدید جذباتی اور پرزور ہوتا ہے:

دُور ہو اے شہنشاہیت کے جذام
جاگ ہندستاں کے غلام
انتقام ، انتقام ، انتقام

کیفی کے یہاں بھی مخدوم اور سردار جعفری کا سا جوش ہے۔ سردار جعفری نے انقلاب آزادیِ ہند کو عالمی انقلاب کے پس منظر میں بھی اور کھا ہے۔ کیفی اعظمی نے ملکی سیاست کے مختلف پہلوؤں کو اپنے کلام میں نمایاں مقام دیا ہے۔ بازار سے نکلے کر تاریخ برطانیہ کا ناانصافی کو انھوں نے ایک عام ہندستانی کی نظر سے دیکھا اور موضوعِ سخن بنایا ہے:

ناکے ناکے پہ ہے پولس کا راج ہو چکی ہے گلی گلی
جیپ ہر موڑ سے گزرتی ہے ہر طرف فوج گشت کرتی

لٹنے ہی والا ہے دم بھر میں حکومت کا سہاگ   لگنے ہی والی ہے جیلوں ، دفتروں ، تھانوں میں آگ
اس انتشارِ چمن کی سوگند، بابِ زنداں ہلا کے اٹھنا   گلے کا طوق آر ہے قدم پر ، کچھ اس طرح تلملا کے اٹھنا
نفاق و غفلت کی آڑ لے کے جیے گا مردہ نظام کب تک   رہیں گے ہندی اسیر کب تک رہے گا بھارت غلام کب تک
سہے گا بھارت ستم کہاں تک عوام اٹھائیں گے ناز کب تک   گلا دبائے گا حریت کا تمہارا دستِ دراز کب تک
سبھاؤں کو توڑنے کچلنے کی ہوگی یہ ساز باز کب تک   اڑیں گے بپھری فضا میں لے کر تمھیں ہوئی جہاز کب تک

بیت اور سرمایہ داری نظام دونوں کو ساحر نے اپنی شاعری میں اس طرح ہم آہنگ کر دیا ہے جیسے یہ دونوں علاحدہ موضوعات نہیں بلکہ لک کا ایک ہی مسئلہ ہے اور دونوں سے نجات پانا برحق ہے:

اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جواں   اونچے ہوٹل کے درِ خاص پہ استادہ ہیں
اور نیچے مرے مجبور وطن کی گلیاں   خون میں سینکڑوں سالوں کی غلامی کا جمود
کاش یہ اپنے لیے آپ صف آرا ہوتے   اپنی تکلیف کا خود آپ مداوا کرتے
مرے سرکش ترانوں کی حقیقت ہے تو اتنی ہے   کہ جب میں دیکھتا ہوں بھوک کے مارے کسانوں کو
حکومت کے تشدد کو ، امارت کے تکبر کو   کسی کے چیتھڑوں کو اور شہنشاہی خزانوں کو
تو دلِ تابِ نشاطِ بزمِ عشرت لا نہیں سکتا   میں چاہوں بھی تو خواب آور ترانے گا نہیں سکتا

ساحر فیض کی طرح عشقیہ اشعار میں سیاسی فضا پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اپنے سیاسی کلام میں ساحر نے زندگی کے چھوٹے تجربات کو بھی بڑی ایمانیت کے ساتھ پیش کیا ہے:

ہمارے عہد کی تہذیب میں قبا ہی نہیں   اگر قبا ہو تو بندِ قبا کی بات کریں
ہے جنھیں سب سے زیادہ دعوئے حبِ وطن   آج ان کی وجہ سے حبِ وطن رسوا تو ہے

وحشتِ دل، سے ذرا نجات ملتی ہے تو توپ و تفنگ اور زنجیر و سلاسل کی جھنکار سے وہ بھی تڑپ اٹھتے ہیں۔ قوم کی بے حسی اور بدحالی سی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھتے ہیں:

کوئی بتائے عظمتِ خاکِ وطن کہاں ہے اب   کوئی بتائے عزتِ اہلِ وطن کو کیا ہوا

ستان میں عورتوں کی پسماندگی، جہالت اور ان پر سماجی جکڑبندی پر بہت سے شاعروں نے آواز اٹھائی ہے لیکن ملکی اور قومی سلامتی اور کے مفاد کے لیے عورت کے راست تعاون کی ضرورت کو بہت کم لوگوں نے محسوس کیا۔ مجاز نے سب سے پہلے اس کی طرف توجہ کی اور

سنانیں کھینچ لی ہیں سرپھرے باغی جوانوں نے   تو سامانِ جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن   تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

ور پر سیاسی غزلیں پختگی اور واقعات کی کھتاؤنی معلوم ہوتی ہیں۔ مجروح سلطان پوری نے سیاسی اور سماجی موضوعات کو بڑی کامیابی سے غزل کے پیرائے میں ڈھال دیا ہے۔ غزل کو نئے مضامین دیے اور اس کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کیا۔ ان کے احساس کی شدت نے وقتی ح یعنی سلسلہ، دار و رسن کو رمز و کنایے سے کام لے کر جمالِ صنم اور اس کی زلفوں کے خم سے ملا دیا۔ اس طرح کہ نوائے وقت، نوائے

جاوداں معلوم ہوتی ہے:

نوائے جاوداں مجروح جس میں روح ساعت ہو | کہا کس نے مرا نغمہ زمانے کے چلن تک ہے
ہزاروں ماہتاب آئے ہزاروں آفتاب آئے | مگر ہم دم وہی ہے ظلمتِ غم خانہ برسوں سے
غلام رہ چکے ، توڑیں یہ بند رسوائی | خود اپنے بازوئے محنت کا احترام کریں
ستم کو سرنگوں ظالم کو رسوا ہم بھی دیکھیں گے | چل اے عزم بغاوت چل تماشا ہم بھی دیکھیں گے

جاں نثار اختر بنیادی طور پر طاؤس و رباب کے شاعر ہیں۔ اس کے باوجود وقت پڑنے پر شمشیر و سناں بھی اٹھا لیتے ہیں۔ ان کی اور سماجی بصیرت تیز ہے۔ اختر نے سیاسی موضوعات پر کئی نظمیں لکھیں۔ نوائے وقت، آج اور کل، میں ان کے گیت گاتا ہوں، اے اہل مسافر کارواں اور ہم رہانِ قافلہ، ان کے سیاسی فکر کی عمدہ ترجمان ہیں۔

بچوں کے لیے جاں نثار اختر نے ایک نظم سچ سچ کی کہانی لکھی جس میں بچوں کی ذہنی تربیت اور ان میں سیاسی شعور پیدا کرنے کے مغرب کی ملوکیت، بربریت اور ہند دشمنی کی کہانی سادہ الفاظ میں بیان کی ہے:

جگ میں پھرتا ایک لٹیرا ملکوں ملکوں ڈالے ڈیرا
خود کو سب کا راجا کہتا سات سمندر پار ہے رہتا
شہروں شہروں آگ لگاتا بھاری گولے آن گراتا
پھولوں کی مسکان کا دشمن بچوں کی تو جان کا دشمن

۱۹۴۷ء کے قریب قریب جب فرنگیوں کا سورج ہندستانیوں کے آہوں کے دھویں سے گہنانے لگا اور مغرب میں ڈوبنے والے کے افق پر ہندستانیوں کا خون رنگ لانے لگا تو رام پرشاد بسمل کا گیت اپنے پورے اعتماد کے ساتھ گونج اٹھا، بچے بچے کی زبان پر یہی نغمہ

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے | دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

تاجرانِ طوق و سلاسل چلے گئے، صبح آزادی کا سورج طلوع ہوا، سکندر علی وجد نے کہا:

دامانِ چاک ، اشکِ مسرت سے تر ہے آج | دو سو برس کے بعد طلوعِ سحر ہے آج

اس کے بعد کیا ہوا اور کیا نہ ہوا۔ اردو شاعری لہو کی وہ رنگین داستان بھی سناتی ہے۔ سرفروش اور بے لوث رہنماؤں کی کھیپ ختم ہوئی۔ کی آن بان اور شان پر مٹنے والے مٹ گئے۔ اب صرف کرسی کا جھگڑا رہ گیا۔ ہماری شاعری اس ذکر سے بھی خالی نہیں۔

اردو شاعری کے ابتدائی دور میں وطن کا تصور محدود تھا، زندگی پیچیدہ نہیں تھی۔ اس وقت کے شاعروں نے اس لیے صرف کے گیت گائے، امن و امان اور وطن کی خوش حالی کی تمنا کی۔ جیسے جیسے مادی، سیاسی اور سماجی نظام میں تبدیلیاں ہونے لگیں ویسے و شاعروں نے اس دور کے انقلابی نتائج کا محدود وطنیت ہی کے پس منظر میں تجزیہ کیا اور سماجی اور شخصی زندگی میں ان کی نشان دہی کی، جس بہترین نمونے ہمیں پہلی جنگِ آزادی سے قبل اور بعد کی شاعری میں بھی مل جاتے ہیں۔

بیسویں صدی کے دوسرے دہے میں عالم گیر پیمانے پر معاشرتی نظام کی شکست و ریخت اور سماجی زندگی میں فرد کی بڑھتی ہوئی اہم کی وجہ سے عالمی ادب میں تغیرات نمودار ہونے لگے جن کے اثر سے ہمارا ادب بھی دوسرے ادوار کے ادب سے ممیز اور ممتاز ہونے لگا۔

"اپنے ماحول کے ساتھ میرا تعلق ہی میرا شعور ہے" مارکس کے اس قول کے مطابق ہمارے خارجی اور مادی اسباب و حالات کے۔

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

(۰ ۵ ۵۱)

پروفیسر محمد انورالدین

جدوجہدِ آزادی میں اردو صحافت کا حصہ

ہندستان کی جدوجہد آزادی میں اردو صحافت ایک ٹھوس اور وقیع کردار کی حامل ہے جس کی اہمیت اور عظمت سے کوئی حقیقت پسند انکار نہیں کرسکتا ۔ جدوجہد آزادی کے آغاز سے کچھ ہی پہلے اردو صحافت کا آغاز ہوا اور آزادی کی جاں گسل اور روح فرسا لڑائی کے دوران اردو صحافت نے نشوونما اور ارتقا کی منزلیں طے کیں ۔ اگر معرکہ ۔ سرنگاپٹنم سے قطع نظر کرتے ہوئے ۔ ۱۸۵۷ء کے فوجی انقلاب کو ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی مانا جائے تو اس وقت سے لے کر ۱۹۴۷ء تک سیکڑوں اردو اخبار جاری ہوئے جنھوں نے اپنے اپنے حلقے میں اپنے اپنے انداز سے جدوجہد آزادی میں اپنا حصہ ادا کیا ۔ اس مقالے میں ان تمام اردو اخبارات کے کارناموں کا احاطہ ممکن نہیں ہے اس لیے صرف چند اہم اور نمائندہ اخبارات کے کارناموں پر روشنی ڈالی جائے گی ۔

دہلی اردو اخبار اس کے موسس مولوی محمد باقر تھے ۔ اس کا اجرا ۱۸۳۶ء میں ہوا ۔ ابتدا میں اس کا نام "دہلی اخبار" تھا بعد میں انھوں نے اس کا نام بدل کر "دہلی اردو اخبار" کردیا ۔ مولوی محمد باقر دلی کی عالم و فاضل شخصیت تھے اور دلی کالج کے مدرس تھے بعد میں مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے ۔ شیخ ابراہیم ذوق سے گہرے تعلقات کی بنا پر انھیں شاہی دربار میں رسائی حاصل تھی ۔ اس تعلق سے امداد صابری اپنی کتاب "تاریخ صحافت اردو" میں یوں رقم طراز ہیں "۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران مولوی محمد باقر بہادر شاہ ظفر کے مشیروں میں شامل تھے (۱) ۔

مولوی محمد باقر جنگِ آزادی کے دوران اپنے اخبار میں بہ بانگِ دہل ہندستانیوں کی حمایت اور انگریزوں کے خلاف لکھا کرتے تھے دہلی اردو اخبار میں دلی کی مجلسی ۔ سیاسی اور تمدنی زندگی کے احوال و کوائف شائع کیے جاتے تھے اس میں صفحہ اول پر دو مستقل عنوان ہوتے تھے ۔ ایک حضورِ والا اور دوسرا صاحبِ کلاں ۔

حضورِ والا عنوان کے تحت بادشاہ دہلی کے شغل و اشغال اور قلعہ معلی کے واقعات درج کیے جاتے تھے اور صاحب کلاں عنوان کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران ۔ گورنر اور دربار کے حالات شائع کیے جاتے تھے ۔ اس میں گاہے بہ گاہے انگریزی عملے کی بدعنوانیوں ۔ پولیس کی نااہلی اور اسی طرح دیگر عنوانات کے تحت سیاسی انتشار اور بے چینی کو ظاہر کیا جاتا تھا ۔ اس کے علاوہ ہندستان میں فرقہ وارانہ منافرت کو ہوا دینے کی انگریزی کارگزاریوں کو برملا طور پر ہدف تنقید بنایا جاتا تھا ۔ جنگِ آزادی کے دوران یہ اخبار انقلابیوں کے حوصلے بڑھانے میں پیش پیش تھا لیکن شومیِ قسمت سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کامیابی کی منزل سے ہم کنار نہ ہوسکی ۔ ۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء میں دلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا ۔ اس کے بعد مولوی محمد باقر کو انگریز پرنسپل ٹیلر کو پناہ نہ دینے کی پاداش میں گولی ماردی گئی ۔ ایک طرح

سے انھیں اردو کا اولین شہید صحافی کہا جاسکتا ہے ۔

دلی اردو اخبار کے معاصر اخباروں میں صادق الاخبار بھی اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس نے بھی نہایت جراءت کے ساتھ انقلابیوں کی تائید کی۔ اس کے مالک و مدیر سید جمیل الدین خاں تھے جنھوں نے ۱۸۵۴ء میں اسے جاری کیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران یہ نہایت مقبول تھا۔ جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد اس کے ایڈیٹر مولوی جمیل الدین کو تین سال قید کی سزا دی گئی اور ان کی املاک قرق کرلی گئیں۔

صادق الاخبار کے علاوہ دلی سے شائع ہونے والے دیگر اردو اخباروں مثلاً خلاصتہ الاخبار وغیرہ نے بھی ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں انقلابیوں کی برملا تائید اور حمایت کی۔

دلی کے علاوہ ہندستان کے دیگر شہروں سے شائع ہونے والے اخباروں نے بھی انگریزوں کے مظالم کے خلاف کھلی تنقید کی اور ان کی حکمرانی کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کرنے میں اہم حصہ لیا۔ ان میں لاہور سے شائع ہونے والا اخبار "کوہِ نور" اس اعتبار سے اہم ہے کہ یہ شمالی ہند کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار تھا۔ اس کے بانی منشی ہرسکھ رائے تھے جنھوں نے ۱۴ جنوری ۱۸۵۰ء میں اسے جاری کیا۔ ۱۸۵۹ء کے دوران اس اخبار نے اپنے ادارتی تبصروں میں نظم و نسق کی خرابی، حکام کی بددیانتی، اقرباپروری، دفتری تاخیر جیسی برائیوں پر شدید نکتہ چینی کی۔ پنجاب کے دیگر اخبارات میں سیالکوٹ سے شائع ہونے والے اخبار چشمہ فیض کو بالجبر لاہور منتقل کیاگیا اور اس پر سخت سنسر شپ عاید کرائی گئی۔ اسی طرح ملتان کے ریاض الاخبار کو بھی اولاً سنسر کا پابند کیاگیا پھر اس کا پریس ضبط کرلیاگیا۔ ان اخبارات کا قصور یہ تھا کہ وہ کمپنی بہادر کے مفادات کے خلاف لکھتے تھے۔ دلی اور لاہور کے اردو اخبارات کی طرح لکھنؤ سے شائع ہونے والے اردو اخبارات طلسم لکھنؤ اور سحر سامری نے بھی انگریزی سامراج کے خلاف غم و غصہ کے جذبات کو پھیلانے میں اہم حصہ لیا۔

جنگ آزادی کی باضابطہ ابتداء ۱۱ مئی (۲) ۱۸۵۷ء سے ہوئی لیکن اس دور کے اردو اخبارات میں سیاسی ہلچل اور ہنگاموں کا اظہار سال ڈیڑھ سال قبل ہی سے شروع ہوگیاتھا۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی جنگ آزادی شروع ہوتی تھی کہ بعض انگریزی اخبارات نے دیسی اخباروں کی "اشتعال انگیزی" کے خلاف حکومت کو متوجہ کرنے کی مہم شروع کی تھی۔ اس سلسلے میں لاہور کے انگریزی ہفت روزہ "دی پنجاب" کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ بہت سے دیسی اخبار ہماری فوج کے دیسی سپاہیوں میں بانٹے جاتے ہیں ــــ لیکن جب کوئی دیسی اخبار مذہبی جذبے سے سرشار ہوتا ہے تو اس کی نوعیت بدتر ہوجاتی ہے ــــ ہم ایسا لکھنے پر اس لیے مجبور ہوتے ہیں کہ ہماری توجہ لکھنؤ کے ایک ایسے دیسی اخبار کی طرف دلائی گئی ہے جو ہماری فوج میں پڑھا جاتا ہے اور اس نے بیرک پور کے ہنگاموں کی خبریں اس انداز سے پیش کی ہیں جن سے شرارت کا امکان ہے۔" (۳)

۱۸۵۷ء کی جنگ کا آغاز ہوا تو ہندستان کے گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے اخبارات کی آزادی سلب کرنے کے مقصد سے وہ صحافتی

ں نافذ کیا جسے Gagging Act قانون زباں بندی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ اس نے اس قانون کے نفاذ کی جو وجہات بیان کی ان سے انگریزی راج کے خلاف اردو صحافت کی جدوجہد پر روشنی پڑتی ہے ۔ وہ کہتا ہے "دیسی اخباروں نے خبریں مہیا کرنے کی آڑ یسی باشندوں میں بغاوت کے جذبات پیدا کیے اور یہ کام نہایت مستعدی ، چالاکی اور عیاری کے ساتھ کیا گیا" ۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں اردو اخبارات خصوصاً دلی کے اخباروں کے کردار پر فوجی عدالت کے وکیل استغاثہ میجر ایف ۔جے ٹ Major F.J. Harriot کے بیان سے بھی بھرپور روشنی پڑتی ہے ۔ وہ کہتا ہے "۱۸۵۷ء کا انقلاب جن وجوہ کی بنا پر ہوا میں قلعہ ۔ محل اور صحافت کے درمیان سازش بھی کارفرما تھی ۔ انقلاب سے پہلے کے اخباری اقتباسات کا حوالہ دیتے ہوئے وکیلِ اشہ نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اخبارات نے آنے والے انقلاب کے لیے زمین تیار کی "(۴)۔

اردو اخبارات نے ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اسی لیے اس جدوجہد کی ناکامی کے بعد سب سے زیادہ بھی وہی ہوئے ۔ قانونِ زباں بندی کے تحت زیادہ تر کارروائی فارسی اور اردو اخبارات کے خلاف ہوئی ۔اس انقلاب نے مسلمانوں اصحافت سے بے دخل کردیا۔ چناں چہ اس تعلق سے مشہور صحافی نٹ راجن لکھتا ہے :

> "انقلاب برپا ہوتے ہی شمال مغربی صوبہ جات کے زیادہ تر اردو اخبارات بند ہوگئے ۔" وہ آگے لکھتا ہے "بہت سے اردو اخبارات بغاوت کے دوران بند ہوگئے تھے ان کی جگہ نئے اخبار نکل آئے جن کی ادارت کے فرائض ہندوؤں کے ہاتھ میں تھے ۔ " ـــ ۱۸۵۳ء میں اردو زبان کے اخبارات کی تعداد (۳۵) تھی ۔ ۱۸۵۸ء کی فہرست میں صرف (۱۲) اخبار رہ گئے ان میں چھ پچھلے اخبار تھے اور چھ نئے ۔ ان بارہ اخباروں میں صرف ایک اخبار کی ادارت کسی مسلمان کے سپرد تھی "(۵)۔

۱۸۵۷ء کے ساتھ ہی اردو صحافت کا ایک دور اختتام کو پہنچتا ہے اس دور میں اردو صحافیوں نے جنگ آزادی سے پہلے اور جنگ ا کے بعد بڑی بڑی قربانیاں دیں ۔

۱۸۵۷ء کے بعد اردو صحافت کا ایک نیا دور شروع ہوا ۔ اس دور میں ابتداً اخبارات کی روش نہایت غیر سیاسی ، محتاط اور مصلحت ۃ رہی لیکن رفتہ رفتہ وہ پھر نرم لب ولہجے میں سہی لیکن ملکی مسائل پر بھی اظہارِ خیال کرنے لگے ۔ اس دور میں جاری ہونے والا نیا اودھ اخبار ہے جو ابتدا میں ہفت روزہ تھا لیکن چند سال بعد روزنامہ بن گیا اور تقریباً نوّے برس تک جاری رہا ۔ اس کے بانی اردو کے عظیم محسن منشی نول کشور نے ۱۸۵۸ء میں اسے لکھنؤ سے جاری کیا ۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے جانشینوں نے اس کو جاری س اخبار سے بڑے بڑے شاعر ، ادیب اور انشا پرداز منسلک تھے جیسے غلام محمد خاں تپش شاگردِ غالب، پنڈت رتن ناتھ سرشار ، احمد شوکت ، عبدالحلیم شرر ۔ سید احمد علی اشہری ۔ مرزا حیرت دہلوی اور مولانا حالب دہلوی وغیرہ ۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل اپنی تصنیف تحریک امیں اردو کا حصہ میں اودھ اخبار کے مقاصد اور پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں، "اس کے اجرا کا مقصد ہندستانی ادب

کی خدمت کرنا ، تباہ کن اور ضرر رساں رسم ورواج سے قوم کو بچانا ، اصلاحی اور ادبی جماعتوں کے مقاصد کی اشاعت کرنا تھا ۔ اس لحاظ سے اخبار اپنے عہد کی ادبی ، معاشرتی اور سیاسی تاریخ کی مستند اور حقیقی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس میں بلا جھجک حکومت کے اعمال اس کی حکمت پر تنقید کی جاتی تھی " (۶)۔

۱۸۵۷ء کی مسلح بغاوت کی ناکامی کے بعد ہندستان کے اینگلو انڈین اخبارات نے اہلِ ہند بالخصوص مسلمانوں کے خلاف آ منظم مہم کا آغاز کیا اور ایسی تجاویز پیش کیں کہ مسلمانوں کو بہ زور عیسائی بنایا جائے یا انھیں جلاوطن کردیا جائے ۔ قرآنِ مجید کی طباعت ممنوع قرار دی جائے ۔ مسلمانوں پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند کردیے جائیں وغیرہ۔ اس صورتِ حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے سرسید احمد خاں میدانِ عمل میں اتر پڑے ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان پیدا شدہ خلیج کو دور کیا جائے وہ حکومت کے مزید جوروستم کا شکار ہونے سے محفوظ رہ سکیں۔

۳ مارچ ۱۸۶۶ء کو سرسید نے علی گڑھ سے اخبار سائنٹفک سوسائٹی یا علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا۔ یہ پہلے ہفت روزہ تھا سہ روزہ ہوگیا۔ اس کا ایک کالم انگریزی اور ایک کالم اردو میں ہوتا تھا۔ سر سید اس میں سیاسی مسائل پر مضامین اور شذرات لکھتے تھے سرسید سرکارِ برطانیہ کے وفادار تھے لیکن اداریوں میں کبھی کبھی بڑی بے باکی سے حکومتِ وقت کے نقائص پر نکتہ چینی کرتے تھے سرسید ملکی سیاست میں دیسی ریاستوں کے حقوق کی حفاظت کے حق میں تھے چناں چہ ریاست پٹیالہ اور ریاست حیدرآباد اور بعض ریاستوں کے حق میں اداریے لکھے اور انگریزی اخبارات کی الزام تراشیوں کا جواب دیا۔ دیسی ریاستوں کی طرح وہ دیسی صحافت کے کے بھی سرگرم حامی تھے ۔ جب کبھی انگریزی اخبارات دیسی اخبارات کے خلاف پروپگنڈہ کرتے وہ اس کا دنداں شکن جواب دیتے ۔

سرسید نے ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو تہذیب الاخلاق کے نام سے ایک اور پرچہ جاری کیا۔ اس میں ایسے مضامین شائع ہوتے تھے جن کا مقصد قوم کے اندازِ فکر کو بدلنا اور عوام کے اخلاق و کردار کو نئے سانچے میں ڈھالنا تھا۔ اس اخبار کے ذریعے سرسید نے مسلمانوں کو علوم سیکھنے کی طرف نہایت دل سوزی اور اخلاص کے ساتھ متوجہ کیا ۔ اس میں شک نہیں کہ سرسید نے اپنے دونوں پرچوں یعنی سائنٹفک سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق کے ذریعے ہندستانیوں کی بڑی خدمت کی اور ان میں ذہنی و علمی بیداری کی وہ لہر دوڑائی جس آغوش میں بے شمار مجاہدین آزادی کی تربیت و نشوونما ہوئی ۔

اس دور کا ایک اہم اخبار اودھ پنچ تھا جسے منشی سید محمد سجاد حسین نے ۱۸۷۷ء میں جاری کیا۔ منشی سجاد حسین کانگریس کے تھے لہذا اودھ پنچ بھی کانگریس اور اس کی تحریک کا مددگار اور مبلغ رہا۔ یہ ہندو مسلم اتحاد کا حامی اور حب الوطنی کا مداح تھا۔ منشی سجاد نے اپنی ذات کی طرح اسے بھی سیاسی خدمت کے لیے وقف کردیا تھا (۸)۔

اودھ پنچ ابتدا ہی سے عوامی امنگوں کی ترجمانی کرتا رہا۔ اس زمانے میں جب کہ کوئی سیاسی جماعت بالفعل موجود نہیں تھی ، اخبار نے عوام کے مسائل اور رجحانات کی نمائندگی کی۔ اس دور کے اہم مسائل جیسے الحاقِ اودھ ، انکم ٹیکس کے نفاذ اور البرٹ بل د

کے بارے میں عوام کے محسوسات حکومت تک پہنچائے۔ اودھ پنچ کا مزاج ظریفانہ تھا۔ چناں چہ اس اخبار میں طنز و مزاح کے پیرائے میں انگریز حکومت پر ایسی سخت تنقید ہوتی کہ حکام تلملا جاتے تھے لیکن اس کے خلاف کچھ کر نہ پاتے چوں کہ یہ سب مزاح کے رنگ میں ہوتا۔ اس اخبار کے خاص لکھنے والوں میں منشی سجاد حسین کے علاوہ سید محمد آزاد، جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی کسمنڈوی۔ اکبر الہ آبادی۔ پنڈت تربھون ناتھ اور مرزا مچھو بیگ ستم ظریف وغیرہ شامل تھے۔ منشی سجاد حسین نے اودھ پنچ میں بعض اربابِ اقتدار کو کھلے خطوط بھی لکھے مثلاً ملکہ وکٹوریا، گلیڈ سٹون وزیر اعظم برطانیہ وغیرہ۔ ان مکاتیب میں سیاسی مسائل سے بحث کی گئی تھی۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اودھ پنچ کے مزاحیہ حملوں اور ظریفانہ چاند ماری نے ہندستانیوں کے دل سے ۱۸۵۷ء کی دہشت انگیزی اور ہراسانی کو دور کیا اور ان کے دلوں سے گورا بہادر کا خوف بڑی حد تک دور کر دیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد سے انیسویں صدی کے اختتام تک مختلف صوبوں اور شہروں سے متعدد اردو اخبارات جاری ہوئے۔ جن کا غالب رجحان انگریز دشمنی تھا لیکن وہ اس کا اظہار اقتضائے وقت کے مطابق کبھی کھلے بندوں اور کبھی ڈھکے چھپے انداز میں کرتے۔ اس مقالے میں ان سب کا احاطہ ممکن نہیں اس لیے راقم الحروف ان سے صرف نظر کرتے ہوئے بیسویں صدی کے اہم مجلوں اور اخبارات کی طرف آتا ہے۔ اوائل بیسویں صدی کا سب سے اہم مجلہ حسرت موہانی کا اردوئے معلی ہے۔ حسرت قدرِ اول کے شاعر بھی تھے اور صفِ اول کے سیاسی رہنما بھی۔ وہ مجاہدین آزادی کی انتہا پسند جماعت سے تعلق رکھتے تھے جن میں ان کے علاوہ آرو بندو گھوش، بال گنگادھر تلک اور بپن چندر پال شامل تھے۔ اس اعتبار سے اردوئے معلی انقلابی اور سرگرم سیاست کا علم بردار تھا۔ حسرت موہانی بدیسی راج کے سخت دشمن تھے۔ وہ کامل آزادی سے کم کسی چیز پر راضی ہی نہ ہوتے تھے۔ وہ عدم تشدد کے کچھ زیادہ قائل نہ تھے۔ اپنی تقریر میں وہ کہا کرتے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دو تو آزادی ملے گی۔ کانگریس کے اجلاس میں انھوں نے تشدد پر مبنی تحریک شروع کرنے کی تجویز پیش کی (۹) لیکن یہ تجویز پاس نہ ہو سکی۔ برطانوی سامراج کے خلاف باغیانہ تحریروں کی بنا پر انھیں ۱۹۰۹ء میں دو سال قید بامشقت کی سزا اور پانسو روپیہ جرمانہ عاید کیا گیا۔ رہائی کے بعد بھی انھوں نے انگریز دشمنی کی روش ترک نہیں کی چناں چہ ایک باغیانہ مضمون کی اشاعت پر ان کے پریس سے تین ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی۔ نتیجہ میں انھیں اپنا پرچہ بند کرنا پڑا۔ مابعد زمانے میں وہ پھر قید ہوئے۔ جیل میں انھیں روزانہ ایک من گیہوں پیسنا پڑتا تھا۔ چناں چہ کہتے ہیں،

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

جیل کے دوران اذیت رسانی کا یہ عالم تھا کہ ایک طرف بیل کو اور دوسری طرف حسرت موہانی کو جوتا کر کنویں سے پانی کھنچوایا جاتا تھا۔ (۱۰)

بہ ہر حال حسرت موہانی نے اندیشہ، سود و زیاں کی پروا کیے بغیر ڈنکے کی چوٹ پر سامراجی نظام کے خلاف اپنے انقلابی خیالات

کا اظہار کیا جس کے صلے میں بالآخر انھیں اپنے کثیرالاشاعت پرچے کو بھی فنا کے گھاٹ اتارنا پڑا۔

اوائل بیسویں صدی میں جاری ہونے والا ایک اہم اخبار "زمین دار" بھی ہے۔ اس کے بانی مولوی سراج الدین احمد وظیفہ یاب پوسٹ ماسٹر تھے۔ انھوں نے جون ۱۹۰۳ء میں لاہور سے ہفت روزہ کی شکل میں زمین دار کا اجرا عمل میں لایا(۱)۔ نومبر ۱۹۰۹ء میں مو صاحب کا انتقال ہوا تو ان کے فرزند مولانا ظفر علی خاں نے اس کی ادارت سنبھالی۔ جنگ طرابلس کا آغاز ہوا تو ظفر علی خاں نے "زمین دار" کو ہفت روزہ سے روزنامہ کر دیا۔ طرابلس کی جنگ کے بعد بلقان کی جنگ چھڑ گئی جو ترکی کے خلاف تھی۔ چوں کہ ہندستانی مسلمان خلافت اسلامیہ سے روحانی وابستگی رکھتے تھے اس لیے انھیں اس جنگ کی خبروں سے بے حد دلچسپی رہتی تھی۔ "زمین دار" اس دور کا واحد اخبار تھا جو رائٹر اور اسوسی ایٹیڈ پریس آف انڈیا سے خبریں حاصل کرتا اور دنیائے اسلام کی خبریں خاص اہتمام سے شائع کرتا۔ اس کے مضمون نگاروں میں مولانا ظفر علی خاں کے علاوہ نیاز فتح پوری مولانا عبداللہ العمادی۔ مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی اور منشی وجاہت حسین جھنجھانوی جیسے مشاہیر اہلِ قلم شامل تھے۔ "زمین دار" کے بلند پایہ مقالات، خبروں کے حصول کے اعلیٰ انتظام اور ظفر علی خاں کی جذبات انگیز ولولہ خیز نظموں نے ہندستان کے عوام میں نہ صرف اخبار بینی کا ذوق بلکہ انگریزوں کی سیاست کے خلاف ایک عام شعور بھی پیدا کیا۔ "زمین دار" کی بے نظیر مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ سرحدی علاقے کے ناخواندہ پٹھان ایک آنہ دے کر یہ اخبار خرید اور مزید ایک آنہ دے کر کسی خواندہ سے پڑھ کر سنتے۔ کانپور میں جب بلدیہ کے حکم سے مچھلی بازار کی مسجد کا ایک حصہ شہید کیا گیا تو زمین دار نے قیامت مچادی۔ اس دور میں یہ پرچہ آٹھ گنا زائد قیمت دے کر خریدا جاتا تھا اور اس کی اشاعت تیس ہزار تھی۔

انگریز حکمرانوں کے نظامِ حکومت کے خلاف طوفانی حملوں نے عوام میں زمین دار کو بے نظیر مقبولیت عطا کی لیکن اس کے ساتھ حکومتِ وقت کے عتاب اور دارو گیر کا بھی شکار ہوتا رہا۔ ۱۹۱۲ء میں اس سے ایک ایک ہزار کی دو ضمانتیں طلب کی گئیں۔ دو روپے قوم نے فوراً جمع کردیے اور اخبار کو بند نہ ہونے دیا۔ اگلے سال کانپور کی مسجد کے سانحے میں حکومت نے یہ ضمانت ضبط کرلی مزید دس ہزار کی ضمانت دس دن کے اندر داخل کرنے کا حکم دیا۔ قوم نے کمالِ ایثار سے چندہ کرکے یہ ضمانت داخل کردی اور اخبار زندہ رکھا۔ انگریز حکام کے نافذ کردہ پریس ایکٹ کے خلاف برطانوی ممبران دارالعلوم سے نمائندگی کی غرض سے مولانا لندن گئے وہاں انھوں نے ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا

چار چیز است تحفہ، لندن ۔۔۔۔ خمر و خنزیر و روزنامہ و زن

اس مقالے کی اشاعت پر حکومت نے "زمین دار" کی دس ہزار کی ضمانت سوخت کرلی چھاپہ خانہ ضبط کرلیا اور مزید دس ہزار کی نئی ضمانت طلب کی۔ اس دفعہ چندہ فوری جمع نہ ہوسکا اور پرچہ عارضی طور پر بند ہوگیا۔ لیکن بعد میں پھر اسی جوش و خروش کے ساتھ جاری لیکن مولانا ظفر علی خاں کی نظر بندی اور پریس ایکٹ کی پابندیوں کے باعث ۱۹۱۵ء میں اس کی اشاعت موقوف ہوگئی۔ ۱۹۱۹ء میں مولانا ظفر علی خاں نے "زمین دار" کا احیا کیا اور پوری توانائی اور محشر خیزی کے ساتھ اسے جاری کیا لیکن تحریکِ خلافت کے آغاز میں پھر اس

ضمانت ضبط ہوگئی اور مزید پانچ ہزار روپے نئی ضمانت داخل کرنی پڑی۔ اسی دوران مولانا ظفر علی خاں پانچ سال کے لیے جیل بھیج دیے گئے۔ اس دور میں اس کی دو ہزار پانچ ہزار اور دس ہزار کی تین ضمانتیں وقفے وقفے سے ضبط ہوتی گئیں۔ ان پے در پے حادثات کے باعث اس کی اشاعت رفتہ رفتہ مائل بہ انحطاط ہوتی رہی۔

"زمین دار" کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے عوام کے دل سے انگریز حکومت کا خوف نکال دیا۔ مولانا ظفر علی خاں نے اپنی صحافیانہ زندگی میں ہزاروں روپیوں کی ضمانتیں ضبط کروائیں۔ پریس سے ہاتھ دھویا لیکن جہد و جہاد اور انگریزی راج کے خلاف حریت کی جس راہ پر وہ روز اول سے گام زن تھے اس سے سرِ مو انحراف نہیں کیا۔ بلاشبہ وہ ہندستان میں اردو صحافت کے بابائے اعظم ہی نہیں بلکہ جدوجہدِ آزادی کے سب سے بڑے صحافی قائد تھے جن کے قلم کی جنبش سے ایوانِ اقتدار میں زلزلہ پیدا ہوجاتا تھا۔

جدوجہد آزادی کے دور شباب کے اخبارات میں ہم درد، ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے موسس و مدیر مولانا محمد علی جوہر جو صف اول کے قائد، قافلہ حریت کے سالار کارواں، روشن دماغ مدبر اور شعلہ بیان مقرر تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اک حق گو اور بے باک صحافی بھی تھے۔ بہ حیثیت صحافی وہ جس بات کو حق سمجھتے اس کے بے محابا اظہار کی راہ میں کسی مصلحت کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ صحافتی اظہار کے سلسلے میں لالچ، خوف، تعزیر، قید و بند غرض خوف و رجا کے تمام حربے ان کی نظروں میں پر کاہ کی وقعت بھی نہیں رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز سامراج ان کی تحریروں سے لرزاں و ترساں اور حکومتی مشنری ان کی تنقید سے خائف رہتی تھی۔ وہ صحافت کے پیشے میں اس وقت داخل ہوئے جب کہ دیسی ریاستوں میں بڑے بڑے مناصب و عہدے ان کے منتظر تھے لیکن اس مرد مجاہد نے محلوں کی آسائش کو تیاگ کر صحافت کے خارزار میں قدم رکھا۔ پہلے انھوں نے انگریزی میں کامریڈ جاری کیا جس کا پہلا پرچہ ۱۱ جنوری ۱۹۱۱ء کو منظرعام پر آیا۔ پہلی عالمگیر جنگ کا آغاز ہوا۔ برطانوی اخبار ٹائمز نے ایک شرانگیز مضمون ترکوں کا انتخاب The Choice of Turks کے عنوان سے لکھا۔ مولانا محمد علی جوہر نے فی الفور کامریڈ میں اسی عنوان سے اس فتنہ انگیز مضمون کا منہ توڑ جواب دیا۔ انیس کالموں پر محیط ان کا یہ مدلل اور مبسوط اداریہ ۲۶ ستمبر ۱۹۱۴ء کو کامریڈ میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کے ساتھ ہی انگریز سامراج کے کاخ و ایوان میں ایک بھونچال آگیا۔ حکومت نے یہ اداریہ ضبط کرلیا اور کامریڈ پریس کی ضمانت بھی ضبط کرلی۔ مولانا محمد علی جوہر نے کامریڈ کے ساتھ ہمدرد کے اجراء کا بھی لائحہ عمل بنایا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ کامریڈ تو انگریزی خوانوں کے لیے ہوگا لیکن انگریزی سے ناواقف عوام کے لیے ایک روزنامہ اردو میں ہونا چاہیے (۲)۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے بیروت سے نسخ کا ٹائپ منگایا تھا لیکن وہ دیر سے آیا اور وہ بھی حسبِ ضرورت نہیں تھا۔ بالآخر ۲۳ فروری ۱۹۱۲ء سے ایک ایک ورقہ، پرچہ نقیب ہمدرد بن کر آنے والے ہمدرد کی نمائندگی کرنے لگا۔ بالآخر جب بیروت سے ٹائپ کا حسبِ ضرورت ساز وسامان فراہم ہوگیا تو انھوں نے ہمدرد کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اس کے ادارتی عملے میں میر محفوظ علی، سید ہاشمی فرید آبادی، قاضی عبدالغفار، شرر، مولانا جالب دہلوی اور ڈاکٹر سید احمد بعلوی جیسے علما اور اہلِ علم شامل تھے۔ ہمدرد میں عوام کے حالات، ضروریات، شکایات، تجارت، صنعت اور تعلیم کے علاوہ سیاسی موضوعات پر بڑی بے خوفی اور آزادی کے ساتھ

اظہارِ خیال کیا۔اتحاد کامریڈ کی ضبطی کے بعد مولانا محمد علی جوہر نے اپنے مشہو اداریے "ترکوں کا انتخاب" کا ترجمہ ہمدرد میں شائع کیا تو اس پر بھی حکومت کا قہر نازل ہوا۔ ۱۸ مئی ۱۹۱۵ء کو مولانا محمد علی اور ان کے برادرِ بزرگ مولانا شوکت علی نظر بند کردیے گئے اور ہمدرد پر ایسی کڑی سنسر شپ عائد کی گئی کہ اس کی اشاعت ممکن نہ ہوسکے۔ چناں چہ اگست ۱۹۱۵ء میں یہ اخبار بند ہوگیا۔ ۹ نومبر ۱۹۲۳ء کو مولانا محمد علی جوہر نے ہمدرد کا احیا کیا۔ اس دور میں مولانا کی سیاسی سرگرمیاں نصف النہار پر تھیں۔ انھوں نے ہمدرد میں سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی پر زور حمایت کی لیکن شبانہ روز کی سیاسی مصروفیات کے سبب انھیں مجبوراً ہمدرد کو مسدود کرنا پڑا۔ مولانا محمد علی کی انگریزی صحافت ان کی اردو صحافت پر غالب ہے۔ تاہم انھوں نے ہمدرد میں بھی معرکۃ الآراء مضامین لکھے جن میں نہایت جراءت کے ساتھ انگریز حکمرانوں کے ظلم و ستم ان کے مکر و فریب اور سیاسی چالوں کا پردہ چاک کیا۔ ۱۹ جنوری ۱۹۲۷ء کے ہمدرد میں انھوں نے "انگریز اور انگریزوں کی سیاست" کے عنوان سے ایک مفصل اداریہ لکھا جس میں وہ رقم طراز ہیں:

"تیس کروڑ خدا کی مخلوق یعنی نسل انسانی کا ایک خمس (پانچواں حصہ) مٹھی بھر اجنبیوں کی غلامی میں مبتلا ہے جو سات ہزار میل کے فاصلے سے سات سمندر پار آکر ان پر حکومت کرتے ہیں عجب۔ روزگار یہ چیز ہے کہ پانچ براعظموں کے تماشائی دور دراز مقامات سے آکر تاج بی بی کا روضہ اور دلی کا لال قلعہ یا قطب مینار کی جگہ اس کا تماشا کریں تو تعجب کی بات نہیں (۱۳)۔

مولانا محمد علی جوہر کے سینے میں حریت و انقلاب کا آتش فشاں دہک رہا تھا۔ اس کے بطن سے جو آواز نکلتی وہ نہ صرف عوام میں جوش و خروش کی لہر پیدا کرتی بلکہ اربابِ اقتدار کے ایوانوں پر صاعقہ بن کر گرتی۔ ان کے قلم اور زبان نے نہ صرف لوگوں کے دلوں سے انگریزوں کا خوف دور کیا بلکہ اپنا خوف انگریزوں پر بٹھایا۔ انگریز ان سے کس درجہ خائف تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ سنسرشپ کے زمانے میں انھوں نے "ہم درد" میں اداریے کی جگہ چڑیا اور چڑونٹے (کذا) کی کہانی لکھ کر سنسر کے پاس بھیجی تو اس نے اسے بھی شائع کرنے کی اجازت نہ دی۔ جب پوچھا گیا کہ یہ کہانی تو بے ضرر ہے اسے پاس نہ کرنے کے کیا معنی تو سنسر کے عہدہ دار نے جواب دیا۔ "ہم درد" والوں کا کیا اعتبار ممکن ہے اس میں بھی کوئی زہر بھر دیا ہو (۱۴)۔

تاریخِ جدوجہد آزادی اور اردو صحافت کی تاریخ میں جو اخبار ایک Legend کی سی حیثیت رکھتا ہے وہ الہلال ہے۔ اس کے بانی و مدیر مولانا ابوالکلام آزاد جو متبحر عالم، سحر طراز خطیب، بلند پایہ ادیب اور بے باک صحافی تھے۔ الہلال کا اجرا ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو عمل میں آیا۔ یہ ہفت روزہ تھا اور کلکتے سے شائع ہوتا تھا۔ الہلال ظاہری اور معنوی دونوں اعتبار سے انقلابی حیثیت کا حامل تھا۔ آزاد نے اس کے ذریعے حکومتِ برطانیہ کے جبر و استبداد کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور عوامی بیداری کے لیے جرس کا کام کیا۔ حکومت کے خلاف تلخ و تند مقالات لکھنے کی پاداش میں ۱۶ نومبر ۱۹۱۴ء کو حکومت نے الہلال پریس کی دو ہزار روپے کی ضمانت ضبط کرلی اور دس ہزار روپے کی مزید ضمانت طلب کی۔ جس کی پابجائی نہ ہوسکی اور نومبر ۱۹۱۴ء میں الہلال کی اشاعت مسدود ہوگئی۔ اس کے اگلے سال مولانا نے البلاغ جاری کیا

جو ہفتہ وار پرچہ تھا لیکن مولانا کی گرفتاری کی وجہ سے یہ بھی بند ہو گیا۔ ۱۹۲۷ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کی تجدید اشاعت لیکن ان کی ہمہ وقتی سیاسی سرگرمیوں کے سبب یہ چھ ماہ سے زیادہ نہ چل سکا۔

مولانا آزاد ایک جید عالم اور دور اندیش سیاست داں تھے۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے علم و فضل کا دریا بہا دیتے۔ الہلال ان کی جلالی، تبحرِ علمی اور ذہنی شباب کا مظہر تھا۔ مولانا کی صحافت میں قیادت اور خطابت کا عنصر غالب ہے۔ ان کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک حکیمِ دانش علم کی چوٹی پر کھڑا ہو کر خلوص اور صداقت کے ساتھ سوتوں کو جگا رہا ہے اور ظلم کے خلاف سینہ سپر ہونے کی دعوت دے رہا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اردو صحافت میں مولانا آزاد کے اس داعیانہ انداز کا تجزیہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"ابوالکلام آزاد نے ان سے (مسلمانوں سے) ایک نئی زبان میں خطاب کیا۔ صرف ان کے خیالات اور نقطہ نظر میں ہی جدت نہ تھی بلکہ ان کی تحریر کا رنگ بھی نیا تھا۔ یہ ایک ایسا اندازِ تخاطب تھا جس سے ہندوستانی مسلمان آشنا نہ تھے۔ وہ علی گڑھ کی قیادت کے محتاط لب و لہجے سے واقف تھے اور سرسید محسن الملک اور نذیر احمد اور حالی کے اندازِ بیان کے علاوہ ہوا کا کوئی زیادہ گرم جھونکا ان تک پہنچا ہی نہ تھا۔ الہلال مسلمانوں کے کسی مکتبِ خیال سے متفق نہ تھا۔ وہ ایک نئی دعوت اپنے ہم وطنوں کو دے رہا تھا(۵)۔

مختصر یہ کہ الہلال کے سخت اداریوں اور مولانا کی بے باک تحریروں سے چراغ پا ہو کر الہ آباد کا انگریزی اخبار پائنیر Pioneer لکھا: "حیرانی ہے کہ حکومت ان تحریروں کو کس طرح برداشت کر رہی ہے" (۶)۔

الہلال میں مولانا آزاد نے بلند پایہ علمی و فکری مضامین کے علاوہ درپیش سیاسی و سماجی حالات و واقعات پر بھی کھل کر اظہار کرتے تھے۔ وہ قومی اور بین الاقوامی مسائل پر بحث کرتے اور کسی بھی مسئلے میں عزیمت و استقامت سے منہ نہ موڑتے خواہ اس نتائج کچھ ہی برآمد ہوں۔

مولانا آزاد نے اپنے اخبار میں "زمین دار" کی ضمانت، اصلاح ندوہ کی بحث، مسجد کانپور، علی گڑھ یونیورسٹی کا مسئلہ، [illegible] صحافت، جنگِ بلقان غرض ہر موضوع پر لکھا اور بغیر کسی رعایت اور مصلحت کے لکھا۔ ان کے بلند آہنگ اسلوب، داعیانہ [illegible] اور جذبہ کی صداقت نے الہلال کے ہر شمارے کو قوت اور توانائی کا مبدا بنا دیا تھا جس سے ساری قوم میں جلال و خروش اور حرکت و عمل کی نئی لہریں پیدا ہوتی تھیں۔

الہلال نے ایک طرف تو انگریز سامراج کے جبر و استحصال کا پردہ چاک کیا اور قوم کو غلامی کی لعنت سے نجات [illegible] دوسری طرف ہندو مسلم [illegible] کے لیے بھی گرانقدر خدمت انجام دی۔

[illegible]

غرض یہ کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں الہلال نے ہماری تحریک آزادی میں ایک مشعل بردار کا رول ادا کیا جس کی روشنی میں آزادی کے متلاشی کو اپنی راہ متعین کرنے میں آسانی ہوئی۔

حوالے :

(۱) امداد صابری "تاریخ صحافت اردو" (جلد اول) ص ص ۱۵۸ - ۱۶۸

(۲) بعض مورخین نے ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء لکھا ہے

(۳) تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند (آٹھویں جلد) اردو ادب سوم) لاہور ص ص ۳۳۸ - ۳۳۹

(۴) بہ حوالہ صحافت پاکستان و ہند ص ۹۲

(۵) ایضاً ص ۹۰

(۶) عقیل، ڈاکٹر معین الدین۔ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ۔ کراچی ۱۹۷۶ء ص ۴۵۳

(۷) بہ حوالہ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر۔ صحافت پاکستان و ہند میں۔ لاہور ص ۱۱۰

(۸) بہ حوالہ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ۔ کراچی ۱۹۷۶ء ص ۴۶۳

(۹) جمنا داس اختر، "جنگ آزادی میں اردو صحافت کا حصہ"۔ ماہنامہ آجکل (دہلی) نومبر دسمبر ۱۹۸۳ء ص ۳۷

(۱۰) ایضاً

(۱۱) بہ حوالہ صحافت پاکستان و ہند میں ص ۱۸۳

(۱۲) بہ حوالہ مسکین حجازی، ادارہ نویسی، لاہور ۱۹۸۶ء ص ۳۲۵

(۱۳) بہ حوالہ ادارہ نویسی ص ۳۵۲

(۱۴) ایضاً ص ۳۶

(۱۵) ایضاً ص ۳۵۱، ۳۶۷

(۱۶) ایضاً ص ۳۵۳

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۳۳ سے)
ہماری ذہنی اور داخلی زندگی بھی نئے فکر اور شعور کے سانچے میں ڈھلنے لگی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہمارے ادیب اور شاعر، سیاسی اور [illegible] نظام اور [illegible] مسائل پر بیک وقت مصروف رہے۔ اس کے نتیجے میں ایک بھرپور [illegible] کی تحریری [illegible] کا ایک [illegible] شعری سرمائے میں نظر آتا ہے جس سے ۱۹۴۷ء کے بعد کا ادب بھی خالی نہیں۔

یوسف میخائلوچ اُرانسکی

تلخیص و ترجمہ : اُسامہ فاروقی

حصاری پریا کی لوک کہانیاں اور زبان (وسط ایشیا)

ماسکو ۱۹۷۷ء

کتاب کا تعارف

تاجکستان کی وادیِ حصار میں آباد ہندی الاصل قوم پریا کی زبان کا روسی اسکالر اُرانسکی (۱۹۲۳ - ۱۹۸۸ء) نے ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے دہوں میں بہت گہرائی سے مطالعہ کیا۔ زیرِ نظر کتاب جس کی تلخیص ذیل میں پیش کی جارہی ہے مرحوم مصنف کی سال ہا سال کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ کتاب میں پریا لوگوں کے بارے میں ضروری معلومات دی گئی ہیں، ان کی زبان کی صوتیات، صرف و نحو اور لفظیات کا تجزیہ دیگر جدید ہند آریائی زبانوں کے تناظر میں کیا گیا ہے۔ ان کی لوک کہانیوں اور مختلف موضوعات پر گفتگو کے نمونے بین الاقوامی صوتی رسم الخط میں چند زاید علامتوں کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ (یہ مواد ٹیپ پر بھی ریکارڈ کیا گیا ہے جو پیٹرزبرگ یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہے)۔ کتاب میں ان لوک کہانیوں اور مکالمات کا روسی ترجمہ فراہم کیا گیا ہے اور کتاب کے آخر میں اس مواد میں مستعمل تمام پریا الفاظ کی فرہنگ شامل کی گئی ہے۔ فرہنگ بہت جامع طریقے سے مرتب کی گئی ہے۔ ہر لفظ کے مختلف سیاق و سباق میں مختلف مفاہیم کی صراحت کی گئی ہے، صرفی و نحوی اعتبار سے اس کی مختلف شکلیں پیش کی گئی ہیں۔ ہر جگہ متن اور متن کے اندر اس جملے کے اعداد و ترتیب کی جس میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے نیز کتاب کے اس پیراگراف نمبر کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں الفاظ کی وضاحت کی گئی ہے۔ تمام الفاظ کے ماخذ اور جدید ہند آریائی زبانوں میں ان کے مماثل الفاظ کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔

یہاں ہم کتاب کے مذکورہ مباحث کی محض تلخیص پیش کر رہے ہیں لیکن کوشش یہ رہے گی کہ کوئی اہم نکتہ چھوٹنے نہ پائے۔ لوک کہانیاں اور مکالمے تقریباً سبھی پیش کیے جائیں گے۔ فی الحال بین الاقوامی صوتی رسم الخط میں، لیکن ماہرینِ لسانیات سے ضروری مشورے کے بعد، وقت ملنے پر، انھیں اردو رسم الخط میں پیش کرنے کی بھی کوشش کی جائے گی۔ ان کہانیوں اور مکالموں کا اردو ترجمہ پیش کیا جائے گا۔ کوشش یہ رہے گی کہ ترجمہ اصل سے جہاں تک ہوسکے قریب ہو تاکہ مکالموں کی ساخت کو سمجھنے کے لیے اس کا بھی کام لیا جاسکے۔

اس مضمون کے ترجمے میں مستعمل اصطلاحات پر زبان انگریزی عربی اور خیر کسی کے مختلف ابواب اور رسائل میں موجود

جاسکے ہیں گو کہ مصنفِ کتاب کا خیال ہے کہ ان مضامین میں اصل روسی متن کو سمجھنے میں کچھ غلطیاں بھی ہوئی ہیں ۔ میرے دوست اور پرانے رفیق کار پروفیسر ہیم چندر پانڈے (جواہر لال نہرو یونیورسٹی ، نئی دہلی) کی اطلاع کے بہ موجب ہندی میں اس موضوع پر تیس سال قبل بھولا ناتھ تیواری کی کتاب " تاج ازبیکی " کے عنوان سے شائع ہوئی ہے ۔ اردو داں قارئین کے سامنے میری دانست میں اس موضوع پر اب تک شاید ہی کوئی مواد سامنے آیا ہو ۔ جدید ہند آریائی زبانوں سے زبانِ پریا کی مماثلت کے پیشِ نظر امید ہے کہ کتاب دل چسپی سے پڑھی جائے گی ۔ خاص طور سے اس لیے کہ قارئینِ " سب رس " کی نظریں جا بہ جا اس زبان اور دکھنی کی مماثلت کو بھی بہ آسانی تاڑ جائیں گی ۔

- مترجم

ooo

دیباچہ

پریا گروہ کے بارے میں عام معلومات

تاجکستان کے وسط میں واقعِ وادیِ حصار کے تقریباً سبھی علاقوں اور ان سے ملحق ازبکستان کے بعض علاقوں میں ہند آریائی زبان بولنے والوں کا ایک گروہ آباد ہے ۔ تاجک ان کو افغانان ، افغانانِ سیاہ رو ، افغانانِ سیہ پوست اور افغانانِ ناس فروش کا نام دیتے ہیں اور یہ لوگ خود اپنے آپ کو پریا کہتے ہیں ۔ یہ لوگ مختلف ذیلی گروہوں یا جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں قوموں میں بٹے ہوئے ہیں جن کے نام کالو ، جیتن ، جونی ، مگرا ، بسیان اور مصلی ہیں ۔ شویا نام بھی سننے میں آیا ہے ۔ گو کہ اس " قوم " کے نمائندوں کا ۱۹۳۰ء کے دہے کے بعد سے وسطِ ایشیا میں کہیں سراغ نہیں ملتا ۔

پریا براہ افغانستان وسطی ایشیا میں آکر بسنے والا ہند آریائی زبان بولنے والا واحد گروہ نہیں ہے ۔ جغرافیائی صورتِ حال اور آمو دریا (جیحون) کے داہنے اور بائیں کناروں کے علاقوں کی تاریخی اور ثقافتی یکسانیت زمانہ ، قدیم ہی سے تجارتی اور ثقافتی تعلقات کی استواری کے لیے سازگار اور آبادی کے مختلف گروہوں کے ادھر سے ادھر نقلِ مکان کے لیے سہولت بخش تھی ۔ ان میں غربت ، افلاس اور جرم و تشدد کے مارے ہوئے یا دوسری کسی وجہ سے دریائے جیحون کے بائیں کنارے سے وسطی ایشیا کو منتقل ہونے والے مختلف چھوٹے نسلی گروہ بھی شامل تھے ۔ ایسے ہند آریائی زبانیں بولنے والے گروہوں میں سے ایک " بلوچی " کے نام سے معروف ہے جسے ایک روسی اسکالر ولکنس نے ۱۸۸۰ء کے دہے میں فرغانہ اور تاشقند میں دریافت کیا تھا ۔ ولکنس کی معلومات کے مطابق دریائے سندھ کی وادی اور بلوچستان سے " بلوچیوں " کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کے وسطی ایشیا میں نقلِ مکان کا عمل ۱۸۸۰ء کے دہے میں بھی جاری تھا اور یہ گروہ وہاں لازمی طور سے بہ راہِ افغانستان ہی پہنچے تھے ۔ اس کے باوجود اس نے خاص طور سے ذکر کیا ہے کہ ان " بلوچیوں " کو اس نے کبھی پشتو بولتے ہوئے نہیں سنا ۔ اپنی ہندستانی بولی کے علاوہ یہ لوگ فارسی میں بات چیت کرتے تھے اور وسطی ایشیا پہنچ کر " ترکی " بھی سیکھ جاتے تھے ۔ ولکنس نے ۱۸۸۷ء میں ماسکو سے شائع اپنے مضمون میں علم الاقوام اور علم الانسان کے نقطۂ نظر سے اس گروہ کے بارے میں نہایت دل چسپ معلومات فراہم کرنے کے علاوہ اس گروہ کی

مستقبل الفاظ کی ایک مختصر سی فہرست " بلوچیوں (حاشیہ ۹) کے الفاظ کے نمونے " کے عنوان سے بھی پیش کی ہے ۔
توقع کی جاسکتی تھی کہ ہند ایرانی زبانیں بولنے والے وسطی ایشیا کے یہ دونوں گروہ اور اسی کے مطابق ان کی زبانیں قریبی رشتے
ہوں گی ۔ تاہم یہ قیاس نہ ہی علم الاقوام اور نہ ہی لسانیات کی سطح پر صحیح نکلا ۔ " بلوچیوں اور افغانستان یا بہ راہ افغانستان
کو منتقل ہونے والے دوسرے چھوٹے چھوٹے گروہوں کے برعکس پریا خود کو موروثی کاشت کار ملتے ہیں ۔ جہاں تک زبان
ہے تو " بلوچیوں " کی بولی کے بارے میں مواد کے ناکافی ہونے کے باوجود اس کے اور زبانِ پریا کے تقابلی مطالعہ سے
، ذخیرہ ، الفاظ اور صوتی نظام کے مابین قابلِ لحاظ فرق وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتا ہے ۔ (اس موضوع پر مصنفِ کتاب
نے ایک تحقیقی مقالہ " دو ہند آریائی بولیاں " کے عنوان سے شائع کیا ہے) ۔
آج کل (یعنی ۱۹۹۰ ء کی دہائی میں) پریا قوم کے افراد وادیِ حصار کے مقامی باشندوں یعنی تاجکوں اور ازبکوں کے ساتھ
کھیتوں میں کام کرتے ہیں ۔ رسوم و رواج ، لباس ، کھان پان ، رہائشی مکانوں کی نوعیت ، طرزِ زندگی اور مذہبی عقائد کے
پریاسنی مذہب کے مسلمان ہیں ۔ ان میں اور مقامی آبادی میں کوئی قابلِ لحاظ فرق نہیں ہے ان کے ہاں بچے تاجک اور
لوں میں تعلیم پاتے ہیں ۔
سبھی پریا دولسانی ہیں ۔ کنبے میں ، گرہستی میں اور ہم قوموں کے حلقے میں مادری زبان ذریعہ ، ابلاغ کا کام دیتی ہے ۔ قلیل
نے اور تاجک نیز ازبک آبادی کے درمیان رہنے سہنے کی وجہ سے اس قوم کے افراد کے پوری طرح سے دولسانی ہونے کے
ندان میں پریا زبان کی حیثیت بہت استوار ہے ۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ پریا خاندانوں کے بچے ابتدا میں صرف مادری
ہیں اور ایسے کنبوں میں بھی جہاں ماں تاجک یا ازبک ہو باپ کے رشتے داروں سے قریبی تعلق کی بدولت بچوں کو عام
یا زبان آتی ہے ۔
گھر کی چار دیواری اور ہم قوموں کے حلقے کے باہر روز مرہ کی زندگی میں اس قوم کے سبھی افراد ، جن میں عورتیں بھی شامل
سے تاجک بولتے ہیں ۔ بہت سے مرد ازبک بھی بولتے ہیں ۔ طالبِ علم روسی بھی کم و بیش روانی کے ساتھ بولتے ہیں ۔
پریا زبان تحریری شکل میں نہیں پائی جاتی اور اس قوم کے افراد کی اپنے ماضی کے بارے میں معلومات خاندان کے بہ قید
افراد کی ایک دو پشت کے اندر ہی محدود ہیں ۔ ان معلومات کے مطابق ماضی میں پریا قوم کے افراد کا بنیادی پیشہ کاشت
(KISHTUK) اور بالخصوص تمباکو کی کاشت (TAMAKUKORI) اور ترکاری کی کھیتی باڑی تھا ۔ اناج کی فصلوں میں سے وہ
م) اور چاول (SHALI) کی کاشت کرتے تھے اور باغیچوں نیز ترکاری باڑوں میں پیاز اور بینگن (BENGA) اگاتے تھے ۔
پالتے تھے لیکن بہ ظاہر یہ پیشہ ان کی معیشت میں بنیادی حیثیت کا حامل نہیں تھا ۔ کاریگری ان کا پیشہ کبھی نہیں رہا ۔
وسطی ایشیا میں پریا افغانستان سے آکر بسے ہیں ۔ ان کے نقل مکانی کے وقت کا تعین مشکل ہے ۔ بہ ظاہر اس قوم کے
گروہ یا ہوسکتا ہے کہ مختلف کنبے مختلف اوقات میں یہاں آکر بسے ۔ پریا افغانستان میں کابل اور جلال آباد کے درمیان
لغمان کو اپنا وطن مانتے ہیں ۔ اس قوم کے بوڑھے افراد کا کہنا ہے کہ ان کے ہم قوموں کے بہت سے خاندان ، جس میں
ان کے کنبے بھی شامل ہیں ، لغمان میں رہتے ہیں ۔ بوڑھے اور کبھی کبھی متوسط عمر کے پریا کابل ، جلال آباد ، اور
جہاں اس قوم کے دوسرے ذیلی گروہ بود و باش پذیر تھے یا ہیں ، افغانستان کے دیگر شہروں اور آبادیوں (جلال آباد ، بلخ ، مزار
شریف ، کل بید ، ... کابل ، گلبہار ، چہاردہ تمر ، ... (...) ... ، ... اور ... کے

[illegible] میں ، زیادہ تر سنی سنائی معلومات رکھتے ہیں ۔

ان کی ہندوستان کی یاد داشتیں اور بھی غیر واضح اور دور دراز کی ہیں ۔ ان کے حافظے میں پشاور اور ملتان کے نام محفوظ رہے ہیں اور ایک حد تک ان کو (گو کہ سب کو نہیں) یہ احساس ہے کہ ان کے اجداد کسی نہ کسی طرح سے ہندوستان سے تعلق رکھتے تھے اور یہ کہ ان کی مادری زبان بھی ہندوستان سے تعلق رکھتی ہے ۔ یہاں نہایت اہم امر واقعہ پریا لوگوں کا یہ مستحکم خیال ہے کہ ان کے باپ دادا خود کو ان حضرت شمس تبریز ہی کا مرید مانتے تھے جن کے نام اور کارناموں کا تعلق ہندوستان سے ہے اور جہاں بہ قول ان کے ان پیر صاحب کا مزار واقع ہے ۔

جیسا کہ اوپر بھی ذکر کیا جا چکا ہے پریا سُنّی المذہب مسلمان ہیں ۔ شمالی افغانستان میں واقع شہر مزارِ شریف سے بھی وہ اچھی طرح واقف ہیں جہاں ان کے الفاظ میں ایک " اولیا " کا مزار ہے اور جو ماضی میں ان کی زیارت گاہ تھی ۔ پریا اس مزار کو اکثر " مزار حق " کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ان کے بڑے بوڑھوں کا خیال ہے کہ اس کی زیارت سے مختلف امراض سے صحت حاصل ہوتی ہے ۔ عقیدت مندوں کا خیال ہے کہ اس مزار کے اطراف کی خاک بھی خاکِ شفا کی تاثیر رکھتی ہے ۔ مزار شریف کا پریا لوک کتھاؤں میں اکثر ذکر ملتا ہے ۔

پریا لوک کتھاؤں اور لطیفوں کے خاکے بالعموم وہی ہیں جو وسطی ایشیا کی دوسری اقوام کی لوک کتھاؤں اور لطیفوں کے ہیں ۔ مثال کے طور پر آفندی سے متعلق لطیفے جس کے کچھ نمونے زیرِ نظر کتاب میں بھی فراہم کیے گئے ہیں ۔ نتیجتاً ان کہانیوں سے اس قوم کے ماضی کے بارے میں کسی طرح کی ٹھوس شہادتیں اخذ کرنا مشکل ہے ۔ اس امر کی البتہ نشان دہی کی جا سکتی ہے کہ ان کہانیوں میں " ہندوستان " اور " ہندو " کا ذکر ملتا ہے اور ہندوؤں کے بعض رواجوں اور ہندو مسلم تعلقات کا بھی ۔ (مثلاً ایک کہانی میں بادشاہ کی طرف سے دی گئی عام دعوت کے بیان میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے لیے پکے ہوئے کھانے کا انتظام تھا اور ہندوؤں کو اناج اور دعوت کی تمام ضروری اشیا کچی فراہم کی گئی تھیں ۔

پریا زبان میں اشعار اور گانے سننے کا مصنفِ کتاب کو اتفاق نہیں ہوا بہ جز اس گانے کے جو ایک ایسی لڑکی کے بارے میں ہے جس کا ارادہ مزارِ شریف کو بہ غرضِ زیارت جانے کا ہے یہ منت مانگنے کے لیے کہ اس کی شادی اس کے پسند کے لڑکے سے ہو جائے ۔ (افسوس کہ اس گانے کو مصنفِ کتاب قلم بند نہ کر سکے) پریا کہانیوں میں جہاں کہیں اشعار ملتے ہیں وہ ہمیشہ پشتو میں ہوتے ہیں ، حالاں کہ پریا لوگ اب پشتو سے ناواقف ہیں اور پرانے زمانے سے حافظے میں محفوظ ان ابیات کا مفہوم خود کہانی سنانے والے پوری طرح سے نہیں جانتے ۔ یہی حال پشتو زبان کے ان رٹے ہوئے گیتوں اور غزلوں کا ہے جو پریا لوگ دونکے (ڈھبرا ، تابک ، ڈمبورا) پر ایک مخصوص راگ (مشخ MASHKH) میں گاتے ہیں ، جس سے مقامی باشندے ناواقف ہیں ۔

جیسا کہ بالکل شروع میں ذکر کیا جا چکا ہے پریا مختلف ذیلی گروہوں میں یا " قوموں " میں بٹے ہوتے ہیں ۔ کبھی ان سب کو کبھی صرف کالو ، جوگی ، جیتن اور مگڑا کو اور کبھی صرف کالو کو شاہی خیل کا بھی نام دیا جاتا ہے ۔ بعض پریا افراد کا خیال ہے کہ ان کو یہ نام افغانوں (پشتونوں) نے دیا ہے ۔ کابل سے ترکِ وطن کرنے والے پشتونوں سے استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ اس نام کا قبیلہ قاضی [illegible] سے لے کر جلال آباد تک کے علاقے میں آباد ہے ۔ پیشہ کاشت کاری (زمین داری) ہے اور اس کی زبان " انکو " [illegible] انکو " (ہندکو ؟) ہے ۔

پریا گروہ کے ذیلی گروہوں میں فرق اب رفتہ رفتہ مٹ رہا ہے ۔ تاہم اب بھی بعض ذیلی گروہ دوسرے گروہوں پر تفوق

ہیں ۔ مثلاً کالو یا جٹی ذیلی گروہ کے نوجوانوں کے لیے انھیں ذیلی گروہوں سے دلہن کے انتخاب کو ترجیح دی جاتی ہے اور اس برعکس ملنگا یا معشق " قوموں " کی لڑکیوں سے رشتہ گویا کہ برادری کا نہیں سمجھا جاتا ۔ جہاں تک دوسری قوموں اور نسلی گروہوں کا ہے تو پریا اکثر تاجک اور کبھی کبھی ازبک عورتوں سے رشتہ ء ازدواج قائم کرتے ہیں لیکن اپنی بیٹیوں کی شادی غیر قوم میں نہیں ۔ جس کی وجہ اپنی " شرافتِ نسب " بتلاتے ہیں ۔ (" اختوانِ ماسفید ") ۔ وسطی ایشیا کے نام نہاد خانہ بدوش جپسیوں (جوگیوں) یہودیوں (جہود) سے پریا شادی بیاہ کبھی نہیں کرتے ۔ مخلوط شادی بیاہ کی اولاد کو تاجک اصطلاح " دورگا " سے یاد کرتے ہیں ۔ بھائی کی موت کی صورت میں چھوٹا بھائی اس کی بیوہ سے شادی کرسکتا ہے لیکن چھوٹا بھائی گزر جائے تو بڑا بھائی اس کی بیوہ سے شادی نہیں کرسکتا ۔

زیرِ تحقیق گروہ کے نمائندے خود کو پریا (PARYA) کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ ان کی مادری زبان کا نام بھی اسی لفظ سے مشتق ہے ؛ " beta, tu urusi gal na kar, tu paryasazi gal kar " (" بیٹا ، تو روسی میں بات نہ کر ، تو پریا [illegible] بات کر ") ۔ اس نام کی اصل کا سوال کافی پیچیدہ ہے ۔ اس لفظ کا ہندستانی اور پنجابی لفظ " پرایا " بہ معنی اجنبی اور سندھی " پرایا " بہ معنی " جلاوطن ، اچھوت ، ذات باہر " وغیرہ سے رشتہ جوڑنا بادی النظر میں تو دل کش بات ہے لیکن ایک طرف تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک گروہ کے افراد ایسی اصطلاح کو خود اپنے نام کے طور سے کیسے استعمال کرسکتے ہیں ۔ دوسری طرف جہاں کہ [illegible] زبان میں لفظ کی ابتدا کا " پ " ہندستانی میں لفظ کی ابتدا کے " بھ " سے توافق رکھتا ہے تو ملتان میں پائی جانے والی کاشت کار برادریوں " بھار " نیز بھاڑہ " امرتسر کے گروہ " بھرباد " اور پنجاب نیز شمال مغربی سرحدی صوبے میں منتشر اسلام کے پیرو اور [illegible] سے مختلف ذیلی گروہوں اور ذاتوں پر مشتمل گروہ " بھرائی " کے نام ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں ۔

وسطی ایشیا میں براہِ افغانستان آکر بس جانے والی بعض دوسری قومیں مثلاً شیخ مداری ، سوگوتراش اور جگی وغیرہ پریا قوم کو " چنگر " (CHANGAR) کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں ۔ خود پریا اپنے اس نام سے واقف ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ دونوں نام " چنگر " اور " پریا " ہم معنی ہیں ۔ " چنگر " کی اصطلاح زیرِ تحقیق پریا قوم کے پنجاب کی متوطن ایک ذات (قبیلے) سے تعلق کی نشان دہی کرتی ہے ۔ اس قبیلے کے بارے میں LEITNER کی کتاب A Sketch of the Changars and their D[illegible] کے نام سے لاہور سے ۱۸۸۰ء میں شائع ہوچکی ہے ۔ اس مصنف کی اطلاع کے مطابق ان چنگروں کی اہم بستیوں میں سے [illegible] لاہور میں واقع ہے جہاں وہ جھونپڑوں میں ایک گٹھے ہوئے گروہ کی حیثیت سے رہتے تھے ۔ جیسا کہ انھوں نے لیٹ نر LEIT[illegible] کو بتایا تھا ، ان کی دوسری بستیاں لدھیانہ ، امرتسر ، فیروز پور ، جالندھر ، پشاور اور " پشاور کے ایک [illegible] " میں [illegible] لاہور کے چنگروں کا دعوا تھا کہ وہ لوگ یہاں سیال کوٹ کے علاقے [illegible] سے آئے ہیں اور یہ کہ ان کے اجداد کشمیر اور ملتان سے ترکِ وطن کر کے آئے تھے جہاں ملتان آباد ہیں ۔ (ضلع سیال کوٹ میں پائی جانے والی دوسری " [illegible] " اقوام [illegible] [illegible] [illegible] کی آبادی پر مشتمل کھیت مزدوروں کے ایک گروہ کے بارے میں شہادت آکسفورڈ سے ۱۹۰۸ء میں شائع شدہ [illegible] گزیٹیئر آف انڈیا جلد پانچ سے بھی ملتی ہے ۔ افغانستان کے علاقے [illegible] میں بھی ساحلی [illegible] والے چنگروں کی موجودگی کی [illegible] بات ہے ۔ لیٹنر (Leitner) کے خیال میں ان کو غیر قوم کے لوگوں نے چنگر کا نام اس لیے دیا ہے کہ یہ لوگ [illegible] [illegible] [illegible] کا کام کرتے ہیں ۔ لیٹنر اس امر کی بھی [illegible] صراحت کرتا ہے کہ [illegible] [illegible]

[illegible]

تی کرنے کا کوئی ثبوت ہے ۔ اہم بات یہ ہے کہ لیٹنر کی بتائی ہوئی اس قوم کی گیارہ ذیلی قوموں میں سے پانچ (کالے ، سگھڑے ، الیاسی اور جیئو) کے نام اور وسطی ایشیا کی جپسی قوم کی ذیلی قوموں (کالو ، مگڑا ، جتیا ، بسیاں اور جنگلی) کے ناموں میں توافق ہے ۔ زیر تحقیق گروہ اور پنجاب کے " چنگڑوں " کے ربط باہمی کی تصدیق اس امر واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ ایک طرف جیسا ذکر ہوچکا ہے جپسی قوم کے افراد کے خیال میں ان کے اجداد حضرت شمس تبریزی کے مرید تھے تو دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا کہ خود " چنگڑ " قوم کے افراد کا بیان ہے ان کے اجداد کو ملتان کے حضرت شمس تبریزی نے مشرف بہ اسلام کیا ۔ لاہور سے ۱۹۱۲ء میں شائع شدہ ایچ ۔ اے ۔ روز (H. A. ROSE) کی " پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائل و ذات کی فرہنگ " (A Glossary of the Tribes and Castes of the Punjab and North - West Frontier Province) کی جلد اول میں ہم کو یہ اندراج بھی ملتا ہے ۔ " چنگڑ ، مونث ، چنگڑی ، چنگڑیانی ، چنگرنی (ملتان میں چنگر) اصل کی رو سے غالباً مغلی (Pariahs) یعنی ذات باہر گروہ ہے ۔ اضلاع گجرات ، امرتسر ، لاہور ، فیروز پور اور فرید کوٹ اور پاکستو کپورتھلہ میں کافی تعداد میں آباد ہیں ۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے اجداد جموں کی پہاڑیوں سے آئے تھے ۔ شروع میں خانہ بدوش کام کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے لیکن اب بڑے شہروں کے مضافات میں بستیوں میں رہتے ہیں ۔ ہر طرح کے کام کرتے ہیں ۔ زیادہ تر ان سے کھیتی باڑی سے متعلق خاص طور سے فصل کاٹنے کا کام لیا جاتا ہے ۔ عورتیں بالعموم اناج صاف کرتی ہیں ۔ سب مسلمان ہیں ۔ ۔ ۔ اور ان کا کہنا ہے کہ ملتان کے شمس تبریزی نے ان کو مذہب اسلام میں داخل کیا تھا ۔ ۔ ۔ جنایت اور جرائم میں بالکل ملوث نہیں ہیں ۔ ان کی اپنی بولی ہے ۔ ۔ ۔ " (خارج از امکان نہیں کہ ہندوستان اور افغانستان میں قبائل پر مشتمل خانہ بدوش ، بھی پائے جاتے تھے ، اور ہوسکتا ہے کہ اب بھی پائے جاتے ہوں ، جن کو بھی غیر قوم کے لوگ " چنگڑ " کے نام سے جانتے تھے ۔ چنانچہ پنجاب کے دریاؤں کے کناروں پر خانہ بدوش زندگی بسر کرنے والے سندھی بولنے والے چنگڑ جن کا ٹرمپ E. Trumpp ذکر کرتا ہے ، بہ ظاہر ان چنگڑوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے جن کی خصوصیات لیٹنر نے بیان کی ہیں اور جو ان سندھی بولنے والے چنگڑوں کو اپنا ہم قوم تسلیم نہیں کرتے ۔ دورنیا کوف کی اطلاع کے مطابق افغانستان کے جلال آباد اور لغمان میں ایک خانہ بدوش نسلی گروہ پایا جاتا ہے جس کو پشتون چنگر کے نام سے جانتے ہیں اور جو سازینی ر بجاتے ہیں ۔ ان کی زبان کو پشتون " انگو " یا " ہندکو " کا نام دیتے ہیں یعنی وہی نام جو افغانستان میں وہاں کے پنجابی اور سندھی زبان کو اور بعض اوقات ہندوستانی کو دیا جاتا ہے ۔ اس قوم کے مختلف پیشوں میں بندر نچانے کے پیشے کا بھی ذکر آتا ہے ۔ پشتون اس گروہ کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کے افراد کو عام طور سے دغاباز سمجھتے ہیں ۔ چنانچہ پشتو میں " چنگڑیم " بدمعاش " اور " چنگڑی " ہوتا ہے ۔ ہوسکتا ہے اس لفظ " چنگر " کا تعلق ہندوستانی لفظ " چھال " سے ہو جس سے کی ایک شکل " چنگر " ہو ۔)

لیٹنر پنجاب کے چنگڑوں کے بارے میں کہتا ہے کہ ان کی مخصوص بولی بھی ہے اور وہ اسے " چنگری " کا نام دیتے ہیں ۔ افسوس کہ اس کی کتاب میں فرہنگ کے بموجب اس بولی کے الفاظ اور فقروں کی بنیاد پر اس بولی اور وسطی ایشیا کے [illegible] کی بولی کا تقابلی مطالعہ ممکن نہیں کیوں کہ زیر مطالعہ کتاب کے مصنف نے بولی میں یہ الفاظ اور فقرے ہندوستانی [illegible] جپسیوں) میں سے لیے گئے ہیں ۔ ان میں ہندوستان کی ان زبانوں میں مشکل سے [illegible] [illegible] الاصل الفاظ جیسے " پیا " Pisma یہ معنی [illegible]

غریب ، " کمبر " KUMBR بہ معنی منہ ، ناک وغیرہ جیسے الفاظ اور وہ الفاظ شامل ہیں جنھیں مخصوص لاحقوں اور وسطیوں کے اضافے کے ذریعے جان بوجھ کر اس لیے مسخ کردیا گیا ہے تاکہ ان کا مفہوم غیروں کی سمجھ میں نہ آسکے ، مثلاً چھ ، سات ، آٹھ کی بجائے چھیلبو CHELBU ، ستیلو SATELU ، اٹیلو ATELU یا صفت " کالا " KALMA (ہندستانی " کالا) وغیرہ ۔ ان سب امور کے پیش نظر کہہ سکتے ہیں کہ لیٹنر کی کتاب میں ہم کو لاہوری چنگروں کی " پشتو " یعنی خفیہ زبان کا نمونہ ملتا ہے ، ان کی اصل زبان کا نہیں ۔ اس کے باوجود متذکرہ ، صدر دیگر تمام باتوں کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وسطی ایشیا کی قوم پریا اس قوم چنگری کی شاخوں میں سے ایک ہے جس کا ذکر ہندستان کے شمال مغربی علاقوں کی اس صدی کی ابتدا میں عمل میں آنے والی مردم شماریوں میں ملتا ہے ۔

گروہ پریا کے ذیلی گروہوں اور ہندستان کے قبائل اور ذاتوں کے ناموں میں توافق بھی پایا جاتا ہے ۔ چناں چہ مثال کے طور سے کاشت کار " جاٹ برادری " کلو کی امرتسر ، منٹگمری اور شاہ پور میں نشان دہی گذشتہ صدی کے اواخر کی مردم شماریوں میں کی گئی ہے ۔ منٹگمری کے کلوؤں نیز ایک اور برادری " کالوں " کے بارے میں صراحت کی گئی ہے کہ یہ سب مسلمان ہیں ۔ (اپنی اصل کے اعتبار سے بہ ظاہر لفظ " کالو " قدیم ہندستانی (سنسکرت) لفظ " کالا " سے مشتق ہے ۔ لفظ کالو پریا زبان میں " کالے " اور سانولے " کا مفہوم رکھتا ہے ۔ یورپ کے خانہ بدوش جپسیوں کی زبان میں اس کے دو مفہوم ہیں : " کالا " اور " جپسی " ۔

پریا گروہ کے دوسرے ذیلی گروہوں جونی ، مگارا اور جیتن کے تعلق سے یہ کہنا کافی ہوگا کہ ضلع منٹگمری میں کاشت کار مسلمان جاٹ برادری جنہی JUNHI اور ملتان میں " مہارا " MAHÁRA ، " ماہرا " MÁHARA اور " جھوٹن " JHOTAN برادریوں کی نشان دہی روز ROSE نے اپنی ١٩١١ ء میں شائع شدہ کتاب میں کی ہے ۔

وسطی ایشیا کی آبادی کے مختلف گروہ " شاہی خیل " اور " مصلی " کی اصطلاحات کا اطلاق بہ ظاہر مختلف گروہوں پر کرتے ہیں ۔ بہت سے پریا " مصلی " قوم کو اپنے گروہ سے علاحدہ قرار دیتے ہیں ۔ ان کے خیال میں مصلی افغانستان کی ایک پست قوم ہے ، جس کا رتبہ نظامِ مراتب میں چنگروں (پریا) سے کم تر ہے ۔ اس کے برعکس پشاور کے تارکینِ وطن کے اخلاف میں سے ایک نے مصنف کتاب کو دورانِ گفتگو مطلع کیا کہ " مصلی " پریا گروہ کے سبھی ذیلی گروہوں کا احاطہ کرنے والی اصطلاح ہے اور " چنگر " نیز" چاش گرگ " کی مترادف ہے ۔ اس کا کہنا تھا کہ " مصلی " دراصل ہندستانی " جوگی " ہیں جن کو ہندستان میں " چوری " ČURI (ہندستانی : چوہڑا ، چوڑا) کہتے ہیں اور جو پیشے کے لحاظ سے جاروب کش ہیں ۔ جیسا کہ معلوم ہے " چوہڑے " ہندستان میں اچھوتوں کی ایک ذات ہے جن کا پیشہ ہمیشہ گلیوں اور گھروں میں صفائی کا ہے ۔ ہوسکتا ہے کہ وہیں سے پشتو نیں لفظ " چُرائی " ČURAI بہ معنی نوکر پہنچا ہو اور براہ افغانستان وسطی ایشیا کی تاجک بولیوں میں ۔ مصنفِ کتاب کا کہنا ہے کہ تاجکستان میں انھوں نے لفظ " چُہری " خدمت گارِ پست " کے مفہوم میں لوگوں کی زبان سے سنا ہے مثلاً " من برائے تو ست چُہری نیستم " (میں تمہارا نوکر نہیں ہوں) ۔

" پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائل اور اقوام کی فرہنگ میں جس کا حوالہ اوپر دیا جاچکا ہے ، یہ اندراج ملتا ہے کہ " مصلی مغربی پنجاب کے چوہڑے ہیں ۔ جب تبدیلِ مذہب کے بعد بھی چوہڑا مردار کھاتا اور پاخانہ صاف کرتا جاری رکھتا تو " چوہڑا " ہی کہلاتا ہے اور جب یہ کام ترک کردیتا ہے تو اسے " مصلی " کہتے ہیں ۔ پشاور کی سرحد پر مصلی پیشے کے لحاظ سے گورکن اور جاروب کش ہیں اور انھیں " شاہی خیل " بھی کہتے ہیں " کم و بیش یہی اطلاع ہم کو ١٩٣١ ء کی ہندستان کی مردم شماری کی رپورٹ میں بھی ملتی ہے اس رپورٹ کے مطابق ١٩٣١ ء میں بلوچستان ، دلی ، شمال مغربی سرحدی صوبے پنجاب ، جموں و کشمیر میں چوہڑوں کی کل آبادی

تقریباً پانچ لاکھ تھی جن میں سے چار لاکھ کے اوپر پنجاب میں تھے اور نو ہزار کے اوپر شمالی مغربی سرحدی صوبے میں۔

اسلام قبول کرنے کے بعد مصلیوں کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ روایتی پیشے ترک کر کے وہ ان دوسرے پیشوں کو ا کرلیں جن کی ہندو اچھوتوں کو ممانعت رہتی ہے۔ شہروں میں وہ اکثر بھشتی • باورچی • بنکر • رنگ ریز کا پیشہ اختیار کرتے ہیں دیہاتوں میں کھیت مزدوری کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جاٹوں کی ایک ذات مصلی کا ذکر ہے جس کے افراد مغربی پنجاب باشندے ہیں اور جن کی مادری زبان لہندا کی ایک جنوبی بولی ہے۔ ۱۹۳۱ء کی ہندستان کی مردم شماری کے مطابق تیس فیصد سے مصلیوں کا پیشہ کھیتی باڑی سے متعلق تھا۔

پشتون علاقوں میں اس گروہ کی سماجی حیثیت اور پیشے کے بارے میں مشہور افغان شاعر اور سردارِ قبیلہ خوش حال خٹک (سترہویں صدی عیسوی) کے ذیل کے شعر سے رائے قائم کی جاسکتی ہے :

ma Xušhal vāi, ma Xatak vái, mā Xāni vái,

čač pa lās vāi, masalli vāi, xo dzvāni vāi

"چاہے میں خوش حال نہ ہوتا • خٹک نہ ہوتا • خان نہ ہوتا •

میرے ہاتھوں میں چھاج ہی کیوں نہ ہوتا میں مصلی ہی کیوں نہ ہوتا • بس جوانی مجھے دغا نہ دیتی۔"

افغانستان کے بعض صوبوں • مثلاً پکتیا میں ایک خانہ بدوش گروہ کو جس کے افراد سانولی رنگت کے ہوتے ہیں مصلی کہا جاتا۔ کہتے ہیں کہ یہ لوگ پکتیا میں فصل کی کٹائی کے موسم میں آتے ہیں اور معینہ معاوضے پر جو زرِ نقد اور اناج کی شکل میں ہوتا۔ مقامی باشندوں کے کھیتوں ہی میں گاتے اور ناچتے ہیں۔ شام میں بھی نوجوانوں کے مجمع میں یہ لوگ ناچ گانے کا تماشا دکھاتے ہیں مصلیوں میں اچھے خاصے مشہور گویّے • سازندے اور رقّاص پائے جاتے ہیں۔ ان کی عورتیں مقامی آبادی کے گھروں میں گھوم گھو خیرات اکٹھا کرتی ہیں۔ مصلی خیموں میں رہتے ہیں۔ ان کا مسلمانوں میں شمار ہے لیکن "عقیدے کے کچے" ہوتے ہیں۔ مقامی آبادی ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے وسطی ایشیا میں پریا قوم کو چاچ گرک ČAČGARĀK کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ یہ بظاہر یہ لفظ "چاچ" (چھاج) یعنی اناج کو پھٹکنے • چھاننے اور صاف کرنے کے اوزار سے ماخوذ ہے۔ خود پریا اس نام کو قبول کرتے • وہ اسے ناگوار لفظ ("طعنہ") گردانتے ہیں • اسے ایک اور ہی ہندستانی الاصل گروہ شیخ مداری کے لیے استعمال کرتے ہیں اور ہیں کہ چاچ گرک چور اور بے ایمان ("دزد") ہوتے ہیں۔ افغانستان سے ترکِ وطن کر کے وسطی ایشیا میں آباد پشتونوں کا کہنا ہے افغانستان میں یہ اصطلاح کھیتی باڑی سے متعلق بے زمین فصلی مزدوروں کے لیے استعمال ہوتی ہے ("زمین دار نیستند") جن کو اج پر گیہوں چھان پھٹک کر صاف کرنے کے لیے رکھا جاتا ہے ("گندم باد می کنند")۔ دریافت کرنے پر دوسرے ذرائع سے یہ ہوا کہ کابل میں یہ لفظ چھاج بنانے والے کاری گروں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

حصاری جگی (JUGI) اپنی خفیہ بولی (ARGOT) میں پریا گروہ کے افراد کو کال تک (KALTUK) مزنگ (MAZANGTUM) اور لم (ILM) کا نام دیتے ہیں۔ ان میں سے پہلا نام غالباً قدیم ہندستانی (سنسکرت) "کالا" سے ماخوذ جس میں جوگیوں کی خفیہ بولی کے لیے مخصوص لفظ کو مسخ کرنے کی غرض سے لاحقہ "تک" کا اضافہ کردیا گیا ہے۔ مذکور ا دوسرے نام میں اسی غرض سے جوڑے ہوئے لاحقے "تُم" سے صرفِ نظر کرنا چاہیے۔ لفظ "مزنگ" وسطی ایشیا میں آباد مختلف

مختلف نسلی گروہوں کے نام کے طور سے استعمال کرتے ہیں ۔ خود پریا " جوگی " یا " لیولی " گروہ کے افراد کو اس نام سے یاد کرتے ہیں ۔ زیادہ دل چسپ اصطلاح " لم " جو بہ ظاہر قدیم ہندستانی (سنسکرت) لفظ DOMBA (پیشہ ور گویوں اور سازندوں کی نیچ ذات کے فرد) سے ماخوذ ہے ۔ یورپ کے ہندی الاصل خانہ بدوش جپسیوں کی بولیوں کے لفظ " روم " (ROM) بہ معنی آدمی ، مرد ، جپسی کی اصل بھی یہی لفظ ہے ۔ اس لفظ کے شروع میں " ل " (L) کے استعمال کی شہادت غالباً صرف ارمنی جپسیوں کی زبان بوشا (بھاشا ؟) میں ملتی ہے جس میں اس لفظ کی شکل " لوم " (LOM) ہے ۔ اس کا تقابل پشتو کے الفاظ dum ، ḍam بہ معنی (۱) نائی ، حجام اور (۲) سازندہ گویا سے بھی کیا جاسکتا ہے ۔

افغانستان میں بولی جانے والی ہندی الاصل زبانوں میں سے پشائی وغیرہ پر کافی کام ہوچکا ہے لیکن چوں کہ ان کا تعلق ہند آریائی زبانوں کی ایک بالکل جداگانہ شاخ دارد (DARD) سے ہے تو جصادی پریا پر گفتگو کے دوران ان زبانوں سے صرف نظر کرنا ہی مناسب ہوگا ۔ افغانستان میں بسے ہوئے پنجابی ، لہندا اور سندھی بولنے والے ہندستانی تارکینِ وطن کا ذکر علمی کاوشوں اور مضامین میں اکثر ملتا ہے ۔ تاہم یہاں عموماً زیرِ بحث شہروں میں بسے ہوئے ہندستانی بیوپاری اور ساہوکار ہوتے ہیں ۔ فارسی کے ساتھ ساتھ ہندستانی بولنے والی وادیِ جلال آباد کے مشرقی حصے کی آبادی کا ذکر ۱۹۷۱ ء میں ماسکو سے شائع شدہ کا بلستان و کافرستان وغیرہ کے بارے میں رٹر K. Ritter کی کتاب میں اور کابل کے شمال مغرب میں واقع کوہ دامن میں بولی جانے والی لہندا کا ذکر ۱۹۲۹ ء سے لے کر ۱۹۶۰ ء تک شائع ہونے والی مارگنسٹیرن G. MORGENSTIERNE کی علمی کاوش " ہند ایرانی سرحدی زبانیں " جلد اول تا سوم اور ۱۹۵۶ ء میں ولبر DONALD N. WILBER کی زیرِ ادارت شائع شدہ مجموعے " افغانستان " میں ملتا ہے ۔ موخر الذکر میں اس امر کی بھی نشان دہی کی گئی ہے کہ مشرقی افغانستان کے شہروں کے برعکس جہاں ہندی الاصل زبانیں بولنے والے زیادہ تر بیوپاری اور ساہوکار ہیں ، کوہ دامن کی ہندی الاصل (لہندا) زبان بولنے والے کاشت کار ہیں ۔ مشرقی افغانستان کے ہندی (ہندکی) کے نام سے موسوم " نسلی اعتبار " سے جاٹ کاشت کاروں کا ذکر لیڈن اور لندن سے ۱۹۱۳ ء میں شائع شدہ قاموسِ اسلام THE ENCYCLOPAEDIAOF ISLAM کی جلد اول میں ملتا ہے ۔ اس سلسلے میں مارگنسٹیرن کے الفاظ قابلِ توجہ ہیں ؛ " مزید براں کہتے ہیں کہ ڈوموں اور جاٹوں کی اپنی زبانیں ہیں ۔" (دیکھو او سلو سے ۱۹۲۶ ء میں شائع شدہ " افغانستان جانے والی لسانی سفارت کی رپورٹ" : G. MORGENS TIERNE REPORT ON LINGUISTIC MISSION TO AFGHANISTAN. REPORT - I ۔ ماسکو سے ۱۹۳۰ ء میں شائع شدہ افغانستان کے بارے میں غزنی ، گردیز ، کوہ دامن اور جلال آباد میں پنجابی زبان کی نشان دہی کی گئی ہے ۔

افغانستان کی سرزمین پر بسنے والے ہندستانی زبانوں کے گروہوں کے بارے میں معلومات انھیں اذکار کی حد تک محدود ہیں ۔ علم الاقوام اور لسانیات کے نقطۂ نظر سے ان میں سے کسی گروہ کے بارے میں کوئی مفصل علمی کاوش دست یاب نہیں ہے اور اس لیے پریا قوم کے ہندستانی زبانیں بولنے والے کسی گروہ یا گروہوں سے راست تعلق کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم کرنا افغانستان اور شمالی مغربی ہندستان کی زبانوں اور نسلی گروہوں کے بارے میں قابلِ اعتبار معلومات کے حصول کے بعد ہی ممکن ہوگا ۔

ان تمام امور کے پیشِ نظر مصنفِ کتاب کا خیال ہے کہ دوسری ہند آریائی زبانوں اور بولیوں کے درمیان جصادی پریا کے مقام کے تعین کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور چناں چہ اسی لیے کتاب کے اگلے باب میں انھوں نے زبان پریا کی صوتی نیز صرفی و نحوی خصوصیات کا تقابلی مطالعہ اس کی قریب ترین ہم رشتہ ہند آریائی زبانوں سے کیا ہے ۔

ooo

مصحف اقبال توصیفی

مطالعہ

راشد آزر کی شاعری ... ایک مطالعہ

(" اندوختہ " کی روشنی میں)

آج کے اس عہد میں جب کہ ادبی تھیوری ہر آن بدل رہی ہے راشد آزر کی کج کلاہی اور ترقی پسند روایت کے ساتھ ذہنی شیفتگی اور وابستگی ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے ۔ بیش تر ترقی پسند شاعروں کی طرح راشد آزر بھی بنیادی طور پر داخلی واردات کے شاعر ہیں ۔ ان کے مزاج کی رومانیت نے انھیں ترقی پسندی سے جوڑ دیا اور وہ اسی در کے ہو رہے ۔ حیدرآباد کے ادبی اسٹیج پر پچھلی چند دہائیوں میں جو چند شخصیتیں ترقی پسند تحریک کا پرچم بلند کیے ہوئے نظر آتی ہیں ان میں راشد آزر کی شخصیت نمایاں ہے ۔ لیکن اپنی شاعری میں راشد آزر نے ان موضوعات کو جو ترقی پسند شاعری کے خدوخال اجاگر کرتے ہوں بہت کم برتا ہے ۔ اس احتیاط کے باوجود یا شاید اسی احتیاط کے سبب جب جب راشد ترقی پسند شاعری کے مخصوص موضوعات کے دائرے کو اپنا نقطہ ، فکر بناتے ہیں اس وقت ہمیں ان کی شاعری پڑھتے ہوئے (بعض دوسرے شاعروں کے برعکس) اچانک ہوا کے دباؤ میں کسی قسم کی کمی کا احساس نہیں ملتا ۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ راشد آزر کے جوہر اس وقت زیادہ کھلتے ہیں جب وہ اپنے انفرادی تجربات اور عشق کی کیفیت کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں ۔ وقت کے گراف پر ان کے احساس اور فکر نے کئی نقطے روشن کیے ہیں جو متحرک سوالات اور آدھے ادھورے جوابوں کی چھوٹی بڑی لکیروں میں ڈھل جاتے ہیں ۔ وہ اپنے قاری اور نقاد (یا اپنے آپ ؟) سے پوچھتے ہیں ۔

آپ کہیے غمِ دوراں ، غمِ جاناں ، غمِ ذات   کون سا رنگ نمایاں ہے ہمارے فن میں

اس سوال کا جواب مشکل ہے اس لیے کہ راشد آزر کی بت تراشی جب کوئی پیکر ڈھالتی ہے تو ان ہی کے الفاظ میں یوں لگتا ہے جیسے ہر رنگ کھل کے اس کے بدن پر نکھر گیا ۔ اس میں زندگی کے سارے رنگ سما جاتے ہیں ۔ راشد کو اس معاشرے سے گلہ ہے کہ وہ ان کے ڈھالے ہوئے بتوں سے اس ریاکار تہذیب کی تزئین کا کام کیوں لیتا ہے اس لیے وہ کبھی کبھی خود اپنے بتوں کو توڑنے پر مجبور ہوجاتے ہیں ۔ وہ موجودہ سماج سے خود کو ہم آہنگ نہیں کرپاتے ۔ جب وہ ماضی اور حال کا تقابل کرتے ہیں تو انھیں اس بات کا دکھ ہوتا ہے کہ آج کے انسان میں اظہار کی جراءت کم ہوگئی ہے ۔ آج کے عہد کی اقدار زوال پذیر ہیں ۔ اس احساس کی پرچھائیں ان کی کئی نظموں پر نظر آتی ہے جیسے " ماحول کا فرق " ، " رسوائی " ، خطِ فاصل " وغیرہ ۔

. . . یہ سارے جلے ہوئے گھر

اجاڑ ساری یہ بستیاں

ان میں خوف ، دہشت ، ہراس کا یہ

عیب سناٹا کچھ نہیں ہے ؟
تو کیا یہ سب سوچنے کے اک
زاویے میں تبدیل ہوگئے ہیں
(نظم " رسوائی ")

وہ اس احساس سے زخمی ضرور ہیں لیکن پسپا نہیں ۔ وہ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ فرد ، زماں اور مکاں کے وسیلے سے سماج سے جڑا ہوا ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ فرد ایک ستارے کی طرح وقت کے آسماں پر تنہا نظر آتا ہے لیکن ذرا دور سے ، ذرا ہٹ کر دیکھیں تو ایک GALAXY میں سمٹا ہوا ہے اور اس آسمان کی وسعت اور پہنائیوں کا امین ہے جس سے خود وقت عبارت ہے ۔ وہ ایک ایسا ستارہ ، سحری ہے جس کے بغیر نئی صبح کا ظہور ممکن نہیں ۔ راشد کی شاعری میں اس ستارے کے بجھنے کا غم ہے لیکن یہ ایک ایسے حزن میں ڈھل گیا ہے جو نشاط انگیز بھی ہے ۔

جو لمحے میرے ہاتھ میں ہیں وہ پھسل نہ جائیں
اس واسطے ہے دل میں کہ جتنی مسرتیں
مجھ کو ملیں وہ چاہنے والوں میں اپنے سب
میں اپنی دونوں مٹھیاں بھر بھر کے بانٹ دوں
(نظم " جب تک لدی ہے شاخ گل ")

راشد آزر کے ہاں یہ رویہ ، بے عملی یا اپنے ماحول اور اپنے اردگرد زندگی سے بے تعلقی کی شکل اختیار نہیں کرتا ۔ سماج کے ایک ذمہ دار اور باہوش فرد کے طور پر کبھی وہ ظلم اور استبداد کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں ، کبھی آب دیدہ ہوکر رہ جاتے ہیں ۔ ان کے یہ جذبات جینوین ہیں محض نعرے بازی کی یا دکھاوے کے آنسو نہیں ۔ اس کی خوب صورت مثالیں ان کی نظمیں " مجنوں موڑ " ، " اندیشہ " اور " سوغاتِ جاں " ہیں جہاں ان کی شاعری عالمی انسانی روایات اور سماجی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہوتی ہے ۔

کہیں کہیں راشد آزر کی شاعری میں اپنے عہد کی حسیت کے ساتھ گزرے ہوئے اور گزرتے وقت کا احساس اس طرح گھل مل گئے ہیں اور برسرِ پیکار بھی جیسے لہریں ساتھ بہتی ہوئی ایک دوسرے کو کاٹتی بھی ہوں ۔ ان کی نظموں " تجزیہ " ، " کل " ، " آئینہ اور عکس " میں ایسی کئی تصویریں ابھرتی ہیں جن میں آمیزش و آویزش ہمیں ملتی ہے ۔ شاعر خبر کی اس منزل میں ہے کہ اسے خود اپنا گھر نہیں ملتا ۔ اب وہ چند قدم اور آگے بڑھا کر خود اپنی کھوج اور تلاش میں نکل پڑتا ہے ۔ اب وہ دنیا کا مشاہدہ بھی کرتا ہے اور اپنی ذات کا محاسبہ بھی ۔ گہرے پانیوں میں غواصی کے بعد وہ اپنی مٹھی میں چند سوالوں ، سوال نما جوابوں کے ، صدف لاتا ہے اور آپ کے سامنے بکھیر دیتا ہے ۔ نظمیں ، " خود احتسابی " ، " خواب ـــ تعبیر " ، " سلسلہ " اس کی مثالیں ہیں ۔ راشد کی شاعری میں حال اور ماضی کی ایسی یک جائی ہے جو زندگی کے حل کی تلاش میں سرگرداں بھی ہے اور ہمیں اس کی پیچیدگیوں کا رازدار بھی بناتی ہے ۔ ہم دیکھتے ہیں ۔

عجب زمانہ ہے
اب تو قاتل کی جلد
مقتول کے بدن پر لگی ہوتی ہے
(نظم " پیوند کاری اور نئی امید ")

انسانی فطرت کی ناپائداری اور بوقلمونی بھی راشد کو حیران کرتی ہے ۔ کبھی کبھی وہ جس شئے کو پانا چاہتے ہیں اسے پاکر وہ اور بھی آوارہ ، مشکوک ہوجاتے ہیں ۔ ان کا عشق زمینی بھی اور علوی بھی ۔ وہ جسم کے وجود سے منکر نہیں لیکن ان کا عشق ان

مجموعی شکل میں حالی کے اس عشق کی طرح ہے جہاں " ایک ہی شخص " انھیں " عہدہ برا " نہیں ہونے دیتا ۔ عشق ان کی زندگی پر حاوی ہے اور غالب کے الفاظ میں " دلِ گداختہ " اور میر کے انداز میں زندگی کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے میں ان کی مدد کرتا ہے ۔ فراق کے برعکس (جو کہتے ہیں " کبھی نہ پوچھو یہ شاعر سے تم کس کے گن گاتو ہو ") راشد اپنے محبوب کے نام کے برملا اظہار اور اس سے راست تخاطب میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے ۔ راشد کا محبوب ان کی مرحومہ بیوی ہیں جو ان سے بچھڑ کر اور بھی ان کے قریب ہوگئی ہیں ۔ راشد نے ایک بہت خوب صورت نعت بھی لکھی ہے ۔ " یہ راز کیا ہے " جدید طرزِ اظہار میں لکھی گئی اس نعت کا عنوان ہے :

ابھی تک جو گفتگو ہوئی اس میں میں نے دانستہ راشد کی نظموں ہی کے حوالے پیش کیے حالاں کہ نظم و غزل دونوں اصناف ان کے فن کا موثر ذریعہ اظہار ہیں ۔ دونوں ہی اصناف میں ان کے طرزِ بیان کی دل کشی اور حسنِ اظہار سے یا راستہ انکار ممکن نہیں ۔ فرق اگر ہے تو اس قدر کہ نظم کے مقابل غزل کے اشعار داخلی کیفیات اور عشقیہ جذبات سے زیادہ مملو ہیں ۔ بہ ایں ہمہ جو باتیں کہی گئیں وہ نظم اور غزل دونوں حوالوں سے ممکن تھیں لیکن میں نے چاہا کہ غزل کے چند اشعار آخر میں نقل کروں تاکہ ان کے اثر کی وحدت منقطع نہ ہو ۔ انھیں پڑھتے ہوئے شاعر اور قاری کے بیچ ۔ ربطِ مہرووفا میں ، میری گفتگو (اگر بامعنی ہو تب بھی) حائل نہ ہو ۔ شعر سنیے :

تو میری سانس کی بے ربطیوں کی گونج تھی
سنو اندھیرے جس کو آوازِ جرس سمجھا تھا میں

میں اس کو شب کے اندھیرے میں دیکھ سکتا ہوں
وہ روشنی جو ابھی وقت کے غبار میں ہے

تارِ نظر جو ٹوٹا تو اے جانِ زندگی
پلکوں سے تیرے نقشِ قدم ڈھونڈتے رہے

آوارگانِ شوق کو منزل کہاں ملی
تجھ سے بچھڑ کے راہِ عدم ڈھونڈتے رہے

وارفتگیِ شوق کا عالم عجیب تھا
خود کو زیادہ اور تجھے کم ڈھونڈتے رہے

کچھ نہیں دیکھتیں یہ ان کے سوا
اتنی محتاط ہوگئیں آنکھیں

وہ اجنبی ہے یہ اپنا دکھائی دیتا ہے
کہ آئینے میں بھی وہ چہرہ دکھائی دیتا ہے

ہماری طرح کوئی باخبر نہیں ملتا
تمام عمر جسے اپنا گھر نہیں ملتا

پرانی قدراں کا اب ذکر کیا کہ آج آزر
وہ سادہ سلسلہ ، خیر و شر نہیں ملتا

یہ کون سا عذاب ہے جو میرے گھر میں ہے
اک آگ سی لگی ہوئی دیوار و در میں ہے

ہر آرزو کو وقت کا سیلاب لے گیا
اور دیکھیے تو وقت بھی خود اک بھنور میں ہے

مدت ہوئی اس راہ سے گزرے ہوئے اس کو
آنکھوں میں وہ نقشِ کفِ پا ہے بھی ، نہیں بھی

ترے ہاتھ کی جس پہ تحریر تھی
وہ کاغذ تو اشکوں سے نم ہوگیا

یہ ہے بند اشکوں کے سیلاب کا
جو آنکھوں کے نیچے ورم ہوگیا

سزا پا رہا ہوں ، مگر کیا کروں
جو سچ تھا سپردِ قلم ہوگیا

" اندوختہ " راشد آزر کا آٹھواں شعری مجموعہ ہے ۔ یہ کہنا کہ انھوں نے اپنی منزل پالی ہے ، یا یہ توقع کہ وہ جلد ہی منزل پالیں گے ، بڑی فرسودہ بات ہوگی ۔ ہمیں خبر نہیں ان کی منزل کیا ہے ؟ شاید انھیں بھی اس کا پتہ نہ ہو کہ تمنا کا کون سا قدم انھیں کہاں لے جائے ۔ آوارگانِ شوق کی کوئی منزل نہیں ہوتی ۔

○●○

راشد آزر

بے تابی

جس کو سودائے بخیہ کاری ہے
اس کو حسرت ہے بےقراری کی
اور محتاط اس قدر ... کم بخت
سانس بھی کھل کے لے نہیں سکتا

○

میں ، کہ دیوانہ ، سکونِ تلاش
لے کے کندھے پہ اک گلیمِ نیاز
گھر سے نکلا ہوا اجالے سے
ایک تسکینِ اضطراب آمیز
ڈھونڈتا پھر رہا ہوں دنیا میں

○

ایک امید ہے کہ دشتِ جنوں
مجھ کو امکاں کی سرحدوں سے پرے
منزلِ شوق کا پتا دے گا

○

پاؤں میں پڑ گئے ہیں چھالے سے
اب تو خود مجھ کو اپنا ہوش نہیں
دھجی دھجی مرا وجود ہوا
میں کہاں فکرِ پیرہن کرتا

○

چاکِ دامن پہ سب کی نظریں ہیں
لوگ میرا لباس دیکھتے ہیں
اس کے اندر کا آدمی دیکھیں !

○●○

خوابوں کا سودا

تم اپنے خلوت کدے میں بیٹھے
ہماری خوابوں کو توڑنے کے
جتن کرو بھی تو کیا ، کہ ہم نے
وہ نیند خود پہ حرام کرلی
کہ جس کے باعث ہماری آنکھیں
کسی کے زخموں کو دیکھ پائیں
نہ رت جگوں سے ہماری محفل
سجا سکی تھیں ، کہ دیکھتے ہم
یہ شہر ، شہرِ نگار بھی ہے
مگر یہاں ہر مکاں میں دیکھو
کوئی جواں دل فگار بھی ہے

○

ہم اپنے خوابوں کے سارے نسخے
امانتِ غم کی طرح دل میں
چھپا کے نکلے ہیں اپنے گھر سے
کہ نوجوانوں کو سونپ آئیں
اور ان کے پاس اپنے خوابِ فردا کو رہن رکھ دیں
ہمیں یقین ہے یہ قرضِ جاں وہ چکا سکیں گے

○●○

ساحر شیوی

○

جو تیری یادوں میں گذری زندگی اچھی لگی
غم ترا اچھا لگا تیری خوشی اچھی لگی

یاس کی رت تھی پر اس کی دل لگی اچھی لگی
آنکھ نم ہوکر بھی ہونٹوں پر ہنسی اچھی لگی

دیکھ لو مجھ کو کھڑا ہوں آج اپنے پاؤں پر
دوستی کے بعد اس کی دشمنی اچھی لگی

دکھ بھی اس کی راہ میں ہے سکھ بھی اس کی راہ میں
آدمی کو موت سے تو زندگی اچھی لگی

حادثوں پر حادثے پھل تھے مرے اعمال کے
یا فلک والے کو میری بےبسی اچھی لگی

ہوگئے گم راہ وہ آکر تمہارے شہر میں
سب کو اب تہذیبِ نو کی روشنی اچھی لگی

خواب کی وادی میں تنہا پھر رہا ہوں روز و شب
دوستی اچھی نہ مجھ کو رہبری اچھی لگی

جاگتی آنکھوں سے ساحر دیکھتا ہوں دہر کو
گلستاں میں کھلنے والی ہر کلی اچھی لگی

○●○

راشد آذر

○

جھک نہ سکے جو سر کبھی ۔ دوش پہ بار ہوگئے
فخرِ زماں تھے ایسے لوگ ۔ زینتِ دار ہوگئے

مصلحتاً کسی سے جو ۔ کرتے رہے مصالحت
ان کی نظر میں ایسے لوگ اور بھی خوار ہوگئے

کتنے عظیم لوگ تھے ۔ ہم نے جنھیں بھلا دیا
زیبِ لحد ہوئے تو بس ۔ لوحِ مزار ہوگئے

جبر سے جب نہ لڑسکے ۔ شیخِ حرم ۔ نصیب کا
کرکے بہانہ ۔ پیکرِ صبر و قرار ہوگئے

یاد کی جب بیاض کے ہم نے جلائے سب ورق
دیکھتے دیکھتے سبھی مشتِ غبار ہوگئے

کیسا جنونِ عشق ہے ۔ ڈوبے ہیں بے خودی میں یوں
اترا جو قرضِ نشہ تو غرقِ خمار ہوگئے

عہدِ وفا ہے بےبسی ۔ کیسے کہیں کہ آذر اب
ایک صنم تراش کے اس پہ نثار ہوگئے

○●○

جمشید مسرور

○

فریاد کا اک حرف سنائی نہیں دیتا — یہ ظلم ہے کیسا کہ دہائی نہیں دیتا
یہ ضعفِ بصارت ہے کہ ہے خون ہی بے رنگ — لگ جائے تو ہاتھوں پہ دکھائی نہیں دیتا
منظر کہ اسے عکس میں ڈھلنے سے ہے انکار — آئینہ کہ منظر کو رہائی نہیں دیتا
دن رات جلتا ہے رگ و ریشہ ، جاں کو — مہلت ہنرِ شعلہ نوائی نہیں دیتا
یا دیتی نہیں سینہ زنی فرصتِ گریہ — یا رقصِ سرِ شامِ جدائی نہیں دیتا
اک سبز سا انکار ہے ان سرخ لبوں پر — اک سانپ ہے پھولوں میں دکھائی نہیں دیتا
یرانئ شب لوٹ کے دیکھی کبھی تونے — اس شہر پہ اب چاند دکھائی نہیں دیتا
سنتے ہیں مرے شعر کچھ ایسے کہ نہیں ہیں — دیتے ہیں اگر داد سنائی نہیں دیتا
پڑھتے ہیں مری پیاس مری گردِ سفر سے — دریا مری باہوں میں دکھائی نہیں دیتا
یں سرزنشِ ہرزہ سرائی نہیں کرتا — میں طعنہ ، انگشت نمائی نہیں دیتا
یں ردِ مضامینِ حریفاں نہیں کرتا — میں اجرتِ تحمید سرائی نہیں دیتا
ہ جو ابھرتا ہے سمندر کے جگر سے — ساحل پہ کھڑے ہوں تو سنائی نہیں دیتا
رشید پہ الزام تراشی بھی غضب ہے — اندھوں کو تو دن میں بھی دکھائی نہیں دیتا
شید پہ ثابت ہوئی پھر تہمتِ یاراں — یہ شخص کبھی اپنی صفائی نہیں دیتا

○●○

ایس ۔ اے ۔ فہیم

○

اندازہ ، امروز ہے ، اندیشہ ، فردا میں گم
اک دل کش سی صدا جیسے کسی صحرا میں گم

جھومتی پھرتی ہواؤں میں وہ خوش بو کا اثر
کر گیا مجھ کو کسی کی یاد کی دنیا میں گم

جب شکستہ ساحلوں سے آندھیاں ٹکرا گئیں
شورشِ طوفاں ہوئی ہے موجہ ، دریا میں گم

تجھ کو پانے کی تمنا میں جو کل تک گم رہا
وہ دلِ دیوانہ اب ہے ، خواہشِ دنیا میں گم

اپنے اندازے سے لیکن کوئی شئے ملتی نہیں
ہے خریداری کی خواہش قیمتِ اشیا میں گم

دل سمٹ جائے تو کثرت میں بھی اک وحدت لگے
اور بکھر جائے تو رنگوں کے کئی اجزا میں گم

ہم تو ہمت کے سہارے ہی کنارے آگئے
حوصلہ جن کو نہ تھا وہ ہوگئے دریا میں گم

○●○

خالد عبادی

○

یہ کھڑکی اب کھلی تو اور ہی منظر نظر آیا
کہیں پتھر کہیں شعلہ کہیں خنجر نظر آیا

بہ ظاہر رات بھی ایسی نہ کوئی بات تھی ایسی
کھلا دروازہ اور سایہ کوئی اندر نظر آیا

نہ پہنچی خاکِ پا کی گرد کو جس کا غبارِ دل
خدا کے فضل سے وہ بھی سرِ منبر نظر آیا

اگر چہ بدحواسی میں گزرنا ہی مقدر تھا
پر اتنا یاد ہے ہر ہر قدم پہ سر نظر آیا

عبادی ہو نہیں سکتا امامت ہو نہیں سکتی
یہ تو کس کا حال پہلے سے مجھے بہتر نظر آیا

○●○

غلام جیلانی

فریب زار

(قسط: تیسری)

(۱۱)

گھر آئی تو رما کو میز پر ڈیڈی کا خط رکھا ملا۔ رڑکی سے آیا تھا۔

"... میرا ایک بھانجا ہے، آنند کمار ورما۔ تم نے نہیں دیکھا ہے اب تک۔ یہاں رڑکی میں اس سے ملاقات رہی۔ یہاں سے اس نے سول انجینئرنگ میں ٹاپ کیا ہے۔ اسکالرشپ پر دلی آیا ہے، ایم۔ ای کرنے۔ بڑا ذہین ہے، اسپورٹس مین ہے، بہت سوشیل ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ شطرنج بہت اچھی کھیلتا ہے (مجھے کئی بار ہرا چکا ہے)۔

میں نے اس سے کہا ہے کہ دلی میں وہ چھتری والی کوٹھی میں رہے۔ تمہارے بارے میں بھی سارا ذکر کر چکا ہوں۔ مجھے یقین ہے میرا یہ یک طرفہ فیصلہ تمہیں کبھی ناخوش ہونے کا موقع نہیں دے گا۔ امید ہے تم سے جلد ہی ملاقات ہوگی۔

تمہارا

ڈیڈی۔

P.S.

خط پوسٹ کرنے میں دیر ہوگئی۔

شاید آنند خط ملنے سے پہلے ہی وہاں پہنچ جائے۔

ڈیڈی۔

... تو وہ آنند تھا! ... جو مجھ سے ملنے کالج آگیا تھا ... رما کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

سب لوگ صوفا کے کمرے میں جمع تھے۔ اندر سے آنند کی آواز آرہی تھی۔ رما دروازے میں جا کھڑی ہوئی ... آنند، انداز میں ایکٹنگ کرتے ہوئے اپنا کوئی قصہ سنا رہا تھا اور سب لوگ ہنسی اشک کے ساتھ خاموش بیٹھے سن رہے تھے ...

آنٹی ، منورما ، رنجنا اور جگدیش انکل ۔

" ۔ ۔ ۔ ہاں آنٹی ۔ ڈر تو گیا تھا ، پر میں نے ظاہر نہیں ہونے دیا ۔ وہ تین تھے اور میں اکیلا ! ۔ ۔ ۔ بس میں نے پلنگ پر سے ہوا میں (ایک سمر سالٹ کیا ۔ ۔ ۔ یوں (اور کھڑے ہوکر ایکشن کے ساتھ دونوں ہاتھ ہوا میں پھیلا دیے) ۔ ۔ ۔ اور سیدھا لینڈ کیا ان تینوں پر ۔ دو کو ٹانگوں سے گرایا اور تیسرے کے جبڑے پر ۔ ۔ ۔ یوں ۔ ۔ ۔ ڈیشوم ! " ۔ ۔ ۔ اور ہاتھ کے ساتھ خود بھی گھوم گیا ۔

گھومتے ہی نظر ربا پر پڑی جو ابھی تک دروازے میں ہی کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی ۔ آنند کے دوسرے مکے کی آواز حلق میں ہی اٹک کر رہ گئی ۔ ۔ ۔ " ڈیشں ۔ ۔ ۔ شوم ! " ۔ ۔ ۔ اور اک دم چپ ہوکر ربا کو دیکھنے لگا ۔ جیسے سانپ سونگھ گیا ہو ۔

" پھر کیا ہوا مسٹر آنند ؟ " یکایک رنجنا نے پوچھا اور آنند نے چونک کر سب کی طرف پلٹ کر دیکھا ۔

" پھر ؟ ۔ ۔ ۔ پھر کچھ نہیں ہوا " ۔ ۔ ۔ آنند کے منہ سے نکلا ۔

آنند کی بوکھلائی ہوئی حالت دیکھ کر ربا کو رحم آ گیا جلدی سے آگے بڑھ کر بولی ۔ ۔ ۔ " ہونا کیا تھا ؟ ۔ ۔ ۔ ایک دم آنکھ کھل گئی ۔ "

سب کے ساتھ آنند بھی ہنس رہا تھا ۔ ربا نے تعجب سے دیکھا کہ اس کے چہرے پر کھسیانے پن کا نام و نشان تک نہیں تھا ۔

" آپ اور ربا جانتے ہیں ایک دوسرے کو ؟ " منورما نے پوچھا ۔

" نہیں ۔ بالکل نہیں ۔ ۔ ۔ " آنند نے فوراً جواب دیا ۔

آنٹی ربا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ۔ ۔ ۔ " ربا بیٹی ، آنند ہے ، ہمارا نیا گیسٹ ۔ بڑا باتونی ہے ، مگر اتنا ہی دل چسپ بھی ہے ۔ اب یہ یہیں کوٹھی میں رہے گا ۔ "

ربا کو شرارت سوجھی ۔ ۔ ۔ " آنٹی ۔ ۔ ۔ ہماری کوٹھی کوئی سرائے نہیں ہے ! ۔ ۔ ۔ آپ ہر ایرے غیرے کو ۔ ۔ ۔ "

آنٹی جلدی سے بولیں ۔ ۔ ۔ " ربا بیٹی ، یہ غیر نہیں ہے ۔ ۔ ۔ تمھارے ڈیڈی رشتے میں انکل ہوتے ہیں اس کے ۔ دو دن پہلے انھوں نے فون کیا تھا ، ڈیرا دون سے ۔ تمھیں بتانا بھول گئی ۔ ۔ ۔ بڑی تعریفیں کر رہے تھے اس کی ! "

منورما چھیڑتے ہوئے بولی ۔ ۔ ۔ " ممی ۔ آپ کو یقین ہے ، انکل مسٹر آنند کی ہی بات کر رہے تھے ؟ "

جواب آنند نے دیا ۔ وہ اپنے اصلی رنگ میں واپس آچکا تھا ۔ ۔ ۔ " جناب ۔ آتے وقت ڈیرا دون میں انھوں نے مجھے دو دن تک اپنے ساتھ ہی روک لیا ۔ ہر جگہ لیے لیے پھرتے رہے ۔ جانے کی اجازت ہی نہیں دے رہے تھے ! "

" بے چارے انکل ! " رنجنا بھی ستانے پر اتر آئی تھی ۔

" آنند بیٹا ۔ ۔ ۔ یہ لڑکیاں بڑی شریر ہیں ۔ " آنٹی پھر جلدی سے بولیں ۔

" جی ہاں آنٹی ۔ انکل نے مجھے وارن بھی کیا تھا ۔ ۔ ۔ "

آنند کو ہرانا کتنا مشکل ہے ، ربا سوچنے لگی ۔ ۔ ۔ آنند سے اس کی ملاقات کا وہ پہلا دن تھا ۔ ۔ ۔

اس رات جانے کب تک ربا کے کمرے کے دریچے سے باہر آسمان کی تاریکی میں یادوں کی روشنیاں جھل ملاتی رہیں اور جانے کب انھیں دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں نے بالآخر اپنے دریچے موند لیے ۔

(۱۲)

آرتی ان عورتوں میں نہیں تھی جو اپنی توہین کا بدلہ لیے بغیر چپ ہوجائیں۔ اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا آرتی نے سیکھا نہیں تھا۔ اس کی اسی بے راہ روی نے شوہر کو امریکہ چلے جانے پر مجبور کردیا تھا۔ جس سے اس کی آزاد روی کو اور چھوٹ ملی تھی۔ آرتی کے پاس روپے پیسے کی یوں بھی کمی نہ تھی۔ امریکہ سے ہر دوسرے مہینے چیک الگ آجاتا۔۔۔ کمی تھی تو ذہنی آسودگی کی، جو ہوس کا دریا پار نہ کرسکی!

رما کے خلاف غم و غصے کی چنگاری دیکھتے ہی دیکھتے حسد کی آگ میں بدل گئی۔ اس خواہش نے اسے بے چین کردیا کہ سب کی نظروں میں رما نے جو بلند اور بے داغ امیج بنا رکھا ہے، اسے ایک پتھر مار کر شیشے کی طرح چکنا چور کردے۔۔۔

وہ اس پتھر کی تلاش میں تھی۔۔۔ کہیں سے بھی، کسی بھی طرح، ایک ذرا سا سراغ ہی مل جائے،

جب سے سنا تھا کہ رما کچھ دنوں کے لیے کہیں باہر جارہی ہے، آرتی کو ادھیڑ بن سی لگ گئی کہ کہاں اور کیوں جارہی ہے!

منوج کو ٹیلی فون کر کے پوچھا مگر اس نے کچھ نہیں بتایا۔ نہ اسوانی نے کچھ بتایا۔۔۔ کسی اور سے معلوم ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ آرتی کا تجسس اور بڑھ گیا۔۔۔ ایک عجیب اور اوچھی حرکت کر کے اس نے ایک خادمہ کو، جو رما کے گھر کے برابر والے گھر میں ملازم تھی، آمادہ کر لیا کہ وہ رما کے گھر پر نظر رکھے اور ہر آنے جانے والے کی اسے اطلاع دے۔

(۱۳)

امریکہ سے نیل کمل کا خط آیا تھا۔ اگلے مہینے وہ انڈیا آرہی ہے۔ اس کے ایک ہفتے بعد رسک بھی آجائے گا۔ پہلے کلکتہ جائے گا، اپنے ماں باپ کے پاس۔ پھر حیدرآباد آکر ان سے ملے گا۔۔۔ "ممی۔ آپ کے اپروول کے بغیر شادی نہیں ہوگی۔۔۔" اس نے لکھا تھا۔

خط ملتے ہی رما اسوانی کے آفس چلی گئی اور ہمیشہ کی طرح اسوانی کے ذریعے بیٹی کے پاس کچھ روپے بھجوا دیے۔

واپس آئی تو گھر پر پروفیسر راجن کو انتظار میں بیٹھا پایا۔ رما کو تعجب بھی ہوا، اور کسی قدر بے چینی بھی ہوئی۔ وہ اچانک آیا تھا۔ حالاں کہ رما نے کہا تھا، وہ کچھ دنوں کے لیے کہیں باہر جارہی ہے۔

راجن نے بتایا کہ اخبار میں سیمینار کا ذکر پڑھا، جس میں وہ بھی پیپر پڑھنے والی ہے، تو اسے بڑی خوشی ہوئی اور ملنے چلا آیا۔

اپنی تمام ذہانت کے باوجود رما پروفیسر راجن کو کبھی سمجھ نہ پائی تھی۔

"آنند کے بارے میں سن کر بڑا افسوس ہوا۔ میں جانتا ہوں تمہارے لیے کتنا بڑا صدمہ ہے یہ۔۔۔ کتنی ہمت سے برداشت کیا ہوگا تم نے، وہ بھی سوچ سکتا ہوں۔۔۔ بس یہی کہنے آیا تھا۔ اب چلتا ہوں۔" اور وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

رما شکریہ ادا کرنے کے لیے کچھ کہنے لگی تو بات کاٹ کر بولا۔۔۔ "مگر یاد رکھو رما۔ زندگی ایک کہانی سے نہیں بنتی۔ اس میں کئی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ چھوٹی لگنے کے باوجود یہ زندگی بہت لمبی ہوتی ہے اور بڑی ہونے کے باوجود یہ دنیا بہت چھوٹی ہے۔۔۔ انیتا کے ساتھ مجھ پر کیا گزری، تم نہیں جانتیں۔ جان بھی نہیں سکتی تھیں! پھر کبھی بتاؤں گا۔۔۔ آج میں اپنے غم کی

داستاں سنانے نہیں آیا ، تمھارا غم بانٹنے آیا تھا کیوں کہ میں تمھارا ٹیچر ہی نہیں ، دوست بھی رہا ہوں ۔"

رما بیٹھی خاموشی سے سنتی رہی ۔ وہ اسے چھوڑنے دروازے تک بھی نہ جاسکی ۔ اس کے ذہن کے پردے پر دھند میں لپٹی کئی تصویریں ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑنے لگیں ۔ جیسے ٹرانس میشن کی خرابی سے ٹی ۔ وی کے اسکرین پر ہوتا ہے اور پھر ان میں سے ایک تصویر کے خدوخال واضح ہونے لگے ۔ ۔ ۔

کالج میں رما پروفیسر راجن کے کمرے میں بیٹھی تھی ۔ کلاس کے بعد راجن نے اسے بلایا تھا ۔ منوج پہلے سے وہاں بیٹھا تھا ۔ میز پر سے ایک فائل اٹھا کر رما کو دیتے ہوئے راجن بولا ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ " کانگریے چولیشن ۔ ۔ ۔ تم نے پھر ایک بہت خوب صورت ڈراما لکھا ہے ۔ نئی تکنیک کے ساتھ ۔ ٹاپک میں بھی یونیورسل اپیل ہے ۔ ۔ ۔ میں نے ایک ہی سیٹنگ میں پڑھ ڈالا ۔"

" شکریہ ۔ ۔ ۔" رما کے منھ سے نکلا ۔

" ان سے ملو ۔ منوج کمار ورما ۔ ۔ ۔ مشہور جرنلسٹ اور کریٹک ۔ ۔ ۔ تمھارے قدر داں ۔ تمھارے پچھلے ڈرامے پر ان کا تعریفی ریویو تم پڑھ ہی چکی ہو ۔ ۔ ۔"

" نمستے ۔ ۔ ۔" رما نے منوج کی طرف دیکھا " آپ کی تعریف نے میرے حوصلے بڑھا دیے ۔"

منوج بولا ۔ ۔ ۔ " مس رما دیوی ۔ ۔ ۔ آپ کے ڈرامے میں نے پڑھے بھی ہیں اور دیکھے بھی ہیں ۔ آپ نے اس آرٹ کو ایک نیا ڈائمنشن دیا ہے ۔ اسے آگے بڑھایا ہے ۔"

رما منوج کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی مگر راجن بول پڑا ۔ ۔ ۔ " رما ۔۔۔ منوج صاحب تم سے ملنا چاہتے تھے ۔ اسی لیے میں نے تمھیں بلایا بھی ۔ وہ تمھارا نیا ڈرامہ اپنی آرٹ سوسائٹی کے تھیٹر گروپ کے تحت پروڈیوس کرنا چاہتے ہیں ۔ وہ اس سوسائٹی کے سکریٹری بھی ہیں ۔ ۔ ۔ تم کہو تو یہ ڈراما انھیں دے دوں ۔ ۔ ۔ ؟ "

" یہ تو میرے لیے بڑی خوشی اور فخر کی بات ہوگی ۔ ۔ ۔" رما بڑی مشکل سے کہہ سکی ۔ وہ نروس ہوتی جارہی تھی ۔

فائل لے کر جاتے ہوئے منوج بولا ۔ ۔ ۔ " تھینکس مس رما دیوی ۔ میں اسے پڑھنے کے بعد پھر آپ سے بات کروں گا ۔ ۔ ۔"

منوج کے جانے کے بعد رما بھی اٹھنے لگی تو چپراسی چائے لے کر آگیا ۔ ۔ ۔ راجن بول پڑا ۔ ۔ ۔ " ٹھہرو رما ۔ چائے پی کر جاؤ ۔ میں اور منوج پہلے ہی پی چکے تھے ۔"

رما گردن جھکائے چائے پی رہی تھی مگر اسے محسوس ہورہا تھا کہ پروفیسر راجن کی نظریں اسی پر ہیں ۔ ۔ ۔ " تمھاری اسٹڈیز کیسی چل رہی ہیں ؟ " ۔ ۔ ۔ رما کی بڑھتی ہوئی بے چینی کو بھانپ کر راجن نے پوچھا ۔

" ٹھیک ہی چل رہی ہیں سر ۔" رما نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا ۔

" گڈ ۔ ۔ ۔ مجھے یقین ہے ۔ فائنل میں بھی تم ہی ٹاپ کروگی ۔ ۔ ۔"

اسی لمحے انیتا آگئی ۔ ۔ ۔ " ساری پروفیسر صاحب ۔ ۔ ۔ شاید میں نے ڈسٹرب کردیا ۔" ۔ ۔ ۔ ہمیشہ کی طرح اس کے چہرے پر شرارت آمیز مسکراہٹ موجود تھی ۔

جواب دیتے ہوئے راجن بھی دھیرے سے مسکرانے لگا ۔ ۔ ۔ " ڈسٹرب تو تم کلاس میں کرتی ہو ۔ اب آگئی ہو تو بیٹھ جا

. . . چائے پیجئے . . ."

راجن نے چپراسی کی میلی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو انیتا روکتے ہوئے بولی . . . " او نو . . . چائے نہیں پروفیسر صاحب شکریہ میں تو رما کی تلاش میں چلی آئی . . ."

" ایسی کیا بات ہے ، انیتا ؟ " پروفیسر نے پوچھا ۔

" اور تمھیں کیسے معلوم تھا ، میں یہاں ہوں گی ؟ " رما بولی ۔

" معلوم نہیں تھا . . . یقین تھا . . . تم یہیں ہوگی ." انیتا بولی . . . " جاؤ ، تمھیں آنند ڈھونڈھتا پھر رہا ہے ."

چائے کا آخری گھونٹ جلدی سے لے کر رما نے پروفیسر سے اجازت لی اور جانے لگی ۔ جاتے جاتے اس نے سنا . . .

" آنند کون ؟ " . . . پروفیسر انیتا سے پوچھ رہا تھا ۔

" آپ کو پتہ نہیں ؟ . . . تعجب ہے ." انیتا کہہ رہی تھی . . . " ان دنوں رما آنند کے ساتھ کالج آتی اور جاتی ہے . . . نند کا کالج بھی پاس ہی ہے . . ."

انیتا اور بھی کچھ کہتی رہی ۔ مگر رما رکی نہیں . . . چلی گئی ۔

اور پھر وہی ٹرانس میشن کی خرابی ۔ رما کے ذہن کے پردے پر تصویروں کے کئی فریم گڈمڈ ہوکر آگے پیچھے تیزی سے حرکت نے لگے . . . بیچ بیچ میں کوئی فریم پل دو پل کے لیے رک بھی جاتا . . .

. . . کالج کے کینٹین میں رضیہ اس سے کہہ رہی ہے " . . . وہ بےوقوف پروفیسر راجن سب کے سامنے تمھاری تعریفیں ں کرتا پھرتا ہے ؟ . . . سب لڑکیاں تم سے جلنے لگی ہیں . . . انیتا نے تو قسم کھائی ہے کہ اس سال فائنل میں تمھیں ٹاپ نہیں نے دے گی . . . رما ۔ مجھے یقین ہے ، تمھارے نوٹس کی فائل گم نہیں ہوئی ہے ، انیتا نے چرائی ہے ."

تصویریں پھر گڈمڈ ہوکر دوڑنے لگیں . . . ایک تصویر لمحہ بھر کے لیے رکی بھی تو پھیلی پھیلی سی ، دھندلی دھندلی سی ۔ البتہ آواز یں آرہی تھی . . . شاید کلاس روم میں کوئی لڑکی کسی سے کہہ رہی تھی . . . اس پروفیسر راجن نے اب تک شادی کیوں نہیں کی ؟ ی عمر ہونے کو آگئی . . . ! سب لڑکیوں کو پریشان کر رکھا ہے . . . وہ انیتا تو سنا ہے اس کے گھر کے چکر بھی لگا رہی ہے . . . !

اور پھر دوسری آواز . . . مگر وہ تو رما پر مرتا ہے ۔

مگر اس کے بعد رما کے ذہن کے پردے پر ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑتی ہوئی بےترتیب تصویروں کا انتشار یک ت رک گیا اور اس کی بجائے فلیش بیک کا تسلسل پھر قائم ہوگیا ۔

رما پروفیسر کے کمرے سے نکلی تو کالج کے کاریڈور میں آنند مل گیا . . . " تو آپ کی دوست کا خیال صحیح نکلا . . . ہم ں دیر سے ڈھونڈھتے رہے اور اس نے ایک منٹ میں ڈھونڈھ لیا آپ کو . . . کیا نام ہے اس کا . . ." آنند سوچنے لگا ۔

" انیتا ۔ اور میری دوست نہیں ، وہ ." رما بولی

" ہو بھی نہیں سکتی ۔ اور اس میں تعجب کی کیا بات ہے ؛ قدرت نے ایک دم ساری خوبیاں آپ کو جو دے دی ہیں . . . خیر

چھوڑیے ان باتوں کو ۔ جلدی سے گھر چلیے ۔ آپ کے ڈیڈی انتظار کر رہے ہیں ۔"

" ڈیڈی ۔۔۔ ؟ "۔۔۔ رما نے حیرت سے پوچھا ۔

" ہاں ۔۔۔ یکایک کہیں سے آ دھمکے ۔۔۔ کہنے لگے جلدی میں ہوں ۔ آپ سے ملنے کے لیے بے چین ہو رہے ہیں ۔"

کالج کے سیڑھیوں سے اترتے ہوئے رما نے شرارت سے طنز بھرے لہجے میں پوچھا ۔۔۔ " تعجب ہے ۔ آپ کے ہوتے ہوئے ڈیڈی میرے لیے بے چین ہو رہے ہیں ! ۔۔۔ ذرا دون میں تو وہ آپ کو چھوڑ نہیں رہے تھے ۔۔۔ ؟ "

آنند کب چوکنے والا تھا ۔۔۔ " جناب ۔۔۔ میں تو سمجھتا ہوں ، اب بھی وہ مجھ سے ہی ملنے گئے تھے ۔ دیکھتے ہی خوش ہوگئے ۔ خوب باتیں بھی ہوئیں ۔۔۔ اب شرما حضوری آپ سے بھی مل ہی لیں گے ۔۔۔ گھڑی ، وہ گھڑی ۔ چلیے ۔۔۔" اور وہ اپنی اسکوٹر لانے چل دیا ۔

گھر پہنچی تو ڈیڈی موسی کے ساتھ پنچ کے ہال میں بیٹھے چائے پی رہے تھے ۔ رما کو لے کر اس کے کمرے میں چلے گئے ۔۔۔ " بیٹی ۔ رپورٹنگ ٹائم ہوگیا ہے ۔ اس پلین سے میرا جانا بہت ضروری ہے ۔ ورنہ رک جاتا ۔ تو جانتی ہے ، میں تو ایک پل بھی تجھ سے دور رہنا نہیں چاہتا ۔۔۔ پر کیا کروں ۔ تیری پڑھائی کا مسئلہ ہے ، اور میری ڈیوٹی کا ۔۔۔ ذرا دون سے نکلتے تجھے اطلاع کرنے کی مہلت بھی نہیں لی ۔۔۔ مدراس کی فلائیٹ میں چار گھنٹے باقی تھے سو تجھ سے ملنے چلا آیا ۔۔۔"

" بہت اچھا کیا ۔۔۔ ورنہ پچھلی دفعہ تو سیدھے ایر پورٹ سے ہی پونا چلے گئے تھے ۔" رما بولی ۔

ڈیڈی کرسی گھسیٹ کر رما کے اور پاس آ بیٹھے ۔۔۔ " یہ دیکھ کر کہ آنند کے یہاں کوٹھی میں آ کر ٹھہرنے پر تجھے کوئی اعتراض نہیں ہے ۔۔۔ مجھے اطمینان ہوگیا ۔۔۔ بلکہ خوشی بھی ۔"

" خوشی کیوں ڈیڈی ۔۔۔ ؟ " رما نے پوچھا ۔

" وہ میری بہن کا لڑکا ہے ۔ اس کے پتا بہت اچھے آدمی تھے ۔۔۔ وہ خود بھی بڑا دل چسپ کیرکٹر ہے ۔ مجھے یقین تھا ، تو اس کی کمپنی پسند کرے گی ۔۔۔

" آنند نے یہاں ہر ایک کا دل موہ لیا ہے " رما نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

" میں جانتا تھا ۔۔۔ میں جانتا تھا " ۔۔۔ اور گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے ۔ ایک دو قدم چل کر پھر واپس آکر بیٹھ گئے ۔۔۔ دوسری بات جو مجھے کہنی تھی وہ یہ ہے کہ ۔۔۔ جیسا کہ تم جانتی ہو یہ کوٹھی تمھاری ہے ۔ تمھاری آنٹی شروع ہی سے یہاں رہتی آئی ہیں ۔ اس لیے کہ میرے سوا ، دنیا میں ان کا کوئی اور نہیں تھا ۔ تمھاری ممی کے بعد انھوں نے ہی اس کوٹھی کی دیکھ بھال کی کیوں کہ مجھے سروس میں زیادہ تر باہر ہی رہنا پڑتا تھا ۔ میں چاہتا ہوں بیٹی کہ انھیں کوئی تکلیف نہ ہو ۔ وہ اسی طرح رہیں جیسے یہ ان ہی کا گھر ہے ۔ انھوں نے بیماری کے دنوں میں تمھاری ممی کی بہت دیکھ بھال کی تھی ۔"

" ڈیڈی ۔۔۔ آپ ایسی باتیں کیوں کہہ رہے ہیں ! کیا آپ مجھے نہیں جانتے ؟ "

" جانتا ہوں بیٹی ۔ بہت اچھی طرح ۔ شاید کوئی باپ اپنی بیٹی کو اتنا نہیں جانتا ہوگا ۔۔۔ پھر بھی میں چاہتا تھا کہ ایک دفعہ تم سے کہہ دوں ۔۔۔ کہہ دیا دل ہلکا ہوگیا ۔۔۔" کہتے ہوئے ڈیڈی نے اٹھ کر رما کو چوم لیا ۔۔۔ " مجھے تم پر فخر ہے بیٹی ۔"

رما نے دونوں ہاتھوں سے ڈیڈی کو بھینچ لیا ۔۔۔ " آئی لو یو ۔ آئی لو یو ڈیڈی ۔"

اس دن پروفیسر کے جانے کے بعد رما کے ذہن میں بیتے دنوں کی یادیں جاگتی ہی چلی گئیں ۔ یادوں کی بھیڑ بھی

ں ہوتی ہے ۔ جانے کہاں ، کون سی تہوں میں برسوں چھپی پڑی رہتی ہیں ۔ ایک ذرا سے بہانے کے انتظار میں ۔ ذرا چھیڑا کسی
ا کہ بس امڈ پڑتی ہیں ، سیلاب کی طرح ۔

جانے کب تک رما اپنے ڈرائنگ روم کے صوفے پر نیم دراز ، آنکھیں بند کیے اس سیلاب میں بہتی رہی ۔

نگار سجاد ظہیر

سیف الملوک اور بدیع الجمال

سیف الرحمن بالکل تنہا وادیِ فاران کے انتہائی دل فریب گوشے میں ایک ترشی ترشائی سلیٹی مائل سفید چٹان پر چپ چاپ بیٹھا تھا ۔ اس کے ارد گرد بلا کا حسن اور دل فریبی تھی ۔ چند گز آگے ایک نہر سی بہہ رہی تھی جو شمالی برفیلے پہاڑوں سے اترتی تھی ۔ نہر کا پانی اس قدر ٹھنڈا اور شفاف تھا جس کے بیان کے لیے سیف کے پاس کوئی تشبیہہ اور کوئی استعارہ نہیں تھا ۔ نہر کے دوسرے کنارے پر سبز لینڈ سکیپ کی انتہا پر پہاڑی سرحد تھی جس پر کہیں کہیں برف جمی تھی اور دن بھر کا تھکا ماندہ سورج ان پہاڑوں کے پیچھے بسیرے کی تیاریوں میں تھا ۔

سیف سے تھوڑے فاصلے پر ایک ترشی ترشائی سلیٹی مائل سفید چٹان پر ایک نیا شادی شدہ جوڑا پہلو سے پہلو ملائے باتوں میں مصروف تھا ۔ اس طرح کے کئی جوڑے وادی میں اسے ملے تھے جو ہنی مون منانے آئے تھے ۔ ہنی مون منانے تو شاید اسے بھی آنا چاہیے تھا کہ اس کی شادی بھی گذشتہ ماہ ہی ہوئی تھی مگر فی الوقت وہ بالکل تنہا تھا ۔ اسے اپنی بیوی زہرہ جمال یاد آئی اور اس کا دل دکھ سے بھر گیا ۔

زہرہ جمال اس کی خالہ زاد تھی ، ایک بدصورت اور بھدی سی لڑکی ۔ ویسے تو پڑھی لکھی تھی اور ایک میگزین میں کام بھی کرتی تھی لیکن یہ تھا کہ اس کی طرف دیکھنے سے دل دکھ سے بھر جاتا تھا ۔ اس میں کچھ بھی تو دیکھنے کے لائق نہیں تھا ۔ درمیانہ قد ، بھدا جسم جس پر قیمتی سے قیمتی اور خوب صورت سے خوب صورت ملبوس بھی اپنا حسن کھو دیتا تھا ۔ سیاہی مائل رنگت ، بال لمبے ضرور تھے مگر بے رونق ، پھیکے اور بے کشش ، روڑوں سے بھری ہوئی تنگ پیشانی ، بھجی بھجی چھوٹی آنکھیں جو ہنسنے پر غائب ہو جاتی تھیں ۔ بدنما ، موٹے سیاہی مائل ہونٹ جن پر کسی بھی شیڈ کی لپ اسٹک اچھی نہ لگتی ، چہرے پر کیل مہاسے اور چھائیوں کے نشان الگ ۔ ۔ ۔ خاندان کی وہ واحد بدصورت لڑکی تھی ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ خالو بہت کم شکل تھے ۔ ستم یہ تھا کہ خالہ کے تینوں بیٹے خالہ پر گئے تھے اور خاصے قبول صورت تھے تاہم ان کی اکلوتی بیٹی زہرہ جمال باپ پر چلی گئی تھی ۔ خالہ اس کی طرف سے بہت فکر مند تھیں ۔ خود زہرہ جمال اپنی طرف سے بے پرواہ نہیں تھی ، رنگ روپ کے نکھار کا ہر ٹوٹکا آزمایا تھا ، بیوٹی پارلر بھی جاتی تھی ، ہو سکتا ہے کچھ فرق پڑا بھی ہو مگر اس کی بدصورتی اور جسم کا بھدا پن ڈھل نہ سکا ۔

بالآخر بہن نے بہن کا دکھ یوں بانٹا کہ اپنے بیٹے سیف کے لیے زہرہ جمال کا رشتہ مانگ لیا ۔ سیف الرحمن پر بجلی گر پڑی اس نے ماں کے آگے بہت سے حیلے بہانے کیے مگر ماں کے آنسو شاید دنیا کا سب سے طاقت ور ہتھیار ہیں اور یوں نہ چاہتے ہوئے بھی زہرہ جمال جو کہیں سے بھی نہ زہرہ تھی نہ جمال اس کی بیوی بن گئی ۔

ایک گہری سانس لے کر سیف نے اپنے ہاتھ پیچھے کی جانب چٹان پر ٹکا دیے ۔ سامنے کے سبزہ زار پر ، نہر کے دوسرے

نظارے ، چند نوجوان کیمپنگ میں مصروف تھے ۔ سورج ڈوب چکا تھا ۔ شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا ، وادی میں بجلی تو تھی مگر گھروں ، ہوٹلوں اور دوکانوں کی حد تک ، سڑکوں پر اندھیرا ہی رہتا تھا ۔ لہذا اب لوگوں نے واپس جانا شروع کردیا تھا ۔ وہ خاصا قنوطی ہورہا تھا لہذا چپ چاپ بیٹھا لوگوں کو دیکھتا رہا ۔ نہر کے دونوں اطراف کو ایک لکڑی کے معمولی سے پل کے ذریعہ جوڑا گیا تھا ۔ نہر کی دوسری طرف سے لوگ اس پار واپس آرہے تھے ، انہی میں ارشد اور ناہید کو دیکھ کر اس نے اچانک واپسی کا ارادہ کرلیا ۔ تیزی سے اٹھا اور نیم اندھیرے میں اپنے ہوٹل کی طرف بڑھنے لگا ۔

ارشد اس کا بڑا اچھا دوست تھا ، یہ دوستی دفتر میں شروع ہوئی اور وہیں پروان چڑھی ۔ دونوں کو دفتر میں ایک ہی کمرہ ملا ہوا تھا ، ہم مزاجی نے دونوں کو جلد ہی دوست بنا دیا تھا ۔ دفتر ہی کے کام کے سلسلے میں دونوں کو ایبٹ آباد آنا تھا ۔ کام تو دو ن ہی کا تھا مگر آگے تین دن کی مزید چھٹیاں لے کر انھوں نے ناران تک گھوم آنے کا پروگرام بنایا تاکہ جھیل سیف الملوک میں طلوع آفتاب کا منظر دیکھ سکیں جس کے بارے میں بڑی جادوئی باتیں وہ سن چکے تھے ۔ دونوں کا ارادہ تھا کہ اپنی بیویوں کو ساتھ لے جائیں گے لیکن اچانک ہی سیف نے زہرہ کو ڈراپ کردیا ۔

زہرہ کو ڈراپ کرنے کی وجہ صرف سیف کو معلوم تھی ۔ ارشد اور اس کی بیوی ناہید سے تو اس نے بہانہ بنایا تھا کہ زہرہ ی طبیعت خراب ہے ۔ اصل بات یہ تھی کہ اسے زہرہ کو ساتھ لے جانے کا حوصلہ نہیں تھا ۔ وہ جب بھی زہرہ کے ساتھ باہر جایا تا اسے اپنے چاروں جانب استعجابیہ نگاہیں اور طنزیہ مسکراہٹوں کے ناگ رینگتے محسوس ہوتے جو اس کے جسم پر چڑھ آتے ، اسے جگہ گہ سے ڈس لیتے اور وہ واپس گھر پہنچتا تو زہر کے اثر سے اس کا بدن نیلا پڑچکا ہوتا ۔ پھر اس نے زہرہ جمال کے ساتھ باہر نکلنا ند کردیا ۔ قنوطی سا ہوگیا تھا یا تو چپ چاپ گھر میں پڑا رہتا یا اکیلا ہی گھر سے نکل جاتا ۔

ناران کی جس نیم کچی اور نیم پختہ سڑک پر وہ چل رہا تھا اس پر دائیں بائیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹے بڑے ہوٹل بنے ہوئے تھے جہاں گرمیوں کی وجہ سے سیاحوں کا خاصا رش تھا ۔ نہر سے ہوٹل تک کے درمیانی راستے میں اسے چھ سات نوبیاہتا جوڑے ملے ۔ ہنستے مسکراتے ، خوش باش ، نئی زندگی کی لذتوں سے سرشار جوڑے !! حیرت ہے سب کی بیویاں خوب صورت تھیں س کا منہ کڑواہٹ سے بھر گیا ، جھلاہٹ میں اس نے کھانا کھانے کا ارادہ بھی ترک کردیا اور ہوٹل پہنچ کر سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا ۔

تھوڑی دیر بعد برابر والا کمرہ کھلنے کی آواز آئی ، شاید ارشد اور ناہید واپس آگئے تھے ، پھر دروازے پر اس نے ارشد کی آواز سنی ۔

"سیف کھانا کھا لیا ؟"

وہ چپ چاپ دبکا پڑا رہا ۔

چند لمحوں کے بعد دروازے پر دستک ہوئی "سیف ، او سیف الرحمٰن ۔ ۔ ۔"

وہ دم سادھے بیٹھا رہا ۔

پھر ایک کاغذ کا ٹکڑا دروازے کی درز سے کمرے میں آ گرا ۔ باہر ارشد اور ناہید کی باتوں کی آوازیں آرہی تھیں ۔ پھر کچھ دروازہ بند ہوا اور ارشد کے جوتوں کی اور ناہید کے سینڈل کی ٹک ٹک نے بتایا کہ وہ راہداری سے گزر کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ چکے ہیں ۔ اس نے آگے بڑھ کر پرچہ اٹھایا لکھا تھا ۔ "ہم مینا ہوٹل چڑھ کھانے جارہے ہیں ، اگر تم دس بجے تک واپس آجاؤ تو واپس ملیں گے ۔ ارشد ، ناہید ۔"

اس نے کاغذ کو پھاڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا ۔ بجلی کا لٹکتا جھولتا ہوا بلب ، جس سے مری مری پیلی روشنی ۔۔۔

ہوئی تھی ۔ بجھا کر کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگانے لگا ۔

اتنا قنوطی تو وہ کبھی نہیں تھا جتنا اب ہوگیا تھا ۔ اچھا ہوتا وہ بھی زہرہ کو ساتھ لے آتا ۔ اس نے دھواں چھوڑتے ہوئے تاسف سے سوچا ۔ مگر دوسرے ہی لمحے ناہید مجسم سے اس کے سامنے سے گزر گئی اور وہ بوکھلاسا گیا ۔ کیا ضروری تھا کہ ناہید اتنی خوب صورت ہوتی ؟ سڈول جسم جس پر خراب سے خراب اور بےتکے سے بےتکا ملبوس بھی سج جاتا ۔ کندن رنگ ، ہنستا ہوا شاداب چہرہ ، کشادہ روشن پیشانی ، کمان ابرو ، غلافی آنکھیں ، نازک سی ناک میں ہیرے کی لونگ کا شکارا ، گلابی ہونٹوں پر سدا بہار مسکراہٹ ، سیاہ بالوں کا ادھ کھلا ، ادھ بندھا جوڑا ، وہ تو ہر روپ میں دیوی لگتی تھی ، ارشد اس کا دیوانہ تھا تو ٹھیک ہی تھا ۔

اچھا ہوا وہ زہرہ کو ساتھ نہیں لایا ۔ اگر لے آتا تو یہاں اسے اپنی بدصورتی کا اتنا شدید احساس ہوتا کہ شاید کسی پہاڑی سے کود کر خودکشی کرلیتی ۔

دوسری صبح وہ بہت جلدی اٹھ گیا ، اس نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا تو دم بہ خود رہ گیا ، ان کا ہوٹل کسی پہاڑی پر بنا ہوا تھا لہذا بلندی پر تھا ۔ نیچے پوری وادیِ فاران ایک جادوئی کہرے میں لپٹی پڑی تھی ۔ سرو اور سفیدے کے اونچے اونچے درختوں کے جھنڈ ، پہاڑیاں ، نہر ، مکانات ، ہوٹل ، سڑک کوئی بھی چیز صاف نظر نہیں آرہی تھی ، دھیرے دھیرے چلنے والی صبح کی ٹھنڈی ہوا جادو کے اثر کو دو آتشہ کر رہی تھی ۔

سیف نے کھڑکی بند کردی ، تیار ہوا اور باہر نکل گیا ۔ کمرے کو لاک کرتے ہوئے اس نے ایک نظر برابر والے بند کمرے پر ڈالی ، کل بھی دونوں دیر سے سو کر اٹھے تھے ۔ وہ سیڑھیاں اتر کر ہوٹل سے باہر آگیا ، جیب سے اونی ٹوپی نکال کر سر پر جمایا اور نیم کچی نیم پکی سڑک پر ڈھلوان کی طرف اترنے لگا ۔ ایک دو کے سوا سڑکوں پر سناٹا تھا ۔ سیاحوں کی اکثریت ہوٹلوں کے گرم کمروں میں کمبلوں میں دبکی ہوئی تھی حالاں کہ حق تو یہ تھا کہ اس وقت قدرت کی صناعی کا نظارہ کیا جاتا ۔

ہر طرف سرور آگیں ، جادوئی حسن بکھرا ہوا تھا ۔ پھر وہی حسن !

حسین وادی ۔

حسین صبح ۔

اس قدر حسن تخلیق کرنے والے رب نے کیا سوچ کر زہرہ جمال کو بنایا تھا ؟

وہ پھر الجھ گیا ۔

نہر پر پہنچا تو مبہوت ہوکر رہ گیا ۔ رات نہر بہہ رہی تھی ، اس وقت جمی ہوئی تھی اور جیسے برف پر سے دھواں اٹھتا ہے بالکل اسی طرح نہر کی سطح سے دھواں اٹھ رہا تھا ۔ اتنا خوب صورت منظر اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا ۔ وہ سحر زدہ معمول کی طرح پھر اسی تراشی ترشائی سلیٹی مائل سفید چٹان پر چپ چاپ بیٹھ گیا اور قدرت کے حسن کو بوند بوند اپنی ترسی ہوئی پیاسی آنکھوں سے اپنے اندر اتارنے لگا ۔

خدا جانے کتنا وقت گزر گیا ۔

" تم یہاں بیٹھے ہو ۔" اس نے اپنی پشت پر ارشد کا گھونسا محسوس کیا " چلو جیپ کا بندوبست ہوگیا ہے ۔"

" کہاں ؟ " اس نے پوچھا ۔

" ارے جھیل سیف الملوک کا پروگرام تھا یار ۔ ۔ ۔ کیا بھول گئے ؟ "

"او۔۔۔ہاں ۔۔۔ مگر اب تو دیر ہوگئی ہے۔"

"دیر، دیر کچھ نہیں ہوئی۔ چلو جیپ تیار ہے۔"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے ہوٹل کی طرف چل پڑے، جو زیادہ دور نہیں تھا۔ ہوٹل کے سامنے جیپ کھڑی تھی جس میں ایک جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ یہ جوڑا بھی انہی کے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ان سے علیک سلیک ہوگئی تھی اور جھیل جانے کے پروگرام میں یہ بھی شامل ہوگئے تھے۔ جیپ میں بیٹھتے ہوئے ایک اچٹتی سی نظر سیف نے اس کی بیوی پر ڈالی۔ کمال ہے، اس کی بیوی بھی خوب صورت تھی!

یہ اتنی بہت سی خوب صورت عورتیں کہاں سے آگئی تھیں؟

جھیل سیف الملوک تک کا راستہ بہت دشوار گزار اور خطرناک تھا۔ ابتدا میں کچے راستوں پر جیپ اچھلتی، کودتی چلتی رہی، پھر بڑے بڑے گلیشیر کو عبور کرتے ہوئے اس کی رفتار اتنی کم ہوجاتی کہ ارد گرد پیدل چلنے والے اس سے آگے نکل جاتے۔ بلندی پر جاتے ہوئے مزید خطرے کا سامنا تھا۔ ایک طرف پہاڑ کی دیوار اور دوسری طرف سیکڑوں فیٹ نیچے بہنے والا دریا، جس کا شور وادی میں گونج رہا تھا۔ ڈرائیور کی ذراسی خطا زندگی اور موت کے درمیانی فاصلے آن واحد میں ختم کرسکتی تھی۔

جب منزل پر پہنچ کر جیپ رکی وہ سب ایک ایک کر کے جیپ سے نیچے اترے تو سیف کو سخت تشویش تھی۔

"جھیل کہاں ہے؟"

"یہ رہی صاحب جھیل" ڈرائیور اس کے بچکانہ سوال پر دل کھول کر ہنسا اور سامنے اشارہ کیا۔

"اچھا۔ یہ جھیل ہے؟؟" وہ سب حیرت سے بڑبڑائے، حیرت کی بات بھی تھی وہ جھیل کے بجائے ایک وسیع و عریض سبز شیشہ نظر آرہی تھی جسے قدرت کے صناع ہاتھوں نے کوہ قاف کے بلند برفیلے پہاڑوں کے بیچوں بیچ زمین پر جڑ دیا تھا۔ یہ ایک عام بات ہے کہ جھیل میں پانی ہوتا ہے، پانی میں لہریں ہوتی ہیں۔ لہروں میں تموج ہوتا ہے اور تموج میں شور ہوتا ہے۔ یہ کیسی جادوئی جھیل تھی جس میں اگر پانی تھا بھی تو لہریں تھیں نہ تموج، شور تھا نہ مدوجزر۔ یہاں تو ایک سحر آگیں خاموشی تھی۔ وہ سب دھیرے دھیرے چلتے ہوئے جھیل کے کنارے آکر رک گئے تھے اور ایسے نظر جماکر جھیل کے ساکت پانی کو دیکھ رہے تھے جیسے وہ ابھی اچھل پڑے گا اور اسی طرح بہہ نکلے گا جیسے وہ دریا کا پانی بہتا چھوڑ آئے تھے۔

"اس جھیل میں پانی پڑا رہتا ہے صاحب" ڈرائیور نے شاید ان کی آنکھوں کا سوال پڑھ لیا تھا۔

کیوں؟ بے ساختہ ناہید کے منہ سے نکلا تھا۔

"کیوں کہ اس کے چاروں طرف پہاڑ ہی پہاڑ ہیں، جس کی وجہ سے ہوا رکتی ہے۔ ہوا ہوگی تو لہریں بھی اٹھیں گی بی بی جی۔"

بات تو وہ صحیح کہہ رہا تھا۔ سیف نے آگے بڑھ کر جھیل کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھے ہوئے اس کے ساکت پانیوں میں ہاتھ ڈالا تو گویا کرنٹ لگا۔ پانی اس قدر ٹھنڈا تھا جیسے پگھلی ہوئی برف۔۔۔ اصل میں یہ گرد و گرد کے پہاڑوں کی پگھلی ہوئی برف ہی تو تھی جو جھیل کی صورت میں جمع ہوگئی تھی۔

"صاحب گھوڑے چاہیے۔" ایک مفلس سا بوڑھا اس سے پوچھ رہا تھا۔

سیف کو معلوم تھا کہ یہاں گھوڑے والے سیاحوں کو گھوڑے پر بٹھا کر پوری جھیل کا چکر لگواتے ہیں۔

"کتنا لوگے؟" ناہید نے پوچھا۔

" ایک چکر کے چالیس روپے صاحب ۔"

" چلو ٹھیک ہے ۔ ہمیں دو گھوڑے چاہئیں ۔" ارشد نے کہا ۔

اس منحنی سے بوڑھے نے وہیں سے کسی بلند خان کو آواز دی ۔ ایک اور ادھیڑ عمر اور مضبوط جسم کا آدمی ایک اور گھوڑے کی باگ پکڑے آ موجود ہوا ۔ اس کے گھوڑے پر ارشد اور ناہید سوار ہوگئے ۔

سیف نے منحنی بوڑھے کے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے اس سے پوچھا "کیا نام ہے آپ کا ؟"

" میرا نام اکبر خاں ہے صاحب " بوڑھے نے جواب دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا ۔ بلند خاں اپنا گھوڑا آگے بڑھا چکا تھا ۔

" کیا بات ہے ؟ " سیف نے پوچھا ۔ " کس کا انتظار ہے ؟ "

" آپ کا بیگم صاحب کدھر چلا گیا ؟ " اس نے پھر ادھر ادھر دیکھا ۔

" میں اکیلا ہوں " سیف نے جواب دیا ۔

" او ہو ۔ ۔ ۔ اچھا ابھی آپ نے شادی نہیں بنایا ۔" اکبر خاں مطمئن ہوکر گھوڑے کی باگ تھام کر چل پڑا ۔

" یہ جھیل واقعی بہت خوب صورت ہے ۔" سیف الرحمن بولا ۔ وہ اپنے داہنے جانب ، پہاڑوں کے بیچوں بیچ ساکت پڑی سبز جھیل کو حیرت سے دیکھ رہا تھا ۔

" کھوب صورت کیوں نہ ہوئے گا صاب ۔ ایدر پری بدیع الجمال اپنی سہیلیوں کے ساتھ نہاتا تھا ۔" اکبر خاں نے جواب دیا ۔

" یہ سب تو خیر ایک افسانہ ہے ۔"

افسانہ نہیں ہے صاب ۔ ۔ ۔ آپ وہ پہاڑ دیکھ رہے ہو اکبر خاں نے دور ایک بلند برف پوش پہاڑ کی طرف اشارہ کیا ۔ " ملکا پربت ہے صاب ۔ ۔ ۔ یہاں سیف الملوک کو دیو اٹھا کر لے گئے تھے ۔"

سیف قہقہہ مار کر ہنس پڑا ۔ وہ جب سے اس سفر پر نکلا آج پہلی بار خوش دلی سے ہنسا تھا ۔

" شہزادہ سیف الملوک اور پری بدیع الجمال کا قصہ تو محض ایک من گھڑت افسانہ ہے اکبر خاں ۔" سیف نے پھر اپنی بات پر زور دیا ۔

اکبر خاں نے بڑے تاسف سے سر ہلایا جیسے اسے سیف کی ذہنیت پر افسوس ہو لیکن ہار نہ مانتے ہوئے بولا ۔

" او من گھڑت داستان نہیں ہے صاب ۔ ۔ ۔ شہزادہ سیف الملوک مصر کے بادشاہ عاصم کا بیٹا تھا ۔

" عاصم بن صفوان شہزادہ والی تخت مصر دا   آیا شاہ سلیمان دوجا ، صاحب دولت زر دا

اکبر خاں لہک لہک کر منظوم داستان گانے لگا ۔

" آپ کو پنجابی آتی ہے صاب ؟ " اچانک اس نے رک کر سیف سے پوچھا ۔

" ہاں کچھ تو آتی ہے ۔"

اکبر خاں مطمئن ہوکر پھر چل پڑا ۔ اس سے چند گز آگے بلند خاں کے گھوڑے پر ناہید اور ارشد تھے ۔ چند اور گھوڑے بھی سیاحوں کو لے کر آگے پیچھے چل رہے تھے ۔ چند نوجوانوں کی ٹولی پہاڑ کے دامن میں برف سے کھیل رہی تھی ۔

" عاصم بہت بڑا بادشاہ تھا صاب پر اس کو ایک بڑا غم تھا کہ اس کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی ۔ وہ بوڑھا ہو گیا تھا صاب ، پر اس کے کوئی اولاد نہیں ہوئی ۔ نجومیوں نے اس سے کہا کہ اگر وہ شاہ یمن کی بیٹی سے شادی کرلے تو اس

کے یہاں ایک بیٹا پیدا ہوگا ۔ اس طرح شاہ بدخشاں کی بیٹی سے عاصم بادشاہ کی شادی ہوگئی صاحب اور پھر ان کے یہاں سیف الملوک پیدا ہوا ۔ یہ جھوٹ نہی ہے صاحب ۔ یہ تو سچا قصہ ہے ۔ اب بادشاہ نے پھر نجومیوں کو بلایا اور شہزادے کے بارے میں پوچھا تو نجومیوں نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ شہزادے کی شان و شوکت تو بہت ہوگی مگر نوجوانی میں اسے عشق کی چوٹ لگے گی اور اسے ایک مصیبت بھرا سفر کرنا پڑے گا ۔

پر اک اس تے چلی عمرے گردش دسے ستارا چنگ عشق دی تل اس دیسوں سفر کریسی بھارا
مارن تے کئی دشمن ڈھکسن ہوئی ایس بچا سی بہتے سخت تھکیسی دس کے اللہ آس پچاسی

اس شعر کا مطلب سمجھے صاحب ۔ اس کا مطلب ہے کہ اس سفر کے بیچ کئی دشمن شہزادے کی جان کے پیچھے پڑیں گے مگر خدا اسے بچائے گا ۔ بہت مشکل کے بعد اللہ اس کی آس پوری کرے گا ۔"

"کون سی آس ؟" سیف نے بے ساختہ پوچھا ۔ اکبرخاں کا گا گا کر اور پھر رک رک کر قصہ سنانا اسے اچھا لگ رہا تھا ۔

"پری بدیع الجمال سے ملنے کی آس صاحب ۔ ۔ ۔" اکبر خاں نے سیف کو اپنے قصے میں کامیابی سے الجھالیا تھا ۔

وہ چلتے چلتے لمبائی میں جھیل کے اختتام تک آ پہنچے تھے ۔ جو لوگ پیدل جھیل کا چکر لگانے کے ارادے سے چلے تھے وہ یہاں آ کر رک گئے تھے ۔

"یہ پوری جھیل کا چکر نہیں کاٹ سکیں گے صاحب ۔" اکبر خاں نے لوگوں کے رکنے کی طرف اشارا کرکے اسے اطلاع دی ۔

"کیوں ؟"

"یہاں سے خشکی کا راستہ ختم ہوگیا ہے صاحب ۔ آپ دیکھ رہے ہو نا جھیل پہاڑ سے مل گئی ہے ۔"

"تو ہم کیسے گزریں گے ؟"

"ہم تو گھوڑا جھیل میں ڈالے گا صاحب ۔ ۔ ۔"

"تو وہ لوگ بھی جھیل میں اتر جائیں گے ۔ کیا جھیل بہت گہری ہے ؟"

گہری تو نہی ہے صاحب ۔ پر پانی بہت ٹھنڈا ہے ۔ ٹھنڈا برف کی مافق ۔ یہ لوگ اس میں ایک قدم بھی نہی اٹھا سکتے صاحب ۔ ۔ ۔"

"تم اٹھا لوگے ؟"

"ہم تو عادی ہے صاحب ۔"

"تو اتنے ٹھنڈے پانی میں پری بدیع الجمال کیسے نہاتی ہوگی ؟" سیف الرحمٰن نے اچانک پوچھا ۔ شاید وہ اکبر خاں کا امتحان لے رہا تھا ۔

تب اکبر خاں کے ہنسنے کی باری تھی ۔ وہ دل کھول کر ہنسا ۔ اس کے ہر دو دانت کے بیچ ایک کھڑکی تھی ۔

"وہ تو پری تھی نا صاحب ۔"

"پری تھی تو کیا ہوا ؟ پری زادوں کو سردی نہیں لگتی ؟"

"جی صاحب ۔ ۔ ۔ سردی تو بس آدم زادوں کو لگتی ہے ۔ ہم جیسوں کو لگتی ہے ۔ ۔ ۔ اکبر خاں کو لگتی ہے ۔ ۔ ۔ آپ کیا جانو صاحب ۔ ۔ ۔ ؟

"میرا نام سیف الرحمن ہے۔"

"ہا!" اکبر خاں پھر منہ کھول کر ہنسا۔ دانتوں کی کھڑکیوں کے بیچ سے لال زبان ہلتی ہی نظر آئی۔ "آپ کا نام بھی شہزادہ سیف الملوک کے ماتق ہے۔ آپ کو بھی ایک بدیع الجمال ملے گا صاب۔ ۔ ۔"

"مجھے تو زہرہ جمال ملی ہے۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ اس کا دل پھر دکھ سے بھرنے لگا۔ وہ خود خاصا اسمارٹ لڑکا تھا راشد سے زیادہ اسمارٹ۔ جب راشد کو حامدہ جیسی خوش شکل بیوی مل سکتی تھی تو اسے اس سے بھی زیادہ خوب صورت لڑکی کیوں نہیں مل سکتی تھی؟ ۔ ۔ ۔ بہن نے بہن کا دکھ بانٹنے کے لیے اسے ہی کیوں منتخب کیا تھا ۔ ۔ ۔ اس کے وجود میں قطرہ قطرہ اداسی اترنے لگی۔

اکبر خاں اک ذرا رکا۔ وہ جھیل کے اختتام پر آ پہنچے تھے۔ اگلے مرحلے میں گھوڑا جھیل میں ڈال کر یہ چوڑائی پار کرنی تھی پھر دوسری طرف پہاڑوں کے دامن سے جھیل کے دوسرے سرے کا چکر لینا تھا۔ اکبر خاں نے پیروں سے چمڑے کا بوٹ اتارے اور بائیں بغل کے نیچے دبا لیے اور جھیل میں گھوڑا لے کر اتر گیا آگے بلند خان نے بھی یہی کیا تھا مگر اس نے اپنے جوتے نہیں اتارے تھے۔ جھیل کا پانی اس قدر یخ تھا کہ گھوڑے کے چلنے سے پانی کی جو چھینٹیں اچھلتیں ان سے بدن پر کپکپی سی چڑھ جاتی۔

"تم نے بوٹ کیوں اتار دیے؟ اس طرح تو تمھیں زیادہ سردی لگے گی۔" سیف نے تاسف سے کہا۔

"بوٹ خراب ہوجائیں گے صاب۔ ۔ ۔ تین سال پہلے کراچی سے ایک بوت اچھی بیگم صاب آئی تھی۔ اس نے یہ دیے تھے اور یہ کوٹ بھی اسی نے دیا تھا صاب۔ ۔ ۔" اکبر خاں نے اپنے کوٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے اطلاع دی۔

"بلند خاں نے تو اپنے جوتے نہیں اتارے۔" سیف نے پھر کہا۔ اسے کچھ شرم سی آ رہی تھی کہ خود جوان ہوکر گھوڑے پر بیٹھا ہے جب کہ اکبر خاں جیسا منحنی بوڑھا یخ پانیوں میں ننگے پاؤں چل رہا ہے۔

"اس کو بوٹ کی فکر نئی ہے صاب ۔ ۔ ۔ اس کے بوٹ پھٹ چکے ہیں۔ اس نے پیسے جمع کرلیے ہیں صاب ۔ ۔ ۔ اس سال وہ نئے بوٹ خرید لے گا۔ پھر وہ بھی میری طرح بوٹ اتار کے آئے گا صاب۔ ۔ ۔" اکبر خاں نے قہقہہ لگانا چاہا مگر ٹھٹھر کر رہ گیا سیف چاہتا تھا کہ ایک زقند میں گھوڑا جھیل کے دوسرے کنارے پہنچ جائے تاکہ اکبر خاں کو برفیلے پانی میں پاؤں جلانے کی اذیت سے نجات مل جائے۔

"گھوڑا تھوڑا تیز چلاؤ۔" سیف نے مشورہ دیا۔

"یہ کچی زمین ہے صاب یہاں گھوڑا قدم جما جما کر چلے گا۔ جھیل کے نیچے بوت سخت پتھر ہیں صاب۔ ۔ ۔" اکبر نے گویا مجبوری بتادی۔ اس نے قصہ سنانا بند کردیا تھا اور منظوم گانا بھی بند کردیا تھا شاید اس کو احساس تھا کہ اس کی آواز کپکپا جائے گی۔

اللہ اللہ کرکے جھیل کی چوڑائی کا سفر ختم ہوا۔ گھوڑا بڑی خوب صورتی سے جھیل کے دوسرے کنارے پر آ گیا۔ اک رک کر اکبر خاں نے اپنے جوتے پہنے۔ اس کنارے سے جھیل پہاڑوں سے بالکل پیوست تھی لہذا یہاں سارا سفر پہاڑوں پر ہوتا تھا بعض جگہ چڑھائی انتہائی خطرناک تھی۔ گھوڑا کئی جگہ رکتا، سم مار مار کر زمین کا اندازہ کرتا پھر قدم رکھتا۔

"اس طرف کا راستہ تو بہت مشکل ہے۔ اگر گھوڑا پھسل گیا تو ۔ ۔ ۔؟" سیف کو پریشانی ہوئی۔

اکبر خاں پھر ہنسا۔

"ایسا کبھی نئی ہوسکتا صاب ۔ اگر آپ گھوڑے کی آنکھ پر پٹی باندھ دو یہ تب بھی آپ کو یہاں سے لےکر نکل جائے گا ۔ ۔ ۔ یہ پہاڑی علاقوں کے گھوڑے ہیں صاب ۔ ۔ ۔"

اس کی یقین دہانی پر سیف کو تھوڑی تسلی ہوئی ۔ اگلے گھوڑے پر سے کبھی کبھی ناہید کی باریک سی چیخ سنائی دے جاتی ۔

"جب شہزادہ سیف الملوک چودہ برس کا ہوا نا صاب تو ملک میں جشن بنایا گیا ۔ اس جشن میں بادشاہ عاصم نے شہزادہ کو اہ ہیرے دیے ۔" اکبر خان نے دوبارہ قصہ شروع کردیا ۔ "ان شاہ ہیروں میں سے ایک پر سیف الملوک کی تصویر بنی تھی اور ں پر ایک نوجوان لڑکی کی تصویر تھی وہ بوت خوب صورت تھی صاب ۔ ۔ ۔ اتنی خوب صورت کہ شہزادہ غش کھا کے گر گیا ۔ د عشق کا روگ لگ گیا صاب اب وہ اسی فکر میں کہ یہ کس کی تصویر اے ؟ ۔ ۔ ۔ کہاں کی شہزادی اے ؟ ۔ ۔ ۔ اسے کیسے ؛ کرے ؟

عاشق دا جو دارو دے باجھ ملاپ سجن دے اوہ سیانا جان ایانا روگ نہ جانے من دے

بادشاہ عاصم نے پوری دنیا میں تلاش کرایا اس شکل کی لڑکی نہ ملی ۔ اصل میں یہ شاہ ہیرے حضرت سلمان نے بادشاہ عاصم ماندان کے بزرگوں کو دیے تھے جو باپ دادا سے ہوتے ہوئے اب سیف الملوک کو ملے تھے ۔ کچھ پتہ نئی پڑتا تھا صاب کہ یہ چہرہ ، زہرہ جبین کون اے ؟ پھر ایک رات سیف الملوک کو وہ خواب میں نظر آئی اور کہا کہ میں پریوں کی شہزادی بدیع الجمال ۔ شہزادے نے رو رو کر اس کا ٹھکانا پوچھا تو بولی میں شاہ شاہپال کی بیٹی ہوں ۔ سنہری شارستان کے باغ ارم میں رہتی ہوں ۔ بے تابی سے انتظار کر رہی ہوں ۔

مت جانے معشوق میرے نوں مول نہیں پروایاں دل پر داغ تسا ڈا دائم میل محبت چایاں

اب کیا تھا صاب شہزادہ پری کی تلاش میں نکل پڑا ۔ چودہ سال اسے ڈھونڈھتا اور خون کے آنسو روتا رہا ۔"

"لو بھلا ۔ ایک لڑکی کے پیچھے چودہ سال خوار ہوئے ۔" سیف الرحمن بڑ بڑایا "لڑکی نئی بولو صاب ۔ پری زاد تھی وہ ۔ پریوں ادی ۔ بوت خوب صورت تھی صاب وہ ۔"

پھر اکبر خاں کے اشعار شروع ہوگئے ۔ اشعار کیا قصیدے تھے جو بدیع الجمال کی شان میں کہے گئے تھے یعنی یہ کہ وہ حوروں حسین تھی ، اس کی پیشانی نور کا ایک دریا تھی ، کستوری نے اسے دیکھا تو اس کا دل دو ٹکڑے ہوگیا ۔ سورج ، آسمان ، سب اس کے حسن کا قصیدہ پڑھتے تھے ۔ جب وہ قدم اٹھاتی تو چاندی اسے سجدے کرتی ، اڑتے پرندے اسے دیکھ پاتے تو کھاکر زمین پر آرہتے ۔

سوہنا بدن چناں دا دستہ سلے وچ چھپایا کیتے جتن ہزار ہزاراں کسے نہ درشن پایا

"اچھا اچھا" سیف الرحمن کے لیے معاملہ اب خاصا ناقابلِ برداشت ہوگیا تھا ۔ اسے لگا کہ اکبر خاں اسے چڑھا رہا ہے ۔" کوئی لڑکی اتنی خوب صورت نہیں ہوسکتی ، اس نے گویا اپنے آپ کو تسلی دی ۔

"تو وہ لڑکی کہاں تھی صاب ۔" اکبر خاں پھر ہنسا ۔ دانتوں کی کھڑکیوں سے گلابی زبان ہلتی سی نظر آئی ۔ "وہ تو پریوں کی تھی ۔ پھر آخر میں یہ ہوا صاب کہ سیف الملوک نے پری بدیع الجمال سے شادی بنائی اور اسے اپنے گھر ، مصر لے گیا ۔"

"تمہارا گھر کہاں ہے ۔" سیف الرحمن نے بات پلٹی ۔

"ابی آپ کو دکھائے گا صاب ۔"

دونوں گھوڑے چل چل کر رکتے اور رک رک کر چلتے رہے ۔ جھیل کے اس کنارے پر صرف یہی دو گھوڑے تھے جب پہلے کنارے پر خاصے سیاح تھے ۔ اس طرف جھیل اور پہاڑ کے درمیان خاصا کشادہ راستہ تھا ۔ جب کہ یہاں ایسا نہیں تھا ۔ ا کنارے پر جب جھیل کا اختتام ہوا تو بائیں جانب ایک بلند ، سفید پہاڑی کی طرف اکبر خاں نے اشارا کیا ۔

" وہ دیکھو صاب ۔ ہمارا گھر ادھر ہے ۔"

سیف نے گردن گھما کر دیکھا ۔ بلند پہاڑی کی ترائی میں ایک جگہ چار پانچ گھر لکڑیوں کے بنے ہوئے تھے ۔ انھی میں ۔ ایک گھر اکبر خاں کا تھا ۔

" آپ ہمارے گھر چلو صاب ۔"

" پھر کبھی اکبر خاں ۔ ۔ ۔" سیف نے ٹالا ۔

. سفر ختم ہوچکا تھا ۔ وہ اسی جگہ پہنچ چکے تھے جہاں سے سفر شروع کیا تھا ۔ " آپ اگلے برس آؤ گے صاب ۔" اکبر خا نے اس سے پوچھا ۔

" کیا خبر اکبر خاں ۔" سیف الرحمن جیب سے پرس نکالنے لگا ۔

" ام دعا کرے گا صاب ۔ ۔ ۔ ہمارا بی وی بچہ دعا کرے گا صاب ۔ ۔ ۔ آپ کی جلدی شادی ہوجائے ۔ ۔ ۔ آپ کو جلد آپ کا بدیع الجمال مل جائے ۔ ۔ ۔ جب مل جائے نا صاب تو بیگم صاب کو سیر کرانے اور ایدر ضرور لانا ۔ ۔ ۔ اور صاب آ۔ آتے اکبر خاں کے لیے ایک کمبل ضرور لانا صاب ۔ ۔ ۔ ایدر بوت سردی ہوتا اے صاب ۔ ۔ ۔"

" اچھا ۔" سیف نے چالیس روپے کی جگہ اسے سو کا نوٹ پکڑا دیا تو اکبر خاں خوش ہوگیا ۔ اس کا پوپلا منہ دعاؤں سے گیا جس میں ایک دعا یہ بھی تھی کہ اللہ جلدی آپ کا شادی کرے ۔ ۔ ۔ آپ کو آپ کا بدیع الجمال دے ۔ ۔ ۔

پتہ نہیں اکبر خاں نے کس گھڑی اور کس دل سے یہ دعا کی تھی کہ اسی سال اسے اپنی بدیع الجمال مل گئی ۔

وہ غزالہ تھی ۔ جب وہ فاران کی سیر کر رہا تھا تو دفتر میں اس کا تقرر ہوا تھا ۔ چوں کہ اسے کام کا تجربہ نہیں تھا لہذا سیف کی ذمہ داری لگائی گئی تھی کہ چند ہفتوں میں اسے کام سکھادے ۔ غزالہ بےحد خوب صورت اسمارٹ ، پڑھی لکھی اور خاندا لڑکی تھی ۔ سیف کو نہیں پتہ کہ کس طرح وہ اس کے اعصاب پر ، اس کے حواس پر اور اس کی زندگی پر سوار ہوگئی تھی ۔

سیف کے اندر غزالہ کے حوالے سے آنے والی تبدیلی اتنی واضح تھی کہ زہرہ جمال نے محسوس کرلیا تھا ۔ حالاں کہ وہ سیف کے لیے بنتی سنورتی تھی ۔ نت نئے کپڑے پہنتی تھی ، خوش بو میں نہا جاتی مگر پھر بھی سیف اس کی طرف نہیں دیکھتا تھا ۔ سیف ۔ کبھی اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ آج تو تم اچھی لگ رہی ہو ۔ اس کا دل رکھنے کے لیے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا ۔ بہت سچا آدمی تھا ۔ اسے اپنے ساتھ باہر لے کر نہیں جاتا تھا ۔ بہت شرمیلا آدمی تھا ۔

وہ میکے جاتی تو کبھی نہیں روکتا تھا ۔ اور واپس آتی تو کبھی نہیں کہتا کہ اتنی دیر کیوں لگادی ؟ پھر بھی زہرہ اس کا د جیتنے کی کوشش کرتی رہتی ۔ گھر صاف ستھرا رکھتی ، نت نئے کھانے پکاتی ، اس کے ماں باپ ، بہن بھائیوں کی خدمت کرتی لیک وہ سیف کی محبت نہ جیت سکی ۔ سیف اس کے ساتھ برا سلوک تو نہیں کرتا تھا ۔ نہ طعنے دیتا ، نہ ڈانٹتا نہ مارتا مگر اس کی ۔ اعتنائی زہرہ کو کرچی کرچی کردیتی ۔

اور جب اسے یہ پتہ چلا کہ سیف کے مزید کھو جانے کا سبب غزالہ ہے تو اس نے کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنا

سپنے خود ہی پھینک دیے ۔ غزالہ سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا لہذا زہرہ نے خاموشی سے خود کو سمیٹ لیا ۔ اس نے سیف ئی جھگڑا نہیں کیا مگر اس کی آنکھوں میں دکھ کے سائے لتے گہرے ہوگئے کہ خوف آنے لگا ۔ یہ دوسری بات ہے کہ سیف رے ہوتے ان سایوں کو محسوس ہی نہیں کیا ۔ وہ تو اب غزالہ میں زندہ تھا ۔ وہ دفتر میں ہوتا تو غزالہ کے ساتھ ہوتا ۔ گھر میں ب بھی غزالہ ہی کے پاس ہوتا ۔

تھک ہار کے زہرہ نے بننا سنورنا چھوڑ دیا اور ڈریسنگ ٹیبل کے بڑے سے آئینے پر چادر ڈال دی ۔ اس نے کانوں کے ، گلے کا ہار ، ہاتھوں کی چوڑیاں اور انگوٹھیاں ، ایک دن جو اتاریں تو پھر کبھی نہ پہنیں ۔ اس کی شادی کے خوب صورت ت ، سوٹ کیس کی تہوں میں چلے گئے ۔ اس نے بیڈروم کی دیواروں پر آویزاں اپنی دلہن بنی فریم شدہ تصویریں اتار کر الماری ند کردیں ۔ حیرت ہے سیف کو ان میں سے کسی ایک تبدیلی کا احساس نہیں ہوا اور اس نے اس سلسلے میں ایک بھی سوال ے نہیں کیا ۔ اس بات نے زہرہ کو اور زیادہ زخمی کردیا ۔

لپنے غیر اہم ہونے کا احساس بڑا جان لیوا ہوتا ہے ۔

یوں بھی وہ امید سے تھی ۔ بعض عورتیں ان دنوں میں زیادہ پرکشش ہوجاتی ہیں لیکن زہرہ روز بہ روز زیادہ بدنما اور ہوتی جارہی تھی ۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے ۔ رخساروں کی جھائیاں بڑھ گئی تھیں ۔ گردن میں سیاہ لکیریں پڑ گئی اور چہرے کی کلونس میں اضافہ ہوگیا تھا ۔

دفتر میں غزالہ جیسی ذہین ، خوب صورت اور زندہ دل لڑکی کے ارد گرد سات آٹھ گھنٹے گزار کر جب وہ گھر آتا تو زہرہ اسے سے زیادہ بدصورت لگتی ۔

زہرہ جانتی تھی . . . ان دنوں بیویوں پر شوہروں کی عنایات بڑھ جاتی ہیں ۔ مگر سیف ایک دفعہ بھی زہرہ کو ڈاکٹر کے پاس نہیں گیا ۔ کبھی اس کے لیے پھل لے کر نہیں آیا ۔ کبھی اس سے یہ نہیں کہا کہ اپنا خیال رکھا کرو ۔ بہت کم زور ہوگئی ہو ۔ ئی کام اس کے ہاتھ سے لے کر یہ نہیں کہا کہ اتنا کام مت کیا کرو ۔ تھک جاؤ گی ۔

اس کے بدلے روز بہ روز اسے نئی سے نئی باتیں معلوم ہوتیں ۔ اب تو غزالہ کے فون گھر آنے لگے تھے ۔ اب تو سیف ے اسے گھر ڈراپ کرنے بھی جاتا تھا ۔ زہرہ جانتی تھی کہ وہ غزالہ کو شاپنگ کرانے لے جاتا ہے ۔ دفتر کے ڈنر میں جہاں سب بیگمات کے ساتھ جاتے ، سیف غزالہ کے ساتھ جاتا تھا ۔ زہرہ نے کبھی سیف سے جواب طلبی نہیں کی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے ۔

وہ خاموشی سے دوہری آگ میں جلتی رہی ۔ اک آگ اس کی بدصورتی کی تھی ، دوسری آگ سیف کی بے وفائی کی تھی ۔ ، سے گھری ہوئی اس لڑکی میں کسی کو جنم دینے کی آخر کتنی صلاحیت ہوسکتی تھی لہذا ایک دن اس نے ایک مردہ بچے کو جنم دیا رد بھی چل بسی ۔ شاید کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی آسانی سے مرجائے گی ۔

خدا جانے اکبر خاں نے قبولیت کی کس گھڑی میں اسے شادی کی اور بدیع الجمال کے ملنے کی دعا دی تھی ۔ زہرہ کے مرنے چند ماہ بعد غزالہ سیف کی بیوی بن کر اس کے گھر میں آ گئی اور شادی کے دسویں دن وہ غزالہ کو لے کر قادان کی چاندنی گری لیے روانہ ہوگیا ۔ جاتے جاتے وہ اکبر خاں کے لیے ایک کمبل ، ایک گرم چادر ، ایک اونی ٹوپی اور جوتوں کا ایک جوڑا لے جانا بھولا ۔ وہ راستے میں غزالہ کو اپنے پہلے سفر کی روداد سنا چکا تھا ۔ سیف الملوک اور بدیع الجمال کا قصہ ۔ اکبر خاں کی دعا اور سکے بارے میں سب کچھ بتا چکا تھا ۔

دو تین دن فاران میں قیام کے بعد جب وہ جھیل کی سیر کے لیے پہنچے تو چند منٹ کی تلاش کے بعد اسے بلند خاں نظر وہ اپنے گھوڑے کے آگے پڑے چارے کو سمیٹ رہا تھا ۔ سیف نے قریب جاکر اسے آواز دی تو وہ چونک گیا ۔ اس نے چند غور سے سیف کو دیکھا تو پہچان لیا ۔

" ارے صاب آپ ہو ۔" اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا " پہلے تو آپ اکیلے آئے تھے ۔ اب بیگم صاب ساتھ ہیں آپ کو بوت بوت مبارک ہو صاب ۔ ۔ ۔ گھوڑا چاہیے ؟ "

" گھوڑا بعد میں چاہیے ۔ پہلے یہ بتاؤ اکبر خاں کہاں ہے ؟ "

" اکبر خاں تو مرگیا صاب ۔"

" ارے ؟ ۔ ۔ ۔" سیف کے دل پر گھونسہ سا لگا ۔ " مگر کیسے ؟ "

" بس صاب ایک رات اچانک ہی ایک پہاڑی تودہ آگرا ۔ وہ سب اپنے گھر میں سوئے ہوئے تھے ۔ چاروں مرگئے صاب ۔"

" چاروں کون ؟ "

" اکبر خاں اس کی بیوی ، بہو اور بیٹا ۔"

" یہ کب کا واقعہ ہے ؟ "

" دو مہینے ادھر کی بات ہے ۔ ۔ ۔ گھوڑا چاہیے صاب ؟ "

" نہیں گھوڑا نہیں چاہیے ۔"

وہ خاموشی سے وہیں جھیل کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گیا ۔ اس نے دیکھا ۔ جھیل کے دوسرے کنارے پر بلند سفید کی ترائی میں جہاں کبھی اکبر خاں کا گھر تھا ، اب وہی جگہ افتادہ پڑی تھی ۔

بعض لوگ کتنی آسانی سے مرجاتے ہیں ۔ ۔ ۔ سیف کو بڑی دیر سے پتہ چلا تھا ۔

○●○

امتحانات ادارہ ادبیاتِ اردو

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ معتمدِ اعزازی شعبہ ، امتحانات ادارہ ، ادبیاتِ اردو کی اطلاع کے بہ موجب ادارہ کے امتحانات حیدرآباد اور اضلاع کے تمام مراکز پر ۸ / اکتوبر ۱۹۹۸ ء سے ۱۱ / اکتوبر ۱۹۹۸ ء تک ایک ساتھ منعقد ہوں گے ۔ شرکت کی آخری تاریخ ۷ / ستمبر مقرر کی گئی ہے ۔ اس کے بعد ۱۵ روپے دیرانہ فیس کے ساتھ ، / ستمبر سے ۱۳ / ستمبر تک درخواستیں قبول کی جائیں گی ۔

۱۴ / ستمبر سے ۲۰ / ستمبر تک پچاس روپے جرمانہ ادا کرنے پر درخواستیں قبول کی جائیں گی ۔ مزید تفصیلات کے لیے شعبہ ، امتحانات دفتر ایوانِ اردو پنجہ گٹہ روڈ حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۸۲ سے بالمشافہ یا پھر جوابی مراسلت سے ربط پیدا کیا جاسکتا ہے ۔

مرزا اکبر علی بیگ
(معتمد شعبہ ، امتحانات)

نتائجِ امتحانات منعقدہ مئی ۱۹۹۸ ء

اردو فاضل

۱ ـــ مرکز اوپیر :-
درجہ دوم : ۳۸۲ تا ۳۸۸ ـ
تکمیل : ۸۱۰ ـ
پارٹ فرسٹ کامیاب : ۱ تا ۴ ، ۳۸۱ ، ۷۰۱ ، ۷۰۳ ـ

۲ ـــ مرکز اونکور :-
درجہ دوم : ۵ تا ۷ ، ۷۰۴ ، ۷۰۵ ـ
پارٹ فرسٹ کامیاب : ۳۸۹ ـ

۳ ـــ مرکز بودھن :-
درجہ دوم : ۹ تا ۱۲ ، ۱۴ تا ۳۰ ـ
تکمیل : ۸۱۱ ـ

۴ ـــ مرکز پوچم پاڈ پراجکٹ :-
درجہ دوم : ۳۲ تا ۳۴ ، ۳۵ تا ۳۶ ، ۷۰۶ ، ۷۰۷ ، ۹۰۱ ، ۹۰۲ ـ
درجہ سوم : ۳۳ ـ
تکمیل ۸۱۲ ، ۸۱۳ ـ
پارٹ فرسٹ کامیاب : ۳۹۰ ، ۳۹۵ ـ

۵ ـــ مرکز ٹیکمال :-
درجہ دوم : ۳۸ ، ۷۰۸ تا ۷۱۰ ـ
درجہ سوم : ۵۲ ـ
پارٹ فرسٹ کامیاب ، ۳۹۶ تا ۵۰۱ ـ

۶ ـــ جڑچرلہ :-
درجہ اول : ۵۴ ـ
درجہ دوم : ۵۳ ، ۵۵ تا ۵۹ ، ۷۱۱ ـ
تکمیل : ۸۱۵ ـ

۷ ـــ مرکز سنگاریڈی :-
درجہ دوم : ۶۱ ، ۶۳ ، ۹۰۳ ، ۷۱۲ تا ۷۲۳ ـ
تکمیل : ۸۱۵ ، ۸۱۹ ـ
پارٹ فرسٹ کامیاب : ۵۰۵ تا ۵۱۰ ، ۵۱۳ تا ۵۱۹ ـ

۸ ـــ مرکز سرپور (کاغذ نگر) :-
درجہ دوم : ۷۴ تا ۸۱ ـ
تکمیل : ۸۱۷ ـ

۹ ـــ مرکز شمس آباد :-
درجہ اول : ۹۸ ، ۹۹ ـ
درجہ دوم : ۸۴ تا ۸۸ ، ۹۰ تا ۹۷ ، ۱۰۰ تا ۱۰۲ ، ۷۲۴ تا ۷۲۹ ، ۹۰۵ ـ
تکمیل : ۸۱۸ تا ۸۲۰ ـ
پارٹ فرسٹ کامیاب : ۵۱۶ تا ۵۲۱ ، ۹۰۶ ، ۹۰۷ ـ

۱۰ ـــ مرکز ظہیر آباد :-
درجہ دوم : ۱۰۳ تا ۱۰۵ ، ۱۰۷ تا ۱۱۳ ، ۱۱۵ ، ۱۱۹ ، ۹۱۲ ، ۹۱۳ ـ

پارٹ فرسٹ کامیاب : ۵۶۹ ۔

۱۱ ــــ مرکز عادل آباد :۔

درجہ دوم : ۱۱۷ تا ۱۲۱ ، ۱۲۳ ، ۱۲۴ ، ۱۲۶ ، ۱۲۸ ، ۱۲۸/A ، ۱۲۸/B ، ۷۳۰ ، ۷۳۱ ۔

۱۲ ــــ مرکز کرنول :۔

درجہ دوم : ۱۳۱ تا ۱۳۴ ، ۷۳۲ تا ۷۳۴ ۔

پارٹ فرسٹ کامیاب : ۵۲۲ تا ۵۲۶ ۔

۱۳ ۔ مرکز کریم نگر :۔

درجہ دوم : ۱۳۶ تا ۱۴۰ ، ۱۴۲ تا ۱۴۵ ، ۱۴۸ ، ۹۰۸ تا ۹۱۰ ۔

تکمیل : ۸۲۱ تا ۸۲۳ ، ۱۵۰/A ۔

پارٹ فرسٹ کامیاب : ۵۲۷ ۔

۱۴ ــــ مرکز کاماریڈی :۔

درجہ دوم : ۱۵۰ تا ۱۵۳ ۔

پارٹ فرسٹ کامیاب : ۵۲۸ ، ۵۲۹ ۔

۱۵ ــــ مرکز گدوال :۔

درجہ دوم : ۱۵۵ ، ۱۵۷ ، ۷۳۶ ، ۷۳۷ ،

پارٹ فرسٹ کامیاب : ۵۳۱ ، ۵۳۲ ، ۵۳۵ تا ۵۳۷ ، ۵۳۹ تا ۵۴۱ ، ۵۴۳ ، ۵۴۴ ، ۵۴۶ ، ۵۴۹ ۔

۱۶ ــــ مرکز گوداوری کھانی :۔

درجہ اول : ۱۶۵ ، ۱۶۹ ۔

درجہ دوم : ۱۵۸ تا ۱۶۴ ، ۱۶۶ تا ۱۶۸ ، ۱۷۰ ، ۱۷۱/A ، ۵۵۱ ، ۵۹۹ ، ۷۳۹ ، ۷۵۰ ۔

پارٹ فرسٹ کامیاب : ۵۵۲ ، ۵۵۳ ، ۵۵۵ ، ۵۵۶ ، ۵۵۸ ، ۵۶۰ تا ۵۶۲ ، ۵۶۴ ۔

۱۷ ــــ مرکز گلبرگہ :۔

درجہ اول : ۱۷۴ ۔

درجہ دوم : ۱۷۳ ، ۱۷۶ تا ۱۸۹ ، ۱۹۱ ، ۱۹۳ ، ۱۹۵ ، ۱۹۷ ، ۲۰۳ ، ۲۰۵ تا ۲۱۱ ، ۲۱۳ تا ۲۱۵ ، ۲۱۹ تا ۲۲۳ ، ۲۲۵ ، ۲۲۷ تا ۲۳۳ ۔

تکمیل : ۸۲۵ ، ۸۲۶ ۔

۱۸ ــــ مرکز محبوب نگر :۔

درجہ دوم : ۲۳۷ ، ۲۳۸ ، ۲۴۲ تا ۲۵۲ ، ۲۵۴ ، ۲۵۵ ، ۲۵۷ تا ۲۶۴ ، ۲۶۶ تا ۲۶۹ : ۲۷۱ تا ۲۷۸ ۔

تکمیل : ۸۲۷ ، ۸۲۹ ۔

پارٹ فرسٹ کامیاب : ۵۷۲ ، ۵۷۳ ، ۵۷۵ ، ۵۷۷ ، ۵۷۸ ۔

۱۹ ــــ مرکز من ملی :۔

درجہ اول : ۲۷۹ ۔

درجہ دوم : ۲۸۰ تا ۲۸۳ ۔

تکمیل : ۸۳۱ ، ۸۳۲ ۔

۲۰ ــــ مرکز نرساپور :۔

درجہ اول : ۷۵۱ ، ۷۵۲ ۔

درجہ دوم : ۲۸۴ تا ۲۹۲ ، ۹۱۱ ۔

تکمیل : ۸۳۳ ۔

پارٹ فرسٹ کامیاب : ۵۸۳ تا ۵۸۶ ۔

۲۱ ــــ نارائن کھیڑ :۔

درجہ دوم : ۲۹۳ تا ۳۰۲ ۔

پارٹ فرسٹ کامیاب : ۵۸۷ تا ۵۹۳ ۔

۲۲ ــــ مرکز نرمل :۔

درجہ دوم : ۳۱۳ ، ۳۲۳ ، ۳۲۶ ، ۳۲۷ ، ۳۲۹ ، ۳۳۰ ، ۳۳۲ ۔

۲۳ ــــ مرکز نظام آباد ۔

درجہ دوم : ۳۳۳ تا ۳۳۶ ، ۳۳۸ ، ۳۳۹ ، ۳۵۱ تا ۳۶۱ ، ۷۵۳ تا ۷۵۸ ۔

تکمیل : ۸۳۷ ، ۸۳۸ ، ۹۳۲ ۔

پارٹ فرسٹ کامیاب : ۶۰۶ تا ۶۱۳ ، ۶۳۰ ۔

۲۴ ــــ مرکز نلگنڈہ :۔

درجہ دوم : ۳۶۲ تا ۳۸۱ ، ۹۱۳ تا ۹۱۶ ، ۹۱۸ تا ۹۲۸ ۔

تکمیل : ۸۳۹ ، ۸۴۰ ۔

پارٹ فرسٹ کامیاب : ۵۹۴ تا ۵۹۸ ۔

۲۵ ــــ مرکز نارائن پیٹ :۔

درجہ اول : ۳۸۳ ، ۷۶۱ تا ۷۶۳ ۔

درجہ دوم : ۳۸۲ ، ۳۸۴ تا ۳۸۸ ، ۷۵۹ ، ۷۶۰ ۔

پارٹ فرسٹ کامیاب : ۵۹۹ تا ۶۰۵ ۔

۲۶ ــــ مرکز ورنگل :۔

درجہ دوم : ۳۸۹ تا ۳۹۹ ، ۹۲۹ ۔

تکمیل : ۸۴۱ ۔

پارٹ فرسٹ کامیاب : ۶۱۷ ، ۶۱۹ تا ۶۲۲ ، ۶۲۴ تا ۶۲۶ ۔

۲۷ ــــ مرکز حیدرآباد ذکور :۔

درجہ اول : ۳۲۱/A ، ۳۳۱/A ، ۳۳۵/A ، ۳۳۹/A ، ۳۴۳/A ، ۳۴۹/A ، ۳۶۰/A ، ۷۹۸ ، ۷۷۱ ، ۷۷۲ ۔

درجہ دوم : ۳۲۰/A ، ۳۲۲/A تا ۳۲۹/A ، ۳۳۲/A ، ۳۳۳/A ، ۳۳۷/A ، ۳۴۰/A ، ۳۴۳/A ، ۳۴۵/A ، ۳۴۷/A تا

۴ ، ۳۵۳/A تا ۳۵۶/A ، ۳۵۸/A
۳۵۹ ، ۳۶۲/A ، ۳۶۳/A ، ۳۶۷/A
۳۶۹، ۳۷۲/A تا ۳۷۳/A ، ۳۷۶/A
۳۷ ، ۳۷۸/A تا ۳۸۲/A ، ۷۶۶ ،
، ۷۶۹ ، ۷۷۰ ، ۷۷۲ تا ۷۷۳ ،
۷۷۹ ۔
سوم : ۷۶۵ ، ۷۷۵ ۔
ب : ۳۸۳/A ، ۸۳۲ تا ۸۳۶ ،
۸۳۹ ، ۸۵۱ تا ۸۵۵ ۔
ٹ فرسٹ کامیاب : ۳۲۹/A ،
۳۳ ، ۹۳۱ تا ۹۳۳ ، ۹۳۷ ، ۹۳۹ ،
۹۳۲ ، ۹۵۳ ، ۹۵۳ ، ۹۵۶ ۔
ــ مرکز حیدرآباد اناث ۔
اول : ۳۶۶ ، ۷۹۰ ، ۷۹۷ ، ۷۹۸ ۔
دوم : ۳۰۳ ، ۳۰۵ ، ۳۰۶ ، ۳۰۸
۳ ، ۳۱۲ ، ۳۱۳ ، ۳۱۵ ، ۳۱۷ تا
، ۳۲۸ تا ۳۳۱ ، ۳۳۳ ، ۳۳۷ ،
تا ۳۳۵ ، ۳۳۷ ، ۳۳۹ تا ۳۵۳ ،
تا ۳۵۸ ، ۳۶۰ ، ۳۶۱ ، ۳۶۳ ،
، ۳۶۹ ، ۳۷۰ ، ۶۶۵ ، ۹۷۰ ، ۷۸۱ ،
، ۷۸۷ ، ۷۹۳ تا ۷۹۶ ، ۷۹۹ تا
۔
سوم : ۷۶۵ ، ۷۷۵ ، ۷۸۰ ، ۷۸۵
۷ ، ۷۸۸ ، ۷۸۹ ۔
با : ۸۵۷ ، ۸۵۹ تا ۸۶۱ ، ۸۶۳ ،
، ۸۶۶ ، ۸۶۷ ، ۸۶۹ تا ۸۷۱ ،
تا ۸۷۶ ، ۸۷۷/A ، ۸۷۸ تا ۸۸۰ ،
تا ۸۸۵ ، ۸۸۷ ، ۸۸۹ تا ۸۹۳ ،

۹۳۱ ۔
پارٹ فرسٹ کامیاب : ۹۶۲ ، ۹۶۳ ،
۹۶۶ تا ۹۶۹ ، ۹۷۱ تا ۹۷۳ ، ۹۷۵ تا
۹۷۷ ، ۹۷۹ ، ۹۸۰ ، ۹۸۳ تا ۹۸۷ ، ۹۹۱ ،
۹۹۲ ، ۹۹۳ ، ۹۹۸ ۔
۲۸ --- منچریال ۔
پارٹ کامیاب : ۹۳۲ تا ۹۳۶ ۔

○●○

اردو عالم

۱ --- مرکز اوپیر ۔
درجہ دوم : ۱ ، ۵ ، ۷ ، ۹ تا ۱۲ ۔
درجہ سوم : ۳ ۔
۲ --- مرکز انگور ۔
درجہ اول : ۱۵ ، ۱۷ ۔
درجہ دوم : ۱۳ ، ۱۴ ، ۱۶ ۔
۳ --- مرکز بودھن ۔
درجہ دوم : ۱۸ تا ۲۰ ، ۲۲ تا ۲۴ ، ۲۷ تا ۳۰ ۔
۴ --- مرکز بیلم پلی ۔
درجہ دوم : ۳۴ تا ۳۹ ۔
درجہ سوم : ۳۱ تا ۳۳ ۔
۵ --- مرکز پوچم پاڈ پراجکٹ ۔
درجہ اول : ۴۰ ، ۴۲ ، ۴۵ ، ۵۰ ۔
درجہ دوم : ۴۱ ، ۴۳ ، ۴۴ ، ۴۶ تا ۴۹ ۔
۶ --- مرکز جڑچرلہ ۔
درجہ دوم : ۵۱ ۔
۷ --- مرکز سنگاریڈی ۔
درجہ دوم : ۵۲ تا ۵۵ ، ۵۸ ، ۶۷ ، ۶۹
تا ۷۲ ۔
درجہ سوم : ۵۶ ، ۵۷ ۔
۸ --- مرکز سرپور کاغذ نگر ۔
درجہ دوم : ۷۳ تا ۷۶ ، ۷۹ ، ۸۰ ، ۸۲
تا ۸۴ ۔
درجہ سوم : ۷۷ ۔
۹ --- مرکز شمس آباد ۔
درجہ اول : ۸۷ ، ۸۸ ۔
درجہ دوم : ۸۵ ، ۸۶ ، ۸۹ تا ۹۳ ،
۵۱۳ تا ۵۱۵ ۔
۱۰ --- مرکز ظہیر آباد ۔
درجہ دوم : ۹۴ ، ۹۵ ، ۱۰۰ تا ۱۰۷ ،
۱۱۰ ، ۱۱۳ تا ۱۱۸ ، ۱۲۰ ، ۱۲۱ ، ۱۲۳ ،
۱۲۷ ، ۱۲۷/۱ ۔
۱۱ --- مرکز عادل آباد ۔
درجہ دوم : ۱۳۳ ، ۱۳۴ ، ۱۳۶ ۔
درجہ سوم : ۱۳۵ ۔
۱۲ --- مرکز کرنول ۔
درجہ اول : ۱۳۹ ۔
درجہ دوم : ۱۳۷ ، ۱۳۸ ، ۱۴۰ تا ۱۴۲
۱۳ --- کریم نگر ۔
درجہ اول : ۱۴۵ ، ۱۴۶ ، ۱۴۸ ، ۱۴۹
درجہ دوم : ۱۴۳ ، ۱۴۴ ، ۱۴۷ ، ۵۱۱
۱۴ --- مرکز کالاریڈی ۔
درجہ دوم : ۱۵۱ ، ۱۵۳ تا ۱۵۹ ۔
۱۵ --- مرکز گدوال ۔
درجہ اول : ۱۶۲ ، ۱۶۳ ، ۱۶۷ ۔

درجہ دوم : ۱۹۱ ، ۱۹۳ ، ۱۹۵ ، ۱۹۶ ۔

۱۶ ـــ مرکز گوداوری کھانی :۔

درجہ اول : ۱۶۸ ، ۱۸۹ ۔

درجہ دوم : ۵۳/ ، ۱۶۹ تا ۱۷۷ ، ۱۷۹ ، ۱۸۰ ، ۱۸۲ ، ۱۸۶ تا ۱۸۸ ، ۱۹۱ تا ۱۹۵ ، ۱۹۷ ، ۱۹۹ ۔

۱۷ ـــ مرکز محبوب نگر :۔

درجہ اول : ۲۰۲ ۔

درجہ دوم : ۲۰۱ ، ۲۰۳ ، ۲۰۵ تا ۲۰۷ ۔

۱۸ ـــ مرکز کمکھل :۔

درجہ دوم : ۲۰۹ ، ۲۱۰ ۔

۱۹ ـــ مرکز من ملی :۔

درجہ دوم : ۲۱۱ تا ۲۱۳ ۔

۲۰ ـــ مرکز نرساپور :۔

درجہ اول : ۲۱۴ ۔

درجہ دوم : ۲۱۵ ۔

۲۱ ـــ مرکز نارائن کھیڑ :۔

درجہ دوم : ۲۱۹ ، ۲۲۱ ، ۲۲۳ تا ۲۲۶ ۔

۲۲ ـــ مرکز نرمل :۔

درجہ دوم : ۲۲۸ تا ۲۳۱ ، ۲۳۵ تا ۲۳۷ ، ۲۳۹ ، ۲۴۰ ۔

۲۳ ـــ مرکز نظام آباد :۔

درجہ اول : ۲۴۱ تا ۲۵۷ ، ۲۵۷/A ، ۲۵۹ تا ۲۶۸ ، ۲۷۰ ، ۲۷۱ ، ۲۷۳ ، ۲۷۵ ، ۵۱۷ ، ۵۱۸ ۔

درجہ دوم : ۲۶۹ ، ۲۷۲ ، ۲۷۴ ۔

۲۴ ـــ مرکز نلگنڈہ :۔

درجہ اول : ۲۸۱ ، ۲۸۸ ۔

درجہ دوم : ۲۷۸ ، ۲۸۰ ، ۲۸۲ ، ۲۸۷ ، ۲۸۹ ، ۲۹۰ ۔

درجہ سوم : ۲۸۶ ۔

۲۵ ـــ مرکز نارائن پیٹ :۔

درجہ اول : ۲۹۱ ، ۲۹۳ ، ۲۹۵ ۔

درجہ دوم : ۲۹۲ ۔

۲۶ ـــ مرکز ورنگل :۔

درجہ اول : ۳۰۱ ، ۳۰۳ ، ۳۰۶ ، ۳۰۷

درجہ دوم : ۲۹۷ تا ۳۰۰ ، ۳۰۲ ، ۳۰۴ ، ۳۰۵ ، ۳۰۹ ، ۳۱۰ ۔

۲۷ ـــ مرکز حیدرآباد (ذکور) :۔

درجہ اول : ۳۱۱ ، ۳۱۲ ، ۳۲۹ ، ۳۳۲ ، ۳۳۵ ، ۳۵۰ ۔

درجہ دوم : ۳۱۳ ، ۳۱۵ ، ۳۱۷ ، ۳۱۹ ، ۳۲۱ تا ۳۲۳ ، ۳۲۶ ، ۳۲۸ ، ۳۳۰ ، ۳۳۳ ، ۳۳۶ ، ۳۳۹ تا ۳۴۵ ، ۳۴۸ ، ۳۵۱ ، ۳۵۲ ۔

درجہ سوم : ۳۲۵ ، ۳۲۷ ، ۳۳۸ ۔

۲۸ ـــ مرکز حیدرآباد (اناث) :۔

درجہ اول : ۱۸۲ ، ۳۶۶ ، ۳۷۹ ، ۳۸۳ ، ۴۰۳ ، ۴۱۰ تا ۴۱۲ ، ۴۳۰ ، ۴۳۳ ، ۴۵۱ تا ۴۵۳ ، ۴۵۸ ، ۴۶۸ ۔

درجہ دوم : ۳۶۲ ، ۳۶۴ ، ۳۶۶ ، ۳۷۲ ، ۳۷۳ ، ۳۷۶ ، ۳۸۱ ، ۳۸۲ ، ۳۸۷ تا ۳۹۰ ، ۳۹۲ تا ۳۹۴ ، ۳۹۶ ، ۳۹۹ تا ۴۰۱ ، ۴۱۴ ، ۴۱۹ ، ۴۲۵ تا ۴۲۷ ، ۴۳۱ ، ۴۳۴ ، ۴۳۵ ، ۴۳۹ تا ۴۴۱ ، ۴۴۳ ، ۴۴۵ ، ۴۴۸ ، ۴۴۹ ، ۴۵۴ ، ۴۵۵ ، ۴۵۷ ، ۴۵۹ ، ۴۶۳ تا ۴۶۷ ، ۴۷۰ ، ۴۷۱ ، ۴۷۳ ، ۴۷۵ ۔

درجہ سوم : ۴۶۱ ، ۴۷۴ ، ۴۱۸ ، ۴۲۰ ، ۴۴۴ ، ۴۵۰ ، ۱۶۱/A ۔

۲۹ ـــ مرکز منچریال :۔

درجہ اول : ۵۱۹ ۔

درجہ دوم : ۵۲۰ تا ۵۲۳ ۔

تکمیل اردو عالم : ۴۸۱ ، ۴۸۳ ، ۴۸۵ ، ۴۸۷ تا ۴۹۲ ، ۴۹۴ تا ۴۹۶ ، ۴۹۹ ، ۵۰۰ ، ۵۰۲ ، ۵۰۲/A ۔

○●○

اردو ماہر

۱ ـــ مرکز اپیر :۔

درجہ اول : ۵ تا ۷ ۔

درجہ دوم : ۱ تا ۴ ، ۸ ۔

۲ ـــ مرکز اوکلور :۔

درجہ اول : ۹ تا ۱۱ ، ۱۳ ۔

درجہ دوم : ۱۲ ۔

۳ ـــ مرکز بیلم پلی :۔

درجہ دوم : ۱۵ ، ۱۸ ، ۱۹ ۔

درجہ سوم : ۱۴ ، ۱۷ ۔

۴ ـــ مرکز ٹیکمال :۔

درجہ دوم : ۲۰ ۔

۵ ـــ مرکز سرپور :۔

درجہ اول : ۲۱ ۔

درجہ دوم : ۲۲ ، ۲۴ تا ۲۸ ۔

درجہ سوم : ۲۳ ۔

۶ ـــ مرکز عادل آباد :۔

بہ یادگار سید محی الدین قادری زورؔ

سن اجراء : ۱۹۳۸ء

فون : 3310469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد : ۶۰ — ستمبر ۱۹۹۸ء — شمارہ : ۹

فی پرچہ	:	۱۲ روپے
زر سالانہ	:	۱۲۵ روپے
کتب خانوں سے	:	۱۵۰ روپے

مشرق وسطی اور امریکہ	:	۲۵ ڈالر
پاکستان ، برما ، سری لنکا و بنگلہ دیش	:	۱۰ ڈالر
انگلستان	:	۱۵ پونڈ

ناشر : ادارہ ادبیاتِ اردو ، پنجہ گٹہ روڈ ، حیدرآباد ـ ۵۰۰۰۸۲ (اے۔ پی) انڈیا۔

کمپیوٹر کتابت : جی ۔ جی ۔ کمپیوٹرس [illegible] ، / شارپ کمپیوٹرس چادرگھاٹ ، حیدرآباد۔

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر ، پرنٹر ، پبلشر نے [illegible] پرنٹنگ پریس [illegible] سے چھپوا کر ادارہ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

پہلی بات

اس ماہ سے ایک نیا کتابی سلسلہ شروع کیا جارہا ہے ۔ اسامہ فاروقی صاحب ، مشہور ماہرِ غالبیات جناب پون ورما کی انگریزی کتاب GHALIB THE MAN THE TIMES کا اردو میں ترجمہ کر رہے ہیں ۔ یہ کتاب انگریزی داں حلقوں میں کافی مقبول ہوچکی ہے ۔ اردو والے اس سے کم واقف ہیں ۔ اس کتاب کے ابواب بالاقساط "سب رس" میں شائع ہوا کریں گے ۔

پون ورما ۱۹۵۳ء میں ناگ پور میں پیدا ہوئے ۔ انھوں نے سینٹ اسٹیفن کالج دلی میں تعلیم پائی ۔ بی ۔ اے میں ان کا اختیاری مضمون تاریخ تھا ۔ بعد ازاں دلی یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی ۔ پھر انڈین فارن سروس کے لیے منتخب ہوئے ۔ وہ بلغاریہ ، رومانیہ اور نیویارک میں سفارتی خدمات انجام دے چکے ہیں ۔ وہ اقوامِ متحدہ میں ہندستانی مشن کے ایک رکن تھے ۔ آج کل حکومتِ ہند کی وزارتِ امورِ خارجہ میں جوائنٹ سکریٹری کے عہدے پر فائز ہیں ۔

پون ورما غالب کی شاعری کے شیدائی ہیں ۔ غالب کی شاعری کو سمجھنے اور اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کی خاطر انھوں نے اردو سیکھی ۔ انھوں نے نہایت تحقیق کے ساتھ غالب کی حیات اور عہد پر ایک کتاب انگریزی میں تصنیف کی ۔ غالب پر تحقیقاتی کام کے ضمنی نتیجے میں انھوں نے "پرانی دلی کی حویلیوں" پر ایک کتاب لکھی ۔ یہ اس تاریخی شہر اور اس کی تہذیب کی بربادی کا نوحہ ہے ۔ پون ورما نے مہابھارت کا غائر نظر سے مطالعہ کیا جس کے نتیجے میں یدھشٹر اور دروپدی کے باہمی تعلق پر ایک طویل بصورت نظم تخلیق کی اس کے علاوہ کرشن جی کے بارے میں کتاب "کرشنا" تصنیف کی ۔ ہندستان کے متوسط طبقے کے بارے میں حال میں ان کی ایک کتاب شائع ہوئی ہے ۔

OOO

"سب رس" کی اس اشاعت کا ایک خاص فیچر گوشہ ، شمیم حنفی ہے ۔ شمیم حنفی موجودہ دور کے ایک اہم اور قابلِ توجہ نقاد اور ادیب ہیں ۔ سید خالد قادری نے ان کی شخصیت پر دل چسپ خاکہ تحریر کیا ہے ۔ انور صدیقی نے ان کی تنقید نگاری کا اور محمد ظفر حسین نے ان کی ڈراما نگاری کا معروضی جائزہ لیا ہے ۔ اس گوشے میں شمیم حنفی کی چند تنقیدی نگارشات اور غزلیں شامل کی گئی ہیں ۔ رسالے کی تنگ دامانی کی وجہ سے ان کا تحریر کردہ کوئی ڈراما شامل نہیں کیا جاسکا ۔

OOO

ہم "سب رس" کو صوری اور معنوی اعتبار سے بہتر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ ادیب شاعر اور قارئین ہماری اس کی داد دے رہے ہیں لیکن محض تعریف و توصیف سے رسالے کو زندہ نہیں رکھا جاسکتا ۔ ہم اپنے تمام ہی خواہوں سے اس کی توسیع اشاعت میں تعاون کی درخواست کرتے ہیں ۔

OOO

(ادارہ)

پون ورما

ترجمہ : اسامہ فاروقی

کتاب : غالب ، شخصیت اور عہد

باب ۱ : روبہ زوال مملکت

(قسط : ۱)

مرزا محمد اسداللہ خاں بنیادی طور سے ایک غیر سیاسی شخص تھے ۔ ان کی فارسی ابیات اور اردو دیوان دونوں میں صریحاً سیاسی نظم تقریباً نہیں کے برابر ہے ۔ گو کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد ان کے خطوط میں سیاسی واقعات کا حوالہ ملتا ہے ۔ اس کی وجہ بیش تر یہ امرِ واقعہ ہے کہ اس تغیرِ عظیم اور اتھل پتھل کے ضمنی سیاسی نتائج اتنے واضح تھے کہ اس پر تبصرہ غیر سیاسی ہو ہی نہیں سکتا تھا ۔ ۱۸۵۷ء سے قبل کے عہد میں قابلِ لحاظ تغیرات اور تبدیلیاں عمل میں آئیں ۔ جاگیردار شرافیہ کے ایک رکن اور اپنے عہد کے شاعرِ اعظم کی حیثیت سے غالب کے لیے ان واقعات کا چشم دید گواہ ہونا اور ساتھ ہی ساتھ ان میں شریک ہونا ناگزیر تھا ۔ ان پر چھوڑ دیا جاتا تو وہ شاید ہی سیاسی واقعات سے کسی طرح کے تعلق کے خواہش مند ہوتے ۔ شاعر اور فلسفی کی حیثیت سے وہ اپنی توجہ ان واقعات کی بہ جائے دوسرے دائرہ ہائے نظر ، دوسرے اہم امور اور انسان کو درپیش تکلیف دہ صورتِ حال کے لیے مخصوص کہیں زیادہ دل کش ذرائع تفریح پر مرکوز رکھنے کو ترجیح دیتے ۔ لیکن نوشتہ ، تقدیر یہی تھا کہ وہ ایک ہنگامہ خیز عہد کے چیدہ و چشم دید گواہ بنیں ۔ حالات ایسے تھے کہ ان کے لیے خود کو اپنے عہد کے ماحول سے جدا کرنا ناممکن تھا ۔ خود اسے چاہے وہ تسلیم نہ بھی کرتے رہے ہوں ان کا ردِ عمل اکثر سیاسی ماحول کا ساختہ پر داختہ ہوتا تھا ۔ اور مختلف مواقع پر ان کے طرزِ عمل کے تجزیے سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے کتنی شدت سے اسے اپنے باطن کا ایک جزو بنالیا تھا ۔ سیاسی پس منظر سے ان کا تعلق نہ صرف غالب کی شخصیت کو سمجھنے میں بلکہ گذشتہ صدی کے دوران دلی اور ہندستان کو اپنے نرغے میں لے لینے والے تغیرات کے چکر میں پھنسے سارے جاگیردار طبقے کے ردِ عمل کی تفہیم میں ہماری مدد کرتا ہے ۔

غالب کے سالِ پیدائش ۱۷۹۷ء سے قبل ہی مغلیہ سلطنت روبہ زوال ہوچکی تھی ایک صدی کے دوران اورنگ زیب کی وسیع و عریض مملکت دلی اور اس کے اطراف چند مربع میل کے علاقے تک محدود ہوچکی تھی ۔ ۱۷۸۸ء میں مغل بادشاہ شاہ عالم کو روہیلہ فوجی قسمت آزما غلام قادر نے ، جس نے دلی پر عارضی طور سے قبضہ کرلیا تھا ، اندھا کرکے قید کرلیا ۔ غلام قادر کی پس پائی کے بعد مرہٹوں نے شہر کو اپنے قبضے میں لےلیا اور شاہی خاندان کی خودداری کو بر سرِ عام صدمہ پہنچانے میں روہیلوں سے سبقت لے گئے ۔ ۱۸۰۳ء میں افق پر حال میں نمودار ہونے والے فرماں روائی کے دعوے دار انگریزوں نے مرہٹوں کو دلی کے قریب واقع گاؤں پت پر گنج میں شکست دی ۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ عالم لال قلعے کے ایک بالا خانے میں بیٹھے اس لڑائی کی پیش رفت کی خبر لے رہے تھے انگریز سپہ سالار لارڈ لیک کو شاہ عالم نے ۱۶ ستمبر ۱۸۰۳ء کو اپنے دربار میں باریاب کیا ۔ بہت جلد برطانوی تسلط کا زیریں ڈھانچہ مستقل بنیاد پر قائم ہوگیا ۔ مغل بادشاہ کو انگریزوں کا وظیفہ خوار بنادیا گیا اور ان کے گزارے کی رقم سالانہ ساڑھے گیارہ لاکھ روپے مقرر

ہوئی ۔ کشمیری دروازے کی بیرونی حدود میں برطانوی حکومت پر نگرانی کے لیے ایک انگریز رزیڈنٹ سکونت پذیر ہوگیا ۔ سیاسی اقتدار بالفعل انگریزوں کو منتقل ہوگیا ساتھ ہی ساتھ مغل بادشاہ کو ازروئے قانون فرماں روائی کی خوش فہمی میں مبتلا رہنے کی اجازت دے دی گئی ۔

یہ وہ سیاسی نیم ظلمات کا ماحول تھا جس میں غالب پیدا ہوئے ۔ قانونی مفہوم میں مغل بادشاہ ہی مقتدرِ اعلیٰ تھا ۔ بکسر میں اپنی فتح کے بعد انگریز مغل بادشاہ سے ۱۷۶۵ء میں محض دیوانی بنگال کے حصول میں کام یاب ہوئے تھے ۔ یہ معاہدہ خود اس امر کی شہادت تھا کہ مغل بادشاہ بلاشبہ اس سیاسی اقتدار کا حامل تھا جس کی رو سے مراعات بخشی اور عطا کی جاتی ہیں ۔ قانوناً ۱۷۶۵ء کے بعد اس کے برخلاف طے ہونے والے کسی معاہدے کی غیر موجودگی میں بادشاہ کا مقتدرِ اعلیٰ کا یہ موقف برقرار تھا ۔ چناں چہ نظری اعتبار سے انگریز مغل بادشاہی کے چوکھٹے میں ماتحت لگان داروں کی حیثیت رکھتے تھے ۔ لیکن لارڈ ولزلی کی مسلمہ پالیسی یہ تھی کہ برائے نام مغل اقتدارِ اعلیٰ کا وقتاً فوقتاً زبانی اعتراف انگریزوں کے مکمل سیاسی تسلط کے قیام کے اہم کام میں ہرگز مخل نہ ہو ۔ یہاں اس کا اور اس کے جانشینوں کا مقابلہ شاہ عالم کے زمانے سے چلی آرہی ، قانونی اقتدارِ اعلیٰ کو دوام بخشنے والے تمام دستوری لوازم سے مضبوطی کے ساتھ چمٹے رہنے کی پالیسی سے تھا ۔ شاہ عالم اور ایک حد تک اس کے جانشین برائے نام مغل اقتدارِ اعلیٰ کی انگریزوں کی طرف سے قبولیت کو اشتباہ میں ڈالنے والی تمام کوششوں کے خلاف جان توڑ کر لڑے ۔ اگرچہ کہ انگریز خود کو فرماں روائی کی مستحق فاتح نسل کا نمائندہ سمجھتے تھے ، مغل بادشاہ اپنی وظیفہ خوار حیثیت سے واقف ہوتے ہوئے بھی جماعتِ وابستگان اور لگان داروں سے متوقع مراسمِ دربار سے انحراف کی انگریزوں کی تمام کوششوں کو بے ادبی اور شوخ چشمی پر محمول کرتے رہے ۔

مغل شاہی خاندان کا اب بھی ذہنوں پر ایک دبدبہ تھا جو صدیوں تک غیر منقطع طور پر حکومت کرنے والے شاہی سلسلے ہی کو میسر ہوتا ہے ۔ مرہٹوں اور یہاں تک کہ انگریزوں کو بھی اپنی بالفعل حکومت کو سیاسی و قانونی جواز فراہم کرنے کے لیے مغل بادشاہ کے نام کی ضرورت تھی ۔ عام آدمی کے لیے بادشاہ سلامت اپنے محدودِ اختیارات کے باوجود حضرت ظلِ سبحانی ، صاحب قرانِ ثانی خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ جہاں پناہ تھے ۔ لال قلعے کی دیوار کے اندر ان کا فرمان سب سے برتر تھا ۔ بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد کو قانونِ بین الاقوام کے تحت سفرا کے لیے مخصوص استثنائی حقوق حاصل تھے اور مراسمِ دربار پہلے کی طرح برقرار تھے ۔ برطانوی رزیڈنٹ بادشاہ کے دربار میں ویسے ہی حاضر ہوتا تھا جیسے دوسرے درباری ، وہ نقار خانے کے پاس سواری سے اترتا تھا اور بقیہ فاصلہ پیدل طے کرتا تھا ۔ فرحت اللہ بیگ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے عہد کے ایک مشاعرے کی اپنی معتبر تشکیلِ جدید میں بیان کرتے ہیں کہ کیسے اس وقت کے ایک عالم کریم الدین کے ، جن کے مکان میں مشاعرہ منعقد ہو رہا تھا ۔ پسینے چھوٹ گئے ، جب انھیں بادشاہ کے حضور میں پیش ہونے کے لیے کہا گیا ۔ " مجھے کیا خبر تھی کہ بارگاہِ جہاں پناہی میں یاد ہوگی ۔ ۔ ۔ حکم حاکم مرگِ مفاجات ۔ " مولوی کریم الدین کو اندر پہنچاتے ہوئے چوب دار نے آواز دی : " ادب سے ، نگاہ روبہ رو ، حضرت جہاں پناہ سلامت ، آداب بجالاؤ " اور مولوی کریم الدین جو اس ملاقات کی تیاری میں درباری آدابِ مجلس کا سبق اچھی طرح پڑھ کر آئے تھے دہرے ہوکر سات تسلیمات بجالائے ۔ اختیارات سے محروم آخری مغل بادشاہوں نے شاہی طور طریق برقرار رکھے تھے ۔ ایک انگریز کے روز نامچے میں ، جو ۱۸۲۸ء میں شاہ اکبر ثانی کے دربار میں برطانوی سپہ سالار لارڈ کومبرمیر کی حاضری کے وقت موجود تھا ، ہمیں یہ اندراج ملتا ہے : " اپنے بلند رتبے کا لحاظ رکھتے ہوئے معمر بادشاہ نے سپہ سالار پر اس وقت جب وہ نذر پیش کرنے کے لیے پاس آئے ایک نگاہِ غلط انداز ڈال کر بھی التفات نہیں کیا ۔ ۔ ۔ ہماری جماعت کے بقیہ افراد کو بھی اس وقت جب ہم ایک ایک کر کے آگے بڑھے ، سلام کیا اور تین تین طلائی مہریں پیش کیں ، بادشاہ نے آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی ۔ ۔ "

اس میں شک نہیں کہ گزشتہ شان و شوکت کا فقدان تھا ۔ نذر کی رقم پہلے سے کم تھی ۔ بادشاہ کی طرف سے مرحمت کی جانے والی خلعتیں کم قیمت تھیں اور شاہی جلوس جاہ و جلال خسروی کے مظاہرے کی بہ جائے ایک تماشا ہوکر رہ گیا تھا ۔ لیکن بادشاہ اب بھی سماجی اور سیاسی نظام کا محور تھا ۔ عید تیوہار اور جشن کے موقعوں پر اسے اب بھی اناج کی سات اقسام سونے اور چاندی میں تولا جاتا تھا گو کہ مالی مجبوریوں کی وجہ سے بادشاہ کو سونے اور ہیرے جواہرات میں تولنے کی پرانی روایت کو برقرار رکھنا دشوار ہوگیا تھا ۔ بقرعید کے موقعے پر عیدگاہ یا دیوانِ عام میں رسمی طور سے اونٹ کی قربانی دینا اب بھی ان کے فرائض میں شامل تھا اور ان کی سال گرہ اب بھی سرکاری جشن کی تقریب سمجھی جاتی تھی اور اگر بادشاہ بیمار پڑیں تو ان کی شفایابی کی خوشیاں پُرتکلف غسلِ صحت کے موقع پر دھوم سے منائی جاتی تھیں ۔ عہدِ گزشتہ کی طرح لوگوں کو بادشاہ کی مصروفیات سے واقف کرانے کے لیے روزانہ درباری اطلاع نامہ اب بھی جاری کیا جاتا تھا ۔ رؤسا اب بھی ان کے عطا کیے ہوئے خطابوں سے مخاطب کیے جاتے تھے ۔ دلی والوں کے لیے جہاں پناہ اب بھی حکم رانی کرتے تھے چاہے اس تخت سے ہی سہی جس کی چمک دمک ماند پڑتی جارہی تھی ۔ ان کے دنیوی اختیارات کم ہوگئے تھے لیکن وہ "پیرومرشد" اب بھی تھے ۔ ان کا حکم رانی کا دعویٰ اب بھی شک و شبہے سے بالاتر تھا گو کہ ماننا پڑتا تھا کہ ان کے عہد کے دن گنے تھے ۔ یہ احساس دلی کی دیواروں کے باہر بھی عرصۂ دراز تک برقرار رہا ۔ چھوٹے والیانِ ریاست کے جانشینوں کی توثیق کی درخواستیں اب بھی مغل بادشاہ کے حضور میں پیش کی جاتی تھیں ۔ ہول کروں یعنی ان مرہٹہ سرداروں کے سکوں پر ، جواب زیر دست نہیں رہے تھے ، ملکاجی راؤ دوم (۱۸۳۴ء تا ۱۸۸۶ء) کے عہد تک شاہ عالم ثانی کا نام کندہ رہتا تھا ۔ اسی طرح ایک اور سابقہ زیر دست ریاست یعنی گوالیار کے سندھیا رجواڑے کے سکوں پر شاہ اکبر ثانی کا نام ۱۸۸۶ء تک یعنی مغل شاہی سلسلے کے انگریزوں کے ہاتھوں خاتمے کے دو دہوں سے بھی زاید عرصے تک کندہ رہتا تھا ۔

غالب کے لیے جو جاگیردار اشرافیہ کے ایک رکن ہونے اور اس ترک نسل سے ہونے کے دعوے دار تھے جس نے مغل حکومت کے قیام میں ہاتھ بٹایا تھا مغل حکومت کا ظاہری تسلسل اعلیٰ ترین سطح پر شاہانہ و جاگیردارانہ طرزِ زندگی کی مناسبت اور جواز کی توثیق تھا ۔ اس توثیق سے ان تبدیلیوں کے پیشِ نظر جو جاگیرداری کی سیاسی و معاشی بنیادوں کو تیزی سے کھوکھلا کر رہی تھیں ایک اہم نفسیاتی ضرورت کی تکمیل ہوتی تھی ۔ دلی کے دوسرے باشندوں کی طرح غالب بھی مغل حکومت کے جواز کو امرِ بدیہی مانتے تھے ۔ وہ مغل دربار سے رسائی کے کتنے متمنی تھے اور ناکامی کی صورت میں دوسروں کے رسوخ پر کتنے کبیدہ خاطر ہوتے تھے ۔ وہ مغل دارالحکومت کو اپنا اصلی وطن سمجھتے تھے اور فی الحقیقت اس کا کوئی ثبوت نہ ہونے کے باوجود اس بات کے دعوے دار تھے کہ یہ شہر "میرے اجداد کا اصلی مسکن" ہے ۔ دربار سے ان کا تعلق واضح تھا ۔ ۱۸۵۴ء میں شیخ محمد ابراہیم ذوق کی وفات کے بعد انھیں سرکاری طور سے شاعری میں بادشاہ کا استاد مقرر کیا گیا تھا ۔ اس وقت وہ پہلے ہی سے ولی عہد کے استاد تھے ۔ چار سال قبل بہادر شاہ نے انھیں مغل شاہی خاندان کی فارسی نثر میں تاریخ لکھنے کا کام تفویض کیا تھا ۔ ملک الشعرا کی حیثیت سے اور ویسے بھی غالب نے مغل بادشاہ کی مدح میں بے شمار مبالغہ آمیز قصیدے لکھے تھے ۔ شاعری میں بہادر شاہ سے اپنے اختلافات کے باوجود انھوں نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں لکھی جسے شاہی حکومت یا خود بادشاہ کی سبک سری پر محمول کیا جاسکے ۔ غالب کے باادبانہ اور شستہ ساتھ عرفانیہ نواز روزنامچے "دستنبو" تک میں بادشاہ کا کوئی تحقیر آمیز ذکر نہیں ملتا ۔ کچھ بھی ہو مغل بادشاہ کا مرکز اس سماجی نظام کا ضامن تھا جس میں غالب کی جڑیں پیوستہ تھیں ۔ اشرافیہ کے ایک رکن کی حیثیت سے مقررہ نظامِ حیات میں غالب کا اپنا مقام اس کے واضح تسلسل پر منحصر تھا اور اس تعلق باہمی سے حاصل ہونے والی طاقت بالفعل حکم رانوں یعنی انگریزوں تک کے تحفظ ان ۔

رویے اور طرزِ عمل کے تعین میں ایک کلیدی عنصر کی حیثیت رکھتی تھی ۔

بلاشبہ انگریزوں کو وقوع میں آنے والی قلبِ ماہیت کے مطابق تسلیم ہونے کے بارے میں درحقیقت کبھی کوئی شک نہیں تھا ۔ انگریز صحافی ولیم ناٹن جو بہادر شاہ ظفر کے عہدِ بادشاہی میں دلی آیا تھا بے حد وضاحت کے ساتھ لکھتا ہے : " شاہی شان و شوکت کی باضابطہ نقل کرتے ہوئے موجودہ جانشین ، جو ظاہر میں بادشاہ لیکن دراصل غلام ہے ، شاہی کا بے معنی تزک و احتشام برقرار رکھے ہوئے ہے ۔ اس کے پاس تختِ شاہی بھی ہے اور عصائے شاہی بھی ، محل بھی ہے اور نوکر بھی ہیں ، وزرا اور امرا بھی ہیں جب کہ اس کی سلطنت انگریزوں کے قبضے میں ہے ۔ وہ اپنے غیر ملکی مہمانوں کی پذیرائی ایک بادشاہ کی طرح کرتا ہے اور جھوٹے گوٹے کناری کے بھدے اور بھڑکیلے بے مصرف گوندے سے ان کو مزین کرتا ہے ۔ وہ جواہرات اور خلعتِ شاہی زیبِ تن کرتا ہے اور منصبِ شاہی کے تمام لوازم اس کے پاس موجود ہیں لیکن حقیقی سطوت رخصت ہوچکی ہیں صرف دکھاوا رہ گیا ہے ۔" انگریزوں کے لیے مغل بادشاہ اگر برقرار تھا تو محض مروت کی بنا پر ۔ اس کے بادشاہی کے دعوے کو ایک حد تک شرفِ قبولیت بخشا جاسکتا تھا ؛ وہ بھی صرف اس لیے کہ نام کی بادشاہی کے مفروضے کی تائید کرنا ہی فائدہ مند ہے ۔ اس جھوٹے کے اندر اختر لونی اور سیٹن جیسے اولین برطانوی ریذیڈنٹ تھے ، مغلوں کے احساسات سے نمٹنے میں تنک چڑھے پن کا مظاہرہ کم کرتے تھے اور دربارِ شاہی کے مقررہ آدابِ مجلس کی پابندی کا زیادہ لحاظ رکھتے تھے ۔ تاہم جلد ہی اس محتاط خوش خلقی کی جگہ ایک نیا " مستقل مزاجی " کا رویہ لینے لگا ، جو دراصل مغل اقتدارِ اعلیٰ کے مفروضے کو برقرار رکھنے کے اس سارے تماشے سے خود بہ خود پیدا ہونے والی صحیح بیزاری کا ایک دوسرا ، خوش نما نام تھا ۔ رویے کی یہ تبدیلی طامس مٹکاف اور کول بروک کے عہدِ ریذیڈنسی میں آہستہ آہستہ یہ رویہ کار آنے لگی اور بالکس کے زمانے میں زیادہ وضاحت کے ساتھ ۔ برطانیہ کو اپنے سیلاب میں بہا لے جانے والے نظریہ ، افادیت کے آئینہ دار ہندوستان کے تئیں اربابِ اقتدار کی رگ و پے میں وہ روح افزا اور تجدیدی جادو جلانے والی برتی سرایت کیے ہوئے تھی ۔ جس کی بنا سے برطانوی اقتدار اخلاقی طور سے درست تھا ، انگریزوں کی تہذیب بنیادی طور سے دوسری تہذیبوں سے برتر تھی اور عیسائیت نوعِ انسان کی واحد نجات دہندہ تھی ۔ ایک جامد اور پس ماندہ سماج کے سربراہ دہلی بادشاہ کے سامنے دوہرے ہوکر تسلیمات بجالانا ، خاص طور سے اس صورت میں جب کہ خود بادشاہ اور یہ سماج دونوں ہی اپنے دفاع کی قدرت نہیں رکھتے تھے ، اب تکلیف دہ بلکہ اخلاقی طور سے نامناسب بھی ہوتا جارہا تھا ۔ کم و بیش اسی زمانے میں دلی آنے والا ایک برطانوی افسر ، بریمی سے لکھتا ہے ، " ان " سلاطین " میں سے ہر ایک (اشارہ ظاہر ہے مغل شہزادوں کی طرف ہے) جس کی اپنے اور اپنے خاندان کے گذارے کے لیے ماہانہ آمدنی دس شلنگ سے زیادہ نہیں ہے ، برطانوی حکومت کے نمائندے کو خطوط میں اپنے فدوی خاص کی حیثیت سے مخاطب کرے گا اور جواب میں اسے لکھا جائے گا کہ : حضورِ والا کا حکم نامہ فدوی کو ملا " ۔ " نوشتہ بدیوار واضح تھا ۔ مغلوں اور یہ حیثیت مجموعی پرانی جاگیردار شرفا کے بہتری کے دعووں کے دن بس اب گنتی کے رہ گئے تھے ۔

اشرافیہ کے ایک فرد اور شہر کے ممتاز شاعر کی حیثیت سے غالب کی معتمد انگریز ریذیڈنٹوں سے جان پہچان تھی اور ان کے بعض با اثر لوگوں سے غالب کے ایک حد تک دوستانہ مراسم بھی تھے ۔ تاہم مغلوں اور انگریزوں کے باہمی تعلقات کے متوازی خود غالب کے انگریزوں کے ساتھ تعلقات کی واضح تصویر پنشن کے مقدمے میں ان کی طویل جدوجہد کے دوران سامنے آگئی ۔ غالب بمشکل ۵ سال کے تھے جب ان کے والد عبداللہ بیگ خاں الور کے راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت میں تھے ، ایک جنگ میں مارے گئے ۔ ان کے والد کے چھوٹے بھائی نصراللہ بیگ خاں مرہٹوں کی ملازمت میں تھے اور ترقی کرتے ہوئے قلعہ آگرہ کے ناظم کے عہدے کے

سپاہی جنرل پیرون کے تحت آگرے کی قلعہ داری پر مامور ہوئے ۔ جب ۱۸۰۳ ء میں لارڈ لیک نے آگرہ فتح کیا نصراللہ بیگ نے ہوشیاری کے ساتھ قلعہ انگریزوں کے حوالے کردیا ۔ جس کے لیے وہ انگریزوں کی طرف سے انعام کے بھی مستحق قرار پائے ۔ انھیں سترہ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ پر چار سو سواروں کے رسالے کا افسر مقرر کیا گیا اور تاحینِ حیات بھرت پور کے قریب سونک اور سرسہ کے پرگنے جاگیر میں دیے گئے ۔ بدقسمتی سے اس کے کچھ ہی دنوں بعد نصراللہ بیگ ہاتھی پر سے گر کر مر گئے ۔ اس وقت غالب کی ۴ نو سال کی تھی چوں کہ نصراللہ بیگ لا ولد مرے تھے ان کی جاگیر پہلے انگریزوں کو واپسی کے بعد ان کے خسر نواب احمد بخش خاں کی جاگیر میں ضم کردی گئی ۔ شرط یہ تھی کہ وہ نصراللہ بیگ خاں کے پس ماندگان یعنی بھتیجے غالب ، غالب کے چھوٹے بھائی ، نصراللہ بیگ کی والدہ (یعنی غالب کی دادی) اور نصراللہ بیگ کی تین بہنوں (غالب کی پھوپھیوں) کو گذارے کی رقم دیں ۔ یہ انتظام لارڈ لیک کے ۴ مئی ۱۸۰۶ ء کو جاری کیے ہوئے اور کلکتہ میں گورنر جنرل اور ان کی کونسل کے منظورہ ایک پروانے میں کیا گیا تھا ۔ اس پروانے کی رو سے نواب احمد بخش خاں اپنی حال میں وسعت دی ہوئی جاگیر سے انگریزوں کو واجب الادا لگان کی پچیس ہزار روپے کی ر سے دس ہزار روپے کی تخفیف کے مستحق قرار دیے گئے تھے تاکہ وہ نصراللہ بیگ کے پس ماندگان کو گذارے کی ادائگی کا انتظ کرسکیں ۔ نزاع اس لیے شروع ہوئی کہ احمد بخش خاں کا کہنا تھا کہ لارڈ لیک نے ان کو جون ۱۸۰۶ ء میں ایک اور پروانہ عطا کیا تھ جس میں صراحت کے ساتھ نصراللہ بیگ کے پس ماندگان کے گذارے کی رقم صرف پانچ ہزار روپے سالانہ کی گئی تھی ۔ غالب نے اس دوسرے پروانے کو ماننے سے انکار کیا کیوں کہ ان کے خیال میں یہ یا تو جعلی دستاویز تھی یا پھر اسے احمد بخش خاں نے دھوکے سے حاصل کیا تھا ۔ خصوصاً اس لیے کہ اس کی رو سے گذارے کے مستحقین میں سے ایک فرد ، خواجہ حاجی ، کو دراصل پس ماندگا کی فہرست میں شامل کرنے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا ۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ فورٹ ولیم میں اس دوسری دستاویز کا کوئی اندرا نہیں تھا ۔ خصوصاً اس لیے کہ سپہ سالاروں کے لیے ضروری تھا کہ میدانِ کارزار میں دیے گئے اپنے تمام احکام کی صدر سے توثی حاصل کریں ۔

غالب کا مقدمہ برحق تھا اور انھوں نے اسے جیتنے کی جان توڑ کوشش کی ، یہاں تک کہ ۱۸۲۸ ء میں کلکتے کا دشوار گذ سفر بھی کیا تاکہ انگریز حکام کے سامنے شخصی طور پر مقدمے کی پیروی کرسکیں ۔ اگلے دو دہوں کے دوران انھوں نے یاد دہانیوں عرض داشتوں اور درخواستوں کا تانتا باندھ دیا ۔ ہر سطح پر مقدمہ لڑے ، دلی کے رزیڈنٹ ، آگرہ کے لفٹنٹ گورنر ، کلکتہ میں گور جنرل اور ان کی کونسل ، لندن میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی مجلسِ نظما اور آخرکار خود ملکہ وکٹوریہ کی سطح پر ۔ لیکن سب بے کار ۔ نہیں کہ انگریزوں میں ان کے کوئی حامی نہیں تھے ۔ گورنر جنرل کا قائم مقام سکریٹری سائمن فریزر اور سابق میں دلی میں انگریز رزیڈنٹ کا مددگار اور بعد میں گورنر جنرل کا پرشین سکریٹری اینڈریو اسٹرلنگ دونوں ادیب بھی تھے اور فارسی زبان کے عالم بھی ۔ انفرادی سطح غالب کے تعلق سے ان کا رویہ مخالفت کا نہیں تھا ۔ فی الحقیقت گورنمنٹ کے چیف سکریٹری جارج سوئنٹن نے غالب کے مفید مطلب ایک غیر معمولی نوٹ لکھا تھا ۔ لیکن اپنے انفرادی محسنوں کے باوجود غالب مقدمہ ہار گئے کیوں کہ انگریزوں کے ذہن میں بالعم پرانے جاگیردار طبقے کے احساسات کے تعلق سے بے اعتنائی ایک نیا رجحان جاگزین ہوگیا تھا ۔ جو دراصل خود مغل بادشاہی کے تئ سے انگریزوں کی بڑھتی ہوئی بے زاری کا ایک حصہ تھا ۔ یہ بات نہیں تھی کہ احمد بخش خاں یا بعد میں ان کے بیٹے شمس الد کے انگریزوں کے ساتھ بہتر تعلقات تھے یا یہ کہ انھوں نے زیادہ جان توڑ کوشش کی ۔ مقدمے کا فیصلہ غالب کے خلاف انگریزا کی ان افراد کے تعلق سے بنیادی بے زاری کی وجہ سے ہوا جن کی کوئی مالی افادیت نہیں تھی اور ساتھ ہی ساتھ جن کی سیاسی افاد

میں روز بہ روز کمی ہوتی جارہی تھی ۔ عام رجحان یہ تھا کہ اس " مفت خور طبقے " کے افراد کے مطالبوں سے سختی سے نپٹا جائے اور ان کے سماجی برتری کے دعووں کو تو بالکل درخورِ اعتنا نہ سمجھا جائے ۔ مقدمے کے حق و باطل کی کوئی اہمیت نہیں تھی ۔ سوئٹن کا مفصل اور تجزیاتی نوٹ شاید مقدمے پر اس کی حقیقتِ حال کی بنیاد پر سنجیدگی سے غور کرنے کی واحد کوشش تھی ۔ باقی سب رواداری میں لکھی ہوئی مختصر تحریریں تھیں ، جن سے برطانوی مفاد سے کلیتہً غیر متعلق معاملے پر جہاں تک ہوسکے کم سے کم وقت ضائع کرنے کی پالیسی کا اظہار ہوتا تھا ۔

اس امر کو ذہن نشین کرلینا بہت اہم ہے کہ اول سے آخر تک غالب اپنے بزرگوں کی انگریزوں کے تئیں بجالائی ہوئی خدمات کے صلے میں پنشن پانے کے حق کو بدیہی سمجھتے تھے ۔ یہ بات خدمت اور صلے کے تعلقِ باہمی کے جاگیر دارانہ تصور سے کلیتہً ہم آہنگ تھے ۔ لیکن انگریز عہدے داروں کی نئی نسل نے اس پشت در پشت تعلقِ باہمی کی افادیت ہی پر اعتراض کرنا شروع کردیا تھا اور پنشن کا یہ مقدمہ بنیادی طور سے اس صورتِ حال سے نپٹنے کی غالب کی کوششوں کے اس ادراک کی وجہ سے اہمیت کا حامل ہے جو ہمیں اس سے حاصل ہوتا ہے ۔ لاعلاج طور پر مقروض غالب کو پنشن میں اضافے کی سخت ضرورت تھی لیکن ان کی کوشش یہ تھی کہ انھیں ان کا حق وقار کے ساتھ ملے ، سماجی نظامِ مراتب میں ان کے مقام کو دھکا پہنچائے بغیر اور اشرافیہ کے ایک رکن کی حیثیت سے ان کی کسرِ شان کے بغیر ۔ جب سائمن فریزر نے کلکتے میں ان کی پذیرائی تواضع کے ساتھ کی ، عطر اور پان پیش کیا اور وقتِ رخصت پھاٹک تک دن کی مشایعت کی تو انھیں مسرت ہوئی ۔ انھیں اتنی ہی مسرت اس وقت ہوئی جب فریزر نے گورنر جنرل کے دربار میں معزز جگہ کی ان کی درخواست کو فوراً قبول کرلیا ۔ غالب کو سلسلہ ، مراتب میں دسویں جگہ ملی جہاں وہ نواب علی اکبر خاں جیسے ممتاز شخص کے برابر اور بادشاہِ دہلی کے وکیل ، بادشاہِ اودھ کے وکیل اور مہاراجہ نیپال کے وکیل جیسے نام در اشخاص سے بس ایک درجہ نیچے کی نشست پر بیٹھے تھے ۔ لیکن سبھی انگریز عہدے دار اتنے شائستہ نہیں تھے ۔ فرانسس ہاکنس جو ۱۸۲۰ میں قائم مقام رزیڈنٹ کی حیثیت سے دہلی میں تعینات تھا خصوصاً نہایت گستاخ تھا ۔ وہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے کمپنی کے نئے عہدے داروں میں سے ایک تھا جو اس حقیقی اقتدار کے تعلق سے جو انھیں حاصل تھا بڑا جارحانہ رویہ رکھتے تھے اور مقامی ..بات سے توافق کے لیے مجبوراً اس کے محدود کیے جانے کی صورت میں سخت ناراض ہوتے تھے ۔ اسے بادشاہ کے علاوہ کسی اور بھیجا ہوا تحفہ وصول کرنے سے انکار تھا ، ملکہ کے حضور میں کھڑے رہنے سے انکار تھا ، اس نے ولی عہد کا بھیجا ہوا گل دستہ ..ل کرنے سے اس لیے صاف انکار کردیا کہ اسے ایک ادنیٰ مالی لے آیا تھا ، وہ بادشاہ کو رواج کے مطابق نذر پیش کرنا اپنے لیے ..ثِ ذلت اور شرم ناک سمجھتا تھا ۔ تعجب کی بات نہیں کہ ہندستانی شرفا کے تئیں اس کا یہ رویہ اور بھی تحکمانہ تھا اور ابتدا ہی .. وہ غالب کے اس دستاویز کے بارے میں محض قیاس پر مبنی شک کا مخالف تھا جسے بہ ظاہر لارڈ لیک کی دست خط اور مہر کا ..ں حاصل تھا ۔ اس نے اس مضمون کی رپورٹ کلکتہ بھیجنے میں دیر نہ لگائی کہ " مستغیث کو لارڈ لیک کے صریحاً مقرر کیے ..ے گذارے سے زیادہ کا کوئی حق نہیں پہنچتا " اور لامحالہ کلکتے کے حکام نے اس کی رائے سے اتفاق کیا ۔ غالب نے فیصلے کے ..ے مرافعہ کیا اور سوئٹن کو اس ادعا کے ساتھ مراسلہ بھیجا کہ ہاکنس نے نواب شمس الدین کی طرف داری کی ہے ۔ سوئٹن نے ، جو غالب کی عرض داشت کو سنجیدگی سے پڑھنے والا واحد انگریز عہدے دار تھا اس نتیجے پر پہنچا کہ دعوے میں وزن ہے اور ہاکنس کو کہ وہ لارڈ لیک کا دوسرا پروانہ جانچ کے لیے روانہ کرے ۔ طے شدہ مقدمے کی پھر سے جانچ پڑتال سے ہاکنس کو خوشی نہیں ہوئی ۔ وہ یہ ..ے قاصر تھا کہ کلکتے کے حکام اس بے حقیقت مسئلے پر اپنا اتنا بیش بہا وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں ۔ چناں چہ مطلوبہ پروانہ

کلکتہ بھیجتے ہوئے اس نے اپنی رائے وضاحت کے ساتھ ظاہر کردی تا کہ کسی کو اس بارے میں کوئی شک وہ شبہ نہ رہے ۔ اس نے لکھا ، " نواب (شمس الدین) نے مطلوبہ فارسی نقشہ ، جس پر لارڈ لیک کی مہر کلاں اور دست خط ثبت ہیں ، ابھی ابھی بھیجا ہے اور اسے اس مراسلے کے ساتھ ملاحظے کے لیے پیش کرتے ہوئے مجھے امید واثق ہے کہ جانچ پڑتال کے بعد حکومت کو اس کے اصلی ہونے کا اسی طرح سے یقین آجائے گا جیسا کہ گزشتہ مئی میں مجھے ، اس وقت جب کہ میں نے اسداللہ خاں کے دعوے کی بابت رپورٹ پیش کی تھی ۔ مجھے امید واثق ہے کہ حکومت اس شخص کے ادعائے باطل کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھے گی جس نے آپ کو اور مجھے اتنا پریشان کیا ہے اور نواب مذکور الصدر کو اتنا صدمہ پہنچایا ہے کہ سزا دیے بغیر اس کی اس حرکت کو نظر انداز کرنا مناسب نہ ہوگا ۔"

جب تک فرانسس ہاکنس اپنی رائے کا اظہار مراسلوں میں کرتا رہا کوئی وجہ نہیں تھی کہ غالب شخصی سطح پر اس کا برا ملتے ۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد ہاکنس اس وقت جب غالب اپنے مقدمے کے سلسلے میں اس سے ملاقات کو گئے ان سے بد تہذیبی کے ساتھ پیش آیا ۔ یہ بات ناقابلِ برداشت تھی ۔ غالب خود کو کوئی معمولی درخواست گذار ، جس کی خودداری کا سودا کیا جاسکے ، نہیں بلکہ انصاف کا طلب گار مدعی سمجھتے تھے ۔ ہاکنس کو مقدمے کے حق و باطل کے بارے میں اپنی ذاتی رائے رکھنے کا حق تھا لیکن ہندستانی اشرافیہ کے ایک رکن کے ساتھ پیش آتے ہوئے اسے شائستگی اور مسلمۂ آدابِ مجلس سے انحراف کا کوئی حق نہیں تھا ۔ غالب نے بہت واضح الفاظ میں احتجاج کیا ۔ کلکتہ میں حکومت کے چیف سکریٹری کے نام اپنے مراسلے میں انھوں نے لکھا :

> " چوں کہ میرا مقدمہ عزت مآب نائب صدرِ کونسل کے زیرِ غور ہے اور بہت ممکن ہے کہ میرا دعویٰ جلد ہی غور و خوض اور جانچ کے لیے رزیڈنٹ کے پاس دہلی بھیجا جائے گا میرے لیے یہ درخواست کرنا موجبِ فخر ہے کہ آپ ازراہِ مہربانی میری یہ استدعا گورنمنٹ کے ملاحظے میں پیش فرمائیں کہ رزیڈنٹ دہلی مسٹر مارٹن سے میرا تعارف اس طرح کرایا جائے کہ نتیجتاً وہاں میرے ساتھ بہ حیثیت خلف نصراللہ بیگ خاں مرحوم ، جاگیردار سونک و سہسہ ضلع آگرہ ، اسی تواضع اور خوش خلقی سے پیش آئیں جس سے میرے قیامِ کلکتہ کے دوران دربارِ عام کے موقعوں پر عزت مآب گورنر جنرل نے مجھے سرفراز فرمایا تھا ۔
>
> میں رزیڈنسی میں مسٹر ہاکنس کے دور میں اپنی پہلی آمد کے نتیجے میں آپ سے ایسی غیر معمولی درخواست کرنے پر مجبور ہوا ہوں جب کہ کلکتے سے واپسی پر رزیڈنسی میں میری پذیرائی اس طور سے ہوئی جو ایشیائی سماج کے سلسلہ ، مدارج میں ، میرے مرتبے اور مقام سے بالکل میل نہیں کھاتی تھی اور میرے جذبات کے لیے حد درجہ غیر اطمینان بخش تھی ، خصوصاً اگر اس کا مقابلہ اس شائستگی اور خوش خلقی سے کیا جائے جس کے مظاہرے سے عزت مآب گورنر جنرل نے مجھے شرف بخشا ۔"

یہ مراسلہ اس روشنی کے پیشِ نظر جو اس وقت وقوع پذیر ہونے والے تاریخی عمل پر اس سے پڑتی ہے بےحد لائقِ توجہ ہے ۔ مناسب اور شائستہ برتاؤ کے لیے انگریزوں کی تعریف اور اس کی خلاف ورزی کی صورت میں ان کی شکایت کرتے ہوئے غالب دراصل جاگیردار طبقے کے ان بیشتر افراد کی تشویش کی ترجمانی کر رہے تھے جو انگریزوں کی ان کے روایتی رتبے کو حقیر کرنے کی سوچی سمجھی پالیسی کے علی الرغم اسے برقرار رکھنے کی کوشش کررہے تھے ۔ اس مفہوم میں " ایشیائی سماج کے سلسلہ ، مدارج میں ان کے رتبے اور مقام " کے چھپتے ہوئے ذکر کے دوٹوک ہونے میں کوئی شک نہیں ۔ انگریز البتہ شائستگی کی تعلیم پانے کے موڈ میں بالکل نہیں تھے ۔ ایسی کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی کہ " ہدایات " جیسی کہ غالب چاہتے تھے مارٹن کے پاس بھیجی گئیں یا ان کی دوسری عرض

داشتوں اور مراسلوں کے برخلاف اس مراسلے کی وصول یابی کی انھیں اطلاع بھی دی گئی ۔ اس اثنا میں پنشن کے مقدمے کے تعلق سے بری خبر وصول ہوئی ۔ اصلیت کی جانچ کے لیے مابہ النزاع پروانہ ممبئی کے گورنر سر جان میلکم کے پاس بھیجا گیا تھا جو ۱۸۰۶ء میں لارڈ لیک سے منسلک تھے ۔ نتیجہ ظاہر تھا ۔ کوئی وجہ نہیں تھی کہ سر جان غالب کی اس مفصل اور نہایت مدلل عرض داشت پر غور و خوض کرتے جو انھوں نے گورنر جنرل بین ٹنک کو الگ سے بھیجی تھی اور جسے سوٹن نے از راہ مروت پروانے کے ساتھ منسلک کردیا تھا ۔ ہاکنس کی طرح میلکم کو بھی دیسیوں کے زمرے کے ایک فرد کو ، سماج میں چاہے جس رتبے کا بھی وہ دعوے دار کیوں نہ ہو ، ایک اصلی دستاویز پر شک کرنے کی اجازت دینا قطعی نامناسب لگا ہوگا۔ جس پر بہ ظاہر لارڈ لیک کی دست خط اور مہر ثبت تھی ، خصوصاً اس صورت میں جب کہ نتیجتاً اس سے انگریزوں کو کوئی فائدہ بھی نہیں پہنچتا تھا ۔ ایسے دعوے کی ہمت افزائی سے جاگیرداروں کے دوسرے بے مصرف اخلاف کو بھی شہ ملتی اور انگریزوں کے خزانے پر ان کے موروثی دعووں کے لیے دروازہ پھر سے کھل جاتا ۔ ایک پیراگراف پر مشتمل نوٹ میں ، جس کی نمایاں خصوصیت سارے مقدمے کی سرسری ، غیر متعلق جانچ اور اسے بے بنیاد ثابت کرنے کا رجحان تھا ، میلکم نے دستاویز کی صحت کی تائید کی ۔ ۳۰ نومبر ۱۸۳۰ء کی تاریخ تھی جب غالب اپنا مقدمہ ہارے ۔

مقدمہ ہارنے کا غالب کی پہلے ہی سے ڈانوا ڈول مالی حالت پر فطری طور پر ناموافق اثر پڑا ۔ لیکن اس جاگیردارانہ ماحول میں جس کا وہ ایک حصہ تھے یہ ہار مساوی طور پر ان کی نام وری کی اہانت بھی تھی ۔ ایک ایسے امیر زادے کی حیثیت سے جس کے اسلاف صاحبِ اختیار اور خوش حال تھے اور استحقاق کے مطابق انگریزوں کے التفات سے مستفید ہوتے رہے تھے اس سے سماج میں ان کی وقعت بھی متاثر ہوئی ۔ ان کے ہم سروں کی نظروں میں اہم بات یہ نہیں تھی کہ ان کا مقدمہ قانونی دلائل کی روشنی میں کم زور ثابت ہوا ، اہم بات یہ تھی کہ فرنگیوں کے ہاں ان کا اثر رسوخ برائے نام رہ گیا تھا ۔ چناں چہ غالب کے لیے معاملے سے یوں ہی دست بردار ہوجانا ممکن نہ تھا ۔ دسمبر ۱۸۳۱ء میں دہلی میں دربار کے موقعے پر ، غالب نے شخصی طور پر گورنر کو ایک عرض داشت پیش کی اور سکریٹری پنسپل کے ذریعے بھی ایک عرضی بھیجی ۔ اپریل ۱۸۳۲ء میں انھوں نے گورنر جنرل کو اپنے مقدمے پر دوبارہ غور کرنے کے لیے لکھا ۔ ایک سال بعد انھوں نے چیف سکریٹری سوٹن کو لکھا ۔

" آپ کے علم میں یہ بات ضرور ہوگی کہ میرے والد عبداللہ بیگ خاں مرحوم نے ہندستان میں انگریزی حکومت کے قیام سے قبل انتقال کیا ، جب کہ میں نو سال کا تھا اور میرے چچا نصراللہ بیگ خاں آں جہانی جنرل پیروں کی طرف سے آگرہ کے حاکم تھے اور برطانوی حاکموں کی فرماں برداری میں بھی اسی عہدے پر برقرار رہے اور چار سو سواروں کے رسالے کے ساتھ انھوں نے آں جہانی لارڈ لیک کی رفاقت کی اور آنربیل کمپنی کی بیش بہا خدمات انجام دیں جس کے صلے میں انگریزی حکومت کی طرف سے انھیں سونک اور سونسہ کے پرگنے جاگیر میں عطا کیے گئے جن کی تفصیل سرکاری کاغذات میں درج ہے ۔ میں عاجزانہ توقع رکھتا ہوں کہ آپ براہِ کرم سرکاری کاغذات سے نصراللہ بیگ خاں مرحوم کی نیک نامی اور منصب کے بارے میں پتہ چلائیں گے اور مجھے اس مضمون کا ایک صداقت نامہ عطا فرمائیں گے تاکہ اس کے ساتھ میں ان انگریز صاحب بہادر کی خدمت میں حاضر ہوں جو میرے مقدمے کی سماعت فرمائیں گے اور تاکہ وہ میرے ساتھ عزت کا سلوک فرمائیں ۔"

اس امرِ واقعہ ہی سے کہ غالب کو اپنے رتبے کے ثبوت میں ایک صداقت نامہ درکار تھا ، مگر انگریزوں کے ہندستانی شرفا کے ساتھ باہمی تعلقات کی بڑھتی ہوئی نااستواری کی نشان دہی ہوتی ہے ۔ انگریز عہدے دار اپنی حکومت کے ابتدائی سالوں میں "دیسی اعلیٰ طبقے"

کے افراد سے شخصی طور پر واقف رہتے تھے اور یہ واقفیت اکثر محض صاحب سلامت تک محدود نہیں ہوتی تھی ۔ مگر اب رتبے کے بارے میں مقامی طور سے میسر واقفیت ، تعلیم و تربیت کی واضح نشانیاں اور زبانی تعارف کافی نہیں تھا ۔ اب دلی کے اعلیٰ عہدے داروں کو خوش خلقی کے ساتھ برتاؤ پر راغب کرنے کے لیے انگریزوں کے صدر مقام کلکتے سے تحریری صداقت نامہ درکار تھا ۔ بالکل کی حیثیت اب استثنائی نہیں رہ گئی تھی ۔ بدسلوکی کے کسی ایک واقعے کے خلاف شکایت مسئلے کا حل نہیں تھا ، خود حاکموں کی طرف سے حسب نسب کی تصدیق ضروری تھی ۔

اور پھر اس امر کی کوئی تحریری شہادت نہیں ہے کہ غالب کو مطلوبہ صداقت نامہ مل گیا ۔ اسی سال کچھ دنوں بعد انھوں نے چیف سکریٹری کو ایک اور خط لکھا ، جس کے ساتھ اس بار گورنر جنرل کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ بھی منسلک تھا ۔

" خدا کا شکر کہ حاکمِ وقت کلیتہً انصاف پسند ہے اور حق و باطل میں فرق کرنا جانتا ہے لیکن مجھے یہ عرض کرتے ہوئے افسوس ہے کہ اس عہدِ مبارک میں میرے معاملے کی یک سوئی ابھی تک نہیں ہو پائی ہے اور میرے اوصاف کی قدر نہیں ہوئی ہے ۔

میں نے آپ کی شان میں ایک غزل اور عزت مآب گورنر جنرل کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے ۔ پہلے بند میں میں نے اپنی خواہشات کا اظہار کیا ہے اور نیاز مندانہ توقع رکھتا ہوں کہ کسی مناسب وقت اسے گورنمنٹ ہاؤس میں عید نصاریٰ (کرسمس) کے موقع پر بطریقِ احسن پڑھا جائے گا ۔ امید کرتا ہوں کہ جناب والا اس عرض داشت کے جواب میں مجھے اپنے دست خطی پروانے سے نوازیں گے اور اگر جناب والا مذکورہ غزل اور قصیدے کے بند کو کسی فارسی اخبار میں شائع کرنے کی ہدایت دیں تو میں اسے اس امر کے معتدبہ ثبوت پر محمول کروں گا کہ مذکورہ اشعار جنابِ والا کو پسند آئے اور اس سے میری ہمت افزائی ہوگی کہ جناب والا کے مزید لطف و کرم کی طرف سے پُر امید رہوں ۔"

خط دو وجوہ سے نہایت دل چسپ ہے ، اول یہ کہ جواب میں غالب چیف سکریٹری کے دست خطی پروانے کے خواہش مند تھے ۔ دوم یہ کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ چیف سکریٹری غزل اور قصیدے کے بند کو کسی فارسی اخبار میں شائع کروائیں ۔ چوں کہ لوک صداقت نامہ جاری ہونے کے آثار نہیں تھے ضروری تھا کہ اسی مقصد کے حصول کے لیے دوسرے ذرائع اختیار کیے جائیں ۔ چیف سکریٹری درخواست منظور کرتے ہیں تو امید تھی کہ ان انگریز عہدے داروں پر جن سے اپنے مقدمے کے سلسلے میں غالب کا سابقہ پڑتا تھا اس کا خاطر خواہ اثر پڑے گا ۔ اس سے ان کے اپنے ہم عصروں کو ان کے پہلے جیسے رسوخ اور رتبے کا ثبوت بھی مل جائے گا ۔ بعض انگریز ناشائستہ تھے ، لیکن بالذات " صاحبِ اختیار تھے ، چناں چہ ان کا ایسا لطف و کرم جو سب کو دکھائی دے اہمیت رکھتا تھا ۔ گورنر جنرل کی شان میں لکھا ہوا قصیدہ جس کی وصول یابی کی اطلاع چیف سکریٹری کے دست خطی پروانے سے ملے ان کے لطف و کرم کا ثبوت ہوگا ۔ خود چیف سکریٹری کی ایما سے کسی فارسی اخبار میں شائع ہونے والی غزل سے بھی وہی مقصد ہوگا (ملحوظ خاطر رہے کہ وہ چند فارسی اخبار جو اس زمانے میں شائع ہوتے تھے ہندستانی علمی حلقوں اور حلقہ امرا میں بہ کثرت پڑھے جاتے تھے) اصل مقصد وہی تھا ، اس مقررہ نظامِ مراتب میں اپنے روایتی مقام کو برقرار رکھنا ، جس کا توازن انگریزوں اور سماجی و معاشی تغیرات کی وجہ سے دن بہ دن بگڑتا جارہا تھا ۔ پنشن کے مقدمے کا موافقِ مطلب فیصلہ اس میں شک نہیں کہ اس روایتی مقام کی برقراری کی بہترین شہادت ہوتا لیکن چوں کہ معاملے کی یک سوئی میں وقت درکار تھا تو فی الوقت دوسرے ذرائع سے کام لیے

علاوہ اور کوئی چارہ ٔ کار نہ تھا ۔

دہری مشکل لامحالہ یہ تھی کہ خودداری کی قربانی دیے بغیر انگریزوں سے کچھ حاصل کیسے کیا جائے ۔ درخواست کرنا ناگزیر تھا
کسی بھی معمولی جویائے لطف و کرم کی مانند فرومایگی سے استدعا کرنے سے تو اس کام کا مقصد ہی فوت ہوجائے گا ۔ غالب کو
کا پورا احساس تھا اور انھوں نے پوری احتیاط سے کام لیا کہ صحیح توازن برقرار رہے ۔ انگریزوں کو مراسلہ لکھنے والے غالب نہیں
" نصراللہ بیگ خاں مرحوم ، جاگیردار سونک و سرسہ ، ضلع آگرہ کے بھتیجے اسداللہ خاں " تھے ۔ مراسلے حد سے زیادہ خوشامدانہ ہرگز
ہوتے تھے ۔ تمہیدی عبارت میں روایتی تحسین و آفرین کے فقرے مختصر اور اکثر ، مثلاً محولہ ، بالا مراسلے میں ، بے ڈھنگے پن
حد تک مختصر ہوتے تھے ۔ بعض اوقات یہ بالکل ہی غائب رہتے تھے ۔ جب انگریز عہدے دار جیسا کہ ہاکنس کے معاملے میں ہم
چکے ہیں ، استحقاق کے مطابق شائستگی سے پیش نہیں آتے تھے تو غالب شکایت کرتے تھے ۔ جب اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا تو
پھر بھی فورٹ ولیم سے اپنے رتبے کی توثیق کے طلب گار ہوکر کوشش کرتے تھے کہ ان کے ساتھ زیادہ شائستگی کا برتاؤ کیا جائے ۔
ورنر جنرل سے راست مراسلت کو نامناسب نہیں سمجھتے تھے ۔ مدحیہ قصائد لکھتے ہوئے وہ کسی نہ کسی طرح ذہن نشین کردیتے تھے کہ
جنرل کو اپنی مشقِ سخن کا موضوع بناکر وہ اس پر احسان کر رہے ہیں ۔ وہ نہیں سمجھتے تھے کہ حکومت کے چیف سکریٹری سے
قصیدے کی وصول یابی کی اطلاع اسی کے دست خطی پروانے کے ذریعے پانے کی درخواست کرتے ہوئے وہ اپنی حدود سے متجاوز
رہے ہیں ، نہ ہی انھیں اس بارے میں کوئی شک تھا کہ ان کا قصیدہ اتنا اہم ہے کہ گورنمنٹ ہاؤس میں کرسمس کے دن اسے پڑھا
جائے ۔ ۱۸۴۲ء میں لارڈ ہارڈنج کی شان میں لکھے ہوئے مدحیہ قصیدے میں وہ ممدوح کو نام ور ایرانی سپہ سالار افراسیاب سے مماثل
دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ خود کو شاہِ قلم رو نظمان بھی کہتے ہیں ۔ کبھی کبھی وہ ایسا لہجہ بھی اختیار کرسکتے تھے جو ان کے طنزیانہ
ـ سے شاید ہی توافق رکھتا تھا ۔ ۱۸۳۲ء میں ان کی درخواست پر کہ ان کے مقدمے پر دوبارہ غور کیا جائے نوکر شاہی کے لیے
ـس داؤ پیچ کا مظاہرہ کرتے ہوئے گورنر جنرل نے حکم دیا کہ اس مقدمے کی جانچ پڑتال پہلے لفٹنٹ گورنر ، آگرہ کے ہاں ہونی چاہیے ۔
لفٹنٹ گورنر کے ساتھ مراسلت کرتے رہے اور سات سوالوں کی ایک فہرست پیش کی جن کے جواب انھیں مطلوب تھے ۔
ـٹ گورنر نے جواب تو فراہم نہیں کیے البتہ ۱۸ جون ۱۸۳۶ء کو فیصلہ غالب کے خلاف صادر کیا ۔ اس وقت تک غالب راست
جنرل کے ہاں مرافعہ کرچکے تھے ۔ لیکن گورنر جنرل اور ان کی کونسل نے لفٹنٹ گورنر کے فیصلے کی توثیق کی اور اس کی اطلاع دلی
متعینہ ایجنٹ کے ذریعے بہ تاریخ ۱۷ / اکتوبر ۱۸۳۶ء غالب کو دی ۔ ایک مہینہ بھی نہیں گذرا تھا کہ غالب نے پھر لارڈ آک لینڈ کو ،
ـن ٹنک کی جگہ پر گورنر جنرل مقرر ہوئے تھے ، مخاطب کیا ۔ سخت کلامی کی حدوں کو چھوتا ہوا تو نہیں لیکن درشت شکایتی لہجے کا
یہ مراسلہ اس تجزیے کے تعلق سے اتنا برمحل ہے کہ یہاں اسے از اول تا آخر نقل کرنا مناسب ہوگا ۔

نہایت مؤدبانہ عرض ہے :

۱) کہ حضور والا کے اس درخواست گذار کو ایجنٹ متعینہ دلی کے ذریعے مسٹر میک ناٹن سکریٹری کا ماہ گذشتہ کی ۱۷
کا مراسلہ اس مضمون کا موصول ہوا ہے کہ " حضورِ والا اور ان کی کونسل کا خیال ہے کہ اس درخواست گذار کے اس دعوے
ـں کو صوبہ جات شمال مغربی کے لفٹنٹ گورنر کے گذشتہ جون کی ۱۸ / تاریخ کو صادر شدہ حکم کی رو سے بالآخر فیصل کردیا گیا ہے ،
ـہ غور کرنے کی کافی وجوہ نہیں ہیں ۔"

۲) کہ یہ درخواست گذار مؤدبانہ یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے کہ آگرہ کے لفٹنٹ گورنر کے ہاتھوں چند در چند

ناانصافیوں کا مورد ہونے پر اس درخواست گذار نے مذکورہ ، صدر حاکم کے فیصلے کے خلاف جناب والا معہ کونسل کے حضور میں مرافعہ کیا تھا اور بعد ازاں گذشتہ جولائی کی ۱۴ تاریخ کو اس کے مقدمے کی ایک توضیحی روداد پیش کی تھی اور سات نکات یا استفسارات اس التجا کے ساتھ پیش کرنے کی جراءت کی تھی کہ ان کے جواب آگرہ کے لفٹننٹ گورنر سے حاصل کیے جائیں اور یہ کہ ان استفسارات اور عزت مآب لفٹننٹ گورنر ، آگرہ کے ہاں سے موصولہ ان کے جوابات پر مناسب غور و خوض کے بعد حضور والا اس درخواست گذار کے مقدمے کا فیصلہ صادر فرمائیں اور یہ درخواست گذار نہایت مؤدبانہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے کہ یہ طریقہ ، کار حضور والا کی توجہ کا سزا وار تھا ۔

۳) کہ یہ درخواست گذار نہایت مؤدبانہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے کہ آگرہ کے لفٹننٹ گورنر کے ہاں سے ان سات استفسارات کے جواب حاصل کرنے اور انھیں تسلیم کرنے کی صورت میں یہ درخواست گذار نہایت مؤدبانہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے کہ اسے ان کی ایک نقل عنایت کی جانی چاہیے تھی اور اسے ان وجوہ سے واقف کیا جانا چاہیے تھا ، جن کی بنا پر حضور والا نے انھیں تسلیم کرنا مناسب سمجھا ۔ لیکن اگر حضور والا نے آگرہ کے لفٹننٹ گورنر سے ان سات استفسارات کے جواب طلب نہیں فرمائے ، تو یہ درخواست گذار نہایت ادب سے یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے کہ حضور والا کو ان کے تعلق سے اس درخواست گذار کی التجا پوری کرنی چاہیے تھی ۔

۴) کہ اس درخواست گذار کے لیے اب یہ التجا کرنا موجب فخر ہے کہ حضور والا ازراہِ کرم اس کے مقدمے کو ان تمام متعلقہ کاغذات کے ساتھ ، جنھیں حضور والا کی ہندستان میں آمد کے بعد وقتاً فوقتاً پیش کرنے کا اس درخواست گذار کو شرف حاصل ہوا تھا ، صدر دیوانی عدالت ، کلکتہ کو منتقل فرما دیں ، ان احکام کے ساتھ کہ اس درخواست گذار کے مقدمے کی جانچ پڑتال عدالت میں معینہ عمل درآمد کے مطابق کی جائے اور اگر اس درخواست گذار کا دعویٰ عدالت کی نگاہ میں حق بہ جانب قرار پائے تو اس عدالت میں بہ حیثیت جج صدر نشینی کرنے والے حکام حضور والا کو از سرِ نو مطلع کریں تاکہ حضورِ والا اس درخواست گذار کو اس کا قانونی اور جائز حق دیں ، لیکن اگر وہ اس درخواست گذار کے مقدمے میں آگرہ کے لفٹننٹ گورنر کے احکام کو درست اور انصافاً جائز قرار دیتے ہیں تو وہ اس درخواست گذار کو باقاعدہ روبکاری کے ذریعے وہ تمام وجوہ سمجھائیں جن کی بنا پر انھوں نے لفٹننٹ گورنر کے احکام کی توثیق کی ۔

۵) کہ یہ درخواست گذار مؤدبانہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے کہ اگر حضور والا اس کے مقدمے کو "دیوانی عدالت کلکتہ کو منتقلی کی مذکورالصدر التجا کو شرفِ قبولیت نہیں بخشتے ہیں تو اس کے لیے نہایت مؤدبانہ یہ التماس کرنا لازمی ہوگا کہ حضورِ والا از راہِ کرم اس کے مقدمے کو تمام متعلقہ کاغذات کے ساتھ انگلستان منتقل فرمادیں تاکہ اس کی تحقیقات بادشاہ اور ان کی کونسل کے حضور میں ہوسکے ۔ اور حضور والا کا یہ درخواست گذار اپنے اخلاقی فریضے کی طرح حضور والا کی درازیٔ عمر اور اقبال مندی کے لیے ہمیشہ دست بہ دعا رہے گا ۔

اس سپاٹ اور موضوعِ بحث سے قطعاً انحراف نہ کرنے والے مراسلے کے بین السطور میں مراسلہ نگار کی دبی ہوئی خفگی کو آسانی سے تاڑا جاسکتا ہے ۔ اس میں غالب خبردار کرتے ہیں کہ وہ رحم کے نہیں دادرسی کے طلب گار تھے ، لطف و کرم کی استدعا نہیں کر رہے تھے بلکہ خود برطانوی قوانین کی رو سے جس طریق کار کو اختیار کرنے کا انھیں حق تھا اسی کے ذریعے اپنے جائز حق کا مطالبہ کر رہے تھے ۔ یہ گورنر جنرل کی اہلیتِ عدل گستری کے تعلق سے عدم اعتماد کا اظہار تھا اور یہ بات مراسلے کی عبارت سے روزِ روشن کی طرح عیاں تھی ۔ مراسلے میں حضور والا کو ان کی فرد گذاشتوں پر فہمائش کی گئی ہے ، ان کو ہدایت دی گئی ہے کہ آئندہ

انھیں کون سا طریقِ عمل اختیار کرنا چاہیے اور انھیں مطلع کیا گیا ہے کہ بہ صورتِ دیگر درخواست گذار کا مصمم ارادہ شاہِ انگلستان کے حضور میں مرافعہ کرنے کا ہے ۔ ہندستانی طبقہ ، امرا کا ہر ایک فرد گورنر جنرل کو راست مخاطب کرنے کی جراءت نہیں کرسکتا تھا ۔ لیکن ستے واضح برہم لہجے میں ، روایتی طولانی تمہید اور مدح و ستائش اور دعائے خیر پر مشتمل اختتام سے عاری مراسلہ لکھنے کے لیے بہت درکار تھی ۔ یہ مراسلہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ غالب بھلے ہی انگریزوں کے وظیفہ خوار اور ان کے سامنے محض ایک درخواست گذار رہے ہوں لیکن ان کے خوشامدی نہیں تھے ۔

قرینِ قیاس ہے کہ یہ مراسلہ انگریزوں کو برہم کرنے سے زیادہ ان کے لیے باعثِ تفنن رہا ہوگا ۔ مسلمہ عمل درآمد کے مطابق درخواستِ مرافعہ لندن میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی مجلسِ نظما کو بھیجی جاتی تھی ۔ فیصلے کے انتظار کے دوران غالب بتے دسمبر ۱۸۳۶ ء میں حکومت کے چیف سکریٹری میڈاک کے نام کچھ اشعار بھیجے ۔ اشعار میں انھوں نے مطلع کیا کہ " میں نے حضورِ والا (گورنر جنرل) کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ لکھا ہے ۔" لامحالہ مدحیہ قصیدے کے ساتھ " وظیفے کے تعلق سے میرے مطالبات کی بابتہ " ایک عرضِ داشت بھی منسلک تھی ۔ نہ ہی عرض داشت اور نہ ہی قصیدے کی وصول یابی کی اطلاع غالب کو دی گئی ۔ اپریل ۱۸۳۷ ء میں انھوں نے انگریزوں کو یاد دہانی کی کہ انھیں جواب کا انتظار ہے ۔ انھیں اس مضمون کا ایک شائستہ مگر ٹکاسا جواب موصول ہوا کہ " حضورِوالا اس التفات کے تعلق سے جس کا اظہار اپنے اشعار کا ایک نسخہ بھیج کر آپ نے کیا ہے ، مسرت کا اظہار کرتے ہیں ۔" مجلسِ نظما نے فروری ۱۸۴۲ ء میں ، یعنی مقدمے کو ان کے ہاں فیصلے کے لیے بھیجے جانے کے چھ سال بعد ، اپنی رائے کا اظہار اس ایک سطری فیصلے میں کیا : " اس دعوی کو جاگیر کی ضبطی[1] کے قبل ہی اور معقول وجوہ کی بنا پر مسترد کیا جاچکا ہے ۔" ہار نہ ملتے ہوئے غالب نے خود ملکہ ، وکٹوریہ کے حضور میں مرافعے کی درخواست گذارنی ۔ انھوں نے گورنر جنرل لارڈ ایلن برو کو لکھا : " اپنے مقدمے میں صادر شدہ حکم سے غیر مطمئن یہ درخواست گذار مشفق و مہربان ملکہ ، معظمہ کے حضور میں مرافعہ کا شرف حاصل کرتا ہے ۔ چناں چہ وہ نہایت مؤدبانہ یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے کہ حضور والا ازراہِ تلطف منسلکہ عرض داشت کو مشفق و مہربان ملکہ ، معظمہ کی خدمت میں ہمدردانہ و کریمانہ ملاحظے کے لیے بھیج دیں ۔"

انگریز حیرت کے ساتھ سوچتے رہے ہوں گے کہ آیا وہ اس مستقل مزاج درخواست گذار سے کبھی چھٹکارا بھی پاسکیں گے ۔ ان کی مرافعے کی متعدد عرض داشتوں پر ضروری کارروائی کرنے میں ان کا مقصد غالب کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنے سے زیادہ " دیسیوں " کے فائدے کے لیے برطانوی عدل و انصاف کے " روشن خیال " بنیادی ڈھانچے کو برقرار رکھنا تھا ۔ لیکن یہ درخواست گذار کبھی مطمئن ہوتا ہی نہیں تھا ۔ انگریزوں کے جواب جتنے زیادہ رسمی اور سرسری ہوتے تھے غالب اتنا ہی زیادہ ان کو انھیں کے قوانین اور ضابطوں کی رو سے زچ کردیتے تھے ۔

اب انھوں نے ملکہ کے حضور میں راست مرافعہ کرنے کی جراءت کی تھی ۔ لامحالہ غالب نہیں سمجھتے تھے کہ ایسا کر کے انھوں نے ذرہ برابر بھی بے ادبی کا مظاہرہ کیا ہے ۔ طبقہ ، امرا کے ایک فرد اور ممتاز شاعر کی حیثیت سے انھیں حضرتِ اقدس ،

(باقی ص ۲۰ پر)

---

[1] دہلی کے انگریز رزیڈنٹ ولیم فریزر کے قتل کی سازش کے الزام میں ۱۸۳۵ ء میں فیروز پور اور جھرکہ کے نواب شمس الدین کو پھانسی کی سزا دی گئی تھی ۔ اس وقت ان کی جاگیر انگریزوں نے ضبط کرلی تھی اور تب سے غالب کو پنشن کی ادائگی راست برطانوی محکمہ ، خزانہ سے ہو رہی تھی ۔

مضطر مجاز

غالب کی فارسی غزلوں کا منظوم ترجمہ

(۱)

تا فصلے از حقیقتِ اشیا نوشتہ ایم
آفاق را مرادفِ عنقا نوشتہ ایم
ایماں بہ غیب تفرقہ ہا رفت از ضمیر
اسما گذشتہ ایم و مسمیٰ نوشتہ ایم
عنوانِ رازِ نامہ ، اندوہ سادہ بود
سطرِ شکستِ رنگ بہ سیما نوشتہ ایم
قلزم فشانیِ مژہ از پہلوئے دل است
ایں ابر را برات بہ دریا نوشتہ ایم
در ہیچ نسخہ معنیِ لفظِ امید نیست
فرہنگِ نامہ ہائے تمنا نوشتہ ایم
آئندہ و گذشتہ تمنا و حسرت است
یک "کاوش کہ" بود کہ بہ صدجا نوشتہ ایم
رنگِ شکستہ عرضِ سپاسِ بلائے تست
پنہاں سپردہ ، غم و پیدا نوشتہ ایم
آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بہ خونِ دل
قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم
غالب الف ہماں علمِ وحدتِ خود است
بر "لا" چہ برفزود کہ "الا" نوشتہ ایم

○○○

جب ہم نے بابِ ہستیِ اشیا رقم کیا
آفاق کو مرادفِ اشیا رقم کیا
ایماں جو غیب پر ہو تو مٹتے ہیں تفرقے
اسما کو چھوڑ چھاڑ مسمیٰ رقم کیا
اندوہ و غم کے نامے کا عنوان سادہ تھا
خطِ شکستِ رنگ بہ سیما رقم کیا
قلزم فشانی آنکھ کی پہلوئے دل سے ہے
اس ابر کی برات کو دریا رقم کیا
لفظِ امید کہ کہیں معنیٰ نہ مل سکے
سارا لغاتِ بابِ تمنا رقم کیا
آئندہ و گذشتہ ہے حسرت اور آرزو
اک لفظِ "کاش کہ" کو بہ صدجا رقم کیا
رنگِ شکستہ عرضِ سپاسِ بلا بھی ہے
پنہاں سپردِ غم کیا ، پیدا رقم کیا
ہر نوکِ خار قلب کے لہو میں ڈبو ڈبو
قانونِ باغبانیِ صحرا رقم کیا
غالب الف ہے اپنا تو وحدت کا خود علم
"لا" کیا ہے کیا ہوا ہے جب "الا" رقم کیا

○○○

(۲)

رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم
در بزمِ رنگ و بو نمطے دیگر افگنم
در وجدِ اہلِ صومعہ ذوقِ نظارہ نیست
ناہید را بہ زمزمہ از منظر افگنم
معشوقہ را ز نالہ بد آں ساں کنم حزیں
کز لاغری ز ساعدِ او زیور افگنم
ہنگامہ را جحیمِ جنوں بر جگر زنم
اندیشہ را ہوائے فسوں در سر افگنم
نخلم کہ بہ جائے رطبِ طوطی آورم
ابرم کہ ہم بہ روئے زمیں گوہر افگنم
باغازیاں ز شرحِ غمِ کارزارِ نفس
شمشیر را بہ رعشہ ز تن جوہر افگنم
بادیریاں زشکوہ ، بیدادِ اہلِ دیں
مہرے زخویشتن بہ دلِ کافر افگنم
ضعفم بہ کعبہ مرتبہ ، قربِ خاص داد
سجادہ گستری تو و من بستر افگنم
تا بادہ تلخ ترشود و سینہ ریش تر
بگزارم آبگینہ و در ساغر افگنم
راہے ز کنجِ دیر بہ مینو کشودہ ام
از خم کشم پیالہ و در کوثر افگنم
منصورِ فرقہ ، علی اللہیاں منم
آوازہ ، انا اسداللہ در افگنم
غالب بہ طرحِ منقبتِ عاشقانہ ای
رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم

ooo

سوچا ہے کہنگی کا مداوا کوئی کروں
اس بزمِ رنگ و بو میں کوئی طرحِ نو رکھوں
ذوقِ نظارہ سے ہیں تہی اہلِ صومعہ
ناہید کو فلک سے زمیں پر اتار لوں
معشوقہ کو میں نالے سے اتنا کروں ملول
زیور ، میں لاغری سے سب اس کے اتار لوں
میں جھونک دوں جگر میں جحیمِ جنونِ شوق
اندیشے سے ہوائے فسوں سر میں پھونک دوں
طوطی ہیں جس پہ نغمہ زناں ، وہ شجر ہوں میں
گوہر زمیں پر جو لٹائے وہ ابر ہوں
ان غازیانِ دیں کو بہ فیضِ جہادِ نفس
رعشے سے تن کے جوہرِ شمشیر بخش دوں
بےدادِ اہلِ دیں سے جو شاکی ہیں اہلِ دیر
کافر کے دل کو مہر و محبت سے جیت لوں
کعبے میں قربِ خاص ملا مجھ کو ضعف سے
سجادہ تو سنبھال لے ، بستر میں ڈال لوں
ہو تاکہ بادہ تلخ تر اور سینہ ریش تر
پگھلا کے آبگینے کو ساغر کو پُر کروں
ڈھونڈا ہے کنجِ دیر سے جنت کا راستہ
خم سے پیالہ بھر کے میں کوثر میں ڈال دوں
منصورِ فرقہ ، علی اللہیاں ہوں میں
دم ، دم بہ دم ، انا اسداللہ کا بھروں
غالب بہ طرحِ منقبتِ عاشقانہ اب
سوچا ہے کہنگی کا مداوا کوئی کروں

ooo

(۴)

به وادیی که درآں خضر را عصا خفت است
به سینه می سپرم ره اگر چه پا خفت است
بدیں نیاز که باتست نازمی رسدم !
گدا به سایهٔ دیوارِ پادشا خفت است
به روزِ حشر چنیں خسته روسیه خیزد
که در شکایتِ درد و غمِ دوا خفت است
خروشِ حلقهٔ رنداں ز نازنیں سرِ مست
که سر به زانوئے زاہد به بوریا خفت است
ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسسته لنگرِ کشتی و ناخدا خفت است
غمت به شهر شبیخوں زناں به بنگهٔ خلق
عسس به خانه و شه در حرم سرا خفت است
درازیِ شب و بیداریِ من ایں ہمه نیست
ز بختِ من خبر آرید تا کجا خفت است
به بیں ز دور و مجو قربِ شه که منظر را
دریچه باز و به دروازه اژدہا خفت است
به راه خفتنِ من ہر که بنگرد ، داند
که میرِ کارواں در کارواں سرا خفت است
دگر ز ایمنیِ راه و قربِ کعبه چه حظ
مرا که ناقه زرفتار ماند و پا خفت است
به خواب چوں خودم آسوده دل مداں غالب
که خسته غرقه به خوں خفته است تا خفت است

راہ وہ جس میں عصا بھی خضر کا خوابیدہ ہے
سینے کے بل چل رہا ہوں گرچہ پا خوابیدہ ہے
ناز اسی پر ہے مجھے ، تجھ سے ہے مجھ کو جو نیاز
سایۂ دیوارِ شہ میں یہ گدا خوابیدہ ہے
صبحِ محشر خستہ تن اس طرح اٹھا جس طرح
مبتلائے درد ، جو پائے دوا خوابیدہ ہے
ہے خروش اک حلقۂ رنداں میں جب سے وہ حسیں
زانوئے زاہد پہ سر رکھے پڑا خوابیدہ ہے
رات تاریک اور ہوا دشمن تو طوفاں خیز بحر
ہوگیا لنگر شکستہ ناخدا خوابیدہ ہے
تیرے غم نے شہر پر مارا ہے شب خوں اور ادھر
کوتوالِ شہر ہو یا پادشاہ خوابیدہ ہے
لمبی یہ شب اور یہ میرا جاگنا کچھ بھی نہیں
میری قسمت کی خبر لو تا کجا خوابیدہ ہے
دور ہی سے دیکھ قربِ شاہ کی کوشش نہ کر
ہے دریچہ باز ، در پر اژدہا خوابیدہ ہے
نیند میں جو دیکھتا ہے مجھ کو وہ واقف ہے خوب
واں سرائے میں جو میرِ قافلہ خوابیدہ ہے
راہ بھی پُر امن ہے ، نزدیک کعبہ بھی مگر
ناقہ بے رفتار میرا اور پا خوابیدہ ہے
غالب اپنی طرح سے آسودہ دل مجھ کو نہ جان
خستہ تن یہ غرقِ خوں ہو کر سوا خوابیدہ ہے

شمیم حنفی



شمیم حنفی معاصرِ اردو ادب کا ایک نمایاں اور اہم م ہے ۔ ادب میں وہ کئی حیثیتوں سے جانے جاتے ہیں ؛ نقاد ، اما نگار ، شاعر ، مرتب ، مترجم اور ادبی صحیفہ نگار ۔

شمیم حنفی ایک باذوق اور باشعور نقاد ہیں ۔ ان کی نید محض نظریاتی مباحث تک محدود نہیں ہے ۔ نقاد کے اصلی ن علمی تنقید میں کھلتے ہیں ۔ عملی تنقید ہی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نقاد کتنے پانی میں ہے ۔ شمیم حنفی ادب اور آرٹ کے اسے نظریات سے بہرہ مند ہونے کے ساتھ ایک تخلیقی فن ر بھی ہیں اور ادب کا شائستہ مذاق رکھتے ہیں اسی لیے ان کی نید باوزن اور باوقار ہوتی ہے ۔ ان کی چھے تنقیدی کتابیں اب تک شائع ہوچکی ہیں ؛ جدیدیت کی فلسفیانہ اساس ، غزل کا نیا منظر نامہ ، نئی شعری روایت ، کہانی کے پانچ رنگ ، اقبال کا حرفِ تمنا ر قاری سے مکالمہ ۔

اردو میں ڈراما کی صنف کو زندہ رکھنے اور ترقی دینے میں شمیم حنفی کا گراں قدر حصہ رہا ہے ۔ ڈرامے کے فن پر انھیں پوری ست رس حاصل ہے ۔ انھوں نے زیادہ تر ریڈیائی ڈرامے لکھے ہیں جو نشر کیے جاچکے ہیں ۔ ان کے ریڈیو ڈراموں کے چار مجموعے "مٹی کا لاوا" ، "مجھے گھر یاد آتا ہے" ، "زندگی کی طرف" اور "بازار میں نیند" شائع ہوچکے ہیں ۔ "مٹی کا بلاوا" مختلف یونیورسٹیوں کے ساب میں شامل ہے ۔ شمیم حنفی کے چند ڈرامے اسٹیج پر بھی پیش کیے جاچکے ہیں ۔

شمیم حنفی ایک اچھے شاعر ہیں ۔ ان کا کلام رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے ۔ لیکن انھوں نے اپنی شاعری کا کوئی مجموعہ مرتب ہیں کیا ۔ یہ صنف جس سے وہ بے اعتنائی برت رہے ہیں ان کی خاص توجہ کی مستحق ہے ۔

شمیم حنفی نے ترجموں کے ذریعے بھی اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دی ہے ۔ اہم کتابوں کے اردو میں ترجمے کیے جو شائع ہوچکے ہیں ان میں "ہماری آزادی" (مولانا ابو الکلام آزاد) ، "یادوں کی دنیا" (بھگوان سنگھ) ، "قومی یک جہتی اور سیکولر زم" (ڈاکٹر تارا چند) "جدوجہد کے سال" (جواہر لال نہرو) قابلِ ذکر ہیں ۔ ان کے علاوہ انھوں نے پچاس بنگالی نظموں کے ترجموں کا مجموعہ "شہر خوں آشام" کے نام سے شائع کیا ۔

شمیم حنفی نے بچوں کے لیے کئی کہانیاں لکھیں اور ترجمے کیے پری کتھاؤں کے دو مجموعے اور تین سوانح عمریاں شائع ہوچکی ہیں ۔ آج بھی وہ بچوں کے لیے لکھتے رہتے ہیں ۔

شمیم حنفی ۱۰ مئی ۱۹۳۹ء کو سلطان پور میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد محمد یسین صاحب پیشہ وکالت سے وابستہ تھے ۔ شمیم

حنفی کو ابتدا میں ان کی والدہ زیب النسا بیگم صاحبہ نے گھر پر تعلیم دی ۔ اسکول میں ان کے استاد ممتاز ماہرِ اسلامیات سید معین الدین قادری تھے جن سے شمیم حنفی خاص طور پر فیض یاب ہوئے ۔ شمیم حنفی نے ۱۹۶۰ ، میں تاریخ سے اور ۱۹۶۲ ، میں اردو سے ایم ۔ اے کیا ۔ ۱۹۶۷ ، میں الہ آباد یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی ۔

ان کا ابتدائی تقرر اندور کے ایک کالج میں لکچرر کی حیثیت سے ہوا ۔ ۱۹۶۹ ، میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ ، اردو سے منسلک ہوئے اور ۱۹۷۶ ، میں ڈی ۔ لٹ کیا اسی سال جامعہ ، ملیہ اسلامیہ میں ریڈر شپ پر ان کا انتخاب عمل میں آیا ۔ یہ آج کل شعبہ ، اردو کے پروفیسر اور ڈین فیکلٹی آف ہیومینی ٹیز اینڈ لنگویجز کی حیثیت سے برسرِ کار ہیں ۔

○●○

(م ۔ ت)

(سلسلہ ص: ۱۵ سے)
ظل اللہ مغل بادشاہ کے دربار میں راست تقرب اور باعزت مقام حاصل تھا ۔ وہ نہیں سمجھتے تھے کہ مشفق و مہربان ملکہ ، معظمہ وکٹوریہ کے ساتھ معاملہ دوسری طرح کا کیوں ہونا چاہیے ۔ ان کی تہذیب میں جلیل القدر فرماں روا نام ور شاعروں کی ناز برداری کرتے اور انھیں عطیوں سے نوازتے تھے ۔ وہ توقع رکھتے تھے کہ ملکہ ، معظمہ بھی ایسا ہی کریں گی ۔ اس نظامِ حکومت میں جس سے وہ واقف تھے سلطنت کے ہر باشندے کو بادشاہ کے حضور میں راست مرافعہ کرنے کا حق حاصل تھا ۔ نتیجتاً وہ خود کو ان کے معاملے میں دل چسپی نہ لینے والی برطانوی افسر شاہی کو نظر انداز کرتے ہوئے ملکہ سے راست مراسلت کا حق دار سمجھتے تھے ۔ اسے ہم تناظر کا صریح فرق کہہ سکتے ہیں ۔ انگریزوں نے جن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس مرافعے کا کیا کیا جائے اور جن کا اسے ملکہ ، معظمہ کے علم میں لانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا ، اسے دوبارہ کمپنی کی مجلس نظما کے حوالے کیا تاکہ " عالی وقار مجلس جیسا مناسب خیال کرے اسے طے کرے ۔" جہاں تک غالب کا تعلق ہے انھوں نے سمجھا کہ ان کا استدلال صحیح مانا گیا ہے ۔ چناں چہ انھوں نے بہ تاریخ ۱۵ / اگست ۱۸۴۲ ، چیف سکریٹری میڈاک کو لکھا ، " میں خلوصِ دل کے ساتھ ممنون ہوں اور والاشان گورنر جنرل ہندستان اور جناب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ میری دعا ہے کہ حضورِ والا لاٹ صاحب اور جنابِ عالی پر خداوندِ تعالیٰ کی رحمتِ خاص کا نزول ہو اور آپ کی تمام مساعی کو کام یابی نصیب ہو ۔"

سید خالد قادری

شمیم بھائی (شمیم حنفی)

[کچھ یادیں کچھ باتیں]

اردو رسالوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے کتنی ہی ادبی شخصیتوں کے نام ذہن میں ابھر کر غائب ہوجاتے ہیں مگر " شمیم حنفی " ہ لیے ایک ایسا نام ہے جو اگر کسی پرچے میں نظر آجائے تو وہ مجھے ماضی کے دھندلکوں میں دور تک اپنے ساتھ لے جاتا ہے ۔ پیچھے کی طرف لوٹنے لگتا ہے اور میں شمیم بھائی کے بارے میں سوچتے سوچتے " شمی " تک پہنچ جاتا ہوں ۔ ۔ ۔ " شمی " ۔ ۔ ۔ یہ م تھا جس سے شمیم بھائی کی والدہ انھیں پکارا کرتی تھیں ۔

ویسے تو ان کے بھائی بہن اور والد بھی انھیں اسی نام سے پکارتے تھے ۔ ۔ ۔ " شمی بھائی کیا کر رہے ہیں ؟ میاں جان کے لیے بلا رہے ہیں ۔" ان کی بہن بانو انھیں پکارتیں ۔ ۔ ۔ " اماں شمی کہاں ہو ! دیکھو قادری صاحب آئے ہیں ۔" ان کے شیخ محمد یسین صاحب کی مشفقانہ آواز سنائی دیتی ۔ ۔ ۔ مگر یہی نام ان کی اماں کی زبان سے کچھ اس طرح ادا ہوتا تھا کہ سننے والا کے پیچھے چھپی ماںتا کی غیر معمولی مٹھاس محسوس کیے بغیر نہ رہ سکتا تھا ۔ شاید یہی وجہ ہوگی کہ شمیم بھائی کا رسمی اور قلمی نام " شمیم " جس سے وہ اب کافی معروف ہوچکے ہیں مجھے آج بھی " شمی " کی یاد دلا جاتا ہے اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ آج جب کہ ، اس نام سے پکارنے والے تقریباً تمام اپنے ۔ ۔ ۔ زیر زمین ابدی نیند سو رہے ہیں اور خود شمیم بھائی بھی " شمی " کو زندگی کے ں میں کہیں بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں کیا انھیں تنہائی میں کبھی اس نام کی بازگشت سنائی دیتی ہے ؟ ۔ ۔ ۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب زمانہ اتنا پُر آشوب نہ تھا ۔ ہم لوگ گومتی ندی کے کنارے آباد مشرقی یو ۔ پی ۔ کے ایک ن شہر سلطان پور میں رہا کرتے تھے ۔ یہ وہی سلطان پور ہے جسے آج لوگ مجروح کے نام سے جانتے ہیں ۔ ۔ ۔ گنگیو ہاؤس کے د دیوار جہاں کبھی مجروح کا ترنم گونجا کرتا تھا اور جو بزرگوں کے بہ قول بعد میں ان کی جوانی کی ہلکی پھلکی لغزشوں کے گواہ بنے ۔ ۔ ۔ انہی کے سائے میں سلطان پور کے ابھرتے ہوئے وکلا اور اس وقت کے کانگریس اور مسلم لیگ کی ہنگامہ خیز سیاست ترجمان سید تفضل حسین ، شیخ محمد یسین اور سید ممتاز الدین وغیرہ کی شام کی محفلیں برپا ہوا کرتی تھیں ۔ ۔ ۔ برِ صغیر کی تاریخ کا ب انتہائی اہم اور نازک موڑ تھا ۔ ۔ ۔ اور شمیم بھائی کا زمانہ ، طفلی ۔ ۔ ۔ تاریخ اور سیاست کی اس عظیم اتھل پتھل سے یکسر نیاز ۔ ۔ ۔ آپ اپنی دنیا کی دریافت میں منہمک ۔ ۔ ۔

غالباً چالیس کے دہے میں جب میرے والد سید معین الدین احمد قادری بہ سلسلہ ، ملازمت سلطان پور وارد ہوئے تو قریبی ں کے علاوہ اس شہر کے جن چند لوگوں کی شخصیت اور خلوص نے انھیں متاثر کیا ان میں شمیم بھائی کے والد شیخ محمد یسین ب کا نام نمایاں ہے ۔ پیشے سے مختلف ہونے کے باوجود ان حضرات کی ملاقات جلد ہی قربت میں بدل گئی جو تاعمر قائم رہی ۔

ہم لوگوں کے آپس میں گھریلو تعلقات تھے ۔ شمیم بھائی میرے گھر میرے والد سے پڑھنے آیا کرتے تھے ۔ ان دنوں بہ قول میری بڑی بہن فاطمہ وہ پڑھنے میں کم اور تعلیمی تاش کھیلنے میں زیادہ دل چسپی لیتے تھے ۔ میری ماں جنھیں وہ میاں کہتے تھے ان سے بڑی شفقت رکھتی تھیں ۔ پڑھائی ختم ہونے کے بعد کبھی کبھی وہ ان سے باتیں کرنے آجاتے تھے ۔ ۔ ۔ ہمارے پرانے مکان کے باورچی خانے میں بان کی پٹریوں پر یا میری ماں کی پلنگ کے پائنتی میرے پھوپی زاد بھائی اور اپنے کلاس فیلو غیاث الدین عثمانی کے ساتھ بیٹھ کر گاؤں سے آتے ہوئے باجرے کی روٹی اور سرسوں کا ساگ کھاتے ہوئے شمیم بھائی کی تصویر آج بھی کسی بھولی ہوئی فلم کے منظر کی طرح میرے ذہن کے پردے میں ابھر آتی ہے ۔

شمیم بھائی کے بچپن یا اسکول اور کالج کی زندگی کے بارے میں میری معلومات کچھ زیادہ نہیں ۔ عمر میں کافی چھوٹا ہونے کے باعث ان دنوں مجھے ان کی شفقت یقیناً حاصل تھی مگر صحبت نہیں ۔ پھر بھی ایامِ گذشتہ کے کئی نقوش ذہن میں ابھرتے ہیں ۔

ان کے اس دور کے دوستوں میں میرے کزن غیاث الدین عثمانی کے علاوہ رشید (مرحوم) بدر الھدیٰ ، ظفر ، محمود علی اور ابرار احمد وغیرہ ہوا کرتے تھے ۔ یہ لوگ ان کے ہم مکتب بھی تھے ۔ ان میں ابرار احمد ہی ایک ایسے دوست تھے جن میں کسی قدر ادبی اور تخلیقی صلاحیتیں پائی جاتی تھیں ۔ ہر چند کہ ناسازگار حالات کے بہ موجب وہ مستقبل میں ابھر کر سامنے نہ آسکیں ۔ انھیں اقبال ، جوش اور فراق کے سینکڑوں اشعار یاد تھے جنھیں وہ اپنے مخصوص انداز میں مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے ۔ خاص طور پر فراق کی " روپ " کی رباعیاں اور اس دور کی انھی کی ایک اور مشہور نظم " آدھی رات کے بعد " ۔ ۔ ۔ وہ ان دنوں شمیم بھائی کو میدانِ ادب میں اپنا حریف نہیں سمجھتے تھے ۔ ۔ بعد میں انھوں نے اپنی تمام ذہنی اور تخلیقی صلاحیتیں کرکٹ کے کھیل کے نذر کردیں ۔

اپنے اس ہم مکتب سے وہ آج بھی ربط رکھتے ہیں ۔ اس کا ثبوت مجھے اس وقت ملا جب چند مہینوں پہلے سلطان پور میں ابرار احمد صاحب سے ملاقات ہوئی ۔ انتہائی روبہ زوال صحت اور ناتوانی کے باوجود شمیم بھائی کا ذکر آنے پر ان کی پژمردہ آنکھوں ہیں ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہوگئی ۔ وہ NOSTALGIC ہوتے ہوتے ماضی کی ان یادوں میں گم ہوگئے جب وہ شمیم بھائی اور محمود علی بیت بازی کے مقابلوں میں حصہ لیا کرتے تھے یا پھر وہ رات جب اختر حسن صاحب کے مکان پر ان دونوں نے مجروح سلطان پوری کا کلام صبح کی اولین ساعتوں تک سنا تھا ۔ اس سلسلے میں الہ آباد کے مچھلی کے تاجر اور کالج کے نوجوانوں میں بےحد مقبول ایک مخصوص قسم کے شاعر چنگیزی کا بھی ذکر آیا جس کی شاعری پر شمیم بھائی کو اتھاریٹی مانا جاتا تھا ۔ ابرار صاحب نے اس حالیہ ملاقات میں قیصر بنارسی کی بہ یک وقت اردو اور فارسی میں لکھی گئی اس مثنوی کا نایاب قلمی نسخہ بھی مجھے دکھایا جو گو کہ بالغوں کے لیے تصنیف کیا گیا ہے مگر جیسے زمانہ ، طالبِ علمی میں یہ دونوں جویائے علم انتہائی انہماک سے پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کیا کرتے تھے ۔

نسبتاً چھوٹا اور الگ تھلگ سا شہر ہونے کے باوجود سلطان پور میں باذوق لوگوں کی کمی نہ تھی ۔ شہر کے شرفا کی ایک قابلِ لحاظ تعداد شعر و ادب میں دل چسپی رکھتی تھی جس میں سے بیش تر شمیم بھائی کے والد کے ملنے والوں میں سے تھے ۔ جدراج بلی عیش ، عبدالحی خاں اور سکسینہ اور سہائے فیملی کے بزرگ حضرات ۔ انھی میں سے ایک معمر اور پرانے طرز کے شاعر نے کچھ سال پہلے شمیم بھائی سے اپنے مجموعہ ، کلام کا دیباچہ لکھنے پر اصرار کر کے انھیں ایک قسم کی اخلاقی کشمکش سے دوچار کردیا تھا ۔ لگی بندھی روایتی شاعری سے متنفر ہونے کے باوجود والد کے رفیق اور اپنے بزرگ کے حکم کی تعمیل انھیں بہ ہرحال کرنا تھی ۔

ابتدائی زمانے میں شمیم بھائی کی ذہنی تربیت میں جن لوگوں کا ہاتھ رہا ہوگا ان میں سے زیادہ تر ان کے اسکول اور کالج کے استاد تھے ۔ ان دنوں سلطان پور میں اردو اور فارسی شعروادب کا ستھرا ذوق رکھنے والے کئی حضرات اکٹھا ہوگئے تھے ۔ ۔ ۔ اقبال عظیم

صاحب مولوی عزیزالدین سالک ، محی الدین شوقی اور راقم الحروف کے والد سید معین الدین احمد قادری وغیرہ جن میں سے آخرالذکر کو چھوڑ کر سبھی شعروسخن کے میدان میں باقاعدہ مشق تر آزمائی کیا کرتے تھے ۔ اس دور کے طلبہ کا جو گروہ ان کے زیر اثر تھا ان میں شمیم بھائی بھی تھے ۔ یہ اور بات ہے کہ ان تمام حضرات کی بہ نسبت بہ حیثیت شاگرد میرے والد سے شمیم بھائی کا رشتہ سب سے زیادہ دیرپا ثابت ہوا ۔

کالج کے دنوں کے اردو کے استاد نیر سلطان پوری سے بھی انھیں بےحد لگاؤ تھا ۔ ان کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے " شمع ادب " میں دل چسپی لینے کے علاوہ وہ شخصی طور پر بھی اپنے استاد کی ہر خدمت بجالانے کے لیے تیار رہتے تھے ۔ ان کے بعد کے اساتذہ پروفیسر اعجاز حسین ، پروفیسر احتشام حسین اور پروفیسر آلِ احمد سرور کے ساتھ بھی ان کا رویہ کم و بیش ایسا ہی نیاز مندانہ رہا ۔ مجھے یقین ہے کہ ان تمام حضرات کے نزدیک وہ ایک نہایت ذہین اور فرماں بردار شاگرد رہے ہوں گے ۔

شمیم بھائی کے والد کو شعروادب میں کچھ زیادہ لگاؤ نہ تھا ۔ وہ اس زمانے کے دوسرے وکلا کی طرح سیاست میں دل چسپی رکھتے تھے ۔ چناں چہ بڑا بیٹا ہونے کے ناتے وہ شمیم بھائی کو بھی منصف یا کلکٹر ، یا پھر کم سے کم وکیل بنانا چاہتے تھے ۔ مگر یہاں تو سر میں کوئی دوسرا ہی سودا سما چکا تھا ۔ ۔ ۔ ان دنوں جب بھی میں شمیم بھائی کو انگلیوں میں سگریٹ دبا کر کوئی اسکیچ یا تصویر بناتا ہوا دیکھتا تو میرے ذہن میں یہ خیال پختہ ہوجاتا کہ یہ آدمی کسی نہ کسی درجے میں اس لطیف دیوانگی (FINE MADNESS) کا ضرور شکار ہے جو صرف فن کاروں کا حصہ ہوتی ہے ۔ CAPSTAN کے پائپ تمباکو سے باریک کاغذ کو رول کر کے بنائی ہوئی سگریٹ پیتے ہوئے کمرے میں شمیم بھائی کو HOPE کے عنوان سے امید کی دیوی ، کی تصویر بنانے میں منہمک ، میں آج بھی تصور کی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہوں ۔

یہ وہ زمانہ تھا جب الہ آباد کی آرٹس فیکلٹی کے طلبہ عموماً ایم ۔ اے کرنے کے بعد یا تو لکچرر بننے کے خواہش مند ہوتے تھے یا پھر آئی ۔ اے ۔ ایس اور پی ۔ سی ۔ ایس کے امتحانات کی تیاری کرتے تھے جیسے کہ شمیم بھائی کے مسلم بورڈنگ ہاؤس کے ساتھی سولنکی اور محمودالرحمان (موجودہ وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی) وغیرہ ۔ مگر شیخ بھائی کے تعلیمی کیریر میں اس وقت ایک اہم موڑ آیا جب ایم ۔ اے تاریخ کے امتحان میں وہ اچھے نمبرات نہ حاصل کرسکے ۔ اس بات سے ان کے والد اتنے دل برداشتہ اور برہم ہوئے کہ انھوں نے شمیم بھائی کی مزید تعلیم کی ذمہ داری لینے سے انکار کردیا ۔ دراصل اس وقت تک ان کے سرپرستوں میں سے کسی کو بھی ان کے ذہنی رجحانات کا صحیح اندازہ نہ تھا ۔

شمیم بھائی کے لیے ایک نوجوان طالبِ علم کی حیثیت سے یہ ایک قسم کے جذباتی انتشار اور آزمائش کا دور تھا مگر ایک مضبوط قوتِ ارادی اور اپنی ذہنی صلاحیتوں پر اعتماد نے اس مشکل مرحلے سے گزرنے میں ان کی مدد کی" ۔ ۔ ۔ وہ مسلم بورڈنگ ہاؤس میں مقیم رہے اور ساتھ ہی والد کی مرضی کے خلاف اردو ایم ۔ اے میں داخلہ لےلیا ۔ ان دنوں انھوں نے لکھنے پڑھنے سے متعلق مختلف کام کیے جن میں اسرار کریمی پریس الہ آباد کے لیے " جاسوسی دنیا " اور " نکہت " وغیرہ کے مسودے لکھنا بھی شامل تھا ۔ ظاہر ہے کہ یہ سبھی کام کسی تخلیقی محرک کے تحت نہ ہوکر ایک قسم کی مجبوری یا مالی منفعت کے لیے کیے گئے تھے ۔ شاید یہی وجہ ہوگی کہ شمیم بھائی نے اسرار کریمی پریس کے ایک اور مستقل قلم کار (SCRIBE) محن بھائی (مجاہد حسین رضوی) کی طرح کسی دوسرے شہر جاکر خود کے " ہزاروں ناولوں کا مصنف " ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ۔ وقت گزرنے پر اردو شعروادب کے میدان میں شمیم بھائی کی صلاحیتوں کا وافر ثبوت مل جانے کے بعد نہ صرف یہ کہ انھیں اپنے والد کی شفقت دوبارہ حاصل ہوگئی بلکہ وہ ان کے لیے

باعث بھی بنے ۔ ۔ ۔

شمیم بھائی کی علمی اور ادبی شخصیت کے ارتقا میں پروفیسر اعجاز حسین اور پروفیسر احتشام حسین کی قربت کے علاوہ ان ت کا بھی خاصہ حصہ ہے جو انھیں ان دنوں حاصل ہوئے جب وہ ہاسٹل چھوڑ کر فراق صاحب کے ساتھ ان کے یونیورسٹی کوارٹر رہنے لگے تھے ۔ اس وقت وہ فراق صاحب کی ازلی تنہائی میں ان کے رفیق بننے کے ساتھ ساتھ کئی سالوں تک ان کے لٹریری ٹری کا بہ ظاہر مشکل رول بھی نبھاتے رہے تھے ۔ ان کے ادبی اور شعری ذوق کے نکھرنے اور دنیائے ادب میں ان کا مستقل باقاعدہ مقام بننے میں فراق صاحب کی صحبت کی کچھ نہ کچھ برکتیں ضرور شامل ہوں گی ۔

شمیم بھائی کی اہلیہ میری بڑی بہن کی کلاس فیلو اور دوست تھیں اور اس ناتے کبھی کبھی ہمارے گھر آیا کرتی تھیں ۔ ان ہ میں انھیں ایک سیدھی سادی خوش شکل گھریلو لڑکی کے طور پر جانتا تھا ۔ بعد میں شمیم بھائی سے ان کی شادی کے کسی قدر ڈی انداز نے مجھے اور میری بہن دونوں کو تھوڑا بہت ضرور چونکایا تھا ۔ آج اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد ان میں کیا ذہنی یاں آچکی ہیں میں نہیں جانتا ۔ پتہ نہیں وہ آرٹ اور ادب پر گفتگو کے دوران اپنے شوہر کے لیے ایک اچھی سامع ثابت ہوتی یا نہیں ۔ البتہ عزیزوں اور دوستوں کے لیے ان کے ایک اچھی ہوسٹ ہونے کی تعریفیں مجھے اکثر ملتی رہتی ہیں ۔

شمیم بھائی کی شریکِ حیات کا نام صبا اور بیٹی کا نام غزل بھی کچھ کم معنی خیز نہیں ۔ یہ ان لوگوں کے لیے محض اتفاق ، جو کلاسیکی اردو غزل کی روایت میں شمیم اور صبا کے باہم رشتے سے واقفیت رکھتے ہیں ۔

شمیم بھائی کے بارے میں سوچتے ہوئے جب کبھی ان دنوں کو یاد کرتا ہوں جب میں حیدرآباد نیانیا آیا تھا اور شمیم بھائی بھی اپنی ت کے ابتدائی ادوار میں اندور اور علی گڑھ میں ہوتے تھے اور ہم چھٹیوں میں سلطان پور میں ملا کرتے تھے تو گرمیوں کی ان شاموں کا ں آجاتا ہے جب ہم گومتی ندی کے کنارے کنارے ٹہلتے ہوئے پل کے اس پار دور نکل جاتے تھے ۔ ۔ ۔ ریت کے ان ٹیلوں کے پرے کے دھندلکوں سے ابھرتے پرانے سلطان پور کے کھنڈرات اور ان کے نشیب میں ایک قدیم مسجد کا ٹوٹا ہوا مینار ۔ ۔ ۔ گردشِ افلاک ، شاکی اور ناپائیداریِ دنیا کے خاموش گواہ ۔ ان دنوں ایسے پُر اثر مناظر شمیم بھائی کی گفتگو کو کچھ اور فلسفیانہ بنادیا کرتے تھے ۔

" زندگی کی حقیقت ، موت کی صداقت ، زمان و مکاں یا پھر تصورِ وقت یہ سبھی موضوعات ، فلسفیانہ ادراک کے متقاضی ، انھیں منطقی یا عقلی دلائل کی مدد سے سمجھ پانا دشوار ہے ۔" وہ سوچ میں ڈوب کر کہتے ۔

" لیکن پھر ایک عام آدمی جو فلسفیانہ ادراک کا حامل نہیں ہوتا ان مسائل کو کیوں کر سمجھ سکتا ہے ؟ کیا اس کا مقدر ہمیشہ اندھیروں میں بھٹکنا ہے ؟ " بات کو آگے بڑھانے کے لیے میرا اگلا سوال ہوتا ۔

ظاہر ہے کہ یہ باتیں کبھی نہ ختم ہونے والی ہوتیں اس لیے تھوڑی دیر بعد تھک کر ہم کسی دوسرے موضوع پر آجاتے ۔ شوپن ہار ، پال ویلری ، پشکن ، ملارمے ، بادلیر ، پکاسو ، رومی ، اقبال ، میراجی ، سارتر اور کامو کو انگلیوں کی پوروں سے چھوتے ے جب ہم شام کی سیر ختم کرکے واپس گھر پہنچتے تو چائے کی گرم پیالی کے ساتھ ہماری گفتگو کا موضوع نسبتاً ہلکا پھلکا ہوچکا ہوتا ۔ ۔ ۔

میں اپنے حیدرآباد کے نئے نئے دوست شاذ کی شاعری کی تعریف کر رہا ہوتا ، شمیم بھائی اسے میرے تنقیدی شعور کی ناپختگی ، تعبیر کرتے ہوئے محض شخصی قربت کا نتیجہ کہتے ۔

" اماں خالد ! شاذ تمھارے دوست ہوں گے مگر مجھے تو ان کی شاعری زیادہ تر رومانی اور روایتی معلوم ہوتی ہے ۔ جدید یت تو اس میں مجھے کہیں نظر نہیں آتی ۔ ہاں اکا دکا اشعار کہیں ادھر ادھر مل جائیں گے ۔ ۔ ۔ تمھیں نئی شاعری کا اندازہ کرنا ہے

تو عمیق حنفی کو پڑھو ۔ میں یہ اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ وہ میرے دوست ہیں ۔ ویسے اور لوگ بھی ہیں کمار پاشی ، محمود علوی ، بانی ، بلراج کومل وغیرہ ۔ یا پھر پاکستان میں ناصر کاظمی ، منیر نیازی اور شکیب جلالی ہیں ۔ فکشن میں بھی عبداللہ حسین ، انتظار حسین ، سریندر پرکاش اور خالدہ اصغر جیسے اہم لکھنے والے ہیں ۔ تمھیں ان لوگوں کو پڑھنا چاہیے ۔" " ہمارے حیدرآباد میں ایک اور دوست عوض سعید بھی ہیں ۔" میں عوض صاحب کے بارے میں ان کی رائے جاننے کی کوشش کرتا ۔

" عوض سعید کو تو میں نے زیادہ پڑھا نہیں ۔ ہاں پرچوں میں یہ نام اکثر دکھائی دیتا ہے ۔ کافی زمانے سے لکھ رہے ہیں ۔ مگر اب پرانے لکھنے والوں کو ادب میں اپنی جگہ باقی رکھنی ہے تو کچھ نہ کچھ بدلنا اور EVOLVE کرنا ہوگا ۔ تم اپنے مغنی صاحب کو ہی دیکھو ۔ شعر و حکمت ایک اہم ادبی پرچہ نکالتے ہیں ۔ تنقید میں بھی خاصے جانے جاتے ہیں ۔ مگر ادھر کچھ دنوں سے جہاں ملاقات ہوتی ہے لسانی اور اسلوبیاتی تنقید کے نام پر وہی فاعلاتن فاعلاتن قسم کی کوئی چیز ساتھ لے آتے ہیں ۔ ویسے آدمی ملنسار اور مخلص ہیں ۔ اب آج کل کی ادبی سیاست میں تو ہر کوئی گروہ بندی کا شکار ہے اس کا کیا کیا جائے ۔ ۔ ۔"

" مجھے حیدرآباد میں جو سب سے زیادہ پڑھا لکھا آدمی دکھائی دیا وہ عالم خوندمیری ہیں ۔ ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟ " میں پوچھتا ۔

" واہ بھئی ! کیا نام یاد دلایا ہے ۔ حیدرآباد کے ذکر پر میں یہی نام یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ عالم صاحب واقعی قابل آدمی ہیں میری ان سے ایک ہی ملاقات ہو سکی مگر اس مختصر ملاقات میں بھی انھوں نے مجھے بے انتہا متاثر کیا ۔ ایسے لوگوں سے بار بار ملنے کو جی چاہتا ہے ۔" شمیم بھائی خوش ہو کر کہتے ۔ نیرد چودھری کی The Continent of Circe سر وِلیور دیال سکسینہ کی شاعری ، شوپن ہار اور کیرک گارڈ کا فلسفہ ، گوتم بدھ کی روحانی شخصیت کا طلسم ، وجودیت کا نظریہ ، Surrealist Art اور French Symbolists کا ادبی طریقہ ، کار ان کی دل چسپی کے مختلف موضوعات میں سے چند ایک تھے ۔ میں بھی حسبِ استطاعت ان موضوعات پر ان سے گفتگو کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا ۔ شاید ایسی ہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ جب وہ اپنی پی ایچ ۔ ڈی کا مقالہ " جدید اردو شاعری کی فلسفیانہ اساس " مکمل کر کے سلطان پور لائے تو انھوں نے اسے مجھے بھی دو چار دن کے لیے گھر لے جا کر دیکھنے کے لیے دیا تھا ۔ یہ ان کا حسنِ ظن تھا یا پھر انھوں نے ایسا ازراہِ خلوص کیا تھا میں نہیں کہہ سکتا مگر میں چونکہ اپنے آپ کو اس کے تجزیاتی مطالعے کا اہل نہ سمجھتا تھا اس لیے میں نے اسے ایک دو دن بعد ہی انھیں یہ کہہ کر واپس دے دیا کہ میں نے اسے دیکھ لیا اس میں کسی قسم کی کمی ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا جب کہ ان کے جیسے ذہین آدمی نے اس کے پیچھے اس قدر عرق ریزی کی ہے ۔ درحقیقت اتنے ضخیم اور اس قدر بھاری بھرکم مقالے کا باقاعدہ مطالعہ کرنا میرے لیے یوں بھی کارِ دشوار تھا ۔ یہ وہی مقالہ ہے جس کے کتابی شکل میں شائع ہونے پر وارث علوی نے اس کی خامیاں تلاش کرنے میں اپنی کافی توانائی بلاوجہ صرف کی ۔

شمیم بھائی نے شروع میں تھوڑی بہت شاعری بھی کی جو اچھی خاصی تھی اردو کے استاد تو وہ ہیں ہی ۔ تجزیاتی اور تاثراتی تنقید کے میدان میں ان کا اپنا مقام ہے جس سے انکار ممکن نہیں مگر بہ حیثیت تخلیقی فن کار ادب کی جس صنف میں وہ غیر معمولی طور پر کامیاب رہے وہ افسانے کی ہے ۔ انھیں بہ حیثیت افسانہ نگار جاننے والوں میں ایک قابلِ لحاظ تعداد ان کے مداحوں کی ہوگی ۔ ۔ ۔ خود مجھے ان کی جس چیز نے متاثر کیا وہ ان کا فن کارانہ تخیل اور ذہانت تھی ۔

لیکن ہم گزشتہ چند برسوں کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں ۔ ہمارا قدیم وطن سلطان پور ہے ۔ یہی ہم دونوں ہی کا رشتہ قریب قریب ختم ہو چکا ہے ۔ [illegible] ملنے [illegible] میرے والد کی وفات کی اب [illegible] سے ہمارے درمیان نہیں رہی ۔ [illegible]

(باقی ص [illegible] پر)

انور صدیقی

منظروں کا مسافر

آج سے کوئی سولہ سال پہلے کی ایک بہ ظاہر غیر اہم اور جس سے گراں بار دوپہر یاد آتی ہے ۔ اودھ کے ایک نسبتاً گم نام نیم شہر پرتاب گڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر نازش پرتاب گڑھی ایک ایسے دھان پان اور پریشان نوجوان سے میری ملاقات کراتے ہیں جس کے بارے میں اس وقت صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس نے " شاہ کار " کے فراق نمبر میں فراق صاحب کی شاعری پر کوئی عالمانہ مقالہ نہیں لکھا ہے بلکہ ان کے بعض ایسے لطیفے مرتب کیے ہیں جن سے لوگ کم واقف ہیں ۔ اس کے علاوہ " فنون " لاہور میں فراق صاحب کے ساتھ اس کی پانچ شاموں کی طویل گفتگو اور فراق کا ایک بہت بے تکلف خاکہ بھی میری نظر سے گزرچکا ہے ۔ یہ وہ زمانہ ہے جب فراق صاحب کی بڑائی کا مجھے ہی کیا اور بہتوں کو ایک طرح کا مبالغہ آمیز احساس ہے ۔ وہ ہمارے لیے ایک Legend کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ہمیں ان کی شاعری سے بھی دل چسپی ہے مگر اس سے کہیں زیادہ دل چسپ ہمیں ان کی زندگی محسوس ہوتی ہے ۔ ان سے مل کر ہمیشہ کچھ اس قسم کا تاثر مرتب ہوتا ہے گویا ان کا شاہ کار ان کی شاعری نہیں زندگی ہو ۔ جب نازش میرا اس نوجوان سے تعارف کراتے ہیں تو مجھے کچھ ایسا لگتا ہے جیسے وہ صرف ذرہ نوازی ۔ فرما رہے ہوں ۔ مگر جب مجھے وہ یہ بتاتے ہیں کہ یہ وہ نوجوان خوشہ چینانِ فراق میں سے ہے تو مجھے یہ نوجوان جو ابھی چند لمحوں پہلے " معمولی " محسوس ہوا تھا " غیر معمولی " نظر آنے لگتا ہے ۔ اب اس کا لکھا ہوا فراق کا خاکہ اور لطیفے مجھے زیادہ معتبر محسوس ہونے لگتے ہیں ۔ اب میرے لیے وہ ادھوری پہچان کا نوجوان نہیں ہے ۔ اب میں اس میں اکرمین (Eckcramann) کا عکس دیکھنے لگتا ہوں جس نے بڑی محبت ، دیدہ ریزی اور دیانت داری سے گیٹے سے اپنی گفتگو کی ساری تفصیل کتابی شکل میں شائع کر کے اپنے دوست کی شخصیت کو کچھ اور گراں مایہ بنادیا تھا ۔ اب یہ نوجوان میرے لیے ایک امکان تھا روشن اور تابندہ ۔

یہ تھی شمیم حنفی سے میری پہلی ملاقات جو ایک پائدار ذہنی رفاقت میں تبدیل ہوجائے گی اس کا مجھے اس وقت بالکل احساس نہیں تھا ۔ اس وقت تک وہ نہ محقق تھے اور نہ ہی دانش مند اور نہ ہی انھوں نے شعر گوئی کی ابتدا کی تھی ۔ وہ صرف فراق صاحب کے ہم نشین تھے اور الہ آباد یونیورسٹی میں تاریخ اور ادب کے ایک ذہین طالب علم ۔ میں یہ بات قدرے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں انھیں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ بڑی حد تک ایک تجرید تھے ، ایک مبہم امکان تھے اور ایک نیم روشن بشارت ۔ میں انھیں فراق صاحب کا یہ نسبتاً غیر معروف شعر سنا سکتا ہوں ،

اس عہد سے ہیں میری پریشاں خیالیاں جب تیرے گیسوؤں کے سنورنے کے دن نہ تھے

پرتاب گڑھ سے کوئی سترہ میل دور اودھ دیس کا ایک چھوٹا سا شہر ہے سلطان پور ۔ شمیم حنفی اسی شہر کے باسی ہیں ۔ یہاں سے کچھ دور پر اجودھیا نگری ہے اور اس سے ذرا آگے گوتم بدھ سے وابستہ کپل وستو کا علاقہ ہے ۔ اس پورے علاقے پر اب بھی رام

اور گوتم کی آواز کا سایہ ہے ۔ یہاں کی دھرتی کا ہر ذرہ تاریخ کا امین ہے اور مقدس ۔ اس دیار کی ہوائیں ان بزرگوں کے پیام کی رُنی حلاوت اور گداز سے معمور ہیں اور ماضی سے حال اور حال سے ماضی میں سفر کا ماجرا سننے والوں کو سناتی ہیں ۔ یہاں کے منظروں پر کیا کچھ ثبت ہے ۔ صرف دیکھنے والی آنکھ ہی دیکھ سکتی ہے ۔ یہاں وقت کا حصہ بے معنی ہے ۔ یہاں ایک طرح کے Eternal Now کی حکمرانی ہے ۔ یہاں ہماری لاکھوں سال پرانی تہذیب ، حال میں موجود بھی ہے اور پیوست بھی ۔ یہاں تاریخ ، تاریخیت کے محدود تصور کی غالباً سب سے پُر زور تردید کرتی ہے ۔ شمیم حنفی اپنے دیار کا جب بھی ذکر کرتے ہیں اس میں ایک طرح کی حسرت آفریں Nostalgia کا احساس ہوتا ہے ۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے انھوں نے اپنے علاقے کے ماضی سے استمراری بندوبست کرلیا ہو ۔ انھیں سول لائنز میں اپنے گھر کے سامنے کا میدان اور وہ پکی سڑک بھی یاد آگئی ہے جس کے دو رویہ نیم کے سایہ دار درختوں کا سلسلہ تھا ۔ گرمیوں میں ہر شام میونسپلٹی کی طرف سے چھڑکاؤ کے بعد مٹی کی مہک ساری فضا میں دیر تک بسی رہتی تھی ۔ میدان میں مونڈھے اور پان کی چار پائیاں بچھتی تھیں اور رات گئے تک وہاں دنیا جہان کی باتیں ہوتی تھیں ۔ جب حال یہ ہے کہ ان کی عینک ، قلم اور کاغذات کی حفاظت یا تلاش کی ذمے داری صبا کے سر ہے مگر شمیم حنفی کو ان تمام خونچے والوں اور مداریوں کے چہرے اور ان سے وابستہ قصے تفصیل کے ساتھ یاد ہیں جن سے ان کا بچپن آباد تھا ۔ وہ اس بات کا ذکر بار بار کرتے ہیں کہ وہ بچپن میں کس طرح تنہا گومتی کے کناروں پر گھنٹوں ٹہلا کرتے تھے اور اس جگہ ضرور رکتے تھے جو " سیتا کنڈ " کہلاتا ہے ۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سیتا نے بن باس سے پہلے اشنان کیا تھا اور جس کا ذکر تلسی داس نے بے پناہ شعریت کے ساتھ کیا ہے ۔ شمیم حنفی کو وہ اشعار یاد ہیں اور جب بھی وہ رامائن کا یہ حصہ سناتے ہیں تو ان پر ایک پُر اسرار گم شدگی اور محویت کا عالم طاری ہوتا ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ حال کے حصار میں ماضی کے شنکھ کی آواز ان کے لیے یوں معتبر ہے کہ اس آواز میں انھیں ان دکھوں کا سراغ ملتا ہے جنھیں زمانہ بدلتا جاتا ہے ۔ جاتک کہانیوں اور لوک کتھاؤں سے ان کی دل چسپی اور تاریخ کو بھی قصص کے طور پر پڑھنے کا ان کا رویہ تاریخ و تہذیب کو ایک لازماں اور لازوال تناظر میں دیکھنے کی ایک کوشش ہے ۔ انھیں تاریخ کے مختلف ادوار ایک ہی مالا کے مختلف منکوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں ۔ احتشام حسین مرحوم کو تاریخ کے ساتھ ان کے اس برتاؤ کی شکایت تھی کہ اس سے وقت کے جدلیاتی عمل کی تردید ہوتی ہے اور انسانی تجربہ بنیادی طور پر ایک جیسا نظر آنے لگتا ہے ۔ شمیم حنفی کو تاریخ ، مابعد تاریخ (Meta History) نظر آتی ہے اور وہ ، خواہ آپ کچھ کہیں ، اسے اسی طور پر دیکھتے اور برتتے ہیں ۔ اس رویے سے تاریخ کے طالب علموں کو جو بھی صدمہ پہنچتا ہو ، ادب کے طالب علموں کو بڑے فائدے ہیں کہ ادب بالخصوص شاعری میں بنیادی طور پر کبھی کوئی بڑا انقلاب نہیں آتا ، صرف چھوٹی موٹی اوپری تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ۔

شمیم حنفی کے والد یٰسین صاحب سلطان پور کے ایک ممتاز وکیل اور سماجی کارکن تھے ۔ کسی اور بھائی بہن کی غیر موجودگی میں وہ کوئی آٹھ سال تک والدین کی توجہ کا مرکز بنے رہے ۔ گھر میں ہم عمروں کے نہ ہونے سے انھیں شدید تنہائی کا پہلا تجربہ ہوا ۔ اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے انھوں نے پڑھنے اور بے مقصد سڑکیں ناپنے کو اپنا مشغلہ بنالیا ۔ رام لیلا اور محرم کے زمانے میں ، اودھ دیس کے عام بچوں کی طرح ، وہ بہت خوش رہتے ۔ رام بازاروں کی سیر کرتے اور علم اور تعزیوں میں دل چسپی لیتے ۔ انھیں زنجیری ماتم بہت پسند آتا ۔ ڈھول تاشے کی آواز انھیں اب بھی بچپن کا بلاوا لگتی ہے ۔ محرم اور اس کے متعلقات سے ان کی شدید جذباتی وابستگی کیا عجب کہ پاکستان ہجرت کرجانے کی صورت میں انھیں انتظار حسین بنادیتی ۔

سلطان پور میں اپنے والد کے علاوہ جس بزرگ نے انھیں سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کے استاد سید معین الدین قادری

تھے جن سے انھوں نے شروع میں فارسی انگریزی اور اردو پڑھی۔ قادری صاحب کو ادب سے گہری دل چسپی تھی۔ انھوں نے ایک اچھے استاد کی طرح شمیم حنفی کے ادبی مزاج کا اندازہ بہت پہلے لگا لیا اور ان سے چھوٹے چھوٹے مضامین اور کہانیاں لکھوانے لگے۔ قادری صاحب ابھی حیات ہیں اور شمیم حنفی کی ہر ادبی کامیابی میں ان کی دعائیں شامل رہتی ہیں۔ قادری صاحب سے تعلق خاطر کے اعتراف کے طور پر انھوں نے غزل پر اپنی نئی کتاب کا انتساب ان کے نام کیا ہے۔

آریاؤں کی طرح شمیم حنفی کا سفر بھی بڑی حد تک دریائی علاقوں سے وابستہ رہا ہے۔ انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد وہ سنگم کے شہر آئے اور گومتی کے اس جگی کے من میں سرسوتی کے دید کی تمنا کچھ ایسی جاگی کہ اس لیے یہیں دھونی رمالی۔ انھوں نے الہ آباد سے بی بی۔ اے کیا۔ تاریخ میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ پھر خیال آیا کہ ان کی حقیقی دل چسپی تو ادب سے ہے۔ چناں چہ انھوں نے اردو ادب میں ایم۔ اے کیا اور لگے ہاتھوں محمد حسین آزاد پر تحقیقی کام کر کے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرلی۔ الہ آباد کے دوران قیام انھیں پروفیسر اعجاز حسین اور پروفیسر احتشام حسین کی شفقت آمیز تدریس اور رہنمائی سے فیض یابی کا موقع ملا۔ یہ دونوں بزرگ ان کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کے قائل تھے۔ انھیں بزرگوں کے زیر اثر شمیم حنفی کچھ عرصے ترقی پسند کے چکر میں رہے۔ پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے انھیں ترقی پسندی سے ناآسودہ کردیا۔ ہوا یوں کہ کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان اخبار "عوامی دور" کی حالت سقیم تھی۔ اسے زندہ رکھنے کے لیے الہ آباد کے ترقی پسند ادیبوں نے ٹکٹ سے ایک آل انڈیا مشاعرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مشاعرے کا ٹکٹ غالباً دو آنے تھا۔ ٹکٹ بیچ کر تقریباً ڈھائی ہزار کی رقم جمع کی گئی۔ شمیم حنفی نے بھی بڑی محنت سے ٹکٹ فروخت کیے۔ مشاعرے میں شرکت کے لیے ملک کے سبھی ممتاز اور سرکردہ ترقی پسند شعرا الہ آباد آئے اور ان انقلابی شاعروں کو شہر کے سب سے اچھے وکٹوریائی طرز کے بنے ہوئے ہوٹل Barnets میں ٹھہرایا گیا۔ بڑی دھوم دھام سے مشاعرہ ہوا۔ مشاعرے کے بعد جب حساب کتاب ہوا تو پتہ چلا کہ "عوامی دور" کے لیے تو ایک پیسہ بھی نہیں بچا ہاں شعرا کی سیال ضیافت اور مشاعرے کے انتظام پر کئی ہزار روپے ضرور خرچ ہوچکے ہیں۔ اس واقعے کا شمیم حنفی کے ذہن پر گہرا اثر پڑا۔ انقلاب کا جو رومانی تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کیے ہوئے تھے وہ آن کی آن میں پاش پاش ہوگیا اور پھر انھیں مجاز کی ایک جملے کی تقریر یاد آئی جو انھوں نے لکھنو میں ترقی پسند ادیبوں کے جلسے میں کی تھی اور بڑی جراءت کے ساتھ کہا تھا "عام لوگ جھونپڑیوں میں رہ کر محلوں کا خواب دیکھتے ہیں مگر ہم ترقی پسند لوگ محلوں میں رہ کر جھونپڑیوں کا خواب دیکھتے ہیں۔" قول و عمل کے اسی اندوہ ناک تضاد نے شمیم حنفی کو ترقی پسندی سے ناآسودہ ہی نہیں منحرف بھی کردیا۔ ویسے مارکس کو وہ اب بھی پیغمبروں کی صف میں رکھتے ہیں۔ میں نے ایک بار ترقی پسندی سے ان کے اختلاف اور مارکس سے تعلق کے تضاد پر کوئی سوال پوچھا تو شمیم حنفی کا جواب بس یہ جملہ تھا کہ "امتوں کے حشر سے پیغمبری پر بھلا کب حرف آیا ہے؟"

الہ آباد میں قیام کے دوران شمیم حنفی کچھ عرصے فراق صاحب کے ساتھ رہے۔ فراق صاحب غیر معمولی ذہانت کے انسان ہیں۔ ادب، تہذیب اور تاریخ کے مسائل پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ ان امور پر ان کی گفتگو بصیرت کا خزینہ ہوتی ہے۔ وہ باتوں باتوں میں ایسے لطیف اور اچھوتے نکتے بیان کرجاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اردو نے Table Talk کا اتنا بڑا جادوگر ابھی پیدا نہیں کیا ہے۔ شمیم حنفی برسوں ان کے ساتھ اٹھے بیٹھے ہیں۔ وہ ان کی عبقریت اور ذہن کی خلاقی دونوں کے قائل ہیں۔ حسن عسکری مرحوم کے بعد اگر کسی نے فراق سے معنی خیز طور پر سیکھا ہے تو وہ یقیناً شمیم حنفی ہیں۔ شمیم حنفی کا حافظہ بلا کا ہے۔ وہ ساری باتیں تمام تر جزئیات کے ساتھ یاد رکھتے ہیں۔ وہ جب کبھی الہ آباد میں فراق صاحب کے ساتھ گزارے ہوئے شب و روز کا

ذکر کرتے ہیں تو ان پر عجیب کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور پھر وہ فراق صاحب کے دل چسپ فقرے ، لطیف نکتے اور پُر بصیرت جملے کچھ ایسے لطف سے سناتے ہیں گویا انھیں ابھی سن کر آتے ہوں ۔ ان کے ذوق و ذہن کی تہذیب و تربیت میں فراق کا ناقابلِ فراموش حصہ ہے ۔ وہ فراق کے بارے میں جو کچھ اور جتنا کچھ جانتے ہیں اسے دیکھ کر کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ وہ جب چاہیں فراق کے Boswell بن سکتے ہیں ۔

الہ آباد میں شمیم حنفی کو ہندی ادب سے دل چسپی پیدا ہوئی ۔ کافی ہاؤس میں تقریباً روز ہندی کے ادیبوں اور شاعروں سے ان کی ملاقاتیں رہتی تھیں ۔ اسی زمانے میں انھوں نے ہندی والوں کے لیے اردو شاعری کی تاریخ کے موضوع پر کئی مضامین لکھے ۔ " آبِ حیات " کے کچھ حصوں کا ترجمہ کیا ۔ گھر بہت آسودہ حال تھا مگر الہ آباد میں اپنی تعلیم کے دوران انھوں نے گھر سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا اور قلم کی مزدوری کو اپنا شعار بنایا ۔ یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ اسی زمانے انھوں نے پیری لوئی اور زولا کے ناولوں کے ترجمے کیے ۔ الہ آباد کے ہی ایک پبلیشر کے لیے فرضی نام سے ناول لکھے ، ایک مقامی اخبار کی ادارت کی ۔ آج بہتیروں کو لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ شمیم حنفی کس طرح کم سے کم وقت میں مضمون لکھ دیتے ہیں ، فیچر تیار کر دیتے ہیں ، ڈرامے لکھ دیتے ہیں ۔ یہ سب کچھ وہ یوں کرلیتے ہیں کہ انھیں ان کاموں کی مشق بھی ہے اور تجربہ بھی ۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کا علم حاضر ہے ۔ انھیں ، عام حالات میں ، اپنے علم کو حقے کی طرح تازہ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی ۔ وہ لکھتے ہیں اور قلم برداشتہ لکھتے ہیں ۔ ادھر چند برسوں سے وہ کچھ اتنا لکھنے لگے ہیں کہ ان کے بعض ہم چشم سخت دل برداشتہ ہیں اور ان کے لیے ایک نفسیاتی مسئلہ بن گئے ہیں ۔

دریا شمیم حنفی کی خلقی کم زوری ہے ۔ الہ آباد میں بھی سنگم کی سیر ان کا معمول تھی ۔ روز کوئی چار پانچ میل کا پیدل سفر اس جثے اور جسمانی توانائی کے بل بوتے پر کرونا کچھ آسان نہیں تھا ۔ سنگم انھیں روز بلاتا اور وہ روز کشاں کشاں جاتے اور اسی خوشی سے جاتے جیسے کوئی پیمانِ وفا ، نبھانے جارہے ہوں ۔ واپس آتے تو ایسا لگتا جیسے بے نام جگہوں کے بےشمار منظر آنکھ کے تل میں سمیٹ لائے ہوں ۔

اور پھر یوں ہوا کہ سنگم سے جدائی کی گھڑی آپہنچی ۔ اب انھیں مدھیہ پردیش کے پہاڑ جو ان کے دکھوں کی طرح سنجیدہ پُرشکوہ اور مستحکم ہیں ، بلا رہے تھے ۔ مالوے کی پُرکیف ، خنک اور سحر انگیز راتیں ان کے انتظار میں تھیں ۔ قلم کی مزدوری کب تک کام دیتی ۔ گھر بسانے کا مسئلہ تھا ۔ اس کے مطالبات تھے ۔ سو ، اندور کے ایک ڈگری کالج سے تقرر نامہ آ پہنچا اور دیکھتے دیکھتے وہ الہ آباد کو خیر باد کہہ کر اندور یونیورسٹی کے اردو اور فارسی کے مشترکہ شعبے کے صدر کی حیثیت سے اندور پہنچ گئے ۔ وہاں ان کے دوستوں میں عمیق حنفی جو پہلے سے موجود تھے ۔ بعد میں سید وقار حسین کالج کے شعبہ ، انگریزی میں لکچرار ہوکر آگئے ۔ وقار کو انگریزی ادب کے علاوہ اردو کے جدید ادب اور اس کے مسائل سے گہری دل چسپی تھی ۔ وہ پاکستان کے نئے شعرا کے کلام سے متاثر تھے ۔ زاہد ڈار کی نظموں نے ان پر جادو کر رکھا تھا ۔ وہ پاکستان کے جدید اردو ادب میں ایک نئی لذت اور ایک نیا جمالیاتی ذائقہ محسوس کر رہے تھے ۔ شمیم حنفی بھی ۱۹۶۰ ، کے بعد ابھرنے والی شعرا کی نئی نسل سے امیدیں لگائے بیٹھے تھے اور ایک نئی شعریات کے ظہور کے منتظر ۔ شمیم حنفی اور وقار کی دوستی دل چسپیوں کے اس اشتراک کا نتیجہ تھی ۔ دونوں مل کر پہروں منیر نیازی ، زاہد ڈار ، ناصر کاظمی ، ابن انشا ، احمد مشتاق اور شکیب جلالی کے کلام پر ایک استعجاب انگیز مسرت کے عالم میں گفتگو کرتے ، اردو کے نوجوان گرد ادب کے مسائل زیرِ بحث آتے ۔ اندور کے قیام کے دوران شمیم حنفی نے اپنی پہلی غزل کہی جو " نقوش " میں شائع ہوئی ۔ عمیق حنفی نے ان سے ان کا پہلا ریڈیائی ڈرامہ " آخری کش " لکھوایا جو ریڈیو اندور سے نشر ہوکر خاصا مقبول ہوا ۔ اسی زمانے میں اندور

میں خاصی ادبی اور ثقافتی چہل پہل اور رونق تھی ۔ اُردو کے علاوہ ہندی اور گجراتی کے لکھنے والوں کا حلقہ بن گیا تھا ۔ شمیم حنفی کہ ہندی ادب کی ایک زندہ آگہی رکھتے تھے ۔ اسی حلقے کے سرگرم رکن بن گئے ۔ اسی حلقے کے زیرِ اہتمام اسی زمانے میں ۔ اندور میں بعض بہت اچھے ڈرامے اسٹیج کیے گئے ۔ شمیم حنفی کے لیے یہ زمانہ انتہائی تخلیقی بیداری اور سرشاری کا زمانہ تھا ۔ اندور میں ان کے مکان کے [illegible] چھوٹاسا جنگل تھا جس سے ہوکر ایک پُرشور پہاڑی چشمہ گزرتا تھا ۔ یہ چشمہ گومتی اور گنگا سے ان کی محرومی کی کسی حد تک [illegible] اس سے قریب کے درختوں پر ہرشام مور بسیرا کرتے تھے ۔ سارا جنگل موروں کی آوازوں سے گونج رہا ہوتا اور یہ گونج طرح طرح سے ان کا دل کھینچتی اور ان کے لیے اسرار سے بھی کائنات تھوڑی دیر کے لیے پھر پُراسرار ہوجاتی ۔ شام کی تاریکی بڑھتے ہی وندھیاچل کی پہاڑیوں کا سلسلہ اسرار سے اور بھی لب ریز ہوجاتا اور شمیم حنفی کچھ دیر کے لیے انسانیت کے بچپن کے دور میں پہنچ جاتے جہاں ان کے لیے تسکین اور تشفی کے بڑے سامان ہوتے ۔ ان کے لیے شعر و ادب ہی کیا زندگی میں بھی سفاک اور سپاٹ وضاحت سے زیادہ قطعیت سے عاری بسیط ابہام معنی خیز ہے ۔ انھیں شہروں سے زیادہ بن اچھے لگتے ہیں اور متمدن شہریوں سے زیادہ آدی باسی ۔ چناں چہ اندور میں وہ ان بازاروں کا ضرور پھیرا کرتے تھے جہاں آدی باسی مرد اور عورتیں اپنے روایتی دھگا رنگ لباس میں ملبوس ، گلے میں رنگین منکے ڈالے ، ایک طرح کی عنصری سادگی کے ساتھ آتے اور خریداری کرتے ۔ فطرت اور فطری انسان کی طرف شمیم حنفی کا رویہ خاصا ہندستانی ہے ۔ یا یوں کہیے کہ ان کی فکر تجریدی نہیں ، تشبیہی ہے ، ماورائی نہیں ، ارضی ہے ۔

وندھیاچل کی آتما سے دوری شاید ان کے مقدر میں تھی ۔ اب کی بار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ ، اردو سے بلاوا تھا ۔ وہ کہ جس نے بڑے جتن سے اپنی عنصری سادگی کو بچا رکھا تھا ، اب بڑے خطرے میں تھا ۔ ریا کاروں سے آباد اس خرابے میں نہ تو جنگل تھے اور نہ ہی مور ۔ وہ اپنے آدی باسی اندور میں چھوڑ آیا تھا ۔ یہاں تو بےکیف اور باسی لوگ تھے ۔ آدھے ادھورے لوگ تھے ۔ تہذیب کے مارے ہوئے لوگ چہروں پر خول چڑھائے ہوئے لوگ ۔ شمیم حنفی کی خوش بختی نے بھی چند اچھے دوست تلاش کرلیے جو بہ ہر حال ان کے روحانی دشمن نہیں تھے ۔ انھیں یہاں خلیل الرحمٰن اعظمی ، خواجہ مسعود علی ذوقی ، وحید اختر اور شہریار کی رفاقت نصیب ہوئی اور آلِ احمد سرور کی وسیع النظر شفقت ۔ اسی حلقہ ، یاراں میں اسلوب احمد انصاری بھی تھے ۔ ان دوستوں اور بزرگوں کے علاوہ سید وقار حسین جو اندور سے علی گڑھ واپس آچکے تھے ، شمیم حنفی کے لیے اس دیارِ غیر ، میں بڑا سہارا تھا ۔ اگر انھیں علی گڑھ کے اعصاب شکن ماحول میں یہ سہارے نصیب نہ ہوئے ہوتے تو ان کا جینا دوبھر ہوگیا ہوتا کہ انھیں زندگی گزارنے کا وہ ہنر نہیں آتا جس کی یہاں ضرورت ہے ۔ دنیا داری کے معاملے میں اپنے اناڑی پن کی سزا انھوں نے خوب بھگتی ہے ۔ مگر دل چسپ بات یہ ہے کہ وہ اسے سزا نہیں قیمت کہتے ہیں اور اس کی ادائیگی پر کبھی پشیماں نہیں ہوئے ۔ چناں چہ اپنے آپ سے یا کسی سے کوئی گلہ شکوہ بھی نہیں ۔ یہ وہ زمانہ ہے جب جدیدیت اور ترقی پسندی کے بیچ گھمسان کا رن پڑ رہا تھا ۔ جدیدیت کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیوں کا چلن تھا ۔ ادب کے منظر نامے پر وہ دھول تھی کہ راستہ سجھائی نہیں دیتا تھا ۔ سرور صاحب نے شمیم حنفی کو مشورہ دیا کہ وہ جدیدیت کی فلسفیانہ بنیادوں کا سراغ لگائیں ۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ مشورہ بروقت تھا اور جس شخص کو دیا گیا تھا وہی یہ کارِ دشوار انجام دے سکتا تھا ۔ سو وہ اس کام میں بڑی سنجیدگی سے لگ گئے اور دیکھتے دیکھتے ڈی ۔ لٹ کے لیے تحقیقی مقالہ مرتب کر ڈالا ۔ کیسے پریشان کن اور مشکل موضوع پر کیسا مربوط اور منظم کام کر ڈالا کہ جاہدانِ کول اور تیز میرانِ جدید ، حیرت میں ہیں ۔ ادھر شمیم حنفی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے کام کے سلسلے میں کوئی بلند بانگ دعویٰ نہیں کررہے تھے ۔ وہ اپنی سنجیدہ منکسر المزاجی کے ساتھ بس یہ کہہ رہے تھے کہ یہ مقالہ " ایک پریشان نظر جاتری کی جستجو کا سفر نامہ ہے " ۔

ادب ہے نہ ادبی تنقید " خواہ کچھ بھی ہو انھوں نے جدیدیت کو ایک آزاد مگر پیچیدہ اور بہ ظاہر متضاد مظہر کی شکل میں دیکھا اور دکھایا اور وہ بھی کچھ اس شان سے کہ اس موضوع پر بہت دنوں تک کام کرنے کا حوصلہ تو دور کی بات ہے ۔ لوگ سکون سے اس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکیں گے ۔ بعد میں یہ تحقیقی مقالہ دو الگ کتابوں کی شکل میں مکتبہ ، جامعہ دہلی سے شائع ہوا ۔ پہلی کتاب کا نام " جدیدیت کی فلسفیانہ اساس " ہے اور دوسری کا " نئی شعری روایت " ۔ پہلی کتاب کی ، عام طور پر شایانِ شان پذیرائی ہوئی ۔ مگر بعض حلقوں کی طرف سے کتاب کے مندرجات اور اس کے حدود کو سمجھے بغیر جہل آمیز عفونت کے ساتھ رائے زنی کی گئی ۔ بعض تبصرے ، تبصرہ نگاروں کے اپنے نفسیاتی اور جسمانی عارضوں کی رپورٹ سے آگے نہ بڑھ سکے ۔ شمیم حنفی کی یہ دونوں کتابیں ان کے علی گڑھ میں قیام کا حاصل ہیں ۔ علی گڑھ کے سلسلے میں ان کے رویے میں مجھے محبت اور نفرت کی یکساں موجودگی کا احساس ہوا ہے ۔ یہ ادارہ انھیں عزیز بھی ہے مگر وہ اس سے ناآسودہ بھی ہیں ۔ انھیں یہاں روایت سے وابستگی پر اصرار اچھا لگتا ہے مگر روایت پرستی افسردہ کرتی ہے ۔ وہ ہمیشہ ایک کشادہ ذہن علی گڑھ کا خواب دیکھتے ہیں ۔ سرور صاحب جب تک صدر شعبہ ، اردو رہے ، شمیم حنفی کسی حد تک علی گڑھ میں اپنے قیام سے مطمئن رہے ۔ غالباً سرور صاحب کی شفقت نے انھیں کچھ دنوں اصل علی گڑھ کو دیکھنے کا موقع دیا ۔ ادھر سرور صاحب ہٹے اور شمیم حنفی پر عرصہ ، حیات تنگ ہوا ۔ وہ ٹھہرے بےچارے بقول فراق آدھے تھپڑ کے آدمی ، کسی سے کیا لڑتے ۔ اگر لڑائی علمی ہوتی تو لڑ بھی لیتے مگر معاملہ اپنی معصومیت کے بچانے کا تھا سو وہ جامعہ ملیہ ، دلی چلے آئے ۔ غالباً اپنے آپ کو یک جا کرنے اور اپنی اس دولتِ بیدار کو بچانے کے لیے جو انھیں سلطان پور ، الہ آباد اور اندور سے ملی تھی ۔ یہاں آکر ایک بار پھر انھیں ان کے درخت ، دریا اور پرند واپس مل گئے ۔ اب کی بار انھیں جمنا اور اس کے کناروں نے بلایا تھا ۔ وہ کیسے نہ آتے ۔ ویسے بھی وہ متمدن انسانوں سے زیادہ اشیا سے قرب محسوس کرتے ہیں ۔ انسانوں میں انھیں وہی انسان اچھے لگتے ہیں جو تہذیب کی کثافتوں سے پاک ہوں ، جن سے اظہار و احساس کی بے ساختگی چھنی نہ ہو ، جن کی آنکھیں آہن پوش نہ ہوں ۔ وہ لانڈری میں دھلے دھلائے لوگوں کو ہمیشہ شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں ۔ انھیں حقیقی معنوں میں تخلیقی آدمی سچا آدمی لگتا ہے ، اس کی محبتیں اور نفرتیں اچھی لگتی ہیں ۔ قرۃ العین حیدر ، انتظار حسین اور بلراج مین را کے لیے ان کے بےپناہ اور بےکراں تعلق کی غالباً یہی وجہ ہے ۔ قرۃ العین حیدر یوں تو طبعاً بڑی کم آمیز ہیں مگر جب بھی دلی آتی ہیں ، شمیم حنفی کے ساتھ ان کی گفتگو ہوتی ہے ۔ جب تک ڈاکٹر عابد حسین حیات رہے ان سے بھی شمیم حنفی کا قرب ایک تجربہ بنا رہا کہ عابد صاحب مرحوم کی شخصیت میں ایک معلم ، ادیب اور کشادہ ذہن مفکر کی شخصیتیں یک جا ہوگئی تھیں اور ذہنی یا جذباتی وسعت شمیم حنفی کے نزدیک کسی ادیب یا دانش ور کا سب سے بڑا وصف ہے ۔ انتظار حسین ، شمیم حنفی کی بڑی کم زوری ہیں ۔ وہ جب بھی کسی سیمینار میں شرکت کے لیے ہندستان آتے ہیں ، ان کے گھر ٹھہرتے ہیں اور ہر صبح بندروں کا درشن کرنے نکلتے ہیں اور اس اشتیاق سے نکلتے ہیں جیسے پاکستان میں مارشل لا قوانین کے تحت اس مخلوق کو یا تو دیس سے نکال دیا گیا ہے یا پھر اس کے درشن پر پابندی ہے ۔ رام لعل انھیں پسند ہے کہ وہ بھی ایک سچا اور اچھا تخلیقی فن کار ہے ۔ اگر کبھی انھیں انسانوں کی صحبت میسر نہیں آتی تو وہ درختوں ، دریاؤں اور پرندوں کو اپنا رفیق اور ساتھی بنا لیتے ہیں ۔ پرندوں میں مور اور کوئل کی آوازیں انھیں بےچین کردیتی ہیں ۔ بڑے اور چھتنار درخت انھیں یوں لگتے ہیں کہ ان کی جڑیں دور تک زمین میں پیوست ہوتی ہیں اور وہ روایت اور استحکام کا استعارہ محسوس ہوتے ہیں ۔ انھیں ادب سے گہری اور سچی دل چسپی ہے مگر ادبی سیاست سے نفرت ہے ۔ ان کی نظر میں ادیب سے زیادہ اہم اس کا ادب ہوتا ہے ۔ وہ ادب کو زندگی کے ہر مظہر کی طرح ، اپنی ذات کے حوالے سے سمجھنا چاہتے ہیں اور اس طرزِ تفہیم کی تمام تر توانائیوں اور کم

زودیوں سے آگاہ ہیں ۔

شمیم حنفی طبعاً دیر آشنا اور کم آمیز ہیں ۔ علم کے معاملے میں خاصے توسیع پسند ہیں مگر حلقہ ٔ احباب کو وسعت دینے پر جلد راضی نہیں ہوتے ۔ وہ اپنی پسند کی دنیا میں رہنا چاہتے ہیں ۔ چند منظروں ، چند دوستوں ، ڈھیر سی کتابوں اور سرکاری میعاد کے چھوٹے سے خاندان پر ان کی اپنی دنیا مشتمل ہے ۔ اس دنیا میں انھیں مطمئن ، مسرور اور آسودہ دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے اصغر گونڈوی کا یہ شعر یاد آتا ہے :

یہی تھوڑی سی مے اور یہی چھوٹا سا مے خانہ اسی سے رند رازِ گنبدِ مینا سمجھتے ہیں

شمیم حنفی بہ ظاہر کچھ غیر جذباتی اور خرد سرد سے لگتے ہیں مگر اپنے جذباتی معاملات میں بے انتہا جذباتی ہیں ۔ یہ الگ بات ہے کہ جذبات کے اظہار کے لیے موقعوں اور افراد کا انتخاب خود کرتے ہیں ۔ وہ شدید محبت کی خاطر ناپسندیدہ رویوں سے شدید نفرت کو بھی ایک مثبت قدر سمجھتے ہیں ۔ نفرت محسوس کرتے ہوں تو کرتے ہوں مگر میں نے انھیں اسے برتتے کبھی نہیں دیکھا ان کے لیے بھی جنھوں نے بلاوجہ انھیں اپنا حریف سمجھ لیا ہے ۔ وہ اپنے بارے میں سخت سے سخت رائے سننے پر آمادہ رہتے ہیں ۔ ایسے موقعوں پر وہ بے پناہ صبر و تحمل کا ثبوت دیتے ہیں ۔ افسوس کہ یہ بے پناہ صبر و تحمل ہمارے ادبی کلچر سے رخصت ہو رہا ہے ۔

شمیم حنفی مزاجاً خلوت پسند ہیں ۔ توجہ کی دھوپ زیادہ ہو تو گھبرا اٹھتے ہیں ۔ ادبی جلسوں کی شرکت پر آسانی سے راضی نہیں ہوتے ۔ اگر راضی ہو بھی گئے تو ڈرامے اور اسٹیج سے گہری دل چسپی کے باوجود اسٹیج پر بیٹھنا گوارا نہیں کرتے ۔ سامعین میں ہی بیٹھنا پسند کرتے ہیں کہ اس طرح "تماشے" کا لطف تو رہتا ہی ہے ۔ تقریر کرنی آتی ہے ۔ مگر فراق صاحب کی طرح ان کا اپنا خیال بھی یہی ہے کہ اکثر اچھا مقرر اچھا انسان نہیں ہوتا یا یہ کہ کاروباری ذہن کا آدمی ہوتا ہے ۔ وہ ایک ادبی دانش ور ہیں مگر دانش وری کا پوز اختیار کرنے والے انھیں ایک آنکھ بھی نہیں بھاتے ۔ وہ عام سماجی زندگی میں اپنے آپ کو مالِ مسروقہ کی طرح چھپا کر رکھتے ہیں ۔ مصوری کی نمائش کے علاوہ ہر طرح کی نمود و نمائش کو وہ جاہل قسم کی عریانی خیال کرتے ہیں ۔ وہ اپنی خلوت گزینی کی تلافی لکھ کر کرتے ہیں اور ہر طرح اور ہر سطح کی چیزیں لکھتے ہیں ۔ "شعور" سے لے کر بچوں کے رسالے "پیامِ تعلیم" تک کے لیے یکساں انہماک اور توجہ سے لکھتے ہیں ۔ بچوں کے لیے لکھنے کا شوق پرانا ہے کہ وہ بچوں میں دل چسپی کو تخیل کی تربیت کا وسیلہ اور بلوغت سے فرار کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں ۔ وہ باقاعدہ صحافی نہیں ہیں ۔ مگر منھ کا مزہ بدلنے کے لیے ہجوم میں تھوڑی سی سات روزہ قسم کی صحافت کر لیتے ہیں ۔ یہ کام وہ علی گڑھ اور الہ آباد میں پہلے بھی کر چکے ہیں ۔ "ہماری زبان" جب علی گڑھ سے نکلتا تھا تو کچھ عرصہ ان کا تعلق اس کی ادارت سے بھی رہا ۔ اس زمانے میں "ہماری زبان" کے ذریعے عالمی اہمیت کے ہر ادبی وقوعے کی اطلاع اردو پڑھنے والوں کو مل جاتی تھی ۔ شعر اب بھی کہتے ہیں مگر سناتے صرف چند احباب کو ہیں وہ بھی کچھ اس انداز سے جیسے کوئی راز کی بات سنا رہے ہوں ۔

ان کی اپنی دنیا میں گوتم اور مسیح کے مجسموں کی بڑی اہمیت ہے ۔ ان کے ڈرائنگ روم کی ترتیب بدلتی رہتی مگر یہ مجسمے جہاں ہیں وہیں رہتے ہیں ۔ شاید یہ مجسمے ان کے لیے گیان اور گیانی کے انجام کا استعارہ ہیں ۔ انھیں کلاسیکی موسیقی اور جدید مصوری دونوں ہی سے یکساں دل چسپی ہے ۔ وہ قدیم داستانی اور حکائی ادب کو بھی اتنا ہی پسند کرتے ہیں جتنا کہ انتظار حسین ، قرۃ العین حیدر اور باقر مہدی کے ادب کو ۔ وہ جہاں ایک طرف میر و غالب کے کلام پر سر دھنتے ہیں وہیں دوسری طرف کم شہرت رکھنے والے شعرا کے اشعار کو بھی سراہتے ہیں اور اس سراہنے میں وہ بعض اوقات سیڑھیوں کا چھوٹا موٹا جلوس نکال کر بھی خوش ہو لیتے ہیں ۔ وہ یہ

یک وقت آواں گارد ادب اور کلاسیکی ادبیات کو سنبھالنے اور نبھانے کا حوصلہ رکھتے ہیں ۔ وہ تیز سوچتے ہیں ، تیز بولتے ہیں اور تیز لکھتے ہیں ۔ یہ تیزی ان کی ذہنی توانائی کا اظہار ہے ورنہ یہ تیزی ادب کے معاملے میں اکثر خطرناک ثابت ہوتی ہے اور لکھنے والا اول درجے کی چیزیں لکھنے کے بجائے تیسرے درجے کا مسافر بن کر رہ جاتا ہے ۔ شمیم حنفی کا ذہن ایسے مقامات پر جہاں ہماری تنقید کے بوعلی " خبازِ ناقد " میں گم رہتے ہیں بڑی تیز آسانی یا آسان تیزی سے " پردہ ، محمل " پکڑ لیتا ہے ۔ حد یہ کہ ان کا ذہن مال گودام نہیں ہے بلکہ ایک خوش ترتیب ڈرائنگ روم کی فضا رکھتا ہے ۔

شمیم حنفی ادھر کئی برسوں سے جامعہ میں ہیں ۔ وہ الہ آباد کو چھوڑ کر شاید ہی کہیں اور اتنے عرصے ٹکے ہوں ۔ دلی شہر کے ہنگاموں اور شور و شر سے دور ، جمنا تٹ پر آباد جامعہ نگر کی اس بستی سے مجموعی طور پر وہ مطمئن نظر آتے ہیں ۔ وہ ہر شام رام چندرن کے ساتھ جمنا کے کنارے کنارے دور تک ٹہلنے نکل جاتے ہیں ۔ شام کے رنگوں اور منظروں کا بھید پانے کے لیے یا شاید آنکھوں کی تہذیب کے ذریعے اپنی روح کی تہذیب کی خاطر ۔ شام کے منظروں کے اس تیرتھ یاتری کے لیے اس یاترا کا کوئی انت نہیں ۔ ادھر چند مہینوں سے نہ جانے کیوں وہ منیر نیازی کا یہ شعر گنگنانے لگے ہیں :

جس شہر میں بھی رہنا اکتائے ہوئے رہنا   عادت ہی بنالی ہے تم نے تو منیر اپنی

کہیں ایسا تو نہیں کہ اس یاترا کا منظر نامہ بدلنے والا ہے !

(۱۹۸۱ء)

○●○

(سلسلہ ص : ۲۵ سے)
میں کسی دوست ادیب یا شاعر یا کسی ادبی پرچے کے ذریعے ہی کبھی کبھی شمیم بھائی کے بارے میں کوئی خبر مل جاتی ہے ۔

شمیم بھائی جامعہ کی آرٹس فیکلٹی کے ڈین ہوگئے ہیں ۔ ان کی بیٹی سیمیں کی شادی ہے ۔ ان کی آنکھ کا آپریشن ہوا ہے ۔ وہ عمرہ کے لیے جدہ گئے ہیں یا پھر کسی ادبی جلسے یا سمینار میں وہ بھی شریک تھے ۔ اس دورِ پُرآشوب میں جب کہ رخشِ عمر اس قدر تیزی سے بھاگ رہا ہو اور کسی کو کسی کی خبر نہ ہو شمیم بھائی کے بارے میں اتنا جان پانا بھی مرے لیے غنیمت ہے ۔

عرصہ ہوا شمیم بھائی نے میرے والد سید معین الدین احمد قادری کے بارے میں " چراغِ سرِ رہ گزر " یا پھر شاید " عشق کا دیا " کے عنوان سے " جامعہ " میں ایک مضمون شائع کیا تھا ۔ شاید ان کے لیے وہ " استاد " سے اپنی عقیدت کے اظہار کا ذریعہ رہا ہوگا ۔ مگر میرے نزدیک اس کا ایک ایک لفظ اس سعادت مندی اور خلوص کا شاہد ہے جن کے لیے میرے والد انھیں عزیز رکھتے تھے ۔ آج ان کے بارے میں میری یہ تحریر نہ تو اس پائے کی ہے نہ ایسے کسی جذبے کا ثبوت فراہم کرتی ہے مگر پھر بھی میرے لیے اس طمانیت کا باعث ضرور ہے کہ فراموشی کے اندھیروں میں کہیں گم ہوجانے سے پہلے میں نے ماضی سے وابستہ شمیم بھائی کی یادوں کے کچھ نقوش ان اوراق پر ابھار لیے ۔

○●○

انور صدیقی

نئی شعری روایت

گزشتہ برس جب شمیم حنفی کی کتاب " جدیدیت کی فلسفیانہ اساس " شائع ہوئی تو اس پر میں نے پہلا تبصرہ لکھا تھا اور ا کی پذیرائی کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ کتاب اپنے فکری حجم ، مباحث کی وسعت ، تجزیے کی گہرائی اور اپنی عام بصیرت کی وجہ سے صرف خاصی اشتعال انگیز ثابت ہوگی بلکہ جدیدیت کے بعض معروف شارحین اور مفسروں کے اندر بھی ردِ عمل کے دل چسپ مظا کا موجب ہوگی ۔ ردِ عمل کے جن مظاہر کی میں نے پیش بینی کی تھی وہ سب کے سب ان تبصروں میں ظاہر ہوگئے ہیں جو ا تک شائع ہوچکے ہیں ۔

اشتراکی حقیقت پسندی کا جو تجزیہ شمیم حنفی نے کیا تھا اور اس میں جس طرح کے تضادات کی ، اور غیر ادبی رویوں نشان دہی کی تھی اس نے سکہ بند ترقی پسندی کے سادہ ذہن جانب داروں کے پسپا ہوتے ہوئے لشکر میں کہرام کی لے تیز کردی ا ان کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ اردو کی ترقی پسندی نہ تو مارکس کے ادبی رویوں سے آگاہ ہے اور نہ ان ادبی مباحث سے واقف جو مارکس کے بعد مشرقی اور مغربی یورپ میں مارکسی فکر کے شارحین نے ادبی تنقیدی اور جمالیات ـ حوالے سے اٹھائے ہیں اور اس طرح اس کٹھ ملائیت کو معتدل کیا ہے ، جو ابتدا میں مارکسزم سے وابستہ کردی گئی تھی ۔ ترقی پسند اد یا ادبی تنقید کی اولین خشونت اور کوتاہ نظری کے پیچھے ادب کے سلسلے میں وہ رویے تھے ، جو بہ قول ایڈمنڈولسن ، مارکس کے پرور نہیں تھے بلکہ ادب کو ہدایت ناموں کی روشنی میں تخلیق کرانے کے اس رجحان کے زائیدہ تھے جو روسی سماج میں انقلاب سے پہ بھی موجود تھے اور جنھیں سوویت حکمرانوں نے مستحکم روایت کی شکل دے دی تھی ۔ اردو میں ترقی پسندی کے اکثر رویے ، مارکس سے نہیں بلکہ روس سے مستعار لیے گئے ہیں اس دھوکے میں کہ جو کچھ روس کے راستے ان تک پہنچ رہا ہے ، مارکسزم کے سوا کچھ ا نہیں ہے ۔ پھر جب شمیم حنفی نے اردو کے ترقی پسندوں کو یہ اطلاع دی کہ یورپ کی آواں گارد تحریکوں میں جو انقلابی عنصر رہا ۔ اور جس نے جدیدیت کی تخلیق کی ہے ، اس میں مارکسی فکر کا فیضان کم اہم نہیں ہے تو جہاں ایک طرف اردو کے ترقی پسند نقادو کو اپنے جہل کا عرفان ہوا ، وہیں دوسری طرف جن بنیادوں پر وہ اردو میں جدیدیت کی مخالفت کر رہے تھے ، ان پر ایک طرح رعشہ ، سیماب طاری ہوگیا ۔ مگر چوں کہ عرفانِ جہل ان میں ایک طرح کا پھوہڑ اضطراب پیدا کر چکا تھا ، لہذا انھوں نے بعض یونیورسٹیوں کے اردو کے شعبوں کی کمیں گاہوں یا پارکوں میں بیٹھ کر سازش کی اور شمیم حنفی کی کتاب پر خود اعتمادی کے ساتھ لکھ اور اختلاف کرنے کی صلاحیت کے فقدان پر رنجیدہ ہوکر ، اپنی دوسری دفاعی لائن پر کھڑے ہوتے چند حواس باختہ ، سپاہی پیشہ طالب علموں (نائب علموں) کو سنجیدگی کے ساتھ حکم یلغار عطا کیا ۔ نتیجے میں ذہنی افلاس اور ادب ناشناسی کا چیخ چیخ کر اعلان کرتے ہو ۔ چند تبصرے شائع ہوئے جو ان مباحث کے اولین دائروں تک بھی رسائی سے محروم تھے جو شمیم حنفی نے اپنی کتاب میں اٹھائے تھے

یہ ہوا کہ کتاب کا تو کچھ نہ بگڑا ، تبصرہ نگاروں کی تاریک ذہنی ، بےبصری اور اخلاقی ناخواندگی کا تاثر اور بھی شدید ہوگیا ۔ ان
ں میں اس WOOLFISH SNARL کی گونج بھی پیدا نہ ہوسکی جس پر کسی زمانے میں اردو کی ترقی پسند تنقید قادر تھی ۔
تاریک ذہنی کے تو نہیں ہاں ، تاریک جہگی کے بھی کچھ مظاہر سامنے آئے ۔ شمیم حنفی کی کتاب نے علمی انداز اور وسعت
۔ کے علاوہ ایک طرح کی وسیع المشرب ادبی آگہی اور بصیرت کا بھی ثبوت دیا تھا ۔ ان کی دست رس میں مغرب اور مشرق کا
ادا علمی سرمایہ تھا جو جدیدیت کے عرفان کے لیے ضروری ہے ۔ انھوں نے اپنے مطالعے کے دوران جن مآخذ کا حوالہ دیا تھا ،
سے واقفیت تو دور کی بات ہے ، ہم میں سے بہتوں کو ان سے بصری اتصال تک کا شرف حاصل نہیں تھا ۔ صحت مند ردِ
تو یہ ہوتا کہ ہم ان کتابوں کے بہ راہِ راست مطالعے کی طرف راغب ہوتے ، اور اس مطالعے کے بعد شمیم حنفی کے اخذ کردہ
کا محاکمہ کرتے اور ان سے اختلاف و اتفاق کے گوشے تلاش کرتے کہ ایسے بہت سے گوشے ایک ایسی کتاب میں نکل ہی آتے
جو اپنی بساط کی وسعت سے متاثر کرتی اور جدیدیت جیسے پیچیدہ اور CURRENTS AND CROSS CURRENTS
؛ خال رجحان سے متعلق ہو ۔ جدیدیت پر مشرق ہی کیا مغرب میں جو کچھ لکھا جارہا ہے اس میں POLEMICS کا عنصر اور
بہ ہرحال موجود ہے ۔ ایسی صورت میں جدیدیت پر کسی بھی تصنیف کو تنقیص آمیز تنقید کی شکار گاہ یعنی HUNTING
GROUN آسانی سے بنایا جاسکتا ہے ۔ مگر یہاں ہوا یہ کہ جدیدیت کے اردو شارحین اپنی نفسیاتی پیچیدگیوں کی سپر کو آلہ ؛
۔ سمجھ کر آگے بڑھے ہیں ۔ جدیدیت سے وابستہ بعض ناقدین کی شمیم حنفی کی کتاب سے برہمی کے کئی اسباب ہیں ۔ ایک بڑی
تو یہ ہے کہ ادھر چند برسوں سے جدید تنقید نگاری میں سلیم احمد کے زیرِ اثر ایک طرح کا غیر علمی لب و لہجہ فروغ پارہا ہے اور
ایک مخصوص انداز کے پرشور انشائیے میں تبدیل ہوتی جارہی ہے ۔ اس لب و لہجے کی بھی اپنی جگہ اہمیت ہے ، مگر اسے کسی
ملک کی ادبی تنقید کا غالب لب و لہجہ بنا لینا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے ۔ شمیم حنفی نے اپنی کتاب میں " یونیورسٹی زاد "
و لہجہ اختیار کیا ہے اور اپنے انداز کو علمی رکھا ہے اور پیشہ ورانہ تنقید کی سنجیدہ گفتاری کو کہیں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے ۔ یہ
ی مجبوری تھی کہ وہ یہ کتاب ڈی ۔ لٹ کی ڈگری کے لیے لکھ رہے تھے ، کسی معاصر رسالے میں اشاعت کے لیے نہیں ۔ ہماری
میں انہدام کے اسلوب کے شیدائی کو یقیناً شمیم حنفی کی کتاب کا سنجیدہ علمی اسلوب پسند نہ آیا ہوگا ۔ مگر اس اسلوب کی
تد سے انکار کا حق بھی کسی پیشہ ور نقاد کو نہیں شاعر نقاد کو ہی دیا جاسکتا ہے ۔
جدیدیت کے نام لیواؤں میں جدیدیت کی اس تعبیر کو تسلیم کرنے کا رجحان خاصا راسخ ہے جس کے مطابق " خالص ادب "
دب ہے ۔ ادب کو خالص رکھنے پر اصرار کی یورپ میں ایک لمبی تاریخ ہے جو فن برائے فن کے نظریے سے شروع ہوکر
یت پسندی کی فرانسیسی تحریکوں تک پھیلی ہوئی ہے ۔ بریڈلی نے انگلستان میں اشاریت پسندی کے زیرِ اثر PURE POETRY
نعرہ لگایا تھا ۔ فرانس کے اشاریت پسند ، شعری تجربے اور اس کے اظہار کا خاصا اشراف تصور رکھتے تھے اور ادب و شعر کے
ن میں انھوں نے ایک طرح کی برہمنیت کا انداز اختیار کر رکھا تھا اور ادبی تجربے کی خلوت میں سیاست ، اخلاق اور معیشت سے
ی موضوعات کو " نامحرم " سمجھتے تھے اور شاعری کو موسیقی کی طرح پاک اور ساری نثری آلودگیوں سے منزہ سمجھتے تھے ۔ اردو میں
کہ جدیدیت ترقی پسندی کی برہنہ گفتاری ، خطابت اور سیاست زدگی کے خلاف ایک ردِ عمل کے طور پر ابھری تھی اس وجہ سے
میں شروع سے ہی خالص ادب ، کا اشرافی تصور غالب رہا ہے ۔ شمیم حنفی نے جدیدیت کی اس اشاریت پسندانہ تعبیر سے انکار کیا
۔ ان کا یہی انکار بعض جدید ناقدوں سے ان کے اختلاف کی وجہ بنا ہے ۔ وہ جدیدیت کا EXCLUSIVE نہیں شمولی یعنی

INCLUSIVE تصور رکھتے ہیں ۔ ان کے اس تصور سے بحث کی جاسکتی ہے اور اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے ۔ مگر ابھی تک ایسا نہیں ہوا ہے ۔

ایک سال کے وقفے کے بعد شمیم حنفی نے اپنی کتاب جدیدیت کی فلسفیانہ اساس کا دوسرا حصہ شائع کیا ہے جسے انھوں نے " نئی شعری روایت " کا نام دیا ہے ۔ پہلا حصہ دراصل نظری تھا اور ان افکار کی نشان دہی اور تجزیے پر مشتمل تھا جو جدیدیت کی تشکیل و تعمیر میں معاون ہوئے تھے اور جن کے بغیر اس لازمانی اور زمانی تجربے کی مختلف جہتوں اور ابعاد کو نہیں سمجھا جاسکتا جس کے اظہار کے کرب و نشاط کا جدیدیت ایک رزمیہ ہے ۔ نئی شعری روایت میں ان تمام افکار کی تخلیقی گونج کا تجزیہ کیا گیا ہے جس سے جدید اردو شاعری عبارت ہے ۔ نئی انسان دوستی وجودیت ، نفسیات ، نئی لسانیات ، منطقی اثباتیت ، نئی تاریخیت (NEW HISTORICISM) جیسے تصورات کے ادبی مضمرات اور تخلیقی ادب پر ان کے اثرات کے جائزے کے بعد شمیم حنفی نے جو نتائج نکالے ہیں ان میں ان کی اپنی بصیرت اور ادب کی اقدار شناسی کا نور ہے ۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ادبی نظریہ سازی کا کام کرنے والے اطلاق کی راہ میں مارے جاتے ہیں ، شمیم حنفی بڑی حد تک اس میدان میں کامیاب رہے ہیں ان کی کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے :

(۱) بیسویں صدی کی اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت اور اس کے مضمرات (۲) نئی جمالیات ۔۔۔ فنی و لسانی مسائل (۳) تخلیقی عمل ۔۔۔ اظہار و ابلاغ کے مسائل ۔

پہلے باب میں وہ اس معروف نظریے کی تردید کرتے ہیں جس کے مطابق حالی اور آزاد جدید شاعری کے اولین معماروں میں شمار کیے جاتے ہیں ۔ اس ضمن میں انھوں نے بیسویں صدی کی اردو شاعری کا جو منظرنامہ پیش کیا ہے اس سے ایک نئے ذہنی ماحول کی تصویر ابھرتی ہے ۔ یہ تصویر ان کے قول کے مطابق جدید کے تاریخی اور مادی تصور (حالی اور آزاد کی اصلاحی تحریک) اور جدید کے سیاسی ، اقتصادی یا تہذیبی تصور (ترقی پسند تحریک) دونوں سے یک سر مختلف ہے ۔ اس پر جدید کے اس منطقی تصور کا اطلاق بھی ممکن نہیں جس کی تشکیل عقلیت کے ہاتھوں ہوئی ۔ یہ تصویر نئے انسان کے مقاصد اور اس سے وابستہ امکانات و فرائض کے بجائے اس کی حقیقی صورتِ حال پر بنی ہے ، ایک انتہائی پیچیدہ اور پُر اسرار حقیقت کے زندہ و متحرک پیکر کی شکل میں ۔ یہ پیکر پورے انسان کا ہے ، صرف اس کے اخلاقی یا سماجی یا سیاسی یا اقتصادی وجود کا مظہر نہیں ہے ۔ اسی لیے اس کی ترکیب میں جا بہ جا وہ تضادات دکھائی دیتے ہیں جن سے زندگی کی پیچ در پیچ کلیت عبارت ہے ۔ اسی کلیت کو جدیدیت ایک بسیط تجربے کی شکل دیتی ہے ۔ حالی اور آزاد زندگی کو اس کی کلیت میں نہیں دیکھ پاتے ۔ اقبال ، شمیم حنفی کے خیال کے مطابق جدیدیت کا نقطہ آغاز ہیں مگر وہ بھی جزوی طور پر جدیدیت کا ساتھ دیتے ہیں ۔ بعد میں وہ ایک طرح کی مثالیت پسندی کا شکار ہوکر اس ہوش ربا حقیقت پسندی سے گریزاں ہوجاتے ہیں ۔ جو حقیقی انسانی صورتِ حال کے شعری اظہار کے لیے ضروری ہے ۔ ترقی پسند ادب کا افادی اور منصوبہ بند تصور رکھنے کی وجہ سے اور ترقی کے ایک غیر فطری تصور پر انحصار کی وجہ سے جس حقیقت پسندی کا سہارا لیتی ہے ، وہ مثالی پسند اور غیر حقیقی ہے ۔ حلقہ ، ارباب ذوق سے وابستہ شعرا میں بڑی حد تک ادبی مزاج اور طریق کار کا شعور ہے ۔ اس ضمن میں میراجی اور راشد کو جدیدیت کی تاریخ فراموش نہیں کرسکتی ۔ اس سلسلے میں شمیم حنفی نے نئی حقیقت پسندی کے عناصرِ ترکیبی کا تفصیلی طور پر ذکر کیا ہے جو نئے شعرا کو کسی سکہ بند اور معین نظریے کی اسیر نہیں ہونے دیتی اور وہ تہذیب اور انسان کو اس کے حقیقی خدوخال میں دیکھنے کا مطالبہ کرتی ہے ۔ نئی حقیقت پسندی کسی قسم کی سطحی اور سستی رجائیت کی شکار نہیں ہوتی ۔ وہ انسان کی اس تقسیم کو تسلیم نہیں کرتی جو اب تک رائج رہی ہے ۔ یعنی فطری انسان ، اقتصادی انسان اور جمالیاتی انسان ۔ وہ پورے انسان کی

لاش میں رہتی ہے ۔ اسی پورے انسان کے بسیط تجربے کی پیش کش کو جدیدیت نے اپنا مقصدِ اولین قرار دیا ہے ۔ اردو کی جدید
عری اسی پورے انسان کی طبیعی اور مابعد الطبیعی ابعاد کو پیش کرنے کی ایک کوشش ہے ۔ جدیدیت بنیادی طور پر انسان کا
سیاتی تصور رکھتی ہے ۔ اسی السیاتی تصور کے پس منظر میں ہجرت ، ماضی کی طرف مراجعت ، بے گانگی ، وجود کی لایعنیت اور موت
کے تصور پر شمیم حنفی نے بڑی اچھی بحث کی ہے ۔ ۔ ۔ ایسی بھر پور بحث جو اردو کے ناقدین کی تحریروں میں کم ہی نظر آتی ہے ۔

دوسرے باب میں نئی حقیقت پسندی کی روشنی میں نئی جمالیات کا مسئلہ اٹھایا گیا ہے اور اس جمالیات میں اظہار کے جو
سائل بہ روئے کار آتے ہیں ان کا ذکر کیا گیا ہے ۔ اس سلسلے میں انھوں نے خاص طور پر علامتی اظہار کے مسئلے سے بحث کی
ہے ۔ کیسرر ، سوسین لینگر اور علامتی لسانیات کے دوسرے عالموں کے نظریات کی روشنی میں علامت کے تصور کا جائزہ لیا ہے ۔
یدیت جس انسانی تجربے کا اظہار کرتی ہے اس کے لیے روایتی جمالیات کے اظہاری اصول کام کے نہیں رہے ہیں ۔ صرف علامتی
ریلے کے ذریعے ہی یہ مہم سر کی جاسکتی ہے ۔ منطقی اثبات پسندوں کے لسانی نظریات اور ان سے عصری علامتی فکر کے اختلاف و
اق کے جملہ پہلوؤں کو شمیم حنفی نے نمایاں کیا ہے ۔ مگر یہاں وہ اگر یورپ کے POST MODERNIST ادب میں غیر
امتی اظہار کے اسالیب کا ذکر تفصیل سے کرتے ہیں تو معاملے کا ایک اور پہلو بھی سامنے آجاتا ہے اس لیے کہ امریکہ میں علامت
ندی یا علامتی طرزِ اظہار SYMBOLIC MODE کے خلاف بغاوت کی ایک لہر چل رہی ہے جو خاصی قوی ہے ۔ شمیم حنفی
نے نئی جمالیات اور نئی شعری زبان کے تقریباً سبھی مکاتب کا ذکر کیا ہے جن کا مغرب میں ان دنوں چلن ہے ۔ بحران زدہ تہذیب
ں طرح بدصورتی ، بے ہنگمی ، خوف اور تشدد پر مبنی جمالیاتی معیاروں کی تخلیق کرتی ہے اس کے احساس و ادراک میں شمیم حنفی
نے کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہیں برتی ہے ۔ انھوں نے لارنس کی BLOOD AESTHETICS سے لے کر VEHICLE
AESTHETIC ، TYPE WRITER AESTHETICS اور سوسین سونٹیگ کی AESTHETICS OF SILENCE
ت کا تجزیہ کیا ہے ۔ انھوں نے بڑی خوبی سے اس تاثر کی تخلیق کی ہے کہ کس طرح یورپ میں آواں گارد روایتی فن اور جمالیات
ظاہر غیر جمالیاتی ذرائع سے حملہ آور ہے تاکہ شکست و ریخت کے اس عمل سے جمالیات کی نئی قدریں ابھریں ۔ ہمارے یہاں
یدیت ابھی ان مسائل سے دوچار ہے جو مغرب کو ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۲ء تک درپیش تھے ۔ یہ دور یورپ میں جدیدیت کا کلاسیکی دور
تا ہے ۔ آج یورپ اپنی ابتدائی جدیدیت سے کہیں آگے بڑھ چکا ہے اور ایک ایسے دور میں ہے جہاں POST
MODERNISM کا دور دورہ ہے ۔ شمیم حنفی نے اردو کی جدیدیت پر گفتگو کے دوران اس POST MODERNIST ادب
ہ مظاہر سے بحث کی ہے جس کی ابھی اردو والوں کو صرف اطلاع ملی ہے ۔ یہ اطلاع خطرناک ہوسکتی ہے کہ ہمارے اکثر فیشن زدہ
نے والے ، اپنے تخلیقی سفر میں تنقید کو رہنما بناتے ہیں اور برباد ہوتے ہیں ۔

شمیم حنفی کی اس کتاب کو ان کی پچھلی کتاب " جدیدیت کی فلسفیانہ اساس " کے ساتھ پڑھنا چاہیے کہ یہ اس کا تکملہ ہے ۔
یدیت اور اردو کی نئی شاعری کی تفہیم میں اس کتاب کو فراموش کرنا ایک ایسا کفر ہوگا جس کی جرات وہی کرسکے گا جس میں جہل
رزدہ خود اعتمادی ہوگی ۔ معلومات کے ہجوم میں شمیم حنفی نے اپنی بصیرت کھوئی نہیں ہے بلکہ اسے اور بھی روشن کیا ہے ۔ دیکھیے
روشنی ان کے لیے ہالہ بنتی ہے یا عذاب ۔ (۱۹۸۰ء)

○○○

سید وقار حسین

مجھے گھر یاد آتا ہے

" مجھے گھر یاد آتا ہے " ڈاکٹر شمیم حنفی کے ڈراموں کا دوسرا مجموعہ ہے ۔ پہلا مجموعہ " مٹی کا بلاوا " چند برس پہلے چھپا تھا ۔ زیرِ نظر کتاب میں پانچ ڈرامے ہیں جن میں سے چار ریڈیو کے لیے لکھے گئے تھے اور ایک ڈراما " پانی بہہ رہا ہے " اسٹیج کے لیے ۔ پیش لفظ میں شمیم حنفی کہتے ہیں کہ ان ڈراموں کی مشترک تھیم " وقت " ہے اور وقت کی پہچان انھیں ، زوال کے واسطے سے ہوئی ہے ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان ڈراموں میں موضوع کے اعتبار سے ایک تسلسل ملتا ہے اور اس تسلسل کا عکس کردار نگاری اور تکنیک میں دکھائی دینا تقریباً ناگزیر ہے اسٹیج والے ڈرامے کو چھوڑ کر ہر ڈرامے کا سماجی پس منظر بھی کم و بیش ایک جیسا ہے بلکہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ چند مستقل کردار ہر ڈرامے میں تھوڑی سی سطحی تبدیلی کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں ۔ یہ بھی کردار فیض کے الفاظ میں " یادِ ماضی سے غمیں وحشت فردا سے نڈھال " ہیں اور وقت بالخصوص ماضی کی طرف سے کسی رویے کی تجسیم کرتے ہیں ۔

کیا یہ کردار محض مجرد تصورات کے پیکر ہیں اور کیا یہ ڈرامے صرف خیالات ، عقائد اور جذباتی وابستگیوں کی کشمکش کی صوتی تصویریں پیش کرتے ہیں ؟ ایک حد تک یقیناً ایسا ہے لیکن چوں کہ مصنف کو اپنے کرداروں کے پس منظر ، ان کی تہذیب ، ان کی زبان اور ان کی روز مرہ کی زندگی کا صحیح اور گہرا علم بلکہ تجربہ ہے اس لیے ان ڈراموں کی فضا میں روز مرہ زندگی کی سادگی اور پُرکاری کا ایک ایسا تاثر پیدا ہوگیا ہے جس کی وجہ سے ڈرامے صرف DRAMA OF IDIAS اور PROBLEM PLAY نہ رہ کر بعض نہایت نازک احساسات کی حشر سامانیوں کے معتبر اور تادیر یاد رہنے والے مرقع بن گئے ہیں ۔ بڑی مشکل سے گرفت میں آنے والے احساسات کا تانا بانا ڈرامے میں ملتا ہے لیکن جذباتیت سے زیادہ تر دامن بچایا گیا ہے ۔ البتہ کہیں کہیں ضرورت سے زیادہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ۔ ایسا مکالموں میں شاذ و نادر ہی ہوا ہے مگر بعض مقامات پر خصوصاً پہلے ڈرامے ، پانچویں سمت ، میں راوی کے بیانات خاصے طویل ہو گئے ہیں ۔

اس کے برخلاف آخری ڈرامے " مجھے گھر یاد آتا ہے " میں راوی کے تبصروں کا (جن کو نہج البلاغہ سے اخذ کیا گیا ہے) موثر ڈرامائی استعمال ملتا ہے ۔

" پانچویں سمت " اور " اپنی اپنی زنجیر " ان دونوں ڈراموں میں ماضی کے بوجھ تلے دبے ہوئے دو اعلیٰ متوسط طبقے کے مسلمان خاندانوں کے افراد جو زمین داری کے خاتمے کے بعد بڑی حد تک اپنی اگلی وجاہت کھو چکے ہیں ، اور کم و بیش زندہ لاشوں کی طرح ہیں کسی نہ کسی طرح زندگی سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے ہیں ۔ پانچویں سمت میں تین نسلوں کے نمائندے ایک چھت تلے رہ رہے ہیں ۔ سید صاحب ، باجی بیگم ، عالیہ اور فرحت ۔ یہ سب زندگی کی طرف مختلف رویوں کی علامتیں ہیں کہ انھیں سے ہر ایک نے زندگی گزارنے کا اپنا ایک ڈھنگ نکالا ہے لیکن ہیں یہ سب کے سب ہراساں اور ایک طرح سے تاریکی میں بھٹک رہے ہیں ۔

س مایوسی کے عالم میں امید کا استعارہ عالیہ کی آٹھ برس کی بیٹی جمیلہ کو بنایا گیا ہے جو ڈرامے کے آخر میں اپنے ماموں کو پانچویں ست کی طرف لے جاتی ہے ۔ یہ فنی نسل میں ایک ایسے ایقان کا اظہار ہے جس کا تعلق عقل اور منطق سے کم اور وجدان سے زیادہ ہے ۔ ساتھ ہی ڈرامے کا خاتمہ اس امر کا اعلان بھی ہے کہ نئی نسل کی رہنمائی قبول کرنا ایک طرح کا جبر ہے جسے پرانی نسل نے چار ناچار تسلیم کرلیا ہے ۔ کٹ جانے والے درخت کو ماضی کی علامت کے طور پر خوبی سے برتا گیا ہے ۔ مکالموں میں بین السطور اور ور رس معنی کی ترسیل کی ایک کامیاب مثال وہ منظر ہے جس میں فرحت اور جمیلہ کھلونے والی ریل گاڑی کے بارے میں بات تے ہیں ۔ " اپنی اپنی زنجیر " میں دو نسلوں کی کشمکش زیادہ واضح اور فیصلہ کن ہے ۔ ڈرامے میں مزاح ، طنز اور IRONY کے ناصر خاصے نمایاں ہیں بالخصوص چودھری صاحب کے کردار کی پیش کش میں چودھری صاحب عامر تو ہیں لیکن مضحکہ خیز قسم کے ۔

ان کی ماضی پرستی اور ایک دقیانوسی طرز حیات کو اپنی بہن کے بچوں پر مسلط کرنے کے جنون کی علامت وہ شربت ہے س کی بوتل بالآخر ٹوٹ جاتی ہے ۔

چودھری صاحب تنہا رہ جاتے ہیں ان کا بھانجا علی انھیں ماضی کے زنداں سے آزادی دلانے کے لیے آدھمکتا ہے ۔ یہ TRAGI-COMEDY خالص کامیڈی کی طرح بھی لکھی جاسکتی تھی ۔ لیکن شاید ڈراما نگار کے نزدیک " اپنی اپنی زنجیر " کے دار صرف اپنی حماقت کے باعث ہی ماضی کے اسیر نہیں ہیں بلکہ تقدیر کے ایک بےرحم جبر کا شکار بھی ہیں ۔

اگر پہلے ڈراموں میں نوجوان نسل کے نمائندے کسی نہ کسی ماضی کے چکر سے نکلنے کی راہ ڈھونڈ لیتے ہیں تو تیسرے ڈرامے چوراہا " میں صورتِ حال بالکل برعکس ہے جو اپنی ٹھوس حقیقت نگاری اور بہتر ڈرامائی تعمیر کے باعث " پانچویں سمت " اور " اپنی پی زنجیر " سے زیادہ موثر ڈراما ہے ۔ اس ڈرامے میں دنیا دار بزرگ شہر آکر تجارت اور پیسے کے چکر میں پڑ جاتے ہیں اور نوجوان ارف ماضی اور اس کی اقدار میں کھویا رہتا ہے ۔ عارف اور اس کے والد کا تضاد اور کشمکش دراصل زندگی کی طرف دو رویوں کا تضاد ور کشمکش ہے ۔ ڈرامے کے آخر میں یہ اطلاع کہ عارف بہت دیر سے نہا رہا ہے ایک طرح کا رمزیہ ابہام پیدا کرتی ہے ۔

کیا عارف نے خودکشی کرلی ہے یا اس کا تادیر نہانا اپنے آپ کو ان آلائشوں سے پاک کرنے کی علامت ہے جن سے اس کے دنیا دار باپ نے اپنی عاقبت اندیشی کے زعم میں سارے گھر کو آلودہ کر رکھا ہے اور ایک گھر ہی کا کیا ذکر ہر گھر اس آلودگی کی یٹ میں ہے ۔

" پانی بہہ رہا ہے " تاریخ کے مختلف تصورات اور زندگی اور وقت کی طرح مختلف رویوں کی کشمکش کو ڈرامائی شکل دینے کی یک کوشش ہے ۔ یہ ڈراما ایک ہسٹری کانفرنس کے موقع پر پیش کرنے کے لیے لکھا گیا تھا ۔

اس قسم کے ڈرامے کے کرداروں سے توقع نہیں کی جاتی کہ وہ جیتے جاگتے انسانوں کی طرح نظر آئیں ۔ آفتاب کے کردار کی یش کش میں اگر UNDER STATEMENT ہوتا تو بہتر تھا ۔ اس کے باوجود آفتاب ایک پرکشش کردار ہے جو کسی نہ ی طرح اپنے اس کردار کی ترسیل میں کامیاب ہوجاتا ہے کہ وہ تاریخ جس سے عام آدمی غائب ہوجائے معتبر ہوسکتی ہے اور یہ کہ ریخ اپنے IVERY TOWER میں مقید نہیں رہ سکتا ۔ ڈرامے کا خاتمہ عوام کی قوت میں ایقان کے اظہار پر ہوتا ہے کہ یہی ت اب تاریخ کا رخ متعین کرے گی ۔

باوجود اس کے کہ " مجھے گھر یاد آتا ہے " کی تھیم بھی ماضی سے انسان کا رشتہ ہے یہ ڈراما بقیہ چار ڈراموں سے مختلف ر وسیع تر ہے ۔ اس ڈرامے کے ہیرو نعیم کی جھلک " چوراہا " کے عارف میں دکھائی دیتی ہے لیکن جس صورتِ حال میں عارف

آپ کو پاتا ہے اس میں ماضی کی طرف اس کا فطری جھکاؤ ایک ردِ عمل کے طور پر سامنے آتا ہے ۔ اسی طرح پہلے دو ڈراموں بھی نوجوان نسل اپنے بزرگوں سے ایک حریفانہ کشمکش کو ناگزیر پاتی ہے ۔ "مجھے گھر یاد آتا ہے" میں اس قسم کا ٹکراؤ نہیں ہے ۔ نعیم ان طرزِ حیات یا نظامِ اقدار کا انتخاب نہیں کرتا ہے ۔ وہ وقت کی تباہ کاریوں کا ایک حساس مگر خاموش اور بے بس تماشائی ہے ۔

"آدمی کا مستقبل چاہے درخشاں ہو چاہے تاریک یادِ رفتگاں ، تنہائی اور موت اٹل حقیقتیں ہیں جن سے نجات کی کوئی صورت نہیں ۔ نعیم جانتا ہے کہ زندگی کے کھیل میں سوائے وقت کے اور کوئی نہیں جیتتا ۔ وہ جب جہاں جائے گا اپنے ماضی کو لے کر جائے گا ۔ وہ کہتا ہے "میرا گھر میرے اندر ہے" اس طرح یہ ڈراما آگہی کی ایک سطح پر وقوع پذیر ہوتا ہے جہاں خارجی صورت داخلی واردات کو اظہار کی منزل تک لانے کا محض ایک وسیلہ ہے ۔

ریڈیو ڈرامے کا سارا دارومدار مکالموں پر ہوتا ہے اور ڈرامے کا جو کچھ عمل ہے وہ بھی زیادہ تر لفظ کے وسیلے سے ہی سننے والے پر واضح ہوتا ہے ۔ اس قسم کے ڈرامے کو نسبتاً زیادہ پیچیدہ ، نازک اور مجرد فکرواحساس کی ترسیل کا وسیلہ بنایاجاسکتا ہے اور حنفی نے ریڈیو ڈرامے کے میڈیم کو اسی مقصد کے حصول کے لیے نہایت سلیقے سے برتا ہے ۔ اس طرح انھوں نے ریڈیو ڈرامے کی سطح کو جو بالعموم پست طنز و مزاح اور بے بضاعت میلو ڈرامے کی دلدل سے نہیں نکل پاتا ہے خاصا بلند کردیا ہے ۔ جس طرزِ احساس کی کارفرمائی ان ڈراموں میں ہے اس کا اظہار فکشن میں خاص طور سے قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کی تحریروں میں تو ہوا لیکن اردو ڈرامے میں یہ اپنی نوعیت کی سب سے کامیاب کاوش ہے اور اردو ڈرامے کی مجموعی روایت میں ایک اہم اضافہ ہے ۔ یہ کہ اپنی جڑوں سے کٹ جانے کے کاشاتی اور لاانسانی تجربے کو ان ڈراموں میں جس خوبی کے ساتھ وقت ، مقام اور تہذیب کے حوالے سے ٹھوس اور متحرک پیکروں میں ڈھالا گیا ہے وہ خاصے کی چیز ہے ۔

○●○

شمیم حنفی

ادب میں نئی حسیت کا مفہوم

ادب میں نئی حسیت کے مفہوم کو میں زندگی میں نئی حسیت یا رویئے اور افکار کی ایک نئی جہت کے مفہوم سے یکسر لاتعلق نہیں سمجھتا۔ شرط صرف یہ ہے کہ زندگی یا فکر یا رویئے میں اس حسیت کے مفہوم کا تعین کرنے والے کی شخصیت ایک چہرہ بھی رکھتی ہو اور سایہ (Persona) بھی۔ اس بحث کے دائرے سے ایسے افراد خود خارج ہوجاتے ہیں جنھیں زندگی کی پہچان کا سراغ بس اس کے خارج میں ملتا ہے اور وہ لکھنے والے بھی جنھوں نے زندگی اور ادب دونوں کو بس ایک کارگہ شیشہ گری سمجھا اور ہمہ وقت ایک ڈر کے آسیب کا شکار ہے۔ وہ زمانے لد گئے جب ادب میں سماجی یا سیاسی مسائل کا تذکرہ بہتوں کے نزدیک شجر ممنوعہ کی مثال تھا۔ اس خفیف الفکری کے قصوروار کچھ تو لکھنے والے بھی تھے اور وہ پڑھنے والے بھی جنھوں نے ہر اس رویئے کو دشمن آنکھوں سے دیکھا جس سے ان کے تحفظات پر ضرب پڑتی تھی۔ یا کم از کم جس سے وہ اپنے تعصبات کی تصدیق کا کام نہیں لے سکتے تھے۔ جب ترقی پسندوں نے اپنی دنیوی ضرورتوں کے تحت ادب میں نئی حسیت کا جو مفہوم مقرر کیا تھا اس کا دائرہ محدود تھا اور غیر حقیقت پسندانہ بھی کہ ان کے نزدیک ہماری تہذیبی اور جمالیاتی فکر ، وقت کے ایک معین نقطے پر آکر ٹھہر گئی تھی۔ اس انجماد کو وہ تکمیل سمجھ بیٹھے تھے۔ یا پھر جان بوجھ کر کچھ اس قسم کا کنفیوژن پیدا کر رہے تھے کہ لوگ سوچنا بند کردیں۔ اصلیں میں سوچ اگر کسی بندھے ٹکے سانچے کی پابند نہ ہو تو ہر کاوش اس کی شاخ سے افکار کے انکھوے پھوٹتے ہیں۔ اور افکار عبارت ہے برسوں کی پروردہ نفرتوں اور خوش گمانیوں اور تعصبات اور مفروضات کی تردید سے۔ ظاہر ہے کہ ترقی پسند ہر اس رویئے کی تردید سے خوف زدہ ہوتے تھے جس کی بنیادوں پر انھوں نے اپنی جنت ارضی اور اپنے وجود کا رنگ محل تعمیر کر رکھا تھا۔ دوسری طرف وہ سے لکھنے والے تھے جن کے افکار کو کوئی بامعنی جہت میسر نہ آسکی۔ انھوں نے افکار کو ایک خود کفیل اور قائم بالذات اکائی سمجھا اور یہ بھول گئے کہ زندگی کا سمندر بے کراں ہے اور اس کی اونچی سے اونچی لہر کی صورت نمودار ہونے والی کوئی بھی قدر آپ اپنا حاصل نہیں ہوتی۔ وہ نشانِ راہ کو منزل سمجھ بیٹھے تھے۔ نتیجہ یہ کہ ان کا انجام آج ترقی پسندوں سے زیادہ عبرت ناک ہے۔ تحریک بلند کر وہ یا تو کلاسیکیت کی ڈیوڑھی کے دربان بن گئے یا پھر اس مقام پر پڑاؤ ڈالا جہاں لفظوں اور آوازوں کا ایک بے اماں شور برپا تھا۔ تخلیقی تجربے کی دستک اس شور میں گم ہوگئی تھی۔

آخر کچھ تو بات تھی کہ اس رویئے کو سب سے زیادہ قبولیت ان سماجی اور تہذیبی ماحول میں ملی جہاں احتساس کی بدمذاقی عام تھی اور شعر و ادب کے علاوہ لکھنے والے کو آتش فشاں مسائل کی رزم گاہ سے الگ اس کے خلوت کدے میں محصور رکھنے پر مصر تھے۔ لیکن خلوت کدے تو ان علاقوں میں بھی مسمار ہوچکے۔ سبب صاف ہے۔ بعض حالات میں تاریخ کا بلاوا ناگہانی بھی ہوتا ہے اور اگر راستے بھٹکنے والے یا راہ دکھانے والے آپ ہی بھٹکے ہوتے ہوں تو پھر نیک و بد کی تمیز نہیں رہ جاتی۔ حملے کے ہر منظر کو

وہ تہس نہس کرنا چاہتا ہے ۔ اسے اس بات سے کیا غرض کہ کن وادیوں میں گلاب لگتے ہیں اور کن صحراؤں میں فقط ریت اڑتی ہے ۔ بیسویں صدی نے جس طرح تاریخ کے ایک نئے تصور کو جنم دیا ہے ۔ اسی طرف مختلف النوع مناظر کی حدیں بھی آپس میں گڈمڈ کردی ہیں ۔ اب کوئی بھی حقیقت اپنے آپ میں مکمل یا واضح یا متعین یا یک رنگ نہیں ہے ۔ سوائے تجربوں کی اس پوٹ کے جواب ماضی ہے ۔ مگر ماضی کو بھی تو آخر حال بننے کے لیے کوئی راستہ چاہیے تھا اور حال یہ ہے کہ ہر راستے پر تضادات کی بھیڑ ہے ۔ ایسا اجتماع انسانی آنکھ نے اب سے آگے شاید کبھی نہیں دیکھا ۔

ادب میں نئی حسیت کے ایک مفسر نے جارحیت ، مستقبلیت اور فنا پرستی کو ایک ساتھ نئی حسیت کے عناصر کا نام دیا تھا ۔ پھر ان مفکرین کے فرمودات کو دھیان میں لائیے جو وجود کے تمام ارتعاشات کا عکس اس آئینے میں دیکھتے ہیں جس کی بساط ہمارا حاضر ہے ، جو نہ تو امکان ہے ، نہ بشارت ، صرف سچائی ہے ۔ جو ماضی کی دست برد سے اور مستقبل کے اندیشوں سے آزاد بھی نہیں مگر جو ان سے الگ اپنی پہچان قائم کرنے کے درپے بھی ہے ۔ یہ بات تو بہتیرے کہتے ہیں کہ ہمارے عہد کی فکر کا محور اور شناس نامہ وجودیت ہے ۔ مگر کون سی وجودیت ؟ سارتر اور ہائیڈیگر کی لادینی وجودیت یا کرکےگار ، یاس پرس اور مارسل کی دینی وجودیت ؟ وہ جس نے دوسرے انسانوں کو اپنی ذات کا جہنم سمجھا ، یا وہ جو اپنے وجود کے معنی کا تعین دوسروں سے اپنے روابط کی بنیاد پر کرتی ہے ؟ اس سوال کا جواب ایک ساتھ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے دائروں میں چھپا ہوا ہے ۔ پس ثابت یہ ہوا کہ نفی اور اثبات ایک دوسرے سے متضاد نظر آنے کے باوجود ایک دوسرے کے ہم زاد بھی ہیں ۔ جس حقیقت سے ہمارا زمانہ دوچار ہے ۔ اس کے سلسلے دو الگ الگ دنیاؤں میں پھیلے ہوئے ہیں ۔ ان کا آپسی رشتہ حریفانہ بھی ہے اور اس رشتے میں رفاقت کی مہک بھی چھپی ہوئی ہے ۔ تعلق اور ٹکراؤ کے اس تماشے کا طلسم روز بہ روز گہرا ہوتا جارہا ہے ۔

جبھی تو یہ عہد قطعیت کے میلان اور اپنی حسیت کے مابین کوئی مضبوط رشتہ قائم کرنے سے قاصر ہے ۔ ترقی پسندوں کی فکر محض آدھی فکر و حلقوں کی ہٹ دھرمی کے سبب فرسودہ نہیں ٹھہری ۔ اسے اس عہد کی سچائی نے پامال کیا ہے اور کچھ ان کی اپنی سادہ خیالی نے اور وہ لوگ بھی خوار ہونے سے نہ بچ سکے جو تخلیقی لفظ کو انسانی تجربے کی سرزمین سے اٹھا کر علوم کے برف خانوں اور تجربہ گاہوں کے سمانے میں اس شور سے فرار کا راستہ ڈھونڈ رہے تھے ۔ کچھ تو اپنی معصومیت کے سبب ، کچھ اس لیے کہ اس ہم سے نمٹنے کا ان میں حوصلہ نہ تھا ، اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ اس طرح ترقی پسندی کے عضو ضعیف پر انھیں نزلہ گرانے کا [illegible] ہاتھ لگا تھا ۔ خیر ، انھیں حروف و اصوات کے اعداد و شمار اکٹھا کرنے دیجیے ۔ یہ صحیح ہے کہ تاریخ ان کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے گی ۔ [illegible] خود انھوں نے بھی تو اپنے آپ کو ایسی تمام راہوں سے دور کرلیا جدھر سے تاریخ کے سخت جان قافلوں کا گزر ہوتا تھا ۔ ترقی پسند تو خیر اپنے مقاصد اور تنگ نظری کے غلام تھے اور انھوں نے مات کھائی اپنی ہوشیاری کے سبب ۔ مگر یہ غریب تو ادب اور اس کے واسطے سے انسانی کائنات کے مجرم ہیں کہ انھوں نے اس کائنات کو ایک ننھے سے گھروندے میں محصور جانا اور اس کی چوکھٹ پر معنی و بیان کے ناقص علم کا ڈھول تاشا بجاتے رہے اور چوں کہ یہ سارا ہنگامہ بے موقع تھا اس لیے اپنی سادہ لوحی کے نتیجے میں انھوں نے بھی ہزیمت اٹھائی ۔ اس شکست پر پردہ ڈالنے کے لیے ترقی پسند انسان دوستی اور نظریے کا رنگ الاپتے ہیں ، یہ حضرات شعر و ادب کی لسانی صداقت کا ۔

[illegible] ہے کہ ادب کی لسانی صداقت سے انکار ممکن نہیں ۔ یہ ظاہر یہی سچائی اس کا لعل بھی ہے اس کا جوہر بھی ۔ لیکن [illegible] کے اقرار کے سلسلے اگر ادب میں انسانی عنصر کی پیچ حقیقت کے تئیں انکار یا اس کے تئیں ایک سوچی گئی

بے نیازی سے ملادیے جائیں تو نئی حسیت کیا ، پوری زندگی ہی اپنا مفہوم کھو دیتی ہے ۔ کسی تخلیقی لفظ کے معنی متعین ہوتے ہیں اس تجربے سے جو اس لفظ کی اساس بنتا ہے یا اس کا حاصل ، اور جو اسے بے نوا لفظوں کے ہجوم میں ممتاز اور مختلف ٹھہراتا ہے رہی لسانی صداقت تو اس کے جبر سے تو دواساز کمپنیوں کا لٹریچر بھی آزاد نہیں ہے ۔ ترقی پسندوں نے لینن کی وضع کردہ پارٹی لٹریچر کی اصطلاح کو یعنی جانب داری کے ادب کا محرک سمجھنے کی غلطی کی اور گم راہ ہوئے ۔ اسی گم راہی سے آگے کی تمام گم راہیوں کا سلسلہ نکلا ۔ ہمارے زمانے میں وہ جنھیں زباں دانی کا دعویٰ تھا ادب کی لسانی صداقت کے مفہوم کی تہہ داری تک نہ پہنچے اور بھول بیٹھے کہ لسانی صداقت کی ایک ساتھ بہت سطحیں اور پرتیں ہوتی ہیں اور اس صداقت کا حوالہ جب ادب ٹھہرتا ہے تو پوری انسانی کائنات ، اپنی نیکی اور بدی ، اپنے سناٹے اور شور شرابے کے ساتھ سامنے آن موجود ہوتی ہے ۔ تخلیقی اظہار کا جزو بننے کے بعد لفظ لفظ نہیں رہ جاتا ۔ تجربہ اور واردات اور وقوعہ بن جاتا ہے ۔ روشنائی کی ایک ٹیڑھی میڑھی منحنی لکیر سے نکل کر رنگ اور لے میں ڈھل جاتا ہے ۔ تب ہم اسے صرف پڑھتے نہیں ۔ سنتے اور سمجھتے اور محسوس کرتے ہیں ، اور دیکھتے ہیں کہ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اس کا روپ کیوں کر بدلتا جاتا ہے ۔ پھر وہ انسانی لغات کے بجائے ایک جیتی جاگتی ، مہیب اور لطیف اور دہشت آثار اور سکون بخش کائنات کا حصہ بن جاتا ہے ۔ سو ہم اگر اس سب کے ہوتے ہوئے بھی اس کی وساطت سے بالآخر ایک عظیم کائنات کے کسی گوشے تک نہیں پہنچتے تو قصور اس لفظ سے زیادہ خود ہمارا اپنا ہے ۔ میر کا شعر صرف نوراللغات کی مدد سے نہیں سمجھا جاسکتا نہ محض صنائع لفظی و معنوی کے ذریعے ہم کسی فن پارے کے ان اسرار کا سرا پاسکتے ہیں جن سے انسانی تجربے کی بھول بھلیاں عبارت ہے ۔ اگر شعر و ادب کی لسانی صداقت کا مفہوم یہی کچھ ہوتا تھا تو پھر پرانے عروضیوں اور شارحوں کے ارشادات کیا برے تھے ؟ یہاں اس تفصیل میں جانے کی ضرورت بھی نہیں کہ متقدمین سے لے کر میر و غالب تک ، کسی کی تخلیقی سرشت اور تجربے کا رمز تذکرے اور تاریخ اور صنائع و بدائع کے مرتب تو دور ہے ، ایک دو مستثنیات سے قطع نظر بیسوی صدی کے ربع اول تک کی اردو تنقید بھی روشن کرنے سے قاصر رہی ۔ ہمارے عہد کی تنقید نے ادب اور زبان کے دائروں سے آگے جاکر فلسفہ ، نفسیات ، تاریخ ، سماجیات ، مذہب ، سیاست ، سائنس کی اصطلاحوں کو اور ان کے مضمرات کو سمجھنے کے جتن جہاں تہاں اس لیے کیے ہیں کہ انسانی تجربے کی کلیت اور اس کی بسیط حقیقت کا بھید بھاؤ جان سکے ۔ اگلے زمانوں میں طب اور تصوف اور نجوم کی اصطلاحوں سے کام چل جاتا تھا اور ان اصطلاحات کے مروج اور معلوم لاحقوں سے آگے جانے کی ضرورت بھی کم کم ہی پیش آتی تھی کیوں کہ خود شعر کہنے والے کے نزدیک بھی اس کھڑاگ کا مقصد بس برائے شعر گفتن تک محدود ہوتا تھا ۔ نہ تجربے اتنے پیچیدہ ہوتے تھے کہ ان پر ایک منفرد اور انتہائی ذاتی واقعے کا گمان ہو ، نہ ان کے اظہار کی نوعیتیں اتنی گنجلک ہوتی تھیں کہ لفظ کی ڈور تھام کر علامتوں کے بے حساب صحراؤں کی خاک چھاننا ناگزیر بن جائے ۔ مگر ہمارے عہد نے جس جمالیات کے تانے بانے ترتیب دیے ہیں ۔ اس کی جہات کثیر بھی ہیں اور مختلف المقاصد بھی ۔ ہم ایک پیچیدہ اور دہشت انگیز حسن کے تصور کو صرف ایک شخص (ملیو ۔ ؟ ۔ آڈن یا ایک قوم فرنگی کے جمالیاتی ادراک کی کلید کہہ کر پیچھا نہیں چھڑا سکتے ، اس لیے کہ اس کا تعلق جس طرز احساس سے ہے یا جذبے اور فکر کے جن ابعاد سے ہے ان کے حدتے مخصوص اور متعین ہیں نہ ان کی نوعیتیں محدود اور قطعی ہیں ۔

یہی وجہ ہے کہ نئی حسیت کی کوئی ایسی تعریف ممکن نہیں جو اس کے ہر زاویے اور ہر پہلو کا احاطہ کرسکے ۔ اس نے جغرافیائی خطوں کی طرح علم و فکر اور اختصاص کے قلعوں کو بھی منتشر اور مسمار کیا ہے ۔ سماجی علوم کا کوئی ایک شعبہ یا انسانی علوم کی کوئی ایسی منطق جس کا تعلق بس ایک دائرے سے ہو ، کیا فلسفہ کیا نفسیات اور کیا اسلوبیات ، ہم اس کی مدد سے نئی حسیت کے خمیر تک نہیں

سچ سکتے ۔ پاؤنڈ نے ادب کے مطالعے میں پیشہ ور اور نصاب زدہ علما کی ذہنی موشگافیوں کا مذاق بلاوجہ یا محض تفریحاً نہیں اڑایا تھا ۔

پھر سوال یہ ہے کہ نئی حسیت کے معنی کا تعین آخر کیوں کر کن خطوط پر کیا جائے ؟ اس کے لیے ہمیں ایک ساتھ کئی سمتوں کا سفر کرنا ہوگا ۔ متضاد اور مختلف ۔ اصحاب فلسفہ کہتے ہیں کہ ہمارے عہد کا انسان آپ اپنے لیے ایک سوال یا مغالطہ بن کر رہ گیا ہے ۔ سو اس کی حسیت بھی سوالوں کے ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سلسلے اور ایک لحہ بہ لحہ وسیع تر ہوتے ہوئے افق سے مربوط ہے ۔ اس عہد کے علوم کا المیہ یہی ہے کہ انھوں نے ہوا کو مٹھی میں قید کرنے کی جستجو کی اور انجام کار مجردات میں الجھ کر رہ گئے ۔ جب کہ بعضوں کے نزدیک سوچنا بھی عمل کی ایک شکل اور ایک واقعے کے برابر قرار پایا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقت اور تخیل کے بیچ مفروضات نے جو لکیر کھینچ رکھی تھی ، دھیرے دھیرے وہ غائب ہوتی گئی ، اور ظہور ایک ایسی سچائی کا ہوا جو نہ خالی خولی تخیل کی گرفت میں آتی ہے نہ حقیقت کے مسلمہ اور مروجہ اصولوں کی اطاعت قبول کرتی ہے ۔ یہ سچائی اس امر کی طالب ہوتی ہے کہ خیال اور حقیقت کی ثنویت کو ایک اکائی میں مجتمع کیا جائے ۔ اس عہد کا انسان جو بہ یک وقت خیال پرست بھی ہے اور حقیقت پسند بھی ، جو خوابوں کا پجاری بھی ہے اور ٹھوس صداقتوں کا متلاشی بھی ، جو مادی اور طبیعی قوتوں کا تابع بھی ہے اور ان کے غیر مادی یا مابعد الطبیعیاتی روابط کا شناسا بھی ، اس کی کلی اور اجتماعی حیثیت نیز اس کے ظاہر اور مخفی تضادات کے ساتھ اسے قبول کیا جائے ۔ اب اس کے سوا اور کیا گنجائش رہ جاتی ہے کہ ہم نئی حسیت کو ایک بسیط اور ہمہ گیر تناظر میں دیکھیں اور اسے ایک نئی حقیقت کے طور پر تسلیم کریں ، ایک ایسی نئی حقیقت کے طور پر جو نہ تو خیال کے مادی انسلاکات کی منکر ہے ، نہ ہی کہ مادے میں کسی غیر مادی ارتعاش یا کسی باطنی اور روحانی تجربے کے ادراک کو ایک ان ہونی اور من مانی سے تعبیر کرتی ہے سچائی کو ڈھلے ڈھلائے سانچوں کی قید سے رہا کرکے ایسا وسیع تناظر دینے کی کوشش ہماری ادبی تاریخ میں اس سطح پر اب سے آگے ہو سکی ۔ نئی حسیت نے اظہار اور تجربے کے تمام مسلمات کو توڑنے کے جتن کیے ہیں ۔ یہ کوشش کبھی کامیاب اور بارآور ہوئی اور کبھی یہ بھی ہوا کہ اس جستجوئے نجات اور میلانِ سرکشی نے نئی حسیت کے خدوخال مسخ بھی کر دیے ۔ اس نوع کی آزمائش سے گزرنا ، بہرحال ، ہر نئے تجربے کا مقدر ہے ۔

ادب کے سادہ ذہن قاری (اور کیا قیامت ہے کہ بعض زعمائے تنقید بھی) ایک نقطے پر ، بہ ظاہر ایک دوسرے کے لیے اجنبی رنگوں کے اجتماع کو ایک طرح کی تضاد فکری اور ژولیدہ خیالی سمجھتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں کہ نئی حسیت ایک سانس میں سائنس اور مذہب ، مادیت اور سریت نفی اور اثبات کے وظیفے کی گردان کیسے کر سکتی ہے ۔ یہ قصور ان کا نہیں ، ذہنی یک رخے پن اور اختصاص اور ضابطہ پسندی کے جبر کا ہے اور یہ نتیجہ ہے ادب میں نئی حسیت کے مفہوم کو تمام و کمال سائنسی اور تاریخی سطح کی حسیت کے مفہوم سے خلط ملط کرنے کا ۔ نئے اور پرانے کی پہچان کا پیمانہ اگر جنتری یا تاریخی زمان کے شعور کو بنایا جائے تو ہمیں مغربیت کے ان بازی گروں کو بھی نئی حسیت کے مفسروں میں شامل کرنا ہوگا جو حروف و اصوات کے مطالعے میں جدید علم الانسان سے ماخوذ اطلاعات اور اصولوں کو اپنا راہنما بناتے ہیں ۔ محمود ہاشمی نے اس رویے کو زوال پرستی کا نام دیا ہے ۔ آپ اس بارے میں زوال پرستی کی اصطلاح کے اطلاق سے متفق ہوں یا نہ ہوں ، بہرحال یہ تو مانیں گے کہ مغرب میں زوال پرستی کے باضابطہ میلان کا خاتمہ پہلی جنگِ عظیم سے قبل ہو چکا تھا اور خود ہمارے ادب میں اس روایت کا سلسلہ حلقہ ارباب ذوق کا شیرازہ بکھرنے پر ہی ختم ہو گیا ۔ مگر جنگِ عظیم سے پہلے زوال پرستی اور اس میلان کے حامل حلقے کے شعرا کی وارفتگی بہ ہرحال ، ایک خودکار روحانی اور نجی مطالبے اور مقصد کی بازگشت تھی ۔ اس کے دھندلے نشانات ہمارے عہد کی تخلیقی حسیت کے آئینے میں آج بھی دیکھے جا سکتے

ہیں ۔ البتہ اس بات کو ملحوظ رکھنا یہاں ضروری ہے کہ میرا جی اور ان کے رفیقوں نے جن عناصر کے اجتماع میں اپنی حسیت کا سراغ پایا تھا ۔ ان کے جذباتی ، ذہنی اور تہذیبی رابطے آج تبدیل ہوچکے ہیں اور ان پر نئی حقیقتوں کی ضرب پڑنے لگی ہے ۔ اسی لیے آج کے عہد کی حسیت نظم و ضبط کے بجائے ایک ایسے جذباتی اور ذہنی ماحول سے ہمارا تعارف کراتی ہے جو انتشار اور ابتری سے بھرا ہوا ہے ۔ مذہب ، اشتراکیت ، عقلیت ، سریت ، مراجعت ، مستقبلیت ، اظہار کے آزمودہ سانچوں سے باہر ایک نئے اظہار کی جستجو ، ماضی کو اور روایت کو اور وہ ، کچھ جسے سماج ترقی کے ترجمانوں نے فرسودہ جانا اسے ایک نئے تناظر میں دیکھنے کی کوشش ، ذات اور کائنات کے مابین ایک نئے رشتے کی تلاش غرض یہ کہ ساری تگ و دو جو باہم متضاد ، متصادم اور ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی لکیروں سے ایک نیا خاکہ ترتیب دینے کی بے نام آرزو کا علامیہ ہے ، جو کبھی احتجاج اور برگشتگی کی روش اپناتی ہے ، کبھی افسردگی اور محرومی کے احساس سے جاملتی ہے ، نئی حسیت کا تار و پود اسی پیچیدگی سے عبارت ہے ۔ الجھے ہوئے سیاسی اقتصادی اور سماجی رابطوں ، الجھے ہوئے انسانی رشتوں اور روحانی و نفسیاتی لاحقوں نے آج کے انسان کو ہزار بھیدوں کا مخزن بنادیا ہے ۔ سو اس کی حسیت بھی ایک بھید ہے اور اس بھید میں وہ اسرار بھی گھل مل گئے ہیں جو تخلیقی اظہار اور انسانی تجربے کی سرشت میں ازل سے شامل چلے آتے ہیں ۔ اب کھل جا سم سم کا جادوئی کلمہ قصے کہانی کی بات ہے اور ایک نئے مہم جو کے لب گویا کا منتظر ہمارے عہد کے کم از علمی ضابطوں کی کوئی کلید اس جادوئی کلمے کا عمل اختیار کرنے کی قوت سے محروم ہے ۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کمال اور زوال اور کامرانی اور نارسائی کی حدیں ایک دوسرے سے جاملتی ہیں ۔ اس خیال کی وضاحت کے لیے فراق صاحب نے ایک روز ایک فقرہ سنایا تھا ۔

NOTHING FAILS LIKE SUCCESS.

(۱۹۸۰ء)

○●○

شمیم حنفی

فراق کی حسّیت سے ہمارا رابطہ

اب سے کوئی پچیس برس پہلے (۱۹۷۱ء میں) ناصر کاظمی نے اپنے ایک مضمون (نئی غزل) میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ فانی اور یگانہ رنگِ غالب کے اچھے غزل گو شاعر ہونے کے علاوہ بھی کچھ تھے یا نہیں ؟ اور یہ کہ ہمارے عہد کی غزل میر و غالب کے سائے سے ہٹ کر اپنی دھوپ میں بھی چل سکتی ہے یا نہیں ؟ اسی مضمون میں ناصر کاظمی نے نئی غزل کی چند ایسی خصوصیات کا ذکر بھی کیا تھا جو اسے پرانی غزل سے الگ کرتی ہیں ۔ یہ خصوصیات ہیں روایت سے انحراف ، نئے استعاروں کی بہتات ، اظہار میں جراءت اور غنائی سانچوں کا انتخاب ۔

نئی غزل کی پیش رو روایت پر نظر ڈالی جائے تو فانی ، یگانہ اور فراق کے نام تقریباً ایک ساتھ سامنے آتے ہیں ۔ اصغر ، حسرت اور جگر کی شہرت ان تینوں سے کم نہیں مگر ان کی غزل ہر صنف کے مانوس اور روایتی فریم سے باہر نہیں نکلتی ۔ فانی اور یگانہ کے یہاں احساس اور ادراک میں ایک نئے آہنگ کا کچھ سراغ ضرور ملتا ہے مگر یہ آہنگ محدود بہت ہے ۔ دونوں کے مزاج کی مجبوریاں ان کی غزل کو ایک خاص ڈھرے سے نکلنے نہیں دیتیں ۔ دونوں کے یہاں غیر متوقع نتائج تک جاپہنچنے کی صلاحیت کا حیرت ناک فقدان ہے اور دونوں کی شاعری ایک طرح کی انتہا پسندانہ ذات آلودگی کا شکار ہے ۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے کلامِ فراق کے انتخاب کے ساتھ (۱۹۶۵ء میں) جو مقدمہ ترتیب دیا تھا اس میں فانی اور یگانہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ " حسرت کے معاصرین میں فانی کے یہاں تھوڑی سی دبازت معلوم ہوتی ہے لیکن ان کا تصورِ مرگ اور ان کا متصوفانہ تفلسف جدید ذہن کے لیے دل کشی نہیں رکھتا تھا ۔ البتہ اس زمانے میں مرزا یگانہ کے یہاں زندگی کے متضاد اور پیچیدہ مسائل سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ ملتا ہے اور ان کی شاعری میں ذہن کا عنصر بھی خاصی حد تک ہے ، لیکن یگانہ کی بدقسمتی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شخصیت کی اس قوت سے مثبت طور پر کوئی فائدہ نہیں اٹھایا ۔ اس لیے آگے چل کر ان کے ذہنی سوتے خشک ہوگئے اور ان کے اندر ایک ایسی خشکی اور خشونت پیدا ہوگئی جس نے ان کی غزل کے امکانات کو محدود کردیا ۔ "

فانی اور یگانہ کے برعکس فراق کی غزل اپنی ناہمواری اور کھردرے پن کے باوجود نئی حسّیت کے ایک رواں دواں سرچشمے کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس کی مجموعی ساخت پر ایک ایسی تجربہ گاہ کا گمان ہوتا ہے جہاں احساس اور اظہار کی سطحیں جامد اور متعین نہیں ہیں اور ان سطحوں پر تبدیلیوں کے نشانات برابر ابھرتے رہتے ہیں ۔ فراق کی غزل اپنے ماضی سے مربوط ہوتے ہوئے ابھی ہمیں ایک نئے فکری اور جذباتی نظام تک لے جاتی ہے اور اپنے وقت سے پیچھے نہیں ہٹتی ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ فراق کی تخلیقی شخصیت اپنے تمام معاصرین کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع اور پہلودار تھی ۔ ان کی شاعری اور تنقید سے جو شعری کردار ابھرتا ہے وہ بڑی حد تک نیا اور نامانوس ہے اور ہر چند کہ نثر و نظم دونوں میں فراق کا اسلوب جذباتی ہے مگر ان کے رویے اور ترجیحات جذباتی

نہیں ہیں ۔ اسی لیے فراق کی شاعری اور تنقید کو ہم ایک دوسرے سے پوری طرح الگ نہیں کرسکتے ۔ "اندازے" ، "حاشیے" ، "اردو کی عشقیہ شاعری" ، "اردو غزل گوئی" ، یہاں تک کہ ان کے خطوط کے مجموعے "من آنم" میں شعر اور شاعری سے متعلق کچھ واضح قسم کے تصورات کی موجودگی اور تکرار بھی ان تحریروں کو نظریہ بازی اور نظریہ سازی کے عیب سے بچائے رکھتی ہے ۔ فراق روایتی انداز کے استدلال سے گریز کے باوجود اپنی تمام نثری کتابوں میں ایک مخصوص منطقی رویے کے پابند دکھائی دیتے ہیں اور کوئی انوکھی ، متنازعہ یا نئی بات بھی دلیل اور مثال کے بغیر نہیں کہتے ۔ فانی اور یگانہ کے مقابلے میں فراق کی تخلیقی حسیت ہمیں جو زیادہ موثر ، منظم اور مربوط نظر آتی ہے تو اس لیے کہ فراق ان دونوں کی بہ نسبت ایک بہتر اور وسیع تر تنقیدی شعور رکھتے تھے ۔ فراق کا شعری تناظر اپنے تمام معاصرین سے زیادہ وسیع ہے ۔ فراق مخصوصیت کو شاعری کا دشمن سمجھتے تھے ۔ PARTICULARIZATION IS THE ENEMY OF POETRY اور کسی خاص واقعے یا صورتِ حال سے کہیں زیادہ دل چسپی انھیں زندگی کی مجموعی صورتِ حال یا اس کی عام صداقتوں سے تھی ۔ اپنی ایک گفتگو میں (دلی دوردرشن ، ۲۸ / مارچ ۱۹۸۲ ء) فراق نے یہ معنی خیز بات کہی تھی کہ بڑے شاعر کے یہاں خارجی زندگی کے واقعات (اپنے معین حوالوں کے ساتھ) یا تو آئیں گے نہیں ، یا آئیں گے تو لوگ انھیں قیامت تک پہچان نہیں سکیں گے ۔ شاید اسی لیے عسکری نے بھی کہا تھا کہ فراق کی شاعری آہٹوں کی شاعری ہے ۔ یہ شاعری ایسی دنیاؤں میں سانس لیتی ہے جو کچھ سمجھ میں آتی ہیں ، کچھ نہیں آتیں ۔ اپنے زبان زدِ خاص و عام شعر :

زندگی کیا ہے آج اسے اے دوست سوچ لیں اور اداس ہوجائیں

کی مثال دیتے ہوئے فراق نے کہا تھا کہ اس شعر کی روشنی میں اگر کوئی یہ نتیجہ اخذ کرلے کہ فراق نے یہ شعر اپنے والد کے انتقال پر کہا تھا تو وہ اس شعر سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہوجائیں گے ۔ زندگی کے اسرار اور زندگی کی ہمہ گیر سچائیوں کو ایک غیر زمانی سطح پر دیکھنے کی جیسی کوشش ہمیں فراق کے یہاں ملتی ہے ، ان کے کسی دوسرے ہم عصر کے یہاں نظر نہیں آتی ۔ فراق نے اپنے آپ کو نہ تو اپنی روایت کا پابند رکھا ، نہ اپنے عہد کے فکری اور جذباتی ماحول کی اطاعت قبول کی ۔ ان کی غزل ایک کٹر اور بے لوچ مزاج رکھنے والی صنف میں بھی اپنے لیے نجات کے راستے نکال لیتی ہے ، کھلی فضاؤں میں پرواز کرتی ہے اور تخلیقی آزادی کے ایک مستقل احساس کی توثیق کرتی ہے ۔ آزادی کا یہ احساس فراق کی غزل میں کئی سطحوں پر رونما ہوا ہے اور شعری ادراک کے کئی واسطوں سے آیا ہے ۔ زبان و بیان ، لہجہ ، اسلوب ، آہنگ ، مصرعوں کی ساخت ، تجربوں کی رنگا رنگی اور بے تکلفی ، مانوس اور نامانوس اشیا اور مظاہر سے تقریباً یکساں شغف کے معاملے میں فراق سے پہلے غزل گویوں میں صرف میر کا نام لیا جاسکتا ہے ۔ اس جملے سے اگر کسی کو یہ گمان گزرتا ہے کہ میر اور فراق ہم مرتبہ شاعر ہیں تو یہ اُس کا اپنا مسئلہ ہے ۔ میں تو بس اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میر اور فراق کی شعری کائنات میں بعض بنیادی مماثلتیں موجود ہیں اور زبان و بیان ، واردات اور تجربے ، تصور اور احساس کی طرف اپنے رویوں کے اعتبار سے اردو کے تمام غزل گویوں میں فراق کو سب سے زیادہ قربت میر صاحب سے حاصل ہے ۔

غزل کی ماہیت اور ہیئت کے بارے میں فراق نے کچھ ایسے نکات کی طرف اشارے کیے تھے جو تک بھگ چالیس برس کے بعد بھی (یہ مضمون ۱۹۵۸ ء میں لکھا گیا تھا) ہماری توجہ اور تجزیے کا تقاضا کرتے ہیں ۔ مثال کے طور پر فراق کا یہ کہنا کہ

۱ غزل انتہاؤں کا ایک سلسلہ ہے (A SERIES OF CLIMAXES)

۲ غزل کی ماہیت تہذیب و انسانیت کے مرکزی جمالیاتی و وجدانی تجربات کی اس ماہیت میں پوشیدہ ہے جہاں حسی ، اخلاقی اور یقینی حقائق کا ایک اتفاقِ عام میں یا آہنگ کے مرکز پر سنگم ہوتا ہے ۔

۳ غزل کہنے کے لیے بہت سچائی اور بہت معصوم طبیعت چاہیے ۔

۴ ہر کامیاب غزل تاریخ کا سلسلہ ہوتی ہے ۔

۵ کلیم الدین احمد نے غزل کو نیم وحشی صنفِ سخن بتایا تھا اور وحشت کی جبلتیں اگر یک لخت ترک کردی جائیں تو تہذیب اور فنونِ لطیفہ کی موت ہوجائے ۔ (یہاں فراق کا یہ قول بھی یاد آتا ہے کہ LITERATURE IS WITHOUT ILLITERACY) ۔

۶ غزل کے وہ اشعار جن میں غزل کی حقیقی روح کار فرما ہے ۔ ہمیں بتاتے ہیں کہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی بے نام واردات تہذیب کی اساس ہوتی ہیں ۔

۷ نظم میں ، خیال میں ، عمل میں ۔ بلند سے بلند اور مشکل سے مشکل فکر میں یا فلسفے میں وہ گہرائی نہیں ہوتی جو رچے ہوئے جذبات اور خاص کیفیات میں ہوتی ہے ۔

۸ غزل ایک بنیادی مذاقِ زندگی کی پیداوار ہے ۔

۹ غزل کے اشعار کا ایک مجموعی اثر ہم پر پڑتا ہے اور اس طرح ہمارے وجدان میں ایک داخلی نظام رونما ہوتا ہے ۔

۱۰ غزل کے اشعار میں ایک وجدانی ہم آہنگی ہوتی ہے ۔ ایک خاص وجدانی عمل ۔ عاشق اور معشوق کے تعلقات ، انسان سے انسان کے تعلقات ، انسان کے اپنے آپ سے تعلقات ، انسان کے زندگی سے رشتے ، کائنات سے ہم آہنگی اور پنہاں رشتے ، زندگی کے دکھ درد ، غم خوشی ، دنیا سے مانوسیت ، کائنات سے پیدا ہونے والے استعجاب ، مناظرِ فطرت کی علامتی اور اشاریاتی معنی خیزی ، زندگی کے وہ خواب اور وہ تصورات جن کے بغیر زندگی زندگی نہیں رہتی ، کائنات کا وہ حسن (FEELING) جس کے بغیر ہم اس آفاق کے حقیقی باشندے یا شہری بن ہی نہیں سکتے جس کے بغیر زندگی مہذب ہوکے بھی ویران رہتی ہے ۔ ہماری بکھری ہوئی شخصیتوں کو اندر سے سالم بنانے کے عمل ۔

ان تمام اقتباسات میں انسانیت کے تصور کو شاعری کی ایک بنیادی سچائی کے طور پر دیکھا گیا ہے ۔ فراق زندگی کے عام شعور اور شاعری کے شعور کو ایک دوسرے کے حوالے کے طور پر برتنا چاہتے ہیں ظاہر ہے کہ صنفِ غزل کی حد تک یہ رویہ فراق کے عہد میں بہت عام نہیں تھا اور فراق کی سی شدومد کے ساتھ ان کے کسی بھی ہم عصر نے اس سوال پر غور نہیں کیا تھا کہ ادب اور زندگی میں اوصاف اور محاسن کے اشتراک کی ایک صورت بھی تلاش کی جاسکتی ہے ۔ غزل کی ہیئت اور ماہیت کی بحث میں فراق بار بار زندگی کی حقیقتوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی جستجو بھی کرتے ہیں ۔ گویا کہ شاعری بھی زندگی ہی کی طرح ایک روحانی مہم کا درجہ رکھتی ہے ۔ ادب کا احترام فراق کے نزدیک زندگی کے احترام کی ہی ایک شکل تھا ۔ ناصر کاظمی نے میر پر اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ ہمیں از سرِ نو ایک ذہنی اور اخلاقی تصور ، زبان اور فلسفہ ، حیات کی ضرورت ہے اور گو کہ میر صاحب کے زمانے اور ہمارے زمانے میں بڑا بُعد ہے اور دنیا اتنی بدل چکی ہے کہ آج کے شاعر کے سامنے پہلے سے بھی کہیں وسیع منظرِ حیات کھل گیا ہے مگر واقعات کی مماثلت کی وجہ سے میر صاحب کا زمانہ ہمارے زمانے سے مل گیا ہے ۔ فراق کی حسیت جس ذہنی اور جذباتی ماحول میں مرتب ہوئی وہ آج کی دنیا کے ماحول سے مماثل نہ ہوتے ہوئے بھی ہمارا اپنا تجربہ اس لیے بن جاتا ہے کہ اس کی طرف فراق کا رویہ ان کے بعد کی نسل کے رویے سے مماثلت رکھتا ہے ۔ فراق کے رویے نے ان کی غزل کی سرزمین ، اس کی معرفت وہ کچھ نہیں رہنے دی جس کا تماشا ہم حسرت ، اصغر ، جگر ، فانی اور یگانہ کے یہاں دیکھتے ہیں ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ایک تو فراق کے یہاں

زبان کا شعور زندگی سے تعلق کے پس منظر میں ابھرتا ہے ۔ دوسرے یہ کہ فراق اپنی ہر بات اشاروں میں کہتے ہیں ۔ تفصیل سے بچتے ہیں اور خیالوں کو بھی اشخاص کی طرح جیتا جاگتا ، مجسم اور متحرک دیکھنے پر قادر ہیں ۔ ذہنی زندگی سے یہ انس ہمیں فراق کے عہد کے کسی دوسرے غزل گو کے یہاں نظر نہیں آتا ۔

اس سلسلے میں ایک اور حقیقت جس کا تجزیہ ضروری ہے ، یہ ہے کہ فراق کی حسیت کو تشکیل دینے میں ادب کی تین روایتوں کا عمل دخل تقریباً یکساں رہا ہے ۔ ایک تو ہند ایرانی روایت جس سے فراق کا تعارف فارسی غزل کے علاوہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اردو غزل گویوں کے واسطے سے ہوا ۔ یہ روایت فراق کی بصیرت کے سیاق میں ایک طرح کی تہذیبی یادداشت کا مرتبہ رکھتی تھی ۔ پھر مغربی ادبیات کی روایت تھی جس سے فراق نے براہِ راست استفادہ کیا تھا اور جس کا اثر فراق کی تنقید اور فراق کی شاعری دونوں پر دیکھا جاسکتا ہے ۔ البتہ اس سلسلے میں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ فراق صرف رومانی تنقید یا شعر کے صرف رومانی تصور سے مناسبت رکھتے تھے ۔ فراق کی شاعری اور تنقید کچھ بھی ثابت نہیں کرتی ، بس حواس کے کچھ راستے روشن کرتی ہے اور یہ راستے ہمیں صرف رومانی طرزِ احساس تک نہیں لے جاتے ۔ ان راستوں کی مدد سے ہم فکر کے ایک پورے نظام تک پہنچتے ہیں جو زندگی اور شاعری دونوں کا احاطہ کرتا ہے ۔ اس لیے عسکری نے یہ بات کہی تھی کہ فراق کی تنقید ادب کی تنقید ہے ۔ تنقید کی تنقید نہیں ہے اور یہ تنقید ہمارے لیے ادب کی روح کے ساتھ ساتھ اپنی شخصیت اور اپنی انسانیت کو سمجھنے کا وسیلہ بھی بن جاتی ہے ۔ فراق کی حسیت میں ایک نئی انسان دوستی اور روشن خیالی کے عناصر انھی واسطوں سے شامل ہوئے جن کا سرچشمہ مغربی لبرلزم کو قرار دیا جاسکتا ہے ۔ تیسری روایت جس نے فراق کی حسیت کا ایک واضح رخ متعین کرنے میں نمایاں حصہ لیا ، قدیم ہندستانی تصورات اور شعریات کی روایت ہے ۔ فراق صاحب انگلستان کے صنعتی انقلاب اور نئی ٹکنالوجی کے شیدائیوں میں تھے اور مشین کی دریافت کو تہذیب کی ترقی کا ناگزیر وسیلہ سمجھتے تھے ، اس حد تک کہ ماضی پرستی کے رویے کو انھوں نے اپنی نثر و نظم میں ایک مستقل موضوع کی حیثیت دی ہے اور اس پر سخت اعتراضات کیے ہیں ۔ مگر فراق نے بڑی جوش و خروش کے ساتھ اپنے مزاج اور بصیرت کی ارضی بنیادوں ، اس کے مکانی رابطوں ، اس کے دیسی پن کو محفوظ رکھنے پر بھی زور دیا ہے ۔ اس سلسلے میں یہ خیال کہ فراق کی شاعری میں مقامی رنگ صرف اُن کی دو تین نظموں (کارتکی پورنما ، دیوالی کے دیپ جلے ، ہنڈولہ ، جگنو) اور روپ کی رباعیوں تک محدود ہے ، درست نہیں ہے ۔ فراق نے غزل کے بہت سے شعروں میں ایک نئی زبان اور نیا محاورہ وضع کرنے کی کوشش بھی کی ہے ۔ بہاری ، تلسی داس ، سورداس ، کبیر داس کے لہجے اور طرزِ اظہار کے علاوہ فطرت اور کائنات کے مظاہر کی طرف قدیم سنسکرت شعرا کے رویے کی گونج بھی فراق کی غزلوں میں دیکھی جاسکتی ہے ۔ فراق صاحب کو جتنی دل چسپی تصورات سے اور اپنی ذہنی زندگی سے تھی اس سے کم دل چسپی انسانوں اور اشیا سے نہیں تھی ۔ موسموں ، منظروں ، موجودات کے بیان میں فراق کا انہماک فطرت سے ان کی مکمل ہم آہنگی کا پتہ دیتا ہے ۔ فطرت میں خود کو گم کردینا ان کے نزدیک ایک نئی اور وسیع تر انسانی سطح پر خود کو پالینے کے مترادف ہے ۔ یہ شاعری ایک واضح انسانی موقف کی شاعری ہے اور بہ قول نیاز ، فراق شعر نہیں کہتے ، زندگی اور محبت اور فطرت کے نکات پر تبصرہ کرتے ہیں ۔ چناں چہ فراق کی حسیت کو سمجھنے کے لیے صرف جمالیاتی قدروں کے اندر رہ کر ان کی قدر و قیمت کا حساب کرنا صحیح نہیں ہوا ۔ فراق کی حسیت نے اردو غزل کی روایت میں کئی ایسے عناصر کا اضافہ کیا ہے جو اپنے آپ کو ، اپنے زمانے کو اور اپنی دنیا کو پڑھنے اور پہچاننے میں ہماری مدد کرتے ہیں ۔

○●○

شمیم حنفی

○

لکڑہارے تمہارے کھیل اب اچھے نہیں لگتے
ہمیں تو یہ تماشے سب کے سب اچھے نہیں لگتے

اجالے میں ہمیں سورج بہت بے کار لگتا ہے
ستارے بھی سرِ دامانِ شب اچھے نہیں لگتے

تو یہ ہوتا ہے ہم گھر سے نکلنا چھوڑ دیتے ہیں
کبھی اپنی گلی کے لوگ جب اچھے نہیں لگتے

یہ کہہ دینا کہ ان سے کچھ گلہ شکوہ نہیں ہم کو
مگر کچھ لوگ یوں ہی بے سبب اچھے نہیں لگتے

نہ راس آئے گی جینے کی ادا شاید کبھی ہم کو
کبھی جینا، کبھی جینے کے ڈھب اچھے نہیں لگتے

○●○

شمیم حنفی

○

طلسم ہے کہ تماشا ہے کائنات اس کی
چراغِ درد سے روشن رہے گی رات اس کی

زمین ہو کہ زماں ، سب اسی کے مہرے ہیں
بچھی ہوئی ہے بہت دور تک بساط اس کی

ہمارے ساتھ بھی ہونے ہیں تجربے اس کے
ہمارے حال میں شامل ہے واردات اس کی

شکست و فتح کے قصے ہمیں پسند نہیں
یہ کیا کہ جیت ہماری ہے اور مات اس کی

اسے خموش بھی رہنا تھا ایک پل کے لیے
سمجھ سکا نہ کوئی انجمن میں بات اس کی

ادھر یہ نیند ادھر جاگتے ہوئے سپنے
عجیب سلسلہ ، خواب ہے۔حیات اس کی

○○○

○

جانے والوں کو بھلا کب تک پکارے جاؤ گے
اس طرح جیتے رہے صاحب ! تو مارے جاؤ گے

خواب جو پلکوں میں رکھے تھے خفا کیوں ہو گئے
دور جانا ہے مگر کس کے سہارے جاؤ گے

ڈوبتے سورج کا ہر منظر مری آنکھوں میں ہے
دیکھ لوگے جب بھی دریا کے کنارے جاؤ گے

چاند ، سورج ، موسم و منظر سبھی ٹھہرے ہوئے
تم گزرتے آئے ہو تم ہی گزارے جاؤ گے

مان لو سیڑھی شرارت میں کسی نے کھینچ لی
اتنی اونچائی سے پھر کیسے اتارے جاؤ گے

آج پھر سر پہ وہی ابر سیہ چھانے کو ہے
آج پھر اس کی طرف لے کر ستارے جاؤ گے

○○○

یوسف میخائلوچ ارانسکی
تلخیص و ترجمہ : اسامہ فاروقی

حصاری پریا کی لوک کہانیاں اور زبان (وسط ایشیا) ماسکو، ۱۹۷۰ء

حصاری پریا لوگوں کی زبان ، ہند آریائی زبانوں کے وسطی زمرے کی ایک بولی

(قسط : ۲)

گریرسن کی مجوزہ ہند آریائی زبانوں کی درجہ بندی کے مطابق زبانِ پریا کا شمار وسطی ہند آریائی زبانوں کے گروہ میں کرنا چاہیے ۔ متعدد ، مختلف سمتوں میں متقاطع متساوی لسانی خطوط زبانِ پریا کی برِ صغیر ہندستان کے وسطی اور شمال مغربی علاقوں کی مختلف بولیوں سے قربت کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔ اس کی مختلف صوتی ، نیز صرفی و نحوی خصوصیات کی ہندی کی بولیوں نیز پنجابی ، لہندا ، راجستھانی ، گجراتی اور دیگر قریبی ہم رشتہ زبانوں کی بعض مماثل خصوصیات سے قربت کے باوجود زبانِ پریا بہ حیثیتِ مجموعی ان میں سے کسی ایک سے بھی کلی توافق نہیں رکھتی ۔ اس بنیاد پر حصاری پریا کو ہند آریائی زبانوں کے وسطی گروہ کی ایک آزاد شکل قرار دیا جاسکتا ہے ، جس کی اپنی خصوصیات ہیں جو اسی مجموعی شکل میں دوسری ہند آریائی زبانوں میں نہیں پائی جاتیں ۔

صوتیات :

۱) ہندستانی (نیز پنجابی اور لہندا) ă (آ) کی بجائے پریا میں لازمی طور سے (ō) o استعمال ہوتا ہے اور یہ خصوصیت اس کو ہندستانی ، پنجابی ، لہندا سے دور لے جاتی اور اس کے برعکس راجستھانی ، گجراتی سندھی اور بسا اوقات نیپالی سے قریب لاتی ہے ۔ مثلاً پریا kuto (کتو) اور ہندی ، پنجابی ، لہندا kuttā (کتا) لیکن راجستھانی kutto (کتو) ، سندھی kuto (کتو) ، گجراتی kutro (کترو) پریا tago (تاگو) اور ہندستانی tāgā, dhāgā (تاگا ، دھاگا) پنجابی ، لہندا dhāgga (دھاگا) لیکن سندھی dhāgo گجراتی dhāgo, tāgdo نیپالی tāgā, dhāgo ۔ پریا loyo (لویو) ، ہندستانی ، پنجابی ، لہندا لوہا lohā ، لیکن راجستھانی Lōho (لوہو) ۔ اسی طرح مصادر ، پریا aṇō (آنو) ، ہندستانی ānā (آنا) ، پریا bandnṓ ، ہندستانی " باندھنا " (bā̃d(h)na) ، پنجابی bannhṇā ، پریا bečnṓ ہندستانی " بیچنا " (bečnā) ، پریا čarṇō ، ہندستانی " چھاننا " (chānnā) ، پنجابی chānnā وغیرہ ۔ استثنائی اشکال : پریا beṭā اور ہندستانی " بیٹا " (beṭā) ، پریار biṭiya اور ہندستانی " بٹیا " (bitiya) ۔

یہی قاعدہ تاجک سے مستعار لیے ہوئے الفاظ پر بھی منطبق ہوتا ہے ۔ تاجک آرہ ، پنجہ ، تختہ ، تیشہ ، زینہ (arra, panja, parda, taxta, teša, zina) کا تلفظ پریا زبان میں arro, panjo, pardo, taxto, tešo, zino ہوجاتا ہے ۔

۲) ہندستانی اور پنجابی ai (ǣe, ae) کی بجائے پریا میں e(e, i) استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً پریا beṭnṓ (بیٹھنو) بجائے ہندستانی (بیٹھنا) baiṭhnā پنجابی baiṭhnā ، پریا per (پیر) بجائے ہندستانی pair (پَیر) ۔ پریا peṇ (چھوٹی بہن) بجائے

ہندستانی bahin ، پنجابی bhaiṇ, paiṇ ، پریا فعل مسند رابط متکلم ، حاضر ، غائب ، واحد زمانہ ، حال و مستقبل (-e, -e) -i بجائے ہندستانی اور پنجابی haiṇ (ہے) ۔ اس کے برخلاف دیکھیے لہندا ؛ bèhaṇ بہ معنی بیٹھنا ، pēr, pêr, paiṛ بہ معنی پاؤں ، پیر ، ٹانگ ، bhên بہ معنی بہن ، hai, (h)ē فعل مسند رابط ، غائب ، واحد ۔

۳) ہندستانی اور پنجابی au (aò, औ) کی بجائے پریا میں o(u) استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً پریا kō̃ (kon) بجائے ہندستانی kauṇ ، پنجابی kauṇ ، پریا dur- بجائے ہندستانی dauṛnā (دوڑنا) ، پنجابی dauṛnā وغیرہ ۔ اس کے برخلاف لہندا kōn dòraṇ ۔

۴) ہندستانی ابتدائی مسموع ہاکاری بندشیے bh-, dh-, gh- (بھ ، دھ ، گھ) اور مسموع ہاکاری بند صفیریہ jh- (جھ) کی بجائے پریا میں غیر مسموع ، غیر ہاکاری بندشیے (p-, t-, ṭ-, k-) اور غیر مسموع غیر ہاکاری بند صفیریہ c (چ) مستعمل ہے ؛

الف) پریا p- (پ) بجائے ہندستانی ، راجستھانی گجراتی ، سندھی ، نیپالی bh- (بھ) ۔ مثلاً پریا paiṇ (بھائی ، چھوٹا بھائی) بجائے ہندستانی ، راجستھانی ، سندھی bhāī ، گجراتی ، نیپالی bhāi ، پریا pā(n)jo (بہ معنی بھانجہ) بجائے ہندستانی bhā̃jā (بھانجہ) ، سندھی bhaṇiju ، گجراتی bhānej ، نیپالی bhānij ، پریا مصدر puk- بجائے ہندستانی bhū̃knā (بھونکنا) ، پریا مصدر pun- بجائے ہندستانی bhūnnā (بھوننا) ، پریا puk (u) بجائے ہندستانی bhūkh (بھوکھ ، بھوک) پریا مصدر paj- بہ معنی ٹوٹنا ، بھوٹنا ، پھٹنا ، بجائے ہندستانی bhā̃jna ، پریا مصدر pag- بجائے ہندستانی (بھاگنا) ، پریا pij بہ معنی بھیگا ہوا ، نم ، بجائے ہندستانی bhija ۔

ب) پریا t- (ت) بجائے ہندستانی ، راجستھانی ، گجراتی ، سندھی ، نیپالی dh- (دھ) ، مثلاً پریا tup (ٹپ) بجائے ہندستانی ، گجراتی dhūp (دھوپ) ، سندھی dhupa ، گجراتی ، نیپالی dhup ، پریا tago (تاگو) بجائے ہندستانی dhāgā (دھاگا) ، سندھی ، نیپالی ، گجراتی dhāgo وغیرہ ۔ پریا tanyá (تنیا) بجائے ہندستانی dhaniya ، پریا مصدر tar- (تر-) بہ معنی رکھنا بجائے ہندستانی dharnā (دھرنا) ، پریا tī ("تی" بہ معنی بیٹی) لیکن ہندستانی ، راجستھانی ، گجراتی dhī (دھی) ، پریا مصدر te- (تے-) بجائے ہندستانی dhasnā (دھنسنا) ۔

پ) پریا k- (ک) بجائے ہندستانی ، راجستھانی ، گجراتی ، سندھی ، نیپالی gh- (گھ) ، مثلاً پریا kas بجائے ہندستانی ، گجراتی ghās ، نیپالی ghās, ghas (گھاس ، گھانس) ، پریا kar بجائے ہندستانی ، راجستھانی ، گجراتی ، نیپالی ghar (گھر) ، سندھی gharú ، پریا kor(r)o ، لیکن ہندستانی ، نیپالی ghorā (گھوڑا) ، راجستھانی ghōrō ، سندھی ghoro ، گجراتی ghoḍo ، پریا مصدر kal- (بہ معنی ڈالنا ، رکھنا ، کرنا) بجائے ہندستانی ghālna (گھالنا) ۔

ت) پریا č (چ) بجائے ہندستانی jh- (جھ) مثلاً čuṭ (چٹ) بجائے ہندستانی jhuṭh (جھوٹھ ، جھوٹ) ، نیپالی jhuṭ وغیرہ ، پریا čāṛú (چاڑو) بجائے ہندستانی jhāṛū (جھاڑو) ۔

پریا زبان کے لیے مخصوص ابتدائی مسموع ہاکاری مصمتوں کی غیر مسموعیت اور غیر ہائیت پنجابی میں بھی مشاہدے میں آتی ہے (دیکھیے پنجابی koṛā "کوڑا" بجائے "گھوڑا" pāī "پائی" بجائے "بھائی" paiṇ "پینڑ" بجائے "بہن" وغیرہ) اور یہ

پریا زبان کو پنجابی بولیوں سے ملانے والا ایک اہم متساوی لسانی خط ہے۔

۵) ہندستانی میں لفظ کے درمیان میں واقع مسموع باکاری بندشیوں -(d)dh ،(d)-dh- ، -bh- ، -gh- یعنی بھ، دھ، (ڈ) ڈھ، گھ) کی بجائے بالعموم پریا میں مسموع غیر باکاری مصمتے (-b- ، -d- ، -ḍ- ، -g-) یعنی (ب، د، ڈ، گ) استعمال ہوتے ہیں، مثلاً پریا (pâbi) ، pabi (پابی) بہ معنی بڑے بھائی کی بیوی بجائے ہندستانی bhābhi (بھابھی)، پریا abé (ابے) بجائے ہندستانی abhi (ابھی)، پریا gabā(n) (گابن) بجائے ہندستانی gābhin، gabhan (گابھن، گابھن) وغیرہ، پریا (indar) indar بجائے ہندستانی īdhan (ایندھن)، پریا مصدر tund- (ٹنڈ-) بجائے ہندستانی dhū̃ḍhna (ڈھونڈھنا)، پریا buḍo (بُڈو) بجائے ہندستانی buḍḍhā، پریا مصدر langnō (لنگنو) بجائے ہندستانی lā̃ghna ، lāghnā "لانگھنا")۔

تاہم بعض اوقات ہندستانی لفظ کے درمیان میں واقع مسموع باکاری بندشیے کی بجائے پریا میں غیر مسموع غیر باکاری مصمتہ استعمال ہوتا ہے مثلاً پریا k^h aki(kâki) (کھکی، ککی) بجائے ہندستانی، پنجابی، لہندا kanghi (کنگھی)، پریا مصدر سادہ (sat-) (، ست "، "سٹ") بجائے ہندستانی sādhna (" سادھنا " بہ معنی رکھنا کھڑا کرنا، پھینکنا وغیرہ)۔

۶) ہندستانی لفظ کے آخر میں استعمال ہونے والے غیر باکاری اور باکاری مسموع بندشیوں اور مسموع بند صفیریہ j (ج) کی بجائے پریا میں غیر باکاری مسموع بندشیے k ، t ، p (پ، ت، ک) اور غیر مسموع بند صفیریہ č (چ) استعمال ہوتا ہے، مثلاً پریا مصدر -čap بجائے ہندستانی مصدر -čab (چابنا) وغیرہ۔ پریا jip (جیپ) بجائے ہندستانی، پنجابی، گجراتی jibh (" جیبھ " بہ معنی زبان) وغیرہ، پریا dut بجائے ہندستانی، گجراتی dūdh (دودھ)، پریا ak(āk) (اَک) بجائے ہندستانی āg (آگ)، پنجابی agg (اگ) وغیرہ، پریا ac(ač) (اَچ) بجائے ہندستانی، گجراتی āj (آج)، لہندا، پنجابی ajj (اَج) وغیرہ، پریا pâwâō (" پوَج " بہ معنی چھوٹے بھائی کی بیوی) بجائے ہندستانی bhāwaj (بھاوَج) وغیرہ۔

۷) ہندستانی باکاری مصمتوں (غیر مسموع بندشیوں اور بند صفیریوں) کی بجائے پریا میں اکثر غیر باکاری مصمتے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً پریا کا pepuro (پیپرو) بجائے ہندستانی phephra (پھیپھڑا)، پریا puị (پُپی) بجائے ہندستانی، لہندا، پنجابی phupphī (پھپھی) وغیرہ۔ پریا paṭar (پٹر) بجائے ہندستانی pat(t)har (پتھر) phūphī، پریا cut (چُٹ) بجائے ہندستانی jhūṭh (" جھوٹھ " بہ معنی جھوٹ) پریا مصدر -bet بجائے ہندستانی baiṭhnā (بیٹھنا) پریا مصدر -uṭ (اُٹ) بجائے ہندستانی uṭhnā (اُٹھنا)، پریا unguṭi (اُنگوٹی) بجائے ہندستانی angūṭhi (انگوٹھی)، پریا muč (مُچ) بجائے ہندستانی mūćh (مُوچھ)، پریا مصدر -čan بجائے ہندستانی chānnā (چھاننا)، لہندا channa وغیرہ۔

بعض اوقات ہندستانی (č)ćh (چھ، چھ) کی بجائے پریا میں š (ش) استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً پریا kuš (کُش) بجائے ہندستانی kuch (کُچھ)، پریا gośa (گوشا) بجائے ہندستانی guččha (گُچھا)، پریا مصدر -pešan بجائے ہندستانی palchānna (پہچاننا)، پریا مصدر pišna (پشنا) بجائے ہندستانی pūchnā (پُوچھنا)۔

کبھی کبھی ایک ہی لفظ کے دو طرح کے تلفظ بھی مشاہدے میں آتے ہیں، مثلاً پریا مصدر -dek^h / dek- (دیکھ / دیک-) [ہندستانی dek^hna (دیکھنا)]، پریا mak^h i/maki (مکھی / مکی) [ہندستانی makhī (مکھی)]، پریا mi̇ṭ^ho / miṭo (میٹھو / میٹو) [ہندستانی miṭṭhā (میٹھا)]، پریا

maṭo/maṭʰo (ماٹو / ماٹھو) [ہندستانی māthā (ماتھا)] پریا čʰuri/čuri (چُھری / چُری) [ہندستانی čʰuri (چھری)] وغیرہ۔

۸) ہندستانی کے گونج دار ہاکاری ṛh (ڑھ) کی بجائے پریا میں بالعموم غیر ہاکاری ṛ (ڑ) استعمال ہوتا ہے، مثلاً پریا مصدر čaṛ- (چڑ) بجائے ہندستانی čaṛhna وغیرہ۔ پریا مصدر paṛ- (پڑ-) بجائے ہندستانی "پڑھنا"۔ یہاں یہ امر دل چسپی سے خالی نہیں کہ پنجابی میں بھی صورتِ حال یہی ہے۔

۹) ہندستانی میں لفظ کی ابتدا میں استعمال ہونے والے -b (ب) کی بجائے پریا میں v (و) استعمال ہو سکتا ہے۔ مثلاً پریا vâ(vā) بہ معنی "ہوا" بجائے ہندستانی bāv (باو) پریا (vačʰo) ، vač(č)o بہ معنی بچھڑا بجائے ہندستانی bačhā (بچھا)، پریا مصدر vaṛnó بہ معنی "داخل ہونا" بجائے ہندستانی baṛnā (بڑنا)، پریا viya (ویا) بجائے ہندستانی b(i)yāh (بیاہ)۔ پریا کی یہ خصوصیت اس کو پنجابی، لہندا، گجراتی اور سندھی سے قریب لاتی ہے۔ دیکھیے پنجابی، لہندا، گجراتی vā (وا)، سندھی vāu (واؤ) بہ معنی "ہوا"۔ پنجابی، لہندا vaččhā (وَچّھا)، سندھی vačha (واچھا) بہ معنی "بچھڑا"۔ پنجابی، لہندا viāh (ویاہ) سندھی vihãu (وِہاؤں)، گجراتی vivāh (وِواہ) بہ معنی "بیاہ"۔

۱۰) ہندستانی h (ہ) کی بجائے پریا میں اکثر صفر صوتیہ مشاہدے میں آتا ہے۔ ہندستانی -aha-، hā-، -āha-، -ahā-، -ahu-، -ahū کی شکل پریا میں علی الترتیب a-، -e-، -â- (ā)، -o-، -au̯ ہو سکتی ہے۔ مثلاً پریا مصدر as- (آس) بجائے ہندستانی hãsnā (ہنسنا)، پریا duper (ڈُپیر) بجائے ہندستانی do-pahar (دوپہر)، پریا bâr(bār) (بار) بجائے ہندستانی bāhar (باہر) پریا paṛ (پاڑ) بجائے ہندستانی pahāṛ، پریا bot (بوت) بجائے ہندستانی bahut (بہت)، پریا bau̯ (بَو) بجائے ہندستانی bahu وغیرہ۔ بین مصوتی h (ہ) کے غائب ہو جانے کا رجحان متعدد دوسری نئی ہند آریائی زبانوں اور بولیوں، مثلاً سترھویں صدی عیسوی کی دکھنی میں بھی مشاہدے میں آتا ہے۔

صرفی و نحوی ساخت

اسم ۱) ہندستانی میں جنس کی نشان دہی کرنے والے اسم کے آخری حروف -a (آ) (مذکر) اور -ī (ای) (مونث) کے تضاد کی بجائے پریا میں علی الترتیب -o(ō) اور -i کا تضاد استعمال ہوتا ہے۔ تاہم جنس کا قواعدی زمرہ پریا زبان میں بڑی حد تک مٹی ہوئی شکل میں مشاہدے میں آتا ہے۔ اسمائے ذات میں مندرجہ بالا آخری حروف زیادہ تر مذکر یا مونث جان داروں کے لیے استعمال میں آنے والے لفظیوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً kor(r)o ("کوڑو" "کوڑو" بہ معنی گھوڑا) مذکر اور kor(r)i ("کوڑی" "کوڑی" بہ معنی گھوڑی) مونث۔ kuṭo ("کُتو" بہ معنی کُتّا) مذکر اور kuti ("کُتی" بہ معنی کُتی) مونث۔ budo ("بُڈو" بہ معنی بوڑھا) مذکر اور budi ("بُڈی" بہ معنی بوڑھی) مونث۔ poto ("پوتو" بہ معنی پوتا) مذکر اور poti (پوتی) مونث۔ laṛo ("لاڑو" بہ معنی دولہا) مذکر اور lâṛi ("لاڑی" بہ معنی دلہن) مونث وغیرہ۔ پریا اسمائے ذات میں بھی آخری حروف -o اور -i جسامت کے تضاد کو ظاہر کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں (بالکل اسی طرح جیسے ہندستانی اور لہندا میں -a اور -i)۔ دیکھیے čamčo ("چمچو" بہ معنی چمچا) مذکر اور čamči ("چمچی") مونث۔ kaṭo ("کٹو" بہ معنی آب پاشی کی بڑی نہر) مذکر اور kaṭi ("کٹی" بہ معنی چھوٹی نہر) مونث۔ اسمائے صفت (بہ شمول ضمیری اسمائے صفت) میں بھی جب وہ بہ طور وصف استعمال ہو رہے ہوں، یہی تضاد مشاہدے میں آتا ہے۔ مثلاً kaṭo

kurro (" کالو کُرّو " بہ معنی کالا گھوڑا) مذکر اور kali kurri (" کالی کُرّی " بہ معنی کالی گھوڑی) مونث ۔ kalo-de (" کالودیو " بہ معنی کالا دیو) مذکر اور kali gā (" کالی گا " بہ معنی کالی گائے) مونث ۔ bago fil (" باگو فیل " بہ معنی سفید ہاتھی) مذکر اور bagi ruti (" باگی رُتی " بہ معنی سفید روٹی) مونث ۔ nuko jatak (" نکو جتک " بہ معنی چھوٹا بچہ) مذکر اور niki handi (" نِکی ہنڈی " بہ معنی دیگچہ یا چھوٹی ہانڈی) مونث ، niki ungli (" نِکی انگلی " بہ معنی چھوٹی انگلی) مونث ۔ susro-turo (" سُسرو تُرو " بہ معنی تیرا سسر) مذکر sasu-teri (" ساسو تیری " بہ معنی تیری ساس) مونث ۔ مُسند یا خبر کی حیثیت سے بھی اسمائے صفت بالعموم o ۔ پر ختم ہوتے ہیں (بلا لحاظ جنسِ مبتدا) دیکھیے tu nukoi (" تو نکوئی " بہ معنی تو چھوٹا ہے) اور ti mᵊro nukoi (" تی مرو نکوئی " بہ معنی میری بیٹی چھوٹی ہے) ۔ me borro čʰo (" مے بورو چھو " بہ معنی میں بڑا ہوں) اور yek-so borō cʰo (" یک سو بورو چھو " بہ معنی (بیٹیوں) میں سے ایک بڑی تھی) ۔ جنس کی نشان دہی کرنے والے لفظ کے اختتام کی اس ملاوٹ کا مشاہدہ ضمیری اسمائے صفت میں بھی کیا جاسکتا ہے ۔ دیکھیے ayi-muro اور ayi-mri (" ائی مُرو " اور " ائی مری " دونوں بہ معنی میری ماں) ، ti-mᵊro اور ti-mri (" تی مرو " اور " تی مری " دونوں بہ معنی میری بیٹی) یہ بے قاعدگی غالباً دونوں جنسوں کے لیے o ۔ (" او ") کے استعمال کے رجحان اور جنس کے قواعدی زمرے کے رفتہ رفتہ غائب ہوجانے کی ایک شہادت ہے ۔

۲) ā ۔ (آ) پر ختم ہونے والے ہندستانی اسما کے فاعلی اور غیر فاعلی حالتوں میں واحد کے لیے ē ۔ : ā ۔ (آ : اے اور جمع کے لیے مستعمل ō ۔ : ē ۔ (اے : اوں) تضادات کی بجائے پریا زبان میں واحد کے لیے o(-ō) (فاعلی حالت) اور e ۔ (غیر فاعلی حالت) کا تضاد استعمال ہوتا ہے اور جمع کے لیے e ۔ (فاعلی حالت) اور ū ۔ ، un ۔ کا تضاد ۔

دیکھیے واحد (فاعلی حالت) : dumbo pašm duvoi (" ڈمبو پشم دووئی " بہ معنی " بھیڑ / دنبہ پشم دیتا ہے ") kuto kale-pᵊra čaryo (" کُتو کلے پراچڑیو " بہ معنی کتا سر پر چڑھ گیا) ، mundo giyo (" منڈو گیو " بہ معنی لڑکا گیا) ۔ غیر فاعلی حالت : dumbe - ko segvo (" دمبے کو سِگو دو " بہ معنی بھیڑ / دمبے کا گوشت) kute -ko ʰcka - se bagáyō (کُتے کو بیکّے بگایو " بہ معنی " کُتے " کے آگے پھینکا ") bai - na is kōrre - ta bešatyo (" بے نا اس کوڑّے تا بیشتیو " بہ معنی " امیر نے اس گھوڑے کو بیچ دیا ") ۔ جمع (فاعلی حالت) : dumbe cay hoge (" ڈمبے چی ہوگے " بہ معنی " دُنبے موٹے (چاق) ہوگئے ") munde tireza - ta marin čʰe (منڈے تریزا تا مرین چھے " بہ معنی " لڑکے کھڑکیاں (شیشے) توڑ رہے ہیں ") guče puri buri lā čʰe (گُچے پُڑی بُڑیں چھے " بہ معنی " ازبک لوگ چٹائی بن رہے ہیں ") ۔ (غیر فاعلی حالت) dumbun - ta ham bakar čarova cʰe (" ڈمبن تا ہم بکر چروا چھے " بہ معنی " دُنبوں کو ہم اچھی طرح چراتے تھے ") pača kurun - ta dek(h)o (پچھا کرن تا دیکو / دیکھو " بہ معنی " بادشاہ نے گھوڑوں کو دیکھا ") kutūn - na dumbun - ta - rat-a raka cʰe (" کتون نا ڈمبن تا راتا رکا چھے " بہ معنی " کتے رات میں دنبوں کی رکھوالی کرتے تھے ") ۔

بھی ū(n) ۔ ، un ۔ جمع میں استعمال ہونے والے پریا زبان کے سبھی اسما کی غیر فاعلی اشکال کی ساق کو جوڑے جانے والے عمومی اختتام کے طور سے کام آتا ہے جبکہ عدد واحد میں ان کے آخر میں ā ۔ (آ) آتا ہو یا کوئی اور حرف ۔ مثلاً فاعلی اشکال عدد واحد (kor(r)o , bitya , dev , pai , me(h)mon , hamsoya , jatak) (کوڑو / کوڑو ، بیٹا

Beyun.

bityun ، devun ، دیو، بِٹی، بیھون / مہموناں بہ معنی گھوڑا، بیٹی، دیو، بھائی، مہمان کی عدد جمع میں غیر فاعلی اشکال (بِٹیُن، دیوُن، پائیُن، میھونن / مہمونن، ہمسوئیُن) hamsoyun payu(n) ، me(h)monun ہوتی ہیں۔ جنگلی

ذی روح اسماء کے ساتھ (بلحاظ اس امر کے کہ ان کی ساق کس حرف پر ختم ہوتی ہے) کبھی عدد جمع کا لاحقہ xel - " خیل " بہ معنی " لوگ ") بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً (" پائی مُر آیو " بہ معنی " میرا بھائی آیا " / " میرا چھوٹا بھائی آیا) pai - mur ayo اور (" پائی خیل میر آیے " بہ معنی " میرے بھائی لوگ آئے / میرے چھوٹے بھائی (لوگ) آئے ") paixel - mir aye اور (" تی مری آیو " بہ معنی " میری بیٹی آئی ") ti - mri ayo - bityaxel - mire aye اور " بِٹیا خیل مِرے آئے " بہ معنی " میری بیٹیاں آئیں ")۔

عدد واحد میں اگر کسی اسم کی فاعلی شکل ā - (آ) پر ختم ہوتی ہے تو اس کے واحد اور جمع کی فاعلی اشکال اور واحد کی غیر فاعلی شکل کی ساق میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ عدد جمع کی غیر فاعلی اشکال کی ساق کا اختتام un - / ũ - (-اون / -اُن) پر ہوتا ہے۔ مثلاً عدد واحد (فاعلی شکل): (بئے کے بیٹا پدوان تا مرائی) bai - ke - beta padwan - ta marai " بہ معنی امیر کے بیٹے نے گلہ بان کو مارا " یا (بٹیائی بہ معنی یہ بیٹا ہے، یہ لڑکی ہے) ya bitiyai - (غیر فاعلی شکل): (" اُسے کنجا بیٹا سے نا کیو ".... بہ معنی یہ اس کے چھوٹے بیٹے نے کہا...) use kenja beta - sa - na kiyo.

(" بڑو بیٹا سونا اُڈایو " بہ معنی اس کے بڑے بیٹے نے گولی چلائی، نشانہ مارا -) boro beta - so - na udayo

(" بلبلِ گویا نا بٹیا تا کیو.... " بہ معنی بلبل گویا نے بیٹا یعنی لڑکی سے کہا...) bulbul - i guya - na bitya ta kiyo... - عدد جمع (فاعلی شکل): (" اِس کو بیٹا سارے غایا ما راسکے " بہ معنی اس کے سب بیٹے شادی کی عمر کو پہنچ گئے) is-ko beta sare ɣaya-ma raske: bitya likir keta , bay-ma, kino - ma cali - (" بِٹیا لکر کیتا باغ ما کِنو ما چلی جووا چھے " بہ معنی بیٹیاں یعنی لڑکیاں نکل کر باغ کو، سینیما گھر کو چلی جا رہی تھیں -) jova cʰe - (غیر فاعلی شکل): (" تِن بیٹن ..... ") tin betun - ..... (" اِن بیٹن نا کیو " بہ معنی ان بیٹوں نے کہا) in betu(n) - na kiyo...:

(" تین بیٹن پرے تا پاشا نا بلایو " بہ معنی بادشاہ نے اپنے تین بیٹوں کو بلایا) pare - ta pāšā - na balayo - (" یا بِٹیا سارے تین بیسی بِٹن نالا چلے گی " بہ معنی یہ لڑکی ستر لڑکیوں کے ساتھ چلی گئی) ya bitya sare tinbisi bitun-nala čale gi - (" بِٹیُن پہ تا دینو " بہ معنی اپنی بیٹیوں کو بیاہ دیا) bityun - pa - ta dino - وغیرہ۔

بار بار فاعلی اور غیر فاعلی اشکال کی آمیزش اور بعد بعد مو خر سے قبل فاعلی اشکال کے استعمال کی مثالیں بھی مشاہدہ میں آتی ہیں۔

000

(سلسلہ ص: ۔۔ سے)

[illegible] میں جلدی سے بچوں کو [illegible] کی طرف بھاگی۔ [illegible]

[illegible] لمبے لمبے سانس لے رہی تھیں۔۔

[illegible] ۔۔۔ مجھے خیال ہی نہ رہا ۔۔ چلئے آپ کو [illegible] ۔۔۔ میں تو [illegible]

[illegible]

[illegible] ۔۔۔

[illegible] ۔۔۔ [illegible] ۔۔۔ [illegible]

[illegible]

گیان چند جین

مطالعہ

ایک زنجیری کا نغمہ

نغمہ ، زنجیر کے شاعر حضرت محمد عبدالرحمن صدیقی مظہر سے میری تین نسبتیں ہیں[۱]۔ سب سے پہلی اور سب سے اہم یہ کہ ان کی اصل حیدرآباد دکن سے ہے ۔ مجھ لامکانی کی یہ کیفیت ہے ؛

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

میں نے ملازمت کے سلسلے میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے ۔ ۱۱ سال حیدرآباد دکن میں رہا ہوں ۔ اس فرخندہ بنیاد شہر میں جو رہ آتا ہے ، اس کی نظر پر پھر کوئی دوسرا شہر نہیں چڑھتا ۔ صدیقی صاحب سے اس علاقائی رشتے کے بعد دوسری نسبت بھی دکن سے ماخوذ ہے ۔ میں ۱۹۶۹ ۔ میں حیدرآباد کی نئی مرکزی یونیورسٹی میں اردو کا پروفیسر ہوکر گیا ۔ لوگوں نے سوچا ؛

ع بعد مدت کے پھنسا ہے یہ پرانا چنڈول

مجھ سے دھڑا دھڑ کتابوں کی رونمائی کرانے لگے ۔ اس رسم میں قباحت یہ ہے کہ مقررین کو کتاب اور صاحبِ کتاب کو بانس پر چڑھانا ہوتا ہے۔ اس نثری کتاب خوانی سے زچ آکر میں نے ایک مضمون لکھا " میری تعریف کرو ، ایک مذموم مطالبہ " اس میں کتاب کا مقدمہ اور تبصرہ لکھنے نیز رسم اجرا میں مقالہ خوانی سے معذرت چاہی ۔ یہ مضمون قومی زبان کراچی ، سیاست حیدرآباد اور ہماری زبان دلی میں شائع ہوا ۔ اس کے بعد کسی کی مجال نہ ہوئی کہ مجھ سے کتاب کی رسم اجرا کے لیے کہتا ۔ حیدرآباد میں جو پابندی اپنے اوپر عائد کی تھی ، دور امریکہ میں آکر ایک حیدرآبادی ہی کی کتاب کے اجرا میں شرکت کر کے اسے چھوڑتا ہوں ۔

صدیقی صاحب سے آخری نسبت یہ ہے کہ امریکہ میں مستقل ورود کے بعد انھیں کے اردو اخبار کے طفیل میں یہاں کے اردو حلقوں سے روشناسس ہوا ۔ انھوں نے میرا ایک وسیع و بسیط انٹرویو چھاپ کر میری شہرت کا سامان کیا ؛

ع اے وقت تو خوش کہ وقتِ ماخوش کردی

میرا بھی یہ فرض بنتا ہے کہ

ع کیا خوب سودا نقد ہے ، اس ہاتھ دے ، اس ہاتھ لے

---

[۱] میرے بزرگ دوست حیدرآباد کے پروفیسر عبدالقادر سروری نہ معلوم کس شاعر کا مصرع پڑھا کرتے تھے
ع نسبتیں ہوگئیں مشخص تین ۔

کے مصداق میں ان کے مجموعے کی توصیف میں تنقید کے جملہ جوہر دکھاؤں لیکن میں سامعین اور قارئین سے بھی انصاف کرنا چاہوں گا اس لیے کاروانِ عشق و مستی کو زرا آہستہ لے چلوں گا اور توازن کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑوں گا ۔

اسی لیے سب سے پہلی بات میں یہ کہوں گا کہ صدیقی صاحب اردو کے بہت بڑے یا غیر معمولی شاعر نہیں ۔ ہاں امریکہ کے نقشے میں وہ ضرور قابلِ اعتنا اور قابلِ داد ہیں ۔ وہ شاعر ابنِ شاعر ہیں ۔ ان کے والدِ مغفور کا کھنکتا ہوا شعر ہے ؛

دوستو زندانِ غم بھی کیا نشاط انگیز ہے　　آہِ شیون ریز بھی ہے ۔ نغمہ ، زنجیر بھی

رحمٰن صاحب نے مصرعِ ثانی سے اپنے مجموعے کا نام اخذ کیا اور گرہ لگائی ؛

کون کہتا ہے کہ اب محفل میں دل لگتا نہیں　　آہِ شیون ریز بھی ہے ۔ نغمہ ، زنجیر بھی

وہ اول اول مظہر تخلص کرتے تھے ۔ نہ جانے کیوں اسے ترک کرکے متعدد غزلوں اور ایک آدھ قطعے میں اپنے عائلی نام صدیقی کو تخلص کے طور پر باندھنے لگے ۔ یہ اٹ پٹا سا لگتا ہے ۔ کوئی اگر جینجو ، لکڑوالا ، بوہیہ یا سری واستو وغیرہ کو مقطعوں میں چلانے لگے تو ایسا لگے گا جیسے کسی سرکاری دفتر کی کینٹن میں ایک دوست دوسرے دوست سے خطاب کر رہا ہے ۔ چکبست کے بعد عبدالرحمٰن صاحب دوسرے شخص ہیں جنھوں نے اپنی ذات کو تخلص کے طور پر استعمال کیا ۔ خوب ہو اگر وہ مظہر پر مراجعت کرلیں ۔

رسالہ آج کل دہلی کے مدیر محبوب الرحمٰن فاروقی نے ، مئی ۱۹۹۸ء کے شمارے میں اکادمیوں پر اداریہ لکھتے ہوئے شعری مجموعوں کی یوں خبر لی ۔

"آج صورتِ حال یہ ہے کہ ایک سال میں چھپنے والی کتابوں میں ۹۵ فی صد کتابیں زیادہ تر شعری مجموعوں کی ہوتی ہیں ۔ (اکادمیوں سے) امداد پانے والے ادیب یا شاعر بہ ذاتِ خود اپنی کتابوں کی نکاسی کے لیے (کیوں کہ ان کے پاس اسٹاک رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی) اپنے خرچ پر دوستوں یا اداروں کو بھیجتے ہیں ۔ ان اکادمیوں کی مالی امداد سے شائع ہونے والے زیادہ تر مجموعوں کا حشر یہ ہے کہ انھیں کوئی پڑھنا پسند نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی لینا اور رکھنا پسند کرتا ہے ۔ حد تو یہ ہے کہ ہمارے ادارے میں تبصروں کے لیے جو لوگ کتابیں لینے آتے ہیں ان کی فرمائش بھی یہ ہوتی ہے کہ شعری مجموعوں کے علاوہ کوئی دوسری کتاب ہو تو دیں اور میرے سامنے سوائے انکار کے کوئی اور راستہ بھی نہیں بچتا کیوں کہ ادب کے دوسرے اصناف یا علم کے دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں نہیں کے برابر شائع ہوتی ہیں ۔" (ص : ۲)

جون ۱۹۹۸ء کے اداریے میں پھر لکھتے ہیں ۔

"ان اکادمیوں اور دیگر اداروں میں مسودوں کی اشاعت کے لیے بڑے پیمانے پر بغیر جانچے پرکھے صرف تعلقات کی بنا پر احباب نوازی کے لیے اس قدر مالی امداد دی جاتی ہے کہ ہر شاعر اور ہر لکھنے والا صاحبِ کتاب بن بیٹھا ہے ۔ ان کے مجموعوں کو مفت پڑھنے والا تو ملتا نہیں ، انھیں خریدنے والا کون ملے گا ۔" (ص : ۲)

جب میرے پاس شعری مجموعے اور ان پر تبصرے لکھنے کی فرمائشوں کا تانتا بندھ گیا تو میں نے ہندستان اور پاکستان کے رسالوں میں ایک مضمون بھیجا تھا ۔ "مجھے شعری مجموعوں سے بچاؤ" ۔ اس کے بعد بھی شعرا حضرات نے مجھے نہیں بخشا ۔ اس کے بعد ایک اکادمی کی مالی امداد سے میں نے اپنا شعری مجموعہ چھپوایا ۔ تقریباً پوری لاگت دے کر محض پچاس کاپیاں لیں ۔ بعد میں تقسیم کار نے مجھے لکھا کہ اپنی کتابیں اٹھاؤ ۔ میں نے انھیں لینے سے معذرت کرلی ۔ عبدالرحمٰن صاحب کے لیے میری نیک خواہشات اور دعائیں ہیں ۔

مجھے شاعروں سے ہم دردی ہے ، ان پر رحم آتا ہے ۔ جب تک شعر میں کوئی غیر معمولی بات نہ ہو ، قاری و سامع اس پر سے گزر جاتا ہے لیکن شاعر کتنا خونِ جگر جلا کر ایک مصرع تر کی صورت دیکھتا ہے ۔ وہ شعر کے تمام متعلقات ، مالہ ، وما علیہ میں سے ایک شمہ ہی لفظوں میں پیش کر پاتا ہے ۔ شعر کے نگفتہ مرموزات کے پیشِ نظر اس کے لیے اس کا ہر شعر ایک جہانِ معنی رکھتا ہے ، اس کی جذباتی سوانح کا ایک حلقہ ، زنجیر ہوتا ہے ۔ یہی سبب ہے کہ ہر شاعر کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے دروں کے آئینہ خانے کو اپنے دیوان کے وسیلے سے سب کے سامنے درشادے اور سب اس کی قدردانی کے طور پر ایک کلمہ ، خیر کہہ دیں ۔ شاعر اپنی تعلّی کے لیے بدنام ہوتے ہیں لیکن عبدالرحمن صدیقی صاحب کا انکار توجہ طلب ہے :

جو دل پہ گزری ، کہا ، شعر ہو گیا شاید — نہ ہم نے آج تلک شاعری کا فن جانا
کیا کہتا ہے صدیقی ، کیوں سنتے ہو — اک بے کار مسافر کی کیوں سنتے ہو
کتنے شاعر آئے ، کہا گم نام ہوئے — ہم بھی کہہ لیتے ہیں کبھی ، کیوں سنتے ہو

شاعر کا یہ کہنا کہ مجھے کیوں سنتے ہو ، نرالی آواز اور انوکھی بات ہے ، ورنہ آج تک تو ہر شاعر اپنے ہر شعر پر خراجِ داد طلب کرتا ہے ۔ صدیقی صاحب کی بات ہی دوسری ہے :

شعر اچھا لگے تو داد بھی دے — ورنہ بے وجہ واہ واہ نہ کر

انھوں نے کہا تھا : ع جو دل پہ گزری ، کہا ، شعر ہو گیا شاید ان کی شاعری کا سب سے دل نواز خوش کن پہلو یہی ہے کہ ان کا کلام کہیں بھی روایتی اور تقلیدی نہیں ۔ سب کچھ ان کے محسوسات ، واردات ، تجربات اور مشاہدات ہیں ۔ ایسا حقیقت نگار خلوص کم شعرا کے یہاں ملے گا ۔ چند جستہ جستہ مثالیں :

یاد رہے کہ عبدالرحمن صاحب تین ملکوں کے شہری یا باشندے رہ چکے ہیں : ہندستان ، پاکستان اور امریکہ ، گویا کربِ ہجرت کا تلخیِ دوآتشہ چکھے ہوتے ہیں لکھتے ہیں :

کیا ترقی کی راہ دیکھی ہے — در بہ در ہو گئے بیچارے (کذا) لوگ
یہ کیسی ہجرتیں لکھی گئی ہیں — میں اب بے نام ہونا چاہتا ہوں
ہم ہیں غریبِ شہر کچھ ایسے کہ کچھ نہ پوچھ — تھے اجنبی وطن میں ، یاں زنداں ہے ہر طرف

یہ شعر غالباً امریکہ میں کہا گیا ہے ۔ اپنے وطن میں کوئی اجنبی نہیں ہوتا ۔ پاکستان کو وطن کہا گیا ہوگا لیکن وہ بھی دراصل ہجرتِ اول تھی ۔ امریکہ کو زنداں کہنا بھی عجیب ہے کہ یہ آزادی کا دیس ہے ۔ شاید زنداں اس لیے کہا ہو کہ میری طرح خود کہیں نہیں جاسکتے دوسروں کے محتاج ہیں ۔

انسان و کائنات کے بیچ ایک عجیب کشاکش کا رشتہ ہے آرام کسے کہتے ہیں ؟ سکون کے کیا معنی ہیں ؟ حرکت نہ کرنا ساکن رہنا ۔ دقت یہ ہے کہ کائنات ، ہمارا ماحول مسلسل حرکت میں ہے ، تغیر پذیر ہے اور تنِ انسانی ، تن آسانی چاہتا ہے اس لیے وہ اپنے حرکی ماحول سے خوش نہیں ۔ قدسی کا شعر ہے :

بہ قدرِ ہر سکوں راحت بود ، بنگر تفاوت را — دو بیدن ، رفتن آستادن ، نشستن ، خفتن و مُردن

کہنے میں آرام بڑی چیز ہے منہ ڈھانک کے سوئیے لیکن ترقی یافتہ صنعتی معاشرے میں یہی تو ممکن نہیں ۔ ایک دوا دوش ، بھاگ دوڑ کا عالم ہے ۔ اس عدم فرصتی میں امریکہ سب سے اوپر ہے ۔ صدیقی صاحب کہتے ہیں :

یہ ترقی ہے یا سزا کوئی صبح تا شام دوڑتے رہیے

اس سے چلتے چلتے سماجی مشاہدات پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں :

رہِ طلب کے مسافروں سے کوئی یہ کہہ دے خرد نے اکثر فریب کھائے ، خیال رکھنا

چل پڑے ہو اٹھائے منہ اپنا کوئی منزل بھی ہے مرے بھائی ؟

اسبابِ دولت کی فراہمی کے باوجود ذہنی انتشار کو دیکھ کر یہی حل ہے کہ خواہشات کو قطع کر کے پائے ہوس توڑ کر گوشہ نشین ہو جائیے ۔

بھول جاؤ گے واپسی کا سفر دشتِ خواہش میں دور جاؤ نہیں[1]

اس سے زیادہ حرص و ہوس ہے کٹیا ، کپڑا ، سبزی ، آٹا

کیوں صاحب اس میں کوکا کولا اور آئس کریم کا اضافہ کریں تو کیا رہے گا ۔ چلیے ہم ان کے بغیر بھی گزر بسر کریں گے ۔ مجھے یہ بنیا شاہی شعر اس لیے پسند ہے کہ میں سبزی خور ہوں ۔ انھوں نے دال آٹا کے بجائے سبزی آٹا کہا ہے ۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض کروں کہ شمالی ہند کے سبزی خوروں میں لفظ ترکاری معیوب سمجھا جاتا ہے ، وہ اسے سبزی ہی کہتے ہیں گو وہ سرخ یا زرد ہی کیوں نہ ہو ۔

قطعات سے قطعِ نظر انھوں نے غزلوں میں بھی متعدد سیاسی تبصرے کیے ہیں گو غزل کی رمزیہ لفظیات میں لپیٹ کر ۔ چند متفرق مثالیں :

اس کو کہتے ہیں گفتگو کا ہنر بات کہہ دی ، بیان خالی ہے

مدبر (ڈپلومیٹ) اس طرح گفتگو کرتے ہیں یا بیان دیتے ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوپاتا کہ انھوں نے کیا کہا ہے ، ان کا مافی الضمیر کیا ہے ۔ میں نے تو ایک مقرر ادیب کی ایسی شگفتہ تقریر سنی ہے جس سے سب مسحور ہوگئے لیکن جب یہ سوچا کہ انھوں نے کیا کہا ہے تو کچھ ہاتھ نہ آیا :

خود میرِ کارواں ہی ، یہاں رہزنوں کے ساتھ کس شان سے بِکے ہے سرِ عام ، دیکھنا

ظاہر ہے کہ روئے سخن پاکستان کے کسی قائد کی طرف ہے ، کس کی طرف ؟ مجھے معلوم نہیں ۔

ظلم کچھ یوں بھی ڈھایا جاتا ہے لشکرِ امن لایا جاتا ہے

اقوامِ متحدہ کے تحت کئی ممالک میں ایسے نام نہاد لشکرِ امن بھیجے گئے جن کا کام مقامی باشندوں سے نبرد آزمائی کرنا تھا ۔ میزبان باشندوں پر ظلم بھی ڈھاتے تھے ۔ ہندستان نے لنکا میں لشکرِ امن بھیجا تھا جو مسلسل شمال کے تاملوں سے لڑا کیا ، جس کی پاداش میں راجیو گاندھی کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا

بات کرتے ہیں ساری دنیا کی اور گھر میں بھی اختیار نہیں

گھر سے مراد اگر اپنا مسکن ہے تو یہ شعر سماجی ہے ۔ اگر یہ لفظ اپنے ملک کے لیے استعارہ ہے تو یہ شعر سیاسی ہے ۔ عندیہ کچھ بھی ہو یہ بہرحال ہے لطیف طنز ۔

کچھ سماجی اور نفسیاتی اشعار بھی ملاحظہ ہوں :

---

[1] اس شعر کی زمین مجھے میر اشک لکھنوی کی اسی زمین کی یاد دلاتی ہے جس پر ان کے کسی معاصر نے پیروڈی کی تھی ۔

دور سے کھینچے دکھاؤ نہیں رشک بیٹھا ہے ، بن جاؤ نہیں

واعظ یہاں میں قاردوں کے سوا کچھ بھی نہیں   دور ہی دور سے منظر کا نظارا (کذا) کرنا

کیا یہ تلقین ہے کہ مغرب میں آکر حسنِ نسوانی کے طلسم میں نہ پھنسنا ۔ ہاں دور کے جلوے میں کوئی قباحت نہیں ۔

صنفِ نازک کو دیکھ کر ہوں دنگ   اپنی فطرت سے کر رہی ہے جنگ

مجھے ان کے اس مشاہدے سے قطعاً اتفاق نہیں ۔ جدید عورت نے اپنا آزاد تشخص بنالیا ہے ۔ وہ ہر قسم کے دفتروں کو چلاتی ہے ٹرک اور ہوائی جہاز پر قادر ہے ، فائر بریگیڈ میں کام کرتی ہے ، فوج اور ایرفورس میں افسر ہے ، خلانورد ہے ۔ یہ قابلِ اعتراض ہے یا افغانستان کے طالبان کی طرح اسے چار دیواری میں مقید کردینا ، اسے تعلیم تک سے محروم کردینا ؟ اگر اس میں کسی جنسی بےراہ روی کی طرف اشارہ ہے تو ، میرے بھائی ! "تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی ۔۔ مرد بھی فطرتاً کچھ ، ہر دیگی ہونا چاہتا ہے لیکن اپنی فطرت سے جنگ کر کے پارسا رہتا ہے اور یہ قابلِ تحسین ہے ۔

مزید اشعار :

ہنس رہا ہے کہ ہنس رہے ہیں سب   روئے گا جب ، تو روئے گا تنہا ۔

خوب

ہر خوشی اک سراب ہے لیکن   آدمی شہرِ آرزو ہی رہا

بات سچے کی کہی ہے لیکن "شہرِ آرزو" کی ترکیب پر کچھ کہنا چاہتا ہوں ۔ ظاہراً یہ ترکیب غالب کے ذیل کے شعر سے ماخوذ ہے ۔

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہر آرزو   توڑا جو تونے آئینہ تمثال دار تھا

یہاں "شہر" پر اضافت کا زیر نہیں ۔ مقدار کی کثرت دکھانے کو غالب کا مخصوص انداز ہے ۔ یک شہر آرزو یعنی ایک شہر بھر آرزو ، ڈھیر سی آرزو ۔

رحمٰن صدیقی صاحب مفکر بھی ہیں ، فلسفہ ، حیات و ممات کے بارے میں غور کرتے ہیں ۔ عمر رسیدہ ہونے پر ہر شخص حیات کی ماہیت کے بارے میں سوچتا ہے ، ہمیشہ مذہب کی تاویلات سے مطمئن نہیں ہوتا ۔ رحمٰن صاحب کے اس نوع کے چند اشعار :

رات دن سوچتا ہوں میں اکثر   بے سبب ساری کائنات ہے کیا
منزل ہے ، نہ رستہ ہے ، نہ کچھ نام و نشاں ہے   میں سوچتا رہتا ہوں کہ جاتے ہیں کہاں لوگ
اک کلی پوچھتی تھی کل مجھ سے   موت کے بعد بھی حیات ہے کیا
زندگی بھی عجیب نقشہ ہے   خواب کو خواب میں کہے کوئی

یہ تو شنکر آچاریہ کا مایا کا فلسفہ ہوگیا کہ سب فریب ہے بہ قول غالب

ع   ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
ع   ہر چند کہیں کہ ہے ، نہیں ہے

دو سماجی نفسیاتی اشعار :

ہونٹوں پہ مسکراہٹیں ، چہروں پہ بانکپن   جھانکو اگر دلوں میں بیاباں ہے ہر طرف
نہ کوئی غم ہی سلامت نہ خوشی پائندہ   ایک دھوکا ہے فقط سود و زیاں اے لوگو !

حافظ کا فارسی شعر یاد آتا ہے ۔ خدا کرے پہلا مصرع صحیح یاد رہا ہو

به نوش باده که ایام غم نه خواهد ماند چناں نه ماند و چنیں نیز هم نه خواهد ماند

میں نے غزل کے دل پسند موضوع ، کاروبارِ دل کا ذکر نہیں کیا کیوں کہ اس میں صدیقی صاحب بھی سست رو ہیں ، میں بھی نیاز مند ہوں ۔ ان کے قطعات معاصر پاکستان کی سیاست اور سماج پر تبصرے ہیں ۔ یہ صحافیانہ انداز کی ہنگامی شاعری ہے اس لیے اس میں شعریت کی تلاش بےکار ہے ۔ اگر ہر قطعے کے ساتھ اس کی تاریخ تصنیف بھی لکھ دی جاتی تو کچھ اتا پتا چل جاتا کہ کس واقعے کی طرف اشارہ ہے ۔ ایک مثال :

یہی کوشش رہی حضرت کی ، کرسی پر ہی دم نکلے مگر جس طرح بزمِ انجم سے یہ نکلے ہیں ، کم نکلے
بہت نقصان پہنچا کر وطن کو قوم کو آخر بڑی مشکل سے صدرِ محترم کے پیچ و خم نکلے

میں کیا جانوں کہ یہ کن محترم کی تعریف ہے ۔ تاریخ درج ہوتی تو اندازہ ہوتا[1]

کہا جاتا ہے ع "عیبِ مے جملہ بہ گفتی ہنرش نیز بگو" میں نے ہنر ہی بیان کیے ہیں ، عیبِ مے بھی کہہ دوں ۔ رحمن صاحب کے قطعات میں کئی بار اور غزلوں میں بہت شاذ عروضی تسامحات در آجاتے ہیں ۔ یہ اس لیے اور بھی حیرت ناک ہے کہ انھوں نے بعض غزلیں اپنے مترنم قدم ، غیر معمولی اوزان میں سر کی ہیں جو عام طور سے دیکھنے میں نہیں آتے مثلاً :

قدم قدم اک سراب آئے ، خیال رکھنا کوئی مسافر بھٹک نہ جائے ، خیال رکھنا (ص ؛ ۳۹)
کیا کہتا ہے صدیقی کیوں سنتے ہو اک بےکار مسافر کی کیوں سنتے ہو (ص ؛ ۴۵)

پہلے شعر کا وزن ہے فعول فعلن فعول فعلن فعول فعلن

یعنی ہر مصرع میں ۶ ارکان اور شعر میں ۱۲ ارکان ہیں ۔ اردو میں مسدس ، مثمن اور شانزدہ رکنی اوزان تو ہوتے ہیں دو ازدہ رکنی دیکھنے میں نہیں آتے ۔ واضح ہو کہ ارکان کی تعداد دونوں مصرعوں کو ملاکر ظاہر کی جاتی ہے ۔ ان کا دوسرا شعر ہندی وزن میں ہے جس کا ہر مصرع ۲۲ ماترا یعنی ۱۱ سببِ خفیف کا ہوتا ہے ۔ دونوں تجربے خوش گوار ہیں ۔

میں نے نقد ، زنجیر کا ہر صفحہ ، ہر شعر بالاستیعاب پڑھا ہے ۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر اس کا ایک مختصر انتخاب کیا جائے جس میں اس کا عطر نچوڑ لیا جائے تو یہ انتخاب یقیناً قابلِ التفات اور قابلِ فخر ہوگا جسے ہند و پاک کے اعلیٰ اردو حلقوں کے سامنے بھی بے تامل گزارا جاسکتا ہے ۔

حرفِ آخر ۔ صدیقی صاحب کی شاعری سے قطعِ نظر وہ ایک شریف انسان ہیں جن سے مل کر مسرت ہوتی ہے ۔

ooo

---

[1] تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ غلام اسحٰق خاں کا ذکرِ خیر ہے ۔

ooo

علی ظہیر

ایک نظم جو کم زور دل قاریوں کے لیے نہیں ہے

جب وہ آیا
اور اس نے دستک دی
تو میں نے سمجھا کہ یہ وہ نہیں ہے
کیوں کہ وہ تو دستک نہیں دیتا
جب وہ مرے قریب پہنچا
تو میں گھبرایا
میرے ماتھے پر سرد پسینہ آنے لگا
کچھ لوگ میرے سرہانے تھے
کچھ پائنتی
کچھ آوازیں آرہی تھیں
جیسے مکھیاں بھنبھناتی ہیں
لیکن اب صرف وہی دکھائی دے رہا تھا
اس نے میرے پیروں کے دونوں انگوٹھوں پر ہاتھ رکھا
ایسے لگا جیسے کوئی مجھے خار دار جھاڑیوں پر گھسیٹ رہا ہے
میں نے آنکھیں چھت کی طرف کردیں
مجھے ایک جانی پہچانی صورت نظر آئی
بڑی نورانی بہت تسکین دینے والی
میں نے اسے سلام کیا (اس صورت کو)
اب میرے پیر بے حرکت ہوچکے تھے
پھر نیچے سے ہوتے ہوئے اوپر تک کا بھی معاملہ ختم ہوچکا تھا
صرف آنکھوں کی بات رہ گئی
ابھی یہ بات جاری ہے
اور اس کا عمل بھی

○●○

عطیہ ارسلان

تنہائی

کس طرح کم کروں اسے
کبھی بیٹھ جاتی ہوں ریفریجریٹر میں
جب وہ مجھ سے اکتا جاتا ہے
وہاں سے ویکیوم کلینر میں داخل ہوجاتی ہوں
اسے بھی ساتھ منظور نہیں
پھر ایرکنڈیشن سے دل بہلاتی ہوں
کچھ دیر وی ۔ آر ، ڈشس انٹینا میں دبک جاتی ہوں
چند لمحے مائیکرو ، ویو کے ساتھ رہتی ہوں ۔
موبائیل کو بھی استعمال کرتی ہوں ۔
پھر آخر میں
دیوار سے لپٹ کر
رونے لگتی ہوں ۔

○●○

دعا

ایک ننھا وجود
پل رہا ہے
میرے وجود میں
دنیا کی
فکروں سے آزاد
یا خدا تو
دنیا میں بھی
اسی طرح
بے فکر رکھ
جس طرح
اب ہے ۔

○●○

عطیہ ارسلان

(۱)

تم بھی وہی ہو
میں بھی وہی ہوں ،
چہرہ ، لب و گیسو بھی پرانے ہیں
لیکن ان میں ویرانیاں ہیں
کہاں گئے وہ دن ،؟
جب روز کا ملنا تھا
کلچر ، ادب ، سائنس فلسفہ پر
لمبی بحث ہوتی تھی
نہ اپنی خبر ، نہ دنیا کی خبر
اب کیوں جمود چھا گیا ہے
اور گفتگو کا رخ ،
صرف
" معاف کیجیے " اور " شکریہ " تک
محدود ہو گیا ہے ۔

○●○

(۲)

ساری ڈگریاں ،
تنہائی ، حسیت ،
جس پر کبھی
فخر و ناز تھا مجھے
ان چوبیس گھنٹوں میں
لگا مجھے
اس نے سارے غرور کو
کچل دیا
اپنے پیروں تلے ۔

○●○

(۳)

صبح جب
نیند سے بیدار ہو کر
کھڑکی کا پردہ کھینچ کر
باہر دیکھا تو
سورج . . . .
رات بھر اپنے بیڈروم میں
جلتے ہوئے دیے سے بھی
چھوٹا لگا ۔

○●○

(۴)

نظر آئیں چند خواتین
گوری چٹی خوب صورت ،
سونے میں پیلی ،
مجھ سے تعارف ہوا
میری سونی کلائیوں پر
سب کی نظریں تھیں اور
میرے خالی گلے پر
یہ کیوں اس طرح دیکھ رہی تھیں
اوہ
یہ بات ہے
فرداً فرداً
سوالات کی بوچھاڑ
کس مدرسے کی ہو
مدرسے کا نام بتاتی رہی
حیراں ہوتی رہی
پتہ چلا
ساری کی ساری صرف
مدرسے کی فارغ التحصیل ہے
ان کے درمیان
اپنے آپ کو
ریسرچ اسکالر بتاتے ہوئے
عجیب سا لگا
کیا یہ خواتین
جانتی ہوں گی مطلب
ریسرچ کا
جن کی دنیا صرف
زیورات اور
اپنے بیڈروم کی
خفیہ باتوں تک محدود ہو

○●○

رضی اختر شوق

○

تھا مری جست پہ دریا بڑی حیرانی میں
کیوں مرا عکس بہت دیر رہا پانی میں
شاید اس خاک سے خورشید کوئی اٹھے گا
سو میں رہتا ہوں عناصر کی نگہبانی میں
کون اک طائرِ بے حال کا نوحہ سنتا
شہر کا شہر تھا مصروف غزل خوانی میں
پاسِ آداب کہ یاں دیر نہیں لگتی ہے
میرِ زنداں کو بدلتے ہوئے زندانی میں
ان کی آواز کو خاطر میں نہ لانے والو
تم نے دریاؤں کو دیکھا نہیں طغیانی میں
وہ بھی تصویر سا آغازِ محبت میں رہا
میں بھی تھا آئینہ خانوں کی سی حیرانی میں
کوئی غم خوار نظر آئے تو ڈر جاتا ہوں
یہ بھی آسیب نہ ہوں قالبِ انسانی میں
میرے ہونٹوں ہی پہ اڑتی رہی آواز کی راکھ
کیسے لو دے یہ کسی خطۂ برفانی میں
تیری بستی کو خدا عشق سے آباد رکھے
جس نے آباد رکھا ہے مجھے ویرانی میں

○●○

○

میں دنیا اپنے اندر دیکھتا ہوں
یہیں سے سارا منظر دیکھتا ہوں

کبھی تصویر کر دیتا ہوں اس کو
کبھی تصویر بن کر دیکھتا ہوں

مرے چہرے سے نکلا ہے وہ چہرہ
کہ آئینہ مکرر دیکھتا ہوں

وہ لمحہ جو ابھی آیا نہیں ہے
ابھی سے اس کے تیور دیکھتا ہوں

مجھے اس جرم میں اندھا کیا ہے
کہ بینائی سے بڑھ کر دیکھتا ہوں

○●○

من موہن تلخ

○

ہر شکل رفتہ رفتہ انجان ہوگئی ہے
مشکل تھی جو بھی جس کی آسان ہوگئی ہے

کہنا نہ کچھ کسی سے ، چپ چپ سے تکتے رہنا
آخر یہی ہماری پہچان ہو گئی ہے

اک شخص بھولا بھالا بستی کی پوچھتا ہے
کیسے کہوں کہ بستی ویران ہوگئی ہے

جو تھا ، رہا نہ کچھ بھی ، جو ہے نہ جانے کیا ہے
سو اب یہاں سے رخصت آسان ہوگئی ہے

پہلے تھے ہم ہی حیراں ہم سا نہیں ہے کوئی
اور اب تو ساری دنیا حیران ہوگئی ہے

ایسی چہل پہل تھی مشکل سے لوٹتے تھے
یادوں کی وہ گلی اب سنسان ہوگئی ہے

اک تلخ کی روش تھی اب تک بغیر عنواں
اب اس روش کا دوری عنوان ہوگئی ہے

○●○

○

یہ اب انتہائے جنوں ہے یا کوئی اور سطحِ شعور ہے
کہ ہو چشم وا تو ہے تیرگی کروں آنکھ بند تو نور ہے
ابھی تک جو محوِ تلاش ہوں ، کوئی ہے کہیں سے جو دور ہے
مرے پاس ایک ہی عمر ہے یہی دل کو دھڑکا ضرور ہے
کہاں تک جواب کسے میں دوں ، یہی بات ہے تو یوں ہی سہی
ملے جو بھی اب تو یہ سوچ کر کہ مرا ہی سارا قصور ہے
یہ جو ذات ذات کا ہے سفر ، کہاں ختم ہو ، نہیں کچھ خبر
کوئی دوسرے سے پرے ہے تو ، کوئی اپنے آپ سے دور ہے
پڑا جس پہ وقت یہی لگا لیے بوجھ ازل کا ٹھہر گیا
کئی بار مجھ کو یہی لگا کہ تھکن سے وقت بھی چور ہے
دمِ فیصلہ یہ قبول ہے ہوئیں مجھ سے سینکڑوں لغزشیں
مگر اتنی بات نہ بھولیے مرا ایک نام شعور ہے
یہ مری کتابِ حیات جو ہوئی ہے جہاں میں ورق ورق
یہ لکھے ہوئے کا غضب نہیں ، یہ عتابِ بینِ سطور ہے
کبھی خود میں شیش محل سے تھے ، کبھی چکنا چور ہوتے ہیں یوں
جدھر آنکھ اٹھے تو یہی لگے یہ ہمارے سچ کا ظہور ہے
میں اکیلے پن کے سفر میں بھی جو رہا ہوں سب کی نگاہ میں
مجھے خود بھی تلخ گماں رہا ، مرے ساتھ کوئی ضرور ہے

○●○

اقبال متین

۱

جانے والے تو بھلا کس کے نگر جائے گا
وہ ترا دوست ہے ہنس ہنس کے مکر جائے گا

ہم کو روکے گی صبا باغ میں اس دن جس دم
قافلہ دشت کی راتوں کا ٹھہر جائے گا

بھیڑ سی تھی ترے کوچے میں مگر کیا معلوم
وہ جو اک شخص پڑا رہتا تھا مر جائے گا

وہ جو کہتا تھا تجھے اس کا بھی گھر ہے کوئی
اب وہی شخص کسی اور کے گھر جائے گا

میں اسی خوف سے چھپتا رہا سائے سے مرے
میرا سایہ بھی مجھے دیکھ کے ڈر جائے گا

مجھ کو الزام نہ دو میں بھی تو رویا ہوں بہت
مجھ کو کھودے گا زمانہ تو کدھر جائے گا

دار پر چڑھ کے نہ دیکھو کہ وہاں خون بھی ہے
خوں جو ہوگا تو بھلا کتنوں کے سر جائے گا

مجھ کو اقبال متین اس نے کہا تھا ہنس کر
ہاتھ اٹھیں بھی تو دعاؤں کا اثر جائے گا

○●○

۲

ذہن و دل بے سروساماں تھے جدھر سے گزرے
آگ ہی آگ تھی جب دیدہ ، تر سے گزرے

زندگی تجھ سے مگر بانٹ ہی لیتے غمِ جاں
تکنے ہاتھوں میں لیے برق و شرر سے گزرے

میں نے سب دے کے بھی کیا رکھ لیا اللہ جانے
میرے بچے مرا غم پوچھتے در سے گزرے

مجھ کو کچھ اور نہیں چاہیے مالک میرے
سائباں ایسا تو ہو ، دھوپ نہ سر سے گزرے

ہائے وہ شخص جو بیٹھا رہے دروازے پر
ہائے وہ شخص جو دن رات ادھر سے گزرے

ایسی کیا بات تھی ، خود کو بھی نہ پہچان سکے
اپنا گھر ڈھونڈتے ہم اپنے ہی گھر سے گزرے

کوئی آیا نہ گیا ، اٹھو بھی اقبال متین
کوئی سایہ تو کہیں راہ گزر سے گزرے

○●○

اسعد بدایونی

○

زمیں کے جسم پہ جید گھر اٹھاتے ہیں
شریف لوگ تو رنج سفر اٹھاتے ہیں

نہ دنیا دار ہیں پوری طرح نہ ہم بیزار
یہ بوجھ اٹھ نہیں سکتا مگر اٹھاتے ہیں

یہ سوچتے نہیں انجام اپنا کیا ہوگا
منافقوں میں کوئی بات اگر اٹھاتے ہیں

کسو کو خبر نہیں آج تختِ شاہی کی
قدم جو چوم رہے تھے وہ سر اٹھاتے ہیں

فساد و قتل و زنا سے بھرے ہیں سب اخبار
خبر نویس کہاں سے خبر اٹھاتے ہیں

○●○

○

سیاہ رات سے ہم روشنی بناتے ہیں
پرانی باتوں کو اکثر نئی بناتے ہیں

کل ایک بچے نے ہم سے کہا بناؤ گھر
سو ہم نے کہہ دیا ٹھہرو ابھی بناتے ہیں

ہم ایک اور ہی منظر کی تاک میں ہیں یہاں
یہ دھوپ چھاؤں کے نقشے سبھی بناتے ہیں

مصورانِ فنا اپنے کینوس پہ کبھی
نہ کوئی شہر نہ کوئی گلی بناتے ہیں

ہم اس دیار میں زندہ ہیں جس کے سارے لوگ
کبھی قتیلہ کبھی لیلیٰ بناتے ہیں

○●○

شکیل اعظمی

○

فلک پہ رہتا تھا لیکن زمیں پہ ملتا تھا
کبھی کبھار وہ ہم کو یہیں پہ ملتا تھا

محبتوں میں ہوس راہ پا گئی ، ورنہ
مکاں کا کرب بھی روئے مکیں پہ ملتا تھا

افق کا خون ، محبت کا قتل ہے جاناں !
کہ آسمان زمیں سے وہیں پہ ملتا تھا

تمہارے بعد سحر کی شبیہہ ایسی تھی
گمانِ تیرہ شبی بھی یقیں پہ ملتا تھا

کسی کے قتل کا الزام بن گیا اب کے
جو داغ پہلے پہل آستیں پہ ملتا تھا

غزل کے جتنے ہدف تھے وہ سب ہمارے تھے
جنوں کا سارا لبادہ ہمیں پہ ملتا تھا

شکیل گاؤں کو چھوڑے تو اک زمانہ ہوا
پہ یاد ہے کہ کوئی تھا ، کہیں پہ ملتا تھا

○●○

○

تمام عمر جنوں کا ہدف بنے ہم لوگ
نہ جانے کس کے لیے ٹوٹتے رہے ہم لوگ

ہوا نے ایسا بکھیرا ، کہ یہ بھی یاد نہیں
نہ جانے کون سے صحرا کی خاک تھے ہم لوگ

تمام رات کسی خواب کا گزر نہ ہوا
تمام رات مگر جاگتے رہے ، ہم لوگ

ہمارے ہاتھ سے پھر کوئی رسم ٹوٹی ہے
دبے ہیں پھر کسی دیوار کے تلے ہم لوگ

مقامِ جسم سے آگے بھی کوئی بستی ہے
یہ دیکھنے کے لیے روح تک گئے ہم لوگ

نہ کوئی نقشِ قدم ہے نہ کوئی پگڈنڈی
نہ جانے کون سے جنگل میں آ گئے ہم لوگ

ہوا نہ ختم ابھی تک عذابِ دربدری
غزل کے عشق میں رسوا بہت ہوئے ہم لوگ

○●○

مسعود صدیقی مسعود

○

کس کام کی نگاہ جو زخمی جگر نہیں
جنبش میں ہے نقاب تمھیں کچھ خبر نہیں

تو سر بسر جمال ہے ۔ تجھ پر ہے اب نگاہ
تو جلوہ گر نہیں تو کوئی جلوہ گر نہیں

مستی نہیں سرور نہیں کیفیت نہیں
کچھ بھی نہیں جو آپ بہ قیدِ نظر نہیں

میری نمود سے ہے جہاں میں ترا وجود
یعنی جہاں میں تو بھی نہیں میں اگر نہیں

آوارگی نصیب کو کیا قیدِ دشت و در
گل زار ہو کہ باغ کہاں میرا گھر نہیں

پردہ برائے نام ہے پردے میں دم کہاں
پردہ ہے اس لیے کہ کوئی پردہ در نہیں

تاریکیوں کو رات کی سمجھا ہے کوہِ غم
مسعود کیا یقین طلوعِ سحر نہیں

○●○

رئیس الدین رئیس

○

پہلے دل سے آنکھوں تک تھا منظر ریگستانی کیوں
اب آنکھیں کیوں دریا دریا میری طغیانی کیوں

کب گزری تھیں سبز ہوائیں میرے خال و خد چھوکر
جھانک رہی ہے آئینوں سے اس درجہ حیرانی کیوں

آخر کیا رشتہ ہے میرا ان خستہ محلوں سے اب
بچپن سے سنتا آیا ہوں اک قصۂ سلطانی کیوں

اجلا اجلا شہر تمھارا بارونق بازار مگر
چہرہ چہرہ ۔ چیخ رہی ہے اس درجہ ویرانی کیوں

گھر کے بام و در کو چھوڑو سارا شہر سجا ڈالا
کر بیٹھے تیرے وعدے پر ہم ایسی نادانی کیوں

ساری بستی پر پہرہ ہے جاڑوں کے سورج کا رئیس
میرے چھت آنگن پر لیکن بارش ہے طوفانی کیوں

○●○

غلام جیلانی

فریب زار

(قسط : چوتھی)

(۱۴)

منوج کی سو سائٹی آف آرٹ اینڈ کلچر نے جس سیمینار کا انتظام کیا تھا، اس کی تاریخ بالکل قریب آگئی تھی۔ الہ آباد سے ڈاکٹر سوبراں کے علاوہ کلکتے سے پروفیسر مترا بھی آرہے تھے۔ منوج کی وجہ سے ہی وہ سیمینار میں شریک ہو رہے تھے۔ اپنے آفس کے کاموں کو پس پشت ڈال کر منوج سیمینار کے انتظامات کی نگرانی میں لگا ہوا تھا۔ اس کی سکریٹری لی نا بھی برابر کا ہاتھ بٹا رہی تھی حالاں کہ ایسا کرنے کے لیے منوج نے اس سے ایک بار بھی کہا نہیں تھا مگر وہ خود ہی پہل کر کے ہر جگہ اس کے ساتھ ساتھ پھر رہی تھی۔ وہ منوج کے مزاج سے، اس کے سوچنے اور کام کرنے کے ڈھنگ سے اور اس کی پسند ناپسند سے اچھی طرح واقف تھی۔

سیمینار کا پروگرام اور مختصر سا رائٹ اپ اخبار کے دفتر میں دے کر نکلے تو لنچ کا وقت ہوچکا تھا۔ لی نا بولی "سر، ہوٹل بلوگیون چلیے۔۔۔ پاس ہی ہے۔ آج کا لنچ میری طرف سے ہوگا۔"

منوج کار اسٹارٹ کرنے لگا تھا۔ رک کر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا تو اس نے کہا۔۔۔ "کچھ مت کہیے سر، یہ میری خوشی ہے۔"

"نہیں۔ یہ فرض بڑوں کا ہوتا ہے۔" منوج بولا "جانتی ہو تم کتنی چھوٹی ہو مجھ سے؟"

"آپ کیا سمجھتے ہیں؟ کتنی چھوٹی ہوں؟" اک دم پلٹ کر لی نا نے منوج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔۔۔ اور پھر رک کر کہنے لگی۔۔۔ "کیا یہ حق ایک دفعہ بھی نہیں دیں گے مجھے؟"

منوج کو لگا برفیلی ہوا کا ایک جھونکا اس کے دل و دماغ کو چھوتا ہوا گزر گیا۔۔۔ عجیب عجیب خیالات نے اس کے ذہن میں ہل چل سی مچادی۔ دفعتاً انھیں جھٹک کر اس نے موٹر اسٹارٹ کردی۔۔۔ "ٹھیک ہے۔ جیسی تمھاری مرضی۔"

کار میں چلتے ہوئے منوج نے پوچھا۔۔۔ "لی نا کئی دن سے تم نے اپنے لڑکی کی کوئی بات نہیں سنائی۔۔۔ کیا اب بھی پونا سے بھاگ بھاگ کر وہ تم سے ملنے آتا رہتا ہے؟"

"جی ہاں، سر۔" لی نا کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تم بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتی ہوگی؟"

"جی ہاں۔۔۔ سر۔"

"اس کی ٹریننگ کب ختم ہوگی؟"

"شاید تین مہینے اور ہیں۔۔۔" لی نا منوج کی طرف الجھی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو، آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟

ہلکی سی مسکراہٹ میں منوج نے خود ہی جواب دیا۔۔۔ "اس کے بعد تمھاری شادی ہوجائے گی۔۔۔ اور لڑکی کی پوسٹنگ نہ معلوم کون سے ملٹری سنٹر پر ہوجائے۔۔۔!"

" نہیں سر ۔ ۔ ۔ اس کی پوسٹنگ اسی شہر میں ہوگی ۔" لی نا نے بڑے بااعتماد لہجے میں کہا ۔ ۔ ۔ " اور اگر نہ بھی ہو ، تو میں کہیں نہیں جاؤں گی ۔ ۔ ۔ ممی کو چھوڑ کر ۔" دفعتاً اس کے لہجے میں سنجیدگی آگئی تھی ۔ ۔ ۔ دونوں چپ ہوگئے ۔ اسی خاموشی میں کار ہوٹل کے گیٹ میں داخل ہوگئی ۔

کھانے کے بعد لی نا نے آئس کریم کا آرڈر دے دیا ۔ منوج کی نظریں بار بار پاس بیٹھی ہوئی ایک جاذبِ نظر خاتون کی طرف اٹھ رہی تھیں ۔ اس کے ساتھ دو بچے تھے ۔ اور اب وہ لوگ اٹھ کر جارہے تھے ۔ منوج کی نظروں نے دور تک ان کا تعاقب کیا ۔ اور تب اسے محسوس ہوا کہ لی نا دیر سے اسے دیکھے جارہی ہی ۔ منوج مسکرانے لگا ۔ وہ جانتا تھا لی نا کے تجسس کو دور کیے بغیر وہ نہیں رہ سکے گا ۔ رکتے رکتے کہنے لگا ۔ ۔ ۔

" اس خاتون کو دیکھ کر مجھے اپنی بیوی یاد آگئی ۔ ۔ ۔ بڑی مشابہت تھی ۔"

۔ ۔ ۔ لی نا نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ ۔ ۔ اسے چپ دیکھ کر منوج خود ہی بولا " تمھیں معلوم تھا ، میری بیوی بھی تھی ؟ "

لی نا اب بھی کچھ نہیں بولی ۔ ۔ ۔ صرف گردن ہلاکر ہاں کردی ۔

" تو پھر کبھی پوچھا کیوں نہیں ، کیا ہوا تھا ؟ ۔ ۔ ۔ کیوں چلی گئی تھی وہ میرے دوست کے ساتھ ؟ "

لی نا حیران نگاہوں سے منوج کو دیکھنے لگی ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے ۔ ۔ ۔ منوج پھر کہنے لگا ۔

" تم میرے ساتھ اتنے دن سے کام کر رہی ہو ۔ تمھیں میری ہر بات کی خبر ہونی چاہیے ۔ ۔ ۔ ہے نا ؟ " چند لمحوں کے لیے وہ رک گیا ۔ پھر جیسے کسی اندرونی کشمکش کو ختم کرتے ہوئے وہ کہتا چلا گیا ۔ ۔ ۔ " میں اور وہ کالج میں ساتھ پڑھتے تھے ۔ مگر ہماری شادی ایک غلطی ثابت ہوئی ۔ اس کے ایم بیشس نیچر کا مجھے اندازہ نہیں ہوا تھا ۔ ۔ ۔ مارننگ پوسٹ کلکتے کا بہت بڑا اخبار تھا اور اس کا مالک ایک بہت دولت مند آدمی تھا ۔ میں وہاں ایڈیٹر تھا ۔ خاصی بڑی تنخواہ تھی ۔ وہاں رہتا تو ٹاپ تک جاسکتا تھا ۔ ۔ ۔ مگر اخبار کی پالیسی کی بنیادوں پر میرا وہاں نباہ نہیں ہوسکا ۔ ۔ ۔ خلیج بڑھتی گئی ۔ ۔ ۔ مونیکا اور میرے درمیان بھی ۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں ریزائن کردوں ۔ ۔ ۔ وہ دولت کی ریل پیل میں جینا چاہتی تھی اور میں نے جینے کے لیے درکار روپیوں سے زیادہ کی کبھی خواہش نہیں کی ۔ میں نے استعفیٰ دے دیا ۔ اور وہ میرے دوست کے ساتھ چلی گئی ، جو دو دو کارخانوں کا مالک تھا ۔ ۔ ۔ اب وہ کہاں ہے ، مجھے نہیں معلوم ۔ شاید امریکہ یا انگلینڈ میں ہے ۔ ۔ ۔"

منوج چپ ہوگیا ۔ لی نا بھی چپ تھی ۔ میز پر آئس کریم پگھلنے لگی تھی ۔ منوج چونک کر بولا ۔ ۔ ۔ " لی نا تم کیا سوچنے لگیں ! ۔ ۔ ۔ آئس کریم کھاؤ " ۔ ۔ ۔ اور وہ خود بھی کھانے میں مشغول ہوگیا ۔

" آپ ان سے پیار کرتے تھے ؟ " ۔ ۔ ۔ آئس کریم کھاتے کھاتے لی نا نے اچانک پوچھا ۔ منوج رک کر کپ میں پگھلتی ہوئی آئس کریم کو دیکھنے لگا ۔ ۔ ۔ " ہاں ۔ ۔ ۔ وہ بڑی جذباتی تھی بچوں کی طرح اضطراری ہوجاتی تھی ۔ ۔ ۔ اور کتنی عجیب بات ہے ، مجھے اس کی یہی چیز اچھی لگتی تھی ۔ ۔ ۔ انسانی فطرت میں کتنے راز تہہ خانوں میں چھپے ہوتے ہیں ، جن سے کوئی واقف نہیں ہوتا ۔ ۔ ۔ ۔ خود وہ بھی نہیں ہوتا ! ۔ ۔ ۔"

سیمینار میں رما کا پیپر بہت پسند کیا گیا ۔ ڈاکٹر سوبران نے اپنی صدارتی تقریر میں اس کا بہ طور خاص ذکر کیا ۔ رما کے مالک

پر آنے سے پہلے جب منوج اس کا تعارف کراتے ہوئے اس کی صلاحیتوں کی تعریف کر رہا تھا ، تو پہلی صف میں بیٹھی ہوئی آرتی بار بار اندرانی گھوش کو کہنی سے ٹھوکے دے رہی تھی ۔ اسے یہ بھی پرواہ نہیں رہی کہ پیچھے ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ اسے دیکھ رہے ہیں ۔

پے پر کے ختم پر جب بحث کی باری آئی ، تب بھی رما ہر سوال کا سنجیدہ اور مدلل انداز میں جواب دیتی گئی ۔ آرتی سوچ کر آئی تھی کہ کوئی ایسا اعتراض اٹھائے گی جس کا رما سے جواب بن نہ پڑے اور اس کی ہنسی اڑ جائے ۔ چناں چہ اپنی دانست میں ، سب کے آخر میں ، اس نے ایسا ہی ایک تیر چھوڑا ۔ ۔ ۔ " اگر آپ سے یہ پوچھا جائے کہ آج کے سماجی ، سیاسی اور معاشی ماحول میں ایک سچے ادیب کا کیا فرض ہونا چاہیے ، تو اس کا کیا جواب ہوگا ؟ آپ کے پورے پے پر میں اس کا ذکر نہیں ہے ۔ ۔ ۔"

رما کے چہرے پر مسکراہٹ کی ایک مہین سی جھلک آ گئی ۔ ۔ ۔ " میرا پے پر ادب کے ٹرینڈز پر تھا ، ادیبوں کے فرائض پر نہیں ۔ ویسے آپ کے سوال کا جواب تو وہی ہے جو کنفیوشس نے کہا تھا ۔ ۔ کہ اگر تمام انسانی فرائض کو ایک لفظ میں سمو دیا جائے تو وہ لفظ ہوگا " ہم دردی " ۔ ۔ ۔ میرا بھی یہی خیال ہے ۔ سچے ادیب کا دل ہم دردی اور خلوص کا ٹھکانا ہوتا ہے ، نفرت یا حسد کا نہیں ! ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہی انسانی ہم دردی وہ نیوکلس ہے جس کے گرد ادب کے سارے ٹرینڈز مختلف ناموں کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں ۔"

رما مڑ کر اپنی کرسی کی طرف جانے لگی تو سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا ۔ آرتی کے عین پیچھے بیٹھا ہوا پروفیسر راجن کھڑا ہوکر تالیاں بجا رہا تھا ۔ پھر جھک کر آرتی کے برابر بیٹھے ہوئے دھیرج گھوش اور اندرانی کو پُر جوش انداز میں سناتے ہوئے بولا ۔ ۔ ۔ بری لی اینٹ ! ۔ ۔ ۔ از اینٹ شی ؟

آرتی کا وار خالی نہیں بلکہ الٹا پڑا ۔ رما کے جواب میں چھپے ہوئے نشتر نے اسے اور بھی تڑپا دیا ۔ ہال میں بیٹھے رہنا دوبھر ہوگیا ۔ لنچ بریک بھی قریب آگیا تھا اٹھ کر انٹرنس کے دالان میں چلی گئی ۔ ۔ ۔ اور ایک سگریٹ سلگا کر ٹہلنے لگی ۔ ۔ ۔ سوچنے لگی کہ گھر چلی جائے ۔ ۔ ۔ اسے روپیش پر بھی غصہ آرہا تھا جو سیمینار میں نہیں آیا ۔ ورنہ جانے کے لیے اسے گھوش اور اندرانی کا انتظار کرنا نہیں پڑتا ، جن کے ساتھ آئی تھی ۔

اسی دوران ایک ٹیکسی کار آکر رکی اور اس میں سے ایک عورت اتر کر انٹرنس کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی ۔ اس کے قدم سیدھے نہیں پڑ رہے تھے ۔ اس نے فراک پہن رکھا تھا ، اور ترشے ہوئے بال بے ترتیبی سے ہوا میں اڑ رہے تھے ۔ قریب آئی تو اس کی آنکھوں سے دیوانگی کی وحشت جھانک رہی تھی ، اور ناک کے نتھنے مرتعش ہو رہے تھے ۔ ۔ ۔ اور پھر یکبارگی آرتی اسے پہچان گئی ۔ ۔ ۔ انیتا ! پروفیسر راجن کی بیوی ۔ اس دن آرٹ گیلری میں پروفیسر کے ساتھ آئی تھی ۔ ۔ ۔ شراب کی تیز بو کا بھپکا اس وقت بھی اس کے آگے آگے چل رہا تھا ۔ آرتی کو گھورنے لگی ۔ ۔ ۔ " نہیں ۔ تو کوئی اور ہے ! ۔ ۔ ۔ وہ بڈھا کہاں ہے ؟ ۔ ۔ ۔ وہ سن آف دی بچ ؟ ۔ جا کر کہہ دے میں اسے شوٹ کردوں گی ۔ موقع ملا تو دونوں کو ۔ ۔ ۔"

اس کی خوف ناک آواز یوں لگ رہی تھی جیسے مرصے سے خالی پڑی ہوئی کسی حویلی کے ویران در و دیوار سے گونج کر آرہی ہو ۔ ایک لمحے کے لیے آرتی کے دل میں خیال آیا کہ انیتا سے کہے کہ دونوں کو شوٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ اس کے بےوقوف پروفیسر کو خبر نہیں کہ رما کا افیر منوج سے چل رہا ہے ۔ مگر دوسرے ہی لمحے ایک دوسرے خیال نے اسے چونکا دیا ۔ موقع سے فائدہ کیوں نہ اٹھائے ! اس کو اطلاع مل چکی تھی کہ پروفیسر رما سے ملنے اس کے گھر گیا تھا ۔ ۔ ۔ " آپ کو پتہ ہے رما سے پروفیسر کی ملاقاتیں اس کے گھر پر ہوتی ہیں ؟ "

انیتا جاتے جاتے بل کھا کر رک گئی ۔ ۔ ۔ " تمھیں کیسے پتہ ؟ "

"مجھے سب پتہ ہے ۔"

"کس کے بارے میں ؟"

"رما کے بارے میں ۔" آرتی کے لہجے میں چھپتے ہوئے طنز نے انیتا کے دل میں رما کے خلاف بھری ہوئی نفرت کے لیے مہمیز کا کام کیا ۔ ۔ ۔ "بڑی بگلا بھگت بنی پھرتی ہے ۔"

انیتا بگلا بھگت کی باتیں سننے کو بے چین ہوگئی ۔ مگر اسی وقت لوگ سیمینار ہال سے باہر آنے لگے تھے ۔ لنچ کا وقفہ ہوچکا تھا ۔ پروفیسر انیتا کو دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف آیا ۔ ۔ ۔ "او گاڈ ! ۔ ۔ ۔ انیتا تم یہاں کیوں چلی آئیں ؟ یو فول ۔ ۔ ۔ چلو میرے ساتھ ۔"

اور پروفیسر اسے تقریباً دھکیلتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے لے جانے لگا ۔ الکوہلک انیتا کے اعضا غصے میں اور بھی زیادہ مرتعش ہونے لگے ۔ آرتی کے زہر بھرے تیر نے دماغ کو بھی مفلوج کردیا تھا ۔ کسی بھی قسم کی مزاحمت اس کے بس میں نہ تھی ۔

(۱۶)

دوسرے دن سویرے ہی رما دلی کے لیے روانہ ہوگئی ۔ آنند کے حادثے کے بعد اس نے ہوائی جہاز سے سفر چھوڑ دیا تھا ۔ اسٹیشن پر اسے چھوڑنے صرف اسوانی آیا تھا ۔ منوج جانتا تھا کہ رما کب اور کہاں جارہی ہے مگر وہ اسٹیشن نہیں گیا ۔ اسے احساس تھا کہ چھتری والی کوٹھی کے در و دیوار میں برسوں سے مقید ان یادوں کے دروازے کھولتے وقت رما کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی ۔ ان لمحوں سے گزرنے کے لیے اس نے اپنے آپ کو تیار کیا تھا ۔ منوج چاہتا تھا کہ وہ اس تجربے سے تنہا گزرے ۔ جو نشتر بھی ہے اور مرہم بھی ۔ ٹیس بھی ہے اور نجات بھی ۔

رات ہی کو فون پر سیمینار میں اس کے پیپر کی مبارک باد دیتے وقت منوج نے رما سے کہہ دیا تھا وہ اسٹیشن نہیں آ سکے گا ۔ کیوں کہ سیمینار کا دوسرا اور آخری دن ابھی باقی تھا اور فون رکھتے ہوئے ایک لمحے کے لیے رما دھیرے سے مسکرانے لگی تھی ۔ وہ جانتی تھی ۔ سیمینار کا بہانہ نہ بھی ہوتا تو منوج اس کی تنہائی میں مخل نہ ہوتا ۔

اسٹیشن پر رما نے دو تین اخبار خرید لیے تھے ۔ سیمینار کی رپورٹنگ کرتے ہوئے ہر اخبار نے اس کے مضمون کی تعریف لکھی تھی ۔ ٹرین روانہ ہوئی تو ہر ایک تفصیل پڑھنے لگی ۔ اپنی تعریف میں بھرے ہوئے ریویو اس نے پہلے بھی بہت پڑھے تھے مگر اتنے دن بعد ان تعریفوں سے اسے ایک عجیب سی تشفی ہو رہی تھی ۔

اس دن سیمینار میں رما کو نہ پا کر آرتی کو تعجب ہوا ۔ جب اس کے مخبر نے بتایا کہ وہ صبح ہی کو کہیں دور جانے کے لیے روانہ ہوگئی ہے تو تجسس اور بھی بڑھا ۔ کیوں کہ منوج سیمینار میں موجود تھا ۔ سیدھی اسوانی کے گھر پہنچی ۔ وہاں اس کی بیوی نے بتایا کہ اسوانی بزنس کے سلسلے میں اسی دن کلکتے کے لیے روانہ ہوگیا ہے ۔

واپسی میں اس کے ذہن کے ایک گوشے میں ایک نیا خیال کروٹیں لینے لگا ۔ ۔ ۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسوانی کلکتہ نہیں ، رما کے ساتھ گیا ہے ؟ کیا اب تک وہ بےوقوف بنی رہی ؟ ۔ ۔ ۔ اور یہ سوچ کر اسے اور بھی جھلاہٹ ہو رہی تھی کہ اپنے اس

شیشے کا ذکر وہ کسی سے کر بھی نہیں سکتی ۔

(۱۷)

دن کے دس بج چکے تھے ۔ سوپر فاسٹ ایکسپریس تلنگانے کے دھان کے کھیتوں میں سے گزر رہی تھی جو پہاڑوں کے دامن میں دور تک گہرے سبز مخمل کی طرح پھیلے ہوئے تھے ۔ کھیتوں میں کٹائی کرنے والی عورتوں کے بکھرے ہوئے بال اور ساڑھیوں کے اڑتے ہوئے پلو بتا رہے تھے کہ باہر تیز ہوا چل رہی ہے ۔ بے اختیار رما کا جی چاہا کہ پہاڑوں اور میدانوں سے ہوکر آنے والی ہوا کے تیز جھونکے اس کے بھی بال بکھیر دیں ۔ ان میں بسی جنگل کی الھڑ خوش بو اس کے بوجھل دماغ میں تازگی کی لہر دوڑا دے ۔ ۔ ۔ مگر فرسٹ کلاس کے اے ۔ سی کیبن میں یہ سہولت کہاں ! اس نے اپنا سر پیچھے کشن پر ٹکا دیا اور ادھ کھلی آنکھوں سے باہر کا منظر دیکھنے لگی ۔ ۔ ۔

کیبن میں اس کے علاوہ صرف دو مسافر اور تھے ۔ دونوں کسی بڑی فرم کے بزنس پارٹنر لگتے تھے ۔ ہوائی جہاز میں سیٹ نہ ملنے پر سخت جھلائے ہوئے تھے ۔ ناشتے کے دوران اور اس کے بعد بھی دیر تک کسی نئے قانون پر گورنمنٹ کو گالیاں دیتے رہے ۔ اب جاکر چپ ہوئے تھے ۔

رما چپ چاپ باہر دیکھ رہی تھی ۔ منظر اسی تیزی سے پیچھے کی طرف دوڑے جارہے تھے ۔ کھیتوں کی جگہ اب اونچے اونچے پہاڑوں نے لے لی تھی جن کی ڈھلانوں پر اکا دکا گاؤں آباد تھے ۔ رما کو پتہ بھی نہ چلا کہ کب اس کا ذہن ان منظروں سے بھی کہیں تیز دوڑ کر بہت پیچھے چلا گیا تھا اور اب اس کی نیم وا آنکھوں کے سامنے برسوں پرانا ایک منظر اپنی دھندلاہٹیں جھاڑ کر آ کھڑا ہوگیا تھا ۔ جیسے کیمرے میں کلوز اپ ہو ۔

اس دن اسے کالج جانے میں دیر ہوگئی تھی ۔ کار بھی خراب تھی اور ڈرائیور اسے کارخانے لے گیا تھا ۔ وہ تیز تیز قدموں سے کوٹھی کے گیٹ کے پاس پہنچی تھی کہ پیچھے سے موٹر سیکل پر آنند آگیا آہستہ سے بولا ۔ ۔ ۔ "آپ کو دیر ہوگئی ہے ۔ چلیے میں آپ کو ڈراپ کردوں گا ۔" ۔ ۔ ۔ اور رما کے کچھ کہنے سے پہلے جلدی سے کہنے لگا ۔ ۔ ۔ "اب سوچیے مت ۔ آجائیے ۔ میرا کالج آپ کے کالج سے دور نہیں ہے ۔ ۔ ۔"

رما نے پلٹ کر دیکھا ۔ پورٹیکو کی سیڑھیوں پر منورما کتابیں لیے کھڑی آنند کو دیکھ رہی تھی ۔ پیچھے سے آنٹی آرہی تھیں ۔

رما اس دن دل ہی دل میں آنند سے سخت ناراض تھی ۔ وہ دن پہلے منوج کی سوسائٹی کی طرف سے اس کا ڈراما کھیلا گیا تھا اور بڑا کامیاب رہا تھا ۔ جس پر سب نے اسے مبارک باد دی تھی ۔ سوائے آنند کے ۔ بلکہ ڈرامے کے بعد آنند منورما اور رنجنا کو کہیں آئس کریم کھلانے لے کر چلا گیا تھا ! ۔ ۔ ۔ کوٹھی میں رہتے ہوئے وہ چند ہی دنوں میں سب کا چہیتا بن گیا تھا ۔ ۔ ۔ اپنی الٹی سیدھی حرکتوں سے ۔ خوش گپیوں سے ۔ اور سنجیدہ بن جاتا تو اپنی ذہین باتوں سے ۔ منورما تو ہر وقت اس کے ساتھ چپکی پھرتی تھی ۔ آنٹی بھی یہی چاہتی تھیں کہ آنند منورما کو پسند کرلے تو ان کی ایک فکر دور ہو ۔ ۔ ۔

مگر اپنی تمام ناراضگی کے باوجود اس روز ذراسے پس و پیش کے بعد رما موٹر سیکل پر بیٹھ گئی ۔ آنند نے اسٹارٹ کک دبائی تو پیچھے سے منورما کی غصے میں ڈوبی روہانسی آواز سنائی دی ۔ ۔ ۔ "مگر ممی ۔ آنند تو آج مجھے کالج لے جانے والا تھا !"

رما کا کالج شہر کی آبادی سے باہر زیادہ دور نہیں تھا ۔ اس روز صبح ہی سے آسمان پر ہلکے ہلکے بادل جمع تھے ۔ ہوا میں خنکی ابھی تک برقرار تھی ۔ لمبی اور خالی سڑک پر آنند نے موٹر سیکل کا تھراٹل گھمایا تو ٹھنڈی ہوا کے تیز نکیلے جھونکے رما کے جسم میں گدگدی سی کرنے لگے ۔ مگر اس نے آنند کو اتنا تیز چلانے پر ٹوکا نہیں ۔ ذرا سی دیر میں وہ چوراہا آگیا جہاں سے ایک سڑک کالج کے لیے جاتی تھی ۔ آنند نے موٹر سیکل کو دھیما کر کے سڑک کے ایک طرف روک لیا ۔ رما اتر کر اس کی طرف دیکھنے لگی ۔ جیسے پوچھ رہی ہو ، کیا ہوا ؟

آنند ویسے ہی بیٹھا رہا ۔ کالج جانے والی سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ۔ ۔ ۔ " ادھر مڑجائیں تو وہ سڑک روز کی طرح آپ کو کالج لے جائے گی ۔ ۔ ۔ اور اگر مڑے بغیر سیدھے چلے جائیں تو یہ سڑک ہمیں شہر سے دور گھنے پیڑوں اور ندی کے پاس لے جائے گی ۔ آپ کبھی اس سڑک پر گئی ہیں ؟ "

رما نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ جھلکنے لگی ۔ ۔ ۔ چند لمحے وہ اسی طرح کھڑی رہی ۔ پھر اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے چپ چاپ آنند کے پیچھے بیٹھ گئی ۔

سیدھی سڑک پر موٹر سیکل پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے دوڑ رہی تھی ۔ آبادی کے چھدرے چھدرے نشان گھنے پیڑوں اور کھیتوں کے ہریاول میں گم ہوچکے تھے ۔ آسمان پر بادل اب سیاہ ہوچلے تھے ہوا کا کوئی جھونکا نمی میں ڈوبا آجاتا تو جسم میں ہلکورے بھردیتا ۔ آنند گردن اٹھا کر بادلوں کو دیکھنے لگا ۔ ۔ ۔ پھر بولا ۔ " ۔ ۔ ۔ یہ نہ آتے تو آج کتنی کمی رہ جاتی ! "

موٹر سیکل کی آواز میں رما کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا آنند کیا کہہ رہا ہے ۔ زور سے چلا کر بولی ۔ ۔ ۔ " کچھ سنائی نہیں دیا ۔ "

مگر آنند نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ نہ موٹر سیکل کی رفتار کو کم کیا ۔ ایک بڑے سے ٹیلے کے دامن سے سڑک بل کھا کر نکلی تو سامنے ہی برگد کے جھنڈوں کے اس پار ندی آگئی ۔ پل کے پاس پیڑوں تلے موٹر سیکل چھوڑ کر دونوں پانی کے پاس ایک پتھر پر بیٹھ گئے ۔ اسی لمحے آسمان پر بادلوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی ۔ پانی کی سرد بوندوں سے بوجھل ہوا کا ایک تیز جھونکا جسموں کو چھوتا گزر گیا ۔ آنند آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ۔ ۔ ۔ " رما ۔ میں نے کہیں ایک نظم پڑھی تھی ۔ کچھ اس طرح تھی ۔ ۔ ۔ یہ بادل بڑے جادوگر ہیں جانے کہاں سے آجاتے ہیں ، دل کے ارمانوں کی طرح اور پھر خود تو برس جاتے ہیں مگر ارمانوں کی آگ اپنے پانی سے اور بھڑکا دیتے ہیں ۔ ۔ ۔ " پھر رک کر رما کی طرف دیکھنے لگا ۔ ۔ ۔ " میں بھی کتنا بے وقوف ہوں ۔ ٹھیک سے یاد بھی نہیں اور سنانے بیٹھا ہوں آپ کو ! ۔ ۔ ۔ کیا معلوم آپ ہی کی لکھی ہو ! "

رما کچھ نہیں بولی ۔ اپنی غلافی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی ۔ ذرا سے توقف کے بعد آنند پھر کہنے لگا ۔ ۔ ۔ " کتنی عجیب بات ہے ۔ کوٹھی سے یہاں تک آپ نے ایک بات نہیں کی ۔ ساری بکواس میں کیے جارہا ہوں ، ایک بے وقوف کی طرح ۔ "

رما مسکرا دی ۔ " مجھے آپ کی طرح دل چسپ باتیں کرنی نہیں آتیں ۔ "

" تو غیر دل چسپ باتیں ہی کیجیے ۔ چپ رہنے والوں سے مجھے ڈر لگتا ہے ۔ "

" کیوں ؟ "

" اس لیے کہ وہ آرام سے بیٹھے دوسروں کے دل و دماغ کو کتاب کی طرح پڑھتے جاتے ہیں ۔ ان کی کم زوریوں سے واقف ہوجاتے ہیں ۔ ۔ ۔ اور تھوڑی دیر میں بات کرنے والے کو محسوس ہوجاتا ہے کہ اس کے سارے ہتیار چھن چکے ہیں ۔ ۔ ۔ وہ اپنے کو احمق کے ساتھ بے بس بھی محسوس کرنے لگتا ہے ۔ "

" ۔ ۔ ۔ تو پھر آپ اتنی باتیں کیوں کرتے ہیں ؟ "

" آپ کو امپریس کرنے ۔ آپ تو کبھی کوئی بات کرتی نہیں ۔ ۔ ۔ نہ معلوم کون سی مٹی سے بنی ہیں ! سدا کی چپ ! اسی لیے آپ کے حصے کی باتیں بھی میں ہی کر ڈالتا ہوں ۔"

" آپ کی ان ہی باتوں نے چھتری والی کوٹھی میں سب کا دل موہ لیا ہے ۔"

آنند نے چونک کر رما کو دیکھا ۔ ۔ ۔ " ان سب میں ۔ ۔ ۔ آپ کا دل بھی ہے ؟ "

رما نے ایک کنکری اٹھا کر پانی میں پھینکنی چاہی مگر وہ کچھ پہلے ہی ریت پر گر گئی ۔ کہنے لگی ۔ ۔ ۔ " آنند صاحب ۔ میں جتنا سوچتی ہوں ، آپ اتنے ہی عجیب لگتے ہیں ۔ ۔ ۔ کبھی تازہ پھول کی طرح خوش بو بکھیر دیتے ہیں اور کبھی کانٹے کی طرح چبھ کر ٹیس بن جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ زندگی کو آپ نے کھیل سمجھ رکھا ہے ، جس میں سنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں ۔ ۔ ۔ اور آج آپ کو میرے دل کا خیال آ رہا ہے ! "

آنند اٹھ کر کھڑا ہو گیا ۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا کنکر تھا ۔ زور سے پھینکا تو پانی میں آواز کے ساتھ جا گرا ۔ ۔ ۔ " میں جانتا ہوں ۔ میں جانتا ہوں آپ ناراض ہیں ۔ کیوں کہ ڈرامے کی کامیابی پر میں نے آپ کو مبارک باد نہیں دی تھی ۔ مگر یہ رسمی مبارک بادیاں دینی مجھے نہیں آتیں ۔ آپ نہیں جانتیں ، مجھے اسٹیج پر ڈرامے دیکھنا پسند نہیں ۔ مگر زندگی میں پہلی بار میں نے آپ کا ڈراما شروع سے آخر تک دیکھا ۔ اس لیے نہیں کہ وہ آپ کا تھا ۔ بلکہ اس لیے کہ وہ اتنا ٹھاٹ پروڈکنگ تھا ۔ آپ کے ڈیڈی میرے پاس بیٹھے تھے ۔ وہ دیکھ رہے تھے میں کتنا متاثر ہو رہا تھا ۔ جب ڈراما ختم ہوا تو مجھے لگا میں آپ کے مقابلے میں کتنا معمولی انسان ہوں ۔ میں نروسس ہو گیا تھا ۔ آپ کے سامنے اپنی بے پناہ خوشی کا اظہار بھی نہیں کر سکا ۔"

رما ایک دم ہنس پڑی ۔ ۔ ۔ " اور آپ نے وہ ساری خوشی منورما پر نچھاور کر دی ۔"

آنند نے چونک کر رما کو دیکھا جس کی ہنسی میں ایک عجیب کھوکھلا پن تھا ۔ آنند کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی ۔ ۔ ۔ " آپ ۔ ۔ ۔ ایسی بات کہیں گی ، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا ۔" اس کی آواز میں جیسے کسی چوٹ کی کسک شامل تھی ۔

رما بولی ۔ ۔ ۔ " آپ کیا سمجھتے ہیں ؟ ۔ ۔ ۔ میں عام عورت سے مختلف ہوں ؟ "

" ہاں ۔ ۔ ۔ آپ کاغذ پر کیریکٹرز زندہ کرتی ہیں تو زندہ کیریکٹرز کے دل و دماغ کو پڑھنا بھی جانتی ہیں ۔ ان کے نہاں خانوں میں چھپے ان کے ولولے ، ان کے خواب ، ان کے خوف اور ان کے راز آپ سے چھپے نہیں رہتے ۔ ۔ ۔" رما حیران سی آنکھوں سے اسے تکنے لگی ۔ آنند کی آواز بھاری ہو کر عجیب سی لگ رہی تھی ۔ ۔ ۔ وہ پھر کہنے لگا ۔ ۔ ۔

" سنو رما ۔ ڈرامے والے دن میں بہت خوش تھا ۔ جب بھی مجھے کوئی خوشی ملتی ہے تو میرا جی چاہتا ہے ایک راز کی طرح دیر تک اسے اپنے دل میں چھپائے رکھوں ۔ اس سے مسرور ہوتا رہوں ۔ کسی سے اس کی بات تک نہ کروں ۔ ورنہ وہ خوشی پرائی ہو جائے گی ! یہ بچوں جیسی عادت میری کم زوری رہی ہے ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ کیا آپ سچ مچ یہ سمجھتی ہیں کہ اس دن میں نے منورما کی خوشی کی خاطر وہ ناٹک کھیلا تھا ؟ ۔ ۔ ۔ اور کیا یہ ضروری ہے کہ اپنی ہر بات اسٹیج کے اداکار کی طرح زور سے دوسرے کو سنائی جائے ۔ ۔ ۔ ؟ "

کوشش کے باوجود رما اپنی مسکراہٹ نہ روک سکی ۔ اسے اس طرح مسکراتے دیکھ کر آنند چپ ہو گیا تو رما بولی ۔ ۔ ۔ " کہتے جائیے ۔ رکیے مت ۔ آج پہلی بار آپ کو سنجیدہ روپ میں دیکھ رہی ہوں ۔"

اسی لمحے بارش کی بوندوں کا ایک جھلا سا آکر انھیں بھگو گیا ۔ دونوں چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر بوندوں کا سلسلہ

بڑھنے لگا تو دونوں بچوں کی طرح جلدی سے برگد کے تناور پیڑوں تلے آگئے جہاں ان کی جڑیں زمین کے اوپر اژدہوں کی مانند پھیل گئی تھیں ۔ ان پر ایک دوسرے کے مقابل بیٹھتے ہوئے دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگے ۔ ہنستے چلے گئے ۔ آنند کی سنجیدگی ہمیشہ کی شگفتگی میں بدل چکی تھی ۔ ۔ ۔ بوندوں کی تڑ تڑ آواز بتا رہی تھی کہ بارش کی رفتار بڑھتی جارہی ہے ۔ ۔ ۔

"چلیے ، چھوڑیے اسٹیج اور ڈراموں کی بات ۔ کوئی اور بات کیجیے ۔" ۔ ۔ ۔ آنند بولا ۔

"کون سی بات ؟ " ۔ ۔ ۔ رما نے پوچھا ۔

"کوئی سی ۔ اپنے بچپن کی ، ۔ ۔ ۔ اپنی امنگوں کی ۔ اپنے خوابوں کی ۔ ۔ ۔ آپ نے ناولوں اور افسانوں میں پڑھا نہیں ، جب دو دلوں کی دھڑکنوں میں الفاظ کھو جاتے ہیں ، تو بات چیت کا سلسلہ اسی طرح جوڑ لیا جاتا ہے ؟ "

" او ہو ! ۔ ۔ ۔ آپ تو باتوں باتوں میں بہت سا فاصلہ طے کر گئے ! ۔ ۔ ۔ آپ بڑے چالاک ہیں ۔ ۔ ۔" رما یکایک رک گئی ۔ پھر جب بولی تو آواز میں وہ شگفتگی جاتی رہی تھی ۔ ۔ ۔ "مگر مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ میں کبھی بچپن سے بھی گزری ہوں ! ۔ ۔ ۔ یاد ہے تو بس اتنا کہ سدا اپنی سوچوں اور ابسرڈ خیالوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتی رہی سب کہتے تھے یہ تو بوڑھی پیدا ہوئی ہے ۔"

آنند بولا ۔ ۔ ۔ "مگر ابسرڈ خیالوں میں دلوں کے راز چھپے رہتے ہیں ۔ آپ کیا سوچتی تھیں ؟ "

" اتنی کرید کیوں ہے آپ کو ؟ میں نے آج تک سنایا نہیں کسی کو ۔"

"کسی کو تو پہلا بتانا ہی پڑتا ہے ۔"

" تو سنیے ۔ ۔ ۔ جب میں سات آٹھ برس کی تھی تو سوچا کرتی تھی کہ بادلوں کے دیس سے کوئی راج کمار آئے گا اور مجھے سفید گھوڑے پر بٹھا کر اپنے ساتھ لے جائے گا ۔ جب دس بارہ برس کی ہوئی تو میرا یقین شبہے میں بدلنے لگا اور پھر اس کے بعد کانوں میں کوئی آواز بار بار کہہ گئی ، نہیں ۔ تو اتنی خوش نصیب نہیں ۔ ۔ ۔ !" رما چپ ہوگئی ۔

ایک بھدی سی خاموشی دونوں کے درمیان معلق ہونے لگی تو آنند بے چین ہوگیا ۔ ۔ ۔ " رما دیوی ۔ بادلوں کا دیس بہت دور ہے ۔ شاید راج کمار کو آنے میں دیر ہوگئی ہو ۔ ۔ ۔ یا پھر اسے سفید گھوڑے کی تلاش ہو ! "

" یا راستے میں کسی پری نے روک لیا ہو ۔" رما بولی اور دونوں یکبارگی ہنس پڑے ۔ فضا پھر شگفتہ ہوگئی ۔

بارش اس دوران کم ہو چلی تھی ۔ مگر آسمان پر کالے بادل تلے کھڑے تھے ۔ رما انھیں دیکھتے ہوئے ایک دم کھڑی ہو گئی ۔ کہنے لگی ۔ ۔ ۔ " آنند صاحب ۔ ان بادلوں کے تیور ٹھیک نہیں لگتے ۔ اپنی موٹر سیکل سنبھالیے اور چلے چلیے ۔ ورنہ گھر پہنچنا مشکل ہوجائے گا ۔"

واپس آتے ہوئے ابھی کچھ فاصلہ طے کیا تھا کہ گرج کے ساتھ زوروں کی بارش شروع ہوگئی ۔ ذراسی دیر میں دونوں شرابور ہوگئے ۔ مگر رکے نہیں ۔ آنند نے موٹر سیکل کی رفتار اور تیز کرتے ہوئے پلٹ کر زور سے پوچھا ۔ ۔ ۔ " رما دیوی ۔ کیا آپ بھیگ رہی ہیں ؟ "

رما نے بھی چلا کر جواب دیا ۔ ۔ ۔ " نہیں ۔ بالکل نہیں ۔ کیا آپ بھیگ رہے ہیں ؟ "

" نہیں ۔ ۔ ۔ بالکل نہیں ۔"

اور دونوں کے قہقہے بادلوں کی گڑگڑاہٹ میں ڈوب گئے ۔ ۔ ۔ بارش اب موسلادھار ہورہی تھی ۔ ہر بوند سیدھی جسم میں پیوستہ ہوتی جارہی تھی ۔ آنند کو آنکھیں کھلی رکھنے میں مشکل ہورہی تھی ۔ مگر خالی سڑک پر پانی اڑاتے ہوئے موٹر سیکل اڑی جارہی

تھی ۔ آنند اور رما ایک عجیب کیفیت میں ڈوبے لطف اٹھا رہے تھے اور اس قدر بھیگ جانے کے بعد اب رکنے کا سوال بھی نہیں تھا ، مگر شاید قدرت نے طے کر رکھا تھا کہ وہ اس دن کو ان کی زندگی کا سب سے یادگار دن بنادے گی ۔ انھیں رکنا پڑا ۔ تھوڑی ہی دیر بعد موٹرسیکل میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی اور وہ جھٹکے کھانے لگی ۔ پھر یکایک پھٹ پھٹ کرکے خاموش ہوگئی ۔ کوشش کے باوجود پھر اسٹارٹ نہیں ہوئی ۔ بارش کی تیزی میں کچھ اور کرنے کا موقع ہی نہیں تھا سوائے اس کے کہ دونوں اسے دھکیل کر پاس ہی سڑک کے ایک طرف لے آئیں جہاں گھاس کا ایک خستہ حال چھپر بانسوں پر کھڑا تھا ۔ دونوں سیدھے اس میں آ کھڑے ہوئے ۔ یہاں شاید بیل بندھتے تھے ۔ گوبر اور بکھرے ہوئے چارے کی گیلی بو پھیلی ہوئی تھی ۔ ٹوٹا پھوٹا چھپر ہر طرف سے ٹپک رہا تھا ۔ پھر بھی باہر کی طوفانی بارش سے سہارے کا بہانہ ضرور تھا ۔ آنند اور رما جگہ بدل بدل کر چھپر کے لگاتار ٹپکوں سے بچنے کی کوشش کرتے رہے ۔ سر کے بالوں سے پانی جھٹکتے ہوئے آنند بولا ۔ ۔ ۔

" فلموں میں ایسے سچویشن پر ہیرو اور ہیروئن ۔ ۔ ۔ میرا مطلب ہے لڑکا اور لڑکی کسی سڑے بسے شیڈ میں نہیں ، بلکہ ویران گھر میں پناہ لیتے ہیں ۔ ایک کمرے میں جاکر لڑکی بھیگے کپڑے بدل کر شال لپیٹ لیتی ہے ۔ پھر تھوڑی سی لکڑیوں پر ایک چھوٹی سی آگ جلا کر دونوں پاس بیٹھ جاتے ہیں ۔ سردی سے کانپتے جسم آگ کے شعلوں سے دہک اٹھتے ہیں ۔ ۔ ۔ لکڑیوں کی آگ سے نہیں ، دلوں میں بھڑک اٹھنے والی آگ سے ۔ ۔ ۔ "

رما تالی بجاتے ہوئے بولی ۔ ۔ ۔ " بہت خوب ۔ آپ تو اچھا خاصا اسکرین پلے لکھ رہے ہیں ۔ میں تو سمجھی تھی ۔ ۔ ۔ " رک کر ہنسنے لگی ۔

" کیا سمجھتی تھیں آپ ؟ " آنند نے اپنی آواز میں رعب شامل کرلیا تھا ۔

" کچھ نہیں ۔ فی الحال اس ریسٹ ہاؤس کے گرین کارپٹ پر بیٹھ جائیے جو مویشیوں کے چارے سے بنایا گیا ہے ۔ اور اپنے کپڑوں کو نچوڑ ڈالیے ۔ " ۔ ۔ ۔ رما خود بھی ایک طرف نسبتاً کم بھیگے ہوئے چارے پر بیٹھ گئی ۔ اور بالوں کو کھول کر جھٹکنے لگی ۔ پھر یکایک اپنا بیگ کھولتے ہوئے بولی ۔ ۔ ۔ " اف ۔ ۔ ۔ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا ۔ دیکھانا ، بھیگ گئیں ساری ! " اور اپنی کتابیں نکالنے لگی ۔ ۔ ۔ " لائبریری کی تھیں ۔"

" کوئی بات نہیں ۔ سوکھ جائیں گی ۔" آنند نے لاپروائی سے کہا ۔

رما نے بیگ میں سے ایک چھوٹا سا پیکٹ نکالا جو پلاسٹک کے کور میں لپٹا تھا ۔ اس میں دو سینڈوچس رکھے تھے ۔ ایک آنند کو دیتے ہوئے بولی ۔

" روز کالج کے لیے جیوتی رکھ دیتی ہے ۔ میں تو بھول ہی گئی تھی ۔"

آنند سینڈوچ لے کر منہ میں رکھنے لگا تو چھپر سے ایک موٹی بوند سینڈوچ پر ٹپ ۔ ۔ ۔ بولا " گڈ ۔ اس بوند سے اور بھی مزے دار ہوجائے گا ۔" اور منہ میں رکھ لیا ۔ ۔ ۔ دونوں ہنس پڑے ۔

سینڈوچ کھاتے ہوئے رما نے کہا ۔ " ۔ ۔ ۔ چلیے ۔ اب آپ کی باری ہے ۔ اپنے بچپن کی باتیں سنائیے ۔"

" مگر میرا بچپن ختم کہاں ہوا ہے ؟ " ۔ ۔ ۔ اور آنند نے اپنے چہرے پر حیرت کے تمام آثار جمع کر لیے تھے ۔ ۔ ۔

○●○

امراؤ طارق

صحرا میں اذان

حسین بادشاہ اپنے کنبے کے ساتھ گاؤں چھوڑ کر جانے کے لیے نکلے تو مسجد کے مینار پر بیٹھا کوا مسلسل چیخے جارہا تھا ۔ آسمان پر ابابیل کے غول پروں کو پھیلائے ہوا میں تیر رہے تھے ۔ ابابیلیں اونچی اڑانوں سے لوٹ کر پرانی چھتوں کی دھنیوں میں غولوں میں بنے گھونسلوں میں آتیں ۔ ایک لمحہ توقف کرتیں ۔ پھر اپنی آزادی کا لطف اٹھانے اونچی اڑانوں پر نکل جاتیں ۔ حسین بادشاہ نے مینار پر بیٹھے کوے کو چیختے دیکھا تو انھیں یاد آیا کہ یہ پرندہ تو مہمانوں کی آمد کا پیغام دیا کرتا ہے ۔ ہم تو اپنا گھر چھوڑ کر بے گھری کی سمت جا رہے ہیں پھر یہ پرندہ کیوں مسلسل چیخے جا رہا ہے ۔ انھوں نے بلندی پر فضا میں تیرتی ابابیلوں کو دیکھا ۔ ان کو لوٹ کر اپنے گھونسلوں میں آتے جاتے اور پھر اونچی اڑانوں پر نکل جاتے دیکھا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے ۔ انھوں نے سوچا پرندے اپنے گھونسلوں کو ضرور لوٹتے ہیں خواہ وہ گھونسلے گھروں کی چھتوں کی بوسیدہ دھنیوں کے خولوں میں کڑیوں کے بیچ ہی کیوں نہ بنے ہوں اور ابابیلیں تو انسانوں کے بیچ گھروں میں بنے گھونسلوں میں ہی قیام کرتی ہیں ۔ پھر حسین بادشاہ کو بیا کے وہ گھونسلے یاد آئے جو انھوں نے بازار سے خرید کر گھر کے آنگن میں اس پار سے اس پار تک ایک ڈوری باندھ کر لٹکا دیے تھے اور بیاؤں کے آکر ان میں بس جانے کا انتظار کیا تھا مگر کسی بیانے ان گھونسلوں میں بسیرا نہ کیا اور گھونسلے خالی جھولتے رہے حتیٰ کہ ان کے سنہرے رنگ خاکستری ہوگئے ۔ تب حسین بادشاہ نے جان لیا تھا کہ پنکھ پکھیرو اپنے گھونسلے چھوڑ کر کہیں نہیں جاتے ۔ موسم کی شدت سے محفوظ رہنے کے لیے عارضی نقلِ مکانی کر لیتے ہیں ۔ عارضی نقلِ مکانی میں ایک رومانس ہوتا ہے ۔ پھر گھر لوٹنے کی چاہ ہوتی ہے ۔ گھر سے بچھڑنے کی ہوک ہوتی ہے ۔ اپنا بچھڑا گھر یاد آتا ہے تو دل محبتوں سے بھر جاتا ہے مگر پھر نہ لوٹنے کے فیصلے سے گھر چھوڑ کر چل دینا تو قسمت کا لکھا ہوتا ہے ۔ تقدیر کا فیصلہ ہوتا ہے ۔ انھوں نے ابابیلوں کو فضا میں پر پھیلائے تیرتے دیکھا تو گلیوں میں کھیلا اپنا بچپن آنسوؤں کے قلزم میں تیرنے لگا ۔ ابابیلیں فضا میں تیر رہی ہوں ۔ گاؤں کا سورج غروب ہو رہا ہو ۔ کوا مسجد کے مینار میں چیخ رہا ہو تو پھر ایسے وقت کا سفر منشائے ربی ہوجاتا ہے ۔

حسین بادشاہ جب گاؤں کے بازار پہنچے جہاں سے گاؤں والے پردیس جانے والوں کو رخصت کیا کرتے تھے تو وہاں خلقت جمع تھی ۔ گاؤں کے معززین ۔ دکان دار جو بازار میں دکان سجائے بیٹھے تھے وہ ۔ مسجد کے پیش امام اور نمازی عصر کی نماز کے بعد ۔ برہمن ۔ کائستھ ۔ سبزیاں اگانے والے موراتی ۔ باغوں کو پھلوں کے زمانے میں تکنے والے لودھ اور سور چرانے والے پاسی اور شادی کا پیغام لے جانے والے نائی اور فقیروں کی دیکھ ریکھ کرنے والے فقیر اور آتش باز سب ہی اپنا کام چھوڑ کر حسین بادشاہ کو اس سفر پر جانے سے روکنے کے لیے انھیں سمجھانے کی نیت سے بازار میں آگئے تھے ۔ سب اپنے چھوٹے چھوٹے حلقوں میں اس ان ہونی پر سرگوشیاں کر رہے تھے ۔

" میاں ہرے گاؤں کاہے چھوڑ رہے ہیں " (میاں لوگ گاؤں کیوں چھوڑے جارہے ہیں) کچھ لوگ بازار میں پکے کنویں کی جگت پر املی کے درخت کی نیچے بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے ۔

" کسی کو کچھ معلوم نہیں ۔"

" شاید خدا کو یہی منظور تھا ۔"

بازار پہنچ کر حسین بادشاہ کی سواری رک گئی ۔ عورتیں اور بچے بیل گاڑی کے دونوں طرف لگے بانسوں میں کمان کی طرح موڑ کر باندھی گئی قمچیوں پر منڑھی سفید چادروں کے پردوں کے اندر تھے جن سے بچے سر نکالے ہوئے گاؤں سے رخصتی کا منظر دیکھ رہے تھے ۔ ان کے بازوؤں پر امام ضامن کے سکے بندھے ہوئے تھے اور بیل گاڑی میں جتے بیل طویل سفر کے ابتدا ہی میں گھر کے دروازے سے بازار تک آتے آتے لمبے لمبے سانس لینے لگے تھے اور ان کی پیٹ دھونکنی کی طرح پھولنے پچکنے لگے تھے اور ناک سے سائیں سائیں کی آوازیں نکل رہی تھیں ۔ نتھنے پھولنے لگے تھے ۔ گاڑی بان ان کے پٹھے پر پیار سے چمکار کے ساتھ ہاتھ پھیر رہا تھا ان کے موت سے ان کے پیٹ کے نیچے کی زمین گیلی ہوگئی تھی ۔ گاؤں والوں نے حسین بادشاہ کو گھیرلیا اور ان سے گاؤں لوٹ چلنے کو کہا ۔ گاؤں چھوڑ کر نامعلوم کے سفر پر نکل کھڑے ہونے کے خلاف دلیلیں دیں ۔ یہاں اور وہاں کے فرق کی وضاحت کی ، لوگوں کے نگاہیں پھیر لینے اور دشمن بن جانے کی جانے کتنی کہانیاں سنائیں ، معاشی مفاد کی خاطر سگے بھائیوں میں نفرتے کے قصے سنائے ، اپنی زمین سے منھ موڑ کر بے زمینی کے طعنوں سے ڈرایا مگر جب حسین بادشاہ پھر بھی نہ مانے اپنی ضد پر اڑے رہے تو عورتوں اور بچوں کو سفر پر نہ لے جانے کی تلقین کی مگر حسین بادشاہ اپنے اہل و عیال اور عزیز و اقارب کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے ۔ کسی نے وقتِ رخصت کانوں میں شہادت کی انگلی پرو کر اذان کہی ۔ گاؤں کی اس جانب جہاں مسجد نہ تھی ، اذان کا وقت نہ تھا اور اذان کی آواز سنائی دی تو گھروں میں بیٹھی عورتوں نے سروں پر ڈوپٹے درست کیے اور سارا گاؤں جان گیا کہ مسافت شروع ہوگئی ۔ گاؤں والے ہار گئے اور اذاں کے ساتھ جانے والوں کو خدا کی امان میں دے دیا ۔

سفر میں صعوبتیں اٹھاتے آگے بڑھتے رہے ، بچوں کو حوصلہ دیتے رہے ، عورتوں کی ہمت بندھاتے رہے پھر حکومت کے والنٹیروں نے اور مقامی باشندوں نے انھیں اسٹیشن پر اتارا اور سینے سے لگایا اور نعرہ ۔ تکبیر بلند کیا تو نیم جاں حسین بادشاہ کے جسم میں لہو پھر سے گرم ہوگیا ۔ جی بھر کے بچھڑ جانے والوں کے لیے روئے پھر زمین پر سر رکھ کر سجدے میں گر گئے سفر کی صعوبتیں یاد کیں ، کنبے کی بےبسی یاد کی ، اپنوں کا بچھڑنا یاد کیا اور آنسوؤں سے چہرہ اور سجدے کی جگہ کی زمین بھگو دی ۔

سبحان ربی الاعلیٰ — حلق میں گھٹ کر رہ گیا

سبحان ربی الاعلیٰ — زبان سے ٹوٹ کر ادا ہوا

سبحان ربی الاعلیٰ — آنسوؤں میں ڈوب کر ادا ہوا

کیمپ کی ناہموار زمین پر راتوں کو جب نیند آنکھوں کے قریب نہ آتی ، حسین بادشاہ سوچتے گاؤں والے ٹھیک ہی تو کہتے تھے ۔ ۔ ۔ کچھ لوگ تو ۔ ۔ ۔ ہماری قربانیوں سے ہی منکر ہیں ۔

ہم کہاں آگئے ۔ وہ کہتے ہیں ۔

" وہاں کھانے کو روٹی نہ تھی یہاں زمینوں اور مکانوں کے مالک بتاتے ہیں اپنے آپ کو " حسین بادشاہ نے کروٹ بدلی اور تاریخ کے صفحات میں چلے گئے ۔

مملکتِ مدینہ قائم ہوئی تو روم و ایران دو بڑی مملکتیں مملکتِ مدینہ کے خلاف تھیں ۔ روس اور امریکہ اس مملکت کے خلاف ہیں ۔
وہ چاروں طرف یہود سے گھری ہوئی تھی ، یہ ہنود سے گھری ہے ۔ انصار نے مہاجرین کے لیے فقید المثال قربانیاں دیں ۔
یہاں بھی جب تک معاشی مسابقت نہ ہوئی ۔
وہاں انصار و مہاجرین میں افتراق ہوا یہاں بھی ہوا ۔
" یہ کیسی مماثلتیں ہیں ۔ ہم جو سب کچھ تج کر آگئے ہیں ۔ ہم مہاجر ہیں نا ۔"
" بابا آپ جہاں سے آئے تھے اس علاقے کو تسلیم کر لیا گیا ۔" کسی نے حسین بادشاہ کو اطلاع دی ۔
" علاقے کو تسلیم کرلینے سے تمھاری کیا مراد ہے ۔" حسین بادشاہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اطلاع دینے والے سے پوچھا ۔
" آپ جو زمینیں چھوڑ آئے ہیں جو گھر چھوڑ آئے ہیں وہ آپ کو مل جائیں گے ۔"
" وہ باتوں سے نعروں سے ، جھوٹے وعدوں سے اور طفل تسلیوں سے ملنے والے نہیں ان گھروں اور ان زمینوں کو پھر سے لینے کے لیے سروں پر کفن باندھنا ہوگا ، حسین بادشاہ نے وضاحت کی ۔
" مگر جو علاقے تسلیم کر لیے گئے ہیں ان علاقوں سے آئے ہوئے مہاجروں کو چھوڑی ہوئی زمینوں کے بدلے میں زمینیں اور چھوڑے ہوئے گھروں کے بدلے میں گھر مل جائیں گے ۔" اطلاع دینے والے نے بھی وضاحت کی ۔ حسین بادشاہ نے اس کی بات سنی ، سمجھی اور سر جھکا کر اس طرح چپ ہوگئے جیسے کچھ سوچنے لگے ہوں ۔
حسین بادشاہ نے سوچا اور اپنے آپ کو تشفی دی ۔
وہ گاؤں جسے چھوڑ کر حسین بادشاہ اپنے مختصر کنبے کے ساتھ اپنے دین پر چلنے اور اپنی ثقافت جینے کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے ان کے پرکھوں نے بسایا تھا ۔ اس گاؤں کے بیچوں بیچ ان کا لکھوری اینٹوں سے بنا دو منزلہ مکان تھا جسے گاؤں والے دو منزلہ اور لکھوری اینٹوں سے بنا ہونے کے باعث محل کہتے تھے ۔ اس کے لکڑی کے موٹے صدری دروازوں پر یہ موٹی موٹی کیلیں اور پتریاں جڑی ہوئی تھیں اور بھاری پلے زور لگا کر کھولے اور بند کیے جاتے تھے اور دیوڑھی اتنی اونچی تھی کہ ایک چوتھائی دروازہ بند ہو تو اس میں چھپ جاتا تھا ۔ سارے گاؤں کے دوسرے مکان مٹی کی دیواروں سے بنے ہوئے تھے جن میں سے بعض پر اوپلے تھپے ہوئے نظر آیا کرتے تھے ۔ برسات میں ان مکانوں کی دیواروں اور چھتوں پر مٹی کی نئی لیپ چڑھائی جاتی تھی اور چھتوں پر مٹی کی تازہ تہہ جمادی جاتی تھی اور دھنیوں کے بیچ چھتوں میں لکڑی کی جو کڑیاں جھول جاتی تھیں انھیں نئی کڑیوں سے بدل دیا جاتا تھا مگر دھنیوں کے بیچ اور کڑیوں میں بنے خلا میں ابابیلوں کے گھونسلوں کو کوئی اس خیال سے ہاتھ نہ لگاتا کہ ابابیل کے بچے ان گھونسلوں کے اجڑنے سے بے گھر ہوجائیں گے چاہے بچے ابھی انڈوں میں بند ہی کیوں نہ ہوں ۔ گاؤں والے بے گھری کے عذاب سے ہمیشہ خوف زدہ رہتے ہیں ۔ وہ کسی کو بے گھر ہوتے نہیں دیکھ سکتے چاہے وہ پنکھ پکھیرو ہی کیوں نہ ہوں ۔ گھر ہی گاؤں والوں کی خوشیوں کا محور ہوتا ہے چاہے وہ پھوس کی دیواروں اور پھوس کی چھتوں سے بنا ہوا ۔ یا کچی دیواروں اور مٹی کی چھتوں کا ہو اور فرش اور دیواروں کی لیپ سے گوبر کی بو ہی کیوں نہ آتی ہو اور دیواروں پر تھپے اوپلوں پر تھاپنے والی عورتوں کے ہاتھوں کے نشان ہی کیوں نہ ثبت ہوں ۔ نیم کا کیڑا نیم کے پیڑ سے بچھڑ جائے تو مر جاتا ہے بھرا گھر چھوڑ کر نکلنے والے ساری عمر گھر چھوڑنے کے گھاؤ کی میٹھی میٹھی ٹیس کی خلش کے ساتھ جیتے ہیں اور اسی درد کے ساتھ مر جاتے ہیں ۔ اس ٹیس کو صرف گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑنے پر مجبور ہونے والے ہی جان سکتے ہیں ۔ جو مرنے کے تجربے سے نہ گزرا ہو وہ موت کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتا ۔

" بابا آپ کو ان زمینوں کے بدلے میں جو آپ چھوڑ آئے ہیں جہاں زمینیں دی گئی ہیں ان زمینوں کے پاس جھیل ہے ذرا ی محنت سے زمینیں آباد ہوجائیں گی ۔" سرکاری اہلکار نے حسین بادشاہ کو کاغذات دیتے ہوں زمینوں اور زمینوں تک پہنچنے کی تفصیل دی ۔ حسین بادشاہ نے کاغذات لیے اور اپنے کنبے اور ان تمام لوگوں کے ساتھ جنھیں حسین بادشاہ کی زمینوں کے ساتھ جھیل کے اف میں زمینیں دی گئی تھیں اس نئی زمین کی طرف چل دیے ۔ وہ سب ملاکر لگ بھگ پونے دوسو آدمی تھے ۔ راستہ معلوم نہ تھا ۔ ستانوں میں بھٹکتے پھرے تب کہیں وہ جھیل نظر آئی جس کے اطراف میں ان کی زمینیں تھیں ۔ رات آدھی جا چکی تھی باقی کی رات ی پھوٹی جھگیاں بنانے میں گزری ۔ جو سامان ساتھ لائے تھے اس سے سروں پر سائبان سا ہی بن سکا ۔ خیمے تو کیا خاک بنتے ۔ جب ہ ان نامکمل سائبانوں میں سو گئے تو حسین بادشاہ نے آسمان کی طرف دیکھا ۔ تاروں کی روشنی ماند پڑنے لگی تھی صبح کا ستارہ جھلمل مل کر رہا تھا ۔ حسین بادشاہ نے دونوں کانوں میں کلمے کی انگلی پروئی اور سمت کا یقین کر کے فجر کی اذاں دی ۔ ریگستان میں بے رات الارض نے صحرا میں اذان کی آواز سنی تو باہر آگئے اور اپنے رب کے شکر گزار ہوئے ۔ فرحت بخش ہوائیں چلیں ۔ سب چشمے گئے وضو کیا اور صف بستہ ہوکر فجر کی نماز ادا کی ۔ آسمان پر جانے کہاں سے ابر کے ٹکڑے آگئے ۔ ادھر نمازیوں نے نماز ختم کرکے کے لیے ہاتھ بلند کیے ادھر بادل کے ٹکڑوں میں روزن بن گئے ۔ دعاؤں پر جیسے قبولیت کے در وا ہوگئے ہوں ۔

اذاں کی آواز دور تک تیرتی چلی گئی تھی اس لیے آبادی میں صاف سنی گئی ۔ نمازیوں نے نماز ختم کی اور بچوں اور توں کی غذا کا انتظام کرنے میں مصروف ہوئے تو آبادی کی سمت سے انسانوں کا ایک مشتعل گروہ وہاں آگیا ۔ حسین بادشاہ نے ں نزدیک جاکر سلام کیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو دوسری طرف سے نہ کسی نے سلام کا جواب دیا اور نہ مصافحے کے لیے ے ہوئے ہاتھوں کے لیے ہاتھ بڑھایا ۔ سب کے ہاتھ سینوں پر بندھے رہے گردنیں تنی رہیں کسی نے حسین بادشاہ سے معانقہ تک یا ۔ تب حسین بادشاہ نے وضاحت کی ۔

" ہم مسلمان ہیں ، مہاجر ہیں ، ہجرت کرکے آئے ہیں ۔ یہاں بس جانے کے خواہش مند ہیں ۔ یہ زمینیں اور یہ چشمہ اب ا ہے یہ رہے کاغذات " حسین بادشاہ نے جیب سے کاغذات نکال کر ان کی طرف بڑھا دیے ۔

" یہ کاغذ کے ٹکڑے اپنے پاس رکھو اور یہاں سے واپس چلے جاؤ ورنہ ہم تمھارے ٹکڑے ٹکڑے کردیں گے ۔" ان میں سے ۔ نے کہا جو سردار معلوم ہوتا تھا ۔

" ہم کلمہ گو ہیں ۔ ہم نے فجر کی اذان دی ہے ۔" حسین بادشاہ نے کہا ۔

" اسی اذاں کی آواز پر تو ہم جاگے ہیں ، ہماری آنکھیں کھلی ہیں ، اب تم میں سے کوئی جھیل سے پانی نہ لے گا ۔ میرے ی جھیل پر چوبیس گھنٹے پہرہ دیں گے ۔" آنے والوں کے سردار نے کہا اور اس کے ساتھیوں نے چشمے کو گھیر لیا ۔

حسین بادشاہ نے اور ان کے رفقا کے سامنے ایک اور معرکہ تھا اور وہ سوچ رہے تھے ۔ چپ تھے ۔ ان پر پانی بند ہوگیا تھا ۔

○●○

ترنم ریاض

مائیں

" بہت گرمی لگ رہی ہے ماما ۔ ۔ ۔" میرے دس سالہ لڑکے نے نیند کے خمار سے نڈھال اور گرمی کی شدت سے بےحال ہوکر کہا تو میں جو خود گرمی کے مارے کروٹ پر کروٹ بدل رہی تھی اور خود کو سوتا ہوا سمجھ رہی تھی ، یک لخت جاگ گئی ۔

ہاں بیٹا ! جانے کیوں آدھی رات کو بجلی چلی گئی ۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور کسی طرح روشنی کر کے دو پنکھیاں اٹھا لائی ۔ دونوں بچوں کے درمیان بیٹھ کر انھیں پنکھا جھلنے لگی ۔

آج کا دن بھی بہت مصروف تھا ۔ سورج جیسے جسموں کے قریب ہوکر تموز پھینک رہا تھا ۔ میں امی کا ٹکٹ لینے کے لیے گئی تھی اور تقریباً ناکام ہی لوٹی ۔ گرمی کے اچانک شدید ہوجانے سے لوگ پہاڑوں کو روانہ ہو رہے تھے ۔ تین دن بعد کا ایک ٹکٹ تھا مگر منتظر فہرست میں ۔

یہ تیسرا چکر تھا میرا ٹریول ایجنسی میں ۔ ایک مختصر سی اڑان اور لستے دنوں کی پریشانی ۔ سارا دن میں پسینہ بن کر بہہ گئی تھی ۔ دو ، تین جگہوں پر گئی مگر بات نہ بن پائی ۔

شام کو امی سے سارا ماجرا کہا ۔ وہ خاموش سنتی رہیں ۔ مگر ان کے چہرے پر ابھرتے ڈوبتے کرب کو میں محسوس کرکے اداس ہوتی رہی ۔ سردیوں میں وہ کچھ وقت میرے پاس گذارا کرتیں مگر گرمیوں کے شروع ہونے سے پہلے ہی وہ روانہ ہوجاتیں ۔ دس بارہ دن پیش تر خاصا خوش گوار موسم تھا ۔ انھوں نے کہا بھی تھا کہ نشست محفوظ کروالوں ان کی ، مگر میں نے سوچا ، کچھ دیر اور ٹھہر جائیں یہاں ۔ ابھی موسم بہتر ہے ۔ مگر موسم کیا بدلا کہ پریشان ہوگئی میں ۔

امی پہاڑ کی تھیں ۔ جھیلوں ، چشموں اور ہریالی پر زندہ رہتی تھیں ۔ ان موسموں کی عادت نہ تھی انھیں ۔ گرم ہوا کی لہر ان کے ضعیف وجود کو ایسے جھنجھوڑ دیتی کہ وہ تمازت سے جھلس جھلس جاتیں ۔

میرے شوہر شہر سے باہر گئے ہوئے تھے ۔ ورنہ یہ ٹکٹ وغیرہ کا کام وہی کیا کرتے ہیں ۔

" ماما ۔ ۔ ۔ زور سے جھلیے نا پنکھا ۔ ۔ ۔" میرا دوسرا بیٹا باہیں اور ٹانگیں پھیلا کر ایک لمبا سانس لیتے ہوئے بولا ۔ میرا ہاتھ تیز تیز چلنے لگا ۔ کافی دیر سے میں دونوں ہاتھوں سے پنکھیاں جھل رہی تھی ۔ میری دونوں آنکھوں کی پلکوں پر پسینے کے قطرے لٹکتے اور بہہ جاتے ۔ ہتھیلیوں کو بھی بار بار پونچھنا پڑتا تھا ۔ ورنہ ڈنڈیاں ہاتھوں سے پھسل جانے لگتی تھیں ۔

آج دن میں کچھ دیر کے لیے بجلی چلی گئی تھی ۔ جینریٹر میں پٹرول نہیں تھا ۔ مگر کمرے چوں کہ ٹھنڈے تھے اور کچھ دیر بعد بجلی آگئی تھی ۔ اس لیے مجھے اور بچوں کو پریشانی نہیں ہوئی ۔ مگر امی کی حالت خراب ہورہی تھی ۔ ادھر ادھر بےقرار چکر لگاتیں ، کبھی غسل خانے میں جاکر اپنے لباس پر پانی چھڑکتیں ۔ کبھی باورچی خانے میں جاتیں بہت سا پانی پیتیں ۔ میں دعائیں مانگتی کہ جلد

آجائے بجلی ۔

اور اب یہ رات بھی کس قدر تپی ہوئی تھی ۔ نیند مجھ پر غلبہ کیا چاہتی تھی ۔ اس شدید گرمی میں اگر کچھ دیر آنکھ لگ بھی جاتی تو میں سو نہ پاتی کہ بچے بےچین ہو اٹھیں گے ۔ ان کے آرام میں خلل پڑے گا تو صبح وقت پر بیدار نہیں ہو پائیں گے ۔ سکول میں اونگھنے لگیں گے ۔ سرزنش ہوگی ۔ اس وقت قدرے پُرسکون لگ رہے تھے ۔ چہروں پر چاندنی پھیلی ہوئی تھی ۔ کاش بجلی آجاتی اور وہ سکون سے اپنی نیند پوری کرلیتے ۔ ۔ ۔ میں بھی کچھ دیر سو جاتی ۔

اچانک مجھے خیال آیا ۔ شاید امی بھی نہ سو پارہی ہوں یا شاید چھت پر چلی گئی ہوں مگر ۔ ۔ ۔ انھیں چھت کا خیال کہاں آسکے گا ۔ اس دفعہ پہلی بار تو ہوا ہے ان کو گرمی کا تجربہ ۔ ۔ ۔ میں بھول ہی گئی ۔ ۔ ۔ یہ خیال مجھے بہت پہلے آجانا چاہیے تھا ۔ ۔ ۔ جو دن میں تھوڑی سی گرمی میں اتنی بےچین ہوتی تھیں وہ ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ اس وقت ۔ ۔ ۔

میں تو بھول ہی گئی ۔ ۔ ۔

بچوں کا پنکھا چھوڑ دوں گی تو یہ جاگ جائیں گے ۔ ۔ ۔ مگر ۔ ۔ ۔

امی کے کمرے کی طرف چل دی ۔ راہ داری طے کرنے کے دوران میری نظر ان پر پڑ رہی تھی ۔ وہ کمرے میں کھڑی تھیں کچھ پل ۔ ۔ ۔ پھر بیٹھ گئیں ۔ ۔ ۔ پھر کھڑی ہوگئیں ۔ ۔ ۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی برآمدے کے دروازے تک گئیں ۔ ۔ ۔ دروازے کا دستہ پکڑ کر اسے کھولنے لگیں ۔ ۔ ۔ پھر دستہ چھوڑ کر کمرے کی طرف پلٹیں ۔ ۔ ۔ کمرے کا ایک چھوٹا سا چکر کاٹا ۔ ۔ ۔ پھر برآمدے کے دروازے تک جاکر دوبارہ کمرے کی دیوار تک آئیں ۔ ۔ ۔ پھر دوسری دیوار تک ۔ ۔ ۔

کسی تنگ پنجرے میں قید پرندے کی طرح وہ ادھر ادھر پریشان اور بےحال تڑپ رہی تھیں ۔ گرمی نے انھیں بری طرح سے بےچین کر رکھا تھا ۔ اور یہ سب میں نے محض مختصر سی راہ داری میں چلتے ہوئے دیکھا تھا ۔

" امی ۔ ۔ ۔ آپ ۔ ۔ ۔ آپ ٹھیک ہیں نا ۔ ۔ ۔ ؟ "

" ہاں بیٹا ۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ میرا دم گھٹ رہا ہے ۔ ۔ ۔ شاید میری موت ۔ ۔ ۔ میری موت ۔ ۔ ۔ مجھے یہاں کھینچ لائی ہے ۔ ۔ ۔ " وہ رک رک کر بولیں ۔

" نہیں امی ۔ ۔ ۔ ایسا نہ کہیے ۔ ۔ ۔ چلیے ۔ ۔ ۔ چھت پر چلتے ہیں ۔ ۔ ۔ آئیے ۔ "

" تم نے ۔ ۔ ۔ پہلے ۔ ۔ ۔ کیوں نہیں بتایا ۔ ۔ ۔ چھت پر کچھ بہتر ہوگا ۔ ۔ ۔ کیا ؟ "

" جی ہاں ۔ ۔ ۔ جب گرمیوں میں بجلی نہیں رہتی ۔ ۔ ۔ تو لوگ اندر کہاں رہ پاتے ہیں ۔ گھر کے باہر ہی کچھ ہوا محسوس ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ آئیے ۔ " میں نے اندھیرے میں ان کا ہاتھ پکڑ کر زینہ طے کرتے ہوئے کہا ۔

" برآمدے والا دروازہ ۔ ۔ ۔ بہت شور مچاتا ہے بیٹا ۔ برآمدے میں ہی چلی جاتی کچھ دیر ۔ ۔ ۔ اس کے قبضوں میں تیل ڈلوا نتا ۔ ۔ ۔ میں اسے کھول دیتی تو ۔ ۔ ۔ تو کچھ سانس ۔ ۔ ۔ مگر تمھاری نیند تو بہت کچی ہے ۔ ۔ ۔ کہیں جاگ جاتیں ۔ ۔ ۔ پھر ۔ ۔ ۔ پھر بچے بھی ۔ ۔ ۔ اگر ۔ ۔ ۔ کھولتی تو ۔ ۔ ۔ تم سب کی نیند خراب ہوجاتی ۔ ۔ ۔ ورنہ ۔ ۔ ۔ کچھ ہوا ۔ ۔ ۔ کچھ سانس ۔ ۔ ۔ تم بھی ری سے جاگ گئی نا ۔ ۔ ۔ میری بچی ۔ ۔ ۔ ! ۔ ۔ ۔ اور بچے ۔ ۔ ۔ ؟ " وہ تیز سانس لیتی ہوئی کہہ رہی تھیں ۔ ۔ ۔

" نہیں امی ! میں تو بہت پہلے ۔ ۔ ۔ بجلی کے جاتے ہی جاگ گئی تھی ۔ بچوں کو پنکھا جھل رہی تھی ۔ میں بھی ۔ ۔ ۔ ں نے سوچا ۔ ۔ ۔ کہ آپ ۔ ۔ ۔ آپ میں تو بھول ہی گئی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ کتنی تکلیف ہوئی آپ کو ۔ ۔ ۔ "

(باقی ص : ۸۸ پر)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔۱، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔۱۱۰۰۶۶ فون : 6103381, 6103938 فیکس : 6108159

قومی اردو کونسل کی نئی مطبوعات اور تازہ ری پرنٹ

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
1.	اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ	پروفیسر محمد حسن	۹۸/=
2.	اردو ڈراموں کا انتخاب	پروفیسر محمد حسن	۱۵۰/=
3.	اردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل وابلاغ کی زبان	ڈاکٹر کمال احمد صدیقی	۲۰۰/=
4.	اردو زبان کی تدریس	معین الدین	۴۰/=
5.	تامل ناڈو میں اردو	علیم صبا نویدی	۱۳۵/=
6.	جنت سنگار	پروفیسر سیدہ جعفر	۱۸۰/=
7.	چکبست	رام لال نابھوی	۱۸/=
8.	فکر و تحقیق (جنوری تا جون، جولائی تا دسمبر ۱۹۹۷، جنوری تا جون، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۸)	قومی اردو کونسل	۱۵۵/=
9.	فیودر دستوئیفسکی	ظ۔انصاری	۸/۵۰
10.	قومی تہذیب کا مسئلہ	پروفیسر سید عابد حسین	۵۴/=
11.	لمعات بصیرت	رگھوناتھ کھنہ	۴۰/=
12.	مسدود راہیں	زاہدہ زیدی	۱۲۶/=
13.	لغات ابجد شماری ۱۹۹۲ جلد اوّل، حصہ دوم	سید احمد	۱۲۹/=
14.	ہندوستان کا شاندار ماضی	اے۔ایل۔باشم / غلام سمنانی	۱۳۵/=
15.	ہندوستانی مسلمان	پروفیسر مجیب	۲۵۸/=
16.	سفرنامہ فرہنگ سیر طالبی فی بلاد افرنجی	مرزا ابوطالب اصفہانی / ثروت علی	۳۲/=
17.	اردو انسائیکلوپیڈیا (حصہ اوّل، دوم، سوم)	پروفیسر فضل الرحمٰن	۱۲۰۰/=
18.	جامع انگریزی اردو لغت (H-S) (حصہ سوم، چہارم، پنجم)	پروفیسر کلیم الدین احمد	۱۸۰۰/=
19.	جامع انگریزی اردو لغت (T-Z) (حصہ ششم)	پروفیسر کلیم الدین احمد	زیر طبع
20.	نور اللغات (حصہ اوّل، دوم، سوم، چہارم) (ری پرنٹ)	مولوی نور الحسن نیر	۱۰۹۵/=
21.	ابتدائی سماجیات	ڈاکٹر محمد عبد القادر حمادی	۶/۲۵
22.	تاریخ فلسفہ سیاست	پروفیسر مجیب	۱۸/=
23.	حیاتیات (حصہ دوم)	قومی اردو کونسل	۵/=
24.	ہندوستان کی معاشی تاریخ (وکٹوریہ کے عہد حکومت میں 1837 تا 1900) (حصہ دوم)	رمیش دت / غلام ربانی تاباں	
25.	سائنس کی تدریس (تیسری طباعت)	ڈی این شرما / آر سی شرما / غلام دستگیر	
26.	سائنسی شعاعیں	ڈاکٹر احرار حسین	
27.	فن صنم تراشی	کملیش سنہا ونیش / اظہار عثمانی	
28.	گھریلو سائنس	طاہرہ عابدین	
29.	منشی نول کشور اور ان کے خطاط و خوشنویس	امیر حسن نورانی	
30.	انوکھی پہیلی	ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی	
31.	سچی کہانیاں	قاضی مشتاق احمد	
32.	شہنشاہ اثمار آم	تاباں نقوی امروہوی	
33.	عظیم سائنس داں	ڈاکٹر احرار حسین	
34.	ننھے منے گیت	کیدار ناتھ کومل	
35.	وسطی جنوبی افریقہ اور ملاگاسی کی مزیدار کہانیاں	محمد امین	
36.	ہندوستان کی بزرگ ہستیاں (حصہ دوم)	صفدر حسین	
37.	اصول طب	سید کمال الدین حسین ہمدانی	
38.	پیڑ پودوں پر وائرس کی بیماریاں	رشید الدین خاں	
39.	ذہنی حفظان صحت	مترجم: ہرالڈ ڈبلو برنارڈ / معین الدین	
40.	نفسیات	محمد رفیق اے ایس	
41.	شعریات	شمس الرحمٰن فاروقی	
42.	عرب لوک کہانیاں ایک تہذیبی ورثہ	ڈاکٹر حسن عسکری کاظمی	
43.	فلسفہ بنیادی اصول	اے۔سی۔ایونگ	
44.	پوشکن	ظ۔انصاری	
45.	درس بلاغت	قومی اردو کونسل	
46.	اتر پردیش کے لوک گیت	اظہر علی فاروقی	

بہ یادِ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

سنِ اجراء : ۱۹۳۸ء فون : 3310469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد : ۶۰ اکتوبر ۱۹۹۸ء شمارہ : ۱۰

فی پرچہ	:	۱۲	روپے
زرِ سالانہ	:	۱۲۵	روپے
کتب خانوں سے	:	۱۵۰	روپے

مشرق وسطی اور امریکہ	:	۲۵	ڈالر
پاکستان، برما، سری لنکا و بنگلہ دیش	:	۱۰	ڈالر
انگلستان	:	۱۵	پونڈ

ناشر : ادارہ ادبیاتِ اردو ، پنجہ گٹہ روڈ ، حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۸۲ (اے ۔ پی) انڈیا ۔

کمپیوٹر کتابت : جی ۔ جی ۔ کمپیوٹرس، مہدی پٹنم ، حیدرآباد ۔ / شلوپ کمپیوٹرز چادرگھاٹ ، حیدرآباد ۔

رحمن راج سکسینہ ایڈیٹر ، پرنٹر ، پبلیشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے او ایس گرافکس نارائن گوڑہ میں طبع کروا کے ادارہ ادبیاتِ اردو سے شائع کیا ۔

اس شمارے میں

○●○

پہلی بات

ادارہ ء ادبیاتِ اردو کے بانی سید محی الدینؒ قادری زور مرحوم نے ادارے کے کتب خانے کے لیے مختلف ذرائع سے تقریباً چالیس ہزار مطبوعہ کتابیں اور تین ہزار مخطوطات جمع کیے تھے ۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں بھی بیش بہا قلمی اور مطبوعہ کتابیں محفوظ تھیں ۔ ہماری درخواست پر زور صاحب کے صاحب زادوں نے حال ہی میں یہ کتابیں ادارے کے کتب خانے کو بہ طور عطیہ دے دی ہیں ۔ اس ذخیرے میں دو ہزار ستاون اردو مطبوعات ، انگریزی کی چھ سو نواسی کتابیں ، چوہتر مخطوطات اور زور صاحب کے تصانیف کے بارہ مسودے شامل ہیں ۔ اس گراں قدر عطیے کے لیے ہم زور صاحب کے صاحب زادوں سید تقی الدین قادری صاحب ، سید علی الدین قادری صاحب ، سید صفی الدین قادری صاحب ، سید رفیع الدین قادری صاحب اور رضی الدین قادری صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں ۔

سب رس کے زیرِ نظر شمارے میں اردو کے ممتاز شاعر شہریار سے لیا ہوا ایک انٹرویو شامل ہے ۔ اس انٹرویو میں جو بات مشاعروں کے شاعروں کے لیے کہی گئی ہے کہ " ان کے موضوعات بابری مسجد ، اقلیتیں ، فرقہ پرستی کا آسیب اور اردو کی کم وقعتی وغیرہ ہوتے ہیں " وہ آج کل ادبی رسالوں میں شائع ہونے والے بہت سے تخلیق کاروں پر بھی صادق آتی ہے ۔ لگے زمانے میں ترقی پسندی کے نام پر سیاسی سماجی مسائل کو موضوع بنا کر خام اور ادھ کچری تخلیقات پیش کی جاتی رہی تھیں جن میں ادبی معیار اور فن کے تقاضوں کو سرے سے نظر انداز کردیا گیا تھا ، آج بھی مابعد جدیدیت کے نام پر یہی کچھ ہورہا ہے ۔

ڈاکٹر حسن منظر اردو کے ایک منفرد اور اہم افسانہ نگار ہیں ۔ وہ ماہرِ نفسیات اور نفسیاتی معالج بھی ہیں اس بار انھوں نے ایک اہم سماجی مسئلے پر قلم اٹھایا ہے ۔ ان کے طویل مضمون " موجودہ معاشرہ اور برہنہ فلمیں " کی پہلی قسط شائع کی جارہی ہے ۔

اس شمارے میں پروفیسر عبدالستار دلوی کا گوشہ شامل ہے ۔ پروفیسر دلوی نے لسانیاتی تحقیق و تنقید اور علمی ادبی تراجم کے ذریعے اردو زبان کی جو قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے اس کا اندازہ اس گوشے میں شامل مضامین سے لگایا جاسکتا ہے ۔ یہ گوشہ اعترافِ حقیقت کے ساتھ ایک نذرانہ ء خلوص بھی ہے ۔

حسبِ ذیل اصحاب نے ادارہ ء ادبیاتِ اردو کی دوامی رکنیت قبول فرمائی جس کے لیے ادارہ ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہے ۔

۱) جناب اسلم عمادی صاحب کویت — ۲) جناب اصغر حسین صاحب فرانس
۳) محترمہ صدیقہ شبنم صاحبہ انگلینڈ — ۴) محترمہ رقیہ جیلانی صاحبہ امریکہ
۵) محترمہ نجمہ نفیس صاحبہ حیدرآباد — ۶) جناب عبدالرحیم آرزو صاحب گلبرگہ

ooo

(ادارہ)

پون ورما

ترجمہ : اسامہ فاروقی

کتاب : غالب ، شخصیت اور عہد

باب ۱ : روبہ زوالِ مملکت

(قسط : ۲)

غالب کی عرض داشت کبھی ملکہ ، وکٹوریہ کی نظر سے نہیں گزری ۔ جب غالب نے اپنی یاد دہانیوں کا سلسلہ جاری رکھا تو انھیں مطلع کیا گیا کہ : " ملکہ ، معظمہ کی طرف سے اس سلسلے میں ہمیں کوئی اطلاع نہیں موصول ہوئی ہے ۔" غالب کے مقدمے میں مزید کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ۔ عرض داشت پر لندن میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفتر کی کسی الماری کے خانے میں دھول جمتی رہی ۔ معاملے کا تصفیہ ایک آسان سی تدبیر کے ذریعے کردیا گیا جس پر سبھی نوکر شاہیوں کو عبور حاصل ہے ، یعنی اسے معلق رکھ کر ۔ غالب اپنی عرض داشتیں لکھتے رہے ۔ انھیں بیش تر ان کی وصول یابی کی اطلاع بھی نہیں ملی ۔ ۱۸۵۷ ء کی بغاوت کے ایک سال قبل تک وہ گورنر جنرل کیننگ کے پاس سے اپنے مقدمے کے بارے میں اطلاع کے لیے درخواست کرتے رہے تھے ۔ انگریزوں کے پاس بس یہی جواب تھا کہ کاغذات انگلستان بھیج دیے گئے ہیں ۔ ۱۸۵۷ ء کے بعد غالب کو سب سے زیادہ فکر ان کی پنشن کی بحالی کی تھی ۔ اس میں اضافے کا سوال جس کے لیے وہ کم و بیش تیس سال سے مسلسل لڑتے آئے تھے ، ہمیشہ کے لیے دفن ہوچکا تھا ۔

غالب کی لڑائی اس بات کے لیے تھی جسے وہ اپنا حق سمجھتے تھے ۔ ان کا ارادہ برطانوی اقتدار کے جواز کے متعلق شک ظاہر کرنے کا نہیں تھا ۔ مخالف استعمار سیاق و سباق میں قوم پرستی کو معرضِ وجود میں آنے کے لیے ابھی وقت درکار تھا ۔ انیسویں صدی عیسوی کے ہندستان کے تغیر پذیر حالات میں بالفعل صاحبانِ اقتدار کو تسلیم کرنے کے لیے ، چاہے وہ افغان ہوں یا مرہٹے ، جاٹ ہوں یا انگریز ، وفاداریوں کی کتر بیونت عام دستور تھا ۔ بھاڑے کے سپاہیوں کی قدیم روایات کے مطابق ان کے والد نے مغل بادشاہ شاہ عالم ، اودھ کے نواب آصف الدولہ ، حیدرآباد کے نظام علی خاں اور الور کے راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت کی تھی ۔ ان کے چچا نے لچکیلے پن کے ساتھ اپنی وفاداری مرہٹوں سے انگریزوں کی طرف منتقل کردی تھی ۔ دہلی ہو یا لکھنو ، حیدرآباد ہو ، الور ہو یا آگرہ اس خاندان کی وفاداریاں لستے ہی آقاؤں کو منتقل ہوتی رہیں ۔ یہ ایسا زمانہ تھا جب وجود کا قائم رہنا وفاداری کو حرکت پذیر رکھ سکنے والی سیاسی پھرتی پر منحصر تھا ۔ غالب کے لیے بالفعل اقتدار کے غاصب کو تسلیم کرنا اس لیے جائز تھا کہ یہ امر معمول کے عین مطابق تھا ۔ مزید برآں غالب بہ مشکل چھے سال کے تھے جب انگریزوں نے دہلی میں اپنی حکومت قائم کی ۔ جب وہ سنِ بلوغ کو پہنچ رہے تھے تو اس تمام عرصے میں انگریزوں کی موجودگی ان کے لیے ایک امرِ بدیہی تھی ۔ انگریزوں کی حکومت کے ابتدائی سالوں میں ولیم فریزر جیسے

بعض انگریز عہدے داروں کو وہ اپنا دوست اور محسن سمجھتے تھے ۔ اس غیر ملکی وجود کو خود اپنے معاشرتی ماحول کے جانے بوجھے تسلسل میں شامل کر کے انھیں مسرت ہوتی ۔ ایک مختلف سطح پر صریحاً سیاسی وجوہ کے مد نظر مغل بادشاہ بھی بالکل یہی چاہتے تھے ۔ لارڈلیک خود کو تیموریوں پر قطعی تسلط کا نقیب خیال کرتا رہا ہوگا لیکن شاہ عالم نے شاہانہ گو کہ پُر فراست عالی ظرفی کے ساتھ لارڈلیک کو خانِ دوراں ، خان بہادر سپہ سالار جیسے جانے بوجھے خطاب سے نواز کر ایسی جسارت کے خلاف پیش بندی کی کوشش کی ۔ اسی انداز میں غالب نے اس سے نااتفاقی سے پہلے فرانسس ہاکنس کی توصیف ناظم الملک بہادر ہیبت جنگ جیسے القاب سے کی ۔ صنعتی انقلاب سے راست مستفید ہونے والوں کی حیثیت سے انگریز سائنسی اور صنعتی دونوں میدانوں میں طرح طرح کی ترقیوں کو بڑھاوا دے رہے تھے ۔ اپنے بہت سے ہم عصروں کے برخلاف غالب ان کی قدر کرتے تھے ۔ کلکتے سے ایک خط میں ایک موقع پر انھوں نے لکھا تھا : " مخفی مباد کہ دخانی کشتی ان لوگوں کی ایجادات میں سے ایک ہے ۔ یہ نسبتاً تیز رفتار ہوتی ہے اور بارہا دخانی کشتیوں نے کلکتے سے الہ آباد کے درمیان کا فاصلہ دو ہفتوں میں طے کیا ہے ۔" وہ انگریزوں کے قائم کیے ہوئے ڈاک اور لاسلکی کے نظام کی بھی اتنی ہی قدر کرتے تھے ۔ اس لیے غالب برطانوی اقتدار کو تسلیم کرنے کو راضی ضرور تھے لیکن موروثی امیر زادے کی اپنی مسلمہ حیثیت کی نفی کے بدل میں ہرگز نہیں ۔ وہ ان کی جائز قانونی حیثیت پر شک کرنے کا میلان نہیں رکھتے تھے لیکن ان کی اس حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے وہ اپنی جائز قانونی حیثیت جتانے کے بھی آرزو مند تھے ۔ ابتدا ہی سے وہ اس ادعا پر قائم رہے کہ اگر انگریز ان کے مقدمے میں عدالت عالیہ کا اختیار رکھتے ہیں تو وہ مقدمے کی حقیقتِ حال کی بنیاد پر دادرسی کے لیے ان سے رجوع ہوں گے لیکن ہمیشہ " ایشیائی معاشرے کے نظام مراتب میں اپنے رتبے اور مقام " سے مطابقت کے ساتھ ۔ یہی وجہ تھی کہ وہ درخواست گذار تھے لیکن خوشامدی نہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ان کی مدح میں قصیدے لکھتے تھے ۔ یہ شاعر کی ریاضت تھی اور غالباً اس کے لیے روزی کمانے کا واحد ذریعہ ۔ قصیدہ صاحبِ اختیار کی سرپرستی اور اس کی طرف سے مالی فائدے کی امید میں ایک طرح کی سرمایہ کاری تھی اور اس وقت مروج مسلمہ قاعدوں کی رو سے اسے جواز بھی حاصل تھا اور قابلِ عزت مقام بھی ۔ امر واقعہ یہ ہے کہ حکم راں شاعروں سے اس کی توقع رکھتے تھے اور اگر انگریزوں کی افتادِ مزاج ایسی نہیں تھی تو غالب ان تک رسائی کے کسی دوسرے طریقے سے واقف نہیں تھے ۔ قصیدہ لکھنے کا مطلب پست غلامانہ ذہنیت کا اظہار نہیں تھا ۔ یہ لازمی طور سے کاسہ لیسی کی علامت نہیں تھا بلکہ یہ تعارف کا ایک ذریعہ تھا ، روایتی پیش کش تھا جس کا مقصد سرپرست اور زیرِ سرپرستی فرد کے درمیان مناسب اور باعزت تعلق کے لیے زمین ہموار کرنا ہوتا تھا ۔ بلاشبہ قصیدے میں مدح مبالغہ آمیز ہوتی تھی لیکن اس کی لفظی یا سنجیدہ تعبیر مقصود نہیں ہوتی تھی ۔ غالب قصیدے بغیر کسی خاص کوشش کے ایسے لکھتے تھے جیسے کوئی بندھا ٹکا کام کیا جاتا ہے اور اکثر ان کا مذاق بھی اڑاتے تھے ۔ انھوں نے ایک دفعہ اودھ کے نواب امجد علی شاہ کی شان میں قصیدہ لکھا تھا جو بعد میں معزول ہوئے ۔ قصیدہ پیش ہونے سے پہلے امجد علی کا انتقال ہوگیا چناں چہ باپ کی جگہ غالب نے ان کے بیٹے واجد علی شاہ کا نام شامل کردیا اور فقرہ چست کیا " آخر تو یہ خدا ہی کی کرنی تھی ۔" اس طرح کی غیر سنجیدہ حرکت کے جواز میں بہت اونچی نظیر بھی موجود تھی ۔ غالب دعوے سے کہتے تھے کہ نام ور شاعر انوری کے لیے ایک ہی قصیدے کو باری باری مختلف ممدوحوں کی خدمت میں پیش کرنا معمول میں داخل تھا ۔

غالب اپنا مقدمہ اس لیے ہارے کہ انگریزوں کا کبھی ارادہ تھا ہی نہیں کہ مقدمے کا نفس معاملہ کے لحاظ سے فیصلہ کیا جائے ۔ ان کا کام اپنے سیاسی اقتدار کو استوار کرنا تھا اور وہ وظیفہ خوار ہندستانی امرا کی حد سے زیادہ ناز برداری کو مفید مطلب بالکل نہیں سمجھتے تھے ۔ یہ نظریاتی مغائرت تھی جس نے مرورِ زمانہ کے ساتھ مسلمہ پالیسی کی شکل اختیار کی ۔ غالب کی کوشش یہ تھی کہ اپنی

دست نگری کو خدمت اور صلے کے نظریے کا جامہ پہنائیں ۔ انگریز چاہتے تھے کہ بنیادی سوالات سے ہٹ کر ۔ " جا جائے چاہے وہ کتنے ہی کڑے کیوں نہ ہوں ۔ مثلاً کیا یہ واقعی ضروری ہے ؟ کتنی رقم اور کتنی مدت کے لیے ؟ جاگیردارانہ طبقاتی کردار سے بالکل میل نہ کھاتا ہوا یہ نقطہ ، نظر غالب کے لیے سخت ناگوار تھا ۔ " روبہ زوال طبقہ ، امرا کے ایک رکن کی حیثیت سے ان کی آزردگی کی وجہ انگریزوں کی بہ طیب خاطر داد و دہش کی عدم صلاحیت تھی اور یہی عدم صلاحیت جو کچھ دیا جائے اسے ایک شریف آدمی کی طرح خوش ، اسلوبی سے قبول کرنے کی ان کی صلاحیت کو بہ روئے کار نہیں آنے دیتی تھی ۔ " خلعتِ فاخرہ ، قصیدے کا مناسب صلہ یا دربار عام میں صحیح جگہ نہ صرف شخصی نمود و نمائش کے نقطہ ، نظر سے اہمیت رکھتی تھی بلکہ اس امر کے اشارے کے طور سے بھی کہ انگریز ان کے مرتبہ ، شریف زادگی کو اور نتیجتہً اس سیاسی و سماجی نظام کو قبول کرتے ہیں جس میں ہی ایسے کسی رتبے کی اہمیت تھی ۔ اس نظام کے منتہائے کمال پر مغل بادشاہ تھے ۔ وہ بھی اپنی جائز ممتاز حیثیت کے لیے لڑ رہے تھے ۔ اور غالب کی طرح ان کے ہتھیار بھی وہی تھے ، ادعا ، یادداشتیں ، عرض داشتیں اور مرافعے ۔ ۱۸۰۵ ء میں لارڈ ویلزلی نے اکبر شاہ ثانی کو سالانہ پندرہ لاکھ روپیے بہ طور وظیفہ ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا ۔ بعد میں انگریزوں نے گیارہ لاکھ روپیے سے زیدہ ادا کرنے سے انکار کردیا ۔ اکبر شاہ نے وعدے کی اس خلاف ورزی پر احتجاج کیا ، اور جب یہ بےاثر ثابت ہوا تو انھوں نے راجہ رام موہن رائے کو اپنے سفیر کی حیثیت سے مجلسِ نظما میں راست شکایت پیش کرنے کے لیے انگلستان بھیجا ۔ اگلی بار ایسی ہی اپیل بادشاہِ انگلستان کے حضور میں کی گئی جب انگریزوں نے مغل بادشاہوں کے اپنے کسی بھی بیٹے کو جانشین نام زد کرنے کے حق میں قطع دبرید پر اصرار کیا ۔ نذر پیش کرنے کے مسئلے پر بھی لڑائی ایک عرصہ ، دراز تک لڑی گئی ۔ قانوناً انگریزوں کا شمار مغلوں کے وابستگان اور زیرِ دستوں میں تھا اور باریابی یا تقاریب کے موقع پر اپنے اس موقف کو تسلیم کرتے ہوئے وہ جہاں پناہ کی خدمت میں نذر پیش کرتے تھے ۔ جب نذر کی پیش کشی کے اس دستور کو موقوف کرنے کی کوشش کی گئی تو بہادر شاہ نے پُر زور طریقے سے احتجاج کیا ۔ ایک بار پھر معاملہ کمپنی کی مجلس نظما سے رجوع کیا گیا جن کا بہ ظاہر یہ منشا نہیں تھا کہ معاملہ قبل از وقت ایسی نازک شکل اختیار کرے ۔ بہادر شاہ جانتے تھے کہ اس مضمون کا ایک مراسلہ لندن سے فورٹ ولیم آچکا ہے ۔ غالب کی بہت سی عرض داشتوں اور درخواستوں کے بالکل مشابہ اسلوب میں انھوں نے گورنر جنرل کو لکھا : " جناب والا کے علوئے مزاج اور نام وری سے میں انصاف اور فراخ دلی کی اور اس امر کی توقع رکھتا ہوں کہ آپ ازراہِ مہربانی کلکتے میں سرکاری کاغذات میں تلاش کروائیں گے اور یہ پتہ چلنے پر کہ اس طرح کے احکام یورپ سے موصول ہوئے تھے ازراہِ عنایت ایجنٹ کے نام گزشتہ دو سال کی واجب الادا نذر کی رقم پیش کرنے اور آئندہ بہ پابندی اس دستور پر عمل کرنے کے لیے ضروری احکام صادر فرمائیں گے ۔ ایسا کرنے سے میری دل جوئی ہوگی اور آپ کی نام وری میں اضافہ ہوگا ۔ " لیکن اس لکھنے لکھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا ، نذر پیش کرنے کا دستور ۱۸۵۱ ء میں باقاعدہ موقوف کردیا گیا ۔ سالانہ وظیفے میں کبھی اضافہ نہیں کیا گیا اور جانشین کے انتخاب کے حق سے مغلوں کو بالکل محروم کردیا گیا ۔

غالب جس چیز کے لیے اپنی سطح پر لڑے اور ناکام رہے ، بہادر شاہ اسی چیز کے لیے اپنی سطح پر لڑے اور ناکام رہے ۔ اپنا حق منوانے کے لیے دوسرے ذرائع کی عدم موجودگی میں دونوں قانونی دادرسی کے لیے جم کے لڑے ۔ دونوں کے مقدمے ازروئے قانون حق بہ جانب تھے ۔ دونوں نے دلی میں انگریز عہدہ داروں کو نظر انداز کرتے ہوئے لندن میں مجلس نظما کے پاس مرافعہ کیا ۔ جب یہ بےسود ثابت ہوا دونوں نے راست فرماں روائے برطانیہ کے حضور میں مرافعہ کیا ۔ برطانوی شعورِ عدل و انصاف سے اپیل کرتے ہوئے دونوں نے نہ ہی فرو مایگی کا مظاہرہ کیا اور نہ ہی چاپلوسی کا ، انھوں نے علانیہ وہ روش اختیار کی جو اس حیثیت اور

رتبے سے مطابقت رکھتی تھی جس کے وہ دعوےدار تھے ۔ درخواستوں اور عرض داشتوں کے شائستہ طرزِ بیان کے پس پردہ بہادر شاہ جانتے تھے کہ وہ اپنی بقا کے لیے سیاسی لڑائی لڑ رہے ہیں ۔ غالب انگریزوں کی نظر میں مغل چوکھٹے میں اپنی صحیح جگہ تسلیم کروانے کے لیے لڑائی لڑ رہے تھے ۔ بہادر شاہ اور غالب کی قسمت اور تقدیر باہم دگر مضبوطی کے ساتھ مربوط تھی ۔ انگریزوں کی طرف سے برائے نام مغل اقتدار اعلیٰ کے اعتراف کا مفہوم بالکنایہ اس جاگیردارانہ نظام کو تسلیم کرنا تھا جس کا مغل بادشاہ صدر تھا ۔ غالب اس اعتراف کی بنا پر ہی خود اپنے رتبے کے پورے احساس کے ساتھ انگریزوں سے رجوع ہوئے تھے ۔ لیکن مغل بادشاہ اور غالب ایک ہی تاریخی عمل کے کشتگان میں سے تھے ۔ وہ اس حکومت سے قانونی دادرسی کے خواست گار تھے جو جان بوجھ کر ان کے قانونی حقوق کی قطع و برید کے درپے تھی ۔ یہ ایک قانونی لڑائی بالکل نہیں تھی ، یہ ایک سیاسی لڑائی تھی جو مغل بادشاہ صریحی طور پر ہار رہے تھے ۔ اور غالب کا بنیادی المیہ یہ ہے کہ وہ اس صورتِ حال سے لازمی طور پر واقف بھی رہے ہوں گے ۔ ان شاہی لوازم سے جو لال قلعے کی چاردیواری میں مغل بادشاہ نے ابھی تک ترک نہیں کیے تھے شاید عام آدمی کو اس مغالطے میں مبتلا رہنے کی تحریک ملی ہو کہ تماشا تو ابھی ختم نہیں ہوا ۔ لیکن چوں کہ وہ ایک شاعر نیز غیر معمولی حساس اور حد درجہ زودفہم شخص تھے یہ تقریباً یقینی ہے کہ بہ روئے کار حقیقی عوامل کو نہ سمجھتے ہوئے بھی غالب اس امر سے آگاہ تھے کہ شان دار مغل عمارت اور اس کے مستلزم اداروں کی بنیادیں کھوکھلی ہوچکی ہیں ۔ ملک کے دوسرے باشندوں کی طرح سے یہ بات ان کی بھی گرفت میں نہ آئی کہ انقلاب سر ہی پر منڈلا رہا ہے لیکن عام آدمی کے برعکس ان کو یہ سمجھنے کا شعور بھی تھا اور موقع بھی حاصل تھا کہ انقلاب وقوع پذیر ہورہا ہے اور وہ سیاسی نظام ، جس سے وہ واقف تھے ، شکست و ریخت کے عمل سے گذر رہا ہے ۔

وہ یہ ضرور جانتے رہے ہوں گے کہ مغل اقتدار کو کچھ ہی عرصہ پہلے ایسی ذلت اٹھانی پڑی ہے کہ اس سے پہلے اس کی نظیر نہیں ملتی ۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں مغل بادشاہ کو جاٹوں ، مرہٹوں ، افغانوں اور نادرشاہ کے ہاتھوں جن مصائب کو برداشت کرنا پڑا وہ قصص و روایات کا ایک حصہ اور زبان زد خاص و عام تھے ۔ قلعے میں پابندی سے حاضری دینے والے ایک فرد اور بعد میں شاعری میں استادِ شاہ کی حیثیت سے غالب انگریزوں کو متاثر کرنے کی بہادر شاہ کی لاحاصل اور باعثِ ذلت کوششوں سے ضرور واقف رہے ہوں گے ۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ قلعہ ، معلیٰ اپنی گذشتہ شان و شوکت کے مقابلے میں مادی طور پر کس حد تک زوال پذیر ہوچکا ہے ۔ جیسے ہی سیاسی اقتدار کی جوش اور ہیجان میں لانے والی لہریں خشک ہونا شروع ہوئیں شاہی محل ایسے مرجھایا جیسے ایک پودا پانی کی کمی سے مرجھاتا ہے ۔ نادر شاہ کا تختِ طاؤس کو لے جانا اس کی ویرانی کی وجہ نہیں تھی اور نہ ہی جاٹوں اور غلام قادر روہیلہ کی غارت گری سے پہنچنے والا نقصان ناقابلِ تلافی تھا ۔ لال قلعے کی خستہ حالی کی وجہ یہ تھی کہ اب مغل خود سلطنت کے فرماں روا نہیں رہے تھے ۔ ان کے اختیارات ایک بے حقیقت صوبےدار کے اختیارات سے بھی کم تھے اور ان کے ذرائع آمدنی اکبر کے زمانے کے کسی اوسط درجے کے منصب دار کے ذرائع آمدنی سے بھی کم تھے ۔ استف ہیبر ، جسے ۱۸۲۴ء میں محل دیکھنے کا موقع ملا تھا ، لکھتا ہے کہ کسی زمانے میں شان دار دیوانِ عام " ہر طرح کے کاٹ کباڑ ، ٹوٹی ہوئی پالکیوں اور خالی صندوقوں سے اٹا ہوا تھا اور تختِ شاہی پر کبوتروں کی بیٹ کا ایسا ردا جما ہوا تھا کہ اس کے نقش و نگار بہ مشکل قابلِ شناخت رہ گئے تھے ۔" ہیرے جیسی موتی مسجد " بھی اسی کس مپرسی کی حالت میں اور خستہ حال تھی ، اس کی دیواروں سے پیپل کے پیڑ اگ رہے تھے اور کوئی پرسانِ حال نہیں تھا ۔" کم و بیش اسی زمانے میں سیر کے لیے آنے والے ایک اور شخص نے دیکھا کہ دیوانِ خاص میں جواہر کی جگہ نقلی جواہر نے لے لی ہے جو چمک دمک کے فریبِ نظر کا باعث تو ہوتے ہیں لیکن جن میں جواہر کی اصلی درخشانی کا فقدان ہے ۔ یہ

ایسا فرق تھا جو مغل بادشاہوں کی حقیقی قلبِ ماہیت کو علامتی طور سے ظاہر کرتا تھا ۔ غالب اس بربادی اور بوسیدگی کو بہ آسانی محسوس کرسکتے تھے ، اس لیے نہیں کہ وہ اس کا زیادہ اقبال مندی کے دنوں سے موازنہ کرسکتے تھے بلکہ اس لیے کہ وہ بچپن ہی سے مغلوں کے شاہانہ تمول اور شان و شوکت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے والی کہانیاں سنتے آئے تھے ۔ ہیرے اور زمرد ، لعل اور نیلم جیسے قیمتی پتھر اور خالص سونے کے نقش و نگار کے ساتھ لاجورد ، عقیق اور فیروزے وغیرہ وغیرہ کی نفیس مرصع کاری ، نہایت بیش قیمت ریشمی پردے ، پُر تکلف قالین اور تختِ طاؤس اتنے زیادہ قریب زمانے میں معرضِ وجود میں تھے کہ ان کو بھلانا ممکن نہیں تھا ۔ غالب اپنے بادشاہ کو دہرے ہوکر تسلیم بجالاتے ہوئے بھی لامحالہ گردوپیش کی بوسیدگی پر غور کرتے رہے ہوں گے اور انگریز رزیڈنٹ کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے سامنے بادشاہ کی گھٹتی ہوئی اہمیت کا احساس بھی انھیں لازمی طور پر ہوتا رہا ہوگا ۔

ایک شاعر کی حیثیت سے آشوبِ زمانہ کا شدید احساس رکھنے میں غالب انوکھے نہیں تھے ۔ پچھلی صدی کے تین نام ور شعرا ، سودا ، خواجہ میر درد اور میر تقی میر کی اپنے عہد کے واقعات کے تعلق سے تاثر پذیری بھی ایسی ہی تھی اپنی متعدد تحریروں میں سودا نے اس وقت کی افراتفری اور نراج پر اور مغل بادشاہ کی بےکسی و بےچارگی پر ماتم کیا ہے ۔ سودا کے ہم عصر میر نے بھی ایسے ہی کرب کا اظہار کیا ۔

۱۷۸۸ء میں غلام قادر روہیلہ کے ہاتھوں شاہ عالم ثانی کے اندھے کیے جانے سے دلی کے ہر باشندے کے ہوش گم ہوگئے تھے لیکن یہ میر تقی میر تھے جنھوں نے شعر کے ذریعے اس المیے کو زندہ ، جاوید بنایا ۔

غالب کے زمانے میں اتھل پتھل اور ذہن کو متوحش کردینے والے واقعات زیرِ زمین ہوگئے تھے ۔ پچھلی صدی کی افراتفری اور نراج کی جگہ " امنِ برطانوی " کی منجمد بےانصافی نے لے لی تھی ۔ قسمت آزما لٹیرے اور دغاباز دیوان برطانوی حکومت کے بہ زور وجود میں لائے ہوئے استحکام سے مغلوب ہوچکے تھے ۔ غلام قادر روہیلہ یا نادرشاہ کی طرح انگریز لوٹ مار کر جلد از جلد رخصت ہوجانے کی مہم پر دلی نہیں آتے تھے ۔ استعماری حکومت کا تقاضا نظم و ضبط کا قیام اور سیاسی غیر یقینی کیفیت کا اختتام تھا ۔ انگریزوں کے پاس اپنے سیاسی اقتدار کی پشتی بانی کے لیے مادی طاقت تھی اور انھوں نے اس امر کو ذہن نشین کرنے کے لیے کہ ان کی حکومت چاردن کی چاندنی نہیں ہے ان دونوں کو نظم و نسق کے ایک بنیادی نظام کے قیام کے لیے استعمال کیا ۔ محاصل کی موثر طریقے سے وصولی سیاسی مخالفت کو سختی سے نیست و نابود کرنے کے بعد ہی روبہ عمل لائی جاسکتی تھی نیز ادا کنندہ کو اچھی طرح سے یہ یقین دلانے کے بعد کہ وصول کنندہ استواری کے ساتھ صاحبِ اختیار و اقتدار ہے ۔ یہی وہ استعماری طریقِ عمل تھا جس نے دلی کے ہر طرف سے مصیبتوں کے نرغے میں پھنسے باشندوں کے لیے معمول کی زندگی کا بھرم بحال کیا ۔ لیکن اس مغالطے میں ڈالنے والے سکون کے نیچے غالب کو ایک گہری پیش اندیشگی کا احساس تھا کہ کوئی بنیادی تغیر واقع ہو رہا ہے اور قوانین ، قابلِ اعتماد سہارے اور معتبر شہادتیں ، جیسا کہ وہ انھیں جانتے تھے ، ناقابلِ تنسیخ طور پر تغیر پذیر ہیں ؛

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز   گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفت است

(بادِ مخالف چل رہی ہے ، رات اندھیری ہے اور سمندر میں طوفان آیا ہوا ہے ۔ جہاز کا لنگر ٹوٹ چکا ہے اور ناخدا سو رہا ہے) ۔

برطانوی اقتدار کے استحکام و توسیع اور مغل اقتدار اعلیٰ کے زوال کے مابین توافقِ زمانی اتنا واضح تھا کہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اس پر نظر نہ پڑے ۔ یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ غالب ان دو کے باہم دگر تعلق کا ادراک ایک زوال پذیر جاگیردارانہ نظام اور اس کو مغلوب کرنے والی استحصال کنندہ استعماری طاقت کے مفہوم میں نہ کرتے رہے ہوں ۔ وہ برطانوی وجود کو تسلیم کرنے کو

منی تھے کیوں کہ ان کے خیال میں یہ کوئی اخلاقی مسئلہ بالکل نہیں تھا ۔ ان کے زمانے کے سیاق و سباق میں جہاں پناہ کے حضور ں دہرے ہوکر تسلیمات بجالانے اور انگریز رزیڈنٹ کو سلام عرض کرنے میں کسی تضاد یا تناقض کا پہلو نہیں کھلتا تھا ۔ عمل درآمد کی سیت اور بے یقینی کے دباؤ نے ان دونوں کو ترتیب دے کر خدا اور قیصر والے اس فارمولے کے ہم آہنگ اطلاق کی تشکیل کی ں ، دونوں کو وہ ادا کرو جو ان میں سے ہر ایک کو واجب الادا ہے ۔ ایک کو وہ تعظیم دو جواز روئے قانون اقتدارِ اعلیٰ کا حق ہے ۔ سرے کو وہ قبولیت دو جو بالفعل حکومت کی حیثیت سے اس کا حق ہے ۔ لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ اور پنشن کے مقدمے میں خود پنے تجربے کی روشنی میں غالباً انھوں نے سمجھ ہی لیا کہ انگریز موجودہ نظام میں غیر جذب پذیر بھی ہیں اور اس سے متناقض بھی ۔ اس ساس نے کلیتہً استدلالی کبیدگی کی شکل کبھی نہیں اختیار کی ۔ یہ ادراک کی محض خفیف سی ایک جھلک تھی ۔ استعماری طریقِ عمل کے یتی نتائج و عواقب کا ابتدائی نیز مبہم تصور تھا ۔ اس ادراک کی شہادت میں ان کی تحریروں میں ، کم از کم ۱۸۵۷ء سے قبل کے عہد ں ، ہم کو وضاحت سے کوئی بات نہیں ملتی ۔ لیکن ارادۃً مبہم پیکر تراشی کے باوجود حسبِ ذیل اشعار کا گہرا طنز کافی واضح اشارے ہم کرتا ہے :

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا   رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہ زن کو
فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے   متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہ زن پر

ں کبھی یہ پیکر تراشی خطرناک حد تک واضح بھی ہوسکتی تھی :

آئی اگر بلا تو جگر سے ٹلے نہیں   ایرا[1] ہی دے کے ہم نے بچایا ہے کشت کو

رہ زن “ اور ” دزد “ جیسے الفاظ بار بار استعمال میں آتے ہیں ۔

سپہر را تو بہ تاراج ما گماشتہ ،   نہ ہرچہ دزد زما برد در خزانہ تست

(چرخِ گردوں کو تو نے ہمیں تاراج کرنے پر مقرر کیا ہے ۔ لیکن جو کچھ راہ زن نے ہم سے چھینا وہ تیرے خزانے میں تو نہیں پہنچا)

اس ڈھٹائی سے جمے رہنے والے رہ زن کے سامنے شاعر خود کو بے بس اور سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور محسوس کرتا تھا اور ے ایسا لگتا تھا کہ سبھی وسائل اس کی دست رس سے باہر ہیں اور وہ جو بھی کرے نتیجہ صفر ہی رہے گا ۔

غالب کچھ اپنی سعی سے لینا نہیں مجھے   خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

ے اور شعر میں انھی جذبات کا اظہار ملتا ہے لیکن غیر معمولی باموقع پیکر تراشی کے ساتھ ۔

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر   کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

بڑی حد تک بے بسی کا یہ احساس نتیجہ تھا خود جہاں پناہ کی اس بے بسی کا جس کا سبھی کو شدت سے احساس تھا ۔ اپنے سی اشعار میں سے ایک میں غالب خود اپنی حالت کو میرِ کارواں سے مربوط کرتے ہیں ۔

براہِ خفتنِ من ہر کہ بنگرد داند   کہ میرِ قافلہ در کارواں سرا خفت است

ں اوقات صورتِ حال کے تعلق سے وہ غیر سنجیدہ بھی ہوسکتے تھے ،

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا   لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

---

[1] ایرا : وہ مہرہ جس کی قربانی دے کر شاہ شطرنج کو مات سے بچایا جائے ۔

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ بنیادی طور سے جاگیردارانہ شاہی نظام کے ساختہ پرداختہ فرد کی حیثیت سے انھیں ایک ایسے مستحکم شاہی مرکز کی غیر موجودگی کا شدید احساس تھا ، جس سے وہ اپنی شناخت کا رشتہ جوڑ سکیں ۔

کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے ، مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی ۔ ۔ ؟

یا پھر

سخن نیست در لطفِ ایں قطعہ غالب بہشتے بود ہند کا دم ندارد

(غالب اس قطعے کی لطافت میں کوئی شبہہ نہیں ۔ ہندستان ایک بہشت ہے جس میں آدم کا وجود نہیں)

ایک سطح پر شاہی مرکز کی اس غیر موجودگی کو ایک سیاسی تصورِ مجر کی حیثیت سے اپنے داخل کا ایک جزو بنالیا گیا اور دوسری سطح پر اس کے نتائج و عواقب ٹھوس اور مادی بھی تھے ۔ عہدِ وسطیٰ کی روایت میں ایک پیشہ ور شاعر کا اہم ترین وجہ معاش شاہی سرپرستی تھی ۔ اگر شاعر کی زندگی شاہانہ فیاضی کے عہد میں بسر ہوتی تو اس کے شاہی سرپرست کی داد و دہش بےحساب بھی ہوسکتی تھی ۔ غالب کی توقعات جن کا سرچشمہ یہ روایت تھی ، اس عہد کے سیاسی حقائق سے بری طرح ٹکرائیں ۔ مغل دربار کی جھوٹی ٹیپ ٹاپ کسی سے چھپی نہیں تھی ۔ بہادر شاہ ظفر خود شاعر اور شاعری کے سرپرست تھے لیکن سیاسی حالات نے مغلوں کے پاس صرف شاعری کی قدر پہچاننے کی حس چھوڑی تھی لیکن شعر لکھنے والوں کی مالی اعتبار سے دل جوئی کے لیے کافی وسائل نہیں چھوڑے تھے ۔ شیخ ابراہیم ذوق شاعری میں استادِ شہ تھے اور اپنی خدمات کا مالی صلہ بھی بےشک پاتے تھے ۔ مغل داد و دہش کی خلعتِ بوسیدہ صرف اس قابل رہ گئی تھی کہ اس پر دکھاوے کے لیے بہ مشکل ایک رتن ٹانکا جاسکے ، وہ اکبرِ اعظم کے برعکس جس نے بے تکلف و بہ سہولت تمام شان و شوکت کے ساتھ ایسا کیا ، نورتنوں کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی ۔ ذاتی سطح پر ظفر کے ذوق کو بہ حیثیت ملک الشعرا منتخب کرنے پر غالب ناراض تھے ۔ تاہم مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے بادشاہ کو ان کی پسند کے لیے معاف کیا جاسکتا ہے مگر اس دور کے حالات کو کیسے معاف کیا جائے جنھوں نے شاہی داد و دہش پر اس شدت سے روک لگادی تھی کہ غالب جیسے نام ور شاعر کے حصے میں نام وری کے علاوہ اور کچھ بھی تو نہیں آسکتا تھا ۔

غالب کی اس مخفی کبیدہ خاطری کی جھلک ان کی تحریروں میں نظر آتی ہے ۔ مغلیہ شاہی خاندان کی مجوزہ تاریخ کی پہلی جلد " مہرِ نیم روز " کی تمہید میں وہ ظفر کو شاہ جہاں کے عہد کی یاد دلاتے ہیں جب شاعر کلیم کو اکثر سونے چاندی ، لعل اور موتیوں میں تولا جاتا تھا ۔ شکایت کی شدت میں اس وقت اضافہ ہوتا ہے جب وہ آگے در پردہ تعریض کرتے ہیں کہ کلیم کے اشعار خود ان کے اشعار کے سامنے جھکے دکھائی دیں گے ۔ اگر مغل غالب کی توقعات کو پورا کرنے سے قاصر تھے تو انگریز انھیں پورا کرنے کے لیے رضامند نہیں تھے ۔ ملکہ ، وکٹوریہ کی شان میں ایک قصیدے میں غالب نے اس کا ذکر کر کے کہ ایران کے شہنشاہ اور دوسرے فاتح بادشاہ معمولاً اپنے شاعروں کو گاؤں جاگیر میں عطا کر کے اور ان پر سونے موتی کی بوچھاڑ کرکے مالا مال کردیتے تھے بہ صراحت بتایا کہ ان کی توقعات کیا ہیں ۔

ماضی کے اس تصوّر اور زمانہ ، حال میں غالب کی تنگ دستی کا فرق روزِ روشن کی طرح عیاں تھا ۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ زمانہ ، حال سے اظہارِ ناخوشی کے لیے وہ ماضی کی دہائی دینے کو ترجیح دیتے تھے اور یہ ممکن ہے کہ ان کے اردو پر فارسی کو پرزور اور علانیہ طور پر ترجیح دینے کی اصل یہی علت تھی ۔ اردو ان کے زمانے کی عام پسند زندہ زبان تھی ، اس میں اس نوخیز زبان کا جوش اور زور تھا جس نے ادبی نقطہ ، نظر سے اپنا شایانِ شان مقام حاصل کرلیا تھا ۔ لیکن اردو پر ایک داغ تھا ۔ وہ

سیاسی افراتفری اور زوال کے عہد کی پیداوار تھی ۔ یہ اکبر یا شاہ جہاں کے درباروں جیسے کسی مقتدر اور نام ور دربار کی زبان نہیں تھی ۔ یہ تو کم زور پڑجانے والے اور بڑھتی ہوئی تنگ دستی کے شکار طبقہ ، امرا کی اشک شوئی کا ایک ذریعہ تھی ۔ یہ ادب میں بہارِ نو کی علامت رہی ہوگی لیکن یہ فارسی کی طرح ایک طاقت ور جاگیر دارانہ شاہی نظام کی رابطے کی زبان نہیں تھی ۔ ایک مورخ کی حریت فکر کو بروئے کار لاتے ہوئے دیکھیں تو صورتِ حال بلاشبہ نہایت دل چسپ تھی ؛ ایک روبہ تنزل اور ناکام جاگیردارانہ نظام کی حدود میں ایک جدید زبان میں ادب کی نشاۃ ثانیہ عمل میں آرہی تھی ۔ گو کہ اس سے زمانہ ، مابعد میں اردو ادب کی ترقی کی بنیاد پڑی ۔ اس صورتِ حال نے ساتھ ہی ساتھ بنیاد ڈالنے والوں کو مادی صلے یا فائدے کے وسائل سے بیش تر محروم ہی رکھا ۔ غالب کے لیے اردو کو تسلیم کرنا اس صورتِ حال کو حق بہ جانب قرار دینے کے مترادف ہوتا ۔ اس کو قبول نہ کرنا ان کے احساس محرومی و ناکامی کی علامت تھی اور ان کے غلط وقت پر اور غلط جگہ پیدا ہونے کے احساس کی ۔ غالب کے ہم عصر اور سوانح نگار حالی نے ، جو اعلیٰ درجے کی ذہنی قابلیت کے شاعر بھی تھے ، ذکر کیا ہے کہ غالب اردو میں شاعری کو کوئی کارِ نمایاں نہیں سمجھتے تھے ۔ فی الحقیقت وہ اس زبان میں لکھنا اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے ۔

فارسی کا ، جسے تاریخی وجوہ کی بنا پر خود مغلوں نے ایک گنگا جمنی ہندستانی ثقافت کی تخلیق سے مربوط کردیا تھا ، اب زندہ زبانوں میں شمار نہیں رہ گیا تھا ۔ لیکن غالب کےلیے یہ امرِ واقعہ کہ اس کو سمجھنے اور اس کی قدر پہچاننے والے اب معدودے چند ہی رہ گئے ہیں ان کے زمانے کی خرابی کا کھلا ثبوت تھا ۔ وہ اکثر افسوس ظاہر کرتے کہ ان کی اردو غزلوں کے مداح تو کافی ہیں لیکن ان کے فارسی کلام کی قدر پہچاننے والا کوئی بھی نہیں ۔ انھوں نے علانیہ اپنے اردو کلام کی مذمت کی اور بادشاہ کے لیے لکھی گئی ایک مشہور نظم میں یہ بھی تصریح کی کہ انھیں اردو شاعر ہونے کا دعویٰ ہی نہیں ہے ۔ بلاشبہ وہ اردو بہت نفیس لکھتے تھے اور آگے چل کر انھوں نے بہ شمول خطوط اپنی ساری نثر اسی زبان میں لکھی ۔ ان کی طرف سے اردو کی بہ بانگِ دہل ناقبولیت غالباً ایک ایسے تاریخی دور سے غیر استدلالی رو گردانی کی محض ایک تقریب تھی ، جس کی یہ زبان ایک غیر معمولی طور پر نمایاں علامت بن چکی تھی ۔ جیسا کہ انھوں نے کہا :

بود غالب عندلیبے از گلستانِ عجم ‏ ‏ ‏ ‏ من زغفلت طوطیِ ہندوستان نامیدش

(غالب گلستانِ عجم کا عندلیب تھا ۔ اپنی لا علمی کی وجہ سے میں نے اسے طوطیِ ہندستان کہا)

ماضی سے چمٹے رہنا ، زمانہ ، حال کے کسی بھی پہلو سے جو ماضی کے تسلسل کی ضمانت دے کھینچ تان کر تسکین حاصل کرنا ایک ڈھیتے ہوئے جاگیردارانہ نظام کے ملبے میں پھنسے افراد کا کم و بیش فطری ردِّ عمل ہے ۔ غالب کا اپنی عالی نسبی کے بارے میں بارہا دہرایا جانے والا اور مبالغہ آمیز ادعا غالباً اسی ردِّ عمل کا مرہونِ منت ہے اور جب اسے مدِّ نظر رکھا جائے تو بلاشبہ زیادہ قابلِ فہم ہے ۔ ان کے اجداد بھاڑے کے سپاہی تھے جو اپنے میدانِ عمل میں اس حد تک کام یاب ہوئے تھے کہ غالب بجا طور پر اشرافیہ کے رتبے کے دعوے دار ہوسکتے تھے ۔ انگریزوں کو اس امر کا قائل کرانا غالب کے لیے وقار کا مسئلہ تھا اور تدبیر کا بھی ۔ لیکن اس بات کی شہادت ہے کہ غالب نے اپنی عالی نسبی کے بارے میں بار بار دہرائے جانے والے مبالغے کو واقعی سچ ماننے کے لیے خود کو قائل کرلیا تھا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بالفعل برطانوی اقتدار کی چھتر چھایا تلے ایک بےبس بادشاہ اور تہی دست و پا امرا کے پاس اپنی شاموں کو اپنے جنگ جویانہ ماضی کی یادوں سے رنگین بنانے کے علاوہ اور کچھ بچا ہی نہیں تھا ۔ ان کی وظیفہ خواری کی زندگی ان کے اجداد کے زمانے سے ، جب سلطنتیں قائم کی گئی تھیں اور ملک و دولت کی فراوانی تھی ، جتنی زیادہ دور ہوتی جاتی تھی ، اتنا ہی زیادہ

وہ اپنے فرصت کے اوقات اپنی عالی نسبی کی مبالغہ آمیز تعریف و توصیف میں صرف کرتے تھے کہ ہمارے اجداد لیقینًا نام ور امیر اور ایسے بہادر سورما تھے ۔ یہ انہماک اور ذہنی کیفیت اتنی واضح تھی کہ اتفاقًا ملک کی سیر کو آنے والا بھی اسے محسوس کر سکتا تھا : " یہ محض عہدے کی خواہش نہیں ہے جو تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ہندستان کے پرانے ادوار کی یاد کو سینے سے لگائے رکھنے پر مجبور کرتی ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ " ہم بادشاہ اور اس کے خاندان کی سلامتی کے لیے ہر رات دعا کرتے ہیں کیوں کہ ہمارے آبا و اجداد نے اس کے آباد و اجداد کا نمک کھایا تھا ۔" یعنی ان کے باپ دادا اس کے باپ دادا کی ملازمت میں تھے اور نتیجۃً ان کا شمار ملک کے طبقۂ امرا میں ہوتا تھا ۔ آیا یہ واقعی ایسا تھا اس کی کوئی اہمیت نہیں ۔ انھوں نے خود کو اور اپنے بچوں کو باور کرادیا کہ صورتِ حال ایسی ہی تھی ۔"

دلی پر انگریزوں کے فوجی قبضے نے ان سیاسی آرزوؤں اور امیدوں کا جن کی جاگیردار امرا لو لگائے رہتے ہوں گے گلا گھونٹ دیا ۔ ساتھ ہی ساتھ مگر محض اتفاقًا نہیں ، سماج کا یہ طبقہ مالی پریشانیوں میں بھی مبتلا تھا ۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں موروثی طور پر اور سونے پر سہاگہ یہ کہ خود اپنی طبیعت کی افتاد کے لحاظ سے غالب کا نظریہ ، زندگی جاگیردارانہ تھا ۔ وہ خاندانی امرا کے دائرہ ، اقتدار میں کمی سے اور عوام کا لا انعام کی طرف سے اس جاہ ، پرُ تکلف کے ، جو ہمیشہ سے مغل اقتدار کی زینت تھا ، تار تار کیے جانے پر برہم تھے ۔ ان کا ردِ عمل زمانے سے مناسبت رکھتا تھا : زمانہ ، حال کی ناخوش گواری سے بچنے کے لیے اپنے ماضی کو آسمان پر چڑھانے کی کوشش اور اس کے اب بھی برمحل اور مفید مطلب ہونے کا ادعا ۔ چناں چہ برطانوی سرپرستی کے دباؤ سے خمیدہ کمر اور اختیارات سے محروم بادشاہ کے سایہ ، عاطفت میں تنگ دستی کی زندگی بسر کرتے ہوئے غالب بار بار تیمور کے نام ور خاندان کا خلف اور قدیم ایران کے اساطیری بادشاہ فریدوں کی نسل سے ہونے کا اور ترکی فرماں رواؤں پشنگ ، سنجر وغیرہ مشہور زمانہ ، خانوادوں سے تعلق کا دعویٰ کرتے ہیں :

غالب از خاکِ پاکِ تورانیم   لا جرم در نسب فرہ مند یم
ایبکیم از جماعتِ اتراک   در تمامی زماہ دہ چند یم

(غالب ہم توران کی خاکِ پاک سے ہیں ۔ بلاشبہ بہ اعتبارِ نسب ہم نہایت خوش بخت ہیں ۔ ترکوں کے ایبک قبیلے سے ہمارا تعلق ہے اور کمال میں چاند سے بھی دس گنا بڑھ کر ہیں) ۔

یا پھر :

ساقی چو من پشنگی و افرا سیا بیم   دانی کہ اصل گوہرم از دودہ ، جم است
میراث من کہ مے بود اینک بہ من سپار   زیں پس رسد بہشت کہ میراثِ آدم است

(ساقی میں پشنگ اور افراسیاب کی نسل سے ہوں اور تو جانتا ہے میرے گوہر کی اصل خانوادہ ، جم سے ہے ۔ میری میراث شراب ہے اور باغِ بہشت ، یہ تو آدم کا ورثہ ہے ، جو مجھے ملنا ہی چاہیے) ۔

خاندان کی اصل اور حسب نسب کے بارے میں اس طرح کے افکار غالب کے تحریروں میں اکثر ملتے ہیں ۔ یہ ٹیپ کا مصرع ان کے ہاں اس بلند آہنگ تواتر سے دہرایا گیا ہے کہ حالی جیسے ہم عصروں نے بھی اس پر خاص طور سے توجہ دی ہے اور اس کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرزِ زندگی کو ترک کرنے کی بجائے جس کی ان کے امیرانہ اور سپ گرانہ ماضی کے ان کے اپنے تصور سے توقع کی جاتی تھی وہ متروکِ رہنے کو ترجیح دیتے تھے ۔

واقعی اس صورت میں جب کہ انگریزوں کے فوجی دستے دلی کو اپنی زد میں لیے ہوئے پہاڑی سلسلے پر مرکوز تھے یہ بات

قابلِ فہم ہے کہ غالب ترجیح اس بات کو دیتے تھے کہ ان فوجی دستوں کے بجائے اس زمانے کو نظر میں رکھیں جب خود ان کے آبا اجداد کام ران فاتحوں کی حیثیت سے ہندستان آئے ۔ کیوں کہ اگر وہ زمانہ ، حال کی طرف لوٹتے تو حقیقت واقعہ یہ تھی کہ برطا[نوی] فوجی قبضے نے سیاسی میدانِ عمل میں جاگیردار طبقے کی آرزوؤں اور تمناؤں پر قطعی طور سے پانی پھیر دیا تھا ۔ اس بارے میں ، شا[ید] تحت شعوری طور پر کبھی حسرتِ جاں کاہ البتہ رہ گئی تھی ۔ اپنے فارسی مجموعہ ، کلام میں انگریزوں کی طرف واضح اشارہ کرنے کے س[اتھ] ساتھ وہ دوسری تلافیوں کا ذکر کرتے ہیں :

گہر از رایتِ شاہانِ عجم برچیدند　　بہ عوض خامہ ، گنجینہ ، فشانم دادند

افسر از تارکِ ترکانِ پشنگی بردند　　بہ سخن ناصیہ ، فرِ کیانم دادند

(شاہانِ عجم کے جھنڈوں سے لعل و گہر نوچ لیے گئے اور اس کے عوض میں مجھے گنجینہ فشاں قلم دے دیا گیا ۔ ترکانِ پشنگی کے [سر] سے تاج چھین لیا گیا اور اس کے عوض میں میرے سخن کو کیانی بادشاہوں کا کروّ فر دیا گیا)

زیادہ صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اپنے ایک خط میں وہ افسوس ظاہر کرتے ہیں : " مجھ پر افسوس ہے کہ مجھے زیاں زدہ سوختہ ساماں بناکر پیدا کیا گیا ۔ میری تخلیق اپنے اجداد کی طرح جنگی کارناموں کے لیے نہیں ہوئی ۔ ۔ ۔ " اس آہ و زاری میں غالبؔ [کی] طرف سے ماضی کی مبالغہ آمیز حمد و ثنا کا اصلی نفسیاتی سبب مضمر ہے ، وہ مبالغہ آمیز حمد و ثنا جس نے انھیں اپنی ایک مشہور [غزل] میں یہ اعلان کرنے پر مجبور کیا کہ :

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری　　کچھ شاعری ذریعہ ، عزت نہیں مجھے

حقیقت اور اسطور تاریخ کے عبوری دور میں بہ آسانی گھل مل جاتے ہیں ۔ مغل سلطنت جاں بہ لب تھی لیکن اس کا خا[تمہ] ابھی نہیں ہوا تھا ۔ انگریز نئے فرماں روا تھے لیکن اس کا کھلے بندوں اعلان انھوں نے ابھی نہیں کیا تھا ۔ اس دھندلکے میں ماضیؔ [کے] قوانین برقرار تھے ، طرزِ زندگی میں بھی تبدیلی نہیں آئی تھی ۔ لیکن نئے واقعات و رجحانات ان دونوں کی بیخ کنی کر رہے تھے ۔ حالات میں تغیر کا ، غیر یقینی اور منقسم وفاداریوں کا ، واہمے اور حقیقت کے معنی خیز اور پیچیدہ عملِ باہمی کا دور تھا ۔ تبدیلیؔ [کی] معروضی قوتیں اور عوامل موجود تھے لیکن ابھی وضاحت کے ساتھ قابلِ شناخت نہیں تھے ۔ سیاسی شعور ماضی کے زورِ حرکت اور [ر]عب سے سحر زدہ تھا ۔ نیچے کی طرف جاتی ہوئی ڈھلان کا آخری مرحلہ شروع ہوچکا تھا لیکن ان لوگوں کے لیے جو اس کا ایک حصہ تھے ، [اس] کے اختتام پر روشنی کی کوئی سبیل نہیں تھی ۔ " خطاب اور بعض حقوق کی برقراری کے ساتھ لمحہ سلطنت کی یہ دنیا ، خستہ حالی ا[ور] ناامیدی کے پس منظر میں دیمر جیسی نفاست و شائستگی کی یہ دنیا ، مغلوں کے غروبِ آفتاب کی یہ روشنی شاید بہ تدریج خود ہی [شام] کے اندھیرے میں گم ہوجاتی ۔۔ لیکن انگریز واقعات کی رفتار بڑھانے کے لیے بےقرار تھے ۔ ۱۸۵۲ء میں انھوں نے طے کیاؔ [کہ] بہادر شاہ کی وفات کے بعد شاہی خاندان کو لال قلعہ چھوڑنا اور شہر کے باہر ، قطب مینار کے پاس کسی عمارت میں منتقل ہونا پڑے گا [۔] یہ بھی طے کیا گیا کہ بہادر شاہ کے جانشین کا خطاب " شاہ " نہیں بلکہ " شاہ زادہ " ہوگا اور انگریزوں کی طرف سے دیے جا[نے] والے وظیفے کی رقم بھی کم کردی جائے گی ۔ مغل بادشاہ کے درباری ، انگریزوں کے وظیفہ خوار ، تنگ دست امیرزادے ، مغرور رئیس[زادے] زادے اور دلی کے باشندے مرزا محمد اسداللہ خاں غالب نے زود فہمی سے نزدیک آتے ہوئے انجام کا اندازہ لگایا ۔ ۱۸۵۲ء میں انھو[ں] نے اپنے شاعر دوست جنون کو لکھا :

" قلعے میں معدودے چند شاہ زادے اکٹھا ہوتے اور اپنے اشعار پڑھتے ہیں ۔ کبھی کبھی میں بھی محفل میں شریک ہوجاتا ہوں

(باقی ص : ۵۸ پر)

ترجمہ : مضطر مجاز

غالب کی فارسی غزلیں

دل برد و حق آنست کہ دل بر نہ تواں گفت
بیداد تواں دید و ستم گر نہ تواں گفت
در رزم گہش تا چ و خنجر نہ تواں برد
در بزم گہش بادہ ، و ساغر نہ تواں گفت
پیوستہ دہد بادہ ، و ساقی نہ تواں خواند
ہموارہ تراشد بت و آزر نہ تواں گفت
ہنگامہ سر آمد چہ زنی دم زِ تظلم
گر خود ستے رفت بہ محشر نہ تواں گفت
در گرم روی سایہ و سرچشمہ نہ جوئیم
بامن سخن از طوبیٰ و کوثر نہ تواں گفت
آں راز کہ در سینہ نہان است نہ وعظ است
بردار تواں گفت و بہ منبر نہ تواں گفت
کارے عجب افتاد بدیں شیفتہ مارا
مومن نہ بود غالب و کافر نہ تواں گفت

دل لے اڑے لیکن اسے دل بر نہ کہا جائے
بیداد سہی جائے ستم گر نہ کہا جائے
جب جنگ ٹھنے تیغ نہ خنجر کی اجازت
جب بزم جمے بادہ ، و ساغر نہ کہا جائے
دے جام پہ جام اور نہ ساقی اسے کہیے
بت روز تراشے مگر آزر نہ کہا جائے
ہنگامہ ہوا ختم نہ کر نالہ و فریاد
اک ظلم ہے یہ بھی سرِ محشر نہ کہا جائے
سائے کی نہ چشمے کی طلب گرم روی میں
ہم سے سخنِ طوبیٰ و کوثر نہ کہا جائے
جو راز کہ سینے میں نہاں ہے وہ نہیں وعظ
سن دار پہ اس کو سرِ منبر نہ کہا جائے
غالب سے عجب کام ہمیں آن پڑا ہے
مومن بھی نہیں اور اسے کافر نہ کہا جائے

○

بہ شغلِ انتظارِ مہ وشاں در خلوتِ شب ہا
سرِ تارِ نظر شد رشتہ ، تسبیحِ کوکب ہا
بہ روئے برگِ گل تا قطرہ ، شبنم نہ پنداری
بہار از حسرتِ فرصت بہ دنداں می گزد لب ہا
بہ خلوت خانہ ، کامِ نہنگِ لا زدم خود را
ستوہ آمد دل از ہنگامہ ، غوغائے مطلب ہا
کند گر فکرِ تعمیرِ خرابی ہائے ما گردوں
نیاید خشت ، مثلِ استخواں بیروں ز قالب ہا

ہے شغلِ انتظارِ مہ وشاں اور خلوتِ شب ہے
سرِ تارِ نظر اب رشتہ ، تسبیحِ کوکب ہے
نہیں تو موسمِ گل اپنے لب کاٹے گا حسرت سے
تو روئے گل پہ دیکھے قطرہ ، شبنم اگر ، عجب ہے
درونِ حلقہ ، کامِ نہنگِ لا فروکش ہوں
بہ ہر سو اک عجب ہنگامہ ، غوغائے مطلب ہے
ہماری فکرِ تعمیرِ خرابی ہے جو گردوں کو
ہمارے استخواں سے بڑھ کے کوئی خشت یاں کب ہے

خوشا بے رنگیِ دل دست گاہِ شوق را نازم
نمی بالد بہ خویش ایں قطرہ از طوفان مشرب ہا
نہ دارد حسن در ہر حال از مشاطگی غفلت
بود تہہ بندیِ خطِ سبزہ ، خط در تہہِ لب ہا
خوشا رندی وجوشِ زندہ رود و مشرب عذبش
بہ لب خشکی چہ میری درسرابستانِ مذہب ہا
تو خوی پنداری و دانی کہ جاں بردم ، نمی دانی
کہ آتش در نہادم آب شد از گرمیِ تب ہا
مبادا ہم چو تارِ سبحہ از ہم بگسلد غالب
نفس با ایں ضعیفی برنتابد شورِ یارب ہا

○

گر نہ نوایا سرودے چہ غم استی
من کہ نیم گر نہ بودے چہ غم استی
زنگ زدودن نبرد ز آئینہ ، کلفت
گر ہمہ صورت زودے چہ غم استی
بختِ خود از بودے کہ تا بہ قیامت
بے خبر از خود غنودے چہ غم استی
لے نہ سخن مزد لے ستائش اگر من
کشت کدیور در و دے چہ غم استی
نیست مشامِ شمیم جوئے ، اگر من
غالیہ چندیں نہ سودے چہ غم استی
چوں در دعویٰ چناں بہ لغو کشودن
من بہ ہنر گر کشودے چہ غم استی
چوں دل یاراں تواں بہ ہزل ربودن
من بہ سخن گر ربودے چہ غم استی
گر بہ مثلِ لال گشتے کہ بہ مستی
گفتہ ، خودرا ستودے چہ غم استی
قافیہ غالب چو نیست پرس ز عرفی
گر منِ فرہنگ بودے چہ غم استی

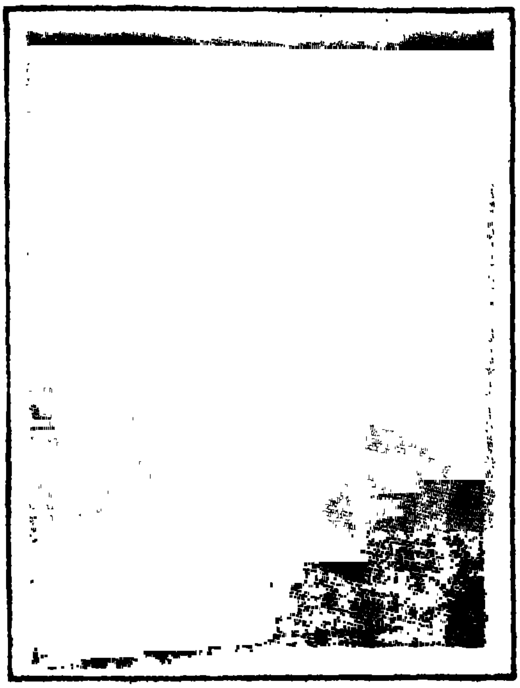
○○○

خوشا بے رنگیِ دل ، دست گاہِ شوق کے صدقے
یہ قطرہ خاک ابھرے گر یہی طوفانِ مشرب ہے
نہیں غافل کسی بھی حال میں مشاطگی سے حسن
عجب تہہ بندی خط سبزہ ، خط میں تہہِ لب ہے
سرا بستانِ مذہب میں نہ دے جاں تشنہ لب ہوکر
مئے آشامی کنارِ رود ہم مستوں کا مشرب ہے
تجھے پندار میری جان لینے کا نہ جانا یہ
کہ آتش مجھ میں پانی ہوگئی وہ گرمیِ تب ہے
نہ بن غالب تو تارِ سبحہ تک بھی ، کر حذر اس سے
ارے اتنی ضعیفی میں کہاں کا شورِ یارب ہے

○

نہیں ہوتا نوا کا مجھ کو سودا تو برا کیا تھا
یہ میں ناچیز پیدا ہی نہ ہوتا تو برا کیا تھا
کھرچتا زنگ کا آئینہ ، کلفت سے لا حاصل
میں آئینے سے صورت ہی کھرچتا تو برا کیا تھا
اگر میرا مقدر اس طرح ہی تا قیامت ہے
تو میں بھی بےخبر مخمور رہتا تو برا کیا تھا
صلہ کوئی سخن کا ہے نہ توفیقِ ستائش ہے
میں دہقاں کی طرح ہل ہی چلاتا تو برا کیا تھا
مشام افسوس جویائے شمیم گل نہیں مجھ کو
یہ شوقِ عنبر افشانی نہ ہوتا ، تو برا کیا تھا
اگر یاں لغو گوئی ہی سے کھلتا ہے درِ دعویٰ
ہنر سے میں نے اپنے اس کو کھولا تو برا کیا تھا
ہزل گوئی سے یاروں کا بہلتا ہے اگر دل تو
میں اس ذوقِ سخن سے ہاتھ اٹھاتا تو برا کیا تھا
اگر گونگے کی صورت مجھ کو مرنا تھا تو ہوکر مست
سخن پر اپنے اپنا سر میں دھنتا تو برا کیا تھا
نہیں ہے قافیہ غالب کوئی تو پوچھ عرفی سے
ارے میں بھی کوئی فرہنگ ہوتا تو برا کیا تھا

○○○



نکہت کاظمی

ـــ شہریار سے بات چیت ـــ

امراؤجان صرف مظفر علی کی فلم نہیں ۔ وہ شہریار کا نغمہ بھی ہے ۔ فلم میں ریکھا کی مسحورکن شخصیت کا تمام تر انحصار اس پر فلمائے گئے لیسے سدا بہار گیتوں پر ہے جیسے " ان آنکھوں کی مستی کے ۔ ۔ ۔ " ، " یہ کیا جگہ ہے دوستو ۔ ۔ ۔ " وغیرہ آج بالی ووڈ کے اہم ترین نغمہ نگار اور فلموں میں شاعری کی بازیافت کرنے والے کے طور پر جاوید اختر توجہ کا مرکز ہوسکتے ہیں لیکن شہر یار بہت پہلے سے مقبولِ عام شاعری میں معنویت اور اثر آفرینی کے لیے خاموش جہاد کرتے آرہے ہیں ۔ ان کے تحریر کردہ " گمن " ، " امراؤجان " اور " انجمن " کے دل پذیر گیت شہری زندگی کے درمیان ایک فرد کے اکیلے پن اور کرب اور اس انتشار میں عافیت کی تلاش کی خوب صورت اور بھرپور عکاسی کرتے ہیں ۔

نئے مجموعے " میرے حصے کی زمین " کی اشاعت کے ساتھ غیض و غضب کی شکار اس دنیا میں شاعر معلم کی اپنے سوالوں کے جواب کی جستجو جاری ہے ۔ پیش ہے اس عزلت پسند شاعر سے ایک سنجیدہ ذہنی مکالمہ جو ادب میں عوامی تحریکات کی نمائندگی بھی کرتا ہے ۔

OOO

سوال : آپ مشاعروں میں کبھی کبھار ہی نظر آتے ہیں اور اپنی شاعری کی تمام تر مقبولیت کے باوجود آپ کا تعلق اس قبیلے سے نہیں معلوم ہوتا جنھیں مشاعروں کا شاعر کہا جاتا ہے ۔ کیا آپ آج کل کے مشاعروں کے ماحول سے اپنے آپ کو مزاجاً ہم آہنگ کرنے میں مشکل محسوس کرتے ہیں ؟

جواب : آج کل مشاعرے اسٹیج پر پیش کیے جانے والے آرٹ جیسی چیز بن گئے ہیں اور میں اپنے آپ کو اداکار یا گانے بجانے والا نہیں سمجھتا ۔ ماضی میں زیادہ سے زیادہ دس فی صد شاعر اداکار ہوتے تھے باقی نوے فی صد سنجیدہ ادبی ذوق رکھتے تھے ۔ آج کے مشاعروں میں تو صرف دو یا تین فی صد شاعروں کا کلام ہی کسی ادبی معیار کا حامل کہا جاسکتا ہے باقی تمام لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کہیں شائع نہیں ہوتے اور جنھیں صرف مشاعروں میں سناجاتا ہے ۔ یہ ایک مخصوص قبیل کے شاعر ہیں جو اپنی مخصوص قسم کی شاعری گاکر پیش کرتے ہیں ۔ ایسی شاعری صرف تماش بینوں کے لیے ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے موضوعات بابری مسجد ، اقلیتیں ، فرقہ پرستی کا آسیب اور اردو کی کم وقعتی وغیرہ ہوتے ہیں ۔ دوسرے لفظوں میں متنازعہ اور سلگتے ہوئے سوال ۔ آج کل مشاعرے کا اہتمام کرنے کے لیے صرف چار باتیں اہمیت رکھتی ہیں ۔ مشاعرے کی کاروائی کون چلائے گا ۔ خاتون شعرا کتنی ہوں

گی ۔ مزاحیہ شاعر کتنے ہیں اور ترنم سے پڑھنے والے کتنے شاعر شریک ہورہے ہیں ۔ حد یہ ہے کہ مشاعروں کے لیے شاعروں کی ویسی ہی بولی لگائی جانے لگی ہے جیسی مویشیوں کے میلوں میں مویشیوں کی ۔

سوال : کیا ایسا اس لیے ہے کہ عوامی ذوق میں بھی بہت انحطاط آگیا ہے ؟

جواب : یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے ۔ عوام اب بھی معیاری چیزیں پسند کرتے ہیں ۔ آج بھی وہی گیت مقبول ہوتے ہیں جن میں شاعری اور نغمگی ہوتی ہے ۔ اب اگر آپ مسلسل مسالے دار غذا پیش کرتے رہیں گے تو ممکن ہے کہ لوگ اچھے کھانے کا ذائقہ بھول جائیں ۔ کوئی بہتر تبادل نہ ہونے کی صورت میں عوام کو غیر معیاری اور کم تر درجے کی چیزوں سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے ۔ شاعری کلچر کا حصہ ہے آپ اسے قومی کلچر سے جدا نہیں کرسکتے ۔

سوال : امراؤجان کے گانے فلمی موسیقی کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں مگر اس کے بعد آپ نے ویسی کامیابی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی ۔ کیا آپ نے ہندی فلموں کے لیے گیت لکھنا ترک کردیا ہے ؟

جواب : ایسا نہیں ہے ۔ بدقسمتی سے میں نے " دامن " ۔ " زونی " اور " انجمن " جیسی جن فلموں کے گیت لکھے وہ یا تو بیچ میں ہی رک گئیں یا پھر ریلیز نہیں ہوئیں ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں صرف اپنی پسند کی فلم میں ہی گیت لکھتا ہوں ۔ ایسی فلمیں جن میں گیتوں کی اپنی جگہ ہو اور جن میں شاعری کی گنجائش ہو ۔ میں صرف چھت پر بیٹھے ہوئے کبوتروں کے بارے میں شعر نہیں کہہ سکتا ۔ لیکن آج کل ویسی فلمیں کہاں بن رہی ہیں ۔ آج کل گانوں کا کہانی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔

سوال : پوکھران کے دور میں شاعری ؟ کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں کہ آج شاعری کا روایتی تصور مر رہا ہے اور سامعین اور قاری ختم ہوتے جارہے ہیں ؟

جواب : اس کے برخلاف میرے خیال سے تو ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا ہے ۔ میں نے دیوناگری میں چار مجموعے شائع کیے ہیں ۔ اور میری شاعری کے اردو مجموعوں کا بازار میں اسٹاک ختم ہوچکا ہے ۔ آج لوگ مصروف ہیں ۔ وہ ٹی وی دیکھتے ہیں اخبار پڑھتے ہیں فلم دیکھنے جاتے ہیں مگر اس سب کے ساتھ وہ شاعری بھی پڑھنا چاہتے ہیں ۔ شاعروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہورہا ہے بالخصوص علاقائی زبانوں تامل ، گجراتی اور مراٹھی میں ۔ جدید ترقی یافتہ دور نے شاعر کو بھی بدل دیا ہے ۔ ماضی میں شاعر کا تصور ایک ایسے غیر تعلیم یافتہ فرد کا تھا جو کسی دوسرے کام کے قابل نہ ہوتا تھا ۔ آج کا شاعر ایک ایسا تعلیم یافتہ نوجوان ہے جو اپنے تمدن اور اپنے اطراف پائی جانے والی سیاسی اور سماجی حقیقتوں کا گہرا ادراک رکھتا ہے ۔

(بہ شکریہ ٹائمز آف انڈیا ۔ نئی دہلی)

یوسف میخائلووچ اورانسکی

تلخیص و ترجمہ : اسامہ فاروقی

حصاری پریا کی لوک کہانیاں اور زبان (وسط ایشیا) ماسکو ۱۹۷۷ء

حصاری پریا لوگوں کی زبان ۔ ہند آریائی زبانوں کے وسطی زمرے کی ایک بولی

(قسط : ۳)

۳ ۔ جارِ لاحقہ موخر : جملے کی ساخت میں جار لاحقہ موخر کے ترقی یافتہ نظام کو کافی اہمیت حاصل ہے جیسا کہ جدول نمبر (۱) سے ظاہر ہے زبانِ پریا کے جارِ لاحقہ موخر کا نظام ہندستانی اور دیگر ہم رشتہ زبانوں کے متعلقہ نظاموں سے قابلِ لحاظ حد تک مختلف ہے ۔ ان میں مفعولِ اول (indirect object) اور مفعولِ ثانی (direct object) کی تخصیص کرنے والا جار موخر (‎-ta) (۔تا) ، حیثیت اور آلہ ، کار کی تخصیص کرنے والا جارِ موخر (‎-nala) (نلا) ، اخراج (ablativeness) کی تخصیص کرنے والے جار موخر (‎-mata, ‎-ta) (متا ، تا) خاص طور سے قابلِ توجہ ہیں ۔ بانگڑو بولی میں مستعمل مفعولِ اول ، مفعولِ ثانی اور اخراج کی تخصیص کرنے والے جارِ لاحقہ موخر ‎-te اور ‎-tai سے ان کو ایک حد تک قربت ضرور حاصل ہے ۔ (دیکھیے جدول نمبر ۱)

جارِ لاحقہ موخر ‎-a (ا) اور ‎-ma (ما) علامت ہیں :

الف) مقام عمل کی : Falân jag-a yek bulbul-i guya ĉ'a (فلاں جگہ یک بلبل گویا چھے بہ معنی فلاں جگہ ایک بلبل گویا ہے) ۔ da-muro Kalxoz-ma kam karai (دامورو کل خوز ما کام کرئی بہ معنی میرا باپ کل خوز یعنی پنچایتی کھیت میں کام کرتا ہے) ۔

ب) زمانِ عمل کی : Fe rat-a so ge (فے راتا سو گے بہ معنی پھر رات کو سوگئے) saat-i sat-ma ۔ (سا اتی سات ما بہ معنی ساعت سات میں یا سات بجنے کے وقت) ۔

ت) جہت عمل کی : tu dast-a javai (تو دشتا جوائی بہ معنی تو دشت کو جارہا ہے) ۔ baɣ-ma var ۔ (باغ ما ور بہ معنی باغ میں داخل ہو) ۔

جارِ موخر ‎-ta (تا) علامت ہے :

الف) مفعولِ اول کی : be-ta ban kar (بے تا بن کر بہ معنی دروازے کو بند کر) ۔ devun-ta balayo (دیون تا بلایو بہ معنی اس نے دیووں کو بلایا) ۔ ti-par-ta pàĉâ de (تی پرتا پاشا دے بہ معنی اپنی بیٹی بادشاہ کو بیاہ دے) ۔ (جب فقرے میں جارِ موخر (تا) مفعولِ اول کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اسی فقرے میں مفعولِ ثانی کے ساتھ جارِ موخر ‎-ta (تا) کے ساتھ کی ضرورت نہیں رہتی) ۔

جدول نمبر ۱ بنیادی جابجاسۃ موخر

مندرجہ ذیل امور کی تخصیص کرنے والے جابجاسۃ موخر	زبان براہوئی	ہندستانی	پنجابی	لہندا (ملتانی)	سندھی	راجستھانی (میواتی)	نیپالی
مکان ظرف یا محل	-a (آ) -ma (ما)	-mẽ (میں)	-vic (وچ) -nū (نوں)	-vic (وچ)	-mẽ (میں)	-mãĩ (میں)	-mā (ما)
جہت عمل	-ā (آ) -ma (ما)	-mẽ (میں)		-kū (کوں) -kū (کوں)	[illegible] (ڈانہہ)	-naĩ (نیں)	-mā (ما)
مفعولِ اول	-nā (نا)	-ko (کو)	-nū (نوں)	-kū (کوں) -kū (کوں)	-khe (کھے)	-naĩ (نیں)	-lāī (لائی)
مفعولِ ثانی	-nā (نا)	-ko (کو)	-nū (نوں)	-kū (کوں) -kū (کوں)	-khe (کھے)	-naĩ (نیں)	-lāī (لائی)
آلۂ کار	[illegible] (ئکلا)	-se (سے)	-to (تے)		-sā̃ (ساں)		[illegible] (بہانا)
معیت	[illegible] (ئگل)	-se (سے)	-nāl (نال)	-nāl (نال)	-sā̃ (ساں)		-saṅg (سنگ)
اخراج	[illegible] (انا) [illegible] (اٹی)	-se (سے)	-tõ (توں)	-ū̃ (اوں) -tū̃ (توں) -thū̃ (تھوں)	-khā̃ (کھاں)	-saĩ (سیں) -taĩ (تیں)	-bāṭa (باٹا)
توصیفی	-ko (کو)	-kā (کا)	-dā (دا)	-dā (دا)	-jo (جو)	-ko (کو)	-ko (کو)
فاعلی (فعلِ متعدی ماضی کے ساتھ)	-nā (نا)	-ne (نے)	-ne (نے)			-naĩ (نیں)	-le (لے)

ب) مفعولِ ثانی کی ، munde—ta pācā—na kiyu (منڈے تا پاشا نا کیو یعنی بادشاہ نے لڑکے سے کہا) .

minja ... muallim—ta . (اول کُنے پیرے نا دے یعنی پہلے لپڑکے کو دے) avval kune — pāre — na de

yck handi dinco (منجا معلم تا یک ہنڈی دِ نے او بہ معنی میں نے ایک ہنڈی معلم کو دی) ۔

ت) نقطۂ آغازِ کار ؛ bàzàr–ta paća murkc ayo (بازار تا پچا مُڑ کے آیو بہ معنی میں بازار سے واپس لوٹا) ۔ lak –ta šamšer–ta kaḍ yo (لک تا شمشیر تا کاڑیو بہ معنی اس نے بغلے سے شمشیر کھینچ نکالی) ۔

جارِ موخر نلا –nala علامت ہے ؛

(الف) آل ہ کار کی ؛ bak˚ri ... śax–nala maraị (بکری شاخ نلا مرائی بہ معنی بکری نے سینگوں سے مارا) ۔ śamšcr –nala maró شمشیر نلا مرو بہ معنی اس نے شمشیر سے مارا) ۔

(ب) اشتراکِ کار کی ؛ Gul unya yck habaś–nala bcti (گُل اُنیا یک حبش نلا بیٹی بہ معنی گل وہاں ایک حبشی کے ساتھ بیٹھی تھی) ۔ laṛó lâṛi –nála súvai (لاڑو لاڑی نلا سوائی بہ معنی دلہا دلہن کے ساتھ سو رہا تھا) ۔

(ت) عمل باہمی کی ، mc ... rayis –nala ašnâ oyc ćo (مے ۔ ۔ ۔ رئیس نلا آشنا اویو چو بہ معنی میری پنچایتی کمیٹی کے رئیس یعنی صدر سے جان پہچان ہوگئی) ۔ sīya marc –nala ĉamōr giyo (سیں یا مارے نلا چمور گیو بہ معنی مالک نے میرے ساتھ گالی گلوچ کی / لڑائی کی) ۔ mcrc –nala gal karo (میرے نلا گل کرو بہ معنی اس نے مجھ سے بات کی) ۔

یہی جارِ موخر مفاہیم (ب) اور (ت) میں (بعض اوقات –nal کی شکل میں) بہ طور جار مقدم بھی استعمال میں آ سکتا ہے ، nal –tcrc gal karai (نل ترے گل کرائی بہ معنی وہ تجھ سے بات کرے گا) ۔ nala-sc mulyó بہ معنی وہ اس سے ملا) ۔

جارِ موخر ماتا (مے تا) –mata (–məta) علامت ہے ؛

(الف) نقطۂ آغازِ کار کی ، us ran –ta juval –máta ka(ṛ)ḍyo (اُس رن تا جُو ال ماتا کاڑیو بہ معنی اس عورت کو تھیلے میں سے نکالا) ۔ galc –matá yck kōṛi láyo (گلے ماتا یک کوڑی لایو بہ معنی گلے یعنی ریوڑ میں سے ایک گھوڑی لاتے) ۔ yck hat ayo zimịn –matá (یک ہات آیو زمین ماتا بہ معنی زمین میں سے ایک ہاتھ نکلا) ۔ mc daraxt –mata uturuị (مے درخت مے تا اُترُ وئیں بہ معنی میں درخت پر سے اتروں گا) ۔

(ب) کسی شے یا کسی وسیلے سے گذر کر جہتِ کار کا ؛ ... ćcxov ulisa –məta langi (چیخوف اولیسا مے تالانگی ۔ ۔ ۔ بہ معنی چیخوف گلی کو پار کر کے ۔ pul –məta ya dirav –məta (پل مے تا یا در او مے تا بہ معنی پل سے ہوکر یا دریا سے ہوکر) ۔ tamoku –ta yalbcr –məta langovaị (تموکو تا غالبر مے تا لنگو وَے بہ معنی وہ تمباکو چھلنی سے چھان رہا ہے) ۔ minja dcval –məta xcz máryō (منجا دیول مے تا ہیز ماریو بہ معنی میں نے دیوار کے پار چھلانگ ماری) ۔

(ت) کسی فرد یا امر کی ابتدا یا ماخذ کی ؛ tu kcro uruś (zât) –matai (تو کیرو اُروغ / ذات ماتائی بہ معنی تو کس نسل / ذات سے ہے ؟) ۔ yck ran –i –si –mata du bcṭa –su ćo (یک رنی سی ماتا دو بیٹا سو چو بہ معنی ایک بیوی سے اس کے دو بیٹے تھے) ۔

(ث) اس مادے یا شے کی جس سے کوئی چیز بنائی گئی یا بنائی جارہی ہے ؛ makʼan –məta kcum likirai (مکھن مے تا کے اُم لکی رے بہ معنی مکھن سے گھی نکلتا ہے) ۔ kumur –məta dan rakcyo دن رکے یو

کرے تا بہ معنی کوٹلے کے دانت لگا دیے) ۔ dut –su –mata širbrinj karo (دُت سوئے تا شیر برنج کرو بہ معنی
دودھ سے اس نے شیر برنج / کھیر بنائی ۔

جارِ موخر کو (کا ، کی) (–kâ, ki) –ko اسمِ ذات (جس سے اسم صفت ، ضمیرِ اشارہ اور ماقبل منفصر یعنی
enclitic جُڑے ہوئے ہوں) ۔ ضمیرِ اشارہ و شخصی اور ضمیرِ استفہامی کے ذریعہ ظاہر ہونے والے سابق وصف (prepositive attribute) کو
تشکیل دیتا ہے ؛ us ran –ki kat (گاں کو شاخ بہ معنی گلے کا سینگھ) ۔ gâ(n) –ko šâx (اُس رَن کی کت بہ
معنی اس عورت کا aba –pare –ko vasiyat –(bride money (اباپرے کو وصیت بہ معنی اپنے باپ کی وصیت) ۔
us –ko nâ (اُس کو نا بہ معنی اس کا نام) ۔ tu kis –ko poto? (توکس کو پوتو بہ معنی توکس کا پوتا ہے ؟) ۔
وصف یا موصوف کی جنس (قدرتی) اور عدد جارِ موخر کی شکل پر اثر انداز نہیں ہوتے ۔ موازنہ کریں ؛ me kolxozói –ka
betai (مے کولخوزچی کا بیٹائی بہ معنی میں کلخوزی کسان / پنچایتی کھیت کے کسان کا بیٹا ہوں) اور me kolxozći –ka
bitai (مے کولخوزچی کا بِٹائی بہ معنی میں کلخوزی کسان / پنچایتی کھیت کے کسان کی بیٹی ہوں) pâcâ –ki ran (پاچا کی رن
بہ معنی بادشاہ کی بیوی) اور pabi –ki beta (پابی کی بیٹا بہ معنی بھابی / بڑے بھائی کی بیوی کا بیٹا) ۔ da –mur
–ko gâ (دا مُر کو گاں بہ معنی میرے باپ کی گلے) اور is ran –ko murs (اِس رن کو مُرس بہ معنی اس عورت کا
شوہر) ۔ munde –ko aba –so (مُنڈے کو ابّا سو بہ معنی لڑکوں کا باپ) اور bit(iy)un –ko aba–so
بٹیُن / بِٹُن کو ابّا سو بہ معنی لڑکیوں کا باپ) ۔ tu kis –ki ran –i? (توکس کی رن ای ؟ بہ معنی توکس کی بیوی ہے
اور tu kis –ki betai ? (توکس کی بیٹائی ؟ بہ معنی توکس کا بیٹا ہے ؟) ۔

آلی فاعلی ساخت والے جملوں میں جار موخر تا –na فاعل کی علامت کا کام دیتا ہے ؛ abo –mare –na ka
vasiyat kare čo ? (ابو مَرے نا کا وصیت کرے چو بہ معنی ہمارے باپ نے کیا وصیت کی تھی ؟) ۔ Bibi –Rabia
–na sar –par –ta k'aki karti lagi še (بی بی رابعہ نا سر پر تا ککی کرتی لگی شے بہ معنی بی بی رابعہ اپنے بالوں
کو کنگھی کر رہی تھی ۔ is ami –na dek'o (اس امی نا دیکھو بہ معنی اس آدمی نے دیکھا) ۔ vazir –na kiyo (وزیر
نا کیو بہ معنی وزیر نے کہا) ۔ agar kui –na pišna karto... (اگر کئی نا پِشنا کرتو بہ معنی اگر کوئی سوال کرے /
پوچھے) ۔ tund, kis –na kari (تنڈ ، کس ناکری بہ معنی ڈھونڈ / پتہ چلا یہ کس نے کیا) ۔ Sanâvar pâcâ –na is
gal –ta sun keta (صناور پاچا اس گل تا سُن کیتے ۔ ۔ ۔ بہ معنی صنوبر بادشاہ نے اس بات کو سن کر ۔ ۔ ۔) ۔ اختتامی –n
(ن) کے بعد جارِ موخر کا ابتدائی (ن) ساقط بھی ہوسکتا ہے pâdvân–(n)a ---dinco (پڈوانا دینے او بجائے
پدوان نادِ نے او بہ معنی گلہ بان نے دے دیا) ۔ فعل کے محذوف ہونے کی صورت میں بھی جارِ موخر na– (نا) استعمال کیا
جاسکتا ہے ؛ munde –na : mija kari (مُنڈے نا : می جا کری بہ معنی لڑکے نے / کہا / ؛ میں نے کیا) ۔ pâcâ
–na : kâini ne –k' âta ? (پاچانا ، کینی نے کھاتا ؟ بہ معنی بادشاہ نے / پوچھا / ، کیوں نہیں کھاتے ہو ؟) ۔

جارِ موخر کُلا مندرجۂ ذیل کی نشان دہی کرتا ہے ؛

(الف) مقام یا شخص جس کی جانب حرکت وقوع پذیر ہورہی ہے ؛ mundo ... giyo pâcâ kula (مُنڈو
۔ ۔ ۔ گیو پاچا کُلا بہ معنی لڑکا بادشاہ کے پاس گیا) ۔ aizo rayis –kula aye (اَیزو رئیس کُلا آئے بہ معنی عورتیں رئیس
یعنی پنچایتی کھیت کے صدر کے پاس آئیں) ۔

(ب) مفعولِ ثانی : payū(n) –pere –kula gal na –karyo (پائیں پیرے کُلا گل نہ کریو = یعنی اس نے بھائیوں سے کوئی بات نہیں کی) ۔ arz karāi qazi –kula (عرض کرائی قاضی کُلا = یعنی اس نے قاضی سے شکایت کی / عرض کی) ۔

(ت) مقام یا شخص جس کے نزدیک یا پاس کوئی کام ہورہا ہے یا کوئی شئے موجود یا واقع ہے : o yek budo –kula beṭi c̄o (او یک بُڈو کُلا بیٹی چھو = یعنی وہ ایک بوڑھے کے پاس بیٹھی تھی) ۔ c̄aixane –kula lari go (چائے خانے کُلا لری گو = یعنی چائے خانے کے پاس لڑائی ہوئی) ۔ pavarot –kula kar –ū –soi (پوروت کُلا کر سوئی = یعنی اس کا گھر پُل کے پاس ہے) ۔

جار مؤخر پیرا • پرا para– (para–) مندرجۂ ذیل کی نشاندہی کرتا ہے :

(الف) جہتِ کار اوپر کی طرف یا کسی شئے کی سطح کی جانب : me kōre –pera c̄aṛūi (مے کورے پیرا چڑوئیں = یعنی میں گھوڑے پر سوار ہوجاؤں گا / چڑھ جاؤں گا) ۔ mundo c̄aṛyo taxt –para (منڈو چڑیو تخت پرا = یعنی لڑکا تخت پر بیٹھا / چڑھا) ۔ kota –pera... ladyo (کوتا پیرا لادیو = یعنی ٹٹو / گدھے پر لادا) ۔ karavat –para na –beṭ (کرووات پرا نہ بیٹ = یعنی چارپائی پر نہ بیٹھو) ۔

(ب) کسی چیز کی سطح پر یا کسی شے کے اوپر ہونا / موجود ہونا : tū ka befam manji –para paṛi ? (تو کا بے فم منجی پرا پڑی ؟ = یعنی تو کیوں بے غم / بے فکر چارپائی / منچ پر پڑی ہے ؟) ۔ selka –para satū muro c̄o (سیلکا پرا ستو مرو چھو = یعنی بیج بونے کی مشین پر میرا سالا تھا / کام کر رہا تھا) ۔ us –para six –ta langova c̄o (اس پیرا سخ تا لنگوا چھو = یعنی اس پر یعنی الاؤ پر سیخ رکھی) ۔

(ث) کسی شئے یا کسی شخص کی جانب حرکت : kabar –para jō(n) vai (کبر پرا جوں وئی = یعنی میں قبر پر جاتا ہوں) ۔ kam –para c̄alu giyo (کام پیرا چلو گیو = یعنی وہ کام پر چلا گیا) ۔ tū ka mere –para ... ayi c̄e? (تو کا میرے پرا آئیچھے ؟ = یعنی تو کیوں میرے پاس آئی ہے ؟) ۔

جارِ مؤخر vase– (واسے) • "کے لیے" اور • "واسطے" کا مفہوم رکھتا ہے : bai –na me(n) mon –vase an pakayo (بے نا میں مون واسے ان پکایو = یعنی زمین دار نے مہمانوں کے لیے پلاؤ پکایا) ۔ bald ō kulbe –vase, virō ga (n) –vase (بلد او کلبے واسے • ویرو گاں واسے = یعنی بیل • وہ ہل چلانے کے واسطے ہے • ساز گانے کے واسطے یعنی فنون کھیل کے واسطے) ۔ mardikor satiyo xist –vase (مردکور سٹیو خشت واسے = یعنی زمین نے لیکی مزدور رکھا خشت کے واسطے یعنی اینٹیں بنانے کے لیے) ۔

جارِ مؤخر لے (le–) مندرجہ ذیل کی نشاندہی کے لیے استعمال ہوتا ہے :

(الف) مفعول ثانی : paca –le xabar takyo (پاچا لے خبر تاکیو = یعنی بادشاہ کو خبر بھیجی) ۔ Larajar Kambardinxan –la sawlat takai (لاڑا جار کمبر دین خان لے سولات تکائی = یعنی لاڑا جار قمبر دین خان کے ہاں خراج بھیجتا ہے) ۔ mere –le top leka (مرے لے توپ لیکا = یعنی مجھے گیند لا کر دے) ۔

(ب) وہ شے یا شخص جس کی طرف کسی کام کا رخ ہو : mere –le sato hova (مرے لے ستو ہوا = یعنی یہ کام میرے سپرد ہو • مجھے سونپا جائے) ۔ bakari –le hat lamo karyo (بکری لے ہات لامو کریو = یعنی میں

نے بکری / بکری کی لاش کی طرف ہاتھ بڑھایا) ۔ ji –mri... jatak –le dekai (جی مری ۔ ۔ ۔ جاتک لے دیکائی بہ معنی میری ماں بچوں کو دیکھتی ہے / بچوں کی خبر گیری کرتی ہے) ۔

(ت) وہ شخص یا شے جس کے لیے کوئی کام کیا جاتا ہو : mec(h)mon –ki hat –le pani pugur (میہمان کی ہات لے پانی پگر بہ معنی مہمانوں کے ہاتھ دھونے کے لیے پانی دے) ۔ bom –le cakar kar(i)yo (بام لے چکر کر یو بہ معنی میں نے چکنی مٹی / نمک کے ساتھ / چھت / لیپنے / کے لیے گوندھی) ۔

چار موفر کلتا kulta– مندرجہ ذیل کی نشان دہی کے لیے استعمال ہوتا ہے :

(الف) حرکت کا نقطہ آغاز (اس معنی میں کلتا ایک اور چار موفر " کو " کے تسلسل میں استعمال ہوتا ہے) : gastinsa –ko –kulta kar –ma juva so de (گستنس سا کو کلتا کر ما جوا شودے بہ معنی میں ہوٹل / مسافر خانے / سے گھر کو چلا گیا تھا) ۔

(ب) وہ مقام یا علاقہ جس کے پاس سے ، جس کے پار یا جس میں سے ہو کر گذریں : aprabalet –kulta langki (اپرا بلیت کلتا لانگ کی بہ معنی اپیرا اور بیلٹ / تھیٹر / کے پاس سے گذر کے) ۔

(ت) کسی چیز کے حصول کا ذریعہ : ayi –pare –kulta dova le keta (ائی پیرے کلتا دوا لے کیتے بہ معنی اپنی ماں کی دعا لے کر) ۔

چار موفر تما fama– مندرجہ ذیل کی نشان دہی کرتا ہے :

(الف) کسی فعل ، واقعے یا شے کا مقصد یا غرض و غایت : vazir –ta dyakaliyo ti –fama (وزیر تا دیا کلیوتی تما بہ معنی بیٹی کے لیے وزیر کو بھیجا) ۔ telpak –fama roba –ko post layo (تلپاک تما روبا کو پوست لایو بہ معنی / پوستین کی / ٹوپی کے لیے لومڑی کی کھال لایا) ۔ daru paxta –rama fayido tarai (دارو پکتا تما فائدو اترائی بہ معنی کیمیائی اشیا کپاس کے لیے فائدہ مند ہیں) ۔

(ب) مفعول ثانی یا وہ شخص جس کے مفاد میں فعل وقوع پذیر ہوا ہو : drektor –fama telfan karo (دریکٹر تما تلفان کرو بہ معنی اس نے ڈائرکٹر کو ٹیلی فون کیا) ۔ usta –fama layo (استا تما لایو بہ معنی وہ استاد یعنی لوہار کے لیے لایا) ۔ almasti –fama dino (الستی تما دنو بہ معنی اس نے چڑیل کو دیا) ۔

چار موفر اوفر ، اوفرا ufar(a)– حسب ذیل کی نشان دہی کرتا ہے :

(الف) فعل کی جہت کسی شے کے اوپر کی طرف یا اس کی سطح کی جانب : muro –ufara car (مورو اوفرا چر بہ معنی میرے اوپر چڑھ ، مجھ پر سوار ہوجا) ۔ unt–u fara latke, cale ge (اونٹو فرا لاتکے چلے گے بہ معنی اونٹ پر / صندوق / لاد کے چلے گئے) ۔

(ب) کسی شے کی سطح پر یا اس کے اوپر وقوع (اس مفہوم میں اوفر / اوفرا دوسرے جار ہائے موفر کے ساتھ استعمال ہوتا ہے) ۔ zambur tare –ufar –ta taw khowai de, katai (زمبور تیرے اوفر تا تاو کھوائی دے ، کٹئی بہ معنی زنبور / بھڑ / تیرے اوپر گھوم رہی ہے / چکر کاٹ رہی ہے ، کاٹے گی) ۔ me un –ke –ufara chu (مے اون کے اوفرا چھوں بہ معنی میں اونٹ کے اوپر ہوں) ۔

○●○



م ۔ حسین

پروفیسر عبدالستار دلوی ایک نظر میں

نام : عبدالستار دلوی

والد کا نام : محمد اسمٰعیل دلوی

تاریخِ پیدائش : ۱۸ / اگست ، ۱۹۳۰ ، (لیکن سرکاری کاغذات میں یکم ستمبر ، ۱۹۳۰ ، درج ہے) ۔

مقامِ پیدائش : داجھیل ، ضلع رتناگیری ، مہاراشٹرا (انڈیا) ۔

ابتدائی تعلیم : آبائی گاؤں کے پرائمری اسکول میں اردو اور مراٹھی زبان کے ذریعے حاصل کی ۔

ثانوی تعلیم : احمد سیلر ہائی اسکول بمبئی میں دسویں جماعت تک زیرِ تعلیم رہے اور کامیاب بھی ہوئے ۔

اعلیٰ تعلیم ۱ : اسمٰعیل یوسف کالج جوگیشوری بمبئی سے مندرجہ ذیل ڈگریاں حاصل کیں ۔

بی ۔ اے ، ایم ۔ اے (اردو) ، پی ایچ ۔ ڈی ۔

ایم ۔ اے (اردو) میں یونیورسٹی آف بمبئی میں اول پوزیشن حاصل کی اور چانسلر گولڈ میڈل جیسے باوقار اعزاز کے مستحق قرار دیے گئے ۔ پی ایچ ۔ ڈی (اردو) کی ڈگری یونیورسٹی آف بمبئی سے حاصل کی ۔

۲ : لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز میں لسانیات اور صوتیات کی اعلیٰ تربیت حاصل کی ۔

۳ : اردو میں پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے باوجود شعبہ ، لسانیات بمبئی یونیورسٹی سے لسانیات میں دوبارہ پی ایچ ۔ ڈی کی حاصل کی ۔

شادی : ۱۹۵۸ ، میں مسلکِ ازدواج سے منسلک ہوئے ۔

فلوشپ ۱ : پی ایچ ۔ ڈی کے مقالے کی تکمیل کے لیے حکومتِ ہند کے محکمہ ، تعلیم کی جانب سے دو سال (۱۹۶۰ ، تا ۱۹۶۲ ،) کے لیے فیلوشپ منظور ہوئی تھی ۔

۲ : یو۔جی۔سی۔ نئی دہلی کی جانب سے تین سال ۱۹۶۳ء تا ۱۹۶۶ء کے لیے پوسٹ ڈاکٹرل فیلوشپ ملی تھی۔

۳ : ایم۔ اے۔ میں حکومتِ مہاراشٹر کی دکشنا فیلوشپ منظور ہوئی تھی۔ یہ ریاستِ مہاراشٹر کی ایک باوقار فیلوشپ تصور کی جاتی ہے۔

ملازمت :

۱ : ایلفنسٹن کالج بمبئی میں ایک سال (۱۹۶۶ تا ۱۹۶۷ء) تک بہ حیثیت اردو لکچرر خدمت انجام دیے۔

۲ : اسمٰعیل یوسف کالج بمبئی میں ایک سال (۱۹۶۶ تا ۱۹۶۷ء) تدریسی عملہ سے منسلک رہے۔

۳ : ۱۹۶۸ تا ۱۹۸۲ء تک مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر اینڈ لائبریری، بمبئی کے بانی ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔

۴ : ۱۹۸۲ء سے یونیورسٹی آف بمبئی کے شعبہ اردو میں بانی صدر کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہے ہیں۔

تصنیفات و تالیفات :

۱ : انتخابِ کلامِ مصحفی : طالب علمی کے زمانے یعنی ۱۹۶۰ء میں مصحفی کے کلام کا انتخاب کیا اور اسے شائع بھی کیا۔

۲ : انتخابِ کلامِ چکبست : یہ انتخاب بھی طالب علمی کے زمانے (۱۹۶۱ء) میں مرتب کیا اور شائع بھی کیا۔

۳ : من سمجھاون : اس کتاب کو ۱۹۶۵ء میں مرتب کر کے شائع کی۔ یہ مراٹھی کے مشہور سنت شاعر رام داس کی مقبولِ زمانہ شعری تخلیق "مناچے شلوک" ہے جسے شاہ تراب چشتی نے ۱۷۰۰ء میں آزاد اردو ترجمہ کیا تھا۔ یہ دکنی اردو کا شاہکار ہے۔

۴ : اردو میں لسانیاتی تحقیق : سنہ ۱۹۷۰ء میں مرتب کر کے شائع کی۔ یہ کتاب اپنے موضوع کی اہمیت و افادیت کے پیشِ نظر ہندوستان کی بیشتر یونیورسٹیوں میں ایک بنیادی کتاب کی حیثیت سے داخلِ نصاب ہے۔

۵ : رانی کیتکی : انشا کی مشہور کتاب رانی کیتکی کی کہانی کو ہندی اور اردو میں ایک ساتھ مرتب کر کے ۱۹۷۲ء میں شائع کیا۔ یہ گاندھی جی کے تصورِ ہندستانی کو تقویت پہنچاتی ہے۔

۶ : امرت بانی : یہ اردو اور ہندی زبان و ادب سے منتخب غزلوں، نظموں اور رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ اسے ۱۹۷۵ء میں مرتب کر کے شائع کی۔ یہ کتاب بھی گاندھی جی کے تصورِ ہندستانی کو جلا بخشی ہے۔

۷ : گھر آنگن (بہ جموریہ ہندی) : جاں نثار اختر کی ہندستانی رباعیوں کا مجموعہ "گھر آنگن" کو اردو اور ہندی میں ایک ساتھ مرتب کر کے ۱۹۷۶ء میں شائع کیا۔

۸ : اردو میں ۱۹۷۶ء تحقیق اصول اور طریقہ کار : یہ اصولِ تحقیق پر ایک بنیادی کتاب ہے جسے

مرتب کر کے ۱۹۹۴ء میں شائع کی۔ یہ کتاب ہندستان کی تمام یونی ورسٹیوں میں شاملِ نصاب ہے۔

۹ : نئی تحریریں : یہ تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا تھا۔

۱۰ : دکنی اردو : یہ دکنی اردو پر ایک حوالہ جاتی کتاب ہے۔ اس کے بیش تر مضامین شعبہ اردو بمبئی یونیورسٹی میں منعقدہ سمینار پر مشتمل ہیں۔ اس کتاب کو طویل مقدمہ کے ساتھ مرتب کر کے ۱۹۸۷ء میں شائع کی۔

۱۱ : اردو زبان اور سماجی سیاق : یہ اردو کی سماجی لسانیات سے متعلق مضامین کا مجموعہ ہے جو اردو میں اپنے موضوع پر واحد کتاب ہے اپنے موضوع کے پیشِ نظر یہ کتاب ادبی اور علمی حلقوں میں خاصی مقبول ہوئی۔

۱۲ : کرشن چندر، شخص اور ادیب : یہ کرشن چندر پر جامع مقالات کا مجموعہ ہے اسے مرتب کر کے ۱۹۹۴ء میں شائع کیا۔

تراجم

۱ : ساوتری : یہ مشہور مراٹھی ناول نگار پرشوتم شیورام رینگے کا ناول ہے۔ اسے اردو زبان میں ترجمہ کر کے ۱۹۷۸ء میں شائع کیا۔ اس ناول کو جدید مراٹھی ادب میں ایک شاہ کار کی حیثیت حاصل ہے۔

۲ : رن آنگن : رن آنگن، مراٹھی کے ناول نگار وشرام بیڈیکر کا شاہ کار ہے۔ یہ ناول " رن آنگن " ہی کے نام سے اردو میں ترجمہ ہو کر ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ اس ناول پر ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی نے دلوی صاحب کو قومی ترجمہ ایوارڈ سے نوازا ہے۔

۳ : اولوکتا : یہ مراٹھی کے ناول نگار پرشوتم شیورام رینگے کا ناول ہے۔ اسے " اولوکتا " ہی کے نام سے اردو میں ترجمہ کر کے ۱۹۹۰ء میں شائع کیا۔

۴ : اقبال، شاعر اور سیاست داں : یہ مشہور اسکالر رفیق ذکریا کی انگریزی کتاب Iqbal the Poet and the Politician کا اردو ترجمہ ہے۔ اسے انجمن ترقی اردو دہلی نے ۱۹۹۵ء میں شائع کیا ہے۔

عنقریب منظرِ عام پر آنے والے تراجم :

۱ : رتھ کا پہیہ : یہ مراٹھی ناول " رتھ چکر " کا اردو میں ترجمہ ہے جو ایس۔ این پنڈسے کا شاہ کار ہے۔

۲ : ذکر ایڈنبرا : یہ انگریزی کے شاعر نسیم ایزیکل کی تیس مسلسل نظموں کا اردو ترجمہ ہے

ادارت : دلوی صاحب کی ادارت میں مندرجہ ذیل رسائل ہے۔

۱ : امکان : مہاراشٹرا اردو اکاڈمی کا یہ ایک ادبی رسالہ ہے اسے ترتیب دینے کے لیے مجلسِ ادارت میں کئی ایک نام درج رہتے تھے ۔ مگر صحیح معنوں میں دلوی صاحب ہی امکان کی ادارت کے فرائض انجام دیتے تھے ۔

۲ : ہندستانی زبان : یہ مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر اینڈ لائبریری بمبئی کا ترجمان تھا ۔ جو ۱۹۶۸ ء سے نکلنا شروع ہوا اور ۱۹۸۰ ء تک نکلتا رہا ۔ ابتدا میں سالانہ تھا ۔ مگر بعد میں ششماہی ہوگیا تھا ۔ اس کے دو خصوصی شمارے ایک امیر خسرو نمبر اور دوسرا سورداس نمبر بہت مقبول ہوئے تھے ۔

۳ : نقشِ کوکن یہ پبلیکیشنز ٹرسٹ بمبئی کا ایک تہذیبی رسالہ ہے ۔ دلوی صاحب کی ادارت میں یہ رسالہ ۱۹۷۳ ء سے لے کر ۱۹۷۶ ء تک نکلا ۔ اس کے دو نمبر نکلے جو خاصے مقبول ہوئے تھے ۔ مہاراشٹر خصوصی نمبروں کا مہاراشٹر اردو ٹائمز نے خوب پذیرائی کی تھی ۔

مختلف اداروں ، انجمنوں اور کمیٹیوں سے وابستگی :

۱ : ترقی اردو بورڈ (حکومتِ ہند) کے لسانی اور ادبی پینل کا دس سال (۱۹۷۵ تا ۱۹۸۵ ء) تک ممبر رہے ۔

۲ : مہاراشٹرا اردو اکاڈمی کے بانی رہے اور بارہ سال (۱۹۷۵ ء تا ۱۹۸۷ ء) تک جوائنٹ سکریٹری کے عہدے پر فائز رہے ۔

۳ : سنٹرل ہندی ڈائرکٹوریٹ (حکومتِ ہند) کی ایگزیکٹیو کونسل کے دو سال (۱۹۷۶ تا ۱۹۷۸ ء) تک ممبر رہے ۔

۴ : حکومتِ مہاراشٹرا کی جانب سے تین سال (۱۹۸۶ تا ۱۹۸۹ ء) تک اسپیشل ایگزیکٹیو مجسٹریٹ رہے ۔

۵ : بمبئی ٹی ۔ وی ایڈوائزری بورڈ کا ایک سال ۱۹۷۷ ء تا ۱۹۷۸ ء تک ممبر رہے ۔

۶ : فلم سنسر بورڈ آف انڈیا کے دس سال (۱۹۷۹ تا ۱۹۸۹ ء) تک ممبر رہے ۔

۷ : انجمنِ اسلام بمبئی کے جنرل کونسل کے نو سال (۱۹۸۹ تا ۱۹۹۸ ء) تک ممبر رہے ۔

۸ : ۱۹۹۱ ء میں ریاستِ مدھیہ پردیش کے " اقبال سمان " کے جیوری کا ممبر ہونے کا امتیاز حاصل رہا ۔

۹ : انجمن ترقی اردو مہاراشٹرا کے دو سال (۱۹۹۰ ء اور ۱۹۹۱ ء) تک صدر رہے ۔ اور اس زمانے میں ایک ایسا کام انجام دیا جو ہمیشہ یادگار رہے گا ۔ اور وہ ہے ایم ۔ پی شاہ کالج ماٹونگا ، بمبئی میں شعبہ اردو کا قیام ۔ یہ کالج این ۔ ڈی ۔ ٹی یونیورسٹی ، بمبئی سے ملحق ہے ۔

۱۰ : یو ۔ جی ۔ سی کے متعدد بورڈوں اور کمیٹیوں کے مختلف اوقات میں ممبر رہے ۔

۱۱ : صدرِ جمہوریہ ، ہند کی جانب سے سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے لیے ۱۹۹۳ ء میں ممبر نامزد ہونے یہ ممبرشپ ۱۹۹۶ ء تک رہی ۔

۲۴ء   ۱۹۹۳ء میں نیشنل کونسل سائنس فار پروموشن آف اردو (حکومت ہند) کے ممبر نامزد ہوئے۔

۲۴ء   انڈو عرب سوسائٹی بمبئی (جو ایک ثقافتی و سیاسی ادارہ ہے) کی مینیجنگ کمیٹی کے ممبر ہیں۔

۲۴ء   جنوری ۱۹۹۱ء میں مہاراشٹر اردو اکادمی بمبئی کے کارگزار صدر نامزد ہوئے۔

استفادہ   ۱۹۶۳ء   میں لسانیات کی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے اور وہاں یونیورسٹی آف لندن کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن کے شعبے میں ایک سال زیر تعلیم رہے۔

۱۹۸۶ء   میں برٹش کونسل اسکالر کی حیثیت سے لندن گئے اور وہاں مشہور اسلامی اسکالر چارلس ایٹن (Charles Eaton) کی تقریر روحِ اسلام (The Sprit of Islam) کی صدارت کی۔
(یہ لندن کا دوسرا سفر تھا)۔

۱۹۸۸ء   میں ہند و مصر ثقافتی تبادل (Indo-Egypt Cultural Exchange) کے تحت مصر گئے۔ یہاں جامعہ ازہر، قاہرہ یونیورسٹی اور عین شمس یونیورسٹی قاہرہ میں لکچرز دیے۔ اس سفر نے دلوی صاحب کو عمرہ کرنے اور مدینہ و مکہ شریف کی زیارت کرنے کا موقع عطا کیا۔ اور لسانیاتی موضوع پر جدہ یونیورسٹی میں اساتذہ کے ساتھ تبادلۂ خیال کیا۔

۱۹۸۹ء   میں یونیورسٹی آف لندن کے انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن کے سمینار میں شرکت کرنے کے لیے گئے اور سینٹل سے اڈنبرا یونیورسٹی بھی گئے۔ یہاں اردو اور اسلامیات کے موضوع پر لکچرز دیے۔
(یہ لندن کا تیسرا سفر تھا)

۱۹۸۹ء   ہی میں جنوبی افریقہ گئے۔ یہاں کیپ ٹاؤن اور ڈربن کی یونیورسٹیوں میں لسانیاتی اور تہذیبی موضوعات پر لکچرز دیے۔ اس کے علاوہ شہر کیپ ٹاؤن کے حبیب کالج اور بزمِ ادب کے زیرِ اہتمام ادبی علمی پروگراموں میں لسانیاتی، ثقافتی اور ادبی موضوعات پر بھی لکچرز دیے۔

۱۹۹۰ء   میں حکومتِ ہند کی جانب سے مختلف علوم کے ماہرین کے ایک وفد کے ساتھ ہند و مصر سمینار میں شرکت کرنے کے لیے مصر گئے۔ وفد کی لیڈر راجیہ سبھا کی چیرپرسن ڈاکٹر نجمہ ہبت اللہ تھیں۔ اس وفد میں حکومتِ ہند کے سابق سفیر براے امریکہ و روس جناب ٹی۔ این کول بھی شریک تھے۔

۱۹۹۴ء   میں حکومتِ مصر کی دعوت پر عین شمس یونیورسٹی قاہرہ میں شعبۂ اردو کے قیام کے لیے مصر گئے۔ وہاں ایک سال تک مقیم رہے۔ (یہ مصر کا تیسرا سفر تھا)

۱۹۹۵ء   میں خلیجی مملکت قطر کے شہر دوحہ میں منعقدہ سمینار "جشنِ امیر خسرو" میں شرکت کرنے کے لیے گئے۔ قطر یونیورسٹی میں شعبۂ لسانیات کے فارسی اور عربی اساتذہ کے ساتھ تبادلۂ خیال کیا۔ اس کے علاوہ وہاں کے متعدد ادبی و تعلیمی اداروں اور انجمنوں میں مختلف موضوعات پر لکچرز دیے۔

۱۹۹۷ء   مارچ کو بین الاقوامی امتحانی ادارہ "انٹرنیشنل بیکلوریا" میں اردو زبان کے لیے Examiner Responsible کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ اس کی پہلی میٹنگ میں جو انگلستان کے شہر

کانفرنس میں منعقد ہوئی شرکت کی۔ پھر آکسفورڈ اور کیمبرج یونی ورسٹیوں کی لائبریریوں میں ایک ماہ رہ کر علمی کام میں مصروف رہے۔

انعام و اعزاز : ۱ : ۱۹۷۰ء میں مہاراشٹرا اردو اکاڈمی ممبئی نے مراٹھی اردو انعام سے سرفراز کیا۔

۲ : اترپردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ کا انعام ۱۹۷۶ء میں ملا۔

۳ : ۱۹۹۵ء میں میر اکاڈمی لکھنؤ نے اپنا "امتیازِ میر" انعام دیا۔

۴ : ۱۹۹۰ء میں ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی نے "قومی ترجمہ" ایوارڈ سے نوازا۔

مقالات : مقالات کی فہرست خاصی طویل ہے یہاں چند جامع مقالات کی تفصیلات درج کی جاتی ہیں:

۱ : بچوں کی اردو ۔۔۔ تحصیلِ زبان کا ایک مطالعہ۔

۲ : اردو اور انگریزی کے دو لسانی پہلو۔

۳ : اردو میں تلفظ کا مسئلہ۔

۴ : امیر خسرو کے عہد کا لسانی اور سماجی پس منظر اور ان کی ہندی شاعری۔

۵ : دکنی اردو پر مراٹھی کا اثر۔

۶ : دکنی اردو کا سماجی لسانی مطالعہ۔

۷ : اردو کا ہندوستانی رجحان۔

۸ : مولوی عبدالحق ۔۔۔ نفسیاتی مطالعہ۔

۹ : سکندر علی وجد ۔۔۔ فنونِ لطیفہ کا شاعر۔

۱۰ : اقبال اور بمبئی۔

۱۱ : شبلی بہ حیثیتِ مکتوب نگار۔

۱۲ : گاندھی جی اور قومی زبان کا مسئلہ۔

۱۳ : اردو اور ہندی : تاریخی اور لسانی تناظر میں۔

سکونت : ۲ جالال، باندرہ (ویسٹ) ممبئی - ۴۰۰۰۵۰

○●○

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ

"دکنی اردو" پر ایک نظر

دکنیات بعض محققین کا ایک پسندیدہ اور مخصوص موضوع رہا ہے ۔ اس ضمن میں اردو میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، پروفیسر عبدالقادر سروری، نصیرالدین ہاشمی، مولوی عبدالحق، پروفیسر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر اکبرالدین صدیقی اور ڈاکٹر سیدہ جعفر ا ہندی میں بابو رام سکسینہ، شری رام شرما اور دیوی سنگھ چوہان کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں ۔ دکنیات پر زیادہ تر کام یا تدوینِ متن سے متعلق ہوا ہے یا دکنی اردو کے لسانی مطالعے کی طرف توجہ دی جاتی رہی ہے ۔ پروفیسر عبدالستار دلوی کی مرتب کر کتاب "دکنی اردو" اس لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے کہ یہ دکنی اردو کا بہ یک وقت تاریخی، تہذیبی، سماجی، لسانی اسلوبیاتی اور اد مطالعہ پیش کرتی ہے ۔ اسے اگر دکنیات میں ایک گراں قدر اضافہ کہا جائے تو بےجا نہ ہوگا ۔

بول چال کے طور پر دکنی اردو، اگر چہ حیدرآباد اور دکن کے دوسرے علاقوں میں آج بھی رائج ہے، لیکن ادبی حیثیت سے اس کا وجود اب بالکل ختم ہوچکا ہے ۔ دکنی اردو، کا تمام تر ادبی سرمایہ اب قدیم اور کلاسیکی ادب بن چکا ہے جس کی طرف صرف محققین ہی کی توجہ مبذول ہوتی ہے ۔ عام لوگ اس کا مطالعہ اگر کرتے بھی ہیں تو محض نصابی ضروریات کے تحت ۔ علمی ذوق کی بِ پر دکنی اور ادب کا مطالعہ کرنے والے بہت ہی کم ہیں ۔ معیاری اردو کے مقابلے میں دکنی اردو کی حیثیت آج اگر چہ محض ایک علاقا بولی کی ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس علاقائی بولی کو تاریخی، تہذیبی، لسانی، اسلوبیاتی اور ادبی لحاظ سے اردو کی دیگر بولیوا پر فوقیت حاصل ہے ۔ یہ بولی اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ خود اردو زبان ۔

پروفیسر عبدالستار دلوی نے جو ایک لسانی محقق ہونے کے علاوہ دکنی (باشندہ، دکن) بھی ہیں، دکنیات کے بارے میں سرِ نو غور و خوض کی ضرورت کو محسوس کیا اور شعبہ، اردو، بمبئی یونی ورسٹی (جس کے وہ آج کل صدر ہیں) کے زیرِ اہتمام دکنی اردو پر ایک کل ہند سمینار کا انعقاد کیا جس میں اس موضوع سے دل چسپی رکھنے والے تمام محققین کو مقالے لکھنے اور شرکت کرنے کی دعوت دی گئی ۔ زیرِ تبصرہ کتاب کے بیش تر مضامین اسی دکنی سمینار میں پڑھے گئے مقالات ہیں ۔ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں دکنی اردو کا تاریخی و تہذیبی مطالعہ پیش کیا گیا ہے ۔ دوسرا حصہ ادبی مطالعات کے لیے وقف ہے اور تیسرے حصے میں اسلوبیاتی اور لسانی مسائل و مباحث پیش کیے گئے ہیں ۔ کتاب کے شروع میں پروفیسر عبدالستار دلوی کا ایک نہایت جامع مقدمہ بھی شامل ہے جس میں دکنی اردو کی تشکیل اور اس کے آغاز و ارتقا سے لےکر اس کی لسانی اور ادبی روایت، نیز اسلوب کے ارتقا سے بحث کی گئی ہے ۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ دکن کے بعض محققین کی طرح پروفیسر دلوی "دکنی" اور "اردو" کو دو الگ الگ زبانیں نہیں مانتے بلکہ دکنی کو اردو ہی کا ایک علاقائی روپ تسلیم کرتے ہیں اور اسے صرف "دکنی" نہیں بلکہ "دکنی اردو" کے نام سے یاد کرنا پسند کرتے ہیں ۔ چوں کہ ہندی والوں نے اسی زبان کو "دکنی ہندی" کہنا شروع کردیا ہے، اس لیے یہ اور بھی ضروری ہے ک

اسے " دکنی اردو " کہا جائے ۔ دلوی صاحب نے اپنے مقدمے میں بڑی خوبی کے ساتھ اس امر کی بھی صراحت کردی ہے ۔ دکنی یا دکنی اردو دراصل قدیم اردو ہی ہے جسے اس دور میں کبھی " ہندی " اور کبھی " ہندوی " کے نام سے یاد کیا گیا ۔ بہ قول پروفیسر عبدالستار دلوی " یہ بات صحیح نہیں کہ (محض) نام کی وجہ سے دکنی کو موجودہ ہندی کے مماثل قرار دے کر اس کے اردو ہونے کی حیثیت سے انکار کیا جائے ۔ دکنی بہ ہرحال اپنے وسیع معنوں میں اردو ہی ہے اور جدید ہندی عالموں کا یہ اصرار کہ قدیم اردو دراصل ہندی ہے محض ایک ضد ہے ۔"

جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے کہ پوری کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے ۔ اس کے پہلے حصے یعنی تاریخی و تہذیبی مطالعات کے ضمن میں ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی نے گجری اور دکنی اردو کے رشتوں پر روشنی ڈالی ہے ۔ ڈاکٹر سید نعیم الدین نے دکنی ادب اور ایرانی روایات کو مطالعے کا موضوع بنایا ہے ۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کا تہذیبی مطالعہ پیش کیا ہے ۔ ڈاکٹر یونس اگسکر نے مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کی دکنی کہاوتوں کا تجزیہ کیا ہے اور ڈاکٹر محمد اقبال احمد خاں نے قدیم دکنی شاعری میں ہندو اساطیر کی چھان بین کی ہے ۔ دوسرا حصہ جو ادبی مطالعات کے لیے وقف ہے اس میں " دکنی غزل " (پروفیسر سیدہ جعفر) اور " دکنی مرثیہ اور عزاداری " (ڈاکٹر رشید موسوی) اہم مضامین ہیں ۔ اسی حصے میں " سب رس " ، " قطب مشتری " اور بعض دکنی مثنویوں کا بھی مطالعہ پیش کیا گیا ہے ۔ ڈاکٹر شیخ فرید کا تحقیقی مضمون " حضرت شاہ بہاء الدین باجن ؛ حالات اور ہندوی کلام " بھی اسی حصے میں شامل ہے ۔ اس کتاب کے تیسرے حصے کے مضامین لسانی اور اسلوبیاتی نوعیت کے ہیں ۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے دکنی اردو کا سماجی لسانیاتی Sociolinguistic نقطہ نظر سے مطالعہ پیش کیا ہے جو ایک نیا علمی کام ہے ۔ جناب رشید حسن خاں نے دکنی ادب کی تدوین کے بعض مسائل سے بحث کی ہے ۔ ڈاکٹر عالی جعفری نے مثنوی " خوب ترنگ " کی لسانی خصوصیات کا جائزہ لیا ہے ۔ البتہ ڈاکٹر گیان چند جین کے مضمون " دکنی کے لسانی رشتے " میں کوئی نئی بات نہیں کہی گئی ہے اور پورا مضمون ڈاکٹر شری رام شرما کی ہندی تصنیف " دکھنی ہندی کا ادبھو اور وکاس " سے ماخوذ ہے جس کا اعتراف خود جین صاحب نے بھی اپنے مضمون کی ابتدا میں کیا ہے ۔ اس حصے کے دوسرے قابلِ ذکر مضامین " میراں جی کی شاعری میں چھندوں کا نظام " (ڈاکٹر سید یحییٰ نشاط) ، " دکنی اردو پر مراٹھی کا اثر " (پروفیسر عبدالستار دلوی) اور " دکنی اردو کے اسلوبیاتی مطالعے کی اہمیت " (ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ) ہیں ۔

اس کتاب میں دکنی زبان و ادب سے متعلق بعض وہ مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں جو اگر چہ کافی پہلے لکھے گئے لیکن جن کی افادیت آج بھی قائم ہے اور جن سے اسکالر آج بھی استفادہ کرسکتے ہیں ۔ دکنیات پر محمود شیرانی (سب رس ؛ ایک مطالعہ) ، نصیرالدین ہاشمی (دکنی ادب کا تہذیبی پس منظر) ، عبدالقادر سروری (دکنی زبان) ، پروفیسر مسعود حسین خاں (قدیم و جدید اردو کی کشمکش ، سرزمینِ دکن میں) ، ڈاکٹر اکبرالدین صدیقی (دکنی مثنویاں) اور ڈاکٹر مبارزالدین رفعت (دکنی اردو کا ایک عظیم مرکز ، بیجاپور) وغیرہ کے مضامین جو آج بہ آسانی دستیاب نہیں ہوتے ، تلاش و جستجو کے بعد اس کتاب میں شامل کردیے گئے ہیں جس سے اس کتاب کی اہمیت و افادیت میں اور بھی اضافہ ہوگیا ہے ۔

○●○

پروفیسر محمد انور الدین

اردو زبان اور سماجی سیاق

(اردو میں لسانی مطالعے کی ایک نئی جہت)

پروفیسر عبدالستار دلوی اردو کے بلند مرتبت محقق و نقاد ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک قدآور ماہرِ لسانیات بھی ہیں ۔ انھوں نے لسانیات میں نہ صرف اعلیٰ ترین ڈگری حاصل کی ہے بلکہ اس فن میں مجتہدانہ مہارت اور بصیرت بھی پیدا کی ہے اس شعبہ میں ان کے علمی تبحر مطالعے کی وسعت اور فکر کے تعمق کا نیا مظہر ان کی تازہ تصنیف " اردو زبان اور سماجی سیاق " ہے ۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ علم لسانیات کی شروعات تاریخی لسانیات Philology سے ہوئی ۔ اس میں انیسویں صدی کے آغاز میں توضیحی لسانیات کی شاخ کا نشو و نما ہوا ۔ لیکن عصرِ حاضر کے دوران علم لسانیات میں متعدد جدید شعبوں کا ارتقا ہوا ہے مثلاً نفسیاتی لسانیات اور ریاضیاتی لسانیات وغیرہ ۔ انھیں نئے شعبوں میں سے ایک سماجی لسانیات ہے جس میں زبان کی سماجی اہمیت ۔ اس کے سماجی کردار ، سماجی تبدیلیوں سے اس کی اثر پذیری اور سماج سے متعلق اس کے دیگر ابعاد سے بحث کی جاتی ہے ۔ اردو میں لسانیات پر بہت کم کام ہوا ہے اور خاص کر سماجی لسانیات پر اس سے بھی کم ، جب کہ مطالعہ زبان میں اس کے سماجی سیاق کی اہمیت محتاجِ دلیل نہیں ہے ۔ پروفیسر عبدالستار دلوی کی زیرِ نظر کتاب اردو میں سماجی لسانیات پر اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے ۔ اس میں زبان اور سماج کے رشتے سے متعلق گیارہ مضامین شامل ہیں ۔ جنھیں فاضل مصنف کے ایک عمر کی تحقیق و تلاش ، تجربات و مشاہدات اور غور و تفحص کا نچوڑ سمجھا جاسکتا ہے ۔

کتاب کا پہلا مضمون " امیر خسرو کے عہد کا لسانی اور سماجی پس منظر اور ان کی ہندی شاعری " ہے ۔ اس مضمون میں پروفیسر دلوی نے امیر خسرو کے عہد کے لسانی اور سماجی پس منظر کا نہایت تعمق اور گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور شرح و بسط کے ساتھ ان سماجی عوامل اور تہذیبی عناصر پر روشنی ڈالی ہے جن کے پس منظر میں خسرو کی ہندوی شاعری ایک تاریخی ضرورت بن کر معرضِ وجود میں آئی ۔ اس مضمون میں مسلمانوں کی آمد سے قبل برصغیر کی لسانیاتی صورتِ حال کا نقشہ کھینچ کر یہ دکھایا گیا ہے کہ جدید ہند آریائی زبانوں اور فارسی نیز ہندی و ایرانی تہذیب و تمدن کے اختلاط اور میل ملاپ کے نتیجے میں ہندوی زبان کس طرح وجود پذیر ہوئی ۔ امیر خسرو سے قبل جن شعرا کے ہندوی اشعار کا ذکر ملتا ہے ان کے حوالے دیئے گئے ہیں جن میں مسعود سلمان ، شاہ معین الدین چشتی ، شیخ فریدالدین گنج شکر ، شیخ برہان الدین ، شیخ حمیدالدین ناگوری شامل ہیں ۔ اسی تسلسل میں کھڑی بولی کی وسعت اور مقبولیت کے اثبات کے لیے دلوی صاحب نے نہایت وقتِ نظری اور دقیقہ سنجی کے ساتھ مراٹھی کے کلاسیکی شعرا سنت گیانیشور ، نما باتی اور نام دیو کے پدوں میں کھڑی بولی کے الفاظ کھوج نکالے ہیں ۔ اس تاریخی ، تہذیبی ، سماجی اور لسانی تناظر میں خسرو کی ولادت

اور ابتدائی احوال پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہے ۔ اس کے بعد ان کی ہندوی شاعری کا بھرپور مطالعہ پیش کیا ۔ امیر خسرو کی ہندوی زبان سے واقفیت اور فارسی شاعری اور نثری تصنیف میں ہندوی الفاظ کی شناخت کی ہے ۔ امیر خسرو کی ہندی دانی کی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے دلوی صاحب نے خسرو سے منسوب مشہور ہندوی نظم خالق باری کا بھی ذکر کیا ہے ۔ پروفیسر محمود شیرانی نے جو دلائل دیے ہیں وہ تشنہ اور ناقص ہیں اور ان پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے ۔ اس مضمون میں دلوی صاحب نے خسرو سے منسوب پہیلیوں ، دوہوں اور کہہ مکرنیوں پر بھی مفصل گفتگو کی ہے ۔ خسرو کی ہندوی شاعری کی اہمیت یہ ہے کہ یہ اس دور کا آئینہ ہے جب مختلف زبانوں ، بولیوں تہذیبی اکائیوں اور دیگر تاریخی عوامل کے امتزاج و اختلاط سے اردو زبان کا قوام تیار ہوا تھا ۔ اسی مناسبت سے پیش نظر مضمون کی اہمیت بھی یہی ہے کہ اس میں فاضل مقالہ نگار نے نہایت شرح و بسط اور تفصیل کے ساتھ عہدِ خسرو کے سماجی پس منظر کا احاطہ کیا ہے ۔

دوسرے مقالے کا عنوان " اردو اور ہندی تاریخی اور لسانی تناظر میں " ہے ۔ اس میں دلوی صاحب نے مشہور ماہرِ لسانیات گریرسن کے اس نظریے کی روشنی میں کہ " اردو اور ہندی کھڑی بولی کے دو روپ ہیں " ان زبانوں کے تاریخی اور لسانی پہلو کا عالمانہ جائزہ لیا ہے ۔ یورپی اور ہندستانی ماہرینِ زبان کے حوالے سے انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ " اودھی ، برج ، راجستھانی اور بہاری وغیرہ جنھیں اب ہندی کہا جانے لگا ہے ہندی سے الگ آزاد زبانیں ہیں ۔ ان زبانوں کے آزادانہ وجود کی نفی بالواسطہ طور پر یہ ثابت کرتی ہے کہ قدامت اور عمر کے اعتبار سے اردو ہندی کے مقابلے میں زیادہ پرانی زبان ہے ۔ اس بات کی توثیق کے لیے دلوی صاحب نے گریرسن ، منشی رام چند شکل اور ڈاکٹر دھیریندر ورما کے اقوال بھی پیش کیے ہیں۔

اردو اور ہندی میں مشابہت اور مشاکلت کے سبب بیش تر ہندی علما اور بعض اردو علما نے ان دونوں کو ایک ہی زبان کہا ہے اس کے برخلاف پروفیسر احتشام حسین اور پروفیسر مسعود حسین خاں نے لسانیات کے نقطۂ نظر سے انھیں جداگانہ زبانیں ماننے پر زور دیا ہے ۔ دلوی صاحب نے معروضی انداز میں یہ بتایا ہے کہ توضیحی لسانیات کی سطح پر اردو اور ہندی میں کافی گہری مناسبت ہے ان زبانوں میں صوتی صرفی اور نحوی یکسانیت پائی جاتی ہے ۔ جس کا سبب یہ ہے کہ دونوں ایک ہی بولی (کھڑی بولی) کی دو صورتیں ہیں ۔ لیکن سماجی لسانیات اور اسلوبیات کے اعتبار سے دونوں میں واضح فرق ہے ۔ اردو اور ہندی کے سیاق میں اس حقیقت کو ماننا ہی لسانی صحت مند رویے کی علامت ہے ۔

تیسرا مضمون " دکنی اردو سماجی لسانیات کی روشنی میں " ہے ۔ اس میں دلوی صاحب نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ جب اردو نے شمال سے جنوب کا سفر کیا تو دکن کے لسانی ماحول میں مقامی زبانوں کے اشتراک سے اس نے ابتدا میں ایک عوامی میل جول و ابلاغ کے لیے ثانوی زبان کی حیثیت اختیار کی ۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ کریول (مادری زبان) کی حیثیت حاصل کی ۔ دکنی حیثیت میں دکنی اردو نے گجراتی اور مراٹھی کے ساتھ تلگو اور کنڑ سے بھی ، فارسی ، عربی اور انگریزی زبانوں کے عناصر ناشت طلبی پر قبول کیے ۔ کریول کی حیثیت میں دکنی اردو نے دیگر مقامی زبانوں کو متاثر کیا ۔ چنانچہ مقامی زبانوں میں دخیل عربی و فارسی کے الفاظ دکنی ہی کے وسیلے سے ان تک پہنچے ۔ دکن کی جغرافیائی وسعت اور زبان ہونے کے ناطے دکنی اردو میں اس علاقے کی تہذیب و ثقافت منعکس ہو گئی ہے ۔ اس طرح یہ زبان اپنی ایک خاص حیثیت رکھتی ہے جس کی جڑیں دکن کے مقامی رسم و رواج ، طرزِ معاشرت اور تہذیب و تمدن کی تہوں میں پیوست ہیں ۔ مقالے کے اختتام میں دلوی صاحب نے یہ نکتہ بھی واضح کیا ہے کہ سماجی درجہ بندی کے اعتبار سے معیاری اردو کے دہلوی اور لکھنوی دبستانوں کی طرح دکنی اردو کے بھی کئی مقامی مراکز ہیں ۔ شہری دیہاتی ماحول سے قطع نظر ہر علاقے کے مقامی اور تہذیبی پس منظر میں دکنی اردو کہیں مراٹھی ، کہیں کنڑ ، کہیں تلگو اور کہیں تامل اثرات

کے تحت بولی جاتی ہے ۔ اس مقالے میں دلوی صاحب نے نہایت جامع و بلیغ انداز میں دکنی اردو کی سماجی لسانیات پر روشنی ڈالی ہے ۔

اگلے مقالے کا موضوع " اردو میں دخیل آوازیں " ہے ۔ اس میں دلوی صاحب نے اردو زبان میں دخیل آوازوں کا مطالعہ پیش کیا ہے ۔ اردو ایک مخلوط زبان ہے اس کی تشکیل میں فارسی ، عربی اور بر عظیم کی مقامی زبانوں کے الفاظ کے ساتھ ساتھ ان کی اصوات بھی اردو کے صوتی نظام میں شامل ہوگئیں ۔ دلوی صاحب نے اردو میں دخیل آوازوں مصوتوں اور مصموتوں کو دو جماعتوں میں تقسیم کیا ہے ۔ عام طور پر ماہرین اردو زبان کے درج ذیل دس مصوتوں کی نشان دہی کرتے ہیں :

əu - əi - o: - e: - u: - U - i: - i - a - ə

دلوی صاحب نے بتایا ہے کہ انگریزی کے درج ذیل تین مصوتے بھی انگریزی الفاظ کے ساتھ اردو کے مصوتوں کی فہرست میں شامل ہیں ۔ e - æ - ɔ مصوتوں کے علاوہ اردو زبان نے دراوڑی زبان سے مصموتہ ڑ ' ا ' بھی اپنایا ہے ۔ اس رگڑالو Flap کی وجہ سے اردو میں رگڑالو ہائیہ Aspirated Flap ڈھ وجود میں آتا ہے دلوی صاحب نے علم لسانیات کی روشنی میں حرف و صوت کے درمیان پائے جانے والے فرق و امتیاز کی وضاحت کرتے ہوئے اردو میں دخیل عربی و فارسی کی خاص آوازوں یعنی ث ، ح ، ص ، ض ، ط ، ظ ، ع ، غ ، ف ، ق وغیرہ کی ادائی کی بحث اٹھائی ہے ۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ عام طور پر بول چال کی زبان میں عام اردو والا قطع نظر اس سے کہ وہ تعلیم یافتہ ہو یا ناخواندہ مذکورہ آوازوں کو عربی اور فارسی صوتیات کے مطابق ادا نہیں کرتا اور طبعاً اس کے اعضائے نطق بھی اس پر قادر نہیں ہیں ۔ اس بنا پر بعض لوگ ان آوازوں اور ان کی علامتوں (حروف) کو اردو رسم خط سے شہر بدر کرنا چاہتے ہیں ۔ اس مقدمے میں دلوی صاحب کا قول فیصل یہ ہے کہ چوں کہ ہر اردو داں ان سب علامتوں کو استعمال کرتا ہے اس لیے ماہرین کو چاہیے کہ آوازوں کو صرف بول چال کی زبان کی اکائی مانیں اور حروف کو تحریری زبان کا جزو سمجھ کر آگے بڑھیں ۔

پانچواں مضمون " اردو میں تلفظ کا مسئلہ " ہے ۔ اس میں دلوی صاحب نے تلفظ اور معیار کے تعلق سے مغربی ماہرین لسانیات ایڈرسی وارڈ ۔ پال گارڈن اور بلوم فیلڈ کی آرا پیش کر کے اردو میں تلفظ کے مسائل پر سیر حاصل گفتگو کی ہے ۔ اردو میں تلفظ کا مسئلہ نہایت نازک اور پیچیدہ ہے لیکن اس مسئلے میں تنہا اردو ہی گرفتار نہیں ہے بلکہ انگریزی ، جرمنی ، فرنچ اور عربی وغیرہ زبانیں بھی اس کی اسیر ہیں ۔ ہندستان جیسے وسیع و عریض ملک میں مقامی بولیاں اپنے اپنے علاقے کے اردو بولنے والوں کے لہجے پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں ۔ زبانوں کی مقامی بولیوں کے علاوہ سماجی بولیاں بھی ہوتی ہیں جیسے ، پنجابی ، پٹھان ، کشمیری ، قریش ، کھتری ، نداف وغیرہ ۔ ان کے تلفظ میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے ۔ دلوی صاحب کا نقطہ ، نظر یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں تلفظ کے سلسلے میں قدما مثلاً انشا ، ناسخ ، خان آرزو ، رجب علی بیگ ، داغ اور میر امن کی سخت گیر معرب اور مفرس اردو کی طرف میلان اور علاقائی اثرات کی نفی اور تضحیک کا رویۂ نہایت درجہ غیر حقیقت پسندانہ ، غیر صحت مندانہ اور اردو کے حق میں ازحد خطرناک ہے ۔ دلوی صاحب نے تلفظ اور زبان کے اختلاف کی دو وجوہات بتائی ہیں ۔ پہلی وجہ اردو رسم الخط میں اعراب کی غیر موجودگی ہے اور اس کا حل اعراب کی پابندی ہے جو تمام الفاظ کے لیے نہیں بلکہ ایسے الفاظ کے لیے ناگزیر ہے جن میں اعراب کی غلطی سے معنی بدل جاتے ہیں ۔ تلفظ میں اختلاف کی دوسری وجہ عربی و فارسی کا ذخیرہ ، الفاظ ہے ۔ اس کا حل یہ ہے کہ ان الفاظ کو عربی و فارسی صوتیات کے مطابق بولنے کی قید ختم کردی جائے ۔ اور نہ صرف عربی اور فارسی بلکہ سنسکرت اور انگریزی الفاظ کے تلفظ کو بھی " اردوانا " چاہیے ۔ لیکن اگر دخیل الفاظ کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کی صوتی خصوصیات بھی چلی آرہی ہوں تب بھی بلا پس و پیش دونوں طریقوں کے تلفظ کو صحیح قرار دینا چاہیے ۔

پیشِ نظر کتاب کا اگلا مضمون "بچوں کی اردو تحصیلِ زبان کا ایک مطالعہ" بھی نہایت معلوماتی، اہم اور وقیع ہے ۔ اس ں تمہیداً بچوں کی زبان جو انگریزی کی اصطلاحوں Child language اور Baby talk دونوں کو محیط ہے کی تعریف کی گئی ہے ۔ لم لسانیات میں شیرخوار اور بالغ معروف معنی سے جداگانہ تصورات ہیں ۔ ان کی وضاحت کرتے ہوئے بہ حیثیتِ زبان اردو کی تصیل کی مختلف منزلوں کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ بچوں میں صوتی ترقی Phonetic development کے چار مدارج ہیں (۱) رونا (۲) وں غاں کرنا (۳) للانا (تتلانا) (۴) گفتگو فاضل مقالہ نگار نے ہر مرحلے کے دوران، بچہ اکتساب زبان کے جس عمل سے گزرتا ہے اس کی تفصیلی صراحت کی ہے جو نہایت دل چسپ ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو میں بچوں کی تحصیلِ زبان کو موضوع بنا کر نہ تو تحقیق کی گئی ہے اور نہ اس سلسلے میں کوئی سائنٹیفک کام ہوا ہے ۔ دلوی صاحب نے تین بچوں کو تحقیق اور مشاہدے کا موضوع بناکر ن میں عمر کے مختلف مرحلوں کے دوران تحصیلِ زبان کی کیفیت اور ان کی صوتی خصوصیات کا مشاہدہ کیا ہے ۔ اور ان مشاہدات کی ثیق دیگر ذریعوں سے کی ہے ۔ اس طرح حاصل شدہ مواد کا بچوں کی اردو کے مصوتے، بچوں کی اردو کے مصمتے، نیم مصوتے، بچوں ں اردو میں مصمتی خوشے کی ذیلی سرخیوں کے تحت لسانیاتی اصولوں کے مطابق تحلیل و تجزیہ کیا ہے ۔ اسی ضمن میں صوتیاتی نقطہ نظر سے بچوں کی اردو کی مصمتی آوازوں کا گوشوارہ بھی بنایا گیا ہے ۔ یہ مضمون نہایت تبحرانہ، سائنٹیفک اور تکنیکی ہے اور اردو میں اپنی میت کا پہلا مضمون ہے جسے فاضل مصنف نے نہایت عرق فشانی، دیدہ ریزی اور منطقی تسلسل اور سلیقہ مندی کے ساتھ قلم بند کیا ہے اور اس مطالعے میں مغرب کے جید ماہرینِ لسانیات کے نظریات سے استفادہ کیا ہے ۔

اگلا مضمون "بمبئی کی اردو ایک لسانی مطالعہ" بھی نہایت فنی اور عالمانہ ہے ۔ اس میں مصنف نے شہر بمبئی کی کاسمو لیٹن شناخت کے حوالے سے بتایا ہے کہ بمبئی کی اردو جو "بمبیانہ زبان" یا "بمبیا زبان" کے نام سے مشہور ہے ۔ مراٹھی، گجراتی پرتگیز اور انگریزی، کے اثرات کے تحت تشکیل پائی ۔ بمبئی کی اردو یہاں کے مخصوص ہمہ رنگی معاشرت، مذہبی، تہذیبی اور سماجی ندگی کی آئینہ دار ہے ۔ دلوی صاحب نے منشی محمد ابراہیم مقبہ، ملاطیب، علی بن بھائی میاں و۔ عبدالفتاح گلشن آبادی کی تصانیف کی شنی میں جو بمبیانہ زبان میں لکھی گئی ہیں ۔ اس زبان کا سماجی و لسانی مطالعہ نقد قلم کیا ہے ۔ اس سلسلے میں بمبئی کی اردو کی صوتی صوصیات کی جدول تیار کر کے دکھایا ہے کہ اس میں ادبی اردو کی کون کونسی آوازیں شامل نہیں ہیں ۔ اس کے بعد بمبیانہ زبان کی چند ید صوتی خصوصیات کی صراحت کی گئی ہے ۔ جن میں پھ کے بجائے ف کا استعمال، لفظوں کو مشدد کرنے کا رجحان، ہکاریت کا عدم تعمال، مصمتی خوشوں کی تسہیل، صرفی خصوصیات میں "لوگ" کے لاحقے سے جمع بنانے کا طریقہ، تذکیروتانیث کی بےقاعدگی، ضمائر ں اپن وغیرہ کا استعمال دل چسپ بھی ہے اور امتیازی بھی ۔ لغوی اعتبار سے بمبیانہ زبان نے مراٹھی، کوکنی، گجراتی اور بالواسطہ طور پر نگریزی زبان سے بے دریغ خوشہ چینی کی ہے ۔ ذخیرہ الفاظ کے اعتبار سے یہ ایک آزادانہ شکل کی حامل ہے ۔ دلوی صاحب نے بمبئی ں اردو اور عام اردو کے ذخیرہ الفاظ کی تقابلی فہرست مرتب کی ہے ۔ اس کے علاوہ انھوں نے بمبئی کی اردو میں تحریر شدہ کتابوں سے یسویں صدی کے دوران مروج بمبیانہ زبان کے نمونے اور ان کے عام اردو متبادل کی بھی طویل فہرست دی ہے ۔ یہ مضمون لسانی تحقیق کا بلند پایہ نمونہ پیش کرتا ہے ۔

آٹھواں مضمون "اردو میں لسانی ادب" ایک اچھوتے اور نئے موضوع پر روشنی ڈالتا ہے ۔ ایک مغربی ماہرِ لسانیات کے بہ جب ہر معاشرے میں اظہارِ خیال کے تین مختلف طریقے ہوتے ہیں ۔ (۱) رسمی یا شائستہ (۲) روز مرہ (۳) بازاری ۔ اس مضمون ں دلوی صاحب نے اردو زبان میں اظہار کے رسمی یا شائستہ اسالیب کا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے ۔ اردو زبان میں رسمی انداز

گفتگو یا شائستہ طرزِ اظہار کی نشوونما اور ارتقا ، امرا و روسا اور بادشاہ کے درباروں ، شرفا و معززین کے دیوان خانوں اور علما و صوفیا کی بارگاہوں میں ہوا ۔ ہندستان کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں اردو کا دامن خطابات ، صفات ، پر احترام الفاظ ، شائستہ کلمات نستعلیق فقرات اور اعزاز و اکرام ، مروت و مروت اور خلوص و محبت کے خوب صورت اور دل نشین اظہارات سے مالا مال ہے ۔ شہنشاہ و ولی عہد ، ساتھی ، رہنما ، پیر طریقت ، والدین ، اعزہ و اقربا ، دوست احباب ، متعلقین خورد و سال حتیٰ کہ نوکر چاکر بھنگی ، حجام اور علوینا وغیرہ تک ہر ایک کے لیے اردو میں مخاطبت کے الگ الگ القاب و آداب مقرر ہیں جن کے استعمال سے ایک خاص تہذیب ، سماجی روایت ، شائستگی و متانت کا اظہار ہوتا ہے ۔ شائستہ کلامی ، شیریں سخنی ، حسنِ گفتار ، اظہارِ خلوص اور اعزاز و اکرام لسانی آداب کے مختلف ابعاد ہیں ۔ ان سب میں ضمائر اور ان کے ساتھ افعال اور اسما کا موزوں استعمال قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے ۔

" تو جا " " آپ تشریف لے جائیں " ۔ ان دو جملوں کے درمیان درحقیقت لسانی آداب کی ایک طویل داستان مخفی ہے ۔ دلوی صاحب نے اس بکھری ہوئی داستان کو فنی اصولوں اور قواعد کی گرفت میں لیا ہے ۔ اردو لسانیات کی دنیا میں یہ گوشہ بالکل نیا اور اچھوتا ہے ۔

اگلے مضمون کا عنوان " اردو اور انگریزی کے دو لسانی پہلو " ہے یہ بھی نہایت ہی عالمانہ اور علمِ لسانیات کی مخصوص مصطلحات و تصورات سے مملو مقالہ ہے ۔ اس میں فاضل مصنف نے سب سے پہلے لسانیات میں دو لسانیت Bi lingualism کی تعریف نیز اس کی نشاندہی ۔ دو لسانیت کے اسباب و محرکات نیز تداخل Borrowing اور دو لسانیت کے فرق کی تشریح اور تفہیم کی ہے ۔ دو لسانیت بہ یک وقت دو یا کئی زبانیں جاننے اور ان میں اظہارِ خیال کرنے کی صلاحیت کو کہتے ہیں ۔ اس کے ضمنی مسائل و مباحث کافی طویل اور علم افزا ہیں ۔ جنھیں دلوی صاحب نے نہایت دل چسپ اسلوب میں بیان کیا ہے ۔ اردو اور انگریزی کی دو لسانیت کا نقطہ آغاز اوائل انیسویں صدی کا وہ عہد ہے جب ہندستان میں انتظامِ حکومت ، عدلیہ ، تعلیم اور مختلف شعبوں میں انگریزی زبان کے الفاظ استعمال ہونے لگے ۔ اس کے جواب میں اردو نے بھی انگریزی کو متاثر کیا اور کئی الفاظ اسے مستعار دیے ۔ دلوی صاحب نے اردو اور انگریزی کی دو لسانیت کے ضمن میں اردو میں دخیل انگریزی الفاظ کا صوتی مطالعہ بھی کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اردو میں داخل ہونے کے بعد ان الفاظ میں کس قسم کی صوتی تبدیلیاں (مصوتوں میں ترمیم یا تخفیف کا عمل) واقع ہوتی ہیں ۔ اسی طرح ان الفاظ کے مصمتی خوشوں میں اہلِ اردو نے اپنے لسانی مزاج کے مطابق تسہیل کی ہے ۔ ایک زبان کے الفاظ جب دوسری زبان میں استعمال ہوتے ہیں تو صوتی ، صرفی ، نحوی اور معنیاتی ہر سطح پر اپنی عادتیں اور طور و طریق بدل دیتے ہیں اس اجمال کی تفصیل گو نہایت خشک اور علمی ہے لیکن دلوی صاحب نے اسے آسان اور دل چسپ بنا کر پیش کیا ہے جو لسانیات سے ان کی طبعی مناسبت اور اس میں ان کی دستگاہ کامل پر دال ہے ۔

دسواں مقالہ " اردو اور لسانی منصوبہ بندی " ہے ۔ ہندستان کے کثیر لسانی پس منظر اور متنوع سماجی و تعلیمی مسائل کے پیشِ نظر اردو زبان کے لیے منصوبہ بند طریقے سے کام کرنا بے حد ضروری ہے ۔ یہی عمل دراصل لسانی منصوبہ بندی ہے ۔ ظاہر ہے جہاں مسائل ہوں گے وہیں ان کے حل کی تلاش کا سلسلہ بھی ہوگا ۔ اس ضمن میں دلوی صاحب کا پختہ کارانہ مشورہ یہ ہے کہ اردو کے مسائل جذباتیت کے بجائے ملک کے وسیع تر لسانی ، تہذیبی تعلیمی اور سیاسی حالات کے علاوہ بین الاقوامی تہذیب و ثقافت ، علوم و فنون کے عصری اکتسابات اور سماجی و لسانی صورتِ حال کے سیاق میں حل کرنا چاہیے ۔ فاضل مصنف کی یہ شکایت بجا ہے کہ اردو زبان کی ترقی کے تعلق سے ہماری گفتگو صرف اس کے ادبی پہلوؤں تک ہی محدود ہوتی ہے ۔ حالاں کہ شاعری یا افسانہ ہی پر زبان

ب کی اساس نہیں ہے بلکہ سماجی وسائنسی علوم بھی ایک طرح سے اس کا حصہ ہیں کوئی بھی زبان محض ادبی زبان ہونے کی ے بڑی زبان نہیں ہوتی بلکہ اس کے ساتھ اسے علمی زبان بھی ہونا چاہیے ۔ اردو کی لسانی منصوبہ بندی کا موضوع نہایت وسیع رتی ہے زیرِ نظر مضمون میں فاضل مصنف نے جن مسائل کا جائزہ لیا ہے ان میں سماجی ، سائنسی ، تعلیمی اور علمی موضوعات پر کتب ، اصطلاح سازی ، رسم الخط اور معیارِ املا کا تعین ، قواعد لغت ، انسائیکلو پیڈیا اور حوالے کی کتابوں کی تیاری وغیرہ شامل ہیں لی لسانی منصوبہ بندی وقت کا اہم تقاضا اور اہلِ اردو کی خرد اور بصیرت کا امتحان ہے ۔ دلوی صاحب نے نہایت خوبی اور بینی سے اس مسئلے کے ہر ّ و باطلیہ سے بحث کی ہے ۔

کتاب کا آخری مضمون " اردو کا ہندستانی رجحان " ہے ۔ زمانی و مکانی پس منظر کی رنگا رنگی ، تہذیبی عناصر کی کثرت اور تاریخی عوامل کے اختلاف و تنوع کے سبب اردو ادب میں تین قسم کے اسالیب یا رجحانات واضح اور ممیز ہیں (۱) مفرس و رجحان (۲) ہندستانی رجحان (۳) انگریزی رجحان ۔ دلوی صاحب نے ثانی الذکر رجحان کو موضوعِ بحث بنایا ہے ان کا خیال ہے ں میں ہندستانی رجحان اور علاقائی آب و رنگ کی آمیزش دکنی اور گجری کے دور سے ہوتی ہے ۔ دلوی صاحب نے کسی احتراز کے اسباب و علل کی بھی صراحت کی ہے جن کی وجہ سے اردو ادب میں مفرس اور معرب رجحان نے بار پایا ۔ محمد حسین آزاد پہلے ہیں جنھوں نے ہندستانی عناصر کی شمولیت کی قدروقیمت محسوس کی قدیم دور میں ہندستانی رجحانات کے حامل دکن اور شمالی ہند اعروں اور ادیبوں کی شناخت اور نشان دہی کے بعد دلوی صاحب نے جدید اردو کے شاعروں کے کلام میں ہندستانی عناصر کی کی ہے جن میں حفیظ ۔ الطاف مشہدی ، میراجی ، اختر شیرانی ، جوش اور جمیل الدین عالی وغیرہ شامل ہیں ۔ نظم کی طرح انھوں دو نثر میں بھی ہندستانی نقوش اور ارتسامات روشن کیے ہیں جس کے نقطۂ آغاز پر میر امن اور انشا کھڑے ہیں ۔ تو نقطۂ انتہا پر ، کرشن چندر ، بیدی اور اشک اور ہنوز یہ سفر جاری ہے ۔

اس مضمون میں دلوی صاحب نے مدلل طور پر ثابت کیا ہے کہ اردو زبان اور ادب میں ہندستانی عناصر کی کارفرمائی اور ں رجحانات نمود تاریخ کے ہر دور میں موجود رہی ہے ۔

عبارت مختصر پروفیسر عبدالستار دلوی کی زیرِ نظر کتاب اردو میں سماجی لسانیات کے موضوع پر ایک گراں مایہ اور وقیع تصنیف اس میں اردو کی سماجی لسانیات کے نئے گوشوں اور اچھوتے زاویوں کو فکر و نظر کی روشنی میں لایا گیا ہے ۔ اس کتاب کے ، نہایت معلوماتی ، دل چسپ ، مفید ، ٹھوس اور علمی قدروقیمت کے حامل ہیں ۔ دلوی صاحب کی تحقیق سائنٹیفک اور معروضی اور دلائل عقلی و منطقی ہوتا ہے ۔ اس لیے وہ جن نتائج کا استخراج کرتے ہیں اس سے انکار یا اختلاف کی شاذ ہی کہیں گنجائش ہوتی اس کے ساتھ ساتھ ان کا اسلوبِ تحریر نہایت شگفتہ اور دلآویز ہے ۔ جس کی وجہ سے قاری پر مسائل و مباحث کی خشکی بارِ خاطر ہوتی ۔ اس کے ذریعے طلبہ ریسرچ اسکالرس اور باذوق قاری اردو زبان پر علاقائی ، تہذیبی ، جغرافیائی ، تاریخی اور سماجی اثرات کی صل کرسکتے ہیں ۔

○●○

ڈاکٹر محمد علی اثر

پروفیسر عبدالستار دلوی اور " نئی تحریریں "

اردو تنقید و تحقیق میں پروفیسر عبدالستار دلوی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ۔ وہ اردو کے خاموش خدمت گزاروں میں شما کیے جاتے ہیں ۔ پروفیسر دلوی صاحبِ نظر محقق ، بلند پایہ نقاد اور ماہرِ لسانیات ہیں ۔ ان کی محنت ، دیدہ ریزی اور انہماک کا اندازہ ا تحقیق و تدوینِ متن ، لسانیات اور دکنیات کے موضوع پر ان کی مرتبہ کتابوں سے لگایا جاسکتا ہے " اردو میں لسانیاتی تحقیق " ، " اد اور لسانی تحقیق " ، " اصول اور طریقِ کار " اور " دکنی اردو " پروفیسر دلوی کی مرتبہ ایسی تصانیف ہیں ، جنھیں کتبِ حوالہ کی حیثیہ حاصل ہوگئی ہے ۔ ان کتابوں کے علاوہ دلوی صاحب کی دیگر مطبوعات میں " انتخابِ کلامِ چکبست " ، " من بھاون " ، " انتخاب مصحفی " ، " رانی کیتکی کی کہانی " ، " امرت بانی " ، " گھر آنگن " ، " ساوتری " اور " رن آنگن " (مراٹھی ناولٹ کا اردو ترجمہ) کے نام قابلِ ذکر ہیں ۔ آخر الذکر کتاب پر انھیں ساہتیہ اکیڈیمی دلی کا انعام بھی مل چکا ہے ۔ لسانیات ، تحقیق اور تنقید کے موضوع پروفیسر دلوی کے مقالات اور مضامین ملک اور بیرونِ ملک کے موقر رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں ۔ ہندستانی زبان اور لسانیات سے متعلق ان کے بعض اہم مطبوعہ مضامین درج ذیل ہیں ۔

" بمبئی کی اردو " ، " بچوں کی اردو " ، " تحصیلِ زبان کا مطالعہ " ، " ہندستان کا لسانی مسئلہ " ، " ہندستان کے لیے لسا یک جہتی کا تصور اور گاندھی جی " ، " اردو کا ہندستانی رجحان " ، " اردو کے لسانی آداب " ، " اردو ، ہند اور اودھی " ، " دکنی اردو مراٹھی کا اثر " ان مضامین کو برِ صغیر ہند و پاک کے علمی اور ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ۔

ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے سنیتی کمار چٹرجی اور ڈاکٹر وی ۔ کے ۔ آر ۔ وی راؤ کی کتابوں ndia: A Polyglot Nation اور Many Languages and One Nation کا پیش لفظ بھی تحریر کیا تھا جسے خود مصنفین نے بھی پسند کیا تھا ۔

پیشِ نظر کتاب " نئی تحریریں " مجموعہ ہے ، پروفیسر دلوی کے گیارہ فکر انگیز ادبی ، تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا ، جو گزشہ پچیس سال کے عرصے میں اردو کے معتبر اور موقر رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں ۔ ان میں سے جیسا کہ خود مصنف نے لکھا ہے بعض مقالات فرمائشی ہیں جو مکتبی ضروریات کے پیشِ نظر تحریر کیے گئے ہیں اور چند مضامین ایسے بھی ہیں جو خود مصنف کے اپنے علم و ادبی شغف اور لسانی شعور کے نتیجے کے طور پر معرضِ وجود میں آئے ہیں ۔ ان مضامین اور مقالات کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ ، ان کے مطالعے سے قاری پر مہاراشٹرا اور بمبئی کا علاقائی رنگ و روپ اور مقامی قدآور شخصیات کا گہرا تاثر ابھرتا ہے ۔

" نئی تحریریں " میں بمبئی سے متاثر ہونے والے یا بمبئی میں قیام کرنے والے شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ ، بمبئی مہاراشٹرا کی اہم علمی و ادبی شخصیتوں کے بارے میں درج ذیل مضامین شامل ہیں ۔

۱ ۔ اقبال اور بمبئی ۲ ۔ پریم چند کا قیامِ بمبئی ۳ ۔ سکندر علی وجد فنونِ لطیفہ کا شاعر ۴ ۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی علمی زندگی کے تین دور ۵ ۔ ندوی صاحب شخصیت اور کردار ۶ ۔ وشنو سکھارام کھانڈیکر ۔

متذکرہ مضامین کے علاوہ " شبلی مکتوب نگار کی حیثیت سے " ایک ایسا مضمون ہے جس کا رشتہ مہاراشٹرا اور بمبئی کے علمی اور ادبی حلقوں سے بہ آسانی جوڑا جاسکتا ہے ۔

بمبئی ابتدا ہی سے اردو کا مرکز رہا ہے اور اس کی تجارتی اور ثقافتی حیثیت بھی مسلم ہے ۔ شہر بمبئی کی علمی اور تہذیبی حیثیت کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر دلوی رقم طراز ہیں :

" شہر بمبئی کو ہندستان کے دیگر شہروں کے مقابلہ میں گذشتہ تقریباً دوسو سال سے ایک امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے ۔ ابتداءً اس کی اس اہمیت کی وجہ ، اس کا جغرافیائی محلِ وقوع تھا جسے بعد میں اس کی صنعتی اور تجارتی حیثیت نے اور جلادی ۔ اسے ہندستان کا دروازہ بھی کہا گیا کہ اس کے راستے سے ہندستان نے اپنے تعلقات کو بیرونی ممالک کے ساتھ وسعت دی ۔"

قرۃ العین حیدر نے بمبئی کی آزاد خیالی اور اہلِ بمبئی کی آرٹ سے دل چسپی کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا ۔

" فنونِ لطیفہ اور ادب کی آب یاری کے لیے جس آزاد خیالی کی ضرورت ہے وہ فضا مہاراشٹرا میں ملتی ہے ۔ ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ ترقی پذیر ریاستوں میں شہر بمبئی کی روشن خیالی سارے بر صغیر میں بہ طورِ مثال پیش کی جاسکتی ہے ۔ بمبئی میں مختلف فرقوں کے کلچر ، فکشن ، ڈرامہ ، موسیقی ، فلم پرفارمنگ ، آرٹ کی فضا ساز گار ہے ۔"

مہاراشٹرا اور بمبئی کی علمی و ادبی فضاؤں اور مقامی شخصیات سے متعلق ان مقالات و مضامین میں پروفیسر دلوی نے اپنی ژرف نگاری اور تحقیقی بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے تمام منتشر اور بکھرے ہوئے مواد کو بڑی مہارت اور چابک دستی سے یک جا کردیا ہے ۔ مختلف شخصیتوں کے متنوع پہلوؤں پر لکھی گئی ان تحریروں کو دلوی صاحب نے اس خوب صورتی کے ساتھ ، ایک گل دستے کے روپ میں پیش کیا ہے کہ اس کتاب کو ایک مستقل تصنیف کی حیثیت دی جاسکتی ہے ۔

" نئی تحریریں " کا پہلا مقالہ " اقبال اور بمبئی " ہے ، جس میں پروفیسر نے ۴ ستمبر ۱۹۰۵ء کے ایک خط کے حوالے سے ، جو اقبال نے اپنے ایک قریبی دوست ، مولوی انشاء اللہ خاں کے نام تحریر کیا تھا ، بمبئی کے بارے میں اقبال کے تاثرات کا مفصل تذکرہ کیا ہے ۔ ڈاکٹر دلوی لکھتے ہیں :

" انھوں نے (اقبال نے) اس خط کے ذریعے ابتدائے بیسویں صدی کی بمبئی کی علمی اور تہذیبی زندگی پر روشنی ڈالی ہے ۔ یہاں کے رہن سہن کا نقشہ کھینچا ہے ، یہاں کی ارزانی کی کیفیت بیان کی ہے ۔ یہاں کے مسلمانوں کی تعلیمی حیثیت اور علمی سوجھ بوجھ اور اسی طرح پارسیوں کے طریقہ زندگی کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے ۔"

" پریم چند کا قیامِ بمبئی " اس کتاب کا دوسرا مضمون ہے ، جس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ پریم چند اپنی مالی پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی غرض سے ، ایک فلم کمپنی کے ایک سال کے کنٹریکٹ پر بمبئی گئے تھے ۔ کمپنی کے بند ہوجانے کی وجہ سے انھیں تین ماہ قبل ہی اپنے وطن واپس ہوجانا پڑا ۔ ویسے بمبئی کے تجارتی ماحول اور فلم کمپنی کی چکاچوند سے وہ ہمیشہ ناخوش ہی رہے ۔

پریم چند فلموں میں اپنی مقصدی کہانیوں سے سماج کی اصلاح کرنا چاہتے تھے ۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

" سنیما میں اصلاح کی توقع کرنا بے کار ہے ۔ یہ صنعت بھی اسی طرح سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے جیسے شراب فروشی ۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

" ایک ادبی انسان کے لیے سنیما میں کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ میں اس لائین میں اس لیے آیا کہ مجھے اس میں مالی نقطہ ۔ نظر سے آزاد ہونے کے کچھ امکان نظر آئے ۔ لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ میں دھوکے میں تھا اور اب میں پھر ادب کی طرف لوٹ رہا ہوں ۔"

پروفیسر دلوی نے ، پریم چند کے احباب کے بیانات اور مکاتیبِ پریم چند کے تانے بانے سے ان کے قیام بمبئی کا ا[illegible] خوب صورت اور پُر از معلومات خاکہ تحقیقی انداز میں مرتب کیا ہے اور بعض نئے زاویوں سے پریم چند کی شخصیت اور واقعاتِ حیات پر روشنی ڈالی ہے ۔

سکندر علی وجد نہ صرف اورنگ آباد اور مہاراشٹرا کے ایک قدآور سخن ور ہیں بلکہ اردو کے ممتاز کلاسیکی شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں ۔ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں ۔ لیکن غزل گوئی کے میدان میں بھی ان کی اہمیت مسلم ہے ۔ وجد کی نظم " اجنتا ، ایلورا " کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ نظمیں انھوں نے پندرہ سال کے عرصے میں مکمل کی ہیں ۔ ان نظموں میں واقعی ش[illegible] کے خونِ جگر کی آمیزش دیکھی جا سکتی ہے ۔ اقبال اپنی مشہور نظم " مسجدِ قرطبہ " میں کہتے ہیں :

رنگ ہو یا خشت و سنگ ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزہ ، فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

سکندر علی وجد کی نظمیں " اجنتا " اور " ایلورا " ، " معجزہ ، فن کے نقطہ ، نظر سے بے مثل اور شاہ کار تخلیقات ہیں ۔ پروف[illegible] دلوی نے " سکندر علی وجد فنونِ لطیفہ کا شاعر " میں وجد کے حالاتِ زندگی کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے ان کی مشہورِ زمانہ منظومات " اجنتا " ، " ایلورا " ، " رقاصہ " اور " تاج محل " کا اس دور کے تاریخی ، ملی ، مذہبی اور ثقافتی پس منظر میں تجزیہ کیا ہے اور ساتھ ساتھ وجد کی نظم نگاری اور غزل گوئی پر بھی نئے مباحث ابھارے ہیں ۔

بمبئی اور مہاراشٹرا سے متعلق شخصیات میں ڈاکٹر دلوی نے پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی شخصیت و کردار اور ان کی زند[illegible] کے مختلف ادوار کے بارے میں دو معرکتہ الآرا مضامین تحریر کر کے گویا حقِ شاگردی ادا کر دیا ہے ۔ پروفیسر ندوی کے بارے میں اگر[illegible] اور کتابیں اور مضامین بھی لکھے گئے ہیں لیکن دلوی صاحب کے مضامین میں ان کی بھی پہلی اور نسبتاً پوری شخصیت کے زاوی[illegible] سامنے آتے ہیں ۔ ان مضامین میں پروفیسر دلوی نے نہ صرف ندوی صاحب کے واقعاتِ حیات ، شخصیت و کردار کا بھرپور جائزہ لیا ہے بلکہ ان کی علمی و ادبی اور تحقیقی زندگی کے تین اہم ادوار (۱ ۔ دارالمصنفین کے عملہ ۲ ۔ اسمٰعیل یوسف کالج کے پروفیسر ۳ ۔ انجمنِ اسلام کے ڈائرکٹر) پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے ۔ دلوی صاحب کے ان مضامین سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی بدولت بمبئی کے علمی اور ادبی وقار میں اضافہ ہوا ہے اور ندوی صاحب کے تذکرہ کے بغیر بمبئی کی علمی ادبی اور تحقی[illegible] شخصیات کے بارے میں لکھی جانے والی کوئی بھی تصنیف نامکمل اور ادھوری رہے گی ۔

مہاراشٹری ادب کے عظیم مصنفوں میں وشنو سکھا رام کھانڈیکر کا نام اہمیت کا حامل ہے وہ مراٹھی ادب کے ایک بلند

افسانہ نگار ، ناول نویس ، انشائیہ نگار اور نقاد بھی تھے ۔ انھوں نے متذکرہ نثری اصناف میں کوئی ۴۰ کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں ۔ کی ایک تصنیف کو "گیان پیٹھ" انعام سے بھی نوازا گیا ہے ۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے اپنے مضمون وشنو "سکھارام کھانڈیکر" سیدھے سادے اور دل نشین انداز میں ، اردو والوں کو ، مراٹھی کے ایک بلند پایہ مصنف سے متعارف کروانے کی پُر خلوص کوشش ہے ۔ موجودہ دور میں ایسے مضامین کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے ۔ مختلف ہندستانی زبانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور ایک دوسرے کی ادبی تخلیقات سے استفادہ کرنے کے سلسلے میں یہ ایک اہم مضمون ہے ۔ ڈاکٹر دلوی نے علاقائی ادب کے ایک عظیم کار کی ادبی خدمات کو اہلِ اردو سے متعارف کرکے دیگر علاقائی زبانوں کے شاعروں اور ادیبوں اور ان کی تخلیقات سے واقفیت حاصل کرنے کی شروعات کی ہے ۔

"شبلی مکتوب نگاری کی حیثیت سے" "نئی تحریریں" کا ایک اہم مضمون ہے ، جس میں دلوی صاحب نے اردو مکتوب نگاری پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے غالب کے بعد شبلی کو اردو کا سب سے اہم مکتوب نگار قرار دیتے ہیں جس کے خطوط میں مکتوب نگاری کی شخصیت کے واضح نقوش کے علاوہ خیالات و جذبات کی لطافت اور اسلوب کی رنگا رنگی ملتی ہے ۔ مولانا شبلی نہ صرف ایک عالم دین ، مورخ ، شاعر اور انشاپرداز کی حیثیت سے اعلیٰ رتبے پر فائز تھے بلکہ ایک ماہر تعلیم اور مکتوب نگار کی حیثیت سے بھی اہمیت کے حامل تھے ۔ شبلی کی عالمانہ شخصیت اور تنقیدی بصیرت ان کی تمام تحریروں میں نمایاں ہے لیکن ان کی طبیعت کی شوخی ، زندہ دلی اور بذلہ سنجی کی جھلک صرف اور صرف ان کے خطوط میں دیکھی جاسکتی ہے ۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے عطیہ فیضی کے نام شبلی کے مکاتیب کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی شخصیت کی رنگین مزاجی کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ ان کے خیال میں شبلی کے یہ مکاتیب ، اردو خطوط نگاری کی تاریخ میں نمایاں حیثیت کے حامل ہیں کیوں کہ ان خطوط سے ، شبلی کی عطیہ بیگم سے رسم و راہ کا پتہ چلتا ہے اور ساتھ ساتھ شبلی کی شخصیت کے تمام پہلو ان مکاتیب میں روشن ہوجاتے ہیں ۔

"مولوی عبدالحق ، نفسیاتی مطالعہ" پروفیسر دلوی کا ایک جامع اور بھرپور مقالہ ہے ، جس میں بابائے اردو کی شخصیت ، حیات اور ان کی علمی ادبی اور تحقیقی زندگی کے بعض نئے گوشے پہلی بار سامنے آتے ہیں ۔ اگر چہ مولوی صاحب پر متعدد کتابیں اور بیسیوں مضامین تحریر کیے گئے ہیں ۔ لیکن دلوی صاحب کے مقالے میں مولوی عبدالحق ، ان کے واقعاتِ حیات ، شخصیت و کردار ، اور مختلف ادوار میں ان کی علمی ، ادبی اور تحقیقی سرگرمیوں کا تفصیلی جائزہ ملتا ہے ۔ پروفیسر دلوی نے ، دکنی ادب سے متعلق ، مولوی صاحب تصانیف اور مضامین کو ، ان کا سب سے اہم تحقیقی کارنامہ قرار دیا ہے ۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں ۔

> "اردو ادب میں مولوی عبدالحق صاحب مختلف النوع شخصیت کے مالک ہیں اور ادبی دنیا ان سے ایک مورخ ، محقق ، نقاد ، لغت نویس ، مترجم اور خاکہ نگار کی حیثیت سے واقف ہے ۔ تحقیق کے میدان میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قدیم دکنی ادب کو منظرِ عام پر لاکر اسے عوام سے روشناس کرایا اور اس کی عمر کو صدیوں آگے بڑھایا ۔"

پروفیسر دلوی نے مولوی عبدالحق پر سرسید اور حالی کے اثرات کی نشان دہی کرتے ہوئے ان کی تنقید نگاری ، مقالہ نگاری اور تبصرہ نویسی اور خاکہ نگاری کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے ۔

"ہندستان کا لسانی مسئلہ اور گاندھی جی" اور "اردو کا ہندستانی رجحان" پروفیسر دلوی کے دو فکر انگیز اور بصیرت افروز مقالے ہیں ۔ اول الذکر مقالے میں ڈاکٹر دلوی نے ہندستان میں اردو اور ہندی زبان کے تاریخی اور لسانی پس منظر پر تفصیل سے روشنی

ڈالی ہے ۔ وہ گاندھی جی کے نظریے سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"گاندھی جی قومی زبان کی حیثیت سے ہندستانی کو اپنا کر ، درحقیقت ہندی اور اردو دونوں کو اپنا جائز مقام دلانا چاہتے تھے ۔ وہ ان دونوں اسالیب کو اتحاد اور میل کی تمام خصوصیات سے مملو دیکھنا چاہتے تھے ۔ جس کے میل سے ایک انسان عظیم انسان اور ایک تہذیب عظیم تہذیب اور ایک زبان عظیم زبان بن جاتی ہے اور اس لحاظ سے وہ ہندی اور اردو کو ہندستان کی پلنے والی بھاشائیں کہتے تھے ۔"

"اردو کا ہندستانی رجحان" میں پروفیسر دلوی نے اردو شعروادب میں ہندستانی روایات اور رجحانات کی نشان دہی کی ہے اور اسے اردو شعروادب کا ایک اہم اور نمایاں وصف قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ "اس کی سادگی اور اصلیت" بھاشا سے آئی ہے ۔ اس میں بارہ ماسے ہیں گیت ہیں ، دوہے ہیں اور ان سب سے بڑھ کر ہندستانی مزاج اور فکر کی آمیزش ہے ۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں ۔ "اردو میں لسانی اعتبار سے "ہندستانیت کا رجحان دکنی کے دورِ دوم سے شروع ہوتا ہے جب کہ اورنگ آباد اور اس کے نواح میں دکنی اردو اور شمالی اردو کے ملاپ سے زبان کا ایک ملا جلا رنگ پیدا ہورہا تھا" ۔

راقم السطور کے خیال میں متذکرہ بالا سطور میں پروفیسر دلوی نے دکنی اردو کے دورِ دوم میں جس "ہندستانیت کی ابتدا کا تذکرہ کیا ہے ، زبان و ادب کے نقطہ ، نظر سے وہ صرف ایک تسلسل ہے ، دکنی اردو کے دورِ اول کی شاعری کا ، جس کے واضح نقوش وجہی ، محمد قلی ، غواصی ، نصرتی ، ہاشمی ، شوقی اور شاہی کے کلام میں دیکھے جاسکتے ہیں ۔

تحقیقی نقطہ ، نظر سے "نئی تحریریں" کا سب سے اہم مقالہ "شاہ تراب چشتی ، نظیر اکبرآبادی کا پیش رو" ہے ۔ جس میں پروفیسر دلوی نے اردو کے دو بلند مرتبہ عوامی شاعروں شاہ تراب چشتی اور نظیر اکبرآبادی کے کلام کا تحقیقی ، تنقیدی اور تقابلی مطالعہ کر کے اردو کے عوامی ادب کی اہمیت کو نمایاں کیا ہے ۔ اس مقالے کو بجاطور پر ڈاکٹر دلوی کا تحقیقی کارنامہ کہا جاسکتا ہے ۔ شاہ تراب چشتی اور نظیر اکبرآبادی دونوں اردو کے بڑے نظم نگار اور صاحبِ دیوان شاعر تھے ۔ دونوں کے یہاں مضامین و موضوعات اور اندازِ بیان میں مماثلت اور اشتراک کے حیرت انگیز نمونے ملتے ہیں ۔ شاہ تراب نے اپنے خیالات و افکار کے اظہار و ترسیل کے لیے ترجیع بند کی ہئیت کو پسند کیا جب کہ نظیر نے زیادہ تر نظمیں مخمس کی ہئیت میں لکھی ہیں ۔ ڈاکٹر دلوی نے تراب اور نظیر کے کلام کا تنقیدی اور تقابلی جائزہ لیتے ہوئے دونوں کے مزاج و کردار ، ان کی وسیع المشربی ، انسان دوستی اور بھائی چارگی کے جذبات کی ترجمانی کو ان کے کلام کا نمایاں وصف قرار دیا ہے ۔

ooo

* جی ۔ ایم ۔ خان "اردو ادب کے چالیس سال" (رپورٹ) بہ حوالہ "ہماری زبان" دہلی ۔ یکم مارچ ۱۹۹۱ ، ص ، ۸ ۔

ooo

ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی

ڈاکٹر دلوی بہ حیثیت مترجم

ڈاکٹر دلوی کے قریب ترین احباب کو بھی شاید اس بات کا علم نہ ہوگا کہ موصوف باقاعدہ شاعر ہیں اور مبداءِ فیاض سے شعر گوئی کا ملکہ ساتھ لے کر دنیا میں آئے ہیں ۔ پنڈت برج نرائن چکبست کی طرح وہ یہ دعویٰ بھی نہیں کرسکتے کہ " میں تخلص گنہ گار نہیں ہوں " ؛ جس زمانے میں وہ کالج میں پڑھتے تھے اس وقت بھی میں ان کی بیاضوں پر " دلوی جاوید " لکھا ہوا دیکھا تھا ۔

سردست میں موصوف کے طبع زاد اشعار سے قطع نظر کرتے ہوئے ان منظوم تراجم کا تذکرہ کروں گا جو بہ بات خود طبع زاد نظر آتے ہیں ۔ ایک ملاقات کے دوران انھوں نے بتایا کہ انھیں ترجمہ نگاری کا شوق اسی وقت سے تھا جب وہ اسکول کے طالبِ علم تھے ۔

جو حضرات ترجمہ نگاری سے علمی دل چسپی رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ کس قدر مشکل کام ہے ۔ اس کے باوجود یہ ایک مبارک و مسعود کام بھی ہے کیوں کہ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ترجمے کا فن ، محبت و یگانگت کا ایک خاموش لیکن عالم گیر اور پائیدار پیغام ہے ۔ بہ قول شخصے ؛

" ترجمہ ایک فن ہے ۔ یہ ربطِ باہمی ، جذبِ باہمی اور انسانی عالمی برادری کے خواب کی تعبیر ہے ۔ اخوت ، محبت اور ہمدردی و انسانیت ، دوستی کے حصول کا ذریعہ ہے ۔ انسان کے شب و روز کے تجربات ، کاوشات اور علمی ادبی ، سائنسی فتوحات کے جاننے ، سمجھنے اور اپنانے کا وسیلہ ہے ۔ مترجم نئی دنیا کو پرانی دنیا سے ملانے والا کولمبس ہے ۔ مترجم اپنے دوش پر مینا خانہ لے کر اس طرح آگے کی منزل کی طرف گام زن ہوتا ہے کہ کہیں ٹھوکر نہ لگ سکے ۔ ترجمہ نہ مکھی پر مکھی مارنے کا شغلِ بے کار ہے اور نہ قطرے کو دریا بنانے کا چمتکار ۔ بلکہ کسی حسن کو اس کی تمام تر جلوہ سامانیوں اور پرکاریوں کو ٹھیس لگنے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا نازک کام ہے ۔" (۱)

دلوی صاحب بنیادی طور پر لسانیات کے عالم ہیں اور یہی ان کا پسندیدہ میدان بھی ہے یہ اور بات ہے کہ موصوف اس میدان تک ادب ہی کی وساطت سے پہنچے ہیں ۔ پہلے انھوں نے شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کی حیات و خدمات پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کیا ۔ لسانیات میں تحقیقی مقالہ لکھ کر انھوں نے دوبارہ پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ۔ قیاس کہتا ہے کہ علم اللسان سے فطری لگاؤ اور مہارت نے بھی دلوی صاحب کو ترجمہ نگاری پر اکسایا ہوگا ۔ اس کی بدیہی وجہ یہ ہے کہ ترجمے کے عمل میں کم از کم دو زبانوں کا بہ خوبی جاننا ازبس ضروری ہے ۔ ایک وہ زبان جس میں زیرِ ترجمہ فن پارہ ہے اور دوسری وہ زبان جس میں ترجمہ کیا جاتا ہے ۔ یہ اصول بیسویں صدی میں آکر کچھ اور وسیع ہوگیا ہے کہ انیسویں صدی کے بعد سے ساری مہذب دنیا میں زبانوں کا فروغ برق رفتار ہوگیا ہے ۔

تراجم عموماً تین قسم کے ہوتے ہیں ؛ (۱) وہ جو تجارتی نقطہ ، نظر سے کیے جاتے ہیں ۔ مثلاً صحافتی ترجمے ، اشتہاری ترجمے یا پیشہ ورانہ ترجمے ۔ (۲) عقیدت مندانہ تراجم مثلاً مذہبی کتابوں اور رسائل کے ترجمے ۔ (۳) آزاد اور شاعرانہ تراجم اس ق

کے تراجم میں نہ تو مالی منفعت کا احساس ہوتا ہے نہ ہی کسی قسم کا دباؤ یا پابندی عائد ہوتی ہے ۔ دلوی صاحب نے جو ترجمے کیے ہیں ان کا تعلق تمام تر تیسری نہج سے ہے یعنی کوئی شاعر انھیں پسند آیا انھوں نے اس کے کلام کو بار بار پڑھا وہ اس سے متاثر ہوئے اور دل میں یہ خواہش جاگ اٹھی کہ لاؤ اپنی اس پسند اور حظ میں اردو دانوں کو بھی شریک کرلیں ۔ بس اس طرح ترجمہ کا عمل شروع ہوگیا ۔

دلوی صاحب کا ایک پسندیدہ شاعر بھرتری ہری ہے ۔ جن حضرات نے ڈاکٹر محمد اقبال کے مجموعۂ کلام بالِ جبریل کا مطالعہ کیا ہے وہ اس مجموعے کے سرنامے پر بھرتری ہری کے اس شعر کو پڑھ کر سر دھنتے ہیں :

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر　　مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

بہت سوں کے لیے یہی اس کا پہلا اور آخری تعارف ہوگا لیکن ڈاکٹر دلوی نے اس خود آگاہ و حق آگاہ شاعر کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا اور اس کے کلام کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے ۔ آئیے اختصار کے ساتھ آپ کو ایک بار پھر بھرتری ہری سے ملائیں ۔

اخلاقیات بھرتری ہری

ایک مدقوق و منحنی کتا
لنگڑا لولا بھی اور اندھا بھی
اپنی دم اور بالوں سے محروم
جسم سارا سڑا ہوا جس کا
اور کیڑے پڑے ہوں زخموں میں
سوکھا ، دبلا سا اور فاقہ زدہ
پھر رہا ہے گلی ، گلی ، بھوکا
اپنی مادہ کو جب بھی دیکھے گا
اس کے پیچھے ضرور جائے گا
جس کو کہتے ہیں ، جذبہ ، شہوت
جان مردے میں ڈال دیتا ہے

اس نظم کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ بہ ظاہر ایک نہایت درجہ معمولی اور غیر مہذب سی بات کو موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے لیکن جو نتیجہ نکالا گیا ہے وہ کتنا دل چسپ ، سچا اور آفاقی اپیل کا حامل ہے ۔

اسی طرح ایک اور نظم میں بزعمِ خود فلاں قسم کے لوگوں کی پول اس طرح کھولی گئی ہے :

علم و دانش سے جب نیں عاری تھا
خود پہ کتنا غرور تھا مجھ کو
جیسے اک فیلِ مست و آوارہ
ہوگئی تھی مجھے غلط فہمی
گویا " میں بھی ہوں ایک دانش ور "

ہاں مگر جب میں ایک بار ملا
حلقِ مندوں سے اہلِ دانش سے
ڈھل گیا اس طرح سے میرا غرور
جیسے بیمار کا بخار اترے
اور پھر مجھ کو یہ ہوا معلوم
" میں حقیقت میں ایک جاہل ہوں "

○

ایک مقام پر سماج کے درمیانہ درجہ یا متوسط طبقے کے لوگوں کی تعریف کتنے لطیف پیرائے میں کی ہے :

مرد ناداں ہے ، اپنے حال میں مست
ہے یہی حال اہلِ دانش کا
ہاں ، مگر ہیں جو درمیان کے لوگ
وہ کبھی مطمئن نہیں ہوتے

○

دنیا میں آئے دن ہم نیکی کے مقابل بدی اور محبت کے سامنے نفرت کو پھلتے پھولتے دیکھتے ہیں اور دل ہی دل میں کڑھتے ہیں ۔ دنیا والوں کا یہ وطیرہ روزِ ازل سے ہے اور روزِ قیامت تک رہے گا ۔ بھرتری ہری نے اس عالم گیر تضاد کا پردہ ایک ہی نظم میں یوں فاش کیا ہے :

آدمی کی زباں کا کیا کہنا
بے حسی نام ہے شرافت کا
نیند کو بھی فریب کہتے ہیں
نامِ معصومیت ریا کاری
اور شجاعت کا نام بے رحمی
نام رہبانیت ہے مکاری
اور تملق ہے نامِ ہم دردی
خود سری ، عظمت و جلال کا نام
خوش بیانی کا نام ہے بکواس
اک وفا کیش آدمی نامرد !
کوئی ایسا ہے وصفِ انسانی
لوگ جس کو نہ مجرم کردیں ؟

○

اثر صحبت کے بارے میں شیخ سعدی کا یہ شعر تو آپ نے بارہا سنا ہوگا۔

جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد   وگر نہ من ہماں خاکم کہ ہستم

لیجے حکیم بھرتری ہری کے یہ بیش قیمت خیالات بھی سنیے ۔ کہتے ہیں :

بوند پانی کی گرم لوہے پر
گر پڑے تو وجود کھو بیٹھے
برگِ گل پر اگر گرے اک بوند
اس کو موتی کی آب و تاب ملے
اور وہی بوند گر صدف میں پڑے
جا کے بن جائے گوہرِ نایاب
اس طرح آدمی بھی صحبت سے
خود شریف و رذیل بنتا ہے

o

«جمالیاتِ بھرتری ہری» کے زیرِ عنوان دلوی صاحب نے ۵۵ نظموں کا آزاد ترجمہ کیا ہے ۔ چند نمونے ملاحظہ فرمائیے

یوں تو اہلِ خرد کے ذہنوں میں
عقل و دانش کی شمع جلتی ہے
ایک عورت کی مرتعش پلکیں
روشنی اس کی ڈھانپ لیتی ہیں

o

اک تبسم ، اک محبت ، اک لگاوٹ کی ادا
تیز نظریں ، دشمنی کی اک نگاہ
خوش کلامی ، حاسدانہ گفتگو اور شوخیاں
لتے حربے لے کے عورت کرتی ہے
اپنے دامِ حُسن میں سب کو اسیر

o

نیچی نظریں ، رقصاں ابرو
میٹھی باتیں ، شوخ تبسم
چال میں جیسے مستانہ پن
عورت کے سنگھار یہی ہیں
اور اس کے ہتھیار یہی ہیں

○

پیار کا دیوتا کھلاڑی ہے
بحرِ ہستی کی شوخ لہروں پر
پھینک دیتا ہے جال عورت کا
مرد نادان ، مچھلیوں کی طرح
سرخ ہونٹوں کے جال میں فوراً
آکے پھنستا ہے اور جلتا ہے
تخ پر آتشِ محبت کے

○

ر پہلے عرض کیا گیا تھا کہ ڈاکٹر دلوی لسانیات کے اختصاصی ہیں ۔ اس لیے اگر وہ بہ یک وقت کئی زبانوں کے ماہر ہوں تو تعجب نہیں ہے ۔ مرہٹی ، جنوبی ہند کی ایک مشہور زبان ہے اور ریاست مہاراشٹرا کی پہلی علاقائی دفتری زبان مانی گئی ہے ۔ یہ زبان دلوی صاحب کی مادری زبان نہیں ہے لیکن وہ اس زبان میں انتہائی روانی سے نہ صرف گفتگو کرتے ہیں بلکہ اس کے ادب سے بھی بہ خوبی واقفیت رکھتے ہیں ۔ انھوں نے مرہٹی کے کئی نام ور شعرا کے کلام کو نہایت بے تکلفی اور چابک کے ساتھ اردو کا لباس پہنایا ہے ۔ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ "ترجمہ پن" کا احساس کہیں بھی نہیں ہوتا بلکہ ترجمہ کے طبع زاد کا یقین ہوجاتا ہے ۔

ڈاکٹر دلوی کو مراٹھی کے کلاسیکی ادب سے بہ طورِ خاص شغف رہا ہے ۔ اس کے ثبوت میں مہاراشٹرا کے سنت کوی سوامی اس کی کتاب "مناچے اشلوک" کا ذکر کیا جاسکتا ہے ۔ جسے دلوی صاحب نے بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ ایڈٹ کیا ہے ۔ کتاب نام "من سمجھاون" ہے اور یہ ایک اور عارف کامل شاعر شاہ تراب کا کیا ہوا آزاد ترجمہ ہے ۔ پروفیسر سید نجیب اشرف مرحوم کی تقریظ نے اس مرتبہ کتاب کی اہمیت کو بہ خوبی واضح کردیا ہے ۔ شاہ تراب کا زمانہ اندازاً ۱۷۰۰ء کا ہے ۔

اسی طرح دلوی صاحب نے مشہور مراٹھی صوفی شاعر سنت گیانیشور (۱۲۷۸ء سے ۱۲۹۶ء) کی شہرہ آفاق نظم "گیانیشوری" کی تفسیر) کے آخری دعائیہ حصے کا بھی خوب صورتی کے ساتھ ترجمہ کیا ہے ۔ اس حصے کو گیانیشور نے "پسایدان" کہہ کر پکارا پسایدان کو آپ پرساد ، نذر یا تبرک بھی کہہ سکتے ہیں ۔ یہ مراٹھی ادب میں کلاسک کا درجہ رکھتا ہے ۔ پسایدان کے دو ابتدائی ل کیے جاتے ہیں :

یہ نذر ادب میری ، خلاقِ دو عالم کو
اسے کاش پسند آئے
خوش ہو کے وہ دیتا پر بس اتنا کرم کردے
گم راہ جو بندے ہیں ، وہ راہ پہ آجائیں
ہوجائیں وہ خود دل سے نیکی کی طرف مائل
انسانوں میں پیدا ہو اک جذبہ ، آفاق

الفت کا اخوت کا
عصیاں کے سیہ بادل آفاق سے چھٹ جائیں
اور دینِ حقیقی کا خورشید منور ہو
دنیا کی فضاؤں میں
ہر بندے کی خواہش کو تکمیل عطا کردے
اللہ کے وہ بندے جو اس کے مقرب ہیں
اللہ کے پیارے ہیں
بندوں پہ جو کرتے ہیں
الطافِ مسلسل کی اک بارشِ بے پایاں
اے کاش وہ دنیا میں اک بار چلے آئیں
اللہ کے بندوں کو دیدار دکھا جائیں (۲)

○

طوالت کے خوف سے محض چند اقتباسات پیش کیے گئے ۔ سچ پوچھیے تو اقتباسات کے بجائے مکمل نظموں کے مطالعے ہی میں پورا لطف آتا ہے ۔ ان نظموں کے علاوہ بھی دلوی صاحب نے اور بھی مرہٹی نظموں کے ترجمے کیے ہیں مثلاً تشنگی (انیل) (۳) ۔ مٹی کا نغمہ (کسما گرج) (۴) ۔ اب بھی (وسنت بلہٹ) (۵) ۔ یہ بھی دلوی صاحب کے فنی کارنامے ہیں جن کی وجہ سے اردو کے ترجماتی ادب میں نہایت خوش گوار اضافہ ہوا ہے ۔

دلوی صاحب مراٹھی ادب کے جدید بلکہ جدید ترین رجحانات سے بھی باخبر ہیں ۔ انھوں نے جدید دور کے مقبول مراٹھی کوی پرسوتم شیدام سگے کی نظم " " کا آزاد ترجمہ ایک آزاد عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیے :

ایک بار پھر سے آنا
جاؤ سنبھل سنبھل کر ۔ جاؤ سنبھل سنبھل کر
قدموں کی آہٹوں کو پہچان لے نہ کوئی
پیڑوں کی ڈالیوں پر ۔ بیلوں کے آنچلوں میں
کچھ نوشگفتہ کونپل جب بھی نظر میں آئے
قول و قرارِ ماضی اور زندگی کے وعدے
سب کچھ بھلا کے پھر تم
رنگین ولولوں سے بن کر شمیم رقصاں
اک بار پھر سے آنا

○

جاؤ سنبھل سنبھل کر ۔ جاؤ سنبھل سنبھل کر
جب تک مری ہار جیت کو کوئی نہ بھانپ لے
کھیت کھیت میں نئی کپاس کے
ڈوڈے جب جب چٹکیں
پہلے کی طرح مجھ کو چونکا کر
شرمیلے انداز میں تم
موگرے کا بے داغ شگوفہ بن کر
اک بار پھر سے آنا ۔ ۔ ۔!

ایک اور نئے شاعر وسنت بلہٹ کی نظم ازون (اب تک) کو اردو کا لباس یوں پہنایا ہے :

اب بھی ان پہاڑوں کے عقب میں
دور بہاراں ہم دونوں پر ہنستا ہے
اب بھی ہماری ان یادوں پر
سیوتی شرما جاتی ہے
یوں تو اب بھی ہمیں دیکھ کر
شبنم کے قطروں میں لرزش ہوتی ہے
تنا ہوا چمپک کا پودا
سرگوشی کو بے تاب سا ہے
جب سے تیری پشت کا آئینہ دیکھا ہے
سبزہ کچھ شرمندہ اور ناراض سا ہے
تیرے کف پا چوم سکے وہ
حلی کو ارمان سا ہے
موگرہ اب بھی کچھ خاموش سا ہے
تیرے بالوں کی خوش بو سے
وہ آوارہ چھینٹے اور پانی کے قطرے
اب بھی ہم پر ہنستے ہیں
چاند کی ہلکی روشنی میں اب بھی
میرے ارماں پگھلتے رہے ہیں
زہر مرے گیتوں کا پی کر
باد صبا مدہوش سا گیت سناتی ہے

o

دلوی صاحب نے برطانیہ کے انگریزی شاعری کے بھی منظوم ترجمے کئے ہیں۔
انگریزی زبان کے مشہور ہندستانی شاعر پروفیسر نسیم ایزیکیل جو منتک بھی یونی ورسٹی میں دلوی صاحب کے رفیق کار رہ چکے ہیں۔ انھوں نے ۲۸ اگست سے ۲ / ستمبر ۱۹۸۳ء کے دوران (جب وہ ایڈنبرا اور لندن کے دورے پر تھے) تیس مختصر و طویل نظمیں کہی تھیں۔ دلوی صاحب نے ان نظموں کا آزاد ترجمہ نہایت خوش اسلوبی سے کیا تھا اور یہ سبھی تراجم حیدرآباد (آندھرا پردیش) سے شائع ہونے والے ادبی جریدے "شعر و حکمت" میں چھپ چکے ہیں۔ ایک اقتباس نمونۃً نقل کیا جاتا ہے:

یہ نکتہ ایک دانش ور نے بتایا تھا شاید
پریشانی کا اک آسان مداوا بس یہی ہے
جو کسی انسان کا حال پریشاں دیکھو تو تم بھی
مری خلوت میں جب تک یہ بکھری آتی نہیں تھی
میں اس نکتے سے بھی واقف نہیں تھا
اور اب میں نے جب اوروں کو پریشاں حال دیکھا ہے[4]
مداوائے غم دل کی مجھے خواہش نہیں ہے۔

ooo

حوالے:

(۱) سردار احمد (علیگ) بہ حوالہ مضمون (ترجمہ کا فن، روایت اور مسائل) مطبوعہ ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی بابت جون ۱۹۸۹ء، ص: ۸۰۔
(۲) یہ مکمل ترجمہ روزنامہ "انقلاب" (بمبئی) کے ۲۴ / جون ۱۹ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔
(۳) مطبوعہ امکان (مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکیڈمی، بمبئی) مارچ ۱۹۸۸ء، ص ۲۸۸۔
(۴) ایضاً ص: ۵۱۸۔
(۵) ایضاً ص: ۵۲۸۔



پروفیسر [illegible] ۔ [illegible] کے ساتھ۔



پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر [illegible]۔



پروفیسر عبدالستار دلوی کو ڈاکٹر شنکر دیا شرما اردو مراٹھی خدمات کے لیے انعام دیتے ہوئے ۔



فیض احمد فیض ، علی سردار جعفری اور پروفیسر عبدالستار دلوی ۔

ڈاکٹر عبدالستار دلوی

ممبئی یونی ورسٹی کے نذر

الوداع اے درس گہِ علم و دانش الوداع
الوداع اے مرکزِ اربابِ بینش الوداع
تو کہ اک بستانِ حکمت ، علم کی کانِ مبین
تجھ سے بڑھ کر میری دنیا میں نہیں کوئی نہیں
تیرے دامن میں جو یہ استادہ اک مینار ہے
جہل کی تاریکیوں میں مطلعِ انوار ہے
ہند کا سب سے پرانا مرکزِ دانش ہے تو
اس عروسِ ممبئی کی اصل زیبائش ہے تو
وہ خزف ریزے وطن کی خاک میں پنہاں جو تھے
تیرے ہاتھوں میں جب آئے تو جواہر بن گئے
میری دانش گہ ! تجھ کو یاد تو ہوں گی ضرور
وہ ادب کی محفلیں ، وہ علم و حکمت کا سرور
خوش قلم وہ ، خوش نوا وہ اور خوش گفتار وہ
ہاں وہ عصمت اور ہیدی اور علی سردار وہ
ملک کے دانش وروں کو ، عالموں کو بارہا
تیری محفل میں بلاکر میں نے یک جا کردیا
میں نے یہ چاہا کہ وہ جو تشنگانِ علم ہیں
ان کے دل میں بھی نہ رہ جائیں کہیں کچھ حسرتیں

لا کے دلی سے ، علی گڑھ سے عظیم آباد سے
میں نے کتنے ہی کنویں پیاسوں کے آگے رکھ دیے
اک طرف رکھی مراٹھی ، اک طرف اردو زباں
ایسے پھولوں سے سجایا میں نے تیرا گلستاں
تجھ سے رخصت ہو رہا ہوں آج ، لے میرا سلام
زندگی کیا ہے مسلسل آمد و شد کا نظام
ہاں مگر اے جامعہ ! اس بات کا کر اعتبار
یاد آئے گی تری اور آئے گی وہ بار بار
یاد آئیں گے یہ رستے ، پیڑ اور گلیاں مجھے
یاد آئیں گے یہ غنچے ، پھول اور کلیاں مجھے
تیرے ان شاداب و رنگیں سبزہ زاروں کو سلام
موسم حرف و صدا کی ان بہاروں کو سلام
بحرِ نا پیدا کنارِ علم و حکمت السلام
آج کہتا ہوں تجھے باصد محبت السلام
جارہا ہوں ، پھر بھی یک گونہ ہے دل کو اطمینان
ہوسکا جتنا کیا میں نے ترے شایانِ شان*

○●○

---

* یہ نظم ممبئی یونی ورسٹی سے کرشن چندر پروفیسر و صدر شعبہ اردو (۱۹۸۲ء تا ۱۹۹۸ء) ۳۰/ اگست ۱۹۹۸ء کو سبک دوشی کے موقع پر کہی گئی۔

پروفیسر عبدالستار دلوی

ـــــ مراٹھی میں اردو کے ادبی اور علمی تراجم ـــــ ایک تعارف ـــــ

ہندستان ایک وسیع و عریض ملک ہے جس میں علاقائی تہذیبیں اور مختلف علاقائی زبانیں لسانی اور ادبی حیثیت کی وجہ سے ممتاز درجہ رکھتی ہیں ۔ ہندستانی زبانوں میں آریائی زبانیں لسانی اور فکری اعتبار سے ایک دوسرے سے قریب ہیں ۔ ان میں لسانی ، فکری روابط اور مشترکہ ہندستانی قدریں محفوظ ہیں ۔ ہندستان کا یہ ادبی اور لسانی سرمایہ ہماری تہذیب کو یک رنگ نہیں بناتا بلکہ تنوع کی دل کشی سے خوش رنگ اور جاذب نظر بناتا ہے ۔ مختلف تہذیبی اور لسانی رنگوں سے اس ملک کی خوب صورتی میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے ۔ کثرت میں وحدت کی یہ ایک نادر مثال ہے زبانیں مختلف ہوتی ہیں لیکن ان کا ادب ایک ہوتا ہے یہی وجہ ہے مختلف زبانوں کے منتخب اور اعلیٰ ادب کا ترجمہ خالص علمی نقطہ نظر سے بہت اہم اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے ۔ دوسری زبانوں سیکھنے اور ان کے ادبیات سے واقف ہونے کا جذبہ ایک مثبت اور صحت مند رویہ ہے ۔ کثیر لسانی ماحول میں یہ علمی اور ذہنی ضرورت کے علاوہ یہ عصری اور سماجی و سیاسی ضرورت بھی ہوسکتی ہے ۔ لہذا ایک زبان سے دوسری زبان سے ترجموں کی ضرورت ہر صورتوں میں قائم رہتی ہے ۔

اردو اور مراٹھی ہندستان کی دو اہم زبانیں ہیں ۔ اردو اپنی وسعت کے لحاظ سے سارے ملک کے لیے افہام و تفہیم اور رابطے زبان ہے ۔ مراٹھی اس کے برعکس (دیگر ریاستی زبانوں کی طرح) مہاراشٹرا کی سب سے بڑی زبان ہے ان دونوں زبانوں میں جو یگانگت ، باہمی محبت ہی کا نہیں بلکہ لسانی ، ادبی اور تاریخی رشتہ ہے ۔ یہ دونوں زبانیں آپس میں گھر آنگن کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ ا کے ابتدائی ادبی ارتقا میں مہاراشٹرا اور مراٹھی دانوں نے ایک اہم رول ادا کیا ہے ۔ مراٹھی کے سنت اور صوفی شاعر مثلاً گیانیشور ، باِئی ، ایکناتھ ، نام دیو ، تکارام اور رام داس کے ابھنگوں میں مراٹھی کے ساتھ اردو (ہندستانی) ابھنگ اور شلوک بھی ملتے ہیں ۔ صرف مراٹھی کے شاعر نہ تھے ، بلکہ اردو کے حوالے سے دو لسانی شاعر تھے ۔ جب اردو زبان نے اپنے ارتقا کی منزلیں طے کیں تو ا کا سب سے پہلا بڑا شاعر بھی اسے مہاراشٹرا نے دیا ۔ یہ ولی دکنی تھا ۔ جو ولی اورنگ آبادی بھی کہلاتا ہے ۔ سراج اورنگ آبادی ، قاسم ، شاہ عاجز ، لچھمی نرائن شفیق ، ونائک راؤ ذرہ وغیرہ کے نام اس سلسلے میں خصوصی اہمیت رکھتے ہیں ۔ مراٹھی کے قدیم شعرا انبر حسین نے حسین انبری لکھی ۔ یہ گیانیشور کی گیانیشوری کی طرح ، گیتا کی مراٹھی تفسیر ہے ۔ قدیم عہد میں کئی مسلمان شعرا گذرے جنھوں نے مراٹھی میں شاعری کی ۔ حسین انبر کی طرح ایک دوسرا بہت بڑا نام صوفی شاعر شیخ محمد کا بھی ہے جنھوں نے مراٹھی شا کو حسن و لطافت اور وجودی فکر و فلسفہ سے آراستہ کیا اور یک جہتی محبت اور انسان دوستی کا پیغام دیا ۔ اردو مراٹھی میں ترجمہ نگاری نقش اول مشہور سنت کوی رام داس کی مشہور زمانہ مناچے شلوک ([illegible]) کا آزاد ترجمہ ہے ترجمہ ۱۸۰۰ ، کے قریب ترنالی کی صوفی شاعر شاہ تراب چشتی نے " من سمجھاون " کے نام سے کیا تھا ۔ راقم الحروف نے اسے [illegible]

یں مرتب کر کے شائع کیا ۔ شاہ تراب چشتی کی مراٹھی سے ترجمہ کی روایت کو انیسویں صدی میں احمد علی شوق نے آگے بڑھانے کی کوشش کی ۔ آنندی بائی جوشی کی خود نوشت سوانح عمری کو مراٹھی نثر میں کلاسیکی درجہ حاصل ہے ۔ یہ پہلی بار ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی تھی ۔ اس کی مقبولیت اور اصلاحی اہمیت کے پیش نظر احمد علی شوق نے اسے ۱۹۱۳ء میں اردو میں منتقل کیا ۔ کسی بھی ہندستانی زبان میں اس کتاب کے ترجمے ہونے کی یہ اولین مثال تھی ۔ یہ صحیح ہے کہ مراٹھی سے اردو میں ترجمے کی روایت کو اولیت حاصل ہے ۔ ہم مراٹھی میں اردو تصانیف کے ترجمے کی روایت بھی قدیم ہے ۔ اردو سے دل چسپی گذشتہ صدی کے ربع اول ہی میں شروع ہوگئی تھی ۔ اردو کے نثری ادب میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی وقیع اور تاریخ ساز خدمات ہیں ۔ میر امن ، للو لال ، کاظم علی جواں اور دوسرے مترجمین اور ادیبوں کی طرح حیدر بخش حیدری اور ان کی مشہور کتاب " آرائش محفل " کا شمار اردو کی کلاسیکی کتابوں میں ہوتا ہے ۔ اردو میں آرائش محفل ۱۸۰۴ء میں لکھی گئی ۔ اس کا مراٹھی ترجمہ ستارا کے راجہ شری پرتاپ سنگھ نے ازراہ ادب نوازی اپنے عہد کے ادیب شری بلاجیو راؤ شنی سے ۱۸۱۸ء تا ۱۸۳۹ء کے درمیان اختصار کے ساتھ " سجاد بخت " کے نام سے کرایا تھا ۔ یہ ترجمہ ماہ نامہ " بھارت درش " میں شائع ہوا ۔

مراٹھی سے اردو یا اردو سے مراٹھی میں ترجمے کی یہ روایت اردو اور مراٹھی میں تقریباً ختم ہو چکی تھی ۔ ترجمے کی اس روایت کو از سر نو زندہ کرنے کا اعزاز مراٹھی اسکالروں کو جاتا ہے ۔ مشہور مورخ اور ادیب اور کثیر لسانی عالم پنڈت سیتو مادھو راؤ پگڑی کو تاریخ اور دیگر سماجی علوم سے گہری دل چسپی تھی ۔ وہ مراٹھی اور سنسکرت کے ساتھ فارسی اور اردو کے بھی جید عالم تھے ۔ انھیں اردو شاعری اور نثر اور خصوصاً خود نوشت سوانح عمریوں سے خاص لگاؤ تھا ۔ وہ سابق ریاست حیدرآباد کے پروردہ تھے ۔ آزادی کے بعد جب ان کا تبادلہ بمبئی میں ہوا تو انھوں نے مراٹھی داں حضرات میں اردو زبان اور شعر و ادب سے دل چسپی پیدا کرنے کے لیے مراٹھی اخبارات میں اردو ادب کے بارے میں مضامین کا سلسلہ شروع کیا ۔ مہاراشٹرا ٹائمس ، لوک ستا اور دیگر سارے اخبارات اور مراٹھی کے رسائل میں اور خصوصاً دیوالی کے موقع پر شائع ہونے والے خصوصی رسائل میں وہ اردو شاعری اور ادب کے بارے میں مسلسل مضامین لکھتے رہے ۔ یہ سلسلہ ان کے انتقال (۱۳ / اکتوبر ۱۹۹۳ء) تک جاری رہا ۔ ۱۹۶۸ء میں انھوں نے دیوان غالب کو مراٹھی میں نثری ترجمے کے ساتھ شائع کیا تا کہ اردو کے اس عظیم شاعر سے اور اس کی عظمت فکر سے مراٹھی داں حلقہ بھی لطف اندوز ہو ۔ مراٹھی دیوان غالب کا دوسرا ایڈیشن پاپولر پرکاشن ، بمبئی نے شائع کیا ۔ اسی طرح میر کے شعرا پر " نین تجھے بلاؤنگا " کے عنوان سے کتاب شائع کی ، جس میں دلی اور لکھنو اسکول کے منتخب شعرا شامل ہیں ۔ اسی طرح ایک کتاب " اردو شاعری چے پہچے [illegible] " یعنی اردو شاعری کا تعارف کے نام سے شائع کی جس سے اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ سے فیض احمد فیض تک کے منتخب شعرا کا تفصیلی تعارف شامل ہے ۔ پگڑی صاحب نے اردو کی خود نوشت سوانح عمریوں پر بھی مضامین لکھے اور اردو کے افسانہ نگاروں بالخصوص قرۃ العین حیدر کو بھی مراٹھی حلقے سے روشناس کرایا ۔ " ساہتو تمہا رنگ ہروا " کے نام سے ان کی ایک تصنیف اردو کی خود نوشت سوانح عمریوں کے بارے میں ہے ۔ اسی طرح شیخ محمد عبداللہ کی خود نوشت " آتش چنار " پر ان کی تفصیلی کتاب " کشمیر ایک جلا وطنی " بھی شائع ہو چکی ہے ۔ سیتو مادھو راؤ پگڑی صاحب جب مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکیڈیمی کے ممبر تھے اس زمانے میں اردو کی فرمائش پر انھوں نے اقبال کی " بانگ درا " کی منتخب نظموں کا مراٹھی ترجمہ کیا ۔ یہ کتاب شائع ہو چکی ہے ۔ پگڑی صاحب کی دل چسپی اور مضامین کا یہ اثر ہوا کہ اردو شاعری بالخصوص اور اردو زبان بالعموم مراٹھی داں حلقوں میں مقبول ہو گئی ۔ پگڑی صاحب کی مراٹھی کے ذریعے ان اردو خدمات کا اعتراف نہ کرنا ظلم [illegible]

زبان کی مقبولیت میں پگڑی صاحب کا حصہ سب سے زیادہ رہا ہے ۔ وہ اردو زبان و ادب سے والہانہ عشق کرتے تھے اور غالب ان کا محبوب ترین شاعر تھا اور اس کے سینکڑوں اشعار انھیں ازبر تھے اور مراٹھی جلسوں میں بھی گرمیِ محفل کا باعث بنتے تھے ۔ پگڑی صاحب کی طرح شری پد جوشی نے بھی اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو اپنے مضامین کے ذریعے متعارف کرایا ۔ ان کے یہ مضامین بھی کتابی صورت میں شائع ہوچکے ہیں ۔

مراٹھی میں غالب سے دل چسپی کے پیش نظر "لوک ستا" کے ایڈیٹر اور مشہور مراٹھی ڈراما نگار شری ودیا دھر گوکھلے نے غالب پر ایک کتاب شائع کی جس میں غالب کی حیات ، شاعری ، فکر اور فن کا بھرپور تعارف ہے ۔

پگڑی صاحب کی طرح پروفیسر را ۔ بھی ۔ جوشی کو بھی اردو سے گہری دل چسپی تھی ، مگر پگڑی صاحب کے برعکس جنھیں اردو شاعری بہت پسند تھی ، جوشی صاحب کا خاص موضوع اردو افسانہ اور ناول رہا ۔ جوشی صاحب کی تعلیم بھی حیدرآباد میں ہوئی لہذا وہ اردو تہذیب اور ادب سے گہری دل چسپی رکھتے تھے ۔ وہ ابتدا میں آل انڈیا ریڈیو سے منسلک رہے جہاں ایک طرف وہ آل انڈیا ریڈیو کے مشہور ڈائرکٹر ذوالفقار علی بخاری سے قریب تھے تو دوسری طرف کرشن چندر ، راجندر سنگھ بیدی اور ن ۔ م ۔ راشد کے رفیقِ کار تھے ۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ اردو زبان و ادب خصوصاً اردو افسانے سے انھیں دل چسپی پیدا ہوئی ۔ اس دل چسپی کا نتیجہ تھا کہ وہ وقتاً فوقتاً اردو کہانیوں کے مراٹھی میں ترجمے کرتے رہے ۔ "میلاد شریف" جوشی صاحب کے اردو افسانوں کے ترجموں پر مشتمل ایک مجموعہ ہے ۔ اس مجموعے میں اردو کے مرد افسانہ نگاروں کے افسانے شامل ہیں ۔ دوسرا مجموعہ اردو کی خواتین افسانہ نگاروں کے منتخب افسانوں کے تراجم پر مشتمل ہے جس میں نذر سجاد حیدر سے واجدہ تبسم تک کے افسانے شامل ہیں ۔ جیلانی بانو کا افسانہ "موم کی مریم" بھی اس مجموعے میں شامل ہے ۔ خواتین افسانہ نگاروں کے افسانوں پر مشتمل یہ مجموعہ "انوکھی واٹا" (ان دیکھی راہیں) کے نام سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا تھا ۔ کتاب کا نام صدیقہ بیگم سیوہاروی کے افسانے "ان دیکھی راہیں" کی مناسبت سے رکھا گیا ہے ۔ اسی طرح را ۔ بھی ۔ جوشی صاحب نے کرشن چندر کے مشہور ناول "شکست" کا بھی مراٹھی میں ترجمہ کیا ۔ یہ ناول بھی مراٹھی میں بہت مقبول ہوا ۔ پروفیسر جوشی کے یہ ترجمے گذشتہ سال مہاراشٹرا اردو اکیڈمی کے مالی تعاون سے دوبارہ چھپ چکے ہیں اسے ڈاکٹر رام پنڈت نے مرتب کیا ہے ۔

پروفیسر را ۔ بھی جوشی کے بعد اردو کے مراٹھی تراجم کی طرف ڈاکٹر رام پنڈت نے خصوصی توجہ دی ہے ۔ انھوں نے اردو شاعری افسانوں اور ڈراموں کے تراجم کیے ہیں ۔ ڈاکٹر رام پنڈت مراٹھی ، اردو اور ہندی ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں ان کا مطالعہ وسیع ہے اور مختلف زبانوں میں ادبی لین دین کو اور بہ طور خاص اردو سے مراٹھی ترجمہ کو انھوں نے اپنے فرائض میں شامل کرلیا ہے ۔ چناں چہ انھوں نے اردو افسانے کے تعلق سے مراٹھی میں تین مجموعے شائع کیے ہیں پہلے دو مجموعے ترجمہ (جلد اول) میں جدید کہانی کار ہیں تو ترجمہ (جلد دوم) میں پاکستانی افسانہ نگاروں کے افسانے شامل ہیں ، تیسری کتاب "افسانہ" میں اردو کے پچیس افسانے مراٹھی قارئین کے لیے ایک قابلِ قدر تحفہ ہیں ۔ افسانے ہی کی ذیل میں مشہور مراٹھی شاعر نرائن سروے ، شری پاد جوشی اور رمیش دیش پانڈے کی خدمات بھی بہت اہمیت رکھتی ہیں ۔ نرائن سروے نے جو مراٹھی ساہتیہ پریشد کے صدر رہ چکے ہیں اور جن کا ترقی پسند تحریک سے بھی تعلق رہا ہے ۔ کرشن چندر کی منتخب نو (۹) کہانیوں کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے اسی طرح "یوکلپٹس کی ڈالی" کے افسانوں کو بھی مراٹھی میں منتقل کرنے کا کام بڑے سلیقے سے کیا ہے ۔ اردو افسانے کے مترجمین میں شری پاد جوشی بھی ایک اہم نام ہے ۔ شری پاد جوشی نے "اردو کتھا" (۱۵ کہانیاں) اور منٹو کی کہانیاں (منٹو چا کتھا) کے نام سے دو مجموعے شائع کیے ہیں ۔ اس طرح اردو افسانے کا مراٹھی کے جرائد قارئین سے تعارف کا کام ہنرمندی اور سلیقے سے ہوا ہے ۔

اردو ناولوں میں جیسا کہ ذکر ہوچکا ہے ۔ کرشن چندر کے ناول "شکست" کا مراٹھی ترجمہ پروفیسر جوشی نے کیا تھا ۔ اس سلسلے کو نرائن سروے نے آگے بڑھایا اور "دادر پل کے بچے" کا مراٹھی ترجمہ کیا ۔ اسی طرح رمیش دیش پانڈے نے عظیم مسرور کے ناول "بہت دیر کردی" کا ترجمہ "پھار اشیر کیلاش" (फार उशीर केलास) کے نام سے مراٹھی میں کیا ۔ اردو کی ممتاز ادیبہ اور دانش ور محترمہ قرۃ العین حیدر کا ادبی شاہکار "آگ کا دریا" بھی مراٹھی میں منتقل ہوچکا ہے ۔ اس ناول نے ہندوستان گیر شہرت پائی اور اعلیٰ پڑھے لکھے گھروں میں ادبی علمی حلقوں میں اس کی جو پذیرائی ہوئی ، وہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے ۔ اس کا مراٹھی ترجمہ "آگی چا دریا" ([illegible]) کو مراٹھی میں شری پاد جوشی نے کیا ۔ "آگ کا دریا" پر مراٹھی میں چند مضامین بھی شائع ہوئے جن میں ڈاکٹر چندر کانت باندیو ڈیکر (سابق صدر شعبہ ، ہندی ، بمبئی یونی ورسٹی) کا ذکر ضروری ہے ۔ جس میں ناول کا تفصیلی تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے ۔ رام پنڈت نے جن کا ذکر اوپر ہوچکا ہے اقبال مجید کے ڈرامے "کتے" کو بھی مراٹھی کا جامہ پہنایا ہے ۔

شاعری میں سیتلا ہو راؤ بگڑی کی طرح جنھوں نے اردو کے کلاسیکی سرمایہ کو مراٹھی میں متعارف کرایا ، جدید شاعری کو ڈاکٹر رام پنڈت نے مراٹھی میں قارئین سے روشناس کرایا ۔ انھوں نے اختر الایمان کی ۵۰ نظمیں مراٹھی میں منتقل کی ہیں ۔ اسی طرح فیض احمد فیض ، علی سردار جعفری ، باقر مہدی اور ندا فاضلی کی بھی متعدد نظموں کو مراٹھی ترجمے کی صورت میں پیش کیا ۔ اس طرح مراٹھی میں اردو کی قدیم اور جدید شاعری کو عوام الناس تک پہنچانے کا کام ایک قومی جذبے کے تحت مراٹھی میں ہوا ہے ۔ مراٹھی میں اردو شاعروں کے بارے میں اندازاً چالیس مضامین مراٹھی رسائل میں چھپ چکے ہیں ۔ اسی طرح "اردو گیتیں" کو بھی ایک مجموعے کی صورت میں مراٹھی میں منتقل کیا ہے ۔ قاضی سلیم کی منتخب نظموں کے بھی مراٹھی میں تراجم ہوچکے ہیں ۔ قاضی سلیم کا منتخب کلام "قاضی سلیم چی کویتا" ([illegible]) پردیپ دیش پانڈے نے کیا ۔ یہ مجموعہ ستا دیش پبلی کیشن نے شائع کیا ۔ اس طرح اردو کی قدیم اور جدید شاعری ۔ اس کے لہجے اس کی فکر کے مختلف سماجی ، ثقافتی و سیاسی پہلو اور اردو شاعری کا اندازِ فکر مراٹھی ادب کے ذخیرہ میں محفوظ ہوگیا ہے ۔

اردو کے برعکس مراٹھی میں جو ادب منتقل ہوا ہے اس کا دائرہ وسیع ہے ۔ اس میں شاعری اور فکشن کے علاوہ علمی تحریریں بھی ترجمے کی صورت میں محفوظ ہیں ۔ اس ضمن میں اردو تنقید کے شاہکار ، مولانا الطاف حسین حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کا بھی مراٹھی میں ترجمہ ہوا ہے ۔ مقدمہ شعر و شاعری کا یہ مراٹھی ترجمہ "کاویہ آنی کویتا" ([illegible]) ہے جسے ڈاکٹر رنگ ناتھ تلگیری نے مراٹھی میں منتقل کیا ۔ ڈاکٹر رنگ ناتھ تلگیری کو اردو اور مراٹھی دونوں پر عالمانہ قدرت حاصل ہے ۔ شاعری کے فنی اور تنقیدی تقابلی مطالعہ کے پیش نظر یہ ترجمہ بہت اہم ہے ۔ ڈاکٹر تلگیری چند سال قبل تک عثمانیہ یونی ورسٹی (حیدرآباد) میں مراٹھی کے پروفیسر اور صدر شعبہ ، مراٹھی رہ چکے ہیں ۔ مولانا عبدالحلیم شرر نہ صرف اردو کے ناول نگار ، انشا پرداز ، افسانہ نگار اور ادبی صحافی تھے بلکہ ان کے قلم سے بے شمار موضوعات پر بھی گوہر تاب دار برسلے ۔ اردو میں معریٰ شاعری کی ابتدا کے سلسلے میں بھی ان کا نام اہمیت رکھتا ہے ۔ اس کے علاوہ وہ ایک باکمال تہذیبی مورخ بھی تھے ۔ ان کی کتاب "گذشتہ لکھنؤ - لکھنؤ کی تہذیبی تاریخ" ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے ۔ جس میں ایک مٹتی ہوئی تہذیب کو نئے جامہ پہنا دیا گیا ہے ۔ "گذشتہ لکھنؤ - لکھنؤ کی تہذیب کی سچی اور باتی تصویر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ کانت نے اس "لکھنؤ کی تہذیبی تاریخ" (Cultural History) کو مراٹھی میں منتقل کرکے ، مشرق اور بالخصوص ہندوستان کی ایک مٹتی ہوئی تہذیب کو ، اس کی زبان ، رسوم و رواج ، نشست و برخاست ، غرض کہ زندگی کے سارے

لوازمات کو اس میں محفوظ کر کے اردو کی اس مٹتی ہوئی تہذیب کو مراٹھی دانوں کے لیے بھی ترجمہ کی صورت میں پیش کر دیا ہے اسی طرح خواجہ حسن نظامی کی کتاب " بیگمات کے آنسو " بھی مراٹھی میں منتقل ہوچکی ہے ۔

ہندستانی زبانوں میں ادبی اور علمی سطح پر لین دین جیسا کہ ابتدا میں لکھ چکا ہوں ، کثیر لسانی ماحول میں بے انتہا ضروری ہے اس بات کا احساس مراٹھی ادیبوں کے ہاں شدت سے پایا جاتا ہے اور اسی شدتِ احساس کا نتیجہ ہے کہ نجی سطح پر جس کی ا ستیہ مادھو راؤ پگڑی اور پروفیسر را ۔ بھی ۔ جوشی نے کی تھی اسے نرائن سروے ، ڈاکٹر رام پنڈت اور تندنی ست پال نے جاری رکھا جس کو ایک بڑی سطح پر قومی زبانوں کے پس منظر میں نیشنل بک ٹرسٹ نے آگے بڑھایا اور اس قومی ادارے کے تحت اردو منتخب ادب اور علمی کتابوں کے مراٹھی زبان میں ترجمے کرائے ۔ اس سلسلے میں مراٹھی سے اردو میں ترجمے کی اچھی پیش رفت ہوئی ۔ راقم الحروف کو اس کام کی اہمیت کا احساس ۱۹۶۳ ء میں ہوا تھا ۔ یہاں اس واقعے کا ذکر ضروری ہے کہ اسی سال یعنی ۱۹۶۳ ء انجمنِ اسلام اردو انسٹی ٹیوٹ میں ، استادِ محترم پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے دکنی اردو کے مشہور عالم اور مورخ ڈاکٹر نصیرالدین ہا کو دکنی زبان و ادب پر تین توسیعی خطبات کے لیے حیدرآباد سے مدعو کیا تھا ۔ اس سلسلے کی تیسری تقریر کے موقع پر ستیہ مادھو پگڑی جلسے کی صدارت کر رہے تھے ۔ پگڑی صاحب نے اپنے صدارتی خطبے میں اردو سے مراٹھی میں ان کے اور دیگر مراٹھی اسکالر کے تراجم کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ، ترجمے کا یہ کام یک طرفہ ہورہا ہے اور یہ " ون وے ٹریفک " نہیں ہونی چاہیے بلکہ اسے " ٹو وے ٹریفک " میں بدل جانا چاہیے اور مراٹھی کے تراجم بھی اردو میں کثیر تعداد میں ہونے چاہئیں تاکہ اردو اور مراٹھی میں تخلیقی لین د بڑھے اور اس طرح دوریاں کم ہوں اور لوگ ایک دوسرے سے قریب آئیں ۔ اس تقریر کا مجھ پر اثر ہوا اور میں نے یہ تہیہ کرلیا اس کام میں مقدور بھر میں بھی ہاتھ بٹاؤں گا ۔ یہ اسی تحریک کا نتیجہ ہے کہ میں نے جامع مسجد ، بمبئی کے کتب خانے میں محفوظ " سمجھاون " کا مطالعہ کیا اور اسے ۱۹۶۴ ء میں ایک تفصیلی مقدمے کے ساتھ شائع کیا اور اپنے احباب سے بھی اس سمت میں کام کروا کی کوشش کی ۔ ستیہ مادھو راؤ پگڑی کی اسی تحریک کا نتیجہ ہے کہ اب اردو میں بھی مراٹھی سے تراجم کا کام " لوگ ساتھ آتے گئے کارواں بنتا گیا " کی مصداق تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے او نئے نئے لوگ ادبی ترجمے کے اس قومی کام میں دل چسپی لے رہے ہیں اردو میں بھی اب اسے ایک تحریک کی صورت حاصل ہوگئی ہے ۔

○●○

(سلسلہ ص : ۱۳ سے)

یہ صحبت بھی کچھ ہی دنوں کی ہے ۔ کون جانتا ہے شعرا پھر کب اکٹھا ہوں گے یا اکٹھ ہوں گے بھی ۔"

تین سال بعد دربار ، اس تمام طرزِ زندگی کے ساتھ جس سے غالب واقف تھے اور جو غالب کی شناخت تھا ایسی اتھل پتھل اور ایسے تشدد کے درمیان تہس نہس ہوگیا جس کی پہلے کوئی نظیر نہ تھی ۔ مغل شاہی خاندان کا خاتمہ ہوگیا اور بہادر شاہ جلاوطن کردیئے گئے ۔ لیکن اس وقت بھی جب شان و شوکت اور دھوم دھام کے ساتھ امنِ برطانوی کا ڈھنڈورا پیٹا جارہا تھا پیش بین ا واقعات پر نظر رکھنے والا شاعر غالب ایک طرف کھڑا ہونے اور اس ازلی و ابدی حقیقت کے اظہار کی صلاحیت رکھتا تھا ،

طرۂ اوج بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

○●○

ڈاکٹر عبدالستار دلوی

مہاراشٹرا سے اردو کا لسانی و ادبی رشتہ

(ایک مختصر جائزہ)

ہندستانی کا علاقہ ہندستان کی دیگر زبانوں کے لحاظ سے سب سے زیادہ وسیع اور عریض ہے اور جب کوئی زبان کسی وسیع علاقے پر پھیلی ہوئی ہوتو لسانی اعتبار سے وہ مختلف ذیلی بولیوں میں تقسیم ہوجاتی ہے ۔ مغربی ہندی جو اردو کی اصل اور منبع ہے تقریباً پانچ ذیلی بولیوں میں منقسم ہے، حسب ذیل ہیں :

(۱) بندیلی (۲) ہریانوی یا بانگڑو (۳) بھاشا (۴) قنوجی (۵) کھڑی بولی ۔

مندرجہ بالا پانچ بولیوں میں موخر الذکر کھڑی بولی عہد مابعد میں ہندستانی کے نام سے موسوم ہوئی ۔ دیکھیے جائزہ زبان ہند از ابراہام گریرسن جلد نہم ، یہ بولی عام طور سے مغربی روہیل کھنڈ دوآبہ اور پنجاب میں ضلع انبالہ میں بولی جاتی تھی اور اب اس کا دائرہ ، اثر سارے شمالی ہندستان اور جنوب میں میسور ، بنگلور کے علاوہ ہندستان کے تقریباً سارے بڑے شہروں مثلاً احمد آباد ، بمبئی ، مدراس وغیرہ تک پھیلا ہوا ہے ۔ جنوب میں ہندستانی کی دو اہم بولیاں گجری (بولی گجرات) اور دکنی خاص طور سے مشہور و معروف ہوئیں ۔

جدید ہند آریائی زبانوں میں مراٹھی ایک بہت ہی اہم اور ادبی لحاظ سے بہت ہی ممتاز زبان ہے ۔ اسے ریاستِ مہاراشٹرا کی سرکاری زبان ہونے کا بھی شرف حاصل ہے ۔ مراٹھی بولیوں کے اعتبار سے سات بولیوں میں منقسم ہے جو عام طور سے " کوکنی " کہلاتی ہے ۔ پونا مراٹھی ، ناگپور مراٹھی اور دیسی مراٹھی اس کے علاوہ ہیں جن میں کہیں پونا اور اس کے اطراف و جوانب کی زبان ادبی اور معیاری زبن کہلاتی ہے ۔ مرہٹی فی الوقت دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے ۔ مراٹھی کے ابوآ لابا گیانیشور سے لے کر پو۔ شی ۔ رینگے تک پھیلا ہوا ہے ۔ اس کا ادب اور اس کی روایتیں بہت ہی شان دار ہیں ۔ جدید ہند آریائی زبانوں میں گجراتی کے ساتھ مراٹھی ہی ایک ایسی زبان ہے جو سنسکرت کے زیرِ اثر تثنیہ کا صیغہ بھی رکھتی ہے ۔ اردو ، جس کا مولد و منشا دلی اور نواحِ دلی ، کا علاقہ ہے اپنی پیدائش سے تقریباً سو سال بعد علاء الدین خلجی اور محمد تغلق (۱۳۲۶ ء) کے ساتھ دکن پہنچی ۔ جہاں پر اس کے اولین مرکز دیوگری یا دولت آباد تھا جو لسانی اعتبار سے مرہٹی کا علاقہ ہے ۔ بہمنی سلطنت کے قیام ۱۳۴۷ ء کے بعد یہ زبان دکن میں ہندی دکنی اور ہندستانی کے مختلف ناموں سے ۱۷۰۰ ء تک پروان چڑھتی رہی ۔ کبھی اس کے مراکز گلبرگہ اور

بیدر جو کنڑی علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اور کبھی بیجاپور اور گولکنڈہ کی عادل شاہی اور قطب شاہی عہد میں یہاں کے عدل و انصاف سے متاثر ہوکر ان کی رواداری کی علامت کے طور پر کنڑ اور تلگو کے علاقوں میں پرورش پاتی رہی ۔ تاہم اردو اس علاقے میں بھی باوجود کنڑا اور تیلگو سے ربط کے ، اپنی فطری رجحان کے بہ موجب اپنی ہم پیالہ و ہم نوالہ ہند آریائی مرہٹی سے متاثر ہوتی رہی ۔ اردو اور مراٹھی کو ان کے خاندانی و نسلی رشتے نے استقامت بخشی ۔ اور دونوں بہنیں ایک دوسرے کو مختلف سمتوں میں متاثر کرتی رہیں ۔

اردو لسانی اعتبار سے شمالی ہندستان سے وابستہ ہونے کے باوجود اپنے دور ارتقا میں شروع ہی سے ہندستان گیر حیثیت رکھتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شمالی ہند آریائی زبانوں کے ساتھ ہی جنوب میں ہندآریائی مراٹھی سے اپنا رشتہ استوار کرسکی ۔ برخلاف اس کے شمالی ہند کی دیگر زبانیں مثلاً پنجابی ، بنگالی ، اڑیا ، میتھلی ، اودھی اور آسامی وغیرہ ایک ہی جغرافیائی علاقے میں محدود ہوکر رہ گئیں لہذا ان کا لسانی رشتہ اپنے علاقے کی باہر کی زبانوں سے استوار نہ ہوسکا ۔

جنوب میں اردو اور مراٹھی کے مراسم کی دوسری وجہ جیسا کہ ماقبل سطور میں بیان کیا جاچکا ہے ، یہ ہوئی کہ یہ لسانی اعتبار سے ایک ہی خاندان اور نسل کی زبانیں ہیں لہذا ایک دوسرے کے بنیادی مزاج میں کوئی فرق نہ ہونے کی وجہ سے دونوں کے قریب آنے کے بھرپور مواقع تھے ۔ اردو اور مراٹھی الفاظ کے تقابلی مطالعے سے یہ بات ثابت ہوئی کہ دونوں زبانوں کے تقریباً ۶۰ فی صد الفاظ کی اصل ایک ہی ہے اور ان دونوں زبانوں میں (CONGMATES) کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ یہ حقیقت حال جنوب میں مراٹھی کے ساتھ دیگر زبانوں کی نہیں ہے اس لیے کہ جنوب کی ساری زبانیں مثلاً تامل ، تیلگو ، کنڑ اور ملیالم زبانوں کے ایک علاحدہ خاندان " دراوڑی خاندان " سے تعلق رکھتی ہیں اور ظاہر ہے کہ ایک ہی خاندان کی زبانیں ایک دوسرے کو متاثر کرنے کی صلاحیت زیادہ رکھتی ہیں بہ نسبت دوسرے خاندان کی زبانوں کے ۔ جنوب میں مراٹھی اور اردو کے لسانی و ادبی لین دین سے اردو اور مراٹھی والوں میں تہذیبی و ثقافتی اثرات بھی نمودار ہوئے جیسا کہ عام طور سے زبانوں کے معاملات میں ہوتا آیا ہے ۔ اس سلسلے میں یہ بھی ایک دل چسپ حقیقت ہے کہ خود عادل شاہیوں نے جن کی سلطنت کا ایک بڑا حصہ مہاراشٹرا اور مراٹھی کا حصہ تھا ، ایک عرصے تک اپنی ادبی زبان دکنی کے بجائے مراٹھی ہی کو سرکاری زبان کی حیثیت دی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری سرپرستی نے بھی مراٹھی اور اردو کو قریب سے قریب تر آنے کے مواقع فراہم کیے ۔ اردو اور مراٹھی کے اس لسانی ، ادبی و تہذیبی لین دین اور ربط سے جو اثرات ایک دوسرے پر پڑنے شروع ہوئے اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :

(۱) لسانی (۲) ادبی ۔

قدیم اردو (دکنی) پر مراٹھی کے اثرات کافی گہرے ہیں اور اسما ، حروف اور افعال تک محدود ہیں ۔ قدیم اردو کا ذخیرہ الفاظ مرہٹی کے بے شمار الفاظ پر مشتمل ہے ۔ یہی وجہ ہے ۔ اس کے مطالعے کے لیے کم از کم مرہٹی کی بنیادی معلومات ضروری ہے ۔ گو ایک آدھ مرہٹی کی صرفی خصوصیت بھی قدیم اردو میں در آئی ہے تاہم ذخیرہ الفاظ پر جو مرہٹی کے اثرات زیادہ دکھائی دیتے ہیں ، اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور سے زبانیں دیگر لسانی خصوصیات مثلاً صوتی ، صرفی ، نحوی کے مقابلے میں لغت کے اثرات زیادہ قبول کرلیتی ہیں ۔ دکنی بول چال کے علاوہ قدیم کتابی و ادبی زبان میں بھی اس تعلق سے جو بے شمار مرہٹی الفاظ استعمال ہوئے ہیں اس کی مثالیں خواجہ بندہ نواز گیسودراز سے منسوب معراج العاشقین سے صدیوں تک تقریباً ہر کلاسیکی شاعر کے یہاں دیکھی جاسکتی

ہیں۔ دکنی کے مندرجہ ذیل الفاظ جو ملاوجہی کی سب رس، قطب مشتری، نصرتی کی گلشنِ عشق، وغیرہ سے ماخوذ ہیں، دکنی کے مرہٹی سے رشتے کی یادگار ہیں۔

کتک بہ معنی کتنے، ادھک بہ معنی زیادہ، اتاول بہ معنی عجلت یا جلدی، باٹ بہ معنی راستہ، اڈبلٹ بہ معنی ناہموار راستہ، اجون بہ معنی ہنوز۔ اب تک، اپٹنا بہ معنی اکھاڑنا، ان یان بہ معنی کھاتا، اتم بہ معنی اعلیٰ، بیسنا بہ معنی بیٹھنا، پاڑنا بہ معنی ڈالنا، پیلاڈ بہ معنی پرے ندی پار، ترپھرنا بہ معنی بے تاب ہونا، جناور بہ معنی جانور، بڑبڑا بہ معنی بلبلا، بھار بہ معنی بوجھ، پاؤنے بہ معنی مہمان، ناڑ بہ معنی نبض، ہنچ بہ معنی احمق، ہو بہ معنی ہاں، نوا بہ معنی نیا، بھانڈے بہ معنی برتن، اندھلا بہ معنی اندھا، ویتاگ بہ معنی بیزاری وغیرہ۔ اس سلسلے میں دکنی ادب سے چند مثالیں خالی از دلچسپی نہ ہوں گی۔ قطب شاہ کہتا ہے:

سکی سیام کسیاں میں پھولاں دسے یوں   کہ تدیاں سوں کیتے گگن کوں مرصع

دو تن کا ناؤں میں منگتا ہوں لیانے کہ زباں اوپر   کہ اس کا ناؤں سے سب ناداں منے دستا ہے جگ تھے خوش

دو تن جدائی پاڑ نے تدبیر کی دیے   سائیں ہمارا ہم نے کہ میں بھی سیا نہیں

قلی قطب شاہ کی بارہ محبوبائیں مشہور ہیں۔ ان محبوباؤں میں ایک کا نام "کنولی" کنولا یا کونولا نازک، تازہ اور خام کے معنوں میں مرہٹی میں مستعمل ہے۔ قطب شاہ نے اس نرم و نازک گانے والی "کنولی" محبوبہ پر کئی نظمیں لکھی ہیں انھیں نظموں میں سے ایک شعر میں کہتا ہے:

کالیاں، گوریاں، سکیاں کوں جگ میں جو تھیاں سو ہربا   کونلی سکی کوں دیکھت ہیں سدھ بھلیا دکن میں

اپنی محبوبہ "پیاری" سے مخاطب ہوکر قطب شاہ کہتا ہے کہ جوانی اور جوبن مہمان کی حیثیت رکھتے ہیں لہذا معشوق کو چاہیے کہ عاشق کے لیے اس کی جوانی اور جوبن عیش و عشرت کا باعث ہو۔ مرہٹی میں   پاہونا بہ معنی مہمان استعمال ہوتا ہے قطب شاہ کہتا ہے:

جوانی و جوبن ہے سب پاؤنا   کہ تجھ تھے ہوئے عیش سا ییں کوں جم

دکنی میں معاون فعل "ہے" کے لیے "اہے" بولا جاتا ہے۔ اسکی اصل بھی مرہٹی ہے۔ فرق صرف یہ طویل مصوتہ خفیف مصوتہ میں تبدیل ہوگیا ہے۔ "اہے" مرہٹی میں آہے   کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

بالی سندر آلی اہے گلال کی ڈالی اہے
بالاں کی مکاری سیں جس کمھ گلالی اہے
جگ مگ ستارے سوہیے ناری کے جوبن پھل اوپر

اسی طرح "اتھا"، "تھا" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ اتھا مہاراشٹری پراکرت کے اتھی یا اتھ لکھا ہوا ملتا ہے۔ مرہٹی میں یہ "ہوتا" بن گیا ہے۔

اردو اس لحاظ سے بہت خوش قسمت زبان ہے کہ اسے شمال سے جنوب تک تقریباً ہر لسانی گروہ کی حمایت حاصل رہی ہے۔ بہار، بنگال، پنجاب، سندھ، مہاراشٹرا اور دکن نے مختلف علاقے اردو کی ادبی سرگرمیوں کے مراکز رہ چکے ہیں اور اس کے بہی خواہوں اور پرستاروں میں ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی وغیرہ سارے ہندی اقوام شامل رہی ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ کی ابتدا

شمال میں امیر خسرو اور اسی عہد کے چند بزرگوں کے ملفوظات سے شروع کی جاتی ہے ۔ عہد امیر خسرو کے بعد اردو ادب کی ساری اٹھان اور تشکیل و ترقی کا انحصار ہمارے ادبی محققین کے مطابق دکن ہے ۔ جہاں پر عہدِ عادل شاہی اور قطب شاہی میں اردو شاعری اور نثر کو ترقی ہوئی ۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز بھی قلی قطب شاہ ، ابراہیم عادل شاہ ، وجہی ، نصرتی ، وغیرہ شاعروں اور نثر نگاروں نے اس کے ادبی نقوش ابھارے ۔ اردو ادب کی تاریخ میں دکن کا اتنا اہم حصہّ ہے اور اس سے اردو ادب کو جو سمت و رفتار ملی ، وہ اتنی واضح ہے کہ اس سے انکار ممکن نہیں تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عہدِ خسرو اور دکن کے درمیان کا زمانہ جو تقریباً دو صدیوں پر پھیلا ہوا ہے ادبی اعتبار سے بنجر نہیں ہوسکتا اور خسرو اور دکنی دور کے بیچ اردو زبان و ادب کی ترقی کی مختلف کڑیاں ضرور ہونی چاہیں ۔ یہ خلا دراصل خلا نہیں ہے بلکہ ادبی رفتار کا یہ سارا مرکزِ ثقل عہد خسرو کے بعد پنجاب اور مہاراشٹری علاقے میں منتقل ہوجاتا ہے چناں چہ وہ عہدِ پنجاب میں گرو گرنتھوں کا دور ہے اور مہاراشٹرا میں گیان دیو ، ایکناتھ ، تکارام ، نام دیو وغیرہ مہاراشٹری سنت ، شاعروں کا دور ہے جب کہ اردو ادبی لحاظ سے ان سنتوں کے ہاتھوں یہاں پرورش پارہی تھی ۔ یہ دور مہاراشٹری ہندوؤں سے متاثر ہونے کا اور انھیں متاثر کرنے کا دور تھا چناں چہ اس لسانی ، مذہبی اور ثقافتی لین دین کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مراٹھی صوفی شاعروں نے اردو کو بھی اپنے خیالات کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا حتیٰ کہ اسلامی وجودی فلسفہ اور بھگتی کی تعلیم کے پیش نظر مسلمان صوفیا اور ہندو سنتوں کی شاعری ایک دوسرے کی بازگشت معلوم ہونے لگی ۔ (دیکھیے "Rise of the Maratha Power" By : Rande) مہاراشٹری سنتوں کی اردو شاعری کے سلسلے میں نمونتہً میں صرف نام دیو ، ایکناتھ اور تکارام کی مثال پر اکتفا کروں گا ۔

نام دیو جو مراٹھی کے بلند تین سنت کویوں میں سے ہیں ۔ مہاراشٹرا میں اردو کے قدیم ترین شاعروں میں سے ہیں جن کا اپدیش صوفیانہ اور مسلک رواداری اور بھائی چارہ ہے وہ ۱۳۲۸ء میں ستارا میں پیدا ہوئے اور بھگتی تحریک کو مہاراشٹر میں رواج دیا ۔ انھوں نے اپنے خیالات کو ہر طبقے تک پہنچانے کے مقصد کے تحت مرہٹی کے علاوہ کھڑی بولی ، اردو یا ہندوستانی میں بھی شاعری کی تاکہ وہ اپنا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچاسکیں ۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو جو دیوگیری پر پٹھانوں کی چڑھائیوں سے مہاراشٹرا میں پھیل رہے تھے انھیں اس صوفیانہ اور بھگتی کی اس ملی جلی شاعری سے متاثر کیا جاتے اس مختصر سے جائزے میں تفصیلات کا موقع نہیں تاہم نام دیو کی اردو شاعری کا نمونہ پیش خدمت ہے :

مائی نہ ہوتی ، باپ نہ ہوتے کرم ہوتا کایا
ہم نہیں ہوتے ، تم نہیں ہوتے کون یہاں لے آیا
چندا نہ ہوتا سورج نہ ہوتا ، پانی پون سلایا
شاستر نہ ہوتا وید نہ ہوتا کرم کہاں سے آیا

میں اندھے کی ٹیک تیرا نام کھنڈ کارا (خدا وند گار)
میں گریب میں مسکین تیرا نام ہے ادھارا
کریما رحیما اللہ تو گنی
حاذرا حزر دری پیتوں منی

دری آذں تود ہند توں بسیار توں دھنی
دیہی لیہی ایک توں ، دیگر کو نہیں
توں والی توں بنا میں بچا رو کیا کری
ماے ہے سوامی بخسند توں ہری

ایکناتھ سوامی بھی مہاراشٹری سنت کویوں میں بہت ممتاز شمار کیے جاتے ہیں ۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ شمالی ہند بھی گئے اور مختلف مقامات کی سیر کی ۔ ایک ناتھ پیٹھن میں پندرھویں صدی میں پیدا ہوئے ۔ ان کی والدہ کا نام رکمنی تھا ۔ ان کے والدین کا انتقال بچپن میں ہوگیا تھا ۔ بچپن ہی سے انھوں نے خدا سے لو لگائی اور سارا رجحان مذہب اور بھگتی کی طرف تھا ۔ سنت اور صوفیوں سے متعلق جس طرح قسم قسم کی کرامات بیان کی جاتی ہیں ۔ اسی طرح ایکناتھ سوامی کے سلسلے میں بھی مشہور ہیں ۔

ایکناتھ کی شاعری کے چند نمونے درج ذیل ہیں :

دل کی گانٹھ کھولو
یارو رام نام بولو
کوئی نہیں آوے ساتھ
بھنڈے کاہے کون کرے بات
جورو لڑکے ماں باپ !
سب پہارے ہاتھ
ہتھی گھوڑے پالکو مینا
نہیں آوے ساتھ
دو دن کا بزار یارو
کاہے کون کرتا بات
جھوٹی مایا ، جھوٹی کایا
جھوٹا سب دن رات
ایکا جناردھن بولے بھائی
کوئی نہیں آوے ساتھ

اول یاد کرو دستار کی
گرو کی ، پیغمبر کی اور یاد کرو کرتار کی
جن نے منڈان پیدا کیا ہے
اول دیکھ یہ لکھتا ، اسے نام نہ تھا
نام درمیان پیدا ہوا ، چل چل چل

ایک سو دون ۔ دو سو تین ۔ تین سو چار ۔ چار سو پانچ
پانچ سو چھبیس ۔ چھبیس سو چھتیس بتایا ہے
چھتیس کا بھی ایک ہیا ہے ۔ سو گرو گاروڑی کی ہے یاد
اور دیکھو کیسا کھیل بتایا ہے

آدی پروش نرادھار کی یاد کر
میرے گرو پروردگار کی یاد کرہ جنے عجب بنائی
اس استاد کی یاد کرہ کیسی کھرمنانا سنا دیا
اس صاحب کی یاد کر ۔ سنت مہنت کی یاد کر
گنی گنونت کی یاد کر ۔ جوگ جگت کا باندھا توڑا
شم دھرم کا سرپر جملا چھوڑا ۔ تکا جو ہی سادے ترا
گرو گاروڑی پورا ۔

تکارام پونا کے قریب دیہو میں ۱۶۰۸ء میں پیدا ہوئے ۔ وٹھوبا کی پرستش ان کی خاندانی روایت بن گئی تھی ۔ تیرہ سال میں تکارام کے والد کا انتقال ہوگیا اور ساری ذمہ داریاں انھیں کے سر آپڑیں ۔ تاہم انھوں نے خانگی و دنیوی ذمہ داریوں کے ساتھ صوفیانہ زندگی بھی بسر کی ۔ انھوں نے ہمیشہ غریبوں کی مدد کو اپنا مطمح نظر بنایا اور فرصت کے اوقات میں گیانیشور ، نام دیو اور ایکناتھ پوتھی پستکوں کا مطالعہ کرتے رہے اور بہت جلد اپنے گرد عقیدت مندوں اور شاگردوں کا حلقہ بنالیا ۔ انھوں نے مراٹھی ابھنگوں (مناجاتوں) کے ساتھ اردو میں بھی شعر کہے ۔ تکارام کی شاعری کے چند شعر ملاحظہ ہوں :

چیت ملے تو سب ملے نہیں تو پھوکٹ سنگ ۔ پانی ، پاتھر ایک ہی ٹھور کو دن بھیگے رنگ

○

ہمت نہ ہارے مال سی چھیا لوگ رجھائے ۔ تکا جگ میں کہن سو ہی سوگل ہٹائے

○

تکا ملنا تو بھلا من سوں من مل جائے ۔ اوپر اوپر ماٹی دھرتی نینہ ہی کون برائی

کیا کھوں نہیں بوجھت لوکا
بل جاوے تم ملت دھکا
لیا جینے کی بھری آسا
باتوں لیا نہیں تیرا گھاسا

[illegible]

پھوٹے جانے تن توں سب بھائے

لے شکا تو بھیا دیوانا

کیتا بھاؤ کرنے جتا

کیا کاؤں کون سنتی والا

دیکھو تو سب ہی جگ بھلا

بولیں اپنے رام ہی ساتھ

جیسی تیسی کریں بات

کا نہ تی دھر جانی

یہ مجھے جگ الٹی بیرانی

گر دھر ال تو بھاؤ کا بھوکا

راگ کلا نہیں جانت تکا

نام دیو، ایکناتھ اور تکارام کے علاوہ بھی متعدد شاعر ایسے ہیں جو مراٹھی کے ساتھ اردو میں بھی شعر کہتے تھے جن کا مختصر سے تعارفی مضمون میں نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا صرف تین شاعروں کے کلام کے نمونے ساتھ پیش کرنے پر اکتفا کر کے مہاراشٹر سے اردو کے اس لسانی و ادبی رشتے کے پیشِ نظر جسے میں نے قدیم دور تک محدود کیا ہے۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ابتدا ہی سے اردو کسی ایک مذہب، فرقے یا علاقے کی زبان نہیں رہی بلکہ اس نے ہندوستان گیر حیثیت پائی ہے۔ مہاراشٹر ہندوستان کا وہ خوش قسمت خطہ ہے کہ جس نے شمالی ہند کی ابتدائی اردو اور دکنی کے درمیان کی کڑیاں فراہم کی ہیں جن کے بغیر اردو زبان و ادب کی تاریخ کی تدوین مکمل نہیں ہوتی۔

○○○

پروفیسر عبدالستار دلوی

"مرزا غالب" از ڈاکٹر نتالیہ پری گارِ نا پر ایک نظر"

غالب کی شاعری نہ صرف اردو بلکہ مشرقی شاعری میں ایک اعلیٰ و ارفع مقام رکھتی ہے۔ مولانا روم، حافظ، سعدی، عمر م کی صدرنگ شاعری کی طرح غالب اور اقبال مشرقی شاعری کو اپنی فکر اور فنی حیثیت سے مالا مال کیا اور فارسی شاعری کی طرح ، زبان و ادب میں عالمی منظر نامہ پر ایک منفرد حیثیت حاصل کی۔ ان کی شاعرانہ انفرادیت اور عظمت فکر ہی کا نتیجہ ہے کہ ی شاعری کے دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے اور ان کی فکر و فلسفہ کی باریکیوں پر علماءِ ادب نے اپنی تمام تر حیتوں کے ساتھ مطالعے بھی کیے۔

غالب کی شاعری مختلف زبانوں میں دل چسپی کا موضوع بنی ہوئی ہے اور یورپ اور ایشیا کی متعدد زبانوں میں اس کے مے ہوچکے ہیں۔ مشرقی علوم کو ان ملکوں نے اپنی پوری اہمیت کے ساتھ اپنایا اور مختلف اداروں اور یونی ورسٹیوں میں یہ مطالعہ موضوع بنے رہے۔ انگریزی میں رالف رسل اور چیک زبان میں یان مارک نے غالب کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ روس اور لستان میں مشرقی زبانوں سے بہ طورِ خاص دل چسپی لی گئی۔ چناں چہ ماسکو، لینن گراڈ اور تاشقند مشرقی زبانوں کے مطالعوں کا امرکز رہے ہیں۔

غالب کی زندگی، اس کے مختلف پہلو، ان کا درد و غم، ان کی نفسیاتی الجھنیں، ان کے فن کی عظمت اور فکر کے ہشت لوؤں پر اردو میں بے شمار کتابیں موجود ہیں۔ انگریزی میں بھی وافر مواد دست یاب ہے۔ روسی زبان بھی غالب پر تعارفی مضامین ہ محروم نہیں۔ روسی میں غالب کے مطالعوں کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ غالب کے مطالعوں پر مشتمل ایک انتہائی اہم اور فکر انگیز اب ڈاکٹر نتالیا پری گار نا کی تصنیف "مرزا غالب" غالبیات میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے جسے جناب اسامہ فاروقی نے اردو ، پیش کر کے غالبیات کے اردو ذخیرے میں ایک اہم اضافہ کیا ہے۔ تاکہ اس قابلِ قدر کتاب سے غالب کے اردو شائقین بھی نفادہ کرسکیں۔ اصل کتاب کی طرح اردو ترجمہ بھی لائقِ صد تحسین ہے۔

"مرزا غالب" کی مصنفہ ڈاکٹر نتالیا پری گار نا روسی مستشرقین میں ممتاز اردو اسکالر ہیں اور ادارہ، علومِ مشرقیہ ماسکو ہ وابستہ ہیں۔ انھیں اردو اور فارسی زبانوں اور ان کے ادبیات سے گہرا لگاؤ ہے۔ اسی علمی ذوق کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے ۱۹۱ء میں اقبال پر ایک کتاب "اقبال کی شاعری" تصنیف کی تھی۔ ان کی دوسری کتاب "کلامِ اقبال کی شعریات" سے متعلق ہے۔ یہ دونوں کتابیں ۱۹۰۰ء سے ۱۹۲۰ء تک کی اقبال کی شاعری کا مطالعہ پیش کرتی ہیں۔ غالباً ابھی تک ان کتابوں کے اردو تراجم نہیں ہوئے اور وہ بھی جناب اسامہ فاروقی کی توجہ کی منتظر ہیں جو اردو، فارسی اور روسی پر نہ صرف عبور رکھتے ہیں بلکہ

اپنے اعلیٰ علمی و ادبی ذوق کے ساتھ اصل کتابوں کی روح، اس کے معانی اور ان میں پیش کیے گئے خیالات کو من و عن پیش کرنے کی اعلیٰ صلاحیت رکھتے ہیں۔

غالب اور اقبال پر ڈاکٹر پری گار نا کی کتابیں یقین ہے کہ غالبیات اور اقبالیات میں جو ذخیرہ اردو میں موجود ہے ایک اہم اضافہ ثابت ہوں گے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ظ۔ انصاری (مرحوم) بھی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے غالب اور اقبال کی شاعری پر ڈاکٹر پری گار نا کی توجہ مبذول فرمائی اور ان میں ان دو عظیم شاعروں کے لیے دل چسپی اور شوق پیدا کیا۔

"مرزا غالب" پر ڈاکٹر نتالیا پری گار نا کی یہ کتاب مصنف کی گہری علمیت، اردو زبان پر قابلِ قدر قدرت اور تفہیم غالب کے ساتھ گہرے تاریخی اور سماجی شعور کا حاصل ہے۔ شاعر اور ادیب اپنے عہد کی تاریخ، سماجی زندگی اور سیاسی کوائف سے وابستہ رہتا ہے۔ اور اس کی تخلیقات میں عصری حالات اور زندگی، اس کی انفرادی زندگی میں پیوست ہوکر اس کی ذہانت اور فطانت اور فکر و فن کی علامت کا اظہار بن جاتی ہے شاعر اور ادیب کے مطالعے بھی تخلیق کار کی نفسیاتی گرہ کشائی اور فنی و فکری نکات کی بازآفرینی کے لیے اعلیٰ علمی ذوق اور ذہانت اور مطالعہ اور فن کی باریکیوں پر گہری نظر کے متقاضی رہتے ہیں اور یہ سب کے بس کی بات نہیں۔ اس میں مخصوص خداداد صلاحیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ فنونِ لطیفہ کو سمجھنے کے لیے محض مطالعے کی وسعت بھی ساتھ نہیں دیتی، اس میں فکر و فن کا ادراک بھی ضروری ہوتا ہے، جو فطرت ودیعت کرتی ہے۔ وسیع مطالعہ صرف اس دھیمی آنچ کو تیز کر دیتا ہے۔ اس دھیمی آنچ کا ہونا لازمی ہے۔ ڈاکٹر پری گار نا کی زیرِ نظر کتاب "مرزا غالب" اسی فکر و فن کے ادراک، شعر فہمی، تاریخی و سماجی شعور اور نفسیاتی گرہ کشائیوں کی فطری صلاحیت اور وسیع مطالعے کا ایک حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔ کسی شاعر اور ادیب کا مطالعہ اس شاعر یا ادیب کے عصر کا سماجیاتی (Sociological) مطالعہ ہوتا ہے اور جب یہ مطالعہ اس تناظر میں کیا جاتا ہے تو اس سے شاعر کی شخصیت کی ازسرِ نو بازیافت ہو جاتی ہے اور شخص اور شاعر (ادیب) مختلف خانوں میں تقسیم نہ ہوکر ایک اکائی بن جاتے ہیں۔ ڈاکٹر نتالیا پری گار نا کی اس تصنیف کے مطالعے سے جو فرحت و انبساط، جو سرخوشی اور نظر کی بالیدگی اور روشنی ہمیں حاصل ہوتی ہے وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اردو میں غالبیات میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔

غالب کی زندگی، ان کا ماحول، ان کے احباب، ان کی شاعری، ان کے افکار، ان کی روشن خیالی، زندگی سے متعلق ان کا رویہ، ان کی انسان دوستی اور رواداری، ان کی وسیع المشربی، غرض کہ غالب کی زندگی اور فن کے مختلف پہلوؤں پر مصنف اس فن کارانہ چابک دستی سے روشنی ڈالی ہے کہ ان کے خیالات اور شاعری اور عصر کو مربوط طریقے سے ایک ہی لڑی میں پرو دیا ہے اور اس طرح یہ کتاب شخصیت اور شاعری، عصری حالات اور فکری رجحانات کا ایک خوب صورت مرقع بن کر سامنے آتی ہے۔ مصنف کو بجا طور پر اس بات کا احساس ہے کہ:

"قارئین کی خدمت میں پیش کی جانے والی یہ کتاب شاید عالیہ تاریخِ ادب میں اس عظیم شاعر کی تخلیقی کاوشوں کو ان کے سوانحِ حیات کے تناظر میں متعارف کرانے کی واحد کوشش ہے۔ اور علمی حقائق اور شاعری، شعریات، تاریخ اور شرقیہ کے دومبرے شعبوں کی ان تحقیقات کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ ۔۔۔۔ اس میں غالب کی شخصیت، ان کے معاصرین کا ادبی اور شخصی اختلافات، سیاسی حالات، سماجی و معاشرتی پریشانیاں، قدامت اور جدیدیت پسندی میں کشمکش کو غالب

فنی و فکری کیفیات کے تجزیہ میں باہم دگر مربوط طریقے سے پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ ہر باب کی ابتدا میں مغربی یا روسی شاعر یا ادیب مثلاً گوئٹے، ہینے، پوشکن، ٹیوٹ چیف، سلتی کوف، برانسکی یا کسی روسی کہاوت سے ماخوذ کے مقتبس کو درج کر کے غالب کو عالمی تناظر (World view) میں پیش کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ غالب کی شاعری کی فلسفیانہ اساس، شعری محاسن اور فکر تازگی اور معنی آفرینی کو مروجہ مفاہیم یا شرحوں سے ہٹ کر ان کی نئی توضیحیں اور تعبیریں (Inter pretation) بھی کی گئی ہیں جس سے مطالعہ غالب کو نئی سمت حاصل ہوتی ہے۔ جگہ جگہ روسی شاعروں کے حوالوں اور تقابل سے بھی غالب فہمی کے در وا ہوتے گئے ہیں اور غالب کی عظمت فکروفن کا بھرپور اندازہ ہونے لگتا ہے۔ کتاب میں غالب کی زندگی سے متعلق شخصی، سیاسی، معاشرتی، واقعات اور شعری و فکری رجحانات اور مذہبی معتقدات کو حسن و خوبی قبول نہ کرتے ہوئے ان تمام عوامل کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ غالب ایک آزاد فکر انسان تھے۔ انھیں علم اور شدت پسندی ناگوار تھی، وہ آپ اپنی عزت کرتے تھے اور ذہنی عظمت کے شدید احساس کی وجہ سے بڑے سے بڑے حکام اور عالی مرتبہ لوگوں کے سامنے عزت و توقیر کے خواہاں تھے۔ غالب نے کشمکش حیات سے کبھی گریز نہیں کیا بلکہ اس کا ہنس کر مقابلہ کیا۔ یہ کتاب غالب کی زندگی کی انھی ہی کہانی ہے جو کشمکش حیات سے متبسم گزر جاتی ہے۔ حالات کا نبرد آزمائی سے مقابلہ کرتی ہے اور ان تمام تجربات سے لیس فن اور فکر کے روشن پہلو پیش کرتے ہوئے زندگی کرنے کا ہنر سکھاتی ہے۔ یہ کتاب عالی دماغ اور روشن خیال شاعر کی زندگی اور اس کے فن کا ایک خوب صورت مرقع ہے۔

ڈاکٹر [illegible] اور ان کی کتاب کے مترجم جناب اسامہ فاروقی کی طرح ادارہ ادبیات اردو (حیدرآباد) بھی قابل مبارک باد ہے جس نے ابتدا اپنے ماہ نامہ "سب رس" میں بالاقساط ترجمہ شائع کیا اور اب غالب کی دو سالہ سالگرہ کے موقع پر اسے کتابی صورت میں فراہم کیا ہے۔

***

حسن منظر

موجودہ معاشرہ اور برہنہ فلمیں

(قسط اول)

انتساب:

روشنی کے نام

جس کے بغیر ذہن اندھیرے رہتے ہیں
اور زندگی میں راستہ نہیں سوجھتا
اور ان سب کتابوں، آرٹ کے شہ پاروں
اور افراد کے نام جن کا کام کردار ساز رہا ہے۔

تعارف:

مجھ سے سوال کیا گیا ہے کہ میں نے اپنے مضمون کے لیے اس موضوع کو کیوں چنا۔

میرا سیدھا سا جواب ہے کہ یہ مضمون میرے اردگرد کی دنیا میں اسی طرح بکھرا ہوا ہے جیسے گرد اور کوڑا۔ دوسروں کی دنیا میں بھی اسی طرح ہے لیکن جس طرح لوگ تیز گرد کے طوفان میں منہ موڑ لیتے اور آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ وہ بھی گندگی سے آنکھیں چرا کر گزر جاتے ہیں۔ انھیں بھی معلوم ہے کہ بڑے ہوٹلوں کی دکانوں پر کیا کر کے بیچا جاتا ہے اور کس قسم کے کتب فروش، بالعموم پرانی کتابیں رسالے بیچنے والے، اپنے کاؤنٹر کے نیچے کیا چھپائے رکھتے ہیں، جسے شیلفوں پر نہیں رکھا جا سکتا ہے اور جس کے خریدار خاموشی سے آتے ہیں اور ان کی متلاشی آنکھوں سے جہاں دیدہ دکان دار بھانپ لیتا ہے کہ انھیں کیا چاہیے۔

لیکن وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ ان میں وہ بھی [illegible] معلوم [illegible] اس خبر [illegible] سے [illegible] ہیں کہ فلاں سینما ہال پر چھاپا مارا اور برہنہ فلمیں دکھانے کے جرم میں اس کے منیجر کو پکڑ لیا گیا یا سینما ہال کو [illegible] کے لیے بند کر دیا گیا۔ [illegible]

سائیکیٹرسٹ کے حصے میں ان عادات کے گرفتارشدگان اور ان کے گھر والوں کی مشکلات آتی ہیں اور برہنہ فلمیں دیکھنے والوں کے جنسی اور نفسیاتی جسمانی Pyschosomatic مسائل جن سے وہ خود بھی واقف نہیں ہوتے کہ وہ اس عادت کی دین ہیں ۔

موجودہ دور کو جو بیسویں صدی کی آخری چوتھائی ہے بلو فلموں کا دور کہلانے کا اتنا ہی حق ہے جتنا سائنس کی بے بہا ترقی کا ۔ جنھوں نے ۶ ، ۷ سال کی عمر سے یہ فلمیں دیکھنا شروع کی تھیں اب وہ جوان ہوکر ان عوارض میں مبتلا ہوچکے ہیں جو کسی نہ کسی طرح سے ان واہیات فلموں کا عطیہ ہیں ۔ ننھے بچے بچیاں زندگی کے ان رموز سے ان کی کریہہ شکل میں واقف ہوتے جارہے ہیں جن کی حسین شکل سے انھیں بلوغت کے دور میں آہستہ آہستہ واقف ہونا چاہیے تھا ۔ نہ کہ یک بارگی اپنی تمام تر تفصیل کے ساتھ ۔ قبل بلوغت دور میں جنس سے آگہی اور بھی مدھم ردم میں ہوتی ہے ۔ بچے اڑتے ہوئے ہوائی جہاز کو دیکھ کر نہ ایروڈائنیمکس Aerodynamics کو سمجھ سکتے ہیں نہ سمجھنا چاہتے ہیں ۔ انھیں ان کے سوال کے جواب میں کہ ہوائی جہاز کیسے اڑتا ہے ؟ اتنا ہی بتانا کافی ہوتا ہے "پٹرول سے" ۔ کچھ اور بڑے ہوجانے پر وہ اس سے زیادہ جاننے کے متمنی ہوتے ہیں ۔ پھر اس سے زیادہ کے بعد تک کہ فزکس کے اصول سمجھنے لگتے ہیں ۔ یہی حال جنسی آگہی کا ہے ۔ جو ایک ہی چھلانگ میں ۵ ، ۶ سال کے بچے کو اس کی معصومیت سے محروم کر کے بڑوں کی بگڑی ہوئی زندگی میں نہیں پہنچا دیتی ۔

اس مضمون میں وہی گفتگو جو میرے اور شخصیت کے مریضوں کے مابین بسا اوقات ہوتی ہے ۔ جو جنسی مسائل پیش کرنے والے افراد سے پیش آتی ہے اور جو نفسیاتی جسمانی مریضوں میں سے اکثر سے کرنی پڑتی ہے ۔ لیکن ایسی گفتگو (سائیکیٹرک انٹرویو) بس دو افراد ہی تک محدود رہتی ہے ۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مریض دوسرے کو کلینک کی راہ بتا تا ہے ۔ یہ بڑا تھکا دینے والا عمل ہے جس سے ایک دن میں زیادہ سے زیادہ تین چار افراد کے اذہان کا اندھیرا کم کیا جاسکتا ہے اور انھیں روشنی پیدا ہونے میں تو ایک مدت لگتا ہے ۔

تو پھر کیا برا تھا اگر میں انھی باتوں کو کاغذ اور قلم کی زبان سے کہنا چاہا تاکہ بات بہ آسانی آبادی کے ایک نسبتاً بڑے حصے تک پہنچے اور ــــ علم ہوکہ برہنہ فلموں کا دیکھنا ایک تفریح ہی نہیں ہے ۔ اس کے ساتھ اس کے اثرات دماغ اور جسم اور ازدواجی زندگی پر بھی ہیں اور برہنہ فلموں کو دیکھنا کوئی تنہا تفریحی عمل نہیں ہے اس کے رفیق اور بھی ہیں ۔ یہ عمل نشان دہی کرتا ہے ایک خلائی بے مقصد زندگی کا اور ان بچوں اور نوجوانوں کا جن کی زندگی میں اور کچھ نہیں ہے ۔ نہ تقریری مقابلے ، نہ اسپورٹس نہ سماجی کاموں میں دل چسپی ، نہ پڑھائی میں ایک دوسرے پر سبقت لےجانے کی زبردست خواہش اور نہ ہی مناسب ادارے اور فضا جہاں مگن ہوں ایک بھرپور ترقی پذیر زندگی کی ۔

ooo

موجودہ معاشرہ اور برہنہ فلمیں :

برہنہ فلموں کا بنانا ، عوام کو دکھانا اور انھیں ان فلموں کو دیکھنے کا شوق پیدا کرنا فحاشی کی ایک قسم ہے ۔

فحاشی Pornography کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے ، جنسی عمل کے اظہار کا ذریعہ واضح اور غیر مہذب بصری یا سماعی طرز سے جمالیات کی بجائے شہوانی جذبات کو تصاویر ، سنگ تراشی یا تحریر میں تحریک دینا ہے ۔ اس میں ہم موجودہ دور میں بلیو ، صوتی فلم کو بھی شامل کر سکتے ہیں کیوں کہ جدید پروڈیوسر یہ تینوں لذتیں بھی اپنی تخلیقات میں فراہم کر سکتے ہیں ۔

برہنہ فلموں کو عرفِ عام میں بلو فلمیں کہا جاتا ہے یعنی نامہذب فلمیں اور ان کے دوسرے نام ہیں گندی فلمیں اور (گندی سندھی) فلمیں یا مووِیز ۔ یہ وہ فلمیں ہیں جو اک خاص مقصد کے لیے بنائی جاتی ہیں ۔

۱۔ ان کے لیے جن کے ذوق پہلے ہی سے برگشتہ ، اخلاق ہیں ۔

۲۔ نئے لوگوں کو اس شوق میں شامل کرنے کے لیے ۔

ان فلموں کے شوق کی متوازی مثال ہیروئن کا کاروبار ہے جو ان کے لیے کیا جاتا ہے جو پہلے سے کسی طرح کا بھی نشہ کرتے ہیں اور ان کے لیے جن میں یہ عادت پیدا کی جاسکتی ہے ۔ یہ دوسری بات برہنہ فلموں اور ہیروئن کے کاروبار میں بڑی اہمیت رکھتی ہے کیوں کہ ایک محدود حلقے تک ان کے رہنے میں اس تجارت کو پھیلایا نہیں جاسکتا ہے ۔ اگر صرف چند افراد ہی ان فلموں کو دیکھتے ہوتے تو technical excellence یعنی اعلیٰ معیار اور اچھے جسم اور چہرے جس فنانس کے متقاضی ہوتے ہیں وہ مہیا نہیں کیا جاسکتا اور نہ یہ کاروبار اتنے بڑے پیمانے پر کیا جاسکتا ہے کہ ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے ۔ چناں چہ یہ فلمیں سب دنیا بھر میں بنتی ہیں اور ہر نسل کے لوگ ان کے بنانے میں شریک ہوتے ہیں ۔ مہلک نشہ آور اشیا کی طرح یہ فلمیں بھی اپنے پھیلنے کے لیے ملکی حدود کو نہیں جانتی ہیں اور ہر جگہ موجود ہیں ۔ ان دیکھے ہاتھ انھیں ضرورت مندوں تک پہنچاتے ہیں اور نئے طلب گار پیدا کرتے ہیں ۔

اس مضمون میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ برہنہ فلمیں پرانے اور نئے ہر دو طرح کے دیکھنے والوں میں جنس کو بہ لحاظ ، غیر فطری پہلو کے دیکھنے کا شوق پیدا کرتی ہیں اور کس طور سے وہ ان کی جنسی زندگی کو مجروح کرتی ہیں ۔

فحاشی خود ابلیس کی طرح انسانی سوسائٹی میں ہمیشہ سے موجود رہی ہے یعنی جہاں تک تاریخ کی نگاہ پہنچی ہے گپھاؤں میں انسانی شکلوں کو پتھروں میں ہر اس طور سے ایک دوسرے سے گڈمڈ تراشا گیا ہے جس کے دیکھنے والوں کا جنسی ہیجان بڑھتا ہے اور یوں کہ محض ایک عورت اور ایک مرد کا جنسی اختلاط محدود جنسی تحریک کا حامل ہوتا ہے اس لیے اس دور میں بھی یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ اگر ایک جنسی عمل میں نیم برہنہ جسموں کو ایک ساتھ مختلف حرکتوں میں شامل کرلیا جائے تو اس سے تخلیق کے جنسی لذت کے امکانات کو بے اندازہ طور سے بڑھایا جا سکتا ہے ۔

یہی صورت گپھاؤں کی پینٹنگس میں بھی دیکھنے میں آتی ہے جو قدرتی ، معدنی ڈنٹھلوں اور پھولوں کے رنگوں سے بنائی جاتی ہیں ۔ بعد میں جب انسان رنگ ، برش اور کینوس پر قادر ہوا تو ایسی چیز پیدا ہونے لگی جسے دیکھنے کے لیے چل کر نہیں جانا پڑتا تھا کہ ہر وہ شخص اسے حاصل کرسکتا تھا جو اس کی قیمت ادا کرسکے ۔

جنس کو اس کی پاکیزگی سے ہٹ کر دیکھنے اور اس پر عمل کرنے کی پوشیدہ جبلت انسان میں ویسی ہی ہے جیسی کہ (بعض چند) جانوروں میں دیکھنے میں آتی ہے جہاں ایک مادہ اور ایک نر کی تمیز کی ختم ہوجاتی ہے مثلاً خرگوش اور کبوتر ہیں ۔ لیکن ان جانوروں میں بھی عمل جنسی ضرورت کو پورا کرنے تک محدود ہوتا ہے ۔ مختلف جنسی تجربات ، فطری اور غیر فطری طریقے ان گنت شکلوں میں اور ہر ممکن طریقے سے ، یہ چیز انسان کی دنیا تک محدود ہے ۔ جانوروں بالخصوص اعلیٰ ارتقا تک پہنچنے والے چوپایوں animals and birds کے پاس اتنا اختراعی دماغ نہیں ہوتا کہ وہ جنسی تجربات یا ایجادات کرسکیں ۔

عیاش دماغوں نے مردانہ صحت کے لیے جسے غلطی سے مردانہ طاقت ، مردمی اور مرمی (سندھی) کہا جاتا ہے کچھ معیار قائم کر رکھے ہیں اور ان کے نزدیک ایک انسانی نر میں یہ اور وہ ہونا چاہیے اور تا عمر ہونا چاہیے جب کہ قدرت کے

[illegible] ہیں۔

[illegible] جنسی [illegible] اور [illegible] ایک ہی زندگی کے [illegible] ہے۔ اور

[illegible] (یعنی مرد اور عورت) اس کنٹریکٹ پر ایک ہی ذہنی اور روحانی دستخط کر دیتے ہیں تو [illegible]
[illegible] ایک جسمانی ضرورت پوری ہو چکے۔ ان کی ایک دوسرے میں جنسی دلچسپی قائم رہتی
[illegible] جسمانی نہیں ہوتی اور وقت کے ساتھ ساتھ اس اور طرح (روحانی۔ جذباتی) شکلیں اختیار کرتی جاتی ہے
[illegible] بھی رہتا ہے۔ یعنی ایک دوسرے کے لیے جینا، تکلیفیں اٹھانا۔

[illegible] زندگی کے احساس کے ساتھ مرد اور عورت میں جنس کی مادی حقیقت کی سمت پیدا ہوتی ہے۔
[illegible] احساس تھا۔ ایک دوسرے کے لیے کام کرنے کی سعی تھا۔ لیکن اس مشترکہ [illegible] کی حالت
[illegible] کو ایک دوسرے سے نزدیک تر لاتی جاتی ہے ورنہ مچھلیوں اور مینڈکوں کی طرح محض نئی زندگی کو
[illegible] بھی اپنی راہ لیا کرتے۔ جوں جوں ہم ارتقا کی سیڑھی پر اوپر چڑھتے جاتے ہیں جنس کا یہ دوہرا عمل زیادہ
[illegible] نظر آتا ہے۔ چڑیوں کا ساتھ جینے والے کے لیے گھونسلہ بنانا۔ ایک دوسرے کی خبرگیری اور بچوں کے لیے گھونسلہ
[illegible] بھی (نر اور مادہ کا قدرت کی پہلی جنسی ضرورت کے پورا ہو جانے کے بعد) ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑنا بچے
[illegible] کی [illegible] کو کسی اختیار سے ظاہر کرتا ہے۔

[illegible] اور عورت میں یہ جنسی کنٹریکٹ پر ذہنی، اخلاقی اور روحانی طور سے دستخط کر چکے ہیں ایک دوسرے میں یہ دلچسپی [illegible]
[illegible] ہوتی ہے کہ وہ جنسی انتقالی ضرورت پوری ہو جانے کے بعد بھی ایک دوسرے کی ضروریات زندگی پوری
[illegible] ہیں جس نے گھر بنا ہے اور جس میں یہ اپنے کو محفوظ محسوس کرتا ہے۔ ماں باپ کی جنسی زندگی سے وہ [illegible]
[illegible] ہے ایک یادوں [illegible] ہیں۔ گھر میں پلا جاتا ہے۔ اسے پلنے کے لیے [illegible] کے نیچے [illegible] ہے اور اگر
[illegible] ہے تو وہ ایسے ہی جنسی تصور کو لیے آتا ہے۔ نہ کہ حیوانی سے، جس میں [illegible] صرف
[illegible] ہے۔ جنس کے اس دوسرے پہلو سے بے بہرہ [illegible] ہوتے ہیں۔ وہ اپنی [illegible] کے
[illegible] اپنے پیچھے چھوڑتے جاتے ہیں اور [illegible] سے محروم ہو گئی۔ جس کے لیے [illegible]
[illegible] ہیں اور [illegible] نہیں ہوتا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بلکہ غیر شادی شدہ بالغ یا بلوغت کو پہنچنے والے نوجوانوں میں بعض حالات میں ایک اور دو طریقہ ، عمل سے زیادہ کارفرما نظر آتا ہے اور کبھی کبھی گروپ کی شکل اختیار کرلیتا ہے ۔

۳ ۔ بڑے شہر اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں نہ ہی اس کے لیے آدمی کا کم عقل یا جاہل ہونا ضروری ہے جیسا کہ پہلے سمجھا جاتا تھا ۔

میں نے نمبر ۲ اور نمبر ۳ اور بعض دوسرے جنسی سیری کے طریقوں کو افریقی جنگی قبائل کی زندگی میں مفقود پایا لیکن اس کی وجوہات ان کے طریقہ ، زندگی سے وابستہ ہیں اور ایک الگ مضمون چاہتے ہیں ۔

۴ ۔ جنسی زندگی کی چوتھی مسخ شدہ شکل وہ ہے جس کا کچھ ذکر مضمون کی تعارفی سطور میں آچکا ہے ۔ ننگی فلموں کو باقاعدہ پروگرام کے تحت پابندی سے دیکھنا ۔

اوپر ہم نے اس پر غور کیا ہے کہ جنسی تعلق ارتقا کے اعلیٰ مدارج پر فائز جانوروں میں نظر آتا ہے ۔ اس کی وہ شکل نچلے درجے کے جان داروں میں نظر نہیں آتی ۔ ارتقا کے اعلیٰ مدارج پر فائز بعض دودھ دینے والے جانور ایسے بھی ہیں کہ اگر اطراف میں انھیں احساس ہو کہ تاک جھانک والی آنکھیں موجود ہیں تو وہ فعل سے احتراز کرتے ہیں اور مہذب انسان میں تو یہ قدر اتنی ارفع ہے کہ مکمل تنہائی کے بغیر یہ اختلاط ناممکن ہوتا ہے اور اس بات کو دہرانا بھی نفسِ مضمون کو زیادہ واضح کردے گا کہ جنسی فعل کا مقصد اگر ممکن ہو تو نئی زندگی کو وجود میں لانا ہے اور اس سے وابستہ افراد کی زندگی میں تا عمر قائم رہنے والی تبدیلی کو لانا بھی جو ایثار ، محبت اور خدمت پر مبنی ہوتی ہے ۔ یہ تبدیلی بہ ذاتِ خود ایک مضبوط در و دیوار کے گھر کی اپنے اور بچوں کے لیے اساس بن جاتی ہے ۔ اس سے زیادہ کی مردانگی کا تصور بگڑے ہوئے دماغوں کی پیداوار ہے جو مخصوص غذاؤں ، دواؤں ، جنس پر اکسانے والی تصاویر تحریر اور شراب (افیون ایک خاص جنسی مقصد کے لیے) کا تا عمر طلب گار رہتا ہے ۔ ضرورت سے زیادہ جنسی صحت پر توجہ یہاں تک کہ وہ زندگی کی دوسری ضرورتوں پر سبقت لے جائے ایک ذہنی بیماری کا پتہ دیتی ہے ۔

انسان کا بگڑا ہوا یہ جنسی ذوق گپھاؤں کی تصاویر اور پتھر پر ابھار کر بنائی ہوئی انسانی اور حیوانی شکلوں میں تو نظر آتا ہی ہے لیکن اس کی ایک عام مثال پبلک بیت الخلا میں جن کی دیواروں پر جو تصاویر پنسل اور لکڑی کے کوئلے کے ٹکڑوں سے بنائی جاتی ہیں ۔ ان میں جسمانی ساخت anatomy کی تفاصیل کو نہایت بے ڈھنگے پن سے عجلت میں کھینچا گیا ہوتا ہے اور بالعموم جو عضو ایسے کندہ ، ناتراش مصوروں کے جنس زدہ ذہن میں سب کے اوپر ہوتا ہے وہ اپنی طوالت اور جسامت میں اس تصویر دیوار کے سر سے ڈیوڑھا ہوتا ہے ۔ پبلک مقامات اور بیت الخلاؤں کا یہ بھونڈا آرٹ ہماری اس اجتماعی تحت الشعوری فکر کا گواہ ہوتا ہے جو جنس کو ہمارے تمام دوسرے افعالِ زندگانی پر فوقیت دیتی ہے ۔ اس بیمار فکری نہج کے نزدیک جس کا شکار میں نے نہایت معقول پڑھے لکھے افراد کو بھی اندرونی طور سے پایا ہے زندگی کی سب سے اہم چیز جنسی فعل اور اس کی کبھی ختم نہ ہونے والی صلاحیت ہے ، بیوی بچوں کی فکر ، بوڑھے ماں باپ کی خدمت ، معاشرے کا سدھار اور اس میں اپنی محنت سے بھرپور شرکت ثانوی حیثیت رکھتے ہیں ۔

جسمانی ساخت کے توازن سے بے پرواہ ان غریب تصاویر کی ایک نہایت قیمتی و آرٹ کلرز میں بنائی ہوئی رسنے دار تصویر کو پوم پی آئی Pompeii میں مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا جو اٹلی کی بندرگاہ نیپلز کے جنوب مشرق میں واقع ہے اور جہاں رومن تہذیب کے کارہائے نمایاں achievements دیواروں پر بنی ہوئی پینٹنگس ، عمارتوں ، رنگ محلوں اور چشمے کے آب رسانی کے پمپوں ، فواروں اور پینے کے پانی کے نلکی کوچوں میں بنائے ہوئے پتھر کے ایستادہ مستطیلوں کو آتش فشاں ویسوویس vesuvius نے

۹ء بعد مسیح میں دفعتاً اپنی راکھ میں دفن کردیا تھا اور جو تہذیب ۱۶۶۹ سال تک باقی دنیا کی نظروں سے اوجھل رہی اور جب کھود کر نکالی گئی تو اس میں زندگی کی ہمہ ہمی کے کتنے ہی سین آتش فشاں کی بکھری ہوئی راکھ میں جامد نظر آئے جیسے کرب کی حالت میں انسانی جسم اور انسان کا ازلی دوست کتا ۔ اپنے گروپ کے ساتھ گھومتے ہوئے دو بھائیوں کے رنگ محل سے نکل کر جس کی دیواریں فرش اور سقف دیدنی ہیں ہم ایک کمرے کے دروازے پر پہنچے جہاں گائیڈ نے عورتوں اور لڑکیوں کو باہر رکنے کے لیے کہا کیوں کہ اندر جو چیز تھی اسے پبلک کو دیکھنے کی اجازت نہیں تھی اور نہ ہی یوم پی آئی کے آرٹ کے رکھوالے اسے برباد کرکے دنیا کو آرٹ کے اس شہ پارے سے محروم کرنا چاہتے تھے ۔ ہماری ساتھی ایک انگریز ۔ تنہا لڑکی جو یقیناً اپنے بائیسویں ، چوبیسویں سال میں حسن کی معراج پر تھی اور جس پر ہمارے اٹالین چھبیلے گائیڈ کی جو خود مردانہ حسن کا مرقع تھا پورے وقت خصوصی توجہ رہی تھی اور جسے وہ اکثر دیدنی اشیا اور جگہوں کو دوسروں سے پہلے یہ کہہ کر دکھاتا تھا کہ " یو فرسٹ " (بروزن فراست) جس پر وہ لجا جاتی تھی اور دوسرے سب جن میں مختلف ملکوں کے مختلف عمروں کے عورت مرد سب ہی شامل تھے اس کے حسن پر اس توجہ ، خاص پر مسکرا کر رہ جاتے تھے کیوں کہ اٹالین مرد میں حسن کا احترام اسے دوسرے ملکوں کے مردوں سے ممیز کرتا ہے ۔

اس کمرے کے دروازے پر روک دیے جانے پر عورتیں جز بز ہوئیں کیوں کہ سوال مردوں کے برابری کا بھی تھا اور تجسس سے کون بری ہوتا ہے ۔ اور جب اوروں کے ساتھ انگریز لڑکی نے بھی اندر ، آنا چاہا تو گائیڈ نے نہایت لجاجت سے کہا ' نوٹ الیون یو signorina سنیورینا " وہ خود بھی باہر رہ گیا ۔

اندر خلافِ توقع دیواریں سپاٹ تھیں اور داخل ہونے کے دروازے سے ملحق دیوار پر ایک بہت بڑا بھورا لکڑی کا چپٹ بکس آویزاں تھا جیسا عمارتوں کے بجلی کے کٹ آوٹس ، مین سوئچز وغیرہ کو چھپانے کے لیے بنایا جاتا ہے ۔ اندر جو فربہ ، ادھیڑ عمر پہرے دار تھا اور اٹالین شراب جس کے گالوں سے چھلکی پڑتی تھی اس نے سب کو خاموش رہنے کے لیے کہا اور بتایا کہ تصویر جسے ہم دیکھنے جارہے تھے کس صدی کی ہے ۔ آرٹسٹ کا نام معلوم نہیں اور اندازاً اس کی قیمت کتنے ہیرے ہے ۔ پھر اس نے وقت حاضر کے حساب سے اس کی قیمت امریکی ڈالر ، برٹش پاؤنڈ اور سوئس فرینک میں بتائی ۔ اپنے کوٹ کے بٹن درست کیے اور تصویر کے پٹ کھول دیا ۔

اٹالین آرٹ بالخصوص اور یورپین آرٹ بالعموم جسمانی ساخت اور اعضا کے تناسب ، وریدوں اور شریانوں کے اظہار میں خواہ وہ انسانوں کا ہو یا جانوروں کا اپنے کمال کو اس دور میں بھی پہنچا ہوا تھا جب کی ،، تصویر تھی ۔ لیکن تصویر میں جس کے رنگ اور خطوط نمایاں تھے ایک بھونڈا پن وہی تھا جو اسے اس کی کم نسب بیت الخلا کی تصویروں کی صف میں رکھتا ہے ۔ ایک ترازو ہے جس کے ایک پلڑے میں سونا ہے اور دوسرا پلڑا جو بوجھ سے جھکا ہوا ہے اس میں نزدیک کھڑے ہوئے برہنہ مرد نے اپنے جسم کا وہ حصہ رکھا ہے جس کا کام قدرت کی طرف سے کچھ اور تھا اور جسے عیاش ذہنوں نے دنیا کی ہر چیز پر فوقیت دے رکھی ہے بیت الخلا کی دیواروں کی تصاویر کی طرح اس اوپل پینٹنگ میں بھی مصور نے جسمانی ساخت کے اظہار سے آزادی برتی تھی کیوں کہ طویل ہونے میں وہ حصہ سر اور شکم دونوں ہی سے سوا تھا ۔ نیچے جو اٹالین میں لکھا تھا اسے سیاحوں کو چوری سے تصویر دکھا کر زائد پیسے کمانے والے پہرے دار نے ہمیں پڑھ کر سنایا اور اپنی رٹے اور ڈال سے میری انگریزی میں کہا " اس میں دکھایا گیا ہے کہ طلا اور مرد کے عضوِ جنس میں سے کون چیز حقیقت میں بھاری ہے ۔"

تصویر بھی وہاں ویسوویس کی راکھ کے ملبے کے تلے آ جانے والے کسی رنگ کی دیوار سے نکلی ہوگی ۔

" تم بھی اسی زمین پر رہے اور بنیادی طور سے اسی انسانی ماحول میں جیسے کہ تم سے پہلے کی نسلیں جنھوں نے تمام اخلاقی قدروں کو زک پہنچائی تھی اور یوں خود اپنی تباہی لائے ۔ اس لیے ان کا درد ناک انجام تمہارے لیے تنبیہہ کا باعث ہونا چاہیے تھا ۔" (قرآنی آیت کا مفہوم)

جنسی اعضا اور فعل کے فطری اور غیر فطری اظہار کی جو روایت گپھاؤں ، عبادت گاہوں اور رنگ شالاؤں کی دیواروں چھتوں اور فرشوں سے لے کر پینٹنگز اور پبلک مقامات میں درختوں اور بیت الخلاؤں جیسی جگہوں پر دیکھنے میں آتی ہے اپنی جگہ پر اس حد تک محدود رہی کہ عام گھر ، دکانیں اور تعلیم گاہیں اس کی لپیٹ میں نہیں آتے تھے ۔ غاروں میں پتھروں پر مرتسم ان تصاویر اور مناظر کو دیکھنے کوئی کوئی ہی اور وہ بھی زندگی میں ایک دوبار ہی جاسکتا تھا اور اس دور کی محدود تعداد میں چھپنے والی کتابوں تک بس چند ہی کی رسائی تھی ۔ چھاپے خانوں کی ترقی کا ایک حاصل یہ ہوا کہ یہ تصویریں اپنی بھدی شکل میں گھر گھر پہنچنے لگیں اور بے حرکت فوٹو گرافی اور پھر متحرک فوٹو گرافی نے اپنی پوری سحر انگریزی کے ساتھ پوری سوسائٹی کے لیے عام کردیا ۔ یہ عمل بیسویں صدی کے شروع میں قدرے سست تھا ، تیسری چوتھائی میں اس نے ایک پھیلی ہوئی صنعت کی جگہ لے لی اور آخری چوتھائی میں اس صنعت نے عوام میں اپنی ضرورت پیدا کرلی ہے ۔ بالکل ویسے ہی جیسے ہیروئن کی کسی سوسائٹی کو ضرورت نہیں ہوتی ہے لیکن ایک بار اگر اس میں اسے جادے دی جائے تو کتنے ہی اس کے ضرورت مند ہوتے جاتے ہیں ۔

جنس صوتی کیسیٹس کی شکل میں بھی بکتی ہے ۔ ٹیلی فون پر بھی اس تک پہنچا جاسکتا ہے کہ جنس طلب ایک نمبر گھماتے اور جنس کو مہمیز کرنے والی آوازیں سنے اس کے لیے اسے اس ٹیلی فون کلب کا ممبر بننا پڑتا ہے ۔ لیکن جو عنودی فلموں کے آنے تک بلیک اینڈ وہائٹ ننگی تصویروں کے کارڈ اور رنگین رسائل عام ہوچکے تھے ۔ مشہور عبادت گاہوں کے دروازوں پر جنسی صوتی کیسیٹس بکنے لگے تھے اور جب یہ چیز اثر پذیر بلکہ اثر کی جو یا دماغوں میں اپنی جگہ پیدا کرچکی تھی اور وہ ایک نشے کے بعد دوسرے قسم کے نشے کے طلب گار کی طرح مزید کے منتظر تھے تو ننگی جنسی موویز کا ہماری زندگی میں سیلاب آگیا ۔ پہلے یہ فلمیں ۸ ، ۱۶ ، اور ۳۶ ملی میٹر کی ریلوں تک محدود تھیں اور انھیں دیکھنے کے لیے پروجیکٹرز اور سنیما ہالوں کا سہارا لینا پڑتا تھا ۔ پروجیکٹرز اور اسکرین کے مالکین پیسے والے ہوتے تھے اور وہ اپنے اوطاقوں ، بیٹھکوں اور گھر کے مردانہ حصوں میں انھیں دیکھتے اور دوستوں کو دکھاتے تھے جن سے کبھی کبھی گھر کے نوکر اور بچے بھی چھپے چوری لطف اندوز ہولیتے تھے ۔ ویڈیو سسٹم نے جہاں کھوئی ہوئی آرٹ فلموں کو دوسری زندگی دی اور مثبت کردار ادا کرنا شروع کیا وہاں اس کی چھپی ہوئی صلاحیت سب سے پہلے ان اداروں پر عیاں ہوئی جو بے مہار جنس کی سوسائٹی میں کبھی ختم نہ ہونے والی مانگ سے آگاہ تھے ۔

یہ فلمیں کتنے ہی سنیما ہولوں میں یعنی بلا شرکت غیرے شوز کی طرح دکھلائی جانے لگیں اور ان شوز کا ٹکٹ عام فلم شو کے ٹکٹ سے زیادہ رکھا گیا ۔

دوسرے سنیما ہاؤزز نے تماش بینوں کی تعداد بڑھانے کے لیے عام فلم کے شو کے درمیان " پورنو " فلموں کے حصے دکھانا شروع کردیے ۔

زیادہ سے زیادہ دیکھنے والوں تک پہنچانے کے لیے چائے خانوں ، ریستورانوں اور ہوٹلوں نے ٹیلی وژن اسکرین پر ویڈیو پلیئر سے یہ فلمیں دکھانی شروع کیں اور ان تک قصبوں اور دیہاتوں تک کے آٹھ آٹھ ، دس دس سال کے لڑکوں کی بھی پہنچ ہوگئی ۔ جو چیز سنیما ہول کے صرف جنس شو میں اس وقت جس قیمت پر دیکھی جاسکتی ہے وہ ان تمام چینی کی نیلی کیتلی کے چائے خانوں اور

آسمان تلے کھری کھانوں کے ہوٹلوں میں اس کے ۵/ قیمت میں دیکھی جاسکتی ہے ۔

ان مووریز کی طلب اتنی بڑھ چکی ہے کہ جنسی نا آسودہ عورتیں اور جوانی کی دہلیز پر کھری لڑکیاں انھیں گھر اور محلے کے بچوں سے اسی طرح (لیکن روزانہ کہیں زیادہ تعداد میں) محلے کی وڈیو کیسٹ کی دکانوں سے منگواتی ہیں جس طرح ایک زمانے میں پرائیوٹ لائبریریوں سے وہی دبانوی قسم کی کتابیں منگوا کر پڑھتی تھیں پر لیکن ان کی تعداد بہت کم ہوتی تھی ۔ ننگی فلموں سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے یہی حشر فیچر فلمیں بھی بپا کرچکی ہیں اور کررہی ہیں ۔ اردو ، ہندی ، انگریزی ، عربی اور صوبائی سب ہی زبانوں کی ۔ اور یہ سین تو عام ہے جس گھر میں بچے وڈیو دیکھ رہے ہوں وہاں اگر ان کے بڑے آجائیں اور کوئی نیم برہنہ یا برہنہ سین شروع ہوجائے (یورپین اور امریکی فلموں میں مع اپنی تمام تفصیل کے) یا پردے پر ہوتو بچے فلم کو فاسٹ فورورڈ یا فریز Freeze کردیتے ہیں یا بڑے جھینپ کر خود ہی وہاں سے اٹھ جاتے ہیں ۔ بڑے چھوٹوں میں اتنا لحاظ بھی کتنے دن کا مہمان ہے دیکھا چاہیے ۔

جن گھرانوں میں آج سے پچاس سال پہلے بچوں کے فلم دیکھنے پر پابندی تھی وہاں کے بچے تھوڑے بڑے ہوتے ہی چھپ کر سنیما ہول پہنچنے لگتے تھے ، بات کھل جانے پر پٹتے تھے ، ان کی سرزنش ہوتی تھی اور ان میں سے اکثر ڈھیٹ بن کر زیادہ پابندی سے فلمیں دیکھنے لگتے تھے ۔ آج جن گھروں میں وڈیو سسٹم یا ڈش پر پابندی ہے وہاں کے بچے دوسرے " آزاد " گھرانوں میں اپنی یہ لت پوری کرتے ہیں ۔ میرے علم میں مریض لڑکیوں کے انٹرویوز پر مشتمل یہ انکشافات شامل ہیں کہ اس قسم کی دعوتیں اعلیٰ عہدوں پر فائز افسروں ، تاجروں ، جاگیرداروں ، بڑے زمین داروں اور سیاسی کرداروں کے گھر میں دی جاتی ہیں جن میں وہ لڑکیاں بھی اکثر شامل ہوتی ہیں جن کے گھر نہ ڈش ہیں (کیبل) نہ وڈیو سسٹم ۔ چھوٹے گھروں میں ایسی دعوتیں ناممکن ہیں ۔ اعلیٰ تعلیم کے لڑکیوں کے ہوسٹلوں میں بھی یہ وقت گزاری کا عمل رات رات بھر اور دوپہر میں جاری رہتا ہے جن میں ہوسٹل کا نگران اور خاص تعلیم دینے والیاں بھی شریک ہوسکتی ہیں ۔

ایسے تجربے سے پہلی بار گزرنے والی لڑکی یعنی وہ جسے گھر دعوت کے لیے بلایا گیا ہو اور جسے اچانک اپنی ہم عمروں میں ایسے نظارے کا سامنا کرنا پڑجائے اکثر شدید ذہنی پریشانی کا شکار ہوجاتی ہے ۔ اسے گناہ کا سانپ ڈسنے لگتا ہے کہ میں وہاں گئی ہی کیوں تھی ، وہاں سے اٹھ کیوں نہیں گئی ۔ کیوں ڈٹی بیٹھی رہی کہ اٹھ کھری ہونے پر پاس والیاں ہنسیں گی کہ بڑی پارسا بنتی ہے اور جب وہ برہنہ جسم اور ان کی حرکات اس کے دماغ سے نہیں مٹتے ہیں بلکہ ہٹانے کی کوشش میں اور بڑھتے جاتے ہیں تو وہ کبھی ختم نہ ہونے والی دعاؤں کا سہارا لیتی ہے ، نیند کھو بیٹھتی ہے اور کبھی کبھی عارضی طور سے ذہنی توازن بھی ۔ یہ اس کا پہلا بصری جنسی تجربہ ہوتا ہے اور یوں فطرت سے وہ غیر فطری طریقے سے روشناس ہوتی ہے ۔

لڑکوں اور مردوں کے ہوسٹلوں میں (خصوصاً جو سیاسی پارٹیوں کی لپیٹ میں ہوں) یہ دن رات کے شو ٹیلی وژن اسکرین تک ہی محدود نہیں رہتے ان کے ساتھ دوسری رنگ رلیوں کا انتظام بھی کیا جاتا ہے ۔ یوں بھی زیادہ کم عمری سے سنیما ہولوں چلنے خانوں ، بیت الخلاؤں اور سوکھی ندیوں پر بنے ہوئے پلوں ، کے ستونوں پر بنے ہوئے آرٹ کے نمونوں کو دیکھنے کے عادی ہونے کی وجہ سے ان کو پہلی بار وڈیو پر مکمل برہنہ فلم دیکھنے سے وہ ذہنی جھٹکا نہیں لگتا ہے جو لڑکیوں میں دیکھنے میں آتا ہے آرٹ کی یہ قسم زنانہ بیت الخلاؤں میں کم ہی دیکھنے میں آتی ہے ۔

جن گھروں میں وڈیو سسٹم نہیں ہے یا اگر ہے تو منتخب فلموں کی ذاتی لائبریری نہیں ہے اور گھر کے بڑے ایسے نہیں

ہیں کہ بچے ان کے جلال سے تھر تھر کانپیں وہاں بچے کبھی کبھی اس وقت کی کوئی مشہور انگریزی ، بھارتی یا مقامی زبان کی فلم کو وڈیو شو سے منگا کر دیکھنے کی فرمائش کرتے ہوئے اپنے بڑوں کو مکمل معصومیت سے یقین دلاتے ہوئے کہتے ہیں " بالکل صاف فلم ہے ، آپ بھی دیکھ سکتے ہیں " یہ ہے جو ان کے ماحول کی فضا میں رچا ہوا ہے ۔

ان فلموں کا جہاں بڑوں کی جنسی اور تمام ذہنی زندگی پر اثر ہوا ہے بچوں اور نوجوانی میں داخل ہونے والوں پر یہ اثر بھی واضح ہے کہ وہ ان کی قبل از وقت نشوونما precocious development کا باعث ہیں ۔ ایک ۷ ، ۸ سال کا لڑکا (لڑکی) ان جنسی تفاصیل سے انا فانا بغیر تدریجی بلوغیت اور آگہی کو پہنچنے کے واقف ہوجاتا ہے جو گھریلو اور ماحول کی معصوم سچائیوں کی عمارت کو ڈھا دیتی ہے ۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے اس کے کردار تصور میں اس کے ماں ، باپ ، عزیز ، رشتے دار سب ہی بن جاتے ہیں اور وہ اپنی عمر کے دوسرے تقاضوں ، دوسری دل چسپیوں کو بھلا کر عملی جنسی زندگی کا آغاز کرسکتا ہے ۔

یہ سب پہلے بھی تھا لیکن اس کے محرکات نہایت محدود تھے ۔ بچوں کا ذہن نسبتاً ایک بڑی عمر تک زندگی کے دوسرے challenges (للکار) کا مقابلہ کرنے کے لیے آزاد رہتا تھا ۔ جنسی زندگی اپنی فطری شکل میں آہستہ آہستہ اس پر تعلیم اور کائنات سے آگاہی کے ساتھ ساتھ کھلتی جاتی تھی ، نہ کم نہ زیادہ ، اور وقت آنے پر اس کا جنس کے بارے میں ایک صحت مند نظریہ ہوتا تھا ۔ ہوسناکی کا نہیں ۔

۱۹۷۳ ء سے (اب ۱۹۹۶ ء تک) میں نے اپنی سائیکیٹرک پریکٹیس میں شروع ہی سے توقع کے مطابق ، مریضوں کی ایک خاصی بڑی تعداد کو اس کا منتظر پایا کہ ان کے جنسی مسائل پر بات کی جائے ۔ ان میں سے بعض اپنی مشکل کا اظہار صاف الفاظ میں کرتے ہیں (بعض بازاری زبان میں) زیادہ تر چھپے الفاظ میں ۔ عورتوں اور لڑکیوں کے ان مسائل کو بیان کرنے کی اپنی زبان ہوتی ہے ۔ ہر سائیکیٹرسٹ اپنے مریض سے انٹرویو کو اپنے دور اور ماحول کے مطابق شعوری یا غیر شعوری طور سے ڈھالتا جاتا ہے ۔ جو سوالات نیویارک یا لندن میں کیے جاسکتے ہیں بہ آسانی کراچی یا دلی میں نہیں کیے جاسکتے ۔ نہ ہی شکاگو یا برمنگھم کا مریض جو پہلے ہی انٹرویو میں کہہ ڈالتا ہے وہ لاڑکانے یا سوات کا مریض دوسرے انٹرویو تک میں کہہ پاتا ہے ۔

شروع شروع میں ، میں ضرورت کے مطابق اپنے وقت پر جنسی مسائل کے بوجھ کی وجہ سے میں مردوں اور لڑکوں سے ان کے صرف مخالف جنس سے تجربات کے بارے میں معلومات حاصل کرتا تھا جن میں سے ان کی مشکلات سر نکالے باہر جھانک رہی ہوتی تھیں ۔ درونِ ازدواج یا بیرونِ ازدواج دونوں ہی مشکلات کا بہ حیثیت معالج مجھے سامنا کرنا پڑتا تھا ۔ بیرونِ ازدواج جنسی مشکلات کا رونا رونے والوں کی روحوں کو میں نے بہت ہی کم گھائل پایا ۔ یعنی وہ اپنے طور طریقے بدلنے کے بارے میں غور نہیں کررہے تھے ۔ بہت جلد ایک دوسری متوقع جہت کے مریضوں نے مجھے اپنی مشکلات سے آگاہ کرنا شروع کیا ، جنھیں خوش فہم مشرق کی روحانیت کے حامی صرف مغرب تک ہی محدود سمجھتے ہیں یعنی دو ، ایک ہی جنس والوں کے مابین جنسی مشکلات اور ناکامیاں اور ساتھ کھو بیٹھنے پر اداسی ۔ عورتیں اس کی بہت کم شکار نظر آئیں ۔ یہ مضمون ایسے مریضوں سے کلیتہً متعلق نہیں ہے اور اس بات کو میں یہیں ختم کرنا چاہتا ہوں ۔

پھر معاشرے میں پائی جانے والی جنسی تیسری خرابی آہستہ آہستہ کھل کر میرے سامنے آنے لگی یعنی وہ چیز جس کا ذکر پرانی جورس پروڈنس کی کتابوں میں بہ طورِ عجوبے کے قابلِ تعزیر یا قابلِ سزا واقعات کے آتا تھا اور جنس اور نفسیات کی کتابوں میں بھی ۔ میرا اشارہ اس جنسی فعل کی طرف ہے جس کا ذکر ادب کا نوبل انعام پانے والے مصنف گیبرئیل گارسیا مارکیز کے ناول

" تنہائی کے سو سال " میں یوں آیا ہے ۔ ایک لڑکے نے جو دیکھا ہے اس پر وہ متعجب ہے اور پادری اس کی بات سن کر سرسری طور سے کہتا ہے " ہاں کچھ لوگ اپنا کاروبار مادہ خر سے بھی رکھتے ہیں ۔"

پہلے اس عمل کو صرف کم عقل چرواہوں تک محدود سمجھا جاتا تھا اور میں بھی یہی سمجھتا تھا لیکن بعد میں اس سے متعلق سوالات جہاں ضروری ہوں میرے انٹرویو کا حصہ بن گئے اور میں نے اس جنسی طریق کار کا راہ رو گاؤں ، قصبوں اور چھوٹے بڑے شہروں کے پڑھے ، بے پڑھے افراد کو کبھی کبھی پایا اور ان میں سے وہ بھی تھے جو شادی شدہ ہیں ۔ مادہ خر اس کی سب سے زیادہ شکار ہوتی ہے جو شروع کے جنسی تجربہ کرنے والوں میں اکثر انسانی ضبق مادہ کی طرح اجتماعی جبر یعنی گینگ ریپ کی شکل میں قابو میں لائی جاتی ہے ۔ مادہ سگ دوسرے نمبر پر آتی ہے ۔ نمبر ایک اور نمبر دو کی طرح اس عمل کے مرتکب مردوں کے ضمیر کو بھی میں نے کبھی کلبلاتے نہیں پایا (سوائے کوالا لمپور میں ایک میلے Malay نوجوان کے ، کیوں کہ وہاں یہ شغل بہت کم ہے) ۔ ایک چیز تھی جو ہوگئی یا ہوجاتی ہے ۔ پچھتاوے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ تجربہ کار ہوجانے پر بڑی عمر والے تن تنہا یہ کام کر گزرتے ہیں ۔

پرانی داستانوں اور مثنویوں میں جو پڑھنے میں آتا ہے یہ عمل عورتوں میں میرے سننے میں بہت کم آیا ، لیکن اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ میرے انٹرویو کو اس سوال کی بالعموم ضرورت نہیں ہوتی ہے ۔ مردوں میں فی الفور اخراج کی ذمے داری اس فعل پر بھی آتی ہے ۔ بلو فلموں میں عورتوں کو بھی اس بےراہ روی میں شریک دکھایا جاتا ہے ۔ یہ تمام تفاصیل انٹرویوز پر مبنی ہیں ۔

لیکن جنسی زندگی سے متعلق جو چوتھی حقیقت پہلے کبھی کبھی پھر تواتر سے میرے سامنے آنے لگی وہ تھی برہنہ فلموں کا لوگوں کی ذہنی اور جنسی زندگی پر اثر ۔ ان میں سے اکثر نے بلو فلموں کو دیکھتے ہوئے آنکھیں کھولی ہیں ۔ بہت سرعت سے جنسی زندگی کے حقائق سے وقت سے پہلے آگاہ ہوتے گئے ۔ اکثر میں اس شوق کی جڑیں اتنی مضبوط ہوتی ہیں جتنی ہیروئن کی عادت جسے ترک کرنے کے بعد اس کا عادی بار بار اس قعر میں گرتا رہتا ہے ۔ ایک طرح کا compulsion جسے پاکستانی تناظر میں پیروں اور کپڑوں پر چھینٹے پڑ جانے کا وہم جس کی شکار عمد کرتی ہے اب کپڑے اور پیر نہیں دھوؤں گی لیکن خیالات سے تھوڑی دیر جنگ کرنے کے بعد پھر نل کی ٹونٹی ، صابن ، پیروں اور پائنچوں کو دھونے بیٹھ جاتی ہے ۔

برہنہ فلموں کو دیکھنے کے کمپلشن کے شکار مریض اکثر نہیں جانتے کہ ان کی جنسی ناکافیت inadequacy کی تخلیق اور اس کی برقراری میں ان فلموں کا کتنا دخل ہے اور یہ چیز صرف عمیق انٹرویوز ہی سے کھل کر سامنے آتی ہے جس کے لیے سائیکیٹرسٹ کو وقت صرف کرنا پڑتا ہے کہ جس میں جنسی ناکافیت کے ارتقا کو وہ مریض کے تعاون سے ، پرسکون گفتگو کی ٹھک ٹھک سے جو آثارِ قدیمہ کو کھود کر نکالنے والے نازک آلات کی طرح کام کرتی ہے دریافت کر پاتا ہے ۔ کھود کر نکالنے والا اوزار خواہ لوہے اور لکڑی کا ہو خواہ عدالت میں کیے جانے والے بہ راہِ راست اوکھڑ سوالات کا ذہن اور زمین میں پوشیدہ آثار کو تباہ کرسکتے ہیں ۔

ننگی فلموں کو دیکھنے کی پختہ عادت اکثر دوسری ناپسندیدہ عادات کی ہم سفر ہوتی ہے ۔ اس کے مریض (باقاعدہ انٹرویوز پر مبنی نتائج کے پیشِ نظر) یا تو نشہ آور اشیا کے تجربات بھی ساتھ ساتھ کر رہے ہوتے ہیں یا ان کے عادی ہوتے ہیں ۔ لیکن جو چیز زیادہ دیکھنے میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ پابندی سے نیلی ، بلو ، ننگی یا انگھاڑی فلمیں دیکھنا دوسری جنسی کج راہیوں aberrations میں سے ایک ہوتی ہے اور اس کے شکار اگر وہ نہیں ہوتے جنھوں نے ان فلموں کو دن رات دیکھ کر خود کو جنسی طور سے ناکافی بنایا ہے تو وہ ہوتے ہیں جو کسی بھی وجہ سے پہلے ہی سے جنسی طور سے ناکافی ہیں ۔ موخر الذکر کے پاس لذت کی آسودگی کا یہ فلمیں ایک بڑا ذریعہ ہوتی ہیں جس طرح بعض ازکار رفتہ لوگ اس عمل کا اپنے سامنے انعقاد کراتے تھے یا کراتے ہیں ۔

سائیکٹرک انٹرویوز سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ برہنہ فلموں کو دیکھنے کی عادت ان طلبہ میں زیادہ ہے جن کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے ۔ نہ پڑھنے والے ، نقل کر کے پاس ہونے والے ، سیاسی تنظیموں سے وابستہ نوجوان اور وہ جنھیں ان کے دانش وروں نے مذہب اور اس سے متعلق اخلاق کی جھنجھٹوں سے آزاد کردیا ہے ۔ زیادہ تعداد میں اس عادت کا شکار نظر آتے ہیں ۔ یہ نوجوان خود کو سماجی تقاضوں سے آزاد کرنے والے سب ہی تجربے کرچکے ہوتے ہیں اور بالعموم دو باتوں کا رونا روتے آتے ہیں احساسِ محرومی (مجھے محبت نہیں ملی) اور احساسِ کم تری ۔ خود دوسروں کے لیے انھوں نے کیا کیا ہے ، دوسروں کو کتنی محبت دی اس سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا ۔ یہ کبھی مطمئن نہ ہونے والی محرومی کیوں کہ غیر حقیقی ہوتی ہے اس لیے آسودگی کے لیے غیر حقیقی ذرائع بھی ڈھونڈتی ہے ۔ ان میں نشہ آور اشیا کا استعمال ، جوا ، جنسی بے راہ رویاں ، دوسروں پر جبر اور ظلم ، موٹر سائیکلوں اور کاروں کو برق رفتاری سے دوڑانا ، جرائم میں شمولیت کا لطف اور بلو فلموں کی تفریح سب ہی شامل ہیں ۔

کہا جاتا ہے کہ کوکین انسان کو ایک ہی سانس میں ذہنی آزادی کے آسمان پر پہنچادیتی ہے لیکن وہ زیادہ دیر وہاں رہ نہیں سکتا ، اس کے لیے اسے ہیروئن کی ضرورت ہوتی ہے ۔ میرے طالبِ علمی کے دور میں سرجری کے وارڈ کی درمیانی میز پر دوسرے ضروری انجکشنوں کی طرح پیتھے ڈین ، مورفین اور جہاں کینسر کے قریب الرگ مریض ہوں وہاں ہیروئن کے امپیول AMPOULE بھی ایک تھالی میں رکھے ہوتے تھے ، اور رکھے رہتے تھے ۔ انیس سو کی چھٹی اور ساتویں دہائی میں یہ دوائیں ہسپتالوں سے عنقا ہوئیں اور ہیروئن کا برہنہ فلموں کی طرح سوسائٹی میں جشنِ نو ہوا اور پرانے کوالی فائیڈ سائیکٹرسٹوں میں سے اکثر نے اپنی پیشہ وارانہ زندگی میں پہلی بار نئے طالبِ علموں کی طرح ہیروئن کے عادی مریضوں کو دیکھنا شروع کیا ۔ ہم میں سے اکثر نے تا حال کوکین کے مریضوں کو نہیں دیکھا ہے الا ان کو جو امریکہ سے ذہنی توازن کھو بیٹھنے کی وجہ سے یہاں آندھی پانی کی رفتار سے لائے جاتے ہیں یوں کہ ان کا وہاں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا ہے ۔ لیکن کوکین کے یہاں آنے میں بھی کیا دیر لگے گی ۔ سوسائٹی میں سب کچھ ہی تو ہے منت کا پیسہ ، اخلاق سے بے زاری ۔ " اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے " ۔

جو وابستگی نوجوانوں اور طلبہ کو برہنہ فلموں سے ہے وہی زندگی کے اوپر کے ڈانڈوں پر بیٹھے ہوئے مالی اور دبدبے کے حساب بڑے بڑوں کو بھی ہے ۔ ان کی زندگیاں بھی اتنی ہی بے مقصد ہیں اور انھیں نہیں معلوم ان کے بچے کیا کر رہے ہیں ، ان کے صحرا جیسے لق و دق مکانوں کے کن کمروں میں کونسی فلمیں دیکھی جارہی ہیں ، کیا پھونکا جارہا ہے ، کیا پیا جارہا ہے ۔ ایسے گھرانوں میں بڑوں کا تعلق بچوں سے بس اتنا رہ گیا ہے کہ وہ انھیں امتحانوں میں پاس کرادیں ، حقیقت میں پڑھنے والوں پر سبقت کی پوزیشن دلوادیں اور جب یہ بھی ہوجائے تو ان کی پسند کا عہدہ دلوادیں ۔ ایسے پیسے والے اور بارسوخ افراد اعلیٰ تعلیم کے وظیفے جو مستحق طلبہ کو ملنے چاہئیں اپنے نقل کر کے پاس کرنے والی اولاد کے لیے وقف سمجھتے ہیں اور اولاد سمجھتی ہے عیش اس کے لیے بنا ہے ۔

بہ ظاہر برہنہ فلموں کے سوسائٹی اور فرد پر اثرات کے ساتھ ہیروئن ، شراب اور دوسری نشہ آور اشیا کا ذکر بے محل لگتا ہے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ زندگی بسر کرنے کی یہ تمام بے ڈھنگی چالیں آپس میں مربوط ہیں ۔ ایک خاص طرح کے ماحول ہی میں یہ خرابیاں پیدا ہوتی اور پھلتی پھولتی ہیں ۔ دنیا میں نوآمدہ بچی کو زندہ زمین میں گاڑ دینا ہی ایک جاہلیت کے دور کے عربوں میں برائی نہیں تھی ، اس کے ساتھ دوسری کتنی ہی برائیاں تھیں ۔ اور ان تمام برائیوں کو ذہن میں رکھے بغیر اس دور کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے نہیں آسکتی ۔

جہاں نوجوانوں کی زندگی میں نشہ آور اشیا داخل نہیں ہوئی ہیں انھیں عمر کے حساب سے بچپن ، لڑکپن اور نوجوانی میں مختلف

ذمے دار جنسی تعلیم دی گئی ہے اور جنس کے متعلق ان کے سوالوں کو جو ارد گرد کی دنیا کے مشاہدے سے ہر بچے اور لڑکے ، لڑکی کے دماغ میں پیدا ہوتے ہیں ایک ڈانٹ سے ان کے ذہنوں میں دفنا نہیں دیا جاتا ہے ، جہاں ان کے داغوں میں زندگی کا کوئی صحت مند نظریہ ہے جس کی اساس ہمیشہ مقصدیت پر اور دوسرے کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر فوقیت دینے پر ہوتی ہے ، جن کے ذہنوں میں اخلاقی قدروں کی اتنی ہی اہمیت ہوتی ہے جتنی صاف ہوا میں سانس لینے کی ۔ ۔ ۔ ایسے افراد یا تو اخلاقی بے راہ روی کی طرف جاتے ہی نہیں ہیں یا اگر اتفاقاً دانستہ یا نادانستہ طور سے ایک بار وہاں پہنچ جائیں تو واپس اپنی ڈگر پر آجاتے ہیں ۔ ایسے افراد ایک بار برہنہ فلم دیکھ بیٹھنے کے بعد دوبارہ اس کو دیکھنے کے آرزو مند نہیں رہتے ہیں بلکہ پہلا تجربہ اکثر دھوکے سے دیئے جانے والے بھنگ کے پہلے گلاس کی طرح بڑا شوکنگ ہوتا ہے جو پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیتا ہے ۔

اور اس کے برعکس بھی درست ہے ۔ جہاں زندگی کا کوئی مقصد ہی نہ ہو ، زندگی جدوجہد اور اخلاقی قدروں سے عاری ہو ، نشوں سے آلودہ ہو وہاں پر نیا جنسی تجربہ ، نئے نشے کی طرح ، اپنی ضرورت پیدا کرلیتا ہے ۔ جس شخص نے سدا اعلیٰ درجے کی شراب پی ہو اسے اگر ایک بار دیسی ٹھرا (کوطی وھسکی) پینے کو مل جائے تو وہ کبھی کبھی اسے بھی پھر سے چکھنا چاہتا ہے کیوں کہ اس کا نشہ ایک نئی ہی طرح کا ہوتا ہے ۔ پھر جب کچی سستی شراب کا نشہ اتر جاتا ہے تو وہ ہربار یہی کہتا ہے کہ موخرالذکر نہایت گھٹیا نشہ ہے ۔

بلو یا ننگی فلمیں دیکھنا بھی ایک قسم کا نشہ ہے ۔ ان کے دیکھنے والے ہر عمر کے فرد ہیں ۔ ۸ سال کے بچے بھی اور ۶۰ سال کے بوڑھے بھی ۔ لڑکیاں بھی اور لڑکے بھی ۔ لیکن ہمارے ملکوں میں لڑکیاں نسبتاً کم اور لڑکے زیادہ ۔ اور ۱۵ سے ۴۵ سال کی عمر والے زیادہ اس عادت کے شکار نظر آتے ہیں ۔ ان میں شادی شدہ بھی ہیں اور غیر شادی شدہ بھی ۔ شادی شدہ میں وہ بھی ہوتے ہیں جن کی قوتِ تولید اپنے نصف النہار پر ہوتی ہے اور وہ بھی جو خود بھی ازکار رفتہ ہیں اور ان کی بیویوں کی عمر بھی تولید کی منزل سے گزر چکی ہے یعنی وہ ۵۰ ، ۵۵ کی عمر میں خشک ہوچکی ہیں ۔ موجودہ دور کی بیش تر انگریزی اور اکثر ہندی فیچر یا مقامی زبانوں کی فیچر فلموں کے بعض سیکوئینسیس sequences کو بھی اگر ننگی فلموں کی صف میں رکھ دیا جائے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سوسائٹی کا کتنا بڑا حصہ بیسویں صدی کے اس فن کے غلط استعمال سے متاثر ہورہا ہے ۔ ظاہر ہے جن فیچر فلموں میں وہ آرٹ کے حساب سے خواہ کتنی ہی بلند پایہ ہوں ، عریاں اور برہنہ جسم ہوں گے اور ان کی واضح حرکتیں وہ اتنی ہی آبادی کے اس حلقے میں مقبول ہوں گی جو اوئل جوانی سے ہے اور جو یقیناً اپنی جنسی زندگی کو اپنی مناظر کے مطابق ڈھالے گا ۔ اور یہاں وہ نہایت اہم نکتہ ہے کہ یہ طبقہ جو جنسی زندگی کا آغاز کرنے جارہا ہے یا کرچکا ہے اپنی ازدواجی زندگی میں کس طرح کی تسکین کا جویا ہوگا ۔

○●○

شہریار

ایک نظم

○

صحرا کی حدوں میں داخل
جو لوگ نہیں ہو پائے
شہروں کی بہت سی یادیں
ہم راہ لیے آئے تھے

○●○

پہلی شرط

○

ہر ایک شخص اپنے حصے کا عذاب خود سے
کوئی نہ اس کا ساتھ دے
زمیں پہ زندہ رہنے کی یہ ایک پہلی شرط ہے

○●○

مصحف اقبال توصیفی

تیری آنکھیں

○

افق پر تیری دو آنکھیں
پانیوں اور خشکی پر جھکی ہوئی ہیں
تیرے آنسو
سمندر میں جزیروں کے مانند تیر رہے ہیں
پہاڑوں اور میدانوں میں
گرم چشموں، نالوں اور دریاؤں کی صورت بہہ رہے ہیں
میری انگلی کے خم پر
گلیشیر کی طرح تھم گئے ہیں
وصل کے ایک لمحے نے
تیرے سرخ بالوں کی ڈھیر ساری شفق
میری عمر کے ڈوبتے سورج کا سونا
سب دھرتی پر لٹا دیا ہے

○

رات کے سینے میں
دودھ کی نہر بہہ رہی ہے
رات کی پلکوں پر
ایک ننھے سورج کا دیا جل اٹھا ہے
شاید یہ وہی لمحہ ہے
وہی آنسو
جو تیری آنکھوں سے
دھرتی کی گود میں ٹپکا تھا

○●○

شاہین

ہم اپنا جسم واپس مانگتے ہیں

(بیجنگ ۱۹۹۵ ، اقوام متحدہ کے زیرِ اہتمام منعقدہ خواتین کی چوتھی عالمی کانفرنس کے موقع پر)

تمہارا جسم
بے اندازہ قوت
اور تمہاری ذات کے عرفان
اور تنظیمِ روحانی کا مظہر ہے
ہمارے جسم پر
تحریر ہیں وہ داستانیں
جن میں بے شرمی ہے ، شہوت کے نظارے ہیں
خط و جسم کے پردے میں
ترغیبِ گنہ کے بولتے واضح اشارے ہیں
تمہارا جسم مائیکل انجلو کے
دستِ قدرت کا تراشیدہ بتِ داؤد ہے
تکمیلِ فن کا اک مجسم استعارہ ہے
ہمارے جسم پر
بلدونگ* کے اوجِ ہنر کی چیرہ دستی ہے
ہمارے جسم سے چپکی ہوئی ہے
حضرتِ آدم کو جنت سے نکلوانے کی رسوائی
ہماری روپ ریکھا جیسے زینت ہو کسی نیلام گھر کی
اور ہمارا جسم سارا پارہ پارہ ہے
ہماری روح تک اب مسخ اتنی ہو چکی ہے
اس طرح لگتا ہے جیسے
آئینوں سے محض چھوٹا سا کوئی رشتہ ہمارا ہے

ہمارا جسم اب تک تھا
تمہاری ملکیت ، لیکن
تم اس پر اپنی شریانوں کے بل بوتے پہ قابض تھے
جو
اب ممکن نہیں ہوگا
ہمیں اپنے تحفظ کا سہارا بخشنے والو
ہم اپنا جسم واپس مانگتے ہیں

---

* Hans Baldung سولہویں صدی کا ایک مشہور مصور

شاہین

پیلا تاج محل

رات کی سرشاریوں کے بوجھ سے
لڑکھڑاتے ہیں قدم وحشی ہوا کے
سب دنوں کی طرح
سورج آج بھی اترا زمیں پر
چہچہاتے ہیں درختوں میں پرندے
گھاس کی نم پتیوں پر ناچتی ہے
جاودانی سی دھنک صبحِ ازل کی
(میرے دل !
اک بھلی سی بات بن جاتی ہے اب بھی
آج کے ہاتھوں میں ہے زنجیر کل کی)
لوگ نکلے ہیں گھروں سے
ال کر
اپنی اپنی نیتوں پر لفظ کے رنگین جال
ائقہ تھا جن کے ہونٹوں پر لہو اور گوشت کا
وہ سب کے سب
پنے جسموں پر سجا لیتے ہیں پھر
یتون کی شاخوں کی ڈھال
اج محلوں میں لگے
رمر کا اجلا رنگ پیلا ہو گیا
ظر سب کچھ دیکھتی ہے
ظر سب پہچانتی ہے !

○●○

دعا

ربِ بود و نبود و نادیدہ
تجھ سے کچھ بھی نہیں ہے پوشیدہ
اس لئے کہ ہے بےنظیر تیری ذات
اک کرم کی نگاہ ہم پر ڈال
ہم کہ ہیں دل فگار و خستہ حال
سر ہمارا پھرے نہ غفلت میں
دل نہ ہو بےمزہ مصیبت میں
ہو کمالِ ہنر میں اپنا نام
نام سے ہم رکھیں نہ لیکن کام
خامشی جہل کی دلیل نہ ہو
بات بے وجہ بھی طویل نہ ہو
ہو گھڑی فتح یا ہزیمت کی
دے چمک آنکھ میں بصیرت کی
گر ہو ثابت غلط ہمارا طریق
دے بدل جانے کی ہمیں توفیق
مفلسی سے ہزار وحشت ہو
مفلسوں سے ہمیں محبت ہو
زیر دستوں کی ہم نوائی کریں
ظلم سے طاقت آزمائی کریں
سازشِ رنگ و نسل پہچانیں
ہر کہ و مہ کو محترم جانیں
اپنی تاریخ مستند کردیں
جو روایت غلط ہو رد کریں

○●○

جمشید مسرور

شہر پہ پھر وہ شبِ درد ۔۔۔

شہر ہے چار طرف یا کوئی ویرانہ ہے
اب مرے ساتھ نہ ساتھی ہے نہ راہی کوئی
راستے ماندہ و بیزار نظر آتے ہیں
جس طرح شہر پہ آجائے تباہی کوئی

لالہ ، لب ، گل ، دامن ، مری خوشیوں کی طرح
مجھ سے جس وقت بدل جاتے ہیں اپنی راہیں
سونپ جاتے ہیں گزرتے ہوئے لمحات مجھے
اپنے ٹوٹے ہوئے دل ، اپنی شکستہ باہیں
ایسے ویران ہیں جیسے کوئی اندھی مسجد
راستے ہیں کہ گئے وقت کی ٹھنڈی آہیں
جانے کس لمحہ ، برباد کی پروردہ ہیں
اے خموشی تری ویران اقامت گاہیں
رکھ ہی لوں سینۂ بے تاب پہ اب جبر کی سل
دیکھتی ہیں مرے قدموں کو وہ دشمن راہیں

جن پہ چلتے ہوئے چپ چاپ پہنچ جاتا ہوں
ایک خاموش سے کونے پہ جدا ہے سب سے
یوں ہی ویراں ، یوں ہی چپ چاپ کھڑا ہے کب سے
وہ مکاں جس میں مری رات بسر ہوتی ہے

نگہیِ فکر ، سلگتے ہوئے آنسو لائی
شہر پہ پھر وہ شبِ درد اتر ہی آئی
اے دلِ زار وہی موت وہی تنہائی

○●○

عزیز الرحمن

مضطرب

را جی چاہتا ہے توڑ دوں ہر ڈور بندش کی
تاروں قطب پر رکھا ہوا
یمان کا پتھر
ٹھا کر پھینک دوں اس جسم سے لپٹی ہوئی
ہچان کی چادر
سی انجان دنیا کی طرف بھاگوں
ں کوچوں میں گھوموں
روں اٹھوں
اؤں جست دوڑوں
پلٹ کر کچھ نہ دیکھوں
پر افق کی نیلی وادی میں
سمٹ جاؤں

○●○

ضرورت

کل کئی روز کے بعد
جب میں نے
اک غیر کے ساتھ دیکھا اسے
درد کی ٹیس سینے میں بھڑکی
نہ خفگی کا شعلہ
نظر میں اٹھا
میں تو اس کے لیے صرف اک جیب تھا
اور وہ میرے لیے جسم تھی ۔
درمیاں کوئی معصوم جذبہ نہ تھا
ساتھ جینے کا مرنے کا وعدہ نہ تھا
میرا اور اس کا رشتہ ضرورت کا تھا

○●○

شہریار

○

تجھ کو کھو کر کیوں یہ لگتا ہے کہ کچھ کھویا نہیں
خواب میں آئے گا تو اس واسطے سویا نہیں

آپ بیتی پر جہاں ہنسنا تھا جی بھر کے ہنسا
ہاں جہاں رونا ضروری تھا وہاں رویا نہیں

موسموں نے پچھلی فصلوں کی نگہبانی نہ کی
اس لیے اب کے زمینِ دل میں کچھ بویا نہیں

وقت کے ہاتھوں نے جتنے داغ تھے سب دھو دیے
داغ جو تجھ سے ملا تھا اک اسے دھویا نہیں

کیسی محفل ہے یہاں میں کس طرح سے آ گیا
سب کے سب خاموش بیٹھے ہیں کوئی گویا نہیں

○●○

میرہاشم

○

مدعا کوئی نہیں ۔ کوئی مناجات نہیں
ایسا لگتا ہے مرا دل بھی مرے ساتھ نہیں
صبر اک آخری صورت ہے سحر ہونے تک
صبح جس کی نہ ہو ایسی تو کوئی رات نہیں
زندگی ۔ بزمِ طرب ۔ اپنے ۔ پرائے ۔ دنیا
کوئی بھی ساتھ نہیں ۔ تیرا اگر ساتھ نہیں
اک نظر ابرِ گہر بار ! شجر سوکھ گئے
ایک مدت ہوئی اس دشت پہ برسات نہیں
دن تو ظالم ہے ہر اک نقش مٹا دیتا ہے
ہم تجھے بھول گئے ایسی کوئی رات نہیں
جن سے امید تھی حق گوئی کی ہم کو ہاشم
وہ بھی انجان رہے ۔ خیر ۔ کوئی بات نہیں

○●○

محسن بھوپالی

زمیں شاداب کرتا جارہا ہوں
لہو سے رنگ بھرتا جارہا ہوں

مخالف نکتہ چینی میں لگے ہیں
میں اپنے کام کرتا جارہا ہوں

وہ کانٹے بو رہے ہیں ہر قدم پر
میں ہنس ہنس کر گزرتا جارہا ہوں

زمانہ دیکھ کر حیرت زدہ ہے
بگڑنے میں سنورتا جارہا ہوں

نظر سے تم گراتے جارہے ہو
مگر دل میں اترتا جارہا ہوں

مرا تم راستہ روکو گے کب تک
میں سورج ہوں ابھرتا جارہا ہوں

کرلیا طے یوں تو چرخ و قمر کا فاصلہ
بڑھ گیا ہے اپنے ہم سایے کے گھر کا فاصلہ

سوچیے تو زندگی بھر کی مسافت بھی ہے کم
یوں بہ ظاہر کچھ نہیں دل سے نظر کا فاصلہ

ہو اگر عزمِ سفر تو دوریاں کچھ بھی نہیں
سوچتے رہنے سے بڑھتا ہے سفر کا فاصلہ

جستجو بھی ہے غنیمت رہ نوردانِ سخن
کون کرسکتا ہے طے دشتِ ہنر کا فاصلہ

محسن اب رختِ سفر کا جائزہ بھی لیجیے
طے ہوا ہی چاہتا ہے عمر بھر کا فاصلہ!

شاہین

○

دل کو عجب بیماری ہو گئی
منت میں اپنی خواری ہو گئی
کیا ہی سبک زنجیر تھی رقص میں
بیٹھ گئے تو بھاری ہو گئی
اپنی شرط پہ جینا چاہا
دشمن دنیا ساری ہو گئی
دل داروں نے چہرے بدلے
یاری اب عیاری ہو گئی
کام بہت اور فرصت کم ہے
یاد بڑی دشواری ہو گئی
گونج بہت ہے سناٹے کی
زیست بھی کلا باری ہو گئی
بن مانگے ہی ملا سہارا
بدمستی ہشیاری ہو گئی
ہم میں کچھ اچھائی ہو گی
اچھوں سے جو یاری ہو گئی
عشق ہی کب آسان تھا اپنا
طرہ یہ بے کاری ہو گئی
وہ تحریر جو تذر تھی تیری
آج وہی دیواری ہو گئی
سکہ جن گلیوں میں جس کی
وہ شہرت درباری ہو گئی
پڑ گئی تنگ خدا کی بستی
جیسے خلق بھکاری ہو گئی
اپنے غیظ و غضب کو دیکھ کے
دہشت خود پہ طاری ہو گئی
دنیا کب شاہین تھی اپنی لیکن دنیا داری ہو گئی

○○○

○

جلوے کا سرِ طور تقاضا نہیں کرتے
آنکھوں کے لیے دل کا خسارہ نہیں کرتے

وہ خوش قدمی ہے کہ کھلے جاتے ہیں مطلب
جاتے ہیں ادھر قصد جہاں کا نہیں کرتے

تنہائی بڑی چیز ہے وقتوں میں اگر آتے
ہمدم مگر اس طرح تو تنہا نہیں کرتے

اس بات پہ پھر ہم سے خفا ہو گئی دنیا
ہم کیوں ہوسِ دولتِ دنیا نہیں کرتے

تعبیر نظر آئے تو دیکھیں بھی کوئی خواب
بے وجہ تو ہم نیند گنوایا نہیں کرتے

ہم اپنی تمناؤں سے عاجز تو بہت تھے
پر اب بھی تمناؤں کو رسوا نہیں کرتے

جل جاؤگے اور تن پہ کوئی داغ نہ ہوگا
اس کھیل میں یوں آگ سے کھیلا نہیں کرتے

سودا کبھی شاہین اسی تک ملیے ، دل کا
افلاس نے جو ہم کو دیا تھا نہیں کرتے

○○○

جمشید مسرور

○

داغِ شکست و نکبتِ تقدیر دیکھنا
تم بھی نہ میرے پاؤں کی زنجیر دیکھنا

تم بھی گھسیٹنا مجھے مٹی پہ منہ کے بل
تم بھی نہ میری عزت و توقیر دیکھانا

دل پر جو لوحِ عشق تھا اے یارِ کم نظر
کچھ کردیا ہے وقت نے تحریر دیکھنا

دن خواب دیکھنا تری بزمِ وصال کے
شب دردِ دل کے روپ میں تعبیر دیکھنا

دن راستوں کے ساتھ بکھرنا گلی گلی
شب جاگ کر تری تصویر دیکھنا

کرتا ہوں اک جوابِ نظر کا سوال میں
بڑھ کر نہ زندگی سے ہو تاخیر دیکھنا

جمشید نوجواں تھا عجب ہم کو یاد ہے
جس وقت دیکھنا اسے دل گیر دیکھنا

○●○

○

صبر کرتے تو لبِ یار کو وا ہونا تھا
حرفِ انکار سہی کچھ تو عطا ہونا تھا

روح سے خوف کا یہ سنگِ گراں تو اترا
یوں بھی اک روز ہمیں تم سے جدا ہونا تھا

پھر مرے ذہن کو کیوں قوتِ تدبیر ملی
جب خدا ہی کو مقدر کا خدا ہونا تھا

اب یہی سوچ کے بربادیِ دل پر چپ ہوں
رنگ کو اڑنا تھا خوش بو کو ہوا ہونا تھا

ہم ہی اٹھ آئے تھے جمشید وگرنہ سرِ بزم
پھول کھلنے تھے ابھی رقصِ صبا ہونا تھا

○●○

چندر پرکاش شاد

فلک نشاں نقش ہیں کہ اب ٹوٹتے بہت ہیں
کہ ان دنوں ممکنات میں زلزلے بہت ہیں

تم ان کے ہم راہ کیسے محتاط رہ سکو گے
کہ لوگ یہ آشنا تو ہیں ، سر پھرے بہت ہیں

خود اپنی پرچھائیوں نے گھیرا ہوا ہے مجھ کو
مجھے خبر ہے نکلنے کے راستے بہت ہیں

کبھی بھی آوارہ دوریوں سے پکار لو تم
ہمارے قدموں میں آج بھی حوصلے بہت ہیں

ہماری رفتار یونہی بے قاعدہ رہے گی
کہ پتھریلی زمیں پہ ہم گھومتے بہت ہیں

میں اپنے دکھڑے سنا کے شرمندہ ہو رہا ہوں
کہ آج کل کے نظام میں مسخرے بہت ہیں

ہمارے اندر کا ڈر ہمارے ہی سامنے ہے
یہ سانپ کاغذ کے ہیں مگر کاٹتے بہت ہیں

○●○

مہتاب حیدر نقوی

کسی کے خواب سے باقی نہ بیداری سے قائم ہے
جہانِ درد بس تیری اداکاری سے قائم ہے

زباں سے کچھ نہیں کہتے سو دل کو ہول آتا ہے
وجودِ شام کس کس کی دل آزاری سے قائم ہے

جہاں میں باہنر لوگوں کو کوئی کیسے سمجھائے
کہ یہ دنیا ابھی تک کارِ بےکاری سے قائم ہے

خزاں کے گیت تو ہم لوگ اکثر گاتے رہتے ہیں
خدا کا خوف پھر کس کی جہاں داری سے قائم ہے

بدن کی آگ میں جلنے کی خواہش بھی نہیں لیکن
تراوٹ جسم میں کس چشمہ ، جاری سے قائم ہے

رخِ مہتاب سے کچھ بھی عیاں ہوتا رہے لیکن
یہ کاروبارِ دنیا صرف عیاری سے قائم ہے

○●○

شاداب رضی

یہ دنیا ایک تازہ کربلا ہے
یہاں ہر سانس میں کربل کتھا ہے

سویرا شام سے پھر جا ملا ہے
دھیان اب تک تعاقب میں لگا ہے

مرا ممدوح مانگے مدح لیکن
گریز اب کے قصیدے میں بڑا ہے

جلے خود روشنی اوروں کو بخشے
مرا ہم زاد ہر جلتا دیا ہے

بڑھا جب ہاتھ کوئی دوستی کا
تری یادوں کے ہاتھوں دل دکھا ہے

پڑا تھا ایک رخ دونوں کا پانسا
میں سانپ اترا ہوں وہ سیڑھی چڑھا ہے

وہ دیکھو! اس بدن کی وادیوں میں
کوئی شاداب لمحہ تھم گیا ہے

○●○

منظر پس منظر میں ڈھلتے جائیں گے
آئینے میں عکس بدلتے جائیں گے

آئیں گے بھونچال دلوں کی بستی میں
شہرِ خواب سے خواب نکلتے جائیں گے

تتلی تتلی پھول اڑیں گے شاخوں سے
جگنو جگنو جنگل جلتے جائیں گے

جشن بھی لوگ منائیں گے اس دنیا میں
اور کفِ افسوس بھی ملتے جائیں گے

کیسی آب و ہوا ہو کوئی مٹی ہو
درد کے پودے پھولتے پھلتے جائیں گے

خود سے پوچھتا رہتا ہوں تنہائی میں
یوں کتنے منصوبے ٹلتے جائیں گے

جن کی فطرت زہر اگلنا ہو شاداب
کچھ بھی کرو وہ زہر اگلتے جائیں گے

○●○

شکیل اعظمی

○

انا کی پشت پہ خود کو سوار رہنے دیا
گلے ملے بھی تو دل میں غبار رہنے دیا

نئے مکان کی تعمیر کر تو لی ہم نے
پرانی چھت کو مگر برقرار رہنے دیا

وہ ہم کو توڑ کے جاتا تو بھول جاتے اسے
نکلنے والے نے لیکن حصار رہنے دیا

نہ جانے کیا تھا کہ اس سے فریب کھا کر بھی
اسی کے ہاتھ میں سب اختیار رہنے دیا

بڑا گمان تھا اس کو ہماری چاہت کا
شکیل ہم نے بھی اس کا خمار رہنے دیا

○●○

○

سنگ ، دستِ ہنر سے نکلا تھا
اک جنوں تھا جو سر سے نکلا تھا

مجھ کو کچھ دور چھوڑنے کے لیے
اس کا احساس گھر سے نکلا تھا

اور پھر کھو گیا اندھیروں میں
وہ جو دیوار و در سے نکلا تھا

وہ بھی دیوار و در سے خوش تھا بہت
مَیں بھی گردِ سفر سے نکلا تھا

رات بھی اونگھنے لگی تھی شکیل
میں بھی پچھلے پہر سے نکلا تھا

○●○

قاضی فراز احمد

اس کی چوکھٹ پہ نہ جا اور نہ کسی در ہی پہ رک
اے مرے درد ! نہ بڑھ زخم کے محور ہی پہ رک

ہے کڑی دھوپ پگھل جائے گا عظمت کا خیال
اور کچھ دیر ابھی طرح اسی در ہی پہ رک

سایہ ، شمع ہے اک تابِ بصیرت کے لیے !
یوں لرزتے ہوئے شعلے کے نہ تو سر ہی پہ رک

ہے کناروں پہ بھی شوریدہ سری طوفاں کی
وک پتوار ابھی غم کے سمندر ہی پہ رک

یری ثروت سے ہے راحت کا تصور قائم
یری غربت پہ نہ جا آج میرے گھر ہی پہ رک

بت شکن ٹوٹ رہے ہیں نئے تیشوں سے فراز
ج کچھ دیر مزارِ غم آزر ہی پہ رک !

○●○

تیرا ستم بھی مجھے خوش خیال کردے گا
ہر ایک غم کو مرے لازوال کردے گا

یہ امتحانِ خودی ہے کوئی مذاق نہیں
جو ڈوب جائے گا وہ بھی کمال کردے گا

طلب کروں بھی اگر میں دوا مسیحا سے...
علاجِ دل میرا جینا محال کردے گا

وفا کا حکم نہیں ورنہ میں جو کہہ دوں تو
وہ اپنے سینے سے دل بھی نکال کردے گا

○●○

مسعود صدیقی مسعود

○

تو ہی تو دنیائے الفت کی ہر اک منزل میں ہے
نالہ ، غم میں نگاہِ مضطرب میں دل میں ہے
غیر ممکن ہوگیا ہے امتیازِ حسن و عشق
سخت حیراں ہوں کہ دل تجھ میں ہے یا تو دل میں ہے
کاروانِ عشق روزِ آفرینش سے رواں
جادہ ، ہے منزل و دریائے بے ساحل میں ہے
مجھ کو محفل سے اٹھانے کی نہ زحمت کیجیے
بیٹھنے دے گا کسے یہ رنگ جو محفل میں ہے
اس خوشی میں جان جانے کا بھی مجھ کو غم نہیں
عکس میرا تا قیامت دیدہ ، قاتل میں ہے
امتیازِ شاہد و مشہود باقی ہی نہیں
اب نظر میں بھی وہی تنویر ہے جو دل میں ہے
ہم جہاں بھی ہیں تری چشمِ دوعالم بیں میں ہیں
تو جہاں بھی جلوہ فرما ہے ہمارے دل میں ہے
یہ بھی کیا کچھ کم تفاوت ہے کہ اے مسعود ، عشق
دوسروں کے صرف لب پر ہے ہمارے دل میں ہے

○●○

مسعود سراج

○

ریاض کرتا رہا گرچہ عمر بھر کوئی
قلم سے نکلا کہاں حرفِ معتبر کوئی

دیارِ شب میں ہمارا ہے منتظر کوئی
چراغ راہ میں روشن ہو تا سحر کوئی

ہر ایک منزلِ مقصود کا تمنائی
مگر اٹھاتا نہیں زحمتِ سفر کوئی

دلوں کے چاک کی ہم کو رفوگری آئے
نہیں ہے شہر میں اس فن سے باخبر کوئی

اتر گئے ہیں ، اگرچہ چڑھے ہوئے دریا
وہ آندھیاں ہیں بچے گا نہ اب شجر کوئی

○●○

ایس۔ اے۔ فہیم

○

کھلا کھلا سا بدن رنگ و روشنی کی طرح
ہے خوش گوار سے موسم کی چاندنی کی طرح
دراز زلف سے لپٹی ہوئی گرہ میں بسا
غرورِ حسن تمنا بھی رسی کی طرح
ادا میں حسنِ تکلم بھی بے قرار سا ہے
لبوں پہ عکسِ تبسم بھی کلی کی طرح
میں بھول جاؤں تمہیں زندگی میں ناممکن
ملا ہے غم بھی تمہارا مجھے خوشی کی طرح
تعلقات میں ہرگز کوئی کمی نہ ہوئی
وہ دشمنی بھی نبھاتی ہے دوستی کی طرح
یہ کس عقیدہ کے ہیں لوگ، جو یہ کہتے ہیں
وفا گناہ، محبت ہے خودکشی کی طرح
رکا رہا تو ہواؤں کو وہ سمیٹ لیا
چلا گیا ہے تو بہتی ہوئی ندی کی طرح
وہ نرم جھونکا، ہوا کا تھا یا خیال ترا
جو چھو گیا مجھے، تپِ سرگمی کی طرح
میں رہ رہا ہوں چمن میں نسیمِ صبح کے ساتھ
شگفتہ رنگ گلابوں کی دل کشی کی طرح
تباہ کر کے مجھے تو بھی رہ نہیں سکتا
بھری بہار میں پھولوں کی تشنگی کی طرح

○○○

حبیب اجملی

○

نہ رنگ ہے نہ وہ خوش بو نہ وہ گل تازہ
بکھر چکا ہے اب اپنے چمن کا شیرازہ

نہ کھٹکھٹائے خوشی کوئی دل کا دروازہ
لگا رہا ہوں ابھی اپنے غم کا اندازہ

ہے شاید اس لیے پلکوں کا بند دروازہ
حسین خوابوں کا ہو منتشر نہ شیرازہ

یہ آندھیاں ہیں کہ اس فتنہ خیز کی رفتار
یہ دھول ہے کہ رخِ ماہتاب کا غازہ

کبیر نے تو یہاں سب کی خیر مانگی تھی
بھگت رہا ہوں میں کس بددعا کا خمیازہ

یہ دیر ہے کہ حرم ہے کہ میکدہ کیا ہے؟
حبیب تم ہی لگاؤ کچھ اپنا اندازہ

○○○

غلام جیلانی

فریب زار

(قسط : پانچویں)

ٹرین کے فرسٹ کلاس اے ۔ سی کوچ میں دو بزنس مینوں میں سے ایک اوپر کی برتھ پر پڑ کر سوگیا تھا ۔ اس کے دھیمے دھیمے خراٹوں کی آواز سے بے نیاز رما اپنی زندگی کے اس یادگار دن کی ایک ایک تفصیل میں ڈوب چکی تھی ۔ اسے یہ احساس نہیں رہا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر دیر سے دبی دبی مسکراہٹ کھیل رہی ہے ۔

بارش ذرا تھمی تو اکا دکا لوگ سڑک پر نظر آنے لگے ۔ دیر سے رکی ہوئی گاڑیاں شہر کی طرف فراٹے بھرنے لگیں تو بھیگی سڑک پر ان کے پہیوں سے گونج اٹھنے والی سیٹیاں دور تک ان کے تعاقب میں دوڑ جاتیں ۔ پاس کے کھیتوں سے دو تین بیل گاڑیاں نکل کر سڑک پر آئیں تو ایک گاڑی بان کو آنند نے راضی کرلیا ۔ لکڑی کے ایک تختے کی مدد سے سب نے مل کر موٹر سیکل گاڑی میں چڑھا دی ۔ رما اور آنند بھی بیٹھ گئے ۔ اور بیل گاڑی کوٹھی کے لیے روانہ ہوگئی ۔

سڑک کے دونوں طرف جل تھل ایک ہورہا تھا ۔ درختوں کی شاخوں سے پرندے پَر جھاڑ جھاڑ کر باہر نکل آئے تھے اور فضا ان کی آواز سے گنگنا اٹھی تھی ۔ ۔ ۔ آنند نے بیلوں کی رسیاں گاڑی والے سے اپنے ہاتھ میں لے لیں ، اور ہانک لگاتے ہوئے لہک لہک کر گانے لگا ۔ ۔ ۔ " تو کہے اگر ، میں جیون بھر ، گاڑی ہی چلاتا جاؤں ۔"

مڑ کر پیچھے بیٹھی ہوئی رما کی طرف دیکھا ، جیسے اپنی تعریف سننی چاہتا ہو ، تو رما بولی ۔ ۔ ۔ " گاڑی بان صاحب ۔ لوگ ہماری طرف دیکھ رہے ہیں ۔ گاڑی چلاتے ہوئے گانا بھی کیا اتنا ضروری ہے ! "

" ہاں ۔ ۔ ۔ بے حد ضروری ۔" آنند بولا " ایسے سچویشن میں ہیرو ۔ ۔ ۔ کبھی گانا گائے بغیر چوکتا ہے ؟ ۔ ۔ ۔ بلکہ ایسے میں تو ڈوئیٹ ہوتا ہے ۔"

۔ ۔ ۔ ۔ کتنی بھرپور زندگی کا مالک تھا آنند ! پُر جوش ولولوں اور مسرتوں کا سرچشمہ !

اور اس روز جب بیل گاڑی چھتری والی کوٹھی میں پہنچی ، تو ایک ہل چل سی مچ گئی ۔ سب لوگ دوڑ کر باہر دالان میں آ کھڑے ہوئے ۔ ۔ ۔ چہروں پر کہیں پُر لطف استعجاب تھا ، تو کہیں تشویش ناک جستجو رما کے ڈیڈی بھی اس روز ذرا دن سے آئے ہوئے تھے ۔ اس ملے جلے ردِ عمل کے گھیرے میں ایک وہی تھے جو ان دونوں کی اس دل چسپ آمد پر بے تحاشہ ہنسے جارہے

تھے ۔ دوسروں کے برخلاف انھوں نے کچھ پوچھا بھی نہیں ۔ ساری کیفیت کا خود ہی اندازہ لگالیا تھا ۔
اور جب کھانے کی میز پر آنند سب کو اپنی اس دن کی دل چسپ مگر من گھڑت داستان سنا رہا تھا ، تو ڈیڈی زیرِ لب مسکرائے جارہے تھے ۔ تھوڑی ہی دیر پہلے اپنے کمرے میں انھوں نے رما سے کہا تھا ۔ ۔ ۔ " بیٹی ۔ ۔ آج کا دن تو کبھی بھلا نہ پائے گی ۔"

(۱۸)

شام کو سیمینار کا آخری سیشن ختم ہو گیا ۔ سیمینار توقع سے زیادہ کامیاب رہا تھا ۔ ادیبوں اور دانش وروں کی تسلی بخش تعداد ہر سیشن میں موجود رہی تھی ۔ سب لوگ منوج کی ستائش کر رہے تھے جو آرٹ سوسائٹی کا روحِ رواں تھا اور جس نے سیمینار منظم کیا تھا ۔
الہ آباد سے آئے ہوئے پروفیسر سوران اور کلکتے سے آئے ہوئے پنکج سرکار اسی دن لوٹ جانا چاہتے تھے ۔ انھیں ایرپورٹ پر وداع کر کے منوج لوٹا تو رات کے ساڑھے سات بج چکے تھے ۔ لی نا ابھی تک ساتھ تھی ۔ دو دن کی گہما گہمی کے بعد یکایک منوج کا جی چاہنے لگا کہ راستے میں اپنی کلب میں رک کر اچھا سا کھانا کھائے اور تھوڑی دیر اپنے آپ کو خالی الذہن چھوڑدے وہ لی نا کو لے کر کلب چلا گیا ۔
کھانے کے دوران لی نا نے کوئی بات نہیں کی ۔ وہ منوج کے مزاج کو جانتی تھی جب بیرا برتن اٹھاکر لے گیا تو اس نے آہستہ آہستہ باتوں کا سلسلہ شروع کیا کیوں کہ خاموشی اب دوبھر ہوئی جارہی تھی ۔ ڈرتے ڈرتے پوچھا ۔ ۔ ۔ " سر ۔ اب آپ مجھے ڈراپ کر کے سیدھے گھر جائیں گے نا ؟ "
تھوڑے سے تامل کے بعد منوج نے پوچھا ۔ ۔ ۔ " یہ کیوں پوچھ رہی ہو ؟ " مگر لہجے کی ملائمت سے لی نا کی ڈھارس بندھی ۔
" اس لیے کہ آپ تھک گئے ہیں ۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے ۔"
منوج نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ اس کی خواب آگیں نظریں لی نا کے چہرے پر تھیں مگر لگتا تھا وہ کہیں اور دیکھ رہا ہے ۔ لی نا نے ہی پھر کہا ۔۔۔
" میرا مطلب ہے ، اب آپ نو بجے اس فلم کی مہورت والے فنکشن میں نہ جائیں ۔"
منوج نے اپنے ذہن سے ان تمام سوچوں کو یکبارگی جھٹک دیا جن کے مہین جال نے اسے جکڑ لیا تھا ۔ ۔ ۔ " نہیں لی نا ۔ میرا جانا ضروری ہے ۔ میں نے وعدہ کر رکھا ہے ۔ روپیش کو پہلی بار لیڈنگ رول ملا ہے ۔ مہورت شاٹ اسی پر ہے ۔" ۔ ۔ ۔ پھر رک کر دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا " ۔ ۔ ۔ مگر وہاں سے جلد ہی واپس ہوجاؤں گا ۔"
اور پھر ایک بار دونوں چپ ہوگئے ۔ اب کی بار خاموشی کو منوج ہی توڑتے ہوئے بولا ۔ ۔ ۔ " لی نا ۔ سیمینار کے کاموں میں تم نے میرا بہت ہاتھ بٹایا ۔ آئی تھینک یو ۔"
" سیمینار کی کامیابی پر آپ خوش تو ہیں نا ؟ "
" تمھیں شک کیوں ہو رہا ہے ؟ "
" اس لیے کہ آپ کب خوش ہوتے ہیں ، اور کب نہیں ، پتہ نہیں چلتا ۔ ۔ ۔ ویسے بھی آپ کو خوش دیکھنے کا موقع کم

ہی ملتا ہے۔"

۔۔۔ منوج ہنس پڑا۔۔۔ "نہیں لی نا۔ میں سچ مچ خوش ہوں۔"

"اور یہ خوشی اس لیے اور بھی ہے کہ رما دیوی نے بھی پیپر پڑھا۔۔۔ اور سب نے بہت پسند کیا؟"

منوج نے چونک کر لی نا کی طرف دیکھا، جو متجسس نگاہوں سے اسے دیکھے جارہی تھی۔ چند لمحے اسی طرح دیکھتا رہا۔ پھر جانے کے لیے آہستہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔۔۔ "یس۔ یو آر رائیٹ۔" اس کی آواز ہمیشہ کی طرح نارمل تھی۔

(۱۹)

مورت شاٹ ختم ہوا تو تالیوں کی گونج میں منوج نے بڑھ کر روپیش کو مبارک باد دی۔ ڈائرکٹر اور پروڈیوسر سے بھی خیر سگالی کے جملے کہے۔ اور ناریل کا ٹکڑا اور لڈو لے کر حسین چہروں اور زرق برق لباس کی ریل پیل سے ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

۔۔۔ ہر طرف مسکراہٹیں اور روشنیاں اور رنگینی بکھری تھی۔۔۔ کون کہتا ہے دنیا میں رنج اور افلاس کا وجود ہے! صرف شادمانیاں ہیں، اور فراوانی ہے، اور مسکراہٹیں ہیں۔۔۔ منوج مسکرانے لگا۔ مگر اس مسکراہٹ میں طنز کی کسک تھی۔۔۔ ان فرشی قہقہوں اور کھوکھلی رنگینیوں میں کتنے دلوں کی آرزوؤں کی شکست کے چھنا کے اور رنج و حسد کے شعلوں کی لپٹیں پوشیدہ تھیں! رقابتوں کی کشاکش سے لب ریز گلیمر کی یہ دنیا منوج کو کتنی مصنوعی لگ رہی تھی!

آرتی آگے بڑھ کر روپیش کو مبارک باد دینا چاہتی تھی، مگر روپیش نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ وہ ہیروئن کے ساتھ کھڑا تھا۔ اور کیمروں کی فلیش لائٹیں مسلسل چھک چھک کرتی ان پر سے گزر رہی تھیں۔ مختلف پوزوں میں تصویریں لی جارہی تھیں۔ آرتی کی مضطر طبیعت اس ہزیمت پر آگ بگولہ ہو گئی۔

کاگ اچھل رہے تھے۔ گلاسوں میں شراب انڈیلنے کی آوازیں مچل رہی تھیں۔ فضا وسکی کی بو سے بوجھل ہوئی جارہی تھی۔ منوج وہاں سے چلا آیا۔

کار اسٹارٹ کرتے ہوئے منوج اچانک رک گیا۔ پلٹ کر دیکھا تو بائیں طرف کار سے لگی آرتی کھڑی تھی۔ چپ چاپ پٹ کھول کر منوج کے برابر سیٹ پر آ بیٹھی اور اس کی طرف دیکھے بغیر بھاری آواز میں بولی "۔۔۔ منوج صاحب۔ گھر چلیے؟"

"گھر۔۔۔؟" منوج نے پوچھا۔

"ہاں۔ آپ کو جہاں بھی جانا ہے، پہلے مجھے ڈراپ کرتے جائیے۔"

"بات کیا ہے آرتی؟۔۔۔ تم ڈسٹرب سی لگتی ہو!"

"کوئی سوال مت کیجیے مسٹر منوج۔۔۔ آپ مجھے لے چلتے ہیں۔۔۔ یا نہیں؟"

منوج نے کار اسٹارٹ کردی۔ اور خاموشی سے پارکنگ لاٹ سے باہر نکل آیا۔

دو تین روڈ کراسنگ سگنلس کو پار کرنے کے بعد آرتی نے کار میں معلق اضطراب آمیز خاموشی کو توڑا۔۔۔ "آپ غصے میں ہیں؟"

"نہیں۔۔۔"

"میرے اس عجیب سے بی ہیویر پر آپ کو برا نہیں لگا ؟"

"نہیں۔ کیوں کہ یہ عجیب سا بی ہیویر، تمہارا نارمل بی ہیویر ہے۔"۔۔۔ منوج نے مڑکر کہا۔ اور دونوں مسکرانے لگے۔

"عجیب بات تو یہ ہے منوج صاحب، کہ آج آپ اس طرح مل گئے۔۔۔ ورنہ آپ کو پانا آسان کہاں ؟ اب آپ نے اتنی مہربانی کی ہے تو مجھے ڈراپ کر کے چلے مت جائیے۔ کچھ دیر رکیے میرے ساتھ۔ میں کئی روز سے چاہتی تھی، کہ آپ سے کچھ باتیں کروں۔"

"کیسی باتیں ؟"

"اپنی باتیں۔۔۔ میری اپنی باتیں۔" منوج کچھ کہنے لگا تو روک کر جلدی سے بولی۔۔۔ "نہیں۔ آج آپ انکار مت کیجیے۔"

سڑکیں ویران ہوچلی تھیں۔ ہوا میں رات کی خوش گوار خنکی آگئی تھی، جس کے سرسراتے جھونکوں میں اسٹریٹ لائیٹس نے ابھی سے اونگھنا شروع کردیا تھا۔ منوج کو لگا جیسے دن بھر کی تھکن نے اس سے آرتی کی کسی بھی بات سے انکار کرنے کی طاقت سلب کرلی ہے۔

۔۔۔ دھیمی دھیمی روشنی میں آرتی کے کمرے کی فضا فسوں آمیز ہوگئی تھی۔ مہین نائٹ گون نے آرتی کے جسم کی رعنائیوں کو اور دل قریب بنادیا تھا۔ آنکھوں کے سرخ ڈورے اور گالوں کی دمک شراب کے اثر کی غمازی کر رہے تھے۔ ہاتھ میں جام تھامے وہ منوج کے سامنے ایسے انداز میں کھڑی تھی جیسے کسی ٹیبلو کا سین ہو۔

منوج کرسی پر بیٹھا تھا۔ آرتی پر سے نظریں ہٹا کر اس نے اپنے گلاس کو دیکھا جو آدھا خالی ہوا تھا۔ ایک گھونٹ لے کر دھیمے سے بولا۔۔۔ "نہیں۔ آرتی۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔۔۔ جو تم چاہتی ہو، میں نہیں کرسکتا۔"

"کیوں نہیں کرسکتے ؟" ۔۔۔ آرتی کی آواز عجیب سی لگ رہی تھی۔

"تمہاری نظموں میں ابھی وہ گہرائی اور اثر نہیں آیا ہے کہ۔۔۔ میں ان پر کچھ لکھوں۔۔۔ ان نظموں کو ابھی اپنے پاس رکھو۔"

آرتی منوج کے اور پاس آگئی۔۔۔ "کیا آپ میرے لیے اتنی سی چیز نہیں کرسکتے ؟" ۔۔۔ اس کی بھاری اور لرزاں آواز نے منوج کو چونکا دیا۔۔۔ وہ منوج کے آگے دو زانو ہوکر بیٹھ گئی، اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی۔۔۔ "وہ گہرائی اور اثر میری نظموں میں نہ سہی، میری نظروں میں بھی محسوس نہیں کرتے آپ ؟۔۔۔ دیکھیے۔۔۔ ان میں جھانک کر دیکھیے۔۔۔"

منوج گلاس تپائی پر رکھ کر کھڑا ہوگیا۔۔۔ "آرتی۔ تم اس وقت ہوش میں نہیں ہو"۔۔۔ ہار نہ جاننے والی آرتی تڑپ اٹھی۔ بجلی کی طرح بل کھا کر کھڑی ہونے لگی تو دھکے سے تپائی پر رکھا منوج کا گلاس ایک چھناکے کے ساتھ گر کر ٹوٹ گیا۔ مگر آرتی نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اس کی شعلہ فشاں نظریں اس وقت منوج میں پیوست ہوئی جارہی تھیں۔۔۔ چہرے کا رنگ بدل کر یک لخت ڈراؤنا سا ہوگیا تھا۔۔۔ "کیا آپ کے قلم کا سارا زور صرف رما کے لیے ہے ؟ سارا اثر اور ساری گہرائی صرف اسی میں نظر آتی ہے آپ کو ؟" اس کی کرخت اور مرتعش آواز یوں لگ رہی تھی جیسے پھٹی ہوئی، پتنگ ہوا میں، پھڑ پھڑا

رہی ہو ۔ ۔ ۔ " کیا دیکھا آپ نے اس میں ، جو اس قدر مرے جارہے ہیں اس پر ؟ " ۔ ۔ ۔ وہ اپنا سارا زہر اگل دینے پر تل گئی تھی ۔

" شٹ اپ ۔ کیا بک رہی ہو ؟ " منوج کی آواز غصے میں کانپنے لگی تھی ۔ " ۔ ۔ ۔ کیا یہی سب کہنے کے لیے روکا تھا مجھے ؟ "

مگر دوسرے ہی لمحے منوج نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا ۔ آگے کچھ کہے بغیر چپ چاپ کھڑا آرتی کو دیکھنے لگا ، جس کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا اور ایک جارہا تھا ۔ پھر اس نے وہاں سے چلے جانے کی نیت سے قدم بڑھایا ہی تھا کہ تیزی سے دوڑ کر آرتی نے دروازہ اندر سے بند کرلیا ۔ ۔ ۔ اور پلٹ کر منوج کو دیکھنے لگی اس کے چہرے پر عجیب وحشت برس رہی تھی ۔ جیسے گھری ہوئی بلی کی طرح جست لگا کر منوج کا چہرہ نوچ ڈالے گی ۔

" اتنا برا لگا اس کا نام سن کر ؟ ۔ ۔ ۔ اور اگر میں نہ جانے دوں آپ کو ؟ ۔ ۔ ۔ زبردستی کروں ، شور مچاؤں ؟ یہ میرا گھر ہے ۔ " طنز بھری مسکراہٹ کے زہر نے چہرے کو اور بھیانک بنادیا تھا ۔

منوج نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ بڑھتا ہوا آرتی کے پاس آگیا ۔ اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا ۔ ۔ ۔ "

چپ کیوں ہو ؟ ۔ ۔ ۔ بلاؤ سب کو ؟ مچاؤ شور ؟ ۔ ۔ ۔ یہ تمھارا ہی گھر ہے تمھاری ہی عزت کا پاسباں ! "

منوج یکایک رک گیا ۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے آرتی جو جذبات کے سیلاب میں بید کی طرح کانپ رہی تھی ، اب اس کے سامنے نچڑے ہوئے کپڑے کی طرح بےجان کھڑی تھی ۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے اور ستے ہوئے چہرے پر خزاں کی اداس دھوپ کی زردی پھیل گئی تھی ۔ جس ہونٹوں پر بھنچی بھنچی لرزش تھی جو کسی اندرونی کرب کی نشان دہی کر رہی تھی ۔ ۔ ۔ اور پھر سوکھے پتے کی طرح جھول کر وہ منوج کے کاندھے پر آ گری ۔ رگ رگ میں چھایا ہوا تناؤ آنسوؤں کے ریلے میں بہہ نکلا ۔ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگی ۔ بڑی ملائمت سے منوج اس کی پیٹھ پر تھپکتے ہوئے بولا ۔ ۔ ۔ " آرتی تمھیں آرام کی ضرورت ہے ۔ جاؤ نیند کی گولی کھا کر سوجاؤ ۔ "

(۲۰)

منوج دوسرے دن آفس پہنچا تو لی نا نے میز پر خطوں اور کاغذوں کا ڈھیر سا پھیلا دیا ۔ پچھلے دو دنوں میں منوج نے سیمینار کی وجہ سے آفس کا رخ بھی نہیں کیا تھا ۔ جلدی جلدی خطوں پر نظر ڈال کر انھیں دوسرے کاغذوں کے ساتھ ایک طرف سرکا دیا ۔ اور لی نا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ۔ ۔ ۔ " لی نا ۔ تم کئی دن سے کہہ رہی تھیں ، تمھیں دو دن کا آف چاہیے ۔ "

، لی نا نے چونک کر منوج کو دیکھا ۔ اس کی آواز عجیب سی لگی ۔ جیسے اس میں کوئی اندرونی اضطراب چھپا ہوا ہو ، وہی اضطراب اس کے چہرے پر بھی نظر آرہا تھا ۔ لی نا نے ہولے سے گردن ہلا کر ہاں کی ۔ منوج کہنے لگا ۔ " کل اور پرسوں تمھیں آنے کی ضرورت نہیں ۔ آفس بند رہے گا ۔ ۔ ۔ "

لی نا حیران سی منوج کو دیکھنے لگی ۔ ۔ ۔ " آپ کہیں جا رہے ہیں ؟ "

" ہاں ۔ " لی نا سے نظریں ہٹاتے ہوئے منوج بولا ۔

" کہاں جارہے ہیں سر ؟ "

" تمھیں اس سے کیا ؟ " منوج نے یکایک درشت لہجے میں کہا " ۔ ۔ ۔ اور پھر تم ہوتی کون ہو ، یہ سب جاننے والی ؟ "

لی نا سن سے سہم کر رہ گئی ۔ جیسے منوج نے اسے تھپڑ مارا ہو ۔ صدمے سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے ۔ منوج کو خود

بھی اپنے چڑ چڑے پن پر تعجب ہو رہا تھا۔ اس کے منہ سے ایسے الفاظ کیسے نکلے! پچھلی رات کے ہیجان انگیز تجربے کے تناؤ نے اس کے دماغ کو ماؤف کر رکھا تھا۔ سنبھل کر دھیمی آواز میں بولا۔۔۔ "آئی ایم ساری لی نا۔۔۔ مجھے معاف کردو۔" اس کے لہجے میں اب درشتی نہیں تھی۔۔۔ "مجھے تم سے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔"

لی نا کی آنکھ کے آنسو واپس ہوگئے۔ سارا صدمہ آنِ واحد میں کافور ہوگیا۔۔۔ "کوئی بات نہیں سر۔ آپ مجھ پر غصہ بھی کرسکتے ہیں۔"

"ہاں لی نا۔ ایک تم ہی تو ہو جس پر غصہ بھی کرلیتا ہوں۔"

لی نا پھٹی پھٹی آنکھوں سے منوج کو تکنے لگی۔ خوشی سے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔۔۔

"اچھا بتاؤ۔ کیا کروگی یہ دو دن۔۔۔؟" لی نا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی منوج نے گفتگو کا رخ بدل دیا۔

"میں نے کہا تھا نا، گھر شفٹ کرنا ہے۔۔۔ ایک دوسرا اچھا گھر مل گیا ہے۔" لی نا نے بتایا۔۔۔ دونوں کے بیچ ب پھر وہی سبک اور مانوس فضا لوٹ آئی تھی۔

"ممی کیسی ہیں؟۔۔۔ تم نے بتایا تھا، ان کی طبیعت ٹھیک ہے؟"

"اب ٹھیک ہیں، سر۔"

"اور۔۔۔ تمھارے اس لڑکے کا کیا حال ہے؟ کب آرہا ہے پونا سے تم سے ملنے؟"۔۔۔ منوج نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی تو گیا ہے مل کر۔۔۔ اب پندرہ دن بعد ہی آئے گا۔۔۔ ویک اینڈ پر۔"

"تم نے ممی سے ملایا اس کو؟۔۔۔ شادی کی بات چیت ہوئی کچھ؟" منوج نے لی نا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ اور لی نا نے کوئی جواب نہیں دیا تو پھر کہنے لگا۔۔۔ "کیوں نہیں ملایا اب تک؟۔۔۔ وہ اتنا بے چین ہو رہا ہے، شادی کے لیے؟"

"ممی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔۔۔ وقت نہیں ملا۔" لی نا نے آہستہ سے کہا۔

"وقت نہیں ملا!۔۔۔ بے وقوف لڑکی، وقت کے ذرا سے پھیر بدل سے پلین نکل جاتے ہیں۔ ریلیں چھوٹ جاتی ں۔۔۔ وقت کہیں لوٹ کر آتا ہے؟"۔۔۔ منوج کی آواز میں دفعتہً عجیب کاٹ سی آگئی تھی جس نے لی نا کو چونکا دیا۔۔۔ گھبراؤ نہیں۔۔۔ اب جو آئے تو اپنے نئے گھر لے جاؤ۔ ممی سے ملاؤ۔۔۔ اور شادی کرلو۔"

منوج کو دیکھ کر لی نا بھی مسکرانے لگی۔۔۔ "پھر آپ کا کام کون کرے گا، سر؟"

"یہ میرے سوچنے کی بات ہے۔۔۔ نادان لڑکی۔ کوئی کسی کے لیے اپنی زندگی ویران نہیں کرتا۔۔۔" لی نا کے ے پر سے نظریں ہٹائے بغیر منوج نے جواب دیا۔

لی نا کی مسکراہٹ اپنی جگہ منجمد ہوگئی۔ منوج کی آواز پھر پہلے کی طرح اجنبی ہوگئی تھی۔۔۔ وہی اضطرار، وہی بے چینی نے اندر چھپائے ہوئے۔ چہرے پر بھی وہی اضطراب آمیز کیفیت جھلکنے لگی۔ دفعتہً دونوں کو محسوس ہوا کہ فضا پھر بوجھل ہوئی

جارہی ہے۔ نئی سگریٹ سلگاتے سلگاتے واپس پیکٹ میں رکھ کر منوج یکایک اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔۔۔۔۔ "لی نا۔ میں جارہا ہوں۔ تم بھی چلی جاؤ۔۔۔ اور گھر شفٹ کر ڈالو۔"

(۲۱)

منوج کی کار اب شہر سے نکل کر ہائی وے پر ایک ہموار رفتار سے جا رہی تھی۔ سڑکوں کی بھیڑ بھاڑ اور آلودگیاں پیچھے چھوڑ آنے پر بھی منوج کی گھٹن ویسی ہی برقرار تھی۔ پچھلی سیٹ پر سوٹ کیس میں اس کے کچھ ضروری کپڑے تھے جو گھر سے لے لیے تھے۔ تین وھسکی کی بوتلیں بھی تھیں جو راستے میں خریدی تھیں۔ ہر لمحہ اسے پناہ کی منزل کی طرف لے جارہا تھا، پھر بھی اس بار وہ اپنے احساس کے سارے دریچے بند نہ کر پایا تھا۔ جو ہیجان پچھلی رات سے اس کے دماغ میں مچایا تھا اس نے اس اعتماد کو اتھل پتھل کردیا تھا جو اسے خود پر تھا۔

ہائی وے پر اب منوج کافی دور نکل آیا تھا۔ جگہ جگہ چھوٹے بڑے دھابوں پر اکا دکا ٹرک کھڑے تھے، مگر رش کا وقت ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ ان ہی میں ایک چھوٹے سے دھابے پر منوج اپنی کار کو دھیما کر کے پچھواڑے کے رخ پر لے گیا۔ اور ایک درخت کے نیچے کھڑا کردیا۔ درخت کے نیچے ایک دھان پان بوڑھا بیٹھا کھانس رہا تھا۔ اٹھ کر پاس آیا۔ منوج کو دیکھتے ہی سلام کیا۔ اور پچھلے دروازے کے پاس جاکر زور سے بولا۔۔۔ "جمنی۔۔۔ دیکھ صاحب آئے ہیں۔"

اتنی دیر میں جمنی موٹر کو دیکھ کر خود ہی باہر آگئی تھی۔ اچھی خاصی عمر کی قریب اندام جمنی اپنے رکھ رکھاؤ سے عمر میں آٹھ دس سال چھوٹی لگتی تھی۔ دھابے کی مالکن تھی۔ آتے ہی مسکراکر پوچھنے لگی۔۔۔ "کیسے ہو صاحب؟۔۔۔ اب کے بہت دن میں آئے؟"

منوج نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سوٹ کیس نکال کر موٹر کو لاک کردیا۔ اور جمنی اسے لے کر اندر چلی گئی۔ دیہات کے اکثر گھروں کی طرح یہ بھی ایک رہائشی گھر تھا جس کے اگلے اور کھلے حصے کو جمنی دھابے کی طرح استعمال کر رہی تھی۔ دروازہ ایک چھوٹے سے دالان میں کھلتا تھا، جس پر کویلو کی چھت تھی۔ دونوں طرف دو کمرے تھے، چھوٹے چھوٹے سے۔ منوج جانتا تھا دائیں ہاتھ والا کمرا مکان کا بیڈروم ہے۔ اسی کی چوکھٹ پر نرملی کھڑی مسکرا رہی تھی۔۔۔ نہ بناؤ نہ سنگھار۔ نہ ڈھنگ کے کپڑے۔ بالوں کی ایک لٹ پیشانی پر سے ہوتی گال پر جھول رہی تھی، لگتا تھا، کوئی کام کرتے کرتے اٹھ آئی ہے۔ مگر چہرے پر وہی مسرت تھی جو کسی کے اچانک آجانے پر کھل اٹھتی ہے،۔۔۔ وہ جو غیر نہ ہو۔ اپنا ہو۔

۔۔۔ اور اپنائیت تو بس ایک دوسرے کو سمجھ لینے کا نام ہے۔ جس کا اظہار الفاظ کا سہارا نہیں ڈھونڈھتا۔ نہ وہ کسی رشتے یا بندھن کی محتاج ہے۔ وہ تو بس خود سپردگی کے اس کیف کا نام ہے جو نہ کوئی سوال پوچھتا ہے، اور نہ کوئی جواب دینا چاہتا ہے۔ اس وقت نہ وہاں بیتا ہوا کل ہوتا ہے اور نہ آنے والا کل۔ بس وقت کے یہ منجمد لمحات ہوتے ہیں جو اپنی تہوں میں سارے دکھ، سارا کرب سمیٹ لیتے ہیں۔

اور اس دن بھی جب منوج نے نرملی کو آغوش میں لیا، تو وقت کے گزرتے ہوئے لمحات منجمد ہوگئے۔۔۔

(۲۲)

پورے دس سال بعد رما دلی آئی تھی۔ اور دس سال میں بڑے شہر کہیں سے کہیں بدل جاتے ہیں۔ اسوانی نے رما سے

تو تھا کہ چھتری والی کوٹھی جو کبھی شہر کے سرے پر سمجھی جاتی تھی، اب چاروں طرف سے اونچی اونچی بلڈنگوں میں گھر چکی ۔ بس یہی ایک پرانی عمارت اپنے وسیع احاطہ کے ساتھ جوں کی توں کھڑی ہے ۔ خریدار اسے بھی ڈھا کر ایک بڑا کامپلکس ا چاہتا ہے ۔ مگر پھر بھی جب ٹیکسی کوٹھی کے گیٹ کی ویرانی سے اندر مڑی تو رما کا دل بیٹھ سا گیا ۔ چاروں طرف کھڑی ہوئی توں میں کوٹھی سکڑ کر ذراسی رہ گئی تھی ۔ پچھواڑے کا کھلا میدان اور اس پر کیکر کی جھاڑیوں کا سلسلہ جو پہاڑی تک چلا گیا تھا، ، ان کا نشان تک نہیں تھا ۔

پورٹیکو کی سیڑھیوں پر بندو کھڑا تھا ۔ اک دم بوڑھا ہوگیا تھا ۔ کمر جھک گئی تھی ۔ آگے بڑھ کر سلام کیا تو وفور جذبات ہاتھ کانپنے لگے ۔ وہ پچھلے دور کے ان ملازموں میں تھا، جو ایک دفعہ ملازم ہوجائیں تو مر کر ہی مالک کا در چھوڑتے ہیں ۔ اتنی میں آوٹ ہاوس سے نکل کر بندو کی بہو اپنے دونوں بچوں کے ساتھ آگئی ۔ رما کا سامان اس کے کمرے میں رکھ دیا گیا ۔ مگر رما تک درمیانی ہال میں کھڑی رہی ۔ کوٹھی کے خالی ہوجانے کے بعد بھی رما دو مرتبہ یہاں آچکی تھی ۔ ۔ ۔ انہی بھائیں بھائیں تے خالی ہال اور کمروں میں ۔ ۔ ۔ اسی اداس خاموشی میں، جہاں کا ذرہ ذرہ اس کی زندگی کی انمول یادوں سے بھرا تھا ۔ مگر اس ہال میں کھڑے کھڑے ایک لمحے کے لیے اسے وہاں کی فضا کچھ بدلی بدلی سی لگی ۔ وہ پرانی شناسائی اور اپنائیت کی گرم جوشی نہ ۔ جیسے وہاں کے در و دیوار آنکھیں جھپکائے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں ! ۔ ۔ ۔ جیسے وہ ان کی راز دارانہ سرگوشیوں بے تکلف محفل میں اچانک غیر کی طرح مخل ہوگئی ہو ! ۔ ۔ ۔

"رما بیٹی ۔ رک کیوں گئیں ؟ ۔ ۔ ۔ چل کر منہ ہاتھ دھو لو ۔ بہو نے پانی گرم کر رکھا ہے ۔"

رما نے چونک کر دیکھا ۔ شفقت کی مٹھاس میں ڈوبی یہ آواز بندو کی تھی ۔ ۔ ۔ اور آنِ واحد میں اس کا ذہن واہموں کی دل میں نکل آیا ۔ نہیں ۔ سب کچھ وہی ہے ۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا ۔ یہ در و دیوار، یہ دریچے، یہ ستون ۔ ۔ ۔ ۔ یہ مانوس فضا، بھی تو نہیں بدلا ۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی جہاں بندو نے اس کے ٹھہرنے کا انتظام کردیا تھا ۔

رما کے آنے کی خبر پا کر بندو نے تمام کمروں کی صفائی کر دی تھی جو برسوں سے خالی پڑے تھے ۔ کوٹھی کو فروخت ینے کا فیصلہ آنند نے اپنی زندگی میں ہی کردیا تھا ۔ اسوانی کی مدد سے سارا سامان بھی فروخت کروادیا تھا ۔ البتہ رما کے ڈیڈی کا جو بالا خانے پر تھا، جوں کا توں چھوڑ کر مقفل کردیا تھا ۔ رما جب بھی آتی، اس کمرے کو کھلوا کر تھوڑا وقت وہاں ضرور گزار ڈیڈی کا بستر، ان کا وارڈ روب، ان کا بریف کیس اور سوٹ کیس، سب چیزیں اسی طرح محفوظ رکھی تھیں ۔ جن کے لمس آج بھی رما کے لیے ڈیڈی کے پسینے کی مہک بسی ہوئی تھی ۔

شادی کے بعد رما آنند چھتری والی کوٹھی میں تھوڑے ہی دن رہے ۔ رما کے ڈیڈی کے ایک دوست جرمنی میں مقیم تھے ۔ کے اثر سے آنند کو جرمنی میں ایک کمپیوٹر بنانے والی فرم میں بڑا اچھا آفر مل گیا ۔ ٹریننگ بھی تھی اور جاب بھی ۔ چار مہینے ہی اس نے رما کو بھی بلا لیا ۔ اکیلے نہ رہا گیا ۔ ان دنوں یورپ میں تھیٹر کی دنیا نئے نئے ٹرینڈز سے روشناس ہو چکی تھی ۔ جدید کے ڈرامے لکھے اور کھیلے جا رہے تھے ان کی کشش بھی تھی جو رما پی ایچ ۔ ڈی کا کام ادھورا چھوڑ چھاڑ جرمنی چلی گئی ۔ مگر نی میں آنند کا دل نہیں لگا ۔ عجیب بے قرار طبیعت پائی تھی اس نے ۔ ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ جرمنی

انگلینڈ اور پھر چھ مہینے بعد سنگاپور چلا گیا۔ جہاں ڈیڑھ سال تک رہا۔ ہر مرتبہ اسے پہلے سے بہتر ملازمت ملی، تمام آسائشوں کے ساتھ۔ رما بھی ساتھ تھی۔ مگر ہر جگہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کا جی اچاٹ ہوجاتا۔

ڈیڈی ریٹائر ہوکر دلی آگئے تھے۔ ان سے ملنے رما ہر تیسرے چوتھے مہینے ضرور آجاتی۔ کبھی آنند کے ساتھ بزنس ٹرپ پر، اور کبھی اکیلی ہی۔ منورما اور رنجنا کی شادیاں ہوگئی تھیں۔ اور دونوں امریکہ میں رہ رہی تھیں۔ کوٹھی میں ڈیڈی کے ساتھ بس موسی رہ گئی تھیں۔ انھیں بھی بیٹیاں امریکہ بلا رہی تھیں۔ رما اور آنند بھی سوچ رہے تھے کہ چند دنوں کے لیے ڈیڈی کو سنگاپور بلالیں۔ مگر یکایک ڈیڈی چل بسے۔ اس جاں کاہ صدمے کے بعد دونوں دلی واپس چلے آئے۔ اور موسی امریکہ چلی گئیں۔

سنگاپور کے ایک دوست اسوانی نے آنند کو حیدرآباد چلے آنے کو لکھا، جہاں اس کے ساتھ وہ ایک فینانسنگ فرم شروع کرنا چاہتا تھا۔ رما اور آنند دلی چھوڑ کر حیدرآباد چلے آئے۔ اور یہیں کے ہو رہے۔

اجنبی سمندروں کے غیر مانوس پانیوں سے نکل کر زندگی کی ناؤ اب ایک پرسکون جھیل کی نرم لہروں میں بہہ رہی تھی۔ ہر قسم کی فراوانی تھی، پھر نیل کمل دنیا میں آئی تو جیسے اس کی برکت سے آنند کا بزنس اور وسیع ہوگیا۔ رما کا قلم ان دنوں پوری توانائی کے ساتھ رواں دواں تھا، دیس بدیس کے مشاہدوں اور تجربوں نے ذہن و فکر کو نئی آب و تاب سے ہم کنار کردیا تھا۔ اس کے ڈراموں اور کہانیوں سے ادب کو نئی جہتیں مل رہی تھیں۔ اور پھر ان ہی دنوں منوج نے بھی حیدرآباد کو اپنا ٹھکانہ بنالیا۔ کلکتے میں بیوی کی بے وفائی سے اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ ملک کے بڑے بڑے اخباروں کے اونچے آفر اس کے پاس موجود تھے، مگر وہ اپنے ماما کے پاس حیدرآباد چلا آیا۔ ماما نے ہی اس کی پرورش کی تھی، اور اب وہ بوڑھے ہو چلے تھے۔ ۔ ۔ یوں بھی اب وہ اخباروں کی دنیا کی سیاسی بازی گری، شب و روز کی مصروفیتوں اور ذمہ داریوں کے تناؤ سے تھک چکا تھا۔ ماما کے ساتھ رہتے ہوئے منوج نے اپنا چھوٹا سا آفس کھول لیا، اور فری لانسنگ کرنے لگا۔ اس کے آرٹیکلس جرنلزم کی دنیا میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔

آنند اور رما سے ملاقات ہوئی تو پرانے مراسم اور استوار ہوگئے۔ آنند منوج کی خوبیوں کا گرویدہ دلی کے زمانے سے ہی تھا۔ اب اور بھی قربت بڑھ گئی۔ شہر کی قدیم سوسائٹی آف فائن آرٹس رما کے ڈراموں کو اسٹیج کرنے کا اہتمام کرتی، اور منوج کے ریویوان کی شہرت دور دور تک پھیلا دیتے۔

آنند اور رما اب جوبلی ہلز پر اپنے نئے مکان میں رہنے لگے تھے جس کی تعمیر میں رما کے ذوق کو ملحوظ رکھا گیا تھا۔ اس کی آرائش اور زیبائش بھی رما نے اپنی پسند سے کی تھی۔ نیل کمل اب سیانی ہوچلی تھی۔ اس کا پبلک اسکول زیادہ دور نہیں تھا، پھر اس نے ضد کر کے اسکوٹر خریدلی تھی، موٹر کی بجائے اپنی اسکوٹر پر جانے میں اسے لطف آتا تھا۔

جس سال آنند کا پلین کریش ہوا، رما کا نام بھی ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ کے لیے پیش ہوا تھا، مگر انعام دھیرج گھوش کو اس کے ناول "رات کے مسافر" پر ملا۔

آنند کی موت پر سب ہی دم بہ خود رہ گئے۔ آنند اور رما کی محبت کی مثال دی جاتی تھی۔ مگر رما نے اس عظیم صدمے پر نہ کوئی صف ماتم بچھائی، نہ آنسو بہائے، نہ کسی سے ہمدردی کی طلب گار ہوئی۔ بس نیل کمل کو سینے سے لگائے سارے طوفان کو اپنی خاموشی کی چادر میں لپیٹ لیا۔ ۔ ۔ بس خاموشی۔ صرف خاموشی۔ ۔ ۔ اور دبے پاؤں پھیلتا سناٹا۔ ۔ ۔

○●○

نمیتا سنگھ

ترجمہ : قاسم ندیم

اس کا خواب

نئی شادی کے بعد جب وہ اپنی بیوی کو لے کر پہلی بار اپنے گھر آیا تو یکایک اسے شرم آنے لگی ۔ ٹیکسی سے اتر کر وہ سی والے کو پیسے دے رہا تھا ۔ اس کی بیوی اتر کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی اور دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ دونوں مکانوں میں ے اس کا کون سا مکان ہوسکتا ہے ۔ اسے کہیں شوہر کے نام کی تختی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی ۔

ٹیکسی والے کو پیسے دے کر اور اس سے بقیہ پیسے لے کر وہ بیوی کے پاس آیا تو اس کی آنکھوں میں سوالیہ نشان تھا ۔ اس بڑے پیار سے اس کی چوڑو کو اپنے ہاتھوں کے گھیرے میں لیا جیسے اپنی حفاظت میں لیا ہو اور کہا "آؤ چلتے ہیں ۔"

دو تین مکانوں کے بعد دائیں اور ایک گلی تھی ۔ اس میں چار مکان چھوڑ کر پانچواں مکان اس کا تھا ۔ نیچے سے زینہ اوپر ا تھا ۔ دو موڑ والا ۔ گھماؤ دار زینہ تھا ۔ نسینے کے دروازے پر اس کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی ۔ جب وہ لوگ نسینے کے قریب پہنچے ۔ اس نے نیچے لگی ہوئی گھنٹی کا بٹن دبایا تو اوپر کھڑکی سے ایک چہرہ نمودار ہوا ۔

ان کا لو میرج ہوا تھا ۔ اس کی بیوی کے خاندان کی حیثیت ان لوگوں کے خاندان سے زیادہ تھی ۔ بیوی کے والد انجینیر ۔ بھائی جوتیر انجینیر تھا ۔ گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی اور مفت کے نوکر چاکر رہتے تھے ۔ وہ ابھی بینک میں لگا تھا اور اس کی نیت صرف ایک کلرک کی تھی ۔

ویسے اس کی تمنگے پڑھنے کی تمنند تھی ۔ وہ ادب کا طالبِ علم تھا اور پڑھنے میں تیز تھا ۔ شاعری کا شوقین ۔ اسے نظمیں نے کا شوق بھی تھا لیکن وہ طویل راستہ تھا ۔ معشوقہ سے شادی کرنے کے لیے ایک عدد نوکری کا ہونا ضروری تھا ۔ بینک کے بان میں شریک ہوا ۔ کامیاب ہوکر کلرک بن گیا ۔ یوں کہنے کو تو کلرک تھی لیکن بیوی کے گھر والوں نے صبر کرلیا کہ چلو بینک نوکری میں تنخواہیں اچھی ہوتی ہیں ۔ ترقی کرے گا تو جلد ہی منیجر بھی بن جائے گا ۔ پھر تنگی کا کیا ہے ۔ اگر آپ ذہین ہیں تو جگہ آپ کما سکتے ہیں ۔

بیوی جب زینہ چڑھ رہی تھی تو اسے لگا کہ وہ کوئی پہاڑی دکھائی دے رہی تھی ۔ پھر یہ زینہ ۔ وہ ایک بار جب اس کے ے آیا ۔ وہ نکلا تو وہ اپنے آپ کو اندر سے شکستہ ہوا محسوس کرنے لگا ۔ شاید ۔ یہی ایک ڈھنگ کا مکان مل پایا ۔ دراصل ے دماغ میں یہ تھا کہ مکان جیسا بھی ہو آرام دہ ہونا چاہیے ۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اچھے ماحول میں ہونا چاہیے ۔

"بہترین ! بڑا آرام دہ ہے ۔" بیوی نے کہا ۔ کہتے کہتے قلب جلد جیسی سیڑھیاں چڑھتا دیں ۔"

"ہاں ! بس یہی خرابی ہے کہ اوپر مکان ہے ۔ لیکن یار ، شہر کے سب سے اچھے محلے میں ہے یہ مکان ۔ سوائے اس زینے کے ، تم خود دیکھ لو ، مکان اندر سے کتنا اچھا ہے ۔"

سچ مچ مکان اچھا تھا ۔ تین کمرے ، ایک برآمدہ ، بڑا سا کچن ، بڑی سائز کا باتھ روم ، بیوی خوش ہوگئی ۔ لیکن ناراضگی برقرار تھی ۔ اس کی بیوی نے گراؤنڈ فلور کے مکان کی فرمائش کی تھی ۔ دراصل اس کی خود بھی دلی تمنا تھی ۔ لیکن کیا کرتا ، مجبور تھا ۔ شہر کی گھنی آبادی میں پورا مکان مل سکتا تھا لیکن وہاں کا ماحول ، باپ رے باپ ۔ مکان تو اسے ستے علاقے میں ہی لینا تھا ۔ پاش علاقے میں ۔ اچھے لوگوں کے درمیان رہنے کی بات نرالی ہے ۔ لیکن یہاں اس محلے میں نیچے کا مکان یعنی آدمی تنخواہ کرائے پر خرچ کردو ۔"

شام کو وہ آفس سے آتا ۔ بیوی چائے بناکر لاتی ۔ باہر چھت پر بید کی کرسیاں اور میز ڈال کر وہ بیٹھتے ، باتیں کرتے ، چائے پیتے ۔ وہ اکثر بات کرتے کرتے اپنی بیوی کا چہرہ ہی دیکھتا رہ جاتا ۔ اس کی بیوی اگر چہ بہت خوب صورت نہیں تھی مگر وہ پھر بھی دل کش تھی ۔ اسے بناؤ سنگھار کی تمیز تھی ۔ جب وہ گھنٹی بجاتا تو اوپر کی کھڑکی سے اس طرح جھانکتی جیسے پہلے دن اس کی آمد پر نوکرانی نے جھانکا تھا ۔ وہ اسے دیکھ کر مسکراہٹ چہرے پر لے آتی ، پھر دروازہ کھولتی ۔ شاعرانہ مزاج تو اس کا تھا ہی ، اسے دیکھ کر وہ خوش ہوجاتا ۔

سامنے ایک بڑا لان ہو ۔ ایک کونے میں گل مہر کا اور دوسرے کونے میں الماس کا پیڑ ہو ۔ ہری ہری مخملی گھاس ، پھولوں سے بھرا ہوا باغیچہ ، پرانے قلعوں میں جیسے کنگورے ہوا کرتے ہیں ویسے ہی کنگورے دار منڈیر والی چھت ہو ۔ وہ جب آتے تو اوپر کنگوروں کے بیچ سے بیوی کا جھانکتا ہوا چہرہ اسے دکھائی دے ۔ پھر ہری بھری گھاس پر کرسیاں ڈالیں وہ لوگ شام کی چائے پیتے رہیں اور ان کے پیارے پیارے بچے لان میں چڑیوں کی طرح دوڑتے پھدکتے پھریں ۔ اسے اپنی محبوبہ جو اب بیوی تھی ، راجستھانی فن کی تصاویر میں بھی ہوئی لگتی ۔ لمبوترا چہرہ ، ابھری گالوں کی ہڈیاں ، چکنی صاف جلد ، بڑی بڑی آنکھیں ۔ اسی لیے چھت پر بیٹھ کر چائے پیتے پیتے وہ اس کے چہرے کی جانب یک ٹک دیکھنے لگتا ۔

ایک بار اس نے اپنے خواب کے بارے میں اپنی بیوی سے ہچکچاتے ہوئے بتایا ۔ وہ بہت خوش ہوئی ۔ اس کی پیٹھ ٹھونکنے کے انداز میں اس نے کہا " تو اس میں شرمانے یا پریشان ہونے کی کیا بات ہے ؟ اب ایسے گئے گزرے تو ہم لوگ ہیں نہیں ۔ اچھی خاصی تمھیں تنخواہ ملتی ہے ۔ ابھی خاندان کی ایسی ذمہ داریاں بھی نہیں ہیں ۔ خود بھی دھیان رکھو اور لوگ باگ سے بھی کہہ رکھو ۔ کہیں کوئی ڈھنگ کا پلاٹ ہو تو خرید لیں گے ۔ مکان بھی دھیرے دھیرے بن ہی جائے گا ۔ اسے آئیڈیا اچھا لگا ۔ بینک میں آنے جانے والے لوگوں اور دلالوں سے اس نے اپنی آرزو کا اظہار کردیا ۔ تبھی اسے کسی نے مشورہ دیا کہ ایک سرکاری کالونی بن رہی ہے ۔ شہر کے بالکل بیچ میں ہے ۔ ہر کام کی جگہ نزدیک ہے ۔ پیسہ جمع کروا کے مکان بک کروا لو ۔ دو ایک سال میں تین منزلہ عمارت بن جائے گی اور نمبر آنے پر ایک فلیٹ اپنا ہوجائے گا ۔

دھت ترے کی ! یہ سرکاری فلیٹوں میں ہم نہیں رہیں گے ۔ ہر روز پڑوسیوں کی چخ چخ ۔ ایک دوسرے کے گھر تاکتا جھانکی ۔ ہمارے گھر میں کیا پکا ، یہ بات پڑوس بتادے گا ۔ اور پھر تین منزلہ عمارت ! ہماری رانی کہاں کس باغیچے میں ٹہلے گی ۔ اس نے مذاق میں اس بات کو ٹالنا چاہا ۔ ایسا کرو کہ سب سے نیچے کی منزل کے مکان کے لیے رجسٹریشن کروادو ۔ تھوڑا پیسہ زیادہ لگے گا ۔ ضرورت پڑنے تو رجسٹریشن کلرک کے ہاتھوں میں کچھ رکھ دینا ۔ تھوڑی بہت زمین ہوگی نیچے کے فلیٹ کے ساتھ تو ہمارے راجا اسی میں چھوٹی سی پھلواری لگادیں گے ۔ بیوی نے مذاق کا جواب مذاق میں دے کر بات بنانی چاہی ۔

" ہنسو مت یار " زندگی میں ایک ہی تو تمنا ہے میری ۔ ایک اچھا بڑا سا مکان ۔ اسے بھی تم ختم کرنا چاہتی ہو ۔

" چلو ، جیسی تمھاری مرضی ۔" اور بیوی نے بات ختم کردی ۔

اس درمیان اس نے کسی کار آمد پلاٹ کے لیے بھاگ دوڑ تیز کردی ۔ کچھ ہی مہینوں بعد محنت رنگ لائی ۔ کسی نے اسے خبردی کہ شہر کو جس اور سے بڑھانے کا ماسٹر پلان ہے ، ادھر کچھ کالونیاں بنائی جارہی ہیں ۔ انھیں میں سے سوچ سمجھ کر ایک ایسی کالونی میں اس نے پلاٹ لے لیا جو سب سے پہلے بسنے والی تھی ۔ اس میں مکان بننا شروع ہوگئے تھے ۔

اس کالونی میں پلاٹ دو درجوں میں موجود تھے ۔ بڑے پلاٹ بہت کم تھے ۔ اس کے ساتھ ہی کچھ دیگر شناساؤں نے بھی پلاٹ خریدے ۔ سب نے چھوٹے چھوٹے پلاٹ خریدے تھے ۔ کون سا پلاٹ خریدا جائے ۔ اس بات پر پھر غور و خوض کیا گیا ۔ اس کی بیوی کا کہنا تھا کہ دوسرے درجے والا پلاٹ خریدا جائے ۔ اسی درجے میں اس کے کئی دوستوں نے بھی پلاٹ خریدے ہیں ۔ اچھا رہے گا ۔ جانے بوجھے لوگ پڑوس میں ہوں گے ۔ اس نے کہا تھا " بڑا پلاٹ نہیں لیں گے تو ڈارلنگ ، اپنا لان نہیں بن پائے گا ۔"

" کیسی بات کرتے ہو تم ! نقشے میں دیکھا نہیں ؟ لان کی جگہ چھوڑی گئی ہے ان پلاٹوں میں بھی ۔"

" یار ، میرا خواب ہے کہ ایک بہت اچھا لان ہو ۔ اس کے سامنے سفید سنگِ مرمر سے بنایا گیا برآمدہ ۔ بڑھیا مکان ۔ اوپر کھلی ہوئی چھت ۔ میں جب آؤں تو تم اوپر سفید پتھروں کی ریلنگ سے جھانکتی ہوئی دکھائی دو تو کسی بادشاہ سے کم نہیں سمجھوں گا میں خود کو ۔"

بیوی ہنسنے لگی ۔ اس کے دانت اب بھی ویسے چمکتے تھے ۔ لیکن ہنسی اتنی تازگی بھری نہیں لگتی تھی ۔ یہ فطری تھا ۔ ایک بچہ اب ان کی فیملی میں شامل ہوگیا تھا ۔ کام کا بوجھ تو بڑھنا ہی تھا ۔ اب اس کے گھر واپس آنے پر کھڑکی سے بیوی اور اس کی گود میں بیٹا دونوں ہی نیچے جھانکتے تھے ۔

طے یہ ہوا کہ بڑا پلاٹ ہی خریدا جائے گا ۔ اب ایک تو بڑے پلاٹوں کی قیمت زیادہ ۔ پھر اس کی تعداد کم ، جس کی وجہ سے پلاٹ کم اور خریدار زیادہ ۔ وہ لوگ بازی مار لے گئے جو بلیک میں پیسہ دے سکتے تھے ۔ جس دن بڑے پلاٹ کی ملکیت کے کاغذات اسے ملے ، اس دن فخر سے اس کی چھاتی پھولی ہوئی تھی ۔ باقی سب کچھ تو اس کے منصوبے کے مطابق تھا ۔ لیکن گڑبڑ بس یہ ہوئی کہ جتنی جمع پونجی تھی ان کے پاس ، اس سے زیادہ پیسہ لگ گیا تھا ، جس کی وجہ سے تھوڑا قرض چڑھ گیا تھا اس کے اوپر ۔

ابھی کافی سال ہیں سروس کو ۔ اس نے سر جھٹکا اور پھر اپنے کام میں لگ گیا ۔ اس نے سوچا ، یہ چڑھا ہوا قرض اتار دے ۔ پھر مکان بنوانا شروع کرے گا ۔ دھیرے دھیرے بنتا رہے گا مکان اس کے منصوبے کے لحاظ سے ۔ اس دوران بے شمار تبدیلیاں ہوئیں ۔ کچھ تو آمدنی بڑھانے کا خیال اور کچھ کام کاج والی عورتوں کا برابری کا درجہ ملنے کی آرزو ۔ بیوی نے ایک کالج میں نوکری کرلی ۔ پڑھی لکھی تھی ۔ پوری صلاحیتیں تھیں اور نوکری کا موقع مل رہا تھا ۔ بیوی نے نئے نئے مکان کے بارے میں پوچھنا بند کردیا تھا ۔ اب اس کے پاس دو بچے تھے ۔ یہ گھر کالج سے نزدیک تھا ۔ کبھی کوئی مسئلہ ہو یا مجبوری ہو ، ایسی حالت میں بچوں کو نیچے مالکِ مکان کے یہاں چھوڑا جاسکتا تھا ۔ وہ اچھے لوگ تھے ۔ جب وہ دونوں کام پر اور بچے اسکول چلے جاتے تو اوپر کا گھر ہونے کی وجہ سے محفوظ بھی رہتا تھا ۔ ایک آدھ بار اس نے نئے مکان کے بارے میں بات کرنا چاہی لیکن بیوی نے ٹال دیا ، بچے تھوڑے بڑے ہوجائیں کہ انھیں اکیلا چھوڑا جاسکے ۔ تبھی نئے مکان کی بات سوچی جاسکتی ہے ۔

وہ خاموش ہوگیا ۔ اس کی سمجھ میں بات آگئی تھی ۔ اس کا خواب برقرار تھا ۔ اس نے چھت پر ڈھیروں پھول والے گملے رکھ کر اسے خوب صورت بنا لیا تھا ۔ جب کبھی فرصت ملتی تو وہ پہلے کی طرح نظمیں پڑھنے کی کوشش کرتا تھا ۔ ابھی بھی شام کو وہ

سب ڈھکے چھت پر بیٹھتے اور چائے پیتے ۔ اس کی بیوی کی مسکان ابھی بھی دل کش تھی ۔ حالاں کہ اس کے دانتوں میں اب چمک جھلملاتی نہیں تھی ۔ دوسرے بچے کے بعد وہ بہت دنوں تک بیمار رہی تھی اور اس کی صحت خراب ہوگئی تھی ۔ تھوڑی موٹی بھی ہوگئی تھی ۔ اب شام کو گھر لوٹتے پر وہ گھنٹی بجانے کی بجائے ہارن بجاتا تھا اور اوپر کھڑکی سے دونوں بچے جھانکتے تھے اور دوڑ کر دروازہ کھولتے تھے ۔ اس کی بیوی کالج سے لوٹ کر کچن میں مصروف رہتی تھی ۔

اب تک وہ پروموشن کی کئی سیڑھیاں الانگھ چکا تھا اور بینک میں منیجر تھا ۔ اب کئی رکاوٹیں دور ہوچکی تھیں ۔ بچے اچھے خاصے بڑے ہوگئے تھے ۔ اس بیچ اس اوپر کے مکان میں تبدیلی لانی پڑی ۔ برآمدہ گھیر کر کمرہ بنوانا پڑا ۔ آنگن میں ٹین کا شیڈ بنوانا پڑا سامان اتنا ہوگیا کہ گھر چھوٹا پڑتا تھا ۔ تبھی اسے ہائی بلڈ پریشر کی بیماری شروع ہوگئی ۔ جس کی وجہ سے اس نے چائے پینا بند کردی ۔ اب شام کو بچوں کے ٹیوٹر آتے اور آنگن میں کرسی ڈال کر انھیں پڑھاتے ۔ وہ آفس سے آکر بیٹھ جاتا اور لیمو پانی پیتا ۔

بیوی ہمیشہ کی طرح اس وقت کچن میں رہتی ۔ بیوی کے گھٹنوں میں درد رہنے لگا ۔ گٹھیا کی شکایت ہوگئی تھی ۔ اسی لیے وہ اپنا کام جلد سے جلد نپٹانے کی فکر میں لگی رہتی ۔ ان کی شادی کو پچیس سال ہوگئے تھے ۔ اس کے خواب میں ایک خواب اور جڑ گیا تھا ۔ وہ اپنی محبوبہ کو شادی کی پچیسویں سال گرہ پر ایک تحفہ دینا چاہتا تھا اور اپنا خواب پایہ ، تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا ۔ اس نے سوچا وہ بیوی کو سرپرائز دے گا ۔ اس نے الماری میں دبے اپنے پلاٹ کا نقشہ نکالا ۔ بالو ، سمنٹ ، ریت ، اینٹ اور لوہے کا آرڈر دیا سپرنٹنڈنٹ کو بلا کر پروگرام طے کیا اور چپ چاپ وہیں پلاٹ پر پہنچنے کا حکم دیا ۔ یہ سارے کام بینک میں اس کے ماتحت نے کردیے تھے ۔ اب وہ چاہتا تھا کہ مکان بننا شروع ہوجائے اور اپنی شکل میں آجائے ۔ پھر ایک دن بیوی بچوں کو لے کر حیرت زدہ کردے گا ۔ وہاں لے جاکر ان سے کہے گا کہ اب دھیرے دھیرے سامان باندھنا شروع کردو ۔ ہم لوگ بس مہینے دو مہینے میں نئے مکان میں شفٹ ہونے والے ہیں ۔

وہ وہاں پہنچا تو لگا جیسے کسی اور کالونی میں آگیا ہو ۔ شہر کے باہر کے پُرسکون ماحول میں جہاں کالونی بنی تھی ۔ اب تک زیادہ چہل پہل تھی ۔ کالونی کے اندر داخل ہونے کے راستے ہی میں ایک گندہ نالا تھا ۔ پہلے ایک نالی ہوا کرتی تھی ۔ جو اب ٹوٹ پھوٹ کر نالے میں تبدیل ہوگئی تھی ۔ چاروں طرف کوڑے کے ڈھیر بکھرے پڑے تھے ۔ وہ ایک سرے سے دوسرے تک چلا گیا ۔ اس کی بغل کا مکان اب ایک شراب کے ٹھیکے دار نے خرید لیا تھا جو کسی قتل کے شبہ میں قید تھا اور پھر ضمانت پر رہا ہوگیا تھا ۔ دوسری طرف کا مکان ایک کچہری کے بابو نے خریدا تھا ، جس نے آگے کے حصے میں دو پلاٹ نکال کر دو فلیٹ نما گھر بنالیے تھے اور کرایے پر اٹھا رکھے تھے ۔ اس کے خالی پلاٹ میں اس نے اپنی بھینسیں باندھ رکھی تھیں ۔ کیسے کیسے لوگ یہاں آکر بس گئے ہیں ۔ کہاں وہ پوش کالونی اور اس کا خوب صورت نقشہ ۔ بالکل بنجاروں کی بستی لگتی ہے یہ ۔"

وہ بہت بے چین تھا اور اپنی بیوی کو ساری باتیں بتانا چاہتا تھا ۔ جب وہ لوٹ کر آیا تو نہ جانے کس خیال اس نے بیل کے بٹن پر ہاتھ رکھا اور کسی پرانی عادت کے تحت اوپر دیکھا ۔ کھڑکی سے ایک عورت نے جھانکا ۔ سپاٹ چہرہ ۔ تناؤ سے بھرپور ۔ پھر ایک تھکی ہوئی بیمار آواز جو اس کے بیٹے کا نام لے کر دروازہ کھولنے کو کہہ رہی تھی ۔ اسے یاد آیا ، اس کی بیوی کے گھٹنے کا درد آج صبح سے بہت بڑھ گیا تھا ۔

وہ کمرے میں آکر ڈھیر ہوگیا ۔ اس نے چاروں طرف دیکھا ۔ بیوی بستر پر لیٹی تھی ۔ اسے اس حالت میں دیکھا تو کہہ اٹھی کیا بات ہے ؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ؟ بلڈ پریشر چیک کروالیجئے ۔" پھر خود ہی بڑبڑانے لگی ۔ کتنی بار کہا ہے کہ صبح و شام تم

یا کرو ۔ کتنی تو ند نکل آئی ہے ، دیکھو ۔" اس نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا ۔

" سنو ۔ وہ ہمارا جو پلاٹ تھا نا ، وہاں تو ایسی کالونی بس گئی ہے کہ شہر کے کسی پرانے محلے کو بھی مات کردے ۔ ایک تھا ۔ ایک تو سب نے اپنے مکانات آگے بڑھا بڑھا کر زمین ہتھیالی ہیں ۔ گٹر سب بھرے پڑے ہیں ۔ گندے پانی کی نکاسی کا م نہیں ۔ سڑکوں کی بری حالت ۔ ایک دم سلم ایریا ہوگئی ہے کالونی ۔ سلم ۔ پیچھے والوں کی جھونپڑ پٹی لگتی ہے ۔ وہ جگہ ہمارے کے لائق تو قطعی نہیں ہے ۔"

بیوی چپ رہی ۔

سنو یار ۔ میں سوچ رہا ہوں کہ کسی اور جگہ جہاں سکون ہو ، تھوڑا شہر سے الگ ، ایسی کسی کالونی میں پلاٹ لے کر مکان ں ۔ اچھا سا ڈیزائن دے کر ۔ بڑا سا لان ۔ شاندار چھت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بیوی پھر بھی چپ رہی ۔ تھوڑی دیر ۔ پھر آہستہ آہستہ بولی ۔ میرے بس میں نہیں ۔ اب چھت پر چڑھنا اترنا ۔ لان اب یا نہ ہو کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ میرے گھٹنے کا درد تو لگتا ہے میرے ساتھ ہی جائے گا ۔ ہاں ایک بات کی یاد پھر دلا رہی ہوں ۔ جاکر جلد بلڈ پریشر چیک کروالو ۔ ان دنوں کچھ زیادہ ہی محنت کرنی پڑ رہی ہے ۔ لاپرواہی میں کہیں کچھ گڑبڑ ہوگئی تو لینے کے دینے پڑ ں گے ۔" اور بیوی نے کروٹ بدل کر پیٹھ کرلی اس کی جانب ۔ وہ سونا ہی چاہتی تھی ۔ پھر یکایک اس کی جانب منہ کر کے بولی رے خیال سے تو یہ مکان بھی برا نہیں ہے ۔ ایک آدھ سال میں دونوں بچے پڑھنے کے لیے باہر چلے جائیں گے ۔ ہمارے ے لیے اور کتنا بڑا مکان چاہیے ۔" تھوڑی دیر بعد ہی بیوی کے خراٹے اس کی سماعت سے ٹکرانے لگے ۔ ان خراٹوں کی آواز میں کا خوابوں کا مکان ڈھتا ہوا نظر آیا تھا ۔

(○●○)

سلسلہ میں : ۱۹۹۰ء)

گجرال کمیٹی اور اس سے متعلقہ دیگر کمیٹیوں کے کام سے بھی کسی نہ کسی حیثیت میں جڑے رہے اور اردو کی بقا اور ترویج و ت کے سبھی مسائل سے یہ بخوبی واقف ہیں ۔ بڑی لگن ، محنت اور کاوش سے اس سلسلے کی ایک اہم کتاب " گجرال کمیٹی اور اس متعلق کمیٹیوں کا جائزہ " تصنیف کی ہے جس میں سرکاری ، غیر سرکاری ، مقامی ، ریاستی اور کل ہند سطح پر علمی ، ادبی ، تعلیمی ، ی اور تہذیبی زمروں سے وابستہ معاملات و مسائل کا تاریخی سیاق کے ساتھ وقت کے نئے تقاضوں کے تناظر میں جائزہ لے کر سلسلہ باب بہ باب عنوان بہ عنوان پیش کیا ہے ۔ تقریباً سبھی اہم نکات کا احاطہ کیا گیا ہے اور دستاویزی حوالوں سے مزید توضیح و ح بھی کی گئی ہے ۔ اس طرح یہ کتاب ، ایک لحاظ سے ہندستان میں آزادی کے بعد اردو زبان کی بقا اور ترقی کے لیے کی جانے والی ششوں کا ایک بھرپور منظر نامہ ہے جس میں ، اردو کے درد کا ، اخلاص کا احساس ہوتا ہے ۔ آج ہندستان میں اردو تحریک کو نئے ں و سیاق میں سمجھنے اور اسے مزید تقویت پہنچانے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بے حد ضروری ہے جس میں یہ ساری کڑیاں ایک ی زنجیر کی طرح ملتی بھی ہیں اور روشنی کے نئے دریچے بھی کھولتی ہیں ۔ لہذا مجموعی طور سے دیکھا جائے تو یہ جو کچھ بھی ہے جیسا بھی ہے ۔ اجتماعی شعور اور مشترکہ جدوجہد کی دعوت مسلسل بھی ہے ۔

○ صفحات : ۳۰۴ ○ قیمت : ۱۲۵ روپے

○ ملنے کا پتہ : انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر ۲۱۲ راؤز ایونیو ، نئی دہلی ۲

نقد و نظر

[تبصرے کے لیے کتاب کی دو جلدیں روانہ کی جائیں ۔ ادارے کا تبصرہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے]

○ کتاب کا نام : تیرے خیال کی وحدت (شاعری) ○ مصنف : حبیب اجملی ○ تبصرہ نگار : مصحف اقبال توصیفی

ہر خطہ ، زمین کی پانی مٹی اور ہوا کی تاثیر جدا ہوتی ہے ۔ وہ اپنا الگ آسمان تخلیق کرتی ہے ۔ شاید سلطان پور کی فضا میں شعر و ادب کی محفلوں کے چراغوں کی بقا کے لیے وافر مقدار میں آکسیجن موجود ہے ۔ اس شہر کی روشنیاں مجروح سلطان پوری ، نیر سلطان پوری اور اجمل سلطان پوری جیسے اکابرینِ سخن کے خد و خال پر ہی مرکوز نہیں رہتیں بلکہ ساحل سلطان پوری اور حبیب اجملی کے نقوشِ فن بھی اجاگر کرتی ہیں ۔ حبیب اجملی خوش قسمت ہیں کہ انھیں نہ صرف سلطان پور کی گلیاں بلکہ ایک ایسے علم دوست گھرانے کا آنگن بھی ملا جس میں ان کی شاعری کا پودا نشو و نما پاسکے ۔

اس کتاب کا آغاز حبیب اجملی کے نعتیہ کلام سے ہوتا ہے ۔ ان کے قلب و نگاہ ، حضورِ اکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے سرشار ہیں ۔ وہ سرورِ کائنات آنحضورؐ سے اپنی غلامی کے شرف کا اظہار اور اسی وسیلے سے اپنی بخشش کی دعا مانگتے ہیں ۔ انھیں یقین ہے کہ

بہہ جائیں گے گناہ میرے آنسوؤں کے ساتھ　　　دریا ندامتوں کا مری چشمِ تر میں ہے

حبیب اجملی اپنے مذہب کا سچا شعور رکھتے ہیں اسی لیے ان کے دل میں دوسرے مذاہب کا احترام بھی ہے ۔ ان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ کسی سے مذہب ، فرقہ یا جماعت کی بنیاد پر نفرت کرسکیں ۔ شاید انھوں نے نفرت کرنا سیکھا ہی نہیں۔ان کے دل میں ساری انسانیت کے لیے محبت ہے پھر اپنے پڑوسیوں کے لیے یہ جذبہ کیوں نہ ہو ۔

ہمسائے کے صحن میں بھی یہ اپنی چھاؤں بکھیرے　　　جب بھی ہو چھتنار کبھی پودا میرے آنگن کا

حبیب اجملی کی شاعری پڑھتے ہوئے یہ خوش گوار احساس ہوتا ہے کہ غزل کے اکثر شاعروں کے برعکس ان کی شاعری محض ذکرِ لب و رخسار تک محدود نہیں ۔ غمِ جاناں سے زیادہ غمِ دوراں یعنی موجودہ سیاسی و معاشرتی حالات اور ان سے پیدا شدہ ناآسودگی نے ان کے دل و دماغ کو مضطرب رکھا ہے ۔ وہ ایک ناکام عاشق کے بجائے سماج کے ایک باہوش اور ذمہ دار فرد کے روپ میں سامنے آتے ہیں ۔ انھیں اپنی زمین کی مٹی سے پیار ہے اور اپنے تہذیبی ورثے پر ناز ہے ۔ وہ چاہتے ہیں کہ موجودہ سماجی اور سیاسی گھٹن دور ہوسکے تاکہ فرد اور سماج کھلی اور صحت مند ہوا میں سانس لے سکیں ۔ وہ موجودہ مذہبی رہنماؤں اور سیاست دانوں کے نقابوں کے پیچھے ان کا اصلی چہرہ دیکھ سکتے ہیں ۔ انھیں اس بات کا احساس ہے کہ یہ رہنما ملک کو تباہی کے کس موڑ کی طرف لے جارہے ہیں ۔

بند گوداموں میں ہے جنسِ ضمیر　　　اور مہنگائی سڑک تک آگئی ۔

دین کے خادم بھی ہیں ، دنیا کے رشتہ دار بھی　　　دانہ ، تسبیح میں پیوست ہے زنار بھی

حبیب اجملی کی شاعری عشق کی کیفیات سے بھی عاری نہیں ۔ ایسے اشعار کی تعداد کم ہے مگر یہ جتنے بھی ہیں اپنی دل نشینی کے سبب دامن کشِ دل ہیں ۔

نصیب میں جو میسر ہو سایہ ، گیسو تو رکھ کے زانو پہ سر تھوڑی دیر سو رہیئے

ب اجملی کا اسلوب کلاسیکی روایت کا پاس دار بھی ہے، او جدید طرز اظہار سے آشنا بھی ۔ کہیں کہیں ہندی الفاظ کے خوب
ت امتزاج نے ان کے لہجے میں اور بھی گھلاوٹ پیدا کردی ہے ۔ ان کی شاعری میں نہ ایسا ابہام ملتا ہے جو شعوری ہو ، نہ ایسی
، جو پامال ہوچکی ہو ۔ ان کے یہاں روایت کی بہتی ندی میں نئی فکر نئے خیال اور نئے لہجے کے چھوٹے چھوٹے جھرنے اس
شامل ہوگئے ہیں کہ یہ سارا عمل فطری نظر آتا ہے ۔ ان پانیوں کو کوئی صحرا کوئی ساحل نہیں پاٹتا بلکہ ایک ایسا بہاؤ وجود میں آتا
دل و دماغ کو نئے مناظر سے روشناس کرتا ہے ۔ مثال کے طور چند شعر ملاحظہ ہوں :

شفق ، چراغ ، دھندلکے ، ستارے ، جگنو ، اشک جو شام آئی تو کتنے ہی غم گسار آئے
ہے شور ، ڈوب کے سورج نے خودکشی کرلی لگی ہے بھیڑ سمندر کے آس پاس بہت
جب مرتب کر چکا لوگوں کی فہرستِ گناہ آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر میں ڈر گیا
کیوں ہوا میں تیرتی ہیں کشتیاں اب نہیں دریاؤں میں پانی بھی کیا
ہم اپنی صبح کے ہیں انتظار میں کب سے زمین بھول گئی آج اپنا محور کیا
فقط ایک ماں کی ممتا منتظر تھی جو گھر ہم دیر سے کل رات پہنچے

اس مجموعے میں نظمیں اتنی کم ہیں کہ انگلیوں پر گنی جاسکیں ۔ ان کی نظمیں " احساس " اور " میرے احباب " شاید پرانی
ں لیے اظہار میں پھیلاؤ اور مصرعے بکھرے نظر آتے ہیں لیکن " یاد " اور " نیا سال " مرتکز خیال اور نئے طرز اظہار کی حامل
یہ نظمیں ہمیں چونکاتی ہیں ۔ ہماری خواہش ہے حبیب اجملی اور نظمیں لکھیں ۔ اس مختصر تبصرے میں یہ ممکن نہیں کہ حبیب
ل شاعری کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا جاسکے ۔ مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری جذبے کی تازگی اور فکر کی ندرت کے
دل و دماغ دونوں کو متاثر کرتی ہے ۔ ان کی شاعری کا مستقبل روشن ہے ۔

○ ۸ / ۱ ڈیمائی سائز ○ صفحات : ○ قیمت : ۷۰ روپے ○ ناشر : الہدیٰ ایجوکیشنل اینڈ سوشل آرگنائزیشن ۔

ooo

○ کتاب کا نام : کاغذ کی دیوار (افسانے) ○ مصنف : محافظ حیدر ○ تبصرہ نگار : علی ظہیر

محافظ حیدر کسی مخصوص ادبی گروہ سے وابستہ نہیں رہے اور سستی شہرت کی کبھی خواہش نہیں کی اسی لیے نقاد انھیں
رہے اور سمجھتے ہی غیر اہم فضول قسم کے لکھنے والوں کو بڑے بڑے افسانہ نگاروں کی صف میں شامل کرتے رہے جب کہ
ن اور پاکستان کے معیاری ادبی رسائل میں ان کے افسانے پچھلے چار دہوں سے چھپ رہے ہیں ۔
" کاغذ کی دیوار " محافظ حیدر کے تیرہ افسانوں کا مجموعہ ہے جسے تخلیق کار پبلیشرز نے نئی دہلی سے شائع کیا ہے ۔ افسانے
ع اور ٹریٹ منٹ کے لحاظ سے مختلف چنے گئے ہیں تاکہ قاری کو یکسانیت کا شکار نہ ہونا پڑے ۔ پہلا افسانہ " سائے جو بچھڑ گئے
ستان کی آزادی سے ذرا پہلے (جب کہ یہاں کی ریاستوں میں جاگیردارانہ نظام رائج تھا) کے فیوڈل طبقے پر لکھا گیا ہے ۔ افسانہ
نے اس زمانے کے ماحول ، اس طبقے کی نفسیات اور بالآخر اس کے زوال کی بھرپور فن کارانہ انداز میں عکاسی کی ہے ۔ اس طبقے
نے والوں کو وقت کی بدلتی ہوئی رفتار کا کوئی اندازہ ہی نہیں تھا ۔ جب انھیں اس کا اندازہ ہوتا ہے تو بہت دیر ہوچکی ہوتی
" نواب صاحب کو بس اتنا یاد ہے کہ جب سے انھوں نے ہوش سنبھالا ہے اس گکو کلاک کو اسی طرح دیکھتے اور سنتے رہے
یہ گکو کلاک جب اس گھر میں نئی نئی آئی تھی کہ ان کی ماں رات کو ان کے لیے کئی دفعہ اٹھتی تھیں ۔ انھیں گھڑی دیکھے بغیر

ہی وقت معلوم ہوسکے ۔ گو اس کی حیثیت ان کے خاندان کے ایک رکن کی سی تھی مگر ان کے خاندان کے ہر رکن کا روزِ عمل اس کی ہر قسم کی آواز پر میکانکی ہی تھا ۔ کسی نے اس کی طرف سنجیدگی سے توجہ ہی نہیں کی لیکن اس وقت جب کہ نواب صاحب اور ان کی بیٹی کے درمیان ان کے طوفانی خیالات کی وسیع و عریض خلیج حائل ہوچکی تھی ، اس کی ہر پندرھویں منٹ کی پکار ان کو چند لمحوں کے لیے اپنی طرف متوجہ کرلیتی ۔"

"کاغذ کی دیوار" کے افسانوں میں "روح کا جگنو" سب سے مختصر افسانہ ہے لیکن اثر اور ترسیل کے لحاظ سے سب سے زیادہ یاد رہ جانے والا ہے ۔ غالباً اسے یقیناً مابعد جدیدیت کا افسانہ کہہ سکتے ہیں ۔ سائنسی فکر کی بنیاد ہے کہ کائنات رشتوں سے عبارت ہے ، اشیا سے نہیں ۔ کسی شئے ، تجربے یا تصور کی حقیقت کا اس وقت تک ادراک نہیں ہوسکتا جب تک اس کو اس کی پوری ساخت کے رشتے میں پرو کر دیکھا جائے ۔ زمین پر انسان کا سب سے گہرا رشتہ اگر کوئی ہوسکتا ہے تو وہ اس کے پیدا کرنے والے کے ساتھ ہی ہوسکتا ہے ۔ کوسوو کے پس منظر میں لکھا جانے والا یہ افسانہ ایسے رشتے کی تلاش ہے " میرے مصلوب بیٹے میرا مقدس باپ تیری قبر پر کہاں کہاں ڈھونڈ آیا اور کب سے ڈھونڈ رہا ہے ۔ میرے بچے آج ہی تو تو پیدا ہوا ہے ۔ ۔ ۔ اور وہ آواز مجھے اپنے گلے سے لگا لیتی ہے ۔" (افسانہ روح کا جگنو)

سزائے موت پر دوستو فسکی سے زیادہ شاید کسی اور تخلیق فن کار نے نہیں سوچا ۔ محافظ نے اس موضوع کو موت کی اصل حقیقت سے جوڑتے ہوئے ایک کامیاب افسانہ "ڈوبتے ابھرتے تنکے" لکھا ہے ۔ "کسی مہلک حادثے یا لاعلاج حد تک خطرناک بیماری کے مریض کو آخر وقت تک رمق برابر امید ہوتی ہے کہ شاید اس کوئی بات بن جائے گی جس کی بدولت وہ نہیں مرے گا لیکن پھانسی سے پہلے پھانسی پانے والے کے پاس یہ امید قطعی ہی نہیں ۔ فیصلہ ہوچکا ہوتا ہے ۔ تاریخ مقرر ہوجاتی ہے اور مقررہ وقت جوں جوں قریب ہونے لگتا ہے تصور میں پھندہ واضح اور گہرا ہوتا چلا جاتا ہے اور پتہ تک نہیں چلتا کہ اصل پھندے نے اس کی جگہ کب لے لی ۔"

ایک طویل عرصہ سے محافظ حیدر فلمی دنیا سے وابستہ ہیں ۔ انھوں نے کہانی ، مکالمے اور اسکرین پلے سے لے کر ڈائرکشن تک بھی کچھ کیا ہے ۔ میرے خیال میں وہ فلم اسکرپٹ اور اسکرین پلے کے ماہر ہیں ۔ ان کی یہ خوبی ان کے بعض افسانوں میں بھی جھلکتی ہے ۔ افسانہ "ایک سانپ گرہ" میں ہمیں دو چیزوں کا احساس ہوتا ہے ۔ ایک کہانی کی رفتار ، دوسرے بصری مکالموں کی تشکیل ۔ جس طرح ڈرامائی مکالمے اپنے اور صوتی پہلو نمایاں رکھتے ہیں اس طرح فلمی مکالمے بصری پہلو پر زور دیتے ہیں ۔ یہ بات ہمیں انگریزی میں ہیمنگ وے کے پاس بھی ملتی ہے ۔ یہ تکنیک انھوں نے "روز نامچے کا ایک ورق" ، "پاسپورٹ کی شناخت" اور "کاغذ کی دیوار" میں بھی استعمال کی ہے ۔ گو کہ "کاغذ کی دیوار" (افسانہ) میں مکالمے اور کردار دونوں نہیں ہیں لیکن مسلسل بصری ٹکڑوں میں یہ افسانہ بہت کچھ کہہ جاتا ہے ۔

ایک اور بات جو محافظ حیدر کے افسانوں میں قابلِ توجہ ہے وہ ان کی مذہبی حسیت ہے ، یہ روحانیت سے الگ ہے کیوں کہ اس میں مابعد الطبیعاتی عناصر نہیں بلکہ خدا ، بھگوان اور گاڈ کے ماننے والے انسانی کردار ہیں ، ان کی الجھنیں ہیں ، ان کے مسائل ہیں ۔ اس سلسلہ میں "کشمکش" ایک نہایت ہی پُر اثر افسانہ ہے ۔

"کاغذ کی دیوار" عہد کے افسانوی ادب میں ایک خوش گوار اضافہ ہے جس کا خیر مقدم ہونا چاہیے ۔

○ [illegible] ڈیمائی سائز ○ صفحات ، [illegible] ○ قیمت ، [illegible] روپے ○ ناشر، تخلیق کار پبلیشرز، نئی دہلی۔

○○○

کتاب کا نام : سمندر بلا رہا ہے (شعری مجموعہ) ○ شاعر : خیاث صدیقی ○ تبصرہ نگار : ڈاکٹر راشدہ افشاں بیگم

خیاث صدیقی اپنے ہم عصروں میں خاصی امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاحال ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہوچکے ہیں "کا رنگ"، "قفسِ رنگ" اور "سمندر بلا رہا ہے"۔ دیگر زبانوں سے بھی شعری ترجموں میں ان کو مہارت حاصل ہے۔ ہم لگو شاعر شیشیندر شرما کی تلگو نظموں کا ترجمہ "نظم کے پنکھ" کے عنوان سے کیا ہے۔ ان کے شعری مجموعوں میں انگریزی شاعری کے ترجمے بھی شامل ہیں اور واقعی بعض تو عمدہ ہیں بلکہ جواب آپ رکھتے ہیں۔ مثلاً "نظم کے پنکھ" کے شرما کی نظم کا ترجمہ مشمولہ "قفسِ رنگ" و نیز "سمندر بلا رہا ہے" شامل ان کی انگریزی سے مرہٹر کی نظمیں۔

جہاں تک خیاث صدیقی کے اپنے کلام کا تعلق ہے۔ نظم اور غزل دونوں پر ان کی قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔ نظم نگاری اور ارتکازِ فکر کی اہمیت ہے۔ تسلسلِ بیان ضروری ہوتا ہے اور یہ خوبیاں جامع انداز میں خیاث صدیقی کی منظومات میں ملتی ہیں کی تراش خراش اور مصرعوں کا در و بست اپنی جگہ۔ "قفسِ رنگ" میں شامل ان کی منظومات "تکمیرِ ست" [illegible] جیوتی"، "تقاضائے وطن" اور "باطنا البیر اور سمندر بلا رہا ہے" میں ان کی نظمیں "انہیں غم"، "ابرِ کرم" اور "نہر" میں قابلِ ذکر ہیں۔

غزلوں میں خیاث صدیقی کا فن اور نکھر جاتا ہے بلکہ یوں کہیے نظم کے مقابلے میں غزل سے ان کو ایک طرح کی جذباتی ں ہے۔ "عروسِ غزل" اور "دیارِ ہند کی محبوب اسے عروسِ غزل" جیسی شعری تخلیقات سے غزل سے ان کی جذباتی ت مترشح ہے۔ صفی اورنگ آبادی سے شرفِ تلمذ کے باعث فنِ شعر پر گرفت اور کلاسیکی شعری سرمایہ کا ان کا فائدہ ارتکازِ خور نہیں۔ اسی کے ساتھ جدید شعری میلانات سے بھی خیاث صدیقی نے اپنے آپ کو دور نہیں رکھا۔ شعری روایت کو کلام میں جذب کرتے ہوئے عصری میلانات سے بھی خوب خوب استفادہ کیا ہے۔ ان کی شاعری پر ایک طرح کا جو نکھار ہے وہ اسی باعث ہے۔ انھوں نے غزل کو صرف دل کی حکایت نہیں بنایا بلکہ اپنے اطراف و اکناف کے حالات کی تفسیر بھی بنا دیا۔ "سمندر بلا رہا ہے" کی غزلوں سے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہم تو سے عاشقوں میں معتدل تھے لیکن کچھ لوگ
[illegible]

کبھی ... [illegible] ... خیاث
[illegible]

ایک پل کے لیے آنکھیں ترستی رہیں کبھی
[illegible]

[illegible] سے چلے گئے اول گئے
[illegible]

[illegible] بہت مختصر ۔ مجموعہ ساون ایک ۔ (کہانیاں)
مصنف ۔ [illegible] محسن علی ○ تبصرہ نگار ۔ ڈاکٹر بیگ احساس

[illegible] مجموعہ ساون ایک ۔ چند طویل مختصر کہانیوں کا مجموعہ ہے ۔ یہ کہانیاں اپنے [illegible] میں مختلف ہیں ۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر اسکر وائلڈ کی رومانی تحریک کے زیر اثر لکھی گئی [illegible] ممکن ہے یہ اسی عہد میں لکھی گئی ہوں ۔ کیوں کہ پیش لفظ میں مصنف نے اس بات پر زور [illegible] کے بعد بھی کسی فن پارے کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں ہوتی ۔ ممکن ہے یہ اشارہ اس [illegible] کہانیوں کی طرف ہو ۔ پھر مصنف نے انگریزی میں ایک تجویز رکھی ہے کہ جس طرح سگریٹ کی ڈبیہ پر [illegible] لکھا ہوتا ہے کہ سگریٹ نوشی صحت کے لیے مضر ہے اور اس وجہ سے سگریٹ نوشی میں [illegible] اسی طرح ہر نئی کتاب پر ایسی وارننگ درج کرنی چاہیے تاکہ مطالعے کا ذوق بڑھے لیکن [illegible] کیا سگریٹ کا شوق صرف اس وارننگ کی وجہ سے بڑھ رہا ہے ؟

[illegible] "جرف چراغ دہر" ہے ۔ ایک بڑے صحرائے میں ایک نوجوان رہتا ہے جس کا قبیلہ [illegible] ہے ۔ وہ عطروں کا سوداگر ہے اور مختلف قافلوں کے ساتھ سفر کر کے تجارت [illegible] ہے ۔ صحرائے میں قیام کے دس دن بعد ایک نیم جاں جوانی اس سے ٹکراتی ہے ۔ یہ کالی عورت ہے [illegible] کہتی ہے کہ اگر وہ اسے پسند نہیں کرتا تو اس کا خون کر دے ۔ اور وہ اس کا [illegible] مرد ہے یا نہیں ہے ۔ اس کالی عورت کا ایک عراقی عاشق ہے اور اس عراقی عاشق پر ایک [illegible] والا ہے عاشق ہے بالآخر عراقی عاشق کا خون کر دیتے ہیں اور [illegible] کالی عورت [illegible] کے ساتھ بھاگ نکلتی ہے اور [illegible] محسوس کر سکے وہ عطروں والے کو [illegible] کے پیروں میں دم توڑ دیتی ہے ۔ عطروں والے کی جرأت گوارا نہیں کرتی کہ وہ کالی عورت کو [illegible]

[illegible] کی [illegible] سے [illegible] ہے۔ [illegible] کے علاوہ [illegible] کی [illegible]

[illegible] ہے کہ [illegible] نے اس [illegible] کی [illegible] ۔ [illegible] کی [illegible]

[illegible] کی [illegible] کے [illegible] میں [illegible] ہے [illegible] میں [illegible] گیا ہے [illegible]

[illegible] کے لیے [illegible] بہت [illegible] اس کے باپ نے اس کے [illegible]

[illegible] ۔ وہ [illegible] کو [illegible] ہے اپنی [illegible] ہے لیکن اس کی [illegible] نہیں [illegible]

[illegible] ہے اور اس کی [illegible] کی محبت [illegible] ہے۔ [illegible] کہانیاں [illegible] کے [illegible]

یہ تمام [illegible] میں۔ ایک اعلیٰ طبقے کی لڑکی کی کہانی ہے جو عیش و عشرت کی زندگی کی عادی [illegible] ہے۔ کئی مردوں سے [illegible] کے بعد وہ ایک [illegible] کو [illegible] کر [illegible] ہے۔ [illegible] ہے وہ اس زخم کو نہیں بھولتی۔ [illegible] کے پیچھے [illegible] گرتے گرتے ایک [illegible] کی سطح تک [illegible] ہے کہ وہ ایک [illegible] کا [illegible] ہے تو اسے [illegible] کے غم سے زیادہ اس بات کی [illegible] ہے کہ [illegible] گیا۔ [illegible] ایک " ہے

ان کہانیوں کا موضوع مرد سے کوئی تعلق نہیں ایک [illegible] کو [illegible] کے [illegible] کہانیاں [illegible] ہیں۔ ان کہانیوں میں [illegible] زیادہ ہے۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر [illegible] ۔ [illegible] ہے۔ ان کہانیوں کے [illegible] کی [illegible] ۔ [illegible] ادب ۔ [illegible] ہے جس سے [illegible] کے [illegible] ہے۔ [illegible] کے اس [illegible] میں [illegible] ہے کہ [illegible] سے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] گدا کی شکل اس پر واضح ہوجاتی ہے اور جنسی آنکھ مچولی کھیلتی ہے۔ [illegible]
[illegible] کے ساتھ [illegible] ہے جہاں اس کے ساتھی منظور حسین کی محبوبہ صبا، منظور حسین کو جنسی [illegible]
[illegible] قائم کرلیتی ہے۔ ہائی اسکول [illegible] بڑا آدمی بننے شہر جاتا ہے۔ شہر کے کالج کا [illegible]
[illegible] ہے۔ یہاں طالب قسم کے لڑکے عارضی شادی کرتے ہیں۔ ہاسٹل سے بھاگ کر لڑکے
[illegible] کرتے ہیں، [illegible] کے کوٹھے پر جاکر مجرے سنتے ہیں۔ نائٹ بار میں جاکر گدا کا ڈانس دیکھتے ہیں۔ [illegible]
[illegible] جنسی [illegible] حاصل کرتی ہے۔ پادری شراب نوشی کرتا ہے۔ یہ دنیا بڑی عجیب دنیا ہے۔ اس دنیا میں
[illegible] کردار ابھرتے ہیں لیکن یہ دونوں کردار بھی الجھے ہوئے ہیں۔ ان کی نفسیات سمجھ میں نہیں آتی۔
[illegible] کی [illegible] بھی غائب ہوجاتی ہے۔ کلثوم، فوزیہ اور سمی سب مرکزی کردار کو چھوڑ جاتے ہیں۔ ناول
[illegible] ہے، یہ سمجھ میں نہیں آتا۔

[illegible] کے ناول میں واقعات کی بے حد کمی ہے۔ ایک معمولی سے واقعے کے بعد کیفیات و محسوسات
کا تفصیلی بیان [illegible] ہے۔ وہ الفاظ اور تراکیب کا اتنا ڈھیر لگادیتے ہیں کہ واقعات کی کڑی جوڑتے ہوئے دشواری
محسوس ہوتی ہے۔ اس ناول میں ناول نگار نے پاسبانِ عقل کو تنہا چھوڑ دیا ہے۔ اس میں شراب نوشی، شراب
نوشی کے بعد [illegible] کا عمل، محبوبہ کے سراپا کی تفصیل، جنسی کشش و عمل کی تشنگی و تسکین کا بیان ہے
[illegible] حسن کی جھلکیوں سے اس عہد کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ عہد ریاستِ حیدرآباد کی تاریخ کا ایک اہم زمانہ
تھا۔ [illegible] کے بعد جدوجہد اور ایک بڑی تبدیلی کے آثار نمایاں تھے۔ مصنف نے اسے بالکل نہیں چھیڑا
لیکن حقیقت نگاری اور سماجی عکاسی مصنف کا منشا بھی نہیں ہے۔ اگر حقیقت نگاری کے معیار پر اس ناول کو
[illegible] کئی سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں۔ اس ناول میں خارجیت کا نہیں داخلی کیفیات کا بیان ہے۔ یہ اپنے عہد
کے [illegible] سیاسی و سماجی صورتِ حال کا آئینہ دار نہیں ہے بلکہ اس میں انسانی ذات میں پوشیدہ نفسانی خواہشات
[illegible] کی [illegible] کا اظہار ہے۔ جنس انسان کی ایک اہم جبلت لیکن نفسیاتی محرکات کے بغیر جنس کا بیان لذتیت کی
[illegible] بن جاتا ہے۔ جنسی تقاضوں کے زیرِ اثر کرداروں کی زندگی میں کوئی نمایاں تبدیلی بھی نہیں آتی۔
[illegible] کردار ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ چاہے وہ پروفیسر [illegible] کے عاشق کی داستان ہو یا فوزیہ و کلثوم
[illegible] کا قصہ۔ ہر جگہ اسلوب یکساں ہے۔ ویسے انسانی محسوسات کا بیان ایک مشکل فن ہے۔ [illegible]
[illegible] کا اسلوب منظوم ہے۔ زبان [illegible] ہے۔ [illegible] مصنف کو بھی اس کا [illegible]
[illegible] زبان کا ایک [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

مشرقی دنیا کے رنگ ، مشرقی دنیا کی روشنیاں اس سے بکھری ہیں جو ان ہر کہانی میں قائم رہتی ہیں ۔ (ص ۵۰۰)

مجموعی طور پر یہ ناول بے شمار تلخ حقیقتوں کی پر لطف داستان ہے ۔ جو اپنے اسلوب اور انوکھے پن کی وجہ سے یاد رکھا جائے گا ۔

○ ۸ / ۱ دیہاتی مانو ○ صفحات : ۳۳۵ ○ قیمت : ۲۵ روپے ○ ناشر : مکتبہ شعر و حکمت چنچل گوڑہ حیدرآباد

000

○ کتاب کا نام : " گجرال کمیٹی اور اس سے متعلق دیگر کمیٹیوں کا جائزہ "

○ مصنف : خلیق انجم ○ تبصرہ نگار : ابوالفیض سحر

آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو کے متنوع مسائل اور ان کے تحت پیچیدہ لسانی موقف کا جائزہ لینے اور پھر اردو کے فروغ کے لیے مناسب اور نتیجہ خیز سفارشات پیش کرنے کی غرض سے ۱۹۷۲ء میں شریمتی اندرا گاندھی اس وقت کے وزیر اعظم نے ممتاز قومی رہنما اور ہمدردِ اردو جناب اندر کمار گجرال کی صدارت میں ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جو بعد کو ایک تاریخی کمیٹی ثابت ہوئی ۔ اس کمیٹی نے ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کر کے مختلف ماہرین سے مل کر مقامی اور ملکی سطح پر صورت حال کا جائزہ لیا ۔ شہادتیں قلم بند کیں اور ساتھ ہی مناسب تجاویز بھی طلب کیں ۔ پھر ان سب کو اکٹھا کر کے ان پر مختلف زاویوں سے غور و فکر کر کے ، ضروری صلح و مشورے کے بعد ، سرکاری طور سے ایک مبسوط رپورٹ مرتب کی گئی ۔ یہ اہم ذمہ داری جناب [illegible] اور ڈاکٹر خلیق انجم کو سونپی گئی تھی جنھوں نے اس اہم کام کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ۔ اس طرح ایک جامع رپورٹ مرتب کر کے حکومت کو پیش کر دی گئی ۔ واقعی یہ آزادی کے بعد کی تاریخ میں ایک غیر معمولی اہمیت کا واقعہ ہے جس کے دور رس نتائج [illegible] ہوئے ۔ اس کے بعد کیا کیا ہوا کیسے ہوا ۔ ایک طویل قصہ ہے ۔

یہ بہرحال گجرال کمیٹی کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ملک بھر کی سطحوں پر کام ہوا ۔ کئی ذیلی کمیٹیاں بھی بنائی گئیں جن میں بہوگنا کمیٹی اور علی سردار جعفری کمیٹی بطور خاص قابل ذکر ہیں ۔ ان کمیٹیوں نے گجرال کمیٹی کی سفارشات کا جائزہ [illegible]

[illegible]

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

[illegible] کو [illegible] استنل [illegible] کی میٹنگ ہوئی۔ میٹنگ میں مندرجہ ذیل اراکین شریک [illegible] پروفیسر عبدالودود اظہر، پروفیسر اختر الواسع اور پروفیسر نثار احمد فاروقی۔

[illegible] اردو اکادمیوں کی کوآرڈینیشن میٹنگ ہوئی اس میں جن اراکین نے شرکت کی ان کے نام حسب [illegible] جناب صدر نشین، ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ ڈائرکٹر قومی اردو کونسل، جناب کشمیری لال ذاکر [illegible] جناب محمد سعیدی سکریٹری دلی اردو اکادمی، پروفیسر عبدالستار شکیل چیئرمین کرناٹک اردو [illegible] رضوان احمد سکریٹری بہار اردو اکادمی۔

[illegible] قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام سری نگر (کشمیر) میں قومی اردو [illegible] اردو اکادمیوں کی دوسری سالانہ کانفرنس شیر کشمیر انٹرنیشنل کنونشن کمپلیکس میں منعقد ہوئی۔ جس میں [illegible] منظور کی گئیں۔ ان سفارشات میں مختلف ریاستوں کے لسانی اقلیتی کمیشنوں میں اضافہ کرنا اور [illegible] بھی شامل ہے۔ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر حمید اللہ [illegible] کہ ریاستی اردو اکادمیوں کو اپنی ریاستی حکومتوں کے لیے تعلیمی مشیر کی حیثیت سے کام کرنا چاہیے [illegible] گئی ہیں۔ انھیں حقیقت میں بدلا جاسکے۔ یہ کانفرنس [illegible] منعقد کی گئی تھی۔ کانفرنس میں [illegible] ریاستوں کی اردو اکادمیوں کے نمائندوں [illegible]

[illegible]

کونسل کا پروگرام آندھرا پردیش میں عنقریب پانچ اردو کمپیوٹر سنٹر قائم کرنے کا ہے ، جہاں ایڈوانس اردو سافٹ ویر سسٹم کی سہولت رہے گی ۔ یہ سنٹر حیدرآباد ، کریم نگر ، محبوب نگر اور کرنول میں قائم کیے جارہے ہیں ۔

۲۱ تا ۲۲ جولائی ڈائرکٹر قومی اردو کونسل ڈاکٹر حمیداللہ بھٹ اور جناب انوار رضوی پرنسپل پبلکیشن آفیسر قومی اردو کونسل اترپردیش اردو اکاڈمی لکھنو کے خصوصی جلسے میں شریک ہوئے اور اترپردیش اردو اکاڈمی کو اردو کے فروغ کے کاز میں مدد کرنے کی یقین دہانی کرائی ۔

۲۰ تا ۲۴ جولائی قومی اردو کونسل کے دفتر میں پانچ روزہ ورکشاپ ہوا جس میں اردو زبان کے جادو کا جائزہ لیا گیا (اس کھیل کو سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لنگویجس ، میسور نے تیار کیا ہے ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اسے بہت جلد شائع کر رہی ہے)۔

ورکشاپ کی نگرانی و رہنمائی کے فرائض محترمہ شیاملا کماری CIIL نے انجام دیے اور جناب شرف الدین صدیقی (NCPUL) نے رابطے کے فرائض ادا کیے ۔ دیگر اراکین میں محترمہ حلیمہ سعدیہ ، جناب ارشاد احمد ، ڈاکٹر شبانہ نذیر ، ڈاکٹر خالدہ زاہدی اور ڈاکٹر اسرار حسین شامل تھے ۔

" اردو زبان کا جادو " کا جائزہ لینے کے بعد یہ طے پایا کہ وہ کھیل جس میں عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ شامل ہیں انھیں سادہ الفاظ میں بدل کر آسان بنایا جائے ، لہذا ان ۲۸۱ کھیلوں میں سے ۳ کھیلوں کو دوبارہ لکھا گیا ۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ شائع کرنے کے لیے کھیل کو دو جلدوں میں ترتیب دیا جائے گا ۔ ایک ۹ تا ۱۲ سال کے بچوں کے لیے اور دوسرا ۱۳ تا ۱۶ سال کی عمر کے لڑکوں کے لیے ۔

۲۰ سے ۲۴ جولائی جہاں ایک جانب " اردو زبان کا جادو " کا جائزہ لیا جارہا تھا وہیں دوسری جانب ڈاکٹر اوم کارناتھ کول ڈائرکٹر CIIL میسور کی نگرانی میں مراسلاتی اردو کورس کے تعلق سے پانچ روزہ ورکشاپ بھی جاری تھا ۔ اس ورکشاپ میں ڈاکٹر ایس ۔ جمال محمد ، جناب عبداللہ ولی بخش قادری ، جناب منظور عثمانی ، پروفیسر عبدالحق ، ڈاکٹر محمد صابرین ، ڈاکٹر طاہر حسین کاظمی ، جناب شمیم احمد اور جناب عبدالرشید شریک تھے ۔ اس میں طے پایا کہ میسور (NCPUL) کی نگرانی میں مراسلاتی اردو کورس پہلے ہندی میڈیم میں تیار کرے گا بعد میں انگریزی کے بارے میں طے کیا جائے گا ۔

۲۴ جولائی کو قومی اردو کونسل کے دفتر میں اردو پریس پروموشن کمیٹی کی میٹنگ ہوئی اس میں ملک کے اردو اخبارات کے مدیران نے شرکت کی ۔ میٹنگ کی صدارت ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نائب صدر نشین قومی اردو کونسل نے کی ۔ اس میٹنگ میں جناب مقصود علی خاں (سالار ، بنگلور) جناب موہن چراغی (قومی آواز ، دہلی) ڈاکٹر حافظ ماجد حسین (ایکشن ، بھوپال) جناب جمیل اختر نعمانی (سیاست جدید ، کانپور) جناب صوفی غلام محمد (سری نگر ٹائمز ، سری نگر) جناب ایم ۔ احمد کاظمی (میڈیا اسٹار فیچر ایجنسی ، نئی دہلی) اور جناب سموئیل بید (یو ۔ این ۔ آئی) شریک ہوئے ۔

قومی کونسل نے پچھلے ایک سال کے دوران نئے منصوبوں کی تکمیل کے لیے ملک کی ۱۳ اردو اکاڈمیوں کے ثروت مند تجربات سے مستفید ہونے کی کوشش کی ہے ۔ نوڈل ایجنسی کا مرتبہ پانے کے بعد کونسل نے اردو اکاڈمیوں کے مابین رشتوں کو نئی جہات دینے کے سلسلے میں کچھ قدم اٹھائے ہیں ۔ کونسل یہ سمجھتی ہے کہ ریاستی اردو اکاڈمیوں کو وہ رول ادا کرنے کی آزادی ہونی چاہیے جو رول ان کے قیام کے وقت سوچا گیا تھا ۔ اردو زبان کے فروغ اور اردو میڈیم کو استحکام بخشنے کا رول ، تعلیمی ایڈوائزری رول ، قومی کونسل کے ان اقدامات سے ایک ملک گیر نٹ ورک سامنے آیا ہے ۔ قومی تعلیمی نظام میں اردو میڈیم کے استحکام کے لیے (INPUTS) کی فراہمی کے لیے اور حکومت ہند کی پالیسیوں کی عمل آوری کے لیے کونسل برائے علاقائی مراکز کو قیام میں لانے کے بجائے ریاستی اکاڈمیوں سے تعاون کو ترجیح دی ۔ یہ تعاون فکری سطح پر ، مالی معاونت کی سطح پر اور وحدتِ فکر پیدا کرنے کے لیے ہے ۔ اس نٹ ورک کے بعد کونسل کا دوسرا کام اردو پریس پروموشن کا ہے ۔ یو ۔ ین ۔ آئی ۔ اردو سروس کو ملک کے اردو اخبارات تک پہنچانے کے لیے کاوشیں ہوئیں ۔ اب یہ سروس کشمیر سے کلکتہ تک اور عنقریب ممبئی سے حیدرآباد تک اردو پریس میں News & Views میں اپنا حصہ ادا کرے گی ۔ حال ہی میں UNI کو اردو اخبارات کی جانب سے دی جانے والی سبسیڈی کو Rationalise کیا گیا ہے ۔ عام خبروں کے علاوہ اردو بولنے والوں کے مسائل کو اجاگر کیا جارہا ہے ۔

کونسل کے رابطوں کی تیسری جہت اردو کمپیوٹر سنٹروں کا قیام ہے ۔ ملک میں پچاس ایسے کمپیوٹر سنٹر کھولے جارہے ہیں جہاں دیگر سافٹ ویر کے علاوہ اردو سافٹ ویر استعمال ہوگا ۔ دوسالہ کورس کے لیے نصاب ، ہارڈویر اور پروگرام کی تفصیل مکمل ہوگئی ہے ۔ کونسل یہ چاہتی ہے کہ کتابت کو نئے تکنیکل اور جدید تقاضوں سے آراستہ کیا جائے تاکہ اردو زبان کو ترقی ملے اور ہمارے بچے نئی دوڑ میں آگے ہوجائیں ۔

اس موقع پر حال ہی میں سری نگر میں منعقد ہوئی آل انڈیا اردو اکاڈمی کانفرنس کی سفارشات کا اجرا بھی کیا گیا ۔

ماہنامہ **سب رس** حیدرآباد

جلد : ۶۰ نومبر ۱۹۹۸ء شمارہ : ۱۱

تہنیت النسا بیگم زورؔ نمبر

مدیر

مغنی تبسم

معاونین

غلام جیلانی ۔ بیگ

فی پرچہ	: ۱۲	روپے
زرِ سالانہ	: ۱۲۵	روپے
کتب خانوں سے	: ۱۵۰	روپے

مشرق وسطی اور امریکہ	: ۲۵	ڈالر
پاکستان ، برما ، سری لنکا و بنگلہ دیش	: ۱۰	ڈالر
انگلستان	: ۱۵	پونڈ

ناشر : ادارہ ، ادبیاتِ اردو ، پنجہ گٹہ روڈ ، حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۸۲ (اے ۔ پی) انڈیا ۔

کمپیوٹر کتابت ، جے ۔ جے ۔ کمپیوٹرس، مہدی پٹنم ۔ حیدرآباد ۔ / شارپ کمپیوٹرز چادرگھاٹ ، حیدرآباد ۔

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر ، پرنٹر ، پبلیشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے او ایس گرافکس نارائن گوڑہ میں طبع کرواکے ادارہ ، ادبیاتِ اردو سے شائع کیا ۔

اس شمارے میں

شخصیت

شاعری

○●○

○●○ ● ○●○

پہلی بات

ادارہ ، ادبیات اردو کی سرپرست محترمہ تہنیت النسابیگم زورؔ مرحومہ کو نذرانہ ، عقیدت کے طور پر سب رس کا یہ
ص نمبر ترتیب دیا گیا ہے ۔ اس نمبر کی اشاعت میں بعض وجوہ سے تاخیر ہوی ۔ بڑی وجہ یہ ہے کہ چند مضامین دیر سے حاصل
ۓ ۔ اب یہ نمبر مرحومہ تہنیت النسابیگم مرحومہ کی پہلی برسی کے موقع پر شائع کیا جارہا ہے ۔ اس نمبر میں مرحومہ کے مختصر
انحی حالات کے علاوہ ان کی صاحب زادی محترمہ تہذیب یحیٰ فاروقی ، ان کے فرزند سید رفیع الدین قادری صاحب اور ان
حباب و خواتین کے تاثرات شامل ہیں جنھوں نے مرحومہ کی زندگی کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے ۔ ان مضامین کے مطالعے سے
ندازہ ہوگا کہ مرحومہ نہایت دین دار اور پاکباز خاتون تھیں ، اوروں کے دکھ درد میں شریک رہتیں ۔ وہ مشرقی تہذیب اور
رافت کا مکمل نمونہ تھیں ۔ محترمہ تہنیت النسابیگم صاحبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی رفیقِ حیات ہی نہیں رفیقِ کار بھی
یں ۔ وہ ڈاکٹر زور کی تمام ادبی سرگرمیوں میں معاون رہیں ۔ ادارہ ، ادبیات اردو سے انھیں خاص تعلقِ خاطر تھا ۔ انھوں نے
انِ اردو کی تعمیر کے لیے اپنی زمین بہ طور عطیہ دی تھی ۔ وہ ادارے کے شعبہ ، خواتین کے جلسوں میں شریک رہا کرتیں ۔ ڈاکٹر
ر کی وفات کے بعد بھی ادارے کے کاموں سے ان کی دل چسپی برقرار رہی ، ادارے کی تشکیل اور اس کی سرگرمیوں کو آگے
ھانے میں ان کے قیمتی مشوروں اور گراں قدر تعاون کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھیں ادارے کے سرپرست نام زد کیا گیا تھا ۔

مرحومہ ایک باکمال شاعرہ بھی تھیں ۔ انھوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو حمد ، منقبت اور نعتِ رسولؐ کے لیے مختص
دیا تھا ۔ وہ سر تا پا عشقِ رسولؐ میں ڈوبی ہوئی تھیں ۔ ان کے نعتیہ کلام کے تین مجموعے "ذکروفکر" ، "صبروشکر" اور "تسلیم و
ضا" ان کے حینِ حیات شائع ہوچکے تھے ۔ ان کی شاعری قلبی واردات کی ترجمان تھی ۔ ساتھ ہی ساتھ شعریت اور فنی محاسن سے
ی مملو تھی ۔ اس نمبر میں ناقدین اور اہل نظر اصحاب کے مضامین شامل ہیں جن میں محترمہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ کی شاعری
نصوص نعت گوئی کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے ۔ ان کے شعری مجموعے اب نایاب ہوچکے ہیں ۔ انشاء اللہ جلد ہی ان تینوں
وعوں پر مشتمل کلام کو کلیات کی صورت میں شائع کیا جائے گا ۔

ooo

ادارہ ، ادبیات اردو کے شعبہ ، امتحانات کے انچارج جناب وقار خلیل صاحب یکم نومبر ۱۹۹۸ ، بہ روز یکشنبہ رات
ائی بجے بہ عارضہ ، قلب انتقال کرگئے ۔ جناب وقار خلیل مرحوم ڈاکٹر زور کی زندگی ہی میں ادارے سے وابستہ ہوگئے تھے اور یہ
بستگی تادمِ مرگ قائم رہی ۔ انھوں نے ادارے کے مختلف شعبوں میں خدمات انجام دیں ، کچھ عرصہ ماہ نامہ سب رس کے شریکِ
ر بھی رہے ۔ ڈاکٹر زور کی ایما پر انھوں نے بچوں کے لیے کتابیں لکھیں ، ادارے کی مخطوطات کے اشاریے مرتب کیے ۔
ب رس کے لیے وہ " ادارے کی خبریں " اور " وفیات " مرتب کرتے تھے اور " نقدونظر " میں ان کے تبصرے شائع ہوا کرتے تھے ۔

جناب وقار خلیل ایک معروف شاعر او رنثر نگار تھے ۔ " روشنی ہی روشنی " ، " ورثہ " اور " شاعری " ان کے شعری
وعے ہیں ۔ ان کے علاوہ بچوں کے لیے نثر و نظم میں کئی کتابیں لکھیں جن میں مولانا آزاد ، قلی قطب شاہ ، حرف حرف نظم اور
ی ڈالی پھول قابلِ ذکر ہیں ۔

وقار خلیل صاحب کی وفات سے اردو شعروادب کو بالخصوص ادارہ ، ادبیات اردو کو ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے ۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا کرے ۔

(ادارہ)

۴

تہذیب یحییٰ فاروقی

تہنیت النسا بیگم تہنیت

مقدس آغوشِ محبت و عظیم گہوارۂ تربیت

حیدرآباد دکن کی بے نظیر تہذیب و ثقافت، اعلیٰ اقدار و روایات، بلند کردار و معیار اور مخصوص وضع داری کی آخری شمع بہ روز جمعہ ۸ نومبر ۱۹۹۶ء کو گل ہو گئی۔ یہ شمع حیدرآباد دکن کے وضع دار، لائق ترین و سربرآوردہ خاندان میں، اپنے بلند کردار و مجسم اخلاق والد نواب رفعت یار جنگ بہادر یعنی فصیح الدین احمد صدیقی سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا حبِ رسولؐ اور اپنی فرشتہ سیرت و نیک طینت والدہ محترمہ اسما بیگم سے حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا جذبہ، جاں نثاری بہ رسولؐ لے کر بہ روز جمعہ ۲۰ مئی ۱۹۱۱ء کو روشن و فروزاں ہوئی تھی۔

ابتدائی تعلیم اپنی والدۂ محترمہ سے حاصل کی جو نواب نصیر جنگ بہادر اولیٰ قاضی القضاۃ کی صاحب زادی مدینۂ منورہ سے ۹ سال کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ ہند تشریف لائی تھیں جو مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی ماموں زاد بہن تھیں۔ اور تربیت اپنے بے مثال و اعلیٰ اقدار و کردار والد سے حاصل کی تھی۔ پھر "محبوبیہ گرلز اسکول" سے سینیئر کیمبرج کی تعلیم حاصل کی لیکن آگے جاری نہ رکھ سکیں اس لیے کہ اس زمانے میں ان کے خاندان میں سنِ بلوغت کو پہنچنے کے بعد لڑکیوں کا گھر سے باہر جانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ البتہ گھر پر محترمہ رابعہ بیگم انوار اللہ صاحبہ اور امۃ اللہ بیگم صاحبہ سے اور مختلف کتابوں کے مطالعے کے ذریعے دینی و دنیوی علوم سے بہرہ مند ہوتی رہیں۔ ۱۸ نومبر ۱۹۳۲ء بہ روز جمعہ، مشہور مبلغِ دین، صوفی بزرگ اور مقبول واعظ شاہی خطاب یافتہ بہ اعزاز "سرکاری واعظ دکن" حافظ حضرت ابوالبرکات سید شاہ غلام محمد قادری زعم صاحب کے فرزند ارجمند ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور پروفیسر جامعۂ عثمانیہ سے شادی ہوئی اور پانچ لڑکوں اور چار لڑکیوں کو اپنی اولاد ہونے کا شرف بخشا بہ فضلہ تعالیٰ۔

رفیقِ حیات: ڈاکٹر زور صاحب کی تو زندگی ہی فرائضِ منصبی کی عمدہ ادائیگی کے ساتھ ساتھ علم و ادب کی خدمت اور اردو کی ترقی کے کاموں میں بسر ہوئی۔ چناں چہ محترمہ کے علمی و ادبی ذوق نے جلا پائی لیکن شرم و حیا اور گوشہ پردہ کی پابندیوں کو نہیں توڑا۔ باپردہ آپ نے ادارۂ ادبیاتِ اردو کی ہر طرح سے خدمات انجام دیں۔ تمام سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے شعبہ، خواتین کی سرگرم رکن رہیں۔ ادارے کی جانب سے اردو زبان سکھانے کے لیے "اردو دانی" و "زبان دانی" وغیرہ کے جو امتحانات بلدہ و اضلاع میں منعقد کیے جاتے تھے تو خواتین کے امتحانی مراکز کی نگرانی خود کیا کرتی تھیں اور مختلف مقامات پر انتظامات کرواتی تھیں۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو اور ڈاکٹر زور ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے اور یہ کہنا غلط نہیں کہ ادارے کی ترقی میں جتنا ڈاکٹر زور کا ہاتھ ہے اتنا ہی بیگم صاحبہ کا در پردہ ساتھ ہے۔ ہم یہ کہنے میں حق بہ جانب ہیں کہ "ادارۂ ادبیاتِ اردو" ڈاکٹر زور کی جان "کو قالب ہمیشہ تہنیت النسا بیگم ہی کا میسر ہوا۔ یعنی اس کی ابتدا و نشو نما "تہنیت منزل" ہی میں ہوئی۔ پھر جب یہ ادارہ ترقی کی منازل تک پہنچ گیا تو اس کی مخصوص عمارت حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کے عطا کردہ نام" ایوانِ اردو "کے لیے بیگم صاحبہ نے اپنی کروڑوں کی زمین بھی" ادارۂ ادبیاتِ اردو "کو بہ طور عطیہ نذر کر دی۔

نشر گاہ حیدر آباد دکن سے خواتین کے پروگراموں میں "تعلیم نسواں" اور "بہبود خواتین" جیسے مختلف عنوانات پر آپ کی تقاریر نشر ہوتی جاتی تھیں۔ بعد میں آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد سے خواتین کے مشاعروں میں آپ کی نعتیں پڑھوائی جاتی تھیں۔

نواب رفعت یار جنگ بہادر کے بھائی سر نظامت جنگ بہادر وزیر باتدبیر ماہر سیاسیات ہونے کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان و ادب میں اعلیٰ مقام کے باعث "سر" کا خطاب حاصل کیا تھا اور انگریزی کے بلند پایہ شاعر تھے چناں چہ ایک بھتیجے غازی الدین احمد اردو کے بڑے اچھے شاعر تھے لیکن کلام کتاب کی شکل میں چھپانہ تھا کہ انتقال کر گئے۔ دوسری شاعرہ محترمہ تہنیت النساء بیگم تھیں جو حب رسول سے سرشار تھیں۔ جس کے باعث نعت گوئی کا شرف حاصل ہوا چناں چہ اردو شاعری میں پہلی صاحب دیوان نعت گو شاعرہ کی حیثیت حاصل ہوئی۔ ان کی نعت گوئی کے متعلق اس عہد کے مایہ ناز نعت گو شعرا اور ناقدین ادب نے بہت کچھ لکھا ہے اور آئندہ بھی لکھتے رہیں گے لیکن تین مجموعوں کے بعد کا کلام طبع نہ ہو سکا تھا۔ دنیوی نام و نمود اور شہرت کی قائل نہیں تھیں۔ دین و مالک یوم الدین کی طرف مائل ہو گئی تھیں۔

بہ روز جمعہ بہ تاریخ ۸ نومبر ۱۹۹۶ء جب اچانک یہ خبر ملی کہ ہماری والدہ صاحبہ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اپنے لب پر رب کا نام لیے اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں تو دل و دماغ پر ایک ضرب سی پڑی، ایک دھچکا سا لگا اور ایسا محسوس ہوا جیسے سب کچھ ختم ہو گیا۔ ایک عہد ختم ہو گیا۔

وہ عزم و ہمت و استقلال کی چٹان، وہ صبر و تحمل کا پیکر، وہ عظیم المرتبت شخصیت، گنجینۂ محبت و شفقت، مجسم نیکی و شرافت، سراپا سنجیدگی و متانت، وہ پیکر شرم و حیا، وہ نمونۂ وفا شعاری، وہ نرم خوئی و شیریں گفتاری، وہ قناعت پسندی و شکر گزاری اور وہ تصویر عجز و انکساری آنکھوں کے آگے گھومنے لگیں۔

ذہن ماضی کی طرف گھوم گیا، بچپن، لڑکپن اور جوانی کی یادوں کے ہجوم نے مختلف زاویوں سے ذہن کے تاروں پر مضراب کا کام کیا کبھی تار چھڑ گئے۔ ہر قسم کے سر جھنجھنا اٹھے۔ ذہن میں سینکڑوں خیالات، ہزاروں جذبات اور لاکھوں تصورات کی جھنکار ہونے لگی۔ یادوں کے بے شمار دریچے کھل گئے۔

ماں ایک عظیم ہستی ہوتی ہے۔ ہر بچے کے اپنی ماں کے متعلق گہرے تاثرات ہوتے ہیں۔ اولاد کی صحیح تربیت کے لیے والدین کی نصیحت و فضیحت سے زیادہ ان کا اپنا کردار اور طرز زندگی، ان کے اپنے اخلاق اور ان کے اپنے اعمال کار فرما ہوتے ہیں۔ اپنی والدۂ محترمہ کے انداز تعلیم و تربیت کی موہوم سی جھلک پیش کرنا چاہتی ہوں جو آج کل کی ماؤں کے لیے مشعل راہ ثابت ہو سکتی ہے۔

آج کل مائیں دو بچوں میں پریشان ہو جاتی ہیں لیکن ماشاء اللہ نو بچوں کی ماں ہونے کے باوجود ہم لوگوں نے اپنی والدہ کو کبھی حیران پریشان یا جھنجھلاتے، بڑبڑاتے نہیں دیکھا۔ ان کے مزاج میں نظم و ضبط، صبر و تحمل بے حساب تھا۔ انھوں نے بہت ہی محبت و شفقت اور سکون سے ہم سب کی پرورش کی۔ کمال کی بات یہ تھی کہ کبھی بے جا لاڈ پیار اور محبت کا غیر معمولی اظہار نہیں کیا۔ ان کا انداز ہی مشفقانہ، نرم اور محبت بھرا ہوتا تھا۔ بہت ہی ملائم انداز میں سمجھاتی تھیں کہ دل پر اثر ہوتا اور خود بہ خود تعمیل ہوتی۔ بلکہ اکثر ہماری تربیت اشعار کے ذریعے کرتی تھیں۔ بچپن کی بات آج تک یاد ہے، کہتیں "ایسی بات نہ کہہ کہ کوئی چپ کہے، ایسی چال نہ چل کہ کوئی رک کہے، ایسی جا نہ بیٹھ کہ کوئی اٹھ کہے۔ کسی موقع پر "صحبت نہ رکھ بروں سے کہیں گے برا تجھے" ہمدردی اور خیال کے لیے کہتیں "درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو"، "دیکھ کر چلنا کچل جائے نہ چیونٹی راہ میں"، "آدمی کو بے زبانوں سے بھی الفت چاہیے۔" مختصر یہ کہ اقوال زریں، کہاوتوں، مثالوں اور بزرگوں کے واقعات کے ذریعے اس عمدگی سے تربیت دیتی تھیں کہ اثر لازمی تھا اور خاطر خواہ فائدہ ہوتا تھا۔

انتہائی بے ضرر مرنجاں و مرنج طبیعت واقع ہوئی تھیں۔ فتنہ فساد، لڑائی جھگڑے سے کوسوں دور رہتی تھیں اور نصیحت کرتی تھیں کہ جہاں لڑائی جھگڑا ہو رہا ہو وہاں سے ہٹ جانا چاہیے۔

بچوں کی تعلیم میں بہت دل چسپی لیتی تھیں اور ان پر پوری توجہ دیتی تھیں۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ جب لکھنا شروع کیا تو ہمارا ہاتھ پکڑ کر صحیح اور درست لکھوایا کرتی تھیں۔ کونسا حرف کتنا لمبا، کتنا چھوٹا، کتنا گول اور کیسے نقطے ہونے چاہئیں خود ہاتھ پکڑ کر لکھواتی تھیں۔ پڑھائی اور کھیل کے اوقات کا خاص خیال رکھتی تھیں۔ مختلف کھیلوں مثلاً باسکٹ بال، ٹیبل ٹینس اور بیڈ منٹن کے متعلق بھی ہدایات دیتیں اور حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ تعطیلات میں ہمیں سلائی، کڑھائی، بنائی، پینٹنگ، کشیدہ کاری وغیرہ خود اپنے ہاتھوں سے سکھاتیں اور ایسا شوق پیدا کرتیں کہ ہم لوگ چھٹیوں میں بہت کچھ بنالیتے اور سب سے داد و تحسین حاصل کرتے اور یہ سب ہنر آج تک کام آرہے ہیں۔

بزرگوں کی عزت و احترام کا خاص خیال رکھتی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انھیں اپنے بڑوں کی عزت کرتے دیکھ کر ہی ہم لوگوں نے بزرگوں کا احترام سیکھا۔ اکثر کہتیں "باادب بانصیب بے ادب بے نصیب" ہمارے بابا کا بے حد خیال رکھتیں۔ آرام کا خیال کہ جب وہ سو رہے ہوں تو ہم لوگ شور نہ کریں، کھانے پینے کا، پہننے کا، اوقات کی پابندی کا۔ جب کالج سے واپس آتے تو شام میں نوکر چاکر ہونے کے باوجود چائے کے ساتھ کوئی نہ کوئی میٹھی چیز اپنے ہاتھ سے بناکر رکھتی تھیں۔ اس بات کا خیال رکھتی تھیں کہ کوئی بات انھیں ناگوار نہ گزرے اور خود انھوں نے ایسا کام یا ایسی بات کبھی نہیں کی جو انھیں ناپسند ہو۔ بغیر اجازت کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

وہ غیر معمولی قوت برداشت کی حامل تھیں۔ انھیں اپنے جذبات و احساسات پر مکمل قابو تھا۔ کبھی کسی تکلیف، کسی خوشی، غم یا غصے کے وقت آپے سے باہر ہوتے نہیں دیکھا۔ کبھی کسی پر خفا ہوتے یا ڈانٹتے نہیں سنا۔ کبھی کسی کی طرف سے اپنے دل میں برا خیال نہیں لاتی تھیں اور نہ کبھی کسی کی برائی کرتے سنا۔ اگر کوئی ان کے سامنے کسی کی برائی کرتا تو نہایت عمدگی سے بات کا رخ دوسری طرف موڑ دیتیں کہ برائی کرنے والے کو محسوس بھی نہیں ہوتا اور وہ برائی سے بچ بھی جاتا۔

صبر و ضبط و تحمل ان میں بہ درجہ اتم موجود تھا۔ کسی بھی زیادتی کو، کسی بھی تکلیف کو، کیسی بھی کٹھن وقت کو مسکرا کر سہہ لیتی تھیں۔ مروتاً خاموش رہ جاتیں منھ سے کبھی اظہار نہیں کرتیں خواہ کتنی ہی تکلیف دہ بات ہو۔ خوش اخلاق ایسی تھیں کہ خواہ بڑا ہو یا چھوٹا سب سے اخلاق کے ساتھ پیش آتیں، مسکرا کر بات کرتیں، ادب سے سلام کرتیں اور سلام لیتیں۔ احکام خداوندی کی تعمیل خود بھی کرتیں اور ہم سب کو بھی تربیت دیتیں۔ بچوں کو اپنے ساتھ کھڑا کر کے نماز پڑھتی تھیں اور ہمیں یاد ہے کہ شب قدر، شب برات و شب معراج میں فجر تک عبادت و تلاوت، ہم لوگوں کو ساتھ لے کر کیا کرتی تھیں۔ انھیں ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ پر بھروسا تھا۔ ہر وقت کہا کرتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ محنت و جد و جہد کرنا بندے کا کام ہے اس کا پھل دینا اور کامیابی عطا کرنا اللہ کا۔ ہم لوگوں نے انھیں ہمیشہ توکل علی اللہ اور راضی بہ رضاءِ الٰہی دیکھا۔

حب رسول تو ان کی گھٹی میں تھا۔ جب سے ہوش سنبھالا اپنے والدین کی زبان پر نعت کے اشعار سنے۔ محترم بابا صاحب صبح صبح "سبز گنبد کے مکیں میری مدد فرمائیے۔" گنگناتے رہتے تھے اور والدہ مختلف نعتیں پڑھتیں اور ہم لوگوں کو سکھاتی تھیں۔ بچپن میں سب سے پہلی نعت جو سیکھی تھی، یاد کی تھی وہ تھی:

خالق نے دکھائی یہ مسرت کی گھڑی آج
تشریف یہاں لائے رسولِ عربی آج

اس طرح اللہ رسول کی محبت اور پابندیٔ احکامِ خدا اور پیرویٔ سنتِ رسول، ہم سب کے دلوں میں بھر دی۔

ہمارے دادا محترم سید شاہ غلام محمد قادری زعم صاحب حافظ و واعظ جنوبی ہند (جنھیں سرکاری اعزاز وعظ خواں کا عطا ہوا تھا) کے سالانہ عرس میں بہت جوش و خروش سے اہتمام کرواتیں اور امیر غریب سب کو ایک ساتھ کھانا کھلانے اور لنگر تقسیم کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتیں۔ قوالی بھی ہوتی تھی جس میں اللہ رسولؐ کا ذکر اور پند و نصائح سننے میں آتے جو ہم بچوں کی دینی تربیت کا ذریعہ ہوتے۔ اور باتوں باتوں میں قرآن کی تعلیم دیتیں۔ آیات پڑھتیں اور ان کا ترجمہ پھر تفسیر بیان کرتی تھیں۔ تعلیم و تربیت کا عجیب، منفرد اور دل کش انداز تھا۔

مختصر یہ کہ تمام شعبہ ہائے زندگی میں مہارت کی تربیت دی جو اس طرح ہماری سرشت میں سرایت کر گئی کہ اس شمع کی روشن کرنیں، ہم لوگوں کی زندگی میں ہر ہر قدم پر نور بکھیر رہی ہیں اور منزل بہ منزل سفر کو آسان بنا رہی ہیں۔ ہم اپنی عظیم والدۂ ماجدہ کی خدمت میں جتنا بھی خراجِ عقیدت پیش کریں کم ہے کہ:

وہ خالق "ذکر و فکر" بھی وہ مجسمہ "صبر و شکر" کا بھی
وہ پیکر عجز و انکساری، خلوص و تسلیم اور رضا بھی
سکھادیا جس نے ہم کو جینے کا ہر سلیقہ کمالِ فن سے
ملی ہدایت قدم قدم پر ہمیں محبت بھرے سخن سے
خلوص و عزم و خود آگہی و جفاکشی و وفاشعاری
کیا ہے ضم خلق و ذات میں یوں سنوار دی شخصیت ہماری

○ ○ ○

سلسلہ ص: ۱۰ سے)

۔ماں کی دعاؤں، رحمتوں اور برکتوں سے محروم ہو گئے۔

آج سے ٹھیک ۱۴ دن قبل سردی ہوئی ڈاکٹر کاظم حسین صاحب نے جو آج ۳۰ برس سے والدہ صاحبہ کا علاج کرتے آئے ہیں معائنہ کیا ,دوائیں دیں مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ تکلیف بڑھتی ہی گئی۔ والدہ محترمہ نے تاکید کر دی کہ "مجھے دواخانے میں شریک نہ کرانا" ڈاکٹر کاظم حسین ب کا آخری مشورہ یہی تھا کہ صرف دواخانے ہی میں اس کا صحیح علاج ہو سکے گا۔ گلوکوس اور آکسیجن دینا ضروری ہے۔ جمعہ کے دن جب ت اور خراب ہوئی ڈاکٹر نیلا یزدانی دیکھنے آئیں۔ اپنے ساتھ ایک آلہ لائیں اس سے دوا دی گئی مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ اسی دن صبح بڑے بھائی ام کیا ہاتھ ملائے اور کہا کہ تم سب کو اللہ کے حوالے کر رہی ہوں۔ تادمِ آخر سب کو پوچھتی رہیں ہوش و حواس قائم تھے۔ زبان پر اللہ اللہ کا تھا۔ شام سے ہی حالت گرتی جا رہی تھی پھر کاظم حسین صاحب کو تکلیف دی گئی۔ انھوں نے بی پی چیک کیا اور کہا کہ بہت کم ہو گیا ہے۔ مانہ لے جانا چاہیے اس وقت رات کے ۸ بجے تھے پھر والدہ سے پوچھے کہ دواخانہ چلیے تو انھوں نے انکار کیا۔ اس کے آدھے گھنٹے بعد سانس ا ہوتی گئی اور آخر جان جان آفریں سے جا ملی۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون** ۔ محترمہ عاشقِ رسولؐ، خوش خلق، ہنس مکھ، نہایت سادہ ت، بلند ہمت، نفاست پسند، عالی دماغ، صائب الرائے، پابندِ صوم و صلوٰۃ، ہمدردِ بنی نوعِ انساں اور اپنی نظیر آپ تھیں۔

وقتِ رخصت ہم پہ کیا گزری وہ اب تک یاد ہے
چھوڑتے ہی ان کا در تنہا نظر آنے لگے
(تہنیت)

000 0 000

سید رفیع الدین قادری

طوطیِ دکن

محترمہ تہنیت النسا بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور

میری والدہ محترمہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ اس رفیع الشان خاندان کی دخترِ نیک اختر تھیں ۔ جس کے اکثر و بیش تر افراد عالم، فاضل اور بڑی گراں قدر و اہم ترین خدمات انجام دے کر موردِ الطاف و انعاماتِ شاہانِ وقت رہے اور ان میں سے بعض علماء کرام و مشائخین عظام، واعظین و مبلغین گزرے ہیں ۔ اس خاندان کے افراد بہ لحاظ رشد و ہدایات، اعلیٰ معیارِ اخلاق، فضل و کمال، سلطنت ہائے بیجاپور، اورنگ آباد حیدرآباد و میسور میں نہایت عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھے گئے ۔ حیدر علی والیِ میسور اور ان کے بیٹے ٹیپو سلطان نیز شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے اس خاندان سے متوسل ہونے کو اپنی سعادت سمجھا اور احترام کیا ۔ اس خاندان کے حالات شرح و بسط کے ساتھ اکثر معتبر تواریخِ دکن میں موجود ہیں ۔

محترمہ بیگم صاحبہ کا ددھیالی سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے ۔ آپ کے جدِ اعلیٰ ملا عطا اللہ محمود ساتویں صدی ہجری میں اپنے چند افرادِ خاندان کے ساتھ عرب سے بخارا ہوتے ہوئے سلطان معزالدین سام کے عہد میں دہلی منتقل ہوئے، جہاں کچھ عرصہ رہنے کے بعد سلطان نے آپ کی علمیت و قابلیت سے متاثر ہو کر قاضی ناگور مقرر کیا ۔ ملا عطا اللہ محمود کے بعد آپ کے فرزند قاضی حمید الدین ناگوری کو جو خود بھی عالمِ وقت تھے خلیفہ اعظم بنایا گیا ۔ آپ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے استاد تھے ۔

آپ کے دادا نواب رفعت یار جنگ اول ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے ۔ آپ حافظ و قاری شیخ عبدالرحمان صاحب کے فرزند اور شیخ عبدالکریم صاحب کے نبیرہ تھے ۔

آپ ایک روشن خیالی مدبر، ہمدرد، رحم دل، منصف مزاج، مردم شناس، خوش اخلاق ہر دل عزیز اور غریب پرور حاکم تھے ۔ آپ کے کاموں میں مدرسہ نظامیہ، مدرسہ اعزہ، سیول سروس کلاسس اور نظام کلب شامل ہیں ۔ آپ نے یورپ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے طلبہ کو تیار کرنے اور وظیفہ دے کر روانہ کرنے کی تحریک کی تھی ۔ اردو زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے پر زور دیا اور اس بارے میں زبردست تحریک کی جو جامعہ عثمانیہ کی شکل موجود ہے ۔

آپ کے والد نواب رفعت یار جنگ ثانی جن کا اصلی نام ضیاء الحق فصیح الدین احمد تھا ۔ ۱۸۶۹ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے ۔ آپ کی ابتدائی تعلیم اردو، فارسی، عربی، دینیات اپنے والدین کی نگرانی میں ہوئی پھر وہ مدرسہ اعزہ میں شریک ہوئے ۔ اس کے بعد سینٹ جارجس گرامر اسکول میں شریک ہوئے ۔ بعد ازاں مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں انگریزی، ریاضی، تاریخ وغیرہ کی تعلیم حاصل کی ۔ حیدرآباد لوٹنے کے بعد " اصلاحِ خیالات و ترقی " کے واسطے مجلسِ اتحاد، ایک کتب خانہ اور ایک کرکٹ کلب قائم کر کے آپ نے کامیابی کے ساتھ معتمدی کے فرائض انجام دیے ۔ ۱۸۸۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن روانہ ہوئے ۔ وہاں انگریزی کے ساتھ ساتھ فرانسیسی کا بھی درس لیا ۔ ٹرینٹی کالج میں

Sir Haindi سے قانون کی تعلیم لی پھر آپ نے مڈل ٹمپل میں قانون کی تکمیل فرمائی ۔ لندن میں انجمن طلباء ہند قائم کی اور جشن میلاد النبی منانے کی بنیاد ڈالی وہاں آپ مشہور مبلغِ اسلام مسٹر عبداللہ کو لئیم کے شریکِ کار رہے اور آپ نے وہاں تبلیغِ اسلام کا ایسا کام کیا کہ بڑے بڑے لارڈس ، اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئے ۔

حیدرآباد لوٹنے کے بعد آپ سرکارعالی سے منسلک ہوگئے ۔ مختلف عہدوں پر اپنی اعلیٰ خدمات انجام دیتے ہوئے صوبہ داری کے جلیل القدر عہدے پر مامور ہوئے ۔

آپ نے کئی کتب خانوں کی بناد ڈالی ۔ ملک میں صنعتی نمائش کی بنیاد آپ ہی نے ڈالی صنعت و تجارت و زراعت کو خوب فروغ دیا ۔ ہمیشہ ایک نہ ایک رفاہِ عالم کے کام کی فکر میں لگے رہتے ۔ آپ باوجود خاندانی وجاہت و امارت کے جس کسی سے ملتے خندہ پیشانی سے ملتے ۔ غرور و تکبر نام کو نہیں تھا ۔ آپ کے اخلاقِ حسنہ و عادات پسندیدہ کی بدولت جو شخص بھی آپ سے ایک بار ملتا ہمیشہ ملنے کا متمنی رہتا ۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے دن گزرنے کے بعد بھی والدہ محترمہ کے انتقال کی خبر روزنامہ سیاست میں پڑھ کر بیدر شریف سے جناب گنج نشین قادری سجادہ نشین نے نواب صاحب سے اپنے روابط کا ذکر کرتے ہوئے ان کے اخلاقِ حسنہ کی تعریف کی اور متعلقین کو پرسہ بھیجا ۔

آپ کے چچا سر نظامت جنگ مرحوم تھے ۔ وہ نہ صرف انگریزی کے اعلیٰ پایہ شاعر تھے بلکہ محبِ رسول بھی تھے آپ نے اپنی ساری جائیداد مدینہ منورہ کے نام وقف کردی ۔ آپ کی ۰۰ پھوپیاں خیرالنساء بیگم خیبر اور زینت النساء بیگم ساجدہ دردمند نعت گو شاعرات تھیں ۔

خیرالنساء بیگم صاحبہ کو اپنی قوم کی زبوں حالی کا بڑا رنج تھا ۔ لکھتی ہیں:

کہاں ہیں اب مسلمانوں میں پچھلی خوبیاں باقی　　　صداقت ، راستی ، انصاف ، ہم دردی کہاں باقی
نہ ہو اخلاق کی خوبی ، جو ہر تہذیب کی جڑ ہے　　　نہ ہو علم و ہنر میں بھی شرافت کا نشاں باقی
تو اس تعلیم کے طوفان سے خوفِ تباہی ہے　　　کہاں مذہب ، کہاں ملت ، کہاں نام و نشاں باقی

بنت النساء بیگم شاجدہ عشقِ رسولؐ میں ڈوبی ہوئی لکھتی ہیں:

محبوبِ خدا ، معشوقِ خدا ، ہے سارا جہاں شیدا تیرا　　　مشتاق ہے ہر اک شاہ و گدا دکھلادے ذرا چہرہ تیرا
اے فخرِ رسل سردارِ امم اے شاہِ دو عالم عالی امم　　　اے پیارے نبی فیاضِ اتم عالم میں ہوا شہرا تیرا

محترمہ تہنیت النسا بیگم صاحبہ کی والدہ ماجدہ حضرت اسماء بیگم صاحبہ ایک عابدہ و زاہدہ خاتون تھیں جن کی عمر کا ابتدائی اور آخری حصہ مدینہ منورہ میں گزرا اور وہیں جنت البقیع میں مدفون ہیں ۔ آپ کے والد مولوی ظہور حسن صاحب اور والدہ سلیمہ بیگم صاحبہ اسی سر زمین میں مدفون ہیں ۔

محترمہ والدہ صاحبہ ۲۵ مئی ۱۹۱۵ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئیں ۔ آپ کی ابتدائی تعلیم محبوبیہ گرلز ہائی اسکول میں ہوئی اور سینیر کیمبرج تک تعلیم حاصل کی گو کہ وہ زمانہ مستورات کی تعلیم کا نہیں تھا مگر آپ کے والد روشن خیال نواب تھے ۔ اس لیے آپ نے اپنی لڑکیوں کی تعلیم کا نہایت عمدہ بندوبست کیا ۔ والدہ صاحبہ اکثر اپنی بورڈنگ کا ذکر کرتی رہتی تھیں ۔ وہ مسز جہان سن کی بورڈنگ میں اپنی ہمشیرہ عظمت النساء کے ساتھ شریک کی گئیں ۔ مسز جہان سن بڑی قابل استاد تھیں ۔ ان کا ذکر والدہ ہمیشہ کرتی تھیں ۔

والدہ صاحبہ بچپن ہی سے بڑی ذہین اور صاحبِ قلم تھیں ۔ اس عمر میں بھی حافظہ غیر معمولی تھا ۔ اپنے بچپن کے قصے ایسے سناتی تھیں جیسے کل کی بات ہو ۔ عمر کے اس حصے میں بھی سینکڑوں اشعار یاد تھے ۔ مطالعے کا شوق ایسا کہ کبھی کوئی رسالہ ہاتھ سے نہ چھوٹتا ۔ "منادی" اور

"سب رس" کا ضرور مطالعہ کرتیں۔ جب کچھ بھی نہیں ملتا تو مجھ سے فرمائش کرتیں کہ "ایم اسلم صاحب کی اسلامی ناول لاؤ۔ بہت دن ہوئے ان کو پڑھے ہوئے"۔ جب میں ان کے لیے ناول جنگ احد، جنگ بدر، فاتح مکہ، فاتح قسطنطنیہ لے آتا تو وہ مطالعے میں اس قدر محو ہو جاتیں کہ آس پاس کا کچھ پتہ نہ چلتا۔ آپ کا صبر و ضبط مثالی تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے والد صاحب قبلہ کی وفات کے وقت جب ہم سب بھائی پردیس میں باپ کے سایے سے محروم ہوگئے تھے، وہ وقت اتنا المناک تھا جو بیان سے باہر ہے۔ اب سوچتا ہوں تو ان کی ہمت اور اولوالعزمی کی داد دینی پڑتی ہے۔ کس صبر و استقلال سے انھوں نے ہمیں سہارا دیا۔ منھ سے ایک آہ بھی نہیں نکلی، آنسوؤں کو پی لیا، زمانے کے سارے غم خود سمیٹ لیے صبر و استقلال کی تصویر بنی بیٹھی رہی۔ دکن کی تہنیت کشمیر میں تعزیت بن گئی مگر زبان پر نہ شکوہ نہ شکایت۔

آپ کی شادی ۱۵ نومبر ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ والد صاحب ان کی بڑی عزت کرتے تھے ۱۹۳۴ء سے والد کے ساتھ زندگی تمام ان کے علمی ادبی کاموں میں ممد و معاون رہیں۔ کوئی کام ایسا نہیں ہوتا جو والد صاحب والدہ سے مشورہ لیے بغیر کرتے۔ جو بھی کتاب لکھتے یا مضمون لکھتے اس کا مسودہ پہلے بیگم صاحبہ کو دکھلاتے۔ قابل باپ کی لائق بیٹی اپنے مفید مشوروں سے نوازتیں۔ گھر کا سارا کام والدہ صاحبہ انجام دیتیں۔ والد کی ہر چیز بڑے قرینے اور سلیقے سے رکھتیں۔

ادارے کی کوئی تقریب ہو، کوئی کام ہو، اس میں برابر بیگم صاحبہ کا حصہ ہوتا۔ ایوانِ اردو کی عمارت کے نقشے سے لے کر تعمیر، تزئین، زیب و آرائش تک سب کام بیگم صاحبہ کے حسبِ منشا ہوا۔ ادارے کو جب زمین کی ضرورت ہوئی آپ نے بڑھ کر اپنے گھر "تہنیت منزل" کی زمین کا ایک حصہ عطیہ دے دیا اور پھر زندگی بھر اس کا کسی سے ذکر تک نہیں کیا۔ ادارے کے شعبۂ خواتین سے برسوں تک وابستہ رہیں۔ آپ کو نعتیہ شاعری کا ذوق ورثے میں ملا۔ آپ کے پہلے مجموعۂ کلام "ذکر و فکر" سے متاثر ہو کر مصورِ فطرت خواجہ حسن نظامی نے آپ کو "**طوطیِ دکن**" کے لقب سے نوازا۔ آپ نے اپنا پہلا حج ۱۹۵۱ء میں اپنے بڑے لڑکے سید تقی الدین قادری صاحب کے ساتھ کیا۔ اس وقت مدینے میں ان کی والدہ صاحبہ بہ قیدِ حیات تھیں۔ دوسرا حج ۱۹۶۶ء میں سید تقی الدین قادری صاحب کے ساتھ کیا۔ وہ ایک سچی عاشقِ رسولؐ اور پکی مسلمان خاتون تھیں۔ حج بیت اللہ کے بعد ہی آپ نے نعتیہ کلام لکھنے کا سلسلہ شروع کیا، جو تین مجموعوں کی شکل میں چھپ کر منظرِ عام پر آیا۔ طبیعت میں اتنی انکساری تھی کہ کبھی اپنے شاعرہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ آپ کے تینوں مجموعے "ذکر و فکر"، "صبر و شکر" اور "تسلیم و رضا" عوام میں بے حد مقبول ہوئے۔ پہلے ایڈیشن ختم ہو چکے ہیں۔ صفی بھائی کا ارادہ ہے کہ کلیاتِ تہنیت کے نام سے تینوں مجموعوں کو یکجا کر کے چھاپ دیا جائے۔

آپ نام و نمود سے بہت گھبراتی تھیں۔ آپ کو اپنے خاندان کی عزت و حشمت کا ہمیشہ بڑا خیال رہتا۔ ہمیشہ تاکید کرتی تھیں کہ ہر کام سلیقہ و شائستگی کے ساتھ ہونا چاہیے وہ والد صاحب کے اسی شعر کی قائل تھیں:

ذوقِ پاکیزہ سے ہر چیز ہے پر لطف و حسیں   یہ نہ حاصل ہو تو بے کار ہے دنیا ہو کہ دیں

خاندان کا ہر ایک چھوٹا بڑا آپ کی بڑی تعظیم کرتا۔ آپ ہر ایک سے بڑی شفقت و محبت سے ملتیں آپ نادار طلبہ اور بیواؤں کی اس طرح مدد کرتیں کہ ایک ہاتھ سے دیتیں تو دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہوتی۔ ایسی ہمدرد و شفقت ممتا میں بھری تھی جس کے بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ بچوں کی طبیعت خراب ہوتی تو پریشان ہو جاتیں۔ ابھی حال ہی کی بات ہے میری طبیعت خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ کورنٹی میں شریک ہونا پڑے گا۔ یہ بات انھیں معلوم ہوئی تو رات بھر نہیں سوئیں۔ جب دوسرے دن میں ملنے گیا تو بہت فکر و تردد سے پوچھا "طبیعت کیسی ہے، ہم خود چل کر کمرے تک آتے مگر مجبور ہیں۔ رات تمام دعا کرتے رہے"۔ ہم نے ایسی شفیق ماں کو کھو دیا، ہمیشہ کے

(باقی ص: ۷ پر)

ڈاکٹر سید کاظم حسین

تہنیت النسا بیگم صاحبہ ... چند تاثرات

محترمہ تہنیت النسابیگم مرحومہ کی وفات سے سابق ریاست حیدرآباد کے مغل ، قطب شاہی اور آصف جاہی دور کی ایات کی حقیقی عمل آوری کا ایک نمونہ ختم ہوگیا ۔ میرا اس خاندان سے اس وقت سے تعلق ہے جب میں ۱۹۴۳ء میں معہ ء عثمانیہ میں انٹرمیڈیٹ سائنس بیالوجی میں شریک ہوکر اقامت خانہ عارضی (سی) میں مقیم ہوا ۔ میں کمرہ نمبر ۴ سید م علی صاحب (میرے بھائی) کمرہ نمبر ۱۰ اور ڈاکٹر محمد عبدالحفیظ قتیل مرحوم کمرہ نمبر ۱۱ میں مقیم تھے ۔ ڈاکٹر قتیل مرحوم جو یدک کے متوطن تھے ، ان کا میرا تعلق ۱۹۳۳ء سے ہوا جب کہ میں اسکول میں بھی شریک نہیں ہوا تھا اور وہ میٹرک میں ھتے تھے میرے والد مرحوم کی وداعی تقریب کے موقع پر لی گئی تصویر میں قتیل صاحب کے ساتھ میری اور میرے بھائی کی ویر ہے اس کے بعد میں ۱۹۴۰ء میں جماعت ہشتم میں میدک میں تعلیم پایا اور ڈاکٹر قتیل مرحوم کے گھر جایا کرتا تھا جہاں لوی عبدالرحیم صدیقی مرحوم فرزند مولانا عبدالقدیر صدیقی مرحوم مقیم تھے ۔ جب میں ۱۹۴۲ء میں اقامت خانہ عارضی میں خل ہوا تمام سینیر طلبہ کے ساتھ میں بھی ڈاکٹر قتیل مرحوم کے کمرے میں اپنا زیادہ وقت گزارتا تھا ۔ ڈاکٹر قتیل صاحب ایچ ۔ ڈی ڈاکٹر زور مرحوم کی نگرانی میں کر رہے تھے اور مقالہ کا عنوان تھا " اردو غزل کا ارتقا " اس طرح اردو کی پہلی یورسٹی کے پہلے ڈاکٹر قتیل اور ان کے توسط سے ڈاکٹر زور کا تعلق خاطر بہت اہم تھا ۔ اس کے بعد ۱۹۵۰ء میں ، میں ڈاکٹر ادر خان مرحوم کا عثمانیہ دواخانہ میں اسسٹنٹ تھا ۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم کے بڑے فرزند " عنایت ..... کے ہے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور وہ ڈاکٹر بہادر خاں کے زیرِ علاج رہے ۔ جب میرے بھائی کی شادی ہوئی تو جناب سراج ین احمد صاحب فرزند رفعت یار جنگ مرحوم میرے بھائی کے ہم زلف تھے اس طرح رشتہ اور استوار ہوگیا ۔ اس کے بعد ء مختلف تقریبوں اور محفلوں میں جناب سراج الدین مرحوم اور ان کے خاندان کے افراد سے ملاقاتیں ہونے لگیں ۔ میرا ہی تعلق محترمہ مرحومہ سے اس وقت ہوا جب میں نے ۱۹۶۴ء میں پنجہ گٹہ میں ایک مکان خریدلیا ۔ اس کے بعد میری تعیناتی گٹہ دواخانے پر ہوئی ۔ اس وقت دواخانہ کالونی کے اندر اور سڑک سے دور تھا اس لیے میں جناب ابوطاہر محمد عبدالقادر وم ڈائرکٹر میڈیکل سرویسس جو میرے بھائی کے ہم زلف بھی تھے کی مدد سے مرحومہ کے مکان کا ایک حصہ کرایہ پر لیا اور نات میں اور قربت اور استواری آئی ۔ اس طرح ملاقات زیادہ ہونے لگی ، ڈاکٹر آر ۔ آر ۔ سکسینہ آں جہانی کے انتقال کے مجھے بیگم صاحبہ سے زیادہ قریب ہونے کا موقع ملا ۔ ڈاکٹر آر ۔ آر ۔ سکسینہ نے آں جہانی حیدرآباد کی طبی خدمات کی تاریخ ا ایک باب کا اضافہ کیا ۔ ملازمت چھوڑ کر جب انھوں نے گلزار حوض کے پاس اپنا کلینک قائم کیا تو جیسے غریب مریضوں

کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ کا اضافہ ہوا ۔ وہ صبح سے شام تک سوائے دوپہر میں تھوڑے سے وقفہ کے ہمیشہ خدمت کے لیے موجود رہتے اور رات میں مریضوں کے گھروں کو جاتے جس کا سلسلہ ۱۰ بجے رات سے بعض اوقات ۲ ۳ بجے رات تک رہتا اور فیس برائے نام لیتے ایسا ۔ معلوم ہوتا ہے سارا شہر حیدرآباد ان کے زیرِ علاج ہے ۔ ڈاکٹر آر ۔ آر ۔ سکسینہ آصف جاہی کائستھ تھے اور شاعر ، مضمون نگار اور مقرر بھی شنیعہ اس تعلق سے ان کا ڈاکٹر زور مرحوم سے قریب ہونا لازمی تھا اسی لیے وہ محترمہ کے علاوہ تمام خاندان کے معالج تھے ۔ یہ قدیم حیدرآبادی روایات کا نمونہ تھے کہ نہ صرف ضرورت پڑنے پر دن میں کئی مرتبہ آتے بلکہ دوائیں بھی اپنے پاس سے دیتے لیکن فیس لینے کو گناہ ، عمل شنیعہ سمجھتے تھے یہ حیدرآبادی اخلاق قطب شاہی اور آصف جاہی روایات کا حسین نمونہ تھا ۔ ڈاکٹر آر ۔ آر ۔ سکسینہ آں جہانی کے انتقال کے بعد ان کے فرزند نے وہی طور طریقہ جاری رکھا اور پرانی روایات کو باقی رکھتے ہوئے اپنے والد کا نام روشن کیا ۔ یہ حیدرآبادیوں کے لیے باعثِ فخر بات ہے کہ یہاں کے لوگ کس قدر غیر متعصب اور روادار تھے ۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر آر ۔ آر ۔ سکسینہ آں جہانی کے فرزند کسی مصروفیت کی وجہ سے نہ آسکے اور مجھے وقت کی نزاکت کی وجہ سے بلایا گیا میں نے دوائیں تجویز کرنے کے بعد درخواست کی کہ ڈاکٹر سکسینہ کو بھی مطلع کردیا جائے اور رائے لی جائے ۔ ڈاکٹر سکسینہ کو بھی مطلع کردیا جائے اور رائے لی جائے ۔ ڈاکٹر سکسینہ مطلع ہونے پر آئے اور حسبِ روایت خدمت انجام دی ۔ محترمہ مرحومہ نے اپنے فرزندوں سے کہا کہ قربت کی وجہ سے آئندہ مجھے ہی بلایا جائے یہ ان کی عنایت اور میری خوش نصیبی تھی کہ ایسی وضع دار پُر خلوص شخصیت کے قربت کا موقع حاصل ہوا اور سعادت نصیب ہوئی ۔ محترمہ مرحومہ جب بھی بیمار پڑتیں تو اس خیال سے کہ بچوں کو تکلیف ہوگی اظہار نہیں کرتی تھیں اور صبر کرتیں حالاں کہ تمام فرزند اور پوترے ، پوتریاں ہمہ تن خدمت کے لیے موجود اور تیار رہتیں جب تکلیف زیادہ ہوتی تو بعض اوقات وہ خود یاں ان کے بچے محسوس کرکے مجھ کو لے جاتے اور اکثر افاقہ ہوجاتا تھا ۔ ان کی لڑکیوں کو جو ہندستان میں نہیں ہیں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بڑی خدمات پر فائز ہیں ہمیشہ ان کی فکر رہتی اور بار بار خط اور ٹیلیفون سے معلوم کرتی رہتیں ۔ لیکن عمداً سوائے اس کے کہ طبیعت زیادہ خراب ہو کبھی ان کو مطلع نہیں کیا جاتا کہ ان کو فکر ہوگی ، ان کا چین متاثر ہوگا لیکن جب ان کو بالواسطہ خبر مل جاتی تو ٹیلیفون کالس کا تانتا بندھ جاتا تھا اور اکثر صورتوں میں کوئی نہ کوئی آہی جاتا تھا ۔ انتہائی محبت کی وجہ سے دن رات خدمت کرتیں ۔ علاج اور تشخیص میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی تھیں اور دوایئاں اصول اور قاعدے کے مطابق باالالتزام دی جاتیں تو وہ پہلے سے اچھی ہوجاتی تھیں ۔ ان کے جانے کے بعد جو صدمہ ہوتا اور جو خاموشی ہوتی اس کو وہ پوری ہمت سے برداشت کرتی تھیں اور اپنے بچوں کو اس کا احساس نہیں ہونے دیتیں تاکہ بچے یہ نہ سمجھیں کہ انھیں بچیوں سے زیادہ پیار بچوں سے کم ہے ۔ وہ ہمیشہ اپنے ساتھ کوئی اچھی کتاب رکھتیں اور مطالعہ کرتی رہتیں ۔ باتیں مختصر مگر پُر مغز کرتیں ، تصنع بالکل نہیں تھا ۔ کسی کے بارے میں حرفِ شکایت کبھی زبان پر نہ لاتیں ۔ صبر کی یہ انتہا تھی کہ تکلیف کتنی بھی ہو چہرے یا حرکات سے اظہار نہ ہو جس کی وجہ سے بعض اوقات مرض کی شدت کا اندازہ ہونا بھی مشکل ہوتا تھا ۔ وہ اپنی ہر چیز سلیقہ سے ہمیشہ ایک مقام پر رکھتیں تاکہ کوئی زحمت کسی چیز کے حصول میں نہ ہو ۔ ان کی ان عادات کا لحاظ ان کی اولاد پوری طرح رکھتی تھی اس طرح کہ ان کو تکلیف یا شکایت کا موقع نہ ہو ۔ میرے اس خصوصی تعلق کے ساتھ ساتھ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ میرے بھائی سائنس کے طالبِ علم اور اعلیٰ سرکاری عہدہ دار ہونے

کے باوجود اردو سے بہت محبت رکھتے تھے اس لیے انھوں نے ادارہ ۔ ادبیاتِ اردو کی صدارت قبول کی اور برسوں اس ادارے کی پرُ خلوص خدمت کی وہ ہمیشہ محترمہ مرحومہ کا نام بڑی عزت سے لیا کرتے تھے اور ان کے علم ۔ خلوص ۔ محبت کے مداح تھے ان سے مشورہ کیے بغیر کوئی بڑا فیصلہ نہ کرتے ۔ ان کے دور میں ادارے کی ترقی اس کا بین ثبوت ہے ۔ اپنے امریکہ جانے سے پہلے کئی سو کتابیں ادارہ ۔ ادبیاتِ اردو کو دیں ۔ محترمہ مرحومہ کی قربت کی وجہ سے میں بھی اس ادارے کا ایک مستقل جز بن گیا اور جلسوں اور تقریبوں میں حتیٰ الامکان شریک رہتا ہوں ۔ اس ادرے کے تعلق خاطر کے سلسلے میں ان کا ہی مرہونِ منت ہوں ۔ اتنی قربت کے باوجود ان کے لاجواب نعت گو شاعر ہونے کا علم مجھے اس وقت ہوا جب میرے ایک دوست ڈاکٹر اقبال علی خاں نے جو پاکستان میں رہتے ہیں میری اور میرے بھائی کی تصویر پاکستان " سب رس " میں دیکھ کر وہ پرچہ میرے پاس بھجوایا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ پاکستان کا سب رس میرے نام جاری کردیا ۔ ایک پاکستانی سب رس میں محترمہ مرحومہ کے کلام کا کچھ حصہ شائع ہوا اور اس میں مجھ کو پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ وہ کس قدر اعلیٰ درجہ کی نعت گو شاعرہ ہیں ۔ میں نے ان سے کہا کہ میری بدقسمتی ہے کہ اس کلام سے محظوظ ہونے کا مجھے پہلے موقع نہ ملا ۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ایک شاعر بھی اس قدر منکسر المزاج بھی ہوسکتا ہے ۔ محترمہ مرحومہ کے والد مرحوم کا مکان کئی ہزار گز پر مشتمل تھا اس کے بڑے حصے پر حکومت نے قبضہ کرلیا اور چند گز زمین جو ان کے نام حبہ تھی بچ گئی ۔ اس کے ایک قیمتی اور سڑک پر واقع حصے کو ایوانِ اردو کے لیے وقف کردیا یہ ان کی اردو سے محبت کا بین ثبوت ہے ۔ تیس سال تک میرے زیرِ علاج رہنے کے باوجود میں نے کبھی ان کے چہرے پر شکن نہیں دیکھی باتوں میں شکوہ نہیں سنا ۔ اللہ سے شاکی ہونے کا شبہ تک نہ تھا صرف صبر اور شکر کی مظہر تھیں ۔ مرحومہ حقیقی مسلمان اور راسخ العقیدہ تھیں ۔ کبھی کسی متنازعہ مسئلے میں الجھنے سے گریز کرتیں ۔ کسی کی دل آزاری کرنے کا سوال ہی نہیں تھا ۔ مرض الموت کے وقت جب مجھے بلایا گیا تو ہمیشہ سے ذرا مختلف ان کا طرزِ عمل تھا انھوں نے کہا کہ وہ دواخانہ نہیں جانا چاہتیں ۔ میں نے ان کے فرزندوں سے درخواست کی ان کو ان کی مرضی کے خلاف گھر سے منتقل نہ کیا جائے اور دواخانے میں شریک نہ کیا جائے اس لیے کہ اللہ کی طرف سے کسی القا ۔ الہام کی وجہ سے وہ یہ الفاظ کہہ رہی ہیں ۔ وہ آخری وقت تک بات کرتی رہیں اور ہوش میں تھیں ۔ شام کے ۶ بجے جب میں نے ان کو دیکھا تو دم کی تکلیف سے بے چین تھیں ۔ دوا دینے کی ہدایت دے کر میں واپس گیا ۔ تھوڑی دیر کے بعد اطلاع ملی کہ ان کا انتقال ہوگیا ہے ۔ ۔ ۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ۃ

خدا ہر انسان کو ان کا ایمان ۔ تقویٰ ۔ صبر و شکر ۔ توکل و قناعت اور محبت عطا کرے ۔ ۔ ۔ آمین ۃ

۱۴
رمن راج سکسینہ

محترمہ تہنیت النسا بیگم زور

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی شریکِ حیات محترمہ تہنیت النسا بیگم صاحبہ جنھوں نے ڈاکٹر زور کی تجویز پر ایک انتہائی قیمتی آراضی " ایوانِ اردو " کی عمارت کے لیے عطیہ دیا تھا۔ آج اس دنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن اردو زبان کے لیے انھوں نے جو احسانِ عظیم کیا ہے۔ اس کے لیے وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

ایک مشہور کہاوت ہے کہ ہر انسان کی کامیابی میں ضرور کسی محترم خاتون کی کوشش اور تعاون کا حصہ ہوتا ہے، شاید صحیح ہو اور شاید غلط بھی ہو۔ لیکن میں اپنے اس تعلق کی بنا پر جو مجھے ڈاکٹر زور سے رہا ہے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ ڈاکٹر زور کے علمی، ادبی اور دکنیات سے متعلق تحقیقاتی کاموں میں بیگم صاحبہ زور کا خاص حصہ رہا ہے۔

ڈاکٹر زور ادارے کے کاموں اور دکنی ادبیات کی تحقیق و ترتیب میں ہمہ تن مصروف رہا کرتے تھے جس کے لیے انسان کو مکمل اطمینانِ قلب کی ضرورت ہوتی ہے۔ بیگم صاحبہ زور نے ڈاکٹر زور کو گھریلو مسائل، بچوں کی تعلیمی ضرورتوں اور دیگر امور سے بے نیاز رکھا، جس کی وجہ سے ڈاکٹر زور اپنی ۵۶ چھپن سالہ مختصر زندگی میں وہ کام کر گئے جو شاید طویل ترین زندگی پانے کے باوجود کوئی اور شخص انجام نہ دے سکے۔

" ایوانِ اردو " کی عمارت تعمیر ہونے سے قبل، ادارہ ادبیات اردو کا دفتر اور کتب خانہ " تہنیت منزل " کے چند کروں میں تھا۔ جب کتابوں کی تعداد بڑھ گئی اور ڈاکٹر زور نے چوک لاڑبازار کے کتب فروشوں سے قدیم قلمی نسخے کثیر تعداد میں خرید کر جمع کر لیے تو ان کروں کی گنجائش بھی ختم ہو گئی۔ ڈاکٹر زور نے " تہنیت منزل " کے قریب حسبِ گنجائش ایک مختصر عمارت اپنے خرچ پر تعمیر کروائی جس میں چند کمرے اور ایک بڑا ہال ہے۔ ان ہی کروں میں کتب خانہ اور میوزیم کی اشیا رکھی جاتی تھیں۔ ادارے کا دفتر بھی اسی ہال میں تھا۔ جب ادارے کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس ہوتا یا پھر ممتاز شخصیتیں ادارے کے معائنے کے لیے تشریف لاتیں تو " تہنیت منزل " کے وسیع ڈرائنگ روم میں اجلاس منعقد ہوا کرتے تھے۔ اجلاس کے ختم ہونے کے بعد ڈاکٹر زور بڑی مایوسی کے انداز میں ادارے کے ارکین سے شکایت کرتے تھے کہ ادارے کی کوئی عمارت نہیں ہے اور ادارے کے لوگ بیگم صاحبہ کے ڈرائنگ روم میں اجلاس منعقد کر رہے ہیں اور بیگم صاحبہ کے قیمتی فرنیچر کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ڈاکٹر زور چاہتے تھے کہ ہم سب مل کر ادارے کے لیے کوئی مناسب عمارت کا انتخاب کر لیں تاکہ قیمتی مخطوطات اور میوزیم کی اشیا مناسب طریقے پر رکھی جاسکیں۔

پولیس ایکشن سے کچھ سال پہلے ڈاکٹر زور کی تجویز پر نواب زین یار جنگ اور نواب مہدی نواز جنگ کی تائید پر حکومت نظام نے ادارے کی عمارت کے لیے پچاس ہزار روپے منظور کیے لیکن اس وقت کے حالات کے لحاظ سے کوئی آراضی حاصل نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر زور اور ان کے رفقا نے دار الشفا، نامپلی اور باغ عامہ وغیرہ کے علاقوں میں کئی زمینات کا معائنہ کیا لیکن زمین کی قیمت اس قدر زیادہ تھی کہ اس قدر رقم اس وقت جمع نہ ہو سکتی تھی۔ اس دوران حکومت کی جانب سے کئی مراسلے وصول ہوئے کہ حکومت کی منظورہ رقم ادارے کی

ب سے خرچ نہیں ہوئی ہے اس لیے حکومت اس گرانٹ کو منسوخ کر دے گی ۔

ان حالات میں ڈاکٹر زور نے اپنی بیگم صاحبہ سے خواہش کی کہ " تہنیت منزل " کے قریب ان کی زمین ادارے کو بطور عطیہ یت فرمائیں ۔ تہنیت النسا بیگم صاحبہ لپنے شوہر کی ہر خواہش کو ان کا حکم تصور کرتی تھیں ۔ اس طرح یہ قیمتی زمین انھوں نے ایک سٹری شدہ ہبہ نامے اور کے ذریعے ادارے کو عطا فرمائی ۔ خدا کا شکر ہے کہ ادارے کی شان دار عمارت تعمیر ہو گئی اور ڈاکٹر زور اور یت النسا بیگم صاحبہ نے لپنے خوابوں کی تعبیر دیکھ لی ۔

مجھے بیگم صاحبہ زور سے ملنے اور بات کرنے کا شرف حاصل رہا ۔ وہ ایک پردہ نشین خاتون تھیں اور شاید ادارے کے اراکین ، میں اور جناب حمید الدین شاہد صاحب ہی وہ لوگ تھے جن سے وہ پردہ نہیں کرتی تھیں ۔ وہ بہت کم سخن تھیں اور ہمیشہ بہت آہستہ نرم و نازک لہجے میں گفتگو فرماتی تھیں ۔، معمولی شور بھی انھیں پسند نہیں تھا ۔ وہ ایک اچھی ادیبہ اور اعلیٰ مرتبت شاعرہ تھیں ۔ ان کے مجموعہ کلام شائع ہو چکے ہیں ۔ ایوان اردو کے مشاعروں میں پس پردہ بیٹھ کر وہ مشاعرہ سنا کرتی تھیں ۔ وہ نواب رفعت یار جنگ ثانی ختر تھیں اور ان میں وہ تمام خصوصیات تھیں جو حیدرآباد کے بڑے گھرانوں کی بیگمات میں ہوا کرتی تھیں ۔ حیدرآباد کی خواتین میں م ہمایوں مرزا ، بیگم ولی الدولہ اور محترمہ تہنیت النسا بیگم زور صاحبہ اس لیے قابل ذکر ہیں کہ وہ پردہ نشین ہوتے ہوئے بھی ۔ ان ز خواتین نے لپنے علمی و ادبی کارناموں کے باعث حیدرآباد کی تہذیب و معاشرت کی تشکیل میں امتیازی حصہ ادا کیا افسوس ہے کہ اب ، شخصیتیں کم ہوتی جارہی ہیں ۔

ڈاکٹر زور صاحب سے میرے چچا ڈاکٹر رگھو نندن راج سکسینہ کے بہت قریبی تعلقات تھے ۔ اسی تعلق کی بنا پر ڈاکٹر زور میرے ٹے چچا صاحب پروفیسر مہندر راج سکسینہ اور مجھے بہت عزیز رکھتے تھے ۔ محترمہ بیگم صاحبہ زور اسی خلوص اور شفقت کو برقرار رکھتی ں ۔ جناب سید تقی الدین قادری جناب سید علی الدین قادری ، جناب سید صفی الدین قادری اور جناب سید رفیع الدین قادری صاحب سے وہی خلوص اور احترام ہمیں حاصل ہوتا رہا ہے ۔ دعا ہے کہ خدا ڈاکٹر زور کے فرزندان اور دختران کو اس صدمے کے برداشت کرنے کا ملہ عطا فرمائے ۔ یہ صدمہ محض ان کے خاندان کا صدمہ نہیں ہے ۔ اس صدمے میں ہم سب ان کے شریک ہیں ۔ بیگم صاحبہ زور کے ال سے نہ صرف ادارہ ادبیات اردو لپنے سرپرست اعلیٰ سے محروم ہو گیا ہے بلکہ یہ علاقہ حیدرآباد ، تہذیب و شرافت کی اس عظیم یت سے محروم ہو گیا ہے ، جس کی تلافی ناممکن ہے ۔

000 0 000

حسب ذیل اصحاب نے ادارہ ادبیات اردو کی دوامی رکنیت قبول فرمائی ہے جس کے لیے ادارہ ان کا شکر گزار ہے ۔

- جناب ڈبلیو ۔ اے ۔ شاہین — اوٹاوا (کینیڈا)
- جناب محمد کریم اللہ خاں صاحب — حیدرآباد
- جناب مظفر مجاز صاحب — حیدرآباد

ڈاکٹر رحیم الدین کمال

محترمہ بیگم زورؔ

یہ ان دنوں کی بات ہے جب حیدرآباد علم و فضل تہذیب و تمدن ، لطافت و ثقافت کی وجہ سے سارے ہندستان میں ممتاز تھا ۔ اس میں علم و ادب اور شعر و سخن کے نغمے گونج رہے تھے ۔ حیدرآباد کی تہذیبی آبیاری کرنے والوں میں نواب رفعت یار جنگ کے خاندان کو خاص فوقیت حاصل تھی ۔ حیدرآبادی تہذیب کے تین مراکز تھے ۔ نواب سالار جنگ اول ان کے اپنے انگریزوں سے قریبی تعلقات کی وجہ سے مغربی تہذیب کے دل دادہ تھے ۔ پائیگاہی امرا خاص طور پر شمس الامرا قدیم مغلیہ روایات پر قائم تھے ۔ اسی دور کے عمائدین میں نواب رفعت یار جنگ اولیٰ نے مغربی اور مشرقی تہذیبوں میں ایک حسین امتزاج پیدا کیا تھا ۔ نظم و نسق کے علاوہ مذہب ، علم و ادب اور ملک کے فلاحی معاملات سے گہری دل چسپی رکھتے تھے ۔ یہ جانتے ہوے بھی کہ سالار جنگ اول فارسی کو قائم رکھنے کے نہ صرف حامی تھے بلکہ اس پر مصر بھی تھے ، رفعت یار جنگ اولیٰ نے اردو جامعہ کے قیام کی تجویز پیش کی تھی ۔ اس سے ان کی جراءت اور ملکی فلاحی معاملات سے دل چسپی کا اظہار ہوتا ہے ان کے دو صاحب زادے ، نواب رفعت یار جنگ ثانی اور سر نظامت جنگ نے اپنے والد کی طرح علم و ادب اور مذہب و ثقافت کی ترقی میں گہری دل چسپی لی ۔ سر نظامت جنگ نے انگریزی شاعری اور ادب میں بھی بڑا نام پیدا کیا ۔ اس خاندان کو حیدرآباد میں بڑا اقتدار حاصل تھا ۔ ان کے ایک عزیز نواب عماد جنگ کے بہت سے قصے زبانِ زدِ عام تھے ۔

جب شہر حیدرآباد کی توسیع ہوئی تو امرا اور عمائدینِ شہر نے خیریت آباد ، سوماجی گوڑہ اور بیگم بیٹھ میں نئے طرز کے مکانات تعمیر کیے اور ان علاقوں میں رہائش اختیار کی ۔ نواب رفعت یار جنگ ثانی نے سوماجی گوڑہ میں لب لڑک ایک وسیع اراضی خریدی اور اس کے ایک بلند حصے پر اپنا مکان تعمیر کیا ۔ اس کا نام رفعت منزل رکھا ۔ یہ بڑا خوش منظر اور خوش سواد مقام تھا ۔ یہاں سے حسین ساگر کا دل کش منظر دکھائی دیتا تھا ۔ جب چراغ جلتے تو اس منظر کا لطف دوبالا ہوجاتا ۔

محترمہ بیگم زورؔ (تہنیت النساء بیگم) نواب رفعت یار جنگ ثانی کی تیسری صاحب زادی تھیں ۔ یہ تین بھائی اور چار بہنیں تھیں ۔ ان کی تعلیم و تربیت اسی پرفضا اور دینی اور علمی اور ادبی ماحول میں ہوئی تھی ۔ نواب رفعتِ یار جنگ ثانی بھی اپنے والدِ محترم کی طرح ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے ۔ رفعت منزل ، قدیم و جدید تہذیب کے حسین امتزاج کا مرکز تھی نواب صاحب

لم و ادب ، تہذیب و ثقافت کے مشاغل کی سرپرستی کیا کرتے تھے ۔ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں بھی انھوں نے ان ہی سولوں کا بڑا خیال رکھا ۔

جب ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ انگلستان اور فرانس کی جامعات کی تعلیم سے فارغ ہو کر حیدرآباد واپس ہوئے اور جامعہ عثمانیہ ں بہ حیثیت استاد ان کا شعبہ ، اردو میں تقرر ہوا ۔ تو محترمہ تہنیت النساء بیگم ان سے بیاہی گئیں ۔ نواب رفعت یار جنگ نے اپنی وسیع اضی کا ایک بڑا حصہ لبِ سڑک اپنی صاحب زادی تہنیت النساء کو دیا تھا ۔ ڈاکٹر زورؔ صاحب نے اسی اراضی پر ایک خوب صورت مکان یر کیا اور وہیں رہنے لگے ۔ اس کا نام تہنیت منزل رکھا ۔ لیکن یہ سب علاقہ رفعت ں کے نام سے ہی مشہور رہا ۔

ڈاکٹر زورؔ نے ادارہ ، ادبیاتِ اردو قائم کیا ، " سب رس " جاری کیا اور علمی و ادبی محفلیں سجانی شروع کیں تو رفعت منزل تہذیبی اور ثقافتی اہمیت کو چار چاند لگ گئے ۔ اب اس کی شہرت حیدرآباد کی حدوں کو پار کر کے سارے ہندستان میں پھیل گئی ۔

یہ حسنِ اتفاق تھا کہ زورؔ صاحب کو دکھنی ادب سے لگاؤ تھا ۔ انھوں نے ادارہ ، ادبیاتِ اردو قائم کر کے دکھنی ادب کی یافت کی اور اسی کے تہذیبی اداروں کی نئے سرے سے آبیاری کی ۔ اس طرح رفعت منزل کو جدید دکھنی اور حیدرآبادی تہذیب کے ز کی حیثیت حاصل ہوگئی ۔ حیدرآبادی تہذیب کا یہ ایک زرین باب ہے جس پر میں نے علاحدہ تفصیل سے لکھا ہے ۔

میرا لڑکپن اور نوجوانی کا زمانہ رفعت منزل کے علمی ، تہذیبی اور ادبی ماحول میں گزرا تھا ۔ میرے ہم عمر (نواب رفعت یار ـ) کے نواسے معین الدین احمد انصاری سے ایسی دوستی اور یگانگت تھی کہ ہم نے پیامِ برادری اور سب رس کے شعبہ ، طلبہ کی ں مصروفیتوں کو اپنا محور بنایا تھا ۔ ڈاکٹر زور کے بچے تو ابھی بہت کم سن تھے ۔ نواب رفعت یار جنگ کے منجھلے صاحب زادے ب ناصر الدین جو سولین تھے مجھ سے مشفقانہ برتاؤ رکھتے تھے اور چھوٹے صاحب زادے سراج الدین احمد مرحوم کی حیثیت بڑے ئی جیسی تھی ۔ تہنیت النساء بیگم اور ان کی بہنیں یعنی والدہ معین الدین احمد انصاری اور محترمہ بیگم جسٹس باسط علی مرحوم میرے " ماں جائی " کا مقام رکھتی تھیں ۔ ہمارے ہر کام میں گہری دل چسپی لیتی تھیں اور ایسی شفقت ، عنایت اور محبت سے پیش ں کہ غیریت کا احساس باقی نہیں رہا تھا ۔

ڈاکٹر زورؔ اپنے علمی اور ادبی مشاغل میں ایسے جتے رہتے تھے کہ کبھی ان کو اپنے گھریلو زندگی کے کاروبار میں کوئی خاص دل ، نہیں رہتی تھی ۔ بچوں کی دیکھ بھال ، ان کی تعلیم و تربیت خاص طور پر صاحب زادیوں کی تعلیم و تربیت میں محترمہ بیگم زور کی ، مندی نفاست اور شرافت کا بڑا حصہ رہا ہے ۔ یہ زور صاحب کے اہلِ خاندان سے بھی محبت اور شفقت کا برتاؤ رکھتی تھیں ۔ : صاحب کے والد اور ان کی علاتی والدہ کی میزبانی اور دیکھ بھال میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتیں ۔ ڈاکٹر زور اکثر اپنے خاندان کے ، کو بھی تعلیم و تربیت کے لیے اپنے ہاں رکھ لیتے تھے ۔ محترمہ بیگم زورؔ ان بچوں سے مشفقانہ سلوک رکھتی تھیں ڈاکٹر زور نے ئی زمانے میں ادارہ ، ادبیاتِ اردو کا دفتر اور کتب خانہ اپنے گھر میں قائم کیا تھا ۔ ان سب کی دیکھ بھال بھی انہماک سے کیا کرتی

تھیں ، شعبہ ، خواتین قائم ہوا تو خواتین کی مہمان نوازی کی ذمہ داریاں بھی ان ہی کے سر تھیں ۔ جب ان کی صاحب زادیاں ذرا بڑی ہوئیں تو ان کا ہاتھ بٹانے لگیں ۔

ڈاکٹر زورؔ صاحب کی زندگی مختلف مرحلوں سے گزری ہے ۔ پولیس ایکشن کے بعد ڈاکٹر زور صاحب کی اگلی سی جولانیاں باقی نہ تھیں ۔ بلکہ ایک زمانہ تو ایسا بھی گزرا ہے کہ ان کو اپنے کیے ہوے کاموں کو محفوظ رکھنا بھی مشکل نظر آرہا تھا ۔ ان ہی حالات میں زور صاحب کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کسی طرح ادارے کی عمارت کے لیے جو رقم منظور تھی اس سے ادارے کی عمارت کا آغاز کردیا جائے ۔ جگہ کے انتخاب کا مرحلہ پیش آیا تو میں نے اس مقام کی نشان دہی کی جہاں آج کل رویندرا بھارتی بنا ہوا ہے ۔ لیکن زور صاحب کہتے تھے کہ اس جگہ کے خرید نے کے لیے سرمایہ فراہم ہونا مشکل تھا ۔گو کہ اس وقت اس زمین کی قیمت صرف چھ روپے گز تھی ۔ اسی کرب و اضطراب میں تھے کہ زمین فراہم ہو تو منظورہ رقم سرکار سے حاصل کی جائے بیگم زور صاحب سے ڈاکٹر زور صاحب کا کرب و اضطراب اور تردد دیکھا نہ گیا ۔ انھوں نے اپنی زمین کا لب سڑک حصہ دینے کی پیش کش کی ۔ اس میں زور صاحب کی خواہش یا ترغیب کا کوئی دخل نہیں تھا ۔ بیگم زور نے از خود یہ زمین ادارے کو بطور عطیہ دے کر زور صاحب کے حوصلہ بڑھائے ۔ ادارے کی اس عالی شان عمارت کی تعمیر میں بیگم زور کی نیک نیتی اور خلوص کا بہت بڑا حصہ تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک خوب صورت عمارت کھڑی ہوگئی ۔

بیگم رفعت یار جنگ نے اپنی آخری عمر میں مکہ ، معظمہ ہجرت کرلی ۔ ان کی ہجرت کے بعد سب ہی افرادِ خاندان کو یکے بعد دیگرے حجِ بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی ۔

بیگم زورؔ کو بھی یہ شرف حاصل ہوا ۔ یوں تو ان کو اپنے بچپن ہی سے شعروادب کا ذوق تھا اور یہ اپنی بہنوں میں سب سے زیادہ لطیف احساسات کی مالک تھیں اور ان کی طبیعت کے میلان نے ان کو نعت گوئی کی طرف راغب کردیا تھا اور وہ اس میں ایسی محو ہوئیں کہ یکے بعد دیگرے کئی مجموعے شائع ہوے اور نعت گوئی میں ایسا کمال حاصل کیا کہ اس صنفِ سخن کی خواتین شعرا میں ان کو خاص مقام حاصل ہوگیا ۔

نعت گوئی بیگم زور کا بہت ہی محبوب مشغلہ تھا وہ بڑے ذوق و شوق سے نعت کہتیں اور نہایت جذب و کیفیت کے ساتھ ان کو پڑھتی تھیں ۔ نعت گوئی سے خود شاعر کی ذات روحانی رفعتوں اور قلبی وارداتوں سے آگاہ ہوجاتی ہے ۔ اس کی شخصیت میں نکھار پیدا ہوتا ہے ۔ بیگم زور کی والدہ کا تعلق لکھنو کے مشہور دینی خانوادے فرنگی محل سے تھا ۔ عشقِ رسولؐ ان کو ورثے میں ملا تھا ۔ ان کی صاحب زادی تہذیب میں یہ جوہر نمایاں ہے ۔ نعت لحن سے پڑھنے میں بھی کمال رکھتی تھیں ۔

ڈاکٹر زور مرحوم نے جب کشمیر جانے کا فیصلہ کرلیا تو یقیناً محترمہ بیگم زور کے لیے بھی یہ ایک فیصلہ کن مرحلہ تھا ۔ ان کا عالم طریقہ تو یہ تھا کہ وہ ہر معاملے میں اپنی رائے تو رکھتی تھیں لیکن ڈاکٹر زور صاحب کے فیصلوں کو بھی خندہ پیشانی سے قبول کرلیتی تھیں ۔ میں نے زور صاحب کے کشمیر جانے کی سخت مخالفت کی تھی ۔ وہ کہتے تھے کہ کشمیر میں کام کرنے کا میدان ہاتھ آئے گا ۔

حیدرآباد میں ان کے کاموں کو دیکھنے اور سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا ۔ حمید الدین شاہد صاحب پاکستان جاچکے تھے ۔ غرض بیگم نے یہ فیصلہ قبول تو کرلیا تھا لیکن افسوس کہ زور صاحب کو کشمیر راس نہ آیا ۔ جب میں نے سری نگر پہنچ کر خانیار میں ڈاکٹر کی قبر پر فاتحہ پڑھی تو میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے ۔ میرے سامنے اس زمانے کے مناظر گھومنے لگے ۔ جب کہ زور ب حیدرآباد کے مشاعروں اور ادیبوں کی قبروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالنے اور ان کی تعمیر و ترمیم کے بعد ان کو محفوظ کرنے کے ن پر نام سنِ پیدائش اور وفات کے تفصیلات کی تختیاں لگایا کرتے تھے ۔ آج ایسے شخص کی قبر کشمیر میں تنہا کس مپرسی کی میں تھی ۔ ۔ ۔ رہے نام اللہ کا ۔ ۔ ۔ بہ ہرحال ڈاکٹر زورؔ کے انتقال کے بعد بیگم زورؔ نے بڑی ہمت اور حوصلے سے اپنی ذمہ ں بہ حسن و خوبی نباہیں اور اپنے بچوں کی دیکھ بھال تادمِ مرگ کرتی رہیں ۔

بیگم زورؔ کو اپنی زندگی میں اپنے سب بھائیوں اور بہنوں کی مفارقت کا غم بھی جھیلنا پڑا ۔ ان کی صاحب زادیاں ان سے ملی گئیں لیکن ان کے صاحب زادوں اور ان کی بہنوں نے ضعیفی میں ان کی خدمت گزاری، کے فرائض دل و جان سے ادا کیے ۔ ں صاحب زادی تہذیب ان کی بیماری کے زمانے میں آئی تھیں لیکن وہ بھی زیادہ نہیں رہ سکیں ۔

بیگم زورؔ اپنی بہنوں میں سب سے زیادہ حساس اور کم سخن تھیں ۔ ان کی طبیعت میں ایک گونہ حجاب تھا ۔ وہ نمود و ، پسند نہیں کرتی تھیں ۔ منکسر المزاج اور بڑی ملن سار تھیں ۔ میری شادی میں تینوں بہنوں ان کی بھاوج مسز ناصر الدین اور کے بچوں نے ایسا ہی جوش و خروش سے حصہ لیا جیسے کسی عزیز کی شادی کا اہتمام کرتے ہیں ۔

ڈاکٹر زور کے سامنے جب " راہ رو اور کارواں " کا مسودہ محمد بن عمر صاحب نے پیش کیا تو میرے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا : پڑھ کر مسکرائے اور اپنے قلم سے اس جملے کا اضافہ کیا ۔ " اپنے عزیزوں کی طرح ان کی تربیت کی "

ایک روز میں ڈاکٹر زورؔ سے اپنے مستقبل کے سلسلے میں گفتگو کر رہا تھا ۔ اس زمانے میں سول سروس کے لیے درخواستیں طلب ، تھیں ۔ اس موضوع پر گفتگو ہورہی تھی ۔ میں نے کہا کہ میں کوئی آزاد پیشہ اختیار کرنے کا قائل ہوں ۔ اس لیے میں سول سرویس لیے درخواست دینے کا ارادہ نہیں رکھتا ۔ میرے اس فیصلے پر رفعت منزل میں بحث چھڑ گئی ۔ معین الدین احمد انصاری کی والدہ صاحبہ پنے بھائی ناصر الدین صاحب سے اس کا ذکر کیا ۔ ناصر الدین صاحب نے بہ اصرار درخواست کے فارم منگوائے اور اپنے سامنے ان کی ، کروائی اور بہ حیثیت گزیٹیڈ عہدہ دار صداقت ناموں کی تصدیق بھی کی ۔ اس واقعے سے اندازہ ہوگا کہ اس خاندان کے ہر فرد کو میری اور بہبود سے کس درجہ تعلقِ خاطر تھا ۔ میرے لیے محترمہ بیگم زور کی موت اتنی ہی گراں گزری جیسے میری اپنی والدہ کی موت کا صدمہ ہوا تھا ۔ ان میں بہت سی خوبیاں تھیں ۔ خدا انھیں غریقِ رحمت کرے اور ان کے پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے ۔

OO ● O ● OO

پروفیسر رفیعہ سلطانہ

بیگم ڈاکٹر زور میری نظر میں

علامہ شبلی نے رباعی لکھی تھی:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی — مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں ، سیرتِ پیغمبر خاتم — خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

بیگم تہنیت زور کا بھی عشقِ رسول میں خاتمہ بالخیر ہوا۔ عورت خدا کی تخلیق کی شاہ کار ہے۔ یہ ایک ایسا نشہ اور سرور ہے جو ایک آتشہ ہے۔ اس کے ساتھ حسن ہو تو دو آتشہ اور حسن کے ساتھ ذہانت بھی ہو تو یہ سہ آتشہ ، بن جاتی ہے بیگم زور کی شخصیت بھی اسی طرح سہ آتشہ تھی۔ وہ ذہین بھی تھیں، حسین بھی اور صنف نازک کی پیدائشی صفات یعنی وفا، تحمل، بردباری، منکسر المزاجی کا خوب صورت امتزاج۔ وہ محفلوں کی رونق کبھی نہیں بنیں۔

ادارۂ ادبیات اردو کے بے پناہ ہنگاموں میں کسی نے انھیں نہیں دیکھا نہ وہ کبھی اسٹیج پر آئیں، نہ کسی محفل میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا لیکن پس پردہ وہ ڈاکٹر زور کی جلیس، رفیقِ کار اور اپنے نام ور شوہر کی طرح اردو ادب سے بے پناہ محبت اور زور صاحب کے ہر کارنامے میں رفیقِ کار، ہم دم اور دم ساز رہیں۔ زور صاحب نے جب ادارۂ ادبیاتِ اردو کی بنیاد رکھی اور اس کے لیے ایک دفتر کی تلاش ہوئی تو بیگم زور نے اپنا ذاتی پلاٹ اس کے نذر کیا۔ وہ چاہتیں تو اسے فروخت کر کے اس کی رقم حاصل کر سکتی تھیں جیسا کہ میں پیش تر بتا چکی ہوں کسی نے بیگم زور کو کسی ادبی محفل میں نہیں دیکھا۔ اس کی وجہ ان کا خاندانی پس منظر تھا جہاں کی مستورات بالخصوص لڑکیاں خواتین کا سامنا کرنے سے بھی ہچکچاتی تھیں۔ بیگم زور ایک ایسے خاندان کی چشم و چراغ تھیں جنھوں نے دکن کی مذہبی، ادبی اور سیاسی تاریخ میں ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ خود ان کے شوہر نام دار سے قطع نظر ان کی والد رفعت یار جنگ چچا نظامت جنگ، رفعت یار جنگ تو خیر انتظامی امور کے ماہر تھے لیکن نظامت جنگ انگریزی کے بے مثال خطیب اور مصنف تھے۔ انھوں نے [illegible] تاریخ بالخصوص سیرت محمدؐ صلعم پر انگریزی میں کئی کتابیں اور مضامین لکھے تھے۔ ان کی سوانح انگریزی میں ان ہی کے ایک رفیق ظہیر احمد صاحب نے لکھی۔ خسر زعم صوفی اور عالم متبحر اور ماموں انوار اللہ خاں فضیلت جنگ جنھوں نے جامعہ نظامیہ کی بنیاد رکھی تھی، اس کے سوا ان کی والدہ ایک متشرع اور مذہبی خاتون تھیں جن کا انتقال مدینۂ منورہ میں ہوا۔ بچپن اور جوانی کے اس [illegible] کا اثر تھا جس نے بیگم زور کو مذہب کی طرف مائل کیا۔ ہندوستان کی تاریخ جاننے والے واقف ہیں کہ ہر ہندوستانی خاتون میلاد شریف کی محفلیں منعقد کرتی تھی۔ ان محفلوں میں حضور صلعم کی ذات پاک کا نہ صرف بیان ہوتا بلکہ ان محفلوں میں خواتین خوش الحانی سے نعتیں پڑھتی تھیں۔ اردو میں نعت گوئی کی اس روایت کی ابتدا یہیں سے ہوئی لیکن باقاعدہ صنفِ سخن کی طرح چند ہی شعرا، نے اسے اپنایا۔ ویسے ہر صاحب دیوان شاعر کے دیوان میں حمد کے بعد نعت کا رواج ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ شمالی ہند میں یوں تو بہت سے شاعر گزرے ہیں لیکن اکبر میرٹھی، احسن مارہروی سرِ فہرست ہیں۔ دکن میں اور شعرا کے علاوہ شائق کا دیوان نعتوں کا مجموعہ ہے۔ یوں تو نعت گوئی کا آغاز سرکار دوعالم کے زمانے سے ہوا۔ چناں چہ مشہور ہے کہ ایک صحابی طلحہ بن عبید اللہ نے غزوۂ احد میں بہادری کے جوہر دکھائے تو آپ نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور جوہر شجاعت کی قدر دانی کے لیے ان کی تعریف میں قصیدہ لکھنے کا حکم دیا۔ اسی دور کے ایک صحابی کعب بن زہیر نے نعتیہ اشعار لکھے جن میں انصار مدینہ کو نظر انداز کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ

یہ وسلم نے ان کو انصار کی مدح میں بھی اشعار لکھنے کی ترغیب دی۔

عربی اور فارسی میں نعت گوئی کی تاریخ کافی پرانی ہے۔ عربی میں قصیدۂ بردہ، اپنی بے مثال مقبولیت کی وجہ سے مقدس وظیفہ بن گیا ہے۔ فارسی میں عرفی، ابو طالب کلیم کی نعتیں مشہور رہیں۔ اردو میں حالی کی نعت "وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا" اپنی تاثیر اور لطافت کی بہ سے حالی کے تمام دیوان پر بھاری ہے۔

اردو کے نعت گو شعرا نے جس میں شائق کی نعتیں، سراپانگاری کے ذیل میں آتی ہیں غالباً یہ ہندی کے اثرات ہیں۔ ہندی میں کرشن اور رام چندر جی کی شخصیتوں کے ذاتی صفات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ تہنیت صاحبہ نے نعت گوئی کی روایت میں فارسی شعرا کی تقلید کی ہے۔ ت گوئی کا فن غزل سے زیادہ مشکل ہے۔ غزل میں شاعر اپنے واردات قلبی کو بیان کرتا ہے۔ اس میں داخلیت ہے۔ نعت میں شاعر جذبہ میں ب کر قاری پر وہی اثر طاری کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح سے اس میں خارجیت ہے۔ یہ گویا دل و دماغ کی کشمکش کی آئینہ دار ہوتی ہے اور اس ں دل کا جتنا حصہ ہے اتنا دماغ کا۔ تہنیت زور کی شاعری دل و دماغ کی کیفیتوں کا خوش گوار امتزاج ہے۔ علامہ ابوالحسن علی ندوی نے اپنی نیف "نظرات فی الادب" میں بجا طور پر کہا ہے کہ:

"ان کے نزدیک ادب وہ ہے جو ضمیر کی صحیح ترجمانی کرے اور احساسات پر اثر انداز ہو۔ ادب کو ان تحریروں میں تلاش کرنا چاہیے جو ادب کے نام پر نہیں لکھی گئیں۔ جس میں تکلف اور تصنع سے کام نہیں لیا گیا۔ لہذا یہ بات صحیح نہیں ہے کہ ادب کو دیوانوں اور سخن سازوں کے بیانات میں تلاش کیا جائے۔"

نظہ ہوں یہ اشعار:

یہ گنج سعادت کبھی خالی ہی نہ ہوگا — سب آپ کے الطاف رقم کرتے رہیں گے
حق کے پیارے جو خیرالبشر بن گئے — سارے عالم کے نورِ نظر بن گئے
حاصلِ زیست ہیں وہی گھڑیاں — آپ کے در پہ جو گذار آئے

ی حضور صلعم سے شیفتگی کا یہ عالم ہے کہ کہتی ہیں:

آرزو اب دل میں باقی ہے یہی — جا کے طیبہ پھر نہ آنا چاہیے

، تک ان کی نعتوں کے تین مجموعے، صبر و شکر، ذکر و فکر، تسلیم و رضا سامنے آئے ہیں۔ مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے فکر و فن میں ا ہوا ہے۔ پہلے مجموعے میں وارفتگی ہے۔ دوسرے مجموعے میں جذبات کے ساتھ اشعار میں ترنم ہے۔ تیسرے مجموعے میں ایک طرح کا سوز از ہے۔

مختصراً تہنیت زور کا کلام نعتیہ شاعری میں ایک اہم مقام کا حامل ہے۔

○ ○ ○

طیبہ بیگم

مدحِ نبیؐ کی کلیاں گوندھی ہیں تہنیت نے

یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نسوانی فکر اور جذبات نے اردو ادب کو دل آویزی اور حسن عطا کیا ہے ۔ ان کی رنگین بیانیاں ادبی ماحول میں رنگ بھر دیتی ہیں ۔ بالکل قوسِ قزح کی طرح ۔

۱۹۲۹ء میں جب محترم ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ادارہ ادبیاتِ اردو قائم کرنے کا ارادہ کیا تو ان کی بیگم اور شریکِ حیات تہنیت النساء بیگم نے اس کارِ خیر کے لیے اپنی زمین کا ایک قطعہ اس غرض سے اس کی عمارت کے لیے وقف کر دیا اور خلوصِ نیت سے اپنے شوہر کا ہاتھ بٹاتی رہیں ۔ گھر کو سنبھالتی رہیں وہ اور اطمینانِ قلب کے ساتھ زور علم و ادب اور ادارے کا کام کرتے رہے ۔ یہ مقولہ درست نظر آتا ہے کہ ہر آدمی کی کامیابی کے پیچھے ایک عورت رہتی ہے ۔

زور صاحب کی سرپرستی میں اردو نسوانی دنیا میں علمی سرگرمی اور علم و ادب کا صحیح ، سنجیدہ اور سلجھا ہوا مذاق پیدا کرنے کی غرض سے "شعبہ نسواں" قائم کیا گیا جس میں قابل لکھی پڑھی خواتین کو ان کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کی بنا پر اس شعبے کی مجلس عاملہ کی زینت بنایا گیا ۔ خود تہنیت النسا بیگم اس شعبے کی سرگرم رکن رہیں اور رابعہ بیگم ، پاشا بیگم صوفی ، سکینہ بیگم ، بشیر النسا بیگم ، جہاں بانو بیگم نقوی ، لطیف النسا بیگم نے صدر ، معتمد اور شریک معتمد کے فرائض انجام دیے ۔ ان میں کوئی مضمون نگار تھیں ، کوئی شاعرہ ، کوئی مقرر اور کوئی لکچرار اور ان کی علمی سرگرمیاں حیدرآبادی تہذیب کی مکمل ترجمانی کرتی تھیں ۔ سکینہ بیگم "سب رس" کی مجلسِ ادارت کی رکن بھی تھیں اور خواتین کی قلمی کاوشوں کو ادارے کے اس ترجمان یعنی "سب رس" میں نہ صرف شائع کرواتی تھیں بلکہ ان کی تصنیف و تالیف میں بھی دل چسپی رکھتی تھیں ۔

تہنیت النسا بیگم ایک سلجھی ہوئی شاعرہ تھیں اور ہر دل عزیز شخصیت کی مالک تھیں ۔ دل کی گہرائیوں سے عاشقِ رسولؐ تھیں ۔ غزل کے پیرائے میں نعت اور قصیدے اور سلام لکھتی رہیں ۔ ان کے کلام میں خلوص و تاثر ملتا ہے ۔ لطافت اور موسیقی ان کے ہر شعر سے ٹپکتی ہے ۔ انھوں نے کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ وہ شاعرہ ہیں ۔ کسر نفسی کا یہ حال تھا کہ:

فضل ہے یہ بھی اسی کا تہنیت کے حال پر　　مل گئی مقبولیت جو چند ہی اشعار میں

لکھتی ہیں:

تہنیت ہوں نبیؐ کی مدح سرا　　شاعروں میں مرا شمار نہیں

سادگی دیکھیے:

وہ بھی دن تھے تہنیت جب تابِ گویائی نہ تھی　　مدحِ سرور میں غزل خواں بن گئے ہیں آج کل

شاعری جزوِ پیغمبری ہوتی ہے اسی خیال کے ساتھ انھوں نے لکھا ہے:

تہنیت نعتِ نبیؐ باعثِ توقیر بنی　　ورنہ ہم اہلِ سخن میں کہیں مشہور نہیں

کرو فکر" رسولؐ ان کا وظیرہ تھا "تسلیم و رضا" ان کا ایمان اور "صبر و شکر" ان کا شیوہ۔

ان کی ذکر و فکر کا محور و مرکز شہہ عجم اور میر عرب اور مکہ مدینہ تھا۔ وہ حب نبی میں سرشار تھیں اور ان کا کلام یثرب کی گلیوں میں، ہ والا کی لگن و جستجو میں اس پاک سرزمین کے صدقے لیتا نظر آتا ہے۔

تہنیت کے نعتیہ کلام کی یہ تین قندیلیں یعنی "ذکر و فکر" (۱۹۵۵ء)، "تسلیم و رضا" (۱۹۵۹ء) اور "صبر و شکر" (۱۹۵۶ء) کے ے میں آغا حیدر حسن نے کس خوب صورتی سے اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔ کہتے ہیں: "ان کی ہر نعت ایک چراغ ہے۔ کیسا چراغ؟ جس کی ر میاں قرآن میں تعریف فرماتے ہیں کہ بلور کی قندیل ہے اور اس میں زیتون کے تیل کا چراغ روشن ہے۔ زور بیگم کی نعتوں کی یلیں حرم نبویؐ میں نظر آتی ہے۔ اللہ! یہ اتنے سارے روشن حسین چراغ ان کے پاس کہاں سے آئے"؟ تہنیت کو آغا حیدر حسن "زور یم" کہا کرتے تھے اور ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔

میری والدہ سکینہ بیگم سے تہنیت النساء بیگم کے بڑے اچھے مراسم تھے۔ وہ صرف دوست ہی نہیں ایک دوسرے کی قدر دان بھی یں اور اردو ادب کی خدمت میں دونوں نے جی جان سے حصہ لیا اور اپنا فرض ادا کیا۔

"شعبہ خواتین" کی میٹنگس ہمارے گھر ہوا کرتی تھیں۔ یہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ ایک ہشت پہلو میز فرش پر رکھا ہوتا تھا ں پر ایک میزپوش اور میزپوش پر ہر خاتون کے لیے ایک فائل رکھی جاتی تھی جس میں میٹنگس کا ایجنڈہ ہوتا تھا اور کاروائی کی روداد۔ ب سب خواتین مجلس عاملہ آجاتیں تو ان کے لیے پہلے تو چائے اور دوسرے لوازمات کا انتظام ہوتا اور پھر میٹنگ شروع ہوتی۔ سب کو ام کرکے میں چپکے سے والدہ کے پیچھے آکر بیٹھ جاتی تھی اور ان خواتین کے مفید مشوروں اور مستقبل کے لائحہ عمل کا دلچسپی سے جائزہ ں۔ کسی نے اس پر اعتراض کبھی نہیں کیا بلکہ وہ میرے ذوق ادب کی ہمت افزائی کرتی رہیں۔ دراصل میرے ادبی ذوق کی ابتدا یہیں ہ ہوئی۔ یہیں میں ان خواتین اور ان کی صلاحیتوں سے واقف ہوئی۔ والدہ کے پاس بہت سارے مضامین اور افسانے اشاعت کے لیے تے تھے۔ ان کی اجازت سے میں انھیں پڑھتی اور ان کے بارے میں اپنی ناقص رائے کا اظہار بھی کرتی۔

تہنیت اسلامی معاشرت کی نمائندہ تھیں اور حیدرآبادی تہذیب کی پروردہ اور دل دادہ۔ ان کی شخصیت میں ایک خاص کشش ں۔ ان کا برتاؤ پرشفقت اور گفتگو نرم اور دھیمی ہوتی۔

تہنیت کی نعتیں اور قصیدے ان کے دلی جذبات سے لب ریز ہوتی ہیں۔ کہتی ہیں:

ہر شعر مرا تہنیت اک نالہء دل ہے — اس سے مجھے منظور کوئی نام نہیں ہے
تمھاری دھن میں ہیں ہم بے نیاز دولت کونین — ہماری آرزو تم ہو ہمارا مدعا تم ہو
ان ہی کے لطف سے ہے تہنیت مست مئے عرفاں — نہ ہوتے وہ اگر ساقی تو مئے خانے کہاں جاتے
حب نبیؐ ہے نعمت دارین تہنیت — اس کے سوا کسی کی تمنا نہ کیجیے

نیت عمر بھر ساقیِ کوثر کی شیفتہ رہیں اور مدینے کے قصیدے گاتی رہیں:

حرم میں جابجا اس شوق میں کیے سجدے — حضور جلوہ فگن بس یہیں ہوئے ہوں گے
روضہء انور کے قصے اور حرم کے تذکرے — راحت دل مونس جاں بن گئے ہیں آج کل
مدینے کے وہ دن وہ دل کش فضائیں — نہ کیوں یاد آئیں نہ کیوں دل دکھائیں

وہ صبحِ حرم وہ شبِ راہِ طیبہ
کلی جوں کھلے ، پھول جوں مسکرائیں

جان کے ساتھ جائے گا یہ غم
کیوں حرم سے چلے آئے تھے ہم

فرشِ اقدس ہے اور اپنا سر ہے
ہائے دونوں کا وہ ربط باہم

آرہی ہے ہوائے مدینہ
تہنیت دردِ دل ہے جو کچھ کم

یثرب میں اگر مل جائے زمیں تھوڑی سی اسے مدفن کے لیے
پھر تہنیتِ خوش قسمت کا یاں پھر کوئی ارماں کیا ہوگا

یہ عاشقِ رسولؐ حیدرآباد میں پیدا ہوئیں اور ہوش سنبھالا ۔ محبوبیہ گرلز اسکول میں جہاں حیدرآباد کے شرفا اور امراء اپنی لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجتے تھے ، تہنیت سینیئر کیمبرج تک تعلیم حاصل کرتی رہیں ۔ اپنا زیادہ وقت مطالعے میں گزارتیں ۔ ۱۹۳۱ء میں آپ کی شادی جناب محی الدین قادری زور سے ہوئی اور ان کے آنگن میں پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں کھیلتی نظر آئیں ۔

۱۹۵۱ء میں آپ نے پہلا حجِ بیت اللہ کیا اور پھر ۱۹۶۶ء میں دوسری بار حرمِ پاک اور شاہِ امم میرِ عرب کے درِ مقدس پر حاضری دی

جب زور صاحب کشمیر..... فردوس بر روئے زمین ، سدھارے تو تہنیت بھی ان کے ساتھ گئیں ۔ ۱۹۶۲ء میں دلِ ناتواں نے زور کا جینا حرام کردیا ۔ برسوں کا ساتھ چھوٹا اور ایک سوگوار تہنیت ۳ مہینے بعد واپس اپنے گھر لوٹیں تو جیسے زندگی کی دھوپ ڈھل چکی تھی ۔ وہ گوشہ نشین ہوگئیں ۔ خدا نے انھیں اولاد کی خوشیاں دکھائیں ۔ بیٹیاں داماد ، بیٹے ، بہو ، پوتے پوتیاں ، نواسے نواسیوں نے ان کی دل جوئی کی ۔ ہردم آپ کو سب گھر والوں کی فکر رہی گھرداری ، مطالعے اور شاعری میں وقت نکل جاتا ۔

آخر آخر میں وہ بیمار رہنے لگیں ۔ دوبار میں نے حاضری دی اور کیفیت دریافت کرنے گئی مگر معلوم ہوا کہ علالت کی وجہ سے وہ فریش ہیں اور کسی سے نہیں ملتیں ۔ میں لوٹ آئی ۔

۸ نومبر ۱۹۹۶ء کو جب آپ اللہ کو پیاری ہوئیں میں حیدرآباد سے باہر گئی ہوئی تھی ۔ سنا سینے میں درد رہنے لگا تھا ۔ کم زوری اور ناتوانی محسوس کرتی تھیں ۔ وقتِ سفر دریافت کیا کہ سب بچے ان کے قریب ہی ہیں اور پھر زبان پر اللہ کا نام ، کون جانے آنکھوں میں شبیہِ رسولؐ ہوگی اور روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی ۔

جب مجھے اس کی اطلاع ہوئی میں تقی الدین اور رفیع الدین سے ملنے تہنیت منزل گئی ۔ ایک بار رونق گھر بے رونق ہوگیا تھا ۔ بہت دیر تک تہنیت ہی کی باتیں ہوتی رہیں ۔

دمِ آخر خیال انھیں ہمیشہ ستاتا رہتا تھا ۔ لیکن انھیں یقین تھا کہ :

اس کو بخشائیں گے حبیبِ خدا
تہنیت کا یہی سہارا ہے

بچالو تہنیت کو روزِ محشر شرم ساری سے
اسے ہے ناز اس کا شافعِ روزِ جزا تم ہو

لیتے ہیں نام ان کا جو نام خدا کے ساتھ
سنتے ہیں وقتِ مرگ وہ جلوہ دکھائیں گے

کالی کملی میں وہ چھپالیں گے
پرسشِ حشر کیا ڈراتی ہے

نزع کی فکر ابھی سے دلِ ناداں بے سود
وقت پر سیدِ ابرار چلے آئیں گے

یا علیؑ نکلے گا جب منہ سے مصیبت میں بھی سنتے ہیں حیدرِ کرار چلے آئیں گے

ں عقیدت تہنیت کو اپنے خدا، رسولؐ اور اہل بیت سے۔ گاہے گاہے وہ بادِ صبا کو اپنا پیام بر بناتی تھیں:

کہنا صبا مدینے میں جاکر بہ صد ادب گل دستہ ایک نعتیہ اب لا رہے ہیں ہم
قلبِ مضطر کی خبر سوئے حرم پہنچادے تیرے جھونکے جو ادھر بادِ صبا جاتے ہیں

ی جستجو میں رہتی تھیں کہ کسی طرح محبوبِ خدا کے قریب پہنچ جائیں:

رہے نظروں میں گنبدِ خضرا ان کا جلوہ ہو زندگی کے قریب
سربہ سجدہ رہیں، انھیں نہ کبھی پھر جو پہنچیں درِ نبیؐ کے قریب
عمر گزرے ان ہی کے روضے پر جان دے دیں گے ہم ان ہی کے قریب

یہ ان کی دیرینہ آرزو پوری نہ ہوئی یثرب کی یاد ان کے دل کو تڑپاتی رہی:

ذکرِ حرم میں ملتا ہے اک لطف تہنیت قصہ یہی پسند، یہی گفتگو پسند
تمنا رہ گئی دل میں جو ہم ہندوستاں لوٹے فدا کرنے کو روضے پر ہم اپنے جسم و جاں جاتے

کتنے خوش نصیب تھے وہ لوگ جو مدینے میں آسودہء خاک ہوئے۔ تہنیت کی والدہ اسما بیگم اسی سرزمین پر پیوندِ خاک ہوئیں۔

تعلق فرنگی محل سے تھا اور ننھیالی سلسلہ حضرت شہاب الدین سہروردی سے ملتا ہے۔

تہنیت کے والد ضیاالحق فصیح الدین احمد خاں بیدر اور اورنگ آباد میں صوبہ داری کے منصب پر فائز تھے۔ صنعتی نمائش کی ابتدا ں نے ہی کی بیدری صنعت و حرفت اور کاغذ سازی اور تجارت کو انھوں نے فروغ دیا۔ عوام میں وہ "دھرما اوتار" کے لقب سے ے جاتے تھے۔ انھوں نے کئی دار المطالعے قائم کیے اور آصف جاہ ششم میر محبوب علی خاں نے اپنی چالیس سالہ جوبلی کے موقع پر انھیں ت یار جنگ ثانی کے خطاب سے نوازا تھا۔

دادا شیخ احمد حسین تھے۔ جنھیں غفران مکاں نے نواب رفعت یار جنگ کا خطاب عطا کیا تھا۔

جدِ اعلیٰ ملا عطا اللہ محمود عرب سے بخارا پہنچے اور پھر دہلی آئے۔ سلطان معزالدین سام کا عہد تھا۔ ان کی قابلیت اور علمیت سے متاثر سلطان نے انھیں ناگور کا قاضی مقرر کیا تھا۔ ان کے انتقال پر ان کے بیٹے قاضی احمد الدین ناگوری کو خلیفہٴ اعظم کے عہدے پر فائز ا جو خود بھی عالم و فاضل تھے اور حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے استاد تھے۔

مغل شہنشاہ جہاں گیر اور شاہ جہاں کے دورِ حکومت میں تہنیت النسا کے افرادِ خاندان صوبہ داری اور وزارت کے اعلیٰ عہدوں پر رہے۔ کچھ افرادِ خاندان اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں دکن آئے اور اورنگ آباد کو اپنا مسکن بنایا۔ بعض افرادِ خاندان مشائخ اور ب رشد و ہدایت بھی رہے ہیں۔

اس خاندانی ورثے میں تہنیت کو ایسا ہی ہونا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ لیکن بہت کم لوگوں نے انھیں جانا، ان کی شاعری سے واقف ،۔ اور آج جب وہ ہم میں نہیں رہیں، ان کے قدر دان انھیں یاد کرکے روتے ہیں۔

جن کلیوں کو تہنیت نے اپنے آنسوؤں سے محبت و الفت کے دھاگوں میں پرو دیا تھا، کاش ہم بھی ان کلیوں کو چن سکتے۔ اس گل، سے گزر سکتے!

اس پاک بی بی کو آج ہم اپنا خراجِ عقیدت اپنی یادوں کے پھولوں سے پیش کرنے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔

عرشیہ جبین

تہنیت النسا بیگم زور

(ڈاکٹر زینت ساجدہ صاحبہ سے شخصی انٹرویو)

ع ۔ ج : تہنیت النسا بیگم زور کے بارے میں آپ کیا جانتی ہیں ؟

ز ۔ س : تہنیت النسا بیگم زور نواب رفعت یار جنگ بہادر کی صاحب زادی تھیں ان کی چار بہنیں اور دو بھائی تھے ۔

تہنیت النسا بیگم زور کا خاندان رکھ رکھاؤ اور آداب و اطوار والا تھا کبھی میں سے بات نہیں کرتے تھے بلکہ " ہم " سے بات کرتے ۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ " ہم " سے بات یا تو درویش کرتے ہیں یا بادشاہ ۔ میں سمجھتی ہوں یہ لوگ درویش تھے ۔ تہذیب یافتہ لوگ تھے ۔ پرانی وضع داری تھی خواتین گوشہ پردے کی پابند تھیں اور ہمیشہ سر ڈھانکے رہتی تھیں ۔

ع ۔ ج : تہنیت صاحبہ کے اوصاف اور عادات و اطوار پر کچھ روشنی ڈالیے ۔

ز ۔ س : تہنیت صاحبہ بہت ہی آہستہ بات کرتی تھیں ۔ تہنیت صاحبہ میں جھوٹی شان نہیں تھی اور نہ ہی دکھاوا تھا بلکہ انتہائی سادگی تھی ۔ حیدر آباد کی تہذیب کے مطابق اصول پسند ۔ تکلف طبیعت میں تھا ۔ آپ کے والد صاحب کی طبیعت میں صبر وضبط اور اخلاق پسندی تھی ۔ تو یہی خصوصیات بچوں میں بھی آئی ہیں ۔ ایک واقعہ ان کے والد صاحب کا مجھے یاد ہے ، وہ یہ کہ میں نے سنا تھا کہ ان کے والد صاحب کھانا کھاتے وقت اگر کوئی چیز یعنی کھانا یا سالن پسند نہ آئے تو اس کا اظہار نہیں کرتے تھے یعنی صاف صاف بتاتے نہیں تھے بلکہ خاموشی سے اٹھ جاتے تھے یعنی ان کی بیوی خود یہ اندازہ کرلیتی تھیں کہ کھانا یا سالن صحیح نہیں بنا ہے یعنی والد صاحب کی طبیعت میں سادگی اور خاموشی تھی صبر وضبط تھا اور یہی خصوصیت ان کی اولاد میں بھی آئی تھی ۔

ع ۔ ج : تہنیت النسا بیگم زور کی نعتیہ شاعری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟

ز ۔ س : ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا ان کے کلام میں تنوع ہے نعت گوئی کا ذوق انھیں والدہ کی طرف سے ملا ۔ ان کی والدہ بھی شعر کہتی تھیں نعت میں جذبہ کو دیکھا جاتا ہے ان کی نعت میں بھی دلی جذبات خصوصاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و عقیدت کا اظہار ملتا ہے ۔

ع ۔ ج : ہم عصر شاعرات کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے تھے ۔

ز ۔ س : ہم عصر شاعرات کے ساتھ ان کے اچھے روابط تھے ۔ سب مل کر کام کرتی تھیں اس زمانے میں خواتین کی ایک تنظیم ہوا کرتی تھی اس میں لڑائی جھگڑے والی کوئی بات نہیں ہوتی تھی ۔ اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ تنظیمی سرگرمیوں میں لوگ عہدے کے خواہش مند ہوتے ہیں لیکن تہنیت صاحبہ کے دور میں یہ بات نہیں تھی سب ہی خواتین مل جل کر کام کرتی تھیں

نہایت ہی خلوص سے ملتی تھیں۔

ج : تہنیت صاحبہ کی سماجی اور ادبی خدمات کے بارے میں کچھ بتایئے۔

س : اس زمانے میں لیڈی حیدری کلب کے بڑے ہال میں مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ ادبی موضوعات پر مضامین پڑھے جاتے تھے۔ ساتھیوں میں صغرا ہمایوں مرزا، جہاں بانو نقوی، لطیف النسا بیگم وغیرہ تھیں یہ سب خواتین اس تنظیم کی سرگرم رکن تھیں اور یہ لوگ اپنے مضامین کے ذریعے ترک رسوم، کفایت شعاری، بچوں کی تربیت، علم کی اہمیت، لڑکیوں کی تعلیم، ادب سے دل چسپی وغیرہ کی طرف متوجہ کرتے تھے۔ یہی خواتین تھیں جو حیدرآباد میں جتنی بھی کانفرنسیں ہوتی تھیں ان میں خواتین کی نمائندگی کرتی تھیں، ادبی محفل ہو یا مشاعرے چلمن ڈال کر پردے کا اہتمام کیا جاتا تھا نسوانی تعلیم کی اہمیت پر زور دیا جاتا تھا اور سماجی اصلاح ان کا مقصد ہوا کرتا تھا۔ انھی لوگوں کو دیکھ کر ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ یعنی ان لوگوں نے ہمارے لیے زمین تیار کی تھی جس کی وجہ سے آج ہم نے یہ مقام حاصل کیا ہے۔

حیدرآباد میں حبیب الرحمٰن صاحب اور ان کی بیوی دوسرے ڈاکٹر زور کی بیوی صرف دو ہی لوگ ایسے ہیں جنھوں نے اپنی جائیداد کا بڑا حصہ اردو کی خدمت کے لیے بہ طور عطیہ دیا ہے۔

ج : تہنیت النسا کا کوئی واقعہ یاد ہو تو بتایئے۔

س : ایک واقعہ ڈاکٹر زور صاحب کا ہے وہ یہ کہ زور صاحب روز صبح کے وقت اپنے گھر کی چھت پر کرسی ڈال کر بیٹھتے تھے اور باہر کا نظارہ کرتے تھے۔ روز صبح دودھ والا آیا کرتا تھا اور اپنی بھینس سے دودھ نکال کر اس میں تھوڑا سا پانی ملا دیتا تھا۔ زور صاحب روز اس کی اس حرکت پر نظر رکھتے تھے اور ہر روز یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ جب کسی طرح بیگم صاحبہ کو یہ اطلاع ہوئی تو وہ دودھ والے پر بگڑیں لیکن زور صاحب انتہائی نرم لہجے میں کہنے لگے کہ جب ہم روز دودھ والے کو دودھ میں پانی ملاتے دیکھتے تھے تو ہم نے کچھ نہیں کیا اور آپ نے ایک بار سنا تو بگڑ گئیں یعنی ان کے شوہر ڈاکٹر زور کی طبیعت میں نرمی تھی۔ وہ اخلاق پسند اور انسانیت پسند شخص تھے۔ کبھی کسی پر غصہ نہیں ہوتے تھے ہر ایک کی مدد کرتے تھے۔

○●○

(سلسلہ ص : ۲۶ سے)

ب میں ڈھلتی چلی گئی ہے اور محبت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک شعر سے جھلکتی ہے۔"

محترمہ تہنیت کا کلام مختلف علمی، ادبی اور دینی رسائل و جرائد میں بھی چھپتا رہا ہے اور حیدرآباد کی اب سے ربع صدی کی نمائندہ نعتیہ محفلوں بزم کامل شطاری، بزم جلیل، گلستاں اور بزم یاد صفی کی طرح نعتیہ محفلوں اور مشاعروں میں سنا جاتا رہا ہے۔

محترمہ تہنیت زور مرحومہ کی نعتیہ شاعری بلاشبہ ہندوپاک کی شاعرات میں اولیت اور افضلیت کا مقام رکھتی ہے۔

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

000 0 000

عرشیہ جبین

تہنیت النسا زور

(بانو طاہرہ سعید صاحبہ سے انٹرویو)

ع ۔ ج ۔ آپ تہنیت صاحبہ کو کب سے جانتی ہیں اور ان سے کیسے ملاقات ہوئی ؟

ب ۔ط ۔ س ۔ میں انھیں ۱۹۵۰ء سے جانتی ہوں ۔ ڈاکٹر زور صاحب کی وہ اہلیہ تھیں ۔ زور صاحب کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ لوگوں کو پہچان جاتے تھے کہ ان میں کیا جوہر ہے ۔ مجھے تو خبر بھی نہیں تھی کہ مجھ میں کوئی جوہر ہے بھی یا نہیں لیکن زور صاحب نے مجھے بھانپا اور مجھے مجبور کیا کہ میں ان کی ادبی محفلوں میں حصہ لوں ۔ ان کی لڑکیوں سے بھی میری دوستی تھی خاص کر ان کی بڑی لڑکی تہذیب النسا بیگم میری خاص دوست تھیں اس لیے اکثر میں ان کے گھر جایا کرتی تھی ۔ اس طرح تہنیت النسا زور سے بھی میری ملاقات ہوئی ۔ ان کے گھر جاتے جاتے ایسا ہوا کہ ہم ان کے گھر کے ایک فرد گنے گئے اور بہت نزدیک ہوگئے ۔ شروع میں جب ان سے ملاقات ہوئی تو ایسا معلوم ہوا کہ میرے بہت ہی عزیز نزدیک کے رشتہ دار مل گئے ہیں ۔

ع ۔ ج ۔ تہنیت النسا صاحبہ کی شخصیت کے بارے میں کچھ اپنے تاثرات بیان کیجیے ؟

ب ۔ط ۔ س ۔ ان کی شخصیت کے بارے میں کیا عرض کروں ۔ ایسی خواتین کسی بھی محفل یا کسی بھی قوم میں بہت کم ملتی ہیں ۔ انھیں خدا نے حسنِ صورت دیا ، حسنِ سیرت دیا اور حسنِ اخلاق دیا اور بہت ہی زبردست پاکیزہ روحانیت دی ۔ یہ بہت بڑی خدا کی نعمت ہے ۔ ان کی فطرت ایسی تھی کہ ہر ایک کے ساتھ مسکراکر ملتی تھیں ، نہایت مہمان نواز ، اردو زبان سے عشق اور گرم جوشی ایسی کہ اتنی بڑی زمین اردو کے لیے وقف کردی ۔ جس پر ایک عمارت ایوانِ اردو کے نام سے قائم ہے جس سے اردو زبان کو بین الاقوامی سطح پر فائدہ پہنچ رہا ہے ۔

وہ خود نمائی کی خواہش مند نہیں تھیں ۔ طبیعت میں نفاست بہت تھی ۔ انتہائی شائستہ خاتون تھیں ۔ اس زمانے میں جو مشاعرے منعقد ہوتے تھے تو پردے کے اس طرف بیٹھ کر دوسرے شعرا کے کلام کو سنتی تھیں اور بہت ہی Enjoy کرتی تھیں ۔ ہم نے ہمیشہ ان کو ساری پہنے دیکھا ہے ۔ لباس ان کا بڑا اچھا ہوتا تھا ۔ ہلکے ہلکے رنگ کے ٹھنڈ لباس بہت پسند کرتی تھیں ۔ بہت ہی پیاری صورت ، گورا رنگ ، متوسط قد ، چھریرا جسم ، ان کی بڑی لڑکی سے کچھ کچھ شباہت ملتی ہے ۔

وہ خاتون خالص حیدرآبادی تہذیب اور اسلامی شرافت کا ایک اعلیٰ نمونہ تھیں ۔ مغرب زدہ نہیں تھیں لیکن ان کے خیالات بہت کھلے تھے کہ لڑکیوں سے کہتی تھیں کہ مغرب کی جو خوبیاں ہیں ان سے فائدہ اٹھائیں ۔

ع ۔ ج ۔ تہنیت النسا بیگم صاحبہ کی شاعری کے بارے میں کچھ بتلایئے ؟

ب ۔ط ۔ س ۔ تہنیت النسا زور بہترین شاعرہ تھیں لیکن انھوں نے اپنی شاعری کو صرف نعت گوئی کے لیے وقف کردیا تھا ۔ وہ حج کے لیے بھی تشریف لے گئیں تو وہاں ان پر جو اثرات مرتب ہوئے ان کو اپنی شاعری میں قلم بند کیا ہے اور ان کی شاعری ایسی ہے جس

ن کر آنکھ سے بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں۔ انتہائی خوب صورت زبان ہے۔ موضوعات میں ہمیں حضورِ اکرم کے واقعات و مقام،
نورِ اکرم سے جو لگن ہے جو تڑپ ہے وہ نظر آتی ہے۔ انھوں نے غزل کی روح کو نعتیہ کلام کے ساتھ پیوست کردیا ہے۔ ان کی نعتوں
، تغزل ہے، شعریت ہے۔ روکھا پھیکا کلام نہیں ہے۔ جب آپ کی نعت پڑھتے ہیں تو وہ دل کو چھوجاتی ہے۔ زبان بہت میٹھی ہے۔
س غزل کی زبان اور عام فہم زبان ہے اور بے حد جذبات میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

ع - ج ۔ تہنیت النسا صاحبہ کے وفات پا جانے سے آپ کیا محسوس کرتی ہیں؟

ب۔ ص۔ س۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ان کو قلب کی شکایت لاحق ہوگئی تھی اور ایک عرصے سے وہ بیمار تھیں مجھے اس کی اطلاع
، تھی۔ ان کی صاحب زادیاں جب پاکستان سے آئیں تو ان کے اعزاز میں ہم نے "ایوانِ اردو" میں ایک محفل منعقد کی تھی تو ان
، ذریعے معلوم ہوا کہ وہ والدہ کو دیکھنے آئی تھیں۔ تھوڑے عرصے بعد وہ پاکستان چلی گئیں اور یہ خدا کو پیاری ہوگئیں۔ یقین کیجیے آپ کے
، جانے سے دنیائے نسواں میں، فقط حیدرآباد نہیں بلکہ پورے برصغیر کی خواتین میں بھی، چاہے وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، عورت ذات
، اندر ایک کمی پیدا ہوگئی ایک خلا ہوگیا۔ وہ پس منظر میں رہتی تھیں وہ اتنی اچھی سلیقہ مند بیوی تھیں اور اتنی ہی اچھی ماں بھی تھیں اور
رف اپنے بچوں کے واسطے ان کا سایہ بہت ہی قیمتی تھا بلکہ ہم سب کے لیے بھی۔ وہ ہر ایک کی بہی خواہ تھیں۔ اور ان میں ایک
ب بات یہ تھی کہ ان سے ملنے کے بعد دل چاہتا تھا کہ دوبارہ ملیں اور پھر ملتے ہی رہیں اور کام کرنے کا جذبہ بھی پیدا ہوتا تھا۔ خود ڈاکٹر
صاحب کی بھی یہ حالت تھی خیر ڈاکٹر صاحب کی یہ بات تھی کہ وہ ہر ایک کو پرکھ لیا کرتے تھے وہ خود مجھ سے کہا کرتے تھے کہ میں
، شعری اصناف کا مجموعہ نکالوں میرا پہلا مجموعہ "گلِ سبز" کے نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے جس میں غزلیں، نظمیں، قطعات وغیرہ شامل
جس کا پیش لفظ خود ڈاکٹر صاحب کا لکھا ہوا ہے۔

تھوڑے عرصے کے بعد ڈاکٹر زور ریٹائر ہوکر کشمیر چلے گئے جہاں کی یونیورسٹی میں انھیں ایک بڑے عہدے پر فائز کیا گیا۔ وہ
ں سے لیے گئے کے پھر واپس نہیں ہوئے۔ ان کا انتقال وہیں پر ہوا اور وہیں تدفین بھی عمل میں آئی۔ یہ ایک افسوس ناک بات
کہ اس حادثے نے بیگم صاحبہ کو ہلادیا تھا اور ان کو اتنا دکھ پہنچا کہ بیگم صاحبہ علیل رہنے لگیں اور ۱۹۹۶ء میں وہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔
کا ادارہ قائم ہے۔ ان کا نام دائم ہے اور جب تک اردو زبان قائم ہے تہنیت النسا بیگم زندہ ہیں۔ ہمارے اور ان کے بیچ میں ایک
ضرور آگیا ہے لیکن وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور انھوں نے جو خدمت کی ہے اردو زبان اور عام انسانوں کی۔ اس کا اجر خدا
ں پر دے اور اپنی رحمت میں ان کو رکھے۔

میری یہ آرزو ہے کہ کم سے کم حیدرآباد کا جو نوجوان طبقہ ہے خواتین کا وہ ان کو یاد رکھے۔ ایسا ہے کہ ہم اپنے محسنوں کو
ں جاتے ہیں۔ ایوانِ اردو کی عمارت میں ایک شعبہ "شعبۂ خواتین" کے نام سے ہے جس کی صدر فاطمہ عالم علی خاں ہیں۔ میں بھی
شعبے کی ایک ممبر ہوں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کی یاد میں ایک محفل برپا کریں اور اس محفل کے ذریعے ہم کو آئندہ سبق مل جائے مجھے
بات کی خوشی ہوگی۔ انشا اللہ تعالیٰ۔

● ☆ ●

عرشیہ جبیں

تہنیت النسا زور

(سید امتیاز عطاءاللہ خاں صاحب اور ان کی شریکِ حیات ثریا مہر صاحبہ سے شخصی انٹرویو) ۔

سید امتیاز عطاءاللہ خاں صاحب کا تہنیت صاحبہ کے ساتھ اس طرح تعلق تھا کہ ان کے ماموں نواب میر باسط علی خاں آصفیہ عدالت کے ہائی کورٹ کے جج تھے ۔ ان کی زوجہ عظمت النسا ، بیگم صاحبہ کی بڑی بہن تھیں ۔ ڈاکٹر زور کے یہاں بچپن ہی سے آنا جانا لگا رہتا تھا ۔ بیگم زور انھیں بہت چاہتی تھیں ۔ بالکل اپنے بچے کی طرح سمجھتی تھیں ۔ ان میں اور اپنے بچوں میں فرق نہیں کرتی تھیں ۔ امتیاز صاحب کی شادی کے بعد ثریا مہر صاحبہ کا تہنیت زور کے ہاں کافی آنا جانا رہا ہے ۔ وہ دونوں شاعر تھیں ۔ اس لیے تہنیت صاحبہ ان کو بہت پسند کرتی تھیں اور ان سے اپنی نعتیں ترنم میں پڑھواتی تھیں ۔ ایک شخصی انٹرویو میں سید امتیاز عطاء اللہ خاں صاحب اور ثریا مہر صاحبہ نے محترمہ تہنیت النسا بیگم صاحبہ کے بارے میں حسب ذیل تفصیلات اور تاثرات پیش کیے ۔

تہنیت النسا بیگم صاحبہ نواب رفعت یار جنگ بہادر کی صاحب زادی تھیں ۔ وہ ہر ایک سے خوش دلی اور خوش کلامی سے پیش آتی تھیں اور بڑی جامہ زیب شخصیت کی مالک تھیں ۔ گوری رنگت ، کھڑی ناک ، مناسب ہونٹ اور مناسب ہی قد ۔ خوش مزاجی اور خوش لباسی تو جیسے ان کی طبیعت میں رچ بس گئی تھی ۔ ہمیشہ ہنستی اور مسکراتی رہتی تھیں جس سے دوسروں کو ان کی دلی کیفیت کا اندازہ نہیں ہوتا تھا ۔ کوئی بھی پریشانی ہو ظاہر نہیں ہونے دیتیں ۔ یعنی ان کی طبیعت میں صبر وضبط کا مادہ بہت زیادہ تھا ۔ یہ وصف انھیں ورثے میں ملا تھا ۔ تہنیت صاحبہ کے والد نواب رفعت یار جنگ بہادر کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے ۔ ان کے ہاں جب کوئی مہمان آتے تو وہ کپڑے بدل کر یعنی اکثر شیروانی پہن کر ان سے ملنے کے لیے باہر آتے تھے ۔ ایک دن ان کے ہاں چند عمائدین شہر آئے ہوئے تھے وہ حسب معمول شیروانی پہن کر باہر آئے ۔ اتفاق سے ان کی شیروانی میں ایک بچھو موجود تھا اور وہ انھیں کاٹنے لگا ۔ چوں کہ وہ اس وقت معزز لوگوں سے مصروفِ گفتگو تھے اس لیے انھیں چھوڑ کر جانا مناسب نہیں سمجھا اور جگہ سے نہیں اٹھے ۔ برابر گفتگو کرتے رہے اور ادھر بچھو بھی برابر ڈنک مارتا رہا ۔ یہاں تک کہ ان کا بازو زخمی ہوگیا وہ مسلسل برداشت کرتے رہے ۔ جب سارے لوگ چلے گئے تو اندر آئے ۔ شیروانی اتار کر دیکھا تو بچھو تھا ۔

کچھ ایسی ہی قوتِ برداشت تہنیت صاحبہ میں بھی تھی ۔ انھیں اپنے بھائی کے انتقال اور اپنی پوتی کے حادثے کا بڑا صدمہ تھا لیکن اس غم کا احساس دوسروں کو ہونے نہیں دیا ۔ صرف خاموشی ہی غماز تھی کیوں کہ ایسے موقعوں پر وہ اکثر خاموش رہا کرتی تھیں ۔

تہنیت صاحبہ لذیذ کھانے پسند کرتی تھیں مگر ان کی غذا بہت مختصر ہوتی ۔ کھانے میں نزاکت کا بڑا اہتمام تھا ۔ ایک تو یہ کہ کافی دیر تک دوسروں کا ساتھ دیتیں اور دوسری طرف ان کی خوراک بھی بہت کم رہتی ۔ البتہ پان کھانے کا شوق تھا جسے آخری دنوں میں ترک کردیا ۔

لباس بڑے سلیقے سے پہنتی تھیں ۔ شائستگی اور نفاست کا بڑا خیال رکھتیں ۔ کپڑے سنبھال سنبھال کر رکھتیں ۔ چناں چہ شادی کا کھڑا دوپٹہ اس طرح سنبھال کر رکھا تھا کہ کئی برس گزرنے کے بعد بھی بالکل نیا معلوم ہوتا تھا ۔

موسیقی سننے کا بے حد شوق تھا۔ غزلیں اور نعتیہ قوالیاں ٹیپ رکارڈر پر بڑے شوق سے سنتی تھیں اور گھر پر بھی قوالیوں کا اہتمام رہتا تھا۔ ڈائس کے قریب پردہ ڈالا جاتا اور وہاں بیٹھ کر وہ بڑے شوق سے قوالیاں سنتی تھیں۔ پردے کی بڑی پابند تھیں کیوں کہ گھر کا ماحول ہی کچھ یسا تھا کہ اگر کہیں باہر بھی جاتیں تو کار کے شیشوں پر پردہ لگا رہتا تھا۔

بچوں سے غیر معمولی لگاؤ تھا۔ ان میں اس طرح گھل مل جاتیں کہ بچے ان کی خوش مزاجی سے متاثر ہوکر ان کے دوست بن جاتے تھے۔ لہجے میں نرمی تھی اور آہستہ سے بات کرتی تھیں۔ نوکروں کے ساتھ ان کا سلوک مشفقانہ تھا۔ بہوؤں کو اپنی بیٹیاں سمجھتی تھیں ان کے ساتھ بیٹیوں جیسا سلوک رکھتیں اور انھیں بہت چاہتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انتقال کے وقت ان لی ایک بہو جو ان سے بہت زیادہ نوس تھیں، بے ہوش ہوگئیں۔

تہنیت صاحبہ ایک شوہر پرست، وفاشعار، اور فرماں بردار بیوی تھیں اور اپنے شوہر کا ہر دم ہر گھڑی خیال رکھتی تھیں۔ مثال کے ور پر اگر کہیں شادی وغیرہ میں جانا ہو اور زور صاحب کہہ دیں کہ مقررہ وقت پر واپس آجائیں تو وہ شادی میں شرکت کے بعد ٹھیک وقت پر واپس جاتیں۔ زور صاحب کی مصروفیت کا ہردم خیال رکھتیں۔ زور صاحب کی عادت تھی کہ رات دیر گئے تک وہ کام میں مصروف رہتے تو وہ بھی برابر پنے شوہر کا ساتھ دیتیں اور جاگتی رہتیں اور اس وقت تک کھانا نہیں کھاتیں جب تک کہ زور صاحب اپنے کام سے فارغ نہ ہوجاتے۔ اس کے د دونوں مل کر رات کا کھانا کھاتے۔ زور صاحب بڑے خوش نصیب تھے کہ انھیں ایسی وفاشعار، خدمت گزار اور نیک بیوی ملی۔ زور صاحب بھی نی بیگم کو خوب چاہتے تھے اور دونوں میں بڑے خوش گوار تعلقات تھے۔ اس زمانے میں پنجہ گٹہ کا علاقہ ویران رہتا تھا۔ زیادہ آبادی بھی نہیں تھی اس لیے شام کے وقت زور صاحب اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ چہل قدمی کے لیے نکل جاتے تھے۔

تہنیت صاحبہ کی صحت آخر دم تک اچھی رہی۔ وہ زیادہ بیمار بھی نہیں تھیں۔ آخر آخر زمانے میں معمولی سا دردِ شکم رہتا تھا۔ گیس شکایت تھی لیکن مسلسل کم زوری نے انھیں نڈھال کردیا تھا۔ غذا بھی بہت کم رہ گئی تھی۔ کسی کو بھی گمان نہیں تھا کہ ان کا آخری وقت آگیا ہے اور آخر وہ وقت آہی گیا کہ جس سے کسی کو مفر نہیں۔

آپ کو اللہ تعالی نے نیک اولادیں بھی دیں۔ پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں۔ فرزندوں میں (۱) سید تقی الدین قادری (۲) سید علی ین قادری (۳) سید صفی الدین قادری (۴) سید رفیع الدین قادری (۵) سید رضی الدین قادری اور دختران میں (۱) تہذیب النسا (۲) توقیر النسا ۲) توفیق النسا (۴) تسنیم النسا۔ الحمدللہ بہ قید حیات ہیں۔

آپ کا نعتیہ کلام بہت متاثر کن اور دلی احساسات کا آئینہ دار ہے جو کچھ محسوس کرتیں اسے الفاظ میں ڈھال دیتی تھیں اور شعر کے ے میں پیش کرتیں۔ مدینے سے لوٹنے کے بعد اکثر مدینے کا ذکر ہی ان کی زبان پر رہتا اور مدینے کی یاد انھیں بے چین کیے رہتی۔ اس کا اظہار ، کے نعتیہ کلام میں جابجا ملتا ہے۔ ثریا مہر نے کہا کہ ان کا یہ شعر مجھے بہت پسند ہے:

بہت باتیں ہیں یوں تو تہنیت دنیا میں کرنے کی
ہم اپنے شوق کی، اپنے لگن کی بات کرتے ہیں

● ○ ●

شاہ مصباح الدین شکیل

محترمہ تہنیت النسا بیگم مرحومہ

[منفرد شاعرہ جن کا توشۂ آخرت ۲۰۵ نعتوں پر مشتمل
تین نعتیہ دیوان]

آج ہم آپ کو دکن کی ایک ایسی شاعرہ سے متعارف کرواتے ہیں جو ابھی چند ماہ پیش تر اس جہانِ فانی سے دار البقا کی جانب سفر کر گئیں۔ وہ سفر جس سے کسی کو مفر نہیں۔ راہِ عدم کا ہر مسافر اپنے اپنے طور پر کچھ نہ کچھ زادِ راہ لے ہی جاتا ہے۔ اس سے کسے انکار کہ بہترین زادِ راہ تقویٰ اور اعمالِ صالحہ ہیں۔ محترمہ تہنیت مرحومہ نے عدم کے اس دور و دراز سفر کے لیے جو توشۂ آخرت اپنے ساتھ رکھا وہ حبِ رسول ہے۔ مہکتی نعتیں ہیں۔ چند نعتیں نہیں بلکہ پورے تین مجموعے۔ جن میں جملہ (۲۰۵) نعتیں ہیں جو محبوبِ رب العالمین سے محبتوں کے رشتے استوار کرتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ نعتوں کے یہ چراغ عدم کی راہِ دراز میں روشنی پھیلاتے رہیں گے۔ بہ قول شاعرہ:

جو ان تک نہ پہنچے، خدا تک نہ پہنچے — نہیں کوئی ان سا وسیلہ جہاں میں

مٹی جو دل میں تھی اک خلش سی کسی کے لطفِ نظر سے پہلے — ہوئی ہے اب موت بھی گوارا کہ تہنیت مل گیا سہارا

محترمہ تہنیت النسا بیگم تہنیت نے ۸ نومبر ۱۹۹۶ء کو ۸۵ سال کی عمر میں حیدرآباد دکن میں انتقال کیا۔ ۱۰ مئی ۱۹۱۱ء کو امراء کے ایک متمول گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد نواب رفعت یار جنگ ریاست آصفیہ کے صوبے اورنگ آباد کے صوبہ دار تھے۔ آپ کی نانی حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی اولاد سے تھیں۔ مدینہ ہی میں پیدا ہوئیں۔ ان کا ابتدائی اور آخری زمانہ مدینہ منورہ ہی میں گزرا۔ نو سال کی عمر میں اپنے والد مولوی ظہور حسن اور والدہ سلیمہ بیگم اور بھائی ظہور علی کے ہم راہ لکھنو آئیں۔ مولانا عبد الباری فرنگی محلی مولوی ظہور حسن کے حقیقی بھانجے تھے اس طرح محترمہ تہنیت کا ننھیال علماءِ فرنگی محل سے ہے۔ ان کی نانی اسما بیگم کے والد نصیر جنگ اول بھی امراءِ دکن میں سے تھے۔ اولاد کی شادی سے فراغت کے بعد اسما بیگم ۱۹۴۶ء میں مدینہ ہجرت کر گئیں اور وہیں ۱۹۵۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔ جنت البقیع میں مدفین عمل میں آئی۔ اپنی والدہ سے ملاقات کے لیے محترمہ تہنیت نے پہلی بار ۱۹۵۱ء میں سفرِ حج کیا۔ دوسری بار ۱۹۶۶ء میں ایک بار پھر انھیں حج کی سعادت نصیب ہوئی۔

محترمہ تہنیت کی تعلیم و تربیت دکن ہی میں ہوئی۔ حیدرآباد دکن کی لڑکیوں کی مشہور درس گاہ جو طبقۂ امرا کے لیے قائم ہوئی تھی ---- محبوبیہ گرلز ہائی اسکول میں تعلیم پائی اور سینیئر کیمبرج کا امتحان پاس کیا۔ اس زمانے میں عورتوں کا اتنا پڑھ لینا بہت بڑی بات تھی۔

ان کی شادی ۱۹۳۱ء میں اردو کے مشہور و نامور محقق اور ادیب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور سے ہوئی۔ جو جامعہ عثمانیہ سے ایم۔اے کرنے کے بعد حکومت حیدرآباد کے اسکالر شپ پر اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ گئے۔ جہاں انھوں نے "آریائی زبانوں کی تقابلی لسانیات پر تحقیقاتی مقالہ لکھا اور ۱۹۲۹ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پیرس کے "صوتیاتی تحقیقاتی ادارے" میں بھی صوتیات پر دو سال تک تحقیقاتی کام کیا۔ واپسی پر جامعۂ عثمانیہ میں اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے۔ ترقی کرتے کرتے شعبۂ اردو کے صدر ہوئے۔

جب دارالعلوم کالج قائم ہوا تو غلام قادر صاحب کے بعد ڈاکٹر زور اس کے پرنسپل ہوئے۔ ان دنوں میں نے بھی اس کالج کے شعبہ ر س میں داخلہ لیا۔ کالج کی انجمن طلبہ کے معتمد اور "فکر نو" کے اڈیٹر کی حیثیت میں انھیں قریب سے دیکھنے اور گفتگو کرنے کے مواقع ملے۔ ری ایکشن کے بعد یہ کالج ختم ہو گیا تو وہ چادر گھاٹ کالج کے پرنسپل ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کشمیر یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر ڈین ہوئے۔

دکنی ادب اور دکنی تہذیب کے اس شیدائی کو وطن میں دو گز زمین نہ ملی۔ وہ ۲۴ ستمبر ۱۹۶۲ء کو سری نگر میں پیوندِ خاک ہوئے۔

ڈاکٹر زور کے والد ابوالبرکات حافظ سید غلام محمد شاہ قادری زعم ایک صاحب باطن بزرگ تھے۔ مسلم جنگ پل کے قریب خانقاہِ ریہ میں مدفون ہیں۔

محترمہ تہنیت کے ۵ لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں۔ بڑے صاحب زادے سید تقی الدین خانقاہ قادریہ میں سجادہ نشین ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ رفعت منزل سے متصل زمین جس پر بہزادِ دکن فیاض الدین (آرکیٹکٹ) کے نقشے کے مطابق "ایوانِ اردو" کی پر شکوہ رت ہے یہ محترمہ تہنیت ہی کی عطا کردہ ہے۔

محترمہ تہنیت کے نعتیہ دواوین کے بارے میں کچھ لکھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے ان شاعرات کا ذکر کیا جائے جن نعتیہ دیوان زیورِ طبع سے آراستہ ہوئے ہیں۔ یہ تذکرہ معلومات آفریں بھی ہوگا اور ہمیں محترمہ تہنیت کی منفرد حیثیت متعین کرنے میں نی بھی ہوگی۔

ماہنامہ نعت (لاہور) کے اڈیٹر راجا رشید محمود نے جولائی ۱۹۹۵ء میں "خواتین کی نعت گوئی" پر ۲۴۸ صفحات پر مشتمل ضخیم خصوصی نمبر ئع کیا ہے۔ اس میں انھوں نے (۲۳۰) شاعرات کا تذکرہ لکھا ہے۔ ۲۷ صفحات کا طویل مقدمہ بھی ہے۔ اس تذکرے کی خوبی یہ ہے کہ کئی تند ماخذوں سے مدد لی ہے۔ غلطیوں کی نشان دہی کی ہے اور پیدائش، وفات اور اشاعت دیوان کے صحیح سنین کا تعین کیا ہے۔ جن ماخذوں پیش نظر رکھا ہے ان میں سے چند اہم کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

اردو میں نعتیہ شاعری۔ ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق (مقالہ پی ایچ۔ ڈی۔ مطبوعہ ۱۹۷۶ء کراچی)

تذکرۂ نعت گو شاعرات۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری (ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان۔ کراچی۔ مطبوعہ ۱۹۸۴ء)

تذکرۂ شاعراتِ اردو۔ جمیل احمد بریلوی (قومی کتب خانہ بریلی۔ ۱۹۴۴ء)

اردو میں نعت گوئی۔ ڈاکٹر ریاض مجید (مقالہ پی ایچ۔ ڈی مطبوعہ لاہور۔ ۱۹۹۰ء)

تذکرۂ بہارستانِ ناز۔ حکیم فصیح الدین رنج (چوتھا اڈیشن مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔ ۱۹۶۵ء)

اردو کی نعتیہ شاعری۔ ڈاکٹر طلحہ رضوی برق۔ (مطبوعہ پٹنہ ۱۹۷۳ء)

تذکرۂ شاعرات پاکستان۔ شفقی بریلوی، (مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء)

اردو کے صاحب کتاب نعت گو

اردو شاعرات کی نعت گوئی ("شام و سحر" نعت نمبر مطبوعہ جنوری / فروری ۱۹۸۷ء)

راجا رشید محمود کے تحقیقی جائزے "خواتین کی نعت گوئی" کے مطالعے سے حسب ذیل شاعرات کے دواوین کا تذکرہ ملا۔ قوسین میں نہ نمبر کا حوالہ "خواتین کی نعت گوئی کا" ہے۔

۱۔ سیدہ اختر۔ نام سردار بیگم تخلص اختر ۱۹۱۸ء میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئیں۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ "صحیفہ درخشاں" چھپ چکا ہے لیکن تلاش بسیار کے باوجود نہیں ملا۔ (ص ۴۸)

۲۔ بشیر النسا بیگم بشیر۔ ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کا مجموعۂ کلام "آبگینہ شعر" ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ جس میں "نذر رسالت مآب کے نام سے سات نعتیں ہیں۔۔ (ص ۶۷)

۳۔ خیر النسا بشیر۔ پیدائش ۱۸۷۶ء۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی والدہ ہیں۔ مجموعہ نعت و مناجات ۱۹۲۴ء میں "باب رحمت" کے نام سے لکھنو سے شائع ہوا۔ اس میں ایک حمد، دو نعتیں، چالیس مناجات، چار نظمیں اور ایک دعا ہے۔ ۹۲ سال کی عمر میں ۱۹۶۸ء میں وفات پائی۔ (ص ۸۱)

۴۔ بڑی بیگم (ام مشتاق) پروین ۱۸۶۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئیں۔ دیوان "سراج اللطیف" ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا۔ نعتیہ کلام خاصی تعداد میں ہے۔ (ص ۹۴)

۵۔ تاباں عابدی۔ مجموعہ کلام "جلوۂ تاباں" ۱۶۰ صفحات کا ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ ایک حمد ۱۶ نعتیں ۸۷ مناقب اور ۴ قطعات ہیں (ص ۹۹)

۶۔ امتہ اللہ تسنیم۔ ۱۹۰۹ء میں رائے بریلی میں پیدا ہوئیں۔ مولانا سید ابوالحسن ندوی کی بڑی بہن تھیں۔ مجموعہ نعت "موج نسیم" اور مجموعہ مناجات "باب کرم" کے نام سے شائع ہونے کا ذکر ہے (ص ۱۰۱)

۷۔ ڈاکٹر حشمت آرا بیگم حجاب۔ ۱۹۱۸ء میں بارہ بنکی میں پیدا ہوئیں۔ ۹۴ صفحات پر مشتمل مجموعہ نعت "نور رب العالمین" مئی ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ ۱۳ حمدیں، ۴۰ نعتیں، ایک دعا، دو قطعات اور ایک حالی کی نعت پر تظمین ہے (ص ۱۱۶)

۸۔ حمیدہ بیگم۔ ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئیں۔ مولانا ظفر علی خان کی بہن تھیں۔ مجموعہ کلام "نوائے حرم" تاج کمپنی نے غالباً ۱۹۴۹ء میں چھاپا۔ اس میں نعتیہ نظمیں بھی ہیں۔ (ص ۱۱۹)

۹۔ خاور درانی۔ اصل نام کبریٰ خانم تھا۔ تعلیم ایم۔ اے، بی ٹی۔، مجموعہ کلام "نغمہ روح" ۱۹۵۰ء میں طبع ہوا۔ کتاب میں سات بند کا ایک سلام "بارگاہِ خیر الانام علیہ السلام" ہے۔ (ص ۱۲۶)

۱۰۔ بدر النسا بیگم خفی۔ ۱۸۶۴ء (۱۲۸۰ھ) میں پیدا ہوئیں۔ نصیر الدین ہاشمی نے خواتین دکن کی اردو خدمات میں لکھا ہے کہ اپنی شاعری کو صرف مدح رسولؐ اور عشق حقیقی تک محدود رکھا۔ دیوان خفی ۱۸۹۳ء میں دکن سے طبع ہوا۔ شروع سے آخر تک ردیف وار نعتیہ کلام ہے۔ اس پر داغ دہلوی نے قطعہ لکھا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں وفات پائی (ص ۱۲۹)

۱۱۔ روحی علی اصغر۔ ۱۹۱۳ء میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئیں۔ مجموعہ کلام "نیرنگ نظر" شائع ہو چکا ہے۔ نعت بھی لکھی ہے جسے شفیق بریلوی نے اپنے انتخاب میں شریک کیا ہے۔ (ص ۱۵۷)

۱۲۔ طاہرہ بانو سعید ۱۹۲۳ء میں آگرے میں پیدا ہوئیں۔ لکھنو یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ والد ایرانی اور والدہ ہندستانی تھیں۔ نعتیہ کلام "ہدیہ طاہرہ" دو بار چھپا۔ کتنی نعتیں ہیں تفصیل نہ معلوم ہو سکی۔ (ص ۲۶۱)

۱۳۔ زینت بی بی محجوب ان کا مجموعہ "گلبن نعت" بہ قول ڈاکٹر سلمان شاہ جہانی ۱۳۲۸ھ م ۱۹۱۰ء میں مطبع احمدی لکھنو سے شائع ہوا ڈاکٹر ریاض مجید نے لکھا ہے "کسی خاتون کی طرف سے اردو نعت کا غالباً پہلا مجموعہ ہے۔ گلبن نعت تاریخی نام ہے اس سے سنہ ۱۳۰۲ھ"

۱۸۸۰ء نکلتا ہے۔ بہ قول راجا رشید محمود مطبع مصطفائی کے مطبوعہ ۴۲ صفحات کے نسخے پر یہی سنہ درج ہے۔ (ص ۳۲۲)

۱۴۔ محمودہ خاتون محمودہ نے غزل کی ہئیت میں بہت ہی دل کش نعتیں کہی ہیں۔ ڈاکٹر طلحہ رضوی برق نے نعتیہ دیوان کا نام "گلستانِ نن محمودہ" لکھا ہے۔ ڈاکٹر اسماعیل آزاد کے قول کے مطابق دیوان کا تاریخی نام "تحفۂ خاتم المرسلین" ہے جو پٹنہ سے شائع ہوا۔ جس میں روف تہجی کے لحاظ سے ردیف وار نعتیہ غزلیں ہیں۔ ان کا انتقال ۲۲ نومبر ۱۹۵۴ء میں ہوا۔ (ص ۳۳۱)

۱۵۔ مریم قادری مارچ ۱۹۳۷ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کی شادی جامعہ کراچی کے ڈاکٹر محمد افضال حسین قادری سے ہوئی۔ "نغماتِ حرم" ۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ جس میں آٹھ حمدیں، ۳۴ نعتیں، ۴ سلام، ۵ نعتیہ نظمیں، ۵ مناقب اور ۲۰ نظمیں ہیں۔ پیش نظ میں ڈاکٹر قادری نے لکھا ہے کہ "مجھ سے کچھ اشعار لکھوائے گئے۔ کچھ خیالات و عقائد و نظریات کو منظوم کرایا گیا۔ بہت سی جگہ بیان و بیال میں ترمیم کی گئی۔ اب یہ مجموعہ نظم ان ہی کا ہے۔ (ص ۳۳۸)

۱۶۔ مسعودہ خانم لدھیانوی کا مجموعہ نعت "ابرِ رحمت" مطبوعہ ۱۹۹۱ء، ۵۲ صفحات پر مشتمل ہے جس میں ۴ حمدیں، ۳۸ نعتیں، یک منقبت اور ایک دعا ہے۔ (ص ۳۴۵)

۱۷۔ وحیدہ نسیم ۱۹۲۸ء میں اورنگ آباد (دکن) میں پیدا ہوئیں۔ جامعہ عثمانیہ سے ۱۹۵۰ء میں ایم۔ ایس۔ سی کیا۔ ۱۹۵۲ء میں کستان آئیں اور سنٹرل گورنمنٹ کالج فار ویمنس کراچی میں نباتات کی پروفیسر ہوئیں۔ کئی کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں پہلی بار "نعت سلام" کا مجموعہ شائع ہوا، جس میں ۵ حمدیں، ۲۵ نعتیں اور ایک مناجات ہے۔ ۱۹۹۶ء میں کراچی میں وفات پائیں۔ (ص ۳۸۵)

۱۸۔ نصرت عبدالرشید بشریٰ رحمان کی والدہ ہیں۔ ان کے دو نعتیہ مجموعے شائع ہوئے۔ "دعائے نیم شبی" جو دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک حمد، ۹۴ نعتیں، ۸ قطعات اور منظوم دعائے خیر اردو میں ہیں۔ ۳۴ پنجابی سرائیکی اور پوربی نعتیں اور ۱۲ دوہے ہیں۔ تاریخِ ناعت معلوم نہیں۔ دوسرا مجموعہ ۱۹۸۰ء میں ۲۳۰ صفحات کا شائع ہوا۔ اس میں ۸۲ / اردو، ۱۵ پنجابی، ۱۲ سرائیکی اور ۱۸ پوربی نعتیں ہیں۔ س ۳۹۷)

۱۹۔ رابعہ خاتون نہاں۔ ۱۹۱۸ء میں آگرہ میں پیدا ہوئیں۔ قیام پاکستان کے بعد راولپنڈی آگئیں۔ "برگ سخن" مجموعہ کلام ہے۔ نوعہ نعت و منقبت "نور جھروکے" ۱۹۸۲ء میں لاہور سے چھپا اس میں ۲ حمدیں، ۲۲ نعتیں اور ۳۲ مناقب اہل بیت ہیں۔ "صبحِ تجلی" مطبوعہ ۱۹۰ء میں ۲ حمدیں اور ۴۹ نعتیں ہیں۔ جن میں ۱۵ نعتیں "نور جھروکے" میں بھی ہیں۔

۲۰۔ زبیدہ خاتون شروانیہ (پیدائش ۱۸۹۴ء۔ وفات ۱۹۲۲ء) جو سر مزمل اللہ خان کی صاحب زادی تھیں۔ ان کے دو مجموعہ کلام آئینہ حرم" ۱۹۲۱ء اور "فردوسِ تخیل" ۱۹۴۱ء دار الاشاعت پنجاب سے شائع ہوئے۔ آئینہ حرم کے کل ۳۹ صفحات ہیں۔ فردوسِ تخیل ۱۲۱ فحات پر مشتمل ہے جس میں آئینہ حرم کے ۳۹ صفحات بھی شامل ہیں۔ اس میں ہر طرح کا کلام ہے جس میں اردو اور فارسی کی نعتیں بھی امل ہیں۔

۲۱۔ نور جہاں بیگم نور بدایونی (پیدائش ۱۹۰۵ء۔ وفات ۱۹۸۰ء تخمیناً) عارف پور نوادہ نامی بستی میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد دھری اساس الدین وہاں کے رئیسوں میں سے تھے۔ ان کی شادی ڈاکٹر امیر حسن صدیقی سے ہوئی جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پروفیسر تھے، بعد میں کراچی آگئے۔ کلام سے ان کی اسلامیت ہر جگہ جھلکتی ہے۔ ان میں نعت گوئی کے مضامین بھی پائے جاتے ہیں۔ شعری مجموعہ خوں نابہ دل پہلی بار ۱۹۴۵ء میں دہلی سے اور دوسری بار ۱۹۶۳ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ اس کتاب کے آغاز میں متعدد نعتیں اور نظمیں

(نعتیہ) ۸۰ صفحات پر مشتمل ہیں۔

۲۲۔ رسول جہاں بیگم بیدل و مخفی (پیدائش ۱۹۰۳ء) نور جہاں بیگم بدایونی کی بڑی بہن تھیں۔ ۱۹۲۱ء میں ڈاکٹر رفعت حسین صدیقی سے شادی ہوئی۔ پہلے تخلص بیدل تھا بعد میں مخفی اختیار کیا۔ ۱۹۴۶ء میں "عروسِ سخن" دیوان شائع ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آگئیں۔ "عروسِ سخن" "میں" "میری شاعری کیا ہے" کے تحت وہ لکھتی ہیں کہ یہ میرے دلی تاثرات و جذبات ہیں جو کبھی حبِ رسولؐ کی صورت میں اور کبھی قومی درد کی شکل میں میرے قلم سے نکلتے رہے ہیں۔" ڈاکٹر ابو سلمان نے لکھا ہے کہ "صاحب تذکرۂ شاعرات اردو" نے بھی نعت گوئی سے ان کے شغف کا بہ طورِ خاص تذکرہ کیا ہے۔

۲۳۔ انیسہ ہارون شروانیہ کی شادی جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر سیاسیات ہارون خان شروانی سے ۱۹۲۲ء میں ہوئی۔ انھوں نے ۱۹۲۸ء میں فریضۂ حج ادا کیا۔ بہ قول ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق ان کی شاعری سفرِ حج کا تحفہ ہے۔ ان کی نعتوں میں بے قراری اور بے تابی کا عنصر ہے۔ شاعرہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا رشتہ جوڑ کر اپنے کلام میں والہانہ کیف، جذب اور شوق کے ساتھ تغزل کا رنگ پیدا کیا ہے۔ مجموعۂ کلام "انیسیات" میں مختلف موضوعات پر طبع آزمائی ہے جو زیادہ تر اخلاقی اور مذہبی ہیں۔ کلام میں نعت کا حصہ بہت زیادہ ہے۔

۲۴۔ نوشابہ خاتون ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد کا نام عبدالحق تھا۔ پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کیا اور جامعہ عثمانیہ سے ۱۹۴۲ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ "خواتین عہدِ عثمانی" میں نصیرالدین ہاشمی نے لکھا ہے کہ آپ نہ صرف ایک اچھی شاعرہ ہیں بلکہ خانگی موانعات اور تعلیمی دشواریوں کے باوجود کلیہ اناث کے قائم ہونے سے پہلے، جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور آپ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے اس جامعہ سے ڈگری حاصل کی۔ ان کا مجموعۂ کلام "موجِ تخیل" ۱۹۳۸ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔ ۱۶۸ صفحات کے اس مجموعے میں چار حمدیں اور ۲۱ بند کا مسدس بہ نام "ہدیۂ عقیدت بہ حضور حبیب خالق اکبر" مضامینِ نعت پر مشتمل ہے۔

مندرجہ بالا اردو کے صاحبِ کتاب نعت گو شاعرات کا جائزہ لیا جائے تو اولیات کے لحاظ سے نعتیہ دیوان مرتب کرنے کا شرف محترمہ زینب بی بی محجوب کے حصے میں آتا ہے۔ اگرچہ گلبنِ نعتؐ ۴۲ صفحات پر مشتمل ہے لیکن تمام تر نعتوں کا مجموعہ ہے۔ ۱۳۰۲ھ م ۱۸۸۵ء میں مطبعِ مصطفائی لاہور سے شائع ہوا۔ اس میں ایک مناجات، ۳۲ نعتیں، ۲ مناقب اور ایک نظم شامل ہے۔

بدرالنسا بیگم خفی کا پورا دیوان جو ردیف وار ہے شروع سے آخر تک نعتیہ ہے۔ دیوان خفی ۱۳۱۰ھ م ۱۸۹۳ء میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔ اس میں کتنی نعتیں ہیں اور دیوان کتنے صفحات پر مشتمل ہے اس کی کسی تذکرہ نگار نے تفصیل نہیں دی۔ فنِ شاعری کے نقطۂ نظر سے اولیت کا سہرا خفی کے سر ہے۔ "ذ" اور "ص" کی ردیف کے دو شعر بہ طور دلیل درج کیے جاتے ہیں۔

بن گیا جب سے مرے دل کا محمدؐ تعویذ — توبہ کرتی ہوئی بھاگی ہیں بلائیں ساری
ہر گز نہیں ہے مجھ کو تو نام و نشاں کی حرص — مدحِ رسولؐ کی ہے مجھے حرص بالضرور

محمودہ خاتون کے بارے میں ڈاکٹر اسماعیل آزاد فتح پوری "اردو شاعری میں نعت" جلد اول مطبوعہ لکھنو ۱۹۹۲ء میں لکھتے ہیں "محمودہ خاتون نے غزل کی ہیئت میں بہت سی دل کش نعتیں کہی ہیں۔ ایک دیوان بھی مدون کیا ہے جس میں حروفِ تہجی کے لحاظ سے ردیف وار نعتیہ غزلیں جمع کی گئی ہیں۔ انھوں نے دیوان کا تاریخی نام "تحفۂ خاتم المرسلینؐ" رکھا ہے۔ اس کے اعداد ۱۹۵۵ء نکلتے ہیں۔ صفحات اور نعتوں کی تعداد کا کسی تذکرہ میں ذکر نہیں ہے۔

یہ تین ہی خالص نعتیہ دیوان ہیں باقی شاعرات کے شعری مجموعے ہیں جن میں نعتیں بھی شامل ہیں۔ اس پس منظر کے ساتھ اب ہم

محترمہ تہنیت النسا بیگم تہنیت کے نعتیہ مجموعوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ پہلا مجموعہ "ذکر و فکر" (مارچ ۱۹۵۵ء) دوسرا "صبر و شکر" (۱۹۵۶ء) اور تیسرا "تسلیم و رضا" (۱۹۵۹ء) میں "سب رس کتاب گھر" رفعت منزل، خیریت آباد، حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔ محترمہ تہنیت کا انتقال ۵ نومبر ۹۶ء کو ہوا۔ یعنی تیسرے مجموعہ کی اشاعت کے بعد بھی ۳۷سال وہ زندہ رہیں۔ اس طویل عرصے میں انھوں نے یقیناً بہت سی نعتیں کہی ہوں گی۔ ان کو محفوظ کرنا ان کی اولاد کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

اب ہم ان نعتیہ مجموعوں کا تفصیلی تعارف کرواتے ہیں اور ارباب نقد و نظر پر محترمہ تہنیت کے مقام کے تعین کی ذمہ داری چھوڑتے ہیں۔ ہر مجموعے سے نعتیں بہ طور نمونہ درج کرتے ہیں۔

ذکر و فکر

یہ نعتوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ کتاب مجلد اور صفحات کی تعداد ۱۱۲ ہے۔ قیمت دو روپے۔ ۱۱۲ صفحات کے من جملہ ۳۲ صفحات پیش لفظ تعارف، فہرست اور قطعہ۔ تاریخ کے ہیں۔ باقی صفحات میں نعتیہ کلام ہے۔ ابتدا میں ایک نوٹ دیا گیا ہے "حمد و منقبت کی نظمیں اور غزلیں اس مجموعے میں شریک نہیں کی گئی ہیں۔ اگر اللہ نے چاہا تو وہ بھی چھپ جائیں گی۔" سب سے پہلے پورے ایک صفحہ پر محترمہ تہنیت کا ایک شعر درج ہے جو ان کی ترجیحات کی نشان دہی کرتا۔ وہ ہے:

بہت باتیں ہیں یوں تو تہنیت دنیا میں کرنے کی　　ہم اپنے شوق کی، اپنی لگن کی بات کرتے ہیں

اس نعتیہ دیوان میں کل ۵۷ نعتیں ہیں۔ مختصر سا پیش لفظ مشہور رباعی گو حکیم الشعرا سید حسین امجد حیدرآبادی کا ہے۔ جو ۲۴ مارچ ۱۹۵۵ء کا لکھا ہوا ہے۔ لکھتے ہیں: "جہاں تک مجھے محسوس ہوا کہ بیگم زور حب نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اکثر اشعار سے ایک خاص قسم کی ربودگی اور فریفتگی محسوس ہوتی ہے اور شعر متاثر ہو کر کہے گئے ہیں۔ جن کا اثر پڑھنے والوں پر بھی پڑتا ہے۔ بعض اشعار سے میں بھی متاثر ہوا ہوں۔ مثلاً

وقت رخصت ہم پہ جو گزری وہ اب تک یاد ہے　　چھوڑتے ہی ان کا در تنہا نظر آنے لگے

سید علی منظور حیدرآبادی نے طویل تعارف لکھا ہے۔ انھوں نے مصنفہ کے خاندانی حالات بھی لکھے ہیں اور کلام پر سیر حاصل تبصرہ بھی کیا ہے۔ نیز یہ بھی لکھا ہے کہ میں اپنے علمی اور ادبی مشاغل کے سلسلے میں بار بار رفعت منزل گیا۔ کبھی ان محترمہ کی آواز تک نہیں سنی۔

وہ لکھتے ہیں: "موصوفہ کے دیوان میں سے ۸۵ / اشعار میں نے چنے ہیں۔ تلاش کر رہا ہوں کسی شعر میں حضور کا اصلی نام نظر آئے۔ اللہ اللہ رے ادب! بہ وقت ضرورت ماہ مدینہ، کرم ایجاد، آقا، حضور، رسالت پناہ، حبیب حق اور محبوب خدا کہتی ہیں۔ ورنہ ضمائر ہی سے کام لیتی ہیں۔ مثلاً:

آپ کے شوق میں ہر شوق کو ہم بھول گئے　　حرم پاک میں کچھ اور ہی حالات ہوئے
سرمایہ گیتی ہے مجھے ان کی محبت　　بے کار ہے میرے لیے جو اس کے سوا ہے
جو یہ کہتے ہیں کہ ہیں ہم بھی بشر وہ بھی بشر　　کیا وہ کرسکتے ہیں ان کی ہمسری کردار میں
کوئی بھی ہمسرِ ماہِ مدینہ ہو نہ سکا　　جہاں میں یوں تو ہزاروں حسیں ہوئے ہوں گے

سید علی منظور نے تعارف کو ختم کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "سیرت خیر النسا" خواتین امت کے لیے بہترین سیرت ہے یہ اسوۂ کامل تہنیت صاحبہ کے پیش نظر ہے:

درسِ جاوید بنا شیوۂ خاتونِ جناں جانِ محزوں کے لیے، قلبِ پریشاں کے لیے

یہ سیدھے سادے دو مصرعے ہیں یا حقائق و معارف کے چند در چند ذخیرے۔ اس شعر کو پڑھتے ہی مجھے کیا کیا یاد آیا۔ اللہ اللہ:

توشہء صبر و رضا لائی ہے اولادِ علیؑ صبحِ زنداں کے لیے، شامِ غریباں کے لیے

صبحِ زنداں کا دھیان اپنے ساتھ کیا کیا مناظر لایا ہوگا، یادِ شامِ غریباں کیسے کیسے مسافروں کو دکھا رہی ہوگی: دیکھیے یہ دکھ بھرے سپنے!

اور ایک شعر سنیے:

کاش یہ جانتے اعداءِ حسین ابن علیؑ کس قدر چاہتے تھے سرورِ دیں پیاروں کو

"پیاروں کو چاہتے تھے" میرے خیال میں بدیع الاسلوب ٹکڑا ہے۔ رسول اللہ کے پیاروں سے رشتہء مودّت جوڑنے والی خاتون مطمئن ہیں:

حبیبِ حق ضامنِ شفاعت ہے دل میں آلِ نبی کی الفت یہ زادِ رہ مل گیا ہے ہم کو رہِ عدم کے سفر سے پہلے

اور ایک شعر سنیے:

الہیٰ ساتھ ایماں کے اٹھا دنیائے فانی سے ہو سایہ حشر میں خاتونِ جنت کا، یہ ارماں ہے

آلِ محمد کے جاں نثار اصحابِ محمد سے بیزار ہو نہیں سکتے، ضروری ہے محمدی نسبت کا احترام۔ رضی اللہ عنہم و رضوعنہ کی شرح کرنے کی ضرورت ہے کیا؟

وہ۔خوش نصیب تھے جو ہم نشیں ہوئے ہوں گے فدائے گیسو و روئے حسیں ہوئے ہوں گے
جنھیں نصیب تھی دیدارِ یار کی دولت جو مستِ بادۂ عین الیقیں ہوئے ہوں گے
شرف ملا جنھیں آقا سے ہم کلامی کا جو پائے بوسِ شہہِ خوش جبیں ہوئے ہوں گے
مجھے بھی کاش یہ نعمت نصیب ہو جاتی یہ بخت کیوں مرے ایسے نہیں ہوئے ہوں گے

چوتھے شعر کو میں منجملہء الہامات سمجھتا ہوں ۔۔۔۔پہلا مصرع یک سر تمنائی دوسرا مصرعہ اتنا بلیغ پہنچایا جس میں تمنا بھی ہے تاسف بھی، استعجاب بھی، استفہام بھی بلکہ ہلکی ہلکی جھنجلاہٹ بھی اس شعر میں نظر آئے گی، بہ ہر حال زبانِ حال سے یہ شعر کہہ رہا ہے کہ صنفِ لطیف کے اظہارِ خلوص کو کتنا لطیف پیرایہ چاہیے۔"

یہ نعتیہ مجموعہ دراصل ارادۂ سفرِ حجاز کی سوغات ہے جس کا اظہار دیکھیے:

کہنا صبا مدینے میں جاکر بہ صد ادب گل دستہ ایک نعتیہ اب لارہے ہیں ہم
روضہء انور کے قصے اور حرم کے تذکرے راحتِ دل، مونسِ جاں بن گئے ہیں آج کل

غزل کی ہئیت میں ایک پوری نعت ان ہی جذبات کی آئینہ دار ہے:

پھر نہ آئیں ہم آگہی کے قریب محوِ حیرت رہیں کسی کے قریب
رہے نظروں میں گنبدِ خضرا ان کا جلوہ ہو زندگی کے قریب
مستِ مہرِ نبیؐ رہیں ہردم کبھی آئیں نہ ہم خودی کے قریب
سر بہ سجدہ رہیں اٹھیں نہ کبھی پھر جو پہنچیں درِ نبی کے قریب
عمر گزرے ان ہی کے روضے پر جان دے دیں گے ہم ان ہی کے قریب

تہنیت ہجر میں ملول نہ ہو — دن ہیں اب تیری حاضری کے قریب

"ذکر و فکر" سے انتخاب سے پہلے اس پر چند مشاہیرِ فن کی رائے، رسائل و جرائد کے تبصرے درج کیے جاتے ہیں جو دوسرے اور تیسرے نعتیہ مجموعہ "صبر و شکر" اور "تسلیم و رضا" میں شامل ہیں۔ یہ اقتباسات میرا کام بہت آسان کر دیں گے۔

۔ بہ حیثیت مجموعی سارا کلام کیف اور سوز میں ڈوبا ہوا ہے۔ عاشقانِ رسول کو اس مجموعے کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

[خواجہ حسن نظامی۔ منادی (دہلی) جولائی ۱۹۵۵ء]

۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بس مدینہ کی گلیوں میں پھر رہے ہیں۔ غزل اور نعت دونوں کا لطف ایک ہی جگہ مل جاتا ہے۔

محمدؐ گر نہ ہوتے ان کے دیوانے کہاں جاتے — نہ جلتی شمع محفل میں تو پروانے کہاں جاتے
بھروسا ہے شفاعت کا ان ہی کا سب کو محشر میں — نہ ہوتے وہ تو ہم جیسے خدا جانے کہاں جاتے

[پروفیسر حافظ محمد حامد صدیقی قادری]

۳۔ اس مجموعے کو پڑھ کر حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی، حیرت اس بات پر کہ ہماری خاکستر میں اب بھی ایسی چنگاریاں پوشیدہ ہیں اور مسرت اس قسم کے پاکیزہ اشعار پڑھ کر:

اسلام سکھاتا ہے محبت کے قرینے — ایمان طلب گارِ رہ و رسم وفا ہے
جب صبا تو مدینہ جاتی ہے — کچھ مرا حال بھی سناتی ہے
کالی کملی میں منھ چھپالیں گے — پرسشِ حشر کیا ڈراتی ہے

تہنیت صاحبہ کے کلام میں ادبی روایات اور تہذیبی عوامل کی جلوہ گری ہے۔ اس میں ایسی عبودیت اور پرستش کا جذبہ کارفرما ہے جو صرف عورت ہی کے لیے مخصوص ہے: [ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی۔ صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی]

۴۔ تہنیت کے کلام میں تصنع اور تکلف نہیں ہے۔ فکر کی اور خیالات کی سادگی شعر کے قالب میں ڈھلتی چلی گئی۔ محبتِ رسول ایک ایک شعر سے جھلکتی ہے۔ [ماہر القادری۔ ماہنامہ "فاران" کراچی۔ جوا(۱)]

۵۔ ذکر و فکر میں بہت سے مقامات ایسے بھی آئے کہ میں پڑھ کر جھوم گیا۔ یہ سب عشق رسول کی برکت ہے جو ایسے ایسے گہر پارے محترمہ کے قلم نے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیے ہیں۔ [ایم اسلم (افسانہ نگار) لاہور]

۔ کتاب نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے اور ایک مسلم خاتون کے جذباتِ عقیدت اور ذاتِ نبویؐ سے والہانہ محبت کی آئینہ دار۔

[روزنامہ "رہنمائے دکن" (حیدرآباد) ۲/اپریل ۱۹۶۵ء]

۷۔ یہ شاعری نہیں جذبہ عقیدت کا بے تامل اظہار ہے جو مصنوعی حدکا پابند نہیں رہ سکتا۔ محترمہ تہنیت کا "ذکر و فکر" بھی محافلِ میلاد کا جزو بننے کا اہل ہے۔ [روزنامہ "قومی آواز" لکھنؤ ۱۷/اکتوبر ۱۹۵۵ء]

۸۔ اس صنفِ شاعری میں، ہم ایک خاتون سے جس قدر حسن و خوبی کی توقع کر سکتے ہیں اس سے یہ کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت وہ خلوص ہے۔ جو شاعرہ کو نبی محترمؐ سے ہے۔ [ماہنامہ "مشرب" کراچی۔ جون ۱۹۵۵ء]

۔ سارا کلام جذباتِ وارفتگی اور حبِ نبیؐ سے معمور ہے اکثر اشعار میں بے ساختہ وارداتِ قلبی کو پیش کر دیا ہے۔

[ماہنامہ "القدیر" حیدرآباد دکن۔ ذی قعدہ ۱۳۷۴ھ]

۱۰۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تہنیت صاحب نے ان غزلوں کی تخلیق میں گویا اپنی عقیدت مندی کا لہو صرف کر دیا ہے۔ ذاتِ اقدسؐ سے ا
کو جو والہانہ عقیدت ہے اس نے ان کے کلام میں ایک فطری بے ساختگی اور دل گدازی پیدا کر دی ہے۔ کلام دل کش اور خلوص
تاثر سے بھرپور ہے۔ [ماہنامہ "صبا" اکتوبر ۱۹۵۵ء]

"ذکر و فکر" کی چند نعتیں بطور نمونہ درج ہیں:

ذکر و فکر سے انتخاب:

(۱)

ازل میں نورِ نبیؐ ہویدا ہوا ہے جن و بشر سے پہلے   نمودِ شام و سحر سے پہلے وجودِ شمس و قمر سے پہلے
تمہارے حسنِ جہاں نما سے ہوا ہے عرشِ بریں منور   زمیں سے پہلے زماں سے پہلے حجر سے پہلے شجر سے پہلے
ملا نہ رتبہ کسی کو ایسا کہ خود ثنا خواں خدا ہو جس کا   نبی اگرچہ بہت ہیں گزرے جنابِ خیرالبشرؐ سے پہلے
ہوئی ہیں آسان مشکلیں سب، ہوئے روانہ جو سوئے یثرب   عجب کشاکش میں زندگی تھی ہماری عزمِ سفر سے پہلے
حبیبِ حق ضامنِ شفاعت ہے دل میں آلِ نبی کی الفت   یہ زادِ رہ مل گیا ہے ہم کو رہِ عدم کے سفر سے پہلے

ہوئی ہے اب موت بھی گوارا کہ تہنیت مل گیا سہارا
مٹی جو دل میں تھی اک خلش سی کسی کے لطفِ نظر سے پہلے

(۲)

دلِ زار کیا کرے گا مرے سینے میں مچل کے   ترا کام بس یہی ہے بہے آنسوؤں میں ڈھل کے
چلے آئیں سر کے بل پھر نہیں چین ہم کو دم بھر   گرے اپنی ہی نظر سے جو حرم سے ہم نکل کے
ترا اضطراب اے دل مجھے بے ادب نہ کر دے   ہے یہ بارگاہِ اقدس ذرا یاں سنبھل سنبھل کے
ہو نظر کرم کی ان پر کہ ہو اطمینانِ خاطر   ہیں یہ نام کے مسلماں، یہ کھرے نہیں عمل کے
نہیں ایسا میرا ساقی، نہ پلائے جو نظر سے   وہ شراب ہی نہیں ہے جو بغیر جام چھلکے
ہمیں اتنا یاد ہے بس کہ حرم سے ہم چلے تھے   یہ کہاں چلا گیا دل مرے سینے سے نکل کے

یہی تہنیت کی خواہش، یہی تہنیت کے ارماں
یوں ہی نعت کے مضامین لکھیں ہم بدل بدل کے

(۳)

درماندگوں کی آنکھ سے آنسو جو ڈھل گئے   چشمے کسی کے لطف و کرم کے ابل گئے
ڈالی جو اس نے ایک اچٹتی ہوئی نظر   خستہ دلانِ راہِ محبت بہل گئے
ہم اور بارگاہِ رسالت پناہؐ میں   "مارے خوشی کے آنکھ سے آنسو نکل گئے"
پہنچے جو ہم دیارِ مدینہ میں سر کے بل   سب اپنے اگلے پچھلے تصور بدل گئے
پھر ہم تھے اور روضۂ اقدس کی جھلکیاں   ارمان کیا بتاؤں کہ کیا کیا مچل گئے

قربِ حضورؐ دھونے لگا دل کے سب محبوب　　باطل تصورات تھے جتنے پگھل گئے

نازاں ہے تہنیت کرم کردگار پر

بہکے جو تھے نصیب وہ آخر سنبھل گئے

(۴)

وہی نور ظاہر ہے شمس و قمر میں　　اسی رخ کے جلوے ہیں شام و سحر میں

محمدؐ سا کوئی نہیں بحر و بر میں　　خدا کی خدائی ہے ساری نظر میں

وہ انسانِ کامل ہیں خیر البشر ہیں　　نہیں دوسرا کوئی جن و بشر میں

وہ سب کے لیے رہنما بن کے آئے　　نہیں ان سا ہمدم، رہِ پر خطر میں

جو محروم ہو ان کی چشمِ کرم سے　　نہیں کوئی ایسا ہماری نظر میں

جو مہرِ عرب ہیں، جو ماہِ مدینہ　　وہ رہبر ہیں دنیا و دیں کے سفر میں

الٰہی یہ ہے تہنیت کی تمنا

رہے ہر گھڑی سبز گنبد نظر میں

(۵)

جب مدینہ نظر سے جدا ہوگیا　　حالِ دل کیا کہیں کیا سے کیا ہوگیا

لطف ملتا نہیں ہے کسی بات میں　　اب تو جینا بڑا بے مزہ ہوگیا

دل دھڑکتا ہے یادِ حرم میں سدا　　شوق پہلے سے بھی کچھ سوا ہوگیا

روتے رہتے ہیں ہم شوقِ دیدار میں　　کس مصیبت کا یہ سامنا ہوگیا

جان دے دیں گے یوں ہی تڑپتے ہوئے　　ہم یہ سمجھیں گے قرضہ ادا ہوگیا

کیوں دوبارہ حضوری سے محروم ہیں　　کیا وہ ماہِ مدینہ خفا ہوگیا

نام آیا لبوں پر جوان کا کبھی　　ہر نفس میرا وقفِ دعا ہوگیا

تہنیت کو مدینے میں ہوگی شفا

درد اس کا جو اب لا دوا ہوگیا

مہر و شکر

محترمہ تہنیت کے نعتیہ کلام کا دوسرا مجموعہ ۱۹۵۶ء میں "سب رس" کتاب گھر، حیدر آباد دکن سے شائع ہوا۔ اس کی قیمت ی دو روپے ہے۔ صفحات کی تعداد ۱۱۲ ہے جس میں فہرست، پیش لفظ، معاصرین کی آرا اور تبصرے کے ۲۵ صفحات ہیں۔ بقیہ صفحات میں ۹ نعتیں اور ایک سلام ہے۔ کتاب غیر مجلد سرورق ممتاز حسن کارخان بہادر عبدالرحمن چغتائی (لاہور) کے موقلم کا مرہون منت ہے۔ شہور افسانہ نگار "ایم۔ اسلم" کے قلم سے "تہنیت نامہ" بہ طور پیش لفظ ہے۔ انھوں نے لکھا ہے: "کلام کے ہر لفظ سے حضور سرورِ عالم صلی

اللہ علیہ وسلم کی محبت اس طرح مترشح ہو رہی ہے جیسے ساون کی مخمور گھٹاؤں سے موتی برستے ہیں۔ محبتِ رسول کا جذبہ اس شعور کے آئینہ میں دیکھیے کتنا خوب صورت نظر آرہا ہے۔

نبی کی مدح سرائی میں تہنیت کتنے غلام داخلِ خلد بریں ہوئے ہوں گے

پھر دیکھیے کتنی پیاری تمنا ہے:

گزرے اسی طرح سے یہ زندگی ہماری آئیں مدینہ سے ہم اور پھر مدینہ جائیں
حضورؐ اپنے ہیں اپنوں کی لاج رکھ لیں گے کہ اپنوں سے بھی کوئی بے نیاز ہوتے ہیں

دیکھیے اس قسم کے اشعار کہنے والے کا دل محمدؐ کی محبت سے کس قدر سرشار ہے:

ہوتا ہے ذکر رحمت و شفقت کا جب کبھیؐ آتا ہے نام ان کا ہماری زبان پر

سارا کلام اس قسم کے پاکیزہ جذبات اور عشقِ رسول سے لب ریز ہے۔ شعر کی ایک خوبی یہ ہے کہ لطافت کے ساتھ اس میں موسیقی کی چاشنی بھی ہو۔ محترمہ تہنیت کے ہاں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ جس دل میں حضور اکرمؐ کی محبت موج زن ہو وہاں درد کا ہونا بھی ایک ضروری چیز ہے (۱۱)۔

ذکر و فکر میں ہر جگہ یہی محبت یہی جذبہ اور درد نمایاں ہے جو پڑھنے والے کے دل کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"معاصرین کی قدر دانی" کے عنوان سے آخر میں اس نعتیہ مجموعے پر رائیں اور تبصرے ہیں نقد و نظر کے اس سرمائے سے چند سطور درج ذیل ہیں:

تہنیت صاحبہ نے نعتیہ شاعری کو "کام کی باتیں" کہہ کر لفظوں میں اس دلی کیفیت کا اظہار کیا ہے جو ان کی پوری شاعری میں پائی جاتی ہے۔ کہتی ہیں:

پھر کریں آؤ کام کی باتیں شاہِ عالی مقام کی باتیں

دوسری جگہ کہتی ہیں:

ذکر دارا و سکندر چھوڑ کر دین کے سردار کی باتیں کریں
تہنیت دل چاہتا ہے ہر گھڑی سیدِ ابرار کی باتیں کریں

نعت گو شاعرہ کا دل پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے سرشار ہے۔ اسی محبت کا اثر ہے کہ کلام میں بعض نازک مقامات خوب صورتی کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ جس کی طرف عام ذہن آسانی سے منتقل نہیں ہو سکتے۔ مثلاً:

ہر قدم جانبِ منزل ہی بڑھائی جائے وہ پریشانی کی رفتار کہاں سے لاؤں
ہم کریں گے ناز اپنی ہوش مندی پر سدا شوق میں ان کے اگر نادان گردانے گئے

[جریدہ قومی آواز۔ لکھنو۔ جولائی ۱۹۵۶ء]

تہنیت صاحبہ کی طبیعت میں آمد ہی آمد ہے۔ ہر شعر میں سلاست، وارفتگی، بے ساختہ پن بدرجہ اتم موجود ہے:

یا نبی بہرِ خدا ہم پہ کرم کی ہو نظر یاد سے غافل تمھاری کوئی لحظہ ہم نہیں

غرض یہ نعتیہ کلام عاشقانِ مصطفویؐ کے جذبات کا آئینہ دار اور بے چین قلوب کے لیے تسکین کا موجب ہے۔

[ماہنامہ "القدیر" حیدرآباد دکن ذی الحجہ ۱۳۷۵ھ

آپ کا کلام خود آپ کی تعریف کرتا ہے کلام میں زبان کی صفائی اور سادگی، تخیل کی بلندی اور خیالات کی ندرت اور اثر ہے۔ محب رسول اور نعت گو شاعر کی تعریف دنیا والے پوری طرح نہیں کر سکتے اس کا صلہ تو دربارِ مدینہ سے ہی ملتا ہے۔

[نصیرالدین ہاشمی مصنف "دکن میں اردو"

سارا کلام کیف اور سوز میں ڈوبا ہوا ہے۔ کلام کے ہر لفظ سے عاشقانہ اور والہانہ حقیقت کا اظہار ہو رہا ہے۔ یہ سب عشقِ رسولؐ کی برکت ہے کہ ایسے ان مول گہر پارے آپؒ نے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیے ہیں۔ [مراد علی طالع]

نعتیہ دیوان "صبر و شکر" سے چند نعتیں نمونے کے طور پر درج کی جاتی ہیں۔

(۱)

صبر و شکر سے انتخاب:

تمھارے لطف کا جب سے کیا یقین ہم نے — کبھی نہ اور کے در پر رکھی جبیں ہم نے
تمھارے در پہ جو حاصل ہوا سکون و قرار — وہ لطف پھر کبھی پایا نہیں کہیں ہم نے
تمھاری شان کا کوئی نظر نہیں آیا — حسین دیکھے ہیں لاکھوں سرِ زمیں ہم نے
خیال ہی میں تمھارے کٹے ہیں دن سارے — تمھاری یادیں راتیں گزار دیں ہم نے
تم ہی سمائے ہوئے ہو سدا تصور میں — تمھیں کیا ہے کچھ اس طرح دل نشیں ہم نے
کبھی کے منھ سے جو نکلا کبھی تمھارا نام — خیال ہی میں تمھاری بلائیں لیں ہم نے

نبیؐ کی یاد لکھاتی ہے تہنیت ہم سے
غزل کبھی کوئی یوں ہی لکھی نہیں ہم نے

(۲)

جب کبھی نامِ نبی لینے کو میں منھ کھولوں — آبِ کوثر سے ضروری ہے کہ اس کو دھولوں
خالقِ ارض و سما خود ہی بنا مدح سرا — آپ کے حسن کے اوصاف میں کیا کیا بولوں
کہتے ہیں خواب میں وہ جلوہ دکھا جاتے ہیں — اسی امید میں ممکن ہے کہ دم بھر سولوں
صبر اور شکر کا درس آج بھی ہے پیشِ نظر — ورنہ جی بھر کے کسی وقت نہ کیوں میں رولوں
ہاں بتادینا ذرا بادِ صبا مجھ کو بھی — عزمِ طیبہ ہے اگر، ساتھ ہی تیرے ہولوں
راہِ طیبہ میں صعوبت کی نہیں ہے پروا — خاک چھانوں میں ضرورت ہو تو پتھر ڈھولوں

تہنیت مجھ سے کبھی یہ تو نہیں ہو سکتا
درِ عالی کے عوض روضۂ رضوان لے لوں

(۳)

جو شغل کہ دل سے ہمیں محبوب رہا ہے — وہ آپ ہی کی یاد سے منسوب رہا ہے

ہوں گے وہ کوئی اور جو ہیں طالبِ دنیا — ہم کو تو کرم آپ کا مطلوب رہا ہے
مخلوق نہ کیوں اس پہ ہو شیدا دل و جاں سے — جب حسنِ نبیؐ حق کو بھی مرغوب رہا ہے
دل یاں ہے پریشان مدینہ میں تو ہر وقت — مسرور رہا ہے، یہ خوش اسلوب رہا ہے
ہر صبح درِ پاک کی رونق ہے نظر میں — ہے شامِ حرم یاد جو دن ڈوب رہا ہے
باوصفِ حضوری نہ کیے حوصلے پورے — دل ہم سے اسی واسطے محجوب رہا ہے

آجائیے گا بہرِ خدا، ہے دمِ آخر
تہنیتِ ناشاد کا دل ڈوب رہا ہے

(۴)

قسمت بندھی ہوئی ہے اسی انجمن کے ساتھ — رونق ہے جس کی جلوۂ شاہِ زمن کے ساتھ
جاگ اٹھے خواب ہی میں نصیب دل و جگر — لڑجائے آنکھ گر کسی ناوک فگن کے ساتھ
آلامِ دہر مانعِ یادِ نبی نہیں — کانٹوں میں ہیں پہ ہیں تو کسی گل بدن کے ساتھ
باوصفِ اشتیاقِ حرم ہند ہی میں ہوں — کہتا ہے کون انس نہیں ہے وطن کے ساتھ
پہنچادے پھر مدینہ میں ہم کو خدا کرے — گردش میں ہیں اسی لیے چرخِ کہن کے ساتھ
اب تک بھی وہ بہارِ مدینہ نظر میں ہے — آتا ہے یاد صحنِ حرم ہر چمن کے ساتھ
قربِ حضور تاکہ میسر ہو بعدِ مرگ — جاتے ہیں ہم مدینے کو اپنے کفن کے ساتھ
محشر میں ہم بھی ساتھ انہی کے اٹھیں کہ جو — ہیں فاطمہ کے ساتھ حسین و حسن کے ساتھ
فوجِ عدو میں تھا کوئی ایسا جری کہ جو — کرتا مقابلہ شہہِ خیبر شکن کے ساتھ

ذکرِ نبیؐ میں لطف جو ملتا ہے تہنیت
دل بستگی بس اتنی ہے بزمِ سخن کے ساتھ

(۵)

مدینے کے وہ دن وہ دل کش فضائیں — نہ کیوں یاد آئیں نہ کیوں دل دکھائیں
وہ صبحِ حرم وہ شبِ راہِ طیبہ — کلی جوں کھلے پھول جوں مسکرائیں
وہ فردوسِ گوش اور وہ آنکھوں کی جنت — مناروں کی رونق اذاں کی صدائیں
رضائے خدا تھی کہ وہ جانِ عالم — اسی سبز گنبد میں آرام پائیں
فرشتوں پہ واجب ہے تعظیم اس کی — جبیں آکے جن و بشر سرجھکائیں
خدا کے کرم سے ملی تھی یہ نعمت — توقع ہی کب تھی کہ واں بار پائیں
عجب دل کی حالت تھی جب تھے حرم میں — زباں پہ درود اور دل میں دعائیں
نظر آئی جالی جو اک دم مقابل — جو تھی کیفیت دل کی کیوں کر بتائیں

خطاؤں کا اپنی خیال آرہا تھا قدم ڈگمگاتے تھے کس طرح جائیں
الہیٰ کچھ افتاد پڑجائے ایسی
جو جائیں مدینہ تو واپس نہ آئیں

(۶)

اضطرابِ دل سے محرومی ہے مرجانے کا نام
زندگانی ہے تمہارے لطف فرمانے کا نام
تم سے ہے ایماں کی فرحت راحتِ جاں تم سے ہے
کعبہء معمور تم سے دل کے ویرانے کا نام
ہوگیا روزِ ازل سے پرتوِ نورِ نبیؐ
گلشنِ کونین کے رنگین افسانے کا نام
ہر طرح بہتر ہی نکلا قیس اور فرہاد سے
ان کے شیدا کا فسانہ، ان کے دیوانے کا نام
ہے نگاہِ فیض ان کی کیف پرور اس قدر
ذکر مئے لب پر نہ آنے اور نہ پیمانے کا نام
دین و دنیا دونوں ہی رکھتا ہے وہ پیشِ نظر
رازدانِ سرِ ہستی ان کے دیوانے کا نام
خوبیِ تقدیر سے طیبہ جو پہنچیں تہنیت
پھر نہ لیں بھولے سے بھی ہم واپس آجانے کا نام

تسلیم و رضا:

یہ محترمہ تہنیت کا تیسرا نعتیہ دیوان ہے جو ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ مجلد ہے۔ دسمبر ۱۹۵۹ء میں "سب رس کتاب گھر" رفعت منزل، حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔ قیمت دو روپے ہے۔ ۹۶ صفحات میں سے ۳۱ صفحات مقدمہ وغیرہ کے ہیں ۸ صفحات پانچ تبصروں پر مشتمل ہیں۔

اس میں جملہ (۴۰) نعتیں اور (۹) منقبتیں ہیں۔ ۲۵ دسمبر کے عرضِ حال میں محترمہ نے اکتوبر ۱۹۵۹ء میں قلب پر حملے اور جان بچ جانے پر اللہ کا شکر ادا کیا ہے یہ بھی لکھا کہ: "میرے کاغذات میں نعت کے علاوہ کچھ اور منقبتی نظمیں بھی موجود ہیں جو شاید سب ہی اس جدید مجموعے میں شریک کی جارہی ہیں۔"

"تسلیم و رضا" کا مقدمہ پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا نے لکھا ہے۔ اپنے مخصوص انداز میں دہلی کی بیگماتی زبان لکھی ہے۔ "اے بی بی، شکر کرو کہ درد آشنا دل پایا ہے۔ ذرا اس نعت کے مطلع کو ملاحظہ فرمایئے:

دلِ درد آشنا نہیں ملتا
یوں تو دنیا میں کیا نہیں ملتا

اگر حضرت درد جیسے نعت گو ہوتے تو یہ پوری نعت ان کی ہو گئی ہوتی۔ شعر کی مقبولیت کا لٹکا بھی بتادیا:

شعر میں جب تڑپ نہ ہو دل کی
لطف ہم کو ذرا نہیں ملتا
تہنیت الفتِ نبی کے بغیر
زندگی کا مزا نہیں ملتا

سبحان اللہ، صلِ علیٰ! کیسا معشوقِ دو عالم ہے کہ چودہ سو برس گزر گئے چاہنے والوں کا عشق اب بھی جوان ہے اور خود فراموشی کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ ان کو جان کنی کی تکلیف سے بھی نجات ملے گی تو شبیہہ اسی محبوب رب العالمین کی دیکھ کر:

تہنیت کو نظر آجائیے وقت آخر
یہی تسکیں ہے مرے دیدۂ گریاں کے لیے

محترمہ نے وہ سرچشمہ وہ منبع، وہ معدن بتادیا جہاں سے انھوں نے یہ جواہر پارے، درِ شہوار پائے ہیں:

لاتے ہیں شعر میں جو مضامینِ رنگ رنگ ان کے ہی در کا فیض ہے جو پا رہے ہیں :
یہ دیکھیے اس نعت کی پوری ردیف تمنائی ہے:

جو یاد آتی ہے یثرب کی تو اب بھی دل تڑپتا ہے جو ہوتی یاد پھر اپنی تو اور اک بار واں جا۔
چلے ہیں جانبِ بطحیٰ نہیں ہے فکر کوئی نکل کے ہند سے ہم رنج و غم کو بھول گے
ہم اک ذراسی عنایت سے تہنیت ان کی دراز دستی اہلِ ستم کو بھول گے
" دراز دستیِ اہلِ ستم کو بھول گئے " ذرا اس نعت کی موسیقیت اور ترنم سے
مزے لیجیے۔ روح پھڑک اٹھے گی اور بوٹی بوٹی وجد میں آکر تھرکنے لگے گی، ساری نعت مرصع ہے:

کبھی ہو عطا ہمیں بھی وہی چشم عارفانہ ہمیں کچھ خبر نہیں ہے جو لگا ہے تازیا۔
ہمیں غم نہیں ہے اس کا کہ ہوئے ہیں خوار و رسوا جو قلق ہے بس تو یہ ہے نہ ہو دین بھی روا۔
یہ نعت جس کا قافیہ مچل اور ڈھل ہے اور ردیف "کے" بہت مترنم ہے اور اس شعر نے تو دل وجان پر بنادی:

ترا اضطراب اے دل مجھے بے ادب نہ کردے ہے یہ بارگاہِ اقدس ذرا یاں سنبھل سنبھل کے
کتاب کے تعارف میں وہ رقم طراز ہیں:
"تہنیت کے شعر کا ارتقا دراصل ان کی روح کا ارتقا ہے۔ خیر البشرؐ ۔ سے عشق پھر اس عشق کا درد:

تمھارے شوق نے بخشا کسی کو سوز دروں کسی کی روح میں بالیدگی نظر آ
بلالؓ کا سا اگر سوزِ دل میسر ہو عجب نہیں کہ دو عالم کی سروری مل جا۔
نہیں کوئی ان سا وسیلہ جہاں میں جو ان تک نہ پہنچے، خدا تک نہ پہنچے
مدینہ ہی میں ملے گا سرورِ قلب ونظر کہ جلتے رہتے ہیں واں، رحمت و کرم کے چرا۔
غرض نغمات تہنیت کا منشا (موٹف) اور اثر (اِفکٹ) خاصے کی چیز ہے۔ پیرایہ، بیان (فارم) غزل سہی مگر خیر البشرؐ سے عشق کی

ہیں:

کہاں روئے انور، کہاں حسنِ لیلیٰ حقیقت حقیقت، فسانے فسا۔
یہ منشا و اثر دیکھیے۔ مجھے تو تہنیت کی ساری شاعری قلب ونظر کا بلند ایک موڑ نظر آتی ہے:

تہنیت تم نے عجب حال بنا رکھا ہے نہ خرد مندوں میں شامل ہو نہ دیوانوں ۔
محترمہ رابعہ بیگم انوار اللہ لکھتی ہیں "یہ شاعری نہیں ہے فقط عرض حال ہے، جذباتِ حقیقی روایاتِ قلبی کا ایک دھارا ہے جو صورت میں رواں ہوگیا۔ اکثر و بیش تر اشعار کیف و وجدان کا گنجینہ ہیں۔ عظمت، ۔ان۔ ادبِ رسولؐ، طلبِ رسولؐ کے فیضان نے بہرہ کھول دیا ہے:

وہی ہیں باعثِ تخلیقِ عالم انھیں کے دم سے ہے رونق جہاں
حضورؐ آپ نے انسان کو آبرو بخشی وگرنہ کیا وہ خدائی کا رازداں ؛

یہ گنجِ سعادت کبھی خالی ہی نہ ہو گا   سب آپ کے الطاف رقم کرتے رہیں گے
مدینہ بلوائیے دوبارہ ، وہ جلوہ دکھلائیے دوبارہ   وہ جام پلوائیے دوبارہ گیا نہیں ہے خمار اب بھی
ہے تہنیت پھر سفر پہ مائل سکون اس کو نہیں ہے حاصل   حرم سے اس کا بھرا نہیں دل ،بجھا نہیں یہ شرار اب بھی
وہ بھی دن تھے تہنیت جب تاب گویائی نہ تھی   مدحِ سرورؐ میں غزل خواں بن گئے ہیں آج کل
تہنیت نعتِ نبی باعثِ توقیر بنی   ورنہ ہم اہلِ سخن میں کہیں مشہور نہیں

محترمہ تہنیت صاحبہ نام و نمود اور حصولِ شہرت کے جذبے سے کوسوں دور تھیں۔ وہ چاہتیں تو کئی رسائل ان کا کلام فخر سے چھاپتے۔ "سب رس" تو خود ان کے گھر کا پرچہ تھا، ان کا کلام بھی معیاری اور بلند پایہ تھا۔ بہ مشکل دس بارہ نعتیں ماہ نامہ "حرم" لاہور، ماہ نامہ "زیب النسا" (لاہور) منادی (دہلی)، سب رس (حیدرآباد) اور القدیر (حیدرآباد) میں چھپیں۔ شہرت سے یہ بے اعتنائی ان کی فطری، نسوانی حیا اور مسلم معاشرے کے تہذیبی اقدار کی حامل ہے۔ آج کی شاعرات کا یہ حال ہے کہ ایک غزل / نعت لکھتی ہیں تو ہر رسالے میں چھپانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا یہ شعر ان کے اندازِ فکر و نظر کا ترجمان ہے۔

ہے تہنیت کے پیشِ نظر عالمِ دگر   منزل ہے اور منزلِ نام و نشاں سے دور

ان کی صاحب زادی تہذیب فاروقی اور پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد کا بیان ہے کہ وہ خواتین کے مشاعروں میں شرکت کرتیں تو خود اپنا کلام نہیں سناتیں بلکہ تہذیب سے پڑھواتیں۔ البتہ "دکن ریڈیو" سے تعلیمِ نسواں کے موضوع پر کئی تقاریر نشر کیں۔

مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں میرا یہ دعوی بے بنیاد نہیں کہ محترمہ تہنیت مرحومہ شاعرات میں اس اعتبار سے ممتاز ہیں کہ انھوں نے تین نعتیہ مجموعے پیش کیے ہیں جن میں نعتوں کی تعداد (۲۱۵) ہے۔ اگر آخری، ۳ سال میں کہا ہوا مجموعہ بھی شائع ہو جائے تو انھیں شاعرات میں اتنا عظیم مدحتِ نبی کا ذخیرہ پیش کرنے میں اولیت کا درجہ دنیا حق بہ جانب ہو گا:

این سعادت بہ زورِ بازو نیست   تانہ بخشد خدائے بخشندہ

"تسلیم و رضا" سے چند نعتیں پیش ہیں۔

تسلیم و رضا سے انتخاب:

(۱)

ملا ان کا نہ ہم رتبہ نہ ثانی   زمانے نے بہت کچھ خاک چھانی
محمد سرورِ کون و مکاں ہیں   نہیں قیدِ زمانی و مکانی
خدا نے جس سے کی تخلیقِ عالم   محمدؐ کا تھا نورِ جاودانی
رہا محروم نعمت ہائے کونین   کسی نے قدر ان کی گر نہ جانی
رہے بے روح بے ذکرِ محمد   لکھے گر کوئی دنیا کی کہانی
وہ دنیا جو ہے تفسیرِ محمد   وہ دنیا جو ہے خود گنجِ معانی

کہ بس یہیں کے کام رہ جائیں گے باقی
یہ دنیا تہنیت ہے گرچہ فانی

(۲)

نہ کام آئے کبھی ثروت و حشم کے چراغ　　غرور ان پہ نہ کر ، ہیں یہ صبح دم کے چراغ
مدینہ ہی میں ملے گا سرورِ قلب و نظر　　کہ جلتے رہتے ہیں واں رحمت و کرم کے چراغ
ہوئے ہیں واقفِ اسرار پیروانِ نبیؐ　　یہاں کے نقش قدم ہیں کہ جام جم کے چراغ
بنے ہیں اس لیے پروانہء چراغِ حرم　　کہ اس کے سامنے جلتے نہیں ارم کے چراغ
ہم ان کے واسطے روشن رکھیں گے خانہء دل　　ملے نہ کچھ تو جلائیں گے درد و غم کے چراغ

ان آنسوؤں نے ہی کچھ لاجِ تہنیت رکھ لی
خدا کرے رہیں روشن یہ چشمِ نم کے چراغ

(۳)

یاد ان کی دلاگئے آنسو　　بختِ خفتہ جگا گئے آنسو
دل کو ویرانہ ہم سمجھتے تھے　　قدر اس کی بڑھا گئے آنسو
رحم آخر انھیں بھی آہی گیا　　اپنی بگڑی بناگئے آنسو
یوں تو آنکھوں میں کچھ نمی سی رہی　　سوزشِ دل بڑھا گئے آنسو
دھیمی دھیمی سلگتی رہتی ہے　　آگ ایسی لگا گئے آنسو
دل تڑپتا ہی رہ گیا لیکن　　ایک طوفاں اٹھا گئے آنسو
ان کے نقشِ قدم میں جذب ہوئے　　دولت ایسی کما گئے آنسو

تہنیت پھر مدینہ یاد آیا
اپنی آنکھوں میں آگئے آنسو

(۴)

جو معیار صبر و رضا تک نہ پہنچے　　عجب کیا درِ مصطفیٰ تک نہ پہنچے
نہیں کوئی ان سا وسیلہ جہاں میں　　جو ان تک نہ پہنچے خدا تک نہ پہنچے
جو ہو سوز کامل تو ممکن نہیں ہے　　کہ بابِ اجابت دعا تک نہ پہنچے
مزہ سوز و سازِ محبت کا شاید　　دلِ درد نا آشنا تک نہ پہنچے
جو لیتے رہے درس عقل و خرد سے　　مضامین مہرو وفا تک نہ پہنچے
کبھی شہرت و مصلحت کے تقاضے　　مری طبع و فکر رسا تک نہ پہنچے

پہنچتے رہے تہنیت خواب ہی میں
حقیقت میں گر مدعا تک نہ پہنچے

(باقی ص: ۸۲ پر)

(۵)

پروفیسر اشرف رفیع

تہنیت زور کی نعتیہ شاعری

اردو زبان نے جب سے قلم سنبھالا ہے اس وقت سے آج تک نعت شریف کے موضوع پر اپنا حق ادا کرنے کوشش کر رہی ہے - یہ موضوع ہے جس پر "تمت تمام شد" کی مہر لگائی ہی نہیں جا سکتی -

نعت شریف کا آغاز کب ہوا؟ کیسے ہوا؟ اس کے لیے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے - یہاں مختصراً اتنا کہنا کافی ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں اپنے نبی کریم کی تعریف اور شان بیان فرمائی اور یوں نعت حبیبِ دو عالم کے آداب بندوں کو سکھائے - عربی فارسی کا کوئی شاعر ایسا نہیں گزرا ہوگا جس نے حبِ رسول کے جذبہ صادق کے ساتھ نعت شریف نہ کہی ہو اور اس کو اپنی شفاعت کا وسیلہ نایا ہو - اردو کے بھی تقریباً سبھی شاعروں نے نعت سرور کونین لکھ کر دونوں عالم میں سرخ روئی حاصل کرنے کی مسعود کوشش کی ہے -

تہنیت النسا بیگم نے حمد، منقبت، نظمیں اور غزلیں بھی کہی ہیں لیکن ان کا اصل میدان نعت گوئی ہے - وہ خود کہتی ہیں:

نعت گوئی کے سوا شغل نہیں کوئی پسند تہنیت شوق سے مصروف اسی کام میں ہے

تہنیت زور کے اب تک تین مجموعے موسومہ:

ذکر و فکر (۱۹۵۵ء) (۲) صبر و شکر (۱۹۵۶ء) (۳) تسلیم و رضا منظر عام پر آئے ہیں -

تہنیت النسا بیگم رفعت یار جنگ ثانی کی صاحب زادی تھیں - ان کا خاندان علم و فضل کا گہوارہ تھا - جہاں دین و دنیا کی دولت جا تھی - ان کے شوہر نامدار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور حیدر آباد کی ایک ایسی ہمہ گیر شخصیت تھی جس نے کئی شاعروں اور ادیبوں کی پ ستی کی اور حیدر آباد میں ادارۂ ادبیات اردو قائم کیا - چراغ تلے اندھیرا کیسے رہ سکتا تھا، اپنی بیگم کے جوہر قابل کی ہمت افزائی کی -

نعت گوئی کوئی آسان کام نہیں - یہ کوئی رہ گزرِ عام نہیں جس نے چاہا، جو چاہا لکھ دیا - یہ محبت اور عقیدت کی وہ شاہ راہ ہے جس پر کے بل چلنا پڑتا ہے، پھونک پھونک کر، سنبھل سنبھل کر - یہاں جذبہ بے اختیارِ شوق کو بھی ہوشِ ادب میں رہنا لازمی ہے:

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

ت نے کمالِ احتیاط سے نعت گوئی کا شرف حاصل کیا - نعت محمدیؐ میں تہنیت نے وارداتِ قلبی و کیفیاتِ روحانی کے علاوہ سراپائے ک، سیرت و اسوۂ رسول کریمؐ فضیلت و منزلتِ اشرف المخلوقات، تاریخ عرب، معجزات نبوی، روضۂ اقدس کی کشش، مدینہ منورہ کی مین، معراج کی فضیلت یہ اور ان کے علاوہ کئی معنوی وسعتیں پیدا کی ہیں - رسولِ اکرمؐ کا شفیع المذنبین اور خاتم النبیین ہونا ہمارے ن کا جزوِ لازم ہے - اس موضوع کو عربی فارسی اور اردو کے سبھی نعت گو شاعروں نے اپنے اپنے انداز سے باندھنے کی کوشش کی ہے - ت کے یہاں بھی ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں - نمونتاً تین شعر پیش ہیں:

آپ ہی فضل جو فرمائیں تو کچھ دور نہیں ورنہ اعمال ہمارے کوئی مستور نہیں

علاجِ دردِ دل کیا پوچھتے ہو ہمدمو مجھ سے شفیع المذنبین کی دید میرے دکھ کا درماں ہے

تہنیت نزع میں وہ سامنے آجائیں اگر دیکھ کر روئے نبیؐ چین سے مرجائیں گے

سراپانگاری اردو شاعری کا خاص موضوع ہے۔ غزل، قصیدے، مثنوی اور مرثیے میں سراپانگاری کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ نعت شریف میں جب سراپائے اقدس کھینچا جاتا ہے تو اس کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے کہ قلم جیسے موتی نچھاور کر رہا ہو۔ شاعرات کے لیے یہ موضوع بڑا پسندیدہ ہو سکتا ہے لیکن تہنیت نے اس طرف خاص توجہ نہیں کی۔ ان کی نظر تو حسنِ ظاہر سے زیادہ حسنِ باطن کے جلوے دیکھ رہی تھی۔ پھر بھی حسنِ ظاہر کی مجموعی کیفیت قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے:

جن کا چہرہ سورۂ والشمس کی تعبیر تھا ہے اسی روئے مبیں سے دل فروزاں آج تک
تمھاری شان کا کوئی نظر نہیں آیا حسین دیکھے ہیں لاکھوں سرِ زمیں ہم نے
مخلوق نہ کیوں اس پہ ہو شیدا دل و جاں سے جب حسنِ نبی حق کو بھی مرغوب رہا ہے
روئے انور کی جھلک سے ضو فشاں سینۂ شمس و قمر ہونے لگا
احسن الخالقین ہے یوں تو خدا حسن ان کا جہاں میں یکتا ہے

عام انسانوں سے جب آپ کے حسنِ مطہر کا مقابلہ کرتے ہیں تو آپ یکتائے زمانہ ہی نظر آتے ہیں۔ اللہ نے صرف آپ ہی کے اعتبار پر ایک مشتِ خاک کو انساں بنایا ہے تو خود آپ کے حسن کا عالم کیا ہوگا۔ اس موضوع پر جلیل مانک پوری نے بڑا معرکۃ الآرا شعر کہا ہے:

وہ آدمی ہیں مگر دیکھنے کی تاب نہیں نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں

نجم آفندی ایک دوسرے انداز میں کہتے ہیں:

صورت گرِ ازل نے ترے اعتبار پر اک مشت خاک تھی جسے انساں بنادیا

یہ یکتائے زمانہ مظہرِ حق اپنے جسمانی حسن سے حبیبِ کبریا نہیں کہلوائے بلکہ آپ کے اخلاقِ حسنہ اور اوصافِ حمیدہ کے سبب خداوند قدوس نے آپ کو انسانِ کامل اور اشرف المخلوقات کے مراتب عطا فرمائے۔ انسانیت اور اخلاق کے میزان میں کوئی آں حضرتؐ کا ہم پلہ نہیں۔ صداقت، شجاعت، شرافت، محبت، مروت یعنی حسنِ اخلاق کی تمام اعلیٰ صفات سے سرورِ دو عالم مزین ہیں جن کی تعریف کرنے سے انسانی قلم قاصر ہے۔ پھر بھی تعریف کے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔ اپنے تمام عجز کے باوجود ہر شاعر نے ضرور آپ کے اسوۂ حسنہ کا بیان دل و جان سے کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے انک لعلیٰ خلق عظیم:

خلق ایسا کہ خدا جس کو کہے خلقِ عظیم حسن کہتا ہے کہ بے مثل ہوں یکتا ہوں میں
اسی خیرالبشر کے اسوۂ حسنہ نے دنیا پر کیا ثابت کہ انسان افتخارِ بزمِ امکاں ہے
آپ کی ذات فخرِ موجودات آپ سا کوئی ذی وقار کہاں؟
صبر ایسا کہ ہر اک دکھ میں کیا شکر ادا رحم ہر عاصی سے کہتا ہے سہارا ہوں میں
تمھارے حلم و صبر و ضبط کی تعریف ہو کیوں کر فرشتوں کو ہو جس پر رشک وہ خیر الوریٰ تم ہو
عرب اور عجم میں رہے جس کے چرچے تجارت میں تھی وہ دیانت تمھاری
وہ بیوہ کے غم خوار ہے کس کے ہمدم غریبوں، یتیموں کا غم کھانے والے
خود اپنے عمل کا نمونہ دکھاکر غلاموں کو آزاد کروانے والے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے اول ما خلق اللہ نوری والخلق کلھم من نوری وانا من نور اللہ۔ اگر

حدیث شریف کے تین حصے ہیں۔ تہنیت نے اس حدیث کی طرف کس کس طرح اشارہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

نور جن کا اولاً ظاہر ہوا روزِ ازل — ہے انھی کے نور سے عالم درخشاں آج تک
وہ ہستی جو بنی فضلِ خدا سے رونقِ گیتی — شرف جس کا نمایاں ہے ابھی تک نوعِ انساں میں
بنا جلوہ انھی کا باعثِ رعنائیِ عالم — انھی کا نور ابھی تابندہ ہے مہر درخشاں میں
اسی گل سے یہاں سب کو ملا ہے فیضِ رنگ و بو — کوئی پھول اس طرح کا پھر نہ مہکے گا گلستاں میں
ازل میں نور نبی ہویدا ہوا ہے جن و بشر سے پہلے — نمودِ شام و سحر سے پہلے، وجودِ شمس و قمر سے پہلے
تمھارے حسن جہاں نما سے سوا ہے عرشِ بریں منور — زمیں سے پہلے، زماں سے پہلے، حجر سے پہلے، شجر سے پہلے
وہ نور ظاہر ہے شمس و قمر میں — اسی رخ کے جلوے ہیں شام و سحر میں

تہنیت النسا بیگم خانوادۂ تصوف کی چشم و چراغ تھیں۔ روحانی فیوض و برکات سے فیض یاب ہونا یقینی تھا۔ نعت شریف میں ایسے کئی مقامات تہنیت کے یہاں آتے ہیں جو کسی سلسلہ تصوف ہی کی دین ہو سکتے ہیں۔ مثلاً:

بشر ہو یوں تو کہنے کو، خدائی سب تمھاری ہے — خدا تو کہہ نہیں سکتے خدا سے کب جدا تم ہو
بنی خیر الورا کی ذات شمع معرفت ایسی — کہ ہر اک چشم بینا بن رہی ہے اس کا پروانہ
حق تعالیٰ کی مشیت تھی ازل ہی میں یہی — جلوۂ نور نبی کون و مکاں تک پہنچے
وہ باعثِ تخلیقِ دوعالم ہے حقیقی — اللہ کی قدرت کا وہی جلوہ نما ہے

حج اور زیارتِ گنبدِ خضرا ہر مسلمان کی ایک لامتناہی آرزو ہے، جس نے اپنی آنکھوں سے حرمین کے جلوے دیکھے وہ پھر پکارتا ہے ھل من مزید، جس نے ایک بار دیکھا وہ بار بار دیکھنے کی آرزو میں تڑپتا ہے۔ دیدار سے پہلے اشتیاق کی جو کیفیت ہوتی ہے بعد مراد اور بڑھ جاتی ہے جامی سے اس کیفیت کا حال سنئے:

مشرف گرچہ شد جامی ز لطفت — خدایا ایں کرم بار دگر کن

تہنیت النسا بیگم کو شرفِ حج بیت اللہ و زیارت گنبدِ خضرا نصیب ہوئی تھی اس سے پہلے کہ وہ اس پاک سرزمین پر قدم رکھتیں ان کے دل کی تڑپ ملاحظہ ہو:

کششِ طیبہ کچھ اس طرح لیے جاتی ہے — ایسی رفتار سے کیا برق و شرر جاتے ہیں
ان کے دربار کی شرکت کے مزے لوٹیں گے — حرمِ پاک میں جب شام و سحر جائیں گے

اور جب اس سرزمین پاک پر قدم رکھا تو:

جب اٹھاتے ہیں نظر گنبدِ خضرا کی طرف — جلوے کونین کے آنکھوں میں سما جاتے ہیں
ہم اور بارگاہِ رسالت پناہ میں — مارے خوشی کے آنکھ سے آنسو نکل گئے

زیارت حرمین جب وطن لوٹے تو پھر وہی:

یاد آتے ہیں حرم کے جو مناظر پیہم — جذبۂ شوق کو کچھ اور بڑھا جاتے ہیں

کیا یاد نہیں آتا؟ اور جب وہ مناظر یاد آتے ہیں تو بس یاد آتے ہی جاتے ہیں:

آتا ہے یاد لطفِ مدینہ بہ ہر نفس ۔۔۔ پھر جاتا ہے نظر میں حرم ہر دعا کے ساتھ
رہتا ہے شب و روز تصور میں ہمارے ۔۔۔ وہ گنبدِ خضرا کے جو ہے جانِ مدینہ
دل دھڑکتا ہے یادِ حرم میں سدا ۔۔۔ شوق پہلے سے بھی کچھ سوا ہوگیا
روضۂ انور کے قصے اور حرم کے تذکرے ۔۔۔ راحتِ دل ، مونسِ جاں بن گئے ہیں آج کل
ابھی تک یاد ہے جدہ میں بے تابی کا وہ عالم ۔۔۔ حرم کے قافلے جب کارواں در کارواں جاتے

اب بس ان کی یہی دعا رہی کہ:

زہے قسمت مدینے کی زمیں پر اپنا مدفن ہو ۔۔۔ اس امید پر کیوں کر نہ ہم سے ناتواں جاتے

آخر دعا قبول ہوئی:

رحمتِ حق نے پھر پکارا ہے ۔۔۔ قصدِ یثرب جو ، اب دوبارا ہے

بارگاہِ رسالت مآب ہی وہ بارگاہ ہے جہاں سب کے دل جھکتے ہیں، دلِ آرزومند بس اس آرزو میں خون ہوتا رہتا ہے کہ ایک نظرِ کرم ہوجائے تاکہ دنیا و آخرت کا ہر مرحلہ سنور جائے۔ حشر کی شرمندگی سے بچ جائے۔ تہنیت نے ایسی التجائیں عموماً اپنے مقطعوں میں کی ہیں:

تہنیت ہوش میں آ ، ذرا تجھے اب کس کا ہے ۔۔۔ حشر میں وہ ترے غم خوار چلے آئیں گے
اس کو بخشائیں گے حبیبِ خدا ۔۔۔ تہنیت کا یہی سہارا ہے

چند ایک نعتیں ایسی ہیں جن میں ایک آدھ شعر کے سوا تمام اشعار التجائیہ ہیں۔ مثلاً صرف ایک نعت پیش ہے:

شیدا بنائیے ہمیں دیوانہ کیجیے ۔۔۔ دنیا میں پھر کسی طرح رسوا نہ کیجیے
جلوہ دکھا کے پھر کوئی پردا نہ کیجیے ۔۔۔ دل میں ہمارے حشر سا برپا نہ کیجیے
تڑپائیے ، رلائیے ، سب کیجیے مگر ۔۔۔ محرومِ التفات ہوں، ایسا نہ کیجیے
سہہ لیں گے تلخیِ غمِ دنیا کسی طرح ۔۔۔ شرمندہ حشر میں تو خدارا نہ کیجیے
بختِ رسا پہ ناز ہے لیکن یہ فکر ہے ۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ یاد دوبارہ نہ کیجیے
ہوتی ہیں یہ فراق کی گھڑیاں بڑی کٹھن ۔۔۔ آکر میرے خیال میں ، جایا نہ کیجیے
جب ان کی ذات حاصلِ کل کائنات ہے ۔۔۔ کیوں ان کی ذات ہی پہ سہارا نہ کیجیے
الفت جو ہو کسی سے تو ہے مصلحت یہی ۔۔۔ مرجائیے مگر ، کوئی چرچا نہ کیجیے

جنت یہی ہے نعتِ دارین تہنیت
اس کے سوا کسی کی تمنا نہ کیجیے

تہنیت کی نعت میں محبت و عقیدت کے درد و غم کا ایک طوفان ہے۔ یہ غم کوئی غم دوراں نہیں بلکہ یہ غم جاناں ہے اور جاناں بھی کون! جو جانِ جاناں ہے۔ ایسے غم کا اظہار زبان کی سادگی، سلاست اور شیرینی کا متقاضی ہوتا ہے۔ یہی تہنیت کی نعتوں کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ کہیں کہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ غزل کہہ رہی ہیں، جس کا محبوب محبوبِ الٰہی ہے۔ ایسے چند شعر سنیے:

محوِ آلام رہے ، موردِ آفات رہے ۔۔۔ تم سے غافل نہ کسی دن ، نہ کسی رات رہے

آپ کی راہ میں بن جاتے ہیں صحرا گلشن
آپ کے در پہ عجب لطف و مدارات رہے

دلِ درد آشنا نہیں ملتا
یوں تو دنیا میں کیا نہیں ملتا

ایک سے ایک ہیں جہاں میں حسیں
پر کوئی آپ سا نہیں ملتا

کبھی ہو عطا ہمیں بھی وہی چشمِ عارفانہ
ہمیں کچھ خبر نہیں ہے جو لگا ہے تازیانہ

ہمیں غم نہیں ہے اس کا کہ ہوئے ہیں خوار و رسوا
جو قلق ہے بس تو یہ ہے نہ ہو دین بھی روانہ

جب کبھی ان کی یاد آئی ہے
کیا ہی تسکین دل نے پائی ہے

ہم ہیں تنہائی ہے، جدائی ہے
آپ کے ساتھ سب خدائی ہے

ہم کو شاہی سے واسطہ ہی کیا
ہم ہیں اور نازشِ گدائی ہے

نیت النسا بیگم کا گھرانہ ثروت و امارت، تصوف و طریقت کا گھرانہ تھا مگر اپنے عصر کے سیاسی، اخلاقی اور ذہنی انتشار و ادبار سے بھی خوب قف تھا۔ تغیرات زمانہ نے مسلمانوں کو بے بسی و بے چارگی میں مبتلا کر دیا تھا۔ کوئی بھی ملت پرست ان کی اس بے چارگی پر افسردہ ہوگا ر ان کی بھلائی کا متمنی ہوگا۔ تہنیت اپنی نعتوں میں سرکارؐ کے حضور یہ عریضے بھی گزرانتی ہیں کہ اپنے نام لیواؤں اور جاں نثاروں پر بھی نظر م فرمائیں۔ ایسے اشعار، شاعرہ کی انسان دوستی اور ملت پرستی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں:

ہم ہند کے مسلم صبح و مسا کہتے ہیں بہ صد امید و رجا
سنتے ہیں کہ تم قوموں کی سدا قسمت کو سنوارا کرتے ہیں

ہے آج ہر اک ایماں دشمن کب تک یہ سہیں، ہم رنج و محن
تم ہم کو سنبھالو شاہِ زمن ہم تم پہ بھروسا کرتے ہیں

ر مایوس مسلمانوں کو دلاسا بھی دیتی ہیں کہ:

تم اپنے دورِ حاضر سے۔ گھبراؤ مسلمانو!
بہار آنے کو ہے اب رنگ بدلے گا گلستاں کا

طیکہ انسان اپنی حقیقت کو نہ بھولے اور پیرویِ اسوۂ محبوبِ خدا کا پابند رہے:

انساں کو بناتی ہے حقیقت میں جو انساں
وہ پیرویِ اسوۂ محبوبِ خدا ہے

اسلام سکھاتا ہے محبت کے قرینے
ایمان طلب کار رہِ ورسمِ وفا ہے

احکامِ خدا جو بھول گیا جو راہِ نبی سے ہٹ کے چلا
انساں کی حقیقت کیا سمجھے گا اور وہ مسلماں کیا ہوگا

جو دکھ میں کسی کا ساتھ نہ دے جو اپنی غرض کا بندہ ہو
وہ شیخ و برہمن تو ہوگا لیکن کوئی انساں کیا ہوگا

سرورِ دو عالم نے انسانیت کو جس قعرِ ذلت سے نکالا اس میں ایک واقعہ حرمتِ نسواں کا ہے۔ رحمت اللعالمینؐ نے انھیں زندہ در گور نے سے بچالیا اور مرد کے مساوی حقوق سے سرفراز فرمایا۔ تہنیت اس احسان کا ذکر اس طرح ایک نعت شریف میں کرتی ہیں:

صنفِ نسواں کو بخشی نئی آبرو
بخت بگڑے تھے اس کے مگر بن گئے

ت النسا بیگم کی تمام نعتیں غزل کے اسلوب میں ہیں۔ ان کی زبان صاف، شستہ، شیریں اور رواں ہے۔ چھوٹی چھوٹی بحروں میں یہ کلام اور علا معلوم ہوتا ہے اور پھر ان میں شاعرہ کا جذبِ دروں، فطری وابستگی، والہانہ شیفتگی یہ سب کچھ اور ہی لطف دے جاتے ہیں۔ حیدرآباد عرات میں تہنیت النسا بیگم وہ واحد شاعرہ ہیں جنھوں نے صرف نعت شریف کے نازک فن کو اپنایا ہے۔ فرماتی ہیں:

نعت گوئی کے سوا شغل نہیں کوئی پسند
تہنیت شوق سے مصروف اسی کام میں ہے

تہنیت نعتِ نبی باعثِ توقیر بنی
ورنہ ہم اہلِ دکن میں کہیں مشہور نہیں

ڈاکٹر محمد علی اثر

محترمہ تہنیت النسا بیگم اور ان کی نعتیہ شاعری

محترمہ تہنیت النسا بیگم تہنیت مشہور محقق اور ماہرِ لسانیات و دکنیات ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی شریکِ حیات اور اردو کی ایک باکمال نعت گو شاعرہ تھیں۔ شاعری کا ذوق انھوں نے ورثے میں پایا تھا۔ ان کے چچا سر نظامت جنگ بہادر اپنے وقت کے ایک نام ور ماہرِ سیاسیات ہونے کے علاوہ انگریزی کے قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ انھوں نے میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کی غزلوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ محترمہ تہنیت کی دو پھوپھیاں خیر النسا بیگم خیر اور تہنیت النسا بیگم ساجدہ اردو میں طبع آزمائی کرتی تھیں۔ خود ان کے شوہر ڈاکٹر زور محقق و نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کے ایک خوش گو شاعر بھی تھے جس کی وجہ سے ان کے ادبی ذوق کو مزید نکھرنے سنورنے کا موقع ملا۔ تہنیت صاحبہ نے نعتیہ شاعری کے تین مجموعہ ہائے کلام "ذکر و فکر"، "صبر و شکر" اور "تسلیم و رضا" اپنی یاد گار چھوڑے ہیں۔ یہ تینوں کتابیں ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے علی الترتیب ۱۹۵۵ء، ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۹ء میں شائع ہو چکی ہیں۔

تہنیت النسا بیگم صاحبہ حیدرآباد کے ایک علمی و مذہبی اور ذی ثروت گھرانے کی چشم و چراغ تھیں۔ ان کا ددھیالی سلسلہ نسب خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ تک پہنچتا ہے۔ ننھیالی سلسلہ ایک طرف حضرت شہاب الدین سہروردیؒ سے ملتا ہے تو دوسری طرف علماء فرنگی محل سے بھی قرابتِ قریبہ رکھتا ہے۔ ان کی والدہ ہندستان کے مشہور عالم مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی ماموں زاد بہن تھیں۔ بہ قول پروفیسر آغا حیدر حسن "حضرت مولانا (عبدالباری فرنگی محل) کے دربار سے گاندھی جی کو مہاتما کا خطاب ملا تھا اور پوری دنیا میں باپو مہاتما جی مشہور ہوگئے۔ مولانا محمد علی نے اسی دربار میں دستِ بیعت دراز کیا تھا اور مسٹر سے مولانا ہوگئے" (۱)۔

تہنیت صاحبہ کے والد نواب رفعت یار جنگ ثانی مملکت آصفیہ میں بیدر اور اورنگ آباد میں صوبے داری کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کی والدہ محترمہ اسما بیگم صاحبہ مدینہ منورہ میں تولد ہوئی تھیں اور نو سال کی عمر میں اپنے والدین اور بھائی کے ساتھ ہندستان آئیں اور تقریباً ربع صدی تک یہاں قیام پذیر رہنے کے بعد ۱۹۳۰ء میں اپنے پیدائشی مقام مدینہ منورہ ہجرت کر گئیں۔ ۱۹۵۲ء میں انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ مدینہ منورہ ہی میں تدفین عمل میں آئی۔

محترمہ تہنیت ۲۵ مئی ۱۹۱۰ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم اپنی والدہ محترمہ اسما بیگم سے حاصل کی اور بعد ازاں انھیں حیدرآباد کی مشہور درس گاہ محبوبیہ گرلز ہائی اسکول میں شریک کروایا گیا۔ جہاں انھوں نے سینیر کیمبرج تک تعلیم حاصل کی۔ تہنیت صاحبہ کے تین بھائی غازی الدین احمد، ناصر الدین احمد، سراج الدین احمد اور تین بہنیں رفعت النسا بیگم، عظمت النسا بیگم اور لیاقت النسا بیگم تھیں۔ ان کے بڑے بھائی غازی الدین احمد انگریزی کے اور ناصر الدین احمد ناصر اردو کے شاعر تھے (۲) اور چھوٹے بھائی سراج الدین احمد

محکمہ سیل ٹیکس میں اسسٹنٹ سکریٹری تھے ۔ انھوں نے آخر عمر تک ادارہ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کے رکن اور شعبہ امتحانات کے صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

تہنیت النسا بیگم صاحبہ ۱۵ نومبر ۱۹۳۲ء کو مشہور واعظ دکن حافظ سید شاہ محمد قادری کے فرزند ارجمند سید محی الدین قادری زور سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئیں ۔ ان کے شوہر کا سلسلہ نسب حضرت سید شاہ شیخ علی سانگڑے سلطان مشکل آسان (متوفی ۸۴۶ھ) تک پہنچتا ہے ۔ حضرت سانگڑے سلطان، حضرت سید احمد کبیر رفاعی کے بڑے فرزند اور اپنے وقت کے ایک جید عالم اور صاحب باطن بزرگ تھے ۔ تہنیت النسا بیگم کی خوش دامن صاحبہ محترمہ بشیر النسا بیگم نواب فضیلت جنگ کی قرابت دار تھیں ۔ نواب فضیلت جنگ آصف جاہ سادس نواب میر محبوب علی خاں کے عہد حکومت میں سررشتہ امور مذہبی میں وزیر اعلیٰ کے منصب پر فائز تھے ۔

تہنیت النسا بیگم کے شوہر نام دار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (۱۹۰۴ء ـ ۱۹۶۲ء) کی ادبی شخصیت ان کی غیر معمولی خدمات کی وجہ سے تاریخ ادب اردو میں ایک درخشاں ستارے کی طرح جگمگاتی رہے گی ۔ وہ نہ صرف ایک صاحب نظر نقاد، بلند پایہ محقق اور ماہر لسانیات تھے بلکہ دکنی ادب کے نام ور مورخ، خوش گو شاعر اور باکمال افسانہ نگار بھی تھے ۔ انھوں نے اپنی بے پناہ تحقیقی و تنقیدی اور تدریسی و تنظیمی صلاحیتوں کے ذریعے کم و بیش چار دہوں تک اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دی ۔

ادارہ ادبیات اردو کی تاسیس ڈاکٹر زور کا ایک یادگار کارنامہ ہے ۔ اس ادارے کا قیام ڈاکٹر زور کے علاوہ پروفیسر عبدالمجید صدیقی، مولوی عبدالقادر صدیقی، مولوی نصیر الدین ہاشمی اور پروفیسر عبدالقادر سروری کے رقمی عطیوں سے ۱۹۳۱ء میں درج ذیل اغراض و مقاصد کے تحت عمل میں آیا تھا ۔

۱۔ اردو زبان اور ادب کی توسیع و اشاعت

۲۔ سرزمین دکن میں اردو زبان اور ادب کا صحیح مذاق پیدا کرنا ۔

۳۔ ملک کے نوجوانوں میں انشا پردازی اور شاعری کا ذوق پیدا کرنا ۔

۴۔ عوام میں اردو کی تعلیم اور مطالعے کا شوق پیدا کرنا اور اس کے لیے ضروری وسائل اختیار کرنا ۔

۵۔ اردو کو غیر اردو داں اشخاص سے روشناس کرانا ۔

۶۔ تاریخ دکن کی خدمت اور ملک کے تاریخی ادب و آثار کی حفاظت ۔

۷۔ ایک ایسا مکمل کتب خانہ قائم کرنا جس میں اردو کی بالعموم اور خاص طور پر دکن کی تمام تحریریں اور آثار محفوظ ہو سکیں اور جس کا ایک حصہ خواتین کے لیے وقف رہے (۳) ۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ادارے کی اپنی کوئی عمارت نہیں تھی ۔ اس کے سارے کاروبار "تہنیت منزل" کے ایک کمرے ہی میں انجام پاتے تھے ۔ جب اس کی سرگرمیوں میں مزید اضافہ ہوا اور کتابوں کی ایک کثیر تعداد جمع ہوگئی تو زور صاحب نے اپنے گھر کے قریب تین

چار کمروں اور ایک ہال پر مشتمل ایک عمارت تعمیر کروائی اور ادارے کو اس میں منتقل کردیا۔ ۱۹۴۱ء سے انھوں نے ادارے کے لیے زمین اور عمارت کی تعمیر کے سلسلے میں باقاعدہ جستجو شروع کردی تھی۔ حکومت کی جانب سے عمارت بنوانے کے لیے سالانہ گرانٹ بھی منظور ہوئی تھی لیکن ایک مرحلے تک وہ زمین کے حصول میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ حکومت حیدرآباد کی طرف سے منظورہ رقم کے منسوخ ہوجانے کا اندیشہ درپیش تھا، ایسے نازک موقع پر محترمہ تہنیت النسا بیگم نے اپنے مکان سے متصل ۸۰۰ گز پر مشتمل پلاٹ کو ادارے کے لیے تحفتہً رجسٹری کرواکے اپنے شوہر کے دیرینہ خواب کو عملی جامہ پہنانے کی راہیں آسان کردیں۔ ۱۹۴۶ء میں خواجہ حسن نظامی نے اس عمارت کے لیے "ایوانِ اردو" کا نام تجویز کیا تھا۔ اس عمارت کا نقشہ بہزادِ دکن فیاض الدین نظامی نے ۱۹۵۵ء میں تیار کیا۔ ۱۹۵۹ء میں بی رام کشن راؤ چیف منسٹر آندھرا پردیش نے "ایوانِ اردو" کا سنگ بنیاد رکھا۔ ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر زور کے انتقال سے تقریباً دو سال قبل وزیر اعظم کشمیر بخشی غلام محمد نے اس کا افتتاح کیا۔ بہ قول سید رفیع الدین ہاشمی "ایوانِ اردو کی عمارت کے نقشے سے لے کر اس کی تعمیر و تزئین اور آرائش و زیبائش تک سب کام محترمہ تہنیت النسا بیگم صاحبہ کے حسبِ منشا ہوئے۔" ادارے کی مختلف سرگرمیوں اور اس کے مختلف شعبوں سے بیگم زور کی عملی وابستگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر زور کی صاحب زادی تہذیب یحییٰ فاروقی صاحبہ لکھتی ہیں:

> "پردے میں رہ کر آپ نے ادارۂ ادبیات اردو کی ہر طرح خدمت انجام دی۔ تمام سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ ادارہ ادبیاتِ اردو کے شعبہ خواتین کی سرگرم رکن رہیں۔ ادارے کی جانب سے "اردو دانی و اردو زبان دانی" وغیرہ کے جو امتحانات بلدہ و اضلاع میں منعقد کیے جاتے تھے، خواتین کے امتحانی مراکز کی نگرانی اپنی بہن عظمت النسا بیگم ہمشیرہ ڈاکٹر فراست شاہد وغیرہ سے مختلف مقامات پر انتظامات کرواتی تھیں" (۴)۔

ڈاکٹر زور اپنے علمی و ادبی اور تحقیقی و تنقیدی اور تدریسی و تنظیمی امور میں اس قدر مشغول رہتے تھے کہ دن بھر کی مصروفیات کے باوجود انھیں رات دیر گئے تک پورے انہماک اور یک سوئی کے ساتھ کام کرنا پڑتا تھا۔ محترمہ تہنیت بھی نہ صرف رات رات بھر جاگتی رہتی تھیں بلکہ ان کے کام میں ہاتھ بھی بٹاتی تھیں۔ بہ قول سید رفیع الدین قادری "والد صاحب کوئی بھی کام والدہ سے مشورہ کیے بغیر نہیں کرتے تھے۔ جب بھی کوئی مضمون تحریر کرتے یا کتاب لکھتے تو اس کا مسودہ پہلے والدہ صاحبہ کو دکھاتے اور وہ مسودہ دیکھنے کے بعد انھیں مشورے بھی دیا کرتی تھیں۔

محترمہ تہنیت ایک اطاعت گزار، فرماں بردار اور شوہر پرست بیوی تھیں۔ وہ اپنے شوہر کے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھتی تھیں محترمہ تہذیب یحییٰ فاروقی کا بیان ہے کہ:

> "بابا کا بے حد خیال رکھتی تھیں۔ آرام کا (اتنا) لحاظ کہ جب وہ سو رہے ہوں ہم لوگ شور نہ کریں۔ ان کے کھانے پینے کا پہننے کا ان کے اوقات کی پابندی کا۔ جب کالج سے شام واپس آتے تو نوکر چاکر ہونے کے باوجود اپنے ہاتھ سے چائے کے ساتھ کوئی میٹھی چیز بنا کر رکھتیں۔ اس امر کا خاص خیال رکھتی تھیں کہ کوئی بات انھیں ناگوار نہ

گزرے اور خود وہ کام یہ بات نہ کرتیں جو انھیں ناپسند ہو" (۶)۔

رزور کی علمی و ادبی فتوحات میں بیگم زور کا بھی حصہ رہا ہے ۔ انھوں نے ڈاکٹر زور کو بچوں کی تعلیم و تربیت اور دیگر گھریلو مسائل سے حد تک مستغنی کر دیا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر زور نے ایک مختصر سے عرصے میں بہ حیثیت محقق و نقاد اور ماہر لسانیات و دکنیات ، نما جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ کئی انجمنوں اور اداروں کی جانب سے کیے جانے والے کام پر بھی بھاری ہیں۔ تصنیف و تالیف کام اور دیگر مصروفیات کے سلسلے میں قاضی عیاذ انصاری کے ایک استفسار پر ڈاکٹر زور نے اپنی شریک حیات کا بہ طور خاص تذکرہ ، ہوئے بتایا کہ "دن رات میں لکھنے پڑھنے کے سوا کسی اور مطلے کو کبھی دخل نہیں رہا اور اس کے لیے میں اپنی بیوی کا شکر گزار کہ انھوں نے سارے گھریلو کاروبار سے مجھے آج تک بے نیاز رکھا ۔ نہ صرف یہی بلکہ میرے علمی و ادبی کاموں میں بھی انھوں نے ار دور تک ہاتھ بٹایا ہے " (۷)۔

تہنیت النسا بیگم صاحبہ ایک وفاشعار اور سلیقہ مند بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صابر و شاکر خاتون بھی تھیں ۔ ایک دولت رانے سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ بے جا اسراف اور غیر ضروری شان و شوکت کی قائل نہیں تھیں ۔ انھوں نے اپنے شوہر سے یورات یا قیمتی ملبوسات کی فرمائش نہیں کی ۔ ڈاکٹر زور نے "تہنیت منزل" کی عمارت زیادہ صرفے کے بغیر کچھ اس انداز سے تعمیر ی تھی اور بیگم زور نے اسے کچھ اس طرح آراستہ کیا تھا کہ دیکھنے میں یہ عمارت کافی وسیع و کشادہ محل کی طرح دکھائی دیتی تھی ۔ ادارہ ت اردو کی عمارت کی تعمیر سے پہلے ادارے کی ساری علمی و ادبی سرگرمیاں اور مشاعرے "تہنیت منزل" ہی میں منعقد ہوتے تھے ۔ اری تقاریب میں بیگم زور کے گھر کا قیمتی فرنیچر اور برتن استعمال ہوتا تھا اور ان ساری تقریبوں کے انتظامات بھی وہ خود کرتی تھیں ۔

تہنیت النسا بیگم صاحبہ نے شہرت و مقبولیت اور نام و نمود سے پرے رہ کر ناقابلِ فراموش سماجی ، فلاحی اور علمی و ادبی ت انجام دی ہیں ۔ ڈاکٹر زور کی وفات کے بعد بھی ادارے کی مختلف سرگرمیوں سے ان کی دل چسپی برابر برقرار رہی اور تاحیات انھوں دارے کو بہ حیثیت سرپرستِ اعلیٰ اپنے مفید مشوروں سے نوازا ۔

جہاں تک محترمہ تہنیت کی شعر گوئی کا تعلق ہے جیسا کہ اس سے پہلے بھی مذکور ہوا ہے ۔ وہ اردو کی ایک خوش گو شاعرہ تھیں بل کی ہئیت میں ان کی نعتیہ شاعری کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۔ وہ ایک پابند صوم و صلوات ، نیک سیرت اور شریف النفس تھیں ۔ خوش قسمتی سے انھیں دو بار زیارتِ حرمین شریفین سے مشرف ہونے کا موقع ملا ہے ۔ پہلی بار ۱۹۵۱ء میں مکہ معظمہ اور مدینہ لی زیارت سے سرفراز ہونے کے بعد ہی انھوں نے باقاعدہ نعت گوئی کا آغاز کیا تھا :

تہنیت شوق سے مصروف اسی کام میں ہے	نعت گوئی کے سوا شغل نہیں کوئی پسند
تمھارے فیض کا چشمہ جہاں ابلتا ہے	خدا کرے کہ پھر اک بار واں پہنچ جائیں

ء میں دوسری بار حج و زیارتِ مقاماتِ مقدسہ کی سعادت حاصل کرنے سے پہلے انھوں نے ، صبا کے ذریعے ، سرکارِ مدینہ کو بہ صد

ادب یہ پیام بھیجا تھا:

کہنا صبا مدینے کو جاکر بہ صد ادب گل دستہ ایک نعتیہ اب لارہے ہیں ہم

لیکن بہ فضلِ تعالیٰ محبوبِ خدا کی شان میں انھوں نے ایک نہیں تین گل دستے آراستہ کرنے کا شرف پالیا تھا۔ زبان و بیان کی سادگی اور بے ساختگی ان کی شاعری کا نمایاں وصف ہے اور بہ قول ایم۔ اسلم "کلام کے ہر لفظ سے حضورِ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس طرح مترشح ہورہی ہے جیسے ساون کی مخمور گھٹاؤں سے موتی برستے ہیں" (۸)۔

نعت گوئی کے لوازمات میں حضور اکرم سے والہانہ عشق کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔ نعت گو شاعر حبِ رسولؐ میں جس قدر سرشار ہوگا اس کے کلام میں اتنی ہی جاذبیت، تاثیر اور دل کشی پیدا ہوگی۔ تہنیت النسا بیگم صاحبہ امجد حیدرآبادی کے الفاظ میں حبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوبی ہوئی ہیں (۹)۔ اس لیے ان کی نعتوں میں دل کشی اور دل آویزی بھی ہے اور اثر آفرینی بھی۔ "یادِ نبیؐ" ان کے لیے "وجہِ سکونِ دل و جگر" بھی ہے اور "لذتِ مدام" بھی۔ اس لیے ان کے لبوں پر بار بار سرکارِ دو عالم کا نام آجاتا ہے:

یادِ نبی ہے وجہِ سکونِ دل و جگر یہ لطف عارضی نہیں ہے لذتِ مدام
یہ بات یاد رہے تہنیت خدا کے لیے کھلے جو منھ تو کھلے مدحِ مصطفیٰ کے لیے
ملتا ہے لطفِ خاص سدا ہر گھڑی ہمیں آتا ہے بار بار لبوں پر جو ان کا نام
آپؐ کی یاد بار بار آئے دلِ وارفتہ کو قرار آئے

یادِ نبی، مدحِ مصطفیٰ اور ذکرِ سرورِ کائنات کی مناسبت سے ان کی نعتوں میں مدینہ، منورہ، روضہ، رسول اور گنبدِ خضرا سے عقیدت و احترام کا اظہار بھی بڑے والہانہ اور مؤثر انداز میں ملتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

مدینے ہی میں ملے گا سرورِ قلب و نظر کہ جلتے رہتے ہیں واں رحمت و کرم کے چراغ
وہاں صبح و مسا اللہ کی رحمت برستی ہے مدینہ نام جس بستی کا ہے دراصل جنت ہے
خدا کرے کہ نظر میں سدا رہے اپنی وہ سبز گنبدِ اقدس کہ جو ہے جانِ حرم
رہے نظروں میں گنبدِ خضرا ان کا جلوہ ہو زندگی کے قریب
رہتا ہے شب و روز تصور میں ہمارے وہ گنبدِ خضرا کہ جو ہے جانِ مدینہ

مدینے سے دوری کا احساس اور اپنے غموں کے مداوا کے لیے حضور سے فریاد، مدینہ بار بار جانے کی خواہش، روضہ، رسول پر درود و سلام پڑھنے اور درِ نبیؐ پر جان دینے کی تمنا، محترمہ تہنیت کی نعتیہ شاعری کے اہم موضوعات ہیں:

سرکارِ دوعالم سے ہم دور بہت ہیں مغموم ہیں، دل گیر ہیں، رنجور بہت ہیں
خدا کرے کہ پہنچ جائیں جلد طیبہ میں تڑپ رہے ہیں دل و جاں اسی فضا کے لیے

مدینے ہی کا تصور ہے تہنیت ہردم　　نہیں ہے فکر کہ کب اپنا دم نکلتا ہے
زندگی چین سے گزرے گی مدینے ہی میں　　موت اگر آئے تو مرنا بہت آساں ہوگا
اک تمنا رہ گئی ہے ان کے در پر جان دوں　　کاش پوری ہو سکے اس خستہ تن کی آرزو
جو پہنچوں مدینہ تو واپس نہ لوٹوں　　مری جاں ہو یارب نثارِ مدینہ

اسی خواہش، اسی تمنا اور اسی آرزو میں کبھی کبھی دل برداشتہ ہوکر وہ اشک بار بھی ہوجاتی ہیں۔

یاد ان کی دلا گئے آنسو　　بختِ خفتہ جگا گئے آنسو
تہنیت پھر مدینہ یاد آیا　　اپنی آنکھوں میں آگئے آنسو
فیض معمور فضاؤں سے لپٹ کر رولیں　　پھر مدینے کی ہواؤں سے لپٹ کر رولیں
ابر چھایا ہے ہوائیں ہیں مدینے سے دور　　جی تڑپتا ہے گھٹاؤں سے لپٹ کر رولیں
یاد جو آرہی ہے تمہاری　　بہتے جاتے ہیں اشکوں کے دھارے
دیکھیں گے کبھی تہنیت اپنی بھی طرف وہ　　اشکوں سے جو ہم آنکھوں کو نم کرتے رہیں گے
روضہ پاک کی جالیاں ہیں　　اور ادھر اپنی آنکھیں ہیں پرنم

مدینے کی ہوا محترمہ تہنیت کے لیے باعثِ تسکین ہے، اسی لیے وہ بادِ صبا کے ساتھ اس ارضِ مقدس تک پہنچنے کی تمنا کرتی ہیں۔

تہنیت باعثِ تسکیں جو ہوئی　　یہ مدینے کی ہوا ہے شاید
صبا لے چل اڑا کر ساتھ اپنے تہنیت کو بھی　　گزر ہونے کو ہو تیرا مدینے کی جو راہوں سے
ہاں بتا دینا ذرا بادِ صبا مجھ کو بھی　　عزمِ طیبہ ہے اگر ساتھ ہی تیرے ہولوں

محترمہ تہنیت کی نعتوں میں جگہ جگہ فیضانِ رسول اور حضورِ اکرمؐ کی تعلیمات کے نقوش منور نظر آتے ہیں۔ انھوں نے یہ نقوش اخلاص، عقیدت اور دردمندی کے ساتھ ابھارے ہیں:

یاد ہے اب بھی ساری دنیا کو　　ان کے فیضانِ عام کی باتیں

درِ فیضِ سرورِ انس و جاں، ہے جہاں میں مامنِ بے کساں
جو کوئی نصیب سے پہنچے واں، وہی اپنی بگڑی بنا گئے

رحمت اللعالمینؐ کے فیض سے　　نورِ ایماں جلوہ گر ہونے لگا
سدا ان کا فیضان جاری رہے گا　　گزرتے رہیں گے یوں ہی سب زمانے
وہی ہیں عارف کامل وہی بہ فیضِ کرم　　بشر کو دہر میں دانائے راز کرتے ہیں

ان کی تعلیم سے وحشی بھی ہوے شائستہ ۔ یعنی انسانیت آہی گئی انسانوں میں
اس گل سے یہاں سب کو ملا ہے فیضِ رنگ و بو ۔ کوئی پھول اس طرح کا پھر نہ مہکے گا گلستاں میں

فیضانِ نبی کریمؐ اور آپ کی تعلیمات کے پہلو بہ پہلو تہنیت صاحبہ نے سرورِ دوعالمؐ کی سیرت و سوانح اور بنی نوع انسان پر آپ کے حسانات ۔ آپ کی امانت ، صداقت ، دیانت ، اخوت ، محبت ، بخشش ، عنایت ، جودو سخا ، فضل و عطا ، علم وحلم جیسے اعلیٰ اوصاف اور خلاقِ حمیدہ کا تذکرہ کیا ہے :

عرب اور عجم میں رہے جس کے چرچے ۔ تجارت میں تھی وہ دیانت تمھاری
رہی نقش بن کر عدو کے بھی دل میں ۔ شرافت تمھاری ، صداقت تمھاری
اٹھائیں خدمت انساں کی خاطر زحمتیں ایسی ۔ مثال ان کی نہیں ملتی کہیں تاریخِ انساں میں
شہ کونین جس کے پاس چاندی تھی نہ سونا تھا ۔ وہ سردار دوعالمؐ بوریا جس کا بچھونا تھا
جو ان کے درسِ صبر و شکر کو پیشِ نظر رکھے ۔ اسے کیا فکر جو اہلِ جہاں بیداد کرتے ہیں

سرسید احمد خاں نے جس طرح "مسدسِ حالی" کو اپنی بخشش کا ذریعہ قرار دیا تھا بالکل اسی طرح عبدالرحمٰن خاں چغتائی محترمہ ہنیت کے پہلے مجموعہ نعت " ذکر و فکر " کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوے لکھتے ہیں " ذکر و فکر " روح کی بالیدگی کا وہ وحانی تحفہ ہے جس کو بغل میں دبائے جنت میں جانے سے کوئی روک نہیں سکتا " (۱۰)۔

حواشی

۱۔ آغا حیدر حسن ۔ تسلیم و رضا (مقدمہ) ص ۸
۲۔ سید رفیع الدین قادری (شخصی انٹرویو)
۳۔ خواجہ حمید الدین شاہد ۔ سرگذشتِ ادارہ ، ادبیاتِ اردو
۴۔ مقدس آغوش محبت و عظیم گہوارہ ، تربیت مشمولہ ماہ نامہ "نعت" لاہور ۔ اکتوبر ۱۹۹۷ء ۔ ص ۸۶
۵۔ سید رفیع الدین قادری (شخصی انٹرویو)
۶۔ مقدس آغوش محبت و عظیم گہوارہ تربیت ۔ ص ۹۰
۷۔ "یادگارِ زور" ادارہ ، ادبیاتِ اردو حیدرآباد ص ۹۲
۸۔ صبر و شکر (تہنیت نامہ) ص ۹
۹۔ ذکر و فکر (پیش لفظ) ص ۷
۱۰۔ صبر و شکر ص ۱۰۵

● ☆ ●

ڈاکٹر عقیل ہاشمی

ممتاز شاعرۂ دکن۔ تہنیت صاحبہ زور

.عری خواہ کسی زبان میں کی جائے ایک اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی انفرادیت اس کا تاثر اور مقصد انسانی جذبات و احساسات سے اس میں سچائی خواہ ذہنی ہو یا اخلاقی اساسی درجہ رکھتی ہے نیز اس میں دل کشی دل آویزی لطف و انبساط کا پیدا ہونا شاعر کے شعوری ربھی ہے۔ شاعری کے بارے میں کسی مغربی مفکر کا خیال ہے کہ شاعری میں عظمت اور دائمی شہرت کی سطح پر ریاکاری کے لیے ین ہے اور اس رفیع الشان دائرے کو محفوظ اور ناقابلِ تسخیری رہنا چاہیے کیوں کہ شاعری میں اعلی و پست صحیح و غیر صحیح یا نیم صحیح یا ث یا نیم سچائی کے درمیان فرق بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ شاعری میں اس کی اساسی اہمیت اس کی اعلی صفات کی وجہ سے ہے۔ اس رکریں تو شاعری کے مختلف اصناف اس خوبی و رعنائی سے متصف ہیں۔ خصوصیت سے ایسی شاعری جس میں عزم و حوصلہ سرور و مقصدیت کی قوت موجود ہو، شاعری کے مطالعے سے اگر ہر لمحہ بہترین تصور حقیقی محبت و علویت کا خیال اور اس سے خوشی و ل کرنے کا شوق ہمارے ربط و نسبت سے عبارت ہے۔

تیہ شاعری کی ایک طول طویل تاریخ ہے اور یہ تاریخ اسلامی عقیدت کا دوسرا نام ہے روایت کے اعتبار سے اس میں حد درجہ حزم و رورت ہوگی شاید اسی وجہ سے ایسی شاعری کو، ہم کلیتہً رسمی شاعری نہیں کہہ سکتے دراصل یہ شاعری داعی اسلام حضرت محمد صلی اللہ سے گہری وابستگی آپ سے والہانہ محبت و ربط و تعلق سے تحریک پاتی ہے اس میں ذہنی یا تخیلی کارفرمائیوں کی گنجائش نہیں بلکہ تساسات کو کمال عقیدت متوازن اور فدیانہ انداز سے رقم کیا جاتا ہے۔ اب ان خیالات کے اظہار میں مرد و زن کی تخصیص نہیں۔ ، تو وجدان طبع کے ساتھ ساتھ ودیعتِ الٰہی کا انعام سے ہے، عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں خلفائے راشدین، صحابہ کرام کئی ایک صحابیات اس نعمت سے بہرہ ور تھیں۔ تاریخی اعتبار سے امیر المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے ب خواتین کے نام نامی اس ذیل میں لیے جاسکتے ہیں۔ خصوصیت سے قبیلہ خزاعہ کی مہمان نواز خاتون ام معبد کہ جن کی نعت اور ائے مقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت کچھ اس قدر معروف و مشہور رہے کہ سرورِ کائناتؐ کے بارے میں متعدد مورخین محدثین و ؛ اس سے استفادہ کیا ہے (تفصیلات کے لیے دیکھیے کتاب زاد المعاد اور شمائلِ ترمذی شریف) مزید نعتیہ شاعری میں ہجرت کے ینہ منورہ کی لڑکیوں کا گیت بھی یاد رکھنا چاہیے:

طلع البدر علینا ، من ثنیات الوداع وجب الشکر علینا ، ما داع للّٰہ داع

ضح رہے کہ اسلام نے شاعری کو کبھی قابل اعتنانہ سمجھا اور اس کو رسول اکرمؐ کے شایانِ شان بھی نہیں خیال کیا وما علمنا الشعرا، اس ، ہے۔ قرآن ہی میں شعرا کی گم گشتگی سے متعلق یتبعہم الغاوٗن کہا گیا لیکن استثنائی صورتیں بھی رکھی گئیں یعنی حکیمانہ نکات، مضامین ہیم، وعظ و نصیحت، شعار دینی کی ترسیل و ابلاغ کے لیے جن شعرا نے اپنے آپ کو وقف کردیا ان کو تلامذۃ الرحمان کہا، ارشاد حق موجب الاالذین وامنوا الصلحت ذکر واللہ کثیرا کے زمرے میں ایسے ہی شعرا مقام پاتے ہیں جو خدا اور اس کے رسولِ برحق کی محبت ظ مراتب حقوق اللہ اور حقوق العباد کا نصیب العین رکھتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان حضرات نے نعت گوئی کے سلسلے میں خود قرآن

مجید سے راست اکتساب کیا قرآن مجید میں ایسے کئی مقامات صاف پڑھے جاسکتے ہیں جس میں اللہ تعالی نے حضور اکرمؐ کی مدح بیان کی ہے کہیں آپ کو طٰسین و طٰہ سے خطاب کیا جارہا ہے تو کہیں سراجاً منیراً جیسے مزمل اور مدثر کے القابات سے یاد کیا جارہا ہے تو کہیں انک لعلی خلق عظیم اور رفعنالک ذکرک سے سراہا جارہا ہے گویا نعت گوئی کا اولین ماخذ قرآن مجید ہے۔ مگر قرآن کتاب حکیم ہے اور اس کا مقصد اصلی انسانی شعور میں روحانیت اور رابطہ الٰہی کو استوار کرنا ہے۔ اس کے باوجود خود عہد نبوت میں بعض صحابہ کرامؓ کے کلام میں یہ چیز دکھائی دیتی ہے۔ چناں چہ حضرت جعفر طیارؓ کا دربار نجاشی میں خطبہ نثر میں نعت کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ بہ قول صاحب ارمغان نعت حضرت حسان ابن ثابتؓ، حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ، حضرت کعب ابن زہیرؓ (قصیدہ بانت سعاد) جیسے مشاہیر شعرا کے علاوہ کوئی بائیس صحابہ کرامؓ کے نعتیہ اشعار مل جاتے ہیں۔ ان حضرات کے قطع نظر حضرت ابو طالب، حضرت عباس، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت فاطمہ الزہراؓ، حضرت زین العابدینؓ اور خلفائے راشدین کے اسمائے گرامی سرفہرست ہوں گے۔ جنھوں نے حضور سرور عالمؐ کی شان اقدس میں نعتیہ اشعار کہے ہیں۔ شاید کسی موقعہ پر داعی اسلام نے شعر گوئی کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا، ان من الشعر الحکمہ وان من البیان لسحراً (ترجمہ: بے شک شعر حکمت ہے، یقیناً بیان میں سحر ہے (بخاری شریف)

نعتیہ شاعری کے بارے میں اس تمہید کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ زیر نظر مجموعے "فکر و فکر" "صبر و شکر" اور "تسلیم و رضا"، حمد نعت و منقبت سے ہی متعلق ہیں اور اس کی شاعرہ ہیں محترمہ تہنیت النسا اہلیہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور جن کی شخصیت درون پردہ ہی رہی لیکن اپنے شاعرانہ اوصاف و اعلی خیالات کی وجہ سے مقبول عام ہوئی اور کیوں نہ ہوتی ان مجموعہ ہائے حمد، نعت و منقبت کے مطالعے کے بعد شاید ہی کوئی دل ایسا ہو جو متاثر نہ ہوا ہو شاعرہ نے اپنے جذبات و احساسات کو جس طرز و اسلوب و ادراک سے واضح کیا ہے وہ دیدنی ہیں۔
یہ صحیح ہے کہ ذکر و فکر صبر و شکر اور تسلیم و رضا آج سے کوئی چالیس بیالیس برس پہلے شائع ہوئے اور اہل ایمان و محبت سے بھرپور خراج حاصل کیا تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس وقت سے آج تک ایک خاتون (پردہ نشین) کے کلام کی تازگی نکہت اور دل پذیری میں فرق نہیں آیا، عام طور پر مستورات میں شاعری کے رجحانات کم پائے جاتے ہیں اور یہ کہ مردوں کے مقابلے میں خواتین کے شاعرانہ خیالات سے متعلق شک و شبہ کی گنجائش فراہم کی جاتی ہے لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ قدیم زمانہ سے عورتوں میں شعر و ادب کا ذوق و شوق پایا جاتا رہا ہے۔ عربی اور فارسی زبان کے قطع نظر اردو زبان میں شاعرات کی کمی نہیں۔ خود میر تقی میر کی صاحب زادی شعر کہتی تھیں۔ سودا اور انعام اللہ یقین کے تلامذہ میں خواتین کے نام ملتے ہیں۔ تفصیلات کا یہاں کوئی موقع نہیں تاہم اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ نواب مصطفی خاں شیفتہ نے گلشن بے خار میں چند شاعرات کا نہایت مختصر احوال اور نمونہ کلام درج کیا ہے اسی طرح مولوی عبد الغفار نساخ نے سخن شعرا میں بہ طور ضمیمہ چند شاعرات کا تذکرہ شامل کتاب کیا پھر رفتہ رفتہ شاعرات کے مستقل تذکرے وجود میں آئے جیسے شمیم سخن تذکرہ خواتین اور اردو شاعرات اس کی اچھی مثالیں ہوں گی۔ مگر بہ قول عندلیب شادانی "مرد کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ انھیں (عورتوں کو) منظر عام پر آنے دیا جائے" پھر بھی دلی اور لکھنؤ اور حیدرآباد کے بیش تر اساتذہ کے شاگردوں میں عورتوں کے نام مل جاتے ہیں۔

دکن میں خاتون شعرا کی تفصیلات بھی ایک تاریخی حقیقت ہے۔ مہ لقا بائی چندا، لطف النسا امتیاز سے لے کر بشیر النسا بشیر، خورشید نذیر بیگم، بیگم عظمت عبد القیوم اور تہنیت النسا زور تک نہ جانے کتنی خواتین نے شعر و ادب کے گلہائے رنگارنگ نہ کھلائے ہوں مگر آج یہاں تہنیت صاحبہ اور ان کے مجموعہ ہائے کلام ذکر و فکر صبر و شکر اور تسلیم و رضا کے بارے میں گفتگو مقصود ہے۔

ذکر و فکر، تہنیت صاحبہ کا یہ نعتیہ مجموعہ ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا جس کے بارے میں حضرت خواجہ حسن نظامی اپنے ماہ نامہ منادی ذیل

بابت جولائی ۱۹۵۵ء میں لکھتے ہیں:

"بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہوگا کہ اردو کے مشہور خادم ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی اہلیہ محترمہ اعلیٰ درجہ کی شاعرہ ہیں ان کے نعتیہ کلام کا مجموعہ حال میں شائع کیا گیا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی سارا کلام کیف اور سوز میں ڈوبا ہوا ہے۔ عاشقانِ رسول کو اس مجموعہ کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے"

فی الواقعی ذکر و فکر اپنی نام کی مناسبت سے اسم بامسمیٰ ہے (۷۵) نعتوں پر مشتمل اس انتخاب کا پیش لفظ، شہنشاہِ رباعیات حضرت امجد حیدرآبادی نے تحریر کیا جو بہ جائے خود ایک اعزاز کی بات ہے۔ اپنے پیش لفظ میں حضرت امجد نے تہنیت صاحبہ کا محض ایک شعر منتخب کیا جو اپنے اندر ایک عالم پنہاں و پوشیدہ رکھتا ہے:

وقتِ رخصت ہم پہ گذری وہ اب تک یاد ہے　　چھوٹتے ہی ان کا در تنہا نظر آنے لگے

درِ رسولؐ سے دوری اس کی جدائی، اس کا فراق کسی اہلِ دل سے پوچھیے جس کا ایمان یہ ہے کہ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ جس نے رسولؐ کی اطاعت کی گویا اس نے خدا کی اطاعت کی اور یہی محبت رسولؐ کا تقاضہ بھی ہے، دراصل حضرت امجد نے چند جملوں میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو ایک عاشقِ رسول، جاں نثار رسول کی حالت ہے، محبتِ رسول کا انداز جیسا کہ حدیث میں مرقوم ہے:

قال رسول اللہ صل اللہ علیہ وسلم لا یمن احد کم حتی اکون الیہ حب من ولدہ و والدہ و من نفسہ والناس اجمعین ○

تو پھر کس طرح ایک سچا دل مومن رحمت اللعالمین کی دوری آپ کے ہجر کو کیوں کر برداشت کرے گا۔ یہی کچھ طرز و اسلوب تعارف کے ذریعے حضرت علی منظور نے وضع کیا۔ اپنے دل کش و دل پذیر پرخلوص تعارف میں دکن کی اس استاد سخن نے بجا طور پر تہنیت صاحبہ کے خاندانی احوال و آثار، علمی ادبی خدمات کا احاطہ کیا ہے۔ اندازِ بیان اس قدر دل چسپ اور دل گیر ہے کہ اس سے جہاں شاعرہ کے کوائف کا علم ہوتا ہے وہیں اس کی طبیعت کا خاصہ، جذبات و احساسات کا اندازہ بھی۔ خاندانی وقار و مرتبت کا معاملہ یہ تھا کہ نواب رفعت یار جنگ اول اور رفعت یار جنگ دوم کے قبیلے کے اکثر اناث و ذکور حج و زیارت سے مشرف، طبقۂ امرا سے متعلق رہے جب کہ شوہر ڈاکٹر محی الدین قادری زور حیدرآباد کے دین دار گھرانے کے فردِ فرید مرفہ الحال، علمی و ادبی میدان کے شاہ سوار، فعال اور مجلس ساز شخصیت کے حامل خود اپنی بیگم صاحبہ کے اس فطری رجحان و مذاق شعری سے واقف اکثر شاعرہ کے اشعار سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ذکر و فکر کی اشاعت میں غیر معمولی دل چسپی دکھائی۔ حضرت علی منظور کے تعارف کے بعد شاعرہ یعنی تہنیت صاحبہ کی جانب سے بہ طور اعتذار یہ اعلان خاصہ اہم لگتا ہے:

"حمد و منقبت کی نظمیں اور غزلیں اس مجموعہ میں شریک نہیں کی گئی ہیں۔ اگر اللہ نے چاہا تو وہ بھی چھپ جائیں گے"

"تہنیت"

شاید اس کو وفاداری، استواری اصل ایمان ہے، کہا جاتا ہے تہنیت صاحبہ کے اس مجموعہ نعتیہ کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے قدم قدم پر حزم و احتیاط، ادب اور حرمت و عظمت کا خیال رکھا کیوں کہ:

ادب گا ہست زیرِ آسماں از عرش نازک تر　　نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

نعت گوئی کا معاملہ ہی کچھ ایسا ہے بہ قول مولانا حافظ حامد صدیقی قادری القادری سابق ریڈر جامعہ عثمانیہ:

"نعت و مدحِ مصطفیٰ کا سچا اور حقیقی مرقع ذکر و فکر کی شکل میں ہم دست ہوا تھا اس کتاب سے مجھے اور میری اہلیہ کو بہت زیادہ خوشی ہوئی بہت سی نعتیہ غزلیں تو ایسی ہیں کہ ہم لوگ صبح و شام ترنم سے پڑھتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بس مدینے کی گلیوں میں پھر رہے ہیں ۔ غزل اور نعت دونوں کا لطف ایک ہی جگہ مل جاتا ہے ۔ خیالات میں اس قدر پختگی اور مضامین میں اتنی زیادہ جدت ایک ہی مجموعے میں مشکل سے مل سکتی ہے ۔ سارا کلام حقیقت آفرینی کی وجہ سے اثر انگیز ہے ہر ہر لفظ اور ہر ہر جملے سے حلاوتِ ایمان اور عشقِ رسولؐ کی چاشنی کا مزہ مترشح ہو رہا ہے ۔ کلام میں آمد کا عنصر اتنا زیادہ ہے کہ صرف جذبات ہی جذبات محسوس ہوتے ہیں ۔ مگر یہ حقیقت اور تاریخی واقعہ ہے اس لیے تاریخی واقعات کو اس قدر شگفتگی کے ساتھ کہنا سوائے کہنہ مشق کے کسی کے بس کا روگ نہیں ہے ۔ پس ہوا یہ ہے کہ تاریخ بھی ہے اور جذبات بھی اس لیے حقیقت کی عریانی اثر آفرینی نہیں بلکہ سحر کاری کا کام کر رہی ہے: "وہ خوش نصیب تھے جو ہم نشین ہوئے ہوں گے" آخر یہ غزل صرف جذبات ہیں یا ایک زیارت کی تاریخی اور عاشقانہ و والہانہ حقیقت کا مرقع ہے ۔ پھر موزونیت اور کلام کی ترتیب کا کیا کہنا ۔ آخر میں حسرت و محبت کا نچوڑ" یہ بخت کیوں مرے ایسے نہیں ہوئے ہوں گے" کیا کوئی بھی محبِ رسول اس مصرع پر بغیر دو اشکِ عقیدت بہائے گزر سکتا ہے ۔ پھر حاضریٔ دربار کے موقع پر "مارے خوشی کے آنکھ سے آنسو نکل گئے" کس قدر فرطِ مسرت اور اظہارِ تعشق کو گوارائی کے ساتھ پیش فرمایا گیا ہے اور اس میں قدرتِ جذبہ ۔ عشق کی فراوانی کا اظہار بھی ہے اور نہایت سادگی کے ساتھ یہ اشعار ٹپک پڑے ہیں ۔

اس اقتباس سے تہنیت صاحبہ کے عشقِ رسول اور اس کی فراوانی کی مختلف جہتیں معلوم ہوتی ہیں ۔ سچ تو یہ ہے کہ تہنیت صاحبہ نعتیہ شاعری میں ایک مخصوص رنگ و آہنگ ہے ۔ لہجے میں اعتماد ہے جو اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ نعت گوئی سے ان کو روحانی مناسبت ۔ یہ رشتہ اٹوٹ ہے جو شاعرہ کو محبوب رب اللعالمین کے ذکر سے ممتع کرتا ہے ۔ اظہار و بیان کی طاقت بخشتا ہے کہیں کہیں جذبات کی ۔ ساختگی اور محویت الفاظ و بیان کے وسیلے راست دل پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ ان میں آمد ہی آمد نظر آتی ہے ۔ عروضی پابندیاں فقروں ترکیبوں کے حوالے سے بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ شاعرہ کے نزدیک جذبات کی نکاسی اہم ہے نہ قواعد و ضوابط ۔ اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ کلام شاعرانہ اور صاف نزاکتوں سے دور ہے ہاں رسول اللہؐ کی ذاتِ اقدس سے وابستگی پر شاعرہ کو ناز ہے بلکہ اس کی محبت، اس کی تڑ س محبت کی آئینہ دار ہے جس نے ذکر و فکر سے دوچار کیا ۔

نعت گوئی دراصل ایک سعادت ہے اور عبادت بھی ۔ تہنیت صاحبہ کے کلام سے یہ بات اجاگر ہوتی ہے کہ انہوں نے نعت گوئیؐ ۔یے حضور اکرمؐ کے لطفِ مکرم اور اس فیضِ اتم کو تلاشنے کو دانستہ و شعوری کوشش کی اس میں انہوں نے باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیہ ۔مصداق سنبھل سنبھل کر نعت گوئی کا حق ادا کیا ہے ۔ چند اشعار دیکھیے:

وہ نبی جو نبی فضلِ خدا سے رونق گیتی — شرف جس کا نمایاں ہے ابھی تک نوعِ انساں میں
مدحتِ روئے نبی تعریفِ گیسوئے نبی — انبساطِ دل کے ساماں بن گئے ہیں آج کل
کیوں نہ لکھوں نعتِ کونین مجھ کو مل گئی — دم نکل جائے جو ذکرِ احمدِ مختار میں
جب مدینے کی یاد آتی ہے — ہم کو اپنا پتہ نہیں ملتا
حرم میں جا بجا اس شوق میں کیے سجدے — حضور جلوہ فگن بس یہیں ہوئے ہوں گے

تمھاری دھن میں ہیں، ہم بے نیازِ دولتِ کونین ہماری آرزو تم ہو ہمارا مدعا تم ہو

تہنیت صاحبہ کے نعتوں میں محامد و محاسنِ رسول اکرمؐ کے ساتھ ہجر و فراق نبی کا تذکرہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ شاعرہ کو پیغمبرِ اسلام سے سچی محبت و عقیدت ہے وہ اس سراپا نور سے والہانہ انداز میں فیض کی خواہاں ہیں وہ نعت گوئی کو اپنے مقدر کے سنوارنے کا وسیلہ سمجھتی ہے ان کی یہ وابستگی قابلِ رشک ہے بلکہ لائق تقلید کہ اس دولتِ لازوال سے اہل ایمان کی جھولیاں ہمیشہ بھری بھری رہتی ہیں۔ اور اس عشقِ رسول سے ان کے قلوب ہمیشہ تابندہ و رخشندہ رہتے ہیں۔ تہنیت صاحبہ کے کلام میں سادگی، نرمی، لطافت، طمانیت صاف نظر آتی ہے وہ کسی وقت بھی وفورِ جذبات سے مغلوب نہیں ہوتیں اپنے خیالات کی آبیاری میں وہ زیادہ تر وہ ان جذبوں کو بروئے کار لاتی ہیں جن میں صداقت ہے، ایمانی حرارت ہوش مندی کا سلیقہ، جاں گزاری ارتکاز و انہماک ہے۔ بہ الفاظ دیگر وہ محض روایتی انداز کی نعتیہ شاعری نہیں کرتیں بلکہ اپنے جذبات کو الفاظ کا پیرہن دے کر صفحہ قرطاس پر بکھیر دیتی ہیں۔ ایک خاتون ہونے کے ناطے ان کی یہ تخلیقی صلاحیت قابلِ قدر و منزلت ہے اور وہ بھی اس دور میں جب کہ زمانہ بھر میں غزل اور تغزل کی فراوانی نے ہر ایک کو سرمستی و سرشاری سود و زیاں میں مبتلا کر دیا ہے ایسے ایسے موضوعات شاعری کے عنوان سے زندگیوں میں در آئے جن کا اظہار بہ جائے خود عجیب و غریب ہوگا ایسے مرحلے میں مذہبی شاعری کا خاموش یک سر کے ساتھ ریاض جاری رکھنا ایمانی حرارت جوش و عقیدت اور مذہبی روایات کی عظمت کی دلیل ہے۔

ذکر و فکر کے آخری صفحات میں تہنیت صاحبہ کی اس شعری صلاحیت کاوش و کارنامے کی اشاعت پر تاریخی قطعات کہے گئے ہیں ان میں سبھی شاعر اپنے وقت کے استاد اور محبتِ رسول سے آگاہ و باخبر تھے۔ خصوصیت سے مولانا شخین احمد شطاری کامل کے ساتھ ساتھ محمد حسین آزاد (دکنی) حضرت تاج الدین تاج قریشی خود حضرت سید علی منظور کے علاوہ میرے استاد حضرت خواجہ عبد العلی صدیقی جنھوں نے زندگی بھر حمد نعت و منقبت کو اپنا مطمحِ نظر بنا رکھا تھا جو آگے چل کر حسانِ دکن وصافِ رسول خطابات سے نوازے گئے۔ ان حضرات نے تہنیت صاحبہ کے اس نعتیہ انتخاب ذکر و فکر کی تاریخ اشاعت کے سلسلے میں قطعاتِ تاریخی کے حضرت صدیقی کا قطعہ درج کرتا ہوں:

مدح ممدوحِ رب سلامت باد یہی وجہِ نجات ہے گویا
ہے یہی ذکر فکر بھی ہے یہی یہی صوم و صلوات ہے گویا
آپ کی بات واہ کیا کہنا رشکِ قند و نبات ہے گویا
یہ اشاعت بھی سچ ہے صدیقی تہنیت کی نجات ہے گویا ۱۳۶۴ف

یہ مری خوش بختی ہے کہ مرے استاد نے جس نعت گو شاعرہ کے کلام کی اشاعت میں تاریخی قطعہ کہا آج برسوں بعد میں اس شاعرہ کے کلام پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہوں۔

ذکر و فکر کے بعد تہنیت صاحبہ نے صبر و شکر کے عنوان سے ایک اور انتخاب شعری محض ایک سال کے بعد شائع کیا دراصل یہ انتخاب ذکر و فکر کا دوسرا حصہ ہے اس میں شامل تمام تمام کا تمام کلام اپنی نوعیت اور مضامین کے لحاظ سے ذکر و فکر سے جدا نہیں جب کہ تہنیت نامہ کے عنوان سے معروف مشہور ادیب جناب ایم اسلم نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

"کلام کے ہر لفظ سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس طرح ترشح ہو رہی ہے جیسے ساون کی مخمور گھٹاؤں سے موتی برستے ہیں۔

سان کی عظمت اگر کبھی ظاہر ہوتی ہے تو مذہب سے ظاہر ہوتی ہے مذہب ایک ایسی کسوٹی ہے جس سے انسان کے وہ خواص پرکھے جاتے ہیں جو

اسے انسان کے خطاب کا حق دار بناتے ہیں جہاں محبت وہاں گلہ ہوتا ہے اور زبان شکوہ بھی بلا ارادہ ہی وا ہو رہی ہے:

جب ساقیِ کوثر اپنے ہیں جب شافعِ محشر اپنے ہیں محروم کرم ہم کیوں ہوں گے ہم کو غم عصیاں کیا ہوگا

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر ایک بے پایاں احسان ہے کہ اس نے ہمیں امت احمد مرسل کا رتبہ عطا کیا اور یہ فخر صرف مسلمانو کو ہی حاصل ہے:

عطا کی ہیں ہزاروں نعمتیں دنیا میں انساں کو محمد کی غلامی سب سے بڑھ کر فضلِ یزداں ہے

مجھے شاعری سے سروکار نہیں میں تو صرف یہ دیکھ رہا ہوں کہ اس قسم کے اشعار کہنے والے کا دل محمد کی محبت سے کہاں تک سرخ رہے:

ہوتا ہے ذکر رحمت و شفعت کا جب کبھی آتا ہے نام ان کا ہماری زبان پر

سارا کلام اس قسم کے پاکیزہ جذبات اور عشق رسول سے لب ریز ہے شعر کی ایک خوبی یہ ہے کہ لطافت کے ساتھ اس میں موسیقی کی چاشنی بھی ہے۔ محترمہ تہنیت کے ہاں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں جس میں حضورِ اکرمؐ کی محبت موج زن ہو وہاں درد کا ہونا بھی ایک ضروری چیز ہے"

جناب ایم اسلم کے یہ خیالات ذکر و فکر کے بارے میں مجھے لیکن صبر و شکر میں بہ طور دیباچہ شامل کر دیے گئے۔ کم و بیش (۹۰) نو۔ نعتوں کے اس انتخاب میں تہنیت صاحبہ کی وہ نعتیں بھی شامل ہیں جو حیدرآباد میں منعقد ہونے والے مشاعروں کے لیے لکھی گیں جن میں طور خاص، بزم گلستان، بزم کامل (شطاری)، مشاعرہ حضرت جلیل، مشاعرہ بزم جلیل، مشاعرہ بیدر، مشاعرہ سالانہ عرس حضرت زخم، مشا بزم صفی، مشاعرہ طرحی ملک پیٹ وغیرہ۔ مزید اسی مجموعے میں تہنیت صاحبہ کا وہ کلام بھی شریک کیا گیا جو رسالہ۔ سب رس حیدرآباد، رسا منادی دہلی، رسالہ۔ القدیر حیدرآباد، رسالہ۔ زیب النساء لاہور میں شائع ہو چکا تھا۔ بہ الفاظ دیگر شاعر کی کاوش و کوشش کو مختلف صاحبا ذوق اور اہلِ علم اور سخن ورانِ ذی شرف نے بہ نظر استحسان دیکھا اور ان کی خاطر خواہ داد دی۔ صبر و شکر کی نعتوں کا بالا ستیعاب مطالعہ ا بات کی گواہی دیتا ہے کہ تہنیت صاحبہ کے پہلو میں ایک گداز دل ہے اور ایک وجدانی اور ذوقی کیفیت ان کے رگ و پے میں سمائی ہوئی۔ جس کا بیان محال نہ سہی مشکل ضرور ہے۔ ان کے کلام میں محض الفاظ کی مرصع سازی نہیں بلکہ توحید، معرفت، عشق رسول کی نعمت مو ہے تہنیت صاحبہ نے اپنے اشعار میں کبھی فلسفیانہ نکات یا رموز و اسرار کی باتیں نہیں کیں البتہ نہایت سیدھے سادے طریقے سے لم واردات قلبی اور روحانی کیفیات کو رقم کر دیا شاعرانہ قواعد و ضوابط کی روشنی میں رکھا جائے تو انھوں نے اکثر نعتیں سہل ممتنع میں کہی ہیں ج میں ردیف اور قافیے کی تنگ نائی کا بھی خیال رکھا مگر مضمون کی علویت میں فرق آنے نہیں پایا مری اس بات کی دلیل یہ چند اشعار دیں گے

آؤ پھر سرکار کی باتیں کریں احمدِ مختار کی باتیں کریں

حق و باطل کی پرکھ مشکل ہے پردے آنکھوں سے اٹھا کر گزرو

شمعِ عرفاں پھر سے روشن کیجیے زندگی میں تیرگی ہے آج بھی

آپ نے یاد کیا ہے شاید پھر مرا بخت رسا ہے شاید

آپ کی چشم التفات اپنی متاعِ کائنات

جب سے آئے ہیں ان کی محفل سے دل ہے اس وقت سے اداس بہت

یاد ہے اب بھی ساری دنیا کو ان کے فیضانِ عام کی باتیں
کیا تعجب کہ یہ اسیرِ الم بزمِ نور و سرور تک پہنچے
زندہ درگور ہیں جو جیتے ہیں آپ سے دور زندگی کیسی
ہوگئی صبح آنکھوں آنکھوں میں وہ اگر وقتِ شام یاد آیا

اسی طرح بعض طرحی مشاعروں کی نعتوں میں تہنیت صاحبہ زورِ کلام رفعت خیال مضمون آفرینی دیدنی ہوئی چند مثالیں پیش ہیں:

طیبہ سے بہت دور ہیں بے لطف ہے جینا وہ صبح میسر نہیں وہ شام نہیں ہے
(مشاعرہ بزمِ جلیل)

ہر طرح بہتر ہی نکلا قیس اور فرہاد سے ان کے شیدا کا فسانہ ان کے دیوانے کا نام
مشاعرہ گلستان)

محمد کی غلامی مانگ لائے ہیں جو یزداں سے نہیں وہ چاہتے پھر کوئی نعمت بزمِ امکاں سے
مشاعرہ بزمِ کامل)

قیامت کی مصیبت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی ؟ درِ عالی سے دوری ہی مرے حق میں قیامت ہے
مشاعرہ بزمِ کامل)

اگر تصور میں وہ نہیں ہیں تو اس میں کچھ دل کشی نہیں ہے خیال سے ان کے ہو جو خالی وہ زندگی زندگی نہیں ہے
(مشاعرہ حضرتِ کامل)

وہ ہے بے نیازِ غمِ دین و دنیا جو رکھتا ہے دل میں محبت تمھاری
(مشاعرہ طرحی ملک پیٹ)

بہ قدرِ ذوق ہر اک ڈھونڈتا ہے پیکرِ خوبی نظر اپنی مگر اس شاہِ خوبانِ جہاں پر ہے
(مشاعرہ یادگارِ صفی)

خدا جو اس کا شیدا ہے خدائی بھی سمجھتی ہے کہ وہ نورِ نظر تسکینِ دل سے راحتِ جاں ہے
(مشاعرہ گلستان)

صبر و شکر کی اشاعت ذکر و فکر کے فوری بعد یعنی صرف ایک سال بعد ہی ہوئی اور اس کے بعد تسلیم و رضا منصہ شہود پر آگیا۔ صفحاتِ گذشتہ میں عرض کر چکا ہوں کہ حب یعنی اخلاصِ نیت محبت کی پاکیزگی والہانہ جذبہ۔ صداقتِ دل شاعر میں کارفرما ہوجائے تو نظم ہو کہ نثر اپنے سحر طرازی دکھانی لگتی ہے اس میں قلب کی صفائی اور نفس کی طہارت بھی اپنی جگہ۔ بنا لیتی ہے قرآن پاک ایسے نفوس کی رہنمائی کرتا ہے اس کو صحیح راستہ بتاتا ہے اور ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے:

فمن میرو اللہ یھدیہ بشرح صدرہ للاسلام (۶-۱۲۶)

(پس جب ارادہ فرماتا ہے اللہ کی ہدایت فرمائے کہ کسی کی (تو) کھول دیتا ہے۔ اس کا سینۂ اسلام کے لیے)

اسی کو صوفیاء کرام کشفِ صدر اور نورِ بصیرت کا نام دیا ہے اگر الفاظ شرحِ صدر اور اسلام کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے تو اس سے واضح ہوگا کہ جو شخص وحیِ نبوت پر ایمان رکھتا ہے اس کے کشف و الہام و وجدان کے ذریعے معلوم کی ہوئی بات کا اعتبار قائم ہوجاتا ہے۔ شاعر کو

شاید اس لیے کبھی کبھی الہامی شاعر کا نام بھی دیا جاتا ہے کہ جو کیفیات اس کے قلب و ذہن پر مرتسم ہوتی ہیں وہی الفاظ کے ذریعے ظاہر ہوتی ہیں اور یہ عشق ہی کی صورت ہوگی۔ صوفیا نے اس نظریہ۔ عشق کی توضیح میں ہزارہا، اشعار اور کتابیں تحریر کی ہیں اور اقبال کے مرشدِ معنوی عارف رومی کی مثنوی کا اہم ترین موضوع بھی یہی عشق رہا:

مرحبا اے عشق خوش سودائے ــــ اے طبیب جملہ علت ہائے ما

اور یہی عشق ان پاک طینت اصحاب کا مذہب و مشرب بھی تھا اس عشق کی تفصیل بحرِ بے کنار سے جدا نہیں۔ مختصر یہ کہ انسانی فطرت عشق حقیقی کی متلاشی رہتی ہے کیوں کہ عشق حقیقی پیدا نہ ہو تو انسان اپنے آپ کی حقیقت سے بے خبر رہتا ہے اور جب خود شناسی کی منزل نہ آئے تو خداشناسی کے ممکن ہے۔ اس ضمن میں نفوس انسانی نے کائنات کے ذرے ذرے میں اس عشق کی کارفرمائی دیکھی اور اس کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ اس کے اظہار کے لیے مختلف ذرائع کا استعمال کیا شاعری بھی اس میں سے ایک ہے اور شاعری کی وہ جہت جو تسلیم و رضائے الٰہی کے ساتھ اللہ اور اللہ کے رسول سے عشق یا محبت کو استوار کرے وہ یقیناً قابلِ قدر تعریف و تحسین کے لائق ہے تہنیت صاحبہ کے کلام میں اس عشق و محبت کی شرحیں نظر آتی ہیں اور اس کے لیے وسیلہ، ذریعہ عشق رسول کی نعمت سے خود کو وابستہ کرلینا ہے اقبال کی زبان میں اس بات کو یوں سمجھیے:

عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب ــــ عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات ــــ عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم سے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب
عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں ــــ عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں عشق زمان و زمیں ــــ عشق سراپا یقیں اور یقین فتح یاب
علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے ام الکتاب

اسرارِ عشق کی اس وضاحت کے لیے کلام اقبال سے سینکڑوں اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں اور میری دانست میں تہنیت صاحبہ کے کلام میں اسی عشق کی بازگشت سنائی دیتی ہے یہ ان کی فہم و فکر کی جولانی سے نوازا گیا۔ خداوند قدوس کی عطا اور نبی اکرمؐ کی رحمت بے پایاں ہے کہ دل تہنیت کو اس دولت لازوال سے نوازا گیا۔ بہرحال دکن کی یہ پردہ نشین صاحبہ، ربط و نسبت شاعرہ اپنے دور کی ایک کامیاب اور خوش کلام شاعرہ رہی کہ جس کے کلام کی اثر انگیزی سے آج بھی اہلِ علم و ادب، صاحبانِ ذوق و شوق صحیح معنوں میں استفادہ کر رہے ہیں۔

○ ○ ○

(سلسلہ ص: ۷۲ سے)

ملتاں و پیچاں ہے وہی تڑپ بن کر ان سے شعر لکھواتی ہے۔ وہ سچی عاشق رسولؐ ہی نہیں بلکہ ان کی امت میں پیدا ہونے پر فخر کرنے والی ایسی خاتون ہیں جن کی مثالیں امت مسلمہ میں خال خال ہی ملتی ہیں۔ خانقاہی گھرانے سے تعلق رکھنے کے ساتھ ساتھ کئی بار زیارتِ خاکِ طیبہ سے مشرف ہوکر آئی ہیں۔ اس عظیم عاشقِ رسولؐ کی رحلت بہرحال نعت کے ایک سبک انداز کے خاتمے کی دلیل ہے۔ اتنے عمدہ نعتیہ اشعار کا تحفہ لے کر رخصت ہونے والی خاتون کو بلاشبہ خاتونِ واصلِ جنت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ بلاشبہ ان کا مقام دودھ اور شہد کی نہروں کے قریب ہے۔ دکن کی ایک باصلاحیت اور نعت گو خاتون کا ہمارے درمیان سے اٹھ جانا ایک نعمت غیر مترقبہ کے گم ہوجانے کے مترادف ہے دعا ہے کہ بیگم تہنیت کی اطاعت گزاری اور نعت گوئی کے طفیل دکن کو مستقبل میں ایسی ہی باصلاحیت خاتون سے نوازے۔ جس کے کارناموں اور عمدہ کلام پر ہم فخر کر سکیں۔ آمین۔

ڈاکٹر مجید بیدار

بیگم تہنیت کی نعتیہ شاعری۔ والہانہ عشق کی تفسیر

پیغمبرِ اسلام صلعم کی مدح کا سلسلہ رسالت کے زمانے سے شروع ہوا اور یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ قیامت تک جاری رہے گا۔ دنیا کی ہر زبان میں حضرت محمد صلعم کی تعریف و توصیف کی روایت ملتی ہے۔ ایشیائی زبانوں میں عربی اور فارسی کے بعد اردو زبان کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس زبان سے وابستہ شعرا نے صرف مدحِ رسول صلعم کے لیے زبان و بیان کے حسین پیرائے ہی استعمال نہیں کیے بلکہ صنائع و بدائع کی ایسی دنیا آباد کی کہ جس کی سیر دل اور روح کو سکون فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتی ہے۔ اردو زبان میں صرف شاعروں نے ہی نعت گوئی کا حق ادا نہیں کیا بلکہ شاعرات نے بھی اس طرزِ اظہار میں ایسی جولانیاں دکھائیں کہ ان کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اردو میں خواتین کی نعت گوئی کا سلسلہ اولین صاحبِ دیوان شاعرہ لطف النساء امتیاز زوجہ اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی سے شروع ہو کر ماہ لقا بائی چندا مقیم حیدرآباد سے ہوتے ہوئے شرف النساشرف متوطن کرنالک سے ہوتا ہوا دورِ حاضر میں تہنیت النسا بیگم تہنیت زوجہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور تک پہنچتا ہے۔ دکن میں نعت گو شاعرات کی ایک طویل فہرست ملتی ہے اور ان کے نعتیہ کلام میں وابستگی کا ایک اچھوتا انداز پایا جاتا ہے۔ دکن کی ان نعت گو شاعرات کی انفرادیت اپنی جگہ مسلم تاہم جب بیگم تہنیت کی نعت گوئی کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ان کی نعتوں میں دل گیری، برجستگی اور والہانہ پن کے ساتھ ساتھ عشقِ رسول کی ایک ایسی زیریں رو کام کرتی نظر آتی ہے جس میں لفظوں کو موم بنا کر پگھلا دینے اور احساس کو مجسم کرنے کی بہترین صلاحیت موجود ہے اور ان کا جذبہ۔ عشقِ رسول نعتیہ شعر بن کر دلوں کو متاثر کرتا اور ہدیہ۔ تہنیت وصول کرتا ہے۔ بیگم تہنیت کے نعتیہ کلام کے تین یادگار مجموعے ذکر و فکر، صبر و شکر اور تسلیم و رضا بنیادی طور پر روح اور دل کی زبان سمجھنے والوں کے لیے نہ صرف ایک تحفے کا درجہ رکھتے ہیں بلکہ یہ ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے جذبات اور احساسات کی دنیا کو بھی قابلِ احترام بنا دیا ہے۔ شانِ رسالت کی انفرادیت کو لفظوں کا پیرہن دیتے ہوئے تہنیت فرماتی ہیں:

غریبوں، بے کسوں کی آس کیوں ٹوٹے کبھی تجھ سے
ترا مسلک فقیرانہ، ترا دربار شاہانہ

پیغمبرِ اسلام صلعم سے والہانہ محبت اور اس محبت میں عشق کی کارفرمائی کا ثبوت بیگم تہنیت کی شاعری میں جابجا ملتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ ان کا جذبہ اس قدر صادق ہے کہ اس کے روبرو موت کی بھی پروا نہیں۔ اس حقیقت کی عکاسی ذیل کے شعر میں دیکھیے:

سنا ہے آئیں گے وہ وقتِ آخر ابھی سے یاد کرتے ہیں قضا کو

بیگم تہنیت نے والہانہ عشق کا برجستہ اظہار کیا ہے۔ انھیں رسول صلعم سے عقیدت مندانہ عشق ہی نہیں ہے بلکہ انھیں پیغمبر اسلام صلعم سے وابستہ ہر کام اور رویے سے بے ساختہ عشق دکھائی دیتا ہے۔ ان کے کلام میں ایسے بے شمار اشعار مل جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاکِ طیبہ سے انھیں بے انتہا انسیت ہے۔ صرف مٹی سے محبت کا یہ حال ہے تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس مٹی سے وابستہ ہستی سے ان کے عشق کا کیا عالم ہوگا۔ چناں چہ وہ لکھتی ہیں:

جو پہنچوں دوبارہ تو واپس نہ لوٹوں مری جاں ہو یارب نثارِ مدینہ

یا پھر

گزرو تہنیت قصدِ طیبہ یہ کہہ کر نہیں لوٹ کر اب کے ہم آنے والے

جذبات کے والہانہ اظہار کا سیدھا سادہ طریقہ تہنیت نے شاعری میں استعمال کیا ہے۔ اس کی روانی اور سیلاب صفتی اپنی جگہ مسلم ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ ان کے جذبے رفتہ رفتہ ہمارے سینے میں اترتے جا رہے ہیں۔ اپنے پیام کو دوسروں کے دل میں اتارنے کا شعری وصف تہنیت کی شاعری میں نمایاں ہے اسی لیے ان کی نعتیہ شاعری کی جتنی قدر کی جائے کم ہے:

ہند میں صبر و قرار آہ نہیں سکتا ہرگز تہنیت ہم کو مدینے ہی میں فرحت ہوگی

تہنیت دل ہوا ہے بے قابو مجھ کو یثرب کی یاد آتی ہے

نعت گوئی کے منصب اور اس وسیلے سے انسان کو حاصل ہونے والے مرتبے کے بارے میں ہزاروں مقالے لکھے جا سکتے ہیں تاہم ان تمام کتابوں پر تہنیت کا یہ شعر بھاری ہوگا کہ اس طرزِ اظہار کے طفیل انسان کو کیا ملنے والا ہے وہ کہتی ہیں:

نبیؐ کی مدح سرائی میں تہنیت کتنے غلام داخلِ خلد بریں ہوئے ہوں گے

اردو مرثیے میں ایک کیفیت کا اظہار "رخصتی" کا درجہ رکھتا ہے۔ اردو نعت گوئی میں بیگم تہنیت نے مدینے سے واپسی کو جس غم انگیز انداز میں بیان کیا ہے اس کے کیف و سرور سے دلوں کی دھڑکن کا تیز ہونا ایک فطری عمل ہے۔ اپنے جذبات کو مناسب الفاظ سے تہنیت کس طرح ہم آہنگ کرتی ہیں ملاحظہ ہو:

وقتِ رخصت ہم پہ کیا گزری، وہ اب تک یاد ہے چھوڑتے ہی ان کا در تنہا نظر آنے لگے

دوری اور حضوری کی کیفیت کو نظم کرنے میں بھی تہنیت کو بڑا کمال حاصل ہے۔ ہر موضوع پر بے شمار اشعار پیش کرنا دشوار امر ہے لیکن چند اشعار کے ذریعے ہی تہنیت کے والہانہ انداز کی نمائندگی ہو جاتی ہے۔ ان کا متاثر کن انداز شعر میں کیسے چھلک پڑتا ہے اس کی مثال دیکھیے:

ہم اور بارگاہِ رسالت پناہ میں! مارے خوشی کے آنکھ سے آنسو نکل گئے

سید علی منظور نے دوری اور حضوری کے ان دونوں اشعار کی توضیح کرتے ہوئے "ذکر و فکر" کے دیباچے میں بہت خوب لکھا ہے:

"وہ جذبہ غم انگیز، یہ جذبہ مسرت خیز لیکن مبالغہ آمیز نہ وہ شعر نہ یہ شعر۔" خلوص و جذبات ان کے سارے کلام کی جان ہے اسی لیے تو ان کے شعر جان دار نظر آتے ہیں:

مقصود مرا لطفِ شبیہ ہر دوسرا ہے محبوبؐ مرا اصل میں محبوبِ خدا ہے

تہنیت نے اپنے اشعار میں بار بار دوری کو موضوع بنایا ہے اور جہاں جہاں اس کیفیت کو نظم کیا ہے ایسا لگتا ہے کہ یہ اشعار نہیں بلکہ دل کا غبار ہے جو شاعری کی شکل میں نمایاں ہو رہا ہے:

فیض معمور فضاؤں سے لپٹ کر رولیں پھر مدینے کی ہواؤں سے لپٹ کر رولیں

وقتِ رخصت دلِ مضطر کی تمنا تھی یہی آپ کے در کے گداؤں سے لپٹ کر رولیں

جب اٹھاتے ہیں نظر گنبدِ خضرا کی طرف جلوے کونین کے آنکھوں میں سما جاتے ہیں

تہنیت نے فکر و فلسفے کی شاعری نہیں کی بلکہ دل اور جذبے کی شاعری کی ہے لیکن ان کے نعتیہ کلام میں کہیں کہیں مفکرانہ لہجے کی

جھلک بھی دکھائی دیتی ہے لیکن یہ عمل ان کے شعری وصف کو بوجھل نہیں کرتا۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

بندۂ محبوب یزداں بن گئے ہیں آج کل — روکشِ صبح بہاراں بن گئے ہیں آج کل
ہے تصور میں ہمیشہ اب سراپائے نبیؐ — ہم سراپا اک گلستاں بن گئے ہیں آج کل

تہنیت کے ہر شعر میں وارفتگی، دل بستگی اور بے ساختگی موجود ہے۔ کن کن اشعار کا حوالہ دیا جائے اور کن کن شعری اوصاف کا بیان کیا جائے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک فراق زدہ خاتون اپنے رسولؐ کی چاہت میں مسلسل دلی جذبات کا اظہار کرتی جارہی ہے اور وہ شعر بن کر احساسات کی دنیا کو جگاتے جارہے ہیں۔ "ذکر و فکر" کے چند اشعار کی خوبیوں کے ذکر کے بعد "صبر و شکر" جیسے شعری مجموعہ میں تہنیت کے احساسات کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ خدا نے ان کی ذات کو صرف نعت گوئی کے لیے پیدا کیا تھا۔ اس بارے میں خود تہنیت کہتی ہیں:

نعت گوئی کے سوا شغل نہیں کوئی پسند — تہنیت شوق سے معروف اسی کام میں ہے

وہ نعت گوئی کو ہی کام کی بات تصور کرتی ہیں اور اسی شغل کو شفاعت کا درجہ دے کر بڑے ہی والہانہ انداز میں کہتی ہیں:

پھر کریں آؤ کام کی باتیں — شاہِ عالی مقام کی باتیں

تہنیت کے بے شمار اشعار میں ایک جانب تو دل کو مسحور کرنے کی طاقت ہے تو دوسری جانب سہل ممتنع کا وصف بھی پایا جاتا ہے سادہ لفظوں کے ذریعے کیفیت کو نظم کرنے میں انھیں بڑا کمال حاصل ہے۔ اس شعر میں لفظوں کا دروبست اور اس کی سادگی کا اندازہ لگائیے کہ دل کہتا ہے کہ قربان جائیے اس اندازِ بیان پر:

پھر کلی دل کی کھل کے پھول ہوئی — شاید اپنی دعا قبول ہوئی

دوسرے مصرعے کی بے ساختگی پر تو دل بلائیں لینے لگتا ہے۔ بلاشبہ یہ بڑی فن کاری کا کام ہے کہ شعر کو شعر رکھا جائے اور اس میں نثر کا لطف بھی آجائے۔ تہنیت نے بے شمار نعتیں غزل کے انداز میں مختصر بحر میں ایسی لکھی ہیں کہ جن میں بے ساختگی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ ان کی چند غزلیہ نعتوں کے اشعار ملاحظہ ہوں:

یاد جو آرہی ہے تمھاری — بہتے جاتے ہیں اشکوں کے دھارے
تم پہ مرتے ہیں روزِ ازل سے — آسماں پر بھی چاند اور ستارے

ولولے اپنے دور تک پہنچے — رفتہ رفتہ حضور تک پہنچے
یاد فرمالیا مدینے میں — زہے قسمت کہ طور تک پہنچے

ہر جگہ احترام ہے ان کا — عرش پر بھی مقام ہے ان کا
ہر گھڑی ان کی یاد آتی ہے — ذکر ہر صبح و شام ہے ان کا

یہ خلاصہ ہے قصہء غم کا — دلِ محزوں خراب و خستہ ہے
حق کو پاتے ہیں شوقِ احمد میں — عشق منزل نہیں ہے رستہ ہے

عشق کو منزل کے بجائے رستہ کہہ کر جس فلسفیانہ بات کو وارفتہ انداز میں پیش کیا گیا ہے وہ تہنیت ہی کا حق ہے۔ سہل ممتنع میں کیفیت اور تاثر کے ساتھ فلسفے کی بات کہنا بہت دشوار کام ہے اور اس مرحلہ میں تہنیت نے کامیابی حاصل کی ہے اور خاص بات یہ ہے کہ

انھوں نے یہ کارنامہ نعتیہ شاعری میں انجام دیا ہے جب کہ میر تقی میر یہ کام بڑی مشکل سے ریختہ گوئی میں انجام دے سکے تھے۔ تہنیت کی نعتیہ شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے کیا سچ کہا ہے:

"نعت محبت کے بغیر نہیں ہو سکتی اور محبت تغزل کی جان و ایمان ہے۔ دیکھیے کیا پیارا اور پاکیزہ شعر ہوا ہے:

جب پیشِ نظر کوئی سہارے نہیں ہوتے — بن جاتی ہے خود ان کی محبت ہی سہارا

مگر اس میں بھی ایک افشا کرنے کے قابل راز ہے:

کچھ ان کی طرف سے جو اشارے نہیں ہوتے — ہے ہم کو یقین تہنیت اس طرح نہ لکھتے

ان نعتیہ اشعار میں نعت کے حسن کے ساتھ ساتھ غزل کا بانکپن بھی ہے۔ تہنیت کا کمال یہی ہے کہ ان کی بے شمار نعتیں مکمل مدحِ رسول کی نمائندہ ہونے کے ساتھ ساتھ غزل کی شان اور حسن کی بھی نمائندگی کرتی ہیں۔ کسی کلام کو بہ یک وقت نعت کے ساتھ ہی غزل کے مزاج سے متصل رکھنا بہت مشکل کام ہے اور تہنیت نے اس فن میں نہ صرف کمال حاصل کیا ہے بلکہ اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ تہنیت نے عظمتِ آدم کی دلیل جس حقیقت کو سمجھا ہے، ذرا اس کی طرف بھی غور کر لیں:

عطا کی ہیں ہزاروں نعمتیں دنیا میں انساں کو — محمدؐ کی غلامی سب سے بڑھ کر فضلِ یزداں ہے

اردو شاعری نے غزل کی ہیئت کو نئے نئے مضامین کا تحفہ دیا اور اچھوتے موضوعات کو غزل میں شامل کر کے اسے اردو کی آبرو بنا دیا۔ تہنیت نے غزل کے لطف کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں نعتیہ وصف کو اس طرح پیوست کیا ہے کہ ساری شاعری لطف اور حسن کا مرقع بن گئی ہے۔ غزل کا حسن اور نعت کے تیور ملاحظہ ہوں:

دل محمد سے لگانا چاہیے — اپنی قسمت آزمانا چاہیے
آرزو اک دل میں باقی ہے یہی — جا کے طیبہ پھر نہ آنا چاہیے
ساقیِ کوثر کے فضل و لطف سے — تشنگی اپنی بجھانا چاہیے

مرصع غزل کا کیف بھی ان اشعار میں دکھائی دے گا جس کے ساتھ ہی نعت کی دل بستگی بھی نمایاں نظر آئے گی۔ بیگم تہنیت نے غزل کے حسن کو نعت کے موضوعات سے وابستہ کر کے ایک لازوال کارنامہ انجام دیا ہے۔ غزل کے حسن کے ساتھ نعت کا لطف ذرا اس کلام میں دیکھیے:

متاعِ دو عالم محبت تمھاری — تقاضائے فطرت عقیدت تمھاری
رہی نقش بن کر عدو کے بھی دل میں — شرافت تمھاری صداقت تمھاری
عرب اور عجم میں رہے جس کے چرچے — تجارت میں تھی وہ دیانت تمھاری
حسینانِ عالم میں سب سے جدا ہے — صباحت تمھاری ملاحت تمھاری
نہیں ہم سے بہتر کسی کے مقدر — قیامت میں ہوگی شفاعت تمھاری

الفاظ کی نرم روی اور سبک خرامی کا جو وصف تہنیت کی نعتوں میں دکھائی دیتا ہے وہی اس کلام کی جان ہے۔ وہ لہجے کو کبھی بلند ہونے نہیں دیتیں۔ شاید اس کی وجہ تعظیمِ رسولؐ کا احساس ہو، تاہم نرم لہجے میں بھی جو کمال انھوں نے پیدا کیا ہے اس کی ہم سری ممکن نہیں۔ تینوں شعری مجموعوں میں بے شمار مثالیں ایسی مل جاتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ والہانہ عشق کی جو کیفیت ان کے سینے میں

(باقی ص: ۶۸ پر)

تمھاری دھن میں ہیں ہم بے نیازِ دولتِ کونین   ہماری آرزو تم ہو ہمارا مدعا تم ہو

تہنیت صاحبہ کے نعتوں میں محامد و محاسن رسول اکرمؐ کے ساتھ ہجر و فراق نبی کا تذکرہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ شاعرہ کو پیغمبرِ اسلام سے سچی محبت و عقیدت ہے وہ اس سراپا نور سے والہانہ انداز میں فیض کی خواہاں ہیں وہ نعت گوئی کو اپنے مقدر کے سنوارنے کا وسیلہ سمجھتی ہے ان کی یہ وابستگی قابلِ رشک ہے بلکہ لائقِ تقلید کہ اس دولتِ لازوال سے اہل ایمان کی جھولیاں ہمیشہ بھری بھری رہتی ہیں۔ اور اس عشقِ رسول سے ان کے قلوب ہمیشہ تابندہ و رخشندہ رہتے ہیں۔ تہنیت صاحبہ کے کلام میں سادگی، نرمی، لطافت، طمانیت صاف نظر آتی ہے وہ کسی وقت بھی وفورِ جذبات سے مغلوب نہیں ہوتیں اپنے خیالات کی آبیاری میں وہ زیادہ تر وہ ان جذبوں کو بہ روئے کار لاتی ہیں جن میں صداقت ہے، ایمانی حرارت ہوش مندی کا سلیقہ، جاں گزاری ارتکاز و انہماک ہے۔ بہ الفاظ دیگر وہ محض روایتی انداز کی نعتیہ شاعری نہیں کرتیں بلکہ اپنے جذبات کو الفاظ کا پیرہن دے کر صفحہ قرطاس پر بکھیر دیتی ہیں۔ ایک خاتون ہونے کے ناطے ان کی یہ تخلیقی صلاحیت قابلِ قدر و منزلت ہے اور وہ بھی اس دور میں جب کہ زمانہ بھر میں غزل اور تغزل کی فراوانی نے ہر ایک کو سرمستی و سرشاری ہود و زیاں میں مبتلا کر دیا ہے ایسے ایسے موضوعات شاعری کے عنوان سے زندگیوں میں در آئے جن کا اظہار بہ جائے خود عجیب و غریب ہوگا ایسے مرحلے میں مذہبی شاعری کا خاموش یک سر کے ساتھ ریاض جاری رکھنا ایمانی حرارت جوش و عقیدت اور مذہبی روایات کی عظمت کی دلیل ہے۔

ذکر و فکر کے آخری صفحات میں تہنیت صاحبہ کی اس شعری صلاحیت کاوش و کارنامے کی اشاعت پر تاریخی قطعات کہے گئے ہیں ان میں سبھی شاعر اپنے وقت کے استاد اور محبتِ رسول سے آگاہ و باخبر تھے۔ خصوصیت سے مولانا شخین احمد شطاری کامل کے ساتھ ساتھ محمد حسین آزاد (دکنی) حضرت تاج الدین تاج قریشی خود حضرت سید علی منظور کے علاوہ میرے استاد حضرت خواجہ عبد العلی صدیقی جنھوں نے زندگی بھر حمد نعت و منقبت کو اپنا مطمح بنا رکھا تھا جو آگے چل کر حسانِ دکن وصافِ رسول خطابات سے نوازے گئے۔ ان حضرات نے تہنیت صاحبہ کے اس نعتیہ انتخاب ذکر و فکر کی تاریخ اشاعت کے سلسلے میں قطعات تاریخی کے حضرت صدیقی کا قطعہ درج کرتا ہوں:

مدح ممدوحِ رب سلامت باد یہی وجہِ نجات ہے گویا
ہے یہی ذکر فکر بھی ہے یہی یہی صوم و صلوات ہے گویا
آپ کی بات واہ کیا کہنا رشکِ قند و نبات ہے گویا
یہ اشاعت بھی سچ ہے صدیقی تہنیت کی نجات ہے گویا   ۱۳۶۴ف

یہ مری خوش بختی ہے کہ مرے استاد نے جس نعت گو شاعرہ کے کلام کی اشاعت میں تاریخی قطعہ کہا آج برسوں بعد میں اس شاعرہ کے کلام پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہوں۔

ذکر و فکر کے بعد تہنیت صاحبہ نے صبر و شکر کے عنوان سے ایک اور انتخاب شعری محض ایک سال کے بعد شائع کیا دراصل یہ انتخاب ذکر و فکر کا دوسرا حصہ ہے اس میں شامل تمام کا تمام کلام اپنی نوعیت اور مضامین کے لحاظ سے ذکر و فکر سے جدا نہیں جب کہ تہنیت نامہ کے عنوان سے معروف مشہور ادیب جناب ایم اسلم نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

"کلام کے ہر لفظ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس طرح ترشح ہو رہی ہے جیسے ساون کی مخمور گھٹاؤں سے موتی برستے ہیں۔

نسان کی عظمت اگر کبھی ظاہر ہوتی ہے تو مذہب سے ظاہر ہوتی ہے مذہب ایک ایسی کسوٹی ہے جس سے انسان کے وہ خواص پرکھے جاتے ہیں جو

اسے انسان کے خطاب کا حق دار بناتے ہیں جہاں محبت وہاں گلہ ہوتا ہے اور زبانِ شکوہ بھی بلاارادہ ہی وا ہو رہی ہے:

جب ساقیِ کوثر اپنے ہیں جب شافعِ محشر اپنے ہیں محروم کرم ہم کیوں ہوں گے ہم کو غمِ عصیاں کیا ہوگا

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالی کا ہم پر ایک بے پایاں احسان ہے کہ اس نے ہمیں امت احمد مرسل کا رتبہ عطا کیا اور یہ فخر صرف مسلما
کو ہی حاصل ہے:

عطا کی ہیں ہزاروں نعمتیں دنیا میں انساں کو محمد کی غلامی سب سے بڑھ کر فضلِ یزداں ہے

مجھے شاعری سے سروکار نہیں میں تو صرف یہ دیکھ رہا ہوں کہ اس قسم کے اشعار کہنے والے کا دل محمد کی محبت سے کہاں
تک سرشار ہے:

ہوتا ہے ذکر رحمت و شفقت کا جب کبھی آتا ہے نام ان کا ہماری زبان پر

سارا کلام اس قسم کے پاکیزہ جذبات اور عشق رسول سے لب ریز ہے شعر کی ایک خوبی یہ ہے کہ لطافت کے ساتھ اس میں موسیقی کی چاشنی بھی ہے۔ محترمہ تہنیت کے ہاں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں جس میں حضورِ اکرمؐ کی محبت موج زن ہو وہاں درد کا ہونا بھی ایک ضروری چیز ہے"

جناب ایم اسلم کے یہ خیالات ذکر و فکر کے بارے میں مجھے لیکن صبر و شکر میں بہ طور دیباچہ شامل کر دیے گئے۔ کم و بیش (۹۰) ن
نعتوں کے اس انتخاب میں تہنیت صاحبہ کی وہ نعتیں بھی شامل ہیں جو حیدرآباد میں منعقد ہونے والے مشاعروں کے لیے لکھی گئیں جن میں
طور خاص، بزمِ گلستان، بزمِ کامل (شطاری)، مشاعرہ حضرت جلیل، مشاعرہ بزمِ جلیل، مشاعرہ بیدر، مشاعرہ سالانہ عرس حضرت زخم، مشا
بزمِ صفی، مشاعرہ طرحی ملک پیٹ وغیرہ۔ مزید اسی مجموعے میں تہنیت صاحبہ کا وہ کلام بھی شریک کیا گیا جو رسالہ سب رس حیدرآباد، ر
منادی دہلی، رسالہ القدیر حیدرآباد، رسالہ زیب النساء لاہور میں شائع ہو چکا تھا۔ بہ الفاظ دیگر شاعر کی کاوش و کوشش کو مختلف صاح
ذوق اور اہلِ علم اور سخن ورانِ ذی شرف نے بہ نظرِ استحسان دیکھا اور ان کی خاطر خواہ داد دی۔ صبر و شکر کی نعتوں کا بالاستیعاب مطالعہ
بات کی گواہی دیتا ہے کہ تہنیت صاحبہ کے پہلو میں ایک گداز دل ہے اور ایک وجدانی اور ذوقی کیفیت ان کے رگ و پے میں سمائی ہوئی
جس کا بیان محال نہ سہی مشکل ضرور ہے۔ ان کے کلام میں محض الفاظ کی مرصع سازی نہیں بلکہ توحید، معرفت، عشق رسول کی نعمت م
ہے تہنیت صاحبہ نے اپنے اشعار میں کبھی فلسفیانہ نکات یا رموز و اسرار کی باتیں نہیں کیں البتہ نہایت سیدھے سادے طریقے سے
وارداتِ قلبی اور روحانی کیفیات کو رقم کر دیا شاعرانہ قواعد و ضوابط کی روشنی میں رکھا جائے تو انھوں نے اکثر نعتیں سہل ممتنع میں کہی ہیں
میں ردیف اور قافیے کی تنگ دامانی کا بھی خیال رکھا مگر مضمون کی علویت میں فرق آنے نہیں پایا مری اس بات کی دلیل یہ چند اشعار دیں گے

آؤ پھر سرکار کی باتیں کریں احمدِ مختار کی باتیں کریں
حق و باطل کی پرکھ مشکل ہے پردے آنکھوں سے اٹھا کر گزرو
شمعِ عرفاں پھر سے روشن کیجیے زندگی میں تیرگی ہے آج بھی
آپ نے یاد کیا ہے شاید پھر مرا بخت رسا ہے شاید
آپ کی چشمِ التفات اپنی متاعِ کائنات
جب سے آئے ہیں ان کی محفل سے دل ہے اس وقت سے اداس بہت

یاد ہے اب بھی ساری دنیا کو ان سے فیضانِ عام کی باتیں
کیا تعجب کہ یہ اسیرِ الم بزمِ نور و سرور تک پہنچے
زندہ درگور ہیں جو جیتے ہیں آپ سے دور زندگی کیسی
ہوگئی صبح آنکھوں آنکھوں میں وہ اگر وقتِ شام یاد آیا

اسی طرح بعض طرحی مشاعروں کی نعتوں میں تہنیت صاحبہ زورِ کلام رفعت خیال مضمون آفرینی دیدنی ہوئی چند مثالیں پیش ہیں:

طیبہ سے بہت دور ہیں بے لطف ہے جینا وہ صبح میسر نہیں وہ شام نہیں ہے
(مشاعرہ بزم جلیل)

ہر طرح بہتر ہی نکلا قیس اور فرہاد سے ان کے شیدا کا فسانہ ان کے دیوانے کا نام
مشاعرہ گلستان)

محمد کی غلامی مانگ لائے ہیں جو یزداں سے نہیں وہ چاہتے پھر کوئی نعمت بزمِ امکاں سے
مشاعرہ بزم کامل)

قیامت کی مصیبت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی ؟ درِ عالی سے دوری ہی مرے حق میں قیامت ہے
مشاعرہ بزم کامل)

اگر تصور میں وہ نہیں ہیں تو اس میں کچھ دل کشی نہیں ہے خیال سے ان کے ہو جو خالی وہ زندگی زندگی نہیں ہے
(مشاعرہ حضرت کامل)

وہ ہے بے نیازِ غم دین و دنیا جو رکھتا ہے دل میں محبت تمہاری
(مشاعرہ طرحی ملک پیٹ)

بہ قدرِ ذوق ہر اک ڈھونڈتا ہے پیکرِ خوبی نظر اپنی مگر اس شاہ خوبانِ جہاں پر ہے
(مشاعرہ یادگار صفی)

خدا جو اس کا شیدا ہے خدائی بھی سمجھتی ہے کہ وہ نورِ نظر تسکینِ دل سے راحتِ جاں ہے
(مشاعرہ گلستان)

صبر و شکر کی اشاعت ذکر و فکر کے فوری بعد یعنی صرف ایک سال بعد ہی ہوئی اور اس کے بعد تسلیم و رضا منصہ شہود پر آگیا۔ صفحاتِ گذشتہ میں عرض کر چکا ہوں کہ حب یعنی اخلاصِ نیت محبت کی پاکیزگی والہانہ جذبہ۔ صداقت دل شاعر میں کار فرما ہوجائے تو نظم ہو کہ نثر اپنے سحر طرازی دکھانی لگتی ہے اس میں قلب کی صفائی اور نفس کی طہارت بھی اپنی جگہ بنالیتی ہے قرآن پاک ایسے نفوس کی رہنمائی کرتا ہے اس کو صحیح راستہ بتاتا ہے اور ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے:

فمن یرد اللہ یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام (٦-١٢٦)

(پس جب ارادہ فرماتا ہے اللہ کی ہدایت فرمائے کہ کسی کی (تو) کھول دیتا ہے۔ اس کا سینہ اسلام کے لیے)

اسی کو صوفیاء کرام کشفِ صدر اور نورِ بصیرت کا نام دیا ہے اگر الفاظ شرحِ صدر اور اسلام کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے تو اس سے واضح ہوگا کہ جو شخص وحی نبوت پر ایمان رکھتا ہے اس کے کشف و الہام و وجدان کے ذریعے معلوم کی ہوئی بات کا اعتبار قائم ہوجاتا ہے۔ شاعر کو

شاید اس لیے کبھی کبھی الہامی شاعر کا نام بھی دیا جاتا ہے کہ جو کیفیات اس کے قلب و ذہن پر مرتسم ہوتی ہیں وہی الفاظ کے ذریعے ظاہر ہوتی ہیں اور یہ عشق ہی کی صورت ہوگی۔ صوفیا نے اس نظریہ عشق کی توضیح میں ہزارہا، اشعار اور کتابیں تحریر کی ہیں اور اقبال کے مرشد معنوی عارف رومی کی مثنوی کا اہم ترین موضوع بھی یہی عشق رہا:

مرحبا اے عشق خوش سودائے ما اے طبیب جملہ علت ہائے ما

اور یہی عشق ان پاک طینت اصحاب کا مذہب و مشرب بھی تھا اس عشق کی تفصیل بحر بے کنار سے جدا نہیں۔ مختصر یہ کہ انسانی فطرت عشق حقیقی کی متلاشی رہتی ہے کیوں کہ عشق حقیقی پیدا نہ ہو تو انسان اپنے آپ کی حقیقت سے بے خبر رہتا ہے اور جب خود شناسی کی منزل نہ آئے تو خدا شناسی کے ممکن ہے۔ اس ضمن میں نفوس انسانی نے کائنات کے ذرے ذرے میں اس عشق کی کار فرمائی دیکھی اور اس کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ اس کے اظہار کے لیے مختلف ذرائع کا استعمال کیا شاعری بھی اس میں سے ایک ہے اور شاعری کی وہ جہت جو تسلیم و رضائے الہی کے ساتھ اللہ اور اللہ کے رسول سے عشق یا محبت کو استوار کرے وہ یقیناً قابل قدر تعریف و تحسین کے لائق ہے تہنیت صاحبہ کے کلام میں اس عشق و محبت کی شرحیں نظر آتی ہیں اور اس کے لیے وسیلہ، ذریعہ عشق رسول کی نعمت سے خود کو وابستہ کر لینا ہے اقبال کی زبان میں اس بات کو یوں سمجھیے:

عشق کی گرمی سے ہے معرکہ کائنات علم مقام صفات، عشق تماشائے ذات

عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات

علم ہے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب

عشق کے ادنی غلام صاحب تاج و نگیں عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں

عشق مکان و مکیں عشق زماں و زمیں عشق سراپا یقیں اور یقیں فتح یاب

علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے ام الکتاب

اسرار عشق کی اس وضاحت کے لیے کلام اقبال سے سینکڑوں اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں اور میری دانست میں تہنیت صاحبہ کے کلام میں اسی عشق کی بازگشت سنائی دیتی ہے یہ ان کی فہم و فکر کی جولانی سے نواز اگیا۔ خداوند قدوس کی عطا اور نبی اکرمؐ کی رحمت بے پایاں ہے کہ دل تہنیت کو اس دولت لازوال سے نواز اگیا۔ بہرحال دکن کی یہ پردہ نشین صاحبہ، ربط و نسبت شاعرہ اپنے دور کی ایک کامیاب اور خوش کلام شاعرہ رہی کہ جس کے کلام کی اثر انگیزی سے آج بھی اہل علم و ادب، صاحبان ذوق و شوق صحیح معنوں میں استفادہ کر رہے ہیں۔

○ ○ ○

(سلسلہ ص: ۲۷ سے)

غلطاں و پیچاں ہے وہی تڑپ بن کر ان سے شعر لکھواتی ہے۔ وہ سچی عاشق رسولؐ ہی نہیں بلکہ ان کی امت میں پیدا ہونے پر فخر کرنے والی ایسی خاتون ہیں جن کی مثالیں امت مسلمہ میں خال خال ہی ملتی ہیں۔ خانقاہی گھرانے سے تعلق رکھنے کے ساتھ ساتھ کئی بار زیارت خاک طیبہ سے مشرف ہو کر آئی ہیں۔ اس عظیم عاشق رسولؐ کی رحلت بہرحال نعت کے ایک سبک انداز کے خاتمے کی دلیل ہے۔ لتنے عمدہ نعتیہ اشعار کا تحفہ لے کر رخصت ہونے والی خاتون کو بلاشبہ خاتون واصل جنت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ بلاشبہ ان کا مقام دودھ اور شہد کی نہروں کے قریب ہے۔ دکن کی ایک باصلاحیت اور نعت گو خاتون کا ہمارے درمیان سے اٹھ جانا ایک نعمت غیر مترقبہ کے گم ہو جانے کے مترادف ہے خدا سے دعا ہے کہ بیگم تہنیت کی اطاعت گزاری اور نعت گوئی کے طفیل دکن کو مستقبل میں ایسی ہی باصلاحیت خاتون سے نوازے۔ جس کے کارناموں اور عمدہ کلام پر ہم فخر کر سکیں۔ آمین۔

ڈاکٹر مجید بیدار

بیگم تہنیت کی نعتیہ شاعری ۔ والہانہ عشق کی تفسیر

پیغمبر اسلام صلعم کی مدح کا سلسلہ رسالت کے زمانے سے شروع ہوا اور یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ قیامت تک جاری رہے گا ۔ دنیا کی ہر زبان میں حضرت محمد صلعم کی تعریف و توصیف کی روایت ملتی ہے ۔ ایشیائی زبانوں میں عربی اور فارسی کے بعد اردو زبان کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس زبان سے وابستہ شعرا نے صرف مدحِ رسول صلعم کے لیے زبان و بیان کے حسین پیرائے ہی استعمال نہیں کیے بلکہ صنائع و بدائع کی ایسی دنیا آباد کی کہ جس کی سیر دل اور روح کو سکون فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتی ہے ۔ اردو زبان میں صرف شاعروں نے ہی نعت گوئی کا حق ادا نہیں کیا بلکہ شاعرات نے بھی اس طرزِ اظہار میں ایسی جولانیاں دکھائیں کہ ان کی مثال ملنی مشکل ہے ۔ اردو میں خواتین کی نعت گوئی کا سلسلہ اولین صاحبِ دیوان شاعرہ لطف النسا امتیاز زوجہ اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی سے شروع ہو کر ماہ لقا بائی چندا مقیم حیدر آباد سے ہوتے ہوئے شرف النسا شرف متوطن کرناٹک سے ہوتا ہوا دورِ حاضر میں تہنیت النسا بیگم تہنیت زوجہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور تک پہنچتا ہے ۔ دکن میں نعت گو شاعرات کی ایک طویل فہرست ملتی ہے اور ان کے نعتیہ کلام میں وابستگی کا ایک اچھوتا انداز پایا جاتا ہے ۔ دکن کی ان نعت گو شاعرات کی انفرادیت اپنی جگہ مسلم تاہم جب بیگم تہنیت کی نعت گوئی کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ان کی نعتوں میں دل گیری ، برجستگی اور والہانہ پن کے ساتھ ساتھ عشقِ رسول کی ایک ایسی زیریں رو کام کرتی نظر آتی ہے جس میں لفظوں کو موم بنا کر پگھلا دینے اور احساس کو مجسم کرنے کی بہترین صلاحیت موجود ہے اور ان کا جذبہ ۔ عشقِ رسول نعتیہ شعر بن کر دلوں کو متاثر کرتا اور ہدیہ ۔ تہنیت وصول کرتا ہے ۔ بیگم تہنیت کے نعتیہ کلام کے تین یادگار مجموعے ذکر و فکر ، صبر و شکر اور تسلیم و رضا بنیادی طور پر روح اور دل کی زبان سمجھنے والوں کے لیے نہ صرف ایک تحفے کا درجہ رکھتے ہیں بلکہ یہ ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے جذبات اور احساسات کی دنیا کو بھی قابلِ احترام بنا دیا ہے ۔ شانِ رسالت کی انفرادیت کو لفظوں کا پیرہن دیتے ہوئے تہنیت فرماتی ہیں:

غریبوں ، بے کسوں کی آس کیوں ٹوٹے کبھی تجھ سے
ترا مسلک فقیرانہ ، ترا دربار شاہانہ

پیغمبر اسلام صلعم سے والہانہ محبت اور اس محبت میں عشق کی کارفرمائی کا ثبوت بیگم تہنیت کی شاعری میں جابجا ملتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ ان کا جذبہ اس قدر صادق ہے کہ اس کے روبرو موت کی بھی پروا نہیں ۔ اس حقیقت کی عکاسی ذیل کے شعر میں دیکھیے:

سنا ہے آئیں گے وہ وقتِ آخر ابھی سے یاد کرتے ہیں قضا کو

بیگم تہنیت نے والہانہ عشق کا برجستہ اظہار کیا ہے ۔ انھیں رسول صلعم سے عقیدت مندانہ عشق ہی نہیں ہے بلکہ انھیں پیغمبر اسلام صلعم سے وابستہ ہر کام اور رویے سے بے ساختہ عشق دکھائی دیتا ہے ۔ ان کے کلام میں ایسے بے شمار اشعار مل جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاکِ طیبہ سے انھیں بے انتہا انسیت ہے ۔ صرف مٹی سے محبت کا یہ حال ہے تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس مٹی سے وابستہ ہستی سے ان کے عشق کا کیا عالم ہوگا ۔ چناں چہ وہ لکھتی ہیں:

جو پہنچوں دوبارہ تو واپس نہ لوٹوں مری جاں ہو یارب نثارِ مدینہ

یا پھر

کرو تہنیت قصدِ طیبہ یہ کہہ کر نہیں لوٹ کر اب کے ہم آنے والے

جذبات کے والہانہ اظہار کا سیدھا سادہ طریقہ تہنیت نے شاعری میں استعمال کیا ہے۔ اس کی روانی اور سیلاب صفتی اپنی جگہ مسلم ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ ان کے جذبے رفتہ رفتہ ہمارے سینے میں اترتے جا رہے ہیں۔ اپنے پیام کو دوسروں کے دل میں اتارنے کا شعری وصف تہنیت کی شاعری میں نمایاں ہے اسی لیے ان کی نعتیہ شاعری کی جتنی قدر کی جائے کم ہے:

ہند میں صبر و قرار آ نہیں سکتا ہرگز تہنیت ہم کو مدینے ہی میں فرحت ہوگی

تہنیت دل ہوا ہے بے قابو مجھ کو یثرب کی یاد آتی ہے

نعت گوئی کے منصب اور اس وسیلے سے انسان کو حاصل ہونے والے مرتبے کے بارے میں ہزاروں مقالے لکھے جا سکتے ہیں تاہم ان تمام کتابوں پر تہنیت کا یہ شعر بھاری ہوگا کہ اس طرزِ اظہار کے طفیل انسان کو کیا ملنے والا ہے وہ کہتی ہیں:

نبیؐ کی مدح سرائی میں تہنیت کتنے غلام داخلِ خلدِ بریں ہوئے ہوں گے

اردو مرثیے میں ایک کیفیت کا اظہار "رخصتی" کا درجہ رکھتا ہے۔ اردو نعت گوئی میں بیگم تہنیت نے مدینے سے واپسی کو جس غم انگیز انداز میں بیان کیا ہے اس کے کیف و سرور سے دلوں کی دھڑکن کا تیز ہونا ایک فطری عمل ہے۔ اپنے جذبات کو مناسب الفاظ سے تہنیت کس طرح ہم آہنگ کرتی ہیں ملاحظہ ہو:

وقتِ رخصت ہم پہ کیا گزری، وہ اب تک یاد ہے چھوڑتے ہی ان کا در تنہا نظر آنے لگے

دوری اور حضوری کی کیفیت کو نظم کرنے میں بھی تہنیت کو بڑا کمال حاصل ہے۔ ہر موضوع پر بے شمار اشعار پیش کرنا دشوار امر ہے لیکن چند اشعار کے ذریعے ہی تہنیت کے والہانہ انداز کی نمائندگی ہو جاتی ہے۔ ان کا متاثر کن انداز شعر میں کیسے چھلک پڑتا ہے اس کی مثال دیکھیے:

ہم اور بارگاہِ رسالت پناہ میں! مارے خوشی کے آنکھ سے آنسو نکل گئے

سید علی منظور نے دوری اور حضوری کے ان دونوں اشعار کی توضیح کرتے ہوئے "ذکر و فکر" کے دیباچے میں بہت خوب لکھا ہے:

"وہ جذبہ غم انگیز، یہ جذبہ مسرت خیز لیکن مبالغہ آمیز نہ وہ شعر نہ یہ شعر۔" خلوص و جذبات ان کے سارے کلام کی جان ہے اسی لیے تو ان کے شعر جاندار نظر آتے ہیں:

مقصود مرا لطفِ شہہِ ہردوسرا ہے محبوبؐ مرا اصل میں محبوبِ خدا ہے

تہنیت نے اپنے اشعار میں بار بار دوری کو موضوع بنایا ہے اور جہاں جہاں اس کیفیت کو نظم کیا ہے ایسا لگتا ہے کہ یہ اشعار نہیں بلکہ دل کا غبار ہے جو شاعری کی شکل میں نمایاں ہو رہا ہے:

فیض معمور فضاؤں سے لپٹ کر رو لیں پھر مدینے کی ہواؤں سے لپٹ کر رو لیں
وقتِ رخصت دلِ مضطر کی تمنا تھی یہی آپ کے در کے گداؤں سے لپٹ کر رو لیں
جب اٹھاتے ہیں نظر گنبدِ خضرا کی طرف جلوے کونین کے آنکھوں میں سما جاتے ہیں

تہنیت نے فکر و فلسفے کی شاعری نہیں کی بلکہ دل اور جذبے کی شاعری کی ہے لیکن ان کے نعتیہ کلام میں کہیں کہیں مفکرانہ لہجہ

جھلک بھی دکھائی دیتی ہے لیکن یہ عمل ان کے شعری وصف کو بوجھل نہیں کرتا۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

بندۂ محبوب یزداں بن گئے ہیں آج کل — روکشِ صبحِ بہاراں بن گئے ہیں آج کل
ہے تصور میں ہمیشہ اب سراپائے نبیؐ — ہم سراپا اک گلستاں بن گئے ہیں آج کل

تہنیت کے ہر شعر میں وارفتگی، دل بستگی اور بے ساختگی موجود ہے۔ کن کن اشعار کا حوالہ دیا جائے اور کن کن شعری اوصاف کا بیان کیا جائے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک فراق زدہ خاتون اپنے رسولؐ کی چاہت میں مسلسل دلی جذبات کا اظہار کرتی جارہی ہے اور وہ شعر بن کر احساسات کی دنیا کو جگاتے جارہے ہیں۔ "ذکر و فکر" کے چند اشعار کی خوبیوں کے ذکر کے بعد "صبر و شکر" جیسے شعری مجموعہ میں تہنیت کے احساسات کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ خدا نے ان کی ذات کو صرف نعت گوئی کے لیے پیدا کیا تھا۔ اس بارے میں خود تہنیت کہتی ہیں:

نعت گوئی کے سوا شغل نہیں کوئی پسند — تہنیت شوق سے معروف اسی کام میں ہے

وہ نعت گوئی کو ہی کام کی بات تصور کرتی ہیں اور اسی شغل کو شفاعت کا درجہ دے کر بڑے ہی والہانہ انداز میں کہتی ہیں:

پھر کریں آؤ کام کی باتیں — شاہِ عالی مقام کی باتیں

تہنیت کے بے شمار اشعار میں ایک جانب تو دل کو مسحور کرنے کی طاقت ہے تو دوسری جانب سہل ممتنع کا وصف بھی پایا جاتا ہے سادہ لفظوں کے ذریعے کیفیت کو نظم کرنے میں انھیں بڑا کمال حاصل ہے۔ اس شعر میں لفظوں کا در و بست اور اس کی سادگی کا اندازہ لگائیے کہ دل کہتا ہے کہ قربان جائیے اس اندازِ بیان پر:

پھر کلی دل کی کھل کے پھول ہوئی — شاید اپنی دعا قبول ہوئی

دوسرے مصرعے کی بے ساختگی پر تو دل بلائیں لینے لگتا ہے۔ بلاشبہ یہ بڑی فن کاری کا کام ہے کہ شعر کو شعر رکھا جائے اور اس میں نثر کا لطف بھی آجائے۔ تہنیت نے بے شمار نعتیں غزل کے انداز میں مختصر بحر میں ایسی لکھی ہیں کہ جن میں بے ساختگی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ ان کی چند غزلیہ نعتوں کے اشعار ملاحظہ ہوں:

یاد جو آرہی ہے تمھاری — بہتے جاتے ہیں اشکوں کے دھارے
تم پہ مرتے ہیں روزِ ازل سے — آسماں پر بھی چاند اور ستارے

ولولے اپنے دور تک پہنچے — رفتہ رفتہ حضور تک پہنچے
یاد فرمالیا مدینے میں — زہے قسمت کہ طور تک پہنچے

ہر جگہ احترام ہے ان کا — عرش پر بھی مقام ہے ان کا
ہر گھڑی ان کی یاد آتی ہے — ذکر ہر صبح و شام ہے ان کا

یہ خلاصہ ہے قصہء غم کا — دلِ محزوں خراب و خستہ ہے
حق کو پاتے ہیں شوقِ احمد میں — عشق منزل نہیں ہے رستہ ہے

عشق کو منزل کے بجائے رستہ کہہ کر جس فلسفیانہ بات کو وارفتہ انداز میں پیش کیا گیا ہے وہ تہنیت ہی کا حق ہے۔ سہل ممتنع میں کیفیت اور تاثر کے ساتھ فلسفے کی بات کہنا بہت دشوار کام ہے اور اس مرحلہ میں تہنیت نے کامیابی حاصل کی ہے اور خاص بات یہ ہے کہ

انھوں نے یہ کارنامہ نعتیہ شاعری میں انجام دیا ہے جب کہ میر تقی میر یہ کام بڑی مشکل سے ریختہ گوئی میں انجام دے سکے تھے۔ تہنیت کی نعتیہ شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے کیا سچ کہا ہے:

"نعت محبت کے بغیر نہیں ہو سکتی اور محبت تغزل کی جان و ایمان ہے۔ دیکھیے کیا پیارا اور پاکیزہ شعر ہوا ہے:

بن جاتی ہے خود ان کی محبت ہی سہارا — جب پیشِ نظر کوئی سہارے نہیں ہوتے

مگر اس میں بھی ایک افشا کرنے کے قابل راز ہے:

ہے ہم کو یقین تہنیت اس طرح نہ لکھتے — کچھ ان کی طرف سے جو اشارے نہیں ہوتے

ان نعتیہ اشعار میں نعت کے حسن کے ساتھ ساتھ غزل کا بانکپن بھی ہے۔ تہنیت کا کمال یہی ہے کہ ان کی بے شمار نعتیں مکمل مدحِ رسول کی نمائندہ ہونے کے ساتھ ساتھ غزل کی شان اور حسن کی بھی نمائندگی کرتی ہیں۔ کسی کلام کو بہ یک وقت نعت کے ساتھ ہی غزل کے مزاج سے متصل رکھنا بہت مشکل کام ہے اور تہنیت نے اس فن میں نہ صرف کمال حاصل کیا ہے، بلکہ اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ تہنیت نے عظمتِ آدم کی دلیل جس حقیقت کو سمجھا ہے، ذرا اس کی طرف بھی غور کر لیں:

عطا کی ہیں ہزاروں نعمتیں دنیا میں انساں کو — محمدؐ کی غلامی سب سے بڑھ کر فضلِ یزداں ہے

اردو شاعری نے غزل کی ہئیت کو نئے نئے مضامین کا تحفہ دیا اور اچھوتے موضوعات کو غزل میں شامل کر کے اسے اردو کی آبرو بنا دیا۔ تہنیت نے غزل کے لطف کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں نعتیہ وصف کو اس طرح پیوست کیا ہے کہ ساری شاعری لطف اور حسن کا مرقع بن گئی ہے۔ غزل کا حسن اور نعت کے تیور ملاحظہ ہوں:

دل محمد سے لگانا چاہیے — اپنی قسمت آزمانا چاہیے

آرزو اک دل میں باقی ہے یہی — جاکے طیبہ پھر نہ آنا چاہیے

ساقیِ کوثر کے فضل و لطف سے — تشنگی اپنی بجھانا چاہیے

مرصع غزل کا کیف بھی ان اشعار میں دکھائی دے گا جس کے ساتھ ہی نعت کی دل بستگی بھی نمایاں نظر آئے گی۔ بیگم تہنیت نے غزل کے حسن کو نعت کے موضوعات سے وابستہ کر کے ایک لازوال کارنامہ انجام دیا ہے۔ غزل کے حسن کے ساتھ نعت کا لطف ذرا اس کلام میں دیکھیے:

متاعِ دو عالم محبت تمھاری — تقاضائے فطرت عقیدت تمھاری

رہی نقش بن کر عدو کے بھی دل میں — شرافت تمھاری صداقت تمھاری

عرب اور عجم میں رہے جس کے چرچے — تجارت میں تھی وہ دیانت تمھاری

حسینانِ عالم میں سب سے جدا ہے — صباحت تمھاری ملاحت تمھاری

نہیں ہم سے بہتر کسی کے مقدر — قیامت میں ہوگی شفاعت تمھاری

الفاظ کی نرم روی اور سبک خرامی کا جو وصف تہنیت کی نعتوں میں دکھائی دیتا ہے وہی اس کلام کی جان ہے۔ وہ لہجے کو کبھی بلند ہونے نہیں دیتیں۔ شاید اس کی وجہ تعظیم رسولؐ کا احساس ہو، تاہم نرم لہجے میں بھی جو کمال انھوں نے پیدا کیا ہے اس کی ہم سری ممکن نہیں۔ تینوں شعری مجموعوں میں بے شمار مثالیں ایسی مل جاتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ والہانہ عشق کی جو کیفیت ان کے سینے میں

(باقی ص: ۶۸ پر)

وقار خلیل

محترمہ تہنیت زورؔ کی نعتیہ شاعری

عہدِ عثمانی کی اہلِ قلم خواتین اور شاعرات میں محترمہ تہنیت النسا بیگم کا نام تاریخِ ادبیاتِ دکن کے اوراق پر روشن نظر آئے گا۔ وہ کئی جہتوں، حیثیتوں اور صلاحیتوں کے باعث نمایاں مقام کی حامل رہی ہیں۔

محترمہ تہنیت النسا بیگم (ولادت ۲۰ مئی ۱۹۱۰ء) حیدر آباد کے ایک وضع دار اور نیک سیرت امیر نواب رفعت یار جنگ ثانی کی صاحب زادی اور دبستانِ دکن کے ممتاز معلم اور دانش ور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم (وفات ۲۳ ستمبر ۱۹۶۲ء) کی شریکِ حیات تھیں، خواجہ حمید الدین شاہد نے اپنی مرتبہ کتاب "حیدر آباد کے شاعر" (جلد اول مطبوعہ ۱۹۵۸ء) میں لکھا ہے کہ محترمہ تہنیت النسا بیگم محبوبیہ گرلس اسکول حیدر آباد کی فارغ التحصیل خاتون تھیں بچپن سے شعروادب کا ذوق رہا۔ فریضہ حج و زیارتِ گنبدِ خضرا سے مشرف ہو چکی ہیں، اس کے بعد سے نعتیہ کلام لکھنے کی ابتدا ہوئی، سارا کلام عشقِ نبیؐ اور پاکیزہ جذبات سے لب ریز ہے۔"

محترمہ تہنیت کی نعتیہ شاعری کے تین مجموعے زندگی ہی میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ جن کی تفصیل یوں ہے:

○ ○ ○ ذکر و فکر مطبوعہ ۱۹۵۵ء صفحات (۱۱۲) پیش لفظ امجد حیدر آبادی تعارف سید علی منظور، اس پہلے مجموعے میں ۶۷ نعتیں شامل ہیں، اس مجموعے کے آخری حصے میں تاج قریشی، محمد حسین آزاد، علی منظور اور خواجہ عبد العلی صدیقی کے قطعاتِ تاریخ درج ہیں۔

○ ○ ○ صبر و شکر مطبوعہ ۱۹۵۶ء صفحات (۱۱۲) "تہنیت نامہ" کے زیرِ عنوان، یم۔ اسلم لاہور کے تاثرات شائع ہوئے ہیں۔ اس دوسرے مجموعے میں (۹۱) نعتیں شامل ہیں، آخر کے اوراق میں ڈاکٹر موہن سنگھ دیوان (امرتسر) خواجہ حسن نظامی دہلوی، خان بہادر عبد الرحمان چغتائی (لاہور) پروفیسر ہارون خاں شروانی، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی دہلی کے تاثرات اور پہلے مجموعہ پر معاصرین کے تبصروں کے اقتباسات شامل ہیں۔ سرورق چغتائی کے قلم کا شاہکار ہے۔

○ ○ ○ "تسلیم و رضا" تیسرا مجموعہ کلام مطبوعہ۔ ۱۹۵۹ء، صفحات (۹۶) مقدمہ: پروفیسر آغا حیدر حسن دہلوی، نغماتِ تہنیت: مولوی وزیر حسن دہلوی، ایک خط محترمہ رابعہ بیگم انوار اللہ۔ اس مجموعے میں (۳۸) نعتیں، (۲) حمد اور (۹) منقبتیں اور سلام شامل ہیں۔ آخری حصے میں رسائل و جرائد کے تبصروں کے اقتباسات اور چند اہلِ قلم اصحاب و خواتین کے تاثرات اور منظوم قطعاتِ تاریخ درج ہیں۔

محترمہ تہنیت النسا بیگم کا ددھیالی اور ننھیالی گھرانا علماء دین اور روسائے دکن کا گھرانا رہا ہے۔ والد نواب رفعت یار جنگ ثانی اپنے ادب آداب اور رکھ رکھاؤ میں مشہور تھے۔ بہ قول پروفیسر آغا حیدر حسن دہلوی "کبھی کسی ملنے والے نے ننگے سر اور بغیر شیروانی کے نہ دیکھا۔ والدہ نصیر جنگ کی ہمشیرہ تھیں، عالم دین مولانا عبد الباری فرنگی محلی سے قرابتِ قریبہ، سگے ماموں کی بیٹی۔ ان ہی حضرت فرنگی محلی کے دربار سے گاندھی جی کو "مہاتما" کا خطاب ملا تھا۔ آگے چل کر پروفیسر حیدر حسن دہلوی مرحوم نے تہنیت صاحبہ کے تیسرے نعتیہ

مجموعہ کلام "تسلیم و رضا" کے بسیط اور فاضلانہ "مقدمہ" میں یہ بھی تحریر کیا ہے کہ "بی بی تہنیت، ڈاکٹر زور کے گھر میں لچھمی بن کر آئیں، خود لکھنے پڑھنے کی شوقین، شوہر کو بھی مطالعے اور تصنیف و تالیف کی چونپ لگی رہی، اس میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہ ہوئی اور اتنا لکھا کہ اگر ایک طرف ترازو کے پلڑے میں زور صاحب کو بٹھائیں اور دوسرے پلڑے میں ان کی تحریریں، تو تحریروں کا پلڑا نیچے آئے گا اور زور صاحب بلندی پر نظر آئیں گے، زور بیگم کی سرکارِ دو عالمؐ سے یہ محبت ضرور ان کو دین و دنیا کی نعمتیں دیں گی۔ آغا صاحب نے مزید یہ بھی لکھا ہے کہ جن عورتوں پر اللہ میاں کی رحمت ہوتی ہے وہ کثیر الاولاد ہوتی ہے۔ ماشاء اللہ زور بیگم نو بچوں کی اماں ہیں۔ ایک بھرے پرے خاندان کی سرپرست، پرانی تہذیب ان کے رگ و ریشے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔"

ڈاکٹر زور کے صاحب زادے عزیزی سید رفیع الدین قادری نے بھی محترمہ تہنیت صاحبہ کے جلسہ تعزیت منعقدہ "ایوان اردو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ

> "مرحومہ اس رفیع الشان خاندان کی دخترِ نیک اختر تھیں، جن کے اکثر و بیش تر افراد عالم و فاضل گزرے ہیں اور گراں قدر خدمات انجام دے کر موردِ الطاف و عنایاتِ شاہان وقت رہے ہیں، ان کا ددھیالی سلسلہ حضرت سیدنا ابو بکر صدیقؓ سے ملتا ہے، آپ کے دادا رفعت یار جنگ اول ایک روشن خیال مدبر تھے، چچا سر نظامت جنگ انگریزی کے بلند پایہ شاعر اور دو پھوپیاں خیر النسا بیگم اور زینت النسا بیگم ساجدہ دردمند نعت گو شاعرہ تھیں، آپ کی والدہ اسما بیگم صاحبہ نہایت متقی پرہیزگار اور زاہدہ خاتون تھیں، میری والدہ (محترمہ تہنیت) کو ورثے میں یہی کچھ دولت ملی، وہ بڑی ذہین اور صاحبِ قلم تھیں، حافظہ غیر معمولی تھا، مطالعے کی بے حد شوقین تھیں۔ صبر و ضبط بے مثال تھا، والد ڈاکٹر زور کا جب انتقال ہوا تو نہایت صبر و تحمل کے ساتھ اس صدمے کو برداشت کیا اور ہم سب کو سہارا دیا، انھیں اپنے خاندان کی عزت و حشمت کا بڑا خیال رہتا تھا۔ نادار طلبہ اور بیواؤں کی مدد کرتیں، ان کی ممتا نہایت شفقت آمیز تھی۔"

ایسی روشن خیال اور ستودہ صفات خاتون نے طویل علالت کے بعد ۸ نومبر ۱۹۹۶ء کو زندگی کی آخری سانس لی اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئیں۔ ۹ نومبر کو بعد نماز ظہر اپنے خسر حضرت سید شاہ غلام محمد زعم قادری چشتی رفاعی مشکل آساں ثانیؒ کی درگاہ گنبد (خانقاہ عنایت اللہی واقع محاذی پل مسلم جنگ) میں استراحت فرما ہوئیں، خدا رحمت کند........ محترمہ تہنیت صاحبہ نے جذباتِ ادب نوازی کے تحت ۱۲ / اکتوبر ۱۹۵۵ء کو مجلسِ انتظامی ادارہ ادبیاتِ اردو کی درخواست پر ادارے کی عمارت "ایوانِ اردو" کے لیے ایک وسیع خطہء زمین تحفتہ مرحمت فرما کر رجسٹری کرادی۔ مرحومہ ادارے کی سرپرستِ اعلیٰ تھیں اور ادارے کے علمی و ادبی کاموں کے لیے اپنے بیش قیمت مشوروں سے نوازتی تھیں۔ ان کی وفات افرادِ خاندان ہی کے لیے نہیں بلکہ حیدر آباد کی اردو دنیا اور ادارہ ادبیاتِ اردو کے لیے بھی نقصانِ عظیم ہے۔

محترمہ تہنیت النساء بیگم، عہدِ عثمانی کی ہی نہیں بلکہ اردو دنیا کی واحد نعت گو شاعرہ ہیں جن کے تین اہم نعتیہ شاعری کے مجموعے چھپ کر قبولیتِ خاص و عام حاصل کر چکے ہیں۔ انھوں نے بلاشبہ نعت کو ایک ادبی اسلوب اور فنی معیار عطا کرنے کی سعیِ مشکور انجام دی اور اسے پوری توجہ اور پورے شعور کے ساتھ فکر و فن کی جولان گاہ بنایا ہے۔ حضرت محسن کاکوری کی طرح اردو دنیا خصوصاً زمرہء خواتین میں وہ بلاشبہ ہند و پاک کی اولین صاحبہء سہ دیوان شاعرہ کے منصب پر فائز نظر آتی ہیں۔

نعتیہ شاعری کے نکات و محرکات پر جناب محمد طفیل ایڈیٹر مجلہ "نقوش" لاہور نے نقوش کے گراں قدر رسول نمبر جلد دہم جنوری ۱۹۸۴ء میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "نعت معتبر صنفِ شاعری ہے، اس کے اصول اور معیار حضور اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ ہی میں مقرر ہوئے، بعض شاعروں کو حضورؐ نے اصلاح دی اور انعام و کرام سے نوازا، شاعری کی یہ صنف حضورؐ کی فرمائش پر وجود میں آئی، ایک دن سرورِ کائناتؐ صحابہ کرامؓ کے درمیان تشریف فرما تھے اور فرمایا کہ جو لوگ تلوار سے میری مدد کرتے ہیں انھیں چاہیے کہ زبان سے بھی میری مدد کریں۔ چناں چہ حضرت حسان بن ثابتؓ نے کہا کہ "یا رسول اللہ! میں حاضر ہوں اور پھر نعتیہ شاعری کی ابتدا ہوئی اردو میں بھی اس صنف نے بہت ترقی کی، خوب لکھا گیا۔ اردو میں بھی اس صنف نے بہت ترقی کی، خوب لکھا گیا۔ بڑی توجہ اور جذب کے ساتھ لکھا گیا کیوں کہ اس صنف میں تو کسی غیر الہامی لفظ کی گنجائش ہی نہیں ہوتی، پھر ایک شعر کہنے کے بعد درود پڑھے بغیر دوسرا شعر نہیں لکھا جاتا۔

حقیقی نعت میں حضورِ اکرمؐ کی سیرت و تعلیمات، غزوات و معجزاتِ عادات و خصائل مبارکہ کا ذکر جزوی اور سرسری انداز کی بجائے گہری دل چسپی اور وابستگی سے ملتا ہے نیز آں حضرتؐ سے محبت کے ضمن میں رسمی عقیدت نگاری کے بجائے جذب و مستی اور جوشِ محبت کا گہرا اور موثر اظہار نظر آتا ہے، جذب و کیف اور شوق و ذوق کے اسی جوہر کے سبب نعت کی یہ قسم اپنے اندر دل کشی اور تاثیر رکھتی ہے۔ توصیفی اندازِ نعت میں حضورِ اکرمؐ کی مدح و توصیف کا رجحان غالب ہو جاتا ہے اور آپ سے اظہارِ محبت اور شیفتگی کا ذریعہ ثانوی بن جاتا ہے۔ اس انداز کی نعتوں میں حضورؐ کی مدح کا جذبہ غالب نظر آتا ہے اور آپ کی ستائش و ثنا سے زیادہ شاعری میں آپ کی ذاتِ تقدس آثار سے وابستہ جذبات و احساسات اور وارداتِ قلبی کا زیادہ اظہار ہوتا ہے۔

محترمہ تہنیت زور کی نعتیہ شاعری کا نمایاں وصف سرورِ کائناتؐ کی ذاتِ بابرکات سے والہانہ محبت رہا ہے۔ مسجد نبوی کی فضاء، روضہء مبارک کی جالیوں، مواجہ شریف پر درود و سلام کے پر کیف مناظر کا احترام اور عقیدت سے بیان ہے اور ایسا ہی انداز کم و بیش ہر تخلیقی نعت لکھنے والے کے یہاں کسی نہ کسی جذب و شکل میں نظر آتا ہے۔

ذیل میں محترمہ تہنیت زور مرحومہ کی نعتیہ شاعری سے چند روشن اور مطہر ابیات درج کی جاتی ہیں۔

جب مدینے کی یاد آتی ہے ہم کو اپنا پتہ نہیں ملتا
تہنیت الفتِ نبی کے بغیر زندگی کا مزہ نہیں ملتا

غریبوں، بیکسوں کی آس کیوں ٹوٹے کبھی تجھ سے ترا مسلک فقیرانہ، ترا دربار شاہانہ

عطا کی ہیں ہزاروں نعمتیں دنیا میں انساں کو محمدؐ کی غلامی سب سے بڑھ کر فضلِ یزداں ہے

نور جن کا اولاً ظاہر ہوا روزِ ازل ہے ان ہی کے نور سے عالم درخشاں آج تک

انساں کو جس نے واقفِ انسانیت کیا احسان کر گیا ہے جو سارے جہاں پر

مخلوق کے لیے کرے خالق سے التجا ایسا زمین پر نہ کوئی آسمان پر

رازِ خدا ان ہی نے کیا دہر پر عیاں لیتے ہیں نام انھیں کا جو نامِ خدا کے بعد

بن جاتی ہے خود ان کی محبت ہی سہارا جب پیشِ نظر کوئی سہارے نہیں ہوتے

ہے ہم کو یقیں تہنیت اس طرح نہ لکھتے کچھ ان کی طرف سے جو اشارے نہیں ہوتے

پھر کریں آؤ کام کی باتیں
شاہِ عالی مقام کی باتیں

تہنیت کام آئیں گی اک دن
یہ درود و سلام کی باتیں

وہ صبح نہیں جس میں نہ ہو ذکر تمہارا
جو یاد سے خالی رہے وہ شام نہیں ہے

ان کی لطفِ نظر ہی کی امید ہے
اور دنیا میں کوئی سہارا نہیں

آپ سا دہر نے نہیں دیکھا
یوں تو انسان بے شمار آئے

ہاتھ خالی کوئی نہیں آتا
دامن ہر ایک کا وہ بھرتے ہیں

گر میسر ہو ان کی چشم کرم
بخت بگڑے ہوئے سنورتے ہیں

مدینے ہی میں ملے گا سرورِ قلب و نظر
کہ جلتے رہتے ہیں واں رحمت و کرم کے چراغ

تہنیت پھر مدینہ یاد آیا
اپنی آنکھوں میں آگئے آنسو

خدا کے ساتھ نبیؐ کو بھی یاد کرتے ہیں
خدا کا شکر حقیقت نگار ہم بھی ہیں

انھی کے نور سے معمور ہے جہاں سارا
بنے ہیں کون و مکاں جن کی اقتدا کے لیے

انھی کو اپنا وسیلہ بنائے رکھتے ہیں
کبھی جو ہاتھ اٹھاتے ہیں ہم دعا کے لیے

ایک معمہ تھی سراسر کائناتِ رنگ و بو
کھل نہیں سکتا تھا یہ سرِ نہاں ان کے بغیر

دہر میں سوزِ دروں سے کوئی واقف ہی نہ تھا
کیف سے محروم تھی سب داستاں ان کے بغیر

ہم قصۂ تسلیم و رضا کس کو سنائیں
دل والے ہیں کم، عقل کے معذور بہت ہیں

کیا ڈریں گے کسی سیاست سے
ان کے حلقہ بگوش خانہ زاد

لیتے ہیں ہر گھڑی ان ہی کا نام
یہی اذکار ہیں، یہی اوراد

جب ان کی ذات حاصلِ کل کائنات ہے
کیوں ان کی ذات ہی پہ سہارا نہ کیجیے

حبِ نبیؐ ہے نعمتِ دارین تہنیت
اس کے سوا کسی کی تمنا نہ کیجیے

تمہارے در پہ جو حاصل ہوا سکون و قرار
وہ لطف پھر کبھی پایا نہیں کہیں ہم نے

بہت باتیں ہیں یوں تو تہنیت دنیا میں کرنے کی
ہم اپنے شوق کی اپنے لگن کی بات کرتے ہیں

محترمہ تہنیت صاحبہ نے اپنے شوق اور لگن سے نعتیہ شاعری کے چراغ روشن کیے اور کہا کہ:

حب نبی ہے نعمت دارین تہنیت
اس کے سوا کس کی تمنا نہ کیجیے

تہنیت ان کی یاد سے بہتر
کوئی سرمایۂ حیات نہیں

نبی کی یاد لکھاتی ہے تہنیت ہم سے
سخن کبھی کوئی یوں ہی لکھا نہیں ہم نے

عبارت مختصر، تہنیت زور صاحبہ کی نعتیہ شاعری کو ورق ورق پڑھنا ہر صاحب ایمان کے لیے باعث برکت ہے۔ اب سے چار دہوں قبل مطبوعہ تینوں شعری مجموعوں کو کلیات کی شکل میں شائع کیا جانا ضروری ہے، یہ تینوں مجموعے نایاب ہوگئے ہیں۔

محترمہ تہنیت مرحومہ کا نعتیہ کلام بہ قول ماہر القادری "تصنع اور تکلف سے مبرا ہے، فکر کی عصمت اور خیالات کی سادگی شعر کے

(باقی ص: ۴۷ پر)

۷۷

ڈاکٹر زیب حیدر

تہنیت النسا بیگم صاحبہ ایک نعت گو شاعرہ

الہیٰ تا ابد قائم رہے الفت کا میخانہ ملا کرتا ہے ہم جیسوں کو پیمانہ پہ پیمانہ

تہنیت النسا بیگم رفعت یار جنگ بہادر ثانی کی تیسری صاحب زادی تھیں جو اورنگ آباد کے صوبہ دار تھے ۔ اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی اہلیہ تھیں ۔ ان کی والدہ نواب نصیر جنگ مرحوم کی ہمشیرہ تھیں ۔ ابتدائی تعلیم محبوبیہ گرلز اسکول میں ہوئی جو اس زمانے کا ایک قابل قدر مدرسہ تھا ۔ شاعری میں نعتیہ کلام کے تین مجموعے "ذکر و فکر"، "صبر و شکر" اور "تسلیم و رضا" آپ کے فکری آثار ہیں ۔ ابتدا ہی سے ڈاکٹر زور کے دوش بہ دوش ادارہ ادبیات اردو کی ترقی کے لیے کام کرتی رہیں اور سرپرست بھی رہیں ۔ جس وقت ادارے کے صدر نواب لیاقت جنگ بہادر تھے آپ نے اپنی ذاتی زمین ادارے کے لیے وقف کر دی جس پر آج یہ عمارت ایوان اردو قائم ہے اور آخری عمر تک اس ادارے کی سرپرستی کرتی رہیں ۔ حیدرآباد کی اردو دنیا پر ان کا یہ بڑا احسان ہے ۔ وہ عاشق رسولؐ تھیں ۔ ساری عمر عبادت الہیٰ اور عشق رسولؐ میں بسر کی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ بچوں کی تعلیم و تربیت امور خانہ داری کا پورا پورا کام اپنے ذمہ لے لیا اور ڈاکٹر زور صاحب کو اتنی فرصت مل گئی کہ وہ اپنے علمی و ادبی مشاغل میں ہر وقت منہمک رہ سکیں ۔ ان کے مجموعہ کلام "تسلیم و رضا" کے مقدمے میں آغا حیدر حسن صاحب اس طرح رقم طراز ہیں ۔ "۱۹۵۷ء میں مجھے عزیزی ڈاکٹر زور صاحب نے دو کتابیں "ذکر و فکر" اور "صبر و شکر" بیگم زور سلمہا کی طرف سے ان کے دستخطوں کے ساتھ لا کر دیں میں جب ان کو پڑھنے بیٹھا تو ایک عجیب کیفیت دل و دماغ پر طاری ہوئی ۔ میں ہمیشہ مسند پر بیٹھ کر گاؤ تکیے سے کمر لگا کر اور زانو تکیے رانوں کے نیچے دبا کر مطالعہ کیا کرتا ہوں جب ان کتابوں کی باری آئی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس قدیم روش پر ان کو پڑھنا سوء ادبی ہے میں نے اگر بتیاں روشن کیں اور تخت پر جانماز پر قبلہ رخ ہو کر اور ذرا رخ مدینہ منورہ کی طرف کر کے پڑھنا شروع کیا ۔ جو حلاوت ملی وہ میں کیا بیان کروں ۔ پوری کتاب میں کوئی خیال ایسا نہ تھا کہ جس کو کہیں کہ اس میں شرک یا کفر کا شائبہ ہے ۔ سیدھی سادی باتیں ہیں ۔ دل سے نکلی ہیں اور دل میں اترتی چلی جاتی ہیں ۔ ہر نعت ایک چراغ ہے کیسا چراغ جس کی اللہ میاں قرآن میں تعریف فرماتے ہیں کہ بلور کی قندیل ہے اور اس میں زیتون کے تیل کا چراغ روشن ہے ۔ بیگم زور کی نعتوں کی قندیلیں حرم نبویؐ میں روشن نظر آتی ہیں اور ایک بہار دکھا رہی ہیں ۔ اللہ یہ لتنے سارے روشن چراغ کہاں سے آئے ۔ یہ سب خانہ ساز ہیں، آغا حیدر حسن کے اس جامع تبصرے سے بیگم صاحبہ کے نعتیہ کلام کی تمام خوبیاں نظروں کے سامنے آجاتی ہیں ۔

اکثر غزلیں چھوٹی بحر میں ہیں ۔ آپ کہتی ہیں کہ شعر میں تڑپ ہونی چاہیے ورنہ پڑھنے والے کو کوئی لطف نہیں آتا ۔

شعر میں جب تڑپ نہ ہو دل کی لطف ہم کو ذرا نہیں ملتا

اور کبھی کہتی ہیں کہ الفت نبیؐ کے بغیر زندگی کا مزا نہیں ملتا ۔

تہنیت الفت نبیؐ کے بغیر زندگی کا مزا نہیں ملتا

وہ وقت آخر بھی شبیہہ رسولؐ کو ایک نظر دیکھ لینے کی تمنا رکھتی ہیں اور یہی ان کے لیے باعثِ تسکین ہے۔

تہنیت کو نظر آجائیے وقتِ آخر | یہی تسکیں ہے مرے دیدہء گریاں کے لیے

اور زیارت یثرب کی دوبارہ خواہش کچھ اس طرح کی ہے:

جو یاد آتی ہے یثرت کی تو اب بھی دل تڑپتا ہے | جو ہوتی یاد پھر اپنی تو اور اک بار واں ہو۔

اور کبھی کہتی ہیں:

مدحتِ روئے نبیؐ تعریفِ گیسوئے نبیؐ | انبساط دل کے ساماں بن گئے ہیں آج کل
روضہء انور کے قصے اور حرم کے تذکرے | راحتِ دل مونسِ جاں بن گئے ہیں آج کل
اسوہء آلِ نبیؐ ایثارِ اولاد علیؑ | رہنمائے دین و ایماں بن گئے ہیں آج کل

اور کبھی کہتی ہیں کہ مجھے سرکارؐ کی نوازشوں پر اس قدر بھروسا ہے کہ اب محشر کا خوف نہیں رہا۔

ان کی نوازشوں پہ بھروسا ہے اس قدر | محشر کا تھا جو خوف و خطر کچھ نہیں رہا

کبھی اپنا حال درِ حبیب تک پہنچانے کے لیے صبا کو پیام بر بناتی ہیں۔

جب صبا تو مدینہ جاتی ہے۔ | کچھ مرا حال بھی سناتی ہے؟
صورتیں لاکھ ہوں جہاں میں حسیں | ہم کو صورت ان ہی کی بھاتی ہے
حشر کے ڈر سے ہم جو روتے ہیں | اس کی رحمت ہمیں ہنساتی ہے

وہ یہ سمجھتی ہیں کہ دین میں رنگ و نسل کی کوئی تفریق نہیں ہوتی بلکہ دین کیا ہے عشق ہے:

رنگ اور نسل کی تفریق نہیں دین میں کچھ | یاں کوئی فرق نہ خوش رو نہ سیاہ فام میں ہے

اسلام نے عورت و مرد کا درجہ برابر کیا۔ مرد کو طلاق کا حق تھا تو عورت کو خلع کا حق ملا۔ اور آج تک بھی اس کا حق دنیا کی قوموں کی عورتوں سے زیادہ ہے:

نکالا قعرِ مذلت سے صنفِ نسواں کو | کوئی تو عزتِ عورت کا پاسباں ہوتا

آغا حیدر حسن حسبِ ذیل شعر کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس شعر نے تو جان پر بنادی:

ترا اضطراب اے دل مجھے بے ادب نہ کردے | ہے یہ بارگاہِ اقدس ذرا یاں سنبھل سنبھل کے

مسلمانوں کی مغرب زدگی سے پریشان ہو کر کبھی کہتی ہیں:

ہم قصہء تسلیم و رضا کس کو سنائیں | دل والے ہیں کم، عقل کے معذور بہت ہیں

کبھی خیر البشر کے حسن کی تعریف اس طرح کی ہے جو دل پر ایک تاثر پیدا کرتی ہے:

کہاں روئے انور، کہاں حسنِ لیلیٰ | حقیقت، حقیقت، فسانے، فسانے

ان کی شاعری قلب کی گہرائی اور نظر کی بلندیوں کو چھوتی ہے:

تہنیت تم نے عجب حال بنا رکھا ہے | نہ خردمندوں میں شامل ہو نہ دیوانوں میں

ذکر و فکر کے پیش لفظ میں امجد حیدر آبادی فرماتے ہیں " ان کے اکثر اشعار سے ایک خاص قسم کی ربودگی اور فریفتگی محسوس ہوتی ہے

اثر پڑھنے والوں پر بھی پڑتا ہے۔ ان کے بعض اشعار سے میں بھی متاثر ہوا ہوں مثلاً:

وقتِ رخصت ہم پہ جو گزری وہ اب تک یاد ہے ۔۔۔ چھوڑتے ہی ان کا در تنہا نظر آنے لگے

امید ہے کہ یہ نعتیہ مجموعہ محبانِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آتشِ شوق کو اور بھڑکا دے گا اور عوام و خواص میں مقبول ہوگا۔ اسیرانِ جاہ و حشم کی وقعت ان کی چشمِ بصیرت میں کیا ہے اس کا اندازہ انھیں کے شعر سے کیجیے:

دیکھتے آئے ہیں باوصفِ زروجاہ و جلال ۔۔۔ ہاتھ خالی ہی چلے جاتے ہیں دولت والے

رسول الثقلینؐ گھر میں نان جویں کھاتے ہیں یہ ہے مسلکِ فقیرانہ گھر کے باہر دولِ مختلفہ کے سفیروں سے صلح نامے لکھواتے ہیں یہ ہے دربارِ شاہانہ۔ ایسا انسانِ کامل کیا صرف ہمارے لیے مفید ہو۔ رسولِ اکرمؐ سے کون مستفید نہیں ہوا:

غریبوں بیکسوں کی آس کیوں ٹوٹے کبھی تجھ سے ۔۔۔ ترا مسلک فقیرانہ، ترا دربار شاہانہ

ان کے مذہبی تصورات پختہ ہیں لیکن ان کی پختہ مذہبیت مائل بہ رہبانیت نہیں۔ رفتارِ زمانہ ان کے پیشِ نظر ہے:

روسی ہوں کہ ہوں وہ امریکی چھائی ہے سبھوں پہ تاریکی ۔۔۔ ہو ان پہ نظر ترچھی کیسے تم سب کو سدھارا کرتے ہیں

جس کو دنیا سے بڑھ کر دین کا خیال ہو:

انسان کامیاب وہی ہے جسے سدا ۔۔۔ دنیا سے بڑھ کے دین کی ہو آبرو پسند

وہ اپنے آپ کو محمدؐ کی کنیز سمجھتی ہیں اور کبھی اپنے آقا کے حضور میں بے باک بھی ہو جاتی ہیں۔

آپ ہی دیکھ لیں امت کی پریشاں حالی ۔۔۔ ہم جو کچھ اور کہیں گے تو شکایت ہوگی

اور مسلمانوں کے مستقبل سے پر امید بھی ہیں اور ان کی زبوں حالی کو دیکھ کر متاثر ہوتی ہیں تو کہتی ہیں:

تم اپنے دورِ حاضر سے نہ گھبراؤ مسلمانو! ۔۔۔ بہار آنے کو ہے اب رنگ بدلے گا گلستاں کا

اور کبھی محمدؐ کی غلامی کو منشاءِ یزداں قرار دیتی ہیں:

خدا کی بندگی دینِ محمد کا ہے سرمایہ ۔۔۔ محمدؐ کی غلامی اصل میں منشاءِ یزداں ہے

اور کبھی صراطِ مستقیم اختیار کرنے کو تلقین کرتی ہیں اور کہتی ہیں درمیانی راستہ اختیار کرو نہ گل کی خواہش کرو نہ خار کی فکر:

گل کی خواہش نہ فکرِ خار کریں ۔۔۔ راستہ ایسا اختیار کریں

اور کبھی دنیا و آخرت کے متعلق اس طرح اظہارِ خیال کرتی ہیں:

کھیتی ہے آخرت کی جو دنیائے چند روز ۔۔۔ رہتی ہے فکر دہر کے سود و زیاں سے دور

اور کبھی روضہء رسولؐ پر جانے کی تمنا کا اظہار اس طرح کیا ہے اور دل کی تڑپ کو یوں بیان کیا ہے:

پھر بلائیں گے اگر اس کا یقین ہو جاتا ۔۔۔ صبر کر لیتے تڑپ دل میں نہ اتنی ہوتی

اور کبھی کہتی ہیں کہ دل کو دیوانگی کا حال یہ ہے کہ اگر صبر و شکر کا اس کو درس دیں تو کوئی فائدہ نہیں:

درسِ صبر و شکر قلبِ مضطرب لیتا نہیں ۔۔۔ تہنیت ہے کار دیوانے کو سمجھانے گئے

خوشی سے سونپ دیتے ہیں سب اپنا اختیار ان کو ۔۔۔ گرفتارِ محبت ورنہ کب مجبور ہوتے ہیں

ور کبھی کہتی ہیں کہ میرا کلام ان ہی کے اشارے پر لکھا گیا ہے ورنہ میں یہ جرأت نہیں کر سکتی:

[illegible]

۰۰۰ ۰ ۰۰۰

ڈاکٹر غیاث صدیقی

بیگم تہنیت زورؔ مرحومہ

علامہ اقبال فرماتے ہیں:

چیست قرآں ، اختلاط ذکر و فکر فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور دکن سے اس طرح پیار کرتے تھے جس طرح Cowper اپنی محبوبہ سے کرتا ہے۔ With all thy faiths. I love thee still تیری تمام تر کمزوریوں کے باوجود میں تجھ سے اب بھی محبت کرتا ہوں۔ یا کوئی شاعر اختصار و اجمال کو پیش نظر رکھ کر یوں بھی کہہ سکتا ہے:

شاخ گل پر پھول بھی میرا خار بھی میرے

جب اردو زبان مختلف علوم و فنون کے چٹخاروں سے ناواقف تھی، عوام کے دلوں اور ذہنوں پر حکمرانی سے ناواقف تھی اور دلی اور لکھنو کے اردو داں اہل زبان کہلاتے تھے، اس میں کیا شک ہے کہ انھوں نے ادب کے بیش تر میدانوں میں اپنے جوہر دکھائے لیکن کسی عظیم زبان کی منزل، داستان، تمثیل، ناول، افسانہ، کہانی، مثنوی، قصیدہ یا نظم و نثر کے محدود عنوانوں اور سرمایوں تک محدود نہیں رہتی۔ اگر ایسا ہو تو وہ زبان عظیم زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہوتی۔

جس طرح حیات و کائنات کی وسعت متقاضی ہے کہ ہزاروں علوم و فنون کی آنکھوں میں اسے دیکھا جائے، ان گنت انگلیوں سے چھو کر اسے محسوس کیا جائے۔ لاتعداد احساسات و جذبات سے اسے سمجھنے کی کوشش کی جائے، شش جہت سے اس پر روشنی کے جھماکے ٹوٹ پڑیں اور ان کے ہر پہلو کا عکس ایک نئے تجسس کا متقاضی ہو بالکل اسی طرح ایک عظیم ادبی زبان، ادبی حصاروں سے نکل کر مختلف علوم و فنون کو اپنی آغوش اور اپنے دل میں لے لیتی ہے تو ایک عظیم زبان کہلاتی ہے۔

تخلیق ادب کے گلشن میں اگر دلی اور لکھنو کے محسنوں نے رنگ رنگ کے پھول کھلائے تو اردو کے دامن دل میں اہل دکن نے بھی علوم و فنون کے خزانے بھر دیے۔ جامعہ عثمانیہ نے محبوبہ اردو کو گلشن ادب کے علاوہ تاریخ، سائنس، فلسفہ معاشیات، سیاسیات، عمرانیات اور فلکیات وغیرہ کے گلشنوں کی بھی سیر کروائی ہے۔ فن ترجمہ کے حکمرانوں نے کئی عظیم کارنامے انجام دیے ہیں۔

اب وہ گل و بلبل اور حسن و عشق کی وادیاں طے کر کے ہمالہ کی چوٹی پر کھڑی ہیں اور دنیا کی کسی عظیم زبان سے آنکھیں ملانے کے قابل ہیں اور اہل دکن کو اس کارنامے پر جھکے سر کے ساتھ افتخار ہے کہ انھوں نے یہ سب کچھ کیا اور اب بھی کر رہے ہیں۔

جامعہ عثمانیہ نے کئی نامور سپوت پیدا کیے جن کے نقوش پا کے آگے بین الاقوامی چاند، سکندری کھاتے ہیں۔

میں یہاں مادر جامعہ کے ان تمام فرزندوں کے نام نہیں گنواؤں گا جن کی پیشانیوں کو بین الاقوامی شہرت نے چوما اور ان کے سروں پر فضیلت علم کے تاج رکھے۔ بلکہ ایک ایسے عاشق اردو کا سرسری ذکر کروں گا جو محبوبہ دکن کی ہر ادا پر مرمٹا۔ کیا شاعری، کیا نثر، دکن کی تاریخ و تہذیب کے ہر پہلو کو دنیا کے سامنے پیش کیا اور بہ صد افتخار پیش کیا۔ جھجک، شرم، ندامت اور احساس کم تری کے سپاہیوں نے

حالیں، تلواریں پھینک کر گم نامی میں اپنے چہرے چھپا لیے اور اہلِ زبان کے گھسے پٹے سکے چند مٹھیوں میں رہ گئے۔

اس نئی سلطنت کا حکمران ڈاکٹر زور تھا۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، جس نے اہلِ دکن کو نئی راہیں دکھائیں، عزم و ہمت کے سپ و شتر و فیل عطا کیے، تحقیق و تنقید کی قمچیاں دیں مہمیز بخشے نوجوانوں کے بازوؤں کو پر پرواز لگا کر منزل کی جانب گام زن کیا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کہا تھا کہ اگر غالب نہ ہوتے تو اقبال نہ پیدا ہوتے میں کہتا ہوں کہ زور نہ ہوتے تو سینکڑوں اردو کے توالے اپنے خط و خال کی بجائے دوسروں کو سمجھنے، دیکھنے، تعریف کرنے اور سر جھکانے کے عادی ہو جاتے۔ کم بخت دکن کی مٹی ہی ایسی ہے، م سخن، شرمیلی۔ اوروں کی طرح نہ اشتہار بازی آتی ہے نہ ان کو اوروں کی طرح باتوں کے طوطا مینا بنانا آتا ہے۔ دوسری ریاستوں میں تو ایک ندی فن کار کو بھی اس کے ساتھی سروں پر اٹھائے پھرتے ہیں، باہمی توصیف کے نقارے بجاتے ہیں، تحقیق و تنقید میں ان کی نظر آس پاس سے آگے نہیں جاتی۔ ع "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کی آنکھیں کبھی دکن پر نہیں اٹھیں اور کبھی اک نگاہِ غلط انداز ڈالی بھی تو سو تسامات جتائے۔ ڈاکٹر زور نے اس طلسم کو توڑا۔ خود شناسی کے جوہر سے دکن کو آگاہ کیا۔ ادارہ ادبیات اردو کے لیے قابل شخصیتوں کا نخاب کیا، ایوانِ اردو تعمیر کر کے اس میں دکن کے اہلِ علم و دانش کو ان کے اعزاز کے مطابق تخت و تاج عطا کیے اور دکن کی زبان کو تسخیرِ ذہن قلب کا وہ جادو عطا کیا جو عظیم بھارت کے ہر شعبہ حیات میں سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

میں نے ڈاکٹر زور کو قریب سے دیکھا ہے اور دور سے بھی، ان کے جاں بازوں کی محفل میں بیٹھ کر بھی۔ ان کے مخالفین کی صفوں ں داخل ہو کر۔ اگر دیانت، غیر جانب داری، حق گوئی و بے باکی اپنی آنکھیں کھولیں، وسعتِ قلب و نظر کے ہاتھ تعصب کے پردوں کو ٹھا دیں تو یہ حقیقت ضرور نظر آئے گی کہ اردو زبان کے لیے زور مرحوم نے اپنا سب کچھ لٹا دیا۔

زور مرحوم کی ابتدائی زندگی سے حال حال تک مرحوم کی جد و جہد کی نشانی محترمہ بیگم زور نے "حبِ نبیؐ" میں ڈوب کر جو کچھ اردو الوں کے لیے پیش کیا وہ نہ صرف بیش قیمت اثاثہ ہے بلکہ نئی آنے والی نسلوں کے لیے ایک مشعلِ راہ کا کام دیتا ہے۔

امجد حیدرآبادی کی تعریف سے لے کر بڑے بڑے نقاد اور شاعروں نے محترمہ کی دینی شاعری کی تعریف کی ہے اور دل کی گہرائیوں سے کی ہے۔ محترمہ نے اپنی مذہبی شاعری کے مجموعے "ذکر و فکر" ۱۹۵۵ء میں، صبر و شکر ۱۹۵۶ء میں اور "تسلیم و رضا" ۱۹۵۹ء میں شائع فرمائے تھے۔

ایک شعلے کے اطراف غیر مرئی شعلہ بھی ہوتا ہے جس کی تپش شعلے سے زیادہ ہوتی ہے لیکن اس کا وجود شعلے کی وجہ ہی سے ہوتا ہے ی حال محترمہ تہنیت صاحبہ مرحومہ کا ہے۔ "ذکر و فکر" سے دو ایک مثالیں پیش کرتا ہوں:

بہت باتیں ہیں یوں تو تہنیت دنیا میں کرنے کی
ہم اپنے شوق کی، اپنی لگن کی بات کرتے ہیں

تہنیت الفتِ نبیؐ کے بغیر
زندگی کا مزا نہیں ملتا

کیا بات ہے خوش تہنیت آتے ہیں نظر آج
کیا سوئے حرم کوچ دوبارہ تو نہیں ہے

فضل ہے یہ بھی اسی کا تہنیت کے حال پر
مل گئی مقبولیت جو چند ہی اشعار میں

صبر و شکر" محترمہ کا دوسرا مجموعہ ہے جو ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔

تہنیت دل چاہتا ہے ہر گھڑی
سیدِ ابرار کی باتیں کریں

تہنیت اب تک ہے محروم نظر
شوق کی شاید کمی ہے آج بھی

رہی ہے پیشِ نظر تہنیت کے نعتِ نبیؐ — وگر نہ وہ کبھی راہِ سخن سے گزرے ہیں
کلام کیوں نہ ہو مقبول ، تہنیت اپنا — کہ نامِ پاک ہے عنوانِ داستان ان کا

تہنیت مرحومہ کا تیسرا مجموعہ "تسلیم و رضا" ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا اس میں صاف صاف کہا ہے کہ ان کی شاعری در اصل ان کے دل و دماغ کی تسکین اور نذرانہ عقیدت ہے جو دل کی ترجمانی ہے ۔ فرماتی ہیں:

ہماری شاعری صنعت گری سے دور رہتی ہے — کہ اس سے تہنیت ، مقصود دل کی ترجمانی ہے
کیا ہے تہنیت شبیرؑ نے اسلام کو زندہ — زمانے میں کوئی منکر نہیں شانِ امامت کا ۔

اللہ تعالیٰ سے ہم سب کی دعا ہے کہ مرحومہ کو اعلیٰ وارفع مقام عنایت فرمائے..... آمین ۃ

000 O 000

(سلسلہ ص: ۴۸ سے)

کیا کام شاید ہماری دعا نے — کہ یاد ان کی آنے لگی ہے ستانے
حسیں ایک سے ایک بڑھ کر ہی ہوں گے — چنا ہے دو عالم میں ان کو خدا نے
کہاں روئے انور کہاں حسنِ یوسفؑ — حقیقت حقیقت ، فسانے فسانے
سدا ان کا فیضان جاری رہے گا — گزرتے رہیں گے یوں ہی سب زمانے
سہارا قیامت میں ان کا ملے گا — جہاں میں تو بس لاج رکھ لی خدا نے
بلالیں کسی طرح وہ اپنے در پر — بناتے ہیں ہم روز ایسے بہانے

مبارک ہو پھر تہنیت سوئے یثرب
چلے دو جہاں کی سعادت کمانے

(۶)

آپ کے سایہء دیوار تک آپہنچے ہیں — شکر اللہ کا گلزار تک آپہنچے ہیں
گر مدینہ کو پہنچ جائیں سمجھ جائیں گے — جنتِ تحتہا الانہار تک آپہنچے ہیں
جاں نثار آپ کے اک روز کہیں گے یہ بھی — ہم بھی سرکار کے دربار تک آپہنچے ہیں
کچھ تعجب نہیں قائل ہوں نبوت کے سبھی — لوگ توحید کے اقرار تک آپہنچے ہیں

تہنیت لطف و کرم سے نہیں ان کے مایوس
ولولے اس کے جو اصرار تک آپہنچے ہیں

(رپورٹ)

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

ابتدائی اور ثانوی تعلیم

قومی اردو کونسل ماہرین کے تجربات کی روشنی میں اور ان کے مشوروں سے اردو کی ہمہ جہت ترقی اور اردو تعلیم و تدریس ل معیار بندی کے لیے جو اقدامات کررہی ہے ان میں بنیادی یہ ہے کہ اردو تعلیم کا دائرہ وسیع ہو اور اس کا معیار بھی بلند ہو۔ انگریزی سڈیم اسکولوں نے اعلیٰ معیار کی جو شہرت حاصل کرلی ہے، اردو میڈیم اسکول بھی اس درجے پر پہنچیں۔ یہ کام مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ اس کے لیے درس و تدریس کے کام کو نئی بنیادوں پر استوار کرنے کی بھی ضرورت ہے، استادوں کی تربیت کی بھی نىرورت ہے اور نصابی کتابوں کی بھی ضرورت ہے۔ قومی کونسل ان تینوں باتوں کے لیے سرگرمی سے کام کر رہی ہے۔

کونسل نے اردو میڈیم طلبہ کی اردو زبان کی تعلیم اور معیار میں بہتری لانے کے لیے اردو میڈیم اسکولوں سے رابطہ کیا اور دہلی کے اردو میڈیم سے وابستہ پرنسپل صاحبان اور اساتذہ کی میٹنگ میں نصابی کتابوں میں اصطلاحات انگریزی میں برقرار رکھنے، اردو میڈیم سکولوں کے طلبہ کے لیے معاون تعلیمی مواد، جغرافیہ کے نقشے ہندی اور اردو میں مہیا کرانے، نصاب کی کتابوں کی بروقت فراہمی، اردو للبا کو کوچنگ دینے، اسکولوں کو مالی تعاون دینے، جنرل نالج کی کتابوں اور ورک بکس کی فراہمی کے سلسلے میں کونسل کی جانب سے کیے بانے والے کاموں کی تفصیل بتائی۔

ردو کمپیوٹر سینٹر

اردو کی ترقی کے لیے قومی اردو کونسل نے ملک بھر میں پچاس کمپیوٹر سینٹر کھولنے کا پروگرام بنایا ہے جہاں دوسری زبانوں کے سافٹ ویر کے ساتھ اردو سافٹ ویر بھی استعمال ہوں گے۔ دو سالہ کورس Computer Application to Calligraphy & Desk Top Publishin کے لیے نصاب، ہارڈویر اور سافٹ ویر کی تفصیل مکمل ہوگئی ہے۔ کونسل یہ چاہتی ہے کہ کتابت کو نئی ٹکنیک اور جدید تقاضوں کے مطابق آراستہ کیا جائے تاکہ اردو زبان کو ترقی ملے اور ہمارے بچے زندگی کی دوڑ میں تیزی سے آگے بڑھیں۔

ثابت مرکزوں کو گرانٹ

۲۶ / اگست کو گرانٹ ان ایڈ کمیٹی کی میٹنگ قومی اردو کونسل کے دفتر میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی صدارت میں ہوئی۔ پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر مغنی تبسم، جناب عبدلکریم شاہ تندور اور قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر حمیداللہ بھٹ کے علاوہ مرکزی زارتِ فروغِ انسانی وسائل کے ڈائرکٹر (لینگویجس) جناب سے سنگھ، جناب بی ایس ڈھلوں اور جناب ٹی آر پرساد نے شرکت کی۔

کمیٹی نے سفارش کی کہ جن انجمنوں کو مالی تعاون دیا جارہا ہے ۔ ان سے پروجکٹ اور ان کی تفصیل منگائی جائے تاکہ مقرر پروجکٹ کے لیے مالی تعاون دیا جائے اور جو کام اس پر ہو اس کے ہر مرحلے کے بارے میں اطلاع ہو ۔

ملک کے مختلف مقامات پر کتابت کے ۲۰ مرکزوں کو اس سال کے لیے گرانٹ دینے کی سفارش کی گئی ۔

کمیٹی نے اس بات سے بھی اتفاق کیا کہ کتابت کے مرکزوں میں کمپیوٹر ٹریننگ کا بھی بندوبست ہو تاکہ وہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے آسانی سے موجودہ سماج میں روزگار حاصل کرسکیں ۔ جو رضاکارانہ تنظیمیں ان مرکزوں کے لیے مقررہ سہولتیں فراہم کرسکیں ان کو مالی تعاون دیا جائے (تکنیکی سہولتوں اور ہارڈویر کے بارے میں امداد کی طالب انجمنوں کو بتایا جائے کہ قومی اردو کونسل اور وزارتِ فروغ انسانی وسائل کی ٹیم معائنہ کرنے کے بعد ہی مالی تعاون کے بارے میں رپورٹ اور سفارشات پیش کرے گی) ۔

سترہ اداروں کو اردو کی درس و تدریس کے لیے ۵ لاکھ ۸۸ ہزار روپے کی گرانٹ منظور کرنے کی سفارش کی گئی ۔

کتابت کے مرکز ، جن میں کمپیوٹر پر کام کرنے کی تربیت دی جائے ، ان میں یہ بھی سکھایا جائے کہ کتابت کا فن تزئین اور خوش نما بنانے کے کام بھی آسکتا ہے ۔ کمرشیل آرٹ اور گرافکس کو اس سے جوڑنا مفید ہوگا ۔ اس کے لیے کونسل مناسب قدم اٹھائے ۔

گرانٹ ان ایڈ کمیٹی نے ان پروجکٹوں کو منظور کرنے کی سفارش کی :

۱ ۔ اردو مخطوطوں کا وضاحتی کیٹلاگ ، ادارہ ، ادبیاتِ اردو حیدرآباد ۳۵۰ ہزار روپے ۔

۲ ۔ اردو کی تعلیم کا خط و کتابت کورس ، غالب اکیڈمی دلی ۷۰ ہزار روپے ۔

۳ ۔ تلگو اردو لغت ، آندھرا پردیش اردو اکیڈمی ، ڈیڑھ لاکھ روپے ۔

اردو اداروں کو گرانٹ

کمیٹی نے جوش ملیح آبادی کا صد سالہ جشن ولادت منانے کے لیے ادارہ ، ادبیاتِ اردو حیدرآباد کو ۳۵ ہزار روپے جموں و کشمیر میں اردو زبان کے فروغ اور نمائش کے لیے ، کشمیر سوسائٹی سری نگر کو ۲۸ ہزار روپے اور ثقافتی سرگرمیوں کے اہ کے موضوع پر کاروانِ ادب بارہ مولہ کو سمینار کے لیے ۱۶ ہزار روپے ، شاہین لائبریری جلگاؤں کو ۱۱ ہزار روپے ، سمینار اور عا مشاعرہ کے لیے (شامِ بہاراں ٹرسٹ) کو ۲۵ ہزار روپے ، مرزا غالب کی حیات اور ان کی تصانیف پر دو روزہ سمینار کے ۔ (اورینٹل سوسائٹی ، نئی دلی) کو ۳۰ ہزار روپے دینے کی سفارش کی ۔

اردو کتابوں کو مالی تعاون

کمیٹی نے تین کتابوں کی اشاعت کے لیے مجموعی طور پر ۴۳۲۹۹ روپے کی مالی امداد دینے کی بھی سفارش کی ۔ مصنف ہیں ڈاَ طاہر حسین کاظمی (معاصرین مرزا دبیر) ، ڈاکٹر خالد سعید (کہاوت) اور جناب محمود بلساری (اڑیسہ کہانیاں) ۔

مصنفوں کی چھاپی ہوئی کتابیں زیادہ تعداد میں خرید کر بھی قومی اردو کونسل مصنفوں کی مدد کرتی ہے اور ان کی کتابیں تقسیم کرا ہے ۔ اس اسکیم کے تحت بارہ عربی اور فارسی کی کتابیں ، سب ملاکر ۵۰۳۰۵ روپے کی یہ کتابیں خریدی گئیں ۔

۱۱۶ اردو کتابوں کے مصنفوں کو کل ملاکر پانچ لاکھ اسی ہزار روپے ، ان کی مطبوعات کی قیمت کے طور پر دینے کا فیصلہ کیاً ہے ۔ ان میں نو آموز ادیبوں کے ساتھ ساتھ کہنہ مشق اور مشہور ادیب بھی شامل ہیں ، جیسے کشمیری لال ذاکر ، جوگیندر پال ، مظہر اما

ڈاکٹر خلیق انجم ، نصرت ظہیر ، ڈاکٹر مسعود ہاشمی ، پریم پال اشک ، پروفیسر ابوالکلام قاسمی ، ڈاکٹر زینت اللہ جاوید ، ڈاکٹر اسلم پرویز ، جناب وارث علوی ، پروفیسر عبدالحق ، پروفیسر امیر عارفی اور جناب غلام نبی خیال ۔

خطاطی اور گرافکس کورس

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی طرف سے جو کتابت سینٹر چلائے جارہے ہیں ان کی کارکردگی کا جائزہ وقتاً فوقتاً لیا جاتا رہا ہے ۔ ان کے معائنہ کے بعد یہ بات سامنے آئی ہے کہ موجودہ کورس نہ تو روایتی کتابت / خطاطی کو فروغ دے پایا ہے اور نہ ہی روزگار کے مواقع فراہم کرپایا ہے ۔ کتابت سینٹر کے انفرا اسٹرکچر (Infrastructure) میں بھی بڑی حد تک کمی رہی ہے ۔ اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس کورس میں نئے داخلے نہیں کیے جائیں گے البتہ ان سینٹروں کو مزید ایک سال تک چلانے کی اجازت دی جائے گی جہاں طالبِ علم پہلا سال مکمل کرچکے ہیں اور دوسرے سال میں داخل ہوچکے ہیں ۔ ان سینٹروں کے وہی اخراجات کونسل برداشت کرے گی جو سالِ دوم کے سالانہ امتحان تک شامل ہوں گے ۔

کتابت سینٹروں کو کمپیوٹر اسکیم کی کاپی ارسال کی گئی تھی ۔ جن سینٹروں نے انفرا اسٹرکچر و دیگر سہولیات فراہم کرنے کا اگریمنٹ فارم ارسال کردیا ہے ان کا معائنہ کیا جارہا ہے ۔ اس اسکیم کے تحت منظور شدہ ادارے ہی کمپیوٹر سینٹر چلائیں گے ۔ ان سینٹروں کا معائنہ ہونے کے بعد ان میں کمپیوٹر نصب کیے جائیں گے ان سینٹروں میں نیا کمپیوٹر کورس (Calligraphy, Introduction to Computer & Desk Top Publishing using Urdu) شروع کیا جائے گا جس کی اطلاع الگ سے دی جائے گی ۔ اس نئے کورس میں داخلے نئی تقرری کے بعد ہوں گے اور داخلے کا نوٹیفکیشن کونسل اجرا کرے گی ۔

وہ کتابت سینٹر جو کمپیوٹر کا نیا کورس نہیں چلا پائیں گے ان کو کونسل کی طرف سے دوسرے سال کے امتحان کے بعد موجودہ کورس چلانے کے لیے کوئی گرانٹ نہیں دی جائے گی ۔ ان سینٹروں کے لیے ایک نیا کورس شروع کیا جارہا ہے جس کا نام " کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن " ہے ۔ اس کورس کے لیے نصاب تیار کیا جارہا ہے ۔ ان سینٹروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ مندرجہ ذیل انفرا اسٹرکچر مہیا کرے ۔

(۱) ۱۵ × ۲۰ کا ایک ہال ۔

(۲) ۲۵ کرسیاں اور ۲۵ ٹیبل جو کتابت اور ڈیزائننگ کے لیے موزوں ہوں (جیسی آرٹ کالج یا آرٹ سینٹر میں استعمال ہوتی ہیں) ۔

(۳) ٹیچر کے لیے ایک کرسی اور ٹیبل ۔

(۴) بلیک بورڈ ۔

سینٹر میں لائٹ و باتھ روم وغیرہ کا انتظام ہو ۔

معائنہ کے بعد ہی " کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن " کا کورس شروع کرنے کی اجازت دی جائے گی ۔ اس بات کی وضاحت کی جارہی ہے کہ کورس شروع کرنے سے پہلے نئی تقرری مثلاً گرافک ڈیزائن ٹیچر وغیرہ درکار ہے اس لیے کورس کی شروعات نئی تقرری اور کونسل کے فیصلے کے بعد ہوگی ۔ اس کورس میں داخلوں کا نوٹیفکیشن کونسل جاری کرے گی ۔

ملٹی میڈیا سارک کانفرنس

۳ / ستمبر کو حکومت ہند کی وزارتِ امورِ خارجہ کی جانب سے ملٹی میڈیا انفارمیشن ٹیکنالوجی کی سارک کانفرنس کا انعقاد پونہ میں ہوا ۔ اردو کے سلسلے میں خصوصی اجلاس کی صدارت ڈائرکٹر قومی اردو کونسل ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ نے کی ۔ اجلاس میں سارک ممالک میں انفارمیشن ٹکنالوجی کو ترقی دینے کے سلسلے میں اہم تجاویز پیش کی گئیں اور اردو سافٹ ویر کی تیاری کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لیا گیا ۔ سسٹم تیار کرنے والوں کو اپنا کام پیش کرنے اور ان کو درپیش مسائل سے آگاہ کرنے کو بھی کہا گیا ۔

ڈائرکٹر قومی کونسل نے کہا چوں کہ اردو تمام سارک ممالک میں بولی جاتی ہے لہذا سافٹ ویر کی تیاری میں عالمی معیار کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ دوسرے سافٹ ویر سے بھی میل کھاسکے اور انٹرنیٹ کی ضروریات بھی پوری ہوسکیں ۔

بحث و مباحثے کے دوران میں اجلاس کے صدر نے کئی اہم نکات کو نوٹ کیا اور ان پر عمل درآمد کے طریقہ کار پر تبادلہ خیال کے بعد طے پایا ، چوں کہ اردو ، سندھی ، بلوچی ، پنجابی (پاکستانی) زبانوں کا رسم الخط بڑی حد تک مشترک ہے اس لیے ان زبانوں سے متعلق سافٹ ویر ڈیولپمنٹ پر قومی اردو کونسل ، سی ڈیک اور ڈی ای او مشترکہ حکمتِ عملی اپنائیں ۔ قومی اردو کونسل کو اس سلسلے میں کلیدی رول دیا گیا ہے ۔

اردو مدرسوں میں عصری تعلیم

یکم اکتوبر سے ۳ / اکتوبر تک قومی کونسل کے ڈائرکٹر حمیداللہ بھٹ نے کلکتہ ، آسام اور منی پور کا تین روزہ دورہ کیا ۔ اردو زبان کی تعلیم اور تدریس کے مسائل کا جائزہ لینے کے لیے وہ تعلیمی اداروں میں گئے اور وہاں کے کارکنوں اور طالب علموں کے علاوہ ان لوگوں سے بھی ملے ، جو تعلیم کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں ۔ قومی اردو کونسل نے مدرسوں میں دینی تعلیم کے ساتھ جدید علوم کی تعلیم کو بڑھادینے کے لیے قدم اٹھاتے ہیں تاکہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد نوجوان روٹی روزی سے بھی جڑ سکیں ۔ ایسی سرگرمیاں منی پور ، آسام اور بہار کے دینی مدارس میں شروع ہوگئی ہیں اور ان کے اچھے نتائج سامنے آرہے ہیں ۔ قومی کونسل کا مقصد یہ ہے کہ اس اہم سماجی کام کی ذمہ داریاں انجمنیں سنبھالیں ۔ رضاکار تنظیمیں (NGO) جو تعلیمی ادارے چلارہی ہیں ، ان کو کیا مالی امداد دی جاسکتی ہے اور اس کے لیے اسکولوں ، مکتبوں میں کیا کیا سہولتیں فراہم ہونا ضروری ہیں ۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر حمیداللہ بھٹ نے تفصیل سے بتایا ۔ قومی کونسل یہ ضرور چاہتی ہے کہ جو مضامین مذہب سے تعلق نہیں رکھتے جیسے ریاضی ، جغرافیہ ، تاریخ اور سائنس ، ان کا نصاب آج کی معلومات کے مطابق ہو ۔ اس سلسلے میں ڈائرکٹر قومی اردو کونسل نے بنگال اردو اکادمی کے اراکین اور مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے عہدے داروں سے گفتگو کی ۔ انھوں نے وہاں تین گھنٹے گذارے اور اردو زبان کی ترقی و ترویج کے بارے میں اکادمی کے چیئرمین سے بات چیت کے بعد کتابت سینٹر اور لائبریری کا معائنہ کیا ۔ کونسل چاہتی ہے کہ اردو اکادمی جلد سے جلد کمپوٹر ٹریننگ سینٹر قائم کردے اس کے ساتھ گرافکس اور خطاطی کا کورس بھی جاری رہے ۔ کونسل فوری طور سے دس لاکھ روپے کی گرانٹ دینے کو تیار ہے ۔ اکادمی کو صرف عمارت اور اس میں مقررہ سہولتیں فراہم کرنا ہیں ۔ کونسل یہ بھی چاہتی ہے کہ مغربی بنگال اردو اکادمی میں اعلیٰ پایے کا کمپیوٹر کورس شروع کیا جائے جہاں خطاطی کو گرافکس سے جوڑ دیا جائے ۔ کمپیوٹر کورس کے لیے اگر ضروری ہوا تو اساتذہ دہلی سے بھی بھیجے جاسکتے ہیں ۔ با صلاحیت طلبا و طالبات کا داخلہ ہی اس کورس میں ہوگا ۔ یہ کورس ڈیڑھ برس کا ہوگا اس مدت میں طلبا و طالبات کو کمپیوٹر کی تعلیم دی جائے گی ۔ ڈاکٹر بھٹ نے مغربی بنگال اردو اکادمی کو مشورہ دیا کہ وہ آزادی کے بعد کے پچاس برسوں میں اردو کے مختلف اصناف پر

آئندہ سال مارچ سے قبل ورکشاپ کا اہتمام کرے ۔ کونسل بنگلہ سے اردو اور اردو سے بنگلہ ترجمے کے لیے مالی تعاون دینے کو تیار ہے ۔ خصوصاً رابندر ناتھ ٹیگور کی ان تصانیف کے ترجمے کے لیے جن کا ترجمہ اب تک اردو میں نہیں ہوا ہے ۔

ڈائرکٹر نے اردو اخباروں کے مدیروں سے بھی ملاقات کی ۔ اخبارات کے ایڈیٹروں نے اردو اخبارات کو درپیش مسائل کے سلسلے میں بتایا کہ روز بہ روز ڈی اے وی پی کے ذریعے ملنے والے اشتہارات میں کمی آرہی ہے جس کے سبب اردو اخبارات اقتصادی بحران کا شکار ہورہے ہیں ۔ آفسیٹ پر چھپنے کی وجہ سے اخراجات میں بھی اضافہ ہوگیا ہے ۔ انھیں زندہ رکھنے کے لیے اشتہار اور اخبارات کی تعداد اشاعت دو ہی ذریعے ہیں ۔ اگر یہ بھی مہیا نہیں ہوں گے تو اردو اخبارات اور بھی بدحالی کا شکار ہوں گے جس کی وجہ سے اخبار کا معیار یقیناً گرے گا ۔ کونسل نے تجویز پیش کی کہ اردو کے اخبارات کا ایک بیورو دہلی میں قائم کیا جائے جہاں ایک دفتر ہو اور وہ دفتر اشتہارات کا آرڈر اور کاپی ڈی اے وی پی سے حاصل کرے اور تمام اردو اخبارات کو روانہ کرے ۔ کونسل نے یہ تجویز رکھی کہ دہلی میں بیورو آفس کی ذمے داری آل انڈیا ایڈیٹر کانفرنس کے صدر کو دی جاسکتی ہے ۔ یہ تجویز بھی رکھی گئی کہ مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات سے رجوع کیا جائے اور اردو اخبارات کے مسائل اور ان کے حل کرنے کے لیے توجہ دلائی جائے ۔ ڈائرکٹر قومی اردو کونسل مسلم انسٹی ٹیوٹ بھی گئے جہاں انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر سلیمان خورشید نے مغربی بنگال میں اردو تعلیم کی راہ میں حائل دشواریوں کا تفصیل سے ذکر کیا ۔

اردو انسائیکلوپیڈیا

۱۸ / ستمبر کو قومی کونسل کے دفتر میں پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کی صدارت میں اردو انسائیکلوپیڈیا کمیٹی کی میٹنگ ہوئی اس میں پروفیسر عبدالستار دلوی ، پروفیسر شمیم حنفی ، جناب بلراج پوری ، جناب احمد سعید ملیح آبادی ، قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر جناب انوار رضوی اور شمس اقبال شریک ہوئے ۔

اردو انسائیکلوپیڈیا کی تین جلدیں شائع ہوچکی ہیں ۔ جن میں ۳۲ موضوعات پر محض طویل نوشتے ہیں ۔ یہ تین جلدوں پر مشتمل ایک مکمل انسائیکلوپیڈیا ہے ۔ اس کے چیف ایڈیٹر پروفیسر فضل الرحمٰن (مرحوم) تھے اور یہ مولانا آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد نے تیار کی تھی ۔ طویل نوشتوں پر مشتمل پہلی چار جلدیں تین جلدوں کی صورت میں پیش کردی گئی ہیں اور بقیہ ۸ جلدیں مختصر نوشتوں پر مشتمل ہیں ۔ ان ۸ جلدوں کو نظر ثانی اور Updating کرنے کے بعد دس جلدوں میں پیش کیا جائے گا ۔ انسائیکلوپیڈیا کمیٹی کے سامنے بقیہ دس جلدوں کا طباعتی پروگرام رکھا گیا جس کو کمیٹی نے منظور کیا ۔ پہلی پانچ جلدیں Update ہورہی ہیں تقریباً آدھا کام ماہرین کی نگرانی میں مکمل ہوچکا ہے ۔ یہ پانچوں جلدیں مالی سال ۹۹-۱۹۹۸ میں شائع ہوجائیں گی ۔

کمیٹی نے اس تجویز کو بھی منظوری دی کہ قومی اردو کونسل انٹرنیٹ پر ایک Web Site لے اور اولاً کونسل کی بعض چنندہ مطبوعات بشمول اردو انسائیکلوپیڈیا اس کو Feed کی جائیں ۔ ہندستان سے متعلق قومی اردو کونسل کا شائع کردہ مستند مواد بھی اس کو فیڈ کیا جائے اور رد عمل دیکھا جائے ۔

اس کے علاوہ ورلڈ کلاسک جن کے ترجمے ہوچکے ہیں اور مارکیٹ میں نایاب ہیں انھیں حاصل کر کے دوبارہ شائع کیا جائے ۔ کمیٹی نے اس تجویز کی بھی منظوری دے دی ۔

بہ سرپرستی انجمنِ خواتین آندھرا پردیش

(الف) الصمد اردو عربک اسکول اینڈ سوینگ سنٹر خیریت آباد ، حیدرآباد ۔

فون نمبر 3312532

۱ ۔ جماعت ہفتم (اردو میڈیم) تک سرکاری نصاب کے مطابق غریب یتیم اور نادار لڑکیوں کے لیے مفت تعلیم ۔ نیز عابد علی خاں ٹرسٹ کے تحت زبان دانی ، اردو دانی اور انشا کی تدریس کا انتظام ہے ۔

۲ ۔ سوینگ سنٹر میں زنانہ سوٹس کی کٹائی اور سلائی کا انتظام ہے ۔ کورس ختم ہونے پر خود روزگار بنانے کے لیے خواتین اور لڑکیوں کو ایک سلائی مشین مفت دی جاتی ہے ۔

۳ ۔ فنی تعلیم کے لیے کارچوبی ، کڑھائی ، اون کی سلائی ، ایمبرائیڈری اور مہندی ڈیزائننگ کا کام بھی سکھایا جاتا ہے جو عورتوں اور لڑکیوں کی خود روزگاری کا ضامن ہے ۔

۴ ۔ دینی اور مذہبی تعلیم کے لیے عربی اسباق کے ساتھ ساتھ ناظرہ قرآنِ مجید اور حفظِ قرآنِ مجید کی تعلیم بھی جاتی ہے ۔

(ب) غریب ، نادار اور یتیم لڑکیوں کی اجتماعی شادیاں

اہلِ خیر حضرات کے تعاون سے ہر سال دس شادیوں کا اہتمام کیا جاتا ہے ۔ جس کے لیے جناب عابد علی خاں مرحوم ایڈیٹر " روزنامہ سیاست" ، ڈاکٹر شاہد علی خاں ، مز انیس خاں پرنسپل نصر اسکول ، جناب وزارت رسول خاں سابق ایم ۔ ایل ۔ اے اور دیگر اراکینِ انجمن کا دستِ تعاون شاملِ حال ہے ۔

ایسے عظیم الشان کام کے مسلسل انصرام کے لیے اسکول بلڈنگ اور مالیہ کی شدید ضرورت ہے ۔ اہلِ خیر خواتین و حضرات سے اپیل ہے کہ ممبر بن کر معاشرے کی غریب ، نادار اور یتیم عورتوں اور لڑکیوں کی معاشی مشکلات دور کرنے اور نئی نسل کو تعلیم سے بہرہ ور کرنے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں ۔ فیس رکنیت ماہانہ Rs. 200/- Rs. 100/- Rs. 50/- ہے ۔ اگر آپ مستقل رکن نہ بن سکیں تو کم از کم سالانہ زکوٰۃ یا صدقات کی رقم سے انجمن کے مقاصد کی تکمیل فرما کر فلاحِ دارین حاصل کریں ۔

شاہدہ صمد

(صدرِ انجمن)


دکن کے افق پر ایک روشن ستارہ
ثناء
بے مثال شرارہ
گھرارہ
اور
دوپٹہ
معیاری خواتین کی اولین پسند
ثناء کلکشنس
Sana
Collections
پتھر گٹی حیدرآباد فون 521488
SANA COLLECTONS
PATHER GATTI, HYDERABAD
Phone : 521488

Authorised Dealer :

Phones : Show Room : 3396521
: 3310196
: Work Shop : 3310791
: Kakatpally : 3813001

CLASSIC AUTO SERVICE CO.

Shop No. 7 & 8, Shanti Sikhara, Raj Bhavan Road,
Somajiguda, Hyderabad – 500'082.

LML – VESPA

Easy Finance Available For Govt. / Ltd. Co. Employees & Income Tax Payees
Exchange Scheeme Available For All

زیرو بنا ہیرو ایک بار پھر

ایل ایم ایل کی اصلی ٪0 سود اسکیم آگئی ہے پھر سے

کچھ بہترین سلسلے رکتے نہیں کبھی ۔ جیسے ایل ایم ایل کی اصلی ٪0 سود Finance Scheme ۔ جی ہاں ، یہ آگئی ہے پھر سے ۔ شان ، طاقت اور جان سے بھرپور اسکوٹر بنانے والوں ، ایل ایم ایل کی بےحد مقبول عام اور کامیاب پیش کش ۔ جس سے آپ کے لیے ایل ایم ایل اسکوٹر خریدنا بن جائے بالکل آسان ۔ اپنے نزدیکی ایل ایم ایل ڈیلر کے یہاں آئیے اور اس اسکیم کی پوری معلومات حاصل کیجیے اور انتخاب کرلیجے ، بھارت کی عمدہ اور وسیع اسکوٹر رینج میں سے اپنے خوابوں کے ایل ایم ایل کا ۔ اس لیے اگر پچھلی مرتبہ آپ اس اسکیم کا فائدہ نہیں اٹھاپائے تو اس بار یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں اور نہ ہی اس کے دوبارہ لوٹنے کا انتظار کریں ۔

جلدی پہنچیں نزدیکی ایل ایم ایل ڈیلر کے یہاں ۔ ۔ ۔ اسکیم صرف محدود مدت کے لیے ہے ۔

● اسٹار ایک طوفانی شاہکار ● سلیکٹ ، شان اور کارکردگی کا جوشیلا احساس ● ان دی اسپیشل ہر خوبی سے آراستہ



ایل ایم ایل ○ شان ○ طاقت ○ اور جان

بہ یادگار سید محی الدین قادری زورؔ

سن اجراء : ۱۹۳۸ء

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد : ۶۰ دسمبر ۱۹۹۸ء شمارہ : ۱۲

مدیر
مغنی تبسم

معاونین
غلام جیلانی ، بیگ

فی پرچہ : ۱۲ روپے
زرسالانہ : ۱۲۵ روپے
کتب خانوں سے : ۱۵۰ روپے

مشرق وسطی اور امریکہ : ۲۵ ڈالر
پاکستان ، برما ، سری لنکا و بنگلہ دیش : ۱۶ ڈالر
انگلستان : ۱۵ پونڈ

ناشر : ادارہ ادبیاتِ اردو ، پنجہ گٹہ روڈ ، حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۸۲ (اے ۔ پی) انڈیا ۔

کمپیوٹر کتابت : جی ۔ جی ۔ کمپیوٹرس ، مدنی چیمبر ، حیدرآباد ۔ / شارپ کمپیوٹرز چادرگھاٹ ، حیدرآباد ۔

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر ، پرنٹر ، پبلیشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے اے ایس گرافکس ، دہان گوڑہ میں طبع کرواکے ادارہ ادبیاتِ اردو سے شائع کیا ۔

اس شمارے میں

○○○

پہلی بات

اردو کے ممتاز افسانہ نگار اور ڈراما نویس آغا بابر ۲۵ ستمبر ۱۹۹۸ کو نیویارک میں وفات پا گئے۔ آغا بابر مرحوم حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ رہے۔ ان کے بڑے بھائی اردو کے معروف ادیب عاشق حسین بٹالوی بھی اس حلقے میں شامل تھے۔ آغا بابر گزشتہ چالیس برس سے امریکہ میں مقیم تھے۔ ان کا تخلیقی سفر آخری عمر تک جاری رہا۔ چند برسوں سے وہ امریکہ کے ہفتہ وار رسالے اردو ٹائمز میں "سریلی باتیں" کے عنوان سے کالم لکھ رہے تھے۔ یہ کالم سارے امریکہ میں اور امریکہ سے باہر بھی بے حد مقبول تھا۔

آغا بابر کا اسلوب منفرد تھا، صاف ستھری شگفتہ زبان، دل نشیں پیرایہ، اظہار، کہیں ہلکا سا طنز اور کہیں لطیف مزاح۔ انسانی نفسیات پر گہری نظر تھی جس کا اندازہ ان کی کردار نگاری سے ہوتا ہے۔

سب رس کے زیرِ نظر شمارے میں آغا بابر کا گوشہ شائع کیا جارہا ہے۔

●

ہم ماہ نامہ "سب رس" میں تنوع پیدا کرنے اور اس کے معیار کو بلند کرنے میں کوشاں رہے ہیں۔ اس کی ضخامت بھی بڑھا دی گئی ہے۔ ڈاک کی شرح اور کاغذ کی قیمت میں یک گونہ اضافہ ہوگیا ہے جس کی وجہ سے "سب رس" کی قیمت اور زرِ سالانہ میں یکم جنوری ۱۹۹۹ء سے اضافہ کیا جارہا ہے۔ امید ہے کہ "سب رس" کے قارئین ہماری مجبوری کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنا تعاون جاری رکھیں گے۔

زرِ تعاون کی نئی شرح حسب ذیل ہے:

قیمت فی شمارہ	: پندرہ روپے
زرِ سالانہ	: ایک سو پچاس روپے
زرِ سالانہ کتب خانوں کے لیے	: ایک سو پچھتر روپے

بیرونِ ہند زرِ تعاون میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔

○●○

(ادارہ)

پون ورما

ترجمہ: اسامہ فاروقی

کتاب: مرزا غالب، شخصیت اور عہد

باب دوم ___ شہرِ ناز و نعمت

(قسط: ۴)

" رات کے کم و بیش ایک بجے میں نے اپنی پالکی میں سے جھانک کر دیکھا تو چٹکی ہوئی فرحت بخش چاندنی میں مجھے جامع مسجد کے مینار دکھائی دیے ۔ اسی عظیم الشان اسلامی عبادت گاہ کے مینار جس کا شمار دلی اور شمالی ہندستان کی دل کش ترین عمارتوں میں ہوتا ہے ۔ جب ہم لوگ اور قریب پہنچے مجھے شہر کے گرد سرخ رنگ کی نہایت عمدہ فصیل دکھائی دی ۔ ۔ ۔ ایسی شان دار چاندنی اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی اور جب ہم ندی پار کر رہے تھے اور یہ عالی شان شہر ہمارے سامنے پھیلا ہوا تھا تو دونوں جانب منظر قابلِ دید تھا ۔ اسلامی عبادت گاہوں کے بہت سارے خوش نما مینار آسمان سے باتیں کر رہے تھے ۔ ۔ ۔ " سال ۱۸۲۸ء تھا اور دن ۲۰ / جنوری کا ۔ ان سطور کی لکھنے والی دلی کے انگریز ریزیڈنٹ سر طامس مٹکاف کی بیٹی ایمیلی بے لی تھی ۔ منظر ، جس کی اس سرخوشی کے عالم میں وہ تصویر کشی کر رہی تھی ، غالب کی دلی کا تھا ، جیسا کہ اسے دلی آتے وقت جمنا ندی کو کشتیوں کے پل پر سے پار کرتے ہوئے دکھائی دیا تھا ۔ کشمیری دروازے کے باہر انگریز رزیڈنٹ کی عالی شان کوٹھی پہنچ جانے پر اپنے باپ کے مشفقانہ اصرار پر ایمیلی اپنے مشتعل جذبات کو قابو میں لائی اور کچھ دیر کے لیے سو گئی ۔ لیکن اگر وہ اور کچھ دیر جاگتی تو شاید شہر میں طلوعِ صبح کا منظر بھی دیکھ سکتی اور یہ بھی مشاہدہ کر سکتی کہ طلوع ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں شہر کے اہم مقامات کو کیسے چھانٹتی اور انھیں نمایاں کرتی ہیں ۔ یہ اہم مقامات تھے ۔ جمنا کے کنارے مشرق کی طرف واقع اور قلعہ ۔ معلیٰ کے نام سے مشہور لال بھربھرے پتھر کا بنا ہوا بلند و بالا لال قلعہ ۔ اس کے سامنے مغرب کی جانب واقع ۶۶۶۴ گز لمبی چار گز چوڑی اور نو گز اونچی اینٹ پتھر کی فصیل سے گھرا ہوا قوس کی شکل کا شہر ۔ اس فصیل کے بہت سارے دروازے ، شمال میں کشمیری دروازہ ، مغرب کی طرف موری ، کابلی ، لاہوری اور اجمیری دروازے اور جنوب میں ترکمان دروازہ اور دلی دروازہ ، شہر سے گزرنے والی اور زاویہ قائمہ پر ایک دوسرے کو کاٹنے والی دو بڑی سڑکیں : چاندنی چوک در فیض بازار ، شمال مشرق میں واقع لال قلعے کی شان و شوکت کا برابری سے مقابلہ کرنے والی ، اپنی عالی شان بلندی ، وسعت اور سر بہ فلک میناروں سے متاثر کرنے والی جامع مسجد اور شہر کے باہر پہاڑی سلسلہ جس کی درختوں سے ڈھکی چوٹیوں کو شہر کی فصیل سے درختوں ، جھاڑیوں ، میوہ باغوں اور ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں کا ایک سپاٹ اور مختصر درمیانی فاصلہ جدا کرتا تھا ۔

شہر کی گنگا جمنی تہذیب کی خاص الخاص ہستی اور ملجا و ماویٰ مغل بادشاہ تھے ۔ حالاں کہ غالب کے عنفوانِ شباب

کے دنوں میں اکبر شاہ ثانی مغل بادشاہ تھے، ان سے زیادہ ان کے جانشین بہادر شاہ کی کی شخصیت کو شہر کے مزاج و خصوصیات کا صحیح معنوں میں مظہر اور لبِ لباب کہا جاسکتا ہے۔ وہ پسندیدہ آدابِ مجلس کی کسوٹی تھے، اپنے زمانے کے مقبول عام نظریات، اس کی کامیابیوں، اس کی کمزوریوں اور اس کے دل ولولوں کی علامت تھے۔ وہ ایک اچھے نشانہ باز اور ممتاز شہ سوار تھے۔ وہ ایک باکمال شاعر تھے، جن کا تخلص ظفر تھا۔ وہ ایک اہلِ علم تھے جنھوں نے سعدی کی گلستاں کی ایک عالمانہ شرح لکھی تھی۔ وہ "شوق رنگ" کے قلمی نام سے خیال اور ٹھمریاں تصنیف کرتے تھے۔ وہ ایک باکمال ماہرِ خطاطی اور مصوری کے قدردان و سرپرست تھے۔ بیش تر دربار کی دل چسپی ہی کی بہ دولت دلی کا دبستانِ مصوری زندہ تھا، جہاں راجہ جیون رام اور حسین نذیر جیسے فن کاروں نے تربیت پائی۔ خزانہ خالی ہونے کے باوجود انھوں نے باغات سے مغلوں کی محبت کے جس طرح سے بھی ہو اظہار کے لیے وسائل فراہم کیے اور ایک باغ شاہ دراہیں اور دوسرا محل کی دیوار کے نیچے ترتیب دیا۔ وہ شطرنج اور تاش کھیلتے تھے، پتنگ بازی سے لطف اندوز ہوتے تھے اور مرغ بازی سے دل چسپی لیتے تھے۔ ان کی اپنی بلبل، بلبلِ ہزار داستان، عوام کو بےحد پسند تھی۔ وہ اچھی غذا اور خوب صورت عورتیں پسند کرتے تھے۔ شاہی پسند کی بہ دولت خصوصیت کے ساتھ آم، شہر کا مرغوب ترین پھل بن گیا تھا۔ وہ تنگ دست لیکن خوددار تھے، سیاسی طور سے بے دست و پا لیکن پھر بھی عالم پناہ تھے۔ دلی کی تہذیب کو ایک خاص استناد حاصل ہوگیا تھا۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ مختلف عناصر کے امتزاج سے اس شہر کے باشندوں کا ایک گنگا جمنی طرزِ زندگی معرضِ وجود میں آیا تھا جو نہ ہی بناوٹی تھا اور نہ ہی عملِ جراحی و پیوند کاری کا نتیجہ تھا، بلکہ بےساختگی کے ساتھ شہر کی اپنی شخصیت کا ایک جزو بن گیا تھا۔ یہ اس کی سماجی اور ثقافتی خصوصیات تھیں (جن کی امتیازی حیثیت شہر کی ٹھٹول کو بھی صریحاً دلی کے لیے مخصوص رنگ روپ عطا کرتی تھی) جنھوں نے ذوق کو "کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر" کہنے پر اکسایا۔ بہادر شاہ ظفر جو اب عظیم الشان سلطنت کے فرماں روا باقی نہیں رہے تھے، اس روحِ عصر کی علامت تھے۔

بادشاہ دین دار مسلمان تھے لیکن معاشرتی ماحول صریحاً غیر فرقہ پرستانہ تھا۔ دربار رکھشا بندھن، دسہرہ، ہولی، دیوالی اور بسنت پنچمی جیسے ہندو تہوار جوش سے مناتا تھا۔ یہ سوچ بچار کے بعد اپنایا ہوا سیکولرزم کا رویہ نہیں تھا، یہ تو اس حقیقی امتزاج کی ایک فطری توسیع تھی جو اکبرِ اعظم کے عہد میں شروع ہوا جب مغل معاشرتی ماحول میں ہندو عناصر کے اخذ و قبول نے نمایاں شکل اختیار کی۔ اکبر نے ایک راج پوت راج کماری سے شادی کی اور ہندوؤں کو اپنی سلطنت میں اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیا۔ عوام کے لیے اکبر بادشاہ جہاں پناہ بھی تھے اور مہابلی بھی۔ شاہ جہاں کے بیٹے داراشکوہ نے یوگ وششٹ، گیتا اور اپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ کروایا۔ خود اس نے "مجمع البحرین" نام کی ایک کتاب لکھی، جس کا موضوع ہندومت اور اسلام کا تقابلی مطالعہ تھا۔ اورنگ زیب صرف عارضی طور پر اس عمل کو روک سکا، مستقل طور پر نہیں۔ ظفر شاہ کے عہد تک یہ گنگا جمنی تہذیب ایک ورثے میں ملنے والی طرزِ زندگی بن چکی تھی، جسے بادشاہ شاید تقویت تو پہنچا سکتا تھا لیکن اس پر اعتراض نہیں کرسکتا تھا۔

جب کسی روایت کے استحکام کے لیے ماحول سازگار ہو تو معمولی واقعات کو بھی جو اسے مزید تقویت پہنچا سکتے

عمل غیر شعوری طور پر بڑھا چڑھا کر دستور کی شکل دے دی جاتی ہے۔ چناں چہ رکھشا بندھن کے تیوہار کو منانے کی رسم کو شاید بادشاہ نے اسی طرح باقاعدہ دستور کی شکل دی۔ قصہ یوں ہے کہ صبح سویرے جمنا ندی سے اشنان کے بعد لوٹتی ہوئی رام جی گوڑ نامی ایک برہمن خاتون نے مقتول بادشاہ عالم گیر ثانی کی راستے میں پڑی ہوئی لاش کو پہچان لیا۔ بادشاہ کے سپاہیوں کو پتہ چلنے اور اسے اپنی تحویل میں لینے تک بغیر چون و چرا کے اس نے لاش پر پہرہ دیا۔ عالم گیر ثانی کے بیٹے اور جانشین شاہ عالم نے خاتون کو اس کے اس کام کا صلہ دینا مناسب سمجھا۔ چناں چہ اس کے بعد سے ہر سال رکھشا بندھن کے موقع پر رام جی ایک نہایت آراستہ پیراستہ پالکی میں قلعے کو جاتی اور اپنے احسان مند شاہ بھائی کو راکھی باندھتی۔ بدلے میں بادشاہ اس پر تحفے تحائف کی بھرمار کردیتے۔ اس رسم نے سالانہ جشن کی صورت اختیار کرلی۔ جسے شاہ عالم کے جانشین اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ اور رام جی کے گھرانے کی خواتین غرض سبھی پابندی سے مناتے۔

ہر سال برسات میں دلی کے سبھی فرقوں کی طرف سے " پھول والوں کی سیر " کے نام سے معروف پھولوں کا جشن منایا جاتا جس نے ظفر کے عہد میں ایک سالانہ تقریب کی شکل اختیار کرلی۔ جشن کی ابتدا دل چسپ تھی۔ ظفر وہ شاہ زادے تھے جن کو انگریزوں نے اکبر شاہ ثانی کی جانشینی کے لیے چنا تھا۔ لیکن اپنی چہیتی ملکہ ممتاز محل کی ترغیب پر اکبر شاہ نے اس فیصلے کو ممتاز محل کے بیٹے مرزا جہاں گیر کے حق میں بدلوانے کی سعی کی۔ انگریز رضا مند نہیں تھے۔ مرزا جہاں گیر جوشیلے نوجوان تھے اور نازبرداری کرنے والے اپنے والدین کے رویے سے ہمت جٹا کر انھوں نے انگریز ریذیڈنٹ سیٹن پر گولی چلاکر اپنی برہمی کا مظاہرہ کیا۔ اقدام کے نتیجے میں محض سیٹن کی ہیٹ اس کے سر سے گر پڑی۔ لیکن یہ بہرحال انگریزوں کو یہ حرکت اتنی ناگوار گزری کہ انھوں نے جہاں گیر کو الہ آباد جلا وطن کروادیا۔ مرزا جہاں گیر کی رنجیدہ ماں نے منت مانگی کہ اگر میرے بیٹے کو دلی واپس آنے کی اجازت مل جائے تو میں مہرولی میں حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کی درگاہ شریف پر چادر اور پھولوں کی مسہری چڑھاؤں گی۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد انگریزوں نے شاہ زادے کی واپسی کی اجازت دے دی لیکن اس شرط پر کہ بادشاہ اپنے اس بیٹے کے اچھے چال چلن کی ضمانت دیں اور ظفر کی ولی عہدی کے موقف کو موضوعِ بحث نہ بنائیں۔ مرزا جہاں گیر کی دلی کو واپسی کا دھوم دھام سے جشن منایا گیا۔ ممتاز محل نے منت بڑھانے کی دیدہ ریزی سے تیاریاں شروع کیں۔ پھولوں کا ایک خوب صورت چھتر بنایا گیا جس پر پھول والوں یعنی پھلباروں نے خود اپنے خرچے سے دیدہ ریزی سے بنائے ہوئے پھولوں کے ایک پنکھے کا اضافہ کیا۔ پھر ان دونوں کو اہتمام سے ایک بڑے جلوس کے ساتھ ولی کی درگاہ لے جایا گیا۔

مرزا جہاں گیر نے اپنے طور طریقے نہیں بدلے۔ انھیں پھر جلا وطن کیا گیا اور آخرکار ان کا الہ آباد میں اکتیس سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ یہ ظاہر وہ شاہ زادے کی شراب کے حد سے زیادہ استعمال کی وجہ سے جگر کی ایک بیماری (تشمع الکبد CYRROHOSIS) میں مبتلا تھے۔ لیکن سارے دربار کا اور دلی کے لوگوں کا زیارت کے لیے مہرولی کو جانا ہر سال کا دستور بن گیا۔

"جشن کے کچھ دن پہلے بادشاہ، ملکہ اور محل کی سبھی خواتین و امراء دربار پالکیوں اور ہواداروں پر دلی سے روانہ ہوتے۔ جب کہ شاہ زادے کلیل کرتے ہوئے گھوڑوں پر سوار ان کے ہم رکاب ہوتے۔ ہمایوں کے مقبرے، نظام الدین اولیا کی درگاہ پر حاضری دے کر اور صفدر جنگ کے مقبرے پر دوپہر کے کھانے کے لیے کچھ دیر توقف کر کے شاہی جلوس مہرولی پہنچتا جہاں اس کا شایانِ شان استقبال کیا جاتا۔ خواجہ بختیار کاکیؒ کی درگاہ کے پاس واقع جنگلی محل کو جو اب کھنڈر میں تبدیل ہوچکا ہے لیکن ان دنوں ایک شاہی محل کی ساری شان و شوکت کے ساتھ صحیح سلامت تھا، قالینوں اور جھاڑ فانوس سے بہ درجہ، کمال آراستہ کیا جاتا۔ دوسرے دن بادشاہ جھرنے کو جاتے، جہاں قناتوں اور پردوں کی خلوت میں محل کی خواتین فرصت سے وقت گذار سکتی تھیں۔ شاید ہی کبھی ایسا ہوتا ہو کہ اس موقع پر مینہ کے کچھ چھینٹے نہ پڑیں اور تب بادشاہ اور ان کے ہم راہی جھرنے کے مشرق میں واقع دل کش سیرگاہ امریاں یعنی آم کے درختوں کے کنج کی طرف منتقل ہوجاتے۔ یہاں محل کی خواتین خود موسم کے پکوان تیار کرتیں، سب مل کر کھیلتے کودتے اور ناچ گانے سے لطف اندوز ہوتے۔

جشن کے پہلے دن پنکھوں اور پھولوں کا جلوس جھرنے سے شروع ہوتا، ساتھ میں گوینے اور سازندے ہوتے، پہلوان اور ورزشی اپنے کرتب دکھاتے اور تلوار کے ہاتھ نکالتے، اپنی رنگ بہ رنگی وردیوں میں سپاہی ساتھ ہوتے اور مہرولی کے بڑے تکلف سے سجے سجائے اور روشنی میں نہائے ہوئے بازار سے گزرتا ہوا یہ جلوس جوگ مایا مندر پہنچتا۔ دوسرے دن ایک اور بڑے جتن سے منظم کیا ہوا جلوس خواجہ بختیار کاکیؒ کے مقبرے کو جاتا۔"

جو کام ایک مسلمان خاتون کی طرف سے ایک مسلمان ولی کی درگاہ پر شکرانے میں اور اظہارِ عقیدت کے طور پر شروع کیا گیا تھا، مذہب و ملت اور ذات پات کی سرحدیں پار کر کے سارے شہر کے لیے زیارت اور جشن کی تقریب بن گیا۔ بادشاہ خواجہ بختیار کاکیؒ کی درگاہ کو بھی جاتے اور جوگ مایا مندر کو بھی۔ جلوس میں ان کے ساتھ جانے والوں میں ہندو بھی ہوتے اور مسلمان بھی۔ اپنے خطوط میں سے ایک میں غالب اس تیوہار میں لوگوں کی بڑی تعداد میں شرکت اور اس کے سیکولر کردار کا ذکر کرتے ہیں:

"اس شہر میں ایک میلہ ہوتا ہے، پھول والوں کا میلہ کہلاتا ہے۔ بھادوں کے مہینے میں ہوا کرتا ہے۔ امرائے شہر سے لے کر اہلِ حرفہ تک قطب صاحب جاتے ہیں۔ دو تین ہفتے تک وہیں رہتے ہیں۔ مسلمین اور ہنود دونوں فرقے کی شہر میں دکانیں بند پڑی رہتی ہیں۔ (خط بہ نام خواجہ غلام غوث خاں بے خبر، مورخہ اکتوبر نومبر ۱۸۲۳ء)"

غالب کی دلی میں فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہوتے تھے۔ ۱۸۵۲ء میں جب انگریز ریذیڈنٹ طامس مٹکاف نے بقر عید کے موقع پر ذبیحۂ گاؤ کی اجازت دے دی تھی، کچھ کشیدگی ضرور تھی۔ ہندوؤں کے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے مغل بادشاہ روایت کی پابندی کرتے ہوئے اس موقع پر اونٹ کی قربانی دیتے تھے۔ اور انھوں نے ذبیحۂ گاؤ کی ممانعت کردی

تھی۔ انگریزوں نے نتائج و عواقب کو ملحوظ خاطر نہ رکھتے ہوئے اس ممانعت کو برخاست کردیا۔ گو کہ ہندوؤں نے احتجاج کیا لیکن کسی طرح کا فرقہ وارانہ تشدد وقوع پذیر نہیں ہوا۔ غالب اسی سال کے ایک خط میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہیں:

"یہاں کی عید کا ماجرا عرض کروں گا۔ پہلے یہ تو پوچھیے کہ یہاں کول (یعنی علی گڑھ) کا کیا واقعہ مشہور ہے لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ ہرا نجمن میں یہی ذکر رہا کہ کول میں بڑی خانہ جنگی ہوئی اور ہندو مسلمانوں میں تلوار چلی۔ دس بیس آدمی طرفین کے مارے گئے۔ میں چاہتا تھا کہ تم کو لکھوں کہ اس عرصے میں تمہارا خط آگیا اور حال معلوم ہوا۔ میں جانتا ہوں ایسا ہی مشہور ہوگا کہ دلی میں تلوار چلی۔ سو، حضرت نہ تلوار چلی نہ خانہ جنگی ہوئی۔ دو دن ہندو دکان داروں نے دکانیں بند کردی تھیں۔ سو، مجسٹریٹ صاحب بہادر اور کوتوال نے سارے شہر کا گشت کیا۔ بہ ملاطفت و ملائمت و بہ تاکید و تہدید دکانیں کھلوائیں۔ بکریاں بھی قربان ہوئیں اور گائیں بھی۔" (خط بہ نام منشی نبی بخش حقیر، جمعہ ۵/ستمبر ۱۸۵۴ء)۔

غالب کے خط میں اس واقعے کے بیان سے اس احساس کا پتہ چلتا ہے کہ انھیں واقعی یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خلاف تشدد پر بھی اتارو ہوسکتے تھے۔ صحیح صورتِ حال سے واقفیت پر انھیں اطمینان کا جو احساس ہوا وہ خط سے ظاہر ہے اور وہ دلی کے واقعات کے بارے میں مبالغہ آمیز افواہوں کی فوراً تردید کرتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ عہدِ استعمار کے قبل بھی شمالی ہندوستان میں فرقہ وارانہ آویزشیں بالکل معدوم نہیں تھیں۔ لیکن غالب کی دلی میں ہمیں فرقہ وارانہ کشیدگی کی کوئی شہادت ملتی بھی ہے تو یہ ضروری نہیں کہ سیاق و سباق ہندو بہ مقابلہ مسلمان ہی کا ہو۔ ۱۸۱۶ء اور ۱۸۳۴ء میں یہ جین رتھ یاترا کے مسئلے پر ہندوؤں اور جینوں کے درمیان کشیدگی تھی، جس کے نتیجے میں (اگر رزیڈنٹ چارلس مٹکاف کا اعتبار کیا جائے تو) فساد ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ایک اور موقع پر یہ شیعوں اور سنیوں کے درمیان کشیدگی کا معاملہ تھا۔ انگریز عید اور رام لیلا کے موقع پر کشیدگی کو دور کرنے کے لیے سواروں کے دستے بے شک تیار رکھتے تھے لیکن ایسی کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی کہ انھیں کام میں بھی لایا گیا ہو۔ اس کے برعکس اس کی شہادت ملتی ہے کہ ان موقعوں پر جشن میں شرکت بلالحاظ مذہب و ملت کی جاتی تھی۔ "عوام میں مروج مذاہب اپنے اعتقادات و معمولات میں نہایت فراخ دل اور آزاد خیال تھے۔ ایسے بھی اولیا اور پیر تھے، مزاریں، درگاہیں اور مقدس مقامات تھے، یہاں تک کہ مقبولِ عام دیوی دیوتا بھی تھے، جن سے ہندو اور مسلمان یکساں عقیدت رکھتے تھے۔" خود بہادر شاہ ظفر نے حکم دیا تھا کہ رام لیلا کے جلوس کے راستے میں ایسے ترمیم کی جائے کہ وہ محل کے سامنے سے گزرے تاکہ وہ بھی اسے دیکھنے کا لطف اٹھا سکیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب انھیں بائبل کا عربی ترجمہ تحفے میں دیا گیا تو وہ بہت خوش ہوئے تھے۔"

منشی ذکاء اللہ جن کا دلی کے نہایت قدیم اور معزز باشندوں اور اہلِ علم میں شمار ہوتا تھا سی۔ ایف۔ اینڈریوز سے دلی میں ۱۹۰۴ء میں ملے۔ آگے چل کر دونوں گہرے دوست بن گئے اور ذکاء اللہ، جو ان معدودے چند بہ قیدِ حیات لوگوں میں سے تھے جنھوں نے فی الحقیقت غالب کی دلی میں زندگی بسر کی تھی، اینڈریوز کے ساتھ گھنٹوں مغلیہ حکومت کے آخری ایام میں شہر، اس کے باشندوں اور ان کے طرزِ زندگی کے بارے میں گفتگو میں گزارتے۔ مشہور مورخ پرسی وال اسپیر اس زمانے کی فرقہ وارانہ تعلقات کی صورتِ حال کے بارے میں اسی کسی قدر خوش دلانہ نتیجے کو پہنچے

ں تحمل کرنے میں احتیاط سے کام لینے کا مشورہ دیتا ہے جو ذکاء اللہ سے اپنی گفتگو کے زیر اثر لیلیویلڈ نے اخذ کیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ ذکاء اللہ وغیرہ نے خاصے اعتماد کے ساتھ اس امر کا ذکر کیا ہوگا۔ اسی لیے مسئلہ زیر بحث کے بارے میں لیلیویلڈ کی رائے اتنی قطعی اور غیر مبہم ہے:

> "مسلمانوں اور ہندوؤں کی ایک ہی شہر میں اکٹھے اور پہلو بہ پہلو رہائش کا نتیجہ عوام کے درمیان رسوم و رواج کے نمایاں امتزاج کی شکل میں ظاہر ہوا تھا۔۔۔ پرانی دلی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ان خصوصی دوستانہ تعلقات کے بارے میں میرے پاس کسی بھی دوسری حقیقت کے مقابلے میں زیادہ باوثوق اور تائیدی شہادت موجود ہے۔ یہ اطلاع مجھے دونوں طرف سے ملی ہے اور تقریباً ایک سی ہے۔ یہ بہ ظاہر اس شہر کی خصوصیت تھی جس پر خود وہاں کے باشندوں کو فخر تھا۔ ان نسبتاً معمر باشندوں نے، جن سے میں ملا، چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان، اس امر واقعہ کا ذکر بڑے جوش کے ساتھ کیا اور اس کا مقابلہ دورِ حاضر کی تلخی سے کیا۔۔۔ بہادر شاہ کے عہد میں دوسرے مذہب کے پیرو ہمسایوں کے ساتھ پُر امن زندگی بسر کرنے کے فن نے بہت ترقی کی تھی۔"

اس عہد میں بھی روایتی اسلامی تقلید پسندی کے علم بردار پائے جاتے تھے لیکن ان کا اثر شاہ ولی اللہ جیسے اشخاص کی وجہ سے، جو ہندستان میں اسلام کے دائرے کے اندر طاقت ور تحریکِ اصلاح کے بانی سمجھے جاتے تھے، کافی کم ہو گیا تھا۔ اس اصلاحی تحریک نے جس کی اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں شاہ ولی اللہ نے بنیاد ڈالی، مذہب کے بارے میں مباحثے کی آزادی کو جس کی اس کے قبل کوئی نظیر نہیں ملتی، بڑھاوا دیا۔ ایک طرف سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل کی تحریروں سے رہنمائی حاصل کرنے والے نام نہاد وہابی تھے تو دوسری طرف وہابیوں کی سرگرمی سے مخالفت کرنے والے روایت پسند تھے۔ شہر دلی دینی تحقیق و تفتیش کا ایک اہم مرکز بن گیا، جہاں مذہبی عقائد علما کی اجارہ داری سے نکل کر تمام تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لیے موضوعِ بحث بن گئے تھے لیکن اہم بات یہ ہے کہ متنازع فیہ مذہبی مسائل و عقائد بڑے جوش و خروش کے ساتھ زیرِ بحث آنے کے باوجود، تشدد یا کٹر دشمنی پر انگیختہ کرنے والے جذبات کو نہیں ابھارتے تھے۔ خود غالب سے ان کے ایک نہایت عزیز دوست اور ممتاز روایت پسند مولانا فضل حق نے [illegible] کے رد میں ایک مثنوی لکھنے کی درخواست کی۔ مثنوی تو غالب نے لکھی لیکن اس میں مسئلے کے بارے میں [illegible] حق کے نظریے پسندیدہ خیالات کی ترجمانی شاید ہی ہو پائی۔ فضل حق غالب کی کوشش سے قطعی مطمئن نہیں [illegible] لیکن جیسا کہ اس عہد کا عام رواج تھا، انھوں نے غالب سے اپنی دلی دوستی برقرار رکھی۔

اس عہد کا [illegible] عام طور پر عملی رواداری کی تھی، جس کے [illegible] میں بارہویں صدی عیسوی سے [illegible] غالب کے زمانے تک مسلمانوں کے لیے ایک [illegible] مسلک کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ [illegible] کائنات میں [illegible] سبیل الاعتدال [illegible] ریاست [illegible] کے ذریعے مہیا کرنے [illegible] قطعی [illegible] مذہب کے [illegible] ظاہری کو اہمیت نہیں [illegible] غالب [illegible] حقیقت [illegible] کو بھی

کیا نہیں رکھا۔ ۱۸۹۸ء کے ایک خط میں وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ ایک ایسے مولوی کی دھجیاں اڑاتے ہیں جس نے غالب کے پاس یہ پیغام بھجوایا تھا کہ وہ شراب ترک کر دیں (جیسا کہ سب جانتے ہیں شراب کا غالب کو ساری عمر بے حد شوق رہا)۔

دیکھا ہم کو یوں چلاتے ہیں۔ مدرسے کے ملاؤں کے کوتوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور رسائل ابو حنیفہ کا دیکھنا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ و وحدت وجود کو اپنے دل نشین کرنا اور ہے۔ علی الحقیقت "مولوی" مجھ جیسے اور طنز و تضحیک کا باقاعدہ نشانہ بن گیا تھا۔ چوں کہ یہ مختلف فرقوں کے درمیان بھائی چارے کا دور تھا۔ جب ہندو اور مسلمان آپس میں بہ آسانی گھل مل جاتے تھے۔ رسمی مذہب کے تقاضوں سے عموماً غیر معمولی لاپرواہی برتی جاتی بلکہ ان کا مذاق بھی اڑایا جاتا۔

زہد و اتقا کی نمائش کے عادی "واعظ" کی ریاکاری کا مضحکہ اڑاتے ہوئے غالب قاری کو بے حد محظوظ کرتے ہیں:

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

یا پھر اسی رنگ میں فارسی کا یہ شعر ہے:

زاہد از حور بہشتی بجز این نشناسد
کہ شود دست زد شوق و بکارت نہ رود

(زاہد حور بہشتی سے بہ جز اس کے اور کوئی سروکار رکھنا نہیں چاہتا کہ وہ اس کی خواہش کا ہدف بھی بنے اور اس کی دوشیزگی بھی برقرار رہے)

بنیادی طور سے وہ زہد و تقویٰ کو خداوند تعالیٰ سے سودے بازی کی غرض سے استعمال کرنے کے خلاف تھے:

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

ان کے فارسی مجموعۂ کلام میں بھی اس سے ملتا جلتا خیال ملتا ہے:

زاہد کہ ورزش مجود آمد ز دعوی وجود
تا نہ زد اہرمن رہش بندگی ملک نہ خواست

(زاہد کے لیے سجدوں کی ورزش اس کے پارسا وجود کا تر تصنع دعویٰ ہے۔ جب تک اہرمن نے اس کی راہ نہیں ماری اس نے فرشتوں کا بندہ نہیں مانا)

ان کا یقین تھا کہ انسان کے وجود کا عروج یہی اتنا ہے کہ اس کے جینے کے طور پر اور خدا کے تعلق کے لامحدود لطف و کرم کے ذریعے جو رحمی کرے۔ انسان کی راست دست رس میں ہے۔ روحانی اعتبار سے کوئی بلند درجہ کے لئے غالب عمل سے راست الرحمان کی تلاش میں عبادت کے رسمی طریقے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

نوی فنادہ چو نسبت ادب مجو غالب
نہ دیدہ کہ سوئے قبلہ پشت محراب است

(نسبت بھی ہو جو رسمی آداب مجلس کی پابندی کیا ضروری ہے۔ دیکھتے نہیں ہو کہ مسجد میں محراب کی پشت قبلے کی طرف ہے)

[illegible]

[illegible]

کمالاتِ عمل کی خواہش سے محروم، محض تعدد سجر کے جھگڑے میں پڑا ہے لیکن مطالعۂ الٰہی کا مشتاق شط و گل میں فرق نہیں کرتا) ۔

انھوں نے سب پر واضح کردیا کہ ان کی تنقید کا نشانہ اور کوئی نہیں تقلید پسندی کے علم بردار ہی تھے ۔

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

خود اپنے لیے وہ بلا جھجک قدیم رسوم کے خلاف نبرد آزما کے لیے مخصوص آزادی کا اعلان کرتے ہیں :

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی
کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب شرم تم کو مگر نہیں آتی

۔ سب جانتے تھے کہ غالب کی پیدائش ایک سنی گھرانے میں ہوئی تھی ۔ ان کا طرزِ زندگی اور مختلف مواقع پر اظہار ن ان کے مذہبی موقف کے بارے میں ہر طرح کی قیاس آرائیوں کا باعث ہوا ۔ دربار اور طبقہ ٔ امرا کے مختلف ں میں بعض خیال کرتے تھے کہ وہ شیعہ ہیں اور بعض کے خیال میں وہ تفضیلیے تھے ۔ خود غالب اس غیر یقینی کیفیت لطف اندوز ہوتے تھے ۔ ان کا رسمی مذہب کے تقاضوں کی ہنسی اڑانا اکثر ایک موضوعِ تفنن رہتا تھا ۔ نہ صرف یہ وہ رمضان کے روزے نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ اس بارے میں بہ شمول بادشاہ ان لوگوں سے جو دین داری پہ فریضہ م دیتے تھے مذاق بھی کرسکتے تھے ۔ وہ کھلم کھلا اقرار کرتے تھے کہ چوں کہ میں شراب پیتا ہوں آدھا مسلمان ہوں اور کا ادعا تھا کہ مذہبی رسم و رواج سے متعلق امور کی حد تک دوسرے میری روش کے بارے میں کیا کہیں گے اس فکر میں نے خود کو آزاد کرلیا ہے ۔

مذہبی رسوم کے تعلق سے اس علانیہ بے اتفاقی کی بنیاد دراصل ایک متجرانہ وسیع المشربی تھی ۔ نسلِ انسانی کے ن چارے پر یقینِ واثق تھا ، جس کی رو سے وجودی مفہوم میں تمام انسان ایک قادرِ مطلق کی الوہیت اور شفقت و ت کی علامتیں ہیں ۔

اس تصور کا تکمیلی جز نظریہ ٔ وحدت الوجود تھا ۔ غالب کے لیے یہ محض ذہنی یقین کلی کا معاملہ تھا ۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

ایک خط میں وہ ظریفانہ انداز سے اعلان کرتے ہیں کہ وہ ہر انسان کو چاہے وہ مسلمان ہو ، ہندو ہو یا عیسائی ، اپنا بھائی سمجھتے ہیں ۔ اس پر اکتفا کرتے ہوئے آگے وہ کہتے ہیں کہ مجھے اس کی پروا نہیں ہے کہ دوسرے اس خط ۔ نظر کی ۔ یہ کہتے ہیں یا نہیں ۔ اپنے ایک اور شعر میں وہ ادعا کرتے ہیں :

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

[illegible]

تعالی اللہ بنارس چشمِ بد دور — بہشتِ خرم و فردوسِ معمور

حلاج مشرباں چوں لب کشایند — بہ کیش خویش کاشی را ستایند

کہ ہر کس کاندراں گلشن بہ میرد — دگر پیوند جسمانی نہ گیرد

ودیں ویرینہ دیرستانِ نیرنگ — بہارش ایمن ست از گردشِ رنگ

بود در عرضِ بالِ افشانیِ ناز — خزانش صندل پیشانیِ ناز

ز تسلیم ہوائے آں چمن زار — ز موجِ گل بہاراں بستہ زنار

فلک را قشقہ اش گر بر جبین نیست — پس ایں رنگینیِ موجِ شفق چیست ؟

عبادت خانۂ ناقوسیان ست — ہمانا کعبۂ ہندوستان ست

بتانش را ہیولیٰ شعلۂ طور — سراپا نورِ ایزد چشم بد دور

زتابِ جلوۂ خویش آتش افروز — بتانِ بت پرست و برہمن سوز

بہ سامانِ دو عالم گلستاں رنگ — زتابِ رخ چراغانِ لبِ گنگ

مگر گوئی بنارس شاہدے ہست — ز گنگش صبح و شام آئینہ در دست

شبے پرسیدم از روشن بیانے — زگردش ہائے گردوں راز دانے

کہ بینی نیکوئی ہا از جہاں رفت — وفا و مہر و آزرم از میاں رفت

ز انساں ہا بہ جز نامے نہ ماندہ — بغیر از دانہ و دامے نہ ماندہ

پدرہا تشنۂ خونِ پسرہا — پسرہا دشمنِ جانِ پدرہا

برادر با برادر در ستیز است — وفاق از شش جہت رو در گریز است

ودیں بے پیگی ہائے علامت — چرا پیدا نمی گردد قیامت ؟

بہ بانگِ صور تعویق از پے چیست — قیامت راعناں گیرِ جنوں کیست

سوئے کاشی بہ انداز اشارت — تبسم کرد و گفتا ایں عمارت

کہ حقا نیست صانع را گوارا — کہ از ہم ریزد ایں رنگیں بنارا

بلند افتادہ تمکینِ بنارس — بود بر اوجِ او اندیشہ نارس

زکسے شہرت جنت کو بھی اپنے کعبے رنگیں ہے — بنارس کو خدا محفوظ رکھے چشمِ بد بیں سے

حلاج کا عقیدہ رکھنے والے سب یہ کہتے ہیں — بنارس میں جو مرجاتے ہیں وہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

یہ کعبۂ دیر • دیرستانِ عالم کا محبوبہ ہے — بدلتے موسموں سے ناشناسا اس کی دنیا ہے
بہار ایسی یہ رکھتا ہے چمن زار — کہ موجِ گل سے جو باندھے ہے زنّار
فلک یہ اپنی پیشانی پہ جو قشقہ لگاتا ہے — اسی کے گلشن و گل زار سے سرخی چراتا ہے
بنارس جانِ جاناں پائے تخت بت پرستاں ہے — بنارس ارضِ خوباں ہے زیارت گاہِ مستاں ہے
بنارس کو عبادت خانۂ ناقوسیاں کہیے — بنارس کو بجا ہے کعبۂ ہندوستاں کہیے
صنم یاں کے سبھی ہیں شعلہ ہائے طور سے گویا — ز سر تا پا عبادت ہیں خدا کے نور سے گویا
ہیں تابِ رخ سے اپنے آتش افروز — بتانِ بت پرست و برہمن سوز
وہ رخساروں کی تابانی نظر حیراں و ششدر ہے — لبِ گنگا سراسر اک چراغاں کا سا منظر ہے
بنارس کو اگر ٹھیرائیے اک شاہدِ زیبا — وہ جس کے رو بہ رو صبح و مسا گنگا کا آئینہ
وحیدِ عصر اک عالم سے میں نے ایک دن پوچھا — یہ آخر ماجرا کیا ہے سمجھ میں کچھ نہیں آتا
جو پوچھو دین و ایماں کی تو بس اک نام باقی ہے — مئے الفت کہاں باقی ہے • خالی جام باقی ہے
اِدھر ماں باپ ہیں اولاد سے برگشتہ و بدظن — اُدھر یہ حال ہے اولاد بھی ماں باپ کی دشمن
لڑے مرتے ہیں بھائی بھائی آپس میں خدا سمجھے — محبت • پیار • یاری • دوستی • عنقا ہے دنیا سے
قیامت کے سبھی آثار پیدا ہیں مگر پھر بھی — بہت حیران ہوں آخر قیامت کیوں نہیں آتی
مری اس بات کو سن کر تبسم زیرِ لب بولا — سوئے کاشی اشارہ کر کے وہ دانائے بے ہمتا
اسے دیکھو یہ شہرِ نور و نکہت یہ حسیں وادی — نہیں صنّاعِ فطرت کو گوارا اس کی بربادی
کہاں ہے فرشِ گیتی پر بنارس شہر کا ثانی — تصوّر خانہ • بانی بھی اس کے آگے بے معنی
کمندِ فکر اپنی نارسائی پر ہے شرمندہ — بلند • اوجِ ثریا سے بھی اس کا نقشِ تابندہ)

چناں چہ تعجب کی بات نہیں کہ غالب نے فی الواقع بنارس میں مستقل طور سے سکونت پذیر ہونے کا بھی ارادہ کیا تھا۔ ایک دوست کے نام خط میں وہ لکھتے ہیں : " میری تمنا تھی کہ ترکِ مذہب کر کے ایک مالا ہاتھ میں لے لیتا ماتھے پر قشقہ کھینچ لیتا • گلے میں زنار ڈال لیتا اور گنگا کنارے بیٹھ جاتا تاکہ خود کو وجود کی آلائشوں سے پاک کر سکتا اور قطرے کی طرح دریا میں ضم ہو جاتا۔"

اعتراف بیان کی ہے۔ یہاں ہمارے سامنے غالب ہی کی وہ [illegible] ہے جو موجودہ مذہب کی بندشوں اور تنگ نظری سے [illegible] کرتا ہے۔ مذہب کی بحث ڈالنے والی دیواروں کو اس حد تک [illegible] ہے کہ [illegible] کے برابر کر دیا گیا ہے۔ انسانوں کے درمیان تفریق کی علامت کو انسانیت کے اس تصور میں ضم کر دیا گیا ہے جو ہندو اور مسلمان کے [illegible] کے [illegible] ہے۔ اس سیکولرزم میں وہ [illegible] رواداری [illegible] ہے جس کے بغیر غالب کے [illegible] یہ [illegible] ممکن نہ ہوتا۔

[illegible] کے ناقوس [illegible] میں احرام

بلاشبہ دلیل لائی جاسکتی ہے کہ عام آدمی غالب کی انتہا پسندانہ سیکولرزم کا پوری طرح سے ہم نوا نہیں تھا۔ اس میں شک نہیں کہ صوفی سلسلہ ۔ تدریج میں غالب انتہائی وسیع المشرب گروہ کی نمائندگی کرتے تھے لیکن اگر ان کا عہد ان کے عقائد سے ایک حد تک مطابقت نہ رکھتا تو نہ ان کے لیے اپنے نظریے کا علانیہ اظہار اور اس پر عمل پیرا ہونا ممکن ہوتا اور نہ ہی انھیں بہ حیثیت شاعر اپنے کلام کے شائقین کی اتنی بڑی تعداد میسر ہوتی ۔ نہ ہی ، مثال کے طور پر ، ان کے خیالات سے بنیادی ناموافقت کے دور میں ایک ہندو ، منشی ہرگوپال تفتہ کے لیے غالب کا خاص الخاص شاگرد اور عزیز ترین دوست ہونا ممکن ہوتا ۔ نہ ہی غالب کے لیے ایک اور ہندو شیوجی رام برہمن کو اپنے بیٹے کے مثل قرار دینا ممکن ہوتا اور نہ ہی بہادر شاہ ظفر کے لیے ایک نوعیسائی ہندو ڈاکٹر چمن لال کا اپنے شخصی معالج کی حیثیت سے تقرر کرنا ممکن ہوتا ۔ فی الحقیقت ، کہا جاتا ہے کہ جب بعض لوگوں نے برہمی کے ساتھ بہادر شاہ سے ڈاکٹر چمن لال کی تبدیلیِ مذہب کی شکایت کی تو انھوں نے الٹ کر جواب دیا کہ اس میں کوئی خرابی نہیں ہے ۔

اس وسیع المشربانہ کیفیتِ مزاج نے زبانِ اردو کے ارتقا میں انتہائی موثر کردار ادا کیا ۔ مغلوں نے فارسی کو درباری زبان کی حیثیت دی تھی اور وہ اسے انتظامی اغراض کے لیے بھی استعمال کرتے تھے ۔ فارسی اسلامی تقلید پسندی کی بھی زبان تھی لیکن فارسی عوام کی زبان کبھی نہیں بن پائی اور نہ ہی یہ رووداروں کے گھروں میں بول چال کی زبان تھی ۔ فارسی سے مستفید ہونے والی لیکن اصلی خوراک عوام کی روز مرہ کی زبان کے محاورے اور خزانۂ الفاظ سے حاصل کرنے والی ایک زبان کا ارتقا ایک مسلسل عمل تھا ۔ صوفیا نے اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے ہمیشہ عوام الناس کی بول چال کی زبان کے استعمال کو ترجیح دی تھی ۔ ادب میں ولی دکنی (۱۶۶۸ء تا ۱۷۴۴ء) جنھیں اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے ، فارسی کے مقابلے میں اردو کو ترجیح دینے والے پہلے شاعر تھے ۔ ان کے بعد حاتم (سالِ پیدائش ۱۶۹۹ء) میر درد (سالِ وفات ۱۷۸۸ء) ، مظہر جانِ جاناں (۱۷۰۰ء تا ۱۷۸۱ء) ، سودا (۱۷۳۰ء تا ۱۷۸۰ء) ، میر تقی میر (۱۷۲۲ء تا ۱۸۱۰ء) ، انشاء اللہ خاں انشاء (سالِ وفات ۱۸۱۷ء) اور ناسخ (سالِ وفات ۱۸۳۸ء) جیسے دوسرے شعرا آئے ۔ اردو شاعری کو میر و سودا کی ذہن خاص طور سے قابلِ ذکر ہے ۔ سودا کے ہجویہ قصائد کی آب و تاب اور میر کی عشقیہ مثنویوں کے سوز و گداز اور بیگم تراشی سے پہلی بار اردو کے ادبی امکانات ظاہر ہوئے ۔ میر اس اردو کے استاد اور خصوصیت کے دعا پر ، جیسی کہ دہلی کی بول چال کی زبان کی حیثیت سے ارتقا پذیر ہوئی تھی ، بالارادہ فخر کرتے تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ جب لکھنؤ میں ان سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کی گئی انھوں نے یہ کہتے ہوئے انکار کردیا کہ لکھنوی میرا کلام سمجھ نہیں پائیں گے ۔ لوگوں کے اصرار کرنے پر انھوں نے الٹا جواب دیا کہ صرف وہی جو جامع مسجد دلی کی سیڑھیوں پر بولی جانے والی اردو سے واقف ہے ان کا لکھا سمجھ سکتا ہے ۔ اور یہ واقفیت اہلِ لکھنؤ کے پاس نہیں سکتی ۔ اس کے باوجود نوابانِ اودھ نہ صرف لکھنؤ کے اردو شعرا کی بلکہ دلی کے میر تقی میر کی طرح ترک وطن کرکے وہاں آنے والے دوسرے شعرا کی بھی فیاضانہ سرپرستی کرتے تھے ۔ ۱۸۰۳ء میں قرآن شریف کا پہلی بار فارسی سے اردو ترجمہ کیا گیا جو کہ نہ صرف مذہبی نقطۂ نظر سے ایک دور آفریں واقعہ تھا بلکہ اردو نثر کی قبولیت پر اپنے خوش آئند اثر کے لحاظ سے بھی ۔ اس طرح سے انیسویں صدی کی ابتدا میں اردو کو بہ حیثیت زبان قوت بھی مل گئی تھی اور اعتبار بھی حاصل ہوگیا تھا ۔ اس پیش رفت

کے نتیجے کے طور پر، جس کا صوفی طریقے کی سماج میں روز افزوں مقبولیت اور اسلامی تقلید پسندی کے گھٹتے ہوئے اثر کے ساتھ توافق زمانی بھی تھا، فارسی کی جگہ اس زبان کے مغل دربار کی اُزروئے قانون عام رابطے کی زبان بننے کے لیے فضا سازگار ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ فارسی کا نفسیاتی ورثہ اب بھی استوار تھا۔ مثال کے طور پر غالب اپنے اس خیال پر اڑے رہے کہ حقیقی مغل روایت کی زبان فارسی کے تعلق سے اردو کی حیثیت محض ایک انگمڑ گمس پٹھو کی ہے تاہم چوں کہ ان کے زمانے میں ان قوتوں کے جو اردو کی ترقی کا باعث تھیں، نتائج سامنے آچکے تھے آخرکار انھوں نے اسے قبول کرلیا اور ان کا شمار اس زبان کے ممتاز ترین فن کاروں میں ہونے لگا:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی   گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے کہ ۱۸۵۰ء کے دہے تک مقبول عام ادبی ذریعہ اظہار کی حیثیت سے اردو نے تقریباً کلیتہً فارسی کی جگہ لے لی تھی۔ فرحت اللہ بیگ اپنی زندہ جاوید مستند تصنیف "دلی کی آخری شمع" میں جس میں کم و بیش اسی زمانے کے ایک مشاعرے کی انھوں نے تشکیل جدید کی ہے، مشاعرے میں فارسی کلام پڑھنے والے واحد شاعر صہبائی کے تعلق سے سامعین کے ردِ عمل پر یوں تبصرہ کرتے ہیں: "(صہبائی کی غزل کی) خوب خوب تعریفیں ہوئیں مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ لوگوں کو مزہ نہ آیا۔۔۔ مگر جو بےچارے فارسی نہیں سمجھتے تھے، بیٹھے منہ دیکھا کیے۔ صاف بات تو یہ ہے کہ اردو کے مشاعرے میں فارسی کا ٹھونسنا کچھ مجھے بھی پسند نہ آیا۔"

غالب کے ہم عصروں میں ذوق، علوی، آزردہ، نیر، عیش، مومن، شیفتہ، جوہر، صہبائی، نظیر اکبرآبادی اور تفتہ جیسے آسمانِ ادب کے چاند ستارے شامل تھے۔ بہادر شاہ المتخلص بہ ظفر، خود مشہور شاعر تھے۔ ابتدائے عمر میں ان کے استاد مشہور شاعر نصیر تھے، بعد میں کہا جاتا ہے کہ وہ شاعر بےقرار سے صلاح لیا کرتے تھے، یہاں تک کہ بالآخر شیخ ابراہیم ذوق کی طرف رجوع ہوئے۔ ذوق کے انتقال کے بعد غالب شاعری میں استاد شاہ مقرر ہوئے۔ ظفر کے عہد میں مغل دربار نے اس مرکز کی حیثیت حاصل کرلی جہاں سے اردو ادبیات کی بہار کو تحریک اور رہ نمائی ملتی تھی۔ محل میں ہر ماہ دو بار پندرہ اور انتیس تاریخ کو، مشاعرے پابندی سے ہوتے تھے، جب کہ حضور والا فارسی اور اردو غزلیات کے لیے الگ الگ زمین تجویز فرماتے تھے۔ متعدد شاہ زادے اچھے شاعر تھے، جن میں خاص طور پر قابلِ ذکر ظفر کے منجھلے بیٹے مرزا فخرو ہیں۔ ہفتہ وار مشاعرے مدرسہ غازی الدین میں بھی یعنی اجمیری دروازے کے پاس جہاں بعد میں دلی کالج قائم کیا گیا تھا، منعقد ہوا کرتے تھے۔ شاعر ممنون کے گھر پر بھی مشاعروں کی محفل پابندی کے ساتھ جما کرتی تھی۔

ہر مسلمہ شاعر کے پاس عقیدت مند شاگردوں کا ایک گروہ ہوتا۔ فی الحقیقت استاد شاگرد کے رشتے نے خود ایک ادارے کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ غالب کے شاگردوں میں ممتاز علائی اور ہرگوپال تفتہ تھے۔ مومن کے شاگردوں میں شیفتہ، تسکین، رقم اور حیا شامل تھے۔ دیوان ذوق کے بےحد عقیدت مند اور اکثر شاگرد تھے، جو ہر ایک سے ان کے استاد پر تنقید کرنے پر جُٹ جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ مہذب زندگی کے خواہش مند ہر فرد کے لیے اچھا شاعری کرنے اور اس کی قدر پہچاننے کی آموزش لازمی ہو گئی۔ چناں چہ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اساتذہ

صحن کے پاس اصلاح اور رائے زنی کے لیے پیش کیے جانے والے اشعار کی بھرمار ہوگئی ۔ صحیح اردو لکھنے کا فن گہرے مطالعے کا موضوع اور اکثر تلخ مباحثوں کا باعث بن گیا تھا ۔ شہر کے مانے ہوئے سرکردہ شاعر غالب اور استاد شاہ ذوق کے درمیان رقابت پر سارا شہر انتہائی دل چسپی کے ساتھ نگاہ رکھے ہوئے تھا ۔

مشاعرے کا آغاز بڑے جتن سے منضبط کیے ہوئے آداب و رسوم کی پابندی کے ساتھ ہوتا تھا جس میں شاعروں کی نشست پر خاص توجہ دی جاتی تھی ۔ یہ سوال کہ مشاعرہ شروع کون کرے گا اور ختم کون کرے گا تلخی کا سبب ہوتا تھا ۔ طرح کا مقرر کرنا بھی قیل و قال اور نزاع کی ایک وجہ تھا ۔ فی الحقیقت یہ جھگڑے اتنے شدید ہوگئے کہ بہادر شاہ کو اپنے پندرھواڑے کے مشاعرے موقوف کرنے پڑے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سارے معاشرے کو اپنی گرفت میں لے لینے والا اردو شاعری کا ماحول ہی تھا جسے غالب کے عہد کی وضاحت کے ساتھ تصویر کشی کرنے والی علامت کے طور سے پیش کیا جاسکتا ہے ۔ اور یہ امر واقعہ کہ ممتاز شعرا کا کلام گلیوں میں بھاٹ اور گویئے گاتے پھرتے تھے اس بات کی دلیل ہے کہ یہ شاعری اب محض مہذّب رودادوں کا شوقِ بےحد نہیں رہی تھی بلکہ عوام بھی اس سے لطف اندوز ہوتے اور اسے سمجھتے تھے ۔ جیسا کہ منشی ذکاء اللہ نے سی ۔ ایف ۔ اینڈریوز کو بتلایا : " بادشاہ ہو یا فقیر سبھی شاعری کی دیوی کے شکار تھے ۔"

بہادر شاہ ظفر کے عہد میں دلی کے آخری مشاعرے کے مقام انعقاد مبارک النسا کی حویلی میں تیاریوں کی وہ روداد جو ہمیں فرحت اللہ بیگ کے پاس ملتی ہے اس لائق ہے کہ اسے شروع سے آخر تک نقل کیا جائے :

" چونے میں ابرک ملاکر مکان میں قلعی کی گئی تھی جس کی وجہ سے درو دیوار جگ مگ کر رہے تھے ۔ صحن کو بھروا کر تختوں کے چوکے اس طرح بچھائے تھے کہ چبوترہ اور صحن برابر ہوگئے تھے ۔ تختوں پر دری چاندنی کا فرش ، اس پر قالینوں کا حاشیہ ۔ پیچھے گاؤ تکیوں کی قطار ۔ جھاڑ فانوسوں ، ہانڈیوں ، دیوار گیروں ، قمقموں ، چینی قندیلوں اور گلاسوں کی وہ بُہتات تھی کہ تمام مکان بقعہ ، نور بن گیا تھا ۔ جو چیز تھی خوب صورت اور جو شئے تھی قرینے سے ۔ سامنے کی صف کے بیچوں بیچ چھوٹا سا سبز مخمل کا کارچوبی شامیانہ ، گنگا جمنی چوبوں پر سنہری ریشمی طنابوں سے استادہ تھا ۔ اس کے نیچے سبز مخمل کی کارچوبی مسند ، پیچھے سبز* کارچوبی گاؤ تکیہ ، چاروں چوبوں پر چھوٹے چھوٹے آٹھ چاندی کے فانوس کسے ہوئے ! فانوس کے کنول بھی سبز ، چوبوں کے سنہری کلسوں سے لگا کر نیچے تک موٹے موٹے موتیا کے گجرے سہرے کی طرح لٹکے ہوئے ، بیچ کی لڑیوں کو سمیٹ کر کلابتونی ڈوریوں سے جس کے سروں پر مقیش کے گچھے تھے اس طرح چوبوں پر کس دیا گیا تھا کہ شامیانے کے چاروں طرف پھولوں کے دروازے بن گئے تھے ۔ دیواروں میں جہاں کھونٹیاں تھیں وہاں کھونٹیوں پر اور جہاں کھونٹیاں نہیں تھیں وہاں کیلیں گاڑ کر پھولوں کے ہار لٹکا دیے تھے ۔ اس سرے سے لگا کر اُس سرے تک سفید چھت گیری جس کے حاشیے سبز تھے ، کھنچی ہوئی تھی ۔ چھت گیری کے بیچوں بیچ موتیا کے ہار لٹکا کر لڑیوں کو چاروں طرف اس طرح کھینچ دیا گیا تھا کہ پھولوں کی چھتری بن گئی تھی ۔ ایک صحن چی میں پانی کا انتظام تھا ۔ کورے کورے

* سبز رنگ دہلی کا شاہی رنگ تھا

گھڑے رکھے تھے اور شورے میں جست کی صراحیاں لگی ہوئی تھیں ۔ دوسری صحن چی میں پان بن رہے تھے ۔ باورچی خانے میں حُقّوں کا تمام سامان سلیقے سے جما ہوا تھا ۔ جا بہ جا نوکر صاف ستھرا لباس پہنے دست بستہ مودّب کھڑے تھے ۔ تمام مکان مشک و عنبر اور اگر کی خوش بو سے پڑا مہک رہا تھا ۔ قالینوں کے سامنے تھوڑے فاصلے پر حُقّوں کی قطار تھی ۔ حُقّے ایسے صاف ستھرے تھے کہ معلوم ہوتا تھا ابھی دوکان پر سے اٹھ آئے ہیں ۔ حُقّوں کے بیچ میں جو کچھ جگہ چھوٹ گئی تھی وہاں چھوٹی چھوٹی تپائیاں رکھ کو ان پر خاص دان رکھ دیے تھے ۔ خاص دانوں میں لال قند کی صافیوں میں لپٹے ہوئے پان ۔ گلوریوں کو صافی میں اس طرح جمایا تھا کہ بیچ میں ایک تہہ پھولوں کی آگئی تھی ۔ خاص دانوں کے برابر چھوٹی چھوٹی کشتیاں ، ان میں الائچیاں ، چکنی ڈلیاں اور بن دھنیا ۔ مسند کے سامنے چاندی کے دو شمع دان ۔ اندر کافوری بتّیاں ، اوپر ہلکے سبز رنگ کے چھوٹے کنول ۔ شمع دانوں کے نیچے چاندی کے چھوٹے لگن ، لگنوں میں کیوڑا ۔ ۔ ۔ ۔ "

فارسی اور اردو کی سنگی طباعت کے لیے دلی میں چھاپنے کی مشین کی تنصیب سے لسانی سرگرمیوں کے حلقہ و اثر میں اضافہ ہوا ۔ غالب کا اردو دیوان ۱۸۴۱ ء میں اور فارسی دیوان ۱۸۴۵ ء میں شائع ہوا ۔ یہ امر واقعہ کہ ۱۸۴۷ ء ان کے اردو دیوان کی اشاعتِ دوم عمل میں آئی نہ صرف ان کے اردو کلام کی مقبولیت کا بلکہ ادبی ذوق کے حلقے بڑھتی ہوئی وسعت کا بھی ثبوت ہے ۔ ہندستان کے بعض قدیم ترین اخباروں کا اجرا بھی اسی زمانے میں عمل میں آیا ۔ بہ سی ۔ ایف ۔ اینڈریوز پہلا اردو اخبار کسی مولوی محمد باقر کی ادارت میں جاری ہوا ۔ دوسرے دو اخباروں میں " فوائد رین " اور " قران السّعدین " کی ادارت نام ور فاضل ماسٹر رام چندر کرتے تھے ۔ جو بہ شمول ڈاکٹر چمن لال ان ممتاز وں میں سے ایک تھے جنھوں نے عیسائیت اختیار کرلی تھی ۔ انگریزی کا پہلا اخبار " دلی گزٹ " تھا ۔ اس بات کی ت ہے کہ ۱۸۳۰ ء کے دہے میں ہی لوگوں کے لیے یہ ممکن تھا کہ ایک سے زاید اخباروں میں سے کسی کا بھی انتخاب) اور اس کے خریدار بنیں اور وہ اچھے اور گھٹیا اخبار کے فرق کو پہچاننے بھی لگے تھے ۔ غالب کے ایک دوست نے ریعہ خط ان سے اخبار " آئینہ ء سکندر " کے دلی میں مستقل خریدار فراہم کرنے میں مدد کی فرمائش کی ، جس کے ب میں غالب نے لکھا :

" صاحبِ من ، میری آنکھیں " آئینہ ء سکندر " کے مشاہدے سے روشن ہوئیں اور اس کی صفائے عبارت نے رشتہ ء تحریر میں موتی پروئے ۔ عمدہ بیان ، مختصر خبریں ، دل پسند نکتے اور نظر فریب نگارش اس کے صفحات کی زینت ہیں ۔ آپ کا سحرِ قلم تو میرے دل و جان پر چلتا ہے اور میں ان اوراق کو دوسروں سے متعارف کرانے میں بہترین طریقے سے کوشاں ہوں ۔ اس دیا کے رہنے والے " جامِ جہاں نما " کی نامعتبری سے بد دل ہیں ، یوں بھی یہ لوگ اخبار نویسی کا صحیح ذوق نہیں رکھتے ۔ انصاف بالائے طاعت ، ایسا کم اتفاق ہوتا ہے کہ " جامِ جہاں نما " اس ہفتے میں یہ خبر شائع کرے اور دوسرے ہفتے میں خود ہی اس کی تردید نہ کردے ۔ ایک ہفتے میں سرکار انگریزی کی والیِ لاہور سے جنگ کی بات کرتا ہے

کہ وہ موسم زمستان کی آمد سے پہلے چھڑ جائے گی اور دو ہفتے بعد خود ہی یہ اطلاع دیتا ہے کہ وہ خبر غلط تھی۔ اس ہفتے میں یہ خبر چھپتی ہے کہ اکبر آباد کی مسجد جامع اور روضۂ تاج گنج کو اس قیمت پر فروخت کیا جارہا ہے اور دو ہفتے گزرنے پر خود ہی اعلان کرتا ہے کہ فرماں روایانِ کونسل اس بیع و شرا کو جائز نہیں سمجھتے۔" (فارسی سے ترجمہ: ڈاکٹر تنویر احمد علوی)

تاہم "جامِ جہاں نما" کی کوتاہیاں غالب کو کسی وبا کی طرح تیزی سے پھیلنے والی "اخبار کی لت" سے محفوظ نہیں رکھ سکیں۔ افواہوں یا قیاس کی توثیق کے لیے اخبارات کی مانگ میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا اور اپنے خطوط میں غالب خود اپنے اس میلانِ خاطر کا ذکر کرتے ہیں۔

صدی کے وسط تک یہ ایسا لگتا ہے کہ اخبارات میں اتنی سکت آچکی تھی کہ خود اپنے شہر کے علاوہ دوسرے شہروں کے دل چسپ، اہم اور قابلِ اشاعت واقعات کا احاطہ کرسکیں۔ چناں چہ بمبئی کے اردو اخبار "احسن الاخبار" نے ١٨٤٧ء میں قمار بازی کے الزام میں غالب کی گرفتاری کی طول طویل تفصیلات شائع کیں۔ خود شہر دہلی میں ایک معاصر اخبار نے اداریے میں برہمی کا اظہار کیا۔ ہفتہ وار "سراج الاخبار" دربار کے اطلاع نامے کی حیثیت سے محل کے چھاپہ خانے سے شائع ہوتا تھا۔ لیکن اس میں کابل اور ڈیرہ غازی خاں جیسے دور دراز مقامات سے "نامہ نگاروں" کی بھیجی ہوئی اطلاعات یا قبرص میں فرانسیسیوں اور انگریزوں کے مابین کش مکش جیسے نسبتاً بعید از کار معاملات پر تبصرے بھی شائع ہوتے تھے۔ یہ نہیں کہ اطلاعات ہمیشہ صحیح رہتی ہوں لیکن ان سے اخباروں میں خبروں کی پیش کشی کی روز افزوں وسعت اور راست تعلق نہ رکھنے والے واقعات سے باشندگانِ دہلی کی دل چسپی کے پھیلتے ہوئے دائرے کی نشان دہی ہوتی ہے۔

ادّعا کیا جاتا ہے کہ "امنِ برطانوی" کے قیام نے لکھنو اور دوسرے شہروں کو ممتاز شعرا کی منتقلی پر روک لگی اور نتیجتاً اس سے دہلی میں اردو کی نشاۃ ثانیہ کو مدد ملی۔ مشاہدے پر مبنی شہادت سے پتہ چلتا ہے کہ ١٨٠٣ء کے بعد دہلی کی آبادی میں واقعی اضافہ ہوا لیکن دہلی کی ذہنی فضا پر انگریزوں کے اثر کی نشان دہی اس سے کہیں زیادہ فیصلہ کن طریقوں سے بھی کی جاسکتی ہے۔ ہندستان میں اپنے بالکل ابتدائی عہد سے ہی انگریزوں نے تعلیمی اداروں کے قیام پر خاص توجہ دی تھی۔ جس کی وجہِ تحریک بنیادی طور پر ان کی یہ خواہش تھی کہ نوآبادیاتی حکومت کے استحکام کے لیے انگریز افسروں کے لیے دیسی زبانوں اور تہذیب سے واقفیت کا موقع فراہم کیا جائے۔ خیال یہ تھا کہ ان اداروں سے زیرِ حکومت افراد خصوصاً ان کے سرداروں کو تہذیبی نقطۂ نظر سے محکوم بنانے میں بھی مدد ملے گی۔ چناں چہ وارن ہیسٹنگز نے ١٧٨١ء میں کلکتے میں مشہور مدرسۂ عالیہ قائم کیا، مسٹر ڈنکن نے ١٧٩١ء میں بنارس میں ہندو سنسکرت کالج کی بنا رکھی اور ١٨٠٠ء میں کلکتے میں لارڈ ویلزلی نے فورٹ ولیم کالج کی تاسیس کی۔ ١٨٠٣ء تک فورٹ ولیم کالج کے ڈاکٹر جان گل کرائسٹ انگریزی کی منتخب کہانیوں کا ہندستانی، فارسی، عربی، برج بھاشا، بنگالی اور سنسکرت میں ترجمہ کرچکے تھے (اس کے لیے انھوں نے رومن حروف استعمال کیے تھے)۔ آگرہ کالج ١٨٢٣ء میں قائم کیا گیا اور بعد میں بمبئی، بنگال اور مدراس تینوں پریزیڈنسی صوبوں میں یونی ورسٹیوں کی ابتدا ہوئی۔ دہلی میں مدرسۂ غازی الدین میں ١٧٩٢ء سے یہ [illegible] اسکول کی برطانوی مجلسِ تعلیمِ عامہ کی طرف سے فراہم کردہ مالی وسائل سے تعلیمِ جدید عمل میں آئی اور اس طرح دہلی کالج قائم ہوا۔

۱۸۲۴ء سے ۱۸۵۷ء تک دلی کالج سی۔ ایف۔ اینڈریوز کے الفاظ میں "دانشِ جدید" کو رواج دینے کا ایک مرکز
ن گیا۔ ناگزیر طور پر واضح ترین مرکزِ توجہ لسانی تھا۔ انگریزی زبان و ادب کی جماعتیں ۱۸۲۷ء میں شروع کی گئیں، جن
کے نصاب میں گولڈ اسمتھ کی تصنیف "مسافر اور اجڑا گاؤں" پوپ کا "مقالہ متعلق بہ انسان" ملٹن کی نظم "فردوسِ گم
دہ" اور اعلیٰ ترین جماعتوں میں شیکسپیر کے ڈرامے، بیکن کی تصنیف "فروغِ دانش" اور برک کے "مضامین و تقاریر"
امل تھیں۔ کالج میں اردو، عربی اور فارسی ادب کے لیے ایک علاحدہ "اورینٹل" یعنی مشرقی شعبہ بھی تھا جس کو ۱۸۲۸ء
ے اپنے نصاب کی جامعیت کے لحاظ سے انگریزی شعبے سے برابری کا درجہ حاصل ہو گیا تھا اور شعبہ نہایت مقبول بھی
ھا۔ اینڈریوز کہتے ہیں: "مشرقی شعبہ۔۔۔۔ واقعی بہت مقبول ہو گیا تھا۔ جدید انگریزی علوم کی تحصیل کے لیے طلبا ان
ماعتوں کو جہاں ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ چھوڑتے نہیں تھے۔ فارسی اور عربی میں طلبا کی جس معیار تک رسائی ہوتی تھی وہ
کثر بہت اونچا ہوتا تھا۔" واقعی بعض نہایت ممتاز مشاہیرِ ادب مثلاً نامور اردو شاعر الطاف حسین حالی، اردو اور
رسی کے مسلم الثبوت نثر نگار نذیر احمد، عربی کے ممتاز فاضل مولوی ضیاء الدین، مورّخ اور بے شمار تصانیف کے مترجم
ولوی ذکاء اللہ اور ادبی تنقید کی کتاب "خم خانہ جاوید" کے مصنف محمد حسین آزاد کا تعلق اسی مشرقی شعبے سے ہے۔

مختلف وجوہ سے دلی کالج سے مربوط تعلیمی نشاۃ ثانیہ ادبی سرگرمیوں کے بہ مقابل اس جوش و خروش کے لیے جو
س نے علومِ طبیعیات کی تحصیل کے لیے پیدا کیا اور ان مواقع کے لیے جو اس نے اس غرض سے فراہم کیے زیادہ قابلِ
جہ ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو اس کے اور اس کلکتہ جاگرن (نشاۃ ثانیہ) کے مابین امتیاز قائم کرتی ہے، جہاں زور
یادہ تر ادبی مطالعے پر تھا۔ کلکتہ کے اولین تعلیمی اداروں نے جنھیں بنیادی طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں کو "دیسی
بانوں" کی تعلیم دینے کے لیے قائم کیا گیا تھا، انگریز شاعروں اور ناول نگاروں کی تصانیف اور دیسی بنگالی ادب، فارسی،
ربی اور اردو کے زیادہ باقاعدہ مطالعے سے دل چسپی پیدا کی تھی۔ یہ دل چسپی ایک ایسے ادبی جوش و خروش کا باعث
وئی جو انگریز عہدہ داروں کے محدود افادیت پسند مقاصد سے کہیں زیادہ متجاوز ہو کر بنگالی روداروں کا بنیادی موضوع بن
یا۔ تاہم دلی میں انگریزی جماعتوں کے قیام کو یک گونہ مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا جس کا سبب آبائی مذہب سے برگشتہ اور
سائی مذہب میں داخل کیے جانے کا خوف تھا، جو محض ایک حد تک اس وقت کم ہوا جب ۱۸۲۹ء میں لکھنؤ کے ایک
متاز امیر نواب اعتماد الدولہ نے دلی کالج کے حق میں ایک بیش بہا جائداد وقف کی۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اردو کی
بے مثل مقبولیت پر منتج ہونے والی ادبی سرگرمیوں کی حقیقی نشاۃ ثانیہ کا آغاز دلی کالج کے قیام کے پہلے ہو چکا تھا۔ کالج
اس جاری و ساری عمل کو شروع تو نہیں کر سکتا تھا محض آگے بڑھا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بہادر شاہ ظفر کے تحت
ن دربار کی حیثیت ادبی سرگرمیوں کے لیے ایک مرکزی ادارے کی تھی جس نے کلکتہ کے برعکس جہاں اس طرح کی
ابی سرپرستی میسر نہیں تھی، اسے بلاشرکت غیرے اپنا رول ادا کرنے کا موقع نہ دے کر اس کی اہمیت کو گھٹا دیا۔ کالج
دراصل لوگوں کی قوتِ متخیلہ کو گرفت میں لیا تو ان دریچوں کی بہ دولت جو اس نے مغرب میں علومِ طبیعیات کی
حصیل میں باشی رفت کے مشاہدے کے لیے باز کیے تھے۔ علومِ طبیعیات پر انگریزی کتابوں کا جاں کنی لیکن جوش و
روش سے صفحہ بہ صفحہ اردو میں ترجمہ کیا جاتا اور نقلیں تقسیم کی جاتیں۔ سرگرم طلبا نے بکثرت علومِ طبیعیات کے لیے

وقف، چار پینی قیمت والے ماہ نامے کی اشاعت شروع کی۔ اس اعتماد کی وجہ سے جو ادب کے شعبے میں اردو نے اس وقت تک حاصل کرلیا تھا، اس کی تکنیکل معلومات کے ذریعہ، ابلاغ کی حیثیت سے قلبِ ماہیت میں مدد ملی۔ طبعیات اور کیمیا کے تجربوں یا ریاضی کے اطلاق کے پہلے پہل مشاہدے نے ایسا لگتا ہے کہ جوش و خروش کی ایک برقی لہر دوڑا دی تھی۔ سی۔ ایف۔ اینڈریوز لکھتے ہیں: "پرانے دلی کالج میں ممکن الحصول تعلیم کا یہ درجہ با مقبول شعبہ وہ تھا جس کا سروکار علومِ طبعیات سے تھا۔ ۔ ۔ ۔ اپنے بڑھاپے میں منشی ذکاء اللہ چمکتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ کتنے اشتیاق سے وہ سائنس کے لکچر سننے جاتے تھے اور کیسے ہر لکچر کے بعد نوٹ کا بار بار مطالعہ کیا جاتا تھا اور طلبہ اس کی متعدد نقلیں تیار کرتے تھے۔ گویا ہم ذہنِ انسانی کے ایک بالکل نامعلوم علاقے میں داخل ہورہے ہوں۔"

کالج کے بعض طلبہ نے بعد میں سائنس کو اپنی دین کی بہ دولت امتیاز حاصل کیا۔ ماسٹر رام چندر، جنھوں نے وظائف اور انعامات حاصل کرکے اپنی تعلیم مکمل کی، آگے چل کر ریاضی کے پروفیسر بنے، تفرقی احصا Differential calculus) پر جن کی تصنیف یورپ میں قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ شمالی ہند کے اولین ڈاکٹروں میں سے ایک ڈاکٹر مکند لال، جن کی طبِ مغرب سے گہری واقفیت کی وجہ سے بڑی عزت تھی، کالج کے طالبِ علم رہ چکے تھے۔ کالج کے ایک اور ممتاز فارغ التحصیل سرسید احمد خاں تھے جنھیں ریاضی اور علمِ آثارِ قدیمہ میں یکساں درک حاصل تھا اور جنھوں نے بعد میں ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ میں مسلم اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا۔ طلبا بادی النظر میں ارکانِ شعبہ، تعلیم کی دل سے عزت کرتے تھے اور اسی طرح معلوم پڑتا ہے کہ اساتذہ بھی علم کا شوق رکھنے والے اپنے طلبہ کی ذہنی نشوونما میں بےحد دل چسپی لیتے تھے۔ اس امر کی شہادت ہے کہ کالج کے پرنسپل ٹیلر اپنے شاگردوں میں خاص طور پر جوش پیدا کرتے اور انھیں حوصلہ دیتے تھے۔ دوسروں مثلاً باشندہ، فرانس بطروس اور باشندہ، جرمنی اسپرنگر کا احترام کیا جاتا تھا اور انھیں پسند کیا جاتا تھا۔ ایمیلی بیلی اپنی یادداشتوں میں اسپرنگر کے بارے میں یاد تازہ کرتی ہیں: "ایک عجیب باشندہ، جرمنی ڈاکٹر اسپرنگر (دلی کالج کے) پرنسپل تھے۔ ان کی بیوی نے جو انھیں کی طرح ایک قابلِ قدر لیکن عامی باشندہ، جرمنی تھیں اور جن سے میں واقف تھی مجھ سے کہا کہ شام میں مجھے گھر پر اکیلا چھوڑ کر باہر جانے سے روکنے کے لیے مجھے اپنے شوہر کا پتلون چھپادینی پڑتی تھی۔"

یقیناً شہر میں مغربی سائنسی نظریات کے ناقدر شناس بھی تھے۔ یہ ناگزیر تھا کیوں کہ "دانشِ نو" کو کالج کے احاطے میں قرنطینہ میں نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ جوش میں آئے ہوئے طلبہ اکثر گھر پر اکٹھا ہوکر اپنے سائنسی مباحثوں کا جاری رکھتے یا اپنے والدین کی موجودگی میں، جو بالکل چپ گم سم ہوتے کہ کیا ہورہا ہے، نئے تجربے انجام دیتے۔ ماسٹر رام چندر اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں: "عربی کے ذریعے پڑھائے جانے والے قدیم فلسفے کے عقائد اس طرح جدید سائنس کے زیادہ قرینِ عقل اور تجربے پر مبنی نظریات کے سامنے ناند پڑگئے مثلاً اس قدیم عقیدے کی کہ زمین کائنات کا ایک جگہ قائم مرکز ہے دلی کالج کے مشرقی شعبے اور نیز انگریزی شعبے کے منتہی طلبہ ہنسی اڑاتے تھے۔ لیکن شہر میں رہنے والے اہلِ علم قدیم یونانی فلسفے کے اپنے پسندیدہ نظریات کے تعلق سے جن کی گزشتہ کئی صدیوں سے ان کو تعلیم دی جارہی تھی، اس بدعت کو بہ نظرِ استحسان نہیں دیکھتے تھے۔" اگر ان تقلید پسندوں اور سن رسیدہ حضرات کے عقائد نہیں تو کم از کم ان

کے خدشات بالکل بے بنیاد نہیں تھے ۔ اس زمانے میں انگریزوں کے رواج دیے ہوئے نئے خیالات اور دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے حلقہ ، عیسائیت میں شمول کے مابین ایک ربط باہمی قائم ہوچکا تھا ۔ بپٹسٹ تبلیغی انجمن نے ۱۸۱۸ ء میں اپنا کاروبار شروع کردیا تھا اور جب ۱۸۵۲ ء میں " انجمن تبلیغ انجیل " کا قیامِ عمل میں آیا تو اس کے حقیقی مقاصد کو پوشیدہ رکھنے کی کوششیں بھی رفتہ رفتہ ترک کردی گئیں ۔ یہاں تک کہ عیسائی مبلغین کا بڑھتا ہوا اثر وسیع المشرب غالب کے بھی پیش نظر تھا ۔ انھوں نے ان کی سرگرمیوں کے بارے میں لکھا :

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر   کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

چناں چہ راسخ العقیدہ " دانشِ نو " کو تبدیلِ مذہب کے ذریعے نئے پیرو بنانے کی غرض سے مروجہ مذاہب کو درہم برہم کرنے کا بڑی ہوشیاری سے ایجاد کیا ہوا ایک وسیلہ سمجھنے میں حق بہ جانب تھے ۔ یہ امر واقعہ کہ " دانشِ نو " کے مشہور اور ممتاز حامیوں میں سے ایک ماسٹر رام چندر اپنا آبائی مذہب ترک کر کے عیسائی ہوگئے تھے بہ ظاہر ان کے خدشات کو صحیح ثابت کرتا تھا ۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ وہ اپنے نسبتاً کم عمر ہم مذہبوں کی سادہ لوحی کو شبہہ کی نظر سے دیکھنے کا میلان رکھتے تھے ۔ ایک ہم عصر انگریز ، شاید " دیسیوں " کی جہالت اور توہم پرستی کو ڈرامائی شکل میں پیش کرنے والے ارادی مضحکہ انگیز تصرف کے ساتھ لکھتا ہے کہ مرادآباد کے ایک نواب نے کوپرنیکس کے ذکر پر کس طرح اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا :

" اور جناب کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی کسی دوربین کی شہادت کو میں رسولِ پاک کی شہادت کے مقابل رکھوں گا ؟ نہیں جناب ، آپ یقین رکھیے کہ دوربین میں مغالطہ بہت ہے ، اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا ۔ میں نے بہتیرے یورپی صاحبوں سے گفتگو کی ہے اور میرے خیال میں ان دوربینوں پر کامل عقیدہ ان کی بڑی بھول ہے ، ان کی شہادت کو وہ حضرت موسیٰؑ ، ابراہیمؑ اور الیاسؑ جیسے نبیوں کی شہادت پر فوقیت دیتے ہیں ! یہ دوربینیں کتنی موجب ضرر ہوسکتی ہیں اس کے خیال سے بھی وحشت ہوتی ہے ! نہیں جناب ، ہمیں نبیوں کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے رہنا چاہیے ، ان کا کہا سچ ہے ، وہ واحد سچ جس پر اس زندگی میں ہم کلیتہً بھروسہ کرسکتے ہیں ۔ میں ساری دنیا کی دوربینوں کی شہادت کو صد نامہ ، قدیم و جدید یا قرآن شریف میں مذکور معمولی سے معمولی نبی کے فرمودہ ایک لفظ کے مقابلے میں بھی بالکل بے حقیقت مانوں گا ۔ جنابِ من ، پیغمبروں کا ہاتھ تھامے رہیے اور اپنی دوربینیں پرے پھینکیے ، ان میں کوئی سچائی نہیں ہے ؛ بعض دوربینیں تو لوگوں کو الٹا کردیتی ہیں اور ان کو سر کے بل چلتا دکھاتی ہیں اور اس کے باوجود اس شہادت کو آپ انبیاء کی شہادت کے مقابلے میں پیش کرتے ہیں ۔"

جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں یہ آبائی مذہب سے برگشتہ کرا کے عیسائی مذہب میں لئے جانے کا خوف تھا جس نے تقلید پسندوں کے ردِ عمل کو اتنا شدید اور ارادی طور پر خود فرض پر مبنی بنا دیا تھا ، ورنہ معاشرے کا ذہنی مزاج جس نے اردو کو فارسی کی جگہ لینے کی اجازت دی تھی یا جس کے نتیجے میں مذہبی وسیع المشربی کو اتنی [illegible] عام مقبولیت

حاصل ہوتی تھی۔ نئی سائنس کے حق میں بھی کام کرتا۔ فی الحقیقت اس امر کی شہادت ہے کہ تقلید پسندوں کی لگائی ہوئی قیود و شرائط کے باوجود مغربی علوم طبیعیات کی تحصیل کا دائرہ اثر بہت وسیع تھا۔ چاہے اس کا اثر قبول کرنے والوں میں سے بعض اس کے بارے میں اتنے پر جوش نہ بھی رہے ہوں جتنے ماسٹر رام چندر یا منشی ذکاء اللہ تھے۔ ۱۸۵۰ء کے دہے کی ابتدا میں سید احمد خاں آئینِ اکبری یعنی اکبر کے عہد میں مغلیہ نظم و نسق پر ابوالفضل کی مستند کتاب کو بعد تہذیب و تدوین شائع کر رہے تھے۔ انھوں نے شہر کے دیگر ممتاز اشخاص کے ساتھ ساتھ غالب سے بھی ایک تقریظ لکھنے کی فرمائش کی لیکن غالب آئینِ اکبری پر قوت صرف کرنے کو فضول ماضی پرستی قرار دیتے ہیں۔ چناں چہ وہ سرسید سے کہتے ہیں: "ان صاحبانِ انگلستان کو دیکھو۔۔۔۔ وہ ہمارے مشرقی پُرکھوں سے کہیں آگے نکل چکے ہیں۔ باد و موج کو انھوں نے بے کار بنادیا ہے۔ ان کے جہاز آگ اور بھاپ سے چلتے ہیں۔ وہ ساز سے نغمہ بغیر مضراب کے پیدا کرتے ہیں اور اپنے جادو سے الفاظ کو چڑیا کی طرح اڑاتے ہیں۔ ہوا کو آگ لگاتے ہیں۔۔۔۔ شہروں کو چراغ کے بغیر روشن کردیتے ہیں۔۔۔ جب ایسا گنج گہر تمھارے سامنے ہے تو ایسے دیرینہ خرمن کی خوشہ چینی کیا ضروری ہے؟" اس زمانے میں جب ماضی کو بڑھا کر پیش کرنا اور اس کی وصف و ثنا کرنا ایک فطری بات تھی غالب کے ردِ عمل کا کچھ نہ کچھ تعلق یقیناً مغربی علم و فن اور سائنس کے اثر ان تمام پاستانی باتوں کے لیے حقارت کے جذبے سے تھا جن کے یہ قدامت پرست حامی تھے۔

○●○

یوسف میخائلوچ آرانسکی

تلخیص و ترجمہ: اُسامہ فاروقی

حصاری پریا کی لوک کہانیاں اور زبان (وسط ایشیا) ماسکو ۱۹۷۰ء

حساری پریا لوگوں کی زبان، ہند آریائی زبانوں کے وسطی زمرے کی ایک بولی

(قسط: ۲)

ضمائر

ضمائر شخصی: جدول نمبر ۲ سے زبانِ پریا کے ضمائر شخصی کے نظام کے بارے میں واقفیت حاصل کی جاسکتی ہے اور اس کا ہندستانی اور دوسری قریبی ہم رشتہ زبانوں کے ضمائر شخصی کے نظام سے موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ جدول سے ظاہر ہے زبان پریا ضمائر متکلم و حاضر عدد جمع کے اعتبار سے پنجابی، لہندا اور سندھی سے بہت مختلف ہے اور ضمیر متکلم عدد کے اعتبار سے گجراتی سے بہت مختلف ہے۔ ضمائر کی فاعلی اشکال ہندستانی اور راجستھانی کی بعض بولیوں کی متعلقہ اشکال سے نسبتاً قریب ہیں تاہم ضمائر شخصی متکلم و حاضر واحد نیز متکلم جمع کی غیر فاعلی شکلیں زبانِ پریا کو ہندستانی سے جدا کرتی ہیں اور اسے راجستھانی کی بولیوں اور گجراتی سے قریب لاتی ہیں۔ ضمائر واحد متکلم، واحد حاضر اور جمع متکلم کی غیر فاعلی اشکال کی دو قسموں (علی الترتیب ta-, tare/ma-, mare- اور ma-, mare- ما۔ مرے / تا۔ ترے اور ما۔ مرے کی موجودگی ہمارا دھیان اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ma ما۔ (واحد و جمع متکلم) اور ta تا۔ (واحد حاضر) سابقین جارّ موخر ta۔ تا کے ساتھ استعمال ہوتی ہیں (مفعول اول اور مفعول ثانی کے اشاریے کی حیثیت سے اور mare- مرے (واحد متکلم)، ta-e (واحد حاضر)، mare- مرے (جمع متکلم) سابقین دیگر تمام جارہائے موخر کے قبل استعمال ہوتی ہیں۔ غیر فاعلی اشکال سابقوں ma- ما اور ta- تا۔ کی راجستھانی (جے پوری، ہگری، لمبنی اور مالوی بولیوں) اور گجراتی میں نشان دہی کی گئی ہے۔ (Vorobyev- Desyatovsky وریف دیسیا توفسکی: ہند آریائی زبانوں میں ضمائر شخصی کا ارتقاء، ماسکو۔ ۱۹۵۶ء، ۱۳۰ء۔ ضمائر شخصی کی غیر فاعلی اشکال کی ساق کی حیثیت سے ضمائر معکوس کے ہند آریائی زبانوں میں استعمال کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ (دیکھیے محولہ بالا کتاب، صفحات: ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۳)۔ آل فاعلی اشکال واحد متکلم و حاضر (minja من جا، tin تن جا) کی مماثل شکلیں البتہ دوسری ہند آریائی زبانوں میں نہیں ملتیں۔

جدول نمبر ۲ ضمائر شخصی:

عدد	صیغہ	زبان / شکل	زبان پریا	ہندوستانی	پنجابی	لہندا (شاہپوری)	راجستھانی (جے پوری)	گجراتی	سندھی	نیپالی
واحد	متکلم	فاعلی شکل غیر فاعلی شکل کی ساق آئی فاعلی شکل	مے me ما- ، مرے- ma-², mare³ مِن جا minja	میں maĩ, mẽ مجھ mujh میں نے maĩ-ne¹	maĩ mae-, me- maĩ-ne	mã mã- mã	maĩ¹ ma-⁴ maĩ	hu ma-, mārā mẽ	mã mũ- mũ	maĩ, ma ma- maĩ-le
	حاضر	فاعلی شکل غیر فاعلی شکل کی ساق آئی فاعلی شکل	تو tu ترے، ت- ta³, t(a)re³ تِن جا tinja	تو tū تجھ tujh- تو نے tū-ne	tū tae-, tu- taĩ-ne	tū tā- tā	tū ta-⁴ tū	tū ta, tāro tẽ	tũ to- to	tā tã- taĩ-le
جمع	متکلم	فاعلی شکل غیر فاعلی شکل کی ساق آئی فاعلی شکل	ہم ham ما- ، مارے- ma³, mare³ ہم نا ham-na	ہم ham ہم- ham- ہم نے ham-ne	asī asā-, asā- asā-ne	assī assā- assā	mhẽ⁵ mhā-⁶ mhẽ	ame am-, amāro amẽ	asī asā- asā	hāmī hāmī- hāmi-le
	حاضر	فاعلی شکل غیر فاعلی شکل کی ساق آئی فاعلی شکل	تم tam ترو/تارے taro-/tare- تم نا tam-na	تم tum تم- tum- تم نے tum-ne	tusī tusā-, tusā- tusā-ne	tussī tussā- tussā	thẽ⁵ thā-⁶ thẽ	tame tam-, tamāro tamẽ	(t) avhī (t) avhā- tavhā	timī timī- timī-le

۱- میواتی میں بھی یہی شکل ہے۔

۲- جار موقر [illegible] کے قبل (مفعول اول اور مفعول ثانی کے اشاریے کے طور پر)۔

۳- باقی تمام جارہائے موخر کے قبل ۔

۴- گجری ، مالوی اور لبھنی میں بھی یہی شکل ہے ۔

۵- میواتی ، گجری اور لبھنی میں مستعمل ham ہم (جمع متکلم) اور tam تم (جمع حاضر) سے موازنہ کریں ۔

۶- مالوی اور مارواڑی میں بھی یہی شکل ہے ۔

واحد متکلم

(الف) فاعلی شکل me مے ؛

me viya- ma giyo مے ویاَ ما گیو (میں بیاہ / شادی میں گیا) ۔

me kore- para čaryo مے کوڑے پرا چڑیو (میں گھوڑے پر چڑھا) ۔ me Šura (b)- me bete čʰo مے شوراب مے بیٹے چھو (میں شوراب میں رہتا تھا) ۔ me parya ču مے پریا چھو (میں پریا ہوں) ۔

(ب) غیر فاعلی اشکال کی ساقیں ؛

۱ ۔ ma- (ma-) ما ۔ جارِ موخر ta- تا سے قبل (مفعول اول اور مفعولِ ثانی کے اشاریے کی حیثیت سے) ؛ nin ma-ta na- leka نین ماتا نہ لے کا (مجھے نیند نہیں آرہی ہے) ۔ curi ma- ta de چوری ماتا دے (چھوری مجھے دے) ma-ta do din juvab mango ماتا دو دن جُواب مانگو (اس نے دو دن کے لیے مجھے رخصت دینے کو کہا) ma- ta is malim- na kiyo --- ماتا اس مالم نا کیو (اس مُعلّم نے مجھ سے کہا ۔ ۔ ۔) ۔

۲ ۔ mare- مرے ۔ باقی تمام جار ہائے موخر سے قبل ؛ o mare- nala gal karai او مرے نلا گل کرائی (وہ مجھ سے بات کرے گا) ۔ tu mare- pará mehman hŭvai تو مرے پُرا مہمان ہُوائی (تو میرا مہمان ہوگا) ۔ mare- kula aja مرے کلا اُجا (میرے پاس آ) ۔ da- mare- na soat- (t)a mare- le sawrat dineo دا مرے نا ساعت تا مرے لے سوغات دنیو (میرے آبا نے مجھے گھڑی تحفے میں دی) ۔

(ت) آلی فاعلی شکل minja (mija) ؛ minja yek bitya- ta paci karyo منجا یک بیٹیا تا پچی کریو (میں نے ایک بچی کو چوما) ۔ minja panj sōm bai dinō منجا پنج سوم بَے دنو (میں پانچ روپیہ ہار گیا) ۔ minja ta- ta marya منجا تا تا مریو (میں نے تجھ کو مارا) du su mal- tare mija raki دو سُو مال تِرے می جارکی (میں نے تیرے دو سو عدد مویشی چَرائے) ۔ mija suki ruti kʰāyo می جا سوکی روٹی کھایو (میں نے سوکھی روٹی کھائی) ۔

واحد حاضر

(الف) فاعلی شکل tu kis-ko poto? تو کِس کو پوتو ؟ (تو کس کا پوتا ہے ؟) tu ki(n)- ta ayo? تو کین تا ایو (تو کہاں سے آیا ؟) ۔ tu ji tarai? تو جی ترائی ؟ (تیری کوئی بڑی بہن ہے ؟) ۔ tu apero ti-ta kadun mursa تو اپروتی تا کدن مُرسا دُوائی ؟ (تو اپنی بیٹی کا بیاہ کب کرے گا ؟) ۔

(ب) غیر فاعلی اشکال کی ساقیں ؛

(۱) ta- تا { جار موخّر ta- تا کے قبل ۰ مفعولِ اول اور مفعولِ ثانی کے اشاریے کی حیثیت سے) ؛
agar salâm na- de tu, ta- ta k"ova čho اگر سلام نہ دیتو ۰ تاتا سے کھوا چھو (اگر تو سلام نہ کرتا تو میں تجھے کھاجاتا) ۔ tu nukoi, ta-ta ne- degti تو نکوئی ۰ تا تا نے دیگتی (تو چھوٹا ہے ۰ تجھے نہ دیکھیں گے / تجھ پر توجہ نہ دیں گے) ۔ ta-ta ham asman-a tunda č"e تاتا ہم آسمانا ٹنڈا چے (تجھے ہم نے آسمان پر ڈھونڈھا) ta-ta bi- تاتا بی خدا رکا (تجھے خدا سلامت رکھے) ۔ (وقتِ رخصت ادا کیا جانے والا کلمہ) ۔ xuda raka

۲ t(e)re- ترے (دیگر تمام جارہائے موخر کے قبل) me t(a)re nala usu vaxta gal karui میں ترے نلا اُسو وختا گل کروئی (میں تجھ سے اُس وقت بات کروں گا) ۔ aba- mare- mata tare- kula- heč kero nišan-i če? ابا مرے ماتا ترے کلا ہیچ کیرو نشانی چے ؟ (میرے باپ کی تیرے پاس کوئی نشانی ہے ؟) ya kâm tire- vamá faido tarai ? یہ کام ترے وما فائدو ترائی ؟ (یہ کام تیرے لیے فائدے کا ہے ؟) zambur tare- ufor- ta tâw k"owai de, katai. زنبور ترے اوفرتا تاو کھووائی دے ۰ کٹائی (زنبور تیرے اوپر منڈلا رہی ہے ۰ کاٹ لے گی) ۔

ت آں فاعلی شکل tinja / tija تن جا ۰ تجا ؛ tinja pâčâ- para ravam na-kayo تن جا پاچا پرا رحم نہ کایو (تو نے بادشاہ پر رحم نہ کھایا) ۔ kala tinja ma-ta tinja kur کلاتن جاماتا مُرِیو (کل تو نے مجھے مارا) tinja karyo? تن جا کریو ؟ تو نے یہ کیسے کیا ؟ tija k"ayo? تجا کھایو ؟ تو نے کھانا کھانا ؟

جمع متکلم

(الف) فاعلی شکل ham ہم ؛ rat- a- se ham sandali- ke gird- a- se beti kite avqât kōvai راتا سے ہم صندلی کے گردا سے بے ٹی کتے اوقات کووئی (رات کو ہم صندلی کے گرد بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں) ۔ ham zimin kulbo karai ہم زمین قُلبو کرائی (ہم زمین جوتتے ہیں) ۔ ham taxčo- ma čini tarai, ہم تاخچو ما چینی ترائی (ہم طاقچے میں چینی کے برتن رکھتے ہیں) ۔

(ب) غیر فاعلی اشکال کی ساقیں ؛

(۱) ma- ما { جار موخر ta- تا کے قبل مفعولِ اول اور مفعولِ ثانی کے اشاریے کی حیثیت سے) ؛
jatkun- (n)a kiyo : "ma-ta dak" au" جاتکن ناکیو ؛ ماتا ڈکھاؤ (لڑکوں نے کہا ؛ ہمیں دکھاؤ) ma- ta zala! ماتا زلال نہ ڈکھا (ہم کو تنگ مت کر) na- duk"a ma- ta sust karou, han ham- a- pare jōvai ماتا سست کرو ۰ ہم ہم آپرے جووئی (ہمیں کھول دو / ہماری بیڑیاں ڈھیلی کرو ہم آپ ہی چلیں گے) ۔

(۲) mare- مارے (باقی تمام جارہائے موخر کے قبل) mare- nala yake ya jovai, yake مارے نالا یاکے یا جووائی یا کہ نی جاتا ؟ (وہ ہمارے ساتھ جائے گی یا کہ نہ جائے گی ؟) ۔ ni- jata? mare- kula layo (/ وہ / ہمارے پاس / چڑیا / لایا) ya muallim yek rat- a mare- lab- a suto یا معلم یک راتا مارے لبا سوتو (یہ معلم ایک رات ہمارے ہاں سویا) ۔

(ت) آلی فاعلی شکل ham- na ہم نا : abet-ma ham-na c̆ai̯ piyó ابیت ماہم نا چائے پیو (دوپہر کے کھانے کے وقفے میں ہم نے چائے پی) ۔ ham- na kute ta tím- nala maryo ہم نا کُتے تا تم نالا ماریو (ہم نے کُتّے کو ڈھیلے سے مارا) ham-na kute- siya- ṭa gal dineo ہم نا کُتے کے سیاں تا گل دینو (ہم نے کُتّے کے مالک کو بُرا بھلا کہا / گالی دی) ۔

جمع حاضر

(الف) فاعلی شکل tam تم : tam kōre luva c̆ʰo ya pânde تم کوڑے لوا چھو یا پانڈے (آپ گھوڑے لے رہے ہیں یا کپڑے ؟) ۔ ? tam yau̯ s̆o, tam el s̆ó تُم یاو شو ۰ تُم ایل شو ؟ (تم لوگ دشمن ہو یا دوست / ہم قبیلہ ؟) ۔ ? tam taxc̆o- ma ka tara c̆o̯ تم تاخچو ما کا ترا چو ؟ (تم لوگ طاقچے میں کیا رکھتے ہو ؟)

(ب) جمع حاضر کا ضمیر اضافی : taro / tare / tari / -tari تارو ۰ تارے ۰ تاری ضمیر شخصی کی غیر فاعلی اشکال کی ساق کی حیثیت سے مستعمل ہے ۰ لیکن اس کے ضمیر شخصی کی غیر فاعلی اشکال کی حیثیت سے اور ضمیر اضافی کی حیثیت سے استعمال کا فرق پوری طرح سے واضح نہیں ہے اور مثالیں فیصلہ کُن نہیں ہیں : Karaimai, Patexan, کراائی ۰ پتے خان ۰ larâi na- karò ! davlat kâm- a- tari, karan, s̆er kâm- a- tari, me dōvai لڑائی نہ کرو ! دولت کا ماتری ۰ کَرَن ۰ شیر کا ماتری ۰ مے دو وائی (کراائی ۰ پتے خاں ۰ لڑائی نہ کرو ! تم کو دولت درکار ہے ۰ گندم اور شہد درکار ہیں ۰ میں دوں گا) ۔

واحد حاضر اور جمع حاضر کا فرق بھی غیر واضح ہے : ?taro kar c̆ʰe تارو کر چھے ؟ (تمھارے / تم لوگوں کے پاس گھر ہے ؟)

(ت) آلی فاعلی شکل tam- na تم نا : tam- na ma- ta izat kari تم نا ما تا عزت کری ۔ (تم نے میری عزت کی) ۔ tam- na is- ta mär saṭi تم نا اِس تا مار سٹی (تم نے اس کو / ان کو مار ڈالا) ۔

شخصی ضمائر اشارہ

شخصی ضمائر اشارہ ya یا (یہ ۰ وہ) اور u(ō) او (وہ) کا نظامِ اشکال ہندستانی کے شخصی ضمائر اشارہ کے نظامِ اشکال کے مماثل ہے (دیکھیے جدول ۳) ۔

عدد	زبان / شکل	زبانِ پیریا		ہندوستانی	
واحد	فاعلی شکل غیر فاعلی اشکال کی ساق	ya یا is- اِس-	u (ō) اُو us- اُس-	yah یہ is- اِس-	vah, voh وَہ ، وُہ us- اُس-
جمع	فاعلی شکل غیر فاعلی اشکال کی ساق	ye یے in- اِن-	u (ō) اُو un- اُن- (un un -?) اُن اُن-؟	ye, yah یے ، یہ in- اِن- inhẽ- اِنھوں-	vah, vē وَہ ، وِے un- اُن- unhẽ- اُنھوں-

شخصی ضمیر اشارہ واحد غائب جنسِ مشترک ya یا :

(الف) ضمیرِ شخصی - وہ - کی حیثیت سے (وہ جس کا ذکر ہو رہا ہے) : ya kar- a- parefer ayó یا کارا پرے فیر آیو (پھر وہ اپنے گھر آیا) ۔ na, ya ni- samtai نا، یانی سمتائی (نہیں، وہ نہیں سمجھتا ہے) ۔ unya ya utarai اُنیا یا اُترائی (وہاں وہ اُتری۔ حرف بہ حرف "اُتری ہے") ۔ ya dadvai kuva čo یا دادوائی کووا چو (وہ کراہی / چلائی) ۔ ya k ōn-i یا کون ای ؟ (یہ کون ہے ؟) ۔ ya sač- i یا سچ ای (یہ سچ ہے) ۔

غیر فاعلی اشکال کی ساق is-(iz) : is- ko beṭá اِس کو بیٹا (اس کے بیٹے) ۔ is- ta jor kárke de sagái? اِس تا جوڑ کار کے دے سگائی ؟ (اسے، یعنی ہاتھ کو، اچھا کرسکتا ہے ؟) tu is- lana laraî na- kar تو اس لنا لڑائی نہ کر (تو اس سے لڑائی نہ کر) ۔ iz- na tamošo káro ازنا تموشو کارو (اس نے دیکھا) ۔ is- ki na اِس کی نا (اس کا نام) ۔ is- te heka اِس تے ہے کا (اس کے آگے / اس سے پہلے) ۔ iz-na na -kiyo ازنا ناکیو (اس سے نہیں سجا) ۔

(ب) ضمیرِ اشارہ : "یہ" کی حیثیت سے۔ اشارہ جنسِ مذکر، مونث یا مشترک کی طرف ہوسکتا ہے :
ya habaš یا حبش (یہ حبشی) ۔ ya pâčâ یا پاچا (یہ پادشاہ) ۔ ya ran یا رن (یہ بیوی) ۔ ya bitya یا بیٹا (یہ لڑکی) ۔ ya dâru یا دارو (یہ دوا) ۔

غیر فاعلی شکل is (iz) اِس (اِز) : is pàšâ- ta bakri durayo اس پاشا تا بکری ڈُڑایو (اس پادشاہ کو گھسیٹتے ہوئے لے گئے، جیسے بزکشی کے دوران بکرے کی لاش کو) ۔ is munde- na kaṡaz- ta leke ... اِس مُنڈے نا کاغذ تا لے کے ... (اس لڑکے نے خط لے کر ...) ۔ is ran- ko murs- (s)o اِس رن کو مُرسو (اس عورت کا شوہر) ۔ mre vere- na is gā(n)-ta čaryó مرے ویڑے نا اس گان تا چڑیو (میرا سانڈ اس گائے پر چڑھا) ۔

شخصی ضمیر اشارہ جمع غائب جنسِ مشترک ye یے :

(الف) ضمیرِ شخصی کی حیثیت سے : ye ov- ma ge یے اووما گے (وہ / بھائی لوگ / شکار کو گئے) ye mar ge یے مَرگے (وہ / کراماتی اور پتے خاں / مرگئے) ۔ ye ... pâšâ- kula ge یے پاشا کُلا گے (وہ / عورتیں / ... پادشاہ کے ہاں گئیں) ۔

غیر فاعلی اشکال کی ساق in- : in- ta neka banke ان تا نیکا بان کے (ان کا نکاح باندھ کے / ان کی شادی کر کے) ۔ memân ayê či, dumbo, ketuno čaval in-ramá dekale میمان آتے چی، ڈُمبو کتنو چاول ان رما دے کالے (مہمان آتے ہیں، ان کے لیے دُنبہ اور اتنا چاول بھیجو) ۔ in- (n)a láye ان نالایے (یہ لوگ / یعنی دیو / لائے) ۔ in- (n)a kiyo ان نا کیو (انھوں نے / یعنی بیٹوں نے / کہا) ۔ in- ki kurta, sutô picke čale ge ان کی کُرتا، سُتو چ کے چلے گے (ان کے یعنی جوتوں کے / کُرتے، شلواریں بھیگ گئیں) ۔

(ب) ضمیرِ اشارہ کی حیثیت سے : ya jatak bazr-a ge یا جاتک بزرا گے (یہ لڑکے بازار گئے) ۔

ye ran paxta ۔ (یہ آدمی کیا کام کررہے ہیں ؟) ye ami ka kâm karin či ? یے آمی کا کام کرن چی ؟
یے رن پھتا چُرِن چی (یہ عورتیں کپاس چن رہی ہیں) ۔ čurin či

غیر فاعلی شکل in اِن : in jatkun- ta budi- na leke... اِن جاتکُن تا بوڑی نا لے کے . . . (بوڑھی ۔
ن بچوں کو لے کے . . .) in jatkun- (n)a (ان بیٹوں نے کہا) اِن بیٹُن ناکیو in betun- (n)a kiyo- (ان جاتکن ناپشنا کریو (ان لڑکوں نے پوچھا / سوال کیا) pišna karyo
in kafirun-ko heč hesâb gum kar. ان کا فِرُن کو ہیچ حساب گم کر بگایو (ان کافروں کا شمار بھی مشکل ہوگیا) ۔ bagayo

شخصی ضمیر اشارہ واحد غائب جنسِ مشترک u(o) اُو :

(الف) ضمیر واحد غائب جنسِ مشترک کی حیثیت سے : u mar gi اُو مَر گی (وہ مرگیا) ۔ ō.
ō nakro mundoi اونا کرو مُنڈوئی (وہ خراب / ناکارہ لڑکا ہے) ۔ o. budo čʰe او بوڑد چھے (وہ بوڑھا ہے) ۔
o gā̃-ta ničuvai اوگاں تا نچُوائی (وہ گانے کو دُہرا رہا ہے) ۔ budi čʰe اوبوڑی چھے (وہ بوڑھی ہے) ۔

غیر فاعلی اشکال کی ساق us اُس : me us- mata pača regyō مے اُس مَتا پچا رے گیو (میں اس سے پیچھے رہ گیا / بچھڑ گیا) ۔ tu kaine us-ta marai ? تو کینے اُس تا مرائی ؟ (تو اسے کیوں مار رہا ہے ؟) us- ta ke
اُس تا کے (اُس سے کہہ) ۔ us- ta ṭaga (اُس ٹاٹا گا) اُسے / یعنی اُس بچی کو / بہلا / دلاسا دے) ۔ us- ko.
na kai ? اس کو ناکائی ؟ (اس کا نام کیا ہے ؟) ۔

(ب) ضمیر اشارہ کی حیثیت سے : ō pâšâ andōi او پاشا انڈوئی (وہ پادشاہ اندھا ہے)
ō mundō kedai او منڈو کیڈائی (وہ لڑکا کھیل رہا ہے) ۔ u armi sutei اُو آرمی سُتے ای (وہ آدمی سو رہا ہے / سوتا ہے) o bitiya be (r) ti. اُو رَن بے مُعلّم ای (وہ عورت بھی معلم ہے) u ran be muallim- i
ča او بیٹیا بےرُتی چا (وہ لڑکی بیٹھی ہے) ۔ o us- ke pandui او اس کے پَندوئی (وہ اس کی ٹوپی ہے) ۔

غیر فاعلی شکل us اُس : us dunya- ma اُس دنیا ما (اُس دنیا میں) us vaxt- a اُس وَختا (اُس وقت) ۔ us daftar- ta le اس دفتر تا لے (وہ کاپی لے) ۔ us dev- kulā legyo اُس دیو کُلا لے گیو (اُس دیو کے پاس / لڑکے کو / لے گیا) ۔ us ran- ta juval- mata kar (d)yo اُس رَن تا جُوال ماتا کاڑیو (اس بیوی کو تھیلے میں سے نکالا) ۔ us ran- ki kat اُس رَن کی کت (اس عورت کا bride- money)

شخصی ضمیر اشارہ جمع غائب جنسِ مشترک u(o) او :

(الف) ضمیر شخصی - وہ - کی حیثیت سے : u ham kar- a beti čʰe اُو ہم کرا بیٹی چھی (وہ بھی گھر بیٹھے ہیں) ۔ u Regar- ma zindagoni karin či اُو ریگر ما زندگانی کرن چی (وہ ریگار میں رہتے ہیں) o.
kar tarin či اُو کر ترن چی (وہ گھر رکھتے ہیں یعنی ان کے پاس اپنا گھر ہے) ۔

غیر فاعلی اشکال کی ساق un اُن : un- ke kolxoz- ma kalank bijin či اُن کے کولخوز ما کلنک بِجن چی (ان کے کولخوز میں گندم بویا جارہا ہے) ۔ un-ta kurta dineo اُن تا کرتا دینیو (میں نے انھیں / ان عورتوں کو / ...

(باقی صفحہ ... پر)

حسن منظر

موجودہ معاشرہ اور برہنہ فلمیں

(قسط : آخر)

یہ مضمون تقریباً ۱۸ سال کے ان گنت ، بے ترتیب UNSTRUCTURED انٹرویوز پر مشتمل ہے اور ان سے برآمد ہونے والے نتائج کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دوسری برائیوں EVILS کے ساتھ ساتھ ننگی فلمیں دیکھنے کی عادت بھی سوسائٹی میں مستحکم ہوچکی ہے اور یہ عادت دیگر جنسی بےراہ رویوں (رشتہ ، ازدواج سے باہر جنسی فعل ، ایک ہی جنس کے دو افراد کے مابین فعل اور غیر از انسان مخلوق سے جنسی فعل) کی نسبت کہیں عام ہے ۔ حتیٰ کہ ایک دوسری بے راہ روی کی سطح پر اگر جائزہ لیا جائے تو ننگی فلمیں دیکھنے کی عادت نشہ لانے والی اشیا کے استعمال سے بھی زیادہ سوسائٹی کے اعصاب اور دماغ میں راہ پیدا کرچکی ہے ۔ ننگی فلموں کے اثرات کے لحاظ سے سوسائٹی کے افراد کو چار خانوں میں رکھا جاسکتا ہے ۔

۱ وہ جنھوں نے کبھی بھی کوئی خالصتاً ننگی فلم نہیں دیکھی ہے ۔
۲ وہ جنھوں نے کبھی کبھار ہی ننگی فلم دیکھی ہے یا صرف ایک بار ۔
۳ وہ جو باقاعدگی سے ننگی فلمیں دیکھتے ہیں لیکن انھیں دیکھے بغیر بھی رہ سکتے ہیں ۔
۴ وہ جو ننگی فلمیں دیکھنے کی عادت کو ترک نہیں کرسکتے ۔

لوگ ننگی فلمیں اکیلے بھی دیکھتے ہیں اور جنس والوں یا غیر جنس والوں کی صحبت میں بھی ۔ اکثر ان فلموں کو ایک گروپ کی شکل میں بیٹھ کر دیکھا جاتا ہے ۔ اور یہ برائی اکیلے اور سنگت دونوں ہی صورتوں میں دوسری کسی برائی کے ساتھ انجام دی جاسکتی ہے ۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں ننگی فلموں سے پہلا واسطہ حادثاتی طور سے بھی ہوسکتا ہے جیسے کسی کے اوطاق یا ڈرائنگ روم میں یا کسی سنیما ہول میں جہاں کوئی فیچر فلم دکھائی جارہی ہے اور اچانک ننگی فلموں کی ایک یا دو ریل REEL نورمل ریلز کے درمیان بالارادہ داخل کردی جائے ۔ ایک طرح سے ہر شہر میں سنیما ہولوں کی اپنی شناخت بن چکی ہے ۔ وہ جن میں سب جانا پسند نہیں کرتے اور وہاں جن میں سب جاسکتے ہیں ۔ اور یہ بھی ہوتا ہے کہ اصل فلم جسے " تمام عمروں کے ناظرین کے لیے مناسب ہے " کا سرٹیفکیٹ سنسر بورڈ سے ملا ہے اس کے درمیان مکمل برہنہ جسموں کی فلموں کے ہزار ، بارہ سو فٹ آجائیں ۔ ایسے میں اگر کوئی اپنے بچوں کو یہ فلم دکھانے کے لیے ساتھ لایا ہے اس کا بس نہیں چلتا کہ وہ کس طرح سنیما ہول کے فرش میں سماجائے اور بچوں کے دیکھنے کو ان دیکھا کرسکے ۔ چھوٹے شہروں میں تقریباً تمام ہی سنیما ہول پر خطر بن چکے ہیں جن میں لوگ اپنی بیویوں بچوں کو لے کر جانا پسند نہیں کرتے ۔ اور اکثر خود جاتے ہیں ۔

ننگی فلموں سے دوسری طرح واسطہ ان نوجوانوں کو بہ خوشی ہوتا ہے جنھوں نے ان کے بارے میں سن رکھا ہے اور جو اپنے دوستوں سے فرمائش کر کے دیکھتے ہیں اور جھوٹے فقرے کہتے ہیں ہم پر کوئی اثر نہیں ہوا ۔ یعنی اپنے لذت پذیری سے بالا ہونے کا اعلان ۔ اس اعلان کی وہی نوعیت ہے جو پہلا سگریٹ سلگا کر لڑکے خود کو اپنے بڑے ہونے کا یقین دلاتے ہیں اور اپنے ہم عمروں کو بھی کہ ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں ۔ PEER CONFORMITY ۔

شراب کی دنیا میں ایک اصطلاح ہے سوشیل ڈرنکر ۔ یعنی وہ فرد ۔ عورت یا مرد جو مناسب ماحول پیدا ہوجانے پر پی لیتا ہے ۔ ایسوں کو CASUAL ڈرنکر بھی کہا جاتا ہے یعنی کبھی کبھار پینے والا ۔ ہمارے یہاں اس کے لیے مروجہ اصطلاح ہے سنگت میں ۔ ... ۔ اور سنگت بہم ہوجانے پر لوگ ہر قسم کا نشہ بھی کرتے ہیں ۔ ہر قسم کی جسمانی عیاشی بھی اور ننگی فلمیں بھی دیکھتے ہیں ۔ اکثریت سنگت نہ ملنے پر تنہائی میں یہی عمل جاری ۔ رکھتی ہے اور پھر ایسے فرد میں اور اس فرد میں کوئی فرق نہیں رہتا جو صبح سے پینا شروع کرتا ہے تو شام کردیتا ہے اور سورج چھپے پینا شروع کرتا ہے تو بھور لڑکوں اور لڑکیوں دونوں ہی کی تعلیمی قیام گاہوں میں جہاں سپروژن ناکافی ہے اور ہر صورت میں امتحان میں کامیابی یقینی ۔ ٹیلی وژن اور ویڈیو کیسٹ چلانے والی مشین ۲۴ گھنٹے چلتی ہیں یہاں تک کہ گرم ہوجائیں یا جل اٹھیں اور ان میں نیم برہنہ اور بلو فلمیں سب ہی ہوتی ہیں ۔ لیکن ایسا تمام ہوسٹلوں میں نہیں ہے اور جہاں ہے وہاں بھی چند کمروں تک محدود رہتا ہے ورنہ بھانڈا پھوٹ جائے ۔ (ایک انٹرویو پر مبنی)

گھروں میں جہاں نگرانی نہ ہو لڑکیاں بھی مختلف ریٹنگ کی بلو فلمیں چھوٹی عمر کے لڑکے لڑکیوں سے محلے کی دکانوں سے منگاتی رہتی ہیں جو جاکر محلے کی دکانوں سے منگاتی رہتی ہیں جو جاکر جو انھیں بتایا گیا ہے من و عن دکان دار کے سامنے دہرا دیتے ہیں ۔ ان بچوں کی ذہنی تربیت میں اتفاق اور تجسس کا بڑا ہاتھ رہتا ہے ۔ دکان دار کاؤنٹر کے نیچے رکھے ہوئے ویڈیو سیٹ پر کیا دیکھ رہا ہے ۔ گھر میں چھپاکر کیا دیکھا جارہا ہے ۔ اتفاق سے اس پر نظر پڑسکتی ہے اور تجسس بھی بچے سے یہی کام کروا سکتا ہے ۔

م ۔ ا عمر ۲۱ سال اس نوجوان مریض نے اپنی پہلی مکمل بلو فلم آٹھ سال کی عمر میں دیکھی تھی ۔ یہ پہلی فلم اس نے اپنے (پیشے کے) استاد کی صحبت میں دیکھی تھی جس کے یہاں وہ اور اس کے ساتھی لڑکے کام کرتے تھے ۔ اس وقت وہ روزانہ ۴ یا ۸ فلمیں لگاتار دیکھنے کا عادی تھا اور ان کا اہتمام وہ خود کیا کرتا تھا ۔ یعنی کرایے پر ٹیلی وژن ۔ ویڈیو پلیر اور کیسٹ وہ خود لاتا تھا ۔ ان ننگی فلموں کی ۔ جو وہ دیکھا کرتا تھا ۔ درجہ بندی یوں تھی :

سنگل ایکس : جیسے ایک جھلک کے پار سب کچھ نظر آرہا ہو لیکن نیم برہنہ ۔

ڈبل ایکس : مکمل طور سے برہنہ اور جنسی فعل کی جزئیات ۔

ٹرپل ایکس : جنس اپنی تمام بہیمیت کے ساتھ ۔

یہ درجہ بندی اس دور میں ہماری سوسائٹی میں مسلمہ ہے ۔ دکان دار بھی اسے پہچانتے ہیں اور عادت کے شکار بھی ۔ ع ۔ ح ۔ ج عمر ۲۸ سال ۔ ایک دوسرا مریض ۔ کسی زمانے میں ایک میڈیکل اسٹور کا مالک تھا ۔ جب وہ پہلی بار علاج کے لیے آیا بے کار تھا ۔ وہ دوپہر ۲ بجے سے رات کے ۸ بجے تک بلو فلمیں اکیلا دیکھا کرتا تھا اور اس کے بعد رات کے ۲ بجے تک

دوستوں کے ساتھ۔ بعد میں جب اس کی شادی ہوئی تو جنس اس کے لیے بیوی کے ساتھ بلو فلمیں دیکھنے کے بعد ممکن تھی لیکن جب جب اس نے اس عادت کو ترک کرنا چاہا اور بغیر برہنہ فلم دیکھے بیوی کی طرف رجوع کیا وہاں جنسی زوال کا شکار ہوجاتا تھا۔ اس کی بیوی کو غالباً بلو فلموں سے زیادہ ان بلو فلموں میں نظر آنے والی عورتوں سے نفرت محسوس ہوتی تھی اور ایسا ہونا فطری ردِ عمل تھا کیوں کہ شوہر ان کی تصاویر میں ڈوب کر ہی اس کی طرف مائل ہوسکتا تھا۔ دوسرے ایسا کرنے میں وہ خود اس کا رتبہ ایک باعزت ہستی سے گرا کر ایک لذت فراہم کرنے والی عورت کا کردیتا تھا اور یہی ان دونوں کے درمیان مستقل گہری ہوتی ہوئی خلیج تھی جس نے اسے علاج تلاش کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اس کی بغیر ان فلموں کے ناکامی اور بیوی کا ان کے لیے تنفر۔ سگریٹ کے عادی افراد کی طرح ننگی فلمیں پابندی سے دیکھنے والے بھی یہی سمجھتے ہیں ہم جب چاہیں گے اس عادت کو ترک کردیں گے لیکن ترک نہیں کرسکتے اور ہمیشہ دھوکے میں رہتے ہیں کہ کم کردیا ہے۔

ج۔ ر۔ ع۔ عمر ۲۵ سال۔ عورت اس وقت اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی جب اس کے شوہر نے سونے کے کمرے میں ننگی فلمیں دیکھنے کا اہتمام کیا۔ اس کے لیے اسے رات کے بارہ ایک بجے تک جاگنا پڑتا تھا اور جب یقین ہوجاتا تھا کہ بچے سوگئے ہیں تو فلمیں پروجیکٹر پر شروع ہوتی تھیں جنھیں دیکھنے کے لیے وہ بیوی کو بھی مجبور کرتا تھا اور توقع رکھتا تھا کہ بعد میں بیوی بھی وہی تمام عمل دہرائے جو تھوڑی دیر پہلے سفید دیوار پر وہ دیکھ چکی تھی۔ وہ عورت قصباتی ماحول کی تھی، پڑھی لکھی نہ تھی لیکن تھوڑی بہت عبادت گزار تھی۔ آہستہ آہستہ احساسِ گناہ کا شکار ہوئی کہ میری آنکھیں بھی اس گناہ میں شریک ہیں، ادھر شوہر کو مطمئن کرنے کی صلاحیت وہ خود میں نہیں پارہی تھی ادھر اس کی نیند پوری نہیں ہوتی تھی اور بالآخر اس میں وہ بیماری رونما ہوئی جو اگر ماحول گڑبڑا دینے والا نہ ہوتا تو شاید ساری زندگی ظاہر نہ ہوتی۔ شوہر اپنی بیوی کی بیماری میں اپنی اس عادت کا ہاتھ دیکھنے سے قاصر تھا اور بیوی سے برہم کہ اس نے کیوں اپنی نیند گم ہوجانے کی وجہ ان لیٹ نائٹ پرائیوٹ شوز کو ٹھہرایا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا Denial تو خود کو مجرم سمجھنے لگتا۔ بعد کے دنوں میں جب ویڈیو سسٹم عام ہوگیا تو وہ آواز کم خاموش کرکے سونے سے پہلے ایک یا دو کیسٹ دیکھ کر سونے لگا۔ ان متحرک تصویروں کا جنھوں نے اس کی بیوی کی نیند کو اجاڑ تھا اس پر خواب آور اثر ہوتا تھا اور انھیں دیکھے بغیر وہ سو نہیں سکتا تھا اور غالباً سرِ شام اس پر ان کو دیکھنے کی طلب طاری ہوجاتی تھی۔ جس طرح شرابی شام کی راہ دیکھتے ہیں کہ کب سورج ڈوبے اور سے کدے PUB کی راہ لیں۔ اس عادت کو چھوڑنے کے لیے اس نے کبھی مدد نہیں چاہی۔ سب شرابی بھی شراب چھوڑنا نہیں چاہتے ہیں، نہ سب افیونی، افیون۔

ع۔ ح۔ مرد۔ عمر ۲۴ سال نورا فلاں کا باشندہ۔ ۱۵ سال کی عمر سے ننگی فلمیں دیکھنا شروع کیں اور چوں کہ فلم دیکھتے ہوئے ختم ہوجانے کی عادت پڑچکی تھی اس لیے بار بار شادی کی بات کو ملتوی کرتا رہا تھا یہاں تک کہ قصبے والوں نے اسے ناقابل سمجھنا شروع کردیا۔ یہ بات اس کے گھر والوں کے لیے باعث شرمندگی تھی۔ بالآخر ۲۴ سال کی عمر میں باپ کے ہاتھوں بے دردی سے پٹنے کے بعد تنہائی میں اس نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا اور وہ اسے علاج کے لیے لے کر آیا۔ انٹرویو کے درمیان وہ سخت اداس تھا اور اداسی ناامیدی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس کے خیالوں میں خود

کو ختم کردینے کی جھلک تھی جس کا اس نے اعتراف کیا۔

س ۔ ا ۔ مرد ۔ عمر ۳۸ سال ۔گورنمنٹ وہیکل ڈرائیور۔ بلوفلموں کو دیکھتے ہوئے ۵ سال ہوئے ۔ ہر ماہ پابندی سے دوبار ۔ زیادہ اس لیے نہیں دیکھتا کہ فلم دیکھتے ہوئے ختم ہوجاتا ہے ۔ اس کا خرچہ سنیماہولوں میں پون گھنٹے کی فلم کا دس روپے تھا اور اس کا کہنا تھا کہ سب ہی سنیما ہول یہ شو دکھاتے ہیں ۔ اس کی فکر مندی یہ تھی کہ بےعزتی ہوجاتی ہے کیوں کہ ساتھی (بےحیائی سے) بلند آواز سے پوچھتے ہیں " اوئے کپڑے تھے خراب تیں ہوگئے ؟ " جس پر آس پاس بیٹھے ہوؤں میں ایک قہقہہ پڑتا تھا ۔

علاج کے لیے آنے کی وجہ وہی عام وجہ تھی کہ نکاح کے بعد کیا ہوگا ۔ اس کے یہاں بھی صرف جنسی بےعزتی کا تصور تھا احساسِ گم رہی نہیں تھا ۔

غ ۔ ف ۔ ل ۔ زمیندار ، عمر ۱۵ سال ۔ اس تاریخ میں بھنگ ، چرس ، کوبلی وہسکی (جو ببول کی چھال ، نوسادر اور سڑے ہوئے پھلوں سے بنائی جاتی ہے) ، پکی شراب ، افیون ، مین پوڑی اور گٹکا سب ہی شامل تھے ۔ پکی شراب کا ایک ٹرپ Trip اس کے لیے بہت ہی وحشت ناک ثابت ہوا تھا ۔ وہ اپنی جنس اور غیر جنس دونوں کے تجربات کرچکا تھا ۔ اس نے پہلی بلوفلم اپنے ایک رشتے دار کے اوطاق میں ایک اور گاؤں میں بارہ سال کی عمر میں دیکھی تھی ۔ جب وہ اپنی دوسری مشکلات کے لیے کلینک آیا تو اس کا اوسط مہینے میں ۲ بار ہوٹل میں ننگی فلمیں دیکھنے کا تھا ۔ وہ ضمیر سے بےنیاز تھا ۔

م ۔ ا ۔ گ ۔ مرد ۔ عمر ۲۶ سال ۔ بڑے زمین دار گھرانے کا فرد ۔ بےمقصد زندگی ۔ یونی ورسٹی کا تعلیم یافتہ لیکن تمام امتحان نقل اور سفارشوں سے پاس کیے تھے اور تعلیمی زندگی کے ضائع ہونے کا اسے مطلق ملال نہیں تھا ۔ دوسری ناپسندیدہ عادتوں کے ساتھ ایک پختہ عادت ننگی فلمیں دیکھنے کی بھی تھی جس کے بعد وہ ذہن کو ہلکا محسوس کرتا تھا ۔ گھبراہٹ صرف اس وقت ظاہر ہوتی تھی جب کوئی ذمے داری کا کام آن پڑے ۔ غالباً بلوفلمز دیکھنے کی عادت پہلے سے تھی لیکن جب اس نے شدید گھبراہٹ کے عالم میں یہ فلمیں دیکھنی شروع کیں اور اس طرح گھبراہٹ کو کم کرنے کا عادی ہوگیا تو پھر بغیر گھبراہٹ کے بھی انھیں دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا تھا ۔ ہر انٹرویو کے خاتمے پر وہ بڑی لجاجت سے کم سے کم ایک فلم روزانہ دیکھنے کی اجازت کا طالب ہوتا تھا لیکن اجازت نہ ملنے پر بھی وہ ایک دن کے وقفے سے دوچار فلمیں لگاتار دیکھ ڈالتا تھا ۔ جیسے Binge drinker جو چند دن نہ پی کر بے تحاشہ پیتا ہے اور ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے ۔ ہر غیر ضروری چیز کو استعمال کرنے والے کم سے کم ایک بار اس کے استعمال کی اجازت مانگتے رہتے ہیں ۔

ن ۔ س ۔ عمر ۳۵ سال یا زیادہ ۔ ایک کولج کی لکچرر جس کی شادی کافی دیر سے ہوئی تھی ۔ جنس سے شدید طور سے خائف تھی اور اس کی حالت اس وقت اور بھی غیر ہوئی جب ایک ماہرِ نفسیات کے مشورے پر اس کے شوہر نے اسے ننگی فلمیں دکھانی شروع کیں ۔ غالباً مفروضہ یہ تھا کہ لذت خوف پر غالب آجائے گی اور یہ فیصلہ صرف دو منٹ کے انٹرویو میں کیا گیا تھا ۔ بغیر یہ جانے ہوئے کہ اس کی بچپن سے شادی کے وقت تک کی تربیت کیسی تھی ، کن خوفوں میں بھری تھی اسے بھونرے میں تو نہیں پالا گیا تھا جو روزمرہ کے ناگہانی تجربات نے بچوں کو نوجوانی تک لگا

ہنے نہیں دیتی ہے ۔ اس سے مرنے کی خبروں کو چھپایا جاتا ہے اور چڑیوں اور سڑک کے جانوروں کو اپنے اشغالِ فطری ں مصروف دیکھنے سے روکا جاتا ہے اور انٹرویو میں جاننے کی کوشش بھی نہیں کی گئی تھی کہ اسے کوئی اندرونی تکلیف نہیں ہے ۔

پورے مریض کا دماغی اور جسمانی معائنہ اب اس عجلت کے دور میں ایک فرسودہ ضرورت بن چکا ہے ۔ ولپی J.Wolpe نے پرانی فرائیڈین Freudian تحلیلِ نفس کا جو سالہاسال پر پھیلی ہوئی تھی ذکر کرتے ہوئے ایک عورت کا یس بیان کیا ہے جسے تکلیف ہوتی تھی اور یہ فرض کرلیا گیا تھا کہ اس کی وجہ ذہنی رکاوٹ کے سوا کچھ اور نہیں جو اسے خود سپردگی اور لطف لینے سے مانع رکھتی تھی ۔ یہ بات بہت بعد میں ، شاید ایک دوسری علاج گاہ میں ، اتفاقیہ پتہ چلا کہ سے اندرونی زخم ہے ۔ ان مریضاؤں میں زیادہ تر بات کچھ اور ہوتی ہے اور ہر قسم کے معالج ، غیر تربیت یافتہ خود کو ماہرِ نفسیات گردانے والے اشخاص ننگی فلمیں دیکھنے اور دکھانے کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ بیمار فرد کی ، ان کی دانست میں تجدیت ختم ہوسکے ۔ نتیجہ اکثر ہلاکت خیز یا توقع کے برعکس ہوتا ہے اور جیسا کہ ان بیمار نوجوانوں میں دیکھنے میں آیا ہے و کم عقلی یا دماغی بیماری کی وجہ سے شب زفاف میں ناکام رہتے ہیں اور ان کے بڑے (باپ تک) انھیں تجربے کے لیے جسم فروش عورتوں کے پاس بھیجتے ہیں اور وہ نتیجتاً اس کوچے کے عادی ہوکر رہ جاتے ہیں ۔ ننگی فلموں کو دیکھنا بھی معالجوں اور مفت مشورہ دینے والوں کی وجہ سے ایک عادت بن جاتا ہے ۔ اور اصلی مسئلہ اپنی جگہ پر جوں کا توں رہتا ہے ۔

ف ۔ م ۔ خ ۔ نوجوان مرد عمر ۲۱ سال ۔ دسویں پاس ۔ آٹھویں کلاس سے برہنہ فلمیں دیکھنی شروع کیں اور جو وہ ن فلموں میں دیکھتا تھا اپنی فینٹیسی میں وہی کچھ انڈین فلموں کی ایکٹریسوں سے شادی کر کے ان کے ساتھ دہراتا تھا ۔ نڈین فلم ایکٹریسوں کے بارے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ اس دور میں اپنے جسم کے اظہار میں پرانے دور کی سنجیدگی سے کام پر توجہ دینے والی خواتین سے اتنی ہی مختلف ہیں جتنی گپھاؤں کی شکار کی تصاویر سے بیت الخلاؤں کی پنسل یا کوئلے کے ٹکڑے سے بنائی ہوئی تصویریں ۔ ظاہر ہے موجودہ دور کی انڈین فلموں میں سب ہی اس طور نہ سانسیں لیتی نظر آتی ہیں ، نہ پیٹ کی جلد کو حرکتیں دیتی اور نہ ہی اس دور کی سنجیدہ ایکٹریس محبت کے سین میں عملاً برہنہ ہوجاتی ہیں ۔ س نوجوان کی فینٹسی کی دنیا میں برہنہ فلموں کے سین ان ایکٹریسوں پر منطبق ہوجاتے تھے جن کا سونے کا کمرہ فلم میں خاص و عام کے لیے بے دیوار ہوتا ہے ۔

جس زمانے میں یہ مضمون لکھا جارہا تھا ایک خبر ایک روزنامے میں یہ چھپی کہ جنوبی پنجاب میں تین نوجوانوں (یا مردوں) نے برہنہ فلم یا فلمیں دیکھنے کے بعد کے جنسی ہیجان میں ایک کسان کی بیوی کو اس کے گھر سے اغوا کیا اور کھیت میں لے جا کر اسے اپنی بہیمیت کا شکار بنایا ۔ یہ ہیجان ظاہر ہے ویسا ہی تھا جیسا مندرجہ ذیل کیس ہسٹری میں ایک نوجوان نے اپنے بارے میں بتایا تھا ۔

ع ۔ س ۔ ولد غ ۔ م ۔ ایک دکان دار اور اس کا دوست جو زندگی کے اکثر کاموں میں ایک دوسرے کے شریک رہتے تھے اکثر بلو فلمیں بھی مکان کے مردانہ کمرے میں ایک ساتھ دیکھا کرتے تھے ۔ ایک دن زیادہ رات گئے تک برہنہ فلمیں دیکھنے کے بعد دونوں وہیں سو گئے ۔ ایسے مکانوں کے دوسرے مکینوں جن میں زیادہ تر عورتیں ، لڑکیاں ،

لڑکے اور بچے ہوتے ہیں اس کی تربیت غیر شعوری طور سے ملی ہوتی ہے کہ اس سے انھیں سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ کہ گھر کا سربراہ یا کوئی بڑا مرد باہر کے کمرے میں کن شغلوں میں مصروف ہے اور اگر وہ طالبِ علم ہے تو وہاں پڑھ رہا ہے یا گھر کا وہ حصہ کسی اور مصرف میں آرہا ہے۔

ع۔ س۔ کا دوست غالباً فلم دیکھنے کے دوران جنسی طور سے فارغ ہوچکا تھا اور شو ختم ہونے کے فوراً ہی بعد سوگیا تھا لیکن اس کے میزبان کا جنسی ہیجان ختم نہیں ہوا تھا اور اپنے دوست کو اس نے شغل میں اپنا شکار بنایا جو پہلے ان دونوں کے مابین نہیں تھا۔ اس دوست نے بعد میں ع۔ س۔ سے قطع تعلق کرلیا اور پرانی دوستی کے خاتمے سے ع۔ س۔ پر ایک افسردگی مسلط ہوگئی جو نہ اسے کام کرنے دیتی تھی نہ اس نے اسے اپنے گھر کا رکھا تھا۔ دن رات اس کے ذہن پر ایک پسندیدہ ہستی کو گم کر بیٹھنے کا غم تھا Loss of a love object لیکن نہ وہ اپنے فعل پر متاسف تھا نہ اوگھاڑی فلموں کے دیکھنے کی عادت پر ملول۔ اس کی گفتگو سے یہ اندازہ بھی ہوتا تھا کہ اس کے دوست نے اس عمل میں اپنی بے عزتی محسوس کی تھی ورنہ ، نہ وہ بالذات اس فعل کے بارے میں کوئی رائے رکھتا تھا، نہ اوگھاڑی فلمیں دیکھنے کے بارے میں اوگھاڑی فلمیں دیکھنے کے مریضوں میں سے تقریباً ۹۰ فی صد اس سے انکاری ہوئے ہیں کہ ہم جنسوں کے درمیان جنسی فعل میں ان کا کردار کبھی بھی انفعالی رہا ہے ، فاعلانہ کردار کو قبول لینے میں انھیں تامل نہیں ہوتا۔ ع۔ س۔ کے دوست نے شاید بعد میں یا اگلی صبح اس فعل میں اپنی اہانت محسوس کی تھی۔

ظاہر ہے اگر ع۔ س۔ کے مرض کو عام ڈپریشن (مایوسی) سمجھا جاتا اور چند منٹ کے انٹرویو کے بعد اسے دو ایک دواؤں کے نسخے کے ساتھ رخصت کردیا جاتا تو نہ وہ اپنے مرض کی بنیاد کو دیکھ پاتا۔ اور اس سے وابستہ بیمار اپنی شخصیت کو۔ اور نہ اس سے اسے نجات ملتی۔ ایک بار جب اس نے اپنی سرشت کی خرابیوں کو جان لیا اور تسلیم کرلیا تو اس کی زندگی میں پرسکون ٹھہراؤ آگیا۔

ع۔ ح۔ ولد م۔ ش۔ عمر ۱۸ سال نے پہلی بار تین برہنہ فلمیں ایک ساتھ دیکھیں اور دیکھنے کے دوران اسے چکر آگئے ، دل بے طرح سینے میں دھڑکا اور وہ وہیں اس خوف کے سے عالم میں ختم ہوگیا۔

جب وہ علاج کے لیے آیا تو خوف کا مریض تھا۔ اس کے خوفوں کی نوعیتیں مختلف تھیں اور پہلے انٹرویو میں وہ صرف اتنا بتا سکا کہ پہلی بار۔ خوف ایک بند جگہ میں اس پر طاری ہوا تھا۔ وہ اس پر مصر تھا کہ اس سے زیادہ اسے کچھ یاد نہیں ہے کہ اس کا دل وہاں اچانک دھڑکنے لگا تھا اور اسے شدت سے پیاس لگی تھی۔ کیوں کہ گلا خشک تھا۔

بعد کے دنوں میں اس کے کئی بار ای۔ سی۔ جی۔ Electro Cardio Grams کیے گئے تھے۔ کیوں کہ دل اس کے خوف کی علامتوں کا محور تھا اور E.C.G کے بعد اسے اتنے عرصے کے لیے تسکین ہوجاتی تھی کہ وہ دل کا مریض نہیں ہے جب تک کہ دوبارہ اس پر خوف کا حملہ ہو اور اسے یقین ہونے لگے کہ وہ دل کے دورے سے مرنے والا ہے۔

یہ کہ وہ بند جگہ اندھیری تھی اور اس میں مرد ہی مرد تھے ، عورت کوئی نہ تھی اسے کچھ دنوں بعد یاد آئی یا یہ کہ اس میں اتنی بات کہنے کا حوصلہ ہوا۔ جب اس کے علاج کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کی شادی کی بات چل رہی تھی اور جب اس نے بالآخر نفسیاتی علاج کو قبول کرنے کا فیصلہ بادلِ ناخواستہ کیا تو اس کی شادی کی تاریخ مقرر ہوچکی تھی۔ جنس

تصور یا جنسِ مخالف سے نزدیکی کا خیال اس کے ذہن میں لاشعوری طور سے سرسمگی سے جفت تھا اور شادی کی ہر
ت جو اس کے کان میں پڑتی تھی اس پر وہی کیفیت طاری کردیتی تھی جو سنیما ہول میں ہوئی تھی ۔ ۔ ۔ دل کا تیزی سے
ڑکنا ، زبان اور حلق میں خشکی ، ہاتھوں پیروں میں لرزہ اور معدے کی جگہ میں ڈوبنے کا تکلیف دہ احساس ۔ ان علامتوں
جلو میں مایوسی آتی تھی ۔ اس نے اس واقعے کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے کہ بیوی کے ساتھ پہلی شب وہی علامات
سے اپنی گرفت میں لے لیں گے جو برہنہ فلمیں دیکھتے وقت اس پر طاری ہوتی تھیں ۔ اس کی خوف بھری مایوسی میں شدید
ساسِ جرم بھی شامل تھا کہ میں ایسی جگہ گیا ہی کیوں تھا ۔ اس احساسِ جرم کو بھی اس نے شروع کے انٹرویوز میں یہ
ہ کر ٹال دیا تھا کہ وہ وہاں بالارادہ نہیں گیا ، اسے دھوکے سے وہاں لے جایا گیا تھا اور بعد کے ایک انٹرویو میں کہ
ہنہ فلمیں اچانک شروع ہوگئی تھیں ۔ آخری انٹرویو میں اس نے بغیر چہرے کے تناؤ کے کہا " میں خود وہاں گیا تھا
ں کہ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ ان فلموں میں کیا ہوتا ہے جس کے بارے میں میرے دوست گفتگو کیا کرتے تھے ۔"

الف ولد ح کپڑے کا بیوپاری اور م ۔ ح ۔ ولد م ۔ ع ۔ بیڑی باندھنے کا کاریگر دونوں کے کیس کی نوعیت
یک ہی ہے ۔ بے حرمتی کے خیالات Blasphemous Idias کسی خاتونِ مقدس ہستی کے لیے ۔ الف کی یہ عادت
دی سے پہلے سے تھی ۔ بعد میں کسی وجہ سے بڑھ گئی اور بلو فلمیں دیکھے بغیر وہ رہ بھی نہیں سکتا تھا ۔ باہر دوستوں میں
ں اور گھر میں اپنے کمرے میں بھی ۔ گھر کا ماحول مذہبی ہے ۔ بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے کاروبار کا
جھ الف پر نہیں ہے ۔ بڑے بھائی اور باپ کاروبار سنبھالے ہوئے ہیں ۔

جنسی نوعیت کے خود بہ خود پیدا ہونے والے بے حرمتی کے خیالات دوسرے کلچرز Cultures میں بھی دیکھنے
ں آتے ہیں اور میرے ایک چینی عیسائی مریض کو ایسا خیال پہلی بار مجسمے کے سامنے پیدا ہوا تھا ۔

الف کو شادی سے پہلے خود پر اختیار نہ ہونے نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور یہ نااختیاری بلو فلمیں دیکھنے سے
فیت inadequacy میں بدل گئی تھی ۔

ایک دن اچانک معمول کے مطابق جب وہ برہنہ فلمیں دیکھتا ہوا ان مونث کرداروں کی جگہ ان اور ان عورتوں
اپنے تخیل میں جگہ دیتا جارہا تھا ایک مقدس خاتون کے بارے میں اسے ایسا ہی خیال آیا ۔ یہ تجربہ اس کے لیے بوکھلا
ینے والا تھا اور اس نے اسے جھٹک کر باہر نکالنا چاہا ۔ خوف کی لہر اسے پسینے میں ڈبو گئی لیکن بات آئی گئی ہو گئی ۔

بعد کے دنوں میں جب جب اس نے کوئی برہنہ فلم دیکھنی چاہی گناہ کا تصور اس پر شدت سے طاری ہوا اور بغیر
ہ فلمیں دیکھے بھی وہ نہیں رہ سکتا تھا ۔ بالآخر گناہ کے بچھو کے ڈنک سے بچنے کے لیے اس نے برہنہ فلمیں دیکھنی
ند دیں لیکن بے حرمتی کا ایک فقرہ اس مقدس ہستی کے بارے میں اس کی فکر کا جزو بن گیا ۔ جس طرح ننگی فلمیں
کھنا اس کا بے اختیاری عمل Compulsive act تھا اسی طرح بے حرمتی کا یہ اڑتا ہوا خیال اس کا جبری تواتر سے خود
پیدا ہونے والا تصور بن گیا obsessive thought ۔ گھر والوں کو صرف یہ معلوم تھا کہ کچھ ایسے خیالات اس کے ذہن
ں پیدا ہوتے ہیں جنھیں روکنا اس کے بس کا کام نہیں ۔ ان خیالات کو روکنے کے لیے بھی اس تواتر سے مذہبی حلقے
قے کی ہدایت کی گئی اور باپ نے سختی سے کام لیا کہ کیوں نہیں انھیں دماغ سے نکال دیتا ۔ لیکن باپ کے تھپڑوں

ی وہ جملہ اس کے ذہن میں آنے سے نہیں رکا۔

الف نے تین بار خودکشی کی کوشش کی کیوں کہ وہ خود پیدا ہونے والے ان خیالات کی یورش کو روک نہیں اور ذہنی ساخت کے لچک سے عاری right thinking ہونے کی وجہ سے وہ خیالات کو روکنے کی عادت بھی ترک سکتا تھا (مذہبی بیک گراؤنڈ)

م۔ ع۔ کا کیس الف سے بنیاد میں زیاد فرق نہیں رکھتا ہے۔ لیکن وہ وہاں ان پڑھ ہے۔ اس کا تعلق ایسے ۔سے ہے جو مذہبی نہیں کہے جاسکتے گو ان کا اعتقاد پکا ہوتا ہے۔ اس ۔ا۔ وہ خیالات کو روکنے کے لیے مذہبی ۔ پڑھنے کی کوشش نہیں کرتا ہے کیوں کہ وہ اسے آتی ہی نہیں ہیں۔ اس کو ننگی فلمیں دیکھتے ہوئے زیادہ عرصہ ۔ا ہے اور نہ ہی اس نے اتنی ننگی فلمیں دیکھی ہیں جتنی الف نے۔ برہنہ فلموں سے اپنی شکایت (بیماری) کا رشتہ ۔ے بعد اس نے یہ عادت ترک کردی اور خود بہ خود پیدا ہونے والے بے حرمتی کے خیالات بھی وقت کے ساتھ ہوتے چلے گئے۔ جس طرح پانی نہ ملنے سے گھاس سوکھ جاتی ہے۔

کم عقل انسان کا دماغ زیادہ ایجاد نہیں ہوتا ہے۔ اس کے بے حرمتی کے خیالات میں وہ وسعت نہیں تھی جو خیالات میں تھی۔

م۔ ا۔ ولد ع۔ ص۔ پیشہ نائی۔ برہنہ فلمیں اپنے قصبے میں ۱۵ سال کی عمر سے دیکھنا شروع کیں اور اس وقت ہے گا ہے دیکھتا رہا جب ۱۹ سال کی عمر میں اس کی شادی ہوئی۔ وہ نفسیاتی جسمانی مسائل کا شکار تھا۔ ک۔ ہ۔ سال کی عمر سے برہنہ فلمیں دیکھنی شروع کیں۔ گھر پر یا دوستوں کی سنگت میں۔ وہ ان فلموں کے دیکھنے کو برا ا۔ نہ دیکھنے کا عہد کرلیتا تھا اور کچھ دنوں کی توبہ کے بعد یہ عادت پھر اس میں عود کر آتی تھی۔ نتیجتاً وہ مایوسی کا اور خود اعتمادی نہ ہونے کی شکایت لے کر علاج کے لیے آیا تھا۔ ج۔ ل۔ ذات ل۔ ج۔ ولد۔ ن۔ ر۔ کو دیکھنے کا اتفاق بارھوں جماعت میں ہوا جب دوست کے اتاق میں اس کا ان سے تعارف ہوا۔ اس کا یہ تجربہ ۔ا اور الٹی کے لیے اسے اٹھ کر باہر جانا پڑا جسے اس نے اور اس کے متمول دوست نے بدہضمی پر محمول کیا۔ ج۔ یاد نہیں تھا کہ خاص کسی سین کو دیکھتے ہوئے اس کا جی متلایا تھا لیکن اغلب ہے وہ تھا کوئی غیر فطری فعل ان اور جانور کے درمیان ذہنی ربط یا اسی قسم کا کوئی اور سیکوئنس۔

ل۔ ج۔ کی طرح کے نوجوان میرے تجربے میں بہت کم آئے ہیں جنھیں غیر فطری افعال کو دیکھنے سے کراہت ۔ ح۔ (ک) نے۔ ف۔ م۔ خ۔ کے اپنی عمر کے اس نوجوان کی طرح جس کا ذکر اوپر آیا ہے ان گنت فلمیں دیکھی ہیں۔ ۔۔ فوٹوگرافی کے ایک طالب علم کی طرح وہ فلمیں دیکھتے ہوئے نوٹس لیا کرتا تھا کہ کس فلم میں دیکھا۔ اسی طرح وہ نیم عریاں فیچر فلمیں دیکھتے ہوئے نوٹس لیتا جاتا تھا۔ اداکاراؤں کے نام جن کے برہنہ پیٹ ہوئی نافیں اور جسم کے دوسرے برہنہ اعضا اس کے تخیل کو ایڑ لگاتے تھے اور ان فیچر فلموں کو بھی وہ دیکھے بغیر سکتا تھا۔ وہ برہنہ فلموں کی لڑکیوں عورتوں کا نیم برہنہ فلمی اداکاراؤں سے لکھ لکھ کر مطابقت کرتا تھا اور سوچتا تھا ۔ سے شادی کرے گا اور ان کے ساتھ وہی عمل دہرائے گا جو اس نے ان کی مکمل برہنہ بہنوں کو کرتے دیکھا تھا۔

وہ ایک سیاسی کردار کے بارے میں بھی ایسی ہی ذہنی اڑانیں رکھتا تھا۔ وہ ایسا دماغی مریض نہیں تھا جو حقیقت سے ربط کھو بیٹھا ہو۔ جب وہ علاج کے لیے آیا تو مختلف قسم کی ایک دوسرے سے غیرمربوط جسمانی تکالیف کا ایک کٹیا لوگ ساتھ لیے کر آیا تھا جیسا خواتین شوپنگ کے لیے گھر سے نکلتے ہوئے بنالیتی ہیں۔

اس کی بیماریوں کے نوعیت نفسیاتی ذہنی Psychogomatic تھی اور شخصیت ہر قسم کی مقصدیت اور ذمے داری سے عاری۔ زیست کے خلاء Existential Vaccum کو وہ اپنے اس پروگرام سے پُر کیا کرتاتھا۔ زندگی اس کے لیے مسلسل آرام تھی۔

جنسی مسائل کے علاج میں ماسٹربیشن اور رات کا اخراج مریضوں کو بہ آسانی سمجھایا جاسکتا ہے اور اینیٹمی کی تصویروں اور فزیولوجی کے اصولوں کی مدد سے وہ اسے اپنی استعداد بھر سمجھ بھی لیتے ہیں اور ان کی پریشانی اور مایوسی کم ہوجاتی ہے اور وہ اپنی زندگی میں معمولی مناسب تبدیلیاں بھی پیدا کرسکتے ہیں۔ لیکن باقی چار جنسی برائیوں کا تدارک مشکل ہوتا ہے کیوں کہ اس میں کسی فرد کی پوری زندگی کو دخل ہوتا ہے۔ اس کی فکر کی نہج کیا ہے، خواہشات کیا ہیں، مقصدِ حیات کیا ہے اور زندگی میں مذہب کی اخلاقیات کا کیا مقام ہے۔ ان میں شادی سے باہر کی جنس، اپنی ہی جنس والوں سے رغبت، چوپائیوں سے کام چلانا اور ننگی فلمیں دیکھنا شامل ہیں۔ ان اطوار میں تاوقتیکہ خود ہی خواہش مند نہ ہو تبدیلی مشکل ہی سے لائی جاسکتی ہے اور وہ وقت کے ساتھ ساتھ compulsoin کی صورت اختیار کرجاتے ہیں یعنی وہ عمل جو آدمی نہ چاہتے ہوئے بھی کرتا ہے اور بار بار کرتا ہے۔ سنگت اور نشہ ان عادات کو برقرار رکھنے میں بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔

ننگی فلموں کو پابندی سے دیکھنے والوں کا کردار بالعموم وہ ہوتا ہے جو ہر وقت جنسی لذت کا جویا رہتا ہے وہ جنسِ مخالف کا پیچھا کرتا ہے۔ انھیں گھورتا ہے ان کے جسم کو کسی بہانے سے چھوتا ہے اور اس کے اپنے حلقے میں جنسی گفتگو اور ایک دوسرے سے جنسی مذاق کا راج رہتا ہے۔ اور خود پر مسلط کیے ہوئے اس ہیجان کے تحت فردخود کو بار بار ختم کرنے پر مجبور رہتا ہے۔ ایسے کردار کی نیند بھی اس کی دن کی زندگی سے مختلف نہیں ہوتی ہے اور عام فرد کی نسبت اس کے خواب میں بھی اچھے واقعات، مناظر اور صحت مند فکریں کم ہوتی ہیں اور جنس زیادہ۔ ایسے افراد کے مابین ساکت جنسی تصاویر کا لین دین بھی ہوتا رہتا ہے اور متحرک فلموں کا بھی۔ اس کے شکار موٹر گیارجوں میں کام کرنے والے تیل کے دھبوں سے بھرے ہوئے کپڑے پہننے والے لڑکے بھی ہوتے ہیں اور اعلیٰ عہدوں پرفائز اجلے کپڑے پہننے والے بھی۔

جنسی صحیح رغبت محض ساتھی کے نزدیک اور رضا مند ہونے پر ایک وقفے کے بعد خود بہ خود پیدا ہوتی ہے اس کے برعکس بلو فلمیں دیکھنے والوں کی جنس کی تیاری کے لیے محض ساتھی کا موجود ہونا ناکافی ہوتا ہے۔ یعنی آمادہ ہونا اگر ایک دہلیز ہے تو عام صحیح العقل انسانوں کی زندگی میں وہ دہلیز اتنی نیچی ہوتی ہے کہ بہ آسانی پار کی جاسکتی ہے۔ محض ساتھی کی موجودگی، نزدیکی، دو گرم سانسوں کا ایک ساتھ آنا (آرزو لکھنوی) کافی ہوتا ہے۔ بلوفلمیں دیکھنے والوں کی زندگی میں ان کی خود بلند کردہ جنسی طور سے ممیز ہونے کی دہلیز اتنی اونچی ہوتی ہے کہ اسے پار کرنے کے لیے بیک وقت کئی

کئی برہنہ جسموں کا ایک ساتھ نظر آنا ضروری ہوجاتا ہے ۔ اور ان کی باہم وہ حرکات جن کے لیے انسانی جسم اور اعضا نہیں بنے ہیں ۔

دوسرا اثر بلوفلموں کے سال ہا سال کے ملاحظے کا یہ ہے کہ وہ جسم کو ایسی ڈسپوزیبل سرنج بنا دیتا ہے جسے اس کے پیکٹ پر چھپی ہوئی ہدایت کے برخلاف ابالا گیا ہو، وہ مڑ تڑ کر رہ گئی ہو، استعمال کے وقت سیدھی نہ ہوسکتی ہو اور اس میں سے دوا فوراً ہی بہہ نکلے ۔ یعنی سنیما ہولوں، ریسٹورانوں، گھروں اور اوطاقوں میں ان فلموں کو دیکھتے ہوئے جسم میں بغیر تبدیلی کے آئے خارج ہوجانے کی عادت پیدا ہوجاتی ہے ۔

تیسرا اہم اثر جنسی زندگی پر ان فلموں کا یہ ہے کہ سیدھے سادے، بے بگڑے انسانوں کے برعکس جن کا ازدواجی اختلاط ان کے لیے مطمئن کرنے والا ہوتا ہے بلوفلموں کے مارے ہوؤں کو اس میں وہ اشتعال نہیں ملتا ہے جو ان فلموں میں دکھایا جاتا ہے اور جسے بہم پہنچانے کی سکت ایک عام خاتونِ خانہ میں نہیں ہوتی اور یوں یہ (بالعموم) مرد اپنی بیویوں سے نامطمئن رہتے ہیں اور آسودگیِ نفس کے دوسرے طریقے ڈھونڈتے ہیں ۔

ایک چوتھی شکایت جو یہ مریض کرتے ہیں وہ ہے پروسٹیٹک ڈسچارج یعنی پیشاب کی نالی کے دہانے پر آب نما ایک قطرے کا ہمہ وقت موجود رہنا ۔ اس کی وجہ ان کا جاگنے کے ہر گھنٹے میں جنسی اشتعال میں رہنا ہے جس کے محرکات عورتوں کا پیچھا کرنا، ان پر بیہودہ فقرے کسنا، بیہودہ جنسی اشارے، تاک جھانک بالخصوص غسل خانوں میں، جسم کو موقع ملتے ہی خواتین اور اطفال سے مس کرنا، برہنہ فلمیں دن رات دیکھنا، بے حرکت جنسی تصاویر کو سینوں سے لگائے رکھنا، جنسی لطائف کا بیان اور ایسی کتابوں کا پڑھنا ہیں جن میں کہانی صرف اس لیے ہوتی ہے کہ اس کے ہر فقرے اور واقعے سے کوئی جنسی تفصیل یوں لٹکائی جا سکے جیسے وہ کپڑے ٹانگنے کے ہک ہوں اور ان واقعات کی اپنی کوئی حیثیت نہ ہو ۔

برہنہ فلموں کو دیکھنے کی عادت یا کوئی بھی جنسی بے راہ روی خال خال ہی اپنی جگہ واحد برائی ہوتی ہے ۔ بالعموم دوسری برائیاں اس کی ہم رکاب ہوتی ہیں جن میں نشہ آور اشیا کا استعمال، وقت کی فراوانی، زندگی میں ذمے داری کا نہ ہونا، مفت کا پیسہ جو اپنا بھی ہوسکتا ہے چوری چکاری کا بھی، جنسی مزدوری کرنے والی عورتوں اور بچوں بچیوں کی سماج میں موجودگی اور اخلاقی اقدار سے دوری سب ہی شامل ہے ایسے نوجوانوں کا خود کو احساسِ محرومی کا شکار کہنا وغیرہ وہ لیبل ہیں جو وہ خود پر لگالیتے ہیں اور اس طرح جو بچا کھچا ضمیر ہوتا ہے اس کی ایذا رسانی سے محفوظ رہتے ہیں ۔

اس صورتِ حال کا سدِّ باب ممکن نہیں ۔ نہ بیت الخلاؤں میں لکیروں کی تصویریں بنانے والوں کے ہاتھ پکڑے جاسکتے ہیں، نہ برہنہ فلموں کے بنانے، بیچنے والوں کے دماغوں پر پہرے بٹھائے جاسکتے ہیں ۔ بیت الخلا کے مصوروں کے ہاتھ میں موقلم دے دیجیے ان کی صلاحیت کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے ۔ وقت اور پیسے کا صحیح حصول اور مصرف سوسائٹی کے ازسر تا پا ہر فرد میں پیدا کردیجیے نہ بلو فلموں رہیں گی نہ ان میں کام کرنے والے بچے، جانور اور انسان ۔ یہ کاروبار ناقدری سے مرجائے گا ۔ لیکن اس کو کیا کہیے کہ انسان کی تعمیر میں ایک صورت خرابی کی مضمر ہے وہ پھر برائی کی راہیں ڈھونڈلے گا ۔

پسِ لفظ

مضمون میں جو کیسس نوٹس آئے ہیں ان کا چناؤ اپنی انفرادیت کی وجہ سے کیا گیا ہے اور ان کی تعداد دیکھے جانے والے مریضوں میں سے سو میں سے دس کی بھی نہیں۔ ان کرداروں کو اصلی زندگی میں تلاش کرنا بے سود ہوگا کیوں کہ نام کے حروفِ تہجی ان کی شناخت کے لیے میرے دیے ہوئے ہیں نہ کہ اصلی ناموں کو ظاہر کرتے ہیں۔

مضمون جہاں جہاں پڑھا گیا اسے سنجیدہ خاموشی سے سنا گیا۔ اور جنھوں نے بھی اسے پڑھا اس کی افادیت کو سراہا۔

ایک آرٹسٹ قاری کے ذہن میں اس خیال سے کچھ الجھن پیدا ہوئی تھی کہ مضمون شاید آرٹ کے خلاف ہے کیوں کہ آرٹ اور بالخصوص مغربی آرٹ میں برہنہ جسم کے بڑے خوب صورت نمونے ملتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ فحاشی جنسی عمل کے اظہار کا ایسا طریقہ ہے جو جمالیاتی کی جگہ شہوانی جذبات کو ابھارتی ہے اور کوئی بھی نیوڈ (برہنہ جسم) جو آرٹسٹ کے موقلم سے نکلا ہو ایسی تحریک مہیا نہیں کرتا۔ فوٹوگرافی میں بھی یہی اعجاز ہے اور کتنی ہی بلند معیار کی فلموں کے نام لیے جاسکتے ہیں جن میں عورت کا بالاجسم برہنہ تھا لیکن وہ اپنی بے لباسی میں کہانی کا حصہ تھا اس سے علاحدہ کوئی اور چیز نہیں جس پر نظر جاکر ٹھہر جائے۔ یہی بات جنگلوں میں بسنے والے افریقی جسموں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے جو کھلے ہونے کے باوجود دعوت نگاہ نہیں دے رہے ہوتے ہیں۔ اور بے لباسی ہی جن کا لباس ہوتی ہے۔

ایک نوجوان نے یہ سوال کیا تھا کہ جنس جیسے اسفل فعل کی مضمون میں تعریف کی گئی ہے۔ وہ ایڈولیسینس کی اس منزل پر تھا جب نوجوان اپنے جسم میں بیدار ہوتی ہوئی نئی تحریک کو اسے برا کہہ کر روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اسے مناسب تعلیم اس بارے میں نہیں مل رہی تھی۔ ماحول سے ملنے والی غلط تعلیم ایسے نوجوانوں کو غلط راہ پر بھی ڈال سکتی ہے، اور جنس سے جنگ آئندہ ذہنی پیچیدگیوں کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ صحیح تعلیم کے بعد یہ ہیجان کم ہوجاتا ہے اور جوانی میں داخل ہونے والے خود کو اگلی زندگی کے لیے تیار کر لیتے ہیں۔

مضامین کے بارے میں فون بھی آئے خط بھی اور بالمشافہ گفتگو بھی ہوئی اور اندازہ ہوا کہ مضمون کی ضرورت تھی۔

○●○

(سلسلہ ص: ۲۹ سے)

کرتے دیے) ؛ un- xatara ziyâfat karo اُن خاطر ضیافت کرو (میں نے / اُن کے لیے ضیافت کا انتظام کیا)۔ un- (n)a kiyo اُن نا کیو (انھوں نے کہا) ؛ xuda un- ta ugi rakʰa خدا اُن تا اُگی رکھا (خدا اُن کو سلامت رکھے)۔

(ب) ضمیرِ اشارہ "وہ" کی حیثیت سے ؛ o jatak maktab ni- parti او جاتک مکتب نی پاڑتی (وہ بچے مکتب میں / اسکول میں / نہیں پڑھتے ہیں)۔ u capati اُوچپاتی (وہ چپاتیاں)۔

غیر فاعلی اشکال: un اُن ؛ un anmun- (n)a kiyo اُن اَن مُن نا کیو (اُن آدمیوں نے کہا)

○●○

کاوش عباسی

ہم تو مرتے رہے

○

ہم تو مرتے رہے
اور وہ اور جیتے رہے
پھولتے اور پھلتے رہے
سب حساب اور سارے نصاب
الٹے پڑتے رہے
ہاتھ ملتے رہے
ہر نیا دن ہی ان کے لیے
اک نئے اور مضبوط تر اتفاق
مشیت کی ان پر سنہری عنایت کی طرح نمودار ہوتا رہا
جیسے شاہِ مقدر کی جانب سے
صدیوں کی نسلوں کا ،
لاکھوں ، کروڑوں جنموں کا ، سب آبِ حیات
ان کے لیے نوشِ جاں کی ودیعت ہو

کبھی یوں لگا بھی کہ ان میں بھی کچھ زندگی ہی کے جو پائیں
انسانوں کی زندگی میں نمو چاہتے ہیں
تو فوراً انھوں نے وہ کچھ چال چل دی
کہ پھر سے سبھی رخ پچھل پائیوں کے ہوئے
اور ہاتھوں سے آواز لیے نکلنے لگے
جو کفن پھاڑتے ،
اور مردوں کا ، زندوں کا ، سارا بدن کاٹتے ، نوچتے ہیں
تو ہم دیکھتے ہیں
کہ فوراً ہی بستی کی مخلوق

سب عامۃ الناس ، مردوں کی فل فارم میں
خود کو ان کے لیے نوشِ جاں کی طرح پیش کرتے ہیں
اور مردہ خوری کا سارا عمل ہونے لگتا ہے
ایسے میں کچھ لوگ انھیں کہتے ، سمجھاتے بھی ہیں
تو یہ عامۃ الناس سنتے نہیں
گر کبھی لڑتے بھی ہیں ، الجھ پڑتے بھی ہیں تو آپس میں ہی ،
یا پھر ان کہنے ، سمجھانے والوں سے ہی ،
مردہ خوروں سے نہیں
مردہ خوروں کے ذی منصبوں ، مشرفوں سے نہیں
جو کفن پھاڑتے اور ان کے بدن کاٹتے ، نوچتے ہیں
تو ہم سوچتے ہیں
تو کیا تا ابد ہی یہ مخلوق اپنی
مری آنکھوں میں ، سن نسوں میں ، یوں ہی موت جیتی رہے گی
یہ مخلوق ، انسان کے نام کی
لیکن انسان کے سب ثبوتوں سے عاری
ہم ان سارے حساس ذہنوں کے حق میں
بھی بے فائدہ موت کے خطرے جیسی
جو اس کے لیے ، اس میں جاں پھونکنے کے لیے
اپنی جانوں کے ، عمروں کے نذرانے دیتے چلے آرہے ہیں
تو کیا تا ابد ہی یہ مخلوق اپنی
کھلی جنگ لڑنے سے منکر رہے گی
سبھی زندگی اس کی ، ساری تگ و دو
انہی ٹوٹے پھوٹے سے سانسوں کے رشتے

کو ہی باقی رکھنے کی خاطر رہے گی
اور اس کا بدن نوچتی اور لہو چوستی
طاقت اس پر اسی طرح جابر رہے گی

تو ہم سوچتے ہیں
کہ کیسی یہ مخلوق ہے ۔ کیسی بستی ہے یہ
کیا کوئی خواب ۔ کوئی جنوں ۔ کوئی آگ
خواب کی رہ میں سر دھڑ کی بازی لگانے کی آگ
اس میں کبھی ہم نہ دیکھیں گے
جو دنیا کے سب کامراں ، شعلہ افشاں جہانوں میں دیکھا ہے
اس عالم بے طپش میں کبھی ہم نہ دیکھیں گے
تو کیا ساتھ اس کے ہمارا بھی جیون
کوئی خار و خس ہے ۔ شئے رائگاں ہے ۔۔
جو اپنے نہ اپنے عزیزوں کے کچھ کام آیا
نہ اس مردہ مخلوق میں شعلہ سا کوئی بھڑکا ہی پایا
کبھی زندہ و مردہ جوروں سے جنگ ان کی دیکھی
نہ خود کوئی پیکار کرتا ہی پایا

کہاں جائیں سر پھوڑنے ہم
کہاں جا کے چیخیں
کہاں جا کے کس کو پکاریں ۔
پکاریں کہ آؤ ۔ جہاں بھر کی روحو ۔
آؤ دیکھو
یہاں ایک صدیوں کی مخلوق ہے ۔ بے کسی اور ڈر کی بنائی ہوئی
ڈر ہی کھاتی ہوئی ۔ ڈر ہی پیتی ہوئی
یہاں ایک بستی ہے ۔ اپنے ہی جسموں کے پانی میں ڈوبی ہوئی
یہاں جنگ ہے ایک صدیوں سے ٹھہری ہوئی
یہاں موت ہے ایک سو روپ جیتی ہوئی
کہاں جائیں سر پھوڑنے ہم ۔
کہاں جا کے چیخیں

ہم تو مرتے رہے
اور وہ اور جیتے رہے

○●○

ایس ۔ اے ۔ فہیم

○

کچھ ایسا عقل و دانش سے رہا ہے واسطہ میرا
کہ میں اپنی طرف سے جستجو کا سلسلہ رکھوں
وہ میں دنیا کو دوں سب کچھ
جو ممکن ہوسکے مجھ سے
اسی کے ساتھ گزرے
روز و شب اپنی جوانی کے
ضرورت بن کے رہ جاؤں میں اس کی
آرزو یہ ہے ۔

○●○

میر ہاشم

الزام نہ دو

راہ کا کیا ہے وہ ہر جائی ہے
وہ کبھی جاتی ہے منزل کی طرف
اور کبھی دشتِ فراموشی کو
راہ رہبر بھی ہے ، رہزن بھی ہے ، قاتل بھی ہے

نظریں وارفتگیِ شوق میں کھو جاتی ہیں
ذہن آشفتہ خیالی میں بھٹک جاتا ہے
لغزشِ پا کی بھی آہٹ نہیں ہونے پاتی
اور سرمایۂ جاں داؤ پہ لگ جاتا ہے

روز ناموں کی جلی سرخیاں سر پیٹتی ہیں
کون کس طرح سے دنیا سے اٹھا
اور وہ شخص جو زندہ ہے ابھی
زندگی کاسۂ دریوزہ لیے
موت کے سامنے شرمندہ ہے

حادثے راہ میں منہ کھولے ہوئے بیٹھے ہیں
اپنی تقدیر کو تدبیر کے کاندھوں پہ اٹھائے رکھو
اس کو الزام نہ دو

○●○

آر۔ کے۔ روشن

انتقام

کس حسیں انداز سے
دیکھو لیا ہے انتقام
خواب !
اپنا رکھ دیا میں نے
عدو کی آنکھ میں

○●○

مسخ منظر

ہر اک منظر کے
چہرے کو چھپا کر
مسخ کرتے ہیں
یہاں کے
لوگ آنکھوں میں
نکیلے دانت رکھتے ہیں

○●○

صراطِ مستقیم

راستہ
کتنا ہی سیدھا کیوں نہ ہو
اس پر
آنکھیں بند کر کے مت چلو

○●○

مظہر مہدی

اے میری روح

اے میری روح
کیا تجھے اور کوئی قالب پسند نہ تھا
جو اس پنجر میں قید ہو کر
زنداں کو بھی سزا میں مبتلا کر دیا

اے میری روح
کیا تو طائر کی طرح آزاد نہیں ہو سکتی تھی
کیا تو اس درندے کی طرح
جنگلوں میں چنگھاڑتے دندناتے پھر نہیں سکتی تھی
یا پھر سمندر کے سکوں آمیز ماحول میں
آبی مخلوق کی طرح
لا محدود وسعتوں میں
لا محدود آسماں کا نظارہ بھی کر سکتی تھی
یہ قہر ہی تو ہے
تو اور میں
مدعی اور مدعی علیہ
ایک ساتھ
سزا کاٹ رہے ہوں

○●○

دوست کے دشمن کے لیے ایک نظم

ہم ظالم حاکم نہ وحشی درندے
بے بس روحیں جبر کا شکار
معیشت کی چکی میں پستی ہوئیں آوازیں
تم خرد کی دھجیاں دھجیاں کر کے
ہوس کے ارادوں کو نیا رنگِ پیراہن دو
چلو تم اپنے آلاتِ حرب تیز کر لو
ہم اپنی ڈھالیں پھینک دیتے ہیں
ہمارے لہو کی بوندوں کو مےِ ناب سمجھو
اور مالا جپو
ہماری کراہوں کی تھاپ پر
رقص کرو اور آسودہ ہو جاؤ
غضب کی آگ میں اپنے بدن اتنا تپاؤ
کہ ہاتھ لگتے ہی ہم بھسم ہوجائیں یا گل زار
ہماری ہڈیوں سے تیر و تبر بنالو
اور ہماری روح پر وار کرو
ہم اپنے ایقان میں اتنے ثابت ہیں
تم پر ایک حرف بھی آنے نہ دیں گے

○●○

مظہر مہدی

مہاجر

ایک ایسا نگر
شام سے دور
سحر سے بعید
جیسے تاریک آسماں
جس پر میرے وجود کی طرح
ٹمٹماتے تارے
فلک کو مسلسل ٹکٹکی باندھے گھورتے ہوئے
آسماں ان گنت رنگوں سے مرصع
جیسے میری یادیں
ایک یاد کا دوسری یاد سے علاقہ نہیں
ایک منظر کو دوسرے منظر سے نسبت نہیں
سیاہ ، سبز اور نیلے میری یادوں کے مراکز
جیسے برگد ، طائر اور دور تک پھیلی ہوئی اداسی
یہ کیا وقت ہے !
شاید وقت ٹھہر گیا !
شاید میں ہی زمان و مکاں کے درمیان
خلاؤں میں ٹھہر گیا ہوں
کوئی تو مجھے آواز دے
آوازوں کو دھرتی سے آیا ہوں
آوازوں کا باشندہ
آوازوں کا پروردہ
آوازوں کی مشعلوں میں ڈھلنے والا
کیوں بے نطق ہوں

○●○

اسلم عمادی

روشنائی

روشنائی
جیب سے دامن تلک پھیلی ہوئی . . .

اس قلم نے . . .
بے لکھے الفاظ کو ایسے بکھیرا
ان کی ساری صورتیں ضم ہوگئیں . . .
جانے کیا تھا گفتنی . . . ؟
جو مرے ملبوس ہی میں سو گیا . . .
اک تھکی ماندی سی قوت کی طرح !

○●○

راشد آزر

کل

میں سوچتا تھا کہ مرچکا ہے
وہ "کل" جو سب
حادثوں اور سانحوں کو لے کر
چلا گیا ہے
وہ صرف ماضی کا باب ہے جو
ہزار لمحوں کی چادروں سے
ڈھکا ہوا ہے
کچھ ایسے لمحے جو یاد ہیں
اور ایسے لمحے جو بھول کی دھند میں چھپے ہیں
میں سوچتا تھا
وہ "کل" کسی کام کا نہیں ہے

مگر وہ "کل" . . . "آج" میں ابھی تک
اسی طرح جی رہا ہے ، جیسے
زمین میں بیج
آسماں پر ستارے جو اب نہیں ہیں ، لیکن
ہزاروں صدیوں کے بعد جن کی
شعاعیں ہم تک پہنچ رہی ہیں
وہ "کل" مرے "آج" سے نکل کر
وہ "کل" بنے گا
جو آنے والا عظیم "کل" ہے

○●○

جستجو

بہت دنوں سے نہ چاند دیکھا
نہ بادلوں کے مہین سائے ہی چاند پر سے گزرتے دیکھے
نہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے
نہ اب کھلا آسماں ہے سَر پر
نہ شبنمی میں نے تان رکھی
نہ اوس میں بھیگتا ہے کرتا
نہ صبح کو سبزہ روندتا ہوں
نہ شبنم اب پاؤں چومتی ہے
میں اونچی اونچی فصیل جیسی
عمارتوں میں گھرا ہوا ہوں
انھی کے تنگ گھیرے میرے منظر کی سرحدیں ہیں
بلندیوں کے حدود ، حدِ تعیناتِ نظر ہیں ، لیکن
مرے خیالوں کی وسعتیں
اور آسماں کی تلاش میں ہیں

○●○

مناظر عاشق ہرگانوی

انیسویں صدی کی ایک نظم

جینے کا انداز
کبھی اتنا بڑا لگا کہ
اسے مٹھی میں باندھنے کے
اپنے خیال پر ہنسی آگئی
اور کبھی اتنا چھوٹا لگا کہ
ریت کی طرح مٹھی کے بیچ سے
کھسکتا چلا گیا
ہوا کی طرح سرکتا ہوا !
پرت در پرت تب بھی
یہی خواہش جاگتی رہی کہ
گلاب کی مہک بکھرتی رہے !
اندھیرے کو ہاتھ بڑھا کر
ایک کرن میں کھینچ لینا چاہا
اس نے
جب بھی کہرے سے ڈھک گیا وجود
مسکان سے من بھر لینا چاہا !
بانجھ شروعات کا اختتام
درد کا سہلانا
تاریخ کا دہرانا
لوٹتے پرندے
اُگتا سورج
تازہ دم چہچہاہٹ !

○●○

شاہد کلیم

میراث

کبھی کوئی
ہرے پتوں کو
ننھی کونپلوں کو نوچتا ہے
کبھی کوئی
ہری شاخوں کو
جبراً کاٹتا ہے
یہی وہ پیڑ ہے جو
ہر برس پھلتا ہے لیکن
ہرے ادھ پکے پھل
کوئی نہ کوئی
توڑ لیتا ہے ۔
درختوں پر ثمر پکنے کے
جب آتے ہیں دن
تو بانجھ پن کی چادرِ غم
اوڑھتا ہے ۔
یہ خود رو پیڑ ہے میراث سب کی
کسی کو
کوئی کیسے روک سکتا ہے ؟

○●○

مصحف اقبال توصیفی

اپنے غم کی حد میں رہنا ۔ کیوں اس سے بے کار ملیں
ہم نے بھی اب سوچ لیا ہے نومیدانہ زیست کریں

رہتے تھے اس شہر میں ہم بھی ۔ لیکن ہم کو جانے کون
اپنا نام تو کب کا بھولے ۔ اب اس کا بھی نام نہ لیں

ان خوابوں کا سونا چاندی ۔ تیری کھڑکی کی سل پہ
یہ آنسو ۔ ۔ ۔ یہ موتی ۔ ۔ ۔ تیرے تکیے کے نیچے رکھ دیں

کیا یہ چہرہ یاد ہے تم کو ۔ آنکھ اٹھا کر دیکھو تو
اچھا ۔ ہم کو ڈھونڈو اپنے البم کی تصویروں میں

مصحف تم نے شعر سنا کر بہت سمے برباد کیا
آؤ میر کے پاؤں دابیں ۔ میراجی کے پاس چلیں

شاہین

گھر سی ویراں ہوا پھر بھی گل افشانی کرے
زخم جیسے درد کی پیہم نگہبانی کرے

فصل غارت کر چکی اب رقصِ عریانی کرے
رت وہ آتی ہے کہ گھر گھر جشنِ ویرانی کرے

ہم سے دانائی بھی اکثر یوں ہی سرزد ہوگئی
جیسے نادانستہ کوئی شغلِ نادانی کرے

میری اس چھوٹی سی دنیا کا سکوں برہم نہ کر
تیری مرضی جس طرح چاہے جہاں بانی کرے

بھیگ کر ساری کتابیں لکڑیاں سی ہوگئیں
جیسے ایندھن کا بہم سامانِ طغیانی کرے

پھر انہی کے سحر میں شاہین کھو جاتا ہوں میں
جن طلسموں سے بنا خود میری حیرانی کرے

مصطفیٰ شہاب

○

اک شمع کا سایا تہہِ محراب میں ڈوبا
اک میں کہ ترے ہجر کے گرداب میں ڈوبا

میری شبِ تاریک کا چہرہ ہوا روشن
سورج سا کوئی شام کو مہتاب میں ڈوبا

بے دیدہ ، بے خواب مرا کتنا فریبی
جب دیکھیے لگتا ہے کسی خواب میں ڈوبا

بچھڑا وہ ، کسی کھیل کے پتھر کی طرح ، جو
موجوں سے الجھتا ہوا تالاب میں ڈوبا

کھلتا ہی نہیں ہم پہ وہ خلوت ہو کہ جلوت
ملتا ہے ، مگر مجلسی آداب میں ڈوبا

وہ ایک قلعہ ، ایک پناہ گاہ تھی مضبوط
وہ گھر بھی شہاب آپ کا سیلاب میں ڈوبا

○●○

○

انسان کا چولا ہے ، کبھی کچھ ہے کبھی کچھ
جادو کا ہیولا ہے ، کبھی کچھ ہے کبھی کچھ

ہر طرح کے امرت سے بھری زندگی اس نے
اب زہر جو گھولا ہے ، کبھی کچھ ہے کبھی کچھ

خود اپنی تمناؤں کو پرکھا ہے کئی بار
اس کو بھی ٹٹولا ہے ، کبھی کچھ ہے کبھی کچھ

کانٹا کوئی نشتر نما ، مرہم کوئی اکسیر
پاؤں کا پھپھولا ہے ، کبھی کچھ ہے کبھی کچھ

وہ گردِ سفر ، اب ہے ، کبھی راہ نشیں تھا
کہنے کو بگولا ہے ، کبھی کچھ ہے کبھی کچھ

○●○

محسن بھوپالی

○

ہم سخن اور ہی سفر میں ہیں
شاعری میں نہیں خبر میں ہیں

ہیں نمونہ انا پرستی کا
یہ جو خود اپنے ہی اثر میں ہیں

حاصلِ عمر ہوں گے وہ نغمے
جو ابھی ذہنِ نغمہ گر میں ہیں

ہم اندھیروں کی دست رس سے دور
روشنی کی طرح سفر میں ہیں

جانے کب آئیں گے نگاہوں میں
ہم بھی اس عہدِ کم نگر میں ہیں

دیکھیے وقت کیا بناتا ہے
ہم ابھی دستِ کوزہ گر میں ہیں

محسن ان سے عمل کی ہے امید
محو جو ذکرِ خیر و شر میں ہیں

○●○

راشد آزر

○

وہی تعلقِ خاطر جو برق و باد میں ہے
دلِ ستم زدہ کی حسرت و مراد میں ہے

ہر ایک عہد کی ہوتی ہے اک خصوصیت
ہمارے دور میں یکسانیت تضاد میں ہے

کسی نتیجے پہ پہنچے ہیں غور و فکر کے بعد
تو یہ کہ سارا جہاں ایک گِردباد میں ہے

اگر نظر ہو تو پڑھ لو پیامِ بیداری
فصیلِ شہر پہ لکھا ہوا فساد میں ہے

وہ بات ساری کتابوں میں مل نہیں سکتی
جو انقلاب کے چھوٹے سے استناد میں ہے

وہی اساسِ محبت بھی ہے عقیدت بھی
وہ اعتماد کا پہلو جو اعتقاد میں ہے

وہی تو فن میں روایت کی روح ہے آزر
وہ ایک چھوٹا سا نکتہ جو اجتہاد میں ہے

○●○

اسلم عمادی

○

گہری شب میں یوں کس حدتک سوچا جائے
بجھنے لگا ہے خوں کس حدتک سوچا جائے

سرحدِ فکر علاقہ ۔ ہوش سے ہٹ نکلی ہے
آن پڑا ہے جنوں کس حد تک سوچا جائے

ہر اک سمت یہاں پر ٹوٹ کے یوں بکھری ہے
اب کس طرح کہوں ۔ کس حدتک سوچا جائے

وقت کے بہتے دھارے میں ہیں کیوں یہ چٹانیں
میں اس فکر میں ہوں ۔ کس حدتک سوچا جائے

سیارے کیوں دشتِ فلک میں بھاگ رہے ہیں
آخر کیوں سوچوں ۔ کس حدتک سوچا جائے

فکر و خیال پہ سایہ فگن تلوار کی صورت
اسلم جذبِ دروں کس حد تک سوچا جائے

○●○

مسعود صدیقی مسعود

○

ہر ناز کو لے ہمتِ مردانہ اٹھالے
محشر ہی اٹھانا ہے تو پیمانہ اٹھالے

ہے فیصلہ عشق کے دنیا سے گذر جا
ایک اور قدم لغزشِ مستانہ اٹھالے

کیا مجھ کو ٹھکانے لگا تو اے زاہدِ خود بیں
گر اٹھ سکے تجھ سے مرا پیمانہ اٹھالے

آجائے اگر ضد پہ قدح خوار بلا نوش
اک جام تو کیا ہاتھ سے مےخانہ اٹھالے

اس چشمِ سیہ مست کا ایما ہے بہر حال
توبہ کو توڑ ہاتھ میں پیمانہ اٹھالے

تبیداد جہاں جور محبت ستم دھر
جو غم بھی ہو لے ہمتِ مردانہ اٹھالے

جو بارِ امانت نہ اٹھا ارض و سما سے
مسعود بہ یک لغزشِ مستانہ اٹھالے

○●○

ایس ۔ اے ۔ فہیم

○

ہم ان کی بزم میں ناحق بہ راہِ سادگی آئے
وہ کس تیور سے کہتے ہیں کدھر یہ اجنبی آئے

اندھیرا دور ہو ایسا کہ ہر دم روشنی آئے
ہم آغوشِ سحر ہو کر نہ ہرگز تیرگی آئے

میسر ہو کوئی ایسا بھی دن اس بزمِ ہستی کو
محبت کی بلندی پر شعورِ آدمی آئے

ہر اس بے جا تکلف سے ہمیشہ خوف آتا ہے
مزاجِ حسن میں جس کے سبب سے برہمی آئے

مرے ہم راہ بھی اک خوب صورت چاند رہتا ہے
مرے گھر جب کبھی آئے سنبھل کر چاندنی آئے

ہمیں راہوں میں اپنی چھوڑ کر تم چل دیے لیکن
تمھاری یاد کے سائے ہمارے ساتھ ہی آئے

فہیم آنے نہ دوں گا حرف خودداری کے جذبے پر
اجل کے ہی مقابل کیوں نہ میری زندگی آئے

○●○

نعمت انور غوری

○

اہلِ چمن کی شوخی میں تیری ادا لگے
ہر سو ترا جمال ہی بکھرا ہوا لگے

یہ کس کی چھیڑ چھاڑ سے گل مسکرا اٹھے
مجھ کو بھی اے نسیمِ سحر کچھ پتہ لگے

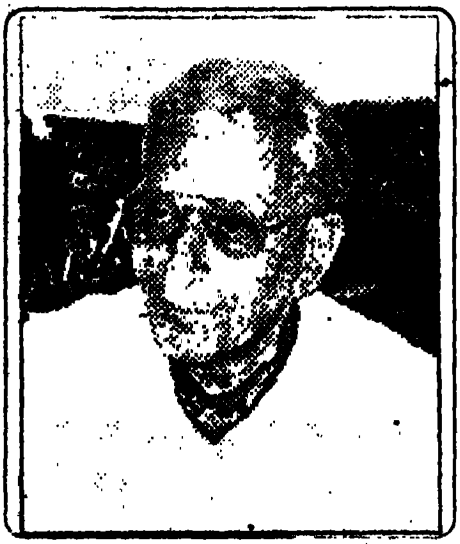
ہر چند ہے تغافلِ پیہم مگر مجھے
دزدیدہ اک نگاہ سے وہ دیکھتا لگے

اوروں کا درد و غم بھی ذرا بانٹ لیجیے
کیا جانے کس غریب کے دل کی دعا لگے

انور وہ جلتے ہیں مرے دل کا حال سب
کچھ ان کے حالِ دل کا مجھے بھی پتہ لگے

○●○

مرزا حامد بیگ



آغا بابر

نام : آغا سجاد حسین

قلمی نام : آغا بابر

پیدائش : ۳۱ مارچ ۱۹۱۹ء بہ مقام بٹالہ۔

تعلیم : ایم۔ اے (تاریخ) پنجاب یونی ورسٹی، لاہور۔ میٹرک ایم۔ سی ہائی اسکول، بٹالہ سے کیا۔ گورنمنٹ کالج، لاہور سے بی۔ اے (آنرز) اور بعد میں پرائیوٹ طالب العلم کے طور پر پنجاب یونی ورسٹی، لاہور سے ایم۔ اے کیا۔ انفارمیشن اسکول فورٹ سلوکم نیویارک کے گریجویٹ تھے۔

مختصر حالاتِ زندگی : غلام اکبر خاں کے ہاں بٹالہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ لڑکپن کا بیش تر وقت لاہور میں گزرا۔ ایم۔ اے اردو کرنے کے بعد ۱۹۴۵ء پنچولی آرٹ سٹوڈیو میں مکالمہ نویس کے طور پر کام کیا۔ ڈراما سے طبعی مناسبت کے سبب ابتدا میں بہ طور ڈراما نویس شہرت پائی۔ غیر منقسم پنجاب کی صوبائی اسمبلی میں بہ طور رپورٹر کام کیا۔ کچھ مدت حکومتِ پنجاب (ہند) کے انفارمیشن ڈپارٹمنٹ میں پبلسٹی افسر رہے۔ ۱۱ مئی ۱۹۴۹ء کو پاکستان آرمی میں کمیشن حاصل کیا اور ۱۱ جولائی ۱۹۴۹ء میں انٹر سروسز پبلک ریلیشنز ڈائریکٹوریٹ (G.H.Q) سے وابستہ ہوگئے۔ "مجاہد" اور "ہلال" کے مدیر رہے۔ ۱۹۵۱ء میں پاکستان کے ایک خیر سگالی وفد کے ساتھ سعودی عرب گئے۔ ۱۹۶۱ء میں انٹرنیشنل پریس انسٹیٹیوٹ کے زیرِ اہتمام کوالالمپور، ملیشیا میں منعقد ہونے والے مدیروں کے سیمینار میں شرکت کی۔ میجر کے عہدے پر پہنچ کر ریٹائر ہوگئے۔ ۶۸۔ ۱۹۶۷ء میں حلقہ ارباب ذوق راولپنڈی کے سکریٹری رہے۔ ۱۹۶۸ء میں نیشنل کونسل آف آرٹس، راولپنڈی کے ڈائرکٹر تھے۔ جہاں سے ریٹائرمنٹ کے بعد امریکہ چلے گئے۔ اور "ریڈرز ڈائجیسٹ" کے ساتھ منسلک رہے۔

اولین مطبوعہ اردو افسانہ : "ہی اینڈ شی" مطبوعہ: "ہمایوں" لاہور۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب) :

۱۔ "چاک گریباں" (آٹھ افسانے) مکتبہ جدید، لاہور۔ طبع اول: اگست ۱۹۴۸ء۔

۱۔ تعجب   ۲۔ بڑے میاں سو بڑے میاں   ۳۔ فرار   ۴۔ زندگی کی شام   ۵۔ میری سالیاں

۶۔ طلبہ کی فریاد ۷۔ ایک خط جو سنسر ہوگیا ۸۔ محبت مسبب

۲۔ "لبِ گویا" (بیس افسانے) گوشۂ ادب ۔ لاہور ۔ طبع اول : ۱۹۵۶ء

۱۔ کبو ۲۔ برقع گرا پارٹی ۳۔ زنانہ کلب ۴۔ بیوگی ۵۔ کوزے کے ڈھیر پر

۶۔ غلام ۷۔ زہرہ مذروب ۸۔ دل کی بستی عجیب بستی ہے ۹۔ شاپ لفٹنگ ۱۰۔ شہسوار

۱۱۔ ہم بدلے نہ وہ بدلے ۱۲۔ دسترخوان ۱۳۔ سبز پوش ۱۴۔ مسیحائی ۱۵۔ روح کا بوجھ

۱۶۔ رات والے ۱۷۔ جستجوئے جمال ۱۸۔ وہ زندگی کی بات تھی ۱۹۔ چارلس ہیجڑا ۲۰۔ چال چلن

۳۔ "اڑن طشتریاں" (پانچ ڈرامے ایک سفر نامہ اور بارہ افسانے) "گوشۂ ادب" لاہور ۔ طبع اول : ۱۹۵۸ء

۱۔ باجی ولایت ۲۔ قصرِ شیخ ۳۔ غرارہ ۴۔ بیگانۂ غم ۵۔ مواد ۶۔ گریز

۷۔ الائچیاں اور لونگ ۸۔ حب کا تعویز ۹۔ ممی ۱۰۔ جوئے نرم رو ۱۱۔ پرنس تلی ۱۲۔ حویلی

۴۔ "پھول کی کوئی قیمت نہیں" (تیرہ افسانے) فیروز سنز ۔ لمیٹڈ ۔ لاہور ۔ طبع اول : ۱۹۸۶ء

۱۔ چٹھی رساں ۲۔ جیسے کوئی چیز ٹوٹ گئی ۳۔ پھول کی کوئی قیمت نہیں ۴۔ بادِ صحرا

۵۔ مرد کا فولاد ۶۔ واردات ۷۔ لکڑی والا ۸۔ نہ آئیں تم کو جبتیں کرنیں ۹۔ کڑوی بیل

۱۰۔ چھجے والا مکان ۱۱۔ خیری مہری ۱۲۔ نیا پاکستان ۱۳۔ سردے ۔

۵۔	"بڑا صاحب" (ڈراما)	مینارِ ادب ۔ لاہور	طبع اول : ۱۹۶۰ء
۶۔	"سیز فائیر" (ڈراما)	مینارِ ادب ۔ لاہور	طبع اول : ۱۹۴۸ء
۷۔	"حوا کی بیٹی"	مکتبۂ علم و ادب ۔ راولپنڈی	طبع اول : ۱۹۶۴ء
۸۔	"کہانی بولتی ہے"	فیروز سنز ۔ لاہور	طبع اول : ۱۹۸۹ء

غیر مدون : ان مطبوعہ کتب کے علاوہ آغا بابر نے ولیم شیکسپیر کے ڈرامے A Mid Summer Night کا ترجمہ "سردیوں کی ایک رات" کے عنوان سے اوپن ایئر تھیٹر راول پنڈی صدر کے لیے ۱۹۶۵ء میں کیا ۔ افسانے "تلاش" (انتخاب "ماہِ نو" ۱۹۵۲ تا ۱۹۶۵ء) "خالہ تاج" مطبوعہ "سیپ" کراچی جولائی ۱۹۷۰ء "پھیلتا ہوا کاجل" مطبوعہ "نقوش" لاہور ۔ جنوری ۱۹۷۷ء "نسوانی آواز" مطبوعہ "نقوش" لاہور ستمبر ۱۹۸۶ء "خدوخال" مطبوعہ "نقوش" دسمبر ۱۹۸۶ء اور ڈراما "آخری شب عرف میرا جی کی موت" مطبوعہ "نقوش" لاہور ۔ دسمبر ۱۹۸۶ء کسی کتاب میں شامل نہیں ۔

نظریۂ فن : "میں جب کوئی افسانہ لکھتا ہوں تو سب سے پہلے اس کا اختتام میرے ذہن میں آتا ہے پھر کردار اور باقی تفاصیل اور اس طرح میرے لیے افسانے کی عمارت کو کھڑا کرنا آسان ہوجاتا ہے ۔"

آغا بابر

○●○

(بہ حوالہ : "نیشن" لاہور مارچ ۹۹۱

آغا بابر

"کبو"

تالاب کا فاصلہ متھرا ریلوے سٹیشن سے کوئی ڈیڑھ ایک میل تھا۔ سڑک سٹیشن کے قریب سے گھوم کر فصیل کے ساتھ ہوتی ہوئی سیدھی نکل گئی تھی۔ آگرے، جھانسی، اور بمبئی آنے جانے والی فوجی لاریاں اس سڑک پر چلتی رہتیں۔ تالاب سڑک کے قریب ہی تھا اس لیے کئی دفعہ کنوائے رک جاتا اور ڈرائیور اپنے ٹرکوں میں پانی اسی تالاب سے ڈالتے۔ سادھو اپنی کٹیا میں کبھی چلم پیتا نظر آتا کبھی گڑوی منجتا۔ دوپہر کو کوئی کالی کلوٹی عورت تلیا کی سیڑھیوں پر آ بیٹھتی اور اپنے آب نوسی بدن پر دھوتی لپیٹ کر گندے میلے کپڑوں پر تھاپے مارنے لگتی۔ اس بےدردی سے تالاب کی پُر سکون فضا پر چوٹیں سی پڑنے لگتیں کہ گلہری سرکنڈوں کے پاس بھاگ جاتی۔ اپنا دھڑ اوپر اکڑا کر دو پیروں پر کھڑی ہوجاتی اور دیکھنے لگتی۔ پھر پھدک کر درخت پر چڑھ جاتی۔ وہ حاملہ تھی کتے یا بلی کی بو سونگھ کر درخت سے کبھی نہ اترتی۔ اتنے بوجھ سے بھاگنا اور پھدکنا اس کے لیے مصیبت تھا۔ یہ سادھو کی سختی برتنے کا احسان تھا کہ متھرا کی کتیا اور اس کے چاہنے والوں نے اب تلیا کی طرف آنا ترک کردیا۔

سادھو چلا جاتا تو گلہری کٹیا کے سامنے بنے ہوئے چبوترے کا کونہ کونہ سونگھتی۔ روٹی کا کوئی بچا کھچا ٹکڑا کئی کے دو ایک دانے کہیں نہ کہیں گرے پڑے مل ہی جاتے۔ تالاب پر کوئی نہ ہوتا تو وہ گھانس پھونس میں سے ہوتی ہوئی سڑک کے کنارے تک جا پہنچتی اور بار بار آنکھیں جھپک کر آنے جانے والی لاریوں کو دیکھتی اور پھر تالاب کی طرف بھاگ آتی۔

شریف اپنا ٹرک لے کر اس سڑک پر سے کئی بار گزرا تھا۔ کبھی "کون وائے" کے ساتھ کبھی اکیلا، وہ پسینہ پونچھ کر نیچے اترتا سگریٹ منہ میں دباتا اور دو پیسے کی چائے کی پیالی پی کر پھر ٹرک میں جا بیٹھتا۔ پانی ڈالنا ہوتا تو تالاب موجود تھا۔ ویرانے میں کسی جوہڑ سے پیپے بھر کر ریڈی ایٹر میں پانی ڈالتا! چھایا یا تلیا پر سے جہاں شاید کوئی دھوتی لپیٹے۔۔۔۔

اس نے ٹرک اسٹارٹ کیا۔ تالاب کے قریب ابھی پہنچنے نہ پایا تھا کہ سڑک پار کرتی ہوئی ایک گلہری اس کے پہیے کے نیچے آکر مسل گئی۔

"برا ہوا۔" اس نے دل میں کہا۔ بریک لگا کر ٹرک پیچھے کیا۔ ایک گلہری کی حیثیت کیا تھی۔ تارکول کی پکی سڑک پر گوشت کا ایک کراہت انگیز لوتھڑا اور خون کی ایک مختصر لکیر۔۔۔۔

تالاب سونا پڑا تھا۔ ہوا بند تھی۔ نیلے نیلے گدلے پانی میں کوئی حرکت نہ تھی۔ سادھو کی کٹیا کا چبوترا ایک طرف سے ٹوٹا پڑا تھا جس کے آس پاس درختوں سے گرے ہوئے سوکھے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک بوڑھی عورت ایک پیڑ کے پاس کھڑی ایک کتے کو جو بار بار درخت کی ٹہنیوں کی طرف منہ کر کے بھونکتا اور اچھلتا تھا، پتھر مار کر بھگا رہی تھی۔ کتا پگڈنڈی سے ہٹ گیا۔ عورت جب آگے بڑھی تو شریف نے پوچھا۔ "کس کو بھونک رہا ہے۔"

عورت نے کپڑوں کی گٹھڑی پر پڑا رکھ کر روانہ ہوتے ہوئے کہا۔ "گلہری کے بچوں کو۔۔۔۔

ماں ان کی کھیں باہر گئی ہوئی ہے میں نے سارے کپڑے دھو لیے سکھالیے۔ وہ نہیں آئی۔ بیچارے بھوکے پیاسے کب سے چلا رہے ہیں۔"

شریف نے درخت کے پاس جاکر دیکھا گھنی ٹہنیوں سے چپکے ہوئے دو بچے گوشت کے بے جان لوتھڑے معلوم ہو رہے تھے۔ سلیٹی رنگ کا لجلجا سا گوشت۔ اس نے دونوں کو اٹھا کر اپنی فوجی ٹوپی میں رکھ لیا۔ ریڈی ایٹر کیپ بند کرتے ہوئے اس کی نظر پیچھے چند گز فاصلے پر خون کی ابھری ہوئی ہوئی سرخ لکیر پر پڑی جو اب کالی ہو چکی تھی۔

وہ آگرے پہنچا تو ایک بچہ مر چکا تھا۔ دوسرا بھی مردے کی طرح تھا مگر دو پیسے کا دودھ پی کر اس کے بدن میں جان پڑ گئی۔ زیرہ سی آنکھیں کھل گئیں۔ بیوی نے کہا "جان بچانی ہے تو ایک شیشی خریدو۔ مگر جب وہ چمچے ہی سے دودھ پینے کا عادی ہو گیا تو شریف کو شیشی خریدنے کی ضرورت نہ پڑی۔ گلہری کا بچہ جب چندی چندی آنکھیں کھولتا اور شریف کی طرف دیکھتا تو شریف بہت خوش ہوتا۔ بیوی کہتی "ہم نے ایک پڑوسی کو نیولا پالتے دیکھا تھا مگر گلہری کا بچہ پالتے کسی کو نہیں دیکھا۔ یہ بڑی مشکل سے پلتا ہے۔ وہ اس سے کہتا جب یہ پل جائے گا تو دیکھنا کتنا لطف آتا ہے۔ کبھی میرے کندھے پر سوار ہو گا کبھی جیب میں گھس جائے گا۔ کبھی میرے کالر سے چمٹ جائے گا۔"

شریف گلہری کے بچے کو روئی اور پھٹے ہوئے مفلر کے ٹکڑے میں لپیٹ کر گتے کے ایک ڈبے میں بند کر کے رکھ دیتا صبح دودھ پلاکر جاتا دوپہر کو یہ کام بیوی کے سپرد تھا۔ شام کو آکر پھر پلاتا۔ پندرہ دن میں گلہری کے بچے کے بال نکھر آئے اور پھیکی پھیکی دھاریوں کا رنگ گہرا ہونے لگا۔ اب اسے ہاتھ میں اٹھاتے وقت اس کے گوشت کی لجلجاہٹ محسوس نہ ہوتی بلکہ ہاتھ کو اس کے بالوں کی نرمی اور ملائمت محسوس ہوتی اس کی کمر پر دو کالی اور تین خاکستری دھاریاں گہری ہو گئیں۔ اب شریف جب اسے اپنے تکیے پر رکھ دیتا تو وہ سلیٹی رنگ کے گوشت کا حقیر ٹکڑا معلوم نہ ہوتا بلکہ کوئی پیاری سی چیز جسے چھونے کو جی چاہے۔ شریف پیار سے کبھی اسے اپنے گالوں سے لگاتا کبھی اس کے نرم نرم روئیں سے اپنی ناک رگڑتا اور اسے "کبو کبو" کہتا۔

آگرے سے شریف کی تبدیلی جھانسی کے فوجی ورک شاپ میں ہو گئی۔ ایک دن وہ کبو کو جیب میں ڈال کر ورک شاپ لے آیا۔ عجب تماشا تھا۔ لوگ اکھٹے ہو گئے۔ کوئی ہاتھ بڑھاتا تو کبو پہلے اپنی چھوٹی سی تھوتھنی سے سونگھتا پھر چھوٹے چھوٹے پنجے رکھ کر ہاتھ پر چڑھ جاتا اور بازو پر سے ہوتا ہوا شانوں تک جا پہنچتا۔ لینے والا عجیب گدگدی محسوس کرتا۔ شریف ہاتھ بڑھاتا تو وہ ایک ہی مرتبہ سونگھ کر جھٹ شانوں پر جا سوار ہوتا پھر سینے سے آکر چمٹ جاتا۔ شریف کہتا "چل جیب میں" وہ خاکی قمیص کی جیب میں گھس جاتا اور شریف جیب کا بٹن بند کر لیتا۔ چند روز شریف نے اسے الماری میں بند رکھا۔ کھانا کھانے کے لیے دوپہر کو ڈیڑھ گھنٹے کے لیے ورک شاپ بند ہوتا۔ شریف اور اس کے ساتھی کھانا کھاتے وقت کبو کی الماری کا تالا کھول دیتے۔ کبو جو الماری کے تختے کے پچھلے حصے سے چپٹا ہوا ہوتا بنچ پر بیٹھتا۔ ایک دم میں کئی بار آنکھیں جھپکتا۔ گوشت، روٹی سبزی اور دال کی خوش بو سونگھتے ہی اس کی دم کے بال کھڑے ہو جاتے۔ دم اس وقت شیشی دھونے والے برش کی طرح نظر آنے لگتی۔ علی جان دسترخوان میں لپٹے ہوئے پراٹھے کا ٹکڑا توڑ کر اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا "آ یار میرے کر بسم اللہ" کبو اپنی کمر اکڑا کر پچھلے پنجوں پر کھڑا ہو جاتا اور ٹکڑے کو اگلے پنجوں میں پکڑ کر جلد جلد کترتا چلا جاتا۔ دیکھنے میں اس کی آنکھیں زیرہ سی تھیں مگر دراصل وہ چپے چپے کا جائزہ لے رہی ہوتیں۔ اس کے جسم میں ایک سیمابی کیفیت تھی جو ہر وقت اسے

مضطرب رکھتی ۔ ابھی یہاں ابھی وہاں جیسے اس کے جسم میں سپرنگ لگے ہوں ۔

چند دنوں کے بعد جب کبوٗ ان لوگوں سے مانوس ہوگیا تو شریف نے اسے جیب میں ڈال کر ورک شاپ میں جہاں وہ دن بھر کام کرتا تھا لے جانا شروع کردیا ۔ کبوٗ صرف برآمدے تک جاتا یا سامنے والے پٹرول پمپ پر پھر اندر آجاتا ۔ زیادہ وقت شریف ہی کے ارد گرد دوڑتا رہتا ۔ ایک روز ورک شاپ کا اسٹاف کیپٹن بغیر اطلاع کے آگیا ۔ شریف گھبرایا کہیں وہ کبوٗ کو دیکھ کر ناراض نہ ہو مگر سپروائزر نے کاریگروں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے ہاں ایک پالتو گلہری آئی ہوئی ہے جو اپنی عجیب و غریب حرکتوں سے کاریگروں کو تھکنے دیتی ۔ کیپٹن انگریز تھا ۔ اس نے حیران ہوکر پوچھا ۔ " گلہری کہاں ہے ۔"

سپروائزر نے شریف کی طرف دیکھا ۔ اس نے کہا ۔ " جناب میری جیب میں ہے ۔" شریف نے قمیص کی جیب کے بٹن کھولے کیپٹن نے آگے بڑھ کر جھانکا ۔ گلہری جیب میں دہرہوکر لیٹی سورہی تھی ۔ شریف نے اسے جیب سے نکال کر اپنے ہاتھ پر بٹھالیا کبوٗ جلد جلد آنکھیں جھپکنے لگا ۔ کیپٹن نے پوچھا ۔

" نر ہے یا مادہ ؟ "

شریف نے کہا " نر "

کیپٹن نے اپنا ہاتھ کبوٗ کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا " مادہ گلہریاں اکثر بھاگ جایا کرتی ہیں ۔ میں نے بچپن میں ایک گلہری پالی تھی ۔"

کبوٗ پہلے کیپٹن کا ہاتھ سونگھتا رہا پھر اچک کر اس کے بازو پر چلا گیا پھر ہاتھ پر اتر کر آیا ۔ کیپٹن کے ہاتھ پر کوئی دو قطرے پانی کے بہہ گئے ۔ یہ کبوٗ نے موت دیا تھا ۔ شریف نے کبوٗ کو اٹھاتے ہوئے کہا ۔ " ارے بے ایمان یہ کیا کردیا ۔ کیپٹن نے اپنی نکر سے ہاتھ پونچھ کر کہا ۔ " کوئی بات نہیں ۔ کل بھی لاؤ گے اسے ہم اپنے بادا لوگ کو دکھائے گا ۔ شریف نے کہا " بہت اچھا جناب ۔"

اگلے دن کیپٹن کے دونوں بچے کبوٗ کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے ۔ بڑا بچہ تو اسے کندھوں پر بٹھائے ساری ورک شاپ میں لیے پھرا ۔ پوچھنے لگا تم نے یہ گلہری کہاں سے لی تھی ۔ شریف نے سارا واقعہ سنایا کہ کس طرح کبوٗ کی ماں اس کے ٹرک کے نیچے آکر مسلی گئی تھی ۔ وہ رحم کھا کر کبوٗ کو اپنی ٹوپی میں ڈال کر آگرے سے لے آیا تھا ۔

کبوٗ کی رسائی اب تو کیپٹن کے دفتر تک ہونے لگی ۔ کبھی کبھی کیپٹن ادھر سے گزرتا تو کبوٗ کبوٗ کہہ کر اسے اپنے شانوں پر بٹھا کر اپنے دفتر میں لے جاتا ۔ کبو میز پر کاغذوں کے درمیان پچھلی ٹانگوں پر بیٹھ کر کیپٹن کا دیا ہوا بسکٹ کا ٹکڑا کترنے لگتا ۔ اور کیپٹن اپنی انگلی سے اس کی نرم نرم گردن پر سے پھسلا کر اس کی تھوتھنی تک لے جاکر پیار سے کہتا " یو نوٹی کریچر (YOU NAUGHTY CREATURE) کبوٗ کمرے کا کونہ کونہ سونگھتا پھرتا ۔ کبھی دم کے بال اکڑا لیتا ۔ کبھی الماریوں اور بکسوں پر دوڑتا پھرتا ۔ چاکولیٹ اور بسکٹ کا ستیاناس کر کے پھر شریف کے دوڑ آتا اور اس کی جیب میں گھس کر سوجاتا ۔ ہفتے دس دن میں ایک آدھ دفعہ شریف اسے جیب میں ڈال کر بچوں کے دل بہلانے کے لیے کپتان صاحب کی کوٹھی پر لے جاتا ۔ صاحب کے بچے اس سے کھیل کر بہت خوش ہوتے ۔

ہر طرف سے تر لقمہ ملنے پر کبوٗ خوب پل گیا ۔ یہ بڑی بڑی مونچھیں نکل آئیں ۔ اب وہ ننھا کبوٗ نہ رہا تھا ۔ اب تو

اس کی آنکھوں سے بلوغت ٹپکنے لگی چہرے پر جیسے ایک پختگی آ گئی ہو۔

شریف اگرچہ اچھے کاریگروں میں شمار ہوتا تھا مگر کئی مرتبہ کوئی بگڑی ہوئی مشنری اسے گھنٹوں الجھائے رکھتی۔ وہ تنگ آکر سگریٹ سلگا کر بیٹھ جاتا اور مرغولے اڑا اڑا کر مشنری کا نقص جاننے کی کوشش کرتا۔ کبوٗ جب سے مالک کو اس طرح سستاتے دیکھتا تو صین اس کے سامنے آکر پچھلی ٹانگوں پر بیٹھ جاتا، دھڑا کڑالیتا اور شریف کی طرف ٹکر ٹکر دیکھنے لگتا۔ بعض دفعہ اس کا ایک بال تک نہ ہلتا اور یوں معلوم ہوتا کہ پتھر کی بنی ہوئی گلہری زمین میں گڑی ہے۔ شریف اس کی طرف دیکھ کر مسکرادیتا اور دوسرے لمحے میں مشنری کا اصلی نقص اس پر منکشف ہوجاتا جیسے کھوئے حروف مل جانے پر قفل ابجد وا ہوجائے۔ یہ عجیب بات تھی کہ اس معاملے میں کیپٹن بھی کبوٗ کا قائل تھا۔ وہ بھی یہی کہتا کہ کئی سرکاری سکیمیں جو وہ سمجھ نہیں پاتا تھا ایسے ٹیڑھے مسائل جن پر وہ کسی آخری نتیجے تک پہنچ نہیں سکتا تھا کبھی کبھی کبوٗ کے کرتب دیکھنے سے چشم زدن میں حل ہوجاتے تھے۔

ورک شاپ کیا، شریف کو جھانسی کی چھاؤنی بازار میں بھی گلہری والا کہتے تھے۔ جب وہ سنیما دیکھنے جاتا تو بچے اس کے شانوں سے چمٹی ہوئی گلہری کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے۔ تالیاں پیٹتے اور کئی ایشت ایشت کر کے اسے ڈراتے اور وہ شریف کی گردن کے ساتھ چمٹ جاتا۔ کئی لڑکے شریف کو مونگ پھلی اور اخروٹ لالا کر دیتے۔ کبوٗ انھیں کتر کتر کے چند منٹوں میں ختم کردیتا۔

سٹاف کیپٹن نے شریف کے لیے ترقی کی سفارش کی تھی۔ لکھا تھا کہ اسے فٹر بنا دیا جائے۔ شریف کو فٹر بنے ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ کیپٹن کی میجری کا حکم آگیا اور تبدیلی کا بھی کہ دلی جاؤ۔ شریف کو کیپٹن کے جانے کا بہت افسوس ہوا۔ جب کیپٹن نے گلہری کے گرم گرم گدار گدار روئیں کے ساتھ اپنا گال رگڑا تو شریف نے رندھے ہوئے گلے سے کہا " کپتان صاحب آپ نے مجھے ترقی دلوائی۔ آپ مجھ پر اتنے مہربان تھے۔ اب خدا معلوم کیسا کپتان آئے مجھے بھی آپ اپنے پاس دلی میں بلا لو تو بڑا اچھا ہو۔"

کیپٹن نے کہا " تم دلی آنا چاہتے ہو۔ اچھا ہم کوشش کرے گا۔"

شام کو شریف اپنے گھر اداس اداس لوٹا۔ اس مہربان افسر کی تبدیلی کا سن کر اس کی بیوی کو بھی بہت رنج ہوا۔ شریف نے ایک خیالی سہارا لیتے ہوئے کہا۔ " صاحب نے وعدہ تو کیا ہے کہ ہم تمھارے لیے کوشش کرے گا۔

بیوی نے کہا " کیا اچھا ہوا اگر ہم دلی چلے جائیں۔ یہ جھانسی گلے کی پھانسی تو مجھے ذرا پسند نہیں۔ خدا نا خواستہ ہندو مسلم فساد ہو جائے۔ ہمارا یہاں کون ہے پردیس میں۔"

شریف نے بیوی کی قمیص کا جائزہ لیتے ہوئے جس کی گولائی پیٹ پر سے زیادہ گول ہورہی تھی کہا " ہمارا کوئی ہو ہی جائے گا تعویذ گلے میں ڈالا ہوا ہے نا؟"

کارنس پر لٹکے ہوئے، قائد اعظم کی تصویر والے کیلنڈر کے نیچے بیٹھے ہوئے کبوٗ نے چرؤں چرؤں کیا۔ بیوی نے کچھ فخر سے شرما کر کبوٗ کی طرف منہ پھیر کر کہا۔ " کبوٗ دلی جائے گا؟ " کبوٗ نے کمر اکڑا کر اگلے پنجے اپنی مونچھوں پر پھیرنے شروع کردیے جسے دیکھ کر شریف اور اس کی بیوی کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑنے لگی۔

کیپٹن میجر ہوکر دہلی پہنچا تو دونوں بچوں کو کبوٗ کی یاد بہت ستانے لگی وہ باپ سے کہتے کہ کبھی وہ جھانسی جائے تو کبوٗ کی خیریت ضرور پوچھ کر آئے ایک دن باپ نے کہا ۔ "اگر ہم کبوٗ کو یہیں بلا لیں تو ؟"

بچے مچل اٹھے ۔ "ضرور ڈیڈی ۔ ضرور ۔"

"پر کیسے ڈیڈی ؟" بڑے نے پوچھا ۔

ہم شریف کو یہاں بلاسکتے ہیں ۔ وہاں سے اس کی تبدیلی ہوجائے گی ۔

کوئی بیس پچیس دن کے بعد آرڈر آگیا ۔ شریف دہلی آ پہنچا ۔ بچوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا ۔ کبوٗ کو اٹھائے اٹھائے ساری کوٹھی میں لیے پھرے ڈبل روٹی کا ٹوسٹ ، مکھن ، چاکولیٹ ، پنیر ، گولیاں ، بسکٹ اتنا کچھ اس کے آگے لاکر ڈال دیا گیا کہ بے چارے کبوٗ کا سارا وزن ان اشیا سے کہیں کم تھا ۔

ایک مہینے کے بعد یک لخت ہوا کا رخ بدلا ۔ غیر مسلم پناہ گزین دہلی پر چھا گئے ۔ پنجاب کے فسادات کی دل ہلادینے والی خبریں جنگل کی آگ کی طرح پھیلیں اور فضا کے تیور بدلنے لگے ۔

شریف کی بیوی کی قمیص کی گولائی کمر کے قریب سے زیادہ پھیل چکی تھی لہٰذا شریف کی ماں کا خط پر خط آرہا تھا کہ اسے آکر چھوڑ جاؤ ۔ مگر شریف مجبور تھا ۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے چھٹی ملنی محال تھی ۔ بہ ظاہر دہلی میں امن و امان تھا مگر لوگ چاروں طرف دیکھ رہے تھے ۔ بھانپ رہے تھے ۔ انسانوں کا ایک سمندر تھا پرُ سکون بےحرکت مگر پرُ اسرار سطح پر اگر چہ کوئی لہر نہ تھی مگر پھر بھی ناؤ ڈالتے دل کانپتا تھا ۔ ہر لحہ یہ ڈر لگتا تھا کہ کسی وقت سکون و جمود کا یہ مصنوعی طلسم یکایک ٹوٹ جائے گا اور اس پرُ سکون آب کے نیچے سے ایک محشر خیز طوفاں ابھر کر نظام کو درہم برہم کر دے گا ۔ پانی کی پرُ سکون سطح پر جو دل کو موہ لینے والی بات ہوتی ہے وہ نہ تھی ۔ اس لیے یہ امن و امان کچھ زیادہ ہی پرُ اسرار سا تھا ۔ شریف کی بیوی کبوٗ کو لے کر سارا سارا دن بند کمرے میں پڑی رہتی ۔ شریف نے کبوٗ کو ورک شاپ لے جانا ترک کردیا تھا کیوں کہ ورک شاپ کے جانے پہچانے چہرے اب اجنبی سے معلوم ہوتے تھے ۔ طبیعتیں گھٹی گھٹی تھیں فضائیں سہمی سہمی ۔ کبوٗ کو بھی جیسے غم ناک ٹھہراؤ کے سمجھنے کا شعور پیدا ہو گیا تھا ۔ وہ کھڑکی کی جالی کے ساتھ لگا باہر سے آنے والی ہوا سونگھتا رہتا ۔ کبھی پھدک کر کواڑ کے اوپر دبک کر جا بیٹھتا جیسے کہیں سے بلی یا کتے کی بو آگئی ہو ۔ شریف کی بیوی سہمی ڈری کاٹ پر پڑی رہتی ۔ کبوٗ کو سمٹتے سکڑتے دبکتے دیکھتی تو اور گھبرا جاتی ۔ ہوا میں جیسے انسان کے خون کی بو ہو ۔ کان اچھی خبر سننے کو جیسے ترس رہے ہوں کبھی کبوٗ بھاگ کر اس کے تکیے کے نیچے جا گھستا ۔ شریف کی بیوی کا ہاتھ اپنی گردن کے قریب جاتا اور وہ کبوٗ کو تکیے کے نیچے سے اٹھاکر اپنے پیٹ پر بٹھالیتی اور اس کے روئیں پر ہاتھ پھیر پھیر کر پوچھتی ۔ "کبوٗ پاکستان جائے گا ؟"

کبوٗ اپنی چھوٹی چھوٹی زیرا سی آنکھیں ایک پرُ زور اضطراب کے ساتھ سینکڑوں پر جھپک دیتا ۔ اس کے ننھے ننھے نتھنے سکڑتے پھیلتے مونچھیں کانپتیں جیسے کچھ کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہا ہو ۔

آخر ایک دن شریف دس دن کی چھٹی مل جانے کی خبر لے ہی آیا ۔

کبوٗ شریف کی جیب میں اپنی دم پیٹ کے ساتھ لگائے لیٹا تھا ۔ گاڑی دھن دھن چل رہی تھی ۔ ہوا کو چیرتی دھرتی کو مسلتی ۔ مسافروں کے دلوں میں خوشی کی لہر سی ناچتی مگر یکایک خوف اور ہراس کے کالے بھوت ڈراؤنی آنکھیں نکال کر دیکھتے

وہ لہر جھٹ سمٹ کر نقطہ بن جاتی ۔ نقطہ ایک دم پھٹ جاتا ۔ دل کانپ اٹھتے ایک جھرجھری سی کلیجہ چیر کر نکل جاتی ۔ بعض مسافر چپ چاپ سگریٹ پیئے جارہے تھے ۔ بعض فسادات کا ذکر کر رہے تھے ۔ ان مظالم کا ذکر جو چشم فلک نے آج تک نہ دیکھے تھے ۔ حاملہ عورتوں اور ننھے ننھے معصوم بچوں کا قتل بھی بھی بھی ۔ شریف سوچنے لگا ۔ خون کرنے کا یہ سفاکانہ طریقہ انسانوں کا ذہن سوچ کس طرح لیتا ہے ۔ یہ درد ناک مظالم کو سن کر ہی آدمی کانپ اٹھتا ہے اور تو اور ، وہ تو خون میں لتھڑی ہوئی گٹھری کا لوتھڑا نہ دیکھ سکا تھا اور ٹہنیوں میں پھنسے ہوئے بچوں کو اٹھا کر آگرے لے آیا تھا ۔

امرت سر کا سٹیشن آ پہنچا ۔ گاڑی رکی ۔ لیکن گاڑی کیا رکی کائنات نے دم سادھ لیا ۔ خوف و ہراس کے بھوت اور زیادہ ڈراؤنے بن گئے یکایک پلیٹ فارم پر ایک بڑے زور کا دھماکا ہوا ۔ چہروں کے رنگ اڑگئے ۔ دل دہل گئے ۔ کبو بڑبڑا کر شریف کی جیب سے باہر آپڑا ۔ ایک مسافر نے گھبرا کر ہاتھ چلائے وہ دوسرے کے کندھوں پر کودا ۔ دوسرے نے چیخ مار کر ہاتھ جو مارا تو چھٹانک بھر کا کبو ایک دم سے پلیٹ فارم پر جا گرا ۔ شریف مسافروں کو دھکیلتا ۔ ان کے سروں سے ٹکراتا ۔ کھڑکی تک پہنچا ۔ کبو کبو کبو " اس نے چلانا شروع کیا ۔ کبو جو ایک ٹی سٹال کے تختے کے پیچھے چھپا بیٹھا تھا ۔ شریف کی آواز پہچان کر آگے بڑھا ۔ لیکن گاڑی چل دی ۔ شریف زور سے پکارا کبو کبو ۔ ۔ ۔ کبو پلیٹ فام پر بکھرے ہوئے بکسوں اور صندوقوں سے سر پھوڑتا آواز کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا ۔ پلیٹ فارم کا آخری سرا آن پہنچا ۔ یہاں ہجوم کم تھا ۔ کبو نے جو مالک کی آواز کے پیچھے پیچھے بھاگتا آرہا تھا ۔ اب شریف کو دیکھا ۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں کبو کے ننھے ننھے پنجے پکے چکنے پلیٹ فارم پر پھسلے جارہے تھے ۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا وہ اپنی بساط سے بڑھ کر بھاگ رہا تھا ۔ پلیٹ فارم ختم ہونے کے بعد کچی زمین آگئی ۔ گاڑی تیز ہوگئی ۔ کبو ہار کر ایک ٹنڈ منڈ درخت کے ساتھ چمٹ گیا ۔ اس کی مونچھیں کانپ رہی تھیں اس کے کان کھڑے تھے وہ اپنا دھڑ اوپر اٹھائے ایک عجیب حیران اور مایوس نگاہوں سے شریف کی طرف دیکھتا رہا ـــــــ گاڑی دور ہوتی چلی گئی اور کبو محض ایک نقطہ نہیں ، ایک داغ سا بن کر رہ گیا ۔

" کاش تم اس سلیٹی سے داغ کو ٹہنیوں میں پھنسے پھنسے مرجانے دیتے ۔" ایک مسافر نے شریف کی کہانی سن کر کہا ۔

" تو جو بچے اب یتیم ہوگئے ہیں کیا آپ انھیں مرجانے دیں گے ؟ "

شریف نے مرے ہوئے لہجے میں کہا اور اپنا ہاتھ سینے پر رکھ لیا ۔ جیب کے اوپر ، جو اب خالی پڑی تھی گاڑی اب میلوں آگے نکل آئی تھی ۔ کبو اس وقت معلوم نہیں کہاں تھا ۔ شاید وہ ابھی تک اسی ٹنڈمنڈ درخت کو اپنے محسن کی جیب سمجھ کر اس سے چمٹا ہوا تھا یا حیران پریشان ، سر اٹھائے اپنے حساس نتھنوں کو پھلا پھلا کر ہوا میں سے اپنے مالک کی بو سونگھنے کوشش کررہا تھا ۔

○●○

آغا بابر

بڑے میاں سو بڑے میاں ۔۔۔

یہ بات مظہر کی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ گھر میں گموں کی شرافت کا سکہ کیوں چلتا تھا اور اس کی اپنی ساکھ کیوں بگڑی بگڑی سی تھی ۔ گھر آنے جانے والی لڑکیاں جب اس سے بات کرتیں تو ایک مجبوری سے اور گموں کے ساتھ جیسے خود بہ خود ہی باتیں ہوتی چلی جاتیں ۔ گھر کی باہر کی لڑکیاں بیٹھی ہیں ۔ باتیں ہو رہی ہیں ۔ پھول کاڑھے جارہے ہیں ۔ دھوتی ناپی جارہی ہے ۔ بیچ میں گموں صاحب بھی براج مان ہیں ۔ خالہ سروتے سے چھالیہ کاٹ رہی ہیں ۔ ایک مجلس سی جمی ہوئی ہے ۔ جوں ہی مظہر پہنچا ۔ کسی نے اپنے ٹخنے پر پاجامہ کھینچ لیا ۔ کسی نے ڈھب سے دوپٹہ لے لیا اور وہی کھلے کھلے چہرے یوں مرجھا سے جاتے ۔ جیسے سورج مکھی کی پتیاں سورج چھپتے ہی بے جان سی ہوجائیں ۔ یہ دیکھ کر اسے بڑی کوفت ہوتی ۔ اور وہ جھٹ سے اٹھ کر آجاتا ۔

اچانک بارش یا مہمان آنے پر چارپائیاں کم ہوجاتیں ۔ خالہ یا چچی کہہ دیتیں " میں گموں کے ساتھ ہی پڑ رہوں گی ۔" مظہر بے چین ہوجاتا اور سوچتا یہ الفاظ کتنے آرام سے کہہ دیے جاتے ہیں ۔ یوں ہی معمولی اور سرسری طور پر ۔ مگر اس کے نزدیک ان الفاظ میں کتنی اہمیت تھی ۔ جی میں آتا کہہ دے خالہ اور چچی ہی ایک چارپائی پر کیوں نہیں پڑ رہتیں ۔ مگر اس کے ہونٹ بھنچ جاتے ۔ اور وہ بارش کی چھما چھم میں یہ آس لگائے سوچتا کہ شاید اگلی بارش پر اس کے کان یہ سن پائیں " میں مجو کے ساتھ ہی پڑ رہوں گی ۔" مگر کئی مہمان آئے کئی بارشیں ہوئیں ۔ مجو کے کانوں میں یہ امرت نہ ٹپکا ۔ وہ سوچنے لگتا اس کا بھائی گمو اس سے ذرا چھوٹا ہے مگر اس کی اتنی رعایت کیوں کی جائے کہ جب شام کو اڑوس پڑوس کی کوئی جوان لڑکی گھر آجائے اور اسے گھر تک چھوڑ آنے کا سوال پیدا ہو تو اماں بھی جھٹ سے یہی بول اٹھتیں جا گموں بیٹا بہن کو گھر تک چھوڑ آ ۔ مجو غصہ پی جاتا ۔ چلو مجو کو نہ بھیجو اگر یوں کہہ دیں تو کیا ہے کہ جاؤ دونوں بہن کو چھوڑ آؤ ۔ اس وقت اسے اپنی ماں بھی ایک حضرت معلوم ہوتیں ۔ جیسے گھر والوں نے ایسے دل چسپ کاموں کے لیے اسے بائیکاٹ کر رکھا ہو ۔۔۔ وہ جی میں کڑھتا اور سوچتا اگر مجھے بھی گموں کے ساتھ ستارہ کو چھوڑنے بھیج دیا جاتا تو کیا قیامت آجاتی ۔

اگر چہ گھر والوں کے نزدیک یہ چھوٹی چھوٹی باتیں قطعاً اہمیت نہیں رکھتی تھیں مگر مجو کے کردار کی تعمیر میں ان کا اثر ضرور تھا ۔ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں اس کے لیے پیاری پیاری معصوم مسرتیں تھیں جن سے اسے ہمیشہ محروم رکھا گیا تھا ۔ اس محرومی سے اس کا احساس بے دار ہوگیا تھا اور اس کے مزاج نے خفیہ خفیہ ایک نیا جنم لینا شروع کردیا تھا ۔ اندر ہی اندر ایک نئی دنیا کی بنیاد رکھی جارہی تھی جس کے اسے خبر نہ تھی ۔ جسم جتنا عورت سے دور رہتا رہا ذہن اتنا ہی قریب ہوتا چلا گیا ۔ مسیں بھیگ آئیں ۔ آواز بھاری ہوگئی اور مجو پہلے کی نسبت کچھ خاموش رہنے لگا ۔ جب کوئی عورت اس کی ماں سے کہتی " بہن بڑے نیک ہیں تمھارے بیٹے کبھی نظر اٹھا کر اوپر نہیں دیکھتے ۔" تو مجو اپنے خیالوں کا جائزہ لیتا اور جی میں کہتا خیال تو ایک بھی نیک نہیں اور اگر نظر بھی اندھے کی لاٹھی کی طرح زمین پر لگی رہے تو مجبوری ہے ۔۔۔ پھر جب وہ کہتی " اور یہ گموں تو سات بیٹیوں جیسا ایک بیٹا ہے ۔" تو گموں پر نہ جانے کیا کیفیت گزرتی مگر مجو کو ایک حاسدانہ جلن ضرور محسوس ہوتی کہ تعریف کرانے میں بھی گموں ایک ہاتھ آگے

رہتا ہے۔ مجو خود اگر چہ سات بیٹیوں جیسا بیٹا بننا کبھی پسند نہ کرتا تھا۔ تاہم وہ اس مرکب کے جادو سے غار ضرور کھاتا تھا۔ تنہا اور خاموش رہنے سے اس کی طبیعت میں ایک خودداری کا رنگ آگیا تھا۔ چناں چہ جب وہ گموں کو لڑکیوں یا عورتوں کی مجلس میں بیٹھے دیکھتا تو وہ ان کے پاس سے ایک بے نیازی کے ساتھ گزرجاتا۔ اگر چہ اس کا جی چاہتا کہ وہ بھی اس نخلستان پر ذرا رکے۔ کھجوروں اور ٹھنڈے پانی سے اپنی پیاس بجھائے۔ مگر اب اس کا انس تنہائی کے ویرانے سے بڑھ گیا تھا۔ جہاں کے نخلستانوں کے بیل بوٹے اس کے اپنے تخیل کا نتیجہ تھے اور جہاں میٹھے چشمے پھیل کر وسیع و عمیق جھیلیں بن گئی تھیں۔۔۔ دل بہلانے کا سامان کتابوں میں کم نہ تھا۔ غزلیں، اشعار، ناول، قصے، کہانیاں اس کے آڑے آئے اور کم تری کے احساس پر برتری کا احساس غالب آنے لگا۔ اس کی سوچ میں گہرائی پیدا ہونے لگی۔ "تم ہر وقت کیا پڑھتے رہتے ہو؟" گموں کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھتا۔

مجو دل میں کہتا کیا میں تم سے پوچھتا ہوں تم ہر وقت لڑکیوں میں بیٹھے کیا کرتے رہتے ہو، تم مجھ سے کیوں پوچھتے ہو۔ مگر وہ بن کہے اسے کتاب کا سرِ ورق دکھا دیتا۔ گموں ناک سکیڑ کر کہتا۔ "اچھا جناب نے اب ناول پڑھنے شروع کردیے ہیں۔" لہجہ ایسا ہوتا گویا مجو کوئی گناہ کر رہا ہے۔

"اچھا لو گموں! اس شعر کا مطلب بتاؤ تو مان جاؤں تمھیں" گموں شعر پڑھ کر جب اوٹ پٹانگ سے معنی بیان کرنے لگتا تو مجو کتاب چھین کر یوں بدلہ لیتا۔ "کیا ایران کی توران ہانک رہے ہو، جاؤ تم وہیں بیٹھو عورتوں میں۔ بڑے بجتے ہو وہاں۔" اتنے میں مسجد کے حافظ جی آجاتے اور گموں جزدان میں لپٹا ہوا قرآنِ مجید اٹھا کر دالان میں جا بیٹھتا۔ مغلانی بھی آجاتی اور پڑوس میں رہنے والے گل فروش کی بیوی بھی۔ باری باری تلاوت ہوتی۔ حافظ جی زیر زبر درست کرتے اور ساتھ والے کمرے میں مجو ناول کے دل چسپ واقعات میں اپنے آپ کو اس طرح کھودیتا کہ گموں کے واپس آنے پر اس کا طلسم ٹوٹتا۔ شہر میں آنے والے مولویوں اور واعظوں کی خبر گھر میں حافظ جی کی زبانی پہنچنے لگی۔ اور انھیں کے کہنے پر گموں نے ان مذہبی جلسوں میں شریک ہونا شروع کردیا۔ چناں چہ اب تلاوت کے بعد مسئلہ مسائل کا ذکر اذکار بھی ہوتا۔ گموں بڑے زور شور سے حصہ لیتا۔ حافظ جی نے محلے کی عورتوں کو بھی مذہبی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے ان وعظوں اور جلسوں میں شریک ہونے کو کہا۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ اگلے ہی روز عورتوں کا قافلہ اجلے کپڑے پہنے عطر لگائے ڈیوڑھی میں گموں کا انتظار کر رہا تھا اور سالار قافلہ گموں مسجد سے نمازِ عشاء ادا کر کے نہیں آیا تھا۔

جب یہ قافلہ روانہ ہوا تو مجو کھڑکی سے دیکھتا رہا۔ گل فروش کی بیوی کو آج اس نے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے کٹوروں میں ایک رس چھلک رہا تھا۔ ایک گھلاوٹ تھی جس نے مجو کو ایک عجیب احساس سے دوچار کردیا تھا۔ وہ بھونرے کی طرح چشم زدن کے لیے اپنے ہونٹ ان کٹوروں پر رکھ دینا چاہتا تھا۔

گل فروش ایک مذہبی قسم کا آدمی تھا۔ رمضان کے مہینے میں نمازِ تراویح کے لیے حافظ کا بندوبست کرنا اور محلہ بھر سے چندہ وغیرہ جمع کرنا اسی کا کام تھا۔ اس کی پہلی بیوی مر چکی تھی۔ اور دو سال سے اس نے دوسری شادی کرلی تھی۔

یہ سنی سنائی بات نہ جانے مجو کو کہاں سے یاد آگئی اور خوب برمحل یاد آئی کہ سرمہ لگانا تو سب کو آتا ہے۔ مگر مٹکانا کوئی کوئی جانتا ہے۔ گل فروش کی بیوی کی آنکھوں میں سرمے کا ڈورا کنپٹیوں کی طرف کتنی دور تک کھینچا چلا گیا تھا اور جب وہ آنکھیں مٹکا مٹکا کر باتیں کرتی تھی تو سرمہ کی یہ لکیر کتنی خوش نما لگتی تھی اور برقع کا نقاب پھینکتے وقت اس کی سڈول نازک کلائیوں پر سونے کی چوڑیاں کس طرح جھنجھنا اٹھتی تھیں۔۔۔ گل فروش کتنی ناز برداریاں کرتا ہوگا اس بیوی کی۔ اس نے ریڈیو کھول دیا۔ سازوں کی پیاری پیاری دھنیں فضا میں چھاگئیں۔ پھر گانے والی کی لوچ دار آواز اس کے دل کے اندر سماتی چلی گئی۔ فضا ساز گار ہو تو موسیقی پانی کی

رح اپنی جگہ آپ بنالیتی ہے ۔ مجو نے اپنا سر کرسی پر ٹیک دیا اور موسیقی کا جادو اس کے لطیف جذبات کو صیقل کرتا رہا حتیٰ کہ اس
، انجان سی بےکلی اور ان بوجھی سی تھکان دور ہوتی چلی گئی ۔ ریڈیو کا گانا سننے کا اسے اتنا لطف پہلے کبھی نہیں آیا تھا ۔

اب جب حافظ جی آتے مجو ایک پوشیدہ سی مسرت محسوس کرتا اور دالان کے سامنے سے کسی بہانے گزر بھی جاتا ۔ گل
روش کی بیوی کی آنکھیں جھکی ہوتیں ۔ کبھی پاؤں کی چاپ سن کر اوپر اٹھتیں تو ایک سنسناہٹ مجو کا کلیجہ پکڑ لیتی ۔ اس کی سرمگیں
نکھوں کی پلکیں اور گال کا خم اسے بدحواس کردیتا اور وہ بغیر ارادے کے غسل خانہ میں گھس کر پانی کا گلاس پی جاتا ۔ واپسی پر وہ
یکھتا کہ ڈیوڑھی میں تخت پر ایک برقع اس طرح پڑا ہے گویا پہننے والی نے اسے بے پروائی سے اتار کر پھینک دیا ہے مگر جسے پہنتے
قت سڈول نازک کلائیوں پر سونے کی چوڑیاں ضرور جھنجھنا اٹھیں گی ۔ میدان صاف ہوتا تو وہ اسے اٹھا لیتا اور نقاب میں ریشم کے
ھاگے سے کڑھی ہوئی آنکھوں کو دیکھتا رہتا اور کہتا وہ نگاہیں ۔ اس جالی سے گزرتی ہیں وہ نگاہیں ۔ وہ غزالی آنکھیں اس سے چھوتی
ہیں اور نقاب الٹ کر جالی کو ہونٹوں کے ساتھ لگالیتا ہے ۔ لمبے لمبے سانس لیتا تاکہ نقاب کی ہلکی ہلکی باس اور برقع کی ٹوپی میں کھٹے
میٹھے تیل کی رچی ہوئی خوشبو اس کے بدن کے روئیں روئیں میں سرایت کر جائے ۔

ایک رات اس کا باپ جتا رہا تھا کہ اگلے وقتوں میں لوگ کس طرح پگڑیاں بدل کر بھائی بن جاتے تھے اور عمر بھر یہ
دستار بدل بھائی ایک دوسرے سے بھائیوں جیسا ہی سلوک کرتے تھے ۔ "کیا بہنیں بھی بناتے ہوں گے ؟ "

گموں نے پوچھا اور ابا نے بتایا " ہاں بناتے تھے وہ اس طرح کہ مرد اپنی اوک میں عورت کو تین بار پانی پلاتا تھا اور
عورت بھی اسی طرح اپنی اوک میں مرد کو پانی پلاتی تھی ۔" مجو بستر پر لیٹا آسمان پر پھیلی ہوئی کہکشاں کے موہوم غبار پر نظریں
جمائے یہ گفتگو سن رہا تھا ۔ یہ غبار کچھ ایسا ہی تھا جیسا اس کی اپنی موہوم آرزو کا غبار جسے وہ اپنی ہستی پر چھایا ہوا محسوس کرتا تھا
اور معلوم نہ کرسکتا تھا کہ یہ پراسرار غبار کیا ہے ۔ ستارے اپنی اپنی جگہ پر جمے ہوئے مجبور و محکوم تھکے تھکے افسردہ سے نظر آرہے
تھے ۔ شاعروں نے اپنے محبوب کو ستاروں کی طرح معصوم اور سادہ کہا تھا ۔ مجو سوچنے لگا گل فروش کی بیوی کا حسن بھی تو ستاروں
کی طرح معصوم اور سادہ ہے مگر جو موہنی چمک اس کی بہار آفریں آنکھوں میں ہے ۔ وہ تو ان ستاروں میں بھی نہیں ۔ اس وقت ہوا
کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکوں میں جیسے نیند رچی ہوئی تھی اور ستاروں بھرے آسمان کا سحر کار نور جیسے کوئی منتر پھونک رہا تھا ۔ مجو
کے پپوٹے بھاری ہوگئے ۔ اس نے کہا میری اپنی غلطی سے میں خود اس سے دور رہتا ہوں اس سے کیا ہر عورت سے کٹی کاٹ جاتا
ہوں ۔ لڑکیوں کے پاس سے یوں گزر جاتا ہوں جیسے مجھے ان کی پروا نہیں مگر انھیں چھپ چھپ کر دیکھتا ہوں اور مچلتا ہوں میں کیوں
اجنبی بن گیا ہوں ۔ میری زبان کیوں گنگ ہوجاتی ہے میں گلستان پر دم لینے کی بجائے اپنے ویرانے میں کیوں پڑا رہتا ہوں ۔ شاید یہی
وجہ ہے کہ میں اپنے آپ کو تنہا اور اداس پاتا ہوں ۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور آنکھیں بند کرتے ہی گل فروش کی بیوی ایک
تصویر کی طرح بڑھی چلی آئی اور مجو نے اوک سے اسے اس طرح تین بار پانی پلایا کہ اس کی انگلیاں اس کی آنکھوں کی پلکوں کو
چھونے لگیں اور اسے اس کے گال کے خم کی ملائمت تک محسوس ہونے لگی ۔ پھر مجو نے اس کی اوک سے پانی پیا ۔ سڈول نازک
کلائیاں اس کی تھوڑی سے مس کر رہی تھیں اور سونے کی ڈھیر سی چوڑیاں ۔ اس نوزائیدہ خیال نے مجو کو جھنجھوڑ دیا ۔ اس نے آنکھیں
کھول دیں اور اپنے آپ سے پوچھنے لگا ۔ کیا سچ مچ ایسا ہوسکتا ہے ؟ آنکھوں کے سامنے پھر کہکشاں کا غبار تھا یا آسمان تک اس کی اپنی
موہوم آرزو غبار بن کر چھا گئی تھی ۔ وہی تھکے تھکے مجبور و محکوم ستارے مجو کو پھر اس کی مجبوری اور محکومی کی یاد دلانے لگے ۔

اگلے روز جب گل فروش کی بیوی کے آنے کا وقت ہوا تو مجو پر وہی درد آمیز سا سرور چھانے لگا ۔ وہ پہلے ہی چھپکے

کمروں میں جا بیٹھا ۔ جب حافظ جی گموں اور گل فروش کی بیوی کی آوازیں آنے لگیں تو وہ اٹھ کر غسل خانہ میں چلا گیا اور ایک درز میں سے دیکھنے لگا ۔ سادہ سی دل کش صورت کالی کالی پُر سحر آنکھیں ، چہرہ اور کندھے ایک مسلسل رفتار کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے پیچھے ہل رہے تھے جیسے پھولوں سے لدے پھندے پیڑ کی کومل شاخ آہستہ آہستہ لرز رہی ہو اور اس کی آواز ۔ ۔ ۔ کوئی مینا چہک رہی ہو ۔ مجو نے کہا کاش وہ کافر ہوتا اور اس معصومیت اور حسن کی دیوی کو یوں تلاوت کرتے دیکھ کر مسلمان تو ہوجاتا ۔ اس کی خاطر کچھ تو کرتا ۔ اتنے میں حافظ جی نے حاجیوں کا قصہ چھیڑا گل فروش کی بیوی نے کہا ۔ " حافظ جی آپ نے اس روز کھجوریں لانے کا وعدہ کیا تھا ۔ عرس کی کھجوریں تو ساری گموں ہی چھین کر لے گیا تھا ۔" حافظ جی نے اپنی صدری میں ہاتھ ڈالا ۔ ہاں میں تو بھول ہی گیا ۔ یہ تو ایک دم ہاتھ پر ہاتھ پڑا ۔ گموں نے چھیننی چاہیں ۔ گل فروش کی بیوی نے " اوئی " کی آواز کے ساتھ ہی مٹھی پیٹ کے ساتھ لگالی ۔ گموں نے زور لگایا ۔ دوپٹہ الجھ کر ادھر جا پڑا ۔ اس نے ہاتھ پیچھے کیا ۔ گموں گھوم گیا مگر ہاتھ نہ چھوڑا ۔ اس نے کچھ کھجوریں دوسرے ہاتھ میں پکڑ کر اپنے گریبان میں ڈال لیں اور ایک ہاتھ کو پیٹ پر دبائے رکھا ۔ گموں کے زور لگانے سے ایک گر پڑی ۔ وہ اس پر لپکا تو وہ ہنستی ہنستی اٹھ بیٹھی اور قمیض جھاڑنے لگی ۔ ایک کھجور اور گر پڑی ۔ گموں نے اس کو بھی دبالیا ۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا ۔ اس نے اپنی گردن ذرا ٹیڑھی کر کے گموں کی طرف دیکھا اور تن کر بولی " ہمت ہے تو نکالو ۔"

کھجوریں پھنسی ہوئی بنیان میں چھوٹی چھوٹی گٹھلیاں معلوم ہورہی تھیں ۔ اس کی آنکھوں کے کٹوروں کا رس کہاں چھلک گیا تھا ۔ وہاں تو ایک تیزاب تھا بدن کو جھلس دینے والا ۔ وہاں گھلاوٹ کہاں تھی وہاں تو ہلاکت تھی ۔ ۔ ۔ مجو کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ۔ حافظ اپنے مکروہ دانت نکال رہا تھا ۔ چہرے پر ہنسی کے آثار تھے اور کہہ رہا تھا ۔ " او حیوانو شیطانو ۔ کیا فرمستی مچا رہے ہو ۔"

مگر اب فرمستی کہاں تھی ، دوپٹہ پھر کندھوں پر جھولنے لگا تھا اور گموں اسی متانت سے بیٹھ گیا تھا ۔ مجو غسل خانہ میں سے ہٹ کر پچھلی کوٹھری میں جا لیٹا اور سوچنے لگا ۔ ۔ ۔ اس کا کوئی انداز تھا ۔ یوں آگے کو ہوکر جیسے کوئی شمشیر زن وار بچانے کے لیے اپنی ڈھال آگے کردے کہ لو کرو وار ۔ اور گدھے کا بچہ اندھا حافظ دانت نکال رہا ہے جیسے تماشا دیکھ رہا ہے پاجی ۔ ۔ ۔ مگر اس نے جن الفاظ میں سرزنش کی وہ کتنے مناسب الفاظ تھے ۔ " او حیوانو شیطانو ۔" اس کی آنکھوں میں اس وقت شیطانیت ہی تو تھی ۔ کیا ان اندھوں کو بھی نظر آجاتا ہے ؟ اور گموں کی آنکھیں جیسے بلی کا چھوٹا سا بچہ پلے ہوئے کبوتر پر حملہ کرنے سے گھبرائے ۔ ہچکچائے ۔ اسے اچانک یوں محسوس ہوا جیسے اس کی کہکشاں بلندیوں پر سے اتر کر اس زمین کے غلیظ و ناپاک کیچڑ میں لت پت ہوگئی ہے ۔ جیسے اس کو کسی نے بہت زور سے جھنجھوڑ دیا ہے ۔ اتنے زور سے کہ اس کے نوبیدار احساسات کی ادھ کھلی کلیاں یک بارگی جھڑ گئی ہیں اور وہ ایک ٹنڈمنڈ درخت سا رہ گیا ہے ۔ گل فروش کی بیوی کی معصومیت اور سادگی کے پُر خلوص تاثر کا کسی نے گلا گھونٹ دیا ہے ۔ اس واقعہ کے بعد اس کا دل ناولوں میں بھی نہ لگتا ۔ اور رفتہ رفتہ اس کی روح پر ایک بیزاری سی طاری ہوگئی ۔ وہ سوچتا حسن سراسر چالاک اور پُر فریب ہے ۔ عورت ایک دھوکا ہے ایک ملمع ہے ۔

اب موسم میں خنکی ہوگئی تھی ۔ لوگ پہاڑوں سے آرہے تھے ۔ جب اس کا دوست بختیار بھی آگیا تو اسے بے حد خوشی ہوئی کیوں کہ بختیار کی ظریفانہ باتیں اس کی اداسی کو دور کردیا کرتی تھیں ۔ وہ مجو کی رام کہانی سن کر ہنسا اور بولا " تمھیں عورت نے کاٹا ہے ۔ عورت ہی تمھارا اعلاج ہے بلکہ تمھارا اپنا قصور ہے کہ تم نے عورت کو جو ایک سراب اور دھوکے سے بڑھ کر کچھ نہیں حسن و معصومیت کی دیوی بناکر پوجنا شروع کردیا ۔ بھلا آج کل پوجا پاٹ کون کرتا ہے ۔ کوئی تصورِ جاناں میں وقت کیوں کھوئے ۔ اس کاروباری دنیا میں عورت یہ نہیں چاہتی کہ مجو میاں چھپ چھپ کر آہیں بھرتے رہیں اور شعر کہتے رہیں ۔ یہ زمانہ تو

خرید و فروخت کا ہے حصول اور سپردگی ۔ ایک عورت کہیں سے لاؤ لنگڑی ، لولی کانی ، مگر ہو عورت جسے تم چھو سکو جس سے بات کر سکو ، تمھاری بیماریاں ابھی درست ہوجائیں گی ۔"

" یہی تو رونا ہے عورت کہاں سے لاؤں ۔ اس طبقہ کا اجارہ دار تو گموں بنا ہوا ہے ۔ میرا تو اعتبار ہی نہیں گھر میں ۔"

" کیوں ! اس لیے کہ تم نماز نہیں پڑھتے ، ناول پڑھتے ہو ، ریڈیو سنتے ہو ۔"

" اور میں سنتے سنتے کسی وقت کہہ دیتا ہوں " واہ " اور گھر والے یہ سمجھتے ہیں بس یہ بدمعاش ہوگیا ۔ جو موسیقی کے اتار چڑھاؤ سے واقف ہے ۔ وہ عورت کے نشیب و فراز سے بھی ضرور آگاہ ہے ۔ جو شعر گنگناتا ہے اس کی نیت میں ضرور فتور ہے ۔ لڑکیاں اس سے بچتی ہیں کیوں کہ ان کے لیے سخت مضر ہے ، انھیں تو ایسا لڑکا پسند ہے جو بودم بے دال ہو جسے وہ چاہیں الو بنا سکیں ۔"

" خیر ان باتوں کو چھوڑو ۔ مجھے یہ بتاؤ کہ جب گموں اور وہ آپس میں گتھم گتھا ہورہے تھے ۔ کیا گموں کے ہاتھ میں بےباکی اور شرارت تھی ؟ "

" تم جانو لوٹ کھسوٹ میں ہاتھ ادھر ادھر لگ ہی جاتے ہیں ۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ گموں کے ہاتھوں میں بےباکی اور شرارت قطعاً نہ تھی ۔ بلکہ میں نے تمھیں بتایا ہے کہ گموں کی آنکھوں میں شرم جھجک اور خوف جھلک رہا تھا اور ادھر جوانی کی ایک للکار تھی ۔ گموں کی جگہ اگر تم ہوتے تو ۔ ۔ ۔"

بختیار ہنس پڑا ۔ او مجو میاں تم نہیں جانتے یہ مولوی بڑے سخت ۔ ۔ ۔"

ابھی بختیار نے بات بھی پوری نہ کی تھی کہ مہترانی جھاڑو دینے کے لیے برآمدے میں داخل ہوئی ۔ وہ کرسیاں اٹھا کر صحن میں لے گئے کہ اتنے میں گموں میاں سر پر تولیہ ڈالے باہر آئے بختیار سے صاحب سلامت کے بعد پوچھنے لگے ۔ " کیا باتیں ہو رہی ہیں ۔ بختیار صاحب ! "

بختیار نے آہستہ سے کہا " کچھ نہیں ۔ تمھاری مہترانی کی جوانی دیکھ رہا ہوں ۔ کیا خیال ہے تمھارا گموں ، اس کی کمر کے متعلق ۔ سو سو بل کھا رہی ہے ؟ "

گموں نے گھبرا کر کہا " لاحول ولا ۔ اس غلاظت اٹھانے والی کے متعلق ۔ ۔ ۔ آپ کی یہی باتیں رہیں بختیار بھائی ۔"

" ارے واہ غلاظت ۔ دنیا کی آدھی رونق غلاظت کے دم قدم سے ہے ۔ یہ ہنسی مذاق کی بنیاد غلاظت پر تو ہے ۔ اگر غلاظت نہ رہے تو دنیا کی آدھی رونق ختم ہوجائے ۔ بات بات پر غلیظ گالیاں دینے والے لوگوں کی زندگی آدھی ہوجائے ۔ جو لوگ شرافت ادعویٰ کرتے ہیں ، غلاظت ان کے اندر بھی ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ چھپائے پھرتے ہیں اور بختیار ظاہر کر دیتا ہے ۔"

" یہ آپ ہی کا فلسفہ ہوگا ۔" گموں نے طنز سے مسکرا کر جاتے ہوئے کہا ۔

" بیٹھو تو " بختیار نے گموں کو کھینچا ۔

" نہیں بھائی نماز قضا ہوجائے گی ۔ آپ سے کون بحث کرے ۔"

گموں نے نماز کے لیے مسجد کا رخ کیا اور کچھ عرصہ بعد بختیار بھی اپنے گھر جانے کے لیے اٹھا ۔ مجو بھی اسے وہاں تک چھوڑنے کے لیے ساتھ ہولیا ۔ ادھر سے چلو یہ شارٹ کٹ ہے ۔" بختیار نے کہا ۔ دونوں سڑک سے اتر کر پگڈنڈی پر ہولیے ۔ جو سفید زمین کے بکے ہوئے ٹکڑوں میں سے ہوتی ہوئی نئی آبادی سے جاملی تھی ۔ مسجد کے پچھواڑے تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر کچی اینٹوں کے ڈھیر چنے ہوئے تھے ۔ جب وہ وہاں سے گزرے تو بختیار نے پوچھا ۔

"یہ عورت کون ہے ؟"

"کوئی فقیرنی ہے ۔" مجو نے جواب دیا ۔

عورت اینٹوں سے ٹیک لگائے چلم پی رہی تھی اور آدمی جو شکل و صورت سے اچھا سمجھ دار معلوم ہو رہا تھا ۔ اس کی ٹانگ دبا رہا تھا ۔ جو اس نے بڑی بے پروائی سے زمین پر پھیلا رکھی تھی ۔ بختیار ایک دل چسپی سے اس عورت کو دیکھتا چلا جا رہا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بات کہنے ہی والا ہے کہ مجو بولا "یہ تو معمولی سا آدمی لگتا ہے ۔ بڑے بڑے سفید پوش سٹے کا نمبر پوچھنے آتے ہیں ۔"

"یہ مسٹنڈی کیا نمبر بتلائے گی ۔ آنکھیں دیکھو نشہ سے سرخ ہو رہی ہیں ۔"

مگر غرض مند دیوانہ ہوتا ہے مجو نے بڑے بزرگانہ انداز میں کہا ۔

جب وہ بختیار کو چھوڑ کر آیا تو وہ عورت آسمان پر نظریں جمائے اپنے دونوں ہاتھوں کو گردن کے پیچھے رکھے لیٹی ہوئی تھی ۔ چلم پاس اوندھی پڑی تھی اور وہ آدمی مٹی کے پیالے کو رکابی سے ڈھک کر روانہ ہو رہا تھا ۔

جب وہ دونوں پاس سے گزرے تو مجو نے پوچھا "یہ کون ہے ؟"

"کوئی اللہ کی پیاری ہے جس کی ایک مخلوق سیوا کر رہی ہے ۔ تم جانو سیوا سے میوا ملتا ہے ۔"

آدمی نے اپنی راہ لی اور مجو اس عورت کے پاس جا کھڑا ہوا ۔ اس کے بدن پر مردانہ قمیص تھی جس کی دونوں آستینیں کندھوں تک غائب تھیں اور وہ اسی طرح دونوں ہاتھوں کو گردن کے پیچھے رکھے آسمان کو تکے جا رہی تھی ۔ جیسے کچھ لکھا ہوا پڑھ رہی ہے ۔ "سائیں جی آپ کیا تک رہی ہیں آسمان پر " عورت نے مجو کی طرف دیکھا ۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اور دیوانگی جھلک رہی تھی ۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجو سے بیٹھ جانے کو کہا ۔ مجو چاروں طرف دیکھ کر کوئی ہے تو نہیں بیٹھ گیا ۔ ایک پیالے میں بچا کھچا دودھ پڑا تھا ۔ جس میں مکھیاں مری پڑی تھیں اور پاس ایک اور پیالہ پڑا تھا جسے وہ آدمی رکابی سے ڈھک گیا تھا ۔ مجو کو وحشت سی ہوئی اور اس نے خاموشی سے اکتا کر کہا ۔ "اس پیالے میں کیا ہے سائیں جی ؟"

عورت بولی ۔ "لے لو ۔"

"نہیں یہ مطلب نہیں ۔"

"لے لو جو کچھ بھی ہے ۔ اٹھاؤ لے لو ۔"

مجو نے بے بس ہو کر رکابی اٹھائی ۔ پیالے میں جلیبیاں پڑی تھیں ۔ اس نے ایک جلیبی لے کر کہا ۔ "بس ایک کافی ہے سائیں جی ۔" عورت نے اپنی گردن پر زور سے ہاتھ مار کر ایک غلیظ گالی دی اور ایک مری ہوئی مکھی کو گردن پر سے پکڑ کر بچے کھچے دودھ والے پیالہ میں ڈال دیا ۔ پھر اپنا تخنہ کھجا کر اسی طرح دونوں ہاتھوں کو گردن کے پیچھے رکھے ہٹر ہٹر آسمان کو تکنے لگی ۔ اس کے دھول سے بھرے پاؤں کی کھردری ایڑیاں جگہ جگہ سے پھٹی پڑی تھیں ۔ ایک ٹانگ پر سے پیوند لگی شلوار اوپر چڑھ گئی تھی جس کے باعث پنڈلی ننگی ہو رہی تھی ۔ "اچھا میں چلتا ہوں سائیں جی ۔" مجو نے اٹھتے ہوئے کہا ۔

"کوئی کام تھا ؟"

"نہیں بس ایسے ہی سلام کرنے آ گیا تھا ۔" وہ دو قدم چل کر پھر پلٹ آیا ۔ اور بولا سائیں جی دل بڑا اداس رہتا ہے ۔ عورت نے جنبش کیے بغیر سرخ سرخ آنکھیں پھرا کر اس کی طرف دیکھا اور بولی "نماز پڑھا کرو ۔"

وہ مڑنے ہی کو تھا کہ ایک پکی عمر کا آدمی آ کر کہتا ہے ۔ "سائیں جی ہو گیا وہ کام ۔ جیت لیا مقدمہ " اور بیٹھتے ہی اس کا

پاؤں پکڑ کر دبانے لگا پھر اس نے شلوار کا اوپر پڑھا ہوا پائنچا نیچے کھینچ کر ننگی پنڈلی کو خود ہی ڈھک دیا اور دباتا رہا ۔ مجو دیکھتا رہا ۔ اس کی مٹھیوں میں عورت کی ٹانگوں کا گوشت کس طرح دبا جارہا تھا ۔ آدمی نے مجو کی طرف دیکھ کر کہا ۔ "اللہ والی کبھی کبھی روز بولتی ہے یوں سمجھو کہ بس ہاتھوں پر سرسوں جمتی ہے ، یہ تمھارے ہاتھ میں کیا ہے ؟ سائیں جی نے تبرک دیا ہے ۔ بس ٹھیک ہے خدمت کرو ان کی ، فقیر لوگ بادشاہ ہوتے ہیں ۔" ہوا کے جھونکے نے فقیرنی کے پیٹ سے قمیص ہٹا دی ۔ وہ آدمی اس کی قمیص نیچے کھینچ کر بولا ۔ "بیٹھی ہے مست اپنے حال میں ۔ آؤ پکڑ لو ایک پاؤں ۔" مجو کا جی تو چاہا اس کا بدن دبانے کو مگر وہ ہنر نفی میں ہلاکر چل پڑا ۔ مسجد کی منڈیر پر سے کوے کائیں کائیں کرتے اڑ گئے ۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی جلیبی کی طرف دیکھا اور اسے چنی ہوئی پکی اینٹوں کے ڈھیر پر رکھ دیا ۔

رات کو جب مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی تو مجو ہاتھ میں کتاب لیے بیٹھا تھا ۔ مگر اس کا جی کتاب سے بھی اچاٹ ہوچکا تھا ۔ نماز کی طرف اس کی طبیعت کبھی راغب نہ ہوئی تھی ۔ مگر آج جیسے اذان میں ایک زور دار بلاوا ہو کہ آؤ فلاح کا یہی ایک راستہ ہے اور خدا کی ہستی بہت بڑی ہستی ہے ۔ اس کے آگے جھک جاؤ اس نے سوچا شاید نماز پڑھنے سے یہ دل شکستگی اور اداسی جاتی رہے ۔ اس عورت کا کہنا نماز پڑھا کرو ، ضرور کوئی معنی رکھتا ہے ۔ گموں نماز پڑھتا ہے شاید اسی لیے خوش رہتا ہے ۔ وہ کم از کم ان کرب انگیز احساسات کا شکار نہیں جنھوں نے میرے ذہن میں قیامت برپا کر رکھی ہے لیکن اگر میں نے مسجد میں جاکر نماز پڑھی تو گموں گھر بار میں شور مچادے گا کہ لو آج مجو بھی مسلمان ہوگیا ۔ سب مجھ سے پوچھیں گے ۔ ہیں مجو ۔ یہ کیا ؟ یہ تبدیلی ارے تم تو گموں کو ملاجی کہا کرتے تھے ۔ گھر میں پڑھوں تو بھی وہی بات ہے لیکن اگر پڑھنی ہے تو آدمی علی الاعلان پڑھے ۔ یہ کوئی گناہ تھوڑی ہے ۔ مسجد میں جاکر ادھر ادھر کہیں کونے میں کھڑا ہو جاؤں گا ۔ اگر گموں نے دیکھ لیا تو دیکھ لے ۔ نماز پڑھی ہے ۔ کوئی چوری تو نہیں کی ۔ وہ مسجد کی طرف جارہا تھا ۔ اسے خیال آیا کہ اذان کو تو کافی دیر ہوچکی ہے ۔ اب تو نماز بھی پڑھی جاچکی ہوگی ۔

اس نے دیکھا مسجد سے لوگ نکل رہے تھے ۔ وہ سڑک سے اتر کر پگڈنڈی پر ہو لیا ۔ مگر کیا نماز سے اسے سکون حاصل ہوسکتا تھا ۔ اس میں اسے کچھ شک پیدا ہوگیا ۔ وہ تاویلیں کرنے لگا ۔ نماز میں تو خدا کی تعریف کی جاتی ہے اس کی برتری اور عظمت کا احساس ہوتا ہے اور آدمی سجدے کرتا ہے ۔ میری بیماری کا اعلاج نماز نہیں ہوسکتی ۔ وہ بات جو بختیار نے کہی تھی وہ کچھ دل لگتی ہے جس کو چھو سکو جس سے بات کرسکو ۔ تمھارا علاج عورت ہے لنگڑی ہو ، لولی ہو ، کانی ہو ۔ اندھیرا اس کے کان میں کہنے لگا ۔ مگر وہ نہ لنگڑی ہے نہ لولی ، گول پنڈلیاں ، بھرا بھرا بدن ، مٹیالی رنگت ننگی باہیں ۔" اس کے قدم بڑھتے چلے گئے ۔ اور اس نے پسینہ پونچھتے ہوئے گھپ اندھیرے میں چاروں طرف دیکھ کر کہا ۔ "سائیں جی ہوگیا وہ کام جاتی رہی دل کی اداسی ۔" اور پھر بیٹھ کر اس کی ٹانگیں دبانے لگا ۔ اس کے ہاتھوں میں رانوں کا لجلجا گوشت زور زور سے دب رہا تھا مچل رہا تھا ۔ اس نے کروٹ لے کر کہا ۔ "تم آج کس طرح دبا رہے ہو ۔ تمھارے ہاتھ آج چبھ رہے ہیں جیسے چٹکیاں لے رہے ہوں ۔

"مجھے دبانا نہیں آتا سائیں جی ۔"

"روز تم دباتے ہو اور ابھی تک دبانا نہیں آیا ۔ تمباکو لاتے ہو ؟"

"کیسا تمباکو ؟" مجو نے حیران ہوکر پوچھا ۔

وہ اٹھ بیٹھی اور اپنی مٹھی میں چلمگی کے پاس اٹے ہوئے سگریٹ کا کش لے کر بولی "کیسا تمباکو ! ! جو تم ابھی لینے گئے تھے ؟"

(باقی ص : ۸۷ پر)

آغا بابر

(ڈرامہ)

فالتو چیزیں

افراد

ایڈمنسٹریٹر۔ سٹینوگرافر۔ منیجر۔ پی۔ اے لڑکی۔ شہزادہ نوچند۔
توفیق رؤف۔ ہوٹل کا منیجر۔ ناذلی۔ ملازم۔

○ پہلا سین

(کمپنی کے آفس کا کمرہ اعلیٰ فرنیچر، دائیں اور بائیں دو دروازے)

ایڈمنسٹریٹر : سٹینو، خط ٹائپ ہو چکا؟

سٹینوگرافر : جی

ایڈمنسٹریٹر : شاباش۔ ہمیں یاد آیا ایک اور ضروری خط لکھنا ہے۔

سٹینوگرافر : میں نوٹ بک لے آؤں (جاتا ہے)

ایڈمنسٹریٹر : (انتظار میں سیٹی بجاتا ہے) (سٹینو آتا ہے) ہاں۔ لکھو۔ مائی ڈیئر، تمہارے آخری خط سے معلوم ہوا کہ فیکٹری کو آگ لگ چکی ہے۔ ملبہ اٹھایا جا رہا ہے۔ نقصان خاصا ہوا ہے۔ مگر تم نے آج تک یہ اطلاع نہیں دی کہ ملبے میں اس کی نعش ملی یا نہیں۔ اگر ملی ہو تو کس شکل و صورت میں ملی۔ اب تمہاری ضرورت ہمیں یہاں محسوس ہو رہی ہے تم اپنا کام ختم کر کے جلد واپس آنے کی کوشش کرو۔ فقط تمہارا خیر اندیش۔۔

(دروازے پر دستک)

ایڈمنسٹریٹر : یس۔ کم ان۔

منیجر : (داخل ہو کر) ہیلو سر۔

ایڈمنسٹریٹر : ہیلو منیجر۔ سٹینو جب تک ہم بلائیں نہیں تم نہیں آؤ گے۔

سٹینوگرافر : ویسٹ از رائٹ سر۔

ایڈمنسٹریٹر : کہیے منیجر صاحب۔

منیجر : جناب ہمارا کام بہت بڑھ جائے گا۔

ایڈمنسٹریٹر : یقیناً۔

منیجر : یہ فائل میرا چیف رپورٹر بنا کر لایا ہے۔ بڑی تفصیل سے ہر بات پر اس نے روشنی ڈالی ہے۔ میں نے اپنے ریمارکس لکھ دیے ہیں۔ یہ فائل مطالعہ فرمانے کے بعد آپ مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کریں۔

ایڈمنسٹریٹر : کہتا کیا ہے تمہارا چیف رپورٹر؟

منیجر : لب لباب یہ ہے کہ روز بہ روز انسان دشمنی بڑھ رہی ہے۔ شادیاں دھڑا دھڑ ناکام ہو رہی ہیں بیویاں خاوندوں کو زہر دے رہی ہیں۔ خاوند بیویوں کو قتل کر رہے ہیں۔ اس نے اپنے دعوے کے ثبوت میں اونچے طبقے کی عورتوں کے اعداد و شمار دیے ہیں جن میں جرائم بڑھ رہے ہیں۔

ایڈمنسٹریٹر : زندگی کے راستے رکاوٹوں سے بھر رہے ہیں۔

منیجر : جی ہاں۔

ایڈمنسٹریٹر : راستوں سے یہ رکاوٹیں ہٹانے کی ضرورت بڑھ رہی ہے۔

منیجر : جی ہاں۔

ایڈمنسٹریٹر : ہوں۔ ٹھیک ہے، بڑھنے دو۔ اس نے نئے گاہکوں کا کچھ اتا پتا دیا ہے؟

منیجر : جی ہاں تین نئے گاہکوں کی تفصیل اس نے دی ہے۔ اس کی یہ بھی تجویز ہے کہ دو چار اور شہروں میں ہمیں اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔

ایڈمنسٹریٹر : غور کریں گے۔ ہم فائل کو دیکھنے کے بعد کچھ بتا سکیں گے۔ آپ وہ اخراجات کی فائل بھی لائے ہیں؟

منیجر : جی ہاں۔

ایڈمنسٹریٹر : ہمیں بتائیے شہر میں ان گداگروں کی کیا تعداد ہے

جو کمپنی کی طرف سے گاہکوں کا پیچھا کرنے کے کام پر مقرر ہیں ؟

منیجر : دو سو ۔

ایڈمنسٹریٹر : خرچ ؟

منیجر : دو سو ۔

ایڈمنسٹریٹر : فیکٹریوں میں ہمارے آدمیوں کی کیا تعداد ہے ؟

منیجر : بارہ سو ۔

ایڈمنسٹریٹر : ہوں (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے ۔ ٹیلیفون اٹھا کر) ہیلو ۔ ہاں میری گھڑی میں بھی یہی وقت ہے ۔ تین منٹ بجتے ہیں ۔ ۔ ۔ تھینک یو ۔

منیجر : کیا پندرہ نمبر فلیٹ سر ؟

ایڈمنسٹریٹر : یس ۔ پندرہ نمبر فلیٹ (ٹیلی فون آتا ہے) یس ۔ آگ لگ گئی ؟ عین اس وقت جب ہمارا فائر انجن ادھر سے گزر رہا تھا ۔ شاباش ۔ موقع پر جا پہنچا ۔ جو رپورٹ ہو ہمیں اطلاع دو ۔ (منیجر سے کہتا ہے) اطلاع ہے کہ آگ نہیں بجھ رہی ۔ آگ کیسے بجھ سکتی ہے ۔

منیجر : پانی میں تیل زیادہ تو نہیں ملایا گیا ۔

ایڈمنسٹریٹر : نہیں ۔ فائر آفیسر کو ہمارا مستقل حکم ہے کہ جب تک خاص حکم نہ ہو پانی میں تیل کی مقدار دستور کے مطابق ہی رہے ایک تو فلیٹ ہے زیادہ وقت نہیں لگے گا ۔

منیجر : ہمارا فائر آفیسر بڑا تیز آدمی ہے ۔

ایڈمنسٹریٹر : کمپنی میں کون سا آدمی ہے جو تیز نہیں ۔ لپنے م میں تم کم تیز ہو ؟

بجر : تھینک یو ۔

ایڈمنسٹریٹر : ریڈیو لگاؤ ۔ خبروں کا وقت ہے ۔

منیجر : جی (پاس پڑے ریڈیو کا بٹن گھماتا ہے ۔ خبریں سنائی دیتی ہیں) آدم بلڈنگ کے فلیٹ نمبر پندرہ کو آگ لگ جانے کی ابھی خبر آئی ہے ۔ اس فلیٹ میں شہزادہ نوچند کی ماں رہتی تھی جو شعلوں میں بری طرح لپٹ گئی ۔ راستہ بند پاکر اس نے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی اور جاں بحق ہوگئی ۔ فلیٹ کی کوئی چیز نہیں بچی ۔ دو فائر انجنوں نے بڑی مشکل سے آگ پر قابو پالیا ۔ آج تاجروں کی تیسری کانفرنس کا جلسہ ۔ ۔ ۔ ۔

ایڈمنسٹریٹر : بند کردو (منیجر ریڈیو بند کردیتا ہے) یہ بڑھیا کھڑکی سے کیسے کود گئی ۔ ۔ ۔ ۔

منیجر : وہ بڑھیا جو آوارہ شہزادے کا پیچھا کرتے ہوئے ملک ملک پھر سکتی ہے اس سے کوئی بعید نہ تھا مگر ہمارا انتظام تھا کہ وہ وہیں بھسم ہوجائے ۔

ایڈمنسٹریٹر : وہی تو ہم حیران ہیں ۔

پی ۔ اے لڑکی : اندر آسکتی ہوں ؟

ایڈمنسٹریٹر : ہاں ۔

پی ۔ اے لڑکی : کوئی صاحب ملنے کے لیے آئے ہیں ۔ یہ کارڈ ہے ان کا ۔

ایڈمنسٹریٹر : (پڑھ کر) پرنس نوچند ۔ آنے دو ۔ (شہزادہ داخل ہوتا ہے) آئیے شہزادے صاحب ۔

شہزادہ : (نشہ میں ہے) ہم نے خبر سن لی ۔ ہم آپ کے بہت ممنون ہیں ۔ آپ اس کے دفنانے کا انتظام کریں ۔ یہ لیجیے اپنی خدمات کے لیے چیک ۔ میں ابھی ابھی فلائی کر رہا ہوں یہاں سے خدا حافظ ۔

ایڈمنسٹریٹر : کمپنی کو بہت افسوس ہے شہزادہ صاحب کہ مرحومہ کھڑکی سے چھلانگ لگا گئی ورنہ معاملہ آپ سے یہ طے ہوا تھا کہ اس کو وہیں بھسم کر دیا جائے گا ۔

شہزادہ : کوئی بات نہیں ۔ مرحومہ بڑی نیک دل تھی ۔ فکر نہ کیجیے معاوضے میں سے ہم نے کچھ رقم کاٹی نہیں بلکہ پانچ سو روپے انعام کا بڑھا دیا ہے ۔

ایڈمنسٹریٹر : اس کی کیا ضرورت تھی شہزادے صاحب ۔ آپ کتنے نیک دل ہیں ۔

شہزادہ : خدا حافظ ۔

ایڈمنسٹریٹر : رخصت مبارک باد (شہزادہ چلا جاتا ہے)

منیجر : آپ کو یاد ہے وہ عورت ؟ مجھے شہزادہ نوچند

کی شکل دیکھ کر وہ یاد آگئی ہے۔

ایڈمنسٹریٹر : کون سی ؟

منیجر : وہی جس نے گذشتہ سال اپنے مکان کو آسیب زدہ ظاہر کرنے کے لیے ہماری کمپنی سے مدد مانگی تھی۔

ایڈمنسٹریٹر : ہاں ہاں کمپنی کے لیے اگر چہ وہ کام نیا تھا مگر لطف اس وقت آیا جب اس کے خاوند نے مکان کے اردگرد پولیس کا پہرہ لگا دیا۔

منیجر : (ہنس کر) آج تک کسی کو معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ اینٹیں کہاں سے آتی تھیں۔

ایڈمنسٹریٹر : یہ کام کمپنی کے ریکارڈ پر سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

منیجر : واقعی۔ پولیس والے بھی ایک بھکڑ ہم نے چنے تھے۔ اینٹیں اس طرح پھینکتے کہ معلوم یہی ہوتا کہ بھوت بہت تاؤ میں آیا ہوا ہے۔

ایڈمنسٹریٹر : (ہنس کر) آہا ہا ہا۔ مجھے خوب یاد ہے (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے) ہیلو۔ جی ہاں بھول رہا ہوں۔ کیا کہا ہمارے ٹرک کے ڈرائیور کو بہت چوٹ آئی ہے۔ ہسپتال میں لے گئے ہیں۔ نے ور مائنڈ۔ ہاں ہم ابھی ہسپتال میں جاکر اسے دیکھ آئیں گے۔ شکار تو مار لیا نا ؟ بس زیادہ اہم بات تو وہی تھی۔ ہمارے آدمیوں کو جان کی پرواہ نہیں۔

منیجر : ہمارا ڈرائیور زخمی ہوگیا ہے۔

ایڈمنسٹریٹر : سیٹھ کی گاڑی بڑی تیزی سے آرہی تھی۔

منیجر : سات نمبر ڈرائیور تھا۔

ایڈمنسٹریٹر : ہاں۔

منیجر : کوئی بات نہیں۔ وہ تو ہتھیلی پر جان لیے رکھتا تھا۔

(دروازے پر دستک)

ایڈمنسٹریٹر : کم ان۔

پی۔ اے لڑکی : سر۔ ہیر از اے کان فی ڈینشل فائل۔

ایڈمنسٹریٹر : ہمیں دے دو۔ (پڑھتا ہے) رفیق رؤف کو کارڈ دے دیا گیا۔

منیجر : دے دیا گیا۔ گڈ

ایڈمنسٹریٹر : منیجر اب تم اکیلے جاکر ڈرائیور کو ہسپتال دیکھ آؤ۔ ہم نہیں جاسکتے۔ ہمیں رفیق رؤف کے لیے رکنا پڑے گا

منیجر : گڈ لک سر۔

ایڈمنسٹریٹر : گڈ لک (منیجر جاتا ہے) (ایڈمنسٹریٹر ٹیلیفون کرتا) ہیلو مسٹر کیس نمبر ۲۲۳۔ رفیق رؤف کو کارڈ دے دیا گیا۔ (ٹیلیفون کا دوسرا نمبر ملاتا ہے) جی میں ایڈمنسٹریٹر بول رہا ہوں۔ چیئر مین بورڈ آف ڈائرکٹرز کو مطلع کر دیا گیا ہے۔ آپ کو اطلاع باقی تھی۔ کیس نمبر ۲۲۳۔ رفیق رؤف کو کارڈ دے دیا گیا (ٹیلیفون کا تیسرا نمبر ملاتا ہے) گڈ لک ٹو یو سر۔ کیس نمبر ۳ رفیق رؤف۔ جی ہاں۔ کارڈ دے دیا گیا۔ تھینک یو سر۔ (پڑ

دوسرا سین

(رفیق رؤف کا کمرہ۔ توفیق رؤف کوچ پر یوں لیٹا ہے جیسے تھکا ہوا ہو۔ دو تپائیاں قریب پڑی ہیں۔ ایک پر ٹیلیفون ہے۔ ایک خالی ہے)

ملازم : (باہر سے) اندر آسکتا ہوں۔

توفیق : کافی لے کر آئے ہو ؟

ملازم : جی ہاں۔

توفیق : لے آؤ۔ یہاں رکھ دو۔ (خالی تپائی پر وہ رکھ دیتا ہے) ان کھڑکیوں کے پردے نیچے گرا دو۔

ملازم : (پردے گرا کر) اور کچھ سرکار ؟

توفیق : اور کچھ نہیں۔

ملازم : بیگم صاحبہ ابھی تک نہیں آئیں۔

توفیق : ان کی دعوت ہے۔ کھانا کھا کر آئیں گی جاسکتے ہو ؟ صبح جلدی آجایا کرو۔ تم جانتے ہو ہمارے دونوں چھٹی پر گئے ہوئے ہیں۔

ملازم : جی ہاں۔ میں تو بڑی صبح آجاتا ہوں۔

توفیق : دیکھو وہ کتاب پڑی ہے سامنے۔ اسے ا

(ملازم اٹھاتا ہے) ہاں اسی کو ۔ اس کے نیچے ایک کارڈ پڑا ہے ۔ چھپا ہوا کارڈ ۔ ہاں یہی ۔ یہ ہمیں دے جاؤ ۔ ٹھیک ہے اب تم جاسکتے ہو ۔

ملازم : سلام صاحب (جاتا ہے)

توفیق : سلام ۔ (کارڈ پڑھتا ہے) حاشیہ پر یہ سنہری لکیریں ۔ یہ موٹا دبیز کاغذ کتنی عمدہ چھپائی ہے ۔ اشتہار بازی کی بھی حد ہوگئی ۔ (پڑھتا ہے) فالتو چیزیں ٹھکانے لگانے والے ہر قسم کے ذاتی معاملات طے کیے جاتے ہیں ، مشورہ مفت ۔ کام کی فیس معمولی اور واجبی ۔ ہم اپنے کام کے بڑے ماہر ہیں ۔ ملاقات کے لیے ٹیلیفون کریں یا خود وقت مقرر کریں ۔ (کارڈ پر سے نظریں ہٹا کر) آ ۔ ۔ ۔ ! ٹیلیفون نمبر بھی دیا ہوا ہے ۔ ہو نہ ہو یہ لوگ کباڑیے ہوں گے ۔ مگر نہیں یہ تو لکھا ہوا ہے فالتو چیزیں ٹھکانے لگانے والے ۔ اگر کباڑیے ہوتے تو کارڈ پر لکھا ہوتا فالتو اور پرانی چیزیں خریدنے والے ۔ پھر یہ لوگ ذاتی معاملات سے کیا مراد لیتے ہوں گے ؟ کیوں نہ اس وقت ٹیلیفون کیا جائے ۔ شاید کوئی ۔ ۔ ۔ و

(ٹیلیفون کرتا ہے) ہیلو ۔ کون بول رہا ہے ۔ ایڈمنسٹریٹر کی پی اے ۔ کیا میں ایڈمنسٹریٹر صاحب سے بات کرسکتا ہوں ۔ تو ٹیلیفون دیجیے ذرا انھیں ۔ ہیلو ۔ میں کل شام سیر کر کے واپس آرہا تھا کہ ایک شخص نے مجھے ایک کارڈ دیا جس پر لکھا ہوا ہے فالتو چیزیں ٹھکانے لگانے والے ۔ جی ہاں میں توفیق رؤف بول رہا ہوں آپ کو میرے نام کا کیسے علم ہے ۔ مگر آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں ہی آپ کو ٹیلیفون کر رہا ہوں ۔ میں تو آپ کو جانتا نہیں ۔ کمال ہے ۔ آپ نے تو مجھے حیرت میں ڈال دیا ۔ ہاں تو ملاقات کا وقت ، جی ہاں سہ پہر کو ۔ صبح کے وقت میں نہیں آسکتا ۔ دفتر کے کام سے فارغ ہوکر آجاؤں گا ۔ جی ہاں چار بجے ۔ (پردہ)

○ تیسرا سین

(ایڈمنسٹریٹر کا آفس وہی پہلا سین)

پی ۔ اے لڑکی : توفیق رؤف آگئے ہیں ۔

ایڈمنسٹریٹر : اندر لے آؤ (پی ۔ اے لڑکی چلی جاتی ہے ۔ توفیق رؤف داخل ہوتا ہے) ہیلو ۔ تشریف رکھیے ۔ آپ کچھ پئیں گے ؟

توفیق : نو تھینک یو ۔

ایڈمنسٹریٹر : رات آپ ٹیلیفون پر بڑے حیران ہوگئے تھے

توفیق : جی ہاں ۔ آپ کو میرا اتا پتا کیسے معلوم ہوا ۔ میرا نام میرا پیشہ ۔ ۔ ۔ ۔

ایڈمنسٹریٹر : (ہنس کر) ہماری کمپنی کا کام ہی کچھ ایسا ہے کہ اسے ان تمام باتوں سے واقف رکھنی پڑتی ہے ۔

توفیق : کمپنی کا کام ہی کچھ ایسا ہے ۔ کیا کاروبار کرتی ہے آپ کی کمپنی ؟

ایڈمنسٹریٹر : ہم فالتو چیزوں کو ٹھکانے لگاتے ہیں ۔

توفیق : آپ کباڑی تو ہرگز نہیں ؟

ایڈمنسٹریٹر : جی نہیں ۔ ہم انسانوں کو ٹھکانے لگاتے ہیں ۔ فالتو اور غیر ضروری انسانوں کو ۔ یہ کام بہت آسان ہے ۔ اگر چہ آپ کو یہ بات عجیب و غریب نظر آتی ہے مگر ذرا غور کرنے سے حقیقت آپ پر ظاہر ہوجائے گی کہ دنیا میں بہت سے انسان فالتو ہیں ۔ مثلاً غیر ضروری خاوند ، غیر ضروری بیویاں ، غیر ضروری رشتہ دار ، بیوپار کے ساتھی ، ہم انھیں راستے سے ہٹا دیتے ہیں اور اگر آپ اور وضاحت چاہتے ہیں تو یوں کہہ لیجیے کہ ہم دنیا سے ان کا حساب چکا دیتے ہیں ۔

توفیق : آپ کا مطلب ہے کہ آپ انھیں مار ڈالتے ہیں ۔

ایڈمنسٹریٹر : جی نہیں ۔ ہم انھیں راستے سے ہٹا دیتے ہیں ۔

توفیق : مگر صاحب یہ تو بالکل قتل ہے ۔

ایڈمنسٹریٹر : جی نہیں ۔ یہ فالتو شے کو ٹھکانے لگانا ہے ۔ اگر آپ سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس دنیا میں بعض لوگوں کی ضرورت ہے اور بعض بالکل غیر ضروری ہیں ۔ بالکل فضول اور فالتو ۔ ہم ایسے لوگوں کو ٹھکانے لگادیتے ہیں ۔ آج تک ایسے کام انا‌ڑی کرتے رہے ہیں اسی لیے ان میں کوئی نہ کوئی خامی باقی رہ جاتی رہی ہے ۔ مگر ہم ماہر ہیں ۔ لیکن

ہر۔ ہم کسی کام کو الجھاتے نہیں۔ ہمارا کام بڑی فنی مہارت سے سر انجام پاتا ہے۔ لہٰذا اس کے نتائج خطرناک نہیں ہوتے۔ ہم ارنٹی دیتے ہیں اس لیے ہمارا معاوضہ بھی زیادہ ہے۔

توفیق : کیا آپ ہوش و حواس میں ہیں؟ آپ مجھے کیا بتا رہے ہیں؟ یہ کہ آپ معاوضہ لے کر لوگوں کو قتل کرتے ہیں۔

ایڈمنسٹریٹر : توفیق صاحب۔ میں آپ سے یہ عرض کر رہا ہوں کہ ہم جائز معاوضہ لے کر غیر ضروری لوگوں کو راستے سے ہٹا دیتے ہیں۔ اگر آپ کو ہماری خدمات درکار ہیں تو ہم حاضر ہیں۔

توفیق : آپ کا یہ مطلب ہے کہ۔۔۔۔

ایڈمنسٹریٹر : مطلب وطلب کچھ نہیں۔ ہم اپنا کام اندازوں سے نہیں کرتے ہمیں ہر بات کو یقین کے ساتھ جاننا پڑتا ہے۔ ہم ہر بات کی تہہ تک پہنچتے ہیں کیوں کہ ہمارا کام ہی یہی ہے اور یہ بات جانے بغیر ہمارا بیوپار نہیں چل سکتا کہ آپ کو ہماری خدمات کی ضرورت ہے۔

توفیق : آپ کی کمپنی۔۔۔۔

ایڈمنسٹریٹر : ہماری کمپنی پچھلے پانچ سال سے کام کررہی ہے۔

توفیق : اسی دوران میں آپ نے۔۔۔۔

ایڈمنسٹریٹر : اسی دوران میں ہم نے ۲۵۰ فالتو اشخاص کو ٹھکانے لگایا ہے۔ ان میں اکثریت غیر ضروری خاوندوں اور بیویوں کی ہے جن کے رہنے سے ملک کو کوئی خاص فائدہ نہ تھا۔ ہم اپنے ملک کو تمام فالتو چیزوں سے پاک کردینا چاہتے ہیں۔ آپ ماننا پڑے گا کہ ہم انسانیت کی بہت بڑی خدمت سر انجام دے رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم آپ کو اپنی فائلیں نہیں دکھا سکتے ورنہ آپ ہماری فائلوں کو بہت دل چسپ پاتے۔ ان میں اکثر نام آپ کو جانے پہچانے نظر آتے۔ معلوم ہوتا ہے، آپ مجھ سے کوئی سوال دریافت کرنا چاہتے ہیں؟

توفیق : جی ہاں ایک سوال میرے دماغ میں گھوم رہا ہے۔

ایڈمنسٹریٹر : ہمارے طریقوں کے متعلق۔ یہی نا؟

توفیق : جی ہاں۔

ایڈمنسٹریٹر : معاف کیجیے۔ ہم اپنے گاہکوں کو ان طریقوں سے آگاہ نہیں کرتے کیوں کہ ہمارے طریقے ہی ہمارے کاروبار کے اہم جزو ہیں۔ بہرحال آپ کو یہ بتادینا کافی ہے کہ ہمارے طریقے مکمل ہیں۔ البتہ اتنا بتائے دیتا ہوں کہ اکثر انسانوں کو راہ سے ہٹانا ظاہراً بالکل حادثہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے پچھلے پانچ سال میں کئی حادثات کے متعلق اخبار میں پڑھا ہوگا۔ کوئی شخص گاڑی کے نیچے آکر کچلا گیا۔ کسی نے مکان کی چھت سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرلی۔

توفیق : جی ہاں۔

ایڈمنسٹریٹر : ان حادثات میں اکثر ہمارا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ سڑکوں پر گاڑیوں کی ٹکروں کے واقعات۔ خوراک میں زہر۔ توفیق صاحب آپ حیران نہ ہوں۔ ہمارا سٹاف بہت بڑا ہے۔ ہمارا خرچ بھی بہت ہے۔ اسی لیے ہم معاوضہ بھی زیادہ لیتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اناڑی اپنا کام بگاڑ دیتا ہے اور پھر وہ اناڑی پن کے باعث اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ ہم ماہر ہیں۔ یہ ہمارا پیشہ ہے اور ہم ماہرِ فن ہونے کی وجہ سے زیادہ معاوضہ طلب کرتے ہیں۔

توفیق : خوب جس شخص نے مجھے آپ کی کمپنی کا کارڈ دیا تھا وہ آپ کا ایجنٹ ہوگا؟ کیا وہ کارڈ ہر کسی کو دے دیتا ہے۔

ایڈمنسٹریٹر : جی نہیں۔ یہ کارڈ خاص خاص لوگوں کو دیے جاتے ہیں۔

توفیق : اچھا؟

ایڈمنسٹریٹر : یہ کارڈ صرف ان لوگوں کو دیے جاتے ہیں جنھیں ہماری خدمات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ ہمارا سٹاف بہت بڑا ہے جو اپنے کام کا ماہر ہے۔ وہ لوگ گہری تحقیق و تفتیش کے بعد حقائق معلوم کرتے ہیں۔

توفیق : واقعی؟

ایڈمنسٹریٹر : جی ہاں ہمیں آپ کے متعلق ایک ایک بات کا علم ہے۔

توفیق : مگر کیا آپ یہ تمام باتیں مجھے بتا کر کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے؟

ایڈمنسٹریٹر : جی نہیں۔ یہ خفیہ بات چیت ہے اور پھر آپ

یسے شخص نہیں جو ہمارے اعتبار کو ٹھیس پہنچائیں اور اگر آپ
بات باہر جاکر بتا بھی دیں تو آپ کی بات کا یقین کون کرے
۔ دوسرے ہم ہر بات کا دھیان رکھتے ہیں ۔ ہم جزئیات تک کی
انی کرتے ہیں ۔ خیر چھوڑیے ان باتوں کو ۔ آپ اپنی کہیے ۔
پ بھی کسی کو راستے سے ہٹانا چاہتے ہیں ؟

یق : جی ہاں ۔ اپنی بیوی کو ۔ کچھ مدت سے ہم میں
ت اختلافات پیدا ہوگئے ہیں ۔ میں دوسری شادی کرنا چاہتا
ں ۔

منسٹر پیٹر : ہمیں آپ کے جذبات سے کوئی کام نہیں ۔ بہ
مال آپ کا کام ہوجائے گا ۔ مگر آپ کب تک چاہتے ہیں ؟

ق : جس قدر جلد ہوسکے ۔ اسی قدر اچھا ہے ۔

سٹر پیٹر : ایسا ہی ہوگا ۔ معاوضہ دس ہزار روپے ہوگا ۔
، ہزار روپے کی ادائیگی فوراً ہوجانی چاہیے اور باقی پانچ ہزار
نے کے ایک ہفتہ بعد ۔ اگر آپ تمام رقم ابھی دے دیں تو
ے کو پانچ فی صد کمیشن مل سکتا ہے ۔

ق : آپ ساری رقم ابھی لے لیجیے ۔ میں چیک دیے
ہوں اور ہاں آج کے بعد آپ کی میری ملاقات کی کوئی
بت نہیں ۔

سٹر پیٹر : آپ ہر طرح سے مطمئن رہیں ۔ (پردہ)

○ چوتھا سین

(ہوٹل کے منیجر کا آفس)

، : منیجر صاحب آج آپ اپنی سیٹ پر بہت کم دکھائی
ہیں ۔

: آپ کو یہ سن کر افسوس ہوگا کہ ہوٹل کے
کی بیوی کا آج صبح انتقال ہوگیا ہے ۔

: ہیں ؟

: میں دو چار منٹ کے لیے ایک ضروری کام سے
ا ۔ بس اب جاتا ہوں ۔

: مگر وہ تو ابھی بھلی تھیں ۔ ہوا کیا ؟

منیجر : جی ہاں بالکل اچھی بھلی ۔ آج صبح گھر سے نکلی
ہیں ۔ پرانے چوک سے گھومتے ہوئے موٹر اینٹوں کے ایک ٹرک
سے ٹکرا گئی سخت زخمی ہوئیں اور ہسپتال میں جاکر مرگئیں ۔

مسافر : توفیق صاحب کو بہت صدمہ پہنچا ہے ۔

منیجر : ان کا حال تو دیکھا نہیں جاتا ۔ عورتوں کی طرح رو
رہے ہیں ۔

مسافر : میں یہاں سے کل صبح صبح فلائی کر رہا ہوں ۔
واپسی پر تعزیت کرسکوں گا ۔ میری طرف سے آپ اظہار افسوس
کردیں ۔

منیجر : توفیق صاحب تو کئی روز تک ہوٹل میں نہیں
آسکیں گے ۔ اس ناگہانی موت کا صدمہ برداشت کرنا بڑے حوصلے
کا کام ہے ۔

مسافر : بے شک ۔ (پردہ)

○ پانچواں سین

(ہوٹل کے منیجر کا آفس)

منیجر : آپ دفتر میں ایک دم سے ایسے نازل ہوتی ہیں کہ
میں بھونچکا سا رہ جاتا ہوں ۔

نازلی : ہمارا نام بھی تو نازلی ہے مگر ہمارے آنے سے تم
نروس کیوں ہو جاتے ہو ؟

منیجر : کون کافر نروس ہوتا ہے بیگم صاحب ۔ آپ کے
آنے سے تو اس ہوٹل میں اجالا ہوجاتا ہے ۔

نازلی : سچ ؟

منیجر : کیا مجھے جھوٹ بولنے کی عادت ہے ؟

نازلی : اگر تمھیں جھوٹ بولنے کی عادت نہیں تو سچ سچ
بتاؤ آج ہوٹل کی آمدنی کتنی ہوئی اور تم مجھے اس میں سے کتنا
روپیہ ابھی دے سکتے ہو ۔

منیجر : آپ بیروں سے قرض لیکے آپ کو یہاں گھنٹے
سے جا ملیں ؟

نازلی : شاباش ۔ مجھے ایک [illegible]

کپڑے والے کا ادھا کیا ہے ۔

منیجر : کل کتنی رقم ہوگی ؟

نازلی : سوا دو ہزار سے کام چل جائے گا ۔

منیجر : اگر کل کو توفیق صاحب نے مجھے ملازمت سے برطرف کردیا تو آپ میرے لیے سفارش کا ایک لفظ بھی نہیں کہیں گی ۔

نازلی : ایسا نہ کہو ۔

منیجر : آپ بڑی شاہ خرچ ہیں ۔

نازلی : یہ دولت کسی نے سینے پر رکھ کر تھوڑی لے جانی ہے ۔ پہلی بیوی توفیق کی سب کچھ دھرا دھرایا چھوڑ کر آنا فانا چل بسی اس چل چلاؤ میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا منیجر ۔ میرے بھی تو اولاد نہیں ہوئی ۔

منیجر : آپ کیوں دل میلا کرتی ہیں ۔ تین سال ہی تو ہوئے ہیں ابھی آپ کی شادی کو ۔ اولاد اتنی جلدی تو نہیں ہوا کرتی ۔

نازلی : توفیق آدمی بڑا اچھا ہے ۔

منیجر : پہلی بیوی کو اس کمرے میں آنے کی کہاں اجازت تھی ۔ یہ تو آپ ہی ہیں کہ اس طرح بے باکانہ چلی آتی ہیں اور پھر مجھ سے آکر کہتی ہیں تم نروس ہوجاتے ہو ۔

نازلی : آخر یہ کمرہ کیا ہے ۔ ایک کمرہ ہے جس کا نام دفتر ہے جس میں تم منیجر بن کر بیٹھتے ہو اور دن بھر جماہیاں لیتے ہو ۔

منیجر : جی ہاں جماہیاں لیتا ہوں ۔ صبح سے لے کر شام تک سر کھپاتا ہوں ۔ سیاہ و سفید میرے سپرد کیے تو نہیں کردیا گیا بیگم صاحب ۔ اعتبار بڑی مشکل سے پیدا ہوا کرتا ہے اور یہ اعتبار ہی کے بل بوتے پر آپ کے بیسیوں اخراجات کے لیے روپیہ نکل رہا ہے ۔

نازلی : تم بڑے وہ ہو ؟

منیجر : وہ کیا ؟

نازلی : چرب زبان ۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑا بڑا مطلب نکالنے والے ۔ یہ باہر موٹر کس کی آئی ۔ توفیق آگیا ۔ میں چلی ۔ (دوسرے دروازے سے چلی جاتی ہے)

توفیق : (ہاتھ میں کچھ کاغذات لیے داخل ہوتا ہے ۔ بیٹھ کر دو ایک کاغذات دیکھ کر) دیکھو منیجر ہم نے تم پر اعتبار کیا ۔ یہ ہماری غلطی تھی ۔ اس طرح تمھیں روپیہ خرد برد کرنے کا موقع مل گیا ۔

منیجر : آپ کا خیال ہے میں نے روپیہ غبن کیا ہے ۔

توفیق : ہم اسے غبن نہیں کہیں گے مگر تم خود ہی بتاؤ یہ روپیہ آخر گیا کہاں ۔ تمھاری حسابات کی کتابوں میں کوئی پتہ نہیں چلتا ۔ ہم نے تمھارے ساتھ ہمیشہ نرمی برتی ہے کیوں کہ تم ہماری سختی ایک دن بھی برداشت نہ کرسکو گے ۔ اگر تمھارے خلاف ہم غبن کا مقدمہ دائر کردیں تو چند ہی دن میں تم بڑے گھر کی ہوا کھاتے نظر آؤ گے ۔

منیجر : اگر ثابت ہو جائے کہ میں نے غبن کیا ہے ۔

توفیق : اور غبن کے سر سینگ ہوتے ہیں ؟ زیادہ باتیں مت بناؤ ۔ اپنے گریبان میں منھ ڈالو ۔ شرم سے تمھارا سر جھک جانا چاہیے ۔ (پردہ)

۶ چھٹا سین

(توفیق کا کمرہ ۔ ساتھ والے کمرے سے
کھڑکی کے کواڑ بجنے کی آواز آتی ہے)

توفیق : یہ آواز کہاں سے آرہی ہے کواڑ بجنے کی ۔ ارے کوئی ہے ؟

ملازم : (دور سے) آیا حضور !

توفیق : یہ کون سی کھڑکی کھلی رہ گئی ہے ؟

ملازم : بیگم صاحب کے کمرے کی کھڑکی ہے حضور ۔ وہ شاید اندر سے چٹخنی لگانی بھول گئی ہیں ۔

توفیق : جاؤ کھڑکی بند کردو ۔ چٹخنی لگا کر پردہ کھینچ دو ۔

ملازم : بہتر ۔

توفیق : نو بج گئے ۔ ابھی تک نہیں آئی نازلی (نوکر سے چھوٹی میز الٹ جاتی ہے) ارے ۔ یہ کیا گرایا ۔ کیا ٹوٹا (اٹھ کر) یہ میز کیسے الٹ گئی ۔

ملازم : میں تیزی سے مڑتے وقت اس سے ٹکرا گیا۔

توفیق : نالائق۔ تمھیں جلدی کیوں پڑی رہتی ہے ہر وقت کی۔ ہٹ جاؤ مت یوں اکٹھی کرو چیزیں۔ سارا دراز الٹ گیا ہے ساری چیزیں ان کی بکھر گئی ہیں۔ ایسی خبر لیں گی آکر بیگم صاحبہ کہ یاد کرو گے۔ بھاگ جا۔ ہٹ جا۔ چیزیں ہم اکٹھی کرلیں گے۔ مت ہاتھ لگاؤ تم۔ جاؤ تم کھانا لگاؤ۔

ملازم : جی بہتر۔

توفیق : (چیزوں کو اٹھا اٹھا کر دراز میں رکھتا ہے) حد ہوگئی بیگم نے بھی کیا زمانہ بھر کی اوٹ پٹانگ چیزیں درازوں میں اکٹھی کر رکھی ہیں کوئی پوچھے بھلا انسان کو ان فالتو اشیاء کی کیا ضرورت پڑتی ہے۔ یہ کیا گرا۔ ایں!!! یہ فالتو چیزیں ٹھکانے لگانے والوں کا کارڈ۔ ایسا ہی تجارتی چمکیلا کارڈ مجھ تک پہنچایا گیا تھا۔ یہ کارڈ ہرگز فالتوں نہیں ہوسکتا۔ میری بیوی کو کیسے پہنچایا گیا یہ کارڈ۔ میری بیوی۔ میری۔ بیوی۔ کیا اس وقت تک کمپنی کے ایڈمنسٹریٹر سے مل چکی ہے۔ شاید مل چکی ہو۔ ممکن ہے مجھے اپنے گھر کا کھانا ہلاک کردے۔ ممکن ہے میں کل صبح غبن کے مقدمے کے سلسلے میں عدالت جاتا ہوا کسی حادثہ کا شکار ہوجاؤں۔ (پسینہ پونچھتا ہے)۔

ملازم : میں اندر آسکتا ہوں؟

توفیق : ہاں۔ ان درازوں کو میز میں ڈال دو۔ ٹھیک ہے۔

ملازم : حضور کھانا میز پر لگا دیا گیا ہے۔

توفیق : ہاں۔ ان درازوں کو میز میں ڈال دو۔ ٹھیک ہے۔

ملازم : حضور کھانا میز پر لگا دیا گیا ہے۔

فیق : کھانا میز پر سے اٹھالو۔ ہم نہیں کھائیں گے۔ بازار سے کون سودا لاتا ہے؟

ملازم : خانساماں۔

فیق : اوں! خانساماں بیگم کا چہیتا نوکر۔ کیا دیکھ رہے ہو۔ بھاگ جاؤ یہاں سے ہمیں بھوک نہیں ہے۔ سنتے نہیں تم۔ کھانا نہیں کھائیں گے۔

ملازم : کافی پئیں گے۔

توفیق : نہیں ہم کافی بھی نہیں پئیں گے۔ تم لوگ لتے خیر خواہ بننے کی کوشش کیوں کر رہے ہو۔ نکل جاؤ یہاں سے (نوکر جاتا ہے کچھ سوچتا ہے پھر ٹیلیفون کرتا ہے) ہیلو۔ کیا آپ "پانی دے ائر لائنز" سے بول رہے ہیں۔ کیا آپ کا کوئی جہاز رات کو جارہا ہے۔ کہاں؟ مصر، عراق، شام، خوب کیا ایک سیٹ مل سکتی ہے۔ تھینک یو۔ مصر کے لیے ایک سیٹ دے دیجیے۔ میرا نام توفیق رؤف ہے۔ میں ابھی آرہا ہوں۔ (آواز دیتا ہے) بواتے!

ملازم : حاضر۔

توفیق : ہماری گاڑی۔ نہیں۔ ایک ٹیکسی لاؤ۔ ہم یہ خط لکھ کر باہر جا رہے ہیں۔

ملازم : بہتر۔

توفیق : (خط لکھتا ہے اور بولتا جاتا ہے) ڈارلنگ! مجھے ایک ضروری کاروبار کے سلسلے میں آنا فانا مصر جانا پڑ رہا ہے۔ تم سے ملے بغیر جارہا ہوں۔ میں تھوڑے عرصے کے بعد وہاں سے فرانس چلا جاؤں گا۔ وہاں پہنچ کر تمھیں خط لکھوں گا۔

ملازم : ٹیکسی آگئی حضور۔

توفیق : یہ بکس اس میں رکھو۔ بیگم صاحب آئیں تو ان کو یہ خط دے دینا۔

ملازم : بہتر حضور (جاتا ہے)۔ (پردہ)

(۷) ساتواں سین

کمپنی کا آفس۔ (ایڈمنسٹریٹر اور ہوٹل کا منیجر بیٹھے ہیں)

ایڈمنسٹریٹر : اب آپ مطمئن رہیں منیجر صاحب۔ ہوٹل اب آپ کا سب کاروبار اب آپ کا ہے۔ آپکے مالک توفیق رؤف کو ٹھکانے لگا دیا گیا۔ آپ جو چاہتے تھے ہم نے اس کا انتظام کردیا۔ فالتو چیز راستے سے ہٹادی گئی۔ آپ کے ذمہ ہماری کمپنی کا پانچ ہزار روپیہ باقی ہے۔

منیجر : جی ہاں۔ یہ لیجیے پانچ ہزار کا چیک۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں ورنہ تو جانے غبن کے مقدمے میں میری کیا

(باقی ص ۸۲ پر)

غلام جیلانی

فریب زار

(قسط ۶)

(۲۳)

آرتی ان لوگوں میں نہیں تھی جو اپنی ہار مان کر چپ چاپ حالات سے سمجھوتا کر کے بیٹھ جائیں ۔ اس کی ہر ہار انتقام اور حسد کی آگ پر تیل کا کام کرتی ۔ اس رات جن حالات میں منوج اسے جذبات کے دہکتے انگاروں پر چھوڑ کر اس کے گھر سے چلا آیا تھا ، آرتی نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب رما اور منوج دونوں کی نیک نامی اور انگو کو خاک میں ملائے بغیر اسے چین نصیب نہ ہوگا ۔

سیمینار کے پہلے دن کے بعد سے رما کا کوئی پتہ نہیں تھا ۔ ان کے گھر پر نظر رکھنے والی ملازمہ نے آرتی کو بتایا کہ پروفیسر راجن آیا تھا ۔ باہر سے ہی لوٹ گیا ۔ دوسرے دن سیمینار ختم ہوگیا تو منوج بھی غائب ہوگیا ۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اسوانی ، منوج اور رما تینوں کہاں گئے ہوئے ہیں ۔ آرتی کے ذہن کو کسی کروٹ چین نہیں تھا ۔ طرح طرح کے امکانات کے تانے بانے جوڑ جوڑ کر واہموں کے جنتر منتر میں بھٹکتا پھر رہا تھا ۔ جیسے کوئی پر اسرار واقعہ ظہور پذیر ہوگیا ہے جس کی گتھیاں سلجھانے پر اس کے ہاتھ وہ بارودی مصالحہ لگ جائے گا جس سے وہ رما اور منوج کی جھوٹی شان کے پرخچے اڑا دے گی ۔

تیسرے دن اسوانی کلکتے سے واپس آگیا تو آرتی کی تشویش اور بڑھ گئی ۔

" کیا معلوم ، منوج بھی واپس آگیا ہوگا ، اپنے کسی کام سے گیا ہوگا کہیں ۔ ۔ ۔ تم نے تو خواہ مخواہ شکوں کے جال میں پھنسا رکھا ہے خود کو ! " اندرانی نے آرتی سے کہا ۔

" نہیں منوج واپس نہیں آیا ہے ۔ میں خود گئی تھی اس کے آفس ۔ بند پڑا ہے ۔ گھر پر بھی نہیں ہے ۔ ۔ ۔ اندرانی دیدی ، جال میں تو رما پھنسا کر رکھتی ہے مردوں کو ، مکڑی کی طرح ! ۔ ۔ ۔ آنند تو بے چارہ نہیں رہا ۔ ۔ ۔ منوج ، پروفیسر راجن ، اسوانی ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ " وہ یکایک چپ ہو گئی ۔

" اور کون ؟ ۔ ۔ ۔ " اندرانی کے لہجے میں چبھن تھی ۔

آرتی پھر بھی چپ رہی ۔

" میں جانتی ہوں " اندرانی خود ہی بولی " لوگ دھیرج گھوش کا نام بھی لیتے ہیں مگر میں اپنے شوہر کو بھی جانتی ہوں ۔ وہ جال میں پھنسنے والا شکار نہیں ، پھانسنے والا شکاری ہے ۔ ۔ ۔ اور یہ بات تم رما سے بھی کہہ دینا ۔ "

مگر آرتی کے زہر بھرے تیر نے اپنا کام کرلیا تھا۔ رما کا نام لیتے وقت اندرانی کے سانولے چہرے کا رنگ گدلا گیا تھا۔

(۲۴)

ناشتے کے بعد رما نے تھوڑا سا وقت کوٹھی کے ویران کمروں اور دالانوں میں گھوم کر گزارا۔ پھر پورٹیکو کی سیڑھیوں سے اتر کر اس حصے میں چلی گئی جہاں کبھی چمن ہوا کرتا تھا۔ پھولوں سے لدی کیاریاں اور لان تھا۔ اور بیڈمنٹن کا کورٹ تھا جہاں منورما اور رنجنا اور ان [illegible]ت کھیلا کرتی تھیں۔ کبھی وہ خود بھی شامل ہوجاتی تھی۔ اب اس میدان میں خودرو جھاڑیاں اور گھاس اگ آئی تھی۔ البتہ پیپل کا پرانا پیڑ ایک کونے میں اب بھی کھڑا تھا اور ایک لوہے کا پول، زنگ میں لپٹا، تنہا کھڑا اس جگہ کی نشان دہی کر رہا تھا جہاں کورٹ تھا۔ اور جس سے نٹ باندھا جاتا تھا۔

رما وہاں سے جلد ہی لوٹ آئی۔

اپنے پرانے کالج کو ایک بار جاکر دیکھنے کی تمنا نے رما کے دل میں کئی بار چٹکیاں لی تھیں۔ مگر جانے کو موقع کبھی نہیں مل سکا تھا۔

کوٹھی سے نکل کر وہ سیدھی اپنے قدیم کالج چلی گئی۔ مگر وہاں جاکر اسے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ الٹا دل کو دھکا سا لگا۔ نئی نئی بلڈنگوں نے سارا منظر بدل ڈالا تھا۔ رما کے ذہن میں تو وہی پرانی تصویر بسی ہوئی تھی۔ انگریزی کے L کی شکل میں جڑی دو لمبی لمبی عمارتیں، جن کے دالانوں کے آگے کھیل کا میدان، جن کی سیڑھیوں پر بیٹھی وہ اپنی دوستوں کے ساتھ گھنٹوں گپ شپ کیا کرتی تھی۔ درختوں کے سائے میں کینٹین تھا۔ اب وہاں کسی چیز کا کوئی نشان باقی نہیں تھا۔ نئی اور اونچی اونچی عمارتوں نے سب کچھ ہڑپ کرلیا تھا۔

۔۔۔ اجنبی ماحول، اجنبی چہرے، ناآشنا آوازیں، ۔۔۔ کوئی اشارا، کوئی سہارا تک نہیں، جن کے بہانے کوئی یاد ہی اٹھے! ۔۔۔ رما کو وحشت ہونے لگی۔

کناٹ پلیس پر آنند اور اسوانی کی فرم کا برانچ آفس تھا۔ وہاں کا منیجر آنند کے پرستاروں میں تھا۔ رما کچھ دیر کے لیے وہاں چلی گئی۔ دلی سے اس کی واپسی کے رزرویشن کا انتظام اسوانی نے اس منیجر کے ذمے کردیا تھا۔ رما آفس سے بھی جلد ہی اٹھ آئی۔

باہر سڑک پر زندگی پورے جوش و خروش کے ساتھ رواں دواں تھی۔ گاڑیوں کا شور، لوگوں کی گہما گہمی، ہر شخص کو اپنی دھن میں پاگلوں کی طرح قدم اٹھائے ہجوم میں کھو جانے کی جلدی، جیسے پھر موقع ملے نہ ملے۔ رما کی وحشت میں اضافہ ہونے لگا۔ وہ بغیر کسی مقصد کے ایک طرف چلنے لگی۔

اس نے سوچا تھا دلی پہنچ کر وہ شدید جذباتیت کا شکار ہوجائے گی۔ چھتری والی کوٹھی اب اس کی نہیں رہے گی۔ وہاں کے ذرے ذرے میں بسی یادوں سے کیا وہ ہمیشہ کے لیے اپنا دامن چھڑا سکے گی؟ وہاں کے محراب و در کیا غیر ہوسکیں گے؟ اسے ڈر سا لگ رہا تھا، ۔۔۔ کیوں جا رہی وہاں؟ ۔۔۔ کیا جانا اتنا ضروری ہے؟

مگر کچھ بھی نہیں ہوا۔ نہ وہ ذہنی تناؤ میں مبتلا ہوئی، نہ کسی محراب و در نے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور نہ ہی ان سے وابستہ کسی یاد نے اس کے قدم روکے۔ ایک عجیب الجھن اور بدمزگی اس کے ذہن و دل میں جاگزیں ہوتی جارہی

تھی ۔ ۔ ایک لمحہ بھی اس کو چھو کر نہیں گذرا کہ جس کے لمس سے اس کے احساس کے آب گینوں پر ضرب پڑتی !
۔ ۔ ۔ بکواس ۔ ۔ ۔ سب بکواس ۔ ۔ ۔ ۔

○

یکایک اسے رضیہ نظر آ گئی ۔ ۔ ۔ اس کی کالج کی دوست ۔ کسی دکان سے لدی پھندی شکل رہی تھی ۔ پیچھے مختلف عمروں کے چار بچوں کی قطار تھی ، رما کو دیکھتے ہی پکار اٹھی ۔ ۔ ۔ ۔ " ارے رما ؟ " اور دیوانہ وار بڑھ کر لپٹ گئی ۔ فٹ پاتھ پر لوگ دونوں جانب رک کر انھیں دیکھنے لگے ۔ رضیہ کے دونوں ہاتھوں میں شاپنگ سے بھرے ہوئے پلاسٹک بیگ اسی طرح لٹک رہے تھے ۔ ذرا ہوش آیا تو جھینپ کر الگ ہو گئی ۔

" یہاں کیا کر رہی ہو ؟ ۔ ۔ ۔ دلی کب آئیں ؟ ۔ ۔ ۔ اکیلی ہو ؟ مجھے اطلاع کیوں نہیں کی ؟ " ہمیشہ کی طرح ایک ہی سانس میں پوچھتی چلی گئی ۔ اور جواب کا انتظار کیے بغیر رما کو کار کے پاس لے آئی ۔

" کیسی ہو رضیہ ؟ " رما نے پوچھا ۔

" اچھی ہوں ۔ تم کیسی ہو ؟ "

" میں بھی اچھی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ "

اتنی دیر میں چاروں بچے رضیہ کے پاس آ کھڑے ہوئے تھے ۔

" ان سے ملو ، یہ تمھاری آنٹی ہیں ۔ ۔ ۔ ٹلو ۔ ۔ ۔ منو ۔ ۔ ۔ سمی اور سرو ۔ ۔ ۔ ان کے پورے نام ہیں ۔ شوکت ، رفعت ۔ ۔ ۔ ۔ "

رما نے جلدی سے روک دیا ۔ " نہیں ۔ وہی نام اچھے ہیں ۔ " اور پیار سے بچوں کے سروں پر ہاتھ پھیرنے لگی ۔

" اچھا " سنو رما ۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں ۔ تم چاہے کہیں بھی ٹھہری ہو ، اور کسی بھی کام سے آئی ہو ، میرے ساتھ چلو ، ابھی ، اسی وقت ۔ ۔ ۔ لنچ کا وقت بھی ہو رہا ہے ۔ گھر چل کر ہی باتیں کریں گے ۔

" نہیں رضیہ ۔ میں آج ہی آئی ہوں ۔ ۔ ۔ اس وقت ، آج ۔ ۔ ۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو ۔ ۔ ۔ ۔ "

رضیہ کچھ کہتے کہتے رک کر رما کو دیکھنے لگی ۔

" سب ٹھیک ہے رضیہ ۔ ۔ ۔ بہت دن بعد آئی ہوں نا ؟ " رما نے مسکرا کر کہا ۔

" میں سمجھ سکتی ہوں " مجھے معلوم ہے رما ۔ ۔ ۔ " رضیہ کی آواز سنجیدہ ہو گئی تھی ۔ رما نے گردن اٹھا کر دیکھا تو بولی ۔ ۔ ۔ " اخبار میں خبر کے ساتھ فوٹو بھی آیا تھا ۔ ۔ ۔ "

چند سکنڈ کے لیے دونوں خاموش ہو گئے ۔

" کہاں ٹھہری ہو ؟ " رضیہ بولی ۔

" کوٹھی میں ۔ ۔ ۔ "

" میں نے سنا تھا وہ بک گئی ؟ "

" ابھی نہیں بکی ۔ "

"اچھا سنو رما ۔ شام کو میں تمھیں لینے کوٹھی آؤں گی ۔ رات کو دیر تک میرے ساتھ رہنا ۔ ۔ ۔ ۔ کھانے سے پہلے اور بعد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ڈھیر ساری باتیں کریں گے ۔"

"آج ہی ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

"ہاں ۔ آج ہی ۔ کل کون جانے ۔ ۔ ۔ ۔ پھر کھو نہ جائیں ہم کہیں دنیا کی بھیڑ میں !"

(۲۵)

آرتی پروفیسر راجن کے لیے اجنبی نہیں تھی ۔ اس لیے جب وہ اس سے کالج میں ملنے آئی تو کسی تعارف کی ضرورت نہیں پڑی ۔ پروفیسر کتابیں ہاتھ میں اٹھائے کلاس کو جانے کی تیاری میں کھڑا تھا ۔

"پروفیسر صاحب ۔ میں بس ایک منٹ سے زیادہ نہیں لوں گی ۔" آرتی بولی ۔

"او ، نو ۔ یو آر ویلکم مس آرتی ۔ ۔ ۔ ۔" پروفیسر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "ابھی چار پانچ منٹ باقی ہیں کلاس کے لیے ۔"

آرتی کو جب بھی کوئی مس آرتی کہتا ، اسے بڑی خوشی محسوس ہوتی تھی ۔

"میں بس ایک بات پوچھنے آئی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کو معلوم ہے رما دیوی کہاں گئی ہیں ؟"

پروفیسر راجن نے چونک کر آرتی کی آنکھوں میں دیکھا ۔ مگر وہاں اسے کوئی سراغ نہیں ملا ، یہ سوال اس نے کیوں کیا تھا ۔

"نہیں ۔ ۔ ۔ ۔" پروفیسر نے جواب دیا "آپ کو معلوم ہے ؟"

"نہیں ۔ میں نے سوچا ، جب آپ ان کے گھر ملنے گئے تھے ، تو شاید کسی نے کچھ بتایا ہوگا ، وہ کہاں گئی ہیں ۔"

پروفیسر پھر ایک بار چونک پڑا ۔ ۔ ۔ ۔ اسے کیسے معلوم کہ میں رما سے ملنے گیا تھا ؟ مگر وہ بولا کچھ نہیں ۔ ساری باتیں آرتی ہی کر رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔

"معاف کیجیے پروفیسر صاحب ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے ڈسٹرب کیا آپ کو ۔ دراصل مجھے ایک کام آپڑا تھا ، رما سے ۔ مگر وہ گھر پر نہیں ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مسٹر منوج سے پوچھتی ، مگر وہ بھی نہیں ہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

"نہیں ہیں ، کیا مطلب ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ منوج بھی گئے ہوئے ہیں کہیں ؟" ۔ ۔ ۔ ۔

پروفیسر کے چہرے پر ہر لحہ بڑھتے ہوئے تجسس کو دیکھ کر آرتی کو بڑی خوشی ہورہی تھی ۔ بڑے بھولپن سے بولی ۔ ۔ ۔ "جی ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تقریباً اسی روز سے ۔"

پروفیسر کو اپنے خیالوں میں غلطاں و پیچاں چھوڑ کر آرتی وہاں سے جلد ہی چل دی ۔ ۔ ۔ ۔

(۲۶)

رما کہہ گئی تھی دوپہر کا کھانا کوٹھی میں ہی کھائے گی ۔ بندو کی ہونے بندو سے پوچھ کر اس کی پسند کی چیزیں تیار کر رکھی تھیں ۔ کھانا کھانے کے بعد رما کو شدید تھکن کا احساس ہونے لگا ۔ بستر پر لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی ۔

جب اٹھی تو دن ڈھل چکا تھا ۔ چائے پی کر پھر ایک بار ٹہلتی ہوئی کوٹھی کے بائیں باغ والے حصے میں چلی گئی جو

شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں اور بھی اداس اور ویران لگ رہا تھا۔ مگر بیڈ منٹن کے کورٹ والا وہ تنہا پول اس مرتبہ خاموش تماشائی بنا نہیں کھڑا رہا۔ اس نے رما کے ذہن میں بیسیوں یادوں کی ہل چل سی مچادی۔ ۔ ۔ ۔ ان دنوں کی جب کورٹ پر روز شام کو کھیل ہوتا تھا۔ منورما اور رنجنا کی دو ایک دوست بھی آجاتی تھیں اور کبھی آنٹی بھی رما کی پارٹنر بن جاتی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ایسے میں آنند آجاتا تو سب کو خوب چھیڑ چھیڑ کر مذاق اڑاتا۔ ۔ ۔ سب سے زیادہ مذاق خود رما کا اڑاتا، اور سب سے کم منورما کا۔ اس کی ان ہی باتوں سے آنٹی دل ہی دل میں خوش تھیں کہ جب وقت آئے گا تو آنند اور منورما کی شادی میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔

جس دن آنند اور رما بارش میں شرابور ہوکر اپنی موٹر سائیکل سمیت بیل گاڑی میں کوٹھی واپس آئے تھے، اس کے چند دن بعد کی ایک شام رما کی نظروں میں پھر گئی۔ اس دن منورما اور رنجنا کی کئی دوست کھیلنے آگئی تھیں۔ اچھی خاصی رونق سی ہورہی تھی۔ اکثر دنوں کی طرح رما اس روز بھی دیر سے آئی تھی۔ اور لان پر بیٹھی سب کا کھیل دیکھ رہی تھی۔

کھیل ختم ہوا تو سب لڑکیاں آکر رما کے پاس لان پر پڑ گئیں۔ ایک لڑکی نے رما سے پوچھا۔ ۔ ۔ ۔ "رما۔ تم کیوں نہیں کھیلیں؟"

رما کے کچھ کہنے سے پہلے ہی منورما بول پڑی۔ ۔ ۔ ۔ "وہ آج کل کھیلتی نہیں کھلاتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ لوگوں کو، اسٹیج پر۔ ۔ ۔ ۔ زندگی کے کھیل۔"

"کیا مطلب؟" لڑکی نے پوچھا۔

"ڈراما رائٹر اور ڈائرکٹر بنی ہوئی ہے نا؟ ۔ ۔ ۔ لوگ اس کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ سوانگ بھرتے ہیں۔" منورما کے لہجے میں مذاق سے زیادہ طنز بھرا تھا۔

اسی لمحے آنند کہیں سے آ ٹپکا۔ گلے میں کوئی قیمتی سا کیمرا لٹک رہا تھا۔ آتے ہی کیمرے کو سب پر فوکس کرتے ہوئے بولا۔ ۔ ۔ ۔ "پلیز، ڈونٹ موو۔ ۔ ۔ ۔" اور پھر کلک کی آواز کے ساتھ۔ ۔ ۔ "تھینک یو۔"

"مگر فوٹو گرافر کب سے بن گئے، آنند؟" منورما نے چہک کر پوچھا۔

"جب سے تم جیسی حسیناؤں کا ساتھ ہوا ہے۔" آنند نے فوراً جواب دیا۔

رما الگ بیٹھی تھی۔ وہ جانتی تھی وہ کیمرے کی فیلڈ میں نہیں ہے۔ آنند اپنی دھن میں کہے جارہا تھا۔ ۔ ۔ "تم لوگ چاہو تو اپنی الگ الگ تصویر بھی کھچواسکتے ہو۔ ۔ ۔ ۔ کلر میں۔ ۔ ۔ ۔ جس پوز میں چاہو۔" لڑکیاں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ ۔ ۔ ۔ "گھبراؤ نہیں۔ ۔ ۔ ۔ میں کچھ چارج نہیں کروں گا۔ ۔ ۔ ۔ بتاؤ کون کون تیار ہے؟"

منورما فوراً تیار ہوگئی۔ آنند نے اس کی کئی تصویریں لیں۔ مختلف پوزوں میں، جن میں کئی عجیب اور مضحکہ خیز بھی تھے۔ پھر اس کی ایک دوست آگے آگئی۔ وہ بیڈمنٹن کے ریکٹ کے ساتھ تصویر کھچوانا چاہتی تھی۔ آنند نے تصویر میں ریکٹ کو اس کے چہرے کے سامنے رکھا۔ عجیب بدنما پوز تھا۔ پھر دوسری لڑکی۔ اور پھر ایک اور لڑکی۔ ۔ ۔ ۔ کلک، کلک۔ ۔ ۔ ۔ مگر آنند نے ایک دفعہ بھی رما سے نہیں کہا، جو وہاں الگ کر رہی تھی۔ اسے تصویروں کا اتنا شوق بھی نہیں تھا مگر آنند کی اس حرکت پر اسے غصہ آگیا تھا۔ اس نے سب کے سامنے اس کی توہین کی تھی، خاص طور پر منورما کے

سامنے !

اور پھر "تھینک یو، سوی ٹیز۔ ۔ ۔ ۔" کہہ کر اور کیمرا گلے میں لٹکا کر وہ وہاں سے چل دیا۔ رما جہاں کی تہاں بیٹھی رہی۔ ۔ ۔ ۔

رات کو کھانے کی میز پر رما نہیں آئی تو آنٹی نے بندو سے کہا۔ ۔ ۔ ۔ "جاکر رما کو بلا لاؤ۔ کھنا کھانا شروع ہوگیا ہے۔"

مگر بندو وہیں کھڑا رہا۔ ۔ ۔ ۔ "رما بی بی نے کہا ہے، وہ نہیں کھائیں گی۔ سر میں درد ہے۔"

منورما نے جھک کر آنند کے کان میں کہا۔ ۔ ۔ ۔ "خفا ہے، تم پر۔ اس کی تصویر کیوں نہیں لی۔"

جب رات کو آنند نے دبے پاؤں رما کے کمرے میں قدم رکھا، تو کوٹھی میں سب جگہ خاموشی ہوچکی تھی۔ رما کے کمرے میں ہلکی نیلگوں روشنی ہورہی تھی اور رما کھڑکی کے پاس بیٹھی باہر دیکھ رہی تھی جہاں ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اندر آکر آنند نے دروازہ بند کیا تو آہٹ پر رما چونک پڑی۔ ۔ ۔ ۔ "کون ہے؟" ۔ ۔ ۔ ۔ اور جلدی سے ٹیبل لیمپ روشن کردیا۔

"ششش۔ ۔ ۔ ۔ میں ہوں۔ ۔ ۔ ۔ شورمت مچاؤ۔" انگلی سے چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے آنند بولا۔

"کیوں آئے ہو؟، اس وقت۔ ۔ ۔ ۔ اتنی رات کو؟" رما بے حد سنجیدہ ہورہی تھی۔

"ارے۔ ۔ ۔ ۔ آہستہ بولو۔ ۔ ۔ ۔" کہتے ہوئے آنند پاس آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور جیب سے ایک چھوٹا سا پیکٹ نکال کر کھولنے لگا۔ ۔ ۔ ۔ "سینڈوچس ہیں۔ ۔ ۔ ۔ تم نے آج کچھ کھایا نہیں ہے نا؟"

"لے جاؤ انھیں۔ ۔ ۔ ۔" رما غصے سے بولی۔ ۔ ۔ ۔ "اور نہیں کھایا ہے تو تمھیں کیا؟"

"بڑی مشکل سے چھپا کے لایا ہوں۔" آنند سینڈوچس نکالتے ہوئے بولا، جیسے رما کے غصے کا نوٹس ہی نہیں لیا ہو۔

"کس نے کہا تھا تم سے لانے کو؟"

"باورچی کو رشوت دینی پڑی۔ ۔ ۔ ۔"

تنگ آکر رما بولی "۔ ۔ ۔ ۔ آنند۔ چلے جاؤ یہاں سے۔"

"کیوں چلا جاؤں؟ ۔ ۔ ۔ ۔ جانتی ہو کتنی مشکل سے آیا ہوں؟"

"۔ ۔ ۔ ۔ آنند۔ کیوں ستارہے ہو اتنا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا چاہتے ہو؟"

"بس اب مان جاؤ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ کھا لو۔ ۔ ۔ ۔ اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔"

"میں نہیں کھا سکتی۔"

"تو میں نہیں جاؤں گا۔"

"دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ۔ ۔ ۔ آنند اک دم ہنس پڑا۔" ۔ ۔ ۔ ۔ اری باولی۔ وہ کیمرا خالی تھا۔" رما اب دیکھ کر آنند کو اور ہنسی آنے لگی۔ "ہاں۔ خالی۔ ان لوڈڈ! ۔ ۔ ۔ ۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

"مذاق؟" ۔ ۔ ۔ ۔ رما اب بھی حیران تھی۔

"ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ تصویر کھنچواتے وقت، تم نے دیکھا نہیں، ہر آدمی بچہ بن جاتا ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تو دیکھ رہا تھا، کون کتنا بے وقوف بنتا ہے!"

"مگر تمہارا ہر مذاق لوگوں سے بھرا کیوں ہوتا ہے، آنند ۔ ۔ ۔ ؟ جانتے ہو منورما کیا کہہ رہی تھی؟ ۔ ۔ ۔ ۔ آنند نے شائد رما کو تصویر کے لائق نہیں سمجھا۔"

"بے وقوف ۔" آنند کے منہ سے نکلا۔

"کون ہے، بے وقوف؟"

"دونوں ۔ منورما بھی اور ۔ ۔ ۔ میں بھی ۔ وہ کیا جانے وہ جس کی بات کر رہی ہے اس کا حسن کیمرے سے قید میں تو سما بھی نہیں سکتا! ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی تصویر تو کب کی میں نے دل میں اتار رکھی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی ۔ اور میں بے وقوف یہ بھول گیا کہ عورت چاہے کتنی ہی انٹلکچوئل ہو، عورت ہی رہتی ہے ۔"

رما چند لمحے چپ چاپ آنند کو دیکھتی رہی ۔ ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آنے لگی تھی، جسے روکتے ہوئے بولی ۔ ۔ ۔ "تم اچھی طرح جانتے ہو، تم بے وقوف نہیں ہو ۔ البتہ دوسروں کو بے وقوف بنانا خوب جانتے ہو ۔"

"میں نے تمھیں کبھی بے وقوف نہیں بنایا، رما ۔ ۔ ۔ بس یہ سینڈوچ لایا تھا تمھارے لیے ۔ ۔ ۔ وہ بھی چوری چھپے ۔"

"یہ بھی سوچا ہے کہ اگر یہ بات کھل گئی تو کتنی کھل بلی مچ جائے گی کوٹھی میں؟ ۔ ۔ ۔ ۔ آنٹی نے تمھیں منورما کے لیے چن رکھا ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

اور اسی لمحے کمرے کے باہر سے کسی کے قدموں کی آوازیں آنے لگیں، جو قریب ہوتی جا رہی تھیں ۔ آنند ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا ۔ اور آؤ دیکھا نہ تاؤ، سیدھا کھڑکی میں سے باہر لٹک کر نیچے کود گیا ۔ رما روکتی رہ گئی ۔ آنند تھا ہی ایسا ۔

○●○

(سلسلہ ص: ٧٥ سے)

رسوائی ہوتی ۔

ایڈمنسٹریٹر : آپ کو شاید علم نہیں کہ ہماری کمپنی اپنے ہر گاہک کی عزت آبرو کا پورا پورا خیال رکھتی ہے ۔ بہرحال میں آپ کو اپنی کمپنی کی طرف سے آپ کی ہونے والی شادی پر مبارک باد پیش کرتا ہوں ۔

منیجر : میری شادی؟

ایڈمنسٹریٹر : میں آپ کی نظرِ انتخاب کی داد دیتا ہوں ۔ اصل میں مسز توفیق اپنے خاوند سے ہمیشہ رنجیدہ خاطر ہی رہی طبیعت ملنے کی بات ہوتی ہے ۔ ان سے نہ ملی آپ سے مل گئی ۔ خدا آپ کو خوش و خرم رکھے ۔

منیجر : تھینکس سو مچ ۔ مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟

ایڈمنسٹریٹر : ہم اپنا کام اندازوں سے نہیں کرتے ۔ ہر بات کی تہہ تک پہنچتے ہیں کیوں کہ ہمارا کام ہی یہی ہے اور یہ جانے بغیر کہ کوئی چیز کس حد تک فالتو ہے ہمارا کاروبار نہیں چل سکتا ۔

منیجر : مگر اب آپ کی اور میری ملاقات کی کوئی ضرورت نہیں ۔

ایڈمنسٹریٹر : بالکل نہیں ۔ (دونوں ہاتھ ملاتے ہیں) خدا حافظ! (پردہ)

○●○

انیس رفیع

شہرِ مادر میں پٹرول کی قیمت

پٹرول کی قیمت بڑھ چکی تھی ۔ ۔ ۔

اور BY-PASS پر گاڑیوں کی رفتار SPEED LIMIT پھلانگ کر اس بڑھتی ہوئی قیمت کو NEUTRALISE کرنے کے درپے تھی ۔ SPEED اور FUEL ECONOMY ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہورہی تھی لیکن اپنا (MOPED) پٹرول کی قیمتوں میں اضافے کا نتیجہ ۔ موٹر سائیکل گھٹ کر MOPED بن گئی تھی ۔ اس بار جو پٹرول کی قیمت بڑھی تو اس کی SPEED نہ بڑھی ۔ شاید اگلے ماڈل میں اس کا خیال رکھا جائے ۔ پٹرول کی قیمت آگے آگے اور اپنا یہ پرانا ماڈل اس کے پیچھے پیچھے کیا فائدہ اب اس موپڈ کا ۔ ابھی اس ادھیڑ بن میں ہی تھا کہ سفید رنگ کی بائی اسپیڈ موٹر کار ایک کتے کو کچلتی ہوئی ژن سے نکل گئی ۔ کتے کی ادھوری چیخ میری سماعت سے ٹکرائی اور میرا موپڈ بغیر بریک لگائے ہی تھم گیا ۔ کتا جان کنی کے آخری مرحلے میں تھا ۔ بائی پاس پر فراٹے بھرتی برق رفتار گاڑیاں اس جان کنی کے عالم کو دیکھنے کے لیے نہیں رکتیں ۔ رکنے والے یہی ہوتے ہیں ۔ سست رفتار موپڈ اور موپڈ سوار ۔

کتا بیچ سڑک پر ٹھنڈا اور بےجان پڑا تھا ۔ ایک ذرا پلک جھپکی ۔ دوسرے لمحے دیکھا کہ کتے کا جسم ROLL رتا ہوا آگے جاکر چت ہوگیا ۔ چاروں ٹانگیں آسمان کی طرف زبان باہر لٹکی ہوئی ۔ کھوپڑی ادھ کھلی خون بھبھکاتی ۔ یک آنکھ سے بھوں غائب ۔ دوسری کی گولی چھٹکی ہوئی ۔ دم میں ہلکی ہلکی جنبش اب بھی تھی ۔ پیٹ کے اوپر کی چمڑی دھڑ چکی تھی ۔ میں نے موپڈ ذرا آگے بڑھایا ۔ مگر تیز رفتار گاڑیاں ادھر سے ٹھوکر دیتیں تو جسم آگے لڑھک جاتا ۔ ادھر سے ٹھوکر دیتیں تو اس طرف ROLL کرجاتا ۔ ان ٹھوکروں کے درمیان کتے کا جسم جھولے کی طرح پینگ کھارہا تھا ۔ دل ! ہوں ! ہوں ۔ جسم کی یہ جنبش میرے موپڈ کی رفتار کو مات دینے پر تلی ہوئی تھی ۔ قیامت کی رفتار سڑک کے ردے کی رفتار میرے سست رو موپڈ سے آگے لپک رہی تھیں ۔ کیوں ہورہا ہے ایسا ؟ کاہے کو بنتی ہی یہ سست نسار گاڑیاں ؟ ابھی اسی سوال کا جواب بھی نہ مل پایا تھا کہ ایک فوجی HEAVY VEHICLE نے اپنے تیز رفتار پہیے سم پر چڑھا دیے ۔ پہیے جسم کو روند کر رفتار کے نئے آسمان کی طرف بھاگ گئے ۔ بچ گیا روندا ہوا کتا ۔ خون تار کول نے الیا ۔ ہڈی چمڑی سوئے کتے کی مانند سڑک پر بچھ گئیں ۔ کتا اب یوں لگ رہا تھا جیسے کالی سلیٹ پر چاک سے ایک سے ہوئے کتے کی تصویر بنائی گئی ہو ۔ دفتر کو دیر ہورہی تھی اس لیے میں نے کتے کی لاش کو پیچھے چھوڑا اور نکل گیا گے ۔ بہت آگے ۔

اب دفتر سے واپسی تھی ۔ چھوٹی موٹی گلیوں سے گزرتا پل پار کرکے شاہ راہ یعنی بائی پاس پر آگیا ۔ اپنی

سست رفتاری مجھے اس بائی پاس پر اجنبی بنائے دے رہی تھی۔ نہ جانے کیا ہوا تھا ان چند گھنٹوں کے درمیان۔ BY-PASS پر گاڑیاں مزید تیز رو ہو رہی تھیں۔ کسی کارن ہوائی اڈے پر آگمن (ARRIVSL) بڑھ گئی ہوگی۔ کیوں کہ جب جب شہر میں آسمان سے بھی بڑا کچھ ہوجاتا ہے تو آگمن بڑھ جاتی ہے اور بائی پاس پر کاریں اڑن طشتریاں بن جاتی ہیں۔ کیا ہوگیا تھا شہر میں۔ نئی نئی ساخت کی کاریں، گاڑیاں بھاگی چلی آرہی ہیں۔ دوڑی چلی جارہی ہیں۔ ضرور کچھ ہوگیا ہے شہر کو۔ WRITERS میں دفتر ہوتا تو واقعے سے پہلے واقعے کی خبر مل جاتی۔ مگر میرا دفتر بھی میرے موپڈ کی طرح سست رفتار علاقے میں واقع ہے۔ BURIAL GROUND BOARD کا دفتر، جہاں کوئی قبر نہیں ہوتی۔ ریکارڈ ہوتا ہے۔ مردوں کا۔ ہوتی ہے نئی پرانی قبروں کی گنتی۔ اور جو قبریں گھروں میں کھد جاتی ہیں ان کا کوئی ریکارڈ نہیں ہوتا۔ ایسے دفتروں میں خبریں آتے آتے مردہ ہوجاتی ہیں۔ ٹی وی پر خبریں زندہ ہوتی ہیں۔ GLAMOUR ہوتا ہے ان میں۔ بھرمار ہوتی ہے خبروں کی اور بے خبری کی بھی۔ دفتر کے لیے روانگی سے قبل بہت سی خبریں تھیں۔ آزادی کے پچاس سال، ریل ٹکر، ڈانبا اور۔۔۔ اور اس کے بعد تو میں دفتر آگیا تھا۔ جب واپسی کے لیے نکلا تو شہر کچھ رکا رکا سا لگا۔ مگر بائی پاس پر آتے ہی بہت تیز ہوگیا۔ کوئی PILOT CAR اپنا HOOTER بجا بجا کر میرے موپڈ کو BY-PASS کرنے کا سگنل دے رہی تھی۔ رفتار کی بلا خیزی وہ تھی جیسے رن وے پر TAKE-OFF کرنے والا جہاز دوڑ رہا ہو۔ موپڈ میں نے کنارے کرلیا۔ VVIP کی CONVOY چھلاوے کی طرح گزر گئی۔ گاڑیوں کے تیزی سے گھومتے پہیوں نے اپنے پیچھے جو سڑک چھوڑی وہ چمچماتی اور بے داغ تھی۔ حالاں کہ آج صبح آس پاس ہی ایک کتا کچل گیا تھا۔ اس کی لاش چکوں کی رگڑن سے تار کول میں تحلیل ہوگئی تھی شاید۔ میں نے موپڈ کا ایکسیلیٹر دبایا اور دھیرے دھیرے سڑک پکڑی۔ ابھی رفتار زیادہ تیز بھی نہیں ہوئی تھی کہ کان میں ایک آواز سی گونجی۔۔۔ بھونہہ! بھونہہ! بھونہہ! کتے کے بھونکنے کی آواز۔ آس پاس کہیں کوئی کتا نہ تھا۔ میری نظر نیچے سڑک پر پڑی چمچماتی سڑک پر ایک داغ سا نظر آیا۔ جس میں حرکت تھی۔ کتے کی زندہ زبان جو تحلیل ہونے سے رہ گئی تھی جیسے۔ بھونہہ! بھونہہ! بھونہہ! اس آواز نے میرا پیچھا کیا کہ میں سست رفتار تھا۔ بھاگنے کے لیے موپڈ کی اسپیڈ بڑھائی۔ یا حیرت۔ رفتار تیز ہوگئی۔ تیز تر JET-SPEED HIGH-SPEED اور ایک CRASH. !!!

CRASH کے بعد میں کہاں ہوں مجھے نہیں معلوم۔ مگر میرے دفتر کے ریکارڈ میں شاید میرا نام پہلا ہوگا جس کی کوئی قبر نہیں، کوئی قبرستان نہیں۔۔

۔۔۔ تو کیا پٹرول کی قیمت یوں بھی چکائی جاتی ہے؟ ؟ ؟

○●○

ماہ نامہ سب رس ۹
دسمبر ۱۹۹۸ء

گلاب سنگھ کوہری (پنجابی کہانی)

ترجمہ : جے۔ این۔ جگنو

ٹھہرا

باہر گہری دھند چھائی تھی آج سردی کچھ زیادہ ہی تھی۔ میں کمرے میں تنہا رضائی میں سمٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دھند اتنی زیادہ تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ تیز ہوا کے تھپیڑے موسم کو کچھ اور سرد بنا رہے تھے۔ اس طرح کی صبح تنہائی میں گزارنا مجھے ناگوار لگ رہا تھا۔ آج میں یہاں اکیلا ہوں لیکن کل میرے ساتھ دو ساتھی اور تھے۔ یہ ڈاک بنگلہ جہاں میں ٹھہرا ہوں، ہمالیہ کی گود میں بسے ایک چھوٹے سے گاؤں پنچ لوہ سے کوئی نصف فرلانگ دور اتر میں ایک گھنے پہاڑی علاقے میں ہے۔ میرے وہ دونوں ساتھی، جو کل تک میرے ساتھ تھے، اپنے مقصد کی تلاش میں آگے جاچکے تھے اور ان کے ایک ہفتے سے پہلے لوٹنے کا امکان نہیں تھا۔ دراصل ہماری ٹیم یہاں ایک مطالعے کے سلسلے میں آئی ہوئی تھی۔

کھڑکی کے دروازے بار بار کھلنے کی کوشش کر رہے تھے شاید ہوا کچھ زیادہ تیز ہوگئی تھی۔ مجھے چائے زیادہ پینے کی عادت ہے۔ میں سوچنے لگا چائے بنا کر پی لینی چاہئے اوہ ! بہت زیادہ سردی ہے۔ ایسے میں رضائی چھوڑنے کا من نہیں ہوا۔ کوئی ساتھ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ دروازے پر دستک سنائی دے رہی ہے، میرا خیال ادھر منتقل ہوجاتا ہے۔ مگر پھر دستک بند ہو جاتی ہے۔ شاید میرا وہم تھا۔ میں اپنے خیالوں میں دوبارہ گم ہوگیا تھا، دروازے پر پھر دستک ہونے لگی۔ میں اٹھتے ہوئے سوچتا ہوں، کون ہوسکتا ہے۔ اس وقت ؟ دروازہ کھولتے ہی سرد ہوا کا تیز جھونکا اندر داخل ہوجاتا ہے۔ دروازہ پر کوئی نہیں تھا۔ میں نے دروازہ جلدی سے بند کردیا۔

میں مایوس ہوکر دوبارہ بستر کی طرف لپکتا ہوں۔ رضائی میں گھس جاؤں یا پہلے چائے بنالوں ؟ میں کشمکش میں تھا، چائے کی کچھ زیادہ ہی طلب ہو رہی تھی۔ چلو چائے بنا ہی لیتا ہوں۔ میں نے اسٹو چالو کیا۔ پھر پانی رکھا۔ کانگڑی کو گرم کرنے لگا۔ کانگڑی پہاڑی لوگوں کے استعمال کی ایک عجیب چیز ہے۔ زیادہ سردی سے بچنے کے لیے یہاں کے لوگ اس میں آگ ڈال کر اپنے سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ اس چھوٹی سی کانگڑی کے سہارے یہاں کے لوگ ہوا کے سرد سے سرد جھونکے کو بھی برداشت کرلیتے ہیں۔ سچ مچ یہ ایک نایاب ایجاد ہے۔ چائے بن چکی تھی۔ میں دوبارہ رضائی میں گھس کر چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ چائے کا پیالہ خالی ہوا، تو ایک طرف رکھ دیا۔

اب پھر تنہائی ڈسنے لگی تھی، ابھی تو اسی طرح کی سات (۷) صبحیں گزارنی تھیں۔ یہ سوچ کر میں اندر تک لرز جاتا ہوں۔ کسی نے دروازے پر دستک دی ہے۔ نہیں یہ میرا وہم بھی ہوسکتا ہے، پھر دروازے پر دستک کی آواز آئی ہے۔ ضرور کوئی ہے۔

پھر دستک ۔ ۔ ۔ ۔ ارے بھئی کون ہے ؟ کھولتا ہوں ۔ میں اٹھ کر دروازہ کھولتا ہوں ۔ ہوا کا سرد جھونکا اندر داخل ہوتا ہے ۔ میں کمرے میں باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا ۔ یہ ایک نوجوان لڑکی تھی ۔ اندر آجائیے ۔ میں نے اس کے لیے راستہ بناتے ہوئے کہا ۔ دروازہ بند کر میں اس کی طرف مڑا ۔ آپ اتنی سردی میں اس وقت باہر ۔ ۔ ۔ ؟ میرے سوال کو ان سنی کرتے ہوئے وہ سمٹ کر دیوار کے سہارے بیٹھ گئی ۔ اس کے چہرے پر ڈر اور اطمینان کی ملی جلی لکیریں تھیں ۔ سردی سے وہ بری طرح کانپ رہی تھی ۔ میں نے ایک گرم کمبل اس کی طرف بڑھا دیا ۔ میں نے دیکھا اس کے پاس کانگڑی نہیں تھی ۔ یہ تعجب خیز بات تھی ۔ وہ سردی میں بنا کانگڑی کے کیسے ؟ یہاں کے لوگ بغیر کانگڑی کے باہر گھومیں یہ عجیب سی بات ہے ۔

کمرے میں ایک گہری چپ چھائی تھی ۔ بیچ بیچ میں اس کے دانتوں کی کٹ کٹانے کی آواز سنائی دے جاتی تھی ۔ وہ ایک دبلی پتلی لیکن خوب صورت جوان لڑکی تھی ۔ اس کی عمر مشکل سے ۲۴ ۔ ۲۵ برس رہی ہوگی ۔ میں نے کہا " آپ " ۔ ۔ ۔ آگے کے الفاظ گلے میں پھنس گئے ۔ وہ اب بھی سردی سے کپکپا رہی تھی ۔ میں نے اپنی ہمت سمیٹ کر دوبارہ کہا ۔ " آپ اطمینان سے بیٹھ جائیے ۔ میں آپ کے لیے چائے بناتا ہوں ۔" چائے بناتے وقت میری نگاہیں برابر اس کی طرف اٹھ جاتی تھیں ۔ وہ اب بھی سہمی سی سمٹی سی بیٹھی تھی ۔ لیجیے چائے پیجیے ۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھا دیا ۔ وہ دھیرے دھیرے گھونٹ گھونٹ چائے پینے لگی ۔ کمرے میں اب بھی بھیانک سناٹا چھایا تھا ۔ میرے لیے اس کی یہ خاموشی برداشت سے باہر ہورہی تھی ۔ " آپ کچھ بولتی کیوں نہیں ؟ " میں نے پوچھا ۔ میری طرف ایک خاموش نگاہ اٹھا کر اس نے نظریں جھکالیں ۔ اس کی نظروں میں ایک عجیب سی اداسی تھی ممکن تھا وہ کسی بات کو لے کر الجھن میں تھی ۔ " جاننا چاہو گے ؟ اس کی آواز کافی گہرائی سے آتی ہوئی معلوم ہورہی تھی ۔" اتنا بول کر اس نے ایک سوالیہ نگاہ مجھ پر ڈالی ۔ وہ غالباً وہ اپنی کہانی تو سنانا چاہتی تھی لیکن ایک اجنبی کے سامنے کیسے کہے یہ خیال اس کو روکے ہوئے تھا ۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب تاثر پیدا ہوا جیسے دریافت کرنا چاہتی ہو ۔ تم کون ہو ؟ لیکن بول نہیں سکی ۔ میں اس سے اپنا تعارف کرانا چاہ ہی رہا تھا ۔ اس نے پوچھ لیا آپ کون ہیں ؟ اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی ۔ " میں ایک ریسرچ ٹیم کا رکن ہوں ۔ میرے دو ۔ دو ساتھی آگے گئے ہوئے ہیں ۔ ہماری ریسرچ ٹیم یہاں کے علاقائی طور طریقوں کا مطالعہ کرنا چاہتی ہے ۔ آپ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں ، بے جھجک کہیے ۔ جہاں تک ہوسکے گا میں آپ کی مدد کروں گا ۔

وہ متعجب ہوگئی تھی ۔ اس نے اپنے حواس درست کیے اور آرام سے بیٹھ گئی ۔ ہلکے سے کھنکھار کر اس نے اپنا گلا صاف کیا اور نظریں جھکالیں ۔ قسمت نے مجھ کو مصیبتوں کے سمندر میں پھینک دیا ہے ۔ میں نے کبھی مریضوں میں کوئی تفریق نہیں کی میرے لیے فوجی جوان ، معمولی آدمی ، یا راہ سے بھٹکے جوان جو اتحاد پسند کہلاتے ہیں سبھی یکساں تھے ۔ میں علاج کو اپنا فرض سمجھتی تھی ۔ ہر مریض کی خدمت میں اپنا فرض سمجھتی تھی ۔ میری نظر میں مریض صرف مریض تھا وہ مسلم تھا نہ ہندو ۔ مجھے یاد ہے ۔ ایک تصادم میں تین اتحاد پسند گھائل ہونے کے بعد دے میرے پاس آئے تھے ۔ میں نے ان کا علاج کیا اور پڑوسی کے بہکاوے میں آکر غلط کام کرنے سے منع بھی کیا ، لیکن وہ نہیں مانے ۔ میں بغیر کسی تفریق کے اور مریضوں کی طرح ان کا علاج کرتی رہی ۔

ایک شام وہ ہمارے گھر آئے اور میرے بھائی کو ساتھ چلنے اور بغاوت میں شامل ہونے کے لیے کہنے لگے ۔ ابو نے انھیں صاف منع کردیا ۔ ابو کو انھوں نے مذہب کا واسطہ دیا ۔ لیکن ابو نہیں مانے ۔ میں نے بھی ان کے واپس جانے کو کہا ۔ لیکن وہ کہاں ماننے والے تھے ۔ آخر کار میں نے ان سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میرا بھائی گم راہ لوگوں کی ٹولی میں نہیں جائے گا ۔ دیکھ لینے کی دھمکی دے کر چلے گئے ۔ اگلے کچھ روز تک ہم سہمے رہے ۔ لیکن کچھ نہیں ہوا ۔

ایک روز کالج سے لوٹتے وقت میرے بھائی کا اغوا کرلیا گیا ۔ پورا گھر پریشان تھا ۔ دوسرے دن ان کا ایک آدمی آیا ۔ اس نے کہا اگر ہم پولیس کو اطلاع کریں گے تو وہ میرے بھائی کو مار ڈالیں گے ۔ میں نے ان کو اپنے علاج کا واسطہ دیا ۔ لیکن پتھر دل نہ پگھلے میں بھی ہار کہاں ماننے والی تھی ۔ میں نے پولیس کو اطلاع دے دی ۔ اسی رات میرے بھائی کو لے کر وہ میرے گھر آئے اور ہم سب کے سامنے اس کو گولیوں سے چھلنی کردیا ۔

بس میرا من اچٹ گیا ۔ اسی دن میں نے فیصلہ کرلیا کہ آگے سے کبھی ان کے لوگوں کا علاج نہیں کروں گی ۔ کچھ دن بعد وہ ایک گھائل نوجوان کو لے کر میرے پاس آئے ۔ اس کے گلے میں گولی لگی تھی ۔ میں نے اس کا علاج کرنے سے صاف منع کردیا ۔ بعد میں مجھے اس کا بہت دکھ بھی ہوا کہ میں نے ایک مریض کا علاج نہیں کیا ۔ مریض نہ اتحاد پسند ہوتا ہے ۔ نہ سادھو ہوتا ہے ۔ مریض تو بس مریض ہوتا ہے ۔ ایک ڈاکٹر کا فرض ہوتا ہے کہ وہ بغیر کسی تفریق کے اس کا علاج کرے ۔ پچھلی رات کو وہ پھر آئے تھے ۔ ابو نے دروازہ کھولا تو انھوں نے ابو کو گولی ماردی ۔ میں یہ نظارہ دیکھ کر سمجھ گئی کہ میرا بھی یہی حشر ہونے والا ہے ۔

میں پچھلے دروازے سے جان بچا کر بھاگ نکلی ۔ باہر شدید کہر تھا ۔ میں اس میں چھپ کر آگے بڑھنے لگی ۔ اس کہرے کو میں روزانہ کوستی تھی ۔ آج اسی کے سہارے اپنی جان بچاتی بھاگتی پھر رہی تھی ۔ رات بھر ادھر ادھر بھٹکتی رہی ۔ صبح اللہ نے آپ کے دروازے پہنچا دیا ۔" اس نے اپنی کہانی ختم کردی ۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں ۔ اب باہر برف گرنے لگی تھی ۔ ماحول کچھ اور سرد اور بوجھل ہوچکا تھا ۔ میں سوچنے لگا ۔ یہ لوگ کسی کے بہکاوے میں آکر خود اپنوں کو کھوتے جارہے ہیں ۔ کیا مل جائے گا ان کو ایسا کر کے ۔ ان کی آنکھوں کے آگے چھایا کہرا کب ہٹے گا ؟

○●○

(سلسلہ ص [illegible] سے)

" میں تو نہیں لینے گیا تھا " ۔ مجو نے حوصلے سے کہا ۔

اس نے [illegible] سے دیکھا اور لیٹ گئی ۔ پھر آہستہ آہستہ قدموں کی چاپ سنائی دی مجو نے چاہا بھاگ جائے مگر وہ سایہ بالکل قریب آگیا تھا ۔ " لے آئے ہو تمباکو ۔" وہ بولی ۔ سائے نے اپنا ہاتھ بڑھایا جس میں کاغذ کی پڑیا تھی ۔ " تم بہت اچھا دباتے ہو ۔" اس نے " سائے " کے آگے ٹانگ پھیلا کر کہا ۔ سائے نے جھک کر جوں ہی پاؤں پکڑے مجو کے منہ سے نکلا ۔ " تم ہو گموں !!! اور دونوں کے ماتھوں پر پُر معنی اور بے معنی سی شکنیں ابھر آئیں ۔ دور موذن کے حجرے کی مدھم روشنی بھی گل ہوگئی اور مسجد کے [illegible] رات کی [illegible] میں یک بارگی ڈوب گئے ۔

○●○

ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی

حیدر آباد۔ 500033 ۔ فون 244729

بی اے ، بی کام اور بی ایس سی کورسس (2000-1999) میں داخلوں کیلئے اہلیت کا امتحان

اہلیت کی شرط

بی اے /بی کام /بی ایس سی (تین سالہ ڈگری کورس) میں داخلہ کی بابت اہلیت ٹسٹ میں شرکت کیلئے تعلیمی قابلیت اور غیر تعلیمی قابلیت کے ساتھ ایسے امیدواران اہل ہوں گے جو یکم جولائی 1999 کو عمر کے 18 سال مکمل کرتے ہوں۔ یکم جولائی 1999 کو 18 سال مکمل نہ کرنے والے امیدوار کسی بھی حالت میں اہلیت ٹسٹ میں شرکت کے اہل نہیں ہوں۔ اگر ایسے غیر اہل امیدوار اہلیت ٹسٹ میں شرکت کرتے ہوں تو ان کے اہلیتی امتحان کے نتائج کسی بھی مرحلہ میں منسوخ کردیے جائیں گے اور ان کی فیس واپس نہیں کی جائے گی۔

تاریخ ، مقام اور اہلیت ٹسٹ کا میڈیم

اہلیت کا امتحان اتوار 24/ جنوری 1999 سے 10 بجے صبح تا 12.00 بجے دوپہر انگریزی، تلگو اور اردو ذریعہ تعلیم میں آندھرا پردیش کے تمام اسٹڈی سنٹر میں بشمول دونوں شہروں اور منتخب امتحانی مراکز جو اس اعلامیہ میں بتائے گئے ہیں، پر منعقد ہوگا۔

پراسپکٹس اور درخواست فارم کیسے حاصل کریں

شخصی طور پر ۔ امیدوار پراسپکٹس اور درخواست فارم شخصی طور پر -/30 روپے نقد ادا کرکے اپنے نزدیکی منتخب امتحانی مراکز یا کسی بھی اسٹڈی سنٹر یا پھر دفتر کنٹرولر آف اگزامنیشن ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، روڈ نمبر 46، جوبلی ہلز، حیدر آباد 500033 سے حاصل کرسکتے ہیں۔

بذریعہ ڈاک ۔ امیدوار پراسپکٹس اور درخواست فارم بذریعہ رجسٹری ڈاک کسی بھی اسٹڈی سنٹر یا دفتر کنٹرولر آف اگزامنیشن ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی روڈ نمبر 46، جوبلی ہلز، حیدر آباد 500033 سے بہ ادائیگی 70 روپے بذریعہ ڈی ڈی بحق " Registrar,Dr.B.R.Ambedkar Open University Hyderabad " تحریری گذارشی مکتوب کے ساتھ صحیح مکمل پتہ معہ پن کوڈ نمبر دیتے ہوئے حاصل کرسکتے ہیں۔

درخواست فارم کیسے داخل کریں

امیدواروں کو چاہیے کہ وہ آخری تاریخ سے قبل تکمیل کردہ درخواست فارم اس اسٹڈی سنٹر یا منتخب امتحانی مرکز میں داخل کریں، جہاں وہ اہلیت کے امتحان میں شرکت کرنا چاہتے ہوں۔ جہاں انہیں اہلیت کے امتحان کے آغاز سے ہفتہ پہلے درخواست فارم داخل کرنا ہوگا۔

- **فارمس کی فروختگی کا آغاز : 11 نومبر 1998**
- **فروخت اور ادخال کی آخری تاریخ : 22 ڈسمبر 1998**

نوٹ 1 ۔ اعلامیہ سے قبل اور درخواست کے ادخال کی آخری تاریخ کے بعد حاصل کردہ ڈی ڈیز ناقابل قبول ہیں۔ آئی پی او منی آرڈر اور چیکس قبول نہیں کئے جائیں گے۔ تکمیل کردہ درخواست فارمس جو 22 ڈسمبر 1998 کے بعد وصول ہوں کسی بھی حالت میں قبول نہیں کی جائیں گی، حتیٰ کہ جرمانہ فیس کے ساتھ بھی نہیں۔ اس تعلق سے کوئی مراسلت بھی قبول نہیں ہوگی۔

2۔ ایسے امیدواران جو یونیورسٹی کی جانب سے 1995, 1996, 1997 اور 1998 میں منعقدہ اہلیت ٹسٹ میں پہلے ہی کامیاب ہوئے ہوں لیکن داخلہ نہ لئے ہوں وہ تعلیمی سال 2000-1999 کے دوران ڈگری پروگرام میں راست داخلے کے اہل ہیں۔ ایسے امیدواروں کو ایک بار پھر اہلیت ٹسٹ میں شرکت کی ضرورت نہیں ہے۔ راست داخلہ کی بابت ایک علحدہ اعلامیہ مئی /جون 1999 میں ایسے امیدواروں کیلئے جاری کیا جائے گا جو انٹرمیڈیٹ یا اس کے مماثل امتحان کامیاب کئے ہوں۔

دستخط

(ای چندریا)

رجسٹرار

ڈسٹرکٹ اسٹڈی سنٹرس

ضلع عادل آباد گورنمنٹ ڈگری کالج عادل آباد 504001، گورنمنٹ جونیر کالج سرپور کاغذ نگر 504296، گورنمنٹ ڈگری کالج نرمل 504106، گورنمنٹ جونیئر کالج بیلا پلی 504251 ۔ اننت پور ضلع گورنمنٹ ڈگری کالج اننت پور، ایس ڈی جی ایس کالج ہندوپور 515201، سری کنیکا پرمیشوری گورنمنٹ کالج گنتکل 515803، گورنمنٹ ڈگری کالج دھرماورم 515201، کے ایس این گورنمنٹ کالج فار ویمن اننت پور 515001 ۔ ضلع کڑپہ گورنمنٹ کالج فار مین کڑپہ 516001، ایس بی این آر گورنمنٹ کالج پروداتور 516360، ولی ایس آر ڈگری کالج پلی وینڈولا 516390، گورنمنٹ ڈگری کالج رایاچوٹی 516269، ایس بی وی آر ڈگری کالج بدویل 516227 ۔ مشرقی گوداوری سی آر آر کالج ایلورو 534006، گورنمنٹ جونیئر کالج پالا کولو 534375، ڈی این آر کالج بھیماورم 534202، ڈاکٹر ایس آر آر اینڈ سی وی آر کالج ... ۔ ضلع گنٹور ہندو کالج گنٹور 522003، شری تریک بی آر ریڈی کالج نرسا راؤ پیٹ 522601، وی ایس آر اینڈ این وی آر کالج تینالی 522201 ۔ ضلع کریم نگر ایس آر آر گورنمنٹ کالج کریم نگر 505002، گورنمنٹ جونیر کالج پیدا پلی 505172، گورنمنٹ جونیر کالج گوداوری کھنی 505202، ایس کے این آر گورنمنٹ ڈگری کالج جگتیال 505327، گورنمنٹ جونیر کالج حضور آباد 505468، گورنمنٹ جونیر کالج منتھنی 505184، گورنمنٹ جونیر کالج مہادیو پور 505504، گورنمنٹ جونیر کالج میٹ پلی 505925 ۔ ضلع کھمم ایس آر اینڈ بی جی این آر کالج کھمم 507002، کے وائی کے آر وائی اور پی این گورنمنٹ جونیر کالج کتہ گوڈم 507101، گورنمنٹ ڈگری کالج فار ویمن کھمم 507001، گورنمنٹ جونیئر کالج مدیرا 507203، گورنمنٹ جونیئر کالج بھدراچلم 507111 ۔ ضلع کرنول سلور جوبلی کالج کرنول 518302، بی ایس سی اینڈ کے وی ایس سی گورنمنٹ کالج نندیال 518502، آرٹس اینڈ سائنس کالج ادونی 518302، گورنمنٹ جونیر کالج سری سیلم پروجیکٹ سری سیلم 518102 ۔ ضلع محبوب نگر ایم ایس وی آرٹس اینڈ سائنس کالج محبوب نگر 509001، گورنمنٹ جونیر کالج ... 509216، ایم اے ایل ڈی گورنمنٹ آرٹس اینڈ سائنس کالج گدوال 509125، گورنمنٹ ڈگری کالج فار مین ونپرتی 509103 ۔ ضلع نلگنڈہ : ناگر جنا گورنمنٹ کالج نلگنڈہ 508002، گورنمنٹ جونیر کالج ... 508101، سری وینکٹیشورا کالج سوریا پیٹ 508212، گورنمنٹ جونیر کالج مریال گوڑہ 508207، گورنمنٹ جونیر کالج ناگر جنا ساگر ۔ ضلع نیلور ۔ سری سرودیا کالج نیلور 524003، جواہر بھارتی کالج کاولی 524201، وائی آر جونیر کالج ... 524228، گورنمنٹ ڈگری کالج ... پیٹ 524126 ۔ ضلع نظام آباد گری راج گورنمنٹ ڈگری کالج نظام آباد 503002، گورنمنٹ جونیر کالج بانسواڑہ 503187، گورنمنٹ آرٹس اینڈ سائنس کالج کاماریڈی 503111، گورنمنٹ جونیر کالج ... 503187 ۔ ضلع پرکاشم : سی ایس آر شرما کالج اونگول 523001، گورنمنٹ جونیر کالج ... 523301، گورنمنٹ جونیر کالج ... 523230، وی ایس آر اینڈ این وی آر این کالج چیرالہ 523157 ۔ ضلع مشرقی گوداوری گورنمنٹ ڈگری کالج راجمندری 533105، آر آئی جی آر گورنمنٹ جونیر کالج ... 533450، پی آر گورنمنٹ کالج کاکناڈا 533001، سنٹرل جیل راجمندری 533105 گورنمنٹ ڈگری کالج ... گورنمنٹ ڈگری کالج کتہ پیٹ ۔ ضلع میدک گورنمنٹ ڈگری کالج ... پیٹ 502103، گورنمنٹ کالج سنگاریڈی 502001، گورنمنٹ ڈگری کالج میدک 502110 ۔ ضلع سریکاکلم گورنمنٹ ڈگری کالج سریکاکلم 532001، گورنمنٹ جونیئر کالج ... 532312، ایس وی اے گورنمنٹ کالج ... 532201 ۔ ضلع چتور ایس وی آرٹس کالج تروپتی 517502، ایس وی اے گورنمنٹ کالج ... 517644، پی وی کے این گورنمنٹ کالج چتور 517001، ایم ایف سی گورنمنٹ جونیر کالج ... 517425، گورنمنٹ جونیر کالج ... 517588، بی ٹی کالج مدن پلی 517312، گورنمنٹ جونیر کالج ... 517425، گورنمنٹ جونیر کالج ... 517583 ۔ ضلع کرشنا ... 520010، ... 521001، ... 521010، کے وی آر کالج نندی گاما 521185، ... 521201، اے این آر پی ایل آرٹس اینڈ سائنس کالج گڈی واڑہ 521301 ۔ ضلع وشاکھاپٹنم ڈاکٹر وی ایس کرشنا گورنمنٹ کالج وشاکھاپٹنم 530014، گورنمنٹ ڈگری کالج ... 531001 ۔ ضلع وزیانگرم مہاراجہ کالج وزیانگرم 532201، سری وینکٹیشورا کالج ... 532501 ۔ ضلع ورنگل سی کے ایم آرٹس اینڈ سائنس کالج ورنگل 506001، گورنمنٹ جونیر کالج ... 506343، ... ڈگری کالج ... 506001، اے بی وی ڈگری کالج جنگاؤں 506167، گورنمنٹ جونیر کالج محبوب آباد 506301، گورنمنٹ جونیر ... ۔ ضلع رنگا ریڈی ایس اے پی آرٹس اینڈ سائنس کالج ... 50110، گورنمنٹ جونیر کالج ... راجندر نگر 500032، گورنمنٹ جونیر کالج ...۔

دونوں شہروں کے اسٹڈی سنٹرس

گورنمنٹ سٹی کالج نزد ہائی کورٹ حیدر آباد 500002، نیو گورنمنٹ جونیر کالج ... سکندر آباد 500003، گورنمنٹ جونیر کالج فار گرلز ... حیدر آباد 500001، ریلوے جونیر کالج لالہ گوڑہ سکندر آباد 500017، گورنمنٹ ڈگری کالج فار ویمن بیگم پیٹ حیدر آباد 500077، نیو گورنمنٹ جونیر کالج خیریت آباد حیدر آباد 500004، گورنمنٹ جونیر کالج ... حیدر آباد 500027، محبوب کالج ایس پی روڈ سکندر آباد 500003، محبوب کالج ... ایس پی روڈ سکندر آباد 500003، گورنمنٹ جونیر کالج ... حیدر آباد 500001، گورنمنٹ جونیئر کالج عالیہ ... حیدر آباد 500001، گورنمنٹ جونیر کالج ... حیدر آباد 500036، ... کالج فار ویمن، پرانی حویلی حیدر آباد 500002، ... کالج ... حیدر آباد ... حیدر آباد 500038۔

اہلیت امتحان 1999 کیلئے نئے امتحانی مراکز

ایس بی ایس این گورنمنٹ کالج، کالیری اننت پور ڈسٹرکٹ ۔ گورنمنٹ ڈگری کالج بیجم پیٹ منڈل، ضلع کڑپہ۔ گورنمنٹ ڈگری کالج ... ضلع کرنول۔ گورنمنٹ جونیر کالج منچریال ضلع عادل آباد۔ ایم کے آر گورنمنٹ ڈگری کالج ... ضلع نلگنڈہ۔ ڈگری کالج ... ضلع رنگا ریڈی۔ ... ڈگری کالج گرازالا ضلع گنٹور۔ سری واساوی کنیکا پرمیشوری آرٹس اینڈ سائنس ... کالج ... ضلع پرکاشم۔ گورنمنٹ ڈگری کالج ظہیر آباد ضلع میدک۔ گورنمنٹ ڈگری کالج کلواکرتی ضلع محبوب نگر۔ ... آرٹس اینڈ سائنس کالج ... ضلع پرکاشم۔

(AdvM No.Dr.BRAOU/RO/PR/...

December, 19[illegible] [illegible]
Regd. [illegible]
THE "SABRAS" URDU MONTHLY
TAHNEYAT-UN-NISSA BEGUM ZORE NUMBER
Organ of "Idara - e - Adabiyat - e - Urdu" Aiwan - e - Urdu, Hyderabad - 500 482 (A.P.)

بیرونی ممالک میں
ادارہ ادبیاتِ اردو کے نمائندے

کینیڈا ☆ جناب شاہد صدیقی صاحب
SIDDIQI SIDDIQI & CO,
1719 BANK STREET,
SUITE 204,
OTTAWA, ONTARIO,
KIV 724 (CANADA).
فون نمبر 613 - 738 - 7712.

امریکہ ☆ جناب حسن چشتی صاحب
7130 N. KEDVALE
LINCOLN WOOD,
IL 60046. U.S.A.

برطانیہ ☆ محترمہ صدیقہ شبنم صاحبہ
2. LYMINGE CLOSE,
SIDCUP KENT,
DA 14 6RE U.K.
Phone : 081 - 302 - 5904.

سکینڈے نیویا ☆ جناب جمشید مسرور صاحب
LINDEBERGASEN 46 - A,
N - 1068 - OSLO,
NORWAY

سعودی عرب:

جدہ ☆ جناب شریف اسلم صاحب
بزمِ اردو ، جدہ ۔

جدہ ☆ جناب سلیم فاروقی صاحب
اردو اکیڈی ، جدہ ۔
فون نمبر 6855698

ریاض ☆ جناب غوث ارسلان صاحب
P.O. BOX. NO. 71.
RIYADH- 11411.